دیوی

طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

دیوی ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے انوکھی تھی۔ یہ سیدھی سادی لڑکی جب بے آسرا ہو کر روشنیوں اور رنگوں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے شہر میں پہنچی تو اسے انسان کا اصل روپ دیکھنے کا موقع ملا۔ اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے موقع شناس اور مطلب پرست ملے۔ اس نے خود کو اس تنہا ہرنی کی طرح محسوس کیا جو راستہ بھٹک کر درندوں سے بھرے ہوئے تاریک جنگل میں نکل آئی ہو، ہر شخص پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا۔

لیکن نہیں...... ابھی دنیا میں کچھ لوگ موجود تھے جن پر اعتبار کیا جا سکتا تھا اور اسے ایک ایسا شخص ملا جو واقعی قابلِ اعتبار تھا۔ وہ اپنی فطرت میں جدا تھا۔ وہ ایک قاتل ڈاکو تھا، لیکن اس کے سینے میں ایک انسان کا دل دھڑکتا تھا۔

ان دونوں کے ملاپ نے ایک حیرت انگیز روداد کو جنم دیا۔ شانی اور رستم کی یہ روداد دو متضاد جذبوں کی کہانی بھی ہے۔ ان میں سے ایک شبنم ہے اور ایک شعلہ۔ ایک شیشہ ہے اور ایک پتھر۔ ایک کو زمانے نے ڈاکو بنایا ہے، صرف مارنا اور انتقام لینا سکھایا ہے۔ دوسرے کو اس کی فطرت نے دیوی بنایا ہے۔ وہ صرف پیار کرنا اور معاف کرنا جانتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انہیں منہ زور محبت کی ڈور نے ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے۔

یہ ایک نامی گرامی مجرم اور ایک اونچے خاندان کی ''چھوٹی چوہدرانی'' کا ملاپ ہے۔ وہ اپنے اپنے مزاج اور ذہن کے مطابق اپنے خوفناک مسائل سے نبٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کہانی پڑھ کر کریں۔

امید ہے کہ مقبولِ عام جاسوسی ڈائجسٹ میں چھپنے والی یہ قسط وار کہانی کتابی صورت میں قارئین کو پسند آئے گی۔

طاہر جاوید مغل

سردیوں کا سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ رنگ والی گاؤں میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ گاؤں سے چند کھیت دور بابے خدا بخش کا کنواں تھا۔ بیلوں کی جوڑی چکر کاٹ رہی تھی اور کھالے میں سفید چمکیلا پانی تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی کچھ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں چھوٹی بچیاں بھی تھیں، لڑکیاں بھی اور دو چار درمیانی عمر کی عورتیں بھی۔ پاس ہی چند بچے ملیشیا کی شلوار قمیص پہنے کھیل کود میں مصروف تھے۔ شانی کو پانی نہیں بھرنا تھا، وہ بس یونہی اپنی سہیلی سکینہ کے ساتھ کنوئیں پر چلی آئی تھی۔ شام کے وقت شانی کو حویلی سے باہر نکلنا اور کھلی ہوا میں گھومنا اچھا لگتا تھا خاص طور سے جب سکینہ ساتھ ہوتی تھی تو اسے زیادہ لطف آتا تھا۔ سکینہ اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ سکینہ ایک عام کاشت کار کی بیٹی تھی جب کہ شانی گاؤں کے چوہدری ارشاد کی اکلوتی دھی رانی تھی۔ دونوں کی حیثیت میں نمایاں فرق تھا مگر ان کی دوستی ہر چیز سے بالاتر تھی۔ دونوں حویلی کے اندر باہر چڑیوں کی طرح چہکتی پھرتی تھیں۔ گاؤں کی ساری گلیاں اور راستے انہیں اپنے گھر کے صحن جیسے لگتے تھے۔ گاؤں کے سب لوگ بھی تو جانے پہچانے تھے کوئی چاچا تھا، کوئی ماماں، کوئی بھائی ہر بوڑھی عورت بے بے اور ہر درمیانی عمر کی عورت ماسی تھی۔

گاؤں کی فضا میں ایک گہرا اپناپن تھا۔ اسی اپنے پن کا اعجاز تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں گھر کی چار دیواری سے باہر بھی آزادانہ چہلیں کرتی تھیں اور ان کے ہنسی مذاق سے قرب و جوار گونجتے تھے۔ اس روز بھی کچھ ایسی ہی فضا بنی ہوئی تھی، شانی نے شرارت سے صغراں کو مٹی کا ڈھیلا مارا تھا اب صغراں اور شمیم پانی سے بھری ہوئی کٹوری لے کر شانی کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی نوخیز تھیں لیکن شانی کے بدن میں چستی اور لچک ان دونوں سے زیادہ

تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے انہیں دو تین چکمے دیئے اور راستے کی طرف نکل آئی، سامنے سے سکینہ جھپٹی...... سکینہ سے بچنے کے لئے شانی نے تیز رفتار ہرنی کی طرح خود کو ایک دم روک کر پھر رخ پھیرا...... اور یہی وقت تھا جب اس سے غلطی ہوئی۔ وہ اپنے کھیل میں اتنی مگن تھی کہ سامنے سے آنے والے تیز رفتار گھڑ سوار کو نہیں دیکھ سکی۔ گھڑ سوار نے شانی کو بچانے کے لئے زور سے لگامیں کھینچیں۔ گھوڑی کی گردن اوپر کو اٹھی اور وہ ہنہناتی ہوئی ذرا ترچھی ہوگئی۔ بہرحال اس کی رفتار میں اب بھی کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی۔ گھڑ سوار کا ایک گھٹنا شانی کے کندھے سے ٹکرایا اور وہ لڑھک کر کیکر کے ایک درخت سے جا لگی۔ چند گز آگے جا کر گھوڑی رک گئی۔ شانی گرتے گرتے بچی تھی پھر بھی درخت کے ساتھ ٹکرانے سے اس کی ایک کہنی چھل گئی تھی۔

لڑکیاں اور عورتیں ایک دم شانی کے اردگرد اکٹھی ہوگئیں۔ اس کی آستین اٹھائی گئی۔ گورے گورے خوبصورت بازو پر خراش کی سرخی نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ گھڑ سوار دو تھے۔ ایک جواں سال تھا اور اپنے لباس سے کھاتے پیتے گھرانے کا نظر آتا تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی اس شخص کو کنوئیں کے آس پاس دیکھا ہے۔ شاید ایک بار وہ گاؤں کے بازار میں بھی نظر آیا تھا۔ دوسرا درمیانی عمر کا سانولا سا شخص تھا۔ اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نوجوان کا کارندہ ہے۔ دونوں گھڑ سوار گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔

سکینہ نے جواں سال گھڑ سوار کو مخاطب کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''اندھے ہو، دیکھ کر نہیں چلا جاتا تم سے؟''

گھڑ سوار مسکرایا تو اس کی چوڑی ناک کچھ اور بھی چوڑی نظر آنے لگی۔ اس کے کانوں کے نیچے گوشت کی بہتات تھی اور جبڑے کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سخت گیر اور سخت جان شخص ہے، وہ اطمینان سے بولا۔ ''یہ بات تم اپنی اس سہیلی سے کہو تو زیادہ مناسب ہے۔''

''زیادہ زبان نہ چلاؤ، جاؤ اپنا کام کرو۔'' شانی نے غصے سے سُرخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کے آثار بھی تھے۔

جواں سال شخص اب دلچسپی سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''بڑا غصہ آرہا ہے بھئی۔'' اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر دیدے مٹکائے۔

''بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ یہاں سے۔'' شانی نے پھر طیش بھرے لہجے

میں کہا۔

گھوڑی سے ٹکرانے سے چند سیکنڈ پہلے صغراں نے شانی پر پانی پھینک دیا تھا۔ اب یہ پانی اس کی گردن اور گریبان کو بھگو رہا تھا۔ اس گیلے پن کی وجہ سے شانی کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ بہت نمایاں نظر آرہا تھا۔ وہ دیہی خوبصورتی کی کامل تصویر تھی۔ نازک، سبک بدن اور دودھ کی طرح سفید...... اب اس سفیدی میں غصے کا سُرخ رنگ بھی گھلا ہوا تھا۔

جواں سال شخص بے ساختہ چند قدم چل کر اس کے قریب آگیا۔ اس کی گرم نگاہیں شانی کے سراپا سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''کہاں چوٹ لگی ہے جناب کو؟'' انداز میں ہمدردی سے زیادہ شرارت تھی۔

اس سے پہلے کہ اجنبی کا ہاتھ شانی کے جسم سے چھوتا، بجلی سی چمکی، شانی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنا ہاتھ گھمایا، چٹاخ کی آواز سے ایک تھپڑ جواں سال شخص کے گال پر پڑا۔ اس کا گندمی رنگ یکا یک سیاہی مائل، سُرخ ہوگیا۔ اس کا درمیانی عمر کا ساتھی اپنی جگہ پر تڑپ گیا۔ اس نے بڑے خونخوار انداز میں شانی کی طرف بڑھنا چاہا۔ ''خبردار۔'' سکینہ دیوار بن کر شانی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ سکینہ سے کندھا ملا کر صغراں کھڑی تھی۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے چوہدری جی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔'' درمیانی عمر کا شخص گرجا اور اس نے سکینہ اور صغراں کو دھکیل کر شانی کی طرف بڑھنا چاہا۔ اس کا انداز خطرناک تھا لیکن پھر وہ رک گیا۔ جواں سال شخص نے اپنے ہاتھ سے اسے روک دیا تھا۔

''نہیں...... اکبرے...... جانے دے اسے۔'' جواں سال شخص نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس لہجے میں امن پسندی اور درگزر کے بجائے جنگ اور طیش کا رنگ جھلکتا تھا۔

درمیانی عمر کے شخص نے جس کا نام اکبرے لیا گیا تھا، پھنکارتے ہوئے اپنے مالک کی طرف دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا پڑھا کہ قدرے ٹھنڈا ہوگیا۔

جواں سال چوہدری کا ایک گال اور کان سُرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہولے ہولے اپنے گال کو سہلایا۔ اس کی تیز نگاہیں بدستور شانی کے سراپا پر تھیں۔ گھمبیر آواز میں بولا۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔''

''چل جا اپنا کام کر۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ''نہیں تو ابھی گاؤں کے مرد آجائیں گے...... مار مار کر ہتھ پیر توڑ دیں گے تم دونوں کے۔''

جواں سال شخص نے جیسے ادھیڑ عمر عورت کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نگاہوں کا طیش بدستور شانی کے جسم کو چھید رہا تھا۔ موٹے موٹے سانولے ہونٹوں پر اب ایک زہریلی سی

مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں گھڑ سوار دھول اُڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سکینہ نے اپنی اوڑھنی کا کنارہ پھاڑ کر شانی کی کہنی پر باندھ دیا۔ اسی دوران میں درختوں کے اندر سے رنگ والی گاؤں کا سابقہ چوکیدار بابا نتھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا عورتوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے یہاں پہنچنے سے پہلے سارا واقعہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن جواں سال چوہدری اور اس کے کارندے اکبرے کی جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔

لڑکیوں کے پاس پہنچ کر بابا نتھا بولا۔ ''کیا ہوا دھی رانیو...... یہ بندے تم سے کیا کہہ رہے تھے؟''

سکینہ نے ایک ہی سانس میں سارا واقعہ کہہ سنایا اور شانی کی زخمی کہنی بھی دکھا دی۔

بابے نتھے کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دور کچے راستے کے آخری سرے پر دونوں گھڑ سواروں کی اُڑائی ہوئی دھول ابھی تک باقی تھی۔ اس بکھری بکھری سی دھول کے ذرات ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور ان کے عقب میں کماد کے بلند کھیت تھے۔ بابے نتھے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ تار پور کا چوہدری فاخا تھا۔''

''چوہدری فاخا؟ یہ کون ہے؟'' صغراں نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

''بڑی اوتری شے ہے۔'' بابے نتھے نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بزرگانہ ناراضی دکھائی دی۔ شانی کی زخمی کہنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اتنی چھوٹی سی خراش کے لئے تم نے اتنا جھگڑا ڈال دیا ہے۔''

''بابا! بات خراش کی نہیں ہے وہ لفنگا شانی پر ہاتھ ڈال رہا تھا۔'' سکینہ نے تنک کر کہا۔

بابے نتھے نے کچھ نہیں کہا، بس خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ صغراں نے کہا۔ ''بابا یہ تار پور کا نام تو شاید پہلے بھی کہیں سنا ہوا ہے لیکن یہ چوہدری فاخے کا نام پہلی بار سن رہے ہیں۔ یہ کس باغ کی مولی ہے؟''

''یہ اچھا بندہ نہیں ہے۔ اس کا باپ بھی ایک نمبر کا سخت اور کرخت زمیندار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے تین مزارعوں کو بجلی والے ٹوکے میں دے کر کٹوا دیا تھا۔ اگر دھی رانی نے اسے تھپڑ مارا ہے تو یہ آسانی سے نہیں بھولے گا۔ اس کے بدلے میں کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔''

''کیا کر لے گا، فوج لے کر آ جائے گا، بڑے دیکھے ہیں ایسے سورمے۔'' ادھیڑ عمر

عورت نے سر جھٹک کر کہا۔

لڑکیاں ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگیں...... شانی بھی ان باتوں میں شریک ہو گئی۔ بابا نتھا اپنی گمشدہ بکری ڈھونڈتا ہوا آگے نکل گیا...... بات آئی گئی ہو گئی۔ معمولی سی خراش تھی۔ شانی نے گھر میں بتانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ دیکھا جاتا تو اس واقعے میں قصور اس کا اپنا ہی تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی خود ہی گھوڑی کے آگے آ گئی تھی۔ اگر وہ یہ بات ابا جی کو بتاتی تو سب سے پہلے تو اسے ہی ڈانٹ ڈپٹ ہونا تھی اور ابا جی کی ہلکی سی ڈانٹ بھی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ جس سے پیار زیادہ ہو اس کا مارا ہوا پھول بھی تکلیف دیتا ہے۔

ابا جی سے شانی کو بہت پیار تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، دو بھائی تھے۔ ایک تو کاروبار کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا اور دوسرا گاؤں میں ہی تھا لیکن اسے اپنے مشغلوں سے ہی فرصت نہیں تھی۔ گھر میں اس کے پاؤں کم کم ہی ٹکتے تھے۔ آجا کے شانی ہی تھی جو رات کو ان کے پاؤں دباتی تھی۔ جمعے کی دوپہر ان کے سر میں سرسوں کے تیل یا دیسی گھی کی مالش کرتی تھی۔ ان کی کھانسی کی دوا، ان کی عینک، پگڑی اور جوتی وغیرہ کا خیال رکھتی تھی۔ یہ چیزیں چوہدری ارشاد کو ہمیشہ مقررہ جگہ پر پڑی ملتی تھیں اور یہی وہ ہمیشہ سے چاہتے تھے۔ یوں تو شانی کی مرحومہ ماں بھی ان باتوں کا بہت خیال رکھتی تھیں، اکثر ان سے بے پرواہی بھی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں چوہدری ارشاد بڑے جز بز ہوتے تھے۔ ان کی زندگی میں سلیقہ تھا، ترتیب تھی اور وہ چاہتے تھے کہ دیگر اہلِ خانہ کے رویے میں بھی یہ صفات آ جائیں۔

شانی کی والدہ تقریباً تین سال پہلے سرطان جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر انتقال کر گئی تھیں۔ ان کے علاج معالجے پر چوہدری ارشاد نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا اور بات صرف روپے ہی کی نہیں تھی، انہوں نے چھ ماہ تک ہر طرح کی بھاگ دوڑ کر کے خود کو بھی ہلکان کیا تھا۔ انہی دنوں میں شانی کو اندازہ ہوا تھا کہ اس کے امی ابا جو بظاہر عام سی زندگی گزار رہے ہیں درحقیقت ایک دوسرے سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ شانی کی ماں کے موت کے بعد بھی وہ ایک سال تک سنبھل نہیں سکے تھے۔ باپ بیٹی سینکڑوں ہی دفعہ ایک دوجے کے گلے لگ کر روئے ہوں گے اور تنہائی میں بیٹھ کر بچھڑنے والی کو یاد کیا ہو گا۔ درحقیت چوہدرانی آسیہ کی موت کو اہلِ خانہ میں سب سے زیادہ چوہدری ارشاد اور شانی نے ہی محسوس کیا تھا۔ شانی تو تین چار ماہ تک بستر سے لگی رہی تھی پھر اس خیال سے کہ غمزدہ باپ کو اس کی ضرورت ہے، وہ تمام تر ہمت کو بروئے کار لا کر سنبھلی تھی اور باپ کی خدمت و دلجوئی میں لگ گئی تھی۔ اب ان واقعات کو تین ساڑھے تین سال گزر چکے تھے۔ زندگی اپنے معمول پر آ چکی

تھی۔

اس روز شام کو کنوئیں پر جو واقعہ ہوا تھا وہ بظاہر تو شانی کو بھول گیا لیکن اس کے دماغ کی گہرائی میں کہیں محفوظ رہا۔ کسی وقت بیٹھے بیٹھے اچانک اسے اس اجنبی کی سُرخ آنکھیں اور چوڑی ناک یاد آ جاتی، تھپڑ کھانے کے بعد اس نے جن تیز برچھی جیسی نگاہوں سے شانی کو گھورا تھا وہ بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھیں۔ بابے نتھے کے الفاظ بھی شانی کو یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''فاخا اچھا بندہ نہیں ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے بابے کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سا ہراس اُتر آیا تھا۔

تین چار ہفتے بعد ہی زندگی کی گہما گہمی میں یہ واقعہ دھندلا گیا۔ روز و شب کی اُڑتی ہوئی گرد بڑی بڑی خبروں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یہ چھوٹا سا حادثہ بھی دب گیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے خدا بخش کے کنوئیں پر عورتیں اسی طرح پانی بھرتی تھیں۔ لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتی تھیں، کنواریاں، سہاگنیں اور ادھیڑ عمر کی سب ایک رنگ میں رنگی ہوتی تھیں۔ ان کے قریب ہی بچے کھیل کود میں مصروف رہتے تھے...... بیلوں کی جوڑی اپنا دائرے کا سفر جاری رکھتی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی ان مصروفیات کے دوران میں بھی کسی وقت اچانک شانی کے سینے میں خوف ایک نکیلی شے کی طرح چبھ جاتا تھا...... ایسے میں اس کی نگاہ خود بخود مشرق کی طرف اٹھ جاتی۔ اسی جانب جہاں سے وہ دونوں گھڑ سوار نمودار ہوئے تھے...... اور پھر جھگڑا ہوا تھا۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ شانی نے دور سے کسی گھڑ سوار کو دیکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا اور ذہن میں اسی فاخا نامی گھڑ سوار کا ہیولا ابھر آیا۔ دو تین بار وہ رات کو بھی ڈری۔ ایک مرتبہ عادل بھائی کے کسی دوست نے بڑے زور سے حویلی کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ دوسری مرتبہ قریبی گھر سے ایک نقب زن پکڑا گیا تھا اور اس کی وجہ سے شور بلند ہوا تھا۔ دونوں مرتبہ پتا نہیں کیوں آپوں آپ اس کا دھیان اجنبی گھڑ سوار کی طرف چلا گیا تھا۔

بہر حال جُوں جُوں دن گزرتے گئے شانی کے ذہن سے گھڑ سوار سے دوسری ملاقات کا خوف کم ہوتا گیا۔ یہ انسانی ذہن کی خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی بھی خوشی یا پریشانی تا دیر اپنی شدت برقرار نہیں رکھ سکتی۔

تین چار ماہ بعد کی بات ہے ایک روز شانی اپنے ابا جان کی پائنتی کی طرف بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی ساتھ ساتھ وہ انہیں ایک کتاب بھی پڑھ کر سنا رہی تھی۔ ایک جگہ کہانی کار نے لکھا تھا۔ ''کبھی کبھی ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خطرہ ٹل گیا ہے لیکن خطرہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے بلکہ اکثر پہلے سے زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو

خوش اور نارمل رکھنے کے لئے اکثر ہمیں خود کو دھوکا دینا پڑتا ہے۔ خود کو سمجھانا پڑتا ہے کہ سب اچھا ہے...... جب کہ سب اچھا نہیں ہوتا۔ ہم وقت کو ٹالتے رہتے ہیں...... وقت ٹلتا رہتا ہے لیکن پریشانی اور تکلیف کینسر کے کسی اندرونی پھوڑے کی طرح اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔''

یہ تحریر پڑھتے پڑھتے پتا نہیں کیوں اچانک ہی کئی روز بعد شانی کا دھیان ایک بار پھر اجنبی گھڑ سوار کی طرف چلا گیا...... وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ کسی روز وہ خبیث اچانک ہی تو اس کی پُرسکون زندگی کو درہم برہم نہیں کر دے گا۔ پتا نہیں وہ کہاں اوجھل ہو گیا تھا اگر وہ اسے ایک دو بار نظر آ جاتا اسے گھورتا یا تنگ کرنے کی کوشش کرتا یا کسی اور طریقے سے اپنی موجودگی ثابت کرتا تو شاید شانی کے ذہن سے اس کے حوالے سے اتنا خوف نہ ہوتا لیکن وہ تو اس دن کے بعد ناپید ہی ہو گیا تھا۔ شانی نے ایک دفعہ اپنی دادی سے سنا تھا۔ ''جو لوگ جلدی سے ہار مان لیتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔''

ابا جان کی آواز نے ایک دم شانی کو چونکا دیا۔ ''او شانی! کہاں گم ہو گئی ہے پڑھتے پڑھتے۔''

شانی بُری طرح چونک گئی۔ کتاب سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''کک...... کچھ بھی نہیں ابا جی...... وہ یونہی...... ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

''تجھے کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا بیٹی؟'' چوہدری ارشاد نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

''نہیں ابا جی...... آپ کے ہوتے ہوئے پریشانی کی کیا مجال ہے کہ میرے پاس آئے۔''

چوہدری ارشاد نے اپنے سفیدی مائل بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ''دھی رانی، تُو جانتی ہی ہے آج کل اپنے کام کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہوں۔ واہی بیجی کے خرچے روز بروز زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کھادوں کی قیمتیں آسمان پر ہیں...... بیج، کیڑے مار دوائیاں، کھیت مزدوری، بجلی، ڈیزل ہر شے کے ریٹ چڑھے ہوئے ہیں، پر فصل کے ریٹ وہی کے وہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے اس بار بھی گندم کی فصل کا حال اچھا نہیں ہوگا۔''

''ابا جی، آپ پریشان نہ ہوا کریں اتنا...... سب ٹھیک ہو جائے گا آدھا قرضہ تو اُتر ہی گیا ہے باقی بھی جلدی اُتر جائے گا۔''

چوہدری ارشاد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بیٹی کو کیسے بتاتا کہ قرضہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس کے چھوٹے بیٹے عادل سلطان نے تین چار ماہ پہلے فیصل آباد سے چند من سستی الائچی خرید لی تھی۔ بعد ازاں یہ الائچی چوری کی نکلی۔ عادل کو اس سودے میں منافع تو کیا ہونا

تھا اصل رقم بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ چوہدری ارشاد کو فوری طور پر تیس پینتیس لاکھ کا انتظام کر کے اسے دینا پڑا۔

دراصل یہ ادھار تب سے چلا آرہا تھا جب شانی کی والدہ بیمار ہوئی اور اس کے علاج معالجے پر چوہدری ارشاد کو روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑا۔ اس نے زمین رہن رکھ کر کچھ قرضہ بینک سے لیا کچھ اِدھر اُدھر سے اکٹھا کیا یہ مل ملا کر تقریباً ستر لاکھ روپیہ بن جاتا تھا۔ اس میں سے تقریباً پینتیس لاکھ روپیہ اس نے پچھلے سال چکا دیا تھا کیونکہ ربیع اور خریف دونوں کی فصلیں اچھی ہوئی تھیں مگر تقریباً اتنی ہی رقم تین چار ماہ پہلے اسے پھر سے ادھار لینا پڑ گئی تھی۔ چوہدری ارشاد کا ہاتھ روز بروز تنگ ہوتا جارہا تھا لیکن اس نے گھر والوں سے اور خصوصاً شانی سے اپنی پریشانی چھپا رکھی تھی۔

☆======☆=======☆

وقت گزرتا رہا اور دو سال اسی طرح مزید گزر گئے۔ شانی اب بھرپور جوان تھی۔ اس کی عمر بیس سے کچھ کم ہی ہوگی۔ اس کا انگ انگ لشکارے مارتا تھا اور تن بدن میں جوانی کا رس بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی طرف دیکھنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ لڑکے تو لڑکے اس کی سہیلیاں بھی اسے عاشقانہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھیں، معصوم مسکراہٹ، لمبے سیاہ بال، نہایت متوازن اور نازک جسم اور سب سے بڑھ کر اس کی گفتگو کا دلربا انداز...... اس سے ملنے والا اس کی طرف کھنچتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ بڑی قسمت والا ہوگا جو گاؤں کی اس روشنی کو ڈولی میں بند کر کے اپنے گھر لے جائے گا۔ حال اور مستقبل کی فکروں سے آزاد وہ اپنے بابل کے آنگن میں قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کی پازیب کی جھنکار اس کی دلگداز ہنسی، یہ سب مل جل کر حویلی کو جگمگا دیتے تھے۔ وہ ایک خوش رنگ تتلی کی طرح چوہدری ارشاد کے اردگرد چکراتی رہتی تھی اور چوہدری ارشاد یہ سوچ کر غمزدہ ہو جاتا تھا کہ اب یہ تتلی بہت جلد اس کی نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ وہ اس کے گھر کی رونق تھی۔ اس کی زندگی کا جواز تھی لیکن اسے کسی اور کا گھر بسانا تھا...... کسی اور کی زندگی بننا تھا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ چوہدری ارشاد نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا یا شاید وہ اس لئے نہیں دیکھتا تھا کہ وہ تو اس کی ہے ہی نہیں...... اس نے تو بس ایک مہمان کی طرح اٹھارہ بیس برس اس کے گھر میں گزارے ہیں اب اسے اپنے اصل گھر چلے جانا ہے۔ بابل کے آنگن کو ہمیشہ کے لئے اداس چھوڑ کر۔ اس آنگن میں بس اس کے قہقہوں کی بازگشت رہ جاتی ہے یا اس کے گڈیاں گڈے اور پرانے کپڑے۔

زندگی میں ہر موڑ اپنے مقررہ وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ زندگی کے سفر کی رفتار سُست کر کے ایسے موڑوں کو تھوڑی دیر کے لئے ٹالا تو جا سکتا ہے لیکن ان سے بچا نہیں جا سکتا۔ شانی کی شادی کا موڑ بھی جلد ہی پہنچ گیا۔ خاندان میں تو کوئی ایسا لڑکا تھا نہیں جس کے بارے میں سوچا جا سکتا۔ یقینی بات تھی کہ لڑکا خاندان سے باہر ہی کا ہوگا۔ دو تین مہینے تک خاموشی سے تلاش ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکا چوہدری ارشاد اور اس کی منہ بولی بہن آمنہ یعنی شانی کی پھوپھی کو پسند بھی آیا لیکن لڑکے والے ''حیثیت'' کے لحاظ سے کم تھے۔ چوہدری ارشاد چاہتا تھا کہ سمدھی بہت امیر کبیر نہ ہوں لیکن ہم پلہ تو ہوں۔ شانی ناز و نعم میں پلی تھی اس نے ایک بڑی حویلی میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی بیشتر ضروریات بغیر کہے پوری ہوتی تھیں...... محنت مشقت کی اسے عادت نہیں تھی۔ چوہدری ارشاد اور اس کی بہن کو یہ ساری باتیں مدِنظر رکھنا تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ شانی ان سے کہیں بہت دور نہ چلی جائے۔ وہ اسے اپنے آس پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ شانی نے دیہی علاقے میں رہنے کے باوجود انٹرمیڈیٹ کیا ہوا تھا۔ کوئی ایسا لڑکا بھی منتخب نہیں کیا جا سکتا تھا جو اَن پڑھ یا کم پڑھا لکھا ہو۔ بہت سی سوچنے کی باتیں تھیں۔

چوہدری ارشاد اور ان کی منہ بولی بہن جب اس مہم پر نکلے تو انہیں اندازہ ہوا کہ معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے...... مناسب رشتہ ڈھونڈنے کے لئے انہیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ انہی دنوں شانی کے ایک چچا رئیس احمد نے ایک اچھے رشتے کا سراغ دیا۔ لڑکا مقامی معیار کے مطابق پڑھا لکھا بھی تھا۔ لاہور میں اس نے ٹیکسٹائل کا کارخانہ لگا رکھا تھا۔ گاؤں میں بھی زمین تھی۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ شانی کا چچا رئیس احمد انہیں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ کچھ عرصے سے رئیس احمد کی زمینوں کی ساری کپاس اسی فیملی کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں جا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ رئیس احمد نے ٹیکسٹائل کے کام میں تھوڑا بہت سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

شانی کے چچا یعنی رئیس احمد کی بات پورے گھرانے میں بہت مانی جاتی تھی۔ خاص طور سے چوہدری ارشاد چھوٹے بھائی کی بات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ ان سے چھوٹا تھا اس کے باوجود وہ اسے عزت و احترام سے ''رئیس جی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ رئیس احمد نے جب رشتے کا بتایا اور یہ بتایا کہ لڑکا اور خاندان ان کا دیکھا بھالا ہے تو چوہدری ارشاد لڑکا دیکھنے سے پہلے ہی پچاس فیصد آمادہ ہو گئے۔

چند دنوں بعد دیکھ پرکھ کے مرحلے کا آغاز ہوا۔ پہلے چوہدری ارشاد، آمنہ، رئیس احمد اور آمنہ کی بیٹی نگہت لڑکے والوں کے گھر گئے۔ اس کے بعد لڑکے کی بھابی اور چند رشتے دار

عورتیں شانی کو دیکھنے آئیں۔ بظاہر لوگ اچھے ہی لگ رہے تھے، خوشحال اور رکھ رکھاؤ والے بھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے شانی کو دیکھا اور پسند کیا۔ خواتین کے ساتھ آنے والے ایک سات آٹھ سالہ بچے کو تو شانی اتنی پسند آئی کہ اس نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک شانی کی گود سے اُترنے کا نام نہیں لیا۔

دو ہفتے بعد شانی کی فیملی کے کچھ اور لوگ لڑکے والوں کے گھر گئے اور تقریباً مطمئن ہوکر واپس آئے۔ صرف پھوپھی آمنہ کا خیال تھا کہ لڑکا عمر میں تھوڑا سا زیادہ لگتا ہے۔ شانی بیس سال سے بھی کم تھی جب کہ لڑکے کی عمر اٹھائیس کے قریب تھی۔ اس موقع پر رئیس احمد نے زور دے کر کہا کہ لڑکوں کے بیاہ کے حوالے سے اٹھائیس سال زیادہ عمر نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لڑکا اپنا کاروبار رکھتا ہے، خودمختار ہے، نندوں اور دیوروں وغیرہ کا بھی کوئی جھنجھٹ نہیں ہے۔

چوہدری ارشاد نے کہا۔ ’’بھئی ڈاکٹر اور انجینئر وغیرہ تو آج کل پینتیس سال کے بعد شادیاں کررہے ہیں، اٹھائیس انتیس سال زیادہ عمر نہیں ہے۔ ویسے بھی لڑکوں میں ظاہری خوبیوں سے زیادہ اندرونی خوبیاں دیکھنی چاہئیں۔‘‘

سلسلۂ جنبانی جاری رہا اور پھر ایک روز بھاری بھرکم کپڑوں اور زیوروں سے لدی ہوئی کچھ عورتیں آئیں اور ’’شگن‘‘ کرگئیں۔ لڑکے کی بھابی نے بڑی شفقت سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا منہ میٹھا کرایا اور اس کے ہاتھ میں کچھ روپے تھما دیئے۔ شانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دیس نکالے کی سزا ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ ایک دم ہی اپنا گھر اسے پرایا لگنے لگا۔ اس کے قدم جیسے زمین سے اکھڑ گئے وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہوگئی۔

چند روز بعد شانی کے گھر والے بھی گئے اور لڑکے کے ہاتھ پر روپے رکھ آئے۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ دونوں گھرانوں کو رشتہ منظور ہے۔ پانچ چھ روز تک شانی روتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھالنا شروع کردیا۔ اپنی مرحومہ ماں کی باتیں اسے یاد آنے لگیں وہ اس کا سر منہ چوم کر کہا کرتی تھیں۔ ’’تُو تو پرایا دھن ہے بیٹی، دھی رانیاں پیدا ہوتے ہی دوسرے گھر کی ہوتی ہیں، دھی غریب کی ہو یا کروڑ پتی کی اسے اپنا گھر چھوڑ کر دوسرا گھر بسانا ہی پڑتا ہے۔‘‘

پہلے تو شانی حیران ہوکر سوچتی تھی کہ وہ اتنا سب کچھ کیسے چھوڑ سکے گی۔ اپنا گاؤں، گاؤں کی گلیاں، گاؤں کے لوگ، سہیلیاں، اپنے ابا جی، ابا جی کا ویہڑا...... ویہڑے میں نیم کا

درخت، درخت پر چہکتی چڑیاں، یہاں کی صبحیں اور یہاں کی شامیں؟ لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کا دل حوصلہ پکڑنے لگا۔ سکینہ دن رات اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی اور کھٹی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ اس کی باتیں سن سن کر شانی کے سینے میں کہیں گہرائی کے اندر ایک میٹھی سی لہر بھی جاگنے لگی تھی۔

اس نے اپنا ہونے والا دولہا ابھی تک دیکھا نہیں تھا مگر اس کی دھندلی سی تصویر شانی کے دل و دماغ میں جگہ بنانے لگی۔ شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات کے حوالے سے شانی حیران کن حد تک معصوم تھی مگر سکینہ دن رات اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ وہ معصوم نہ رہے۔ کبھی کبھی صغراں بھی اس ’’سازش‘‘ میں شریک ہوجاتی تھی۔ شانی کبھی غصہ کرتی، کبھی شرما جاتی اور کبھی سنی اَن سنی کردیتی۔

گھر میں شانی کے بیاہ کی تیاریاں چپکے چپکے شروع ہوگئی تھیں۔ پھوپھی آمنہ شانی کی ایک ممانی کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے ہفتے لاہور جانے لگیں اور سامان سے لدی پھندی واپس آنے لگیں۔ ایک بار عادل اور ایک بار ابا جی بھی ان کے ساتھ لاہور گئے۔ ابا جی کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں آج کل معمول سے گہری ہوگئی تھیں۔ شانی کو دیکھ کر وہ ایک دم مسکرانے لگتے تھے اور یوں ظاہر کرتے تھے کہ انہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے لیکن شانی جانتی تھی کہ وہ اندر سے کتنے پریشان ہیں۔ ایک تو ظاہر ہے کہ شانی کی جدائی ہی کی فکر تھی۔ اس کے علاوہ ان کی معاشی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ اکلوتی بیٹی کی شادی تھی، لڑکے والے بھی خوشحال لوگ تھے، ضروری بات تھی کہ شادی کے انتظامات شایانِ شان ہوں۔ چوہدری ارشاد جیسے وضع دار شخص کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بیٹی کی شادی پر کسی بھی حوالے سے اپنا ہاتھ کھینچ کر رکھتا۔

شانی اور عادل سلطان جانتے تھے کہ ان کے ابا جی آج کل تنگ دست ہیں اور وہ زبردست خوشحالی جو والدہ مرحومہ کے دنوں میں تھی اب مکمل طور پر اوجھل ہوچکی ہے لیکن اصل حالات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ چوہدری ارشاد کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ تقریباً دو مربعے نہری زمین کا مقدمہ چل رہا تھا اور پچھلے تین سالوں میں لاکھوں روپیہ اس مقدمے پر خرچ ہوچکا تھا۔ جو زمین زیرِ کاشت تھی اس کی آمدن بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کم آمدن میں ہی سے قرض کی قسطیں ادا ہوتی تھیں اور سارے اخراجات چلتے تھے۔ یہ بڑی قیمتی نہری زمین تھی اور اسی کی وجہ سے ابھی تک چوہدری ارشاد کے گھرانے کا بھرم قائم تھا لیکن اب چوہدری ارشاد کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس میں سے کم از کم ایک تہائی زمین بیچ دیں۔

بڑھتے ہوئے معاشی تقاضوں کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

بہار کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ پہلے منگنی کا پروگرام بنا لیکن پھر یہ طے ہوا کہ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر شادی ہی ہو جائے۔ شادی کا پروگرام وسیع پیمانے پر تیار کیا گیا تھا۔ چوہدری ارشاد کے گھرانے میں رواج تھا کہ ''تقریب'' سے ایک ماہ پیشتر ہی چولہے پر دیگیں چڑھا دی جاتی تھیں۔ روزانہ عورتیں اکٹھی ہوتی تھیں، ڈھولک بجتی تھی، گیت گائے جاتے تھے، سب کو دعوتِ عام ہوتی تھی جس کا جی چاہے آتا تھا اور مہمان کی حیثیت سے کھانا کھاتا تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ یہ تین ہفتے بعد کی تاریخ تھی، مقامی رواج کے مطابق اسے ''دن متھنا'' کہتے تھے۔ دن متھنے کے ساتھ ہی شادی کی رونق شروع ہو گئی۔ نائی دیگیں کھڑکھڑانے لگے اور حویلی کے صحن میں ایک زرنگار شامیانے کے نیچے ڈھولک کی آواز گونجنے لگی۔

شانی کو معلوم تھا کہ ابا جی نے اپنی نہری زمین کا کچھ حصہ فروخت کر دیا ہے۔ اس سودے کے بعد وہ کئی روز تک گم صم بھی رہے تھے لیکن آج کل وہ خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ شانی ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک دیکھتی تھی۔ ایک رات جب وہ ابا جی کو دودھ دے کر اور ان کے پاؤں دبا کر واپس آ رہی تھی تو حویلی کے برآمدے میں بھائی عادل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا، لمبے بال شانے پر جھول رہے تھے، اس کی چوٹی پکڑتے ہوئے بولا۔ ''کہاں سے آ رہی ہے چھپکلی؟'' وہ اچھے موڈ میں اکثر اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

''ابا جی کے پاؤں دبا کر آ رہی ہوں۔ کبھی تم بھی دبا دیا کرو۔''

''جب تم چلی جاؤ گی تو میں دبا دیا کروں گا۔ ابھی تو گزارہ ہو ہی رہا ہے۔''

''سارے اچھے کاموں کے لئے میرے جانے کا ہی انتظار ہو رہا ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔'' عادل نے کہا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''ویسے چھپکلی! لگتا ہے کہ تمہاری قسمت اچھی ہے اچھا خاوند مل رہا ہے تجھے۔''

شانی کا رنگ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ نازک گلابی رخساروں کے نیچے جیسے دو شمعیں جل اٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ شانی کوئی جواب دیتی، عادل گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مذاق کی بات تو علیحدہ رہی لیکن بندہ ہے سمجھ دار اور ہمدرد...... دوست بنانا اور سنبھالنا جانتا ہے۔ چاچا رئیس ایسے ہی اس کے گن نہیں گاتے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس نے ابا جی کو بھی ٹیکسٹائل کے کام میں پیسہ لگانے کی آفر کی ہے اور میں نے غور کیا ہے یہ بڑی اچھی آفر ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اُمید ہے کہ ہماری کپاس کی فصل بھی اچھے داموں بکے گی، کیونکہ کھیت سے سیدھی فیکٹری میں پہنچے گی۔ یہ نہیں کہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے تمہارے دولہا میاں کو بھی فائدہ ہو گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے عادل کا لہجہ پھر شرارتی ہو گیا تھا۔

شانی اس کے بال پکڑنے کے لئے جھپٹی، وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی کی نہایت پتلی کمر بل کھا کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بھائی کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

دو ہفتے تک شادی کا ہنگامہ جاری رہا۔ جُوں جُوں شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا، حویلی کی رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پوری عمارت کا رنگ و روغن مکمل ہو چکا تھا۔ درختوں کی کاٹ چھانٹ ہو گئی تھی، نئے پودے لگ گئے تھے...... گاؤں سے گزر کر حویلی تک آنے والے راستے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا۔ جہاں سے اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں وہاں نئی اینٹیں لگائی تھیں، کمروں کو خوب اچھی طرح لیپ پوت دیا گیا۔ گاؤں میں بجلی موجود تھی تاہم اضافی روشنی کے لئے گوجرانوالہ سے دس جنریٹرز منگوائے گئے۔ برات کو رات گاؤں میں ہی رہنا تھا ان کی رہائش اور طعام کا وسیع بندوبست ایک ہفتہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ براتیوں کی تفریح کے لئے کھیل تماشے اور شکار وغیرہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ چوہدری ارشاد نے چھ سال پہلے اپنے بڑے بیٹے سجاول کی شادی بڑے چاؤ اور دھوم دھام سے کی تھی، اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کی رخصتی میں کسی طرح کی کمی رہ جائے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ بیٹا بیٹا ہی ہوتا ہے۔

جس دوپہر شانی کو بوسیدہ سے کپڑے پہنا کر مایوں بٹھایا گیا اور اس کی جھولی میں رسم کے طور پر ابلی ہوئی گندم ڈالی گئی، وہ دیر تک سوچوں میں گم رہی، اپنوں سے جدا ہونے کے دن قریب تر آ رہے تھے۔ ایک میٹھا رشتہ ٹوٹ رہا تھا اور ایک کھٹا میٹھا سا رشتہ بن رہا تھا۔

جب مایوں کی رسم ختم ہوئی تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ گاؤں کی سہاگنیں اور کنواریاں کچھ دیر کے لئے گھروں کو چلی گئیں، تاکہ شام کو پھر سے تازہ دم ہو کر ڈھولک بجانے اور ناچنے گانے کے لئے حویلی آ سکیں۔ شانی کچھ دیر آرام کرنے کے لئے چھت پر چلی گئی۔ چھت سے دور تک گاؤں کے ہرے بھرے کھیت کھلیان نظر آتے تھے اور وہ راستہ بھی نظر آتا تھا جس پر سے کسی کو آنا تھا۔ ٹھیک سات روز بعد کسی دور دراز گاؤں سے اسے یہاں پہنچنا تھا اور ہمیشہ

کے لئے اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے عزت محبت اور خلوص دے گا، ان زخموں پر اپنے حسنِ سلوک کا مرہم رکھے گا جو "بابل کے گھر" سے جدائی کے سبب شانی کے دل پر لگے ہیں۔ وہ اسے شریکِ حیات بنائے گا اور ہر دکھ سکھ میں ہمیشہ اس کا شریک رہے گا۔

وہ سوچ رہی تھی جب آمنہ پھوپھی کی بڑی بیٹی فوزیہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آ گئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ غالباً اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی پھر شانی کو اندازہ ہوا کہ اس نے کوئی شے اپنی اوڑھنی کے پلو میں چھپا رکھی ہے۔

''کیا ہے یہ؟'' شانی نے غور سے اوڑھنی کے پلو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتنی معمولی سی چیز نہیں ہے کہ یونہی دکھا دوں۔ پہلے ہماری مٹھی گرم کرنی پڑے گی بھئی۔''

''اچھا کر دوں گی۔''

''نہیں...... نہیں...... پانچ سو روپے نکالو...... کل سہ پہر منشی خادم کو گوجرانوالہ بھیجیں گے وہاں سے رس ملائی منگوائیں گے۔''

''اچھا بھئی، دکھاؤ تو سہی، کیوں پریشان کر رہی ہو۔''

''نہ جی نہ...... ادھار نہیں چلے گا، پردیسیوں سے ادھار کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔'' کچھ دیر تک دونوں میں تکرار ہوئی پھر شانی نے وعدہ کر لیا کہ وہ ابھی نیچے جا کر پانچ سو روپے دے گی۔

فوزیہ نے اندرونی جوش کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اس ''ہونے والے'' کی تصویر ہے۔ امی نے بڑی مشکل سے لی ہے، وہ تو دیتے ہی نہیں تھے، کہتے تھے ہمارے ہاں رواج نہیں۔ امی نے بہت منت کی تو کہنے لگے کہ کوئی اچھی تصویر ہی نہیں۔ تمہاری ہونے والی جیٹھانی نے بس کسی طرح ایک البم سے نکال کر دے دی۔''

شانی کا دل یکبارگی شدت سے دھڑکنے لگا۔ سانسوں کی لے خود بخود چڑھ گئی۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ فوزیہ سے کہہ دے کہ وہ تصویر دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب جیتا جاگتا شخص سات دن کی دوری پر تھا پھر تصویر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن پھر فوزیہ کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے وہ انکار نہ کر سکی۔

فوزیہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں اوڑھنی کا پلو آہستہ آہستہ تصویر سے سرکانا شروع کیا۔ پہلے سر سے پردہ سرکا، پھر آنکھوں سے پھر منہ سے...... پھر وہ پورے کا پورا شانی کے سامنے

تھا۔ شانی کے ذہن میں جھما کا سا ہوا...... اسے کچھ یاد آ رہا تھا، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑنے لگی، پھر اس کا رنگ زرد ہوتا چلا گیا۔ وہ اس تصویر کو پہچان رہی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ اندیشہ موجود نہیں تھا کہ فوزیہ کی اوڑھنی کے پیچھے سے یہ چہرہ برآمد ہوگا۔

فوزیہ کی دور افتادہ آواز جیسے کسی کنوئیں کے اندر سے برآمد ہوئی اور شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''یہ ہیں فاخر احمد صاحب...... ہمارے جیجا جی اور تمہارے وہ...... ناک ذرا سی بڑی ہے لیکن ٹھوڑی کی وجہ سے اوپری نہیں لگتی ہے۔ بال تو زبردست گھنگھریالے ہیں اور آنکھیں دیکھو تو کیسی چمکتی ہوئی ہیں......''

شانی بھی ان آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی آنکھیں تھیں، سو فیصد وہی آنکھیں تھیں۔ اسے وہ بھولا بسرا سا منظر ایک دم یاد آ گیا تھا۔ اس شخص کا شانی کے زخمی بازو کی طرف ہاتھ بڑھانا۔ شانی کا ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے منہ پر طمانچہ مارنا، اس کے رائفل بردار کارندے کا مشتعل ہونا اور غضب ناک انداز میں شانی کی طرف بڑھنا...... پھر اس شخص کا اپنے کارندے کو روک دینا اور کہنا ''نہیں...... اکبرے جانے دے اسے۔'' اس کے بعد اس...... اس کے بعد فاخانا می اس شخص نے انہی آنکھوں سے اسے گھورا تھا۔ ہاں یہی برے کی طرح چھیدتی ہوئی آنکھیں تھیں، یہ آنکھیں آج بھی شانی کو چھید رہی تھیں...... یہ آنکھیں بہ زبانِ خاموشی شانی سے کہہ رہی تھیں۔ ''تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا تم نے کیسے سمجھ لیا کہ بات سردیوں کی اسی شام کو اسی کنوئیں کے کنارے ختم ہو جائے گی۔ بات ختم نہیں ہوئی ہے، بات تو ابھی دور تک جائے گی۔''

فوزیہ بھی تصویر ہی کی طرف دیکھ رہی تھی، اس لئے شانی کے تاثرات اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ چند لمحے بعد جب فوزیہ نے شانی کی طرف دیکھا وہ اپنے تاثرات پر کسی حد تک قابو پا چکی تھی۔ پھر بھی اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی چمکنے لگی تھی۔

فوزیہ نے بڑے غور سے شانی کا چہرہ دیکھا اور بولی۔ ''کیا بات ہے بھئی...... تم تو گم صم ہی ہو گئی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے پسینے چھوٹ گئے ہیں۔ یہ کوئی ایسا ڈراؤنا چہرہ تو نہیں ہے میری جان۔''

''نن...... نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

فوزیہ پوسٹ کارڈ سائز تصویر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ ''آج کل کے منڈے تو بس کڑیوں کی طرح ہی ہوتے ہیں، خاص طور سے شہری منڈوں کا تو حال ہی نہ پوچھو...... اس

چہرے کو دیکھو...... ماشاء اللہ مردانہ پن ہے۔ مرد تھوڑے سے کرخت نہ ہوں تو وہ مرد لگتے ہی نہیں۔ مجھے تو یہ کسی ڈھول سپاہی کی طرح لگ رہا ہے۔ جی دار...... تیکھا اور ایک دم کڑک۔"

فوزیہ بول رہی تھی لیکن اس کی آواز جیسے شانی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو بس ایک ہی سوال کی گونج تھی۔ "یہ کیسے ہوگیا؟ یہ کیوں ہوگیا؟"

اس نے خود کو بڑی مشکلوں سے سنبھال رکھا تھا۔ پتا نہیں کب فوزیہ کی باتیں ختم ہوئیں، کب شانی چھت سے اُتری اور کب اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ باہر زرنگار شامیانے کے نیچے ڈھولک بج رہی تھی۔ چند لڑکیاں لہک لہک کر گا رہی تھیں۔

اکھیاں اڈیک دیاں دل واجاں مار دا
آجا پردیسیا واسطہ ای پیار دا

شانی کے دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی میں خوفزدہ خیال خشک پتوں کی طرح اُڑتے پھرتے تھے...... اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔ ایک گہری سازش کے تحت، یہ شخص منصوبہ بندی کے ذریعے آگے بڑھا ہے اور بالآخر اس تک آ پہنچا ہے۔ چچا رئیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی یقیناً اسی منصوبے کا حصہ رہی ہوگی۔ اس نے انہیں مٹھی میں لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چوہدری ارشاد کے خاندان میں ان کی بات بہت مانی جاتی ہے...... اس نے ان کے ذریعے رشتے کی بات آگے بڑھائی تھی اور اب تو صورتِ حال یہ تھی کہ شانی کے ابا جی یعنی چوہدری ارشاد خود بھی اس کے گُن گاتے تھے۔ پھر اس کے ذہن میں اپنے گاؤں کے بابے نتھے کا خیال آیا۔ بابے نتھے نے اس شخص کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ شانی کے کانوں میں گونجنے لگا۔ (بابے نتھے کو فوت ہوئے دو سال گزر چکے تھے)

اوہ میرے خدا یہ کیا ہوگیا؟ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی...... لڑکیاں اتنی بے بس اور بے خبر کیوں ہوتی ہیں۔ جن کے ساتھ انہیں زندگی بتانا ہوتی ہے، پوری حیاتی کا سفر کرنا ہوتا ہے، وہ ان کی شکل بھی نہیں جانتیں۔ ان کی شکل اس وقت ان کے سامنے آتی ہے جب وہ سہاگ کی سیج پر ہوتی ہیں اور ہونے والا ہر کام ہو چکا ہوتا ہے...... اس کے بعد انہیں صرف قبول کرنا ہوتا ہے اور خود کو سمجھوتوں کی آغوش میں گرانا ہوتا ہے۔

شانی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ابھی ابا جی کے کمرے میں جائے گی۔ ساری مصلحتیں اور سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر ہر بات انہیں بتا دے گی۔ انہیں سمجھا دے گی کہ یہ فاخر دراصل کون ہے؟ اور اس شادی کی آڑ میں وہ کون سی پرانی رنجشیں چکانا

چاہتا ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن پھر بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ اسے جیسے کسی نے تھام لیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن عقب میں کوئی نہیں تھا۔ شاید اس نے خود ہی اپنے آپ کو روکا تھا۔ وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ابا جی کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ آج کل کتنے خوش اور مطمئن تھے وہ، وہ ان کا سارا اطمینان غارت کرنے جا رہی تھی۔ اس کی شادی پر وہ لاکھوں روپے خرچ کر چکے تھے اور لاکھوں کا انتظام و انصرام ہو چکا تھا۔ سب کچھ طے اور مکمل تھا۔ کارڈز تک بانٹے جا چکے تھے۔ کئی ہفتوں کی بھاگ دوڑ، محنت و مشقت اور دردسری اب اپنا صلہ پانے والی تھی۔ صرف چھ دن درمیان میں تھے اور یہ کیسا تکلیف دہ انکشاف ہوا تھا شانی پر......

وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر ڈھے گئی۔ وہ ابا جی کی حد سے بڑھی ہوئی پریشانیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی عزت اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے بڑے جتن کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کیا شادی کی تقریبات کے اس آخری مرحلے میں وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت کر لیں گے۔ وہ پہلے ہی بیمار تھے، کیا یہ دھچکا ان کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔

تو پھر وہ کیا کرے؟ کیا سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش رہ جائے۔ اپنے آپ کی قربانی دے دے؟

فوراً ہی ایک دوسرا سوال اس کے ذہن میں اٹھا۔ کسی نے اس کے اندر سے پکار کر کہا۔ "تم اپنے ابا جی کو ایک صدمے سے بچانے کی کوشش میں لاتعداد صدموں کے حوالے کر دو گی۔ جب شادی کے بعد تمہاری ازدواجی زندگی تباہ ہوگی تمہیں دھکے دے کر سسرال' سے نکالا جائے گا یا ذلیل و خوار کر کے رکھا جائے گا تو پھر ابا جی صدموں سے دوچار نہیں ہوں گے؟ بہتر ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ ابھی بھر لو۔ ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا، ہمت کرو اور سب کچھ اپنے بڑوں کے گوش گزار کر دو۔"

وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہی اور کمرے میں گھومتی رہی۔

سہیلیاں بار بار آئیں تاکہ اسے شامیانے میں لے جا کر سہاگ کے گیت گا سکیں اور اس کے کانوں میں نرم گرم سرگوشیاں کر سکیں لیکن اس نے طبیعت کا بہانہ بنا کر ہر بار انہیں منع کر دیا۔

رات کو وہ بہت تھوڑی دیر کے لئے سو سکی۔ صبح سویرے اس نے کھڑکی میں سے دیکھا تو ابا جی صحن کی گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے۔ شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے ارادہ کیا

کہ دروازہ کھول کر نکلے اور بھاگ کر ابا جی کے گلے سے لگ جائے۔ پھر اسی طرح گلے سے لگے لگے سب کچھ انہیں بتا دے۔ غالباً وہ اسی ارادے سے باہر بھی نکلی تھی لیکن پھر ایک دم ٹھٹک گئی۔ وہ ستون کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ اس نے سنا ابا جان گنگنا رہے تھے۔ ہولے ہولے بابا بلھے شاہ کی کوئی کافی ان کے ہونٹوں سے مترنم شکل میں نکل رہی تھی۔ آج بہت عرصے بعد شاید سال ڈیڑھ سال بعد اس نے ابا جی کو یوں گنگناتے سنا تھا۔ ان کا گنگنانا اس بات کی علامت تھا کہ وہ خوش ہیں۔ وہ اسی وقت گنگنایا کرتے تھے جب خوش ہوتے تھے۔ وہ بچپن سے ان کی آواز سنتی آئی تھی۔ کبھی ان کی چھاتی پر سر رکھ کر کبھی ان کے کندھے پر سوار ہو کر، کبھی ان کے ساتھ کھیتوں کی سیر کرتے ہوئے۔ ان کی آواز بڑی میٹھی تھی۔ اس آواز کے ساتھ خوشی کی ایک لہر سی سفر کرتی تھی اور شانی کے دل میں اُترا کرتی تھی۔

ایک دم ہی شانی کے سارے ارادے ریت کی دیواروں کی طرح دھڑام سے گر گئے اسی دوران میں ابا جی نے اسے دیکھ لیا۔ ''اوئے شانی، وہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ اونچی آواز میں بولے۔

''بس آپ کو دیکھ کر باہر نکل آئی۔''

''اب نکل آئی ہو تو اِدھر آؤ۔ گھاس پر ننگے پاؤں چل کر دیکھو مزہ آ جائے گا۔'' وہ بولے۔

شانی باہر صحن میں آ گئی اور شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں ابا جی کے ساتھ چلنے لگی۔ انہوں نے چلتے چلتے اپنا ایک بازو شانی کے کندھوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے وہ بولے۔ ''آج رات میں دیر تک تیرے بارے میں سوچتا رہا، سویرے عادل کی حالت عجیب ہو رہی تھی، پتا نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ جو دعا بھی مانگوں گا ضرور پوری ہوگی۔ میں نے یہیں گھاس پر نماز پڑھی اور پھر تیرے لئے بڑی لمبی دعا مانگی......دعا مانگ کر میرے دل کو عجیب سی تسلی ہوگئی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہم نے تیرے لئے جو فیصلہ کیا ہے وہ بڑی برکت والا ہے۔ تُو بہت خوش رہے گی شانی......دیکھنا تجھے پتا ہی نہیں چلے گا کہ تُو ہم سے جدا ہوئی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے ابا جی۔'' وہ گہری اداسی سے بولی اور کچھ اور بھی باپ کی بغل میں گھس گئی۔

''دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ فاخر بڑا اچھا لڑکا ہے، میرے دل کی گواہی ہے کہ بہت جلد تم دونوں کے مزاج مل جائیں گے ایسی اپنائیت ہوگی تم دونوں میں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ

جائیں گے۔'' شاید چوہدری ارشاد کچھ اور بھی کہتے لیکن یہ محسوس کر کے کہ بیٹی شرما رہی ہے اور ان کے بازو کے نیچے سمٹ رہی ہے تو انہوں نے موضوع بدل دیا۔ ''پتا ہے میں یہاں ننگے پاؤں گھومتے ہوئے کیا گنگنا رہا تھا؟''

''کیا؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''یہ ایک کافی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ غم اور خوشی تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں جہاں غم ہوگا وہاں خوشی بھی ضرور آئے گی شرط صرف یہ ہے کہ بندہ بُرے وقت میں صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرے۔''

باپ کو خوش اور مطمئن دیکھ کر شانی کے ہونٹوں کو تالا سا لگ گیا۔ وہ جو کچھ کہنے آئی تھی وہ اس کے سینے میں ایک آگ کی طرح تھا لیکن اب گھٹ کر چنگاری کی طرح رہ گیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے سکینہ آ دھمکی۔ وہ زبردستی اس کے کمرے میں گھس آئی اور پلنگ پر اس سے باقاعدہ کشتی کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے گدگداتی بھی جا رہی تھی۔ ''ایسی کم تیسی تیری طبیعت کی، ابھی طبیعت خراب ہونے کے دن کہاں ہیں، ابھی تو طبیعت اچھی ہونے کے دن ہیں۔''

شانی نے اسے بہتیرا ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھی جب تک شانی کے دودھیا چہرے پر تھوڑی سی ہنسی نہیں آئی اس نے اسے چھوڑا نہیں، دھینگا مشتی کے بعد دونوں ہانپ گئیں اور پھر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر سنجیدگی سے دیکھنے لگیں۔

''ہاں اب بتا......کیوں طبیعت کی خرابی کا رولا ڈال رہی ہے۔ اصل بات کیا ہے؟''

غیر متوقع طور پر ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ سکینہ حیران رہ گئی، وہ سمجھ گئی کہ بات واقعی اہم ہے۔ اس نے اصرار کے ساتھ شانی سے پوچھا اور شانی نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد سب کچھ سکینہ کے گوش گزار کر دیا۔

دونوں سہیلیاں بہت دیر تک گم صم بیٹھی رہیں۔ تقریباً تین سال پرانے واقعے کی تفصیلات کسی فلم کے مناظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں، کافی دیر بعد سکینہ نے شانی کے بکھرے بکھرے بالوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اُڑسا اور کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

''شانی، یہ سب ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''نہیں سکینہ، یہ تو خود کو دھوکا دینے والی بات ہے۔''

کچھ دیر گہری خاموشی طاری رہی تب سکینہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''چلو مان لیا کہ یہ ایک اتفاق نہیں ہے......تو بھی...... اب پیچھے ہٹنے والی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو

بڑی بدنامی والا معاملہ ہو جائے گا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور پھر سب سے بڑھ کر چاچا جی (چوہدری ارشاد) کا خیال آتا ہے، ان کے دل پر کیا گزرے گی شانی...... وہ لوگوں کو کیا جواب دیں گے کہ بالکل کنارے پر پہنچ کر سب کچھ کیوں ختم ہو گیا ہے۔"

"یہی سوچ سوچ کر تو اپنے اندر مر رہی ہوں۔ ابا جی پہلے ہی بال بال قرضے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میری خوشی کے لئے پتا نہیں انہوں نے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ اب بیٹی کا بار سر سے اتارنے کا وقت آیا ہے تو سب کچھ چوپٹ ہو رہا ہے۔"

دونوں تادیر سر جوڑ کر بیٹھی رہیں اور اپنی عقل سمجھ کے مطابق اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہیں۔ ان کی سوچ میں سنجیدگی تھی اور ایثار و صبر کا وہی آفاقی جذبہ تھا جو قدرت نے بنتِ حوا کے اندر روزِ اول سے محفوظ رکھا ہے۔ دھیرے دھیرے شانی ایک نتیجے پر پہنچ رہی تھی۔ سکینہ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے شانی، سب ٹھیک ہو جائے گا، وہ تیری من موہنی صورت دیکھے گا تو ساری پچھلی باتیں بھول جائے گا، دیکھ لینا تیرا پیار اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی نہیں دے گا۔ اگر وہ کوئی سخت بات کہے بھی تو تم خاموشی سے سن لینا بلکہ اس سے معافی مانگ لینا۔ اپنے شوہر کی عزت کرنے سے عورت کی عزت گھٹتی نہیں، بڑھتی ہے۔"

"لیکن سکینہ! اگر پھر بھی......؟"

"مجھے یقین ہے شانی! تیری محبت اسے سب کچھ بھلا دے گی، چار پانچ دنوں میں وہ تیرے پاؤں دھوتا نظر نہ آئے تو میرا نام بدل دینا۔"

رات کو بھی شانی دیر تک سوچتی رہی۔ سکینہ نے جو کچھ کہا وہ گویا اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جو واقعہ ہوا اس میں کس کی عداوت یا کدورت کو دخل نہیں تھا۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا...... شانی کی جگہ کوئی لڑکی بھی ہوتی تو وہ اس واقعے میں اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتی۔ شانی کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اس کا ہونے والا مجازی خدا اس معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر اس کی اور اپنی زندگی میں مستقل زہر نہیں گھولے گا۔ بہرحال ان سارے مثبت خیالات کے باوجود وہ ابھی تک کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

رات کو وہی ہوا جو اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی اور اس نے سونے کے لئے اپنا سر تکیے پر رکھا تو اس کی نظریں خود بخود سامنے دیوار پر جم گئیں۔ وہاں اس کی ماں کی تصویر تھی، ہلکی نیلی قمیص جس کے گلے پر خوبصورت کڑھائی تھی۔ سر پر لیس دار دوپٹا، چہرے پر نیکی اور آنکھوں میں ممتا کا سمندر۔ وہ تصویر کی طرف دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ دھیرے

دھیرے جیسے تصویر میں زندگی کی لہر دوڑتی چلی گئی، پھر وہ مکمل طور پر زندہ ہو گئی، جیتی جاگتی...... اپنی لاڈلی کی طرف محبت سے دیکھتی ہوئی...... اکثر ایسا ہوا کرتا تھا۔ ماں جیتی جاگتی حالت میں اس کے سامنے آجاتی تھی وہ کچھ بولتی نہیں تھی لیکن شانی اس کی آنکھوں سے اپنے ہر سوال کا جواب پڑھ لیتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ ماں اس سے بہت دور ہونے کے باوجود اس کے پاس ہے۔ اس کی رہنمائی کرتی ہے، جیسے اپنی زندگی میں کیا کرتی تھی۔ آج بھی وہ کچھ کہہ رہی تھی اپنی لاڈلی کے درد کو محسوس کر کے اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔ شانی نے غور سے ماں کی آنکھوں میں دیکھا...... یہ آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں تم جو کچھ سوچ رہی ہو وہ ٹھیک ہے، تم آگے قدم بڑھاؤ، عورت تو نام ہی قربانی کا ہے۔

☆======☆======☆

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب دولہا راجا کی بارات کو نارپور سے رنگ والی میں پہنچنا تھا۔ بارات میں دو شاندار فلائنگ کوچز تھیں۔ بیس کے قریب کاریں تھیں۔ پانچ چھ لینڈ کروزر اور پجارو جیپس اس کے علاوہ تھیں۔ دولہا نے نارپور سے رنگ والی کے مضافات تک کا سفر تو لینڈ کروزر میں کیا تھا، لیکن گاؤں میں داخل ہوتے ہی اسے ایک شاندار سفید بگھی میں سوار ہونا تھا۔ یہ بگھی ایک روز پہلے ہی مقررہ مقام پر پہنچ چکی تھی۔ چار گھوڑوں والی اس زبردست بگھی میں سوار ہو کر جب دولہا اپنی بارات کے ساتھ گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بینڈ باجوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن پھر بھی بے تحاشا آتش بازی ہو رہی تھی اور بموں کے فلک شگاف دھماکے تھے۔ دولہا کے یار دوست بے دریغ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دلہن کو بیاہنے نہیں بلکہ اٹھانے آئے ہیں۔

شروع میں ہی ایک بدمزگی ہو گئی۔ مقامی رواج کے مطابق گاؤں کے داخلی راستے پر کچھ عورتوں اور لڑکیوں نے ہیجڑوں کے ساتھ مل کر بارات کو روکا اور ان سے ہنسی مذاق کیا۔ یہ ایک عام سی رسم تھی اس میں دولہا اور اس کے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی تھی اور ان کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ بارات کے بزرگوں میں سے کچھ لوگ پیار محبت سے کہہ کر یا کچھ روپے دے دلا کر باراتیوں کا راستہ صاف کرتے ہیں لیکن نارپور سے آنے والے باراتیوں کو اس رسم میں شاید اپنی توہین نظر آئی۔ کچھ باراتی عورتوں سے جھگڑ پڑے اور انہیں دھکیل کر راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سے قدرے سخت جواب ملا تو وہ باقاعدہ ناراض ہو گئے، نوبت تلخ کلامی تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ معاملہ مزید بگڑ جاتا،

چوہدری ارشاد کے چھوٹے بھائی رئیس احمد کو خبر ہوئی اور وہ دو تین بزرگوں کو لے کر بھاگم بھاگ موقع پر پہنچا اور مشتعل براتیوں کو بمشکل ٹھنڈا کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔

باراتیوں کو ٹھہرانے کے لئے حویلی کے علاوہ دو دیگر مکانوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ دونوں مکانات رنگ والی کے سرکردہ زمینداروں کے تھے اور انہیں رہائش کے لئے بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔ ایک مکان تو حویلی کے بالکل ساتھ ہی واقع تھا لیکن دوسرا تھوڑے فاصلے پر تھا۔ جن افراد کو اس دوسرے مکان میں ٹھہرایا جانا تھا انہوں نے ناک بھوں چڑھائی اور شکوہ کیا کہ انہیں باقی بارات سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

شام سے پہلے پہلے یہ پریشانی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔ دلہن والے پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے اب مزید بوکھلا گئے۔ ہنگامی طور پر حویلی کا وہ حصہ خالی کرا لیا گیا جہاں چوہدری ارشاد کے خاندان کی عورتوں اور بچوں وغیرہ کو رات بسر کرنا تھی، افراتفری میں نئے انتظامات کئے گئے اور اس جگہ کو باراتیوں کی رہائش کے قابل بنایا گیا۔ پھر بھی فضا میں ایک کشیدگی سی موجود رہی۔ اس کشیدگی کی وجہ وہ واقعہ ہی تھا جو بارات کے گاؤں میں داخل ہوتے وقت پیش آیا تھا۔

دولہا کی گہری سنجیدگی اور رعب داب عورتوں میں موضوع گفتگو بنا رہا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا چنچل لڑکیاں سوچ رہی تھیں کہ نکاح کے بعد دولہا سے چھیڑ چھاڑ کی رسمیں وہ کس طرح پوری کریں گی۔ خاندان کے بزرگوں نے بھی انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ زیادہ شوخی اور طراری نہ دکھائیں۔

رات کے کھانے کے بعد باراتیوں نے اپنے طور پر جشن کا اہتمام کیا۔ وہ اپنے ساتھ لاہور کی چند مہنگی رقاصائیں لائے تھے، رات گئے تک ناچ گانا ہوا، بڑھکیں ماری گئیں اور امارت کے زبردست مظاہرے کے طور پر رقاصاؤں پر لاکھوں کرنسی نوٹ نچھاور کئے گئے۔ یہ ہلا گلا ضرورت سے کچھ زیادہ تھا اور گاؤں کے سنجیدہ لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ غیر معمولی شور شرابے کی وجہ سے رات گئے تک گاؤں کے اکثر مکین سو نہیں سکے یہاں تک کہ جب گاؤں کی مسجد سے ''تہجد'' کی اذان بلند ہوئی تو اس وقت بھی رقص و سرور کی محفل میں کسی طرح کا وقفہ نہیں کیا گیا۔ مسجد کے مؤذن جو اکثر امامت بھی کراتے تھے، چوہدری ارشاد کے ایک دور کے رشتے دار تھے اور حاجی معصوم کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہ اذان کے فوراً بعد حویلی پہنچے اور چوہدری ارشاد سے ملے۔ انہوں نے اپنا غصہ بمشکل دبا رکھا تھا۔ چوہدری ارشاد سے بولے۔ ''ارشاد بھائی ان لوگوں نے ساری رات آفت مچائے رکھی ہے اب صبح نماز روزے کا

وقت ہے، اب یہ شور شرابا ختم کر دیں۔''

جی تو چوہدری ارشاد کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ من چلوں کی اس ٹولی کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ وہ اپنا شغل میلا ختم کر کے اب کچھ دیر آرام کر لیں لیکن وہ ضبط کئے ہوئے تھے۔ وہ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں کوئی بھی ایسی بات کرنا نہیں چاہتے تھے جس سے بدمزگی میں اضافہ ہو...... اور اس کا نتیجہ بعد میں شانی کو بھگتنا پڑے۔ اس نے حاجی معصوم کو بڑے تحمل سے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔

تیس چالیس افراد کی جس ٹولی نے رات بھر ہنگامہ مچائے رکھا تھا وہ تو صبح دم نڈھال ہو کر سوئی رہی، تاہم باراتیوں کا ایک دوسرا گروہ جس میں دولہا صاحب بھی شامل تھے صبح سویرے شکار کو نکل گیا۔ شانی کے چچا رئیس احمد اور ان کے دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ دوپہر سے ذرا پہلے یہ اطلاع چوہدری ارشاد تک پہنچی کہ شکاری گروپ ذخیرے میں مچھلی کا شکار کر رہا ہے اور اس کے لئے بم استعمال کر رہا ہے۔ ذخیرے سے مراد پانی کا وہ ذخیرہ تھا جو رنگ والی کے نواح میں واقع تھا اور جسے چوہدری ارشاد نے بڑی چاہت سے ایک وسیع مچھلی فارم کی شکل دے رکھی تھی۔ یہاں وہ لوگ صرف جال یا کنڈی سے مچھلی پکڑتے تھے...... بم استعمال کرنے کا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی بم کے ذریعے مچھلی کو ہلاک کر کے پکڑنا ایک ناپسندیدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس اطلاع پر چوہدری ارشاد اور اس کے دیگر عزیزوں کو بہت دکھ ہوا۔ بہرحال چوہدری ارشاد نے آج ہونٹ سی رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

کل ''شروعات'' میں ہی جو بدمزگی پیدا ہو گئی تھی وہ اسے کسی طور بڑھاوا دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ معاملہ اس کی جان سے پیاری لاڈو رانی کا تھا۔ ایک دن تو کیا وہ اس کے لئے زندگی بھر کے لئے اپنے ہونٹ سی سکتا تھا۔

دوپہر کے فوراً بعد نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد مختلف رسمیں ادا کی گئیں۔ شانی دلہن کے سرخ لباس میں کوئی آسمانی شے نظر آ رہی تھی۔ جو نگاہ اسے دیکھتی تھی بس کہیں کھو کر رہ جاتی تھی۔ گڑیا سی معصوم، کانچ سی نازک پری چہرہ، رنگت ایسی جیسے دودھ میں شہد اور گلاب ملا ہوا ہو۔ جب وہ آرسی کی رسم کے لئے اپنے دولہا کے پہلو میں بیٹھی تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس جوڑی میں توازن کی کمی ہے۔ فاخر احمد چوڑا چکلا اور عمر میں تھوڑا سا بڑا لگتا تھا۔ شانی اس کے پہلو میں بیٹھی کچھ اور نازک اور چھوئی موئی محسوس ہوتی تھی۔

کسی نے رسماً کہا۔ ''چاند سورج کی جوڑی ہے۔''

لیکن اگر یہ چاند سورج کی جوڑی بھی تھی تو پھر چاند شروع کی راتوں کا تھا اور سورج

جون جولائی کی گرم ترین دوپہر کا تمتمایا ہوا اور شعلہ صفت۔ بزرگوں کی ہدایت کے مطابق جوتا چھپائی اور دودھ پلائی وغیرہ کی رسموں کے دوران میں لڑکیوں نے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور یہ رسمیں جلدی سے ختم ہوگئیں۔ شانی کی رخصتی کے موقع پر چوہدری ارشاد بے حد اداس اور غمزدہ نظر آئے۔ شانی کی جدائی کے موقع پر یہ اداسی اور غم سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن لگتا تھا کہ بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ رخصتی کی رسموں کے دوران میں ایک دو بار شانی کی نگاہ والد کے چہرے پر پڑی اور اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اب کون ابا جان کے سرہانے دودھ لے کر کھڑا ہوگا، کون ان کی ٹانگیں دبائے گا، کون جمعے کے جمعے ان کے سر میں مالش کرے گا، اَن گنت خیالات تھے جو شانی کو آبدیدہ کر رہے تھے۔ وقتِ رخصت وہ ابا جان کے سینے سے چمٹ کر یوں روئی کہ دل جیسے آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک ایک سہیلی بلکہ گاؤں کی ہر عورت کے گلے لگ کر روئے لیکن جو اسے جیون کے بندھن سے باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ انہیں عصر سے پہلے پہلے ہر صورت میں روانہ ہونا تھا۔ دولہا اور اس کے رفقاء بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ انہیں وداع کی ہر رسم بے کار اور طویل محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ روتی سسکتی اپنوں سے جدا ہوگئی۔ سسرال کی ایک لحیم شحیم عورت نے اسے تقریباً کھینچ کر بگھی کے قریب پہنچا دیا۔ بگھی پر سوار ہونے کے بعد اس نے مڑ کر ایک نظر اپنے گاؤں پر ڈالی۔ سارا منظر رو رہا تھا۔ لگتا تھا ہر جاندار و بے جان شے اشک بار ہے۔ وہ گلیاں جن میں وہ کھیلی کودی تھی، وہ درخت جن میں جھولے ڈالے تھے، وہ باغیچے جن سے پھول چنے تھے، وہ سب اسے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ انجانے لوگوں اور انجانے گلی کوچوں کے سپرد ہو رہی تھی۔

اپنے گاؤں سے رخصت ہوتے وقت شانی کو کچھ ادھورا سا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم بات بھول رہی ہے، کوئی بہت اہم بات، اس کے اردگرد اتنا شور اور ہنگامہ تھا کہ وہ بات اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آئی۔

☆======☆======☆

نارپور میں شانی کا نیا گھر بڑا شاندار تھا، گاؤں کے بیچوں بیچ یہ بھی ایک شاندار حویلی تھی۔ یہ حویلی چوہدری ارشاد کی حویلی سے تقریباً دگنا بڑی تھی۔ اس کی آرائش میں بھی بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا تھا، کوشش کی گئی تھی کہ حویلی کو کچھ شہری رنگ بھی دیا جائے۔ حویلی کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بنے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اونچے اونچے دروازے، بڑے بڑے فانوس، قالین پوش راہداریاں، دیواروں پر تصویریں ...وہ سب کچھ تھا جو رہائشی

عمارتوں کو پُرشکوہ بناتا ہے لیکن ایک بات نمایاں تھی۔ اس ساری سجاوٹ میں کہیں کہیں بھونڈا پن بھی نظر آتا تھا۔

مختلف رسموں کے بعد سکڑی سمٹی شانی کو جس کمرے میں پہنچایا گیا وہ عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شوخ رنگ کے کپڑے، بھاری بھاری گہنے، یہ عورتیں اور لڑکیاں شوخ قہقہے لگاتی ہوئی شانی پر گری جا رہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی نئی خریدی ہوئی بھیڑ بکری تھی، کوئی اس کی چھوٹی سی ناک پر تبصرہ کر رہی تھی، کوئی اس کے ہونٹوں پر، کوئی زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سارے مشاغل شانی کے لئے سخت وحشت کا باعث تھے۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہوگا؟ یہ سوال ایک شعلے کی طرح شانی کے سینے میں اٹھتا تھا اور پورے جسم میں جلن سی پھیل جاتی تھی۔ ماضی کے چند مناظر بار بار شانی کی نگاہوں کے سامنے آتے تھے اور ہر بار ان مناظر سے وابستہ اندیشے گمبھیر ہو جاتے تھے۔ کل تک وہ اپنوں میں تھی۔ اس کے چاروں طرف محبت اور شفقت کی بارش تھی، آج اردگرد کوئی چہرہ مانوس نہیں تھا، کوئی آواز جانی پہچانی نہیں تھی، وہ اجنبی چہروں اور آوازوں میں گھری ہوئی تھی اور اپنے اندر سمٹ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے یوں لگا کہ وہ ایک قیدی ہے، اسے میدانِ کارزار سے اچک کر اغیار کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اب حریف سپاہ کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے چاروں جانب جال بُن رہی ہیں۔

نارپور واپس پہنچتے پہنچتے رات بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ تھکاوٹ سے شانی کا پہلے ہی بُرا حال تھا اوپر سے عورتوں نے اس بُری طرح کمرے میں ہجوم لگایا کہ شانی کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ تو پہلے سے ہی آ رہا تھا، اب متلی بھی محسوس ہونے لگی، عورتوں میں سے ایک سمجھ دار خاتون نے شانی کی کیفیت بھانپ لی۔ اس نے کہہ سن کر عورتوں کو کمرے سے باہر نکالا۔ رش ذرا کم ہوا تو شانی کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے، پارہ بھی ہائی تھا۔ دو ملازماؤں نے اس کی ہتھیلیوں اور تلووں کی مالش شروع کر دی۔ ایک عورت دستی پنکھے سے ہوا دینے لگی، سیون اَپ میں پانی اور نمک ملا کر اسے تھوڑا تھوڑا پلایا گیا، متلی تو کم ہوگئی لیکن بدن کا ٹمپریچر اسی طرح رہا۔ پسینہ بھی آتا رہا۔

کوئی بولی۔ ”نازک سی ہے بے چاری، لگتا ہے جسم میں خون ہی نہیں ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”غریب گھر کی ہو تو پھر بھی بندہ کہے... اچھے بھلے کھاتے پیتے گھر کی ہے، پھر بھی اتنی سی جان، یہ بھلا کیا بات ہوئی۔“

ایک تیسری آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ”یہ آج کل کی کڑیوں کو خود بھی تو فیشن کی

مار ہے، جسم پر بوٹی نہیں چڑھنے دیتیں، چار پڑوپیاں دانے اٹھائیں تو کمر میں چک پڑ جاتی ہے۔ایک ہمارا وقت تھا ڈھائی من کی بوری اٹھا کر کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔“

ایک جلی کٹی سی آواز دور سے سنائی دی۔”جسم پر بوٹی نہیں ہوگی تو غش تو پڑیں گے۔“

دو اڑھائی گھنٹے بعد شانی کی طبیعت سنبھل گئی لیکن تب تک رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا، عورتوں نے اسے حجلۂ عروسی میں نہیں بھیجا۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔شانی کو اُمید تھی کہ وہ کل تک خود کو پوری طرح سنبھال لے گی......اور ماحول سے بھی مانوس ہو جائے گی۔

دن چڑھ گیا، ایک بار پھر گہما گہمی شروع ہو گئی۔شانی کے اردگرد جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے شانی کو معلوم ہوا کہ دولہا صاحب صبح سویرے پٹواری کے ساتھ کسی کام سے نکل گئے ہیں اور اب ناشتے کے لئے ان کی واپسی کا انتظار ہو رہا ہے۔دولہا کی واپسی گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوئی۔اس دوران میں سینکڑوں ہی اندیشے شانی کے ذہن میں کلبلاتے رہے، کہیں یہ بات نہ ہو؟ کہیں وہ بات نہ ہو؟ آخر وہ صبح سویرے کیوں چلے گئے ہیں، ناشتہ بھی نہیں کیا ہے، کسی کو بتایا بھی نہیں ہے۔

دولہا صاحب واپس آئے تو شانی کی جان میں جان آئی۔ناشتہ ان دونوں نے اکٹھے کیا دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ابھی تک شانی نے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا نہیں تھا۔ناشتے کے دوران میں گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے ایک نظر شوہر کے چہرے پر ڈالی۔جو پہلا تاثر شانی کے ذہن میں ابھرا وہ ایک سنجیدہ، گہرے اور جسمانی طور پر مضبوط شخص کا تھا۔ایسا شخص جو معاملات کو کنٹرول کرنا جانتا تھا جو دوسروں کا تابع نہیں ہوتا بلکہ دوسرے اس کے تابع ہوتے ہیں۔

ولیمہ تین روز بعد تھا۔دوپہر کو شانی نے نہا دھو کر پھر سے اپنا عروسی لباس پہن لیا۔آج وہ خود کو تازہ دم اور قدرے مطمئن محسوس کر رہی تھی۔سہ پہر کو سونے کے بہانے دیر تک کمرے میں بند رہی اور خود کو پیش آنے والے حالات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتی رہی۔اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس کا شوہر ”خدا بخش کے کنوئیں“ پر پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرے یا نہ کرے۔وہ اس واقعے پر شوہر سے معذرت ضرور کرے گی وہ نہیں چاہتی تھی کہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز دل میں کوئی پھانس رکھ کر کیا جائے۔وہ پوری سچائی اور محبت کے ساتھ اپنی نئی زندگی کو گلے لگانا چاہتی تھی۔وہ خود کو ایک ایسی خود سپردگی کے لئے تیار کر رہی تھی جس میں گریز اور غیریت کی آلائش تک نہ ہو، اپنی ماں کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔وہ ماں

جو زندگی میں ہر قدم پر اس کی رہنما رہی تھی اور مرنے کے بعد بھی ہر مشکل میں اس کے قریب ہوتی تھی۔

اس کی ماں قربانی، ایثار اور ضبط و تحمل کی تصویر تھی۔پورے گاؤں میں ہر چھوٹا بڑا، بزرگ اور بچہ انہیں وڈی آپا کہتا تھا اور واقعی انہوں نے آپا بن کر دکھایا تھا۔وہ سب کا ایسے ہی خیال رکھتی تھیں جیسے اپنے گھر کے افراد کا رکھا جاتا ہے، کسی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا، کسی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ جان کر اسے حل کرنے کی کوشش میں لگ جانا...ہر کسی کے غم اور خوشی میں پورے اخلاص سے شریک ہونا ان کا وطیرہ تھا۔اپنی نندوں، دیوروں اور دیورانیوں کی طرف سے انہیں کئی سخت ترین امتحانوں میں ڈالا گیا لیکن وہ ہر کڑے امتحان میں سرخرو ہو کر نکلیں اور ہر امتحان کے بعد ان کی عزت و تکریم میں اضافہ ہی ہوا۔ان کی موت پر اہلِ علاقہ بلک بلک کر روئے تھے۔آج وہ ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھیں اور کئی لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت......عقیدت کی حدوں کو چھوتی تھی۔شانی اسی باہمت ماں کی نیک سیرت بیٹی تھی۔وہ جانتی تھی کہ قدرت نے اسے بھی ایک امتحان میں ڈالا ہے۔

اور یہ شب عروسی تھی، وہ پھولوں کی سیج پر تھی، کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے، شیشم کے بلند دروازے کے سنہری ہینڈل میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کا شوہر اندر آ گیا۔دروازہ بند کر کے وہ مڑا اور دبیز قالین پر بے آواز چلتا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔شانی کا دل اس کے سینے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑایا تھا۔وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ایک میٹھی میٹھی سی لہر شانی کے سراپا میں دوڑ رہی تھی۔

لاتعداد بوجھل لمحے گزر گئے، کمرے کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، گٹھڑی بنی شانی نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور پھولوں کی لڑیوں کی اوٹ سے دیکھا۔فاخر صوفے پر بیٹھا تھا۔آنکھوں میں غنودگی سی تھی، چہرہ بے تاثر تھا۔کیا سہاگ رات کو دولہا کا چہرہ اتنا سپاٹ ہوتا ہے۔اس نے حیرت سے سوچا۔

تب ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں ”خدا بخش کے کنوئیں“ کے مناظر گھومنے لگے، ایک ٹیس سی شانی کے دل میں اٹھی۔اس نے چند لمحے مزید انتظار کیا پھر اپنی تمام تر ہمت اور طاقت جمع کرتے ہوئے بولی۔”آپ مجھ سے ناراض ہیں شاید؟“

چند سیکنڈ بعد بھاری بھرکم آواز ابھری۔”ناراض؟ کس بات پر؟“

”میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں......وہ واقعہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے بھولا جا سکے۔اس کے باوجود آپ نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی ہے۔اپنا شریکِ حیات بنایا

ہے اسے آپ کا بڑا پن ہی کہا جا سکتا ہے۔"

"نہیں اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔" ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب ملا۔

"آپ کے نزدیک اہمیت نہ ہوگی لیکن میرے نزدیک ہے، آپ کی زندگی میں آنے کے بعد یہ اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ میرا ردِعمل شاید ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔ میں اس واقعے پر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔"

کوئی جواب نہیں ملا بس ایک گہری سانس کھینچی گئی اور اس کے بعد گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی، وہی وال کلاک کی ٹک ٹک گونجنے لگی۔

شانی نے کافی دیر تک فاخر کے بولنے کا انتظار کیا، اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ہونٹ بھی لرزاں تھے، تب ایک بار پھر وہ ہمت کر کے بولی۔ "در...... دراصل اس وقت مجھے یوں لگا جیسے آپ......"

"میں نے کہا ہے نا اس واقعے کی خاص اہمیت نہیں ہے۔" فاخر نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ فاخر کا آخری جملہ کانوں میں گونجنے لگا...... اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں...... مطلب یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔

پھر تھوڑی دیر بعد شانی نے دوسرے زاویئے سے اس فقرے کو سوچا۔ فاخر نے کہا تھا "اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔" کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کسی اور واقعے کی اہمیت ہے۔ وہ ایک بار پھر جان سے لرز گئی۔

حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کا ریشمی گھونگھٹ منتظر تھا کہ اسے اٹھایا جائے لیکن گھونگھٹ کو اٹھانے والے ہاتھ اس سے دور تھے۔ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ان ہاتھوں کا انتظار کرتی رہی۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی پھر کوئی دھپ سے آ کر اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ فاخر تھا۔

"چلو لیٹ جاؤ تم بھی۔" خشک لہجے میں کہا گیا۔

شانی چند لمحے تذبذب میں رہی پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی ہوئی نیم دراز ہوگئی اور پھر دراز ہوگئی۔ "لائٹ تو بجھا دو۔" ایک بار پھر غیر جذباتی اور تحکمانہ آواز ابھری۔

بات کرنے کے اس عام سے انداز نے شانی کو خجل کر دیا۔ وہ ذرا بوکھلا کر اٹھی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا لیمپ آف کر دیا۔ اس کا شوہر چند فٹ کے فاصلے پر بے تعلق سا لیٹا ہوا تھا۔ وہ

میٹھی میٹھی سی لہر جو سرِ شام سے شانی کے بدن میں چل رہی تھی اچانک ہی کہیں دم توڑ گئی خودسپردگی اور محبت کے سلگتے ارادے، سفید راکھ کی طرح بجھ گئے۔ فاخر کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ وہ پتا نہیں کتنی دیر تک سیدھی لیٹی رہی پتھر کی طرح ساکت، اپنے مقدر پر حیران...... پھر اس نے بھی ہولے سے کروٹ بدل کر رخ دوسری طرف کر لیا۔ گھونگھٹ ابھی تک اس کے چہرے پر تھا لیکن اب اس میں جذبات کے ستارے نہیں جھلملائے تھے، وہ کپڑے کے کسی بیکار چیتھڑے کی طرح شانی کے حسین رخسار پر دھرا تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات بھی نہیں تھی کہ شانی کے تہلکہ خیز "قرب" نے فاخر کو متاثر نہ کیا ہو۔ وہ کتنی بھی معصوم سہی لیکن ایک عورت کی نظر رکھتی تھی اور عورت اپنی طرف اٹھنے والی نظر کے درجہ حرارت کو لمحوں میں جان جاتی ہے۔ شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ فاخر نے خود پر جبر کر کے خود کو اس سے دور رکھا ہوا ہے۔

رات گزر گئی، کھڑکیوں کے باہر چڑیاں چہکنے لگیں تو شانی نے کھڑکیوں سے پردے ہٹائے، باہر ایک ملگجی روشنی پھیل رہی تھی، فاخر گہری نیند سو رہا تھا۔ شانی نے اس کے چہرے پر ایک سہمی ہوئی سی نظر ڈالی۔ نیند کی حالت میں وہ اپنی عمر سے کچھ اور بھی بڑا لگ رہا تھا۔ نیچے والا جبڑا بہت چوڑا، کلے پھولے ہوئے اور ناک پھیلی پھیلی سی۔ شانی کو اچانک اپنی دادی کی بات یاد آ گئی۔ وہ کہا کرتی تھیں نیند کی حالت میں بس کوئی کوئی خوبصورت لگتا ہے، اکثر ایک دم اول جلول لگنے لگتے ہیں، چادر فاخر پر سے کھسک گئی تھی اور اس کی پشت ذرا بے ڈھنگے انداز میں نظر آ رہی تھی۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے چادر سیدھی کی اور پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر لان میں گھاس شبنم سے گیلی تھی، اسے ابا جان یاد آ گئے۔ صبح سویرے گھاس پر ننگے پاؤں چلنا ان کی عادت تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ بھی اس وقت چڑیوں کی چہکار سن رہے ہوں اور چہل قدمی کر رہے ہوں۔ اس نے اپنے سفید گلابی پاؤں چپل کی قید سے آزاد کئے اور انہیں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لے آئی، اسے ٹہلتے ہوئے تین چار منٹ ہوئے تھے۔ وہ گلاب کے ایک پودے کو دیکھنے کے لئے گارڈینا کی اونچی باڑ کی طرف گئی۔ اس نیم تاریک گوشے میں اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا اور سر تا پا لرز گئی۔ وہیل چیئر پر ایک بدہیئت شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا گوشت ایک طرف سے لٹکا ہوا تھا، ایک آنکھ بھی نیم وا تھی، اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بڑا اور سیاہ تھا اور وہ اپنی عمر رسیدہ لیکن نہایت غصیلی آواز میں گرج کر کچھ بولا۔

شانی کو الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن لہجے میں پوشیدہ شعلہ فشاں کڑک نے اسے سر تا پا

لرزا دیا۔ بدہیئت بوڑھا آگے کو جھکا اس نے ایک ہاتھ وہیل چیئر کے ایک پہیے پر گھمایا چیئر ڈھلوان پر تھی تیزی سے شانی کی طرف آئی۔ یوں لگا جیسے بوڑھا اسے دھکیلنے یا تھپڑ مارنے کا ارادہ رکھتا ہو، شانی دہشت کے عالم میں پیچھے ہٹی اور پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ بوڑھے کی غضب ناک آواز اسے کمرے کے اندر تک سنائی دی تھی۔ شانی نے خوف کے عالم میں دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

فاخر اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ شانی کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر ہولے سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

کہیں یہ اس کے دادا سسر تو نہیں ہیں؟ یہ سوال تیزی سے شانی کے ذہن میں ابھرا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے سسر تو فوت ہو چکے ہیں لیکن دادا سسر حیات ہیں، وہ بیمار رہتے ہیں۔ شانی کی معلومات کے مطابق ان کے جسم کا ایک حصہ فالج زدہ تھا۔ شادی کی گہما گہمی میں شاید اس کے دادا سسر بھی اس کے آس پاس کہیں موجود رہے ہوں لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں پائی تھی۔ اب یہ سوال ایک دردناک چیخ کی طرح شانی کے ذہن میں ابھر رہا تھا کہ کہیں یہی بدنما اور قہرناک بوڑھا تو اس کا دادا سسر نہیں۔ اگر وہ اس کا دادا سسر تھا تو پھر اس بری طرح اس پر خفا کیوں ہوا تھا؟ شانی نے تو کچھ کہا نہیں تھا، کچھ کیا نہیں تھا وہ ابھی تک اس منظر کی دہشت سے لرز رہی تھی۔

کچھ دیر بعد فاخر بیدار ہو گیا۔ ایک بے چارہ سا گھونگھٹ شانی کے چہرے پر اب بھی تھا لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ گھونگھٹ نکالنے اور گھونگھٹ اٹھانے والی رات تو گزر چکی تھی۔ شانی نے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں فاخر سے کچھ نہیں کہا۔ ناشتے پر بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ناشتے کے بعد فاخر نے سپاٹ لہجے میں شانی سے کہا۔ ''میں پہلی تاریخ کو لاہور جا رہا ہوں، شام تک آ جاؤں گا تم حویلی میں گھوم پھر سکتی ہو۔ میں نے بھابو مقبول سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں سب سے ملائے گی اور یہاں کے رہن سہن کے بارے میں بھی بتائے گی۔''

فاخر کے آخری الفاظ شانی کو کچھ اچھے نہیں لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اجڈ گنوار ہو اور اسے یہاں کے اصول قاعدے سکھائے جانے ہوں۔ بہرحال اس نے ناگواری کی شکن اپنی پیشانی پر نہیں آنے دی۔ وہ بہت کچھ سہنے کا حوصلہ لے کر اس چار دیواری میں اُتری تھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی اسے کچھ زیادہ سہنا نہیں پڑا تھا۔ اس کے بیشتر اندیشے ابھی تک غلط ہی ثابت ہوئے تھے۔ کل تک اس کے دل کی گہرائی میں کئی طرح کے خدشے

چھپے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کہیں اسے فاخر کی طرف سے کسی کرخت یا جنونی رویے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کل رات یہ خطرہ باطل ثابت ہوا تھا۔ کل رات شانی نے ماضی کے ناخوشگوار واقعے کا ذکر بھی کر دیا تھا اور اس واقعے کے حوالے سے فاخر نے معمولی ردِعمل ظاہر کیا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ شانی کے ذہن میں ایک نئی کھٹک بھی پیدا ہوئی تھی۔ فاخر نے جو الفاظ استعمال کئے تھے ان سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس واقعے کے علاوہ بھی کوئی وجہ نزاع ہو سکتی ہے۔ کیا کوئی اور واقعہ تھا؟ کوئی ایسا واقعہ جو ابھی تک شانی کے علم میں نہیں تھا۔ جس کی جڑیں ماضی میں یا کہیں ماضی بعید میں تھیں۔ پتا نہیں کیوں یہ سب سوچتے ہوئے شانی کے ذہن میں ایک بار پھر بدنما بوڑھے کی چیخم دھاڑ اور اس کی زہریلی نگاہیں آ گئیں۔

فاخر اپنی بھاری بھرکم جیپ پر دو چار باڈی گارڈز کے ساتھ شہر چلا گیا۔ شانی، بھابو مقبول کے ساتھ حویلی میں گھومنے پھرنے لگی۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ خوب سجی سنوری بھی تھی لیکن سجاوٹ میں سلیقہ کم اور دولت کی نمائش زیادہ تھی۔ اس حویلی میں مہر جی کو سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مہر جی دراصل شانی کے دادا سسر ہی کو کہا جاتا تھا۔ ان کی عمر سو سال سے اوپر بتائی جاتی تھی۔ مہر جی کے دو پوتے یعنی چوہدری بشیر اور چوہدری فاخر اس حویلی میں آباد تھے۔ چوہدری بشیر کی بیوی بھابو مقبول تھی اور چوہدری فاخر کی نوبیاہتا خود شانی تھی۔ چوہدری بشیر کے دو بچے بھی اہلِ خانہ میں شامل تھے۔ اس شاندار حویلی میں ایک مردانہ اور ایک زنانہ حصہ تھا۔ دو درجن کے قریب ملازم اور خادمائیں خدمت کے لئے موجود تھیں۔ شانی نے دیکھا کہ اس کی سسرالی عورتیں سب کی سب خوب ہٹی کٹی تھیں۔ انہوں نے بھاری کپڑے اور بھاری زیور پہن رکھے تھے۔ شانی کو ان کی نگاہوں میں سچی محبت کے سوا ہر شے نظر آئی۔

شانی، بھابو مقبول کے ساتھ حویلی میں گھومتی رہی لیکن اس کا ذہن مسلسل صبح سویرے ہونے والے واقعے میں اٹکا رہا۔ دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے بھابو تیزی سے شانی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے فربہ چہرے پر پریشانی تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور شانی کو کندھوں سے تھامتے ہوئے بولی۔ ''شانی یہ تم نے آتے ساتھ ہی کیا کر دیا ہے۔ مہر جی کو ناراض کر دیا ہے تم نے وہ تو ایک دم غصے میں ہیں۔''

شانی نے لرز کر کہا۔ ''بھابو! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''تُو صبح سویرے پھلواری میں گئی تھی؟''

''ہاں، پھلواری میں تو گئی تھی۔''

"بس وہی بیڑا غرق کیا تُو نے، وہاں نہیں جانا تھا۔" بھابو نے شپٹا کر کہا۔

"کیوں وہاں کیا ہے؟"

"بس کچھ ہے وہاں۔" بھابو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مہر جی نے منع کیا ہوا ہے، وہاں ان کے سوا کوئی نہیں جا سکتا۔ مالی نے بھی جانا ہو تو ان سے پوچھ کر جاتا ہے تُو بغیر پوچھے وہاں چلی گئی اور دھڑ نگے مارنے لگی۔"

"مم...... مجھے کیا پتا تھا بھابو۔" شانی نے سہم کر کہا۔

"اب پتا نہیں مہر جی کا غصہ کہاں چڑھے اور کہاں اُترے۔" بھابو نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ہیجڑوں کی ایک ٹولی صحن میں آ گئی اور مبارک سلامت کا شور بلند کرنے لگی۔ شانی اور بھابو کی بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

☆======☆======☆

شانی رات تک سہمی رہی۔ فاخر حویلی واپس آیا تو پہلے مہر جی کی طرف ہی گیا۔ وہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ شانی کے پاس کمرے میں آیا۔ شانی نے چور نظروں سے دیکھا۔ فاخر کا سنجیدہ چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ "تم نے بے خبری میں مہر جی کو ناراض کر دیا ہے۔ وہ پھلواری میں کسی کو آنے نہیں دیتے، میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ان کا غصہ ٹھنڈا تو ہو گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ تم جا کر تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ جاؤ، ٹھیک ہو جائیں گے۔" کچھ ہی دیر بعد ڈری سہمی شانی حویلی کے ایک کشادہ کمرے میں اپنے دادا سسر مہر جی کے روبرو تھی۔ وہ پرانی طرز کے ایک بہت بڑے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے، ٹانگیں ایک قیمتی چادر سے ڈھکی ہوئی تھیں، دائیں ہاتھ میں ایک منقش حقے کی نے تھی، کمرے کی دیواروں پر کلہاڑیاں، تلواریں اور رائفلیں وغیرہ آویزاں کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ الماری میں کچھ دیسی دوائیں شیشے کی بوتلوں میں رکھی تھیں۔

جس شخص کو یہاں مہر جی کہا جاتا تھا، اس کے چہرے پر بائیں طرف بدنما داغ تھے اور گوشت لٹکا ہوا تھا، چہرے کے اس حصے کو دیکھ کر ذہن میں ایک کراہیت آمیز خوف جاگتا تھا۔ چہرے کی دائیں جلد صحت مند تھی، دائیں آنکھ میں ایک تیز چمکیلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں شانی کو اپنے لئے قہر اور نفرت کے آثار نظر آئے۔ شانی نے جھک کر سلام کیا اور سر کو ندامت آمیز انداز میں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

فاخر نے آنکھوں کے اشارے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ مہر جی کی پائنتی کی طرف بیٹھ جائے۔ شانی چند لمحے تذبذب میں رہی پھر بیٹھ گئی۔ جونہی وہ بیٹھی عمر رسیدہ شخص کے جسم نے بے چینی سے حرکت کی، پھر اس کے فالج زدہ ہونٹوں سے وہی غصیلی غوں غاں برآمد ہونے لگی جو اس سے پہلے شانی نے علی الصباح سنی تھی۔ مہر جی کی آواز میں بلا کی سختی تھی اور ان کی اکلوتی سلامت آنکھ جیسے شعلے برسا رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے شانی کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا لیکن فاخر ان کی بات غالباً سمجھ رہا تھا۔

شانی نے بے چارگی کے عالم میں شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ دادا سسر کی ٹانگیں دبانا شروع کر دے۔ اپنے عجیب الوضع دادا سسر کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہوئے شانی ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھر فاخر کی طرف دیکھا اس مرتبہ فاخر نے تحکمانہ اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ مہر جی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کی ٹانگیں دبانا شروع کر دے۔

شانی نے دل کڑا کر کے اپنے ہاتھ مہر جی کی پلپلی پنڈلیوں پر رکھ دیئے۔ وہ دبانے لگی مہر جی کے ہونٹوں سے تھوڑی دیر تک ناقابلِ فہم غصیلے الفاظ نکلتے رہے پھر ان الفاظ پر خاموشی غالب آ گئی، وہ ٹانگیں دباتی رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فقط مٹھی چاپی ہی کرتی رہے یا کچھ کہے بھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے فاخر کی طرف دیکھا۔ فاخر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جوڑ کر اشارہ دیا کہ وہ معافی مانگ لے۔

شانی نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "معاف کر دیں دادا جی۔ مجھے پتا نہیں تھا، پتا ہوتا تو کبھی ایسی غلطی نہ کرتی۔ میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچا میں بہت شرمندہ ہوں۔"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بس تیز سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی ایسی سانسیں جن میں عجیب ناگوار باس تھی۔

فاخر اسے وہاں تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ شانی بے چین سی بیٹھی رہی اور پاؤں دباتی رہی۔ ایک بار اس نے ہمت کر کے دادا سسر کے بگڑے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ان کی اکلوتی سلامت آنکھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھ میں اب بھی عفو و درگزر یا نرمی کی جھلک نہیں تھی۔ یہ آنکھ اب بھی لشکارے مار رہی تھی۔ شانی کو یوں لگا جیسے اس آنکھ میں فتح مندی کی جھلک ہے...... شانی کو یوں اپنے قدموں میں جھکا دیکھ کر مہر جی کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہو رہی ہے۔ کیا یہ صرف اس کا وہم ہے یا حقیقت میں ایسا ہے؟ وہ سوچتی رہی اور اس کے کومل ہاتھ مہر جی کی کہنہ سال پلپلی پنڈلیوں پر لرزتے رہے۔ مہر جی کی سانسوں کی

باس میں شانی کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن فاخر اسے تنہا چھوڑ کر پتا نہیں کہاں نکل گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بھابو آئی اور اس نے اس قیدِ بامشقت سے شانی کو یہ کہہ کر رہائی دلائی کہ فاخر اسے بلا رہا ہے۔

اس کی نازک کلائیاں بری طرح دکھنے لگی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو فاخر وہاں نہیں تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ بھابو نے صرف دادا سسر سے اس کی جان چھڑانے کے لئے کہا تھا کہ فاخر اسے بلا رہا ہے۔

وہ رات بھی ایسے ہی گزر گئی۔ شانی اور اس کا شوہر بستر کے دو کناروں پر علیحدہ علیحدہ لیٹے رہے۔ شانی نے ایک دو بار کروٹ بدلی۔ اس کے کپڑوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی، اس کی چوڑیاں چھنکیں۔ شاید غیر ارادی طور پر اس نے شوہر کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت اپنی جگہ لیٹا رہا۔ اس کے کشادہ سینے سے اس کی بھاری بھرکم سانس ایک پھنکار کی طرح نکلتی رہی اور پھر داخل بھی ہوتی رہی۔ کسی وقت شانی کا دھیان شادی کے روز پیش آنے والے واقعات کی طرف بھی چلا جاتا تھا اُس روز کچھ بدمزگی ہوئی تھی بعد میں مچھلیوں کے شکار کے موقع پر بھی چند تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا تھا، کہیں فاخر کے ذہن پر ان تازہ واقعات کا اثر تو نہیں تھا؟

اگلے روز شانی کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ کھڑکیوں سے باہر اجالا پھیل چکا تھا، دور کہیں نارپور کے کھیتوں میں ڈیزل انجن ''کو......کو'' کی آواز سے چل رہا تھا۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی تھی۔ پھلواری میں پھول کھلے تھے، گھاس پر اوس چمک رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس اوس پر ننگے پاؤں چلنے کے لئے شانی کا دل مچل جاتا لیکن اب تو وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مہر جی کا بگڑا ہوا غضب ناک چہرہ کسی میخ کی طرح شانی کے ذہن میں گڑا ہوا تھا۔

وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھتی حویلی کی چھت پر چلی گئی۔ نارپور کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی تھی، کچے اور پکے دونوں طرح کے مکانات یہاں موجود تھے۔ مکانات سے آگے کھیتوں کے سلسلے تھے، سنہری گندم حدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھی، کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان درختوں اور سنہری گندم کے ان کھیتوں سے آگے افق تھا اور افق سے آگے اس کا میکہ تھا۔ جہاں اس کے ابا جی تھے اور اس کے سارے ''اپنے'' تھے۔ وہ ''اپنے'' جواب غیر محسوس ہونے لگے تھے۔ اچانک شانی کو کھٹ کھٹا کھٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ذرا جھجکتی ہوئی منڈیر کی طرف گئی۔ منڈیر کے جھروکوں میں اس نے دیکھا اور حیران رہ گئی، دلچسپ

نظارہ تھا۔ اس کا شوہر فاخر صرف ایک لنگوٹ میں نظر آرہا تھا۔ دراصل یہ اس کی دھوتی تھی جسے اس نے لنگوٹ کی شکل میں کسا ہوا تھا۔ اس کا ٹھوس جسم ورزشی تھا اور سارے کا سارا گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فاخر کے ہاتھ میں ایک چمکتی لاٹھی تھی۔ وہ بیک وقت دو افراد سے لٹھ بازی کر رہا تھا۔ فاخر کے انداز میں بلا کی پھرتی اور مہارت تھی۔

شانی دیکھتی رہی اور اسے اپنا بھائی عادل سلطان یاد آگیا۔ عادل بھی تو لاٹھی چلانے کا ماہر تھا۔ دو سال پہلے نوران شاہ کے میلے میں اس نے لاٹھی چلانے کا مقابلہ کیا تھا اور پندرہ پنڈوں کے جوانوں میں سے اسے پہلا انعام ملا تھا اور یہ شوق صرف عادل کو ہی نہیں تھا، جوانی میں اس کے ابا جی، چچا رئیس اور چچا مشتاق بھی لاٹھی چلاتے تھے...... یہ ایک طرح سے ان کا خاندانی شوق تھا۔ اس کے ابا جی تو رائفل کا نشانہ لینے میں بھی مہارت رکھتے تھے، بچپن میں شانی نے خود دیکھا تھا کہ ملازم خادم حسین چینی کی پلیٹوں کو ہوا میں اچھالتا تھا اور ابا جی نشانہ لے کر ان پلیٹوں کو ہوا میں ہی چکنا چُور کر دیتے تھے۔ دس بارہ پلیٹوں میں سے شاید ہی کوئی پلیٹ گولی سے بچتی ہو۔

شانی منڈیر کے رخنے میں سے اپنے توانا شوہر کو لٹھ بازوں سے برسرِ پیکار دیکھتی رہی۔ شوہر کے عریاں جسم کو دیکھتے ہوئے اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئی ہیں وہ رخنے سے پیچھے ہٹ گئی اور چھت کے درمیان میں جا کر چہل قدمی کرنے لگی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آوازیں بدستور اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

وہ سوچنے لگی عادل اور فاخر کا شوق مشترک ہے ہوسکتا ہے یہ شوق دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ ایک دو ملاقاتوں میں جب وہ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگیں۔ اس نے سوچا جب وہ دونوں ملیں گے تو وہ ان کے مشترکہ شوق کا ذکر ضرور کرے گی۔ پھر اسے یاد آیا کہ صرف ایک دن بعد ولیمے کی تقریب ہے۔ اس تقریب میں اس کے میکے سے بھی سب کو شریک ہونا تھا۔ اس کے دل میں خوشگوار دھڑکن جاگنے لگی۔ ابا جی اور عادل کو دوبارہ دیکھنے کے خیال سے ہی اس کے اندر پھول سے کھل گئے۔ ان سے جدا ہوئے صرف دو روز ہوئے تھے لیکن شانی کو لگ رہا تھا کہ دو سال گزر گئے ہیں۔ مقامی رواج کے مطابق ولیمے کے بعد شانی کو میکے چلے جانا تھا......اور پندرہ بیس روز وہاں گزارنا تھے۔ اپنی گلیوں اپنی سہیلیوں اور اپنے پیاروں سے ملنے کا خیال ہی شانی کے لئے جاں فزا تھا۔

اگلے روز دوپہر سے تقریب کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حویلی کے صحن میں اور صحن سے

باہر بڑے بڑے شامیانے لگائے گئے تھے۔ حویلی کے پچھواڑے ایک میدان میں اَن گنت چولہے بنائے گئے اور دیگوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی، حویلی کی طرف آنے والے راستوں کو خوب اچھی طرح سجا سنوار دیا گیا۔ شام کو مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی لاہور سے بلائے گئے فوجی بینڈ نے طربیہ دھنیں بکھیرنا شروع کر دیں۔ ورائٹی شو کے لئے بھی لاہور سے فن کار بلائے گئے تھے۔ ورائٹی شو کا نام تو بس آڑ کے لئے استعمال ہو رہا تھا اصل کام ناچ گانے اور رقص و سرور کا تھا۔

شانی ان ساری مصروفیات سے الگ تھلگ تھی، اسے فقط اس بات سے دلچسپی تھی کہ اس کے گھر والے آ رہے تھے اور اسے چند دن کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے وہ جیسے ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔

رات کو سونے سے پہلے فاخر نے پوچھا۔ ”کتنے دن رہو گی؟“

وہ اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے عام سے لہجے میں بولی۔ ”جتنے دن آپ کہیں۔“

”اگر میں کہوں کہ دو دن رہ کر واپس آجاؤ تو آجاؤ گی۔“

”اگر آپ ایسا کرنا مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”مجھے پتا ہے کہ تمہارے ابا جی ایسا نہیں کرنے دیں گے، وہ بڑے بے چین ہوں گے تمہارے لئے ...... سنا ہے کہ بڑا پیار کرتے ہیں تم سے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”سنا ہے سارا پنڈ اتمہارا دیوانہ ہے۔ بھابو کہتی تھی جس سے بات کرو تمہاری تعریفوں کے پُل باندھتا ہے۔“ شانی نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ فاخر نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تعریفیں تو تمہاری یہاں بھی شروع ہوگئی ہیں، بھابو اور بچے تو تمہارے گن گاتے ہی تھے اب ملازموں نے بھی گن گانے شروع کر دیئے ہیں۔“

”دل... لیکن...... کچھ لوگ مجھ سے...... ناراض بھی لگتے ہیں۔“ شانی نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”مم... میرا مطلب ہے کہ دادا جی......“ شانی نے جلدی سے بات بدلی۔

”ان کی ناراضگی تم نے ابھی دیکھی نہیں، وہ ہم سب کے بزرگ ہیں، ان کی ہر بات برداشت کرنا پڑتی ہے۔“ فاخر کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

اس رات بھی شانی منتظر رہی لیکن فاخر کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ وہ پتھر کی طرح ساکت و جامد بستر کے ایک کنارے پر ٹکا رہا۔ شانی نے کئی بار کروٹ بدلی۔ اپنی ہفت رنگ چوڑیوں کی جھنکار اس کے کانوں تک پہنچائی لیکن کوئی آواز جیسے اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت تھی کہ فاخر کو دیکھ کر اور اس کے ساتھ ایک کمرے میں رات گزار کر شانی کے دل میں کوئی کلی نہیں کھلی تھی۔ کوئی ایسی ہوا نہیں چلی تھی جس سے دل کا موسم بدل سکے...... لیکن پھر بھی ایک میٹھی میٹھی سی لہر تھی جو فاخر کی قربت کے سبب اس کے بدن میں جاگتی تھی۔ اسے خود سپردگی پر ابھارتی تھی...... وہ خدائی حکم کے مطابق اپنا تن من اپنے شوہر پر نچھاور کرنا چاہتی تھی لیکن جسے وہ سب کچھ سونپنا چاہتی تھی وہ بے خبر تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ شانی کی خواہش ہی نہیں رکھتا تھا...... شانی نے اس کی سرخی مائل آنکھوں میں طلب کی چنگاریاں دیکھی تھیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ان چنگاریوں کو جان بوجھ کر شعلہ بننے سے روکا ہوا ہے۔

بہرحال شانی کو اس بات کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ دوری تا دیر برقرار نہیں رہے گی۔ بستر کے درمیان کی خالی جگہ جلد پُر ہو جائے گی۔

اگلے روز صبح سویرے ”رنگ والی“ سے دو نائی شگن کی مٹھائی لے کر نارپور پہنچے۔ ان کی زبانی شانی کو پتا چلا کہ اس کے گھر والے شام سے تھوڑی دیر پہلے نارپور پہنچیں گے۔ انہیں رات یہیں بسر کرنا تھی۔ اگلے روز ولیمے کے فوراً بعد انہیں شانی سمیت واپس روانہ ہو جانا تھا۔

شانی اپنے گاؤں سے آنے والے دونوں افراد سے یوں ملی جیسے کوئی قریبی عزیزوں سے ملتا ہے۔ وہ دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی اور گاؤں کی ایک ایک بات پوچھتی رہی۔ اسے نائیوں کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ چھ روز بعد اس کی عزیز سہیلی صغراں کی منگنی ہے، یہ خبر جتنی اچانک تھی اتنی ہی خوشگوار بھی تھی۔ شانی کے دل میں بڑی خاموشی کے ساتھ درجنوں لڈو پھوٹ گئے۔

جس وقت شانی بڑی وارفتگی کے ساتھ اپنے گاؤں کے نائیوں سے بات کر رہی تھی، دو آنکھیں کھڑکی کی اوٹ سے اسے گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ناپسندیدگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ یہ اس کے شوہر کی آنکھیں تھیں۔

شام کو رنگ والی کے مہمان پہنچ گئے۔ وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی نارپور کی حدود میں داخل ہوگئے لیکن ان کی گاڑیوں کو نارپور میں داخل ہونے کے لئے آدھا پون گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ پتا چلا کہ شامیانے اور کراکری وغیرہ لانے والے ایک ٹرک کا ایکسل عین اس راستے پر

ٹوٹ گیا تھا جہاں سے مہمانوں کی گاڑیوں کو حویلی تک پہنچنا تھا۔ ٹرک کو راستے سے ہٹانے کی کوششوں میں کافی وقت ضائع ہوا (اس بات کا پتا شانی کو ڈھائی تین ماہ بعد چلا کہ ٹرک خراب نہیں ہوا تھا بلکہ کیا گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ رنگ والی سے آنے والے مہمانوں سے اس "تاخیر" کا بدلہ لیا جائے جو نارپور کے باراتیوں کو شادی کے دن جھیلنا پڑی تھی) یقیناً یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت تھی جو مہر خاندان کی کج روی کو ظاہر کرتی تھی۔

شانی کئی منٹ تک ابا جی کے گلے سے لگی رہی۔ ان سے جدا ہوئی تو بھائی کی بانہوں میں سما گئی۔ فاخر اور اس کے گھر والوں نے مہمانوں کی آؤ بھگت کی لیکن بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس آؤ بھگت میں محبت سے زیادہ نمود و نمائش پائی جاتی ہے۔ بہرحال رات خیریت سے گزری۔ شانی آج دوسرے کمرے میں اپنی چچازاد بہن ناصرہ اور سہیلی شمیم کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ دونوں اسے چھیڑتی رہیں اور الٹے سیدھے سوال پوچھتی رہیں۔ شانی نے کوشش کر کے باتوں کا رخ صغراں کی منگنی کی طرف موڑ دیا۔ صغراں کی منگنی اور شادی کا شانی کو اتنا چاؤ تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر رنگ والی پہنچ جائے۔ رات، رات میں ہی تینوں سہیلیوں نے منگنی کا لمبا چوڑا پروگرام بھی بنا لیا۔

اگلے روز ولیمہ تھا۔ دعوت ولیمہ سے تھوڑی دیر قبل شانی کی چچی نصرت نے شانی سے کہا کہ وہ اپنا ضروری سامان سنبھال لے۔ شانی کمرے میں چلی گئی اپنے چند جوڑے، میک اَپ کی چیزیں اور اس طرح کا دیگر سامان اس نے بڑے اٹیچی میں رکھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں اسے اپنے عقب میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا فاخر کھڑا تھا۔ سفید دھوتی اور قمیص پہنے ہوئے کندھوں پر ایک ریشمی چادر تھی، ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں سنہری کھسا چمک رہا تھا۔ "کہاں کی تیاری ہے؟" وہ مخصوص سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کو پتا ہی ہے، گھر جا رہی ہوں۔"

"کس کے گھر؟" فاخر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"اپ...... اپنے...... میرا مطلب ہے ابا جی...... کے ساتھ۔" شانی کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ چند دن میں ہی "اپنا" کہنا کتنا مشکل ہو گیا ہے وہ گھر جہاں اس نے زندگی کے انیس سال گزارے ہیں۔

فاخر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جا رہی ہو۔"

الفاظ شانی پر بجلی بن کر گرے۔ وہ حیرت سے فاخر کا گندمی چہرہ تکنے لگی۔ اسے اپنی

سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "مم...... میں سمجھی نہیں۔" وہ لرز کر بولی۔

"میں فارسی میں نہیں بول رہا، تم آج نہیں جا رہی ہو۔ اگلے ہفتے میں نے رنگ والی کی طرف جانا ہے، میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔"

"مم...... مگر...... ابا جی اور......" آواز شانی کے خشک حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔" فاخر نے درشتگی سے کہا۔ "دادا جی کی طبیعت آج صبح خراب ہو گئی ہے، کل لاہور سے دو ڈاکٹر انہیں دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ آپریشن کرانے کا کہیں، اگر ایسا ہوا تو پرسوں دادا جی کو لاہور لے جانا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے موقع پر تم رنگ والی چلی جاؤ۔"

شانی جیسے ایک دم بے جان سی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بھی بول نہ سکی۔ فاخر یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ "اپنے گھر والوں کو بتا دو کہ تم اگلے ہفتے آؤ گی۔"

شانی بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا تھا۔ بالکل وہی کیفیت تھی جو شادی کے روز ہوئی تھی اور وہ عورتوں میں بیٹھے بیٹھے تقریباً بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پھر وہی حالت نہ ہو جائے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور قالین پہ ٹہلنے لگی۔ اس کی نگاہ میں گھر والوں کے خوش و خرم چہرے گھوم گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں یہ تکلیف وہ خبر کیسے پہنچائے۔

اسی دوران میں چچی نصرت کمرے میں آ گئیں۔ شانی کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر ایک دم ان کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ "کیا ہوا میری رانی؟" انہوں نے اسے پچکارتے ہوئے پوچھا۔ شانی نے اپنے سینے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے دل کو بمشکل سنبھالا اور ساری بات چچی کے گوش گزار کر دی، وہ بولیں۔ "ابھی ہم رات کو تو مل کر آئے ہیں مہر جی سے تب تک تو ٹھیک تھے۔"

"صبح طبیعت بگڑی ہے۔" شانی نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ بات ابا جی، عادل، چچا رئیس اور دیگر اہلِ خانہ کو بھی معلوم ہو گئی۔ عادل خاص طور پر مضطرب نظر آنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جوان خون جوش مار رہا ہے۔ وہ دبے ہوئے لیکن سخت لہجے میں بولا۔ "مجھے تو یہ پابندی بالکل اچھی نہیں لگی، مہر جی کی طبیعت تو پہلے بھی ایسی ہی تھی اور اگر فرض کیا کہ دو تین دن میں انہیں ہسپتال لے جانے کی ضرورت پڑتی بھی ہے تو شانی واپس یہاں آ سکتی ہے بلکہ میں اسے خود چھوڑ جاؤں گا۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" چچی نصرت نے تائید کی۔

''میرا خیال ہے کہ میں خود جا کر فاخر سے بات کرتا ہوں۔'' عادل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چوہدری ارشاد نے جوان بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ ''نہیں پتر! بات بڑھانے سے فائدہ نہیں اب شانی پر ہمارا حق کم اور اس کے گھر والوں کا زیادہ ہے۔ اگر وہ شانی کا نہ جانا بہتر سمجھتے ہیں تو ہمیں زور نہیں دینا چاہئے۔''

''ابا جی! میں......کوئی ٹانگ تو نہیں پکڑ رہا......منہ زبانی بات ہی کرنے لگا ہوں نا، اب دو دن میں اتنا بھی حق نہیں رہا ہمارا۔''

اسی دوران میں چوہدری ارشاد نے کھڑکی میں سے دیکھ لیا کہ فاخر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ چوہدری ارشاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عادل کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا، ضبط کی وجہ سے عادل کا چہرہ لال ہو گیا، فاخر کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ باہر چلا گیا۔ فاخر نے باقی گھر والوں کے سامنے بھی وہی بات کہی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شانی کے سامنے کہی تھی۔ چوہدری ارشاد نے کہا ''ٹھیک ہے پتر، جیسا تم مناسب سمجھتے ہو۔''

سہ پہر کے وقت شانی کے گھر والے شانی کے بغیر ہی رنگ والی واپس روانہ ہو گئے۔ سب کے دل بجھے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ شانی کا بجھا ہوا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل ضبط کر رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس نے محسوس کیا، جیسے وہ ایک قیدی ہے اور اس کے گھر والے اس سے ملاقات کے بعد جیل سے واپس چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی وہ باتھ روم میں گھس گئی اور دیر تک روتی رہی۔

شام کے بعد شانی کو پتہ چلا کہ جن دو ڈاکٹروں نے کل مہر جی کو دیکھنے آنا تھا وہ آج ہی آ گئے ہیں اور مہر جی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ عشاء کے بعد بھابو مقبول سے شانی کی ملاقات ہوئی۔ شانی نے پوچھا۔ ''بھابو، دادا جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں ہے انہیں۔'' بھابو نے بے زار لہجے میں کہا۔ ''مہینے میں ایک دو بار ان کا وہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے......بلڈ پریشر......سانس اوکھا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔''

''اور وہ آپریشن؟''

''ہرنیا کا آپریشن ہونا ہے اس کا تو دو سالوں سے سن رہے ہیں، پتا نہیں کہ ہونا بھی ہے کہ نہیں۔''

''ڈاکٹر آئے تو ہوئے تھے انہوں نے کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں بس دوائیاں وغیرہ دے کر چلے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپریشن کے لئے ابھی ان کی حالت ٹھیک نہیں۔''

بھابو مقبول سے باتیں کر کے شانی کے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا۔ اسے لگا کہ اس کے دادا سسر کی بیماری کا بس بہانہ بنایا گیا ہے ورنہ فاخر چاہتے ہی نہیں تھے کہ اسے گھر والوں کے ساتھ رنگ والی بھیجا جائے۔ وہ ایک دم اداس اور غمزدہ ہو گئی۔ اپنے گھر والوں کے ستے ہوئے چہرے یاد کر کے اس کا دل رونے لگا......پھر اسے صغراں کا خیال آیا وہ سوچنے لگی جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ اس کی منگنی پر نہیں آ سکے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

اس رات شانی نے کھانا بھی نہیں کھایا، بس فاخر کا ساتھ دینے کے لئے ایک دو لقمے لئے اور انہیں بھی دیر تک منہ میں گھماتی رہی لیکن آج وہ محسوس کر رہی تھی کہ فاخر خلافِ معمول ذرا اچھے موڈ میں ہے، وہ اسے اپنے ساتھ ٹہلانے کے لئے چھت پر لے گئے۔ رات کے دس بجے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ فاخر کے سامنے شانی پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سینے میں گہری اداسی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ کمرے میں آ کر فاخر نے ڈیک پر ہلکا سا میوزک لگا دیا۔ پنجابی گیت تھے اور انتخاب بھی زیادہ اچھا نہیں تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ شانی اپنے کمرے میں موسیقی کی آواز سن رہی تھی لہٰذا جیسی بھی موسیقی تھی، غنیمت تھی۔

ایک دم شانی نے محسوس کیا کہ فاخر کی سلگتی نگاہیں اس کے سراپا پر ہیں۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا اور اسے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ شانی کے ذہن میں ایک اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ چند لمحے بعد فاخر کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ ''آج ذرا وہی شادی والا جوڑا تو پہن کر دکھاؤ۔''

شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز درست تھی۔ آج اس کے شوہر نے اسے پکارا تھا......لیکن یہ کیا بات تھی، آج تو اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں وہ خود کو بالکل خالی محسوس کر رہی تھی۔ مٹی کی مورت......اس کے سینے میں بس ایک زرد اداسی تھی اور آنکھوں کے پیچھے سسکیاں چھپی ہوئی تھیں۔

اسے پکارنے کے لئے اس کے شوہر نے آج یہ کیسا دن منتخب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کئی بار خود سپردگی کا مستحکم ارادہ لئے رات کی دہلیز پر آئی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھیں خواب ناک ہوتی تھیں اور بدن میں ایک میٹھی سی لہر بھی چلتی تھی لیکن آج تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مٹی کا ڈھیر ہو رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' فاخر کی آواز پھر ابھری۔ اس بار لہجے میں ہلکا سا تحکم بھی چھپا ہوا

تھا۔

ایک بار تو شانی کے جی میں آئی کہ کہہ دے۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں سونا چاہتی ہوں۔'' یا پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہہ دے۔ ''فاخر مجھے منافقت پر مجبور نہ کریں...... آج میرے پاس ایسا کچھ نہیں جو آپ کو دے سکوں...... آج میں صرف دھوکا کروں گی۔''

لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکی...... اور وہ بھی نہیں کہہ سکی جو پہلے سوچا تھا اور وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔

فاخر خاموش تھا، وہ بھی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی، شاید فاخر کی مردانہ انا آڑے آ رہی تھی۔ وہ شانی کے سامنے اپنی خواہش دہرانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ شانی کی فراست نے محسوس کیا کہ وہ کچھ دیر مزید یونہی بیٹھی رہی تو فاخر کے منہ سے کوئی بہت سخت بات نکل جائے گی یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غضب ناک ہو کر پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل جائے...... وہ خود کو سنبھال کر اپنی جگہ سے اٹھی اور الماری کی طرف بڑھ گئی کچھ ہی دیر بعد اس کے ہاتھ میں عروسی جوڑا تھا۔

وہ عجیب رات تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنے آپ سے...... اپنے جسم سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ کسی کی بانہوں میں تھی گرم پھنکارتی ہوئی سانسیں اس کے چہرے اور گردن سے ٹکراتی تھیں۔ کسی کی گرم جوشی اسے اتھل پتھل کر رہی تھی لیکن اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ خوشی اور محبت اس سے بہت دور تھی۔

اور پھر صبح ہو گئی۔ ایک ناگوار تکلیف دہ رات کی صبح۔ وہ بے ترتیب پڑی تھی، بکھری بکھری سی، اجڑی اجڑی سی...... اس کا رنگ زرد تھا...... مایوسی اور توہین کا غبار سا اس کے ''سراپا'' سے چمٹا تھا۔ ایک فٹ کے فاصلے پر فاخر بے خبر سو رہا تھا۔ وہ سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم پر ریچھ کی طرح بال تھے، سوتے میں اس کے سینے سے ایک گونجدار آواز نکل رہی تھی۔ جیسے وہ نیند کی حالت میں بھی اپنے کسی ملازم یا مزارعے پر غضب ناک ہو رہا ہو۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور گندمی چہرہ تمتما رہا تھا۔ نہ جانے کیوں شانی کو اس سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا وہ اس کا شریکِ زندگی تھا۔ اس ڈر سے کہ اس کراہت میں مزید اضافہ نہ ہو جائے، شانی نے اپنی نگاہ پھیر لی۔ غیر متوقع طور پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر کچھ دیر سسکتی رہی پھر بستر سے اٹھ گئی۔

صبح نو بجے کے بعد جب فاخر کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو اس کا موڈ بہت اچھا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت تھی۔ خلافِ معمول اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں بھابو اور اس کے بچوں سے چند باتیں بھی کیں، بہرحال شانی سے اس کا رویہ وہی تکلف والا رہا۔ شانی کی آنکھیں سُرخ تھیں اور طبیعت میں بھی کسلمندی تھی لیکن فاخر نے ایک بار بھی اس کا حال نہیں پوچھا...... ہاں دروازے سے باہر نکلتے ہوئے شانی کی نگاہ سے اس کی نگاہ ایک لمحے کے لئے ملی۔ شانی کو اس کی نگاہ میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ اسے یوں لگا کہ یہ فتح مندی کی چمک ہے۔

دوپہر کو شانی نے اپنے دادا سسر مہر جی کو دیکھا، وہ وہیل چیئر پر بیٹھے تھے اور اسی پھلواری میں تھے جس میں قدم رکھنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے سر پر ایک تولیہ ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کا بدنما چہرہ چھپ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے عین سامنے کسی شے کو یک ٹک دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ شانی دبے پاؤں پھلواری کے قریب سے گزر گئی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ مہر جی کی نگاہ اس پر پڑ جائے پہلے دن والے تجربے کے بعد اسے مہر جی سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ سیدھی بھابو کے کمرے میں چلی گئی۔ بھابو کا کمرا بالائی منزل پر تھا۔ بھابو اپنے بڑے بچے ندیم کو نہلا رہی تھی۔ وہ چھ سات سال کا تھا اور بے حد شریر، ماں نے اسے الف ننگا کیا ہوا تھا، شانی کو دیکھ کر وہ شرمانے لگا۔ ''بہت تنگ کرتا ہے اب موسم بدل گیا ہے پھر بھی نہانے کے ڈر سے بھاگ جاتا ہے۔'' بھابو نے کہا۔

''ہاں...... اس معاملے میں بچے اکثر تنگ کرتے ہیں۔''

بھابو ندیم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دیکھو...... چچی نہا دھو کر آئی ہے کتنی پیاری لگ رہی ہے۔''

پہلے تو شانی نے فقرے کو عام انداز میں لیا لیکن جب اس کی معنی خیزی پر غور کیا تو اس کے رخسار ایک دم تپ گئے۔

ندیم کو تولیے سے خوب رگڑے دینے کے بعد بھابو شانی کی طرف آ گئی۔ اپنے گیلے گیلے ہاتھ میں اس کی کلائی تھامتے ہوئے بولی۔ ''آؤ اِدھر بیٹھو پلنگ پر......'' پھر وہ ایک دم چونک سی گئی۔ اس نے شانی کی کلائی چھوڑ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تب اس کے رخسار کو چھوا اور بولی۔ ''ہا...... ہائے...... تیرا تو سارا پنڈا تپ رہا ہے لگتا ہے کہ بخار چڑھا ہوا ہے۔''

شانی کو اندازہ ہوا کہ اسے واقعی بخار ہو گیا ہے۔ منہ خشک ہو رہا ہے اور جسم دکھ رہا ہے۔

بھابو نے اسے اپنے کمرے میں ہی لیٹا لیا۔ ایک ملازمہ کو بھیج کر اس نے نارپور کے پرانے حکیم صاحب کو بلا لیا۔ حکیم نے دوا وغیرہ دی اور کمرے کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے کہا۔

شام کو فاخر آیا تو اسے پتا چلا کہ شانی اوپر بھابو کے کمرے میں ہے اور اسے بخار ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ فوری طور پر اوپر آتا لیکن وہ نہا کر اور کپڑے بدل کر آیا۔ اس نے رسمی انداز میں شانی کی مزاج پُرسی کی اور نیچے چلا گیا۔ بھابو نے اس سے کہہ دیا تھا کہ شانی آج اسی کے کمرے میں رہے گی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ فاخر کے آنے سے شانی کو تسلی ہوتی لیکن اسے تسلی تب ہوئی جب وہ مزاج پُرسی کر کے کمرے سے چلا گیا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہا شانی کے دل و دماغ میں عجیب سے بے چینی کلبلاتی رہی۔ اسے لگا جیسے گرم پھنکاروں جیسی سانسیں اس کی گردن اور چہرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اس کے رخساروں پر کانٹے چبھ رہے ہیں اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

اگلے روز سہ پہر تک شانی کا بخار اُتر گیا...... لیکن نیچے جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھابو کے کمرے میں اسے اپنے کمرے سے کہیں زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی کمزوری اور طبیعت میں گراوٹ موجود تھی۔ وہ دوسری رات بھی بھابو ہی کے کمرے میں رہی...... فاخر بس ایک چکر لگا کر واپس چلا گیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ شانی کا یوں دوسری رات بھی بھابو کے کمرے میں گزارنا اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ چاہتا ہے کہ شانی اپنے کمرے میں آ جائے بہرحال یہ بات اس نے زبان سے نہیں کہی۔

تیسرے روز شام کے وقت شانی کی طبیعت میں پھر تھوڑا سا بھاری پن آ گیا۔ اب پتا نہیں یہ جسمانی تکلیف تھی یا ذہنی دباؤ کے سبب ایسا تھا۔ اپنے کمرے کا خیال آتے ہی شانی کے سینے میں عجیب سی گھٹن پیدا ہو جاتی تھی گرم سانسوں اور رخساروں پر چبھتے ہوئے نکیلے کانٹوں کا احساس اسے بے کل کر دیتا تھا۔ بھابو نے اسے دو روز اپنا مہمان بنایا تھا۔ اب وہ ایک دانا جیٹھانی کی حیثیت سے چاہتی تھی کہ شانی واپس کمرے میں جائے لیکن شانی کی ہچکچاہٹ اور اس کی گری ہوئی طبیعت کو دیکھ کر اس نے شانی پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں بچے بھی شانی سے لپٹ لپٹ جا رہے تھے۔ وہ اسے ہرصورت اپنے کمرے میں رکھنا چاہتے تھے۔

اس رات فاخر ذرا دیر سے گھر آیا۔ شانی اس کے آنے سے پہلے ہی سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔ بھابو کا چھوٹا بیٹا منان اس سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ دس بجے کے قریب دروازے سے باہر بھاری قدموں کی آواز آئی پھر دروازہ کھلا اور شانی کو اندازہ ہوا کہ فاخر

اندر آیا ہے۔ بھابو مقبول نے دبی ہوئی سرگوشی سے اس سے کہا۔ ''سو رہی ہے شام کو طبیعت پھر ذرا خراب ہو گئی تھی۔''

''کیا ہو گیا تھا؟'' فاخر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں...... کہتی تھی، سر ذرا بھاری ہے۔''

''اور تم نے سمجھ لیا کہ سچ مچ ایسا ہی ہے۔'' فاخر کے لہجے میں طنز تھا۔

''تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔''

''جانے دو بھابو...... میں کوئی کاکا نہیں ہوں۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ شانی آنکھیں بند کئے دم سادھے لیٹی رہی۔ کمرے سے باہر جا کر بھی دونوں باتیں کرتے رہے۔ مدھم آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ فاخر نے کہا۔ ''بھابو تم خواہ مخواہ اسے سر پر چڑھا رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

جواب میں بھابو نے کہا۔ ''چل ایک دن اور اسے آرام کر لینے دے۔ اس کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے ویسے بھی ملوک سی تو ہے۔''

''سب نخرے ہیں بھابو اور تمہیں پتا ہے میں نخرے اٹھانے کا عادی نہیں ہوں۔ میں اس لئے بیاہ کر نہیں لایا ہوں اسے...... کہ سرہانے کھڑا ہو کر اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتا رہوں۔ اسے گھر کا کام...... سنبھالنا ہو گا۔ اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہوں گی۔''

''سب کچھ کرے گی فاخے ابھی اسے دن ہی کتنے ہوئے ہیں آئے ہوئے، دو چار دن میں، میں خود اس سے زردہ پکواؤں گی اور کام پر لگواؤں گی۔''

کچھ دیر تک دیور بھابی کی چونچ لڑتی رہی پھر فاخر سیڑھیوں کو اپنے پاؤں سے کوٹتا ہوا نیچے چلا گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد شانی کو پیاس محسوس ہوئی، اس نے منان عرف مُنا کو بڑی آہستگی سے خود سے جدا کیا اور پانی کے کولر کی طرف گئی۔ ایک کھڑکی میں سے اس کی نگاہ نیچے صحن میں گئی۔ پھلواری کے پاس پختہ روش پر فاخر ٹہل رہا تھا۔ وہ سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس کی چال میں بے زاری اور جھلاہٹ نظر آتی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی اس لئے فاخر اسے نہیں دیکھ سکتا تھا، پھر بھی شانی کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔

اگلے روز اتفاقاً شانی کی مشکل آسان ہو گئی۔ لاہور میں ٹیکسٹائل کے مزدوروں نے کوئی جھگڑا کیا تھا اور فاخر اس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے لاہور چلا گیا تھا توقع تھی کہ اس کی واپسی

دو تین دن کے بعد ہو سکے گی۔

یہ مہلت شانی کے لئے بڑی مفید تھی۔ وہ اس دوران میں اپنا دل ٹھکانے پر لا سکتی تھی، اپنے ذہن سے اس خوف اور ناپسندیدگی کو کھرچ سکتی تھی جنھوں نے تین رات پہلے اس کے اندر جگہ بنائی تھی۔ اسی روز وہ نیچے اپنے کمرے میں آ گئی، دوپہر کو اس نے اپنے بے ترتیب کمرے کو سنبھالا۔ کمرے کی سجاوٹ میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کیا، شوخ رنگوں کے ڈیزائن دار پردوں کی جگہ دھیمے رنگوں کے خوشنما پردے لگائے، شام کو بھابو اور اس کے بچوں کے ساتھ پجارو میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لئے وہ کینو اور امرود کے باغوں کی طرف گئی۔ انہوں نے کچھ دیر نہر کے کنارے ٹھنڈی ہوا کا مزہ لیا۔

اگلے روز بھی سارا دن شانی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، ساتھ ساتھ وہ فاخر کے رویے کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ کسی وقت تو شانی کو شک ہوتا تھا کہ فاخر جان بوجھ کر کج روی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہاں آنے کے ایک روز بعد جب وہ فاخر کے قریب آنا چاہتی تھی، اس کی بانہوں میں سما کر سب کچھ بھولنا چاہتی تھی، وہ اس سے دور رہا تھا لیکن جب میکے نہ جا سکنے کے سبب وہ دل گرفتہ اور دکھی تھی، وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس کے انداز میں محبت اور نرمی نہیں تھی، سرکشی اور من مانی تھی۔ ایسی من مانی جو دل میں پھول کھلانے کے بجائے کراہت جگاتی ہے۔

بے شک میکے نہ جا سکنے کے سبب شانی اب بھی غم زدہ تھی لیکن اس نے اپنے فطری ''ضبط'' کو بروئے کار لا کر خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اسے رہ رہ کر صغراں کی منگنی اور منگنی کی رونقوں کا خیال آتا تھا لیکن ہر بار وہ یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ تین چار روز تک اپنے وعدے کے مطابق فاخر اسے خود رنگ والی چھوڑ آئے گا۔

تیسرے روز صبح سویرے ہی شانی کو معلوم ہو گیا تھا کہ شام کو فاخر گاؤں واپس پہنچ رہا ہے۔ اس نے سہ پہر کو نہا دھو کر اپنا بہترین لباس پہنا۔ ملازمہ ''پکھی'' باغ سے موتیے اور گلاب کے بہت سے پھول توڑ لائی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے دو گجرے بنا کر نئی مالکن کو دیئے۔ گجرے پہن کر شانی نے اپنی کلائیاں دیکھیں اور پکھی سے بولی۔ ''بڑے پیارے گجرے بناتی ہے تُو۔''

''گجرے اتنے پیارے نہیں ہیں، آپ کی بانہوں میں سج کر اتنے پیارے ہو رہے ہیں۔'' وہ شانی کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

پھر اس نے اپنے رومال سے ایک اور ہار نکالا، یہ گلاب اور موتیے کو ملا کر بنایا گیا تھا۔

سُرخ گلابوں کو دیکھ کر شانی کو اپنے میکے کے گلاب یاد آ گئے۔ گلاب کے وہ چند پودے، اس نے بڑی محبت اور لگن سے لگائے تھے۔ بچوں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی کہ پتا نہیں وہ پودے کس حال میں ہوں گے۔ بابا فخری ان کو پانی دیتا بھی ہو گا یا نہیں؟

اچانک حویلی کے مین گیٹ سے باہر گاڑیوں کے تیز ہارن سنائی دیئے۔ فاخر واپس آ گیا تھا۔ شانی نے اپنے ذہن سے میکے کے گلابوں کو نکال کر چہرے کو فوراً تر و تازہ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد فاخر سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ شانی کو سامنے برآمدے میں دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا، شانی سر پر دوپٹا درست کر کے آگے بڑھی اور شوہر کو سلام کیا وہ سلام کا جواب دیتا ہوا مہر جی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ بڑی سہانی رات تھی، فضا میں موتیے اور رات کی رانی کی مہک تھی، نہر کی جانب سے آنے والی خوشگوار ہوا دل میں ہلکی سی ترنگ جگاتی تھی لیکن اس رات بھی وہی کچھ ہوا جو شروع کی راتوں میں ہوا تھا۔ وہ رات گئے تک ایک بڑے رجسٹر میں کچھ حساب کتاب جوڑنے میں مصروف رہا پھر تھکا تھکا سا بستر پر لیٹا اور کچھ ہی دیر بعد شانی اس کے مدھم خراٹوں کی آواز سن رہی تھی۔ وہ دیر تک جاگتی رہی، یہ بات اس پر واضح ہوتی جا رہی تھی کہ فاخر جان بوجھ کر ایسا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب وہ شانی کو اپنی طرف مائل دیکھتا ہے تو بے رخی اختیار کرتا ہے۔ جب وہ شانی میں گریز کی کیفیت دیکھتا ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت پسندی کی ہی ایک شکل تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس سوال کے جواب میں کنوئیں والا واقعہ شانی کے ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا لیکن فاخر نے خود کہا تھا کہ اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ تو کیا پھر کوئی اور واقعہ تھا وہ کیا واقعہ ہو سکتا تھا؟ کیا مہر جی کا بھی اس واقعے سے کوئی تعلق تھا؟

فاخر نے شانی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے ہفتے خود اسے ''رنگ والی'' چھوڑ آئے گا۔ اگلا ہفتہ آ گیا اور شانی منتظر تھی کہ اس کا شوہر میکے جانے کے بارے میں اس سے کچھ کہے۔ ہفتے کی شام کو وہ بڑی شدت سے منتظر تھی۔ اسے توقع تھی کہ شاید کل اتوار کے روز وہ رنگ والی کا رخ کریں گے لیکن رات آٹھ بجے کے قریب شدید بارش شروع ہو گئی جو ساری رات جاری رہی...... نشیبی جگہوں پر پانی کھڑا ہو گیا۔ بہرحال اگر فاخر چاہتا تو اس موسم میں بھی سفر کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس ہر موسم میں استعمال کی جانے والی گاڑیاں موجود تھیں لیکن وہ تو شاید خود ہی کسی بہانے کا منتظر تھا۔ اس نے شانی سے کہہ دیا کہ اس ہفتے وہ رنگ والی نہیں جا سکیں گے۔ شانی کو مایوسی تو ہوئی، تنہائی میں دو چار آنسو بھی آنکھوں سے نکلے تاہم اس نے خود کو جلد

ہی سنبھال لیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کو ایسے دھچکے وقتاً فوقتاً برداشت کرنا ہی پڑیں گے۔

اگلے روز شام کو فاخر نے اس سے کہا۔ ''جاؤ دادا کے پاس سے ہو آؤ۔ آج بھابو بھی گھر میں نہیں ہے۔''

دراصل یہ معمول تھا کہ رات سونے سے پیشتر بھابو یا بھابو کا بڑا بیٹا ندیم...... دادا کی ٹانگیں دباتے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ وہ بھی بہت جلد اس معمول میں شامل ہونے والی ہے۔ فی الحال شاید نو بیاہتا ہونے کی وجہ سے اس کی مستقل ڈیوٹی نہیں لگائی گئی تھی۔ وہ شوہر کی ہدایت پر دادا سسر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ایک ملازم پہلے ہی مٹھی چاپی میں مصروف تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ شانی کے نتھنوں میں ناگوار سانسوں کی وہی جانی پہچانی باس ٹکرائی اور اس کا دل مالش کرنے لگا۔ مہر جی گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے۔ منقش حقے کی طویل نے (نالی) کا آخری حصہ ان کے سینے پر دھرا تھا۔ ٹانگوں سے اوپر تک سفید چادر کھنچی نظر آتی تھی۔ بالائی جسم پر ویل کا کرتہ تھا جس میں سے بوسیدہ سانولے گوشت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لشکارے مارتی ہوئی اکلوتی آنکھ کی چبھن سے نظر چرا کر شانی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور سر جھکا کر ٹانگیں دبانے لگی۔ پلپلا گوشت ہاتھوں میں آیا تو دل گھبرانے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ دن کا بیشتر حصہ اس طرح گزرتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ملازم مہر جی کی مٹھی چاپی کرتا رہتا ہے...... یوں لگتا تھا کہ مہر جی کے بوڑھے جسم کو مٹھی چاپی اور مالش کا نشہ لگ گیا ہے۔

وہ خاموشی سے دباتی رہی اور اس بات کی منتظر رہی کہ ابھی کچھ دیر میں مہر جی اسے ہاتھ روکنے کے لئے کہہ دیں گے مگر وہ تو جیسے ''بس'' کا لفظ منہ سے نکالنا بھول ہی گئے تھے۔ شانی دباتی رہی اس کی نازک کلائیاں دکھنے لگیں، ناگوار باس کے سبب سانسوں کی گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ آج تو بھابو بھی گھر میں نہیں تھی۔ پچھلی دفعہ اسی نے آکر شانی کو اس قیدِ بامشقت سے رہائی دلائی تھی۔ ایک دفعہ ہمت کر کے شانی نے چور نظروں سے مہر جی کا چہرہ دیکھا۔ ان کی ناکارہ آنکھ بالکل بند تھی جب کہ کارآمد آنکھ نیم وا تھی۔ غنودگی میں ہونے کے باوجود یہ آنکھ شانی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ ایسی کیفیت تھی...... اس آنکھ میں کہ شانی جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ مہر جی کی پنڈلیاں دبا دبا کر اب اس کی انگلیوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر چلی جائے لیکن پھر مہر جی کا بے پناہ طیش اور غصیلا پن ذہن میں آ گیا۔ وہ اپنے کام میں جتی رہی۔ کچھ دیر بعد مہر جی کے ہونٹوں سے ایک سرسراتی ہوئی غصیلی آواز نکلی، اس کے ساتھ ہی انہوں نے ٹانگوں کو بے چینی سے جنبش دی مطلب یہی تھا کہ وہ ٹھیک سے

نہیں دبا رہی۔ شانی پھر رہی سہی قوت جمع کر کے پلپلے ماس کو سکون پہنچانے کی کوشش کرتی رہی، اس کی پیشانی پر اب پسینہ چمکنے لگا تھا...... پتا نہیں کتنی ہی دیر اس عذاب میں گزر گئی۔ تب اچانک شانی کے کانوں میں بے ہودہ خراٹوں کی مدھم آواز گونجی اس نے چور نظروں سے دیکھا۔ اس کا دادا سسر سو رہا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ جو مفلوج تھا مزید بدنما نظر آنے لگا تھا، جلد پر عجیب سے دھبے تھے اور ادھ کھلے ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ وہ ہولے سے اٹھی اور باہر نکل آئی۔

☆======☆======☆

نارپور سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر بھابو مقبول کا میکہ تھا۔ اس گاؤں کا نام پارکے تھا۔ دیہات میں بہار کی آمد پر اکثر میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ پارکے میں بھی ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ بدھ کا ایک دن عورتوں کا دن تھا۔ بھابو اور اس کے دونوں بچے میلے میں جانے کے لئے کئی دن سے پروگرام بنا رہے تھے۔ انہیں منگل کی دوپہر چلے جانا تھا۔ بدھ کو میلہ دیکھ کر جمعرات کی سہ پہر کو واپس آنا تھا۔ ندیم اور مُنا بضد تھے کہ شانی کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ بھابو نے بھی میلے کی اور اپنے گاؤں کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ شانی کے دل میں اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ بھابو نے مناسب موقع دیکھ کر فاخر سے شانی کے لئے اجازت لے لی تھی۔ اب شانی بھی دو دن کے لئے ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک اُمید یہ بھی تھی کہ شاید اس کے گاؤں رنگ والی سے بھی میلے میں کچھ لوگ آئیں، ہو سکتا تھا کہ چچا رئیس یا چچا مشتاق کی فیملی میں سے ہی کوئی آ جائے، لگتا تھا کہ اپنوں کی صورت دیکھے اسے مہینوں گزر گئے ہیں۔

منگل کی صبح شانی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے چھوٹا سا اٹیچی تیار کر لیا تھا فاخر ناشتہ کر چکا تھا اور اب اپنے زرعی فارم پر جانے کے لئے پر تول رہا تھا، اچانک اس کی نظر شانی کے اٹیچی پر پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

''میرا سامان ہے، بھابو کے ساتھ جانے کے لئے رکھا ہے۔''

''بھابو کے ساتھ؟ کہاں؟''

''ان کے گاؤں، آپ سے پوچھا تو تھا۔''

''نہیں نہیں...... آج نہیں جا سکتی ہو تم، لاہور سے میرا ایک دوست اور اس کی بیوی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے شام سے پہلے پہنچ جائیں۔''

شانی سناٹے میں رہ گئی پھر ہمت کر کے بولی۔ ''لیکن۔ یہ تو بڑی بدمزگی ہو جائے گی سب تیار ہیں۔ ندیم اور مُنا تو صبح سویرے ہی مجھے جگانے آ گئے تھے..... وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا دل بڑا بُرا ہوگا۔''

فاخر کا چہرہ ایک دم خون کے دباؤ سے تاریک ہوگیا۔ اپنے لہجے پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں ندیم اور مُنے کا خیال ہے لیکن ان کا خیال نہیں جو صرف ہم سے ملنے کے لئے لاہور سے آ رہے ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا..... لیکن۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' فاخر پھنکارا۔ ''اگر میری اجازت سے جانا چاہتی ہو تو پھر میری طرف سے اجازت نہیں ہے۔'' وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس شام وہ بے حد افسردہ تھی، ندیم اور مُنا تقریباً روتے ہوئے ''پارکے'' گئے تھے۔ بھابو بھی دل گرفتہ تھی سارا پروگرام دھرا رہ گیا۔ اگر فاخر گھر میں ہوتا تو شاید بھابو اس کی منت کر کے اسے منانے کی کوشش کرتی لیکن وہ تو شانی کو حکم سناتے ہی جیپ میں بیٹھ کر فارم چلا گیا تھا۔ یقیناً اسے بھی معلوم تھا کہ بھابو اس کا فیصلہ بدلنے کی کوشش کرے گی۔

شانی کو زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ وہ مہمان بھی نہیں آئے تھے جن کے استقبال کے لئے فاخر نے شانی کو جانے سے روکا تھا۔ مہر جی کے خاص ملازم اکبرے نے بتایا تھا کہ چوہدری فاخر کے مطابق لاہور سے آنے والے مہمان آج نہیں آ رہے۔

اب شانی کو پتا نہیں تھا کہ ان مہمانوں کو واقعی آنا بھی تھا یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات بھی فاخر نے ایسے ہی کہہ دی ہو۔ اس سے پہلے بھی شانی کو میکے جانے سے روکنے کے لئے اس نے مہر جی کے ہسپتال جانے کا بہانہ بنایا تھا۔ ندیم اور مُنا کے روتے ہوئے چہرے بار بار اس کی نگاہوں میں آ رہے تھے اور وہ افسردہ تر ہو رہی تھی۔ جو اٹیچی کیس اس نے پارلے جانے کے لئے بڑے شوق سے تیار کیا تھا وہ اسی طرح بند پڑا تھا۔ وہ اٹیچی کیس کھول کر کپڑے الماری میں لٹکانے لگی۔ اسی دوران میں فاخر کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ لیں۔

فاخر کمرے میں داخل ہوا۔ آج وہ قدرے خوشگوار موڈ میں لگتا تھا۔ اس نے مہمانوں کے نہ آنے کے بارے میں کوئی وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جو اس نے صوفے پر پھینک دیا اور بستر پر نیم دراز ہوگیا۔

شانی نے چہرے پر حتی الامکان بشاشت پیدا کی اور بولی۔ ''چائے پئیں گے؟''

''نہیں ابھی دادا کے پاس سے پی کر آیا ہوں۔''

''کپڑے بدلیں گے؟''

''میں تو نہیں بدلوں گا، لیکن اگر تم چاہو تو بدل سکتی ہو۔''

''میں..... سمجھی نہیں۔''

وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قدرے بے زاری سے بولا۔ ''یہ کیا ہر وقت شلوار قمیص پہنے رہتی ہو۔ یہ دیکھو میں نے لاہور سے ساڑھی منگوائی ہے تمہارے لئے، زبردست رنگ ہے۔''

شانی کے دل پر چوٹ سی لگی لیکن اس نے تکلیف کا اثر چہرے پر نہیں آنے دیا۔ اس نے اپنے میکے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک دو موقع پر جب اس نے میکے کے کپڑے پہن رکھے تھے، فاخر نے ایسے ہی ناک بھوں چڑھائی تھی۔ اس نے خاموشی سے ساڑھی کا ڈبا اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ ''بہت اچھی ہے۔'' اس نے کہا۔

''پہنو تو پھر پتا چلے گا کہ کتنی اچھی ہے۔'' فاخر سنجیدگی سے بولا۔

وہ ساڑھی لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پھر پہن کر آ گئی۔ فاخر کی تیز پُرحرارت نظریں اس کے سراپا سے لپٹنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر حصہ اس کی نگاہوں کی زد میں ہے۔ اگر کسی حصے پر فاخر کی نگاہیں نہیں پڑ رہی تھیں تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ روئی روئی سی سُرخ آنکھیں۔

کچھ دیر بعد فاخر نے بھی کپڑے بدل لئے اور بولا۔ ''چلو آؤ چھت پر ٹہلتے ہیں۔'' وہ چھت پر چلے آئے منڈیر کے اوپر سے شانی کی نگاہ نیچے پھلواری پر پڑی، وہی پُراسرار پھلواری جہاں مہر جی کے سوا کوئی نہیں جاتا تھا..... وہ وہیل چیئر پر بیٹھے تھے اور پھلواری میں موجود تھے لیکن آج وہ اکیلے نہیں تھے۔ آج تو ان کے ساتھ ان کا پہلوان نما ملازم اکبرے بھی موجود تھا۔ اکبرے کو شانی نے نارپور آنے کے دو روز بعد ہی پہچان لیا تھا۔ یہ وہی غصیلا شخص تھا جس نے اس موقع پر شانی پر رائفل تاننے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے کو تین سال گزر چکے تھے لیکن شانی کو سب یاد تھا... شانی نے چھت پر سے دیکھا۔ اکبرا کوئی چیز زمین میں دبا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں۔ شانی کی بس ایک نگاہ اس منظر پر پڑی پھر اس نے دھیان دوسری طرف کر لیا۔

آج کی رات فاخر کا موڈ ویسا ہی تھا جیسا ان کے ''ملن'' کی پہلی رات کو تھا۔ شانی کے

دل کا موسم بھی وہی تھا جو "ملن" کی پہلی رات کو تھا۔ وہ اداس تھی..... خود کو بالکل خالی محسوس کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک باوفا بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس فاخر کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ فاخر اس پر مہربان ہونے کے لئے ایسا وقت کیوں منتخب کرتا تھا جب وہ کسی مہربانی کی متحمل نہیں ہوتی تھی۔ ہاں یہ ویسی ہی رات تھی اور اس رات وہی سب کچھ ہوا جو پہلے ہوا تھا.....اس کی روح نے اس کے جسم کا ذرا سا ساتھ بھی نہیں دیا۔ اس کے معصوم دل میں محبت کی کوئی کلی نہیں کھلی، اس کے چہرے سے گرم ناگوار سانسیں ٹکرائیں۔ اس کے رخساروں پہ کانٹے چبھے.....وہ روندی گئی، مسلی گئی اور خود سے دور کھڑی یہ سب ہوتے دیکھتی رہی۔

صبح جب اس نے لحیم شحیم .. بالوں بھرے فاخر کو اپنے پہلو میں محوِ خواب دیکھا تو اس کے دل میں محبت کے بجائے کراہت جاگی۔ اس کا سانس سینے میں پھر سے گھٹنے لگا۔ اس ڈر سے کہ یہ کراہت مزید نہ بڑھ جائے، اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ نو دس بجے کے قریب جب فاخر تیار ہو کر فارم پر جانے کے لئے نکلا تو وہ بہت ہشاش بشاش تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ سی چمک تھی۔ پتا نہیں اس چمک کو دیکھ کر شانی کو کیوں احساس ہوتا تھا کہ اس کے سسرال اور اس کے میکے کے درمیان کوئی پرانا تعلق موجود ہے۔ ...پرانا اور ناخوشگوار..

شانی کو رنگ والی سے اپنی رخصتی کے لمحے یاد تھے۔ ان لمحوں میں ابا جی کچھ زیادہ ہی افسردہ اور دکھی نظر آئے تھے۔ شانی کو یوں لگا تھا کہ یہ دکھ صرف اس کی رخصتی کا نہیں ہے بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ وہ ابا جی سے پوچھنا چاہتی تھی شاید یہ مالی پریشانی کا کوئی سلسلہ تھا...... یا اس کے علاوہ کوئی بات تھی؟ لیکن اب تک پوچھنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا.... اور پتا نہیں کب تک نہیں ملنا تھا، اسے اپنے میکے سے رخصت ہوئے اب بارہ دن ہونے کو آئے تھے اسے یقین تھا کہ وہاں رنگ والی میں سب بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ابا جی اور پھوپھی آمنہ ہر روز ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر حویلی کو آنے والی راہ دیکھتے ہوں گے۔ وہ خود بھی تو کسی بے قرار پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی مگر ابھی فوری طور پر آزادی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

شام تک شانی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ اسے ہلکا سا بخار بھی ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے، یہ ٹوٹ پھوٹ جسم سے زیادہ روح کی تھی۔ اسے لاہور میں دیکھا ہوا ایک واقعہ یاد آرہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنی مرحومہ ماں اور ابا جی کے ساتھ شاہی قلعہ اور مینار پاکستان دیکھنے لاہور گئی تھی۔ وہ لوگ شام کے وقت انارکلی بھی گئے

تھے۔ کراکری کی ایک خوبصورت دکان میں اچانک ایک بپھرا ہوا بیل گھس آیا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر اس نے شاندار دکان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ شانی خود کو اس دکان کی طرح محسوس کر رہی تھی۔

ساری رات وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ اگلے روز بھابو مقبول اور بچے واپس آگئے وہ بھابو کے ساتھ اوپر والے کمرے میں چلی گئی۔ موسم گرم ہوتا جا رہا تھا اوپر والا کمرا زیادہ ہوادار اور روشن تھا وہ ایک رات بھابو اور بچوں کے ساتھ رہی۔ اس کی طبیعت تھوڑی سی سنبھل گئی۔ وہ ابھی مزید اوپر والے کمرے میں رہنا چاہتی تھی، بچوں کا اصرار بھی یہی تھا لیکن بھابو کچھ خائف نظر آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فاخر اس بات پر خفا ہوگا۔ اس کا موڈ پہلے ہی اچھا نہیں تھا۔

دوپہر کو شانی کے لمبے ریشمی بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے وہ بولی۔ "شانی! میرا خیال ہے کہ تم کچھ دن کے لئے رنگ والی چلی جاؤ۔"

"لیکن وہ لے کر جائیں تو جاؤں نا۔"

"اگر وہ نہیں جا سکتا تو میں اور چاچا رشید تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ چاچے رشید کو تو جانتی ہو نا تم......حویلی کا پرانا منشی ہے۔"

"لیکن......وہ اجازت دے دیں گے؟"

"میں ابھی پوچھ لیتی ہوں اس سے......میرا خیال ہے کہ وہ فارم سے آگیا ہے۔" بھابو اس کے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد بھابو نیچے چلی گئی۔ منا شانی کی گود میں اونگھ رہا تھا وہ اسے تھپکتی رہی اور سوچتی رہی، شاید اس کا چند دن کے لئے یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا...... بلکہ یہ بہت ضروری تھا۔ شانی کو اپنے دل میں امڈتی ہوئی کراہت اور گھٹن سے ڈر آرہا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ ہو رہا تھا۔ خاص طور سے اس دوسری چپ کے بعد تو وہ اپنے آپ کو بالکل خالی اور بنجر محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ ایسی ہو گئی تھی جیسا ایک بیوی کو بالکل نہیں ہونا چاہئے...... اور وہ اس بات پر شرمندہ بھی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سب کچھ بھول بھال کر بڑی نیک نیتی سے اپنا گھر بسانے آئی تھی لیکن یہ گھر تھا کہ اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

بھابو کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی اس کی صورت دیکھ کر ہی شانی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ناکام لوٹی ہے۔

بھابو نے بے دلی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ میں اسے خود ہی چھوڑ کر آؤں گا لیکن ابھی فرصت نہیں ہے۔"

''فرصت کب ہوگی؟''

''کہتا ہے کہ گندم کی کٹائی سر پر ہے۔ پانچ چھ دن تو بہت مصروف ہوں۔ اس کے بعد کوئی وقت نکالتا ہوں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ ٹال رہے ہیں۔''

''نہیں شانی، اس وقت واقعی کام سر پر چڑھا ہوا ہے اس نے جانا ضرور ہے شاید تمہارے ابا جی اور چاچا جی سے کوئی کاروباری بات بھی کرنی ہے۔'' بھابو دیر تک شانی کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ اسے گھریلو زندگی کے حوالے سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی مثالیں دے دے کر بتا رہی تھی کہ اس نے شادی کے بعد شروع کے دنوں میں اپنے مسئلے مسائل پر کس طرح قابو پایا۔

باتوں باتوں میں شانی کا دھیان پرسوں رات والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ شام کے بعد وہ فاخر کی پسندیدہ ساڑھی پہن کر چھت پر فاخر کے ہمراہ چہل قدمی کر رہی تھی تو اس کا دھیان نیچے مہر جی کی پھلواری کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا کہ مہر جی کا ملازم خاص اکبراز مین میں کوئی گوشت قسم کی شے دبا رہا ہے۔ مہر جی بھی وہیل چیئر پر پاس ہی موجود تھے۔

شانی نے اس بارے میں بھابو سے پوچھا تو وہ ایک گہری اور بوجھل سانس لے کر رہ گئی، ذرا توقف سے بولی۔ ''بندہ جب اتنی عمر کا ہو جائے تو اس کی عقل مت کا بس اللہ ہی حافظ ہوتا ہے، مہر کی عمر بھی سو سال سے زیادہ ہے۔ اس کی کئی باتیں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں اور تو اور اس کے بیٹے بھی سر پکڑ کر رہ جاتے ہوں گے۔ پچھلے بیس تیس سال سے یہ سنیاس کے چکر میں پڑا ہوا ہے، کبھی سپیرے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، کبھی جڑی بوٹیوں والے چلے آتے ہیں ... تمہیں یہ سن کر بڑی حیرانگی ہوگی کہ یہ پھلواری میں سانپ اگاتا ہے۔''

''سانپ اُگاتا ہے؟'' شانی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

''ہاں ... کہیں کسی کو بتانا نہیں جو کچھ میں تمہیں بتا رہی ہوں، میرا مطلب ہے کہ میرا نام نہیں لینا۔ کچھ دن بعد تمہیں خود ہی پتا چل جانا ہے پھر جس سے مرضی کہہ دینا۔''

''ٹھیک ہے بھابو! نہیں کہوں گی.... لیکن سانپ اگانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''سانپ دراصل ایک چھوٹے سے بوٹے کا نام ہے۔ اس کے پتے پھنیئر سانپ کے پھن جیسے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لال پھول بھی لگتے ہیں اس میں، تُو پھلواری کے پاس سے گزرے گی تو تجھے یہ لال پھولوں والا بوٹا نظر آئے گا اسے پنجابی میں ''سپ گندل'' بھی کہا

جاتا ہے۔ یہ پودا بہت ہی کم ملتا ہے، کہتے ہیں کہ اسے پالنا ہو تو اس کی جڑوں میں کھاد کی جگہ مُردہ سانپ ڈالنا پڑتا ہے اور پانی کے ساتھ ساتھ اسے خون بھی دینا پڑتا ہے۔''

''اس پودے سے کیا ہوتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اصل بات تو اوپر والا ہی جانتا ہے کہتے ہیں اگر کسی کو اصل 'سپ گندل' مل جائے اور وہ اسے استعمال کرتا رہے تو اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔''

''تو مہر جی اس پودے کو استعمال کرتے ہیں؟''

''سنا ہے کہ اس پودے کے چند خاص خاص پتے ہی استعمال کرنے والے ہوتے ہیں، مہر ان پتوں کو جمع کرتا ہے پھر ان سے کوئی معجون وغیرہ بنواتا ہے یہ اتنی کڑوی ہوتی ہے کہ ڈنگر کو کھلا دو تو وہ زمین پر لیٹنے لگے لیکن مہر بالکل وکھری ٹائپ کا شخص ہے جو بندہ سانپ کا لہو اور سانپ کے پتے کا پانی پی جائے اور سانپ کا گوشت کھا جائے وہ کیا نہیں کر سکتا۔''

''تمہارا مطلب ہے.....'' شانی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں شانی! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے سانپ کے لہو میں سانپ کے پتے کا پانی ملا کر پیتے ہوئے۔''

شانی کا دل خراب ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی ابکائی بمشکل روکی......وہ دونوں کمرے میں بیٹھی تھیں، اچانک شانی کی نظر کھڑکی سے گزر کر نیچے حویلی کے مین گیٹ کی طرف چلی گئی۔ وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے نیلے ڈوریئے والی ایک سفید پگڑی نظر آئی۔ ایسی پگڑی ''رنگ والی'' کے جامع مسجد کے امام حاجی معصوم ہی پہنتے تھے، حاجی معصوم شانی کے دور کے رشتے دار بھی تھے۔ وہ انہیں تایا کہہ کر بلاتی تھی۔ اسے لگا کہ یہ تایا ہی ہیں چند لمحے بعد اس کی پوری تصدیق بھی ہو گئی۔ جب وہ تانگے میں بیٹھنے کے بعد مڑے تو ان کا چہرہ شانی کے سامنے آ گیا۔ وہ تایا معصوم ہی تھے اور جا بھی رہے تھے، اس سے ملے بغیر۔ شانی کے جی میں آئی کہ وہ کھڑکی سے ہی انہیں پکارنا شروع کر دے لیکن فاصلہ زیادہ تھا کچھ ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''کون تھا یہ؟'' بھابو نے پوچھا۔

شانی نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ بھابو بھی حیران ہوئی کہ فاخر نے اس بارے میں شانی کو کیوں نہیں بتایا۔

شانی دیر تک سوچتی رہی کہ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تایا معصوم اس سے ملے بغیر چلے گئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ فاخر نے انہیں اس سے ملنے ہی نہ دیا ہو کچھ بعید از قیاس نہیں تھا..

کیوں آئے تھے؟ کوئی پیغام لائے تھے یا کوئی اور بات تھی؟ وہ خیالوں کے گورکھ دھندے میں کھوئی رہی اور پھر نیچے چلی گئی۔ سپ گندل والی بات وہیں کی وہیں رہ گئی تھی۔ فاخر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دو رجسٹر کھول رکھے تھے اور حساب کتاب میں گم نظر آتا تھا۔ منشی رشید اس کام میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد منشی رشید اٹھ کر چلا گیا۔ شانی فاخر کے اردگرد گھومتی رہی۔ پہلے اسے چائے دی پھر اس کی ہدایت پر سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر وغیرہ بیڈروم سے لے کر آئی پھر کمرے میں ادھر اُدھر سامان ترتیب سے رکھتی رہی...... وہ چاہتی تھی کہ فاخر اس سے خود ہی تایا معصوم کے بارے میں بات کرے لیکن وہ تو جیسے اس بات کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں لیکن تایا کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس سے تایا والی بات چھپانا چاہتا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کے اندر کچھ اور بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ دکھ اور غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی لیکن وہ برداشت کرگئی۔ رات گئے جب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے، شانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں شوہر سے پوچھا۔ ''آج کوئی رنگ والی سے آیا تھا آپ کے پاس؟''

فاخر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ذرا خشک لہجے میں بولا۔ ''کس کی بات کر رہی ہو؟''

''تایا معصوم کی۔ م...... میں نے انہیں حویلی کے پھاٹک سے نکلتے دیکھا تھا۔''

''اگر معلوم ہی ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟'' فاخر ایک دم بھڑک گیا۔

''وہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے، مجھے ان سے ملانا تو دور کی بات ہے آپ نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تک نہیں۔''

''کوئی خاص بات نہیں تھی کہ میں تمہیں اس سے ملاتا، میں نے کہہ دیا کہ وہ بیمار ہے آرام کر رہی ہے۔''

شانی چند لمحے شوہر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر دبے لہجے میں بولی۔ ''کیا وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ میں رنگ والی کب آ رہی ہوں؟''

''ہاں ہاں یہی پوچھنے آیا تھا۔'' فاخر بلند آواز میں بولا۔ ''اور میں نے کہہ دیا ہے ان سے کہ مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں وہ لوگ...... مجھے جب آنا ہوگا خود لے کر آجاؤں گا۔ میرا دماغ چاٹنے اور مغز کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''لل لیکن۔''

''اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔'' فاخر دھاڑتا چلا گیا۔ ''میں بھی تمہیں کہیں نہیں بھیج رہا۔ میں اپنے ٹینٹے میں پھنسا ہوا ہوں، اس سے نکلوں گا تو تمہاری سواری چھوڑ کر آؤں گا تمہارے اباجی کے پاس۔ ابھی جانے کی بات کھوپڑی سے نکال دو۔''

شانی سُن کھڑی تھی۔ شاید اس وقت اسے کاٹا جاتا تو جسم سے لہو کا قطرہ بھی نہ نکلتا۔

فاخر گرج کر بولا۔ ''جاؤ اب کام کرو اپنا۔''

شانی خود کو سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

صبح اُسے پتہ چلا کہ فاخر منہ اندھیرے اپنے دو دوستوں اور ایک وکیل کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ لاہور سے انہیں اسلام آباد جانا تھا۔ اس کا اٹیچی کیس پہلے سے تیار پڑا تھا وہ ساتھ لے گیا تھا۔ شانی نے اس بارے میں منشی رشید سے پوچھا۔ حویلی کے اکثر لوگوں کی طرح منشی رشید بھی چند ہی دنوں میں شانی کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ اسے بیٹی بھی کہتا تھا اور اس کا ادب بھی کرتا تھا۔ منشی کی بیوی بھی حویلی ہی میں ملازم تھی وہ بھی آتے جاتے شانی کی بلائیں لیتی تھی اور دودھوں نہانے پوتوں پھلنے کی دعا دیتی تھی۔ حالانکہ شانی ان لوگوں کو کچھ دیتی نہیں تھی بس میٹھا بول بولتی تھی اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کی یہ ادا حویلی کے ہر ملازم کے دل میں اُتر گئی تھی۔ شانی کی بات کے جواب میں منشی رشید نے کہا۔ ''بیٹی جی! مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں ہے پر میرا خیال ہے کہ یہ وہی فیکٹری کے ملازموں والا معاملہ ہے، شاید چوہدری صاحب اسی معاملے کو سیدھا کرنے گئے ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے منشی چاچا، وہ کب تک آجائیں گے؟''

''بیٹی جی! میرا اندازہ ہے کہ انہیں کچھ دن لگیں گے مجھے کچھ پیسے دے گئے ہیں کہ میں پہلی تاریخ کو ضروری تنخواہیں دے دوں۔''

شانی کا دل کچھ اور بھی بجھ گیا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ ابھی وہ آٹھ دس دن مزید رنگ والی نہیں جاسکے گی۔ اسے یقین تھا کہ رنگ والی سے تایا معصوم کو اباجی نے ہی بھیجا ہوگا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ شانی کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ تایا معصوم یہاں سے کیسا جواب لے کر گئے ہیں اور اس جواب کا اثر شانی کے گھر والوں پر کیا ہوا تھا۔ وہ جتنا سوچتی تھی اتنی ہی افسردہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔

یہ تیسری رات کا واقعہ ہے۔ فاخر کے جانے کے بعد شانی بھابو کے کمرے میں سوتی تھی۔ ندیم اور منا بہت خوش تھے، رات گئے تک شانی سے لپٹ کر کہانی سنتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دل میں دعا کرتے ہوں کہ چاچا فاخر دس بارہ دن کے بجائے دس بارہ ہفتوں بعد واپس

آ ئیں۔ درحقیقت فاخر اس گھر کا مطلق العنان تھا۔ بڑا بھائی بشیر کویت میں تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے، دادا اپنے مزاج کا ایک علیحدہ ہی شخص تھا، کوئی شخص فاخر سے پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں تھا اور وہ ہر کسی سے پوچھ تاچھ کر سکتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ملازمین سے لے کر اہلِ خانہ تک سبھی سہمے رہتے تھے۔

اس رات بھی ندیم اور مُنا دیر تک شانی کے ساتھ جاگتے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ بھابو پہلے ہی سو چکی تھی۔ برآمدے سے سیڑھیوں کی طرف کھلنے والا دروازہ رات کو شانی ہی مقفل کرتی تھی۔ اسے وہم سا ہو رہا تھا کہ پتا نہیں اس نے دروازہ مقفل کیا ہے یا نہیں۔ اسی وہم کے سبب وہ اٹھی اور ننگے پاؤں زینے اُترتی ہوئی برآمدے کے دروازے تک پہنچی اس کی یہ تھوڑی سی احتیاط کارآمد ثابت ہوئی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شانی نے کنڈی لگا کر قفل چڑھایا اور چابی لے کر سیڑھیوں کی طرف مڑی۔ اچانک اسے لگا کہ سیڑھیوں کے نیچے موجود کمرے میں آہٹ سی ہوئی ہے۔ وہ بُری طرح چونک گئی نازک بدن ہونے کے باوجود اس میں فطری دلیری اور جرأت موجود تھی۔ وہ ذرا سا آگے بڑھی، اس کی چھٹی حس پکار کر آگاہ کرنے لگی کہ تاریک کمرے میں کوئی ہے۔

شانی کا ہاتھ سیڑھیوں کے پاس لگے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوئچ آن کیا تو باہر کی روشنی کمرے کے اندر تک گئی اچانک ایک منظر نے شانی کو سرتا پا لرزا دیا۔ ایک شخص شدید زخمی حالت میں کمرے کے ایک گوشے میں گٹھڑی کی طرح سمٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں جسم بھی لہولہان تھا۔ شانی نے پہلے تو شور مچانے اور سیڑھیوں کی طرف بھاگنے کا ارادہ کیا۔ غالباً اس ارادے سے اس نے منہ بھی کھولا تھا اور پیچھے کی طرف ایک قدم بھی اٹھایا تھا مگر پھر اجنبی کے چہرے پر اسے نہ جانے کیا چیز نظر آئی کہ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ وہ شخص شدید زخمی تھا اور بے چارگی کی مکمل تصویر نظر آتا تھا۔ شانی نے سب سے پہلے تو یہ دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں یا اس کے آس پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے پھر اس نے ایک لرزتا ہوا قدم کمرے کی دہلیز کی طرف بڑھایا۔

یوں لگتا تھا کہ زخمی بس بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا اور آنکھیں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ ایک التجا کے ساتھ شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانی چند لمحے سوچتی رہی پھر اجنبی کی طرف بڑھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا اور ایک طرف کو کھسکتا چلا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے جان شے کی طرح پختہ فرش پر گرنے والا ہے۔ ایسے میں اس کے سر کے ساتھ پختہ فرش کا تصادم بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک

اضطراری حرکت کے تحت شانی بے ساختہ آگے بڑھی۔ اسے تب پتا چلا جب زخمی کا سر اس کی گود میں تھا واقعی اگر وہ بروقت آگے نہ بڑھتی تو اس کا سر بُرے طریقے سے فرش کے ساتھ ٹکراتا۔

وہ ایک یا دو سیکنڈ تک اضطراری کیفیت میں اس کا خون آلود چہرہ دیکھتی رہی پھر جلدی سے اس کا سر اپنی گود سے نکال کر فرش پر رکھ دیا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ شخص ہوگا۔ اس کا جسم مضبوط اور بال لمبے تھے وہ سیاہ تہبند اور اسی رنگ کے کُرتے میں تھا۔ یہ لباس بوسیدہ اور خون آلودہ تھا۔ اجنبی کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا تاہم اس کے خشک، پھٹے ہوئے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بے ہوشی گہری نہیں ہے۔ شانی نے پریشانی کے عالم میں بھابو کو آواز دی لیکن محسوس ہوا کہ آواز بھابو تک پہنچی نہیں بس سیڑھیوں میں ہی گونج کر رہ گئی ہے۔ ویسے بھی بھابو کی نیند بڑی پکی تھی۔ شانی کی سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا وہ قریب رکھے ہوئے واٹر کولر کی طرف بڑھی اور تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈال لیا، اپنے لرزتے ہاتھوں سے یہ پانی اس نے تھوڑا تھوڑا اجنبی کے خشک ہونٹوں پر ٹپکایا، پھر اپنی اوڑھنی کے پلو سے اسے ہوا دینے لگی۔ اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ ہولے ہولے کراہنے لگا۔

پہلے تو شانی کے جی میں آئی کہ تالا کھول کر ملازموں کو آوازیں دے لیکن پھر پتا نہیں کیوں اس نے ارادہ بدل لیا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص کیوں اور کس خوف کے سبب یہاں آ کر چھپا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے اس بُری طرح زخمی کر کے یہاں پناہ لینے پر مجبور کرنے والے حویلی کے لوگ ہی ہوں۔ پتا نہیں کیوں اسے اجنبی بے حد قابلِ رحم نظر آ رہا تھا۔

اس نے غور سے اس کا سراپا دیکھا۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ کر لٹک رہا تھا۔ جسم پر تیز دھار آلے کے درجنوں زخم تھے اور ایک دو زخم تو اتنے گہرے تھے کہ ہڈی تک نظر آ رہی تھی، خون بہہ رہا تھا، اسے فوری مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ پنڈلیوں کے قریب دو تین زخم ایسے بھی تھے جو تیز دھار آلے کے نہیں تھے، انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی جانور کے کاٹنے سے آئے ہیں۔ شاید کتے کے کاٹنے سے۔ شانی کو کچھ اور تو نہیں سوجھا، اس نے الماری سے ایک پرانی چادر نکال کر اسے پٹیوں کی صورت میں پھاڑا، باورچی خانے کے چولہوں میں راکھ موجود تھی۔ وہ ایک تھالی میں بہت سی راکھ ڈال کر لے آئی۔ اجنبی کے وہ زخم جن پر سے کپڑا ہٹانے میں کوئی حرج نہیں تھا اس نے ننگے کیے اور ان پر راکھ ڈالتی گئی اور پٹیاں باندھتی گئی۔

ایسا کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا یہ کوئی بھلا آدمی ہے اور اسے مدد کی شدید ترین ضرورت ہے۔ وہ کس گاؤں، کس قبیلے کا تھا؟ اس حویلی سے اور یہاں رہنے والوں سے اس کا کیا تعلق تھا؟ یہ باتیں بعد میں بھی سوچی جاسکتی تھیں۔ جب وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق زخمی کی مرہم پٹی کر رہی تھی، اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ شانی کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔

زخمی کا خون کسی حد تک بند ہوگیا تو شانی کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ کم از کم بھابو کو اس بارے میں ضرور بتا دے۔ وہ اس ارادے سے اٹھی تو اس کی نگاہ زخمی کے زرد چہرے پر پڑی شاید وہ اپنا سر نفی میں ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اسے باہر جانے اور اس کے بارے میں دوسروں کو بتانے سے روک رہا ہو لیکن شانی اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی تھی اسے کم از کم بھابو کو تو آگاہ کرنا ہی تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی اوپر بھابو کے پاس پہنچی اور اسے جگایا پہلے تو بھابو اس کے خون آلود کپڑے دیکھ کر بُری طرح گھبرا گئی۔ پھر شانی نے اسے تسلی دی اور اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ساری بات شروع سے آخر تک بھابو کو بتائی۔

بھابو نے شال اوڑھی اور شانی کے ساتھ نیچے سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں پہنچی۔ دونوں گھبرائی ہوئی تھیں لیکن بھابو کی گھبراہٹ نسبتاً زیادہ تھی، زخمی اسی طرح فرش پر لیٹا ہوا تھا، خون کے زیادہ اخراج کے سبب وہ شدید ترین نقاہت کے اثر میں تھا۔ رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ بھابو نے اس کا سراپا دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ زخمی کے ہاتھ کے کڑے پر پڑی، وہ چونک سی گئی۔

چند لمحے بعد بھابو شانی کو کمرے سے باہر لے آئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ''شانی، مجھے پکا یقین ہے یہ بندہ سیالوں کا ہے۔ نارپور کے چوہدری اور آس پاس کے زمیندار سیالوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ تم نے ٹھیک ہی کیا ہے کہ ابھی کسی کو بتایا نہیں یہ بے چارا تو پہلے ہی آدھا مرا ہوا ہے۔''

''اب کیا کیا جائے اس کا؟'' شانی نے پوچھا۔

''خون تو اس کا بند ہوگیا ہے ہوسکتا ہے کہ صبح تک اس کی حالت سنبھل جائے۔'' بھابو نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ہمیں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے، دو ہی طریقے ہیں یا تو اس کے بارے میں مہر اور منشی رشید وغیرہ کو بتا دیا جائے یا اسے جلد سے جلد یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''ابھی اس کی حالت تو ایسی نہیں لگتی کہ یہاں سے نکل سکے۔'' شانی فکرمندی سے بولی۔

''پر بھلیے لوکے ہم اپنے لئے کوئی مصیبت بھی تو کھڑی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ بندہ کسی غلط نیت سے حویلی میں گھسا ہے یا اس کی ہمارے بندوں کے ساتھ کوئی دشمنی ہے تو پھر اس کی مدد کر کے ہم اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے۔''

شانی نے کہا۔ ''میرے دماغ میں ایک اور بات آرہی ہے، شام کے بعد جب آپ مہر جی کی مٹھی چاپی کرنے گئی تھیں، بیلے کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آئی تھیں۔''

''ہاں وہ آوازیں تو میں نے بھی سنی تھیں۔'' بھابو نے کہا۔

''میں نے بعد میں منشی چاچا سے پوچھا تھا، اس نے بتایا کہ بیلے میں کچھ لوگوں کے درمیان لڑائی ہوئی ہے کوئی زمین وغیرہ کا معاملہ ہے۔ لڑائی میں زخمی ہونے والے ایک بندے کو مرہم پٹی کے لئے یہاں نارپور میں بھی لایا گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ بھی بیلے کی لڑائی میں زخمی ہوا ہے۔''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔'' شانی نے کہا۔

لگتا تھا شانی کی بات بھابو کے دل کو لگی ہے۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر لمبی سانس لے کر کہنے لگی۔ ''تو ایسا کر کہ دروازے کو باہر سے تالا لگا دے صبح سویرے ہم دونوں اس سے بات کریں گے۔ اگر تو یہ باہر کا بندہ ہے اور کسی باہر کی لڑائی میں ہی زخمی ہوا ہے تو پھر اس کی مرہم پٹی میں کوئی حرج نہیں اور اسے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دی جاسکتی ہے لیکن اگر اس کا چکر ہماری حویلی یا یہاں کے کسی بندے سے ہوا تو پھر ہمیں مہر اور منشی کو بتانا ہی پڑے گا۔''

رات کا بیشتر حصہ شانی نے جاگتے ہی گزارا۔ اجنبی کی بے چارگی اور اس کی دگرگوں حالت بار بار اس کے ذہن میں آرہی تھی۔ وہ اس کے قریب پانی تک رکھ کر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حالت میں تھا، کہیں بے ہوشی کی حالت میں ختم ہی نہ ہوگیا ہو۔ وہ خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سوچ رہی تھی۔ صبح ابھی دور تھی۔ بھابو گہری نیند سو رہی تھی، اچانک شانی کو لگا کہ سیڑھیوں کے نیچے بند کمرے میں زخمی دردناک انداز میں کراہ رہا ہے وہ آواز صاف طور پر نہیں سن رہی تھی لیکن محسوس یہی ہوتا تھا کہ رات کے سناٹے میں دھیرے دھیرے کراہنے کی آواز در و دیوار میں سرسرا رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ وہم تھا یا حقیقت اس کا دل لرزنے لگا۔ اس کی فطری ہمدردی اور خداترسی اسے جھنجھوڑنے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھی، تکیے کے نیچے سے چابی نکالی اور زینوں پر ننگے پاؤں ہولے ہولے چلتی نیچے آگئی۔ اس نے دل کڑا کر کے قفل

میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اجنبی واقعی کراہ رہا تھا مگر اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل کمرے سے باہر نکلتی ہوگی۔ اس کا مطلب تھا کہ شانی نے جو کراہیں سنیں وہ خیالی تھیں۔ وہ اسی طرح فرش پر لیٹا تھا۔ اس کی ران کے زخم سے رِسنے والا خون اس کے سیاہ تہبند کو گیلا کر رہا تھا۔ باقی زخموں سے رِسنے والا خون تقریباً بند ہو چکا تھا۔ اجنبی درمیانی شکل و صورت کا تھا، اس کا چہرہ فربہ نہیں تھا رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کی جفاکشی کو ظاہر کرتی تھیں۔ مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹ سوکھ کر اکڑ رہے تھے۔ ''پ... پانی......'' اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی سی آواز نکلی۔

شانی نے کولر میں سے پانی نکالا اور اس کے سرہانے آ بیٹھی۔ بائیں ہاتھ سے اس کا سر اونچا کر کے وہ دائیں ہاتھ سے تھوڑا تھوڑا پانی اس کے ہونٹوں میں ٹپکانے لگی۔ تب اس نے الماری سے صوفے کے دو کشن نکالے اور انہیں تکیے کی جگہ زخمی کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ زخمی کو توانائی کی شدید ضرورت ہے۔ وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں گئی وہاں اس نے ایک منقش گلاس میں تھوڑا سا دودھ نکالا، دودھ میں دیسی گھی ملایا اور دوبارہ زخمی کے پاس آ گئی۔ اس نے کوشش کر کے تقریباً ایک تہائی گلاس اسے پلا دیا۔ ان ساری کارروائیوں کے دوران ایک دو بار اس کی نگاہ زخمی کے چہرے کی طرف بھی گئی۔ ہر بار اس نے دیکھا کہ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ زخمی کی نگاہوں میں کوئی عجیب سی بات تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں ہوش سنبھالنے سے اب تک شانی نے بہت سے مردوں کی نگاہیں دیکھی تھیں۔ ان میں اجنبی بھی تھے اور اپنے عزیز بھی، خونی رشتے دار بھی تھے اور پرائے بھی لیکن جو کیفیت وہ اس نگاہ میں دیکھ رہی تھی اس کا تجربہ اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک سرد لہر سی اس کے اندر گہرائی تک دوڑ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نگاہ میں سے ایک دودھیا روشنی پھوٹ رہی ہے اور کسی بے نام خوشبو کے ساتھ مل کر یہ روشنی اس کے گرد ایک ہالہ سا بنا رہی ہے۔

اسے اجنبی کی نگاہوں سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان تو اپنی شدید جسمانی تکلیف کی طرف ہونا چاہئے تھا اور وہ واقعی تکلیف میں تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ صرف اور صرف یہ تکلیف ہی تھی جس کے سبب شانی نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھا تھا اور اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ جو چند پٹیاں زیادہ بھیگ گئی تھیں، وہ اس نے زخمی کے جسم سے علیحدہ کیں اور زخموں پر تازہ راکھ رکھ کر نئی پٹیاں باندھ دیں۔ کمزوری کے سبب زخمی پر بار بار غنودگی طاری ہو جاتی تھی پھر تکلیف ہی کے سبب غنودگی ٹوٹ بھی جاتی

تھی۔ جب غنودگی نہیں ہوتی تھی وہ کراہنے لگتا تھا۔ اس کا منہ اندر سے بھی گھائل تھا۔ شاید اسی لئے اسے بولنے میں زیادہ دشواری ہو رہی تھی۔

اس نے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کہے جن میں سے بس ایک لفظ ہی اس کی سمجھ میں آیا۔ ''مہربانی۔''

زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں شانی نے دھیان سے زخمی کا لباس دیکھا، اس کے کپڑوں پر کیچڑ کے علاوہ سرکنڈوں کا بہت سا بور بھی چمٹا ہوا تھا اور سرکنڈے یہاں صرف بیلے میں ہی تھے۔ کم از کم شانی نے تو بیلے میں ہی دیکھے تھے یہ قیافہ درست محسوس ہوتا تھا کہ یہ اجنبی شخص بیلے کی لڑائی میں ہی زخمی ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کیا کیا جائے ابھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے یہاں سے نکل جانے کو کہا جاتا۔ حویلی کے کسی دوسرے فرد کو اس بارے میں اطلاع دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ جیسا کہ بھابو نے بتایا تھا کہ یہ سیالوں کا بندہ ہے اور سیالوں کو علاقے کے چوہدری اچھا نہیں سمجھتے۔

اجنبی کی حالت اب قدرے تسلی بخش تھی، شانی نے سرگوشیوں میں اسے سمجھایا کہ وہ خاموشی سے یہاں پڑا رہے، ورنہ مشکل میں پڑ سکتا ہے اس نے پانی کا گلاس اس کے نزدیک رکھا۔ دروازے کو باہر سے مقفل کیا اور اوپر بھابو کے پاس چلی گئی۔

دن چڑھنے کے بعد شانی اور بھابو مقبول سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے غیر دانستہ طور پر ایک ذمے داری اٹھالی تھی۔ اب چاہتی تھیں کہ جلد از جلد اس سے عہدہ برآ ہو جائیں، وہ کسی مزید چکر میں الجھنا نہیں چاہتی تھیں اور مزید چکر سے بچنا اسی صورت میں ممکن تھا کہ اجنبی حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جاتا۔

دن میں اجنبی سے رابطہ کرنا آسان نہیں تھا۔ سیڑھیوں اور برآمدے میں ملازموں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ صرف دوپہر کے وقت موقع مل سکتا تھا۔ اس وقت ذرا سکون ہوتا تھا، اس روز بھابو کے میکے سے چند مہمان بھی آ گئے۔ ان مہمانوں کے سبب سیڑھیوں کے نیچے والے کمرے کی طرف جانا اور بھی مشکل ہو گیا۔

دوپہر دو بجے کے قریب شانی نے مشکل سے چند منٹ نکالے، قفل کھول کر اندر گئی وہ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس نے کمرے کے اندر سے ہی تین چار چھوٹی لکڑیاں ڈھونڈی تھیں اور انہیں اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ جوڑ کر اوپر پٹی باندھ لی تھی۔ اس کا رنگ اب بھی لیموں کی طرح زرد تھا اور اسے ہلنے جلنے میں دشواری ہوتی تھی۔

شانی نے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا پیتل کا گلاس اس کے قریب رکھا اور بولی۔ ''تھوڑا،

تھوڑا کر کے پی لو۔"

"بہت مہربانی۔" اس نے اپنے زخمی منہ کو بمشکل ہلایا، آنکھوں میں وہی عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ رقت، احسان مندی اور عقیدت سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی۔ شانی اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچا ہے لیکن اسی دوران میں مین گیٹ کی طرف گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ یہ فاخر کی گاڑی تھی، کیا وہ واپس آ گیا تھا؟ اتنی جلدی واپس آ گیا تھا؟ خون شانی کی رگوں میں سنسنا اٹھا اس نے افراتفری میں کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر بھابو کے پاس آ گئی۔ بھابو بھی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے بھی حویلی سے باہر فاخر کی گاڑی کی آواز سن لی تھی۔ وہ اوپر کی ایک بالکونی سے نیچے احاطے میں دیکھنے لگیں۔ تاہم وہ اس طرح کھڑی تھیں کہ انہیں نیچے سے نہ دیکھا جا سکے۔ اگر واقعی فاخر آ گیا تھا تو پھر بڑی مصیبت پڑ سکتی تھی۔ حویلی میں ایک غیر شخص موجود تھا اور شانی اور بھابو کے سوا اس کے متعلق کسی کو معلوم نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد بھابو کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ یقیناً شانی کی پریشانی بھی ایک دم ناپید ہو گئی تھی۔ یہ گاڑی فاخر کو لے کر نہیں آئی تھی۔ جیسا کہ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا، فاخر اسلام آباد چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے دوست کے پاس تین چار گاڑیاں موجود تھیں لہٰذا فاخر نے اس گاڑی کو فالتو سمجھتے ہوئے واپس بھیج دیا تھا۔

فاخر کا رعب آمیز خوف صرف بھابو یا شانی تک ہی محدود نہیں تھا، حویلی میں موجود غالباً مہر جی کے سوا ہر ذی حس اس خوف میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر کسی کے اعصاب تنے رہتے تھے۔ لہجے محتاط اور حرکات و سکنات نپی تلی ہوتی تھیں۔ اس کی غیر موجودگی میں ہر شے اپنی اصل حالت میں آ جاتی تھی۔ در و بام میں زندگی کی لہر دوڑتی تھی اور ماحول کی کشیدگی ایک رواں دواں بے تکلفی میں ڈھل جاتی تھی۔

اب بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ جان کر کہ نیلی لینڈ کروزر پر فاخر کے بجائے اس کا ایک ملازم اور دو گارڈ آئے ہیں، بھابو اور شانی کی اندرونی کشیدگی بھی ایک خوشگوار اطمینان میں ڈھل گئی۔ شانی نے بھابو کو بتایا کہ زخمی اب پہلے سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس کا منہ اندر سے بُری طرح زخمی ہے لیکن وہ کوشش کر کے ایک دو لفظ ادا کر لیتا ہے۔ وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھی رہیں اور کوئی ایسا طریقہ سوچتی رہیں جو زخمی کو حویلی سے نکالنے کے لئے محفوظ ترین ہو۔

بھابو نے کہا۔ "کم از کم آج کی رات تو ہمیں ایسا موقع نہیں مل سکتا۔"

"وہ کیوں؟" شانی نے پوچھا۔

"کل ہفتہ ہے۔ ہفتے کی شام چار پانچ کارندے چھٹی پر چلے جاتے ہیں۔ پھاٹک پر تین پہرے داروں کے بجائے ایک یا دو پہرے دار ہوتے ہیں۔ حویلی کے پچھواڑے بھی پہرا نرم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پچھواڑے والے پہرے دار دارو شارو بھی پی لیتے ہیں۔ میرے خیال میں تو کل کسی وقت اسے یہاں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔"

"ہاں۔ آج تو ویسے بھی وہ چلنے پھرنے جوگا نہیں ہے۔" شانی نے کہا۔

بھابو کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں، کہنے لگی۔ "اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ میں پھاٹک والے بندے کو کسی کام کے بہانے اندر بلا لوں۔ برآمدے کے آخری سرے پر بجلی کا مین سوئچ ہے۔ جب پھاٹک والا بندہ اندر آئے گا تو میں مین سوئچ اوپر کر دوں گی۔ دو چار منٹ کے لئے بھی اندھیرا ہو جائے تو وہ شخص یہاں سے نکل سکتا ہے۔"

بھابو اور شانی پروگرام بناتی رہیں لیکن ان کے سارے پروگرام دھرے رہ گئے۔ رات دس بجے کے بعد جب بھابو اور شانی سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچیں اور انہوں نے زخمی کو دیکھنا چاہا تو انہیں شدید دھچکا لگا۔ وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ دروازے کا قفل ہاضمی تھا۔ اسے اندر سے تار وغیرہ ڈال کر بڑی ہوشیاری سے کھول لیا گیا تھا۔ زخمی نے کمرے کے اندر سے ہی ایک شلوار قمیص اور چادر لی تھی، اس کے خون آلود کٹے پھٹے کپڑے وہیں ایک کونے میں ڈھیر تھے۔

خالی کمرا دیکھ کر بھابو اور شانی کو دھچکا سا تو لگا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک طرح کا اطمینان بھی ہوا، انہیں ایک بھاری اور خطرناک ذمے داری سے نجات مل گئی تھی۔ جسے یہاں سے بحفاظت نکالنے کے لئے وہ دن بھر پریشان رہی تھیں۔ وہ یہ کام خود ہی کر گزرا تھا۔ انہیں اس شخص کی ہمت اور قوت برداشت پر بھی حیرت ہوئی۔ وہ سخت زخمی تھا اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ خطرے کی زد میں آ جائے گا پھر بھی وہ یہاں سے نکلا تھا۔

"کیا خیال ہے بھابو۔ وہ بچ کر نکل گیا ہو گا؟" شانی نے پوچھا۔

"اُمید تو ہے اگر وہ پکڑا جاتا تو شور شرابا ہوتا...... پر...... مجھے ایک اور بات کا بھی شک ہو رہا ہے۔" بھابو نے ذرا توقف سے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کہیں حویلی کے اندر سے ہی تو کسی نے اس کی مدد نہیں کی؟"

شانی نے دھیان سے ہاضمی قفل کو دیکھا۔ قفل کے ساتھ جو کچھ بھی کیا گیا تھا، اندر سے

کیا گیا تھا، اس کا سوراخ کھلا ہو گیا تھا اور پیتل پر واضح رگڑیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ یہ نشان بھابو کو دکھا کر بولی۔ ''بھابو! آپ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے۔''

بھابو نے بھی دھیان سے تالے کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلانے لگی۔

اس کے بعد وہ کمرے کو مقفل کر کے باہر احاطے میں آ گئیں۔ وہ کافی دیر تک عام سے انداز میں حویلی کے اندر باہر گھومتی رہیں۔ پھاٹک کی طرف بھی گئیں، انہیں کہیں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی۔

☆======☆======☆

تیسرا دن اتوار کا تھا، اتوار کے روز علی الصبح حویلی کے احاطے میں ایک گاڑی داخل ہوئی۔ کھڑکی میں سے گاڑی کی جھلک دیکھتے ہی شانی کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سنسنی کے ساتھ خوشی کا ایک ریلا بھی تھا۔ یہ اس کے ابا جی کی گاڑی تھی۔ دروازہ کھلا اور شانی کا دراز قد بھائی عادل سلطان باہر نکلا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں شاندار نظر آ رہا تھا۔ شانی نے نظروں ہی نظروں میں بھائی کو سر تا پا چوم لیا۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی اور بھائی سے لپٹ گئی، بھائی نے بھی بار بار اس کا ماتھا چوما پھر وہ دونوں اندر آ گئے۔

شانی کو لگ رہا تھا کہ اس نے برسوں بعد اپنے کسی شناسا کی صورت دیکھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ ایک ایک کا حال پوچھنے لگی۔ ابا جی، پھوپھی، آمنہ، چچی نصرت، نگہت، تایا معصوم۔ پھر اس نے گھر کے ہر ملازم اور ملازمہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد سہیلیوں کی باری آئی۔ سکینہ، صغراں، شمیم اور پتا نہیں کون کون؟

وہ ایک ہی سانس میں پوچھتی جا رہی تھی اور عادل سلطان مختصراً بتاتا جا رہا تھا۔ آخر وہ تھک کر بولا۔ ''بھئی! مجھ سے بیٹھنے کو نہیں کہو گی۔''

''ہاں، ہاں بیٹھو ناں بھائی۔'' وہ چونک کر بولی۔

''فاخر کہاں ہے......؟ آج تو چھٹی ہے ناں؟''

''وہ......وہ لاہور سے باہر ہیں۔''

''اوہو......وہ ہوتا تو بہتر تھا۔''

''کیا مطلب بھائی؟''

''میں تمہیں لے جانے آیا ہوں......'' عادل سلطان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''کیوں......خیریت تو ہے بھائی؟'' وہ ذرا چونک گئی۔

''ہاں خیریت ہی ہے بس......ابا جی ذرا بیمار ہیں۔''

''ہائے میں مر گئی......کیا ہوا ابا جی کو؟'' وہ سر تا پا لرز گئی، رنگ زرد ہو گیا۔

''بس سینے میں ذرا درد ہوا تھا، لاہور ہسپتال لے کر گئے تھے اب واپس آ گئے ہیں۔ کافی بہتر ہیں۔''

شانی سناٹے کی سی کیفیت میں تھی۔ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اتنا کچھ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔''

''کوئی زیادہ پریشانی کی بات نہیں بھئی، اب ٹھیک ہیں تمہیں یاد کر رہے تھے۔ میں نے کہا اچھا میں خود جا کر لے آتا ہوں۔''

''میں ابھی چلوں گی۔'' شانی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

ساتھ والے کمرے میں جا کر وہ جلدی جلدی اپنے چند کپڑے اٹیچی کیس میں رکھنے لگی، اسی دوران میں بھابو اس کے پاس آ گئی۔ اس نے عادل اور شانی کے درمیان ہونے والی بات چیت سنی تھی اور جان گئی تھی کہ شانی کے ابا جی کو دل کی تکلیف ہوئی ہے اور اب شانی فوری طور پر بھائی کے ساتھ رنگ والی جا رہی ہے۔

وہ کچھ دیر تک شانی کو اٹیچی کیس تیار کرتے دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''اگر ابا جی کی طبیعت اب ٹھیک ہے تو تھوڑا سا انتظار کر لو......میرا مطلب ہے......کہیں اس طرح ایک دم چلے جانے سے فاخر ناراض نہ ہو جائے۔''

شانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تیز سرگوشی میں بولی۔ ''بھابو تم کیسی بات کرتی ہو۔ میرا باپ بستر پر پڑا ہے۔ مجھے بلا رہا ہے اور میں یہاں بیٹھ کر فاخر کا انتظار کرتی رہوں؟''

''اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک ہو لیکن......میں یہ بات اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں اس حویلی کو اور یہاں کے رہن سہن کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ فاخر اور مہر جی کی اجازت کے بغیر جاؤ گی تو تمہارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''ہو جائے اگر مشکل ہوتی ہے تو۔'' شانی روتے ہوئے بولی۔

بھابو کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر بولی۔ ''اچھا میں مہر جی کے پاس جاتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ وہ تمہیں جانے کی اجازت دے دیں۔''

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بھابو تیزی سے باہر نکل گئی۔ دیورانی جیٹھانی میں یہ گفتگو بڑے دھیمے لہجے میں ہوئی تھی، ساتھ والے کمرے میں بیٹھے عادل تک آواز نہیں پہنچی تھی پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ دس منٹ کے اندر شانی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس دوران میں بھابو نے عادل کے لئے چائے بسکٹ وغیرہ بھجوا دیئے تھے۔

خود وہ شاید مہر جی کے پاس چلی گئی تھی۔ مہر جو کچھ بولتا تھا وہ کم از کم شانی کی سمجھ میں تو نہیں آتا تھا لیکن وہ لوگ جو اس حویلی میں اس کے ساتھ کافی عرصے سے رہ رہے تھے، اس کی غوں غاں سمجھ لیتے تھے، خاص طور سے اس کا پہلوان نما ملازم اکبرا تو آنکھ کے اشارے تک پہچانتا تھا۔

بھابو کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی، اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مایوس لوٹی ہے۔ تب تک شانی چادر اوڑھ چکی تھی اور ملازم طفیل نے اٹیچی کیس تھام لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بھابو کچھ کہتی اکبرا اندر داخل ہوا۔ اس نے جھک کر عادل کو سلام کیا اور بولا۔ ''چوہدری جی۔ چھوٹی مالکن آپ کے ساتھ جا رہی ہیں؟''

''ہاں، جا رہی ہیں...... کیوں؟ کیا بات ہے؟''

''جناب! آپ ناراض نہ ہوں، مہر جی کہتے ہیں کہ چھوٹی مالکن، چوہدری فاخر صاحب سے اجازت لینے کے بعد جائیں۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔'' عادل گرجا۔ ''رنگ والی میں چوہدری ارشاد بیمار ہیں بیٹی کو پکار رہے ہیں، میں اسے لینے آیا ہوں اور تم کہتے ہو کہ اس کے لئے اجازت نامہ درکار ہے۔''

''جناب! ہم تو ملازم لوگ ہیں، آپ سر پر جوتیاں بھی مار لیں گے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر جو مالک کا آرڈر ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ چوہدری صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ اسلام آباد سے واپس آئیں گے تو خود چھوٹی مالکن کو رنگ والی لے کر جائیں گے۔''

عادل کا رنگ غصے سے انگارہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر بولا۔ ''اچھا تو تم کو چھوٹی مالکن پر نگران بٹھایا گیا ہے تاکہ وہ اس چار دیواری سے باہر قدم نہ نکال سکے۔''

''میری کیا حیثیت ہے جی۔ میں تو بس حکم کا بندہ ہوں۔'' اکبرے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اگر میں چھوٹی مالکن کو لے جاؤں تو تم روکو گے مجھے؟''

''میں جانتا ہوں یہ بے ادبی ہے لیکن مالک کا آرڈر توڑنا بھی مشکل ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، ہم جا رہے ہیں، تم نے جو کرنا ہے کر لو۔'' عادل کی آواز غضب سے لرز رہی تھی۔

بھابو نے دیکھ لیا تھا کہ بات بگڑ رہی ہے۔ وہ تیزی سے آگے آتے ہوئے بولی۔ ''اکبرے! اپنا دماغ ٹھیک کرو یہ کوئی عام مہمان نہیں ہیں، چھوٹی مالکن کے بھرا ہیں۔ ہمارے

لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں، عزت کی جگہ پر نہیں ہیں۔ میری کھال کھینچ کر فرش پر بچھا لیں اُف نہیں کروں گا لیکن......''

اکبرے کی ''لیکن'' پر عادل کا رنگ پھر گہرا سُرخ ہو گیا۔ اس نے روتی ہوئی شانی کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ شانی کا خیال تھا کہ اکبرا راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر اس نے عادل کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ عادل جب اسے دھکیلتا ہوا احاطے کی طرف بڑھا تو اکبرے نے بے لحاظ لہجے میں اپنے کسی ساتھی نورے کو پکارا۔ ''نورے پھاٹک بند کر دے۔''

بھابو نے چیخ کر کہا۔ ''اکبرے! یہ کیا کر رہا ہے تُو۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے، نہ کر ایسے، پیچھے ہٹ جا۔''

مگر یوں لگ رہا تھا کہ زوردار دھکا کھانے کے بعد اکبرے کا میٹر بھی گھوم گیا ہے۔ وہ پھر گرج کر بولا۔ ''نورے! میں کہہ رہا ہوں پھاٹک بند کر دے۔''

دوہرے جسم کا دراز قد نورا جھجکتا ہوا پھاٹک کی طرف بڑھا۔ جب تک وہ پھاٹک کے دونوں حصوں کو حرکت دے کر ایک دوسرے کے قریب لاتا، عادل کا ملازم اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے نورے کو پھاٹک بند کرنے سے روک دیا۔ اس دوران میں عادل نے شانی کو جیپ میں سوار کرا دیا تھا۔ ڈرائیور نے جیپ کو یوٹرن دیا اور پھاٹک کی طرف بڑھا۔ تب تک پھاٹک کے قریب پانچ چھ افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں بھابو، منشی رشید اور اکبرا بھی تھے۔ دراصل عادل کے رائفل بردار ملازم نے نورے کو زوردار تھپڑ جڑ دیا تھا اور اب اکبرا ملازم کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا اور اسی پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھابو ان دونوں کے درمیان آ رہی تھی اور ابھی تک اس کوشش میں تھی کہ معاملہ حد سے زیادہ بگڑنے نہ پائے۔ منشی رشید بھی اسی تگ و دو میں تھا۔ اچانک اکبرا پھنکارتا ہوا عادل کے ملازم سے لپٹ گیا اور اسے بے دریغ پیٹنے لگا۔ اب عادل کے لئے ممکن نہیں تھا کہ تماشائی بنا رہتا۔ اس نے اکبرے کو زوردار تھپڑ رسید کئے اور پھر ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ اکبرا اُٹھتا اور ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر عادل پر جھپٹ پڑتا، عادل نے اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ گولی اکبرے کی ران میں لگی اور وہ وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

عادل طیش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ کڑک کر بولا۔ ''کون روکے گا مجھے... اور کس بیچے

نے بدمعاشی دکھائی ہے؟''

کچھ دیر کے لئے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ عادل گرجا۔ ''بھاگ جاؤ یہاں سے.... بھاگ جاؤ حرامزادو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پستول سے فاخر کے کارندوں کی طرف فائر کئے۔ یہ فائر ڈرانے کے لئے تھے۔ گولیاں ان کے پاؤں کے قریب کچی زمین میں لگیں اور وہ تتر بتر ہوگئے۔ بھابو اور شانی نے آگے بڑھ کر عادل کو بڑی مشکل سے سنبھالا اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو عین ممکن تھا وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے اکبرے کو ایک اور گولی مار دیتا۔

اکبرا زخمی ہونے کے باوجود چیخ چنگھاڑ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا...... شانی جانتی تھی کہ اب کسی بھی وقت مہر جی بھی اپنی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے اور معاملہ مزید بگڑ جائے گا۔ غالباً بھابو اور منشی رشید بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے عادل اور شانی کو دھکیل کر جیپ میں سوار کیا۔ منشی رشید نے خود آگے بڑھ کر پھاٹک کھولا، کچھ ہی دیر بعد عادل کی جیپ نار پور کی حویلی سے نکل کر اس کچے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی جو آگے جا کر پختہ سڑک سے جا ملتا تھا۔

☆======☆======☆

ابا جی کو دیکھ کر شانی کا دل خون ہوگیا۔ وہ چند روز میں ہی برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی تھی، آنکھیں گہرائی میں اُتری ہوئی تھیں۔ شانی نے اپنا سر ان کے چوڑے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ وہ اس کے سر پر مسلسل ہاتھ پھیرتے رہے، تسلی دی۔ ''میری کملی دھی! میں بالکل اچھا بھلا ہوں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے...... جو تھوڑی بہت تکلیف تھی وہ بھی تجھے دیکھنے کے بعد دور ہوگئی ہے۔''

انہوں نے شانی کو بمشکل اپنے سینے سے اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ شانی نے جلدی سے پلکیں جھکا لیں، جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کا باپ اس کی آنکھوں میں وہ ساری تکلیف، توہین اور پشیمانی پڑھ لے گا جو اسے اپنے سسرال میں اٹھانا پڑ رہی تھی۔ اس کے باپ نے اس کے لئے سنہری خواب دیکھے تھے۔ اس کے لئے نیک تمنائیں کی تھیں، نیم شب کی بے شمار دعائیں اس کے نام کی تھیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ اپنی لاڈلی کو ایک اچھا گھر اور اچھا جیون ساتھی دے سکیں۔ اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کا مقدر تھا۔ وہ اپنے علیل باپ کو اپنے مقدر کی جھلک دکھا کر مزید دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

راستے میں بہن بھائی کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ وہ نار پور میں پیش آنے والے

واقعے کا ابا جی سے ہرگز ذکر نہیں کریں گے۔ بہرحال اب دونوں بہن بھائی دیکھ رہے تھے کہ ابا جی کی سوالیہ نظریں بار باران کے چہروں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ یہ جہاندیدہ نظریں اپنے بچوں کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ عادل تو تھوڑی ہی دیر میں باہر چلا گیا تاہم شانی کو وہیں بیٹھنا تھا۔ وہ ابا جی سے باتیں کرنے لگی اور ساتھ ساتھ ان کے پاؤں دبانے لگی۔

''فاخر نہیں آیا تمہارے ساتھ؟'' چوہدری ارشاد نے پوچھا۔

''نہیں ابا جی، وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں، ابھی چار پانچ دن میں آئیں گے۔''

''مہر جی سے پوچھ کر آئی ہو؟''

''نن...... نہیں...... جی ہاں۔'' شانی ہکلائی۔

''تم پریشان لگ رہی ہو شانی، مجھے لگتا ہے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔''

''سب ٹھیک ہے ابا جی، فاخر بہت اچھے ہیں، مہر جی، بھابو اور بچے سب بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ میں بہت خوش ہوں ابا جی۔''

''فاخر نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد خود تمہیں لے کر آئے گا لیکن وہ نہیں آیا...... میں نے تمہارے تایا معصوم کو بھیجا تھا وہ بھی آنکھوں میں آنسو لے کر واپس آیا تھا۔ کہتا تھا شانی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... اور فاخر بھی فارغ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے جب فارغ ہوگا تو خود شانی کو لے کر آئے گا۔''

''ہاں ایک دو دن کے لئے ذرا بخار ہوگیا تھا ابا جی......'' شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مسکرانے کی کوشش کی مگر اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں اور اس نے مسکرانے کی کوشش جاری رکھی تو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر ابا جی کے ہاتھ کی پشت پر گرنے لگیں گے۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اسی دوران میں اسے اپنی سہیلی سکینہ کی صورت نظر آئی۔ موقع غنیمت جان کر وہ اٹھی اور سکینہ کی طرف لپک گئی۔

کچھ ہی دیر بعد سکینہ اور شانی کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شانی نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کو بھی اپنے مصائب کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ اس نے اپنے آنسو حلق میں گرا لئے تھے اور چہرے پر بشاشت پیدا کر لی تھی۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟'' سکینہ نے اسے گدگداتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''میں نہ کہتی تھی، تیرے حسن کا جلوہ دیکھے گا تو ساری اکڑ شاکڑ بھول جائے گا۔ تُو چیز ہی ایسی ہے بھئی۔ ایمان سے کہتی ہوں جب سے تُو گئی ہے، سارا پنڈ ہی ویران لگتا ہے... نہ

کوئی ہنسی مذاق، نہ کوئی چھیڑ خانی اور تو اور صغراں کی منگنی پر بھی کوئی رنگ نہیں جم سکا۔ تیرا دل بھی ایسا لگا ہے وہاں کہ منگنی پر بھی واپس آنے کا نام نہیں لیا تُو نے۔ ایمان سے آخری وقت تک ہم ساری تیری راہ تکتی رہیں۔"

"بس، انہوں نے آنے ہی نہیں دیا۔" بے دھیانی میں شانی کے منہ سے نکل گیا۔

سکینہ فوراً بات کو دوسری طرف لے گئی۔ "آنے کیسے دیتا ہم نے بھی تو کوئی ایسی ویسی شے نہیں دی ہے اسے، پورے رنگ والی کا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے اس کے ہاتھ پر۔ ساری عمر تیری غلامی نہ کرے تو میرا نام بدل دینا۔ بس ذرا اپنے حساب سے چلاتی جانا اسے، نہ زیادہ ترسانا، نہ زیادہ رنجھانا...... تھوڑی تھوڑی بھوک رہے، تھوڑی تھوڑی ٹنی رہے۔" سکینہ کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

شانی کے دل کا حال سکینہ سے اوجھل تھا۔ وہ اوپر سے ہنس رہی تھی، اندر سے رو رہی تھی۔

رات تک وہ ابا جی کے بستر کے گرد ہی گھومتی رہی، کبھی انہیں پھل کاٹ کر دے رہی ہے، کبھی دوا کھلا رہی ہے، کبھی اخبار پڑھ کر سنا رہی ہے۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم کپڑے اور زیور اتار دیئے تھے، ہلکی پھلکی شلوار قمیص پہن لی تھی اور بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ لئے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے مچھلی ہو اور واپس پانی میں آ گئی ہو۔ بہرحال اس کا دھیان مسلسل اپنے بھائی عادل کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ اسے حویلی میں چھوڑ کر کچھ ہی دیر بعد واپس چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ نارپور میں کیا صورتحال ہے، مہر جی کے خاص ملازم کو گولی لگی تھی اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بات بہت زیادہ بڑھ بھی سکتی تھی، فاخر خود بھی نارپور میں موجود نہیں تھا۔ شانی کا دل اندر سے کانپ رہا تھا اور چوہدری ارشاد کی کھوجی نظریں بار بار بیٹی کے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

عادل کی واپسی رات نو بجے کے بعد ہوئی۔ موقع ملتے ہی شانی نے اس سے بات کی۔

"بھائی! کیا بنا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔" عادل نے تسلی دی۔ "اس کو ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ حویلی میں ہی ڈاکٹر منگوا کر گولی نکال لی گئی ہے۔"

"مہر جی کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

"سنا ہے اس بڈھے نے کچھ شور مچایا تھا۔ وہ پولیس کو بلانا چاہتا تھا مگر تمہاری جیٹھانی مقبول نے معاملے کو سنبھال لیا ہے کم از کم وقتی طور پر تو سنبھال ہی لیا ہے۔"

شانی کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ عادل کے منہ سے اپنے دادا سسر کے لئے "بڈھے" کا لفظ سن کر اسے افسوس ہوا ہے۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "بھائی جو کچھ بھی ہے لیکن مہر جی میرے لئے عزت کی جگہ پر ہیں بلکہ ہم سب کے لئے...."

"خدا کے لئے شانی، چپ رہو۔" عادل نے جھنجھلا کر شانی کی بات کاٹ دی۔ بھائی کا رویہ شانی کے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ اس کی باتوں سے تو یوں لگتا تھا کہ نارپور میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، وہ عادل کے علم میں ہے۔

"بھائی یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

عادل سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ "شانی ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے....." اس کے لہجے میں انتہا درجے کا درد تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟" شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"ابا جی! مجھے پوری بات نہیں بتا رہے، لیکن وہ جو کچھ بھی بتا رہے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے سسرالیوں نے ہمیں بیوقوف بنایا ہے۔ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم سے پرانی دشمنی چکانے کی کوشش کی گئی ہے۔" عادل کے لہجے میں دکھ کی شدید لہر تھی۔

"پپ...... پرانی دشمنی۔" شانی کے ہونٹ لرزے۔

شانی کا دھیان ایک بار پھر خدا بخش کے کنوئیں پر پیش آنے والے واقعے کی طرف چلا گیا لیکن اس کے بارے میں عادل کو کیا پتا تھا اور پھر اس واقعے کو پرانی دشمنی بھی تو نہیں کہا جا سکتا تھا یہ تو صرف دو چار سال پہلے کی بات تھی...... تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ دشمنی تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ گرد و پیش نگاہوں میں چکرا رہے تھے۔ "بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" شانی کے ہونٹوں سے سہمی سہمی آواز نکلی۔

عادل کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، وہ بولا۔ "رشتے کے موقع پر وہ خبیث بڈھا سامنے نہیں آیا۔ اسی وجہ سے ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا ہوا۔ وہ اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ...... وہ قتل کئے جانے کے لائق ہے۔"

"بھائی، خدا کے لئے میرے سامنے ایسی باتیں نہ کریں، میرا دل بند ہو جائے گا۔" شانی رو پڑی۔

"میں کیا باتیں کروں گا۔ مجھے تو ابھی خود بھی ساری بات کا پتا نہیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔" عادل نے بڑے کرب سے کہا۔ پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "ابا جی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے ہمارے دادا جی کا بیاہ اسی گاؤں میں ہوا تھا

جہاں وہ بڈھا مہر جی رہتا ہے۔ یہ دشمنی اسی رشتے کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔''

''مم..... مگر ساٹھ ستر سال پہلے کی باتوں کا مجھ سے اور فاخر سے کیا تعلق ہے بھائی؟''

عادل کے چہرے کا کرب بڑھ گیا وہ بولا۔ ''میری بھولی بہن تُو ساٹھ ستر سال کی بات کرتی ہے یہاں تو سات سو سال پہلے کی دشمنیاں بھی چکائی جاتی ہیں۔''

شاید بھائی بہن کے درمیان یہ تکلیف دہ گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں چوہدری ارشاد کو شدید کھانسی شروع ہوگئی۔ شانی نے اپنے آنسو پونچھے اور انہیں دوا کھلانے کے لئے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اب ابا جی کے دل کی تکلیف کی وجہ کچھ کچھ شانی کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس کی شادی کے دوران میں یا شادی کے بعد ان پر کچھ اندوہناک انکشافات ہوئے تھے۔ اپنے نئے رشتے داروں کے حوالے سے کچھ ایسا ان کے علم میں آیا تھا جس نے ان کے دل و دماغ میں طوفان برپا کردیا۔ اس طوفان کا زیادہ اثر ان کے دل پر ہوا تھا اور وہ ہسپتال کے شعبہ کارڈیالوجی میں جا پہنچے تھے۔

اگلے روز شانی بہت سویرے اٹھ گئی۔ اس کے دل میں شاید یہ خواہش تھی کہ اس کے ابا جی باغیچے کی گیلی گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے ہوں وہ انہیں دیکھے اور خود بھی ان کے ساتھ ٹہلنے لگے لیکن ابا جی تو بستر پر تھے اور سو رہے تھے۔ ان کی صحت انہیں چہل قدمی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ شانی نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلی ہی باغیچے میں چلی گئی۔ ایک دم اسے لگا کہ ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے اس کا دادا سسر مہر جی برآمد ہوگا۔ اپنے خوفناک چہرے سے اسے دہشت زدہ کرے گا اور پھر اس پر ناقابلِ فہم الفاظ کی بوچھاڑ کردے گا۔ اپنی اس خام خیالی پر وہ خود ہی مسکرا دی۔ وہ مہر جی کے باغیچے میں نہیں تھی، اپنے بابل کے آنگن میں تھی، یہاں کا ہر پھول پتا اور گھاس کا ہر تنکا اسے جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ اس نے چپل اتار دی اور ٹھنڈی گھاس پر گھومنے لگی۔ حویلی کا ملازم بختاور کچھ لاٹھیاں لئے پچھواڑے کی طرف جا رہا تھا۔ ان لاٹھیوں پر چمکیلی میخیں لگائی جاتی تھیں اور انہیں مضبوط رکھنے کے لئے سرسوں کے تیل میں ڈبویا جاتا تھا۔ یہاں حویلی کے پرانے ملازم لٹھ بازی کرتے تھے۔ جب شانی بچی تھی تو اس کے ابا جی اور چاچا رئیس اور مشتاق بھی لٹھ چلانے کی مشق میں شامل ہوا کرتے تھے لیکن اب صرف عادل کا شوق ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی روزانہ نہیں جاتا تھا، بس ہفتے میں ایک آدھ بار ہی اکھاڑے کا رخ کرتا تھا۔ لٹھ چلانے میں عادل کی مہارت کو سب مانتے تھے۔

بختاور اور اس کی بغل میں دبی لاٹھیوں کو دیکھ کر شانی کا دھیان اپنے شوہر کی طرف چلا

گیا۔ اسے بھی تو یہ شوق لاحق تھا۔ حویلی میں قیام کے دوران اس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے لاٹھی چلاتے دیکھا۔ بعدازاں بھابو سے بھی معلوم ہوا کہ فاخر کا یہ شوق بہت پرانا ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص فاخر کے پاس ملازمت حاصل کرسکتا ہے جو اچھی لاٹھی چلانا جانتا ہو اور فاخر کے سامنے اپنی مہارت ثابت کرسکے۔ ابھی تک شانی اسے ایک اتفاق ہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے بھائی اور اس کے شوہر کا شوق ایک ہی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس حوالے سے اس پر ایک زبردست انکشاف ہونے والا ہے۔ ابا جی اس کے سامنے ایک پرانی کہانی کے پیچ و خم سے پردہ اٹھانے والے ہیں۔

ابا جی کو ناشتہ کروانے اور دوا کھلانے کے بعد وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چاچا مشتاق اور تایا معصوم بھی پاس ہی تھے دونوں چپ چپ نظر آرہے تھے۔ وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلے گئے تو باپ بیٹی تنہا رہ گئے۔ اپنے بیاہ سے پہلے شانی نے ایک کتاب شروع کر رکھی تھی۔ روزانہ سونے سے پہلے وہ ابا جی کو اس کتاب کے چند صفحات پڑھ کر سناتی تھی۔ یہ مغل دور میں لکھا گیا ایک دلچسپ سفرنامہ تھا۔ آج وہ پھر اس کتاب کو جھاڑ پونچھ کر لے آئی۔

چوہدری ارشاد بڑے عجیب سے موڈ میں تھے۔ انہوں نے کتاب شانی کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دی اور بولے۔ ''ہمیشہ تم سناتی ہو لیکن آج میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔''

''کیسی کہانی ابا جی؟'' شانی نے پوچھا۔

''ایک ایسی کہانی جس کا تمہاری موجودہ اور آئندہ زندگی سے گہرا تعلق ہے شانی۔'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور بولے۔ ''یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتانا چاہ رہا ہوں شانی کہ تم ان حالات پر غور کرسکو اور اس سوچ بچار کے ذریعے اپنی آئندہ زندگی کی مشکلیں کم کرسکو۔ مجھے تم پر بھروسا ہے تم اپنی ماں ہی کی طرح سمجھ دار اور ہمت والی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا کتنا بڑا دل ہے۔''

''میری ساری طاقت تو آپ ہی ہیں ابا جی۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے خوش ہیں تو میں بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرسکتی ہوں۔''

''نہیں میری دھی رانی، میں کچھ نہیں ہوں میں تو سمجھتا ہوں کہ میری طاقت بھی تمہاری ماں ہی تھی۔ وہ عام انسان نہیں تھی شانی، اس کا مقام بڑا اونچا تھا۔ لوگ ایسے ہی تو اسے وڈی آپا نہیں کہتے، اور تم نے دیکھا ہوگا جب وہ اسے وڈی آپا کہتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں کیسی محبت بھری چمک آجاتی ہے، ان کے ماتھوں پر ایک طرح کی عقیدت لشکارے مارنے لگتی

ہے، ہاں شانی میں سچ کہتا ہوں میں جو کچھ بھی ہوں، جس مقام تک بھی پہنچا ہوں اس میں زیادہ کردار تمہاری ماں کا ہی ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے ہیں اس کی قدر و قیمت میرے دل میں بلکہ شاید ہم سب کے دلوں میں بڑھتی جا رہی ہے۔ کاش...... کاش میں اس کی زندگی میں اس کی قدر کر سکتا۔"

"ابا جی! آپ نے سب کچھ کیا ہے۔ انہیں ہر طرح خوش رکھا ہے، ان کی بیماری میں آپ نے کیا نہیں کیا ان کے لئے اور ہم سب کے لئے۔ آپ ایسی باتیں مت سوچا کریں۔ آپ کا مقام بڑا بلند ہے ہم سب کی نظروں میں۔"

"لیکن میں کتنے پانی میں ہوں، اس کا پتا مجھے بہت اچھی طرح ہے۔ تمہاری ماں زندہ تھی تو ہر کام سیدھا پڑتا تھا۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا ہو جاتی تھی...... اب سونا بھی مٹی ہو جاتا ہے ہر جگہ دھوکا کھاتا ہوں، ہر جگہ نقصان اٹھاتا ہوں... اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا کہ اپنی بیٹی کے بارے میں بھی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے بھی مشکلوں کے حوالے کر دیا...... باپوں پر بیٹیوں کا یہی تو ایک قرض ہوتا ہے وہ اپنی ساری محبتوں، خدمتوں اور حیاؤں کے بدلے اپنے بابل سے بس ایک ہی چیز مانگتی ہیں...... ایک اچھا بر...... ایک عزت دار اور محبت دینے والا جیون ساتھی، پندرہ بیس برس تک ان کی چوڑیوں کی چھن چھن اور پازیبوں کی کھن کھن باپ سے بس ایک ہی بات کہتی رہتی ہے...... مجھے اچھی طرح دیکھ بھال کر خود سے جدا کرنا۔ شانی میں بھی بیس برس تک تیری یہ خاموش آواز سنتا رہا، لیکن جب فیصلے کا وقت آیا تو دھوکا کھا گیا۔ میں تیرا حق ادا نہیں کر سکا میری بیٹی! میں تیرے سامنے بہت شرمندہ ہوں۔"

چوہدری ارشاد کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ شانی نے بے قرار ہو کر اپنی اوڑھنی سے ان کے آنسو پونچھے اور گلے سے لگ گئی۔ "ابا جی! آپ نے میرے لئے جو کچھ چنا، وہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ اگر آپ کے اس فیصلے میں میرے لئے کوئی پریشانی ہے بھی تو وہ میرے سر آنکھوں پر، میں ہر پریشانی کا مقابلہ کر لوں گی۔ آپ ذرا سی بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔"

یہ جذباتی کیفیت کچھ دیر برقرار رہی پھر اشک بار چوہدری ارشاد نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ان کے علم میں آچکا ہے وہ اب شانی تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے ایسے الفاظ ڈھونڈ رہے ہیں جو ان کی لاڈلی بیٹی کو کم سے کم تکلیف دیں۔

کچھ دیر بعد انہوں نے شانی کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہنا شروع کیا۔ "میں تمہیں شروع سے بتانا چاہ رہا ہوں تاکہ ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ آج سے کوئی ستر پچھتر سال پہلے کی بات ہے۔ ضلع گجرات کے موضع آنند پور میں چوہدری ملک نواب شاہ کی حویلی مشہور تھی، نواب شاہ کے سر پر پچاس دیہات کی پگڑی تھی وہ بڑا رعب و دبدبے والا زمیندار تھا۔ ان دنوں انگریز افسروں کی بڑی دہشت ہوتی تھی لیکن نواب شاہ کی علمداری میں انگریز افسر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھتے تھے۔ نواب شاہ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، بس ایک خوبصورت بیٹی تھی اس کا نام دولت بی بی تھا۔ دولت بی بی جوان ہوئی تو وہی کچھ ہوا جو ہم اکثر کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ نواب شاہ کو بیٹی کے رشتے کی فکر ہوئی، دولت بی بی خوبصورت تھی اس کو جہیز میں کئی مربعے زمین بھی ملنے والی تھی، علاقے کے کئی چوہدری اور بڑے زمیندار یہ خواہش کرنے لگے کہ نواب شاہ کے گھرانے سے ان کا رشتہ جڑ جائے۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ دولت بی بی کو مل سکتا تھا مگر ملک نواب شاہ کسی اور مزاج کا آدمی تھا وہ دلیر اور بہادر شخص تھا۔ اس نے ایک وقت میں انگریزوں کے خلاف لڑائی میں بھی حصہ لیا اور نام کمایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا داماد بے شک لاکھوں کروڑوں کا مالک نہ ہو لیکن دلیر، جی دار اور غیرت مند ہو۔ جس دور کی یہ بات ہے اس دور میں سویمبر اور سویمبر رچانے کی رسمیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ لڑکی کے لئے شوہر ڈھونڈنے کے لئے اچھے گھرانوں کے نوجوان تلاش کئے جاتے تھے اور پھر ان کی دلیری اور ہمت پرکھنے کے لئے ان کے درمیان مقابلے وغیرہ کروائے جاتے تھے۔ خاص طور پر ہندوؤں میں یہ رواج عام تھا۔ نواب شاہ مسلمان تھا مگر وہ اور اس کے بزرگ جس ماحول میں رہ رہے تھے اس پر ہندوؤں کا اثر اور رنگ زیادہ تھا۔ ملک نواب شاہ نے بھی اپنی بیٹی دولت بی بی کے لئے بر ڈھونڈنے کے لئے سویمبر کی طرح ایک مقابلہ کرایا۔ یہ لٹھ بازی کا مقابلہ تھا۔ اس میں علاقے کے گنے چنے بیس پچیس جوانوں نے حصہ لیا۔ اس لڑائی میں جو جوان پہلے نمبر پر آیا اس کا نام مہر داد خان تھا۔

رسم کے مطابق مہر داد خان کو دولت بی بی سے رشتے کے لئے قبول کر لیا گیا...... مہر داد بھی ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ان کی زمین تھی یہ لوگ باغوں کے ٹھیکے بھی لیتے تھے اور ان کے اپنے باغ بھی تھے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے، شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شادی سے چند روز پہلے کی بات ہے ملک نواب شاہ کے والد کا ایک پرانا دوست نواب شاہ سے ملنے آیا۔ اس نے نواب شاہ پر انکشاف کیا کہ جس جوان کو اس نے اپنی بیٹی کے جیون ساتھی کے طور پر چنا ہے، وہ ماہر لٹھ باز اور دلیر تو بے شک ہے لیکن ذات کا اصیل نہیں ہے۔ اس نے

نواب شاہ پر یہ ثابت کیا کہ مہر داد خان جدی پشتی زمیندار نہیں ہے۔ مہر داد کی ماں نے تمیں سال کی عمر میں ایک سانسی (بلی مار) سے بیاہ رچایا تھا اور مہر داد دراصل اسی سانسی کا بیٹا ہے۔

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تو نواب شاہ کے لئے کسی طور بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بیٹی کا ہاتھ ایک ''بلی مار'' کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ اس نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا۔ لوگ اکٹھے ہوئے، کئی پنچایتیں بیٹھیں لیکن فیصلہ مہر داد خان کے حق میں نہ ہو سکا۔ نواب شاہ نے اعلان کیا کہ وہ رسم و رواج کی پابندی کرتے ہوئے بیٹی کا ہاتھ اس نوجوان کے ہاتھ میں تھمائے گا جو سویمبر کے مقابلوں میں دوسرے نمبر پر آیا تھا... تمہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دوسرے نمبر پر کون آیا تھا؟'' چوہدری ارشاد نے شانی سے پوچھا۔

''ہمارے دادا۔'' شانی نے جواب دیا۔

''ہاں یہ ہمارے والد قادر بخش تھے۔ بچپن میں ہم یہ بات سنتے آئے ہیں کہ ہمارے والد کی شادی سویمبر کے نتیجے میں ہوئی تھی اور وہ بہت بڑے لٹھ باز تھے۔ یہ بات میں نے تم کو بتائی تھی اور تم نے اپنے چاچاؤں سے بھی سنی ہوگی۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہدری ارشاد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں باقی باتوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔ یہ باتیں ہم نے اپنے بچوں تک پہنچانا ضروری بھی نہیں سمجھا تھا۔ یہ بات صرف میرے اور تمہارے چاچاؤں تک ہی محدود ہے کہ تمہاری دادی دولت بی بی کی شادی پہلے مہر داد نامی ایک ایسے شخص سے ہونے لگی تھی جو ''بلی ماروں'' کے خانوادے سے تعلق رکھتا تھا اور اس شادی کے نہ ہونے سے مہر داد خان اور تمہارے دادا قادر بخش میں دشمنی چلی تھی۔''

شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک دفعہ چاچا مشتاق نے مجھے اور عادل بھائی کو اتنی بات بتائی تھی کہ آبائی گاؤں میں مہر داد نامی ایک بندے سے دادا کی پرانی دشمنی تھی اور دونوں میں کئی مرتبہ لاٹھی چلی تھی۔''

''کئی مرتبہ تو نہیں بس دو بار ایسا واقعہ ہوا تھا۔ ایک بار تمہارے دادا قادر بخش کی شادی سے تین چار دن پہلے، دوسری مرتبہ شادی کے دو تین مہینے بعد ایک میلے میں .... اس دوسری لڑائی میں تمہارے دادا کو کافی چوٹیں آئی تھیں، کہا جاتا ہے کہ وہ پھسل کر گر گئے تھے۔ اس دوسری لڑائی کے بعد اردگرد کے سارے دیہات اور وہاں کے معزز لوگ مہر داد خان کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سراسر زیادتی کر رہا تھا۔ شادی بیاہ تو رضامندی اور خوشی کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں ضد اور زور کی بات نہیں ہونا چاہئے لیکن مہر داد خان ایسا کر رہا تھا۔ اس لڑائی

کے بعد ایک بڑی پنچایت بیٹھی تھی جس میں مہر داد خان اور اس کے بھائیوں کا حقہ پانی بند کر دیا گیا تھا۔ زمینداروں نے انہیں باغوں کے ٹھیکے وغیرہ بھی دینے چھوڑ دیئے تھے، قریبی گاؤں کی ایک جٹ برادری سے مہر داد خان کے جھگڑے بھی شروع ہو گئے۔ دو چار سال میں ہی وہ اتنا تنگ ہوا کہ زمین بیچ باچ کر خاموشی سے اپنے پرانے علاقے ڈیرہ غازی خان کی طرف نکل گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک اس کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آہستہ آہستہ علاقے کے لوگ اسے اور اس کے گھرانے کو بھول گئے۔''

''کہیں یہ مہر جی...... وہ مہر داد خان تو نہیں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

چوہدری ارشاد نے بے پناہ کرب سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''یہ ہماری بدقسمتی ہے دھی رانی کہ یہ مہر جی وہی ہے۔''

چوہدری ارشاد کی بُردبار آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے پھر بولے۔ ''مہر داد کے پوتے کو اپنا داماد بناتے ہوئے ہم دھوکا کھا گئے دھی رانی...... دراصل مہر داد نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی دوسری شادی بالکل خفیہ تھی۔ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس دوسری بیوی سے مہر داد کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے کا نام امانت علی ہے اور وہی تمہارا مرحوم سسر ہے۔ جب تمہارے رشتے کی بات چلی اور ہم نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق فاخر کے خاندان کی جانچ پرکھ کی تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس گھرانے کا تعلق مہر داد خان سے ہوگا۔ ان لوگوں نے بھی بڑی ہوشیاری سے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہونے دی جس سے ہمارا دھیان بُھولے سے بھی ڈیرہ غازی خان یا آنند پور کی طرف جاتا۔ تمہاری شادی سے پہلے جب ہم تمہارے سسرال نار پور جاتے تھے تو ایک مرتبہ وہ بڈھا مہر جی حویلی میں ہی موجود تھا لیکن ہمیں اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی گئی۔ کاش ایسا نہ ہوتا شانی ..... کاش ایسا نہ ہوتا۔''

چوہدری ارشاد نے اپنے بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور ان کے زرد رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ وہ روتے ہوئے شانی کی طرف بڑھے اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولے۔ ''میں تیرا گناہ گار ہوں بیٹی! میں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے آگ میں جھونکا ہے، کتنا بدقسمت باپ ہوں میں...... کاش تیری ماں کی جگہ میں مرا ہوتا، وہ بختوں والی تھی، اس کے ساتھ اللہ کی رحمت ہوتی تھی، وہ ہوتی تو تیرے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوتا، کبھی نہ ہوتا۔''

شانی بھی رونے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ باپ کو تسلی دے رہی تھی۔ ”اباجی! آپ نے کچھ نہیں کیا جو کچھ میری قسمت میں لکھا تھا، وہ ہوا ہے لیکن میں اس مصیبت سے بھاگوں گی نہیں، میں اس کا سامنا کروں گی۔ میں سب کچھ ٹھیک کروں گی، آپ فکر نہ کریں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔“

رات تک شانی کو اس حوالے سے کچھ اور باتوں کا پتا بھی چلا، یہ سب کچھ اباجی نے ہی اسے بتایا۔ جس روز شانی کی بارات آئی مہر جی بارات کے ساتھ موجود نہیں تھا لیکن بارات میں موجود ایک دو عمر رسیدہ چہروں کو دیکھ کر چوہدری ارشاد کا ماتھا ٹھنکا...... بعد ازاں کئی باراتیوں کا رنگ ڈھنگ اور بولی ٹھولی دیکھنے کے بعد چوہدری ارشاد کا شبہ تقویت پکڑنے لگا۔ اپنی رخصتی کے موقع پر شانی نے اباجی کے چہرے پر جو گہرا اضطراب دیکھا تھا، اس کا تعلق اسی صورتِ حال سے تھا۔ شانی کی رخصتی کے بعد چوہدری ارشاد دو دن کمرے میں ہی بند رہے تھے۔ بعد ازاں وہ خود پر جبر کر کے ولیمے کی تقریب میں گئے۔ اس تقریب میں سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا۔ مہر جی سے بھی چوہدری ارشاد کی ملاقات ہو گئی اور انہوں نے اپنے داماد کی آنکھوں میں بھی نفرت اور دشمنی کی لپک دیکھ لی۔ فاخر نے ولیمے کے بعد شانی کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا تھا اور بہانہ بنایا تھا کہ وہ چند روز تک خود اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ تاہم چوہدری ارشاد سمجھ گئے تھے کہ ان کے داماد نے انہیں سزا دینے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ ولیمے کی تقریب کے بعد وہ شانی کے بغیر رنگ والی واپس آئے اور اس بات کا ان کے دل پر بے حد بوجھ تھا۔ آخر ایک دن یہ بوجھ رنگ لایا اور وہ دل پکڑ کر ہسپتال پہنچ گئے۔

ابھی تک عادل کو یہ ساری باتیں معلوم نہیں تھیں لیکن اسے تادیر اندھیرے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ شانی کے آنے کے صرف اڑتالیس گھنٹے کے اندر عادل کو بھی وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جو چوہدری ارشاد نے شانی کو بتایا تھا۔ عادل جوان خون تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ چوہدری ارشاد کی بیماری اس کے پیشِ نظر نہ ہوتی تو وہ ان کے سامنے ہی چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیتا۔ وہ چوہدری ارشاد کے سامنے تو چپ رہا لیکن چچا رئیس کے سامنے اس نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ اس نے کہا۔ ”چاچا، میں شانی کو کسی صورت واپس سسرال نہیں جانے دوں گا۔ ان کے اور ہمارے درمیان ہر تعلق اب ختم ہو گیا۔“

چچا رئیس نے شانی کی طرف دیکھا، شانی کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی آنکھیں بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی تھیں۔ ”بھائی یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتا ہے، زندگی کے فیصلے پنسل کی لکیر تو نہیں ہوتے کہ جب جی

چاہے مٹا دیئے جائیں۔“

چچا رئیس نے کہا۔ ”عادل! ہمیں اب جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے، ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔“

عادل نے چیخ کر کہا۔ ”چاچا! آپ کی ”سوچ سمجھ“ نے ہی تو سارا کام خراب کیا ہے۔ آپ کے سامنے تو بس اپنا کاروبار تھا اور اس کے سوا آپ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آپ نے دن رات نارپور والوں کی تعریفیں کیں۔ اپنی باتوں سے ان میں دنیا بھر کی خوبیاں جمع کر دیں۔ اگر نارپور میں شانی کی بات پکی ہوئی تو اس میں سب سے زیادہ ہاتھ آپ کا تھا۔“

”میں اپنا گناہ مانتا ہوں عادل پتر...... یہ میری غلطی تھی کہ میں دشمنوں کی چال نہ سمجھ سکا۔ انہوں نے ...... سب کچھ...... ایک منصوبے کے مطابق کیا۔ آہستہ آہستہ جال بچھایا، میرے یا بھائی ارشاد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پردے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ چلو میں تو چاچا ہوں، بھائی ارشاد تو باپ تھے ان پر تو تم شک نہیں کر سکتے ہو، انہوں نے بھی فاخر سے کاروبار کی بات کی۔ اپنی فصل فاخر کے کارخانے کو بیچی۔“

”وہ سب بھی آپ کی وجہ سے ہوا چاچا۔ آپ نے نارپور والوں کی تصویر ہی کچھ ایسی کھینچ رکھی تھی کہ اباجی بھی ان پر بھروسہ کرنے لگے۔“

چچا رئیس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی خود کو بے حد نادم محسوس کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”عادل پتر! جو ہو گیا وہ تو ہو گیا، اب آگے کا سوچنا ہے بیٹی کا معاملہ ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا میری بات بالکل صاف اور کھلی ہے۔ میں اپنی بہن کو واپس اس دوزخ میں نہیں بھیجوں گا۔ ہرگز نہیں بھیجوں گا۔“

شانی کا ردِعمل جاننے کے لئے رئیس احمد نے بے ساختہ شانی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شانی نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپایا اور سسکی لیتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

نارپور میں مہر جی کے کارندے اکبرے کو گولی لگنے والی بات ابھی تک چوہدری ارشاد سے چھپائی گئی تھی مگر اسے تادیر نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔ تیسرے روز شانی جب چوہدری ارشاد کے سرہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی، اس نے مناسب لفظوں میں سب کچھ چوہدری ارشاد کے گوش گزار کر دیا۔ شانی نے واقعے کی شدت کو بہت کم کر دیا تھا اور ایسے الفاظ استعمال کئے تھے جن سے چوہدری کو شاک نہ پہنچے، اس کے باوجود چوہدری ارشاد کا رنگ زرد ہو گیا اور ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ وہ لیٹ گئے اور کتنی ہی دیر گم صم رہے۔ دس پندرہ روز میں ہی وہ دائمی

بیمار نظر آنے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ کراہتے ہوئے بولے۔ ''شانی تیرا بھائی غصے والا ہے، اس کا غصہ کہیں اس معاملے کو اور بگاڑ نہ دے۔ اگر بات پولیس وغیرہ تک پہنچ گئی تو بڑی بدنامی ہوگی۔''

''ابا جی، ابھی تک تو بات پولیس تک نہیں پہنچی اور اُمید ہے کہ اب پہنچے گی بھی نہیں۔ چار پانچ دن تو گزر چکے ہیں مم میرا خیال ہے کہ فاخر نے اس معاملے کو دبا لیا ہے۔''

''کیا اس واقعے کے بعد فاخر نے کوئی رابطہ کیا ہے؟''

''نہیں ابا جی، رابطہ تو نہیں کیا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اس واقعے کے بعد اس کا رویہ کیا ہوگا؟''

''بھابو دل کی بڑی اچھی ہے، سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ مجھے پکا یقین ہے وہ فاخر کو سمجھا بجھا لے گی اور شاید اسی کے سمجھانے بجھانے کی وجہ سے بات ابھی تک پولیس میں نہیں پہنچی اور نہ ہی کوئی اور فساد ہوا ہے۔''

''مگر فاخر کو رابطہ تو کرنا چاہئے تھا۔''

''شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ ہماری طرف سے رابطہ ہو۔''

چوہدری ارشاد چند سیکنڈ تک خاموش رہے پھر انہوں نے شانی سے نگاہیں ملائے بغیر پوچھا۔ ''فاخر کا سلوک تیرے ساتھ کیسا ہے بیٹی؟''

''کچھ کھچے کھچے ضرور رہتے ہیں لیکن سلوک بُرا نہیں ہے، ہاں مہر جی کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مجھے ایک بار بھی رحم کی جھلک نظر نہیں آئی۔'' شانی شوہر کی کج روی پر جان بوجھ کر پردہ ڈال گئی۔

چوہدری ارشاد نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوتا تو خود نارپور جاتا اور فاخر سے بات کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ نئی نسل کئی معاملوں میں پرانی نسل سے بہتر ہوتی ہے لیکن تم دیکھ ہی رہی ہو کہ میں بستر سے پاؤں نہیں اتار سکتا۔''

شانی باپ کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ''ابا جی! آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆======☆======☆

چار پانچ روز بعد کی بات ہے۔ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ حویلی میں چاٹی کی لسی لینے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی، شانی اپنے ہاتھ سے برتنوں میں لسی ڈال رہی تھی، کسی کسی کے برتن میں وہ لسی کے ساتھ تھوڑا سا مکھن بھی رکھ دیتی تھی۔ یہ اس کی مرحومہ ماں کی روایت تھی

جو ابھی تک حویلی میں ہر روز نبھائی جاتی تھی روزانہ تقریباً آٹھ چاٹی لسی تقسیم کی جاتی تھی، بانٹتے بانٹتے شانی کی کمر دوہری ہوگئی اور نازک کلائیاں دکھنے لگیں مگر اس طرح کی تکلیف اٹھا کر اسے ہمیشہ سے راحت ہوتی تھی، اچانک حویلی کے اندرونی حصے سے کچھ آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچیں اور وہ چونک گئی۔ بھائی عادل کسی ملازم پر برس رہا تھا۔ شانی نے اسٹیل کا جگ اپنے ہاتھ سے رکھا اور جلدی سے اندرونی حصے کی طرف گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ عادل غصے سے سُرخ ہے اور خادم حسین پاس کھڑا کانپ رہا ہے۔ عادل کے ہاتھ میں ایک چاک کیا ہوا لفافہ تھا اور لفافے میں سے نکلنے والا خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

''کیا ہوا عادل بھائی؟'' شانی نے سہم کر پوچھا۔

''اتنا پرانا ملازم ہو کر بھی جھوٹ بولے تو دکھ ہوتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ ابا جی کے کمرے سے نکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے سے نکلنے کے بعد یہ کہیں روانہ ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو بولا بھائی بیمار ہے اس کی خبر لینے گاؤں جا رہا ہوں۔ حالانکہ بھائی اچھا بھلا ہے، تھوڑی دیر پہلے مجھے راستے میں ملا ہے، یہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ دیکھو اس کی جیب سے ابا جی کا لکھا ہوا خط نکلا ہے، یہ نارپور جا رہا تھا۔''

''لیکن بھائی! اس میں خادم حسین بے چارے کا تو کوئی قصور نہیں، ابا جی نے کہا ہوگا کہ کسی کو بتانا نہیں۔''

''ہم تو حکم کے غلام ہیں چھوٹی بی بی۔'' خادم حسین نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔

''اچھا تم باہر جاؤ۔'' عادل غصیلے انداز میں بولا۔ ''لیکن ابھی ابا جی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جو حکم چھوٹے مالک۔'' خادم حسین نے کہا اور باہر چلا گیا۔

عادل نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو مجھے ابا جی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ جس کسی کے سامنے جھکتے ہیں تو پھر جھکتے چلے جاتے ہیں۔ ایک تو بلا سوچے سمجھے تمہاری شادی کرنے کی غلطی کی...... اب منت سماجت اور عاجزی کا رویہ اختیار کر کے اس ظالم کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔ دیکھو اس خط میں کیا لکھا ہے انہوں نے۔'' عادل نے پہلے خط پر سرسری نظر دوڑائی پھر پڑھنا شروع کیا۔ ''بیٹے فاخر ماضی میں جو کچھ ہوا اس میں قصور کس کا تھا؟ اس بحث میں پڑیں گے تو دکھ اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ شانی کے بزرگوں کی طرف سے تمہارے بڑوں کے ساتھ زیادتی ہوئی یا تمہارے بزرگوں کی طرف سے شانی کے بڑوں کی دل آزاری ہوئی جو کچھ بھی ہوا یہ پرانے ماضی کا قصہ ہے۔ اگر ہم

اس ورق کو پھاڑ دیں اور ہر وہ بات بھول جائیں جو آج سے پہلے ہوئی ہے تو ہم ایک نئی اور بہتر زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

جو کچھ بھی تھا فاخر لیکن اب تم میرے بیٹے ہو اور مجھے عادل اور اختر ہی کی طرح عزیز ہو۔ میں بڑا ہونے کے باوجود ہر اس زیادتی اور دل آزاری کے لئے تم سے معافی مانگتا ہوں جو تم سمجھتے ہو کہ ماضی میں ہوئی ہے۔ یہ معافی میری طرف سے ہی نہیں میرے بیٹوں اور بھائیوں کی طرف سے بھی ہے۔

اب میں چند دن پہلے کے واقعے کی طرف آتا ہوں۔ عادل ہرگز تمہاری غیر موجودگی میں شانی کو لینے نہ جاتا لیکن اس دن میری طبیعت بہت خراب تھی، میرے ہی اصرار پر وہ گیا تھا۔ وہاں جو کچھ ہوا اس پر عادل کو بھی بے حد افسوس ہے معمولی سی بات تھی جو بڑھ گئی۔ یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، تمہارے ملازم اکبرے کی طرف سے بھی کچھ زیادتی ہوئی بہر حال جو کچھ بھی ہوا، اس میں مجھے اور عادل کو بے حد افسوس ہے۔ یہ تمہاری مہربانی اور برخورداری ہے کہ تم نے فوری طور پر اسلام آباد سے واپس آ کر اس معاملے کو سمیٹ لیا۔

یقین کرو، میں تندرست ہوتا تو خود چل کر تمہارے پاس آتا اور اس واقعے کے لئے تم سے اور مہر جی سے معذرت کرتا......شانی شدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں بھی تمہاری صورت دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔ ہفتے کی شام کو آ جاؤ اور ایک دو روز ہمارے ساتھ رہو۔

خیر اندیش و دعا گو ارشاد احمد۔''

خط کی آخری سطور تک پہنچتے پہنچتے عادل کا چہرہ انگارہ ہو چکا تھا۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''ابا جی سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ خود نرم دل ہیں ایسے ہی ساری دنیا بھی ہے۔ اگر ان کا خیال ہے کہ یوں معافیاں مانگنے اور منتیں کرنے سے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کتے کی دُم کو سو سال بھی حقے کی نلی میں رکھو وہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ جن لوگوں نے ستر اسی سال تک دشمنی کو پال پوس کر جوان کیا ہے وہ اسے اتنی جلدی کیسے ختم کر دیں گے۔ انہوں نے ہماری غیرت کو للکارا ہے شانی۔ ان کی ہر اینٹ کا جواب ہمیں پتھر سے دینا ہوگا۔''

''بھائی، دشمنی کو جتنا بڑھایا جائے بڑھتی جاتی ہے، ہمیں کوئی باعزت راستہ نکالنا ہوگا۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اور ابا جی کسی مصیبت کا شکار ہوں۔''

''تُو کیسی باتیں کرتی ہے شانی؟ تیری اور ہماری مصیبت جدا نہیں ہے، اگر تُو مشکل میں ہے تو ہم بھی مشکل میں ہیں اور ایک بات میں تجھے صاف بتا دوں میں تجھے کوئی قربانی

نہیں دینے دوں گا۔ تُو دشمنی کی اس آگ میں واپس نہیں جائے گی۔'' وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

شانی کی آنکھوں سے دو آنسو خاموشی سے گرے اور قالین میں جذب ہو گئے۔

شانی اور عادل نے ابا جی سے یہ بات چھپائے رکھی کہ انہوں نے معذرت خواہی والا خط نارپور نہیں پہنچنے دیا، ملازم خادم حسین کو بھی تاکید کر دی گئی کہ وہ ابا جی کی بیماری کے پیش نظر انہیں کوئی بات نہیں بتائے گا۔ نہ جانے کیوں شانی کے دل کی گہرائی میں کہیں یہ توقع موجود تھی کہ شاید فاخر رنگ والی آ جائے اور ابا جی کی عیادت کرے۔ اگر ایک بار وہ آ جاتا تو یقیناً معاملات سدھرنے کی اُمید پیدا ہو جاتی۔

پانچ چھ روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز شام کو عادل گھر واپس آیا تو سخت بھنایا ہوا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی شانی سہم گئی۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''شانی تم سے کہا تھا نا کہ نارپور والوں سے ہمارا صرف دشمنی کا رشتہ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ دیکھو کیا ہے؟'' عادل نے چند کاغذات شانی کی طرف بڑھا دیئے۔

شانی نے سرسری انداز میں دیکھا۔ ان کاغذات کا تعلق زرعی بینک سے تھا۔ عادل نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ قرضے کے کاغذات ہیں۔ بیج، کھاد اور پانی کے سلسلے میں چالیس لاکھ کا یہ قرضہ چوہدری ارشاد نے بینک سے حاصل کرنا تھا۔ اس قرضے کے لئے کوشش کرنے کا مشورہ فاخر نے ہی چوہدری ارشاد کو دیا تھا اور پورا یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے یہ قرضہ حاصل کر لے گا۔ اب یہ کاغذات انکار کی مہر کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔ فصل کی بوائی سے پہلے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ عادل اور چاچا مشتاق کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ کاغذات اس لئے واپس ہوئے تھے کہ فاخر نے اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''بھائی! ابا جی تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں یہ خبر ان کے لئے بڑی تکلیف والی ہوگی۔''

''لیکن انہیں بتائے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ وہ کل بیج اور کھاد وغیرہ کے لئے ایڈوانس دینے والے ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ کی زرعی دوا تو انہوں نے منگوا بھی لی ہے۔''

''بھائی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کہیں اور سے رقم مل جائے؟''

عادل کے چہرے پر شدید پریشانی اور سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے، بیلے کے ساتھ والی زمین بیچ دی

جائے ....اس بارے میں چاچا مشتاق ہی کوئی بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔ بہر حال یہ ساری تو بعد کی باتیں ہیں فی الحال سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ فاخر نے ہم پر اوچھا وار کیا ہے۔ ایسا گھٹیا بندہ بُرے سے بُرا راستہ اختیار کر سکتا ہے...... مجھے تو یہ ڈر ہے کہ.....'' عادل کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو بھائی؟''

''مجھے تو یہ ڈر ہے شانی کہ وہ تمہیں دھونس کے ساتھ یہاں سے لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ خدا کی قسم اگر اس نے کوئی اس قسم کی حرکت کی تو میں اس کے اندر سے گزر جاؤں گا۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو بھائی۔ جو بات ہے ہی نہیں تم اس کو سوچ سوچ کر حقیقت بنا رہے ہو۔''

''کیا یہ کاغذ حقیقت نہیں ہیں؟'' عادل نے بینک سے آنے والے کاغذات شانی کے سامنے پھڑپھڑائے۔ ''اگر یہ حقیقت ہیں تو اور بھی بہت کچھ حقیقت بن سکتا ہے۔''

شانی رات گئے تک ابا جی کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ ان سے باتیں کرتی رہی ان کی دلجوئی میں لگی رہی لیکن اس کے ساتھ اس کا ذہن آج کی غم ناک خبر میں بھی اٹکا رہا۔ ہمیشہ سے اس کی عادت تھی کہ وہ ہر حادثے یا غم ناک واقعے میں اپنی غلطی تلاش کرتی تھی۔ یہ کھوج لگاتی تھی کہ ایسے حالات پیدا کرنے میں اس نے کیا کردار ادا کیا ہے۔ اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی، اگر وہ اور عادل ابا جی کا لکھا ہوا خط نار پور پہنچ جانے دیتے تو شاید نار پور والوں کی طرف سے یہ ردِعمل ظاہر نہ ہوتا۔ سب کچھ سلجھ جاتا، اُمید کے نئے راستے کھل جاتے۔

اس رات عادل، چچا مشتاق اور چچا رئیس میں کافی دیر تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ اگلے روز شام کو جب شانی حویلی کی چھت پر ٹہل رہی تھی، عادل اس کے پاس آیا اور اس نے شانی کو ایک خوشخبری سنائی۔ وہ بولا۔ ''شانی میرا خیال ہے کہ اب ہم بینک کے قرضے اور فاخر کے تعاون پر لعنت بھیج سکتے ہیں، ہم نے بیلے کے ساتھ والے آٹھ مربعے بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سے بڑی خبر یہ ہے کہ زمین کے لئے ایک اچھا گاہک بھی مل گیا ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''یہ وہی جگہ ہے نا جو ابا جی نے پچھلے سے پچھلے سال بھی بیچنے کی کوشش کی کی تھی؟''

''ہاں وہی، اس سے پہلے بھی دو تین بار ہم نے ٹرائی ماری تھی لیکن وہ جگہ کلری ہے۔ اس کا گاہک نہیں ملتا اور اگر کوئی ملتا ہے تو پورے پیسے نہیں دیتا۔ اب اللہ کا کرنا ہے کہ

گاہک مل رہا ہے اور پیسے بھی ٹھیک دے گا۔ یہ سب چاچا مشتاق کی کوشش سے ہوا ہے۔ ہم کل پٹواری کے پاس جا رہے ہیں۔ زمین کی فردیں وغیرہ نکلوائیں گے اُمید ہے کہ تین چار روز تک بیعانہ ہو جائے گا۔''

''ابا جی کو بتایا ہے۔'' شانی نے اپنی اندرونی خوشی سمیٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابھی تو نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ اب بتا دینا چاہئے۔ یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ بینک سے قرضے والے کاغذ واپس آ گئے ہیں۔ اب یہ خبر دینے میں زیادہ حرج نہیں ہے۔''

''اور وہ خط روکنے والی بات؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں۔ اسے ابھی رہنے دو جب ابا جی کو پتہ چلے گا تو بات کر لیں گے۔''

رات کو ابا جی کے پاس بیٹھ کر عادل ٹی وی پر خبرنامہ دیکھتا رہا پھر اس نے سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ قرضے والی اطلاع نے چوہدری ارشاد کو بھی صدمہ پہنچا دیا۔ اپنے داماد کے لئے ان کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا لیکن اس خبر کے بعد اس گوشے کی وسعت کچھ کم ہو گئی تھی۔ اگر عادل نے چوہدری ارشاد کو اس صدمے سے سنبھالنے کا انتظام نہ کر لیا ہوتا یعنی زمین کا گاہک نہ ڈھونڈ لیا ہوتا تو چوہدری ارشاد پر یقیناً قیامت گزر جاتی۔ کچھ دیر بعد چاچا رئیس اور مشتاق بھی وہاں آ گئے۔ اس نئی صورتِ حال پر وہ تادیر تبصرہ کرتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ کاروبار کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے یہ ان کے پاس آخری موقع ہے۔ اگر اس مرتبہ سارا رقبہ کاشت کیا جاتا اور خریف کی فصل بھی غیر معمولی ہوتی تب ہی وہ اپنے حالات کے شکنجے سے نکل سکتے تھے۔ زمین کی فروخت کی صورت پیدا ہوئی تھی تو انہیں اپنے کئی مسئلے حل ہوتے نظر آنے لگے تھے۔

شانی رات دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ حالات اسے بہا کر کہاں سے کہاں لے جا رہے تھے۔ شادی سے چھ روز پہلے جب اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر وہی گھڑ سوار ہے جس کے منہ پر اس کے طمانچے کا نشان پڑا تھا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی زندگی ایک بے ڈھنگی چال چلنے والی ہے لیکن اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ صبر اور فراست کے ساتھ اس چال کو درست کرے گی اور اس نے دلیری کے ساتھ اس امتحان گاہ میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے سرد و گرم کو ہمت سے برداشت کیا تھا اور دل میں یہ اُمید کی تھی کہ جلد ہی وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ ہر دل میں جگہ بنا لے گی اور اس دل کو بھی جیت لے گی جسے جیتنا اس کے لئے سب سے زیادہ آسان تھا لیکن اس کے بعد حالات کے سانپ نے

اپنی کنڈلی کے کچھ اور بل کھولے تھے۔ شانی کے علم میں یہ بات آئی کہ بات صرف ایک اتفاقیہ طمانچے کی نہیں تھی، اس کے پیچھے ایک کہنہ سال کہانی سرسرا رہی تھی۔ ایک پون صدی پرانی کہانی جو روز و شب کی بھول بھلیوں میں رینگتی رینگتی اس تک پہنچی تھی اور عین جوانی کے سہانے دنوں میں اسے دبوچ بیٹھی تھی۔

اب تک جو حالات سامنے آئے تھے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ خدا بخش کے کنوئیں پر پیش آنے والا طمانچے کا واقعہ اتفاقاً ہی نہیں ہو گیا تھا وہ واقعہ نہ بھی ہوتا تو بھی شانی کے لئے صورتِ حال کم و بیش یہی ہوتی جواب تھی۔ وہ واقعہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔ فاخر، خدا بخش کے کنوئیں پر سرِ راہ شانی سے نہیں ٹکرایا تھا۔ وہ شانی کے پیچھے تھا۔ اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ شانی اور سکینہ نے پہلے بھی دو تین بار اسے رنگ والی میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا، ہوسکتا ہے کہ وہ چچا رئیس سے ملنے کے بہانے آتا ہو مگر اس کا اصل ہدف شانی ہی تھی۔

بہر حال یہ سب باتیں اب تو ماضی کا حصہ بن گئی تھیں۔ حقیقتِ حال یہ تھی کہ اب شانی، فاخر کی منکوحہ بیوی تھی۔ فاخر، شانی کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد بن چکا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ اسے سونپ چکی تھی اور اب اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کم از کم اس کی ''مشرقی روح'' کے اندر سے تو یہی آواز آتی تھی کہ اب واپسی کی کوئی راہ نہیں۔ اب ایک طرف شوہر تھا اور دوسری طرف اس کے خونی رشتے، وہ خود کو دو انتہاؤں کے درمیان پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی...... ''یا اللہ! دشمنی کی آگ میں سے محبت کا کوئی پھول کھلا دے، تُو قادرِ مطلق ہے...... تُو سب کچھ کر سکتا ہے تُو نے میرے دل کو ''خانہ محبت'' بنایا ہے۔ اپنی ماں کی طرح میں بھی کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔ اس سے بھی نہیں جو میرے سینے میں خنجر گھونپنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ میں سراپا محبت ہوں تو پھر مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹا جا رہا ہے۔ میری مدد فرما میرے مالک! مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے والے گناہ گار ہوں گے تو اس کا دکھ بھی مجھ کو ہی ہوگا۔ میری مدد فرما میرے مالک!''

اگلے ایک ہفتے میں شانی نے دن رات ابا جی کی خدمت کی۔ وہ ان کی خوراک اور دوا کا خاص خیال رکھتی تھی۔ ابا جی کی صحت پہلے سے بہتر ہو رہی تھی۔ ابا جی سے پیار تو شانی کو پہلے بھی بہت تھا لیکن ان کی تکلیف نے یہ پیار دوگنا کر دیا تھا۔ وہ رات کو کھانستے بھی تھے تو شانی چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ سوموار کے روز وہ لوگ ابا جی کو لاہور میں چیک اَپ کے لئے لے گئے۔ ان کی ایکوگرافی ہوئی، ورزش کا ٹیسٹ ہوا۔ ساری رپورٹیں اچھی آئیں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام اور علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

واپسی پر شانی خوش تھی، کئی دنوں بعد اس نے سکھ کی سانس لی تھی۔ وہ دیر تک ابا جی کے پاس بیٹھی رہی ان سے باتیں کرتی رہی، لطیفے سناتی رہی۔ وہ اپنا اور ابا جی کا دھیان اصل غم سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ابا جی کے پاس کافی دیر بیٹھ چکی تو پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے امی جی کے پاس بھی بیٹھنا چاہئے۔ اس کے کمرے میں مرحومہ ماں کی تصویر لگی تھی اور وہ اس تصویر کے سامنے ایسے ہی بیٹھتی تھی جیسے ماں کی زندگی میں ان کے سامنے بیٹھا کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ماں واقعی اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔

جب وہ ماں کے سامنے بیٹھنے کے لئے اپنے کمرے کا رخ کر رہی تھی کہ اچانک اسے گھن گرج کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں حویلی کے مردانے سے ابھری تھیں اس لئے شانی کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدھم پڑ گئی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ عادل کسی سے لڑ جھگڑ رہا ہے۔ شانی کا دل سینے میں چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا گیا۔ وہ تیزی سے مردانے کی طرف گئی۔ جاتے جاتے وہ راستے میں آنے والے سارے دروازے بند کرتی گئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ آوازیں ابا جی کے کانوں تک پہنچیں۔ اس نے دیکھا کہ زنانے اور مردانے حصے کو ملانے والے کمرے میں چچا مشتاق اور عادل ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں۔ عادل کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ چچا مشتاق اسے روکنے کے لئے پورا زور لگا رہے تھے۔ عادل دھاڑ رہا تھا۔ ''میں اسے سبق سکھا دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو اگر دشمنی ہے تو پھر دشمنی سہی۔ اب کھلے میدان میں مقابلہ ہوگا۔ اس کی بدمعاشی ناک کے راستے نہ نکال دوں تو عادل نام نہیں۔''

شانی کے ذہن میں خطرے کی کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عادل جو کچھ کہہ رہا ہے فاخر کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ وہ چچا مشتاق کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ اسی دوران میں چچا مشتاق کی نظر شانی پر پڑ گئی، انہوں نے پکار کر کہا۔ ''شانی! اسے روکو یہ پاگل ہو رہا ہے۔''

شانی آگے بڑھی اور وہ بھی بھائی سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ''بھائی ایسا مت کرو تم جانتے ہو ابا جی کی حالت کیسی ہے۔ وہ کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے بھائی، چھوڑ دو یہ رائفل۔''

شانی اور چچا نے مل کر بمشکل عادل کے ہاتھ سے بھری ہوئی رائفل چھڑائی۔ ہانپتا کانپتا ہوا خادم حسین بھی موقع پر پہنچ چکا تھا۔ چچا مشتاق نے رائفل اسے تھمائی پھر بپھرے ہوئے

عادل کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اسے دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کمرے کا دروازہ انہوں نے اندر سے بند کرلیا۔

چچا مشتاق نے پتہ نہیں کیسے اور کس طرح بپھرے ہوئے عادل کو ٹھنڈا کیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آئے تو نڈھال نظر آتے تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر پریشانی کی گہری لکیریں تھیں۔

''کیا ہوا چاچا؟ بھائی کیوں اتنے غصے میں آگئے ہیں؟'' شانی نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

چوہدری مشتاق ایک گہری اور مضطرب سانس لے کر بولے۔ ''شانی! عادل کا غصہ بھی بے جا نہیں ہے، نارپور والے ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے۔ انہوں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں چچا؟''

''زمین کا سودا کینسل ہوگیا ہے اور اسے کینسل کرانے والا فاخر ہے۔''

''اوہ خدایا...... یہ کیا ہو رہا ہے۔''

''تم جانتی ہی ہو یہ گاہک بڑی مشکل سے ہاتھ لگا تھا۔ میرے بچپن کا ایک دوست تھا۔ میں زمین کے لئے کافی عرصے سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے بات ''سودے'' تک پہنچی تھی۔ فاخر کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑا کر سودا خراب کر دیا۔ ہمیں آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ فاخر نارپور کے قریب اپنی دس مربعے زمین ہمارے گاہک کو بہت سستے بھاؤ دے رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ یہ سب ہماری عداوت میں کر رہا ہے۔ اس نے سستی زمین دے کر نقصان برداشت کیا ہے لیکن ہماری زمین بکنے نہیں دی۔''

''آپ کو یہ سب کس نے بتایا ہے؟''

''نارپور کا نائب تحصیلدار آج سویرے خود میرے پاس آیا تھا۔ اس نے ساری حقیقت کھولی ہے۔ شک تو ہمیں تین چار روز سے تھا لیکن آج تو سب کچھ کھل کر سامنے آگیا ہے۔''

شانی کے سینے میں جیسے کچھ چکنا چور ہو کر بکھر گیا۔ پچھلے چند دنوں سے ابا جی کے چہرے پر جو بشاشت اور صحت مندی نظر آ رہی تھی، وہ ایک دم کافور ہونے والی تھی۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''چچا! اس بات کا پتا ابا جی کو چلے گا تو کیا ہوگا؟''

''یہی سوچ سوچ کر تو میں پریشان ہو رہا ہوں۔ ساری اُمیدیں زمین کے اس سودے سے ہی تھیں۔ تمہارے سسرال والوں نے بڑا سخت وار کیا ہے۔ اگر ہم نے کوئی حل نہ نکالا تو

قرض خواہوں سے عزت بچانی مشکل ہو جائے گی۔''

''آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں، کیا چاہتے ہیں وہ؟'' شانی نے کہا۔

''یہ بات تو وہی بتا سکتے ہیں۔ فاخر سے اب تک ہم میں سے کسی کی بات نہیں ہوئی ہے لیکن جو خبریں پہنچ رہی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عادل پر بہت خفا ہے۔ عادل تمہیں بغیر اجازت کے نارپور سے لے آیا تھا۔ اس کی گولی سے فاخر کا کارندہ زخمی بھی ہوا ہے۔ شاید اب فاخر چاہتا ہے کہ ان واقعات پر اس سے معافی مانگی جائے۔''

''لیکن چاچا! یہ ساری تو غیروں والی باتیں ہیں۔ وہاں نارپور میں سراسر زیادتی اس اکبرے نامی ملازم کی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ فاخر یہاں آجاتے، ابا جی کی خیریت بھی پوچھ لیتے اور باقی معاملے بھی صاف ہو جاتے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی اکڑ توڑ کر یہاں آئے گا۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ تم خود واپس آجاؤ۔''

☆======☆======☆

حالات بہتر ہونے کے بجائے بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پون صدی سے دشمنی کی جو چنگاری دونوں خاندانوں کے اندر دبی ہوئی تھی، وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی ہے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے بڑی احتیاط اور نرم روی کے ساتھ بڑے بھائی چوہدری ارشاد کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ خبر اتنی سنگین تھی کہ ساری احتیاط کے باوجود اس کا اثر چوہدری ارشاد پر ہو رہا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور سینے میں ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔

شانی اپنے ابا جی کی حالت دیکھ کر نیم جان ہو رہی تھی۔ یہ خیال بار بار اس کے دل میں آتا کہ شاید فاخر کے لئے ابا جی کا خط روک کر انہوں نے غلطی کی ہے۔ اگر معذرت کا وہ خط فاخر اور مہر جی تک پہنچ جاتا تو ہوسکتا تھا کہ حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ اگر شانی کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے پندار کی ذرہ بھر پرواہ کئے بغیر از خود نارپور پہنچ جاتی اور اپنے شوہر کی ہر کڑوی کسیلی بات سر جھکا کر سن لیتی لیکن ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اب دھیرے دھیرے یہ دو خاندانوں کی انا اور عزت کا مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ عادل تو اس قدر مشتعل تھا کہ شانی کی واپسی کی بات بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ سودا ختم ہونے والے واقعے کے بعد چچا مشتاق بھی عادل کے ہم خیال نظر آتے تھے۔ چچانیس ''درمیان درمیان'' محسوس ہوتے تھے۔ وہ کبھی ایک طرف کی بات کرنے لگتے تو کبھی دوسری طرف کی۔

یہ سوچ کر شانی کا دل پتے کی طرح کانپنے لگتا تھا کہ کہیں مردوں کی دشمنی اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ خون خرابا شروع ہو جائے۔ اسے اپنے بھائی عادل کی تیز طبیعت سے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس روز تو چچا مشتاق کے ساتھ مل کر شانی نے کسی نہ کسی طرح عادل کو روک لیا تھا لیکن اس کے اشتعال پر کب تک پہرا بٹھایا جا سکتا تھا۔ چچا رئیس اسے مسلسل سمجھانے بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا رہے تھے کہ جو کچھ بھی ہے اب شانی اس گھر کی بہو ہے۔ اگر کسی بڑے جھگڑے کی وجہ سے شانی کی زندگی پر اثر پڑے گا تو ہم سب گناہ گار ہوں گے۔ ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔

دوسرے روز صبح سویرے شانی کی آنکھ کھلی۔ ابا جی کو دیکھنے کے بعد وہ صحن کی طرف جا رہی تھی جب اس نے دیکھا کہ ملازم شفیع محمد بہت سی لاٹھیاں لئے حویلی کے پچھواڑے جا رہا ہے۔ وہ جانتی تھی یہ لاٹھیاں کہاں استعمال ہوں گی۔ حویلی کے پچھواڑے ایک بڑا اکھاڑا تھا یہاں کشتی، کبڈی اور لٹھ بازی وغیرہ ہوتی تھی۔ لٹھ بازی کے لئے عموماً اتوار کا دن چنا جاتا تھا۔ اتوار کے دن عادل بھی بڑے اہتمام سے اکھاڑے میں پہنچتا تھا۔ لٹھ بازی کے مقابلے دیکھتا تھا اور اکثر خود بھی ان مقابلوں میں حصہ لیتا تھا، لیکن آج تو اتوار نہیں تھا۔ پرسوں بھی اتوار نہیں تھا، پرسوں بھی شانی نے صبح سویرے عادل کو اکھاڑے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ شفیع محمد کے علاوہ رنگ والی کا مشہور لٹھ باز شاہو پہلوان بھی اس کے ساتھ تھے۔ شانی دبے پاؤں بھائی کے کمرے کی طرف گئی شانی کی توقع کے عین مطابق عادل کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اکھاڑے میں ہے۔

صبح نو بجے کے قریب شانی نے عادل کو دوبارہ دیکھا۔ اس وقت شانی اور ابا جی ناشتہ وغیرہ کر چکے تھے۔ عادل پسینے میں شرابور تھا اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اکھاڑے میں خاصی کسرت کی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ان دنوں نظر آیا کرتا تھا جب رنگ والی کے نواح میں ''بڑا میلہ'' لگتا تھا۔ اس میلے میں لٹھ بازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ عادل جوش و خروش سے ان مقابلوں میں حصہ لیتا تھا اور مقابلوں کی تیاری کے لئے خوب کسرت کرتا تھا لیکن آج کل تو کوئی میلہ نہیں تھا پھر وہ کیوں ایسے ہلکان ہو رہا تھا۔

وہ دیر تک اس بارے میں سوچتی رہی اور اس کے ذہن میں انجانے اندیشے سر اٹھاتے رہے۔

شام کو اسے ایک نئی بات کا پتا چلا۔ وہ زنانے کے صحن میں بیٹھی تھی اور دو ملازماؤں کو تندور میں روٹیاں لگاتے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں چچا مشتاق آئے اور موڑھا گھسیٹ کر اس

کے پاس آ بیٹھے۔ ان کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ شانی سے پوچھنے لگے۔
''کیا عادل نے تم سے کوئی بات کی ہے؟''

''کیسی بات، چاچا؟'' شانی نے الجھن سے پوچھا۔

''کوئی بھی بات؟'' شانی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ہمارے منع کرنے کے باوجود عادل، فاخر سے ملا ہے اور شاید دونوں میں ''سردی گرمی'' بھی ہوئی ہے۔''

شانی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کے اپنے دل میں بھی بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ عادل چپکا نہیں بیٹھا رہے گا کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔ ''آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا ہے چاچا؟'' شانی نے پوچھا۔

''بس کسی بندے نے مجھے بتایا ہے اس نے سوموار کے روز عادل کی جیپ کو نارپور کے راستے پر دیکھا تھا، فاصلہ زیادہ تھا وہ عادل کو تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کا خیال ہے کہ جیپ یہی تھی۔''

شانی خاموش رہی۔ چچا مشتاق نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں اندر ہی اندر یہ دونوں لڑکے معاملہ مزید خراب نہ کر لیں۔ تم عادل سے ٹوہ لینے کی کوشش کرو کہ وہ نارپور گیا تھا یا نہیں۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں اس کا ذہن خود بخود صبح والے واقعے کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اکھاڑے سے واپسی پر عادل کا چہرہ کس طرح پسینے میں شرابور تھا اور آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ شانی کو یہ بھی پتا تھا کہ اس کا شوہر فاخر بھی لٹھ بازی کا شوق رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ پون صدی پہلے جو کہانی اس کی دادی دولت بی بی کے بیاہ سے شروع ہوئی تھی اس میں بھی لٹھ بازی کا عمل دخل تھا۔ کہیں یہ ''لٹھ بازی'' پھر سے تو اس کہانی میں داخل نہیں ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اندر ہی اندر ایک مہیب اندیشہ اس کے وجود میں سرسراتا رہا۔ ''کیا سوچ رہی ہو شانی؟'' چچا کی آواز نے اسے خیالوں کی دنیا سے چونکا دیا۔

''کک...... کچھ نہیں چاچا...... میں سوچ رہی ہوں کہ بھائی عادل آج کل روزانہ صبح سویرے اکھاڑے میں جا رہے ہیں۔ شاہو پہلوان اور شفیع محمد بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کسی...... لڑائی وغیرہ کی تیاری تو نہیں ہے۔ مم...... میرا مطلب ہے، کہیں فاخر اور عادل میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہونے والا؟''

"یہی ڈر تو مجھے ہے۔ میرے خیال میں تم طریقے سے پوچھو گی تو عادل کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔"

شانی نے چچا مشتاق سے وعدہ کیا کہ وہ کل صبح عادل سے ٹوہ لینے کی کوشش کرے گی۔

لیکن اگلی صبح شانی پر انکشاف ہوا کہ عادل کو فوری طور پر راولپنڈی جانا پڑ گیا ہے۔ دراصل فصل کی بوائی سر پر ہے۔ اخراجات کے لئے نقد رقم کی شدید ضرورت تھی لیکن رقم کا دور دور پتا نہیں تھا۔ قرض خواہ علیحدہ تنگ کر رہے تھے۔ راولپنڈی میں ایک پارٹی سے چوہدری ارشاد کے دیرینہ کاروباری مراسم تھے۔ چوہدری ارشاد نے ہی عادل کو راولپنڈی بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ چاہے سخت شرائط پر ہی ملے لیکن کچھ قرضہ مل سکے۔

عادل سے تو شانی کی ملاقات نہیں ہو سکی لیکن جو کچھ وہ عادل سے معلوم کرنا چاہتی تھی، وہ اسے کسی اور سے معلوم ہو گیا۔ یہ اس کی جان سے پیاری سہیلی سکینہ تھی۔ سکینہ گاؤں ہی کے ایک لڑکے منظور سے پیار کرتی تھی۔ منظور جٹ نامی یہ لڑکا نارپور بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ اسے نارپور کے اکثر حالات کا پتا ہوتا تھا۔ اس نے سکینہ کو بتایا تھا کہ نارپور کی بیٹھک (دائرے) میں عادل اور فاخر میں سخت جھگڑا ہوا ہے۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتے پہنچتے رہی۔ لاٹھیاں اور پستول نکل آئے تھے لیکن بڑوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ فاخر نے عادل کو طعنہ دیا کہ اس کے دادا نے لاٹھیاں مار مار کر عادل کے دادا کا کچومر نکال دیا تھا۔ لوگ اسے اکھاڑے سے چارپائی پر ڈال کر باہر لے گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ملی بھگت سے دولت بی بی کا دولہا بن گیا تھا۔ فاخر نے عادل سے کہا تم بھی اسی بھگوڑے خاندان سے ہو۔ اس خاندان کے سورمے اکھاڑے میں زمین چاٹتے ہیں اور اکھاڑے سے باہر بے غیرتی سے گردن اکڑاتے ہیں۔

فاخر کی اس بات کا عادل نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ چند بڑوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور فیصلہ کیا کہ اگر وہ دونوں طاقت آزمانا ہی چاہتے ہیں تو پھر اکھاڑے میں آزمائیں۔ نارپور کے بڑوں کی طرف سے عادل کو چیلنج کیا گیا جو اس نے فوراً قبول کر لیا۔ طے ہوا کہ دونوں جوان چاند کی پہلی تاریخ کو شاہ مراد کے عرس پر آپس میں مقابلہ کریں گے۔ لٹھ بازی کے اس مقابلے کا فیصلہ لٹھ بازی کے مشہور استاد بابا نور دین نے کرنا تھا اور مقابلے کے لئے انہیں خاص طور سے گجرات سے بلایا گیا تھا۔

یہ ساری تفصیلات شانی کے لئے حیران کن تو تھیں لیکن غیر متوقع نہیں تھیں۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کے اندیشے وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ یہ صورتِ حال کربناک تھی کہ اس کا شوہر اور بھائی تصادم کے راستے پر چل نکلے ہیں۔

دفعتاً وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے ایک جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی تھی۔ نارپور کی حویلی میں یہ آواز کئی بار اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی اور جب بھی ٹکرائی تھی، اس کے دل و دماغ کو ایک طرح کی کپکپی سے دوچار کر گئی تھی۔ یہ فاخر کی جیپ تھی۔ خون شانی کی رگوں میں سنسنا اٹھا۔ خوف، شرم، خوشی، پریشانی، ایک ساتھ کئی طرح کی کیفیتیں اس نے محسوس کیں۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا فاخر اپنے دو محافظوں کے ساتھ سیاہ جیپ سے اُتر رہا ہے۔ کھڑکھڑ کرتی سفید شلوار قمیص، پاؤں میں اونچی نوک کا کھسہ، واسکٹ اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی انگشتریاں۔

شانی یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر اس وقت عادل گھر میں ہوتا تو کیا ہوتا... یقیناً وہ فاخر کو حویلی میں قدم نہ رکھنے دیتا۔ شاید فاخر آیا ہی اس لئے تھا کہ اسے عادل کے موجود نہ ہونے کی خبر تھی۔

سکینہ نے شانی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "لے آ گیا تیرا جوگی۔ مجھے پتا تھا وہ تیرے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکے گا۔"

شانی اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی سانسوں کی لَے تیز ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ابا جی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ ملازمہ نے شانی کو بتایا کہ چوہدری صاحب (فاخر) بھی وہیں موجود ہیں۔

شانی کچھ دیر تک اپنے حواس پر قابو پاتی رہی پھر اس نے بالوں میں کنگھی پھیری، لباس درست کیا، اوڑھنی لی اور لرزاں قدموں سے ابا جی کے کمرے میں چلی گئی۔ "السلام علیکم!" اس نے فاخر کو سلام کیا۔

بھاری بھرکم آواز میں جواب ملا اور تیز و تند نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہی جسم اور روح کو چھیدتی ہوئی اجنبی نگاہیں۔ وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

فاخر رسمی لہجے میں چوہدری ارشاد کی خیر خیریت دریافت کر رہا تھا۔ چوہدری ارشاد کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ شاید داماد کی طرف سے کی جانے والی اس مزاج پُرسی کو وہ بہت بڑی مہربانی سمجھ رہے تھے۔

شانی جانتی تھی کہ اب ابا جی نارپور میں پیش آنے والے واقعے پر معذرت کا اظہار شروع کر دیں گے اور اس بات پر تاسف کا اظہار کریں گے کہ عادل کے ہاتھوں سے مہر جی کے چہیتے ملازم کو گولی لگ گئی۔ ایسا ہی ہوا ابا جی نے نادم لہجے میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو انہوں نے خط میں لکھا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی پشیمانی کے کئی فقرے ان کی زبان سے ادا

ہوئے۔ فاخر ایک مہیب خاموشی کے ساتھ سنتا رہا اور بس دو تین بار سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اباجی نے خط کی بات نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد چچا رئیس اور پھپھو آمنہ بھی آ گئے۔ سب فاخر سے دبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چائے بھی تناؤ کے ماحول میں ہی پی گئی۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ فاخر کے چہرے پر سفر کی گرد تھی۔ وہ قدرے تھکا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ چوہدری ارشاد نے کہا۔ ''بیٹا، جاؤ تھوڑی دیر آرام کر لو پھر نہا دھو لینا، اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔''

شانی، فاخر کو لے کر کمرے میں آ گئی۔ اس کا دل سینے میں چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے وہ سارے ناگوار لمحے یاد آ گئے تھے جن کا تعلق فاخر کی قربت سے تھا۔ بوجھل سانسیں، رخساروں پر چبھتے ہوئے کانٹے اور ایک بالوں بھرا جسم، جس کی نسبت ایک ناگوار وزن سے تھی۔ روندتا اور کچلتا ہوا وزن۔ دل میں کراہت سی جاگنے لگی جسے شانی نے بمشکل دبایا۔

''کیسا حال ہے تمہارا؟'' فاخر نے پوچھا۔

''بس ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں اباجی کی وجہ سے بہت پریشان رہی ہوں۔''

''یہ تو ظاہری سی بات ہے۔'' فاخر نے کہا۔ لہجے میں طنز کی ہلکی سی چبھن بھی تھی۔

شانی اس چبھن کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ مجھے لے جانے کے لئے آئے ہیں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ تم جانا چاہتی ہو؟''

''مجھے تو جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لل...... لیکن......''

''لیکن تمہیں عادل کا ڈر ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا ایسا ہی ہو گا۔ بہرحال تم گھبراؤ مت۔ میں بھی تمہیں ایسے نہیں لے جاؤں گا۔ اس وقت لے جاؤں گا جب یہ لوگ خود تمہیں میرے پاس بھیجیں گے۔'' فاخر کا لہجہ بظاہر نرم تھا مگر اس کی تہہ میں چھپی ہوئی دھمکی آمیز حرارت محسوس کی جا سکتی تھی۔

''آپ بات کو بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ عادل آپ کے لئے اچھے خیالات رکھتا ہے۔''

''وہ رکھے گا۔ اسے رکھنا پڑیں گے۔ ابھی اس کے سر میں دو چار کیڑے رینگ رہے ہیں۔ یہ کیڑے جھڑ جائیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا...... اور میرے خیال میں اس کا ایک کیڑا تو اسی ہفتے میں جھڑے گا۔''

شانی سمجھ گئی کہ فاخر لٹھ بازی کے مقابلے کی بات کر رہا ہے۔

''فاخر! میں جو باتیں سن رہی ہوں وہ مجھے پشیمان کر رہی ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ شاہ مراد کے عرس پر لٹھ بازی کے مقابلے ہوں گے اور ان میں آپ اور عادل بھی لڑیں گے۔''

''اس لڑائی کی دعوت میں نے نہیں، اس نے دی تھی۔ پورے نارپور کے سامنے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر چارپائی پر ڈالے گا۔''

''خدا کے لئے فاخر! خدا کے لئے ایسی باتیں مت کریں۔ یہ بڑی گھٹیا باتیں ہیں۔ اس طرح تو ہم خود اپنے آپ کو تماشا بنائیں گے۔ اس تماشے کو شروع ہونے سے پہلے روک دیں۔''

''تماشا تو بہت سال پہلے شروع ہو گیا تھا۔'' فاخر نے زہرخند لہجے میں کہا اور تیز قدموں سے باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

جب تک فاخر باتھ روم میں نہاتا رہا، شانی بے قراری سے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ اسے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں عادل واپس نہ آ جائے۔ اس کے آنے کا امکان نہیں تھا پھر بھی اندیشہ آنا گھمبیر تھا کہ وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ وہ آ جاتا اور فاخر کو اس حویلی کے داماد کی حیثیت سے یہاں دندناتے پاتا تو یقیناً اپنے غضب پر قابو نہ رکھ سکتا۔

فاخر قریباً تین گھنٹے تک حویلی میں موجود رہا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی شانی اور چوہدری ارشاد کے ساتھ کھایا، پھر وہ رخصت ہو گیا۔ اس نے شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات نہیں کی تھی اور یہ ایک طرح سے ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اگر وہ شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کرتا تو شانی کے والد، دونوں چچا اور پھپھو سخت مخمصے میں پڑ جاتے۔ شانی کو اپنے ساتھ لے جانے والا معاملہ اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ ماہ و سال کا پردہ چاک ہو گیا تھا اور اس کے عقب میں چھپا ہوا دشمنی کا عفریت کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ فاخر ایک داماد کی حیثیت سے اس حویلی میں آیا ہوتا تو وہ یہاں کے ذرے ذرے کو اپنے استقبال پر مائل دیکھتا لیکن وہ داماد سے زیادہ ایک دشمن کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ شانی کو یہ بتانے آیا تھا کہ وہ اس کے بھائی کی اکڑ اور اس کے گھمنڈ کو خاک میں ملائے گا۔ وہ نہ صرف جسمانی نقصان کی بات کر رہا تھا بلکہ مالی لحاظ سے بھی عادل اور پوری فیملی کو دھچکے پہنچا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے دادا کی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے وہ چوہدری ارشاد کی فیملی سے دشمنی چکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔

اگلے روز عادل واپس آ گیا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ فاخر کی حویلی میں آمد اس سے چھپی

نہ رہ سکے گی۔ شانی نے سوچا کہ وہ خود ہی مناسب طریقے سے اسے بتا دے۔ ابا جی سوئے ہوئے تھے۔ شانی بھائی کو حویلی کی چھت پر لے گئی اور سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ حسب توقع عادل کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''شانی! وہ یہاں داماد کی حیثیت سے نہیں دشمن کی حیثیت سے آیا تھا اور اگر آئندہ بھی آیا تو اسی حیثیت سے آئے گا۔ میں اسے اس حیثیت سے یہاں نہیں آنے دوں گا۔ خود مر جاؤں گا...... یا......''

''خدا کے لئے بھائی۔ ایسی باتیں مت کرو۔'' شانی نے اپنے ہاتھ سے عادل کے ہونٹوں کو بند کیا اور پھر سسکنے لگی۔

☆======☆======☆

شانی نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بس پھپھو آمنہ کے بے حد اصرار پر مکئی کی روٹی کے دو لقمے لے کر ذرا سی لسی پی لی تھی۔ اس کا سینہ غم اور پریشانی سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی نکیلے پنجوں والا جانور جیسے اندر ہی اندر اس کے دل کو زخمی کر رہا تھا۔ دو روز بعد چاند کی پہلی تاریخ تھی۔ شاہ مراد کے عرس پر لاٹھی کے مقابلے ہونے تھے۔ سب سے اہم مقابلہ دو جوان چوہدریوں کے درمیان تھا۔ نارپور کا چھوٹا چوہدری فاخر عرف فاخا اور رنگ والی کا چھوٹا چوہدری عادل۔ اس مقابلے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ دونوں چوہدری آپس میں سالا بہنوئی بھی تھے۔ ایک طرف رشتے داری تھی۔ دوسری طرف دشمنی کی باتیں تھیں۔ لوگ الجھن کا شکار تھے کہ یہ کیسی رشتے داری اور کیسی دشمنی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دشمنی پہلے تھی رشتے داری بعد میں ہوئی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ رشتے داری کے بعد دشمنی پیدا ہوئی ہے۔ رنگ والی اور نارپور کے لوگوں میں اس مقابلے کے حوالے سے خصوصی جوش پایا جاتا تھا۔ اپنے اپنے چوہدری کے بارے میں بلند و بانگ دعوے کئے جا رہے تھے اور نیک تمنائیں پالی جا رہی تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب شانی اپنی پرانی ملازمہ نوراں کی عیادت کر کے حویلی واپس آ رہی تھی، اس نے فیضو حلوائی کی دکان کے پاس لوگوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ موضوع شاہ مراد کے عرس پر ہونے والا مقابلہ ہی تھا۔ بس دو چار اُڑتے اُڑتے فقرے ہی شانی کے کانوں میں پڑے تھے۔

فیضو حلوائی کہہ رہا تھا۔ ''کوئی مذاق نہیں ہے۔ پندرہ پنڈوں کی پگ ہے چوہدری عادل کے سر پر۔ مجھے تو پکا یقین ہے۔ یہ مقابلہ دو چار منٹ سے زیادہ نہیں چلے گا۔ چوہدری عادل کا

ایک بھی سیدھا ہاتھ پڑ گیا تو فاخا صاحب زمین چاٹتے نظر آئیں گے۔''

کرامت تیلی نے کہا۔ ''تم دو چار منٹ کی بات کرتے ہو، مجھے تو لگتا ہے پہلے بلے میں ہی چوہدری فاخے کا سر کھلے گا۔ سنا ہے چوہدری فاخے کا کھبا ہتھ زیادہ چلتا ہے ... اور کھبے ہتھ والے کو تو اپنا چوہدری دو سیکنڈ میں تارے دکھاتا ہے۔''

شوکے پرچون والے نے مداخلت کرتے ہوئے رائے پیش کی۔ ''پر یارو! اک بات سوچنے والی بھی ہے اور یہ بات تم کو بھی ماننا پڑے گی۔ ڈیل ڈول کے حساب سے چوہدری فاخا اپنے چوہدری پر بھاری ہے۔''

فیضو حلوائی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''شوکے تُو بھی نرا سائیں ہے۔ اوئے باگڑ بلے! یہ کوئی کشتی کا مقابلہ نہیں ہے۔ لٹھ بازی میں ڈیل ڈول سے زیادہ پھرتی کی لوڑ ہوتی ہے۔ ہتھ میں کرامات ہو تو عام سا بندہ بھی بھولو پہلوان کی بھنبھیریاں گھما سکتا ہے۔ تُو دیکھ لینا پہلے بلے میں نارپور کا پھنے خان لہولہان نظر آئے گا.....''

چادر میں لپٹی ہوئی شانی اپنی پھپھو کے ساتھ آگے نکل گئی تھی۔ فیضو حلوائی کی دکان سے بلند ہونے والی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔

لوگ ہڈیاں ٹوٹنے اور لہولہان ہونے کی باتیں کر رہے تھے اور جن دو افراد کے بارے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، وہ دونوں اس کے اپنے تھے ایک پیارا بھائی تھا، ایک سر کا سائیں تھا۔

اب وہ حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہی تھی اور دو روز بعد عرس پر ہونے والی لڑائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو رہے تھے۔ دوپہر کی گرمی بتدریج چھاؤں اور ٹھنڈک میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک طرف گھاس کا قطعہ تھا۔ اس گھاس کی پرلی طرف سفید، زرد اور سُرخ گلاب کے پھول تھے۔ ان پھولوں کو شانی نے بڑی محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ شانی نے ملازمہ مختاری سے باسی روٹی منگوائی پھر وہ برآمدے کے گول ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کی طرف پھینکنے لگی۔ چہچہاتی چڑیوں کا روٹی کے ٹکڑوں پر جھپٹنا اور پھدکنا اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔

کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر یہ نظارہ دیکھا کرتی تھی لیکن اب وہ اکیلی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب وہ پریشان ہوتی تھی اس طرح کے کاموں میں اسے بہت سکون ملتا تھا۔ چڑیوں کی طرف روٹی کے ٹکڑے پھینکنا بھی ایک معمولی سا عمل تھا لیکن اسے راحت محسوس

ہو رہی تھی۔ پریشان کن خیالات کی طرف سے اس کا دھیان بٹ رہا تھا۔ اچانک وہ بُری طرح چونک گئی۔ اس کی نگاہ دور گلاب کے پودوں کی طرف گئی۔ اسے ایک شخص نظر آیا۔ وہ بظاہر مالی دکھائی دیتا تھا۔ تہبند اور قمیص پہنے وہ پاؤں کے بل پودوں کے پاس بیٹھا تھا اور کھرپے سے زمین کی گوڈی کر رہا تھا۔ شانی نے اس کا چہرہ دیکھا اور جسم سنسنا کر رہ گیا۔ یہ شخص اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ چند ہفتے پہلے وہ اس سے ملاقات کر چکی تھی۔

☆======☆======☆

نارپور حویلی کی وہ رات ابھی بھولی نہیں تھی۔ دروازے کا قفل دیکھنے کے لئے وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے والے کمرے میں اسے ایک لہولہان شخص نظر آیا تھا۔ وہ بس بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ شانی بے ساختہ آگے بڑھی تھی اور اس نے زخمی کو گرنے سے بچانے کے لئے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا تھا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں کوند گیا۔ آج کئی ہفتے بعد یہ شخص مختلف حلیے میں یہاں رنگ والی میں موجود تھا اور ملازم کی حیثیت سے حویلی میں نظر آ رہا تھا۔

شانی نے نگاہیں سکیڑ کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا...... پھر اس نے کھرپا چلاتے چلاتے اپنا سر اُٹھایا۔ چند لمحے کے لئے دونوں کی نگاہ ٹکرائی۔ شانی جھرجھری لے کر رہ گئی۔ ہاں یہ وہی تھا...... اور یہ نگاہ بھی وہی تھی جس نے نارپور کی حویلی میں شانی کو سرتاپا دہلا دیا تھا۔ ایک جوگی کی سی نگاہ...... اپنے اندر بے پناہ گہرائی اور پوشیدہ راز سمیٹے ہوئے۔

شانی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس شخص نے پھر سے سر جھکایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ قطعی لاتعلق اور بیگانہ نظر آنے لگا۔ شانی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ہتھیلی پر جمع ہو جانے والی روٹی کے بہت سے ٹکڑے چڑیوں کی طرف پھینکے اور کمرے کی طرف لپکی۔ وہ کچھ دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنے اور نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے ملازمہ مختاری کو بلایا۔ وہ چولہے میں آگ جھونکتے ہوئے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں دھوئیں سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ''وہ...... باہر جو بندہ گلاب میں گوڈی کر رہا ہے، اسے جانتی ہو؟''

مختاری نے کہا۔ ''وہی خاکی دھوتی والا جس کے بال لمبے لمبے ہیں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مختاری بولی۔ ''وہ نیا ملازم ہوا ہے جی...... بابے فخری نے رکھا ہے اسے۔''

''کب ہوا ہے ملازم؟''

''ڈیڑھ دو ہفتے ہو گئے ہیں جی...... اچھا بندہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے، محنتی بھی بڑا ہے۔ پرسوں اس نے صرف ایک دن میں پچھواڑے کی ساری گھاس کاٹی ہے اور جمعے والے دن اکیلے ہی ڈیرے کی باغیچی صاف کی ہے۔ وہ پچھلا مالی ''ماجھو'' تو ایک غنڈا تھا جی...... اس کی آنکھ میں سؤر کا بال تھا۔ خبیث کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ یہ اچھا بندہ ہے، نماز بھی پڑھتا ہے۔''

شانی نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا نام ہے اس کا؟''

''واحدی...... واحدی کہتے ہیں جی اسے، میں نے ایک دن پوچھا تھا تو کہتا تھا رام پور سے آیا ہوں، ویسا بولتا بہت کم ہے۔ دو چار دن تو میں یہی سمجھتی رہی کہ گونگا ہے۔'' مختاری نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی۔ ''اگر آپ نے بات کرنی ہے تو میں اسے بلاؤں یہاں؟''

''نن...... نہیں...... کوئی ضرورت نہیں۔'' شانی نے کہا۔

مختاری کے جانے کے بعد شانی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ یہ ہرگز اتفاق نہیں تھا کہ نارپور کے بعد یہ بندہ یہاں حویلی میں نظر آیا تھا۔ شانی ایک حساس اور زیرک لڑکی تھی وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کا ہر زاویہ بھانپ سکتی تھی، اسے وہ لمحے یاد تھے جب وہ نارپور کی حویلی میں اس شخص کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ وہ اپنی شدید تکلیف سے قطعی بے خبر دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ شانی کو اس کی نگاہ سے شدید جھنجلاہٹ محسوس ہوئی تھی لیکن یہ جھنجلاہٹ اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ طیش میں ڈھل جاتی...... آج بھی وہ جھنجلائی ہوئی تھی مگر یہ کیفیت طیش یا شدید پریشانی میں نہیں ڈھلی پتا نہیں کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ یہ بندہ بے ضرر ہے کم از کم اسے اس بندے سے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو نظرانداز کر دیتی۔ اگر یہ شخص دانستہ طور پر اس حویلی میں داخل ہوا تھا اور ایک مالی کے روپ میں یہاں موجود تھا (وہ شکل وصورت سے ہرگز مالی نہیں لگتا تھا) تو پھر اس کا نوٹس لیا جانا ضروری تھا اور یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

اسی دوران میں عادل آ گیا۔ شانی کی توجہ عادل کی طرف مبذول ہو گئی۔ عادل کی تھوڑی پر نیل کا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ شانی سمجھ گئی کہ اسے یہ چوٹ شاہو پہلوان کے

ساتھ لٹھ بازی کی مشق کرتے لگی ہوگی۔ ''کہاں سے آ رہے ہو بھائی؟'' شانی نے پوچھا۔

''شاہ مراد کے مزار سے، تایا معصوم ساتھ لے کر گئے تھے کہتے تھے وہاں منت مانی جاتی ہے۔ گاؤں کے کئی لوگ بھی ساتھ چل پڑے اچھا خاصا جلوس بن گیا۔''

''کیا منت مانی آپ نے؟''

''یہی کہ پرسوں مقابلے میں کامیابی ملے، میں وہ برسوں پرانا قرض چکا سکوں جو ہمارے خاندان کے سر پر ہے اور جس کا طعنہ نارپور میں سننا پڑا تھا۔''

''ابا جی کو تو ابھی کچھ نہیں بتایا؟''

''نہیں اور ابھی بتانا بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے دل پر کسی طرح کا بوجھ پڑے۔''

''اگر واقعی آپ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ سب کچھ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ کیوں بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں، کبھی لڑائیوں اور مقابلوں سے بھی کسی کا فیصلہ ہوا ہے؟''

''جو لوگ صرف لڑائی کی زبان سمجھتے ہیں، ان پر کوئی اور زبان اثر نہیں کرتی۔''

''ابا جی کی طبیعت آج پھر گری ہوئی ہے۔ بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا ہے۔'' شانی نے کہا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں ان کو...... تم جا کر ذرا بابے فخری کو سمجھا دو کہ ابا جی سے ابھی مقابلے وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے بھی اسے تاکید کی تھی لیکن تمہیں پتا ہی ہے ابا جی کے سامنے وہ سب کچھ فرفر بول دیتا ہے۔''

''اچھا، میں ابھی بات کرتی ہوں اس سے۔'' شانی نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

عادل، چوہدری ارشاد کے کمرے کی طرف بڑھا تو شانی بابے فخری کو دیکھنے کے لئے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ خود بھی بابے فخری سے ملنا چاہتی تھی اور اس سے واحدی نامی شخص کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ اسے اپنی حویلی میں دیکھنے کے بعد اس کا خیال ایک لمحے کے لئے بھی شانی کے ذہن سے نکلا نہیں تھا لیکن جب وہ بابے فخری کو ڈھونڈنے نکلی تو اسے پتا چلا کہ وہ تو ظہر کے بعد فوری طور پر اپنے گاؤں واقع کھاریاں چلا گیا تھا۔ وہاں اس کا بھائی شدید بیمار ہے۔

شانی رات بھر پریشان رہی۔ حالات تو پہلے بھی پریشان کن تھے لیکن اب ان میں ایک اور پریشانی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کا تعلق اس شخص سے تھا جس کا نام ملازمہ نے واحدی بتایا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کس لئے تھا؟ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ کیا اسے اس بارے میں عادل یا چاچا مشتاق کو بتانا چاہئے؟ لیکن اس سے پہلے وہ بابے فخری سے تفصیل سے بات کرنا چاہتی

تھی۔

امید تھی کہ بابا فخری شام سے پہلے پہنچ جائے گا لیکن فخری شام تک نہیں آیا۔ فخری کے بجائے ایک خبر پہنچ گئی، فخری کا بھائی فوت ہو گیا تھا۔

اگلے روز شاہ مراد کا عرس تھا۔ شاہ مراد کا مزار رنگ والی گاؤں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود علاقے کے بہت سے لوگ بسوں، ٹرالیوں اور موٹر سائیکلوں کے ذریعے عرس میں پہنچتے تھے۔ اس دفعہ لوگوں میں اضافی جوش و خروش تھا اور اس کی وجہ وہ مقابلہ تھا جو نارپور اور رنگ والی کے دو جوان چوہدریوں کے درمیان ہونا تھا۔ عادل کے پُر زور اصرار پر چوہدری ارشاد سے یہ خبر ابھی تک چھپائی گئی تھی۔ وہ چونکہ بیماری کی وجہ سے اپنے کمرے تک محدود تھے اس لئے گھر والوں کو خبر چھپانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور پھر عرس کا دن پہنچ گیا۔ شانی پر صبح سے ہی گھبراہٹ سوار تھی۔ وہ اکھاڑے کی طرف سے آنے والی پُر شور آوازیں سن رہی تھی۔ عادل اور اس کے ساتھی آج منہ اندھیرے سے ہی لٹھ بازی کی مشق میں مصروف تھے۔ گاہے بگاہے بلند نعروں کی آواز بھی شانی کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اباجی کے کمرے کی طرف بھی نہیں گئی۔ اگر اباجی ان نعروں اور شور وغیرہ کے بارے میں پوچھتے تو جواب میں اسے جھوٹ بولنا پڑتا اور اباجی کے سامنے وہ جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

صبح آٹھ بجے کے قریب بس اور ٹرالیاں شاہ مراد کے مزار کی طرف روانہ ہو گئیں لیکن ابھی اس قافلے کو روانہ ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے موسم کے تیور بدل گئے۔ پہلے طوفانی آندھی آئی اس کے بعد گھرے تاریک بادلوں کے ساتھ تابڑ توڑ بارش ہونے لگی۔ بارش کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ شانی کو یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں امید کی کرن پیدا ہو رہی تھی۔ اس خراب موسم میں عرس کے انتظامات یقیناً درہم برہم ہو جانے تھے۔ ایسے میں لٹھ بازی کے مقابلے ہونے بھی بہت مشکل تھے۔

بارش سہ پہر تک جاری رہی اور پھر ایک معمولی سے وقفے کے بعد پھر شروع ہو گئی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عرس پر جانے والے زائرین اور تماشائی واپس آنا شروع ہو گئے۔ عادل بھی واپس آ گیا۔ شانی کی بے تاب نگاہوں نے بھائی کے چہرے کا طواف کیا۔ عادل بالکل صحیح سلامت اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ شانی کو معلوم ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے شاہ مراد کے عرس پر لٹھ بازی اور کبڈی وغیرہ کے مقابلے نہیں ہو سکے۔ اس کے سینے سے اطمینان کی طویل

سانس خارج ہو گئی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا یہ اطمینان عارضی ہے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد شانی نے اپنے گلابوں کو پانی دیا اور پھر کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لئے سو گئی۔ اسے ملازمہ مختاری نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ ''اٹھو بی بی ...اٹھو... دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے؟'' شانی نے ہڑبڑا کر پوچھا اور سینے پر اوڑھنی کو درست کیا۔

''چوہدری فاخا صاحب آئے ہیں۔ ساتھ میں بہت سے لوگ ہیں، پانچ چھ جیپیں ہیں، دو ٹرک بھی بندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو لڑائی کل عرس میں نہیں ہو سکی تھی وہ آج یہاں حویلی کے سامنے میدان میں ہو گی۔''

شانی نے غور کیا تو اسے بھی باہر سے ہلکا شور سنائی دیا۔ نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''بھائی عادل کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''انہوں نے چوہدری فاخا کی بات مان لی ہے، وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے کل بارش کی وجہ سے جو مقابلہ نہیں ہو سکا وہ آج ہو گا۔''

''اباجی کہاں ہیں؟''

''وہ کمرے میں سوئے ہوئے ہیں۔''

''تم سارے دروازے بند کر دو۔ ابا تک کوئی آواز نہیں جانی چاہئے۔'' مختاری اندرونی حصے کی طرف لپک گئی۔ اتنے میں شانی کو عادل کی جھلک نظر آئی۔ وہ ریوالور میں گولیاں بھرتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ شانی تڑپ کر اس کے سامنے آ گئی۔ ''کیا کر رہے ہیں بھائی؟'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کچھ نہیں، بس اس خبیث سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔''

''لل...... لیکن آپ تو گولیاں بھر رہے ہیں۔''

''یہ تو احتیاط کے طور پر ہے پاگلے!''

''خدا کے لئے بھائی! یہ تماشا نہ بنائیں۔''

''تماشا تو وہ بنا رہا ہے۔ اب اس تماشے کا انجام بھی بھگتنا پڑے گا اسے۔'' عادل شانی کو پیچھے ہٹاتا ہوا تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھپھو آمنہ بھی ایک دم پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ اتنے میں حویلی کا پرانا ملازم خادم حسین آگے بڑھا۔ اس نے شانی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی بی بی! آپ دل ہولا نہ کریں یہ کوئی لڑائی تو نہیں ہے، جوانوں کا کھیڈ ہے ابھی

تھوڑی دیر میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

شانی اسے کیسے بتاتی یہ تو وہ کھیڈ ہے جس کا فیصلہ پچھلی پون صدی میں نہیں ہو سکا۔ اب یہ کھیڈ خونی کھیڈ بن چکی ہے۔

دس پندرہ منٹ مزید گزرے پھر حویلی کے سامنے میدان سے بلند ہونے والے نعروں کی آواز واشگاف ہو گئی۔ شانی کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا شوہر ایک عقاب ہے اور اس کا بھائی ایک چکور کی طرح اس کے پنجوں میں جکڑا جانے والا ہے۔

شور بلند ہو گیا تو شانی پھپھو آمنہ، صغراں اور مختاری وغیرہ دوڑ کر حویلی کی چھت پر چلی گئیں۔ یہاں سے نیچے میدان کا منظر ہیجان خیز تھا۔ ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں سینکڑوں لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان دونوں چوہدری چمکدار لاٹھیاں سونتے ایک دوجے کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ دونوں نے پاؤں کھولے ہوئے تھے۔ ان کے کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر پہلا وار کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔

دو ڈھولچیوں نے اندھا دھند ڈھول بجانا شروع کر دیئے۔ ڈھولوں کی دھمک، دلوں کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر قیامت خیز ہو گئی۔

پہلا وار عادل نے ہی کیا تھا۔ فاخر نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ وار اپنی ترچھی لاٹھی پر لیا۔ پھر دوسرا وار بھی اس نے اسی طرح روکا، تیسرا وار اس نے جھک کر بچایا۔ لاٹھی اس کے توانا کندھے سے پھسل کر زمین پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی فاخر نے جوابی حملہ کیا۔ لاٹھیاں ٹکرانے کی آواز دور دور تک گونجی۔ فاخر کے حملے میں بے حد شدت تھی۔ چند لمحے کے لئے تو عادل ڈگمگاتا محسوس ہوا مگر جلد ہی وہ سنبھل گیا۔ تماشائیوں نے حوصلہ افزائی کے لئے نعرے بلند کئے۔ شانی کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا بھائی فاخر کے لئے تر نوالہ نہیں ہے۔ مہارت اور طاقت میں وہ شاید فاخر سے تھوڑا سا کم ہو مگر حوصلے اور جذبے میں وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اگلے تین چار منٹ میں رنگ والی اور نار پور کے سینکڑوں تماشائیوں نے لٹھ بازی کا یادگار مظاہرہ دیکھا۔ بڑھکوں، نعروں اور للکاروں کے شور میں دونوں چوہدری ڈٹ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سی کمزوری دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ عادل کے جبڑے اور سر پر چوٹ آئی تھی۔ سر سے خون رسنے لگا تھا۔ چوہدری فاخر کے منہ پر لاٹھی لگی تھی۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ

گیا ہے۔ شانی ایک طرف اپنے بھائی کے لئے ہمدردی محسوس کر رہی تھی اور دوسری طرف اپنے شوہر کے لئے لیکن یہ بات واضح تھی کہ بھائی کی ہمدردی میں شدت ہے۔ وہ اسے ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ اس کی ہار کے ساتھ اس کے ابا جی، اس کے چچاؤں اور اس کے خاندان کی ہار تھی۔

اچانک شانی کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ہجوم کے درمیان وہ سب سے جدا نظر آ رہا تھا کیونکہ وہ لڑائی کے ان نازک ترین لمحات میں بھی لڑائی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ شانی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ منہ اٹھا کر یک ٹک چھت کی منڈیر کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں شانی دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھی...... یہ وہی تھا جس نے کئی روز سے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ اندیشوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کا نام مختاری نے واحدی بتایا تھا۔ وہ آج کل مالی کی حیثیت سے اس حویلی میں موجود تھا۔

ایک ناگوار احساس کے ساتھ شانی نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ میدان کے بیچوں بیچ اب فیصلہ کن مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ فاخر کے حملوں میں شدت آ گئی تھی اور عادل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک شانی کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ عادل تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ فاخر کے حامیوں کے نعرے فلک شگاف ہو رہے تھے۔ "یا اللہ میرے بچے کی مدد کر۔" پھپھو آمنہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

کچھ ایسی ہی دعا اپنے بھائی کے لئے شانی کے ہونٹوں سے بھی نکل رہی تھی...... رنگ والی کے تماشائی دم بخود نظر آنے لگے تھے۔ ڈھولچیوں کے ہاتھ ڈھول پر ڈھیلے پڑنے لگے۔ اچانک عادل کے ہاتھ سے لاٹھی نکل گئی۔ چمکدار شاموں اور کوکوں والی لاٹھی ایک لمحے کے لئے فضا میں تیرتی ہوئی نظر آئی پھر میدان کے وسط میں جا گری۔ نار پور کے تماشائیوں نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ ایک سیکنڈ کے لئے تو یوں محسوس ہوا کہ لڑائی کا فیصلہ ہو گیا ہے مگر رنگ والی کے چوہدری نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اس نے دو تین قدم بھاگ کر چیتے کی طرح جست بھری اور اپنی لاٹھی کے اوپر گرا۔ اس سے پہلے کہ حریف کی لاٹھی اس کے سر کو چھوتی، وہ ایک بار پھر لاٹھی سمیت اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ رنگ والی کے سینکڑوں تماشائیوں میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ عادل چومکھی لڑائی کے انداز میں لاٹھی کو چاروں طرف گھماتا ہوا چوہدری فاخر پر حملہ آور ہوا۔ چوہدری فاخر کو ایک دو سخت چوٹیں لگیں اور وہ لڑکھڑا گیا۔ رنگ والی کے تماشائی خوشی سے ناچنے لگے۔ تاہم اسی دوران میں چوہدری فاخر نے ایک وار کیا۔ یہ چوٹ عادل کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کے بعد عادل سے سنبھلا نہیں گیا۔

مزاحمت کی ہر کوشش بپھرے ہوئے چوہدری فاخے نے ناکام کردی۔ عادل پیچھے ہٹتا گیا۔ پھر فاخے نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ایک ایسا زوردار وار کیا کہ عادل کی لاٹھی نہ صرف درمیان سے دو ٹکڑے ہوگئی بلکہ وہ خود بھی گر گیا۔

رنگ والی کے تماشائیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ نارپور کے لوگ فلک شگاف للکاریں بلند کرنے لگے۔ فاخا غصے میں نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ گرے ہوئے چوہدری عادل پر بے رحمی سے وار کر رہا تھا۔ ان چوٹوں سے بچنے کے لئے عادل مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن امان کہیں نہیں تھی۔ ایک دو بار اس نے فاخے کی بے رحم لاٹھی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن بُری طرح ناکام رہا۔ گاؤں والوں کے لئے یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ غالباً ان میں سے ہر ایک کی خواہش اب یہ تھی کہ مقابلہ روک دیا جائے اور اصولی طور پر اب مقابلہ روک دیا جانا چاہئے تھا لیکن طیش میں دیوانہ چوہدری فاخا...... اپنے مفتوح کو لہولہان کرتا چلا جا رہا تھا۔

''ہائے، کوئی ہے جو اس کو روکے۔'' پھپھو آمنہ نے چیخ کر کہا۔

''بھائی بھائی۔'' شانی بھی چیخ پڑی۔

چھت پر موجود دیگر رشتے دار خواتین اور ملازمائیں بھی واویلا کرنے لگیں۔ اچانک شانی نے کسی کو تیر کی طرح فاخر اور عادل کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ یہ کوئی اور نہیں وہی پُراسرار شخص تھا جو واحدی کے نام سے اس حویلی میں موجود تھا۔ وہ عادل اور فاخر کے درمیان آ گیا۔ فاخر کی بے رحم لاٹھی کے دو تین وار اس نے اپنے ہاتھوں پر روکے۔ اسی دوران میں کئی اور لوگوں کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ ان میں چچا مشتاق اور خادم حسین وغیرہ بھی تھے۔ یہ لوگ فاخر کو عادل سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

نارپور والوں نے اس مداخلت کو غلط معنوں میں لیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید چوہدری فاخے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ چوہدری فاخے کا دفاع کرنے کے لئے اس کی طرف جھپٹے۔ چند سیکنڈ کے اندر چالیس پچاس افراد میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چلنے لگیں جو کمزور دل تھے وہ چیختے ہوئے تتر بتر ہونے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں کے بھاگتے قدموں سے گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ عادل کہاں ہے اور فاخا کہاں۔

دفعتاً شانی کی نگاہ اپنے بائیں طرف اٹھی اور وہ سکتے میں رہ گئی۔ ابا جی نیچے بالکونی میں کھڑے تھے اور یک ٹک میدان کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کا زرد چہرہ دیکھ کر ہی شانی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کئی منٹ سے یہاں موجود ہیں اور انہوں نے فاخر کے ساتھ عادل کی لڑائی

اور شکست کا سارا منظر دیکھ لیا ہے۔ وہ چھت سے نیچے اُتری اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالکونی میں پہنچ گئی۔

اسے لگا کہ ابا جی بس گرنے ہی والے ہیں، اس نے انہیں سہارا دیا۔ ابا جی کا سارا وجود لرز رہا تھا، وہ انہیں اندر کمرے میں لے آئی اور بستر پر لٹا دیا۔ میدان سے اُبھرنے والی چیخ و پکار کی آوازیں حویلی کے در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ اسی دوران میں میگافون پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ''خبردار...... سب اپنے ہتھیار پھینک دیں، خبردار پیچھے ہٹ جائیں سب لوگ۔''

شانی سمجھ گئی کہ پولیس حرکت میں آ گئی ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہوائی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ فائرنگ بھی پولیس کی طرف سے تھی۔

ابا جی کی حالت بگڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ شانی ان کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ دو منٹ بعد ملازمہ انوری بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اس سے پہلے کہ شانی اسے کوئی بُری خبر دینے سے روکتی، وہ چلا کر بولی۔ ''بی بی جی...... چھوٹے مالک کو چھری لگ گئی ہے وہ لہولہان ہو گئے ہیں۔''

چھوٹے مالک کا خطاب شانی کے چہیتے چچا مشتاق کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ شانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کبھی وہ ہانپتے کانپتے ابا جی کی طرف دیکھتی تھی کبھی ملازمہ انوری کی طرف۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ احمق انوری کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے اور سارے دروازے کھڑکیاں بند کر دے۔ کچھ ایسا کرے کہ باہر کی کوئی آواز اس کمرے تک نہ آ سکے لیکن شاید ملازمہ انوری بھی اتنی قصوروار نہیں تھی، حالات ہی ایسے تھے کہ سب اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھے تھے۔

ابا جی کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ شانی نے جلدی سے انہیں زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی اور ان کی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ تب وہ پھپھو آمنہ کو آوازیں دینے لگی، پھپھو آمنہ کمرے میں پہنچیں تو وہ انہیں ابا جی کے پاس چھوڑ کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف لپکی۔ وہ اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے چاچا مشتاق کو اور اپنے چاچا رئیس کو...... اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس حال میں ہیں......

ننگے سر بھاگتی ہوئی وہ ابھی صدر دروازے سے پندرہ بیس قدم دور ہی تھی کہ اسے چاچا رئیس نظر آئے۔ ان کے ساتھ دو مسلح پولیس والے بھی تھے۔ چاچا رئیس نے شانی کو بانہوں میں روک لیا۔ ''نہیں بیٹی...... ابھی باہر نہیں جانا۔''

شانی رو رو کر ان سے بھائی عادل اور چاچا مشتاق کے بارے میں پوچھتی رہی۔

چاچا رئیس اسے سنبھالتے رہے اور بتاتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا...... رنگ والی کے تھانیدار میاں مظفر کی ہدایت پر پولیس والوں نے حویلی کا صدر دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد شانی کو پتا چلا کہ چاچا مشتاق کو چھری کا کاری زخم لگا ہے۔ انہیں شدید زخمی حالت میں ہسپتال روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس بلوے میں کم از کم دس افراد مزید زخمی ہوئے تھے کچھ کو لاٹھیوں کے اور کچھ کو تیز دھار آلوں کے زخم آئے تھے۔ عادل کو بھی سخت چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ گاؤں میں ہی تھا۔

چوہدری ارشاد تکیے پر سر رکھے گم صم لیٹے تھے۔ ان کی حالت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ دل کے ایک اور دورے سے بچ گئے تھے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر بڑی خاموشی کے ساتھ ان کے کانوں کی طرف بہہ رہے تھے۔ شانی ان کے پاس بیٹھی آہستہ آہستہ ان کی ہتھیلی سہلا رہی تھی۔ چوہدری ارشاد نے دکھی لہجے اور نہایت مدھم آواز میں کہا۔ ''کتنا اچھا تھا کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا، میں نے عادل کو کتنا منع کیا لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اس نے نافرمانی کی۔''

شانی بس اتنا کہہ سکی۔ ''ابا جی! آپ بالکل نہ بولیں۔ آپ کے دل پر بوجھ پڑے گا۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولتے رہے۔ ''مجھے سب پتا ہے میں جانتا ہوں۔ اس نے میرا لکھا ہوا خط بھی نارپور پہنچنے نہیں دیا۔ اس نے تمہیں بھی زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ غصے کو غصے سے ختم نہیں کیا جا سکتا...... دشمنی کو دشمنی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔''

چوہدری ارشاد بار بار اپنے بھائی چوہدری مشتاق کی حالت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کی حالت کے بارے میں شانی کو خود پتا نہیں تھا، وہ انہیں کیا بتاتی۔ وہ لاہور کے میو ہسپتال میں تھے۔ چاچا رئیس بھی وہیں تھے اپنی مرہم پٹی کروا کے عادل بھی ان کے پیچھے لاہور روانہ ہو گیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے بابے فخری نے شانی کو بتایا تھا کہ جس بندے نے لڑائی کے دوران میں چاچا مشتاق پر چھری سے وار کئے اسے پولیس نے موقع پر ہی گرفتار کر لیا تھا۔ اب وہ رنگ والی تھانے کی حوالات میں تھا۔ اس کے علاوہ بھی پولیس نے دونوں طرف کے کم از کم بیس بندے گرفتار کئے تھے۔

☆======☆======☆

اسی طرح چار پانچ دن مزید گزر گئے۔ یہ چار پانچ دن شانی اور اس کے اہلِ خانہ نے کرب کے دریا میں بہتے ہوئے گزارے۔ چاچا مشتاق بدستور ہسپتال میں تھے، ان کے پیٹ کا ایک آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ تقریباً ایک درجن بوتل خون انہیں دیا جا چکا تھا۔ ان کی حالت بظاہر خطرے سے باہر تھی لیکن ڈاکٹر ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔

بادی النظر میں یہ واقعہ فوری اشتعال کا لگتا تھا بلوے کے دوران جب آزادانہ کلہاڑیاں اور چاقو چل رہے تھے، نارپور کے ایک شخص نے چوہدری مشتاق کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ اس مہلک وار نے ان کی کئی انتڑیاں کاٹ ڈالی تھیں اور اندرونی اعضا زخمی کئے تھے۔ حملہ آور کو فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔

چوہدری فاخر نے اعلانیہ کہا کہ حملہ آور سے اس کا اور اس کے کسی عزیز کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ پولیس نے پوچھ گچھ کے بعد چوہدری فاخر اور اس کے دو ساتھیوں کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ شانی کو معلوم ہوا تھا کہ کل رات فاخر ہسپتال میں چاچا مشتاق کی عیادت کے لئے بھی گیا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا، گرمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے لان کی پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ اوڑھنی کو اچھی طرح اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے بالائی منزل کی طرف گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کام کرنے والی نے صفائی ستھرائی ٹھیک طرح سے کی ہے یا نہیں۔ بالائی منزل کے جھروکے سے اچانک اس کی نگاہ نیچے صحن کی طرف گئی۔ اسے واحدی نظر آیا۔ پچھلے چار پانچ دن سے حالات اتنے ابتر تھے کہ وہ اس شخص کو بالکل بھولی ہوئی تھی، اسے یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بابے فخری سے اس شخص کے بارے میں کچھ پوچھے۔ آج اسے مردانے حصے کے صحن میں دیکھ کر شانی کو بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ جب فاخر غصے اور جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا اور نیچے گرے ہوئے عادل پر تابڑ توڑ لاٹھیاں برسا رہا تھا تو یہ واحدی نامی شخص ہی فاخر کے سامنے آیا تھا اور عادل کے جسم پر پڑنے والی لاٹھیاں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔

شانی نے جھروکے میں سے دیکھا وہ امرود کے پیڑ کے پاس بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ شانی ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی، چند سیکنڈ بعد جب وہ اٹھا تو شانی کو پتا چلا کہ وہ وضو کر رہا تھا۔ اس کے بازو کہنیوں تک بھیگے ہوئے تھے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور لمبے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ وہ شانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ

پودوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا مگر ابھی پوری طرح اوجھل نہیں ہوا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔حویلی کے صدر دروازے سے باہر شور سنائی دیا تھا۔دراصل گلی میں دو لڑکے جھگڑ پڑے تھے۔ایک لڑکا دوسرے پر مکے برسا رہا تھا اور غصے سے چیخ رہا تھا۔شانی نے غور سے دیکھا تو وہ اس کا بھتیجا سفیان تھا۔وہ اس کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔عمر یہی کوئی بارہ سال رہی ہوگی۔جھگڑے کی آوازیں سن کر واحدی گلی کی طرف لپکا۔ایک اور ملازم بھی اس کے ساتھ تھا۔گلی میں پہنچ کر واحدی نے دونوں لڑکوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔سفیان اب بھی چلا رہا تھا اور لڑکے کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔

شانی نے مختاری کو آوازیں دیں اور اسے کہا کہ وہ سفیان کو اوپر لے آئے۔

چند منٹ بعد لال بھبھوکا سفیان اس کے سامنے تھا۔"کیا ہوا تھا سفیان؟" شانی نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

سفیان بولا۔"وہی پٹواری کا لڑکا قادرا تھا۔خواہ مخواہ بکواس کر رہا تھا۔کہتا تھا تمہارے چاچے عادل کی وجہ سے سارے گاؤں کی ناک کٹ گئی ہے۔چاچا عادل کوئی ہارا تھوڑی تھا، وہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گر پڑا تھا۔اس کو کوئی ہارنا کہتے ہیں۔"

معصوم سفیان کے استدلال پر شانی کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنے چاچا کی ہار کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا اور یہ کیفیت......صرف سفیان کی نہیں تھی وہ سب کے سب اس تکلیف دہ صورت حال کے لئے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ رہے تھے۔

کسی کا خیال تھا کہ عادل ٹھوکر لگنے سے گرا۔کوئی کہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے لاٹھی پھسل گئی۔کسی کی سمجھ کے مطابق مخالف تماشائیوں میں سے کسی نے اسے دھکا دیا تھا،بہرحال یہ بڑی کمزور دلیلیں تھیں اور صرف دل کو سہارا دینے کے لئے تھیں۔اصل اور سچی بات تو یہی تھی کہ عادل یہ لڑائی ہار گیا تھا۔اس نے بھرپور مقابلہ کیا تھا مگر مقابلے میں بہر صورت کسی ایک کو تو شکست ہونا ہوتی ہے۔

ابھی ہار کا زخم تازہ تھا،کئی دن گزر چکے تھے پھر بھی شانی کو اس مقابلے کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا یقیناً سفیان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔وہ اپنے ساتھی کی بات برداشت نہیں کر سکا تھا اور اس سے الجھ پڑا تھا۔شانی نے غمزدہ سفیان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور دلاسا دینے لگی۔اسی دوران میں سکینہ اندر آ گئی۔وہ بھی بہت افسردہ نظر آ رہی تھی۔اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔

کہنے لگی۔"ہمارے حصے میں رونا آیا ہے اور ان کے حصے میں ہاسے آئے ہیں۔سنا ہے کہ نارپور والوں نے اپنے جیتنے کی خوشی منائی ہے۔ناچ گانا ہوا ہے اور اُدھر شاہ مراد کے مزار پر چادریں چڑھائی گئی ہیں۔"

"تجھے کس نے بتایا ہے؟"

"اسی نے۔وہ کل شام آیا ہوا تھا" سکینہ نے ذرا دبے لہجے میں کہا۔

شانی سمجھ گئی کہ وہ منظور جٹ کی بات کر رہی ہے۔منظور کے ساتھ سکینہ کا پکا یارانہ تھا۔وہ ہر چھٹے ساتویں دن نارپور سے آ کر سکینہ سے مل جاتا تھا۔

جشن کی بات نے شانی کو مزید اداس کر دیا۔

چاچا مشتاق کی حالت بدستور خراب تھی۔کسی وقت ہوش آ جاتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ بہتر ہو جائیں گے لیکن مختصر افاقے کے بعد تکلیف پھر شدت اختیار کر جاتی تھی۔ابا جی کی بیماری کے پیشِ نظر ان سے چاچا مشتاق کی حالت چھپائی جا رہی تھی۔اگلے روز شانی چاچا رئیس اور پھپھو آمنہ کے ساتھ چاچا کی عیادت کے لئے لاہور پہنچی۔وہ میو ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں تھے۔جب شانی ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی تو اس نے بھائی عادل کو دیکھا۔اس کے ہاتھ میں کچھ دوائیں تھیں اور وہ زرد چہرے کے ساتھ بھاگا ہوا ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔چاچا رئیس نے اسے آوازیں بھی دیں لیکن وہ اتنا بدحواس تھا کہ اس نے کچھ سنا نہیں۔

عادل کو اس کیفیت میں دیکھ کر ہی پھپھو آمنہ نے رونا شروع کر دیا۔شانی کو بھی یوں لگا کہ اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے۔گاڑی سے اتر کر وہ لوگ چاچا مشتاق کے کمرے کی طرف بھاگے۔راستے میں جو بھی جان پہچان والا ملا اس کے چہرے پر ایک اندوہناک خبر کی سیاہ پرچھائیاں نظر آئیں۔شانی کا دل چاہا کہ وہ وہیں رک جائے۔آگے نہ بڑھے......اگر وہ آگے بڑھی تو اس کی سماعت کو اور اس کی نگاہوں کو کسی قیامت سے دوچار ہونا پڑے گا۔اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے۔وہ ہانپ کر رک گئی لیکن رکنے سے وقت تو نہیں رکتا،آنکھیں بند کر لینے سے اندوہناک خبریں تو تحلیل نہیں ہوتیں...شانی کے پیارے چاچا مشتاق مر گئے۔ہسپتال کا طویل برآمدہ دردبھری چیخوں اور آہ و بکا سے گونج اٹھا۔جانے والا چلا گیا۔آئی سی یو میں اس کا جسدِ خاکی مشینوں اور نالیوں میں جکڑا رہ گیا۔اس کی روح نیلے آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔اس کے عزیز ہسپتال کے فرش پر پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے لگے۔

☆======☆======☆

شانی کے پیارے چاچا مشتاق کی موت شانی پر قیامت کی طرح گزر گئی۔ وہ کئی دن تک دن رات روتی رہی۔ تاہم پھر اسے خود کو سنبھالنا پڑا۔ اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی تو اس کے ابا جی کو کون سنبھالتا۔ ابا جی کی حالت ٹھیک نہیں تھی، چھوٹے بھائی کی ناگہانی موت نے انہیں نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ دو دن کے لئے ''دل ہسپتال'' کا چکر بھی لگا آئے تھے۔

فاخر دو تین بار چوہدری ارشاد کی عیادت کو آ چکا تھا۔ جب وہ آخری بار آیا تو اتفاقاً عادل بھی گھر میں ہی تھا۔ جب عادل نے سنا کہ فاخر آیا ہے تو وہ ایک دم آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ شانی سے مخاطب ہوا اور پھنکار کر بولا۔ ''چاچا کا اصل قاتل یہی ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، یہاں سے اس کی لاش نارپور واپس جائے گی۔''

شانی نے بھائی کے پاؤں میں گر کر اسے روک لیا تھا۔ اپنی مری ماں کا واسطہ سننے کے بعد عادل کے پاؤں حرکت نہیں کر سکے تھے۔ شاید اس روز فاخر نے بھی صورتِ حال بھانپ لی تھی۔ وہ دوبارہ چوہدری ارشاد کی عیادت کو نہیں آیا تھا۔ عادل کا غیظ و غضب دیکھ کر اس روز شانی بہت غمزدہ ہوئی تھی۔ عادل کا یہ حد سے بڑھا ہوا غیظ و غضب ہی تھا جس کے سبب حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ابا جی اور چاچا رئیس اور خود شانی نے عادل کو کتنا منع کیا تھا مگر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے فارمولے پر عمل پیرا تھا۔ جہاں تک شانی کا اپنا خیال تھا وہ فاخر کو چاچا مشتاق والے معاملے میں زیادہ قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ لٹھ بازی کے مقابلے کے بعد اچانک ہی بلوے کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ تیس چالیس افراد تھے جو اندھا دُھند ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ اسی ہنگامے میں چاچا مشتاق کو چھری لگی تھی۔

اس حوالے سے ابا جی بھی شانی کے ہم خیال تھے۔ وہ قاتل کو سخت ترین سزا تو دلوانا چاہتے تھے لیکن اس حق میں نہیں تھے کہ قتل کے اس کیس میں فاخر یا اس کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو نامزد کیا جائے۔ چاچا رئیس کا بھی یہی خیال تھا۔ عادل کی رائے یکسر مختلف تھی۔ وہ اس کیس میں فاخر کو ملزم کی حیثیت سے نامزد کرنا چاہتا تھا۔ گھر کے اندر ہونے والی یہ کشمکش گھر سے باہر ہونے والی کشمکش کے علاوہ تھی۔

وہ ایک تاریک رات تھی۔ ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا، ہر طرف سناٹا تھا۔ بس دور کہیں کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی تھی یا گاؤں کے نواح میں آوارہ کتے شور مچاتے تھے۔ شانی ابھی جاگ رہی تھی پتا نہیں کیوں وہ ابا جی کی طرف سے ہر گھڑی فکرمند رہتی تھی۔ اب بھی وہ سونے سے پہلے ایک بار پھر ابا جی کے کمرے میں جھانکنا چاہتی تھی۔ لیمپ کی روشنی

میں ان کے سینے کا زیر و بم دیکھ کر اسے اطمینان ہو جاتا تھا۔

وہ پلنگ سے اٹھی، چکنے فرش پر ننگے پاؤں چلتی ہوئی ابا جی کے کمرے کی طرف بڑھی، راہداری کے سرے پر موڑ مڑتے ہوئے اسے دبی دبی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں ڈرائنگ روم سے آ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کا ایک بلب بھی روشن تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ عادل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں کوئی موجود ہے۔ شانی نے زنانے و مردانے حصے کی درمیانی حد پار کی اور اس کے قدم بے ساختہ ڈرائنگ روم کی طرف اٹھ گئے۔ رات کے اس پہر عادل کا ڈرائنگ روم میں موجود ہونا اس کے لئے سخت تجسس کا باعث تھا۔ اس نے ایک ادھ کھلی کھڑکی سے کان لگائے۔ اندر سے کھسر پھسر سنائی دے رہی تھی۔ عادل اور شاہو پہلوان کی آواز وہ صاف پہچان گئی۔ گفتگو کے انداز نے شانی کو مزید چوکنا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر دائیں جانب والی کھڑکیوں کے پاس پہنچی۔ یہاں بھی اسے ایک ادھ کھلی کھڑکی مل گئی۔ اس نے کھڑکی سے کان لگائے۔ آوازیں واضح سنائی دینے لگیں۔

شاہو پہلوان کہہ رہا تھا۔ ''نمبردار امجد کل ہی سیالکوٹ سے آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس دفعہ شکار کا پروگرام نہ بنے۔''

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔ یہ میں اپنے کانوں سے سن کر آ رہا ہوں کہ کل کا پروگرام پکا ہے، چوہدری فاخا شام چھ سات بجے تک کٹھولی پہنچ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے وہ پہنچ جائے گا تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔'' عادل کی آواز آئی، لہجے میں عجیب سا زہر تھا۔

عادل کے ایک دوست کالو ملتانی کی آواز سنائی دی۔ ''اندازاً کتنے بندے ہوں گے نمبردار کے ڈیرے پر؟''

''یہی تو مزے کی بات ہے۔'' نامعلوم شخص نے کہا۔ ''نمبردار امجد کے علاوہ صرف اس کا دوست مستانہ ہوگا اور شاید ایک دو کارندے ہوں۔''

''ٹھیک ہے بھون دیں گے ان حرامزادوں کو بھی ساتھ ہی۔'' شاہو پہلوان نے اُجڈ لہجے میں کہا۔

''تو زیادہ ببر شیر بننے کی کوشش نہ کر۔'' نامعلوم شخص نے بے زاری سے کہا۔ ''ہمارا نشانہ بس نارپور کا بلی مار ہوگا ہاں اگر کوئی ہمارے رستے میں آئے گا تو دیکھ لیں گے۔''

کالو ملتانی کی آواز آئی۔ ''دوسری اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عادل کو ہمارے

ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ وقوعے کے وقت وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں سے گواہی مل سکے۔"

"کیسی گواہی؟" شاہو نے پوچھا۔

"یہ گواہی کہ جس وقت خون ہوا عادل موقع پر موجود نہیں تھا وہ کسی اور جگہ اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔"

شانی سناٹے کی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کا دل سینے میں بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں اس پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ یہ اس کے "سر کے سائیں" کے قتل کا منصوبہ بن رہا تھا۔ شانی ہر روز اپنے بھائی عادل کی آنکھوں میں جو آگ بھڑکتے ہوئے دیکھتی تھی، اب وہ جوالا مکھی بن گئی تھی اور کسی کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ عادل اور اس کے دوست اس بند کمرے میں سگریٹ پھونک رہے تھے، سرگوشیاں کر رہے تھے اور ایک خونی واردات کی تفصیلات طے کر رہے تھے۔ شانی کو لگا کہ وہ کچھ دیر مزید یہاں کھڑی رہی تو بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ وہ پلٹی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

رات گزر گئی۔ وہ اگلے روز دوپہر تک انگاروں پر لوٹتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ عادل کو سمجھانا بجھانا فضول تھا وہ جس راستے پر چل نکلا تھا اس سے واپسی بہت مشکل تھی۔ اگر وہ ابا جی کو بتاتی تو وہ بھی کچھ نہ کر سکتے۔ الٹا ان کے بیمار دل کو مزید دباؤ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کی بیماری ایسی تھی کہ ان کے لئے کسی طرح کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ چاچا رئیس سے بات ہو سکتی تھی مگر شانی جانتی تھی کہ وہ بھی عادل کے سامنے بے بس ثابت ہوں گے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ بدترین لمحات قریب تر آ رہے تھے۔ دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ جب شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے ساتھ لیا۔ دونوں نے بوسکی کی لمبی چادریں اوڑھیں اور حویلی سے نکل پڑیں۔ بظاہر وہ پُل کی طرف روانہ ہوئی تھیں۔ پُل پر ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں رنگ والی کی اکثر عورتیں خریداری کے لئے جاتی تھیں۔ بازار کے ساتھ جھنڈے شاہ کا مزار بھی تھا۔ یہاں دعائیں مانگی جاتی تھیں اور نوافل وغیرہ ادا کئے جاتے تھے۔

پُل پر پہنچنے کے بعد دونوں سہیلیاں لوکل بس پر سوار ہو گئیں۔ شانی نے سکینہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ دونوں کٹھولی گاؤں جا رہی تھیں۔ کٹھولی گاؤں رنگ والی سے صرف دس بارہ کلومیٹر دور پڑتا تھا۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں انہیں وہاں پہنچا سکتی تھی۔ وہ جس

وقت رنگ والی سے روانہ ہوئی تھیں، آسمان پر بادل موجود تھے لیکن یہ بادل ایسے نہیں تھے کہ بارش کا امکان ہوتا۔ شانی کا خیال بھی یہی تھا کہ موسم خراب ہونے کا کوئی امکان نہیں مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر گہری تاریکی چھا گئی اور گھن گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آدھے گھنٹے کا سفر انہوں نے پون گھنٹے میں طے کیا۔ سڑک کٹھولی گاؤں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ وہ بس سے اُتریں اور ایک دکان کے چھجے تلے کھڑی ہو کر بارش کم ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ راہ گیر حسبِ معمول ان دونوں کو تفتیشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سکینہ نے کسمسا کر کہا۔ "شانی میرا تو دل ہول رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" شانی نے پوچھا۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے، ویسے بھی اندھیرا پھیلنے لگا ہے شام ہو گئی تو گھر جانا مشکل ہو جائے گا۔"

شانی نے چادر کے اندر ہی اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولی۔ "ابھی صرف ساڑھے تین بجے ہیں بادلوں کی وجہ سے اندھیرا لگ رہا ہے۔"

"پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"جتنی دیر ہو گی اتنا ہی ڈر بڑھتا جائے گا۔ چلو چلتے ہیں نمبردار کے ڈیرے کی طرف۔"

"مگر بارش؟"

"یہ بارش رکنے والی نہیں ہے۔" شانی نے کہا اور سکینہ کا بازو کھینچ کر اسے گلی میں لے آئی۔

دونوں بارش کی بوچھاڑوں سے بچتی بچاتی ڈیرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ ڈیرا گاؤں سے باہر امرود اور جامن کے درختوں کے درمیان واقع تھا۔ دس فٹ اونچی کچی دیواریں تھیں اس کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے ویران سی جگہ تھی۔ بیرونی دروازے کے باہر چھوٹی داڑھی والا ایک چوکیدار نما شخص ٹہل رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ہوئی دو لڑکیوں کو آتا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ پروگرام کے مطابق سکینہ آگے بڑھی اور اس نے چوکیدار نما شخص سے کہا۔ "میں نمبردار امجد سے ملنا چاہتی ہوں۔"

چوکیدار نے سرتاپا سکینہ کو گھورا۔ اس کا چہرہ چادر کے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ چوکیدار بولا۔ "امجد صاحب تو نہیں ہیں لیکن تمہیں کیا کام ہے ان سے؟"

"بہت ضروری کام ہے اگر وہ نہیں ہیں تو ان کے دوست مستانے صاحب کو بلا دیں۔"

"اچھا... میں دیکھتا ہوں۔" چوکیدار نے کہا اور اندر چلا گیا۔ دو چار منٹ بعد مستانہ

ان کے سامنے تھا۔اپنے نام کے برعکس وہ شکل وصورت سے سنجیدہ اور معتبر نظر آتا تھا۔اس کی مونچھیں گھنی تھیں اوراس نے بارش سے بچنے کے لئے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ وہ پہلے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔''کیابات ہے؟''

سکینہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔''میں آپ سے ایک بے حد ضروری بات کرنے آئی ہوں۔ یہ بات سراسر آپ کے فائدے میں ہے لیکن آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ کہاں سے آئی ہوں اور کون ہوں۔بس یہ سمجھ لیں کہ آپ کا دوست چوہدری فاخر میرے لئے بھائی کی حیثیت رکھتا ہے۔''

''کیاتم چوہدری فاخر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟''اس مرتبہ مستانے کا لہجہ نرم تھا۔

سکینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔''مجھے پتا ہے کہ بھائی فاخر آج شام یہاں ڈیرے پر آرہے ہیں۔آپ انہیں یہ تاکید کردیں کہ وہ آج رات یہاں نہ گزاریں۔ان کی زندگی کو بڑا سخت خطرہ ہے۔''

''کیسا خطرہ ہے؟''مستانہ چونک گیا۔

''بس یہ سمجھ لیں کہ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔جس طرح میں آپ کواطلاع دے رہی ہوں،اسی طرح مجھے بھی ایک گمنام اطلاع ملی ہے۔قسم کھا کر مجھے بتایا گیا ہے کہ آج رات ڈیرے پر بھائی فاخر کی جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔ میں......آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ آج بھائی کو یہاں نہ رہنے دیں۔''

''لیکن......''

''میں آپ کواس سے زیادہ کچھ نہیں بتاسکتی۔ میں گھر سے بتائے بغیر نکلی ہوں اب مجھے جلدی واپس جانا ہے۔اچھا خدا حافظ!''

مستانہ تذبذب میں کھڑا تھا۔ بہرحال اس کے تاثرات سے ایک بات واضح تھی۔ وہ سکینہ کی اطلاع کو بے حد سنجیدگی سے لے رہا تھا۔

بادلوں کی وجہ سے تاریکی ایک بار پھر گہری ہورہی تھی۔ وہ دونوں واپس مڑیں اور پختہ سڑک کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بارش چند منٹ تھمنے کے بعد پھر زوروشور سے شروع ہوگئی تھی۔ موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ وہ دونوں شرابور ہوگئی تھیں۔ پانچ چھ منٹ کے اندر وہ نمبردار امجد کے ڈیرے سے کافی آگے نکل آئیں۔ بہرحال ابھی وہ پختہ سڑک سے نصف فرلانگ دور تھیں۔اچانک شانی نے سرسراتی آواز میں کہا۔''سکینہ! مجھے لگ رہا ہے،کوئی ہمارے پیچھے

آرہا ہے لیکن......تم پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔''

''ہائے میں مرگئی۔کیاسچ مچ کوئی آرہا ہے۔''سکینہ نے سراسیمہ آواز میں کہا۔

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ دونوں ڈری سہمی اور سکڑی سمٹی چلتی رہیں۔ چند سیکنڈ بعد سکینہ نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا شانی! کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔وہ لوگ ہمارا اتا پتا ضرور پوچھیں گے۔''

''اچھا تو دعا کر ''بس'' جلدی سے آجائے۔''

''بس کا بھی کیا پتا۔اتنی تیز بارش ہورہی ہے۔''

دونوں سڑک کنارے پیپل کے ایک درخت تلے آکر کھڑی ہوگئیں۔ سڑک پر پانی جمع ہورہا تھا۔آس پاس کی دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ ایک ریڑھے کا گھوڑا چھینٹے اُڑاتا ہوا ان کے پاس سے گزر گیا۔ریڑھے پر چار پانچ کھیت مزدور ننگے سر بیٹھے تھے اور بارش کا مزہ لے رہے تھے۔انہوں نے بارش سے لت پت دو اکیلی لڑکیوں کو للچائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اتنے میں شلوار قمیص والے دو بندے ان کے قریب آکر کھڑے ہوگئے، وہ کن انکھیوں سے شانی اور سکینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ دونوں نمبردار کے ڈیرے سے ہی ان کے پیچھے آئے ہیں۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر شخص سر پر چارے کا گٹھا رکھے ان کے پاس سے گزرا۔ شانی نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔''چاچا! آخری بس کتنے بجے نکلتی ہے؟''

وہ گردن گھما کر بولا۔''دھیئے! ابھی تھوڑی دیر میں پانچ بجے والا ٹائم آئے گا۔اس کے بعد آخری بس آئے گی چھ بجے۔ پر اب یہ دونوں بسیں اِدھر نہیں آئیں گی۔ یہاں تو پانی کھڑا ہوگیا ہے۔ سڑک کا یہ ٹوٹا (ٹکڑا) بڑا ڈھونگا (نیچے) ہے۔اب بس پچھلی چھوٹی سڑک سے گزرے گی۔'' ادھیڑ عمر شخص نے اپنی بائیں طرف جنتر اور کیکر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ چھوٹی سڑک درختوں کے پیچھے ہے۔

''بہت شکریہ چاچا۔''شانی نے کہا، اس کے بعد چادر کے اندر ہی اندر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس پندرہ منٹ ہی رہ گئے تھے۔

شانی نے چند لمحے سوچا، پھر سکینہ کو ساتھ لیا اور درختوں کی طرف بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے اردگرد خطرہ منڈلا رہا ہے مگر ہمت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بارش ذرا ہلکی ہوگئی تھی لیکن بادل گہرے ہوگئے تھے۔ گہری شام کا سامنظر نظر آنے لگا تھا۔ دور مشرق کی طرف رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور گھڑگھڑاہٹ سے قرب وجوار لرزنے لگتے

تھے۔ وہ چھوٹی سڑک تک پہنچنے کے لئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئیں تو انہیں پتا چلا کہ یہ ایک قبرستان ہے۔ یقیناً یہ بہت پرانا قبرستان تھا۔ قبریں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور ہر طرف ویرانی نظر آتی تھی۔ راستہ تنگ اور کچا تھا۔ وہ کیچڑ میں پھسل پھسل جا رہی تھیں۔

''یا اللہ! یہ کس مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔'' سکینہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''حوصلہ کر سکینہ۔ اللہ مدد کرے گا۔'' شانی نے جما جما کر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہائے میں مر گئی۔ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' چند سیکنڈ بعد سکینہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

شانی نے بھی گردن گھما کر دیکھا۔ ٹانگوں میں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں بندے پیچھے آ رہے تھے۔ شانی اور سکینہ کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ شانی کے ذہن میں ابھی تک امید کی کرن موجود تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شاید وہ دونوں غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں بندے عام راہ گیر ہوں۔ ان ہی کی طرح بس میں سوار ہونے کے لئے چھوٹی سڑک کی طرف جا رہے ہوں۔

بہر حال اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں شانی کی ہر خوش فہمی دور ہو گئی۔ وہ دونوں افراد تیزی سے چلتے ہوئے شانی اور سکینہ کے قریب آ گئے پھر ان میں سے ایک نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ''بات سنو، گڑیو!''

شانی اور سکینہ پہلے ہی بہت تیز چل رہی تھیں، اب وہ بھاگ کھڑی ہوئیں۔ آس پاس کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی کو مدد کے لئے پکارنا بے معنی محسوس ہوتا تھا۔ شانی اور سکینہ کے بھاگتے ہی وہ دونوں بھی بھاگ پڑے۔ سکینہ بے ساختہ چلا اٹھی۔ شانی نے اپنی خوف زدہ چیخ کو بمشکل روک رکھا تھا۔ ابھی وہ پندرہ بیس قدم ہی بھاگی تھیں کہ سکینہ پھسل کر گر گئی۔

شانی چند قدم آگے گئی، پھر پلٹی اور سکینہ کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ پیچھے آنے والوں کے لئے اتنا وقت کافی تھا، وہ اس کے سر پر پہنچ گئے۔ گرنے سے بوسکی کی چادر سکینہ کے سر سے پھسل گئی تھی اور اس کے بالوں کا جُوڑا کھل گیا تھا۔ ایک شخص نے بے رحمی سے سکینہ کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ دوسرے نے عقب سے شانی کو اپنے جپھے میں لے لیا۔ وہ دونوں خوف زدہ انداز میں چیخیں۔ ''چھوڑ دو...... چھوڑ دو!'' شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، لیکن پکڑنے والے کی گرفت بہت سخت تھی۔

''کون ہو تم؟'' پہلے شخص نے سکینہ کو اس کے بالوں سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

اس دوران میں شانی خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ایک چوہدرائن کا حوصلہ اس کے

اندر کام کر رہا تھا۔ اس نے خود کو دبوچنے والے شخص کی کلائی پر اپنے دانتوں سے کاٹا۔ دبوچنے والے کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ درد سے بُری طرح بھنا کر اس شخص نے شانی کو بالوں سے پکڑنا چاہا تو شانی نے اس کا منہ نوچ لیا۔ وہ شخص غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور وہ وحشیانہ انداز میں شانی پر پل پڑا۔ شانی پھسل کر گر پڑی۔ پانی میں شرابور تو وہ پہلے ہی تھی اب کیچڑ میں لت پت بھی ہو گئی۔ وہ شخص اس کے اوپر گرا اور ہوسناک انداز میں اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ دوسری طرف سکینہ کی کربناک چیخیں بھی شانی کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ بھی اسی سلوک کا شکار تھی۔ دوسرے شخص نے اسے دبوچ لیا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ اچانک ایک ڈرامائی تبدیلی رُونما ہوئی۔ شانی کے جسم پر پڑا ہوا غلیظ و ناگوار بوجھ ایک دم ہٹ گیا۔

وہ اٹھی تو اس نے دیکھا کہ اس کے اوپر گرنے والا شخص ایک دوسرے شخص سے گتھم گتھا ہے پھر اسے ایک دردناک کراہ سنائی دی۔ اس کے اوپر گرنے والا شخص بڑی شدت کے ساتھ ایک پختہ قبر کے کتبے سے ٹکرایا اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

شانی اور سکینہ کی مدد کے لئے آنے والے شخص نے اپنی چادر کے اندر سے سیاہ ریوالور نکالا اور اس کی نال دوسرے حملہ آور کی طرف سیدھی کی۔ وہ سکینہ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کی جھلک دیکھی اور ریوالور والے کا خطرناک انداز دیکھا تو یکایک سکینہ کو چھوڑ کر واپس گاؤں کی طرف بھاگا۔

شانی نے دھیان سے اپنے مددگار کو دیکھا اور چند لمحے کے لئے سکتے کی کیفیت میں رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے حویلی میں چکرانے والا وہی اجنبی ملازم تھا جس کا نام مختاری نے واحدی بتایا تھا۔

''بی بی! جلدی آؤ۔'' وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔

شانی کا سکتہ ٹوٹا اور وہ پھر بغیر کچھ پوچھے کہے واحدی کی طرف بڑھی۔ سکینہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''کہاں لے جا رہے ہو؟'' چند قدم چلنے کے بعد شانی نے ہانپتی آواز میں پوچھا۔

''یہاں تھوڑا آگے میرے ایک جاننے والے کا گھر ہے۔ وہاں تک پہنچ جائیں تو ان دکوں سے بچ سکتے ہیں۔''

وہ تینوں تیزی سے چلتے رہے۔ قبروں کے درمیان راستے پر بے حد پھسلن تھی۔ دن میں بھی رات کا سماں ہو رہا تھا۔ ایک بار شانی کا پاؤں پھسلنے لگا تو واحدی نے بے ساختہ اسے

سہارا دیا، لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ سنبھل گئی تو اس نے اپنے ہاتھ یوں پیچھے ہٹائے جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

واحدی کے اس انداز نے شانی کو چونکا دیا۔

وہ تینوں بھاگنے والے انداز میں چل رہے تھے اور بار بار مڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد واحدی انہیں ایک بغلی راستے پر لے آیا۔ یہاں بارش کا پانی کھڑا تھا جو ان کی پنڈلیوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس پانی کا ایک فائدہ ضرور تھا۔ ان کے قدموں کے نشانات کا پیچھا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ راستے میں کھیت مزدوروں کے کچے مکانات نظر آ رہے تھے۔ ان کی چھتیں نیچی تھیں اور بارش کی بوچھاڑیں، گارے کی دیواروں کو چاٹ رہی تھیں۔ واحدی چلتے چلتے اچانک ایک گلی میں مڑا اور پھر اس نے پھرتی کے ساتھ ایک گھر کی پانچ فٹ اونچی دیوار پھاندی اور صحن میں جا کر اندر سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ تینوں ایک کمرے میں موجود تھے۔ یہاں لالٹین روشن تھی اور ایک عورت کمرے کے اندر ہی چولہے پر بھنڈی توری کا سالن پکا رہی تھی۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا، وہ ایک اونچا لمبا گبرو تھا۔ اس کی گردن میں چمڑے کا موٹا تعویذ تھا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ واحدی کا دوست ہے اور شہر میں کسی سرکاری افسر کا ڈرائیور ہے۔

اس کی بیوی قبول صورت تھی لیکن عمر میں اس سے بڑی لگتی تھی۔ اس کا نام حاجرہ تھا۔ حاجرہ نے شانی اور سکینہ کو اپنے سوکھے کپڑے اور اوڑھنے کے لئے سوتی چادریں دیں۔ اس دوران میں واحدی اور اس کے دوست میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ کچھ دیر بعد واحدی کا دوست گھر سے باہر چلا گیا۔

شانی نے واحدی سے کہا۔ ”شام ہو گئی ہے۔ اگر ہم جلدی واپس گاؤں نہ پہنچے تو تلاش شروع ہو جائے گی۔“

”آپ فکر نہ کریں بی بی! مصطفیٰ ٹریکٹر ٹرالی لینے گیا ہے۔ بس پانچ منٹ میں واپس آ جاتا ہے۔“ بات کرتے ہوئے واحدی کی نگاہیں زمین میں گڑی تھیں۔ شانی نے کہا۔ ”تمہاری گردن سے خون رِس رہا ہے۔ یہاں پٹی وغیرہ کر لو۔“

”جی بی بی۔“ اس نے احترام سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

چند ہی منٹ بعد گھر کے دروازے کے سامنے ٹریکٹر کے انجن کی آواز آئی۔ واحدی نے شانی اور سکینہ کو لیا اور باہر آ گیا۔ ٹرالی کے نیچے پرالی بچھی تھی اور اوپر ایک بڑی ترپال رکھی ہوئی تھی۔ واحدی نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ ”بی بی آپ دونوں ترپال کے نیچے لیٹ

جائیں اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہ آئیں۔“

شانی اور سکینہ نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ واحدی نے پہلے سکینہ کو سہارا دے کر ٹرالی پر چڑھایا، پھر چڑھنے میں شانی کی مدد کی۔ جب اس کا ہاتھ شانی کے جسم سے چھوا ایک بار پھر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نمودار ہوئی۔ جیسے اس نے جسم کے بجائے برقی رَو کو چھوا ہو اور اس کے پورے بدن میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی ہو۔ شانی کو ٹرالی پر چڑھاتے ہوئے ایک لحظ کے لئے واحدی کی نگاہیں شانی کی نگاہوں سے ملیں۔ ایک بار پھر شانی کو ان نگاہوں کے انوکھے پن کا احساس ہوا۔ ایک ایسا انوکھا پن جس میں پرستش، عبادت، محبت، تڑپ بہت کچھ یکجا نظر آتا تھا۔ یہ نگاہیں نہیں تھیں شاید...... کوئی طلسم تھا۔ شانی جھرجھری لے کر رہ گئی۔

وہ دونوں ترپال کے نیچے گھس کر بے حرکت لیٹ گئیں۔ ٹرالی حرکت میں آ گئی اور بارش میں ہچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد واحدی کی باادب آواز سنائی دی۔

”بی بی! اب کوئی خطرہ نہیں، آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔“

شانی اور سکینہ اٹھ کر بیٹھ گئیں، بہرحال ترپال بدستور ان کے سروں پر رہی۔ چند فٹ کے فاصلے پر واحدی بھی ترپال کا ایک ٹکڑا اوڑھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی میں بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔ شانی کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی سوال کرے گا۔ ان سے پوچھے گا کہ وہ دونوں اس طوفانی موسم میں ”رنگ والی“ سے اتنی دور کیسے پائی جا رہی ہیں یا اس قسم کا کوئی اور سوال لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ نگاہیں جھکائے ہوئے۔ جیسے وہ کوئی بے دام غلام ہو۔ شانی سے کچھ پوچھنا اس کا حق نہ ہو۔ وہ بس جواب دینے کا حق رکھتا ہو۔

آخر شانی کو ہی بولنا پڑا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تمہارا یہاں پایا جانا اور عین وقت پر ہماری مدد کرنا ایک اتفاق ہے۔“

”جی۔“ مختصر جواب ملا۔

”جی...... سے کیا مطلب......“ شانی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟“

”مجھے ڈر ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“

شانی نے گہری سانس لی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”اچھا نہیں ہوتی ناراض۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی جادو اثر نظروں سے ایک لمحے کے لئے شانی کو دیکھا اور بولا۔

”بی بی! میں نے آپ دونوں کا پیچھا کیا تھا۔ میں نے آپ کو پریشانی کی حالت میں جھنڈے

شاہ کے مزار کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا پھر آپ بس میں سوار ہوگئیں۔ میں بھی پچھلے دروازے سے بس میں سوار ہوگیا۔ کھوئی میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے رہا۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دماغ میں کوئی اور بات نہیں تھی۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ آپ اس طوفانی موسم میں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔"

"اور تمہارا ڈر ٹھیک ثابت ہوا۔" سکینہ نے جھرجھری لے کر کہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یقیناً ابھی تک قبرستان کے مناظر گھوم رہے تھے۔

شانی نے خیال کیا کہ شاید اب واحدی ان سے پوچھے گا کہ وہ یہاں کیونکر آئیں مگر وہ خاموش رہا۔ جیسے اسے کچھ پوچھنے کی حاجت ہی نہ ہو۔ شانی کو اس کی یہ خاموشی اچھی لگی۔

وہ رات شانی کے لئے شدید پریشانی اور گھبراہٹ لے کر آئی۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ کانٹوں کے بستر پر تھی۔ اس ابر آلود رات میں خون کی بو تھی اور اندیشوں کے سانپ پھنکارتے تھے۔ آج رات عادل کے بھیجے ہوئے چند ہرکارے نمبردار امجد کے ڈیرے پر دھاوا بولنے والے تھے۔ ان کا نشانہ فاخر تھا۔ شانی کی جان دونوں طرف سے شکنجے میں تھی۔ ایک طرف شوہر تھا دوسری طرف بھائی۔ اس نے اپنی طرف سے شوہر کو خبردار تو کر دیا تھا لیکن اب ڈر بھی رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اب کھوئی میں عادل کے بھیجے ہوئے کارندے مشکل کا شکار ہوں گے۔

رات دس بجے کے قریب شانی کی ملاقات عادل سے ہوئی۔ وہ تیار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ "کہیں جا رہے ہو بھائی؟" شانی نے پوچھا۔

"انسپکٹر میاں مظفر کی طرف!" عادل نے مختصر جواب دیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے گھر تین بیٹیوں کے بعد بیٹا ہوا ہے۔ سوچا مبارکباد دے آؤں۔"

شانی سمجھ گئی کہ عادل نے پروگرام کے مطابق وقوعے سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کا انتظام کیا ہے۔

رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ اگلے روز نو بجے کے قریب شانی کو خادم حسین کی زبانی معلوم ہوا کہ رات کھوئی میں نمبردار امجد کے ڈیرے پر سخت لڑائی ہوئی ہے۔ گولیاں چلی ہیں۔ نمبردار امجد ہلاک ہوگیا ہے۔ دونوں طرف سے کئی لوگ زخمی بھی ہوئے ہیں۔" یہاں تک بتا کر خادم حسین رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ اور تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔

"کیا بات ہے خادم حسین تم چپ ہوگئے ہو؟" شانی نے پوچھا۔

وہ دبے لہجے میں بولا۔ "چھوٹی مالکن! نمبردار امجد کے وارثوں نے جو پرچہ کٹوایا ہے

اس میں سب سے اوپر ہمارے چھوٹے چوہدری (عادل) کا نام ہے۔"

"ہائے میں مرگئی...... یہ کیسے ہوگیا؟"

"چھوٹے چوہدری صبح کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس چھوٹے چوہدری کو پکڑنے حویلی آ رہی ہے۔"

شانی کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ دشمنی کی آگ تیزی سے پھیل رہی تھی اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو چاٹ رہی تھی۔ شانی کا دھیان سب سے پہلے اپنے اباجی کی طرف گیا۔ ان کا دل پہلے ہی ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح تھا۔ آندھی کا یہ نیا جھونکا پتا نہیں ان کے دل کے ساتھ کیا کرنے والا تھا۔

اور پھر وہی سب کچھ ہوا جس کے اندیشے تھے۔ بارہ بجے کے قریب پولیس کی بھاری نفری نے حویلی پر چھاپہ مارا۔ اس چھاپے کی قیادت خود ایس پی صاحب کر رہے تھے۔ عادل حویلی میں نہیں تھا۔ اگر کسی عام شخص کا گھر ہوتا تو پولیس ملزم کی جگہ اس کے والد، چچا یا عورتوں کو بھی تھانے لے جانے سے نہ چوکتی لیکن یہ چوہدری ارشاد کی حویلی تھی۔ پورے علاقے میں اس حویلی کی عزت تھی اور اس نام کا اثر ورسوخ تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد پولیس واپس چلی گئی۔ تاہم جانے سے پہلے ایس پی رندھاوا نے چوہدری ارشاد اور رئیس کو تاکید کی کہ ایک دو روز کے اندر ملزم کو پیش کر دیں بصورت دیگر ضروری کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

یہ سب کچھ ہوا اور پھر وہ بھی ہوا جس کا اندیشہ شانی کے ذہن میں کل سے کلبلا رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے اباجی کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ انہیں افراتفری میں ابتدائی طبی امداد دی گئی، اس کے بعد لاہور پہنچا دیا گیا۔ ان کی حالت مخدوش تھی، رو رو کر شانی کا برا حال ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی ٹیسٹ کئے اور پھر چوہدری ارشاد کے لواحقین کو بتایا گیا کہ ان کے دل کے تین والو بند ہیں۔ انہیں اوپن ہارٹ سرجری کی ضرورت ہے۔

چوہدری ارشاد کل چھ دن ہسپتال میں رہے۔ یہ لاہور کا ایک مہنگا پرائیویٹ کلینک تھا۔ چھ سات روز کا بل ڈھائی لاکھ سے زیادہ بنا۔ کیش کی صورت میں بینک کے اندر فقط 80 ہزار روپیہ تھا۔ چاچا رئیس نے اپنے ایک دوست سے قرض حاصل کیا اور ہسپتال کا بل چکا کر چوہدری ارشاد کو واپس رنگ والی لائے۔

حالات بڑی تیزی سے شانی اور اس کے گھر والوں کا گھیراؤ کر رہے تھے۔ بوائی کا وقت گزرتا جا رہا تھا، کھیت ویران نظر آ رہے تھے۔ قرض خواہوں کے تقاضے بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف عادل ابھی تک لاپتا تھا۔ پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ہر دوسرے روز

حویلی کے صدر دروازے پر پولیس جیپ کے انجن کی منحوس آواز سنائی دے جاتی تھی۔ عادل کو نمبردار امجد کے قتل میں بڑے ملزم کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ شاہو پہلوان کا نام بھی پرچے میں شامل تھا۔ شاہو کے علاوہ حویلی کے دو اور ملازموں کو بھی پولیس گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب ان ملازمین کا بال بچہ ہر روز سرتاپا فریاد ہو کر حویلی پہنچ جاتا تھا۔ انہیں مالی اور قانونی ہر طرح کی مدد کی ضرورت تھی۔

ایک روز شام کو چاچا رئیس گھر آنے تو معمول سے زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ وہ شانی کو علیحدہ کمرے میں لے گئے اور بولے۔ ''دھی رانی! اب پانی سر سے گزر رہا ہے۔ روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ آج سویرے لاہور سے ایک بندہ عادل کا پیغام لے کر آیا ہے۔ عادل نے فوری طور پر دو لاکھ روپے منگوائے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگلے تین چار دن میں چار لاکھ کا مزید انتظام کر دیا جائے۔''

''بھائی نے اتنے روپوں کا کیا کرنا ہے؟''

''اس کے کسی جاننے والے نے ایس پی رندھاوا سے رابطہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ رندھاوا نے کیس کمزور کرنے کے لئے اور فوری طور پر عادل پر ہاتھ نہ ڈالنے کے لئے چھ لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔''

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چاچا رئیس نے کہا۔ ''زیادہ زمین تو پہلے ہی گروی پڑی ہوئی ہے۔ جو تھوڑی بہت باقی ہے اسے بیچیں گے تو ناک کٹے گی... اب آ جا کے تمہاری چاچی کے زیور رہ جاتے ہیں۔''

''نن نہیں... چاچا جی... بھائی عادل کے لئے چاچی کے زیور نہیں بکیں گے۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ ابا جی کی الماری میں بھی کچھ کیش اور بانڈ وغیرہ ہیں۔ میں دیکھتی ہوں، سب ملا کر کتنے ہوتے ہیں۔''

رقم کے سلسلے میں شانی نے چاچا رئیس سے جھوٹ ہی بولا تھا۔ اس کے پاس فقط چند سو روپے تھے۔ اس رات اس نے الماری سے امی جی کے زیورات نکالے۔ یہ زیورات امی اسے سونپ گئی تھیں۔ اب تک یہ سب کچھ ایک مقدس امانت کی طرح اس کے پاس تھا۔ یہ قریباً دو سیر سونا تو ہوگا۔ کچھ چیزیں جڑاؤ تھیں۔ یہ سب کچھ شانی کے لئے بے حد قیمتی تھا مگر بھائی عادل کی سلامتی اور ابا جی کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو چومتی رہی۔ اس پر اپنے آنسو گراتی رہی اور ماں کی تصویر کو دیکھتی رہی پھر اس نے یہ سب کچھ ایک چرمی تھیلے میں بند کیا اور ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تایا معصوم یہ کام کر سکتے تھے۔ لاہور میں ایک جیولر تایا معصوم کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ابا جی اور مرحومہ والدہ نے بھی جیولری کے سلسلے میں کوئی کام کروانا ہوتا تو تایا معصوم ہی کی ذمے داری لگائی جاتی تھی۔ شانی نے تایا معصوم کو بلوایا اور بڑی رازداری سے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔ حویلی کے پرانے زیورات کی فروخت کا تایا معصوم کو بھی دکھ ہوا مگر وہ بھی حالات کی ستم ظریفی کو سمجھ رہے تھے۔ قرض خواہوں کا گھیراؤ تنگ ہو رہا تھا، مقدمے اور بیماری کے لئے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس موقع پر قربانی کی ضرورت ہے اور یہ قربانی شانی دے رہی تھی۔ اپنی ماں کی نشانیاں جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھیں، وہ فروخت کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

وہ ایک سہانی شام تھی۔ بارش کے بعد ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ابا جی کی طبیعت بھی آج کچھ بہتر محسوس ہوتی تھی۔ شانی نے چاچا رئیس کو بتایا تھا کہ کیش اور پرائز بانڈ وغیرہ ملا کر آٹھ دس لاکھ کا انتظام ہو جائے گا۔ چاچا رئیس قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں کچھ کمی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انہوں نے لاہور میں عادل کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ کل تک وہ اسے رقم پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔

شام کو شانی ابا جی کی وہیل چیئر بالکونی میں لے آئی۔ وہ اب چاہتی تھی کہ لاہور یا کراچی کے کسی اچھے ہسپتال میں جلد از جلد ان کی سرجری ہو جائے۔ زیورات کی فروخت سے انہیں اتنی رقم ضرور حاصل ہو جانی تھی جس سے عادل کی مصیبت ٹل جاتی اور ابا جی کی بیماری کا سدِباب بھی ہو جاتا۔ اس نے قربانی ضرور دی تھی لیکن اس قربانی کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اب اسے تایا معصوم کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ اپنے ایک منہ بولے بھائی ثناء اللہ کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہوئے تھے۔ امید تھی کہ کل دوپہر تک ان کی واپسی ہو جائے گی۔

اچانک ابا جی کی آواز نے شانی کو چونکایا۔ ''وہ کیا ہے شانی؟'' انہوں نے بالکونی سے نیچے حویلی کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ اسے واحدی نظر آیا۔ اس کے کندھے پر کوئی شخص تھا جو چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے یا بے ہوش ہے۔ واحدی اسے لے کر برآمدے میں اوجھل ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ شانی خود نیچے جاتی اور صورتِ حال معلوم کرتی، ابا جی نے ایک ادھیڑ

عمر ملازم کو آواز دی اور اسے کہا کہ وہ اس بندے کو اوپر بلائے۔ بندے سے ابا جی کی مراد واحدی تھا۔

دو چار منٹ بعد واحدی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانے اور چہرے پر لہرا رہے تھے۔ ماتھے پر مشقت کی وجہ سے پسینے کی چمک تھی۔ چوہدری ارشاد نے نحیف آواز میں پوچھا۔ ''یہ کس کو کندھے پر لاد کر لائے ہو؟''

واحدی نے نظریں جھکا رکھی تھیں۔ شانی کی موجودگی میں وہ جیسے نگاہیں اٹھانا بھول ہی جاتا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔ ''بڑے مالک! میں چارے کے کھیت کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہاں یہ بے ہوش پڑا تھا۔ نارووال سے کھیت مزدوری کے لئے آیا ہے۔ نیا نیا ہے شاید گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔''

''جاؤ جاؤ۔ اسے ہوش میں لاؤ۔ اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر شہزاد کو بلاؤ۔'' چوہدری ارشاد بے تابی سے بولے۔ شاید انہیں اپنی مرحومہ بیوی کی بات یاد آ گئی تھی۔ مرحومہ کہا کرتی تھیں جب ہمارے کھیتوں میں کام کرنے والے کسی بندے کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی چوٹ سیدھی میرے کلیجے پر لگتی ہے۔

واحدی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''مالک! اسے پنکھے کے نیچے رکھا ہے۔ لگتا ہے جلدی آنکھیں کھول دے گا۔''

چوہدری ارشاد نے بے تاب لہجے میں کہا۔ ''شانی! جاؤ تم خود دیکھ کر آؤ۔ اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کو بلا لو۔''

شانی، واحدی کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر واحدی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''بی بی! ایک منٹ رکئے۔'' شانی رک گئی۔ اس نے اپنا سر اور سینہ اچھی طرح اوڑھنی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ واحدی نے نگاہیں جھکائے جھکائے شانی پر انکشاف کیا۔ ''بی بی! میں نے بڑے مالک کے سامنے سچ نہیں کہا۔ مجھے پتا ہے ان کی طبیعت خراب ہے۔''

''تو سچ کیا ہے؟'' شانی نے لرز کر پوچھا۔

واحدی گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''یہ ثناء اللہ صاحب ہیں۔ میں نہر والی مسجد میں جا رہا تھا۔ یہ بیلے کے کھیت کے پاس بے ہوش پڑے تھے۔ سر پر گہرا زخم ہے۔ شاید رائفل کے بٹ سے آیا ہے۔''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ ثناء اللہ تو آج صبح تایا معصوم کے ساتھ لاہور گیا تھا۔ اس کے

پاس سوزوکی ایف ایکس تھی۔ وہ دونوں اسی گاڑی میں گئے تھے۔

''تایا معصوم کہاں ہیں؟'' شانی نے کراہ کر پوچھا۔

''ان کا کچھ پتا نہیں۔ ثناء اللہ صاحب کی گاڑی بھی غائب ہے۔''

شانی کو لگا کہ اس نے کسی چیز کا سہارا نہ لیا تو ڈگمگا کر گر جائے گی۔ وہ پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

قریباً دو گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ واضح ہو گیا۔ تایا معصوم بھی حویلی واپس آ گئے۔ ان کے چہرے اور سر پر گہری چوٹیں تھیں۔ لباس بھی تار تار ہو چکا تھا۔ ان کی گاڑی کو بیلے کے قریب روکا گیا تھا۔ چار مسلح افراد ان کے سامنے آئے تھے جنہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ ثناء اللہ نے مزاحمت کی۔ جواباً اسے بے ہوش کر کے چارے کے کھیت میں پھینک دیا گیا۔ تایا معصوم کو گن پوائنٹ پر گاڑی کے اندر ہی یرغمال بنایا گیا۔ رنگ والی سے قریباً 20 کلومیٹر آگے جانے کے بعد انہیں گاڑی سے اتار دیا گیا۔ زیورات اور گاڑی سمیت ڈاکو فرار ہو گئے۔

کہتے ہیں مصیبت تنہا نہیں آتی۔ شانی کے گھرانے پر بھی مصیبتوں نے یلغار کر دی تھی۔ ایک کے بعد دوسری آفت ان کی زندگی کو تہہ و بالا کر رہی تھی۔ شانی نے اپنی مرحومہ ماں کے زیورات کو خود سے جدا کر کے ایک بڑی قربانی دی تھی لیکن یہ قربانی بھی کسی کام نہیں آ سکی تھی۔ یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ سب کچھ تہہ و بالا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ حسب سابق شانی اور چاچا رئیس نے اس المیے کو بھی چوہدری ارشاد سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور اس مرتبہ انہوں نے واقعی چھپا لیا تھا۔

شانی کئی روز تک غم و یاس کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبی رہی۔ یہ دوہرا غم تھا۔ پیاری ماں نے یہ پیاری پیاری نشانیاں بے حد چاہت سے اسے سونپی تھیں۔ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں انہوں نے ایک ایک زیور اپنے ہاتھوں سے شانی کو پہنایا تھا اور دکھایا تھا۔ یہ ساری نشانیاں شانی سے جدا ہوئی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ان نشانیوں کو جدا کرنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہو پایا تھا۔

چوہدری ارشاد کے علم میں لائے بغیر چاچا رئیس نے پولیس میں اس ڈاکے کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ ظاہر ہے کہ شانی کو چاچا رئیس کے علم میں سب پہنچ [illegible] شانی اعتراف کیا تھا کہ کیش اور پرائز بانڈ وغیرہ کے سلسلے میں اس نے جھوٹ بولا تھا۔ تایا معصوم کے منہ بولے بھائی ثناء اللہ کی کار دو روز بعد جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے

کنارے کھڑی مل گئی تھی۔

شانی کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ تایا معصوم اور ثناء اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایف ایکس کار میں قیمتی زیورات لاہور لے جائے جا رہے ہیں پھر اس سلسلے میں مخبری کہاں سے ہوئی۔ وہ جتنا سوچتی تھی، اس کا ذہن الجھتا چلا جاتا تھا۔ غم کی یورش میں یہ پریشانی ایک اضافی اذیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس حوالے سے سوچتے ہوئے ایک اور خیال بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس ڈاکے کا تعلق بھی نار پور اور نار پور والوں کے انتقام سے ہو۔ ان پریشانیوں کے علاوہ ایک اور الجھن بھی تھی جو شانی کی سوچ کو دن رات بھٹکائے رکھتی تھی۔ اس الجھن کا تعلق واحدی سے تھا۔ اس کی حویلی میں موجودگی شانی کو ہر وقت کھٹکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں شانی کو لگتا تھا کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ وہ جس حیثیت سے یہاں حویلی میں کام کر رہا ہے وہ حیثیت اس کی اصل حیثیت سے کہیں کم ہے۔ اس کا ایک ثبوت شانی کو چند روز پہلے مل بھی گیا تھا۔ قبرستان میں پیش آنے والے واقعے میں واحدی نے ایک ایسا کردار ادا کیا تھا جسے تادیر بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے شانی اور سکینہ کی جان دو خطرناک غنڈوں سے چھڑائی تھی اور پھر اس سے پہلے بھی وہ ایک موقع پر جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ شانی کو یاد تھا۔ عادل اور فاخر کی لڑائی میں واحدی نے بپھرے ہوئے فاخر کے وار اپنے ہاتھوں پر روکے تھے۔ اس کی یہ کارکردگی اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ اسے انعام و اکرام سے نوازا جاتا اور اسے "ترقی" دی جاتی لیکن شانی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو اس کے اُلٹ سوچ رہی تھی۔ وہ اس شخص کو حویلی سے نکال دینا چاہتی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ وہ ایک عورت تھی اور عورت اپنی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کی ہر خاصیت بھانپ لیتی ہے۔ واحدی کی نگاہ میں شانی کو وہ کچھ نظر آتا تھا جو اسے سرتاپا لرزا دیتا تھا۔ شانی کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی نگاہ کا تصور کرنا بھی اس کے لئے بہت بڑا گناہ ہے۔

پچھلے دو تین روز کی سوچ بچار کے بعد شانی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ واحدی کی چھٹی کرا دے گی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ بابے فخری کے ذریعے یہ کام کرے گی لیکن بابا ایک بار پھر گاؤں گیا ہوا تھا۔ شانی نے اپنی موٹی اوڑھنی اوڑھی اور ان کوارٹروں کی طرف چل دی جہاں ملازمین رہتے تھے۔ وہ کوارٹروں کے پاس پہنچی تو دو تین ملازموں نے اسے جھک کر سلام کیا۔ واحدی اسے اپنے کوارٹر سے باہر ہی مل گیا۔ وہ گھاس پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شانی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اتنے خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا کہ اسے شانی کی آمد اور موجودگی کا

احساس ہی نہیں ہوا۔ نماز ختم کرنے کے بعد اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک اپنے ہاتھوں کے پیالے پر سر کو جھکائے رکھا۔ شانی خاموشی سے تکتی رہی۔

دعا سے فارغ ہو کر وہ اپنی تر بتر آنکھیں پونچھ رہا تھا جب پہلی بار اس کی نگاہ اپنے عقب میں شانی پر پڑی۔ وہ چونکا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں وہی خوبصورت چمک آئی جس میں عقیدت، محبت، پرستش اور پتا نہیں کیا کچھ ایک ساتھ لہریں لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کسی معمول کے انداز میں اٹھا۔ جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور شانی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شانی کے دل میں غصہ تھا اور ایک عجیب طرح کی اپنائیت بھی تھی۔

وہ حسبِ معمول نگاہیں جھکائے ہوئے بولا۔ "بی بی! میری دعا قبول ہو گئی ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔"

"کیوں ملنا چاہتے تھے؟" شانی نے ماتھے پر تیوری ڈال کر پوچھا۔

وہ اس کی تیوری سے بے خبر رہا اور حسبِ سابق پُرعقیدت لہجے میں بولا۔ "آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی تھی بی بی۔"

"کہو!" شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

واحدی نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک قدم چل کر تھوڑا سا اور نزدیک آ گیا۔ اس کے ہاتھ ناف پر بندھے ہوئے تھے اور نگاہیں ہمیشہ کی طرح زمین پر تھیں۔ بولا "بی بی! میری یہ اوقات تو نہیں کہ اس بارے میں بات کروں لیکن چپ رہنا بھی مشکل ہے۔ میں آپ سے چھوٹے مالک عادل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" شانی نے کہا اور تھوڑا سا چونک گئی۔

واحدی نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ دو تین ملازمین موجود تھے لیکن کافی فاصلے پر تھے۔ واحدی نے کہا۔ "بی بی! میں کل لاہور میں داتا دربار گیا تھا۔ واپسی پر شاہی مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا کہ راستے میں میں نے ایک کالے شیشوں والی کار دیکھی۔ مجھے شک ہوا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر چھوٹے مالک بیٹھے ہیں۔ کار ٹبی کی طرف گئی اور ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ میں پیدل ہی کار کے پیچھے گیا۔ مجھے دکھ کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ میں نے مالک کو نشے کی حالت میں کار سے اُترتے دیکھا۔ ان کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے ایک طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں اس حویلی کا نمک خوار ہوں بی بی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے چھوٹے مالک کے بارے میں جاننے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ چھوٹے مالک کے ساتھ جو بندے کالے

شیشوں والی کار سے اُترے تھے ان میں میرا ایک پرانا جاننے والا افضل ساہی بھی تھا۔ وہ پراپرٹی ڈیلر کا کام کرتا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے بعد چھوٹے مالک اور ان کے ساتھی طوائف کے کوٹھے سے اُترے اور واپس چلے گئے۔ رات دو بجے کے لگ بھگ میں افضل ساہی کے گھر موہنی روڈ پہنچا۔ وہ بھی ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ میں نے بڑی دیر تک اس سے مغز ماری کی اور اس سے کافی کچھ پوچھ لیا۔''

واحدی بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ شانی اس کی نگاہوں میں نہیں جھانک سکتی تھی۔ کیونکہ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، بہر حال اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! چھوٹے مالک بہت زیادہ مایوس ہیں۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ پولیس ان کے پیچھے ہے۔ انہیں پتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی گرفتار ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود وہ گھوم پھر رہے ہیں۔ شاید اب انہوں نے سوچ لیا ہے کہ جو بھی ہونا ہے وہ ہو جائے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' شانی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''بی بی! ڈرتا ہوں کہ آپ کو میری بات بُری نہ لگے...... لیکن...... سچ یہی ہے کہ چھوٹے مالک کو آپ سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔''

''کیسی شکایت؟''

''چھوٹے مالک کو شکوہ ہے کہ بڑے مالک، مالک رئیس اور آپ نے مشکل وقت میں انہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ ان کو رقم کی سخت ضرورت تھی لیکن انہیں رقم نہیں بھجوائی گئی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر انہیں بروقت رقم مل جاتی تو وہ پولیس سے اپنی جان چھڑا لیتے اور ہو سکتا تھا کہ قتل کے پرچے سے بھی ان کا نام نکل جاتا۔ وہ پچھلے دنوں بہت سخت پریشان رہے ہیں۔ مصیبت میں اگر اچھے دوستوں کا ساتھ نہ ہو تو مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ شاید چھوٹے مالک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان کے پاس جو تھوڑی بہت رقم ہے، وہ شراب اور کوٹھے پر خرچ ہو رہی ہے۔''

شانی سنانے کی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ سینے کے اندر اس کا دل رو رہا تھا۔ اپنے ''ماں جائے'' کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور اس ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے واحدی سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ بھائی عادل کو ڈاکے کی واردات کا پتا نہیں ہے؟''

''ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''تم میرا ایک کام کرو۔ کسی طرح بھائی عادل تک میرا پیغام پہنچا دو۔ انہیں بتاؤ کہ ان کے یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا ہے۔ کس طرح کئی لاکھ کے زیورات ڈاکے کی واردات میں گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب انہیں اس بات کا پتا چلے گا تو وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔''

واحدی نے ادب سے کہا۔ ''بی بی! آپ جو حکم دیں گی، میں اسے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

کبھی کبھی واحدی کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ بہر حال اس کے طور اطوار سے اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کبھی وہ ایک عام سا شخص نظر آتا تھا لیکن کبھی لگتا تھا کہ وہ عام نہیں ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ اس کے عام روپ کے اندر ایک دبنگ شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ شانی نے ابھی تک اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ ہی کبھی شانی نے نارپور کی اس رات کا ذکر کیا تھا جب وہ شدید زخمی حالت میں نارپور کی حویلی میں داخل ہوا تھا اور ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ لیکن آج شانی اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ شانی نے اس سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ!''

وہ بڑی سادگی سے وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

''نہیں وہ موڑھا پکڑو۔'' شانی نے کچھ فاصلے پر رکھے موڑھوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چند لمحے تک تذبذب میں رہا، پھر موڑھا پکڑ لایا اور شانی کی کرسی سے کافی فاصلے پر رکھ کر مؤدب بیٹھ گیا۔ ''تمہیں بابے فخری نے ملازم رکھا تھا؟'' شانی نے پوچھا۔

''جی بی بی!'' وہ بولا۔

''بابے فخری نے بتایا ہے کہ تم سیال ہو اور نارووال کے قریب ایک پنڈ کے رہنے والے ہو۔ وہاں کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن دشمنی چل نکلی اور تم علاقہ چھوڑ کر مزدوری کے لئے یہاں آ گئے۔''

''جی بی بی!'' وہ بولا۔

''لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ غلط بیانی کر رہے ہو۔''

''آپ بتائیں۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں بی بی۔'' اس نے کہا۔ نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا ''بی بی'' کہنے کا انداز بھی اپنی مثال آپ تھا۔

شانی نے کہا۔ ''اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ اس رات تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا جب زخمی حالت

میں ہمارے گھر آ کر چھپے تھے۔''

''وہ رات...... وہ رات میں کبھی بھول نہیں سکوں گا بی بی۔ آپ نے میری جان بچائی اس احسان کے بدلے...... آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پاؤں میں پہنیں تو بھی میری طرف سے حق ادا نہیں ہوگا۔''

''خیر اس بات کو چھوڑو!'' شانی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، انسانی فرض سمجھ کر کیا، تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی۔ تم یہ بتاؤ کہ اس رات تم آئے کہاں سے تھے؟''

وہ چند لمحے خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپ نے رستم سیال کا نام سنا ہوا ہے؟ قانون کے کاغذوں میں وہ بہت بڑا ڈکیت سمجھا جاتا ہے۔''

''ہاں..... نام تو شاید سنا ہوا ہے لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔''

''میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں بی بی۔ مگر میں یہ بات مانتا ہوں کہ رستم ہماری برادری کا ہے۔ اس میں لاکھ برائیاں سہی لیکن ایک بات سب مانتے ہیں رستم سیال قانون کے ان مجرموں میں سے ہے جو غریب کے ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود غریبی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ انہوں نے حیاتی کے سب سے سخت دکھ جھیلے ہوتے ہیں.....''

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم اپنی بات مختصر کر کے بتاؤ۔ تم نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے رستم سیال کا نام کیوں لیا ہے؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں بی بی! آپ کو یاد ہوگا جس رات میں نارپور کی حویلی میں گھسا اس رات پاس کے بیلے میں دو پارٹیوں کے درمیان زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں دو تین بندے مارے گئے تھے اور کچھ زخمی بھی ہوئے تھے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلا کر واحدی کی بات کی تائید کی۔ وہ بیان جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ لڑائی زمین کے ایک ٹکڑے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ سیالوں کی ایک بیوہ عورت اور اس کی دو بچیوں کی زمین تھی۔ مخالف پارٹی نے پہلے بیوہ کی بچیوں پر نظر رکھی اور ایک بچی کو اغوا کر کے اس سے زبردستی نکاح پڑھوا دیا پھر زمین کے پیچھے پڑ گئے۔ بات بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی۔ ہماری طرف سے رستم سیال آگے آیا اور اس نے مخالف پارٹی کے چوہدری سے بات کر کے مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کی مگر بات کرتے کرتے نوبت مار کٹائی تک آ گئی۔ چوہدریوں نے بیلے کے اندر پہلے سے بہت سے بندے اکٹھے کر رکھے تھے۔ اسلحے کی دو

گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ شکاری کتے بھی تھے۔ رستم سیال کے ساتھ بس برادری کے دس پندرہ بندے تھے اور وہ بھی لڑائی کے لئے نہیں آئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم پر ایک دم حملہ بول دیا گیا۔ میں کلہاڑیوں اور فائرنگ سے زخمی ہوا اور جان بچانے کے لئے بھاگا۔ بس قسمت اچھی تھی کہ حویلی کی پناہ مل گئی اور اس سے بھی اچھا یہ ہوا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔'' آخری الفاظ ادا کرتے وقت واحدی نے ایک لحظہ کے لئے شانی کی طرف دیکھا اور اس کی جگر پاش نظروں نے شانی کو اندر تک جھنجھوڑ ڈالا۔

شانی نے اپنے لہجے میں قدرے سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم اس حویلی میں کیسے آ گئے؟''

''دانے دانے پر مہر ہوتی ہے بی بی۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایسا اتفاقاً ہوا ہے؟''

''جی بی بی۔'' اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

کسی شخص کے دل کا حال جاننے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکنا پڑتا ہے لیکن شانی کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں ایسی نگاہ کوندتی تھی جو اسے لرزہ براندام کر دیتی تھی لیکن شاید اگر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک بھی لیتی تو بھی اس کے دل کا حال نہ جان سکتی۔ وہ بہت گہرا تھا۔ شانی کے دل میں آئی کہ اس شخص سے وہ بات کہہ ڈالے جو کہنے کے لئے وہ یہاں آئی ہے۔ اس خطرناک شخص کو بتا دے کہ وہ اس حویلی کی ملازمت سے فارغ ہے، کل سے اسے یہاں نظر نہیں آنا چاہئے مگر پھر وہ یہ بات فوراً اپنی زبان پر نہیں لا سکی۔ اس شخص نے یہاں آ کر کم از کم ایک کام ایسا ضرور کیا تھا جو اسے تھوڑی بہت رعایت کا مستحق بناتا تھا۔ طوفانی شام میں قبرستان میں پیش آنے والا واقعہ ابھی شانی کے ذہن میں تازہ تھا۔ واحدی کی بروقت اور ڈرامائی آمد نے شانی اور سکینہ کو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچایا تھا اور اب..... اب ایک نئی وجہ بھی پیدا ہوگئی تھی۔ شانی چاہتی تھی کہ واحدی اس کا پیغام لے کر اس کے بھائی کے پاس جائے..... مگر کیا ایسا کرنا مناسب تھا۔ وہ الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کا جان سے پیارا بھائی مصیبت میں تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی اور جلد سے جلد کرنا چاہتی تھی۔

وہ کافی دیر تک سوچ میں گم رہی۔ واحدی کسی عقیدت مند کی طرح اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ آخر شانی نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تمہیں عادل بھائی کے پاس بھیجنے کے بجائے میں خود ان سے ملوں۔ جس طرح میں ان سے بات کر سکتی

ہوں، شاید تم نہ کرسکو۔ وہ پولیس سے بھاگ کر اپنا کیس خراب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے میرے کہنے پر وہ اپنے لئے قانونی لڑائی لڑنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے بی بی...... مگر... کہیں آپ کا چھوٹے مالک سے ملنا ان کے لئے کوئی مشکل کھڑی نہ کردے۔ پولیس ان کی بُو سونگھتی پھر رہی ہے۔ کیا پتا حویلی کے اردگرد بھی مخبر موجود ہوں۔ اگر آپ چھوٹے مالک سے ملنے لاہور جائیں تو آپ کے ساتھ ہی پولیس بھی ان کے پاس پہنچ جائے۔''

شانی چند لمحے سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولی۔ ''پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے؟''

''اگر آپ خود ہی ان سے ملنا چاہتی ہیں تو پھر آپ کو دو چار دن انتظار کرنا چاہئے۔ اسی دوران میں حالات کی خبر رکھتا ہوں۔ پولیس کی چوکسی ذرا کم نظر آئی تو میں آپ کو بتا دوں گا۔''

شانی کو واحدی کی بات میں وزن محسوس ہوا۔

☆======☆======☆

پانچ چھ روز مزید اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن شام کو واحدی اس سے ملا۔

اس نے کہا۔ ''بی بی! کل شب برات ہے۔ اتفاق سے سرکاری چھٹی بھی ہے۔ ایسے دنوں میں پولیس کی نگرانی اور چوکسی کم ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں لاہور جانے کے لئے کل کا دن بڑا مناسب رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اور سکینہ صبح نو بجے تک مزار پر پہنچ جائیں گے۔ ہم جس بس میں سوار ہوں گے تم بھی اسی میں چڑھ جانا۔ آگے جا کر ہم لاہور جانے والی بس یا ٹیکسی پکڑ لیں گے۔''

''جو آپ کا حکم!'' واحدی نے سر جھکا کر کہا۔

شانی کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ بھائی کو ملنے کے لئے اس کا دل بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ان دنوں شانی کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھائی سے بہت محبت کرتی ہے۔ یہ محبت یقیناً ہمیشہ سے اس کے دل میں موجود تھی لیکن کبھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ اب بھائی سے جدا ہو کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھائی کے کتنے قریب ہے۔ بڑے بھائی تو زیادہ تر لاہور میں رہے تھے۔ صرف چھٹیوں میں حویلی آتے تھے، اب بھی وہ عرصے سے بیرون ملک مقیم تھے۔ ویسے بھی وہ شانی سے کافی بڑے تھے۔ عادل سلطان اور شانی کی عمروں میں بہت تھوڑا فرق تھا۔ وہ بچپن سے ہم جولیوں کی طرح تھے۔ نوعمری کی ان گنت یادیں ان کے دلوں پر نقش تھیں۔ شانی رات گئے تک پرانی تصویروں کے البم دیکھتی رہی۔ ان تصویروں

میں یادوں کے خزانے تھے۔ زیادہ تر تصویریں عادل اور شانی ہی کی تھیں۔ کہیں وہ تین پہیوں والی سائیکلیں چلا رہے ہیں، کہیں جانگھیا پہنے نہا رہے ہیں، کہیں امی ابو کے کندھوں پر سواری کر رہے ہیں۔ یادوں کی ایک کہکشاں تھی جو ماضی کے آسمان پر بچپن سے لڑکپن اور جوانی تک پھیلی ہوئی تھی۔ چند تصویریں دیکھ کر شانی چونکی۔ یہ شب برات کی تصویریں تھیں۔ دس بارہ برس پہلے کی کوئی شب برات تھی۔ ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں، پھلجھڑیاں چمک رہی تھیں، پٹاخے چل رہے تھے۔ شانی اور عادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے، چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ امی ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھیں۔ آہ...... کہاں گئے وہ سنہری دن؟ کہاں گئے وہ جگمگاتے ماہ و سال؟ شانی کا دل رقت سے بھر گیا۔ وہ کل یہ تصویریں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ کل بھی تو شب برات تھی۔ کل بھی گلی کوچوں میں ویسے ہی مناظر بکھرنا تھے جو ان تصویروں میں نظر آ رہے تھے۔ اسے یقین تھا یہ تصویریں دیکھ کر عادل کا دل بھی درد اور محبت سے بھر جائے گا۔ وہ اپنے ساتھ اور بھی بہت کچھ لے جا رہی تھی۔ اپنی ماں کی دعائیں۔ اپنے ابا جی کی بیماری کا احوال، اپنی ویران حویلی کی کہانی۔ وہ عادل کو اپنے حالات سے آگاہ کر کے اور اپنی محبت کا واسطہ دے کر اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کامیاب رہے گی۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ شانی اور سکینہ کامونکی جانے والی بس میں بیٹھیں۔ واحدی بھی اسی بس میں سوار ہو گیا۔ دو بسیں بدل کر اور پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر وہ لوگ ایک بجے کے قریب لاہور کی ایک رہائشی آبادی مصطفیٰ آباد میں پہنچے۔ واحدی کی معلومات کے مطابق عادل اپنے ایک دوست افضل ساہی کے ساتھ اسی آبادی کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھا۔ پروگرام کے مطابق واحدی نے گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹیکسی رکوا دی اور شانی کو مکان کا نمبر وغیرہ بتا دیا۔

شانی کا دل جیسے اس کی کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آئندہ دس پندرہ منٹ میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ رنگ والی سے یہاں تک آتے ہوئے شانی، سکینہ اور واحدی نے پورا خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔ وہ پوری تسلی کر کے ہی یہاں تک پہنچے تھے پھر بھی شانی کو ڈر تھا کہ عادل حسب عادت بھڑک اٹھے گا۔ خدشہ تھا کہ وہ شانی کو اس بات پر ڈانٹنے لگے کہ وہ اس کے پیچھے یہاں کیوں چلی آئی ہے۔ ہوسکتا تھا کہ ان میں لڑائی ہو جاتی لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ بہت جلد مان بھی جائے گا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ وہ ایک دوجے کے بغیر زیادہ دیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔

شانی اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی، سکینہ اس کے پیچھے تھی۔ مطلوبہ مکان کا نیلا گیٹ کچھ ہی فاصلے پر نظر آ رہا تھا مگر مکان کے سامنے کا منظر دیکھ کر شانی اور سکینہ بے طرح چونک گئیں۔ یہاں دروازے پر ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ اردگرد غم زدہ چہروں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ اسٹریچر پر ایک لاش رکھی تھی۔ لاش پر چادر تھی۔ فقط ننگے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ شانی نے پاؤں دیکھے اور دنیا اسے اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چند لمحے کے لئے جیسے پورا جسم برف کی سل بن گیا تھا پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی ایمبولینس کی طرف بڑھی۔ نگاہیں پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پاؤں...... یہ پاؤں اس کے پہچانے ہوئے تھے۔ ان کی ہر پور، ہر نشیب و فراز اس کا دیکھا ہوا تھا۔ کاش اس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ کاش وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہو۔ کاش وہ فاترالعقل ہو اور اس کا دماغ درست کام نہ کر رہا ہو۔ کاش...... کاش۔

وہ تڑپتی ہوئی پاؤں تک گئی۔ انہیں اپنے سرد ہاتھوں سے چھوا پھر اس کے سینے کی گہرائی سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ آنکھوں کے سامنے ایک خون رنگ دھند پھیل گئی۔ وہ لپک کر لاش کے سرہانے گئی اور چہرے سے کپڑا کھینچ لیا۔ اس کا مُردہ بھائی اس کے سامنے تھا۔ جو بچپن سے اب تک اس کے ساتھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا جو مسکراتا تھا تو زندگی مسکراتی تھی۔ جو اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ شانی کی زندگی کا اٹوٹ حصہ تھا۔ وہ اس سے جدا ہو گیا تھا...... ہمیشہ کے لئے۔

وہ دھاڑیں مارتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ اس کا چہرہ اپنے سینے کے اندر سمونے کی کوشش کرنے لگی۔ ''اٹھ جاؤ بھائی..... آنکھیں کھول دو۔ میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کرو۔ اٹھ جاؤ بھائی.....''

وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ دیوانگی کے عالم میں اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مُردہ بھائی کے زخموں سے خون رِسنے لگا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنی بہن کو بتا دیا کہ وہ اب نہیں اٹھ سکتا۔ اب روزِ محشر سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ شانی کی آہ و بکا بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایسی آہ و بکا تھی جو اردگرد موجود انسانوں کو ہی نہیں، بے جان اشیاء کو بھی دہلا رہی تھی۔

''کیا ہوا میرے بھائی کو ... مجھے بتاؤ کیا ہوا؟'' شانی پکار رہی تھی۔ اردگرد موجود سر جھکے ہوئے تھے۔

☆======☆======☆

عادل کے دوست افضل ساہی اور قیصر وغیرہ سے پتہ چلا کہ وہ ان کے بہت منع کرنے

کے باوجود گاڑی لے کر اسلام آباد روانہ ہو گیا تھا۔ دراصل وہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھا۔ ایک تو اسے ہر وقت پولیس کا خوف تھا لیکن اس سے بھی بڑی پریشانی اور الجھن ایک اور تھی۔ فاخر سے مقابلے میں ہارنے کے بعد وہ سخت دل برداشتہ تھا۔ جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ نارپور اور اس کے گردونواح میں اس کی ہار پر جشن منایا گیا ہے اور رنگ والی میں سوگواری کی کیفیت ہے، وہ بہت چپ رہتا تھا۔ شراب پی کر کسی وقت بلند آواز میں فاخر کو للکارتا تھا اور کہتا تھا۔ ''میں ابھی ہارا نہیں۔ میں ابھی لڑ رہا ہوں۔ آ میرے سامنے آ۔ کہاں بھاگ گیا ہے تو......!''

پھر خود ہی رونے لگتا تھا اور واہی تباہی بولتا تھا۔

حادثے کے روز بھی وہ اسی ذہنی انتشار کی حالت میں گھر سے نکلا تھا۔ اس کی گاڑی میں شراب کی بوتل بھی تھی۔ وہ ابھی شاہدرہ سے تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ ہلکی بارش میں پھسلن زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ہلکی بارش تھی۔ راستے میں وہ ایک پولیس ناکے پر رُکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پولیس کی گاڑی پیچھے لگی تو وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ایک موڑ پر گاڑی پھسل کر کنارے کھڑے ایک ٹریکٹر سے ٹکرا گئی اور الٹ کر نشیب میں چلی گئی۔ عادل کے سر اور سینے پر شدید چوٹیں آئیں۔ اسے واپس لاہور لے جایا جا رہا تھا مگر ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

بھائی کی المناک موت نے شانی کو بنیادوں تک ہلا دیا۔ چوہدری ارشاد کی حالت پہلے ہی دگرگوں تھی۔ اس واقعے کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں جان کے لالے پڑ گئے لیکن شاید یہ ان کی استقامت اور سخت جانی ہی تھی جس نے ان کی سانسوں کی ڈور برقرار رکھی ہوئی تھی۔ عادل کی اس اچانک موت پر رنگ والی اور گردونواح کے دیہات میں کئی روز تک سوگ منایا گیا۔ یہ علاقہ اپنے مستقبل کے چوہدری سے محروم ہو گیا تھا۔ چھوٹے چوہدری عادل کے سر پر پندرہ پنڈوں کی پگ تھی۔ یہ سر اپنی تمام پگوں سمیت قبر کی مٹی میں دفن ہو گیا تھا۔ رنگ والی کے جوان چوہدری کی کہانی کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی صرف چند ہفتے پہلے وہ بڑے طمطراق سے چوہدری فاخر کے خلاف میدان میں اُترا تھا۔ اسے سینکڑوں پُرجوش مداحوں نے اپنے کندھوں پر سوار کر کے اکھاڑے تک پہنچایا تھا۔ بعد میں سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ لڑائی... شکست... مایوسی ... موت سارے مرحلے کتنی جلدی طے ہوئے تھے۔

رنگ والی کی پُرشکوہ حویلی اپنی بنیادوں تک ہل چکی تھی۔ چوہدری ارشاد اپنی ساری

شان وشوکت کھوکر بستر سے لگے ہوئے تھے۔ چوہدری مشتاق ہنگامے میں مہلک پ فو کا شکار ہوکر راہی عدم ہوگئے تھے اور اب چھوٹا چوہدری بھی اچانک زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ ان تین سرکردہ افراد کے بعد کھیت اجڑ رہے تھے۔ باغ ویران ہورہے تھے اور قرض خواہوں کا گھیرا حویلی کے گرد تنگ سے تنگ ہوتا جارہا تھا۔

عادل کی آخری رسومات میں فاخر کے علاوہ مہرجی اور بھابو نے بھی شرکت کی تھی۔ بھابو بڑی دیر تک شانی کے گلے لگ کر روتی رہی۔ اس کے آنسو جیسے تھمنے میں ہی نہیں آرہے تھے۔ وہ سسک کر بولی۔ ''شانی! ہم نارپور والے تیرے لئے کتنے منحوس ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے تیرے چاچا گئے، اب پیارا بھائی بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ باپ علیحدہ..... بستر پر پڑا ہوا ہے۔ ایمان سے شانی' میرے بس میں ہوتا تو میں تیرے سارے دکھ لے لیتی۔ اگر میری زندگی کی کوئی خوشی ہے تو میں رب سے دعا کرتی ہوں کہ اے مالک میری یہ خوشی شانی کو اور اس کے گھر والوں کو دے دے۔''

بھابو دیر تک شانی کے پاس بیٹھی رہی۔ اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی ہمت بڑھاتی رہی اور پھر باتوں کے دوران میں اس نے بڑے درد اور بڑے اخلاص سے کہا۔ ''شانی! تیرے بعد بڑی اُداس رہتی ہوں۔ بچے بھی ہر وقت تیرا نام لیتے ہیں اور حویلی کے ملازم تو اٹھتے بیٹھتے تیرے نام کی مالا جپتے ہیں لیکن..... سچ پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ تو کبھی اس حویلی میں نہ آئے۔ وہ حویلی نہیں قید خانہ ہے اور اس قید خانے کا داروغہ فاخر ہے۔ مہرجی کو تُو بڑا داروغہ کہہ سکتی ہے۔ یہ دونوں ظالم داروغہ مل کر قیدیوں کو ہر وقت سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں۔ تُو اس حویلی کی دوہٹی بن کر وہاں گئی تھی۔ پر تُو حویلی کی دوہٹی نہیں تھی، تُو تو قید خانے کی دوہٹی تھی۔ میں تیرے آنے والے دنوں کا سوچتی ہوں تو میرا دل رونے لگتا ہے۔ پتا نہیں..... پتا نہیں اس فاخر نے کیا کرنا ہے تیرے ساتھ۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ اپنا رستہ تجھ سے علیحدہ نہیں کرے گا۔''

''بھابو! کیا کہنا چاہتی ہے تُو؟''

''میں کچھ کہنا نہیں چاہتی..... لیکن..... میرا دل تیرے لئے ڈرتا رہتا ہے۔ تُو بڑی اچھی ہے شانی۔ بالکل پھول کلیوں کی طرح ہے۔ اس زمانے کی ہوا بڑی گرم اور زہریلی ہے۔ یہ تو پتھروں کو بھی جلا کر کوئلہ کر دیتی ہے۔''

''مہرجی کا کیا حال ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہی تو سارے فساد کی جڑ ہے۔'' بھابو نے بے حد تلخی سے کہا۔ ''بزرگ ہے، اس کے

بارے میں اس طرح بات کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن اس کے کرتوتوں پر نظر جاتی ہے تو پھر دل میں کوئی لحاظ باقی نہیں رہتا۔ نیچ ذات کا بندہ بڑی کرسی پر بیٹھ جائے تو پھر بھی اس کا چھوٹا پن نظر آتا رہتا ہے۔ مہرجی کے اندر دشمنی کی آگ جل رہی ہے۔ یہ آگ تجھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔ تیری حیاتی کو برباد کرنا چاہتی ہے۔'' بھابو کی سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ یہ آگ تجھ تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے کہ تجھے بچانے والے ہتھ کمزور پڑ رہے ہیں۔ آجا کے تیرے ابا جی رہ گئے ہیں۔ وہ بیمار پڑے ہیں۔ آمدن ختم ہوگئی ہے، قرضے چڑھتے جارہے ہیں۔ میرے خیال میں آٹھ دس لاکھ کا قرضہ تو فاخر کا ہی ہوگا۔ وہ کسی بھی وقت اپنی رقم مانگ سکتا ہے۔''

بھابو اور شانی دیر تک اپنے دُکھڑے سناتی رہیں اور پھر ڈھیر ساری نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ بھابو نارپور واپس چلی گئی۔

یہ تین دن بعد کا واقعہ ہے۔ شانی صبح سویرے اپنے گلاب کے پھولوں کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطرے تھے۔ شاید شانی کے پھول بھی شانی کی طرح آبدیدہ تھے۔ کچھ دیر بعد واحدی سر جھکائے پھولوں کے پاس پہنچا اور شانی سے قریباً دس فٹ کی دوری پر بیٹھ کر پودوں کو گوڈی دینے لگا۔

اس کے ہاتھ کھرپے پر حرکت کررہے تھے مگر لگتا تھا کہ ذہن پورے کا پورا شانی کی طرف متوجہ ہے۔ واحدی کے لمبے چمکیلے بال رخساروں پر جھول رہے تھے اور آنکھیں سرخ اور متورم نظر آتی تھیں۔

اچانک واحدی نے دھیمی اور نہایت گھمبیر آواز میں ایک فقرہ کہا۔ اس عجیب فقرے نے شانی کو سرتاپا ہلا دیا۔ واحدی نے کہا تھا۔ ''بی بی! میں مہرجی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

شانی نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو واحدی؟ تم ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں بی بی! میں ہوش میں ہوں اور سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔'' واحدی کی آواز بدستور دھیمی اور گھمبیر تھی۔ ''میں مہرجی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ کاش یہ شخص آپ کے شوہر کا باپ نہ ہوتا۔ میں آپ کو بتاتا کہ اس بندے کے لئے میرے دل میں کتنی نفرت ہے یہ... بہت کمینہ آدمی ہے بی بی!''

''واحدی!'' شانی نے پھنکار کر کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔

''مم..... میں معافی چاہتا ہوں بی بی! مجھے پتا ہے، میں اپنے منہ سے بڑی بات کہہ رہا ہوں لیکن بی بی! دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ سچ ہے۔ مجھے مہر کے بارے میں کچھ ایسی باتوں کا پتا

ہے جو شاید اس کے گھر والوں کو بھی نہ ہو۔ کیا آپ اس بات پر یقین کر سکتی ہیں کہ مہر سانپ کا لہو اور سانپ کے پتے کا پانی پی جاتا ہے۔ ...‘‘

شانی کچھ بول نہ سکی۔ اس کے ہونٹ بس لرز کر رہ گئے۔ اسے کچھ عرصہ پہلے کی وہ باتیں یاد آ گئی تھیں جو اسے بھابو نے بتائی تھیں۔ بھابو نے بھی شانی پر کچھ اسی طرح کا انکشاف کیا تھا۔ واحدی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے ایسی بات کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے لیکن سچ یہی ہے کہ مہر کی عمر سو سال کے لگ بھگ ہے اس کے باوجود وہ عورتوں کو...... میلی نظر سے دیکھتا ہے۔ نار پور حویلی کی اکثر جوان نوکرانیاں اکیلے میں مہر کے پاس جاتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ وہ بڑا عجیب اور گندہ بندہ ہے بی بی۔‘‘

شانی کا چہرہ غصے کی زیادتی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی۔ ’’واحدی! تم واقعی اپنے منہ سے بڑی بات کر رہے ہو۔ تم نے میرے سامنے میرے گھر کے ایک فرد کو قتل کرنے کی بات کی ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں اس بارے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتی، تم جاؤ یہاں سے۔‘‘

واحدی کا سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بظاہر کھرپے پر حرکت کر رہے تھے لیکن ذہن پوری طرح شانی کی طرف تھا۔ وہ دبی آواز میں بولا۔ ’’بی بی! جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ کی ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔ آپ کا نمک خوار ہوں، چپ نہیں رہ سکتا۔ بس آج میری بات سن لیں، پھر کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔‘‘

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ شانی کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے مزید بات کرنے کا اذن مل گیا ہے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور برآمدے میں دو نوکرانیاں مولی والے پراٹھے پکانے کے لئے مولیاں کدوکش کر رہی تھیں۔ مین گیٹ کے پاس تین چار مزارعے ایک اڑیل بیل کو کھینچ تان کر باہر لے جا رہے تھے۔ خادم حسین دودھ سے بھرے ہوئے برتن اپنی نگرانی میں اندر لا رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے کام میں مگن نظر آتا تھا۔ واحدی نے کہا۔ ’’میں واقعی اپنے منہ سے بڑی باتیں کر رہا ہوں بی بی لیکن کیا کروں۔ جو میرے دل میں ہے، آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ناراض ہوں لیکن...... لیکن سچ وہی ہے جو آپ سے کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘

’’بی بی! ایک شخص ایسا ہے جو آپ کے گھر کا بندہ ہے۔ آپ کے بہت قریب بھی ہے لیکن .. وہ اصل میں آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ آپ کو دھوکے میں رکھ رہا ہے۔ اس کی

وجہ سے آپ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔‘‘

’’کس کی بات کر رہے ہو؟‘‘

اس ساری گفتگو میں واحدی نے دوسری مرتبہ سر اٹھایا۔ ایک لحظہ کے لئے شانی کی آنکھوں میں دیکھا، پھر سر کو دوبارہ جھکا کر بولا۔ ’’بی بی...... آپ کے چاچا رئیس!‘‘

شانی کی رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا کہ آنکھوں کے سامنے سُرخ دھند پھیل گئی ہے۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لئے غصے کی ایک بلند لہر شانی کے سینے میں اٹھی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ گھوما اور چٹاخ کی زوردار آواز سے واحدی کے رخسار پر پڑا۔ شانی کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی نازک کلائی میں کھب گئیں۔ طمانچے کے زور سے واحدی کے لمبے سیاہ بال اچھل کر رہ گئے۔

وہ بیٹھا بیٹھا ہی ذرا سا ڈگمگا گیا۔ اس کی حیرت زدہ نگاہ ایک ثانیے کے لئے شانی کی نگاہ سے ٹکرائی اور پھر جھک گئی۔

’’دفع ہو جاؤ یہاں سے...... دفع ہو جاؤ!‘‘ شانی اِدھر اُدھر دیکھ کر پھنکارتی ہوئی بولی۔

شکر کا مقام تھا کہ کسی کی نظر بھی گلاب کے پودوں کے اس پار اس ڈرامائی منظر پر نہیں پڑی تھی۔ نہ ہی شاید طمانچے کی آواز نے کسی کے کان تک رسائی حاصل کی تھی۔ واحدی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شانی کی دائیں کلائی لمحوں میں لہولہان ہو گئی تھی۔ دوسری طرف واحدی کے رخسار پر بھی طمانچے کا سُرخ نشان دکھائی دینے لگا تھا۔ نشان کا زیادہ تر حصہ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے واحدی کی نظر شانی کی لہولہان کلائی پر پڑی اور وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے رخسار پر لگنے والا طمانچہ بھول گیا ہے اور اس کی ساری توجہ شانی کی رنگین کلائی کی طرف چلی گئی ہے۔

شانی نے شدید غصے کے عالم میں رُخ پھیرا اور برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ واحدی بھی سُتے ہوئے قدموں سے احاطے کی طرف چلا گیا تھا۔

ٹوٹنے والی دو چوڑیوں نے شانی کی کلائی پر تقریباً دو انچ لمبا زخم لگایا تھا۔ خون مسلسل نکل رہا تھا۔ وہ اندر گئی تو پھپھو آمنہ بُری طرح چونک گئیں۔ ’’ہائے میں مر گئی۔ یہ کیا ہوا؟‘‘

’’کک...... کچھ نہیں پھوپھی! سیڑھی پر پاؤں پھسل گیا ہے۔‘‘

’’پاگلے! تُو نے تو بانہہ کا ستیاناس کر لیا ہے۔‘‘ پھپھو نے کہا پھر وہ انوری اور مختاری وغیرہ کو آوازیں دینے لگیں۔

ذرا سی دیر میں شانی کے گرد جمگھٹا لگ گیا۔ بھتیجا سفیان جلدی سے ٹنکچر اور دوائی لے

آیا۔ ایک صاف اوڑھنی سے لمبی پٹی پھاڑی گئی۔ روئی وغیرہ رکھ کر خون بند کیا گیا اور پٹی باندھ دی گئی لیکن ہوا یہ کہ دو ہی منٹ بعد ساری پٹی پھر خون سے بھیگ گئی۔ پٹی کھول کر دوبارہ کی گئی، وہ بھی ذرا سی دیر میں تربتر ہو گئی۔ بابا فخری بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی ناڑ کٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔“

سب لوگ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ پھپھو نے شانی کا ہاتھ اونچا کر کے پکڑ رکھا تھا تاکہ دباؤ کی وجہ سے خون زیادہ نہ نکلنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد رنگ والی کا اکلوتا ڈاکٹر شہزاد بھی بھاگا ہوا پہنچ گیا۔ اسی دوران میں شانی کے ”سیڑھی پر پھسلنے“ اور زخمی ہونے کی خبر پوری حویلی میں پھیل چکی تھی۔ ڈاکٹر شہزاد نے پہلی پٹی کھول کر زخم کو برف کے پانی سے لگاتار دھویا پھر اچھی طرح اینٹی بائیوٹک پاؤڈر لگا کر پٹی کر دی۔ پٹی کی حالت سے ظاہر تھا کہ خون رکنا شروع ہو گیا ہے۔

کچھ فرصت ملی تو شانی کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ واحدی نے جو کچھ کہا تھا اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے کانوں میں گرم سیسہ انڈیلا گیا ہے..... لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، وہ واحدی کے الفاظ پر غور کرنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ جو سوچیں اس کے دماغ میں آ رہی تھیں، وہ اس کے لئے بہت ناپسندیدہ تھیں۔ وہ اپنے چاچا کے بارے میں اس قسم کا گمان کرنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بار بار اپنے خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

ایک کے بعد ایک بات اس کے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر نئی بات کے ساتھ ایک ناپسندیدہ شبہ اس کے اندر پروان چڑھ رہا تھا۔ چاچا رئیس کے ساتھ فاخر کا گہرا کاروباری تعلق تھا۔ چاچا کے مفاد فاخر سے وابستہ تھے۔ شانی کے ابا جی کو فاخر کے قریب لانے والے بھی چاچا رئیس ہی تھے۔ شانی کے رشتے میں بھی سب سے زیادہ کردار چاچا رئیس نے ہی ادا کیا تھا۔ بعد ازاں جب ہنگامے میں شانی کے چھوٹے چاچا مشتاق کی جان گئی اور بہت سے لوگوں نے کہا کہ اس قتل کے لئے نارپور کے چوہدریوں پر مقدمہ درج ہونا چاہئے تو یہ چاچا رئیس ہی تھے جنہوں نے مختلف دلیلیں دے کر اس رائے کو غلط ثابت کیا۔ شانی سوچتی رہی اور نئی باتیں اس کے سامنے آتی رہیں پھر ایک اور واقعہ اس کے ذہن میں آیا اور وہ بُری طرح چونک گئی۔ چند ہفتے پہلے شانی اور اس کے ابا جی کو ایک بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس نقصان نے ان کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی تھی اور شاید یہی نقصان عادل کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔ وہ لاکھوں کے زیورات جو شانی نے تایا معصوم کے سپرد کئے تھے،

راستے میں نامعلوم افراد نے لوٹ لئے تھے۔ ان زیورات کی لاہور روانگی کے بارے میں شانی اور تایا معصوم کے سوا صرف چاچا رئیس کو معلوم تھا۔

”نہیں ..... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ چاچا رئیس اس حد تک نہیں گر سکتے۔“ شانی نے تڑپ کر سوچا۔

”یقیناً..... وہ شبے کا شکار ہو رہی ہے۔ ایک اجنبی کی باتوں میں آ کر اپنے چاچا کے بارے میں غلط سوچ اختیار کر رہی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

وہ اپنی سوچ کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک بار وہ کامیاب ہو جاتی تھی، دوسری بار ناکام..... اور جب وہ ناکام ہوتی تھی تو اس کے پردۂ تصور میں آپوں آپ واحدی کی شبیہ اُبھر آتی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور رخسار پر تھپڑ کا نشان تھا۔ اگر..... واحدی نے غلط نہیں کہا تھا تو پھر شانی نے کتنا غلط کیا تھا۔ اس نے اسے مارا تھا۔

وہ کمرے میں بند رہی اور دن دھیرے دھیرے شام کی طرف بڑھتا رہا۔ شانی نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا، اب بھی بھوک اس سے کوسوں دور تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا شانی کے دل و دماغ میں وہ ناپسندیدہ شک مضبوط ہو رہا تھا، جس کا تعلق اس کے چاچا رئیس سے تھا۔ چاچا رئیس کے حوالے سے بے شمار سوال اس کے ذہن میں پیدا ہو گئے تھے اور وہ ان کا جواب چاہتی تھی۔

پھپھو اور سکینہ کے بے حد اصرار پر شانی نے رات کو مکئی کی روٹی کے چند لقمے لئے اور تھوڑا سا دودھ پیا۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر چت لیٹی تھی اور ابتدائی راتوں کا چاند مغربی کھڑکی میں اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ذہن پریشان تھا اس لئے منتشر خیالوں کے گھوڑے مختلف اطراف میں دوڑ رہے تھے۔ زندگی میں کم ہی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ مشتعل ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ کسی پر اٹھا تھا۔ اب تک کی زندگی میں بمشکل چار پانچ ایسے موقعے اسے یاد تھے۔ ان میں سے دو موقعے اہم تھے۔ ایک وہ جب خدا بخش کے کنوئیں پر اس نے فاخر کو طمانچہ مارا تھا اور دوسرا آج جب واحدی کے رخسار پر اس کا ہاتھ پڑا تھا۔ یہ دو طمانچے تھے لیکن دونوں طمانچوں کے اثرات کتنے مختلف تھے۔ فاخر نے طمانچہ کھانے کے بعد شانی کو ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو اسے آج بھی یاد تھیں۔ ان نظروں میں بلا کی حرارت اور عداوت تھی۔

آج یہی صورتِ حال واحدی کے ساتھ پیش آئی تھی لیکن اس کی نگاہوں میں کچھ اور ہی

نقشہ اُبھرا تھا۔ ایک بے بسی ایک غم زدہ حیرت، ایک ندامت...... ہاں کتنے مختلف نتائج تھے ان دونوں حادثات کے۔

شانی نے فاخر کی شعلہ برساتی نگاہیں یاد کیں تو اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ سب کچھ جو رخصتی کے بعد نار پور کی حویلی میں اس پر بیتا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی ''خواہش'' کو اپنی دوشیزگی سونپ کر، محبت پانا چاہتی تھی لیکن اس سے نفرت کی گئی تھی۔ اسے تذلیل کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسے وہ سب راتیں یاد تھیں جب اس نے دل کی گہرائی سے اپنا تن من اپنے مجازی خدا پر نچھاور کرنا چاہا تھا۔ ایسی راتوں میں اس سے توہین آمیز بے رخی اختیار کی گئی تھی اور اسے وہ راتیں بھی یاد تھیں جب وہ اپنے آپ سے دور تھی، کسی غم کے سمندر میں غوطہ زن تھی لیکن اس کے شوہر نے اسے اپنی کرخت بانہوں میں سمانے پر مجبور کیا تھا۔ کیا ایسے بھی محبت ہوتی ہے؟ کیا ایسے بھی زندگی میں پھول کھلائے جاتے ہیں؟ وہ جب ایسے موقعوں کا تصور کرتی تھی تو فاخر کے کانٹوں بھرے چہرے اور بالوں بھرے جسم کے لئے ایک شدید گریز اس کے اندر جنم لیتا تھا۔ وہ بڑی گھبراہٹ سے سوچتی تھی، کیا زندگی میں پھر ایسے شب و روز آئیں گے جب نار پور کی حویلی میں وہ فاخر کے رحم و کرم پر ہوگی؟ اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ اس صورتِ حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی۔

چاند کھڑکی کے عین وسط میں آ گیا تھا۔ کہیں کسی کتاب میں پڑھا ہوا لوک گیت لفظ لفظ شانی کے ذہن میں اُترنے لگا۔ مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

وہ مجھے چھمکوں سے مار کر میری ست رنگی چوڑیاں توڑ دے۔
مجھے کانٹوں پر گھسیٹے اور مجھے بھوکا رکھے۔
وہ پوہ ماگھ کی سردی میں مجھے ململ کے کپڑے پہنائے اور
میرے سر کو چھت بھی نہ دے
لیکن مجھ سے پیار تو کرے
میں پیار کی بھوکی، میں کملی، میں جھلی
میرے اندر عشق نے اودھم مچایا ہے
میں ٹوٹ کر پیار کرنا چاہتی ہوں
کسی کے لئے مرجانا چاہتی ہوں
اور چاہتی ہوں کہ کوئی میرے لئے مرجانے کا حوصلہ رکھے۔
میں کملی، میں جھلی۔

......رنگ والی کی بھیدوں بھری رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ شانی کے خیالات مختلف اطراف میں سفر کر رہے تھے۔ واحدی نے جو کچھ مہر جی کے بارے میں بتایا تھا، وہ شانی کے ذہن کے نازک تاروں پر ایک بھاری بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی بھاری بھرکم سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو اور دھیرے دھیرے پھنکار رہا ہو۔ مہر جی کے بارے میں ایسی ہی باتیں وہ پہلے بھابو سے بھی سن چکی تھی اور خود بھی بہت کچھ محسوس کر چکی تھی۔ جونہی مہر جی کا تصور شانی کے ذہن میں آتا تھا ایک طرح کا پُراسرار ڈر بھی سانس لینے لگتا تھا۔

شانی نے اس تصور کو ذہن سے جھٹکا اور کھڑکی میں دیکھنے لگی۔ چاند کھڑکی کے دائیں کنارے کو چھونے لگا۔

خوشگوار ہوا نے حویلی کے مکینوں کو دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ بس مین گیٹ کی طرف سے رات کے چوکیداروں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ شانی کے حساس دل میں واحدی کے لئے ہمدردی کی ایک بلند لہر اٹھ رہی تھی۔ یہ خالص ہمدردی تھی۔ اس میں کوئی اور جذبہ شامل نہیں تھا۔ یہ وہی ہمدردی تھی جو چند ماہ پہلے واحدی کو زخمی حالت میں دیکھ کر شانی کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اب یہ ہمدردی ایک لہر کی طرح شانی کے کومل جسم سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کے سینے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور اس کی جان کو بے قرار کر رہی تھی۔ اس کا دل اسے ملامت کر رہا تھا۔ ''شانی! تجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس شخص کا تجھ پر اور سکینہ پر ایک بہت بڑا احسان بھی ہے۔ کم از کم اس احسان کے بدلے ہی تُو اس کی خطا کو معاف کر دیتی۔''

ایک بار پھر شانی کے تصور میں وہ ''دردناک حیرت'' ابھر آئی جو زنائے کا تھپڑ کھانے کے بعد واحدی کی مغموم آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ بے چین ہو کر اپنے بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے دیوار سے موٹی شال اتاری اور چپل پہن کر برآمدے کی طرف چلی آئی۔ ملازمین کے کوارٹر احاطے کے پرلی طرف شمالی گوشے میں نظر آ رہے تھے۔ رات کے اس پہر یہ کوارٹر بھی مکمل سکوت کے گھیرے میں تھے۔ ایک دو کمروں میں ہی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ شانی دیوار کے ساتھ چلتی ان کوارٹروں کی طرف بڑھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بند کمرے کے سامنے تھی۔ دروازے کی درزوں سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ واحدی اسی کمرے میں رہتا تھا۔ رات کے سناٹے میں شانی کو اندر سے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ کوئی ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان آنسو بہا رہا تھا۔ یہ واحدی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی

مگر ناکام رہی۔ ''تجسس'' جیسے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوارٹر کے عقب میں لے گیا۔ یہاں خودرو گھاس تھی اور جھاڑ جھنکاڑ تھا لیکن یہاں کا ایک ایک چپا چپا شانی کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ ایک کھڑکی کی درز میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب ہوگئی۔ بلب کی زرد روشنی میں اسے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ واحدی کھجور کی ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔ اس کی دائیں کلائی لہولہان نظر آرہی تھی۔ ایک دو جگہ سے تو گوشت کٹ کر نیچے لٹک گیا تھا۔ جس خون آلود پیچ کس سے کلائی پر زخم لگائے گئے تھے وہ بھی قریب ہی پڑا تھا۔ یہ زخم واحدی نے غالباً پانچ دس منٹ قبل خود ہی لگائے تھے۔ اب خون رِسنا کم ہوگیا تھا۔ واحدی نے ایک میلی سی پٹی لی اور اسے بے پرواہی سے کلائی پر لپیٹ کر گرہ باندھ لی پھر وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی ہچکیاں تو سنائی نہیں دے رہی تھیں مگر آنکھیں اب بھی اشک بار تھیں۔

شانی کے دل نے گواہی دی کہ واحدی نے اپنے جسم پر یہ زخم صبح والے واقعے کے نتیجے میں لگائے ہیں۔ شانی کی زخمی کلائی کے بدلے میں اس نے اپنی کلائی زخم زخم کر لی ہے۔ اس نے کیوں ایسا کیا ہے؟ کیا شانی کے بدترین خدشات درست ہیں؟ کیا واحدی کے دل میں شانی کے لئے کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو چکا ہے جسے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جس کے پیدا ہونے کے بارے میں سوچنا بھی شانی کے لئے گناہِ عظیم تھا۔ وہ اندر سے لرز کر رہ گئی پھر شانی کی نگاہ ایک اور شے پر پڑی اور اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔

اس نے اپنی آنکھ کھڑکی سے چپکا کر مزید غور سے دیکھا۔

ہاں...... یہ اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ مڑی تڑی سی یہ تصویر واحدی کے عین سامنے جستی ٹرنک کے اوپر رکھی تھی۔ کارڈ سائز کی اس تصویر کو ایک ٹائم پیس کے ساتھ یوں ٹکایا گیا تھا کہ وہ عمودی رخ پر کھڑی ہوگئی تھی۔ واحدی...... اپنا سر گھٹنوں میں دیئے ہوئے، اسی تصویر کے سامنے بیٹھا تھا۔

کچھ دیر پہلے شانی کے دل میں واحدی کے لئے ہمدردی اور ترحم کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے، وہ ایک دم کافور ہوگئے۔ اس کی جگہ ایک طرح کے خوف اور طیش نے لے لی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ ایک اضطراری حرکت کے ساتھ وہ تیزی سے مڑی اور گھوم کر کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ نے کمرے کے دروازے پر مدھم لیکن طیش بھری دستک دی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ شانی کو واحدی کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اپنی سُرخ اور متورم آنکھیں پونچھ لی تھیں۔

''جی بی بی؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے تقریباً دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ ان لمحوں میں اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر کوئی رات کے اس پہر اسے ایک ملازم کے کمرے میں دیکھ لے تو کیا ہو۔

پہلے اس نے واحدی کے ہاتھوں کی طرف نگاہ دوڑائی، پھر تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ تصویر اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ''تصویر کہاں ہے؟'' وہ پھنکار کر بولی۔

واحدی کا رنگ زرد ہوگیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، شانی کی نگاہ ٹائم پیس کے نیچے تصویر کے سفید کنارے پر پڑگئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے واحدی نے تصویر ٹائم پیس کے نیچے دبا دی تھی۔ شانی نے جھپٹ کر تصویر نکالی اور اس پر ایک نگاہ ڈالے بغیر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ واحدی ساکت کھڑا تھا۔

شانی نے ٹرنک اور ایک چرمی بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی ہے تمہارا سامان؟''

''ج...... جی......''

''یہ سامان اٹھاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ حویلی چھوڑ دو۔ اگر آدھے گھنٹے کے بعد تم یہاں نظر آئے، تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' شانی کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ طیش کے سبب اس کا وجود لرز رہا تھا۔ پھٹی ہوئی تصویر کے ٹکڑے مضبوطی سے اس کی مٹھی میں دبے ہوئے تھے۔

''کک...... کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟'' واحدی کی پھنسی پھنسی آواز ابھری۔

''تم...... ایک لفظ نہیں بول سکتے ہو۔ بس میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اسی وقت اور آئندہ میں کبھی تمہاری صورت نہ دیکھوں۔'' شانی کا لہجہ بے لچک تھا۔

واحدی نے بس ایک نگاہ شانی پر ڈالی اور پھر ''تسلیم'' کے انداز میں سر جھکا دیا۔ واحدی کی اس آخری نگاہ میں کرب کی فلک بوس لہریں تھیں اور شکووں کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا مگر یہ سب کچھ تسلیم و رضا کے دو شفاف آنسوؤں میں چھپ گیا تھا۔ شانی ہوا کے ایک تند جھونکے کی طرح اس کے کمرے سے نکل آئی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ چاند کی روشنی میں مین گیٹ کا منظر دکھائی دیا۔ ایک تانگا حویلی کے دروازے سے نیم پختہ راستے کی طرف

جارہا تھا۔ جسے حویلی چھوڑنے کا اور کبھی شکل نہ دکھانے کا حکم ملا تھا، وہ حویلی چھوڑ رہا تھا، اپنی شکل چھپا رہا تھا۔

وہ دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتے اور اونچے نیچے راستے پر تانگے کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ کیکر اور شیشم کے درخت تانگے کے ہیولے کو ڈھیرے ڈھیرے چھپاتے چلے جارہے تھے۔ ہیولا پرچھائیوں میں گڈمڈ ہورہا تھا، پھر وہ مکمل طور پر شانی کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بس ایک زردسی چاندنی نشیب وفراز پر چمکتی رہ گئی۔ تانگے کے اوجھل ہونے کے بعد بھی شانی دیر تک کمرے کی محرابی کھڑکی میں کھڑی رہی پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ آنسو ایک دم اس کی آنکھوں سے ابل پڑے۔ وہ رونے لگی۔

عجیب صورتِ حال تھی۔ وہ زاروقطار رورہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں رورہی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔ اسے واحدی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بے شک وہ غلط راستے پر تھا۔ اس کی سوچ کسی طور پر بھی قابلِ قبول نہیں تھی لیکن یہ اس کی سوچ تھی۔ ممکن تھا کہ اپنی سوچ پر واحدی کو مکمل اختیار نہ ہو۔ وہ اپنے خیالات کے سامنے بے بس ہوگیا ہو۔ وہ جتنا سوچتی گئی اسے یقین ہوتا گیا کہ ایسا ہی ہے۔ اس نے کئی بار واحدی کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور ان آنکھوں میں ہر بار اسے ایک ایسا منہ زور جذبہ نظر آیا تھا جس کے سامنے ہر مزاحم شے جڑوں سے اکھڑتی محسوس ہوتی تھی۔ اس جذبے کی موجودگی کا احساس شانی کو اندر تک لرزا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ واحدی نامی اس شخص کو جلد از جلد اپنی نظروں سے دور کرنا چاہتی تھی...... اور اب تو اس بات میں شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ واحدی نے شانی کو کسی اور نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک ایسی نگاہ جس کے بارے میں سوچنا بھی شانی کے لئے گناہِ عظیم ہے۔

''تم نے ٹھیک ہی کیا جو اسے نظروں سے اوجھل کردیا۔ اس کی موجودگی تمہارے لئے کسی بہت بڑے طوفان کا باعث بن سکتی تھی۔'' شانی کے اندر سے آواز ابھری۔

لیکن پھر فوراً ہی ایک دوسری مخالف آواز نے پہلی آواز کو دبالیا۔ اس آواز نے کہا۔ ''جو کچھ بھی تھا، اس کے دل کے اندر تھا۔ سینے کی اتھاہ گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔ تمہیں اور تمہاری زندگی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن اس سے تمہارا ایک تعلق پیدا ہوچکا تھا۔ ایک ذہنی ربط تھا۔ بے شک اس ربط میں کسی طرح کی اخلاقی کج روی نہیں تھی مگر اس ربط کی [illegible]

اس کا اخلاص...... نامساعد حالات میں تمہارے لئے سہارا بن سکتا تھا۔ اسے یوں حویلی سے نکال کر تم ایک ہمدرد اور غم گسار سے محروم ہوگئی ہو۔''

پہلی آواز نے مخالفت کی۔ ''جو غم گساری کے بعد غم اور بدنامی کا باعث بنے، اس سے محروم رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ واحدی کے دل میں جو کچھ بھی تھا، وہ اس کے دل کے اندر تھا...... لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ اندر ہی رہے گا۔ ایسے جذبے چھپتے نہیں ہیں۔ وہ جلد یا بدیر اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں پھر جگ ہنسائی اور ذلت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ واحدی کی آنکھیں گواہ تھیں کہ اس کے اندر جو کچھ بھی ہے، وہ بہت گہرا...... اور خطرناک ہے۔ وہ نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔''

''پھر تو تمہیں اور بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔'' دوسری آواز نے نکتہ آفرینی کی۔ ''تمہیں سوچنا چاہئے تھا کہ یہ منہ زور جذبہ کہیں واحدی کو ہی کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ تم نے صرف اپنی زندگی کے بارے میں سوچا کسی اور کی زندگی کے بارے میں نہیں سوچا۔ آخر وہ بھی تو کسی کا بیٹا ہوگا، کسی کا بھائی ہوگا۔ کچھ لوگوں کے لئے اس کی زندگی بھی تو نہایت قیمتی ہوگی۔ تم نے جس گہرے اور خطرناک جذبے کا ذکر کیا ہے، وہ خود واحدی کی زندگی کو بھی تو برباد کرسکتا ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہاری ذہنی اور اخلاقی سطح واحدی سے بہت بلند ہے تو پھر تمہیں بڑے پن کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔ ایک دانا ناصح کی طرح واحدی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس کی ذہنی گتھی کو سلجھانے کا کام جتنی خوبی سے تم کرسکتی تھیں، کوئی اور نہیں کرسکتا تھا...... لیکن تم نے ایک نادان جلد باز کی طرح کانٹوں میں الجھے ہوئے نازک کپڑے کو جھٹکے سے چھڑانے کی کوشش کی ہے۔''

شانی کے دل ودماغ میں دیر تک یہ کشمکش جاری رہی۔ چاندنی رات رنگ والی کے گلی کوچوں میں سرسراتی رہی اور شانی بستر پر لوٹتی رہی۔ اس کے ذہن میں بار بار وہ منظر ابھرآتا تھا جو اس نے آج رات پچھلے پہر واحدی کے کوارٹر میں دیکھا تھا۔ وہ کسی ''عبادت گزار'' کی طرح شانی کی تصویر کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تربتر تھیں۔ اس منظر کا خیال آتے ہی ایک ''کرب آمیز شرم'' کی بلند لہریں شانی کے جسم میں سرایت کرجاتی تھیں۔

☆======☆======☆

گرمی عروج پر تھی۔ دوپہر سے ہی سخت حبس محسوس ہورہا تھا۔ پسینہ دھاروں کی صورت [illegible]

شروع ہوگئی۔ یوں لگا کہ ہر جاندار اور بے جان شے جھوم اٹھی ہے۔ حویلی کے زنانے حصے میں ملازمائیں صحن میں نکل آئیں اور کپڑوں سمیت نہانے لگیں۔ ان میں نوعمر...... جوان...... اور درمیانی عمر کی سب ہی شامل تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ہاتھاپائی کررہی تھیں۔ ان کے جسم مچل رہے تھے، ڈول رہے تھے پھر مختاری اندر سے آموں کا ٹوکرا لے آئی۔ آموں کے پہنچتے ہی بارش میں نہانے کا مزہ دوبالا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ اور دھینگا مشتی میں بھی اضافہ ہوگیا۔ دو نوخیز لڑکیاں جامن کے پیڑ پر چڑھ گئیں اور جھولا ڈالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انسانی زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ ہر حال میں آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ ماضی قریب میں یہ حویلی دو تین نہایت سنگین حادثوں سے دوچار ہوچکی تھی۔ کئی ہفتوں تک یہاں کی ہر شے غم اور سوگ میں ڈوبی رہی تھی لیکن اب پھر رفتہ رفتہ حالات معمول پر آتے چلے جارہے تھے۔ تاہم یہ صورت حال صرف ملازمین تک محدود تھی۔ شانی کا دل تو اب بھی غم میں ڈوبا ہوا تھا بلکہ اس سہانے موسم میں زخم کچھ اور بھی ہرے ہوگئے تھے۔ اسے یاد آنے لگا ایسے موسم میں عادل کا موڈ کتنا اچھا ہوجاتا تھا۔ وہ چھٹی کرکے گھر میں بیٹھ جاتا تھا۔ دونوں بہن بھائی خوب انجوائے کرتے تھے۔ عادل اکثر بیسن کے حلوے کی فرمائش کردیتا تھا اور اس کی شرط یہ ہوتی تھی کہ شانی اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے گی۔ جواب میں شانی اور چاچا مشتاق چونسے آموں کی فرمائش کردیتے تھے پھر یہ آم جہاں سے بھی ملتے عادل کو منگوانے ہی پڑتے تھے۔

چاچا مشتاق تو قلمی آموں کے دیوانے تھے۔ وہ پیٹی اٹھا کر حویلی کی چھت پر چلے جاتے تھے۔ تابڑتوڑ بارش میں چھت کے عین درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تھے اور عادل کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیتے تھے۔ سفیان ان کی ذم بنا رہتا تھا۔ شانی برساتی کے چھجے تلے بیٹھ کر ان کی خرمستیاں دیکھتی تھی۔ آج وہی بارش تھی۔ وہی در و دیوار تھے مگر شانی کا پیارا بھائی نہیں تھا۔ اس کے چہیتے چاچا مشتاق نہیں تھے اور ان دونوں کے وہ زندگی سے بھرپور قہقہے بھی نہیں تھے جو بادلوں کی گھن گرج سے ہم آہنگ ہوکر ماحول کو حسین تر بناتے تھے۔

مختاری اور انوری وغیرہ کی خواہش تھی کہ شانی بھی صحن میں آجائے اور نہانے میں ان کے ساتھ شریک ہوجائے۔ مگر شانی تو کہیں بہت دور تھی۔ پچھلے موسموں کی بھول بھلیوں میں گھوم رہی تھی۔ ایک برسات حویلی کے صحن میں تھی اور ایک اس کے سینے کے اندر جل تھل کررہی تھی۔

اتنے میں بابا فخری کالے رنگ کی چوڑی چھتری سر پر تانے ہوئے زنانے میں داخل

ہوا۔ صحن میں اودھم مچاتی عورتیں بابے فخری کے احترام میں ایک طرف سمٹ گئیں۔ ان میں سے کچھ اپنے تربتر جسم اپنی بھیگی اوڑھنیوں میں چھپانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان شوخ عورتوں پر ایک ناراض نگاہ ڈالنے کے بعد بابے فخری نے اپنی توجہ شانی پر مرکوز کردی۔ بابے فخری کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا ایک بڑا لفافہ تھا۔ اس پر ڈاک کے ٹکٹ اور مہریں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔

''چھوٹی بی بی! رجسٹری والا ڈاکیا یہ لفافہ دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کوئی نوٹس وغیرہ ہے۔'' بابے فخری نے ادب سے کہا۔

شانی کا دل انجانے خدشات سے دھڑک اٹھا۔ لفافہ دیکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کوئی عدالتی حکم وغیرہ ہے۔ حالات ایسے تھے کہ اب کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔ لفافے پر اباجی کا نام تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا...... اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔ یہ قرقی کا نوٹس تھا۔ قرض خواہوں کی دادرسی کے لئے اعلیٰ عدالت نے رنگ والی کی حویلی اور اس سے ملحقہ زمین قرق کرنے کی کارروائی شروع کردی تھی۔

شانی نے مکمل حکم نامہ پڑھا اور پھر بے دم سی ہوکر بستر پر بیٹھ گئی۔ اوہ خدایا یہ کیا ہورہا ہے۔ کیا چرخ کج ادا کی طرف سے وارد ہونے والے سارے ستم، اسی حویلی کے لئے رہ گئے ہیں؟ کیا ہر دنیاوی آفت کا رخ انہی در و دیوار کی جانب ہے؟

وہ رات تک غم واندوہ کے گہرے سمندر میں ڈوبی رہی۔ اس کی نازک جان جیسے کسی آہنی شکنجے میں کستی چلی جارہی تھی۔ کوئی بھی تو ہمدرد نہیں تھا۔ کسی بھی غمگساری کا آسرا نہیں تھا۔ وہ اباجی کی حالت کو بھی بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کی زندگی تیز ہوا میں رکھے ہوئے چراغ جیسی ہوگئی۔ شانی کو ہر گھڑی کسی بے رحم جھونکے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اباجی تک یہ خبر پہنچائے گی۔

''میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟'' اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تن گئی۔ کیا یہ در و دیوار ان سے چھین لئے جائیں گے۔ کیا پرکھوں کی امانت یہ حویلی ان سے جدا ہوجائے گی؟ نہیں...... نہیں یہ ستم ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ میں بچھڑنے والوں کی آوازیں محفوظ ہیں۔ ایک ایک گوشے میں یادوں کے خزانے دفن ہیں۔ یہاں تہوار منائے گئے ہیں، یہاں سالگرہ ہوئی ہیں، یہاں خوش رنگ موسموں کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ اس حویلی کے ذروں میں ماں کا پیار

رچا ہوا ہے۔ بھائی کی محبت، چاچا مشتاق کی شفقت اور پتا نہیں کن کن اٹوٹ رشتوں کی خوشبو اس حویلی میں بسیرا رکھتی ہے۔ اس حویلی کو خود سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے۔ شانی کو لگا کہ اس کا پیارا بھائی اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے قرقی کے ان کاغذات کو دیکھ رہا ہے اور سرد آہیں بھر رہا ہے۔

دفعتاً وہ چونک گئی۔ اسے اپنے عین پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ ابا جی بڑے نحیف انداز میں چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ شانی نے عدالتی کاغذات جلدی سے تکیے کے نیچے گھسیڑ دیئے۔

ابا جی ہولے ہولے چلتے سامنے بید کی کرسی پر آبیٹھے۔ ان کی نگاہیں تکیے ہی کی طرف تھیں۔ ان کے زرد ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”ہماری بیٹی شاید ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”نن..... نہیں ابا جی۔“ شانی نے پوری جان سے لرز کر کہا۔

”میں جانتا ہوں شانی! تم کیا چھپا رہی ہو۔ مجھے چند دن پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔“ وہ اطمینان سے بولے۔

شانی ہکا بکا ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید ابا جی کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ ایسی اندوہناک خبر سننے کے بعد ابا جی کا ردِعمل یہ تو نہیں ہوسکتا تھا۔

چوہدری ارشاد نے اطمینان سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید تم میرے اطمینان پر حیران ہو رہی ہو۔ یہ اطمینان بلاوجہ نہیں ہے۔ چند دن پہلے تک میں بھی سخت پریشان رہا ہوں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب اس اندھیرے سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آگیا ہے۔“

”کک... کیسا راستہ ابا جی؟“

انہوں نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑی محبت سے شانی کے کندھے پر رکھا اور بولے۔ ”پوری امید ہے شانی! کہ اب یہ گھر نیلام ہونے کی نوبت نہیں آئے گی......اور یہ سب کچھ تمہارے چاچا رئیس کی وجہ سے ممکن ہوسکا ہے۔“

”چاچا رئیس؟“ شانی نے حیرانی سے کہا اور اس کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ سب کچھ ابھر آیا جو چاچا کے بارے میں واحدی نے کہا تھا۔ ایک نئی طرح کی بے چینی شانی کے ذہن میں سر اٹھانے لگی۔ وہ ذرا محتاط لہجے میں بولی۔ ”چاچا رئیس کیا کریں گے اس سلسلے میں؟“

”تمہیں پتا ہی ہے، لندن میں رئیس کی ایک شاپ ہے۔ یہ مضافاتی علاقہ اب کافی گنجان ہوگیا ہے۔ اس شاپ کی قیمت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ رئیس نے وہ دکان بیچنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ دکان کتنے کی بک رہی ہے؟“

”کتنے کی؟“ شانی نے پوچھا۔

”کوئی ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کی۔ اگر رئیس دو تین سال مزید اس دکان کو نہ بیچے تو وہ دگنی تگنی قیمت تک جاسکتی ہے لیکن وہ قربانی دے رہا ہے۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ پرسوں لندن جا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دو ہفتے کے اندر رقم پاکستان پہنچ جائے گی۔“

”کیا واقعی ایسا ہو جائے گا ابا جی؟“

”ضرور ہوگا دھی رانی! جب اندھیرا بہت بڑھ جاتا ہے ناں تو پھر کہیں نہ کہیں سے روشنی کی شکل ضرور نظر آتی ہے۔ وہ اوپر والا سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ضرور ہے لیکن اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اسی لئے کہتے ہیں ناں کہ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

ابا جی بول رہے تھے مگر شانی کے ذہن میں دُھند سی بھری ہوئی تھی۔ اس کے سامنے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ ہر منظر دُھندلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ تشویش ناک دھندلاہٹ تھی مگر وہ اس دُھندلاہٹ سے ابا جی کو آگاہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

وہ سارا دن اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ چاچا رئیس سے ملاقات ہوئے آٹھ دس روز ہو چکے تھے۔ یوں تو وہ حویلی میں کم کم ہی نظر آتے تھے مگر پچھلے آٹھ دس روز سے تو بالکل ہی غائب تھے۔ شانی کو پتا چلا تھا کہ کسی کام سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ویزے وغیرہ کے سلسلے میں مصروف رہے ہوں گے۔ چاچا رئیس کا بڑا بیٹا ذیشان انگلینڈ میں ہی پلا بڑھا تھا اور وہیں پر سیٹل تھا۔ چاچا کی ایک بیٹی لندن جا چکی تھی۔ کبھی کبھار شانی کے لئے اس کا خط آجاتا تھا۔

دوسرے روز رات دس بجے کے لگ بھگ شانی پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ چاچا رئیس حویلی کے دائیں جانب والے پورشن میں رہتے تھے۔ اس پورشن میں شانی کو ایک نامانوس سی ہلچل محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے پتا چلا کہ چاچا اہل و عیال سمیت جا رہے تھے۔

شانی نے اس خبر کی تصدیق کی اور یہ خبر درست ثابت ہوئی۔ وہ حیرانی کے عالم میں ابا جی کے پاس پہنچی۔ انہیں بتایا کہ صرف چاچا رئیس ہی نہیں، چاچی بھی جا رہی ہیں۔ شانی کی توقع کے عین مطابق ابا جی اس اہم اطلاع سے بے خبر تھے۔ ابھی شانی اور ابا جی ایک

دوسرے پر اپنی حیرت کا اظہار ہی کر رہے تھے کہ چاچا رئیس اور چاچی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ادب کے ساتھ چوہدری ارشاد کو سلام کیا اور ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ چوہدری ارشاد نے گاؤ تکیے کے سہارے بمشکل اٹھتے ہوئے کہا۔ ''رئیس! میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ تم سب لندن جا رہے ہو؟''

''ہاں بھا جی! بس ایک دم ہی پروگرام بنا ہے۔ میں کل بھی آپ کو بتانے کے لئے آیا تھا لیکن آپ سو رہے تھے۔ بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دراصل نصرت کے گوڈے کی تکلیف کافی بڑھی ہوئی ہے۔ اب تو اٹھنا بیٹھنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہفتے کے روز اسلام آباد میں ہی ذیشان کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ امی کو ساتھ ہی لے آئیں۔ وہاں جوڑوں کے بڑے بڑے اچھے ڈاکٹر موجود ہیں۔ اگر آپریشن بھی کرنا پڑا تو آسانی سے ہو جائے گا۔ امید تو نہیں تھی کہ اتنے تھوڑے ٹائم میں کاغذات بھی بن جائیں گے لیکن شکر ہے کہ بن گئے ہیں۔''

''یعنی... تم سب جا رہے ہو؟'' چوہدری ارشاد نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بھا جی! پر آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا اور پیسے تو میں بس پندرہ دن کے اندر ہی بھیج دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

چوہدری ارشاد کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ وہ اگر بولتے تو کیا کہتے۔ شاید وہ کہتے۔ ''رئیس! میں نے ساری زندگی تم سب کی خدمت کی ہے۔ اب مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ بس تھوڑے سے سہارے کی.... تم دیکھ ہی رہے ہو میں اس وقت بالکل بے آسرا ہوں۔ تمہاری رقم سے بھی زیادہ مجھے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ میرے بھائی! مجھے اور شانی کو اس وقت تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ساری زندگی چپ رہنے والا اور دکھ سہنے والا شخص اب کیونکر بول سکتا تھا۔ کیونکر ٹوٹ سکتا تھا۔

شانی چاچا رئیس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا دل رو رہا تھا۔ چاچا کے مہربان چہرے اور ہمدرد لہجے کے پیچھے اسے ایک اور انسان نظر آ رہا تھا۔ ایک اجنبی اور قطعی ناقابلِ فہم شخص۔ اس شخص کے ہونٹوں پر پھول اور دل میں شاید انگارے تھے۔

شانی کی نگاہیں چاچا کے چہرے پر تھیں۔ اس نے خاموشی کی زبان میں پکار کر کہا۔ ''چاچا مجھے نہیں لگتا کہ تم واپس آؤ گے۔ تم جا رہے ہو، شاید ہمیشہ کے لئے۔ اپنے بڑے بھائی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر تم بڑی بے رحمی کے ساتھ ایک نئی دنیا کی طرف اُڑان بھر رہے ہو۔

تم شاید اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکے ہو کہ یہ حویلی ایک تیزی سے ڈوبتا ہوا جہاز ہے۔ تم نے اپنا اسباب سمیٹ کر اس جہاز کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

یہ خاموشی کی زبان تھی اس لئے چاچا رئیس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ شانی کے پُر درد الفاظ بس اس کے سینے میں ہی گونج رہے تھے۔ جو کچھ بھی تھا، وہ اس کے بڑے تھے، وہ ان کے سامنے بول نہیں سکتی تھی۔ وہ ابا جی کو بھی کچھ بتانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اسے ہر گھڑی بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہوا کے دوش پر رکھے چراغ کے لئے آخری جھونکا ثابت نہ ہو۔

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ نہ بول سکی۔ وہ اجنبی شخص جو اس کا چاچا تھا اپنے اہل و عیال سمیت لندن چلا گیا۔

اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جس کی ہولناک جھلک شانی کئی دن پہلے دیکھ چکی تھی۔ بسترِ علالت پر چوہدری ارشاد کی آنکھیں منتظر رہیں۔ لندن سے کوئی ڈرافٹ نہیں آیا۔ ڈرافٹ تو دور کی بات ہے کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی فون، کچھ موصول نہیں ہوا۔ پندرہ دن گزرے، بیس دن گزرے پھر مہینہ گزر گیا۔ دھیرے دھیرے اصل حالات کی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ چاچا رئیس نہ جانے کب سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ چپکے چپکے انہوں نے اپنا ''بہت کچھ'' پاکستان سے سمیٹ لیا تھا۔ لاہور میں ایک مکان فروخت ہو چکا تھا۔ بینک بیلنس اور بینک لاکرز کا سامان لندن منتقل ہو چکا تھا اور کئی کام بھی نمٹائے جا چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور اندوہناک خبر بھی شانی کو ابا جی کے وکیل کی زبانی ملی۔ بیلے والی غیر آباد زمین جو کاغذات میں چاچا رئیس کے نام تھی، اونے پونے داموں فروخت ہو چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں چاچا رئیس نے حویلی میں اپنا جو حصہ چھوڑا تھا وہ بیلے والی زمین کی قیمت سے پورا کر لیا تھا۔ یہ بڑے سفاک اور مہلک حقائق تھے۔ یہ حقائق چوہدری ارشاد تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن شانی ان کے سامنے دیوار بنی ہوئی تھی۔ ان حقائق کے سارے دھچکے اپنے سینے پر سہہ رہی تھی لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ آخر تو یہ سب کچھ چوہدری ارشاد تک پہنچنا تھا۔

اور پھر دھیرے دھیرے صورتِ حال چوہدری ارشاد پر واضح ہونے لگی۔ ان کا خزاں رسیدہ چہرہ مزید زرد ہونے لگا۔ ان کے خشک ہونٹوں کی پپڑیاں مزید سخت ہوتی گئیں۔ اعصاب کو سکون دینے والی دواؤں میں اضافہ کرنا پڑا۔ ایک دن وکیل شاہنواز صاحب آئے تو خاصے پریشان تھے۔ انہوں نے شانی کو بتایا کہ قرقی کی آفت کو اب مزید نہیں ٹالا جا سکتا۔ شانی نے شاہنواز صاحب کو ابا جی کے ساتھ بات کرنے سے روک دیا لیکن خود آگہی کی

اذیت سے تڑپنے لگی۔ یہ بڑے سخت دن تھے۔ تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ مقولہ اس حویلی کے مکینوں سے زیادہ اور کس پر صادق آسکتا تھا۔ حوادث یکے بعد دیگرے حملہ آور ہو رہے تھے اور پھر ایک دن ایک اور حادثہ دکھ اور پریشانی کا طوفان لے کر روبرو آ گیا۔

نارپور سے فاخر کا منشی رشید لاہور والے کارخانے کے منیجر الطاف کے ساتھ حویلی پہنچا۔ اتفاقاً شانی اس وقت ایک قریبی گھر میں فوتگی پر گئی ہوئی تھی۔ وہ واپس آئی تو اس نے منشی رشید اور منیجر الطاف کو اباجی کے کمرے میں سے نکلتے دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ ایک طویل اور سنجیدہ گفتگو کے بعد باہر نکلے ہیں۔ ان کے جاتے ہی شانی اباجی کے کمرے کی طرف لپکی۔ وہ بستر پر دراز گم صم لیٹے تھے۔ ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔ جب سے دل کی تکلیف نے شدت پکڑی تھی، یہ ان کا انداز ہو گیا تھا کہ گھمبیر بات چیت کے وقت بیٹھنے کے بجائے نیم دراز ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ شاید اس طرح انہیں اپنے دل پر کم بوجھ محسوس ہوتا تھا۔

شانی نے اس موقع پر کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں دوا کھلانے کے بعد آرام کرنے کو کہا۔

باہر آ کر اس نے بابے فخری سے دریافت کیا۔ بابے فخری نے جو جواب دیا وہ شانی کے خدشات کے عین مطابق تھا۔ بابے فخری نے بتایا کہ فاخر کے ملازمین نے قرضے کی واپسی کے بارے میں بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کارخانے میں کام کا سیزن شروع ہونے والا ہے۔ انہیں ہرصورت پندرہ بیس روز کے اندر قرضے کی رقم واپس چاہئے۔

شانی ایک طویل...... دکھ بھری سانس لے کر رہ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ "گردشِ ایام" انتہا کی طرف مائل ہے۔ تقدیر اپنے ترکش کا کوئی تیر بچا کر رکھنا نہیں چاہتی۔

رات کو شانی پر ایک اور انکشاف ہوا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اباجی کے کمرے میں گئی اور ان سے منشی رشید وغیرہ کی آمد کے بارے میں پوچھا۔ اباجی نے نحیف و نزار لہجے میں وہی کچھ بتایا جو بابے فخری نے بتایا تھا۔ چوہدری فاخر نے اپنے اقدام سے گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے قرضے کی واپسی کے لئے پندرہ بیس روز کا آخری نوٹس دیا تھا لیکن بات اس کے علاوہ اور بھی تھی اور اس بات کا پتا صرف چوہدری ارشاد کو تھا۔

چوہدری ارشاد چند سیکنڈ تک بے حد خاموش نگاہوں سے بیٹی کا چہرہ تکتے رہے، پھر بولے "منشی رشید نے مجھ سے اکیلے میں بات کی ہے۔"

"اکیلے میں؟ کیا مطلب؟"

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "منشی رشید! مہرجی کا دور کا رشتے دار بھی ہے۔ اس کی عمر کی وجہ سے فاخر اس کا نام بھی عزت سے لیتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف ملازم ہی نہیں۔ اس کی کہی ہوئی بات میں وزن ہے۔"

"اس نے کیا بات کہی ہے؟" شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہا تو اس نے بہت کچھ ہے شانی۔ لیکن اس کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی غلطی مان کر تمہیں از خود نارپور واپس بھیج دیں تو فاخر تمہیں بسانے کو تیار ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو حالات بڑی جلدی سدھر سکتے ہیں۔ منشی رشید کا کہنا ہے کہ اس طرح نہ صرف تمہارا گھر بچ سکتا ہے بلکہ ہماری پریشانیاں بھی دور ہو سکتی ہیں۔"

شانی کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان پلکوں کے پیچھے دکھ کا طوفان امڈ آیا تھا۔ چوہدری ارشاد خاموشی سے اپنی من موہنی بیٹی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ آخر چوہدری ارشاد کی نحیف آواز ابھری۔ "تمہارا کیا خیال ہے دھی رانی؟"

"آپ کا کیا خیال ہے اباجی؟" شانی نے الٹا سوال کیا۔

جواب دینے سے پہلے چوہدری ارشاد نے چند لمحے سکوت کیا۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فاخر کے لئے چوہدری ارشاد کا رویہ ہمیشہ مفاہمت کا ہی رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ شاید وہ آج بھی کوئی نرم بات کہنے والے تھے۔ شانی کے کان منتظر رہے۔ آخر چوہدری ارشاد بولے لیکن آج ان کی آواز مفاہمت کی نہیں تھی۔ آج ان کی آواز اس باپ کی آواز تھی جو اپنی مصیبت زدہ اولاد کے دفاع میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آج ان کی آواز میں بے پناہ کمزوری کے باوجود دبدبہ اور مزاحمت تھی۔ وہ بولے۔ "نہیں شانی! میں تمہیں نارپور نہیں بھیجوں گا۔"

"لیکن......"

"بس شانی!" وہ اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ تم اس گھر میں نہیں جاؤ گی۔"

شانی کی پلکوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنسو ڈھلک آئے۔ ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ باپ کے کندھے سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔

اگلے روز صبح سویرے وہ اباجی کو جگانے ان کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ آج خلاف معمول صوفے پر لیٹے تھے۔ چادر سر تک تانی ہوئی تھی۔ ان کا نحیف و کمزور جسم صوفے کے فوم

میں دبا دبا سا تھا۔

''ابا جی۔'' اس نے سرہانے کھڑے ہو کر ملائمت سے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوسری اور پھر تیسری آواز دی۔ تیسری آواز میں شدید اضطراب اور عجلت تھی۔ ابا جی کے جسم میں حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اَن گنت خوفناک اندیشے چنگھاڑتے ہوئے اس کے ذہن میں گھس آئے..... وہ تڑپ کر ابا جی کے سرہانے پہنچی اور چادر ان کے چہرے سے کھینچ لی۔ ابا جی کا کمزور لیکن محبوب چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے ابا جی کو جھنجھوڑ کر اور درد سے چیخ کر پکارا۔ ابا جی نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں پھر شانی کے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شانی کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' شانی ان کو چھو کر اور ناک سے سوں سوں کی آواز نکال کر بولی۔

وہ چند سیکنڈ تک بیٹی کا چہرہ دیکھنے کے بعد بولے۔ ''شاید تم میرے لئے ڈر گئی ہو۔ تم نے سوچا ہوگا کہیں کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ نہیں دھی رانی..... مجھے یقین ہے میں تجھے اس منجدھار میں چھوڑ کر نہیں مروں گا۔ اگر مر گیا تو شاید قیامت تک میری روح بھٹکتی رہے.....''

''ابا جی! ایسی باتیں مت کیا کریں۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''اب ایسی ہی باتیں کرنے کا وقت ہے شانی۔ تم دیکھ ہی رہی ہو۔ اب میں زیادہ دیر جیوں گا نہیں لیکن اب جتنے دن بھی جیوں گا، تیرے لئے جیوں گا۔ اپنی دھی رانی کے لئے اپنی جان کے لئے۔'' جذبات کے بوجھ سے چوہدری ارشاد کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ابا جی . آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ آپ لیٹ جائیں۔'' وہ التجا سے بولی۔

''نہیں پتر! یہ لیٹنے کا نہیں اٹھنے کا وقت ہے۔'' انہوں نے کہا اور سچ مچ کھڑے ہو گئے۔ ان کا استخوانی سینہ تنا ہوا تھا اور بیمار آنکھوں میں نئے عزم کی چمک تھی۔ انہوں نے کھونٹی سے اپنی سفید بے داغ پگڑی اتاری اور اس کے بل درست کرتے ہوئے بولے۔ ''معصوم بھائی کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ ابھی مسجد سے نہیں آئے ہوں گے۔'' شانی نے کہا۔

''میں نے اسے کہا ہے کہ آج وکیل شاہ نواز اور بڑے وکیل عبداللہ کو بلائے۔ عبداللہ دیوانی مقدموں میں بڑا تجربہ کار ہے۔ میں اب مہر اور فاخر کے ساتھ قانونی لڑائی لڑوں گا۔ ہر جگہ پوری طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا، میری بیٹی کوئی گاجر مولی ہے کہ وہ اکھاڑ کر

لے جائیں گے۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ ایک باپ جب اپنی بیٹی کا تحفظ کرنے پر آتا ہے تو کہاں تک جا سکتا ہے۔''

چوہدری ارشاد کے سوکھے گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ شانی کو لگا کہ وقت دس پندرہ سال پیچھے چلا گیا ہے۔ جب اس کے ابا جی کی پنچائیت میں بڑے بڑے سرکاری افسر آ کر بیٹھے تھے۔ جب رنگ والی کا چوہدری بولتا تھا اور ایک زمانہ سنتا تھا، لیکن کیا وقت واقعی دس پندرہ سال پیچھے چلا گیا تھا؟ نہیں..... وقت اپنی ''موجودہ جگہ'' پر ہی تھا۔ تھوڑا سا بولنے سے ہی چوہدری ارشاد کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ان کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتے، شانی نے آہستگی سے کہا۔ ''ابا جی! مجھے کچھ سوچنے کے لئے تھوڑی سی مہلت دیجئے.....بس تھوڑی سی مہلت!''

چوہدری ارشاد نے قدرے حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔

اس رات شانی بڑی دیر تک بند کمرے میں ماں کی تصویر کے سامنے بیٹھی رہی۔ خاموشی کی زبان میں ماں سے باتیں کرتی رہی۔ بیٹی کی طرح ماں بھی خاموشی کی زبان میں بول رہی تھی۔ وہ ماں جو صبر و استقامت اور ہمت کی مثال تھی۔ جس کے حسنِ اخلاق اور نیکی کا ایک زمانہ معترف تھا۔ علاقے کے لوگ اسے کسی روحانی شخصیت کی طرح اپنی مصیبتوں میں یاد کرتے تھے اور جب وہ اسے عقیدت بھرے لہجے میں وڈی آپا کہتے تھے تو ان کے ہونٹوں سے محبت کا امرت ٹپکتا تھا۔ وڈی آپا کو دانائی اور فہم و فراست کے اعلیٰ درجات پر فائز کیا جاتا تھا۔ اہم سے اہم معاملات میں وڈی آپا کے مشورے کو بلا چون و چرا مانا جاتا تھا اور یہ مشورے ماننے والوں میں خود چوہدری ارشاد بھی شامل تھا۔ آگے بڑھنے کا مشورہ . ہمت نہ ہارنے کا مشورہ ... بدترین حالات کے باوجود کوشش جاری رکھنے کا مشورہ۔ ایثار کا مشورہ۔

اگلے دن صبح سویرے گلاب کے پودوں کے قریب..... شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلتے ٹہلتے شانی نے بڑی ہی آہستگی اور نرمی کے ساتھ چوہدری ارشاد کے شانے سے سر ٹکایا اور بے حد مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''ابا جی! میں..... نارپور واپس جانا چاہتی ہوں۔''

چوہدری ارشاد نے یک لخت چونک کر شانی کی طرف دیکھا۔ ''کک کیا کہہ رہی ہو شانی؟''

وہ چند لمحے چپ رہی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں اپنا گھر بچانے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔''

چوہدری ارشاد کی آنکھوں میں حیرت اور آنسوؤں کی نمی ساتھ ساتھ امڈ آئی۔

☆======☆======☆

قریباً پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ شانی اپنے شوہر کے ساتھ سسرال واپس جا رہی تھی۔

پچھلے پندرہ سولہ دنوں میں جو کچھ ہوا تھا بہت تیزی سے ہوا تھا۔ یہ سب کچھ جتنا حیران کن تھا اتنا ہی تیز رفتار بھی تھا۔ علاقے کے لوگوں نے ہرگز توقع نہیں کی تھی کہ حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔ یہ خبر ہر ایک کے لئے حیران کن تھی کہ دونوں چوہدری خاندانوں میں صلح ہو گئی ہے اور وڈی آپا کی دھی رانی شانی اپنے سسرال واپس جا رہی ہے۔

شانی کے سوا شاید ہی کسی کو ٹھیک طرح سے معلوم ہو کہ صلح کس قیمت پر اور کس طرح ہوئی ہے۔ شانی کی عزیز سہیلی سکینہ تھوڑا بہت جانتی تھی لیکن اسے بھی سب معلوم نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ اس درد اور اندوہ کا ادراک کیسے کر سکتی تھی جس کے سیلاب سے شانی گزری تھی اور ہر گھڑی تڑپی تھی۔

یہ صرف شانی کا درد تھا۔ وہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے پورے آٹھ پہر تک خود کو سوچ کی سولی پر لٹکایا تھا اور اس معاملے کی ہر پہلو پر عرق ریزی کی تھی۔ وہ جانتی تھی اگر اس کے ابا جی نے فاخر اور مہر جی کی مزاحمت کا فیصلہ کر لیا تو وہ مزاحمت کا حق ادا کر دیں گے۔ اپنی تمام تر توانائیوں اور مجبوریوں کے باوجود وہ نارپور والوں کے ارادوں کے سامنے آہنی دیوار بن جائیں گے پھر اس دیوار کے ساتھ ٹکرا کر بہت کچھ پاش پاش ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ یہ دیوار بھی پاش پاش ہو جائے۔ وہ اپنے ابا جی کی جسمانی حالت سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔ اسے پتا تھا جو دیوار وہ مہر اور فاخر کے سامنے کھڑی کرنے والے ہیں اس کی تعمیر میں ان کی رہی سہی جسمانی طاقت بھی نچڑ جائے گی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کو اور اپنے مصیبت زدہ لواحقین کو اپنی ذات اور انا کی خاطر کسی اور امتحان میں نہیں ڈال سکتی تھی ...اور یہی فیصلہ ایک روز پہلے ماں کی تصویر نے بھی دیا تھا۔ خاموشی کی زبان میں۔

ابا جی کو اپنے سسرال واپس جانے کا فیصلہ سنانے کے ایک روز بعد شانی سکینہ کے ساتھ جھنڈے شاہ کے مزار پر پہنچی تھی۔ وہاں سے دونوں نے پانچ میل تک بس کا سفر کیا تھا اور پھر وہ ایک ایسے جنرل سٹور تک پہنچی تھیں جہاں سے وہ رازداری کے ساتھ لاہور فون کر سکتی تھیں۔ شانی نے لاہور میں ٹیکسٹائل کارخانے کے نمبر پر فاخر سے بات کی تھی۔ فون پر شانی

کی آواز سن کر فاخر چونکا تھا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد شانی جلد ہی اصل موضوع پر آ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

''فاخر! میں گھر واپس آنا چاہتی ہوں۔''

''بڑی جلدی خیال آ گیا گھر کا۔'' فاخر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''آپ کو بھی تو مجھے گھر بلانے کا خیال نہیں آیا۔'' شانی نے کہا۔

''میرے خیال کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ جو اپنی مرضی سے جاتا ہے، وہ مرضی سے ہی آتا ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''تو ٹھیک ہے میں آنا چاہتی ہوں۔''

''تو آ جاؤ۔''

''لیکن...... میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے لے کر جائیں۔ ابا جی کو بکی محسوس نہ ہو۔ میرا بھی مان رہ جائے۔''

''تمہارا مطلب ہے میں تمہارے لئے جھولی پھیلانے آؤں۔'' فاخر کے لہجے میں شدید کاٹ تھی۔

''ایسا کرنے کے لئے آپ سے کون کہہ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں میری اتنی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ آپ صرف ابا جی کی مزاج پرسی کے لئے آ جائیں۔ میں خود آپ کے ساتھ آ جاؤں گی۔''

دوسری طرف چند لمحے تک ایک فاتحانہ خاموشی طاری رہی۔ ... پھر فاخر نے کہا۔ ''میں ایک بات تمہیں صاف بتا دوں۔ میں تمہارے ابا جی کے حضور کسی طرح کی گذارش نہیں کروں گا اور انہیں یہ بھی سمجھا دینا کہ اگر انہوں نے میرے سامنے تلقین شاہ بننے کی کوشش کی تو میں فوراً سے پہلے اٹھ کر چلا آؤں گا۔'' فاخر کے لہجے میں تپش اور جھنجھلاہٹ تھی۔

''نہیں... ایسا کچھ نہیں ہو گا۔'' شانی نے کمزور آواز میں کہا۔

...اور اب یہ سارے مرحلے طے ہو چکے تھے۔ شانی اپنے شوہر کے ساتھ سسرال واپس جا رہی تھی۔ بظاہر تو وہ اسی طرح جا رہی تھی جس طرح بیویاں شوہروں کے ساتھ جاتی ہیں لیکن وہ جانتی تھی، اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں نہ نظر آنے والی زنجیریں ہیں۔ یہ زنجیریں ابتر حالات، ذاتی مجبوریوں اور معاشی تنگ دستیوں کی کڑیوں سے مل کر بنی تھیں۔ نارپور نے شانی سے بہت کچھ لیا تھا۔ اس کی دوشیزگی... دوشیزگی کی شوخیاں، ہنستی مسکراتی سہیلیاں... جانی پہچانی مہربان گلیاں... اور پھر اس کے چچا مشتاق، اس کا جان سے پیارا

بھائی۔ لیکن یہ سب کچھ لے کر بھی نارپور اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، اسے واپس اپنے پاس لے جا رہا تھا۔

چوہدری ارشاد نے ہمیشہ بیٹی کی بات مانی تھی۔ وہ آج بھی مان رہے تھے۔ جس طرح وہ بیٹی کی ماں کے سامنے بحث نہیں کر سکتے تھے، اسی طرح بیٹی کے سامنے بھی نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے اسے دیر تک اپنے مدقوق سینے سے لگا کر بھینچے رکھا تھا پھر فاخر کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ وہ دونوں لینڈ کروزر جیپ میں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے تو حویلی کے ملازمین نے دونوں پر گلاب کی ڈھیروں پتیاں نچھاور کیں۔

جواب میں چوڑے ٹائروں والی جیپ دھول اُڑاتی نیم پختہ راستے کی طرف بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

نارپور کی حویلی میں داخل ہوتے ہی شانی کے ذہن میں بے شمار ناخوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ سینے میں گھٹن سی بھرنے لگی لیکن جب اس نے بھابو کا محبت بھرا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا۔ مُنا اور ندیم کے مسکراتے چہرے دیکھے، تو دل کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اسے یاد آیا کہ حویلی میں سب نگاہیں نامہربان ہی نہیں تھیں، کچھ آنکھوں میں مہر و محبت کی جھلک بھی تھی۔

فاخر سب سے پہلے شانی کو اس کے دادا سسر کے پاس لے کر گیا۔ وہ حسبِ معمول اپنے نیم تاریک کمرے میں لیٹے تھے۔ جہازی سائز کے پلنگ کے پاس وہیل چیئر موجود تھی اور بہت لمبی نال کا منقش حقہ پڑا تھا۔ دیواروں پر کلہاڑیاں، برچھیاں، رائفلیں اور پتا نہیں کیا کچھ آویزاں تھا۔ مہر جی نیم دراز تھے اور گھٹنوں تک چادر کھنچی ہوئی تھی۔ اکلوتی آنکھ لشکارے مار رہی تھی اور اس میں شانی کے لئے بیگانگی اور نفرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ شانی نے عاجزی سے جھک کر سلام کیا اور پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔

مہر کے منہ سے وہی ناقابلِ فہم آوازیں نکلیں جو شانی پر دہشت آمیز گھبراہٹ طاری کرتی تھیں۔ غز غاں... گھڑ گھڑ.... غوں غاں۔

وہ سہمی ہوئی کسی مجرم کی طرح بیٹھی تھی۔ بھابو اور فاخر وغیرہ خاموش تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو اس نے مہر جی کی ٹانگیں دبانے کے لئے ان کی پلپلی پنڈلیوں کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ جونہی اس کے ہاتھ عاجزانہ انداز میں دادا سسر کی پنڈلیوں سے چھوئے ان کے فالج زدہ چہرے پر شدید ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے ٹانگ کے ایک غصیلے جھٹکے سے شانی کو پیچھے ہٹا دیا۔ یہ بڑی واضح توہین تھی لیکن شانی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ بہت کچھ برداشت

کرنے کا عزم لے کر اس چار دیواری میں داخل ہوئی تھی۔

رات کو شانی اور فاخر کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جب وہ کروٹ بدل کر سو گیا اور خواب گاہ میں اس کی بھاری سانسیں گونجنے لگیں تو شانی کی آنکھیں چپکے چپکے آنسو بہانے لگیں۔ مہر جی کی ٹانگ کا غصیلا جھٹکا بار بار اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ آنسو تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ ان کی گرمی شانی کے کومل رخساروں پر رینگ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہونٹوں سے ایک مدھم سی سسکی بھی نکل جاتی تھی۔ وہ روتی رہی۔ اس کے دل کے کسی گہرے گوشے سے یہ خیال اٹھتا رہا۔ کیسا ہو، اگر اس کی کوئی فریادی سسکی فاخر کے کانوں تک پہنچ جائے۔ وہ شانی کے اشک بارِ غم کو محسوس کرے پھر وہ ہولے سے کروٹ بدلے۔ اس کا ہاتھ نرمی سے شانی کے کندھے پر آئے۔ یہ ہاتھ اسے اپنی طرف کھینچ کر کروٹ بدلنے پر مجبور کر دے پھر شانی سسک کر اپنے شوہر کے سینے سے لگ جائے۔ فاخر اس کا سر چومے. پھر اس کے دکھ سنے۔ شانی کی غم گساری کرتے ہوئے وہ کہے۔ تمہارے پیارے چاچا کی موت کا مجھے بھی دکھ ہوا۔ تمہارے لاڈلے بھائی کی جدائی کا غم میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ افسوس ناک تھا۔ اب یہ سب کچھ بھلانا ہوگا۔ تم سارے شکوے بھول کر اور اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر واپس آ گئی ہو۔ تمہاری یہ پیش رفت مجھے بھی پیش رفت پر مجبور کر رہی ہے۔ میں تمہارے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اب ہم ماضی کی ساری کدورتوں اور تلخیوں کو بھول جائیں.. ''

وہ سوچتی رہی، خواہش کرتی رہی لیکن خواہشیں اتنی آسانی سے کب پوری ہوتی ہیں۔ شانی کے کندھے پر کوئی ہاتھ نہیں آیا۔ بالوں بھرے، بھاری جسم والا فاخر کروٹ لے کر سویا رہا اور اس کے سینے سے بھاری سانس خارج ہوتی رہی۔

یوں تو حویلی کا ہر فرد شانی سے پیار کرتا تھا مگر مُنا اور ندیم تو اس کے دیوانے تھے۔ دونوں ہر وقت شانی سے چمٹے رہتے تھے۔ کبھی کندھوں پر سوار ہیں، کبھی گردن سے جھول رہے ہیں۔ بھابو انہیں ہر وقت روکتی ٹوکتی رہتی تھی لیکن یہ دونوں بچے تو شانی کی واپسی سے نہال ہو گئے تھے۔ یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے، شانی باہر گراؤنڈ میں بیٹھی تھی۔ سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ بادل چھائے تھے اور ساون کی نم ہوا چل رہی تھی۔ شانی کا دل ہمیشہ سے زیادہ اداس تھا۔ اباجی کی یاد ستا رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے والے بھائی کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اتنے میں مُنا وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی پتنگ تھی۔ وہ شانی سے اصرار کرنے لگا کہ وہ پتنگ اُڑانے میں اس کی مدد کرے۔ شانی ٹال مٹول کرتی رہی۔ وہ

پتنگ ایک طرف رکھ کر شانی سے کشتی کرنے لگا۔ وہ اسے گدگدا رہا تھا اور ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہنسی گدگدی میں نہیں ہوتی، ہنسی تو دل میں ہوتی ہے اور روح میں ہوتی ہے اور شانی کے اندر یہ دونوں چیزیں ویران تھیں۔ مُنا کی مستی حد سے بڑھی تو شانی اس سے جان چھڑانے کے لئے ایک دم اندر کی طرف بھاگ گئی۔ مُنا اس کے پیچھے لپکا، لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شانی کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مُنا کچھ دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور ''چچی دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو'' پکارتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ شانی نے سمجھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ وہ اپنے جہازی سائز بستر کے ایک کنارے پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

چند منٹ بعد چیخنے کی آواز سنائی دی اور ملازموں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شانی تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ ننگے پاؤں برآمدے میں آئی۔ اس نے دیکھا منشی رشید اور دو دوسرے ملازموں نے کم سن مُنا کو ہاتھوں پر اٹھایا ہوا ہے، اس کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ شانی نے بے قرار ہو کر مُنا کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے ہونٹ بھی خون آلود تھے۔

ملازم راشد نے بتایا۔ ''مُنا اوپر روشن دان سے گرا ہے۔''

''روشن دان سے؟ وہاں کیا کر رہا تھا؟'' شانی نے چلا کر پوچھا۔

پھر جواب، اپنے آپ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سمجھی تھی کہ مُنا چلا گیا ہے مگر وہ کمرے کے سامنے ہی تھا۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے کھڑکی کے شیڈ پر چڑھا تھا۔ وہاں سے وہ روشن دان میں جھانک کر شانی کو آواز دینا چاہتا تھا لیکن پھسل کر نیچے صحن کے پختہ فرش پر گرا تھا۔ شانی نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور اس کا منہ سر چومنے لگی۔ مُنے کی آنکھیں بند تھیں اور گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ لرزتے چلے جا رہے تھے۔

دس منٹ کے اندر ڈاکٹر حویلی میں پہنچ گیا۔ مُنے کے سر میں چار ٹانکے لگے۔ نچلے ہونٹ پر بھی اندر کی طرف زخم آیا تھا۔ بھابو بھی پریشان تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ شانی تھی۔ وہ مُنے کو سینے سے لگا کر سسکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معاف کر دو مُنے! یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''نہیں ایسا نہیں کہتے۔'' بھابو نے اسے تسلی دی۔ ''جو تکلیف قسمت میں ہوتی ہے وہ ملتی ہے۔ شکر ہے کہ ہاتھ پاؤں بچ گئے ہیں۔''

''اب تو میرے ساتھ پتنگ اڑائیں گی ناں؟'' مُنے نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ضرور اڑاؤں گی، ضرور اڑاؤں گی۔ اب تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔''

شانی اسے اپنے ہی کمرے میں لے آئی۔ وہ اس سے لپٹ کر سو گیا۔ رات تک مُنے کو ہلکا بخار ہو گیا اور سارا جسم تپنے لگا تھا۔ شانی سخت پریشان تھی۔ نو بجے کے لگ بھگ اس نے پھر ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے تسلی دی اور کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

فاخر ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ کالی گھٹائیں تو سہ پہر سے ہی چھائی ہوئی تھیں۔ نو بجے تک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھڑکیوں پر پانی کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں اور گرج چمک نے ماحول کو رومانوی کر دیا۔ فاخر ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ واپس لوٹا۔ آج اس کا موڈ قدرے خوشگوار لگ رہا تھا۔ وہ ہلکی سی ترنگ میں بھی تھا۔ غالباً موسم کی رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک دو پیگ لگا رکھے تھے۔ شانی نے اس کا چہرہ دیکھا اور پہچان گئی۔ آج فاخر کے چہرے پر وہی جانی پہچانی چمک تھی جو اس کے جذباتی موڈ کی نشان دہی کرتی تھی۔ اس موڈ سے دو دفعہ پہلے بھی شانی کا سابقہ پڑ چکا تھا۔

فاخر خواب گاہ میں داخل ہوا تو مُنے کو پلنگ پر سوتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس بات کی خبر تو اسے کارخانے میں ہی ہو گئی تھی کہ مُنے کے سر پر چوٹ آئی ہے، کمرے میں آ کر اس کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ مُنا اس کے پلنگ پر سو رہا تھا۔

''اسے یہاں کیوں لٹایا ہوا ہے؟'' فاخر نے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے، میں آج یہیں سوؤں گا۔ بے چارے کو بخار بھی ہو گیا ہے۔'' شانی نے پریشانی سے کہا۔

اتنے میں مُنے نے بھی نحیف آواز میں کہا۔ ''ہاں چاچو...... میں آج یہیں سوؤں گا چچی کے پاس۔''

فاخر کے چہرے پر ناگواری کی شکن نمودار ہوئی اور وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ ایک لمحے میں ہی شانی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ اندر سے روہانسی ہو گئی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ اس نے بڑے درد سے سوچا۔ فاخر کی ''طلب'' اسے اس وقت ہی کیوں پکارتی ہے جب وہ کسی دکھ کے نرغے میں ہوتی ہے۔ آج مُنے کی چوٹ نے اسے ہلکان کر رکھا تھا اور آج ہی فاخر کی خواہش کی ''حرارت'' نظر آئی تھی۔

وہ فاخر کے پیچھے پیچھے باہر آئی۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا تھا۔ ''کھانا لگواؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی بھوک نہیں!'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''جاؤ... تم سو جاؤ جا کر۔'' اس نے

لہجے میں شدید کاٹ تھی۔

شانی ایک لفظ کہے بغیر واپس مڑ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج پھر اسے اپنے آپ پر جبر کرنا ہوگا۔ خاموشی کی زبان میں یہی اس کے شوہر کا حکم تھا۔ وہ کمرے میں جا کر مُنے کے پاس لیٹ گئی۔ اسے تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر مُنا سو جائے تو وہ اسے آہستہ سے اٹھا کر اوپر بھابو کے پاس چھوڑ آئے لیکن وہ تو سونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بار بار مچل کر خود کو شانی کی بانہوں میں گھسا دیتا تھا۔ آخر شانی کو کہنا پڑا۔ ''منے...... چلو آؤ، میں تمہیں امی کے پاس چھوڑ آؤں۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ ایک دم پوری طرح بیدار ہو کر بولا۔ ''میں آپ کے پاس سوؤں گا۔''
اس نے اپنی ٹانگ شانی کے پیٹ پر چڑھائی اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی لپٹ گیا۔

شانی کچھ دیر تک اسے پیار اور حکمت سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام ہوئی۔ آخر وہ روہانسی ہوگئی۔ اس کا لہجہ خود بخود سخت ہوگیا۔ شانی کی اس اچانک بے رخی نے مُنے کو رونے پر مجبور کر دیا۔ شانی نے دل پر بھاری پتھر رکھ کر مُنے کو اٹھایا اور اس کے رونے کی پرواہ کئے بغیر اسے اوپر بھابو کے پاس چھوڑ آئی۔

کمرے میں آ کر خود کو سنبھالنے میں اسے دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ اپنے اشک بار چہرے کو اچھی طرح ٹھنڈے پانی سے دھونے کے بعد اور بال سنوار کر وہ نشست گاہ میں آ گئی۔

فاخر نے ٹیلی ویژن کھول رکھا تھا اور الکحل سے شغل کر رہا تھا۔

''آ جایئے... منا اوپر چلا گیا ہے۔'' شانی نے نظر جھکائے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر تک اس کے سراپے کو گھورتا رہا۔ کاٹن کی گلابی پھول دار قمیص پر ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ قمیص سے اوپر شفاف گردن ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ ریشمی بال کانوں کو ڈھانپ رہے تھے اور ہموار کندھوں کے پیچھے اوجھل ہو رہے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر بادل زور سے گرجا اور فاخر اٹھ کر خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے شانی پر احسان کر رہا ہو۔

وہی ماحول تھا ... وہی گھٹن تھی ... شانی کے اندر وہی بے حسی تھی۔ وہ جو جو کہتا گیا، وہ مشینی انداز میں اس پر عمل کرتی گئی۔ ناگوار سانسیں شانی کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔ رخساروں پر کانٹے سے چبھنے لگے۔ وہ آج کسی طرح کے گریز یا کسی طرح کی مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتی تھی اور ... اسے آئندہ بھی ایسا ہی کرنا تھا۔

اگلے آٹھ دس ہفتے اسی انداز میں گزرے۔ اس کی ازدواجی زندگی نے سہاگ رات سے جو ڈگر اختیار کی تھی، اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ یہ سخت ناہموار، ناقابلِ یقین اور ٹیڑھا راستہ تھا۔ ہر چوتھے پانچویں روز اچانک اسے پتا چلتا تھا کہ اسے اپنے شوہر سے ''محبت'' کرنی ہے۔ یہ ایک ایسا ازدواجی فریضہ تھا جو کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اچانک اس پر عائد ہو سکتا تھا۔ شانی کے اندر محبت کرنے کی حس تو جانے کب سے مر چکی تھی وہ تو بس ایک کٹھ پتلی تھی۔ یہ کٹھ پتلی کسی دوسرے کے اشارے پر ناچتی تھی۔ اس کی ہر حرکت کسی دوسرے کے ہاتھوں کی حرکات کے تابع تھی۔ وہ سب کچھ خاموشی اور صبر سے سہہ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر شکن تک پیدا نہیں ہوتی تھی، بے شک دل شکنوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ خود کو سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رکھتی تھی۔ بھابو اور ملازماؤں کے منع کرنے کے باوجود وہ ہر جگہ ہاتھ بٹاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ کبھی سبزی بنانے میں مدد کر رہی ہے۔ کبھی کسی ملازمہ کے ساتھ مل کر گلدستے بنا رہی ہے۔ کبھی بھابو کے ساتھ مل کر پودوں کو پانی دے رہی ہے۔ اسے یوں کام کر کے خوشی ملتی تھی اور اس کے کام سے جن کی مدد ہو جاتی تھی، وہ بھی اپنی جگہ خوش ہوتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ہر دل میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔ ہر کوئی اس کے نام کی مالا جپتا نظر آتا تھا۔ شاید یہ رنگ والی کی وڈی آپا کا عکس تھا جو ابنار پور کی چھوٹی بیگم میں جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ اگر اس چار دیواری میں کوئی اس سے ناخوش تھا تو وہ یہاں کے دونوں ''داروغے'' تھے۔ یعنی داروغہ مہر جی اور چھوٹے داروغہ چوہدری فاخر۔ خاص طور سے فاخر کو تو شانی کی ''ہر دل عزیزی'' ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی شانی کی مقبولیت کا کوئی منظر دیکھتا تھا، اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ ایک بار تو اس نے ایک بوڑھی ملازمہ حمیدن کو شانی کی بلائیں لیتے دیکھ کر اس بری طرح جھڑکا اور دھمکایا تھا کہ کمزور عورت کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

دادا سسر مہر جی کا رویہ بھی شانی سے جوں کا توں تھا۔ وہ آج کل کچھ بیمار تھے۔ بھابو سے شانی کو معلوم ہوا تھا کہ وہ آج کل سپ گندل کا پودا بھی کم کاشت کر رہا ہے۔ اس پودے کو وہ ''آبِ حیات'' جیسی اہمیت دیتا تھا۔ ایک روز شانی نے چھت پر سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مہر اپنی وہیل چیئر پر پھلواری کے قریب موجود تھا۔ لمبے مہندی لگے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ شانی نے دیکھا کہ پھلواری میں ایک سیاہ کوبرا گھوم رہا ہے۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ سانپ کی دُم میں ایک سوراخ تھا اور اس میں سے ایک رسی گزر رہی تھی۔ رسی میں بے شمار چھوٹی چھوٹی سیپیاں پروئی گئی تھیں۔ اگلے روز شانی نے خوف زدہ لہجے

میں بھابو سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ سانپ آج کل پھلواری میں ہی رہتا ہے۔ اکبرا کہتا ہے کہ سانپ کا پیشاب فضلہ اور اس کے سانسوں کی ہواڑ، سپ گندل کے بوٹوں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں۔ سانپ پھلواری میں کھلا پھرتا ہے پر اس کو اس طرح باندھا گیا ہے کہ وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

شانی نے یہ بات خوف اور کراہت کی کیفیت میں سنی، لیکن اب وہ نارپور میں ایسی باتوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

مہر چونکہ آج کل بیمار تھا اور بستر پر پڑا ہوا تھا اسی لئے شانی کو اس سے نسبتاً کم خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے دستور کے مطابق شانی کو ہر دوسرے تیسرے روز مہر کے کمرے میں جا کر اس کی پلپلی پنڈلیاں دبانا پڑتی تھیں۔ دباتے دباتے اس کے ہاتھ دکھنے لگتے تھے۔ مہر کی بدبودار سانسوں سے بچنے کے لئے وہ رک رک کر سانس لیتی تھی مگر سانس لئے بغیر گزارہ بھی تو نہیں۔ سانس تو لینا ہی پڑتا ہے چاہے ہواؤں میں زہر گھلا ہو۔ جب اس کی کلائیاں بے جان ہو جاتی تھیں اور وہ کوشش کے باوجود مہر کی ٹانگوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی تو مہر کے چہرے پر بے زاری نظر آنے لگتی تھی اور وہ کروٹ بدل لیتا تھا۔ یہ اس امر کا اشارہ ہوتا تھا کہ وہ اب جا سکتی ہے۔ وہ مہر کے کمرے سے یوں نکلتی تھی جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہو۔ باہر آ کر وہ دیر تک باغیچے میں ٹہلتی تھی اور اپنے اندر گھس آنے والی بوباس کو تازہ ہوا میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک روز وہ ایسے ہی مہر کے کمرے سے نکل کر ٹہلتی ہوئی ذرا آگے تک نکل گئی۔ باغیچے کی دیوار اس اکھاڑے کی دیوار سے ملی ہوئی تھی جہاں فاخر اور اس کے ساتھی کسرت کرتے تھے۔ شانی دیوار کے پاس پہنچی تو اسے دوسری طرف سے لاٹھیوں کی ٹھکا ٹھک سنائی دی۔ وہ مخصوص نعرے اور بڑھکیں بھی سنائی دے رہی تھیں جو لٹھ بازی کا حصہ ہوتی ہیں۔

پتا نہیں کیا بات تھی۔ لٹھ بازی کا خیال ذہن میں آتے ہی شانی کے دل میں غم کا تیر سا اُتر جاتا تھا۔ اس کے تصور میں اپنے من موہنے بھائی عادل سلطان کا چہرہ آتا اور آنکھوں کے سامنے دھند پھیل جاتی۔ ابھی کوئی اس کے مرنے کی عمر تھوڑی تھی۔ وہ جوانی کے جوش میں آگ کے اندر ہاتھ ڈال بیٹھا۔ کیا تھا اگر وہ یوں فاخر سے مقابلے بازی نہ پر اُترتا...... اور اگر اُترا تھا تو اس سے ہارتا نہ...... اور اگر ہار گیا تھا تو اس ہار کو دل کا روگ نہ بناتا۔ زندگی میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ ہار نہ ہو تو پھر جیت کا وجود کیونکر ہو۔

وہ خیالوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے دیکھا کہ فاخر پسینے میں بھیگا

ہوا اکھاڑے کی طرف سے آ رہا ہے۔ اس نے دھوتی کو لنگوٹی کی شکل میں کسا ہوا تھا۔ پورے جسم پر گھنے بال تھے۔ شانی کی طرف آتے ہوئے اس کے لنگوٹ نے پھر دھوتی کی شکل اختیار کر لی۔ فاخر کے سانولے چہرے پر پسینے کی بوندیں اور اس کی چڑھی ہوئی سانس دیکھ کر پتا نہیں کیوں شانی کا دم گھٹ سا جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے فاخر نے ابھی ابھی عادل سے لٹھ بازی کی ہے۔ جیسے عادل زخمی حالت میں زمین پر گرا پڑا ہے اور فاخر فاتحانہ انداز میں اس کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ تمام کا تمام دلدوز منظر شانی کے ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا۔

''اِدھر کیا کر رہی ہو؟'' فاخر نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ آج اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔

''کچھ نہیں۔ یونہی ہواخوری کو دل چاہ رہا تھا۔''

''لگتا ہے کہ ہواخوری تمہیں پسند ہے۔'' وہ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''کبھی کبھی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ پرسوں تمہیں ہواخوری کرائیں گے۔''

''کہاں!'' شانی نے چہرے پر خوشی کے تاثرات سجائے۔

''تمہیں تمہارے ابا جی سے ملا کر لائیں گے۔''

شانی کھل اٹھی۔ پورے دو مہینے ہو چلے تھے ابا جی کی صورت دیکھے ہوئے۔ رنگ والی اور رنگ والی کے سارے رنگ اسے بے طرح یاد آ رہے تھے۔ صغراں کی شادی بھی اس کی غیر موجودگی میں ہو گئی تھی اور بھی پتا نہیں کیا کچھ شانی نے کھویا تھا۔ وہ اپنی خوشی پر بمشکل قابو پا سکی۔

پتا نہیں کیوں آج اسے محسوس ہوتا تھا کہ فاخر کے رویے میں حاکمیت کے علاوہ بھی کچھ شامل ہو رہا ہے۔ وہ موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ جسم اور خود سپردگی کے علاوہ بھی شانی سے کچھ چاہتا ہے اور جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ صرف حکم سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ شاید یہ خود اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔

دو روز شانی نے بے حد مشکل سے کاٹے۔ تیسرے روز اتوار تھا۔ علی الصبح شانی اور فاخر بذریعہ جیپ ''رنگ والی'' کی طرف روانہ ہو گئے۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے منی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی تھی۔ تھوڑے سے تردد کے بعد فاخر نے اجازت دے دی تھی۔ جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گارڈ تھے۔ ڈرائیور بھی اسلحہ شناس تھا اور ہر وقت مسلح رہتا تھا۔ مہر جی کا چہیتا گارڈ اکبرا آج کل حویلی میں موجود نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے عارضی طور پر لاہور میں مقیم تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ ان لوگوں نے آٹھ دس میل تک ہموار پختہ سڑک پر سفر کیا۔ اب انہیں گوجرانوالہ جانے والی سڑک پر پہنچنا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے وہ اکثر ایک شارٹ کٹ استعمال کرتے تھے۔ چار پانچ میل کا نیم پختہ راستہ تھا اور جنتر کیکر وغیرہ کے گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اس راستے پر کبھی کبھار ہی کوئی ٹریکٹر ٹرالی یا بیل گاڑی نظر آتی تھی۔ کھیت راستے سے کافی ہٹ کر تھے۔

ان کی جیپ اس شارٹ کٹ پر دو ڈھائی میل آگے گئی ہوگی کہ ایک سیاہ کار نے عقب سے ہارن دینا شروع کر دیا۔ سیاہ کار کی رفتار کافی تیز تھی۔ وہ جیپ سے آگے نکلنا چاہتی تھی۔ فاخر کے ڈرائیور نے سیاہ کار کو راستہ دینے میں تھوڑی سی تاخیر کی تو کار کا ہارن مسلسل سنائی دینے لگا۔ کار جیپ کے بالکل قریب چلی آئی اور پھر کار والے نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ کار کی سائیڈ بری طرح جیپ کی سائیڈ سے ٹکرائی۔ جیپ کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا اور وہ خطرناک طریقے سے لہرائی۔ بائیں طرف کے دونوں پہیے کچھ دیر کے لئے کچے میں اتر گئے تھے اس لئے گرد کا ایک دبیز بادل فضا میں بلند ہوا۔

یہ بے حد طیش دلانے والی حرکت تھی۔ اس علاقے میں فاخر کی جانی پہچانی گاڑی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کون کر سکتا تھا۔ ایک سیکنڈ میں فاخر کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ گارڈ کی مونچھیں بھی پھڑکنے لگی تھیں۔ ''روکو اس حرام زادے کو!'' فاخر نے گرج کر کہا۔

کار ابھی تک عقب میں ہی تھی۔ فاخر کے ڈرائیور نے جیپ کو راستے کے عین درمیان میں لاتے ہوئے رفتار اس طرح آہستہ آہستہ کم کی کہ راستہ بلاک ہو گیا۔ جیپ کھڑی ہوگئی اور پرانے ماڈل کی سیاہ شیورلیٹ کار اس کے عقب میں رک گئی۔ گھنی مونچھوں والا گارڈ اور ڈرائیور چھلانگیں مار کر جیپ سے اترے۔ انہوں نے ایک نظر میں جیپ کے نقصان کا جائزہ لیا اور پھر سیاہ کار کی طرف لپکے۔ سیاہ کار قریباً پچاس فٹ پیچھے کھڑی تھی۔ فاخر کا گندمی چہرہ خون کے دباؤ سے نیم تاریک نظر آنے لگا تھا۔ وہ شانی اور منے کی پرواہ کئے بغیر مسلسل کار والوں کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ (وہ ابھی تک جیپ کے اندر ہی تھا)

شانی نے مڑ کر دیکھا۔ گارڈز کے پہنچتے ہی کار والے بھی باہر نکل آئے تھے۔ یہ دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر شانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اس شخص کو جانتی تھی۔ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ گزر جانے والے تین چار ماہ میں اس شخص کا چہرہ شانی کے تصور میں آیا تھا اور ہر بار اسے عجیب و

غریب کیفیت سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ خوشی نہ غم نہ اداسی۔ نہ وابستگی۔ پتا نہیں یہ کیا کیفیت تھی، جو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں پر عمل کرتی تھی اور درد کی لہر رگ و پے میں جگاتی تھی۔ ہاں یہ اس کا جانا پہچانا شخص تھا۔ یہ واحدی تھا۔ وہ گرے شلوار قمیص میں تھا۔ کندھوں پر ایک پھول دار چادر تھی جو دونوں پہلوؤں پر جھول رہی تھی۔ اس کی داڑھی پہلے سے زیادہ گھنی اور بال پہلے سے بڑھ کر لمبے ہو چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ملیح چہرے کا دو تہائی حصہ ان بالوں سے چھپا ہوا ہے۔

واحدی کو فاخر کے کرخت محافظوں کے روبرو دیکھ کر شانی کے دل میں ٹیس سی جاگی۔ ذہن میں ایک ساتھ کئی سوال اٹھے۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی آمد اتفاقیہ ہے یا دانستہ؟ اس کی گاڑی فاخر کی جیپ سے کیسے ٹکرا گئی؟ اب اس کے ساتھ کیسا سلوک ہونے والا ہے؟

وہ دم بخود تھی۔ منا اس کی گود میں تھا۔ محافظوں اور واحدی وغیرہ میں کوئی بات ہو رہی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ دو منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈرائیور نشان علی تیزی سے جیپ میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔

''کیا بات ہے نشان؟'' فاخر نے پوچھا۔

نشان علی نے تھوک نگلا اور شانی وغیرہ کی طرف دیکھا۔ شاید وہ بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

فاخر نے اس سے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے کہے۔ نشان علی نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ''مالک! میں اس چادر والے بندے کو پہچان گیا ہوں۔ یہ کوئی اور نہیں رستم سیال ہے۔''

''رستم سیال؟'' فاخر نے حیرت سے کہا اور پورا گھوم کر عقب میں دیکھا۔ چند سیکنڈ تک اس کی نگاہ واحدی پر مرکوز رہی، پھر اس کے تاثرات بھی بدل گئے۔ شاید اس کی نگاہ نے بھی نشان علی کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''لگتا تو وہی ہے، بس داڑھی اور مونچھوں کا فرق ہے......''

''سو فیصد وہی ہے مالک! ام...... میرا خیال ہے کہ بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نقصان تو دونوں گاڑیوں کا ہوا ہے۔''

شانی یہ سب سن رہی تھی اور اس کے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دل و دماغ میں رستم سیال کا نام ایک گونج کی طرح پھیل رہا تھا۔ رستم سیال علاقے کا معروف ڈکیت تھا۔ اس کے قصے اکثر لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔ وہ چکرا سی گئی۔ اس کا معطل ذہن اس نتیجے پر

پہنچنے کی کوشش کرنے لگا کہ سیاہ کار کے قریب کھڑا شخص رنگ والی حویلی کا مالی ''واحدی'' ہے یا نامی گرامی ڈاکو رستم سیال؟

کیا واقعی یہ مالی کے بھیس میں رستم سیال تھا۔ شانی کو واحدی سے متعلق وہ واقعات یاد آئے جو اسے پہلے بھی الجھن میں مبتلا کرتے رہے تھے۔ واحدی نے کٹھولی گاؤں کے قریب ایک قبرستان میں شانی اور سکینہ کو ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا اور ایسی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا جو ان دونوں کو اب تک یاد تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ واحدی کی فطری جی داری کا مظاہرہ ہوا تھا۔ لٹھ بازی کے مقابلے کے بعد فاخر، عادل کو بے دردی سے زخمی کر رہا تھا، واحدی آگے آیا تھا اور اس نے فاخر کی لاٹھیاں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔

اس قسم کے اور بھی دو چار چھوٹے بڑے واقعات تھے جو شانی کو الجھن میں مبتلا کرتے تھے۔ اس کے اندر سے آواز آیا کرتی تھی۔ یہ شخص وہ نہیں ہے، جو خود کو ظاہر کرتا ہے۔ آج وہ یہی بات ڈرائیور نشان اور اپنے شوہر کی زبانی سن رہی تھی۔ ایک ساتھ بہت سے مناظر شانی کے ذہن میں آئے اور اس کے ساتھ ہی وہ منظر بھی، جب شانی نے اپنے مالی (واحدی) کے منہ پر طمانچہ مارا تھا......اور وہ منظر بھی جب اسے بے توقیر کر کے گھر سے نکالا تھا۔

یہ بات تو شانی پہلے سے جانتی تھی کہ واحدی نے باغ بانی کا کام صرف رنگ والی کی حویلی میں رہنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ رنگ والی میں ایک موقع پر واحدی نے اسے بتایا تھا کہ وہ رستم سیال کے قبیلے کا ہے اور اس کا دور کا رشتے دار ہے۔ آج ایک مختلف بات کا پتا چل رہا تھا۔ وہ رستم سیال کا دور کا رشتے دار نہیں تھا، وہ خود رستم سیال تھا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ یہ سوال بے پناہ شدت اور خوف کے ساتھ شانی کے ذہن میں ابھرا اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر رستم سیال نے رنگ والی میں شانی کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کیونکر برداشت کی۔

یہ سارے کے سارے خیالات بس دو تین سیکنڈ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے تھے۔ اس کی آنکھیں واحدی (یا رستم سیال) پر جمی تھیں، جو بڑے انداز سے سیاہ کار کے پہلو میں کھڑا تھا اور فاخر کے گارڈز سے بات کر رہا تھا۔

پھر اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ باتوں میں تلخی آ گئی ہے۔ جیسے بجلی چمکتی ہے، واحدی کا دایاں ہاتھ یکا یک گھوما اور ایک طوفانی مکا گارڈ کے چہرے پر پڑا۔ وہ اپنی رائفل سمیت اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ جہاں وہ گرا وہاں واحدی (یا رستم سیال) کا ساتھی پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ رائفل گارڈ سے چھین لی۔ ڈرائیور نشان علی نے بھنا کر اپنی قمیص کے نیچے سے پستول نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی مہلک آٹو میٹک رائفل کی نال اس

کے سینے سے جا لگی۔

''خبردار!'' واحدی کے ساتھی نے کڑک کر کہا۔

ڈرائیور جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ یہ منظر فاخر ایئر کنڈیشنڈ جیپ کے اندر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تلملایا ہوا باہر نکلنے لگا تو شانی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''نہیں فاخر! آپ باہر نہ نکلیں......یہ بندہ......خطرناک لگتا ہے۔''

جو کچھ بھی تھا اب فاخر کے لئے جیپ میں رکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر باہر آیا۔ اتفاقاً اس وقت فاخر کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ ہتھیار یقیناً اس کے ہاتھ میں آ چکا ہوتا۔ وہ واحدی کے سامنے پہنچا اور گرج کر بولا۔ ''تمہیں حیا آنی چاہئے۔ ایک تو گاڑی کو ٹکر ماری ہے، دوسری بدمعاشی دکھا رہے ہو۔''

''بدمعاش اگر بدمعاشی نہیں دکھائے گا تو پھر کیا تم جیسے شریف دکھائیں گے جو صرف کمزور عورتوں اور نوکرانیوں سے کشتی لڑنا جانتے ہیں۔''

''کون ہو تم؟'' فاخر نے اس کے تند جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ بڑے اعتماد سے مسکرایا۔ ایسے میں گھنی مونچھوں اور داڑھی کے اندر سے اس کے سفید ہموار دانتوں کی قطار چمک گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مجھے پہچان چکے ہو۔ میں وہی ہوں جس کا اندازہ تم نے اور تمہارے کڑچھے نے لگایا ہے۔'' اس کا اشارہ ڈرائیور نشان علی کی طرف تھا۔

فاخر کا چہرہ اندرونی غضب سے سُرخی مائل ہو گیا۔ وہ بولا۔ ''چوریاں ڈکیتیاں کر کے کوئی رستم زمان نہیں بن جاتا۔ میرے لئے تمہاری حیثیت قانون کے بھگوڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ کتنے دن بھاگے بھاگے پھرو گے۔ ایک دن تمہاری چمڑی ہوگی اور پولیس کے چھتر۔''

''پولیس کا ڈراوا دینا تیرے جیسے شہدوں کی پرانی عادت ہے۔ مرد کا بچہ تو وہ ہوتا ہے جو اپنے بازوؤں کے بل بوتے پر بات کرتا ہے۔'' واحدی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں جہاں شانی کو ہمیشہ ایک خاموش عقیدت نظر آئی تھی آج نیلی آگ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ آگ اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو خاکستر کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔

فاخر اور واحدی (یا رستم سیال) کے درمیان چند تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ واحدی تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ اس نے لمبی شیورلیٹ کے اندر

سے دو چمک دار لاٹھیاں برآمد کیں۔ عجیب طیش کے عالم میں اس نے ایک لاٹھی فاخر کی طرف پھینکی اور دوسری اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ بادلوں کی گرج سے مشابہ اس کی آواز شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''اگر ہیجڑا نہیں تو آ.... آج میرے ساتھ بھی دو ہاتھ کر۔ تیری ساری لٹھ بازی نہ نکال دوں تو کہنا اپنے باپ کا نہیں!''

فاخر چند لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا۔ یوں لگا جیسے کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا۔ ایک ساعت کے لئے محسوس ہوا کہ وہ لاٹھی دور پھینک دے گا، دوسری ساعت میں لگا کہ وہ گالیاں بکتا ہوا پوری طاقت کے ساتھ واحدی پر پل پڑے گا۔ آخر وہ چند ساعتیں گزر گئیں۔ شانی نے سہم کر دیکھا۔ فاخر نے یکا یک ایک وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ واحدی پر لاٹھی سے حملہ کیا۔ یہ اتنا شدید حملہ تھا کہ چوکس ہونے کے باوجود واحدی لڑکھڑا کر ایک درخت سے جا لگا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی لیکن اس کے سنبھلنے کی رفتار بھی قابلِ داد تھی۔ اس سے پہلے کہ فاخر کی لاٹھی پھر اس کے جسم سے چھوتی، وہ بجلی کی طرح تڑپ کر لاٹھی کی زد سے نکل گیا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، پھر لاٹھیاں، لٹھ برداروں کے ہاتھوں میں برق کوندوں کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ وہ پوری طرح بے جگری اور بے پناہ شدت سے ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔

نیم پختہ راستے سے ہٹ کر کیکر اور جنتر کے گھنے درختوں کے درمیان اچانک ہی ایک میدانِ کارزار گرم ہو گیا تھا۔ دھول اُٹھ رہی تھی، نازک شاخیں ٹوٹ رہی تھیں لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ اور لٹھ برداروں کے نعرے ہیجان خیز تھے۔ دیکھنے والی آنکھیں جیسے ساکت و جامد ہو کر رہ گئی تھیں۔ یوں دکھتا تھا کہ دو صحرائی بگولے ہیں جو ہوا کی غیر معمولی قوت سے باہم ٹکرائے ہیں اور ایک ہی بھنور کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

فاخر وہ لٹھ باز تھا جو آج تک کسی سے زیر نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف تاریک راتوں اور گھاتوں کا شناور رستم سیال عرف واحدی تھا۔ وہ جسامت میں شاید گرانڈیل فاخر سے کچھ کم ہی ہوگا لیکن طاقت اور پھرتی میں وہ قیامت نظر آتا تھا۔ دونوں دیوانگی کے عالم میں لڑتے ہوئے گاڑیوں کے قریب آ گئے۔ شانی اور مُنا سہم کر لینڈ کروزر میں کچھ اور بھی دبک گئے۔ اچانک کسی لاٹھی کی طوفانی ضرب سے لینڈ کروزر کی عقبی سکرین بھی چکنا چور ہو گئی۔ یہ لڑائی کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ لٹھ بازی کی مہارت میں بھی فاخر کو کچھ فوقیت حاصل ہو لیکن اس کمی کو واحدی کے بے پناہ جوش اور حوصلے نے پورا کر دیا تھا۔ گھمسان کی لڑائی میں فاخر کا سر پھٹ گیا تھا اور واحدی کی پیشانی سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دونوں کے چہرے لہولہان

تھے۔ ان آخری مراحل میں فاخر کی وحشت دیدنی تھی۔ وہ لاٹھی کو ایک خاص مہارت کے ساتھ دونوں سروں کی طرف سے استعمال کر رہا تھا۔ اچانک ایک شدید ضرب جسے ''ہج'' کہا جاتا ہے واحدی کے سینے میں لگی۔ وہ ڈگمگا کر اپنی سیاہ شیورلیٹ کے قریب گرا۔ فاخر نے عقاب کی طرح اس پر چھلانگ لگائی اور اپنی لاٹھی کی مدد سے واحدی کی گردن دبانے لگا۔ ایک لمحے میں واحدی کا منہ کھل گیا اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس کا رائفل بردار ساتھی گارڈ کے پاس ہی کھڑا تھا، لیکن وہ بے حرکت تھا۔ غالباً فریقین میں طے ہو چکا تھا کہ اس لڑائی میں باہر سے کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ شانی کے ہاتھ کانپتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کے لئے دعا گو ہو۔ ایک اجنبی کے لئے...... یا اپنے شوہر کے لئے، اپنے شریکِ حیات کے لئے...... وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید اسی کشمکش کا نتیجہ تھا کہ وہ کوئی دعا ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ اچانک اس نے فاخر کو ہوا میں اچھلتے دیکھا۔ فاخر کی کھڑکھڑاتی سفید شلوار قمیص ایک لمحے کے لئے شانی کی نظروں کے سامنے سے گزری۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا لینڈ کروزر کے پچھلے ٹائر سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، واحدی کی لاٹھی اس کی کنپٹی کا بوسہ لے چکی تھی۔ یہ مہلک بوسہ تھا۔ ضرب زیادہ شدید نہ ہونے کے باوجود بے حد سنگین تھی۔ فاخر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔ چشم فلک نے یہ تماشا دیکھا کہ علاقے کا نامور اور ناقابلِ شکست لٹھ باز زمین بوس تھا۔ واحدی کی لاٹھی اس پر تواتر سے برس رہی تھی۔ وہ شیشے کی بکھری ہوئی کرچیوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شانی درد سے چیختی ہوئی دیوانہ وار باہر نکل آئی۔

''رک جاؤ!'' وہ تڑپ کر پکار اٹھی۔

لیکن اس کے پکارنے سے پہلے ہی واحدی یا رستم سیال، وہ جو کوئی بھی تھا اپنا ہاتھ روک چکا تھا۔ اس کی لاٹھی کی نوک فاخر کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی اور فاخر چاروں شانے چت تھا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مقابلہ اختتام کو پہنچ گیا تھا۔

ایک لفظ کہے بغیر اور اردگرد ایک نگاہ ڈالے بغیر واحدی واپس مڑا اور اپنے ساتھی سمیت اپنی کار میں جا بیٹھا۔ اس نے شانی پر بس ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد اس کی کار دھول اُڑاتی کیکر اور جنتر کے درختوں میں اوجھل ہو رہی تھی۔

فاخر کا چہرہ گاڑھے سُرخ خون میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی ایک کلائی سوج کر کپا ہو رہی تھی۔ کندھے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ شانی اور نشان علی اسے سہارا دے کر جیپ تک

لائے اور خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

☆======☆======☆

اس حادثے کے بعد فاخر اور شانی اپنے محافظوں سمیت نار پور واپس آ گئے۔ فاخر کی مرہم پٹی کے لئے فوراً ڈاکٹر حویلی میں حاضر ہو گئے۔ سب کو یہی بتایا گیا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے جیپ پر حملہ کیا اور چھوٹے چوہدری صاحب کو زخمی کر کے فرار ہو گئے۔ اس حملے کے سلسلے میں رستم سیال اور اس کے مسلح ساتھیوں کا نام لیا جا رہا تھا۔ مقامی تھانے دار بہادر علی نے خود حویلی پہنچ کر ملزمان کے خلاف ڈاکے اور اقدام قتل کا پرچہ کاٹ لیا تھا۔ نار پور میں سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شانی کو معلوم ہوا تھا مہر نے اپنے گھاگ اور خطرناک کارندوں کو رستم سیال کی کھوج کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ کچھ کھوجیوں کو بھی پولیس اہلکاروں کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا۔

شانی سے فاخر کی ملاقات اگلے روز دوپہر کو ہی ہو پائی۔ رات فاخر نے مردانے میں ہی گزاری تھی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ یقیناً رستم سیال اور اس کے ساتھیوں سے بدلہ لینے کا پروگرام تیار ہو رہا ہوگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فاخر بیڈروم میں آ گیا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر کپا ہو رہی تھی۔ سر پر پٹی بندھی تھی جو اپنے سائز کے سبب پگڑی کی طرح نظر آتی تھی۔ کلائی پر پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ شانی اس کی مزاج پرسی میں لگ گئی۔ فاخر کی حالت شانی کے لئے تکلیف دہ تھی۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کے سر کا سائیں۔ فاخر کے چہرے پر گہری کلفت دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ دہری کلفت تھی۔ ایک تو چوٹوں کی، دوسری اس ہزیمت کی جو اسے بیوی اور محافظوں کے سامنے شکست کی صورت میں اٹھانا پڑی تھی۔

شانی نے محتاط لفظوں میں اس کی دل جوئی کی کوشش کی مگر وہ اس طرح کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ شانی سمجھ گئی کہ اسے بھی موضوع بدلنا ہوگا۔ اس نے رسمی انداز میں کہا۔ ”ابا جی اور تایا معصوم تو ہمارا انتظار ہی کرتے رہ گئے ہوں گے۔ میں نے انہیں اطلاع بھجوائی تھی کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔“

عام سے انداز میں کہی ہوئی اس بات نے ایک دم فاخر کو بھڑکا دیا۔ طیش کی یلغار سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور جبڑا مزید چوڑا نظر آنے لگا۔ اس نے جگر پاش نظروں سے شانی کو گھور کر زور سے دھکا دیا۔ وہ پلنگ کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اُڑتی ہوئی قالین پر گری اور سرِ سنگِ مرمر کی تپائی سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نیلی پیلی چنگاریاں اُڑ گئیں۔ فاخر کی نہایت کرخت آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”حرام زادی! میں یہاں مر رہا ہوں اور تجھے اپنے

پچھلوں کی پڑی ہے۔ یہ ساری تیری ہی نحوست ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔“

شانی کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔ وہ اس کے لئے سخت الفاظ تو پہلے بھی استعمال کرتا تھا لیکن یہ سخت ترین تھے۔ شاید وہ کل کی ہار کا سارا غصہ اس پر اتار رہا تھا۔

”فاخر......آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ کچھ بھی کہے بغیر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی ہچکیوں سے رونے لگی۔ آنسو اور خون کے قطرے ایک ساتھ قالین پر گرنے لگے۔ اتنے میں چھوٹے ندیم نے کھڑکی سے جھانک کر شانی کا زخمی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی کنپٹی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ندیم فوراً بھاگ گیا۔ یقیناً ماں کو بتانے گیا تھا۔ بھابو اب کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی تھی۔ شانی جلدی سے غسل خانے میں چلی گئی اور اپنے آنسو اور اپنا خون چھپانے کی کوشش کرنے لگی لیکن ایسی چیزیں چھپانے سے کب چھپتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں بھابو کو سب معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح شانی کو اپنے گلے سے لگایا اور اس کی ڈھارس بندھانے میں مصروف ہو گئی۔ ندیم اور مُنا بھی اپنے معصوم انداز میں اس کی مدد کرنے لگے۔

رات کا وقت تھا۔ شانی اپنی خواب گاہ میں تھی۔ وہ پلنگ پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس نے کاٹن کا کڑھائی دار کرتہ پہن رکھا تھا۔ دلکش جسمانی نشیب و فراز ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کی کنپٹی پر میڈیکل ٹیپ چپکی تھی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن فاخر ابھی تک زنانے میں نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ آج رات بھی مردانے میں دوستوں کے ساتھ گزارے گا۔ مردانے میں مردوں کی مصروفیات کیا ہوتی تھیں، اس کے بارے میں تحقیق کرنے کی اجازت حویلی کی عورتوں کو نہیں تھی۔

شانی کی جھیل آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ دل غم سے بھرا ہوا تھا پھر اس کا دھیان رستم سیال کی طرف چلا گیا۔ وہ رستم سیال جو پہلے زخمی حالت میں شانی کو اسی حویلی کے ایک کمرے میں ملا تھا اور پھر بعد میں کئی ماہ ایک مالی کی حیثیت سے رنگ والی کی حویلی میں موجود رہا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ کیوں چاہتا تھا؟ اسے ایسا سوچنے کا کیا حق تھا؟ شانی کبھی حیرت اور کبھی غصے کے عالم میں سوچنے لگتی تھی۔

پتا نہیں کیوں ایک بات کا شانی کو اطمینان تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اور اس کی ذہنی روا سے

جس سمت بھی لے گئی تھی مگر وہ شانی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا پھر شانی رستم سیال یا واحدی کے موجودہ حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کل دوپہر رستم سیال نے جو کچھ بھی کیا اس کی وجہ وہ خود تھی۔ شاید رستم نے اپنی سوچ کے مطابق فاخر سے اس ہزیمت کا بدلہ لیا تھا جو فاخر کے سبب عادل سلطان کو اٹھانا پڑی تھی۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی ہوا تھا، شانی کے لئے بڑے دکھ کا باعث تھا۔ فاخر کا سلوک شانی کے ساتھ جیسا بھی تھا لیکن اس کی تکلیف پر شانی کا دل رونے لگتا تھا۔ شاید اپنی مرحومہ ماں کی طرح وہ کسی کے بارے میں منفی انداز میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک بار پھر اس کے خیالات کا دھارا رستم سیال کی طرف مڑ گیا۔ نارپور کے چوہدری سیالوں کو پہلے ہی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ رستم کی کل والی کارروائی کے بعد وہ بالکل ہی آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ مہر اور فاخر کا ''اثر رسوخ'' بڑے غضب ناک انداز میں رستم کا پیچھا کر رہا ہوگا۔ مہر کے کارندے پولیس کے شانہ بشانہ رستم کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

وہ لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ بس برآمدے کی ہلکی سی روشنی کھڑکی سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ دفعتاً شانی کو محسوس ہوا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا ہے اور کوئی اندر آ گیا ہے۔ اس کی نگاہ سامنے گئی اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا حویلی کا فرد نہیں تھا کیونکہ اسے یوں دبے پاؤں اندر آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آنے والے کا چہرہ ایک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بالکل چوروں کے انداز میں جھک کر چلتا ہوا آیا اور شانی سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر آ کھڑا ہو گیا۔

پہلے تو شانی نے چیخنے چلانے کا ارادہ کیا لیکن پھر اس کی فطری دلیری اور فراست کام آئی، وہ شدید خوف کے باوجود اپنی جگہ بے حرکت لیٹی رہی۔ پلنگ کی دائیں سائیڈ ٹیبل کے پہلو میں ہنگامی گھنٹی کا بٹن موجود تھا۔ اس بٹن کا رابطہ براہِ راست گارڈز کی کوٹھڑی سے تھا۔ شانی پلنگ کے بائیں کنارے پر تھی جب کہ نو وارد دائیں کنارے پر تھا۔ یہ پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اطلاعی گھنٹی تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اسے چند سیکنڈ تک انتظار کرنا تھا تاکہ نو وارد دائیں کنارے سے ہٹ جائے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد پڑی رہی۔ آنکھیں بند تھیں، لیکن پلکوں کے نیچے باریک سی جھری موجود تھی۔ آنے والا پلنگ کی پائنتی کی طرف سے گھوم کر مزید قریب چلا آیا۔ . . پھر ایک سرسراتی ہوئی مدھم آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس کی رگوں میں خون سنسنا کر رہ گیا۔

یہ واحدی یعنی رستم سیال کی آواز تھی۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں شانی کو ''بی بی'' کہہ کر پکارا تھا۔ کئی سیکنڈ تک تو شانی کو یہی محسوس ہوا کہ سینے میں حرکت کرتے دل کے سوا اس کا پورا جسم پتھرا گیا ہے۔ تب ایک بار پھر ''بی بی'' کی مخصوص سرگوشی شانی کے کانوں تک پہنچی۔ وہ آنکھیں بند کئے بے حرکت لیٹی رہی جیسے گہری نیند میں ہو۔

رستم اس سے دو فٹ کی دوری پر کھڑا تھا اور یک ٹک شانی کی صورت دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش شانی اپنے رخساروں پر محسوس کر رہی تھی۔ سینے میں اس کا نازک دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر ہولے سے شانی کو پکارا۔ تب یوں لگا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھونا چاہتا ہے۔ اس کا ہاتھ شانی کے قریب آیا۔ چند لمحے ٹھہرا رہا، پھر جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دم بخود لیٹی رہی۔ آنکھوں کی جھری سے وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی تھا لیکن اب اس کا ہیولا حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ تب وہ اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ سوالات تیزی سے شانی کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ وہ اس کے پاؤں کے قریب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تب شانی نے اپنے تلوؤں کے قریب عجیب سا لمس محسوس کیا۔ کسی چیز نے بے حد نرمی اور ملائمت سے اس کے بائیں تلوے کو چھوا۔ وہ لرز اٹھی۔ یہ کسی اور شے کا نہیں، ہونٹوں کا لمس تھا۔ دو لرزتے اور شاید آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہونٹوں کا لمس۔ ان ہونٹوں نے بے حد آہستگی سے اسے چھوا اور آہستگی سے پیچھے ہٹ گئے۔

اب شانی کے لئے ممکن نہیں تھا کہ مزید خاموش رہتی اور بے حرکت لیٹی رہتی، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اسے یوں اٹھتے دیکھ کر رستم بری طرح چونکا، پھر اس کے جسم نے برق کی طرح حرکت کی اور اس کی چوڑی گرم ہتھیلی نے شانی کے ہونٹوں کو قدرے سختی سے ڈھانپ لیا۔

یقیناً رستم نے یہی سمجھا تھا کہ شانی نیند سے ابھی بیدار ہوئی ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک شانی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کہیں منہ سے ہاتھ ہٹانے کے بعد وہ چیخنا چلانا تو شروع نہیں کر دے گی پھر جیسے شانی کی نگاہوں اور اس کے تاثرات نے اسے یقین دلا دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ شانی کے ریشمی ہونٹوں اور عارضوں سے ہٹا لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جن میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔ تب رستم عرف واحدی نے سرگوشی میں کہا۔ ''بی بی! اس طرح یہاں آنے کی بہت بہت معافی چاہتا ہوں۔''

اس کے لہجے کی نرم کپکپاہٹ نے شانی کو ششدر کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی چلی

جارہی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ وہی رستم ہے جس کے خوف سے ایک خلقت لرزتی ہے اور جس نے صرف 36 گھنٹے پہلے فاخر سے خم ٹھونک کر مخاصمت مول لی تھی، اس وقت نظر آنے والے رستم اور اب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے رستم میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے اس نے جو کچھ شانی کے ساتھ کیا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ شانی اس کے خیال سے ہی شرم سے ڈوبی جارہی تھی۔

وہ بے حد تلخ سرگوشی میں بولی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس طرح میرے کمرے میں گھس آنے کا مطلب کیا ہے؟''

''میں سب جانتا ہوں بی بی! اس کے باوجود مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں۔''

''دماغ ٹھکانے پر لانے کے جو طریقے ہوتے ہیں ان کا بھی تمہیں پتا ہوگا۔'' وہ بے حد بے مروتی سے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے ملازموں کو آواز دینی چاہئے۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کے لئے حرکت کی۔

رستم نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ شانی کے شانوں پر رکھ دیئے پھر یوں ہاتھ پیچھے ہٹائے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بے انتہا عاجزی اور تحمل سے بولا۔ ''بی بی! مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے۔ میری طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں بس دو چار منٹ میں۔ بس دو چار منٹ میں۔''

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ شانی اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکی۔ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

وہ پلنگ پر تھی۔ وہ زمین پر بیٹھا تھا۔ کسی عقیدت مند کی طرح، کسی پرستار، کسی دیوانے کی طرح۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ لرزاں پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ جیسے کسی معبد کے سب سے بلند چبوترے پر رکھی ہوئی دیوی تھی اور وہ اس کے سامنے سرنگوں کوئی سپاس گزار پجاری تھا۔ اس نے عجیب لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''بی بی! میں کوئی ناسمجھ بچہ نہیں ہوں۔ ہر اچھا بُرا سمجھتا ہوں۔ زمانے کے بہت سرد و گرم دیکھے ہیں میں نے لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس کا میں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ میں نے... میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا بی بی! اس کے فوراً بعد میں وہ نہیں رہا تھا، جو آپ کو دیکھنے سے پہلے تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی وہ پہلے والا رستم نہیں بن سکوں گا۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ بی بی! میں وہی رستم سیال ہوں جس کے قصے آپ نے لوگوں سے سنے ہوں گے اور جس کی ہسٹری علاقے کے بے شمار تھانوں میں موجود ہے۔ جس رات میں آپ سے ملا اس رات سے پہلے میں ڈاکو رستم سیال تھا۔ دنیا کی ہر برائی مجھ میں موجود تھی اور ہر اچھائی مجھ سے دور تھی، لیکن پھر آپ کو دیکھنے کے بعد میرے اندر کی دنیا بدلی۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے خود کو بدلنے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ہر کوشش بیکار گئی۔ جیسے پہاڑی ندی کا ریلا ہوتا ہے ایسا ہی کوئی ریلا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا اور اب بھی بہاتا چلا جارہا ہے۔ نہ میں کہیں رک سکتا ہوں، نہ ٹھہر سکتا ہوں۔ نہ اپنا رستہ بدل سکتا ہوں۔ میں بالکل بے بس ہوں۔ بی بی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں راتوں کو دیوانوں کی طرح جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ میرے دل کو کیسا روگ لگا ہے۔''

اس کی پلکیں ہمیشہ کی طرح جھکی ہوئی تھیں اور وہ بولتا چلا جارہا تھا۔ ''بی بی! میں سر سے پیر تک بدل گیا ہوں۔ ہر پچھلا ساتھی ہر پچھلا ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ برائی کے دنوں کا بہت سا پیسہ میرے پاس جمع تھا، سب کا سب دریا بُرد کر دیا ہے میں نے..... ضرورت مندوں کو بھی نہیں دیا کہ مجھے اس پیسے ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب اپنی طرف سے کوشش کر رہا ہوں کہ حق حلال کی روزی کماؤں اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو رہا ہوں۔ اپنے باپ دادا کا گھر بیچ کر لوہے کے ایک چلتے کاروبار میں ڈالا ہے۔ مناسب آمدن ہو رہی ہے۔ شاید آپ سوچ رہی ہوں گی کہ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں آپ کی نظروں میں اپنی عزت بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ عزت بن جائے گی تو پھر میں آپ سے کچھ اور بھی چاہوں گا، کچھ اور بھی حاصل کرنے کی تمنا کروں گا۔ نہیں بی بی! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ نہ ہی آنے والے مہینوں اور سالوں میں ایسا کچھ ہوگا۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے آخری سانس تک میری بس ایک ہی تمنا ہوگی۔ آپ خوش رہیں اور میں کبھی کبھی آپ کو دیکھتا رہوں۔ دور ہی سے سہی..... فاصلے سے ہی سہی، پر آپ کی صورت پر میری نظر پڑتی رہے۔ میرے جینے کے لئے بس یہی ایک سہارا بہت کافی ہوگا بی بی۔''

وہ بولتا چلا جارہا تھا اور آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس دیوانے سے کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ کئی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ رستم عرف ... احدی کہہ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کے سوا اور کوئی تمنا نہیں رکھتا لیکن

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے اس وعدے کی نفی کر چکا تھا۔ اس نے عجب وارفتگی کے عالم میں شانی کے جسم کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا۔ شانی اس سے کہنا چاہتی تھی کہ۔ ۔ ۔ انسان کے جذبے کبھی ایک مقام پر نہیں رہتے۔ وہ جو آج چاہتا ہے کل اس سے بڑھ کر چاہ سکتا ہے اور اس کا ثبوت ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے بدن کو چھوا ہے۔

لیکن وہ یہ بات زبان پر نہیں لاسکی۔ ایسی بات اسے زبان پر لانی ہی نہیں چاہئے تھی۔ جو بات ابھی پردے میں تھی عیاں ہو جاتی۔ عدم سے ''وجود'' میں آجاتی۔

شانی نے اپنا لہجہ ذرا نرم کیا لیکن تاثرات میں کوئی لچک پیدا نہیں کی اور بولی۔ ''تم نے جو کہنا تھا، کہہ لیا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میرے لئے یہی بڑی بات ہے کہ آپ نے میری بات سن لی ہے۔'' اس کے لہجے میں مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔

''لیکن اب میں کچھ اور سننا نہیں چاہوں گی۔'' شانی نے اسی لہجے میں کہا۔

''صرف ایک بات اور بی بی!'' وہ التجا سے بولا۔ اس کی نگاہ شانی کی زخمی کنپٹی پر تھی۔

شانی خاموش رہی، وہ حوصلہ پا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں آپ سخت پریشانیوں میں گھری ہوئی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ کے کسی کام آسکوں۔ آپ کے معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی میں اپنی جان، بخوشی دے سکتا ہوں۔ آپ زندگی میں کبھی بھی کوئی بھی حکم کریں گی وہ اپنی جان دے کر پورا کروں گا۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا ''مجھ جیسے حقیر آدمی کو آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے بی بی! لیکن ایک بات عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس کے لئے مجھے معافی دے دیں۔ میں جانتا ہوں مہر آپ کی زندگی کو خراب کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑے گا۔ وہ آپ کے خیالوں سے زیادہ بُرا بندہ ہے بی بی۔ وہ آپ کے شوہر کو بھی آپ سے دور کرتا چلا جائے گا۔ وہ آپ کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے بی بی۔ اگر آپ......''

''خاموش رہو!'' شانی نے تلخ سرگوشی کی۔ ''میں اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ یہ میرے ذاتی مسئلے ہیں۔ اگر میں نے انہیں حل ہی کرنا ہے تو خود کروں گی اور میرا شوہر بھی ہے اس کام کے لئے۔ تم اس بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی تم سے اس طرح کی حرکت نہ ہو۔''

''آپ ....آپ کس حرکت کی بات کر رہی ہیں؟''

''تمہاری دو حرکتیں مجھے سخت ناگوار گزری ہیں۔ تم نے فاخر پر حملہ کیا اور انہیں جسمانی نقصان پہنچایا۔ دوسرے تم آج یہاں میرے کمرے میں گھسے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے تمہاری جان اور میری عزت کو کتنا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

وہ بغیر کسی وضاحت کے غیر مشروط انداز میں بولا۔ ''میں ان دونوں حرکتوں کے لئے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی کا طلب گار ہوں۔''

''تم آئندہ کبھی فاخر کے راستے میں نہیں آؤ گے۔ نہ ان سے کسی طرح کا کوئی عناد رکھو گے۔ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی کوئی اس قسم کی غلطی نہیں کرے گا۔''

''ٹھیک ہے بی بی! لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس بارے میں کوئی عذر سننے کو تیار نہیں۔'' لہجے میں ایسا رعب تھا کہ الفاظ میں بے پناہ طاقت سرایت کر گئی تھی۔

''ٹھیک ہے بی بی! جو آپ کا حکم!'' رستم نے سر جھکا لیا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ دور حویلی کے بیرونی پھاٹک پر پہرے داروں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ ایک دوسرے کو چوکس رکھنے کے لئے پکار رہے تھے۔ ''جاگدے رہنا۔''

آخر رستم کھنکار کر بولا۔ ''بی بی! کیا آپ نے میرے دیوانے پن اور میرے مجبور خیالوں کے لئے مجھے معاف کر دیا ہے؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اس آگ میں کھیلنے سے تکلیف اور جلن کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔'' شانی کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں زیادہ سختی پیدا نہیں کر سکی۔ اس کے لہجے کی نرمی اور الفاظ کے انتخاب نے رستم کے چہرے پر خوشی کی ایک موہوم سی لہر دوڑا دی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس فقرے کو وہ اپنے لئے ایک بہت بڑا انعام سمجھ رہا ہے۔

وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اب چلتا ہوں بی بی۔'' وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا، جیسے شانی کی طرف پشت کرنا نہ چاہتا ہو۔

شانی سرگوشی میں بولی۔ ''ایک منٹ ٹھہرو۔ کہیں اپنے ساتھ مجھے بھی کسی بڑی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ یہاں ہر طرف تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔''

وہ الٹا چلتے چلتے رک گیا۔ شانی نے الماری سے ایک چابی نکالی۔ رستم کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر تیزی سے باہر آئی۔ اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ راہداری میں اچھی طرح دیکھنے

کے بعد وہ آگے بڑھی اور دیوار پر لگے ایک سوئچ کو آف کر دیا۔ راہداری میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور رستم سے بولی۔ ''چلو آؤ!''

اس نے فوراً ہدایت پر عمل کیا اور شانی کے پیچھے آیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ خطرات کی موجودگی کے باوجود انہیں خاطر میں نہیں لا رہا۔ راہداری میں پندرہ بیس فٹ آگے ایک بالکل تنگ گزرگاہ تھی۔ مشکل سے ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ یہ اوپر سے چھتی ہوئی اور بالکل تاریک تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ شانی نے ایک چھوٹے سے دروازے میں چابی گھمائی اور رستم سے بولی۔ ''اس دروازے سے نکل جاؤ۔ تھوڑا آگے ہی باہر کی دیوار ہے۔''

رستم نے الوداعی فقرہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! ہمیشہ آپ کے کسی حکم کا منتظر رہوں گا۔''

شانی کے بدن میں ایک بار پھر پھریری سی دوڑ گئی۔ پتا نہیں کس لہجے میں بات کرتا تھا یہ شخص لگتا تھا کہ اثر روح تک اُتر گیا ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ دروازے سے نکل کر شانی کے سامنے سے گزرا تو شانی حتی الامکان حد تک دیوار سے لگ گئی پھر بھی شانی کو کراس کرتے ہوئے رستم کا پورا جسم ایک لمحے کے لئے پورے کا پورا شانی سے مس ہوا۔ ایک بجلی سی تھی جو لپکی اور شانی کی رگِ جاں میں اُتر کر اوجھل ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر تھا۔ شانی کانپتے ہاتھوں اور ماتھے پر نمودار ہوتے پسینے کے ساتھ... سٹپٹاتی ہوئی دروازہ مقفل کر رہی تھی۔

کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر تک کسی چڑیا کی طرح سہمی ہوئی ایک گوشے میں دبکی رہی۔ ہر گھڑی دل کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ ابھی فائرنگ کی آوازیں آئیں گی اور رکھوالی کے کتے ہوشیار ہو کر شور مچانے لگیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اردگرد کی فضا جوں کی توں رہی۔ دھیرے دھیرے شانی کا خوف کم ہوتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز بھی وہ سہمی سہمی پھرتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ رات جو کچھ ہوا وہ اس کی پیشانی پر لکھا گیا ہے اور ہر کوئی اسے پڑھ لے گا۔ کم از کم فاخر تو ضرور ہی پڑھ لے گا۔ وہ اپنے آپ پر جھنجلا رہی تھی۔ اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو کیا ہوتا... اور اگر اس کے کمرے میں پکڑا جاتا تو شاید قیامت ہی ٹوٹ پڑتی۔

شانی سے فاخر کی ملاقات اگلی رات ہی کو ہو پائی۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے

ہوئے شانی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ خواب گاہ کی کھڑکیوں سے باہر خنک ہوا چل رہی تھی اور سلک کے نیلے پردے ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

شانی سر جھکا کر فاخر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے فاخر کی نگاہیں شانی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ فاخر کے اس انداز نے شانی کو اور بھی پزل کر دیا۔ اس کا پورا وجود ایک مدھم لرزش کی زد میں آ گیا۔ ایسی لرزش فاخر کے سامنے اکثر اس پر طاری ہو جاتی تھی۔

فاخر نے ہاتھ بڑھا کر شانی کی کنپٹی کو چھوا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''کیا زیادہ چوٹ لگ گئی ہے؟''

''نہیں۔ کچھ خاص نہیں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''مجھے افسوس ہوا۔ اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔'' فاخر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شانی خاموش رہی۔ یہ نرم رویہ فاخر کے عمومی مزاج سے ہٹ کر تھا۔ تاہم اب کبھی کبھی شانی کو اس رویے کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

''کہو تو ڈاکٹر کو بلا دوں۔''

''نہیں...... اب میں ٹھیک ہوں۔''

''چلو کل تمہیں رنگ والی لے چلیں گے۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

''لل...... لیکن آپ کی چوٹیں تو ابھی ٹھیک نہیں ہوئیں۔ میری چوٹ بھی ابا جی کو نظر آئے گی۔ خوامخواہ پریشان ہوں گے۔''

وہ بھاری بھرکم انداز میں ہنسا۔ ''مردوں کو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ رہی تمہاری چوٹ تو اسے چھپا لینا...... یوں کر کے!'' اس نے شانی کے ریشمی بالوں کی ایک تہہ ذرا نیچے کو کھسکا دی۔ یوں اس کی کنپٹی کا زخم چھپ گیا۔

شانی کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔

وہ جہازی سائز کے پلنگ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ یہ سونے کا وقت تھا۔ شانی نے لائٹ آف کی اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ دو دن پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بات کرنے لگا۔ وہ ارادہ ظاہر کر رہا تھا کہ رستم سیال نے ایک بار پھر دو دو ہاتھ ضرور کرے گا اور دو دو ہاتھ کرنے کے لئے اسے ہر صورت تلاش کروائے گا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کے سامنے اپنی خجالت کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جس رستم کو وہ تلاش کرانے کی بات کر رہا ہے وہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے اسی کمرے میں اسی پلنگ کے قریب

موجود تھا۔

گفتگو کرتے ہوئے فاخر کے چوڑے چکلے ہاتھ شانی کی نازک زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اسے قریب کرتا چلا جا رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کے قریب ہو لیکن وہ تو قریب ہو کر بھی ''قریب'' نہیں ہوتی تھی۔ اس کا جسم بے شک فاخر کے قریب چلا جاتا تھا لیکن وہ خود اپنے آپ سے دور کھڑی رہتی تھی۔ اب بھی اس کا جوان بدن فاخر کی بانہوں میں تھا لیکن اپنے بدن سے جیسے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ اسے لپٹاتا رہا، بھینچتا رہا، اس کے اندر کچھ جگانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جیسے جیسے کہتا رہا وہ بلا حجت اس پر عمل کرتی رہی لیکن وہ پُرحرارت محبت، وہ دل نواز سرخوشی کہیں نہیں تھی جس کا فاخر متلاشی تھا۔ جس کا ہر مرد متلاشی ہوتا ہے۔ جو قدرت کا انعام ہوتی ہے۔ وہ محبت تو فاخر نے ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح خود اپنے پاؤں تلے روندی تھی۔ ایک عرصے پہلے ملیامیٹ کر دی تھی۔ اب بکھری ہوئی اور مسلی ہوئی پتیوں سے دوبارہ پھول کیسے بنتا۔

وہ کتنی ہی دیر تک بکھری ہوئی پتیوں سے پھول بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب ناکام ہوا تو جھنجھلا گیا۔ حسبِ معمول اس کی حرکات و سکنات کرخت ہوتی چلی گئیں۔ شانی کی کنپٹی کے زخم سے خون رِسنے لگا۔ وہ اندر ہی اندر کراہنے لگی۔ ایک ناپسندیدہ بوجھ نے اس کے جسم کو دبایا۔ رخساروں پر کانٹے چبھے اور وہ بے حس سی بستر پر پڑی رہی۔

☆======☆======☆

لاہور کے ایک اچھے ہسپتال میں شانی کے ابا جی کا آپریشن ہو چکا تھا۔ آپریشن کے بعد اگر ان کی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی تو اس میں ٹھہراؤ ضرور آ گیا تھا۔ چچا رئیس تو بمع اہل و عیال لندن جا چکے تھے، اب صرف چھوٹے چچا مرحوم کی بیوی چچی پروین تھیں جو ابا جی کی دیکھ بھال کرتی تھیں یا پھر تایا معصوم تھے۔

رنگ والی آنے کے بعد شانی کا بہت دل چاہا کہ وہ چند روز ابا جی کے پاس رہے اور ان کی دیکھ بھال کرے مگر فاخر اس کے لئے راضی نہیں تھا۔ وہ شانی کو اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتا تھا۔ ہاں اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ رنگ والی میں اپنا قیام بڑھا دیا۔ اب انہیں ایک کے بجائے دو راتیں رنگ والی میں رہنا تھا۔

شام کے وقت فاخر اپنے مقامی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا، شانی کچھ دیر آرام کرنے کے لئے سیڑھیوں کی ریلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سنگِ مرمر کی یہ سیڑھیاں بے حد صاف شفاف تھیں اور قریبی جھروکے سے بڑی خوشبودار ہوا آتی تھی۔ ان سیڑھیوں پر بیٹھنے کی عادت

شانی کو بچپن سے تھی۔ شاید اس وقت سے جب اس نے سکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

پرانے ملازم خادم حسین نے شانی کو یوں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تو آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے، اس کے پاؤں کی طرف فرش پر بیٹھ گیا۔ ''کیا حال ہے بابا؟'' شانی نے اپنائیت سے پوچھا۔

''تمہارے بعد ہمارا کیا حال ہونا ہے دھی رانی۔ ہر پاسے اداسی چھائی رہتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی رنگ والی کے سارے رنگ چرا کر لے گیا ہے۔ خالی کمرے کھانے کو دوڑتے ہیں۔''

''آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا بابا۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں پر وقت تو کبھی رکتا نہیں۔ جس طرح پانی اپنا رستہ خود بناتا ہے، زندگی بھی جینے کے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔''

''بالکل وڈی آپا جیسی باتیں کرتی ہے تُو۔'' خادم حسین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''اب دیکھو ناں۔ جب وڈی آپا دنیا سے گئی تھیں، سب کچھ اندھیر لگتا تھا۔ لگتا تھا اب کبھی روشنی ہوگی ہی نہیں، مگر تم نے دیکھا ہی ہوگا پھر زندگی نے جینے کے بہانے ڈھونڈ لئے۔ چاچا مشتاق، بھائی عادل، ابا جی اور ہم سب نے مل کر اس حویلی میں پھر سے رنگ اور روشنی بھری۔ اب چاچا مشتاق نہیں ہیں۔ بھائی عادل بھی نہیں اور میں بھی نہیں لیکن حویلی پھر بھی ہے۔ وقت پھر بھی چل رہا ہے۔''

خادم حسین نے ادھر اُدھر دیکھا پھر سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ''چھوٹا منہ بڑی بات ہے دھی رانی لیکن مجھے ایک بالکل کھاص بندے سے پتا چلا ہے کہ رستم سیال اور چوہدری فاخر جی کے بیچ لاٹھی کا مقابلہ ہوا تھا اور اس مقابلے میں رستم سیال نے فاخر جی کو ہرا دیا ہے۔''

''تم سے کس نے کہی یہ بات؟'' شانی نے ماتھے پر سلوٹ ڈال کر پوچھا۔

خادم حسین اس کی سلوٹ دیکھے بغیر بولا۔ ''میرے ایک یار کا یار ہے۔ جی گاماں گاڈی نام ہے اس کا۔ گڈ (بیل گاڑی) چلاتا ہے۔ اس نے یہ بات بتائی ہے جی۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنے آپ میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا جی کہ رستم سیال جو بھی ہے جیسا بھی ہے پر اس نے ہم سب کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ قدرت نے چھوٹے چوہدری صاحب (عادل سلطان) کی ہار کا بدلہ چوہدری فاخر سے رستم سیال کے ہاتھوں لیا ہے۔ اس نے چوہدری فاخر جی کا سارا گھمنڈ آن کی آن میں ختم کر دیا ہے.....''

بات کرتے کرتے خادم حسین نے شانی کا چہرہ دیکھا اور وہاں غصے کے آثار پائے تو جلدی سے بات بدل دی۔ ”میں نے گاماں گاڈی سے کہا۔۔۔ منہ سنبھال کر بات کرو۔ کچھ بھی ہے چوہدری فخر جی رنگ والی کے جوائی ہیں۔ ہم سب کے لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔ اگر وہ .....اگر وہ بارے بھی ہیں تو اس میں ہمارے لئے خوشی کی کوئی گل نہیں ہے۔“

شانی کی گہری سنجیدگی دیکھتے ہوئے خادم حسین نے اس بارے میں اور کچھ نہیں کہا۔ دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اٹھ گیا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اندر سے مسرور ہے۔

شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ خادم کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جو کچھ اس نے کہا تھا شانی کے لئے ناپسندیدہ تھا لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو اس میں سچ کی جھلک نظر آتی تھی۔ خادم حسین تو خالی بات کر رہا تھا مگر شانی اچھی طرح جانتی تھی، رستم سیال نے جو کچھ کیا، وہ عادل کا بدلہ لینے اور فاخر کو نیچا دکھانے کے لئے کیا۔ چند ماہ پہلے فاخر نے گرے ہوئے عادل پر لاٹھیاں برسائی تھیں اور اسے مچھلی کی طرح تڑپنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید ان لمحوں میں عادل کی وہ تڑپ رستم میں منتقل ہوگئی تھی اور اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔

شانی نے ان باتوں کو سوچنا شروع کیا تو ڈیڑھ دو گھنٹے تک سوچتی چلی گئی۔ یہاں آکر اس کی ذہنی کیفیت عجیب سی ہوگئی تھی۔ انہیں یہاں دو راتیں قیام کرنا تھا۔ اک لحاظ سے یہ مختصر قیام شانی کے لئے اچھا بھی تھا۔ پتا نہیں کیوں یہاں آکر ”یادیں“ بے طرح اسے ستانے لگتی تھیں۔ چاچا مشتاق کی آواز در و دیوار میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ عادل کے قہقہے، اس کی شرارتیں، بیتے ہوئے دنوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات، سب کچھ مل کر اسے گھیر لیتے تھے اور اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ دن رات اباجی کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن جب اس دوسرے پہلو سے سوچتی تھی تو پھر واپس لوٹنے کو دل چاہتا تھا۔ بے شک نارپور کی حویلی اس کے لئے ایک زنداں تھی لیکن اب رنگ والی کی حویلی بھی تو ایک زنداں بنتی جارہی تھی ۔۔۔ یادوں کا زنداں۔

اس دفعہ فصل غیر متوقع طور پر کچھ اچھی ہوئی تھی۔ فاخر کی کوشش سے بینک سے زرعی قرضہ بھی مل گیا تھا، حالات زیادہ نہیں تو کچھ بہتر ضرور ہو گئے تھے۔ اباجی کے سامنے شانی خود کو بہت مطمئن اور خوش ظاہر کرتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اندر سے کتنی خوش ہے۔ وہ دلہن نہیں زنداں کی دلہن تھی۔ اپنے جاں گسل دکھ کو ہنسی میں چھپانا ایک نہایت دشوار کام ہوتا ہے اور شانی کو سکینہ کے سامنے یہ کام اور بھی مشکل محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس کی رازداں سہیلی تھی۔ اس کی

ازدواجی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ اس سے مہکتی راتوں، نرم گرم سرگوشیوں اور دل گداز محبت کے قصے سننا چاہتی تھی ۔ اور اس کے سامنے شانی کو اپنی طبع کے خلاف بے تحاشا جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔

دو روز رنگ والی میں رکنے کے بعد شانی اپنے شوہر کے ساتھ نارپور واپس آگئی۔ ابھی تو اس نے پیاروں کو صحیح طور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دل جبر کے گھیرے میں تھا اور پلکوں کے پیچھے آنسو تھے۔ جو راستہ اس نے چنا تھا وہ قربانی کا راستہ تھا اور ایسے راستوں پر ایسے موڑ تو آتے ہی ہیں۔ اب ایک بار پھر وہی روز و شب تھے، وہی صبح و شام تھے اور وہی چار دیواری تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا شانی کی ازدواجی زندگی کی الجھنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ فاخر اپنے ہی بچھائے ہوئے دام میں الجھتا جارہا ہے۔ شانی اس کے حکم کی تابع تھی۔ اس کی بے دام کی غلام تھی، لیکن اس کی یہ غیر مشروط تابعداری بھی اب فاخر کو مطمئن نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے کچھ اور چاہتا تھا اور اس ”اور“ کی تلاش میں دن رات ہلکان ہوا جارہا تھا۔ کسی وقت وہ جنونی انداز میں شانی کو جھنجوڑ ڈالتا تھا لیکن پھر خود ہی شرمسار ہوتا تھا اور اس کی دل جوئی میں لگ جاتا تھا۔ ایک دو بار اس نے شانی سے باقاعدہ معذرت بھی کی۔

شانی قصداً کچھ نہیں کر رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا آپوں آپ ہوتا جارہا تھا۔ کسی وقت اس نے چاہا بھی کہ اس طرح قریب ہو کر فاخر سے دور نہ رہے لیکن وہ قریب نہیں ہو سکی۔ اس نے رات کے ریشمی اندھیروں میں اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا۔ ان میں سے فاخر کے لئے محبت اور گرم جوشی نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ وہی بے حسی اس پر طاری رہتی جو اسے کٹھ پتلی بنا دیتی تھی اور یہ کٹھ پتلی صرف فاخر کے ہاتھوں کی جنبش سے حرکت کرتی تھی۔

فاخر جوں جوں ناکام ہو رہا تھا توں توں اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی حکمت عملی اور اپنی چالوں سے شانی کو سرتاپا حاصل کر چکا تھا ۔۔۔ پھر بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ الگ نوعیت کی طلب روز بروز شدت اختیار کر رہی تھی۔ کسی وقت تو وہ نیم دیوانہ سا لگنے لگتا تھا۔

شانی نے اپنی تسلیم و رضا اور محبت سے اپنے اردگرد جو ماحول پیدا کر لیا تھا، وہ بھی فاخر کی جھنجلاہٹ اور محرومی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ حویلی میں اور حویلی سے باہر ہر دل عزیز تھی۔ ہر کوئی اس کے حسن اخلاق کا دل سے معترف تھا۔ بھابو اور بچے تو پہلے ہی اس کے دیوانے تھے، گھر کے ملازمین بھی بڑی محبت اور اپنائیت سے اسے چھوٹی مالکن کہہ کر پکارتے تھے اور چھوٹی مالکن بھی ان کا یوں خیال رکھتی تھی جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں کا رکھتا ہے۔ ان کے

ہر دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھی۔ خاموشی کے ساتھ ان کی ضروریات پوری کرتی تھی اور کسی پر کوئی تکلیف آتی تو اسے اپنی تکلیف بنالیتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ اسے ماں کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔

پچھلے دنوں حویلی کے پرانے ملازم صدیق کی پوتی جھولے سے گرگئی تھی۔ اس کے سر پر چوٹ آئی۔ جان خطرے میں پڑ گئی۔ لاہور کے پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن کے لئے فوری طور پر پچیس ہزار روپے درکار تھے۔ شانی نے فاخر سے ذکر کیا۔ اس نے سنی ان سنی کی تو شانی نے اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسے صدیق کو دیئے۔ بچی کی جان بچ گئی۔ صدیق کی بیوی بہت اچھی کشیدہ کار تھی۔ اس نے شکرانے کے طور پر شانی کو ایک قمیص کاڑھ کر دی۔ یہ قمیص اپنی مثال آپ تھی۔ عام سے سوتی دھاگوں کے ساتھ اس عورت نے کرتے کو قابل دید شے بنا دیا تھا۔ جس نے دیکھا بس دیکھتا رہ گیا لیکن فاخر کو یہ قمیص بالکل پسند نہیں آئی۔ شانی نے دو مرتبہ یہ قمیص پہنی اور دونوں بار فاخر کا موڈ ابتر نظر آیا۔ اس موقع پر بھابو نے شانی کو مخلصانہ مشورہ دیا اور اس سے کہا کہ وہ یہ قمیص کسی کو دے ڈالے، ورنہ کسی روز اس کی وجہ سے فاخر اس پر پھٹ پڑے گا۔ شانی خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ بھابو کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شانی نے ایک روز چپکے سے یہ قمیص ایک بھکارن کو دے دی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ یہ قمیص اپنے پاس سنبھال کر رکھے گی تو بھی فاخر کی ناراضگی کا جواز پیدا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قمیص کی ناپسندیدگی کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ فاخر ایک دم رقابت کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ اردگرد کے لوگ شانی کو خصوصی اہمیت دیں اور وہ ان میں مقبولیت اختیار کرے۔

کسی وقت وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ شاید شانی دوسروں کی نگاہوں میں نمایاں ہونے کے لئے ایسے کام کرتی ہے۔ وہ اسے دوسروں سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ محبت کرنا اس کے کردار کا لازمی جزو ہے۔ وہ تو ایسے لوگوں سے محبت کرنے پر بھی مجبور ہے جو اسے دن رات کانٹوں پر گھسیٹتے ہیں۔

☆======☆======☆

موسم بدل رہا تھا۔ گرمیوں اور برسات کے بعد اب سردیوں کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ شانی کا دادا سسر اب صحت مند تھا۔ اکثر گہری شاموں اور اندھیری صبحوں میں وہ اپنی خاص کیاری کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا۔ اس کا خصوصی ملازم اکبر بھی عموماً اس کے ہمراہ ہوتا

تھا۔ وہ لاہور سے واپس آچکا تھا عادل سلطان کے ہاتھوں لگنے والی گولی کے بعد اکبرے کی چال میں تھوڑی سی لنگڑاہٹ آگئی تھی، مگر اس کی طاقت اور چوکسی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ اپنی کبوتر کے خون جیسی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اکثر مہر کی وہیل چیئر کے آس پاس دکھائی دیتا تھا۔

فاخر کئی دنوں سے خاموش تھا۔ شانی سے زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک خوشگوار شام کو وہ دونوں باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور بھابو کے بچوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ منا ہانپتا ہوا آیا اور ذرا سستانے کے لئے شانی کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ شانی نے جلد ہی اسے نیچے اتار دیا۔ فاخر کی موجودگی میں وہ منے اور ندیم سے بھی زیادہ لاڈ پیار نہیں کرتی تھی۔ شانی کو لگتا تھا جیسے وہ ان سے بھی رقابت محسوس کرنے لگتا ہے۔

کچھ دیر بعد شانی کو محسوس ہوا کہ فاخر کا موڈ قدرے بحال ہونے لگا ہے۔ اس نے ایک دو انگڑائیاں لیں۔ منے اور ندیم سے چند باتیں کیں پھر جیب سے فرنچ وہسکی کی کوارٹر بوتل نکال کر ایک دو گھونٹ بڑے اسٹائل سے بھرے۔ شام کے سائے اندھیرے میں بدلنے لگے۔ کل چھٹی تھی۔ فاخر بڑے ایزی موڈ میں نظر آنے لگا تھا۔

اس نے شانی کو کمرے میں چلنے کے لئے کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھانپ گئی کہ اسے کیا فرض ادا کرنا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ کسی حیل وحجت سے کام نہیں لیتی تھی۔ وہ دونوں کمرے میں آئے۔ فاخر نے کیسٹ پر اپنی من پسند پنجابی موسیقی لگائی۔ شانی نے سلک کے نیلگوں پردے برابر کئے پھر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شب خوابی کا مہین لباس پہنے کمرے میں آگئی۔ یہ بستر پر جانے کا وقت تو نہیں تھا لیکن اس حویلی میں کس وقت کیا کرنا ہے، یہ وقت کے حساب سے نہیں فاخر کی مرضی کے حساب سے ہوتا تھا۔ وہ نیم دراز، وہسکی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہا تھا، ساتھ ہی سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ شانی ایک معمول کی طرح اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اسے شب خوابی کے لباس میں دیکھ کر وہ چونک گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ہے بھئی!" اس نے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔"

"میں نے تو اندر چلنے کو کہا تھا۔"

"مم ... میں سمجھی شاید " وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"یہ کیا ہے بھئی؟" وہ بے زاری سے بولا۔ "یہ کیا ہر وقت کاٹھ کی پتلی بنی رہتی ہو۔ کسا

میں صرف اسی کی غرض سے تمہیں اندر بلا سکتا ہوں۔ کیا میاں بیوی میں اور کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپس کی اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔"

"ہوتی ہے فاخر... لل... لیکن... پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں... اس لئے..."

"شانی شانی! خدا کے لئے اپنا یہ روپ بدلو مجھے اس سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے بلکہ کیا کہنا چاہئے وحشت ہونے لگی ہے۔ تم مجھے تکلیف دے رہی ہو۔ میرا سکون برباد کر رہی ہو۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو۔" فاخر کے لہجے میں برہمی تو تھی لیکن زیادہ سختی نہیں تھی۔

شانی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ وہ اسے غصے سے لیکن بے بسی سے دیکھتا رہا۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزر گئے پھر وہ ٹھہرے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "جاؤ، کپڑے بدل کر آؤ۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔"

"جی اچھا۔" شانی نے کہا اور اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پہلے والے کپڑوں میں ملبوس واپس آ گئی۔

آج فاخر کے چہرے پر ایک بے بس سی نرمی تھی۔ وہ اس سے مدھم لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ یہ دل جوئی کی باتیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اندر سے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"شانی! کیا خیال ہے۔ اگلے ہفتے دوبارو رنگ والی نہ چلیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"رمضان شروع ہونے والا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ رمضان سے پہلے تمہارے ابا جی کو چند دن کے لئے یہاں لے آتے ہیں۔ ہوا بدلی سے ان کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ تمہیں بھی ان کی خدمت کا موقع ملے گا۔"

"پتا نہیں کہ وہ آ سکیں گے یا نہیں۔ سفر ان کے لئے مشکل ہوگا۔"

"بھئی، ہم انہیں لگژری گاڑی میں آرام سے لے کر آئیں گے۔ تم تھوڑا سا زور دو گی تو وہ آنے کے لئے تیار بھی ہو جائیں گے۔"

"آپ کہتے ہیں تو کہہ کر دیکھ لیں گے۔" شانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اوہ یاد آیا۔" فاخر چونک کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "لاہور سے تمہاری پسند کی مٹھائی لایا تھا میں"

وہ الماری تک گیا اور خانے میں سے مٹھائی کا ڈبا نکال لایا۔ شانی نے کچن میں جا کر

تھوڑی سی مٹھائی پلیٹ میں نکالی اور فاخر کے پاس آ بیٹھی۔ رات کی رانی کی خوشبو کمرے کو معطر کر رہی تھی۔ "کھاؤ ناں بھئی۔" فاخر نے کہا۔

"آپ بھی تو کھائیں۔" وہ بولی۔

فاخر نے ایک ٹکڑا اٹھایا، ایک شانی نے بھی اٹھا لیا۔

وہ باتیں کرنے لگے۔ شانی کے ریشمی بال ڈھیلے ہو کر رخساروں تک لٹک آئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر بالوں کو سمیٹنے لگی۔ اسے بالوں کا جُوڑا بناتے دیکھ کر فاخر اپنی جگہ سے اٹھا۔ شیشے کی منقش تپائی پر تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ رات کی رانی کے چھوٹے پھولوں کے درمیان گیندے اور گلاب کے پھول تھے۔ فاخر نے گلاب کا ایک تازہ پھول نکالا اور شانی کے عقب میں جا کر اس کے جُوڑے میں اڑس دیا۔

یہی وقت تھا جب کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے سامنے حرکت سی نظر آئی۔ شانی نے چونک کر دیکھا، اس کا دادا سسر مہر اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا راہداری سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک لحظے کے لئے کھڑکی کے سامنے رکا۔ اس نے اپنی اکلوتی جلتی ہوئی آنکھ سے اندر کا منظر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ شانی ٹھٹک سی گئی۔ شاید فاخر بھی تھوڑا سا چونکا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ مہر ہر وقت شانی اور بھابو پر نظر رکھتا ہے۔ خاص طور سے شانی تو ہر وقت مہر یا اس کے خاص کارندے اکبرے کی نظر میں رہتی تھی۔ اب بھی مہر کو کمرے کی کھڑکی کے سامنے دیکھ کر شانی کا دل دھک سے رہ گیا اور ذہن میں انجانے وسوسے سر اٹھانے لگے۔

فاخر نے اس صورتِ حال کا بظاہر کوئی نوٹس نہیں لیا اور شانی سے ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف رہا۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہے، چائے پیتے رہے اور وی سی آر پر ایک خوبصورت فلم دیکھتے رہے۔

بہت کچھ تبدیل ہو رہا تھا لیکن شانی کے اندر کا موسم تبدیل نہیں ہو رہا تھا۔ ایک خزاں سی تھی جو رگ و پے میں ٹھہر گئی تھی۔ مہر کا خوف بھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ اس کی موجودگی شانی کو خوف زدہ کر دیتی تھی۔ وہ اپنے ذہن کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن جب بھی وہ مہر کی آنکھوں میں دیکھتی تھی اسے ان میں ایک خونخوار "بلی مار" کا چہرہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ کسی دن مہر کے اندر کا لاوا پھوٹ پڑے گا اور وہ غضب ناک ہو کر شانی پر پل پڑے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گا یا جان سے مار ڈالے گا۔ مہر کی غیر معمولی کینہ پروری ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ وہ دیہی علاقوں کا وہ روایتی منتقم المزاج تھا جو صدیوں سے میرے دیس کی سنہری فضاؤں میں زہر گھول رہا ہے۔ اس کی بدخصلتی کا عالم یہ تھا کہ اس نے

قادر بخش سے انتقام لینے کے لئے پون صدی تک انتظار کیا۔ قادر کی پہلی نسل میں کوئی لڑکی تولد نہیں ہوئی تو اس نے دوسری نسل کی راہ دیکھی اور جب دوسری نسل کی سب سے پہلی لڑکی نے پیدا ہو کر جوانی کے پہلے زینے پر پاؤں رکھا تو مہر کا انتقام پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

کسی وقت بیٹھے بیٹھے شانی کے دل میں ایک اور طرح کی چنگاری چمک اٹھتی تھی۔ ایک چہرہ اس کے تصور میں آتا تھا اور تمام تر کوشش کے باوجود وہ تصور سے چپکا رہتا تھا۔ یہ رستم عرف واحدی کا چہرہ تھا۔ اس چہرے کا تصور کیوں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا؟ وہ جھنجھلا کر سوچتی اور کسی اور مصروفیت میں دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگتی مگر دھیان پلٹ پلٹ کر اسی طرف چلا جاتا۔ شانی کو یوں لگتا جیسے اس شخص کے سینے میں بھڑکنے والی آگ کی کچھ چنگاریاں اس کے اپنے سینے میں آ گری ہیں اور اب اندر ہی اندر کچھ سلگا رہی ہیں۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو جاتی۔ استغفار پڑھنے لگتی یا نوافل ادا کرنے بیٹھ جاتی۔ نہ چاہنے کے باوجود رستم کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ''بی بی! جیسے پہاڑی ندی کا ریلا ہوتا ہے، ایسا ہی کوئی ریلا ہے جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا جا رہا ہے۔ نہ میں کہیں رک سکتا ہوں، نہ ٹھہر سکتا ہوں، نہ اپنا راستہ بدل سکتا ہوں۔ میں بالکل بے بس ہوں بی بی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں راتوں کو دیوانوں کی طرح جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ میرے دل کو کیسا روگ لگا ہے۔''

وہ خوفزدہ ہو کر سوچتی۔ اس صورت حال کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ معاملہ کوئی سنگین صورت تو اختیار نہیں کر جائے گا؟ پھر اسے رستم کے الفاظ یاد آتے۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا تھا ''میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے آخری سانس تک میری بس ایک ہی تمنا ہوگی۔ آپ خوش رہیں اور میں کبھی کبھی آپ کو دیکھتا رہوں۔''

وہ صدق دل سے یہ دعا کرنے لگتی کہ اس شخص کے دل میں جو نا قابل قبول جذبہ پیدا ہوا ہے، وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہو جائے یا اپنی شدت کھو دے لیکن پھر اس کا دھیان خود اپنی طرف چلا جاتا۔ وہ سوچنے لگتی کیا اس شخص کے حوالے سے اس کے اپنے دل میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب پریشان کن طور پر نفی میں ملتا۔ اس کے اپنے دل میں بھی کچھ نہ کچھ تھا... یا کچھ نہ کچھ پیدا ہو چکا تھا۔ اسے رستم سے ہمدردی تھی۔ ایک عام شخص کی حیثیت سے وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ کئی موقعوں پر اس کی موجودگی اس کی ڈھارس بھی بندھاتی تھی۔ وہ جب نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی لیکن اس کے سوا کچھ نہیں تھا... کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ہفتے کے روز فاخر اور شانی پھر رنگ والی گئے۔ اباجی نے گرم جوشی سے انہیں خوش آمدید

کہا۔ فاخر کے رویے میں بھی محبت کی حرارت تھی۔ وہ ان کے لئے لاہور سے ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حویلی میں ہی چوہدری ارشاد کا معائنہ کیا اور ان کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا۔ ان دونوں نے دو روز رنگ والی کی حویلی میں گزارے۔ فاخر شانی کو ساتھ لے کر چاچا مشتاق اور عادل کی قبروں پر بھی گیا اور فاتحہ خوانی کی۔

مقامی ایم این اے اتفاق سے فاخر کا دوست تھا۔ فاخر اس سے ملا اور اس پر زور دیا کہ وہ رنگ والی کی سڑک کی مرمت اور کشادگی کا کام جلدی شروع کرائے۔

آخری روز چوہدری ارشاد کے مجبور کرنے پر فاخر نے اپنا قیام ایک روز کے لئے مزید بڑھا دیا۔ چوہدری ارشاد چاہتے تھے کہ فاخر گاؤں کے نواح میں مچھلی کا شکار کھیلے۔ وہاں سائفن پر مچھلی کی غیر معمولی بہتات تھی۔ شانی کو یاد آیا کہ جب فاخر اس کی بارات لے کر نارپور سے رنگ والی آیا تھا تو اس نے باراتیوں کے ساتھ مل کر مچھلی کا شکار کیا تھا۔ اس شکار میں ان لوگوں نے بڑے اجڈ پن سے دھماکہ خیز مواد استعمال کیا تھا۔ بم چلا چلا کر مچھلیوں کے چیتھڑے اڑا دیئے گئے تھے۔ شانی نے سوچا شاید اس مرتبہ بھی وہ اپنے طریقہ کار کے مطابق ہی شکار کھیلے گا لیکن یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ اس نے جال کے ذریعے شکار کھیلنے کو ترجیح دی ہے اور ایک مقامی شکاری کی طرف سے آفر کیے جانے کے باوجود دھماکہ خیز مواد استعمال نہیں کیا۔

رات کو ایک پُرتکلف کھانے کے بعد چوہدری ارشاد اور فاخر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چچی پروین، تایا معصوم اور شانی بھی اس محفل میں موجود تھے۔ باتوں باتوں میں رستم سیال کا ذکر چھڑ گیا۔ چوہدری ارشاد نے پوچھا ''اس کا کہیں کھوج لگا یا نہیں؟''

''نہیں ابھی تو نہیں۔ میرے بندے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ پولیس نے بھی چار پانچ سیالوں کو پکڑا ہوا ہے۔ ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔''

''بیٹھا ہوگا کہیں چوہے کی طرح گھس کر!'' تایا معصوم نے کہا۔

چچی پروین نے کہا۔ ''ایسے لوگ وقتی طور پر چپ ہو جاتے ہیں لیکن جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو پھر بدمعاشیاں شروع کر دیتے ہیں۔''

''وہ بدمعاش تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو خطرناک ڈکیت اور قاتل ہے۔'' تایا معصوم بولے۔

''لل... لیکن سنا ہے کہ اب کچھ عرصے سے اس نے کوئی واردات وغیرہ نہیں کی ہے۔'' شانی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہاں... یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے۔'' چوہدری ارشاد نے ہنکارا بھرا۔ ''پچھلے ہفتے

ایس ایچ او میاں مظفر میرے پاس آیا ہوا تھا۔ بتا رہا تھا کہ آج کل علاقے میں کافی سکون ہے۔ ڈکیتوں کے دو بڑے گروہ ختم ہو چکے ہیں۔ رستم سیال کا گروہ بھی خاموش ہے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ رستم سیال بالکل بدل گیا ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو تتر بتر کر دیا ہے اور خود نماز روزے کی طرف توجہ دینے لگا ہے۔ رستم کے ایک جاننے والے نے تو یہاں تک بھی بتایا ہے کہ رستم کے پاس چوری ڈاکے سے جمع ہونے والا آٹھ دس لاکھ روپیہ تھا، جو اس نے دریا میں پھینک دیا۔ بعد میں کچھ زیورات وغیرہ اس نے ان کے حق داروں تک بھی پہنچائے ہیں۔''

''ایسی بات میں نے بھی سنی ہے مگر کیا پتا یہ بھی کوئی چال ہو۔ اس قسم کے لوگ پولیس کو دھوکا دینے کے لئے بھی تو کچھوے کی طرح اپنا سر چھپا لیتے ہیں۔'' تایا معصوم نے خیال ظاہر کیا۔

''بہر حال جو کچھ بھی ہے، ہمارے لئے تو وہ دشمن ہی ہے۔'' چوہدری ارشاد نے کہا۔ ''پچھلے ہفتے اس نے جو کچھ کیا ہے وہ سارا میں نے انسپکٹر مظفر کے گوش گزار کیا ہے۔''

شانی خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے لبوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ رستم کے حق میں کچھ کہہ سکتی اور شاید اسے کہنا بھی نہیں چاہئے تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب شانی اور فاخر خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ فاخر دوستانہ انداز میں شانی کو مچھلی کے شکار کا احوال سنانے لگا۔ اس کے لب و لہجے اور رویے میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رُونما ہو رہی تھیں۔ . . اور یہ عمل مسلسل جاری تھا۔ بستر پر لیٹ کر فاخر نے بڑی نرمی سے شانی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ شب خوابی کا مہین ریشمی لبادہ شانی کے ریشمی بدن پر پھسل رہا تھا۔ دو ریشموں کی رگڑ سے ایک خوبصورت اور جذبات انگیز سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی۔ یہ سرسراہٹ فاخر کے لہو میں آگ جگا رہی تھی۔ اس کا چہرہ شانی کی سیاہ زلفوں میں چھپتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن... دوسری طرف وہی خاموشی تھی۔ وہ حرارت اور چاہت برائے نام ہی دکھائی دیتی تھی جس کا فاخر خواہش مند تھا۔

وہ اس چاہت کی طلب میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا پھر بے دم سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے بے بسی سے شانی کا چہرہ دیکھا پھر آزردہ لہجے میں بولا۔ ''شانی! ایسا کب تک چلے گا۔ کب تک میرے پاس ہو کر بھی دور رہو گی۔''

وہ خاموش رہی۔ اس نے ایک بار پھر گرم جوشی سے اسے بانہوں میں لیا۔ اسے چومنے لگا، لپٹانے لگا۔ وہ نیم دلی سے اس کے قریب رہی۔ آخر وہ ہانپ گیا۔ لاچار سا نظر آنے لگا۔ شانی نے اپنا حسین چہرہ اس کے سینے میں چھپائے چھپائے سرگوشی کی۔ ''فاخر! مجھے تھوڑا سا

وقت دیں۔ آپ تبدیل ہو رہے ہیں تو میں بھی تبدیل ہو رہی ہوں مگر اس تبدیلی میں کچھ وقت تو لگے گا.....''

فاخر نے ایک گہری سانس لی اور مجبور لہجے میں بولا۔ ''کتنا وقت؟''

''بس تھوڑا سا۔ میں بُری طرح بکھر گئی تھی فاخر..... سمجھیں کہ کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ اب آپ کی محبت مجھے سمیٹ رہی ہے۔ امید ہے کہ بڑی جلدی سمٹ جاؤں گی۔''

وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔ ''اگر میرے پاس رہنے سے کوفت ہوتی ہے تو تم سے دور چلا جاتا ہوں۔ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لئے۔''

''نہیں فاخر!'' وہ اس کے توانا جسم کے گرد اپنی نازک بانہیں لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے پاس ہونے سے ہی تو میں بدل رہی ہوں۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ مجھے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔ اس مہلت کے بعد جب میں اس طرح...... آپ کے پاس لیٹوں تو میرے پاس وہ سب کچھ ہو جو ایک بیوی کے پاس ہونا چاہئے۔ آپ کو میرے اندر سچ نظر آئے۔ وہی سچ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے میں اپنی نظروں میں آپ گر جاتی ہوں۔'' وہ شرم سے بوجھل لہجے میں سب کچھ کہہ گئی۔

اگلے روز انہیں رنگ والی سے واپس نارپور روانہ ہونا تھا۔ فاخر، ابا جی کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور گپ شپ کر رہا تھا۔ شانی اس کمرے میں چلی آئی جہاں اس کی ای جی کی تصویر تھی۔ وہی تصویر تھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ آج چہرے پر چمک کچھ زیادہ ہے۔ وہی چمک جو رنگ والی کی وڈی آپا سے مخصوص تھی۔ دانائی اور محبت کی چمک۔ وہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ماں جیسے کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا تھا ناں میری دھی! لڑائی صرف زور اور غصے سے ہی نہیں جیتی جاتی، عاجزی اور محبت سے بھی جیتی جاتی ہے اور ایسی جیت زیادہ دیرپا اور شاندار ہوتی ہے۔ درخت کا 'بی' جب خود کو مٹی اور کیچڑ میں ملاتا ہے تو پھر درخت بنتا ہے۔ آگے کیا ہو گا، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ پر تُو نے نفرت اور دشمنی کو 'محبت اور صبر' کے سامنے نیچا کر دکھایا ہے۔

☆======☆======☆

شانی اور فاخر رنگ والی سے نارپور واپس آ گئے۔ اگلے چھ سات روز میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا لیکن شانی صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ مہر کی آنکھوں میں (بلکہ کہنا چاہئے اکلوتی آنکھ میں) قہر و غضب کی کیفیت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔

پھر ایک دن بھابو نے شانی کے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''شانی

مجھے لگتا ہے کہ مہر کو تجھ پر بڑا غصہ ہے۔ وہ آج کل فاخر کو تیرے خلاف بھڑکانے پر لگا ہوا ہے۔''

شانی نے لرز کر اپنا رخ پھیرا اور بھابو کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' اس نے پوچھا۔

بھابو بولی۔ ''کل شام میں مہر کو کھانا دینے اس کے کمرے میں گئی۔ فاخر وہاں پہلے ہی بیٹھا تھا۔ دادے پوتے میں بات ہو رہی تھی۔ دادا بڑے غصے میں تھا۔ گڑ گڑ غوں غوں غاں غاں بولتا چلا جا رہا تھا۔ تمہاری بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، وہ دشمن کی بیٹی ہے اس سے وہی سلوک ہونا چاہئے جو دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ اس گھر کی رانی نہیں نوکرانی ہے۔ چند دن کے لئے اسے نوکرانیوں کی طرح رکھو پھر میں تمہارے لئے سچ مچ کی رانی ڈھونڈ کر لاؤں گا۔''

''فاخر نے کیا کہا؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس نے کیا کہنا تھا۔ مہر کے سامنے تو وہ بھی اونچی آواز میں نہیں بولتا۔ بس اتنا کہا کہ وہ بڑی احتیاط سے چل رہا ہے، آئندہ اور بھی احتیاط کرے گا۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے اندر چلی گئی۔ ورنہ پتا نہیں کیا کیا باتیں معلوم ہوتیں۔''

شانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی۔ بھابو نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تجھے یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ تجھے خبر رہے۔ ماشاء اللہ تو بڑی سیانی ہے۔ اپنے گھر کی ہر اونچ نیچ سمجھتی ہے۔ اگر مہر کے منہ سے آگ نکلنا شروع ہو گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ تجھے کامیاب ہوتے دیکھ رہا ہے۔ تم دونوں کے سلوک نے اس کے اندر بھانبڑ لگا دیئے ہیں ......''

شانی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتی رہی۔ بھابو نے اس کے کھلے بالوں کو بڑے پیار سے کانوں کے پیچھے اڑسا اور بولی۔ ''بس اب ہمت نہ ہارنا۔ بیوی سے زیادہ خاوند کے قریب اور کوئی نہیں ہوتا۔ فاخر کو اتنا پیار دو کہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہ ملے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس کے ساتھ ہی دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے سوچا۔ وہ کہاں سے لائے پیار؟ اس پیار کی لاش پر تو فتح مند لشکر نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اب وہ کہاں کہاں سے ٹکڑے اکٹھے کرے۔ وہ ان ٹکڑوں کو ڈھونڈنے اور جوڑنے کی دن رات کوشش کر رہی تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ کامیاب ہو جائے گی۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کامیابی بہت دور ہے۔

ابھی شانو اور بھابو باتیں ہی کر رہی تھیں کہ مہر کی پُرغضب غوں غاں سنائی دی۔ وہی آواز جو شانی پر لرزہ طاری کر دیتی تھی۔ شروع میں یہ آواز شانی کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی لیکن اب اس شور میں سے کوئی کوئی لفظ اس کے پلے پڑنے لگا تھا۔

آواز سنتے ہی بھابو کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد مہر اپنی وہیل چیئر چلاتا ہوا کمرے کے دروازے کے عین سامنے آن رکا۔ اس کی اکلوتی آنکھ شعلے برسا رہی تھی۔ غوں غاں گڑ خرخر غوں غا وہ طیش کے عالم میں منہ سے جھاگ اُڑانے لگا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنی پھلواری کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے اور بھابو پر یا اس پر لعن طعن کر رہا ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس لعن طعن کا نشانہ وہ خود ہے۔ بھابو نے زرد چہرے کے ساتھ شانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم شام کو پھر پھلواری کی طرف گئی تھیں؟''

''نہیں بھابو۔'' شانی نے پورے یقین سے کہا اور نفی میں سر ہلایا۔

مہر ایک بار پھر غضب کے عالم میں اپنی جناتی زبان بولنے لگا۔ وہ اپنی وہیل چیئر آگے بڑھاتا چلا آ رہا تھا اور شانی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ اسے کچھ مار ہی نہ بیٹھے۔ شاید بھابو نے بھی اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر مہر اور شانی کے درمیان آ گئی۔

''مہر جی تو کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے خود تمہیں پھلواری کے پاس دیکھا ہے۔''

شانی روہانسی ہو گئی۔ ''نہیں دادا! مم ..... میں احاطے میں گئی تھی لیکن پھلواری کے تو پاس سے بھی نہیں گزری۔ شش ..... شاید اندھیرے میں آپ کو دھوکا ہوا ہو۔''

مہر نے پھر پُرطیش لہجے میں غوں غاں کی۔ ایک ننگی گالی کے الفاظ واضح طور پر سنائی دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ مہر کا طیش بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی کرسی بڑھتے بڑھتے بھابو کے گھٹنے سے آ لگی تھی۔ شاید وہ درمیان میں نہ ہوتی تو وہ اسے کوئی چیز اٹھا کر دے مارتا۔ بھابو نے اپنی انگلی کے ٹہوکے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ بپھرے ہوئے مہر کے سامنے خاموش ہی رہے۔

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر نظر جھکا لی پھر بھی اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ مہر کی اکلوتی آنکھ سے سانپ کا زہر خارج ہو ہو کر اس کے چہرے میں جذب ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مہر کی انگارے برساتی آواز بھی شانی کی سماعت کو مجروح کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے قہر کا یہ چڑھا ہوا دریا اُترا...... اور مہر اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔

بعد میں شانی سسکنے لگی۔ بھابو نے اسے گلے لگا کر دلاسا دیا۔ مُنا اور ندیم بھی ماں کی نقل کرتے ہوئے معصومیت سے شانی کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے اور پچ پچ کرنے لگے۔

شانی نے بھابو کو بتایا کہ وہ ہرگز پھلواری کی طرف نہیں گئی۔ کیا اسے اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہاں سانپ گھومتا ہے۔

بھابو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں تُو سولہ آنے ٹھیک کہتی ہے۔ اس بڈھے کا دماغ خراب ہے لیکن اس کی زبان کو کون پکڑ سکتا ہے۔ بس جو دماغ میں آیا بک دیا۔ تُو پریشان مت ہو۔ میں فاخر کو بھی سمجھا دوں گی کہ اس کے دادے کو اندھیرے میں دھوکا ہوا ہے۔''

''پر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں بھابو! پچھلے ہفتے بھی فاخر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم پھلواری کی طرف کیوں گئی تھیں، دادا جی ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا، میں نہیں گئی تھی۔ فاخر اپنی بات کرتے رہے۔ کہنے لگے دادا نے تمہیں کہیں آس پاس دیکھا ہوگا تو کہہ رہے ہیں ناں۔''

''بس وہ تم دونوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ تُو اپنا حوصلہ جوان رکھ۔ اللہ نے چاہا تو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں چاچی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مُنے نے بھی اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

شانی رات تک کانپتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ مہر جی سے ملنے کے بعد فاخر اس سے بہت ناراض ہوگا اور شاید وہ ہوتا بھی لیکن یہاں بھی بھابو اپنی تمام تر فراست کے ساتھ بیچ میں آ گئی۔ اس نے فاخر کو بہت کچھ سمجھا بجھا دیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی، وہ شانی نے پوری کر دی پھر بھی ایک دو دن تک فاخر خفا خفا نظر آتا رہا۔ حالات بہت بدل چکے تھے۔ اگر مہر نے اس قسم کی چنگاری چند ماہ پہلے پھینکی ہوتی تو شاید بھڑک کر شعلہ جوالا بن چکی ہوتی۔ اب یوں لگتا تھا کہ فاخر کو بات سہنا اور برداشت کرنا آ گیا ہے۔ وہ شانی کی بات بھی تحمل سے سنتا تھا اور ٹھنڈے لہجے میں اس پر رائے بھی دیتا تھا۔

اس کے علاوہ شانی نے ایک اور تبدیلی بھی محسوس کی۔ لٹھ بازی میں فاخر کا شوق پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ اکھاڑے میں جاتا ضرور تھا لیکن جلدی واپس آ جاتا تھا۔ ذاتی طور پر بھی وہ لاٹھی چلانے میں کم حصہ لیتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ اس کی کلائی کی چوٹ تھی۔ باقی چوٹیں تو ٹھیک ہو چکی تھیں لیکن دو ڈھائی ماہ گزرنے کے باوجود کلائی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس پر لچک دار پٹی باندھ کر رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو شانی کو یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ فاخر کے رویے میں جو لچک پیدا ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لٹھ بازی کی طرف سے اس کا دھیان کم ہو گیا ہے۔ اس کے اندر جو ایک بے جا زعم اور فخر پایا جاتا تھا اس میں رستم

سے لڑائی کے بعد کمی واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی مجموعی طور پر اس کے کردار کے لئے نیک شگون رہی تھی۔

چند ہفتے پہلے کی اس سنسنی خیز رات کے بعد رستم سیال کا پھر کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ دھیرے دھیرے شانی کا یہ اندیشہ ختم ہو گیا کہ کسی دن وہ اچانک پھر حویلی میں نظر آنے گا۔ اس کے بارے میں کوئی خبر کوئی اطلاع بھی شانی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ حالانکہ کسی وقت غیر شعوری طور پر اُس کے دل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ رستم کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ جب فاخر اپنے کارندوں سے بات چیت کر رہا تھا، شانی نے اس کی بات پر کان دھرنے کی کوشش کی۔ جیسے وہ جاننا چاہ رہی ہو کہ یہ بات چیت رستم کے بارے میں تو نہیں۔ پتا نہیں کیوں کیوں رستم کا دھیان آپوں آپ شانی کے ذہن میں گھس آتا تھا۔ وہ اس کے خیال سے ذہن کو ہٹانے کی بہت کوشش کرتی لیکن زیادہ تر ناکام رہتی تھی۔ یہ معاملہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایسے میں وہ اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ خود سے سوال کرتی۔ رستم جیسے بدنام زمانہ شخص کے بارے میں کیوں سوچتی ہو تم۔ کیا وہ تمہیں ایک خیر خواہ کی حیثیت سے اچھا لگتا ہے؟ ایک بھائی کی حیثیت سے اچھا لگتا ہے؟ یا پھر اس حیثیت میں اچھا لگتا ہے جس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب نفی میں ہوتے تھے۔ تو پھر وہ کیا تعلق تھا جو دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں موجود تھا۔

وہ سوچتی تھی یہ کیسا جذبہ ہے؟ اسے کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ یا پھر اسے بے نام ہی رہنا چاہئے۔

☆======☆======☆

گلابی جاڑا ابھی دور تھا۔ تاہم سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ شانی نے اپنے جہیز کا سب سے خوبصورت ڈبل لحاف نکالا تھا۔ میاں بیوی بیڈ روم میں تھے۔ وی سی آر پر ایک خوبصورت اردو فلم چل رہی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے فاخر کا ہاتھ بے خیالی میں لحاف کے سُرخ ٹسل کو سہلا رہا تھا۔ فلم کا ایک رومانی سین شاید فاخر کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔ وہ کم از کم اسے تین بار ریوائنڈ کر کے دیکھ چکا تھا۔ اب چوتھی بار ری وائنڈ کر رہا تھا۔ یہ سین نو بیاہتا بیوی اور اس کے شوہر سے متعلق تھا۔ موسم سخت ابر آلود تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ شوہر دفتر جانا چاہتا تھا مگر بیوی اسے اپنی اداؤں سے لبھا رہی تھی۔ اسے روکنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بار بار بستر پر گرا دیتی تھی اور باہوں میں جکڑ لیتی تھی۔ سین کے آخر میں شوہر صاحب کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ ٹائی اتار کر اپنا بریف کیس ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔ بیوی کی آنکھوں میں مسرت کے

آنسو چمکنے لگتے ہیں اور وہ شوہر سے لپٹ جاتی ہے۔

شانی جانتی تھی فاخر یہ منظر بار بار کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس میں بیوی کی گرم جوشی اور وارفتگی نمایاں تھی۔ وہی خالص کیفیت جو فاخر کو مطلوب تھی۔ جس کے لئے وہ سرگرداں تھا۔ وہ شانی کو پورے کا پورا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے دن سے پوری کی پوری اس کے پاس تھی۔ اس نے خود ہی اسے ادھورا کیا تھا۔ اب اس ادھورے پن کی وجہ سے نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔

سین ختم ہوا تو فاخر نے فلم ادھوری چھوڑ کر ٹی وی بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد لائٹ بھی آف ہو گئی۔ دونوں لحاف میں بے حرکت پڑے رہے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات دھیرے دھیرے اپنے وسط کی طرف کھسک رہی تھی۔ فاخر کی انگلیاں بڑی نرمی سے شانی کی ریشمی زلفوں سے کھیلتی رہیں پھر وہ اسے قریب کرتا چلا گیا۔ وہی بکھری ہوئی پتیوں کو پھول کی صورت جوڑنے کا عمل۔ وہی سعیٔ لاحاصل۔ وہی رائیگاں کوشش۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو اپنے التفات کی بارش میں بھگو کر اپنی ساری کوتاہیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ سارے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہے مگر جب زخم خون اگل رہے ہوں تو جلد بازی نہیں کی جاتی۔ پہلے خون کا اخراج روکا جاتا ہے پھر مرہم جمایا جاتا ہے۔

شانی کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ چلنا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی اس کے پاؤں پورا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا جاتی تھی۔ لڑکھڑاتے ہوئے کو زنے کر سہارا دینا پڑتا ہے لیکن اگر اسے اپنے ساتھ کھینچا جائے تو وہ مزید لڑکھڑا جاتا ہے۔ شانی کے ساتھ بھی آج کل ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فاخر سعیٔ لاحاصل میں مصروف رہا۔ شانی محبت بھری گرم جوشی سے خالی رہی۔ تب فاخر کی بے بسی اچانک جھنجھلاہٹ میں بدل گئی۔ تاریکی میں جیسے شعلہ سا لپکا۔ شانی کی سرد بانہیں اپنے عریاں کندھوں سے ہٹا کر وہ یک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کی نہایت کرخت اور بلند آواز خواب گاہ میں دھماکے کی طرح گونجی۔ ''کیا چاہتی ہو تم ؟ آخر کیا چاہتی ہو ؟''

کوئی بہت بڑا شیشہ جیسے سماعت شکن دھماکے سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ شانی بھی بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ فاخر نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ اس کا چہرہ اندرونی غضب سے تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں انگارہ تھیں۔ ''فف.. فاخر کیا ہوا ہے؟'' وہ کمزور آواز میں بولی۔

''مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہوا ہے، مجھ سے پوچھتی ہو؟'' اس کی آواز بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ طیش بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر لحاف دور پھینکتا ہوا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت مختصر لباس میں تھا۔ شانی نے ایک سفید چادر تیزی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔

فاخر کی آنکھوں میں اب جنون نظر آنے لگا تھا۔ ہونٹ غضب ناک انداز میں کھنچ گئے تھے۔ وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں یہ... قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... میں تجھے جان سے مار دوں گا ''

وہ جنونی انداز میں ڈگمگاتا ہوا الماری کی طرف گیا۔ نیچے والی دراز کھول کر اس نے ایک بڑا خنجر نکال لیا۔ خنجر کا کور اتار کر اس نے دور پھینکا تو خم دار پھل ٹیبل لیمپ کی روشنی میں خوفناک نظر آنے لگا۔ شانی کی سہمی ہوئی چیخ اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے بے ساختہ پلنگ کے ایک کونے میں سمٹنے کی کوشش کی۔

فاخر کسی درندے کی طرح اس کی طرف جھپٹا اور اسے پلنگ کے گوشے میں دبوچ لیا۔ وہ عقاب کے پنجوں میں پھڑپھڑاتی ہوئی چڑیا کی طرح تھی بلکہ شاید وہ پھڑپھڑا بھی نہیں رہی تھی بلکہ سکتہ زدہ سی رہ گئی تھی۔ فاخر کا بایاں گھٹنا فوم پر تھا اور دایاں شانی کے پیٹ میں دھنس رہا تھا۔ شانی کے بال فاخر کی بائیں مٹھی میں بے دردی سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خوفناک پھل کا خنجر تھا۔

☆======☆======☆

''میں تجھے جان سے ماردوں گا۔ تیرے ٹکڑے کردوں گا'' وہ ایک بار پھر جنونی انداز میں پھنکارا۔

اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ شانی نے اپنی چیخ ہونٹوں کے اندر روکی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا جسم اپنے مجازی خدا کے مہلک ترین وار کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتی تھی۔ ابھی سینے میں دل کے مقام پر درد کی ناقابلِ برداشت لہر اٹھے گی۔ خون اچھلے گا اور عدم آباد کی طرف اس کا مختصر سفر شروع ہوجائے گا۔ موت کا انتظار چند ساعتوں کا بھی ہو تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ شانی بھی اس ناقابلِ بیان مشکل سے گزر رہی تھی۔

ایک سیکنڈ گزرا۔ دو سیکنڈ گزرے اور پھر کئی سیکنڈ گزر گئے۔ جان لیوا وار نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بے حرکت پڑی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے بالوں پر فاخر کے ہاتھ کی ناقابلِ برداشت گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

فاخر کا خنجر والا ہاتھ اسی طرح اٹھا ہوا تھا لیکن اب اس کے تنے ہوئے چہرے پر جنون اور وحشت کی وہ کیفیت نہیں تھی۔ آنکھوں کے جہنم کا موسم بھی ذرا سا بدلا ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں شانی کو شکست و ناکامی کی کرچیاں نظر آئیں۔ تب اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ پر گھٹنے کا اذیت ناک دباؤ بھی ختم ہوگیا ہے۔ فاخر اس کے اوپر سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کا خنجر والا ہاتھ ابھی تک اٹھا ہوا تھا۔ جیسے کسی مسمار ہوجانے والے قلعے پر قلعے والوں کا جھنڈا لگا رہ جائے۔ تب آہستہ آہستہ یہ ہاتھ بھی نیچے گر گیا۔ فاخر کسی زخمی چوپائے کی طرح اس کے پہلو میں موجود تھا۔ اس کا سر تکیے کو چھو رہا تھا۔

پھر شانی کے کانوں نے پہلی بار اس کی سسکی سنی۔ وہ رو رہا تھا..... نار پور کا چوہدری جس کی پگڑی کا شملہ اور مونچھ کا بال کبھی نیچا نہیں ہوا تھا، چوپائے کی طرح گردن ڈالے پڑا تھا اور

رو رہا تھا۔ بتدریج اس کا رونا کرب ناک ہوتا چلا گیا۔ ہچکیوں سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ اس طرح اوندھا لیٹ گیا کہ اس کا سر شانی کے کندھے سے چھونے لگا۔ شانی اسی طرح بے حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔

فاخر کی کرب ناک آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''میں ہار گیا ہوں شانی! میں ہار گیا ہوں۔ مجھے معاف کردو۔ میری غلطیاں بخش دو۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ بہت رُلایا ہے۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کردو.....'' اس کی ناک شانی کے کندھے میں دھنسی جارہی تھی۔ وہ بولتا جارہا تھا۔ ''مجھے تمہاری محبت چاہئے۔ تمہارا پیار چاہئے۔ وہی پیار جو تم اپنے اردگرد کے سارے لوگوں سے کرتی ہو۔ اسی پیار میں سے میرا حصہ مجھے بھی دے دو۔ اگر مجھے یہ پیار نہ ملا تو میں مرجاؤں گا..... اپنی جان دے دوں گا...''

شانی کا جسم سہم کر گٹھڑی سا بن گیا تھا۔ اس نے گٹھڑی کو کھولا اور فاخر کے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ اس آنسو بہاتے شخص سے کیا کہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے فاخر کے گھنے سخت بالوں میں چلنے لگیں۔ وہ اسی طرح لیٹا رہا اور اس کی آنکھوں سے پانی رستا رہا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے تب شانی نے کروٹ بدلتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولا۔ ''شانی! میں نے چاچا جان (چوہدری ارشاد) سے بھی بہت ناانصافیاں کی ہیں۔ میں کل ان سے بھی معافی مانگنے جاؤں گا۔ ان کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کروں گا۔''

شانی نے نحیف آواز میں کہا۔ ''آپ ان سے ہنس کر بات ہی کرلیں گے تو ان کے سارے شکوے دور ہوجائیں گے۔''

''وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ عزت کی جگہ پر ہیں۔ مجھے ان سے معافی مانگنی چاہئے۔'' فاخر بولا۔ ''شاید اس طرح عادل کی روح بھی مجھے معاف کردے۔''

شانی خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والا گرم پانی شانی کے سینے پر رینگتا رہا..... پھر وہ سو گیا۔ شانی بھی سوگئی۔

☆======☆======☆

اگلے روز فاخر سارے کام چھوڑ کر رنگ والی گیا اور رات گئے واپس آیا۔ اس کے دل میں جو بات پیدا ہوئی تھی، وہ اس نے پوری کی تھی۔ وہ شانی کے ابا جی سے باقاعدہ معافی مانگ کر آیا تھا۔

دو دن بعد جب وہ شام کو گھر آیا تو کافی خوش تھا۔ اس سے پہلے جب وہ گھر آتا تھا تو حویلی کی ہر ذی حس شے جیسے سہم کر سکڑ جاتی تھی لیکن آج کل صورتِ حال کافی مختلف تھی۔ وہ گھر کے افراد اور ملازمین کے ساتھ بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ بچے بھی جو پہلے خوف زدہ رہتے تھے اب فاخر کے اردگرد نظر آنے لگے تھے۔

''تمہارے لئے ایک تحفہ ہے۔'' وہ شانی سے بولا۔

''کیسا تحفہ؟'' شانی نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

''آؤ میرے ساتھ... !'' وہ بولا اور شانی کو نشست گاہ میں لے گیا۔

شانی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہاں ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہے۔ نشست گاہ کی طرف اس کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب یہاں ٹیلی فون ''انسٹال'' کر دیا گیا ہے۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔'' شانی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اس سے اچھی ایک بات اور بھی ہے۔'' وہ بولا۔

وہ سوالیہ نظروں سے فاخر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ فاخر نے سیٹ کے قریب بیٹھ کر ایک نمبر ڈائل کیا اور تھوڑی دیر بعد ریسیور شانی کے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف سے ابا جی کی آواز سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''ہیلو...... ہیلو...... کون؟''

''یہ میں ہوں شانی!'' وہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔ ''آپ کے ہاں کب لگا فون؟''

''جب تمہارے ہاں لگا۔ یہ تمہارے شوہر صاحب کا ہی کارنامہ ہے۔'' ابا جی نے خوش دلی سے کہا پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''کافی کوشش کی ہے اس نے۔ ورنہ اتنی جلدی یہ سہولت نہیں ملتی تھی۔ خاص طور سے ہماری حویلی میں تو تار کا پہنچنا ہی مشکل تھا۔''

شانی نے شکر گزار نظروں سے فاخر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ باپ بیٹی بات کرنے لگے۔ رُکے ہوئے خیالات پانی کے رواں شفاف دھارے کی طرح بہنے لگے۔ ابا جی فاخر سے خوش نظر آتے تھے۔ مسلسل اس کی تعریفیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ دعا کر رہے تھے کہ اس کے اندر آنے والی یہ تبدیلی مستقل ثابت ہو۔ ان کی جہاں دیدہ نظریں فاخر کے حوالے سے مستقبل کی بڑی اچھی تصویر دیکھ رہی تھیں۔

ابا جی خوش تھے تو شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ اردگرد کی ہر شے مسکرانے لگی ہے۔ غم کے سارے بادل چھٹ گئے ہیں۔

اور اس واقعے کے صرف تین روز بعد شانی کے پیارے ابا جی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ زندگی اسی حیران کن اور ناقابلِ اعتبار چیز کا نام ہے۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں وہ روزے سے تھے۔ طبیعت بہت بہتر تھی۔ عصر کی نماز پڑھنے تایا معصوم کے ساتھ مسجد گئے۔ وہیں سینے میں تھوڑی سی تکلیف ہوئی۔ چار پانچ منٹ کے اندر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ یا اللہ مجھے چلتے پھرتے اٹھانا۔ دعا قبول ہوئی تھی۔ ہنستے مسکراتے چل دیئے اور آخری سانس بھی روزے کی حالت میں خدا کے گھر میں لی۔

ابا جی کی جدائی ایک ایسا صدمہ تھا جس نے شانی کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ چند دن کے لئے تو اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ دنیا میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں۔ زندہ رہنے کا ہر جواز ختم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے بابل کے آنگن میں تھی لیکن بابل نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی آنسوؤں کے دریا میں غرق تھی۔ ایسے میں تایا معصوم، بھابو اور فاخر نے اسے بے حد سہارا دیا۔ دوبارہ سانس لینے اور سوچنے سمجھنے کے قابل بنایا۔ غم کے جان لیوا دھوئیں میں یہ احساس شانی کے لئے ہوا کا جھونکا تھا کہ اس کے ابا جی اس دنیا سے خوش خوش گئے تھے۔ جب انہوں نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا تو ان کے اطراف سے دکھ و آلام کے بادل چھٹ چکے تھے۔ وہ مالی طور پر آسودگی محسوس کر رہے تھے۔ قرض خواہوں کے منحوس سائے سمٹ چکے تھے... اور ان کی زندگی کے ایک اہم دکھ نے بھی اپنی شدت کھو دی تھی۔ اس اہم دکھ سے مراد شانی کا دکھ تھا۔ شانی کی گھریلو زندگی نے کروٹ بدل لی تھی۔ فاخر میں رُونما ہونے والی مثبت تبدیلیاں بہت نمایاں تھیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اپنے آخری دنوں میں شانی کے ابا جی اس کی طرف سے سکھی تھے۔

چوہدری ارشاد کی آخری رسوم میں علاقے کے لوگ اُمڈ پڑے تھے۔ یہ ایک طرح سے اس بامروت اور بُردبار چوہدری کی بے داغ زندگی کو خراجِ عقیدت تھا لیکن دو افراد ایسے تھے جو چوہدری ارشاد سے بہت قریبی ناتا ہونے کے باوجود اسے سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو مہر جی تھا۔ وہ بیماری کا بہانہ بنا کر نارپور میں ہی اینٹھتا رہا۔ دوسرا چاچا رئیس تھا۔ جیسا کہ شانی کو بعد میں معلوم ہوا وہ چوہدری ارشاد کے انتقال سے پانچ روز قبل تک، اپنے کسی کام سے پاکستان میں موجود تھا۔ ممکن تھا کہ انتقال کے وقت بھی موجود ہو مگر جنازے میں نہیں آیا تھا۔ بعد میں چاچا رئیس نے انگلینڈ سے تعزیت کا ایک خط لکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ شانی سوچ سوچ کر حیران ہوتی تھی۔ کتنا فرق تھا دونوں بھائیوں

میں۔ ایک چاچا مشتاق تھا ایک چاچا رئیس۔

وقت اپنی رفتار کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ شدید ترین غم بھی روز و شب کی گردش کے ساتھ اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ شانی قریباً دو ماہ تک تایا معصوم اور چاچی پروین وغیرہ کے ساتھ ابا جی کے گھر میں ہی رہی۔ رنگ والی کے محبت بھرے ماحول اور سکینہ صغراں جیسی سہیلیوں کی موجودگی نے اسے تیزی کے ساتھ سنبھلنے میں مدد دی پھر وہ نارپور واپس آ گئی۔

☆======☆======☆

نارپور واپس آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے سامنے اس کی ازدواجی زندگی تھی اور ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز تھے۔ الجھن اور سلجھن کا یہ سفر ایک بار پھر وہیں سے شروع ہوا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ خواب گاہ میں پیش آنے والے آخری واقعے کے بعد شانی کے اندر بھی دور رس تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ خود کو دھیرے دھیرے بدلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ اگر اس کے مجازی خدا نے میانہ روی اختیار رکھی اور جلد بازی نہ کی تو وہ بہت جلد خود کو مکمل طور پر سنبھال لے گی پھر اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ نہ رہے گی اور جب فاخر اس کے قریب آئے گا تو وہ جسم و جاں کی ساری چاہتوں کے ساتھ اسے گلے لگا سکے گی۔

نارپور واپس آنے کے بعد ساتویں آٹھویں روز کا ذکر ہے۔ بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اور ملازمائیں تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ بھابو کے بہت مجبور کرنے پر شانی نے بھی جہیز کا ایک نسبتاً سادہ جوڑا نکال کر درزن کو دے دیا تھا۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے حسب رواج چوڑیاں بیچنے والیاں گاؤں میں آئیں۔ چند عورتیں حویلی بھی پہنچ گئیں۔ ملازمائیں رنگ برنگی چوڑیاں خریدنے لگیں۔ کچھ نے جھمکے اور انگوٹھیاں وغیرہ خریدیں۔ شانی اپنے کمرے میں موجود تھی اور کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی فربہ اندام عورت بھابو کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح شانی کے پاس کمرے میں چلی آئی۔ اس نے چوڑیوں کا ٹوکرا سر سے اتارا اور پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اکثر قبائلی عورتوں کی طرح رخسار چوڑے اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ اس کی ستواں ناک میں چاندی کا کوکا دمک رہا تھا۔ عمر پینتیس کے قریب تھی اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ تین چار سال پہلے تک وہ خوبصورت رہی ہو گی۔

شانی نے غور سے دیکھا تو اسے عورت کے ماتھے پر نماز کا ہلکا سا محراب نظر آیا۔ اس کی شربتی آنکھوں میں بھی نیکی اور روحانیت کی جھلک نظر آتی تھی پھر شانی کو ایک اور بات بھی

محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ عورت کی صورت کچھ دیکھی بھالی سی لگتی ہے۔ کوئی ایسی بات تھی اس عورت میں کہ شانی کو اس سے باتیں کرنے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ دوسری عورتیں چوڑیاں وغیرہ بیچ کر دوسرے گھروں کی طرف چلی گئیں لیکن وہ عورت وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھی رہی اور من موہنے انداز میں شانی سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے اپنا نام نگینہ بتایا تھا۔ دریا کے پار نیل پور گاؤں کے قریب ان کی زمین تھی۔ اس کے خاوند نے گھوڑیاں اور بھیڑ بکریاں وغیرہ پال رکھی تھیں۔ یہ لوگ سیال تھے۔ شانی کو عورت کی کلائیوں میں چاندی کے چپٹے کڑے بھی نظر آئے۔

شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''اگر تمہارا اپنا کھیت ہے۔ ڈھور ڈنگر بھی ہیں تو پھر تمہیں چوڑیاں بیچنے کی کیا ضرورت ہے نگینہ؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے شانی کو دیکھا۔ کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیا اور ہولے سے بولی۔ ''چوہدرانی جی۔ اگر میں کہوں کہ میں چوڑیاں بیچنے والی نہیں ہوں تو پھر؟''

''کیا مطلب!''

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ والہانہ انداز میں بولی۔ ''اگر میں کہوں کہ میں نے صرف آپ کو دیکھنے کے لئے چوڑیوں والی کا بھیس بدلا ہے تو پھر؟''

شانی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں یہ کوئی نوسر باز ہی نہ ہو لیکن پھر اس کی شربتی آنکھوں میں جھانک کر اسے اندازہ ہوا کہ یہ عورت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

''تمہاری بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔'' شانی نے الجھن سے کہا۔

وہ والہانہ انداز میں شانی کو دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہی بولی۔ ''آپ مجھے نہیں جانتی ہیں پر میں آپ کو بہت دنوں سے جانتی ہوں اور جب سے آپ کو جانتی ہوں آپ کو دیکھنے کے واسطے جی مچلتا رہتا تھا۔''

اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''آپ کے بارے جیسا سوچا تھا آپ اس سے جیادہ اچھی نکلی ہیں۔ بہت جیادہ اچھی نکلی ہیں۔ اس لئے دل کرتا ہے کہ آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں مجھے آپ سے کوئی ڈر خطرہ نہیں ہے۔ اگر میں غلتی بھی کر رہی ہوں تو آپ یہ غلتی ضرور ماف کر دیں گی۔ کر دیں گی ناں۔''

''نگینہ مجھے ابھی تک تمہاری کوئی بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ میں تمہیں کیا جواب دوں؟''

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتی چلی گئی۔ ''رستم سیال کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا، میں

اس کی خالہ جاد بہن ہوں۔ آج سے چار پانچ سال پہلے اس کے ساتھ میری شادی بھی ہونے لگی تھی مگر پھر نہ ہوسکی۔ میرا ویاہ چھرو سیال سے ہوگیا۔ اب میں اس کے دو بچوں کی ماں ہوں اور اپنے گھر میں خوش باش ہوں۔ رستم اب بھی ہم سے ملتا رہتا ہے۔ اب میرے لئے وہ بس بھرا کی طرح ہی ہے۔''

اس تمہید کے بعد نگینہ نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی آواز مزید پست کی اور اصل موضوع کی طرف آگئی۔ ''چوہدرانی جی! آپ پریشان نظر آنے لگی ہیں، پر میں اک وار پھر کہوں گی کہ مجھ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور اللہ سوہنے نے چاہا تو آپ کی طرف سے بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ چوہدرانی جی! میں تو بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہاں آئی ہوں۔ میں وہ صورت دیکھنا چاہتی تھی جس نے ایک پتھر میں تریڑ (دراڑ) ڈالی اور اسے موم کردیا۔''

''تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔'' شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

نیک صورت عورت نے بڑی محبت اور بے تکلفی سے شانی کا نرم ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''چوہدرانی جی! یہاں ہمارے درمیان جو باتیں ہو رہی ہیں، وہ قبر کی دیواروں تک میرے اندر ہی رہیں گی۔ باہر نہیں نکلیں گی۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔''

''میں پریشان نہیں ہوں نگینہ۔ لیکن تم نے جو کچھ کہنا ہے، جلدی کہو۔''

وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''چوہدرانی جی! عشق، محبت پیار کے بارے میں لوگوں کی طرح میں نے بھی بہت کچھ سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس بارے میں سب کچھ جانتی ہوں پر کچھ دن پہلے مجھ کو پتا چلا کہ میں تے کچھ بھی نہیں جانتی اور شاید میری طرح کافی سارے لوگ بھی کچھ نہیں جانتے۔ میں نے ایک ایسے بندے کو دیکھا چوہدرانی جی جس نے کسی کے ساتھ عشق کیا اور پھر کر کے دکھایا۔ اس طرح اس کے عشق میں خود کو فنا کیا کہ باقی سب کچھ بھلا دیا۔''

شانی کے دل میں زلزلہ سا برپا ہوگیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔

وہ خاموش رہی تو نگینہ نے کہا۔ ''آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں کس کی بات کر رہی ہوں؟''

''کس کی؟''

''رستم سیال کی!'' نگینہ نے کہا اور ایک چھناکا سا شانی کے سینے میں ہوا۔ نگینہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''چوہدرانی جی! رستم ایک پتھر تھا جی، لوہا تھا، ایسا لوہا جس کو زہر کی پان چڑھائی گئی ہو۔ جو صرف کاٹنا جانتا ہو، بس مارنا جانتا ہو۔ ہمارے قبیلے کے لوگ سوچتے تھے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے اور شاید دریا بھی الٹا چل سکتا ہے پر رستم بدل جائے یہ نہیں ہوسکتا پھر یہ ہوا جی۔ ہم سب کی اکھیوں کے سامنے ہوا۔ میں قسم کھاتی ہوں چوہدرانی جی! میں یہاں رستم کی تعریفیں کرنے نہیں آئی۔ میں تو صرف آپ کو دیکھنا چاہتی تھی اور آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ رستم کس طرح بدلا ہے۔ ہاں چوہدرانی جی! یہ بالکل وکھری طرح کا کام ہوا ہے۔ شاید یہ کام سارے علاقے کی پولیس بھی مل کے نہ کرسکتی تھی۔ وڈے وڈے افسر وزیر نہیں کرسکتے تھے، وہ اپنے آپ ہوگیا اور اتنے چپ چپیتے ہوا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے رستم نے وارداتیں چھوڑیں، پھر اپنے گروہ کے بندے چھوڑے، پھر بالکل الگ تھلگ ہوگیا۔ بہت تھوڑے لوگوں کو پتا ہے کہ وہ اب پنج وقت کا نمازی ہے۔ رُوکھی سوکھی کھاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جوگ لے لیا ہے اس نے۔ پہلے اس کا دل پتھر تھا جی۔ وڈی سے وڈی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ پر اب کسی کو ذرا سا دکھی دیکھ کر اس کی اکھیوں میں پانی چمکنے لگتا ہے۔

چوہدرانی جی! مجھے ہر ویلے اس بات کی ٹوہ رہتی تھی کہ رستم کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ میرے بندے چھرو نے ایک دن کہا تھا، رستم کے کچھ یار کہتے ہیں کہ رستم کو کسی کُڑی سے عشق ہوگیا ہے۔ یہ ایسا عشق ہے جس نے رستم کو دنیا کی ہر شے بھلا دی ہے۔

چوہدرانی جی! ہمارے خاندان کی عورتوں میں عام طور پر اس بارے میں گل ہوتی رہتی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اگر رستم کسی کُڑی سے عشق کرتا تو اس کے لئے اس سے ویاہ کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ وہ دس پہرے توڑ کر بھی اس کُڑی کو گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا۔ پر ہماری برادری کی اماں حاجن سیانی کہتی ہے، کُڑیو! عشق پہرے توڑنے کا نام نہیں۔ یہ تو خود پر پہرے لگانے کا نام ہے۔ مجھے اماں سیانی کی یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی پر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جس طرح کا عشق رستم نے کیا ہے، اس طرح کا بس کوئی کوئی کرتا ہے۔''

شانی کا دل سینے میں سہم کر پھڑک رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے نگینہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نگینہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ایک مہینہ پہلے کی گل ہے، اماں حاجن سیانی بیمار ہوگئی۔ اس کا ساہ (سانس) خراب ہوگیا اور خراب ہی ہوتا چلا گیا۔ سارے قبیلے کو پتا

لگ گیا کہ اماں سیانی اب بچ نہیں سکے گی۔ شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ اماں حاجن سیانی نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ بس اکیلی رہتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب اماں اٹھارہ ورے (سال) کی تھی اس کا منگیتر شادی سے بس دو چار ہفتے پہلے گڈی کی ٹکر سے مارا گیا تھا۔ بس پھر اماں نے سب کچھ بھلا کر اللہ سے لو لگائی...... اور ایسی لگائی کہ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اماں سیانی دم درود بھی کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی۔ بس پانی میں پھونک مار کر دیتی تھی، اللہ سوہنا ہر بیماری کو ٹھیک کر دیتا تھا۔ رستم سیال بھی وارداتیں چھوڑنے کے بعد کبھی کبھی اماں سیانی کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ دو دو گھنٹے سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھا رہتا اور کچھ پڑھتا رہتا۔ جب اماں سیانی جیادہ بیمار ہوئی تو رستم بھی سیانی کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔ ایک رات وہاں رہا تھا پھر اسے اپنے ایک یار کے ساتھ کسی کام سے فوراً لاہور جانا پڑ گیا۔ اگلے روز اماں حاجن سیانی اور بھی جیادہ بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی آخری رات کو میں اس کے پاس تھی۔ میں نے اماں کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ میرا بندہ چھرو اماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب چھرو حکیم کو لینے گیا تو اماں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ کہنے لگی۔ ''نگو! تُو نے مجھ سے کئی بار پوچھا تھا ناں کہ رستم کو کس کُڑی سے پیارا ہوا ہے۔ لے آج میں تجھے بتا دیتی ہوں۔ پتا ہے تجھے کہ میں کیوں بتا رہی ہوں؟ میں تجھے اس لئے بتا رہی ہوں کہ تیرے اندر سے یہ گل کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ تُو اس کو اپنے تک ہی رکھے گی...... رکھے گی ناں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں اماں جی! آپ نے کہہ دیا ہے تو ہمیشہ رکھوں گی۔''

اماں سیانی بولی۔ ''اس گل کا پتا صرف تین بندوں کو ہے۔ صرف تین کو۔ رستم، وہ کُڑی اور میں۔ اب تُو چوتھی شامل ہو رہی ہے۔'' اماں یوں بول رہی تھی جیسے نیند میں ہو۔ اس کی نظر مٹی کے دیے پر تھی۔

میں نے کہا۔ ''اماں! کون ہے وہ کُڑی؟''

''مجھے پتا ہے، تم نے سن کر حیران ہونا ہے۔ وہ بیاہی ہوئی کُڑی ہے۔ نار پور کے چوہدری مہر کے چھوٹے پوتے کی گھر والی ہے۔''

میں سن کر سچ مچ حیران رہ گئی۔ اماں اپنی بات کہہ کے چپ ہو گئی تھی۔ میں انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ اور بھی بولے گی، پر نہیں بولی۔ آخر چھرو واپس آ گیا۔ حکیم اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے دوسرے پنڈ گیا ہوا تھا۔ اماں سیانی نے چھرو سے کہا۔ ''تم ہیر سید وارث شاہ بڑی اچھی پڑھتے ہو، مجھے سناؤ۔''

چھرو رات گئے تک وارث شاہ سناتا رہا۔ صبح اماں نے اشاروں سے نماز پڑھی اور تھوڑی

ہی دیر بعد دم دے دیا۔''

نگینہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی کالی سیاہ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ''اماں سیانی کے دنیا سے جانے کے بعد میں کئی دن تک سوچتی رہی کہ اماں نے مجھے آپ کے بارے میں کیوں بتایا۔ اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا اور شاید ملے بھی نہ...... سیانے کہتے ہیں ناں کہ اللہ والوں کی رمزیں اللہ سوہنا ہی جانتا ہے۔''

ہوا سے کمرے کا محرابی دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ نگینہ نے خود ہی اٹھ کر دروازہ بند کیا اور شانی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''چوہدرانی جی! میں آپ سے ایک وار پھر کہتی ہوں کہ یہاں آنے میں میری کوئی غرض نہیں ہے۔ نہ اپنی، نہ کسی اور کی۔ کسی اور کی غرض، رستم کی غرض ہی ہو سکتی ہے ناں لیکن اس کو تو آپ سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ میں سچ کہتی ہوں چوہدرانی جی! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے وہ آپ کو چاہتا تو بہت ہے۔ شاید اتنا کہ آپ کے ایک ہاسے (مسکراہٹ) کے لئے ساری دنیا قربان کر دے پر آپ سے دور رہ کر بھی وہ دکھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنے آپ میں مست ہے۔ آپ کو پیر جھنڈے شاہ کا تو پتا ہی ہوگا۔ ان کا مزار آپ کے گاؤں رنگ والی کے پاس ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ''آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ جھنڈے شاہ کے مزار پر لوگ اپنے بچھڑے ہوؤں کے نام کی دیگ چڑھاتے ہیں اور منت مانگتے ہیں کہ ان کا میل ہو جائے اور اگر میل نہ ہو سکے تو وہ جہاں رہیں سکھ سے رہیں۔''

شانی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

نگینہ بولی۔ ''پچھلے آٹھ نو ماہ سے مزار پر ہر روز بلاناغہ ایک، بچھڑے ہونے کے نام کی دو دیگیں چڑھائی جاتی ہیں۔ ہماری برادری میں اکثر لوگوں کو پتا ہے کہ یہ دیگیں رستم کی طرف سے چڑھائی جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ دیگیں اس کُڑی کے نام کی ہیں جس کے عشق نے رستم کو چور سے قطب بنایا ہے۔ پر کسی کو پتا نہیں کہ کُڑی ہے کون؟ اور نہ ہی کبھی کسی کو پتا لگنا ہے، پتا لگ بھی کیسے سکتا ہے۔ اماں حاجن سیانی اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ رستم نے ساری زندگی اس بارے میں زبان نہیں کھولنی، نہ ہی آپ نے کھولنی ہے چوہدرانی جی۔ باقی رہی میں تو میں نے اماں سیانی کے سامنے قسم کھائی تھی۔ اب آپ کے سامنے بھی اپنے سر کے سائیں کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ بات میرے ساتھ ہی قبر میں جائے گی۔''

شانی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں پر جیسے خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔

کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ اس عورت کو جھڑکیاں دے کر کمرے سے نکال دے۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ خاموشی سے اس کی باتیں سن لے اور اسے دل کا بوجھ ہلکا کر لینے دے۔ اب شانی کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ عورت کی شکل جانی پہچانی کیوں لگی تھی۔ وہ رستم کی خالہ زاد تھی۔

خاموشی کے اس وقفے میں نگینہ پھر محویت سے اس کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ شانی نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔ ''تم مجھے اچھی اور نیک لگتی ہو، یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہاری یہ باتیں سن لی ہیں۔ کیا تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے؟''

''کہنے کو تو بہت کچھ ہے چوہدرانی جی! مجھے تو یوں لگتا ہے جی کہ...... مجھے رستم کے عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کئی دنوں تک اسی طرح آپ کے قدموں میں بیٹھی رہوں اور آپ کی شکل دیکھتی رہوں۔ پر مجھے پتا ہے میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے جی۔ ہم سب کو پتا ہے کہ مہر جی کتنے غصے والا چوہدری ہے۔ اس کے بندے ہر آنے جانے والے پر شکرے کی نظر رکھتے ہیں۔ کسی کو شک بھی ہو گیا کہ میں چوڑیوں والی نہیں... سیالوں کی عورت ہوں تو مجھے بجلی کے ٹوکے میں سے گزار دیں گے۔''

شانی کے ماتھے پر بل دیکھ کر اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ ''ہاں چوہدرانی جی! مجھے ایک اور گل یاد آئی ہے۔ جاتے جاتے یہ بھی آپ کو سنا دوں۔''

''کون سی گل؟''

''رستم سیال کی گل جی۔'' وہ شانی کو بدستور والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پتا ہے جی، پچھلے سے پچھلے ہفتے کیا ہوا... ؟ پر پتا نہیں کہ آپ میری گل پر یقین کریں گی کہ نہیں۔''

''تم نے جو کہنا ہے جلدی کہہ لو۔'' شانی کے لہجے میں ضبط کا عنصر تھا۔

وہ بولی۔ ''لاہور میں فلموں کی ایک بڑی ایکٹرا اپنے رستم کی عاشق بنی ہوئی ہے۔ وہ چار چھ مہینے پہلے شوٹنگ شانٹنگ کرنے یہاں ایک باغ میں آئی۔ تب رستم نے بیچ بچ کے غنڈوں سے اس کی جان اور عزت بچائی تھی۔ وہ اس ویلے کی رستم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ جس دن اماں سیانی فوت ہوئی، اس سے دو روز پہلے وہ رستم کو ڈھونڈتی ہمارے گھر آ گئی۔ علاقے کا سب سے بڑا پلس افسر حاجی حیات خان رستم کا پکا یار ہے۔ رستم اس ویلے حیات کے ڈیرے پر تھا۔ وہ سیدھی ڈیرے پر پہنچ گئی۔ رستم سے کہنے لگی۔ ''میرے ساتھ لاہور چلو، یا کچھ دن مجھے اپنے پاس رہنے دو۔'' شاید آپ سمجھیں کہ میں گپ لگا رہی ہوں، پر اس گل کا علاقے کے

بہت سے لوگوں کو پتا ہے، اخبار میں بھی خبر چھپ گئی تھی۔ یہ دیکھیں میں آپ کو دکھاتی ہوں۔''

اس نے ٹوکری میں سے چوڑیوں کے آٹھ دس بنڈل نکالے اور نیچے بچھایا ہوا اخبار کا ایک صفحہ نکال کر شانی کے سامنے کر دیا۔ شانی نے حیرانی سے پڑھا۔ ایک خوبصورت ایکٹریس کی رنگین فوٹو کے نیچے لکھا تھا۔ ''نوخیز ہیروئن نادیہ دو دن تک پُراسرار طور پر غائب رہنے کے بعد واپس۔ کہا جاتا ہے کہ اُبھرتی ہوئی شعلہ بدن ہیروئن نادیہ اس جی دار کی کھوج میں تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے اس کی جان بچائی تھی۔ یاد رہے کہ قریباً چار ماہ پہلے نارپور نامی گاؤں کے پاس شوٹنگ کے دوران میں کچھ اصلی غنڈوں نے فلمی یونٹ پر حملہ کیا اور سیکس سمبل نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ جسے اس نامعلوم شخص نے ناکام بنا دیا۔''

کچھ مزید تفصیلات بھی اس خبر میں درج تھیں۔

شانی کو غور سے پڑھتے دیکھ کر نگینہ نے کہا۔ ''اندر کی بات یہ ہے چوہدرانی جی کہ یہ ''سوہنی بلا'' پوری دو راتیں حاجی حیات خان کے ڈیرے پر رہی ہے۔ اس کی گندی نظر رستم پر تھی۔ پر اس کی دال نہیں گلی جی...... میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ رستم تو ملنگوں کی طرح ہو چکا ہے۔ تیسری رات سے پہلے رستم اس بلا کو خود لاہور چھوڑ کر آیا۔ میں نے آپ کو بتایا ناں کہ جس رات کی صبح اماں سیانی فوت ہوئی۔ رستم اور اس کا افسر دوست کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہ یہی کام تھا جی۔''

شانی سر جھکائے سن رہی تھی۔ وہ نگینہ کی باتوں پر کسی طرح کا تبصرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شانی کو چپ دیکھ کر نگینہ بولی۔ ''شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو چوہدرانی جی! اس کے بعد میں اور آپ کبھی نہ ملیں۔ پر آج آپ کے ساتھ جو وقت گزرا اور جو باتیں کیں وہ سدا یاد رہیں گی۔ میرے من میں آپ کو دیکھنے کی حسرت تھی۔ سو آج آپ کو دیکھ لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جن صورتوں سے سچا عشق ہو جاتا ہے وہ کیسی ہوتی ہیں۔ سو آپ کو دیکھ لیا۔ عشق کی وجہ کا پتا چل گیا اور عشق کا بھی۔ اب میں اَن پڑھ بھی اندازہ لگا سکتی ہوں کہ سسی سوہنی اور ہیر کس طرح کی ہوتی ہوں گی اور ان سے عشق کرنے والوں نے اپنی جان کی بازی کیوں لگائی...''

شاید سوئی سوئی آنکھوں والی خانہ بدوش نگینہ کچھ اور بھی کہتی مگر اس دوران میں فاخر کی گاڑی کی آواز مین گیٹ پر سنائی دینے لگی تھی۔ شانی چونک سی گئی۔ اسے چونکتے دیکھ کر نگینہ کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ ''شش شاید... آپ کے خاوند صاحب آ گئے ہیں۔''

''ہاں، وہ آ گئے ہیں، اب تم جاؤ۔''

"اچھا جی، سلاماں لیکم۔" اس نے جھک کر شانی کے ہاتھ پر ماتھا ٹیکا، پھر اپنے ٹوکرے کی سب سے خوبصورت چوڑیاں شانی کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "یہ ایک گریب مسکین کا تحفہ آپ جیسی چوہدرانی کے قابل تو نہیں ہے پر آپ قبول کریں گی تو میں ساری زندگی خوش ہوتی رہوں گی۔"

شانی نے چوڑیاں جلدی سے گاؤ تکیے کے پیچھے رکھ لیں اور بولی۔ "نگینہ، تم بہت اچھی ہو لیکن اب کبھی اس حویلی میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں بی بی! میں سمجھ رہی ہوں۔" نگینہ دل گیر آواز میں بولی۔

اس نے ایک بار پر جھک کر سلام کیا اور آنکھوں میں محبت کی پُر خلوص نمی لئے واپس مڑ گئی۔

☆======☆======☆

شانی ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسے رستم کی ذات سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ اس خوف کی گہرائی میں کہیں حیرانی اور اُنسیت بھی شامل تھی۔ یہ کیسی اُنسیت تھی، کیسی وابستگی تھی۔ وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکتی تھی اور اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کیوں قائم ہوا تھا یہ رشتہ اور کب قائم ہوا تھا؟ وہ کون سی گھڑی تھی جب علاقے کے بدنام ڈاکو کی نگاہ میں وہ اُتری تھی اور اس کی کایا پلٹ کا سبب بنی تھی۔ شاید یہ کام اس وقت ہوگیا تھا جب اس نے پہلی بار شانی کو دیکھا تھا۔ وہ زخموں سے چُور دیوار کے سہارے بیٹھا تھا پھر وہ چکرا کر گرنے لگا تھا۔ شانی نے بے ساختہ کہا تھا۔ "ہائے، میں مرگئی۔" اور لپک کر اسے تھام لیا تھا۔

اس کا سر شانی کی گود میں آگیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے شانی کو دیکھا تھا۔ ہاں...... شاید یہ وہی گھڑی تھی، وہی پہلی نظر تھی۔ اس نظر کی تاثیر عرصہ گزر جانے کے باوجود شانی کو آج تک یاد تھی اور شاید شانی کے سینے کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ نظر آج تک پیوست تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی تھی اور سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ کہیں اس کے سینے کے اندر تہہ در تہہ پردوں اور کواڑوں کے پیچھے رستم کے لئے کوئی نرم گوشہ تو موجود نہیں ہے۔

مگر پھر یہ خیال کر کے اسے تسلی ہوتی تھی کہ اگر کوئی ایسا گوشہ ہے تو بھی اسے ہمیشہ تہوں کے پیچھے ہی رہنا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ رستم کا عشق خاموش عشق ہے۔ یہ عشق اس سے کبھی کچھ مانگے گا نہیں۔ زندگی میں اسے کسی آزمائش میں

نہیں ڈالے گا بس "وہ جو کچھ بھی ہے" زندگی کی آخری سانس تک رستم کے اندر ہی رہے گا۔

اب وہ اپنا پورا دھیان اپنی ازدواجی زندگی کی طرف دینا چاہتی تھی۔ قدرت کی مہربانی نے اسے ایک موقع دیا تھا کہ وہ اپنی گھریلو الجھنوں کو سلجھا کر اپنی زندگی میں سچی خوشیاں اور رنگ بھر سکے اور وہ یہ موقع کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے چند ماہ پہلے فاخر سے تھوڑے عرصے کی مہلت مانگی تھی۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ یہ عرصہ لمبا ہوتا جارہا ہے۔ یہ خوف ہمہ وقت اس کے دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں طویل انتظار کی اکتاہٹ سے فاخر کے مزاج پر منفی اثر نہ پڑ جائے۔ وہ بہت بدل چکا تھا لیکن کچھ بھی تھا اسے خاندانی وراثت میں انا اور حاکمیت ملی تھی۔ اپنی بات منوانے کی خواہش اس کے خون میں پیوست تھی۔ شاید اس خواہش کی شدت ہی تھی جس نے اسے اس طرح بدلا تھا۔ شانی کا حقیقی پیار پانے کے لئے اس نے اپنے دل و دماغ میں سجائے ہوئے بہت سے پُرشکوہ بُت اپنے ہاتھوں سے توڑے تھے اور اب منتظر تھا کہ اسے اس کی "طلب" کا صلہ ملے۔ اگر گہرائی میں جاکر دیکھا جاتا تو یہ بھی انا پرستی اور ضد کی ایک شکل ہی تھی لیکن کچھ بھی تھا شانی کو عزت سے زندہ رہنے کی راہ مل رہی تھی۔ اس نے شوہر کی جسم پرستی اور عیش کوشی کے بت توڑے تھے اور وہاں محبت کا شگوفہ کھلایا تھا۔ اب وہ اپنی دل گداز محبت سے اس شگوفے کو پالنا چاہتی تھی۔ باقی سب کچھ بھول کر صرف اور صرف ایک شوہر پرست بیوی کا لازوال کردار ادا کرنا چاہتی تھی۔ ہاں۔ وہ باقی سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔

چند روز بعد عیدالضحیٰ تھی۔ شانی جانتی تھی اپنے جسم اور اپنی روح کے خوش نما ترین پھول فاخر کے قدموں پر نچھاور کرنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ اسے چاندرات کا انتظار تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے جسم میں وہی میٹھی میٹھی لہر محسوس کرنے لگی جو شادی کے پہلے پہلے دنوں میں محسوس ہوئی تھی۔ سینے میں انگڑائی سی جاگتی تھی۔ دل میں کچھ ہوتا تھا۔ فاخر کو دیکھ کر دل میں جو خوف اور گریز سا جاگا کرتا تھا وہ بتدریج کم ہوتا جارہا تھا۔ اب اس کا بالوں بھرا گرانڈیل جسم بھی شانی کو کچھ زیادہ بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ جلد ہی اپنے رہے سہے گریز پر بھی قابو پالے گی۔

چاندرات سے ایک رات پہلے اس نے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی لگائی۔ اگلے روز نہانے کے لئے بہترین اُبٹن خود بنایا۔ چاندرات کو پہننے کے لئے جوڑا تیار کیا۔

صبح سویرے اسے پتا چلا کہ فاخر کو ضروری کام سے گجرات جانا پڑ رہا ہے اور وہ چاند رات کو نو دس بجے سے پہلے واپس نہیں آسکے گا۔ چلو یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ دس بجے تک واپس

آ جائے گا، ورنہ نار پور سے باہر جانے کے بعد فاخر کی واپسی کئی کئی روز بعد ہوتی تھی۔

شام ہونے کے بعد شانی کو مہر جی کے کمرے میں جانا تھا۔ معمول کے مطابق مہر کی ٹانگیں دبانے کی باری آج بھابو کی تھی، لیکن بھابو چونکہ بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی لہٰذا یہ کام شانی کو کرنا تھا۔ وہ حسبِ معمول مہر کے کمرے کی طرف روانہ ہوئی۔ مہر کی پھلواری کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ کافی فاصلہ رکھتی تھی۔ جب سے اسے وہاں سانپ کی موجودگی کا پتا چلا تھا، پھلواری کے حوالے سے اس کا خوف بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کسی وقت اس کی نگاہ سرخ پھولوں اور سنہری مائل پتوں والے مخصوص پودوں پر پڑتی تو دل میں کراہت جاگتی۔ اسے لگتا تھا ان پتوں کی شباہت سانپ کے پھن جیسی ہے۔

زنانے سے حویلی کے وسطی حصے کی طرف جانے والی روش پر نپے تلے قدم رکھتی وہ مہر کے کمرے میں پہنچی۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ آج صورتِ حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔

مہر بستر پر نیم دراز تھا۔ سینے تک سفید چادر رکھی ہوئی تھی۔ منقش حقے کی نال پہلو میں دھری تھی۔ پلنگ کی عقبی دیوار پر کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور دو چاندی کی برچھیاں سجاوٹ کے طور پر آویزاں تھیں۔ بائیں طرف الماری تھی جو سنیاس کی شعبدہ ٹائپ دواؤں سے بھری ہوئی تھی۔ جب شانی یا بھابو مہر کی ٹانگیں دبا رہی ہوتی تھیں پرانا ملازم اکبرا اکثر کمرے میں آتا جاتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ دیوار کی طرف منہ کئے کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا اور بڑے انہماک سے حقے کی چلم بھرنے میں مصروف تھا۔

شانی اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گئی اور ٹانگیں دبانے لگی۔ کمرے کی مخصوص بو دھیرے دھیرے اس کے پھیپھڑوں میں گھس کر حواس پر اثر کرنے لگی۔ اس نے سانپ کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا، نہ ہی اسے پتا تھا کہ سانپ کے جسم سے اٹھنے والی بو کیسی ہوتی ہے مگر پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ مہر کے کمرے میں پھیلی ہوئی بو سانپ کی بو ہے۔

وہ پلپلی پنڈلیاں دباتی رہی۔ اکبرا لنگڑاتا ہوا آیا اور قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چلم بدلی اور ادب سے جھک کر حقے کی نَے مہر کی ٹھوڑی پر ٹکا دی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر مہر کے اشارے پر وہیں قالین پر بیٹھ گیا۔ مہر کا موڈ آج کچھ عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور اکلوتی آنکھ کی چمک معمول سے زیادہ تھی۔ شانی کو یوں محسوس ہوا کہ مہر کے بوڑھے جسم میں اضطراب کی لہر سی دوڑ رہی ہے۔ مہر نے اپنے مخصوص لہجے میں اکبرے سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اس کھسر پھسر میں سے بس دو چار الفاظ ہی شانی کی سمجھ میں آ پائے۔

”دادا۔ عورت۔۔۔۔ دولت بی بی۔۔۔۔ کمینے۔۔۔ وغیرہ۔۔۔۔“

مہر بات ختم کر چکا تو اکبرے نے اس کے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے شانی سے کہا۔ ”چھوٹی چوہدرانی مہر جی آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔“

”کیا؟“ شانی نے کہا۔

”مہر جی پوچھ رہے ہیں کہ آپ کے دادا نے دولت بی بی سے بیاہ رچا کر جو غلط کام کیا، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

شانی کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس سے پہلے مہر کبھی کبھار شانی کے لئے سخت الفاظ استعمال کر لیتا تھا لیکن یوں سنجیدہ انداز میں اس نے کبھی ماضی کی تلخیوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”دادا! گزرے ہوئے سالوں میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میرا تعلق واسطہ آپ سے اور آپ کے گھر سے ہے۔ میں آپ سب کی خدمت دل و جان سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے پرانی باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔“

جواب میں مہر پورے کا پورا بھڑک اٹھا۔ اس نے اکبرے کی وساطت سے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کچھ لینا نہ دینا ہوگا، لیکن مجھے ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ قادر بخش کی پوتری اپنے بڑوں کے کرتوتوں پر لعنت بھیجتی ہے یا سمجھتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا؟“

مہر کا جنونی انداز دیکھ کر شانی کا رنگ ہلدی ہونے لگا تھا۔ وہ ہکلا کر بولی۔ ”دادا! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سب غلط تھا تو پھر غلط ہی ہوگا۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“

مہر نے ایک بار پھر قہرناک انداز میں جناتی زبان بولی۔ ”غوں غاں خرخر۔۔۔۔ گھڑ گھڑ۔۔۔۔“ کے درمیان فقط چند لفظ ہی شانی کی سمجھ میں آ سکے۔ ”دولت بی بی۔۔۔۔ باپ۔ دادا۔۔۔ حرامی۔“

اکبرے نے بڑی بے باکی سے مترجم کی ذمے داری سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی چوہدرانی جی! مہر جی کہتے ہیں، سارا جگ جانتا ہے کہ مہر جی نے تمہارے دادا کا مار مار کر حشر کر دیا تھا۔ اسے زمین چاٹنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے بے غیرتی دکھائی اور ہار کر بھی دولت بی بی کا دولہا بن بیٹھا۔ اگر دولت بی بی کے باپ کے منہ میں زبان کے بجائے کتے کا چھڑا تھا تو تیرے دادا کو ہی حیا کرنی چاہئے تھی۔ وہ کسی طرح دولت بی بی کا حق دار نہیں تھا۔ وہ ساری زندگی دولت بی بی کے ساتھ زنا کرتا رہا ہے۔“

شانی کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ اس کا سارا بدن کانپا جا رہا تھا لیکن ہاتھ

میکانکی انداز میں مہر کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہ سکی۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ مہر اپنے ایک ملازم کے منہ سے اپنی بہو کے بزرگوں کے متعلق ایسے کلمات کہلوا رہا ہے۔

مہر غضب کے عالم میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے زہریلے شعلے نکل رہے تھے۔ اکبرے کی وساطت سے بولا۔ ''آج تجھے ماننا پڑے گا کہ تیرا دادا تیری دادی کا حق دار نہیں تھا۔ اس نے شادی نہیں کی چوری کی اور اگر اس نے چوری کی تو وہ چور تھا اور اس چوری کی وجہ سے جو پیدا ہوا وہ حرامی تھا۔ ہاں تیرا دادا چور اور تیرا باپ حرامی تھا... بول... اپنے منہ سے بول نہیں تو میں تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔''

شانی کو لگا کہ اسے غش آجائے گا اور وہ مہر کی ٹانگوں کے اوپر ہی گر جائے گی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے اپنے دادا سسر کی طرف دیکھا اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔ ''دادا جی! بڑوں کی کسی غلطی کی سزا مجھے نہ دیں...... مم...... میں تو آپ کی بیٹی ہوں۔''

''بکواس بند کر... جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر...... اپنے منہ سے اقرار کر کہ تیرا دادا چور اور باپ حرامی تھا... میں تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' مہر کے یہ الفاظ اکبرے نے بے دھڑک شانی تک پہنچائے۔

شانی سرتاپا لرز رہی تھی لیکن ہاتھ اب بھی میکانکی انداز میں مہر کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔ کئی ماہ تک گھٹنوں، مہر کی مٹھی چاپی کر کر کے یہ جیسے اس کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ہونٹ خشک ہو کر ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔

مہر کا غضب انتہا کو چھونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ داستانوں کے زہریلے اژدہے کے مانند اس کے منہ سے بھی نیلے شعلے نکلنے لگیں گے۔ ''تُو بولتی کیوں نہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ اپنے منہ سے بول۔'' غضب کے سبب مہر کی آواز اب ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔

شانی سکتے میں تھی۔ اچانک مہر نے اپنی صحت مند ٹانگ کو ایک غصیلا جھٹکا دیا۔ اس کی ایڑی شانی کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ جو پلنگ کے کنارے پر بیٹھی تھی، اچھل کر قالین پر جا گری۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی کراہ نکلی اور زمین آسمان نگاہوں میں گھومتے محسوس ہوئے۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کہ مہر نے اکبرے کو کمرے کا اکلوتا دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ اکبرے نے جلدی سے دروازے کی اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

مہر کے اشارے پر ادنیٰ ملازم اکبرے نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے شانی کو کلائی

سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹ کر مہر کے پاس لے گیا۔ جھٹکا لگنے سے شانی کا نفاست سے باندھا ہوا جوڑا ڈھیلا ہو گیا اور بالوں کی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ اب مہر پلنگ پر تھا اور شانی نیچے قالین پر۔ اکبرے کی نہایت گستاخ اور بے رحم گرفت شانی کی کلائی پر قائم تھی۔ وہ ست رنگی چوڑیاں جو چند دن پہلے سیلانی عورت نگینہ نے بڑی چاہت سے شانی کو دی تھیں اور جو آج شانی نے اپنے شوہر کے لئے کلائیوں میں سجائی تھیں، ٹوٹ ٹوٹ کر قالین پر گر رہی تھیں۔ شانی کی نازک کلائی سے خون رسنے لگا تھا۔

مہر کے ہونٹوں سے اژدہے جیسی پھنکار نکلی۔ اس کا صحت مند ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ شانی نے سمجھا، شاید وہ اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے، لیکن یہ چیز تھپڑ سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ یہ منقش حقے کی نے (نالی) تھی۔ شائیں کی آواز سے یہ نالی شانی کی کمر پر پڑی اور اسے لگا کہ جسم میں دہکتی ہوئی سلاخ اتر گئی ہے۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور آنکھوں سے ایک بار پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نے کی دوسری ضرب شانی کے بائیں کندھے پر لگی اور یہ بھی بے حد تکلیف دہ تھی۔ اکبرے کا انداز بھی گستاخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ شانی کو دبوچ کر رکھنے کے لئے اس نے شانی کے بال بھی مٹھی میں جکڑ لئے تھے۔

شانی کو دو تین دردناک ضربیں لگانے کے بعد، مہر ایک بار پھر طیش کے عالم میں پھنکارنے لگا۔ شانی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''دادا......! میں نے کوئی غلطی نہیں کی، پھر بھی مجھے معاف کر دیں۔''

مہر نے اکبرے کی وساطت سے کہا۔ ''تُو معافی کے قابل نہیں ہے۔ تیری رگوں میں جتنا بھی گندہ خون ہے، سارے کا سارا میں آج نکال لوں گا۔ اس کے بعد ہی تُو معافی کے قابل ہو گی۔''

''مم...... میں...... آپ کی بہو ہوں دادا...... آپ کی عزت......''

''بہو کیا تُو نوکرانی بننے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حرام زادی تیرا ایک گناہ یہ بھی ہے کہ تُو نے اس حویلی کی رانی بننے کا خواب دیکھا۔''

مہر کی دہشت عروج پر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی بیٹھی ہوئی مفلوج آنکھ میں بھی تھوڑی سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے مکروہ ہونٹوں سے لیس دار مادہ بہہ رہا تھا اور ٹھوڑی کو تر کر رہا تھا۔ اس نے اکبرے کو کوئی شیطانی اشارہ کیا۔ اکبرا جو پہلے ہی ''چھوٹی چوہدرانی'' کا ہر ادب آداب بھول چکا تھا اب بالکل ہی غنڈا نظر آنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ شانی کی نازک کلائی پر تھا اور دوسرا اس کے بالوں پر تھا۔ وہ اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ

کیا تھا یہ چاروں طرف سے بند ایک کوٹھڑی تھی۔ صرف ایک کھڑکی تھی جو مہر والے کمرے کی طرف کھلتی تھی لیکن فی الحال وہ بھی بند تھی۔ فرش پر دری بچھی تھی اور ایک طرف گدا پڑا تھا۔ دیگر سامان میں دو ٹرنک تھے۔ ایک الماری کے ساتھ ایک رائفل اور ایک کلہاڑی دیوار پر آویزاں تھی۔ ایک ٹیپ ریکارڈر اور چھوٹا ٹی وی بھی اس کوٹھڑی نما کمرے کے اسباب میں شامل تھا۔ دائیں طرف کونے میں کوئی ٹوکری نما شے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ مہر کے چہیتے ملازم اکبرے کا کمرہ تھا۔

شانی دیکھ رہی تھی کہ حالات بدترین رخ پر جا رہے ہیں۔ اردگرد کی ہر شے اس کی نگاہوں میں دھندلا رہی تھی۔ اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ کہاں ہو فاخر...... کہاں ہو میرے مجازی خدا۔ پھر اس کا دھیان بھابو کی طرف گیا...... کہاں ہو بھابو...... کہاں ہو میری چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جانے والی؟

وہ مدد کے لئے کسی کو پکارنا چاہتی تھی پھر شاید اس غرض سے اس نے اپنا منہ کھولا تھا، اپنے سینے میں سانس جمع کی تھی، لیکن پھر فوراً ہی ایک طوفانی تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا۔ اس کا ذہن کچھ دیر کے لئے گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ شاید دو چار منٹ کے لئے بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید وہ نیم بے ہوش ہی تھی۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے گھسیٹا جا رہا ہے۔ کسی شے سے باندھا جا رہا ہے۔ اسے اپنے ٹخنوں کے قریب اور کلائیوں پر شدید چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

چند منٹ کے وقفے کے بعد جب اس کا ذہن دوبارہ صاف ہوا اور آنکھوں کے سامنے سے دھند کی چادر ہٹی تو کوٹھڑی کا منظر بہت بدلا ہوا نظر آیا۔ چارپائی کی ادوائن کے ساتھ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور پاؤں بھی باندھ دیئے گئے تھے۔ تاہم باندھتے ہوئے یہ احتیاط کی گئی تھی کہ کلائیوں اور ٹخنوں پر گہرے نشانات نہ پڑیں۔ رسیوں کے نیچے شانی کو اسفنج کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔

اکبرا اس سے چند فٹ دور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ اب ملازم نہیں تھا اور نہ ہی شاید وہ چوہدرانی تھی۔ اس نے مکمل بے باکی سے شانی کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے دماغ میں یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو آئے گا تو بالکل بھول جاؤ۔ یہاں کوئی آئے گا اور نہ تمہاری آواز یہاں سے باہر جائے گی۔ چھوٹے چوہدری صاحب بڑے چوہدری صاحب مہر جی کے بھیجنے پر ہی گجرات گئے ہوئے ہیں۔ ان کا کام ایسا ہے کہ کل صبح سے پہلے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑی چوہدرانی (بھابو) کے

لئے بھی ایسا انتظام ہے کہ وہ سویرے سے پہلے واپس نہیں آ سکتی ہیں۔'' اکبرے کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

اس چمک کو دیکھ کر شانی کو اپنے اندر ایک خوفناک کپکپی کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا دادا سسر عداوت اور کدورت میں ساری حدوں کو پھلانگ گیا ہے۔ اس نے شانی کو لاچار کر کے اپنے ایک ادنیٰ ملازم کے سامنے پھینک دیا ہے۔

اکبرے کی بہکی ہوئی آواز ایک بار پھر شانی کے کانوں میں گونجی۔ ''جو کچھ مہر جی، تمہارے ہونٹوں سے سننا چاہتے ہیں انہیں سنا دو۔ شاید...... شاید...... پھر تمہاری بچت کی کوئی صورت نکل آئے۔''

اکبرے کی بات سن کر شانی کی فطری حوصلہ مندی اس کے اندر جاگ گئی۔ اس نے بے پناہ کرب اور دکھ کے عالم میں سوچا، جو کچھ اس کے ساتھ ہونا ہے، وہ تو شاید ہونا ہی ہے، لیکن وہ اپنے منہ سے اپنے باپ دادا کو گالی نہیں دے گی۔ یہ بات بہت ممکن تھی کہ اس کے ہونٹوں سے اپنے من پسند الفاظ سن کر بھی مہر وہی کچھ کرے جو کرنے جا رہا ہے۔

شانی کی آنکھوں سے آنسو بوندوں کی طرح گر رہے تھے اور وہ خود کو زمین آسمان کے درمیان معلق محسوس کر رہی تھی۔ آدھا پون گھنٹا پہلے، مہر کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ اکبرے کے قریب رکھی ایک شیشے کی بوتل پر پڑی۔ اس بوتل میں سنہری رنگ کی کوئی دوا گندم کے دانوں کی شکل میں تھی۔ بوتل کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ قریب ہی پانی کا گلاس رکھا تھا جس میں سے دو تہائی پانی غالباً پی لیا گیا تھا۔ شانی کے بے پناہ خوف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اس دانے دار سنہری دوا کے بارے میں جانتی تھی۔ بھابو سے اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا...... بلکہ وہ جب سے اس حویلی میں آئی تھی اس حوالے سے کچھ نہ کچھ سن رہی تھی۔ یہاں اپنی آمد کے تیسرے ہی دن شانی غلطی سے مہر کی پھلواری میں چلی گئی تھی۔ مہر خوفناک انداز میں اس پر جھپٹا تھا اور وہ جان بچا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

بعد میں ایک موقع پر بھابو نے شانی کو تفصیل سے بتایا تھا کہ ''سپ گندل'' نامی ایک پودا مہر جی کی پھلواری میں اُگتا ہے۔ بعد میں سنیاس کے طریقے سے اسے ایک سنہری دوا کی شکل دی جاتی ہے جو مہر کے لئے آبِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہر اور اس ''سپ گندل'' کے بارے میں اور بھی کئی گفتنی اور ناگفتنی باتیں شانی نے سن رکھی تھیں۔ مہر کی مٹھی چاپی کے

لئے شانی اس کے کمرے میں آتی ہی رہتی تھی۔ اس نے مہر کی الماری میں، گندم کے دانوں جیسی اس سنہری دوا کی جھلک کئی بار دیکھی تھی۔ آج یہی دوا الماری سے باہر بھی نظر آ رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ مہر کے چہیتے ملازم اکبرے نے اس کا استعمال کیا ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شانی کے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے اکبرے نے اپنی بھدی سانولی ہتھیلی پر سنہری دانے دار ''سپ گندل'' کی تھوڑی سی مقدار مزید نکالی اور اسے پھانک گیا۔ فوراً بعد گلاس کا بچا کھچا پانی بھی اس کے حلق سے نیچے اُتر گیا۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تاہم بدترین اندیشے اس کے دل و دماغ کو زخمی کر رہے تھے۔ وہ ایک اور بات نوٹ کر رہی تھی۔ دم بدم اکبرے کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ شاید ''سپ گندل'' نے اس پر اثر شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخی مائل ہو رہی تھیں۔ سانولا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور پیشانی کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں۔ اکبرے کی عمر پینتیس سے اوپر رہی ہوگی۔ چہرہ چوڑا چکلا تھا۔ پیشانی سے بال اُڑ چکے تھے۔ عام طور پر دھوتی کرتہ یا شلوار کرتہ پہنتا تھا۔ گلے میں بڑا سا رومال جھولتا رہتا تھا۔ وہ سانپ کا زہر نکال کر اسے جمع کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔ ایک دو بار شانی نے بھی اسے سانپ کا زہر نکالتے دیکھا تھا۔

بہرحال فی الوقت تو اکبرا خود سانپ بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تر ہوتی گئیں۔ ہونٹ کھچ سے گئے۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ سردی کے باوجود اکبرے کے چہرے کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا ہے۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اکبرے کی آنکھیں اس جنونی کیفیت کا سب سے زیادہ شکار تھیں۔ وہاں شانی کو ایک خوفناک بھوک دکھائی دینے لگی۔ ایسی بھوک جو باقی ہر احساس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ اکبرے کی آنکھوں میں موجود بے باکی اب بے شرمی کی حدوں سے بھی کہیں آگے نکل گئی تھی۔ وہ اب انسان لگتا ہی نہیں تھا۔ بگڑی ہوئی شکل اور ہانپتی ہوئی سانسوں والا کوئی درندہ نظر آتا تھا۔ شاید یہی تھا مہر کی سپ گندل کا اعجاز؟ یا شاید یہ سپ گندل کا اعجاز نہیں تھا یہ انسان کے اندر نسل در نسل پروان چڑھنے والی عداوت اور کدورت کا ''اعجاز'' تھا۔

سپ گندل تو ایک پودا تھا۔ اس کا اچھا یا بُرا کوئی بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بالکل جیسے انسان کے اندر پایا جانے والا جذبۂ تسخیر کسی بھی اچھے یا بُرے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ مہر جی جیسے لوگ اس جذبۂ تسخیر سے پیدا ہونے والی بے پناہ توانائیوں کو دشمنیاں پروان چڑھانے اور لاشے گرانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی کدورتوں کو نسل در نسل پالتے ہیں اور

زہریلی تاثیر والا تناور درخت بناتے ہیں۔ مہر کے جذبۂ تسخیر نے دولت بی بی کو فتح کرنا چاہا مگر اپنی بدقسمتی کے سبب نہ کر سکا۔ اس نے دولت بی بی کو حاصل کرنے والے شخص سے دشمنی پالی اور...... پالتا چلا گیا۔ یہ ایک ایسی زہریلی سپ گندل تھی جو اس کی رگ رگ اور نس نس میں پھیل گئی۔ مدتیں گزر گئیں، نسلیں بدل گئیں لیکن وہ اپنے اندر پھیلی خطرناکی کو کم نہیں کر سکا۔

آج پون صدی بعد وہ اپنی خداداد ناکامیوں کا بدلہ شانی سے لے رہا تھا اور اس طریقے سے لے رہا تھا کہ رات کے اس خنک پہر کو بھی پسینہ آ گیا تھا۔ وہ اپنے پوتے کی پاک دامن بیوی کو ایک بدمست نوکر سے تار تار کروانے جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ قادر بخش اور دولت بی بی سے قرار واقعی بدلہ لے رہا ہے۔

اکبرا ایک بپھرا ہوا جانور تھا اور شانی سے چند فٹ کی دوری پر تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے یکا یک اسے آگ لگ جائے گی۔ بھک بھک کی آواز کے ساتھ شعلے اس کی آنکھوں اور منہ سے خارج ہونے لگیں گے۔ بیس تیس سیکنڈ پہلے اس نے تپائی پر رکھا ہوا پانی کا جگ اپنے سر پر انڈیلا تھا اور اس کے چہرے کی حد سے بڑھی ہوئی تمتماہٹ قدرے کم ہوئی تھی لیکن اب پھر چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

تب شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن نے ایک اور بات نوٹ کی۔ ایک اور دل فگار بات۔ اکبرے نے کوٹھڑی کی اکلوتی کھڑکی کے پٹ ذرا سے وا کر دیئے۔ اس کھڑکی کی دوسری جانب مہر کا کمرہ تھا۔ شاید...... شاید اکبرا، شانی کی چیخ پکار اور منت سماجت اپنے آقا کے بند کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ شانی نے کہیں پڑھا تھا دو ڈھائی ہزار سال پہلے بابل اور مصر وغیرہ کے امراء اور رئیس اپنے سامنے عصمتیں لٹواتے تھے اور یہ تماشے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ شاید مہر کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں بھی کوئی ایسی ہی خباثت شامل تھی۔

یہ نازک ترین لمحات تھے۔ شانی نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ درد بھرے فریادی انداز میں چیخی۔ ''بچاؤ...... کوئی ہے...... کوئی ہے...... بچاؤ۔''

شانی کی آواز بہت بلند تھی مگر اکبرے کے چہرے پر مطلق پریشانی نظر نہیں آئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اور مہر اپنے انتظامات کی طرف سے مطمئن ہیں۔ شانی نے اپنے شریکِ حیات کی خوشنودی کے لئے اپنی کلائیوں میں چوڑیاں سجائی تھیں، ہاتھوں پر مہندی کے خوش نما پھول بنائے تھے۔ اپنے بدن کو مل مل کر اُبٹن اور صندل سے دھویا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، یہ سب کچھ، ایک بدبودار جانور کے ہاتھوں پامال ہونے والا ہے۔

آخری چارے کے طور پر وہ اپنی فریاد مہر کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگی۔

''دادا۔ ایسا مت کرو۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتی ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی ... مجھے معاف کردو۔ دادا! تم کہو گے تو میں اپنے میکے سے ہر رشتہ توڑ لوں گی۔ کسی کو صورت نہیں دکھاؤں گی۔ تمہاری اور تمہارے بیٹے کی باندی بن کر رہوں گی لیکن میرے ساتھ ایسا مت کرو''

کوئی جواب نہیں آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آواز پتھریلی دیواروں سے ٹکرا کر نابود ہوگئی ہے۔

دفعتاً اس نے اکبرے کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کے نازک جسم پر جیسے کوئی بہت بڑی خاردار جھاڑی اپنے تنے سمیت آن گری تھی۔ اس نے چیخنا چاہا تو اس کا منہ ایک بے رحم ہتھیلی نے ڈھانپ لیا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ ایک باعصمت عورت کی حیثیت سے مزاحمت کا حق ادا کر دیا۔ اس نے اکبرے کی پسلیوں پر گھٹنوں کی کئی کرخت ضربیں لگائیں اور مزاحمت کا انمٹ ثبوت فراہم کرتے ہوئے اس کے منحوس جسم پر کئی جگہ اپنے دانتوں کے نشان چھوڑے۔

اکبرا درندے کی طرح چنگھاڑتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ سپ گندل نے اس کے جسم میں دوزخ بھر رکھا تھا۔ وہ لہراتا ہوا کمرے کی طرف گیا۔ وہاں اس نے ٹوکرا قسم کی چیز پر سے کپڑا ہٹایا۔ یہ ایک ٹوکرا نہیں تھا۔ یہ تین چار ٹوکریاں ''پٹاریاں'' تھیں۔ ایسی پٹاریوں میں سانپ ہوتے ہیں اور ان میں بھی یقیناً سانپ تھے۔ اکبرے نے ہاتھ پر ایک سیاہ دستانہ چڑھایا اور سب سے اوپر والی پٹاری کا ڈھکنا کھول دیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ کوبرا نظر آ رہا تھا۔ اکبرے نے اسے گردن کے قریب سے پکڑا تھا۔ کوبرے کا خوفناک منہ درندے کے جبڑوں کی طرح کھلا تھا۔ یکایک شانی کی نگاہ کوبرے کی دم پر پڑی۔ وہاں ایک آر پار ہوتا ہوا سوراخ تھا۔ یہ وہی کوبرا تھا جسے مہر پھلواری میں رکھتا تھا اور اس کے فضلے سے سپ گندل کے لئے کھاد فراہم کرتا تھا۔ اب یہ کوبرا اکبرے کے ہاتھ میں تھا یا شاید یوں کہنا چاہئے کہ کوبرے کے ہاتھ میں کوبرا تھا۔

اکبرا لنگڑاتا ہوا شانی کی طرف پلٹا اور ''کوبرا بدست'' شانی پر حملہ آور ہوا۔ یہ سچ مچ قیامت کے لمحے تھے۔ شانی کے جسم میں زہریلے خنجر اتار دیئے جاتے یا انگاروں پر گھسیٹا جاتا تو بھی اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنا کوبرے کے منہ کو خود سے چند انچ کے فاصلے پر دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ان جان لیوا لمحوں میں شانی کو پتا چلا کہ اسے مہر کے جسم اور اس کے کمرے سے جو مخصوص بو آیا کرتی تھی، وہ واقعی سانپوں کی بو تھی۔ یہ مشہور تھا کہ مہر سانپ کا تازہ خون اور اس کے پتے کا پانی ایک ہی پیالے میں ڈال کر پی جاتا ہے۔ یقیناً یہ سانپ کی بو ہی تھی جو مہر کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

ہاں، ایک کوبرا اس سے چند انچ کے فاصلے پر تھا اور دوسرا کوبرا اسے اپنے جسم کے پیچ و خم میں لپیٹ رہا تھا۔ یہ دوسرا کوبرا اپنی سفاک آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''تیرے بھائی نے میری ٹانگ توڑی تھی۔ وہ بدلہ بھی تو باقی ہے تجھ سے۔''

خوف اور دہشت نے شانی کو بتدریج سکتہ زدہ کر دیا۔ وہ اکبرے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کوبرا کے کھلے منہ میں دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ کوبرا صرف چند انچ کی دوری پر تھا اور اکبرے کا دھمکاتا ہوا لہجہ شانی کو بتا رہا تھا کہ اگر اس نے مزاحمت جاری رکھی تو یہ فاصلہ مزید کم ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب کہیں قریب ہی دستک کی مدھم آواز ابھری۔ شانی کو لگا کہ یہ دستک مہر کے دروازے پر ہوئی ہے۔ چند سیکنڈ بعد شانی کو ادھ کھلی کھڑکی میں سے مدھم نسوانی سرگوشی سنائی دی۔ یہ آواز ادھیڑ عمر ملازمہ جالاں کی تھی۔ جالاں اکبرے کی رشتہ دار تھی اور اس کا شمار مہر کے ذاتی ملازموں میں ہوتا تھا۔ سرگوشی کے بعد مہر کے کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ جالاں واپس چلی گئی۔ ایک مختصر سا وقفہ آیا اس کے بعد مہر کی صورت کھڑکی کے چوکھٹے میں نظر آئی۔ وہ اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

اس نے غرغراتی اور خرخراتی آواز میں اپنے چہیتے اکبرے کو کچھ سمجھایا۔ مہر کی بات میں فاخر اور گاڑی کے الفاظ واضح طور پر شانی کی سمجھ میں آئے۔ امید کی کئی کرنیں ایک ساتھ شانی کے دل میں روشن ہوئیں۔ مہر کا لہجہ اور الفاظ شانی کو سمجھا رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر فاخر کی واپسی ہو گئی ہے۔

اچانک اکبرے نے شانی کے منہ میں زبردستی کپڑا گھسیڑ دیا۔ کپڑے کے اوپر اس نے اپنا رومال کس کر باندھ دیا۔

کوبرا سانپ ایک بار پھر پٹاری میں پہنچ چکا تھا۔ کسی حد تک افراتفری کے عالم میں اکبرا کمرے سے باہر نکل گیا۔

مہر کا چہرہ کھڑکی میں نظر آ رہا تھا اور اس کی اکلوتی لشکارے مارتی آنکھ جنونی انداز میں شانی پر مرکوز تھی۔

اکبرے کی واپسی دو تین منٹ بعد ہو گئی۔ مہر سے کھسر پسر کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا اور شانی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ بمشکل ایک دو منٹ گزرے ہوں گے کہ فاخر کی جاں افزا آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ مہر کے

کمرے میں موجود تھا۔ ہاں اس کا شریک حیات، اس کی عزت اور جان کا محافظ اس سے چند گز کی دوری پر موجود تھا۔ اس نے جسم اور جان کی پوری توانائی کے ساتھ اپنے شوہر کو پکارنا چاہا مگر گلے میں پھنسے ہوئے کپڑے کے گولے نے اس کی آواز سینے میں ہی دبا دی۔

فاخر کی نہایت مدھم آواز شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''دادا...... شانی تو ادھر نہیں آئی؟''

جواب میں مہر کی ناقابل فہم آواز ابھری۔ وہ فاخر کے سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔ شانی کو یوں لگا کہ فاخر واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے مگر پھر ایک جملے نے شانی کی ٹوٹی ہوئی امید دوبارہ باندھ دی۔ فاخر نے کہا تھا ''دادا...... لیکن...... یہ شانی کی چپل؟''

وہ جب مہر کے پاؤں دبانے کے لئے پلنگ پر چڑھتی تھی تو چپل پائنتی کی طرف اتار دیتی تھی۔ اب یہی چپل فاخر کے رکے رہنے کا جواز بن گئی تھی۔

مہر نے ناقابل فہم آواز میں کچھ کہا۔

جواب میں فاخر بولا۔ ''مگر دادا...... وہ چپل...... کے بغیر کیسے جا سکتی ہے۔''

پھر مہر کی ناقابل فہم آواز (آواز میں بوکھلاہٹ کا عنصر تھا)

فاخر نے نہایت پریشان لہجے میں کہا۔ ''دادا...... آپ...... آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔ مم...... مجھے شانی کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

جواب میں پھر غوں غاں ابھری۔ غالباً مہر کہہ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے جھوٹ بول رہا ہے؟

فاخر کی آواز میں خوف اور غصے کی آمیزش بڑھ گئی۔ ''آپ جھوٹ نہیں بول رہے تو کیا میں بول رہا ہوں؟ شانی کہیں نہیں ہے۔ اس کی چپل یہاں پڑی ہے۔''

پھر مہر کی مبہم غوں غاں۔

فاخر نے ہیجانی لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''دادا! میں جانتا ہوں آپ نے...... آپ نے شانی کے ساتھ کچھ کیا ہے۔ کدھر ہے وہ...... اور وہ آپ کا اکبرا؟ وہ کہاں ہے؟ اکبرے...... اکبرے......'' فاخر آوازیں دینے لگا۔

پھر شاید اس نے مہر کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ''آپ پیچھے ہٹیں دادا۔ مجھے دیکھنے دیں، اکبرا کہاں ہے۔'' فاخر کا لہجہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔

مہر چنگھاڑا۔ اس کے الفاظ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے فاخر کے لئے راستہ چھوڑنے سے انکار کیا ہے اور اسے بری طرح ڈانٹ رہا ہے۔

یہ کشمکش قریباً ایک منٹ تک رہی اور پھر انتہا کو پہنچ گئی۔ مہر کی گھن گرج میں جنونی انداز تھا۔ غالباً وہ پوتے کو بے غیرتی کا طعنہ دے رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ شانی اس حویلی میں سزا بھگتنے کے لئے آئی تھی، عیش کرنے کے لئے نہیں۔ دوسری طرف فاخر نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔ ''دادا...... مجھے بندوق سے نہ ڈراؤ۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں جانتا ہوں، شانی یہاں ہے۔ ہٹ جاؤ......!''

شانی اکبرے کے پنجوں میں ایسے ہی تھی جیسے عقاب کے پنجوں میں چڑیا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا منہ اکبرے نے دونوں ہاتھوں سے بند کر رکھا تھا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ وقت ٹل جائے مگر یہ وقت ٹلنے والا نہیں تھا اور نہ ہی فاخر یہاں ٹلنے کے لئے آیا تھا۔ دادا پوتے میں کشمکش نقطہ عروج کو پہنچی پھر سیون ایم ایم رائفل کا خوفناک دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی فاخر کی کراہ ابھری۔ وہ گر پڑا تھا۔ مہر کی جنونی آواز فضا میں گونجی اور اس نے ایک فائر مزید کیا۔

اکبرے نے بوکھلاہٹ کے عالم میں شانی کو چھوڑا اور اپنے آقا مہر کی طرف لپکا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی حیرت زدہ آواز شانی کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ مہر سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ کیا ہو گیا چوہدری جی؟''

شانی تڑپ مچل رہی تھی۔ کسی طرح منہ کا کپڑا بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ شانی نے خود کو بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ ابھی دل سینے میں پھٹ جائے گا۔ اس نے آنکھوں پر بے پناہ جبر کر کے کھڑکی سے جھانکا۔ دوسری طرف قریباً تیس فٹ دور کمرے کے قالین پر فاخر کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ اس کی چھاتی اور پیٹ پر گہرے گھاؤ خون اگل رہے تھے۔ مہر کسی جابر حاکم کی طرح وہیل چیئر پر بیٹھا تھا...... رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

''فاخر...... فاخر......'' شانی کی دلدوز پکار رات کے سناٹے میں گونجی اور وہ شدید کرب کے عالم میں کھڑکی کی چوکھٹ سے سر ٹکرانے لگی۔ ''مجھے بھی مار دو...... میری جان بھی لے لو...... میری جان بھی لے لو......'' وہ فریادی لہجے میں چلائی۔ ان لمحوں میں موت اسے نعمت محسوس ہو رہی تھی۔

یکایک اس کی دھندلائی نگاہوں نے ایک ڈرامائی منظر دیکھا۔ اسے لگا جیسے یہ سب کچھ حقیقت میں نہیں ہو رہا۔ یہ کسی فلم یا ڈرامے کا منظر ہے۔ اس نے اکبرے کو بڑی پھرتی سے مہر کی رائفل سنبھالتے دیکھا پھر اسے کہیں آس پاس ہی رستم سیال کی دل دہلا دینے والی

چنگھاڑ سنائی دی۔ اس کی سماعت دھوکا نہیں کھا سکتی تھی، یہ اسی کی آواز تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ مہر کے کمرے کے عین سامنے رستم کسی سے گتھم گتھا ہے۔ اس سے پہلے کہ اکبرا رائفل سونت کر اپنے ساتھی کی مدد کو پہنچتا، مہر کے کمرے کی بیرونی کھڑکی زوردار دھماکے سے کھلی اور رستم جست لگاتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے لمبے سفید کرتے پر خون کے تازہ دھبے تھے اور ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ کودتے ہوئے اس کے سر سے نیلے کپڑے کا ڈھاٹا کھل گیا تھا اور اس کے گھنے طویل بال اس کے چہرے پر لہرانے لگے تھے۔

اکبرے نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی مگر اس کی اور رستم کی رفتار میں وہی فرق تھا جو زندگی اور موت میں ہوتا ہے۔ خون آلود خنجر کا وار اکبرے کی شہ رگ پر ہوا۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگوں میں سے خون فوارے کی طرح نکلا۔

جیسے یہ خون نہ ہو، مہر کی سپ گندل کا پُرآشوب زہر ہو۔ دوسرا وار ناف سے ذرا اوپر تھا۔ رستم نے وحشت کے عالم میں خنجر کو اوپر کی طرف کھینچا۔ اکبرے کا پیٹ چاک ہوا اور انتڑیاں لٹکنے لگیں۔ سر کی زوردار ٹکر سے اس نے اکبرے کو دور گوشے میں پھینک دیا۔ رائفل پھسل کر پلنگ کے نیچے چلی گئی تھی۔

مہر اپنی وہیل چیئر تیزی سے دھکیلتا ہوا اس کوٹھڑی نما کمرے کی طرف آیا جہاں شانی موجود تھی۔ اس کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ وہ رستم سے چھپنا چاہتا تھا یا رستم کے ہاتھوں مرنے سے پہلے کسی طرح شانی کو مارنا چاہتا تھا۔ بہر حال ان میں سے کوئی مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ وہ ابھی لمبوتری کوٹھڑی کی دہلیز پر ہی تھا کہ رستم نے بلائے ناگہانی کی طرح اسے عقب سے دبوچ لیا۔

اس دوران میں حویلی کے احاطے میں فائرنگ ہوتی رہی تھی۔ یکا یک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ یہی محسوس ہوا کہ ساری کی ساری حویلی بارود سے پُرزے ہو کر اُڑ گئی ہے اور نارپور میں بکھر گئی ہے۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا احاطے میں رستم کے ایک مسلح ساتھی اور حویلی کے محافظوں کے درمیان فائرنگ ہو رہی تھی۔ کسی ایک فریق کا چلایا ہوا برسٹ گودام میں رکھے ڈیزل کے ڈرموں میں لگا۔ یہاں مہر کے ٹریکٹروں، ٹیوب ویلوں اور تھریشروں کے لئے کم و بیش چار ہزار لیٹر ڈیزل آئل جمع تھا۔ اس ڈیزل میں دھماکوں سے شعلے بھڑکے اور ڈرم ماچس کی ڈبیوں کی طرح اُڑتے ہوئے گلی کوچوں میں بکھر گئے۔ اس کے ساتھ ہی پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

دھماکے کے فوراً بعد 200 لیٹر کا ایک جلتا ہوا ڈرم کھڑکی توڑ کر مہر کے وسیع کمرے میں آن گرا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا سامان دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ مہر اپنی وہیل چیئر پر تھا لیکن اس کی گردن رستم کے بازو کے شکنجے میں تھی۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں اب بھی قہر کے شعلے تھے۔ رستم نے وحشت کے عالم میں اس کے دل کے مقام پر خنجر گھونپا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے نکالا اور اس کے پیٹ اور سینے پر پے در پے وار کرنے لگا۔ شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ غوں غاں خرخر.....غوں غوں گھڑگھڑ... مہر کے منہ سے اب بھی قہرناک آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی خبیث روح اپنے مسکن کو چھوڑنے سے انکار کر رہی ہے مگر جب خون جسم سے فواروں کی صورت چھوٹ رہا ہو تو روح کو قفسِ عنصری خالی کرنا ہی پڑتا ہے۔

شانی نے نیم غشی کی مختصر کیفیت کے بعد آنکھیں کھولیں تو رستم خنجر سے اس کی بندشیں کاٹ رہا تھا۔ سامنے وہیل چیئر پر مہر کی لاش ''عداوت پرستی اور کینہ پروری'' کا انجام بن کر پڑی تھی۔ شانی اس کی لاش سے نگاہیں چراتی رستم کے ساتھ مہر کے کمرے میں آئی۔ ایک تہائی کمرہ آگ کی لپیٹ میں تھا۔ حدت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ شانی شوہر کے جسم سے لپٹ گئی۔ وہ بے حرکت تھا۔ سانس کی آمد و رفت بھی معدوم تھی۔ کمرے میں پھیلتی آگ فاخر کے پاؤں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شانی اپنے لہجے میں ہزار التجائیں سمیٹ کر بولی۔ ''رستم... انہیں بچاؤ۔ انہیں ہسپتال لے جاؤ۔''

رستم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر خون میں ڈوبے ہوئے بے جان فاخر کو کندھے پر لادا اور شانی کا ہاتھ تھام کر دھوئیں اور آگ سے باہر نکلا۔ پوری حویلی دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ آگ اتنی تیزی سے بھڑکی تھی کہ شاید کم ہی لوگوں کو جان بچانے کا موقع ملا تھا۔ سیاہ دھوئیں کے مرغولے قرب و جوار کو ڈھانپتے جا رہے تھے۔ رستم نے اپنے چہرے پر ڈھاٹا دوبارہ باندھ لیا تھا۔ وہ دونوں دھوئیں میں کھانستے اور آنسو بہاتے حویلی سے باہر آئے۔ نارپور میں قیامت کا سماں تھا۔ گاؤں کے لوگ بدحواسی میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چار قریبی مکانوں میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ شانی نے کچھ مویشیوں کو بھی زخمی حالت میں بھاگتے دیکھا۔ رستم، شانی کو لئے ایک بغلی گلی میں آیا۔ یہاں ایک جیپ موجود تھی۔ تینوں جیپ میں بیٹھے اور جیپ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

شانی رو رہی تھی اور اپنے بے حس و حرکت شوہر کو ہلاتی چلی جا رہی تھی۔ ''فاخر آنکھیں کھولیں۔ فاخر! خدا کے لئے آنکھیں کھولیں۔''

رستم نیم پختہ راستے پر جیپ کو طوفانی رفتار سے اُڑا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ شانی کو تسلی دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ گہری تاریکی میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک زخمی کو لے جا رہے ہیں یا ایک مُردہ شخص کو۔ قریباً تین میل آگے آنے کے بعد چھوٹی نہر کے پُل پر رستم کو ایک کھمبے کی روشنی دکھائی دی۔ روشنی کے عین سامنے پہنچ کر رستم نے جیپ کو تیزی سے بریک لگائے۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر وہ پچھلی نشست پر آیا جہاں نارپور کا چھوٹا چوہدری فاخر بے حرکت لیٹا تھا۔ سرکاری کھمبے کی روشنی اسے سر سے ناف تک روشن کر رہی تھی۔ رستم نے فاخر کے سینے سے کان لگا کر اس کی دھڑکن سنی پھر گردن کو چھو کر اس کی نبض ڈھونڈی۔ پلکوں کو اٹھا کر پتلیوں میں جھانکا... پھر ایک گہری آزردہ سانس لے کر سر جھکا لیا۔

''کیا ہے رستم.... ؟ کیا ہے؟'' شانی کربناک آواز میں کراہی۔

وہ خاموش رہا۔

''کیا ہے رستم؟ کیا... یہ نہیں رہے...... بولو کیا نہیں رہے... ؟''

وہ ہولے سے بولا۔ ''ہاں بی بی... یہ نہیں رہے۔''

''یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔'' شانی کی دلدوز پکار سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔ اس نے ایک بار پھر فاخر کو جھنجھوڑا۔ تب اس کے سینے سے چمٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ رستم نے اسے کندھوں سے تھاما اور سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆======☆======☆

نارپور سے قریباً سات میل آگے پولیس کے ایک ریٹائرڈ حوالدار کے ہاں انہوں نے پناہ لی۔ یہ شخص بھی رستم کے بااعتماد دوستوں میں سے تھا۔ فاخر کی لاش ان کے ساتھ تھی۔ رو رو کر شانی بے حال ہو رہی تھی۔ رات آخری پہر اس کی حالت میں معمولی بہتری ہوئی۔ شانی، رستم اور ان کے میزبان کے درمیان طویل مشورے کے بعد طے ہوا کہ فاخر کو اس طریقے سے نارپور روانہ کر دیا جائے کہ جسد خاکی پہنچانے والے کے متعلق کسی کو معلوم نہ ہو۔ فی الحال یہی ان سب کے لیے بہتر تھا۔

اپنے شریکِ حیات کو آنسوؤں کی موسلا دھار بارش کے دوران میں شانی نے اس کے گاؤں کی طرف رخصت کیا۔

یوں لگتا تھا کہ رو رو کر وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ رستم نے اسے نیند کی دوا دی۔ وہ پورے آٹھ پہر سوئی رہی۔ اگلے روز رات کو وہ جاگی۔ ستائیس اٹھائیس گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات جاگتی آنکھوں کے ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ ان کے بارے

میں سوچ کر ہی اس کا دل پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔

سامنے دیہاتی طرز کی گول تپائی پر دوپہر کا اخبار پڑا تھا۔ پہلے صفحے پر نارپور کی جلتی حویلی کی تصویر تھی۔ شعلے تھے اور سیاہ دھوئیں کے بلند و بالا مرغولے تھے۔ اس آگ میں یقیناً کچھ بے گناہ بھی خاکستر ہوئے تھے مگر گناہ گاروں کی تعداد زیادہ تھی۔ شانی نے تصور کی نگاہ سے دیکھا ان شعلوں میں بہت کچھ جل رہا تھا۔ قیمتی فرنیچر، بیش قیمت قالین، بلند و بالا منقش دروازے، مہر اور فاخر کے خونخوار پہرے دار، ان کے خون آشام کتے، شکاری عقاب، زہریلے سانپ اور سانپوں سے بڑھ کر زہریلا خود مہر اور اس کا وحشی غلام اکبرا۔ شانی نے تصور کی نگاہ سے سب کچھ دیکھا پھر بے ساختہ اس کی نگاہ خبر پر پھسلنے لگی۔ لکھا تھا۔ کل رات نارپور میں چوہدری مہر جی کی مشہور حویلی آگ سے خاکستر ہو گئی۔ اس واقعے میں چوہدری مہر، چھوٹے چوہدری فاخر اور ان کی چھوٹی بہو سمیت کم و بیش چوبیس افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ہلاک ہونے والوں میں زیادہ تعداد چوہدری مہر کے گارڈز اور ملازمین کی ہے۔

واقعات کے مطابق کل شب گیارہ بجے کے قریب نامعلوم مسلح افراد نے حویلی میں گھسنے کی کوشش کی۔ محافظوں اور مسلح افراد میں فائرنگ کا آزادانہ تبادلہ ہوا۔ حویلی کے ایک گودام میں ایک دن پہلے ڈیزل کی کھیپ پہنچی تھی اور اس وقت وہاں ڈرموں میں کم و بیش چار ہزار لیٹر ڈیزل موجود تھا۔ فائرنگ کے دوران میں اچانک گودام میں آگ بھڑک اٹھی۔ ساعت شکن دھماکے ہوئے اور آناً فاناً پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ آگ اتنی شدید تھی کہ بہت کم افراد کو باہر نکلنے کا موقع مل سکا۔ جلتے ہوئے تیل کے سبب حویلی کے چار پانچ نواحی مکانوں میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ مقامی آبادی نے اپنے طور پر آگ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن انہیں بُری طرح ناکامی ہوئی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اچانک بھڑکنے والی اس آگ میں حملہ آوروں میں سے بھی ایک یا دو افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ قریباً تمام لاشیں اس بُری طرح جل چکی ہیں کہ ان کی شناخت ناممکن ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ چھوٹے چوہدری فاخر مہر کی لاش حویلی سے قریباً تین سو گز دور کھیتوں سے ملی ہے۔ لاش علی الصبح دریافت ہوئی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ فائرنگ میں زخمی ہونے کے بعد انہوں نے حملہ آوروں سے جان بچانے کی کوشش کی لیکن کھیتوں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیا۔

خوش قسمتی سے سانحے کے وقت چوہدری مہر کی بڑی بہو اور ان کے دو بچے حویلی میں موجود نہیں تھے۔ مزید تفصیلات موصول ہو رہی ہیں۔

شانی نے ایک بار پھر زاروقطار رونا شروع کر دیا تھا۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، اس کی آہ وزاری میں شدت آتی گئی۔ مجبوراً رستم نے ایک بار پھر اسے نیند کی دوا دے دی۔ وہ اگلے روز سہ پہر کے وقت بیدار ہوئی۔ وہ چارپائی پر تھی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سرما کی سنہری دھوپ کھڑکی کی درزوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں رستم جائے نماز پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ وہ بالکل بے حرکت تھا۔

وہ بھی بے حرکت لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ اتنا بڑا سانحہ؟ اتنا بڑا واقعہ؟ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ موت کے جبڑوں سے زندہ نکل آئی ہے۔ وہ جب معمول کی مٹھی چاپی کرنے مہر کے کمرے میں داخل ہوئی تھی، اسے کیا پتا تھا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔ اب مہر نہیں تھا۔ اس کے بیشتر خونخوار غنڈے بھی نہیں تھے، وہ بھی نہیں تھا جس کی خواہش پوری کرنے کے لئے شانی نے چاندرات کو چوڑیاں پہنی تھیں اور ہاتھوں پر مہندی رچائی تھی۔ اور تو اور وہ خود بھی نہیں تھی۔ اخباری خبروں اور دنیا کی نظروں میں تو وہ بھی حویلی کے چوبیس مکینوں کے ساتھ ہی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔

وہ لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ مستقبل کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی دنیا میں واپس جا سکتی ہے؟ اور پھر ''اپنی دنیا'' تھی بھی کہاں؟ اب کون تھا اس کا پیچھے؟ کوئی نہیں تھا اور اگر کوئی تھا بھی..... تو اس تک پہنچنے کے لئے شانی کو نارپور والوں کی دشمنی کا زہریلا دریا پار کرنا تھا۔ نہیں نہیں وہ واپس نہیں جا سکتی۔ اس کے دل کے اندر سے یہ آواز ایک پکار بن کر ابھری۔ گزرے ہوئے واقعات چیختے چنگھاڑتے تصورات کا روپ دھار کر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ایک سوال رہ رہ کر اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ فاخر کے گولیاں لگنے کے بعد بالکل آخری لمحوں میں رستم اچانک وہاں کیسے پہنچ گیا۔ کیا اسے کسی نے خبر دی تھی یا کوئی اتفاق عین وقت پر اسے وہاں کھینچ لایا تھا۔ اگر کچھ دیر بھی رستم وہاں نہ پہنچا ہوتا تو یقیناً شانی بھی اس دنیا میں نہ ہوتی۔ شانی کو محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے عقاب کی سی جھپٹ کے ساتھ اسے بچایا ہے۔

باہر سے کسی نے رستم کو آواز دی اور وہ دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر جائے نماز سے اٹھ گیا۔ رستم کے باہر جانے کے بعد بھی شانی اپنی جگہ گم صم لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں ہولے ہولے برستی رہیں۔

اچانک ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شانی نے نیم غنودگی کے عالم میں دیکھا

کہ کوئی عورت ہاتھ میں گلاب اور گیندے کا گلدستہ لئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے یہ چھوٹا سا گلدستہ الماری کے اوپر شیشے کے بڑے گلاس میں رکھا اور شانی کی طرف مڑی۔ یہی وقت تھا جب شانی نے اس کی صورت دیکھی۔ شانی بُری طرح چونک گئی۔ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی کی دھند ایک دم ہی چھٹ گئی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ نگاہیں بدستور عورت کے چہرے پر تھیں۔ یہ عورت کوئی اور نہیں نگینہ تھی۔

نگینہ سے شانی کی پہلی اور آخری ملاقات عید سے چند روز بیشتر ہوئی تھی پھر فاخر آ گیا تھا اور نگینہ خوف زدہ انداز میں شانی کو الوداع کہہ کر چلی گئی تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس کے سامنے تھی۔ اس کی پیشانی اور ٹھوڑی پر چند روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے

نگینہ آنکھوں میں آنسو لے کر شانی سے لپٹ گئی اور کتنی ہی دیر تک سسکتی رہی۔ ''تم یہاں کیسے نگینہ؟'' شانی نے اشک بار لہجے میں پوچھا۔

نگینہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اس روز میں آپ کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی ناں۔ پر میں حویلی سے باہر نہیں جا سکی تھی۔''

''باہر نہیں جا سکی تھیں؟'' شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آہو چوہدرانی جی! گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے ہی وڈے چوہدری کے نوکروں نے مجھے روک لیا تھا۔ ان کو شک پڑ گیا تھا کہ میں کسی چکر میں یہاں آئی ہوں۔ وہ مجھے پکڑ کر کھچڑی داڑھی والے منشی رشید کے پاس لے گئے۔ منشی رشید نے بھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھا اور چوہدری مہر کے پاس لے گیا۔ چوہدری مہر نے کہا کہ اس کو ابھی حویلی میں رکھو اور پوچھ گچھ کرو۔

میں تین روز تک حویلی میں ہی رہی جی۔ وہ مجھے مارتے کوٹتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے۔ وہ میرے منہ سے کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ پر میں نے بھی اپنے سر کے سائیں کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لفظ بول کر نہیں دیا چوہدرانی جی! ایک لفنگے پہرے دار نے مجھے بے عزت کرنے کی دھمکی بھی دی، پر اللہ سوہنے کا شکر ہے کہ وہ دھمکی ہی رہی۔ نہیں تو نگینہ نے آپ مر جانا تھا اور اس کتے کی ٹانگیں بھی چیر دینا تھیں۔''

شانی نے یہ سب کچھ حیرت سے سنا۔ ''پھر تم وہاں سے نکلیں کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے تو آپ نے نکالا جی۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے شام کے بعد آپ کو مہر کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا جی... میں

بڑی دیر تک انتظار کرتی رہی کہ آپ باہر نکلیں گی۔ پر آپ تو نکلی ہی نہیں۔ میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ اماں حاجن سیانی کے صدقے اللہ سوہنے نے میرے دل میں ڈالا کہ آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرا شک ٹھیک نکل آیا۔ مجھے آپ کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ ایسے لگا کہ آپ کسی کو مدد کے لئے بلا رہی ہیں۔ ساتھ ہی میں نے ایک نوکرانی کو بھی دیکھا جو گھبرائی ہوئی مہر کے کمرے سے نکلی تھی۔

بس جی، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ...... سچے عشق کی دین ہے یا پھر اماں سیانی کا فیض ہے۔ اللہ سوہنے نے مجھے ہمت دی اور میں نے کچھ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے تین دن تو مجھ پر سخت پہرا رہا تھا پر چاند رات کو کوئی ایسی خاص نگرانی نہیں تھی۔ منشی رشید نے مجھ سے کہا تھا کہ عید کے دن مجھ کو چھوڑ دیں گے۔ پر میں ان کے چھوڑنے سے پہلے ہی حویلی سے نکل آئی۔ رکھوالی والے بڑے بڑے کتے ابھی بندھے ہوئے تھے۔ گیٹ پر پہرے دار باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے نکل کر گلی میں آگئی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتی پنڈ کے چھپڑ کی طرف چلی گئی۔ یہاں ایک تانگے والا کھڑا تھا۔ میں نے اس کی منت کی اور وہ مجھے سیدھا حاجی حیات خان کے ڈیرے پر لے گیا۔ حیات خان شہر گیا ہوا تھا۔ رستم ڈیرے کے برآمدے میں چادر تانے سو رہا تھا۔ میں نے اس کو جگایا اور بتایا کہ مہر کی حویلی میں چھوٹی چوہدرانی سخت مصیبت میں ہے۔ رستم نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا اور اپنی جیپ کی طرف دوڑ پڑا۔''

شانی سب کچھ خاموشی سے سن رہی تھی۔ آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ نگینہ خاموش ہوئی تو وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے کیوں بچایا تم لوگوں نے؟ مر جانے دیا ہوتا مجھ کو۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں چوہدرانی جی! آپ کو اللہ سوہنے نے بچایا ہے۔ وہ آپ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ اس لئے زندہ ہیں کہ یہ اللہ سوہنے کی مرضی ہے اور شاید......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی پھر ذرا ہمت کر کے بولی۔ ''اور شاید اس میں رستم کے پاک عشق کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ سچا عاشق ہے چوہدرانی جی۔ اماں سیانی کہتی تھیں وہ سچا عاشق ہے۔ ایسا عشق کیا نہیں جاتا خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق میں کچھ لیا نہیں جاتا بس دیا ہی جاتا ہے اور جب بندے کا دھیان لینے کی طرف نہیں ہوتا، اللہ سوہنے کا دھیان دینے کی طرف ہو جاتا ہے۔ دیکھیں اللہ سوہنے نے آپ کو جلتی بلتی حویلی کے اندر سے زندگی دی اور کس طرح دی۔ اماں سیانی کی ساری باتیں صحیح ہوتی ہیں۔''

شانی جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور جسم ہچکیوں سے ہل رہا

تھا۔

نگینہ...... اماں حاجن سیانی کی عقیدت مند...... شانی کے پاس بیٹھی رہی اور آہستہ آہستہ شانی کی پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کے چاندی کے کڑے کلائیوں میں گنگناتے رہے۔

''اچھا چوہدرانی جی! آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لئے چائے بنواتی ہوں۔''

شانی لیٹ گئی۔ وہ باہر چلی گئی۔

پندرہ بیس منٹ بعد پھر آہٹ ہوئی۔ اس مرتبہ اندر آنے والا رستم تھا۔ اس نے سمجھا کہ شاید شانی سو رہی ہے۔ وہ باہر جانے کے لئے پلٹا لیکن شانی کے جسم میں حرکت دیکھ کر رک گیا۔

''بی بی! آپ جاگ رہی ہیں؟''

''ہاں۔'' شانی نے غنودگی سے بوجھل آواز میں کہا۔

''اچھا، میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں۔''

شانی کے منع کرنے کے باوجود وہ باہر چلا گیا اور چائے لے آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی تھی۔ یقیناً یہ چوٹ حویلی کے خون ریز واقعات کی نشانیوں میں سے ایک تھی۔

شانی نے بڑی خاموشی کے ساتھ چائے پی۔ اس کے سر کا بھاری پن قدرے کم ہوگیا تھا۔ اس دوران میں رستم اس کے آس پاس ہی موجود رہا تھا۔ اس کا ''بی بی'' کہنے کا انداز وہی تھا جو شانی کے کانوں کے راستے روح میں اُترتا تھا اور اسے جھنجھوڑ دیتا تھا۔ وہ رستم کے اس انداز سے بچنا چاہتی تھی لیکن بچ نہیں سکتی تھی۔ پتا نہیں کہ رستم کا لہجہ کیا بھر دیتا تھا اس لفظ میں کہ یہ لفظ نہیں رہتا تھا، ایک دل گداز اور اشک بار کہانی بن جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد حوالدار کی بیوی آگئی۔ وہ ایک سمجھ دار گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ وہ شانی سے کھانا کھانے کا اصرار کرتی رہی، مگر شانی کو بالکل بھوک نہیں تھی۔

اسی دوران میں ایک اور ادھیڑ عمر عورت بھی اندر آگئی۔ وہ دیہاتی انداز میں سفید قمیص اور نیلا تہبند پہنے ہوئے تھی۔ اس کی گود میں ڈیڑھ دو سال کی پیاری سی بچی تھی۔ رو رو کر عورت کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ سے شانی کے سر پر بار بار پیار دیا اور چارپائی کے ساتھ ہی پیڑھی ڈال کر بیٹھ گئی۔

شانی نے حوالدار کی بیوی سے پوچھا ''یہ کون ہیں؟''

وہ بولی۔ ''یہ رستم کی رشتے دار ہیں۔ رستم کی خالہ زاد بہن کی ساس۔''

''بہت دکھی لگ رہی ہیں۔''

''چاند رات کو چوہدری مہر کی حویلی میں جو آگ لگی تھی اس میں ان کی بہو بھی جل گئی تھی۔'' حوالدار کی بیوی نے کہا۔

شانی کے چہرے پر غم کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ ''وہ وہاں کیسے گئی تھی؟''

ادھیڑ عمر عورت رونے لگی۔ حوالدار کی بیوی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ بولی۔ ''بس۔ اس نصیبوں جلی کی تقدیر وہاں لے گئی۔ خدا کا قہر ہوتا ہے۔ مہر اور اس کی حویلی ایسے ہی تو کوئلہ نہیں بن گئی۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' شانی نے کہا۔

''ہمارا اندازہ تو یہی ہے جی کہ اس نصیبوں ماری کو مہر کے غنڈوں نے اغوا کر لیا تھا۔'' ادھیڑ عمر عورت نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہم چار دن تک پاگلوں کی طرح اس کو ڈھونڈتے رہے۔ عید کے دن حویلی سے نکلنے والی لاشوں سے اس کی لاش نکلی۔ میرے پتر نے اسے ہاتھوں کے کڑوں سے پہچانا۔''

یکایک شانی کو اپنے جسم میں تیز سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا نام تھا آپ کی بہو کا؟''

''نگینہ۔ ہم اسے نگو کہتے تھے۔ وہ بہو نہیں تھی جی، دھی تھی میری۔'' عورت نے روتے ہوئے کہا۔

شانی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ وہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھتی چلی گئی پھر اس کے ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی آواز نکلی۔ ''آپ..... آپ کس نگینہ کی بات کر رہی ہیں؟ وہ جو..... رستم کی خالہ زاد ہے؟''

''آہو چوہدرانی جی! آپ جانتی تھیں اس کو؟'' ادھیڑ عمر عورت قدرے حیرت سے بولی۔

''ہاں..... نن..... نہیں.....'' شانی ہکلا کر چپ ہو گئی۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے لگا کہ خواب آور دواؤں کا اثر ابھی ذہن پر باقی ہے۔ وہ پتھرائی نظروں سے اردگرد دیکھنے لگی۔ ابھی قریباً ایک گھنٹہ پہلے نگینہ یہاں اس کے سامنے موجود تھی اور اب یہ دونوں عورتیں کہہ رہی تھیں کہ وہ حویلی میں مر گئی ہے۔ اس نے کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا تھا یا یہ عورتیں بے خبری کے اندھیرے میں تھیں۔

شانی کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

ادھیڑ عمر عورت شانی کی حالت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔ ''یہ میری گود..... میں اس بھشتن کی چھوٹی دھی ہے جی۔ اس سے ایک سال بڑا ایک پتر ہے۔ وہ اپنے پیو کے پاس ہے۔ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ پیو اسے بہلانے کے لئے لے گیا ہے۔''

یہ سب کیا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟ شانی نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو لگا کہ اندر کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ نگینہ کی شبیہ تصور میں ابھر آئی۔ وہ اپنے چوڑے رخساروں اور سوئی سوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک اجلی سی خوبصورت روشنی تھی۔ کہیں پاس کے مکان میں ریڈیو بج رہا تھا۔ آواز شانی کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔

بھلیا اساں مرنا ناہیں۔
گور پیا کوئی ہور..... گور پیا کوئی ہور

(ہم مر کر بھی زندہ رہیں گے۔ قبر میں ہماری جگہ کوئی اور ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہے)

شانی نے گھٹی ہوئی آواز میں حوالدار کی بیوی کو مخاطب کیا اور بولی۔ ''رستم کہاں ہے؟''

''وہ باہر گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتا ہے۔ تمہیں کچھ چاہئے تو نہیں دھی رانی؟''

''نن..... نہیں..... میں بس ذرا لیٹنا چاہتی ہوں۔''

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے جھوٹ بولا۔ اس کا سر بے طرح چکرا رہا تھا۔

دونوں عورتیں باہر نکل گئیں۔ شانی پسینے میں تر سوچنے لگی۔ یہ کیا ہوا ہے؟ کیا واقعی اس نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہے۔ اس کے دماغ پر ابھی تک ٹرینکولائزر کی غنودگی موجود تھی۔ کیا اس غنودگی نے اسے کوئی انہونا منظر دکھایا ہے۔

پھر یکایک اس کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ دل سینے میں یکبارگی پھڑک کر رہ گیا۔

کمرے کے دائیں گوشے میں الماری کے اوپر شیشے کے گلاس میں گلاب اور گیندے کا چھوٹا سا گلدستہ موجود تھا۔

''اوہ میرے خدا.....!'' اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بے دم سی ہو کر لیٹ گئی۔

☆======☆======☆

رات کا وقت تھا۔ کمرے میں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کھیتوں سے آوارہ کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شاید کوئی راہ گیر گھڑ سوار ہوگا جس کے پیچھے یہ خدائی فوجدار بھاگ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کا شور معدوم ہوگیا...... خاموشی چھا گئی۔ بس دور کہیں کسی کاشتکار کے ڈیرے پر ڈیزل انجن کی کوکو سنائی دیتی رہی۔ کمرے میں شانی اور رستم کے سوا کوئی نہیں تھا۔

شانی ادھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ آنکھوں میں تحیر اور الجھن کی بہت گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”رستم! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں؟“

”پوچھیں بی بی۔“

”چاندرات کو حویلی میں آگ لگنے سے پہلے تم اچانک وہاں کیسے پہنچ گئے۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ وہاں یہ سب کچھ چل رہا ہے؟“

رستم نے عجیب نظروں سے شانی کو دیکھا پھر اس نے سر جھکا لیا۔ کالے بالوں میں لمبی لٹیں اس کے رخساروں پر جھولنے لگیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ ان لمحوں میں وہ سچ مچ کوئی جوگی نظر آنے لگا تھا۔

کھڑکی سے باہر نیم اور بیری کے سائے پُراسرار انداز میں لہرا رہے تھے۔ رستم نے حسب عادت زمین پر نگاہیں جمائے ہوئے پوچھا۔ ”بی بی! آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

شانی نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ، ایک ایسا واقعہ ہوا ہے کہ...... میں بالکل چکرا گئی ہوں۔ مم...... میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔“

رستم سوالیہ نظروں سے شانی کا چہرہ تک رہا تھا۔

”رستم! کیا تمہیں انہونی باتوں پر یقین ہے؟ کیا تم...... میرا مطلب ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بندہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ سکتا ہے یا کوئی ایسی حقیقت جو خواب کی طرح لگے؟“

رستم کے چہرے کی ہیجانی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اس نے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں شانی کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بی بی! کہیں...... وہ...... آپ کے پاس بھی تو نہیں آئی؟“

”کک...... کون؟“

”نگینہ!“

شانی کانپتی آواز میں بولی۔ ”ہاں...... ہاں آئی تھی۔ مم...... میں یہی تو تم سے پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ وہ کہاں ہے...... وہ...... حوالدار کی بیوی اور دوسری عورت تو کہہ رہی ہے کہ...... وہ مرگئی ہے لیکن وہ تو یہاں آئی تھی...... یہاں......“ شانی نے زور دے کر کہا۔

یوں لگا جیسے رستم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”بی بی! ہماری اماں سیانی کہا کرتی تھیں۔ کچھ باتوں کو پہلے ماننا پڑتا ہے، ان کی سمجھ بعد میں آتی ہے۔ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو ہماری عقل مت سے بالکل باہر ہے۔“

شانی کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ ”رستم! کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ کیا...... ؟“

”ہاں بی بی! نگینہ مرچکی ہے۔ میں نے خود دیکھی ہے اس کی لاش...... لیکن میں نے اسے زندہ بھی دیکھا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شانی دہشت سے کراہی۔

”جس طرح وہ آپ سے ملی ہے، اسی طرح مجھ سے بھی ملی تھی اور جس وقت وہ ملی تھی، اسے مرے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوچکا تھا۔“

شانی کا منہ کھلا تھا۔ وہ رستم کی جانب دیکھتی چلی گئی۔ رستم بولا۔ ”اب سے پہلے میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا تو کوئی مانتا نہیں۔ میرا مذاق اُڑایا جاتا لیکن میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ آپ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا۔ وہ آپ سے بھی ملی ہے، یہ بات ماننے والی نہیں لیکن یہ بات ہوئی ہے۔“

شانی ساکت بیٹھی رہی۔ کھڑکی سے باہر نیم اور بیری کے پیڑوں کے سائے جھومتے رہے۔ شانی نے اپنے جسم کے گرد لپٹی چادر کو مضبوطی سے تھام لیا، جیسے اس کا سہارا لینا چاہتی ہو۔ رستم نے کہنا شروع کیا۔ ”چاندرات کو میں حیات خان کے ڈیرے پر تھا۔ حیات خان لاہور گیا ہوا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں سوگیا۔ اچانک کسی نے مجھے ہلا کر جگایا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا، وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں اس کا وہ تعویذ چمک رہا تھا جو کچھ دن پہلے اماں سیانی نے اسے دیا تھا۔ میں نے کہا نگینہ تو یہاں؟“

وہ بولی۔ ”میرے پاس سوال جواب کا وقت نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔ چھوٹی چوہدرانی

کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں اس کے ساتھ جیپ میں آبیٹھا اور جیپ پوری رفتار سے حویلی کی طرف دوڑا دی۔ میرا گونگا ساتھی مختار بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ راستے میں مجھے بتاتی رہی کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کس طرح چوڑیاں بیچنے والی کا روپ بدل کر حویلی میں آپ کو دیکھنے پہنچی تھی لیکن پھر منشی رشید کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے کہا کہ مہر چھوٹی چوہدرانی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس نے اپنے کانوں سے مہر اور اکبرے کی باتیں سنی ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ چھوٹی چوہدرانی کو اس زہریلے سانپ سے ڈسوا دیا جائے جو مہر کی پھلواری میں رہتا ہے۔ بعد میں وہ کہہ دیں گے کہ چھوٹی چوہدرانی بار بار منع کرنے کے بعد بھی پھلواری میں گئی تھی۔ جہاں اسے شیش ناگ نے کاٹ لیا۔ ان کا یہ منصوبہ کافی پرانا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹی چوہدرانی پر بے وجہ پھلواری میں جانے کا الزام لگاتے رہے ہیں۔

"میں پوری رفتار سے گاڑی چلاتا رہا۔ ہم صرف آٹھ دس منٹ کے اندر نارپور میں تھے۔ جس وقت میں حویلی میں پہنچا اور جیپ سے نکل کر حویلی کے مین گیٹ کی طرف بھاگا، مجھے نگینہ کہیں نظر نہیں آئی۔ مجھے یہی لگا کہ وہ ہم سے پہلے جیپ سے نکل گئی تھی۔ گونگے مختار نے گیٹ پر کھڑے دو بندوں کو گولیاں ماریں۔ میں خنجر لے کے اندر گھس گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو پتا ہی ہے۔"

رستم نے چند لمحے توقف کیا پھر گھمبیر لہجے میں کہنے لگا۔ "میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آیا بی بی۔ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان سے تو یہ پتا چلا ہے کہ...... نگینہ کو اسی وقت گولی لگ گئی تھی جب وہ میری طرف آنے کے لئے حویلی سے بھاگ رہی تھی۔ ابھی وہ مین گیٹ سے نکلی نہیں تھی کہ پہرے داروں نے اسے دیکھ لیا۔ انہوں نے اسے للکارا اور رکنے کا کہا۔ وہ نہیں رکی۔ پہرے دار انڑے نے پیچھے سے گولی چلا دی۔ یہ گولی اس کا سینہ پھاڑ کر نکل گئی اس کی جلی ہوئی لاش بھی حویلی کے اندر سے ہی ملی ہے۔"

رستم چپ ہوگیا۔ رات بھی خاموش تھی اور رات کے سناٹے میں ہر شے بھی جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلی گئی تھی۔ تاریکی کے پیش منظر میں کھڑکی کے پٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

شانی کے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ اماں حاجن۔ یانی کے بقول عاشق صادق تھا...... اور شانی خود سر جھکائے حیرت کے سمندر میں غرق تھی۔

☆======☆======☆

تیسرے روز رات کے وقت حوالدار کے گھر میں ہی شانی اور رستم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

شانی نے نہا کر حوالدار کی بیوی کے کپڑے پہنے تھے۔ یہ کپڑے اسے کافی کھلے تھے۔ ... پھر بھی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کے بال بغیر کنگھی کے بھی سنورے سنورے نظر آتے تھے اور جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک کلائی پر چوڑی لگنے کے زخم تھے جواب مندمل ہو رہے تھے۔ دوسری کلائی پر ایک نیل کا مدھم نشان اب بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ نشان مہر کے حقے کی بے رحم نے کا تھا۔ رستم نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں نسواری گرگابی تھی۔ اس کی داڑھی کے بال نرم اور چمکیلے تھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

ماضی کے چند دن جیسے ایک طلسمی دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس دھندلکے میں لپٹا ہوا وہ منظر...... وہ بھیانک منظر شانی کو بار بار یاد آ رہا تھا جب حویلی کے اندر وہ اکبرے کی گرفت میں تھی اور کوبرا سانپ کا منہ اس کے جسم سے چند انچ کے فاصلے پر تھا تو کیا واقعی اس کوبرے کا زہر اس کے اندر اتارا جانا تھا۔ کیا واقعی ایسا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اسے سانپ سے ڈسوا کر پھلواری میں پھینک دیا جاتا تو فاخر اور بھابو وغیرہ کو یہ باور کرانا بہت آسان تھا کہ وہ پھلواری میں گھسنے کی وجہ سے سانپ کا شکار ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال کے لئے "زمین" تو وہ لوگ پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ مہر کم از کم دو بار شانی پر پھلواری میں گھسنے کا الزام لگا چکا تھا......

کوبرے کی دُم کی خوفناک سرسراہٹ اور اس کے کھلے جبڑے کا تصور شانی کو پسینے میں تر بتر کرنے لگا۔ اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔

رستم نے کھنکار کر شانی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ "بی بی! ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ پولیس مہر کی حویلی پر حملہ کرنے والوں کو ڈھونڈ رہی ہے اور میں تو پہلے ہی نارپور والوں کی نظر میں بہت کھٹکتا ہوں۔"

"پھر کیا پروگرام ہے تمہارا؟" شانی نے پوچھا۔

"میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ آزاد علاقے میں کئی دوست ہیں۔ چار چھ ماہ وہاں گزار دوں گا، پھر آئندہ کا سوچوں گا۔ مجھے اصل فکر آپ کی ہے۔"

"میری فکر نہ کرو۔"

"لیکن آپ کہاں جائیں گی؟"

"ابھی تم مجھے کسی طرح گجرات پہنچا دو۔ وہاں شاہد ٹاؤن میں میری ایک رشتے دار ہیں۔ دو تین دن وہاں رہوں گی۔ اس دوران میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر آزردگی سے بولا۔ "میں آپ کے بارے میں بہت سوچتا رہوں گا۔"

"کیوں سوچتے رہو گے۔" شانی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاید۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔" رستم کے لہجے میں بے ساختگی تھی۔

چند سیکنڈ تک گمبھیر خاموشی طاری رہی تب شانی نے کہا۔ "رستم! تم سے ایک بات کہوں۔"

"ہاں بی بی۔"

"تم بہت عجیب شخص ہو۔"

"مجھ سے عجیب میری سوچیں ہیں۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولا۔

"تم جانتے ہو ایسی سوچوں کا انجام مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔"

"میں سب جانتا ہوں..... لیکن پھر بھی مجبور ہوں۔ اتنا مجبور کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ رواں لہجے میں کہہ گیا۔

شانی کی آنکھوں کے نازک کنارے سُرخ ہو گئے۔ "تم..... تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی....." وہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔

شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی بات کہنے جا رہی ہے۔ اگر وہ فقرہ مکمل کر دیتی۔ کہہ دیتی کہ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو تو یہ اس کی شدید اندرونی بے کلی کا اظہار ہوتا جس کا اظہار کسی طور بھی مناسب نہیں تھا لیکن کیا وہ واقعی اس فقرے کو چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک نظر رستم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نہیں..... وہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ادھوری بات خود بخود مکمل ہو گئی تھی اور اس مکمل بات کا عکس رستم کے چہرے پر نظر آنے لگا تھا۔ ہاں..... بات مکمل ہو گئی تھی اور ثبوت یہ تھا کہ رستم کی دونوں پلکوں پر دو آنسو لرزنے لگے تھے۔

وہ تیزی سے مڑی اور آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ کوئی قوت بے پناہ کشش سے اسے کھینچ رہی تھی۔ یہ نادیدہ کشش کیا تھی؟ اس کا نام کیا تھا؟ اس کی ماہیت کیا تھی؟ اس کا وجود کیوں تھا؟ ان گنت سوالات تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ لوگ حوالدار کے گاؤں سے گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ حوالدار کے چھوٹے بھائی کے پاس ایک سوزوکی پک اَپ موجود تھی جس پر وہ گاؤں سے دودھ شہر تک پہنچاتا تھا۔ حوالدار ولیلہ نے بھائی سے یہ پک اَپ مستعار لے لی۔ اب وہ انہیں اس پک اَپ پر لے کر جا رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق شانی کو گجرات اُترنا تھا، جب کہ رستم کو سرائے عالمگیر پہنچنا تھا۔ سرائے عالمگیر سے اسے بذریعہ بس پشاور روانہ ہونا تھا۔ پشاور سے آگے کرم ایجنسی کا آزاد علاقہ اس کی منزل تھا۔

حوالدار رضا ولیلہ نے پک اَپ کے پچھلے حصے میں کچھ گھریلو سامان اس طرح سیٹ کر دیا تھا کہ بظاہر پک اَپ کے عقب میں صرف سامان ہی نظر آ رہا تھا۔ اس سامان سے آگے قریباً ڈھائی فٹ چوڑی ساڑھے چار فٹ لمبی جگہ خالی تھی۔ یہاں ایک گدے پر شانی اور رستم بیٹھے تھے۔

وہ لوگ رات کو قریباً گیارہ بجے روانہ ہوئے۔ پک اَپ کی حالت اچھی تھی۔ پہلے کچے راستے کا سفر، پھر نیم پختہ سفر اور آخر میں وہ پکی سڑک پر آ گئے جو ایک گھنٹے کے اندر انہیں گوجرانوالہ پہنچانے والی تھی۔

دونوں مکمل خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے لیکن ان کے ذہن خاموش نہیں تھے۔ وہ اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ ماضی قریب کے اندوہناک واقعات ایک فلم کی طرح شانی کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کتنا کچھ ہو گیا تھا اور کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ اس کی شادی ہوئی، اس کے پیارے چاچا مشتاق انتقام کی بھینٹ چڑھے۔ اس کا جان سے پیارا بھائی ہمیشہ کے لئے جدا ہوا، پھر باپ بھی جدا ہو گیا اور اب وہ بھی نہیں تھے جنہوں نے شانی کی زندگی کو زہر آلود کیا تھا۔ فاخر اپنے کردار پر پشیمان ہونے کے بعد اور خود کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے بعد بھی مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکا تھا اور مہر جو انسان کے روپ میں ایک سانپ تھا، وہ بھی اپنے سنپولیوں سمیت خاکستر ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ کچھ سانپ اپنے بچوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ شاید مہر بھی اسی نسل کا سانپ تھا۔ دشمنی کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا کہ اس نے اپنے پوتے کو بھی انتقام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا اور اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔

فاخر کے آخری دن شانی کو یاد تھے۔ شانی پر ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑنے کے بعد فاخر کی [illegible]ت اس کے اندر سے نمودار ہوئی تھی۔ شانی کی عاجزی، ثابت قدمی اور نیم معصوم قوت [illegible]ت نے فاخر جیسے پتھر میں گداز پیدا کر دیا تھا اور اسے جھکنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ شانی سے

سچے التفات کے لئے یوں تڑپا تھا کہ اس کی ساری آن بان شانی کے قدموں میں نچھاور ہوگئی تھی۔

ہاں نار پور جیت کر بھی ہار گیا تھا اور رنگ والی ہار کر بھی جیت گئی تھی۔ شانی ان واقعات کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رستے رہے۔ تب اس کا دھیان ایک بار پھر نگینہ کی طرف چلا گیا۔ نگینہ کا خیال آتے ہی اسرار اور تحیر کی ایک ناقابلِ بیان لہر شانی کے رگ و پے میں پھیل جاتی تھی۔ اسے اس اسرار کا ہر ہر لمحہ یاد تھا۔ وہ کیا معمہ تھا؟ وہ کیا پہیلی تھی؟ وہ کئی دن گزرنے کے باوجود سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ زیادہ سوچتی تھی تو ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر حوالدار کی بیوی یا رستم کے پاس چلی جاتی تھی۔ ایسے میں اس کا دل بے پناہ تیزی سے دھڑکتا تھا۔

کیا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہی ''جاگتا خواب'' رستم کو کیوں نظر آیا تھا؟ وہ جس حلیے اور جس انداز میں رستم کو دکھائی دی، بعینہٖ اسی حلیے اور انداز میں شانی سے ملی۔ اس نے جو باتیں رستم سے کیں۔ انہی باتوں کا عکس شانی کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں نظر آیا۔

بے شک جب شانی نے اسے دیکھا شانی غنودگی میں تھی۔ رستم نے بھی اسے نیند سے بیدار ہو کر غنودگی کی حالت میں دیکھا تھا لیکن رستم کی غنودگی تادیر نہیں رہی تھی۔ وہ تو نگینہ کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا، کئی میل کا سفر کر کے نار پور پہنچا تھا۔ اس دوران میں وہ اس کے عقب میں بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔

شانی ناسمجھ بچی نہیں تھی۔ وہ حقیقت اور واہمے کا فرق جانتی تھی۔ وہ خوابیدہ کیفیت میں ضرور تھی مگر اس کے حواس تو مختل نہیں تھے، وہ دیوانگی کا شکار بھی نہیں تھی، وہ جانتی تھی اس نے نگینہ کو دیکھا ہے۔ اس کا لمس محسوس کیا ہے اور اس سے باتیں کی ہیں...... اور یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ اس وقت ہوا ہے جب نگینہ کو مرے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔

رستم کی آواز نے شانی کو پریشان خیالوں سے چونکایا۔ وہ پک اَپ کے اندر اس سے صرف ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ ''بی بی! ہم گجرات پہنچنے والے ہیں۔''

شانی چونک گئی۔ ایک دم اسے جھٹکا سا لگا۔ سوچوں میں ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ دوراہا قریب آ رہا تھا جہاں سے انہیں جدا ہو جانا تھا پھر شاید زندگی میں کبھی ملاقات ہونا تھی یا نہیں۔

شانی کچھ دیر سوچتی رہی۔ تب اس نے کوشش کر کے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ اور سکون کی

کیفیت پیدا کی اور بولی۔ ''رستم میری ایک بات مانو گے؟''

''بی بی! آپ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔''

''تم شادی کر لینا۔'' شانی نے اچانک کہا۔

رستم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اندھیرے کے باوجود شانی کو لگا کہ رستم کا سارا جسم سرتا پا کانپ گیا ہے۔

چند لمحے کے توقف سے اس کی آواز ابھری۔ ''بی بی! اتنی کڑی سزا کیوں دے رہی ہیں مجھے؟ میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں۔ مانگنا تو دور کی بات ہے، میں نے تو آپ سے کبھی کوئی امید بھی نہیں لگائی۔ امید تو وہاں ہوتی ہے جہاں خواہش ہوتی ہے۔ میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو بس اسی طرح رہنا چاہتا ہوں جس طرح ہوں۔''

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی باقی کی زندگی خود کو تمہارا گناہ گار سمجھتی رہوں۔ یہ سوچتی رہوں کہ میری وجہ سے کوئی اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ اس کے موتیوں سے دانت نیم تاریکی میں چمک گئے۔ ''بی بی! آپ اسے زندگی برباد کرنا سمجھتی ہیں۔ آپ تو بہت سمجھ دار ہیں بی بی! آپ ایسی بات کیوں کر رہی ہیں؟ میری زندگی برباد نہیں ہے۔ یقین کریں میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ میرے دل کے اندر آپ کی ذات کی وجہ سے جو روشنی پیدا ہوئی ہے، وہ دنیا کی قیمتی ترین شے ہے۔''

''نہیں رستم! تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔ تمہیں خود پتا نہیں کیا کر رہے ہو۔ تم ساری زندگی کانٹوں پر گزارنا چاہتے ہو، کس لئے...... ؟ کسی صلے کی تمنا کے بغیر اتنی لمبی اذیت کوئی نہیں جھیل سکتا۔ تمہیں پتا ہو یا نہ ہو پر صلے کی تمنا تمہارے اندر کہیں گہرائی میں ضرور ہوگی۔ میں اس تمنا کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ میں اس خیال کے ساتھ نہیں جی سکتی کہ کوئی میری وجہ سے تباہ ہے۔'' شانی کے لہجے میں وہی فطری محبت بول رہی تھی جو کسی ذی روح کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یکایک رستم کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''بی بی! آپ اپنے اور میرے تعلق کی توہین کر رہی ہیں۔ آپ نہیں سمجھتیں کہ آپ کے لئے میرے اندر کیا ہے۔ آپ بالکل نہیں سمجھتیں۔ اگر...... اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں آپ سے سچا اور پاک عشق کرتا ہوں تو یہ ایک گھسا پٹا لفظ ہوگا۔ میرے اندر جو کچھ ہے وہ ان لفظوں سے بہت اونچا ہے...... میں آپ کو کیسے بتاؤں...... کس طرح بتاؤں کہ میں آپ کے بغیر بھی اتنا ہی خوش ہوں جتنا آپ کے

ساتھ ہوسکتا ہوں۔'' آخری لفظ کہتے کہتے رستم کے لہجے میں قرنوں کی لاچاری اور بے بسی سمٹ آئی۔

شانی نے بے ساختہ، اپنے سامنے بیٹھے انوکھے شخص کو دیکھا۔ اس کے ''کم گوشت'' چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ جیسے سونا کسی بھٹی میں پک پک کر کندن ہوگیا ہو۔ ان لمحوں میں اسے لگا کہ وہ اس شخص کو ہزار ہا سال سے جانتی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو، اس کی ایک ایک ادا کو پہچانتی ہے۔ کون تھا یہ شخص؟ شانی کے اباجی کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی شخص کو دیکھ کر ہمیں لگتا ہے کہ اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ بہت اچھی طرح جانا ہوا ہے۔ حالانکہ ہم اس سے پہلی بار مل رہے ہوتے ہیں۔ پتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم سب عالمِ ارواح میں تھے۔ یہ اسی عالم کی شناسائیاں ہیں جو ہمیں یہاں نظر آتی ہیں۔

تو کیا اس ہچکولے کھاتی پک اَپ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص بھی اسی عالمِ ارواح کی شناسائی ہے؟ شانی نے عجیب کرب کے عالم میں سوچا۔

اچانک پک اَپ ایک دھچکے سے رک گئی۔ یہ جی ٹی روڈ تھی۔ آگے پیچھے تاریکی تھی۔ بس گاڑیوں کی روشنیاں تھیں جو آہستہ آہستہ قریب آتی تھیں اور پھر لپک کر ان کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔

''کیا ہوا رضا؟'' رستم نے پکار کر پوچھا۔

''لگتا ہے کہ بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔'' اگلے کیبن سے حوالدار رضا کی آواز آئی۔

''سیلف مار کر دیکھو۔''

''اونہیں رستم بھائی۔ اگر ٹائمنگ بیلٹ ہوئی تو انجن کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔''

''نہیں۔ ٹائمنگ بیلٹ نہیں ہے۔'' رستم نے یقین سے کہا۔ ''تم سیلف تو مارو۔''

رضا نے دو چار دفعہ سیلف مارا لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ مجبوراً رستم کو سامان ہٹا کر باہر نکلنا پڑا۔ شانی وہیں بیٹھی رہی۔ پک اَپ کے اگلے حصے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ رستم اور رضا خرابی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے پھر وہ دونوں پک اَپ کو دھکیل کر نیچے نشیب میں لے گئے۔ پک اَپ درختوں کے درمیان پہنچ کر رک گئی۔ سڑک اب قدرے بلندی پر چالیس پچاس گز دور نظر آ رہی تھی۔

یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ رستم نے شانی کو بتایا کہ پک اَپ خراب ہوگئی ہے۔ رضا بس پر بیٹھ کر مکینک کو لینے جا رہا ہے۔

''اوہ خدایا۔ کتنی دیر لگے گی۔'' شانی نے کہا۔

''یہ تو مکینک کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔''

''ایک ڈیڑھ گھنٹہ۔'' شانی نے پوچھا۔

''شاید......یا شاید اس سے زیادہ۔ لگتا ہے قدرت کو ہمارا تھوڑا سا ساتھ اور منظور ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''میں ادھر باہر ہی بیٹھتا ہوں۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ لیٹنے کی کوشش کریں۔''

''نہیں۔ میں بھی باہر ہی آجاتی ہوں۔'' شانی نے کہا۔

پتا نہیں، کیا بات تھی۔ نگینہ والے واقعے کے بعد سے اسے تنہائی اور تاریکی ڈرانے لگی تھی۔ اس نے کبھی خلافِ عقل باتوں پر یقین نہیں کیا۔ اس کی شخصیت میں غیر معمولی اعتماد و استحکام تھا۔ اپنے خاندان میں وہ باہمت مشہور تھی اور اس کی ہمت میں یقیناً اب بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن یہ ''واردِ خوف'' بھی اپنی جگہ حقیقت تھا۔

رستم نے سامان ہٹانے میں شانی کی مدد کی اور وہ رکوع کے بل جھک کر پک اَپ سے باہر نکل آئی۔ دونوں پک اَپ کے قریب ہی ہموار گھاس پر بیٹھ گئے۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور اس کے عکس میں کچھ فاصلے پر ایک وسیع پانی جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ چناب ہے بی بی۔''

مختصر جواب کے بعد رستم خاموش ہوگیا۔ شانی بھی خاموش تھی۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ قریباً دو سو گز دور چناب بھی خاموشی میں ان کا شریک رہا اور بے آواز بہتا رہا۔ بلندی پر جی ٹی روڈ جاگ رہی تھی۔ گاڑیوں کے تیز رفتار ٹائر تارکول پر رگڑ کھا کر عجب ڈراؤنی آواز پیدا کرتے تھے۔

خاموشی طویل ہوگئی تو شانی کو الجھن ہونے لگی۔ ''کوئی...... بات کرو رستم!''

رستم نے گہری سانس لے کر سامنے چناب کی طرف دیکھا اور کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''بی بی! یہ پانی سچی محبتوں کا گواہ ہے۔ سچی محبتیں جن کا انجام وچھوڑا ہوتا ہے۔ اسی پانی میں سوہنی اور مہینوال ڈوبے تھے ناں۔ شاید انہی کیکروں میں کہیں مہینوال کی جھونپڑی ہوگی۔ شاید رات کا ایسا ہی پہر ہوتا ہوگا جب سوہنی گھڑے پر تیرنے کے لئے نکلتی تھی۔''

رستم کی بات نے ایک دم ہی اردگرد کا مفہوم بدل دیا۔ چاندنی میں چمکتا چناب محبت کا دریا بن گیا۔ شانی کی سماعت سے سوہنی کی آواز ٹکرانے لگی۔ مہینوال کی سرگوشیاں اس کے

کانوں میں گونجنے لگیں۔ کچھ انوکھی سی کیفیت محسوس کی اس نے۔

وہ بولی۔ ''رستم! سچی محبتوں کی کہانیاں میں نے بھی پڑھی اور سنی ہیں۔ ان کا انجام جدائی ہی کیوں ہوتا ہے؟''

''بس بی بی! یہ قدرت کے کام ہیں۔ کہتے ہیں کہ جدائی سے عشق اور عاشق ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں۔''

''کیا تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟''

''میرے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے بی بی۔ میں تو بس اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ میں نے...... کسی سے سچا اور پاک عشق کیا ہے۔''

''کیا سچا اور پاک عشق وہ ہوتا ہے جس میں پیار کرنے والے ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ کبھی ملتے نہیں؟''

''نہیں بی بی! اماں سیانی کہتی تھی، سچا اور پاک عشق وہ ہوتا ہے جس میں جدائی اور ملاپ کا مطلب ایک ہی ہو۔ نہ ملنے سے محبت کم ہو، نہ وچھڑنے سے کم ہو۔ اماں سیانی کہتی تھی سچے عاشق ویسے تو ایک ہوتے نہیں لیکن اگر کبھی ہو جائیں تو ایک ہو کر بھی عاشق ہی رہتے ہیں۔ اگر ہیر رانجھا مل بھی جاتے تو حیاتی کی آخری سانس تک ہیر رانجھا ہی رہتے۔ وہ کہتی تھی پیار کرنے والے کا کام بس یہ ہوتا ہے کہ وہ پیار کرتا جائے۔ میل اور وچھوڑے (جدائی) کے چکروں میں نہ پڑے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم اداس نہیں ہو؟'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ہمت کر کے بولی۔ ''تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''اور نہ کبھی ہوگا؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں بی بی...... کبھی نہیں۔''

''کیا میں اس اطمینان کے ساتھ یہاں سے جا سکتی ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھ پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں ہے؟''

''ہاں بی بی! آپ جا سکتی ہیں۔ میں اپنے خون سے لکھ کر دینے کو تیار ہوں، آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ آپ کے تو بس احسان ہی احسان ہیں۔''

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''لیکن...... میں خود کو آزاد محسوس کیوں نہیں کرتی۔

کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں کسی چیز میں جکڑی ہوئی ہوں۔ کیوں لگتا ہے ایسا؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''یہ آپ کی اپنی سوچ ہے بی بی! میں اسے بدل نہیں سکتا۔''

وہ عجیب لہجے میں کہنے لگی۔ ''تم بہت اچھے ہو رستم ــــ بہت ہی اچھے لیکن جتنے اچھے ہو، اس سے کہیں زیادہ ظالم ہو۔''

''م...... میں سمجھا نہیں بی بی؟'' وہ نظر چرا کر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھا بھی نہیں سکتی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا احترام کرتے ہوئے رستم بھی فوراً اٹھ گیا۔ چناب اب انہیں مزید اچھی طرح نظر آنے لگا تھا۔ سچی محبتوں کی کہانی اپنے پانیوں میں سمیٹے وہ بڑی خاموشی سے جنوب کی طرف بہہ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد رضا ایک موٹر رکشا پر مکینک کو لے کر پہنچ گیا۔ بیٹری سے بلب کے تار جوڑ کر مکینک اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ رضا اور رستم بھی اس کے پاس کھڑے تھے۔ غیر متوقع طور پر پانچ منٹ کے اندر گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔

اب وہ ایک بار پھر پک اَپ میں تھے اور پک اَپ چناب کو پار کر کے گجرات کی طرف جا رہی تھی۔ شانی اور رستم دونوں چپ تھے۔ پک اَپ میں بیٹھنے کے بعد ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ان آخری لمحوں میں شانی کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا مگر جس طرح پُرسکون سمندر کے نیچے تہلکہ خیز طوفان اودھم مچاتے ہیں، اس کے دل میں بھی عجیب رقت آمیز ہلچل تھی۔

پھر پک اَپ آہستہ ہوئی اور چند ہچکولے کھانے کے بعد آخر شب کی تاریکی میں رک گئی۔ کیبن میں سے رضا کی آواز آئی۔ ''رستم بھائی اب کس پاسے (کس طرف) جانا ہے؟''

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔ ''بی بی! کس طرف جانا ہے؟''

''تمہیں نہیں پتا؟''

''میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اس کا ہر لفظ ایک سوال تھا۔

''کہاں ہیں ہم؟''

''بتی والے چوک پر۔ آپ کی دائیں طرف والی سڑک گجرات شہر کو جاتی ہے۔ سامنے والی بائی پاس کی طرف۔''

شانی کے کانوں میں طوفان کا شور تھا۔ اس شور میں سے جیسے نگینہ کی آواز ابھر کر اس کی

سماعت سے ٹکرائی۔ ''چوہدرانی جی! رستم آپ کو چاہتا تو بہت ہے۔ شاید اتنا کہ آپ کے صرف ایک ہاسے (مسکراہٹ) کے لئے ساری دنیا قربان کر دے۔ پر آپ سے دور رہ کر بھی وہ دکھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنے آپ میں مست ہے'' پھر نگینہ نے اماں سیانی کے حوالے سے ایک بات کہی تھی۔ ''......اماں سیانی نے کہا تھا، ایسا عشق کیا نہیں جاتا، خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق میں کچھ لیا نہیں جاتا، بس دیا ہی جاتا ہے اور جب بندے کا دھیان لینے کی طرف نہیں ہوتا، اللہ سوہنے کا دھیان دینے کی طرف ہو جاتا ہے۔''

تو کیا اللہ سوہنے کا دھیان دینے کی طرف ہو گیا تھا۔ شانی نے سوچا۔ وہ رستم کو کچھ دے رہا تھا اور اپنی عطا کے لئے شانی کو وسیلہ بنا رہا تھا۔ کیا واقعی ایسا ہو رہا تھا؟ شاید واقعی ایسا ہو رہا تھا۔ شانی اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے باوجود خود کو ایک کٹھ پتلی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ نادیدہ ہاتھ کی نادیدہ ڈوریں تھیں جو اسے اپنی مرضی میں جکڑ رہی تھیں۔ شاید یہ امر ربی کی ڈوریں تھیں۔ ان لمحوں میں اس پر یہ انکشاف بھی ہو رہا تھا کہ جس طرح دوستی اور دشمنی کے درمیان ایک باریک لکیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح جدائی اور ملاپ کے درمیان بھی باریک لکیر ہی ہوتی ہے۔ چند گھنٹے پہلے تک وہ جس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ آپوں آپ ذہن پر وارد ہو رہی تھی۔

اس نے پلکیں اٹھا کر عجیب نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال رخساروں پر جھول رہے تھے۔ چاند پک اَپ کی کھڑکی میں تصویر کی طرح ساکت تھا۔ رستم نے مدھم آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ ''بی بی! کس طرف جانا ہے؟''

شانی کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں گہری ہوتی چلی گئیں۔ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کچھ بھی نہیں پھر ایک تھکے ہارے پیراک کی طرح جو خود کو حالات کی سرکش لہروں پر چھوڑ دیتا ہے، شانی نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

اس نے اپنی پلکیں جھکا کر...... لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔ ''فی الحال سیدھے چلو۔''

''فی الحال سیدھے چلو۔'' ان تین لفظوں کی گونج جیسے دور دور تک پھیل گئی۔ چناب کی ریت کے ذروں سے لے کر فلک کے ستاروں تک ہر شے نے یہ تین الفاظ سنے۔

رستم کے چہرے پر اندرونی مسرت کا رنگ بکھر گیا۔ شانی ابھی جدا نہیں ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

گاڑی بائی پاس کی طرف روانہ ہو گئی۔ شانی نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ کسی طرف دیکھنا نہیں چاہتی...... اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے رستم کی

طرف تو ہرگز نہیں۔ پک اَپ جی ٹی روڈ پر دوڑتی رہی۔ خنک ہوا ان دونوں کے اردگرد سرسراتی رہی۔ تیز رفتار گاڑیاں اطراف سے گزرتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔

یکا یک شانی کو محسوس ہوا کہ ان کا سفر طویل ہو گیا ہے۔ رستم نے تو کہا تھا کہ انہیں سرائے عالمگیر تک جانا ہے۔ جہاں تک شانی کو معلوم تھا، گجرات سے سرائے عالمگیر تک کا سفر اتنا زیادہ نہیں تھا۔

بہت دیر بعد شانی نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر رستم کی طرف دیکھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ نیم اُجالے میں اب اس کی صورت شانی کو بہتر طور پر نظر آ رہی تھی۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''پنڈی۔'' رستم نے جواب دیا۔

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ پک اَپ کو سرائے عالمگیر تک جانا ہے۔ وہاں سے بس پکڑنی ہے۔''

''اب میں نے پروگرام بدل دیا ہے بی بی۔ آپ ساتھ جو ہیں۔'' شانی خاموش رہی۔

وہ بولا۔ ''پنڈی میں ایک دور کا رشتے دار ہے بی بی۔ اس کے پاس جائیں گے۔ وہ جگہ ہمارے لئے بڑی محفوظ رہے گی۔''

ایک بار پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے۔

راولپنڈی شہر کے جنوبی مضافات میں وہ ایک وسیع کوٹھی تھی۔ رقبہ تقریباً تین کنال رہا ہو گا۔ تعمیر شدہ لگ بھگ ایک کنال تھی۔ باقی رقبہ خالی تھا۔ یہاں سیب، انار اور لوکاٹ وغیرہ کے درخت تھے۔ بیرونی دیوار کی بلندی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اس کوٹھی میں شانی کی ملاقات ایک جواں سال شخص زوار سے ہوئی۔ زوار کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک سنجیدہ صورت خاتون تھی جس کے بارے میں شانی نے اندازہ لگایا کہ وہ زوار کی ساس ہوں گی۔

رستم اور زوار میں گہری شناسائی اور بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ رستم نے زوار کو ''زارے'' کے نِک نیم سے مخاطب کیا۔ اس سے پہلے دونوں گرم جوشی سے بغل گیر بھی ہو چکے تھے۔ شانی کو زوار کی بیوی ثمیری کے پاس چھوڑ کر رستم نے زوار کو ساتھ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ان کے جانے سے خواتین کو باتیں کرنے میں آسانی محسوس ہوئی۔

شیری نے ادھیڑ عمر خاتون کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری ماسی زینب ہیں لیکن ہم ان کو اپنے گھر کے فرد کی طرح سمجھتے ہیں۔ بڑا پیار ہے انہیں ہم سے۔“

شانی کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ سنجیدہ صورت عورت شاید شیری کی ماں ہے۔ شکلوں کی مشابہت اکثر دھوکا بھی دیتی ہے۔

شیری کی عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ راولپنڈی ہی کی رہنے والی ہے۔ وہ جاذب نقوش اور متوازن جسم کی مالک تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شوخی اور زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں شے اس کے ہونٹ تھے۔ یہ ترشے ہوئے ہونٹ خاموشی کی حالت میں بھی مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے۔

تعارفی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ رستم کے کہنے کے مطابق شانی نے اپنا تعارف مختصر الفاظ میں کروایا۔ اس نے بتایا کہ وہ گجرات کے ایک نواحی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ کوئی بھائی بھی نہیں۔ پرانی دشمنی چل رہی تھی اور مخالفوں کی طرف سے جان کا خطرہ تھا۔ اس کا ایک چچا ہے جو بیرون ملک مقیم ہے۔ وہ رستم کا بھائی بنا ہوا ہے۔ اسی چچا کے کہنے پر رستم اسے دشمنی کے اس نرغے سے نکال کر لایا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کچھ باتیں فرضی تھیں۔ رستم فی الحال نہیں چاہتا تھا کہ شانی کے بارے میں اصلیت ان لوگوں کو بھی بتائی جائے۔

شیری نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ۔ ”ہماری شادی پچھلے مارچ میں ہوئی تھی۔ زوار کی دیہی علاقے میں زمینداری ہے۔ وہ وہیں پلا بڑھا ہے۔ اب بھی اسے شہر سے زیادہ گاؤں میں رہنا پسند ہے، لیکن میرا معاملہ الٹ ہے۔ میری خواہش کو بھانپتے ہوئے زوار نے تین مہینے پہلے ہی یہ گھر خریدا ہے......“

اس نے ذرا توقف کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نئی نئی شادی ہے ناں۔ باتیں مانی جا رہی ہیں۔ پھر تو وہی لال پیلی آنکھیں ہونی ہیں اور ہمارا خشک ہوتا خون ہونا ہے۔ یعنی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔“

”تمہارے ہنستے مسکراتے میاں کو دیکھ کر مجھے تمہارے خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔“ شانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ شادی شدہ ہیں؟“

”نن... نہیں۔“

”تو پھر..... مبارک ہو۔ میرے نزدیک غیر شادی شدہ ہونا اور خوش قسمت ہونا ہم معنی ہیں..... جہاں تک زوار کی مسکراتی صورت کا تعلق ہے، میں بس اتنا ہی کہوں گی، ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔“

”آپ..... دلچسپ لوگ لگتے ہیں۔“ شانی نے کہا۔

اتنے میں زوار دروازے پر نمودار ہوا۔ ”کون دلچسپ ہے جی؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”یہاں تمہارا ذکر ہرگز نہیں ہو رہا۔“ شیری بولی۔

”تو پھر تمہارا ہو رہا ہوگا اور اگر واقعی ایسا ہو رہا ہے تو پھر مجھے اپنی مہمان سے ہمدردی ہے۔ ان کی خوش فہمی بڑی جلدی اور بڑے بُرے طریقے سے دور ہونے والی ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی شانی مسکرا دی۔

میاں بیوی کے درمیان نوک جھوک کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاید یہ طویل ہو جاتا تاہم اس دوران میں سنجیدہ صورت عورت نے شانی کا ستا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے، بیٹی بہت تھکی ہوئی ہے۔ اسے کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے۔“

شیری کا ذہن بھی فوراً اس طرف منتقل ہو گیا۔ اس نے اپنے شوہر سے چونچ لڑانے کا سلسلہ ختم کیا اور پوری طرح شانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شانی، خاتونِ خانہ کے ساتھ ایک کشادہ کمرے میں آ گئی۔ گھر کی سجاوٹ میں سلیقہ تھا۔ آرائش میں وسطی اور شمالی پنجاب کا ملا جلا تاثر ملتا تھا۔ ایک کھڑکی سرسبز لان کی طرف کھلتی تھی۔ یہاں ایک جانب گیراج میں شانی کو سیاہ رنگ کی بہت بھاری بھرکم موٹر سائیکل دکھائی دی۔ قریب ہی نمبر پلیٹ کے بغیر ایک گرے رنگ کی خیبر کھڑی تھی۔ ایک طرف شیڈ کے نیچے پرندوں کے لئے بہت بڑا پنجرہ بنایا گیا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کے رنگ برنگ پنچھی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور مختصر فضا میں اُڑانیں بھر رہے تھے۔ شانی کو باطمینان طریقے سے لٹانے اور کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے کے بعد شیری باہر نکل گئی۔

شانی واقعی بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس اجنبی جگہ اور ان نہایت اجنبی حالات میں بھی اسے نیند آ گئی۔ وہ بیدار ہوئی تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ اصولی طور پر اسے بھوک محسوس ہونی چاہئے تھی لیکن جب سینے میں گلے تک نمکین آنسو جمع ہوں تو کھانے پینے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ جو افسردہ سوچیں تھکاوٹ اور نیند کے سبب کچھ دیر کے لئے اس سے دور ہو گئی تھیں وہ پھر ذہن پر یلغار کرنے لگیں۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ سامنے سرسبز لان کا منظر تھا۔ کچھ ایسا ہی لان رنگ والی کی حویلی میں بھی تو تھا۔ رنگ والی کی حویلی جہاں وہ تھی، اس کے

اپنے تھے، اس کے پیارے ابا جی تھے۔ وہ اپنے ابا جی کی بغل میں دبک کر صبح سویرے ایسے ہی بھیگے بھیگے لان میں ٹہلا کرتی تھی۔ آہ کہاں گئے وہ سب لوگ؟ کچھ ہمیشہ کے لئے..... نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے اور کچھ موجود ہونے کے باوجود اس کے لئے موجود نہیں تھے۔ وہ چچی پروین، تایا معصوم، بابا خادم اور سکینہ وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ یقیناً ان سب لوگوں کے لئے وہ مر چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ رنگ والی کی جنازگاہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ہو چکی ہو اور حویلی میں دسواں کی رسم بھی ادا کی جا چکی ہو۔

اس نے اپنی موت کے بعد سارے مناظر تصور کی نگاہ سے دیکھے۔ نارپور سے یہ چیختی چنگھاڑتی خبر بذریعہ ٹیلی فون رنگ والی پہنچی ہوگی کہ مہر جی کی حویلی میں آگ لگ گئی ہے اور مہر جی سمیت زیادہ تر اہلِ خانہ جل مرے ہیں۔ تایا معصوم اور چچی پروین، خادم حسین کے ساتھ روتے پیٹتے علی الصبح نارپور پہنچ گئے ہوں گے۔ جلی اور ادھ جلی لاشوں کے انبار میں وہ شانی کو تلاش کرتے رہے ہوں گے، پھر کوئلہ ہو جانے والی لاشوں میں سے ایک لاش اس کی تصور کر لی گئی ہوگی۔ چچی پروین پر غشی کے دورے پڑے ہوں گے۔ تایا معصوم ہچکیاں لے کر بے حال ہو گئے ہوں گے اور اس کی جان سے پیاری سہیلی سکینہ...... وہ تو شاید اب بھی آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی ہوگی۔ رنگ والی کے نئے قبرستان میں شاید چند کوئلوں کے اوپر مٹی ڈال کر اس کی قبر بھی بنائی جا چکی ہو۔

کس قدر عجیب سا احساس تھا یہ کہ وہ زندہ تھی اور اس کی قبر بھی بن چکی تھی۔ یعنی وہ بیک وقت مُردہ تھی اور زندہ بھی۔ اچانک اس کی سوچوں کا دھارا ایک اور سمت مڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی بدن میں پھر سرد پھریری دوڑ گئی۔ اسے نگینہ کا خیال آیا۔ اس نے نگینہ کو جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے نگینہ سے باتیں کی تھیں۔ اس کو چھوا تھا اور نگینہ کو مرے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔

"یا خدا! وہ کیا ماجرا تھا؟" یہ سوال سینکڑوں دفعہ شانی کے ذہن میں کلبلا چکا تھا، اب ایک بار پھر کلبلانے لگا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اسے اپنے قرب و جوار سے خوف محسوس ہونے لگا۔ الماری، کرسیاں، شیشے کی تپائی، ہر شے اسے ڈرانے لگی۔۔ اسے لگا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور نگینہ ہاتھ میں گلاب اور گیندے کے پھولوں کا گلدستہ لئے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو جائے گی۔

شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود اسے خوف آتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلا اور کوئی ہولے سے اندر آ گیا۔ شانی نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں... وہ گلدستہ لئے

سامنے کھڑی تھی لیکن وہ نگینہ نہیں شیری تھی۔ نیلی ساڑھی اس کے چست بدن پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گلدستہ تپائی پر رکھا اور بولی۔ "رستم بھائی کہہ رہے تھے کہ میں دیکھ کر آؤں۔ آپ سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔"

"ابھی جاگی ہوں۔" شانی نے کہا۔

"میں آپ کے لئے کھانا لے کر آتی ہوں۔" وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔

شانی نے اس کا بازو تھام لیا۔ "نہیں شیری! مجھے ایک نوالے کی بھوک نہیں۔"

شیری کچھ دیر اصرار کرتی رہی پھر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں رستم بھائی کو بھیجتی ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ شانی نے سر اور سینے پر اوڑھنی درست کی اور بولی۔ "آ جائیں۔"

دروازہ کھلا اور رستم اندر داخل ہوا۔ سر جھکائے ہوئے وہ دور رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس کی آواز ابھری۔ "بی بی، یہاں آپ کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ شیری دل کی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماسی زینب بھی یہیں ہے۔ آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو یہاں سے گھنٹی کا بٹن دبا دیں۔ میں اوپر کی منزل پر رہوں گا لیکن کہیں دور نہیں جاؤں گا۔ آپ کسی بھی وقت مجھے بلا سکتی ہیں۔"

"نارپور سے کوئی نئی اطلاع ملی؟" شانی نے پوچھا۔

"نہیں بی بی، بس اخبار میں چھوٹی موٹی خبریں آ رہی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ نارپور والوں کا شک سیدھا مجھ پر آتا ہے۔ میری تلاش میں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔"

"تمہارا ساتھی بھی تو حویلی میں مارا گیا تھا۔" شانی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ گونگے مختار کی بات کر رہی ہیں لیکن میرے اور گونگے کے تعلق کا تو کسی کو پتا ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کی لاش کئی دوسری لاشوں کی طرح کوئلہ ہو گئی تھی۔"

"مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔" شانی نے کہا۔

"اس کی جان جانے کا دکھ تو مجھے بھی ہے لیکن جس کام کے لئے جان گئی ہے، وہ بھی معمولی نہیں تھا۔ آپ کی زندگی بچی ہے بی بی اور اس کام کے لئے تو میری جان بھی سو بار چلی جاتی تو پرواہ نہیں تھی۔" رستم کے لہجے میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ سچائی پکے ہوئے انگوروں کے رس کی طرح الفاظ سے ٹپک رہی تھی۔

شانی کوشش کے باوجود اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکی۔ اس نے موضوع

بدلتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم آزاد علاقے میں جانا چاہتے تھے لیکن میری وجہ سے یہاں پنڈی میں رک گئے ہو۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو اس میں کیا خرابی ہے بی بی۔''

''ہوسکتا ہے کہ آزاد علاقے میں تم زیادہ محفوظ ہوتے۔''

''میری طرف سے آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ اللہ کے کرم سے میں کہیں بھی غیر محفوظ نہیں ہوں اور یہ جگہ تو ہم دونوں کے لئے خاص طور سے بالکل مناسب ہے۔''

شانی خاموش رہی۔ وہ مؤدب انداز میں گویا ہوا۔ ''میری آپ سے ایک درخواست ہے بی بی..... آپ کچھ دنوں کے لئے ہر طرح کی پریشانی دل و دماغ سے نکالنے کی کوشش کریں۔ اپنے آپ کو سکون دیں۔ آئندہ کے بارے میں سوچنے کے لئے آپ کے پاس بہت وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں جب آپ آئندہ کے بارے میں سوچیں تو آپ کے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہ ہو۔ آپ اپنی زندگی کا نقشہ بناتے ہوئے بالکل ہلکی پھلکی ہوں۔''

وہ اسے کیسے بتاتی، وہ جو کچھ بھی ہے لیکن ایک عورت ہے۔ حساسیت اس کی فطرت ہے۔ وہ ان مہیب طوفانوں کو کیسے بھول سکتی ہے جنہوں نے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کی زندگی کو تہہ و بالا کیا ہے۔ مستقل طور پر تو درکنار وہ عارضی طور پر بھی ان سوچوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی۔ بس نیند ہی تھی جو تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن پر کسے ہوئے غم کے شکنجے کو ڈھیلا کرتی تھی۔

رات کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا۔ شیری نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی، مٹن کے کباب، بریانی اور فرنی۔ بہت کچھ مینیو میں شامل تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی نو بیاہتا میاں بیوی میں نوک جھوک جاری رہی۔ لگتا تھا کہ دونوں عام حالات میں بھی چونچ لڑانا جاری رکھتے ہیں تاہم شانی کی موجودگی میں وہ کچھ زیادہ ہی مزاح تخلیق کر رہے تھے۔ غالباً اپنی دانست میں وہ شانی کا دل بہلا رہے تھے۔ رستم اور زوار میں بھی کافی بے تکلفی نظر آتی تھی مگر شانی کی موجودگی میں یہ بے تکلفی کہیں دبک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ زوار نے ایک دو مرتبہ رستم پر فقرہ چپکانے کی کوشش کی لیکن اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا۔ شانی کی موجودگی میں رستم ایک دم لئے دیئے ہوئے نظر آتا تھا۔

دو روز اسی طرح گزر گئے۔ شانی اور شیری زیادہ وقت اکٹھے گزار رہی تھیں۔ شیری ایک سمجھ دار اور ہمدرد لڑکی تھی..... شانی نے اسے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے زیادہ جاننے کی کوشش شیری نے نہیں کی، نہ ہی ماسی زینب نے اسے کسی طرح کریدنا چاہا۔ تیسرے

دن علی الصبح زوار رنگ دار شیشوں والی گاڑی میں بیٹھ کر کسی کام سے نکل گیا۔ شانی ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، وہ اخبار دیکھ رہی تھی۔ نار پور کے المناک حادثے کی بازگشت ابھی تک خبروں میں موجود تھی۔ ایک باکس میں اس چھوٹی سی خبر پر شانی کی نگاہ پڑی۔

''حادثے کو کئی دن ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ جو لاشیں کوئلہ بن گئی ہیں یا دھماکوں سے جن کے چیتھڑے اُڑ گئے ہیں، ان کی شناخت ناممکن ہے۔ مرنے والوں کے کچھ لواحقین تاحال اس امید میں ہیں کہ شاید مسمار ہو جانے والے تہہ خانوں میں سے کوئی شخص زندہ یا مردہ حالت میں نکل آئے۔ یاد رہے کہ دو روز پہلے تہہ خانے کے ملبے سے ایک لاش ملی تھی۔''

شانی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ بیت جانے والے سارے اندوہناک مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ پھر فاخر کی موت کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے اپنے دادا سے چیخ کر کہا تھا۔ ''دادا! آپ جھوٹ نہیں بول رہے تو کیا میں بول رہا ہوں۔ شانی کہیں نہیں ہے۔ اس کی چپل یہاں پڑی ہے۔''

جواب میں دادا کی جنونی آواز گونجی تھی۔ نفرت اور انتقام کے خونی کھیل نے یوں رنگ جمایا تھا کہ دادا پوتا ایک دوجے کے مقابل آ گئے تھے۔ آتش فشاں جب پھٹتا ہے تو سب سے پہلے خود کو ہی راکھ کرتا ہے۔ نار پور کے آتش فشاں نے بھی خود کو جھلسا لیا تھا۔ جس وقت شانی نے کھڑکی میں سے فاخر کو دیکھا تھا، گولیاں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شاید شانی کی چیخ و پکار اس کے کانوں تک پہنچی ہو۔ آہ..... وہ چاند رات تھی۔ اس چاند رات میں محبت کے پھول کھلے تھے۔ شانی نے خود کو اپنے شریکِ حیات کی بانہوں میں یوں گرانا تھا کہ اس کے تمام دیرینہ شکوؤں کا مداوا ہونا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ زندگی کا رخش کچھ دیگر راہوں کا راہی ہونے والا تھا۔ وہ چاند رات لہو میں نہانے والی تھی۔ محبت کے پھولوں کی جگہ، آگ کی کیاریوں میں خون کے پھول کھلنے والے تھے۔

تب شانی کو فاخر کا آخری سفر یاد آیا۔ رستم اور شانی خونچکاں فاخر کو لے کر ہسپتال کی طرف لپکے تھے۔ رستم نے حتی الامکان تیزی سے جیپ چلائی تھی۔ ایک دو جگہ تو جیپ الٹتے الٹتے بچی تھی لیکن پھر اچانک ان دونوں کو احساس ہوا تھا کہ موت اور زندگی کی جنگ میں نار پور کا چھوٹا چوہدری ہار چکا ہے۔ وہ ایک زخمی کو نہیں لاش کو لے جا رہے ہیں۔ شانی اپنے شریکِ حیات کے سینے پر گر کر دیوانوں کی طرح روئی تھی۔

یہ سب کچھ یاد کر کے ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک ایسے شخص کے لئے رو رہی تھی جس نے اسے مسلسل کانٹوں پر گھسیٹا تھا۔ قرونِ اولیٰ کے کسی ظالم آقا نے اپنی زرخرید باندی پر بھی وہ ستم نہ ڈھائے ہوں گے جو شانی پر ڈھائے گئے تھے۔ آج بھی اس کی روح اور جسم پر کئی گہرے زخم تھے لیکن وہ پھر بھی اس شخص کے لئے رو رہی تھی۔ وہ جو بھی تھا مگر اس کا شوہر تھا۔ حساس لوگ تو ''راہ چلتے'' جس درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں، اسے بھی یاد رکھتے ہیں۔ فاخر کے ساتھ تو اس نے پھر ایک عرصہ گزارا تھا۔

اس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا ان پر ابھی تک اس مہندی کا مدھم رنگ موجود تھا جو چاند رات کو شانی نے فاخر کی خوشی کے لئے لگائی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

اچانک دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ ''کون ہے؟'' شانی نے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''میں ہوں شانی۔'' شیری کی شیریں آواز آئی۔

شانی نے جلدی سے واش روم میں گھس کر چہرے پر پانی ڈالا اور چہرے کو تولیے سے صاف کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ شیری نے ایک نظر اس پر ڈالی اور غالباً اس ایک نظر میں ہی وہ جان گئی کہ شانی روتے روتے اٹھی ہے۔ بہرحال بہت سی دیگر باتوں کی طرح اس نے یہ بات بھی کریدی نہیں۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' شیری نے پوچھا۔

''کافی بہتر ہوں۔''

''بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔ آئیں ذرا لان میں گھومیں۔''

شانی نے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اوڑھنی لی اور چپل پہنتے ہوئے باہر آ گئی۔ واقعی موسم خوشگوار تھا۔ طویل گرمیوں کے بعد سردیوں کی آمد کے آثار اچھے لگ رہے تھے۔ شیری نے محبت بھری نظروں سے شانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بڑی خوبصورت ہیں۔'' اس کا انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ شانی بھی بے ساختہ شرما گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر خون کی سی لہر دوڑ گئی ہے۔

''کیسی بات کر رہی ہو؟'' شانی نے کہا۔

''ب... بس یونہی کہہ دیا۔'' وہ ہکلائی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''دراصل سوچ

رہی ہوں کہ آپ کسی بھی بناؤ سنگھار کے بغیر اتنی اچھی لگ رہی ہیں تو جب ذرا بجتی سنورتی ہوں گی تو کیسی لگتی ہوں گی۔''

''ہوسکتا ہے کہ بُری لگنے لگوں۔'' شانی نے کہا۔ اچانک اس کی نظر ایک بند دروازے پر پڑی۔ یہ دروازہ مقفل تھا۔ اس پر کسی نے سُرخ رنگ کے موٹے مارکر سے لکھ دیا تھا۔ ''ماضی قریب'' شانی دو بار پہلے بھی اس دروازے کو دیکھ چکی تھی۔ ''یہ کیا ہے بھئی؟'' شانی نے پوچھا۔

شیری کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''یہ بھی ہے ایک تماشا۔ زوار ایسے تماشوں کا بہت شوقین ہے۔''

''کیا مطلب؟''

شیری نے چند لمحے سوچا، پھر چنچل انداز میں بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی چند سیکنڈ بعد وہ ہاتھ میں ایک ''کی رِنگ'' لئے نمودار ہوئی۔ لبوں میں مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ ''آیئے آپ کو دکھاؤں۔'' اس نے شانی سے کہا اور جھک کر کی ہول میں ایک چابی گھمانے لگی۔

چند ہی سیکنڈ بعد شانی اور شیری ایک ہال نما کمرے کے اندر تھیں۔ روشندانوں سے مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ شیری نے ٹیوب لائٹ آن کر کے اس روشنی میں اضافہ کر دیا۔ شانی نے اردگرد دیکھا اور حیران رہ گئی۔ یہ کمرہ عجیب وغریب اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ دو عدد بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل، جن پر گرد کی تہیں جمی تھیں۔ شراب کی خالی بوتلیں۔ ایک عدد دور مار رائفل جس پر ٹیلی اسکوپ لگی تھی۔ انگریز اداکاراؤں کی نیم برہنہ اور برہنہ تصویروں کے پوسٹر، سی ڈیز، واکی ٹاکی اور پتا نہیں کیا کچھ۔

''یہ سب کیا ہے؟'' شانی نے حیرت سے دریافت کیا۔

''ماضی قریب۔'' شیری مسکرائی۔

''کس کا ماضی قریب؟''

''اس کا جس کے پلے بندھ گئی ہوں۔'' شیری نے کہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''زوار ڈیڑھ دو سال پہلے، آج کے زوار سے بہت مختلف تھا..... وہ سٹوڈنٹ لیڈر تھا اور لیڈر بھی ایسا جو بات بعد میں کرتا تھا، ہاتھ پہلے چلاتا تھا۔ وہ کالج کے ہاسٹل میں کسی ریاست کے شہزادے کی طرح رہتا تھا۔ ایم ایس سی کی کلاس میں اس نے پورے چھ سال قیام کیا۔ اس کے بعد بھی منت سماجت کر کے نکالا گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود ہی نکل گیا کیونکہ پھر اسے اپنے سامنے مار دھاڑ اور دادا گیری کے کئی اور

میدان نظر آنے لگے تھے۔ بہرحال اس کے بعد بھی اس نے طلباء کی سیاست سے اپنا پاؤں باہر نہیں نکالا۔ بلکہ اب بھی وہ اس میدان میں گاہے بگاہے داخل ہوتا رہتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔"

شانی نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور اب چوری سے چلا گیا ہے؟"

"چلا کہاں گیا جی...... زبردستی مار کوٹ کر بلکہ چھینٹی لگا کر اسے تائب کرایا گیا ہے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ یہ کام تم نے خود کیا ہوگا۔" شانی نے کہا۔

"توبہ جی توبہ۔" اس نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔ "میری اتنی مجال کہاں کہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالوں۔ یہ معرکہ کسی اور کا سر کیا ہوا ہے۔"

"کسی اور کا؟"

"جی ہاں...... آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"کہیں...... تم رستم کی بات تو نہیں کر رہی ہو۔"

"جی ہاں۔" شیری نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ "رستم بھائی کی یہ نیکی ایسی ہے جسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتی۔"

"رستم اور زوار میں پرانا دوستانہ لگتا ہے۔" شانی نے خیال ظاہر کیا۔

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ یہ دوستانہ بہت زیادہ پرانا نہیں لیکن اتنا پکا اور گہرا ہے کہ...... بس کچھ نہ پوچھیں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ "رستم اور زوار کی دوستی کوئی تین سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب رستم بھائی ایک سنگین کیس میں سیالکوٹ پولیس سے بچتے پھر رہے تھے اور گوجر خان کے قریب ایک گاؤں مٹھوالی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو زوار بھی مٹھوالی ہی کا رہنے والا ہے۔ رستم بھائی وہاں مٹھوالی میں ایک کھیت مزدور کے بھیس میں رہ رہے تھے......"

اچانک وہ بولتے بولتے رک گئی۔ چونک کر شانی کو دیکھا اور کہنے لگی۔ "پتا نہیں مجھے یہ باتیں آپ سے کرنی بھی چاہئیں یا نہیں۔"

شانی نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "شیری یہاں میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں بھی ہوں گی، وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔"

اس نے ایک بھرپور نظر شانی کے چہرے پر ڈالی اور بولی۔ "پتا نہیں کیوں آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

شانی مسکرائی۔ "تو پھر دل کا کہا مان لو۔"

"نہ بھی مانوں گی تو دل خود منوا لے گا۔ پتا نہیں کیا جادو ہے آپ میں؟ سچ کہتی ہوں دو چار دن میں ہی آپ بالکل اپنی لگنے لگی ہیں۔ دل چاہتا ہے ...دل چاہتا ہے ہر معاملے میں آپ پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلوں۔"

"شکریہ، کہ تم مجھے اس قابل سمجھ رہی ہو۔"

شیری بولی۔ "چلیں آئیں، اوپر جا کر ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔"

شانی نے رضامندی ظاہر کی۔ شیری نے سامنے دیوار پر لگے ہوئے دو پوسٹروں کو ناراض نظروں سے دیکھا۔ دونوں میں امریکن اداکارہ راکیل ویلچ دو بالشت لباس پہنے اپنے ساتھی مرد سے بوس و کنار کرتی نظر آتی تھی۔ شیری نے پوسٹر پھاڑ کر دیوار سے اتارے اور انہیں چرمر کر کے ہاتھ میں لے لیا۔

"ماضی قریب" کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ دونوں اوپر ٹیرس کی طرح بڑھیں۔

ٹیرس پر ایک بیضوی شکل کا سٹنگ روم بھی شامل تھا۔ اس میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر جنوب میں دور تک سطح مرتفع کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ شمال کی طرف اسلام آباد کے سفید در و دیوار اور فیصل مسجد کے دور افتادہ مینار نظر آتے تھے۔ ان میناروں سے ذرا ہٹ کر پہاڑوں کی آغوش میں راول ڈیم کا پانی بھی جھلک دکھاتا تھا۔

شیری نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "رستم بھائی قریباً چھ ماہ تک مٹھوالی گاؤں میں روپوش رہے تھے۔ ان دنوں شاید اپنی کچھ پرانی نیکیوں کے طفیل کالج والوں کی جان میرے شوہر نامدار سے چھوٹ چکی تھی یعنی وہ کالج کو خیرباد کہہ کر گاؤں میں مقیم تھا۔ وہیں پر دونوں کی دوستی پروان چڑھی۔ ان دنوں دونوں ہی 'معرفت کے اعلیٰ درجات' پر فائز تھے۔ دونوں کے دماغ روشن تھے اور ہر قسم کے بیش قیمت منصوبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ قتل، اغوا، دنگا فساد، غرض ہر قسم کی مہم جوئی کے لئے دونوں کے پاس بے تحاشا وقت اور توانائی موجود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وقت ان کا ساتھ دیتا اور گردشِ ایام ان کے عزائم کو درہم برہم نہ کرتی تو یہ چاند سورج کی جوڑی ثابت ہوتی۔ کامرانیوں کے اعتبار سے یہ دونوں سلطانہ ڈاکو، ملنگی اور بہرام شہرام کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے......"

"تم کہنا چاہتی ہو کہ یہ جرائم کے راستے پر چلنے جا رہے تھے۔"

"اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو میں کہوں گی کہ رستم بھائی تو پہلے ہی اس رستے پر بہت آگے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آپ نے بھی اخباروں وغیرہ میں اس بارے میں

بہت پڑھا ہوگا...... ہاں یہ زوار صاحب نئے نئے عقل مند ہوئے تھے۔ اپنے پختہ عزم، اپنی یکسوئی اور محنتِ شاقہ سے اپنا نام اونچے درجے کے بدمعاشوں میں لکھوانا چاہتے تھے۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں، ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اوپر والے کی مہربانی ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تبدیلی کی ہوا چلی اور بہت کچھ بدل گیا۔"

شیری نے چند لمحے توقف کر کے شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ "تبدیلی کا آغاز رستم بھائی سے ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے ہر اس شخص کو حیران کر دیا جو رستم بھائی کو تھوڑا بہت بھی جانتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رستم بھائی کے طور اطوار بدلنا شروع ہوئے اور پھر بدلتے چلے گئے۔ وہ پرانے قانون شکن تھے۔ پولیس کے محکمے میں رستم بھائی کے بہت سے یار دوست تھے جو ہر اچھے بُرے کام میں رستم بھائی کی مدد کرتے تھے۔ رستم بھائی نے قانون شکنی سے ہاتھ اٹھایا تو پھر ان کے ماحول میں بھی تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ جن چند دوستوں نے رستم بھائی کے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کیا، وہ تو ان کے ساتھ رہے باقی سب دور ہوگئے اور پھر ان سے ہرنا تا ٹوٹ گیا...... زوار بھی رستم بھائی کے ان دو تین دوستوں میں سے تھا، جنہوں نے اس تبدیلی میں ان کا ساتھ دیا۔ شروع شروع میں اس مسئلے پر رستم بھائی اور زوار میں شدید جھگڑے بھی ہوئے۔ ایک جھگڑے کی تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس جھگڑے میں دونوں نے بازارِ حسن کے قریب ایک دوسرے کو زبردست مار لگائی تھی۔ اس لڑائی میں زوار زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ بعد میں رستم بھائی اسے خود ہی اٹھا کر ہسپتالوں میں خجل ہوتے پھرے تھے۔ دونوں میں محبت کا ایک ایسا رشتہ ہے جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ میرے خیال میں یہ محبت ہی تھی جو بالآخر جیت گئی۔ رستم بھائی آہستہ آہستہ لیکن بتدریج زوار کو اپنی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہ من مانیوں سے باز آ گیا اور اپنی زندگی کو ایک نئے رخ پر لے آیا۔"

"جن دنوں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، تم کہاں تھیں؟" شانی نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں ان کے آس پاس ہی تھی۔" وہ بھی مسکرائی۔ "دراصل میں کبھی اپنے کالج کی یونین کی صدر تھی۔ مختلف میٹنگز اور تقریبات میں زوار سے آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ یہ حضرت طلباء و طالبات میں شیطان کی طرح مشہور تھے۔ بس قسمت کی خرابی تھی کہ ان شیطان صاحب کی نگاہِ کرم مجھ پر پڑ گئی اور شیطان کا تو آپ کو پتا ہی ہے...... بندے کو جنت سے نکلوا کر چھوڑتا ہے۔ اس تفصیل میں گئی تو یہ گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔ مختصراً یہ کہ یہ حضرت ان دنوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے...... ایسے کمبل کی طرح جسے میں چھوڑ سکتی تھی نہ

پکڑ سکتی تھی۔ بس نیم دیوانے ہو گئے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ کسی حد تک میری مت بھی انہوں نے ماردی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے۔ اس کی مصروفیات کیا ہیں؟ کہاں کہاں معاشقے چل رہے ہیں۔ کہاں کہاں رنگ بازی ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کے خیال میں مگن تھی۔ جہاں بلاتا چلی جاتی تھی۔ جو کہتا تھا مان لیتی تھی۔" شیری نے آنکھیں بند کر کے جھرجھری سی لی۔ جیسے تصور میں وہ سارے نرم گداز مناظر آ گئے ہوں۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "اب سوچتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ وہ بڑا خطرناک راستہ تھا۔ جس پر ہم چل رہے تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب رستم کے اندر سے ایک نئے رستم بھائی برآمد ہوئے اور اس نئے رستم بھائی نے زوار کو بھی بدلنا شروع کر دیا۔ ایک روز رستم بھائی نے مجھے اور زوار کو اکیلے میں دیکھا۔ انہوں نے ہم دونوں سے کہا کہ اگر ہم اس حد تک آگے نکل گئے ہیں تو پھر ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہئے۔

زوار سے شادی میری خواہش تھی۔ اصل مسئلہ تو زوار کا تھا۔ وہ ایک ایسے گھوڑے کی طرح تھا جس پر کاٹھی ڈالنا تو درکنار اسے اس کی مرضی کے خلاف چھونا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال یہ رستم بھائی کا حوصلہ ہے جنہوں نے اس بے حد اتھرے گھوڑے کو رام کیا اور اس اسٹیج تک پہنچایا کہ ایک دن زوار نے آنکھوں میں خلوص کی چمک لے کر خود مجھ سے شادی کی درخواست کی۔"

"ابھی تم نے رستم اور زوار کے درمیان ہونے والی جس لڑائی کا ذکر کیا، وہ بھی تو اسی سلسلے کی کڑی نہیں تھی؟" شانی نے پوچھا۔

"ہاں...... آپ کہہ بھی سکتی ہیں۔" شیری بولی۔ "ان دنوں زوار اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ ہر ہفتے باقاعدگی سے بازارِ حسن جاتا اور ڈانس دیکھتا تھا۔ اوباش پنڈی وال دوست ہر وقت اس کا دُم چھلا بنے رہتے تھے۔ وہاں عام طور پر پھڈے بازی بھی ہوتی تھی۔ رستم بھائی زوار کو روکتے تھے اور وہ رکتا نہیں تھا۔ بس اس بات پر وہ جنگِ عظیم ہوئی تھی۔"

"ہاں تو تم شادی کی درخواست کا ذکر کر رہی تھیں۔ تو کیا تم نے زوار کی وہ درخواست قبول کر لی؟"

شیری کا لہجہ پھر مزاحیہ ہو گیا۔ "قبول کر لی۔ اس لئے تو اس حال میں بیٹھی ہوئی ہوں جی۔" وہ مظلوم شکل بنا کر بولی۔ "بلکہ...... بلکہ اس میں زیادہ قصور امی ابو کا ہے۔ اگر میری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی تھی تو وہ ہی کچھ ہوش کے ناخن لے لیتے۔ پتا نہیں کیا جادو کیا اس شعبدے باز نے ان پر۔ انہوں نے ہاں کہہ دی اب اس حماقت کے بدلے گن گن کر لئے

جا رہے ہیں مجھ سے۔ بس یہ سارے مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔'' شیری نے سرد آہ بھری۔

''نہیں .. نہیں ایسا مت کہو۔'' شانی جلدی سے بولی۔ ''زوار تو بہت اچھا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے پیار دیکھا ہے۔''

''پیار ضرور ہوگا لیکن میرے لئے نہیں ہوگا۔'' شیری نے بڑے یقین سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔ ''اب ذرا دیکھئے، شادی کے بعد کتنے حوصلے بڑھ گئے ہیں میاں صاحب کے...... اپنی آوارہ گردیوں اور خرمستیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے انہیں باقاعدہ میوزیم کی شکل دے دی ہے اور دروازے پر لکھ دیا ہے ''ماضی قریب'' یہ بھی مجھے دھمکانے کا ایک طریقہ ہے کہ دیکھ لے بی بی! یہ ماضی ابھی مجھ سے زیادہ دور نہیں گیا۔ کسی بھی وقت حال میں تبدیل ہو کر تجھے بے حال کر سکتا ہے۔ دیکھیں جی! اگر بجّو جی میں اتنی ہمت تھی تو شادی سے پہلے بنایا ہوتا یہ گندہ میوزیم۔ اس وقت تو جیسے منہ میں زبان نہیں تھی۔ گردن میں ہڈی نہیں تھی۔ ابو کے سامنے سر ڈالے بیٹھا تھا اور بکری کی طرح مَیں مَیں کر رہا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا پردے کے پیچھے سے......''

''اچھا چلو چھوڑو۔ پھر شادی کے بعد کیا ہوا۔ کیا زوار نے تمہیں گاؤں میں رکھنا چاہا؟''

''ہاں جی۔ اس معاملے پر بھی ٹھیک ٹھاک پھڈا ہوا۔ باقاعدہ ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی تھی ہم دونوں میں لیکن میں اپنے اصولی مؤقف پر قائم رہی اور زوار کو صاف بتا دیا کہ وہ طے شدہ باتوں کو نہ چھیڑے۔ ہم شہر میں ہی رہیں گے۔''

''مجھے یقین آ گیا کہ تم کالج میں واقعی سٹوڈنٹ لیڈر رہی ہو۔'' شانی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

شاید شانی اور شیری کے درمیان ہونے والی یہ انکشاف انگیز گفتگو مزید جاری رہتی کہ اچانک کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف شور سنائی دیا۔ ماسی زینب کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ شیری اور شانی نے ایک ساتھ اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ شانی کو اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر پولیس موجود تھی۔ ایک پولیس موبائل گیٹ کے عین سامنے کھڑی تھی۔ دو رائفل بردار گاڑی کے قریب پائے جاتے تھے جب کہ باقی گیٹ پر تھے۔

''تو کیا یہ لوگ رستم کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے ہیں......؟'' یہ سوال ایک میخ کی طرح شانی کے دماغ میں پیوست ہو گیا۔

شیری کا چہرہ بھی متغیر تھا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شانی نے اسے گیٹ پر پولیس والوں سے بحث کرتے دیکھا۔ شیری کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ

بڑے اعتماد سے اور ٹھوس انداز میں بول رہی تھی۔ پولیس آفیسر جو انسپکٹر تھا کچھ دبا ہوا نظر آنے لگا۔ آوازیں شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ بہرطور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس پارٹی گھر کی تلاشی لینا چاہتی ہے۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جو وہ بار بار شیری کے سامنے لہرا رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سرچ وارنٹ تھا۔ شیری نے ایک بار اس وارنٹ پر نظر ڈالی اور اسے بے پرواہی سے واپس انسپکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی۔ آخر پولیس انسپکٹر شیری اور ماسی زینب کو دھکیلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے ماتحت بھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ شانی کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ وہ ٹیرس سے نکل کر تیزی سے اس کمرے تک پہنچی جہاں رستم محوِ خواب تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ رستم سیدھا لیٹا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ کشادہ چھاتی کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ شانی نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ ''رستم اٹھو! پولیس آئی ہے۔''

رستم سُرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے شانی کو دیکھنے لگا۔ ''رستم! نیچے پولیس والے آئے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں اوپر پہنچ جائیں گے۔ مم ... مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لئے آئے ہیں۔''

رستم نے اپنے خوابیدہ ذہن کو چند سیکنڈ میں سنبھال لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تکیے کے نیچے بھرا ہوا کولٹ پسٹل موجود تھا۔ اس نے پسٹل قمیص کے نیچے اُڑسا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی سے نیچے صحن کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں دو پولیس والے نظر آئے جو ماسی زینب سے ایک دروازے کا بند تالا کھلوا رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا رستم؟'' شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''آپ بےفکر رہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' رستم کے لہجے میں بلا کا اعتماد اور سکون تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم چھت پر جا کر ساتھ والی چھت پر کود جاؤ۔ کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''پہلے یہ تو پتا چلے کہ یہ خبیث یہاں آئے کس لئے ہیں۔'' وہ بدستور مطمئن تھا۔ شانی کو اس کے اطمینان پر حیرانی ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعصاب کی غیر معمولی مضبوطی کا احساس ہو رہا تھا۔ رستم کا اعتماد دیکھ کر شانی کی اپنی ہلچل بھی کم ہو گئی تھی۔ رستم پردے کی اوٹ سے بغور صحن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے پستول کا ابھار شانی کی دھڑکنیں تیز کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد بھاری بوٹوں کی آواز سیڑھیوں پر سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ اوپر آ رہے تھے۔ شانی نے کراہ کر کہا۔ ’’رستم! تم کہیں اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔‘‘

’’بی بی! مجھے نہیں لگتا کہ یہ میرے لئے آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور معاملہ ہو۔‘‘

اس سے پہلے کہ شانی اپنی بات پر اصرار کرتی، رستم نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی اور لائٹ آف کر دی۔ چند سیکنڈ بعد پولیس والے بالائی منزل پر دندنانے لگے۔ وہ دھڑ دھڑ دروازے کھول رہے تھے۔ چیزوں کو بے پروائی سے الٹ پلٹ رہے تھے، اِدھر اُدھر پھینک رہے تھے۔ گاہے بگاہے شیری کی احتجاجی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

وہ ابھی تک پولیس اہلکاروں سے الجھ رہی تھی۔ شانی کو لگا کہ سردی کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ وہ اور رستم دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔ ’’اوئے حشمت علی! تم اِدھر گیلری (ٹیرس) میں دیکھو اور نیاز تم میرے ساتھ آؤ۔‘‘

یقیناً یہ کرخت آواز پولیس انسپکٹر کی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا جس میں شانی اور رستم موجود تھے۔

’’اوئے کون ہے اندر۔ دروازہ کھولو۔‘‘ انسپکٹر کی مشتعل آواز ابھری۔

رستم بے حرکت کھڑا رہا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شانی کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے اور گالیاں بکنے کے بعد انسپکٹر اور دو سپاہی آگے بڑھ گئے۔ وہ دوسرے کمروں میں تاکا جھانکی کرنے لگے۔ صرف ایک حوالدار کھڑکی کے سامنے موجود تھا۔ کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ حوالدار نے جالی سے چہرہ لگایا اور کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ کمرے میں تاریکی اور باہر روشنی تھی۔ وہ حوالدار کو صاف دیکھ رہے تھے۔ مگر حوالدار کو اندر دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ دونوں دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ اگر اس موقع پر وہ ذرا بھی حرکت کرتے تو شاید حوالدار انہیں دیکھ لیتا۔ کم از کم رستم تو ضرور نظر آ جاتا کیونکہ وہ کھڑکی سے زیادہ قریب تھا۔ یہ رستم کا بے پناہ اعتماد ہی تھا کہ وہ اس موقع پر بھی بالکل پُرسکون تھا اور اس نے ذرا سی جنبش بھی نہیں کی۔

حوالدار نے ناکام ہو کر چہرہ کھڑکی سے پیچھے ہٹا لیا۔ غالباً اس نے تصور کر لیا تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں بلکہ باہر سے مقفل کیا گیا ہے۔ شانی کو خوشگوار حیرت ہوئی جب اس

نے محسوس کیا کہ پولیس والے گھریلو سامان کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد واپس جا رہے ہیں۔

رستم نے ہولے سے کہا۔ ’’میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ وہ ہمارے لئے نہیں آئے۔‘‘

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس موقع پر وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اس کے ہاتھوں نے رستم کا بازو تھام لیا تھا۔ شانی کے ہاتھوں کی سخت گرفت رستم کے عریاں بازو پر کہنی کے قریب موجود تھی۔ اپنی نازک ہتھیلیوں کے نیچے اسے نسوں کا ابھار اور بالوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس مردانہ لمس نے ایک لمحے میں اسے خجل کر دیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ یقیناً پُراندیش لحات کے باوجود رستم نے بھی اس لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

پولیس پارٹی اب نچلی منزل پر تھی۔ شانی نے دیکھا کہ ایک لوڈر پر تین بھاری بھرکم موٹر سائیکلیں لادی جا رہی تھیں۔ یہ وہی موٹر سائیکلیں تھیں جو آج ہی شانی نے زوار کے خاص کمرے میں دیکھی تھیں۔ ان موٹر سائیکلوں کے علاوہ چند رائفلیں اور شراب کی خالی بوتلیں وغیرہ بھی لوڈر پر بار کی جا رہی تھیں۔ شیری پاس ہی موجود تھی اور موبائل فون اس کے کانوں سے لگا تھا۔ یقیناً وہ اس صورتِ حال کے حوالے سے زوار سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد پولیس والے سامان سمیت کوٹھی سے روانہ ہو گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے زوار کے گھریلو ملازم لیاقت کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔

پولیس کی روانگی کے بعد شانی اور رستم نیچے آ گئے۔ شیری اب بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ زیادہ فکر مند نہیں ہے۔ وہ برآمدے میں بید کی آرام دہ کرسی پر بیٹھی ٹیٹرا پیک جوس پی رہی تھی۔

رستم نے اس سے پوچھا۔ ’’یہ وہی باری والا معاملہ تو نہیں؟‘‘

’’اسی کتے کو خارش ہو رہی ہے۔‘‘ شیری نے کڑوے لہجے میں تائید کی۔

’’لگتا ہے کہ اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے ہی پڑیں گے۔‘‘ رستم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

پولیس افسر سے دھکم پیل میں شیری کے ہاتھ کی پشت سے ماس چھل گیا تھا۔ وہاں خون کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔

چوٹ دیکھ کر شانی بے تاب ہو گئی۔ شیری کو اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ’’آؤ میرے ساتھ، تمہیں دوا لگاؤں۔‘‘

وہ اسے کمرے میں لے آئی اور اپنے بیگ میں سے بینڈیج کا سامان نکال لیا۔ شیری کے ہاتھ پر پٹی کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''یہ باری کون ہے؟''

''ہے ایک بدخصلت۔'' وہ بولی۔ ''زوار کے پرانے دوستوں میں سے ہے۔ اس کے پیٹ میں ہر وقت اس بات کے مروڑ اٹھتے ہیں کہ زوار نے بدمعاش ٹولے سے الگ ہو کر گھر کیوں بسایا ہے۔ پہلے تو پیار محبت سے اسے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا رہا، ناکام ہو کر غنڈا گردی پر اُتر آیا ہے۔ بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے اوپر سے کوئی ماما، چاچا پولیس کے محکمے میں بھی ہے۔ آج کل وہ موٹر سائیکلوں پر اپنا دعویٰ کر رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ نے جو بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکلیں دیکھی ہیں یہ کافی مہنگی ہیں۔ یہ دو ڈھائی سال پہلے زوار نے اپنی جیب سے ہی خریدی تھیں۔ کسٹم اور دیگر واجبات سب اپنی جیب سے ادا کئے تھے۔ اس وقت جناب کا دماغ کچھ ہلا ہوا بھی تھا۔ یہ چار عدد موٹر سائیکلیں جناب نے اپنے خاص دوستوں کو مفت دی تھیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ یہ دونوں کی ملکیت ہی ہو گئیں۔ یہ موٹر سائیکل سوار ٹولہ کافی عرصے تک راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر اودھم مچاتا رہا ہے۔ زوار بھی ان میں شامل تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے جب زوار کی عقل داڑھ نکلی اور اس نے اپنا چلن بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ زوار نے باری اور باقی دو دوستوں سے موٹر سائیکلیں بھی واپس لے لیں۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان موٹر سائیکلوں پر کیا کیا خرمستیاں ہوتی ہیں۔ اب باری نے زوار کو پریشان کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ ہر آٹھویں دسویں روز پولیس کسی نہ کسی بہانے دروازہ کھٹکھٹا دیتی ہے۔ آج وہ لوگ موٹر سائیکلیں ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''یہ تو کافی سنجیدہ مسئلہ ہو گیا۔ نوکر کو بھی لے گئے ہیں۔''

شیری مسکرائی۔ ''آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ ابھی زوار کو ٹھیک سے جانتی نہیں ہیں۔ وہ آپ نے پنجابی کا محاورہ تو سنا ہوگا۔ سانپ کو سانپ لڑے تو زہر کس کو چڑھے...... زوار جب اپنے خاص موڈ میں آتا ہے تو کچھ کم زہریلا نہیں ہوتا۔ وہ باری جیسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔ ایک دو دن میں وہ سب ٹھیک کر لے گا۔''

شیری نے ایک دو دن کا کہا تھا، مگر شانی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اگلے ہی روز دوپہر سے پہلے تینوں دیوہیکل موٹر سائیکلز ایک پرائیویٹ لوڈر پر واپس آ گئیں۔ لائسنس شدہ رائفلیں اور دیگر سامان بھی جیسے گیا تھا ویسے ہی پلٹ آیا۔ ملازم لیاقت رات کو ہی واپس آ گیا تھا۔

سامان واپس آنے کے بعد شیری اور زوار میں خوب لڑائی ہوئی۔ شیری بولی۔ ''دیکھو تمہیں اپنے واہیات سامان کی کتنی فکر ہے۔ اسے چوبیس گھنٹے بھی تھانے میں نہیں رہنے دیا۔ پچھلے مہینے جب یہی کمینے پلپلے تلاش کے بہانے میری سنگھار میز توڑ گئے تو تم نے اس کی مرمت تک نہیں کروائی۔''

''بھئی، وہ اس لئے کہ تم خوبصورت ہو۔ اتنی خوبصورت کہ تمہیں سنگھار اور سنگھار میز کی ضرورت ہی نہیں۔'' زوار نے جھٹ جواب دیا۔

''وہ سنگھار میز میرے جہیز کی تھی اور میرے جہیز کی ہر چیز تمہارے نزدیک غیر اہم اور بے کار ہے۔''

''لیکن جہیز والی تو غیر اہم نہیں ہے ناں۔'' زوار شرارت سے بولا۔

''دن کے وقت تو وہ بھی غیر اہم ہے۔'' شیری غصے میں کہہ گئی۔

''چلو۔ آج ثابت کر دیتے ہیں تم کسی بھی وقت غیر اہم نہیں ہو۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

مفہوم سمجھ کر شیری شرم سے سُرخ ہو گئی۔ زوار فوراً بدلتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آؤ آج دن دیہاڑے تمہیں...... شاپنگ کرواتے ہیں اور خوب کرواتے ہیں۔ اگر چاہو تو شانی صاحبہ کو بھی ساتھ لے چلو۔ آج کا سارا دن تمہارے نام۔''

''بہت شکریہ۔ ہمیں جانا ہوگا تو خود چلے جائیں گے۔'' شیری نے اپنی خوبصورت ناک چڑھائی اور پاؤں پٹختی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

زوار نے مسکین صورت بنا کر شانی کو مخاطب کیا۔ ''دیکھیں جی! اسے جتنی تکلیف سنگھار میز ٹوٹنے کی ہے اس سے دس گنا کم بھی دل ٹوٹنے کی ہوتی تو آج ہم ایک کامیاب جوڑا ہوتے۔''

''تم اب بھی کامیاب ہو۔ بس شرارتی بچوں کی طرح ذرا لڑ لیتے ہو۔'' شانی نے کہا۔

رات کو شیری کا موڈ بالکل بحال تھا۔ زوار نے اس کی زخمی سنگھار میز شہر کی بہترین فرنیچر ورکشاپ میں مرمت کے لئے بھجوا دی تھی۔ یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پوری رات کا چاند سرِ شام ہی مشرقی پہاڑیوں سے طلوع ہو گیا تھا۔ چیڑ اور سفیدے کے بلند درختوں میں سرسراتی ہوئی خنک ہوا بدن کو گدگداتی تھی۔ شیری نے ہلکے گلابی رنگ کا کامدار جوڑا پہن رکھا تھا۔ کلائیوں میں تازہ موتیے کے گجرے تھے۔ لباس کے نیچے اس کا بدن بھرپور تھا۔ وہ ایک چنچل ادا کے ساتھ رات کی دہلیز پر تھی اور اس کی آنکھوں میں وہی سرخوشی تھی جو نو بیاہتا لوگوں کی

آنکھوں میں رات کی دہلیز پر پہنچ کر ہوتی ہے۔ آنچل، ڈھلکا ڈھلکا سا، پاؤں بہکے بہکے سے۔ آمدہ ساعتوں کا انتظار جن میں خوشگوار لمس اور نشاط انگیز قرب کا وعدہ ہوتا ہے۔ ابھی صرف ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ خواب گاہوں میں جانے کا وقت بہت دور تھا لیکن شیری کی آنکھوں میں ابھی سے بستر بچھا نظر آتا تھا۔

ہاتھوں میں کافی کے کپ لئے وہ دونوں ٹیرس پر آ بیٹھیں۔ نیچے سرسبز لان پر رستم نماز پڑھ رہا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد اس نے جائے نماز تہہ کی اور اوپر ٹیرس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر ٹیرس پر چلا آیا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے شانی سے پوچھا۔

''بی بی، میں بازار جا رہا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔''

''نہیں، ابھی تو کچھ نہیں چاہئے۔'' شانی نے کہا۔

وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ شیری گہری نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ''شانی! مجھے سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔''

''کیا؟''

''رستم بھائی! جب آپ سے بات کرتے ہیں تو ان کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی ہیں۔ آپ بھی ان کی طرف زیادہ نہیں دیکھتیں۔ پھر ان کا ''بی بی'' کہنے کا انداز بھی بے حد عجیب ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح وہ ''بی بی'' کہتے ہیں اس طرح کوئی اور کہہ نہیں سکتا۔''

شانی خاموش رہی۔

شیری بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا اور زوار کا حتمی فیصلہ ہے کہ آپ سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے لیکن ...... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر کسی سوال جواب کے سمجھ میں آتی ہیں...... بالکل خوشبو کی طرح جو اپنے آپ پھیلتی ہے۔ نظر نہیں آتی لیکن اس کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

شانی سمجھ گئی کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لئے کوئی مناسب فقرہ ڈھونڈنا شروع کیا مگر اس دوران میں شیری بول پڑی۔ ''میں اور زوار اکثر سوچا کرتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے رستم بھائی کو اتنی جلدی اور اتنی طاقت سے بدلا ہے۔ اتنا تو ہمیں بھی پتا چل گیا کہ کوئی لڑکی ہے۔ رستم بھائی اس کی محبت میں یوں گرفتار ہوئے ہیں کہ باقی سب کچھ بھلا دیا ہے۔ مگر وہ ہے کون؟ کہاں رہتی ہے؟ کیسی ہے؟ ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ زوار حالانکہ رستم کا بے تکلف دوست ہے لیکن اس میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے بے تکلفی کے زعم میں رستم

بھائی سے پوچھا بھی لیکن اتنا سنجیدہ اور خشک جواب ملا کہ دوبارہ اس کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ ناراضگی دکھانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ دن گزرتے گئے اور ہمارا تجسس اس بارے میں بڑھتا گیا۔ وہ کون ہے؟ وہ کہاں ہے؟ اس قسم کے بے شمار سوال تھے۔ پھر ...... ایک دن پتا ہے کیا ہوا؟''

شانی بس سوالیہ نظروں سے شیری کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

شیری بولی۔ ''پھر ایک دن...... رستم بھائی آپ کے ساتھ اس چار دیواری میں آ گئے۔ کہتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں ہم عورتوں کی حس تیز ہوتی ہے۔ شانی آپ یقین کریں، آپ کی پہلی جھلک دیکھتے ہی مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ آپ ہی ہیں جس نے......ایک خونی ڈاکو اور خطرناک قاتل کی کایا پلٹی ہے اور اسے انسان بلکہ بہت اچھا انسان بنا دیا ہے......اب آپ اقرار کریں یا نہ کریں۔ اس بارے میں کوئی بات کہیں یا نہ کہیں لیکن میں اور زوار اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ ہی ہیں جس نے رستم اور ان کے کئی ساتھیوں کی زندگیاں بدلی ہیں اور اس طرح بدلی ہیں کہ لوگ دیکھتے رہ گئے ہیں۔''

شیری کی نظریں شانی کے ملیح چہرے پر جمی تھیں اور وہ خاموش بیٹھی تھی۔ ایک گہرے سمندر کے مانند اوپر سے بے صدا، اندر سے پُرشور اور متلاطم۔

''میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟'' شیری نے ہولے سے پوچھا۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں شیری۔ میں اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔'' شانی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

چاند افق سے ابھر کر کافی اوپر آ گیا تھا۔ اس کی روشنی دور مارگلہ کی پہاڑیوں پر چمک رہی تھی۔

اس رات شانی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ شیری کی باتوں نے اس کے اندرونی اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر کا مفہوم سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ چھپانا چاہ رہی ہے، وہ چھپنے والا نہیں۔ پچھلے کئی دن سے وہ مسلسل اپنے اور رستم کے تعلق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ جُوں جُوں سوچتی تھی، اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا تھا۔

رستم کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ تو موجود تھا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا تھا مگر ابھی اس کیفیت کو کوئی واضح شکل نہیں ملی تھی۔ بے شک رستم اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی موجودگی شانی کی ڈھارس بندھاتی تھی۔ وہ جب موجود نہیں ہوتا تھا تو شانی

اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ رستم سے محبت کرتی ہے۔ کم از کم یہ شدید محبت تو ہرگز نہیں تھی۔ ایسی محبت جس کے بعد کسی کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔

ایک دو بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جیون کا راستہ بے حد سنسان ہو گیا ہے۔ اس خاردار راستے پر دور دور تک کوئی اپنا نہیں ہے۔ اگر وہ کہیں آگے چل کر رستم کا ہاتھ تھام لے تو شاید زیست کا سفر آسان ہو جائے لیکن اس نے جب بھی ایسا سوچا دل میں عجیب سی بے چینی جاگ گئی۔ اسے رستم کے قرب کے تصور سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ ایسی غیر معمولی محبتوں کے لئے قرب..... زہر قاتل ہوتا ہے۔ وہ اس نہایت نازک اور لطیف جذبے کو قتل کرنا نہیں چاہتی تھی جو اس کے اور رستم کے درمیان موجود تھا۔

پھر کسی وقت اس کا دھیان رستم کے موجودہ حالات کی طرف چلا جاتا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ نارپور کے سیال بھی بڑی تندہی سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو کب کا قبائلی علاقے میں روپوش ہو چکا ہوتا لیکن اب اس کی وجہ سے وہ یہاں پنڈی میں روپوش ہونے پر مجبور تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں وہ رستم کے لئے بوجھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا..... اس کی ''بے حرکتی'' اس کے لئے موت کا پھندا بن جاتی تو کیا ہوتا؟

کیا وہ رستم کو اپنی وجہ سے نقصان اٹھاتے دیکھ سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب یکسر نفی میں تھا۔ وہ اندر سے کانپ جاتی تھی۔ ایسے میں ذہن کے اندر یہ خیال ابھرتا تھا کہ وہ رستم کو چھوڑ کر چپ چاپ کسی طرف نکل جائے۔ رستم نے اس کے لئے کئی قربانیاں دی تھیں۔ اب اسے مسلسل آزمائشوں میں ڈالے رکھنا کہاں کا انصاف تھا؟

لیکن پھر فوراً ہی دوسری طرح کے خیال ذہن پر حملہ آور ہوتے۔ کیا رستم اس کی اچانک دوری برداشت کر لے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے پھر نارپور یا رنگ والی پہنچ جائے اور دشمنی کی مہلک آگ کی نذر ہو جائے.....

اس سوچ میں بہت وزن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیری نے جو کچھ کہا تھا وہ مزید خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ شیری نے سیدھے سادے انداز میں اس شدید محبت کا ذکر کیا تھا جو شانی کے حوالے سے رستم کے دل میں موجود تھی۔ شانی جانتی تھی ایسے جذبے بڑے سرکش اور بے رحم ہوتے ہیں۔ انسانوں اور ان کی زندگیوں کو ماچس کی تیلیوں کی طرح بکھیر دیتے ہیں۔

کہیں رستم بھی تو بکھر نہیں جائے گا۔ کہیں اس کی زندگی بھی تو چکنا چور نہیں ہو جائے گی۔ یہ بڑا اہم سوال تھا اور اس کا جواب شانی کے دل کی گہرائی میں کپکپی سی پیدا کر دیتا تھا۔

وہ ان تمام سوچوں کا ایک نتیجہ نکالتی تھی اور نتیجہ یہ تھا کہ وہ رستم سے دور چلی جانا چاہتی ہے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ ٹوٹ پھوٹ جائے۔

کسی وقت وہ بے ساختہ سوچتی۔ کتنا اچھا ہو کہ رستم کی زندگی میں کوئی اچھی لڑکی آ جائے جو اسے سنبھال لے۔ آناً فاناً اس کے دل میں بس کر اسے اپنے دل میں بسا لے..... رستم کے جذبۂ محبت کی ساری شدتیں اس لڑکی کی طرف منتقل ہو جائیں۔ وہ نادیدہ جال ٹوٹ جائے جس نے شانی کو جکڑ رکھا ہے۔ وہ آزاد ہو کر کسی ان دیکھی منزل کی طرف ہجرت کر جائے۔ یوں رستم سے دور جاتے ہوئے اسے یہ اطمینان ہو کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

شانی کو آج کل ہمہ وقت یہی لگتا تھا کہ وہ دو کشتیوں کی سوار ہے۔ وہ رستم سے دور جانا چاہتی ہے اور پاس بھی رہنا چاہتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو جاتی۔ اسے لگتا کہ کوئی غیر مرئی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے..... یا پھر کوئی اور ہے جو کمرے کی تنہائی میں اس کے قریب ہے۔ اسے کسی کے سانسوں کی مدھم آواز سنائی دیتی..... کانوں میں چاندی کے کڑوں کی کھڑکھڑاہٹ گونجتی۔ ذہن میں ایک ڈرانے والی سوچ اُبھرتی۔ کہیں نگینہ تو اس کے آس پاس موجود نہیں۔

وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور پھر جلد ہی اس کی فطری دلیری اور قوت برداشت اس کے کام آتی اور وہ اس سمی واہمے کے جال سے نکل آتی۔

ایک شام شانی ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے دیکھتے سوگئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ اچانک ماسی زینب کی آواز نے اسے جگا دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے ماسی جی؟'' شانی نے پوچھا۔

''تم نے اس برقع والی کو دیکھا ہے؟'' ماسی نے کہا۔

''کون برقع والی؟''

''وہی جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی ہے۔'' ماسی نے دبی آواز میں کہا۔

''نن..... نہیں۔ میں ذرا سو گئی تھی۔''

''وہ اوپر گئی ہے، رستم کے پاس۔''

شانی کا ذہن ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ اسے ماسی زینب کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ماسی نے کہا۔ ''ابھی ایک لڑکی آئی ہے۔ کہتی ہے کہ میں رستم کے پنڈ سے آئی ہوں۔ اس سے ملنا ہے۔ میں نے اسے اوپر رستم کے کمرے میں بھیج دیا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''آؤ، میں تمہیں دکھاؤں۔'' ماسی زینب رازداری سے بولی اور شانی کی انگلی پکڑ کر اسے سیڑھیوں کی طرف لے آئی۔

شیری اور زوار دونوں گھر میں نہیں تھے ... ماسی زینب کے انداز نے شانی کو پریشان کر دیا تھا۔

ماسی شانی کو کھینچتی ہوئی بالائی منزل پر لے آئی۔ یہاں شام کی گہری تاریکی نے پر پھیلا لئے تھے۔ ماسی نے شاید جان بوجھ کر کوئی لائٹ نہیں جلائی تھی۔ وہ شانی کو سیدھا ایک ادھ کھلی کھڑکی کے سامنے لے آئی۔ آنکھوں کے اشارے سے اس نے شانی سے کہا کہ وہ اندر دیکھے۔

شانی نے جھجکتے ہوئے اندر نگاہ دوڑائی۔ رستم کے کمرے کا ایک تہائی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک صوفہ ایک شیشے کی تپائی اور دیوار گیر الماری کا تھوڑا سا حصہ۔ صوفے پر ایک برقع پوش لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔ اسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ رونے سے اس کی سفید ناک اور آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ شانی کو اس کی شکل کچھ شناسا سی لگی۔

اسی دوران میں کمرے کے دوسرے گوشے سے رستم کی ناراضگی بھری آواز ابھری۔

''تمہارے علاوہ اور کون جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں؟''

''صرف..... صرف یعقوب۔'' لڑکی نے ''صرف'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور تم جانتے ہو کہ یعقوب کے سینے سے کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی۔''

''میں اس کے بارے میں کیا جانوں گا۔ میں تو تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم کیسی عورت ہو۔ میرے لئے مصیبت بن گئی ہو تم..... بھوت بن کر چمٹ گئی ہو مجھ سے۔''

لڑکی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''رستم! میں بہت بدل گئی ہوں۔ تمہارے لئے خود کو بہت بدلا ہے میں نے۔ ذرا میری طرف غور سے تو دیکھو۔ کیا تمہیں مجھ میں کچھ نیا نظر نہیں آتا؟''

''لیکن ... لیکن تمہیں یہاں کا پتہ کیسے چلا؟'' رستم نے سٹپٹا کر کہا۔

''بس لگن سچی ہو او ... بندہ کوشش کرے تو خدا بھی ملتا ہے۔''

''اگر کوئی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا ہو تو پھر؟'' رستم کے دھیمے لہجے میں گرج تھی۔

''نہیں رستم، میں بڑی سے بڑی ضمانت دے سکتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔''

اچانک شانی کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ خوبرو لڑکی کی شکل جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔ نارپور کی حویلی میں ایک روز نگینہ نے اپنے چوڑیوں والے ٹوکرے کے نیچے سے ایک اخبار نکالا تھا۔ اس اخبار میں اس لڑکی کی تصویر موجود تھی۔ ہاں، یہ وہی تھی۔ اُبھرتی ہوئی معروف اداکارہ نادیہ..... جو رستم سے ملنے کے لئے اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اچانک نارپور چلی آئی تھی اور دو روز حاجی حیات خان کے ڈیرے پر رہی تھی۔

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ ایک فلمی اداکارہ کو میک اَپ کے بغیر سادہ سے برقع میں دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ شکل صورت سے عام گھریلو لڑکی نظر آتی تھی۔ کوئی خاص نخرا بھی نہیں تھا۔ یا شاید واقعی اس نے خود کو تبدیل کر رکھا تھا۔

رستم اس سے کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو! میں یہاں تمہیں ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرے دوست کا گھر ہے۔ یہاں اس کی فیملی ہے۔ تمہیں یہاں سے جانا ہو گا۔ ابھی......اسی وقت۔''

''پلیز ایسا مت کرو۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں بہت کچھ چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''تو میں نے کہا تھا چھوڑنے کے لئے۔ میں تمہارے کسی قول فعل کا ذمہ دار نہیں ہوں۔''

''تم کچھ بھی کہو رستم! لیکن میں اب واپس نہیں جا سکتی۔ مجھے اپنے پاس رکھو گے تو اسی میں تمہاری بھی بہتری ہے۔ تم بھی محفوظ رہو گے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''رستم! میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔ بار بار تمہاری طرف آؤں گی ... میری یہ بے قراری تمہارے لئے خطرہ بن جائے گی۔ کوئی اور بھی میرے قدموں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا تو پھر ''

''بہت خوب۔ تم مجھے دھمکا رہی ہو۔'' رستم کا لہجہ آتش بار تھا۔

''نہیں، خدا کی قسم نہیں۔'' اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں تو تمہاری بے دام کی غلام ہوں۔ بس اتنی درخواست کرتی ہوں۔ مجھے خو

سے دور نہ کرو۔''

وہ ہاتھ باندھے کسی حسین پجارن کی طرح رستم کے روبرو کھڑی تھی۔ ہلکی براؤن آنکھوں میں التجا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ برقع کے اندر سے بھی اس کا ہیجان خیز جسم اپنے خدوخال نمایاں کر رہا تھا۔

رستم شانی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا، تاہم اس کی آواز سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ رستم نے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے۔ تم یہاں نہیں رہ سکتی ہو۔ تمہیں جانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔'' نادیہ نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن مجھے اپنے آس پاس تو رہنے دو۔''

''کیا مطلب؟'' رستم کی ناراض آواز ابھری۔

''یہاں پاس ہی میری ایک پرانی سہیلی کا مکان ہے۔ میں وہاں رہ لوں گی۔''

''سہیلی کا مکان؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم ڈرامہ کر رہی ہو۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بس تم مجھے اپنے آس پاس رہنے کی اجازت دے دو۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی۔''

''سہیلی کے مکان والا جھوٹ کیوں بول رہی ہو تم؟''

''نہیں رستم! واقعی یہاں میرے پاس رہنے کے لئے مکان ہے۔''

''کس کا مکان ہے؟'' رستم کی آواز میں بدستور ناراضگی تھی۔ دونوں دھیمی آواز میں بول رہے تھے لیکن شانی چونکہ کھڑکی کے بالکل پاس تھی اس لئے گفتگو کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ ماسی زینب اسے وہاں چھوڑ کر نیچے جا چکی تھی۔

''بتاؤ۔ کس کا مکان ہے؟'' رستم نے سوال دہرایا۔

وہ ڈرے ڈرے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ''اور زیادہ ناراض تو نہیں ہو جاؤ گے؟''

''دیکھو، مجھ سے الٹی سیدھی بات نہ کرو۔ سیدھا سیدھا بتاؤ کہ کس کا مکان ہے؟''

وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ انداز میں لگاوٹ اور معنی خیزی تھی۔ اس مسکراہٹ کے ذریعے شاید اس نے اپنی گھبراہٹ کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ''اسی لین میں دو گھر چھوڑ کر میں نے 14 نمبر کوٹھی کرائے پر لے لی ہے۔ مم...... مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ نہیں رہنے دو گے۔''

''میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ......'' رستم کی کرخت سرگوشی ابھری۔ ''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اب اس میں میں کیا کرسکتا ہوں۔''

غالباً رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نادیہ بھی کھڑی ہوگئی۔ شانی جلدی سے ایک چوڑے ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکلے۔ رستم آگے اور نادیہ پیچھے تھی۔ نادیہ نے محبوبانہ انداز میں پوچھا۔ ''تو تمہاری طرف سے اجازت ہے؟''

''میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔'' رستم نے غصیلی سرگوشی کی اور پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

حالات نے ایک دلچسپ موڑ لیا تھا۔ شانی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نادیہ نامی اس فلمی اداکارہ سے راولپنڈی کی اس کوٹھی میں اس انداز سے ملاقات ہوگی۔

نادیہ کی یہاں آمد سے ایک بات تو کلیئر ہو جاتی تھی۔ وہ رستم کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھی۔ اگر اپنے بیان کے مطابق وہ واقعی اپنی فلمی مصروفیات ترک کر کے لاہور سے یہاں آ پہنچی تھی اور اس نے رستم کے قریب رہنے کے لئے ایک مکان بھی لے لیا تھا تو پھر یہ بڑی حیران کن صورتِ حال تھی۔ بے شک نادیہ کوئی بہت بڑی اداکارہ نہیں تھی۔ وہ ابھی ترقی کے ابتدائی زینوں پر تھی۔ اداکارہ سے زیادہ اس کی پہچان ایک ''سیکس سمبل'' رقاصہ کی حیثیت سے تھی، مگر کچھ بھی تھا اس نے لاہور کی فلم نگری میں اپنے سارے کاموں کو فل اسٹاپ لگا کر......اور یہاں پہنچ کر ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔

ماسی زینب کو شانی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ یہ لڑکی رستم کے گاؤں کی ہی ہے اور اپنے کسی ذاتی کام سے یہاں پہنچی ہے۔ رات کو شیری اور زوار شاپنگ کے حوالے سے لڑتے جھگڑتے گھر پہنچ گئے۔ زوار کے نزدیک شیری سے بڑھ کر فضول خرچ عورت رُوئے زمین پر نہیں تھی اور شیری کے نزدیک دنیا کے کنجوس ترین مردوں میں زوار سرِفہرست تھا۔ بہرحال پیکٹوں اور لفافوں کی تعداد بتا رہی تھی کہ اس مرتبہ شیری کا مؤقف کمزور ہے۔ شانی نے ان دونوں کو بھی نادیہ کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال اتنا بتانا تو ضروری تھا کہ کوئی برقع پوش عورت رستم سے ملنے آئی تھی۔

اگلے دو روز تک اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ تیسرے روز شام کو شانی نے صحن میں ایک منظر دیکھا اور چونک گئی۔ ایک قریبی کوٹھی کی چھت پر پرسوں والی برقع پوش لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ چھت کی منڈیر اونچی تھی۔ لڑکی، یعنی نادیہ کے صرف شانے اور چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بالوں کی لٹیں اور اس کا سبز آنچل ایک ساتھ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بالائی منزل پر رستم کے کمرے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رستم کے کمرے کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ وہ شاید سو رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہاں کھڑی رہی، یہاں تک کہ اندھیرا چھا گیا۔ وہ شانی کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

رات نو بجے کے لگ بھگ وہ کمرے کی کھڑکی میں نظر آنے لگی۔ اس وقت رستم اور زوار لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شانی اور شیری برآمدے میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ شانی کا دھیان ٹی وی کی طرف کم اور پڑوس کی کھڑکی کی طرف زیادہ تھا۔ وہ اس انوکھی صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھی۔ معروف فلمی اداکارہ نادیہ ایک سامنے والی کھڑکی میں موجود تھی... اور اپنے محبوب مرد سے آنکھ مچولی کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی...... وہ حسن و شباب کی ساری رعنائیوں سے لیس ہو کر یہاں پہنچی تھی اور اپنے من کی مراد پانے کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار نظر آتی تھی۔ شانی نے اسے تین دن پہلے بند کمرے میں رستم کے روبرو دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں جیسے اس کا انگ انگ خودسپردگی کی دہائی دے رہا تھا۔ انسان کا ذہن بھی عجیب گورکھ دھندا ہے۔ بندے کو ایسے ایسے چکروں میں الجھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

جو کچھ یہاں ہو رہا تھا، اس سے صرف شانی آگاہ تھی...... لیکن جلدی ہی یہ آگہی شانی تک محدود نہیں رہی۔ اگلے روز شام کو شانی نہا کر باتھ روم سے نکلی تو شیری بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی۔ وہ اب اسے بے تکلفی سے باجی کہنے لگی تھی، بولی۔ ''شانی باجی۔ آئیں، میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی برآمدے میں لے آئی۔ تولیے میں لپٹے ہوئے شانی کے بال کھل کر اس کی کمر کو بھگونے لگے۔ دونوں ایک نیم تاریک کونے میں کھڑی ہوگئیں۔ شیری نے کہا۔ ''وہ سامنے چھت پر دیکھیں...... اور بوجھیں کہ کون ہے؟''

وہاں کل کی طرح نادیہ موجود تھی۔ شانی نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور انجان بن کر بولی۔

''کون ہے؟''

شیری سنسنی خیز انداز میں کہنے لگی۔ ''باجی شانی، مجھے ایک شک پڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فلمی اداکارہ نادیہ ہے۔ وہی نادیہ جس کا تذکرہ اخباروں میں رستم بھائی کے ساتھ آیا تھا۔''

''واقعی؟'' شانی نے اس موقع پر انجان بننا بہتر سمجھا۔

''آپ ذرا غور سے دیکھیں نا۔'' شیری نے اصرار کیا۔

شانی نے چھت پر نگاہیں مرکوز کیں۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''سو فیصد ٹھیک کہہ رہی ہو باجی۔'' شیری کے لہجے میں سنسنی تھی۔ ''اور یہ سب کچھ اتفاقیہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ ایکٹرس پلاننگ کے تحت یہاں آئی ہے۔ اس کی آمد چار پانچ دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ کوٹھی کرائے کے لئے خالی تھی۔''

''کیا ہوسکتی ہے پلاننگ؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' شیری نے آنکھیں گھمائیں۔ ''یہ چنڈال ہاتھ دھو کر اپنے رستم بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ آپ انجان مت بنیں۔ مجھے پتا ہے آپ بھی بہت کچھ جانتی ہوں گی۔''

''بہت کچھ تو نہیں۔ بس تھوڑا بہت۔''

''خیر جو بھی ہے لیکن اس وقت اہم ترین مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ حرافہ یہاں ہمارے گھر کے عین سامنے موجود ہے۔ اوہ مائی گاڈ ..اب پتا نہیں کہ رستم بھائی اس بارے میں جانتے ہیں یا نہیں۔''

شانی کو وہیں چھوڑ کر شیری سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر رستم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شانی وہیں کھڑی رہی۔ نادیہ چھت پر ٹہلنے والے انداز میں گھوم رہی تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور اس کے بال اُڑ رہے تھے۔ وہ گاہے بگاہے رک کر اپنے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ بے شک وہ ایک ایکٹرس تھی اور لاہور کی فلم نگری سے تعلق رکھتی تھی لیکن ایک بات ماننا پڑتی تھی اس کی شکل و صورت میں ایکٹرسوں والا بازاری پن اور تصنع نہیں تھا۔ باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد شیری پھر اس کے سامنے موجود تھی، بولی۔ ''رستم بھائی انجان نہیں ہیں۔ انہیں اس چھمک چھلو کی یہاں آمد کے بارے میں پتا لگ چکا ہے اور آپ کے لئے ایک نئی خبر بھی ہے۔''

''کیسی خبر؟''

''تین دن پہلے جو برقع والی ہمارے ہاں آئی تھی، وہ یہی خانہ خراب تھی۔''

شانی نے اپنی بے خبری کا بھرم رکھنے کے لئے چہرے پر حیرت سجائی۔

شیری جلے کٹے انداز میں بولی۔ ''یہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنا سب کچھ ہتھیلی پر لئے پھرتی ہیں۔ اپنے حسن کے نخروں سے مردوں کو بے حال کرتی ہیں لیکن اگر ان کو خود کوئی مرد پسند آ جائے تو پھر کتیا کی طرح اس کے پاؤں چاٹنے کے لئے بھی تیار رہتی ہیں۔ اب یہ

اُلو کی پٹھی پتا نہیں کہ کس طرح اور کیسے رستم بھائی کا کھوج لگا کر یہاں تک پہنچی ہے اور دلیری دیکھیں کہ گھر کے عین سامنے ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہے۔ میں تو آج ہی شیخ صاحب کی بیگم سے بات کرتی ہوں۔ ان سے پوچھتی ہوں مگر کہ یہ کس ''شریف زادی'' کو کوٹھی دے ڈالی ہے انہوں نے۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔'' کچھ بھی کرنے سے پہلے رستم سے مشورہ ضرور کر لینا۔ کہیں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو جائے۔ ایسی عورتوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا...... رستم نے خود کو یہاں روپوش کیا ہوا ہے اور یہ عورت اس ٹھکانے کو جان چکی ہے۔''

شانی کی بات سے شیری کا جوش قدرے ماند پڑ گیا۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ شانی نے کہا''رستم جانتا ہے کہ نادیہ یہاں موجود ہے۔ اس کے باوجود وہ خاموش ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہوگی۔''

کچھ دیر تک وہ دونوں اس بارے میں بات کرتی رہیں۔ پھر زوار کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور شیری اس کے استقبال کے لئے مین گیٹ کی طرف چلی گئی۔

☆======☆======☆

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شیری نے شانی کو بتایا کہ والدہ کی خراب طبیعت کی وجہ سے چھ سات روز کے لئے میکے جانا پڑ رہا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں شانی اس ایکٹرس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے جو ان کے گھر کے عین سامنے مورچہ لگائے بیٹھی تھی۔

شیری نے شانی کے ہاتھ تھام لئے اور کئی سیکنڈ تک عجیب نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کہنے لگی۔''شانی باجی، پتا نہیں کیا بات ہے دو چار دنوں میں ہی یوں لگنے لگا ہے کہ آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے لئے کچھ کروں۔ آپ کے کسی کام آؤں لیکن آپ تو کچھ بتاتی ہی نہیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے دکھ اپنے سینے میں سمیٹے بیٹھی ہیں۔''

''کچھ بھی سمیٹا ہوا نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ خود کو پریشان نہ کرو۔''

اس نے جیسے شانی کی بات سنی ہی نہیں۔ اپنی رَو میں بولتی چلی گئی۔'' آپ کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کا مجھے کوئی حق نہیں اور نہ میں دینا چاہتی ہوں لیکن ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ یہ بات میرے دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ کوئی مضبوط اور محبت بھرا سہارا۔ پلیز باجی، آپ اپنے

آس پاس دیکھیں۔ اگر آپ کو کوئی ایسا سہارا نظر آئے اور آپ اس کے لیے دل میں تھوڑی سی بھی گنجائش پائیں تو اس سے دور مت رہیں۔''

شانی جانتی تھی کہ شیری کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ خاموش رہی۔

شیری کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور ہلکی سی شوخی تھی۔ بولی''ہو سکتا ہے کہ آپ کے آس پاس کوئی ایسا ہو جو آپ سے بہت محبت کرتا ہو۔ اس کے لب خاموش ہوں لیکن وہ دن رات آپ کا نام لے کر جیتا ہو۔ سیانے کہتے ہیں کہ ایسی محبتوں کی قدر کرنی چاہئے۔ ورنہ آہستہ آہستہ وہ دور ہو جاتی ہیں...... یا انہیں کوئی دور کر دیتا ہے۔ اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔''

شیری جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ شانی کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن یہ سب کچھ شانی کے ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

پچھلے دو تین دن میں شانی نے نادیہ کو بغور دیکھا تھا۔ اس کی چال ڈھال کا مشاہدہ کیا تھا۔ ایک بار اتفاقاً گھر کے سامنے واقع پارک میں بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ صبح بہت سویرے شانی ماسی زینب کے ساتھ تھوڑی سی چہل قدمی کے لئے گئی تھی۔ وہاں نادیہ اپنی دس بارہ سالہ ملازمہ کے ساتھ نیلے رنگ کے ننھے ننھے پھول توڑ کر ایک ننھا سا گلدستہ بنا رہی تھی...... دونوں میں سلام دعا ہوئی تھی۔ شانی نے کہا۔'' آپ وہی ہیں نا جو سامنے 14 نمبر کوٹھی میں رہتی ہیں؟''

نادیہ نے اثبات میں جواب دیا تھا اور اس کے بعد دونوں میں چار پانچ منٹ بات ہوئی تھی۔ اس بات چیت میں شانی کو نادیہ کچھ ایسی بُری نہیں لگی تھی۔ بے شک اس کے چہرے پر حسن کی چکا چوند تھی اور جسم بھی چیختا چنگھاڑتا ہوا تھا، مگر یہ سب کچھ لباس میں ڈھکا ڈھکا اور دبا دبا سا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو ذرا سی کوشش سے کسی بھی خشک سے خشک مرد کو متوجہ کر سکتی ہیں۔

اسی روز شام کو شیری میکے چلی گئی۔ شانی اب گھر میں تنہا تھی۔ تنہائی میں سوچیں اسے مزید شدت سے گھیرتی تھیں اور بے بس کر دیتی تھیں۔ کبھی کبھی اس وسیع و عریض کوٹھی میں بھی اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ کہاں؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں نادیہ کو یہاں دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد شانی کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اگر وہ کسی روز اچانک یہاں سے چلی بھی جائے تو شاید رستم کے لئے یہ صدمہ زیادہ شدید ثابت نہ ہو۔ اس خیال کی بظاہر کوئی ٹھوس وجہ تو نہیں تھی بہرحال یہ شانی کے ذہن میں موجود

تھا۔

شیری کے جانے کے بعد دو تین روز میں شانی نے نادیہ سے کچھ راہ و رسم پیدا کی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی کسی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ پہلے تو چھت پر سے ہی دونوں میں سلام دعا ہوتی رہی۔ پھر ایک روز دوپہر کو نادیہ بریانی کی پلیٹ لے کر ازخود شانی کے پاس چلی آئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ابھی ابھی کوکنگ سیکھی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ آج پہلا کھانا پکایا ہے۔ اگر آپ اس میں کوئی ''رسک'' نہ سمجھیں تو چکھ کر ضرور دیکھیں۔''

شانی نے چکھا۔ جو کچھ تھا گزارے مافق تھا تاہم شانی نے تعریف کی اور حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابھی تک دونوں میں تفصیلی تعارف نہیں ہوا تھا۔ آج یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ دونوں اپنا تعارف نہیں کرا سکتی تھیں۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ شانی نے نادیہ کو بتایا کہ وہ شیری کی پرانی سہیلی ہے۔ والدین اور بڑے بھائی کی وفات کے بعد وہ گاؤں سے یہاں آگئی اور اب کوئی ملازمت تلاش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔ نادیہ نے شانی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اداکاری کا شوق تھا، کچھ عرصہ پہلے ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کرتی تھی۔ اس کام میں مجھے کافی عزت اور شہرت بھی ملی، لیکن اب ایک دم اکتا گئی ہوں۔''

شانی نے کہا۔ ''شاید اسی لئے آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔''

''یقیناً بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔'' وہ مسکرائی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب میں اور طرح کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا گھر ہو، شوہر اور بچے ہوں۔ روپے پیسے کی مجھے کوئی کمی نہیں۔ بس ایک اچھے جیون ساتھی کی تلاش ہے۔''

شانی نے دل میں سوچا...... ساتھی بھی تو ڈھونڈ چکی ہو اور اس کے قریب بھی پہنچ چکی ہو۔ اب آئندہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق تو اللہ ہی جانتا ہے۔

کچھ دیر تک شانی اور نادیہ میں باتیں ہوئیں۔ باتوں کے دوران میں بھی نادیہ کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں۔ وہ جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھی اور شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسے تلاش کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ''کل پھر بریانی بناؤں گی اور آپ کو ٹیسٹ کراؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ کل کا ذائقہ آج سے بہتر ہوگا۔''

''مجھے بھی لگ رہا ہے۔'' شانی نے کہا۔

اگلے روز وہ شام کو آئی۔ اس نے گلابی رنگ کی زبردست شلوار قمیص پہن رکھی تھی کپڑے کی تراش ایسی تھی کہ بدن کے دل آویز خطوط نمایاں ہوتے تھے...... آج بریانی واقعی

کل سے بہتر تھی۔ شانی نے اسے جو دو چار مشورے دیئے تھے ان پر اس نے ذہانت سے عمل کیا تھا۔ آج اتفاقاً رستم بھی گھر میں ہی موجود تھا۔ شانی نے کچھ بریانی ایک پلیٹ میں نکالی اور ماسی زینب کو دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ رستم کو دے آؤ اور پوچھنا کیسی ہے؟ یہ مت بتانا کہ کون لایا ہے۔''

ماسی زینب کی واپسی دو چار منٹ بعد ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''رستم کو بہت پسند آئی ہے، پوچھ رہا ہے کس نے بنائی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید تم نے بنا کر بھیجی ہے۔''

شانی نے ماسی سے کہا۔ ''اس سے کہو کہ آکر دیکھ لے، کس نے بنائی ہے۔''

کچھ دیر بعد زینوں پر رستم کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر وہ ان کے سامنے تھا۔ شانی کے پاس نادیہ کو بے تکلفی سے بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''تم یہاں؟''

نادیہ پہلے تو ذرا گھبرائی پھر سنبھل کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے پہلے سے جانتے ہو۔ خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ملک کے لاکھوں لوگ مجھے جانتے ہیں۔''

''کیوں آئی ہو تم یہاں؟'' رستم بھنا گیا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''میں تمہارے پاس کہاں، اپنی پیاری دوست کے پاس آئی ہوں۔ آج کل ان سے کھانا پکانا سیکھ رہی ہوں۔ ایک نئے اسٹائل سے جینا چاہ رہی ہوں اس لئے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔''

''تم نے جو کچھ سیکھ لیا ہے وہی کافی ہے۔ جاؤ لاہور میں کسی کیمرے کے سامنے ڈانس کرو اور کھیتوں میں چھلانگیں لگاؤ۔ یہاں بھلے مانس لوگوں میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''بھلی مانس بننے کے لئے ہی تو بھلے مانس لوگوں میں آئی ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں پھر دلدل میں واپس جاؤں۔''

''تم دلدل سے نکلی ہی کب ہو۔ تم تو اپنی دل پشوری کے لئے بس سوانگ رچا رہی ہو۔ اداکاری تمہارا پیشہ ہی نہیں تمہاری فطرت بن چکی ہے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ جاؤ یہاں سے۔''

نادیہ تحمل اور سکون سے رستم کا غصیلا لہجہ برداشت کر رہی تھی۔ ماتھے پر سلوٹ تک نہیں تھی۔ اس موقع پر شانی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''رستم، اس وقت یہ میری مہمان ہیں۔ تم ان سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔''

رستم کا چہرہ سُرخ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ شانی کی بات کا کوئی سخت اور مدلل جواب دینا چاہتا ہے۔ نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ جیسے وہ کوئی ادنیٰ غلام ہو اور اپنے آقا و اَن داتا کے سامنے زبان کھولنا اس کی ہمت اور طاقت سے باہر ہو۔ آقا نے جو کہہ دیا۔ وہ صحیح ہے یا غلط، بس وہی حقیقت ہے اور اسی کو ماننا عین اطاعت ہے۔

شانی، نادیہ کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ نادیہ بولی۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس بارے میں چھپایا۔ دراصل میں اور رستم ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے نواحی علاقے میں ایک گاؤں نارپور ہے۔ چند ماہ پہلے وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے گئے تھے۔ وہاں ہمارے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ کچھ مسلح غنڈوں نے ہمارے یونٹ کے تین چار افراد کو سخت زخمی کر دیا اور مجھے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر ایک عام آدمی نے فلمی ہیرو والا کردار ادا کیا اور میری جان ان شرابی غنڈوں سے چھڑائی۔ وہ آدمی یہی رستم تھا۔ اس واقعے کے بعد ہم دونوں میں جان پہچان پیدا ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے کچھ قریب آ گئے لیکن اس دوران میں ایک دو غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ان غلط فہمیوں کا دھواں ابھی تک آپ نے رستم کے چہرے پر دیکھ ہی لیا ہے۔‘‘

’’آپ اداکارہ ہیں اور آپ کی کہانی بھی بالکل فلموں جیسی ہے۔‘‘ شانی نے ہولے سے کہا۔

’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں شانی۔ میرے خیال میں مجھے آپ کو بتا دینا چاہئے کہ میں یہاں صرف رستم کے لئے ہی موجود ہوں۔ آپ کو میری باتیں عجیب لگیں گی اور پتا نہیں آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گی مگر میں اس موقع پر آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہی ہوگا کہ دس گیارہ دن پہلے ایک برقع والی عورت یہاں رستم سے ملنے آئی تھی۔‘‘

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔

نادیہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ’’وہ میں ہی تھی۔‘‘

شانی نے نادیہ کا انکشاف خاموشی سے سنا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہے بلکہ ان دونوں کا طویل مکالمہ بھی سن چکی ہے۔

اس روز نادیہ ساری کی ساری شانی کے سامنے کھل گئی۔ اس نے صاف الفاظ میں شانی کو بتایا کہ وہ رستم کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے ہر حد تک

جانے کو تیار ہے۔ شانی کو اس کے لہجے میں جذبے کی حدت اور خواہش کی شدت محسوس ہوئی۔ اس نے شانی کو اپنا ہمدرد و ہم مزاج تصور کر لیا تھا اور اس کے سامنے دل کا ہر پھپھولا پھوڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔

شانی توجہ اور اپنائیت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ رستم کے لئے نادیہ کے جذبے کی شدت محسوس کر کے معلوم نہیں کیوں شانی کے سینے میں کچھ ہونے لگا تھا۔ یہ کیا تھا؟ ایک ٹیس...... ایک جلن...... یا شاید صرف ایک تلخ احساس۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، شانی اسے نظرانداز کر کے نادیہ کی باتوں پر توجہ دیتی رہی۔

اگلے روز نادیہ نہیں آئی مگر اس سے اگلے روز شانی نے ماسی زینب کے ہاتھ اسے پھر بلا بھیجا۔ دونوں قریباً دن بھر ساتھ رہیں۔ رستم بھی گھر میں ہی موجود تھا۔ یقیناً نادیہ کی موجودگی اسے بے چین کر رہی تھی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بے چینی یا ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتا۔ شانی کے سامنے اس کی ساری فزکس کیمسٹری ہی بدل جاتی تھی۔ ایک عجیب رشتہ تھا اس کا اپنی ’’بی بی‘‘ کے ساتھ۔ بی بی نے جو کہہ دیا وہ اس نے بے چوں و چرا مان لیا۔

شانی بڑے دھیان سے نادیہ کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی نادیہ اسے دل سے بُری نہیں لگ رہی تھی۔ نادیہ کی اس بات میں بھی صداقت محسوس ہوتی تھی کہ وہ خود کو مکمل طور پر تبدیل کر رہی ہے اور ایک نئی زندگی نئے ڈھنگ سے شروع کرنا چاہتی ہے۔ نادیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے شانی کو بتایا تھا کہ وہ پچھلے کئی ہفتے سے رستم کی کھوج میں تھی۔ فلم لائن میں نادیہ کا سیکرٹری یعقوب نام کا شخص تھا۔ نادیہ کے بقول یہ ادھیڑ عمر شخص بے حد کارآمد ہونے کے علاوہ نہایت دیانت دار اور مخلص بھی تھا۔ اس نے کسی طرح رستم کو یہاں راولپنڈی میں تلاش کیا تھا۔

ایک دن شانی پر انکشاف ہوا کہ نادیہ کی آواز بھی اس کی طرح خوبصورت ہے۔

اس نے نادیہ کو گنگنانے کے لئے کہا۔ اس نے فیض کی ایک غزل بڑے اچھے تلفظ اور سُر کے ساتھ سنائی۔

جب وہ گنگنا رہی تھی رستم زینے اُتر کر نیچے چلا آیا۔ غالباً اسے گمان ہوا تھا کہ شانی گنگنا رہی ہے۔ اس نے دروازے میں سے نادیہ کو دیکھا تو جلدی سے واپس پلٹنے لگا۔ شانی نے آواز دے کر اسے روک لیا...... ’’جی بی بی‘‘ وہ دروازے پر ہی کھڑے کھڑے بولا۔

’’اندر آ جاؤ، تمہیں ایک بڑی اچھی آواز سنواتے ہیں۔‘‘

’’لل... لیکن۔‘‘

''آ جاؤ نا۔'' شانی نے ذرا زور دے کر کہا۔

وہ سر جھکائے ہوئے اندر آ گیا، نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''شانی! آپ ان سے کوئی بدلہ لے رہی ہیں۔ دیکھ نہیں رہیں کہ ان کی صورت کتنی پریشان ہوگئی ہے۔ یہ ہرگز سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔''

''آپ گائیں گی تو موڈ بھی بن جائے گا۔'' شانی نے شیری کا ستار نادیہ کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

''کیا سناؤں؟'' وہ مسکرائی تو اس کے گال میں خوبصورت گڑھا پڑا۔

''کوئی پنجابی چیز سنا دیں۔'' شانی نے کہا۔

نادیہ کی نازک انگلیاں مشاقی سے ستار کے تاروں پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ بڑے انداز سے بیٹھی تھی۔ ایک اداکارہ کی حیثیت سے وہ اپنے جسم کے خوش نما خطوط کو غیر محسوس طور پر نمایاں کرنے کا فن بھی جانتی تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں گانا شروع کیا۔

چنے نال چانی، تارے نال لو ماہیا
توں پھل موتیے دا، میں تیری خشبو ماہیا

(جیسے چاند کے ساتھ چاندنی اور تارے کے ساتھ روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح تُو موتیے کا پھول ہے اور میں اس کے ساتھ تیری خوشبو ہوں)

جب وہ گا رہی تھی زوار بھی گھر آ گیا۔ محفل جمی دیکھ کر وہ بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ زوار بھی رستم اور نادیہ کی پوری کہانی سے آگاہ ہوگیا تھا۔ یقیناً اسے بھی نادیہ کا یوں آزادانہ اپنے گھر میں آنا جانا پسند نہیں تھا، مگر نادیہ کے ساتھ شانی کا گہرا دوستانہ دیکھتے ہوئے اور اس حوالے سے رستم کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

نادیہ کی دل آویز اور نفیس آواز نے واقعی سماں باندھ دیا۔ زوار موسیقی کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا وہ نادیہ کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوگیا۔ پنجابی گیت ختم ہوا تو زوار نے ایک اور گیت کی فرمائش کر دی۔ شانی نے کن انکھیوں سے رستم کی طرف دیکھا۔ وہ اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا مگر شانی کی وجہ سے چپ رہنے پر مجبور تھا۔ یقیناً رستم کو زوار پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اس کی بغل میں بیٹھ کر نادیہ کو داد دے رہا تھا۔

زوار کی فرمائش پر نادیہ نے جو دوسرا گیت سنایا وہ اردو تھا اور اسے فلمی کلاسیکل گیت کہا جا سکتا تھا۔ نادیہ کی نکھری اور اجلی اجلی آواز کمرے میں گونجی۔

نہ چھڑا سکو گے دامن، نہ نظر بچا سکو گے

یہ گیت حسبِ حال بھی تھا۔ گانے کے دوران میں نادیہ کی نہایت شوخ و چنچل نظریں گاہے بگاہے رستم کی طرف اٹھتی رہیں۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اگر بی بی کا حکم نہ ہوتا تو شاید کب کا اٹھ کر جا چکا ہوتا۔

اس رات کھانے کے بعد جب شانی برآمدے میں بیٹھی تھی، رستم اس کے قریب چلا آیا۔ ''میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بی بی۔''

''تو کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔'' شانی نے سامنے بید کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ نگاہیں حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ کھنکار کر بولا۔''بی بی! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہیں؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''آپ جانتی بھی ہیں کہ یہ عورت کیا چاہتی ہے؟ کس وجہ سے یہ یہاں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے بار بار یہاں بلاتی ہیں۔ آپ اس کی باتوں پر نہ جائیں۔ یہ جو کچھ خود کو دکھانے کی کوشش کر رہی ہے، اصل میں وہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس کا بہروپ ہے، مجھ تک پہنچنے کے لئے۔''

''رستم! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بہروپ نہ ہو۔ اس نے واقعی خود کو تبدیل کرنے کی دل میں ٹھان لی ہو۔ میں اس کی باتیں بڑی توجہ سے سنتی ہوں۔ مجھے ان میں سچائی کی جھلک نظر آتی ہے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے بی بی۔ سینما اسکرین پر اپنے جلوے دکھانے والی عورت خود کو اتنی جلدی کیسے تبدیل کر سکتی ہے۔''

شانی نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔''ایسا ہوتا ہے رستم! خونی ڈاکو اور بے رحم قاتل اگر دیکھتے ہی دیکھتے بہت نیک اور ہمدرد انسان بن جاتے ہیں تو ایک ایکٹرس بھی شریف اور گھریلو عورت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب اندر کے موسم کی بات ہوتی ہے۔ جب یہ بدلتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔''

رستم کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ کچھ دیر کے لئے وہ لاجواب سا ہوگیا تھا۔ شانی نے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے نادیہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ جب تم اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

رستم نے چونک کر شانی کو دیکھا، اس کے منہ سے نکلنے والا ''دکھ'' کا لفظ جیسے کسی

ہتھوڑے کی طرح اس کے سینے پر لگا تھا۔ وہ ایک دم مجل نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی لرزاں پلکیں جھکائیں اور بولا۔ ''ٹھیک ہے بی بی! میں آئندہ اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔''

وہ اٹھا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔ کوئی اسے دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ کوئی عقیدت مند ہے، کوئی سپاس گزار پرستار ہے جو اپنے ممدوح کے آستانے سے اٹھ کر باہر آرہا ہے۔

شیری کا قیام اپنے میکے میں کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دن میں ایک دو بار اس کا فون آجاتا تھا۔ لڑنے جھگڑنے کے لئے اسے زوار کی کمی بھی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ رات کو ایک بار وہ زوار کو فون ضرور کرتی تھی۔ شیری کو بھی تعجب تھا کہ شانی نے نادیہ سے دوستی کرلی۔ یہ صورتِ حال اسے بھی کچھ پسند نہیں آئی تھی مگر شانی کی وجہ سے اس نے زیادہ نکتہ ہائے اعتراض نہیں اٹھائے تھے۔

شانی اس کوشش میں تھی کہ رستم اور نادیہ کے درمیان گفت و شنید کی کوئی صورت پیدا ہو۔ یہ گفت و شنید ہی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور فاصلے کم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے شانی، نادیہ کی ہر ممکن مدد کررہی تھی۔ وہ کوشش کر کے ایسے مواقع پیدا کرلیتی تھی جب رستم کو نادیہ سے بات کرنا پڑتی تھی۔ یوں نادیہ خود بھی کم فعال نہیں تھی۔ اس کی شوخی آمیز ذہانت دیواروں میں در بنانے کی قدرت رکھتی تھی۔ اس کا حسین سراپا اور گداز لہجہ مشکل میں اس کے مددگار اور معاون تھے۔ زوار کے ساتھ نادیہ کی کافی بننے لگی، وہ اسے بڑے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ وہ بھی اس کی آواز کا مداح تھا۔ ایک روز زوار کی فرمائش پر نادیہ نے ایک پرانی پاکستانی فلم کا مزاحیہ گانا ایسے قہقہہ بار انداز میں سنایا کہ رستم بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

شانی جب سے رستم سے ملی تھی، یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس نے رستم کے چہرے پر دیکھی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بیچ سے اس کے سفید دانت لشکارا مارتے تھے اور آنکھوں میں چمک بھر جاتی تھی۔

نہ جانے کیوں اس رات بہت دیر تک رستم کی مسکراہٹ شانی کے ذہن میں چمکتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہوتا رہا کہ یہ مسکراہٹ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ بہت عرصے پہلے بہت زمانے پہلے... لاکھوں سال قبل۔ شاید اس وقت جب اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ ایک بار پھر ابا جی کی کہی ہوئی ''عالمِ ارواح'' والی بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ جو

شکلیں ہمیں پہلی بار دیکھ کر ہی جانی پہچانی لگتی ہیں ان سے ہماری شناسائی عالمِ ارواح میں ہوئی ہوتی ہے۔ کیا یہ شخص بھی اس کے لئے کسی اور جہان کا شناسا تھا؟ کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے یا یہ صرف اس ''نرم گوشے'' کی کارستانی ہے جو پہلے روز سے شانی کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے؟

پھر اس نے یہ سارے خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیئے اور خود کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جو راستہ اس نے اپنے لئے چنا تھا وہ بالکل موزوں تھا۔ اسی راستے پر چلنے میں اس کی سلامتی اور آبرو تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ رستم کے جذبے کی بے پناہ شدت سے آگاہ نہیں تھی لیکن وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتی تھی کہ وہ اس جذبے کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایک بلند و بالا اَن دیکھی دیوار تھی جو اس کے اور رستم کے درمیان حائل تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بات بھی بہت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کا ''ساتھ'' رستم کے موجودہ مصائب میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔ وہ ایک بوجھ کی طرح رستم پر لدی ہوئی تھی اور رستم مانتا یا نہ مانتا لیکن اس بوجھ نے اس کے پاؤں زمین میں گاڑھ رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رستم سے دور چلی جانا چاہتی تھی۔ بس اس کے ارادے کے سامنے ایک رکاوٹ تھی۔ اس کی حساسیت کو گوارا نہیں تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد رستم کا منہ زور جذبہ رستم کو توڑ پھوڑے یا اس کے شب و روز کو ویران کردے۔ یہی سبب تھا کہ چند روز پہلے اس نے صدقِ دل سے یہ چاہا تھا کہ رستم کی زندگی میں کوئی عورت آجائے۔ کوئی ایسی خوش خلق لڑکی جو اپنی محبت کی بانہوں میں اسے سمیٹ لے۔

شانی کو توقع نہیں تھی کہ اس کی دعا اتنی جلدی پوری ہوگی اور اس انداز میں ہوگی۔ ماضی قریب کی ایک چمکتی دمکتی اداکارہ سادگی اور خوش خلقی کے ایک نئے سانچے میں ڈھل کر وارد ہوئی تھی اور بہت کچھ بدل دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی اور پھر سوچتے سوچتے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ دوبارہ شانی کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے اردگرد ذرا ہلچل سی محسوس ہوئی۔ ماسی زینب نے اسے آواز دے کر جگایا تھا۔ ماسی زینب کی آنکھیں رونے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ رستم بھی گم صم سا پاس ہی کھڑا تھا۔

ماسی زینب نے اشک بار لہجے میں بتایا۔ ''شانی بیٹا! شیری کی والدہ فوت ہوگئی ہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے فون آیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شیری کا چہرہ اس کے تصور میں آیا۔ وہ اپنی والد سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کی اچانک موت نے یقیناً اسے بے حال کر دیا ہوگا۔

''زوار کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ تو خبر ملتے ہی چلے گئے ہیں۔'' ماسی نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی جانا چاہئے۔'' شانی نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھ کر بولی۔ ''تمہاری کیا رائے ہے؟''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں بی بی۔''

تقریباً ایک گھنٹے بعد شانی روانہ ہو رہی تھی۔ رستم بھی ساتھ جا رہا تھا... ماسی زینب کو انہوں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ شانی سیاہ برقع میں تھی صرف آنکھیں ہی نقاب سے باہر تھیں۔ زوار کے پاس تین گاڑیاں تھیں۔ ایک گرے خیبر کی چابی اس نے احتیاطاً رستم کو دے رکھی تھی۔ رستم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شانی ایک لمحے کے لئے تذبذب میں رہی کہ کہاں بیٹھے۔ اس دوران میں رستم نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ شیری کا میکہ گلستان کالونی میں تھا۔ وہاں تک کا سفر خاموشی سے طے ہو گیا۔ بس ایک دو بار شانی نے عقب نما آئینے میں رستم کا چہرہ دیکھا۔ وہ بڑی محویت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑکوں پر رش بھی کافی تھا۔ یہ دفتر اور سکول جانے کا وقت تھا۔

شانی نے بڑی دیر تک شیری کو گلے لگا کر دلاسا دیا۔ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے اپنوں سے بچھڑنے کے مناظر یاد آ گئے تھے۔ خاص طور سے امی کی جدائی کا منظر نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔ امی جو وفا، محبت اور ایثار کا پیکر تھیں۔ جنہوں نے لوگوں کے دلوں پر چوہدراہٹ کی تھی اور وڈی آپا کے نام سے، مر کر بھی ذہن میں زندہ تھیں۔

فوتیدگی والے گھر سے شانی اور رستم کی واپسی دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ صدر کے علاقے سے گزر رہے تھے جب شانی نے اچانک رستم کو چونکتے دیکھا۔ وہ بڑے غور سے عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر شانی کو محسوس ہوا کہ ایک 82 ماڈل سفید ٹویوٹا گاڑی بڑی تیزی سے انہیں اوور ٹیک کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شانی نے کار سواروں کی فقط ایک جھلک دیکھی۔ اسے ایک شخص پولیس کی وردی میں نظر آیا۔ باقی تین افراد سفید کپڑوں میں تھے مگر صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اسی محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فربہ اندام شخص کی آنکھوں میں شانی کو آگ سی روشن دکھائی دی۔

رستم نے سفید کار کو اوور ٹیک نہیں کرنے دیا اور اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ صدر

جیسے بارونق علاقے کی سڑکوں پر گرے خیبر لہراتی اور چرچراتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ''کیا بات ہے رستم؟'' شانی نے پوچھا۔

''کک.... کچھ نہیں۔ مجھے ذرا سا شک ہوا ہے۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔ تاہم اس کے لہجے کی گھمبیرتا شانی کو سمجھا رہی تھی کہ بات معمولی نہیں ہے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں بہت کچھ واضح ہو گیا۔ خیبر کار آندھی کی رفتار سے پنڈی کی بھری پُری سڑکوں پر بھاگ رہی تھی اور سفید کار (جس میں یقیناً پولیس والے تھے) بلائے ناگہانی کی طرح ان کے پیچھے آ رہی تھی۔

رستم کی تیز ڈرائیونگ کا مظاہرہ شانی ایک دفعہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ اس وقت وہ لوگ قریب المرگ فاخر کو نارپور کی جلتی حویلی سے نکال کر ہسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔ بہرحال آج صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ آج ویران دیہاتی راستے کے بجائے شہر کی بھری پُری سڑکیں ان کے سامنے تھیں۔ کئی جگہ تو یوں لگتا تھا کہ ٹریفک بلاک ہو گئی ہے۔ آخر ایک جگہ ٹریفک واقعی بلاک ہو گئی۔ رستم کے لئے گاڑی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا۔ سفید کار بالکل سر پر پہنچنے والی تھی۔ رستم گاڑی کو بیچ سڑک پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

''بی بی آ جائیں۔'' اس نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے رستم کے کہنے پر عمل کیا اور باہر آ گئی۔ اردگرد کے لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ رستم نے شانی کا ہاتھ تھاما اور سڑک کراس کر کے ایک گنجان مارکیٹ میں گھس گیا۔ یہاں لوگوں کا اژدھام تھا۔ وہ بھیڑ کا حصہ بن کر دور نکل سکتے تھے۔ شاید رستم اکیلا ہوتا تو اب تک محفوظ دوری پر پہنچ گیا ہوتا مگر شانی کی وجہ سے وہ بہت تیز نہیں چل سکتا تھا۔ وہ لوگوں سے ٹکراتے بھڑتے آگے نکلتے چلے گئے۔

اچانک ایک آواز نے شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑا دی۔ ''وہ جا رہے ہیں۔'' کسی نے گرج کر کہا۔ یہ آواز پندرہ بیس میٹر پیچھے سے آئی تھی۔

''وہ آ گئے ہیں رستم۔'' شانی نے ہانپتی آواز میں کہا۔

رستم کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔ تاہم شانی اس تیزی کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ شانی نے دیکھا کہ رستم نے اپنی قمیص کے نیچے سے سیاہ پسٹل نکال لیا ہے۔ پیش آمدہ خطرات کے احساس نے شانی کو دہلا دیا۔ یکا یک ایک ہٹا کٹا شخص بائیں جانب سے چیل کی طرح جھپٹا۔ شانی کو اس کی آمد اور موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ رستم کو اپنے لمبے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔

شانی کا ہاتھ تو رستم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رستم نے تڑپ کر خود کو آزاد کرنا چاہا، مگر گرانڈیل شخص کی گرفت ''جن'' کی طرح تھی۔ بمشکل دو سیکنڈ گزرے ہوں گے دو خودکار رائفلیں رستم کے سر سے لگ گئیں۔ تعاقب کرنے والی پولیس پارٹی ان تک پہنچ گئی تھی۔

اردگرد موجود لوگ شدید ہراس کے عالم میں تتر بتر ہو گئے۔ ایک سفید پوش پولیس والے نے رستم کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ دوسرے نے بڑے زور کا تھپڑ رستم کے منہ پر مارا۔ یہ تھپڑ بارش کے پہلے قطرے کی طرح تھا۔ ایک ساتھ تین پولیس اہلکار رستم پر پل پڑے اور اسے بے دریغ مارنے لگے۔ سفید ٹویوٹا کار لہراتی چرچراتی ہوئی ان کے قریب آ کر رکی، رستم کو اُٹھا کر اس میں پھینک دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نہایت کرخت ہاتھوں نے شانی کو بھی بے دردی سے کار میں دھکیل دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈرائیور کے علاوہ چار پولیس والے بھی کسی نہ کسی طرح گاڑی میں لد گئے......دو پولیس والے تو رستم پر تقریباً سوار نظر آ رہے تھے۔ تیسرے سفید پوش نے بڑی ڈھٹائی سے اپنی ٹانگیں شانی کی ٹانگوں پر چڑھا دی تھیں اور اس کے بازو کہنیوں کے اوپر سے یوں جکڑ رکھے تھے، جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ بند گاڑی کے اندر سے ہوا کی طرح اُڑ جائے گی۔

جن دو ہٹے کٹے افراد نے رستم کو دبوچ رکھا تھا ان میں سے ایک کے کندھے کے تین پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس نے بڑے قطعی انداز میں خودکار رائفل کی نال رستم کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انسپکٹر کی صورت سے نظر آتا تھا کہ وہ رستم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔

''اس حرامی کو ہتھکڑی چڑھا لیں راجا صاحب۔'' ایک ماتحت نے ہانپتی ہوئی آواز میں انسپکٹر کو رائے دی۔

''چڑھا لیتے ہیں۔ پہلے اس رش سے تو نکلو۔'' انسپکٹر نے کرخت لہجے میں کہا۔ پھر پھنکار کر ڈرائیور سے بولا۔ ''خدا بخشا! گاڑی تیز چلا۔ کیا ہیجڑوں کی طرح ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔''

ڈرائیور نے سپیڈ کچھ اور بڑھا دی۔ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم سانولا شخص بولا۔ ''میرا خیال ہے غازی چوک پر دو منٹ کے لئے روک لو۔''

چند موڑ کاٹنے کے بعد گاڑی ایک نسبتاً ویران جگہ پر رک گئی۔ یہ ایک چوک نما جگہ تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو کچے میں اتارا اور تین بند کھوکھوں کے عقب میں لے گیا۔ پاس ہی سے ایک گندا نالہ گزر رہا تھا۔ اگلی نشست پر بیٹھے گہرے سانولے پولیس والے نے نشست کے

نیچے سے آہنی ہتھکڑیاں نکالیں اور رستم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اگر وہ لوگ اسے سیدھی ہتھکڑی لگانا چاہتے تو یہ آسان کام تھا۔ مگر وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط کر رہے تھے۔ وہ رستم کو اٹھا کر بٹھانا چاہتے تھے تاکہ اس کے بازو پیچھے کو موڑ کر ہتھکڑی میں جکڑ سکیں۔ رستم پہلو کے بل اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیان خلا میں پھنسا ہوا تھا اور حقیقت احوال یہ تھی کہ اسے ہتھکڑی لگانے کی کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ فربہ اندام پولیس والوں کے نیچے اس کے لئے حرکت کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

جب پولیس والوں نے رستم کو کھینچ کر سیدھا کیا اور ماں بہن کی گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کی تو پہلی بار اس کی نگاہ شانی پر پڑی۔ رستم کی آنکھوں میں ایک ایسی تبدیلی رُونما ہوئی جسے شانی کے سوا کسی نے نہیں دیکھا اور شاید شانی نے بھی اس تبدیلی کی شدت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ رستم کی آنکھوں میں رُونما ہونے والی یہ تبدیلی ''جنونی چمک'' سے مشابہ تھی۔ ایک ایسی کیفیت جو ایک بھڑکے ہوئے انسان کے اندرونی فشار کو انتہا تک پہنچاتی ہے اور اسے اردگرد کے ماحول اور مصلحتوں سے بے گانہ کر دیتی ہے۔

گاڑی کے اندر ایک بدہیئت پولیس والا شانی پر تقریباً لدا ہوا تھا اور یقیناً یہی منظر تھا جس نے رستم کی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بدہیئت پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ان سے پیچھے ہٹ جاؤ......ان کو ہاتھ مت لگاؤ۔''

''اوہو۔ یہ معشوقہ صاحبہ ہیں تمہاری؟'' انسپکٹر نے زہریلے انداز میں کہا۔

''میں کہتا ہوں کہ انہیں ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے جہاں لے جانا ہے لے جاؤ۔''

''ورنہ کیا کرو گے؟ ہیرو بن جاؤ گے؟ ہماری لاشیں گرا کر بھاگ جاؤ گے۔'' انسپکٹر نے خودکار رائفل کی نال رستم کی گردن میں بے رحمی سے گھسیڑی۔

''اس جوہی چاؤلہ کا گھونگھٹ تو اٹھاؤ یار جس کے لئے یہ سنجے دت بن رہا ہے۔'' کالے پولیس والے نے کہا۔

کھینچا تانی میں شانی کے چہرے سے نقاب کافی حد تک کھسک گیا تھا، جو رہ گیا تھا وہ دائیں طرف والے نے کھسکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی للچائی ہوئی نظریں شانی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ وہی نگاہیں جو اکیلی دکیلی عورت کے حوالے سے قانون نافذ کرنے والوں کی پہچان ہیں۔ دھمکاتی ہوئی، اپنا مطلب بیان کرتی ہوئی اور پھر رعایتوں کا وعدہ کرتی ہوئی۔ یہ ننگِ انسانیت نگاہیں کہاں موجود نہیں ہیں؟ یہ ہر جگہ.....تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ صرف

انہیں مناسب اور محفوظ موقع ملنے کا انتظار ہوتا ہے۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ گاڑی کے اندر رکھا ہوا کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ جو کچھ ہوا اس کا صحیح علم تو شانی کو ہرگز نہیں ہو سکا۔ بس اس نے یہی دیکھا کہ شانی کا نقاب کھینچنے والا شخص گاڑی کا دروازہ توڑتے ہوئے باہر جا گرا۔

اس کے ساتھ ہی خودکار رائفل کا برسٹ چلا اور شانی نے دیکھا کہ اگلی نشست پر بیٹھے گہرے سانولے شخص کے جسم کو زبردست جھٹکے لگے ہیں۔ وہ عجیب بے ڈھنگے طریقے سے ڈیش بورڈ پر گر گیا۔ رائفل کی گولیاں نشست کو چیرتی ہوئی اس کی کمر میں لگی تھیں۔ شانی نے رستم کو دیکھا اس کا خون آلود چہرہ فرطِ غضب سے بگڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فربہ اندام انسپکٹر کے گریبان پر تھے۔ رستم اور انسپکٹر راجا ایک ساتھ ہی گاڑی سے باہر گرے۔ انسپکٹر کے ہاتھ سے رائفل نکل کر دور لڑھک گئی۔ پھر شانی نے دیکھا کہ سر کی ایک نہایت سنگین ضرب انسپکٹر راجا کے منہ پر لگی۔ یہ ضرب رستم کے سر کی تھی اور یہ اتنی شدید تھی کہ انسپکٹر جیسے اُڑتا ہوا سا پیچھے کی طرف گیا۔ نالے کے عین کناروں پر وہ چند لمحوں کے لئے ڈگمگایا پھر تیورا کر سیاہی مائل پانی میں گر گیا۔

چوتھا پولیس اہلکار اس کوشش میں تھا کہ ڈیش بورڈ پر اوندھے پڑے سانولے پولیس والے کے نیچے سے رائفل نکال لے۔ تاہم اس سے پہلے ہی انسپکٹر راجا کی رائفل رستم کے ہاتھ میں آ گئی۔ تب تک شانی کا برقع کھینچنے والا پولیس اہلکار اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ غالباً اس کی نگاہوں میں اصل پولیس مقابلوں میں ہلاک ہونے والے پیٹی بھائیوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رستم اس کے تصور کو حقیقت کا روپ دے سکتا تھا، مگر اس نے خودکار رائفل کو دستے کی طرف سے استعمال کیا۔ پولیس والا چہرے پر شدید ضرب کھا کے کھوکھے کی دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔

حواس باختہ پولیس والا ابھی تک اپنے سانولے افسر کے نیچے سے رائفل نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے رستم کے ہاتھ میں پکڑی رائفل کا رخ اپنی طرف دیکھا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ شانی نے تڑپ کر رستم کی رائفل تھام لی۔ جیسے وہ رستم کو پولیس والوں کے قتل سے روکنا چاہتی ہو۔ یہ بالکل اضطراری حرکت تھی۔ کیونکہ اگر رستم فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تو شانی اسے روک نہیں سکتی تھی۔ رستم کی انگلی ٹریگر پر تھی اور انگلی کا ذرا سا دباؤ تینوں پولیس اہلکاروں کو زندگی سے دور کر سکتا تھا۔

وہ تینوں بھی یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ زندگی ان کے لئے بڑی قیمتی تھی۔

وہ ایک بااختیار محکمے کے خدائی فوجدار تھے۔ حکم چلانے اور حاکمیت کا مزہ لینے کے لئے بہت سی لاچار "خلقِ خدا" انہیں میسر تھی۔ ابھی انہوں نے بھنے ہوئے لاتعداد مرغ کھانے تھے، وی سی آر پر بہت سی فلمیں دیکھنا تھیں، سرکاری خرچے پر پتا نہیں کہاں کہاں کی سیر کرنا تھی۔ نہیں نہیں ابھی مرنے کے دن کہاں تھے؟ ابھی تو آنکھوں میں عیش و عشرت کی ہوس تھی اور سر کے بالوں کی طرح دل بھی کالے سیاہ تھے۔ اس سرپھرے شخص کے ہاتھوں، اس گندے نالے کے کنارے اپنی قیمتی زندگی سے وہ محروم ہو جاتے تو اس سے بڑی بے وقوفی کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

گاڑی ابھی تک سٹارٹ تھی۔ ڈرائیور نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا... پہیے چرچرائے اور گاڑی چیختی چلاتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔ وہ دور جاتے ہوئے جیسے بہ زبانِ خاموشی پکار رہے تھے۔ تم سے پھر ملیں گے۔ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ تم دونوں کو مزاحمت کا ایسا مزہ چکھائیں گے کہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی یاد رکھیں گی... لیکن فی الحال ہمیں بھاگ جانے دو کہ رائفل تمہارے ہاتھ میں ہے۔

جونہی سفید گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی، رستم لپک کر سڑک کے درمیان آ گیا۔ ایک سبز مہران کار درمیانی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ رستم نے ہاتھ پھیلا کر اسے روک لیا۔ سرکاری رائفل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ کھوکھے سے ٹکرانے والا پولیس اہلکار بھاگ چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ گاڑی چلانے والا دبلا پتلا لڑکا صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ سکتا رستم اور شانی بائیں جانب کے دونوں دروازے کھول کر اندر بیٹھ چکے تھے۔ رستم کا خون آلود چہرہ اور ہاتھ میں رائفل دیکھ کر لڑکے کی گھگھی بندھ گئی۔

"کیا بات ہے جی؟" لڑکے کے حلق سے دہشت سے پھٹی ہوئی آواز نکلی۔

"ڈرو مت۔ کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔ تھوڑا آگے جا کر اُتر جائیں گے۔ بس، گاڑی چلاؤ۔"

ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ لڑکا اپنی طرف والا دروازہ کھول کر اُتر جائے گا اور بھاگ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس طرح کی کوئی نامعقول حرکت کرتا، رستم نے اس کی گدی دبوچ لی اور گاڑی آگے بڑھانے کو کہا "جی سر" وہ ہکلایا اور گاڑی بڑھا دی۔ اردگرد موجود لوگ ہکا بکا تھے۔ جن چند لوگوں نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ رستم کی برق رفتار مبارزت دیکھی تھی، ان کی آنکھوں میں خوف کی گہری پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

لڑکا رستم کی ہدایت پر گاڑی کو تیزی سے چلاتا چلا گیا۔ چند لمحوں میں اس کی پیشانی پسینے

سے تر ہوگئی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے پرفیوم کی خوشبو آرہی ہے۔ ''جل'' لگے ہوئے لمبے بال خوبصورتی سے کنپٹیوں پر جمائے گئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بے چارہ سہ پہر کے وقت نوجوانوں کی مخصوص ڈیوٹی پر نکلا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسے دو چار لڑکیوں کو کالج سے گھر تک پہنچانا ہو۔ خرابیٔ قسمت سے وہ اچانک اس افتاد میں پھنس گیا تھا۔ شانی خود بھی بُری طرح گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس نے لڑکے کو تسلی دینا ضروری سمجھا، ورنہ خدشہ تھا کہ گھبراہٹ میں وہ گاڑی کہیں ٹھونک دے گا۔

چند منٹ بعد ایک بھرے پُرے بازار میں رستم نے اچانک گاڑی رکوائی۔ انسپکٹر سے چھینی ہوئی رائفل اس نے نشستوں کے درمیان خلا میں رکھ دی۔ لڑکے سے بولا۔ ''کہیں آگے جا کر اس رائفل کو کہیں پھینک دینا...... اور خبردار اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا، ورنہ بُری طرح پھنس جاؤ گے۔ بس ہمارے اُترتے ہی یہاں سے پھوٹ لو۔''

لڑکے نے تھوک نگل کر بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔ رستم اور شانی کے اُترتے ہی وہ ہوا ہوگیا۔ رستم اب کافی پُرسکون نظر آرہا تھا۔ مہران گاڑی کے اندر ہی اس نے اپنا خون آلود چہرہ اچھی طرح صاف کرلیا تھا۔ شانی نے بھی کوشش کر کے اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔ رستم نے ایک موٹر رکشہ رکوایا اور اسے گلزار ٹاؤن چلنے کو کہا.... گلزار ٹاؤن جہاں زوار کے گھر میں وہ قیام پذیر تھے۔

☆======☆======☆

گھر پہنچ کر لاتعداد اندیشے شانی کے ذہن پر یلغار کرتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد رستم نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر آیا تو بالکل نارمل نظر آرہا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ دو تین گھنٹے پہلے اس شخص نے پولیس مقابلہ کیا ہے۔ ایک ایسا مقابلہ جس میں جانی نقصان کا اندیشہ بھی موجود ہے۔

شانی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''اس گاڑی کا کیا بنے گا جسے سڑک پر چھوڑ آئے ہو؟''

''آپ بالکل بے فکر رہیں بی بی۔'' وہ سر جھکائے جھکائے بولا۔ ''گاڑی کے ذریعے پولیس ہم تک نہیں پہنچ سکتی اور نہ ہی زوار کو کوئی خطرہ ہے۔''

''یہ کیسے ہوگا؟''

''گاڑی کے سارے کاغذات فرضی ہیں۔ پولیس جب رجسٹریشن آفس سے ایڈریس لے کر ڈھونڈنے نکلے گی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''اور گاڑی میں موجود کسی چیز سے کوئی کھوج لگ گیا تو......؟''

''اس میں ایسی کوئی چیز نہیں رکھی ہوئی تھی زوار نے۔''

شانی کچھ دیر خاموشی سے فرش کو گھورتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ''اس پولیس والے کا کیا بنا جسے گولیاں لگی ہیں؟''

''پتا چلا ہے کہ بچ گیا ہے۔ ہسپتال میں آپریشن ہو رہا ہے۔''

''اور جو نالے میں گرا تھا؟''

''وہ بھی ہسپتال میں ہے۔''

شانی نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''تمہارا یہ اندازہ درست ہے کہ پولیس تمہیں ہر جگہ سرگرمی سے ڈھونڈ رہی ہے..... لگتا ہے کہ نارپور کے سیالوں نے تمہارے پیچھے پورا زور لگایا ہوا ہے۔''

''ہاں بی بی! انہیں یقین ہوگیا ہے کہ آگ لگنے سے پہلے حویلی میں جو ہنگامہ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دو جھوٹے سچے ثبوت بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔''

''پھر تو رستم، تمہارے لئے خطرہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ خاص طور سے یہاں راولپنڈی میں۔''

''خطرہ کہاں نہیں ہے بی بی! قدرت نہ بچائے تو ہم میں سے کوئی دوجا سانس نہ لے۔'' اس نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

شانی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی جارہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ واقعی کوئی جوگی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ خوابیدہ سی آنکھوں والا شخص ابھی چند گھنٹے پہلے کسی بپھرے ہوئے درندے کی طرح پولیس اہلکاروں پر حملہ آور ہوا تھا اور انہیں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔ رستم کی آواز جیسے ابھی تک شانی کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے پولیس اہلکار کو شانی پر لدے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔ ''......ان سے پیچھے ہٹ جاؤ..... ان کو ہاتھ مت لگاؤ۔''

انسپکٹر راجا زہریلے لہجے میں بولا تھا۔ ''اوہو یہ معشوقہ صاحبہ ہیں تمہاری۔'' رستم نے جنونی لہجے میں اپنی ''وارننگ'' دہرائی تھی۔ جواب میں انسپکٹر پھنکارا تھا ''اگر ہم نہ مانیں تو کیا کرو گے؟ ہیرو بن جاؤ گے؟ ہماری لاشیں گرا کر بھاگ جاؤ گے؟'' تب شاید انسپکٹر کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ابھی وہی کچھ ہو جائے گا جو وہ ازراہِ مذاق کہہ رہا ہے۔

وہ سب کچھ شانی کو جاگتی آنکھوں سے خواب جیسا لگ رہا تھا۔ کتنا اچانک کتنا سنگین اور ڈرامائی تھا یہ واقعہ۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی اور رستم فون سننے کے لئے چلا گیا۔ شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور خیالوں کے گورکھ دھندے میں ڈوبی رہی۔

رہ رہ کر اس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر آنے لگا جب راجا بازار کے علاقے میں گرے خیبر سے اترنے کے بعد رستم اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑا تھا۔ شاید اگر شانی اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ بہت تیز رفتاری سے کسی طرف نکل جاتا اور اس نئے پولیس مقابلے کی نوبت ہی نہ آتی جو آج رستم کے کھاتے میں درج ہوا۔ شانی بازار میں رُونما ہونے والے واقعے کو اپنے موجودہ حالات کے حوالے سے دیکھنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شب و روز کے بازار میں رستم، اسے اپنے ساتھ لے کر بھاگ رہا ہے اور اَن گنت خطرات پولیس اہلکاروں کی طرح رستم کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ان خطرات کو چکما دے کر بہ آسانی نکل سکتا ہے۔ مگر شانی کی وجہ سے ”تیز رفتار فرار“ اس کے لئے ممکن نہیں۔

اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ کہیں چلی جائے۔ ایک دم سب کچھ چھوڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ دردِ دل رکھنے والے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اسے کہیں تو سر چھپانے کی جگہ مل جائے گی۔ کوئی ایسی جگہ جہاں وہ اپنے بل بوتے پر عزت سے زندہ رہ سکے۔

اس دوران میں نادیہ آ گئی۔ وہ شیری کی والدہ کا افسوس کرنے آئی تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ تک شانی کے پاس بیٹھی رہی۔ باتوں میں اس نے رستم کا ذکر بھی کیا۔ کہنے لگی۔ ”ابھی میں نے اسے بالکونی میں دیکھا ہے۔ شاید چہرے پر چوٹیں لگی ہیں۔ کیا ہوا ہے اسے؟“

”بس رستے میں کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ہم شیری کے گھر سے واپس آ رہے تھے، ایک ویگن والے نے سائیڈ سے گاڑی مار دی۔“ شانی نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

”اوہو۔ اسی لئے میں کہوں کہ آپ گئے تو کار میں تھے اور آئے رکشہ پر ہیں۔ کیا گاڑی کا زیادہ نقصان ہوا ہے؟“

”ہاں...... ورکشاپ میں ہے۔“ شانی نے مختصر جواب دیا۔ اسے نادیہ کے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر کی کھڑکیوں سے ہر وقت رستم پر نگاہ رکھتی ہے۔ بہرحال ایک لحاظ سے یہ ”نگرانی“ نادیہ کی اس محبت کی بھی غماز تھی جو وہ اپنے دل میں رستم کے لئے رکھتی تھی۔

ان کی گفتگو کا رخ جلد ہی رستم کی چوٹوں کی طرف مڑ گیا۔ نادیہ کے لہجے میں ایک اپنائیت بھری فکرمندی تھی۔ وہ شانی سے بولی۔ ”آپ ذرا خود اس کا خیال رکھیں۔ وہ بے حد بے پرواہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑا سا لنگڑا بھی رہا ہے۔ شاید پاؤں پر بھی چوٹ آئی ہے۔

اگر ایسا ہے تو ایکسرے وغیرہ کرا لیں۔“

”ٹھیک ہے، میں کہوں گی اس سے۔“ شانی نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

”اور اس سے یہ بھی کہیں کہ لڑائی جھگڑے کی طرف سے ہاتھ ذرا اٹھا کر رکھے۔ ہر وقت کی مارا ماری ٹھیک نہیں ہوتی۔“

”میں کہوں گی۔“

”اور مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے۔ بہت عزت کرتا ہے آپ کی۔“

شانی خاموش رہی۔ ایک دم اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نادیہ اس موضوع پر مزید بات کرے۔

غالباً نادیہ بھی سمجھ گئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اچھا، میں چلتی ہوں۔ اگر آپ کا پھر شیری صاحب کے گھر جانا ہوا تو پلیز مجھے ضرور لے جائیے گا۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانی کے اندر جو کشمکش جاری تھی وہ اس رات عروج پر پہنچ گئی۔ شانی نے زوار کو کسی سے فون پر بات کرتے سنا۔ شاید لائن میں شور تھا۔ زوار کو قدرے بلند آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے اسے بڑا سمجھایا ہے یار! لیکن وہ مانتا نہیں۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے کرم ایجنسی میں چلا جائے۔ وہاں دو تین بڑے پکے یار ہیں اس کے۔ ویسے تو جرائم پیشہ لوگ ہیں لیکن اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔ پولیٹیکل ایجنٹ لاکھ ٹکریں ماریں مگر رستم کی گرد کو نہیں پا سکیں گے۔“

شانی کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ رستم کا ذکر ہی ہو رہا ہے۔

زوار کہہ رہا تھا۔ ”آج جو واقعہ ہوا ہے وہ کم سنگین نہیں ہے۔ نیچے سے اوپر تک کھلبلی پڑ جائے گی۔ جو اہلکار زخمی ہوا ہے، وہ بھی پتا نہیں کہ بچتا ہے یا نہیں۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

جواب میں زوار بولا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک بھلی مانس خاتون بھی ہے۔ وہ خاتون کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا اور قبائلی علاقے میں ساتھ لے جانا بھی نہیں چاہتا۔ بس یہی کشمکش ہے۔“

شانی نے اس موضوع پر دو چار فقرے مزید سنے پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہو گئی۔ یہ وہی صورتِ حال تھی جو پچھلے کئی دن سے شانی کے ذہن میں کھٹک رہی تھی اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ آنچل

اس کے پیچھے زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کے اندر سے آواز آرہی تھی۔۔۔ شانی، اپنا بوجھ رستم کے کندھوں پر سے اتار لو۔ اسے ہلکا پھلکا ہو کر کسی طرف نکل جانے دو۔ حالات ایک خطرناک رخ پر جارہے ہیں۔ اگر تمہاری وجہ سے رستم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا یا اس کی جان گئی تو کیا تم دیکھ سکو گی؟ رستم تم سے پیار کرتا ہے بلکہ شاید عشق کرتا ہے۔ اس عشق کو عشق ہی رہنے دو۔ اسے دنیاداری میں گھسیٹ کر فنا نہ کرو۔ کہیں دور چلی جاؤ۔ اپنے سینے میں محبت کی جوت لے کر اور اچھی یادوں کا سرمایہ سمیٹ کر کہیں دور نکل جاؤ...... بہت دور..... جہاں رستم کبھی تمہاری خبر نہ پاسکے اور نہ تم کبھی اس کی خبر پاسکو۔ اس کہانی کا یہی انجام بہترین ہے۔

پھر اس کے ذہن میں نادیہ کی شبیہ ابھر آئی...... نہ جانے کیوں سروقد نادیہ کا تصور ذہن میں آتے ہی شانی کو اپنے ارادے میں مزید پختگی محسوس ہونے لگی۔ ہاں وہ یہاں سے جاسکتی تھی۔ بالکل جاسکتی تھی۔ رستم کو کچھ تکلیف تو ہونا تھی اور شاید کچھ تکلیف شانی کے حصے میں بھی آنا تھی۔ مگر یہ تکالیف ان مصائب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں جو منہ پھاڑے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆======☆======☆

وہ رات کا درمیانی پہر تھا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہلکی سی ہوا بھی چل رہی تھی۔ شانی اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ کے سامنے تھی اور رستم کے نام ایک مختصر خط لکھ رہی تھی۔ اس نے لکھا ''رستم! میں نے بہت سوچا ہے اور آخر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے..... میں اپنا راستہ تم سے جدا کر رہی ہوں لیکن دل میں تمہارے لئے جو خاص جذبہ ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ جب تک زندگی ہے اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں تمہیں یاد رکھوں گی۔ یاد ہے چناب کے کنارے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اگر میرا راستہ تم سے جدا ہو جائے تو تمہیں کوئی شکوہ تو نہیں ہوگا۔ تم نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا...... میں اپنے خون سے لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے تمہیں اپنی وہ بات یاد ہوگی۔

رستم! میری التجا ہے کہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس شہر میں اور اس شہر سے آگے بہت دور تک..... تمہیں کہیں نہیں ملوں گی اور بالفرض مل بھی گئی تو میرے، خیالات یہی ہوں گے جو اب ہیں۔ تم انہیں بدل نہیں سکتے ہو اور نہ میں بدل سکتی ہوں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم تہہ دل سے اس صورتِ حال کو قبول کر لیں۔

تم نے اور تمہارے دوستوں نے مشکل وقت میں جس طرح میرا ساتھ دیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ تمہارے علاوہ میں ان کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں اور خاص طور سے مختار (گونگے) کا، جس نے میری زندگی کے لئے اپنی زندگی قربان کی۔

آخر میں تم سے آخری درخواست ہے..... میری خواہش ہے کہ تم اس پر غور کرو۔ نادیہ کا ماضی جو کچھ بھی تھا لیکن اب وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جہاں تک میری سمجھ بوجھ نے کام کیا ہے وہ واقعی ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہے..... نادیہ کی اس نئی زندگی میں مرکزی اور اہم ترین کردار تمہارا ہے رستم! وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے اور اس گرفتاری کے خراج میں وہ تمہیں بہت کچھ دے سکتی ہے۔ بہت سی خوبصورتیاں، بہت سے رنگ۔ وہ تمہاری زندگی کو سجا سکتی ہے......اور ہر قسم کے حالات میں تمہارے شانہ بشانہ بھی چل سکتی ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں تم خود بھی اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، تمہیں بتا دیا ہے۔

اب مجھے اجازت دو...... اور مجھے معاف بھی کر دو۔

والسلام''

خط لکھنے کے بعد شانی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اٹھ کر خاموشی سے اپنا کچھ ضروری سامان ایک اٹیچی میں رکھنے لگی۔

صبح پانچ بجے کے قریب جب اندھیرے میں اجالے کی ہلکی سی آمیزش شروع ہوئی وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ جانے سے پہلے اس نے خط رستم تک پہنچا دیا۔ وہ اوپر سے اس کے کمرے تک گئی۔ دروازے کی زیریں دراز کے نیچے سے اس نے بند لفافہ اندر کھسکا دیا۔ واپس پلٹنے سے پہلے اس نے ایک الوداعی نظر کمرے میں ڈالی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں رستم محوِ خواب تھا۔ کنپٹی پر لگنے والی چوٹ کے اوپر پٹی چپکی ہوئی تھی۔ وہ حسبِ عادت سیدھا لیٹا تھا۔ ان سنگین لمحات سے بے خبر جو اسے اور شانی کو جدا کر رہے تھے، شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ تب وہ تیزی سے پلٹی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ گیٹ پر موجود چوکیدار عبداللہ اس وقت نماز کے لئے مسجد چلا جاتا ہے۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ ایک متبادل چابی شانی کے پاس موجود تھی۔ اس نے چھوٹا گیٹ کھولا اور محتاط انداز میں باہر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی سڑک پر تھی۔ اس نے ایک رکشہ رکوایا اور اس میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔ شروع میں وہ خوفزدہ تھی لیکن جُوں جُوں وہ آگے بڑھتی گئی، اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی فطری ذہانت اور حوصلہ مندی اس کا سہارا بننے لگی۔ وہ اپنی

منزل کا تعین بہت پہلے کر چکی تھی۔ لاہور کی ایک نواحی آبادی شاہدرہ میں شانی کی کالج کی سہیلی ریحانہ رہتی تھی۔ یوں تو وہ بھی رنگ والی کی رہنے والی تھی لیکن بیاہ کر لاہور پہنچی تھی۔ سکینہ اور صغراں کی طرح ریحانہ سے بھی شانی کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کا میاں بھی بہت اچھا تھا۔ وہ کویت کی ایک تعمیراتی فرم میں فورمین تھا ریحانہ لاہور میں اپنے ساس سسر اور ایک نند کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ جب رنگ والی آتی تھی اس کا اصرار ہوتا تھا کہ شانی اس کے پاس آئے اور چند روز کے لئے وہاں رہے۔ اس کے میاں سلیم احمد نے بھی کئی بار شانی اور عادل کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ بہت کشادہ دل اور ملنسار شخص تھا۔

جب تک ریحانہ کے والدین رنگ والی میں تھے، دو تین ماہ بعد اس سے ملاقات ہو جاتی تھی، تاہم پچھلے سال کے آخر میں ریحانہ کے والد فوت ہو گئے تھے اور والدہ بڑے بیٹے کے پاس ملتان چلی گئی تھیں۔ تب سے ریحانہ کے ساتھ شانی کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ بہر حال ریحانہ کا مکمل ایڈریس شانی کے پاس موجود تھا۔ ریحانہ نے قریباً دس مرتبہ زبانی بھی اسے یہ ایڈریس اتنی تفصیل سے سمجھایا تھا کہ اسے ازبر ہو گیا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی کہ ازبر ہو گیا ہے۔

یوں تو پنڈی سے لاہور تک کا سفر بذریعہ بس پانچ چھ گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے مگر راستے میں دو بار بس کے خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ شام کو ہی لاہور پہنچ پائی۔ پچھلی مرتبہ جب وہ لاہور آئی تھی تو اسے اپنی زندگی کی اندوہناک ترین ''خبر'' کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا جان سے پیارا، چہیتا بھائی اسے لاش کی صورت میں ملا تھا۔ وہ منظر آج تک دو آتشیں تیروں کی طرح اس کی آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ ان تلخ یادوں نے شانی کے بجھے ہوئے دل کو کچھ اور بھی بجھا دیا۔ وہ اپنا اسمارٹ سا اٹیچی سنبھالے، خود کو سیاہ برقع میں لپیٹے بس اڈے سے باہر نکل آئی۔

گھر سے اکیلے باہر نکلنے کا یہ اس کے لئے پہلا تجربہ تھا۔ آج اسے احساس ہوا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں کتنی گندگی بھری ہوتی ہے۔ قریباً نوے فیصد دیکھنے والے اسے ایک ہی جیسی نازیبا بلکہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک بے ساختہ اور قطعی ناروا چمک ابھرتی تھی۔ وہ اس پر پہلی نگاہ پڑنے کے بعد حدِ نگاہ تک اسے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے وہ عورت نہ ہو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔ اس میں عمر کی بھی زیادہ تخصیص نہیں تھی۔ ہر عمر کے مرد اس ''کارِ خیر'' میں حصہ لیتے نظر آئے۔ خاص طور سے بس اڈے کے اردگرد تو اسے یہی لگا کہ ہر نگاہ اس کے برقع سے پار ہو کر اس کے جسم کو چھید رہی

ہے۔

لاہور کا موسم ابر آلود تھا۔ ابھی شام ہوئی تھی مگر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈ کے سبب لاہور کی روایتی گہما گہمی قدرے ماند نظر آتی تھی۔ شانی نے ایک رکشہ رکوایا اور اسے شاہدرہ ٹاؤن چلنے کو کہا۔

یہ ایک خاصا طویل سفر ثابت ہوا۔ داتا گنج بخش کے مزار کے قریب ٹریفک کا اژدھام تھا۔ اس اژدھام سے نکلتے نکلتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ راوی کا پُل پار کر کے وہ شاہدرہ ٹاؤن پہنچے اور شانی ایک جگہ رکشہ سے اُتر گئی۔ وہ لکھے ہوئے ایڈریس کے مطابق ٹھیک جگہ اُتری تھی مگر جب اس نے سلیم احمد کا مکان ڈھونڈنا شروع کیا تو دانتوں پسینہ آ گیا۔ گلیوں کا جال تھا۔ مکانات کے نمبرز آپس میں گڈمڈ تھے۔ شانی کو ریحانہ کی بتائی ہوئی ایک دو نشانیاں یاد تھیں، اس نے ان نشانیوں سے مدد لینے کی کوشش بھی کی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

تھکن اور بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔ خاص طور سے تھکن پریشان کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد ''گھورنے والے'' خدائی فوجداروں کی نظریں تھیں۔ وہ اسے سرتاپا گھور رہے تھے اور جیسے ایک ہی نگاہ میں اس کے ماضی، حال و مستقبل کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

اسے شاہدرہ ٹاؤن میں چکراتے اور ایڈریس پوچھتے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ کئی گلیوں کی لائٹ غائب تھی۔ ویسے بھی اب رات کے نو بج چکے تھے۔ شانی کو اپنے آس پاس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ جس کام کو آسان سمجھتی تھی وہ اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے پاس ریحانہ کے گھر کا فون نمبر ہوتا۔

دفعتاً شانی کو محسوس ہوا کہ دو تین افراد کی ایک ٹولی اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ غالباً جس جنرل سٹور سے اس نے آخری مرتبہ سلیم احمد کا ایڈریس پوچھا تھا، یہ لوگ وہیں سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے لمبے بالوں والا ایک لڑکا کچھ ہی دیر بعد شانی کے بالکل متوازی چلنا شروع ہو گیا۔ نیلی جینز کے نیچے اس کے پاؤں میں جہازی سائز جوگر تھے۔ کچھ دیر اس کے ساتھ چلنے کے بعد نوجوان نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا ''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

''نہیں شکریہ۔'' شانی نے خشک لہجے میں کہا اور رفتار تیز کر دی۔

لڑکے نے بھی رفتار تیز کر دی اور بولا۔ ''آپ اکیلی ہیں۔ خواہ مخواہ کوئی غلط بندہ آپ

کے پیچھے لگ جائے گا۔ میرے پاس پک اَپ ہے۔ مجھے بتائیں کہاں جانا ہے، میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔'' اس کے لہجے سے فساد کی بو آتی تھی۔ شانی نے اپنے لہجے کو مزید خشک بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا، مجھے آپ کی مدد نہیں چاہئے۔''

اس دوران میں دوسرا شخص بھی قریب آچکا تھا۔ یہ ذرا پکی عمر کا لگتا تھا۔ اس نے تیز رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی بولا۔ ''کیا کہتی ہیں مس صاحبہ؟'' اس کی آواز سے عیاں تھا کہ اس نے منہ میں پان دبا رکھا ہے۔

''کہتی ہیں مدد نہیں چاہئے۔'' لمبے بالوں والوں نے جواب دیا۔

''لگتا ہے شرما رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

تیسرا لڑکا قریب آتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح شرمانے سے کام نہیں چلے گا میڈم...... یہاں دو ٹانگوں والے بڑے آوارہ کتے پھر رہے ہیں۔ کوئی آپ کی ٹانگ پکڑ کر اندر گھسیٹ لے گا تو کیا ہوگا؟''

پہلے والے دونوں بندے اب بالکل قریب آگئے تھے۔ یہ گلی نسبتاً زیادہ سنسان تھی۔ ایک طرف چند گھروں کے بند دروازے تھے۔ دوسری طرف کسی کارخانے کی طویل دیوار تھی۔ شانی نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ تینوں بھی ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ اچانک شانی کی نگاہ ایک باوردی شخص پر پڑی۔ یہ ایک سیکورٹی گارڈ تھا۔ وہ واپڈا کے کھمبے تلے رائفل تھامے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر شانی کو قدرے تحفظ کا احساس ہوا۔ غالباً گارڈ نے بھی بھانپ لیا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ہے۔ وہ خود چل کر شانی کی طرف آگیا۔

گارڈ کو دیکھ کر دونوں لڑکے سڑک کے پار چلے گئے۔ ایک ذرا پیچھے تھا...... گارڈ نے شانی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جی؟''

''یہ غنڈے مجھے تنگ کر رہے ہیں۔'' شانی نے سڑک پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گارڈ نے غور سے لڑکوں کا جائزہ لیا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ''یہ اچھے لوگ نہیں ہیں......''

پھر اس نے بائیں جانب لوہے کا ایک دروازہ کھولا اور کہنے لگا۔ ''آپ تھوڑی دیر کے لئے ادھر آجایئے...... میں انہیں دیکھتا ہوں۔''

گارڈ کے تسلی بخش لب و لہجے نے شانی کا خوف قدرے کم کر دیا تھا۔ ان آوارہ کتوں جیسے غنڈوں سے بچنے کے لئے شانی کو دروازہ غنیمت محسوس ہوا۔ وہ اندر چلی گئی۔

یہ ایک کھلا احاطہ تھا۔ ایک طرف کیکر اور ٹاہلی کی بہت سی لکڑی پڑی تھی۔ دوسری طرف طویل شیڈ کے نیچے نامکمل کرسیاں، میز اور صوفے وغیرہ نظر آرہے تھے۔ یہ فرنیچر سازی

کا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کی لمبی دیوار شانی نے تاریک گلی میں دیکھی تھی۔ دروازے سے بیس تیس فٹ دور ایک دفتر نما کمرہ تھا۔ اس کے بائیں جانب ایک ہال نما کمرہ تھا جہاں تیار شدہ فرنیچر کے کچھ آئٹم نظر آرہے تھے۔ فضا میں برادے، صمد بانڈ اور فوم کی ملی جلی بو تھی۔

ابھی شانی چار دیواری کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ گارڈ ذرا گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ کہنے لگا ''بی بی جی! گڑ بڑ ہوگئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ... ان میں علاقے کے کونسلر کا بیٹا کامی بھی ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دیں گے۔ آپ مشکوک طریقے سے کالونی میں گھوم رہی ہیں۔''

''بڑے بے غیرت لوگ ہیں یہ۔ اکیلی عورت کو دیکھ کر کتوں کی طرح ان کی زبانیں لٹک آتی ہیں۔ آپ بلائیں پولیس والوں کو ... میں بتاتی ہوں سب کچھ۔'' شانی غضب ناک لہجے میں بولی۔

گارڈ کی عمر تیس سال سے اوپر تھی۔ تاہم کنپٹیوں کے سفید بال اسے ایک ''معتبر جھلک'' دے رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''نہیں جی۔ بات بڑھانے کا فائدہ نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کی بکواس کر رہے ہیں یہ لوگ۔ میں سنبھال لیتا ہوں انہیں۔ ویسے آپ نے یہاں ملنا کس سے ہے؟''

شانی نے ایڈریس نکال کر گارڈ کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر بولا ''سڑک کا نام تو ٹھیک لکھا ہوا ہے، مگر آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا آپ کے پاس فون نمبر نہیں ہے؟'' شانی نے نفی میں جواب دیا۔ گارڈ نے کہا۔

''آپ آ کہاں سے رہی ہیں؟''

''وہ... وہ گوجر خان سے۔'' شانی ہکلا گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس کے جواب نے گارڈ پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا۔

''وہاں کا فون نمبر ہے آپ کے پاس؟'' گارڈ نے پوچھا۔

''نن... نہیں۔'' شانی نے کہا۔

پہلی بار اسے اپنی بے حد کمزور پوزیشن کا احساس ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹھسے سے کہہ دیا تھا کہ بلائیں پولیس کو ... اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس قسم کی صورت حال اس کے لئے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ فی الوقت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ سچائی کے ساتھ کسی کے سوال و جواب کا سامنا کرتی۔

گارڈ کا لہجہ تھوڑا سا تبدیل ہوگیا۔ بولا۔ ''دیکھیں بی بی! اگر آپ ٹھیک نہیں بتا ئیں گی تو میرے لئے آپ کی مدد کرنی مشکل ہوجائے گی۔''

''میں نے غلط تو...... کچھ نہیں کہا۔''

''دیکھیں۔آپ گھبرائی ہوئی ہیں......آپ یہاں اطمینان سے بیٹھ جائیں اور مجھے اپنا ہمدرد سمجھیں۔'' اس نے سامنے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی پہلے تو ہچکچائی مگر جب گارڈ نے اصرار سے کہا تو وہ دفتر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔اس کا حلق خشک ہورہا تھا...... اور دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر ایک خطرناک صورت حال میں پھنس گئی ہے۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی مگر باہر تاریک گلی میں اسے غنڈوں کا خطرہ درپیش تھا۔کسی اور کو مدد کے لئے بلانا بھی دشوار لگ رہا تھا۔

نیلی وردی والا گارڈ اسے وہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا اور دو منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی شخص تھا۔ یہ دیکھ کر شانی کے اوسان خطا ہوگئے کہ یہ وہی لمبے بالوں والا لڑکا تھا۔اس کی عمر پچیس سال رہی ہوگی۔ ایک کان میں چھوٹی سی بالی تھی۔اس نے سویٹر کی آستین چڑھا رکھی تھی۔ وہ تند لہجے میں شانی سے سوالات کرنے لگا۔شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گارڈ کا رویہ بھی بدلا ہوا ہے۔ان کی تفتیش بڑھی تو شانی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔''میں کوئی مجرم نہیں ہوں کہ اس طرح تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔میرے پاس یہ ایڈریس ہے اور یہ ایک شریف گھرانے کا ایڈریس ہے۔یہی ایڈریس تمہارے سارے سوالوں کا جواب ہے۔''

لمبے بالوں والا لڑکا جس کا نام کامران (کامی) تھا گہری سانس لے کر بولا۔''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں اس ایڈریس کو۔'' پھر وہ گارڈ سے مخاطب ہوکر بولا۔''بھا جیرے! جب تک میں واپس نہیں آتا، یہ مس صاحبہ اِدھر اُدھر نہیں جائیں گی۔ اگر گئیں تو ذمے داری تمہاری ہوگی۔''

گارڈ جیرے نے اثبات میں سر ہلایا۔شانی تڑخ کر بولی۔''دیکھو، تم لوگ زیادہ تھانیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔میں...... تمہاری...... قیدی نہیں ہوں۔''

''ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔مگر جب تک بات کلیئر نہیں ہوتی آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔'' کامی بولا۔

گارڈ جیرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تاکید کرتا ہوا کامی نامی لڑکا باہر نکل گیا۔شانی اس صورت حال پر کھولتی اور ہولتی رہی۔اس کے ساتھ ساتھ دل میں دعا کرتی رہی کہ سلیم احمد کا گھر مل جائے۔گارڈ نے اسے تسلی دی تھی کہ ایڈریس مل گیا تو وہ ابھی اپنی حفاظت میں اسے

وہاں لے کر جائے گا۔

کامی کی واپسی خلاف توقع پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مطلوبہ ایڈریس سے زیادہ دور نہیں تھی۔کامی کے ساتھ ایک عمر رسیدہ شخص بھی آتا دکھائی دیا۔ شانی نے سوچا کہ وہ ریحانہ کے اہلِ خانہ میں سے کوئی ہوگا اس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔نہ صرف ایڈریس مل گیا تھا بلکہ ریحانہ کا سسر، لمبے بالوں والے کامی کے ساتھ آیا تھا۔

عمر رسیدہ شخص شلوار قمیص میں تھا۔اس کا چہرہ جسم اور کندھوں کی نسبت کافی بڑا تھا اور جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک بند چھتری تھی۔ جسے وہ لاٹھی کی طرح زمین پر ٹیک کر چل رہا تھا۔شانی نے ریحانہ کے شوہر کو دیکھا تھا۔اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ بزرگ ریحانہ کے سسر ہوں گے۔

یہ بزرگ اپنی سفید بھوؤں کے نیچے سرد آنکھوں کے ساتھ شانی کو دیکھ رہے تھے۔

''کون ہو تم؟'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''انکل جی! میں ریحانہ کے بچپن کی سہیلی ہوں۔ اس سے ملنے گوجر خان سے آئی ہوں۔ریحانہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ایک بار لاہور آؤں۔اتفاق یہ ہے کہ مجھے اکیلے آنا پڑا۔راستے میں دو بار بس بھی خراب ہوئی اور دیر ہوگئی۔اندھیرے میں آپ کا پتا ڈھونڈنا مشکل ہوگیا......'' وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

عمر رسیدہ شخص سرد نگاہوں سے شانی کو دیکھتا رہا۔ریحانہ کا نام سن کر اس کے چہرے کی سختی کچھ اور بڑھ گئی۔''تو تم ریحانہ کی سہیلی ہو؟''

''جج...... جی ہاں۔''

''تمہارے بتانے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔''

''جی؟''

''وہ دفع ہوگئی ہے یہاں سے۔اس کا اور ہمارا اب کوئی واسطہ نہیں......اور نہ ہی اس کے کسی ملنے والے سے ہے۔'' عمر رسیدہ شخص نے پھنکار کر کہا۔

شانی حیرت سے اس کا چہرہ تکتی چلی گئی۔ بزرگ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''اٹیچی کیس لے کر آدھی رات کو اکیلی، گلی گلی گھوم رہی ہو۔ یہ کہاں کا شریفانہ چلن ہے۔''

شانی نے اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔''آپ مجھے نہیں جانتے لیکن سلیم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شکیل مجھے بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔آپ ان میں سے

کسی کے ساتھ میری بات کروادیں۔“

”اگر تم انہیں جانتی ہوتو پھر تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ دونوں کویت میں ہیں......“ اس کے ساتھ ہی بزرگوار نے اس کی طرف سے منہ پھیرا اور چھتری کو لاٹھی کی طرح ٹیکتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ بزرگوار کی بڑبڑاہٹ شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

وہ ساکت و جامد کھڑی رہ گئی۔ کامی اور جیرا اب تیز چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دو منٹ بعد کامی کے دونوں ساتھی بھی اندر آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے تضحیک اور غلاظت تھی۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ شانی کو اپنے گھیرے میں بے بس اور خوفزدہ دیکھ کر مسرور ہو رہے ہیں۔ گہرے رنگ کے کپڑوں والے شخص کا رنگ بھی گہرا تھا۔ اس نے پان کی پیک حلق میں گرا کر بازاری انداز میں کہا۔ ”یہ تو سیدھا سیدھا پلس کیس ہے جان جی...... مس صاحبہ کا اٹیچی کیس بھی دیکھو۔ پتا نہیں کیا نکل آئے اس میں سے۔“

”خبردار کسی نے میرے اٹیچی کو ہاتھ لگایا تو۔“ شانی نے کہا۔

”ٹھیک ہے، نہیں لگاتے ہاتھ...... پولیس خود ہی تلاشی لے گی اٹیچی کی......اور آپ کی بھی۔“ کامی نے کہا۔

”اللہ معاف کرے مس صاحبہ...... پولیس والوں کی تلاشی کچھ اور قسم کی ہوتی ہے اور آپ کا تو ...... مجھے لگتا ہے...... آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے۔“

”دیکھو، تم لوگ مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“ شانی نے یہ الفاظ کہہ تو دیئے مگر اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود اسے بھی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔

”ہم دھمکا نہیں رہے، وہ بتا رہے ہیں جو آپ کے ساتھ ہونے والا ہے۔“ کامی غصے سے بولا۔ ”آپ اپنے آگے پیچھے کا کچھ نہیں بتا رہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کسی غلط ارادے سے اور غلط طریقے سے یہاں موجود ہیں۔“

پان والے نے جس کا نام سکندر تھا۔ دیوار سے کندھا ٹکا کر بڑے اسٹائل سے آنکھیں نیم وا کیں اور بولا۔ ”غلط ارادے کیا ہوتے ہیں مس صاحبہ......بس وہی ارادہ ہوگا جس نے آج کل ساری مسوں اور مسٹروں کو وخت میں ڈالا ہوا ہے، یعنی مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شانی نے پوچھا۔

سکندر ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔ ”دیکھو مس صاحبہ! آپ کے منہ پر سچی بات کہہ رہا ہوں۔ آپ بُرا نہ مانیے گا۔ جو بزرگ ابھی یہاں آئے تھے ان کا نام تاج دین ہے۔ یہ آپ کی سہیلی ریحانہ کے سسر ہیں اور کس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اور کہاں تک ہو رہا ہے؟ یہ ہم سے

زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ بس یوں سمجھیں کہ آپ کے یہ خادم، بند دروازوں اور دیواروں کے پیچھے دیکھ لیتے ہیں۔ آپ کی سہیلی صاحبہ کا میاں کویت میں کام کرتا تھا۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا اور یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ سال ڈیڑھ سال بعد پاکستان آتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی سہیلی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جانتی ہوں گی۔ اس پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہوئی تھی۔ تو مس صاحبہ! جب شوہر صاحب ہزاروں میل دور بیٹھے عیدیں شب براتیں منا رہے ہوں تو عورت بے چاری بھی کیا کرے۔

وہ آپ کی سہیلی صاحبہ نے ہمسائے ارشد حسین سے تھوڑی سی دوستی گانٹھ لی۔ ٹیلی فون پر دو چار گھنٹے گپ شپ لگا لیتی ہوگی اور پھر شاید ایک دو بار دونوں نے کمرے میں بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کیا ہو...... یہ دنیا بڑی بے مروت ہے۔ کسی کو ہنستا کھیلتا اور بوجھ ہلکا کرتا نہیں دیکھ سکتی۔ پہلے آپ کی سہیلی صاحبہ کی نند عاشی کو پتا چلا پھر ساس سسر صاحب کو بھی پتا چل گیا۔ آخر میں وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کویت میں شوہر صاحب کے کانوں کی کھڑکیاں بھی کھل گئیں۔ انہوں نے وہاں سے ٹیلی فونی حکم دیا کہ بیوی جی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔“

شانی سناٹے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا جسم خوف اور غصے سے لرز رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

سکندر نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔ ”آپ ریحانہ صاحبہ کی سہیلی ہیں۔ یقینی بات ہے کہ آپ بھی اسی طرح کی معصوم اور سادہ ہیں۔ آپ نے بھی ٹائم پاس کرنے کے لئے کسی سے ذرا سی دوستی گانٹھ لی ہوگی۔ بعد میں یہ دوستی بڑھ کر دوستانہ اور یارانہ بن گئی ہوگی۔ لگتا تو یہی ہے کہ آپ اپنے اس دوست صاحب سے ملنے کے لئے ہی یہاں آئی ہیں......اب وہ اللہ کا بندہ آپ سے وعدہ کر کے پتا نہیں کہاں سٹک گیا ہے۔ شاید...... شاید اس نے اس یارانے کے کھاتے میں آپ سے ”کافی کچھ“ وصول کرلیا ہوا ہے۔ اب آپ کہیں آسرا ڈھونڈنے کے لئے تو پاؤں چلا رہی ہیں۔“

”بکواس بند کرو کتے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“ شانی نے پھنکار کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھنے کے لئے سکندر کو زور سے دھکا دیا۔

کامی خطرناک انداز میں دروازے کے درمیان آ گیا۔ ”نہ نہ...... نہ میڈم! زیادہ چالاکی نہ کرنا۔ ورنہ ہم بھی ہاتھ چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

شانی نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ ”میرا راستہ چھوڑو...... مجھے جانے دو۔ ورنہ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

"یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو پولیس والوں نے اپنے حساب میں جمع کرلیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ پولیس والے ہر شے کو ضرب دیتے ہیں۔ آپ خوبصورت ہیں۔ آپ کو شاید ضرب تو نہ دیں، مگر دوسرے طریقے سے آپ کی ساری جمع تفریق خراب کردیں گے...... اگر آپ کو یقین نہیں تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی رابطہ کرلیتا ہوں، ایس ایچ او سے۔"

کامی نے شانی کو زہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایسے مرحلے میں ہے کہ اپنی دھمکی پر عمل بھی کرسکتا ہے۔

شانی نے ذرا ڈھیلے پڑتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ تم جو سوچ رہے ہو، غلط سوچ رہے ہو۔"

سکندر تاؤ دلانے والے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "آپ کی سہیلی صاحبہ کے سسرالیوں کا بھی خیال تھا کہ شاید وہ غلط سوچ رہے ہیں لیکن بعد میں وہ سب کچھ غلط نہ نکلا۔"

شانی کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے سُرخ ہوگیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی سکندر نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دفاعی انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے میڈم...... ٹھیک ہے۔ میں اب اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا ہی اندازہ غلط ہو۔ آپ اپنی سہیلی کی طرح اپنے دوست سے ملنے نہ نکلی ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے آپ کو بس اڈے کا ٹائم شائم بھی نہ دیا ہو۔ سب کچھ ہوسکتا ہے...... لیکن ایک بات ضرور ہے میڈم ...آپ کا کام بھی اپنی سہیلی کے کام سے ملتا جلتا ہی ہوگا۔ کوئی گڑ بڑی والا کام...... میرا مطلب ہے کہ کوئی میٹھا میٹھا، کھٹا کھٹا کام......" اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

شانی نے ایک بار پھر بپھر کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ کامی نے اسے باقاعدہ ہاتھ سے روک دیا۔ اس کے ہاتھ شانی کے دونوں کندھوں پر آئے اور وہ سختی سے پیچھے دھکیل دی گئی۔

وہ گارڈ جیرے سے مخاطب ہوکر بولا۔ "جیرے! تم ان کے پاس کمرے میں رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

جیرے نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔ وہ اب اس جیرے سے بالکل مختلف نظر آرہا تھا جس کی پہلی جھلک شانی نے گلی میں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی اب شانی کو خباثت کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ یا شاید...... یہ صرف اس کا وہم تھا۔ وہ رائفل ہاتھ میں لئے بڑی بے گانگی سے اس سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ کامی اور سکندر باہر نکل گئے۔

شانی بے دم سی ہوکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی اور قریباً بیس گھنٹے سے بھوکی بھی تھی۔ اب اس افتاد نے اس کی رہی سہی توانائی بھی نچوڑ لی۔ وہ کچھ دیر تک چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں دل بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس نے نقاہت بھرے لہجے میں گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، تم مجھے کچھ بھلے شخص لگ رہے ہو۔ میں تمہارے کہنے پر اندر آئی تھی۔ اب اگر تم بھی ان لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاؤ گے تو میری بات کون سنے گا۔"

وہ بولا۔ "آپ نے اپنا معاملہ خود خراب کیا ہے بی بی...... آپ جن لوگوں کا ایڈریس لے کر پھر رہی ہیں انہوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ جس سہیلی کی آپ نے بات کی ہے وہ پہلے ہی گھر سے نکال دی گئی ہے۔ سونے پر سہاگا کہ آپ اپنا اتا پتا بھی نہیں بتا رہی ہیں۔"

"دیکھو جیرے! میری کوئی مجبوری بھی تو ہوسکتی ہے...... کیا میں تمہیں غلط عورت نظر آتی ہوں؟"

"آپ غلط عورت نہیں لگتیں۔ مگر جن حالات میں آپ یہاں پھر رہی ہیں، وہ سارے کے سارے غلط ہیں۔ ایس ایچ او صاحب نے چار دن پہلے ہی سارے چوکیداروں کو ہدایت کی ہے کہ کسی مشکوک بندے کو پوچھ گچھ کے بغیر نہ جانے دیا جائے۔ علاقے میں وارداتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "جیرے! ہر بندے کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میری یہ مجبوری ہے کہ میں اس وقت اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتی۔ ورنہ...... ورنہ۔" جذبات کی شدت سے آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ آنسو پھر بہنے لگے۔

جیرا خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ذرا توقف سے شانی نے خود کو سنبھالا اور کہا۔ "جیرے! کیا تم میری مدد نہیں کرسکتے؟"

"آپ بتائیں جی! میں کیا کروں۔" جیرے کا لہجہ خلوص سے خالی تھا۔

"ان کو سمجھاؤ۔ یہ میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ مجھے جانے دیں یہاں سے۔ میں عزت دار ہوں۔" شانی کے لہجے میں التجا کا رنگ آگیا۔

شانی کے اس لہجے نے گارڈ جیرے پر مثبت کے بجائے منفی اثر ڈالا۔ اس نے بے باکی سے شانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے سمجھانے بجھانے سے اب کچھ نہیں ہوگا جی۔ آپ کامی صاحب سے خود بات کرکے دیکھیں۔"

"تم ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہو۔ انہیں بتاؤ کہ ایک شریف لڑکی کو تماشا نہ بنائیں۔ آخر وہ بھی ماؤں بہنوں والے ہیں۔" شانی کا گلا رندھ گیا۔

کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو بہت کچھ پگھلا دیتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت جب مجبوری کے شکنجے میں پھنسی ہو تو ہوس کار مرد کو یہ آنسو پگھلانے کے بجائے اور بھی پتھر کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ جیرا جواب میں کچھ کہتا، باہر سے کامی کے تیسرے ساتھی کی تیز باریک آواز آئی۔ "جیرے بھائی۔ ...ذرا باہر آنا۔"

جیرا، شانی کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر شانی کی اندرونی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی کہ جیرے نے دروازہ باہر سے بند کر کے آہستہ سے کنڈی لگا دی ہے۔ وہ اب عملی طور پر یہاں پابند تھی۔

باہر کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ شانی پر بھاری تھا۔ کسی وقت اس کے اندر خوف سرایت کر جاتا تھا کسی وقت غصے کی بلند لہر اٹھتی تھی۔ ایسے میں وہ سوچتی تھی۔ کیا ہو جائے گا۔ دنیا کو یہی پتا چل جائے گا کہ نا کہ رنگ والی کے چوہدری ارشاد کی بیٹی اور نار پور کے سیالوں کی بہو ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس کے ساتھ، کچھ دشمنوں کا، پون صدی پرانا حساب کتاب باقی ہے۔ ابھی زندگی نے اس سے کچھ مزید خراج وصول کرنے ہیں۔ بہر حال یہ بات سوچنا آسان تھی۔ اس کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا بے حد...... بے حد مشکل تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور کامی کا پختہ عمر ساتھی سکندر اندر آ گیا۔ اس کا ایک کلا گلوری کی وجہ سے پھولا ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی ذرا سی ترچھی تھی۔

"اندر آنے کی اجازت ہے میڈم؟" اس نے اندر آکر پوچھا۔

"ہاں کیا بات ہے؟" شانی اپنی آواز کی لرزش پر بمشکل قابو پا رہی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور سامنے کھڑے کھڑے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ شانی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کلہاڑا ہو اور وہ اس شخص کے ٹکڑے کر کے فرش پر بکھیر دے۔

سکندر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں بھا جیرے کے کہنے پر اندر آیا ہوں میڈم۔ میں بات کو گھما پھرا کر کرنا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ بہت بُری طرح پھنسنے والی ہیں۔ ایس ایچ او رانا بڑا بدلحاظ بندہ ہے۔ اللہ ہر کسی کو اس کے شکنجے سے بچائے...." اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا۔ "اگر آپ میرے دل کی بات پوچھیں تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

میں نے کامی، جیرے اور مجید سے بھی کہا ہے کہ آپ کو جانے دیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ خاص طور سے یہ کامی۔ ...یہ بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ بس سمجھیں کہ سرپھرا ہے۔ ہم اس کے یار بیلی ہیں پھر بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ آپ بھی جتنا ڈریں کم ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

سکندر نے پیک نگلی اور بولا۔ "میڈم جی! آپ سیانی ہو۔ اس دنیا میں کوئی کام بھی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتا۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ہی معاملات طے ہوتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں خباثت بڑھتی جا رہی تھی۔

شانی نے کہا۔ "اگر تم روپے پیسے کی بات کر رہے ہو تو میرے پاس زیادہ روپے نہیں ہیں۔ تم اٹیچی کھول کر دیکھ سکتے ہو۔ عام کپڑوں کے علاوہ بیس بائیس سو روپے ہوں گے۔ زیور کے نام پر میرے کانوں میں بس یہ بالیاں ہیں۔"

"او ہو ... ہو ... ہو۔" سکندر نے قہقہہ لگایا اور شانی کو اپنے ہاتھ کی پشت پر پیک کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ "آپ بھی بڑی بھولی ہو میڈم جی، ہزار دو ہزار روپیہ یا چار چھ ماشے سونا ہمارا "چائے پانی" تو ہو سکتا ہے لیکن کامی کو اس سے کیا غرض ہوگی وہ تو کھاتا پیتا بندہ ہے۔"

"تو کیا چاہتا ہے وہ؟"

سکندر کی نظر شانی کے چہرے سے اُتری اور "فوٹو سٹیٹ مشین" کی شعاع کی طرح اس کے برقع سے گزرتی ہوئی پاؤں تک چلی گئی۔ وہ بے حد گھٹیا لیکن بے باک لہجے میں بولا۔ "میں اسے آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اگر آپ "کسی طرح" اس کا دل نرم کر لیں تو بات بگڑنے سے بچ سکتی ہے۔" یہ بات کہتے ہوئے سکندر کی آنکھیں دنیا کی سب سے کریہہ آنکھیں تھیں۔ بھوک، ہوس اور شیطانیت سے بھری ہوئی۔ یہ آنکھیں وہ کچھ بھی کہہ رہی تھیں جو ابھی تک سکندر کی لعنتی زبان پر نہیں آسکا تھا۔

یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اس تاریک ابر آلود رات میں تم اکیلی عورت ہو اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے، جس کی سزا آبروریزی سے کم ہے ہی نہیں.... ہاں اس کی سزا آبروریزی سے کم ہے ہی نہیں۔ تم ماہ و سال کے سارے روزنامچے دیکھ لو۔ تم ماضی کی ساری کھڑکیوں میں جھانک لو، تاریخ کے تمام اوراق پلٹ لو۔ تمہیں بیشتر جگہ اس جرم کی تعزیر یہی ملے گی۔ آج تم ہم چاروں کا شکار ہو۔ تمہاری آبرو اور تمہارے مال پر ہمارا حق ہے۔ کیونکہ ہم مرد ہیں، طاقت ور اور زیادہ ہیں۔

شانی کے اندر سے غیظ کی ایک بلند لہر اٹھی۔ اس لہر نے اسے ان لمحوں میں شانی نہیں رہنے دیا، چھوٹی چوہدرانی بنا دیا۔ اپنے اباجی کی بہادر بیٹی، اپنی ماں کی تصویر، اپنے گاؤں کی شان۔ وہ کمزور اور ناتواں اور بے بس ہونے کے باوجود سب کچھ بھول گئی۔ اس نے پورے زور سے سکندر کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔ شانی اٹیچی اٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر نکلی اور تیر کی طرح مین گیٹ کی طرف بڑھی۔

باہر موجود تینوں افراد کو شاید اس عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ ہال نما کمرے میں موجود تھے۔ ان کے باخبر ہوتے ہوتے شانی مین گیٹ کی طرف نصف راستہ طے کر چکی تھی۔ اسے اپنے عقب میں کامی کی خطرناک آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ...... میں کہتا ہوں رک جاؤ۔“

شانی رکنے کے لئے نہیں بھاگی تھی۔ کامی اس کے پیچھے بھاگا لیکن پھر ٹھہر گیا۔ ”رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔“ اس نے جنونی لہجے میں جیسے آخری وارننگ دی۔

☆======☆======☆

شانی ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر اتنی توانائی، اتنا اعتماد نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اس کے دل کی گواہی تھی۔ یہ غنڈا اسے گولی نہیں مار سکتا..... یہ اسے گولی مار ہی نہیں سکتا۔ ایک وجدان تھا ... ایک یقین تھا۔ یہ ”یقین“ اسے بے حد مستحکم قدموں سے مین گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں تیس چالیس قدم پیچھے کامی کی چنگھاڑتی آواز پھر ابھری۔ ”میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ میں گولی ماردوں گا۔“

شانی تب تک گیٹ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔ اس نے کنڈی ہٹائی اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

عقب میں موجود افراد اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ یقیناً ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے مگر وہ اسے استعمال نہیں کر پائے تھے۔ ہچکچاہٹ کے ان چند لمحات نے شانی کو گیٹ سے باہر پہنچا دیا۔ اب وہ گلی میں تھی۔ اسے اپنے عقب میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی تو وہ بھی بھاگ اٹھی۔ خود کو ہلکا کرنے کے لئے اس نے اٹیچی اپنے ہاتھ سے گرا دیا۔ وہ پختہ سڑک پر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔

چالیس پچاس میٹر کا فاصلہ شانی نے اسی طرح طے کیا۔ اب وہ ایک تاریک چوراہے پر تھی۔ یکایک ایک گاڑی کے ٹائر سڑک پر گھسٹنے کی خوفناک آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ لائٹس کی چمک نے شانی کی آنکھیں چندھیا دیں۔ چھوٹی سوزوکی کار کا بمپر اس کے گھٹنے سے بمشکل چھ انچ کے فاصلے پر رکا ہوگا۔ دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نفیس سوٹ میں ملبوس باہر نکلا۔ پہلے تو اس کے تیوروں سے نظر آیا کہ وہ شانی کو سخت جھاڑ پلائے گا۔ مگر اس کا حلیہ اور تاثرات دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

شانی نے ہانپتی ہوئی آواز میں التجا کی۔ ”انکل...... وہ غنڈے میرے پیچھے آرہے

ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بچائیے۔"

اسی دوران میں ایک لمبا تڑنگا شخص بھی کار سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ ٹریفک پولیس کی وردی میں تھا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ کامی اور اس کے دونوں ساتھی تیس چالیس میٹر پیچھے ہی رک گئے تھے۔ گارڈ جیرا سڑک کے پار اندھیرے میں تھا۔

وردی والا شخص ٹریفک سارجنٹ تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر شاید گاڑی میں رکھی ہوئی تھی۔ گنجا سر بارش کی بوندوں سے بھیگ گیا اور ہیڈ لائٹس میں چمکنے لگا۔

"کون لوگ ہیں یہ؟" نفیس سوٹ والے نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا انکل۔ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔"

سارجنٹ چند قدم آگے آیا اور اونچی آواز میں بولا۔ "کون ہے بھئی؟"

گارڈ جیرا پہلے ہی اوجھل ہو چکا تھا۔ کامی کے ساتھی بھی پسپا ہو کر قریب گلی میں داخل ہو گئے۔ صرف کامی چند سیکنڈ کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی گلی میں اوجھل ہو گیا۔ نفیس سوٹ والے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "چلو تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" لہجے میں شفقت تھی۔

شانی نے ایک نظر اس کے مہربان چہرے پر ڈالی، پھر جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ٹریفک سارجنٹ اور ادھیڑ عمر شخص بھی بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ بس اکا دکا افراد، دور بند دکانوں کے سامنے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ادھیڑ عمر شخص نے پھر سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

تقریباً ایک کلومیٹر آگے جا کر ادھیڑ عمر شخص نے کار روک دی۔ سارجنٹ اور وہ دونوں شانی سے سوالات کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سوالات کی نوعیت وہی تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ یہ لوگ آپ کے پیچھے کیسے لگے؟ انہوں نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟ وغیرہ وغیرہ۔

شانی نے ان سوالات کے مختصر جواب دیئے اور انہیں بتایا کہ وہ گوجر خان سے اپنی ایک عزیز سہیلی سے ملنے یہاں لاہور آئی تھی، مگر اس سے ملاقات نہیں ہو سکی، اب وہ واپس جانا چاہتی ہے۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص سے درخواست کی۔ "انکل آپ کسی طرح مجھے بس اڈے تک پہنچا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "میں تمہیں ضرور پہنچا دیتا لیکن تم بالکل اکیلی ہو۔ موسم بھی ٹھیک نہیں۔ اس وقت سفر کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ صبح تک انتظار کر لیا جائے۔"

"صبح تک میں کہاں رہوں گی؟"

"اگر مناسب سمجھو اور اپنے انکل پر اعتبار کر سکو تو ساتھ چلو ..... میرے گھر وہاں تمہاری آنٹی ہیں، دیگر لوگ ہیں۔ ان سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔"

"لیکن......"

ٹریفک سارجنٹ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! یہ بھلے آدمی ہیں۔ تم صبح تک کے لئے ان کا سہارا لے سکتی ہو۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ اور تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد شانی گھر چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

ٹریفک سارجنٹ صاحب راستے میں اُتر گئے۔ جب انہوں نے ادھیڑ عمر شخص کا شکریہ وغیرہ ادا کیا تو شانی کو پتا چلا کہ وہ راستے میں لفٹ لے کر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ان کے جانے کے بعد شانی اور ادھیڑ عمر شخص گاڑی میں تنہا رہ گئے۔ ادھیڑ عمر شخص کے انداز میں شائستگی اور کسی حد تک شفقت بھی تھی۔ شانی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک اچھے شخص کی تحویل میں ہے۔ عمومی نوعیت کے سوال جواب کرتے ہوئے وہ لوگ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ بالآخر گاڑی ایک کوٹھی نما مکان کے سامنے جا کر رکی۔ ہارن کی آواز پر ایک نوعمر لڑکے نے دروازہ کھولا اور وہ اندر چلے گئے۔

یہاں شانی کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر خاتون سے ہوئی۔ یہ نفیس سوٹ والے انکل کی بیوی تھیں۔ شانی کو انکل کا نام ریاض عثمانی معلوم ہوا۔ وہ ایک سرکاری ملازم تھے۔ یہاں اپنی بیوی، دو بچیوں اور ایک ملازم کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی ایک بچی کی شادی ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔

ادھیڑ عمر عورت نے بڑے اصرار کے ساتھ شانی کو کھانا کھلایا اور پھر اس سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کی باتوں میں شانی کو اپنائیت ملی اور تحفظ کا احساس ہوا۔ شانی کے کپڑے بارش میں نم ہو چکے تھے۔ خاتون نے اسے اپنی بیٹی کے کپڑے پہننے کے لئے دیئے۔ رات کے آخری پہر خاتون نے اصرار کے ساتھ شانی کو آرام کرنے کے لئے کہا۔ ان کے اصرار پر شانی لیٹ گئی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گزر جانے والے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور اس کا دل لرزنے لگا۔ سکندر کی مکروہ مسکراہٹ ابھی تک اس کی نگاہوں میں تھی اور اس کی منحوس آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے کتنے لچر انداز میں کہا تھا۔ "میڈم جی! آپ سیانی بیانی ہیں، اس دنیا میں کوئی کام بھی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتا۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ہی معاملے طے ہوتے

ہیں۔"

اور پھر کامی کی وہ کڑکتی ہوئی آواز جس نے بھاگتی ہوئی شانی کا پیچھا کیا تھا۔"رک جاؤ . ورنہ گولی ماردوں گا۔رک جاؤ۔"

وہ سوچتی رہی اور کروٹیں لیتی رہی۔اسے کچھ عرصے پہلے اخبار میں پڑھی ہوئی ایک خبر یاد آرہی تھی۔گھر سے بھاگنے والے ایک بالغ لڑکے لڑکی کو شیخوپورہ کے قریب کچھ اوباش افراد نے پکڑ لیا تھا۔ایک باغ میں ایک درخت سے رات بھر لڑکے کو الٹا لٹکائے رکھا تھا۔اسے خاموش رکھنے کے لئے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ایک قریبی کولڈ اسٹور میں لڑکی کی عزت لوٹی جاتی رہی تھی ..... ایسے نہ جانے کتنے واقعات روزانہ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ان میں سے کتنے منظرِ عام پر آتے ہیں اور کتنے مصلحت اور عزت کی چادر اوڑھ کر تاریک گوشوں میں چھپ جاتے ہیں۔

شانی خیالوں میں گم رہی اور اپنے موجودہ حالات پر غور کرتی رہی۔وہ بالکل تہی دست تھی۔اسے اپنے اٹیچی کا خیال آیا جو وہ سڑک پر پھینک آئی تھی۔اس میں اس کی کل پونجی تھی۔غنڈوں سے جان بچانے کے بعد جب وہ عثمانی صاحب کی گاڑی میں آئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ اسے کسی طرح بس اڈے تک پہنچا دیں۔تب اس کے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی کہ اس کے پاس تو کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

صبح نو بجے کے لگ بھگ ادھیڑ عمر خاتون دبے قدموں اندر داخل ہوئیں۔شاید ان کا خیال تھا کہ شانی سو رہی ہے۔اسے جاگتا دیکھ کر وہ بڑی محبت سے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ شانی کو نہانے پر مجبور کیا۔اپنی بیٹی کا ایک اور جوڑا اسے پہننے کے لئے دیا۔اس کے بعد ناشتہ کرایا۔شانی دوپہر تک ان کی چاہت بھری باتوں کی پھوار میں بھیگتی رہی۔وہ بڑی جہاندیدہ خاتون تھیں۔جلد ہی سمجھ گئیں کہ اس وقت شانی کا آگے پیچھے کوئی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو وہ بوجوہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔انہوں نے اس معاملے میں شانی کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔شانی نے صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام شہناز اور گھریلو نام شانی ہے۔والدہ کافی عرصہ پہلے فوت ہوگئی تھیں۔پھر بھائی بھی ایک حادثے میں چھن گیا۔ایک والد تھے جو کافی عرصے سے بیمار تھے۔چند ماہ پہلے وہ بھی چل بسے۔اب جو عزیز ہیں، ان سے اسے بھلائی کی توقع نہیں ہے۔وہ ان کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔

سہ پہر کو عثمانی صاحب گھر آئے تو ان کے پاس شانی کے لئے ریڈی میڈ کپڑوں کے دو

جوڑے اور ایک گرم چادر تھی۔اس کے علاوہ ایک درمیانے سائز کا اٹیچی کیس بھی تھا، وہ بھی شانی سے تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہے۔انہوں نے رسمی انداز میں شانی سے اس کے کوائف معلوم کرنا چاہے، مگر جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک حد سے زیادہ بتانا نہیں چاہتی تو موضوع بدل دیا۔انہوں نے کہا۔"اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔آئندہ تمہیں جو بھی قدم اٹھانا ہے اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لو اور جب سوچ سمجھ لو تو ہمیں بتا دینا۔اس دوران میں تم مکمل اطمینان کے ساتھ یہاں رہ سکتی ہو۔تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

شانی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر خودبخود اس کی گود میں گر گئے۔

اگلے دو روز میں شانی نے اس حوالے سے واقعی کافی کچھ سوچا۔اسے یہ چار دیواری اپنے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرح لگی۔اس پناہ گاہ میں اسے انکل عثمانی اور آنٹی ماجدہ کی پُر خلوص محبت میسر تھی۔وہ دونوں بڑے کشادہ دل کے مالک تھے۔ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ شانی کا سہارا بنیں اور اس کی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں اس کی مدد کریں۔

ان کی فقط دو بیٹیاں تھیں۔ایک بیٹی بیاہ کر جرمنی میں مقیم تھی۔دوسری بیٹی کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی۔افشاں کی رخصتی کے بعد دونوں میاں بیوی خود کو ایک دم تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ایک نوعمر لڑکا شاہد بھی اس گھر کا مکین تھا۔اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔وہ عثمانی صاحب کا دور کا رشتے دار بھی تھا، گاؤں سے آیا تھا اور یہاں پڑھائی کے ساتھ گھر کا کام کاج کرتا تھا۔عثمانی صاحب کی بیٹی افشاں کی شادی اسلام آباد میں ہوئی تھی۔وہ ایک دن اپنے شوہر کے ساتھ صرف تین چار گھنٹے کے لئے لاہور آئی۔درمیانے قد اور مختصر سے جسم کی وہ ایک قبول صورت نازک سی لڑکی تھی۔بڑے معصوم انداز میں بولتی تھی۔اس کا شوہر اس کا ہم عمر ہی تھا۔بعد ازاں شانی کو معلوم ہوا کہ وہ اس کا کلاس فیلو تھا۔وہ بھی ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔مجموعی طور پر شانی کو یہ سارے لوگ اچھے دل کے لگے۔اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ وہ غیر معینہ مدت تک اس چار دیواری میں قیام کر سکتی ہے اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دے سکتی ہے۔

☆======☆======☆

وہ ایک زردی دوپہر تھی۔سامنے لان میں شہتوت کے زرد پتے جھڑ جھڑ کر زروی مائل گھاس پر گر رہے تھے۔آنٹی ماجدہ کو اچانک ایک فوتیدگی پر گلبرگ جانا پڑ گیا تھا، انکل عثمانی حسبِ معمول آفس میں تھے۔وہ پی ٹی سی ایل میں ملازم تھے اور اعلیٰ گریڈ میں تھے۔ان کی

واپسی شام کو سات بجے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ ملازم لڑکا شاہد ضروری کام کاج کے بعد اب اپنا ہوم ورک لے کر برآمدے میں بیٹھا تھا۔

شانی کمرے کی کھڑکی سے زرد پتوں کا سفر دیکھتی رہی اور اس کے دل پر پت جھڑ کا موسم طاری رہا۔ ایک عجیب سی اداسی بھری ہوئی تھی اس کے رگ و پے میں۔ نگاہوں میں رہ رہ کر رستم، شیری، زوار اور ماسی زینب کے چہرے آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی، صبح جب انہوں نے اسے گھر میں نہ پایا ہوگا تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ سب سے زیادہ پریشانی اسے رستم کے حوالے سے تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا ردِعمل بہت سخت ہوگا۔ شانی کا چھوڑا ہوا خط پانے کے بعد وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈنے نکل گیا ہوگا۔ اب بھی وہ نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ کہاں بھٹک رہا تھا۔ شانی نے اب تک اسے دکھ کے سوا کچھ نہیں دیا تھا اور شاید وہ کوئی دوسری چیز دے بھی نہیں سکتی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ شاہد کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ شانی خود ہی ٹیلی فون تک پہنچی۔

اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔ ”عثمانی کہاں ہے؟“

”جی وہ تو دفتر میں ہیں۔“

”دفتر میں نہیں وہ۔“

”پھر...... مجھے تو پتا نہیں جی۔“

”تم کون ہو؟“

”میں ان کی عزیزہ ہوں۔“

”دیکھو جب وہ آئے تو اسے بتا دو کہ مجھ سے دفتر میں آ کر ملے۔ ورنہ مجھے پھر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ہوگا...... میں قاسم برلاس بول رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

پتا نہیں یہ کون تھا جس نے اتنے تند لہجے میں بات کی تھی۔ عثمانی صاحب بظاہر تو ایسے آدمی نہیں لگتے تھے جن سے لوگوں کو شدید قسم کی شکایات پیدا ہوتی ہوں۔

وہ کچھ دیر تک اس فون کال پر غور کرتی رہی پھر چاول پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جب آنٹی واپس آئیں تو انہیں پھر سے کچن میں گھسنا پڑے۔ اس نے دو چار روز میں ہی کچن کا بہت سا کام اپنے ذمے لے لیا تھا بلکہ اکثر وہ ایسے کام بھی کر گزرتی تھی

جو اصل میں شاہد کی ذمے داری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اس سے بہت خوش تھا۔

بھیگے ہوئے چاولوں کو چولہے پر چڑھا کر وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ دروازے پر کال بیل ہوئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ آواز دے کر شاہد کو جگائے لیکن وہ تھک کر سویا ہوا تھا۔ اسے جگانا شانی کو اچھا نہیں لگا۔ وہ سر پر اوڑھنی درست کرتی ہوئی خود ہی دروازے پر پہنچی۔ دوسری طرف عثمانی صاحب خود تھے۔ شانی نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”آج...... آپ جلدی آ گئے؟“

”ہاں سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ انگلیوں سے پیشانی کو مسل کر بولے۔

”گاڑی کہاں ہے؟“

”ذرا ورکشاپ گئی ہے۔ مستری مجھے ڈراپ کر کے چلا گیا ہے......“ پھر ذرا توقف سے بولے۔ ”ماجدہ تو شاید گلبرگ گئی ہوں گی، فوحید گی پر۔“

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔ عثمانی صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے اور ٹائی جوتے وغیرہ اتارنے لگے۔ ”آپ چائے پئیں گے؟“ شانی نے پوچھا۔

”ہاں، اچھی سی چائے مل جائے تو کیا بات ہے؟“

شانی کچن میں چلی گئی اور دس منٹ میں گرما گرم چائے لے آئی۔ اس وقت تک عثمانی صاحب شلوار قمیص پہن کر صوفے پر دراز ہو چکے تھے۔ شانی انہیں کچھ دیر پہلے آنے والی فون کال کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر وہ اپنی طبیعت ناساز بتا رہے تھے اس لئے اس نے بہتر سمجھا کہ انہیں تھوڑا سا آرام کرنے دے۔

عثمانی صاحب اٹھ کر چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ شانی پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولے ”بیٹھ جاؤ بھئی...... تم تو نظر ہی نہیں آتی ہو۔“

”بب...... بس۔“

”بیٹھ جاؤ نا۔“ انہوں نے زور دے کر کہا۔

شانی پاس ہی سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے تنہا کمرے میں کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد عثمانی صاحب پھر صوفے پر دراز ہو گئے۔ ان کی انگلیاں گاہے بگاہے اپنی پیشانی کو مسلنے لگتی تھیں۔

”آپ اسپرین وغیرہ کیوں نہیں کھا لیتے؟“

”نہیں وہ مجھے موافق نہیں آتی۔“

”تو ذرا دبوا لیں۔“ شانی نے کہا ”میں شاہد کو بھیجتی ہوں۔“

"نہیں نہیں وہ دبانا کم اور جھنجوڑنا زیادہ ہے۔"

شانی چند لمحے خاموش رہی۔۔۔۔ پھر اسے یہ خاموشی بوجھل محسوس ہونے لگی۔ بوجھل اور ناروا۔۔۔۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "اگر کہیں تو میں دبا دوں۔"

"ہاں۔۔۔۔ اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں انکل۔" شانی نے بمشکل کہا اور اٹھ کر عثمانی صاحب کے سرہانے آن بیٹھی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کی انگلیاں ان کی پیشانی اور سر پر گردش کرنے لگیں۔ نہ جانے کیوں شانی کے دل پر بوجھ سا پڑنے لگا تھا۔ وہی بوجھ جو اس معاشرے کی دین ہے۔ جو ہر موڑ پر عورت سے اس کا اعتماد اور بھروسا چھینتا ہے۔ اچانک عثمانی صاحب کی نرم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "شانی تم اس گھر میں خود کو افشاں ہی کی طرح سمجھو۔ جیسے وہ میری بیٹی ہے، ویسے تم ہو۔ کسی طرح کی جھجک اپنے دل میں نہ رکھنا۔"

شانی ایک دم غنچے کی طرح کھل گئی۔ اس کے ہاتھ مزید اپنائیت اور مستعدی سے عثمانی صاحب کی پیشانی پر حرکت کرنے لگے۔ وہ بولی۔ "انکل! یہ آپ کی محبت ہی ہے جس کی وجہ سے یہ چاردیواری مجھے اپنے گھر کی طرح لگتی ہے۔"

"یہ تمہارا گھر ہے بیٹی! تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ میں اور ماجدہ ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔"

"بہت شکریہ انکل۔۔۔۔۔! آپ کا یہ کہہ دینا ہی بہت ہے۔"

وہ سوچ رہی تھی۔ انسان کے اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں۔ اس کی سوچ کتنی محدود ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک عثمانی صاحب کے بارے میں انجانے اندیشے اس کے ذہن میں سر اُبھار رہے تھے۔۔۔۔ لیکن اب ذہن ایک دم صاف ہو گیا تھا۔ وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ ایک جادو سا تھا لفظ "بیٹی" میں۔

اچانک اسے کچھ دیر پہلے کی ٹیلی فون کال یاد آئی۔ وہ بولی۔ "انکل ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی قاسم صاحب کا فون آیا تھا۔ بڑے اکھڑے اکھڑے لہجے میں بول رہے تھے۔"

شانی نے دیکھا کہ ایک دم انکل عثمانی کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "کب آیا تھا فون؟" ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"آپ کے آنے سے پہلے۔۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ جلد سے جلد ان سے دفتر میں ملیں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں دیکھ لوں گا۔" انکل عثمانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد بھی شانی پانچ دس منٹ تک ان کے پاس رہی۔ مگر ان کی توجہ منتشر تھی اور وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔

یہ تیسرے روز سہ پہر کی بات ہے۔ اتوار کی چھٹی تھی، انکل عثمانی گھر میں ہی تھے۔ شانی اپنا دھیان بٹانے کے لئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آنٹی ماجدہ ذرا گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ "بیٹی شانی! تم چائے بڑی اچھی بنا لیتی ہو۔ ذرا بنا دو۔ تمہارے انکل کے خاص مہمان آئے ہیں۔ میں شاہد سے کہہ کر بسکٹ وغیرہ منگوا لوں۔"

شانی فوراً کچن کی طرف لپک گئی۔ آنٹی ماجدہ کا ہاتھ بٹانا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی، انکل عثمانی کچھ گھبرائے گھبرائے سے کچن میں آئے اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر واپس چلے گئے۔ اسی دوران میں شاہد چائے کے بہت سے لوازمات لے آیا۔ آنٹی ماجدہ سب کچھ ٹرالی میں سجانے لگیں۔ شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ وہ واضح طور پر نروس تھیں۔

اس دوران میں دوبارہ انکل عثمانی کی صورت کچن کے دروازے پر نظر آئی۔ انہوں نے کہا۔ "شانی بیٹی! اگر تم خود ہی چائے لے آؤ تو بہتر ہے۔"

شاید وہ نہ بھی کہتے تو شانی، آنٹی کو ڈرائنگ روم میں نہ جانے دیتی۔ وہ سر اور سینے پر آنچل کو درست کرتی ہوئی۔۔۔۔۔ ٹی ٹرالی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں۔۔۔۔۔ انکل عثمانی کے علاوہ دو اور افراد تھے۔ ان میں سے ایک شخص خاصا لمبا چوڑا تھا۔ اس کا سر نصف سے زیادہ گنجا تھا۔ گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ پینٹ اور جرسی میں تھا۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ دوسرا شخص درمیانے قد کاٹھ کا تھا۔ اس کلرک ٹائپ شخص کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل رکھی تھی۔

"السلام علیکم۔" شانی نے کہا۔

گرانڈیل شخص نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ پھر افسرانہ شان کے ساتھ انکل عثمانی سے پوچھا۔ "عثمانی، یہ کون ہیں؟"

"میری عزیزہ ہیں۔ گوجر خان سے آئی ہیں۔ یہاں کسی اچھی جاب کی تلاش میں ہیں۔"

"بہت خوب۔" افسر نما شخص نے شانی کو سر تا پا گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں

میں شانی کو عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ بھاری بھرکم آواز اس نے کہیں سنی ہے۔ پھر ایک دم اسے یاد آ گیا، یہ آواز اس نے فون پر سنی تھی۔ بولنے والے نے اپنا نام قاسم برلاس بتایا تھا۔

چائے پیش کر کے شانی جلدی سے باہر نکل آئی۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ دو پُرتپش نگاہیں اس کی پشت سے چپکی ہوئی ہیں۔

چائے پینے کے دوران میں اور بعد میں ڈرائنگ روم سے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آتی رہی، عینک والا فائل بردار شخص چائے پینے کے فوراً بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ دروازے کے پاس سے گزری تو قاسم برلاس کی گرجتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ غالباً انکل عثمانی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''تمہارے قول و فعل میں فرق ہے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے..... کھلا دھوکا دیا ہے۔ مجھ سے تمہاری ملاقات ہر دوسرے تیسرے روز ہوتی تھی لیکن تم نے ایک بار بھی افشاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔''

''بس جو کچھ ہوا اچانک ہوا۔'' انکل عثمانی کی معذرت خواہانہ آواز ابھری۔ جواب میں قاسم برلاس نے پھر چیخ کر کچھ کہا مگر الفاظ شانی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ دروازے سے دور جا چکی تھی۔

رات کو شانی نے اس بارے میں آنٹی ماجدہ سے بات کی تو کچھ نئی باتیں سامنے آئیں۔ آنٹی ماجدہ نے بتایا کہ دو ڈھائی سال پہلے عثمانی صاحب کے دو ساتھیوں نے افسرانِ اعلیٰ سے ساز باز کر کے عثمانی صاحب کے خلاف ایک کیس بنوا دیا تھا۔ اس کیس کی محکمانہ انکوائری کئی ماہ تک ہوتی رہی۔ اب یہ کیس ناکافی ثبوتوں کی وجہ سے تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مگر انکوائری کمیٹی کے ایک افسر نے بدنیتی کی وجہ سے اس معاملے کو پھر اچھال دیا ہے..... یہ افسر قاسم برلاس ہی ہے۔ اب وہ مختلف طریقوں سے عثمانی صاحب اور باقی اہلِ خانہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا تعلق محکمے کے انویسٹی گیشن سیل سے ہے۔

کمرے میں ہونے والی گفتگو میں شانی نے افشاں کا نام بھی سنا تھا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ شاید اس معاملے میں افشاں کا بھی کوئی کردار ہے۔ تاہم وہ آنٹی کے سامنے خود سے افشاں کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آنٹی خود ہی اس بارے میں بات کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

رات کو شانی دیر تک اس گورکھ دھندے میں کھوئی رہی۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اہلِ خانہ اس قاسم نامی شخص سے خوفزدہ ہیں۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی وہ خاصا

دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ قد سوا چھ فٹ سے کم نہیں رہا ہو گا۔ جسم چربیلا اور پھیلا ہوا تھا۔ رنگ سُرخی مائل سفید اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

ٹی وی آن تھا۔ شانی کی نظریں سکرین پر تھیں مگر دھیان اس گھر کے مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اچانک نگاہوں کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ بھی ٹی وی سکرین پر مرکوز ہوئی، کسی ڈرامے کا سین تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کے ساتھ کشتی میں مصروف تھا۔ نہ جانے کیوں بچے اور اس کی ماں کو دیکھ کر شانی کو مُنا یاد آ گیا۔ اپنی شرارت بھری آنکھوں، چمکیلی پیشانی اور گلابی ہونٹوں کے ساتھ اس کی پوری تصویر شانی کے تصور میں اُجاگر ہو گئی۔ ایک روز مُنے نے بھی تو اسی طرح شانی سے کشتی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی پتنگ اُڑانے میں اس کی مدد کرے... اور پھر وہ بے چارہ روشندان کے چھجے سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ بستر پر لٹا لیا تھا لیکن اتفاق سے اس رات وہ بستر خالی نہیں تھا۔ اس پر شانی کے ساتھ کسی اور کو لیٹنا تھا اور ہر صورت لیٹنا تھا۔ شانی روتے بسورتے مُنے کو اٹھا کر بھابو کے پاس چھوڑ آئی تھی اور بستر اپنے مخمور شوہر کے لئے خالی کر دیا تھا..... آہ..... ایسی کتنی ہی ناخوشگوار یادیں نارپور کی بلند و بالا حویلی سے منسوب تھیں۔

پھر شانی کا دھیان مُنے سے بھابو وغیرہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ کیا کر رہے تھے؟ اسے یاد بھی کرتے تھے یا نہیں۔ ان کے لئے تو شانی یقیناً مر چکی تھی۔ ان کے لئے ''شانی کی یادیں'' ایک مرے ہوئے کی یادیں ہی ہو سکتی تھیں... شانی ان بچھڑے ہوؤں کے بارے میں سوچتی رہی۔ چچی پروین، تایا معصوم، بابا فخری، خادم حسین، سکینہ، صغراں... کتنے ہی ایسے چہرے تھے، جنہیں وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ جنہیں دیکھنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ ہاں ایک اور چہرہ بھی تھا، جو بہت اہم تھا جو آپوں آپ ہی بہت اہم ہو گیا تھا۔ شانی کے نہ چاہنے کے باوجود وہ شخص اس کے دماغ کے ایک حصے پر قابض تھا۔ وہ اسے راولپنڈی میں چھوڑ کر دور چلی آئی تھی لیکن اس کے خیالات ہر وقت اس کے تعاقب میں تھے۔ یہ کیسا پھندا تھا، یہ کیسی زنجیریں تھیں؟ وہ دور جا کر بھی دور نہیں جا سکتی تھی۔ شانی کی دلی خواہش تھی کہ وہ راولپنڈی چھوڑ کر آزاد علاقے میں جا چکا ہو۔ ان سنگین خطرات کے نرغے سے نکل چکا ہو جو اس کے گرد ہر گھڑی اپنا گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مگر کیا واقعی ایسا ہو چکا ہو گا؟! یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ اس حوالے سے سوچتے ہوئے شانی کے ذہن میں خوش اندام نادیہ کا خیال بھی بار بار آتا تھا۔ وہ آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ رستم ہر گھڑی اس کی نگاہ میں تھا۔ وہ اس پر بُری طرح فریفتہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی طرح اسے آزاد علاقے میں جانے

سے روک لیتی اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی آزاد علاقے میں پہنچ جاتی۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا مگر یہ سب کچھ تب ہوسکتا تھا جب رستم شانی کے لکھے ہوئے آخری خط پر بھروسا کرتا اور اس کی تلاش کا خیال (کم از کم وقتی طور پر) دل سے نکال دیتا۔

اگلے روز شانی کو اس کیس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں جو بقول آنٹی ماجدہ کچھ بدخواہوں نے انکل عثمانی پر بنوا دیا تھا۔ انکل عثمانی محکمہ ٹیلی فون میں ڈی ای تھے۔ آنٹی ماجدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ انہیں تار چوری کے ایک معاملے میں ملوث کیا گیا تھا۔ تانبے کے کئی ٹن وزنی تار تھے جن کی مالیت لاکھوں میں تھی۔ انکل کے علاوہ محکمے کے ہی دو مزید افراد کو بھی ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔

بہرحال یہ ساری باتیں پرانی ہوچکی تھیں۔ شانی کے سوچنے کی بات یہ تھی کہ اب اس باسی کڑھی میں ابال آیا ہے تو کیوں۔ وہ چاہتی تھی کہ آنٹی ماجدہ خود ہی اسے اس بارے میں کچھ بتائیں۔ اسی روز شام کو گھر میں پھر سراسیمگی کی فضا پیدا ہوگئی۔ قاسم برلاس پھر آدھمکا تھا۔ انکل عثمانی بوکھلائے بوکھلائے اندر باہر پھرنے لگے۔ آنٹی کے ہاتھ پاؤں بھی پھولے ہوئے لگ رہے تھے۔ شانی کو ان پر ترس بھی آرہا تھا۔ چائے بناتے ہوئے ان کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ آج پھر شانی کو ہی چائے لے کر اندر جانا پڑا۔ تاہم آج وہ خود بھی ہچکچا رہی تھی۔ اسے گرانڈیل شخص کی وہ پُرتپش نظریں یاد آرہی تھیں جو کل کمرے سے واپسی پر شانی کی پشت سے چپک گئی تھیں۔

بادل نخواستہ وہ اندر داخل ہوئی۔ آج عینک والا کلرک نما شخص کمرے میں موجود نہیں تھا۔ گرانڈیل قاسم برلاس کے عین سامنے عثمانی صاحب صوفے پر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے اور کچھ مخنی سے نظر آرہے تھے۔ آج خلاف توقع قاسم برلاس کا موڈ کچھ بہتر نظر آرہا تھا۔ اس نے شانی کے سلام کا جواب مسکرا کر دیا، پھر بولا۔ ''عثمان! تم نے ان کا نام نہیں بتایا؟''

''اس کا نام تو شہناز ہے لیکن ہم شانی کہتے ہیں۔ رشتے میں...... مم...... میری بھتیجی لگتی ہے۔''

قاسم برلاس نے ایک بار پھر جلتی نظروں سے شانی کو سرتاپا گھورا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''کتنا پڑھی ہوئی ہیں آپ؟''

''گریجویشن......'' شانی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''کمپیوٹر آپریٹ کرنے کا بھی تھوڑا بہت تجربہ ہے یا نہیں؟''

''نہیں جی۔''

''اگر ہوتا تو اچھی بات تھی۔ میرے ایک ملنے والے توفیق پراچہ صاحب ہیں۔ ٹریول ایجنسی ہے ان کی...... وہاں ایک آسامی خالی ہے لیکن کمپیوٹر سے واسطہ پڑے گا اس جاب میں۔''

''وہ تو کوئی بات نہیں جی۔'' انکل عثمانی نے کہا۔ ''ذہین بچی ہے۔ آپریٹنگ تو دو تین ہفتے میں سیکھ جائے گی۔''

''ہاں لگ تو واقعی ذہین رہی ہیں۔'' قاسم برلاس نے کہا پھر افسرانہ شان سے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''شانی! بیٹھ جائیں آپ۔''

شانی نے ایک نظر انکل عثمانی کے دھواں دھواں چہرے پر ڈالی۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہے تھے۔ بیٹھ جاؤ شانی! میری مدد کرو۔ میں اس مگر مچھ کے جبڑوں میں ہوں...... تم کچھ دیر تک، باتوں سے، اس کا دھیان اپنی طرف لگاؤ۔ تاکہ میں ذرا سانس لے سکوں۔

شانی بیٹھ گئی۔ قاسم برلاس انٹرویو لینے والے انداز میں اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ شانی اس صورت حال کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار ہوگئی تھی۔ اس نے ان سوالوں کے نپے تلے جواب دیئے۔ اسی دوران میں اس نے چائے بنا کر قاسم اور انکل عثمانی کو بھی پیش کی۔ اس نے اوڑھنی سے اپنا سر اور سینہ اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس شکرا چشم افسر کے سامنے بے لباس بیٹھی ہے۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے لئے کوئی معقول بہانہ چاہئے تھا۔ آنٹی ماجدہ ہی اندر آجاتیں تو شاید اسے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا لیکن وہ تو جیسے کہیں غائب ہی ہوگئی تھیں۔

پھر شاید انکل عثمانی نے خود ہی محسوس کرلیا کہ شانی یہاں بہت بے آرام ہورہی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''شانی بیٹا! ذرا دیکھنا، میرا خیال ہے کہ میں اوپر والے کمرے میں ٹی وی کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ اسے آف کردینا۔''

شانی ''جی اچھا'' کہتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ ایک بار پھر اسے اپنی پشت پر وہ آنکھیں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اسے دال میں کالا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ آئندہ اگر یہ شخص آیا تو وہ اس کے سامنے نہیں جائے گی۔ ایسے کاموں کے لئے شاہد کو بھی استعمال کیا جاسکتا تھا...... یا پھر آنٹی بھی جیسے تیسے چائے سرو کرسکتی تھیں۔ شانی کو محسوس ہورہا تھا کہ اگر وہ ایک دو بار مزید اس

قاسم نامی شخص کے سامنے گئی تو انکل آنٹی کے لئے اور خود شانی کے اپنے لئے بھی کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ بے آسرا تھی۔ اس چار دیواری کی صورت میں اسے ایک موزوں پناہ گاہ میسر تھی۔ وہ اتنی جلدی اس پناہ گاہ سے محروم ہونا نہیں چاہ رہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ پہلے دن ہی اس شخص کے روبرو نہ گئی ہوتی۔

یہ حقیقی بات تھی کہ کبھی کبھی شانی خود اپنے آپ سے ہی بے زار ہو جاتی تھی۔ وہ جوان تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اللہ نے اسے اچھی صورت دی تھی۔ اب وہ اپنا چہرہ اور حلیہ بگاڑنے سے تو رہی۔ وہ صرف اتنا کر سکتی تھی کہ خود کو نمایاں نہ کرے۔ خود کو حتی الامکان سادگی اور سنجیدگی میں لپیٹ کر رکھے اور وہ یہ سب کچھ کرتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اپنی ''جاذب نظری'' پر خود ہی شرمساری ظاہر کر رہی ہے..... آج کل بھی وہ بالکل سادہ لباس میں تھی۔ جو کپڑے اسے انکل عثمانی نے لا کر دیئے تھے، ان میں دوپٹا قدرے شوخ اور خوش رنگ تھا۔ شانی نے وہ دوپٹا اٹیچی میں رکھ کر افشاں کا ایک سفید دوپٹا لے لیا تھا...... میک اَپ کرنا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی بال بھی ٹھیک سے سنوارے نہیں تھے۔ وہ انہیں بے حد کس کر باندھتی تھی اور دوپٹے سے ڈھانپے رکھتی تھی۔

وہ قاسم برلاس کے بارے میں سوچتی رہی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اس کے روبرو نہیں جائے گی۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ شخص اہلِ خانہ کو مرعوب کر کے بیٹھا ہوا ہے اور اب ان سے ہر جائز و ناجائز فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہے۔ شاید اس معاملے میں انکل کی چھوٹی بیٹی افشاں کا بھی کوئی کردار رہا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ شخص نرم و نازک افشاں کو بھی انہی نظروں سے دیکھتا ہو جن سے خود شانی کو دیکھ رہا تھا۔ شانی نے جب اس امکان کو اس فقرے کے ساتھ جوڑا جو اس نے چند دن پہلے قاسم برلاس کے منہ سے سنا تھا تو صورتِ حال کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آنے لگی۔ اس روز قاسم برلاس نے بڑے تپے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔'' عثمانی! تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ کھلا دھوکا دیا ہے، مجھ سے تمہاری ملاقات ہر دوسرے تیسرے روز ہوتی تھی لیکن تم نے ایک بار بھی افشاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔''

چار پانچ دن خیریت سے گزر گئے۔ انکل عثمانی نے شانی سے قاسم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی نہ ہی آنٹی ماجدہ نے کچھ بتایا، پھر ایک دن قاسم بلائے ناگہانی کی طرح پھر آ دھمکا، شومئی قسمت اس دن آنٹی ماجدہ کے علاوہ لڑکا شاہد بھی گھر میں نہیں تھا۔ وہ دونوں مہینے کا سودا سلف لینے ڈیپارٹمنٹل سٹور گئے تھے۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق شانی کو خود ہی

چائے بنانی پڑی اور خود ہی پیش کرنا پڑی۔ کچھ دیر کے لئے وہ تذبذب کا شکار ضرور ہوئی مگر پھر انکل عثمانی کا زرد چہرہ دیکھ کر اور ان کے جسم کی کپکپاہٹ محسوس کر کے اس نے قاسم صاحب کے سامنے نہ جانے کا ارادہ بدل لیا۔

قاسم برلاس اس روز بھی خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ کچھ مٹھائی اور پھل بھی لے کر آیا تھا۔ اس کا مخصوص لباس پتلون اور جرسی تھا۔ اس کا نصف گنجا سر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمکتا رہتا تھا... اس چٹیل میدان کی وجہ سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی وسیع و عریض معلوم ہوتا تھا۔

قاسم نے انکل عثمانی اور شانی کو مشترکہ طور پر یہ نوید سنائی کہ اس نے اپنے دوست پراچہ صاحب سے بات کر لی ہے۔ امید ہے کہ ''کمپیوٹر آپریٹنگ'' کے بغیر بھی کام چل جائے گا اور شانی کو یہ جاب مل جائے گی۔ شانی خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں انکل عثمانی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں قاسم کی آفر بُری نہیں لگی۔ ابھی وہ تینوں ڈرائنگ روم میں چائے ہی پی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عثمانی صاحب نے ریسیور اٹھایا۔

''کون؟ ماجدہ؟ کیا ہوا؟'' انہوں نے چاروں لفظ وقفے وقفے سے کہے۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

عثمانی صاحب بولے۔''اوہ گاڈ...... کتنے روپے تھے؟''

جواب میں آنٹی ماجدہ نے تفصیل بتائی۔ عثمانی صاحب پریشان لہجے میں بولے۔

''لیکن یہاں قاسم صاحب آئے ہوئے ہیں...... بہر حال میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

فون بند کر کے انہوں نے بتایا۔''ماجدہ سے دو موٹر سائیکل سوار لڑکوں نے پرس چھین لیا ہے۔ دس بارہ ہزار روپے تھے اس میں۔ یہاں مین مارکیٹ میں ہیں وہ لوگ۔''

''تو جاؤ تم ہو آؤ۔ کہو تو...... میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' قاسم برلاس نے کہا۔

''نہیں...... نہیں آپ کیوں زحمت کریں گے۔ یہ کوئی ایسا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں...... میں ابھی ہو کر آتا ہوں۔''

انکل عثمانی قدرے فکرمندی کے عالم میں اپنی سوزوکی کار لے کر نکل گئے۔

گھر میں آناً فاناً قاسم اور شانی تنہا رہ گئے۔ شانی کے دل کی دھک دھک میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' قاسم برلاس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بول پڑا۔''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عثمانی جہاندیدہ بندہ ہے۔ معاملے کو سنبھال لے

گا۔''

''آ... آپ اور چائے پئیں گے؟'' شانی نے بات برائے ''بات'' کی۔

''نہیں... چائے کی تو ضرورت نہیں۔ ...لیکن اگر آپ نے کچھ کھلانا پلانا ہی ہے تو پھر... مولی والا ایک پراٹھا کھلا دیجئے۔ جب میں اندر داخل ہوا تھا تو مولی والے پراٹھے کی خوشبو آرہی تھی۔''

''ہاں۔ وہ میں پکا رہی تھی، انکل کی فرمائش پر۔''

''بڑے خوش قسمت ہیں بھئی، آپ کے انکل۔'' قاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اچھا... میں آپ کے لئے لاتی ہوں۔'' شانی نے اٹھتے ہوئے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

آٹا گوندھ رکھا تھا۔ مولی بھی کدوکش کی ہوئی تھی۔ شانی نے پیڑا بنایا اور توے پر گھی پھیلا دیا۔ ساتھ ساتھ وہ گھر کے بند دروازوں اور اس اکیلے غیر مرد کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو اس چار دیواری میں اس کے ساتھ موجود تھا۔ اگر... اگر خدانخواستہ اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ وہ مرد تھا بلکہ ایک گرانڈیل مرد تھا۔ شانی کی تو شاید چیخ و پکار بھی کھڑکیوں سے باہر نہ جا سکتی۔ وہ خود کو بے چین محسوس کر رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ کام میں بھی لگی ہوئی تھی۔ ذہن میں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ قاسم نے انکل اور آنٹی کو کسی جال میں الجھایا ہو۔ عین موقع پر اس طرح کی فون کال کا آنا کیا معنی رکھتا تھا؟ وہ پراٹھا الٹ رہی تھی جب اچانک اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پُرتپش نگاہیں جو اس کی پشت سے چپک سی جاتی تھیں۔

اس نے یک دم پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے عقب میں موجود تھا۔ اس کے بھاری بھرکم وجود نے پورے دروازے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہ جانے وہ کتنی دیر سے بڑی محویت کے ساتھ شانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی مگن تھی کہ اسے اس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ زمین پر لٹکتا ہوا دوپٹا اس نے جلدی سے اپنے گریبان اور سر پر پھیلایا۔ چہرے پر جھولتی بالوں کی آوارہ لٹیں کانوں کے پیچھے اُڑسیں اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''آپ بیٹھئے! میں لے کر آتی ہوں۔''

وہ بے باکی سے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ پراٹھا کھانے میں اتنا مزہ نہیں آئے گا، جتنا پراٹھا پکتا ہوا دیکھنے میں آرہا ہے۔''

''بس... تقریباً تیار ہو گیا ہے۔'' شانی نے دوپٹا سینے پر کھینچا اور میکانکی انداز میں

بائیں ہاتھ سے اسے اپنی پشت تک پھیلا لیا۔

وہ ڈھٹائی سے وہاں کھڑا رہا اور شانی کو دیکھتا رہا۔ شانی کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ یوں کچن تک چلا آئے گا۔ کچھ دیر بعد اس کی گونج دار آواز شانی کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''بھئی! مولی والے پراٹھے کا مزہ تو دہی کی لسی کے ساتھ آتا ہے۔''

''لسی بھی مل جائے گی سر۔'' شانی نے لہجے میں خوش اخلاقی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

پراٹھا اتار کر وہ جلدی جلدی لسی بنانے لگی۔ اسٹیل کے جگ میں مدھانی چلاتے ہوئے اس کا سارا جسم ڈولنے لگا تھا۔ جسم کا ڈولنا نارمل بات تھی لیکن جن نظروں کے سامنے ایسا ہو رہا تھا وہ ہرگز نارمل نہیں تھیں۔ وہ حجاب کے سبب اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ مدانی پر اس کے ہاتھوں کی حرکت مدھم پڑ گئی۔ تب پانی لینے کے بہانے اس نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔ ''نظارہ'' اوجھل ہو گیا تو دیکھنے والا بھی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جا کر پھر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔ شانی کے اندیشے لحہ بہ لحہ گھمبیر ہوتے جا رہے تھے۔ لسی تیار ہو گئی تو اس نے پراٹھا ٹرے میں رکھا اور دوپٹے کو اچھی طرح درست کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

نیم گرم پراٹھے کے چند لقمے لینے کے بعد اس نے نمکین لسی کے دو چار گھونٹ بھرے اور تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''تمہارے ہاتھ میں بہت سواد ہے بھئی۔ ایسے پراٹھے کھانے کے لئے تو بندے کو سو میل سے چل کر آنا پڑے تو بھی گھاٹے کا سودا نہیں...''

''شکریہ سر!''

''اوہو... اب تم سر کہہ کر مزہ کرکرا کر رہی ہو۔ سر مت کہا کرو۔ اس سے بے گانگی کی بو آتی ہے... کوئی اور مناسب سا لفظ ڈھونڈ لو میرے لئے۔'' اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''لیکن سر...''

''ارے پھر وہی سر۔'' وہ زور سے ہنسا اور اس کے جسم کے ساتھ ساتھ پورا صوفہ بھی ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ قاسم اس غصیلے قاسم سے کتنا مختلف تھا جو چند روز پہلے انکل عثمانی پر برس رہا تھا۔

اس کا چوڑا جبڑا تو پراٹھا چبا رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں جیسے شانی کو چبا رہی تھیں۔ اس بند چار دیواری کے اندر شانی کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ انکل اور آنٹی جلد از جلد واپس آ جائیں۔

دس پندرہ منٹ مزید اسی خوف اور کشمکش میں گزر گئے۔ آخر مین گیٹ پر انکل کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ انکل اور آنٹی واپس آ گئے تھے۔ شانی کی جان میں جان آئی۔

☆======☆======☆

شانی کے دن عجب بے چینی میں گزر رہے تھے۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے آنے کے بعد پنڈی میں کیا حالات پیش آئے ہیں؟ رستم کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ رستم اور نادیہ والے معاملے نے کیا رخ اختیار کیا ہے؟ پنڈی پولیس اور رستم کی سنگین کشمکش کس نتیجے پہ پہنچی ہے؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گاہے بگاہے اخبار بھی دیکھتی رہتی تھی کہ شاید اسے رستم یا اس کے دوست زوار کے حوالے سے کوئی خبر نظر آ جائے۔ پنڈی میں پولیس کے ساتھ جھڑپ کے دوران میں ایک پولیس اہلکار شدید زخمی ہوا تھا۔ شانی کو جو آخری اطلاع ملی تھی اس کے مطابق زخمی کی حالت خطرے میں تھی۔ اگر وہ شخص خدانخواستہ مر گیا تو پھر رستم کے گرد پولیس کا گھیراؤ مزید تنگ ہونا تھا۔

راولپنڈی کی طرح شانی کو اپنی جنم بھومی، رنگ والی کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ رنگ والی اور اس کے ساتھ ساتھ نارپور کے سارے حالات تاریکی کے پردے میں تھے۔

قاسم برلاس تیسرے چوتھے روز انکل عثمانی کے گھر کا چکر لگا رہا تھا۔ وہ جب تک موجود رہتا شانی کی جان جیسے شکنجے میں ہوتی تھی۔ شانی کو نہ چاہنے کے باوجود اکثر اس کے سامنے بھی جانا پڑتا تھا۔ اس نے بظاہر تو کوئی غیر شائستہ بات...... یا حرکت نہیں کی تھی...... لیکن اس کی ہر دم تعاقب کرنے والی پُرتپش نظریں شانی کے لئے باتوں اور حرکتوں سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ گاہے بگاہے وہ کوئی ذومعنی فقرہ بھی شانی کے کانوں میں ڈال دیتا تھا۔

ایک روز وہ سفید براق شلوار قمیص پہن کر آیا تھا، کھانا کھاتے ہوئے وہ مسلسل باتیں بھی کر رہا تھا۔ اس دوران میں آنٹی ماجدہ، سالن کا ڈونگا لئے ہوئے اندر آئیں۔ قاسم کی موجودگی میں وہ بھی انکل کی طرح بہت نروس رہتی تھیں۔ سالن میز پر رکھتے ہوئے آنٹی کا ہاتھ ہل گیا اور تھوڑا سا سالن چھلک کر قاسم کی سفید قمیص پر گر پڑا۔ قاسم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو لگا کہ وہ افسرانہ لب و لہجے میں آنٹی پر برس پڑے گا، مگر پھر اس نے خود کو ایک دم پُرسکون کر لیا اور اپنے بیکراں چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا لی، غالبًا ایسا شانی کی موجودگی کے سبب ہی ہوا تھا۔

سالن گرنے کے بعد قاسم اٹھ کھڑا ہوا اور اب واش روم کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا مطمع نظر سمجھتے ہوئے شانی نے کہا۔ ''آیئے... میں قمیص کا کنارہ دھو دیتی ہوں۔''

قاسم تو پہلے ہی اس قسم کی سچویشن کا متلاشی رہتا تھا۔ وہ شانی کے ساتھ واش روم کے بیسن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شانی واش بیسن پر جھک کر قاسم کی قمیص کے کنارے کو صابن لگانے لگی۔ قاسم کی نگاہیں شانی کے گریبان میں اٹکی ہوئی تھیں اس کا جسم شانی کے پہلو سے مس ہو رہا تھا۔ یا شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کی بھاری بھرکم سانس زیروزبر ہے، بمشکل یہ مرحلہ طے ہوا اور وہ ڈائننگ ٹیبل پر واپس آئے۔

شروع کے دنوں میں قاسم برلاس نے شانی کی ملازمت کا ذکر بڑی شدومد سے کیا تھا مگر اب وہ اس سلسلے میں کچھ ڈھیلا پڑتا ہوا نظر آتا تھا، پتا نہیں کہ اس کی وجہ کیا تھی۔

دو تین روز مزید گزرے اور پھر اس کی وجہ شانی کو معلوم ہو گئی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ انکل عثمانی گھر میں ہی تھے۔ اسلام آباد سے افشاں نے ملنے کے لئے آنا تھا لیکن بوجوہ اس کا پروگرام چند دن آگے چلا گیا تھا۔ دس بجے ناشتا کرنے کے بعد انکل سٹڈی روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ملازم لڑکے شاہد نے کہا۔ ''باجی جان! انکل آپ کو بلا رہے ہیں۔''

شانی اسٹڈی میں پہنچی تو وہ کوئی اہم بات کرنے کے موڈ میں نظر آئے۔ تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد انکل نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''شانی بیٹا! تم تھوڑے ہی عرصے میں اپنے بچوں کی طرح لگنے لگی ہو۔ تمہارے بارے میں بالکل اسی طرح سوچتا ہوں جس طرح عاصمہ اور افشاں کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا مگر تمہارے بارے میں نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے بارے میں اور تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھ میں زیادہ اعتماد نہیں ہوتا۔''

انہوں نے چند لمحے خاموش رہ کر شانی کے ردِعمل کا اندازہ لگایا پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہیں کسی بھی حوالے سے مجبور نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ شانی بیٹا! اگر تم کسی وجہ سے اپنے ماضی کو پردے میں رکھ رہی ہو تو یہ تمہارا حق ہے۔ میرے لئے یہ کافی ہے کہ تم اچھی سوچ رکھتی ہو۔ تمہاری فطرت نیک ہے اور تم کسی نیک ماں کی بیٹی ہو۔ ایک عاقل بالغ لڑکی ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی کے مسئلوں کے بارے میں فیصلہ کرنا تمہارا حق ہے اور تم پوری آزادی کے ساتھ ایسا کر سکتی ہو۔ اس کے باوجود میری طرف سے تمہیں ایک بار پھر مخلصانہ پیشکش ہے کہ اگر تم اپنے وارثوں کے پاس واپس جانا چاہتی ہو تو میں اس سلسلے میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں... ...''

اپنی بات ختم کر کے انکل عثمانی سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھنے لگے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں انکل ...! ایسی بات نہیں۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم انہیں کہیں کھو بیٹھی ہو اور اب انہیں تلاش کرنا چاہتی ہو۔''

''نہیں انکل! یہ بات بھی نہیں...... بس میں واپس لوٹنا ہی نہیں چاہتی...... اگر میں آپ پر بوجھ......''

''بس بس، آگے کچھ مت کہنا۔'' انکل نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''ایسی بات دماغ میں بھی نہیں لانا۔ تم ہماری بیٹی ہو...... اور بیٹی بوجھ نہیں ہوتی۔''

کچھ دیر تک اسٹڈی روم میں گہری خاموشی رہی۔ شانی کی بلوری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ انکل بھی بالکل خاموش تھے۔ ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے گھمبیر آواز میں کہا۔

''شانی بیٹا! قاسم یہاں آتا رہتا ہے۔ میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ دیکھنے میں سخت لگتا ہے لیکن دل کا ایسا نہیں ہے۔ ہر بندے میں خامیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں۔ پرکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مجموعی طور پر بندہ کیسا ہے۔ قاسم نے پرسوں مجھ سے ایک بات کہی ہے۔ شروع میں تو مجھے بھی یہ بات عجیب لگی تھی۔ مگر اب دو دن تک غور کیا ہے تو یہ کچھ ایسی عجیب بھی نہیں لگ رہی۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟'' شانی نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

انکل عثمانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شانی بیٹا! قاسم تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔'' شانی سن ہو کر رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر انکل عثمانی جلدی سے بولے۔ ''میں نے تمہیں صرف وہ بات بتائی ہے، جو قاسم نے مجھ سے کہی ہے۔ اس میں میری کسی طرح کی رائے شامل نہیں ہے۔''

اسی دوران میں فون کی بیل بجنے لگی۔ شانی کی بات منہ میں ہی رہ گئی اور وہ فون سننے کے لئے اٹھ گئی۔ دوسری طرف افشاں تھی۔ وہ اسلام آباد سے بول رہی تھی اور پاپا ممی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ شانی اور انکل عثمانی کی گفتگو وہیں کی وہیں رہ گئی۔ بہرحال اب شانی کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ قاسم صاحب نے اب اس کی سروس کی بات کرنا کیوں چھوڑ دی ہے۔

اگلے روز آنٹی ماجدہ کے ساتھ بھی اس حوالے سے شانی کی بات ہوئی۔ آنٹی ماجدہ بھی جانتی تھیں کہ تین روز پہلے قاسم برلاس نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ آنٹی ماجدہ نے اس بارے میں غیر جانبداری سے بات کی۔ انہوں نے شانی کو بتایا کہ قاسم برلاس سے اس کی بیوی نے سات آٹھ سال پہلے خلع لے لیا تھا۔ اس کی دو بچیاں بھی ہیں جو بیوی کے پاس

ہیں۔ شادی ختم ہونے میں دونوں طرف سے تھوڑا تھوڑا قصور تھا۔ زیادہ قصور شاید قاسم کا ہی تھا۔ وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی سخت گیر تھا۔ بہرحال اب آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جا رہا ہے .... باپ کی طرف سے اسے کافی جائیداد ملی ہوئی ہے، خود بھی ٹھیک ٹھاک کماتا ہے اور دوسروں پر خرچ بھی کرتا ہے، کھلے دل کا مالک ہے۔

یہاں تک بتا کر آنٹی ماجدہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر بولیں۔ ''اپنی زندگی کے بارے میں جتنا بہتر تم خود سوچ سکتی ہو، کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ جہاں تک قاسم کی بات ہے وہ تمہارے جوڑ کا تو نہیں ہے۔ عمر کے لحاظ سے بھی کافی بڑا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تمہارے دل کا بھی پتا نہیں، کیا خبر تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ بہرحال بڑی ہونے کی حیثیت سے میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گی۔ شادی کرنا کسی ایسے مرد سے جو تمہیں چاہتا اور مانگتا ہو .... نہ کہ ایسا مرد جسے تم چاہتی اور مانگتی ہو......''

آنٹی اس موضوع پر کافی دیر تک بات کرتی رہیں۔ شانی نے ان کی ایک دو باتوں کے جواب بھی دیئے۔ ان جوابات نے یقیناً آنٹی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ فی الوقت شادی وغیرہ کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی۔

بہرحال آنٹی نے قاسم کے بارے میں متوازن اور بے لاگ باتیں کی تھیں۔ اس کی شخصیت کے اچھے اور برے دونوں پہلو وضاحت سے بیان کر دیئے تھے۔ ابھی شانی اور آنٹی ماجدہ میں بات ہو ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ملازم لڑکے شاہد نے گیٹ کے اوپر سے باہر جھانکا اور آنٹی کے پاس آ کر بولا۔ ''لمبوں کی امی آئی ہیں۔''

لمبوں کی امی کی اصطلاح شانی نے پہلے بھی سنی تھی۔ محلے میں تین چار لمبے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ''لمبوں کی امی'' پڑ گیا تھا۔

لمبوں کی امی کا ذکر سن کر آنٹی نے شانی کو فوراً اندر چلے جانے کو کہا۔ لگتا تھا کہ وہ اس عورت کو زیادہ پسند نہیں کرتیں۔

ایک دن پہلے بھی یہ عورت ایک دوسری عورت کے ساتھ آئی تھی تو آنٹی نے شانی کو کمرے کے اندر ہی رہنے کے لئے کہا تھا۔ یہ کافی باتونی عورت لگتی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کرتی رہتی تھیں جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہو...... کھوج رہی ہو۔ غالباً آنٹی ماجدہ کو بھی اس کی طرف سے یہی اندیشہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ شانی والے معاملے کو کریدنے کی کوشش کرے گی اور الٹے سیدھے سوال داغنا شروع کر دے گی۔

شانی اندر چلی گئی اور آنٹی ماجدہ اس فیشن ایبل عورت سے صحن میں ہی کھڑے ہو کر

باتیں کرنے لگیں۔ (بعدازاں پتا چلا کہ وہ آنٹی ماجدہ سے ان کے چھینے جانے والے پرس کا افسوس کرنے آئی تھیں)

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ فون کی گھنٹی بجنے پر شانی نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی نسوانی آواز سنائی دی۔ لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی عمر کی عورت ہے۔ اس نے کہا ”شانی تم مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں تمہیں بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتی ہوں۔ یہ ایسی بات ہے جو تمہیں ایک بہت بڑے نقصان سے بچا سکتی ہے۔“

”میں..... آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ ہیں کون؟“

”دیکھو..... میں فون پر تمہیں زیادہ نہیں بتا سکتی۔ زیادہ جاننے کے لئے تمہیں، مجھے گھر سے باہر ملنا ہوگا لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ احتیاط رہے کہ تمہاری آنٹی ماجدہ یا انکل کو خبر نہ ہو۔ اگر انہیں خبر ہوگئی تو سمجھو، سب چوپٹ ہو جائے گا۔“

شانی کو عورت کے لہجے میں ہمدردی اور اپنائیت کی جھلک ملی ایک لمحے کے لئے تو اس کے ذہن میں آیا، کہیں یہ وہی فیشن ایبل عورت تو نہیں جو دو روز پہلے بھی گھر میں آئی تھی۔ آواز بھی ملتی جلتی ہی لگ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہا کہ عورت کی بات سنے لیکن کیسے؟ وہ کہہ رہی تھی کہ تفصیل جاننے کے لئے اسے گھر سے باہر ملنا ہوگا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ بلکہ وہ تو صحن میں بھی زیادہ نہیں جاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تین آوارہ گردوں کے درمیان گھرنے کے بعد اور شدید ذہنی اذیت کا شکار ہونے کے بعد اس کا اعتماد بُری طرح مجروح ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟“ فون پر ابھرنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کک..... کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ آپ اس بات چیت کو انکل اور آنٹی سے چھپانے کا کیوں کہہ رہی ہیں۔ ان کے علم میں لائے بغیر میں گھر سے کیسے نکل سکتی ہوں اور وہ ایسی کیا بات ہے جو ان سے چھپانا ضروری ہے؟“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر خاتون کی آواز ایئر پیس میں ابھری۔ ”اگر تم گھر سے باہر نہیں نکل سکتی ہو تو پھر ایک اور کام کرو۔ رات کو دس بجے کے بعد اپنے گھر کی چھت پر آ جاؤ۔ میں تمہیں وہاں نظر آ جاؤں گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ اڑوس پڑوس کے کسی گھر سے بات کر رہی ہیں؟“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو لیکن دیکھو، میں پھر تمہیں بتا دوں۔ میں تمہاری خیر خواہ ہوں۔ میری

بات سننے کے بعد تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں نے تمہیں کتنی بڑی پریشانی سے بچایا ہے۔ اسے میری التجا سمجھ لو کہ ابھی اپنی آنٹی اور انکل کو میرے فون کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔“

شانی نے کچھ دیر سوچا پھر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آنٹی! میں آپ کی بات سننے آ جاؤں گی لیکن آپ ہوں گی کہاں؟“

خاتون کا لہجہ کچھ اور دھیما اور رازدارانہ ہوگیا۔ کہنے لگیں۔ ”تمہارے گھر کے پچھواڑے جو کوٹھی ہے۔ وہ ہماری ہے۔ ہماری چھتوں کا تھوڑا سا حصہ آپس میں ملا ہوا ہے۔ تم اوپر آؤ گی تو پتا چل جائے گا لیکن ایک احتیاط رکھنا۔ چھت پر آ کر برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر لینا۔ میں نہیں چاہتی کہ ماجدہ تمہیں ڈھونڈتی ہوئی اوپر آ جائے اور دیکھ لے۔“

شانی نے بند ہونٹوں سے ”ہوں“ کی آواز نکال کر اثبات میں جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ دس بجے کے بعد چھت پر۔“ خاتون نے فون بند کرنے سے پہلے پھر تاکید کی۔

......رات دس بجے تک کا وقت شانی نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ اس کا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کئی طرح کے وسوسے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ نامعلوم آنٹی کی بات مان کر کہیں وہ اپنے لئے کوئی مصیبت ہی کھڑی نہ کر لے۔ اگر وہ برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر کے عقبی حصے کی طرف جاتی اور وہاں تاریکی میں کوئی چھپا ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رات دس بجے کے بعد اردگرد کافی خاموشی ہوتی تھی ویسے بھی اب سردی بڑھ گئی تھی اور لوگ کمروں میں دبکنا شروع ہوگئے تھے۔

پھر اسے عورت کے لہجے میں موجود ہمدردی اور اپنائیت کی لہر یاد آئی۔ .....اور وہ الفاظ یاد آئے جن میں اس نے تاکید کی تھی۔ وہ سوچنے لگی، یہ ضروری تو نہیں کہ وہ عورت کوئی ایسی بات کہے جو انکل اور آنٹی کے خلاف جاتی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ بات شانی کے ساتھ ساتھ انکل اور آنٹی کے فائدے میں بھی ہو۔ کوئی ایسی رائے... کوئی ایسا مشورہ جس سے انکل اور آنٹی کے مسائل کم ہونے کی امید پیدا ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چھت پر ضرور جائے گی۔

ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ جب انکل، آنٹی اور شاہد سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، شانی دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر پہنچ گئی۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے وہ دبیز شال لپیٹ رکھی تھی جو چند ہی دن پہلے انکل نے اسے لا کر دی تھی۔ چھت پر جا کر وہ سوچنے لگی کہ دروازہ اپنی طرف سے بند کرے یا نہیں۔ اگر وہ دروازہ اپنی طرف سے بند

کر دیتی اور اتفاقاً آنٹی یا انکل میں سے کوئی اوپر آجاتا تو وہ ضرور پوچھتا کہ اس نے چھت کی طرف سے دروازہ بند کیوں کیا ہے۔ اگر دروازہ کھلا ہوتا تو تشویش کی بات نہیں تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ چھت پر ٹہلنے کے لئے آئی ہے۔

وہ کچھ دیر ادھیڑ بُن میں رہی۔ پھر اس نے نامعلوم آنٹی کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور دروازہ اپنی طرف سے بند کر دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے چھت کے عقبی حصے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ قریبی چھت کی تقریباً پانچ فٹ اونچی منڈیر پر اسے ایک سر حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً یہ کسی عورت کا سر تھا۔ شانی محتاط قدموں سے منڈیر کے قریب چلی گئی۔

''ذرومت۔ آگے آجاؤ۔'' عورت نے دبی آواز میں کہا۔ وہ ساتھ والی چھت پر تھی۔

شانی قریب پہنچی اور اس نے پہچان لیا۔ یہ ترشے ہوئے بالوں والی وہی عورت تھی جسے ''لبوں کی امی'' کہا جاتا تھا۔ وہ خود بھی خاصی دراز قد تھی۔ منڈیر کے اوپر سے وہ بہ آسانی شانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں آنٹی؟'' شانی نے اپنی لرزش پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

اصل بات شروع کرنے سے پہلے آنٹی نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔ ان کا نام ارجمند بیگم تھا۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ عرصہ آٹھ سال سے اس گھر میں مقیم تھیں اور انکل عثمانی و آنٹی ماجدہ کو بہ خوبی جانتی تھیں۔

اپنا تعارف کرانے کے بعد ارجمند بیگم نے شانی سے پوچھا۔ ''تم کہاں سے آئی ہو بیٹی اور عثمانی کے گھر میں کیسے ہو؟''

شانی نے اس سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا اور یہ وہی جواب تھا جو اس نے اس سے پیشتر انکل اور آنٹی کو بھی دیا تھا۔ یعنی وہ گوجر خان سے آئی ہے والدہ کافی عرصہ پہلے فوت ہوگئی تھیں پھر ایک بھائی بھی ایک حادثے میں چھن گیا۔ اس کے بعد والد کا ساتھ چھوٹا۔ اب جو عزیز ہیں وہ ان کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ کوئی مناسب ملازمت کرکے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔

ارجمند بیگم نے پوچھا کہ عثمانی صاحب اور ماجدہ سے اس کا رابطہ کیونکر ہوا۔ شانی نے مصلحت کے تحت کہا کہ وہ انہیں کافی عرصے سے جانتی ہے۔

ارجمند بیگم فوراً بولیں۔ ''بیٹی! میرا نہیں خیال کہ تم انہیں کافی عرصے سے جانتی ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

ارجمند بیگم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ قاسم براس نام کا جو بندہ عثمانی کے پاس آتا جاتا ہے، وہ کون ہے؟''

''وہ محکمے کا کوئی افسر ہے۔''

''محکمے کا افسر تو وہ ہے لیکن عثمانی کے پاس اس لئے آتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں عثمانی کی دکھتی رگ ہے۔ وہ غبن کے اس کیس کی انکوائری کر رہا ہے جس کے بڑے ملزم عثمانی صاحب ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں آنٹی ماجدہ نے بتایا تھا۔''

''مگر اس نے وہ کچھ نہیں بتایا ہوگا جو اسے بتانا چاہئے تھا۔'' ارجمند بیگم نے کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟''

''عثمانی پر جو کیس بنا، وہ سو فیصد درست ہے۔''

شانی کچھ دیر کے لئے حیران رہ گئی پھر سنبھل کر بولی۔ ''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''یہ میں ہی نہیں کہتی، سارے لوگ کہتے ہیں۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ عثمانی نے اپنی پہلی بیٹی عاصمہ کی شادی غبن کے پیسے سے ہی کی تھی۔ بندے کی دیانت داری کا امتحان تو مشکل میں ہی ہوتا ہے اور جب عثمان پر مشکل آئی تو وہ پرلے درجے کا بددیانت اور بے ایمان ثابت ہوا۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر تار چوری کئے اور محکمے کو ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کا نقصان پہنچایا۔''

''آپ... انکل عثمانی کی کس مشکل کی بات کر رہی ہیں؟''

''عثمانی نے جہاں بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا، وہ بھی عثمانی ہی کی طرح لالچی لوگ تھے۔ نام ونمود اور دولت کے پجاری۔ انہوں نے عثمانی سے نہ صرف بھاری جہیز کا مطالبہ کیا، بلکہ یہ شرط بھی عائد کر دی تھی کہ وہ داماد کو بیرون ملک بھجوانے میں مدد کریں گے۔ عثمانی کو اپنے داماد سے غیر معمولی فائدے کی توقع تھی اس لئے وہ غیر معمولی رسک اٹھانے کو تیار ہوگیا۔ اس نے داماد کی خاطر غبن کیا۔ یوں وہ داماد کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی رہا لیکن داماد سے اس کی جو توقعات تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں۔ داماد بیٹی کے ساتھ مغربی جرمنی اُڑن چھو ہوگیا اور عثمانی یہاں چوری کے کیس میں پھنس گیا یہ قاسم براس اسی ''کیس'' کی نشانی ہے۔''

اچانک شانی کو یاد آیا کہ اس نے قاسم براس کے منہ سے افشاں کا نام سنا تھا۔ افشاں کا اس معاملے میں کیا کردار ہوسکتا تھا جب شانی نے یہ سوال ارجمند بیگم سے کیا تو اس کا جواب اسے حسب توقع ملا۔

ارجمند بیگم نے اپنا رازدارانہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی! میں تمہیں جو کچھ

بتاؤں گی، صاف دلی سے بتاؤں گی۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بُری لگے تو اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ میں سمجھتی ہوں کہ عثمانی بددیانت ہی نہیں بڑی حد تک بے غیرت بھی ہے۔ جب اس پر قاسم برلاس انکوائری افسر مقرر ہوا تو اس نے اسے نئے طریقے سے پھانسنے کی کوشش کی۔ یہ اپنی چھوٹی بیٹی افشاں کو سامنے لے آیا۔ یہاں عثمانی کے پاس قاسم کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ روز دعوتیں ہونے لگیں۔ ہم سب کچھ دیکھتے تھے۔ قاسم کی گاڑی کئی کئی گھنٹے عثمانی کے گیٹ کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ پہلی بیوی سے طلاق کے بعد قاسم کی شادی نہیں ہوسکی تھی۔ وہ کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھا۔ ان میاں بیوی نے قاسم کو ایسے اشارے دیئے جس سے اس نے سمجھنا شروع کر دیا کہ یہ افشاں کا ہاتھ تو اس کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ اس آڑ میں یہ دونوں قاسم سے پیسے بھی کھاتے رہے۔ اس کے علاوہ عثمانی نے اپنے ایک بھتیجے کو بھی محکمے میں ملازم کروایا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ سنانے بیٹھوں گی تو یہاں چھت پر ہی رات گزر جائے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ جب غبن کا کیس ٹھنڈا پڑ گیا اور دوسرے دفتری معاملے بھی حل ہوگئے تو ان دونوں میاں بیوی نے قاسم کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ لڑکی کی عمر کم ہے۔ وہ ابھی اور پڑھنا چاہتی ہے۔ ابھی شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ دراصل انہوں نے افشاں کے لئے افشاں کے ایک کلاس فیلو کا رشتہ ڈھونڈ لیا تھا اور اب قاسم سے ٹال مٹول کر رہے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے آناً فاناً افشاں کی شادی بھی کر دی۔ اسلام آباد سے برات آئی اور وہ دلہن بن کر یہ جا وہ جا ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ ایک پکی عمر کے لمبے چوڑے بھوت کے ساتھ اس کی زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کیسے کر سکتے تھے...... لیکن بیٹی! سوچنے کی بات یہ ہے کہ عثمانی اور ماجدہ نے یہ بات تب کیوں نہ سوچی جب وہ بیٹی کو اس کے سامنے چارے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں سنی سنائی بات نہیں کر رہی۔ میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے رات ایک بجے کے قریب افشاں کو گھر کے سامنے قاسم کی گاڑی سے اُترتے ہوئے دیکھا ہے لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب عثمانی ''غبن کیس'' میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا اور جناب کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔''

ارجمند بیگم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''افشاں کی شادی ابھی کوئی تین مہینے پہلے ہی ہوئی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ اس شادی کا اثر قاسم برلاس پر کیا ہوا ہوگا۔ وہ آج کل سخت غصے میں ہے اور سنا ہے کہ اس کے ارادے عثمانی کے لئے اچھے نہیں ہیں۔ وہ بار بار عثمانی کے دروازے پر بھی آرہا ہے۔ کیا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے؟''

''ایک دو دفعہ۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔

ارجمند بیگم نے اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا چلا ہے کہ عثمانی کو کیس ''ری اوپن'' ہونے کی دھمکی ملی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بھتیجے کی ملازمت بھی شدید خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ سارے حالات ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ تم سمجھدار ہو۔ تمہیں ان حالات کو سمجھ جانا چاہئے......''

''آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ انکل......'' شانی کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

ارجمند بیگم نے ستاروں کی مدھم روشنی میں دھیان سے شانی کا چہرہ دیکھا اور جذباتی لہجے میں بولی۔ ''بیٹی! جہاں تک میں نے صورتِ حال کو پرکھا ہے، میرا اندازہ یہی ہے کہ عثمانی سے تمہاری ملاقات کہیں اتفاقاً ہوئی ہے۔ تمہیں سہارے کی ضرورت تھی اور تم نے عثمانی کی ظاہری حالت اور اس کی باتوں سے دھوکا کھا کر اسے اپنا سہارا سمجھ لیا۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ جس طرح تمہیں سہارے کی ضرورت ہے اسی طرح اس خرانٹ کو بھی ایک اچھی شکل کی جوان لڑکی کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی لڑکی جسے یہ اپنی لاڈلی بیٹی کی جگہ قاسم برلاس کی بھینٹ چڑھا سکے۔ تمہیں پتا نہیں ہے بیٹی! کہ اس عثمانی کے اندر کا چہرہ کتنا مکروہ ہے۔ مجھے پتا ہے کہ اس نے تمہیں بڑے لاڈ سے رکھا ہوا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے لیکن یہ ویسے ہی چاؤ چونچلے ہیں، جو ہم قربانی کے بکرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ بالآخر ہم نے اس کے گلے پر چھری چلانا ہوتی ہے۔ یہ بھی قاسم برلاس کے ہاتھوں تمہارے گلے پر چھری چلوائے گا۔ مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔ کتنی پیاری، کتنی من موہنی ہو۔ پتا نہیں کس ماں کے جگر کا ٹکڑا ہو۔ یہ قاسم برلاس بھوت بن کر تمہاری زندگی کو چمٹ جائے گا اور برباد کر دے گا۔''

ارجمند بیگم نے ذرا تامل کر کے اپنی گرم شال کندھوں پر مضبوطی سے جمائی اور بولیں۔ ''عثمانی یا ماجدہ نے تم سے شادی وغیرہ کی بات تو نہیں کی؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ قاسم کے حوالے سے تمہارا ذہن بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے یہ دونوں؟''

''نن...... نہیں آنٹی۔'' شانی نے مصلحتاً انکار کیا۔

ارجمند بیگم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اگر نہیں کیا...... تو یہ کریں گے۔ پہلے تمہیں پیار محبت سے اپنے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کر لیں گے۔ ان دونوں میں سے کسی کو اپنا ہمدرد نہ سمجھنا۔ دونوں ایک سے ہیں۔

شروع شروع میں ماجدہ کا ذہن تھوڑا سا مختلف تھا لیکن اب وہ بھی عثمانی کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ بلکہ کسی وقت تو اس سے بھی آگے نظر آتی ہے۔ ایسی عورت کو تو ماں کہلوانے کا حق بھی نہیں ہے۔ ماں تو موم کی طرح ہوتی ہے اور یہ ایسی پتھر ہے کہ اپنی اولاد کو جس آگ سے نکال رہی ہے، اسی آگ میں کسی دوسرے کے جگر کا ٹکڑا ڈال رہی ہے۔'' شانی کے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے ارجمند بیگم کی باتوں میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔

ارجمند بیگم نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ قاسم براس بڑا منہ زور بندہ ہے۔ کوئی شریف شخص بھی ایسے بندے کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔ ہم بھی نہیں چاہتے۔ لیکن میری تمہیں یہ تاکید ہے کہ آنے والے خطرے کو محسوس کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے ان فریبی مددگاروں کو چھوڑ کر کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لو...... آخر کوئی نہ کوئی جگہ تو ہو گی جہاں تم جا سکو......؟''

شانی نے مبہم انداز میں سر ہلایا۔

ارجمند بیگم نے کہا۔ ''اس کام میں جتنی دیر کرو گی اتنا ہی تمہارے لئے مشکل ہوتا جائے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ......''

اچانک ایک آواز نے شانی اور ارجمند بیگم، دونوں کو بُری طرح چونکا دیا۔

''شانی، کون ہے وہاں؟'' یہ آواز آنٹی ماجدہ کی تھی۔

برساتی کی ایک سائڈ پر چھوٹی سی روزن نما کھڑکی تھی۔ آنٹی ماجدہ نے وہیں سے آواز دی تھی۔

ارجمند بیگم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لو وہ آ گئی ہے...... اچھا میں چلتی ہوں۔'' وہ جلدی سے پیچھے ہٹیں اور چھت کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئیں۔

شانی بھی تیزی سے برساتی کے دروازے کی طرف آ گئی۔ اس کا سینہ بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ اس دوران میں آنٹی ماجدہ نے برساتی کی لائٹ جلا دی تھی۔ ان کے بکھرے بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر آئی ہیں۔

''شانی بیٹا! کیا کر رہی تھیں وہاں؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں آنٹی...... ذرا سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ شاید زیادہ کھا لیا ہے میں نے کہا کچھ دیر چھت پر گھوم لوں۔''

آنٹی ماجدہ نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے لگا تھا۔ شاید کسی سے باتیں کر رہی ہو۔''

''نہیں تو۔'' شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''دروازہ بھی بند تھا۔'' آنٹی نے دوسرا متوقع سوال داغا۔

''میں نے تو ویسے ہی بھیڑا تھا شاید خود کھٹکا لگ گیا ہے۔''

آنٹی ماجدہ کے چہرے پر الجھن تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی پوری تشفی نہیں ہوئی۔ بہرحال انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور یہ کہتی ہوئی اسے نیچے لے آئیں کہ بغیر بتائے اسے چھت پر نہیں آنا چاہئے تھا۔

اس رات شانی دیر تک جاگتی رہی۔ دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اسے رہ رہ کر کچھ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی نو بیاہتا افشاں نے فقط ایک بار یہاں قدم رکھا تھا اور وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے۔ اس دوران میں بھی وہ واضح طور پر بے چین سی رہی تھی۔ بعدازاں اس نے دو تین بار لاہور آنے کا فون کیا تھا مگر آئی ایک بار بھی نہیں تھی۔ پھر اسے آنٹی اور انکل کی وہ گھبراہٹ یاد آئی جو قاسم براس کی آمد کے ساتھ ہی ان دونوں پر طاری ہو جاتی تھی۔ اس گھبراہٹ میں ایک طرح کا احساسِ پشیمانی بھی جھلک دکھاتا تھا ..... کم از کم شانی کو تو یہی لگتا تھا۔ تب شانی کو وہ واقعہ یاد آیا جب انکل عثمانی اسے قاسم کے پاس اکیلا چھوڑ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ انہیں آنٹی نے فون کر کے بلایا تھا اور بتایا تھا کہ ان سے پرس چھین لیا گیا ہے۔ کیا وہ سب پلان تھا؟ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ اسے وہ سب باتیں یاد آئیں جو آنٹی اور انکل نے اس سے شادی کے حوالے سے کی تھیں۔ ان باتوں کو آنٹی ارجمند بیگم کی باتوں سے ملا کر دیکھا جاتا تو سب کچھ ایک ہی سلسلے میں پرویا ہوا لگتا تھا۔

بند دروازوں اور کھڑکیوں سے باہر سردی کی وہ طویل رات آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی، جیسے ایک ناگن پُر پیچ راستوں پر آگے بڑھ رہی ہو۔ کسی کو ڈسنے کے لئے۔ اس سے زندگی چھیننے کے لئے اور شانی تنہا تھی۔ یکسر اکیلی اور بے آسرا۔ ماں کی محفوظ آغوش، ایک مدت پہلے چھن چکی تھی۔ جوان غیرت مند بھائی کی محفوظ بانہوں کا حصار بھی ٹوٹ چکا تھا۔ سر پر سے ابا جی کا گھنا سایہ بھی سرک چکا تھا۔ چچا...... تایا...... شوہر...... اور وہ...... کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں تھا۔ دنیا کے اژدہوں سے بھرے ہوئے جنگل میں وہ تنہا تھی۔ اسے اپنے سارے بچھڑے ہوئے ٹوٹ کر یاد آئے۔ وہ رونے لگی۔ تکیے کو بھگونے لگی۔ کیا اس کے پیارے ابا جی کو پتا تھا کہ چند ہی ماہ بعد ایسا وقت آئے گا کہ ان کی لاڈلی مکمل طور پر غیروں کے رحم و کرم پر ہو گی۔ دشمنی کے سپ گندل کا زہریوں چڑھے گا کہ ہر گلی میں شیش ناگ پھنکاریں گے اور یہ ناگ ان کی بدنصیب بیٹی کو ہنکا ہنکا کر تحت الثریٰ میں پہنچا دیں گے۔

کچھ دیر تک رونے سے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوگیا۔ وہ مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صورتِ حال کی تصویر وہ نہ ہو جو اسے دکھائی دے رہی ہے۔ آنٹی ارجمند نے جو کچھ کہا، اس میں وزن محسوس ہوتا تھا مگر یہ وزن کسی تعصب کی کارفرمائی بھی تو ہوسکتا تھا۔ آنٹی ماجدہ اور ارجمند بیگم میں پرانی چپقلش کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ ارجمند بیگم نے جو کچھ کہا وہ اسی چپقلش کا شاخسانہ ہو۔ انکل اور آنٹی کے پاس رہتے ہوئے اسے اب تقریباً دو مہینے ہو چلے تھے۔ اس دوران میں اس نے ان میں ایسی کوئی معیوب چیز نہیں دیکھی تھی۔ جس سے کوئی گھمبیر نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ انکل اور آنٹی اسے گھر کے فرد جیسی اہمیت دے رہے تھے اور بڑی محبت سے اس کی ضروریات کا خیال رکھ رہے تھے۔

انہی خیالات میں الجھے الجھے رات آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلا دن معمول کے مطابق شروع ہوا اور معمول کے مطابق ختم ہوا۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہی۔ اس نے آنٹی کی ایک پرانی شلوار قمیص پہن لی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ کمبل اور چادریں وغیرہ دھونے بیٹھ گئی اور سہ پہر تک جتی رہی۔ لڑکا شاہد گاؤں گیا ہوا تھا۔ گھر کے دیگر چھوٹے بڑے کام بھی شانی خود ہی کرتی رہی۔ خود کو جوکھم میں ڈال کر اسے جسمانی مشقت تو اٹھانا پڑتی تھی تاہم ذہنی طور پر قدرے سکون رہتا تھا۔

شام تک وہ خاصی تھک چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آنٹی ماجدہ کچھ چپ چپ ہیں..... کچھ کھچی کھچی سی۔ یا شاید یہ اس کا وہم ہے۔ شانی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ رات کو آنٹی نے اسے ارجمند بیگم یعنی ''لمبوں کی امی'' سے باتیں کرتے واقعی دیکھا ہے یا نہیں... دروازہ تو بند تھا۔ کھڑکی پر جالی لگی ہوئی تھی اور وہ ایسے رخ پر تھی کہ اس میں سے چھت کا وہ حصہ بمشکل دیکھا جاسکتا تھا جہاں شانی، ارجمند بیگم کے پاس کھڑی تھی۔ بہرحال جس انداز سے آنٹی ماجدہ نے اسے آواز دی تھی اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ دیکھا ہے۔

شام کے وقت جب شانی نڈھال سی ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی، آنٹی کا موڈ قدرے بہتر محسوس ہوا۔ انہوں نے اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا۔ ''اتنا کام نہ کیا کرو ذرا سا منہ نکل آتا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں ہوتا، ہٹی کٹی تو ہوں۔''

''کوئی نہیں ہو ہٹی کٹی '' انہوں نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دو گرما گرم کپ چائے کے لے آئیں۔ ساتھ میں بسکٹ اور دہی

پکوڑیاں تھیں۔

چائے پینے کے بعد شانی ادھر ہی بیٹھی رہی۔ ٹی وی پر ایک کوئز پروگرام آرہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شانی کو اونگھ سی آگئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے لگائے غنودگی کی حالت میں رہی۔ آنکھ کھلی تو اجالا غائب تھا اور شام خاصی گہری ہوچکی تھی۔ کمرے اور اندرونی کمرے کی لائٹس روشن تھیں۔ ٹی وی بند پڑا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے اسے قاسم برلاس کی آواز آئی۔ وہ اپنی بھاری بھرکم بلند آواز میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''نہیں جی..... عثمانی صاحب اور بیگم دونوں نہیں ہیں۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔ کہیں فوتیدگی ہوگئی ہے ... پتا نہیں جی... ہاں جی۔ ہاں جی... دو ڈھائی گھنٹے تو لگ جائیں گے... ٹھیک ہے جی خدا حافظ۔''

اس نے فون بند کر دیا۔

شانی جھلا سی گئی۔ کہاں چلے گئے تھے وہ دونوں اور آج پھر یہ منحوس شخص گھر میں تھا..... اوہ گاڈ... شاہد بھی تو گیا ہوا تھا وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اسے اپنا سر ایک دم بھاری محسوس ہوا اور قدم ڈگمگاتے ہوئے سے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گرنے لگی ہے۔ وہ جلدی سے پھر بیٹھ گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے بڑی پریشانی کے عالم میں سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔

یہی وقت تھا جب دیوہیکل قاسم دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ حسب معمول سفید پتلون اور جرسی میں تھا۔ انرجی سیور کی روشنی میں اس کا نصف گنجا سر دمک رہا تھا۔

''کیا بات ہے نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے بے تکلفی سے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سر بھاری ہو رہا ہے۔'' شانی کی آواز بھی قدموں کی طرح ڈگمگا رہی تھی۔

''لگتا ہے کہ بہت تھکی ہوئی ہو تم۔ اگر دل چاہتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاؤ۔''

''نن..... نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آ..... آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

''ڈرائنگ روم میں بڑی سردی ہے۔'' قاسم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ہر دم بڑھتی ہوئی غنودگی کے باوجود شانی نے قاسم کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کرلیا۔

''انک..... انکل اور آنٹی کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ کسی مرگ پر چلے گئے ہیں دو تین گھنٹے کے لئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون آیا

تھا۔''

اچانک شانی کو احساس ہوا کہ وہ ایک نہایت خطرناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ اس کی یہ غیر معمولی غنودگی بے معنی نہیں تھی۔ اس نے شام پانچ بجے کے قریب یہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے آنٹی ماجدہ کے ساتھ چائے پی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد آنٹی اٹھ کر چلی گئی تھیں اور اسے اونگھ آ گئی تھی۔ یہ غیر معمولی اونگھ تھی اور اب اسی غنودگی بھری کیفیت میں شانی قاسم کی زبانی سن رہی تھی کہ آنٹی اور انکل دونوں گھر میں نہیں۔ ایک دم دو تین باتوں نے شانی کے ذہن پر یلغار کی۔ پہلی بات تو ذہن میں یہ آئی کہ آنٹی ماجدہ نے کل رات، اسے چھت پر ارجمند بیگم سے باتیں کرتا دیکھ لیا تھا اور یہ جو کچھ ہوا ہے اسی واقعے کا ردِعمل ہے۔ پھر ارجمند بیگم کی یہ بات اس کے ذہن میں آئی کہ پہلے عثانی اور ماجدہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کریں گے اور اگر نہیں نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کر لیں گے۔ تو کیا انگلیاں ٹیڑھی کی جا چکی تھیں؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی ایک سرد لہر اس کے جسم میں سرتاپا دوڑ گئی۔ تیسری بات ذہن میں یہ آئی کہ قاسم برلاس یہاں کیوں موجود ہے؟ اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اگر اس کی نیت خراب ہے تو وہ اس کی مزاحمت کیونکر کر سکتی ہے؟

مزاحمت کی بات اس کے ذہن میں آ تو گئی تھی مگر یہ بہت دور دراز کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں ہر دم نقاہت اُترتی جا رہی تھی اور آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ یہی لگتا تھا کہ پلکوں پر منوں بوجھ رکھا گیا ہے۔ گلے میں بھی خراش سی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ اس کے دھندلائے ہوئے ذہن نے اعلان کیا کہ اسے کوئی تیز اثر نشہ آور چیز دی گئی ہے۔

کیا اسے چیخنا چاہئے؟ اس نے سوچا۔ کیا اس کی آواز میں اتنا دم خم بچا ہے کہ وہ ان دیواروں سے گزر کر کسی مددگار کے کانوں تک پہنچ سکے..... ؟ کیا اسے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرنی چاہئے؟ کیا وہ دیواروں اور سامنے والے دروازے سے ٹکرائے بغیر بھاگ سکے گی؟

اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن نے پکار کر کہا۔ ''شانی وقت گزر رہا ہے، بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اگر اپنی آبرو اور جان بچانے کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے تو جلدی سے کر لے..... اس کے اندر کی باہمت چوہدرانی بیدار ہوئی..... رنگ والی کی باحوصلہ بیٹی..... وہ پوری طاقت جمع کر کے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ زمین جیسے اس کے ننگے پاؤں کے نیچے گول گول گھوم رہی تھی۔ بچپن میں اس کے ابا جی حویلی کے کچے صحن میں اسے بازوؤں سے

پکڑ کر گول گول گھماتے تھے اور پھر ہنستے ہنستے اسے زمین پر بٹھا دیتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ زمین ایک طرف سے اٹھتی چلی جا رہی ہے۔ آج بھی در و بام کی یہی کیفیت تھی۔ پہلے وہ ٹی وی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، پھر ایک کرسی سے ٹکرائی۔ شاید وہ اوندھے منہ گرتی مگر گرانڈیل قاسم کی مضبوط بانہوں نے اسے سہارا دیا۔ اس کے لمبے ریشمی بال کھل گئے اور چہرے پر جھولنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔'' قاسم برلاس نے کہا اور اسے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ قرب و جوار شانی کی نگاہوں میں خلط ملط تھے۔ شانی کو لگا جیسے قاسم اسے برآمدے کی طرف لے جا رہا ہے۔ مگر وہ اسے ایک اندرونی سٹور میں لے آیا۔ یہ تقریباً چھ ضرب دس فٹ کا لمبوترا اسٹور تھا۔ ایک طرف لوہے کی الماری تھی۔ ایک طرف جستی پیٹی تھی۔ اٹیچی کیس، بوسیدہ فوم کے گدے، کمبل، گھریلو استعمال کے اوزار، گتے کے خالی ڈبے، پتا نہیں کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا۔ ان سب اشیاء کے درمیان تقریباً تین فٹ ضرب آٹھ فٹ کی جگہ خالی تھی۔ یہاں قالین کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔

اس تابوت نما مختصر سٹور میں پہنچ کر شانی کا دم گھٹنے لگا۔ قاسم نے اسے سہارا دیتے ہوئے قالین پر بٹھایا۔ شانی کی پشت دیوار سے ٹک گئی۔ غنودگی کا ایک جھونکا سا آیا اور اس مختصر جھونکے کے بعد شانی کو پتا چلا کہ اس سٹور کا دروازہ اندر سے بند کیا جا چکا ہے۔ اب وہ ایک پنجرے کی قیدی تھی۔ چاروں طرف موٹی دیواریں تھیں اور بند دروازے تھے۔ یہ سٹور گھر کے بیچوں و بیچ واقع تھا۔

''مجھے چھوڑ دو..... مجھے ہاتھ مت لگانا..... میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ مت لگانا۔'' شانی کراہی۔ اسے اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

اس کی دھندلائی ہوئی نگاہیں دیکھ رہی تھیں، قاسم برلاس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے بے باکی سے شانی کے رخساروں کو سہلایا۔ اس کے بالوں کو اس کے چہرے سے پیچھے ہٹایا اور اس کے گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی..... ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے وہ سب کا سب تمہارا ہوگا..... تمہارے قدموں میں ہوگا۔ پلیز! میرا دل مت توڑنا، مجھے اپنا بنا لو۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔''

''خدا کے لئے۔ مجھ سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔'' شانی نے سٹور کے ایک گوشے میں سمٹنے کی کوشش کی۔

"شانی! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم کو اپنا بنانا ہی ہے۔ کسی بھی طریقے سے کسی بھی طرح..... میں دعوے سے کہتا ہوں شانی! میرے جیسا چاہنے والا تمہیں کہیں اور نہیں ملے گا..... مجھے تمہارے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہے شانی۔ تم جو بھی تھیں، جہاں بھی تھیں۔ میں اس بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں، صرف تمہیں۔"

شانی نے اپنے سرد پاؤں سے پُرتپش قاسم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ اپنے مخصوص حاکمانہ لہجے میں دہاڑ پڑے گا، مگر جب وہ بولا تو اس کی آواز میں نرمی برقرار تھی۔

"شانی۔ میں تمہیں دنیا کا ہر آرام دوں گا۔ تمہیں پتا نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کیا کیا سوچ رکھا ہے۔ مجھے بس تمہاری ہاں چاہئے۔ پھر دیکھنا میں تمہارے لئے دنیا کو کس طرح بدلتا ہوں۔" اس کے بھاری بھرکم ہاتھ کی گرفت شانی کے نازک گھٹنے پر قائم تھی اور مضبوط ہو رہی تھی۔

شانی نے یہ گرفت ختم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "مجھے یہاں سے نکالو..... میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"میں خود بھی تمہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتا۔ صرف اس لئے لایا ہوں کہ تم میری بات پوری توجہ سے سن سکو۔"

"میں سن رہی ہوں   سن رہی ہوں۔"

اس نے اپنی جرسی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ فل اسکیپ کے صفحے سے کچھ بڑا تھا۔ شانی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کاغذ کی پیشانی پر لکھا تھا۔ "فارم نکاح نامہ!"

ہاں یہ ایک نکاح نامہ تھا۔ یہ تقریباً سارے کا سارا پُر کیا جا چکا تھا۔ گواہوں کے نام اور دستخط موجود تھے۔ دولہا دلہن کی ازدواجی حیثیت، حق مہر کی رقم اور نکاح خواہ کے کوائف..... سارے اندراجات مقررہ جگہوں پر موجود تھے۔ شانی نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ جگہ خالی تھی جہاں دلہن کے دستخط کئے جانے تھے..... نکاح نامے میں دلہن کے ولی کے طور پر ریاض عثمانی کا نام پتا لکھا تھا۔

قاسم برلاس نے نکاح نامہ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"پلیز شانی! اس پر دستخط کر دو۔ تمہاری اور میری ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔"

شانی نے آنکھیں پھاڑ کر اس جعلی کاغذ کو دیکھا۔ پھر نہ جانے ایک دم اتنی ہمت اس میں

کہاں سے آئی۔ اس نے کاغذ کے ٹکڑے کر دیئے۔ قاسم اسے روکتا ہی رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی شانی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر آہنی الماری سے ٹکرائی۔ اس ٹکر سے سٹور کے مختصر خلا میں زبردست شور ہوا۔ اس مرتبہ قاسم برلاس نے شانی کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے سرد نگاہوں سے شانی کو الماری سے ٹکراتے اور پھر پہلو کے بل قالین پر گرتے دیکھا۔

شانی کا سر بُری طرح گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دیکھ رہی تھی کہ قاسم برلاس کے تیور بگڑتے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت نمودار ہو گئی تھی۔ وہ دیوہیکل تھا اور سیدھا کھڑا تھا۔ قالین پر گری ہوئی شانی کو وہ کچھ اور بھی بلند و بالا نظر آ رہا تھا۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی جرسی اور قمیص اتار دی۔ اس کا تھل تھل کرتا چربیلا جسم کریہہ منظر پیش کرنے لگا۔

وہ گھٹنوں کے بل شانی کے پہلو میں بیٹھ گیا اور بڑے حریصانہ انداز میں اس کے بال سہلانے لگا۔ "...... میری اور اپنی عمر کے فرق پر نہ جاؤ میری رانی!" وہ چبا چبا کر بولا۔ "میں آج کل کے ممی ڈیڈی لونڈوں سے کہیں زیادہ جوان اور تندرست ہوں۔ تمہیں ایک بھرپور زندگی دے سکتا ہوں۔" اس کے منہ سے بو آ رہی تھی۔

وہ اس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گرم سرگوشیاں شانی کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ مگر یوں لگتا تھا کہ آواز دور کسی کنویں کی تہہ سے آ رہی ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تیرے پیار کی قسم تجھ سے دور رہنا مشکل ہے۔ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، بے بس ہوں۔"

قاسم کے ہاتھ شانی کے جسم پر تھے۔ پھر یہ ہاتھ ایک کرخت عجلت کے ساتھ اسے بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ شانی مزاحمت کرنا چاہتی تھی مگر مزاحمت کے لئے جس ہوش مند توانائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شانی میں کہیں نہیں تھی۔ وہ اپنے سینے میں طاقت جمع کر کے چلائی۔ اس نے قاسم برلاس کے بھوکے ہاتھوں کو اپنے نیم عریاں جسم سے دور ہٹانا چاہا مگر یہ دونوں فعل بے حد لاغر و کمزور تھے۔

یہی وقت تھا جب شانی کی نگاہ ایک ڈرل مشین پر پڑی۔ یہ عام استعمال ہونے والی ایک درمیانے سائز کی ڈرل تھی اور جستی پٹی کے نچلے خلا سے اس کا نیلگوں دستہ نظر آ رہا تھا۔ شانی کی نگاہیں اس مشین پر جم سی گئیں۔ ڈرل مشین دیواروں میں سوراخ کرتی ہے۔ اگر شانی کے بس میں ہوتا تو وہ اس سے قاسم کے سر میں سوراخ کر دیتی۔ فی الوقت وہ اس مشین کو صرف ایک وزنی شے کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ شانی نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

قاسم برلاس اس کے اوپر تقریباً گرا ہوا تھا۔ شانی کو اس کی گنجی کھوپڑی اور تھل تھل کرتی چربیلی پشت نظر آ رہی تھی۔

اس کے ہاتھ ڈرل مشین کی طرف بڑھے۔ اپنے جسم سے توانائی کی آخری رمق نچوڑتے ہوئے شانی نے یہ ڈرل دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور قوت سے قاسم کے سر پر دے ماری۔ شانی نے ہیجانی انداز میں ضرب لگائی تھی۔ کچھ مشین کا اپنا وزن بھی تھا۔ کھٹاک کی آواز پیدا ہوئی اور قاسم تیورا کر پیچھے کی طرف گرا...... شانی نے سیدھے کھڑے ہو کر ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی، پھر ایک اور اس کے چہرے پر۔ قاسم کے منہ سے عجیب ڈکراتی ہوئی آواز نکلی۔ چند لمحوں کے اندر اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس لہو کے اندر سے اس کی سفید سفید...... بند ہوتی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو رہا تھا...... یا شاید مر رہا تھا۔ شانی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

اس نے ڈرل مشین ایک طرف پھینکی اور سٹور کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ وہ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نے چپل پہنی، اس کے جسم پر ابھی تک آنٹی ماجدہ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے تھے۔ اس نے بستر کی ایک چادر گھسیٹ کر اپنے پھٹے ہوئے لباس کو ڈھانپ لیا۔ پھر وہ تیر کی طرح برآمدے کی طرف آئی۔ وہ بُری طرح ڈگمگا رہی تھی اور دروازوں سے ٹکرا رہی تھی۔ برآمدے میں جالی دار گرل تھی، اسی گرل میں ایک دروازہ تھا۔ جس میں سے گزر کر صحن میں پہنچا جاتا تھا۔ شانی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اس پر انکشاف ہوا کہ یہ دروازہ لاک ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح چابی ڈھونڈنے لگی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں اور قرب و جوار نگاہوں میں چکرا رہے تھے۔ گلے میں شدید جلن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ حلق میں خنجر اُترے ہوئے ہیں۔ چابی نہیں مل رہی تھی...... شاید وہ قاسم کے لباس میں ہی تھی لیکن وہ اب واپس اس منحوس سٹور میں نہیں جانا چاہتی تھی اور نہ اس میں اتنی ہمت تھی کہ پھر سے خونچکاں قاسم برلاس کو دیکھ سکے۔ اچانک قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے چابی مل گئی یہ شیشے کی ایک تپائی پر شراب کی نصف بوتل کے نیچے رکھی تھی۔ قریب ہی شیشے کا ایک گلاس الٹا پڑا تھا۔ گلاس کے ساتھ ہی قاسم برلاس کے پسندیدہ سگریٹوں کا پیکٹ اور اس کا لائٹر پڑا تھا۔ ایک پلیٹ میں تلی ہوئی نمکین مونگ پھلی کی باقیات تھیں۔

شانی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ چائے پینے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی بیٹھی کتنی دیر تک قرب و جوار سے بے خبر رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ غالباً قاسم تب آدھا پون گھنٹے سے یہاں موجود تھا۔ اسی دوران میں اس نے یہاں ان چیزوں سے شغل

کیا تھا۔ شانی کو اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اور چڑھی ہوئی آنکھیں یاد آئیں...... یقیناً وہ سب اسی سیالِ آتش کا کرشمہ تھا جو اس نے یہاں بیٹھ کر اپنے اندر انڈیلی تھی۔

شانی نے بوتل کے نیچے سے جالی دار دروازے کی چابی نکالی اور لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اب مختصر صحن اس کے سامنے تھا۔ اس صحن کو تقریباً دس فٹ اونچی چار دیواری نے گھیر رکھا تھا، شانی جلد از جلد اس خطرناک چار دیواری سے نکل جانا چاہتی تھی...... وہ بیرونی دروازے پر پہنچی اور یہ جان کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ دروازہ بھی لاک ہے۔ قاسم ہر طرح کی پیش بندی کر کے ہی اسے سٹور میں لے گیا تھا۔

"یا خدا میں کیا کروں۔" شانی نے خود کلامی کی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے تھے۔ منہ بھی بالکل خشک ہو رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر دیوانوں کی طرح بیرونی دروازے کی چابی ڈھونڈنے لگی۔ چابی کہیں نہیں تھی۔ اس نے بے قرار ہو کر بیرونی دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بس جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دروازہ پیٹنے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ "کوئی ہے...... کوئی ہے۔"

اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی۔ وہ پوری طاقت سے بول رہی تھی مگر آواز شاید چند فٹ تک ہی جا رہی تھی۔ درحقیقت سٹور روم میں ہونے والی زبردست کھینچا تانی کے دور میں وہ مسلسل چلاتی رہی تھی شاید کچھ اثر نشہ آور دوا کا بھی تھا۔ اس کا گلا بُری طرح بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ پیٹنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ اس کی آواز باہر تک پہنچ سکے۔ اس کوشش کا الٹا اثر ہوا۔ رہی سہی آواز بھی ختم ہوتی محسوس ہوئی۔

یہی وقت تھا جب اچانک اس پر ایک خوفناک انکشاف ہوا، گھر کے اندرونی حصے میں سٹور روم کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔ وہاں حرکت ہو رہی تھی۔ قاسم برلاس کے سوا وہاں کون حرکت کر سکتا تھا۔ شانی کو اپنا خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ اس نے بوکھلا کر برآمدے کی طرف دیکھا تب اسے قاسم برلاس کی ایک مختصر جھلک دکھائی دی۔ وہ دیو کا دیو ڈگمگاتا ہوا کامن روم سے ٹی وی لاؤنج کی طرف آ رہا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ برآمدے میں پہنچنے والا تھا۔ شانی کراہتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ خود کو قاسم برلاس کی نگاہوں سے بچانے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر چلی جاتی۔ وہ خود کو بالائی منزل کے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

آوازوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ زخمی قاسم برلاس بڑے طیش کے عالم میں اسے

نچلی منزل پر ڈھونڈ رہا ہے۔ دروازے بھی دھڑا دھڑ بج رہے تھے۔ گالیاں بکنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ پھر شانی نے محسوس کیا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کی طرف آرہا ہے۔

شانی آخری دم تک مزاحمت کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ''نشے سے متاثر اعصاب'' ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے ٹی وی لاؤنج میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈ رہی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ اوپر کا پورشن تقریباً بے آباد تھا۔ عثمانی کی بیٹیوں کی شادی کے بعد وہ کمرے تو بالکل خالی پڑے تھے۔ ٹی وی لاؤنج کا بھی یہی حال تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد قاسم کی غصیلی آواز ٹی وی لاؤنج کے سامنے سنائی دینے لگی۔ ''کہاں ہے تُو... باہر نکل..... میں کہتا ہوں باہر نکل، نہیں تو پورے گھر کو آگ لگا دوں گا۔'' پھر وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ اس کی آواز سے عیاں تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ گالیوں کا انتخاب اس کے اندر کی بھوک اور ہوس کو ظاہر کرتا تھا۔

شانی اپنی جگہ سکڑی سمٹی کھڑی رہی۔ اس کا دل جیسے سینے میں نہیں پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ ہی لمحے بعد ٹی وی لاؤنج کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا... بے پناہ وحشت کے عالم میں قاسم دروازے کو دھکے دے رہا تھا۔ شانی نے سراسیمہ نظروں سے دروازے کی اکلوتی چٹخنی کو دیکھا۔ یہ چٹخنی گرانڈیل قاسم کی مزاحمت زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ شانی نے ٹی وی لاؤنج چھوڑا اور پچھلے دروازے سے نکلتی ہوئی بالائی پورشن کے کچن میں آگئی۔ یہ کچن بھی نہ جانے کب سے بے آباد پڑا تھا۔ یہاں ایک خستہ حال اے سی..... ایئر کولر اور پیڈسٹل فین وغیرہ رکھے تھے۔ شانی اس کچن میں گھس گئی اور یہاں بھی دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لی۔ یہاں لائٹ وغیرہ نہیں تھی۔

کچن کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہاں بھی آہنی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ قاسم برلاس نے اب ٹی وی لاؤنج کا دروازہ دھڑ دھڑانا بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ کسی اور طریقے سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید وہ اوپر چھت پر دیکھنے چلا گیا تھا پڑوس کا قریب ترین مکان بھی تقریباً سو فٹ کی دوری پر تھا، شانی کی آواز تو گلے سے نکل نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یہ کر سکتی تھی کہ کسی لکڑی لوہے کو کھڑکی سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی اور پڑوسیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ تاہم اس کوشش میں نقصان کا اندیشہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ دھند آلود سردی میں لوگ بند کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ کھڑکی کی آواز پڑوسیوں تک تو نہ پہنچتی مگر قاسم برلاس تک پہنچ جاتی بلکہ یقینی بات تھی کہ یہ آواز اس تک پہنچے گی۔ اسے یقین

ہو جائے گا کہ شانی کچن کے آس پاس موجود ہے۔

وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھی جب اس کی نگاہ نیچے سڑک پر پڑی۔ اس نے دیکھا ایک موٹر رکشہ عثمانی کی بیٹی افشاں کو گیٹ پر اتارنے کے بعد گلی کے موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا ہاں وہ افشاں ہی تھی۔ دبلی پتلی، سمارٹ سی، اس کے ہاتھوں میں تین چار وزنی شاپر بیگ جھول رہے تھے، کندھے پر اس نے شولڈر بیگ سنبھالا ہوا تھا۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو شاپر بیگ نیچے رکھے اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ نیچے برآمدے میں گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

سیڑھیوں پر قاسم برلاس کے مخمور لڑکھڑاتے قدموں کی آواز ابھری۔ وہ نیچے جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز اسے نیچے لے جا رہی تھی۔

''اوہ گاڈ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' شانی نے بوجھل ذہن کے ساتھ سوچا۔ وہ کچن سے نکلی اور دو دروازوں میں سے گزرتی ہوئی پھر ٹی وی لاؤنج میں آگئی..... یہاں ایک کھڑکی سے وہ مین گیٹ کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ اسے قاسم برلاس کی جھلک نظر آئی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ اور کندھے لہولہان تھے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی چیز تھی... یہ جان کر شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یہ بڑے سائز کی تیز دھار چھری تھی۔ گوشت کاٹنے والی یہ چھری قاسم نے یقیناً نچلی منزل کے کچن سے لی تھی۔ اس چھری اور اپنے لہولہان سراپا کے ساتھ وہ بے حد بھیانک نظر آرہا تھا۔ گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

قاسم کا انداز بتا رہا تھا کہ شانی کی طرح اس نے بھی بالائی منزل سے افشاں کی جھلک دیکھ لی ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے لباس میں سے چابی نکال لی تھی۔ چھوٹا گیٹ کھولنے کے ساتھ ہی وہ ایک طرف ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔

زرق برق کپڑوں والی نوبیاہتا افشاں نے دروازہ کھولا اور بے تکلفی سے اندر آگئی۔ شاپرز اس کے ہاتھوں میں تھے۔ دروازہ کھولنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے تعجب سے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ملازم لڑکے شاہد کو آواز دیتے ہوئے بولی۔ ''شاہدی! بڑے شرارتی ہو تم...''

یقیناً اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ ایسا شاہد نے کیا ہوگا۔ شانی کا دل چاہا، وہ پکار پکار کر افشاں کو اطلاع دے کہ وہ ایک گھمبیر خطرے کی زد میں آرہی ہے یہاں ''ان'' میں سے کوئی نہیں ہے جن سے ملنے وہ آئی ہے۔ یہاں تو بس ''ان'' کا بچھایا ہوا وہ جال ہے جو نظر

نہیں آ رہا لیکن جس کی پکڑ بے حد خوفناک ہے۔

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا حلق ایک بنجر صحرا کی طرح تھا۔ اس کا نطق اس سے جدا تھا۔ افشاں کی نوخیز آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''امی کہاں ہیں آپ..... ابو..... ابو۔'' وہ برآمدے کے سامنے صحن میں چکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا وزن ہلکا کرنے کے لئے شاپر غالباً برآمدے میں بچھے تخت پر رکھے اور اندرونی کمروں کی طرف بڑھی۔ اب وہ شانی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ شانی کو صرف عفریت نما قاسم برلاس نظر آ رہا تھا۔ وہ گیٹ پھر سے لاک کرنے کے بعد برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دو لمحے بعد وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شانی سکتے میں کھڑی تھی۔ چند سیکنڈ گزرے اور پھر وہی کچھ ہوا جو بدترین اندیشے کی صورت، شانی کے ذہن میں موجود تھا۔ ایک گھٹی گھٹی دردناک چیخ کسی اندرونی کمرے میں سنائی دی، یقیناً یہ افشاں کی چیخ تھی۔ اس ادھوری چیخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے منہ کو فوراً ہی مضبوطی سے بند کر دیا گیا ہے۔

''اوہ..... خدایا۔'' شانی نے اپنا گھومتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ عثمانی اور ماجدہ کے بچھائے ہوئے جال میں ان کی بیٹی آ پھنسی تھی..... وہی مکافات کی پرانی روایت۔ افشاں کو اتوار کے روز امی ابو سے ملنے آنا تھا لیکن بوجوہ وہ نہیں آ سکی تھی۔ آج غالباً وہ انہیں سرپرائز دینے اچانک ہی آ دھمکی تھی۔

شانی نے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔ اس کے اندر کی آواز تھی کہ جو کچھ بھی ہے، اسے افشاں کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے..... لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے؟ شانی کے اعصاب اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں کی حرکات بے قاعدہ تھیں اور گلا تو جیسے سوکھ کر لکڑی ہو چکا تھا۔ گلے کی اس صورتِ حال کے ڈانڈے یقیناً اس نشہ آور شے سے ملتے تھے جو اسے دہی پکوڑیوں یا چائے میں ملا کر دی گئی تھی۔

شانی کے اندازے کے مطابق اب مخمور قاسم برلاس عثمانی کی بیٹی کو وہیں لے جا چکا تھا جہاں کچھ دیر پہلے شانی موجود تھی۔ وہی قبر نما سٹور جس کے چاروں طرف کمرے تھے اور بند دروازے تھے۔ شانی کے لئے موقع تھا کہ وہ کسی طرح شور مچاتی اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایک اور کوشش کرتی مگر یہاں جوش کے ساتھ تھوڑے سے ہوش کی ضرورت بھی تھی۔ اپنے چکرائے ہوئے غبار آلود ذہن کے باوجود اتنی بات شانی کو سمجھ میں آ رہی تھی کہ اگر اس نے پڑوسیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی اور کسی وجہ سے وہ متوجہ نہ ہو سکے تو صورتحال مزید خراب ہو جائے گی۔ قاسم برلاس کو یقین ہو جائے گا کہ شانی بالائی منزل

پر موجود ہے۔ وہ افشاں کو سٹور میں لاک کر کے، یا کسی اور طرح سے بے بس کر کے پھر سے بالائی منزل کا رخ کر سکتا تھا۔ بہتر آپشن تو یہ تھا کہ وہ پہلے کسی طور اس گھر سے نکلتی۔ پھر مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی لیکن نکلا کیسے جاتا۔ گھر کا نقشہ کچھ ایسا تھا کہ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ محفوظ طریقہ بس ایک یہ تھا۔ وہ صحن میں پہنچتی اور کسی طرح بیرونی دروازہ کھول کر باہر سڑک پر پہنچ جاتی۔

وہ نڈھال سی ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ آس پڑوس کے مکان کچھ فاصلے پر تھے۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے اور شاید مکینوں کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کی آنکھیں اور کان بھی بند تھے۔ یہ بے حسی اور بے خبری بھی ہمارے موجودہ رہن سہن کی دین ہے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے لیکن پڑوسی ایک دوسرے کے احوال سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ شام ہوتے ہی کھڑکیاں دروازے بند کر کے ٹی وی لاؤنج آباد کر لئے جاتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی ناپید ہو چکی ہے جو اہل محلہ کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مسائل اور حالات سے آگاہ ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت کرتے تھے۔ شانی کو لگا کہ وہ ایک بند دروازے والے گونگے بہرے نگر میں ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے حال میں مگن ہے۔ جان و مال پر ڈاکے پڑتے رہیں، شیطان ناچتا رہے، درندے گوشت نوچتے رہیں مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بس اس کی ''مصیبت'' ہوتی ہے جس پر مصیبت پڑتی ہے۔ ہر کوئی الگ الگ اپنی ''قیامتِ صغریٰ'' کا سامنا کرتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک بدحواس سی بیٹھی رہی۔ پھر لڑکھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تصور کی نگاہ سے نرم و نازک افشاں کو شرابی قاسم کے شکنجے میں دیکھ رہی تھی۔ ایک تیز دھار چھری افشاں کی گردن پر تھی اور قاسم کسی عفریت کی طرح اس پر جھپٹ رہا تھا۔

''نہیں میں خاموش نہیں رہ سکتی..... مجھے کچھ کرنا چاہئے..... کچھ کرنا چاہئے۔'' اس نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا۔

وہ سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اُتری اور برآمدے کی طرف بڑھی۔ کامن روم میں ایک کرسی اوندھی پڑی تھی۔ پاس ہی سُرخ رنگ کا لیڈیز سینڈل کا ایک پاؤں نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ اس کھینچا تانی کی نشانیاں تھیں جو قاسم برلاس اور افشاں کے درمیان سٹور کی طرف جاتے ہوئے ہوئی تھیں۔

شانی کی نگاہیں فون سیٹ کو تلاش کرنے لگیں۔ اس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید فون سیٹ کسی طور اس کی مدد کر سکے۔ فون سیٹ اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ شانی

قالین پر نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھی تاہم فوراً ہی امید کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ فون سیٹ کا تار توڑ کر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ قاسم، شانی کو سٹور روم کی طرف لے جانے سے پہلے یہ کارروائی کر چکا تھا۔

اچانک کچھ دبی دبی آوازوں نے شانی کا سینہ شق کر دیا۔ یہ روتی کراہتی آوازیں بند سٹور کی طرف سے آ رہی تھیں۔

وہ جو ہوس کے نرغے میں تھی، سسک رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔ شانی کو وہ بات پھر یاد آ گئی۔ .. کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو بہت کچھ پگھلا دیتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت جب مجبوری کے شکنجے میں ہو تو ہوس کار مرد کو یہ آنسو پگھلانے کے بجائے اور بھی پتھر کر دیتے ہیں۔

بند سٹور سے ابھرنے والی دبی دبی آوازیں گواہ تھیں کہ افشاں بدترین صورتِ حال سے گزر رہی ہے۔ دوسری طرف شانی لاچاری کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ایک دم ہی کوئی بھولا بسرا یاد آ گیا تھا۔ ...وہ جو اپنا تھا، جس کا چوڑا سینہ ایک دیوار کی طرح شانی کی حفاظت کرتا تھا.... وہ جو اس کے ایک اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا اور شانی کو ان حالات میں دیکھتا تو کیا کرتا؟ شاید وہ شعلہ جوالہ بن جاتا اور اپنے سامنے آنے والے......قاسم جیسے ہر شخص کو جلا کر راکھ کر دیتا ہاں ایسا ہی تھا رستم.... شانی نے اس کے غیظ و غضب کی ایک مختصر جھلک راولپنڈی میں پولیس موبائل کے اندر دیکھی تھی . لیکن وہ یہاں نہیں تھا.... پتا نہیں کہاں تھا؟ کس نگر میں تھا؟ کس بستی کے کس کوچے میں تھا؟ شانی نے اسے خود کھویا تھا۔ جان بوجھ کر گنوایا تھا۔

یہ خیالات چار پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ وہ ایک بار پھر اٹھی۔ وہ یہاں نہیں رک سکتی تھی۔ یہاں بند سٹور سے ابھرنے والی دبی آوازیں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھیں۔ وہ پلٹی اور ڈگمگاتی ہوئی پھر صحن کی طرف بڑھی۔ برآمدے میں اسے شاپر بیگ تخت پر ڈھیر نظر آئے۔ جو کچھ دیر پہلے افشاں بڑے چاؤ سے لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اب یہ بیگ بھی حسرت کی تصویر نظر آ رہے تھے۔ وہ یہ شاپنگ غالباً اسلام آباد سے ہی کر کے لائی تھی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ شاید اسے بعد میں لاہور آنا تھا یا شاید وہ اسے مین گیٹ پر ڈراپ کر کے موٹر رکشہ میں کہیں آگے نکل گیا تھا۔ اسے کچھ دیر بعد واپس آنا تھا یا شاید یہ کوئی اور بات تھی۔ بہرحال وہ اس کے ساتھ نہیں تھا

اور اس کا ساتھ نہ ہونا افشاں کے لئے ایک بہت بڑی آفت کا سبب بن چکا تھا۔

شانی ایک بار پھر مین گیٹ کی طرف آئی۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہ اندیشہ بھی اس کے ذہن میں ہر گھڑی گھمبیر ہو رہا تھا کہ کہیں وہ ہوش حواس کھو کر گر نہ جائے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک چمکتی شے پر پڑی اور اس کی بند ہوتی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ یہ چمکتی چیز چھوٹے گیٹ کی چابی تھی جو تالے کے اندر ہی لگی ہوئی تھی. . شراب کے اندھے نشے نے کام دکھایا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے افشاں کے اندر آ جانے کے بعد قاسم برلاس نے دروازہ پھر مقفل کر دیا تھا۔ مقفل کرنے کے بعد وہ چابی اندر ہی چھوڑ گیا تھا۔

شانی نے لپک کر دروازہ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئی۔ اس کے جسم کے گرد بستر کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ بال منتشر ہو رہے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے نیم تاریک سڑک کے وسط میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر قریب ترین مکان کی طرف بڑھی۔ اس سہ منزلہ مکان کی درمیانی منزل پر روشنی ہو رہی تھی۔ شانی کی معلومات کے مطابق یہاں کوئی صحافی باجوہ صاحب رہتے تھے۔ شانی نے کال بیل کا بٹن دبایا اور وقفے وقفے سے دباتی چلی گئی۔ ساتھ ساتھ وہ دستک بھی دے رہی تھی۔ اس کا حلق بند تھا۔ اس کے باوجود وہ پکارنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

دو تین منٹ کے جاں گسل انتظار کے بعد بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلنے کی آواز آئی۔ ایک سُست اور بیزار نسوانی آواز نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

شانی نے پکار کر کہا۔ ''نیچے آئیں. ...بات سنیں۔'' مگر اس کی آواز اتنی پست تھی کہ بس اس کے ارد گرد ہی گونج کر رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس مرتبہ مزید بیزاری اور کاہلی سے پوچھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑبڑانے کی آواز آئی اور کھڑکی کھٹاک سے بند کر دی گئی۔ شانی نے تقریباً ایک منٹ تک مزید کال بیل بجائی اور دروازہ پیٹا......اندر سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ اس دوران میں شانی کی نگاہ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر پڑی......خالی سڑک پر گاڑی درمیانی رفتار سے شانی کی سمت آ رہی تھی۔ شانی نے باجوہ صاحب کا گیٹ چھوڑا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔ گاڑی روکنے کے لئے وہ سڑک کے تقریباً وسط میں کھڑی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ گاڑی اس سے بچتی ہوئی آگے نکل گئی. . .اور پھر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو گئی۔

''یارب ....میری مدد کر۔'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''میں کیا کروں؟

کہاں جاؤں؟'' اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

اس نے کئی مرتبہ اخباروں میں پڑھا تھا اور ابا جی کی زبانی سنا تھا کہ شہر جتنے بڑے ہوتے ہیں اتنے ہی بے حس ہوتے ہیں۔ حادثوں کے بعد سڑکوں پر زخمی تڑپا کرتے ہیں۔ بھرے پُرے چوراہوں پر لوگ اغوا ہوتے ہیں ...... سرِ عام کسی غریب سڑک چھاپ کو کوئی ''بچارو سوار'' ننگا کر کے کھڑا کر دیتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں اور سننے والے کان سنتے رہتے ہیں۔ کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ کوئی مدد نہیں کرتا۔ اسے ان باتوں پر پوری طرح یقین نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج سب کچھ اس کے اپنے اوپر بیت رہا تھا۔ اور وہ دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے آنٹی ارجمند کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ ان کا گھر عقبی جانب سے عثمانی کے گھر سے جڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بغلی گلی کی طرف بڑھی۔ یہ گلی اسے یقیناً عثمانی کے گھر کے عقب تک پہنچا سکتی تھی۔ یہ تیس فٹ چوڑی سڑک تھی۔ کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹس بھی موجود تھیں۔ گہری غنودگی کے سبب شانی کو یہ دودھیا لائٹس لہراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس سڑک پر اچھا خاصا فاصلہ طے کر کے وہ بائیں طرف مڑی۔ یہاں ایک سٹریٹ لائٹ کے نیچے اسے چند لڑکے کھڑے نظر آئے۔ ایک جوان سال شخص موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا۔

شانی ان کے قریب پہنچی۔ وہ بولی تو اس کے حلق سے بس ''گھیس گھیس'' کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ ان لڑکوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ آئیں اور اس کی مدد کریں

شانی کے الفاظ کسی نے نہیں سنے ... یا شاید کسی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ چاروں لڑکے بس اس کے حلیے پر غور کر رہے تھے اور حلیہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ شانی کو اپنے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ یقیناً قاسم سے ہونے والی دھینگا مشتی میں اس کا ہونٹ پھٹا تھا یا منہ اندر سے زخمی ہوا تھا۔ اس کے بال منتشر تھے اور جسم پر بستر کی چادر تھی۔

پھر جس انداز سے وہ مدد کے لئے کہہ رہی تھی وہ بھی چونکانے والا تھا۔

جب اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے جھنجھلا کر ایک لڑکے کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ساتھ ساتھ عثمانی کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔

لڑکا یوں پیچھے ہٹا جیسے وہ اسے اغوا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

موٹر سائیکل پر بیٹھے جواں سال شخص کی تفتیشی نگاہیں شانی کو سرتاپا گھور رہی تھیں۔

''کون ہیں آپ ... کس گھر سے آئی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب دینے کی کوشش کرتی، اس کی نگاہ دور نیلے رنگ کی ایک جلتی بجھتی روشنی پر پڑی۔ یہ روشنی کوئی نصف فرلانگ دور سڑک کے موڑ پر نمودار ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی ... شانی کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ پولیس کار کی روشنی تھی ... کیا وہ پولیس کا سامنا کر سکتی ہے؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا ... نہیں ... وہ نہیں کر سکتی تھی۔ پولیس کے سامنے آنے کا مطلب تھا۔ وہ سب کے سامنے آ جاتی۔ رنگ والی کے سامنے ... نارپور کے سامنے ... رستم کے سامنے اور سب سے بڑھ کر اس پھنکارتی ہوئی کہنہ دشمنی کے سامنے جو درجنوں سروں والے زہریلے اژدھے کی طرح اس کے اردگرد موجود تھی۔ نارپور کا مہر جی اپنی حویلی میں جل کر مر چکا تھا مگر اس کے وارث تو موجود تھے۔ مہر کے وہ خونی رشتے دار ... جو دشمنیاں پالنے کی ''خو'' اپنے لہو میں رکھتے تھے اور دشمنیاں چکانے کے ہنر میں یکتا تھے۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں آیا اور گزر گیا۔ اس کی نگاہ جلتی بجھتی نیلی روشنی پر تھی۔ اس نے کم فہم لڑکوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور چند قدم چل کر ایک بغلی گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایک سرد کہرا در و دیوار کو ڈھانپ رہا تھا۔ اب شانی جلد از جلد دور نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کے لڑکھڑاتے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ایک کار ریورس گیئر میں ایک گیراج سے برآمد ہو رہی تھی۔ وہ اس سے بچتی ہوئی ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ اس کا دل سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

کچھ آگے جا کر اسے یوں لگا کہ دو افراد اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ کون تھے وہ؟ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے لڑکے؟ پولیس والے؟ یا کوئی اور؟ یا پھر شاید یہ اس کا وہم بھی تھا۔ بہرحال اس کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔ اچانک اسے ایک رکشہ نظر آیا۔ رکشہ سٹارٹ تھا۔ پچھلی نشست خالی دکھائی دے رہی تھی۔ شانی کے پاس سوچ بچار کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ سیدھی پچھلی نشست پر جا بیٹھی۔

رکشہ نے ایک جھٹکا لگایا اور حرکت میں آ گیا۔ رکشے والے نے فوری طور پر یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔ بس جس طرف رکشے کا رخ تھا۔ وہ اسی طرف چلنے لگا۔

سرد ہوا کے جھونکے شانی کے چہرے اور جسم سے ٹکرائے تو اسے اپنے حواس کچھ بہتر ہوتے محسوس ہوئے۔ رکشے کی حرکت اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس حرکت کے ساتھ ساتھ وہ لمحہ بہ لمحہ ایک خوفناک شکنجے سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

تقریباً دو فرلانگ آگے جانے کے بعد رکشے والے نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر کر شانی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ کنپٹیوں سے بال سفید تھے۔ اس نے پنجابی لب و لہجے میں پوچھا۔ ”آپ نے کدھر جانا ہے جی؟“

شانی نے اپنا گلا مسلا اور آواز کو حتیٰ الامکان حد تک بلند کرتے ہوئے بولی۔ ”ابھی سیدھے چلتے رہو۔“

”جی کیا کہا آپ نے؟“

”ابھی سیدھے چلتے رہو۔“ شانی نے اپنا جواب دہرایا۔

ابھی تک وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پائی تھی کہ اسے کدھر جانا ہے۔ ذہن ماؤف تھا اور حالات اس سے بھی زیادہ ماؤف کر دینے والے تھے۔ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور کرائے کے بغیر وہ کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ بلکہ اصولی طور پر تو وہ اس رکشے میں بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

رکشہ کچھ دیر تک سیدھا چلتا رہا، پھر ایک جگہ رک گیا۔ اب تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ایک ٹھٹھری ہوئی تاریکی دھیرے دھیرے لاہور کے گلی کوچوں میں گہری ہو رہی تھی اور ایک طویل رات کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا۔ موٹر سائیکلیں، ویگنیں، تانگے، کاریں، ہر نوع کی گاڑی اور ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ دھواں دھواں فضا میں یہ لوگ جیکٹس، گرم ٹوپیاں اور گرم کپڑے پہنے اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ ہر شخص کی حرکت کسی خاص سمت کی جانب تھی۔ ایک شانی تھی جس کی کوئی سمت نہیں تھی۔

رکشے والے کی آواز نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ ”جی..... آپ نے بتایا نہیں کس طرف جانا ہے؟“ اس مرتبہ اس کی آواز میں ہلکی سی سختی تھی۔

”ہم کہاں پر ہیں؟“

”یہ نسبت روڈ ہے جی۔ ہم لکشمی چوک کے سامنے کھڑے ہیں۔“ رکشے والے نے تفصیل فراہم کی۔

دودھیا روشنیوں والا جگمگاتا ہوا لکشمی چوک کچھ فاصلے پر تھا۔ فلموں کے بڑے بڑے بورڈ دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ ابا جی اور امی کے ساتھ لاہور کی سیر کو آئی تھی تو اس چوک سے انہوں نے کڑاہی گوشت کھایا تھا۔ چوک کی گہما گہمی اور بڑے بڑے فلمی بورڈوں کی بھرمار نے اسے بڑا حیران کیا تھا۔ آج ایک بار پھر یہ چوک اس کے سامنے تھا لیکن آج کے حالات اور اُن حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رکشے والا اس کے جواب کا منتظر تھا۔ شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے بے حد بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دیکھو..... بات یہ ہے کہ میرا اٹیچی یہاں گم ہو گیا ہے۔ اسی میں میرے پیسے تھے اور وہ ایڈریس بھی تھا جہاں مجھے جانا تھا۔ میں اس وقت مشکل میں ہوں میں چاہتی ہوں کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں میں آج کی رات اطمینان سے گزار سکوں۔ کل میں کسی طرح فون کر کے گوجر خان سے اپنے کسی عزیز کو بلا لوں گی۔“

”جگہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ رکشے والے نے آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

”سنا ہے..... یہاں ایسی جگہیں ہیں جہاں عورتیں دو چار دن کے لئے حفاظت سے رہ سکتی ہیں۔ انہیں جس طرح کی مدد چاہئے ہوتی ہے وہ بھی کی جاتی ہے۔“

”شاید تم دارالامان کی بات کر رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے یہی نام ہے۔“ شانی نے کہا۔

رکشے والے نے پورا گھوم کر شانی کو سر تا پا گھورا۔ شکل و صورت سے وہ بھلا مانس ہی لگتا تھا۔ عمر بھی پختہ تھی۔

شانی کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”جس جگہ کی تم بات کر رہی ہو۔ وہاں تم کو ایسے ہی نہیں رکھ لیا جائے گا..... سو طرح کے سوال پوچھے جائیں گے۔ پورا شجرہ نسب پوچھا جائے گا کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو..... کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

رکشے والے نے پھر ایک گہری سانس لی۔ رکشے کا انجن بند کر کے اپنی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی کھجائی اور بولا۔ ”تم مجھ کو کسی اچھے گھر کی لگتی ہو۔ لگتا ہے تم پر کوئی مصیبت آئی ہوئی ہے۔“

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک شانی کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اگر دارالامان وغیرہ کے چکروں میں پڑو گی تو تمہاری مصیبت اور بھی بڑھ جائے گی۔“

”تو کیا کرنا چاہئے مجھے؟“ شانی نے اپنے گلے سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے کہا۔

رکشے والے نے ایک بار پھر مڑ کر شانی کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے داڑھی کھجائی اور کہنے لگا۔ ”اگر تم نے کوئی جرم شرم نہیں کیا۔ اور سچ مچ مصیبت میں ہو تو میں تم کو اپنے گھر لے جا سکتا ہوں۔ کم از کم ایک رات تو تم وہاں گزار ہی سکتی ہو۔ وہاں میری ماں ہے، بیوی

ہے، بیٹی اور بچے ہیں۔''

شانی کو ایک دفعہ پہلے بھی اس طرح کی پیشکش ہوئی تھی اور وہ عثمانی پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چلی آئی تھی لیکن عثمانی کے گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے سے رہ گیا تھا، وہ ناقابلِ بیان تھا۔

ایک لمحے کے لئے وہ لرز گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے لاتعداد اندیشے اس کے ذہن میں گھس گئے۔ وہ کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی۔ گلی کوچوں میں لاتعداد خطرے رینگ رہے ہیں۔ کونے کھدروں میں اَن گنت حوادث گھات لگائے بیٹھے ہیں، بند دروازوں اور کھڑکیوں والے اس بے مہر شہر میں ایک پہاڑ جیسی رات سر پر ہے ... کسی تاریک کوچے میں کوئی سکندرا کوئی کامی اس سے ٹکرا سکتا ہے۔ کسی نامہرباں موڑ پر کوئی پولیس ناکا اس کے لئے وبالِ جان بن سکتا ہے۔ اس شہر میں نہ جانے کتنے مہر جی اور کتنے اکبرے آسیبوں کی طرح چکراتے ہوں گے۔

یہ رکشے والا اس کے پیچھے تو نہیں گیا تھا۔ وہ خود اس کے رکشے میں آ کر بیٹھی تھی۔ وہ بھلا مانس بھی لگتا تھا۔ بال بچے دار۔

شانی سوچ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''دیکھو... تم نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو... میرا ٹیم (وقت) کھوٹا مت کرو۔''

''کہاں ہے تمہارا گھر؟'' شانی نے پوچھا۔

''تھوڑا سا پیچھے جانا پڑے گا۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ پر ایک بات ہے مجھے پھر صاف صاف بتا دو۔ کوئی پولیس کا چکر شکر تو نہیں ہے تمہارا۔ میں غریب بندہ ہوں۔ ان جھمیلوں میں نہیں پڑ سکتا۔''

''نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شانی نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ چلیں گھر؟''

''چلو۔'' شانی نے زور لگا کر اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

☆======☆======☆

وہ تنگ گلیوں والی ایک نیم پختہ آبادی میں پہنچے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کے اندر سے ٹی وی چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آوارہ کتے بھی چہل قدمی کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر رکشے والے نے رکشہ پارک کیا اور شانی کو لے کر ایک دروازے کے سامنے آ گیا۔ باہر سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مکان کا صحن گلی سے نیچا ہے۔ خستہ حال دروازے پر

کپڑے کا میلا سا پردہ جھول رہا تھا۔

اس گھر میں بھاری جثے کی ایک صحت مند عورت سے شانی کی ملاقات ہوئی۔ یہ عورت رکشہ والے زکریا کی بیوی جنت بی بی تھی۔ اس نے بڑی تیز نظروں سے سرتاپا شانی کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ شانی کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ سرِ شام جس وقت اس نے بدنیت آنٹی ماجدہ کے ساتھ چائے پی تھی۔ اور ڈھیروں کمبل اور چادریں دھو کر فارغ ہوئی تھی۔ دھلائی کے لئے اس نے میلے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ آنٹی ماجدہ ہی کے کپڑے تھے۔ بعد ازاں قاسم برلاس کے ساتھ دھینگا مشتی کے دوران میں یہ کپڑے بھی ایک دو جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ قاسم برلاس کی گرفت سے نکلتے وقت اس نے افراتفری میں جو جوتی پہنی وہ گھر کا کام کرنے والی ماسی کی تھی۔ بستر کی جو چادر اس کے ہاتھ لگی وہ بھی خستہ حال تھی..... مستزاد یہ کہ شانی کے بال منتشر تھے اور مجموعی حلیہ ابتر ہو رہا تھا۔

رکشے والے زکریا کی بیوی جنت بی بی نے کڑی نظروں سے شوہر کو دیکھا اور پوچھا ''کہاں سے لائے ہو اسے؟''

زکریا نے بیوی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور ایک طرف لے گیا۔ اس دوران میں چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی بھی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی اور متجسس نظروں سے دیکھنے لگی۔ سات آٹھ سال عمر کے دو میلے کچیلے بچے سیڑھیوں پر کھڑے شانی کا ناقدانہ جائزہ لے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جنت بی بی قدرے تیز قدموں سے شانی کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آ گئی۔ یہاں ڈھیلی چارپائیوں پر کھدر کے لحاف پڑے تھے۔ شکستہ فرش پر مونگ پھلی اور گنڈیری کے چھلکے تھے۔ ایک کونے میں پرانے ماڈل کا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی رکھا تھا۔

جنت بی بی نے دروازہ اندر سے بند کیا اور شانی کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہ کھوجی نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ آخر بولی۔ ''دیکھو... تم مجھے اپنی ماں کی طرح سمجھو۔ تم مجھے جو کچھ بھی بتاؤ گی، وہ صرف میرے تک ہی رہے گا۔ زکریا تک بھی نہیں پہنچے گا۔ جو بھی اچھی سے اچھی یا بُری سے بُری بات ہے، ہمیں بتا دو۔ ہم جتنے جوگے بھی ہوئے تمہاری مدد ضرور کریں گے۔''

شانی خاموش رہی۔ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

جنت نامی یہ عورت کچھ دیر تک شانی کو کریدنے کی ناکام کوشش کرتی رہی پھر تھک سی گئی۔ کہنے لگی ''.....اچھا صرف یہ بتادو۔ رہتی کہاں ہو تم؟''

شانی نے اپنے آنسو حلق کے اندر گرائے اور بمشکل بولی۔ ''یہیں ایک گھر میں کچھ دن رہی ہوں .....'' اس کی آواز بے حد پست اور بھرائی ہوئی تھی۔

شانی نے کہا تھا ..... یہیں ایک گھر میں کچھ دن رہی ہوں۔

جنت بی بی نے اس فقرے کو یوں سمجھا۔ ''یہیں ایک گھر میں کام کرتی ہوں۔''

شاید شانی کے حلیے کی وجہ سے جنت بی بی کا ذہن ''کام کرنے'' کی طرف چلا گیا تھا۔ ویسے بھی جو بات ذہن میں ہو وہ نہ ہونے کے باوجود سنائی دے جاتی ہے۔

''گھر میں کام کرتی ہو؟'' وہ ذرا حیرت سے بولی پھر کہنے لگی۔ ''تمہاری شکل وصورت تو کام کرنے والیوں جیسی نہیں لگتی۔''

شانی مسلسل خاموش تھی۔ جنت بی بی چند لمحے تک مترحم نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ تب طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ''اللہ کیسے کیسوں پر کیسی کیسی مصیبتیں ڈال دیتا ہے۔''

اتنی دیر میں زکریا کھنکھارتا ہوا اندر آ گیا۔ جنت بی بی نے اسے دیکھ کر اوپر نیچے سر ہلایا اور بڑے دانا بینا لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں۔ سب سمجھ گئی ہوں۔ یہ امیر لوگ گریب بندے کو بندہ تھوڑا ہی سمجھتے ہیں اور گریب عورت تو ان کے لئے جانور ہوتی ہے اور اگر گریب عورت جوان اور سوہنی بھی ہو تو پھر.....اس وچاری کا اللہ ہی حافظ ہے۔ گھر میں کام کرنے والیوں کو یہ امیر زادے خریدی ہوئی چیز سمجھتے ہیں اور ان کی مائیں بہنیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اندھی گونگی بن جاتی ہیں۔ ان پر اللہ کی مار ہو.....میں سب سمجھ گئی ہوں۔''

زکریا قدرے حیران ہو کر بولا۔ ''تیرا مطلب ہے کہ یہ کسی گھر میں کام کرتی ہے۔''

''اور نہیں تو کیا!''

''پر شکل وصورت سے تو.....''

''یہ شکل وصورت ہی تو ہم گریبوں کی دشمن بن جاتی ہے۔'' جنت بی بی نے پورے وثوق سے کہا۔

زکریا کی نگاہیں شانی کی قینچی چپل پر پڑیں اور اس کے خستہ حال کپڑوں سے ہوتی ہوئی منتشر بالوں تک چلی گئی۔ غالباً وہ اپنی بیوی کی اطلاع کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شانی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

جنت بی بی نے کہا۔ ''یہ گریب پہلے ہی بہت دکھی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سوال

جواب کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی یہ سو جائے تو اچھا ہے۔ سویرے سب کچھ پوچھ لیں گے۔''

زکریا نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے جنتے! اسے کوئی گولی شولی بھی کھلائی ہے ان لوگوں نے .....دیکھتی نہیں اس کی آنکھیں کتنی لال ہو رہی ہیں؟''

جنتے نے شانی سے پوچھا۔ ''کوئی نشے والی شے دی ہے انہوں نے تمہیں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون تھے وہ؟ گھر کے بندے تھے یا باہر کے؟'' جنتے نے پوچھا۔

شانی خاموش رہی تو وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ ''دس ناری، بتاتی کیوں نہیں ہم تیرے دشمن نہیں بجن ہیں۔ کون تھے وہ۔ گھر کے تھے یا باہر کے؟''

''بب.....باہر کا بندہ تھا۔'' شانی نے اپنے گلے سے بمشکل الفاظ برآمد کئے۔

''کیا کوئی زبردستی گھر میں گھس آیا تھا؟'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا کوئی مہمان تھا؟'' شانی نے پھر نفی میں جواب دیا۔ ''کیا گھر والے کا کوئی دوست یار تھا؟'' اس مرتبہ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ پیسہ بندے کو ایک دم شیطان بنا دیتا ہے پپو کے ابا۔'' جنت بولی۔ ''تمہیں یاد ہی ہوگا وہ ہماری گوانڈن (پڑوسن) حمیداں کی دیوارنی ثریا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اقبال ٹاؤن میں ڈاکٹر صاحب کے گھر کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست نے اپنی گھڑی چوری کرنے کا الزام لگایا اور باورچی خانے میں بے چاری کی عزت خراب کر دی، یاد ہے نا تمہیں؟''

زکریا نے اثبات میں سر کو حرکت دی۔

جنتے نے زکریا کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گیا۔ وہ اس کے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ شانی نے ''ہوں ہاں'' میں جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ''بچ تو گئی ہے ناں تو؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مارا کتا تو نہیں ہے تجھے؟''

''تھوڑا سا۔''

''تیرے ہوٹ (ہونٹ) سے اب بھی خون نکل رہا ہے۔ ٹھہر جا میں روئی پر ٹنکچر لگا کر لاتی ہوں۔''

وہ تیزی سے اٹھی۔ جسم فربہ ہونے کے باوجود وہ پھرتیلی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی محبت سے اس کے خون آلود ہونٹ صاف کر رہی تھی۔ اس دوران میں چودہ پندرہ سال کی لڑکی مریم پلیٹ میں اچار رکھ کر لے آئی۔ بولی۔ ''لے آپاں! تھوڑا تھوڑا چاٹ اسے۔ تیڑی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

مریم، زکریا اور جنتے کی بیٹی تھی۔ باپ کی طرح وہ بھی (ر) اور (ڑ) میں گڑبڑ کرتی تھی۔ دوسرے بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ تاہم جنتے کے تلفظ میں یہ خرابی نہیں تھی۔

شانی کو اچار کی بو ہی سے الرجی تھی۔ اس نے پلیٹ پیچھے کھسکا دی۔ جنتے نے آنکھ سے اشارہ کیا اور مریم بھی باہر نکل گئی۔ وہ شانی کے ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولی۔ ''تیرے ہاتھ دیکھ کر لگتا ہے کہ کام کاج کرتے ہوئے تجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ تیرے ماں باپ ہیں؟''

''نہیں۔''

جنتے نے افسوس کے انداز میں سر کو جنبش دی پھر بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ کسی پنڈ کی رہنے والی ہے تو۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون سا پنڈ ہے؟''

شانی نے اپنے گلے کو مسلتے ہوئے بے حد پست آواز میں کہا۔ ''ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھیں..... مم..... میرا سر گھوم رہا ہے۔ میں کچھ دیر لیٹنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... پر سونے سے پہلے تھوڑی سی روٹی کھا لے۔ میں تیرے لئے سالن گرم کر کے دو پھلکیاں پکا لاتی ہوں۔''

''نہیں۔'' شانی نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بھوک بالکل نہیں۔''

جنتے کچھ دیر اصرار کرتی رہی۔ تب اس کے لئے بستر ٹھیک کر کے بچھایا اور اسے لیٹ جانے کے لئے کہا۔

وہ بڑی طویل اور سرد رات تھی۔ ایک پہاڑ تھا جو سرک ہی نہیں رہا تھا..... شانی اپنے اوپر کھدر کا لحاف لپیٹے پڑی تھی۔ چارپائی ڈھیلی اور چرچرائی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں طرف مریم اور بائیں طرف بچوں کی چارپائی تھی۔ زکریا اور جنتے ساتھ والے کمرے میں تھے۔ برآمدے میں ایک میلے سے بلب کی روشنی تھی، جو سلاخ دار کھڑکی کے راستے اندر تک آ رہی تھی۔ گلیوں میں کتوں کا شور تھا اور دور کہیں ریڈیو پر ایک پرانا انڈین گانا بج رہا تھا۔ ''میری

زندگی ہے کیا، اک کٹی پتنگ ہے۔''

جو کچھ پیش آیا تھا، شانی کو جیتی جاگتی آنکھوں کا بھیانک خواب لگ رہا تھا۔ جوں جوں ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی صاف ہو رہی تھی۔ بیت جانے والے مناظر زیادہ واضح اور روشن دکھائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں افشاں پر کیا بیتی تھی۔ شانی نے ابتر حالات کے باوجود اپنے طور پر اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے معطل حواس نے اس کی مزاحمت کمزور کر دی تھی اور ایک موقع پر اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ خود بھی مصیبت میں پھنس جائے گی۔

اسے قاسم برلاس کا منحوس چہرہ یاد آیا۔ وہ سراپا وحشت بن کر اس پر جھپٹتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شانی پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار بھی کرتا رہا تھا۔ یعنی ایک ہی پیالے میں شہد اور زہر کی موجودگی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس نے ایک بار شانی کو جسمانی طور پر فتح کر لیا تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کے گھر بیٹھ جائے گی۔ شانی جانتی تھی ..... ایسا ہوتا ہے..... بے شمار عورتیں زیادتی کا شکار ہوتی ہیں اور بعد ازاں یہ عورتیں انہی مردوں کے گھر بسانے کو غنیمت سمجھتی ہیں جنہوں نے زیادتی کی ہوتی ہے۔ یہ بھی عورت کی ان گنت مجبوریوں میں سے ایک شرمناک مجبوری ہے۔

رات آخری پہر شاید کچھ دیر کے لئے شانی کی آنکھ لگ گئی تھی۔ حالتِ نیند میں بھی وہ جانکاہ عذابوں کا شکار رہی۔ بیدار ہوئی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ جنتے کے تینوں بچے سو رہے تھے۔ شانی کا لحاف کھسک کر اس کی کمر تک آ گیا تھا۔ گریبان کے اوپری دو بٹن کھلے تھے۔ اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ دو آنکھیں کہیں سے دیکھ رہی ہیں۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ اس کی نگاہیں کمرے کے بغلی دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔ یہاں ایک چق لٹک رہی تھی۔ چق کے درمیان تقریباً ایک بالشت لمبا اور دو انگل چوڑا خلا سا تھا۔ دراصل یہاں سے دو سرکنڈے ٹوٹے ہوئے تھے۔ شانی کو لگا جیسے اس خلا کو دو آنکھوں کی سیاہی نے پُر کر رکھا ہے..... ہاں یہاں دو آنکھیں موجود تھیں اور اسے دیکھ رہی تھیں۔

یکایک وہ آنکھیں خلا میں سے ہٹ گئیں۔ چق کی پرلی جانب ایک فربہ سا سایہ لہرایا اور تیزی سے اوجھل ہو گیا، کوئی وہاں موجود تھا اور اسے دیکھتا رہا تھا۔ شانی نے عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ آہنی سلاخوں کی دوسری جانب زکریا نظر آیا۔ اس نے شلوار کے پائنچے اُڑس رکھے تھے اور اپنے رکشے کے ٹائر دھو رہا تھا۔ قدموں کی آواز نے شانی کو ایک دم چونکا دیا۔ پردہ برابر کر کے

اس نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ جنتے ہاتھ میں سٹیل کی ٹرے لئے اندر آ رہی تھی۔ وہ کھچڑی بالوں والی ایک غریب صورت لیکن سیانی عورت لگتی تھی۔ اس نے ٹرے میں ''رس چائے'' کا ناشتہ رکھا تھا۔

جنتے کے بے حد اصرار پر شانی نے ٹونٹی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا۔ چائے پینے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کا گلا رات کے مقابلے میں کافی بہتر ہے۔ تاہم نچلا ہونٹ سوجا سوجا لگ رہا تھا اور جسم کے کئی حصوں میں شدید کھچاؤ تھا۔

جنتے کے دونوں چھوٹے بچے محلے کے ایک سکول میں پڑھنے جاتے تھے، مریم آٹھویں پاس کر کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جنتے کا ایک بڑا بیٹا بھی تھا۔ وہ ابھی تک شانی کی نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اچانک شانی کو وہ دو آنکھیں یاد آئیں جو چق کے دو ٹوٹے ہوئے سرکنڈوں میں سے اسے گھور رہی تھیں۔ پھر ان آنکھوں کے ساتھ ہی ایک فربہ سا جسم اچانک اوجھل ہو گیا تھا۔ کہیں یہ جنتے کا وہی بڑا بیٹا تو نہیں تھا؟ شانی نے سوچا۔ بہرحال یہ سوال اس کی زبان پر نہیں آ سکا۔

بچوں کی سکول سے چھٹی تھی۔ ناشتے کے بعد جنتے ایک بار پھر تسلی سے شانی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دن کی روشنی میں غور سے شانی کا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ''تمہاری شکل سچ مچ اچھی ہے۔ تم نوکرانی کے بجائے مالکن لگتی ہو۔ مجھے پتہ ہے، اچھی شکل کی نوکرانیوں سے مالکنیں بڑی چڑ کھاتی ہیں۔ پکی بات ہے۔ تمہاری مالکن بھی ڈنڈا لے کر تمہارے پیچھے رہتی ہو گی۔''

شانی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد جنتے نے پھر سے شانی کا انٹرویو شروع کر دیا۔

وہ جیسے از خود یہ بات طے کر چکی تھی کہ شانی گاؤں سے آنے کے بعد یہاں کسی امیر گھر میں ملازمت کرتی تھی۔ موقع دیکھ کر گھر کے مالک کے دوست نے اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ جسے ناکام بنا کر وہ نکل بھاگی۔

جنتے کے طویل سوالات کے جواب میں شانی نے مختصر الفاظ میں دیئے۔ شانی کو یہاں بھی مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے اپنا پورا نام شہناز بتایا اور کہا کہ والدین کی وفات کے بعد اسے روزگار کی تلاش میں اپنی ایک سہیلی کے پاس لاہور آنا پڑا۔ وہ یہاں شاہدرہ میں رہتی تھی۔ شاہدرہ پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اسے اپنی کار میں گھر لے گیا۔ یہاں وہ رہنے لگی اور گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ ادھیڑ عمر شخص کا ایک ملنے والا اکثر گھر میں آتا رہتا تھا۔ اس کی نیت خراب ہو گئی اور کل رات وہ اپنی

اصلیت دکھانے پر تُل گیا۔

اس مختصر روداد نے جنتے کو کافی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ وہ از خود شانی کو گھریلو ملازمہ کی پہچان دے چکی تھی۔ شانی نے اسی پہچان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا۔ جنتے سے بات کرتے ہوئے اس نے اپنے لب و لہجے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تا کہ وہ گھریلو ملازمہ ہی نظر آئے۔

''اب تیرا کیا ارادہ ہے شہناز؟'' جنتے نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ آپ ہی کچھ بتائیں۔''

''دیکھ کُڑیے! ان امیر لوگوں سے متھا لگانا تو بالکل بے وقوفی کی بات ہے...... پُلس بھی ایسے مالموں میں الٹا ہم گریبوں کی چمڑی ہی ادھیڑتی ہے۔ بس جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ پر جو کچھ ہوا ہے اس میں آئندہ کے بارے میں تیرے لئے بڑا چنگا سبق ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

جنتے بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تو شکل و صورت کی اچھی ہے۔ پہلے تو کوئی سیانی گھر والی تجھے ملازم رکھے گی ہی نہیں۔ اگر کوئی رکھے گی تو اپنے لئے مصیبت بنائے گی اور تیرے لئے بھی۔ میری بات سمجھ رہی ہے ناں۔ یہ مرد ذات کسی کی نہیں ہوتی۔ یہ بس چٹے رنگ چاہتے ہیں۔ گریب عورت کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ میں ساروں کو تو بُرا نہیں کہتی۔ پر سو میں سے اسی نوے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ باتوں باتوں میں ٹھرک جھاڑتے ہیں۔ کچھ آنکھوں آنکھوں میں عورت کو کھاتے رہتے ہیں اور کچھ ہاتھ چالاکی کرتے ہیں۔ جس طرح کل رات ایک شرابی کتے نے تیرے ساتھ کی ہے...... اس کے علاوہ ان مردوں کی ایک قسم اور بھی ہے یہ اوپر سے تو بڑے بھلے مانس اور نیکوکار لگتے ہیں پر اندر سے یہ بھی ندیدے ہوتے ہیں۔ بڑی شرافت سے کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب موقع مل جاتا ہے تو ان کا روپ ہی بدل جاتا ہے۔ سات آٹھ سال پہلے مریم کے ابے کو بخار ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ دیہاڑی پر رکشہ چلاتا تھا۔ رکشہ بند ہوا تو چولہا ٹھنڈا ہو گیا۔ مجبوراً میں نے مریم کے ساتھ گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ کوئی چار سال مجھے یہ مصیبت کاٹنی پڑی۔ ان چار سالوں میں، میں نے ان بندوں کے ایسے ایسے روپ دیکھے کہ اللہ مافی۔ خاص طور پر یہ امیروں کے جوان منڈے جو سارا دن گھروں میں کیبل دیکھتے ہیں اور پلنگ توڑتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ نہ کام کرنے والی کی عمر دیکھتے ہیں نہ شکل و صورت نہ کچھ اور۔ بس موقع ملا نہیں اور اپنی اصلیت پر آئے نہیں۔ ان میں کچھ چنگے بھی ہوں گے پر میں نے بتایا ہے ناں روپے میں سے چودہ آنے

ایسے ہی ہیں۔‘‘

جنتے نے ذرا توقف کر کے سٹیل کے گلاس میں سے چائے کا گرم گھونٹ بھرا اور بولی۔

’’جن دنوں میں کام کرتی تھی، مریم کی عمر بس نو دس سال ہوگی۔ یہ بھی میرے ساتھ ہوتی تھی۔ ملتانیوں کی کوٹھی میں چوبیس پچیس سال کا ایک منڈا تھا۔ چنگا قد کاٹھ تھا۔ پورا بھائی لگتا تھا۔ اتنا بھلا مانس کہ بندہ سمجھے فرشتہ ہی ہے۔ بولتا بھی کم تھا۔ نظر ہر وقت فرش پر ہوتی تھی لیکن ایک دن میری مریم کو لے کر کمرے میں گھس گیا۔ وہ تو میری قسمت چنگی تھی۔ میں بازار سے جلدی واپس آ گئی۔ مریم کے رونے کی آواز سن کر میں نے واویلا کیا اور میری گڑی کی جان چھوٹی۔ اگلے دن میں نے وہ گھر چھوڑ دیا......اب اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات میں تمہیں بتاؤں؟‘‘ جنتے نے شانی سے پوچھا۔

’’جی!‘‘

’’ملتانیوں کے اسی خبیث منڈے نے چند مہینے بعد ایک اور نوکرانی کو پکڑا ہے اس کی عمر کتنی تھی؟‘‘

’’کتنی؟‘‘

’’کوئی چالیس سال، رفیق کھوتی ریڑھی والے کی بیوی ہے۔ ہمارے پچھواڑے رہتی ہے۔ کالی سیاہ ہے۔ نہ منہ نہ متھا......بس ذرا اپنے آپ کو کس کے رکھتی ہے۔ اُس کی قسمت بھی چنگی تھی کہ ٹائم پر کوئی آ گیا اور معاملہ ٹل گیا......اب تم ہی بتاؤ ایک طرف دس سال کی بچی اور دوسری طرف چالیس سال کی مائی۔‘‘

شانی شاک کی سی کیفیت میں بیٹھی سنتی رہی۔ ایسی گفتگو سے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس طرح کے ایک دو مزید واقعات سنانے کے بعد جنتے بولی۔

’’میں تو تجھے یہ مشورہ بالکل نہیں دوں گی کہ تُو کسی اور گھر میں کام کرے۔ اگر تُو اپنے کسی رشتے دار کے پاس واپس گوجر خان جانا چاہتی ہے تو چلی جا......اور اگر نہیں جانا چاہتی تو پھر اِدھر ہی میرے پاس رہ لے۔ میں اور مریم یہاں گھر میں لفافے بناتے ہیں۔ آسان سا کام ہے۔ دیہاڑی میں پانچ چھ گھنٹے بھی لگ جائیں تو پچیس تیس روپے بن جاتے ہیں۔ رقم بھی گھر بیٹھے مل جاتی ہے۔ تُو اپنا بوجھ بڑے آرام سے خود ہی اٹھا لے گی۔ باقی اصل فیصلہ تو تُو نے ہی کرنا ہے۔ تسلی سے سوچ سمجھ لے۔‘‘

شانی کا دل چاہا تھا کہ اسے کہیں سے اخبار ملے۔ اس کے دل میں یہ خدشہ موجود تھا کہ کل رات والے واقعے کے حوالے سے کوئی خبر اخبار میں موجود ہوگی۔ وہ کل رات نو بجے کے

قریب عثانی کی منحوس چار دیواری سے نکل آئی تھی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ عثانی اور ماجدہ گھر واپس آ گئے ہوں۔ یا پھر کسی مہمان نے ہی آ کر افشاں کی جان قاسم برلاس سے چھڑا دی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ افشاں کسی طرح جدوجہد کر کے خود ہی اس لعنتی سٹور روم سے نکل آئی ہو اور اس نے شور مچا دیا ہو۔ کئی امکانات تھے۔

شانی سوچتی رہی اور لیٹی رہی۔ اچانک ایک بار پھر اسے وہی احساس ہوا جو آج صبح سویرے ہوا تھا۔ کہیں سے دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے چونک کر چق کی طرف دیکھا۔ رگوں میں لہو سنسنا گیا۔ آنکھیں موجود تھیں۔ کالے رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں سرکنڈوں کے خلا میں سے وہ صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

صبح تو جونہی شانی نے دیکھا تھا، آنکھیں اوجھل ہو گئی تھیں مگر اب وہ اوجھل نہیں ہوئیں۔ شانی گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور سینے پر دوپٹا درست کیا۔ جب وہ اٹھی تو آنکھیں اوجھل ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چق پر ایک فربہ سی پرچھائیں لہرا کر غائب ہو گئی۔ شانی نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

اتنے میں جنتے اندر داخل ہوئی۔ ’’کیا بات ہے دھیئے؟‘‘

’’اِدھر......اِدھر کوئی تھا ماسی، چق میں سے دیکھ رہا تھا۔ مم......میں اٹھی تو ایک دم بھاگ گیا۔‘‘

’’اِدھر تو کوئی بھی نہیں ہے گھر میں......بس میرا وڈا پتر گلابا ہے۔ وہ اوپر چوبارے میں بیٹھا ہے۔‘‘

’’کک......کہیں وہی تو نہیں تھا؟‘‘

’’نہیں کڑیے۔ وہ تو بڑا سیدھا سادہ ہے۔ بس سمجھ اللہ میاں کی گائے ہے اور اتنا نیک ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ جب چھٹی ہو تو سارا دن تکیہ شاہ جی میں بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب بھی وہیں سے آیا ہے۔‘‘

اتنے میں جنتے کا چھوٹا بیٹا گڈو ناک سے سوں سوں کرتا اندر آیا۔ بولا۔ ’’امی! بھا پوچھتا ہے میرا لال لنگوٹ کہاں ہے؟‘‘

’’وہ اوپر تار پر لٹکایا ہوا ہے میں نے سوکھنے کے لئے۔ جا اتار کر دے دے اسے۔‘‘

گڈو چلا گیا تو جنتے کہنے لگی۔ ’’یہ لال لنگوٹ گلابے کو اس کے استاد نے انعام میں دیا تھا۔ جان سے لگا کر رکھتا ہے اور اس لنگوٹ میں کرامات بھی بڑی ہیں۔ جس کشتی میں گلابا یہ لنگوٹ پہنتا ہے جیت جاتا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے دینے گوجر کے منڈے کو ہرا کر پورا بارہ سو روپیہ

انعام لیا ہے اس نے۔"

"آپ..... کا بیٹا کشتیاں کرتا ہے؟"

"کوئی ایسی ویسی کشتیاں...... سیالکوٹی پہلوان استاد برکت کا پٹھا ہے میرا پتر۔"

"کوئی کام شام بھی کرتے ہیں وہ؟"

"گول چکر والے بازار میں گلابے کی اچار اور مربوں کی دکان تھی۔ آج کل وہ ذرا اچھے علاقے میں دکان ڈھونڈ رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہفتے دس دن میں مل جائے گی پھر سویرے کا گیا شام کو ہی آیا کرے گا۔"

ایک دم وہ چونک کر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ ڈیوڑھے میں ہے۔ میں اسے بلاتی ہوں۔"

اس نے داخلی دروازے کی طرف دیکھ کر آواز دی۔ "گلابے...... گلابے...... ادھر دیکھ کون آیا ہے۔"

شانی نے سر پر اوڑھنی درست کر لی۔ کچھ دیر بعد وہ کھنکھارتا ہوا اندر آ گیا۔ شانی نے دیکھا وہ واقعی پہلوانوں جیسا تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال، منہ گول، گردن موٹی اور جثہ بھاری۔ اس نے آنکھوں میں خوب کھینچ کر سرمہ لگایا ہوا تھا۔ چہرے سے حماقت ٹپکتی تھی اور اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں ذہنی طور پر کچھ کمی ہے۔ باقی جسم کے مقابلے میں اس کا سر بھی چھوٹا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور اس میں رال کی چمک نظر آ رہی تھی۔

جنتے تعارف کرتے ہوئے بولی۔ "گلابے! یہ شہناز ہے۔ کل رات تیرے ابے کے ساتھ آئی ہے۔ بڑی چنگی کُڑی ہے۔ بے آسرا بھی ہے وچاری۔ میں تو اس سے یہی کہہ رہی ہوں کہ ہمارے گھر رہ لے۔"

"سلاماں لیکم جی۔" گلابے نے عجیب بے ڈھنگی آواز میں کہا۔

"وعلیکم السلام۔" شانی اتنا ہی کہہ سکی۔

اس دوران میں اس کی نگاہ گلابے کی نگاہ سے ملی۔ آنکھیں جانی پہچانی محسوس ہوئیں۔ ایک دم شانی کو پتا چلا کہ یہی آنکھیں تھیں جو پُراسرار انداز میں اسے چق کے پیچھے سے گھورتی تھیں۔ کالی سیاہ اور پھیلی ہوئی سی آنکھیں۔

وہ شانی کو ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تمہاڑا جب تک جی چاہے۔ یہاں آڑام سے رہو۔ ہماڑے گھڑ میں تینوں ٹیم اچھا کھانا پکتا ہے۔ اتواڑ کی اتواڑ ابا سب کو سیڑ کڑانے باغ یا نہڑ پڑ بھی لے کڑ جاتا ہے۔"

فقرہ ختم کر کے اس نے گینڈے کی طرح گردن ہلائی اور بتیسی کی نمائش کی۔

"اچھا، تُو اب جا۔ بازار سے سبزی لے آ۔"

"آج گھڑ میں اتنی چنگی پڑونی آئی ہے۔ مڑغی شڑغی پکا لے امی۔ بابے کڑیے کی دکان پر بڑی تگڑی مڑغیاں آئی ہوئی ہیں۔ ایک دم گوری چٹی۔" فقرہ ختم کر کے وہ گنواروں کی طرح زور سے ہنسا، جیسے کوئی بڑی پُرمزاح بات کہہ ڈالی ہو۔

"اچھا جا، جو مرضی لے آ۔ وہاں پڑچھتی سے پیسے لے لے۔"

گلابے کے جانے کے بعد جنتے بولی۔ "دل کا بڑا چنگا ہے گلابا۔ دماغ بھی تیز ہے اس کا۔ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر کئی دفعہ اتنے پتے کی بات کہتا ہے ہم سارے حیران رہ جاتے ہیں۔"

"جی۔" شانی نے ہنکارا بھرا۔

"محنتی اتنا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ جس کام پر لگ گیا، بس لگ گیا۔ تن من کا ہوش نہیں رہتا اسے۔ مربہ بنانا اس کے چاچے بہشتی نے سکھایا تھا اسے۔ ایسا مربہ بناتا ہے کہ بس کمال کر دیتا ہے۔"

جنتے کچھ دیر تک اپنے مخبوط الحواس بیٹے کی تعریفیں کرتی رہی پھر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ بچے مختصر سے گھر میں کھیلنے کودنے اور اودھم مچانے لگے۔ پڑوس کی دو تین عورتیں بھی گھر میں آئیں۔ ایک خوانچہ فروش کی بیوی تھی۔ ایک چپڑاسی مشتاق کی بہن۔ ایک نذیر سبزی والے کی ماں..... جنتے ان کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی۔ یقیناً انہیں شانی کی کہانی سے آگاہ کرتی رہی ہوگی۔ شانی نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سلام دعا کے بعد پچھلے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی تنگ سی گلی میں کھلتی تھی۔ گلی میں بچے گولیاں کھیل رہے تھے۔ عورتیں ایک دوسرے کو مردانہ گالیاں دے رہی تھیں اور مرغیاں گندی نالیوں میں سے خوراک نکال کر کھا رہی تھیں۔

اس نیم کچی اور نیم پختہ بستی میں شانی زندگی کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھ رہی تھی۔ یہ روپ متوجہ کرنے والا تھا لیکن شانی کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں تو مسلسل عثمانی کے گھر کی فلم چل رہی تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی اسی طرح گزر گئے۔ شانی کمرہ نشین رہی۔ وہ جانتی تھی اڑوس پڑوس کے لوگ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ طرح طرح کی مرچ مسالے والی قیاس آرائیاں بھی جاری تھیں۔ بہرطور یہ سب کچھ آس پاس کے چند گھروں تک محدود

تھا۔

☆======☆======☆

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ نذیر سبزی والے کا پندرہ سالہ بیٹا اپنے گھر کی دہلیز پر لنڈے کے جوگر پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں پر سستا سا ہیڈفون نظر آرہا تھا۔ غالباً کوئی شوخ وشنگ انڈین گانا سنتے ہوئے وہ ہولے ہولے سر بھی ہلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور کام بھی کر رہا تھا۔ صبح کا باسی اخبار اس کے سامنے تھا اور وہ اس میں فلموں اور ڈراموں کے اشتہار بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔

اخبار دیکھ کر فوراً شانی کا اندرونی تجسس جاگ اٹھا۔ اس نے گڈو سے کہا۔ ''ایک کام کرو گے؟''

''کہو آپاں۔''

وہ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس لڑکے سے دو منٹ کے لئے اخبار تو لے کر آؤ۔''

''میں لاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فراٹے سے باہر نکل گیا۔

ایک منٹ بعد وہ اخبار پھڑپھڑاتا ہوا واپس آ گیا۔

اخبار آج کا ہی تھا۔ مگر مڑا تڑا تھا اور اس پر تیل کے دھبے تھے۔ شانی نے دھڑکتے دل کے ساتھ صفحے الٹنے شروع کئے۔ پچھلے صفحے پر ایک دو کالمی خبر نے اچانک شانی کی نگاہوں کو جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی ہیں۔ وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہ گئی۔ خبر یوں تھی۔

''افشاں عثمانی کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی۔''

سرخی کے نیچے متن اس طرح تھا۔ ''افشاں عثمانی قتل کیس کی کچھ اور تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق سر پر زخم گہرا تھا مگر موت کی اصل وجہ دم گھٹنا ہے۔ لگتا ہے کہ قاتل نے زیادہ عرصے تک مقتولہ کا منہ دبائے رکھا...... اس کی سانس بند ہو گئی اور دماغ کو آکسیجن نہ ملنے کے سبب موت واقع ہوئی۔ پولیس ذرائع کے مطابق یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مقتولہ کی حالت غیر ہونے کے بعد قاتل یا قاتلوں نے اس کی جان بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ ایک دو ہومیو پیتھک میڈیسن بھی جائے واردات سے ملی ہیں بہرحال ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ موقع واردات سے جو ایک دو شواہد ملے ہیں وہ اس امر کی

طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قاتل یا قاتلوں کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔''

ایک باکس میں اس حوالے سے ایک دوسری خبر اس طرح تھی۔ ''افشاں قتل کیس کے نامزد ملزم قاسم براڑ نے رات گئے از خود تھانے میں پیش ہو کر گرفتاری دے دی۔ قاسم براڑ کا کہنا ہے کہ اسے زیادتی اور قتل کے اس واقعے میں بدنیتی کی بنا پر ملوث کیا جارہا تھا۔ وقت ثابت کر دے گا کہ اس کا کوئی گناہ ہے تو وہ صرف یہ کہ وہ حکام بالا کی ہدایت پر ریاض عثمانی کے کیس کی محکمانہ انکوائری کر رہا تھا۔

مزید براں پتا چلا ہے کہ مقتولہ افشاں کے والد ریاض عثمانی جن پر کل دوپہر دل کا شدید دورہ پڑا تھا ابھی تک شیخ زائد ہسپتال کے کارڈیالوجی وارڈ میں ہیں اور انہیں انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے۔''

شانی کی نگاہیں اخبار کے صفحے پر تھیں اور دل ودماغ میں زلزلہ برپا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو پارہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اس کے ذہن میں وہ مناظر گھوم گئے جب اس نے افشاں کو دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور کندھے پر شاپر بیگ جھول رہے تھے۔ وہ اپنی امی اور ڈیڈی کو آوازیں دیتی ہوئی اندر آئی تھی۔ اس کی آواز میں ''ایک سرپرائز دینے والا'' مخصوص جوش تھا۔ اس وقت اس بدقسمت کو کیا پتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری قدم اٹھا کر ایک قتل گاہ میں داخل ہو رہی ہے۔

شانی کا دماغ چٹخنے لگا۔ اس نے تصور کی نگاہ سے ناتواں و بے کس افشاں کو ایک پاگل ریچھ کے پنجوں میں دیکھا۔ اس کے آخری لمحات کے کرب نے شانی کا دل ریزہ ریزہ کر دیا۔ اسے لگا کہ اس کا دماغ شدت غم سے پھٹ جائے گا اور وہ یہیں بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

''کیا بات ہے آپاں؟'' گڈو کی معصوم آواز نے اسے چونکایا۔

''نن...... نہیں کچھ بھی نہیں۔'' شانی بوکھلا کر بولی۔

اس نے جلدی جلدی یونہی ایک دو صفحات پلٹے اور اخبار گڈو کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ...... دے آؤ۔''

گڈو جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح اخبار لہراتا ہوا فراٹے سے باہر نکل گیا۔

شانی کا دل بھرا ہوا تھا۔ آتش سیال آنکھوں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے ڈھلوان چھت والے تنگ باتھ روم میں گھس گئی۔ اس نے پلاسٹک کی میلی کچیلی بالٹی میں نلکا کھلا چھوڑا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ افشاں سے اس کی ملاقات بس ایک ہی بار ہوئی تھی۔

پھر بھی وہ اس کی المناک موت کا غم دل کی اتھاہ گہرائیوں میں محسوس کر رہی تھی۔ اس غم میں کسی حد تک پچھتاوے کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ شاید...... شاید وہ تھوڑی سی کوشش مزید کرتی تو کسی طرح افشاں کی جان بچنے کا وسیلہ پیدا ہو جاتا لیکن...... وہ کیسے کرتی؟ کیونکر کرتی؟ وہ تو خود نیم دیوانی ہو رہی تھی۔ نشہ آور دوا نے دماغ کے ساتھ ساتھ اس کا گلا بھی یوں جکڑ لیا تھا کہ وہ اپنی آواز خود نہیں سن سکتی تھی۔

وہ روتی رہی اور اس کے دل میں اس بے مہر رات کا نوحہ گونجتا رہا جب اپنے دام میں خود صیاد آ گیا تھا۔

کافی دیر بعد وہ خود کو سنبھال سکی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر نکل آئی۔ جنتے اور مریم کمرے میں بیٹھی لفافے بنا رہی تھیں۔ گلابا کوٹھے کی دھوپ میں بیٹھا تھا اور اپنے بازوؤں پر سرسوں کے تیل کی مالش کر رہا تھا۔ شانی کمرے میں چلی آئی...... اچھی طرح جانتی تھی کہ افشاں کا مجرم کون ہے۔ وہ اس سانحے کے ہر ہر لمحے کی شاہد تھی۔ اسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے؟ اس نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا۔

اخباری خبر سے اس بات کا اشارہ ملتا تھا کہ افشاں کی موت واقع ہو جانے کے بعد سفاک قاسم نے تفتیش کو بھٹکانے کی کوشش کی ہے...... غالباً افشاں کی موت کے بعد بھی ''افشاں کے والدین کا دیا ہوا'' کافی وقت اس کے پاس موجود تھا...... اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی موجودگی کے شواہد وہاں سے مٹائے تھے اور موقع واردات پر کچھ ایسا ردوبدل کیا تھا کہ کیس خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے جان بوجھ کر وہاں کچھ ایسے شواہد چھوڑے ہوں جن کے سبب تفتیش کاروں کا دھیان بھٹک گیا ہو۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر خبر میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے افراد کا ذکر کیوں تھا؟

شانی کا دل چاہنے لگا کہ وہ پچھلے دن کا اخبار دیکھ سکے۔ مگر وہ کہاں سے ڈھونڈا جاتا۔ وہ گھر والوں کو کسی طرح کے شبہے میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کل کے اخبار میں نہ جانے کیا لکھا تھا۔ یقینی بات تھی کہ خبر میں اس علاقے کا ذکر بھی ہوگا جہاں یہ بہیمانہ واردات ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں خود شانی کا ذکر ہونا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ خبر میں یہ مذکور ہو سکتا تھا کہ موقع واردات سے ایک لڑکی غائب ہوئی ہے جو عثمانی کے گھر میں مقیم تھی۔

اب اگر یہ ساری خبر رکشہ ڈرائیور زکریا کی نظر سے گزرتی تو اس کا سارا دھیان کس طرف جاتا؟ یقیناً اس کا ذہن پرسوں رات والے واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا، جب شانی بدحواسی کے عالم میں اس رکشے میں آ بیٹھی تھی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا تھا کہ شانی ہی وہ

لڑکی ہے جو پرسوں رات موقع واردات سے اوجھل ہوئی ہے۔

وہ دل کی گہرائی سے یہ دعا کرنے لگی کہ کل یہ خبر زکریا کی نظر سے نہ گزری ہو، نہ ہی کسی اور ایسے شخص کی نظر سے گزری ہو جو ''افشاں کے قتل'' اور ''شانی کی یہاں موجودگی'' میں ربط ڈھونڈ سکتا ہو۔

افشاں کی دردناک موت کا غم کچھ اس طرح سے شانی کے ذہن پر سوار ہوا کہ وہ اگلے دو روز میں کوشش کے باوجود اس بوجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکی۔ ہر گھڑی افشاں کے آخری لمحات کی بے بسی اور اذیت کا تصور اس کے ذہن میں موجود رہتا تھا۔ اگر معروضی انداز میں دیکھا جاتا تو افشاں کی موت مکافاتِ عمل کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ وہ ایک ایسے والدین کی بیٹی کی موت تھی جنہوں نے شانی کو پناہ دے کر برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ شانی کو اس موت کا بہت غم نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ منفرد لڑکی تھی۔ وہ زخم کھا کر مسکرانے اور پتھر کھا کر پھول پیش کرنے کا میلان رکھتی تھی۔ وہ بدترین دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔

اس کے دل میں بار بار یہ خواہش سر اٹھاتی تھی کہ وہ مظلوم افشاں کے قاتل کے خلاف اپنی گواہی پیش کرے۔ اس کے ابا جی کہا کرتے تھے۔ گواہی ایک امانت ہوتی ہے۔ جو یہ امانت اپنے پاس رکھتا ہے وہ بددیانتی کرتا ہے۔ مگر وہ اس بددیانتی سے کیسے بچ سکتی تھی۔ اس کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ منظرِ عام پر آ سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو دشمنی اور عداوت کا وہ سارا میکنزیم پھر حرکت میں آ جاتا جو اس سے پہلے شانی کو خون کے آنسو رلا چکا تھا۔ قانون کی مدد کرنے کی خواہش میں وہ اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

''کیا میں پس پردہ رہتے ہوئے کچھ کر سکتی ہوں؟'' شانی نے اپنے آپ سے سوال پوچھا۔ ''کوئی گمنام ٹیلی فون؟ کوئی خط؟ کیا ایسا ممکن ہے؟''

وہ متعلقہ ایس ایچ او یا کسی اعلیٰ مقامی پولیس افسر کو تفصیلی خط لکھ سکتی تھی بلکہ اس خط کی کچھ کاپیاں اخبارات کے دفاتر میں بھیجی جا سکتی تھیں۔ یقیناً اس کی تحریر کو زبردست اہمیت دی جاتی۔ وہ اس واردات کی اکلوتی چشم دید گواہ تھی۔ بلکہ قاتل کے خلاف مدعی بھی تھی۔ پھر سچائی کی اپنی طاقت بھی ہوتی ہے۔ وہ سیدھی دل پر اثر کرتی ہے۔ مگر کیا اس کے گمنام بیان کی کوئی قانونی حیثیت بھی ہوگی؟...... اس نے اپنے ابا جی اور تایا معصوم سے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے بیان دینے کے لئے تفتیشی افسر کے سامنے آنا ضروری ہوتا ہے۔

وہ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے ایک

خط ضرور لکھنا چاہئے ... وہ یہ خط لاہور کے کسی دوسرے علاقے سے جا کر پوسٹ کر سکتی تھی۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا تو اس خط سے پولیس کو تفتیش میں مدد تو مل جاتی۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی موجود ہے۔ اس نے چونک کر چق کی طرف دیکھا اور سٹپٹا گئی۔ ٹوٹے ہوئے سرکنڈوں میں کالی آنکھیں موجود تھیں۔ وہ اپنے دھیان میں مگن بے ترتیب لیٹی تھی۔ لباس بھی اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے اوڑھنی سنبھالی اور جسم ڈھانپا۔ اس کا خیال تھا کہ کالی آنکھیں حسب سابق غائب ہو جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ چق میں حرکت پیدا ہوئی اور جنتے کا اول جلول بیٹا اندر آ گیا۔ ''سلاماں لیکم'' اس نے بے ڈھنگی آواز میں کہا۔

شانی نے ہونٹوں کی خاموش جنبش سے جواب دیا۔

گلابے کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ لفافے پر لگی ہوئی چکنائی ظاہر کرتی تھی کہ اس میں کوئی کھانے کی شے ہے۔ گلابے نے اپنی سرمہ لگی آنکھوں کو شتابی سے دائیں بائیں گھمایا۔ جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کوئی اور تو دیکھ نہیں رہا ہے۔ پھر وہ تیزی سے شانی کی چارپائی پر اس سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر بیٹھ گیا۔ اس کے فربہ جسم سے سرسوں کے تیل کی بو آ رہی تھی۔ آنکھیں مٹکا کر بولا۔

''دیکھ شہناز! میں تیڑے لئے گرم گرم جلیب لایا ہوں۔''

''ماسی کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ ہانڈی لینے گئی ہے۔'' گلابے کے لہجے میں دبی دبی مسرت تھی۔

''میں جلیبی نہیں کھاتی۔''

''اوئے دیکھ تو سہی چکھ کے۔'' گلابے نے ایک جلیبی زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

شانی نے ذرا سی چکھ کر واپس رکھ دی۔

''تجھے اوڑ کون سی شے زیادہ چنگی لگتی ہے؟'' گلابے نے رازداری سے پوچھا۔

''میں مٹھائی کھاتی ہی نہیں۔''

''اچھا..... میں تیڑے لئے کل گاجڑ کا مڑبہ بناؤں گا۔'' شانی خاموش رہی۔ وہ چونک کر بولا۔ ''اوہو ...گاجڑ کا مربہ بھی تو میٹھا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا تُو نمک والی شے کھاتی ہے۔ سچی بات ہے کہ نمکین مجھے بھی بڑا پسند ہے۔ لون (نمک) والی مونگ پھلی، پستہ ... تلے ہوئے بادام۔ ایسی بہت ساڑی چیزیں میں نے اوپڑ اپنے چوباڑے میں، پوگڈو سے بچا کڑ رکھی ہوئی ہیں۔'' وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل شانی کے جسم کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے رال بہہ رہی ہے۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ رازداری سے کہنے لگا۔ ''تو رات کو میڑے پاس چوباڑے میں آیا کڑ۔ میں تجھے برا (بڑا) مزہ کڑاؤں گا۔''

اپنی دانست میں وہ شانی پر بڑے مضبوط ڈورے ڈال رہا تھا۔

اتنے میں دروازے کی طرف سے پپو اور گڈو کی آواز آئی۔ وہ سکول سے واپس آ رہے تھے۔ وہ اپنی دھوتی سنبھال کر جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں امی سے بھی کہہ دوں گا۔ تجھ سے زیادہ کام نہ کڑایا کڑے۔ بس تُو نہا دھو کڑ آڑام سے بیٹھا کڑ۔ یا لفافے شفافے بنا لیا کڑ۔''

وہ چلا گیا تو پپو اور گڈو اندر آ گئے۔ پپو عمر میں بڑا تھا مگر دیکھنے میں گڈو بڑا لگتا تھا۔ دونوں کو پڑھائی سے زیادہ گولیاں کھیلنے اور کبوتر اُڑانے کا شوق تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ ایسی فصیح و بلیغ گالیاں سیکھ گئے تھے کہ سن کر شانی کے کان جل جاتے تھے۔ غالباً یہ ہنر بچوں کو اپنے باپ سے ملا تھا۔ زکریا بظاہر مزاج کا دھیما تھا مگر گالیاں گھڑنے اور ڈلیور کرنے میں اسے بھی کمال حاصل تھا۔

رات کو شانی نے پپو کے بستے میں سے کاپی سائز کے چار کاغذ لئے اور ایک قلم بھی خاموشی سے نکال لیا۔ پپو اور گڈو سو چکے تھے۔ دائیں طرف مریم کی چارپائی تھی۔ اس کے سانس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ دن بھر لفافے بنانے کے بعد بے سدھ سو رہی ہے۔ شانی اس کھڑکی کے پاس آ بیٹھی جو برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ اس نے پٹ وا کئے تو برآمدے کے بلب کی مدھم روشنی اندر تک آنے لگی۔ اس روشنی میں شانی نے خط لکھنا شروع کیا۔

یہ ایک تفصیلی خط تھا۔ خط کے آغاز میں شانی نے لکھا۔ ''......میں وہی لڑکی ہوں جو واردات کی رات عثمانی کے گھر سے غائب ہوئی۔ اپنی کچھ ناگزیر مجبوریوں کے سبب میں سامنے نہیں آ سکتی......اور نہ ہی آئندہ آؤں گی۔ بہر حال جو کچھ میں واردات کے حوالے سے آپ کو لکھ رہی ہوں وہ حرف بحرف درست ہے۔''

اس تمہید کے بعد شانی نے واردات کی رات پیش آنے والے سارے واقعات پوری صداقت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے۔ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھا۔ اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ عثمانی کی کمینگی اور ماجدہ کی منافقت کے بارے میں بھی سب کچھ لکھ ڈالے مگر پھر اس نے اپنا قلم روک لیا۔ ان کے کئے کی سزا انہیں خوب مل رہی تھی۔ عثمانی ہارٹ اٹیک کا شکار

ہوکر ہسپتال میں تھا اور یقیناً ماجدہ بھی دن میں کئی بار مر کر جیتی ہوگی۔

خط مکمل کرنے کے بعد شانی نے اسے تکیے کے غلاف میں سنبھال کر رکھا اور پوسٹ کرنے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خط "پوسٹ کرنے" کے حوالے سے وہ کس نئی افتاد کا شکار ہونے والی ہے

☆======☆======☆

تیسرے روز دوپہر کو جب گلابا سو رہا تھا اور جنتے بچوں کے لئے دو چار کپڑے لینے بازار گئی ہوئی تھی، شانی گھر سے نکل آئی۔ اس نے مریم کو بتایا تھا کہ وہ شاہدرہ میں اپنی سہیلی کا گھر ڈھونڈنے جا رہی ہے۔ پچھلے سات آٹھ دنوں میں وہ جنتے کے کہنے پر تھوڑے تھوڑے لفافے بناتی رہی تھی۔ کل جنتے کو لفافوں کا معاوضہ ملا تھا اور اس میں سے ایک سو پندرہ روپے اس نے حوصلہ افزائی کے طور پر شانی کو دے دیئے تھے۔ اب یہ ایک سو پندرہ روپے شانی کے پاس موجود تھے اور وہ خط بھی جو اس نے لکھا تھا۔

جنتے کی ایک سوتی چادر میں لپٹی لپٹائی وہ بستی سے باہر نکلی۔ پاؤں میں وہی قینچی چپل تھی جو اس نے عثمانی کے گھر سے بھاگتے ہوئے پہنی تھی۔

پہلے اس نے ایک جنرل سٹور سے خط کی پانچ فوٹو سٹیٹ کاپیاں کروائیں، پھر ڈاک خانے پہنچ گئی۔ ڈاک خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گئی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں سکیڑیں...... نہیں...... اس کی نگاہ دھوکہ نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی چہرہ تھا۔ اس کے سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک ایک تیز سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ جالاں تھی۔ چوہدری مہر کی ذاتی اور بااعتماد ملازمہ۔ وہ درندہ صفت ملازم اکبرے کی رشتے دار بھی تھی۔ نارپور کی حویلی میں خطرناک پرچھائیں کی طرح پھرنے والی اس عورت کی آواز شانی نے آخری بار اکبرے کے کمرے میں ہی سنی تھی۔ شانی اکبرے کی بے رحم گرفت میں تھی۔ اکبرے کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کوبرا شانی کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر پھنکار رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جالاں نے داخل ہوکر چوہدری مہر کے کان میں کھسر پھسر کی تھی۔ وہ چوہدری مہر کو یہ بتانے کے بعد کہ فاخر واپس آگیا ہے تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

یہ سارے خیالات شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ اس نے تیزی سے اپنا رخ پھیرا اور واپس پلٹی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جالاں کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑ گئی ہے اور وہ اسے پہچاننے کی

کوشش کر رہی ہے۔ ڈاک خانے کی سیڑھیاں اُتر کر شانی تیز قدموں سے واپس چل دی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی منہ بالکل خشک ہوگیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ایک تنگ گلی کے سامنے بدھ بازار کا رش تھا۔ وہ اس رش میں سے گزرتی ہوئی گلی میں داخل ہوگئی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ گلی آگے جا کر اسی نسبتاً چوڑی گلی سے مل جائے گی جو اسے کریم پورہ میں لے جائے گی۔ کریم پورہ اس بستی کا نام تھا جہاں وہ آج کل رہ رہی تھی۔

سوڈیڑھ سو میٹر چلنے کے بعد وہ ایک دوسری گلی میں مڑی۔ دوسری گلی میں مڑتے ہوئے اس نے دل کڑا کر کے اپنے عقب میں جھانکا...... اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے بدترین اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ جالاں نے ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر اسے پہچان لیا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ جالاں کا قدرے بھاری جسم تیزی سے جھولتا اور آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ کالے رنگ کی چادر میں تھی۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی شانی کے قدموں میں اور تیزی آگئی۔ شاید دس پندرہ قدم اس نے بھاگ کر بھی طے کئے۔ وہ زیادہ دور تک بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ نوجوان دیواروں سے لگے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں کوئی میلی کچیلی عورت بھی دہلیز پر کھڑی نظر آتی تھی۔ ایک غبارے بیچنے والے سے ٹکراتی ہوئی اور ایک پرنالے کے گندے چھینٹوں سے بچتی ہوئی وہ کریم پورہ جانے والی گلی میں آگئی۔

اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے، بس وہ چلتی جا رہی تھی۔ ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے ہوئے اسے اپنے عقب میں تیس چالیس قدم کے فاصلے پر ایک ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ٹھہرو...... بات سنو......"

یہ کس کی آواز تھی؟ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ یہ جالاں کی آواز ہے۔

لیکن وہ رک سکتی تھی اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکتی تھی۔ کریم پورہ میں داخل ہوتے ہی وہ قدرے پُرسکون ہوگئی۔ یہاں تنگ گلیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے دو تین گلیاں تبدیل کیں۔ جہاں کہیں اسے چند قدم بھاگنے کا موقع ملا، وہ بھاگی بھی۔ جلد ہی وہ اپنے عقب سے مطمئن ہوگئی۔

شکر تھا کہ جنتے ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ گلابا بدستور سویا پڑا تھا۔ بچے سکول میں تھے۔ مریم چھوٹے کمرے میں لفافے بنا رہی تھی۔ شانی نے بڑے کمرے میں جا کر چادر اتار پھینکی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ سردی کے باوجود جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ لاہور کی اس گنجان آبادی کے ایک ڈاک خانے پر اسے نارپور کی حویلی کا ایک چہرہ نظر آجائے گا۔

صورتِ حال ایک دم ہی کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ اب تک وہ اپنے لواحقین کے لئے ''مری ہوئی تھی'' (عین ممکن تھا کہ نارپور یا رنگ والی میں اس کی قبر بھی وجود میں آچکی ہو) لیکن آج والے واقعے کے بعد وہ مُردہ نہیں رہی تھی۔ اسے جالاں نے دیکھ لیا تھا اور اب جالاں سے یہ خبر برق کی رفتار سے نارپور پہنچنے والی تھی۔

عین ممکن تھا کہ شروع میں جالاں کی بات پر یقین نہ کیا جاتا۔ اس کے بیان کو وہم قرار دیا جاتا ..... نظری دھوکا سمجھا جاتا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ جالاں عام ملازمہ نہیں تھی۔ چہیتے ملازم اکبرے کی رشتے دار ہونے کی وجہ سے اسے حویلی میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ وہ بڑی چوکس اور ہوشیار کارکن سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ حویلی کی راکھ میں سے شانی کی لاش تو برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ مُردہ تصور کی جاچکی تھی تو یقیناً کسی اور کی باقیات کو ہی اس کی باقیات سمجھ کر ''آخری آرام گاہ'' میں پہنچایا گیا ہوگا۔ اس قسم کے حالات میں ذہنوں میں شبے تو بہرصورت موجود رہتے ہیں۔ برسوں تک لوگ سوچتے رہتے ہیں، شاید یوں ہوگیا ہو...... شاید یوں ہوگیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ نارپور جاکر جالاں جو بیان دینے والی ہے، وہ جلد ہی زبردست اہمیت اختیار کرلے گا۔ وہ سوچتی رہی اور اپنے پریشان ذہن میں مستقبل کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتی رہی۔

جو کام وہ کرنے گئی تھی، وہ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔ خط اور اس کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں ابھی تک اس کے سامنے دھری تھیں۔ سب سے پہلے اس نے ان کاغذات کو چھپایا پھر منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی۔

☆======☆======☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ شانی برتن دھونے کے بعد ذرا سستانے کے لئے کمرے میں آکر لیٹ گئی، گلابا پہلوانی کرنے اکھاڑے گیا ہوا تھا۔ وہ جب تک گھر میں رہتا تھا دزدیدہ آنکھوں سے اسے تکتا رہتا تھا۔ عجیب داہیات نگاہ تھی اس کی۔ معاملہ اگر دیکھنے تک رہتا تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے گاہے بگاہے شانی کو ''ایمپریس'' کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ کبھی بہانے بہانے سے شانی کو اپنا ورزشی جسم دکھاتا، کبھی اپنی کسی ''تاریخی'' کشتی کا قصہ سنانے بیٹھ جاتا، کبھی کھانے کی کوئی شے چپکے سے شانی تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔

اس کی اوٹنگی بونگی حرکتوں کی وجہ سے بعض اوقات شانی کے اداس ہونٹوں میں مسکراہٹ کا ارتعاش پیدا ہوجاتا۔

اس وقت وہ گھر سے باہر تھا لہٰذا شانی قدرے سکون محسوس کررہی تھی۔ جنتے کسی پڑوسن کی چغلیاں کھانے کسی دوسری پڑوسن کی طرف گئی ہوئی تھی۔ بچے چھت پر کبوتر بازی کی مشق کررہے تھے۔ شانی کو لیٹے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی۔ پہلے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند تھا لیکن اب چونکہ ہوا سے کھل گیا تھا لہٰذا آواز بہ آسانی شانی کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ مریم کی آواز تھی۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ شانی سورہی ہے۔ کھڑکی میں سے گلی کے پار نذیر سبزی والے کا دومنزلہ مکان نظر آرہا تھا۔ بالائی کمرے کی کھڑکی میں کوئی موجود تھا۔ شانی نے ذرا دھیان سے دیکھا۔ یہ نذیر کا بڑا بیٹا اکی تھا۔ مریم اس کے ساتھ اشارے بازی میں مصروف تھی۔ اکی کے ہاتھ میں گنا تھا۔ وہ گنا چوسنے کے ساتھ ساتھ مریم کو الٹے سیدھے اشارے بھی کررہا تھا۔ جوابی طور پر مریم بھی ادائیں دکھارہی تھی۔ شانی نے ناگواری سے کروٹ بدل لی۔ بہرحال اس کا دھیان مریم ہی کی طرف رہا۔ وہ ماں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھارہی تھی۔

چند منٹ بعد اس نے پھر کروٹ بدل کر دیکھا۔ اشارے بازی کا کھیل جاری تھا پھر شاید مریم کو شک ہوا ہوگا، اس نے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کردیا۔ شانی کو الجھن سی ہونے لگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لڑکے کو کمرے میں ہی بلالے؟ اس نے بے چینی سے سوچا۔

وہ آواز پیدا کئے بغیر چارپائی سے اٹھی اور کھڑکی تک پہنچی اور کھلی کھڑکی میں جھانک کر اسے اتنا اطمینان تو ہوگیا کہ وہ کمرے میں اکیلی ہی ہے۔ بہرحال اس کی حرکات وسکنات ہرگز قابلِ اطمینان نہیں تھیں۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کی فرمائش پر اپنی قمیص کا پلو اوپر تک اٹھا رہی تھی۔ پھر اسے اپنے جوبن کی ایک جھلک دکھا کر اس نے پلو نیچے گرالیا اور شرماتی اور ہنستی ہوئی برآمدے کی طرف بھاگی۔

یہی وقت تھا جب جنتے اندر داخل ہوئی۔ ماں بیٹی کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ ''کس بات کی خوشیاں چڑھی ہوئی ہیں تجھے حرام زادیئے۔'' جنتے نے دانت پیس کر مریم کو دوہتڑ مارا۔

''مم...... میں نے کیا کیا ہے امی۔'' مریم ہکلائی۔

''میں تیرا بوتھا توڑ دوں گی چپیڑ مار کر۔ مجھے پتا ہے وہ جیرے کا لڑکا اوپر کھڑا ہے کھڑکی میں۔ اس سے آنکھ مٹکا کررہی ہے تو ...''

"تم تو ویسے ہی ڈانگ لے کر میٹرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ میں تو لیٹی ہوئی تھی کمرے میں۔"

"مجھے سب پتا ہے تیرے لیٹنے کا...... آنے دے آج تیرے پیو کو۔ تیری ہڈیاں نہ تڑوائیں تو میرا نام نہیں......" جنتے زہریلی سرگوشی میں بولی۔ لگتا تھا کہ شانی کی موجودگی کے سبب وہ دبے لہجے میں بول رہی ہے۔

"مڑوالینا...... مڑوالینا...... جان سے مڑوالینا مجھے۔" وہ جل کر بولی۔

مریم کی زبان چلتے دیکھی تو جنتے نے ایک اور دوہتڑ اس کے سر پر مارا۔ "ہاں جب بہت کچھ ہو گیا تو پتا چلے گا تجھے اور تیرے پیو کو......"

مریم جنتے کو ایک طرف دھکیلتی ہوئی غصے میں چوبارے کی طرف چلی گئی۔ جنتے وہیں کھڑی بڑبڑاتی رہی۔

شانی جلدی سے دوبارہ چارپائی پر لیٹ گئی اور یہ ظاہر کرنے لگی کہ وہ نڈھال ہو کر سوئی ہوئی ہے۔

جنتے نے کمرے میں آ کر محتاط نظروں سے شانی کو دیکھا۔ ایک دو بار کھنکاری۔ تاکہ پتا چل سکے کہ شانی جاگ تو نہیں رہی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کمرے کی کھڑکی زوردار آواز سے بند کی۔ یہ وہی کھڑکی تھی جس میں سے نوخیز مریم تاکا جھانکی کر رہی تھی۔ کھڑکی اور دروازہ بند کر کے وہ صحن میں آ گئی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر گھومنے اور بڑبڑانے کے بعد وہ پھر پڑوسن کی طرف چلی گئی۔ وہ غالباً بڑھتی ہوئی سردی کے سبب، اپنا سویٹر پہننے کے لئے گھر آئی تھی۔ مریم کی بدقسمتی کہ اس کے بوائے فرینڈ پر اس کی نظر پڑ گئی۔

جنتے کے جانے کے بعد شانی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں مریم بھی سیڑھیاں اُترتی نیچے چلی آئی۔ اس کا ایک گال ابھی تک سُرخ ہو رہا تھا۔ بہرطور شانی نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی مارکٹائی سے باخبر ہے۔ ماں کے حوالے سے مریم کا موڈ بڑا خراب نظر آ رہا تھا۔ وہ شانی کے پاس بیٹھ گئی۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "آپاں! تجھے لفافوں کے کتنے پیسے دیئے تھے امی نے؟"

شانی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک سو پندرہ روپے...... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ انتقامی انداز میں مسکرائی۔ "امی نے پورا ڈھائی سو لیا تھا لفافوں والے سے...... وہ تجھے کبھی پورے پیسے نہیں دے گی ... اور تجھے تنگ بھی بہت کرے گی...... سارا دن کھوتے کی طرح کام کرائے گی تجھ سے۔"

"مریم! اپنی ماں کے بارے میں تم کس طرح سے بات کرتی ہو۔"

"کوئی ماں شاں نہیں ہے میٹری۔ مجھے پیدا کرنے والی تو مر گئی۔ میں تب مشکل سے دو ڈھائی سال کی تھی۔ میٹرے ابّے نے دوسری شادی کی۔ یہ بھائی گلابا میٹری اس دوسری ماں کے ساتھ ہی آیا تھا۔"

"اور پپو، گڈو؟"

"وہ دونوں بعد میں پیدا ہوئے۔"

شانی کو یہاں رہتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے اور آج پہلی بار اس پر یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ مریم جنتے کی سگی بیٹی نہیں ہے۔

ابھی شانی اور مریم باتیں کر رہی تھیں کہ جنتے اچانک اندر داخل ہوئی۔ اس وقت مریم پھر لفافوں اور ان کے معاوضے وغیرہ کی بات کر رہی تھی۔ وہ شانی کو بتا رہی تھی کہ درمیانے سائز کے لفافے اٹھارہ روپے میں سو تیار ہوتے ہیں۔ شاید مریم کے ایک دو لفظ جنتے کے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ اندر آنے کے بعد کڑی نظروں سے مریم کو دیکھنے لگی۔ مریم نے بُرا سا منہ بنایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی پھر سے چوبارے کی طرف چلی گئی۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی دھی رانی؟" جنتے نے شانی سے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ماسی...... ویسے ہی باتیں کر رہے تھے ہم۔"

"یہ ایک فتنی ہے۔ مجھ سے زیادہ بھلا کون جانے گا اسے۔ مجھے پتا ہے، یہ تجھ سے ان ایک سو پندرہ روپوں کی بات کر رہی ہوگی جو میں نے تم کو دیئے۔"

شانی خاموش رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے دل ہی دل میں جنتے کی "زودفہمی" پر داد دی۔

شانی کی خاموشی کو جنتے نے "ہاں" سمجھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر شانی کے قریب بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ "کُڑیے! یہ بات ٹھیک ہے کہ لفافوں کے ڈھائی سو روپے ہی ملے تھے۔ میں نے تجھ کو ایک سو پندرہ دیئے باقی ایک سو پینتیس روپے تیری امانت کے طور پر میرے پاس پڑے ہیں۔ آگے بھی جو تیرے پیسے ہوں گے وہ تیرے ہی رہیں گے۔ تیرے ہی کام آئیں گے۔ تُو جیسے کہے گی ویسے کرلیں گے۔"

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جنتے نے خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اپنی ان باتوں کی وجہ سے ہی تُو مجھ کو چنگی لگتی ہے۔ اللہ دی قسمے! کبھی کبھی تو میں مریم سے زیادہ تجھے اپنی دھی سمجھنے لگتی ہوں۔ تیرے

بارے میں کئی طرح کے خیال میرے دل میں آنے لگتے ہیں......'' اس نے ذرا توقف کیا اور بولی ''کسی وقت سوچتی ہوں تیرے جیسی نوں (بہو) مجھے مل جائے تو میرا اگلا وقت آسان ہو جائے۔''

شانی نے چونک کر جنتے کی طرف دیکھا۔

وہ ہوشیاری سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے گلابے کو بھی تُو چنگی لگتی ہے۔ گلابے کی ایک پھوپھی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتی ہے۔ میں نے تو بھئی صاف انکار کر دینا ہے اس کو۔ امیر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔ مجھے تو اپنی من مرضی کی ووہٹی چاہئے......'' پھر وہ بات کرتے کرتے ایک دم چونک کر بولی۔ ''ہاں شہناز! میں تجھے بتانا ہی بھول گئی۔ گلابے کو نئی دکان کے لئے جگہ مل گئی ہے۔ بڑا موقع کا اڈہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں سے دکان پر جانے لگے گا...... تجھے کیا بتاؤں...... کتنا ہوشیار منڈا ہے یہ...... اوپر سے بالکل اونگا بونگا لگتا ہے، پر اپنے کاروبار میں ایک دم چوکس ہے۔ دیکھنا اس نے چار چھ مہینے میں ہی گھر کی حالت بدل دینی ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے ابے کو بھی ہر حال میں نیا رکشہ لے کر دینا ہے اور مجھے پتا ہے رکشے کے فوراً بعد اس کے دماغ میں اپنا مکان بنانے کی بات آنی ہے۔''

شانی ہولے ہولے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ وہ چھوٹی چوہدرانی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد مال وزر کے ڈھیر دیکھے تھے۔ وہ اب بھی لاکھوں کی جائیداد کی وارث تھی اور یہ عورت اس کے سامنے اپنے ''کماؤ پتر'' کی تعریفیں کر کے اس کا ذہن بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ شانی کو اپنی بہو بنانے کا حتمی فیصلہ کر کے اس پر بہت بڑا احسان کرے گی۔

اگلے روز شام کو جب جنتے محلے کے ڈاکٹر سے چھوٹے گڈو کی دوا لینے گئی ہوئی تھی، مریم پھر سے اس کے پاس آ بیٹھی۔ اپنی سوتیلی ماں کے حوالے سے اس کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں تھا۔ گلابا اوپر چوبارے میں بیٹھا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر ایک لوفر سا پنجابی گانا بار بار بجا رہا تھا۔

مریم نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بھا گلابا کسی دن کسی لڑکی سے ضرور جوتیاں کھائے گا۔ اس کی عقل مت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''ماسی بتا رہی تھی کہ گلابے کو نئی دکان مل گئی ہے؟''

''دکان؟'' مریم نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ ''ریڑھی کہو آپاں ریڑھی۔ یہ کل سے ریڑھی لگا رہا ہے مین مارکیٹ کی پیچھے والی گلی میں۔ امی نے تمہیں بالکل غلط بتایا ہے۔ تم بھی

سیانی بیانی ہو۔ اتنی پاگل تو نہیں۔ تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا آپاں

لئے گھیر رہی ہے۔ بھا گلابے کو تو کوئی لولی لنگڑی بھی نہیں مل سکتی۔ تم

تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ آج کل دن رات اسی چکر میں ہے کہ

بنا دے۔ ایک دفعہ بھا گلابے کے ساتھ تیرا نکاح ہو گیا ناں پھر دیکھنا اس کا اصل

سچ کہتی ہوں آپاں! دن رات لفافے بنوا بنوا کر تیری انگلیاں ڈنگی (ٹیڑھی) کروا دے گی۔''

شانی نے کہا۔ ''وہ تو کہتی تھی گلابے کی گول چکر والے بازار میں دکان تھی جو گلابے نے خود چھوڑی ہے۔ اب اچھی جگہ دکان لے رہا ہے۔''

مریم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ ''وہاں بھی مربے اور اچار کی ریڑھی لگاتا تھا آپاں...... صوفی مشتاق کی دکان کے سامنے بیٹھتا تھا۔ اسے روز کے پچاس روپے کرائے کے دیتا تھا۔ ایک دن صوفی کو کسی کام سے جانا پڑ گیا۔ اس نے گلابے کو کہا کہ ذرا ہوشیار ہو کر بیٹھو میں ابھی آ جاتا ہوں۔ گلابے نے ہوشیار کہاں ہونا تھا۔ روز سویرے تین لمبے گلاس تو شردائی کے پی کر جاتا ہے۔ اوپر سے کبھی کبھی افیم بھی کھا لیتا ہے۔ اِدھر صوفی کام سے نکلا اُدھر بھا گلابا ریڑھی پر ماتھا رکھ کر سو گیا۔ دو مانگنے والی عورتیں صوفی کی دکان میں گھسیں۔ گدی کے نیچے سے چابی نکال کر صوفی کا غلہ صاف کر دیا اور دو چار ہزار کا سامان بھی اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے گئیں۔ تم کو پتا ہی ہوگا کہ منیاری کا سامان کتنا مہنگا ہوتا ہے بس پھر اسی دن شام کو صوفی مشتاق نے بھا گلابے کو دھکے مار مار کر گھر بھیج دیا۔ سارا مربہ اور اچار بھی اس نے جرمانے کے طور پر رکھ لیا۔ بس لوگوں کے کہنے سننے پر خالی ریڑھی واپس کی۔''

''لیکن...... گلابا تو اپنے طور پر بڑا پہلوان بنتا ہے؟'' شانی نے مریم کو اکسایا۔

وہ چمک کر بولی۔ ''تم کس پہلوانی کی بات کرتی ہو آپاں...... میٹرک کی ایک استانی کہا کرتی تھی کہ سکولوں میں انگریزی اس لئے پڑھائی جاتی ہے کہ وہ بچے بھی فیل ہو سکیں جو کسی اور طرح فیل نہیں ہوتے۔ اسی طرح بھا گلابا بھی اس لئے کشتیاں لڑتا ہے کہ وہ لوگ بھی جیت سکیں جو پہلے کبھی نہیں جیتے۔ حرام ہے جو بھا گلابے نے آج تک کوئی کشتی جیتی ہو۔ بس ایک بار وہ بارہ سو روپے کا انعام لے کر آیا تھا اس بات کا پتا آج تک نہیں چل سکا کہ وہ کون سا جھاڑا پہلوان تھا جو بھا گلابے سے بھی ہار گیا......''

شانی مریم کی باتیں سنتی رہی اور سر دھنتی رہی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مریم غلط بیانی نہیں کر رہی۔ کم از کم اس معاملے میں وہ صاف گوئی سے کام لے رہی تھی شانی نے حویلی سے نکلنے کے بعد دنیا کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھا تھا۔ اسے ابھی تک اپنے اردگرد

جھوٹ اور مکر وفریب ہی نظر آیا تھا۔ اس نے تا حال جس طرف نگاہ اٹھائی تھی، مطلب پرستی، ابن الوقتی اور حرص وہوس کے تاریک سائے دیکھے تھے۔ ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی سطح پر اپنے مفاد کو ''خدا'' بنا رکھا تھا۔ کامی اور سکندرے سے لے کر قاسم اور جنتے تک ہر چہرے کے پیچھے اسے ایک اور چہرہ دکھائی دیا تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ زکریا گھر آیا تو خوش نظر آتا تھا۔ وہ آج خلاف معمول رکشہ دروازے پر ہی لے آیا تھا۔ گلابے کے ساتھ مل کر اس نے رکشے پر سے ایک 18 انچ کا رنگین ٹی وی اتارا۔ اس ٹی وی کو بڑے چاؤ کے ساتھ پرانے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی جگہ دے دی گئی۔ بچے بھی خوش نظر آرہے تھے۔ سب گھر والے رات گئے تک ٹی وی کے گرد جمع رہے۔ مریم تھکی ہوئی تھی، وہ جلدی سوگئی۔ اس کی دیکھا دیکھی شانی بھی دس ساڑھے دس بجے تک سوگئی۔

رات ایک بجے کے قریب اتفاقاً شانی کی آنکھ کھلی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہورہی تھی۔ وہ پانی پینے کے لئے باورچی خانے کی طرف گئی۔ زکریا اور جنتے کے کمرے والا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی ہورہی تھی۔ باورچی خانے کی نیم تاریکی میں سے کمرے کا منظر صاف نظر آنے لگا۔

میز پر پلیٹوں میں روسٹ چکن اور روغنی نانوں کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے...... اندازہ ہوتا تھا کہ بچوں کو سلانے کے بعد زکریا اور جنتے نے زبردست ''ڈنر'' کیا ہے۔ اب جنتے جامنی رنگ کے مخمل کا ایک قیمتی سوٹ پہنے کھڑی تھی۔ آئینے کے سامنے گھوم گھوم کر وہ اپنے فربہ جسم کا جائزہ بھی لے رہی تھی، شانی کو اس کے کانوں میں پتلی بالیوں کی جگہ وزنی بُندے نظر آئے۔ غالباً یہ بھی سونے کے ہی تھے۔ سوٹ بھی نیا تھا۔

پانی پینے کے بعد شانی واپس بستر پر جالیٹی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی اور اس صورتِ حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رکشہ ڈرائیور زکریا کے پاس اچانک کافی روپے آگئے ہیں۔ کل شام شانی نے اس کی کلائی پر ایک نئی نکور گھڑی بھی دیکھی تھی۔

اس گھر میں زکریا واحد شخص تھا جس کا ظاہر و باطن، شانی کو ایک جیسا لگا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ صاف سیدھی بات کرتا ہے اور دل میں میل نہیں رکھتا۔ مگر اب شانی کو لگ رہا تھا کہ شاید اس شخص کے حوالے سے بھی کوئی گڑبڑ موجود ہے...... یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا۔ بدقسمتی سے، حویلی چھوڑنے کے بعد شانی کو جو زیادہ تر افراد ملے وہ دہرے چہرے رکھتے

تھے۔ اب شانی کو ہر چہرے کے پیچھے ایک چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے خود سے سوال کیا... کہیں تم بے جا قنوطیت کا شکار تو نہیں ہورہی ہو۔ کچھ دیر تک زکریا اور جنتے کے بارے میں سوچنے کے بعد اس کا دھیان ایک بار پھر چند روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ اس کی نگاہوں میں جالاں کا بھاری بھرکم چہرہ گھومنے لگا اور وہ سارے منظر یاد آنے لگے جو جالاں کو ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر دیکھنے کے بعد نظر آئے تھے۔ بے نام اندیشے سوچ کی لہروں میں اُبھرتے اور ڈوبتے رہے۔ بستی کی کچی تنگ گلیوں میں ایک ٹھٹھری ہوئی تاریک رات سنسناتی رہی۔ ساتھ والے کمرے سے زکریا اور جنتے کی ناقابلِ فہم سرگوشیاں ابھرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ کھدر کے لحاف میں دبکی دبکی پھر سے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دیوی

2

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف کمپوزر۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

دوسرے روز مطلع صاف تھا اور دو تین بعد اچھی دھوپ نکلی تھی۔ شانی نے نہا دھو کر کپڑے پہنے۔ یہ ماجدہ کا وہی ڈھیلا ڈھالا لباس تھا جو عثمانی کے گھر سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے شانی نے پہن رکھا تھا۔ قاسم کی دست درازی کے دوران یہ کپڑے ایک دو جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ جنتے نے دستی سلائی مشین کے ذریعے انہیں مرمت کر دیا تھا۔ گلابا گھر میں نہیں تھا۔ چھت پر دھوپ موجود تھی۔ شانی بال سکھانے کے لئے چھت پر چلی گئی۔

ٹیڑھی میڑی گلیوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں والی یہ بستی سہ پہر کی دھوپ میں ستا رہی تھی۔ آسمان پر چھوٹی چھوٹی پتنگیں تھیں۔ چھتوں کی منڈیروں پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے اور مکینوں کی نقل و حرکت نظر آتی تھی۔ نیچے کمرے میں بچے اپنے ٹی وی کے گرد جمع ہو کر شور مچانے لگے، نئے کپڑوں میں ملبوس جنتے اپنی کرخت آواز میں انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔

اچانک شانی نے زکریا کو تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ صحن میں آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا پھر مدھم آواز میں جنتے سے کچھ پوچھا۔ اس کے بعد وہ بڑی تیزی سے چھت پر گیا۔ اس نے ڈبی دار مفلر کانوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ شلوار قمیص پر تیل کے دھبے تھے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو نیچے اترو۔'' وہ متفکر لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''نیچے چلو بتاتا ہوں تمہیں۔'' زکریا نے کہا اور شانی کو اپنے ساتھ نیچے کمرے میں لے آیا۔ دروازہ بھیڑ کر بولا۔ ''شہناز دیکھ...... میں نے تم کو پہلے دن کہا تھا کہ اگر تم نے پچھلے گھر میں کوئی الٹا پلٹا کام کیا ہے تو مجھے بتا دو...... میں بھلا مانس شریف بندہ ہوں۔ تمہارے

لئے کسی چکر میں پھنسنا نہیں چاہتا۔"

"ہوا کیا ہے چاچا؟"

وہ شانی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے ہم کو اب تک یہ بھی نہیں بتایا کہ تُو کام کہاں کرتی رہی ہے۔ سب کچھ چھپا رہی ہو ہم سے۔"

"چاچا! میں نے بتایا تو تھا کہ مجھے گھر کے نمبر شمر کا پتا نہیں ہے، گلزار ٹاؤن میں کوئی اعجاز صاحب تھے... "

وہ شانی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "آج دوپہر کونسلر مجید صاحب کے پاس دو بندے آئے تھے۔ ان کے ساتھ سادہ کپڑوں میں ایک پلس والا بھی تھا۔ وہ یہاں کریم پورہ میں کسی لڑکی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے جو حلیہ بتایا ہے وہ تم سے ملتا جلتا ہے۔ کپڑے بھی اسی رنگ کے ہیں جو تم نے پہنے ہوئے ہیں۔"

شانی کا دل سینے میں پھڑ پھڑ کر رہ گیا۔ تاہم اس نے اپنے چہرے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہوں میں جالاں کا سراپا گھومنے لگا تھا......

"مم...... مجھے کوئی کیوں ڈھونڈے گا چاچا ......زیادتی تو میرے ساتھ ہوئی ہے، میں نے تو کسی کے ساتھ ......زیادتی نہیں کی۔"

"مجھ کو اس بات کا پتا نہیں۔ کچھ لوگ تم کو ڈھونڈتے پھڑ رہے ہیں۔ مجھے پکا یقین ہے وہ تمہاڑے لئے ہی آئے تھے۔ کیا پتا کل پھڑ آ جائیں۔ یہ بات چھپائی نہیں جا سکتی کہ تم یہاں ہو۔ محلے کے بہت سے لوگوں کو تمہاڑے باڑے میں پتا ہے۔"

"یہ پتا نہیں چلا کہ وہ آئے کہاں سے تھے؟" شانی نے پوچھا۔

"نہیں انہوں نے یہ تو نہیں بتایا۔ پر یہ پتا چلا ہے کہ ان میں سے ایک بندہ کسی گاؤں کا چوہدڑی شوہدڑی لگتا تھا۔"

شانی کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اَن گنت اندیشے عفریت کی طرح چنگھاڑنے لگے تھے۔ جالاں......اور چوہدری ٹائپ......یہ دونوں اشارے ایک خاص سمت کو جا رہے تھے۔

اسی دوران میں جنتے بھی اندر آ گئی۔ زکریا نے شانی کے سامنے ہی اسے بھی اس نئی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ وہ زکریا سے بڑھ کر فکر مند نظر آنے لگی۔ پھر شانی کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر میاں بیوی کھسر پھسر کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

شام کے کچھ دیر بعد ایک اور واقعہ ہو گیا۔ زکریا تب تک رکشہ لے کر اپنے کام پر واپس

جا چکا تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جنتے نے جا کر دروازہ کھولا... شانی نے باہر کھڑے بندے کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اونچا لمبا تھا۔ وہ کچھ دیر تک جنتے سے بات کرتا رہا۔ تب جنتے اسے لئے بیٹھک نما کمرے میں آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔

پانچ دس منٹ بعد وہ شخص ساتھی سمیت واپس چلا گیا۔ جنتے بیٹھک سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ سیدھی شانی کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "وہی ہوا ہے جس کا ڈر تھا، کونسلر مجید کو شک پڑ گیا ہے۔"

"کس بات کا شک ماسی؟"

"تجھے سارا پتا ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ تُو ہمارے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرنے والی ہے۔" جنتے نے کہا۔

اتنے میں مریم وہاں آ گئی۔ "کیا ہوا ہے امی۔" اس نے پوچھا۔

"تیری ماں کا سر ہوا ہے۔" جنتے نے چیخ کر کہا۔ "جا تُو وہاں کمرے میں جا کر اپنے یار سے اکھ مٹکا کر......ہم کوئی اپنی بات کر رہے ہیں۔"

مریم نے بُرا سا منہ بنایا اور باغیانہ انداز میں تن کر چلتی ہوئی چوبارے کی طرف چلی گئی۔

جنتے کا موڈ بدستور بگڑا ہوا تھا۔ وہ تند لہجے میں شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تُو......وہاں ڈیوڑھی میں کیا کرنے چلی آئی تھی۔ کل سے دس بار بکواس کی ہے تجھ سے کہ اندر کمرے میں رہ......"

"میں تو دروازے کی آواز سن کر آئی تھی ماسی۔"

"شکر کر کہ کونسلر مجید نے تجھے دیکھا نہیں۔ ورنہ ابھی موٹر سائیکل پر دھر کر اپنے ساتھ لے جاتا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے سے باہر کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد گاڑی کے دروازے بند ہوئے۔

جنتے نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "ہائے میں مر گئی۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ پھر آ گیا ہے۔"

اس نے شانی کو فوراً کمرے میں جانے کا کہا۔

جنتے کا اندازہ غلط تھا۔ آنے والا کوئی اور نہیں زکریا تھا۔ وہ رکشے کے بجائے گاڑی میں آیا تھا۔ سیدھا شانی کے پاس پہنچا۔ "چل بھئی شہناز......یہاں سے نکل چل ......وہ زور والے لوگ ہیں۔ تجھے زبردستی یہاں سے لے جائیں گے۔ پھڑ پتا نہیں کیا حشر ہو گا

تیزا چل شاباش "

"لیکن چاچا....."

"دیکھ....تُو خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کر...دیر ہوگئی تو پچھتانا پڑے گا۔"

"پپ پر جانا کہاں ہے؟"

"یہاں ماڈل ٹاؤن میں ایک بہت اچھے جج صاحب ہیں۔ میں ان کی بچی کو سکول سے لاتا ہوں۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ فی الحال میں تجھ کو وہاں لے جاتا ہوں۔ پھر دیکھ لیں گے جو کرنا ہوگا...وہ بہت نیک بندے ہیں۔ تجھے وہاں کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوگی۔"

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال وہ پچھلے تین چار ہفتوں سے اس چار دیواری میں تھی.....اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی چکا تھا کہ کسی حد تک زکریا وغیرہ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

جنتے کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ اس کی رائے بھی یہی تھی کہ شانی فوراً یہاں سے کسی اور جگہ منتقل ہو جائے۔ اس نے شوہر کو کونسلر مجید کی آمد کے بارے میں بھی سب کچھ بتایا۔

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد شانی نے زکریا سے کہا۔ "ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی....."

دس منٹ بعد شانی جنتے کی موٹی سوتی چادر میں لپٹی لپٹائی ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔ زکریا اسی ٹیکسی میں یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ غالباً اس نے اپنے کسی دوست سے لی تھی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے روانہ ہوگئی۔ گھر چھوڑنے سے پہلے شانی نے ایک ضروری کام کیا تھا۔ اس نے پولیس کو لکھا جانے والا خط اور اس کی فوٹوسٹیٹس الماری کے پیچھے سے نکال لی تھیں اور یہ سارے کاغذات باورچی خانے کے چولہے میں جھونک دیئے تھے...

اب رات کے نو بج چکے تھے، ایک کہر آلود سرد رات آہستہ آہستہ لاہور کے طول و عرض پر اپنے پنکھ پھیلا رہی تھی۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب چند ہفتے پہلے شانی قاسم برلاس کے شکنجے سے نکل کر بھاگی تھی.....کریم پورہ سے نکل کر ٹیکسی بڑی سڑک پر پہنچی اور پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ شانی کے چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا اور انسانوں کا جمِ غفیر رات گہری ہونے سے پہلے اپنے اپنے ٹھکانوں اور آشیانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ کچھ عرصہ پہلے اس کا بھی ایک آشیانہ تھا۔ ایسی تاریک سرد راتوں میں وہ اپنے باپ اور بھائی کے پاس بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتی تھی۔ کتنا تحفظ اور سکون تھا ان

مضبوط دیواروں کے اندر.....راہداریوں میں نوکرانیوں کی چہکاریں گونجتی تھیں۔ احاطے میں چوکس محافظوں کے آوازے سنائی دیتے تھے۔

آج وہ بے خانماں تھی۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اجنبی اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اجنبی ہی اسے پناہ دے رہے تھے۔ ایک بار پھر رستم کا خیال بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے "دل" سے ٹکرایا، چند دنوں کے وقفے کے بعد جب بھی یہ خیال اس کے دل سے ٹکراتا تھا، اس میں پہلے سے زیادہ شدت اور طاقت ہوتی تھی، یوں لگتا تھا کہ یہ خیال اس کی بے خبری میں چپکے چپکے ہر آن اس کے اندر پروان چڑھتا رہتا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اگر آج رستم اس کے ساتھ ہوتا تو یہ اندیشوں میں گھری ہوئی بے مہر رات کتنی بے ضرر محسوس ہوتی۔ اس کی مضبوط بانہوں سے ٹکرا کر ہر مہیب خطرہ کرچی کرچی ہو جاتا لیکن کہاں تھا رستم؟ وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ شانی بہت آگے آ گئی تھی۔ شانی نے خود اسے کھویا تھا۔ توڑ کر اسے اپنے آپ سے جدا کیا تھا۔ وہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح، لیکن اب ہو چکا تھا۔ شانی اب اس فیصلے کی طرف پلٹنا نہیں چاہتی تھی۔ درد بہت شدید تھا مگر اب اس نے سہہ لیا تھا۔ آنسو بے حد آتش تھے مگر اس نے بہا لئے تھے۔

ٹیکسی ایک کشادہ سڑک پر تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ دکانوں کے نیون سائنز سے شانی کو پتا چلا کہ یہ فیروز پور روڈ ہے۔ زکریا کہہ رہا تھا۔ "جج صاحب بہت اچھے ہیں، بال بچے دار ہیں۔ ان کے تینوں بچے میرے ہی رکشے پر سکولوں میں آتے جاتے رہے ہیں تم وہاں بڑے سکون سے رہو گی۔ میں ایک دو دن میں پتا لگا لوں گا کہ وہ کون لوگ ہیں جو تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں....."

ایسی ہی باتوں کے دوران میں وہ دونوں ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو گئے۔ لاہور کا یہ رہائشی علاقہ بہت کشادہ ہے۔ پرانی طرز کی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں۔ سڑکیں نیم پختہ اور خاموش تھیں۔ چند سڑکوں پر چکرانے کے بعد ٹیکسی ایک گیٹ میں داخل ہوئی اور طویل "ڈرائیو وے" سے گزر کر گول ستونوں والے پورچ میں پہنچ گئی۔ شانی کا دل انجانے اندیشوں کے سبب دھک دھک کر رہا تھا۔ زکریا اسے تسلی دیتا ہوا ٹیکسی سے باہر لے آیا۔ پینٹ اور جیکٹ والا ایک نیم گنجا شخص دروازے پر موجود تھا۔ شانی چادر میں لپٹی لپٹائی ان دونوں کے ساتھ ایک اندرونی کمرے میں آ گئی۔

شانی کی شدید خواہش تھی کہ اس کے کانوں میں عورتوں اور بچوں وغیرہ کی آواز آئے تاکہ اسے یقین ہو سکے کہ یہاں کوئی فیملی موجود ہے۔ بہرحال ابھی تک اس کی یہ خواہش

پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ایک قدیم طرز کے کمرے میں پہنچے جسے جدید انداز میں سجایا گیا تھا۔ شانی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ الیکٹرک ہیٹر کی وجہ سے کمرے میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔

زکریا بولا۔ ''جج صاحب بچوں کے ساتھ ذرا مین مارکیٹ تک گئے ہوئے ہیں ابھی آ جاتے ہیں۔ تم چادر اتار کر سکون سے بیٹھو۔''

شانی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ دونوں باہر چلے گئے۔ شانی میز پر رکھا ایک میگزین الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی، اس کی نگاہ میگزین پر تھی، مگر دماغ اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں اچانک ہی اس کے ذہن میں کل رات کے واقعات آنے لگے۔ اس نے زکریا اور جنتے کو موج میلہ کرتے دیکھا تھا۔ نئے کپڑے، گھڑی، رنگین ٹی وی...... یہ سب چیزیں پچھلے دو تین دن میں ہی تو نمودار ہوئی تھیں۔ اب زکریا پُراسرار انداز میں اسے اس وسیع و عریض کوٹھی میں لے آیا تھا۔ یہاں سے اسے ایک گھر جیسی چہل پہل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے کمرے میں چھوڑ کر زکریا اور میزبان دونوں باہر جا چکے تھے۔ کہیں پاس سے ہی دھم دھم کی آواز مسلسل آ رہی تھی جیسے کسی آہنی شے سے کسی نرم شے پر ضرب لگائی جا رہی ہو۔ یہ آواز بیس پچیس میٹر کے فاصلے سے آ رہی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک دروازہ کھلا اور شانی کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اگر چھت شق ہو کر ہوا میں اُڑ جاتی یا فرش اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل جاتا۔ یا وہ بیٹھی بیٹھی فضا میں معلق ہو جاتی......تو شاید اسے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہوئی...... یہ قاسم برلاس تھا۔ وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حسبِ معمول پینٹ اور جرسی میں تھا۔ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی قاسم نے سب سے پہلے دروازے کو کنڈی چڑھائی پھر پھنکارتے ہوئے بولا۔

''حرام زادی...... آخر آ گئی شکنجے میں۔''

بے حد غصیلے انداز میں آگے بڑھ کر اس نے شانی کے بال مٹھی میں جکڑے اور زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔ شانی کا رخسار سُن ہو گیا اور بائیں کان میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ قاسم نے دھکا دے کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ پہلے صوفے سے ٹکرائی پھر قالین پر جا گری۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی کراہیں نکل گئی تھیں۔

قاسم برلاس نے بے رحمی سے تین چار ٹھوکریں شانی کی پشت اور پسلیوں پر رسید کیں، درد کی لہروں نے شانی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اُڑنے

لگیں۔ قاسم نے شانی کو پھر بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور صوفے پر دھکیل دیا۔ شانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ان آنسوؤں کی نمی اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔

قاسم برلاس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اس دن کی بات اور کس کس کو بتائی ہے تو نے؟''

''کسی کو نہیں...... کسی کو بھی نہیں۔'' شانی کراہی۔

''اچھی طرح سوچ کر بتا۔'' قاسم نے تیسری بار اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر بے رحمی سے جھنجھوڑا۔

''میں سچ کہتی ہوں۔''

قاسم سفاک نگاہوں سے اسے گھورتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے رخسار پر ابھی تک چند ہفتے پرانے زخم کا نشان موجود تھا جو شانی کے ہاتھوں لگا تھا۔ ڈرل مشین کے دستے نے تقریباً دو انچ ضرب تین انچ کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔ قاسم برلاس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے اور سُرخ و سپید چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری ایک ''سنگین ترین کیس'' میں پھنس جانے کی نشانیاں تھیں۔ تھانے کچہری کے چکر بڑے بڑوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور یقیناً قاسم برلاس جس کیس میں پھنسا تھا، وہ چھوٹا نہیں تھا۔ وہ ایک بے گناہ لڑکی کی آبرو ریزی اور قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ عارضی طور پر جیل کی سلاخوں سے باہر نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مُردنی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ مستقبل قریب کے آئینے میں اپنا انجام دیکھ رہا ہے۔ شانی سے چند تند و تیز سوال کرنے کے بعد وہ ایک بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر گیا تھا۔

شانی کی پسلیوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور بائیں نتھنے سے خون رِسنے لگا تھا...... اس نے چادر کے پلو سے خون کو صاف کیا اور اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سنگین ترین صورتِ حال میں پھنس چکی ہے...... اور یہ جو کچھ بھی ہوا تھا، رکشہ ڈرائیور زکریا نے اخبار میں چھپنے والی خبر پڑھی تھی۔ واردات کی نوعیت، اس کا وقت اور مقام جاننے کے بعد زکریا کو شبہ ہوا تھا کہ واردات کی رات اس کے رکشے میں بیٹھنے والی ''بدحواس شہناز'' ہی وہ لڑکی ہے جو موقعِ واردات سے غائب ہوئی ہے۔ زکریا نے ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے شانی سے اپنا شبہ مکمل طور پر چھپایا تھا اور اپنے طور پر کھوج لگا رہا تھا۔ یقیناً وہ واپس گلزار ٹاؤن بھی پہنچا ہوگا اور وہاں صورتِ حال کا جائزہ لیا ہوگا۔ اپنی مسلسل جستجو کے نتیجے میں وہ بالآخر قاسم برلاس تک جا پہنچا تھا۔ بعد

کے واقعات کو سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا۔ شانی کی حیثیت ''افشاں قتل'' کیس کی اکلوتی چشم دید گواہ کی تھی، وہ اس طرح قانون کی مدد کرسکتی تھی کہ چند ہی پیشیوں میں قاسم برلاس کا رخ سیدھا تختہ دار کی طرف ہو جاتا۔ اس تناظر میں شانی قاسم کے لئے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔ زکریا اور قاسم برلاس میں ڈیل ہوئی تھی اور اس ڈیل کے نتیجے میں شانی آج یہاں ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں موجود تھی۔ ان واقعات کے حوالے سے زکریا کا کردار قابلِ غور تھا۔ وہ لالچی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد گہرا شخص بھی تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں اس نے شانی کو شبہ تک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ زکریا نے جنتے کو بھی ان حالات سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنتے شانی کو اپنے بیٹے کے حوالے سے ''ورغلانے'' کی بھونڈی کوششیں کیوں کرتی۔

یہ سارے خیالات چار پانچ سیکنڈ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ تب وہ دروازے کی طرف بڑھی اور اسے ہینڈل سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ''دروازہ کھولو۔ میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔''

اس کی آواز...... جیسے دیواروں سے ٹکرا کر واپس آرہی تھی۔ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی پکار اس وسیع کوٹھی کے بند دروازوں سے باہر نہیں جاسکتی۔

کچھ دیر بعد وہ نڈھال سی ہو کر پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناک کے نتھنے سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ اس خون کی نمی اپنے بالائی ہونٹ پر محسوس کر رہی تھی...... اس نے جنتے کی چادر سے خون پونچھا اور سسکیوں سے رونے لگی۔ وہ اپنے تئیں جالاں...... اور نارپور والے خطرے سے دور بھاگی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس خطرے سے دور لے جانے کی آڑ میں بدنیت زکریا اسے پھر سے قاسم برلاس کی گرفت میں لے جائے گا، یہاں کوئی جج تھا اور نہ اس کی کوئی فیملی، اس حوالے سے زکریا نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

شانی کو پتا تھا کہ قاسم غیر شادی شدہ ہے اور تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے پاس حرام کا پیسہ بھی موجود تھا اور ورثے میں جائیداد بھی ملی ہوئی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ کوٹھی ہی اس کی رہائش گاہ ہو...... اب یہاں شانی کے ساتھ کیا ہونے والا تھا، اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دھم دھم کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کندآلے سے کسی لکڑی پر ضرب لگائی جا رہی ہو، یا کچھ کھودا جا رہا ہو۔

اچانک چند آوازوں نے شانی کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔ یہ آوازیں ساتھ والے کمرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ قاسم برلاس موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز سے

پریشانی مترشح تھی۔ باتوں سے پتا لگتا تھا کہ وہ اپنے وکیل سے مخاطب ہے۔ وکیل کا نام شیخ رضوان تھا۔ قاسم اسے اپنے کیس کے حوالے سے کچھ بتا رہا تھا۔ ''شیخ جی! صبح قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پرسوں کی پیشی بہت خاص ہے۔ میری گرفتاری ہوسکتی ہے......'' چند لمحے توقف کے بعد اس نے دوسری جانب کی بات سنی اور بولا۔ ''نہیں جی...... نہیں...... آپ کے ہوتے ہوئے مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے...... پر آپ لاہور میں ہوتے تو زیادہ اچھا تھا...... باس اور اسسٹنٹ میں فرق تو ہوتا ہے ناں جی...... جی ہاں...... جی ہاں...... نہیں جناب نہیں...... چلیں دیکھتے ہیں پھر جو بھی ہو۔ اچھا جی...... خدا حافظ۔''

فون پر بات ختم ہوئی۔ اس کے بعد چند سیکنڈ کا وقفہ آیا۔ پھر رکشہ ڈرائیور زکریا کی دبی دبی خوشامدی آواز سنائی دی۔ ''اچھا سر! مجھے اب اجازت ہے؟''

''ہوں......'' قاسم برلاس نے طویل ہنکارا ابھرا۔ چند سیکنڈ کے توقف سے اس کی آواز پھر ابھری۔ ''کتنے آئے تھے تمہاری طرف؟''

''جی، دس ہزار پہلے تھے۔ پندرہ ہزار ہفتے کو دیئے تھے آپ نے۔''

''ٹھیک ہے۔'' قاسم برلاس نے کہا۔ اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ یقیناً وہ نوٹ گن رہا تھا۔ ''یہ لو...... پینتیس ہزار ہے...... پینتیس اور پچیس پورے ساٹھ ہو گئے۔'' زکریا نے کانپتی آواز میں کہا۔

''آپ مائی باپ ہیں جناب! ہم تو آپ کے بے دام کے غلام ہیں سرکار۔''

قاسم بارعب آواز میں گویا ہوا۔ ''میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں زکریا۔ مگر تمہارے سامنے یہ بات دہرا رہا ہوں۔ ہم تین بندے ہیں جن کو اس بات کا پتا ہے میں...... خالق اور تم۔ چوتھا کوئی نہیں ہے اور کبھی کوئی چوتھا ہونا بھی نہیں چاہئے۔'' آخری لفظ کہتے کہتے قاسم کا لہجہ بے حد خوفناک ہو گیا تھا۔

زکریا کی لرزاں و ترساں آواز ابھری۔ ''مائی باپ! قبر کی دیواروں تک یہ بات میرے اندر سے نہیں نکلے گی۔ یہ خادم اپنی جان دے دے گا پر زبان نہیں کھولے گا۔''

''ٹھیک ہے، اب تم جاؤ...... جاتے ساتھ ہی ٹیکسی واپس کر دینا۔''

''جو حکم جناب......'' زکریا نے کہا۔ پھر قدموں کی چاپ سے پتا چلا کہ وہ جا رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پورچ کی جانب سے ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ دھیرے دھیرے یہ آواز دور ہوتی گئی۔

ساتھ والے کمرے میں جو گفتگو ہوئی، وہ بے حد اہم نوعیت کی تھی۔ ایسی گفتگو دھیمے لہجے یا سرگوشیوں میں ہونی چاہئے تھی کیونکہ دروازے کے دوسری طرف شانی موجود تھی۔ مگر قاسم نے ایسی کوئی احتیاط نہیں برتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شانی کی طرف سے قطعی طور پر مطمئن ہے اسے یقین ہے کہ وہ اب یہاں سے نکل نہیں سکے گی۔ انجانے خوف کی سرد لہریں شانی کے بدن میں دوڑ گئیں۔

شیشے کی چھن چھن سنائی دی۔ جیسے دو گلاس آپس میں ٹکرائیں۔ یا گلاس سے بوتل ٹکرائے۔ شاید قاسم مے نوشی کر رہا تھا۔ اس کی آواز سے بھی شبہ ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ تقریباً ایک منٹ کے وقفے سے قاسم کی آواز پھر ابھری۔ پریشانی اور اندرونی بے چینی کی لہر اس آواز میں صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ کمرے میں موجود کسی فرد سے بولا ''خالق...... میرا خیال ہے کہ تم اپنا کام کرو۔'' اس مرتبہ آواز خاصی دھیمی تھی۔

''کمرے میں ہی؟'' خالق نے بھی پست آواز میں پوچھا۔

''ہاں''

''گلا دبا کر؟''

''ہاں......ہاں......مگر احتیاط سے۔ کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

شانی کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ قرب و جوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے وہ بزدل نہیں تھی۔ اس میں اخلاقی جرأت اور روحانی توانائی بھی موجود تھی۔ مگر موت کا خوف ہر ذی روح کے لہو میں دوڑتا ہے۔ اپنی موت کا حکم نامہ شانی نے اپنے کانوں سے سنا تھا......قاسم اپنے خالق نامی کارندے کو شانی پر جلاد مقرر کر چکا تھا۔

وہ لڑکھڑا کر کھڑی ہوگئی۔ چند لمحوں میں ہی اس کا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ اس نے متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ لکڑی کی مضبوط کھڑکیاں جن میں شیشے والا پورشن بہت چھوٹا تھا۔ کھڑکیوں سے آگے جالی اور لوہے کی گرل......دونوں دروازے مضبوط اور باہر سے بند......دیواریں موٹی اور لاتعداد۔ اسے اپنے پیٹ میں شدید اینٹھن محسوس ہونے لگی۔

''یا مالک......میری مدد کر......میں کمزور و ناتواں ہوں۔ تیرے سوا کون میرا مددگار ہے''

اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ جان بچانے کی بہترین کوشش اس وقت کر سکتی ہے جب کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو۔ اگر وہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے

گا۔ کچھ بھی نہیں۔

اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر آنے والا کس دروازے سے آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوگا یا نہیں۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ وہ اس کمرے سے نکل بھی گئی تو کیا اگلے کمرے کا دروازہ بھی اسے کھلا ملے گا؟ اور پھر باہر کا آہنی گیٹ؟

وہ انہی سوالوں پر غور کر رہی تھی جب اسے بغلی دروازے کے قریب آہٹیں سنائی دیں۔ یقیناً وہ عبدالخالق نامی شخص اسی دروازے سے آنے والا تھا۔ وہ دروازے سے بالکل قریب ہو کر کھڑی ہوگئی۔ دروازہ کھلا اور وہ شخص جلدی سے اندر آگیا......ہاں، یہ پینٹ جیکٹ والا وہی گنجا آدمی تھا جس نے پورچ میں زکریا کا استقبال کیا تھا۔ شانی کو اس کے ہاتھ میں سیاہ ریوالور کی جھلک نظر آئی۔ اس کے باوجود وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئی۔ ایسے لمحوں میں ایک عجیب قسم کا وجدانی اعتماد اس میں سرایت کر جاتا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر ہوا۔ خالق نامی شخص جتنی تیزی سے اندر آیا تھا، شانی اتنی ہی تیزی سے باہر نکلی۔ دونوں کا تصادم ہوا۔ شانی نے محسوس کیا کہ ریوالور بردار کی ٹھوڑی بڑی شدت کے ساتھ اس کے سر سے ٹکرائی ہے۔ وہ ڈگمگا کر دروازے سے ٹکرایا اور شانی کمرے سے نکل آئی۔ سامنے ایک ہال نما کمرہ تھا۔ اس میں بھی ٹیوب لائٹس کی روشنی تھی۔ یہاں الکحل کی بو کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ تیر کی طرح اس کمرے کے دروازے سے بھی نکل گئی۔

خالق اس کے پیچھے تھا۔ شانی کو اپنے سامنے راہداری نظر آئی۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک جالی دار دروازہ تھا۔ دروازے کی دوسری طرف پائیں باغ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ٹانگوں کی پوری سکت کے ساتھ دروازے کی طرف دوڑی چادر اس کے کندھوں سے پھسل گئی۔ خالق اس کے پیچھے تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا مگر اس نے نہیں چلائی۔ یقیناً وہ فائر کی آواز سے اڑوس پڑوس کو متوجہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جالی دار دروازے سے نکلتے ہی شانی مدد کے لئے چلانا شروع کردے گی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ راہداری کے اندر ''دو تین سیکنڈ کی ریس'' جیت لے اور شانی کو چھاپ لے۔ مگر کہتے ہیں کہ شکاری کتا اپنے مالک کے لئے بھاگتا ہے جب کہ خرگوش اپنی جان کے لئے۔ اس لئے وہ اپنی ہمت سے زیادہ تیز گام ہوتا ہے۔ شانی بھی خالق سے پہلے دروازے تک پہنچ گئی......اور باہر نکل آئی۔ وہ مدد کے لئے چلائی۔ بے حد پھولی ہوئی سانسوں کے سبب اس کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری بار چلاتی، خالق عقب سے توپ

کے گولے کی مانند اس سے آٹکرایا۔ وہ دونوں اوپر نیچے گراسی لان میں گرے۔ شانی کو اپنے پیٹ اور سینے پر گیلی گھاس کی نمی محسوس ہوئی۔ چپل شانی کے پاؤں سے نکل گئی تھی۔ دائیں گھٹنے اور کہنی پر شدید رگڑ اور جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس طرح خالق کی گرفت سے نکلی اور اٹھ کر مخالف سمت میں بھاگی۔ اس مرتبہ خالق نے اسے زیادہ بھاگنے نہیں دیا۔ وہ عقب سے بلائے ناگہانی کی طرح شانی پر گرا۔ ریوالور کے دستے کی اچٹتی سی ضرب شانی نے اپنی گردن پر محسوس کی۔ اس مرتبہ گرنے کے بعد شانی کی آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ وہ اوندھے منہ گری تھی۔ اس کے اوپر ہٹے کٹے شخص کا پورا بوجھ تھا۔ اس شخص کا کھردرا اور مضبوط ہاتھ اس کے نازک لبوں سے یوں چپک گیا جیسے اسے کیمیکل سے جوڑ دیا گیا ہو۔

وہ عقاب کے پنجوں میں آئی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے ذہن میں بدنصیب افشاں کے آخری لمحات کا کرب تازہ ہو گیا۔ پھولی ہوئی سانس، جسم کو ایک کرخت بوجھ پیستا ہوا، تازہ ہوا سینے تک پہنچنے کے لئے بے قرار......لاچاری سی لاچاری۔ وہ تڑپی مچلی مگر کچھ کر نہ سکی۔

اسی دوران میں اسے اندازہ ہوا کہ برآمدے کی جانب سے گرانڈیل قاسم برلاس بھی دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ رہا ہے۔ وہ عبدالخالق سے، اپنے مقرر کئے ہوئے جلاد سے مخاطب تھا۔

''تجھے کہا بھی تھا کہ یہ حرام زادی کوئی کام دکھا جائے گی۔''

خالق کی قاتلانہ گرفت شانی کے ہونٹوں اور گردن پر مزید مضبوط ہو گئی۔ شانی کو لگنے لگا کہ اب کسی بھی وقت اس کی گردن کانچ کی طرح ٹوٹ جائے گی، خالق کی ہانپتی ہوئی سانسیں جن میں تمباکو کی بو تھی، شانی کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کی جیب میں پڑا ہوا موبائل بے حد شدت سے شانی کی کمر پر دونوں کندھوں کے درمیان چبھ رہا تھا۔

قاسم کی جنونی آواز ابھری۔ ''اسے اسی طرح اٹھا کر آگے لے جاؤ۔''

''آگے سے اس کی مراد نہ جانے کیا ہے؟'' شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔

چار مضبوط بازوؤں نے اسے سیدھا کیا اور اٹھا لیا۔ خالق سر کی طرف تھا۔ قاسم برلاس نے اس کی دونوں ٹانگیں جکڑ رکھی تھیں۔ خالق کی بے رحم ہتھیلی مسلسل اس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔ ایک طرح سے خالق نے اسے گردن سے تھام کر اٹھایا ہوا تھا۔ شانی کو آسمان پر ٹمٹماتے چند تارے دکھائی دیئے۔ جیسے وہ بھی شانی کی طرح آخری سانسیں لے رہے ہوں۔

''کیا کبھی میرے پیاروں کو پتا چل سکے گا کہ میں نے آخری سانسیں کہاں لیں اور کیسے لیں؟ کیا کبھی کوئی میری موت سے آگاہ ہو سکے گا۔'' اس نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔

غالباً وہ دونوں اسے اٹھا کر پندرہ بیس قدم تک چلے تھے۔ پھر اسے بے دردی سے اٹھا کر مٹی کے ایک ڈھیر پر پٹخ دیا گیا۔ یہ پائیں باغ کا اندرونی حصہ تھا۔ شانی کو اپنے اوپر درختوں کی شاخیں نظر آئیں۔ اس کی پشت پر ٹھنڈی ٹھار بھربھری مٹی کا لمس تھا۔ سانس پھنس پھنس کر اس کے زخمی نتھنے میں سے گزر رہی تھی۔

''چاقو نکالو۔'' قاسم نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

خالق کا ایک ہاتھ شانی کے منہ پر رہا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی جیکٹ کی جیب ٹٹولی۔ شانی نے پھٹی نظروں سے بائیں جانب دیکھا۔ اسے اپنی قبر نظر آئی۔ تقریباً چھ فٹ ضرب دو فٹ کا سیاہی مائل گڑھا۔ قریب ہی ایک ''کسی'' پڑی تھی۔ شانی کو دھما دھم کی وہ پُراسرار آوازیں یاد آئیں جو وہ اب تک سنتی رہی تھی۔ یقیناً وہ اس کی قبر کی تیاری کا عمل تھا۔

شانی چت تھی۔ جیسے دو زور آور قصائی ذبح کرنے کے لئے ایک ناتواں میمنے کو دبوچ لیں۔ اسی طرح شانی بھی ناقابل مزاحمت گرفت میں تھی۔ جان بچانے کی فطری خواہش کے تحت وہ اپنے جسم کو حرکت تو دے رہی تھی۔ تاہم جانتی تھی کہ یہ حرکت سعیِ رائیگاں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ مرنے سے ڈرتی نہیں تھی۔ مگر مرنے کے عمل سے گزرنا بہرصورت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ والی کی رنگین گلیاں آ گئیں۔ بڑے بھائی کا تصور، عادل کی آواز، امی کا مس، ابو کا چہرہ ...اور... اور ایک اور دھندلا سا چہرہ۔ رستم کا چہرہ غم میں ڈوبا ہوا، اندوہ میں پسا ہوا کہاں ہو رستم، دیکھو میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لئے تم سے دور تمہیں ایک ''تلاشِ نامراد'' دے کر.. ایک غمِ لازوال سونپ کر۔ مجھے معاف کرنا......میری مجبوریوں کو بخش دینا۔''

اسے اپنے اردگرد خوفناک چاقو کے پھل کی مدھم چمک محسوس ہوئی، چاقو خالق کے ہاتھ سے قاسم کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ قاسم شانی کے پاؤں کی طرف تھا، افشاں قتل کیس کا اکلوتا اور اہم ترین گواہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے جا رہا تھا۔

اسی وقت جب شانی کو اپنے سر کی جانب بھاگتے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ یقیناً یہ دھمک دونوں قاتلوں نے بھی محسوس کی تھی۔ ان کے ہیولوں میں اور ان کی گرفت میں ایک بے چین جنبش محسوس ہوئی۔ پھر ایک بھاری بھرکم اجنبی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

یہ گالی کی آواز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی ایک پرچھائیں چیل کی طرح قاسم پر جھپٹی۔ گرانڈیل قاسم برلاس اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا شانی کی ٹانگیں آزاد ہو گئیں۔ اس نے

اوپر دیکھا۔ ایک دوسری پر چھائیں خالق پر جھپٹ رہی تھی۔ ایک بھاری بھرکم گن کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا گیا تھا۔ یہ وار عین خالق کی کھوپڑی پر ہوا۔ ٹھوس لوہے اور سر کی ہڈی کے تصادم سے ایک بھیانک آواز ابھری۔ خالق کسی بے جان شے کی طرح ایک طرف لڑھک گیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی تھی، قاسم بڑی تیزی سے کھڑا ہوا۔ خنجر نما چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ نشے نے اس کے جسم میں اضافی طاقت پیدا کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے مدمقابل پر خطرناک وار کیا۔ ایک کراہ گونجی۔ قاسم پر حملہ آور ہونے والا شخص اپنا سینہ پکڑ کر دہرا ہو گیا اور اوندھے منہ گر گیا۔ اپنے ساتھی کو زخمی ہوتے دیکھ کر رائفل بردار کسی درندے کی طرح قاسم پر جھپٹا۔ اگلے ہی لمحے وہ قاسم کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ قد و قامت میں وہ قاسم سے بھی کچھ بڑھ کر تھا۔ اس نے اپنی وزنی رائفل کو افقی رخ پر پکڑا اور اس کی مدد سے قاسم کا گلا دبانا شروع کر دیا دونوں کی کشمکش میں رائفل سے ایک فائر بھی ہوا، نال نے دھماکے سے شعلہ اگلا جو تیرگی میں گم ہو گیا۔

قاسم حملہ آور کے نیچے بری طرح تڑپا مچلا۔ مگر حملہ آور کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ پہلے لگنے والی چوٹ نے قاسم کو بے دم سا کر دیا تھا۔ اب گردن پر بے پناہ دباؤ پڑا تو وہ نڈھال سا ہو گیا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی بھیانک آواز نکلنے لگی۔ اس کے سینے پر چڑھا ہوا شخص جنونی انداز میں اس کا گلا دباتا جا رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد شانی کو محسوس ہوا کہ قاسم برلاس مر رہا ہے۔ وہ ایک دشمن تھا۔ وہ شانی سے بدترین سلوک کر چکا تھا اور اب کچھ دیر پہلے اس کی جان لینے جا رہا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ شانی اس سے بھی شدید نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس انداز میں مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے اپنی جان ہی ہار جائے۔ وہ اٹھی اور حملہ آور کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ”چھوڑ دو میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔“

مگر حملہ آور کے ہاتھ تو جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ وہ قاسم کے جسم سے زندگی کی آخری رمق تک نچوڑ لینا چاہتا تھا۔ شانی اسے جھنجھوڑتی رہی، پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتی رہی۔ بالآخر وہ اسے پیچھے ہٹانے میں کامیاب رہی، مگر تب تک قاسم برلاس کا ”کام“ ہو چکا تھا۔ رہی سہی کسر حملہ آوروں کے تیسرے ساتھی نے پوری کر دی۔ اس نے اسی ”گن“ کی دو ایسی شدید ضربیں قاسم کے سر پر رسید کیں کہ اس کی کھوپڑی پھٹ گئی اور مغز بہہ نکلا۔ ڈرائیو وے سے باغ کے اندر پہنچنے والی روشنی کی چند شعاعوں میں شانی نے اس کے پھٹے ہوئے سر سے بہنے والے سفید مادے کو صاف دیکھا..... وہ مر چکا تھا۔ ہاں انکوائری افسر اپنی تمام تر گندی

انکوائری سمیت اب مٹی کا ڈھیر تھا۔

رائفل بردار شخص تڑپ کر اپنے زخمی ساتھی کے پاس پہنچا۔ چاقو اس کی چھاتی کے درمیان لگا تھا اور ہڈیوں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ زخمی نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ رائفل بردار نے چاقو اس کی چھاتی سے کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

وہ بھاری آواز میں اپنے ساتھی سے بولا۔ ”ماکھے! تم نواز کو گاڑی میں پہنچاؤ میں لڑکی کو لے کر آتا ہوں۔“

ماکھے نے گن ایک طرف پھینک دی تھی۔ اس نے شتابی سے زخمی ساتھی کو کندھے پر اٹھایا اور مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ قاسم کا ساتھی خالق اس طرح بے سدھ پڑا تھا کہ اس کا سر شانی کے لئے کھودی جانی والی قبر میں لٹکا ہوا تھا۔

رائفل بردار نے شانی کی کلائی پکڑی اور نرم آواز میں بولا۔ ”آ جاؤ ہمارے ساتھ۔“

”کون ہو تم؟“ شانی نے پوچھا۔

”جو بھی ہیں تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ دیر مت کرو۔“ بولنے والے کی آواز میں ہلکا سا تحکم تھا۔

شانی کو ان لوگوں کے لب و لہجے نے سمجھا دیا تھا کہ ان میں سے دو دیہاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شانی کا ذہن جالاں اور نار پور والوں کی طرف چلا گیا...... اس کے دل سے آواز آنے لگی تھی...... یہ وہی لوگ ہیں جو کریم پورہ میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے کسی طور اسے کریم پورہ سے نکلتے دیکھ لیا تھا اور اب اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ وہ اپنے دو دشمنوں کے باہم تصادم کے نتیجے میں عارضی طور پر بچ گئی تھی مگر اب اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا؟ یہ سوال بے پناہ شدت کے ساتھ دماغ میں اودھم مچا رہا تھا۔ رائفل بردار کی گرفت اس کی کلائی پر تھی اور وہ اسے موقع واردات سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دونوں طرف شدید خطرہ تھا۔ اگر ان لوگوں کا تعلق واقعی جالاں اور نار پور سے تھا تو پھر ان کے ساتھ جانا ایک بدترین موت کو دینا دعوت تھا۔ اگر وہ ان کے ساتھ نہ جاتی اور یہاں رہتی تو بھی وہ اذیت اور موت کا ہدف تھی۔

رائفل بردار نے اس بار کرخت لہجے میں کہا۔ ”چلو نکلو یہاں سے..... گولی چل چکی ہے۔ ابھی لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

ابھی یہ الفاظ قوی الجثہ رائفل بردار کے منہ ہی میں تھے کہ کوٹھی کی کال بیل چیخنے لگی اور اس کے ساتھ ہی مین گیٹ کو دھڑا دھڑ بجایا جانے لگا۔

رائفل بردار نے شانی کو باقاعدہ کھینچنا شروع کر دیا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔'' شانی نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

اتنے میں ایک اسٹیشن وین تیزی سے ڈرائیو وے پر حرکت کرتی نظر آئی۔ وہ عقبی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور ریورس گیئر میں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ سمجھتی، اسٹیشن وین اس کے عین سامنے رک گئی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص نے شانی کو پکڑ کر بے دردی سے اندر کھینچا۔ رائفل بردار نے شانی کو پیچھے سے دھکیلا۔ وہ پائدان سے بُری طرح ٹکراتے ہوئے وین کے اندر پہنچ گئی۔ وہ پہلے ہی نیم جان تھی، اس نئی افتاد کے خلاف بالکل معمولی مزاحمت کر سکی۔

رائفل بردار نے رائفل کی نال شانی کی ٹھوڑی کے نیچے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں لیکن خاموش بیٹھی رہو گی تو زندہ رہو گی۔ دوسری صورت میں یہ گولی تمہارے تالو سے گزر کر اور سر کو پھوڑ کر گاڑی کی چھت سے نکل جائے گی۔'' اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس شخص نے جس طرح قاسم برلاس کی جان لی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بے شک یہ نہایت خطرناک لوگ تھے۔ شانی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسٹیشن وین کوٹھی کے عقبی گیٹ سے نکلی اور برق رفتاری سے موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آ گئی۔

پچھلی نشست پر زخمی بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ سینے میں اُترا ہوا چاقو خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ زخمی کا سینہ لہولہان تھا۔ زخم کی نوعیت دیکھنے کے لئے ایک شخص نے چند سیکنڈ کے لئے وین کی اندرونی روشنی جلائی۔ شانی نے اس روشنی میں حملہ آوروں کے چہرے دیکھے۔ کوئی بھی شناسا نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان چار افراد میں سے کم از کم دو دیہاتی ہیں اور ان کا تعلق کسی نہ کسی طور نارپور کے چوہدری سے ہے۔

وہ جس سڑک پر جا رہے تھے، خاصی سنسان تھی۔ ویسے بھی اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ٹریفک بتدریج کم ہو رہا تھا۔ شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لاہور کے شمالی علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ چند منٹ بعد اسے اپنی دائیں جانب مینار پاکستان اور شاہی مسجد کی جھلک نظر آئی۔ مطلب یہ تھا کہ وہ دریائے راوی کے قریب ہیں۔ کچھ آگے جا کر اسٹیشن ویگن نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور سڑک سے اُتر کر رک گئی۔ یہاں پہلے سے ایک اور نیلی اسٹیشن

وین موجود تھی۔ پہلو میں ایک مہران کار بھی کھڑی تھی۔ نیلی وین کے شیشے تاریک تھے۔ دونوں وینوں کو پہلو بہ پہلو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اس کے سلائیڈنگ دروازے ایک دوسرے کے بالکل سامنے آ گئے۔ شانی والی وین کا دروازہ کھولا گیا۔ رائفل بدستور شانی کی گردن پر تھی، اس کی سرد نال کا بے رحم دباؤ وہ ہر آن محسوس کر رہی تھی۔ رائفل بردار نے بڑی عجلت میں شانی کو وین سے اتار کر نیلی وین کی عقبی نشست پر پہنچا دیا۔ پھر وہ نیلی وین کے ڈرائیور کو مخاطب کر کے ہراساں لہجے میں بولا۔ ''نواز زخمی ہو گیا ہے ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔''

اس کے بعد وہ تیزی سے مڑ کر پہلے والی وین میں گھس گیا۔ وین کے پہیے چرچرائے اور وہ طوفانی رفتار سے دائیں طرف مڑ گئی۔

اس کے ساتھ ہی نیلی وین بھی آگے بڑھ گئی۔ مہران کار شہر کی طرف چلی گئی۔ نیلی وین میں ڈرائیور کے علاوہ صرف دو افراد موجود تھے۔ ایک مرد جو اگلی نشست پر تھا اور ایک عورت جو سب سے پچھلی نشست پر شانی کے پہلو میں موجود تھی۔ شانی نے غور سے عورت کا چہرہ دیکھا اور اسے رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جالاں تھی۔

جالاں نے شانی کا ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھوں میں لیا اور گلوگیر آواز میں بولی۔

''چھوٹی چوہدرانی جی! ہم تو آپ کو مار بیٹھے تھے۔ اپنی قسمت کو رو پیٹ چکے تھے۔ یہ بات دماغ میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ ایک دن آپ کو جندہ سلامت دیکھیں گے۔'' جالاں کی آواز اتنی پست تھی کہ سب سے اگلی نشست پر بیٹھے شخص یا ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

شانی خاموشی سے آنسو گراتی رہی۔

''آپ کو دیکھ کر بھی اپنی اکھیوں پر یقین نہیں آ رہا چھوٹی چوہدرانی۔'' جالاں نے اس کے سارے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ جیسے دیکھنا چاہتی ہو کہ وہ کہیں سے ٹوٹی پھوٹی تو نہیں ہے۔

اگلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص اور ڈرائیور دونوں شانی کے لئے اجنبی تھے۔ اگلی نشست والے کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا اور اس سیاہ ریوالور کے بیرل کا رخ عقبی نشستوں کی طرف تھا۔

جالاں نے ریوالور بردار کو جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''وے بخشو! تُو اس بندوقڑی کو تو پیچھے ہٹا..... یہ کوئی غیر نہیں ہے۔ اپنی چوہدرانی ہے۔ پہلے ہی پتا نہیں کن مصیبتوں سے نکلی ہے بے چاری..... دیکھو کیا حال ہو رہا ہے مکھڑے کا.....''

بخشو نامی شخص نے ریوالور کو گود میں رکھ لیا اور اوپر ایک کپڑا پھیلا دیا۔

باہر تاریک رات اور ٹھٹھری ہوئی دھند تھی مگر گاڑی کے اندر خوشگوار حرارت تھی۔ شانی نے دیکھا۔ وہ راوی کا پُل پار کرنے کے بعد جی ٹی روڈ پر جا رہے ہیں۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟'' شانی نے بلند آواز میں پوچھا۔

''فی الحال تو آپ کو ان لوگوں سے دور لے جا رہے ہیں جو آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' اگلی نشست پر بیٹھے بخشو نامی بندے نے کہا۔

''مم...... مجھے کہیں نہیں جانا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' شانی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی وہ ایک رائیگاں مطالبہ کر رہی ہے۔

''آپ جیسے کہیں گی، ویسا ہی ہوگا چوہدرانی جی۔'' جالاں نے دلاسا دیا۔ وین برق رفتاری سے اُڑی جا رہی تھی۔ شانی جانتی تھی کہ اگر وہ دروازے کی طرف جانا چاہے تو ہرگز نہیں جا سکے گی۔

شانی کے پاؤں کے نیچے ربڑ کا نیم گرم ''میٹ'' تھا۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں گاڑی میں بیٹھی تھی جالاں نے ایک مردانہ گرم چادر اس کے سر پر ڈال دی۔ تب وہ اگلی نشست پر بیٹھے شخص سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''وے بخشو! تُو ذرا اپنا ریڈیو لگا لے۔''

بخشو نے اثبات میں سر ہلا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ عیسیٰ خیلوی کی گلوگیر آواز وین میں گونجنے لگی۔ ''اک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنئے۔'' کیونکہ صرف فرنٹ اسپیکرز آن تھے اس لئے پیچھے قدرے سکون تھا۔

اب یہ بات شانی کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ اور جالاں وین کی سب سے پچھلی نشست پر کیوں بیٹھی تھیں۔ جالاں نہیں چاہتی تھی کہ ان کی باتیں ڈرائیور یا بخشو کے کانوں تک پہنچیں۔ اس نے ریڈیو یعنی کیسٹ پلیئر بھی اسی لئے آن کروایا تھا۔

شانی کے سر پر چادر درست کرتے ہوئے جالاں نے کہا۔ ''آ...... آپ کو بھوک لگی ہوگی چھوٹی چوہدرانی۔ تھوڑا سا کچھ کھا لیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ہاٹ پاٹ کھول لیا۔ ہاٹ پاٹ میں سے پراٹھوں اور انڈوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شاید بھنا ہوا گوشت یا قیمہ بھی تھا۔

شانی نے بے زاری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں... مجھے نہیں کھانا۔ تم بس مجھے جانے دو''

''ہائے چھوٹی چوہدرانی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... ہم تو آپ کو دیکھ کر دوبارہ سے جندہ ہو گئے ہیں اور آپ جانے کا کہہ رہی ہیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ کون کون آپ کا انتجار کر رہا ہے۔''

''کون انتظار کرے گا اب میرا...... انتظار کرنے والا تو چلا گیا دنیا سے۔'' شانی نے سسک کر کہا۔

''چھوٹے چوہدری جی کی موت کا دکھ کسے نہیں چھوٹی چوہدرانی۔ پر جندگی چھوٹے چوہدری جی کے ساتھ ختم تو نہیں ہو گئی ناں۔''

''میرے لئے ختم ہو گئی ہے۔ مجھے اب کسی سے نہیں ملنا۔ نہ میکے والوں سے نہ سسرال والوں سے۔ میں بھی مر گئی ہوں...... ہر کسی کے لئے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں چھوٹی چوہدرانی......! آپ کو کیا پتا آپ کے لئے ہمارے دل میں کتنی عجت ہے۔ قسم ہے جب سے کچھ دن پہلے آپ کو ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر دیکھا تو میں تو جیسے پتھرا ہی گئی۔ اکھیوں پر بھروسہ نہیں ہوا اور جب بھروسا ہوا تو یوں لگا کہ خوشی سے دل سینے کے اندر پھٹ جائے گا۔ میں آپ کو آواجیں دیتی آپ کے پیچھے بھاگی۔ پر آپ کا پیچھا نہ کر سکی۔''

ایک دم شانی رو پڑی۔ عجیب جذباتی کیفیت میں اس نے جالاں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''جالاں! تم لوگ مجھے جانے دو...... میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی...... اگر نہیں...... تو مجھے یہیں سڑک پر پھینک کر مار دو۔ میں اپنا خون تم سب کو معاف کرتی ہوں۔ مجھے یہیں مار دو جالاں۔''

جالاں نے جلدی سے شانی کے ہاتھ تھام لئے۔ ''ہائے ہائے چھوٹی چوہدرانی......! کیوں ہم نوکروں کو گناہ گار کرتی ہیں۔ ہم تو آپ کے پیروں کی خاک ہیں۔ نہ نہ...... نہ ایسا نہ کریں۔''

''تو کیا کروں جالاں......! مجھے واپس جانے سے مرنا سہل لگ رہا ہے، بہت سہل لگ رہا ہے۔ مجھے مار دو جالاں۔''

بھاری بھرکم جالاں نے شانی کو پچکارتے ہوئے کمر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''چھوٹی چوہدرانی! آپ بالکل غلط سوچ رہی ہیں۔ آپ کو وہاں کسی طرح کا ڈر نہیں ہے۔ آپ کا گناہ ہی کیا ہے۔ آپ کو پتا نہیں، آپ کو وہاں کتنی عجت اور محبت ملنے والی ہے۔ آپ کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے چوہدرانی جی۔''

''وہاں نارپور میں اب کون ہے میرا۔ فاخر نہیں رہے... بڑے چوہدری صاحب نہیں

رہے۔ وہ حویلی نہیں رہی، وہ لوگ نہیں بچے۔“

”ہاں، بہت کچھ ختم ہوگیا چھوٹی چوہدرانی۔ پر کچھ نہ کچھ بچ بھی گیا ہے۔ آپ شاید ایک دو نام بھول رہی ہیں۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

جالاں نے ایک بار پھر شانی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”چھوٹی چوہدرانی! آپ بڑی چوہدرانی کو بھول رہی ہیں۔ وہ جو آپ پر جان دیتی ہیں۔ جن کی آنکھیں ہر گھڑی آپ کا رستہ تکتی ہیں۔ جن کے بچے آپ کے لئے دن رات روتے رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

جالاں مسکرائی۔ ”ہم آپ کو آپ کی بھابو کے پاس ہی تو لے جا رہے ہیں۔ آپ کی بھابو۔ آپ کا مُنا اور ندیم......“

ایک دم شانی کے سینے میں دکھ اور کرب کی آنچ ذرا دھیمی ہوگئی۔ اس نے اپنی تر بتر آنکھیں اٹھا کر جالاں کو دیکھا۔ جیسے جاننے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ کہاں تک درست ہے۔

جالاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں چھوٹی چوہدرانی۔ ہم چوہدرانی کے حکم پر ہی آٹھ دس دن سے آپ کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں بھابو؟“

”ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو پتا چل جائے گا چھوٹی چوہدرانی۔“ جالاں نے دھیمی آواز میں کہا۔

شانی چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر جلد ہی اس کے سینے میں چھلنی کرنے والا درد و کرب لوٹ آیا۔ یقیناً جالاں اسے بہلا رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، وہ عملی طور پر ہونا ناممکن تھا۔ وہ بکواس کر رہی تھی۔

جالاں چوہدری مہر کی بااعتماد ملازمہ تھی۔ وہ اس جہنمی رات کے بارے میں سبھی کچھ جانتی تھی جب چوہدری مہر کو عداوت کا زہر چڑھا تھا اور وہ انسان سے زہریلا ناگ بن گیا تھا۔ اپنی بہو کی آبرو ایک ملازم کے ہاتھوں تار تار کروانے کے لئے تیار ہوگیا تھا وہ۔ جالاں کو سب کچھ معلوم تھا اور یقیناً یہ بھی معلوم تھا کہ حویلی میں آگ بھڑکنے کے بعد شانی حویلی سے فرار ہوئی ہے۔ نارپور کے چوہدری کو رستم پر شک تھا۔ وہ اسے حویلی کو نذرِ آتش کرنے کا مجرم قرار دے رہے تھے اور پورے ملک میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اس سے پہلے ان کا خیال

تھا کہ شانی آگ میں بھسم ہوچکی ہے۔ اب وہ اسے زندہ سلامت لاہور سے ڈھونڈ لائے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ شانی رستم کے ساتھ ہی فرار ہوئی تھی۔ صرف ایک بات شانی کے حق میں جاتی تھی۔ حویلی میں آگ لگنے سے پہلے تک شانی اور رستم کے ربط کے متعلق کسی کو علم نہیں تھا۔ رنگ والی، نارپور اور قرب و جوار میں کوئی فردِ واحد بھی ایسا نہیں تھا جو شانی اور رستم کے جذباتی تعلق کے بارے میں ذرا سا بھی جانتا ہو۔ جالاں کی ”محبت بھری“ آواز نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ وہ ایک بار پھر بولی۔ ”چھوٹی چوہدرانی آپ کو میرے سر کی قسم......تھوڑا سا کھا لیں۔ بس ایک دو لقمے لے لیں۔“

اس نے پھر ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا۔

شانی نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا۔ بھوک کا دور دور پتا نہیں تھا۔ وہ تو شاید کئی دن تک کھانے پینے کے قابل نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار قاسم برلاس کی کھوپڑی سے نکلنے والا بھیجہ آجاتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ شک بھی ابھر رہا تھا کہ شاید جالاں اسے کچھ کھلا کر بے ہوش یا نیم بے ہوش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس طرح کی صورتِ حال کا شکار وہ اس سے پہلے عثمانی کے گھر میں بھی ہوچکی تھی۔ اس نے کھانے سے صاف انکار کر دیا۔

تاریک شیشوں والی گاڑی کے دروازے لاک تھے۔ سفاک صورت والے بخشو کی جھولی میں ریوالور دھرا تھا۔ پہلو میں جالاں چوکس بیٹھی تھی۔ گاڑی یخ بستہ تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی نامعلوم سمت کو اُڑی جا رہی تھی۔ شانی رو رہی تھی......مگر یہ بھی جانتی تھی کہ یہ آنسو کسی پر اثر کرنے والے نہیں۔

☆======☆======☆

شانی کی توقع کے خلاف گاڑی کا سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ اس کی یہ توقع بھی کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی تھی کہ اسے دیہاتی علاقے میں لے جایا جائے گا۔ وہ جس چار دیواری میں رکے وہ شہری علاقے کا حصہ نظر آتی تھی اور نہ دیہاتی علاقے کا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لاہور کے نواح کا فیکٹری ایریا ہے۔

ایک شاندار وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد کار کوٹھی کے عقب میں پہنچی اور وہاں ایک علیحدہ عمارت کے سامنے رک گئی۔ جالاں اور اس کے دونوں ساتھیوں نے شانی کو ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ شانی کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہوکر ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ جالاں اسے مسلسل تسلیاں دے رہی تھی۔ وہ جس کمرے میں پہنچے وہاں قالین تو نہیں تھا مگر بجلی کا ہیٹر لگا ہوا تھا جس کے سبب خوشگوار حرارت موجود تھی۔

یہ درمیانے درجے کا کمرا تھا......ایک بڑا بیڈ، دو صوفے اور ایک تپائی رکھی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں پر لوہے کی مضبوط گرلیں تھیں۔

''کہاں ہیں بھابو اور بچے۔'' شانی نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

''آپ جرا آرام کریں چوہدرانی......ابھی تھوڑی دیر میں سارے ملیں گے آپ سے۔''

''مجھے یہاں اکیلے چھوڑ کر مت جانا جالاں۔''

''آپ بے فکر رہیں/ میں اِدھر ہی ہوں......اور پھر فردوس بھی تو ہے۔ کوئی کام ہو تو آواج دے دیں۔ فوراً آ جائے گی۔'' پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے دو تین بار فردوس کو پکارا۔ چالیس پینتالیس سال کی ایک ملازمہ نما عورت اندر آ گئی۔

جالاں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ چوہدرانی جی ہیں۔ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ چوہدری جی کا خاص حکم ہے۔''

فردوس نامی ملازمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور سرتاپا شانی کا جائزہ لے کر آہ سی بھری۔

دن چڑھے شانی کو کمرے سے باہر چہل پہل محسوس ہونے لگی۔ اس نے نیلی وردیوں والے دو تین گارڈز کو بھی دیکھا۔ ایک خانساماں ٹائپ شخص انڈے اور ڈبل روٹیاں اٹھا کر شاید کچن کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دیگر ''ملازم صورت'' افراد بھی نظر آئے۔ ایک ہٹا کٹا ڈشکرا رکھوالی کے کتوں کو ٹہلانے کے لئے نکلا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد فردوس نامی ملازمہ شانی کے لئے گرم کپڑوں کا جوڑا، گرم چادر اور چپل لے آئی۔ شانی کے جسم پر ابھی تک وہی مرمت شدہ منحوس لباس تھا۔ جس میں وہ عثمانی کے گھر سے بھاگی تھی۔ فردوس نے اسے بتایا کہ باتھ روم میں گرم پانی صابن تولیا سب کچھ موجود ہے۔

فردوس نامی یہ ملازمہ شکل صورت سے کچھ بھلی مانس نظر آتی تھی۔ شانی اس سے اپنے قرب و جوار کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن وہ جتنی تیزی سے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گئی۔

شانی نے نہا کر کپڑے بدل لئے اور ہیٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس دوران میں ایک نوعمر لڑکا تپائی پر ناشتے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ انڈے، پراٹھا، ڈبل روٹی اور جیم......سب کچھ موجود تھا لیکن جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ ٹرے میں موجود تھی اور نہ شانی کے پاس. یہ چیز ''بھوک'' تھی۔ اس کے دل و دماغ میں تو بس قاسم برلاس کی موت کے مناظر چکرا رہے تھے۔

اچانک شانی کی نگاہ کھڑکی میں سے گزر کر ایک چہرے پر پڑی اور اسے یوں لگا جیسے

بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچی اور جالی سے چہرہ لگا کر غور سے دیکھنے لگی۔ ''اوہ خدایا'' استعجاب کے عالم میں اس کے ہونٹوں سے نکلا اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ جو عورت چھابے میں بہت سی تازہ روٹیاں رکھے لنگڑاتی ہوئی اندرونی کمروں کی طرف جا رہی تھی، وہ انوری تھی۔ رنگ والی کی حویلی کی ملازمہ انوری .. وہ اٹھائیس تیس سال کی گوری چٹی عورت تھی۔ تین بچے بھی تھے۔ اس کا خاوند کراچی میں مزدوری کرتا تھا۔ وہ پچھلے پانچ چھ برس سے حویلی میں کام کاج کرتی تھی۔

اسے یہاں دیکھ کر شانی دنگ رہ گئی۔ زیادہ حیرانی اسے انوری کی صورت دیکھ کر ہوئی۔ وہ مہینوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ بال بے دردی سے کاٹ دیئے گئے تھے......شانی نے بے ساختہ اسے پکارنا چاہا مگر پھر آواز ہونٹوں میں ہی دب کر رہ گئی۔

انوری روٹیاں اندرونی کمرے میں پہنچا کر واپس چلی گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد شانی نے اسے پھر روٹیوں والے چھابے کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف جاتے اور واپس آتے دیکھا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی قابلِ رحم لگ رہی تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچن میں کام کر رہی ہے۔ اگلے تقریباً ایک گھنٹے میں وہ چار پانچ بار کھڑکی کے سامنے سے گزری۔ اس نے کم و بیش پچاس روٹیاں پکا کر اندر پہنچائی ہوں گی۔ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور چہرے پر صبح سویرے ہی نقاہت نظر آنے لگی تھی۔

''یہ یہاں کیسے ہے؟'' بہت سے دیگر سوالوں کی طرح یہ سوال بھی شانی کے ذہن میں مسلسل کلبلانے لگا۔

رات کے بعد جالاں کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ نہ ہی فردوس نے شکل دکھائی تھی ویسے شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے آس پاس موجود ہے۔

شانی کے ذہن میں بار بار یہ سوال شدت سے ابھر رہا تھا کہ یہاں اس کا واسطہ کس سے پڑنے والا ہے۔ بھابو اور بچوں کے آثار تو اب تک کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ نارپور کا کوئی چوہدری ہی ہوگا جس کے کہنے پر یہ لوگ اسے یہاں لائے تھے۔

کچھ دیر بعد شانی نے انوری کو پھر دیکھا۔ وہ دھونے والے بہت سے کپڑے لئے صحن کی طرف جا رہی تھی۔ پختہ صحن بھی باقی عمارت کی طرح وسیع و عریض تھا۔ ایک کونے میں نلکا اور واشنگ مشین نظر آ رہی تھی۔ یہاں دیواروں کے ساتھ دو تین الگنیاں بھی تھیں۔ انوری نے سخت سردی میں کپڑے دھونے شروع کر دیئے۔ کچھ دیر بعد جالاں کپڑوں کے ایک اور ڈھیر کے ساتھ نظر آئی۔ وہ کپڑے بھی اس نے انوری کے قریب پھینک دیئے۔ چند دھلے ہوئے

کپڑوں کو جالاں نے ''چیک'' کیا اور بڑبڑاتے ہوئے انداز میں واپس چلی گئی۔ انوری کے ایک تہائی کپڑے ابھی دھلنے باقی تھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ فردوس کی آواز پر انوری کپڑوں کا کام ادھورا چھوڑ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

سہ پہر ڈھائی بجے تک وہ پھر روٹیاں پکا پکا کر اندر پہنچاتی رہی۔ سالن کا ایک بڑا دیگچہ بھی اس نے نوعمر لڑکے کے ساتھ مل کر اندر پہنچایا تھا۔ یہ کھانا کھانے والے زیادہ تر ملازم پیشہ لوگ تھے۔ کچھ گھریلو ملازم، کچھ گارڈز، کچھ ڈرائیور اور چپڑاسی ٹائپ افراد، یہ عمارت کسی فیکٹری کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

تین ساڑھے تین بجے تک انوری یقیناً تھک کر چُور ہو چکی تھی۔ وہ لنگڑاتی ہوئی پھر سے کسی کام کے لئے جا رہی تھی کہ ایک ہٹے کٹے شخص نے اس کا راستہ روکا۔ شانی کے قیافے کے مطابق یہ شخص یہاں موجود گارڈز کا انچارج تھا۔ اس نے لوفر انداز میں انوری سے کچھ کہا۔ جواب میں انوری کے چہرے پر بے زاری اور بے چارگی کے آثار نظر آئے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر شانی کی آنکھوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ انچارج نے بڑی بے باکی سے انوری کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا۔ برآمدے میں کھڑے دو مسلح محافظ یہ منظر دیکھ کر شیطانی انداز میں مسکرانے لگے۔

شانی کی آنکھیں شدتِ کرب سے جلنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ رنگ والی حویلی کی ملازمہ انوری یہاں کیوں موجود ہے؟ وہ خود یہاں کیوں اور کس کے ایماء پر پائی جا رہی ہے۔ یہاں کس قماش کے لوگ موجود ہیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے بیڈ پر لیٹ گئی اور اپنے ذہن کو اردگرد کے ماحول سے کاٹ کر پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح گزرے اتنے میں دروازہ کھلا اور فردوس اندر آگئی۔ اسے دیکھ کر شانی پھر اٹھ بیٹھی۔ فردوس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ناشتا بھی ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے تو وہ حیران ہوئی۔

''کیا بات ہے چوہدرانی؟ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔''

''نہیں ... مجھے ابھی بھوک نہیں۔''

''اچھا ... میں رکھ جاتی ہوں۔ جب آپ کو بھوک لگے کھا لینا۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا۔ یہ سب لے جاؤ یہاں سے۔ مجھے یہ بتاؤ۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ کس لئے لائے ہو؟'' شانی نے چیخ کر کہا۔ اس کی آواز بلند تھی۔

نہ جانے کیوں یہ الفاظ ادا کرتے کرتے آنسو موٹی بوندوں کی طرح ٹپاٹپ اس کی سیاہ آنکھوں سے گرنے لگے تھے۔ فردوس ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے ٹرے ایک طرف رکھ دی اور دائیں بائیں دیکھ کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''مجھے نہیں پتا کہ تم کون ہو..... کہاں سے آئی ہو۔ جالاں نے تمہیں چوہدرانی جی کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم مالکوں کی کوئی رشتہ دار ہی ہو۔ دراصل یہاں ایک جالاں کے سوا سب ملازم ہی نئے ہیں میں بھی زیادہ پرانی نہیں ہوں۔ نئے مالک نے پہلے سارے کارندے، نوکر اور چوکیدار وغیرہ بدل دیئے ہیں بلکہ اب تو ہر شے بدلی ہوئی لگتی ہے۔''

''نیا مالک کون ہے؟''

''پرانے مالک کے بڑے بھائی صاحب۔''

''اور پرانے مالک کون تھے؟''

''اللہ بخشے چوہدری فاخر..... جو کچھ ہم نے سنا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ کچھ مہینے پہلے مالکوں کے پنڈ میں کوئی بڑا حادثہ ہوا تھا۔ کہیں آگ شاگ لگی تھی۔ اس میں بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ اس کارخانے کے مالک چوہدری فاخر صاحب بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔ اب ان کے بعد ان کے بڑے بھائی صاحب نے یہاں کا انتظام سنبھالا ہے لیکن کیا آپ کو ان باتوں کا پتہ نہیں ہے۔''

شانی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ اس عورت کو کیسے بتاتی کہ وہ جس مرحوم کا ذکر کر رہی ہے وہ اس کے سر کا سائیں تھا..... اور وہ جس آگ کی بات کر رہی ہے وہ اس کے شعلوں میں سے ہو کر گزری ہے۔

فردوس کی بات سن کر اس کے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔ یہ شبہ تو اسے پہلے سے تھا کہ شاید یہی وہ ''لاہور والا کارخانہ'' ہے جہاں فاخر ہر دوسرے تیسرے روز نارپور سے سفر کر کے یہاں پہنچتا تھا۔ اب فردوس کی بات سن کر یہ شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔

''چوہدری فاخر کا بڑا بھائی کدھر ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ فردوس اس بات کا کوئی جواب دیتی ... یا اس حوالے سے کچھ کہتی، اس بند کمرے کا دروازہ کھلا جس میں تھوڑی دیر پہلے انوری کو کھینچ کر لے جایا گیا تھا۔ وہ الٹے ہاتھ سے آنسو پونچھتی نڈھال سی باہر نکل رہی تھی۔ ہاری اور ٹوٹی ہوئی سی .. ایک لمحہ کھڑکی کے سامنے رک کر اس نے اپنی قمیص درست کی اور لنگڑاتی ہوئی صحن کی طرف چلی گئی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے پیچھے ''منظر'' پر درد کی لکیر سی کھینچ گئی ہے۔

شانی نے فردوس سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ہے ایک قسمت کی ماری۔ اس جیسی پتا نہیں کتنی اس چاردیواری میں آتی جاتی رہی ہیں۔''

''کوئی نوکرانی ہے؟''

فردوس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سنا ہے کہ گاؤں میں دشمنی کا چکر شکر ہے۔ یہ بے چاری اسی لپیٹے میں آئی ہوئی ہے۔ اللہ معاف کرے۔ اللہ ہر کسی کو ایسی آفتوں سے بچائے۔'' فردوس نے دو تین بار کانوں کو ہاتھ لگائے اور اس رخ پر دیکھنے لگی جدھر انوری گئی تھی۔

''کیا اسے چوہدری فاخر کا بھائی پکڑ کر لایا ہے؟''

''بس یہی سمجھ لیں۔ بڑا ظلم ہوا ہے اس کے ساتھ۔ مالک کے کارندوں نے پورے تین دن تک اسے چھت سے الٹا لٹکائے رکھا ہے اور ڈنڈوں سے مارتے رہے ہیں۔ اللہ معاف کرے اس کی چیخیں باہر بڑی سڑک تک جاتی تھیں۔ پھر ایک دن تو بے چاری کو ننگا کر کے برف پر لٹا دیا تھا انہوں نے۔ یہ اپنے بچوں کو یاد کرتی تھی اور ساتھ ساتھ کارندوں کی منتیں کرتی تھی کہ وہ اسے جان سے مار دیں......''

''کیوں ایسا کیا انہوں نے اس کے ساتھ؟''

''ٹھیک بات کا تو پتا نہیں۔ بس یہی سنا ہے کہ مالک اس سے کسی عورت کا پتا پوچھتے تھے...... یہ کہتی تھی کہ میں نہیں جانتی۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی وچاری کی۔ پر ابھی بھی پوری طرح چھوٹی کہاں ہے۔ اسے یہاں لا کر باندھ کر رکھا ہوا ہے مالکوں نے۔ واپس نہیں جانے دیتے۔ رات کو اوپر والے کمرے سے اس کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ اپنے بچوں کے نام لے لے کر انہیں یاد کرتی ہے۔ ایک کو گڈی کے نام سے بلاتی ہے۔ ایک کو کاکا کہتی ہے۔''

''ابھی...... اس سے ایک بندہ کھینچا تانی کر رہا تھا۔'' شانی نے کہا۔

''ایک بندہ؟'' فردوس نے عجیب سے انداز میں سر ہلایا۔ ''یہاں کئی بندے ایسا ہی کرتے ہیں۔ سب کے لئے کھلونا بنی ہوئی ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اوپر سے کھوتے کی طرح کام بھی کرتی ہے سارا دن...... ذرا انکار کرے تو جالاں بالوں سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیتی ہے۔ پچھلے جمعے کی بات ہے۔ یہ ساری رات اپنے ''کاکے'' کا نام لے لے کر روتی رہی۔ دہائی دیتی رہی کہ وہ گاؤں میں بیمار ہے۔ وہ مر جائے گا۔ رات آخری پہر اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ پر وچاری کو پتا نہیں ہے۔ یہاں کے انتظام

بڑے سخت ہیں۔ اس ویہڑے سے باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ پکڑی گئی۔ صبح سویرے جالاں نے سب کے سامنے اسے اتنا مارا کہ بے ہوش ہو گئی۔ چولہے میں جلانے والی ''پکی لکڑی'' جالاں نے توڑ دی اس پر...... بھی ٹانگ پر بڑی سخت چوٹ آئی۔ تین چار دن تو ٹانگ نیچے ہی نہیں لگی وچاری کی۔ جالاں اس حالت میں بھی اس سے کام کرواتی رہی۔''

بات کرتے کرتے فردوس ایک دم چونک گئی۔ رک کر شانی کی طرف دیکھنے لگی اور بولی۔

''دیکھو جی! میں نے یہ باتیں آپ کو بتا تو دی ہیں، پر آگے کسی کو نہ بتانا۔ ورنہ میری بڑی بُری شامت آ جائے گی۔ یہ جالاں بڑی کرخت ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔''

''نہیں بتاؤں گی۔'' شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

وہ بولی۔ ''ویسے سچی بات یہ ہے کہ جو باتیں میں نے آپ سے کی ہیں، ان میں آپ کا فائدہ بھی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ لوگ آپ کو یہاں کس لئے لائے ہیں۔ پر لگتا تو یہی ہے کہ یہ آپ سے بھی...... کچھ پوچھنا پاچھنا چاہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ واقعی ایسی بات ہے تو پھر میری آپ کو ایک نصیحت ہے۔ آپ ان لوگوں کے سامنے کسی طرح کی اَڑی (ضد) نہ کریں۔ جو کچھ یہ پوچھیں صاف صاف بتا دیں۔ اسی میں آپ کی بچت ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ ان لوگوں کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے۔ پر جس طرح یہ آپ کو یہاں لائے ہیں اور جس طرح یہاں رکھا ہوا ہے...... مجھے لگتا ہے کہ اگر آپ نے ان کی بات نہ مانی تو یہ آپ پر بھی سختی کریں گے۔''

باتیں کرتے کرتے ادھیڑ عمر فردوس ایک بار پھر بُری طرح چونک گئی۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر وہ دھیان سے شانی کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

''کیا بات ہے۔ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

فردوس اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ ''سنا ہے کہ مالکوں کو کسی عورت کی تلاش ہے۔ کہیں...... آپ ہی تو وہ نہیں...... جسے وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔''

شانی نے اپنے چہرے کو سپاٹ رکھا مگر اس کے سینے میں شدید ہلچل تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ سو فیصد درست قیافے لگا رہی ہے۔

شانی کے لئے اب اس نتیجے پر پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ انوری یہاں کیوں ہے اور اس سے...... مار پیٹ کر...... کیا معلومات حاصل کی جاتی رہی ہیں۔ انوری، شانی کی گہری اور ہمراز سہیلی سکینہ کی دور کی رشتے دار بھی تھی۔ وہ اکثر سکینہ کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ دھیرے

دھیرے وہ شانی سے بھی بے تکلف ہوگئی تھی سکینہ اور شانی کے درمیان ہونے والی اکثر باتیں کسی نہ کسی طرح انوری کو بھی معلوم ہوجاتی تھیں۔ لگتا تھا کہ انوری اسی ''موہوم تعلق'' کی پاداش میں رنگ والی سے اٹھا کر یہاں پہنچا دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس واقعے کے بعد ہوا تھا جب لاہور میں ''شکرا چشم جالاں'' نے شانی کو کریم پورہ کے ڈاک خانے سے باہر دیکھا تھا اور اس کا پیچھا کیا تھا۔ یقیناً چوہدری کو گمان تھا کہ شانی کے میکے والے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔

فردوس کی آواز نے شانی کو خیالات سے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''مم...... مجھے نہیں پتا، تم کس عورت کی بات کر رہی ہو؟'' شانی بولی۔

اس سے پہلے کہ فردوس اس بارے میں شانی کو مزید کریدتی کہیں پاس سے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ فردوس نے سب کچھ بھول بھال کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہائے میں مرگئی۔ مالک آگئے ہیں۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ دروازے کی طرف دو قدم جا کر وہ پھر مڑی اور شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''جو باتیں میں نے آپ سے کی ہیں وہ اپنے تک ہی رکھنا۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔''

شانی نے تسلی دینے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے قدرے فربہ جسم کو تیزی سے حرکت دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک باتونی عورت ہے۔ ایسے لوگ اپنی بسیار گوئی کی وجہ سے اکثر مشکل میں رہتے ہیں۔

شانی نے صحن کے پاس جا کر دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ صحن کے ایک گوشے میں ایک لینڈ کروزر جیپ کی جھلک نظر آئی۔ پاس ہی ایک گارڈ چوکس کھڑا تھا۔ یہ جیپ یہاں پہلے موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے شانی نے اس گاڑی کی آواز سنی ہے۔ شانی کا دل سینے میں شدت سے دھک دھک کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس دھک دھک سے اس کی پسلیاں بھی لرز رہی ہیں۔

فردوس نے کہا تھا کہ مالک آگئے ہیں۔ اب یہ مالک کون تھا؟ اور شانی کے ساتھ کس طرح پیش آنے والا تھا؟ یہ سوال اہم تھے۔ فاخر کا بڑا بھائی بشیر بھابو کا شوہر تھا۔ اس کا نام بشیر احمد تھا اور وہ کاروبار کے سلسلے میں قطر اور کویت میں رہتا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ابھی تک شانی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں نارپور کی حویلی میں اس کی تصویریں وغیرہ شانی نے

دیکھی تھیں۔ بھابو اور مُنا وغیرہ سے اس کی باتیں بھی سنی تھیں۔ غالباً اس لینڈ کروزر میں وہی یہاں پہنچا تھا۔

شانی کی ٹانگیں بے جان سی ہو رہی تھیں۔ وہ ٹھنڈے ٹھار صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک خفیف کپکپی اس کے پورے جسم کو جکڑتی جا رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر بھابو کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اگر بشیر احمد یہاں تھا تو کیا بھابو بھی یہاں آس پاس موجود تھی؟ کیا وہ جانتی تھی کہ شانی یہاں موجود ہے؟ کیا وہ ہمیشہ کی طرح اس کی مدد اور طرف داری کر سکتی تھی؟

☆======☆======☆

انتظار ہمیشہ کٹھن ہوتا ہے اور جب یہ انتظار کسی بُرے وقت کا ہو تو اس کی کٹھنائی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ شانی سہمی ہوئی سی کسی آہٹ کا انتظار کر رہی تھی...... بالآخر آہٹ پیدا ہوئی۔ یہ کئی قدموں کی چاپ تھی۔ تین چار افراد کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر دروازہ کھلا۔ شانی نے ایک جواں سال شخص کو دیکھا۔ وہ سُرخ تہبند اور اسی طرح کی ریشمی قمیص میں تھا۔ قمیص پر چمکدار لائنیں تھیں اور کڑھائی کی گئی تھی...... اس پر واسکٹ تھی۔ ایک لمبی چادر اس کے کندھوں پر دونوں طرف جھول رہی تھی۔ اس شخص کے پیچھے جالاں اور دو مسلح افراد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سُرخ قمیص والے نے ہاتھ کے اشارے سے باقی افراد کو واپس بھیج دیا اور خود اندر آ گیا۔

شانی کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اندر آنے والے کے ساتھ ایک دیوہیکل کتا بھی بے تکلفی سے اندر آ گیا اور شانی کی طرف دیکھ کر عجیب بھیانک سی آواز نکالنے لگا۔ یہ آواز ایک لمبی اور مسلسل گونج کی طرح تھی۔ شانی سمٹ کر ایک گوشے میں ہوگئی۔ نووارد نے خطرناک صورت والے کتے کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور وہ شانی سے پیچھے ہٹ کر اطمینان سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

نووارد جلتی ہوئی تیز نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے لئے شانی کو لگا کہ وہ بشیر احمد نہیں، کوئی اور ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اسے بشیر احمد لگا۔ شاید وہ تصویروں کی نسبت کچھ موٹا ہو گیا تھا۔ بال بھی ذرا لمبے نظر آ رہے تھے۔

وہ بولا تو اس کے بھاری بھرکم دیہاتی لہجے میں دنیا بھر کا زہر بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں لمبی چوڑی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوٹوک بات کرتا ہوں اور دوٹوک ہی سننا چاہتا ہوں... حویلی میں تمہاری حیثیت بہو کی تھی۔ مگر آگ لگنے کے بعد تم چوروں کی طرح حویلی سے غائب ہوگئیں۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد اتفاق سے تمہاری صورت لاہور شہر میں نظر

آئی۔ وہاں بھی تم نے جالاں کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ ایسا کیوں کیا تم نے؟''

شانی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

وہ ایک دم کرسی گھسیٹ کر شانی کے بالکل سامنے آن بیٹھا۔ اس کے سر میں لگے خوشبودار تیل کی بو سیدھی شانی کے نتھنوں میں گھسی۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ زیادہ خطرناک تھا۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں مہارانی، تم حویلی سے کیوں غائب ہوئیں...... کس کے ساتھ غائب ہوئیں اور اب تک کہاں رہیں؟''

شانی کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اچانک اس کرخت شخص نے سامنے رکھی ہوئی کرسی کو اس زور سے ٹانگ ماری کہ لکڑی کی وزنی کرسی اچھل کر دیوار سے ٹکرائی اور اس کے دو پائے ٹوٹ کر دور جا گرے۔ دیوہیکل کتا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شانی کے عین سامنے پہنچ کر غرانے لگا۔ اس کی دبنگ آواز سے کمرے کی دیواریں لرز اٹھیں۔ شانی سہم کر دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی کراہیں نکل رہی تھیں۔ کتے کا خوفناک تالو اس کے چہرے سے بس تین چار فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی بدبودار ہوا شانی کے جسم سے ٹکرا رہی تھی۔

نووارد نے کتے کو ایک بار پھر ڈانٹا اور وہ ذرا سا مچل کر دُم کو گردش دیتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شخص جنونی انداز میں بولا۔ ''شانی بی بی! تم نے ساری زندگی پنڈ میں گزاری ہے، تم نے گنے کی گنڈیریاں بنتے دیکھی ہوں گی...... میں بندے کو ایسے ہی بجلی کے ٹوکے میں سے گزار کر اس کی چھوٹی چھوٹی...... چھوٹی چھوٹی گنڈیریاں بنا دیتا ہوں۔'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے شانی کو گنڈیریوں کا سائز بتایا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت ناک سُرخی تھی۔

''مم...... میں کیا بتاؤں؟'' شانی نے کتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شروع سے لے کر آخر تک...... اور بہتر ہے کہ رستم سیال سے شروع کرو۔'' اس کا لہجہ بدستور جنونی تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''تم سب کچھ سمجھتی ہو شانی بی بی...... بس ہم کو اُلو بنا رہی ہو...... تمہارے لئے ہم سب اُلو کے پٹھے، کھوتے، ڈنگر، بغلول ہیں......'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''رستم اور زوار سے کیا تعلق ہے تمہارا...... وہ تمہیں حویلی سے کہاں لے کر گئے تھے۔ کہاں کہاں رکھا ہے تمہیں؟''

شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے۔ اگر وہ یہ کہتا ہے کہ رستم سے کیا تعلق ہے تمہارا...... وہ تمہیں حویلی سے کہاں لے کر گیا تھا تو اس کی بات میں زیادہ وزن ہوتا اور یہ وزن شانی کو دہلا دیتا۔ مگر اب وہ رستم کے ساتھ اس کے دوست زوار کا ذکر بھی کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سوال کی بنیاد قیافہ ہے۔

شانی نے اعتماد سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھی...... تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو۔ میں یہاں سے اکیلی نکلی تھی...... اور اکیلی ہی رہی ہوں۔''

''بکواس کرتی ہو تم...... بکواس۔'' وہ چنگھاڑا۔ ''تمہارا ناتا تھا ان کے ساتھ۔ تم نے...... تم نے خود انہیں حویلی میں بلایا تھا۔ تم نے ہمارے دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنی دشمنی چکائی ہے۔ نارپور میں جو بربادی بھی ہوئی ہے نا وہ تمہاری وجہ سے...... صرف تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔ تم قاتل ہو۔ تم خون پینے والی چڑیل ہو۔ تمہیں زندہ جلا دوں گا میں...... تمہیں زندہ جلا دوں گا۔'' اس کے چہرے پر اور لہجے میں جنون کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ مالک کو مشتعل دیکھ کر کتا پھر کھڑا ہو گیا۔ اس کی دُم تیزی سے گردش کرنے لگی اور سینے سے ہولناک آواز برآمد ہونے لگی۔ دھمکاتی ہوئی خون آشام حیوانی آواز...... شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم جیسے پتھرا گیا۔ اس کے سامنے کھڑا غضب ناک شخص سرتاپا شعلہ نظر آ رہا تھا۔ سُرخ تہبند، سُرخ کرتہ، سُرخ چہرہ اور انگارہ آنکھیں۔ پھر شانی نے پھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا وہ بے حد اشتعال کے عالم میں بگولے کی طرح چکراتا ہوا کمرے سے نکلا۔ کمرے سے نکل کر دوڑنے لگا۔ اس کا رخ لینڈ کروزر گاڑی کی طرف تھا۔

بے حد ہیجانی انداز میں اس نے جیپ کا دروازہ کھولا اور اندر سے آئل کا ایک کین نکال لیا۔ جیپ کے قریب مسلح گارڈ بھی یکایک چوکس اور حیران نظر آنے لگا۔ شانی کی نگاہوں میں قرب و جوار چکرانے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ اس کمرے سے بھاگ جائے لیکن سامنے دیکھا تو دیوہیکل کتا اپنے مالک ہی کی طرح غضب ناک تھا۔ وہ بے طرح شور مچا رہا تھا اور شانی کو ایک انچ بھی آگے آنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر سے اس شخص کی جنونی چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ شانی کو غلیظ گالی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اس ڈائن کو مار دوں گا۔ میں اسے زندہ جلا دوں گا۔''

شانی کی دہشت زدہ نظروں نے دیکھا کہ وہ آئل کا کین لے کر دوڑتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ واسکٹ کی جیب میں غالباً لائٹر ڈھونڈ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد چمکیلا لائٹر اس کے ہاتھ میں نظر آیا۔ اب بس لمحوں کی بات تھی...... وہ کسی بھی وقت جان لیوا

شعلوں میں گھرا چاہتی تھی۔ اچانک ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

''نہیں قادرے ... نہیں۔'' اس نے چلا کر کہا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ بشیر...... یہ ہمارے خاندان کی قاتل ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''نہیں قادرے! یہ ٹھیک نہیں...... چھوڑ دو اس کو۔'' نووارد نے سُرخ کُرتے والے کے ہاتھ سے گین چھیننے کی کوشش کی۔

وہ مچھلی کی طرح پھڑکتا رہا اور خود کو دراز قد شخص سے چھڑانے کی کوشش کرتا رہا، یہ کشمکش کچھ دیر جاری رہی۔ سُرخ کُرتے والا ایک طرف تو شانی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف غضب کے عالم میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ''نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا۔''

دراز قد شخص کے اشارے پر دو مسلح گارڈز نے سُرخ کُرتے والے کے ہاتھ سے آٹل گین چھین لیا۔ دراز قد شخص جسے سُرخ کرتے والے نے بشیر کہہ کر بلایا تھا بپھرے ہوئے ساتھی کو اپنی بانہوں میں لے کر دھکیلتا ہوا اندرونی کمروں کی طرف لے گیا۔ کتا شانی کو مسلسل ہراساں کر رہا تھا۔ اس نے شانی کو ایک گوشے میں یوں گھیرا ہوا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔

فق چہرے والی فردوس نے ایک گارڈ کو اس طرف متوجہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کتے کو پٹے سے پکڑ کر شانی سے دور ہٹا لیا۔ شانی بے دم ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش جائے گی۔ اس کی کیفیت کچھ ویسی ہی ہو رہی تھی۔ جیسی شادی کے پہلے روز نارپور کی حویلی میں ہوئی تھی۔ وہ بیاہ کر اپنے نئے گھر میں اُتری تھی، عورتوں کے ہجوم نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ گھٹن، حبس اور انجانے خوف کے سبب وہ اچانک نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کیا جا چکا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر تنہا تھی۔ اس کا نازک دل سینے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ دشمنوں کے درمیان تنہا تھی۔ کوئی مددگار نہیں تھا، دشمن ہی اس پر جھپٹ رہے تھے اور دشمن ہی اسے عارضی طور پر بچا رہے تھے۔ ابھی تک کسی اندرونی کمرے سے غضب ناک انداز میں بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بہر حال اب ان آوازوں میں پہلے سی جنونی کیفیت نہیں تھی۔

سُرخ کپڑوں والے نے دراز قد شخص کو بشیر کہہ کر پکارا تھا۔ جب کہ بشیر نے اسے

قادرے کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سُرخ کپڑوں والا جنونی فاخر کا بڑا بھائی نہیں تھا۔ فاخر کا بڑا بھائی وہ تھا جو بعد میں آیا تھا اور جس نے شانی کو بچایا تھا۔ اس کی صورت ''ان تصویروں'' کے عین مطابق تھی جو اب تک وہ نارپور کی حویلی میں دیکھتی رہی تھی۔

صورتِ حال کی اس نئی کروٹ نے شانی کے خوف و ہراس کو کسی حد تک کم کیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے موت، کچھ دیر کے لئے ہی سہی مگر اس پر سے ٹل گئی ہے۔ چوہدری بشیر بھابو کا شوہر تھا اور اگر بھابو بھی کہیں آس پاس ہی موجود تھی تو پھر شانی کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہو سکتی تھی کہ وہ کسی غم گسار کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر روئے...... اور بہت دیر تک روئے۔

وہ سہمی بیٹھی رہی اور اپنی سبک گام تقدیر کے اگلے قدم کا انتظار کرتی رہی۔ ذہن کا خوفناک تناؤ ذرا سا کم ہوا تو اسے کچھ اور بھی یاد آنے لگا۔ نارپور کے چوہدریوں میں سے قادرے کا نام وہ پہلے بھی دو چار بار سن چکی تھی۔ یہ شخص فاخر اور بشیر کا چچازاد تھا اور دوسروں سے زیادہ غصیلا تھا۔ اسی نے اپنے دادا چوہدری مہر کی خواہش پوری کرتے ہوئے چند مزارعوں کو بجلی والے ٹوکے میں دے کر کٹوا دیا تھا۔ نارپور کے قرب و جوار میں یہ بات بہت مشہور تھی۔

شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی کی نگاہ بار بار کمرے کے بند دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ اس کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور بھابو مُنا وغیرہ اندر آ کر اس سے لپٹ جائیں گے۔

آخر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بھاری مردانہ قدموں کی آواز تھی۔ دروازے کو باہر سے کھولا گیا اور پھر دراز قامت چوہدری بشیر اندر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ فاخر کا بڑا بھائی ہے۔ چوہدری بشیر کلف لگی سفید شلوار قمیص میں تھا۔ ماتھے پر سے بال اُڑنے کی وجہ سے پیشانی چوڑی تھی۔ اس کی واسکٹ کی جیب میں پارکر کا قلم نظر آ رہا تھا۔

دروازہ بھیڑ کر وہ شانی کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھمبیر آواز میں بولا۔ ''تمہاری شادی کے تین دن بعد ہی میں کویت واپس چلا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں پتا نہ ہو، میں کون ہوں؟''

''مم... میں جانتی ہوں۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔

وہ بولا۔ ''مقبول (بھابو) خط میں تمہارا ذکر کرتی رہتی تھی۔ پھر جب ٹیلی فون لگا تو مزید باتوں کا پتا بھی چلا۔''

''میں بھی بھابو اور مُنے سے آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔''

اس مختصر تعارف کے بعد چوہدری بشیر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کی آواز میں وہی بھاری پن آ گیا جو فاخر کی آواز میں غصے اور بے گانگی کے وقت آیا کرتا تھا۔ وہ بولا۔ ”شانی! قادرا سخت غصے میں ہے اور بات صرف قادرے کی ہی نہیں، اگر برادری میں پتا چل جائے کہ تم زندہ ہو اور حویلی سے نکل جانے کے بعد اب تک چھپتی پھرتی ہو تو سب اتنے ہی غصے میں نظر آئیں گے۔ وہ سب تم کو دشمن کی بیٹی کے طور پر جانتے ہیں۔ وہ حویلی میں ہونے والی تباہی کا ناتا ضرور تمہارے ساتھ جوڑیں گے۔ یہ ناتا جوڑنے کے بعد ان کے دل و دماغ کی جو حالت ہوگی اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تمہارا قیمہ بنا ڈالیں گے۔“

شانی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

چوہدری بشیر بہ غور اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ”جو کچھ وہ سوچیں گے اور جو نتیجے نکالیں گے وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہوگا...... حالات جس رخ پر اشارہ کر رہے ہیں، وہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔“

شانی سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔ آنسو بوندوں کی طرح اس کی جھولی میں گرتے رہے۔ چوہدری بشیر نے قدرے شائستہ انداز میں جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے رشتے داروں سے کچھ مختلف ہوں۔ میری سوچ کا انداز بھی تھوڑا سا جدا ہے۔ اس کے باوجود تمہارے بارے میں میرے ذہن کے اندر بھی کئی خطرناک سوال اٹھ رہے ہیں...... تمہیں..... ان سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے۔ ورنہ شاید میں بھی تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں۔“

سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اجالا دیکھتے ہی دیکھتے شام کے پروں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ کہیں آس پاس ہی رکھوالی کے دیوہیکل کتوں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ بشیر نے گہرا سانس لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے سے نکل کر اس کی گونج دار آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”جالاں کا کہنا ہے کہ جس وقت حویلی میں آگ لگی تم دادا جی کے کمرے میں موجود تھیں۔ دادا جی پچھلے کچھ دنوں سے تم سے سخت ناراض تھے۔ تم ان کے منع کرنے کے باوجود پھلواری میں جاتی تھیں اور اس طرح کی کئی اور شکایتیں بھی انہیں تم سے پیدا ہو چکی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”دادا نے مجھے پھلواری میں جانے سے منع کیا تھا اور خدا گواہ ہے کہ اس کے بعد میں نہیں گئی لیکن یہ سچ ہے کہ دادا مجھ سے ناراض تھے۔ بہت ناراض تھے۔ مجھے نہیں پتا کہ ایسا

کیوں تھا۔“ شانی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

چوہدری بشیر بولا۔ ”جن لوگوں نے بھی حویلی پر حملہ کیا .. وہ سیدھے اس کمرے میں پہنچے جہاں تم دادا جی کے ساتھ موجود تھیں۔ ایسا کیونکر ہوا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہیں ”چھڑانے“ کے لئے حویلی میں آئے تھے۔

اس سوال کے ساتھ ہی شانی کے ذہن میں نگینہ کی پُراسرار شبیہ ابھری اور وہ سب کچھ یاد آیا جو نگینہ کے حوالے سے پیش آیا تھا اور شانی کے لئے اب تک قطعی طور پر ناقابلِ فہم تھا۔ شانی نے اپنے اندرونی احساسات چھپائے اور چہرے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ”اس کو اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے بھائی جان! مجھے کچھ پتا نہیں وہ کون لوگ تھے۔ کیا چاہتے تھے؟“

”دادا جی کے کمرے میں کتنے بندے گھسے تھے؟“

”صرف ایک تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کپڑے میں چھپایا ہوا تھا۔ پہلے اس نے اکبر کی گردن پر خنجر مارا۔ پھر دادا پر حملہ کیا۔ اس نے دادا کو خنجر مارے اور وہ اپنی وہیل چیئر پر ہی تڑپنے لگے۔ میں ان کی طرف بڑھی۔ اتنے میں گودام کی طرف بڑی زور کے دھماکے ہوئے اور آگ بھڑکتی نظر آئی۔ پھر ایک جلتا ہوا ڈرم کھڑکی توڑ کر کمرے میں آن گرا۔ ہر طرف آگ اور دھواں پھیل گیا۔ میں فاخر کو آوازیں دینے لگی مگر وہ کمرے میں نہیں تھے۔ میں ان کو ڈھونڈتی ہوئی باہر بھاگی۔ باہر ابھی تک گولیاں چل رہی تھیں۔ دھوئیں اور اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“

”دھوئیں سے میرا دم گھٹ گیا۔ میں گر گئی۔ پھر مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ ہوش میں آئی تو میں نارپور میں نہیں تھی۔ یہ کوئی قصبہ تھا۔ میں ایک کاشت دار کے گھر میں تھی۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ بال بچے دار بھلا مانس آدمی تھا۔ وہاں میں نے اخبار بھی دیکھا اور مجھے پتا چلا کہ نارپور میں کیا کچھ ہوا ہے۔ مجھے لگا کہ میرے لئے سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں اب واپس آنا نہیں چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ نارپور اور رنگ والی دونوں جگہوں سے کہیں دور نکل جاؤں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ پھر ایک دن میں کسی کو بتائے بغیر لاہور کے لئے نکل گئی۔“

”کرایہ کہاں سے آیا تمہارے پاس؟ اور باقی خرچا وغیرہ؟“

”میں نے اپنی ایک انگوٹھی محلے کی ایک عورت کو دے کر کچھ روپے لے لئے تھے۔“

شانی نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

''لاہور میں کون تھا تمہارا؟''

''کوئی نہیں تھا۔ بس یہ سن رکھا تھا کہ وہاں ایسی جگہیں ہوتی ہیں جہاں بے سہارا لوگوں کو ٹھکانہ مل جاتا ہے۔ پھر داتا دربار کا خیال بھی ذہن میں تھا۔ میں رات گئے لاہور پہنچی تھی۔ تین آوارہ لڑکے میرے پیچھے لگ گئے۔ میں ان سے بچ کر بھاگ رہی تھی کہ ایک گاڑی کے سامنے آ گئی۔ گاڑی میں ریاض عثمانی نام کا ایک بندہ موجود تھا۔ وہ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے گھر لے گیا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے مجھے عزت سے رکھا، مگر......'' شانی خاموش ہو گئی۔

''دیکھو، مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور میرے لئے بھی یہی چیز آسانی پیدا کرے گی۔'' چوہدری بشیر نے تحکم سے کہا۔

اور پھر شانی نے واقعی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اس سے آگے اس نے کوئی بات بھی چھپائی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ اپنے طور پر تحقیق کریں گے۔ قاسم برلاس والا سرا ان کے ہاتھ میں موجود تھا۔ اس سراغ کی مدد سے وہ باقی کے حالات جان سکتے تھے۔ شانی نے سب کچھ بتا دیا۔ عثمانی اور ماجدہ کی مطلب پرستی، قاسم برلاس کی بدباطنی...... عثمانی کے گھر سے فرار، رکشہ ڈرائیور زکریا کی کمینگی، جنتے کی منصوبہ بندیاں، اس نے کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھا۔ چوہدری بشیر توجہ سے سنتا رہا اور گاہے بہ گاہے اس سے سوال بھی پوچھتا رہا۔ شانی تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔

یہ نشست تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس گفت وشنید کے دوران میں شانی کو اندازہ ہوا کہ بظاہر شائستہ نظر آنے کے باوجود چوہدری بشیر میں بھی وہ کرختگی موجود ہے جو نارپور کے چوہدریوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ چوہدری بشیر کی پیشانی اور ناک کے درمیان ایک افقی سلوٹ موجود تھی۔ یہ سلوٹ عموماً مزاج کی تختی اور چڑچڑے پن کو ظاہر کرتی ہے۔

اپنی طرف سے شانی نے پوری کوشش کی تھی مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ چوہدری بشیر کو کس حد تک مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی شبہات موجود تھے اور کئی سوال بھی جھلک دکھا رہے تھے۔ شاید مزید سوال جواب کرنے سے پہلے وہ شانی کے بیانات کی تصدیق کا خواہاں تھا۔ ایک تفتیشی افسر کی سی چبھتی نگاہوں کے ساتھ وہ مسلسل شانی کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا تھا اور اب بھی گاہے گاہے لے رہا تھا۔

شانی کے خاموش ہونے کے بعد اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور چند طویل کش لینے کے بعد بولا۔ ''تم نے جو کچھ بتایا ہے، وہ ہو سکتا ہے کہ درست ہو۔ مگر اس کے درمیان کی ایک

کڑی غائب ہے۔ آخر وہ بندہ کون تھا جو تمہیں حویلی کے اندر یا باہر سے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا لے گیا۔ اس نے کئی دن تک تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی۔ تم اس کا نام نہیں جان سکی ہو، نہ اس کے گھر والوں میں سے کسی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو۔ قصبے کا نام بھی تمہیں معلوم نہیں ہے۔''

''میں نے کہا ہے ناں کہ ان دنوں میں اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔ بس روتی رہتی تھی یا پڑ کر سو جاتی تھی۔''

وہ شانی کے جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ اس بندے میں اتنی جرأت کہاں سے آئی کہ وہ حویلی کی بہو کو اٹھا کر اپنے گھر لے گیا اور پھر کئی دنوں تک اس معاملے کو ہر کسی سے چھپائے رکھا۔ کم از کم میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے آس پاس کا کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' شانی ہولے سے بولی۔

''ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے۔'' وہ اپنی چوڑی ٹھوڑی کھجا کر کہنے لگا۔ ''تم قصبے کا نام نہیں جانتی ہو لیکن اس کے راستے کے بارے میں تو تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہونا چاہئے۔ تم اپنے پاؤں پر چل کر اس قصبے سے نکلی تھیں اور لاہور پہنچی تھیں۔''

''میں کھیتوں کے درمیان ڈھائی تین میل پیدل چلی اور ایک ٹریکٹر ٹرالی والے نے مجھے بٹھا کر چھوٹی سڑک تک پہنچایا تھا۔ اب اگر میں وہ راستہ دوبارہ دیکھوں تو شاید پہچان جاؤں...... پر...... یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

چوہدری بشیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ تمہارا دوسرا بھائی سجاول اختر بھی میری طرح کویت میں ہے۔ وہاں اس کا کافی بڑا کاروبار ہے۔ تمہارے گھرانے کے ساتھ اتنا کچھ ہوا لیکن اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔''

شانی کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ وہ اس سوال کا جواب دینے بیٹھ جاتی تو سینے کے کئی نیم مندمل زخم چھل جاتے۔ وہ مختصراً بولی۔ ''بھائی سجاول ابا جی کے انتقال پر آئے تھے۔ آٹھ دس دن رہے تھے۔ یہاں فون لگنے کے بعد بھابی اور چچی پروین سے بھی ان کی بات ہوتی رہی ہے۔''

چوہدری بشیر جیسے تاڑ گیا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بولنا نہیں چاہتی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کو کھوجی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ بھی خاموش رہی۔

کمرے کی خاموشی بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ آخر چوہدری بشیر نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''پچھلے مہینے کی ستائیس تاریخ کو جب جالاں نے مجھے اور قادر کو آ کر بتایا کہ اس نے تمہیں لاہور میں دیکھا ہے تو ہمیں بالکل یقین نہیں آیا لیکن وہ جو کچھ بتارہی تھی اور جس انداز میں بات کررہی تھی۔ اس نے ہمیں سوچنے پر مجبور کردیا۔ ہم نے تمہاری تلاش شروع کی، مگر اس طرح سے کہ کسی کا کانوں کان خبر نہ ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ بات پھیل گئی اور تم واقعی زندہ ہوئیں تو پھر تمہارے لئے بڑے خطرے پیدا ہوجائیں گے۔ ہمارے خاندان کے بہت سے لوگ تمہارے خون کے پیاسے بن جائیں گے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے دیکھی ہی ہے۔ قادر حالانکہ میرا بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ میرا گہرا دوست بھی ہے۔ وہ میرے سارے چچیرے ممیرے بہن بھائیوں سے میرے زیادہ قریب رہا ہے۔ میں نے اور مقبول (بھابو) نے اسے ہر بات اچھی طرح سمجھا بھی رکھی تھی، اس کے باوجود وہ تمہیں دیکھ کر اپنے طیش پر قابو نہ پاسکا۔ وہ اب بھی بُری طرح اُبل رہا ہے۔ اسے میں نے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا ہے۔''

شانی نے ایک بار پھر تصور میں اپنے اردگرد پٹرول کی بو اور آگ کی لپک محسوس کی۔

چوہدری بشیر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے، جالاں اور مقبول کے سوا ابھی تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ تم زندہ ہو اور یہاں حویلی میں موجود ہو اور میں جانتا ہوں کہ یہ بات ہم چاروں میں ہی رہے گی تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

مقبول یعنی بھابو کے نام نے شانی کے لرزاں جسم میں توانائی کی ایک موہوم سی لہر دوڑا دی۔ ایک دم اسے لگا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ کوئی ہے جو اس کے آس پاس موجود ہے اور اسے سہارا دے سکتا ہے۔ ''کہاں ہیں بھابو؟'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''یہیں پاس ہی ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں اس سے ملواؤں گا لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

شانی کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے چوہدری بشیر کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ سگریٹ کو پاؤں تلے مسلتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تمہارے بارے میں میرا ذہن واضح نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بہت کچھ چھپا بھی رہی ہو۔ بہرحال کچھ دنوں میں بہت سی باتیں صاف ہوجائیں گی اور اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ تمہارا مستقبل کیا ہے۔''

شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ چوہدری بشیر کی چبھتی نظریں مسلسل اس کے

چہرے پر تھیں۔ اس نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال میں اپنی رہائش کے پاس ہی تمہارے رہنے کا انتظام کررہا ہوں۔ سمجھو یہ ہمارے گھر کا ایک علیحدہ پورشن ہے۔ تمہیں اس چار دیواری کے اندر ہی رہنا ہوگا اور کسی سے فالتو بات نہیں کرنا ہوگی۔ میں پھر تاکید کرتا ہوں کہ کسی کو یہ بھنک بھی نہیں پڑنی چاہئے کہ تم چوہدری فاخر کی بیوہ ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم؟'' آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری بشیر کی ناک کی وہ بالائی سلوٹ نمایاں تر ہوگئی جو اس کے مزاج کی برہمی کو ظاہر کرتی تھی۔

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کے جیٹھ جی اسے کمرے میں چھوڑ کر لمبے ڈگ بھرتے ہوئے احاطے کی طرف جارہے تھے۔

☆======☆======☆

تقریباً آدھ گھنٹے بعد شانی کو اس کی عارضی رہائش گاہ میں منتقل کردیا گیا۔ یہ رہائش گاہ بھی سوڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ درحقیقت یہ ایک شاندار رہائشی عمارت کی چھوٹی سی انیکسی تھی۔ انیکسی کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بہت کم استعمال ہوئی ہے اور اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ پودوں کی تراش خراش بھی نہیں کی گئی تھی اور چھوٹے سے لان میں گھاس بے مہار ہورہی تھی۔ کئی دیواروں کا روغن جھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ فرش بھی میلے تھے۔ بہرحال کمروں میں قالین بچھے تھے اور اندر کی حالت باہر سے بہتر تھی۔ یہ کل دو کمرے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ٹی وی لاؤنج اور ایک کچن تھا۔ ٹی وی لاؤنج کی حالت دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اسے افراتفری میں ابھی ابھی سیٹ کیا گیا ہے۔ ٹی وی کا انٹینا اور تار وغیرہ بھی ویسے ہی دھرے تھے۔ صوفوں کی جھاڑ پونچھ ہونا ابھی باقی تھی۔

اس انیکسی اور اصل رہائشی عمارت کے درمیان سفید پتھر کی ایک ڈیزائن دار دیوار تھی۔ اس دیوار میں جگہ جگہ پتھر کی جالیاں تھیں اور ان جالیوں میں سے رہائشی عمارت کے لان کی جھلک نظر آتی تھی۔ رہائشی عمارت سے انیکسی میں آنے جانے کے لئے ایک دروازہ تھا۔ دروازے کے ایک تہائی حصے کو بوگن بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اگر بیل کو تراشا جاتا تو یہ دروازہ خوبصورت منظر پیش کرتا۔

اس انیکسی میں شانی کو جو سب سے پہلی ناپسندیدہ شے نظر آئی وہ جالاں تھی۔ اس نے بظاہر بڑی محبت اور اپنائیت سے شانی کا استقبال کیا اور اسے یقین دلایا کہ وہ یہاں اس کی خدمت اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔ شانی جانتی تھی کہ وہ یہاں خدمت سے

زیادہ ''دیکھ بھال'' کرے گی اور جالاں نے بھی اپنے فقرے میں دیکھ بھال پر ہی زیادہ زور دیا تھا۔ جالاں کی معاونت کے لئے پندرہ سولہ سال کی ایک نوعمر ملازمہ بھی یہاں موجود تھی۔

شانی سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر اس کا دل بھابو اور بچوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس کے کان ان کی آہٹ کے منتظر تھے۔ اس کی بانہیں ان سے لپٹنے کے لئے بے قرار تھیں۔ وہ کب آئیں گے؟ وہ کس گھڑی انہیں دیکھ پائے گی؟ اس کے دل و دماغ میں یہ سوال زبردست ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کی حرارت خوشگوار تھی۔ کچن میں برتنوں کی کھن کھن سنائی دینے لگی۔ شاید نوعمر ملازمہ چائے بنا رہی تھی اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی مہمان خانے (انیکسی) کی طرف آ رہا تھا۔ یہ نسوانی قدموں کی آواز تھی۔ شانی کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ وہ لاؤنج کے بند دروازے کو تکنے لگی۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی۔ ہاں وہ بھابو ہی تھی۔ جو ہر مصیبت میں شانی کے سامنے دیوار بنتی تھی۔ جس کے سینے میں شانی کے لئے محبت اور ہمدردی کا سمندر ہلکورے لیتا تھا۔ دونوں نے چند لمحے کے لئے ٹھٹک کر ایک دوجے کی طرف دیکھا پھر وہ لپک کر آگے بڑھیں اور لپٹ گئیں۔ وہ ایک دیدنی منظر تھا۔ وہ بڑے جذباتی لمحے تھے۔ شانی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ بھابو کی آنکھیں بھی دریا بہا رہی تھیں۔ بھابو نے شانی کو اپنی دونوں بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔ رونے کے ساتھ ساتھ وہ شانی کو سنبھالنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

''حوصلہ کر شانی...... نہ رو شانی...... چپ کر جا...... چپ کر جا میری بہن۔'' وہ اسے پچکار رہی تھی۔ مگر اپنی حالت زار پر قابو پانا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔

شانی نے روتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ بھابو! تیرے بعد ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ سب کچھ لٹ گیا۔ میرا کچھ بھی نہیں رہا بھابو۔''

''یہ اللہ کی مرضی تھی شانی اللہ ہمیں صبر دے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا میری بہن سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دونوں کتنی ہی دیر تک رو رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہیں۔ پھر بھابو شانی کو سہارا دیتی ہوئی صوفے تک لے گئی۔ اس کا سر اور ماتھا بار بار چومتے ہوئے بولی۔ ''آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا شانی کہ تو زندہ ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی بہت اچھا سپنا دیکھ رہی ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ میں تیری جیتی جاگتی شکل پھر آنکھوں کے سامنے دیکھوں گی۔ کبھی سوچا

بھی نہ تھا۔'' اس نے ایک بار پھر شانی کو گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔

آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ کھڑکیوں سے باہر جامن اور امرود کے درخت ٹیرس سے آنے والی مدھم روشنی میں ساکت کھڑے تھے۔ انہیں ایک سرد شب کی یخ بستہ دھند آہستہ آہستہ اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جلد ہی کھڑکیوں کے باہر کا منظر اوجھل ہو جائے گا۔ شانی اور بھابو ایک دوسرے کے سامنے اپنے زخم کھول رہی تھیں۔ دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ بھابو پہلے سے کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر چھائیاں سی نمودار ہو گئی تھیں۔ یکایک شانی نے چونک کر پوچھا۔ ''منا اور ندیم کہاں ہیں؟''

''ندیم تو یہاں نہیں ہے۔ انہوں نے اسے ہوسٹل میں داخل کرا دیا ہے۔''

''انہوں'' سے بھابو کی مراد چوہدری بشیر تھا۔ وہ خاوند کا نام نہیں لیتی تھی۔ کبھی کبھی ندیم کے ابا کا لفظ بھی استعمال کرتی تھی۔

''کون سے ہوسٹل؟'' شانی نے پوچھا۔

''ایبٹ آباد کے پاس کوئی جگہ ہے۔ شاید فوج کا کوئی سکول ہے۔ مجھے تو ٹھیک سے نام کا پتا بھی نہیں۔''

''اور منا؟'' شانی نے دریافت کیا۔

بھابو نے دائیں بائیں دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''منا یہیں ہے...... پر میں تمہیں اس سے ملا نہیں سکتی۔''

''کیوں؟''

''بس ہے کوئی وجہ۔'' بھابو کی آواز میں درد تھا۔

''بھائی جان نے منع کیا ہے؟''

''بس کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' بھابو کی آواز بھرا گئی۔

شانی نے الٹے ہاتھ سے آنسو پونچھتے۔ ''وہ کیسا ہے؟''

شانی کے اس سوال پر بھابو کے چہرے پر کرب کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ کچھ دیر خود پر ضبط کرتی رہی۔ پھر آنکھوں سے تازہ آنسو گرنے لگے۔ اشک بار ہو کر بولی۔ ''شانی تجھے کیا بتاؤں اس نے تجھے کتنا یاد کیا ہے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے۔ ہم نے اس سے یہ بات چھپائی تھی کہ...... اللہ نہ کرے...... تو نہیں رہی ہے۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ تم اپنے گاؤں گئی ہوئی ہو۔ پر تمہیں تو پتا ہی ہے آج کل کے بچے اتنے بھولے نہیں۔ وہ جان گیا تھا کہ جو کچھ چاچا فاخر کے ساتھ ہوا، پڑدادا کے ساتھ ہوا اور حویلی کے بہت سے

لوگوں کے ساتھ ہوا، وہی کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اسے بخار ہو گیا اور ایسا ہوا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ کئی دن تک تو بے ہوش ہی پڑا رہا۔ بے ہوشی میں تمہیں بلاتا تھا۔ چاچی چاچی کہہ کر آوازیں دیتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہوش میں آ کر بھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ برآمدے میں جاتا تو کہتا تھا۔ میں نے ابھی چاچی کو دیکھا ہے، گنا چوس رہی تھی۔ کبھی کہتا چاچی گلی سے گزر رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو کالے بکرے تھے۔ ایک دن آدھی رات کو کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا...... دیوار کے ساتھ کنک (گندم) کی بوری پڑی تھی۔ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں ڈھونڈتی ہوئی نکلی......'' یہاں تک کہہ کر بھابو کی آواز پھر بھرا گئی۔ وہ رونے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''بوری سے ٹیک لگا کر سو رہا تھا۔ میں اٹھا کر اندر لائی۔ میں نے پوچھا اُدھر کنک کے پاس بیٹھے کیا کر رہے تھے۔ کہنے لگا نہیں کنک تو نہیں تھی۔ وہاں تو میری چاچی بیٹھی تھی۔ مجھے کہانی سنا رہی تھی۔''

''اب کیسا ہے وہ؟'' شانی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بڑی مشکلوں سے کچھ سنبھلا ہے۔ ابھی بھی کسی وقت ہلکا سا بخار ہو جاتا ہے۔ تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ تمہارے پاس رنگ والی جانے کی ضد کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کا دھیان کسی اور طرف لگاتی ہوں۔ جب ندیم یہاں تھا تو دونوں کسی وقت تھوڑا سا کھیل لیتے تھے۔ جب سے وہ گیا ہے بالکل اکیلا ہو گیا ہے۔ پرسوں دھوپ میں اداس بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا کیا سوچ رہے ہو۔ کہنے لگا ای...... جب حویلی میں آگ لگی تو چاچی بھی وہاں تھی ناں وہ چاچو کے ساتھ سوتی تھی۔ پھر جب چاچو اللہ کے پاس چلے گئے تو ''وہ'' رنگ والی کیسے چلی گئی۔ وہ بھی اللہ کے پاس چلی گئی ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہے...... وہ ایک دن ضرور آئے گی۔ تم بس نماز کے بعد دعا کیا کرو۔''

''بھابو! مجھے ایک بار اس سے ملا دو۔ میں اسے صرف ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔'' شانی نے بھابو کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''نہیں شانی! تمہیں نہیں پتا تمہارے بھائی جان نے مجھے کتنی پکی طرح منع کر رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی کو تمہارے یہاں ہونے کی بھنک بھی پڑے اور وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ خاندان میں اس بات کا پتا چل جائے گا کہ تم زندہ ہو اور حویلی سے نکلنے کے بعد کہیں چھپی رہی ہو تو بڑا فساد پڑے گا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم پر کیا کیا آفتیں ٹوٹ سکتی

ہیں۔ یہ بلی ماروں کا خانوادہ ہے شانی۔ بڑے خونی لوگ ہیں یہ۔'' بھابو نے آخری الفاظ زیادہ دھیمے لہجے میں کہے تھے۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے بھائی جان کی طبیعت اور طرح کی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ اپنے چاچوں، ماموں اور پھوپوں وغیرہ سے ان کا میل ملاقات بہت کم ہے۔ ویسے بھی یہ زیادہ ٹائم کویت میں ہی رہے ہیں۔ یہ اور ڈھنگ سے سوچتے ہیں۔ پھر ان کو میرا خیال بھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اور بچے تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فی الحال تمہیں دوسروں کی نظروں سے بچانا چاہتے ہیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ایک دو مہینوں میں وہ اس سارے مسئلے کا کوئی اچھا حل ڈھونڈ لیں گے۔''

رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔ جالاں دو تین بار کمرے میں آئی اور آتش دان کی آگ درست کر کے باہر چلی گئی۔ دو بار نوعمر ملازمہ زہرا بھی چائے کے برتن رکھنے اور واپس لے جانے کے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابو منے کو سلا کر آئی تھی اور اسے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ان حالات کے بارے میں بتانے لگیں جو اب تک پیش آئے تھے۔

جب حویلی میں آگ لگی، بھابو بچوں کے ساتھ میکے میں تھی۔ بھابو نے شانی کو بتایا۔ ''مجھے رات کوئی تین بجے یہ خبر ملی تھی۔ میں اپنے چاچا اور بھائی کے ساتھ روتی پیٹتی نارپور پہنچی۔ تب تک چانن ہونے لگا تھا۔ آگ ابھی بجھی نہیں تھی۔ حویلی کے آس پاس بے شمار لوگ جمع تھے۔ کوئلہ بنی ہوئی لاشیں اور ہڈیاں نکال نکال کر چادروں کے نیچے رکھی جا رہی تھیں۔ ہر طرف سڑے ہوئے گوشت کی بو تھی۔ فاخر کی لاش دن چڑھے کھیتوں سے ملی تھی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ مرا ہوا تھا پر لگتا ہے کہ سویا ہوا ہے۔ میری نظروں میں آج بھی اس کا چہرہ ہے۔'' بھابو نے رک کر آنسو پونچھے اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کوئلوں اور کوئلہ بنی ہوئی ہڈیوں میں دیوانوں کی طرح ہاتھ چلائے اور تمہیں ڈھونڈتی رہی، آوازیں دیتی رہی...... تمہارے گاؤں سے تایا معصوم، چاچی پروین اور بابا فخری وغیرہ بھی پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور تمہیں آوازیں دے رہے تھے۔ چاچی پروین کو غش آ لیا۔ انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں وہ کئی گھنٹے بے ہوش رہیں۔ میں خود بھی نیم بے ہوش تھی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ بس ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی...... وہ عید کا دن تھا...... پر ایسی عید اللہ کسی کو نہ دکھائے......''

''میری...... لاش کے بارے میں...... کیا سوچا گیا؟'' شانی نے پوچھا۔

بھابو نے تڑپ کر اس کا منہ چوما۔ ''اللہ کرے تیرے دشمنوں کو بھی تتی ہوا نہ لگے۔ اپنے منہ سے اپنی لاش کی بات نہ کر...... میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔''

''پھر بھی بھابو...... کیا سوچا گیا میرے بارے میں۔''

''اللہ میری عمر بھی تجھے لگا دے۔ ایسی باتیں کر کے تُو میرے زخموں کو چھیل رہی ہے۔'' بھابو نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ تاہم کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھالا اور شانی کے استفسار پر بتایا کہ جل مرنے والے کئی لوگوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا آگ اتنی شدید تھی کہ لوہے کے بڑے بڑے گارڈر، بھاری مشینیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تڑ مڑ ہو کر رہ گئیں یا پگھل گئی تھیں۔ ایسے میں گوشت پوست کے بندوں کا کیا ہونا تھا۔ کم از کم چھ لاشوں کی جلی ہوئی ہڈیاں ہی ملی تھیں۔ جامع مسجد کے مولوی صاحب سے مشورے کے بعد ان ہڈیوں کو نارپور کے قبرستان میں ایک ہی جگہ دفنا دیا گیا تھا۔

شانی نے بھابو سے پوچھا۔ ''کیا آگ لگنے کے بعد تم کبھی رنگ والی گئیں ہو؟''

''نہیں شانی۔'' بھابو نے جواب دیا۔ ''بس ایک دو بار رنگ والی سے ہی لوگ قرآن خوانی کے لئے آئے تھے۔ تمہارے بھائی جان کا دل نارپور میں بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔ کہتے تھے، حویلی کا کالا کھنڈر دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سارے مرنے والوں کے چہرے تصور کے سامنے گھومنے لگتے ہیں، یہاں آ کر بھی وہ بے چین رہتے تھے۔ انہوں نے وہ ساری چیزیں یہاں سے ہٹا دیں جن کی وجہ سے فاخر یا مہر جی کی یاد آ سکتی تھی بلکہ سارے پرانے ملازموں کو بھی پنڈی والے نئے کارخانے میں بھیج دیا۔''

بھابو کے بعد شانی کی باری تھی۔ وہ اپنے اوپر بیتنے والی ایک ایک بات بھابو کو بتانا چاہتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ بھابو اسی کی طرح چوہدریوں کی چار دیواری میں رہنے والی ایک لاچار مخلوق ہے۔ دلیر اور جرأت مند ہونے کے باوجود وہ بھی کسی وقت اس کی طرح بے بس ہو سکتی ہے۔ اپنی مرضی کے برخلاف اپنے اندر کی باتیں زبان پر لانے پر مجبور ہو سکتی ہے اور پھر رستم والا معاملہ بھی تھا۔ تاحال شانی نے ہر کسی کی طرح بھابو سے بھی یہ معاملہ مخفی رکھا ہوا تھا۔

شانی نے شروع سے آخر تک سب کچھ بھابو کے گوش گزار کر دیا۔ تاہم اس روداد میں دو کرداروں کا ذکر نہیں تھا۔ ایک رستم اور دوسرے نگینہ...... نگینہ کا ذکر تو وہ اس لئے نہیں کرتی تھی کہ ابھی اسے خود بھی اس واقعے پر پورا یقین نہیں تھا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور حواس سے محسوس کرنے کے باوجود اسے لگتا تھا جیسے وہ فقط ایک غنودگی بھرا خیال ہو۔ اس کا

دل گواہی دیتا تھا کہ وہ جس کسی سے بھی یہ واقعہ بیان کرے گی، وہ اسے فاتر العقل سمجھنے لگے گا۔ عین ممکن تھا کہ اس واقعے کی وجہ سے اس کے بیان کردہ باقی واقعات کی صحت بھی مشکوک ہو جائے۔

ان دو کرداروں کو واقعات میں سے حذف کرتے ہوئے شانی نے دل ہی دل میں بھابو سے معافی مانگی...... اس نے بہ زبان خاموشی کہا۔ ''بھابو اپنے حالات کے سبب میں مجبور ہوں۔ ورنہ مجھ میں اور تجھ میں دوئی نہیں ہے۔''

بھابو شانی کی روداد بھیگی پلکوں کے سائے میں سنتی رہی اور کہیں کہیں وضاحت کے لئے سوال بھی کرتی رہی۔

آگ لگنے سے کچھ دیر پہلے حویلی میں جو کچھ شانی کے ساتھ ہوا تھا، وہ اس نے بلاکم و کاست بھابو کے گوش گزار کر دیا۔ مہر کی دشمنی کا پھنکارتا ہوا ناگ۔ اکبرے کو چڑھنے والی سپ گندل کا زہر...... ہوس کی یلغار...... اور پھر ہوس کاروں کی موت۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔ یہ باتیں سن کر بھابو کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ اپنے دادا سسر مہر کے بارے میں کچھ کم نہیں جانتی تھی۔ مگر یہ اس کا بدترین روپ سامنے آیا تھا۔ دشمن کی بیٹی اس کی بہو تھی۔ مگر مہر نے اسے فقط دشمن کی بیٹی سمجھا تھا اور ایک ادنیٰ نوکر سے اس کی عزت کی دھجیاں اُڑوانے پر تُل گیا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا قدیم دور کے کسی سنگدل بابلی آقا کی طرح اس بدبخت نے اس کی آبروریزی کا تماشا دیکھنا چاہا تھا۔ اس کے کانوں نے شانی کی دردناک چیخیں سننے کی خواہش کی تھی۔ بھابو سنتی رہی اور درد کی لہروں میں بہتی رہی۔ روداد کے آخر میں قاسم برلاس کی بھیانک موت کا سن کر وہ بھی شانی ہی کی طرح لرز گئی۔ شانی نے یہ واقعہ بھی پوری تفصیل سے بتایا تھا۔ آخر کار شانی کی روداد ختم ہوئی۔ رات اپنے نصف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود بھابو کو اب جانا تھا...... بھابو کے جانے کے خیال نے شانی کو بے کل کر دیا۔ وہ اس کی بے کلی محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کل تو نہیں آ سکتی لیکن پرسوں شام کو پھر آؤں گی۔ فرصت بھی ہو گی۔ ہم دیر تک باتیں کریں گے۔''

بھابو اب اٹھنے کے لئے تیار نظر آ رہی تھی۔ اچانک شانی کو ایک بات یاد آئی۔ اس نے بھابو کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ''بھابو! بھائی جان بشیر سے کہہ کر میرا ایک کام کروا دو...... پلیز انکار مت کرنا...... ورنہ میں یہاں ایک پل چین سے نہیں رہ سکوں گی۔''

''کیسا کام؟''

''کیا تم کو پتا ہے، رنگ والی حویلی کی ایک نوکرانی پکڑ کر یہاں لائی گئی ہے۔''

"نہیں تو... کون ہے وہ؟"

"انوری نام ہے اس کا۔ پرانی ملازمہ ہے۔ تین بچوں کی ماں ہے۔ بڑی اچھی عورت ہے بے چاری۔"

"تم نے اسے کہاں دیکھا؟"

"جہاں فیکٹری کے ملازم اور چوکیدار وغیرہ رہتے ہیں۔ آج شام تک میں بھی تو وہیں تھی...... میں نے...... میں نے اسے بڑی بُری حالت میں دیکھا ہے بھابو۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"کچھ نہ پوچھو بھابو کیا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بھائی جان بشیر کو ساری بات کا پتا نہ ہو۔ اس بے چاری کی مٹی پلید کردی ہے ان لوگوں نے۔ ۔ ۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ ۔۔۔" بھابو بات مکمل نہ کرسکی۔

"ہاں بھابو! وہ سب ہو رہا ہے اس کے ساتھ جو یہ لوگ...... عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس خبیث جالاں نے مار مار کر اس کی ٹانگ بھی خراب کردی ہے۔ اس کی جان بچاؤ بھابو! نہیں تو وہ کرماں ماری مر جائے گی۔"

"یہ کام ضرور قادرے کا ہوگا۔ تمہارے بھائی جان سے اس نے یہ بات چھپائی ہوگی، یا ساری بات نہیں بتائی ہوگی۔ ... پر اسے یہاں لائے کیوں ہیں یہ لوگ؟ کہیں...... اچھا میں سمجھ گئی۔" بھابو نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پھر ذرا تامل سے بولی۔ "قادرا اور جالاں وغیرہ ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا ہوگا شاید "رنگ والی" والے تمہارے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ انہوں نے پوچھ گچھ کے لئے ملازمہ کو اٹھالیا۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے بھابو! میری گہری سہیلی سکینہ اور انوری دور کی رشتے دار بھی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ سکینہ کو ہی اٹھانے گئے ہوں مگر وہاں انوری ہاتھ آ گئی ہو۔"

بھابو کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئیں۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ جالاں تو آس پاس نہیں۔ پھر پُرسوچ انداز میں بولی۔ "شانی اگر "کام کرنے والی" کو واقعی اٹھا کر لایا گیا ہے تو پھر یہ لوگ اسے آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔۔۔ وہ چھوٹ گئی تو بہت بڑا فساد ہوجائے گا۔"

"کک...... کہیں، یہ اسے مار ہی نہ ڈالیں؟" شانی نے دہل کر کہا۔

"نہیں، اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تم نے مجھے بتا کر اچھا کیا ہے۔ میں اب ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں کل ہی تمہارے بھائی جان سے بات کروں گی۔"

"وہ کیا کریں گے؟"

"بھلیے لوکے! وہ کوئی نہ کوئی درمیانی رستہ ڈھونڈ لیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فی الحال یہیں رہے مگر اس کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہ ہو۔"

"خدا کے لئے بھابو! یہ کام ضرور کرو اور جلد سے جلد کرو۔"

بھابو نے اسے تسلی دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اٹھی تو بے ساختہ اس کے منہ سے ہائے نکلی۔

"کیا ہوا بھابو؟" شانی نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"بھابو میری طرف دیکھو۔" شانی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

بھابو نے اس کی طرف دیکھا۔ شانی کی نظریں بھابو کی بجھی بجھی آنکھوں میں گڑ گئیں۔

"کیا بات ہے بھابو! مجھے لگتا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔"

"نہیں شانی، کچھ بھی نہیں، کیا لگ رہا ہے تمہیں؟"

"مجھے تم بیمار لگ رہی ہو۔ رنگ پیلا ہے۔ پہلے سے دبلی ہوگئی ہو۔ گالوں پر پرچھائیاں بھی ہیں۔"

وہ زبردستی مسکرائی۔ "آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اتنا بڑا صدمہ جھیلا ہے ناں۔ تم اپنی طرف دیکھو، تم کون سی صحت مند نظر آرہی ہو۔ کملائے ہوئے پھول کی طرح منہ ہو رہا ہے۔"

وہ شانی کو "اپنا خیال رکھنے" کا کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

بھابو سے شانی کی اگلی ملاقات تیسرے روز رات آٹھ بجے کے بعد ہوسکی۔ شانی اس ملاقات کا بے حد بے قراری سے انتظار کررہی تھی۔ اس کے دل میں یہ موہوم آس بھی موجود تھی کہ شاید اس بار بھابو کسی نہ کسی طرح مُنے کو بھی اپنے ساتھ لے آئے لیکن بھابو اکیلی آئی۔

نوعمر ملازمہ زہرا کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ وہ کھانا بڑا اچھا پکاتی تھی۔ آتے جاتے وہ شانی کو بڑی فدویانہ نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔ شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے اٹھنے بیٹھنے بولنے کے انداز کو بڑے غور سے دیکھتی ہے۔ غالباً مستقبل قریب میں ان عادات واطوار کی تقلید کا ارادہ رکھتی تھی۔ زہرا کے لب ولہجے میں بھی شانی کے لئے ستائش موجود رہتی تھی۔

آتے ساتھ ہی بھابو نے جالاں کو اپنے گھر کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ مُنے کے آس پاس

رہے۔ وہ مُنّے کو سلانے کے بعد آئی تھی۔ شانی نے سب سے پہلے ملازمہ انوری کے بارے میں پوچھا۔

بھابو نے بتایا۔ ''تمہارے بھائی جان سے میری بات ہوگئی ہے۔ میرا یہ اندازہ ٹھیک نکلا ہے کہ یہ سارا کیا دھرا قادرے کا ہی ہے۔''

''اب کیا کہتے ہیں بھائی جان؟'' شانی نے کسی بحث میں پڑے بغیر پوچھا۔

''وہی بات جو میں نے تمہیں پہلے بتائی تھی۔ اب انوری کو چھوڑا گیا تو بڑا فساد ہوگا۔ پر اب اس کے ساتھ وہ سارا کچھ نہیں ہوگا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔ میں نے ان سے پکا پکا وعدہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ کل ہی انوری کو مردا۔ نر جیسے سے نکال لیں گے۔ وہ جہاں بھی رہے گی عزت کے ساتھ اور اچھے طریقے سے رہے گی۔''

''کہیں ایسا نہ ہو بھابو! کہ ہمیں...... پتا نہ چلے اور وہ اسے مار ہی دیں۔''

''نہیں شانی! میں نے ساری بات ان کے سامنے کھول دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انوری ہمارے آس پاس ہی رہے گی۔ میں اسے دیکھ سکوں گی اور اس کا حال چال پوچھ سکوں گی۔ یہ بھی...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے تینوں بچوں کو بھی اس سے ملا دیا جائے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ انہیں بھی اغوا کر کے یہاں پہنچا دیں گے؟''

''نہیں...... نہیں، تم اب یہ پریشانی چھوڑ دو شانی! انوری اور اس کے بچوں کے ساتھ اب جو کچھ بھی ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔''

کچھ دیر بعد شانی اور بھابو کی گفتگو کا رخ مُنّے کی طرف مڑ گیا۔ شانی نے التجاء آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھابو! میری آنکھیں ترس گئی ہیں مُنّے اور ندیم کو دیکھنے کے لئے۔ خاص طور سے مُنّے کا خیال تو ہر وقت دماغ سے چمٹا رہتا ہے۔''

''اسی لئے کہتے ہیں ناں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ بھی تمہارے وچھوڑے میں آدھا رہ گیا ہے۔''

''مجھے اس کی صورت تو دکھا دو۔ چاہے دور ہی سے دکھا دو۔''

''نہیں شانی! مجھے تمہارے بھائی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بڑے سخت ہیں۔ ابھی تھوڑے دن ٹھہر جا۔''

''اچھا تم ایسا کرنا اسے اپنے گھر کے لان میں لے آنا۔ میں پتھر کی جالیوں کے پیچھے سے اسے دیکھ لوں گی۔''

''ایک دو دن ٹھہر جا۔ پھر میں کچھ کروں گی۔'' بھابو نے کہا۔

کچھ عجیب فطرت تھی شانی کی۔ وہ تو ان سے پیار کرنے پر بھی مجبور ہوجاتی تھی جو اسے علی الاعلان نفرت کا نشانہ بناتے تھے۔ جو اس سے پیار کرتے تھے ان کے لئے تو وہ کلیجہ نکال کر دینے کو بھی تیار رہتی تھی۔ بیت جانے والے چند ماہ میں وہ پُر آشوب حالات کا شکار رہی تھی۔ جگہ جگہ بھٹکی تھی اور سخت غیر یقینی شب و روز گزارے تھے۔ اس کے باوجود بھابو اور بچوں کا خیال اس کے دل سے جدا نہیں ہوا تھا۔ مُنّے کی من موہنی صورت بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزری تھی۔ وہ اپنی اداس اشک بار نگاہوں سے اسے دیکھتا تھا، اس کے پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ ہلتے تھے۔ ''چچی! کہاں چھپ گئی ہو...... میں دن رات تمہارا انتظار کرتا ہوں۔''

اب جب کہ مُنّا اس سے فقط چند قدم کی دوری پر تھا، شانی اسے دیکھنے کے لئے اور ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔

بھابو نے کہا۔ ''میں تجھے دکھانے کے لئے ایک چیز لائی ہوں۔'' اس کا ہاتھ اپنی گرم چادر کی بُکل کے اندر حرکت میں آیا اور پھر ایک اخبار اس نے شانی کے سامنے رکھ دیا...... یہ ایک دن پہلے کا اخبار تھا۔ اخبار میں محکمہ ٹیلی فون کے گریڈ بیس کے افسر قاسم برلاس کی پُراسرار ہلاکت کی خبر موجود تھی۔ خبر کے ساتھ قاسم کی لاش کی تصویر بھی دی گئی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر شانی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ کھوپڑی اس کے سامنے ٹوٹی تھی۔ قاسم برلاس کا ایک گال مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ یقیناً یہ اسی قبر کی مٹی تھی جو قاسم اور اس کے کارندے نے شانی کے لئے کھودی تھی۔

خبر کے متن کے مطابق کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے رات قاسم برلاس کی رہائش گاہ میں گھس کر قاسم کو قتل اور اس کے گھریلو ملازم عبدالخالق کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ متن میں لکھا تھا۔

''قاسم برلاس ماڈل ٹاؤن میں اپنی وسیع کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ فقط ان کا ملازم عبدالخالق اور اس کے بیوی بچے قاسم برلاس کے ساتھ رہتے تھے۔ عبدالخالق کے بیوی بچے بھی ان دنوں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ وقوعہ کے وقت قاسم برلاس اور خالق کوٹھی میں تنہا تھے۔ یاد رہے کہ قاسم برلاس مشہور افشاں قتل کیس میں شاملِ تفتیش تھے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ واردات کے وقت کوئی خاتون بھی کوٹھی میں موجود تھی۔ پولیس دو تین سمتوں میں تفتیش کر رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے قاسم برلاس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور اس حوالے سے جائیداد کا جھگڑا بھی چل رہا تھا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہ قتل کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ اس واردات کے حوالے سے ایک قابلِ ذکر بات یہ سامنے آئی ہے کہ قاتلوں نے مقتول کو دفن کرنے کے

لئے کوٹھی کے باغ میں ایک گہرا گڑھا بھی کھود رکھا تھا۔

خبر پڑھنے کے بعد شانی نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ پرسوں رات کے سارے دلخراش مناظر نگاہوں میں گھومنے لگے۔

وقت کی بساط پر واقعات کے مہرے کیسے کیسے نقشے کھینچتے ہیں۔ تھوڑے دن پہلے قاسم برلاس نے عثمانی کی بیٹی افشاں کو موت کے منہ میں پھینکا تھا اور پولیس کی تفتیش کو بھٹکانے کے لئے موقع واردات پر کچھ چالاکیاں دکھائی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ تفتیش گمراہ ہو کر کچھ سرحدی نقب زنوں کی طرف چلی جائے گی اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا تھا لیکن مکافاتِ عمل نے اسے زیادہ مہلت نہیں دی تھی اور آج وہ خود ایک مقتول تھا۔ آج کسی نے موقع واردات پر ردوبدل نہیں کیا تھا لیکن تفتیش کا رخ خود بخود کسی اور سمت میں مڑ رہا تھا۔ طلاق کے معاملے اور جائیداد کے جھگڑے کا ذکر سننے میں آ رہا تھا۔

شانی نے پوچھا۔ ”بھابو! وہ کون لوگ تھے، جنہوں نے قاسم برلاس کو مارا اور مجھے یہاں لائے؟“

”ہوسکتا ہے کہ قادرے کے کارندے ہوں۔ ایسے کام کر گزرنا چوہدریوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ویسے میرا اپنا خیال ہے کہ یہ کوئی...... کرائے کے لوگ تھے۔“

”کہیں...... بھائی جان پر تو...... کوئی بوجھ نہیں آئے گا؟“

”تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ یہ مردوں کے کام ہیں۔ مرد جانیں اور قاسم کون سا اچھا بندہ تھا۔ جو کچھ تم بتا رہی ہو۔ اس حساب سے تو اسے اور بھی بُری موت مرنا چاہئے تھا۔“

”پر پتا نہیں کیا بات ہے بھابو! میں ہر کسی کے لئے دکھی ہو جاتی ہوں قاسم کو مرنا ہی چاہئے تھا لیکن وہ میرے سامنے مرا ہے ناں...... اس کا تڑپنا پھڑکنا میرے دماغ سے نہیں نکلتا۔“ تھوڑے توقف کے بعد اچانک شانی کو کچھ اور یاد آیا بولی۔ ”جو بندے مجھے قاسم کی کوٹھی سے لے کر آئے ان میں سے ایک کی چھاتی میں خنجر لگا تھا۔ خنجر چھاتی میں بالکل پھنس گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا بنا؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ بچ گیا ہے۔ کل قادر اور تیرے بھائی جان اس بارے میں بات کر رہے تھے۔“

اتنے میں ملازمہ زہرا چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ گرم سموسے بھی تھے۔ وہ دونوں چائے پینے لگیں۔ جب وہ نارپور حویلی میں تھے، شام سے پہلے بھابو ایسے ہی چائے اور

سموسے بنا لیتی تھی۔ دیورانی جیٹھانی اوپر کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتی تھیں اور دنیا جہان کی باتیں کرتی تھیں۔ تین چوتھائی سموسے بھابو ہی کھا جاتی تھی۔ مگر آج شانی نے دیکھا کہ وہ سموسوں کو ہاتھ لگاتے ڈر رہی ہے۔ ”کیا بات ہے بھابو...... تم سموسہ نہیں کھا رہی ہو۔“

”اس میں تیل ہوتا ہے ناں۔“ وہ روانی سے کہہ گئی۔

شانی نے اپنا کپ نیچے رکھا اور کل کی طرح ایک بار پھر بڑے دھیان سے بھابو کو دیکھنے لگی۔ ”بھابو، تم ٹھیک نہیں ہو۔ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ اگر تم مجھ کو بتاؤ گی نہیں، تو میں چائے نہیں پیوں گی بلکہ تم سے کوئی بات ہی نہیں کروں گی۔“

کچھ دیر تک شانی اور بھابو میں تکرار ہوتی رہی۔ آخر بھابو نے بتایا کہ اسے پچھلے ڈیڑھ مہینے سے بخار ہو رہا ہے، کسی وقت سر میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے۔ نمک چکنائی وغیرہ سے بہت پرہیز ہے۔

شانی کا دل بجھ سا گیا۔ بھابو کے ہاتھ تھام کر بولی۔ ”مجھے ہنستی مسکراتی...... دھما دھم سیڑھیاں چڑھتی اور دس سیر دہی میں مدانی چلاتی بھابو اچھی لگتی ہے۔ بس مجھے جلدی سے وہی بھابو لوٹا دو۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

بھابو اس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے بولی۔ ”تُو ایویں پریشان نہ ہو۔ اب تُو آ گئی ہے ناں۔ دیکھنا میں کتنی جلدی بھلی چنگی ہوتی ہوں۔“

وہ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک بیٹھی رہیں اور بے حد اپنائیت سے دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہیں۔ بھابو کا وجود شانی کے لئے ایک زندگی بخش سہارا تھا۔ تاریک طوفانی رات میں جان لیوا چٹانوں سے اَٹے ہوئے سمندر کے اندر شانی کو جیسے روشنی کا مینار نظر آ گیا تھا۔

واپس جانے سے پہلے بھابو نے زہرا کو باورچی خانے کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں۔ اس کے بعد از خود گھر کے سارے دروازے چیک کئے۔ چھت کا ایک دروازہ کھلا پڑا تھا۔ بھابو نے دروازہ بند کرتے ہوئے شانی سے کہا۔ ”ان ناکارہ عورتوں پر نہ رہا کرو۔ سونے سے پہلے خود سارے دروازے کھڑکیاں دیکھا کرو۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”کیا کوئی خطرہ ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

بھابو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”قادرے کی باتوں سے تم نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔ نارپور کے اکثر چوہدریوں کو یہ شک ہے کہ حویلی پر حملہ کرنے والا رستم سیال تھا اور وہاں جو بھی تباہی ہوئی وہ رستم سیال کی وجہ سے ہوئی۔ ان میں سے کچھ لوگ تو علی الاعلان رستم سیال کو چوہدری مہر اور فاخر کا قاتل قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے ہر جگہ دیوانوں کی طرح

ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ سنا ہے کہ تھوڑا عرصہ پہلے رستم سیال پنڈی کے قریب پولیس کے ہتھے چڑھ بھی گیا تھا مگر پھر ہوشیاری دکھا کر نکل گیا۔ بھاگنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں ایک پولیس والا بھی زخمی ہوا تھا جو اب تک ہسپتال میں پڑا ہے۔ آج سے پندرہ دن پہلے ایک اور واقعہ بھی ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاہو میں رستم کا کوئی دوست بادامی باغ کے علاقے میں لوہے کا کام کرتا ہے، نارپور کے تین چار چوہدریوں نے جن میں قادرا بھی شامل تھا، اس بندے کو بہت مارا ہے۔ وہ رات کو گودام میں گھس گئے اور آفندی نام کے اس بندے سے رستم سیال کا پتا پوچھتے رہے۔ بعد میں انہوں نے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں اور اس کے دفتر میں توڑ پھوڑ کر کے آ گئے۔ اب سنا ہے کہ رستم نے آفندی کا بدلہ لینے کی بات کی ہے۔ ویسے مجھے تو ایک اور بات لگتی ہے......'' بھابو نے بولتے بولتے بات کا رخ بدلا۔

''کیا بات لگتی ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''شاید تمہیں پتا نہ ہو۔ رستم بڑا خطرناک بندہ ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے پھنے خان بھی اس کے ساتھ ٹکر لینے سے گھبراتے ہیں۔ بندے کو کیڑے کی طرح مسل دیتا ہے۔'' پھر بھابو ایک دم چونک کر بولی۔ ''ہائے! میں تمہیں کیا بتا رہی ہوں۔ تم نے تو خود بھی دیکھا ہوا ہے اس خبیث کو۔ جب تم فاخر کے ساتھ جا رہی تھیں۔''

''ہاں بھابو! میں نے جیپ کے اندر سے ہی سب کچھ دیکھا تھا۔ وہ سچ مچ خطرناک ہے۔ لڑائی مارکٹائی کرتے بالکل بے رحم ہو جاتا ہے۔ فاخر کے سنبھلتے سنبھلتے ہی اس نے کتنی ہی سخت چوٹیں فاخر کو لگا دی تھیں...... میں اور مُنا تو رونے ہی لگ پڑے تھے۔''

بھابو بولی۔ ''میں بات کر رہی تھی کہ یہ مجھے کوئی اور چکر لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قادرے وغیرہ نے رستم کے یار کو زخمی ہی اس لئے کیا ہو کہ وہ اس کا بدلہ لینے آئے اور پکڑا جائے۔ ایسے چکر دار بندے کو پکڑنے کے لئے کوئی چکر ہی چلانا پڑتا ہے ناں.....''

''پر بھابو، اگر پولیس پہلے ہی اس کے پیچھے ہے تو پھر وہ اتنی جلدی بدلہ لینے کا نہیں سوچے گا۔''

''نہیں شانی...... وہ خود تو شاید سامنے نہ آئے۔ پر اس کے کئی سنگی ساتھی ہیں۔ وہ بھی اسی کی طرح مار دھاڑ کرنے والے ہیں۔ وہ ان سے بھی کہہ کر کچھ کرا دے گا۔ وہ بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ اس کے بارے میں اتنی کہانیاں مشہور ہیں کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ پرانے ڈاکوؤں کی طرح کئی جگہ سچ مچ اعلان کر کے ڈاکا مارنے کے لئے آتا تھا ایک بار اس نے پولیس چوکی کے اندر گھس کر ایک چھوٹے تھانیدار کو قتل کر دیا تھا۔ خیر

یہ پرانی خبریں ہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ کچھ بدل گیا ہے۔ پر بندے کی خصلت تو نہیں بدلتی ہے ناں...... ایسے لوگ کبھی کبھی پولیس کو دھوکا دینے کے لئے بھی تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ جس طرح وہ کل خطرناک تھا اسی طرح آج بھی ہے۔ بھلیے لوکے! جو بندہ نارپور کے چوہدریوں سے ٹکر لے رہا ہو اس کی خطرناکی میں بھلا کوئی شک وشبہ ہوسکتا ہے؟''

شانی خاموش رہی۔

بھابو بولی۔ ''تجھے یاد ہے ناں پچھلے سال نارپور کی حویلی میں ہم نے ایک زخمی کی مرہم پٹی کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ رستم سیال کے ساتھیوں میں سے ہے۔ کتنا کرخت اور سخت جان بندہ تھا۔ زخموں سے چُور تھا پھر بھی اس کے منہ سے ''سی'' نہیں نکلی تھی...... ذرا سوچ جس کے ساتھی ایسے ہوں گے وہ خود کیسا ہوگا۔''

''ہوں......'' شانی نے طویل ہنکارا ابھرا۔

وہ بھابو کو کیسے بتاتی کہ...... وہ رستم ہی تو تھا۔

ہاں...... وہ رستم ہی تھا جو اس تاریک رات کو زخمی حالت میں نارپور کی حویلی میں اُترا تھا اور پھر ایک ''قیامت صفت'' لمحے نے اس کا سر شانی کی گود میں رکھ دیا تھا۔ وہ کیسا لمحہ تھا؟ وہ کیسی کیفیت تھی؟ اس لمحے اور کیفیت کے ساتھ درجہ بہ درجہ کچھ اور ناقابلِ فراموش احساسات بھی جڑے ہوئے تھے۔ ایک دھندلی سی ترتیب کے ساتھ کچھ واقعات تھے۔ ایک طمانچہ جو شانی نے رستم کے منہ پر مارا تھا اور جس کے نتیجے میں اس خونخوار ڈکیت کے چہرے پر حیرت اور بے بسی کے یادگار تاثرات ابھرے تھے۔ ایک تصویر جو ایک سرونٹ کوارٹر میں ایک جستی ٹرنک کے اوپر رکھی تھی اور جس کے سامنے سر جھکائے رستم بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ یہ شانی کی تصویر تھی...... اور پھر ایک لمس جو عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی شانی کے تلوے پر ایک آنچ کی طرح دہک رہا تھا، یہ رستم کے ہونٹوں کا لمس تھا ... اور ایک الوداعی خط جو وہ خوابیدہ رستم کی دہلیز پر چھوڑ آئی تھی۔ یہ جدائیوں کا پیامبر خط تھا۔

وہ جب بھی رستم کے بارے میں سوچتی تھی، اسے لگتا تھا کہ رستم کے خیال میں پہلے سے زیادہ شدت اور گہرائی محسوس ہوتی۔ اسے ابا جی کی کہی ہوئی بات یاد آ جاتی تھی۔ بعض ''تعلق'' دوریوں سے کمزور ہو جاتے ہیں لیکن بعض اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ لرز کر سوچتی تھی، کہیں رستم سے اس کا بے نام تعلق بھی مضبوط تو نہیں ہو رہا۔

☆======☆======☆

اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سارے دروازے کھڑکیاں اور روشن دان بند تھے مگر پھر بھی کوئی اندر آ گیا۔ شانی شنیل کی جامنی رضائی میں لپٹی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر آویزاں کلاک ''ٹک ٹک'' کی مدھم آواز پیدا کر رہا تھا۔ جالاں اور زہرا ساتھ والے کمرے میں محوِ خواب تھیں۔ باہر احاطے سے آگے رکھوالی والا ایک سینٹ برنارڈ کتا بار بار سناٹے کا سینہ چیر کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ اچانک شانی کے اندر کی آنکھ نے اسے بتایا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ کوئی وجود...... کوئی حرکت کرتا اور سانس لیتا ہوا وجود۔ اسے کمرے میں ایک غیر مانوس حدت کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ کیسی خوشبو تھی۔ شانی اسے ٹھیک سے شناخت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے لگا کہ یہ گلاب اور گیندے کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہے۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ سانس میں تیزی آ گئی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا...... مگر دل کہہ رہا تھا کہ ہے۔ یہ کیفیت اس نے پچھلے چند ماہ میں پہلے بھی تین چار مرتبہ محسوس کی تھی۔ یہی خوشبو، ایسی ہی حدت...... مگر اس مرتبہ یہ کیفیت زیادہ شدید اور واضح تھی۔ اس کے کانوں میں ایک نہایت مدھم سرگوشی سی گونج رہی تھی۔ جیسے کوئی عورت سانسوں کی لے میں بول رہی ہو۔

شانی ہمیشہ سے حقیقت پسند رہی تھی۔ دیہی علاقے میں رہنے کے باوجود وہ توہم پرستی اور خلافِ عقل عقائد سے کوسوں دور تھی۔ وہ ایسے کمزور اعصاب کی مالک بھی نہیں تھی جو بندے کو ناموجود اشیاء کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور ڈراتے ہیں مگر جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ اس کے سامنے تھا اور وہ خواہش کے باوجود اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ''نگینہ''...... عرصہ ہوا مر چکی تھی لیکن ناقابلِ فہم احساسات شانی کو باور کراتے رہتے تھے کہ وہ اس کے آس پاس موجود ہے۔ اب بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ کوئی وجود کمرے میں تھا، سانس لے رہا تھا۔ حرکت کر رہا تھا۔ اس کی سرگوشی واضح نہیں تھی مگر وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ چاندی کے موٹے بھاری کڑے کھنکنا رہے تھے۔ سرگوشی کی آواز ان میں مدغم ہو رہی تھی۔

پھر ایک دم یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ کمرے کی نامانوس حدت جاتی رہی۔ گلاب اور گیندے کی خوشبو تحلیل ہو گئی۔

شانی نے جلدی سے اٹھ کر ٹیوب لائٹ جلا دی۔ سخت سردی میں بھی اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا بھاری بھرکم جالاں اور نوخیز زہرا بے خبر سو رہی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر مکمل خاموشی تھی۔ رکھوالی کا کتا بھی اب خاموش تھا۔

وہ رضائی میں اچھی طرح دبک کر لیٹ گئی۔ دیر تک امی جان کا بتایا ہوا ایک ورد کرتی رہی پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلے روز سارا دن رات والا واقعہ شانی کے ذہن پر سوار رہا۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ پتا نہیں کیوں اسے تنہائی سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس رات وہ اپنے اور جالاں کے کمرے کا درمیانی دروازہ کھلا رکھ کر سوئی۔ حالتِ نیند میں بھی ایک یاس آمیز خوف شانی کے رگ و پے میں سمایا رہا۔

بہرطور وہ اگلے روز تک خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ خود کو مزید سنبھالنے کے لئے اس نے ایک مصروفیت ڈھونڈ لی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ باہر لان میں نکل آئی۔ اس مختصر لان میں خودرو پودے تھے اور گھاس بڑھی ہوئی تھی۔ بونی بیلوں کو بھی تراش خراش کی ضرورت تھی۔ کئی گملوں میں غالباً ہفتوں سے پانی نہیں دیا گیا تھا۔ وہ لان کو بنانے سنوارنے میں لگ گئی۔ اسے یوں کمربستہ دیکھ کر زہرا بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی۔ ایک بڑے قینچے کی مدد سے شانی بیلوں کو خوبصورتی سے تراشنے لگی۔ زہرا کیاریوں میں سے گھاس پھوس صاف کرنے لگی۔ جالاں نے اسے کام کرتے دیکھا تو لپک کر آئی۔ ''چوہدرانی! یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ کیوں مجھ کو میری نجروں میں ذلیل کر رہی ہیں۔ کل بھی آپ سارا دن باورچی خانے میں گھسی رہی ہیں۔ آپ پیچھے ہٹ جائیں مجھے کرنے دیں یہ سارا کچھ۔''

''نہیں جالاں! میں اپنی خوشی سے لگی ہوئی ہوں۔ ذرا ہاتھ پاؤں کھل جائیں گے۔''

''پر چوہدرانی......''

''کچھ نہیں جالاں......'' شانی نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم جا کر اندر سے جھاڑ پونچھ کر لو۔''

تھوڑے سے تردد کے بعد جالاں اندر چلی گئی۔ شانی اور زہرا اپنے کام میں لگی رہیں۔ دھند چھٹ گئی تھی۔ اب خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ شانی نے گرم چادر اتار کر ایک طرف ڈال دی تھی۔ دوپٹا کمر سے باندھ لیا تھا۔ سردی کے باوجود اسے پسینہ آ گیا اور گال مشقت سے سُرخ ہو گئے۔

کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے ان پتھریلی جالیوں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی جن کے پار بھابو اور مُنا رہتے تھے۔ دیوار کے پار وسیع خوبصورت لان کی جھلک جالیوں میں سے نظر آتی تھی تو شانی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کے دل میں یہ امید جاگتی تھی کہ شاید بھابو یا مُنا اپنے لان میں نظر آ جائیں۔ مُنے کو دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں واقعی

ترس گئی تھیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے مصروف رہ کر شانی نے بہت سا کام نمٹا لیا۔ گارڈینیا کی باڑ کٹ گئی۔ بیلوں اور چھوٹے پودوں کی تراش خراش بھی ہوگئی تھی۔ سب کچھ صاف ستھرا نظر آنے لگا تھا۔ زہرا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک چوہدرانی کا (بے شک وہ جوان تھی) اس طرح بھاگ بھاگ کر کام کرنا اسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ زہرا کو جالاں نے باورچی خانے سے آواز دی۔ وہ اندر چلی گئی۔ شانی لان میں اکیلی رہ گئی۔ آم کے درخت کی ایک شاخ سے پھٹی پرانی پتنگ اٹکی ہوئی تھی۔ شانی اسے شاخ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ شاخ ذرا اونچی تھی۔ شانی نے دو تین بار پنجوں کے بل اچھل کر پتنگ تک ہاتھ پہنچانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ ایک دم وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے لگا کہ کوئی اس کے عین پیچھے موجود ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے جیٹھ جی کھڑے تھے۔ چوہدری بشیر حسبِ سابق شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ چوڑے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ پتا نہیں وہ کب خاموشی سے آیا تھا اور یہاں کھڑا ہوگیا تھا۔

شانی نے ایک دم خجل ہو کر دوپٹا کمر سے کھولا اور سر پر پھیلایا چوہدری بشیر تیز نظروں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ ''وہ......مم... ...میں بس ذرا۔'' شانی ہکلائی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا اس طرح زیادہ دیر صحن میں رہنا ٹھیک نہیں۔ تم دوسروں کی نظروں سے جتنا چھپی رہو گی اتنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے... ...میں احتیاط کروں گی......'' وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکی۔

''ٹھہرو۔'' عقب سے چوہدری بشیر کی گرج دار آواز سنائی دی۔

شانی ٹھٹک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''یہ اپنی چادر تم یہاں چھوڑے جا رہی ہو۔'' چوہدری نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ... ...سس سوری۔'' شانی بولی اور جلدی سے گرم چادر لے کر اندر چلی گئی۔

چوہدری بشیر اسے آخر تک گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔

اس دوپہر شانی کھانے کے نام پر چند نوالے لے کر لیٹی تو ایک عجیب طرح کی تشویش اس کے لہو میں سرایت کرنے لگی۔ اسے چوہدری بشیر کی وہ نگاہیں یاد آئیں جن سے اس نے شانی کو گھورا تھا۔ یہ نگاہیں کسی بھی رشتے یا تعلق واسطے سے مبرّا تھیں۔ یہ صرف ایک مرد کی نگاہیں تھیں۔ ایک غیر مرد کی نگاہیں۔ شانی کے ذہن میں عجیب وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہیں ویسا نہ ہو۔ گاہے گاہے وہ خود کو ٹوکتی اور روکتی بھی تھی... ...شانی! تم کیوں ہر

شخص کے حوالے سے فوراً اندیشوں میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ دنیا میں صرف بُرے لوگ ہی تو نہیں ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر چہرے کے پیچھے کسی مفاد پرست، بددیانت یا بدکار کا چہرہ ہی چھپا ہو۔ اسی دنیا میں فرشتہ صفت لوگ بھی تو بستے ہیں۔ جو دامن نچوڑیں تو ملائک وضو کریں۔ جن کے وجود سے نیکی کا وجود ہے۔ جن کی نگاہوں سے محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جن کے ظاہر و باطن میں مہر و وفا کے سورج چمکتے ہیں۔ ہر کسوٹی اور ہر امتحان میں پورے اُترنے والے لوگ۔ جو اپنے قول اور اپنے ایمان کے لئے کٹ مرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی انہی گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ تم ان کو کیوں بھول رہی ہو؟

اس سوال کا جواب بھی شانی کے اندر سے ہی آیا۔ ''میں ان لوگوں کو بھول نہیں رہی، میں جانتی ہوں وہ ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو یہ زمین اپنے مدار پر قائم کیسے رہتی۔ اس کے پہاڑ روئی کے گالے کیوں نہ بنتے اور اس پر اجرامِ فلکی کی بارش کیوں نہ ہوتی۔ بس یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنے بابل کے آنگن سے نکلنے کے بعد ابھی تک ان میں سے کسی شخص سے نہیں ملی۔ میں بس دوسری قسم کے لوگوں سے ہی ملتی رہی ہوں۔ اسے ایک سنگین اتفاق کہیے یا کچھ اور کہ ابھی تک میرے حصے میں دوسری قسم کے لوگ ہی آئے ہیں۔ وہ چوہدری مہر ہو یا اکبرا، عثمانی ہو یا ماجدہ، زکریا ہو اور جنتے یا قاسم برلاس یا جالاں، سب ایک ہی طرز کے نفوس ہیں۔ ان لوگوں نے میری سوچ کو ڈگمگایا تھا اور میرے اعتماد کو مجروح کر دیا ہے۔

وہ دیر تک بھابو کے شوہر اور اپنے جیٹھ چوہدری بشیر کے بارے میں سوچتی رہی اور مستقبل کے آئینے میں اس کی صورت دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

اس دن شام کو بھابو پھر ملی۔ وہ آج بھی مُنے کے بغیر تھی۔ شانی نے سب سے پہلے اس سے انوری کے بارے میں ہی پوچھا...... بھابو نے بتایا کہ ابھی دو گھنٹے پہلے وہ خود انوری کو دیکھ کر آئی ہے۔ وہ اب کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں بڑے آرام سے ہے۔ اس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی ہے۔ ایک ملازمہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔

''کیا تم خود اس سے ملی ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں۔ تمہارے بھائی جان نے منع کیا تھا۔ میں نے اسے ذرا فاصلے سے دیکھا ہے۔ پر ہر طرح سے اپنی تسلی کر لی ہے۔'' چند لمحے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''ویسے تمہارے بھائی جان اتنے سخت نہیں جتنے چہرے سے نظر آتے ہیں۔ پہلے مجھ سے کہا تھا کہ ہفتے میں بس دو بار جا کر شانی سے مل لیا کرو لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کہنے لگے۔ ایک دن چھوڑ کر چلی جایا کرو۔ اکیلی رہتی ہے۔ ذرا دل بہل جایا کرے گا۔ تمہارے لئے کپڑے سلوانے کے لئے پیسے بھی

دیئے ہیں۔ کہہ رہے تھے اس سے پوچھ لینا۔ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دے۔"

"انہوں نے پہلے ہی میرے لئے کچھ کم نہیں کیا ہے۔" شانی ہولے سے بولی۔ "وہ جس کا نام آپ قادرے لے رہی ہیں، وہ تو مجھے جلانے پر ہی تُل گیا تھا۔"

"پریشان ہونے کی بات نہیں۔ اسے بھی آہستہ آہستہ سنبھال لیں گے تمہارے بھائی جان۔" بھابو نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ بھابو نے جھک کر آتش دان میں لکڑیاں درست کیں اور خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ تمہارے بھائی جان کچھ دن بعد...... میرا مطلب ہے چار چھ ہفتے بعد مُنّے کو بھی ملنے کی اجازت دے دیں۔ مگر......"

"مگر کیا؟" شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

"مسئلہ پھر وہی آجاتا ہے ناں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ بات ہر کسی سے چھپی رہے کہ تم یہاں ہو۔ بے شک مُنا بہت سیانا ہے، لیکن پھر بھی بچہ ہے۔ کسی وقت کسی کے سامنے اس کے منہ سے یہ بات نکل سکتی ہے......"

اچانک شانی کے ذہن میں ایک بات آئی۔ وہ بولی۔ "بھابو! میرے دماغ میں ایک چھوٹا سا نکتہ آیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تم نے مجھے مُنّے کی بیماری...... اور بیماری کے دوران اس کی الٹی سیدھی باتوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس میں سے ایک راہ نکل رہی ہے۔"

"کیسی راہ؟"

"تم نے بتایا ہے ناں...... وہ اکثر کہتا رہتا ہے کہ اس نے مجھے دیکھا ہے، مجھ سے بات کی ہے۔"

"ہاں ایسی باتیں تو وہ کرتا تھا بلکہ کسی وقت اب بھی کرتا ہے۔"

"تو پھر اس کے منہ سے کبھی میرے بارے میں کچھ نکل بھی جائے گا تو.... سننے والا یہی سمجھے گا کہ وہ الٹی سیدھی ہانک رہا ہے۔"

بھابو نے پُرسوچ انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا۔ "تمہاری بات میں وزن تو ہے... پر مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے بھائی جان بھی یہ بات مانیں گے۔"

"تم ان سے کہہ کر تو دیکھو۔"

"کیا کہوں؟"

"اوہو بھابو...... وہی جو میں نے کہا ہے۔"

"اچھا کسی دن موقع دیکھ کر بات کروں گی۔" بھابو نے کہا اور آتش دان میں مزید لکڑیاں جھونکنے کے لئے ذرا جھکی۔ اچانک اسے شدید کھانسی ہوئی۔ شانی نے سمجھا ابھی ٹھیک ہو جائے گی لیکن کھانسی اتنی شدید تھی کہ بھابو دہری ہوتی چلی گئی۔

"بھابو! کیا ہوا...... بھابو۔" شانی بے تاب ہو کر چلائی۔

اس کے ساتھ ہی وہ زہرا کو آوازیں دینے لگی۔ "پانی لاؤ زہرا...... زہرا پانی لاؤ۔"

اس نے بھابو کو سیدھا کیا اور اس کا سانس بحال کرنے کے لئے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چند لمحوں میں ہی بھابو کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ زہرا کے پانی لاتے لاتے بھابو سنبھل گئی۔ شانی نے اسے اپنے ہاتھ سے چند گھونٹ پانی پلایا... کھانسی کے سبب بھابو کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ بے حد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ گلے میں دھواں لگ گیا ہے۔"

شانی نے اس موقع پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے بھابو کو لیٹ جانے کے لئے کہا لیکن وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "جا کر دوائی کھا لیتی ہوں۔"

شانی کی آواز سن کر جالاں بھی دوڑی آئی تھی۔ شانی نے اس سے کہا کہ وہ چوہدرانی جی کو سہارا دے کر گھر تک پہنچا آئے۔ بھابو چند قدم جالاں کے سہارے سے چلی، پھر خود ہی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

بھابو کے جانے کے بعد شانی دیر تک کمرے کے اندر ہی بے قراری سے ٹہلتی رہی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ بھابو بیمار ہے۔ وہ اپنی بیماری چھپا رہی تھی۔ پتا نہیں کہ چوہدری بشیر کو بھی خبر تھی یا نہیں۔ اگر اسے خبر نہیں تھی تو پھر علاج کہاں سے ہو رہا تھا۔ شانی نے زہرا کو بلایا اور اس سے ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ زہرا ذرا سہمی ہوئی تھی۔ شاید جالاں نے اسے دھمکایا ہوا تھا کہ وہ شانی سے زیادہ بات نہ کرے۔

شانی کے سوالات پر زہرا نے مختصر جواب دیئے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ بڑی مالکن کو ڈیڑھ دو مہینے پہلے بخار ہوا تھا۔ الٹیاں بھی آتی رہی تھیں۔ ان دنوں وہ بستر پر لیٹی رہتی تھیں۔ اب وہ چلتی پھرتی ہیں لیکن لگتا ہے بگاہے طبیعت خراب بھی ہو جاتی ہے۔ دس پندرہ روز پہلے زہرا نے بڑی مالکن کو چوہدری صاحب اور مُنّے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ ان کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ وہ شہر جا رہے ہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے۔

ابھی شانی اور زہرا کی بات ہو رہی تھی کہ جالاں دندناتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ زہرا جلدی سے بولی۔ ''اچھا چوہدرانی جی! میں اب چلتی ہوں۔''

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ جالاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی حسبِ معمول تفتیشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر زہرا کے پاس پہنچ گئی۔

رات شانی کو بہت دیر سے نیند آئی تھی اس لئے اگلے روز اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ صحن میں خوشگوار دھوپ پھیلی [illegible] گرم پانی سے نہا کر اس نے بھابو کا ایک جوڑا پہن لیا۔ [illegible] سوڑے کھلے اور لمبے تھے، پھر بھی سج رہے تھے اور شانی کو [illegible] اچھے لگ رہے تھے۔ ان میں سے اسے بھابو کی خوشبو آتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھابو کے گلے سے لگی ہوئی ہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جیٹھانی دیورانی کے روایتی رشتے کے بجائے ان میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی جو کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

شانی کا ذہن رات والے واقعے میں الجھا ہوا تھا اور وہ بھابو کی تکلیف کے حوالے سے مسلسل سوچ بچار کر رہی تھی۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ اگلی ملاقات میں بھابو سے سب کچھ تفصیلاً پوچھ کر رہے گی۔ وہ انیکسی کی چھت پر چلی گئی دھوپ میں ٹہلنے۔ چھت کے چاروں طرف پانچ فٹ اونچی منڈیر تھی جس میں ہوا کی آمد و رفت کے لئے ویسی ہی پتھریلی جالیاں موجود تھیں جو نیچے انیکسی کی چار دیواری میں لگی تھیں۔

اچانک شانی چونک گئی۔ اسے نیچے ایک نامانوس سا شور محسوس ہوا۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ سینٹ برنارڈ کا کتا بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ شانی جلدی سے ایک جالی کے قریب پہنچی۔ اس نے نیچے جھانکا۔ ایک نیلی جیپ بیرونی گیٹ سے آندھی کی رفتار کے ساتھ اندرونی گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ پھر شانی کی آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ جیپ گیٹ سے ٹکرائی اور اس کے آہنی کھٹکے کو دھماکے سے توڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس میں سے دو افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ ان میں سے اگلے شخص کو دیکھ کر شانی سکتے میں رہ گئی۔ اس کے لمبے بال عجیب عالم مستی میں لہرا رہے تھے۔ وہ رستم سیال تھا۔

☆======☆======☆

چوہدری بشیر کا ایک کارندہ رستم سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ جس طرح شانی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اسی طرح یہ شخص بھی گیٹ کے ٹوٹنے کا منظر دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ رستم نے کھڑے کھڑے ایسی زور کی ٹانگ کارندے کے سینے پر رسید کی کہ وہ

لڑکھڑاتا ہوا کئی فٹ دور جا گرا۔ گرتے ساتھ ہی وہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے سائے تھے۔ رستم کے سامنے کسی طرح کی مزاحمت پیش کرنے کے بجائے وہ ایک دم مڑا اور اندر کو بھاگا۔

رستم سفید شلوار قمیص میں تھا۔ ایک گرم چادر اس کے کندھوں پر تھی اور پہلوؤں پر لٹک رہی تھی۔ پھر شانی کی نگاہ رستم کے ساتھی پر پڑی۔ شانی کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ زوار تھا۔ رستم کا ہم نوالہ و پیالہ... اس سے شانی کی ملاقات راولپنڈی میں ہوئی تھی۔ حویلی میں آگ لگنے کے بعد جب رستم اور شانی نارپور سے نکلے تھے تو پنڈی میں زوار کے پاس ہی پناہ گزین ہوئے تھے۔

زوار کو دیکھنے کے بعد شانی کی نگاہ پھر رستم کی طرف گئی۔ وہ بڑے قہرناک انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک بند دروازے کے سامنے پہنچا۔ یہ ایک ''سرونٹ کوارٹر ٹائپ'' جگہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی رکھوالی کے کتوں کو رکھنے کے لئے ایک جالی دار کوٹھڑی تھی۔ رستم نے لکڑی کے دروازے کو زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ اندر سے بند تھا۔ رستم کی للکار دور تک گونجی۔ ''باہر نکل شادے..... میں کہتا ہوں باہر نکل...'' اس کی آواز میں آگ تھی اور غیظ و غضب کی بلند لہریں تھیں۔

رستم کی دوسری آواز پر بند دروازہ کھلا اور ایک شخص نے حیرت کے عالم میں باہر جھانکا۔ اس کا دروازہ کھولنا ہی اس کے لئے قیامت بن گیا۔ رستم نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر اس زور سے گھمایا کہ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا احاطے کے وسط میں جا گرا۔ شانی نے پہچان لیا، یہ وہی ڈشکرا تھا جسے شانی نے اپنی آمد کے پہلے روز رکھوالی کے کتوں کو ٹہلاتے دیکھا تھا۔ شانی کو اس کا نام وغیرہ معلوم نہیں تھا تاہم اس کی شکل و شباہت سے عیاں تھا کہ وہ ایک زور آور اور سفاک شخص ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص گرد آلود زمین پر سے مکمل طور پر اٹھ پاتا، رستم عقاب کی طرح اس پر جھپٹا اور بے رحمی سے اسے مارنے لگا۔ وہ چوہدری بشیر کے گھر میں گھس کر اس کے ایک وفادار کو مار رہا تھا۔ آس پاس چوہدری کے کئی وفادار کارندے موجود تھے مگر ابھی تک کوئی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ واقعی حیرانی کی بات تھی۔ شاید یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ دیکھنے والے ابھی تک سنبھل ہی نہیں سکے تھے۔ دوسری وجہ رستم کی اپنی شخصیت بھی ہو سکتی تھی۔ اسے جاننے والے اس کے رکھ رکھاؤ سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ رستم کے سامنے آنے کا مطلب کیا ہوگا۔ خاص طور سے ایسی صورتِ حال میں کہ وہ سرتاپا شعلہ جوالا

نظر آرہا ہے۔ چھت پر سے شانی نے کم از کم دو ایسے افراد کو دیکھا جو اپنے ساتھی کو احاطے کے بیچوں بیچ مار کھاتے دیکھ کر آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہے تھے اور دیواروں کے پیچھے اوجھل ہو گئے تھے۔ اب تک جو کچھ ہوا تھا، یہ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہوا تھا۔ پھر بھی ایک ایسی چار دیواری میں جہاں چوہدری کے چمچوں کڑچھوں کی بھرمار تھی رستم کو "فری ہینڈ" ملا ہوا تھا اور یہ تعجب کی بات تھی۔

اچانک شانی کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔ رستم نے اپنے شکنجے میں آئے ہوئے شادے نامی شخص کی ران پر اپنا پاؤں رکھا۔ نیچے گرے ہوئے شادے کی پنڈلی رستم کی گرفت میں تھی۔ ایک وحشیانہ جھٹکے کے ساتھ اس نے ران پر سے شادے کی ٹانگ توڑ دی۔ شادے کے ہونٹوں سے نکلنے والی چیخ نے گواہی دی کہ ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ وہ گرد آلود زمین پر مچھلی کی طرح تڑپا اور رستم کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

اسی دوران میں ایک لحیم شحیم کارندے نے ہمت کی اور عقب سے رستم کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ یا تو وہ لڑائی بھڑائی کے فن سے ناآشنا تھا یا لڑنے سے پہلے ہی ہارا ہوا تھا۔ رستم نے دو سیکنڈ کے لئے اپنے تڑپتے پھڑکتے معتوب کو چھوڑا اور اس لحیم شحیم کارندے کو گھما کر پختہ دیوار کے ساتھ دے مارا۔ تصادم شدید تھا، وہ وہیں گر گیا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

اسی دوران میں ایک شخص رائفل بدست... ٹوٹے ہوئے گیٹ کی طرف سے نمودار ہوا۔ شاید وہ رستم پر گولی چلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شانی نے محسوس کیا کہ وہ مطلع کرنے کے انداز میں چیخنا چاہتی ہے۔ یہ قیاس کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے یا نہیں۔ تاہم اس کی نوبت نہیں آئی۔ رستم کا ساتھی زوار پہلو سے رائفل بردار پر جھپٹا اور اسے اپنے نیچے رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ یہ وہی منحوس سیکورٹی گارڈ تھا جو ایک دن شانی کے سامنے انوری کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گیا تھا۔ زوار نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور لمحوں میں رائفل کے وزنی کندے سے سیکورٹی انچارج کا سر اور تھوبڑا رنگین کر دیا۔

کوٹھی کے مردانے حصے سے چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ شانی چھت کی جالیوں سے بس ایک تماشائی کی سی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے فاخر کے چچازاد قادرے کو دیکھا۔ وہ شاید سویا ہوا اٹھا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا احاطے کی طرف آیا۔ رستم کو اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹکا۔ رستم کے پاؤں میں شادا مرغِ بسمل تھا اور اس کی کرب ناک چیخیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ رستم اور قادرے کے درمیان کوئی تیس

میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے پیوست تھیں۔ پھر شانی نے دیکھا رستم نے اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور بڑے خطرناک انداز میں لمبے پھل کا خم دار خنجر نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی رستم کے منہ سے قہر کے عالم میں ایک گالی قادرے کے لئے نکلی...... یہ گالی ایک للکار کی طرح قادرے تک پہنچی تھی۔ قادرے کا سکتہ ٹوٹا۔ اس کے چہرے پر طیش کی سُرخی لہرائی۔ تاہم وہ بھی رستم کی طرف بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہی گیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کوئی ہتھیار لینے کے لئے لپکا ہے۔

فضا میں سنسنی بڑھتی جارہی تھی۔ شانی جالی سے لگی تھی۔ دل سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ صورتِ حال سیکنڈوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ زوار نے رائفل کے بٹ مار مار کر سیکورٹی انچارج کو نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ رستم نے شادے کو اس کی سلامت ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا اور اپنی سٹارٹ جیپ کے پاس لے آیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ شانی سے کچھ اور قریب ہو گیا۔ دونوں کے درمیان بہ مشکل چالیس پچاس فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ شانی اس کے چہرے کو اب زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور دبلا ہو گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ جیسے کوئی "نفس کُش" خود کو مصائب میں جھونک کر اور فاقہ مستیوں میں ڈبو کر کندن بنا رہا ہو...... اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی چمک تھی۔ ایک لمحے کے لئے شانی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چھت پر سے اسے آواز دے۔ اسے پکارے اور بتائے کہ وہ یہاں ہے۔ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس چار دیواری سے باہر اور اس سے آگے...... دنیا کے آخری کنارے تک۔ شاید اس نے پکارنے کے لئے اپنے ہونٹ کھولے بھی تھے مگر پھر بند کر لئے، وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ پکارا تو اسے جاتا ہے جسے اپنی طرف متوجہ کرنا ہو۔ جس کی توجہ کو اپنی طرف سے ہٹانا ہو اسے تو پکارا نہیں جاتا۔

وہ بس دیکھتی رہی۔ رستم زخمی شادے کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا جیپ کی کھڑکی تک لایا۔ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ شادے کو جیپ کے دروازے کے بجائے کھڑکی کے راستے جیپ کے اندر کھینچ رہا ہے اور کھینچ بھی اس طرح رہا ہے کہ پہلے شادے کی ٹانگیں جیپ میں پہنچیں گی۔ شادے کا سر زمین پر گھسٹ رہا تھا اور اس کی ٹانگ جیپ کی ادھ کھڑکی میں تھی۔ پھر شانی نے دیکھا کہ رستم نے جیپ کے اندر سے کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا ہے۔ شادے کی ٹانگ ٹخنے کے اوپر سے کھڑکی میں بُری طرح پھنس گئی تھی۔

یہی وقت تھا جب قادرا اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ آندھی کی طرح نمودار ہوا۔ اس نے آٹومیٹک رائفل سے جیپ پر تین فائر کئے۔ جیپ کی پچھلی سکرین چکنا چور ہو گئی۔ جیپ کے

دروازے کی اوٹ سے زوار نے ماؤزر سے فائرنگ کی۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے قرب و جوار لرز گئے۔ قادرا اور اس کا ساتھی (جس کے آدھے چہرے پر شیونگ کریم لگی ہوئی تھی) تڑپ کر ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔

رستم نے جیپ چلا دی۔ شادے کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا پاؤں بڑی مضبوطی سے لینڈ روور کی کھڑکی میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ اور کندھے گرد آلود زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جیپ کے ساتھ الٹا لٹک رہا ہے۔ اس کی دلدوز چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ اسی دوران میں ایک دیوہیکل السیشن کتا جالی دار دڑبے سے نکل کر جیپ کے پیچھے لپکا۔ غالباً اس کی موت ہی اسے دڑبے سے نکال لائی تھی۔ ابھی وہ جیپ تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک بار پھر دونوں طرف سے گولی چلی۔ وہ دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آیا اور کئی پلٹیاں کھا کر ایک کیاری میں گرا۔ پتا نہیں کہ اسے کس کی گولی لگی تھی۔ جیپ طوفانی رفتار سے اندرونی گیٹ سے نکل کر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ شادا قابلِ رحم حالت میں جیپ کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ رستم نے بیرونی گیٹ تک پہنچنے سے پہلے پہلے اس کی ٹانگ آزاد کر دی۔ وہ دو تین پلٹے کھا کر ساکت ہو گیا۔ بیرونی گیٹ کے قریب دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک تو قادرے کی جیپ تھی۔ دوسری نئی ماڈل کی کرولا تھی، ان گاڑیوں کے قریب پہنچ کر رستم کی جیپ ذرا سست ہوئی۔ شانی نے محسوس کیا کہ رستم کا ہاتھ کھڑکی میں سے نکلا ہے اور اس نے ماؤزر یا پسٹل سے ان گاڑیوں پر چند فائر کئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد جیپ برق رفتاری سے گھنے درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

یہ سارا واقعہ بہ مشکل ڈھائی تین منٹ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے ایک تند و تیز بگولا آیا اور ارد گرد کی ہر شے کو لمحوں میں تلپٹ کر کے اوجھل ہو گیا ہو۔

قادرا بے حد پریشانی کے عالم میں چیخ رہا تھا اور کارندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اب کئی ہٹے کٹے افراد کونے کھدروں سے نکل آئے تھے۔ اکثر کے ہاتھ میں ہتھیار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ زخمی شادے کی طرف دوڑے۔ کچھ نے کیاری میں پڑی السیشن کتے کی لاش کی طرف دوڑ لگائی۔ قادرے سمیت تقریباً سات آٹھ افراد گیٹ کے قریب کھڑی گاڑیوں کی طرف بھاگے۔ دو تین افراد قادرے والی جیپ میں گھس بھی گئے لیکن پھر تیزی سے اُتر آئے۔ تب شانی کو اندازہ ہوا کہ رستم اور زوار جاتے جاتے ان گاڑیوں کو ناکارہ کر گئے تھے۔ انہوں نے کیا کیا تھا، اس کا پتا شانی کو دو دن بعد چلا تھا۔ فائرنگ سے گاڑیوں کے ٹائر برسٹ کر دیئے گئے تھے۔

گیٹ کے قریب کھڑی گاڑیوں کی طرف سے مایوس ہو کر کارندے گیراجوں کی طرف دوڑے۔ اسی اثناء میں شانی کو چوہدری بشیر بھی دکھائی دیا۔ اتوار کی وجہ سے وہ بھی غالباً ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ سخت غصے میں اور بوکھلایا ہوا نظر آیا تھا۔ پہلی گاڑی کے سٹارٹ ہوتے اور گیراج سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھتے بڑھتے دو تین منٹ لگ گئے۔ ظاہر تھا کہ تب تک جانے والے بہت دور جا چکے تھے۔

☆======☆======☆

تھوڑی دیر بعد بھابو آئی تو اس سے شانی کو ساری صورتِ حال معلوم ہوئی۔ بھابو کے چہرے پر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "دیکھا شانی، وہی ہوا نا، جو تم سے کہا تھا۔ رستم نے اپنے یار کا بدلہ لے لیا۔ اس نے شادے کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ قادرا اسے ہسپتال لے کر گیا ہے۔ اب پتا نہیں کیا ہوتا ہے اس کا؟"

"یہ سب کیسے ہوا بھابو؟" شانی نے پوچھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا یہ رستم کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ کوئی عام بندہ نہیں ہے، نامی گرامی ڈاکو ہے۔ اب ذرا دیکھو چوہدری اسے ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور...... خبیث دندناتا ہوا چوہدریوں کے گھر میں ہی گھس آیا ہے۔ تمہیں پتا نہیں چلا ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا ہوا ہے؟"

"بس مجھے گولیوں کی آواز آئی ہے۔ جب میں چھت پر گئی تو ہر طرف گرد و غبار اُڑ رہا تھا۔ ایک نیلی جیپ گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔"

"میں نے بھی بس اس جیپ کو ہی جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ شادا الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا دایاں پیر جیپ کی کھڑکی میں پھنسا ہوا تھا۔ جالاں بتا رہی ہے کہ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی چُورا چُور ہو گئی ہے۔"

"سنا ہے کہ ایک بندے کو گولی بھی لگی ہے؟"

"نہیں...... بندے کو تو گولی نہیں لگی پر قادرے کا کتا مر گیا ہے۔ بڑا لاڈلا کتا تھا اس کا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔"

"حیرانی کی بات ہے بھابو، وہ لوگ یہ سب کچھ کر کے چلے بھی گئے اور اتنے چوکیداروں اور نوکروں میں سے کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آیا۔"

"رستم کی بڑی دہشت ہے شانی۔ جو ایک دو بندے اس کے سامنے آئے وہ بھی شاید اسے جانتے نہیں ہوں گے۔"

''یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہوئی ہے۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں۔ تمہارے بھائی جان بڑے غصے میں ہیں۔ ابھی نوکروں کو بُری طرح جھڑک رہے تھے اور یہ حرام خور ہیں بھی اس لائق کہ انہیں گالیاں دی جائیں۔ رستم اور اس کا ساتھی زیادہ نہیں تو تین چار منٹ تو احاطے میں رہے ہوں گے۔ اتنی دیر میں یہ لوگ کچھ بھی نہ کر سکے۔''

''پر بھابو شادے سے رستم کی کیا دشمنی تھی؟''

''اس شادے نے رستم کے یار آفندی کو مارا تھا۔ یہ شادا ایک نمبر کا قصائی ہے اور میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہ قصائیوں کا کام بھی کرتا رہا ہے۔ بڑی بے دردی سے مارتا ہے بندے کو۔ خالی ہاتھوں سے بندے کی ہڈیاں توڑ دیتا ہے۔ اس نے مار مار کر آفندی کی دونوں ٹانگیں توڑ دی تھیں۔ پھر ان ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کو مروڑ مروڑ کر اس سے رستم کا پتا پوچھتا رہا تھا۔''

بھابو کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اس نے احاطے میں رستم کی شکل نہیں دیکھی۔ اگر وہ دیکھ لیتی تو شاید پہچان جاتی کہ یہی بندہ ایک روز سخت زخمی ہو کر نارپور کی حویلی میں آیا تھا۔ تب اس نے خود کو رستم کے بجائے رستم کا ساتھی بتایا تھا۔

کچھ دیر بیٹھ کر بھابو چلی گئی۔ کوٹھی میں افراتفری کی کیفیت تھی۔ چہروں پر ہراس نظر آ رہا تھا۔ کتے کی ہلاکت کو پُرتشویش سنجیدگی سے لیا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کی دو گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ شانی نے چھت پر سے دیکھا۔ پولیس والوں نے احاطے سے شہادتیں جمع کیں اور گولیوں کے خول وغیرہ اکٹھے کیے۔ اس کے بعد ملازموں کے بیان قلم بند ہونا شروع ہو گئے۔

رات کو شانی بستر پر دیر تک جاگتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں رستم کی صورت تھی۔ آج بہت دنوں بعد شانی نے اسے دوبارہ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دل کی گہرائیوں میں موجود کچھ زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ وہ کتنا دبلا اور زرد نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر ''دکھ'' جیسے نقش تھا۔ کہیں یہ اسی کا دکھ تو نہیں تھا۔ کہیں یہ زرد روئی اور اداسی اسی کی بخشی ہوئی تو نہیں تھی۔

نہ چاہنے کے باوجود وہ دیر تک رستم کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے دل میں کچھ ہوتا رہا۔ وہ رستم سے دور چلی آئی تھی۔ مگر دل اور دماغ کی کچھ ڈوریں ابھی تک رستم کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ڈوریں کوشش کے باوجود ٹوٹتی نہیں تھیں۔ چھوٹتی نہیں تھیں اس کی نازک جان اکثر و بیشتر ایک نادیدہ عذاب کے گھیرے میں رہتی تھی۔ رستم کے ساتھ ہی ساتھ کسی وقت فاخر بھی اسے بے طرح یاد آتا تھا۔ فاخر کی دی ہوئی بے شمار ذہنی و جسمانی اذیتیں شانی

کے معصوم ذہن پر نقش تھیں۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت کے مثبت پہلو شانی کی سوچ میں اُجاگر ہوتے رہتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے چند خوشگوار لمحوں کو بار بار یاد کرتی تھی۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے تھے کہ اپنے آپ کو بدلنے کے باوجود فاخر اپنے مقدر اور انجام کو نہ بدل سکا۔

سوچتے سوچتے شانی کا دھیان نادیہ کی طرف چلا گیا۔ وہ رستم سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی، رستم کو ہر دم اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کے لئے وہ لاہور سے اٹھ کر راولپنڈی جا بسی تھی۔ رستم سے جدا ہوتے وقت شانی نے رستم کو جو خط لکھا تھا اس میں نادیہ کا ذکر بھی تھا۔ شانی نے رستم سے درخواست کی تھی کہ وہ نادیہ کے والہانہ جذبے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرے۔ اب شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ پنڈی میں حالات کیا ہیں۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی وہ ایک بار...... صرف ایک بار پنڈی میں شیری کو فون کرے اور اس سے وہاں کے حالات پوچھے۔ وہ شیری کو اس طریقے سے فون کر سکتی تھی کہ وہ شانی کے ٹھکانے سے بالکل بے خبر رہتی۔

یہ سوچ اگلے روز دوپہر تک شانی کے دماغ میں پنپتی رہی۔ آخر اس نے راولپنڈی میں شیری کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شانی کے پاس ایک موبائل فون موجود تھا۔ یہ موبائل اس کے پاس اتفاقاً اور غیر متوقع طور پر آ گیا تھا۔ اس رات قاسم برلاس اپنی کوٹھی کے پائیں باغ میں قتل ہوا اور اسے قتل کرنے والوں نے شانی کو جالاں کی تحویل میں پہنچایا، یہ فون سیٹ شانی کو ملا تھا۔ وہ پہلی سٹیشن ویگن میں تھی اور ابھی دوسری سٹیشن ویگن میں جالاں کے پاس نہیں پہنچائی گئی تھی۔ اچانک شانی کو اپنے ننگے پاؤں کے نیچے کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے تاریکی میں ہاتھ چلایا تھا اور یہ موبائل سیٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد مسلح افراد نے اسے دھکیل کر دوسری ویگن میں پہنچا دیا، تب موبائل شانی کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ خیال کر رہی تھی کہ کسی بھی وقت جالاں کی نگاہ موبائل پر پڑ جائے گی۔ تاہم جالاں نے اسے گرم چادر اوڑھا دی اور یوں وہ سیٹ شانی کے پاس ہی رہ گیا۔ بعد ازاں شانی نے انیکسی میں آنے کے بعد سیٹ کو آن کر کے دیکھا تھا۔ اس میں موجود فون بک اور کال ریکارڈ وغیرہ دیکھ کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ کسی لیڈی ڈاکٹر یا ڈاکٹر کا فون سیٹ ہو۔ شاید یہ سیٹ کسی ڈاکٹر کی جیب سے سٹیشن ویگن میں گرا تھا۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ سٹیشن ویگن ہی کسی سے چھینی گئی ہو۔ اس میں کافی بیلنس بھی تھا۔ اگر ضرورت تھی تو ایک چارجر کی تاکہ اس کی بیٹری چارج ہو سکے۔

دوپہر کے بعد جب بھابو اس سے ملنے آئی تو شانی نے اسے فون سیٹ دکھایا اور بتایا کہ اسے اس سیٹ کے لئے چارجر کی ضرورت ہے۔

''یہ کیا شے ہوتی ہے؟'' بھابو نے پوچھا۔

''اس فون میں کرنٹ پورا کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا پرزہ ہوتا ہے......ڈبی جیسا۔'' شانی نے بتایا۔

''کہیں یہ وہ تار تو نہیں تو جو ایک طرف بجلی کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور دوسری طرف فون کے ساتھ؟''

''ہاں۔تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''تھوڑے دن پہلے میں نے تمہارے بھائی جان کے پاس بھی ایسا فون دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نئی طرح کا فون شروع ہوا ہے۔کہو تو ایک تمہارے لئے بھی لے آؤں، میں نے کہا میں تو پیدائشی پینڈو ہوں، مجھے بھلا اس کا کیا پتا چلے گا۔''

''مجھے بھی زیادہ پتا نہیں۔'' شانی نے کہا۔''بس ایک دو بار بھائی عادل کے پاس دیکھا تھا۔اس کے بعد لاہور میں عثمانی کے پاس دیکھا تھا۔''

''پر شانی! یہ تیرے پاس آیا کیسے؟'' بھابو نے پوچھا۔

''بس سمجھو کہ کہیں گرا پڑا مل گیا ہے۔اب میں چاہتی ہوں کہ مل ہی گیا ہے تو اس کو کام میں لاؤں۔''

''کس کو کرنا ہے فون......؟''

''بس کسی کو کروں گی ''

''مگر شانی، یہ خطرناک کام ہے۔اگر جالاں......قادرے یا تمہارے بھائی جان کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا......؟''

''کسی کو پتا نہیں چلے گا بھابو! اور نہ اس کو پتا چلے گا جس کو کروں گی......''

''کیا مطلب......؟''

''جس کو کروں گی وہ بالکل جان نہیں سکے گا کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے اور فون کا مالک کون ہے تم اس بارے میں بالکل بے فکر رہو بھابو......''

''پر کرنا کس کو ہے ؟''

''ماجدہ کو......جس نے عثمانی کے ساتھ مل کر مجھے قاسم برلاس کے شکنجے میں پھنسانا چاہا تھا۔ان مطلب پرست میاں بیوی کا حال چال پوچھوں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ماجدہ اور اس کے خاوند کو فون کرو گی؟''

''ہاں... '' شانی نے مصلحت آمیز جھوٹ بولا۔ وہ بھابو کو زوار اور شیری کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی۔

بھابو کھوجی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بڑی اپنائیت سے اس کے بالوں کی لٹ کو پیشانی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔''تو میری جند جان ہے شانی تجھے کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کہیں رنگ والی میں کسی کو فون کر دے اور کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ نار پور اور رنگ والی کی چوہدری برادریوں میں دشمنی کی آگ تیز ہوگئی تو پھر اس میں بہت کچھ سڑ کر سواہ (راکھ) ہو جائے گا۔''

''نہیں بھابو......میں نہیں کر رہی ہوں رنگ والی میں فون.......اور پھر تم یہ بات بھی نہیں سمجھ رہی ہو کہ اس فون کے ذریعے کوئی بھی میرا ٹھکانہ نہیں جان سکتا۔ سمجھو کہ یہ ایک بالکل گمنام فون ہے۔''

وہ کچھ دیر تک بھابو کو سمجھاتی رہی۔شاید تھوڑی بہت بات بھابو کی سمجھ میں آ بھی گئی ہو۔

اب مسئلہ چارجر کا تھا۔ بھابو نے کہا۔''فون مجھے دے دو۔ مجھے کل شہر جانا ہے... تمہارے کپڑے لانے ہیں اور بچوں کے بھی... انارکلی جاؤں گی۔ وہاں اس طرح کے فون شون بکتے ہیں۔ یہ فون دکھا کر اس کے پرزے کا پتا کروں گی۔''

شانی پہلے تو جھجکتی رہی۔اسے اندیشہ تھا کہ بھابو کہیں یہ فون غائب ہی نہ کر دے۔ تاہم حوصلہ کر کے اس نے فون سیٹ بھابو کو دے دیا۔

بھابو دس پندرہ منٹ بعد ہی واپس آ گئی۔اس کے پاس ایک چارجر تھا۔ یہ چوہدری بشیر والے فون کا چارجر تھا۔وہ بولی۔''یہ لگا کر دیکھو۔شاید یہی کام کر جائے۔''

غالباً وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔شانی نے چارجر لگایا اور وہ لگ گیا۔فون سیٹ ری چارج ہونا شروع ہوگیا۔

چوہدری بشیر کے آنے سے کافی پہلے سہ پہر کے وقت بھابو چارجر واپس لے گئی۔ جالاں اس وقت سو رہی تھی۔ زہرا کچن میں تھی۔موقع اچھا تھا۔شانی گرم چادر اوڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کیا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر شیری کا نمبر ملانے لگی۔

کچھ دیر بعد دور کہیں راولپنڈی کی ایک عالیشان کوٹھی میں فون کی گھنٹی بجنے لگی،شانی کی خواہش تھی کہ شیری ہی فون اٹھائے۔ یہ خواہش پوری ہوئی۔شیری کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی

دی۔ ''کون ...؟''

وہ خاموش رہی۔ اپنے اندر حوصلہ جمع کرتی رہی۔ دل بُری طرح کھٹک رہا تھا۔

''کون ہے؟'' شیری نے ایک بار پھر پوچھا۔

شانی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں شانی بول رہی ہوں شیری......''

دوسری طرف چند لمحے سکتہ طاری رہا۔ پھر شیری کی حیرت اور خوشی میں چیختی ہوئی آواز ابھری۔ ''کون.... ؟...... شانی باجی......؟ شانی باجی، یہ آپ ہیں......؟''

''ہاں شیری! میں شانی ہوں۔''

''اوہ باجی! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ یہ آپ نے کیا کیا باجی...... کیوں ایسا کیا آپ نے ...... ؟ آپ کو پتا نہیں، ہم نے کتنا ڈھونڈا ہے آپ کو۔ کتنا روئے ہیں آپ کے لئے...... ؟ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آپ کہاں ہیں؟ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟ پلیز بتائیں آپ کہاں ہیں؟'' شیری کی آواز لرز رہی تھی۔

شانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ٹھیک ہو نا شیری! اور زوار؟''

''ہم سب ٹھیک ہیں۔ آپ ہماری بات چھوڑیں۔ آپ اپنے بارے میں بتائیں، آپ کیسی ہیں؟ آپ کیوں چلی گئی ہیں، اس طرح اچانک...... ؟ آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ آپ کے پیچھے ہمارے ساتھ کیا ہوگا...... اور رستم بھائی پر کیا گزرے گی۔ آپ نے کسی کا بھی خیال نہ کیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اس بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ ہی وہ شکوے شکایتوں کے دفتر کھولتی چلی گئی۔

شانی خاموشی سے سنتی رہی اور گرم چادر کے پلو سے آنسو پونچھتی رہی۔ جب شیری کا ابال کچھ کم ہوا تو وہ پھر اپنے پہلے سوال پر آ گئی۔ ''آپ اس وقت کہاں ہیں شانی باجی......؟ مجھے بتائیں، میں ابھی...... ابھی آپ کے پاس پہنچتی ہوں۔''

''میں بہت دور ہوں شیری......'' شانی نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

''آپ جہاں بھی ہیں، مجھے بتائیں۔''

''نہیں شیری! میری پہلی شرط یہی ہے کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں پوچھو گی، دوسری صورت میں میں فون بند کر دوں گی۔'' شانی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''نہیں باجی...... پلیز فون بند نہ کرنا۔ میں کچھ نہیں پوچھتی۔''

''شکریہ......'' شانی نے کہا۔

چند لمحے خاموش رہی پھر شیری کی ہیجانی آواز ابھری۔ ''آپ کیوں چلی گئیں شانی باجی

کیا غلطی ہوگئی تھی ہم سے۔ ... آپ کو ... آپ کو پتا نہیں۔ رستم بھائی کا کیا حال ہوا ہے آپ کے بعد...؟''

''کہاں ہے وہ...؟''

''مم...... میں بلاؤں انہیں؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں شیری! بالکل نہیں...... میں صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہوں اور وہ بھی صرف دو چار منٹ۔''

''آپ کیوں اتنی سنگ دل ہوگئی ہیں۔ آپ کو کیوں کسی کا احساس نہیں۔''

''احساس ہے۔ اسی لئے تو فون کیا ہے۔'' شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''زوار کہاں ہے؟''

''رستم بھائی اور زوار اوپر چھت پر بیٹھے ہیں۔ کوئی مہمان آیا ہوا ہے۔''

''اور نادیہ...؟''

''نادیہ اپنے گھر ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئی ہے۔ آپ کے جانے سے وہ بھی بہت پریشان رہی ہے۔ پچھلے مہینے تو وہ اتنی بددل ہوگئی تھی کہ واپس لاہور جانے لگی تھی۔ مگر پھر کہنے سننے کے بعد رک گئی۔''

''رستم کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہے؟''

''آپ کے جانے کے بعد رستم بھائی چند دن اس سے بولے نہیں تھے۔ مگر پھر ٹھیک ہو گئے تھے۔ اب اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو ان کے کہنے پر ہی اس نے لاہور واپس جانے کا ارادہ بدلا ہے۔''

''وہ رستم کو بہت چاہتی ہے۔ اتنی شدید چاہت ہے اس کی کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ رستم بھی اس کی طرف توجہ دینے لگے گا...... میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں ناں؟''

چند لمحے خاموشی رہی پھر شیری کی گلوگیر آواز ابھری۔ ''آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ دوسروں کو دھوکا دے رہی ہیں اور اپنے آپ کو بھی۔ آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''آپ سمجھتی ہیں پھر بھی انجان بنی ہوئی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں شانی باجی...... رستم بھائی کا رویہ نادیہ کے ساتھ اچھا کیوں ہے؟ یہ رویہ اس لئے اچھا ہے کہ آپ نے رستم بھائی کو اس کے لئے پابند کیا ہوا ہے۔ نادیہ کے ساتھ اچھا رویہ رکھنا تو ایک معمولی

بات ہے اگر آپ رستم بھائی کو اپنے گلے پر آپ چھری چلانے کا حکم بھی دیں تو بھی وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کریں گے۔ آپ کی آنکھ کے ایک اشارے پر وہ اپنی ساری زندگی آپ پر نچھاور کر سکتے ہیں۔ وہ دیوانے ہیں آپ کے اور دیوانہ بھی ایسا کہ نہ کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا اگر آپ ''

''شیری۔'' شانی نے ناگواری کے عالم میں اس کی بات کاٹی۔ ''تم کسی اور موضوع پر بات کرلو تو بہتر ہے۔''

''لیکن باجی .....؟''

''شیری میں فون بند کر رہی ہوں۔'' شانی نے سخت لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ ٹھٹھرا ہوا سورج اُفق کی سُرخ جھیل میں غوطہ زن ہونے جا رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ سردی تیزی سے پنکھ پھیلا رہی تھی، موبائل سیٹ شانی کے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے یوں اچانک شیری کے ساتھ سلسلہ منقطع کیوں کر دیا۔

وہ چند منٹ تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ تب اس نے دوبارہ کال کی۔ دوسری ہی گھنٹی پر شیری نے فون ریسیو کرلیا۔ ''ہیلو کون؟''

''میں شانی بول رہی ہوں۔''

''آپ نے فون کیوں بند کیا؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''آپ کہتی ہیں تو میں کچھ نہیں بولتی۔ بس سنتی رہی ہوں۔''

''شیری !'' شانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سچ پوچھتی ہو تو میرے دور چلے آنے کی وجہ رستم ہی ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے بے حد اپنائیت ہے لیکن۔ سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں اس کے لئے ویسے جذبات نہیں ہیں جیسے اس کے دل میں میرے لئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ میری وجہ سے مصیبتوں میں گھر جائے۔ میری خواہش ہے کہ وہ کہیں دور نکل جائے۔ قبائلی علاقے میں چلا جائے یا پھر ملک سے ہی چلا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ پولیس اب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ چکی ہے۔ وہ اسے زندہ گرفتار نہیں کریں گے۔ اس کی لاش نار پور کے چوہدریوں کے سامنے پیش کریں گے۔''

''لیکن باجی! آپ نے ان کے جانے کے راستے تو خود بند کئے ہیں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں؟ کیا سمجھاؤں! وہ آپ کو ڈھونڈے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ ان کے ملک

سے باہر جانے کی بات کر رہی ہیں وہ تو پنڈی سے باہر بھی نہیں جانا چاہتے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ آپ پنڈی یا اسلام آباد میں ہی کہیں موجود ہیں۔ میرے اور زوار کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ خطرہ مول لے رہے ہیں اور آپ کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آپ بہت سمجھدار ہیں مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس معاملے میں آپ سے ناسمجھی ہوئی ہے۔ آپ نے جو سوچا تھا، اس کا الٹ ہوا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد وہ اور زیادہ خطروں میں گھر گئے ہیں اور یقین کریں باجی! گزرنے والے ہر دن کے ساتھ وہ اپنے بارے میں اور زیادہ بے پرواہ اور بے حس ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں اپنے مرنے جینے کی کوئی فکر ہی نہیں رہی تھی جیسے میرا دل ہر وقت پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے۔ جب وہ گھر سے نکلتے ہیں تو.... میرے منہ میں خاک...... یہی لگتا ہے کہ اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ دو تین ہفتے پہلے سیکٹر تین میں اسلام آباد پولیس سے ان کا آمنا سامنا ہوا۔ کچھ روز پہلے نادیہ بتا رہی تھی کہ وہ کپڑے میں ایک بھاری رائفل لپیٹ کر گاڑی کی ڈکی میں رکھ رہے تھے۔ کل وہ اور زوار لاہور پہنچے ہوئے تھے، پتا چلا ہے کہ وہاں چوہدریوں کے کسی بندے کی ٹانگیں توڑ کر آئے ہیں وہ......اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب ان کے چاروں طرف خطرے ہی خطرے ہیں، پلیز شانی باجی! آپ اس بارے میں کچھ سوچیں۔ ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔'' یوں لگتا تھا کہ شیری کے لہجے میں رستم بھائی کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کا درد بھی شامل ہو گیا ہے۔

''میں... میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''آپ سب کچھ کرسکتی ہیں اور آپ ہی کرسکتی ہیں۔ آپ ہی رستم بھائی کو روک سکتی ہیں کہ وہ اس طرح اپنی زندگی سے نہ کھیلیں۔ پلیز شانی باجی..... ! آپ رستم بھائی سے بات کریں۔ انہیں ان بے وقوفیوں سے روکیں۔ میرے بس میں اب کچھ نہیں رہا ہے۔ سچ کہتی ہوں، میں لاچار ہوگئی ہوں ''شیری کی آواز بھرا گئی۔

اسی دوران میں نیچے کھٹ پھٹ کی آوازیں آئیں، پھر جالاں کی کرخت آواز ابھری۔

''نی جہرا! کدھر مرگئی ہے تُو؟''

جالاں جاگ گئی تھی۔ اب اس کی نگران نگاہیں یقیناً زہرا کے ساتھ ساتھ شانی کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ آوازیں تو زہرا کو دے رہی تھی مگر سنا شانی کو رہی تھی۔

شانی جلدی سے بولی۔ ''اچھا شیری! میں تمہیں پھر فون کروں گی۔''

''کب.....؟'' شیری نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بس ایک دو دن میں، لیکن تم آج کے فون کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی۔''

''نہیں بتاؤں گی باجی لیکن آپ فون ضرور کرنا۔ آپ کو پتا نہیں یہاں معاملہ کتنا خراب ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کروں گی فون۔''

''پر باجی...... جاتے جاتے اتنا تو بتا دیں کہ آپ کس شہر میں ہیں؟''

''شیری! میں نے کہا ہے ناں کہ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔ اچھا اللہ حافظ۔'' شانی نے کہا اور فون بند کر کے چادر میں چھپا لیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی جالاں دندناتی ہوئی اوپر چھت پر آگئی۔ ''ہائے میں مرگئی چوہدرانی جی! آپ اوپر اتنی سردی میں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ چاروں طرف شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں...... بس ذرا کمرے میں رہ رہ کر دل گھبرا رہا تھا۔''

''مجھے لگ رہا تھا، جیسے آپ کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔''

''یہاں کون ہے، جس سے باتیں کرنی ہیں۔''

''بس ایسے ہی، میرے کان بج رہے تھے شاید۔''

''تم اتنی پریشان نہ رہا کرو۔'' شانی نے ذرا تلخی سے کہا۔

''لو، پریشان نہ ہوں تو کیا کروں چوہدرانی۔'' وہ ایک دم رکھائی سے بولی۔ ''اب آپ نے دیکھا ہی تھا جو کچھ کل ہوا ہے۔ جرا دیکھو ناں کتنی دیدہ دلیری ہے۔ وہ بدمعاش رستم گھر میں گھسا ہے اور ہمارے بندے کی ٹانگیں توڑ کر چلا گیا ہے۔ حرامجادے کی چمڑی میں ڈر تو جیسے ہے ہی نہیں۔ پورے علاقے کی پُلس اس کے پیچھے ہے۔ سب سوچتے تھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر بیٹھا ہوگا۔ پر دیکھیں وہ کس طرح دندناتا ہوا آیا ہے اور صاف نکل گیا ہے۔ چوہدری بڑے سخت ناراج ہیں ہم سب پر...... دو چوکیداروں کی تو انہوں نے چھٹی بھی کرا دی ہے۔ ابھی شاید اور بھی چھانٹی ہوگی۔''

دو دن بعد شانی کو پھر فون کرنے کا موقع مل گیا۔ جالاں کا کوئی قریبی رشتے دار مر گیا تھا۔ اسے دو تین دن کے لئے سرگودھا جانا پڑ گیا۔ اس کی جگہ زہرا کا ہاتھ بٹانے کے لئے دوسری عورت فردوس آگئی۔ فردوس نسبتاً دھیمے مزاج کی تھی۔ شانی کے سلسلے میں چوکس تو وہ بھی بہت تھی تاہم اس کی نگاہوں میں شکرے جیسی چمک نہیں تھی۔ جمعے کے دن جب فردوس کپڑے دھونے اور نہانے کے لئے غسل خانے میں گھسی تو شانی نے زہرا کو کچن میں کام پر

اٹھایا اور خود اوپر چھت پر آگئی۔ بڑی اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ دور تقریباً ایک فرلانگ کی دُوری پر ٹیکسٹائل مل کی وسیع عمارت نظر آتی تھی۔ رہائشی حصے اور مل کو ایک پرائیویٹ کشادہ سڑک ملاتی تھی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر جی ٹی روڈ کے آثار نظر آتے تھے۔ کیکر کے گھنے درختوں کے اندر سے گاہے بگاہے کسی تیز رفتار گاڑی کا شیشہ چمک دکھا کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ دور افتادہ ہارن بھی سنائی دیتے تھے۔

شانی نے موبائل پر شیری کا نمبر ملایا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی سے فون سیٹ کے پاس بیٹھی تھی۔ ''ہیلو......! میں شانی بول رہی ہوں۔''

''باجی! میں کل سے آپ کے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

سلسلۂ کلام پھر وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

شیری نے رستم کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ شانی کی گمشدگی کو انتہائی شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ راتوں کو اٹھ کر پھرتا ہے۔ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں ہے۔ کئی کئی دن فاقے سے گزار دیتا ہے۔ بے تحاشا سگریٹ پھونکتا ہے مگر جو سب سے خطرناک بات شیری بتا رہی تھی...... وہ یہ تھی کہ رستم اپنی سلامتی کی طرف سے روز بروز بے پروا ہوتا جا رہا تھا۔ موجودہ حالات میں کوئی دور افتادہ شمالی علاقہ اس کے لئے محفوظ ترین تھا مگر زوار، شیری اور نادیہ کے بہت کہنے کے باوجود وہ پنڈی رہنے پر مُصر تھا۔ شانی کی تلاش میں رستم کے دو تین ساتھی بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ ان ساتھیوں کو معلوم تھا کہ رستم کہاں رہ رہا ہے اگر ان ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو رستم کی گرفتاری یا ہلاکت بھی یقینی ہو جاتی۔ شیری کی پُرزور خواہش تھی کہ شانی کم از کم ایک بار رستم سے بات کرے۔

وہ بولی۔ ''باجی! مجھے زیادہ تو پتا نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ ایک بار بھی زور دے کر رستم بھائی سے کہیں روپوش ہونے کا کہہ دو تو وہ آپ کی بات ٹال نہیں سکیں گے۔ ان کے دل پر جو کچھ بھی بیتے مگر وہ آپ کی بات پر عمل ضرور کریں گے۔''

''لیکن شیری! میں اس سے بات نہیں کر سکتی۔''

''اگر آپ بات نہیں کر سکتیں تو پھر میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں۔ آپ ان کے حوالے سے کوئی بُری خبر سننے کے لئے تیار رہیں...... بلکہ...... بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس بُری خبر میں زوار کا اور میرا نام بھی شامل ہو۔'' شیری ایک دم روہانسی ہوگئی۔

شانی شدید تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔ موبائل فون اس کی انگلیوں میں سختی سے دبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ شیری کو کیا جواب دے۔ خاموشی گھمبیر ہوتی جارہی تھی۔ دوسری طرف شیری شاید آنسو بہانے لگی تھی۔ آخر شانی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ''میں اس سے کس طرح بات کروں شیری! اگر اس نے مجھ سے میرا پتا پوچھنا شروع کردیا تو پھر ؟''

''میں ان سے وعدہ لے لیتی ہوں۔ وہ آپ سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔''

چند لمحے کے توقف کے بعد شانی نے گہری سانس لی۔ ''شیری! میں اس شرط پر اس سے بات کرلوں گی کہ وہ میرا ٹھکانہ جاننے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی مجھ سے دوبارہ بات کرنے پر اصرار کرے گا۔''

''میں انہیں سمجھا دوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں بلاتی ہوں۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ ذرا ہولڈ کریں۔''

''نہیں شیری..... تم اسے بلاؤ۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔''

''کتنی دیر میں؟'' شیری نے بے تابی سے پوچھا۔

''پانچ دس منٹ میں۔'' شانی نے جواب دیا۔

تقریباً دس منٹ بعد شانی کے کانوں سے رستم کی جانی پہچانی آواز ٹکرا رہی تھی۔ ''ہیلو بی بی۔ آپ کیسی ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں..... اور تم؟''

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔'' رستم کی آواز سپاٹ تھی۔

''نہیں، مجھے نہیں لگتا۔'' شانی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تم اپنی مرضی کررہے ہو۔ میں نے اپنے خط میں تم سے جو التجا کی تھی، اس کا تم پر ذرا اثر نہیں ہوا..... ''

''میرا اندازہ ہے کہ شیری نے میرے بارے میں بڑھا چڑھا کر بات کی ہے۔ اس نے میری حالت زار کا ذکر کیا ہوگا اور بتایا ہوگا کہ میں بس مرنے کے قریب ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے بی بی! آپ کے اچانک چلے جانے سے میں پریشان ضرور تھا اور بات بھی پریشانی کی تھی، مگر اب آہستہ آہستہ دل کو قرار آتا جارہا ہے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ جو کچھ تمہاری زبان پر ہے وہی دل میں ہے۔''

جواب میں رستم نے کچھ نہیں کہا۔ لائن پر ایک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ دکھ میں بسی ہوئی اور درد میں ڈوبی ہوئی، شانی کے سینے میں ٹیس اٹھی اور رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں جانتی ہوں رستم! میں نے تمہیں دکھ دیا ہے، لیکن میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اسی لئے خط میں تم سے معافی بھی مانگی تھی۔ کیا تم..... کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتے ہو رستم؟''

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں بی بی..... '' وہ لرز کر بولا۔ ''مجھے میری نظروں سے مت گرائیں۔ آپ کو پتا نہیں کہ آپ کا رتبہ میرے لئے کیا ہے۔ آپ کیوں معافی مانگتی ہیں مجھ سے؟ گناہ گار تو میں ہوں۔ سخت سے سخت سزا بھی میرے گناہ کے سامنے حقیر ہے۔ آئندہ ایسے لفظ زبان پر مت لانا۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ کی منت کرتا ہوں۔ آئندہ ایسا مت کہنا۔''

''تم سزا دو گے تو..... مجھے بھی معافی مانگنا پڑے گی۔''

''میں نے کیا کیا ہے بی بی؟''

''تم وہ سب کچھ کررہے ہو جو مجھے بے پناہ تکلیف دے سکتا ہے۔ باقی باتیں تو چھوڑو کیا یہ میرے لئے کم تکلیف دہ ہے کہ تم ابھی تک پنڈی میں ہو۔ نار پور کے چوہدری اور پولیس والے شکاریوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور تم مجھے ڈھونڈ رہے ہو۔ کیا تم ایسا نہیں کررہے ہو؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ شانی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نار پور کا چوہدری ٹولہ کتنا خطرناک ہے پھر بھی تم ان سے دشمنیاں مول لے رہے ہو۔ ان سے بدلے چکا رہے ہو۔ یہ خودکشی نہیں تو اور کیا ہے کیوں ہاتھ دھو کر اپنی زندگی کے پیچھے پڑ گئے ہو تم.. ؟''

''کیا اب مجھے مرنے کا اختیار بھی نہیں ہے بی بی؟'' وہ عجیب بے ساختگی سے بولا۔

''کیوں مرنا چاہتے ہو تم؟'' شانی کے لہجے میں بے پناہ درد کے ساتھ ہلکی سی تلخی بھی تھی۔

''مجھے نہیں پتا بی بی! لیکن کبھی کبھی زندہ رہنے سے یہ رستہ زیادہ آسان لگتا ہے۔'' اس کے الفاظ میں ایسا کرب تھا کہ شانی سرتاپا کانپ گئی۔ اسے لگا جیسے صدیوں سے بہتا چناب درد کا دریا ہے اور یہ دریا رستم کی آنکھوں کے پیچھے ہے۔ اس کے سینے کے اندر ہے۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس سے نادیہ کی بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی نئی زندگی کا نقشہ دیکھنا

چاہتی تھی۔ اسے یہ مشورہ دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنی بی بی کو اپنی سوچوں سے آزاد کر دے اور اپنے دل و دماغ کی طنابیں کھینچ کر اپنی نگاہ نئے راستوں پر مرکوز کرے، مگر رستم کے لہجے کے عقب میں ہلکورے لینے والے چناب کا پھیلاؤ محسوس کر کے وہ دم بخود رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے ایک جملہ بھی مزید کہا تو یہ دریا اپنے کناروں سے بہہ نکلے گا اور یوں بہے گا کہ کرۂ ارض کی ہر شے اس میں ڈوب جائے گی۔ رستم کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مجھے نہیں پتا بی بی! لیکن کبھی کبھی زندہ رہنے سے یہ رستہ زیادہ آسان لگتا ہے۔

اس موقع پر شانی نے فیصلہ کیا کہ وہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دے۔ وہ بولی۔ ''اچھا میں تمہیں پھر فون کروں گی۔''

''کب......؟''

''ایک دو دن میں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ کسی معمول کی طرح بولا۔

''اچھا...... اپنا خیال رکھنا...... اللہ حافظ۔'' شانی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایک طرح سے اس نے فوری طور پر ایک کٹھن صورتِ حال سے جان چھڑائی تھی۔ درحقیقت رستم کے لب و لہجے کو محسوس کر کے وہ ایک دم کانپ گئی تھی۔

وہ وہیں چھت پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی مگر ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں بل کھا کھا کر اس کے تمتماتے رخساروں کو چومنے لگیں۔ اس نے بالوں کو کانوں کے پیچھے اُڑسا۔ والدہ کی کہی ہوئی ایک پرانی بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک مرتبہ شانی نے عجیب سی حرکت کی تھی۔ وہ کالج سے آئی تھی۔ اس کا سفید دوپٹا ملازمہ انوری نے سوکھنے کے لئے ڈینگریوں (سوکھی ہوئی شاخوں) پر ڈال رکھا تھا۔ شانی نے چلبلے انداز میں تیزی سے دوپٹا اتارنا چاہا۔ وہ کانٹوں میں اٹک کر پھٹ گیا۔ والدہ کے چہرے پر پہلے تو خفگی کے آثار نمودار ہوئے پھر انہوں نے ایک پیار بھرا چپت اس کے سر پر لگایا اور اسے اپنی گود میں کھینچ کر بولیں۔ ''اونٹ کی طرح لمبی ہو گئی ہے مگر ابھی اس حساب سے عقل نہیں آئی۔ دیکھو رانی! زندگی میں بہت سے معاملے ایسے ہوتے ہیں جو اس دوپٹے کی طرح جلد بازی میں خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر تم اس دوپٹے کو آرام سے اتارتیں تو کانٹے اسے چھوڑ دیتے اور یہ صحیح سالم اُتر آتا۔ اسی طرح زندگی کے مشکل معاملوں کو بھی آرام اور احتیاط سے سنوارا جائے تو وہ سنور جاتے ہیں اور کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا۔''

شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ رستم والے معاملے میں بھی اس نے جلدی کی تو نقصان

ہو جائے گا لیکن اگر اس نے سلیقے سے کوشش کی تو سب کچھ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ موقع ملتے ہی رستم کو پھر فون کرے گی۔

اگلا موقع اسے چار پانچ روز بعد ملا۔ جالاں کبھی کبھی دوپہر کے وقت سو جاتی تھی۔ اس دن وہ سوئی تو شانی چھت پر چلی گئی۔ ایک دن پہلے ہی اس نے بھابو سے چارجر لے کر سیٹ ری چارج کیا تھا۔ اس نے کال ملائی۔ پہلے شیری سے بات ہوئی پھر رستم لائن پر آ گیا۔ اس مرتبہ گفتگو شروع ہوتے ہی شانی نے نادیہ کی بات چھیڑ دی۔ نادیہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد شانی نے کہا۔ ''رستم......! وہ تمہارے لئے بہت لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ بہت کچھ چھوڑا ہے اس نے...... شہر، دولت اور نام نمود کو ایک طرف رکھ کر وہ تمہارے ساتھ ایک صاف ستھری زندگی شروع کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ برائی کی دنیا سے نکل کر اچھائی کی طرف آ رہی ہے۔ اس کا ہاتھ تھامنے سے تمہیں جہاں بہت سا پیار ملے گا وہاں نیکی بھی حصے میں آئے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اسے نظر انداز کرو۔''

رستم نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''بی بی! آپ جو کہیں گی میں کروں گا۔ مگر یہ ایک جھوٹ ہو گا سفید جھوٹ۔ میں اپنی ساری زندگی ایک سفید جھوٹ کے ساتھ گزاروں گا۔ آپ تو بہت سمجھ دار ہیں۔ کیا آپ بھی یہ سمجھتی ہیں کہ کوئی عورت ایک جھوٹے دھوکے باز کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے؟''

''آئندہ کے بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے۔ کیا پتا جسے آج تم جھوٹ کہہ رہے ہو وہ بعد میں جھوٹ نہ رہے۔ زندگی تو بہتے پانی کی طرح ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے رستے خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔''

''آپ کی ہر بات دل پر اثر کرتی ہے بی بی! آپ جو کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔'' اس نے کہا مگر لہجے میں ایسی اداسی اور ایسا کرب تھا کہ شانی اندر تک کانپ گئی۔

وہ کئی سیکنڈ تک خاموش رہی اور اس بے پناہ کرب کے لگائے ہوئے دھچکے سے سنبھلنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی۔ ''رستم! آخر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے کیا کیا ہے بی بی......؟''

''دیکھو، زندگی خدا کی بخشی ہوئی وہ عظیم نعمت ہے جس کا شکر ہم ادا کر ہی نہیں سکتے۔ اس نعمت کی قدر نہ کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہے...... اور تم ایسا کر رہے ہو۔ رستم میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم بے وجہ خود کو جان لیوا خطروں میں ڈال رہے ہو۔''

''یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے بی بی...... میرے جینے کا ڈھنگ ہمیشہ سے ایسا

ہی رہا ہے۔"

"مگر تم نے خود کو بدل لیا تھا۔ تم اور طرح سے جینے لگے تھے۔"

"وہ تبدیلی تو اب بھی میرے ساتھ ہے بی بی......! جرائم پیشہ رستم تو بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

"مگر یہ مار دھاڑ کی زندگی؟ یہ پولیس سے آنکھ مچولی؟ یہ دشمنی اور انتقام؟ یہ سب کیا ہے رستم؟ یہ تو وہی آگ سے کھیلنے والی بات ہے۔ رستم...... رستم میں تمہیں سلامت اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ کوئی تعلق ہے ناں تم سے۔ اسی لئے یہ چاہ رہی ہوں ناں۔ کسی غیر کے لئے اس طرح فکر مند کیوں نہیں ہوتی؟" آخری الفاظ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلے تھے۔ ان الفاظ کی گہرائی اور شدت نے بعد ازاں اسے خود ہی جھینپنے پر مجبور کر دیا۔

دوسری طرف یقیناً رستم نے بھی ان الفاظ میں پنہاں جذبے کو محسوس کیا تھا۔ وہ چند سیکنڈ چپ رہا۔ شاید ان مہربان جملوں کی "خوشگواری" کو اپنے دل و دماغ میں سمو رہا تھا۔ پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ "آپ میرے بارے میں سوچتی ہیں۔ یہ احساس میرے لئے دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"اگر مجھے اتنی اہمیت دیتے ہو تو پھر...... میری بات مانو...... اپنی زندگی کی طرف سے اتنی بے پرواہی نہ برتو...... تارپور کے چوہدری اور پولیس ایک ہی مصیبت کے دو نام ہیں اور یہ مصیبت ہر جگہ تمہیں کھوج رہی ہے۔"

"میں آئندہ احتیاط کروں گا بی بی! مگر......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" شانی نے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر ملتجی لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے بے سہارا نہ چھوڑیں بی بی! مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

"میں تو خود بھٹکی ہوئی ہوں۔ تمہیں کیا راہ دکھاؤں گی۔" شانی کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

جواب میں رستم نے کچھ نہیں کہا۔ دونوں کے درمیان خاموشی سنسنا رہی تھی۔ وہ رستم کا مطمع نظر سمجھ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی اسے پھر فون کرے۔ وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں رہی۔ آخر پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "اچھا میں کوئی موقع دیکھ کر تمہیں پھر فون کروں گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔" اس نے کہا۔

☆======☆======☆

حالات جوں کے توں تھے۔ سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تیزی سے گزر جاتے

تھے، جالاں کی نگران نگاہیں ہر وقت شانی کو گھیرے میں لئے رہتی تھیں۔ وہ بے حد بدزبان بھی تھی۔ شانی نے اسے زہرا کو ایسی گندی گالیاں دیتے سنا تھا جو مردوں کے منہ سے بھی کم ہی نکلتی ہوں گی۔ قادرے کے کتے کی موت کا غم بھی قرب و جوار میں شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ بھابو کے ذریعے شانی...... ملازمہ انوری کے بارے میں پوری طرح باخبر تھی، انوری یوں بھی حبسِ بے جا میں تھی لیکن اس کے حالات اب بہتر تھے۔ اس کی ٹانگ کا علاج ہو رہا تھا۔

رستم کو فون کئے دو تین روز گزر گئے تھے۔ شانی جانتی تھی۔ وہ بے پناہ شدت سے اس کے فون کا انتظار کر رہا ہوگا۔ شانی کی طبع عجیب تھی۔ یہ احساس اس کے لئے ہمیشہ بڑا تکلیف دہ ہوتا تھا کہ کوئی کسی وجہ سے اس کا منتظر ہے۔ وہ دن رات، رستم اور فون کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کے ذہن پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پانچویں روز فون کو ری چارج کرنے کے بعد اس نے پھر شیری اور رستم سے رابطہ کیا۔

اس کا یہ اندازہ درست تھا کہ رستم بے حد شدت سے اس کی کال کا انتظار کرتا رہا ہے۔ اسے شیری کی زبانی معلوم ہوا کہ فون کے انتظار میں وہ کھانا پینا اور آرام کرنا بھولا ہوا تھا۔

شانی نے تقریباً دس پندرہ منٹ رستم سے بات کی۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے آزاد علاقے کی طرف نکل جانے کی ترغیب بھی دی۔ بالواسطہ طور پر نادیہ کا ذکر بھی کیا لیکن یہ باتیں تو جیسے وہ سن کر بھی نہیں سنتا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے شانی کو اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی، لیکن اس کے کہے ہوئے ہر لفظ میں وہی جذبہ ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوتا تھا جس کی پہلی جھلک پہلی نظر میں دکھائی دیتی تھی۔ پھر یہ دیوانہ جذبہ ہونٹوں کا لمس بن کر شانی کے تلوے پر چپکا تھا...... اور پھر ایک رات چناب کے کنارے یہ جذبہ روشن ہیولے کی طرح واضح تر ہو کر سامنے آیا تھا۔ شانی صاف محسوس کرتی تھی کہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ طاقت پکڑ رہا ہے۔

اگلے دو ہفتے میں تین چار بار مزید، رستم کے ساتھ اس کی بات ہوئی۔ وہ اپنی دانست میں اسے سمجھانے کے لئے ہی فون کرتی تھی۔ مگر فون کرنے کے بعد اسے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے سمجھایا کم ہے اور خود زیادہ الجھی ہے۔ فریقِ ثانی کا جذبہ منہ زور اور سرکش تھا۔ وہ کسی بپھرے ہوئے بیکراں سمندر کی طرح ہر چیز کو بہا لے جانا چاہتا تھا۔ شانی اس کے سامنے جو بڑے بڑے پتھر پھینکتی تھی وہ حقیر کنکروں کی طرح بہاؤ کا حصہ بن جاتے تھے۔ تارپور والوں کا خطرہ، پولیس کا خوف، نادیہ کی محبت یہ سب وہ حقیر کنکر تھے جو لہروں میں گم ہو جاتے تھے۔

ایک دن شانی چھت پر بیٹھی فون کر رہی تھی کہ اس کی نگاہ اس سفید دیوار پر پڑی جو

انیکسی اور کوٹھی کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھی۔ پتھریلی جالیوں کے عقب میں اسے کسی متحرک جسم کی جھلک نظر آئی۔ انجانے اندیشے اس کے ذہن میں امڈ آئے۔ اس نے فوراً فون بند کر دیا۔

فون کا راز فاش ہونے کا خطرہ ہر وقت اس کے اعصاب پر منڈلاتا رہتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کانپ جاتی تھی اگر کسی طرح پتا چل جائے کہ وہ رستم سیال کو فون کرتی ہے تو کیا ہو...... ایسی صورت میں یقیناً شانی کے لئے ایک قیامت کھڑی ہو جاتی۔ شانی اور رستم کا ربط آشکارہ ہو جاتا تو ''نارپور کی حویلی میں آتشزدگی'' کا تمام تر ملبہ شانی پر آن گرتا۔ وہ چوہدریوں کی قاتل اور بدترین سزا کی مستحق ٹھہر جاتی۔ ایسے میں اس کے ساتھ جو کچھ ہو سکتا تھا، اس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ درحقیقت شانی اور رستم کا ''ربط'' ہی وہ درمیانی کڑی تھی جو اب تک ''بلی مار چوہدریوں'' کے لئے گمشدہ تھی...... اور جس کے سبب شانی محفوظ تھی۔

پتھریلی جالی کے پیچھے متحرک جسم ابھی تک موجود تھا، چھت کی منڈیر میں موجود جالی سے شانی اس کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ موبائل کو اپنی گرم چادر میں چھپا کر وہ سیڑھیوں کی طرف آئی اور دھیان سے سفید دیوار کے عقب میں دیکھنے لگی۔ یک بارگی اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ اسے پتھریلی جالیوں کے عقب میں کسی بچے کی جھلک نظر آئی۔ وہ جیسے تڑپ اٹھی، کیا یہ مُنا تھا؟ وہ جلدی سے سیڑھیاں اُتر کر اور لان عبور کر کے سفید دیوار کے پاس پہنچی...... ایک جالی کے ساتھ منہ لگا کر اس نے دھیان سے دوسری جانب دیکھنا شروع کیا۔ ایک دھاری دار سفید قمیص جھلک دکھا کر دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ یہ کوئی بچہ تھا...... اور یقیناً منا ہی تھا۔ شانی جالی کے پاس کھڑی دیکھتی رہی کہ شاید جھلک دوبارہ نظر آئے۔ بھابو سے ملاقات ہوئے بھی دو تین روز ہو گئے تھے۔ شانی کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ زیادہ بیمار ہی نہ ہو گئی ہو۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے طور پر انیکسی سے کوٹھی میں نہیں جا سکتی تھی۔ نہ ہی کسی کو پیغام دے کر بھابو کو بلا سکتی تھی۔ وہ جالی کے پاس کھڑی مُنے کی جھلک دیکھنے کی منتظر تھی، جب ایک آواز نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ یہ جیٹھ جی چوہدری بشیر کی آواز تھی۔ وہ پتا نہیں کب چپکے سے اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ شانی سرتاپا کانپ گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہو......؟'' چوہدری بشیر نے بھاری سنجیدہ آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں...... ویسے ہی......'' شانی ہکلا گئی، چادر کے اندر موبائل فون پر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

وہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں...... تم کیا

دیکھ رہی ہو...... تمہاری بھابو نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ تم بڑا پیار کرتی ہو مُنے سے۔ یہی بات ہے ناں؟''

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''ج...... جی ہاں...... وہ بھی بہت لاڈ کرتا ہے، مجھ سے...... میرا خیال ہے کہ میرے جانے کو اس نے بہت محسوس کیا ہو گا۔''

''تمہارے جانے کو تو سب نے ہی محسوس کیا ہے۔ حویلی کے نوکر چاکر تک تمہاری باتیں کرتے ہیں نارپور کے ہر شخص پر تم نے گہرا نقش چھوڑا ہے۔'' وہ تعریفی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

شانی اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ وہ بولا۔ ''مقبول کو میں نے ہی منع کیا تھا کہ وہ مُنے کو تمہارے پاس نہ لے جائے بہرحال اب تمہاری بے چینی دیکھتے ہوئے کچھ سوچنا پڑے گا؟''

شانی کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے احسان مند نگاہوں سے چوہدری بشیر کو دیکھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ کل مُنے کو تمہارے پاس لاؤں۔''

''ب...... بہت شکریہ......'' شانی کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

وہ چوہدری بشیر سے بھابو کی صحت کا پوچھنا چاہتی تھی مگر بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی، چوہدری بشیر لمبے ڈگ بھرتا رہائشی حصے کی طرف چلا گیا۔

شانی نے دوسرے روز تک کا وقت بڑی مشکل سے کاٹا۔ چوہدری بشیر نے اپنے آنے کا ٹائم نہیں بتایا تھا۔ شانی کی نگاہ دوپہر سے ہی بار بار دروازے کی طرف اٹھنا شروع ہو گئی۔ اس نے کچن میں جا کر اپنے ہاتھ سے انڈے کا حلوہ بنایا۔ انڈے کا حلوہ مُنے اور ندیم کو بہت پسند تھا۔

سہ پہر کے تھوڑی دیر بعد شانی کی امیدیں بر آئیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ اسے سنگِ مرمر کی سفید دیوار کے عقب میں کسی بچے کی چہکار سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور مُنا دکھائی دیا۔ وہ سُرخ سویٹر اور سیاہ پتلون میں تھا۔ بال سلیقے سے پیشانی پر جمے ہوئے تھے۔ اپنے ابو کی انگلی تھامے وہ حیران حیران سا اندر داخل ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں شانی کے سامنے تھا۔ شانی کو دیکھ کر وہ دم بخود سا رہ گیا۔ شانی نے لپک کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، پھر وہ بے تحاشا اس کا منہ سر چومنے لگی، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ذرا دیر کے لئے سہم سا گیا تھا۔

چوہدری بشیر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور مسکراتی نظروں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی انگلیوں میں امپورٹڈ سگریٹ دبا ہوا تھا۔ شانی نے مُنے کو گود میں لے لیا اور اس سے

مسلسل باتیں کرنے لگی۔ گاہے بگاہے وہ اس کا منہ بھی چومتی تھی۔ دھیرے دھیرے مُنا نارمل ہونے لگا، وہ توتلی زبان میں اس کے سوالوں کا جواب دینے لگا اور خود بھی سوال کرنے لگا۔

''آپ کہاں چلی گئی تھیں؟... میں آپ کو ڈھونڈتا تھا...... آپ ہمارے پاس کیوں نہیں آتی تھیں؟''

چوہدری بشیر اخبار دیکھنے لگا۔ شانی مُنے کو لے کر کچن میں چلی گئی۔ اپنے ہاتھ سے اسے حلوہ کھلایا۔ ڈھیروں پیار کیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ بالکل نارمل ہوگیا۔ شانی سے لپٹنے چمٹنے لگا، کھل کر باتیں کرنے لگا دوسرے کمرے سے چوہدری بشیر کی آواز آئی۔ ''بھئی ایک مہمان یہاں کمرے میں بھی آیا بیٹھا ہے۔ اس کو بھی کوئی پوچھ لے۔''

شانی چونک سی گئی۔ اس نے زہرا سے فوراً چائے بنانے کا کہا۔ خود پلیٹ میں انڈوں کا حلوہ نکالا اور لے کر چوہدری بشیر کے پاس پہنچی۔ ''معاف کیجئے گا۔ مجھے دیر ہوگئی۔'' شانی نے کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''ہاں کوئی بات نہیں تاتی (چاچی)'' مُنے نے بھی شانی کے گلے میں بانہیں ڈال کر ابو کی تائید کی۔ وہ شانی کی گود میں چڑھا بیٹھا تھا۔

''تم نے تو اسے دس پندرہ منٹ میں بھلا چنگا کر دیا۔'' چوہدری بشیر نے کہا۔

''بہت پیارا بچہ ہے۔'' شانی نے اس کا گال چوما۔

جواب میں مُنے نے بھی بڑی معصومیت سے شانی کو اپنی بانہوں میں بھینچا اور اپنا گال اس کے گال کے ساتھ لگا لیا۔

چوہدری بشیر نے حلوے کی پلیٹ ایک طرف رکھی اور ایک دم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں ایسے ہی رہنا۔ میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔''

شانی یا مُنے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ شانی حیرت سے سوچنے لگی کہ وہ کدھر گیا ہے...... دو منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیمرا اور کندھے پر چھوٹا سا بیگ تھا۔ یہ کیمرا دیکھنے میں ہی کافی مہنگا لگتا تھا۔ آٹھ نو انچ لمبا ایک لینز بھی کیمرے میں اٹیچ تھا۔ مُنا اسی طرح شانی کی بانہوں میں تھا اور وہ کھڑکی کے نیلے پردے کے سامنے کھڑی تھی۔ چوہدری بشیر نے شانی سے کہا کہ وہ مُنے کو اسی طرح بائیں بازو پر اٹھائے جیسے پہلے اٹھایا ہوا تھا۔ شانی نے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے چوہدری بشیر کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اپنا دایاں ہاتھ مُنے کے بائیں

کندھے پر رکھو۔''

شانی نے ذرا شرماتے ہوئے اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔ دو مرتبہ فلش گن کا جھماکا ہوا اور چوہدری بشیر نے دو تصویریں کھینچ لیں۔

شانی اور مُنے کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ''بڑا اچھا پوز تھا تم دونوں کا۔ زبردست تصویریں بنیں گی۔''

شانی نے مُنے کو گود سے اتار کر اپنے پہلو میں صوفے پر بٹھا لیا۔ چوہدری بشیر نے کیمرے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں نے کویت سے لیا تھا۔ ایک سال پہلے 400 دینار کا آیا تھا، اب تو اور بھی مہنگا ہوگا لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا...... وہاں کویت میں میرا ایک کویتی یار تھا، باسط باتی...... کار ڈیلر تھا۔ اسے فوٹوگرافی کا زبردست شوق تھا۔ اس سے یہ شوق تھوڑا بہت میرے اندر بھی آیا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی شکار کھیلنے بھی جاتے تھے۔ شکار کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافی بھی ہوتی تھی، یعنی ایک تیر سے دو شکار۔''

''فوٹوگرافی اچھا شوق ہے۔'' شانی نے کہا۔ ساتھ ساتھ وہ قدرے حیران بھی ہو رہی تھی۔ نارپور کے چوہدری خانوادے کا ایک شخص بتا رہا تھا کہ اسے فوٹوگرافی جیسا لطیف شوق لاحق ہے۔

چوہدری بشیر نے کندھے سے لٹکایا ہوا بیگ کھولا۔ اس میں کیمرے کے ساتھ اٹیچ ہونے والے مختلف لوازمات تھے۔ لینز، فلش گنز، فلٹر اور ایک فولڈنگ سٹینڈ۔ چوہدری بشیر نے بیگ کے اندر سے ایک البم نکالا اور شانی اور مُنے کو اپنی اتاری ہوئی کچھ تصویریں دکھانے لگا۔ تصویروں پر طائرانہ نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کوئی ''شاہکار'' تصویریں نہیں ہیں اور نہ ہی کھینچنے والا کوئی خاص ماہر ہے، بس یہ عام سے فوٹوگراف تھے، مناظر کے انتخاب سے فوٹوگرافر کے مزاج کا پتا بھی چلتا تھا۔ البم کے شروع میں کتوں کی لڑائی کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے چند تصویریں ریچھ اور کتے کی لڑائی کی بھی تھیں۔ اس سے آگے صحرا میں اونٹ دوڑ کی تصویریں تھیں۔ البم کے درمیان شکار کی تصویریں تھیں۔ کئی خوبصورت جانور از قسم ہرن، مرغابی، تلور موت کے شکنجے میں نظر آ رہے تھے، یا پھر رائفل کی گولی سے زندگی ہار جانے کے بعد خون چکاں پڑے تھے۔ چند جوان خانہ بدوش عورتوں کی تصویریں بھی البم میں شامل تھیں۔ یہ تصویریں غالباً کویت یا کسی ملحق علاقے میں اتاری گئی تھیں۔

چوہدری بشیر البم دکھا کر فخریہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھنے لگا۔

''بڑی اچھی تصویریں ہیں۔'' شانی نے کہا۔

مُنا بھی دلچسپی سے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک تصویر البم سے نکالنے کی کوشش کی تو وہ ذرا سی مڑ گئی۔ ''نہیں مُنے! تصویر خراب ہو جائے گی۔'' بشیر نے سخت لہجے میں کہا۔

منا جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لئے توتلی زبان میں بولا۔

''ابو! آپ نے میرے ساتھ تاتی (چاچی) کی تصویر کیوں کھینچی؟''

''اس لئے کہ تمہاری چاچی کا چہرہ تصویر کے لئے زبردست ہے۔''

''تاتی کا چہرہ پیارا ہے؟'' مُنے نے پوچھا۔

''ہاں پیارا بھی ہے لیکن ضروری نہیں کہ سارے پیارے چہروں کی تصویر زبردست بنے۔ کچھ چہرے خاص طور سے تصویر کے لئے اچھے ہوتے ہیں۔'' چوہدری بشیر نے مُنے سے زیادہ شانی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ آج بالکل مختلف موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی بھاری بھرکم شخصیت میں مسکراہٹ کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ باتوں باتوں میں انوری کا ذکر بھی آیا۔ شانی کے پوچھنے پر چوہدری نے بتایا کہ وہ اس کی بہتری کے لئے کچھ سوچ رہا ہے۔ بھابو کے بارے میں سوال کتنی ہی دیر سے شانی کے ہونٹوں میں مچل رہا تھا۔ آخر وہ بول پڑی۔

''بھابو دو تین دن سے نظر نہیں آئیں۔ وہ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ بس طبیعت ذرا گری ہوئی ہے۔ پہلے پروگرام تھا کہ ہم دونوں مُنے کو لے کر آئیں گے مگر پھر مجھے اکیلے آنا پڑا۔''

''اس بارے میں بھابو سے میری تھوڑی بہت بات ہوئی تھی۔'' شانی بولی۔ ''بھابو ایک دم کمزور اور پیلی نظر آتی ہیں...... مجھے تو دیکھ کر دھچکا لگا ہے بھائی جان...... میں نے بہت پوچھا کہ آپ کو کیا ہے، مگر ٹال گئیں۔ علاج کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ چند دن ہوئے ہیں میرے پاس بیٹھے بیٹھے اتنے زور کی کھانسی آئی کہ دم الٹ گیا۔ چہرہ بالکل ہلدی ہو گیا تھا۔''

چوہدری بشیر نے عمیق سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت سمجھاتا ہوں لیکن مانے تو تب ہے ناں...... اپنی مرضی کرتی ہے۔''

''لیکن ہوا کیا ہے انہیں؟''

''ہارٹ کا مسئلہ ہے۔'' چوہدری بشیر نے انکشاف کیا۔ شانی کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ سلسلہ دو تین سال سے چلا آ رہا ہے۔ پہلے پہلے چکر آتے تھے، ایک دو بار چلتے پھرتے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ اس وقت زیادہ پرواہ نہیں کی،

یہی سمجھتی رہی کہ عام کمزوری ہے۔ میں نے اس وقت بھی کویت سے بار بار پیغام بھیجا تھا کہ لاہور میں کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اَپ کرواؤ۔ مگر ٹالتی رہی... اب تکلیف ذرا بڑھ گئی ہے۔''

''اب تو امی کو دورہ پلتا (پڑتا) ہے تاتی۔'' مُنے نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''نہیں، کوئی دورہ نہیں ہے۔ بس ایک بار طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہو گی۔ ٹھیک ہو جائے گی۔'' چوہدری بشیر نے بیٹے کو تسلی دی۔

شانی نے اس کا گال چومتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ مُنے! تم ذرا لان میں گھوم کر آؤ۔ ابو کے لئے وہ چھوٹے چھوٹے پھول توڑ کر لاؤ۔'' اس نے کھڑکی میں پھول دکھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ میں آپ کے لئے توڑ کر لاؤں گا۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''اچھا میرے لئے ہی لے آؤ۔''

وہ ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گیا۔

شانی نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا زیادہ تکلیف ہے بھابو کو؟''

''نہیں، اتنی زیادہ نہیں لیکن ایسی بھی نہیں کہ نظر انداز کر دی جائے۔ حویلی میں آگ لگنے والے واقعے کا اس نے دوسروں سے زیادہ اثر لیا ہے، فاخر اور دادا کی لاشیں دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی اِدھر ان کے جنازے پڑے تھے، اُدھر اس کی سانس پھنس گئی تھی اور زیادہ اندر کھنچ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے سنبھلی تھی، کوئی دو مہینے پہلے بھی ایک دن ایسی ہی حالت ہوئی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ سانس رک گئی۔ منہ ایک طرف کھنچ گیا۔ تب میں اسے لاہور لے گیا تھا۔ دواؤں سے ٹھیک ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے کچھ ٹیسٹ کروائے اور بتایا کہ دل کا نقص ہے۔ کچھ رگیں ہوتی ہیں جو دل کو دھڑکانے کے لئے کرنٹ جیسی طاقت دیتی ہیں۔ ان رگوں میں نقص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپریشن کرانا پڑے۔''

''تو پھر؟'' شانی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ ویسے اب کافی دنوں سے بالکل ٹھیک ہے۔ درد وغیرہ بھی نہیں ہے۔''

''کوئی علاج ہو رہا ہے؟''

''ہاں.... تھوڑی بہت ڈاکٹری دوا کھا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک حکیم صاحب ہیں۔ ہیں تو دیہاتی علاقے کے مگر کافی شہرت ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں امیروں وزیروں تک کا علاج کرتے ہیں۔ ان پر بڑا اعتقاد ہے مقبول کو۔ آج کل ان کا علاج کرا رہی

ہے اور جب سے علاج ہو رہا ہے تب سے حالت بھی بہتر ہے۔ اب یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ دواؤں کا اثر ہے، یا پھر یقین کی بات ہے۔''

''آپ جس طرح کی تکلیف بتا رہے ہیں وہ تو عام علاج معالجے سے ٹھیک ہونے والی نہیں لگتی۔ آپ...... آپ انہیں کسی اچھے سے سپیشلسٹ کو دکھائیں بھائی جان...... یا پھر ان ڈاکٹر صاحب کو جنہوں نے ٹیسٹ کئے ہیں۔''

''میں تو بہت سمجھاتا ہوں۔ تمہیں ملے تو تم بھی کوشش کر کے دیکھو۔ ویسے آج کل اسے اطمینان بہت ہے۔ کہتی ہے دیکھ لینا میں جب ٹھیک ہوئی تو حضرت صاحب کی دوا سے ہی ہوں گی...... حکیم صاحب کو لوگ حضرت صاحب کہتے ہیں...... بلکہ وہ حکیم بھی نہیں ہیں کوئی اور ہی طریقہ ہے ان کے علاج کا......''

اسی دوران میں مُنا بہت سے ننھے مُنے سُرخ پھول اپنے ننھے مُنے ہاتھوں میں لئے اندر آ گیا۔ اس نے رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ پھول شانی کو اور کچھ اپنے ابو کو دیئے۔ تب اس نے کچھ پھول اپنی پتلون کی جیب میں سے نکالے اور کھلکھلاتے ہوئے انہیں شانی کے سر پر نچھاور کر دیا۔ کئی پھول شانی کے ریشمی بالوں میں اٹک گئے۔ وہ جھاڑنے لگی تو مُنے نے اس کی کلائی پکڑ لی، کھلنڈرے انداز میں اچھلتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... نہیں...... ابو! ایسے ہی ان کی تصویر بنائیں۔ ایسے ہی بنائیں۔''

شانی نے دوسرا ہاتھ اٹھایا تو مُنے نے دوسری کلائی بھی پکڑ لی۔ وہ معصوم انداز میں شانی سے زور آزمائی کرنے لگا، چوہدری بشیر نے کہا۔ ''بھئی...... منے کا آئیڈیا ایسا بُرا نہیں ہے۔ اچھی تصویر آئے گی۔''

وہ کیمرا سنبھال رہا تھا۔ جب شانی نے مُنے سے ہاتھ چھڑا کر پھول جھاڑ دیئے اور آنچل سر پر لے لیا۔ مُنے کے گال پر چٹکی لے کر بولی۔ ''ایک دم شرارتی ہو گئے ہو تم۔''

منظر اوجھل ہو گیا تھا اس لئے چوہدری بشیر نے بھی کیمرا واپس رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ قدرے سنجیدہ بھی نظر آنے لگا تھا۔

مُنا واپس آ گیا تھا اس لئے شانی نے بھابو کے بارے میں مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ وہ اور چوہدری بشیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ چوہدری بشیر نے قادرے کے بارے میں بتایا کہ وہ آج کل اپنے کتے کی موت کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ دو دن پہلے وہ سخت بخار کے باوجود اکیلا ہی رائفل لے کر نکل گیا تھا اور رستم اور اس کے دوستوں کو ڈھونڈتا رہا تھا۔ شانی کے ذہن میں وہ وحشت ناک لمحے تازہ ہو گئے جب قادرے نے کتے کی مدد

سے شانی کو دہشت زدہ کیا تھا...... ان باتوں کے دوران میں ہی زہرا چائے لے کر آ گئی۔

جب وہ چائے پی رہے تھے، مُنے نے ایک بار پھر پرانا مشغلہ شروع کر دیا۔ اس نے البم میں سے ایک تصویر نکالنے کی کوشش کی...... تصویر پھٹ گئی۔ چوہدری بشیر کے صبر کا پیمانہ لبریز چھلک گیا۔ اس نے مُنے کو غصے سے پیچھے دھکا دیا۔ وہ گر گیا۔ چوہدری گرج کر بولا۔ ''تجھے منع نہیں کیا تھا؟ اُلو کا پٹھا، گدھا۔''

مُنا ایک دم سہم کر زرد ہو گیا۔ شانی کے سامنے بے عزتی ہوئی تھی اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی محسوس کر رہا تھا۔ شانی نے اسے پچکارا تو وہ آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ چوہدری بشیر کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا۔ چائے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے کے خوش باش چوہدری بشیر سے مختلف شخص نظر آنے لگا تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا تھا کہ مُنا اور بھابو وغیرہ چوہدری کے اس روپ سے سہم جاتے ہوں گے۔

''چلو آؤ۔'' اس نے قدرے نرم آواز میں مُنے سے کہا۔

مُنا مشینی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا ہم پھر آئیں گے۔'' چوہدری بشیر نے کہا اور مُنے کو لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شانی انہیں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ پتھریلی جالیوں والی سفید دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ بھابو کی بیماری کا سن کر شانی کے سینے میں دھواں سا بھر گیا تھا۔ اس کا دل کتنے دنوں سے گواہی دے رہا تھا کہ بھابو کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہے۔ آج چوہدری بشیر کی زبانی اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر بھابو کے پاس پہنچ جائے اور اس کی دلجوئی کرے۔

رہ رہ کر مُنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے دھڑکا سا لگ گیا تھا کہ مُنا شاید دوبارہ اس سے ملنے آئے یا نہیں۔

بہر حال اگلے روز سہ پہر کو یہ دیکھ کر شانی نے اطمینان محسوس کیا کہ مُنا درمیانی دروازے میں سے گزر کر اس کی طرف آ رہا ہے۔ مزید اطمینان کی بات یہ تھی کہ بھابو بھی ساتھ تھی۔ شانی جپھی ڈال کر بھابو سے ملی، پھر مُنے کو گود میں اٹھا کر بے تحاشا پیار کیا۔

تینوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کرخت چہرہ جالاں آس پاس موجود تھی۔ اس کی آنکھیں اور کان ہمہ وقت شانی کی طرف لگے رہتے تھے۔

مُنے نے توتلی زبان میں ماں کو بتایا کہ کل ابو نے تاتی کے ساتھ اس کی تصویریں کھینچی تھیں۔

شانی ہنسنے لگی اور بھابو کو اس واقعے کی تفصیل بتانے لگی۔ بھابو نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ بولی۔ ''تمہارے بھائی جان کو یہ نیا شوق ڈیڑھ دو سال پہلے ہی چرایا ہے۔ میں نے تمہیں نارپور میں بھی بتایا تھا ناں کہ تمہارے بھائی جان کو شکار کی تصویریں کھینچنے کا شوق ہے۔ ایک دو تصویریں میں نے تمہیں دکھائی بھی تھیں۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھابو اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کو ان کا ایسا کرنا بُرا تو نہیں لگا؟''

''آپ کیسی بات کرتی ہیں بھابو؟'' شانی نے فوراً کہا۔

''وہ دل کے بُرے نہیں ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا، نارپور کے دوسرے چوہدریوں سے وہ کتنے وکھرے ہیں۔ ان کے سارے بھائی بندوں کو میں جانتی ہوں۔ ان میں سے زیادہ ایسے ہیں جو عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں مگر ندیم کے ابا ایسے نہیں ہیں، انہوں نے مجھے پیار دیا ہے۔ عزت دی ہے...... میرے اور بچوں کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے ہیں وہ......''

شانی کے ذہن میں چوہدری بشیر کے وہ تاثرات چمک گئے جو کل تصویر اتارتے وقت اس کے چہرے پر موجود تھے۔ یہ تاثرات کل سے شانی کے ذہن میں کھٹک رہے تھے۔ یہ ایک مرد کے تاثرات تھے۔ ایک ایسا مرد جو عورت کو صرف ایک جسم کے طور پر دیکھتا ہے۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں شانی کو محسوس ہوا تھا کہ چوہدری بشیر کی نگاہیں ایک ہاتھ کا سا لمس رکھتی ہیں اور یہ ہاتھ اس کے جسم کو ٹٹول رہا ہے۔ ان نگاہوں میں اسے ویسی ہی جنسی تپش محسوس ہوئی تھی جو کبھی فاخر کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔

مگر آج شانی اپنے یہ خیالات بھابو کے سامنے بیان نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنے خیالات سے توجہ ہٹانے کے لئے اس نے بھابو کی صحت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر اس نے بھابو کو صاف بتا دیا کہ کل اسے بھائی جان بشیر سے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ بھابو کو دل کی تکلیف لاحق ہے اور وہ اپنے علاج میں مسلسل کوتاہی کر رہی ہے۔ شانی نے بے حد زور دے کر بھابو سے پوچھا کہ وہ اپنا مناسب علاج کیوں نہیں کرا رہی ہے اور کسی دیہاتی معالج کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہے۔

بھابو کے جواب سے چوہدری بشیر کے اس بیان کی تائید ہوئی کہ یہ بھابو ہی ہے جو آپریشن کے امکان سے خوفزدہ ہو کر کسی حضرت صاحب کے علاج کو ترجیح دے رہی ہے۔

شانی سٹپٹا سی گئی پھر بولی۔ ''جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے تمہاری تکلیف اور طرح کی ہے، تمہیں بڑے اچھے علاج کی ضرورت ہے۔ تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ تو مشکل سے ڈر کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے والی بات ہوگی۔''

''لیکن شانی! میں اب ٹھیک ہوں۔ پہلے سے بہت اچھی ہوں۔ حضرت صاحب کی دوا......''

''مجھے تو اچھی نہیں لگ رہی ہو۔'' شانی نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور اگر ہو بھی تو، کیا پتا یہ افاقہ عارضی ہو۔ یہ دل کی تکلیف اگر بڑھ جائے تو بڑی نامراد ہوتی ہے۔ میں نے ابا جی کی بیماری بھگتی ہوئی ہے۔ شروع میں ابا جی بھی ہسپتال جانے سے گھبراتے تھے۔ بس جہاں کسی نے حکیم سنیاسی یا تعویذ گنڈے والے کا بتایا وہاں چل دیئے۔ پنجاب کا کوئی کونا کھدرا نہیں چھوڑا ہم نے...... جب تک یہ چکر سمجھ میں آئے، تب تک بیماری بہت بڑھ چکی تھی...... بس اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی، پر تم ایسا نہ کرنا بھابو۔ ڈاکٹر نے صرف یہی کہا ہے ناں کہ آپریشن کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ آپریشن ہی ہوگا۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم دو تین اور ڈاکٹروں سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ سارے ٹیسٹ وغیرہ بھی کرواتے ہیں، اگر فرض کیا بات پھر بھی آپریشن پر آئے...... تو ڈرنا نہیں چاہئے بھابو! اب تو دل کے آپریشن بہت عام ہو رہے ہیں۔ لوگوں کو شفا مل رہی ہے اور پھر ہم مسلمانوں کا تو ایمان ہے کہ موت زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' شانی کے لہجے میں سچا درد تھا اور بے حد التجا تھی۔

بھابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری جان! تیرا مشورہ سر آنکھوں پر، لیکن تُو یہ سب اس لئے کہہ رہی ہے کہ تُو ابھی تک حضرت صاحب سے ملی نہیں ہے۔ شانی وہ بالکل اور طرح کے بندے ہیں۔ اللہ نے ان کے ہتھ میں خاصی شفا رکھی ہوئی ہے۔ سمجھ جادو ہے ان کی نظر میں اور ان کی دوا میں۔''

لگتا ہے کہ بھابو ان حضرت صاحب پر اندھا اعتماد رکھتی ہے۔ شانی کی خداداد معاملہ فہمی نے اسے سمجھا دیا کہ اگر اس موقع پر اس نے بھابو سے بحث جاری رکھی تو اس کا مثبت نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے اعصاب پُرسکون کئے اور بھابو سے حضرت صاحب کے بارے میں بات کرنے لگی۔ بھابو نے بتایا کہ وہ بے حد نیک اور کم بولنے والے شخص ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک کاروبار کرتے تھے۔ اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ سے لَو لگا رکھی ہے اور لوگوں کے دکھ درد بانٹ رہے ہیں۔ بھابو نے حضرت صاحب کے بارے میں ایک خاص بات بتائی کہ وہ کسی بھی حالت میں کسی شخص کے چہرے کی طرف دیکھتے نہیں ہیں۔ ان کے پاس علاج کے لئے سینکڑوں افراد آتے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ مرد بھی، خوبصورت جوان عورتیں بھی۔ مگر وہ کسی کے چہرے کی طرف نگاہ نہیں کرتے۔ ان کی دوا عام طور پر بس ایک ہی طرح کے سفوف کی شکل میں ہوتی ہے، مگر اہم بات یہ ہے کہ یہ

سفوف ہر شخص کی طبیعت اور بیماری کے مطابق علیحدہ ذائقہ دیتا ہے اور علیحدہ اثر رکھتا ہے۔ اس طرح کی اور کئی باتیں بھابو نے اپنے دیہاتی لب و لہجے میں حضرت صاحب کے بارے میں بتائیں۔

شانی سنتی رہی اور اس حوالے سے کسی طرح کا تبصرہ نہیں کیا۔ جب تک وہ ''حضرت صاحب'' کو دیکھ نہ لیتی ان کے بارے میں کیا کہہ سکتی تھی......حضرت صاحب کو دیکھنا اس کے لئے آسان نہیں تھا، بلکہ وہ تو جالاں، زہرا، فردوس اور بھابو کے سوا کسی کے سامنے آ ہی نہیں سکتی تھی۔ چوہدری بشیر نے اس مختصر چار دیواری میں اسے ہر کسی سے چھپا کے رکھا ہوا تھا۔

بھابو کے جانے کے بعد وہ دیر تک چوہدری بشیر کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کے دل میں جھانک سکے مگر اندازے اور قیافے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ خاص طور سے عورت اپنی طرف اٹھنے والی نگاہوں اور ان کے مقاصد کو بہت جلد بھانپ لیتی ہے۔ بے شک چوہدری بشیر اپنے بھائی بندوں سے بہت مختلف نظر آتا تھا مگر اس کے اندر بھی شانی کو اس مرد کی جھلک نظر آئی تھی جو حویلی چھوڑنے کے بعد اسے پنڈی اور لاہور کے ہر گلی کوچے میں ملا تھا۔ یہ مرد کئی روپ میں نظر آیا تھا مگر جس روپ میں بھی ملا تھا، اس نے اپنی نگاہوں سے شانی کے جسم میں سوراخ کئے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ کسی دن یہ چوہدری بشیر بھی قاسم برلاس بن جائے گا......'' شانی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''نہیں......ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ مختلف شخص ہے۔ جب وہ اس کی گرفت میں آئی تھی تو چوہدری کیا نہیں کرسکتا تھا مگر اس نے اسے قادرے کی وحشت سے بچایا اور اس چار دیواری میں اسے تحفظ فراہم کیا۔ وہ بہت سے دن اور بہت سی راتیں اس چار دیواری کے اندر مکمل تحفظ کے ساتھ گزار چکی تھی۔'' شانی نے خود ہی اپنے خیال کو رد کیا۔

مگر یہاں یہ سوال اٹھتا تھا کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے......وہ کب تک کٹی پتنگ کی طرح وقت کے آسمان پر ڈولتی رہے گی... اور اپنے ساتھ ساتھ بھاگنے والے لٹیروں کی دست بُرد سے بچی رہے گی۔ اسے کسی مضبوط ڈور کی ضرورت تھی جو اسے اپنے ساتھ باندھ کر رکھتی۔ پُراندیش شام سے پہلے اسے کھینچ کر اپنے آنگن میں اتار لیتی، اسے توانا سہارے کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کیوں اپنے آپ اس کا دھیان رستم کی طرف چلا گیا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ کب چوہدری بشیر کے بارے میں سوچتے سوچتے رستم کے متعلق سوچنے لگی۔ رستم کا

خیال ذہن میں آیا تو وہ ایک دم چونک سی گئی۔ دو تین دن ہوگئے تھے وہ ٹیری یا رستم سے رابطہ نہیں کرسکی تھی۔ رستم سے اس کا آخری رابطہ بھی اچانک ہی ٹوٹا تھا۔ وہ فون پر بات کر رہی تھی جب اسے دیوار کے پار کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور اس نے یکا یک فون بند کردیا تھا۔ یقیناً رستم بھی پریشان ہوا ہوگا۔ یہ پریشانی یوں مزید بڑھ گئی ہوگی کہ شانی دوبارہ فون نہیں کرسکی تھی۔ شانی نے تصور کی نگاہ سے دیکھا ... پنڈی کے اس دور افتادہ گھر میں رستم بے قرار تھا۔ اس کی نگاہ رہ رہ کر فون سیٹ کی طرف اٹھتی تھی اور ناکام ہوکر لوٹتی تھی۔ وہ دکھی ہو رہا تھا اور شانی کے لئے یہ احساس بے حد اذیت ناک تھا کہ کوئی اس کے لئے دکھی ہو۔

بھابو کے جانے کے بعد وہ چھت پر آگئی۔ ابھی موبائل میں اتنا بیلنس موجود تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ مزید بات کرسکتی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے نمبر پریس کیا۔ پہلی ہی بیپ پر رستم کی آواز آئی۔ شانی کا اندازہ درست تھا۔ وہ پتا نہیں کب سے فون کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔

''ہیلو بی بی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ میں بہت پریشان رہا ہوں۔ آپ نے ایک دم فون بند کردیا تھا... یہ بھی نہیں بتایا کہ کیوں کیا تھا؟'' رستم کے مؤدب لہجے میں شکوے کراہ رہے تھے۔

''میں تم سے معافی چاہتی ہوں رستم! مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا... دراصل یہاں حالات کچھ ایسے تھے کہ تمہیں دوبارہ فون کرنے کی بات ذہن سے نکل گئی۔ ویسے میں بالکل خیریت سے ہوں۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں......تم کیسے ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' وہ حسبِ معمول سپاٹ آواز میں بولا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ ناراض اور بوجھل خاموشی، پھر شانی نے کہا۔ ''جب میں نے فون بند کیا۔ ہم نادیہ کی بات کر رہے تھے۔ اس بارے میں کچھ سوچا تم نے؟''

''بی بی! کیا ہم کوئی اور بات نہیں کرسکتے؟'' اس کا لہجہ دکھ سے بھرا تھا۔

''پھر تم ہی بتاؤ، میں کیا بات کروں؟''

''میں کچھ بتانے کے قابل ہوتا تو ضرور بتاتا۔''

''رستم! آخر تم اس طرح کیوں بولتے ہو۔ میں تمہیں اسی لئے فون کرتی ہوں کہ ہم کوئی اچھی باتیں کرسکیں۔ کچھ ایسی باتیں جن سے مایوسی ختم ہو اور تمہارے آنے والے کل کے لئے کوئی بہتر راہ نکل سکے لیکن تم الٹا مزید الجھ جاتے ہو اور مجھے بھی الجھا دیتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ہر وقت شکوے شکایت کا ڈھیر لے کر بیٹھے رہتے ہو۔ اگر تم... اگر تم کہتے ہو تو میں آئندہ

فون نہیں کروں گی۔'' شانی کے لہجے میں نہ چاہنے کے باوجود تلخی آ گئی۔

وہ بدستور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''بی بی! میں تو ہر حال میں خوش ہوں۔ آپ دکھی رکھیں، خوش رکھیں، انتظار میں رکھیں، ساری عمر اپنی صورت کو ترسائیں، میں ہر حال میں راضی ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں بی بی میں راضی ہوں۔ آپ کی طرف سے مجھے خوشی کے سوا اور کچھ مل ہی نہیں سکتا۔ آپ بڑے سے بڑا دکھ بھی دیں گی تو وہ میرے پاس آتے آتے خوشی بن جائے گا۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ مجھے کتابوں کی باتیں بھی نہیں آتی ہیں۔ مگر سچ یہی ہے بی بی کہ آپ کی طرف سے آنے والے دکھ میں، مجھے آپ کی طرف سے آنے والی خوشی سے زیادہ راحت ملتی ہے۔''

''یہ وہی باتیں ہیں جو تم پہلے بھی کرتے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم نے ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو پھر اس طرح فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

وہ خاموش رہا۔ بے حد گھمبیر اور بوجھل خاموشی۔ شانی ایک دم جھنجھلا سی گئی۔ اس کے لہجے میں کاٹ آ گئی۔ ''شاید تم بھی فون پر میری آواز سن سن کر اکتا گئے ہو۔ منہ سے نہیں کہتے، مگر چاہتے ہو کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ '' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر آواز بھرا گئی۔ اس نے ایک دم فون بند کر دیا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا اسے۔ اچانک آنسو، بوندوں کی طرح اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ اس نے گرم چادر اپنے سر کے اوپر سے کھینچ کر ٹانگوں تک پھیلا لی۔ یوں ایک خیمہ سا بن گیا۔ اس چھوٹے سے نیم گرم خیمے کے اندر وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ کوئی دکھ تھا جو اپنے آہنی ہاتھوں سے کلیجے کو مسل رہا تھا۔ آنسوؤں کا بہاؤ بڑھتا چلا گیا۔ اسے ڈر محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس کی آواز بلند نہ ہو جائے، ایسے میں جالاں یا زہرا میں سے کوئی چھت پر آ جاتا تو کیا سوچتا۔

جیسے بارش کے بعد مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ نیلے آسمان پر دھوپ کے سنہری پر پھیل جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دیر تک موسلا دھار رونے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ رستم کے ساتھ نہیں رہ سکتی تو اس سے بالکل جدا بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے اندر مسلسل تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ جو کچھ وہ کل تھی وہ آج نہیں تھی اور جو آج تھی شاید وہ کل اس نے نہیں ہونا تھا۔

پنڈی سے روانہ ہوتے وقت اس نے اپنے دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں، سارے دروازے رستم کی طرف سے بند کر لئے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا تھا۔ مگر

راستے شاید موجود تھے۔ درزیں شاید باقی تھیں۔ کوئی چور راستوں کے ذریعے اندر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے دل کی زمین پر چپکے چپکے اپنے اختیار کو مستحکم کر رہا تھا۔ وہ لرز گئی۔

ابھی وہ تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا کہ غم بھی اسے خوشی کی طرح محسوس ہوتا ہے، لیکن ''غمگین خوشی'' دل کی نازک رگوں کو بے رحمی سے توڑتی بھی تو ہے۔ شانی کو اندازہ تھا کہ یوں اچانک فون بند کر کے اس نے رستم کو کتنا دکھ دیا ہے۔ اگر یہاں چھت پر اس نے آنسو بہائے تھے تو یقیناً وہاں وہ بھی دکھ کے بیلنے میں سے گنے کی طرح گزر رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر جیسے کوئی ایک دم بھاگ کر کسی کے گلے لگ جاتا ہے، اسی طرح شانی نے بھی یکایک گود میں رکھے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چند سیکنڈ بعد وہ پنڈی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ ''ہیلو......'' رستم کی بوجھل آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔ ''ہیلو'' رستم نے دوبارہ اور سہ بارہ کہا۔

''ہیلو......'' شانی نے مختصر جواب دیا۔

''آپ نے ایک دم فون بند کر دیا؟''

''ہاں......''

''بہت رنج دیتا ہوں نا آپ کو......''

''دیتے ہو یا نہیں۔ یہ لمبی بحث ہے۔'' شانی کا لہجہ اب نرم تھا۔ ''میں نے اس وقت صرف اس لئے فون کیا ہے تاکہ تمہیں بتا سکوں...... میرے فون کا بیلنس ختم ہو رہا ہے۔ میں ایسی جگہ ہوں کہ اسے ری چارج نہیں کروا سکتی۔ شاید اب کافی عرصہ تک دوبارہ بات نہ ہو سکے گی۔''

''میں اس بارے میں آپ سے کوئی سوال پوچھنے کا اختیار نہیں رکھتا۔'' رستم نے کہا۔ وہ اس کے الفاظ میں چھپے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''رستم! میں آج تم سے ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں، مجھے یہ کہنی بھی چاہئے یا نہیں لیکن تمہارے حوالے سے میرے ذہن میں جو اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں، انہیں دیکھ کر سوچتی ہوں کہ کہہ دوں۔''

''میں سن رہا ہوں بی بی۔'' اس کے لہجے کے پیچھے محبت کا چناب خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ انتہائی طاقت ور، بیکراں اور مہیب پانی مگر بہت پُرسکون۔

شانی نے کہا۔ ''رستم! میں جانتی ہوں تمہارے دل میں کیا ہے۔ میں تمہارے احساس اور جذبے کو سمجھتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری طرف سے تمہارے ساتھ

زیادتی ہو رہی ہے۔ میں اپنے آپ میں شرمندہ ہوتی ہوں۔ میرا دل تمہارے لئے غم زدہ ہو جاتا ہے۔ مگر مجبور ہوں رستم! میں ایک عورت ہوں مجھے بہت [illegible] پڑتا ہے۔ اور پھر ...... رستم...... میں تم سے ایک [illegible] پوری سچائی سے کہہ دینا چاہتی ہوں، شاید تمہارے دل میں میرے لئے جو جذبہ ہے، وہ اس جذبے سے بالکل مختلف ہے جو میرے دل میں تمہارے لئے ہے۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ یہ ایک جیسا ہی جذبہ ہو مگر میرے دل میں اس جذبے کی شدت کم ہو۔ میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ میں الجھ جاتی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہوگئی۔ دوسری طرف رستم بھی خاموش تھا۔ بس اس کے بھاری سانس کی آواز آ رہی تھی۔ شانی نے چند لمحے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "رستم...... میں تم سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو...... چلو...... ہمیشہ کے لئے نہیں، تو کچھ عرصے کے لئے سہی...... ہوسکتا ہے کہ اس دوران میں حالات کچھ تبدیل ہو جائیں...... انسان ہمیشہ تو ایک جیسا نہیں رہتا، وقت اسے بدلتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں بھی ویسی نہ رہوں جیسی آج ہوں۔"

فضا میں سنسناہٹ سی تیرنے لگی۔

"آپ کچھ عرصے کی بات کرتی ہیں بی بی! میں تو...... زندگی کی آخری سانس تک اور پھر قیامت تک آپ کا انتظار کرسکتا ہوں۔" اس کی آواز میں خوشی کی ہلکی سی لرزش شامل ہوگئی تھی۔ عجیب خواب ناک آواز تھی اس کی۔

"مجھے نہیں پتا رستم! آنے والے دنوں میں کیا ہوگا، مگر ایک بات آج بھی پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔" شانی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں اپنا سچا ہمدرد اور غم گسار سمجھتی ہوں۔ میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔ تمہیں اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہارے لئے میرے دل میں نیک تمنائیں رہتی ہیں۔"

"آپ کے منہ سے کوئی ایسی بات سنتا ہوں تو لگتا ہے، میں دنیا میں خوش قسمت ترین انسان ہوں۔" وہ وارفتگی سے بولا۔

چند سیکنڈ سکوت رہا، تب شانی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب کچھ دیر میں فون بند ہونے والا ہے۔ آج کے بعد میں فون نہیں کروں گی۔"

"اب آپ کی آواز کب سنوں گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید ...... پانچ چھ ہفتے بعد...... یا پانچ چھ مہینے بعد...... یا پھر۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

رستم کے بھاری سانسوں کی آواز آتی رہی۔ "میں انتظار کروں گا۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" شانی نے پوچھا۔

"یہیں...... زوار کے گھر۔"

"یعنی تم آزاد ایجنسی میں نہیں جاؤ گے؟"

"اگر چلا گیا تو پھر کیسے پتا چلے گا کہ آپ نے فون کیا ہے۔"

"لیکن یہاں تمہارے لئے خطرے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے شیری نے آپ کو میری مصروفیت کے بارے میں بتایا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد آپ کی تلاش میں نہیں نکلوں گا۔ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جو آپ کو ناپسند ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قریبی شہر میں چلا جاؤں۔"

"اور یہ جو مار دھاڑ کا سلسلہ شروع کیا ہے تم نے۔" شانی نے ذرا توقف سے پوچھا۔

"کہا تو ہے بی بی۔ کچھ ایسا نہیں کروں گا جو آپ کو ناپسند ہو۔" اس کے لب و لہجے میں ایک مثبت تبدیلی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سی تھی جو اس کے الفاظ کے نیچے چل رہی تھی۔ شاید یہ آس کی اس مدھم لو کا کرشمہ تھا جو آج اسے شانی کی باتوں میں دکھائی دی تھی۔ اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ٹھیک سے خدا حافظ کہتے فون نے ان دونوں کو خدا حافظ کہہ دیا۔ بیلنس ختم ہونے سے وہ ڈس کنیکٹ ہوگئے۔

☆======☆======☆

درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ دھوپ پسپا ہوتی جا رہی تھی اور سردی پیش قدمی کر رہی تھی۔ شانی نے کھڑکی میں دیکھا اور خوش ہوگئی۔ بھابو اور مُنا درمیانی دروازے سے گزر کر آ رہے تھے۔ آج ان کے ساتھ چوہدری بشیر بھی تھا۔ تینوں خوشگوار موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔

بھابو نے شانی کو گلے لگایا۔ مُنے نے اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر اسے اٹھانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ چوہدری بشیر پر گرتے گرتے بچی۔ بھابو نے مُنے کو ڈانٹا۔ تینوں ہنسنے لگے۔ جالاں اور زہرا نے چائے بنائی۔ چاروں نے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی اور ساتھ میں ڈرائی فروٹ کھائے۔ چوہدری بشیر کے مزاج سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا موڈ کبھی کبھار ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ آج موڈ خوشگوار تھا لہٰذا بھابو بھی خوش دکھائی دیتی تھی۔ مُنا بھی چہک رہا تھا۔ بھابو، شانی کے لئے سلے ہوئے کپڑے لائی تھی۔ یہ چار پانچ گرم جوڑے تھے، اس کے علاوہ

دو سویٹر اور دو کشمیری شالیں بھی تھیں۔ شانی نے یہ سب کچھ وصول کرتے ہوئے جھجک محسوس کی تو بھابو نے بڑی اپنائیت سے اسے ڈانٹ پلائی۔

چوہدری بشیر نے اپنی واسکٹ کی جیب سے تین چار تصویریں نکالیں اور شانی کو دکھائیں۔ ان میں سے دو تصویریں مُنے اور شانی کی تھیں۔ یہ وہی تصویریں تھیں جو چوہدری بشیر نے اس چھت تلے کھینچی تھیں۔

''دیکھو بھئی! میں نے کہا تھا ناں کہ بڑا پیارا پوز آئے گا۔'' وہ تصویریں شانی اور بھابو کو ایک ساتھ دکھاتے ہوئے بولا۔

''سچ مچ بڑی پیاری فوٹو ہے۔ دونوں بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔'' بھابو نے تعریف کی۔

''ہاں بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے میں تاتی کا بیٹا ہوں۔'' مُنے نے تائید کی۔

''میرے ہی تو بیٹے ہو۔'' شانی نے اس کا منہ چوما۔ پھر ذرا شرمائی نظر سے تصویر کو دیکھا۔ وہ واقعی خوبصورت لگ رہی تھی۔ گھنے سیاہ بالوں نے اس کے دونوں رخساروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ آنچل اس کے سر سے ہوتا ہوا اور سینے کو چھپاتا ہوا گھٹنوں تک چلا گیا تھا۔ آج پتا نہیں کتنے عرصے بعد شانی نے خود کو تصویر کی صورت میں دیکھا تھا، کچھ دیر تک تصویروں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ پھر ٹی وی پر شکار کی ایک دستاویزی فلم چلنے لگی، وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ فلم دیکھتے ہوئے شانی کو گاہے بگاہے احساس ہوتا رہا کہ چوہدری بشیر کی چور نظریں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اس نے ہر بار اس احساس کو اپنا وہم خیال کیا اور ذہن سے جھٹک دیا۔

اس دن کے بعد یہ بھابو اور چوہدری بشیر کا معمول بن گیا۔ وہ ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر شانی کے پاس آجاتے۔ چائے پیتے..... گپ شپ کرتے۔ مُنے کی معصوم شرارتیں دیکھتے۔ کسی وقت چوہدری بشیر اور مُنا مختصر لان میں بیڈمنٹن کھیلنے لگتے۔ ان دلچسپ مصروفیات کے دوران بھابو کو اپنی تکلیف بھولی رہتی تھی۔ شانی محسوس کرتی کہ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں کچھ نہ کچھ چمک نمودار ہوگئی ہے۔

ایک روز جب چوہدری بشیر اور مُنا لان میں گھوم رہے تھے، برآمدے میں بھابو نے شانی کے پاس بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''حویلی والے حادثے کے بعد تمہارے بھائی جان بالکل بجھ سے گئے تھے۔ طبیعت میں چڑچڑا پن آگیا تھا۔ کسی وقت تو ایک دم غصے میں آجاتے تھے پر اب جوں جوں وقت گزر رہا ہے خود کو سنبھالتے جا رہے ہیں۔''

''ہاں..... میں بھی تبدیلی محسوس کرتی ہوں۔'' شانی نے کہا۔

''پتا ہے، کل کیا کہہ رہے تھے۔'' بھابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''کہہ رہے تھے، ہفتے کی شام کو اوپر چھت پر چلیں گے۔ وہاں آگ جلائیں گے اور تکے وغیرہ بنائیں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں..... بابے کیو۔''

''بار بی کیو۔'' شانی نے تصحیح کی۔

''ہاں وہی..... ایک خیمہ بھی ہے ان کے پاس۔ کہتے تھے چھت پر خیمہ لگائیں گے اور دیر تک چھت پر رہیں گے۔''

''اوپر تو بڑی سردی ہوگی۔''

''جب آگ جل جائے تو سردی کہاں ہوتی ہے۔'' بھابو نے کہا۔

اسی دوران میں بھابو کو یاد آیا کہ اسے تو شام چھ بجے والی دوا کھانی ہے۔ وہ ''ابھی آئی'' کہہ کر کوٹھی کی طرف لپک گئی۔

شانی وہیں برآمدے میں کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس اثناء میں مُنا اور زہرا بیڈمنٹن کھیلنے لگے، چوہدری بشیر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا شانی کے قریب آبیٹھا۔

''کہاں گئی ہے مقبول؟'' اس نے پوچھا۔

''کہہ رہی تھیں، دوا کھانا بھول گئی ہوں۔''

''یہی تو اس کی مصیبت ہے، کبھی ملازمہ یاد کراتی ہے۔ کبھی میں کراتا ہوں۔''

اچانک زہرا کا دبا دبا قہقہہ سنائی دیا۔ مُنا کھیلتے ہوئے پھسل کر گر گیا تھا، چوٹ نہیں آئی تھی اس لئے وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ وہیں گرے گرے پکارا۔ ''ابو میری تصویر اتار دیں۔''

شانی اور چوہدری بشیر بھی مسکرانے لگے۔ ایک دم چوہدری بشیر چونک کر بولا۔

''تصویر سے یاد آیا کہ تمہاری تصویریں بھی بہت خوب آئی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ مُنے کے ساتھ تمہاری دو چار تصویریں اور کھینچی جائیں، بڑی کلاسیکل چیز بنے گی بلکہ وہ پھولوں والا پوز بھی بہت خوب تھا۔ اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو وہ پوز ہم دوبارہ بنا سکتے ہیں''

شانی ایک دم بجھ سی گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے تاثرات یقیناً اس امر کا اظہار کر رہے تھے کہ چوہدری بشیر کی بات اسے پسند نہیں آئی۔

چوہدری کچھ دیر تک خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لمبے ڈگ بھرتا کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔

ایک دن چھوڑ کر ہفتہ تھا۔ بھابو نے بتایا تھا کہ کوٹھی کی وسیع چھت پر ''باربی کیو'' کا پروگرام بنا ہے۔ اسے یقین تھا کہ آج سہ پہر کے بعد بھابو آئے گی اور اسے پروگرام کی تفصیل بتائے گی۔ وہ انتظار کرتی رہی مگر بھابو نہیں آئی۔ شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ طے شدہ اصولوں کے مطابق وہ زہرا یا جالاں کو پیغام دے کر کوٹھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ اگلے روز بھی وہ منتظر رہی مگر ان تینوں میں سے کوئی انیکسی میں نہیں آیا۔

شانی کو لگا کہ اس دن والی بات سے چوہدری بشیر خفا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے رویے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

تین چار روز مزید گزر گئے۔ شانی بے کل رہی۔ آخر ایک دن صبح کے وقت اسے بھابو کی صورت نظر آئی۔ اس سے پہلے بھابو یا مُنا کبھی صبح کے وقت نہیں آئے تھے، بھابو کا چہرہ بجھا بجھا تھا۔

شانی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''بھابو! آپ لوگ ہفتے کو نہیں آئے۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔ میں نے مُنے کے لئے میٹھا بنا کر رکھا تھا۔ اس کے بعد بھی دو تین دن گزر گئے، آپ نے میری خبر نہیں لی۔''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' بھابو نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس تمہارے بھائی جان کا موڈ ذرا خراب تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟'' شانی نے پوچھا۔

''مردوں کے کئی بکھیڑے ہوتے ہیں۔ کوئی باہر کی پریشانی ہوگی، ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں۔ پرسوں بے وجہ مُنے کو مار دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہفتے کو خیمہ نہیں لگایا تو آج لگا لیں۔ اسے تھپڑ مارے۔ وہ آدھی رات تک روتا رہا۔'' بھابو کے لہجے میں پژمردگی تھی۔ رنگ بھی زرد تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی چوہدری کو بتائے بغیر آئی ہے۔

ایک ہوک سی شانی کے سینے سے اٹھی۔ اسے لگا کہ بھابو اور مُنے کی دل شکنی کی ذمے دار وہ خود ہے۔ اس بات کا نوے فیصد امکان تھا کہ چوہدری کا موڈ شانی کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔

یکایک بھابو کو کھانسی ہونے لگی۔ شانی نے جھٹ سے اسے پانی پلایا......اور شہد چٹایا کچھ دیر بعد وہ ٹھیک ہو گئی۔ شانی اس کا دل بہلانے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ باتوں باتوں میں وہ بھابو کو یہ سمجھانے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا مکمل چیک اَپ کرائے۔ بھابو کی سوچ کا رخ مسلسل حضرت صاب کی طرف تھا۔ اس

نے بتایا کہ حضرت صاحب سارا مہینہ پاکستان کے مختلف شہروں کے دورے کرتے ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی چار پانچ تاریخوں میں وہ لاہور میں ہوتے ہیں۔ یہ تاریخیں قریب تھیں اس لئے حضرت صاحب سے بھی عنقریب ملاقات ہونے والی تھی۔ شانی کی اطلاع کے لئے بھابو نے بتایا کہ اس مرتبہ ندیم کے ابا کی دعوت پر حضرت صاحب یہاں کوٹھی میں آئیں گے اور شاید ایک رات یہیں گزاریں گے۔ یوں انہیں اطمینان کے ساتھ بھابو کی طبیعت جاننے اور دوا تجویز کرنے کا موقع ملے گا۔ حضرت صاحب کی گھر میں آمد کو بھابو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھ رہی تھی۔ اس کی باتیں سننے کے بعد شانی کے اندر بھی ''حضرت صاحب'' کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

بھابو کے جانے کے بعد دو دن مزید گزر گئے۔ مُنے یا چوہدری بشیر کی صورت دکھائی نہیں دی۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شانی انیکسی کے مختصر لان میں پھولدار پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھی۔ اچانک اسے مُنے کی باریک توتلی آواز سنائی دی۔ ''تاتی جان......تاتی جان۔''

یہ آواز درمیانی دیوار کی ایک پتھریلی جالی میں سے آ رہی تھی۔ شانی نے اپنا کام چھوڑا اور لپک کر جالی کے پاس پہنچی۔ دوسری طرف مُنا موجود تھا۔ ''تاتی! مجھے آپ کے پاس آنا ہے...... مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔

شانی نے منہ سے چچ کی آواز نکال کر اسے پیار کیا اور بولی۔ ''نہیں مُنے اس طرح ٹھیک نہیں......تم امی یا ابو کو ساتھ لے کر آنا۔''

''نہیں۔ مجھے ابھی آنا ہے......'' وہ ضد کرنے والے انداز میں بولا۔ پھر وہ دوڑ کر دروازے کی طرف آیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

دروازے کی دوسری طرف سے چٹخنی چڑھائی گئی تھی اور یہ چٹخنی بلندی پر تھی۔ مُنے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ دروازے کو جھنجھوڑنے لگا۔

اس دوران میں ایک بھاری آواز سنائی دی اور شانی کی ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی۔ یہ چوہدری بشیر کی آواز تھی۔ ''مُنے! یہ کیا کر رہے ہو...... کیا ہو رہا ہے؟''

شانی جلدی سے قریبی جالی کے پاس پہنچی وہاں سے دیوار کے پاس کا منظر دکھائی دیا۔ چوہدری بشیر غصے سے مُنے کو ڈانٹ رہا تھا۔ مُنا سہم سا گیا اور رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ چوہدری بشیر نے اسے کان سے پکڑ کر جھنجھوڑا...... یوں لگا کہ وہ اسے تھپڑ مار دے گا۔ شانی سے رہا نہیں گیا۔ کراہ کر بولی۔ ''میری بات سنیے۔ ذرا [illegible] دروازہ کھولیے۔''

چوہدری بشیر چونک کر جالی کی طرف دیکھنے لگا۔ شانی نے ایک بار پھر دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ چند سیکنڈ، تذبذب میں رہنے کے بعد چوہدری بشیر نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کلف لگی شلوار قمیص اور بے شکن سیاہ واسکٹ میں تھا، لگتا تھا کہ ابھی ابھی کہیں باہر سے آیا ہے

شانی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''کیوں ناراض ہو رہے ہیں اس سے؟'' شانی کو خدشہ تھا کہ کوئی سخت جواب ملے گا مگر غیر متوقع طور پر چوہدری کا لہجہ زیادہ کرخت نہیں تھا۔

''اس کا ٹیچر پڑھانے کے لئے آنے والا ہے اور یہ اِدھر کھسک آیا ہے۔''

''کہیں...... آپ اس بات سے تو ناراض نہیں کہ یہ میری طرف آ رہا تھا۔'' شانی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں۔''

''پھر آپ پانچ چھ روز سے آئے کیوں نہیں؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ذرا باہر کے کاموں میں مصروف تھا۔''

''آپ...... منے اور بھابو کو لے کر آئیں ناں۔''

''میں تو شاید نہیں آ سکوں گا۔ مُنا ٹیچر سے پڑھ کر ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔'' چوہدری بشیر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اتنے میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ موبائل آن کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔

واقعی دو ڈھائی گھنٹے بعد مُنا جالاں کے ساتھ اس کے پاس کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ خوش ہوئی لیکن اس خوشی میں مایوسی کی آمیزش بھی تھی۔ بھابو ساتھ نہیں تھی۔ شانی نے مُنے کو گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائی۔ اس سے بھابو کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ مُنے نے بتایا کہ وہ دوائی کھا کر سوئی ہوئی ہیں۔

آدھ پون گھنٹے بعد ہی جالاں کمرے میں آن دھمکی۔ ''چوہدرانی جی...... مجھے چوہدری صیب نے کہا تھا کہ کاکے کو پندرہ منٹ میں واپس لے آنا۔ اب تو گھنٹہ ہونے والا ہے۔''

''اچھا دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔'' شانی نے ناگواری سے کہا۔

وہ مُنے اور ندیم کے لئے اپنے ہاتھ سے سویٹر بُن رہی تھی۔ ندیم تو ایبٹ آباد میں تھا۔ مُنے کے لئے بنا جانے والا سویٹر شانی نے مُنے کے جسم سے لگا کر دیکھا اور سائز کا اندازہ کیا۔

''پھر کب آؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''کل تمہاری چھٹی ہے۔ ابو کی بھی چھٹی ہو گی۔ کل ضرور آنا۔ ابو اور امی دونوں کو ساتھ لانا۔'' مُنے سے وعدہ لے کر شانی نے اسے جانے دیا۔

اگلے روز وہ بڑی شدت سے انتظار کرتی رہی، سہ پہر سے تھوڑی دیر پہلے اس کی امید بر آئی۔ مُنا اور بھابو آتے دکھائی دیئے۔ ساتھ میں چوہدری بشیر بھی تھا۔

ایک بار پھر محفل جم گئی، چائے کے دو دور ہوئے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ مُنے نے بڑے اشتیاق سے ٹی وی پر کشتیوں کا پروگرام دیکھا، اس سارے دورانیے میں چوہدری قدرے سنجیدہ رہا تاہم چہرے پر ناراضگی کی جھلک نہیں تھی۔ ایک دو بار وہ کسی بات پر مسکرایا بھی۔

اگلی نشست دو دن بعد ہوئی۔ اس نشست میں حالات تقریباً معمول پر آ گئے۔ چوہدری بشیر بھی حسب سابق گفتگو میں حصہ لیتا رہا۔ بھابو کے پژمردہ چہرے پر پھر سے رونق نظر آنے لگی تھی۔ ایک بار پھر ہفتے کی شب کوٹھی کی چھت پر گزارنے کا پروگرام بن گیا۔ چوہدری بشیر نے کہا کہ وہ اس پروگرام کے لئے اپنے ایک دوست ''گیم انسپکٹر'' سے سپیشل طور پر ہرن کا گوشت منگوائے گا۔

گفتگو کے دوران ہی نوعمر ملازمہ زہرا آئی اور اس نے اشارے سے بھابو کو کمرے سے باہر بلایا۔ معلوم ہوا کہ بھابو کے میکے پار کے گاؤں سے بھابو کی دو رشتے دار عورتیں اس سے ملنے کے لئے آئی ہیں۔ بھابو فوراً جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ مُنا اینٹھ گیا کہ وہ ابھی کوٹھی واپس نہیں جائے گا۔

بھابو نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں جاتی ہوں۔ تم ابھی کچھ دیر بعد آ جانا۔''

بھابو چلی گئی۔ مُنا اور چوہدری بشیر شانی کے ساتھ کمرے میں رہ گئے۔

چوہدری بشیر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے اب ہمیں بھی چلنا چاہئے۔''

''کیوں ابو؟'' مُنے نے جرأت کر کے پوچھا۔

''کہیں تمہاری چاچی کو بُرا نہ لگے۔''

شانی اندر سے خوفزدہ ہوئی مگر اس نے اپنے چہرے کے تاثرات بحال رکھے، گہری سانس لے کر بولی۔ ''شروع میں، میرے ذہن میں واقعی بڑے اندیشے تھے بشیر بھائی جان۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ بھی نارپور کے دوسرے چوہدریوں کی طرح ہوں گے، لیکن آپ سے ملنے کے بعد بھابو کی باتوں پر یقین آنے لگا۔ چوہدری ہونے کے باوجود آپ چوہدریوں سے مختلف لگے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرا خوف اور جھجک کم ہوتی رہی ہے اور

یقین کریں اب آپ اپنے سے لگتے ہیں۔شاید اس لئے بھی کہ میں بھابو سے محبت کرتی ہوں اور آپ بھابو کے جیون ساتھی ہیں......"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں تمہارے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولی۔"یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔"

چوہدری بشیر نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور کہنے لگا۔"یعنی صلح ہوگئی اور تم نے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے دماغ میں جو بے سبب کے اندیشے تھے، وہ دور ہوگئے ہیں......" شانی نے اقرار کے انداز میں نگاہیں جھکائے رکھیں، وہ بولا۔"کیا میں ایک بار پھر وہ ناپسندیدہ بات کرسکتا ہوں؟"

"جی......میں سمجھی نہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"تصویروں کی بات۔"

شانی کے سینے میں دھواں سا بھر گیا تاہم اس نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ چوہدری بشیر ایک بار پھر اپنے مطلب کے موضوع پر آ گیا تھا۔شانی اب ایسی پوزیشن میں تھی کہ اقرار کرسکتی تھی اور نہ انکار۔ایک طرف وہ اس صورتِ حال کو غلط سمجھ رہی تھی دوسری طرف اسے چوہدری کی خفگی کا ڈر بھی تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ چوہدری بولا۔"پتا نہیں، تم اتنی سی بات پر یوں گم صم کیوں ہو جاتی ہو۔"

"نن ......نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔"ایسی تو کوئی بات نہیں۔اگر آپ......چاہتے ہیں......تو ... کھینچ لیں۔"

"یہ ہوئی ناں اعتماد اور بھروسے والی بات۔" وہ خوش ہو کر بولا۔"میں کافی عرصے سے تصویریں کھینچ رہا ہوں لیکن اس طرح کسی منظر کو ایکسپوز کرنے کی شدید خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی۔"

وہ ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر مُنے کے بالوں سے کھیلتی رہی، چوہدری بشیر چند لمحے سوچ کر بولا۔"میرا خیال ہے کہ میں ابھی کیمرا لاتا ہوں۔ کپڑوں کا یہ رنگ تم پر جچ بھی بہت رہا ہے۔"

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھ گیا.....اور درمیانی دیوار کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری نے انیکسی کے ڈرائنگ روم میں "فوٹو سیشن" کا سا منظر پیدا کر دیا۔اس نے تین چار لائٹس مختلف جگہوں پر انسٹال کیں اور کیمرے کو سٹینڈ پر لگا لیا۔شانی جیسے اندر سے کانپ رہی تھی۔ چوہدری بشیر نے شانی کو صوفے پر بٹھایا اور مُنے کو اس کی گود

میں دیا، دو تین تصویریں لینے کے بعد اس نے شانی کو ایک صوفے پر نیم دراز کر دیا اور مُنے کو اس کے پہلو میں لٹایا۔ کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔شانی کو صوفے پر نیم دراز کرتے ہوئے اس کا رخ کیمرے کی طرف درست کرتے ہوئے چوہدری کے ہاتھ کئی بار شانی کے جسم سے ٹکرائے۔ ہر بار شانی کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔شانی کے بالوں کو اس کے رخساروں سے ہٹانے کے لئے جب چوہدری بشیر نے بے باکی سے بالوں میں انگلیاں چلائیں تو شانی کے رخسار تمتما گئے۔اس کا دل چاہا مُنے اور چوہدری کو خود سے دور ہٹا کر اٹھ کھڑی ہو اور بغیر کچھ کہے دوسرے کمرے میں چلی جائے، مگر پھر بھابو کا زرد چہرہ اور مُنے کی اشک بار آنکھیں اس کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ وہ دل مسوس کر کیمرے کی آنکھ کے سامنے رہی۔

ایک عورت کی حیثیت سے شانی کی ساری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔ وہ چوہدری کے سانسوں کی بگڑی ہوئی لے اور اس کے چہرے کی غیر معمولی تمتماہٹ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔شرم، بے بسی اور خوف کے سبب اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے، دوسری طرف چوہدری بشیر اس کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔شانی جانتی تھی تصویریں اہم نہیں ہیں......وہ خود اہم ہے۔

ایک گھنٹے بعد چوہدری اور مُنا واپس گئے تو شانی کو لگا جیسے وہ کئی برس بعد ایک تاریک حبس زدہ غار میں رہنے کے بعد باہر نکلی ہے۔

☆======☆======☆

بھابو اور مُنا ایک بار پھر آنے جانے لگے۔اکثر چوہدری بشیر بھی ساتھ ہوتا تھا۔ چوہدری بشیر کی آنکھوں کی بدلی ہوئی کیفیت شانی صاف محسوس کر رہی تھی۔ ہفتے کی شب انیکسی کی چھت پر "باربی کیو" پروگرام بھی ہوا تھا۔ پہلے یہ پروگرام انیکسی کے بجائے کوٹھی کی چھت پر ہونا تھا۔ چوہدری کے پاس کوہ پیمائی میں استعمال ہونے والا ایک شاندار خیمہ موجود تھا۔ یہ خیمہ انہوں نے چھت پر لگایا تھا اور آگ جلا کر ہرن اور دیسی مرغی کے گوشت کے تکے اور کباب وغیرہ بنائے تھے۔ مُنے اور بھابو نے بھی خوب انجوائے کیا تھا۔ رات گئے تک وہ چاروں چھت پر رہے تھے۔ زہرا اور جالاں مختلف کاموں میں معاونت کرتی رہی تھیں۔ پروگرام بنا تھا کہ اب پھر پندرہ دن بعد اس تفریح کو دہرایا جائے گا۔

اگر شانی کا خیال تھا کہ تصویروں والے واقعے کے بعد اس کے لئے جلد ہی کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا، تو یہ غلط نکلا۔تصویروں والے واقعے کے آٹھ دس روز بعد ہی ایک اور

بات ہوگئی۔ چوہدری، مُنا اور بھابو شانی کے ہاں موجود تھے۔ رستم کی بات ہورہی تھی۔ چوہدری بتا رہا تھا کہ اب اس سانپ کا سر کچلے بغیر چارہ نہیں ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ کوٹھی میں ہونے والے واقعے کے بعد نارپور میں بھی اس کے خلاف سخت غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جارہا ہے۔ اس کے ساتھی اور عزیز اپنے ٹھکانوں سے غائب ہیں۔ چوہدری کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ متعلقہ ایس پی نے نارپور کے چوہدریوں کو اجازت دے دی ہے کہ وہ رستم کو دیکھتے ہی گولیوں سے اُڑادیں۔ (ظاہر ہے کہ اگر واقعی کوئی ایسی اجازت دی گئی تھی تو یہ آف دی ریکارڈ تھی) اس گفتگو میں قادرے کا ذکر بھی آیا۔ چوہدری کا کہنا تھا کہ کتے کی موت نے اسے نیم دیوانہ کررکھا ہے۔ وہ ہرایک سے الجھ رہا ہے اور مار پیٹ کررہا ہے۔

جس وقت یہ بات چیت ہورہی تھی، مُنا اور زہرالان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ مُنے کے بوٹ کے تسمے کھل گئے تھے۔ بھابو انہیں باندھنے کے لئے لان کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی چوہدری کے لہجے میں عجیب سی بے باکی آگئی۔ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بھئی! تمہارا وہ پوز ابھی تک میرے دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر تمہارے سر پر بہت سے لال پھول پھینکے جائیں۔ کچھ تمہارے بالوں میں اٹک جائیں، کچھ کندھوں پر پڑے رہیں اور تمہاری تصویر اتاری جائے۔''

''جج......جی۔'' وہ سہم کر بس یہی کہہ سکی۔

''جی سے کیا مطلب؟'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا... مطلب ہے......'' آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ وہ آگے کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی طرف سے ہاں یا نہ میں جواب چاہتا ہو۔ شانی کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔ وہ اقرار کرپارہی تھی اور نہ انکار۔ اس کی مشکل بھابو کی وجہ سے آسان ہوئی۔ وہ مُنے کے تسمے باندھ کر ان دونوں کی طرف لوٹ رہی تھی۔

وہ پاس آکر بولی۔ ''جی ہاں......کیا گل بات ہورہی تھی، جیٹھ اور بھابی میں؟''

''کچھ نہیں۔ میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ اپنی بھابو کی صحت اب تمہیں کیسی لگ رہی ہے؟''

''پھر کیا کہتی ہے یہ؟''

''اس کی فکرمندی کم نہیں ہوسکتی ہے۔ لگتا ہے کہ دن رات سوچتی ہی تمہارے بارے میں ہے۔''

بھابو نے شانی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ہوگا۔ اگر میں اسی طرح تمہارے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھتی رہوں تو بیماری میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

شانی بولی۔ ''بھابو! تم نے کہا تھا، میں تمہیں حضرت صاحب سے ملواؤں گی۔''

''اس بار وہ بڑی جلدی میں آئے تھے، مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی رکے ہوں گے یہاں......اپنے کسی مریض کو دیکھنے انہیں لاڑکانہ جانا تھا۔ بڑی جلدی میں تھے۔ دس بجے جہاز کا ٹائم تھا۔ اگلی بار آئیں گے تو رکیں گے۔''

کچھ دیر بعد بھابو، مُنا اور چوہدری چائے پی کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شانی دیر تک برآمدے میں بیٹھی رہی اور چوہدری بشیر کی کھڑی کی ہوئی نئی مصیبت کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس حوالے سے چوہدری کا رویہ ایک سنجیدہ صنعت کار کے بجائے ایک کھلنڈرے نوجوان کا سا لگ رہا تھا۔ وہ اس کی تصویر کھینچنے کی بات کررہا تھا اور شانی جان چکی تھی کہ یہ تصویر کشی تو محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ چوہدری کے دل و دماغ میں کچھ اور چل رہا ہے۔

اب تک کی صورتِ حال سے شانی نے اندازہ لگایا تھا کہ بھابو کو چوہدری پر بڑا مان ہے۔ وہ اسے دوسرے چوہدریوں سے بالکل مختلف سمجھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ ایک شوہر کی حیثیت سے وہ اس سے پُرخلوص محبت کرتا ہے۔ ایک عورت کے لئے محبت کا یہ احساس ایک اثاثے کی طرح ہوتا ہے اور اس اثاثے کے ہوتے ہوئے وہ اپنے شریکِ حیات کی اور بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کو نظرانداز کردیتی ہے۔ بھابو بھی ایسا ہی کررہی تھی۔ وہ شوہر کی سخت گیری، فضول خرچی اور یارباشی کے ساتھ ساتھ بہت کچھ برداشت کررہی تھی۔ شانی کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ بھابو کو چوہدری کے رویے کے بارے میں کچھ بتاتی۔ وہ تو پہلے ہی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہورہی تھی۔ ہوا کا ہلکے سے ہلکا جھونکا بھی اس کے لئے مضر تھا۔ پھر مُنا تھا۔ جو اس کا عادی ہوتا جارہا تھا۔ اس سے ایک دن کی دُوری بھی برداشت نہیں کرپاتا تھا۔

وہ ایک دوراہے پر کھڑی سوچتی رہی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ چوہدری کا رویہ ابھی مبہم تھا۔ اس غیرواضح رویے کی وجہ سے اسے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا جو بھابو اور مُنے کے لئے شدید رنج کا باعث ہوتا...... جہاں تک تصویریں اُتروانے کا تعلق تھا...... یہ معاملہ بھی اس نے آنے والے کل پر چھوڑ دیا۔ ہوسکتا تھا کہ چوہدری خود ہی سمجھ جاتا اور اس بات پر زیادہ اصرار نہ کرتا۔ دوسری

صورت میں بہ امر مجبوری، وہ مُنے کی موجودگی میں ایک دو تصویریں اُتروا بھی سکتی تھی۔ وہ رات گئے تک کشمکش کا شکار رہی۔ کبھی ایک رخ سے سوچنے لگتی کبھی دوسرے رخ سے۔

☆======☆======☆

اگلے دن شانی دھڑکتے دل کے ساتھ سہ پہر کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ چوہدری کے روپے کے بارے میں بھی قیاس کرتی رہی۔ چوہدری اور بھابو عموماً تین بجے کے قریب آتے تھے۔ کبھی کبھار چار بھی بج جاتے تھے، لیکن اس دن چار بجے اور پانچ چھ بھی بج گئے۔ ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ نہ کوٹھی سے کسی طرح کا پیغام موصول ہوا...... شانی سمجھ گئی کہ معاملہ پھر گڑبڑ ہو گیا ہے۔ کل شانی نے چوہدری کی بات کا کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے مخاطب کی پیشانی پر نمودار ہونے والی معمولی سی سلوٹ کو بھی بھانپ لیتا تھا۔

شانی کے اندر پچھتاوا نمودار ہونے لگا۔ رات تک اس کا دل گواہی دینے لگا کہ اس نے اس چار دیواری کے مالک و آقا کو ایک بار پھر ناراض کر دیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ اس نے بے حد تشویش کے عالم میں سوچا۔ کیا چوہدری بشیر ایک بار پھر بھابو اور مُنے کو اس سے دور کر دے گا؟ کیا بھابو ایک بار پھر بجھ کر رہ جائے گی۔

آنے والے ایک دو دنوں میں اس کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ سفید پتھریلی دیوار، ایک بار پھر آسمان تک بلند ہو گئی تھی۔ بھابو اور مُنا دیوار کی دوسری طرف تھے۔ ان کی کوئی خبر آئی تھی اور نہ شانی کی طرف سے کوئی خبر ان کی طرف گئی تھی۔ تیسرے چوتھے دن کی بات ہے، شانی شاور کے ذریعے پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہی تھی۔ یہ سہ پہر ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ اچانک سنگی دیوار کے پار سے کسی کے دھاڑنے اور نہایت کرخت لہجے میں بولنے کی آوازیں آئیں۔ شانی ایک دم سہم کر برآمدے کی طرف آ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ قادرا ہے۔ وہ درمیانی دروازے کے قریب موجود ہے اور غصے میں پھنکار رہا ہے...... شانی کی نگاہوں میں وہی نقشہ گھوم گیا جب قادرے نے غضب سے مغلوب ہو کر اسے زندہ جلانے کی دھمکی دی تھی۔

کیا وہ ایک بار پھر اس کی طرف آ رہا تھا؟ یہ بے حد خوفناک اندیشہ تھا۔ وہ آواز کو دھیان سے سننے لگی۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ طیش سے پھٹی ہوئی آواز چوہدری قادرے کی نہیں چوہدری بشیر کی ہے۔ وہ اپنے کسی ملازم پر بُری طرح برس رہا ہے۔ کچھ دیر بعد یہ آوازیں دیوار سے دور چلی گئیں۔ بہرحال ان کی شدت اور آہنگ میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی کو بیلٹ یا چپل وغیرہ سے مارا جا رہا ہے۔ مار

کھانے والا منت سماجت کر رہا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد یہ شور معدوم ہو گیا۔

شانی کی ملازمہ زہرا دودھ لے کر کوٹھی کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس کا رنگ زرد محسوس ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ مار پیٹ کا منظر دیکھ کر آئی ہے۔

شانی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے وہاں؟''

جواب دینے سے پہلے زہرا نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ جالاں چھت پر دھلے کپڑے پھیلانے کے لئے گئی تھی۔ زہرا دھیمے لہجے میں بولی۔ ''چوہدری صاحب نے چوکیدار نیابت خان کو مارا ہے۔''

''کیا کیا تھا اس نے؟''

''اُدھر اپنے کوارٹر میں اپنی ووہٹی کے ساتھ سویا ہوا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اندر والے گیٹ پر تھی۔ چوہدری صاحب نے ایک بار پہلے بھی اسے جھاڑ پلائی تھی۔ آج تو انہوں نے اس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دی ہے۔ بڑے غصے میں تھے وہ۔'' زہرا نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں ہے وہ؟''

''کھڑے کھڑے اس کی چھٹی کر دی ہے۔ اس کی بیوی بھی بہت ہاتھ پیر جوڑتی رہی ہے۔ پر انہوں نے ایک نہیں سنی۔ دونوں کا حساب کر دیا ہے۔ اب وہ اپنا سامان باندھ رہے ہیں......''

شانی نے محسوس کیا کہ مار پیٹ کے مناظر نے زہرا کے اعصاب پر گہرا اثر کیا ہے، وہ گم صم تھی اور بھاگ بھاگ کر کام کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ کبھی کبھار جالاں سے الجھ پڑتی تھی مگر آج جالاں کی ہر بات بھی بے چون و چرا مان رہی تھی۔

اگلے روز زہرا ہی کی زبانی شانی کو پتہ چلا کہ بھابو بیمار ہیں۔ زہرا نے بتایا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدری صاحب بڑی چوہدرانی کو گاڑی میں بٹھا کر شہر لے گئے ہیں۔ بڑی چوہدرانی کمزور نظر آ رہی تھیں۔''

شانی کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''واپسی کا کچھ بتایا ہے انہوں نے؟''

''ہاں، کہتے تھے ڈاکٹر کو دکھا کر ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے...... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''اور مُنا کہاں ہے؟''

''وہ گھر میں ہی ہے۔ اسے ماسٹر جی پڑھانے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ ان سے بار

بار جھڑکیاں کھا رہا ہے۔ دراصل وہ بڑی چوہدرانی کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ چوہدری صاحب نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر روکا ہے۔ اس وقت سے مسلسل رو رہا ہے۔"

شانی کا دل تڑپ اٹھا۔ جی چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اسے اپنی گود میں لے لے۔ مگر راستے میں آسمان سے اونچی دیواریں تھیں... اور چوہدری بشیر کا سنسناتا ہوا خوف تھا۔

زہرا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اچھے بھلے تھے چوہدری صاحب... پتا نہیں ایک دم موڈ کو کیا ہو جاتا ہے۔"

شانی نے خود کو قصوروار محسوس کیا۔ اسے لگا کہ زہرا کے سوال کا جواب صرف اس کے پاس ہے۔ چوہدری بشیر کے جس "موڈ" نے اس چار دیواری میں موجود ہر متنفس کو سہما رکھا تھا، اس کی بنیاد کے بارے میں صرف وہ جانتی تھی۔

زہرا کے جانے کے بعد شانی بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ بھابو اور منے پر اپنی ساری محبتیں نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ مگر ستم ظریفی تھی کہ اس کا وجود ان دونوں کے لئے مصیبت بنتا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکل جائے لیکن وہ نکل کیسے سکتی تھی؟ یہاں چاروں طرف پہرے تھے اور اونچی دیواریں تھیں... اور پھر بھابو کو اور منے کو چھوڑ کر جانا اتنا آسان بھی تو نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دونوں اس کی جان کا حصہ ہیں اور پھر بھابو کی بیماری... شانی کا تو دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھابو کو چند لمحوں کے لئے بھی نگاہ سے اوجھل نہ کرے۔

چوہدری بشیر رات دس بجے کے قریب کوٹھی واپس آ گیا۔ بھابو بھی اس کے ساتھ تھی۔ شانی کو اطمینان محسوس ہوا۔ اگلے روز بہانے بہانے سے اس نے زہرا کو دو تین بار کوٹھی بھیجا۔ وہ چاہتی تھی کہ بھابو کی طبیعت کا کچھ پتا چلے مگر ناکامی ہوئی۔ دوسری طرف شکم چشم جالاں نے بھی بھانپ لیا کہ شانی... زہرا کو بے سبب کوٹھی بھیج رہی ہے۔ اس نے شانی سے تو کچھ نہیں کہا مگر زہرا کو بُری طرح لتاڑا۔ گالیاں تک دیں۔ یعنی وہ گرج تو زہرا پر رہی تھی مگر سنا شانی کو رہی تھی۔

شانی کو قرائن سے پتا چل رہا تھا کہ بھابو بدستور بستر پر ہے۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ تین چار دن بعد وہ لاچار ہو گئی۔ اس نے طے شدہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جالاں کے ہاتھ چوہدری بشیر کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔

جالاں نے واپس آ کر نخوت بھرے لہجے میں بتایا۔ "چوہدری جی کہتے ہیں کہ وہ خود نہیں آ سکتے لیکن فون پر بات کریں گے۔"

"کب...؟"

"اس کا پتا نہیں... کچھ پولیس والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔"

شانی تقریباً سارا دن بے قراری سے چوہدری کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ شام کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ شانی نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے چوہدری کی بھاری بوجھل آواز آئی۔ "ہیلو... میں بشیر بول رہا ہوں۔"

"میں... میں آپ ہی کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔" شانی نے اپنی دھڑکنیں سنبھالتے ہوئے کہا۔ چوہدری خاموش رہا۔ وہ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد بولی۔ "میں جانتی ہوں، مجھے جالاں کو آپ کی طرف نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ پر بھابو کی طرف سے میں اتنی فکرمند تھی کہ مجبور ہو گئی۔"

"وہ کل سے کچھ ٹھیک ہے۔ کھانا وغیرہ بھی کھا رہی ہے۔ پریشانی کی بات نہیں۔"

"کیا ہوا تھا انہیں؟"

چوہدری نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ شاید زیادہ سردی کی وجہ سے سانس کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ڈر رہی تھی... اور کہہ رہی تھی کہ میری طبیعت ویسی ہی ہو گئی ہے۔ جیسی دورہ پڑنے سے پہلے ہوتی ہے اس لئے فوری طور پر ہسپتال جانا پڑا۔

کچھ دیر تک بھابو کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شانی نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ کتنے دن سے آئے نہیں؟"

"ویسے ہی..." چوہدری نے جواب دیا۔

"کہیں... میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہہ دی... جو آپ کو بُری لگی ہو۔"

"نہیں... ایسا تو نہیں۔" چوہدری نے کہا۔

شانی نے خود پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ "اس دن آپ نے تصویر اتارنے کی بات کی تھی۔ اگلے دن آپ آئے ہی نہیں۔"

"مجھے لگا تھا کہ مجھے نہیں جانا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"بس ویسے ہی۔" چوہدری کے لہجے میں فتح مندی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

"ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔ آپ وجہ نہیں بتاتے... اور چپ بھی ہو جاتے ہیں۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد چوہدری کا لہجہ شگفتہ ہو گیا۔ "اچھا بھئی نہیں چپ ہوتا۔"

''کب آئیں گے؟''

''چلو کل آئیں گے... چائے پئیں گے اور کہو گی تو تصویر بھی کھینچیں گے۔ اب خوش ہو؟''

شانی ''جی'' کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

رات جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح سے شانی کی طبیعت میں بے چینی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر چوہدری بشیر آیا تو بھابو اس کے ساتھ نہیں ہوگی یعنی وہ اکیلا ہوگا یا مُنا اس کے ساتھ ہوگا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اب چوہدری کا رویہ زیادہ بے باکانہ ہوگا، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کس طرح پیش آئے گا۔ وہ شانی کی دکھتی رگ ڈھونڈ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بھابو کو غم زدہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ مُنے کے آنسو اس سے برداشت ہوتے ہیں۔

سہ پہر کے بعد چوہدری، کوٹھی اور انیکسی کے درمیانی دروازے پر نمودار ہوا۔ یہ دیکھ کر شانی کو ذرا تسلی ہوئی کہ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔ کیمرا مُنے کے گلے سے جھول رہا تھا۔ دیگر چیزیں بیگ میں تھیں اور بیگ چوہدری کے پاس تھا۔ دونوں مسکراتے، باتیں کرتے آ رہے تھے۔

شانی نے مُنے کو اٹھا کر چوما۔ پھر بھابو کا حال احوال پوچھا۔ چوہدری نے بتایا کہ وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہے۔ اب پہلے سے بہتر ہے۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ کمرے میں آ گئے۔ اب اصل کام شروع ہوا۔ چوہدری کیمرا وغیرہ سیٹ کرنے لگا۔ شانی بہت محتاط تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہو اور زود رنج چوہدری پھر بگڑ جائے۔ پہلی دو چار تصویریں چوہدری نے شانی اور مُنے دونوں کی کھینچیں۔ تب اس نے زہرا سے ایک ٹوکری میں بہت سارے چھوٹے سُرخ پھول منگوائے۔ شانی کو ایک خاص زاویے سے کھڑکی کے قریب بٹھایا۔ کیمرے کی آنکھ سے مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد وہ کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ شانی نے جو لباس پہنا ہوا تھا اس میں بھی سُرخ رنگ غالب تھا۔ سُرخ پھول اس میں دب رہے تھے۔

''کوئی اور لباس پہن آؤ'' اس نے شانی سے کہا۔ ''بلکہ میرا خیال ہے وہ فیروزی ساڑھی پہن لو جو مقبول نے تمہیں لا کر دی ہے۔''

چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد شانی اٹھ گئی اور لباس بدل کر آ گئی۔ چوہدری کی جلتی نظریں اس کے سراپا میں دھنستی چلی گئیں۔ شانی کو لگا جیسے وہ اس کے سامنے بے لباس کھڑی ہے۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ شانی کو خاص رخ سے بٹھانے اور اس پر سُرخ

پھول الٹنے کے بعد چوہدری نے دو تین زاویے سے اس کی تصویریں کھینچیں۔ اس کے ہاتھ گاہے بگاہے بے باکی سے اس کے جسم کو چھو رہے تھے۔ شانی کو اپنی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے کا حکم دیتے ہوئے چوہدری کے چہرے پر تمتماہٹ نظر آنے لگی تھی۔

کچھ دیر بعد چوہدری نے مُنے کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ وہ زہرا کے ساتھ مل کر گلدستہ بنائے۔ اب شانی اور چوہدری کمرے میں اکیلے تھے، شانی کے لئے زیادہ مشکل مرحلہ شروع ہوا۔ چوہدری کی بے باکی بڑھ گئی۔ ''تمہاری فگر فوٹو گرافی کے لئے اتنی موزوں ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ اگر تم جیسی لڑکی ماڈلنگ وغیرہ میں ہو تو دھوم مچا دے۔''

شانی بس مسکرا کر رہ گئی۔

''اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہاری ایک تصویر خالص کلاسیکل انداز میں کھینچنا چاہوں گا۔ بڑی شاندار تصویر ہوگی۔''

''کیسے......؟''

''میں بتاتا ہوں......'' وہ تیز سانسوں کے درمیان بولا۔ ''یہاں اس سنگل بیڈ پر لیٹ جاؤ۔''

شانی کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی نیم دراز ہو گئی۔ چوہدری نے اسے بتایا کہ وہ اپنی کہنی نیچے ٹیک کر ہاتھ کنپٹی پر رکھ لے اور رخ کیمرے کی طرف رکھے۔

شانی چوہدری کی ہدایت کے مطابق پہلو کے بل لیٹی تو شرم سے تپ گئی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جسم سرتاپا نمایاں ہو گیا ہے۔ یہ اس سے زیادہ اس کے جسم کی تصویر تھی۔

چوہدری اسے ''فن کے رموز'' بتاتے ہوئے بولا۔ ''کھڑکی تمہارے عقب میں ہے۔ تصویر میں آنے والی ساری روشنی پیچھے سے آ رہی ہے۔ تمہارے خدوخال نمایاں نہیں ہوں گے۔ یہ ہیولے کی سی تصویر ہوگی۔ بائیں پہلو کی اوپر والی لائن نمایاں ہوگی۔ بایاں رخسار نظر آئے گا۔ بائیں کان اور اس کے جھمکے پر روشنی پڑے گی۔ بلکہ اگر تمہیں کوئی تصویر میں پہچاننا چاہے تو شاید آسانی سے پہچان بھی نہ سکے...... زبردست کلاسیکل پوز ہے۔''

ایکسپوز کرنے سے پہلے شانی کے پوز کو مزید درست کرنے کے لئے وہ اس پر جھک آیا۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ہاتھوں کی حرکات میں عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔ ساڑھی کا پلو شانی کے سینے پر تھا۔ اس نے بڑی بے باکی سے یہ پلو نیچے کر کے بلاؤز کے گریبان کو نمایاں کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ شانی کی کمر پر آ گئے۔ وہ کمر کے خم کو درست کر رہا تھا، شانی کے لئے اب مزید برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

وہ چند سیکنڈ تک یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پہلے لگا کہ وہ کوئی تیز تلخ بات کرے گا...... پھر ایک دم وہ ہنس دیا۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگا۔'' وہ بولا۔

شانی خاموش رہی مگر آنسو گرنے کی رفتار بڑھ گئی۔

اس نے لائٹس آف کر کے کمرے کی ٹیوب لائٹ جلا دی۔ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ ''بھئی رونے کی بات نہیں۔ اگر تمہیں ٹھیک نہیں لگ رہا تھا تو مجھے روک دیتیں۔ چلو اب آنکھیں پونچھ لو۔ ابھی مُنا آ جائے گا تو کیا سمجھے گا۔''

شانی جلدی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ اس نے لباس بدلا۔ سُرخ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ آنسو اب بھی امڈ رہے تھے، وہ کچھ دیر مزید واش روم میں رکنا چاہتی تھی مگر دوسری طرف چوہدری کی خفگی کا اندیشہ بھی تھا۔ وہ باہر نکلی تو چوہدری اور مُنا سائیڈ ٹیبل پر گلدستہ درست کر رہے تھے۔ اس گلدستے کے ساتھ شانی اور مُنے کی ایک اور تصویر اتاری گئی۔ شانی کے لئے اطمینان کی بات یہ تھی کہ چوہدری کا موڈ درست ہی تھا۔ کچھ دیر رکنے کے بعد چوہدری اور مُنا واپس چلے گئے۔

☆======☆======☆

حالات عجیب رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ شانی خود کو ایک شکنجے میں محسوس کر رہی تھی۔ بھابو کی بیماری نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف چوہدری بشیر تھا اور اس کی پیش قدمی کرتی ہوئی نظریں تھیں۔ روایتی چوہدریوں کی طرح چوہدری بشیر نے اس پر رائفل نہیں تانی تھی...... اسے باندھ کر کوڑے نہیں مارے تھے..... لیکن پھر بھی وہ اذیت محسوس کر رہی تھی۔ یہ تشدد کی انوکھی قسم تھی۔ یہ تشدد نظر نہیں آتا تھا مگر بہیمانہ تھا۔

ایک دن شانی نے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر دیکھی۔ یہ رستم کے حوالے سے تھی۔ رستم کے ایک اشتہاری دوست کا ذکر بھی خبر میں موجود تھا۔ اس خبر کے متن سے پتا چلتا تھا کہ پولیس کی کئی پارٹیاں رستم اور اس کے دو قریبی ساتھیوں کی تلاش میں مصروف ہیں، ایک آزاد ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے بھی رستم کو ڈھونڈا جا رہا تھا، لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ رستم خطرہ محسوس کر کے زیر زمین چلا گیا ہے۔ خبر کا مجموعی تاثر یہی تھا کہ تلاش عارضی طور پر ختم کی جا رہی ہے یا اس کی سرگرمی ماند پڑ گئی ہے۔

رستم سے شانی کی جو آخری بات ہوئی تھی، اس میں رستم نے شانی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ

کچھ عرصے کے لئے زوپوش ہو جائے گا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے وعدے پر عمل کر رہا ہے اور اس نے اپنی نقل و حرکت ختم کر دی ہے۔ غالباً وہ زوار کے گھر میں ہی تھا.... اور شانی کے اگلے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ شانی نے اسے کسی طرح کا ''ٹائم فریم'' نہیں دیا تھا کہ وہ کب فون کرے گی..... صرف اتنا کہا تھا کہ کرے گی۔ اپنی آخری گفتگو میں شانی نے دانستہ یا نادانستہ رستم کے لئے آس کی ایک کرن روشن کی تھی۔ اب یقیناً وہ اس کرن کی روشنی میں بیٹھا تھا اور اس کی راہ دیکھ رہا تھا...... لیکن یہاں حالات کسی اور رخ پر چلنا شروع ہو گئے تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کیسے عہدہ برآ ہو۔

بھابو سے اس کی ملاقات ہوئے پندرہ بیس روز ہو چلے تھے۔ پچھلی ملاقات میں شانی نے چوہدری سے کہا تھا کہ وہ بھابو کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اب اس بات کو بھی تین چار روز گزر چکے تھے۔ اس روز شام کے فوراً بعد جالاں نے اسے بتایا کہ بھابو اسے بلا رہی ہے۔

''کیا چوہدری صاحب نے اجازت دے دی ہے؟''

''اجاجت دے دی ہے چوہدرانی! اسی لئے تو آپ کو لینے آئی ہوں۔''

شانی کے دل میں اور طرح کا اندیشہ جاگ گیا۔ ''بھابو کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے؟''

''جیادہ خراب تو نہیں...... پر ٹھیک بھی نہیں۔'' جالاں نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد جالاں کے ساتھ شانی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ انیکسی میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سنگِ مرمر کی سفید دیوار کی دوسری جانب جا رہی تھی۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ شانی درمیانی دروازے میں سے گزر کر دوسری طرف آ گئی۔ وسیع لان میں جامن، گوندلی اور سفیدے کے پیڑ جھوم رہے تھے۔ ایک برآمدے میں سے گزر کر وہ اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ یہاں پہنچتے ہی قدرے حرارت کا احساس ہوا۔ کوٹھی کا اندرونی حصہ شاندار تھا۔ ساگوان کے بلند محرابی دروازے، دبیز قالین، بھاری پردے، فانوس اور وہ ساری جدید آرائش نظر آ رہی تھی جو پُرشکوہ عمارتوں کا خاصہ ہوتی ہے، کمروں کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے اکا دکا ملازمائیں بھی دکھائی دیں تب وہ دونوں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ یہاں مُنا صوفے پر بیٹھا تھا اور ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا۔ اس نے آواز بند کر رکھی تھی تاکہ بیمار ماں ڈسٹرب نہ ہو۔

بھابو قریب ہی ایک آرام دہ بیڈ پر دراز تھی۔ اس کے سینے تک لحاف کھچا ہوا تھا اور وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر کچھ حکیمی اور ایلوپیتھک دوائیں

رکھی تھیں۔ ایک عجیب چیز بھی شانی کو دکھائی دی، یہ ایک پنجرہ تھا جو بستر سے تھوڑے فاصلے پر ایک تپائی پر رکھا ہوا تھا، مستطیل شکل کے بڑے پنجرے میں دو طوطے بند تھے۔ وہ اپنی چونکا دینے والی گول آنکھوں کے ساتھ جیسے شانی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ پنجرے کے درمیان ایک رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے دونوں طوطے علیحدہ علیحدہ خانے میں دکھائی دیتے تھے۔

شانی ان پرندوں کو نظر انداز کرتی ہوئی بھابو کی طرف بڑھی۔ بھابو نے اٹھنے کی کوشش کی مگر شانی نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ وہ اس کے اوپر ہی جھک کر اس سے بغل گیر ہوگئی۔ پھر اس کا سر اور ماتھا چوما۔ شانی کے ساتھ ساتھ بھابو کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی نمی آگئی۔ شانی نے بھابو کا حال احوال پوچھا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگی...... منا ٹی وی چھوڑ چھاڑ کر شانی کی گود میں آبیٹھا تھا۔ شانی کو اپنے ہاں دیکھ کر وہ بہت حیران بھی ہو رہا تھا۔

"تمہارے ابو کہاں ہیں؟"

"وہ کسی کام سے گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔" منے کے بجائے بھابو نے جواب دیا۔

"کہیں دور گئے ہیں؟"

"وہی ملازم ہے ناں شادا جس کی ٹانگیں توڑ گیا ہے وہ بدمعاش۔"

"ہاں...... ہاں۔"

"اس کا آپریشن ہے کل بڑے ہسپتال میں۔ اسے پیسے دینے گئے ہوں گے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ کسی بندے کے ہاتھ بھیج دیں، کہہ رہے تھے، نہیں میں خود جاؤں گا۔ اس کا حوصلہ بڑھے گا۔ وفادار ملازموں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" شانی نے ہنکارا بھرا۔

"ان میں اور ان کے چاچے بابے کے پتروں میں زمین آسمان کا فرق ہے شانی۔ بے شک اوپر سے یہ بھی سخت ہیں پر اندر سے سخت نہیں ہیں۔ نارپور کی برادری انہیں اسی لئے چنگا نہیں سمجھتی کہ یہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ان جیسی باتیں نہیں کرتے۔" شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھابو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ان کا دل بالکل اور طرح کا ہے شانی۔ میری بیماری کو انہوں نے اپنا روگ بنایا ہوا ہے۔ کارخانے سے ٹیلی فون کر کے پوچھتے ہیں کہ دوائی کھائی ہے یا نہیں۔ نارپور کا کوئی اور چوہدری ہوتا ناں تو میرے جیسی روگی کو پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ دو چار ہزار پلے سے باندھ کر ماں پیو کے گھر بھیج دیتا اور نیا ویاہ رچانے کے چکر میں پڑ جاتا۔" بھابو کے لہجے میں مان تھا اور ایک چھپی ہوئی خوشی تھی، وہ اپنے شوہر کی وفاداری کا

ذکر کر رہی تھی۔

شانی اسے کیسے بتاتی کہ اس کا شوہر بھی نارپور کے چوہدریوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ فرق شاید صرف یہ ہے کہ یہ پڑھ لکھ کر کچھ شائستہ ہوگیا ہے اور اس کا طریقۂ واردات بدل گیا ہے۔ اس کے بھائی بند جو کام زہریلی چھری سے کرتے ہیں، یہ میٹھی چھری سے کر رہا ہے...... اور شاید اس سے پہلے بھی کرتا رہا ہے۔

شانی بھابو کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور اس کی باتیں سنتی رہی۔ بھابو کے منع کرنے کے باوجود وہ کبھی اس کا سر اور کبھی پاؤں دبانے لگتی تھی۔ منا بھی اس کی نقل کر رہا تھا۔ شانی نے پنجرے میں بند پرندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے بھابو؟"

"یہ عام پنچھی نہیں ہیں شانی۔ حضرت صاحب نے بہت دور سے منگوائے ہیں ان کی قیمت بھی کافی ہے۔"

"ان کا کیا کرنا ہے بھابو؟"

"حضرت صاحب نے چار پانچ دن تک آنا ہے، پھر ہی پتا چلے گا کہ وہ ان کا کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ یہ پنجرہ میرے بستر کے پاس ہی رہنا چاہئے۔ اب پتا نہیں شانی، تُو میری بات مانے گی یا نہیں..... پر سچ کہتی ہوں جب سے یہ پنجرہ یہاں آیا ہے، مجھ کو اپنی طبیعت پہلے سے چنگی لگ رہی ہے۔"

شانی نے دھیان سے ان بڑے سائز کے طوطوں کو دیکھا۔ یہ سفید رنگ کے کاک ٹیل تھے۔ سکول کے زمانے میں شانی اور عادل نے بھی حویلی میں ایسے طوطے پالے تھے۔ یہ طوطے ٹھنڈے موسم میں انڈے دیتے ہیں۔ ان کے چہروں کے قریب رنگ دار دھبے بڑے بھلے لگتے ہیں۔

بھابو بستر پر لیٹی لیٹی بڑی امید بھری نظروں سے ان پرندوں کی طرف دیکھتی رہی۔

شانی اس موقع پر کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر اس نے خود کو روک لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اعتقاد کو توڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جب وہ ایک بار بن جاتا ہے تو اس کی جڑیں بہت گہرائی تک چلی جاتی ہیں۔ اس نے بڑی حکمت سے بتدریج گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ اسی دوران میں چوہدری بشیر بھی گھر واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ لاہور میں ایک سینئر آرتھوپیڈک سرجن شادے کا آپریشن کر رہا ہے۔

چوہدری کے آنے تک منا شانی کی گود میں سو چکا تھا، شانی اسے بڑے آرام سے کمرے میں لٹا آئی، بھابو کی دوا کا وقت ہوگیا تھا۔ شانی نے پہلے بھابو کو ہلکا سا کھانا کھلایا پھر

دوا دی۔ اس کے بعد وہ بھابو کے پاس ہی بیٹھی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔ بھابو کی پلکیں آہستہ آہستہ بوجھل ہوتی جارہی تھیں ۔ باتیں کرتے کرتے شانی نے رک کر دیکھا تو وہ سوچکی تھی۔

شانی آہستہ سے اٹھ گئی۔ وہ جانے کی تیاری کررہی تھی، جب مُنا نیند میں ڈگمگاتا ہوا اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ ''اوئے! اُلو باٹے، تم ابھی تک سوئے نہیں؟'' شانی نے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ سوؤں گا تاتی۔'' وہ ٹھنک کر بولا۔

شانی سٹپٹا گئی مگر اب جانا بھی مشکل تھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ مُنے کے ساتھ ہی لیٹ گئی اور اسے تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ چوہدری بشیر ساتھ والے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کی موجودگی شانی کو کسی نکیلی شے کی طرح چبھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس چھت تلے سے نکل جانا چاہتی تھی مگر مُنا تھا کہ سونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شانی نے ایک دو بار ہولے سے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ پھر جاگ گیا اور ٹھنکنے لگا۔

خدا خدا کرکے وہ سویا مگر چوہدری بشیر ابھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کو اندیشہ تھا کہ ابھی یہ کچی نیند میں ہے پھر جاگ جائے گا اور تنگ کرے گا۔ اس نے شانی سے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر ادھر ہی بیٹھے۔

شانی ''ٹی وی لاؤنج نما کمرے'' میں بیٹھ گئی۔ چار پانچ فٹ کے فاصلے پر چوہدری بشیر صوفے پر موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریموٹ اور دوسرے میں امپورٹڈ سگریٹ تھا۔ آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور تیز ہوا کھڑکیوں سے ٹکراتی محسوس ہوتی تھی......

''مجھے لگتا ہے کہ تم آہستہ آہستہ اس گھر کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بنتی جارہی ہو۔''

چوہدری نے اچانک کہا۔ ''مقبول ہر وقت تمہاری راہ دیکھتی ہے، مُنا ایک دن بھی تمہارے بغیر نہیں گزار سکتا۔ ندیم ہاسٹل میں ہے۔ ورنہ وہ بھی لٹو کی طرح ہر وقت تمہارے اردگرد گھومتا نظر آتا۔''

''بچے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

''کیا صرف بچے ہی کرتے ہیں؟'' چوہدری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں ... سمجھی نہیں۔''

''میرا مطلب ہے......مقبول بھی تو بہت پیار کرتی ہے تم سے۔'' چوہدری نے بات بدلی۔

''جی ہاں۔'' شانی نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''شاید کچھ لوگ پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ انہیں ہر کوئی پیار کرے۔''

''جی؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''مجھے لگتا ہے شانی کہ تمہیں جو بھی دیکھتا ہوگا، پیار ہی کرتا ہوگا۔ تم میں کوئی ایسی بات ہے۔ کوئی ایسی خاص بات، جو دیکھنے والے کا دل تمہاری طرف کھینچتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں منہ پر تعریف کرکے تمہیں بنا رہا ہوں۔ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میرے دل میں ہے۔''

''میرا......میرا خیال ہے، مجھے اب جانا چاہئے۔'' شانی نے وال کلاک دیکھتے ہوئے کہا پھر ایک دم محسوس کرکے کہ چوہدری کی پیشانی پر شکن آئی ہے، اس نے فقرے میں اضافہ کیا۔ ''لیکن مُنا ابھی شاید ٹھیک سے سویا نہیں۔''

چوہدری کی گرم نگاہیں شانی کے سراپا پر تھیں۔ آتش دان میں لہراتی سُرخی اس کے صحت مند چہرے پر منعکس ہورہی تھی۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھچے اور اس نے آگے جھکتے ہوئے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ شانی کا ہاتھ لرزا، مگر پیچھے نہیں ہٹ سکا۔

آتش دان میں شعلے پھنکار رہے تھے۔ چوہدری نے مدھم ہموار آواز میں کہا۔ ''کسی وقت لگتا ہے، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اتنی زیادہ ضرورت کہ میں خود حیران ہوتا ہوں۔ میں تم سے کچھ زیادہ نہیں چاہتا۔ بس چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح میرے پاس بیٹھو۔ باتیں کرو۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں رہے۔ ہمارے سامنے چائے کا کپ ہو......بس میں کچھ زیادہ نہیں چاہتا۔'' شانی کا دل پھڑک رہا تھا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی۔ چوہدری جو کچھ آج کہہ رہا ہے، وہ کل اس کی زبان پر نہیں ہوگا۔ آج وہ صرف پاس بیٹھنے اور ہاتھ تھامنے کی بات کررہا ہے کل وہ کچھ اور کہہ رہا ہوگا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ کہہ دیتی......اگر میں تمہاری بات پر بھروسا کروں تو میں دنیا کی سب سے احمق عورت ہوں۔

وہ کیسے کہہ سکتی تھی۔ وہ تو چوہدری کے بھاری بھرکم ہاتھ تلے اپنے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ ہاتھ جیسے ایک جسم تھا اور ایک دوسرے جسم کی گرفت میں تھا۔ اپنے اندر ہی اندر کسمسا رہا تھا، سٹپٹا رہا تھا۔ گرفت سے نکل جانا چاہتا تھا مگر بے بس تھا۔ شانی کی مشکل کو بھابو کی کھانسی نے آسان کیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چوہدری کے بھاری ہاتھ تلے سے نکال لیا۔ چوہدری بھی ذرا چونک کر ادھ کھلے دروازے میں سے بھابو کے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

بھابو غنودگی میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ شانی نے موقع غنیمت جانا۔ ''میں چلتی ہوں۔''

اس نے کہا۔

چوہدری کی خاموشی نیم رضامندی جیسی تھی۔شانی خوابیدہ منے پر ایک نگاہ ڈالتی دبے پاؤں باہر نکل آئی۔

☆======☆======☆

صبح کا وقت تھا۔شانی نے پتھریلی جالیوں کی دوسری طرف کوٹھی کے سرسبز لان میں جھانکا۔آج اسے کچھ ہلچل سی نظر آ رہی تھی۔نوکر چاکر اندر باہر آجا رہے تھے،سویرے ہی سویرے لان اور برآمدے کی صفائی بھی ہوگئی تھی۔شانی نے چوہدری بشیر اور قادرے کو دیکھا۔چوہدری بشیر موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔چوہدری قادرا ایک چوکس گن مین سے بات چیت میں مصروف تھا۔

جالاں نے شانی کو جالی میں جھانکتے دیکھا تو چہکتے لہجے میں بولی۔''کوئی خاص بات ہے چوہدرانی؟''

شانی چونک کر پیچھے ہٹ گئی،پھر سنبھل کر بولی۔''آج صبح سویرے ہی بڑی بھاگ دوڑ ہو رہی ہے کوٹھی میں۔''

''پروہنے (مہمان) آرہے ہیں ناں۔''

''کون پروہنے؟''

''وہ جو بڑی چوہدرانی کا علاج کر رہے ہیں......حضرت صاحب۔''

''وہ اکیلے ہیں یا کوئی اور بھی ہے ان کے ساتھ؟''

''ان کی بیبیاں ان کے ساتھ ہوتی ہیں جی......''

''تمہارا مطلب ہے بیویاں؟''

''ہاں جی...تین بیویاں ہیں ان کی۔دو تو ہر وقت ساتھ رہتی ہیں۔بڑی پڑھی لکھی عورتیں ہیں،حالانکہ حضرت صاحب خود سادہ سے ہیں۔''

''کب آنا ہے انہوں نے؟''شانی نے بوگن بیل کے پتوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''آج ہی کسی وقت آئیں گے۔سنا ہے کہ ایک دن رہیں گے،بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دن سے جیادہ لگ جائے۔اگر آپ نے ملنا ہے تو چوہدری جی سے گل کریں۔ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی ملاقات کرا دیں۔ہر تکلیف بیماری کا علاج ہے حضرت صاحب کے پاس یہ جو آپ ہر وقت اکھڑی اکھڑی رہتی ہیں،ہوسکتا ہے کہ نہ رہیں۔''جالاں کے لہجے

میں حسبِ معمول کاٹ تھی۔

شانی اس کی بات کو نظرانداز کرتی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی۔اب تک اس نے ان حضرت صاحب کا کافی تذکرہ سنا تھا۔اب وہ اس شخص کو دیکھنا چاہتی تھی۔

حضرت صاحب کی آمد گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔شانی نے چھت پر سے دیکھا۔ایک پجارو جیپ کے ساتھ دو گاڑیاں اور بھی تھیں۔سب سے پچھلی گاڑی میں دو مسلح محافظ بھی دکھائی دے رہے تھے۔اندرونی گیٹ سے گزرنے کے بعد یہ گاڑیاں کوٹھی کے پورچ کی طرف اوجھل ہوگئیں۔مہمانوں کے پہنچتے ہی ملازم بھاگ دوڑ کرتے نظر آئے۔شانی نے یہ بھی دیکھا کہ مرد ملازم فوراً کوٹھی کے رہائشی حصے سے نکل گئے ہیں۔

چوہدری کا موڈ آج کل مہربانی کا تھا۔شانی نے جالاں کے ہاتھ چوہدری کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی حضرت صاحب کو دیکھنا چاہتی ہے۔اسے ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ اس کی درخواست کا کیا جواب آئے گا۔درحقیقت چوہدری یہ چاہتا تھا کہ شانی کا کوٹھی میں آنا کم سے کم ہو۔اب تک کے قیام میں وہ صرف ایک ہی بار کوٹھی گئی تھی اور وہ بھی بھابو کی مسلسل خواہش پر تھوڑی دیر کے لئے۔اس دوران میں کسی ملازم یا ملازمہ کو پتا نہیں تھا کہ کون آیا اور کون گیا ہے۔درحقیقت چوہدری نہیں چاہتا تھا کہ جالاں،زہرا اور قادرے کے سوا کسی چوتھے شخص کو یہ معلوم ہو کہ شانی کون اور کیا ہے۔کچھ دن پہلے''باربی کیو'' کے پروگرام میں ہونے والی تبدیلی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔چوہدری نے پہلے یہ پروگرام کوٹھی کی چھت پر رکھا تھا،مگر پھر اسے انیکسی کی چھت پر منتقل کر دیا تھا۔

شانی کی درخواست کا جواب سہ پہر چار بجے کے قریب آیا۔جالاں نے بتایا کہ شام کے بعد وہ کسی وقت حضرت صاحب کو دیکھ سکے گی۔

شانی بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔اس کے ذہن میں حضرت صاحب کے مختلف ہیولے ابھرتے رہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی ابھرتا رہا کہ حضرت صاحب کس حد تک قابلِ بھروسا یا ناقابلِ بھروسہ ہیں،روحانیت سے شانی کو انکار نہیں تھا۔وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے قرب وجوار میں بہت کچھ ایسا ہے،جو ہماری عقل و سمجھ سے باہر ہے۔(نگینہ والا واقعہ اس کی ایک ناقابلِ تردید و ناقابلِ فراموش مثال تھا) لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے گرد و پیش میں بہت سے ایسے''ابن الوقت'' ہیں جو روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر عوام الناس سے ان کی سادہ لوحی کا خراج وصول کرتے ہیں۔

نو بجے کے قریب جالاں آئی اور اس نے بتایا کہ چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔شانی

پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھی اور شال لے کر جالاں کے ساتھ چل دی۔ درمیانی دروازے سے گزر کر وہ کوٹھی کے لان میں پہنچے اور پھر اندرونی حصے میں آ گئے۔ جالاں یہاں سے واپس چلی گئی۔ ساگوان کے محرابی دروازے کے سامنے ایک اجنبی عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی۔ شانی کو دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرائی اور پنجابی لہجے میں بولی۔ ''جوتی اتار دو۔''

شانی نے چپل اتار دی۔ ''کوئی چوڑی، کنگن وغیرہ تو نہیں پہنا ہوا تم نے؟'' عورت نے پوچھا۔ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ چاہے بھی تو ایسی چیزیں نہیں پہن سکتی۔ عورت نے اپنے ہاتھ سے شانی کے سر پر شال درست کی۔ پھر آہستہ سے ساگوان کا دروازہ کھولا اور اسے اندر بھیج دیا۔ ''اندر جاتے ہی سلام کہنا ہے۔'' اس نے شانی کے کان میں سرگوشی کی۔

شانی کو سامنے ہی بھابو کا کمرہ نظر آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ جو سب سے پہلی چیز شانی کے حواس سے ٹکرائی۔ وہ ایک تیز خوشبو تھی۔ بڑی انوکھی اور اجنبی خوشبو تھی۔ کمرے کا منظر ہی چونکا دینے والا تھا۔ شانی کو دو لڑکیاں نظر آئیں، انہوں نے ٹخنوں تک جاتے ہوئے کھلے لبادے پہن رکھے تھے، وہ پردے میں تھیں، صرف ان کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ایک تیس پینتیس سالہ شخص بھی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ غالباً باتھ روم سے ہاتھ دھو کر نکلا تھا اور اب تولیے سے صاف کر رہا تھا۔ شانی کو حضرت صاحب کہیں نظر نہیں آئے۔ پھر بھی اس نے سلام کیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ایک گوشے میں چوہدری بشیر بھی ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑا تھا۔ بھابو اجلے بستر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مخمل کا سُرخ لحاف اس کی ٹھوڑی تک کھچا ہوا تھا۔ گرم چادر نے اس کے سر کو ڈھانپ رکھا تھا وہ پہلے سے زیادہ کمزور دکھائی دیتی تھی۔ کمرے میں اور کمرے سے باہر ایک گھمبیر سناٹے کا راج تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی بھی گرے گی تو آواز آئے گی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ حضرت صاحب باتھ روم میں ہوں گے۔

چند لمحے بعد جب چوہدری نے پتلون قمیص والے شخص کو حضرت صاحب کہہ کر مخاطب کیا تو شانی کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ چوہدری نے کہا تھا۔ ''حضرت صاحب! بڑی لائٹ جلا دوں؟'' پتلون قمیص والے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ابھی تک شانی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

''تو یہ ہیں حضرت صاحب!'' شانی نے بے حد تحیر کے عالم میں سوچا۔

وہ بالکل جواں سال تھا۔ بال مانگ نکال کر بنائے گئے تھے۔ داڑھی برائے نام ہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چند دن کی شیو بڑھی ہوئی ہے۔ سر کی طرح داڑھی کے بال بھی سیاہ تھے۔ اس نے اپنا سُرخ دھاریوں والا سویٹر اتار کر ایک طرف کرسی پر رکھا ہوا تھا۔

بھابو نے اپنی نیم وا سُرخ آنکھوں سے شانی کی طرف دیکھا۔ اس نے شانی کو پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر ظاہر نہیں ہوا۔ غالباً وہ کسی دوا کے زیرِ اثر تھی۔ شانی نے ایک اور بات نوٹ کی، مستطیل شکل کے بڑے پنجرے کی درمیانی رکاوٹ ہٹا دی گئی تھی۔ اب یہ ایک ہی پنجرہ نظر آ رہا تھا۔ دونوں طوطے اکٹھے ہی پنجرے میں گھوم پھر رہے تھے۔ ایک چیز پر شانی نے پہلے غور نہیں کیا تھا لیکن آج یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ان میں سے ایک نر اور ایک مادہ تھی۔ جو دوسری حیرت انگیز چیز شانی کو نظر آئی تھی، وہ یہ تھی کہ دونوں نقاب پوش لڑکیوں میں سے ایک اس پنجرے کے پاس موجود تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سٹیل کی ایک تیز نوک دار سلاخ نظر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مسلسل پنجرے پر مرکوز تھیں۔

پتلون قمیص والا شخص ہاتھ وغیرہ پونچھ کر بھابو کے سرہانے کی طرف آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ چوہدری نے کہا۔ ''حضرت صاحب......! میں اب جا سکتا ہوں؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' ٹھہری پاٹ دار آواز میں کہا گیا۔

چوہدری نے شانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ مقبول کی عزیزہ یہیں موجود ہے۔ اگر کوئی کام ہو تو اسے بتا دیجئے گا۔''

حضرت صاحب نے شانی کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلایا اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں بند کر کے جیسے مراقبے میں چلے گئے۔

دوسروں کی طرح چوہدری بھی ننگے پاؤں تھا۔ وہ الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔ شانی ایک گوشے میں ساکت کھڑی خود کو بے چین محسوس کرنے لگی۔ تیز خوشبو اس کی حسِ شامہ پر ایک بوجھ کی طرح تھی۔

چوہدری کے باہر جانے اور دروازے بند ہونے کے بعد دونوں لڑکیوں نے اپنے نقاب ہٹا دیئے۔ دونوں ہی قبول صورت تھیں بلکہ جو عمر میں چھوٹی نظر آتی تھی اسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ ہوگی۔ دوسری اٹھائیس سے اوپر کی دکھائی دیتی تھی۔ اس کا جسم بھی پہلی کے مقابلے میں بھرا بھرا تھا۔ دونوں حضرت صاحب کے سامنے مؤدب نظر آتی تھیں۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ حضرت صاحب کی بیویاں ہیں۔

ایک اور چیز شانی دیکھ رہی تھی اور وہ یہ کہ دونوں خواتین کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ وہ بھی ننگے پاؤں تھیں۔ صرف حضرت صاحب کے پاؤں میں سلیپر دکھائی دیتے تھے۔

ان میں سے جو چھوٹی تھی، وہ بھابو کے بالکل قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا دستانہ پوش ہاتھ لحاف میں داخل کیا۔ لحاف تھوڑا سا سرکا اور تب شانی کو اندازہ ہوا کہ لحاف کے نیچے بھابو کا بالائی جسم بے لباس ہے۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ لحاف کے نیچے، بھابو کے دل کے مقام پر رکھ دیا اور اسے آہستہ آہستہ گردش دینے لگی۔ لڑکی کا دوسرا ہاتھ حضرت صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام لیا اور گردن جھکا کر گہرے مراقبے میں جاتے دکھائی دیئے۔ یعنی حضرت صاحب نے اپنی بیوی کے ہاتھ کے ذریعے بھابو کے دل کے مقام سے تعلق جوڑ لیا تھا اور اب کسی نامعلوم عمل میں مصروف تھا۔

دو تین منٹ تک اسی طرح مستغرق رہنے کے بعد اس نے اچانک لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ لڑکی شانی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ شخص بھی شانی کی جانب دیکھ رہا تھا مگر اس کی نظر شانی کے چہرے یا جسم پر نہیں تھی۔ وہ شانی کے پاؤں کے قریب فرش کی طرف متوجہ تھا۔

’’تمہاری سوچ وہی ہے، جو عام طور پر تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کی ہوتی ہے۔‘‘ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولا اور شانی کانپ گئی۔

’’آ...... آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟‘‘

’’ہاں...... تم ہی سے کہہ رہا ہوں۔‘‘ وہ اس کو دیکھے بغیر بولا۔ ’’جو کچھ یہاں ہو رہا ہے تم اسے بے کار کا تماشا سمجھ رہی ہو۔ مگر یہ بے کار کا تماشا نہیں ہے، جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے، وہ بے کار نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر وہی کارآمد ہوتا ہے۔ جہاں کالجوں، یونیورسٹیوں کا علم ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے ایک اور علم شروع ہوتا ہے۔ اس علم کو سمجھنے کے لئے خاص آنکھوں اور خاص دماغ کی ضرورت ہے۔‘‘

’’معافی چاہتی ہوں۔ آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔‘‘

’’سمجھ میں آ رہی ہے۔‘‘ وہ بے حد ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ’’لیکن وہ نتیجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا جو تمہاری غلط سوچ کی وجہ سے نکل رہا ہے۔ اس کمرے میں ہم پانچ افراد موجود ہیں۔ مگر تمہاری سوچ باقی چاروں سے مختلف ہے۔ جب کسی محفل میں کوئی ایک سوچ باقیوں سے مختلف ہوتی ہے تو وہ سب پر اثر ڈالتی ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں چاہوں گا کہ تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔‘‘ اس کی آواز اتنی پاٹ دار تھی کہ لگتا تھا کہ اس کی آواز ہی نہیں ہے۔

شانی دم بخود کھڑی رہی۔ پھر پتا نہیں کیسے اس کے اندر ایک دم جرأت پیدا ہوئی شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بھابو سے محبت کرتی تھی اور بھابو اس کمرے میں ان لوگوں کے درمیان تنہا پڑی تھی۔

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ’’کیا میں آپ سے اتنا پوچھ سکتی ہوں کہ بھابو کی تکلیف کیا ہے؟‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’بھابو کی تکلیف روحانی ہے یا جسمانی؟‘‘

’’اس سوال سے تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟‘‘

’’آپ جس قسم کا علاج کر رہے ہیں وہ کسی روحانی تکلیف کا تو ہو سکتا ہے، جسمانی کا نہیں اور یہ بات ثابت ہے کہ بھابو کو دل کا عارضہ ہے۔‘‘

حضرت صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ شانی کو تفصیل سے جواب دینا چاہتا ہے مگر پھر جیسے یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ شانی اس لائق نہیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے پاس بیٹھی لڑکی کو مخاطب کیا اور بولا۔ ’’صدف! تم اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ اور بات کرو۔‘‘

جس لڑکی کو صدف کہا گیا تھا وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے شائستہ لہجے میں شانی کو اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا۔

شانی نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ صدف نامی لڑکی نے نقاب کھسکا کر پھر چہرے پر کر لیا۔ وہ الٹے قدموں کمرے سے نکل رہی تھی مگر شانی نے ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ دونوں ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں آ گئیں۔ صدف نامی لڑکی نے شانی کو صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ وہ کھلے لبادے میں تھی تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا جسم چھریرا اور متناسب ہے۔

’’روح جسم سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ جسم روح سے علیحدہ کوئی شے ہے۔‘‘ صدف نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔ ’’اس لئے ہم روحانی اور جسمانی علاج کو جدا جدا خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ اسی طرح طریقۂ علاج کے بارے میں بھی کوئی خاص حد یا پیمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ ایلوپیتھک حکمت، ہومیو پیتھک، آکو پنکچر، ویدک یہ علاج کے چند طریقے ہیں۔ ایسے بے شمار طریقے اور بھی ہیں...... اور اپنی اپنی جگہ یہ سب طریقے خاص حالتوں میں خاص فائدے اور نقصان رکھتے ہیں...... حضرت صاحب کا بھی ایک خاص طریقۂ علاج ہے

یہ جسمانی کے ساتھ ساتھ روحانی بھی ہے......اور بہت حد تک نفسیاتی بھی......'' لڑکی لب و لہجے سے واقعی تعلیم یافتہ لگتی تھی۔

''آپ کی ساری باتیں درست ہیں مگر علاج کے بے شمار طریقوں میں سے کچھ مستند ہیں اور کچھ غیر مستند۔ ان کو تجرباتی طریقے کہا جاتا ہے۔ آپ کا طریقہ کس خانے میں آتا ہے......؟''

وہ شانی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آپ ایلو پیتھک کو زیادہ مانتی ہیں مگر شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ حضرت صاحب کے مریضوں اور مداحوں میں کم و بیش چالیس پچاس ڈاکٹر خواتین و حضرات بھی ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے اپنے شعبے کے سپیشلسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میڈیکل کی فیلڈ سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد حضرت صاحب سے استفادہ کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔''

''مثلاً؟'' شانی بحث پر آمادہ تھی۔

''مثلاً...... بہت سے افراد ہیں......مثلاً میں خود ہوں۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں کوالیفائیڈ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ حضرت صاحب میرے شوہر ہی نہیں میرے مسیحا اور محسن بھی ہیں۔ میڈیکل کے آخری دو سالوں میں، میں سر درد کی پیچیدہ تکلیف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ دو سال تک درجنوں ڈاکٹر اور ہزاروں نسخے بدلنے کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔ حضرت صاحب کے دست شفا نے مجھے نئی زندگی دی۔''

شانی حیرت سے سنتی رہی۔

صدف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''حضرت صاحب کی منجھلی بیوی آپی عریسہ فراقی ہیں، انہیں آپ نے ساتھ والے کمرے میں دیکھا ہے۔ آپ جانتی ہیں، وہ کون ہیں؟'' شانی سوالیہ نظروں سے صدف کی طرف دیکھتی رہی۔

''پنجاب کے معروف حکیم تاجدار فراقی کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟ ان کے دو بیٹوں نے بھی حکمت میں بڑا نام کمایا ہے۔ آپی عریسہ حکیم تاجدار فراقی کی بیٹی ہیں۔ حکیم صاحب خود بھی حضرت صاحب کے دیرینہ مداحوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ باتیں میں آپ کو صرف اس لئے بتا رہی ہوں کہ آپ کو حضرت صاحب کی حیثیت اور مرتبے کا تھوڑا سا اندازہ ہو جائے۔ آپ ان کی عمر، حلیے وغیرہ پر نہ جائیں۔ یہ دیکھیں کہ قدرت نے انہیں صلاحیتیں کیا دے رکھی

ہیں۔ اگر آپ......''

اچانک صدف چونک گئی۔ شانی بھی ٹھٹک گئی۔ ساتھ والے کمرے کے اندر سے کسی پرندے کے چیخنے کی دردبھری آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی زور کا کھٹکا بھی ہوا تھا۔

صدف نے شانی کو وہیں چھوڑا اور جلدی سے دروازہ کھول کر کمرے کے اندر گئی۔ ادھ کھلے دروازے میں سے شانی کی نگاہ ایک حیرت انگیز منظر پر پڑی۔ خوف کی ایک لہر اس کے سراپا میں دوڑ گئی۔ حضرت صاحب کی منجھلی بیوی نے ایک طوطے کو مار دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سٹیل کی سلاخ تھی اور یہ سلاخ طوطے کے جسم کے آر پار ہو چکی تھی۔ خوبصورت سفید طوطا سلاخ میں پرویا ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ اس کے خون کے چھینٹے پنجرے سے باہر تک آ رہے تھے۔

حضرت صاحب نے جھک کر پھرتی سے پنجرے کا دروازہ کھولا اور تڑپتے پھڑکتے خونچکاں پرندے کو تھام لیا۔ عریسہ نامی لڑکی نے خون آلود سلاخ طوطے کے جسم سے کھینچ لی۔ اسی دوران میں صدف نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور تحیر خیز منظر شانی کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔

کہیں کسی کتاب میں پڑھی ہوئی ایک پرانی بات شانی کے ذہن میں گونجنے لگی۔ لکھنے والے نے پُراسرار مشرقی علوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ انوکھی باتیں بیان کی تھیں۔ ان میں ہی کہیں لکھا تھا کہ انسانوں کے علاج کے لئے جانوروں کو Meeting کی حالت میں ہلاک کیا جاتا ہے۔ نر اور مادہ کے اولین باہمی ملاپ کے دوران میں نر کو مارا جاتا ہے اور اس کے تازہ خون کو ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے۔

شانی کے دل نے گواہی دی کہ یہ بھی کوئی ایسی ہی صورت حال ہے۔ اس کا دل کراہت اور دکھ سے بھر گیا۔ نئے دور میں انسان چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ مسلسل دکھی انسانیت سے سادگی اور کم علمی کا تاوان وصول کر رہے ہیں۔ شانی کا ذہن کسی صورت ایسی خرافات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازے کو دھکا دیتی ہوئی اندر داخل ہو جائے۔ اپنی بھابو کو ان شعبدہ بازوں کے پنجے سے نکال کر کہیں دور لے جائے......لیکن ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی دکھ کی لہروں میں غوطے کھاتی رہی۔ اندر وہ لوگ کسی نامعلوم کارروائی میں مصروف رہے۔

اسی دوران میں شانی کو کہیں پاس ہی سے مُنّے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ شاید نیند

سے بیدار ہوا تھا۔ شانی ایک کوریڈور سے گزر کر اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں مُنا موجود تھا۔ وہ بھابو کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چوہدری بشیر بھی شاید مُنے کی آواز سن کر ہی کمرے میں پہنچا تھا۔ وہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر بولا۔

''چلو اچھا ہوا تم آ گئی ہو۔ اب سنبھالو اسے۔''

شانی کو دیکھتے ہی منا نارمل ہو گیا۔ شانی نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اس کا منہ چوما اور اسے لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''تاتی! امی کہاں ہیں؟''

''انہیں دیکھنے کے لئے ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ انہیں دوا وغیرہ دے رہا ہے۔''

''تاتی! امی کب ٹھیک ہوں گی؟''

''بہت جلدی۔''

''وہ مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتیں۔ پہلے کی طرح مجھے گودی میں کیوں نہیں اٹھاتیں؟''

''ابھی بیمار ہیں ناں۔ دیکھنا، جیسے ہی اچھی ہوں گی، تمہیں خوب پیار کیا کریں گی۔ ایسے..... ایسے..... اور ایسے۔'' شانی نے بار بار اس کا منہ سر چومتے ہوئے کہا۔

''وہ یہ کیوں کہتی ہیں، میں کہیں چلی جاؤں گی؟''

''کب کہا ہے انہوں نے؟'' شانی نے غصے سے پوچھا۔

''کل بھی کہا تھا۔ اس سے پہلے بھی کہتی تھیں..... کہتی تھیں، میں کہیں چلی جاؤں گی تو رونا مت..... ایک دم بہادر بن جانا۔ ندیم بھائی کے ساتھ مل کر بہت زیادہ پڑھنا۔ پھر جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور افسر بن جاؤ گے تو میں پھر تمہارے پاس آؤں گی..... امی نے کہاں جانا ہے تاتی؟'' وہ معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔

شانی تڑپ اٹھی۔ اس نے مُنے کو گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔'' وہ تم سے غلط کہتی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہے کہ تم اس سے کتنا پیار کرتے ہو۔''

اس کے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ مُنے کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ بھابو کی تکلیف اندر ہی اندر بڑھ رہی ہے اور اس بڑھتی ہوئی تکلیف کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ شانی ماہیء بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تہیہ کر لیا کہ وہ بھابو کو ہر صورت لاہور دل کے ہسپتال لے کر جائے گی اور اس سلسلے میں جیسے بھی ہو سکا، چوہدری بشیر کو بھی قائل کرے گی۔

اتنے میں چوہدری بشیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے شانی سے کہا کہ وہ انیکسی میں

چلی جائے۔ کیونکہ نارپور سے کچھ مہمان آئے ہیں۔

ظاہر تھا کہ شانی کی موجودگی میں چوہدری کسی صورت مہمانوں کو کوٹھی میں نہیں لا سکتا تھا۔ شانی نے مُنے کو بہلا پھسلا کر گود سے اتارا اور گرم شال اوڑھ کر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے سے پہلے اس نے چوہدری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔'' آپ فارغ ہو کر میری طرف آیئے گا۔ ضروری بات کرنی ہے۔''

چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆======☆======☆

شانی کا ارادہ تھا کہ وہ چوہدری کو مجبور کرے گی کہ بھابو کو فوراً کسی اچھے ہارٹ سپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔ اسے امید تھی کہ وہ چوہدری بشیر کو قائل کرنے میں کامیاب رہے گی۔ اب تک اس نے محسوس کیا تھا کہ چوہدری اپنے عزیزوں کی نسبت کسی حد تک جدت پسند ہے۔ اس کی باتوں سے بھی پتا چلتا تھا کہ وہ علاج معالجے کے دقیانوسی طریقوں کو پسند نہیں کرتا۔ اب جب کہ بھابو کی حالت بھی بگڑ رہی تھی چوہدری کو اس بارے میں سوچ لینا چاہئے تھا۔

چوہدری اس روز تو نہیں آیا لیکن اگلے روز شام کے بعد اس کی صورت نظر آئی۔ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔ چوہدری کی باتوں سے پتا چلا کہ بھابو کی طبیعت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی ہے۔ آج وہ تھوڑا سا گھومی پھری ہے اور کھانا بھی کھایا ہے۔

کچھ دیر بعد جالاں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ بھابو کی طبیعت بہتر ہے۔ دو روز بعد شانی کو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ بھابو خود چل کر اس کی طرف آ رہی ہے۔ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔ بھابو کا دم پھولا ہوا تھا اور رنگ بھی زرد تھا مگر یہ بھی بڑی بات تھی کہ وہ خود چل کر آئی ہے۔

شانی نے اسے آرام کرسی پر بٹھایا اور اس کی دلجوئی میں مصروف ہو گئی۔ بھابو مسلسل حضرت صاحب کی تعریفیں کر رہی تھی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ حضرت صاحب کے وسیلے سے قدرت اسے شفا دے گی۔ اس کام میں دیر ضرور ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں ہو گی۔

شانی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کی باتوں سے بھابو کا اطمینان رخصت ہو جائے۔ یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ کے اندر ہی گونج رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ شعبدہ بازی کرنے والے عطائی معالج مریض کو وقتی طور پر مطمئن کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر افاقہ ہو جاتا ہے مگر تکلیف اپنی جگہ جُوں کی تُوں رہتی ہے۔ کبھی کبھار وہ ایسا ماحول پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں کہ مریض صرف

نفسیاتی طور پر خود کو تندرست سمجھنے لگتا ہے۔

بھابو سے باتوں کے دوران گفتگو کا رخ کاک ٹیل طوطے کی ہلاکت کی طرف مڑ گیا۔ شانی نے انجان بنتے ہوئے بھابو سے پوچھا۔ ''بھابو! ان طوطوں کا کیا بنا؟''

وہ بولی۔ ''مجھے تو پتا نہیں، مجھے حضرت صاحب کی بی بی نے دوا کھلائی تھی۔ مجھے چکر سے آنے لگے تھے، پھر میں سو گئی۔ میں تو اگلی صبح ہی جاگی تھی۔ پنجرے میں بس اب طوطی رہ گئی ہے۔ طوطے کو انہوں نے اُڑا دیا ہوگا...... یا پھر...... اس کا کچھ اور کیا ہوگا۔''

شانی نے کہا۔ ''تمہارا اندازہ غلط ہے بھابو...... میں نے ادھ کھلے دروازے میں سے ذرا سی جھلک دیکھی تھی۔ حضرت صاحب کی بڑی بی بی نے لوہے کی نوکدار سیخ مار کر طوطے کو مار دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا خون یا گوشت کسی دوا میں ڈالا گیا ہوگا۔''

بھابو نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ بہر حال کراہت کی ایک شکن سی اس کی پیشانی پر آ کر ضرور غائب ہوئی۔ ذرا تو قف سے وہ بولی۔ ''ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔ دوا تو پھر دوا ہی ہوتی ہے شانی...... پتا نہیں کہ ڈاکٹری اور حکیمی دواؤں میں بھی کیا کیا ڈالا جاتا ہے۔''

''طوطے کو کس نے مارا تاتی؟'' مُنے نے پوچھا۔ وہ دور بیٹھا تھا پھر بھی اس نے آواز سن لی تھی۔

''کسی نے نہیں مارا تھا۔ وہ خود مر گیا سردی سے۔'' شانی بولی۔ مُنا خاموش ہو گیا لیکن انداز سے ظاہر تھا کہ جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔

بھابو سرگوشی میں بولی۔ ''بڑا دماغ ہے اس کا...... جو بات سنتا ہے اس کو اندر ہی اندر سوچتا رہتا ہے اور جو بات سوچتا ہے وہ کئی کئی مہینے تک اس کے دماغ میں گھسی رہتی ہے۔''

''پھر تم اس سے ایسی ویسی باتیں کیوں کرتی ہو؟'' شانی نے دکھی لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم نے اس سے کیوں کہا کہ تم کہیں جانے والی ہو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ بہادر بنے اور ندیم بھائی کے ساتھ مل کر پڑھے لکھے...... تم نے کہا تھا نا اس سے؟''

بھابو کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن پھر وہ سنبھل گئی اور ہنسنے لگی۔ ''تم بھی بالکل نکمی ہو، مذاق کی بات بھی نہیں سمجھتی ہو۔ میں تو ایسے ہی لگی ہوئی تھی اس سے۔''

''بھابو! کبھی کبھی مذاق کی بات میں دل کی بات بھی تو کر دی جاتی ہے۔'' شانی بدستور آبدیدہ تھی۔

بھابو نے بڑی محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میری جان! ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں بالکل بھلی چنگی ہوں۔ تم دیکھنا آٹھ دس دن میں بالکل گھوڑے کی طرح ہو جاؤں گی۔ میرے دل کے اندر سے آواز آ رہی ہے کہ اب مجھے بالکل ٹھیک ہو جانا ہے۔''

''پر بھابو......''

''دیکھ شانی......!'' بھابو نے ایک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تُو مجھے بس دو تین ہفتوں کا ٹائم دے۔ میں تجھے ایک دم ٹھیک ہو کر دکھا دوں گی۔ اللہ نے چاہا تو تُو خود کہے گی کہ بھابو تُو اب چاروں خانے فٹ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ناں تو پھر تُو جس ڈاکٹر اور ہسپتال کا کہے گی، میں وہاں تیرے ساتھ چل دوں گی۔''

شانی جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اسی دوران میں چوہدری بشیر انیکسی کی طرف آتا دکھائی دیا...... دونوں خاموش ہو گئیں۔

آنے والے آٹھ دس دنوں میں بھابو کی حالت واقعی بتدریج بہتر ہوگئی، اس کی آنکھوں کے گرد نظر آنے والے سیاہ حلقے بھی مدھم ہونے لگے۔ وہ خوش تھی مگر شانی اندر سے خوش نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں کوئی شے اپنے تیز نکیلے پنجوں سے اندر ہی اندر اس کے دل کو کریدتی رہتی تھی۔ بھابو کے حوالے سے اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے چوہدری بشیر سے پھر بات کی۔ اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ بھابو کو لاہور کے دل ہسپتال میں لے جایا جائے اور مکمل چیک اپ کرایا جائے۔ چوہدری کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ خود بھی بھابو کو لاہور لے جانا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ روحانی علاج کے ساتھ ساتھ اس کا جسمانی علاج بھی جاری رہے۔ مگر بھابو کی رائے مختلف تھی۔

چوہدری بشیر نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھو تو وہ ہسپتال جانے کے نام سے ہی بدک جاتی ہے۔ شاید کسی حد تک اس کا ڈر بھی ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ مقبول کے خاندان میں چار پانچ بندوں کو کسی نہ کسی وجہ سے دل کا آپریشن کرانا پڑا۔ ان میں سے ایک کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔ پچھلے سال سے پچھلے سال مقبول کی سگی پھوپھی اور اس کے دو مہینے بعد ایک چاچا اسی بیماری کی وجہ سے جان ہارے۔''

''پر بھابو اندر سے ٹھیک نہیں ہیں۔'' شانی نے لاچار لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا نہیں تو پھر اس نے مُنے سے ایسی باتیں کیوں کیں؟''

''کیسی باتیں؟''

شانی نے وہ سب کچھ چوہدری بشیر کو بتایا جو اس نے مُنے سے سنا تھا۔

بھابو کی طرح چوہدری بشیر نے بھی کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ کہنے لگا۔ ''وہ جب موڈ میں ہوتی ہے۔ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی ہے۔ بہت پرانی عادت ہے اس کی۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔''تم ان باتوں کو چھوڑو۔ کیا اب تمہیں وہ پہلے سے بہتر نہیں لگتی ہے؟''

''وہ تو لگتی ہے۔ ......لیکن۔''

''زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں......دل کی بیماری بڑی پیچیدہ ہے۔ ڈاکٹر خود بھی حیران ہوتے ہیں کہ اچھا بھلا بندہ بیٹھا بیٹھا مر جاتا ہے اور جس کی ساری شریانیں ٹھپ ہوتی ہیں وہ پچاس سال اور نکال جاتا ہے۔''

''لیکن میں سوچتی ہوں......''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔'' چوہدری نے ایک بار پھر بے زاری سے اس کی بات کاٹی۔''اب کوئی اور بات کرو۔''

وہ سہم کر چپ ہوگئی۔ چوہدری کے خراب موڈ سے اب اسے بہت ڈر لگنے لگا تھا۔

☆======☆======☆

وقت دھیرے دھیرے آگے سرکتا رہا۔ آنے والے دن عجیب ڈھنگ کے تھے۔ شانی واضح طور پر بلیک میل ہو رہی تھی، چوہدری اسے بتدریج قریب لا رہا تھا۔ وہ اکثر انیکسی میں چلا جاتا تھا۔ اس کے پاس بیٹھتا تھا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ اس کے فقرے شدید ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی نگاہوں کی بے باکی بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی اس سے دور ہٹنے کی کوشش کرتی تھی تو وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اس سے اگلے روز ہی اس کا رویہ مُنے اور بھابو کے ساتھ کرخت ہو جاتا تھا، وہ ان دونوں کو شانی کی طرف آنے سے روک دیتا تھا اور اس کی اجازت کے بغیر وہ دونوں انیکسی میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ایک دو بار تو اس نے مُنے کو مارا بھی تھا۔ مُنا روتا تھا تو بھابو بھی روتی تھی اور وہ بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی صحت کا گراف اوپر نیچے ہوتا رہتا تھا۔ بھابو کا ذرا سا دکھ بھی شانی سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ فوراً ہتھیار پھینک دیتی تھی۔ چوہدری کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لیتی تھی فوراً ہی چوہدری کا رویہ بھی گھر والوں کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا۔

ہاں یہ تشدد کی انوکھی قسم تھی۔ بھابو اس دھوپ چھاؤں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ شوہر کے موڈ کی خرابی اور بہتری کو اس کی متلون مزاجی سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی چار دیواری میں محدود ہونے

کی وجہ سے نہیں جانتی تھی کہ آس پاس کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

جب سے شانی یہاں آئی تھی ندیم دو بار ہاسٹل سے یہاں آیا تھا مگر چوہدری نے شانی سے اس کی ملاقات نہیں کرائی تھی۔ اسے بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ شانی یہاں موجود ہے۔ مُنے نے بڑے بھائی کے سامنے واویلا مچایا تھا کہ وہ ''تاتی'' سے ملنے جاتا ہے مگر اس کی بات کو ندیم نے بھی قابلِ غور نہیں سمجھا تھا۔

مُنا تقریباً ہر روز شانی سے مل رہا تھا۔ شانی کے ساتھ اس کی ''ایسوسی ایشن'' بڑھتی جا رہی تھی۔ دو تین بار وہ انیکسی میں شانی کے ساتھ ہی سو گیا تھا۔ ہر بار جب وہ شانی کے پاس سویا تھا، رات دس گیارہ بجے کے قریب چوہدری بشیر اسے دیکھنے کے بہانے انیکسی میں چلا آیا تھا۔ آخری بار جب وہ آیا تو شانی اور مُنا بے خبر سو رہے تھے۔ شانی کی آنکھ کھلی تو اس نے چوہدری کو خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے پایا۔ پتا نہیں وہ کب سے وہاں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ شانی خاموش رہی، لیکن اسے یہ سب کچھ بہت بُرا لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ چوہدری کی رسائی اس کی خواب گاہ تک ہوتی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال ہر لحاظ سے خطرناک تھی۔

دو دن بعد جب مُنے نے پھر رات کو شانی کے پاس سونے کی بات کی تو شانی نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ وہ ضد کرنے لگا۔ شانی نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی ضد زور پکڑتی جا رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ شانی بھی جھنجھلا گئی۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔

''جاؤ چھوڑ دو میری جان......جاؤ اپنے گھر جاؤ......میں نہیں سلا سکتی تمہیں۔''

جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو، اس کا مارا ہوا پھول بھی پتھر کی طرح لگتا ہے۔ مُنا پہلے تو حیرت زدہ کھڑا رہا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے ہی وہ گھر کی طرف مڑا۔ یہی وقت تھا جب چوہدری بشیر انیکسی کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مُنے کو روتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' چوہدری نے مُنے کو کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔ ...ویسے ہی ضدیں کر رہا تھا۔''

''کیا ضد کر رہے تھے؟'' چوہدری نے مُنے سے پوچھا۔

''میں نے ......تاتی کے پاس سونا ہے۔''

چوہدری کا چوڑا چکلا چہرہ یکا یک سُرخ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر شانی کی طرف دیکھا اور پھر مُنے کو گھورتے ہوئے غصے سے بولا۔''وہ نہیں سلاتی تو کیا نہیں سوتے ہو، ہر وقت کوئی نہ کوئی مُنا ہوتا ہے تمہارا۔ چلو گھر۔'' اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا طمانچہ مُنے کے نازک گال

پر پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

چوہدری نے اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سفید پتھریلی دیوار کی دوسری طرف لے گیا۔ شانی دم بخود رہ گئی۔

اس رات شانی دیر تک روتی سسکتی رہی۔ رہ رہ کر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ مر جائے۔ دنیا کے جنجالوں سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ وہ بھی زمان و مکاں کی حدیں پار کر کے اپنی پیاری امی کے پاس پہنچ جائے۔ اس کی گود میں سر رکھے اور روزِ حشر تک ایسے ہی لیٹی رہے۔ پھر یہ سوچ کر وہ ڈر جاتی کہ اپنی موت کی تمنا کرنا گناہ ہے۔ مُنا پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اس کا سُرخ گال دیکھ کر یقیناً بھابو کے دل پر بھی ایک طمانچہ پڑا ہوگا۔ وہ بھی روئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں ماں بیٹا گلے لگ کر روئے ہوں، ان کو رُلانے کی ذمے دار وہ تھی۔ صرف وہ تھی۔

وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ کیا وہ چوہدری کی ہر پیش قدمی کے سامنے آنکھیں بند کر کے...... ایک حد سے دوسری حد اور دوسری سے تیسری تک جانے کے لئے تیار ہو جائے یا پھر اس سلسلے کو روک دے اور پھر اس روکنے کی پاداش میں جو کچھ ہوتا ہے اسے ہونے دے۔

وہ سوچتی رہی، ہر پہلو پر غور کرتی رہی، وہ جانتی تھی۔ چوہدری کو منانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اصل مشکل اسے منانے کے بعد پیش آئے گی۔ وہ کہاں تک پسپا ہوگی کہاں تک اپنی انا کو روندے گی؟

اس نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ خاموشی اختیار کرے گی۔ دیکھے گی کہ صورتِ حال کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ بھابو کا دکھ ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہتا تھا، لیکن اگر چوہدری کی پیش قدمی جاری رہتی اور ایک دن بھابو کو سب پتا چل جاتا تو کیا بھابو کو دکھ نہ ہوتا۔ یقیناً اس پر قیامتِ صغریٰ بیت جاتی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ خاموشی اختیار کرے گی۔

اگلے چند دن بڑے کٹھن تھے۔ شانی دو طرف سے دکھ کے بے رحم شکنجے میں تھی۔ مُنے کی اشک بار آنکھیں بار بار اس کے تصور میں آتی تھیں اور اس کا دل دہلا دیتی تھیں۔ وہ خود کو ہزار بار ملامت کر چکی تھی کہ اس نے اسے کیوں جھڑکا۔ وہ جانتی تھی سنگِ مرمر کی دیوار کے پار وہ اس سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہوگا اور کچھ یہی کیفیت شانی کی بھی تھی۔ بھابو کی دُوری بھی شانی کے دل و دماغ پر ناقابلِ بیان ستم ڈھا رہی تھی۔ چوہدری نے اپنی شکل دکھائی تھی اور نہ ان

دونوں میں سے کسی کی نظر آنے دی تھی۔ ایک دو بار جالاں کی زبانی بس اسے اتنا پتا چلا تھا کہ چوہدری صاحب آج کل بہت غصے میں ہیں۔ اکثر رات کو گھر بھی نہیں آ رہے۔ بڑی چوہدرانی بہت پریشان ہیں۔

شانی نے دل پر بے پناہ ضبط کر کے چار پانچ دن مزید گزارے پھر اسے محسوس ہونے لگا کہ اس غم کو جھیلنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک جان لیوا دوراہے پر کھڑی تھی۔ اِس طرف جاسکتی تھی نہ اُس طرف۔ ایک طرف بھابو اور مُنا تھے۔ ایک طرف اس کی عزتِ نفس اور اس کی پاک دامنی تھی۔ ایک رخ پر جاتی تو دوسرا رخ اوجھل ہوتا تھا ..... اسی صورتِ حال میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے بہت کچھ تہہ و بالا کر دیا۔

رات کا وقت تھا۔ ایک ٹھٹھری ہوئی چاندنی، کھڑکیوں سے باہر آم، جامن اور سرو کے درختوں پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ دور جی ٹی روڈ کی طرف سے کبھی کبھی کسی گاڑی کا مدھم ہارن سنائی دے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یکسر خاموشی تھی۔

شانی کو اس رات کی تنہائی میں کوئی یاد آ رہا تھا۔ کوئی جو بہت دور تھا، لیکن پھر بھی نزدیک تھا۔ کوئی جو بالکل غیر تھا لیکن پھر بھی اپنا لگتا تھا۔ عجیب شخص تھا وہ مضبوطی سے بند کئے گئے کھڑکیوں دروازوں کے باوجود اندر آتا تھا۔ شانی اپنی ''سوچ نگری'' میں اس کی آمد کو روک نہیں سکتی تھی۔

اچانک ایک دھیمی آواز نے شانی کو چونکایا۔ اسے لگا کہ کسی نے کوٹھی اور انیکسی کا درمیانی دروازہ کھولا ہے اور بھاگتا ہوا اندر آیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کا دھیان آتش مزاج چوہدری قادرے کی طرف گیا۔ قادرے کا خوف ہر وقت شانی کے ذہن میں موجود رہتا تھا تاہم پھر فوراً ہی شانی کو اندازہ ہوا کہ آنے والا کوئی مرد نہیں ہے۔ شانی نے اس کا مدھم سا ہیولا کھڑکی کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی عورت ہے جو انیکسی میں آ کر چھپی ہے۔ جلد ہی اس بات کی تائید بھی ہو گئی۔ کوٹھی کی طرف سے پہرے داروں کی بلند آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی رکھوالی کے کتے شور مچانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ شور بڑھ گیا۔ شانی کو محسوس ہوا کہ ایک یا دو بوگیر کتے بھاگنے والی کا پیچھا کرتے ہوئے درمیانی دیوار تک آ گئے ہیں۔ شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے جالاں کو جگانے کے لئے آواز دی..... پھر ننگے پاؤں کھڑکی تک پہنچی..... اس کا اندازہ درست تھا۔ ایک خوفناک کتا تیزی سے انیکسی کے لان کی طرف آ رہا تھا۔

تب شانی کے کانوں نے ایک دہشت زدہ نسوانی چیخ سنی۔ یہ وہی عورت تھی جو کچھ لمحے

پہلے انیکسی میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ شانی نے اسے گارڈینیا کی اوٹ سے نکلتے اور بدحواسی کے عالم میں برآمدے کی طرف آتے دیکھا۔ کتا اس کے پیچھے لپکا۔ عورت ایک سیکنڈ کے لئے آرائشی پول کی روشنی میں آئی اور شانی کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ اس نے عورت کو دیکھ لیا تھا۔ یہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ انوری تھی۔ رنگ والی حویلی کی ملازمہ۔ یہاں آکر شانی نے انوری کی جان قادرے کے شرابی غنڈوں سے چھڑائی تھی۔ آج کل وہ کوٹھی کے ایک محفوظ حصے میں رہائش پذیر تھی اور آج رات کے اس پہر وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں ایک بوگیر کتے کے آگے بھاگ رہی تھی۔

وہ ایک دھماکے کے ساتھ بند دروازے کے ساتھ ٹکرائی اور فرطِ خوف سے دیوانوں کی طرح چلانے لگی، کتا پلک جھپکتے میں اس کے اوپر تھا۔ شانی جیسی بھی تھی لیکن کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کے اپنے اندر کا ڈر کہیں بہت دور گہرائی میں چلا جاتا تھا، وہ اپنی سلامتی کو بھول کر اس خطرے کے سامنے آجاتی تھی جو دوسرے کو درپیش ہوتا تھا۔ اس میں اس کی کوشش کو دخل نہیں تھا۔ یہ خوبی اس کی فطرت کا حصہ تھی اور شاید ماں (وڈی آپا) کی طرف سے ہی اس میں آئی تھی۔

انوری کو خطرے میں دیکھ کر شانی نے قرب و جوار کو فراموش کر دیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، اس نے کب دروازہ کھولا اور کب انوری کے پاس پہنچ گئی۔ کتا انوری سے چمٹا ہوا تھا۔ انوری کی چیخیں اور کتے کی خوفناک آواز باہم مل کر ایسا شور پیدا کر رہی تھیں جس سے پوری انیکسی گونجنے لگی۔ شانی نے دیوانہ وار کتے کو لمبے بالوں سے پکڑا اور اسے انوری کے اوپر سے کھینچنے لگی۔ شاید عام حالت میں وہ اس جانور کے پاس سے بھی گزرنا پسند نہ کرتی مگر اب وہ کتے سے گتھم گتھا تھی۔ اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو کتے کی بے پناہ جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ وہ اسے فریاد کناں انوری کے اوپر سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی ہیجانی کیفیت میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اسے کیاری کے پاس ایک بیلچہ نظر آیا۔ اس نے بیلچہ پکڑا اور پوری طاقت سے کتے کے منہ پر وار کیا۔ اس نے بیلچے کو کنارے کی طرف سے استعمال کیا تھا۔ کتے کی تھوتھنی پیچھے کی طرف گئی۔ شانی کو اس کے نکیلے دانتوں میں انوری کے خون آلود کُرتے کی نیلی دھجی نظر آئی۔ لباس پھٹنے سے انوری کا بالائی جسم عریاں ہو رہا تھا۔

کتا ذرا سا پیچھے ہٹنے کے بعد ایک بار پھر انوری پر جھپٹا۔ وہ نیچے گری ہوئی تھی۔ شانی کو لگا کہ بے رحم جانور اس کا نیٹوا دبا لے گا۔ اس مرتبہ شانی نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ کھرے بیلچے کی یہ ضرب بھی کافی زوردار تھی، انوری کو اٹھنے کا موقع مل گیا۔ کتے نے پھر اس

کی طرف لپکنا چاہا۔ شانی اس کے اور کتے کے درمیان آگئی۔ ''بھاگ جا انوری..... کمرے میں بھاگ جا۔'' شانی چلائی۔

شاید یہ بوگیر کتے کی فطرت تھی کہ وہ شانی سے چوٹیں کھانے کے باوجود انوری کی طرف ہی لپک رہا تھا۔

شانی دیوانہ وار بیلچے سے ضربیں لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خوف کے عالم میں چیخ بھی رہی تھی۔ دو تین ضربوں کے بعد ہی بیلچے کا آہنی پھل اُتر کر دور جا گرا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ شیشم کے مضبوط دستے کی ضرب بھی کم کارگر نہیں تھی۔ چند سیکنڈ میں شانی نے بپھرے ہوئے کتے کا تھوبڑا لہولہان کر دیا۔ اسی دوران میں ایک دوسرا کتا شانی پر حملہ آور ہو گیا۔ شانی کو لگا جیسے کئی من وزنی شے اس کے کندھے سے ٹکرائی ہے۔ وہ چلاتی ہوئی جالی دار دروازے سے جا ٹکرائی۔ مگر بیلچے کا لاٹھی نما دستہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ہیجانی انداز میں اس دوسرے کتے کے منہ پر بھی تسلی بخش ضربیں لگائیں۔ یہی وقت تھا جب کتوں کے رکھوالے بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے چلا چلا کر کتوں کے ناموں سے پکارا اور انہیں قابو کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ زخمی انوری کمرے میں گھس چکی تھی۔ شانی ابھی تک دیوار کی طرح انوری اور کتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ دروازے کی طرف سے چوہدری بشیر کی دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' شانی نے دیکھا وہ رائفل تھامے بھاگتا ہوا برآمدے کی طرف آرہا ہے۔

☆======☆======☆

چوہدری کو دیکھ کر شانی کو قدرے تسلی ہوئی۔ چوہدری برآمدے میں پہنچا تو اس نے کتوں اور ان کے رکھوالوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔ ''کیا ہوا ہے یہاں؟'' وہ گرج کر بولا۔

ایک رکھوالے نے اپنے مچلتے پھڑکتے کتے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''انوری بھاگ کر ادھر آئی ہے جی۔ اس نے فردوس کا سر بھی پھاڑ دیا ہے۔ وہ اُدھر باغیچے میں بے ہوش پڑی ہے۔''

''کدھر گئی ہے وہ؟'' چوہدری بشیر نے اسی رکھوالے سے پوچھا۔

رکھوالے کے بجائے شانی نے جواب دیا۔ ''وہ کمرے میں ہے۔ یہ کتے تو اسے پھاڑ کھانے والے تھے۔ میں نے مشکل سے جان بچائی ہے اس کی۔''

شانی کی اپنی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اوڑھنی میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں سے چپل نکل چکی تھی اور دروازے سے ٹکرانے کے سبب ایک ہاتھ پر گہری خراش نظر آ رہی تھی۔ بیلچے کے جس دستے سے اس نے کتوں کی پٹائی کی تھی، وہ اس کے پاؤں کے قریب فرش پر پڑا تھا۔

شانی کی حالت دیکھ کر چوہدری بشیر کا غصہ ذرا ماند پڑتا محسوس ہوا۔ اس نے ایک نگاہ دونوں کتوں کی لہولہان تھوتھنیوں پر ڈالی۔ پھر دوبارہ شانی کو دیکھ کر بولا۔ ''کتوں کو کس نے زخمی کیا ہے؟''

''میں نے مارا ہے۔ اگر میں انہیں نہ مارتی تو یہ مجھے مار ڈالتے۔'' شانی نے کہا۔

چوہدری ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ دو تین مزید کتے بھی اب احاطے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے رکھوالے بھی تھے۔ موٹی زنجیروں سے بندھے ہوئے یہ

کتے اپنے رکھوالوں کو جیسے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی خوفناک آوازوں سے قرب و جوار ہل رہے تھے۔ اسی دوران میں انیکسی اور کوٹھی کے درمیانی دروازے کے قریب کچھ گارڈز بھی دکھائی دینے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ کے پاس ٹارچیں تھیں۔ ان کے کندھوں پر کارتوسوں اور گولیوں کی بیلٹس تھیں اور یہ بیلٹس دور ہی سے چمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ مفرور ہونے والی عورت کی تکا بوٹی کرنے کے لئے اپنے آقا کے صرف ایک اشارے کے منتظر تھے۔

وہ ''مفرور'' برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے اندر سے کنڈی چڑھالی تھی۔ اس کی بے چارگی قابلِ غور تھی۔ وہ جس جیل میں بند تھی، اسی جیل کے ایک کمرے کو اپنی پناہ گاہ سمجھ رہی تھی۔

چوہدری بشیر چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے گارڈز اور رکھوالوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

وہ تو حکم کے غلام تھے۔ چوہدری کے اشارے پر وہ اپنی خطرناک رائفلوں، خونخوار کتوں اور کلہاڑیوں سمیت واپس چلے گئے۔ ایسے ہی چوہدری کے ایک اشارے پر وہ انوری کی بوٹیاں نوچ سکتے تھے۔ چوہدری کی ہدایت پر بس ایک گن مین احاطے میں آم اور جامن کے پیڑوں کے پاس کھڑا رہ گیا۔ چوہدری نے آگے بڑھ کر اپنے بھاری بھرکم ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور کرخت آواز میں بولا۔ ''باہر نکلو......فوراً.... دروازہ کھولو۔''

اندر سے انوری کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ چوہدری کی دستک کے بعد یہ آواز مزید بلند ہو گئی۔ یہ آواز خوفزدہ چیخوں سے مشابہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں فریاد کا تاثر بھی نمایاں تھا، چوہدری ایک بار پھر شیر کی طرح دھاڑا۔ ''میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔ ورنہ توڑ کر اندر آ جاؤں گا۔''

انوری کے رونے کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ خوف اور دہشت نے اسے جیسے منجمد کر دیا تھا۔ وہ کچھ بھی کر نہیں پا رہی تھی۔ شاید کمرے ہی کے کسی کونے میں تھوڑا سا اور سمٹ گئی تھی۔

شانی نے آگے بڑھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''یہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ کہیں اسے کچھ ہو ہی نہ جائے۔ آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں ابھی اسے باہر نکالتی ہوں۔''

شانی کی اس بات پر چوہدری نے کرخت انداز میں شانی کی طرف دیکھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ شانی پر بھی پھٹ پڑے گا مگر پھر اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ذرا ڈھیلے پڑ گئے۔

اس نے احاطے میں اکیلے رہ جانے والے گن مین کو اپنے پاس بلایا۔ جالاں بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ حرام زادی باہر نکلتی ہے تو اسے لے کر فوراً میرے پاس آؤ۔'' چوہدری کی ناک کے اوپر آنکھوں کے درمیان نظر آنے والی افقی لکیر اس کی اندرونی جھنجلاہٹ کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی کی طرف بڑھ گیا۔

شانی نے جالاں، زہرا اور گن مین کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دیا۔ پھر اس نے دروازے کی درز سے منہ لگایا اور انوری کو پکارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہچانو انوری میں کون ہوں؟''

کوئی جواب نہیں ملا۔ تاہم یہ ہوا کہ رونے کی آواز تھم گئی۔

شانی نے ایک بار پھر انوری کو پکارا۔ اس مرتبہ دروازے کی دوسری طرف قدموں کی مدھم چاپ ابھری۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انوری کی لرزاں آواز ابھری۔ ''آپ ..... آپ بی بی جی ہیں؟''

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ تم دروازہ کھولو۔ کوئی ڈر والی بات نہیں۔ کھول دو دروازہ۔''

''چچ ...... چوہدری جی چلے گئے ہیں؟'' انوری نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''ہاں چلے گئے ہیں۔ یہاں بس میں اکیلی ہوں۔ گارڈ بھی چلے گئے ہیں۔''

چند لمحے بعد انوری نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کی قمیص پھٹ گئی تھی۔ اپنی برہنگی چھپانے کے لئے اس نے خون آلود قمیص کی دو دھجیوں کی کندھے کے اوپر گرہ لگا رکھی تھی۔ وہ بے حد حیرت سے شانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑکتے چلے جا رہے تھے۔

''آ ..... آپ یہاں بی بی جی ..... ؟'' وہ بے حد تعجب سے بولی۔

''ہاں انوری۔''

وہ ایک دم تڑپ کر شانی کے گلے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا کہ آپ کو زندہ سلامت دیکھ رہی ہوں۔ ہم تو آپ کو مار بیٹھے تھے۔ اپنی قسمت کو رو پیٹ چکے تھے۔'' وہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان پتا نہیں کیا کچھ بولتی چلی گئی۔

تب یکا یک وہ شانی سے الگ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر پھر سے تاریک سائے لہرانے لگے۔ شانی کو زندہ دیکھنے کی خوشی اچانک پس منظر میں چلی گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور کراہ کر بولی۔ ''تو، ان لوگوں نے آخر آپ کو پکڑ ہی لیا۔''

شانی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ وہ خاموش رہی۔ انوری بھرائی ہوئی دردناک آواز میں بولی۔ ''اب کیا ہوگا بی بی جی؟ یہ لوگ کیا کریں گے آپ کے ساتھ؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں بالکل آرام سے ہوں۔'' شانی نے اسے تسلی دی، وہ بڑے دھیان سے شانی کو دیکھ رہی تھی، آنکھوں میں آنسو تھے۔ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں...... آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ میرا دل رکھ رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں ان لوگوں کے دل میں آپ کے لئے بڑا غصہ ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے کوئی بڑا جرم کیا ہے اسی لئے آپ اپنے سسرال والوں سے چھپتی پھرتی ہیں۔ ان لوگوں نے آپ کو لاہور میں کسی ڈاک خانے کے پاس دیکھا تھا۔ آپ کا پیچھا کیا، پر آپ غائب ہوگئیں۔ پھر یہ ظالم مجھے رنگ والی سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ انہوں نے مجھے بڑا مارا ہے بی بی جی ..... مار مار کر میری ہڈیاں کالی کر دی ہیں۔'' وہ سسک اٹھی۔ اس نے اپنی ٹانگ دکھائی جس پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپنے بازو دکھائے جن پر چند ہفتے پرانے زخم تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہاں میرے ساتھ بڑا بُرا ہوا ہے بی بی جی! میں آپ کو کیا بتاؤں انہوں نے میرا کیا حال کیا ہے۔ یہ مجھ سے آپ کا پتا پوچھتے تھے۔ مارتے تھے۔ بھوکا رکھتے تھے۔ میرے بچوں کو مار دینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔'' وہ ایک سانس میں بولتی جا رہی تھی۔ اپنی بی بی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ضبط کے بندیوں ٹوٹے کہ آتشیں سیال رخساروں پر بہہ نکلا تھا۔

وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''یہ جالاں بڑی درا چھی عورت ہے جی۔ اس کی بھی بخشش نہیں ہوگی۔ اس نے مجھے اتنا رُلایا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میرا سارا پنڈا نیل و نیل ہے اس کی مار سے۔ اس کو شک تھا کہ آپ رنگ والی میں ہی کہیں ہیں، یا پھر آپ کی چاچی پروین نے آپ کو اپنے میکے میں کہیں چھپایا ہوا ہے۔ یہ کبھی مجھے لالچ دیتی تھی، کبھی مارتی کوٹتی تھی، کبھی کہتی تھی، تمہارے بچوں کو بھی یہاں منگوالوں گی اور تیرے سامنے ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گی۔''

انوری کے رونے کی آواز بلند ہونے لگی۔ وہ روتے روتے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے بی بی جی! مجھے اپنے بچوں سے ملے کئی سال ہوگئے ہیں۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے ان مسکینوں کو کوئی روٹی بھی پوچھتا ہوگا کہ نہیں۔ حویلی میں جو خیال رکھنے والے تھے، وہ تو سارے چلے گئے۔ وڈی آپا گئیں، چوہدری جی گئے، چھوٹے مالک (چوہدری مشتاق) گئے۔ اتنی بڑی حویلی اب خالی پڑی بھاں بھاں کرتی ہے۔ جن دنوں یہ لوگ مجھے اٹھا کر لائے کاکا بیمار تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔ بچا بھی ہے یا ..... گڈی اور شہباز پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔''

دونوں چھوٹے تو دو پل بھی میرے بغیر نہیں گزارتے تھے۔ ہائے میرے ربا! ان کا کیا ہوا ہوگا''

شانی نے بے ساختہ اسے گلے سے لگایا۔ ''اللہ سے خیر مانگ انوری! کچھ نہیں ہوا تیرے بچوں کو۔ سب ٹھیک ہوں گے۔ تُو بڑی جلدی ان کو دیکھے گی۔ ان کے منہ چومے گی۔''

''آپ . . آپ ان سے ملی ہیں بی بی جی؟'' انوری نے اپنی آنکھوں میں سینکڑوں دیپ جلا کر پوچھا۔

''بس تُو سمجھ، میں ان سے ملی ہوں۔'' شانی نے پُریقین لہجے میں اسے تسلی دی۔

اس سے پہلے کہ انوری کوئی اور سوال پوچھتی اچانک اس کی نگاہ شانی کے عقب میں گئی اور اس کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ فربہ اندام جالاں اور انیکسی کا گن بردار گارڈ برآمدے کی طرف جا رہے تھے۔

قریب پہنچ کر جالاں نے کرخت آواز میں کہا۔ ''چوہدرانی جی! آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں۔'' پھر وہ انوری سے مخاطب ہوئی۔ ''چل بھئی! تجھے چوہدری صاحب کے پاس لے جانا ہے۔''

انوری جیسے سہم کر شانی کی اوٹ میں ہوگئی۔ شانی نے جالاں سے کہا۔ ''انوری ابھی نہیں جائے گی۔ تم اس کا حال نہیں دیکھ رہی ہو۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ زخموں سے خون نکل رہا ہے۔''

''ہو جائے گی جی اس کی مرہم پٹی بھی...... اور کپڑے بھی نئے نکور پہنا دیں گے۔'' وہ تھانیدار کے سے لہجے میں بولی اور انوری کو بازو سے پکڑنے کے لئے آگے بڑھی۔ شانی کی رگوں میں خون سنسنا گیا۔ ابھی اس کے اندر اس بے خوف طیش کی کچھ لہریں باقی تھیں۔ جنہوں نے اسے دیوانہ وار خونخوار کتوں کے مقابل کھڑا کردیا تھا۔ نہ صرف کھڑا کردیا تھا بلکہ اس قابل بھی بنایا تھا کہ وہ رکھوالوں تک پہنچنے سے پہلے انوری کا دفاع کرسکے۔

وہ پوری کی پوری جالاں کی طرف گھومی اور سخت لہجے میں بولی۔ ''تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں انوری کو تمہارے ساتھ نہیں بھیج رہی ہوں۔''

ایک دم جالاں کا سُرخی مائل چہرہ تمتما گیا۔ وہ نتھنے پھلا کر چند لمحے شانی کو گھورتی رہی۔

''تو پھر میں جا کر چوہدری جی سے کہہ دوں کہ آپ اسے نہیں بھیج رہیں۔'' جالاں کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

پہلے تو شانی کے جی میں آئی کہ وہ جالاں کو منہ توڑ جواب دے لیکن پھر چوہدری بشیر کا

غصیلا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ یہ صورتِ حال چند دن پہلے پیش آئی ہوتی تو شاید شانی، انوری کو بھیجنے سے صاف انکار کر دیتی لیکن آج کل حالات مختلف تھے۔ وہ بگڑے ہوئے چوہدری کو مزید تاؤ دلاتی تو یہ خطرناک ہوتا۔ وہ گہری سانس لے کر جالاں سے مخاطب ہوئی۔ ''تم تھوڑی دیر صبر نہیں کرسکتی ہو۔ مجھے اس کا خون وغیرہ تو بند کرنے دو۔ جاؤ اُدھر گراؤنڈ میں جا کر بیٹھو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''

''جو کرنا ہے جلدی کریں۔ یہ نہ ہو کہ چوہدری صاحب ہم پر چھتر اتار لیں۔'' جالاں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ پھر اس نے گن مین کو اشارہ کیا اور اسے لے کر لان کی طرف چلی گئی۔

انوری کا رنگ زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی چوٹیں دیکھ کر شانی اپنی چوٹیں بھول گئی تھی۔ وہ اسے لے کر اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ زہرا بھی ساتھ تھی۔ انوری کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں سے ہمدردی آمیز پریشانی جھلک رہی تھی۔ ان دونوں نے مل کر انوری کی خون آلود قمیص اتاری۔ زہرا جلدی سے روئی، پٹی اور پائیوڈین وغیرہ لے آئی۔ کتوں نے دو تین جگہ سے انوری کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک زخم ہاتھ پر تھا...... ایک کندھے اور گردن کے درمیان، ایک پنڈلی پر۔ شکر تھا کہ کوئی زخم بھی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ شانی نے زخم صاف کرنے کے بعد خون روکنے کی کوشش کی۔ خون رک گیا تو اس نے دوا لگا کر اچھی طرح پٹی باندھ دی۔ پٹی باندھنے کے بعد اس نے زہرا کو باہر بھیج دیا۔ انوری پھر واویلا کرنے لگی۔

''بی بی جی......! یہاں مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے جی...... ایک چوہدری قادرا نام کا بندہ ہے یہاں، وہ بڑا زہریلا ہے۔ اسے دیکھ کر تو میری جان نکل جاتی ہے اور ایک......''

''میں جانتی ہوں سب کچھ۔'' شانی نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے تمہارے بارے میں کافی دنوں سے پتا ہے۔ میرے ہی کہنے پر یہ لوگ تمہیں مردوں والے حصے سے نکال کر کوٹھی کے اندر لائے تھے۔ کوٹھی میں آنے کے بعد تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟''

''نہیں جی! یہاں آ کر نہیں ہوئی۔ پر اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہوگی کہ میں اپنے بچوں سے دور ہوں۔ وہ میرے لئے دن رات روتے ہوں گے۔ ان کا ابو کملوں کی طرح ڈھونڈتا پھرتا ہوگا...... لیکن...... لیکن کیا آپ کو سچ مچ پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟''

شانی اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میری بات ہوئی تھی چوہدری بشیر سے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے لیکن تم نے اس طرح بھاگ کر سارا کام خراب کردیا ہے۔ تم شروع سے بیوقوف ہو۔ اتنے دن ہوگئے ہیں تمہیں یہاں رہتے ہوئے۔ تم کو اب تک پتا نہیں چلا کہ یہاں سے بھاگا جاسکتا ہے یا نہیں۔ دو دو

چار دیواریاں ہیں یہاں۔ رکھوالی کے کتے ہیں۔ گارڈ ہیں۔ پچھلے دنوں قادرے کے بندے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یہاں اس کے بعد نگرانی اور سخت ہوگئی ہے۔ تم نے کیا سمجھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی؟''

انوری کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ''معلوم نہیں جی، کیا ہوگیا تھا مجھے۔ پچھواڑے کے باغ والا دروازہ پچھلے دو دن سے کھلا ہوا ہے۔ شاید تالا خراب ہوگیا ہے اس کا... بس کنڈی لگی ہوئی تھی۔ وہاں پہرے دار گل زمان ہوتا ہے۔ آج شام اسے ہیضہ ہوگیا تھا وہ اپنے کوارٹر میں دوا کھا کر سویا پڑا تھا۔ میری بُری قسمت۔ مجھے لگا کہ میں کسی طرح باغ کے دروازے سے باہر نکل کر کھیتوں تک پہنچ گئی تو یہاں سے نکل سکوں گی۔''

وہ پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اس کی ہر سسکی میں اس کے کاکے کا غم اور اس کی گڈی کا وچھوڑا تھا۔

چند لمحے بعد اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دروازے سے باہر بھی پہرے داروں کی کوٹھڑی ہے، اس کا پتا مجھے دروازے پر پہنچ کر ہی لگا۔ ابھی میں دروازے میں ہی تھی کہ ایک بندوق والا بھاگ کر میری طرف آیا۔ میں ڈر کر واپس بھاگی اور باغ سے نکل کر ویہڑے کی طرف چلی گئی۔ اللہ جانے کیا ہوگیا تھا مجھے۔ بس دل چاہتا تھا کہ میں کسی طرح اس چار دیواری سے نکل جاؤں، میں بڑے گیٹ کی طرف بھاگی۔ سوچ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ گولی ہی لگ جائے گی ناں مرہی جاؤں گی۔ ابھی گیٹ سے دور ہی تھی کہ باجی فردوس وڈے باورچی خانے سے نکل کر میرے سامنے آگئی۔ اس نے مجھے روک لیا۔ میں نے اسے دھکا دے کر گرایا اور پھر بھاگی۔ اتنے میں بڑے گیٹ کی طرف سے پہرے دار للکارنے لگا اور اس کے ساتھ ہی کتوں کی آوازیں آئیں۔ میں سمجھ گئی کہ اب میری خیر نہیں۔ میں سفید پتھر والی دیواری کی طرف دوڑی اور دروازہ کھول کر اس چھوٹے احاطے میں آگئی۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں میں آپ کو دیکھوں گی۔ آپ میرے لئے رحمت کا فرشتہ بنی ہیں بی بی جی... نہیں تو اب تک کتے میری بوٹیاں اُڑا چکے ہوتے۔''

''بہرحال جو کچھ بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا انوری۔ مجھے لگتا ہے کہ تیرے لئے بڑی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ چوہدری صاحب بڑے غصے میں گئے ہیں۔''

''مجھے بڑے چوہدری صاحب سے اتنا ڈر نہیں لگتا بی بی جی...... پر وہ جو چوہدری قادرا ہے ناں وہ بہت بُرا ہے...... مجھے...... مجھے اس کے ہاتھ میں نہ دینا۔''

شانی بے قراری سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بھابو پہلے ہی

بستر پر پڑی تھی۔ اسے کسی مصیبت میں گھسیٹنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔ دوسری طرف انوری کا زرد چہرہ تھا اور اس کے زخموں سے رستا ہوا خون۔ آخر اس نے چوہدری بشیر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ زہرا کو انوری کے پاس چھوڑ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ وہ تقریباً چار پانچ منٹ کوشش کرتی رہی مگر فون سمیت چوہدری کے دونوں فون بند ملے۔ ایک پر مسلسل انگیج کی ٹون جارہی تھی، دوسرا یکسر خاموش تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چوہدری جان بوجھ کر رابطے سے دور ہے۔

شانی کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ اتنے میں برآمدے کے ساتھ والے کمرے سے جالاں کی بلند آواز سنائی دینے لگی۔ وہ انوری کو ساتھ چلنے کا کہہ رہی تھی۔ شانی بھاگ کر موقع پر پہنچی۔ جالاں کی آنکھوں میں خون کی سُرخی اُتری ہوئی تھی۔ انوری سہم کر ایک گوشے میں سمٹی بیٹھی تھی۔

''میں نے تم سے کہا بھی ہے، ذرا حوصلہ کرو۔ میں چوہدری صاحب سے بات کر رہی ہوں۔'' شانی کو جالاں کو مخاطب کر کے سخت لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ جالاں کوئی الٹا سیدھا جواب دیتی۔ سنگِ مرمر کی دیوار کے پار سے کسی نے بھاری بھرکم آواز میں چنگھاڑ کر کچھ کہا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز دور تک سنائی دی۔ آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی گالیاں بک رہا ہے اور چلا چلا کر کسی ملازم سے کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ چوہدری بشیر کی آواز ہرگز نہیں تھی۔ چند لمحے بعد یہ جان کر شانی کی رگوں میں خون منجمد ہوگیا کہ یہ چوہدری قادرے کی آواز ہے۔ وہ موقع پر پہنچ گیا تھا اور اب صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ایک شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے میں آیا اور پھر شانی تک پہنچ گیا۔ یہ قادرے کا خاص ملازم ارشد حسین تھا۔ اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چوہدرانی اس عورت کو قادر صاحب بلا رہے ہیں..... فوراً۔''

''میں چوہدری بشیر صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟''

''وہ کوٹھی میں نہیں ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جیپ میں بیٹھ کر کہیں نکلے ہیں۔ اب اس زنانی کو بھیجنے میں دیر نہ کریں، ورنہ قادر صاحب سخت ناراض ہوں گے۔''

''لیکن......'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

ارشد حسین نے نہایت مؤدب لہجے میں کہا۔ ''آپ ذرا ایک طرف ہوکر میری بات سن

لیں گی؟''

شانی اس کے ساتھ برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔ ارشد حسین تحمل سے بولا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ قادر صاحب کچھ نہیں کہیں گے اس عورت کو۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو تھپڑ مار لیں گے لیکن اگر آپ اس کو بھیجیں گی نہیں تو پھر معاملہ خراب ہو جائے گا......''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایک دو تھپڑوں کے بعد اس کو معافی مل جائے گی؟'' شانی نے پوچھا۔

''جتنا میں قادر صاحب کو جانتا ہوں کوئی اور نہیں جانتا۔ میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔''

''اس کے ساتھ یہاں وہ سب کچھ ہوتا رہا ہے، جو ایک بے سہارا عورت کے ساتھ ہوسکتا ہے۔'' شانی نے آتشیں لہجے میں کہا۔

''جو کچھ پہلے ہو چکا، مجھے اس کا پتا نہیں جی۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اب چوہدرانی جی (بھابو) نے اس عورت کے لئے خاصی سفارش کی ہوئی ہے۔ قادر صاحب یا کوئی اور اس پر سختی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا...... آپ بالکل پریشان نہ ہوں......''

کچھ دیر تک شانی اور ارشد حسین نامی اس کارندے میں بحث ہوئی۔ آخر شانی اس شرط پر انوری کو ساتھ بھیجنے کے لئے راضی ہوئی کہ وہ پہلے اس بارے میں بھابو کو آگاہ کرے گی......فون پر تو رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ شانی از خود بھابو کے پاس جا نہیں سکتی تھی۔ درمیانی راستہ یہی تھا کہ وہ جالاں یا زہرا کے ذریعے بھابو کو پیغام بھیجے جالاں کو بھیجنا بے کار تھا۔ شانی نے زہرا کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ انوری کوٹھی سے بھاگنے کی کوشش میں پکڑی گئی ہے اور بڑے چوہدری صاحب یا چوہدری قادر کے پاس ہے۔

جب زہرا یہ پیغام بھابو کو دے آئی اور شانی کو تسلی ہو گئی کہ اس نے واقعی پیغام بھابو تک پہنچا دیا ہے تو اس نے انوری سے کہا کہ وہ جالاں کے ساتھ چلی جائے۔ اس نے انوری کو یقین دلایا کہ اس کے ساتھ سختی نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اس نے انوری کو یہ ہدایت بھی بڑی سختی سے کی کہ وہ یہاں پر کسی سے بھی اس کا (شانی) کا ذکر کسی صورت میں نہیں کرے گی۔

انوری کی حالت بُری تھی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے شانی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولی۔ ''بی بی جی! اگر میرا کچھ کرسکتی ہیں تو کر لیں۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ نہ بھیجیں۔ اگر ان کے ساتھ بھیجنا ہے تو پھر اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر منجی پر ڈال دیں یا میرا گلا دبا دیں۔''

وہ ضرورت سے زیادہ ڈر رہی تھی۔ شانی نے اسے پوری تسلی دی۔ سمجھایا بجھایا اور پھر جالاں کے حوالے کر دیا۔ جالاں اور ارشد حسین اسے لے کر سنگی دیوار کے پار چلے گئے۔

رات کا باقی حصہ شانی نے سخت بے قراری کے عالم میں کاٹا۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کی آنکھ لگی بھی تو ''جان'' عذاب ناک سوچوں کے شکنجے میں رہی۔ صبح ناشتے کے نام پر اس نے چند لقمے لئے اور لان کی طرف چلی گئی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ خونخوار کتوں کے ساتھ دیوانہ وار نبرد آزمائی کرنے کے اثرات تھے۔ جب دوسرے کتے نے اس پر حملہ کیا تھا تو وہ زوردار طریقے سے جالی دار دروازے کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ اس تصادم کے سبب ہاتھ اور کہنی پر جو چوٹ آئی تھی، وہ رات کو تو زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی، پر اب سارا بازو اکڑا ہوا تھا۔ رات کے واقعات ایک ڈراؤنے سپنے کی طرح لگ رہے تھے۔

شانی کو یاد آیا کہ انوری کو مرہم پٹی کے علاوہ تشنج کا انجکشن بھی لگنا چاہئے تھا اس کے علاوہ کتے کے کاٹنے کا انجکشن بھی ضروری تھا۔ یہی سوچتی ہوئی وہ لان میں پہنچی تو دفعتاً ٹھٹک گئی۔ اسے سنگ مرمر کی دیوار کے پار سے دبی دبی کرب ناک چیخیں سنائی دیں۔ یہ نسوانی چیخیں تھیں۔ شانی کا دل پھڑک کر رہ گیا۔ آواز اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ انوری کی آواز تھی۔ سنگ مرمر کی دیوار کی دوسری جانب آخری سرے پر دو تین سرونٹ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ یہ آوازیں ان میں سے ہی کسی ایک کوارٹر میں سے آ رہی تھیں۔ انوری ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بے دردی سے مارا جا رہا ہے۔

شانی دیوار کے ساتھ لگ کر سننے لگی۔ اسے لگا جیسے دل سینے میں پھٹ جائے گا۔ یہ انوری ہی کی آوازیں تھیں۔ پہلے انوری کو کسی شے سے ضرب لگائی جاتی۔ اس ضرب سے چٹاخ کی آواز بلند ہوتی۔ پھر انوری بڑے کرب سے چیختی۔ اس کے بعد ایک اور نسوانی آواز بلند ہوتی۔ یہ یقیناً جالاں تھی، جو انوری کو مارنے کے ساتھ ساتھ بدترین گالیاں بھی دے رہی تھی۔

شانی کھڑی کھڑی سرتاپا کانپنے لگی۔ اس کا سارا جسم سردی کے باوجود پسینے سے نہا گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے، زور سے چلائے اور جالاں کو اس ستم سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس طرح وہ جالاں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

ایک اور بات بھی غور کرنے کی تھی۔ انوری پر ستم ڈھانے کے لئے کوئی اور جگہ بھی منتخب کی جاسکتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ستم ڈھانے والے انوری کی آہ و بکا شانی کو سنانا چاہتے ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ روز صبح کے وقت لان میں آتی ہے، لان میں آتے ہی وہ ''دیوار

پار'' کی یہ آوازیں آسانی سے سن لے گی۔

پٹاخ پٹاخ کی آوازوں میں اب وقفہ آ گیا تھا، انوری کی روتی بلکتی فریاد بلند ہو رہی تھی۔ غالباً وہ جالاں کی منت سماجت میں مصروف تھی۔ وہ ایک ماں تھی۔ قدرت نے اس کے سینے میں اپنے بچوں کی محبت پیوست کی تھی۔ وہ ان کی جدائی میں تڑپ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں۔ وہ ان دیواروں سے نکلنے کے لئے بار بار کوشش کرتی تھی۔ پکڑی جاتی تھی، لہولہان ہو جاتی تھی۔ بے عزتی ہوتی تھی...... مگر پھر بھی ماں ہی رہتی تھی۔ ماں تو اپنے بچوں تک پہنچنے کے لئے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزر سکتی ہے۔

شانی کے سینے سے ایک دلدوز آہ نکلی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ برآمدے میں کوئی موجود ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ زہرا تھی۔ وہ غم زدہ کھڑی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ شانی کے پاس آئی۔ ڈری ہوئی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور ہولے سے بولی۔

''چوہدرانی جی! جالاں اس کو بہت بُری طرح مار رہی ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے کوٹھری کی طرف گئی تھی تو جالاں نے اسے ننگے پاؤں کمرے کے ایک کونے میں کھڑا کیا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر کرا کے رکھے تھے۔ وہ بے چاری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خود یہ موٹو چارپائی پر بیٹھی حلوے پوڑی اور چھولوں کا ناشتہ کر رہی تھی...... اب اس خبیث نے اسے (انوری کو) چارپائی سے باندھ رکھا ہے اور گھوڑے کی لگام سے اس کو مار رہی ہے۔''

زہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ شانی کا دل سینے میں بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''زہرا! تُو نے رات کو بھابو تک پیغام پہنچا دیا تھا ناں؟''

ایک دم زہرا کی نظریں جھک گئیں۔ وہ آنسو گراتی تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ شانی سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ زہرا پیغام نہیں پہنچا سکی تھی۔ اسے چوہدری قادرے نے یا کسی اور نے روک دیا تھا اور ساتھ ہی پابند کر دیا تھا کہ وہ یہ بات شانی کو نہیں بتائے گی۔

''اوہ خدا میں کیا کروں؟'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ چوہدری بشیر بالواسطہ اسے سزا دے رہا ہے۔ وہ انوری کو اذیت دلا کر دراصل اسے اذیت میں مبتلا کر رہا ہے۔ اب تو شانی کے ذہن میں ایک اور بات بھی آ رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ کل رات ناسمجھ انوری کو جان بوجھ کر ہی بھاگنے کا موقع دیا گیا ہو۔ تا کہ اسے پکڑ کر عبرت کا سامان بنایا جا سکے۔ پولیس والے بھی اکثر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال

کرتے ہیں۔ قیدی کو پہلے نکل بھاگنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے پھر زندگی سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ پچھواڑے کے باغ کا آہنی دروازہ دو دن تک کھلا رہا اور درجنوں پہرے داروں اور مالیوں میں سے کسی کی نظر اس کے قفل پر نہیں پڑی۔ پہرے دار گل زمان کا بیمار ہونا بھی ڈرامے کا حصہ ہو سکتا تھا۔

شانی بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک بار پھر دیوار کے پار سے دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اب یہ سب کچھ شانی کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ اٹھی اور تیزی سے اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ موہوم امید کے سہارے اس نے ایک بار پھر چوہدری بشیر کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ اسے بے حد حیرت ہوئی جب چند ہی سیکنڈ بعد چوہدری سے اس کا رابطہ ہو گیا۔

''ہیلو کون؟'' چوہدری بشیر کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ پس منظر میں گاڑیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

''میں شانی بول رہی ہوں...... آپ...... کہاں ہیں؟''

''میں تو لاہور آیا ہوا ہوں۔ کسی بندے کی ضمانت کرانی ہے۔ اس وقت ضلع کچہری میں ہوں۔'' چوہدری کی سپاٹ آواز سنائی دی۔

شانی نے بہ مشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل سے آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔ یہاں...... انوری بڑی مصیبت میں ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' چوہدری نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''جج...... جالاں نے اسے چارپائی سے باندھ رکھا ہے اور بُری طرح مار رہی ہے۔ مجھے اس بے چاری کا رونا چلانا برآمدے میں سنائی دے رہا ہے۔''

دوسری طرف چند لمحے گھمبیر خاموشی رہی، تب چوہدری نے کہا۔ ''تھوڑی بہت سزا تو اسے ملنی چاہئے تھی لیکن جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ بھی زیادہ ہے۔ شاید قادرے نے جالاں سے کچھ کہا ہو گا......''

''آپ...... آپ کچھ کریں۔ ورنہ وہ اسے مار دے گی۔'' شانی رو دینے کے قریب تھی۔

چند سیکنڈ کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد چوہدری کی آواز سنائی دی۔ ''اچھا۔ میں قادرے کو فون کرتا ہوں۔''

''لیکن اگر فون نہ مل سکا تو پھر؟'' شانی کے لہجے میں اَن گنت اندیشے تھے۔

''اچھا اس لڑکی کو بلاؤ جو تمہارے پاس ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''زہرا۔''

''ہاں بلاؤ اسے۔''

شانی ریسیور رکھ کر دوڑتی ہوئی کچن میں پہنچی اور زہرا کو کھینچ لائی، چوہدری بشیر نے زہرا سے بات کی اور فون بند کر دیا۔ زہرا کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ملی جلی کیفیت نے شانی کو سمجھا دیا کہ ستم زدہ انوری پر سے مصیبت ٹل گئی ہے...... زہرا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی تیزی سے جالاں کی طرف چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد سنگ مرمر کی دیوار کے پار سے ابھرنے والی دلدوز آوازیں تھم گئیں۔

شام کو شانی کا سکون ایک بار پھر غارت ہو گیا۔ اس نے چھت پر سے ایک ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔ وہ اپنا میڈیکل باکس تھامے، تیزی سے کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف جا رہے تھے۔ ملازم بھی ان کے ساتھ تھا۔ شانی کا دھیان فوراً بھابو کی طرف چلا گیا...... شاید بھابو کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ مگر دس پندرہ منٹ بعد اسے پتا چلا کہ ڈاکٹر بھابو کے لئے نہیں مُنے کے لئے آیا تھا۔ مُنے کو تیز بخار تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔

جس دن سے شانی نے مُنے کو جھڑکا تھا اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ نہ ہی بھابو سے اس کی ملاقات ہو سکی تھی، زہرا کی زبانی پتا چل رہا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ شانی تڑپ اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر چوہدری بشیر سے موبائل پر رابطہ کیا۔ چوہدری غالباً فیکٹری میں تھا۔ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''اب کیا بات ہے۔ انوری کی مرہم پٹی کروا دی ہے، انجکشن بھی لگوا دیئے ہیں۔ وہ بالکل آرام سے ہے۔''

''میں مُنے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ اسے سخت بخار ہے۔''

''وہ تو دو تین دن سے ہے۔''

''میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

چند لمحے توقف کرنے کے بعد چوہدری نے کہا۔ ''میرے خیال میں تم اس بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دو تو بہتر ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم وہ سب کچھ کر رہی ہو، جو اس کے لئے خطرناک ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ تم میں بُری طرح انوالو ہے۔ تم اسے اور زیادہ انوالو کر رہی ہو۔ جب وہ تمہارے قریب رہنا چاہتا ہے تو اسے دھتکارتی بھی ہو۔ تم اس کی سوچ اور اس کے ذہن کے ٹکڑے کر رہی ہو۔ مجھے تو ڈر ہے

کہ وہ ذہنی مریض نہ بن جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس نے جتنی تکلیف برداشت کرنی ہے۔ ایک ہی بار کر لے اور تمہارے خیال کو دل سے نکال دے۔''

''میں نے کیا کہا تھا اس سے؟ صرف یہی کہا تھا ناں کہ وہ میرے پاس سونے کی ضد نہ کرے۔ بھابو اس کے بغیر اکیلی رہ جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اسے نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہے۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ نہیں ہے۔'' چوہدری نے خشک لہجے میں کہا۔

شانی کا دل جیسے کوئی مٹھی میں مسل رہا تھا۔ وہ چوہدری کے لہجے میں چھپے ہوئے ہر شکوے، ہر طنز کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''اگر آپ میری وجہ سے ناراض ہیں۔ تو میں معافی مانگ لیتی ہوں لیکن میری غلطی کی سزا مُنے یا بھابو کو نہ دیں۔''

''میں تمہیں سزا دینے والا کون ہوتا ہوں۔ میں تو کوئی ایسا رستہ سوچ رہا ہوں کہ تم حفاظت کے ساتھ اس چار دیواری سے آزاد ہو سکو۔''

''میں قید نہیں ہوں۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔ یہ فقرہ ان فقروں میں سے تھا جو دل سے نہیں صرف زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ ورنہ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ وہ کتنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''کیا میں مُنے سے مل سکتی ہوں؟''

''اگر ضروری سمجھتی ہو تو مل لو۔'' چوہدری نے بظاہر بے دلی سے اجازت دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ جالاں کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی۔ مُنے کو دیکھ کر اس کا کلیجہ کٹ گیا۔ وہ سچ مچ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ پھول کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مرجھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے گلوکوز لگا دیا تھا۔ بھابو جو خود بھی بیمار تھی اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ بھابو کا لباس خستہ تھا اور بالوں میں شاید کئی دن سے کنگھی ہی نہیں کی گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ شانی پہلے خوابیدہ مُنے کے بوسے لیتی رہی۔ پھر بھابو کا منہ سر چومنے لگی۔ جیسے بھابو اس سے بڑی نہ ہو چھوٹی ہو۔

اس نے پانی گرم کر کے بھابو کو زبردستی نہلایا۔ اسے استری شدہ کپڑے دیئے۔ پھر اس کے بالوں میں دیر تک کنگھی کی۔ ساتھ ساتھ وہ مُنے کا خیال بھی رکھ رہی تھی۔ وہ رات گئے تک کوٹھی میں رہی اور پھر انیکسی میں واپس آ گئی۔ آتے ہوئے اس نے چوہدری سے کل کے

بارے میں پوچھ لیا تھا۔ چوہدری نے کہا تھا کہ وہ دن کے وقت ہر صورت اینکسی تک ہی محدود رہے۔ ہاں شام کے بعد جالاں یا زہرا کو بھیج کر پتا کروا لے کہ کوٹھی میں کوئی مہمان تو نہیں ہے۔ اگر نہیں...... تو پھر وہ آسکتی ہے۔

اگلے تین روز تک وہ باقاعدگی سے شام کے بعد کوٹھی گئی اور دس گیارہ بجے تک وہاں رہی۔ مُنے کی طبیعت اب سنبھل گئی تھی۔ بیماری کی وجہ ہی دور ہوگئی تھی تو طبیعت کیوں نہ سنبھلتی۔ اسے شانی کی مہربان باہیں اور گرم آغوش پھر سے مل گئی تھی۔ تیسرے دن وہ ہشاش بشاش تھا۔ شانی اسے اپنے زانو پر بٹھا کر چمچ سے دوا کھلا رہی تھی اور وہ ادائیں دکھا رہا تھا۔ بھابو بستر پر نیم دراز بڑی محویت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ یکا یک بے ساختہ انداز میں بولی۔

''شانی......! اگر مجھے کچھ ہوگیا، تو تُو ان دونوں کو سنبھال لے گی ناں......؟''

شانی چونک کر بھابو کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا مطلب بھابو؟''

بھابو پہلے تو گھبرائی۔ جیسے ڈر گئی ہو کہ اس نے ایسی بات کیوں کر دی پھر سنبھل کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ ''تُو تو ایسے ڈر گئی ہے جیسے میں سچ مچ اللہ کو پیاری ہو رہی ہوں...... پاگلے! میں تو تیرا دل دیکھتی ہوں۔ جب میری کسی ایسی بات پر تیرا رنگ پیلا پڑتا ہے ناں......تو مجھے پتا چلتا ہے کہ تُو مجھ سے بہت ہی زیادہ پیار کرتی ہے اور جس کو کوئی اتنا زیادہ پیار کرتا ہو وہ بھلا مرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟''

شانی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ گھمبیر لہجے میں بولی۔ ''بھابو! کسی دن تیری میری اتنی سخت لڑائی ہونی ہے ناں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔''

مُنے نے شانی کی ٹھوڑی پکڑی اور اس کی توجہ اپنی طرف پھیر لی۔ ''تاتی! وہ میٹھی دوائی اب نہیں کھانی؟''

''میٹھی دوائی کون سی؟''

''وہ سفید والی۔'' مُنے نے کہا۔ پھر تیزی سے شانی کی گود سے نکلا اور سائیڈ بورڈ کی ایک دراز سے پلاسٹک کی ڈبیا میں بند سفید رنگ کا سفوف نکال لیا۔ شانی دیکھتے ہی پہچان گئی۔ یہ وہی دوا تھی جو حضرت صاحب اپنے نوے فیصد مریضوں کو دیتا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ہر مریض کے لئے اس کے مرض کے مطابق دوا کا ذائقہ مختلف ہو جاتا ہے۔

شانی کے ماتھے پر بل آ گیا۔ ''بھابو! تو تم مُنے کو پہلے یہ کھلاتی رہی ہو؟''

''ہاں شانی! حضرت صاحب کو ٹیلی فون پر مُنے کی ساری طبیعت بتائی تھی، پھر انہوں

نے اپنے ایک بندے کے ہاتھ دوا بھیجی تھی۔ بس دو دن ہی کھائی ہے اس نے پھر تمہارے بھائی جان نے کھانے ہی نہیں دی۔''

شانی گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ''بھابو! تمہارا یقین ہے حضرت صاحب پر۔ میں کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتی جو تمہیں بُری لگے۔ مگر کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ تم سے بڑا پیار کرتی ہوں ناں۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے ہی غلطی لگ رہی ہو۔ پر مجھے حضرت صاحب کی اور ان کے علاج کے طریقے کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ تم دیکھو اگر......''

معاً شانی کو چپ ہونا پڑا۔ بیرونی دروازے کی طرف سے چوہدری بشیر کی آواز سنائی دی۔ وہ ابھی ابھی فیکٹری سے آیا تھا اور ملازمہ کو پکار رہا تھا۔

شانی نے وال کلاک دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔ ''اچھا، اب میں چلتی ہوں'' وہ سر پر آنچل لیتے ہوئے بولی۔

مُنا ٹھنک گیا۔ ''تاتی......! آج تو میں ضرور تمہارے پاس سوؤں گا۔ تمہارے کمرے میں۔''

بھابو مسکرائی۔ ''دیکھو اس کے دماغ میں ابھی تک وہ بات اٹکی ہوئی ہے۔ بڑا ضدی ہے۔''

شانی نے کچھ دیر اسے ٹالنے کی کوشش کی، مگر پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے ساتھ لیٹ گیا اور دیر تک اپنی معصومانہ باتوں سے اس کا دل بہلاتا رہا۔ دھیرے دھیرے دونوں نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

دوبارہ شانی کی آنکھ ایک ''لمس'' کے سبب کھلی۔ اس کے دائیں رخسار پر ہولے ہولے سے کچھ رینگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پوری کھولیں۔ پہلے تو اسے لگا کہ وہ کوئی سپنا دیکھ رہی ہے۔ ایک ڈرا ہوا احساس اس کے رگ و پے میں پھیل گیا۔ چوہدری بشیر رکوع کے انداز میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت شانی کے رخسار کو سہلا رہی تھی۔ اس کے انداز میں عجیب ہیجانی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخی مائل تھیں اور جھکنے کے باعث پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

شانی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چوہدری بھی پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مُنا شانی کے پہلو میں سو رہا تھا۔ شانی نے کچھ کہنا چاہا مگر چوہدری نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا اور سمجھایا کہ مُنا جاگ جائے گا۔

شانی آہستگی سے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نگاہ صوفے پر پڑی اور وہ حیران رہ گئی یہاں چوہدری کا کیمرا اور لینسز وغیرہ پڑے تھے۔

چوہدری اس کی نظر کا زاویہ دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا ''دوسری بار یہاں آیا ہوں۔ دس منٹ پہلے مُنّے کو دیکھنے آیا تھا۔ پھر تمہیں اور مُنّے کو ساتھ لیٹے دیکھا تو اندر کا فوٹوگرافر بیدار ہو گیا۔ کیمرا لینے چلا گیا۔ تمہاری بے خبری میں تمہاری تصویر بنائی ہے۔ امید ہے بُرا نہیں مانو گی۔''

شانی مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔ میرے پاس بُرا ماننے کی گنجائش ہی کہاں ہے۔

چوہدری نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے اور اپنے فربہ جسم کو سکوڑا۔ ''آج سردی روزانہ سے زیادہ ہے۔'' وہ بولا۔

وہ شب خوابی کے لباس میں تھا، غالباً بھابو کے سو جانے کے بعد آیا تھا۔ شانی نے ازراہِ اخلاق کہا۔ ''آگ جلا دوں؟''

چوہدری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آتش دان میں لکڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ شانی نے کیروسین ڈال دیا سلائی دکھا دی۔ چوہدری نے کرسی اٹھا کر آتش دان کے پاس رکھ لی...... دوسری کرسی پر شانی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آ...... آپ کے لئے چائے بناؤں؟''

''نہیں...... میں کچھ اور پی رہا ہوں۔ چائے کی ضرورت نہیں۔ تم بس پاس بیٹھ جاؤ۔'' وہ بولا۔

شانی آنچل درست کرتی ہوئی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چوہدری نے سلیپنگ گاؤن کی جیب میں سے ٹن پیک وسکی کی کوارٹر بوتل نکالی اور دو گھونٹ لے کر واپس گاؤن میں رکھ لی۔ اس کے منہ سے اٹھنے والی بُو شانی کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ وہ پاؤں پسار کر آتش دان کے سامنے بیٹھ گیا اور شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''بہت سنا تھا کہ پیار کرنا یا نہ کرنا بندے کے بس میں نہیں ہوتا، لیکن اس بات پر یقین تم سے ملنے کے بعد آیا۔'' اس نے کہا اور اس کے ہاتھ نے بے باکی سے شانی کے ہاتھ کو مسلنا شروع کر دیا۔

''یہ مت سمجھنا کہ مجھے مقبول سے یا بچوں سے محبت نہیں۔ میں ان سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کوئی بھی شخص اپنی فیملی سے کر سکتا ہے لیکن ''جو کچھ'' تمہارے ساتھ ہے وہ بھی اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے۔ یہ بات تو تم بھی اچھی طرح سمجھ سکتی ہو کہ میں عورت کا بھوکا نہیں۔ مجھ

جیسے بندے کے لئے یہ بالکل مشکل نہیں کہ وہ ہر رات ایک نئی خوبصورت لڑکی کے ساتھ گزارے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ بتاؤ بھئی غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔

''اب تم اپنی طرف دیکھو۔ تم کتنے دن سے یہاں موجود ہو۔ کیا تمہارے ساتھ کبھی، کسی طرح کی زبردستی ہوئی ہے؟''

اس سوال کا جواب واضح طور پر ''ہاں'' میں تھا۔ مگر شانی جانتی تھی کہ وہ یہ جواب نہیں دے سکتی۔ ہونٹ بظاہر آزاد تھے مگر حقیقت میں سلے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

چوہدری کی مکالمے بازی جاری رہی، ہلکا ہلکا خمار اس کے لہجے سے جھلکتا رہا۔ اس کا ہاتھ شانی کے ہاتھ سے مصروفِ کار رہا۔ شانی نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے انوری کی بات چھیڑ دی۔ وہ انوری کے لئے چوہدری سے رعایت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے چوہدری سے درخواست کی کہ کسی بھی طرح انوری کو اس کے بال بچوں میں واپس بھیج دیا جائے۔

چوہدری کی پیشانی پر نظر آنے والی سلوٹوں سے اندازہ ہوا کہ یہ کام اس کے لئے مشکل ہے۔ بہرحال یہ ایسی مشکل نہیں تھی جس کا کوئی حل ہی نہ نکل سکے۔ شانی کا اصرار دیکھتے ہوئے چوہدری نے وعدہ کیا کہ وہ دو تین دن کے اندر اس کام کے لئے کوئی نہ کوئی رستہ ڈھونڈ لے گا۔

آدھی رات کے بعد چوہدری لڑکھڑاتا ہوا کوٹھی کی طرف چل دیا۔ ایک قریبی کمرے میں جالاں اور زہرا سو رہی تھیں لیکن کون جانتا تھا کہ سو رہی ہیں یا نہیں۔ خاص طور سے جالاں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

☆======☆======☆

اگلے روز دوپہر کو شانی بند کمرے میں دیر تک اس موبائل فون کو گھورتی رہی جس پر وہ رستم سے رابطہ کیا کرتی تھی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ذہن گواہی دے رہا تھا کہ سرکش ہواؤں کا رخ اس کی زندگی کے سفینے کو کسی اور سمت میں دھکیل رہا ہے۔ وہ اس کنارے سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی جس پر رستم کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

اپنے آخری فون میں شانی نے نہ جانے کس کیفیت کے زیر اثر رستم کے دل میں آس کی ایک کرن روشن کر دی تھی۔ اس نے رستم کو انتظار کرنے کو کہا تھا، لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہر روز اس کے فون کی راہ دیکھتا ہوگا۔ دن میں کئی

مرتبہ اس کی نگاہ فون سیٹ کی طرف اٹھتی ہوگی۔ وہ ہر بیل پر چونک جاتا ہوگا۔

شانی کے لئے یہ تصور کرب ناک تھا کہ کوئی کسی حوالے سے اس کا انتظار کر رہا ہے اور یہ تو انتظار بھی ایسا تھا جس کے آخر میں تکلیف کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شانی کے دل میں آئی کہ وہ رستم کو ایک فون کرے "آس کی کرن" بجھا دے جو اس نے چند دن پہلے دانستہ یا نادانستہ جگائی تھی۔ وہ اسے مناسب الفاظ میں یہ بات سمجھا سکتی تھی کہ وہ اس کا انتظار کرنا چھوڑ دے۔

دس پندرہ دن پہلے بھابو نے ایک کارڈ شانی کو دیا تھا۔ یہ موبائل کنکشن کا واؤچر کارڈ تھا۔ بھابو نے بتایا تھا کہ چوہدری صاحب کی دراز میں ایسے کئی کارڈ پڑے ہیں۔ اس کارڈ کا نمبر موبائل سیٹ میں داخل کر کے شانی اپنے موبائل سیٹ کو ورکنگ پوزیشن میں لا سکتی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئی۔ اب موبائل سیٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ یہ اہم فیصلہ کرنے میں مصروف تھی کہ رستم یا شیری سے رابطہ کرے یا نہیں۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ شانی کے اندر شدید کشمکش ہونے لگی۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ موبائل فون مٹھی میں دبا کر وہ کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔ وہ اپنے اندر رستم سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ قدم جمانے لگی کہ شاید رستم آہستہ آہستہ خود کو سنبھال لے۔ اس کے انتظار کی طوالت اس کے انتظار کی شدت کو کم کر دے۔ وہ خود تو اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ شانی تک آنے کے لئے اس کے پاس کوئی راہ ہی نہیں تھی۔ اس حوالے سے شانی تقریباً محفوظ ہی تھی۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ آخر اس نے موبائل سیٹ ایک بار پھر اٹیچی کیس میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا دیا۔ سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ منہ سر لپیٹ کر کہیں لیٹ جائے اور دل کھول کر رو دے لیکن ابھی تھوڑی دیر میں مُنا آنے والا تھا۔ شانی نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے لئے آلو والا پراٹھا اور انڈے کا حلوہ بنائے گی۔

تھوڑی دیر بعد مُنا آگیا۔ اسے چوہدری بشیر نے گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ مُنے کا کتابوں والا بیگ بھی چوہدری کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ چوہدری بڑی جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر شانی کا ماتھا ٹھنکا۔ "یا اللہ خیر۔" اس کے ہونٹوں سے دعائیہ کلمہ نکلا۔

چوہدری نے عجلت میں مُنے کو شانی کے حوالے کیا اور بولا۔ "مقبول کی طبیعت ایک دم خراب ہوگئی ہے۔ ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ مُنے کو اپنے پاس ہی رکھنا۔"

"ہائے میں مری، کیا ہوا بھابو کو؟"

"بس وہی دورہ سا پڑا ہے۔" چوہدری نے کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ شانی "سنیے سنیے" ہی کرتی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ مُنے کو سینے سے چمٹا کر وہ تیز قدموں سے درمیانی دیوار تک آئی۔ یہ اس کی آخری حد تھی۔ وہ اس سے آگے جانے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ چوہدری جاتے جاتے دروازہ اپنی طرف سے بند کر گیا تھا۔

ایک پہرے دار کی بلند آواز شانی کے کانوں تک پہنچی۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی کو پکار رہا تھا۔ "باہر والا گیٹ کھولو...... جلدی کرو۔"

پھر ارشد حسین کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ ڈرائیور احتشام کو گاڑی ریورس کر کے پورچ میں لانے کا کہہ رہا تھا۔ دیوار کی دوسری طرف افراتفری کے آثار محسوس ہوتے تھے۔ شانی بے چارگی سے کبھی بند دروازے کی طرف دیکھتی تھی، کبھی پتھریلی جالیوں سے چہرہ لگاتی تھی۔ اسے پورچ والا حصہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پھر اس خیال سے کہ شاید چھت پر سے وہ کچھ دیکھ سکے، وہ مُنے کو سینے سے لگائے چھت کی طرف بھاگی۔ خبیث جالاں نے چھت والے دروازے کو تالا لگا رکھا تھا۔ چابی ڈھونڈتے اور دروازہ کھولتے دو تین منٹ مزید لگ گئے۔ وہ چھت پر پہنچی تو ایک سٹیشن ویگن اس کی بھابو کو لے کر بڑی تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک ٹویوٹا کار تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گاڑیاں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ احاطے اور ڈرائیووے پر بس چہ میگوئیاں کرتے ہوئے ملازم اور گارڈ رہ گئے۔ شانی نے سہمے ہوئے مُنے کو گلے سے چمٹا لیا اور اپنے آنسو اس سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تاتی......! امی کو کہاں لے گئے ہیں؟" مُنے نے پوچھا۔

"ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔ وہ دوا وغیرہ دے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"تم سچی کہہ رہی ہو ناں؟"

"میں تم سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟"

اس دوران میں شانی کی نگاہ مُنے کی پھولی پھولی جیب پر پڑی۔ اس نے دیکھا۔ یہ کچھ روپے تھے۔ 700 روپے ایک تہہ میں تھے، 700 روپے دوسری میں۔ "کس نے دیئے ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"امی نے......" وہ توتلی زبان میں بولا۔

"کب؟"

"صبح جب وہ تصویریں دیکھ رہی تھیں۔"

"کس کی تصویریں؟"

"میلی (میری)..... ندیم بھائی کی..... ابو کی..... اور چاچو کی..... وہ رو بھی رہی تھیں... پھر..... پھر انہوں نے مجھے یہ روپے دیئے۔ خرچ کے لئے۔ آدھے روپے میلے ہیں، آدھے ندیم بھائی کے۔ وہ کہہ رہی تھیں اکٹھے بازار جا کر بہت سی چیزیں لے آنا۔"

"ندیم کدھر ہے؟" شانی نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو اپنے سکول میں ہے ناں۔ امی اس کو بہت یاد کر رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ ابو کہتے تھے، میں کل ندیم بھائی کو یہاں لے آؤں گا۔ پھر ہم دونوں اکٹھے بازار جائیں گے۔"

"امی اور کیا کہتی تھیں؟"

"کچھ بھی نہیں بس میلے اور ندیم بھائی کے کپڑے نکال نکال کر دیکھتی تھیں اور روتی تھیں۔ وہ کیوں روتی ہیں تاتی؟ کیا ان کو بہت زیادہ درد ہوتا ہے؟"

"ہاں منے! کبھی کبھی ماؤں کو بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔" شانی نے آنسو ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ خود بخود اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیسے انوری کا خیال بھی شانی کے ذہن میں آ دھمکا تھا۔

شانی کے آنسو دیکھ کر منا اور بھی گھبرا گیا۔ اپنے ننھے منے سرد ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "نہ رو تاتی! امی کہتی تھیں اگر تم لوگ روؤ گے تو میں کبھی واپس نہیں آؤں گی لیکن اگر تم ہنستے کھیلتے رہو گے۔ دل لگا کر پڑھو گے اور پڑھتے رہو گے تو پھر میں ایک دن واپس آ جاؤں گی۔ کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں جاؤں ہی نہ۔"

منے نے چند لمحے توقف کیا پھر اپنی من موہنی آنکھیں حیرت سے جھپکا کر بولا۔ "تاتی..! امی نے کہاں جانا ہے؟ وہ مجھ کو بتاتی کیوں نہیں؟"

شانی نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ "انہوں نے کہیں نہیں جانا منے۔ وہ تم سے مذاق کرتی ہیں۔"

"پر..... وہ مذاق کرتے ہوئے روتی کیوں ہیں تاتی؟"

شانی کے پاس منے کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اسے لے کر باہر لان میں آ گئی اور بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ وہ چوہدری کو اس کے موبائل پر کال کرنا چاہتی تھی مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں، بھابو کے بارے میں کیا خبر ملتی۔ وہ سب دعائیں جو اسے یاد

تھیں..... وہ پڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور دل زخمی پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ نوعمر ملازمہ زہرا بھی پتھر کی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس نے وہ منظر دیکھا تھا جب بھابو کو ہسپتال لے جانے کے لئے گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بھابو کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا اور وہ بہت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھیں۔ چوہدری بشیر، بھابو کے ساتھ ہی سٹیشن ویگن میں سوار ہوا تھا۔

مزید آدھ پون گھنٹہ انتہا درجے کی بے قراری میں گزارنے کے بعد شانی ٹیلی فون کے سامنے آن بیٹھی اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ چوہدری بشیر کا موبائل نمبر ملایا۔ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ رابطہ بھی کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی کر رہی تھی کہ رابطہ نہ ہو۔

اتنے میں جالاں اپنے فربہ جسم کو جھلاتی ہوئی انیکسی میں داخل ہوئی۔ آج تو اس کے کرخت چہرے پر بھی پریشانی کی ایک دو لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ شانی کا دل چاہا کہ اس سے کچھ دریافت کرے۔ وہ یہاں کی خاص ملازمہ تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس ہسپتال سے کوئی خبر آئی ہو لیکن پھر اس نے جالاں کو مخاطب کرنے کا ارادہ بدل دیا۔ جب سے انوری والا واقعہ ہوا تھا۔ شانی نے جالاں سے کلام نہیں کیا تھا۔ اسے جالاں کی صورت سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر شانی کے کانوں میں انوری کی کربناک چیخیں گونجنے لگتی تھیں اور وہ گالیاں اس کی سماعت کو جھنجھوڑنے لگتی تھیں، جو اس موقع پر جالاں کی پلید زبان سے ادا ہوئی تھیں۔ وہ محوِ حیرت تھی کہ کیا ایک عورت بھی ایسے آہنگ میں اس طرح کی گالیاں دے سکتی ہے۔ اس دن کے بعد شانی نے جالاں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کھانے پینے کی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگائے گی لیکن آج وہ پھر کچن میں تھی۔ شاید اس کا ارادہ شانی کے ساتھ کسی طرح کی محاذ آرائی کا تھا۔

سہ پہر چار بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی اور شانی کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس میں ریسیور اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کے اشارے پر زہرا نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف چوہدری بشیر ہی تھا۔ چوہدری بشیر نے شانی کو بلایا تو اسے مجبوراً ریسیور تھامنا پڑا۔

"خیریت تو ہے ناں؟" شانی کی آواز میں سینکڑوں اندیشے ہزار ہا امیدوں کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہے۔ آکسیجن لگی ہوئی ہے۔"

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹر..... ؟"

"اگلے تین چار گھنٹے اہم ہیں۔ اگر طبیعت سنبھل گئی تو پھر بہتری کا سوچا جاسکتا ہے۔"

"ندیم کہاں ہے؟" شانی نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

"قادر اسے لینے ایبٹ آباد گیا ہے۔ وہ آج رات کسی وقت آجائے گا۔"

"کک.....کیا میں..... اس سے مل لوں؟"

"نہیں..... بالکل نہیں۔" چوہدری کے لہجے میں سختی آگئی۔ "جب تک میں نہ کہوں تم انیکسی سے باہر نہیں نکلو گی۔" پھر وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہاری بہتری کے لئے ہی ہے۔"

اگلے تین چار گھنٹے شانی نے پھر سولی پر لٹکتے گزار دیئے۔ آخر آٹھ بجے کے قریب چوہدری کا فون دوبارہ آیا۔ اس نے بتایا کہ مقبول کی حالت میں معمولی بہتری آئی ہے۔

شانی کی آنکھیں پھر چھلک گئیں۔ اس مرتبہ آنسوؤں میں تشکر کی جھلک تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چہرے پر اندیشوں کی پرچھائیاں بھی مستحکم تھیں۔ اس نے فون بند کرنے کے بعد کھڑکی میں سے مُنے کو دیکھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں میز کے ساتھ بیٹھا تھا اور بڑے انہماک سے اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔ دل میں گہرا دکھ چھپائے وہ اپنی امی کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ امی نے کہا تھا کہ وہ آنسو نہیں بہائے گا اور دل لگا کر پڑھے گا تو وہ پھر واپس آجائے گی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کہیں جائے ہی نہ۔

وہ مُنے کو دیکھتی رہی، ندیم کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کے سینے میں محبت کا سوتا پھوٹتا رہا۔ وہی شفیق جذبہ جو رب العزت نے عورت کی مٹی میں گوندھ رکھا تھا۔ اس کے کانوں میں بھابو کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو ایک دن، کسی سوچ میں گم، اس نے بے ساختہ کہہ ڈالے تھے..... "شانی اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تم ان کو سنبھال لو گی ناں؟" یہ چند الفاظ تھے، لیکن ان کے پیچھے ایک انمول رشتے کا بخشا ہوا بے پناہ اعتماد اور بھروسا تھا۔ وہ سوچتی رہی، ان الفاظ کے بارے میں، اپنی بھابو کے بارے میں اور ان حالات کے بارے میں جو تیزی سے اس کی سمت بڑھ رہے تھے۔

اس نے کمرے میں جاکر والہانہ انداز میں مُنے کا منہ سر چوما اور پھر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی اندرونی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ اس نے اندر سے بند کیا اور اٹیچی کیس کی تہہ سے موبائل فون نکال لیا۔ اب موبائل فون اس کے سامنے تھا۔ وہ چند بٹن پریس کرکے رستم سے رابطہ قائم کرسکتی تھی۔ مگر اس نے موبائل فون کو رابطہ قائم کرنے کے لئے

نہیں نکالا تھا۔ وہ عجیب جذباتی کیفیت میں تھی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ پیتل کا ایک وزنی، منقش گلدان تپائی پر رکھا تھا۔ اس نے گلدان میں سے پھول نکالے اور اسے ہتھوڑے کی طرح پکڑ لیا۔ موبائل فون فرش پر رکھ کر اس نے گلدان کی چند شدید ضربیں لگائیں۔ سکرین ٹوٹ گئی۔ موبائل فون کی بیٹری چٹک کر دور جاگری اور اس کی باڈی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ وہ یکسر ناکارہ ہوگیا تھا۔ شانی نے وہ کشتی ہی جلا دی تھی جس کے ہوتے ہوئے وہ واپسی کا سوچ سکتی تھی۔ اس نے رستم سے آخری ناطہ بھی توڑ لیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی۔ صرف.....صرف ایک دن بعد، اسی چار دیواری میں، اسی چھت تلے، رستم سے اس کا سامنا ہونے والا ہے۔ "زندگی" ایسی ہی ناہموار، غیر متوقع اور بے قاعدہ چیز کا نام ہے۔

☆======☆======☆

موبائل فون توڑنے اور کتنی ہی دیر آنسو بہانے کے بعد شانی جب کمرے سے باہر نکلی تو مُنا ہوم ورک کرتے کرتے اپنی کتابوں کے اوپر ہی اوندھا پڑا سو رہا تھا۔ شانی نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا اور لحاف اوڑھا دیا۔

اسی دوران میں اسے بڑے احاطے کی طرف سے شور کی آواز آئی..... یوں لگا جیسے تین چار گاڑیاں ایک ساتھ احاطے میں داخل ہو رہی ہیں۔ اس کے ذہن میں انجانے اندیشے جاگ گئے۔ وہ تیزی سے برآمدے میں آئی اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ اپنے قرب و جوار پر نظر رکھنے کے لئے بس ایک چھت ہی اس کے پاس واحد وسیلہ تھی۔ اس نے جالی دار منڈیر کے اندر سے دیکھا، بھابو کے عطائی معالج حضرت صاحب کی جیپ بڑی شان سے کوٹھی کے پورچ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑی تھی۔ پھر ایک سٹیشن وین تھی۔ یہ قافلہ پورچ میں جاکر رک گیا۔ پورچ کا منظر چھت پر سے شانی کی نگاہوں کے سامنے واضح ہوجاتا تھا۔ شانی نے دیکھا کہ حضرت صاحب کے مریدوں اور ملازمین نے حضرت صاحب کی جیپ کو چاروں طرف سے یوں گھیر لیا تھا جیسے وہ کسی ملک کا فرماں روا ہو اور معزز مہمان کی حیثیت سے کسی دوسرے ملک کے دورے پر آیا ہو۔

چوہدری قادر، ارشد حسین اور دیگر افراد نے رکوع کے بل جھک جھک کر حضرت صاحب سے نہایت مؤدبانہ مصافحہ کیا۔ کچھ افراد اس کے ہاتھوں کو چومتے بھی نظر آئے۔ یقیناً چوہدری بشیر بھی استقبال کرنے والوں میں پیش پیش ہوتا۔ مگر وہ تو بھابو کے پاس ہسپتال میں تھا۔

قافلے میں موجود ایک گاڑی میں سے چند برقع پوش عورتیں اُتریں۔ فاصلہ کافی تھا۔

شانی کو ان کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ وہ چار پانچ کے قریب تھیں۔ یقیناً ان میں حضرت صاحب کی دو یا تین عدد جواں سال بیویاں بھی شامل تھیں۔ سٹیشن ویگن سے دو مریدان نے ایک بڑا پنجرہ بھی اتارا۔ یقینی بات تھی کہ اس میں بھی کچھ بدنصیب پرندے ہوں گے۔

یوں لگتا تھا کہ یہ ''شعبدہ باز معالج'' اس بات سے آگاہ نہیں کہ اس کی مریضہ چند گھنٹے پہلے شدید بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ چکی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو شاید وہ اتنی شان و شوکت سے یہاں قدم رنجہ نہ فرماتا۔ شانی کے سینے میں دھواں بھر گیا۔ ایک عجیب سی نفرت محسوس کی اس نے حضرت صاحب سے اور اس کی کارروائیوں سے۔ اس قماش کے لوگ اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں پر یوں گرفت کرتے ہیں کہ پیر تسمہ پا بھی ہیچ نظر آتا ہے۔ لوگوں کی پوری زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں مگر پھر بھی ان عطائیوں اور جھوٹے عالموں کے بچھائے ہوئے جال سے نہیں نکل سکتے۔ بھابو اگر آج زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ''سی سی یو'' میں پڑی تھی تو اس صورت حال میں اس شخص کا بھی بہت ہاتھ تھا، لیکن یہاں کے مکین آج بھی اس کے ہاتھ چوم رہے تھے اور انہوں نے آئندہ بھی چومنے تھے۔ کہیں ذمے داری کا تعین نہیں تھا، کوئی باز پرس نہیں تھی۔ کسی نے یہ نہیں پوچھنا تھا...... حضرت صاحب! آپ نے تو ارشاد فرمایا تھا کہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ نہ ہی کسی دیگر علاج معالجے کی ضرورت ہے۔ بیماری کے سائے سمٹتے جا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو مریضہ اگلے چاند کی پہلی تاریخوں تک بھلی چنگی ہو جائے گی لیکن اگر کوئی ہمت کر کے ایسے سوال پوچھ بھی لیتا تو یقینی بات تھی کہ حضرت جی کے پاس اس کے ایک سو جواب ہوں گے۔

شانی خون کے گھونٹ بھرتی ہوئی واپس کمرے میں آ گئی اور مُنے کے پاس لیٹ گئی۔

جالاں نے زہرا کو فوراً کوٹھی بھیج دیا تا کہ وہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں دوسرے ملازمین کا ہاتھ بٹا سکے۔ حضرت صاحب اور اس کے ساتھیوں کی آمد کے بعد کوٹھی میں ہر طرف افراتفری کے آثار محسوس کیے جا رہے تھے۔

شانی چپ چاپ بستر پر لیٹی رہی اور بھابو کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ بمشکل ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ شانی کو ایک بار پھر گاڑیوں کے انجن سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ یکے بعد دیگرے کئی گاڑیاں سٹارٹ ہوئیں۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ شانی کو یوں لگا جیسے حضرت صاحب اور اس کے ساتھی واپس جا رہے ہیں۔ اتنی جلدی ان کی واپسی ہرگز متوقع نہیں تھی۔ اسی دوران میں زہرا بھی کوٹھی سے واپس آ گئی۔ شانی کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''پروہنے (مہمان) واپس جا رہے ہیں چوہدرانی جی......''

''کیوں؟''

''پتا نہیں جی...... انہوں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں شاید...... حضرت جی کچھ ناراض ہو گئے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں جی...... پر وہاں جو باتیں ہو رہی تھیں۔ ان سے انداز ہوتا ہے کہ...... وہ بڑی چوہدرانی کے ہسپتال جانے سے ناراض ہیں۔''

شانی کے اندر طیش کی ایک بلند لہر اٹھ کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ حضرت صاحب نام کا کوٹ پتلون والا شعبدہ باز اس کے سامنے ہو اور وہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ اگر اس کی اپنی بیوی یا کوئی عزیزہ بھابو جیسی حالت میں ہو تو وہ پھر بھی اس پر جنتر منتر پھونکے گا یا ہسپتال لے جائے گا؟

رات سوتے اور جاگتے میں بھابو کا خیال ہی شانی کے دامن گیر رہا۔ وہ جیسے کانٹوں کے بستر پر تھی اور کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ جب دل بہت گھبراتا تو وہ خوابیدہ مُنے کو سینے سے لگا لیتی اور اس کے بال سہلانے لگتی۔ رات کے آخری حصے میں وہ ایک دو گھنٹے کے لئے سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ درخت کی چوٹیوں پر تھی۔ برآمدے میں چڑیاں زور شور سے چہچہا رہی تھیں۔ مُنا سو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر حسب عادت لان میں آ گئی۔ گرم چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ ٹیلی فون رات بھر خاموش رہا تھا۔ شانی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اب بھابو کی طبیعت کیسی ہے۔ وہ سنگی دیوار کی جالیوں میں سے کوٹھی کے احاطے میں جھانکنے لگی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ چوہدری بشیر ہسپتال سے لوٹا ہے یا نہیں۔

اچانک دیوار کے پار سے ایک ملازم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کچھ کہا۔

جواب میں کوٹھی کے عمر رسیدہ، باریش مالی بابا جمال نے کہا۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

ایک آتشیں تیر تھا جو شانی کے سینے کے آر پار ہو گیا۔ اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ بابا جمال کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ساتھی ملازم سے پوچھ رہا تھا۔ ''کب ہوئی فوتگی؟''

''کوئی دو گھنٹے پہلے۔''

''بہت صدمے کی بات ہے...... بہت بڑے صدمے کی بات ہے۔'' بابا جمال نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا ہے؟'' شانی کرب سے چیخ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے سنگی دیوار

کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اب دروازے کو انیکسی کی طرف سے تالا لگا دیا جاتا ہے۔

''دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔'' وہ پُر درد ہیجان میں چیختی چلی جا رہی تھی۔

اس کی آوازیں سن کر جالاں بھی بھاگتی ہوئی پہنچ گئی۔ ''کیا ہوا چوہدرانی؟'' اس نے پوچھا۔

''ان سے پوچھو۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' شانی دروازے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی چلائی۔

جالاں نے اپنے چوڑے چکلے گریبان میں سے چابی نکال کر جلدی سے دروازہ کھولا اور دوسری طرف چلی گئی۔

جالاں اور دونوں ملازمین کے درمیان جو بات ہوئی۔ اس سے پتا چلا کہ فوت ہونے والے کا نام گلریز ہے۔ وہ رشتے میں جالاں کا بھانجا تھا۔ آج صبح جی ٹی روڈ پر اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ایک تیز رفتار کار اسے کچلتے ہوئے گزر گئی ہے۔

یہ باتیں سن کر شانی کا رکا ہوا سانس پھر سے چلنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کچھ دیر کے لئے یکسر مفلوج ہو گئی تھی۔

اب دیوار کی دوسری طرف سے جالاں کے رونے اور واویلا کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ آواز فاصلے پر چلی گئی۔

آدھ پون گھنٹے بعد زہرا کی زبانی شانی کو اسی غم ناک واقعے کی کچھ مزید تفصیل معلوم ہوئی۔ گلریز کی عمر بائیس تیئس سال کے قریب تھی۔ حال میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ یہاں ''جننگ'' کے شعبے میں کام کرتا تھا اور ملازمین کے لئے مخصوص کوارٹرز میں رہتا تھا۔ صبح منہ اندھیرے وہ کسی کام سے جی ٹی روڈ کی طرف گیا اور کسی تیز رفتار گاڑی نے اسے کچل ڈالا۔

ظاہر ہے کہ جالاں دو تین روز کے لئے اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ لینے کے لئے فوراً فردوس انیکسی میں پہنچ گئی۔ اس کی پیشانی پر ابھی تک پٹی چپکی ہوئی تھی۔ یہ چوٹ اسے انوری کے ہاتھوں لگی تھی۔ یہاں نگرانی کا نظام بہت چوکس تھا۔ خصوصاً جب سے رستم کی آمد والا واقعہ ہوا تھا۔ نگرانی سے تعلق رکھنے والا ہر شخص بے حد چوکنا ہو گیا تھا۔ شانی اس صورتِ حال کو دیکھتی تو اسے یقین ہو جاتا تھا کہ چند روز پہلے انوری کو فرار کا جو موقع نظر آیا تھا، وہ اتفاقیہ نہیں تھا۔ یہ موقع اسے منصوبے کے تحت فراہم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں انوری کو ''بدست جالاں'' اس طرح مارا پیٹا گیا تھا کہ سب کچھ شانی کے کانوں تک پہنچا تھا۔ بہر حال وہ جو کچھ

بھی تھا، شانی اب اسے بھول جانا چاہتی تھی۔ اب اس کی اولین خواہش تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد انوری کو اس کے بال بچے سے ملا دے۔ اس حوالے سے چوہدری بشیر شانی سے وعدہ کر چکا تھا۔

پروگرام کے مطابق رات نو بجے کے قریب مُنا شانی کے پاس چلا آیا۔ یہ بھی چوہدری کا حکم تھا کہ مُنا دن کے وقت شانی کے پاس نہیں آئے گا۔ مُنے کی زبانی شانی کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے ابو ہسپتال سے گھر واپس آ گئے ہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں اس لئے آتے ہی سو گئے ہیں۔

مُنے نے یہ بھی بتایا کہ ندیم بھائی آ گیا ہے...... وہ سارا دن امی کے پاس ہسپتال میں رہا ہے۔ اب ابو کے ساتھ سو رہا ہے۔

''تم بھی امی کے پاس گئے تھے؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں تاتی...... ابو کہتے ہیں وہ مجھے کل لے کر جائیں گے۔''

''تم نے ندیم کو بتایا ہے کہ میں یہاں انیکسی میں رہتی ہوں؟''

''تاتی! میں تو بتاتا ہوں پر ندیم بھائی مجھ پر یقین ہی نہیں کرتا ہے۔ کوئی بھی میلے (میرے) پر یقین نہیں کرتا، ندیم بھائی کہتا ہے، تم مر گئی ہو یا گم ہو گئی ہو۔''

شانی کی نظر مُنے کے دانتوں پر پڑی۔ وہ بہت گندے ہو رہے تھے۔ اس کے ناخن بھی کچھ بڑھے ہوئے تھے۔ جب مائیں بیمار ہوتی ہیں تو بچے اکثر اسی طرح خستہ حال ہو جاتے ہیں۔ شانی کے دل سے ہوک سی اٹھی اور اس نے مُنے کو گلے سے لگا لیا۔

وہ بار بار سر کھجا رہا تھا۔ شانی نے گود میں لے کر اس کا سر دیکھا۔ پھر اس کے ناخن کاٹے...... دانت صاف کئے۔ اسے نہلا دھلا کر گرم کمبل میں لپیٹا اور اپنے ساتھ لٹا لیا۔ سرما کی ایک طویل، یخ بستہ رات دھیرے دھیرے قرب و جوار کو اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ ایک ہلکا سا کہرا بند کمروں سے باہر نشیب و فراز کو ڈھانپ رہا تھا۔ اس کوٹھی کی وسیع و عریض چار دیواری سے آگے کماد، مکئی اور سرسوں کے ٹھٹھرتے ہوئے کھیت تھے۔ اس سے آگے جنتر اور کیکر کے درخت تھے...... اور ان سے آگے جی ٹی روڈ تھی۔ فراٹے بھرتی روشن لکیریں چمکتی ہوئی، لوگوں کو ملاتی ہوئی اور جدا کرتی ہوئی۔ تاریک ویرانے میں وہ زندگی کی دھڑکتی ہوئی شریان جیسی تھی۔ اس دھڑکتی شریان کے اردگرد بھی سرما کی وہی طویل تر اور سرد رات پھیلی ہوئی تھی جس نے چوہدری بشیر کی وسیع و عریض رہائش گاہ اور ٹیکسٹائل مل کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

☆======☆======☆

اس کے انداز میں بجلی کی تڑپ تھی، اس کی حرکات میں چیتے کی سی پھرتی تھی۔ اس نے دھیمی رفتار سے چلتے ٹرک پر سے چھلانگ لگائی تھی۔ پنجوں کے بل زمین پر گرا تھا اور پھر رول کر کے گارینیا کی باڑ کے پیچھے چلا گیا تھا۔ روئی کی گانٹھوں سے لدا یہ ٹرک احاطے کے بالکل آخری سرے کی طرف چلا گیا۔ ٹرک سے چھلانگ لگا کر پرچھائیں کی طرح گارڈینیا کی باڑ کے پیچھے چھپ جانے والا پندرہ بیس سیکنڈ تک بےحس وحرکت وہیں پڑا رہا۔ پھر وہ اٹھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ کندھوں پر ایک گرم چادر تھی۔ اس نے اپنا منہ سر ایک بڑے صافے میں چھپا رکھا تھا۔ صافے کی بندش چیک کرنے کے بعد اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولا اور پھر جھک کر چلتا ہوا اس سفید دیوار کی طرف بڑھا جو اس وسیع کوٹھی کو انیکسی سے جدا کرتی تھی۔

وہ دراز قد تھا۔ اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا اور آنکھیں عقابی چمک لئے ہوئے تھیں۔ کہیں دور بیرونی گیٹ کے پاس رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ وہ جھک کر چلتا ہوا ایک پہرے دار کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ پہرے وار نے گشت کا سا انداز اپنا رکھا تھا۔ جب وہ راؤنڈ لگاتا ہوا برج کی دیوار کے عقب میں اوجھل ہو گیا تو نووارد باڑ کے عقب سے نکلا اور پھرتی سے پتھریلی دیوار کی طرف لپکا۔ یہاں اس سے تھوڑی سی چوک ہوئی۔ وہ اس پہرے دار کی موجودگی محسوس نہ کر سکا جو ایک پھیلے ہوئے سرو کے عقب میں موجود تھا۔

پہرے دار نے نووارد کو دیکھا تو تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اگر وہ شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کرتا تو یہ اس کے حق میں بہتر تھا، لیکن وہ بروقت اپنا ذہن استعمال نہیں کر سکا، یا پھر اس نے اپنی طاقت اور دلیری کے زعم میں اکیلے ہی نووارد کو چھاپنا چاہا۔ بہرحال اس نے غلطی کی۔ یہ مہلک غلطی اسے ایک ایسے خطرناک شخص کے روبرو لے آئی جو ماضی قریب کا سفاک قاتل، ڈکیت اور جنگجو تھا .. یہ غلطی اسے بپھرے ہوئے رستم کے روبرو لے آئی .. اور رستم کے ہاتھ میں دس انچ کا تیز دھار خنجر تھا۔ پہرے دار کی رائفل پر سنگین چڑھی تھی۔ اس نے سنگین کو نیزے کی طرح استعمال کرتے ہوئے رستم کی ٹانگ پر وار کرنا چاہا، رستم نے یہ وار بچایا اور تڑپ کر پہرے دار کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی۔ اس موقع پر پہرے دار نے دوسری اور اپنی زندگی کی آخری غلطی کی۔ یہ دیکھے بغیر کہ مقابل کے ہاتھ میں خنجر ہے۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ رستم کے چہرے کی طرف کرنا چاہا۔ رستم نے بلاتردد خنجر اس کے دل کے مقام پر گھونپ دیا۔ خنجر کی نوک پہرے دار کی چرمی جیکٹ، سویٹر اور قمیص کو

چیرتی ہوئی اس کی دو پسلیوں کے درمیان سے جوف سینے میں گھس گئی۔ اس نے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخنا چاہا لیکن اس کی گردن پر بازو کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ حلق سے بس گھر رگھر رکی کرب ناک آواز ہی نکلی۔

اس کے جسم نے رستم کے بازوؤں میں دو تین زوردار جھٹکے کھائے۔ گرم خون اس کے سویٹر کو بھگوتا ہوا کچی زمین پر گرا۔ رستم اسے یونہی دبوچے ساکت وجامد کھڑا رہا، یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا، مضروب داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔ مقتول کی پشت رستم کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ رستم اسے اسی طرح گھسیٹ کر درختوں کے نیچے لے گیا۔ یہاں ہیڈ مالی بابا جمال نے ایک مستطیل کیاری کے کنارے خشک پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر جمع کر رکھا تھا۔ رستم نے مقتول کو تقریباً ایک فٹ گہری کیاری میں پھینکا اور خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر کو اس طرح دھکیلا کہ لاش پتوں کے نیچے چھپ گئی۔ اس نے مقتول کی رائفل اور ایک جوتی بھی پتوں میں گھسیڑ دی۔ کچی زمین پر گرنے والے خون پر اس نے پاؤں سے مٹی ڈال دی۔ خون آلود خنجر وہ پہلے ہی مقتول کے کُرتے سے صاف کر چکا تھا۔ یہ خنجر دوبارہ اس کی قمیص کے نیچے لگے ہوئے چرمی کور میں پہنچ گیا۔ پہرے دار کی سنگین کا مہلک وار رستم نے بچا لیا تھا تاہم اس کی پسلیوں کے نیچے ایک کٹ ضرور آ گیا تھا۔

اس ساری کارروائی میں بمشکل تین منٹ لگے ہوں گے۔ سنگِ مرمر کی دیوار کا اکلوتا دروازہ دوسری طرف مقفل تھا۔ رستم نے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد بڑی پھرتی اور صفائی سے یہ دس فٹ اونچی دیوار پھاندی اور ایک گراسی لان میں پہنچ گیا۔ یہاں پودے بڑی خوبصورتی سے تراشے گئے تھے۔ کیاریوں میں موسمی پھول کھلے تھے۔ ایک بچے کی تین پہیوں والی سائیکل لان کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ کسی قریبی کمرے سے کسی عورت کے کھانسنے کی آواز آئی، رستم تیزی سے لان کے دوسرے سرے کی طرف لپکا۔

عین اسی وقت شانی اپنے کمرے میں منے کے ساتھ موجود تھی۔ منا سو رہا تھا۔ شانی نے ایک مدھم آواز سنی۔ یوں لگا کہ کوئی بھاگ کر لان میں سے گزر رہا ہے اور کچن والی کھڑکی کی طرف، کہیں باڑ میں چھپ گیا ہے۔ بیرونی گیٹ کی طرف سے رکھوالی کے کتوں کی چونکی ہوئی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ تقریباً وہی صورتِ حال تھی جو چند روز پہلے انوری کے حوالے سے پیش آئی تھی۔ انوری بھاگ کر لان کے اسی حصے میں آن چھپی تھی۔ شانی کا دھیان ایک بار پھر انوری کی طرف چلا گیا۔ کہیں وہ پھر کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کر رہی تھی۔

شانی نے لحاف ہٹا کر چپل پہنی اور ہولے سے کھڑکی کے قریب آ گئی۔ وہ کچھ دیر سن گن لیتی رہی۔ کسی قسم کے آثار نظر نہیں آئے۔ شاید اسے وہم ہوا تھا۔ چہار سو تاریکی، خاموشی اور سردی کا راج تھا۔ رکھوالی کے کتے بھی کچھ دیر شور مچانے کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔

چوہدری بشیر نے جالاں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ رات کو برآمدے کی بتی ضرور جلا دی جائے۔ جالاں چونکہ آج موجود نہیں تھی اس لئے بتی نہیں جلائی گئی تھی۔ برآمدہ اور لان کا سامنے والا حصہ مکمل تاریکی میں تھا۔ شانی چند لمحے سوچتی رہی پھر ٹیوب لائٹ روشن کرنے کے لئے دروازے کی چٹخنی ہٹا کر برآمدے میں آئی۔ سوئچ بورڈ کمرے کے دروازے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ بٹن دبا کر جلدی سے کمرے میں واپس چلی جانا چاہتی تھی۔ ابھی اس کا ہاتھ بٹن تک پہنچا نہیں تھا کہ چوکور ستون کی اوٹ سے ایک پرچھائیں نکلی اور عقاب کی طرح شانی پر جھپٹی۔ شانی نے چلانے کے لئے منہ کھولا لیکن آواز اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ ایک سرد مضبوط ہاتھ نے اس کے ہونٹوں کو بڑی سختی سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم کے مختلف حصوں پر ایک کڑی، مردانہ گرفت محسوس ہوئی۔ وہ بُری طرح مچلی لیکن یہ سب بے سود تھا۔ توانا بازوؤں نے اسے ہلکی پھلکی شے کی طرح فرش سے بلند کر دیا۔ دو ہی سیکنڈ بعد وہ کمرے کے اندر دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم شخص نے اسے عقب سے جکڑ رکھا تھا اور اب اپنے ایک ہاتھ سے کمرے کے دروازے کی چٹخنی اندر سے چڑھا رہا تھا۔

کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ ایک دم یوں محسوس ہوا کہ نووارد کو بجلی کا جھٹکا لگا ہے۔ شانی کے جسم پر سے اس کی گرفت یک لخت ڈھیلی پڑ گئی۔ چند سیکنڈ بعد شانی کے ہونٹوں پر سے بھی اس کی گرفت ختم ہو گئی۔ ایک سرسراتی ہوئی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ”بی بی آپ؟“

اب شانی کو کرنٹ لگنے کی باری تھی۔ اس کا جسم جیسے ہزاروں واٹ کے ننگے تار سے چھو گیا تھا۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹی۔ قرب و جوار اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ وہ اپنی سماعت پر یقین نہیں کر پا رہی تھی لیکن آواز اس کی جانی پہچانی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ انداز تھا جس میں اسے ”بی بی“ کہا گیا تھا۔ وہ اس منفرد لہجے کو ہزاروں لاکھوں لہجوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ جس آہنگ میں بی بی کہا گیا تھا کوئی اس آہنگ میں کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھتی چلی گئی جو اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اور جس کا منہ سر ایک کالے صافے میں چھپا ہوا تھا۔

اسے لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ کیونکر ہو سکتا تھا؟ وہ تو

سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ سارے دروازے بند کر کے اور سارے رستے مسدود کر کے یہاں بیٹھی تھی۔ وہ کیسے آ پہنچا تھا یہاں؟ وہ ڈگمگا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ لرزتے چلے جا رہے تھے اور شاید سارا جسم ہی لرز رہا تھا۔ ”تم یہاں؟“ شانی کے ہونٹوں سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

اس نے اپنے صافے کو ٹھوڑی تک کھینچ لیا۔ یوں چہرہ شانی کے سامنے آ گیا۔ شانی۔ نے بے حد خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ قریب کھڑکی کے پردے میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ وہ اٹھی اور پردے کو برابر کر دیا۔ وہ اب ساری کی ساری لرز رہی تھی۔ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں تھی وہ۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور آنکھیں بند کر لیں، کتنے ہی سیکنڈ اسی طرح گزرے۔ پھر رستم کی مدھم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”مجھے معاف کر دیں بی بی! مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ آپ ہیں۔ ورنہ اس طرح آپ کو پکڑنے کی ہمت نہ کرتا۔“

”تم کیسے آئے ہو یہاں...... مجھے بتاؤ......نہیں تو......میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“ شانی نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”تم جانتے نہیں ہو۔ تم نے کیا کیا ہے؟ تمہارا یہاں آنا کیا قیامت لا سکتا ہے۔ شاید تمہیں کچھ پتا نہیں۔“

”بی بی......! میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا آپ سے......کچھ بھی نہیں......“ وہ بڑے سکون سے بول رہا تھا۔

کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص ابھی چند منٹ پہلے ایک جیتے جاگتے انسان کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔

شانی کو سنبھلنے میں کئی منٹ لگے۔ اس کے کان گاہے بگاہے باہر سے آنے والی آوازوں پر لگ جاتے تھے۔ اسے ہر آن یہ اندیشہ تھا کہ ابھی اطراف میں پہرے داروں کی للکاریں گونجنے لگیں گی اور واچ ڈاگز کی کریہہ آوازیں کان پھاڑنے لگیں گی۔

شانی کی آنکھوں کے کنارے غم اور پریشانی کی یورش سے جل رہے تھے۔ اس نے بے حد گھمبیر آواز میں پوچھا۔ ”تم کیوں آئے ہو یہاں؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس لئے کہ میرا آنا ضروری تھا۔ کم از کم ایک بار آنا ضروری تھا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میرے دل کی گواہی تھی کہ آپ جہاں بھی ہیں آزاد نہیں ہیں۔ آپ کے ارد گرد اپنے

نہیں غیر ہیں۔ آپ بہت کچھ چھپا رہی ہیں۔ بہت کچھ برداشت کررہی ہیں..... اور میرے دل کی یہ گواہی درست نکلی ہے بی بی۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''بی بی! میں آپ کو آپ کے بدترین دشمنوں کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔'' رستم کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

شانی کا چہرہ جلنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ گفتگو ایک طویل اور ناخوشگوار بحث کی طرف جا رہی ہے۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔'' مجھے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟''

''یہ سب بتانا ضروری تو نہیں بی بی۔''

''ضروری ہے...... میں بُری طرح الجھ رہی ہوں۔''

رستم نے ایک گہری سانس لے کر خوابیدہ مُنّے کی طرف دیکھا۔ (اس نے جتنی بار مُنّے کی طرف دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں سوال ابھرا تھا۔ بہرطور یہ سوال ابھی تک اس کی زبان پر نہیں آیا تھا) پھر اس نے شانی کو بتانا شروع کیا کہ وہ راولپنڈی کی اس دور افتادہ کوٹھی سے انیکسی کی اس خواب گاہ تک کیسے پہنچا۔

''میرے پاس وہ موبائل نمبر تھا جس پر آپ مجھ سے بات کرتی تھیں۔ میں نے آپ کی تلاش کے لئے اسی موبائل نمبر کو سہارا بنایا یہ توقع مجھے ہرگز نہیں تھی کہ یہ نمبر آپ کے نام پر ہوگا، کسی ایسے شخص کے نام پر جس کے ذریعے میں آسانی سے آپ تک پہنچ سکوں گا۔ بس ایک ہلکی سی امید تھی کہ شاید یہ شخص آپ کے اردگرد کہیں موجود ہو۔ اسی امید کے سہارے میں لاہور پہنچا۔ ایک واقف کار کی مدد سے میں نے موبائل کمپنی کے دفتر سے موبائل نمبر کے مالک کا ایڈریس معلوم کیا۔ یہ گوجرانوالہ کے قریب روجھا گاؤں کی رہنے والی ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ میں اس لیڈی ڈاکٹر تک پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ لیڈی ڈاکٹر ایک نامی گرامی عامل اور حکیم کی بیوی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔''

''مجھ سے پہیلیاں مت بوجھواؤ۔'' شانی کے لہجے میں خوف آمیز خفگی تھی۔

رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' میں چار دن پہلے روجھا گاؤں پہنچا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عامل صاحب کی بیوی جس کا نام صدف ہے، عامل صاحب کے ساتھ فیصل آباد میں ہے، میں بس کے ذریعے فیصل آباد پہنچ گیا، یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ عامل صاحب کا اصل نام قدرت اللہ ہے اور لوگ انہیں حضرت صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں

فیصل کی پیپلز کالونی میں قدرت اللہ کے آستانے پر پہنچا۔ یہاں مریضوں اور عقیدت مندوں کا رش تھا۔ میں نے پورے آٹھ پہر تک یہاں عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ آٹھ پہر بعد قدرت اللہ اپنے ساتھیوں اور دو بیویوں سمیت فیصل آباد سے لاہور کے لئے روانہ ہوگیا۔ میں سائے کی طرح ان لوگوں کے پیچھے تھا۔ میرے پاس ایک ٹیکسی کار تھی، یہ میں نے اپنے لاہور کے واقف کار سے حاصل کی تھی۔ یہ لوگ رات دس بجے کے قریب لاہور پہنچے تھے، ان کے ساتھ چار گاڑیاں تھیں۔ لاہور پہنچ کر یہ سیدھے یہاں ٹیکسٹائل مل میں آئے۔ یہ کل رات کا واقعہ ہے۔ جب یہ لوگ اس رہائشی عمارت میں داخل ہو رہے تھے میں جی ٹی روڈ کے قریب موجود تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ نارپور کے چوہدریوں کی مل ہے۔ میرا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ میں صحیح راستے پر جا رہا ہوں۔ وہ لڑکی جس کا موبائل فون آپ کے استعمال میں تھا وہ نارپور کے چوہدریوں کی کوٹھی میں داخل ہوئی تھی۔ میرے ذہن سے یہ آواز آنے لگی کہ ہوسکتا ہے کہ آپ بھی چار دیواری میں ہوں۔

حضرت صاحب اور اس کے کارندوں نے اس چار دیواری میں بس ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی گزارا۔ پھر وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی واپس چلے گئے۔ میرے ذہن میں جو شک پیدا ہو چکا تھا اس کی تصدیق کے لئے میں نے کوٹھی کے ایک بندے کو پکڑا۔ یہ بندہ رات بارہ بجے کے لگ بھگ کوٹھی سے نکل کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ میں اس وقت کوٹھی سے کوئی آدھ فرلانگ دور کیکر کے درختوں میں موجود تھا۔ جس ٹیکسی پر میں آیا تھا وہ ایک فرلانگ پیچھے جی ٹی روڈ کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے اس بندے کو پکڑ لیا اور پستول دکھا کر ٹیکسی میں لے آیا۔'' یہاں تک بتا کر رستم تھوڑا سا ٹھٹکا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

شانی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بھاری پردوں والے اس قالین پوش بند کمرے میں بھی سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ کل ہی کی طرح موسم کی ایک سرد ترین رات تھی...... نائٹ بلب کی روشنی میں مُنّا بے خبر سو رہا تھا۔ شانی کا ایک ہاتھ مُنّے کے لحاف پر تھا۔ خوف اور پریشانی کے سبب شانی کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ رستم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔'' میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا بی بی! لیکن اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ آپ کی رائے میرے بارے میں اور خراب نہ ہو جائے۔''

شانی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند سیکنڈ منتظر رہنے کے بعد بولا۔

''جس بندے کو پکڑ کر میں ٹیکسی میں لے گیا تھا، اس نے مجھے اپنا نام گلریز بتایا تھا۔ وہ اب زندہ نہیں ہے...... لیکن اس کے مرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ سراسر اپنی بے وقوفی اور

جلد بازی سے مرا۔ شاید آپ کو اس کی موت کے بارے میں پتا چل ہی گیا ہو۔"

شانی چونک کر رہ گئی۔ رستم اس کی بات کر رہا تھا جو آج صبح روڈ ایکسیڈنٹ میں مرا..... یہ اطلاع حیران کر دینے والی تھی۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"میں نے اس سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے باوجود وہ آدھی رات کو اس کڑاکے کی سردی میں ایک لڑکی سے ملنے کے لئے کھیتوں میں جا رہا تھا۔ یہ لڑکی قریبی آبادی کی رہنے والی تھی اور دونوں میں غلط قسم کا رشتہ تھا۔ میرا اصل مقصد گلریز نام کے اس بندے سے آپ کے بارے میں پوچھنا تھا اور میرا یہ مقصد پورا ہوا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ کچھ ہفتے پہلے کوٹھی میں ایک عورت آئی ہے۔ اس کو کوٹھی کے مہمان خانے میں رکھا گیا ہے اور وہ کسی سے ملتی جلتی بھی نہیں ہے۔ ان کی حفاظت کا خاص انتظام بھی کیا گیا ہے۔

یہ سب کچھ مجھے یہ سمجھا دینے کے لئے کافی تھا کہ آپ اس چار دیواری میں موجود ہیں۔ اس کے بعد میرے سامنے بس ایک ہی کام تھا کہ میں کسی طرح کوٹھی میں داخل ہو جاؤں۔"

"تم گلریز نام کے اس لڑکے کے مرنے کی بات کر رہے تھے؟"

"ہاں جی......! وہ اپنی بے وقوفی سے حادثے کا شکار ہوا۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرنا تھا کہ اسے نشے کے دو کیپسول کھلا کر اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال دینا تھا لیکن وہ اندر سے بزدل تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اسے بہت زیادہ ڈرا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے زور سے پیشاب آیا ہے۔ میں نے اسے پیشاب کے لئے گاڑی سے باہر نکالا، وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اسے روکنے کے لئے پیچھے بھاگا لیکن وہ اندھا دھند دوڑتا چلا گیا۔ سامنے جی ٹی روڈ تھی۔ مجھے گاڑی کے بریکوں کی زوردار آواز آئی...... میں سمجھ گیا کہ وہ گاڑی کے نیچے آ گیا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ختم ہو گیا۔"

شانی سناٹے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ گلریز کی موت کے واقعے کے بعد رستم نے بتایا کہ وہ کس طرح آج سارا دن کوٹھی کے ارد گرد منڈلاتا رہا ہے اور کس طرح کچھ دیر پہلے وہ روئی کی گانٹھوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک پر سوار ہو کر کوٹھی کے احاطے میں پہنچا ہے۔ یہ ساری روداد شانی کو ہلا دینے والی تھی۔ (حالانکہ اس میں اس قتل کا ذکر شامل نہیں تھا جو کچھ ہی دیر پہلے رستم کے ہاتھوں ہوا تھا)

منا لحاف کے نیچے کسمسانے لگا۔ شانی جلدی سے اس کے ساتھ لیٹ گئی اور لحاف اوپر تک کھینچ لیا۔ وہ کچھ دیر تھپک تھپک کر اسے سلاتی رہی، جب وہ ایک بار پھر پُرسکون نیند سو گیا تو

وہ آہستہ سے اٹھی اور اپنا لباس درست کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ریگولیٹر کے ذریعے نائٹ بلب کی روشنی مزید کم کر دی تھی۔ اب وہ اور رستم جیسے دیئے کی مدھم روشنی میں بیٹھے تھے۔ شانی کے ہاتھوں کی انگلیاں بے قراری میں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں، کچھ دیر بعد وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔"تم کیا چاہتے ہو رستم؟"

رستم نے کہا۔"بی بی......! آپ مجھے کچھ بتائیں یا نہ بتائیں مگر یہ بات تو میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ آپ یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہیں۔ آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔ اگر آپ کو لایا گیا ہے تو پھر آپ یہاں ایک قیدی کی طرح ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کا رویہ آپ سے عارضی طور پر زیادہ بُرا نہ ہو، مگر یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہوں گی کہ آپ دشمنوں کے درمیان ہیں اور دشمن بھی ایسے جو اپنا بدلہ کبھی چھوڑتے نہیں ہیں۔ یہ صرف نام کے چوہدری ہیں بی بی......! ورنہ یہ بلی ماروں کی وہ بگڑی ہوئی نسل ہے جو خونی جانوروں سے بھی زیادہ خونی ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب کے سب ایسے نہیں ہیں پھر؟"

"یہ آپ کا وہم ہو گا بی بی! خاندان کی اصل کبھی چھپی نہیں رہتی۔ اگر آپ کو کوئی بھلائی نظر آ بھی رہی ہے تو یہ بالکل وقتی ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"بی بی......! آپ سے ملنے کے بعد میری کوئی چاہت رہی ہی نہیں ہے۔ میں وہی چاہوں گا جو آپ چاہیں گی۔" اس کی نظر بدستور جھکی ہوئی تھی۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ یہاں سے چلے جانا چاہئے؟"

"جی بی بی......! یہ آپ کے لئے بہترین راستہ ہے۔" رستم نے رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

شانی چند لمحے خاموشی سے رستم کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔"اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے یہاں سے لے جا سکتے ہو؟"

رستم کی آنکھوں میں ایک خطرناک وحشی چمک نمودار ہوئی۔ ایسی ہی چمک شانی نے اس کی آنکھوں میں تب دیکھی تھی جب وہ پولیس کی گاڑی میں پولیس والوں پر جھپٹا تھا۔ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولا۔"بی بی! پتا نہیں، آپ میری اس بات کو کیا سمجھیں گی، لیکن میں سچ کہتا ہوں، کوئی شیخی یا ڈینگ نہیں ہے۔ مجھے یہ کوٹھی اور اس کی رکھوالی کرنے والے چوہدری کے دو

ٹانگوں والے کتے کیڑے مکوڑوں کی طرح نظر آرہے ہیں۔ خدا کی قسم، اگر یہ گنتی میں دوگنا یا تین گنا بھی ہوں تو میں انہیں چیر کر نکل جاؤں گا۔ یہ دروازے، یہ دیواریں اور یہ بند وقڑیاں، ہمارا راستہ نہیں روک سکتیں۔ آپ بس ایک بار چلنے کی ہامی بھریں۔ پھر دیکھیں۔ میں ان کرائے کے ٹٹوؤں کو کس طرح ادھیڑ کر نکلوں گا۔''

رستم کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر شانی نے جھرجھری محسوس کی۔

ایک لمحے کے لئے صرف ایک لحظ کے لئے اس کے دل میں آئی کہ وہ آنکھیں بند کرکے اپنا ہاتھ رستم کے مضبوط ہاتھ میں تھما دے۔ پھر اس چاردیواری سے باہر جی ٹی روڈ سے آگے اور دنیا کے آخری کنارے تک جہاں بھی وہ لے جانا چاہے، وہ اس کے ساتھ چپ چاپ چلتی رہے۔ سب کچھ بھول کر، سب کچھ فراموش کرکے، لیکن اگلے ہی لمحے جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ اس کی نگاہ محوِخواب منّے کے معصوم چہرے پر پڑی۔ وہ جیسے نیند کی حالت میں بھی اس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ پھر بھابو کا چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا۔ وہ بھابو کو اور اس کے معصوموں کو چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی۔ وہ جا ہی نہیں سکتی تھی۔ حالات نے اس کے پاؤں نادیدہ زنجیروں میں جکڑ لئے تھے۔ وہ اس چاردیواری کی مٹی میں پیوست ہوگئی تھی۔

چند سیکنڈ میں شانی جیسے درد و کرب میں لپٹی ہوئی کئی صدیاں بتا گئی۔ پھر اس کے چہرے پر ایک گھمبیر تاثر ابھرا۔ وہ اٹھی اور بیڈ پر منّے کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے خود کو جھکایا اور منّے کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھے۔ ایسے میں دو آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر منّے کے بالوں میں جذب ہوگئے۔ شانی کے اپنے، کالی گھٹاؤں جیسے گھنے بال پھسل کر نیچے آگئے اور انہوں نے ایک ریشمی گھونگٹ کی شکل اختیار کرلی۔ وہ اسی گھونگٹ کی اوٹ سے بولی۔ ''میں کہیں جانا نہیں چاہتی رستم۔۔۔! مجھے یہیں رہنا ہے۔ ان بچوں کے ساتھ اور یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔'' کوئی چیز جیسے زوردار چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی، کرچیاں ہر طرف بکھر گئیں۔ رستم کئی لمحوں تک ساکت بیٹھا رہا۔

تب اس نے شکستہ آواز میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں، آپ کی بھابو بیمار ہیں اور ان کے بچوں کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے سب پتا ہے بی بی! لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی اچھی طرح پتا ہے کہ یہاں آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کاش میں آپ کو اپنا سینہ کھول کر دکھا سکوں۔ کاش ایسا ہو سکے۔''

''انسان کے بہت سارے اندیشے درست ہی تو نہیں ہوتے۔'' شانی نے کہا۔ ''کسی

بہت پڑھے لکھے بندے نے کہا ہے کہ ہماری زیادہ تر پریشانیوں اور تکلیفوں کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ بس ہمارے خیالوں میں ہوتی ہیں۔''

رستم کے لہجے میں دنیا بھر کی اذیت اور بے بسی در آئی۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''لیکن بی بی! آپ ان لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہیں۔ آپ کا واسطہ تو ان سے اب پڑا ہے، میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب......''

''رستم! میں اس بارے میں سب کچھ سن چکی ہوں۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

وہ چپ ہوگیا۔ کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ شانی جواب تک عجیب قسم کے پس و پیش کا شکار تھی، ایک دم یکسو ہوگئی۔ اس کی پیشانی کی ایک رگ ابھر آئی۔ آنکھوں میں ایک ''دوٹوک'' تاثر دکھائی دیا۔ وہ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''رستم! تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ تم ہر حال میں خوش ہو۔ کہا تھا ناں؟''

''جی بی بی۔''

''اور یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے لئے جدائی اور ملاپ کا علیحدہ مطلب نہیں ہے۔''

''جی بی بی......'' ایک زرد پرچھائیں رستم کے چہرے پر نمودار ہوکر اوجھل ہوگئی۔

شانی نے براہِ راست رستم کی آنکھوں میں دیکھا اور عجیب کیفیت میں بولی۔ ''تو میں چاہتی ہوں رستم! کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم چلے جاؤ۔ یہاں سے بھی...... میری زندگی سے بھی...... پلیز رستم۔''

آخری پانچ چھ الفاظ کہتے ہوئے شانی کو یوں لگا جیسے وہ آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزری ہے۔ سینے میں کوئی ہزاروں من وزنی بوجھ دل کو روندتا ہوا گزر گیا تھا۔

رستم کی نگاہ اکثر شانی کے سامنے جھکی ہی رہتی تھی۔ مگر اس موقع پر اس نے شانی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس زخمی نظر کا تاثر لفظوں کے احاطے میں لانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لب لرزے۔ ایک ثانیے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہے گا۔ بہت مدلل، بہت وزنی بات۔ دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والی۔ خیالات کو تہہ و بالا کر دینے والی۔ ایسی بات جو ساعت کو لہولہان کر دے، جو سینے کو چیرتی ہوئی گزرے اور رگ و پے میں دکھ کا جہان بسا دے۔

لیکن اس نے نہیں کہی۔ اس نے وہ بات نہیں کی۔ بڑی محبت بڑی بے چارگی سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اپنے چہرے پر تسلیم و رضا کا وہی رنگ سجا لیا جو ہر مدافعتی آواز کو ایک

بیکراں خاموشی میں ڈھانپ لیتا تھا۔ رنگ والی کی حویلی میں شانی کا تھپڑ کھا کر یہی رنگ اس کے چہرے پر آیا تھا۔ حویلی سے نکل جانے کا حکم سن کر بھی یہی رنگ نمودار ہوا تھا۔ ایکٹرس نادیہ کے بارے میں شانی کا حکم سن کر بھی اس رنگ نے رستم کے نقوش کو ڈھانپ لیا تھا۔ یہ غیر مشروط طور پر، مزاجِ یار سے ہم آہنگ ہو جانے کا رنگ تھا۔ یہ عشق میں ڈوب کر اپنی ہستی کو مٹا دینے کا رنگ تھا۔ شاید کسی ایسے ہی رنگ کو دیکھ کر شاعر کے قلم نے لکھا تھا۔

رانجھا رانجھا کر دی نی، میں آپے رانجھا ہوئی
وھیدو رانجھا آکھو مینوں، ہیر نہ آکھو کوئی

(رانجھے کا نام لیتے لیتے میں خود رانجھا بن گئی ہوں۔ اے سہیلیو! تم اب مجھے ہیر مت کہنا، رانجھا ہی کہنا۔)

وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولا۔ ''ٹھیک ہے بی بی، جو آپ کا حکم۔''

اس کی صورت دیکھ کر شانی کو لگا جیسے وہ چکرا کر گر جائے گی اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکے گی۔ اس نے چند سیکنڈ کے لئے اپنی جان پر ہزار ستم توڑے اور خود کو سنبھال لیا۔ اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی تو اسے کیسے سنبھال سکتی۔

تقریباً ایک منٹ تک کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ اس سکوت کو بس کسی وقت کسی کتے کی دور افتادہ آواز توڑتی تھی یا کسی چوکیدار کا مخصوص آوازہ..... ''ہوشیار رہو..... جاگدے رہو۔''

شانی نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''رستم! بہت پرانی بات ہے لیکن اس کا مطلب کبھی پرانا نہیں ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے لئے اس دنیا میں سارے ہی جیتے ہیں پر جو کسی کے لئے جیتے ہیں، وہ اصل میں جیتے ہیں۔ جو تعلق میرے اور تمہارے درمیان ہے وہ تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ بس اس تعلق کا رنگ دوسرا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے دور رہیں گے اور اپنی اپنی زندگی کو اپنے طور پر جئیں گے۔ رستم! مجھ پر کچھ فرض عائد ہو گئے ہیں۔ میں ان سے آنکھیں نہیں چرا سکتی۔ اگر چراؤں گی تو سمجھو کہ اپنی خوشیوں کی بنیاد کسی کی تباہی پر رکھوں گی اور خوشیاں چھین کر تو خوشیاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ سچی خوشیاں تو خوشیاں دے کر ملتی ہیں.....''

رستم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ مجسم خاموشی و رضا۔

شانی نے اس کی طرف اپنائیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم دور رہ کر بھی پاس رہیں گے رستم! ایک دوسرے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے،

تمہیں خوشیاں ملیں گی۔ تم بہت اچھی زندگی گزارو گے۔ کسی نہ کسی شکل میں، کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا اور تمہاری زندگی کو سجائے گا۔ شاید ابھی یہ سب تم کو ناممکن لگ رہا ہے لیکن یہ ناممکن رہے گا نہیں، یہ میرا یقین ہے رستم! تم بہت اچھے ہو اور اچھوں کے ساتھ بُرا نہیں ہو سکتا۔ ہو ہی نہیں سکتا..... تم دیکھ لینا ایک دن ایسا آئے گا کہ تم میری باتوں پر یقین کرو گے۔'' ایک لحہ توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''ابھی..... دل پر بوجھ ہے بہت زیادہ دکھ ہے..... رونے کو دل چاہتا ہے لیکن بہت جلد یہ سب کچھ بدل جائے گا..... مم..... میں دعا کروں گی تمہارے لئے اور تم بھی کرنا.....''

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جیسے کوئی عقیدت مند اپنے پیشوا کی نصیحتیں سنتا ہے۔ اس کے لمبے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے رخساروں پر جھول رہی تھیں اور کچھ خم کھا کر اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی سے مل رہی تھیں۔

شانی کے لہجے میں اب ٹھہراؤ تھا۔ جیسے ایک بڑے طوفان کے بعد پانی پُرسکون ہو جاتا ہے۔ وہ ملائم لیکن مستحکم لہجے میں بول رہی تھی۔ وہ سنتا رہا۔ کھڑکیوں سے باہر کہرے میں لپٹی رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔

اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ رستم کو بولے کافی وقت ہو گیا تھا۔ شانی کو اندیشہ تھا کہ شاید وہ اب کچھ بولے گا لیکن یہ اندیشہ بھی غلط ثابت ہوا۔ تسلیم کا رنگ رستم کے چہرے پر تھا اور یہ رنگ اسموک سکرین کی طرح ہر شے کو اپنے پیچھے اوجھل کر رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے جب وہ شانی کے کمرے میں گھسا تھا تو شانی کے دل نے پکار کر کہا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جو شخص اونچی اونچی دیواروں اور سخت پہروں سے گزر کر اس تک آپہنچا ہے وہ اب آسانی سے واپس چلا جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی اسے بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔ بہت کچھ کہنا اور سننا ہوگا اور ممکن ہے کہ دل پر بھاری پتھر رکھ کر رستم کے ساتھ درشت رویہ اپنانا پڑے۔ ایسا رویہ جو ہرگز اس کے شایانِ شان نہیں تھا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا..... شانی کو محسوس ہوا کہ اس کے سینے کی گہرائی میں تشکر کے آنسو رس رہے ہیں۔

اچانک شانی کی نگاہ خون کے چند قطروں پر پڑی۔ یہ قطرے رستم کے پہلو سے قالین پر گرے تھے۔ وہ یکایک چونک گئی۔ اس نے غور سے ان قطروں کی طرف دیکھا اور پھر رستم کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا ہے رستم؟'' شانی نے پوچھا۔

رستم بھی چونک گیا۔ اپنی گرم چادر درست کرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں بی بی! تھوڑی

سی چوٹ آئی ہے۔"

تب شانی کی نگاہ گرم چادر کے ایک حصے پر پڑی۔ اس پر خون کا تازہ دھبہ تھا۔

"تمہاری چوٹ معمولی تو نہیں لگتی رستم؟" شانی نے کہا اور اٹھ کر نائٹ بلب کی روشنی تیز کر دی۔

رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "نہیں بی بی! آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔" اس کے اٹھنے سے چند قطرے مزید شیشے کی تپائی اور قالین پر گرے۔ ظاہر تھا کہ خون کا اخراج ہو رہا تھا۔

"رستم! مجھے دکھاؤ۔ تمہیں زیادہ چوٹ آئی ہے۔"

"نہیں بی بی...... یہ کچھ نہیں ہے۔"

"دیکھو...... یہ خطرناک ہے۔ خون گرے گا تو شک پیدا ہوگا۔ یہاں لوگوں کی نظریں بہت تیز ہیں۔ تم ایک منٹ ٹھہرو۔ میں تمہارے لئے دوا اور پٹی لاتی ہوں۔ وہ دروازے کی طرف مڑی مگر پھر ٹھہر گئی۔ "لیکن پہلے دکھاؤ تو سہی، زخم کہاں ہیں؟"

شانی کے اصرار پر رستم کو گرم چادر ہٹانا پڑی۔ قمیص کا ایک حصہ خون سے تر ہو رہا تھا۔ شانی کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ پہرے دار کی سنگین دائیں طرف کی زیریں پسلی پر لگ کر نیچے کی طرف گئی تھی۔ یہاں سے قمیص اور بنیان بھی کٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ "یہ ہوا کیا ہے؟" شانی نے پُراندیش لہجے میں پوچھا۔

رستم کو دروغ مصلحت آمیز سے کام لینا پڑا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ ٹرک سے کودتے ہوئے آہنی پتری لگی ہے...... پتا نہیں شانی نے اس بات پر یقین کیا یا نہیں اور اگر کیا تو کس حد تک، بہر حال بحث کا موقع نہیں تھا۔

"رستم ٹھہرو۔ پہلے یہاں پٹی کرلو۔" شانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے اندرونی دروازہ کھولا اور دبے پاؤں ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ لاؤنج کے ساتھ والے کمرے میں زہرا اور فردوس بے خبر سو رہی تھیں۔ فردوس کے مدھم خراٹے لاؤنج تک سنائی دے رہے تھے۔ شانی نے الماری میں سے بینڈ ایج، کاٹن اور دوا نکالی۔ یہی اشیاء چند دن پہلے اس نے انوری کی مرہم پٹی کے لئے استعمال کی تھیں۔

وہ یہ چیزیں لے کر کمرے میں پہنچی تو رستم نیچے بیٹھا قالین پر سے خون کے قطرے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چادر کے پلو کو پانی میں بھگویا تھا اور اسے قالین پر رگڑ رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ نے زخمی پہلو کو دبا رکھا تھا۔

شانی نے کہا۔ "اسے چھوڑو۔ پہلے یہ پٹی کرلو۔"

رستم ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند سیکنڈ کے لئے شانی کا دل چاہا کہ وہ اپنے ہاتھ سے رستم کی پٹی کرے۔ اس کے زخم پر مرہم رکھنے سے جہاں رستم کو سکون ملتا وہاں شانی کو بھی ایک ناقابلِ بیان راحت محسوس ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ یہ راحت ایک ناقابلِ فراموش یاد بن کر مدت تک شانی کے ذہن میں چمکتی رہتی۔

مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نازک موقع پر وہ کوئی ایسا اشارہ دینا نہیں چاہتی تھی جس سے ہوا کا رخ اور طرف ہو جاتا۔ ویسے بھی سیانوں نے کہا ہے کہ جس گاؤں میں جانا نہ ہو اس کا راستہ پوچھنے سے کیا فائدہ۔ وہ رستم کو خود سے دور کر رہی تھی اور یہ کام ایک ایسی نازک سرجری کی طرح تھا جس میں ہاتھ کے ذرا سے ہٹنے سے نتائج بدل سکتے تھے۔

اس نے مرہم پٹی کا سامان رستم کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ تپائی پر موجود خون کے قطرے، رستم نے اس کے آنے سے پہلے ہی صاف کر دیئے تھے۔ رستم تذبذب میں نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے رستم؟"

پھر ایک دم وہ سمجھ گئی۔ رستم کا زخم پسلیوں سے ناف کی طرف گیا تھا اور وہ شانی کے سامنے جسم کھولتے ہوئے کترا رہا تھا۔ "اچھا، میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔" وہ بولی۔

"نہیں بچہ جاگ جائے گا۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں باتھ روم میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں پانی بھی ہے۔ چادر بھی دھو لیتا ہوں۔" وہ نقاہت بھری آواز میں بولا۔ ایسی نقاہت جس میں شکستگی کی اَن گنت دراڑیں تھیں۔

اس نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی۔ قمیص کے نیچے اس نے سیاہ پیٹی میں پستول لگا رکھا تھا۔ پیٹی میں کوئی تین درجن گولیاں اڑسی گئی تھیں۔ اس پیٹی کے ساتھ ایک چھوٹی سی چرمی تھیلی خنجر کے لئے بھی تھی۔ یہ ہتھیار دیکھ کر شانی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ رستم نے پیٹی کمر سے کھول کر بیڈ کے نیچے گھسیڑی، گرم چادر بغل میں دبائی اور مرہم پٹی کا سامان لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔

شانی نے ہولے سے کمرے کا بیرونی دروازہ کھولا اور برآمدے میں آگئی۔ اگر خون کے قطرے برآمدے میں موجود تھے تو ان کا صاف کیا جانا ازحد ضروری تھا۔ اس نے برآمدے کی ٹیوب لائٹ روشن کی اور اچھی طرح فرش کا جائزہ لیا۔ فرش یا سامنے لان کے

زینوں پر کہیں کوئی نمایاں نشان دکھائی نہیں دیا۔ لائٹ آف کرنے کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آ رہی تھی جب اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں سنگِ مرمر کی دیوار کے پاس سے بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ پہرے دار زور زور سے بول رہے تھے۔ شانی نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اندر آ گئی۔ اس کے دل میں انجانے اندیشے پھر شدت سے سر اٹھانے لگے۔ آوازیں مخدوش تھیں، کتوں نے بھی حقِ نمک ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

شانی نے نائٹ بلب کی روشنی پھر مدھم کر دی۔ کھڑکی کا پٹ ذرا سا وا کر کے وہ بیرونی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ آوازیں دم بدم بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی لاش کا ذکر تھا، شانی کو لگا کہ اس کی رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے چوہدری بشیر کی للکار سنائی دی۔ وہ پہرے داروں سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ کہیں آس پاس ہی ہے۔ دیکھو...... چاروں طرف دیکھو۔“

اس کے ساتھ ہی بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شانی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

”یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے؟“

اس نے مڑ کر باتھ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ رستم اب کسی بھی وقت نکلا چاہتا تھا۔ ”کیا رستم کی یہاں موجودگی کا راز کھل گیا ہے؟ کیا وہ پکڑا جائے گا؟ کیا وہ مارا جائے گا؟“ اَن گنت سوالات شانی کے ذہن پر حملہ آور ہوئے۔

وہ جانتی تھی، خطرے کا شکار ہو کر رستم کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔ اپنے مدِمقابل کو چیونٹی کی طرح مسل دینا اس کے لئے قطعی مشکل نہیں تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ بہت بدل چکا ہے لیکن اب بھی ماضی سے اس کا ناتا مکمل طور پر ٹوٹا نہیں تھا۔ شانی کو تو اب یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ شاید کسی کو مار کر یہاں تک پہنچا ہے۔ عین ممکن تھا کہ احاطے میں جس لاش کا ذکر ہو رہا تھا وہ رستم کے ہاتھوں گری ہو۔

یکا یک شانی کا خوف انتہا کو پہنچ گیا۔ چوہدری بشیر انیکسی کی طرف آ رہا تھا۔ انیکسی اور کوٹھی کے درمیان دروازے کا عارضی قفل کھول کر وہ لان میں پہنچ چکا تھا۔ برآمدے کی طرف آتے ہوئے وہ بلند آہنگ میں گارڈز کو ہدایات بھی دے رہا تھا۔ شانی نے کھڑکی کی درز میں سے آنکھ لگا کر دیکھا...... وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا۔ اس نے لان کی وسطی لائٹ آن کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیاہ پسٹل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے عینک کے شیشے روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک لاٹھی بردار پہرے دار تھا۔ دونوں درختوں کی اوٹ میں اور کونے کھدروں میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب

کسی بھی وقت انیکسی کا دروازہ کھٹکھٹا دیں گے۔

شانی تڑپ کر باتھ روم کے دروازے کی طرف لپکی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تصادم کا خطرہ شدید تر تھا، شانی جانتی تھی۔ اگر تصادم ہوا تو گھیرے میں آئے ہوئے درندے کی طرح رستم بے حد خطرناک ثابت ہوگا۔ اگر رستم اور چوہدری کا تصادم ہوتا تو اس میں چوہدری کی مات یقینی تھی۔ فربہ جسم والے چوہدری بشیر اور بے حد تیز رفتار رستم کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اس نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ چوہدری بشیر سینے پر گولی کھا کر اوندھے منہ کمرے کے قالین پر گر رہا ہے۔ وہ روک رہی ہے اور رستم بے انتہا وحشت کے عالم میں اس پر پستول خالی کر رہا ہے۔ پھر بھابو کا تصور اس کے ذہن میں چمکا۔ وہ بین کر رہی تھی۔ رانیں پیٹ رہی تھی۔ منّا اور ندیم اپنے ابو کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے...... وہ سر تا پا کانپ گئی کیا واقعی ایسا ہونے والا تھا؟ کیا وہ بھابو کے لئے بدترین آفت کا باعث بننے والی ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ اس نے رستم کے پستول سے میگزین الگ کیا اور سپرنگ کو دبا دبا کر گولیاں نکال لیں۔ اس کام میں اسے بمشکل ایک منٹ لگا۔ (چوہدری ارشاد کی بیٹی اور چوہدری عادل کی بہن ہونے کی حیثیت سے وہ ہتھیاروں سے نا آشنا نہیں تھی) اسی دوران میں انیکسی کی کال بیل چیخنے لگی۔ چوہدری بشیر دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ شانی نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ قالین پر خونی قطروں کے نشان اب بہت مدھم ہو گئے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر شانی نے تپائی گھسیٹ کر وہاں رکھ دی۔ پھر وہ باتھ روم کے دروازے کی طرف لپکی۔ تیز سرگوشی میں بولی۔ ”رستم...... رستم۔“

”جی بی بی......“

”تم اندر ہی رہنا...... بب...... باہر گڑبڑ ہو گئی ہے اور لائٹ بھی بجھا دو۔“ اندازہ ہوا کہ شانی کے بتانے سے پہلے ہی رستم کو گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ ”بی بی! میرے خیال میں اب چھپنا فضول ہے۔“

”نہیں رستم...“

”خدا کے لئے بی بی! میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کریں۔ میں چوہے کی موت مرنا نہیں چاہتا۔“

وہ تیزی سے بڑھا اور اس نے بیڈ کے نیچے سے وہ چرمی بیلٹ نکال لی جس میں پسٹل، خنجر اور گولیاں وغیرہ لگی تھیں۔

کال بیل ایک بار پھر چیخی۔ فردوس کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ”کون ہے جی؟“

''دروازہ کھولو۔'' چوہدری نے بے حد تحکم سے کہا۔

رستم بیلٹ اپنی کمر سے باندھتا ہوا ٹی وی لاؤنج کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ شانی کا دل جیسے اس کے پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ وہ زمین پر تھی نہ آسمان پر۔ بس ایک مہیب خلا میں معلق تھی۔ شانی کی خواب گاہ کے دروازے پر چوہدری کے بھاری بھرکم ہاتھ کی دستک ہوئی۔ شانی نے دروازہ کھولا۔ چوہدری کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ عجلت میں بولا۔

''شانی! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے یہاں؟''

''ج...... جی...... میں سمجھی نہیں۔''

''یہاں احاطے میں ایک قتل ہوگیا ہے، کوئی یہاں گھسا ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ بندے ہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم تینوں بھی ہوشیار رہنا۔ دروازے اندر سے اچھی طرح بند رکھو...... مُنا کہاں ہے؟''

''وہ سو رہا ہے۔'' شانی نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں کہا بھی تھا کہ برآمدے کی لائٹ جلا کر رکھا کرو۔'' چوہدری نے شانی کو سرزنش کی۔

''بس غلطی ہوگئی۔ وہ جالاں نہیں تھی ناں۔''

''ٹھیک ہے دروازے بند کرلو۔ پریشانی کی بات نہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

چوہدری جس طرح طوفانی انداز میں آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔

شانی کی سانس اب تک سینے میں اٹکی رہی تھی۔ چوہدری گیا تو سانس کی آمد و رفت بحال ہوئی۔ غنیمت تھا چوہدری انیکسی کے اندر نہیں آیا تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

فردوس کے ساتھ ساتھ زہرا بھی جاگ گئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ احاطے میں پہرے دار اور ملازمین بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کوٹھی اور ملازمین کی رہائش گاہ کی زیادہ تر لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ در و دیوار، درخت اور سبزہ، سبھی کچھ روشنی میں نہا گیا تھا۔ درختوں پر رین بسیرا کرنے والے پرندے شور و غل کے سبب ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد زہرا اور فردوس سے بات کرنے کے بعد شانی نے انہیں کمرے میں بھیج دیا اور کہا کہ کمرے کی کنڈی اندر سے چڑھا لیں پھر وہ خود بھی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پردے درست کر دیئے۔ ٹی وی لاؤنج کی طرف مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی میں رستم موجود تھا۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اب رستم کا یہاں سے نکلنا آسان نہیں

ہے۔ دوسری طرف اس کا یہاں رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس مختصر سی انیکسی میں کسی بھی لمحے فردوس اور زہرا اس کی موجودگی سے آگاہ ہوسکتی تھیں۔ ''یا خدا! میں کیا کروں؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

رستم کا پکڑے جانا اس کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا اور اگر وہ انیکسی کے اندر سے پکڑا جاتا تو پھر یہ قیامت کبریٰ ہوتی۔ شانی کے ساتھ رستم کا تعلق آشکار ہو جاتا تو پھر یہ چوہدری بشیر بھی اپنی تمام تر خواہشات کے باوجود شانی کو بدترین موت کا حق دار قرار دیتا۔

ان لمحوں میں شانی کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار ہو اور وہ خود کو شوٹ کر لے۔ دنیا کے جنجالوں سے آزاد ہو کر وہ وہیں پہنچ جائے جہاں اس کے ابا جی اور امی جی تھے اور باقی سارے پیارے تھے۔ اگر ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ خودکشی کو حرام نہ سمجھتی تو اس کام میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتی۔

وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ احاطے میں ہلچل بڑھتی جا رہی تھی۔ رستم ٹی وی لاؤنج کی تاریکی سے برآمد ہوا۔ اس نے گرم چادر اپنی کمر کے گرد ایک بڑے پٹکے کی طرح باندھ لی تھی۔ صافہ پہلے کی طرح اس کے سر اور چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔

شانی نے دلفگار لہجے میں کہا۔ ''رستم! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ یہاں آ کر تم نے اتنی بڑی غلطی کی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب اس غلطی کا مداوا میری اور تمہاری جان جانے سے بھی نہیں ہوسکے گا۔ تم نے ایسا کیوں کیا رستم؟'' شانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

وہ تڑپ کر بولا۔ ''بی بی! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ سوئی چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ جو کچھ ہوگا، میرے ساتھ ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ بھی نہ ہو، امید ہے کہ میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''نہیں رستم! ابھی نہیں......'' شانی نے بے قرار ہو کر اس کا بازو تھام لیا۔

''نہیں بی بی...... اب جتنی دیر ہوگی آپ کے لئے خطرہ اتنا ہی بڑھے گا۔ میں آپ کی چھت کے نیچے سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ یہاں سے دور ہونے کے بعد جو بھی ہوگا دیکھ لوں گا۔'' اس کا لہجہ اٹل تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ شانی نے ایک بار پھر اس کا بازو تھامنے کا ارادہ کیا مگر پھر ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی وہ اب رکے گا نہیں۔ وہ اب اپنی ''بی بی'' کے لئے مزید خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ انیکسی سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جو بھی ہو جاتا اسے قبول تھا۔ اس

نے ہولے سے برآمدے کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول لیا۔

”اللہ حافظ بی بی۔“ اس نے عجیب نظروں سے شانی کی طرف دیکھا۔ ان زخمی نظروں کا تاثر لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ہزار ہا الفاظ بھی بولے جاتے تو شاید ان نگاہوں کے اندوہ کا مقابلہ نہ کر سکتے۔

شانی سکتے میں کھڑی رہ گئی۔ اسے جواب میں اللہ حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ شاید وہ پتھرا گئی تھی۔ وہ چلا گیا۔ اسے اوجھل ہوئے دس پندرہ سیکنڈ ہوئے تھے۔ جب شانی کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اسے یاد آیا کہ رستم کا پستول خالی ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر رستم کے پیچھے بھاگے۔ اسے روک لے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

مُنا ہلچل کے سبب جاگ گیا تھا۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا تھا اور پریشان نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ ”تاتی ... ! کیا ہوا ہے؟“ اس نے بسورتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ شانی نے کہا اور اٹھا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کوٹھی کے احاطے سے بلند ہونے والی آوازیں شدت پکڑ رہی تھیں۔ شانی نے مُنے کو کمبل میں لپیٹا اور بے قرار ہو کر چھت کی طرف بڑھی۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ برساتی میں آئی اور تالا کھول کر چھت پر آ گئی۔ سرد ہوا برچھیوں کی طرح اس کے جسم سے آر پار ہوئی۔ یکا یک وہ لرز اٹھی۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز نے بہت دور تک فضا میں تہلکہ مچا دیا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ اسے شعلے اوپر کی طرف لپکتے دکھائی دیئے تھے۔ مُنا کچھ اور بھی اس سے چمٹ گیا۔ اس کا ننھا سا دل مشین کی طرح چل رہا تھا اور شاید شانی کی کیفیت بھی یہی تھی۔ شانی نے منڈیر کے اوپر سے احاطے میں جھانکنے کے لئے اینٹوں کو جوڑ کر ایک چھوٹا سا تھڑا بنا رکھا تھا۔ وہ اس چبوترے پر چڑھ گئی۔ اس کے خشک ہونٹ مسلسل دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔

کوٹھی کا وسیع احاطہ فینسی لائٹس اور عام ٹیوبوں کی روشنی میں منور تھا۔ پہرے دار ہیجانی انداز میں اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ رستم کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شانی کے دل میں یہ امید جاگی، شاید وہ گارڈ ینیا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا بیرونی گیٹ کی طرف نکل گیا ہو لیکن نہیں..... ایسا نہیں ہوا تھا۔

اچانک ایک منظر نے شانی کی نگاہوں کو جکڑ لیا۔ اس نے احاطے کے جنوبی حصے میں شدید ہلچل محسوس کی۔ ایک ساتھ کئی چنگھاڑیں گونجیں۔ پہرے داروں کے جسم تیزی سے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ پھر شانی کو سفید کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ یقیناً یہ رستم تھا۔ رستم

نے کسی کو عقب سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانی نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ یقیناً چوہدری قادرا تھا۔ اس کے سُرخ کپڑے، چمکیلی سُرخ واسکٹ اور اسی رنگ کا پرنا دور ہی سے صاف چمکتے دکھائی دیتے تھے۔

یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ چاروں طرف للکاریں گونج رہی تھیں، یقیناً ان میں جو للکاریں زیادہ بلند تھیں وہ رستم کی ہی تھیں۔ وہ قادرے کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا گاڑیوں کی طرف تھا۔ اس نے قادرے کے سر پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ یہ پستول کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ تقریباً چار گارڈز اردگرد موجود تھے۔ وہ رائفلیں سونتے آگے بڑھ رہے تھے۔ رستم کے ہر قدم کے بدلے وہ ایک قدم اٹھا رہے تھے۔ تاہم رستم کے قریب جانے کی ہمت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ گارڈز کی دائیں جانب خود چوہدری بشیر موجود تھا۔ اس نے اپنا پستول دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ عین اس وقت جب رستم گاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا، ایک کتا اپنے رکھوالے سے چھوٹ کر گولی کی رفتار سے رستم اور قادرے کی طرف بڑھا۔ رستم نے پلٹ کر فائر کیا...... مگر فائر نہیں ہوا۔ شانی نے گارڈز کو عقابوں کی طرح رستم پر جھپٹتے دیکھا۔ پھر یہ سارا منظر گوندلی کے دو بلند درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ شانی کو صرف اتنا دکھائی دے رہا تھا کہ چند افراد گتھم گتھا ہیں۔ گر رہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، پھر گر رہے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی بجلی کی طرح لپک رہا ہے۔ چیتے کی طرح تڑپ رہا ہے۔ تن تنہا ہونے کے باوجود وہ اپنے نصف درجن حریفوں میں کھلبلی مچا رہا ہے۔ پھر حریف بڑھتے چلے گئے۔ گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ شانی نے نارپور کے چوہدریوں کی وحشیانہ آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں بتا رہی تھیں کہ بالآخر انہوں نے اپنے اکیلے دشمن پر غلبہ پا لیا ہے۔ اب وہ اسے زمین پر گرا کر بے دردی سے مار رہے ہیں..... شاید جان سے مار رہے ہیں۔

شانی کو لگا کہ وہ ایک سیکنڈ اور کھڑی رہی تو چکرا کر گر جائے گی۔ وہ منڈیر سے ہٹی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا وہ کب سیڑھیاں اُتری۔ کب کمرے کا دروازہ کھولا۔ اسے بس اتنا احساس ہوا کہ اس نے مُنے کو قالین پر کھڑا کیا ہے اور اپنے قدموں پر بُری طرح لڑکھڑائی ہے اس کی سماعت میں فردوس اور زہرا کی خوفزدہ چیخیں گونجیں۔ پھر اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

شانی کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ کھڑکی سے باہر دن کا اجالا نظر آ رہا تھا۔ اس

کا جی متلا رہا تھا اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ چوہدری بشیر اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس نے شانی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ مُنا ہولے ہولے شانی کے رخسار پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شانی کی آنکھوں میں وہ آخری منظر آیا جو اس نے رات کو منڈیر پر سے دیکھا تھا۔ اس کے سینے میں ایک ناقابلِ بیان ٹیس اٹھی۔ رگوں میں لہو کی جگہ ایک جان لیوا غم دوڑنے لگا۔ اسے لگا کہ اپنے اندوہ پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہو جائے گا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی اور اس کو پکارنے لگے گی جس کا نام بھی زبان پر لانا اس کے لئے جرمِ عظیم تھا۔ وہ کہاں تھا......؟ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا......؟ جو کچھ رات اس نے دیکھا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا کہ اسی جگہ گوندلی کے پیڑوں کے نیچے کچی زمین پر اس کے ٹکڑے کر دیئے گئے ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ اب یہ ٹکڑے کسی پولیس سٹیشن پر پڑے ہوں۔ کسی چارپائی کے اوپر، ان پر چادر تانی گئی ہو۔ چادر کے سُرخ دھبوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ پولیس والوں کو بتایا جا رہا ہو کہ یہ ڈاکو، رستم سیال قتلِ عام کی نیت سے ان کی کوٹھی میں داخل ہوا لیکن پہرے داروں اور ان کے خونخوار کتوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ یا پھر وہ کسی سرکاری ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے کسی پولیس سرجن کی میز پر پڑا ہو۔ اس کے لمبے بال خون میں بھیگے ہوں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نرم ریشمی داڑھی پر لہو کی پپڑیاں جمی ہوں۔ اس کے چوڑے سینے پر سنگینوں اور گولیوں کے نشان ہوں اور پھر...... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہو......سانس لے رہا ہو لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔

شانی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ جو کچھ چوہدری بشیر سے پوچھنا چاہتی تھی۔ پوچھ نہیں سکتی تھی اور یہ مجبوری اس کے سینے میں گاڑھا سیاہ دھواں بھر رہی تھی۔ اسے لگا وہ پھر بے ہوش ہو جائے گی۔

چوہدری نے نرمی سے کہا۔ ''تم لیٹ جاؤ...... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''لیکن......''

''پریشانی کی بات نہیں۔ تم نے رات والے واقعے کا بہت زیادہ اثر لیا ہے، تمہیں چھت پر نہیں جانا چاہئے تھا۔ جب کہ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ دروازے اندر سے بند رکھو۔ یہ بھی شکر ہے تم سیڑھیاں اُترتے ہوئے گر نہیں گئیں۔ ایسا ہوتا تو تم اور مُنا دونوں زخمی ہوتے۔''

''وہاں...... کک...... کیا ہوا تھا؟'' شانی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا تھا......بس تم لیٹ جاؤ......ابھی آرام کرو...... میں بعد میں تمہیں

بتاؤں گا۔'' اس نے شانی کو باقاعدہ کندھوں سے تھام کر واپس بستر پر لیٹا دیا۔

کچھ دیر بعد چوہدری اٹھ گیا۔ اس نے فردوس کو شانی کے لئے دودھ والا دلیہ بنانے کی ہدایت کی اور شانی سے بولا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر میں پھر آؤں گا۔ مُنا یہاں تمہارے پاس ہی ہے۔''

چوہدری کے جانے کے بعد فردوس کچن میں چلی گئی۔ بس زہرا شانی کے سرہانے کھڑی رہ گئی۔ زہرا نے کہا۔ ''آپ بالکل بے ہوش ہو گئی تھیں چوہدرانی! اللہ قسمے! ہم تو ڈر ہی گئے تھے۔ چوہدری صاحب نے خود آ کر آپ کو ٹیکہ لگایا تھا۔ پھر آپ کے منہ کا رنگ تھوڑا سا بدلا تھا۔ ورنہ بالکل پیلی پھٹک ہو گئی تھیں آپ......''

شانی نے محسوس کیا کہ اس کے کندھے پر ذرا سی دکھن ہے۔ غالباً انجکشن کی دکھن تھی۔ وہ زہرا کی باتیں سن رہی تھی مگر اس کے ذہن میں تو اور طرح کی کُھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ زہرا سے پوچھا۔ ''زہرا! کیا ہوا تھا رات کو؟''

زہرا کچھ دیر تذبذب میں رہی۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ شاید چوہدری بشیر نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کیا تھا۔ یا پھر وہ اپنے طور پر ہی ڈر رہی تھی۔ شانی نے ایک بار پھر اصرار کے ساتھ پوچھا۔ ''بتاؤ ناں زہرا...... کیا ہوا تھا؟''

''کچھ نہ پوچھو جی...... کیا ہوا۔'' زہرا آزردگی سے بولی۔

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔''

''چوہدرانی جی! یہاں ایسے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ پر رات والا تماشا کچھ زیادہ ہی دکھی کرنے والا تھا۔ رستم کا تو پتا ہے نا آپ کو......؟'' زہرا نے پوچھا۔

''نن......نہیں......ہاں۔'' وہ ہکلا گئی۔

''وہی جی، جس نے پندرہ بیس دن پہلے شادے پہلوان کی ٹانگیں توڑ دی تھیں۔ بہت بڑا ڈکیت ہے جی وہ۔ اتنا نڈر ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ پر بندہ کتنا بھی نڈر اور دلیر ہو جب کبھی بُرے وقت کے لپیٹے میں آ جاتا ہے تو کوئی شے کام نہیں آتی۔''

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟'' شانی کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔

''یہ مت پوچھیں جی، کیا نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اس کی بھی بے وقوفی ہے۔ اگر وہ ایک بار یہاں سے بچ کر نکل ہی گیا تھا تو دوسری بار موت کو آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب روتے رہیں گے، اس کا انتظار کرنے والے ساری حیاتی۔''

شانی کے پورے جسم میں موت کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے بمشکل اپنی زبان اور ہونٹوں

کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا۔ ''کک..... کیا انہوں نے مار دیا اسے؟''

زہرا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''جی ہاں......اسے مرا ہی سمجھیں جی۔ مار مار کر اس کا حشر کر دیا ہے مالکوں نے، اتنا خون بہا ہے جی کہ جیسے بکرے حلال کیے ہوں۔ میری پھوپھی نسرین کہتی ہے وہ وہیں پر مر گیا تھا۔ پر چاچا برکت کہتا ہے، اس کی سانس چل رہی ہے، چوہدری قادر صاحب اور ارشد حسین وغیرہ اسے گھسیٹتے ہوئے پچھلے ویہڑے (صحن) کی طرف لے گئے تھے۔''

''اب کہاں ہے وہ؟''

''کچھ پتا نہیں جی......''

''کیا پولیس نہیں آئی ہے؟''

''سنا ہے رات کو ایک گڈی آئی تھی۔ اس پر ہری پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ پولیس والے ہی ہوں گے۔ پر سادہ کپڑوں میں تھے۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے یہاں رہے، پھر چلے گئے تھے۔''

''وہ اس کو ساتھ لے کر نہیں گئے؟''

''آپ کا مطلب ہے رستم کو؟'' زہرا نے پوچھا۔ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ زہرا افسردگی سے بولی۔ ''اس کا اب کیا لے جانا ہے، انہوں نے...... مجھے تو لگتا ہے کہ وہ مر ہی گیا ہے۔ وڈے چوہدری صاحب نے مشورے کے لئے بلایا ہوگا کسی پولیس والے کو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نارپور سے بھی دو گڈیاں آئی ہیں۔ اونچی پگڑیوں اور کلف لگے کپڑوں والے سات آٹھ چوہدری بھی یہاں پہنچے ہیں۔ کوٹھی کے اندر کچھ صلاح مشورے ہو رہے ہیں۔''

شانی کا دل جیسے کسی بے رحم شکنجے میں تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ زہرا نے کہا۔ ''بے موت مارا گیا ہے وہ۔ پتا چلا ہے کہ جب پہرے داروں نے اسے گھیر ڈالا تو اس نے چوہدری قادر صاحب کو پکڑ لیا اور اس کے سر پر پستول رکھ دیا۔ وہ قادر صاحب کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا گاڑیوں تک لے گیا۔ پر جب گاڑی میں بیٹھتے وقت اس نے ایک کتے پر گولی چلائی تو گولی پستول میں پھنس گئی یا کچھ اور ہوا...... اتنا پتا چلا ہے کہ گولی چلی نہیں...... بس پہرے داروں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا مگر اس کو پکڑنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ دو تین منٹ تک وہاں زبردست لڑائی ہوئی جی۔ اس کے پاس خنجر بھی تھا۔ پہرے داروں میں سے کم از کم پانچ بندے زخمی ہوئے ہیں۔ ان میں سے نیابت خان اور ہاشم ملتانی بہت زیادہ زخمی ہیں...... اور ہاں میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ ایک بندہ مر بھی گیا ہے۔''

''کون؟'' شانی جیسے نیم بے ہوشی میں بول رہی تھی۔

''یار محمد...... وہ لمبا پہرے دار جس کی آنکھ تھوڑی سی خراب تھی۔ اس کی لاش دیوار کے پاس والے درختوں سے ملی ہے۔ اس کی لاش ملنے پر ہی تو کوٹھی میں کھلبلی مچی تھی۔ یار محمد کی ڈیوٹی فوارے کی طرف ہوتی ہے جی...... فوارے سے تھوڑا آگے وہ جگہ ہے جہاں چوہدری قادر صاحب ہوتے ہیں۔ لگتا ہے کہ رستم، چوہدری قادر کو ٹھکانے لگانے ہی یہاں گھسا تھا۔ پر اسے کیا پتا تھا کہ اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔''

شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ اگر وہ کچھ دیر مزید زہرا کی باتیں سنتی رہی تو دوبارہ بے ہوش ہو جائے گی۔ اس نے زہرا سے کہا۔ ''اچھا...... تم جاؤ۔ میں ذرا لیٹنا چاہتی ہوں۔''

مُنے نے کہا۔ ''تاتی...... ! میں بھی لیٹ جاؤں؟''

''نہیں منے! تم بھی ذرا باہر چلے جاؤ...... ٹی وی دیکھ لو۔ میں تھوڑی دیر سس...... سونا چاہتی ہوں۔'' شانی نے بمشکل کہا۔

وہ یکسر تنہائی چاہ رہی تھی۔ مُنا نہ چاہنے کے باوجود بھی زہرا کے ساتھ باہر چلا گیا۔ شانی اوپر تک لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے لگے۔ پورا جسم ایک دلفگار آنسو بن گیا...... تو آخر اس کی محبت رستم کو لے ڈوبی، کیوں ہوا ایسا؟ کیونکر ہوا؟ پچھتاوا ایک مہیب بوجھ کی طرح شانی کے جسم پر آن گرا اور اس کے ایک ایک ریشے کو پیسنے لگا۔ جو سب سے اہم سوال شانی کے دماغ میں دہکی ہوئی سلاخ کی طرح گڑ گیا تھا، وہ رستم کی زندگی اور موت کے بارے میں تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں۔ اس سوال کا حتمی جواب کون دے سکتا تھا؟ شاید خود چوہدری بشیر؟ مگر وہ کہاں تھا؟ اس نے کہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پھر آئے گا۔ یہ تھوڑی دیر نہ جانے کتنے عرصے پر محیط ہوگی۔ شانی کو گزرنے والی ہر گھڑی ایک صدی کی طرح لگ رہی تھی۔ دل و دماغ میں اندوہناک خیالوں کا ہجوم تھا۔ ایک سوال دلدوز کراہ بن کر بار بار سینے کی گہرائی سے بلند ہوتا تھا۔ ''رستم...... ! تم کیوں میری بدقسمتی کی لپیٹ میں آئے، کیوں تم نے اس طرح میرے بارے میں سوچا کہ پھر کچھ اور سوچ ہی نہ سکے۔ کسی اور طرف دیکھ ہی نہ سکے؟'' رستم سے ملاقات کے آخری لمحات بار بار شانی کی نگاہوں میں آتے تھے...... آہ...... وہ جلد از جلد شانی سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس کی موت نے اسے شانی کے قرب و جوار میں آلیا تو شانی کی ناموس پر حرف آ جائے گا۔ وہ شدید خطرات مول لے کر اور پہلی بار شانی کی حکم عدولی کر کے ایجنسی سے باہر گیا تھا، لیکن کیا وہ واقعی اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ اس بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس بات کا امکان موجود تھا کہ قادرے یا چوہدری بشیر کے ذہن میں شک پیدا ہو جائے۔ وہ یہ سوچنے لگی کہ کہیں رستم کی کوٹھی میں آمد اور شانی کی کوٹھی میں موجودگی میں کوئی ربط تو نہیں۔

دوپہر کے وقت چوہدری بشیر اسے پھر دیکھنے کے لئے آیا۔ ایک ملازم نے بہت سا پھل اور امپورٹڈ جوس کے پیکٹ اٹھا رکھے تھے۔ چوہدری اس کے پاس بیٹھ گیا اور حال دریافت کرنے لگا۔ اس کے لہجے میں لگاوٹ تھی اور اس لگاوٹ کی تہہ میں فدا ہو جانے والی کیفیت تھی۔ اس نے زبردستی شانی کو تھوڑا سا جوس پلایا۔ شانی کو تکلیف میں دیکھ کر چوہدری کے چہرے پر بھی تکلیف کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ روز بروز شانی میں زیادہ انوالو ہوتا جا رہا ہے۔ کسی وقت تو شانی کو بالکل بدلا ہوا شخص محسوس ہوتا تھا۔

شانی اس سے اپنی زندگی کا اہم ترین سوال پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ الفاظ اس کے سینے سے بلند ہوتے تھے لیکن لبوں تک آتے آتے ٹوٹ جاتے تھے۔ آخر چوہدری بشیر نے خود ہی کہا۔ ''آج بڑا مبارک دن ہے شانی، ایک بہت بڑے عذاب سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ گئی ہے۔ بے شک دو چار بندے زخمی ہوئے ہیں لیکن اس کے بدلے میں جو کامیابی ملی ہے وہ بہت بڑی ہے۔''

شانی سوالیہ نظروں سے چوہدری کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی چوہدری کے ہونٹوں کی اگلی حرکت بہت اہم ہے۔ چوہدری اسے رستم کے انجام کے بارے میں بتائے گا۔ شانی کا دل سینے میں برف کے گولے کی مانند تھا۔ آخر چوہدری کے ہونٹ ہلے۔ اس نے کہا۔

''اس حرامی رستم کا قصہ تمام ہو گیا ہے... وہ نیم مُردہ تھا۔ ہم نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے... اب قانون جانے اور اس کا کام.....اگر بالفرض وہ زخموں سے بچ بھی گیا تو پھانسی تو اس کا مقدر ہے ہی۔''

شانی کے سینے میں برف کا گولا پھر سے ہولے ہولے دھڑکنے لگا۔ وہ چوہدری کا چہرہ دیکھے چلی جا رہی تھی۔ چوہدری بولا۔ ''اس حرام زادے کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اب دندناتا ہوا ہمارے گھر میں گھس آتا تھا۔ پچھلے چند ہفتے میں یہ دوسری بار ہے کہ وہ یہاں گھسا ہے۔ جب اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اتنی تیزی سے خنجر چلایا کہ جو پاس گیا، لہولہان ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بدروح گھسی ہوئی ہے اس کے اندر... آخر ایک پہرے دار کی ماری ہوئی اینٹ اس کے سر پر لگی اور وہ گر گیا۔ بڑی مشکل سے قابو کیا گیا اسے ... بہت ہی مشکل سے۔''

شانی سن رہی تھی۔ چوہدری نے ابھی تک پہرے دار کی موت کا ذکر نہیں کیا تھا غالباً وہ

نہیں چاہتا تھا کہ پہلے سے ڈری ہوئی شانی مزید ڈرے۔ وہ بھول رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ واردات کے وقت خود ہی شانی کے سامنے پہرے دار کی موت کا ذکر کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ زہرا اور فردوس بھی اس موت سے آگاہ تھیں۔

چوہدری خاموش ہوا تو شانی نے پوچھا۔ ''پولیس والے اسے کہاں لے گئے ہیں؟''

''وہیں جہاں سب کو لے کر جاتے ہیں۔ تھانے میں۔''

''آپ تو بتا رہے ہیں وہ بہت زخمی تھا؟''

''ہو سکتا ہے کہ ہسپتال لے جائیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پولیس سٹیشن کے اندر ہی اس کا علاج کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے بندے کو ہسپتال لے جانا بھی تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے درجنوں ساتھی ہیں جو ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک ہیں۔ پولیس والے اسے جہاں بھی رکھیں گے، سیکورٹی کا زبردست خطرہ ہو گا۔''

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ دل پھر سے برف کا گولا بن گیا ہے۔ اس کی سانس رکنے لگی ہے۔ لیٹے لیٹے اس کی نگاہ تپائی کے نیچے گئی تھی۔ وہاں پستول کی تین گولیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ گولیاں ان چھ گولیوں میں سے تھیں جو رات کو شانی نے رستم کے پستول میں سے نکالی تھیں۔ باقی تین گولیاں بھی یقیناً تپائی کے نیچے ہی ہوں گی لیکن وہ شانی کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔ چوہدری ایسے زاویے سے بیٹھا تھا کہ ذرا سا بھی جھکتا تو گولیوں پر اس کی نگاہ پڑ جاتی۔ ایسا ہو گیا تو کیا ہو گا؟ شانی نے بے پناہ خوف کے عالم میں سوچا۔

یہ رستم کے پستول کی گولیاں تھیں اور رات کو جو معرکہ ہوا تھا۔ اس کی اہم بات ہی یہ تھی کہ رستم کے پستول میں گولیاں نہیں تھیں۔ یہ گولیاں اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت تھیں کہ رات کو پکڑے یا مارے جانے سے پہلے رستم اس خواب گاہ میں شانی کے ساتھ موجود تھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' چوہدری نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ ہکلائی۔

''تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے۔''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''تمہیں کہہ کر بھی گیا تھا کہ دلیہ ضرور کھا لینا لیکن تم نے ایک چمچ بھی نہیں لیا۔ ٹھہرو میں منگواتا ہوں تمہارے لئے۔''

''نن.....نہیں..... مجھے نہیں کھانا۔ پلیز نہ منگوائیں۔ میں بس ذرا آرام کرلوں تو ٹھیک

ہو جاؤں گی۔''

''بہتر ہے۔۔ تم تھوڑی دیر سو لو۔'' چوہدری اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی مقبول کے پاس ہسپتال جا رہا ہوں۔ مُنا بھی میرے ساتھ جائے گا۔ رات کو واپسی پر تمہیں دیکھنے آؤں گا۔''

شانی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ مُنّے کے گرم ہونٹ شانی نے اپنے ٹھنڈے رخسار پر محسوس کئے۔ پھر باپ بیٹا شانی کو اللہ حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی شانی نے دروازہ اندر سے بند کیا اور تپائی کے نیچے سے ساری گولیاں نکال لیں۔ اس نے گولیاں مٹھی میں دبائیں تو آنسو لگاتار اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

☆======☆======☆

رات کو چوہدری بشیر نہیں آیا۔ فردوس کی زبانی شانی کو معلوم ہوا کہ شاید ہسپتال میں بڑی چوہدرانی کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ شانی کا دل پہلے ہی زخموں سے چُور تھا۔ بھابو کی بیماری کا خیال گاہے بگاہے ان زخموں پر انگارے رکھ دیتا تھا۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا انسان پر ایسے بُرے وقت بھی آتے ہیں۔ اپنے ہی بنائے ہوئے خاکی پتلے کو خدا کیسے کیسے کڑے امتحانوں سے گزارتا ہے۔ زندگی اتنی کڑوی لگنے لگتی ہے کہ موت میٹھی محسوس ہوتی ہے۔ نرم نرم راتوں میں جب وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر ابا جی سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتی تھی تو وہ بے دھیانی میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ ''دھی رانی! غموں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ خوشی اور غمی ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ غم آتا ہے تو خوشی بھی ضرور آتی ہے۔ بس دونوں کا اپنا اپنا وقت ہوتا ہے۔''

وہ بڑے دکھ سے سوچنے لگی۔ اس کے غموں کا وقت کب ختم ہوگا۔ اس کے حصے کی خوشیاں کہاں ہیں۔ خوشیاں تو رہیں ایک طرف، اسے تو دور دور تک کہیں سکھ کا سانس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بس سانس کے نام پر زہریلی برچھیاں تھیں جو اس کے سینے پر چل رہی تھیں اور اس کی نازک جان کو ہلکان کر رہی تھیں۔ غم کا ایک جلتا ہوا ریگزار تھا۔ کہیں دیوار کا سایہ نہیں تھا۔ کہیں کوئی کندھا نہیں تھا جس پر وہ سر رکھ کر رو سکے۔

اگلے چوبیس گھنٹے اس طرح گزرے کہ وہ ہر پل مر کر جیتی رہی۔ قرب و جوار پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ اردگرد کے حالات ایک پہیلی کی طرح تھے۔ نارپور سے بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے بھاری بھرکم جیپوں اور کاروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

کوٹھی میں قتل ہونے والے پہرے دار یار محمد کی لاش بذریعہ ٹرک، میانوالی کے قریب اس کے آبائی گاؤں بھجوائی جا چکی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ جی ٹی روڈ کے پاس سے ایک ٹیکسی کار کھڑی ملی ہے۔ جس کے بارے میں خیال ہے کہ رستم اس پر یہاں پہنچا تھا۔ کل والے خونی واقعات کے بعد ٹیکسٹائل مل کے پورے ایریا کی نگرانی بے حد سخت کر دی گئی تھی۔ خاص طور سے رہائشی حصہ تو مکمل طور پر سیل تھا۔ زہرا کے بیان کے مطابق باوردی پولیس والے بھی یہاں وہاں گشت لگاتے دکھائی دیتے تھے۔

کوٹھی کے ملازمین تک جو بات پہنچی تھی، وہ یہی تھی کہ ڈکیت رستم کو شدید زخمی حالت میں پکڑنے کے بعد پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ شانی کی خواہش تھی کہ کسی طرح تازہ اخبار اس کے ہاتھ لگے۔ اخبار سے اسے رستم کے انجام کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔۔۔ ایک پل کے لئے بھی رستم کا خیال شانی کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کی خاموشی اب سوہانِ روح تھی۔ اس خاموشی سے تو بہتر تھا کہ وہ شانی سے جھگڑ گیا ہوتا۔ دل کھول کر شانی کو بے وفا، سنگ دل اور خودغرض ٹھہرایا ہوتا۔ دل کھول کر اسے بُرا بھلا کہا ہوتا بلکہ اس سے بھی اچھا تھا کہ وہ شانی کو تھپڑ مار دیتا۔ غضب کے عالم میں اسے زخمی کر ڈالتا یا اس کی جان لے لیتا لیکن وہ تو زمین سے نگاہ ہی نہیں اٹھاتا تھا۔ چپ چاپ سب کچھ جھیلتا چلا جاتا تھا اور اس کی یہ چپ شانی کو ہر روز ایک نئی زنجیر پہناتی تھی۔

کوٹھی میں چونکہ چوہدری کے رشتے داروں کی آمدورفت جاری تھی اس لئے شانی کے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مُنا بھی پلٹ کر انیکسی میں نہیں آ سکا تھا۔ جالاں اپنی ڈیوٹی پر واپس پہنچ گئی تھی اور اس نے شانی کو چوہدری بشیر کا یہ حکم بڑے سخت الفاظ میں پہنچایا تھا کہ وہ کمرے کے اندر رہے اور انیکسی کے احاطے میں بھی نہ آئے۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے زہرا بھاگی بھاگی آئی اور اس نے شانی کو بتایا۔ ''ایک اچھی خبر ہے چوہدرانی! بھابو ہسپتال سے واپس آ رہی ہیں۔ انہیں چھٹی ہو گئی ہے۔''

''تجھے کس نے بتایا؟''

''ماسی فردوس نے۔ میں نے خود بھی چھت سے دیکھا ہے۔ وہی ویگن ہے جس میں چوہدرانی جی کو لے جایا گیا تھا۔ ساتھ میں دو تین اور گڈیاں بھی آ رہی ہیں۔''

اتنے میں گاڑیوں کی آواز شانی کے اپنے کانوں تک بھی پہنچنے لگی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ بھابو ہسپتال سے اتنی جلدی واپس آ جائے گی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں

تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑیاں پورچ میں آ کر رک گئیں۔ شانی نے زہرا سے کہا۔ ''جا کر دیکھو ... بھابو کیسی ہیں؟''

زہرا چلی گئی۔ شانی دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا انتظار کرتی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے آ کر بتایا۔ ''چوہدرانی جی کو اندران کے کمرے میں لے گئے ہیں۔ وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر آئی ہیں۔ بہت کمزور نظر آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا تو دل ہول گیا۔ چوہدری صاحب بھی چپ چاپ تھے۔''

شانی بے چینی سے چوہدری کا انتظار کرتی رہی۔ اصل بات کا پتا تو اسی سے لگ سکتا تھا۔ وہ رات گیارہ بجے کے قریب آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شانی کا دل جو پہلے ہی بجھا ہوا تھا اور بجھ گیا۔ ''کیا حال ہے بھابو کا؟'' شانی نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

''حال ..... کچھ اچھا نہیں ہے۔'' چوہدری نے جواب دیا۔

''تو پھر .... تو پھر چھٹی کیوں دے دی ہسپتال والوں نے؟'' شانی نے تڑپ کر پوچھا۔

''تو کیا کرتے وہ؟'' چوہدری نے امپورٹڈ سگریٹ سلگایا۔ ''حالت جوں کی توں تھی۔ کسی وقت ذرا سی بہتر ہوتی ہے، پھر اسی طرح ہو جاتی ہے۔ سانس جھٹکوں سے آتی ہے۔ بے چینی بہت بڑھ جاتی ہے۔''

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟''

''وہ کہتے ہیں کہ ہسپتال آنے کے بعد مقبول کو ایک اور اٹیک ہوا ہے۔ اس اٹیک کے بعد اس کا دل ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ دل کا ایک حصہ اس طرح متاثر ہوا ہے کہ تقریباً مُردہ ہو گیا ہے۔ اب جو موجودہ حالت ہے اس میں کسی طرح کا آپریشن نہیں کیا جا سکتا نہ کوئی آلہ لگایا جا سکتا ہے۔ بس انتظار کیا جا سکتا ہے یا دعا کی جا سکتی ہے کہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔''

''تو آپ اسے گھر کیوں لے آئے ہیں۔ ہسپتال میں کیوں نہیں رہنے دیا؟'' شانی نے اشک بار لہجے میں پوچھا۔

''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ فیصلے جذباتی طور پر کرنے پڑ جاتے ہیں۔ ہم سب تو یہی چاہتے تھے کہ وہ ہسپتال میں رہے، ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے تھی۔ ایمرجنسی میں وہاں ہر طرح کی سہولت ہوتی ہے لیکن مقبول بضد تھی۔ وہ کہتی تھی مجھے بس ایک دفعہ گھر لے جاؤ ..... میں ہسپتال کے اس کمرے سے نکل جاؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اس کی یہ ضد اتنی شدید اور مسلسل تھی کہ مجھے مجبور ہونا پڑا۔ میں نے سینئر ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ اس نے کہا بہتر تو یہی ہے کہ مریضہ ہسپتال میں رہے۔ اگر آپ اپنے رسک پر لے جانا

چاہتے ہیں تو پھر آپ کی مرضی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کو آکسیجن سلنڈر اور ایمرجنسی میں استعمال ہونے والی کچھ چیزیں ارینج کرنا پڑیں گی۔ آج صبح میں نے چیزیں قیمتاً منگوا لی تھیں۔ ایک ڈاکٹر بھی ساتھ آئی ہے ..... دوائیں وغیرہ بھی ساری منگوا لی ہیں۔''

''اوہ گاڈ، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

چوہدری کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''مقبول کے دل میں اب بھی یہی خیال ہے کہ شاید حضرت صاحب کی کوشش سے اس کی حالت سنبھل جائے۔ آج صبح مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں حضرت صاحب کا پتا کروں ..... اتنی مدھم آواز میں بولتی ہے کہ بات مشکل سے کان تک پہنچتی ہے۔''

اچانک چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ چوہدری نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف کوئی شخص بھاری بھرکم لہجے میں بول رہا تھا۔ فون کے سپیکر سے برآمد ہونے والی آواز اتنی بلند تھی کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ شانی کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

چوہدری نے کہا۔ ''ہاں جی حضرت صاحب، پھر کب تشریف لا رہے ہیں آپ؟''

''میں بہت معذرت چاہتا ہوں چوہدری صاحب۔ میں نہیں آ سکتا۔''

''حضرت صاحب ایسا مت کہیں۔ ہم تو آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ہماری ساری امید آپ سے ہے۔''

''یہ غلط ہے چوہدری صاحب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کی ساری امیدیں مجھ سے ہیں نہ میرے پیدا کرنے والے سے۔ آپ کی امید انگریزی ڈاکٹروں سے ہے۔ آپ نے اپنا معاملہ خود خراب کیا ہے۔ چوہدری صاحب میں نے آپ سے اور چوہدرانی سے بار بار کہا تھا کہ میرے علاج کے اندر کسی اور کے علاج کو نہ گھسانا۔ ورنہ میری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔ آپ نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ میں قسم سے کہتا ہوں آپ دو چار دن اور انتظار کر لیتے تو سارے روگ کٹ جانے تھے چوہدرانی جی کے۔''

چوہدری نے کہا۔ ''جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا حضرت صاحب! اب یہ واپس تو نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ کی مریدنی ہے۔ آپ کا نام لے لے کر جیتی ہے۔ اس کی آنکھیں آپ کا رستہ دیکھ رہی ہیں۔''

''میں اب کیا کر سکتا ہوں چوہدری صاحب! اب تو معاملہ بہت آگے نکل گیا ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے حضرت صاحب، آپ بس آ جائیں۔ آپ کے ہونے سے ہم سب کو

سہارا ملے گا اور کیا پتا اس کی زندگی بچنے کی بھی کوئی سبیل ہو جائے۔ بس اب آپ انکار نہ کرنا۔ میں ابھی آپ کو لینے کے لئے گاڑی روانہ کر رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر مزید گفتگو ہوئی پھر چوہدری نے فون بند کر دیا۔

شانی نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور کانپتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے گلے میں اتنے آنسو جمع تھے کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ چوہدری سے کہنا چاہتی تھی۔ "چوہدری! تم تو اپنے خانوادے میں سب سے روشن خیال بنتے ہو، تمہیں تو ہر اونچ نیچ کا پتا ہے۔ دنیا گھومی ہوئی ہے تم نے..... کیا تمہیں بھی احساس نہیں۔ یہ بہروپیا عامل کس طرح بھابو کی زندگی برباد کرتا رہا ہے۔ اب تم سب کچھ ہار کر پھر اسی کی طرف دوڑ رہے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تم سب کو۔" لیکن وہ یہ سب کچھ نہیں کہہ سکی۔

چوہدری اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تم کیا سوچ رہی ہو لیکن کیا کروں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں مجبور ہوں۔ مقبول کی حالت ایسی ہے کہ اس کی کوئی بات بھی رد نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دل پر بوجھ بڑھتا جائے گا۔ میں سوچتا ہوں۔ قدرت اللہ کے آنے سے ہو سکتا ہے کہ نفسیاتی طور پہ اسے کچھ فائدہ ہو جائے۔"

شانی بس آنسوؤں کے گھونٹ پیتی رہی۔ اس کے بس میں ہوتا تو چلا چلا کر اپنے سینے کا دکھ لفظوں میں سموتی اور یہ سخت ترین الفاظ پتھروں کی طرح چوہدری اور قدرت اللہ کے منہ پر دے مارتی۔

صبح سویرے شانی کو اوپر تلے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر اہم ترین تھی اور یہ رستم کے حوالے سے تھی۔ زہرا نے شانی کو غنودگی کی حالت سے جگایا۔ "چوہدرانی جی..... اٹھیں۔ آپ کو کچھ پتا چلا ہے؟ کچھ پتا چلا ہے؟"

شانی تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ سینے پر دوپٹا درست کیا۔ "کیا ہوا زہرا؟"

زہرا آنکھیں پٹ پٹا کر سرگوشی میں بولی۔ "ابھی ارشد حسین نے بتایا ہے کہ رستم کو اس کے ساتھیوں نے پولیس سے چھڑا لیا ہے۔ پولیس والے اسے میو ہسپتال سے کسی دوسرے ہسپتال لے جا رہے تھے۔ رستے میں رستم کے ساتھی پڑ گئے۔ گولیاں چلیں، ایک دو پولیس والے بھی زخمی ہوئے۔ وہ لوگ رستم کو ہتھکڑی سمیت چھڑا کر لے گئے۔"

شانی نے سناٹے کے عالم میں اس خبر کو سنا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے۔ پولیس رستم کے حوالے سے بے حد ہوشیار اور چوکس تھی۔ اگر اسے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا تو یقینی بات تھی کہ اس کی حفاظت کا سخت انتظام ہو گا۔ شانی کو یہ خبر غیر حقیقی محسوس ہو رہی

تھی۔ یا پھر اس میں کوئی گہری پلاننگ شامل تھی۔

زہرا نے ایک دو باتیں مزید بتائیں، پھر وہ سہم کر خاموش ہو گئی۔ جالاں دندناتی ہوئی آ رہی تھی۔ زہرا جلدی سے کچن کی طرف کھسک گئی۔

جالاں کی زبانی بھی شانی کو وہی اطلاع ملی جو زہرا کی زبانی ملی تھی۔ جالاں نے رستم کو غائبانہ چند گالیاں بھی دیں اور اس کے لئے بدترین خدشات کا اظہار کیا۔ جالاں نے جو دوسری خبر دی وہ حضرت صاحب کے حوالے سے تھی۔ جالاں نے بتایا کہ حضرت قدرت اللہ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے تشریف لے آئے ہیں اور اس وقت اپنی بیبیوں کے ساتھ بڑی چوہدرانی کے کمرے میں موجود ہیں۔ کوٹھی کے اس حصے کو بالکل خالی کرا لیا گیا ہے۔ گھر کا، یا گھر کے باہر کا کوئی بندہ اس طرف پھٹک نہیں سکتا ہے۔ دروازے لاک کر دیئے گئے ہیں اور روشن دانوں پر کالے کاغذ لگا دیئے گئے ہیں۔

صبح سویرے ملنے والی یہ دونوں خبریں اہم تھیں، خاص طور سے رستم کی خبر، یہ بڑی گنجلک خبر تھی۔ اس بات کا امکان تو فقط چار پانچ فیصد ہی تھا کہ یہ خبر درست ہو گی۔ قوی امکان یہی تھا کہ یہ خبر منصوبے کے تحت پھیلائی گئی ہے۔ اس خبر کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی ہو گی کہ رستم کو کوٹھی کے بیسیوں ملازموں اور پہرے داروں کے سامنے زخمی کیا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو مار کر لاش غائب کر دینا چوہدریوں اور ان کے پلپلے دوستوں کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اب چونکہ بہت سے لوگ دیکھ چکے تھے اس لئے پولیس نے رستم کو تحویل میں لیا تھا۔ تحویل میں لینے کے بعد اس کے فرار کا ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ بہر حال اس ڈرامے میں سے امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی ڈھونڈی جا سکتی تھی اور وہ یہ کہ اگر رستم زندگی کی بازی ہار چکا تھا تو پھر اس کی لاش کوٹھی کے اندر ہی شو کی جا سکتی تھی۔ یا پھر اسے گرفتاری کے وقت "ان کاؤنٹر" میں ہلاک قرار دیا جا سکتا تھا۔ فرار کے ڈرامے سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید رستم زندہ حالت میں چوہدریوں کے پاس ہو یا پولیس کی "آف دی ریکارڈ" حراست میں ہو..... شاید وہ لوگ یہ خیال کر رہے ہوں کہ اپنے پرانے اور بدترین دشمن کو فٹافٹ "پار" کر دینا کہاں کی سزا ہے۔ ایسے لوگ اپنے دشمن کی جان لینے سے پہلے اسے ذلت اور اذیت کے جہنم سے گزارنا بے حد ضروری خیال کرتے ہیں۔ شانی نے اپنے چاچا مشتاق اور ابا جی سے روایتی دشمنوں کے ایسے درجنوں لرزہ خیز واقعات سن رکھے تھے۔ اپنے دشمن کا سر، داڑھی مونچھیں اور بھویں مونڈ کر اس کا منہ کالا کرنا، اس کے گلے میں رسی باندھ کر جانور کی طرح گھسیٹنا۔ اسے غلاظت کھانے پر مجبور کرنا، اس کے منہ سے ایسے کلمات

کہلوانا جنہیں کہنا اس کے لئے کسی طور ممکن نہ ہوا اور ایسی ہی درجنوں بھیانک سزائیں۔

شانی کے دل سے ایک سسکی کے ساتھ بے ساختہ یہ صدا بلند ہوئی۔ ''اے اللہ! تُو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ وہ جیسا بھی تھا، فطرت کا بُرا نہیں تھا۔ تُو اسے عزت کی زندگی دینا اور اگر اس کا وقت پورا ہو چکا ہے تو پھر اسے عزت کی موت دے دینا۔''

وہ سسکتی رہی، سوچتی رہی اور رستم کی ممکنہ حالتِ زار کا تصور اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو رُلاتا رہا۔ گاہے بگاہے اسے یوں محسوس ہوتا کہ دل سینے میں اچانک ٹھہر جائے گا اور دوبارہ حرکت میں نہیں آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ بھابو کی حالتِ زار کا خیال بھی اس کے سینے میں ایک دہکتی سلاخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔

رات تقریباً بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا جب انیکسی کے اکلوتے پہرے دار نے کال بیل بجائی۔ جالاں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پہرے دار نے چند سیکنڈ تک جالاں سے کھسر پھسر کی پھر واپس چلا گیا۔ جالاں نے آ کر شانی کو جگایا (حالانکہ وہ پہلے سے جاگ رہی تھی) وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''چوہدرانی! اٹھ جاؤ...... بلاوا آیا ہے۔''

''کون بلا رہا ہے؟''

''آپ کی بھابو...... وڈے چوہدری جی نے کہا ہے کہ آپ ابھی آ جائیں۔''

شانی تو پہلے ہی کسی ایسے بلاوے کی منتظر تھی۔ ''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی اور چپل پہن کر اپنی شال لینے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ ذہن میں نت نئے خدشے وسوسے اور امکانات پیدا ہو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جالاں کے ساتھ باہر آئی اور کوٹھی کی طرف چل دی۔ رات سرد اور خاموش تھی۔ چاروں طرف ایک پُراسرار ٹھہراؤ تھا۔ ہلکے سے کہرے نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا اور روشنیاں اونگھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ درمیانی دروازے سے گزر کر وہ کوٹھی کے وسیع احاطے میں داخل ہوئیں اور اسے پار کر کے کوٹھی میں داخل ہو گئیں۔ ایک مقام تک شانی کے ساتھ آنے کے بعد جالاں رک گئی۔ درمیانی عمر کی ایک نقاب پوش عورت نے شانی کو اپنے ساتھ لیا۔ بلند دروازوں، قالین پوش کمروں اور آراستہ راہداریوں سے گزر کر شانی اس کمرے میں پہنچی جو بھابو کے کمرے میں اٹیچ تھا، حسبِ سابق قرب و جوار میں ایک عجیب خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو اپنی پُراسرار انگلیوں سے دماغ کو چھیڑتی تھی اور حواس کو مختل کرتی تھی۔ نقاب پوش عورت نے عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ کر اپنا نقاب ہٹا دیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی گوری چٹی عورت تھی۔ سوئی سوئی آنکھوں اور بہت باریک ہونٹوں والی۔ پہلے

کی طرح شانی سے دریافت کیا گیا کہ اس نے کوئی زیور وغیرہ تو نہیں پہن رکھا۔ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ عورت نے شانی کو وہیں کمرے میں چھوڑا اور بھابو کے کمرے کا ساگوانی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ غالباً وہ اجازت لینے گئی تھی کہ شانی کو اندر لانے یا نہیں؟ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ ادھ کھلے دروازے سے شانی نے کمرے کی مختصر جھلک دیکھی۔ اسے صرف بھابو کے پاؤں نظر آئے۔ وہ بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ ایک عورت جو غالباً صدف تھی پاؤں کی طرف بالکل ساکت کھڑی تھی۔ کسی بلی کی ہلکی سی ''میاؤں'' بھی شانی کے کانوں میں پڑی، کمرے میں مدھم سی سُرخ روشنی تھی۔

عورت نے بڑے شائستہ لہجے میں شانی سے کہا۔ ''آپ یہیں پر تشریف رکھیں۔ ابھی آپ کو پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔''

شانی کو وہاں بٹھا کر وہ عورت باہر چلی گئی۔ شانی دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھلنے اور اجازت ملنے کا انتظار کرنے لگی۔ آثار سے لگتا تھا کہ انتظار طویل ثابت ہو سکتا ہے ابھی شانی کو وہاں بیٹھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک لڑکی ہولے سے السلام علیکم کہتے ہوئے اندر آ گئی۔ شانی اسے دیکھ کر چونک گئی۔ لڑکی اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر شانی کو اس کے سارے کوائف یاد آ گئے اور ساتھ ہی وہ اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''سائرہ......! تم یہاں......''

سائرہ نے ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے شانی کو گلے سے لگایا اور بولی۔ ''میں ساتھ والے کمرے میں تھی شانی...... چار پانچ منٹ سے تمہیں دیکھ رہی تھی...... تمہیں پہچان تو لیا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ تمہیں ملوں یا نہیں۔''

شانی کو سائرہ کے بارے میں سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ تقریباً تین سال پہلے شانی گرمیوں کے موسم میں اپنی خالہ اور دو خالہ زاد بہنوں کے ساتھ جانسپور گئی تھی۔ وہاں وہ ڈیڑھ دو مہینے رہے تھے۔ ساتھ والے فلیٹ میں سائرہ اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھی۔ ان دنوں وہ ایم بی بی ایس کا فائنل امتحان دینے کے بعد آرام کی غرض سے وہاں آئی ہوئی تھی۔ شانی اور سائرہ میں دوستی ہو گئی تھی اور انہوں نے اچھا وقت گزارا تھا۔ بعد ازاں دونوں نے ایک دوسرے کا ایڈریس بھی لیا تھا لیکن ایک آدھ خط کے سوا ان میں رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ آج عرصے بعد شانی پھر سائرہ کو دیکھ رہی تھی۔

دونوں دھیمے لہجے میں بات کرنے لگیں۔ تین چار منٹ کے اندر شانی کو معلوم ہو گیا کہ سائرہ ہی دراصل وہ ڈاکٹر ہے جو بھابو کی دیکھ بھال کے لئے لاہور سے آئی ہے۔ سائرہ کی

باتوں سے شانی کے رنج و فکر میں اضافہ ہوا۔ سائرہ کا کہنا تھا کہ چوہدرانی کی حالت اچھی نہیں ہے اور بتدریج خراب ہو رہی ہے۔

''اس کا کیا حل ہے سائرہ؟'' شانی نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ شانی .....! چوہدرانی تمہاری کیا لگتی کیا ہیں اور تم یہاں کس حیثیت میں موجود ہو؟''

''چوہدرانی میری جیٹھانی ہیں۔ مگر ہم دونوں میں بہنوں کی طرح پیار ہے۔ میں اسے بھابو کہتی ہوں اور اس کی دیکھ بھال کے لئے یہاں موجود ہوں۔'' شانی نے بتایا۔

سائرہ نے چند سوال مزید پوچھے۔ شانی نے ان کے بھی مختصر جواب دیئے۔ وہ اور سائرہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ سائرہ نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے شانی کہ مجھے یہاں کے حالات کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں پچھلے تقریباً چوبیس گھنٹے سے یہاں موجود ہوں۔ چوہدرانی کو میری ضرورت بھی ہے مگر مجھے صرف ایک بار کے سوا چوہدرانی کے پاس جانے ہی نہیں دیا گیا۔ وہ بھائی صاحب جنہیں حضرت جی کہا جاتا ہے، پتا نہیں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ یہاں سب کچھ ان کے کنٹرول میں ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے میں نے چوہدرانی کے ''وائیٹل سائنز'' لینے کی پھر کوشش کی لیکن حضرت کی مریدنیوں نے مجھے آگے نہیں جانے دیا بلکہ حضرت کی چھوٹی بیوی تو مجھ سے لڑنے ہی لگی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خود بھی ڈاکٹر ہے۔''

''تم نے اس بارے میں چوہدری بشیر صاحب سے بات نہیں کی؟'' شانی نے پوچھا۔

سائرہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔ یوں لگا کہ وہ کچھ بتاتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''پتا نہیں شانی! مجھے تم سے یہ بات کہنی چاہئے یا نہیں، لیکن سچی بات یہی ہے کہ مجھے چوہدری صاحب کی بھی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ چوہدری صاحب کے بارے میں نرم سے نرم لفظ بھی استعمال کئے جائیں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بیوی کے علاج میں خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''ایک وقت تھا جب چوہدرانی کا علاج زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سینئر ڈاکٹروں نے چوہدرانی کے لئے ''پیس میکر'' تجویز کیا تھا۔ یہ کام زیادہ مہنگا نہیں تھا نہ ہی اس میں کسی طرح کا رسک تھا، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو لاکھ کا خرچا ہوتا ہے۔ چھاتی کے قریب اوپر کی جلد پر چھوٹا سا کٹ دے کر یہ آلہ لگا دیا جاتا ہے.... مگر پتا نہیں چوہدری صاحب یہ کیوں نہ کر سکے۔''

''لیکن...... لیکن سائرہ مجھے تو پتا چلا تھا کہ ڈاکٹروں نے بھابو کے لئے کوئی سیریس قسم کا آپریشن بتا رکھا تھا۔''

سائرہ حیران ہوئی، پھر اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہرگز نہیں میں شروع سے چوہدرانی کا کیس دیکھ رہی ہوں۔ بیماری کے سارے اتار چڑھاؤ کا مجھے معلوم ہے۔ ڈاکٹروں نے کبھی کوئی آپریشن نہیں بتایا۔''

''لیکن یہ پیس میکر والا آپریشن؟''

''بھئی، یہ تو آپریشن ہوتا ہی نہیں۔ مریض کو تو بے ہوش تک نہیں کیا جاتا۔ جلد کے اندر ایک چھوٹی سی تھیلی بنا کر آلہ رکھ دیا جاتا ہے۔ بس اس کے تار خون کی نالی کے ذریعے دل تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔''

شانی حیران ہو رہی تھی۔ چوہدری تو اسے کسی بڑے آپریشن کے بارے میں بتاتا رہا تھا اور بھابو کو بھی یہی معلوم تھا کہ اگر وہ ڈاکٹری علاج کرائے گی تو پھر اسے آپریشن کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ اس سے کیا مطلب تھا؟ کیا چوہدری نے اصل صورت حال چھپائی تھی؟

اس سے پہلے کہ شانی سائرہ سے کچھ کہتی، کہیں پاس ہی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پیدا ہوئی۔ شانی اور سائرہ دونوں چونک گئیں۔ سائرہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا میں چلتی ہوں کوئی آ رہا ہے۔'' وہ تیزی سے بغلی دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں داخل ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد درمیانی عمر کی وہی گوری چٹی عورت اندر داخل ہوئی۔ شانی کی طرف دھیان دیئے بغیر وہ تیزی سے بھابو کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ جیسے کوئی نرس ضروری سامان لے کر تیزی سے آپریشن تھیٹر میں گھس جاتی ہے۔

شانی ایک بار پھر کرب ناک انتظار میں معروف ہوگئی۔ سائرہ کی باتیں رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور پریشانی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ یکایک کسی پرندے کی چیختی ہوئی آواز نے شانی کو جھنجھوڑ دیا۔ یہ آواز اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ چند روز پہلے بھی اس نے یہی آواز اسی کمرے سے سنی تھی۔ یہ کاک ٹیل طوطے کی آخری چیخ تھی۔ آج یقیناً پھر کسی بے گناہ پرندے کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔ ایک ایسا طوطا جو اپنی مادہ سے اولین ملاپ کر رہا تھا۔ اسے بے رحمی سے آہنی سیخ میں پرو دیا گیا تھا۔ شانی کا دل دکھ اور کراہت سے بھر گیا۔ وہ خشک ویران آنکھوں سے بند دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ تب ہولے سے دروازہ کھلا اور درمیانی عمر کی عورت نے اپنا سر باہر نکال کر شانی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ شانی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل

ہوئی۔ کمرہ انوکھی خوشبو سے معطر تھا۔ ایک سُرخ بلب کی بہت مدھم روشنی پورے منظر کو خواب ناک تاثر دے رہی تھی۔ بھابو اپنے بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس کی ٹھوڑی تک لحاف کھچا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک پیالے میں کچھ سلگایا گیا تھا۔ پیالے میں سے سرمئی دھواں اٹھ کر پوری خواب گاہ میں پھیل رہا تھا۔ شانی نے بھابو کا کمزور، زرد چہرہ دیکھا اور اس کا دل رونے لگا۔ وہ بڑے تسلسل کے ساتھ زندگی سے دور اور موت کے قریب ہو رہی تھی۔ تین عورتیں بھابو کے اردگرد موجود تھیں۔ دو کے بارے میں تو شانی پہلے سے جانتی تھی۔ یہ حضرت صاحب کی بیویاں تھیں، منجھلی عریسہ اور چھوٹی صدف۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ تیسری اس کی بڑی بیوی ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ پہلی دونوں کی طرح تیسری بھی جسمانی طور پر سمارٹ اور پُرکشش تھی....اسے ایک بھرپور عورت کہا جا سکتا تھا۔ حضرت صاحب (قدرت اللہ) شانی کو کہیں دکھائی نہیں دیا۔ غالباً وہ ابھی ابھی باہر گیا تھا۔ اس کا رومال، قلم اور گھڑی وغیرہ بیڈ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پر رکھے تھے۔ پھر شانی کی نظر ایک کریہہ منظر پر پڑی۔ چند منٹ پہلے جس کاک ٹیل کو ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کا خونچکاں جسم ایک بڑے بلوری پیالے میں رکھا تھا۔ وہ اپنے ہی لہو میں لت پت تھا۔ اس کی سفید پشت پر سلاخ کا مہلک زخم صاف نظر آ رہا تھا۔ جس پنجرے میں کاک ٹیل کو ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ پر رکھا تھا مقصد یقیناً یہی تھا کہ مقتول پرندے کے خون سے قالین داغ دار نہ ہو۔ پنجرے کے اندر بھی ایک کاک ٹیل موجود تھا۔ یہ مادہ تھی۔ وہ بُری طرح لنگڑاتی ہوئی پورے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کا ایک پہلو بُری طرح گھائل تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نر کو ہلاک کرتے ہوئے وہ بھی زخمی ہوئی ہے۔ اس کا خون جس طرح بہہ رہا تھا، وہ بھی کسی وقت مر سکتی تھی مگر اس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ''خونی عمل'' کرنے والوں کا ''احساس'' فنا ہو چکا ہے۔ پھر ایک اور منظر پر شانی کی نگاہ پڑی اور اس کا ہولا ہوا دل مزید ہول گیا۔ بھابو کے سرہانے کی طرف مقتول پرندوں کے سروں کا ایک ہار سا بنایا گیا تھا۔ یہ کاک ٹیل نر طوطوں کے تقریباً پانچ عدد سر تھے۔ جنہیں ایک کالی ڈوری میں پرو دیا گیا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک میخ سے لٹکا دیا گیا تھا۔ سروں کے اردگرد جما ہوا خون سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ ممکن تھا کہ ایک دو سروں سے بُو بھی اٹھ رہی ہو تاہم کمرے میں پھیلی ہوئی تیز خوشبو میں ہر قسم کی بو باس دبی ہوئی تھی۔

قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف نے شانی کی طرف دیکھا پھر ہولے سے بھابو کا شانہ ہلایا۔ بھابو نے اپنی غنودگی سے بھری آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے

شانی کو دیکھتی رہی۔ اس کے سر نے آہستہ سے جنبش کی تو شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے شانی اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی سرد پیشانی چومی اور رخسار پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرا۔ بھابو کے لب ہلے اور اس نے بے حد دھیمی آواز میں کہا۔ ''شانی، میں نہانا چاہتی ہوں۔ میں نے تجھے اسی لئے بلایا ہے۔''

صدف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''پانی گرم کر دیا گیا ہے۔ صابن، تولیہ، سب کچھ باتھ روم میں موجود ہے۔ بس چوہدرانی جی کا اصرار تھا کہ وہ آپ کے ہاتھوں نہائیں گی۔''

کچھ ہی دیر بعد بھابو کو وہیل چیئر پر بٹھا کر باتھ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہ شانی، صدف اور عریسہ کا سہارا لے کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گئی اور باتھ روم کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ صدف اور عریسہ کے باہر جانے کے بعد شانی نے بڑی احتیاط سے بھابو کے کپڑے اتارے۔ بھابو کے جسم کی ہڈیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں اور پورے پنڈے پر ایک بیمار زردی پھیلی تھی۔ شانی نے اپنی دلدوز سسکیاں اپنے سینے میں قید کر لیں اور بڑی محبت سے اپنی بھابو کو نہلانے لگی۔ بڑے پیار سے بڑے دلار سے۔ ان لمحوں میں اپنی بھابو اسے ایک ناتواں سہمی ہوئی بچی کی طرح لگی۔ شانی کا دل چاہا اسے اپنی بانہوں میں چھپائے اور کہیں دور لے جائے۔ جہاں کوئی اس کی بھابو کو اس سے چھین نہ سکے۔

اچانک بھابو نے کہا۔ ''شانی، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو......تم ہی مجھے نہلانا۔''

''بھابو....'' شانی درد سے چیخ پڑی۔ اس نے بھیگی ہوئی بھابو کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور بلند آواز میں رونے لگی۔

صدف نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ ''کیا ہوا....کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں......'' شانی نے روتے روتے نفی میں سر ہلایا۔ بھابو ایک دم اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ شانی کے سامنے اسے کوئی شرم نہیں تھی مگر صدف کے سامنے وہ اپنی عریانی کو محسوس کر رہی تھی۔ بھابو کی کیفیت دیکھ کر صدف جلدی سے واپس چلی گئی۔ ایک بار شانی کے آنسو نکلے تو پھر نکلتے ہی چلے گئے۔ اس نے اسی طرح سسکتے ہوئے بھابو کو نہلایا اور کپڑے پہنائے۔ وہ بھابو کو سینے سے چمٹائے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہو گا بھابو.... تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی....میں......میں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔''

بھابو کو تینوں نے مل کر پھر وہیل چیئر پر بٹھایا اور بستر تک پہنچا دیا۔ اتنی سی مشقت نے ہی بھابو کا سانس الجھا دیا تھا۔ وہ کھینچ کر سانس لیتی تھی اور ہر سانس کے ساتھ سینے کو ہلکا سا

جھٹکا لگتا تھا۔ اتنے میں قدرت اللہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ حسبِ سابق پتلون کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کوٹ کی آستین کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ وہ موبائل فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔ شانی کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر وہ کرسی پر آ بیٹھا۔ موبائل فون اس کے کان سے لگا تھا اور وہ بڑی توجہ سے دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔ گاہے بگاہے اس کا سر اثبات میں بھی ہلنے لگتا تھا۔ آخر وہ مدبرانہ لہجے میں بولا۔ ''نہیں چشتی صاحب! ایسا نہیں ہے۔ کچھ لوگ یہ ضرور کہتے ہیں کہ جنات جب بہت بوڑھے ہوجاتے ہیں تو پھر سے بچے بن جاتے ہیں لیکن اس بارے میں کوئی ٹھوس روایتیں موجود نہیں ہیں۔ بس کہی سنی باتیں ہیں۔ ہمارے پیرومرشد کا فرمانا یہی تھا کہ جنات عمر رسیدہ ہونے کے بعد تحت الثریٰ میں جاتے ہیں۔ تحت الثریٰ کا مطلب تو سمجھتے ہیں ناں آپ؟''

دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا اور قدرت اللہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس دوران میں بھابو کو سانس لینے میں مزید دشواری پیش آنے لگی۔ قدرت اللہ نے اپنی ''علمی گفتگو'' سمیٹی اور فون بند کر کے بھابو کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک سُرخ رومال سے اس نے بھابو کا چہرہ ڈھانپ دیا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ چار پانچ منٹ بعد بھابو کی حالت میں کسی وجہ سے بہتری پیدا ہوگئی۔ قدرت اللہ نے آنکھ کے اشارے سے منجھلی بیوی عریسہ کو کچھ سمجھایا۔ وہ تیزی سے ایک بغلی دروازے میں اوجھل ہوگئی...... درمیانی عمر کی گوری چٹی عورت بھی اس کے پیچھے گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک طویل پنجرے کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ آہنی پنجرے کے نیچے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس پنجرے کو پولی تھین کی شیٹ کے وسط میں ٹھہرا دیا گیا۔ شانی یہ دیکھ کر دنگ ہوئی کہ پنجرے میں ایک سیاہی مائل بلی اور اس کا سیاہ نر تھا۔ یہ کسی عجیب نسل کا جوڑا تھا۔ ان کے قد لمبے کان تھوڑے سے بڑے تھے۔ شانی نے اس قسم کی بلیاں شاید پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ کاک ٹیل طوطوں کی طرح بلیوں کے پنجرے کو بھی ایک درمیانی رکاوٹ کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پنجرے کے دروازے سے کچھ تعویذ وغیرہ بندھے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ساتھ والے کمرے میں شانی نے بلی کی مدھم آواز سنی تھی۔ شاید اس کا ماخذ یہ پنجرہ ہی تھا۔

کمرے میں سنسنی کی کیفیت بڑھنے لگی۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ قدرت اللہ اپنے مخصوص انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی تینوں بیویاں سفید دستانے پہنے، ننگے پاؤں بالکل ساکت اور مؤدب کھڑی تھیں۔ قدرت اللہ نے اپنے سر کی حرکت سے عریسہ فراقی کو کوئی اشارہ کیا۔ اس نے پنجرے کی درمیانی رکاوٹ اوپر اٹھا دی۔ سیاہ رنگت اور موتیا

رنگ کی چمکیلی آنکھوں والا نر فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ وہ نہ جانے کب سے اس آزادی کا منتظر تھا۔ جلد ہی اس کی حرکات وسکنات بتانے لگیں کہ وہ اپنی مادہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگیا ہے۔ وہ اپنے انجام سے قطعی بے خبر تھا...... دوسری طرف عریسہ فراقی نے سٹیل کی نہایت تیز نکیلی سلاخ اپنے دستانہ پوش ہاتھوں میں تھام لی تھی۔ شانی نے محسوس کیا کہ وہ اب یہاں مزید کھڑی نہیں رہ سکتی...... غالباً قدرت اللہ کی بیبیاں بھی یہی چاہ رہی تھیں کہ اب وہ یہاں سے چلی جائے۔ شانی نے ایک دکھی نگاہ بھابو پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

اس کے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ وہ جلد از جلد چوہدری بشیر سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ بھابو ''خشک ریت کی طرح'' مٹھی میں سے پھسل رہی ہے اور کسی بھی وقت ہاتھ خالی رہ جائے گا۔ ایکسی میں آتے ہی وہ پی ٹی سی ایل کے فون سے چوہدری کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ کوشش کافی طویل ثابت ہوئی لیکن وہ لگی رہی۔ آخر رابطہ ہوگیا۔ دوسری طرف سے جو آواز آئی وہ چوہدری بشیر ہی کی تھی لیکن کافی بھاری بھرائی ہوئی سی تھی۔ ''ہیلو......کون ہے؟'' چوہدری نے قدرے بے زار لہجے میں کہا۔

''مم......میں شانی بول رہی ہوں۔''

''ہیلو کون......ہیلو۔'' آواز غالباً چوہدری تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

''میں شانی بول رہی ہوں چوہدری صاحب......!''

''ہیلو......'' ایک بار پھر کرخت لہجے میں کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑبڑا کر فون ایک طرف رکھ دیا گیا۔

اپنی دانست میں چوہدری نے فون بند کر کے رکھا تھا لیکن وہ ابھی تک آن تھا... دوسری طرف کی مدھم اور تیز آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور یہ آوازیں حیران کردینے والی تھیں۔ چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی اور ایک جوان نسوانی آواز نے کہا۔

''نہیں چوہدری جی......اب میں تھک گئی ہوں۔''

''نہیں بھئی......! بس ایک بار اور۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔''

''اچھا......میوزک تو لگائیں۔'' نسوانی آواز نے جیسے ہار مانتے ہوئے کہا۔ میوزک سنائی دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی چھن چھن اور پازیب کی جھنکار سے اندازہ ہوا کہ لڑکی ناچ رہی ہے۔

تین چار منٹ بعد میوزک کی آواز تھم گئی۔ لڑکی کی ہانپتی ہوئی آواز اُبھری۔ وہ موبائل کے پاس ہی کہیں بیٹھی تھی۔ ''چوہدری جی...... !اب تو خوش ہیں؟''

''خوش ہیں...... بھئی خوش ہیں...... اب اسی خوشی میں تھوڑی سی اپنے ہاتھ سے پلا دو۔''

''اونہوں۔''

''نہیں ڈارلنگ ! موڈ ہو رہا ہے۔''

''کیا اب صرف میرے نشے سے کام نہیں چلتا ہے؟'' ادا سے پوچھا گیا۔

''تمہارے نشے کا تو کوئی جواب ہی نہیں شیلا...... ایسی بوتل بھلا کہاں ہوگی جسے ہاتھ لگانے سے ہی نشہ ہو جائے......''

''اور جب منہ سے لگایا جائے؟''

''تو چار طبق روشن ''

''پینے سے پہلے ہی؟'' نسوانی آواز نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں، پینے سے پہلے ہی۔''

''پھر بھی اس لال پری کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

''کہا ہے ناں، کبھی کبھی نشے کو دو آتشہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''نہیں چوہدری جی...... مجھے لگتا ہے کہ آج کل بات کچھ اور ہے۔''

''کیا مطلب؟'' چوہدری نے مدھم آواز میں کہا۔ شانی بہ مشکل سن پائی۔

''آپ نے...... ایک دن کہا تھا ناں...... کوئی ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی، پھر چوہدری کی مدھم آواز ابھری۔ ''ہاں بھئی! وہ تو ہے۔ میں اس کے ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟''

''خوبصورت بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی بات ہے...... کوئی ایسی بات جو سمجھ میں نہیں آتی اور نہ میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔''

''آپ نے کہا تھا اس کی تصویر دکھاؤں گا۔''

''شاید کسی وقت دکھا دوں، لیکن ابھی نہیں اچھا چھوڑو ان باتوں کو، تم گلاس بھرو۔'' چوہدری کے لہجے میں ہلکا سا تحکم اور تھوڑی سی بیزاری تھی۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ بس شیشہ ٹکرانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ درمیان میں ایک دو بار نسوانی آواز نے کچھ کہا مگر الفاظ شانی کی سمجھ میں نہیں آسکے۔ پھر قربت کا کھیل شروع ہو گیا۔ نسوانی آواز ہنسنے لگی۔ لگتا تھا یہ ہنسی جس کے ہر انگ سے پھوٹ رہی ہے۔ وہ گریز کا مظاہرہ کر رہی ہے لیکن یہ وہی گریز تھا جو صنفِ مخالف کو اور بھی قریب لاتا ہے۔ یہ گریز مرد و زن کے تعلق میں کشش پیدا کرتا ہے اور انہیں ایک دوسرے میں گم ہونے کے لئے بے تاب کر دیتا ہے۔ کچھ دیر بعد کسمساتی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ ''لائٹ بند کریں۔''

لائٹ بند ہونے سے پہلے شانی نے فون بند کر دیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ سینے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ بھابو بسترِ مرگ پر تھی اور چوہدری اس کوٹھی کے کسی کمرے میں، یا کسی اور مقام پر، خود کو عورت اور شراب میں گم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوہدری بشیر کے حوالے سے کبھی کبھی شانی کے ذہن میں مثبت خیال پیدا ہو جاتے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ یہ چوہدری دوسرے چوہدریوں سے خاصا مختلف واقع ہوا ہے۔ بے شک شانی کے حوالے سے اس کا کردار کمزور تھا لیکن پھر بھی اس کے رویے میں ٹھہراؤ نظر آتا تھا۔ خاص طور سے پچھلے دو تین ہفتوں میں شانی نے کئی بار چوہدری کے متعلق مثبت انداز میں سوچا تھا۔ پھر جب وہ مُنے اور ندیم کے بارے میں سوچتی تھی تو اپنے دل میں چوہدری کے لئے مزید گنجائش پیدا کر لیتی تھی لیکن آج یہ ساری گنجائش یکلخت ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے ڈاکٹر سارہ کے ذریعے کچھ تکلیف دہ حقائق کا پتا چلا تھا اور اب ایک ''بہکے ہوئے اتفاق'' کے سبب شانی نے چوہدری کی زندگی کے خفیہ گوشوں میں جھانک لیا تھا۔ ان گوشوں میں کچھ بھی تو مختلف نہیں تھا۔ وہی چوہدری، وہی عورت، وہی رقص اور وہی اُم الخبائث۔ صدیوں پرانی وہی داستان۔ مشرقِ وسطیٰ کے شیخ ہوں یا پاک و ہند کے راجے مہاراجے اور جاگیردار، افریقہ کے قبائلی سردار ہوں یا یورپ کے لارڈز اور ڈیوک، سب اسی داستان کے سرگرم کردار ہیں۔

چوہدری بشیر کی مخمور آواز شانی کے تصور میں گونجتی رہی۔ اس نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا۔ ''کیا وہ کسی بھی صورتِ حال میں، کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے؟''

اس کا جواب نفی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم کے ہر ذرے نے جیسے نفی میں سر ہلایا۔ پتا نہیں کیوں، ان لمحوں میں رستم کو کھو دینے کا غم ہزار گنا شدت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ رات بڑی سرد، بڑی طویل اور ظالم تھی۔

شانی کمرے میں ٹہلتی رہی، رہ رہ کر مُنے کا خیال بے حد شدت سے اس کے دل و دماغ پر حملہ آور ہوتا تھا۔ آج مُنے کو دیکھے ہوئے تیسرا دن تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے لئے ماہیٔ بے

آپ کی طرح تڑپ رہا ہوگا۔ شانی کے ذہن میں بھی جب اس کا خیال آتا تھا سینے میں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا سینہ منّے کے لئے ''مامتا'' سے بھرا ہوا ہے جیسے ''مامتا'' کسی سیال شے کا نام ہو اور وہ نورانی سیال شے اس کے سینے میں لبالب بھری ہوئی ہو، منّے کو دیکھ کر یہ شے ہلکورے لیتی تھی، جوش مارتی تھی اور شانی کو اس بات پر ابھارتی تھی کہ وہ اپنا سب کچھ اس معصوم پر فدا کر دے، یہ عجیب ناطہ تھا...... انوکھا تعلق تھا۔

وہ آبلہ پا خوابگاہ کے طول و عرض میں ٹہلتی رہی اور یخ بستہ رات کسی دومونہی (دو منہ والی) ناگن کی طرح جی ٹی روڈ کے کنارے درختوں، کھیتوں اور سرکنڈوں میں رینگتی رہی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شانی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر کچھ ہو رہا ہے۔ کوئی بے رحم ہاتھ اس کے کلیجے کو مسل رہا ہے۔ اس کی انتڑیوں کو مروڑ رہا ہے۔ گاہے بگاہے رات کے سناٹے میں یکا یک اسے محسوس ہوتا کہ بھابو نے آواز دی ہے۔ وہ تڑپ کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگتی۔ کوٹھی سے واپس آئے ہوئے اب اسے دو گھنٹے ہو چلے تھے۔ وال کلاک کی سوئیاں چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔

شانی کی بے چینی عروج کو پہنچ گئی۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ کوئی چیز بے پناہ طاقت سے اسے بھابو کی طرف کھینچ رہی تھی۔

نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس نے گرم چادر اپنے گرد لپیٹی۔ جالاں کے خراٹے ساتھ والے کمرے میں گونج رہے تھے۔ شانی کے انیکسی میں واپس آنے کے بعد جالاں نے درمیانی دروازے کو مقفل کر دیا تھا۔ شانی نے جالاں کے تکیے کے نیچے سے چابی لی اور باہر ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں آ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ درمیانی دروازے سے گزر کر کوٹھی کی حدود میں پہنچ چکی تھی۔ دھند نے قرب و جوار کو دھندلا رکھا تھا۔ در و دیوار پر ایک خاموش سراسیمگی ٹھہری ہوئی تھی۔ قدرت اللہ کی پہرے دار مریدنیاں کوٹھی کے اندرونی حصے میں موجود تھیں۔

شانی کو دو جگہ روکا گیا لیکن وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی کہ چوہدری صاحب کے حکم پر ہی آئی ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے از خود یہاں سے گئی تھی لہٰذا اس سے زیادہ باز پرس نہیں کی گئی۔ بھابو کے کمرے سے پہلے آخری ناکے پر وہی گوری چٹی عورت موجود تھی جو گاہے بگاہے بھابو کے کمرے کے اندر بھی آ جا رہی تھی۔ وہ شانی کو دوبارہ دیکھ کر چونک سی گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ شانی سے کچھ پوچھتی، شانی نے اس سے بھابو کے بارے میں پوچھ لیا۔ ''چوہدرانی، اب کیسی ہیں؟''

جواب دینے سے پہلے عورت کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ منہ بنا کر

بولی۔ ''حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

شانی کے پورے جسم میں کرب کی ناقابلِ بیان لہر دوڑ گئی۔ اس کے بدترین اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ وہ بھابو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ عورت نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''میں اندر جانا چاہتی ہوں۔'' شانی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''نہیں...... ابھی آپ نہیں جا سکتیں۔'' عورت نے سخت لہجہ اپنایا۔

''تم مجھے روکنے والی کون ہوتی ہو۔ پیچھے ہٹو۔''

''یہ میری ذمے داری ہے، حضرت صاحب نے......''

عورت کی بات ادھوری رہ گئی۔ شانی نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور دروازہ کھول کر آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ قدرت اللہ کمرے میں موجود نہیں تھا لیکن اس کی تینوں بیویاں موجود تھیں۔ منجھلی بھابو کے سرہانے کھڑی تھی اور بڑے سائز کے ایک بلوری پیالے میں سے ایک محلول لے کر چمچ کے ذریعے قطرہ قطرہ بھابو کے بند ہونٹوں پر ٹپکا رہی تھی۔ بھابو کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا۔ اس کے سرہانے پرندوں کے سروں کا ہار، دیوار سے آویزاں تھا۔ اب اس ہار میں ایک سیاہ بلے کے سر کا اضافہ ہو چکا تھا......

بھابو جیسے آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اپنے رنج و غم پر قابو پانا شانی کے بس سے باہر ہو گیا۔ وہ قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف کو ایک طرف دھکیلتی ہوئی بھابو کی طرف بڑھی۔ ''بھابو...... میری بھابو...... آنکھیں کھولو۔'' اس کی پکار کمرے میں گونجی۔ وہ بھابو کی پیشانی اور رخسار چومتی چلی گئی۔

صدف نے اسے بھابو سے دور کھینچنا چاہا۔ ''کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کرخت لہجے میں شانی کو مخاطب کیا۔

شانی نے اسے دور دھکیل دیا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ...... میری بھابو سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم نے اسے مار دینا ہے۔ اس کی جان لے لینی ہے۔''

صدف نے شانی کو پھر دبوچنا چاہا۔ اس مرتبہ ایسا زنانے کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ عریسہ فراتی اور اس کی بڑی سوکن کی چیخیں کمرے میں گونجیں۔ صدف ایک مرتبہ پھر سنبھل کر شانی کی طرف بڑھی۔ اس نے شانی کو بالوں سے جکڑنے کی کوشش کی۔ شانی اسے دھکیلتی ہوئی دیوار تک لے گئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے صدف کا ایک پاؤں بلوری پیالے کے اندر پڑا۔ پیالہ چکنا چور ہوا اور اس کے ساتھ ہی صدف پھسل کر پوری قوت سے

دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگی اور وہ بے سدھ ہو کر گر گئی۔

عریسہ فراتی تو بس عالم خوف میں چیختی ہی چلی جارہی تھی۔ اس کی بڑی سوکن شانی کی طرف بڑھی لیکن وہ بھی شانی کا دھکا کھا کر دور جا گری۔ کمرے کے باہر سے گوری چٹی عورت اندر آگئی تھی۔ وہ بے سُدھ صدف کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صدف کی بڑی سوکن کے گرنے سے ایک مرتبان ٹوٹ گیا تھا اور اس میں سے پرندوں کی بہت سی چھوٹی بڑی ہڈیاں نکل کر قالین پر بکھر گئی تھیں۔ شانی نے طیش کے عالم میں وہ ہار توڑ کر پھینک دیا جس میں مقتول پرندوں کے سر پروئے گئے تھے۔ وہ بھابو پر جھک گئی اور اسے جھنجھوڑنے لگی۔

''بھابو... اٹھ جاؤ...... بھابو'' وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

رونے پیٹنے اور چلانے کی آوازیں بلند ہونے کے بعد قرب و جوار میں ہلچل محسوس ہونے لگی۔ شانی کو بھاگتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز آئی اور پھر ہانپا ہوا چوہدری بشیر دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ ''دوآتشہ'' نشے کے اثرات خدوخال پر ہنوز باقی تھے۔

چوہدری کو دیکھ کر شانی چلائی۔ ''چوہدری! بھابو جارہی ہے۔ بھابو ختم ہو رہی ہے۔ انہوں نے ختم کر دیا ہے بھابو کو۔''

چوہدری ہکا بکا کھڑا تھا۔ شانی نے سٹریچر پکڑا اور کھینچتی ہوئی بھابو کے قریب لے آئی۔

''چوہدری جی...... بھابو کو ہسپتال پہنچائیں۔ ورنہ یہ مر جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی۔''

اسی دوران میں سائرہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے گلے میں اسٹیتھ سکوپ جھول رہا تھا۔ شانی نے پکار کر کہا۔ ''ڈاکٹر......! میری بھابو کو دیکھو...... جلدی کرو ڈاکٹر۔''

سائرہ نے ایک سوالیہ نظر چوہدری کے چہرے پر ڈالی اور پھر تیزی سے بھابو کے قریب آگئی۔ اس نے اسٹیتھ سکوپ لحاف کے اندر گھسا کر بھابو کے دل کی دھڑکن سنی اس کا ایک ہاتھ نبض پر تھا۔ پھر اس نے پلکیں اٹھا کر بھابو کی آنکھیں دیکھیں۔ اس کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نمودار ہوئے۔ ''ان کا دل کام کرنا چھوڑ رہا ہے، انہیں فوری طور پر لے جانا ہوگا۔'' ڈاکٹر سائرہ نے کہا۔ ''She is under attack''

چوہدری سخت تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا۔ شانی اس کے کندھے تھام کر بولی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں چوہدری صاحب! خدا کے لئے کچھ کریں۔ انہیں کچھ ہو گیا تو...... میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

چوہدری ساکت و جامد کھڑا رہا۔ وہ جیسے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ شانی اسے چھوڑ کر بھابو کی طرف پلٹی۔ وہ سائرہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ڈاکٹر بھابو کو میرے ساتھ مل کر اٹھاؤ۔ ہم اسے ہسپتال لے کر جائیں گے۔ میں دیکھتی ہوں کون روکتا ہے مجھے'' ایک عجیب وجدانی کیفیت طاری تھی اس پر، چہرے پر ایسا رعب تھا کہ دیکھنے والی آنکھ ٹکتی نہیں تھی۔ کمرے میں موجود ہر فرد جیسے ہپناٹائز ہو گیا تھا اور شاید چوہدری بھی شانی نے سائرہ کے ساتھ مل کر بھابو کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ بھابو کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اب بھابو کو سٹریچر پر لانے کے لئے کم از کم ایک شخص کی اور ضرورت تھی... اچانک چوہدری بشیر آگے بڑھا اور شانی کی مدد کرنے لگا۔ چوہدری کے آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ کئی اور ہاتھ مدد کے لئے حرکت میں آگئے۔ بے ہوش بھابو کو سٹریچر پر پہنچا دیا گیا۔ اس کے جسم پر کمبل ڈالا گیا اور ہسپتال جانے کے لئے ضروری اشیاء سمیٹ لی گئیں۔

چوہدری باہر گیا اور ایک ملازم کو پکار کر کہا۔ ''سٹیشن ویگن پورچ میں لائی جائے...''

ملازم بھاگتا ہوا حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ یہی وقت تھا بھابو کا سانس جھٹکوں سے آنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر سائرہ کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس نے بی پی آپریٹس نکالا اور بلڈ پریشر دیکھنا شروع کیا، میٹر ریڈنگ کے ساتھ ہی اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ تیزی سے بولی۔ ''آکسیجن سلنڈر لاؤ، جلدی کرو۔''

شانی ایک ملازمہ کے ساتھ دوڑتی ہوئی گئی اور قریبی کمرے سے آکسیجن سلنڈر لے آئی۔ بڑی سُرعت سے ایک انجکشن تیار کر کے ڈاکٹر سائرہ نے بھابو کو لگایا، پھر ایک اور لگایا۔ پھر وہ موبائل پر کسی سینئر ڈاکٹر سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ چوہدری بشیر نے خواب گاہ کے اردگرد کے تمام دروازے بند کرا دیئے۔ تمام فالتو ملازماؤں کو باہر نکال دیا گیا تھا۔ قدرت اللہ کی بیویاں اور دو مریدنیاں نیم بے ہوش صدف کو بھی اٹھا کر باہر لے گئی تھیں۔

فضا میں خوفناک تناؤ تھا۔ فون پر اپنے کسی سینئر سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سائرہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ شانی ساکت و جامد ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی نظریں بھابو کے چہرے پر تھیں۔ بھابو جارہی تھی... بھابو جارہی تھی اور پھر وہ چلی گئی۔ ختم ہو گئی۔

شانی نے ایک دلدوز چیخ ماری اور تڑپ کر بھابو سے لپٹ گئی۔ ''بھابو آنکھیں کھولو...... بھابو...... بھابو......'' وہ اسے چوم رہی تھی، اسے ساتھ لپٹا رہی تھی۔

کمرے میں ایک ساتھ رونے کی کئی آوازیں بلند ہوئیں اور کہرام مچ گیا۔ خواب گاہ

کے اردگرد کے دروازے دھڑا دھڑ بجائے جا رہے تھے۔ کوٹھی میں موجود عزیز و اقارب اندر آنا چاہ رہے تھے۔ شانی نے بمشکل تین چار منٹ ہی بھابو کی میت پر آہ و بکا کی تھی کہ چوہدری نے اسے کھینچ کر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ روتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''سب لوگ اندر آنا چاہ رہے ہیں۔ اب تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔''

شانی نے خود کو چھڑایا اور دیوانہ وار بھابو کے سرد پاؤں چومنے لگی۔ ''میں نہیں جاؤں گی مجھے نہیں جانا۔'' وہ کرب کی انتہاء کو چھو کر بولی۔

جہاں درد و کرب کی انتہا ہوتی ہے، وہاں سے ایک اور کیفیت شروع ہو جاتی ہے۔ شاید اس لئے کہ خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے۔ میں تمہیں تمہاری برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ شانی کے ذہن پر بھی وہ کیفیت طاری ہوئی۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ اس کے ہاتھ اور اس کے ہونٹ بھابو کے پاؤں پر ہیں۔ اس کا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اسے دوبارہ ہوش آیا تو اسے اپنے چاروں طرف ایک گہری زرد دھند دکھائی دی۔ وہ کتنی دیر بعد ہوش میں آئی تھی؟ شاید ایک دن بعد...... شاید دو دن بعد...... یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ کافی دیر تک ہوش و حواس سے بے گانہ رہی ہے۔ پہلا دردناک خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ اسے اپنی بھابو کو نہلانا ہے...... لیکن اس کام کے لئے تو شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ بھابو کے آخری وقت کے تصور نے اس کے دل و دماغ کو غم کے گہرے تاریک غاروں میں دھکیل دیا۔ اس کا جی چاہا، وہ یہیں لیٹے لیٹے مر جائے۔

اچانک ایک شور اس کے کانوں کے راستے اس کے دماغ تک پہنچنے لگا۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں سے باہر کچھ لوگ چنگھاڑ رہے تھے، دھاڑ رہے تھے۔ ''مار دیں گے اسے، ختم کر دیں گے۔ یہ خونی ہے۔ یہ قاتلہ ہے۔'' پھر ایک للکارتی ہوئی آواز ابھری۔ ''زندہ جلا دو حرام زادی کو۔ یہ خون پینے والی ڈائن ہے۔'' یہ آخری آواز شاید چوہدری قادرے کی تھی۔

☆=======☆=======☆

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ کیوں ہو رہا تھا؟ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ در و دیوار لرزنے لگے تھے۔ پھر ایک پتھر اُڑتا ہوا آیا اور کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا۔ شیشہ چکنا چُور ہو کر صوفے اور قالین پر بکھر گیا۔ شانی چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا میں سے دیکھا اور لہو رگوں میں جمنے لگا۔ شام کے جھٹپٹے میں کم و بیش بیس افراد برآمدے میں دکھائی

دے رہے تھے، یہ سب کے سب تارپور کے چوہدری تھے۔ ان میں سے کئی ایک کی اونچی پگڑیوں کے شملے دور ہی سے لہراتے دکھائی دیتے تھے۔ گھنی مونچھیں، سُرخ آنکھیں، تمتماتے ہوئے چہرے...... آستینیں چڑھی ہوئی تیور بگڑے ہوئے۔ قادرا برآمدے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹھ ایم ایم رائفل تھی۔ اس کے عقب میں بھی دو افراد کے ہاتھ میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھی کے گارڈز انیکسی کے لان میں بکھرے ہوئے تھے۔

قادرا اور چند نوجوان افراد شانی کے کمرے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو تین عمر رسیدہ افراد انہیں روک رہے تھے۔ مگر آگے بڑھنے والوں کا غم و غصہ بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی بھی وقت مزاحمت کرنے والوں کو دھکیل کر کمرے کے دروازے پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ پھر شانی نے چوہدری بشیر کو دیکھا۔ وہ اپنے دو گارڈز کے ہمراہ تیزی سے آیا اور ہجوم کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ قادرا دھاڑا۔ ''سامنے سے ہٹ جاؤ بشیر! آج میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔''

''تُو نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔'' بشیر بولا۔ ''تُو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔'' اس کے ساتھ ہی بشیر نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔

''بشیر...... تُو سامنے نہ آ...... ورنہ تیرا نقصان ہو جائے گا۔ پیچھے ہٹ جا۔'' ایک بھاری آواز نے للکار کر کہا۔

''میں کہتا ہوں تم پیچھے ہٹ جاؤ۔'' چوہدری نے للکارا۔ ''میں تمہیں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنے دوں گا۔ اگر وہ گناہ گار ہے تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے تمہارے سامنے ذبح کروں گا۔ پر اگر وہ بے قصور ہے تو پھر ہم اس کا خون اپنے سر نہیں لے سکتے۔''

ایک ادھیڑ عمر گنجا چوہدری گرجا۔ ''تُو نے ہمارے پیو کی قاتل سے یاری لگائی ہوئی ہے، اس کو معشوق بنا کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اگر تُو ہمارے راستے میں آیا تو تیری ساری عشق معشوقی بھی اسی جگہ نکال کر رکھ دیں گے۔''

اس دوران میں قادرے نے جوش کھا کر آگے بڑھنا چاہا۔ چوہدری بشیر نے اسے دھکا دیا۔ اس کا ایک پاؤں برآمدے کی سیڑھی پر رپٹا اور وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی پر گرا۔ ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر بڑے زور کا طمانچہ چوہدری بشیر کو مارنا چاہا۔ چوہدری بشیر نے اس کی کلائی تھام لی۔ ادھیڑ عمر گنجے شخص کے پیچھے کھڑے دو تین افراد نے ایک دم اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ دوسری طرف چوہدری بشیر کے پیچھے گارڈز نے بھی اپنی رائفلوں کو سونت لیا۔ دو تین سیکنڈ کے لئے یہی لگا کہ ابھی یہاں دھماکے ہوں گے اور لاشیں گرتی نظر آئیں گی۔

شانی جیسے سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ پھر یکایک بیچ بچاؤ کرانے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ وہ متحارب افراد کے درمیان آ گئے۔ انہوں نے زوردار آوازیں بلند کیں اور گرج برس کر دونوں فریقوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ بہر حال آنکھیں ابھی تک شعلے اگل رہی تھیں اور چہرے انگارہ ہو رہے تھے۔ چوہدری بشیر کے پیچھے اب اس کے چار پانچ گارڈز آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دو تین ساتھی بھی کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

بڑی عمر کے ایک سیاہی مائل چوہدری نے اپنی کھسکی ہوئی پگڑی کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''خبردار! کوئی رائفل سیدھی نہ کرے۔ نیچے کرو رائفلیں ...... اور پیچھے ہٹ جاؤ۔''

ایک دوسرا بزرگ بولا۔ ''گولی چلانے سے کسی بات کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ ہم ایک غیر زنانی کے لئے کیوں اپنی جانوں کے دشمن بن رہے ہیں۔ بشیر پتر نے ٹھیک کہا ہے۔ جو بات بھی کرنی ہے بیٹھ کر کرو..... اور پھر جو فیصلہ بھی ہو اس کو سارے سچے دل سے مان لو۔''

''ٹھیک ہے، بلالو سب کو ...... آج ہی فیصلہ کرو۔'' ایک کرخت آواز نے کہا۔

''بالکل، آج ہی فیصلہ ہونا چاہئے اور اگر یہ گناہ گار نکلتی ہے تو ابھی ..... اسی وقت گزار دو اسے بجلی کے ٹوکے میں سے......'' قادر دھاڑا۔

شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا دل دھڑکنا بند کر دے گا اور وہ ابھی گر جائے گی، کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔

وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ باہر کی خوفناک آوازوں سے اپنی سماعت کو بچانے کے لئے اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ کافی دیر بعد جب اس نے انگلیاں کانوں سے نکالیں تو شور مچاتی ہوئی غضب ناک آوازیں کوٹھی کی طرف جا چکی تھیں۔ بس ہلکی سی جھنجھناہٹ باقی تھی۔

دروازہ کھلا اور آبدیدہ زہرا اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے شانی کو دیکھا۔ پھر ارد گرد نظر دوڑانے کے بعد ہولے سے بولی۔

''چوہدرانی جی! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اللہ بخشے چوہدری فاخر جی کی بیوی ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد آپ نارپور کی حویلی سے غائب ہوگئی تھیں۔''

شانی نے سر جھکایا۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ ''اور کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟'' شانی نے پوچھا۔

''دراصل..... دراصل آپ کو نارپور پنڈ کی دو عورتوں نے پہچانا تھا۔ جب وڈی چوہدرانی جی نے دم دیئے (آخری سانس لی) تو آپ کوٹھی میں ہی تھیں۔ پھر آپ روتے روتے بے ہوش ہوگئیں۔ اس وقت آپ کو نارپور کی ان عورتوں نے دیکھ لیا... '' زہرا نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر رحم آمیز نظروں سے شانی کو دیکھا اور ہمدرد لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کوٹھی میں نہیں جانا چاہئے تھا چوہدرانی۔ آپ کو چوہدری صاحب نے کہا بھی تھا کہ آپ ان سے پوچھے بغیر وہاں نہ جائیں۔ شاید ان کو یہی ڈر تھا کہ کوئی آپ کو پہچان لے گا۔''

شانی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا۔ ''زہرا! بھابو اب کہاں ہے؟''

زہرا نے سسکی لے کر کہا۔ ''ان کو کل شام دفنا دیا گیا تھا۔ آج جمعے کی نماز کے بعد ان کے قل ہوئے ہیں۔''

شانی نے ماتھا گھٹنوں پر ٹکایا اور چہرہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ زہرا نے جل کر کہا۔ ''اللہ کی مار ہو اس ماسی جالاں پر، اتنی بُری بُری باتیں کرتی ہے کہ دل کرتا ہے کہ اس کا منہ توڑ دیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کہہ رہی تھی کہ وڈی چوہدرانی کی جان آپ کی وجہ سے گئی۔ آپ نے کمرے میں گھس کر حضرت صاحب کی بیبیوں کو مارا.. ان کے نوری علم والے برتن توڑے.. اور بنا بنایا کام بگاڑ دیا اور یہ باتیں صرف جالاں ہی نہیں کہہ رہی، کوٹھی میں کئی نوکرانیاں بھی یہی بات کرتی ہیں۔ ابھی آپ کے کمرے سے باہر چوہدری جمع ہوئے تھے وہ بھی یہی بات کر رہے تھے..... وہ کہتے ہیں. وہ کہتے ہیں......'' زہرا ہکلا کر چپ ہوگئی۔

''کیا کہتے ہیں......؟'' شانی نے روتے روتے پوچھا۔ ''منحوس کہتے ہیں ناں، ڈائن اور چڑیل کہتے ہیں ناں... کون سا غلط کہتے ہیں۔ میں ایسی ہی تو ہوں زہرا۔ میری وجہ سے میرا چاچا اور میرا بھائی مرے۔ پھر میرے ابا جی کی جان گئی، سسرال میں آئی تو اپنے خاوند کو کھا گئی۔ اپنے دادا سسر کو قبر میں اتار دیا اور اب یہاں آئی ہوں تو اپنی بھابو کو قتل کر دیا ہے۔ ہاں میں قاتل ہوں زہرا...... تم جاؤ...... تم جاؤ، چوہدری جی کو بلا لاؤ۔ ان سے کہہ دو مجھے اپنے سارے گناہ قبول ہیں۔ مجھے مار دیں، زندہ جلا دیں۔ یا پھر میرے ٹکڑے کر دیں۔ جاؤ زہرا، بلا لاؤ چوہدری کو......''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ زہرا نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ یہی وقت تھا جب جالاں دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے حسبِ عادت ماتھے پر اپنا دوپٹا باندھ رکھا تھا۔ زہرا کو شانی کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ اور بھی آگ بگولہ ہوگئی۔ اُس نے لپک کر

زہرا کو بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر دروازے کی دہلیز پر دھکیل دیا۔ ”حرامجادی، کتی، کنجری! لکھ بار کہا ہے تجھ سے اپنے کام سے کام رکھا کر۔ نہ اس کے پاس بیٹھ کر باتوں کے چسکے لیا کر۔ چل دفع ہو یہاں سے، چل مر۔“

زہرا جان بچا کر کھسک گئی۔ جالاں نے نہایت قہرناک نگاہ شانی پر ڈالی۔ پھر نفرت انگیز انداز میں سر ہلایا اور دروازے کو ایک دھماکے سے بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ غالباً اس کا بس نہیں چلتا تھا، ورنہ اس نے جو سلوک زہرا سے کیا تھا اور جو سلوک چند دن پہلے انوری سے کیا تھا، شاید وہ شانی کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ شانی کے سینے میں زبردست ٹیس اٹھی۔ اسے مُنے اور ندیم کا خیال آیا۔ وہ کہاں تھے کس حال میں تھے؟ پھر رستم کے خیال نے اس کے سینے پر گھونسا مارا۔ وہ کہاں تھا؟ زندہ تھا یا وہ بھی کہیں دور جا چکا تھا؟ اسے یہی لگا کہ اس کا دوسرا خیال صحیح ہے۔ موت کی اس گرم بازاری میں رستم بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ رستم کی موت کے بارے میں سوچنے کے بعد شانی کو مرنا اور بھی سہل لگنے لگا۔ ان لمحوں میں اسے لگا کہ موت کسی خوفناک شے کا نام نہیں۔ یہ تو بس ایک کروٹ ہے۔ بائیں سے دائیں یا دائیں سے بائیں۔ ایک طرف زندگی ہے دوسری طرف موت...... فضا میں ایک ہولناک سراسیمگی تھی۔ اس سراسیمگی اور خاموشی میں وال کلاک کی ٹک ٹک بہت اہم ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گزرنے والا ہر لمحہ ایک انوکھی منزل کو شانی سے قریب تر کر رہا ہے۔ وہ جانتی تھی، اس کوٹھی کے کسی کمرے میں نارپور کے بہت سے غضب ناک چوہدری سر جوڑے بیٹھے ہیں اور اس کے لئے کوئی قرار واقعی سزا تجویز کر رہے ہیں۔

وہ ہر سزا کے لئے تیار تھی۔ ہر موت کا سامنا کر سکتی تھی۔ موت کے بارے میں سوچتے ہوئے صرف تین نام تھے...... صرف تین نام جو اس کے دل و دماغ میں تھوڑا سا دکھ ابھارتے تھے...... مُنا...... ندیم اور رستم۔

اچانک دروازہ کھلا اور چوہدری بشیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس کی ناک کے اوپر نظر آنے والی سلوٹ بہت نمایاں تھی اور یہ سلوٹ ظاہر کر رہی تھی کہ چوہدری بے حد پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ غصے میں بھی ہے۔ چوہدری کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اس کا آدھے سے زائد چہرہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ ایک گرم چادر اس نے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ یہ شخص باہر برآمدے میں ہی رک گیا۔ چوہدری اندر آ گیا۔ اس کے کلف لگے سفید کرتے پر پانی کے قطرے ظاہر کرتے تھے کہ باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔ وہ طیش بھری سرگوشی میں بولا۔ ”شانی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے تم سے...... تمہیں

مجھ سے پوچھے بغیر کوٹھی میں نہیں جانا چاہئے تھا۔ کام بہت خراب ہو گیا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے......“ شانی نے پہلی بار چوہدری کے مضبوط لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس کی۔ چوہدری نے تیزی سے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ابھی اسی وقت۔ یہ بندہ جو میرے ساتھ آیا ہے، میرا وفادار ملازم ہے۔ یہ تمہیں محفوظ ٹھکانے تک پہنچائے گا......“

”لیکن......“

”چپ رہو......“ چوہدری نے زہریلی سرگوشی کی۔ ”تمہیں پتا نہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں...... جان چلی جائے گی تمہاری...... یہ لوگ ٹکڑے کر دیں گے تمہارے۔“

”تو کر لینے دیں ٹکڑے۔ ان کے کلیجے ٹھنڈے ہو لینے دیں۔ میرے لئے اپنے خونی رشتوں سے دشمنیاں مول نہ لیں آپ......“ وہ آنسو بہاتے ہوئے صدقِ دل سے بولی۔

چوہدری کی انگارہ آنکھوں کی سُرخی ذرا کم ہو گئی، وہ مضبوطی سے اس کا شانہ تھام کر گویا ہوا۔ ”میں جو کہتا ہوں، وہی کرو یہی ہم سب کے لئے بہتر ہے...... اور دیکھو...... ضائع کرنے کے لئے ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔“

پھر شانی کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے اپنے کارندے کو آواز دی۔ ”ریاست اندر آ جاؤ۔“

لمبا تڑنگا شخص کمرے میں آ گیا۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پاؤں میں گرگابی تھی۔ وہ کسی قدیم لشکری کی طرح تن کر کھڑا تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار نظر آتا تھا۔

چوہدری نے بستر پر پڑا ہوا شانی کا سویٹر اٹھایا اور اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ”اسے پہن لو۔ فوراً۔“

شانی بدستور تذبذب میں تھی۔

چوہدری نے ایک بار پھر اسے گھورا۔ اس کی نظروں میں انتہا درجے کی سختی کے ساتھ ساتھ بہت ہمدردی اور اپنائیت بھی تھی۔

شانی سویٹر لے کر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ وہ سویٹر پہن کر نکلی تو چوہدری نے گرم شال اس کے کندھوں پر ڈال دی اور کہا کہ وہ اس میں منہ سر اچھی طرح لپیٹ لے۔ شانی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اب وہ کمرے میں موجود ریاست نامی شخص کو کافی حد تک پہچان گئی۔ یہ وہی دراز قد رائفل بردار تھا جو شانی کو قاسم برلا سے کے چنگل سے نکال کر لایا تھا۔ دوسرے

لفظوں میں قاسم برلاس جن لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس شخص کے ساتھیوں میں نواز اور ماکھا وغیرہ شامل تھے۔ بعدازاں اس شخص نے شانی کو مینارِ پاکستان کے قریب جالاں کے حوالے کر دیا تھا اور خود اپنے زخمی ساتھی کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ آج ایک بار پھر یہ شخص شانی کو ایک مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لئے یہاں موجود تھا۔

چوہدری نے شانی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد چوہدری، شانی اور ریاست انیکسی کے آخری کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ شانی جب سے یہاں آئی تھی اس نے اس کمرے کا دروازہ مقفل ہی دیکھا تھا۔ چوہدری کے اشارے پر جالاں نے دروازے کا تالا کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ چوہدری بشیر، شانی اور ریاست کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، کمرہ تقریباً خالی تھا۔ بس ایک طرف چند چارپائیاں کھڑی کی گئی تھیں۔ فرش کے وسط میں قالین کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔ چوہدری نے عجلت میں یہ ٹکڑا اٹھایا۔ شانی دیکھ کر حیران ہوئی کہ یہاں تقریباً چھ ضرب چھ فٹ کا ایک چوبی تختہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دراصل ایک دروازہ تھا۔ چوہدری نے ریاست اور جالاں کی مدد سے اس بھاری تختے کو اٹھا کر سیدھا کیا۔ نیچے زینے دکھائی دیئے۔ شانی نے وہ بوباس محسوس کی جو بند تہہ خانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چوہدری نے ایک بٹن دبایا تو یہاں بھی بلب کی مدھم روشنی پھیل گئی، زینوں پر گرد کی تہیں تھیں اور چھت پر دو چار جگہ جالے بھی نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کافی عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ شانی چوہدری کے پیچھے ڈرتی ڈرتی زینوں پر اُتری۔ اس کے عقب میں قوی ہیکل ریاست تھا۔ تھوڑا آگے جا کر یہ زینے راہداری کی شکل اختیار کر لئے۔ تیس چالیس قدم آگے جانے کے بعد چوہدری نے ایک اور بٹن دبایا۔ اس سے آگے کا راستہ روشن ہو گیا...... کم و بیش ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ پھر زینوں کے سامنے آ گئے۔ شانی، چوہدری سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن چوہدری کی عجلت اور برہمی دیکھتے ہوئے وہ چپ تھی۔ پھر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریاست ان کے ساتھ تھا۔

زینوں کے آخری سرے پر مکمل تاریکی تھی۔ تاہم سرد ہوا کی آمد سے پتا چل رہا تھا کہ یہ نکاسی کا راستہ پہلے سے کھلا ہے۔ وہ زینے چڑھ کر باہر نکلے۔ یہ چھوٹی سے چاردیواری تھی۔ شانی نے پہچان لیا۔ یہ سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ والی جگہ تھی۔ یہاں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ شانی نے کئی بار انیکسی کی چھت پر سے اس چاردیواری کو دیکھا تھا۔ گاڑیوں کے پرانے ٹائر، درختوں کے کٹے ہوئے تنے...... پرانے درخت، بہت کچھ یہاں دکھائی دیتا تھا۔ ان میں سے ایک چیز ایک جلی ہوئی پرانی شیورلیٹ کا ڈھانچا تھا۔ چاردیواری کے وسط میں موجود وہ

ڈھانچا اپنی مقررہ جگہ سے دس بیس فٹ دائیں جانب پڑا تھا۔ دراصل اس پوشیدہ راستے کا بیرونی دروازہ شیورلیٹ کے ڈھانچے سے برآمد ہوا تھا۔

کھلی فضا میں آتے ہی شانی کو بے پناہ سردی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے پتا چلا کہ بوندا باندی ہو رہی ہے۔ چاردیواری کے دروازے کے عین سامنے ایک سوزوکی لوڈر موجود تھی۔ اس پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے شانی کا بازو پکڑا اور اسے لوڈر کے پچھلے حصے میں سامان کے درمیان یوں بٹھا دیا کہ اسے باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔ ریاست نے سامان کے اوپر پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ پھیلا دی۔

چوہدری تسلی بخش انداز میں شانی کا کندھا دباتے ہوئے بولا۔ ”گھبرانا نہیں... مجھ پر بھروسہ رکھو... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی... میں جلد ہی دوبارہ تم سے ملوں گا۔“

شانی بس ایک سسکی لے کر رہ گئی۔ اسے بائیں جانب کچھ فاصلے پر انیکسی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ دائیں طرف کوٹھی کی روشنیاں تھیں، جہاں بہت سے پُرغضب لوگ کسی بند کمرے میں بیٹھ کر شانی کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ دشمن خانوادے کی بیٹی کے لئے کوئی ایسی سزا تجویز کر رہے ہوں جو ناقابلِ فراموش ہو...... اور جس کی سختی و عبرت ناکی کے احساس سے ان کی پگڑیوں کے شملے کئی برسوں تک بغیر کلف کے اونچے رہیں۔

لمبا تڑنگا ریاست گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی پک اَپ سٹارٹ ہو کر جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اب کوٹھی کی حدود سے نکلنے سے پہلے پک اَپ کو اندرونی اور بیرونی گیٹ سے گزرنا تھا۔ پہلے وہ اندرونی گیٹ سے گزری پھر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ شانی جس ساز و سامان میں دبکی بیٹھی تھی، وہ قناتوں، دریوں اور برتنوں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دریوں سے چپکے ہوئے چاول اور چکنائی کی بُو شانی کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ یہ کسی تقریب کا ساز و سامان تھا؟ پھر اچانک اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ یہ یقیناً اس کی بھابو کی وداعی کی تقریب تھی۔ کل شام بھابو کی تدفین ہوئی تھی۔ آج سہ پہر اس کے لئے قرآن خوانی ہوئی ہوگی۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے ان دریوں کے ساتھ چہرہ لگایا اور سسکنے لگی۔ اپنی بھابو کی آخری رسومات میں اس کی یہ ”شرکت“ تصوراتی ہی تھی۔

اچانک بیرونی گیٹ پر پک اَپ رک گئی، اسے گارڈز نے معمول کے چیک اَپ کے لئے روکا تھا۔ گارڈز نے ریاست سے دو تین باتیں پوچھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ پک اَپ کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتے، شانی نے ایک گھڑ سوار کو دیکھا۔ وہ احاطے کی طرف سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پک اَپ کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی پگڑی اور لباس وغیرہ سے صاف پتا چلتا تھا کہ

وہ نار پور کا ہی کوئی فرد ہے۔ وہ پک اَپ کے قریب آ کر دیہاتی لب و لہجے میں رعب سے بولا۔ ”کون ہے اس گڈی میں؟“

”کوئی نہیں ہے جی...... بس تمبو اور قناتیں واپس جا رہی ہیں۔“ دونوں گارڈز میں سے ایک نے جواب دیا۔

گھڑ سوار اپنا گھوڑا پک اَپ کے بالکل پاس لے آیا تھا۔ اس نے چاروں طرف سے ٹھونک بجا کر پک اَپ کو دیکھا۔ پھر الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ پک اَپ آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ گیٹ سے بمشکل بیس پچیس میٹر دور رہی گئی ہوگی کہ گھڑ سوار نے پکار کر کچھ کہا وہ شاید پک اَپ کو روکنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ریاست نے غالباً اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ وہ پک اَپ کو اسی طرح دوڑاتا چلا گیا۔ گھڑ سوار گھوڑا بھگا کر پیچھے آیا۔ وہ بڑی تیزی سے پک اَپ کے قریب پہنچ گیا اور پکار پکار کر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لئے کہنے لگا۔ اب اس کی آواز نہایت واضح تھی اور الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے، لیکن پک اَپ کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید رفتار پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔

تقریباً ایک کلومیٹر آگے آنے کے بعد پک اَپ سڑک سے اُتری اور نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ گھڑ سوار برق رفتاری سے پیچھے آ رہا تھا۔ شب کی تاریکی میں شانی کو اس کا ہیولا ایک خوفناک پرچھائیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کبھی پک اَپ کی رفتار کے سبب کچھ فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ شانی کو شک ہو رہا تھا کہ گھڑ سوار کے ہاتھ میں رائفل ہے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چوہدری کے کارندے ریاست نے پک اَپ نیم پختہ راستے پر کیوں اتار دی۔ اگر وہ ہموار سڑک پر رہتا تو دو تین منٹ میں ہی اس ڈھیٹ گھڑ سوار کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ ابھی تک گھڑ سوار اکیلا ہی تھا۔ پھر دھماکے کی آواز سنائی دی اور گھڑ سوار کی طرف سے ایک شعلہ سا لپک کر پک اَپ کی باڈی سے ٹکرایا۔

شانی کا اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں رائفل نہ صرف موجود تھی، بلکہ اس نے اسے استعمال بھی کیا تھا، شاید وہ پک اَپ کو رکوانے کے لئے اس کا ٹائر وغیرہ پھاڑنا چاہتا تھا۔ صورتِ حال سنگین ہوتی جا رہی تھی، چاروں طرف ہوا سے جھومتے ہوئے درخت تھے اور تاریکی تھی۔ نیم پختہ راستہ شیطان کی آنت کی طرح طویل تر ہو گیا تھا۔ دو تین گہرے گڑھوں سے گزرتے ہوئے پک اَپ کی رفتار دھیمی ہوئی اور گھڑ سوار آناً فاناً سر پر پہنچ گیا۔ ”رک جا حرام زادے، ورنہ گولی مار دوں گا۔“ وہ جنونی انداز میں گرجا۔

اب وہ بڑی مہارت سے پک اَپ کی دائیں کھڑکی کے ساتھ ساتھ گھوڑا بھگا رہا تھا۔

شانی ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اس کا اندازہ یہی تھا کہ گھڑ سوار نے بھاگتے گھوڑے پر سے رائفل کے کندے کی ضرب ریاست کے سر پر لگائی تھی۔ پک اَپ کی رفتار پہلے ہی سُست ہو چکی تھی۔ وہ گیلی زمین پر پھسلی اور چھوٹے پودوں کو توڑتی اور روندتی ہوئی رک گئی۔

چند سیکنڈ بعد شانی کو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ریاست اور رائفل بردار گھڑ سوار بُری طرح گتھم گتھا ہیں۔ گاہے بگاہے گالی کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ رائفل بردار شخص ریاست پر بھاری پڑ رہا ہے۔ ”اگر رائفل والے نے ریاست کو مار دیا تو کیا ہوگا؟“ یہ سوال بڑی شدت سے شانی کے ذہن میں ابھرا۔

اس کے دل سے آواز آئی ..... شانی ..... یہ موقع ہے، یہاں سے بھاگ جا۔ اگر یہ گھڑ سوار ریاست پر حاوی ہو گیا تو تھوڑی ہی دیر میں ایک بار پھر نار پور کے خونخوار چوہدریوں کے قبضے میں ہوگی۔

اس نے اپنے جسم کو حرکت دی اور تھوڑی سی کوشش کر کے پک اَپ سے باہر آ گئی۔ پک اَپ کی لائٹس ابھی تک روشن تھیں ان لائٹس میں بارش کی پھوار نظر آ رہی تھی، لیکن جو زیادہ اہم منظر ان لائٹس میں نظر آ رہا تھا وہ چوہدری کے وفادار کارندے ریاست اور نار پور کے گھڑ سوار کے درمیان تصادم کا تھا۔ وہ دو وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے۔ دونوں قوی ہیکل اور زور آور تھے، دونوں کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ کسی بھی وقت کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہو سکتا تھا۔ شانی نے چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی اور تیزی سے درختوں میں داخل ہو گئی۔

یخ بستہ ہوا اس کی ہڈیوں میں اُترنے لگی۔ اس کی چادر خاردار جھاڑیوں سے الجھ رہی تھی۔ شاخیں اس کے چہرے اور جسم کے ننگے حصوں سے ٹکرا رہی تھیں مگر وہ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔ وہ دو تین منٹ ہی بھاگی ہوگی کہ اچانک اس کے جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ اسے یہی لگا جیسے زمین دفعتاً اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بائیں ٹخنے سے ذرا اوپر درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ پہلو کے بل گیلی زمین پر گری اور کسی خاردار پودے کی چبھن اس نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔ اس کے ہانپتے ہوئے سینے سے ایک دلدوز کراہ نکل کر رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا پاؤں کسی گڑھے میں گر گیا ہے اور کسی شکنجے جیسی شے میں بُری طرح جکڑ گیا ہے۔ اضطراری حرکت کے تحت اس نے پاؤں نادیدہ گرفت سے نکالنے کی کوشش کی اور اس کے ہونٹوں سے ایک اور کراہ نکلی۔ پاؤں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔

اس نے اپنی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے پاؤں کو دیوانہ وار کئی جھٹکے دیئے لیکن بے سود وہ اپنی تکلیف میں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ وہ اب صورتِ حال کو کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ پیپل کے ایک درخت نے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا درخت کی کچھ موٹی جڑیں ایک گڑھے میں سے نکلی ہوئی تھیں۔ یہ گڑھا اندازاً ڈھائی تین فٹ گہرا تھا اور اس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ بھاگتے بھاگتے شانی کا پاؤں شومیٔ قسمت اس گڑھے میں گیا تھا اور دو جڑوں کے درمیانی خلا میں پھنس گیا تھا۔ وہ پاؤں نکالنے کے زور لگاتی تو خم دار جڑیں اوپر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے مزید مضبوطی سے پاؤں کو جکڑ لیا ہے۔

"یا اللہ... ! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ سوال ایک دلدوز آہ بن کر نکلا۔

اس کی شال تو درختوں کے درمیان بھاگتے ہوئے شاخوں سے الجھ کر اس کے سر سے اتر چکی تھی۔ سویٹر، قمیص دوپٹا سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ تشویش کو مزید بڑھانے والی بات یہ تھی کہ وہ ابھی اس مقام سے زیادہ دور نہیں آئی تھی جہاں گھڑ سوار اور ریاست میں تصادم ہوا تھا۔ ابھی کوئی ایک منٹ پہلے اس نے درختوں میں گونجتی ہوئی ایک دور افتادہ چنگھاڑ سنی تھی۔ یقیناً یہ انہی دو افراد میں سے کسی کی تھی جنہیں وہ پک اپ کے پاس برسرِ پیکار چھوڑ آئی تھی۔

شانی نے اکثر سنا تھا کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اس پر بھی مصیبتیں "باجماعت" حملہ آور ہوئی تھیں۔ آفات کا ایک جمگھٹا تھا جو درد و کرب کے جنگل میں، وحشت کے نقارے پیٹتا اس کو بھگا رہا تھا۔

اچانک کچھ فاصلے پر بلند ہونے والی آوازوں نے شانی کے اعصاب کو جھنجھوڑا...... یہ پتوں کے سرسرانے اور شاخوں کے ٹوٹنے کی آوازیں تھیں۔ یہ اس طرف سے بلند ہوئی تھیں جہاں سے وہ آئی تھی۔ یہ ایک سنسان رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی.... دور و نزدیک کسی متنفس کا پتا نہیں ملتا تھا۔ ایک طویل رات میں دھیمی بارش، سردی اور تاریکی نے اس جگہ کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ ایسے میں یہاں کون اس کی مدد کو آ سکتا تھا لیکن انسان کا دل ایک ایسی چیز ہے جو بدترین حالات میں بھی اپنے لئے امید کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ پھانسی دیئے جانے والے شخص کے سینے میں بھی اس وقت تک زندگی کی امید موجود رہتی ہے جب تک تختہ پاؤں کے نیچے سے کھسک نہیں جاتا۔ شانی بھی یہ امید کر رہی تھی شاید جو آہٹیں سنائی دیں، وہ کسی ایسے فرد یا افراد کی ہوں جو اس کی مدد کر سکیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ مدد کے لئے پکارے۔ مگر اس پکار کا اثر الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ مدد کے بجائے مصیبت بھی پہنچ سکتی تھی۔

وہ شکنجے میں پھنسی کراہتی رہی اور آمدہ گھڑیوں کا انتظار کرتی رہی .. گاہے بگاہے وہ اپنے پاؤں کو چھڑانے کی کوشش کرتی تھی مگر ہر بار ناکام ہوتی تھی۔ ٹخنے سے اوپر اس کی پنڈلی جیسے دم بدم درد سے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جب ذہنی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے تو جسمانی تکلیف اس میں دب جاتی ہے، شانی کا حال بھی یہی تھا۔ عام حالات میں شاید پنڈلی اور ٹخنے کی تکلیف اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی لیکن اب یہ تکلیف پس منظر میں تھی۔ پیش منظر میں بدترین خدشات تھے، اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی موت کب واقع ہونے والی ہے؟ اس کی موت کتنی سہل یا کتنی اذیت ناک ثابت ہونے والی ہے......اور اگر اس کی قسمت میں ابھی مزید زندگی بھگتنا لکھا ہے تو اس زندگی کی نوعیت کیا ہو گی؟

گھڑ سوار کوٹھی کے بیرونی گیٹ سے پک اَپ کے پیچھے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے کچھ ساتھی پک اَپ کے تعاقب میں چل پڑے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نار پور کے چوہدریوں کو چوہدری بشیر کی ہوشیاری کا پتا چل گیا ہو۔ وہ جان گئے ہو کہ شانی تو کوٹھی میں موجود ہی نہیں۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر قرب و جوار میں اس کی تلاش وسیع پیمانے پر شروع ہو سکتی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں الجھ رہی تھی جب یکا یک اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا.... کوئی نادیدہ شخص اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ بمشکل پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر اسے ٹارچ کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی شاخوں اور پتوں کے سرسرانے کی آوازیں آئیں۔ یہاں سبزہ اتنا گنجان تھا کہ اس میں سے راستہ بنا کر گزرنا پڑتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی مختلف اطراف میں حرکت کرتی دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔ جیسے دام میں پھنسا کوئی پرندہ، اپنے شکاری کو دیکھ کر آخری بار خود کو چھڑانے کی فطری کوشش کرتا ہے، شانی نے بھی تڑپ کر اپنا ٹخنہ جڑوں کے "دوشاخے" میں سے نکالنا چاہا۔ اس نے اپنے آزاد پاؤں کی دھکیل کے ساتھ زخمی پاؤں کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی.. مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سسکاریاں نکل کر رہ گئیں۔ وہ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ اس کے آزاد پاؤں پر کیچوا یا اسی قسم کا کوئی کیڑا رینگ رہا ہے۔

ٹارچ بردار دائیں بائیں بھٹکنے کے بعد اب سیدھا پیپل کی طرف آ رہا تھا۔ شاید گیلی زمین پر پاؤں کے نشانات سے بھی اسے کچھ مدد مل رہی تھی۔ شانی کی نگاہوں کے سامنے اس کا ہیولا اب بالکل واضح تھا، یقینی بات تھی کہ وہ گھڑ سوار یا ریاست میں سے ایک ہے۔ تاہم

اس کے قد وقامت سے کچھ بھی اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ دونوں ہی لیے تڑنگے تھے۔ صرف ایک بات تھی جو شانی کی تشویش میں اضافہ کررہی تھی۔ اگر یہ شخص ریاست تھا تو پھر اسے خاموش نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اسے شانی کو پکارنا چاہئے تھا۔ وہ پکار نہیں رہا تھا۔ بس خاموشی سے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر اس کی کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی تھی......وہی امید جو "تختہ نکلنے" تک موجود رہتی ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی زمین پر پھینکتا قریب آتا چلا گیا۔ تب ٹارچ کی روشنی شانی کے چہرے پر پڑی اور ساکت ہوگئی۔ وہ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر وہ روشنی کے عقب میں تھا اس لئے چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شانی کو لگا، وہ ریاست ہے۔

"کک......کون......؟ ریاست؟" شانی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"ریاست کی ماں کا سر، میں تیرا خصم بابر ہوں......حرام زادی۔" ایک دیہاتی آواز نے کڑک کر کہا اور اس کے ساتھ ہی شانی کے بھیگے بال ایک بے رحم گرفت میں جکڑ گئے۔

وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ پک اَپ کے قریب ہونے والی لڑائی میں ریاست کو مات ہوئی تھی۔ اب نارپور کا غصیلا گھڑسوار اس کے سامنے تھا۔

شانی اب اس کے مدھم خدوخال دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ناک غیر معمولی طور پر موٹی تھی۔ بال گھنگھریالے اور جبڑے چوڑے تھے۔ اس کی پیشانی سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ لڑائی میں اس کی پگڑی کہیں گر گئی تھی۔ سویٹر اور کرتہ دونوں اس طرح پھٹے ہوئے تھے کہ پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔ اس کے خدوخال گواہی دے رہے تھے کہ وہ مہر جی کے خانوادے کا ہی کوئی بگڑا ہوا چوہدری زادہ ہے۔ وہ بے حد طیش میں تھا۔ شانی کے بال مٹھی میں جکڑنے کے لئے اس نے اپنی رائفل پیپل کے تنے سے ٹکا دی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی سیدھی شانی کی آنکھوں میں گھس رہی تھی۔

"چل...... کتے کی بچی......اٹھ......وہاں کوٹھی میں تیرے دو سو مہاراج تیرا انتظار کررہے ہیں اور تُو ماں کی رانی یہاں آدھی رات کو اپنی پت مار رہی ہے۔" (نہا رہی ہے)

اس نے شانی کو بازو سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ شانی کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔

اس وقت گھڑسوار کو پتا چلا کہ شانی کا پاؤں کہیں پھنسا ہوا ہے۔

اس نے ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ "باہر نکل......کہاں ٹانگ پھنسا بیٹھی ہے بھگوڑی؟" وہ بے حد کرخت آواز میں بولا۔

شانی اس مرتبہ چلا اٹھی۔ گھڑسوار نے ٹارچ کی روشنی گڑھے میں پھینکی۔ پھر شانی کا بازو چھوڑ کر ایک ہاتھ پانی میں گھسایا۔ اس نے ٹٹول کر وہ "دوشاخہ" جڑیں دریافت کیں جنہوں

نے شانی کا ٹخنہ بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس نے ٹارچ بھی ایک طرف رکھ دی اور دونوں ہاتھ پانی میں ڈال کر شانی کا ٹخنہ چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کی زور آزمائی کے سبب شانی درد سے چیخ اٹھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ٹانگ دو ٹکڑے ہوجائے گی۔ درحقیقت پاؤں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ شانی جب بھاگتی ہوئی آئی تھی تو جسمانی وزن کے سبب پاؤں مضبوط جڑوں میں گھس تو گیا تھا مگر اب اس کو واپس کھینچنا ناممکن ہو رہا تھا۔ دوسری طرف یہ بابر نامی گھڑسوار تھا کہ جلد از جلد اس کی ٹانگ گڑھے میں سے کھینچ لینا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ شانی کے سلسلے میں بے حد پُرجوش نظر آرہا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے اپنے خاندانی دشمنوں کی بیٹی کو چوری چھپے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ نہ صرف پکڑا تھا بلکہ یہ کارنامہ تن تنہا انجام دیا تھا۔ اب وہ اسے جلد از جلد کوٹھی میں اپنے بھائی بندوں کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔ فخر سے سینہ تان کر یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کس طرح جان خطرے میں ڈال کر اکیلے پک اَپ کا پیچھا کیا اور چوروں کی طرح بھاگتی ہوئی دشمن زادی کو پکڑا۔

بارش کچھ تیز ہوگئی۔ شانی کی بے بسی بڑھتی جارہی تھی۔ بابر نامی یہ گھڑسوار بے رحمی سے شانی کی ٹانگ کو جھٹکے دے رہا تھا اور ہر بار جب وہ ایسا کرتا، شانی تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ وہ جھلاہٹ آمیز انداز میں گالیاں بکنے لگا۔ شانی کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ "یہاں تیری بے بے بیٹھی ہوئی تھی جو بھاگی آرہی تھی اس طرف......؟ ہاں کہاں جارہی تھی؟ کہاں جارہی تھی؟" اس نے شانی کے سر کو زور سے جھٹکا دیا......وہ سسکنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکی۔

"یا کوئی تیرا یار تھا، کون تھا یہاں......؟" اس نے پھر شانی کے سر کو جھٹکا دیا۔ وہ کچھ نہیں بولی تو وہ بڑبڑانے لگا۔ "اندھی کہیں کی ٹانگ بھی پھنسائی ہے تو کیسی بھیڑی جگہ پر۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر کو جھٹک کر گڑھے سے پانی نکالنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کام کے لئے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو پیالے کی طرح استعمال کررہا تھا۔ اس نے ٹارچ ایسے انداز سے رکھ دی تھی کہ اس کی روشنی گڑھے پر پڑ رہی تھی، لیکن یہ روشنی گڑھے پر پڑنے کے ساتھ ساتھ شانی کے زیریں جسم پر بھی پڑ رہی تھی۔ گڑھے سے پانی نکالتے نکالتے یہ بابر نامی شخص جیسے ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں سے نکل کر اس نے جیسے پہلی بار غور سے شانی کو سرتاپا دیکھا۔ وہ مصیبت میں تھی۔ بدحال تھی، لیکن حسن پھر بھی حسن ہوتا ہے۔ سات پردوں میں چھپ کر اور کیچڑ میں لتھڑ کر بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ٹارچ کی روشنی شانی کو نمایاں کررہی تھی۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر رخساروں سے چپکے تھے۔ بارش کا پانی قطرہ قطرہ اس کے چہرے اور گردن پر بہہ رہا تھا۔ وہ شروع میں اوندھی گری تھی مگر ٹانگ کے ساتھ

مسلسل ہونے والی جدوجہد کے بعد اب وہ سیدھی ہوگئی تھی۔ بارش کے سبب اس کا لباس اس کے جسم کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ بابر نے ٹارچ زمین سے اٹھائی اور اس کی روشنی کو شانی کے جسم پر دھیرے دھیرے سرکانے لگا۔ پندرہ بیس سیکنڈ میں ہی اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ عجلت اور تیزی اس کی حرکات وسکنات سے مفقود ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے تک دکھائی دیتی تھی۔ وہ چند گہری سانسیں لے کر شانی کے قریب گیلی زمین پر بیٹھ گیا۔ عورت کی چھٹی حس اسے ''اس قسم'' کی تبدیلیوں سے بہت جلد آگاہ کر دیتی ہے اور شانی نے تو اپنے بابل کے آنگن سے نکلنے کے بعد بس یہ ''تبدیلیاں'' ہی دیکھی تھیں۔ یہ چڑھی ہوئی سانسیں، یہ بہکی ہوئی نگاہیں...... یہ جسم کو کچلنے کے لئے بے تاب ہاتھ...... بابر نامی اس شخص کی حرکات و سکنات نے شانی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی...... اور خطرہ تو بالکل واضح تھا۔ یہ اندھیری، اَبر آلود رات، یہ سنسان جنگل، ایک بااختیار مرد اور مجبور شانی۔ ان لمحوں میں وہ دام میں پھنسی ہوئی ہرنی کی طرح تھی شکاری رائفل بدست اس کے سر پر کھڑا تھا۔

پھر شکاری نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا، اس کی بھاری سانس شیطانی پھنکار کی طرح تھی۔ اس کا کھردرا ہاتھ شانی کے رخسار اور گردن پر پھسلنے لگا۔ اس کے بالوں میں الجھنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو...... پیچھے ہٹ جاؤ مجھ سے......''

''اوہو...... ہو...... رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''دیکھو، میرے قریب آئے تو میں اپنی جان لے لوں گی۔ ختم کر لوں گی خود کو......''

''ختم تو اب تم نے ہو ہی جانا ہے میری جان...... اگر...... اس سے پہلے کسی کا تھوڑا سا فائدہ ہو جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔'' وہ ڈھٹائی اور بے رحمی سے بولا۔

''کک...... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

''گل یہ ہے میری سوہنی کہ تیرے مقدر کا فیصلہ تو کوٹھی میں ہو چکا ہے۔ اب تیری جان بچتی نظر نہیں آتی ہے۔ بھائیا بشیر تیرے بدلے اپنی جان دینے سے تو رہا۔ جان تو خیر سے تجھے ہی دینی پڑے گی۔''

''کیوں جان دینی پڑے گی۔ میں نے کیا کیا ہے؟''

''اوہو...... ہو...... تُو نے کچھ کیا ہی نہیں۔'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں شانی کے دونوں رخساروں کو اس طرح دبایا کہ شانی کا بالائی ہونٹ ناک کی نوک سے چھونے لگا اور شکل مضحکہ خیز بن گئی۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''تُو نے اس کتے رستم سیال کے ساتھ ساز

باز کی۔ تُو نے اسے حویلی میں بلایا۔ تُو نے اس کے ہاتھوں بھائی فاخر اور مہر جی کو قتل کرایا۔ تُو نے اس کے ہاتھوں ہمارے پُرکھوں کی حویلی کو آگ لگوائی۔ ہمارے درجنوں بھین بھرا سڑ کر سواہ ہوگئے...... اور ماں کی لاڈو......! تُو کہتی ہے کہ تُو نے کچھ کیا ہی نہیں......'' شانی کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا، لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''یہ سب جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ اگر رستم میرے کہنے سے حویلی میں آیا تھا تو پھر میں اس کے ساتھ حویلی سے جاتی...... اس کی حفاظت میں رہتی۔ میں تو لاہور میں تھی۔ چوہدری بشیر، جالاں، قادرا سب جانتے ہیں۔ وہ رکشہ والا زکریا گواہ ہے اس بات کا...... لیکن ... لیکن اس وقت یہ باتیں کرنے کا موقع نہیں۔ مجھے یہاں سے نکالو......'' وہ کراہی۔

''تُو جتنی مرضی صفائیاں پیش کرے پر سب جانتے ہیں کہ حویلی سے بھاگنے کے بعد تُو کم از کم دو مہینے کہیں غائب رہی ہے۔ کہاں رہی ہے؟ یہ تُو جانتی ہوگی یا تیرے ساتھ سونے والے تیرے عاشق جانتے ہوں گے۔''

''یہ سب...... بہتان ہے، بکواس ہے۔ میں تم لوگوں کے سامنے ہر ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔'' شانی سسکاری لیتے ہوئے بولی۔

بابر نے ایک گہری سانس لے کر ایک بار پھر ٹارچ کا روشن دائرہ شانی کے جسم پر سرکایا۔ ''میں اس بحث جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا میری دلبر جانی۔ میں تو بس تیری شہد بھری جوانی سے تھوڑا سا حصہ لینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوگا، یہ پھر دیکھا جائے گا......'' وہ شانی کو دبوچتے ہوئے بولا۔

''خدا کا خوف کرو۔ تم نے بھی ایک دن اللہ کو جان دینی ہے۔'' شانی کراہی اور اس کے ہاتھوں کو جھٹکا۔

''میں کافر نہیں ہوں میری جان! پر تُو اتنی سوہن حلوہ ہے کہ دل ہاتھوں سے پھڑک کر نکل گیا ہے۔ شاید بھائیا بشیر تیرے لئے ٹھیک ہی جھلّا ہوا ہے۔ تیرے میٹھے مکھڑے میں کوئی ایسی بات ہے کہ بندے کی مت ماری جاتی ہے۔''

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی، بابر نے ہیجانی انداز میں دائیں بائیں دیکھا، پھر ایک جھٹکے سے اپنا پھٹا ہوا سویٹر اور کرتہ اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے شانی کی بھیگی ہوئی لمبی چوٹی پکڑی اور تیزی کے ساتھ اسے ایک شاخ کے گرد گرہ دے دی۔ جب وہ ایسا کر رہا تھا۔ شانی کے پاؤں کو زوردار جھٹکے لگے اور وہ درد سے چیخ اٹھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیوں عورت کو ایسے ذلیل کرتے ہو تم...... کیا ملتا ہے اس

طرح تمہیں؟''

''بہت کچھ ملتا ہے......'' وہ ہانپتے ہوئے لہجے لیکن پُرسکون انداز میں بولا۔ ''اور تم صرف عورت نہیں ہو۔ تم دشمن کی عورت ہو۔ دشمن کی عورت کو ذلیل کرنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔''

''تمہارے گھر کی کسی عورت کے ساتھ کوئی ایسا کرے تو پھر......؟''

اس نے پھر شانی کے رخساروں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑا اور پھنکارا۔ ''جو کرتا ہے، وہی بھرتا ہے، جنہوں نے کیا ہی نہیں وہ بھریں کیوں؟''

شانی اس کی آنکھوں میں وحشت کی چنگاریاں دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے ریاست کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اسے مار دیا تھا یا کہیں بے ہوش کر کے پھینک آیا تھا۔ اب وہ اس بھیگے ہوئے ویرانے میں مختارِ کل تھا۔ شانی بھانپ رہی تھی کہ اس کی موت اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اگر شیطان صفت بابر نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ وہ شانی کو زندہ سلامت اپنے بھائی بندوں کے سامنے پیش کرے......اور اپنے کرتوت کا پول کھلوائے۔ اس کے لئے یہ بہانہ بنانا بہت آسان تھا کہ اس نے مفرور شانی اور اس کے ساتھی کو بھاگنے سے روکنے کے لئے گولی ماری۔

اور حقیقت یہ تھی کہ شانی کو موت سے کسی طرح کا خوف بھی نہیں آ رہا تھا۔ بھابو کی ابدی جدائی اور رستم کی ممکنہ موت کے بعد اب اسے زندگی بے حد ناگوار محسوس ہونے لگی تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ عزت سے مرنا چاہتی تھی۔ اس منحوس گڑھے کے کنارے ایک وحشی بلی مار کے ہاتھوں تار تار ہو کر مرنے کا تصور بے حد اندوہناک تھا۔ بابر نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما اور اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ شانی کا ٹخنہ اذیت کے ناقابلِ بیان شکنجے میں تھا مگر جو شخص شانی کو موت تک دھکیلنے کا ارادہ رکھتا تھا، اسے ٹخنے کی تکلیف کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ وہ بالکل جنونی دکھائی دینے لگا تھا۔

اچانک وہ رک گیا۔ شاید اس نے کچھ سنا تھا۔ ایک مدھم سی آہٹ تو شانی نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ شانی سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ شروع میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ کسی جانور کی آواز تھی یا کسی انسان نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا تھا۔ کچھ دیر تک سن گن لینے کے بعد بابر ایک بار پھر شانی کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس مرتبہ اس نے رائفل اپنے بالکل قریب رکھ لی تھی۔ دفعتاً ایک بار پھر آواز بلند ہوئی۔ اس مرتبہ یہ خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی آواز تھی اور یہ

ایک نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ تین چار افراد جھاڑ جھنکار میں راستہ بناتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بابر نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کی حرکات و سکنات سے ہراس ٹپکنے لگا تھا۔ وہ جھک کر رائفل کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب شانی کو ایک رسی جیسی شے ہوا میں لہراتی نظر آئی۔ یہ شے بابر کی گردن کی طرف بڑھی......اور وہ جھٹکے سے پشت کے بل گرا۔ اس کے سینے سے ایک ڈری ہوئی طویل آواز نکل گئی تھی۔ ایک شخص جست لگا کر بابر کی طرف بڑھا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اسی دوران میں تین چار مزید افراد نمودار ہوئے اور بابر پر پل پڑے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہی انہوں نے اسے بے بس کر دیا۔ تب شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ مچلتے پھڑکتے بابر کو کسی شے سے باندھ رہے ہیں۔ بابر گالیاں بک رہا تھا اور خالص پنجابی زبان میں حملہ آوروں کو بدترین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ جواب میں ایک حملہ آور بھی اسے گالیوں سے نواز رہا تھا۔ جب بابر کی طرف سے قدرے اطمینان ہو گیا تو ایک شخص شانی کی طرف متوجہ ہوا۔ شانی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سخت سردی میں بھی اس شخص کا بالائی جسم عریاں تھا۔ زیریں جسم پر ایک دھوتی نما شے دکھائی دیتی تھی۔ اس نے زمین پر پڑی ٹارچ اٹھائی اور اسے روشن کر کے دھیان سے شانی کو دیکھا۔ پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بابر کے ساتھ زور آزمائی میں شانی کی چوٹی کی گرہ شاخ پر سے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے یہ چوٹی شاخ سے چھڑا دی۔ تب اس نے پکارنے والے انداز میں کہا۔ ''راجے......! ادھر آ......''

لمبا اونی چغا پہنے ہوئے ایک شخص پیپل کے نیچے آ گیا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پہلے شخص نے کہا۔ ''لگتا ہے اس کُڑی کی ٹانگ نیچے جڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا کچھ کرو......''

راجے نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک ساتھی کو بھی بلا لیا۔ اس شخص نے بھی موٹا چغا پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سردی سے بچانے کے لئے ایک صدری بھی اس کے جسم پر موجود تھی۔ وہ دونوں شانی کی ٹانگ کی طرف متوجہ ہو گئے اور پانی میں ہاتھ ڈال کر ان جڑوں کو ٹٹولنے لگے جنہوں نے ٹخنہ جکڑ رکھا تھا۔ شانی ایک بار پھر کراہنے لگی۔ پہلے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ گڑھے کو پانی سے خالی کریں۔ ان دونوں نے ہاتھوں کے پیالے بنائے اور بچا کھچا پانی گڑھے سے نکالنے لگے۔ دوسری طرف بابر دو آدمیوں کی گرفت میں مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی گئی ہیں۔ اس دوران میں اس کا منہ بھی بند کر دیا گیا۔ غالباً کوئی کپڑا وغیرہ ٹھونس دیا گیا تھا۔ اب بس وہ غوں غاں ہی کر پا رہا تھا۔ کہیں پاس سے ہی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اس کا

مطلب تھا کہ ان لوگوں نے بابر کا گھوڑا ڈھونڈ لیا ہے۔ اگر انہوں نے گھوڑا ڈھونڈ لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ چوہدری کے وفادار کارندے ریاست کو بھی زندہ یا مُردہ ڈھونڈ چکے ہوں گے۔ یہ کون لوگ تھے۔ یہاں سنسان رَکھ میں کیا کر رہے تھے۔ اب وہ بابر کے بعد ان کی دسترس میں تھی۔ وہ اس سے کیا اچھا یا بُرا سلوک کرنے والے تھے؟ ایسے کئی سوالات شانی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ ٹارچ کے روشن دائرے کا رخ تو گڑھے کی ہی طرف تھا تاہم اس کی روشنی میں اردگرد کا منظر بھی کچھ واضح ہو گیا تھا۔ جو شخص سب سے پہلے شانی تک پہنچا تھا، وہ عام جسم کا تھا لیکن اس کے شانے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ اس نے ٹنڈ کرا رکھی تھی اور کھچڑی داڑھی جھاڑ جھنکار کی طرح نظر آتی تھی۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا۔ شانی کو اس کے گلے میں موٹے منکوں کی مالا نظر آئی۔ اس شخص کے چہرے پر سب سے نمایاں شے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ بڑی گونج دار آواز میں بولتا تھا جیسے ریڈیو یا ٹی وی پر اناؤنسمنٹ کی جا رہی ہو۔ گڑھا پانی سے خالی ہو گیا تو ٹارچ کی روشنی میں شانی کا پاؤں جڑوں کے دو شاخے میں سے چھڑانے کی کوشش کی جانے لگی۔ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ شانی بار بار تڑپ جاتی تھی۔ ٹنڈ والے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو روک دیا۔ ''پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ جڑوں کو کاٹنا پڑے گا کاکا۔'' اس نے گونج دار آواز میں کہا۔

''سرمد کے پاس کلہاڑا ہے پیر بادشاہ...... '' راجا نے کہا۔

''کھوتے! یہ کلہاڑی کا کام نہیں۔ اس کی ٹانگ ٹٹ جائے گی۔ کہیں سے آری وغیرہ کا بندوست کرو۔''

''جی پیر بادشاہ۔'' راجا نے سر جھکایا۔

''چلو پھر جاؤ..... جلدی کرو، یہاں سردی بہت زیادہ ہے، کہیں سارے کے سارے اکڑ ہی نہ جائیں۔''

راجا اور سرمد جانے لگے تو ٹنڈ والے نے کہا۔ ''اس جنگلی رِچھ (ریچھ) کو بھی اٹھا کر لے جاؤ یہاں سے۔'' اس کا اشارہ بابر کی طرف تھا۔

''آ . آپ یہاں اکیلے رہیں گے۔'' راجا نے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں..... کوئی بات نہیں۔ بس تم آری لے کر آنا۔''

راجا نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ تین بندوں نے بندھے ہوئے گرانڈیل بابر کو اٹھا کر جھاڑیوں کا رخ کیا۔ چوتھے نے اس کی رائفل اٹھالی تھی۔ چند سیکنڈ بعد مختلف آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بابر کو گھوڑے پر لاد رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ وہ اپنے ڈیرے کی طرف چلے گئے ہیں۔

ٹنڈ والے نے ٹارچ اٹھائی اور اس کا روشن دائرہ دھیرے دھیرے شانی کے پورے جسم پر سرکایا۔ یہ وہی انداز تھا جو آدھ پون گھنٹہ پہلے بدفطرت بابر نے اختیار کیا تھا۔ شانی کے دل میں نئے وسوسے سر ابھارنے لگے۔ جس شخص کو پیر بادشاہ کہا گیا تھا وہ کافی عمر کا تھا۔ مگر اب تک کے تجربوں نے شانی کو تو یہی بتایا تھا کہ عمر، حلیہ، پیشہ، رشتہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اگر کوئی چیز معنی رکھتی ہے تو وہ جنس ہے۔ یہ ایک ایسے دیو کی طرح ہے جو ذرا سا موقع ملنے پر بند بوتل سے نکلتی ہے اور ہر اخلاقی قدر کو پامال کر دیتی ہے۔ اس نے بہت سنا تھا کہ اکیلی عورت کے لئے یہ دنیا درندوں سے بھرے ہوئے تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے، کوئی آنکھ اسے رحم کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ ہر کوئی پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ وہ اس عملی تجربے سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پتھرائی ہوئی تھیں اور ہر اچھے بُرے انسان پر سے اس کا یقین اٹھ گیا تھا۔

شانی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج ایک ہی رات میں دوسرے ہوس کار سے اس کا واسطہ پڑنے والا ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں شانی کو بڑے دھیان اور بے پناہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شانی کی خوبصورتی کا عکس اس کی سُرمے سے سنی ہوئی آنکھوں میں واضح طور پر ابھر رہا تھا۔ اس نے اپنے الٹے ہاتھ کی پشت ہولے ہولے شانی کے بھیگے رخسار پر پھیری۔

''بالکل ریشم ہو ..... بہت نازک..... بہت ملائم. ....''

شانی نے روتے ہوئے کہا۔ ''میری ایک بات مانو گے؟''

''تم سو باتیں کہو..... کیوں نہیں مانوں گا۔''

''مجھے مار دو..... میں اپنا خون تمہیں معاف کرتی ہوں۔ میرا گلا گھونٹ دو یا کوئی پتھر اٹھا کر میرے سر پر مار دو۔ خدا کے لئے میری جان لے لو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' رنگ والی کے چوہدری ارشاد کی بیٹی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ ہنسا اور اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی۔ ''پیر بادشاہ کے ہوتے ہوئے تم موت کی تمنا کر رہی ہو؟ بڑی جھلّی ہو۔ اوئے ہم تو مُردوں کو جینا سکھا دیتے ہیں، تُو تو پھر سر سے پاؤں تک زندگی سے بھری ہوئی ہو۔ سولہ آنے فٹ ہو زندہ رہنے کے لئے۔ '' اس نے شانی کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

شانی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کراہ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ سنبھلنے والے

انداز میں بولا۔ ”جھلیے! درویشوں، ملنگوں کے ساتھ اتنا غصہ نہیں کرتے۔ اگر میرے ساتھ میٹھا بول بولے گی تو دیکھنا سواہ (راکھ) کی دو چٹکیوں سے تیرا ہر دکھ درد دور کر دوں گا۔“

شانی کا دل غم و غصے سے لبریز تھا۔ وہ چلا کر بولی۔ ”میں لعنت بھیجتی ہوں، میں لعنت بھیجتی ہوں۔“

”کس پر لعنت بھیجتی ہو......؟“

”تم جیسے درویشوں ملنگوں پر......تم جیسے بہروپیوں پر......تم جیسے جتنے سائیں جی، حضرت جی، پیر جی ہیں، میں سب پر تھوکتی ہوں۔ میں تھوکتی ہوں۔ دور چلے جاؤ مجھ سے...... دور ہٹ جاؤ......“

وہ اپنی جگہ پتھرا سا گیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ نے حرکت کی، شاید وہ شانی کو چھونا چاہتا تھا۔ وہ گرجی۔ ”خبردار مجھے ہاتھ لگایا تو، میں تمہارا منہ نوچ لوں گی، دور رہو مجھ سے۔“

ایک عجیب جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی شانی پر۔ غم کی انتہا کو چھو کر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ان لمحوں میں کوئی ہتھیار یا آلہ اس کے پاس ہوتا تو وہ سچ مچ اپنی جان لے لیتی۔ اس کا دل اندر سے لبالب تھا۔ وہ اس دنیا سے کچھ نہیں مانگ رہی تھی۔ اپنے بچھڑے ہوئے رشتے، نہ اپنی جوانی، نہ اپنی محبت، وہ تو بس موت مانگ رہی تھی عزت کی موت اور یہ دنیا بھی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے لئے بھی ترسا رہی تھی۔ کتنے نامہربان ہو گئے تھے یہ لوگ۔ کتنے سنگ دل؟ کتنے وحشی؟

وہ کچھ دیر تک بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اب بارش تھم گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ سردی پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ ”تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہو گی۔ میں تمہارے لئے آگ جلاتا ہوں۔“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

پھر شانی کا جواب سنے بغیر وہ درختوں کی طرف چلا گیا۔ دو چار منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ لکڑیاں اور پرالی تھی۔ اس نے چند اینٹیں جوڑ کر شانی کے بالکل پاس ہی ایک چولہا سا بنا دیا۔ پھر کچھ پتلی لکڑیاں خشک پرالی کے ساتھ رکھیں۔ پرالی کو آگ جلد پکڑ لیتی ہے۔ اس شخص نے دیا سلائی جلائی اور دو تین منٹ کے اندر ہی شانی کے پاس الاؤ سا بھڑکا دیا۔ اس الاؤ نے شانی کے بھیگے اور ٹھٹھرے ہوئے جسم کو قدرے راحت دی لیکن جب دل راحت سے خالی ہو تو جسمانی سکون کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تڑتڑ کرتے الاؤ کی سُرخ روشنی میں شانی نے غور سے اس پیر بادشاہ کو دیکھا۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان

رہی ہو گی۔ اس کا سر صفاچٹ اور داڑھی خودرو تھی۔ اگر اس کا حلیہ ڈھنگ کا ہوتا تو شاید اسے ایک خوبصورت ادھیڑ عمر شخص کہا جا سکتا، نہ جانے کیوں شانی کو لگا جیسے اس نے کہیں ماضی میں اس شخص کو دیکھا ہوا ہے۔

اس نے دو اینٹیں جوڑ کر ایک چوکی سی بنالی اور اس پر بیٹھ کر آگ کی حدت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں زندگی نے کافی دکھ دیئے ہیں۔“ اس نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔“ شانی کراہی۔

”ضرورت ہے......میرا بچہ ضرورت ہے۔“ اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

شانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی، اس کا فقرہ پوری شدت سے شانی کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس فقرے میں دو لفظ ایسے تھے جنہوں نے شانی کو سرتاپا ہلا دیا تھا...... ”میرا بچہ“ یہ وہ دو لفظ تھے جو بے حد بے ساختہ انداز میں اس شخص کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ کوئی ایسی بات تھی ان الفاظ میں کہ شانی کے اندر کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ وہ اسے دھی رانی کہتا، بیٹی کہتا یا اس طرح کا کوئی اور لفظ استعمال کرتا تو شاید اس کا وہ تاثر نہ ہوتا، جو ”میرا بچہ“ کا ہوا تھا۔ شانی کو یہی لگا کہ جیسے وہ واقعی ایک چھوٹی سی بچی ہو، درد سے رو چلا رہی ہو اور کسی مہربان بزرگ نے اسے گود میں لے کر اور ”میرا بچہ“ کہہ کر ہلکورے دینا شروع کر دیئے ہوں۔

وہ اپنے ”بے پناہ“ لفظ کے غیر معمولی تاثر سے بے خبر، بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تجھے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مصیبتوں کے کالے سائے تیرا پیچھا کر رہے ہیں اور تُو بھاگ بھاگ کر تھکی ہوئی ہے۔ بہت تھکی ہوئی۔ پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرا بچہ......! جہاں حبس بہت بڑھ جاتا ہے وہاں تیز ہوا ضرور چلتی ہے اور جہاں اندھیرا بہت گہرا ہوتا ہے وہیں پر سویرے کی بنیاد پڑتی ہے۔ بس بندے کی ہمت نہیں ٹوٹنی چاہئے۔ اس کا ایمان اس بات پر بڑا پکا ہونا چاہئے کہ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔“

وہ ٹکر ٹکر صفاچٹ والے باریش شخص کو تکتی جا رہی تھی۔ یہ تو وہی بات تھی جو کبھی اس کے ابا جی کہا کرتے تھے۔ الفاظ میں فرق ضرور تھا مگر مفہوم تو وہی تھا۔ اس شخص نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں تیرے دماغ میں بہت سے سوال اٹھ رہے ہیں۔ کچھ میرے بارے میں، کچھ اس جنگلی ریچھ کے بارے میں جسے میرے ساتھی اٹھا کر ڈیرے پر لے گئے ہیں اور کچھ اس بندے کے بارے میں جس کے ساتھ تُو گاڑی پر جا رہی تھی۔“

”ہاں......ہاں......وہ کہاں ہے......؟“ شانی نے پوچھا۔ اس کا اشارہ ریاست کی

طرف تھا۔

''وہ ہمیں گاڑی کے پاس ملا ہے۔ وہی گاڑی جس پر دریاں اور قناتیں شناتیں لدی ہوئی ہیں۔ وہ وہاں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر پر کافی چوٹ آئی ہے۔ میرے ساتھی اس کی مرہم پٹی کر رہے ہیں۔''

''وہ بچ جائے گا ناں......؟''

''اللہ نے چاہا تو بچ جائے گا......''

اتنے میں شانی نے دیکھا۔ ایک بندہ بھاگتا ہوا پیپل کی طرف آ رہا تھا۔ یہ وہی راجا نامی شخص تھا جسے باریش شخص نے آری لانے کے لئے کہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی آری موجود تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ ہانپتا ہوا آیا تھا، شاید کہیں دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس نے لالٹین گڑھے کے اندر شانی کے پاؤں کے بالکل پاس رکھ دی۔ پھر اپنے پیر بادشاہ کی ہدایات کے مطابق بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ ایک موٹی جڑ کو کاٹنے لگا۔ پاؤں اس بُری طرح جکڑا ہوا تھا کہ جڑ کی تھوڑی سی جنبش بھی شانی کو تڑپا دیتی تھی۔ شانی کا دھیان ہٹانے کے لئے باریش شخص شانی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد جڑ کٹ گئی۔ شانی کو یوں لگا کہ پاؤں کسی آہنی شکنجے سے آزاد ہوا ہے۔ اس نے گھوم کر لالٹین کی روشنی میں دھیان سے دیکھا۔ ٹخنے کے اوپر سے کافی کھال چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ باریش شخص نے ایک صافا نما کپڑا شانی کے ٹخنے پر باندھ دیا اور بڑی شفقت کے ساتھ اسے سہارا دے کر چند قدم چلنے کے لئے کہا۔

شانی نے چل کر دیکھا۔ درد ضرور ہو رہا تھا مگر ہڈی سلامت تھی۔ اسی دوران میں دو افراد بابر کے گھوڑے کے ساتھ درختوں سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی پیر بادشاہ کے دیگر ساتھیوں کی طرح لمبے چغے پہن رکھے تھے۔ ان کے سر کے بال صاف تھے اور داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ دبلے پتلے جسموں والے یہ مسکین صورت لوگ تھے۔ بارش ایک بار پھر شروع ہوگئی تھی۔ شانی کو جلد از جلد کسی چھت کی ضرورت تھی۔ باریش شخص پیر بادشاہ کے ساتھیوں نے شانی کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ اپنے زخمی پاؤں کی وجہ سے شانی کے لئے گھوڑے پر توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ رنگ والی میں وہ چاندنی راتوں میں حویلی کے وسیع احاطے کے اندر باقاعدہ گھڑسواری کیا کرتی تھی۔ شانی کو گھوڑے کی پشت پر مشکل میں دیکھا تو باریش شخص نے ازخود گھوڑے کی رکاب میں اپنا ننگا پاؤں رکھا اور شانی کے عقب میں بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی نرمی سے شانی کو تھام لیا۔ شانی نے اس کی نرم داڑھی

اپنے سر اور گردن کے پچھلے حصے پر سرسراتی محسوس کی۔ پھر شانی نے محسوس کیا کہ اس کی پشت باریش شخص کے چوڑے سینے سے چھو رہی ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا ایک غیر مرد تھا لیکن پتا نہیں کیوں، شانی کو وہ اپنا لگا۔ بہت ہی اپنا۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ اپنی پشت کو اس کے سینے کے ساتھ کچھ اور بھی چپکا دے، بلکہ وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ٹیک لگا دے۔ اس کے جسم کی خوشبو اور اس کے پاکیزہ لمس کی لطافت کو محسوس کرتے ہوئے سکون کی نیند سو جائے، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ دل میں خود سے پوچھنے لگی۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے؟

گھوڑے کی لگام راجا کے ہاتھ میں تھی۔ باقی افراد پیچھے آ رہے تھے۔ بارش کی بوندیں برگ و بار پر ٹپ ٹپ کی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ تین چار منٹ کے مختصر سفر کے بعد وہ لوگ درختوں اور جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ایک ہموار قطعے پر پہنچے۔ یہاں گھاس پھونس کی چھتوں والی تقریباً نصف درجن جھونپڑیاں تھیں۔ ان میں سے دو تین جھونپڑیوں میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ کچھ بکریاں اور دو تین بھینسیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جھونپڑیوں کے عقب میں چند کھیت تھے۔

باریش شخص جسے اس کے ساتھی احترام سے پیر بابا یا پیر بادشاہ کہہ رہے تھے، ایک طویل جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ بعدازاں راجا اور سرمد کی مدد سے اس نے شانی کو بھی احتیاط سے گھوڑے سے اتارا اور سہارا دے کر جھونپڑی کے نیم گرم ماحول میں پہنچا دیا۔ یہ جھونپڑی اندر سے کافی کشادہ تھی۔ یہاں دو کھری چارپائیاں اور مٹی کے برتن وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ مٹی کی ہی ایک انگیٹھی میں چند ایک ادھ بجھے انگارے بھی موجود تھے۔ جھونپڑی کے پچھلے حصے کو ایک پردے کے ذریعے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ شانی نے قیافہ لگایا کہ اس حصے میں پیر بادشاہ کی بیوی یا کوئی اور خاتونِ خانہ موجود ہوگی۔

اب شانی پیر بادشاہ کو جھونپڑی کی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں سُرمے کی دھاریاں تھیں اور کوئی سحر انگیز سی کیفیت تھی۔ شاید اسی کیفیت کے زیرِ اثر شانی نے کچھ دیر پہلے خود کو ایک سحر میں جکڑا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ ابھی تک پیر بابا یا پیر بادشاہ کی شخصیت کے حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ پیر بادشاہ نے شانی سے کہا۔ ''تم اپنے یہ گیلے کپڑے بدل لو، کوئی زنانہ لباس تو یہاں ہے نہیں۔ فی الحال تمہیں مردانہ کپڑے ہی پہننا پڑیں گے۔''

اتنے میں راجا کسی لڑکے کی شلوار قمیص اور جرسی لئے اندر داخل ہوا۔ کپڑے شانی کے سامنے رکھتے ہوئے وہ باہر چلا گیا۔ پیر بادشاہ نے لالٹین اٹھائی اور بولا۔ ''میرا بچہ! میں

پچھلے حصے میں جا رہا ہوں۔ تم بڑے اطمینان سے کپڑے بدل لو......"

اس نے طویل جھونپڑی کا درمیانی پردہ اٹھایا اور لالٹین سمیت پچھلے پورشن میں چلا گیا۔ جھونپڑی کے سامنے والے حصے میں تاریکی پھیل گئی۔ شانی نے جھونپڑی کا سامنے والا دروازہ بند کیا اور صرف قمیص اور جرسی بدل لی۔ اس کی شلوار انگیٹھی کی حدت سے بتدریج خشک ہوتی جا رہی تھی۔

کپڑے بدلنے کے دوران میں شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جھونپڑی کے پچھلے حصے میں پیر بادشاہ کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ کبھی کبھی مدھم آواز میں بات چیت بھی سنائی دیتی تھی۔ شانی کا پاؤں اسے تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے پاؤں کو انگیٹھی کے قریب کھسکا دیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اور کسی وقت جھونپڑی کی کھڑکی سے باہر بجلی کی چمک بھی محسوس ہوتی تھی۔ شانی کے ذہن میں رہ رہ کر ریاست کا خیال آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھا۔ باریش شخص پیر بادشاہ نے بتایا تھا کہ اس کے سر پر خاصی چوٹ آئی ہے۔

وہ بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ریاست کی حالت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نگاہ جھونپڑی کے وسط میں موجود بھاری پردے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ پیر بادشاہ اسی پردے کے پیچھے اوجھل ہوا تھا...... اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جھونپڑی عقب سے کسی دوسری جھونپڑی سے جڑی ہوئی ہے، کیونکہ جو مدھم آوازیں شانی تک پہنچ رہی تھیں، وہ ذرا فاصلے سے آ رہی تھیں۔

اتنے میں جھونپڑی کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ دوسری طرف پیر بادشاہ کا ساتھی راجا تھا، اس کی آواز پہچان کر شانی نے لکڑی کا ٹیڑھا میڑھا دروازہ کھولا۔ راجا اپنے ہاتھوں میں مٹی کا پیالہ لئے اندر داخل ہوا۔ اس میں گرم دودھ تھا اور دودھ میں رس ڈبوئے گئے تھے۔ راجا نے سوندھی سوندھی خوشبو والا یہ پیالہ شانی کے قریب ایک لکڑی کی چوکی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کھلے منہ کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی شانی کے سامنے رکھی۔ اس میں سیاہ رنگ کی کوئی مرہم نما شے تھی۔ راجا بڑے یقین سے بولا۔ "دودھ رس کھانے کے بعد آپ یہ مرہم لگا لیں۔ یہ پیر بابا کی کرشمے والی مرہم ہے۔ زخم کیسا بھی ہو۔ چوٹ ہو، ماس اُترا ہو، کٹ لگا ہو، خدانخواستہ ہڈی ٹوٹی ہو، یہ مرہم سو دواؤں کی ایک دوا ہے۔"

شانی کچھ نہیں بولی۔ وہ ایسی باتوں پر کبھی یقین نہیں کر سکتی تھی۔ اب کیسے کرتی۔ راجا نے جب دیکھا کہ شانی کا ردِعمل حوصلہ افزا نہیں تو وہ خاموشی سے باہر چلا گیا ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اس معجزاتی دوا کے چند حیرت انگیز کرشمے بیان کرنے بیٹھ جاتا۔ شانی نے مرہم کو ہاتھ

نہیں لگایا۔ دودھ بھی اسی جگہ رکھا رہا۔ شانی منتظر نگاہوں سے بھاری بھرکم پردے کی طرف دیکھتی رہی۔

دفعتاً اسے پردے کے پیچھے بھاگتے قدموں کی صدا سنائی دی۔ پھر مٹی کا کوئی برتن زمین پر گر کر ٹوٹا۔ اس کے بعد کسی مالا کے موٹے منکوں کی کھن کھن سنائی دینے لگی۔ پردے کے پیچھے کچھ ہو رہا تھا۔ کوئی پُراسرار کارروائی جاری تھی۔ شانی نے چند منٹ مزید انتظار کیا، پھر اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی بھاری پردے کی طرف گئی۔ اس نے پردے کو درمیان سے ذرا سا وا کر کے پچھلے حصے میں جھانکا۔ اس کا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔

چوہدری بشیر کا وفادار کارندہ ریاست شدید زخمی حالت میں ایک چارپائی پر پڑا تھا، اس کے سر کی چوٹ شانی کی توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ لڑائی کے دوران ریاست کا سر بڑی شدت کے ساتھ پک اَپ کے کسی ٹھوس حصے سے ٹکرایا یا پھر بابر نے اپنی وزنی رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے ریاست کے سر پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس کے سر کے وسط سے شروع ہونے والا زخم پیشانی کے درمیان تک چلا گیا تھا۔ کھوپڑی کے متاثرہ حصے سے خون بہہ بہہ کر نہ صرف تکیے کو بھگو رہا تھا بلکہ چارپائی سے نیچے بھی ٹپکا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس زخم کو کسی شے سے ڈھکا نہیں گیا تھا اور نہ ہی مروجہ اصول کے تحت زخم پر دباؤ کے ذریعے خون روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ریاست کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی پتا چل رہا تھا کہ وہ قریب المرگ ہے۔ جس باریش کو اس کے ساتھی پیر بابا اور پیر بادشاہ کہہ رہے تھے وہ بے سدھ ریاست کے پہلو میں کھڑا تھا۔ موٹے دانوں والی مالا اب اس کے گلے کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک ہاتھ اپنی پشت پر رکھے مضروب پر جھکا ہوا تھا۔ جس طرح فرنیچر پر پالش یا رنگ کرنے والے اپنے ہاتھ کو تسلسل کے ساتھ اوپر نیچے حرکت دیتے ہیں اسی طرح پیر بادشاہ بھی دے رہا تھا۔ وہ اپنے موٹے دانوں والی مالا کو ریاست کی پیشانی سے اس کے جسم پر رگڑنا شروع کرتا تھا اور پیٹ تک لے آتا تھا، پھر پیٹ سے شروع ہو کر پیشانی تک چلا جاتا تھا۔ اس کا ایک ساتھی مٹی کا بڑا پیالہ لئے ریاست کے سرہانے کھڑا تھا اور گاہے گاہے پیالے میں سے تھوڑا سا پانی لے کر اس کے چھینٹے گرانڈیل ریاست کے چہرے پر دیتا تھا۔ چہرہ جو بتدریج موت کی دھند میں چھپتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ تقریباً ویسا ہی منظر تھا جیسا شانی نے چند روز پہلے چوہدری بشیر کی کوٹھی میں بھابو کے حوالے سے دیکھا۔ بھابو مر رہی تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانے کی ضرورت تھی اور شعبدہ باز حضرت صاحب اس پر اپنے جادوئی ٹوٹکے آزمانے پر لگا ہوا

تھا۔ کیا یہاں بھی وہی عمل دہرایا جارہا تھا۔ شانی نے بے چین ہوکر پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ اس کی آہٹ سن کر تو پیر بادشاہ اور اس کے ساتھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ شانی روہانسی آواز میں بولی۔ ''خدا کے لئے...... بند کرو یہ سب کچھ۔ اس کی حالت خراب ہے۔ اسے کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس لے جاؤ......''

پیر بادشاہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔ وہ اپنی مالا بے ہوش ریاست کے سینے پر رکھتا ہوا تیزی سے شانی کی طرف آیا اور اسے کندھوں سے تھام کر واپس جھونپڑی کے سامنے والے حصے کی طرف لے آیا۔ وہ اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھ بچہ! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی حالت اب سنبھل گئی ہے۔ بس اب دو چار منٹ کی بات ہے......''

''لیکن......''

پیر بادشاہ نے منہ سے چچ چچ کی شفقت بھری آواز نکالی اور نفی میں سر ہلا کر شانی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، نہ جانے اس کے انداز میں کیا بات تھی کہ شانی مزید کوئی مزاحمتی بات نہ کہہ سکی۔ وہ اس کے سر پر تسلی بخش انداز میں ہولے ہولے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس دوران میں پردے میں جنبش پیدا ہوئی اور سرمد نے بڑے مؤدب انداز میں جھک کر کہا۔ ''پیر بادشاہ! اس نے آنکھیں کھول دی ہیں۔''

پیر بادشاہ، شانی کو وہیں چھوڑ کر ایک بار پھر پردے کے عقب میں اوجھل ہوگیا...... چند سیکنڈ بعد جھونپڑی کے چوبی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور راجا اندر آگیا۔ اس نے سب سے پہلے دودھ والے پیالے کی طرف دیکھا۔ ''اوہو...... آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''نہیں، مجھے بھوک نہیں۔''

''تو آپ یہ مرہم ہی لگا لیتیں۔''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں کرنا...... میں ٹھیک ہوں۔''

''میرے لائق کوئی خدمت۔'' وہ بے حد حلیمی سے بولا۔ نہ جانے کیوں شانی کو اس سے کسی طرح کا خوف محسوس نہیں ہورہا تھا۔ حالانکہ اب تک وہ جن حالات سے گزری تھی، وہ بے حد حوصلہ شکن تھے۔ کسی غیر مرد کی پرچھائیں بھی اسے ڈرا دیتی تھی۔

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''وہ بندہ کہاں ہے، جسے تم لوگ باندھ کر یہاں لائے ہو......؟''

وہ اپنے مخصوص بے ضرر انداز میں مسکرایا۔ ''آپ ذرا غور سے سنیں۔ آپ کو کچھ آوازیں آرہی ہیں؟''

شانی نے اپنا سر جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ لگایا اور راجا کے انداز میں دھیان سے سننے کی کوشش کی، اسے غوں غاں کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ راجا نے کہا۔ ''یہ وہی ہے ساتھ والی جھونپڑی میں پڑا ہے۔ بڑا غصے والا ہے، بہت اچھی طرح بندھا ہوا ہے پھر بھی خود کو چھڑانے کی کوشش کررہا ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''کیا تمہیں پتا ہے کہ یہ چوہدریوں کا بندہ ہے۔ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ اگر وہ اس بندے کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تو تم سب کے لئے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہوجائے گی اور تمہارے ساتھ ساتھ میرے لئے بھی۔''

راجا کے اطمینان میں بالکل فرق نہیں پڑا۔ وہ بولا۔ ''ایسی ساری باتیں پیر بادشاہ کے سوچنے کی ہوتی ہیں۔ ہم تو بس ان کے حکم پر چلتے ہیں۔ اب تک ہم نے جو کچھ کیا ہے ان کے حکم پر ہی کیا ہے۔ ہم سب سے پہلے گھوڑے کی آواز سن کر باہر نکلے تھے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ تھوڑی دور ایک پک اَپ بھی درخت سے ٹکرائی ہے۔ اس کے بعد ہمیں آپ کا بے ہوش ساتھی ملا۔ اس کے بعد گیلی زمین پر پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے ہم اس پیپل تک پہنچ گئے جہاں یہ رائفل والا آپ کو گھیرے بیٹھا تھا۔''

شانی نے اس پیپل کے نیچے جو دو ڈیڑھ دو گھنٹے گزارے تھے ان کا تصور ہی لرزا دینے والا تھا۔ اس نے خود کو انسان سے زیادہ ایک بے بس جانور کی طرح محسوس کیا تھا، پھندے میں پھنسا ہوا ایک ایسا انسان جسے درندے پھاڑ کھانا چاہتے تھے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''تمہارے پیر بادشاہ کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی کیوں لگ رہی ہے؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''ان کی شکل بہت سے لوگوں کو جانی پہچانی لگتی ہے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کو جو کچھ عرصہ پہلے تک فلمیں وغیرہ دیکھتے رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ماضی میں فلموں کے مشہور اداکار آصف وارثی کو جانتی ہوں گی۔ یہ آصف وارثی ہی ہیں۔''

شانی کو یاد آگیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے تصور میں ایک نہایت حسین و جمیل نوجوان کی شبیہ ابھری۔ جب وہ چھوٹی تھی تو عادل بھائی یا ابا جان کے ساتھ کبھی کبھی لاہور کی سیر کو آیا کرتی تھی۔ عادل بھائی کے ساتھ اس نے چند فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ اسے وہ بھولے بسرے منظر یاد آگئے اور وہ سمجھ گئی کہ راجا نامی یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس بھیگے ہوئے ویرانے میں

اس نے منڈے ہوئے سر اور جھاڑ جھنکار داڑھی والے جس شخص کو دیکھا تھا، وہ ماضی کا وہی خوبرو ہیرو تھا۔ حیرت کی ایک لہر شانی کے سینے میں اٹھ کر رہ گئی، وہ شخص جو مردانہ وجاہت کا نمونہ اور یقیناً لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا ایک ننگ دھڑنگ سائیں کے روپ میں یہاں موجود تھا۔ اب شانی کی سمجھ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ پیر بادشاہ کی آواز ریڈیو آرٹسٹوں کی طرح گونج دار کیوں ہے۔

اس دوران میں وہ شخص بھاری پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ اس کے مدقوق چہرے پر اطمینان کی روشنی پہلے سے نمایاں تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''تمہارا ساتھی اب ٹھیک ہے۔ اس نے مجھ سے بات کی ہے۔ تم بھی چاہو تو تھوڑی دیر میں اس سے بات کر سکتی ہو۔''

شانی خاموش رہی۔ راجا نے سر جھکا کر کہا۔ ''پیر بادشاہ......! عظمت اللہ نے گاڑی سٹارٹ کر لی ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اسے یہاں لے آئیں۔''

''ہاں لے آؤ'' پیر بادشاہ نے کہا۔

شانی حیرت سے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ ماضی کے اس خوبرو خوش لباس شخص نے خود کو اس طرح بدلا تھا کہ پہچان مشکل ہو گئی تھی۔

اس نے مٹی کی انگیٹھی میں تھوڑی سی لکڑیاں جھونکیں۔ جلد ہی آگ کی خوشگوار روشنی جھونپڑی کی دیواروں پر لرزنے لگی۔ بارش جاری تھی۔ پیر بادشاہ نے اپنے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور شانی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا۔ ایک دم اندر چلی آئیں۔ ہم سب کو ڈرا ہی دیا۔''

''مم..... میں معافی چاہتی ہوں۔''

''چلو دے دی معافی۔'' وہ اس کے سر پر بے حد شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''لیکن وجہ تو بتاؤ ناں میرا بچہ.....''

شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اسے شدید ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے، پیپل کے نیچے اس کی زبان سے کچھ نہایت نامناسب الفاظ ادا ہوئے تھے۔ اس نے اس باریش شخص کے لئے بہروپیے کا لفظ استعمال کیا تھا اور لعنت بھیجنے کی بات کی تھی بلکہ اس سے کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔

وہ نادم انداز میں بولی۔ ''بابا جی! پچھلے کچھ دنوں سے میں ایسے حالات سے گزر رہی ہوں کہ ہر چیز پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ رہا ہے جنھوں نے اپنے اوپر کئی کئی خول چڑھا رکھے ہیں۔ ان میں سے ہی ایک شخص ایسا ہے جو پیری فقیری کے نام پر

سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے...... میں نے اپنی آنکھوں سے.....'' وہ بات مکمل نہ کر سکی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

باریش شخص نے اسے دلاسا دیا اور اپنی بات مکمل کرنے کے لئے کہا۔ شانی اپنے سینے کا روتا بلکتا دکھ اس کے سامنے بیان کرنے لگی۔ اس نے پیر بادشاہ کو تفصیل کے ساتھ اپنی بھابو اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں بتایا۔ بھابو کی بیماری سے لے کر اس کی موت تک سب کچھ اس نے پیر بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی جو باتیں وہ چھپانا چاہ رہی تھی، وہ بھی اس شخص سے چھپا نہیں پا رہی تھی۔

وہ بڑی توجہ سے ہمدردی سے سنتا رہا۔ شانی چپ ہوئی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''دیکھ میرا بچہ! یہ سامنے لالٹین رکھی ہے۔ اس لالٹین میں سے جو چیز نکل رہی ہے وہ روشنی ہے۔ اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ لالٹین میں سے اندھیرا نکل رہا ہے تو یہ غلط ہے۔ ایک کے بجائے دو تین یا آٹھ بندے بھی یہ بات کہیں تو یہ غلط ہو گی۔ ہم روشنی کو غلط نہیں کہیں گے ان بندوں کو غلط کہیں گے۔ اسی طرح میرا بچہ......! دنیا میں وہ چیز بھی موجود ہے جسے روح کہتے ہیں۔ روح سے روحانیت بنتی ہے۔ روحانیت کے ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مانے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ لوگ اس کو غلط نام دیتے ہیں اس کے نام پر دھوکا کرتے ہیں، لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، لیکن یہ سارے گناہ لوگوں کے ہیں۔ جو لوگ قدرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ قدرت ان کے لئے معجزے دکھاتی ہے اور دکھاتی رہے گی۔ شرط صرف یہی ہے کہ لگن سچی ہو اور صبر سے انتظار کیا جائے۔''

شانی نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ پریشانی اور دکھ میں میرے منہ سے کچھ غلط باتیں نکل گئی تھیں۔''

پیر بادشاہ نے بے ساختہ آگے کو جھک کر شانی کا سر چوما۔ ''نہ میرا بچہ! تُو نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تعویذ گنڈے، عملیات، نوری علم، کالے علم اور پتا نہیں کن کن ناموں سے لوگوں کو بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ ہم اپنی اصل سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اصل یہی ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے، قدرت نے اپنی ساری مخلوق کے لئے کچھ اصول بنائے ہیں۔ جو بھی ان اصولوں کے خلاف چلتا ہے، نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثال یہی ہے کہ ایک شخص ہاتھ بڑھا کر روٹی نہ اٹھائے اور یہ کہے کہ لقمہ خود بخود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ یا ایک شخص آنکھیں بند کر کے سڑک پار کرے اور یہ سمجھے کہ قدرت اس کو بچائے گی تو یہ غلط ہے...... یہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے لیکن میرا بچہ......! ایسی بات بھی نہیں ہے کہ نعوذ باللہ

قدرت اپنے اصول بنانے کے بعد بے بس ہوگئی ہے۔ وہ اپنے نیک اور صابر بندوں کے لئے کبھی کبھی اپنے اختیار کے کرشمے بھی دکھاتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں کو ایک طرف رکھتی ہے اور کوئی انہونی کر دیتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ باتیں واقعی اس پر اثر کر رہی تھیں۔

''انہونیاں ضرور ہوتی ہیں دھی رانی ...... لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ ہر وقت انہونیوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ انہونیوں سے ملاقات کے لئے سخت ترین آزمائشوں کے لئے تیار رہنا چاہئے، دیکھو...... میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں ...... ذرا اسے پہچانو، یہ کیا ہے۔'' باریش شخص نے چارپائی کے بچھونے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کاغذ میں لپٹا ہوا ایک نگینہ نکال لیا۔

''یہ کیا ہے ......؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید ہیرا ہے؟'' شانی نے کہا۔

''ہاں یہ ہیرا ہی ہے لیکن آج سے لاکھوں سال پہلے ایک پتھر تھا۔ بے قیمت اور بے کار پتھر۔ آج یہ بالکل مختلف ہے۔ اس کی بے پناہ قیمت ہے۔ اسے چوما جاتا ہے، گلے کا ہار بنایا جاتا ہے۔ بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ ایک کنکر انمول ہو گیا ہے۔ یہ ایک انہونی ہے لیکن اس انہونی تک پہنچنے کے لئے اس کنکر کو ایک لمبی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہ زمین کی اتھاہ گہرائی میں لاکھوں سال تک دبا رہا، اس نے بے پناہ وزن اور گرمی برداشت کی۔ ہر طرح کی موسمی سختیاں جھیلیں اور آخر ہیرا بن گیا۔ ہیرے ایسے ہی بنتے ہیں۔ کندن بھی ایسے ہی بنتے ہیں...... سیپوں میں موتی بھی ایسے ہی پروان چڑھتے ہیں۔''

ہر لفظ شانی کے دل و دماغ میں سرایت کر رہا تھا۔ عجیب لہجہ تھا۔ اس شخص کا...... اس نے شانی کا ہاتھ ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں لیا...... ''تو میرا بچہ! ہمت نہیں ہارنا۔ حوصلہ چھوٹا نہیں کرنا، منزل ضرور نزدیک آئے گی۔ میں تیری پیشانی پر ایک ایسا ستارہ دیکھ رہا ہوں جو بہت بلندی پر چمکتا ہے۔''

شانی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس کا دل چاہا کہ اس شخص کے سینے سے لگ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس سے کہے۔ ''اے مہربان بزرگ! منزل ملنے یا نہ ملنے کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب مسافر زندہ رہے۔ اگر دکھوں نے جسم سے جان ہی کھینچ لی تو پھر باقی کیا بچے گا۔''

لیکن پھر اس نے خود کو ٹوٹ کر بکھرنے سے سنبھالا۔ یہ شخص اسے یہی تو نصیحت کر رہا

تھا۔ وہ عجیب الوہی لہجے میں بولا۔ ''آج کی یہ رات منزل نہیں ہے۔ بچہ یہ ایک چھوٹا سا پڑاؤ ہے۔ تجھے اپنے راستے پر آگے بڑھنا ہے۔ بس آج پَو پھٹنے سے پہلے پہلے تُو آگے بڑھ جانا۔ جہاں جانا ہے چلی جانا۔''

شانی نے بہت عرصے بعد اپنے قریب ایک ایسا شخص دیکھا جسے دیکھ کر اس کے دل کی گہرائی سے آواز آ رہی تھی کہ وہ سچا ہے...... مخلص ہے...... وہ جیسا دکھائی دے رہا ہے اندر سے بھی ویسا ہی ہے...... نہ جانے ان لمحوں میں اسے کیا ہوا۔ وہ سسک کر بولی۔ ''مجھے اپنے پاس رکھ لو پیر بابا۔ میں ابھی کہیں جانا نہیں چاہتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ کچھ آ رہا ہے میرا بچہ! تجھے آگے بڑھنا ہے۔ آگ کے دریا میں تُو کافی فاصلہ طے کر چکی ہے۔ پیچھے ہٹے گی تو نقصان ہو گا۔ اب اللہ کا نام لے کر چلتی جا۔ اللہ سوہنا بھلی کرے گا۔ جا چلی جا جس طرف تیرا دل تجھے کھینچ رہا ہے۔''

''مم...... میرا دل مجھے کسی طرف بھی نہیں کھینچ رہا بابا۔''

''تُو غلط کہہ رہی ہے، ذرا اپنے دل میں جھانک۔ ایک پیاری سی معصوم سی کشش تجھے بلا رہی ہے۔ میں تیرا چہرہ دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ کسی معصوم کشش سے تیرا ناطہ ضرور ہے...... اور ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور کشش بھی ہو۔ کوئی گہری پرانی کشش۔''

اتنے میں بھاری پردے کے پیچھے سے کراہنے اور کچھ بولنے کی آواز آئی۔ شانی نے پہچان لیا، یہ ریاست ہی کی آواز تھی۔ وہ واقعی ہوش میں آ چکا تھا۔

پیر بادشاہ نے بات ادھوری چھوڑی اور جلدی سے اٹھ کر پردے کے پیچھے چلا گیا۔

شانی اپنی جگہ ساکت بیٹھی سوچتی رہی۔ شاید بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پیاری سی معصوم سی کشش تو شانی کو ہر گھڑی کھینچ رہی ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سخت غیر یقینی کیفیت میں مبتلا تھی۔ حادثے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اسے اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا، لیکن پھر بھی مُنّے کا خیال ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ اپنی ماں کو کھو کر اس پر کیا بیت رہی تھی...... وہ یقیناً اب زیادہ شدت سے شانی کی گود کے لئے تڑپ رہا تھا اور جس کشش کا بابا نے کہا تھا۔ شاید اس کشش کا تعلق اس شخص سے تھا جو دور رہ کر بھی ہمیشہ اس سے قریب رہا تھا اور اب شانی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ دور ہے یا بہت دور ہے، اتنے فاصلے پر جس کو کبھی کوئی پاٹ نہیں سکا۔ شانی کو وہ ہولناک لمحے یاد آئے جب اس نے انیکسی کی چھت پر سے رستم کو چوہدری کے گھیرے میں دیکھا تھا۔ وہ اٹھ رہا تھا، گر رہا تھا، پھر اٹھ رہا تھا۔ جیسے کوئی شیر بھیڑیوں کے غول میں ہو اور پھر وہ گر گیا تھا۔ شاید کبھی نہ اٹھنے کے لئے۔ رستم سیال کی وہ

آخری جھلک تھی جو شانی نے دیکھی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پیر بادشاہ کی باتوں کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسی دوران میں پک اَپ کے انجن کی آواز نے شانی کو چونکایا۔ پک اَپ جھونپڑی کے دروازے کے بالکل سامنے آ کر رکی تھی۔ پھر اس کا انجن بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شانی کو اندازہ ہوا کہ پک اَپ پر کچھ لادا جا رہا ہے۔ کوئی بھاری بھرکم شے۔ جھونپڑی کے بھاری پردے کے عقب سے بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور وہ شانی کے پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھوڑے سے پھول تھے، گلاب کی خوشبو تو شانی صاف پہچان سکتی تھی۔ بابا نے بڑی اپنائیت کے ساتھ یہ پھول شانی کے دوپٹے کے پلو سے باندھ دیئے پھر وہ شانی کے پاس انگیٹھی کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھی کا نام ریاست ہے؟''

''آپ اسے میرا ساتھی نہ کہیں، یہ میرے لئے اجنبی ہے۔ بس میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔''

''چلو جو بھی ہے۔ بہرحال اب وہ ٹھیک ہے۔ اتنا ٹھیک ہے کہ سفر کر سکتا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ اس قابل ہو جائے گا کہ تمہارے ساتھ پک اَپ پر روانہ ہو سکے لیکن ڈرائیونگ کرنا شاید اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ اس کام کے لئے میں تمہارے ساتھ اپنے ساتھی راجا کو بھیج رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو وہ تمہیں حفاظت کے ساتھ تمہاری منزل تک پہنچا دے گا۔''

''مم...... مجھے تو خود پتا نہیں کہ کہاں جانا ہے؟''

''تمہارے ہم سفر کو تو پتا ہوگا......؟ وہ اب اس لائق ہے کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ سکے۔ بارش اب رک گئی ہے۔ تم تھوڑا سا کھا پی لو۔ تمہارے کپڑے تھوڑی دیر میں بالکل سوکھ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہارے روانہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔''

شانی وہاں سے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ کم از کم آج کی رات تو وہ سخت غیر یقینی کیفیت کا شکار تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا باریش میزبان اسے جلد از جلد یہاں سے روانہ کر دینا چاہتا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے دیکھا کہ پیر بابا کے دو ساتھی زخمی ریاست کو دونوں طرف سے سہارا دیئے جھونپڑی کے دروازے کی طرف لا رہے ہیں۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ ہولے ہولے کراہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانی کپڑے بدل چکی تھی۔ اس کی زخمی پنڈلی پر پیر بابا نے اپنے مہربان ہاتھ سے خود مرہم رکھا اور پٹی باندھی تھی۔ شانی کو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا کہ وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ تین چار گھنٹوں میں ہی اس شخص نے

شانی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ شانی پچھلے چند مہینوں میں ایسے حالات سے گزری تھی کہ اسے اپنے سائے پر بھی شک ہوتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں ایک اجنبی پر اتنی جلدی یقین آ جانا اور اس سے وابستگی پیدا ہو جانا اچنبھے کی بات تھی۔

شانی کو اپنے ان الفاظ پر مسلسل ندامت ہو رہی تھی جو نادانی میں اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ بڑے سخت الفاظ تھے اور پیر بابا جیسے شخص کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھے۔ وقتِ رخصت شانی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر پیر بابا سے معافی مانگ لے یا پھر بیٹھ کر ان کے پاؤں پکڑ لے اور کہہ دے کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ شاید وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا دیتی لیکن اچانک پیر بابا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ میرا بچہ...... چلیں۔'' پیر بابا نے کہا۔ انہوں نے جیسے شانی کے دل میں اٹھنے والے خیال کو پڑھ لیا تھا۔

شانی کے دل کی بات دل میں ہی رہ گئی اور وہ پیر بابا کے ساتھ باہر پک اَپ کے سامنے پہنچ گئی، یہاں پیر بابا کے نصف درجن ساتھی موجود تھے اور ریاست بھی سرمد اور راجا کے سہارے کھڑا تھا۔ ریاست کو ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بٹھا دیا گیا تھا۔ شانی حسبِ سابق پک اَپ کے پچھلے حصے میں دریوں اور قناتوں وغیرہ کے درمیان بیٹھی۔ پک اَپ کی ڈرائیونگ سیٹ راجا نے سنبھال لی.....

پک اَپ نے سٹارٹ ہونے کے بعد اپنی جگہ سے سرکنا شروع کیا تو پیر بابا نے محبت سے شانی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''گھبرانا نہیں بچہ! تم اکیلی نہیں ہو۔ کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔''

شانی کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔ پک اَپ ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ درختوں سے گھری ہوئی وہ چھوٹی سی جھونپڑی بستی۔ اس کے مکین اور وہاں کا پیر بابا سب پیچھے رہ گئے۔ اندھیرے کی چادر کے پار اوجھل ہو گئے۔ شانی پیر بابا کے عجیب و غریب کردار کے بارے میں سوچنے لگی۔ ماضی قریب کا ایک خوبرو فن کار، لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور اس جھونپڑا بستی میں نظر آنے والا ملنگ صورت پیر بابا، کتنا فرق تھا دونوں کرداروں میں، پھر پیر بابا کے آخری الفاظ شانی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''تم اکیلی نہیں ہو کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔'' ''کچھ لوگوں'' سے ان کی کیا مراد تھی۔ کیا وہ اپنے ساتھیوں کا ذکر کر رہے تھے؟ نہیں بات کچھ اور تھی۔ شانی کے دل سے آواز آئی شاید ... وہ اپنے ساتھ کسی اور ذکر بھی کر رہے تھے۔ کون ہو سکتا تھا وہ کوئی اور ؟ شانی پک اَپ کے ساتھ ہچکولے کھاتی رہی اور سوچتی رہی۔ دفعتاً اس کا دھیان اپنی اوڑھنی کے پلو میں بندھے پھولوں کی

طرف چلا گیا، ان میں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے پلو کی گرہ کھولی۔ مہک تیز ہوگئی۔ یہ گلاب اور گیندے کی ملی جلی مہک تھی۔ گلاب اور گیندا...... اچانک شانی کے بدن کو کرنٹ سا لگا۔ اس کا دھیان ایک اور طرف منتقل ہوگیا تھا۔ گلاب اور گیندا، اس ملی جلی خوشبو کا تعلق نگینہ کے تصور سے تھا۔ کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا؟ محض ایک مماثلت تھی؟ وہ سرتا پا لرز گئی۔ پیر بابا نے وقتِ رخصت اس کے پلو میں گلاب اور گیندے کے پھول باندھے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ تم اکیلی نہیں ہو کچھ لوگ ہیں تمہارے ساتھ۔ کیا اس فقرے اور ان پھولوں میں کوئی تعلق تھا؟ یا پھر...... یا پھر یہ سب کچھ واہمے کے زمرے میں آتا تھا۔

ایک نشیب سے گزرتے ہوئے پک اَپ کو شدید جھٹکا لگا۔ شانی کے ٹخنے اور پنڈلی میں درد کی ٹیس اٹھی۔ اس کا ذہن ان کرب ناک لمحوں کی طرف منتقل ہوگیا جب وہ جڑوں کے دو شاخے میں پھنسی ہوئی تھی اور شقی القلب بابر کتے کی طرح اس پر جھپٹ رہا تھا۔ انسان اپنے نفس کے ہاتھوں کبھی کبھی کتنی پستی میں گر جاتا ہے۔ یکا یک شانی کو بابر کی غیر موجودگی کا احساس ہوا...... وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جھونپڑا بستی میں ہی ہے۔ پیر بابا اور اس کے ساتھی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ وہ لوگ ایسے تو نہیں تھے کہ اسے مار ڈالتے۔ وہ زیادہ دیر اسے اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ بابر کے والی وارث اسے تلاش کرتے ہوئے کسی بھی وقت جھونپڑا بستی میں پہنچ سکتے تھے۔ خود شانی نے بھی راجا کے سامنے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ پھر وہ اس کا کیا کرنے والے تھے؟ اگر وہ اسے چھوڑ دیتے یا وہ کسی طرح خود چھوٹ جاتا تو پیر بابا اور اس کے ساتھیوں پر مصیبت آجاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ چوہدری بشیر کا بھانڈا بھی پھوٹ جاتا۔ اس کی شریکا برادری کو پتا چلا جاتا کہ چوہدری نے شانی کو ٹیکسی سے خود فرار کرایا ہے۔

ایکا ایکی شانی کو اپنے بالکل قریب کسی حرکت کا احساس ہوا۔ اندھیرے میں اسے لگا کہ کوئی زندہ چیز اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود ہے۔ اس نے پھولوں کو پھر سے گرہ دی اور تاریکی میں ٹٹولنے لگی، بھیگی بھیگی دریوں، قناتوں اور چادروں کے درمیان اس کا ہاتھ کسی کے سر سے ٹکرایا۔ اس کے ہونٹوں سے خوفزدہ چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کوئی یہاں موجود تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ کون ہے۔ شانی کا ہاتھ لگنے کے بعد اس نے منہ سے غوں غاں کی غصیلی آواز نکالی۔ اس کا منہ بند تھا۔ یہ بابر کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا وہ شیطان صفت اس سے صرف تین چار فٹ کی دُوری پر موجود تھا۔ شانی کو اس سے شدید قسم کی خوف آمیز کراہت محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت اچھی طرح بندھا ہوا ہے، اس کے باوجود وہ

اضطراری طور پر اس سے دور سمٹ گئی۔ اس کا قرب بھی شانی کے لئے اس کے لمس کی طرح تکلیف دہ تھا۔ شانی نے سنا تھا کہ ایسے شقی القلب بھی ہوتے ہیں جو روڈ ایکسیڈنٹ میں تڑپتے ہوئے زخمیوں کی جیبوں سے قیمتی چیزیں نکالتے ہیں۔ آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسے نفس پرست کو دیکھا تھا۔ اس نے مصیبت کے شکنجے میں کسی ہوئی شانی کو اس کی آبرو سے محروم کرنا چاہا تھا۔

چند سیکنڈ تک غوں غاں کرنے اور دریوں قناتوں کے نیچے کسمسانے کے بعد وہ ساکت ہوگیا۔ شانی کو یاد آیا کہ جب وہ پیر بابا کی جھونپڑی میں تھی اس نے باہر کچھ آوازیں سی تھیں یوں لگا تھا کہ پیر بابا کے ساتھیوں نے پک اَپ پر کوئی بھاری چیز لادی ہے۔ یقیناً وہ بھاری شے یہی گناہوں کی گٹھڑی تھی۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ کبھی کبھی بدلیوں میں سے چاند جھانکتا تھا، ہوا سے درخت ہلتے تھے تو پک اَپ کے اوپر تنے ہوئے پولی تھین پر قطروں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ انہوں نے تقریباً ایک گھنٹے تک درختوں کے درمیان سخت ناہموار اور نیم ہموار راستوں پر سفر کیا اور بالآخر ایک نیم پختہ سڑک پر نکل آئے۔ یہ ایک مضافاتی آبادی تھی، اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ لاہور کے قریب نہیں ہے۔ جس وقت وہ ایک کشادہ مکان کے گیراج میں داخل ہوئے پو پھٹ رہی تھی۔ یہ مکان کوٹھی کی شکل کا تھا مگر لگتا تھا کہ ابھی تعمیر ہو رہا ہے۔ بس رہائش کے لئے تین چار کمرے مکمل کر لئے گئے تھے۔ بیرونی دیواریں ابھی پلستر سے خالی تھیں۔ صحن کے بڑے حصے کا فرش لگنا باقی تھا۔

جونہی پک اَپ اندر داخل ہوئی، گھر کا بیرونی گیٹ بند کر دیا گیا اور گیراج کی روشنی بجھا دی گئی۔ لمبے سے منہ اور بھوری آنکھوں والا ایک جواں سال شخص جو اس گھر کا مالک لگتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر بھی استری شدہ سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شانی اور ریاست کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے شانی کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ اسی دوران میں اس کا ایک ساتھی ریاست کو اگلی نشست پر سے اتار چکا تھا اور سہارا دیئے کھڑا تھا۔ لمبے چہرے والے شخص نے شانی کو بڑے احترام کے ساتھ اندر ایک نوجوان عورت کے پاس پہنچا دیا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ اس کی بیوی ہوگی۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ لمبے چہرے والا جواں سال عورت کو شائلہ کہہ کر بلا رہا تھا۔ وہ کافی باتونی اور خوشامدی قسم کا شخص لگتا تھا۔ شائلہ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی کہا جا سکتا تھا۔ وہ بڑے چلاتے چنگھاڑتے جسم کی مالک تھی۔ چال

میں لہراؤ اور آنکھوں میں شوخی تھی۔ لباس بھی جسم کو نمایاں کرنے والا تھا۔ اس نے شانی کو ایک گرم شال اوڑھائی اور اس کے لئے ہیٹر آن کر دیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے خود ہلکی پھلکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سویٹر پہننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ غالباً وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سردی میں ٹھٹھرتی بھی ہیں تو اپنے لباس کی چمک دمک دکھانے کے لئے سویٹر سے دور رہتی ہیں۔ وہ بڑی لگاوٹ سے شانی کو بیگم صاحبہ کہہ کر مخاطب کرنے لگی اور اس کے آگے پیچھے گھومنے لگی۔

شانی نے ادھ کھلے دروازے میں سے دیکھا لمبے چہرے والا شخص اپنے دو ساتھیوں کے ذریعے بابر کو ڈنڈا ڈولی کر کے کسی اندرونی کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ بابر کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور شانی نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی مشکیں کسی رسی کے بجائے بڑ کی جڑوں سے کسی گئی تھیں۔ بابر کی رائفل بھی ایک شخص کے کندھے پر دکھائی دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے بیگم صاحبہ! آپ اس بندے کی وجہ سے اتنی لیٹ ہوئی ہیں؟'' شمائلہ نے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

شمائلہ بولی۔ ''چوہدری صاحب! آپ کے لئے بڑے پریشان تھے۔ پچھلے چار پانچ گھنٹے میں کوئی پچیس فون تو آچکے ہیں ان کے۔ ایک ابھی آپ کے آنے کے فوراً بعد آیا ہے، ناصر نے انہیں بتا دیا ہے کہ آپ پہنچ گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے اور موبائل سے فون کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں۔''

''یہ ناصر کون ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

وہ ذرا سا شرمائی۔ ''میرے ہسبنڈ ہیں۔ ابھی آپ نے دیکھا تو ہے انہیں......''

اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے گالیاں بکنے کی بلند آوازیں آنے لگیں، شاید ناصر یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بابر کے منہ سے کپڑا نکالنے کی ''جسارت'' کی تھی۔ منہ آزاد ہوتے ہی وہ خالص دیہاتی لہجے میں ان کی ماں بہن ایک کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ بہر حال اس مرتبہ اسے اپنی دشنام طرازی کا قرار واقعی صلہ ملا، دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں اور پتا چلا کہ ناصر اور اس کے ساتھی بابر کی ٹھکائی کر رہے ہیں۔ وہ پہلے تو مار کھا کر بھی گالیاں بکتا رہا، پھر اس نے تکلیف سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تھی۔ شانی کانپ گئی۔ تکلیف دشمن کی بھی ہوتی تھی تو اسے دہلا دیتی تھی۔ شانی نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''شمائلہ اس تماشے کو روکو۔ ..جلدی کرو..... میرا دماغ پھٹ

جائے گا......''

شانی کی آواز میں کرب کی ایک ایسی کیفیت تھی کہ شمائلہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ''ڈولے.. .اوڈولے جلدی آ۔''

دو سیکنڈ بعد ایک کوتاہ قد شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ بمشکل تین سوا تین فٹ کا ایک بونا تھا۔ اس نے غالباً لنڈے کا کوٹ اور دھاری دار پتلون پہن رکھی تھی۔ بال پیشانی پر جما رکھے تھے۔ ''جی میڈم... ..'' وہ ادب سے اپنی مختصر گردن جھکا کر بولا۔

''میڈم کے بچے...... جا جلدی سے ناصر صاحب کو بلا کر لا.. ''

وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد لمبے منہ والا ناصر کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ شمائلہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس سے کھسر پھسر کی اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد بابر کی دردناک چیخ و پکار کو بریک لگ گئے۔

شمائلہ کی آنکھوں میں بہت سے سوال چمک رہے تھے۔ یقیناً وہ شانی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے اور ریاست کے پیچھے لگ جانے والا یہ ریچھ نما شخص کون تھا۔ اسے کس نے باندھ کر پک اَپ پر لوڈ کیا..... ریاست کے سر پر چوٹ کیسے لگی اور خود شانی کے ٹخنے کے ساتھ کیا ہوا؟ مگر یہ سوال شانی سے پوچھنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اسے امید تھی کہ شانی خود ہی یہ کتھا اسے سنائے گی۔ مگر اس کی یہ امید پوری نہیں ہوئی، شانی کی نگاہیں پیر با' کے ساتھی راجا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تاہم تھوڑی دیر بعد اسے ناصر سے معلوم ہوا کہ وہ شخص پک اَپ سے اُترتے ہی کسی کو بتائے بغیر واپس چلا گیا تھا۔

چوہدری بشیر سے شانی کی ملاقات اگلی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ چوہدری کی آنکھیں سُرخ تھیں اور بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ خاصا اَپ سیٹ نظر آتا تھا۔ شانی کی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ اس شخص کو دیکھنے چلا گیا جس کی وجہ سے کل رات کے سارے مسائل پیش آئے تھے۔ وہ ابھی تک بندھا ہوا تھا اور اسی مکان کے ایک کمرے میں موجود تھا۔

شانی کے کمرے میں چوہدری کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اسی دوران میں اسے زخمی ریاست سے کل رات کے سارے واقعات معلوم ہو چکے تھے اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ بابر نے ''رکھ'' کے اندر شانی پر مجرمانہ حملے کی سفاکانہ کوشش کی تھی۔ شانی کی اپنی خواہش تو یہی تھی کہ چوہدری کو اس واقعے کے بارے میں نہ پتا چلے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چوہدری جان چکا تھا اور بے حد مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ہی شانی نے جان

لیا کہ بابر نامی اس شخص کی بدقسمتی پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔

چوہدری نے گہری سانس لیتے ہوئے بہت گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''شانی! میں تم سے کوئی بات بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا اور ہر قدم بہت پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ اس خبیث بابرے کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ تمہیں میں نے از خود کوٹھی سے نکالا ہے۔ اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ بابرا اس چار دیواری سے نہ نکل سکے۔''

چوہدری کے لہجے کی سختی نے شانی کو چونکا دیا۔ ''کیا آپ اسے......مم...... میرا مطلب ہے، اسے ختم کر دیں گے؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات تو طے ہے کہ اگر بابرے کی زبان کھل گئی تو بھڑکی ہوئی آگ اور بھڑک اٹھے گی۔ سب کچھ تہس نہس ہو جائے گا۔''

''کوٹھی میں کیا صورتِ حال ہے؟'' شانی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہاں ہمیں تھوڑا سا ڈرامہ کرنا پڑا ہے۔ ہم نے ظاہر کیا ہے کہ تم جالاں کی ملی بھگت سے فرار ہوئی ہو۔ ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لئے تمہاری دوسری نوکرانی زہرا کو بھی زخمی کرنا پڑا ہے۔''

''ہائے اللہ......'' شانی نے بے ساختہ کہا۔ ''کیا ہوا ہے زہرا کو......؟''

''بس تھوڑا سا زخمی ہوئی ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال میں ہے کل تک گھر آ جائے گی۔''

شانی کے چہرے پر تشویش کے گہرے سائے لہرانے لگے۔ ''کیا آپ کے اس ڈرامے سے ''رنگ والی'' پر کوئی نئی مصیبت تو نہیں آ جائے گی؟''

''کیا مطلب...... ؟''

''آپ نے ظاہر کیا ہے کہ مجھے جالاں نے انیکسی سے نکالا ہے۔ ذہن میں فوراً آتا ہے کہ اگر آپ کی پرانی نوکرانی نے اس طرح کا کام کیا ہے تو پھر اس نے کافی پیسے کھائے ہوں گے۔ اسے پیسے کھلانے والے میرے وارث ہی ہو سکتے ہیں۔ اب یہ نہ ہو کہ آپ کے بھائی بندے رنگ والی پر چڑھ دوڑیں۔''

''نہیں یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ قادرا وغیرہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی جلد بازی دکھائی تو لمبا چوڑا فساد ہو جائے گا۔ دونوں طرف سے بندے مریں گے اور بے شمار گرفتاریاں بھی ہوں گی۔''

اتنے میں چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ چوہدری نے عینک چڑھا کر اچھی طرح نمبر دیکھا، پھر کال کرنے والے سے بات کی۔ کال کرنے والا چوہدری کا رازدار ملازم ارشد حسین تھا۔ اس نے چوہدری کو بتایا کہ بابرے کا خالی گھوڑا ڈیک نالے کے پاس ''رکھ'' میں سے مل گیا ہے۔ گھوڑا ملنے کے بعد قادرے، عنایت اور اس کے ساتھیوں نے زیادہ سرگرمی سے بابرے کی تلاش شروع کر دی ہے۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ چھوٹی چوہدرانی کے بھاگنے اور بابرے کے غائب ہونے میں گہرا تعلق ہے۔ چوہدری بشیر نے ارشد حسین کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور فون بند کر دیا۔

اسی دوران میں ہٹی کٹی جالاں دروازے پر نمودار ہوئی اور اس نے چوہدری سے کہا کہ انہیں ناصر بلا رہا ہے۔ چوہدری جالاں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

جالاں کی جھلک نے شانی کی بے زاری میں اضافہ کر دیا۔ جب سے اس عورت نے انوری کے ساتھ بے دردی سے مار پیٹ کی تھی اس کی صورت سے ہی شانی کو نفرت ہو گئی تھی۔ یقیناً جالاں کے دل میں بھی شانی کے لئے کوئی اچھے جذبات موجود نہیں تھے۔ یہ جالاں کی مجبوری تھی کہ وہ شانی کے سامنے اپنا غیظ و غضب ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ شانی سمجھ گئی کہ جالاں رازداری سے یہاں پہنچائی گئی ہے اور اب وہ شانی کے ساتھ ہی اس چار دیواری میں رُوپوش رہے گی۔

چوہدری بشیر کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مکان کے کسی اندرونی کمرے سے دبی دبی کرب ناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شانی سمجھ گئی کہ چوہدری بشیر، بابرے کی ٹھکائی کر رہا ہے۔ بابرے پر چوہدری کو دوہرا غصہ تھا۔ ایک تو اس نے کوٹھی سے شانی کا پیچھا کیا تھا۔ دوسرے اس نے شانی کی آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ شانی دیکھ چکی تھی کہ یہ مکان دیگر مکانوں سے ذرا فاصلے پر ہے۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ یہاں پر ہونے والی مار پیٹ کی آوازیں ارد گرد کے لوگوں تک پہنچیں گی۔

شانی کو فضا میں عجیب سی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ ایسا......جو نا روا ہے، جو نہیں ہونا چاہئے۔

کچھ دیر بعد شانی نے کھڑکی میں سے دیکھا بھاری بھرکم جالاں قیمہ بنانے والی ایک وزنی مشین اٹھائے ایک دروازے میں داخل ہوئی۔ شانی چونک گئی۔ چونکنے والی بات مشین میں نہیں تھی۔ اس دروازے میں تھی جس میں جالاں داخل ہوئی تھی۔ یہ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ قیمہ کوٹنے والی مشین کا باتھ روم میں کیا کام تھا۔ یہ بجلی کی موٹر سے چلنے والی مشین تھی اور

ایک بڑے تختے پر نصب کی گئی تھی۔ جالاں زور آور ہونے کے باوجود اسے مشکل سے اندر پہنچا سکی تھی، شانی میں عجیب طرح کا تجسس جاگ اٹھا ...... کچھ دیر بعد جالاں باتھ روم سے نکلی اور اپنے بھاری کولہے مٹکاتی مکان کے کسی دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔

شانی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں باتھ روم کی طرف چل دی۔ باتھ روم کافی فاصلے پر تھا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی وہاں تک پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر اسے پتا چلا کہ جالاں اسے لاک کر گئی ہے۔ وہ جاتے جاتے باتھ روم کی لائٹ بھی بجھا گئی تھی۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس باتھ روم کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی ہے۔ کیا اسے دوسری طرف سے جا کر دیکھنا چاہئے؟ اس نے خود ہی سے پوچھا۔ پھر اس کے قدم دوسرے دروازے کی سمت میں بڑھے۔ ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی کہ رک گئی۔ کراہنے اور ڈکرانے کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ یقیناً یہ آوازیں بابر ہی کی تھیں اور چند کمرے چھوڑ کر عقبی صحن کے آخری کمرے سے برآمد ہو رہی تھیں۔

شانی نے اپنے سینے میں عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ اس کے قدم بے ساختہ آخری کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی وہ سات آٹھ قدم ہی چلی تھی کہ ایک جانب سے شائلہ برآمد ہوئی اور اس نے تیزی سے شانی کا راستہ روک لیا۔ ''آ...... آپ کہاں جا رہی ہیں بیگم صاحبہ؟'' اس نے قدرے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا بات ہے......؟''

''کک...... کچھ نہیں میرا مطلب تھا، آپ اُدھر نہ جائیں۔''

''کیوں کیا بات ہے......؟''

''اِدھر آئیں میرے ساتھ، میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' وہ شانی کا کندھا تھامتے ہوئے بولی۔

پہلے تو شانی کے دل میں آئی کہ اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جائے لیکن پھر نہ جانے کیا سوچا کہ اس کے ساتھ چل دی۔ شائلہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ یہ مکان گو زیر تعمیر لگتا تھا مگر اس کے جو کمرے مکینوں کے استعمال میں تھے وہ اندر سے خوب ڈیکوریٹ تھے، گھر کی آرائش سے پتا چلتا تھا کہ مکین شان وشوکت کو پسند کرتے ہیں لیکن شاید ان کے مالی وسائل اس شان وشوکت سے میل نہیں کھاتے۔ اس تضاد کی وجہ سے ہی غالباً یہ وسیع گھر ابھی تک نامکمل پڑا ہوا تھا۔

بیڈ روم میں گیس ہیٹر کی خوشگوار حرارت تھی۔ شائلہ نے امپورٹڈ سلک کا سلیپنگ گاؤن

پہن رکھا تھا۔ ذرا گھنگھریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کمر کی بیلٹ اس نے اس طرح باندھ رکھی تھی کہ جسمانی نشیب وفراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی اور شانی کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔

''آپ میرے پاس بیٹھیں چوہدرانی! ہم باتیں کرتے ہیں۔'' وہ پنجابی لہجے میں اردو بولتی تھی۔

''دیکھو...... ! مجھے پہیلیاں نہ بوجھواؤ۔ اُدھر جانے سے کیوں روک رہی ہو مجھے؟''

وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''چوہدرانی جی! دراصل اُدھر گڑبڑ ہے۔''

''گڑبڑ سے کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''یہ مردوں کے کام ہیں جی...... مرد ہی جانیں۔ ہم عورتیں ایسے کاموں سے دور ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے جی...... سچی گل تو یہ ہے کہ ہم میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ ایسے تماشے دیکھ سکیں۔'' شائلہ واضح طور پر ڈری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

شانی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جس گڑبڑ کی بات کر رہی ہو اس کا تعلق بابر سے تو نہیں ہے؟''

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس نے کون سا اچھا کام کیا ہے جی...... آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو آپ کو جان سے مارنا چاہتے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے بابر کے ساتھ؟'' شانی نے شائلہ سے پوچھا۔

وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''چوہدری صاحب نے اسے بُری طرح مارا ہے۔ سائیکل کا چین مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی ہے۔ بالکل خونم خون ہو رہا ہے وہ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب تک ختم ہی ہو گیا ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بابر کو قتل کر دیا ہے انہوں نے؟''

''بس کر دیا ہے، یا کرنے والے ہوں گے۔''

ایک دم شانی کا دھیان قیمہ بنانے والی اس مشین کی طرف چلا گیا جو کچھ دیر پہلے جالاں نے باتھ روم میں رکھی تھی۔ شانی نے شائلہ سے اس مشین کے بارے میں پوچھا تو اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟ تم بتا کیوں نہیں رہی؟ کس لئے ہے وہ مشین؟'' شانی نے زور دے کر پوچھا۔

وہ پہلے تو چپ رہی، پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں ہے چوہدرانی جی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ لاش کو غائب کرنے کا انتظام ہے۔''

شانی کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے ایک مرتبہ بھائی عادل سے سنا تھا۔ ڈی جی خان کے ایک وڈیرے نے اپنے مزارعے کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کا قیمہ بنا کر گٹر میں بہا دیا تھا بعد ازاں اس کی ہڈیوں کو بھی کوٹ پیس کر برابر کر دیا تھا۔ بھائی عادل نے اسے بتایا تھا کہ لوگ لاشوں کو غائب کرنے کے لئے ایسے حربے اکثر استعمال کرتے ہیں، لاشوں کو تیزاب میں گلا دیتے ہیں، انہیں بھٹی میں ڈال کر ختم کر دیتے ہیں یا پھر ان کے چھوٹے چھوٹے ناقابل شناخت ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ شانی جانتی تھی یہ سب کراہت انگیز کام ہیں لیکن انسان کی مٹی عجیب ہے۔ وہ کسی بھی کام کو جب دو چار بار دہرا لیتا ہے تو وہ اس کے لئے انوکھا رہتا ہے نہ کراہت آمیز نہ خوفناک لیکن بات انسانوں کے عادی ہو جانے کی نہیں۔ بات تو یہ ہے کہ کیا خونِ ناحق چھپ سکتا ہے...... تاریخ گواہ ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ خون ضرور بولتا ہے۔ جلد یا بدیر حالات کی انگلی قاتل کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے، لاش کو تو مٹی کھا جاتی ہے یا آگ نگل لیتی ہے یا تیزاب گلا دیتا ہے مگر ''جرم'' تو زندہ رہتا ہے اور قانونِ فطرت کے مطابق اپنی طرف ''اپنی'' ''سزا'' کوشش کرتا رہتا ہے۔

شانی کے جسم میں ایک بلند لہر اٹھی۔ اس کے اندر کی اخلاقی جرأت نے اسے وقتی طور پر ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا۔ وہ شائلہ کو حیران چھوڑ کر تیزی سے اٹھی۔ دروازہ کھولا اور مکان کے اس آخری کمرے کی طرف دوڑی جہاں اس کے خیال کے مطابق چوہدری بشیر، ناصر اور بابر وغیرہ موجود تھے۔ جونہی وہ اس کمرے کے قریب پہنچی ایک رائفل بردار شخص نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی ''رک جائیں'' وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ شانی اسے قطعی طور پر نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ ایک دھکے سے کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے بابر پر پڑی۔ وہ لرز گئی۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ فرش پر اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک تار نہیں تھا...... بس گردن میں پھنسے ہوئے کرتے کی چند دھجیاں باقی تھیں۔ اس کا پورا جسم ایک لہو اگلتے زخم کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ بابر کے منہ میں ایک پرانی چپل اس طرح ٹھونسی گئی تھی کہ وہ شاید اس کے حلق تک پہنچ چکی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے غالباً چوہدری بشیر کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کے زخموں پر پیشاب کیا تھا یا پھر شاید یہ اس کے اپنے ہی پیشاب کی بُو تھی۔ وہ قریب المرگ نظر آ رہا تھا۔

ہاں یہی شخص تھا جو تقریباً چوبیس گھنٹے پہلے پیپل کے درخت تلے درندے کی طرح اس پر جھپٹا تھا اور اسے اپنی وحشت کے نیچے روندنے کی کوشش کی تھی۔ کتنا جری، خودسر اور ''بے پناہ'' نظر آتا تھا یہ...... لیکن آج اس ٹھنڈے فرش پر وہ بے کسی، ناتوانی اور ذلت کی مثال تھا۔ ریاست کے سر پر بڑی پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ دیگر افراد کے ساتھ بابر کے سر کی طرف موجود تھا۔ چوہدری بشیر کمرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہٹے کٹے شخص کے ہاتھ میں بجلی کا ایک موٹا تار تھا۔ اس تار کو دہرا کر کے اور بل دے کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ اپنی دونوں ٹانگیں چوڑی کئے یہ شخص بابر کے عین عقب میں سر کی طرف کھڑا تھا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ اگلے ایک آدھ منٹ میں اس تار کے ذریعے بابر کا گلا گھونٹنے اور اس کے جسم سے رہی سہی زندگی نچوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شانی کو یوں اندر گھستے دیکھ کر سب افراد بُری طرح چونکے۔

شانی ہٹے کٹے شخص اور بابر کے درمیان آ گئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' وہ چلائی۔ ''کیا اسے جان سے مار دو گے؟''

وہ سب ہکا بکا کھڑے تھے۔ شانی نے ہٹے کٹے شخص کو دھکیلا۔ ''دُور ہٹ جاؤ اس سے باہر چلے جاؤ۔''

ان لمحوں میں شانی کی نگاہ ایک لحظے کے لئے بابر کی نگاہ سے ٹکرائی۔ ان بجھتی ہوئی نگاہوں میں امید کی ایک موہوم سی کرن نمودار ہوئی، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص آخری بار قاتل پانی کے اندر سے ابھرتا ہے اور کسی مددگار کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

اسی دوران میں چوہدری بشیر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے عقابی نظروں سے کمرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور ایک ہی لحظے میں جیسے سب کچھ جان گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شانی کو بازو سے پکڑا۔ اس کا انداز بظاہر دھیما تھا لیکن گرفت بہت سخت تھی۔ ''شانی، میرے ساتھ آؤ......'' وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

شانی نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گی چوہدری صاحب، میں یہ نہیں کرنے دوں گی۔''

''شانی! میں نے کہا ہے ناں، میرے ساتھ آؤ۔'' چوہدری کی آواز دھیمی رہی مگر لہجہ بے حد گمبھیر ہو گیا۔

شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں چوہدری نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ ہٹے کٹے شخص نے بابر کے عقب میں کھڑے کھڑے بجلی کا موٹا تار اس کی گردن

میں ڈال دیا۔شانی نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر چوہدری کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔''..... خدا کے لئے نہیں '' وہ چلائی اور اس نے ایک طرح سے خود کو بابر کے اوپر گرا دیا......اس کے ہاتھوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ بجلی کا تار بابر کے گلے سے نکال دیا۔اب اس کا وجود بابر کے پارہ پارہ جسم پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ چوہدری کے کارندے ہکا بکا کھڑے تھے .....انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔شاید بابر کی حیثیت ایک ایسے بدفطرت دشمن کی تھی جس نے فقط ایک دن پہلے شانی کو بدترین اذیت اور ذلت سے دوچار کرنا چاہا تھا اور آج وہ سب کچھ بھول کر اس کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔کوئی اور جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر زخمی ریاست ضرور جانتا تھا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس طرح کی صورتِ حال پیش آ چکی ہے۔ جب ریاست اور اس کے ساتھیوں نے محکمہ ٹیلی فون کے افسر قاسم برلاس کی جان لی تھی تو شانی نے اسی طرح اس کو بچانے کی کوشش کی تھی۔حالانکہ قاسم برلاس بھی شانی کو خون کے آنسو رُلا چکا تھا۔

چوہدری بشیر بُری طرح سٹپٹایا ہوا تھا۔اس نے شانی کو بابر کے خونچکاں، برہنہ جسم سے دور ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔وہ اس کے آگے ڈھال بن گئی تھی اور اس کے لئے رحم کی درخواست کر رہی تھی۔ پھر اچانک چوہدری کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اس کا دل کچھ نرم پڑ گیا ہے۔اس کی آواز کا آہنگ بھی کچھ بدل گیا۔اس نے اپنے کارندوں کو باہر جانے کے لئے کہا۔وہ حکم کی تعمیل میں باہر نکل گئے۔چوہدری نے دروازہ اندر سے بند کیا اور شانی کو بابر سے پیچھے ہٹالیا۔شانی نے اپنی گرم شال کندھوں سے ہٹائی اور بابر کی برہنگی چھپانے کے لئے اس کے جسم پر پھیلا دی۔''اسے معاف کر دیں چوہدری! میری خاطر معاف کر دیں۔'' شانی نے رقت آمیز آواز میں کہا۔

چوہدری شدید الجھن کے ساتھ شانی کو دیکھ رہا تھا۔جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ وہ کیا شے ہے، پھر اسے احساس ہوا کہ شانی ننگے سر اس کے سامنے کھڑی ہے۔اس نے اپنی گرم چادر شانی پر ڈال دی۔کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے شانی نے چوہدری بشیر سے وعدہ لیا کہ بابر کی جان نہیں لی جائے گی۔اب شانی کو چوہدری کے لب و لہجے کی کافی شناخت ہو چکی تھی۔وہ اس کے تاثرات سے بہت حد تک اس کی دلی کیفیت بھانپ لیتی تھی۔وہ کمرے سے اسی وقت نکلی جی اس کے دل نے گواہی دی کہ چوہدری پوری سنجیدگی کے ساتھ وعدہ کر رہا ہے۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔چوہدری بشیر نے اپنے ہاتھ اپنے ایک بھائی بند کے خون سے نہیں رنگے لیکن خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔شانی مسلسل فکرمند تھی۔صبح نو بجے کے قریب چوہدری بشیر کو واپس لاہور چلے جانا تھا۔شانی چاہتی تھی کہ چوہدری کے جانے سے

پہلے اس سے ایک ملاقات مزید کر لے، وہ بابر کی جان بخشی کے حوالے سے مزید تسلی کرنا چاہتی تھی۔دوسرے وہ چوہدری سے مُنّے اور ندیم کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی۔یہ سوچ سوچ کر اس کا دل خون ہو رہا تھا کہ ماں کی موت کے بعد وہ دونوں کتنے افسردہ ہوں گے۔

چوہدری نے ناشتہ شانی کے ساتھ ہی کیا۔وہ ناشتہ کرتے ہوئے بھی عجیب نظروں سے اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا، آخر ایک گہری سانس لے کر بولا۔''مجھے مردم شناسی کا دعویٰ ہے۔ بندے کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیتا ہوں، لیکن تم بالکل مختلف ہو۔اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں دیکھتے ہوئے مگر لگتا ہے کہ ابھی تمہاری ''الف ب'' ہی نہیں جان سکا۔''

''میری ''الف ب'' بڑی سادہ ہے چوہدری صاحب۔'' شانی نے سر جھکائے کہا۔ ''مم.....میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔''

''تم غلط کہتی ہو۔ تم بہت سے لوگوں کو دکھی دیکھتی ہو......''

''میں سمجھی نہیں......؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''میں تمہیں دکھی نظر نہیں آتا ہوں.....؟''

''جی......وہ......'' ہکلا کر بولی۔

وہ مسکرایا۔''تمہاری ''الف ب'' اتنی سادہ نہیں جتنی نظر آتی ہے۔کسی وقت تم بہت کمزور خوفزدہ اور بھلی مانس معلوم ہوتی ہو، کسی وقت ایک دم نڈر ہو کر جھپٹتی ہو اور سامنے والے کو ہکا بکا کر دیتی ہو۔رات کو تم نے کیا کیا تھا۔مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔''

چوہدری نے خود ہی بات چھیڑ دی تھی اس لئے شانی نے موضوع پکڑنے میں آسانی محسوس کی۔وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔''چوہدری صاحب......! میں نے رات کا زیادہ حصہ جاگتے ہی گزارا ہے۔بابر کی جو حالت ہوئی ہے وہ بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ اس کے کئے کی کافی سزا اسے مل گئی ہے۔اب میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے معاف کر دیں۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے میں اسے چھوڑ دوں تاکہ وہ سیدھا نارپور پہنچے اور ہر طرف آگ لگوا دے۔''

''میں نے یہ کب کہا ہے۔میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ اس کا خون اپنے سر نہ لیں۔اس کی جان بخشی کر دیں۔اوپر والا ہمیں اس کا صلہ دے گا۔ہمارے مُنّے اور ندیم پر سے مصیبتیں ٹلیں گی۔میری بھابو کا سفر آسان ہوگا.....اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور

اجر دیتا ہے۔"

چوہدری نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "رات کو جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ واقعی ضرورت سے زیادہ تھا۔ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ میں اس وقت کچھ زیادہ ہی طیش میں آگیا تھا۔ تم نے ہمت سے کام لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری ہمت کی وجہ سے بابرے کی جان بچ گئی۔"

شانی نے چونک کر چوہدری کی طرف دیکھا۔ وہ جانچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ چوہدری کس حد تک درست کہہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے تھوڑی سی حیرت بھی ہو رہی تھی، چوہدری کا لب ولہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اس میں جوش کی جگہ ہوش اور مبارزت کی جگہ مفاہمت کا تاثر تھا۔ "اب بابر کے ساتھ کیا کریں گے آپ......؟" شانی نے مزید تسلی کے لئے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے؟"

"مجھے کیا پتا......"

چوہدری بولا۔ "یہ رشتے میں میرے پھوپھڑ کا بھتیجا ہے۔ میرا پھوپھڑ لڑائی بھڑائی کے کاموں میں بہت آگے تھا۔ یہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ بالکل جنگلی بلے کی طرح ہے یہ...... ہم نے اسے باندھا ہوا ہے لیکن یہ کسی بھی وقت اپنی بندشیں تڑا سکتا ہے اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"اسے کہیں محفوظ جگہ پر بند کر دیں۔"

"ظاہر ہے، اب بند ہی کرنا پڑے گا۔ اِدھر ایک بیسمنٹ تو موجود ہے۔ فی الحال اسے وہاں بھجوا دیتا ہوں۔ پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے اس جانور کا۔"

"کیا میں اس کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں؟" شانی نے پوچھا۔

"کیا مجھے سٹامپ پیپر لکھ کر دینا پڑے گا؟"

"نہیں، ایسی بات تو نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ پہلے سے کافی بدل گئے ہیں۔ آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"کافی نہیں...... بہت زیادہ بدلا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں......؟"

"میں بہت بدل گیا ہوں شانی...... تم نے بدلا ہے اور بدل رہی ہو...... شاید تم میں لوگوں کو بدل دینے کی طاقت ہے۔" وہ جیسے روانی میں کہہ گیا۔

"ایسی ہی طاقت والی ہوتی تو......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ آنکھوں کے کنارے نمناک

ہو گئے۔

چوہدری نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ ادھوری بات نہ کیا کرو۔ کیا کہنے والی تھیں......؟"

وہ دانتوں سے نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں...... بس یونہی کسی کا خیال آگیا تھا۔"

"کس کا......؟"

"انوری کا۔" شانی نے سرد آہ بھری۔

"اوہو......" چوہدری سنبھل کر بولا۔ "میں سمجھا پتا نہیں کیا بات کہنے والی ہو...... تمہارا وہ کام تو ہو گیا ہے بھئی۔ تقریباً سارا انتظام کر دیا ہے میں نے اور بڑا پکا انتظام کیا ہے۔ اس لئے تو دیر ہوئی ہے۔ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ پھر اسی دوران میں تمہاری بھابو زیادہ بیمار ہو گئی...... بہرحال اب ایک دو روز میں انوری اپنے بچوں کے درمیان ہو گی...... بلکہ اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ ہو گا۔"

"کہاں ملیں گے وہ......؟" شانی نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"لاہور سٹیشن کے پاس ایک ہوٹل ہے۔ وہاں تین کمروں کا ایک پورشن بک ہے ان کے لئے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ وہاں رہیں گے؟"

"ہاں، لیکن عارضی طور پر شاید پندرہ بیس دن۔ اس دوران میں ان کے باقی کاغذات بن جائیں گے۔"

"باقی کاغذات؟ میں سمجھی نہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔ "شانی!...... یہ کام آسان نہیں تھا لیکن تم نے اتنا زور دے کر کہا کہ مجھے کرنا پڑتا...... انوری اپنے بندے اور تینوں بچوں سمیت پاکستان سے باہر جا رہی ہے۔"

"کک...... کہاں؟" شانی حیرت سے بولی۔

"شارجہ...... میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمہاری خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کے پاس واپس پہنچے۔ تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔"

شانی حیرت سے چوہدری کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے ابھی تک پوری طرح یقین نہیں

ہو رہا تھا۔ چوہدری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھتی ہو شانی تو وہ خوش قسمت ہے۔ اگر تم اسے کوٹھی میں نہ دیکھتیں اور اس کی سفارش نہ کرتیں تو پھر اس کا انجام بہت مختلف ہوتا۔ قادرے کی شدید خواہش تھی کہ راز رکھنے کے لئے اس عورت کو ختم کر دیا جائے۔ کسی وقت میں بھی اسی انداز میں سوچنے لگتا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ جس روز تم نے مجھ سے انوری کا ذکر کیا اس روز رات کو قادرے نے مجھ سے انوری کے بارے میں فیصلہ کن مشورہ کرنا تھا۔''

شانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ تشکر آمیز انداز میں چوہدری کی طرف دیکھنے لگی۔ چوہدری نے کہا۔ ''بھئی! یہ کیسی آنکھیں ہیں تمہاری..... خوشی میں بھی روتی ہیں، دکھ میں بھی۔''

شانی نے بے ساختہ کہا۔ ''کیا میں ایک بار انوری کو اس کے بچوں کے ساتھ دیکھ سکتی ہوں؟''

''نہیں... '' چوہدری نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت مشکل ہے۔ میں اس بارے میں کسی طرح کا رسک نہیں لے سکتا.... '' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے۔''

''کیا.....؟''

''میں تمہیں انوری اور اس کے بچوں کی تصویریں دکھا سکتا ہوں.... یا پھر ان کے ملاپ کی ویڈیو..... ہاں ویڈیو ٹھیک رہے گی۔ جب وہ شان ہوٹل میں ملیں گے تو ان کی ویڈیو بنالی جائے گی۔''

''لیکن، کب تک؟''

''کہا ہے نا، ایک دو دن تک۔'' چوہدری نے یقین سے کہا۔

شانی چوہدری سے رستم کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی مگر اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟'' چوہدری اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''نہیں..... میرے ذہن میں پرسوں رات کی باتیں آ رہی ہیں۔ وہ بابا جی میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔'' شانی نے بات بدلی۔

''ہاں وہ سب کچھ مجھے بتایا ہے ریاست نے۔ ہر قسم کے لوگوں میں اچھے بُرے بندے تو ہوتے ہیں۔ ذرا حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو میں ریاست کے ساتھ وہاں جاؤں گا اور ان

بابا جی کا شکریہ ادا کروں گا۔''

''کک... کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب آپ جائیں..... تو مجھے بھی لے جائیں؟''

چوہدری نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی ایک دو مہینے تک اس طرف جانا بالکل مناسب نہیں ہے، تمہارے ساتھ بابرے کی تلاش بھی زور وشور سے ہو رہی ہے۔ بابرے کا گھوڑا جہاں سے ملا ہے وہ جگہ رکھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی یہ خطرہ ہے کہ کہیں بابا جی اور ان کے مرید بھی حالات کے لپیٹے میں نہ آ جائیں۔ کچھ دن تک حالات بہتر ہوتے ہیں تو پھر اس بارے میں سوچیں گے۔''

چوہدری اور شانی کی گفتگو پندرہ بیس منٹ مزید جاری رہی پھر چوہدری چلا گیا۔

☆======☆======☆

اگلے چار پانچ روز میں چوہدری کی واپسی ہوئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملی یہاں تک کہ اس نے فون وغیرہ بھی نہیں کیا۔ دراصل وہ بے حد احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بھائی بند بڑے تندہی سے حقیقت کو کھوجنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چار دیواری کے حالات بھی آہستہ آہستہ شانی پر واضح ہو رہے تھے۔ شمائلہ اور ناصر کی شادی کوئی دو سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ ناصر، چوہدری بشیر کے پنڈی والے کارخانے کے منیجر کا بھائی تھا۔ اس کے بارے میں شانی کو یہی معلوم ہوا کہ وہ کسی زرعی بینک میں ملازم ہے۔ بینک سے قرضے وغیرہ لینے میں وہ چوہدری کی مدد کرتا ہے لیکن وہ آج کل زیادہ تر گھر میں ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آمدورفت کے اوقات سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا تھا کہ وہ کہیں ملازم ہے۔ ہر وقت کلف لگے کھڑکھڑ کرتے کپڑے اور پالش شدہ جوتے پہنے وہ گھر میں ہی دکھائی دیتا تھا۔ شمائلہ بھی اپنا زیادہ وقت بننے سنورنے میں ہی صرف کرتی تھی۔ انڈین فلمیں دیکھنے کا شوق شمائلہ کو جنون کی حد تک تھا..... وہ ایک کم تعلیم یافتہ لیکن بہت باتونی اور تیز طرار عورت تھی۔ جس مکان میں یہ میاں بیوی رہ رہے تھے وہ لاہور کے مضافاتی قصبے ''مریدکے'' میں واقع تھا۔

شانی زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزار رہی تھی۔ بھابو، منّا اور رستم کے خیالات ہر وقت اس کے ذہن پر یورش کرتے تھے۔ کسی وقت انوری کی مصیبتوں کا خیال بھی بڑی شدت سے آتا تھا۔ قیمے کی مشین والی بات ابھی تک شانی کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ کسی وقت ان سفاک مناظر کا خیال آتا تو وہ سرتاپا کانپ جاتی۔ جالاں اس کے اردگرد دندناتی رہتی تھی اور خشمگیں نظروں سے دیکھتی رہتی تھی، جالاں اس ''نگرانی'' کا حصہ تھی جس نے شانی

کو اس چار دیواری میں حصار میں لے رکھا تھا۔ بابر عرف بابرا تہہ خانے میں تھا۔ وہ براہِ راست ریاست اور ناصر کی نگرانی میں تھا۔ اسے کھانا پہنچانے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھنے کی ذمہ داری ریاست پر تھی۔ یوں تو بھری ہوئی رائفل اکثر ریاست کے پاس نظر آتی تھی لیکن جب وہ بابر کو کھانا وغیرہ پہنچانے تہہ خانے میں اُترتا تھا، رائفل ضرور اس کے کندھے پر ہوتی تھی۔ ایسے میں عموماً کوتاہ قد ڈولا بھی ریاست کے ساتھ ہوتا تھا۔ ڈولا ایک عجیب کردار تھا۔ شمائلہ کا کہنا تھا کہ وہ مخنث ہے۔ وہ اس سے ٹانگیں دبواتی تھی، سر کی مالش کرواتی تھی، لیکن شانی کو پتا نہیں کیوں شمائلہ کی بات پر یقین نہیں تھا۔ اسے ڈولے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آتی تھی۔

شانی کا کمرہ شمائلہ کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دن شام کو شمائلہ کے کمرے سے میوزک کی آواز ابھر رہی تھی۔ شانی نے یونہی گزرتے گزرتے ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکا تو چونک گئی۔ شمائلہ نے ٹی وی آن کر رکھا تھا اور ڈانس کرنے میں مصروف تھی۔ کسی انڈین فلم کے گانے پر وہ ہیروئن کے ساتھ ساتھ بے باکی سے رقص کر رہی تھی۔ اس کے جسم میں بلا کی لچک تھی اور قدم بھی ماہر ڈانسروں کی طرح تھرک رہے تھے۔ اسی دوران میں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی، اس کا خاوند واپس آیا تھا۔ شمائلہ نے ٹی وی بند کیا اور تولیے سے پسینہ پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچھ ہی دیر بعد میاں بیوی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پورچ کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے دو ملازم تھے اور انہوں نے ایک بھاری مشین اٹھا رکھی تھی۔ یہ ایکسرسائز مشین تھی۔ انہوں نے مشین شمائلہ کی وسیع خواب گاہ کے باہر رکھی اور چلے گئے۔

ناصر نے مشین کے کور وغیرہ ہٹائے...... یہ جسمانی ورزشوں کی ''ملٹی پل'' مشین تھی۔ شمائلہ اشتیاق سے مشین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کافی مہنگی لگتی ہے۔''

''تم سے تو مہنگی نہیں ہے۔''

''باتیں بنانی تو کوئی آپ سے سیکھے۔''

''اور بندے کو بنانا کوئی تم سے سیکھے۔'' ناصر نے کہا پھر دائیں بائیں دیکھ کر شمائلہ کی پشت پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''دھیان کرو ذرا موٹی ہوتی جا رہی ہو۔''

''خدا کا خوف کریں...... یہ دیکھیں۔'' شمائلہ نے کمر پر سے قمیص کو کس کر اپنی کمر کا سائز ناصر کو دکھایا۔

''ارے ہاں۔ مشین کے ساتھ ایک دو گفٹ بھی ہیں شیلا جانی۔'' ناصر نے کار کی طرف

واپس جاتے ہوئے کہا۔

شیلا کا لفظ شانی کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برسا... ''شیلا... شیلا...'' کہاں سنا تھا اس نے یہ نام؟ یہ غالباً شمائلہ کا نک نیم تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ نام اس نے کہاں سنا تھا، بھابو کی موت سے کچھ دیر پہلے شانی نے چوہدری بشیر کو موبائل فون پر کال کی تھی۔ اس کال کے نتیجے میں اتفاقاً چوہدری بشیر اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے والی ایک لڑکی کی باتیں شانی کے کانوں میں پڑی تھیں۔ اس لڑکی کا نام شیلا تھا۔ تو کیا یہ وہی شیلا تھی؟ ناصر کی منکوحہ بیوی۔ اس گھر کی نوجوان مالکن؟ وہ سناٹے میں رہ گئی۔

میاں بیوی کی لالچی طبیعت اور آرام پرستی دیکھ کر شانی کو تھوڑا بہت شک تو پہلے بھی تھا، اب شمائلہ کا نک نیم جان کر یہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک سناٹے کی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اسی روز شام کو چوہدری بشیر آ گیا۔

چوہدری بشیر کے پاس شانی کے لئے ایک خوشخبری تھی۔ غموں کی مسلسل یلغار میں شانی تو خوشی کا لفظ ہی بھول چکی تھی۔ بہت عرصے بعد اسے لگا کہ گھٹن زدہ فضاؤں میں تازہ ہوا کا چھوٹا سا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا ہے۔

چوہدری بشیر نے انوری کو بمع اہل وعیال شارجہ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے ثبوت کے طور پر چند تصویریں اور ویڈیو فلم بھی موجود تھی۔ تصویریں چوہدری نے خود اتاری تھیں۔ ویڈیو اس کے ملازم نے بنائی تھی۔ اس نے اپنی کار میں سے ایک ہینڈی کیمرا نکالا اور اسے ٹی وی کے ساتھ اٹیچ کر کے شانی کو پندرہ بیس منٹ کی ریکارڈنگ دکھائی۔ یہ لاہور کے کسی ہوٹل کا کمرہ تھا۔ سب سے پہلے انوری کی تصویر سکرین پر نمودار ہوئی۔ وہ نئے لباس میں تھی۔ وہ چل کر کیمرے کی طرف آئی تو پتا چلا کہ اس کی ٹانگ کی تکلیف اب ٹھیک ہے۔ چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اس سے کوئی بات کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور آنسوؤں کی چمک تھی۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور انوری کے بچے اندر داخل ہوئے۔ کاکا.. گڈی اور شہباز...... وہ بھی نئے کپڑے اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔ انوری خوشی سے چلائی اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ماں بچوں کا ملاپ دیدنی تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لپٹا رہی تھی۔ بھینچ رہی تھی، چوم رہی تھی، بچے بھی اسے یوں چمٹ گئے تھے جیسے اس کا جسم کا حصہ ہوں۔ وہ کبھی ایک کو گود میں لیتی تھی، کبھی دوسرے کو۔ باؤلی سی ہو گئی تھی وہ۔ کاکا حیران پریشان تھا جب کہ دونوں بڑے بچے بھی ماں کی طرح رو رہے تھے۔ پھر انوری نے آگے بڑھ کر چوہدری کے پاؤں میں سر رکھ دیا۔ یہ ایک طرح سے تشکر کا غیر معمولی اظہار تھا۔ چوہدری جلدی سے پیچھے

ہٹ گیا اور اس کا شانہ تھپکنے لگا۔

وہ اپنے ایک ایک بچے کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی۔ جیسے اپنی حیات پر یقین نہ کر پا رہی ہو۔ ہاں یہی تھے وہ بچے یہی تھے وہ جگر کے ٹکڑے جن کے لئے وہ تاریک راتوں میں روتی چلاتی رہی تھی۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام کرنے کے باوجود اور رات کو اجنبی مردوں کے بستروں پر روندے جانے کے باوجود اور قید و بند کی ساری صعوبتیں برداشت کرنے کے باوصف، ان بچوں کی یاد ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دل سے نکل نہیں پائی تھی۔ آج وہ اس کے سامنے تھے، لیکن ابھی ایک کمی تھی۔ ابھی کچھ گمشدہ تھا۔ زندگی کا ایک ٹکڑا، زندگی سے علیحدہ تھا۔ اس کا شوہر اس کے سر کا سائیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھا۔ چوہدری نے ہاتھ سے ملازم کو اشارہ کیا۔ دروازہ پھر کھلا اور اس مرتبہ ایک غریب صورت شخص اندر داخل ہوا۔ یہی انوری کا شوہر تھا۔ شانی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے بھی نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے، وہ ایک سادہ سا دبو شخص تھا، اس کے لئے یہی بہت غنیمت تھا کہ اس کی بیوی اسے مل گئی تھی۔ ہاں..... جس حال میں بھی ملی تھی لیکن مل تو گئی تھی، میاں بیوی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے آنسو بہاتے رہے۔ ان بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کریں۔ پھر انوری نے اپنے کاکے کو گود میں اٹھالیا اور چومنے لگی۔ اس کے شوہر نے گڈی کو اٹھالیا اور چومنے لگا شاید اپنے بچوں کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔

کچھ دیر بعد انوری کی ریکارڈ شدہ مدھم آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ چوہدری سے شانی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ”چوہدری صیب! کیا میں بی بی جی کو دیکھ سکتی ہوں؟ ایک بار، صرف ایک بار۔“

”نہیں انوری..... ! لیکن تجھے بتایا ہے ناں کہ وہ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔“

”لیکن.....“

”دیکھ انوری! تو نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ ایسی مصیبتوں میں پھنس جائے گی جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا، بس سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں سوچو۔ جن لوگوں کے پاس تم میاں بیوی رہو گے وہ تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے لیکن پاکستان میں واپس آنے کا خیال بھی کبھی دماغ میں نہ لانا اور نہ ان لوگوں کا خیال دماغ میں لانا جو یہاں رہتے ہیں، میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔“

انوری نے گھبرا کر جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے بعد چند مناظر مزید دکھانے کے بعد اسکرین تاریک ہوگئی۔

تشکر کے جیسے آنسو انوری کی آنکھوں میں تھے ویسے ہی شانی کی آنکھوں میں بھی نظر رہے تھے۔ وہ نظریں جھکا کر چوہدری سے بس اتنا کہہ سکی۔ ”شکریہ۔“

”بھئی شکریہ تو غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔“ چوہدری لگاوٹ سے بولا۔

”اب انوری کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”شارجہ پہنچ چکی ہے۔ امید نہیں تھی کہ ان کے کاغذات اتنی جلدی بن جائیں گے، بہرحال اب تم اس کے بارے میں ہر طرح کی تسلی رکھو۔“ چوہدری نے شانی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تب اچانک چوہدری کو فلم ”ڈی لیٹ“ کرنے کا خیال آیا۔ اس نے شانی کے کہنے پر ایک بار پھر اسے انوری اور اس کے بچوں کی ریکارڈنگ دکھائی پھر اسے صاف کر دیا۔

چوہدری کے کہنے پر شانی نے اپنے ہاتھوں سے انڈوں کا حلوہ بنایا، ساتھ میں سبز چائے تھی۔ چوہدری کا موڈ آج کچھ اچھا نظر آ رہا تھا۔ شانی کا دل چاہا کہ اس سے رستم کے بارے میں پوچھے۔

دل کڑا کر کے اس نے کہا۔ ”اس روز کوٹھی میں رات کو.....“ مگر اتنا کہہ کر اس کی ہمت جواب دے گئی، کوشش کے باوجود وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

چوہدری نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ”پھر وہی آدھی باتیں؟ کیا کہنے لگی تھیں؟“

”وہ..... دراصل، میں..... منے کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ اس روز رات کو، میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا، پھر وہ نظر نہیں آیا۔“

”وہ بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔“ چوہدری نے حلوے کا چمچ اپنے وسیع منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمحے بعد ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”مجھے لگ رہا ہے جیسے تم کچھ اور پوچھنے لگی تھیں۔“

”کچھ اور..... نن..... نہیں..... مجھے کیا پوچھنا تھا؟“

چوہدری کھانسنے لگا۔ ”اوہو، میں پانی لاتی ہوں۔“ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ چوہدری کی کھوجی نگاہوں کے سامنے سے اٹھ گئی تھی، اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ آخر چوہدری کے سامنے رستم کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ اس طرح تو وہ خواہ مخواہ خود کو مشکوک کر رہی تھی۔ منطقی بات یہی تھی کہ اسے

چوہدری سے اس رات کا ذکر کرنا چاہیے تھا جب رستم کو گھیر کر مارا گیا تھا اور پھر کہیں غائب کر دیا گیا تھا۔

پانی لاتے لاتے اس نے اپنا حوصلہ جمع کیا اور ارادہ کیا کہ وہ چوہدری کے سامنے رستم کی بات ضرور کرے گی۔ کیونکہ بات کرنا...... بات نہ کرنے سے بہتر تھا...... بہر حال اس کی نوبت نہیں آئی، شانی دوبارہ چوہدری کے پاس بیٹھی تو اس نے خود ہی رستم کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک لمبی ڈکار لے کر بولا۔ ''پچھلے دنوں اوپر نیچے عجیب واقعات ہوئے ہیں۔ رستم والی بات تو یاد ہوگی تمہیں بھی، کتنی دیدہ دلیری تھی خبیث کی۔ یوں کوٹھی میں گھس آتا تھا جیسے خالہ جی کا واڑا ہو۔ بہت خطرناک بندہ تھا۔ اس رات چوکیداروں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ فائرنگ نہ کر سکا، ورنہ دو چار بندے تو پھڑکا ہی دینے تھے اس نے۔ پھر بھی اسے قابو کرتے کرتے دانتوں پسینے آ گیا۔''

''مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھی اسے پولیس سے چھڑا کر لے گئے ہیں؟''

''ہاں سنا تو میں نے بھی یہی تھا۔'' چوہدری کے ہونٹوں پر غیر معمولی مسکراہٹ نظر آئی۔

شانی نے حوصلہ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''خیر آپ اتنے بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔ آپ کو اصل بات کا پتا ہوگا۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا...... ''نہیں...... مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے کہ اس کے ساتھی اسے چھڑا کر لے گئے ہیں۔'' چوہدری کی تیز نظریں شانی کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔

وہ گڑبڑا کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ چوہدری نے عینک کے شیشے صاف کیے۔ پھر سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے کش لے کر بولا۔ ''شانی......! تم نے میرے ایک سوال کا جواب آج تک نہیں دیا۔ جس رات حویلی میں آگ لگی تم وہاں سے کسی کو بتائے بغیر نکل گئیں۔ اس واقعے کے تقریباً چار مہینے بعد جالاں اور ریاست وغیرہ نے تمہیں لاہور میں قاسم کے گھر سے نکالا۔ تقریباً چار مہینے بعد...... ٹھیک ہے تم نے کچھ وقت ریاض عثمانی کے گھر میں گزارا، پھر کچھ دن رکشہ ڈرائیور زکریا کے گھر میں رہیں لیکن باقی دنوں کا حساب تم نے نہیں دیا۔ تمہارا کہنا ہے کہ وہ کوئی نامعلوم بندہ تھا۔ اس نے تمہیں نامعلوم جگہ پر رکھا اور پھر نامعلوم طریقے سے تم اس کے گھر سے لاہور پہنچ گئیں...... دیکھو شانی بیگم! گندگی کے ایک قطرے سے پانی کی پوری بالٹی گندی ہو جاتی ہے، جھوٹ چھوٹا سا بھی ہو تو زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ اگر تم کچھ چھپا رہی ہو تو میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو اور شاید اپنے ساتھ بھی......''

شانی سرتاپا کانپ گئی، اس کا حلق لمحوں میں ہی لکڑی کی طرح خشک ہو گیا تھا۔ خود پہ

بمشکل قابو پا کر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ سے اور بھابو سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ شاید میں آپ سے کچھ چھپا بھی لیتی لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اللہ بخشے بھابو سے بھی کچھ چھپا سکتی تھی؟ آپ یقین کریں حویلی سے نکلنے کے بعد میں نے چند دن ایسے ہی گزارے تھے جیسے نیند میں چل پھر رہی ہوں۔ آس پاس کا ہوش نہیں تھا مجھے......''

چوہدری خاموشی سے شانی کی وضاحت سن رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید سوال کرتا، موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی، دوسری طرف چوہدری کا کوئی کارندہ تھا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ کارندے نے چوہدری کو چوہدری کے کسی چاچے کی آمد کی اطلاع دی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس بہروپیے کا ذکر بھی کیا ہے جسے حضرت صاحب کہا جاتا تھا۔ چوہدری کی پیشانی پر بل نظر آنے لگے اور وہ خاصا پریشان دکھائی دینے لگا۔ ''ٹھیک ہے چاچا حشام سے کہو میں آ رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔'' چوہدری نے کہا اور فون بند کر دیا، اس کا خراب موڈ مزید خراب نظر آنے لگا تھا۔

اس نے کہیں اور فون ملانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جھلا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہاری اس جلد بازی کی وجہ سے ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔'' وہ شانی کو مخاطب کر کے لیکن اس کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑایا۔

''جی......؟''

''وہی خبیث قدرت اللہ...... اسے بڑا دکھ چڑھا ہوا ہے کہ تم نے اس کی بیبیوں پر ہاتھ اٹھایا اور اس کے برتن وغیرہ توڑے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس برتن میں پرندوں کی ہڈیاں تھیں، وہ اس کے پاس پانچ نسلوں سے تھا اور بہت قیمتی تھا۔ اس بات کا بڑا فساد ڈالا ہے اس نے۔ اس کا ایک ساتھی تو تمہیں جان سے مارنے کے درپے تھا۔ اس کے کئی مرید بھی آگ بگولا ہیں۔ میرے ساتھ اس کا ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا ہے۔ اب وہ قادرے اور چاچا حشام وغیرہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ روز کوئی نیا فتنہ کھڑا کر رہا ہے۔ اسے پتا ہے کہ وہ نارپور والوں کو آسانی سے بیوقوف بنا سکتا ہے اور وہ بن رہے ہیں۔ خاص طور سے چاچا حشام نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ جب تک تم مل نہیں جاتی ہو، وہ اپنے گھر نہیں جائے گا۔ کپڑے نہیں بدلے گا، بستر پر نہیں سوئے گا اور پتا نہیں کیا کیا نہیں کرے گا۔ آج پھر وہ قدرت اللہ کے ایک مرید کو لے کر کوٹھی پہنچا ہوا ہے۔''

چوہدری جانے کے لئے اپنے جوتے تلاش کرنے لگا۔ وہ کھسک کر صوفے کے نیچے چلے گئے تھے۔ شانی نے جوتے نکال کر چوہدری کے سامنے رکھے۔ وہ جوتے اور واسکٹ

وغیرہ نکال کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کا ابتر موڈ دیکھتے ہوئے شانی نے اس سے کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ پورچ میں چوہدری نے جالاں سے کچھ کھسر پھسر کی۔ شاید شانی کے بارے میں ضروری ہدایات دی تھیں۔ یا ممکن تھا کہ کوئی اور بات ہو۔ جالاں اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد چوہدری ایک چھوٹی سوزوکی کار میں پورچ سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ چھوٹی کار وہ یہاں آنے کے لئے استعمال کرتا تھا اور اس کا مقصد یقیناً ''رازداری'' ہی تھا...... چوہدری کے جانے کے بعد وہ دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے جسم میں اب بھی ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کہ فون کال آ گئی تھی۔ ورنہ گفتگو جس رخ پر جا رہی تھی وہ شانی کے لئے بہت تکلیف کا باعث بن سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ رستم کے ساتھ اس کے تعلق کے حوالے سے چوہدری کا شبہ مضبوط ہو رہا ہے۔ اس کی کھوجی نظریں، اس کی گفتگو کا انداز اور اس کے تاثرات سب اشارہ کرتے تھے کہ چوہدری کے دل میں کچھ ہے، شانی پچھتانے لگی کہ اس نے چوہدری کے سامنے رستم کی بات کیوں چھیڑ دی۔

اگلے چوبیس گھنٹے شانی نے سخت اذیت کے عالم میں گزارے۔ رستم کا خیال کوشش کے باوجود چند لمحوں کے لئے بھی ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ کسی وقت اسے لگتا کہ بھائی عادل، چاچا مشتاق، اباجی اور بھابو کی طرح رستم بھی اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکا ہے۔ زخم زخم ہونے کے بعد منوں مٹی کے نیچے سو چکا ہے، لیکن کسی وقت یوں لگتا کہ وہ زندہ ہے۔ سانس لے رہا ہے۔ ایک چمکیلی صبح...... یا تمتماتی دوپہر، یا خوش رنگ شام میں وہ واپس آئے گا۔ پوری طاقت اور پوری توانائی کے ساتھ...... اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں ہیجانی چمک ہوگی۔ وہ اپنے گرد و پیش کو تہہ و بالا کر دے گا۔ اس کی آتشیں نگاہوں سے ساری زنجیریں پگھل جائیں گی۔ اس کے فولادی بازو ہر طوفان کا رخ پھیر دیں گے۔

امکانات برابر تھے۔ وہ آ سکتا تھا۔ وہ نہیں آ سکتا تھا۔ وہ کبھی ایک رخ پر سوچنے لگی تھی، کبھی دوسرے رخ پر۔

شانی کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ کسی سے نفرت کرتی۔ مگر قدرت اللہ جیسے لوگوں کے لئے وہ بھی اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں پاتی تھی۔ قدرت اللہ پہلی جھلک میں ہی شانی کو برا لگا تھا۔ بعدازاں یہ ناپسندیدگی بڑھتی چلی گئی۔ شانی سمجھتی تھی کہ وہ شخص بھابو کا قاتل ہے اور بھابو جیسے نہ جانے کتنے دکھی لوگ تھے جن کے دکھ اس بہروپیے نے موت دے کر دور کئے تھے۔

شانی کو وہ لمحے یاد تھے جب وہ غم سے نڈھال اور طیش سے بے قابو ہو کر قدرت اللہ کی چہیتی بیویوں پر پل پڑی تھی۔ قدرت اللہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو پتا نہیں وہ کیا کر گزرتا، خاص طور سے سب سے چھوٹی کی پٹائی تو وہ کسی طور برداشت نہ کر پاتا۔ شانی کو بعد ازاں پتا چلا کہ وہ ہنگامے کے وقت بالائی منزل پر سو رہا تھا۔ بھابو کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے بعد ہی وہ بیدار ہوا تھا...... شانی قدرت اللہ کے بارے میں سوچتی رہی اور نت نئے اندیشے اس کے ذہن میں سر اٹھاتے رہے۔

اتنے میں بیرونی دروازے کی بیل ہوئی، جالاں جھومتی جھامتی دروازے تک گئی اور آنے والے کا نام وغیرہ پوچھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا، اب دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت آنا شروع ہو گئی تھی۔ موسم کروٹ لے رہا تھا۔ آنے والی ایک ادھیڑ عمر خوش شکل عورت تھی۔ اسے دیکھ کر شائلہ عرف شیلا تیزی سے آگے بڑھی اور پھوپھی کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ ادھیڑ عمر عورت نے اس کے سر پر پیار دیا اور ایک شاپر جس میں فروٹ تھا، اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے باتیں کرنے لگیں۔ شائلہ نے شانی کو بتایا کہ یہ اس کی مرحومہ والدہ کی پھوپھی ہیں لیکن وہ بھی بچپن سے ان کو پھوپھی ہی کہتی آئی ہے۔ پھوپھی صاحبہ اچھی عورت لگتی تھیں۔ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور نماز روزے کی باتیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر وہ سہ پہر کے بعد واپس چلی گئیں۔ شانی دیر تک سوچتی رہی۔ یہ نیک صورت عورت یقیناً نہیں جانتی کہ اس کی بھتیجی کی بیٹی کس قسم کی زندگی جی رہی ہے اور شاید اس عورت کی طرح اور بہت سے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ ازدواجی رشتے کے بعد شوہر ہی بیوی کا محافظ ہوتا ہے لیکن جب محافظ ہی ڈاکو بن جائے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ شانی کو سو فیصد یقین تھا کہ اگر شائلہ عرف شیلا چوہدری بشیر کے ساتھ ہر حد پار کر رہی ہے تو آج اس گناہ میں اس کا شوہر ناصر بھی برابر کا شریک ہے۔

شائلہ کی پھوپھی شائلہ کے لئے چھوٹے موٹے تحفے لے کر آئی تھیں، ان میں ایک نہایت خوبصورت پوسٹر ایک بچے کا بھی تھا۔ ایک شیر خوار بچہ آنکھوں میں معصوم آنسو لئے منہ بسور رہا تھا۔ یہ اتنی پیاری تصویر تھی کہ ایک ہی لمحے میں نگاہوں کو جکڑ لیتی تھی۔ پھوپھی بے چاری یہ تصویر شاید اس لئے لائی تھی کہ شائلہ اسے اپنے کمرے کی کسی دیوار پر آویزاں کرے گی اور یوں اس کے اندر یہ خواہش زور پکڑے گی کہ اس کی گود میں بھی ایک قلقاریاں مارتا بچہ ہو۔ مگر شائلہ نے یہ تصویر ایک بے کار شے کی طرح ایک طرف پھینک دی تھی۔ پھوپھی بے

خبر کو پتا نہیں تھا کہ جن عورتوں کو اپنے بچے کی ولدیت ہی ٹھیک سے معلوم نہ ہو سکتی ہو۔ وہ اس قسم کی تصویروں میں دلچسپی نہیں لیا کرتیں۔

اس قسم کی تصویروں میں تو شانی جیسی عورتیں دلچسپی لیتی ہیں، جن کے سینے میں مامتا ہلکورے لیتی ہے اور جن کے انگ انگ میں ایک قلقاریاں مارتے وجود کو چھونے کی خواہش ہوتی ہے۔ شانی نے تصویر اٹھائی اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے تصویر کے رول کو کھولا اور اسے سامنے پھیلا لیا۔ اس کے دل سے ٹیس اٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے مُنا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے پکار رہا ہے۔ اسے تصویر کے چہرے میں اپنے مُنے کا چہرہ دکھائی دیا اور وہ بے تاب ہو اٹھی۔ اس کا جی چاہا، اس کے پر ہوں اور وہ سارے اندیشوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہوا میں اُڑتی ہوئی مُنے کے پاس پہنچ جائے۔ اسے گود میں یوں چھپائے کہ پھر کوئی اسے جدا نہ کر سکے۔

☆======☆======☆

پھر ایک دن شام کے فوراً بعد چھوٹی سوزوکی کار مکان کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی، یقیناً چوہدری بشیر کی آمد ہوئی تھی، ناصر اور شائلہ نے چوہدری کا استقبال کیا اور اسے اندر لے آئے۔ یہ دیکھ کر شانی کی جان میں جان آئی کہ آج چوہدری اچھے موڈ میں تھا۔ وہ شانی کے پاس کمرے میں آیا تو شانی نے دیکھا، اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ”یہ کیا ہوا؟“ شانی نے پوچھا۔

”بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“ چوہدری نے مختصر جواب دیا۔

شانی کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ شاید کوئی لڑائی جھگڑے کا واقعہ ہوا تھا۔ آج کل کوٹھی میں جس قسم کے حالات تھے ایسے کسی واقعے کا ہونا عین قرین قیاس تھا۔ شانی کے ذہن میں تو یہ اندیشہ بھی بڑی شدت سے موجود تھا کہ رنگ والی میں اس کے لواحقین کا تصادم نارپور والوں سے نہ ہو جائے۔ یہ امر تو اب یقینی تھا کہ شانی کے حوالے سے ساری بات کھل چکی ہوگی۔ رنگ والی میں شانی کے سارے رشتے داروں کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ وہ اپنے سسرالیوں کی تحویل میں ہے اور اسے ہر کسی سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد رنگ والی والوں کا ردِعمل ظاہر ہونا یقینی تھا۔ بے شک ابا جی نہیں تھے، چاچا مشتاق اور بھائی عادل بھی نہیں تھے۔ چاچا رئیس انگلینڈ جا چکا تھا سارا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اس کے باوجود شانی کے بہت سے رشتے دار اور بہی خواہ رنگ والی میں موجود تھے۔ ان میں تایا معصوم، پھوپھی آمنہ، چچی پروین، شانی کے دو خالو اور خالہ زاد بھائی شامل تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی

موت کے بعد اس کے زندہ ہونے کی خبر نے رنگ والی اور گردونواح میں تہلکہ مچا دیا ہوگا۔ علاقے کے لوگ اپنے مرحوم چوہدری ارشاد کی بیٹی کو پھر سے دیکھنے اور ملنے کے لئے بے تاب ہو گئے ہوں گے۔ وہ تصور کی نگاہ سے ہلچل اور افراتفری کے وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔

چوہدری بشیر نے ابھی تک اس سے اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس کے نہ بتانے سے حقیقت حال بدل تو نہیں سکتی تھی اور اب چوہدری بشیر کے بازو پر چوٹ نظر آ رہی تھی۔ کیا کہا جا سکتا تھا کہ یہ چوٹ کس کے ہاتھوں آئی ہے اور اس کے پیچھے کیا واقعہ ہے۔

چوہدری نے کہا۔ ”آج پھر تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔“

وہ چونک گئی..... وہ بولا۔ ”تم تو ایسے حیران نظر آ رہی ہو جیسے تمہارے لئے اچھی خبر ہو ہی نہیں سکتی۔“

”کچھ ایسا ہی لگتا ہے مجھے۔“ وہ اداسی سے بولی۔

”چلو آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے بے تکلفی سے شانی کا بازو پکڑا اور پورچ کی طرف چل دیا۔ برآمدے میں شائلہ نے بظاہر مسکراتی نظروں سے چوہدری اور شانی کو دیکھا، تاہم شانی نے صاف محسوس کیا کہ ان نگاہوں کے پیچھے رقابت کا دھواں ہے۔ اس سے پہلے بھی شانی دو چار دفعہ اس دھوئیں کی جھلک شائلہ کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی۔

چوہدری شانی کو پورچ میں سوزوکی کار کے قریب لے آیا۔ شانی نے گاڑی میں جھانکا تو اس کا بلیوں اچھل گیا۔ وہاں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ کو اسٹریچ کیا گیا تھا اور اس پر مُنا سو رہا تھا۔ شانی نے تڑپ کر دروازہ کھولا اور خوابیدہ مُنے کو اٹھا کر گلے سے چمٹا لیا۔ وہ نیند کی حالت میں ہی اس کا منہ چومنے لگی۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے پیوست ہو گیا۔

مُنے کی آمد نے شانی کے دل کے بہت سے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ مُنے کو چھو کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بھابو کے جسم کے ایک حصے کو چھو رہی ہے۔ مُنا بھی نہال ہو گیا تھا۔ اس کے سینے میں جتنی بھی باتیں جمع تھیں تھوڑی ہی دیر میں اس سے کر لینا چاہتا تھا۔ چوہدری ان دونوں کو دیکھ کر کسی وقت زیرِ لب مسکرا دیتا تھا۔

”بہت شکریہ.....“ شانی چوہدری کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”کس بات کا.....؟“

”مُنے کو لانے کا.....“

”بھئی! یہ میری اپنی ضرورت بھی تو ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''میں سمجھی نہیں''

''تم ان عورتوں میں سے ہو جو بچے کے ساتھ مکمل اور زیادہ خوبصورت لگنے لگتی ہو۔ اب تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں تو دل چاہ رہا ہے کہ نٹافٹ تم دونوں کی دو چار تصویریں اتار لوں، لیکن افسوس کہ کیمرہ ساتھ نہیں لا سکا۔''

''آپ جھوٹی موٹی کی تصویر کھینچ لیں۔ یوں کر کے.....'' منے نے تصویر کھینچنے کا ایکشن بنایا۔

اس کوشش میں اس کی کہنی بڑے زور سے شانی کی ناک پر لگی۔ شانی کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ وہ چونک کر بولا ''تاتی! تم رو رہی ہو۔ تم تو مجھے رونے سے منع کرتی ہو......''

''مارتے ہو اور رونے بھی نہیں دیتے۔'' شانی نے کہا۔ چوہدری چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے سمجھا تھا کہ شانی کی بات کا رخ اس کی طرف ہے۔

شانی اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے کوئی بات سوچ رہی تھی جب اچانک اسے ندیم کا خیال آیا۔ اس نے چونک کر چوہدری سے پوچھا۔ ''ہائے، ندیم کہاں ہے؟''

''وہ پرسوں ہوسٹل واپس چلا گیا ہے۔ کافی حد تک نارمل ہو چکا ہے۔''

''ایک بار اسے مجھ سے ملا دیتے۔ مدت ہو گئی ہے اسے دیکھے ہوئے۔'' شانی نے افسردگی سے کہا۔

''ابھی حالات ٹھیک ہو لینے دو...... پھر تمہارے بہت سے شکوے دور کر دوں گا۔''

رات کا کھانا تینوں نے اکٹھے کھایا۔ شانی مسلسل منے کی دلجوئی میں لگی رہی۔ وہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی فارغ بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے دل میں ڈر سا بیٹھ گیا تھا کہ فارغ ہوتے ہی اس کا دھیان بچھڑ جانے والی ماں کی طرف چلا جائے گا اور وہ اس کی کوئی بات چھیڑ دے گا۔ شانی اس دردناک موضوع سے بچنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل کے زخموں سے رسنے والے خون کو بمشکل بند کیا تھا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ مُنا شانی کے ساتھ لگ کر سو گیا۔ حالتِ نیند میں بھی اس نے شانی کی اوڑھنی کا پلو مٹھی میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کے اندر شانی کی طلب اتنی شدید تھی کہ اس شدت کو محسوس کر کے شانی اندر سے ہل جاتی تھی۔ چوہدری ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ گھر کے مالک یعنی ناصر کو سرِ شام ایک ضروری کام پڑ گیا تھا اور وہ اپنے ایک ملازم کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ اسے کل دوپہر واپس آنا تھا۔ شاید چوہدری کی آمد کے موقع پر اس قسم کے ''ضروری کام'' ناصر کو پڑتے ہی رہتے تھے۔ بہرحال آج صورتِ حال مختلف تھی۔

شائلہ چوہدری کی ''دسترس'' میں تھی لیکن اس کی ''توجہ'' میں نہیں تھی۔ وہ بن ٹھن کر چوہدری کے اردگرد گھوم رہی تھی لیکن چوہدری مسلسل اپنے موبائل فون کے ساتھ مصروف تھا اور مختلف لوگوں کو کالیں کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو کا کوئی کوئی لفظ شانی کے کان میں بھی پڑ جاتا تھا۔ ان الفاظ سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری بشیر اور اس کی برادری کے درمیان چپقلش بڑھانے میں قدرت اللہ واقعی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ وہ بھابو کی موت کی ذمے داری شانی پر ڈال رہا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے عملیات کے ذریعے ثابت کرنے میں بھی مصروف تھا کہ نارو والوں کے سر پر مزید خطرات منڈلا رہے ہیں۔

آدھ پون گھنٹہ چوہدری بشیر کے اردگرد گھومنے کے بعد شائلہ مایوس ہو کر سونے کے لئے چلی گئی۔ شانی مُنے کے پاس لیٹی رہی۔ اس کا دل انجانے خدشات سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی پریشانی کی آمد سے آگاہ کر رہی تھی۔ رات بارہ بجے تک چوہدری بشیر کے کمرے سے ٹی وی کی مدھم آواز گونجتی رہی۔ کوتاہ قد ڈولا چائے کی ٹرے لے کر اندر جاتا اور باہر آتا رہا، پھر غالباً وہ بھی سونے کے لئے چلا گیا۔ قرب و جوار میں رات کا گہرا سناٹا چھا گیا۔ شانی کو بھاری قدموں کی آواز آئی۔ چوہدری دروازے پر کھڑا تھا۔ ''منا سو گیا؟'' اس نے یونہی رسمی انداز میں پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مُنا سو چکا ہے۔

ثانی نے اثبات میں جواب دیا۔

''آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔'' چوہدری نے متوقع سرگوشی کی۔

شانی کچھ دیر ساکت لیٹی رہی پھر اس نے مُنے کی طرف دیکھا، اس کی اوڑھنی ابھی تک اس کی مٹھی میں دبی تھی، جیسے وہ اسے جانے سے روکنا چاہتا ہو لیکن جو بلا رہا تھا وہ زیادہ زور آور تھا۔ شانی جانتی تھی کہ اگر وہ اوڑھنی کو مٹھی سے چھڑانے کی کوشش کرے گی تو وہ جاگ جائے گا۔ اس نے بڑے آرام سے اوڑھنی اپنے جسم سے علیحدہ کر دی۔ اب وہ ننگے سر چوہدری کے سامنے کھڑی تھی۔ چوہدری کی نگاہوں کی تپش کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے ایک دوپٹا ڈھونڈا اور اسے اوڑھتی ہوئی چوہدری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

یہاں گیس کا ہیٹر دھیمی رفتار سے جل رہا تھا۔ شانی اور چوہدری سامنے صوفے پر بیٹھ گئے، چوہدری پہلے بھی اسی طرح اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ رات کے سناٹے میں وہ دھیمے لہجے میں دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا۔ شانی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہتا تھا اور نگاہیں شانی کے سراپا کا طواف کرتی رہتی تھیں لیکن آج شانی کو صورتِ حال کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

چوہدری نے شانی کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ان مصائب کے بارے میں بتانے لگا جو بھابو کی موت کے بعد اسے درپیش تھے۔ شانی کا یہ قیافہ درست نکلا تھا کہ نارپور کی حویلی کی آگ سے اس کے زندہ بچ نکلنے کی اطلاع دور دور تک پھیل چکی تھی۔ نارپور کے ساتھ ساتھ رنگ والی میں بھی زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ رنگ والی سے معززین کا ایک گروہ چوہدری بشیر سے ملنے کوٹھی پہنچا تھا۔ ان میں شانی کے قریبی عزیز بھی تھے۔ انہوں نے چوہدری بشیر سے شانی کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کی تھیں۔ چوہدری بشیر نے ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا (صرف یہ بات چھپائی تھی کہ شانی اب بھی اس کے پاس ہے) اس نے شروع سے آخر تک سب کچھ ان لوگوں کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اس نے مؤقف اختیار کیا تھا کہ شانی چونکہ نارپور اور رنگ والی کے کسی فرد کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی لہٰذا وہ کوٹھی میں اپنی مرضی سے پناہ گزین ہوئی تھی۔

چوہدری بشیر سے مکمل وضاحتیں لینے کے بعد رنگ والی کے معززین واپس تو چلے گئے لیکن نارپور والوں کی طرح وہ بھی پختہ شک رکھتے تھے کہ شانی اب بھی چوہدری کے پاس ہے۔ کم از کم اسے یہ پتا ضرور ہے کہ شانی کہاں ہے۔ چوہدری نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ٹھنڈی وہسکی کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''میں دو طرف سے مصیبت میں ہوں...... ایک طرف میری برادری ہے جو ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف تمہارے میکے والے ہیں جو راشن لے کر مجھ پر چڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں پارٹیاں آپس میں دشمن ہونے کے باوجود میرے لئے ایک جیسی خطرناک ہوگئی ہیں۔ اب تیسرا وہ اُلو کا پٹھا قدرت اللہ ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ قادرے اور چاچا حشام کے حواریوں کو تمہارے بارے میں بُرے بُرے طریقے سے بھڑکا رہا ہے۔ مجھے اس بندے پر کبھی بھی بھروسا نہیں تھا۔ صرف تمہاری بھابو کی وجہ سے میں اسے برداشت کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ایک نمبر کا شعبدہ باز ہے مگر اس کی باتوں میں کوئی ایسا جادو ہے کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ خاص طور سے عورتیں تو بہت جلد اس کے جال میں آتی ہیں۔''

شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کیوں میرے لئے اتنے لوگوں سے دشمنی مول رہے ہیں؟''

''اس سوال کا جوب میں تمہیں پہلے بھی کئی بار دے چکا ہوں۔ یہ میرے دل کا معاملہ ہے اور دل کے معاملوں میں سمجھانا اور بتانا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

شانی نے دل میں سوچا، چوہدری......! پتا نہیں تمہارے دل کے ایسے کتنے معاملے

ہوں گے۔ یہ شیلا بھی تو ایسا ہی معاملہ ہے۔ تم اس کے خاوند کو گھر سے باہر بھیج کر اس کے ساتھ رات بسر کرتے ہو اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی کوٹھی میں بلا لیتے ہو۔ یقیناً ایسی اور بھی ''شیلائیں'' تمہاری زندگی میں ہوں گی۔ کچھ کویت اور دبئی میں ہوں گی جہاں سے تم آئے ہو۔ کچھ یہاں لاہور میں ہوں گی۔ تم وہی روایتی وڈیرے ہو چوہدری بشیر! جو صدیوں سے اپنے ظلم کی نوک سے اس دھرتی کا سینہ چھید رہا ہے تم نے اپنا لباس بدل لیا ہے۔ بول چال بدل لی ہے۔ ذرا ماڈرن بن گئے ہو لیکن تمہاری فطرت تو وہی ہے۔ اوپر کو اٹھی ہوئی تمہاری پگڑی، اوپر کو اٹھی ہوئی تمہاری مونچھیں، اوپر کو اٹھی ہوئی جوتی کی نوک...... یہ سب کچھ پوری تن فن کے ساتھ تمہارے اندر موجود ہے...... تمہاری خُو کا حصہ ہے۔

وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کہہ سکی۔ چوہدری سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں اور کس لئے بھابو کو قدرت اللہ جیسے بہروپئے کے سپرد کیا، کیوں وہ اسے خطرناک آپریشن کے نام پر ڈراتا رہا اور قدرت اللہ کے شعبدوں کی نذر کرتا رہا۔ آج وہ قدرت اللہ کو بہروپیا تسلیم کر رہا ہے، کیا قدرت اللہ اس وقت بہروپیا نہیں تھا۔ جب چوہدری اسے فون کالز کر کے بھابو کے لئے کوٹھی میں بلاتا تھا۔ یہ چوہدری کا ایک ایسا دوغلا پن تھا جو شانی کے سینے میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا تھا اور جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی، ہاں فراموش کرنے اور نظرانداز کرنے میں فرق ہوتا ہے اپنی مجبوریوں کے سبب وہ چوہدری کے دوغلے پن کو نظرانداز کر رہی تھی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے اسے یہ کرنا پڑ رہا تھا۔

کھڑکیوں سے باہر نیم تاریک ٹھنڈی رات سنسنا رہی تھی۔ لاہور کا یہ مضافاتی شہر نما قصبہ شاید کہیں جاگ بھی رہا ہو لیکن زیادہ تر جگہوں پر یہ سو رہا تھا۔ ہیٹر میں آگ کی مدھم روشنی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں مُنا شانی کی اوڑھنی پکڑے پکی نیند سو رہا تھا۔ شانی کا دایاں ہاتھ چوہدری کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس کا بایاں بازو شانی کے کندھے پر سے گزر کر بائیں کندھے پر آ گیا تھا۔

وہ باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ شانی سے قریب ہو رہا تھا، اس کی بائیں ہاتھ کی انگلیاں شانی کے ریشمی بالوں سے الجھنے لگیں۔ آج چوہدری کے انداز میں ''پیش قدمی'' کی کیفیت تھی۔ شانی کا دل بُری طرح دھڑ دھڑانے لگا۔ چوہدری نے شانی کو اپنی طرف کھینچا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ شانی کا سر اس کے کندھے سے لگ جائے لیکن...... شانی کا سر اس کے کندھے سے دور ہی رہا...... شانی اس سے آگے بڑھنے سے مجبور تھی۔

چوہدری تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا، خاموش، لیکن سوال پوچھتی ہوئی

نظریں۔ یہ نظریں جیسے شانی سے کہہ رہی ہوں۔ ’’دیکھو…… میں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا۔ تمہیں قادرے اور چاچا حشام کی وحشتوں سے بچایا ہے۔ تمہارے لئے اپنوں پرایوں سے دشمنی مول لی ہے۔ تمہاری خوشی کے لئے خطرہ مول لیتے ہوئے تمہاری ملازمہ اور اس کے بال بچے کو پاکستان سے باہر بھجوا دیا ہے۔ اب تمہاری دلجوئی کے لئے ……کوسوں دور سے مُنّے کو تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ جو کچھ تمہارے لئے کیا ہے اور جو کچھ کر رہا ہوں کیا اس کے صلے میں تم مجھے تھوڑی دیر کی راحت نہیں دے سکتی ہو۔ تھوڑی سی راحت۔ تھوڑی سی رعایت……؟‘‘

شانی ایک بے رحم شکنجے میں تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس گرم کمرے کی کھڑکیوں سے باہر سامنے والی تاریک گلی میں رستم کھڑا ہے۔ زخموں سے چُور، چہرے پر دنیا جہاں کا کرب سمٹا ہوا۔ آنکھوں میں ایک اشک بار شکوہ…… وہ اس سے کہہ رہا ہے…… ’’بی بی، میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں تھا لیکن اتنا اطمینان ضرور تھا کہ آپ میری نہیں تو پرائی بھی نہیں۔ ایک کچا سا دھاگا ہی سہی لیکن کوئی ناتا تو ہے ہمارے درمیان، کیا آج اس دشمن کے ہاتھوں وہ ناتا بھی ٹوٹ جائے گا۔‘‘ شانی نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا۔ وہ کیوں خام سوچوں میں الجھ رہی تھی رستم؟ کہاں تھا رستم؟ وہ تو وقت کی بساط پر زندگی کی بازی ہار کر نہ جانے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کی زندگی سے خالی ہو جانے والا وجود بھی کہیں موجود تھا یا نہیں لیکن…… لیکن رستم کے نہ ہونے سے گناہ اور نیکی کا تصور تو ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ جو کچھ چوہدری چاہ رہا تھا وہ کیسے قابلِ قبول ہو سکتا تھا۔

اچانک شانی چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ چوہدری بشیر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ وہی طیش آمیز انداز جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار بھگت چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی چوہدری تیزی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد شانی نے دیکھا کہ وہ جانے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ اس نے کپڑے بدل لئے تھے۔ واسکٹ پہن لی تھی، گرم چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ اس نے سپاٹ خشک لہجے میں شانی کو آواز دی۔ ’’مُنے کو جگاؤ۔ ہمیں جانا ہے۔‘‘

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ ایک دو منٹ تک شدید تذبذب میں رہی پھر چوہدری کے سامنے چلی گئی۔ ’’کیا بات ہے، کہاں جا رہے ہیں؟‘‘

’’واپس لاہور۔‘‘

’’مم…… مگر اس وقت؟ رات کا ایک بجا ہے۔‘‘

’’یہی وقت ٹھیک ہے۔ دن کے وقت پریشانی ہوگی۔ میں نظروں میں آنا نہیں چاہتا

وہاں۔‘‘

بریف کیس چوہدری کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ وہ مکمل بے رخی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک دم شانی بے تاب ہو کر آگے بڑھی اس نے بریف کیس چوہدری کے ہاتھ سے لینے کے لئے اس کا ہینڈل تھام لیا…… ’’آ…… آپ ایسا مت کریں۔ میں اس وقت آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ مُنا بہت روئے گا۔ آپ دیکھ ہی رہے تھے۔ وہ کس طرح صبح کے پروگرام بنا رہا تھا۔‘‘

’’میں تمہارے پروگراموں کے لئے نہیں رک سکتا۔ مجھے جانا ہے۔‘‘ چوہدری کا لہجہ خشک تھا۔

شانی کی گرفت چرمی ہینڈل پر مضبوط ہو گئی۔ ’’نہیں…… یہ ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ وہ نگاہ جھکائے جھکائے بولی۔

’’کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں…… یہ مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے بریف کیس چھڑانے کی کوشش کی، مگر شانی نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

وہ غصے میں شانی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ خاموش لیکن مصمم ارادے کے ساتھ۔ پانچ دس سیکنڈ تک یہی کیفیت برقرار رہی۔ دونوں کھڑے رہے۔ بریف کیس کے ہینڈل پر شانی کی گرفت مضبوط رہی، چوہدری کی پُر تپش نگاہیں شانی کے چہرے پر گڑی رہیں، وہ فرش کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر شانی نے محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے چوہدری کی گرفت ہینڈل پر سے ڈھیلی پڑ گئی ہے…… دبیز پردوں والی کھڑکیوں سے باہر تاریکی تھی، گھر کے بند اور نیم وا دروازوں کے پیچھے بھی خاموشی کا راج تھا…… اچانک چوہدری نے شانی کو دبوچ لیا۔ بڑی سختی اور شدت کے ساتھ۔ اس کے دہکے ہوئے ہونٹ شانی کے چہرے پر پھسلنے لگے۔ اس کی بانہوں کی جارحانہ گرفت اس کے گرد سخت ہوتی چلی گئی۔ اس کی تند پیش قدمی کو سہارتی ہوئی شانی دیوار سے جا لگی۔ وہ ہیجانی انداز میں اسے چومنے اور لپٹانے لگا۔ شانی ایک تصویر کی طرح ساکت تھی…… اس کی آنکھیں بند تھیں۔ تصویریں خوبصورت تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں زندگی نہیں ہوتی، حرارت نہیں ہوتی، دوپٹا شانی کے قدموں میں پڑا تھا۔ اوڑھنی بیٹے نے مٹھی میں دبا لی تھی۔ دوپٹا باپ نے کھینچ کر اتار دیا تھا۔ ابا جی نے اسے کبھی پنجابی کا ایک شعر سنایا تھا اس مختصر شعر کا مفہوم تھا۔ میرا کام غم لینا اور خوشی دینا ہے۔ میں دھرتی کی طرح ہر ظلم سہتی رہی ہوں۔

ان لمحوں میں وہ بھی خود کو جلتے آسمان کے نیچے بے بس دھرتی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد چوہدری پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہی، کچھ دیر تک خاموشی

سے شانی کو دیکھتے ہوئے چوہدری نے ہولے سے ہاتھ بڑھایا اور اس کے بکھرے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ تاہم طوفان میں ذرا سے اتار کے آثار بھی تھے۔ شانی نے فرش سے بریف کیس اٹھایا اور اسے الماری میں رکھ دیا۔ چوہدری نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی روانگی صبح تک ملتوی کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

چوہدری نے اپنی روانگی صبح تک ملتوی کر دی تھی بلکہ اگلے روز تک ملتوی کرنے پر تیار نظر آتا تھا۔ مُنے کی بھی شدید ضد تھی کہ وہ ابھی کوٹھی واپس نہیں جائے گا۔

صبح ان تینوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ پھر رات کو بنائے گئے پروگرام کے مطابق شانی، منا، شائلہ اور کوتاہ قد ڈولا اوپر گھر کی چھت پر چلے گئے، ہلکی ہلکی دھوپ میں وہ مُنے کے ساتھ کرکٹ کھیلتی رہی۔ اس مصروفیت کے دوران شائلہ کی تیز چبھتی ہوئی نگاہیں گاہے بگاہے شانی کی نگاہوں سے ٹکراتی رہیں۔ کسی وقت شانی کو دیکھ کر شائلہ کے ہونٹوں پر مدھم سی معنی خیز مسکراہٹ بھی ابھر آتی تھی۔ شائلہ نے ابھی تک کھلے الفاظ میں شانی کے ساتھ چوہدری کے تعلق کی بات نہیں تھی۔ تاہم شانی کو معلوم تھا کہ وہ اس تعلق کے بارے میں جانتی ہے۔ بھابو کی آخری رات شانی نے چوہدری اور شائلہ کی جو ٹیلی فونک گفتگو سنی تھی۔ اس میں بالواسطہ شانی کا اپنا ذکر بھی آیا تھا۔ شائلہ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ چوہدری سے پوچھا تھا کہ وہ کون خوش نصیب لڑکی ہے جو آج کل آپ کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ چوہدری نے کہا تھا کہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔ بعد میں شائلہ نے ''لڑکی'' کی تصویر دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔

شائلہ اتنی معصوم نہیں تھی کہ وہ شانی سے ملنے کے بعد بھی بات کی تہہ تک نہ پہنچتی۔ اس کی معنی خیز مسکراہٹیں گواہ تھیں کہ وہ سب جانتی ہے۔ مُنا کھیل رہا تھا۔ ڈولا اور شائلہ فیلڈنگ کر رہے تھے۔ شانی کو مُنے نے بالنگ پر لگایا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''تانی! ذرا تیز بال کراؤ.....''

''بھئی، مجھے تیز بال کرانی نہیں آتی۔''

شائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تیز بالنگ کھیلنا تو آتی ہے۔''

''کیا مطلب.... ؟''

''ابھی ڈولے کی اتنی تیز گیندیں سہی نہیں ہیں آپ نے.....'' شائلہ نے بات بدلی۔

شانی اپنے اندر ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گئی

اتنے میں مُنا دوڑتا ہوا شانی کے پاس آیا۔ اس نے دوپٹا شانی کی کمر سے تھوڑا سا ہٹایا۔

''تانی! یہ آپ کی قمیص کو کیا ہوا؟'' اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔

اس کی انگلی کا لمس شانی نے براہِ راست اپنی جلد پر محسوس کیا۔ قمیص وہاں سے ادھڑی ہوئی تھی..... شاید یہ رات والے واقعے کا نتیجہ تھا۔ شانی ٹپٹا کر رہ گئی..... غالباً شائلہ کی معنی خیز مسکراہٹ کی وجہ بھی یہی تھی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ تپ گیا ہے اور کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئی ہیں۔ اس نے دوپٹا برابر کیا۔ پھر مُنا بولا۔ ''تانی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' شانی نے جھنجھلا کر کہا۔

''بھئی! کھیل کھیل میں ہو جاتا ہے ایسا۔'' شائلہ نے مُنے کو سمجھایا۔ لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

شانی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ جو کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی..... ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

مُنا سارا دن بہت خوش رہا۔ وہ شانی سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کپڑے بدلنے کے لئے واش روم میں گئی تو بھی وہ دروازے پر کھڑا رہا اور بار بار آوازیں دیتا رہا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ کہیں ہوا بن کر اڑ جائے گی۔ شانی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ مُنے سے دور نہیں رہ سکتی تھی اور جب وہ پاس ہوتا تھا تو اس کی وارفتگی دیکھ کر اس کے دل پر بوجھ بھی پڑنے لگتا تھا۔

رات کو مُنے کے سونے کے بعد وہ ایک بار پھر ناپسندیدہ صورتحال کا شکار ہوئی......

آج وہ دونوں ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ یہ ایک طرح سے کل والے واقعے کا ایکشن ری پلے ہی تھا، چوہدری کی ہیجانی کیفیت، اس کی گرم سانسیں اور شانی ایک تصویر کی طرح ساکت۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی ہوئی، کل ہی کی طرح تھوڑی دیر بعد چوہدری نے اس پر سے اپنی بانہوں کی گرفت ختم کر دی اور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

الفاظ بے پناہ شدت کے ساتھ شانی کے کانوں میں گونجے..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... وہ اس فقرے کی توقع پہلے سے کر رہی تھی۔

وہ اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولا۔ ''میں، مُنا اور ندیم بہت اکیلے رہ گئے ہیں شانی۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ خاص طور سے مجھے اور مُنے کو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے بغیر مُنے کا کیا حال ہوتا ہے اور جو میرا حال ہے، وہ بھی تم دیکھ رہی ہو۔''

شانی فرش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس سے جو سوال پوچھا جا رہا تھا وہ اس کی زندگی کا کٹھن ترین سوال تھا۔ وہ اس سوال کے کروڑوں ٹن وزنی بوجھ تلے پسنے لگی۔ اس کے لب

تھرتھرا رہے تھے مگر انہیں قوتِ گویائی نہیں تھی۔ وہ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر حلیمی نظروں سے بولا۔ ''تم سوچنے کے لئے پورا وقت لو۔ مگر ساری باتوں پر خوب اچھی طرح غور کر کے جواب دینا۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا جواب میرے اور مُنے کے حق میں ہوگا۔''

شانی نے اپنی آواز کی لرزش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''آپ..... مجھے جو مقام دینا چاہتے ہیں، میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ آپ شاید یہ بات بھول رہے ہیں کہ میں دشمن کی بیٹی ہوں۔ اس سے پہلے آپ کے مرحوم بھائی نے بھی مجھے عزت دینے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا...... دادا جی اور ساری برادری اس کی دشمن ہوگئی، اب بھی آپ کا خاندان اور برادری یہ کبھی برداشت نہیں کرے گی۔ بلکہ اب تو یہ اور مشکل ہے۔ مجھے دادا جی اور درجنوں لوگوں کی قاتلہ کہا جا رہا ہے۔ میں آپ کی ٹھوکروں میں ایک کنیز کی حیثیت سے مر تو سکتی ہوں۔ بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ کے لوگ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

چوہدری نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ ''دیکھو......! گڑے مُردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے خاندان سے ہمارے خاندان کی دشمنی تھی لیکن یہ 75 سال پہلے کی بات ہے۔ میں اور تم آج کی بات کر رہے ہیں، اس گھڑی کی بات کر رہے ہیں۔ تم دیکھ چکی ہو کہ تمہاری خاطر میں کہاں تک جا سکتا ہوں۔ میں اس سے بھی آگے جاؤں گا۔ مجھے نار پور کے جاہلوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ہم ایک نئی طرح کی زندگی شروع کریں گے، باقی رہی کنیز بن کر رہنے والی بات تو مجھے اس پر دکھ ہوا ہے، اگر میری سوچ ایسی ہی ہوتی تو کوٹھی میں آنے کے بعد تم کب میری پہنچ سے دور تھیں۔ میں جب چاہتا ایک دشمن بن کر تمہارے سامنے آ سکتا تھا، لیکن تم جانتی ہو ایسا نہیں ہوا۔ نہ اب ایسا ہو رہا ہے...... کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں تمہیں دل کی گہرائی سے عزت دینا چاہتا ہوں۔''

''میں اپنے لئے فساد نہیں چاہتی ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''تم سے کہا ہے ناں۔ ان باتوں پر مت سوچو...... یہ میرے معاملے ہیں۔ میں انہیں بڑی آسانی سے نمٹا سکتا ہوں، اتنا دم خم ہے مجھ میں۔ ہاں اگر کوئی اور بات تمہارے ذہن میں ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں کھلے دل سے سنوں گا۔''

شانی اندر سے کانپ گئی۔ اسے ڈر لگا تھا کہ گفتگو کا رخ کسی خاص سمت میں نہ مڑ جائے۔ اسے چوہدری سے اپنی پچھلی ملاقات یاد تھی اور اس ملاقات میں جس طرح سے رستم کا ذکر ہوا تھا وہ ابھی تک شانی کے دل میں خوف بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔

چوہدری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کش لے کر بولا۔ ''کہیں ایسا تو

نہیں کہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں تمہیں کسی طرح کی الجھن ہو......؟''

شانی خاموش رہی۔ چوہدری نے اپنے بھاری بھرکم چہرے سے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کئے۔ ''شانی! تمہاری بھابو سے میرا رویہ جس طرح کا تھا تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہر طرح سے عزت دی...... وہ کافی عرصے سے بیمار تھی۔ میں نے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کی بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ بہرحال ایک انسان کے طور پر مجھ میں بھی کچھ خامیاں ہیں۔ میں ڈرنک کرتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات بھی نہیں چھپانا چاہتا کہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد میری زندگی میں لڑکیاں آتی رہی ہیں، کبھی کبھار اب بھی ایسا ہو جاتا ہے۔'' یہاں تک کہہ کر چوہدری نے چند لمحے توقف کیا اور شانی کو سراپا غور سے دیکھ کر بولا۔ ''بہرحال میں تم سے وعدہ کرتا ہوں شانی! اگر تم میری زندگی میں آنے کا فیصلہ کرتی ہو تو پھر میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ ہاں سب کچھ...... ایک گھریلو لڑکی کی حیثیت سے شاید تمہیں اس بات کا پتا نہ ہو کہ فی زمانہ دولت مند مردوں پر خوبصورت لڑکیاں، مکھیوں کی طرح گرتی ہیں۔ شہروں میں یہ سلسلہ اور زیادہ ہے۔ مجھ پر بھی ایسی لڑکیاں گرتی ہیں اور آئندہ بھی گریں گی لیکن میرا یہ تم سے وعدہ ہے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

شانی کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ بار بار نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ جاتی تھی۔

چوہدری نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے فوری جواب نہیں چاہ رہا ہوں۔ تم دو تین دن تک پوری تسلی اور آزادی سے سوچ لو۔''

آزادی کا لفظ شانی کے دل پر گھونسے کی طرح لگا۔ وہ کس آزادی کی بات کر رہا تھا۔ شانی کی تو پور پور شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی...... مُنا...... ندیم...... بھابو کی روح اور پھر انوری، کاکا، گڈی...... اس کے علاوہ رنگ والی میں اپنے پیاروں کی سلامتی اور پتا نہیں کیا کیا تھا اس کے گلے کا طوق۔

چوہدری دھیان سے اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ شاید اس نے شانی کی دلی کیفیت بھانپ لی تھی۔ پوچھنے لگا۔ ''کیا تم کسی طرح کی گھٹن محسوس کرتی ہو؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ سر ہلایا تو آنکھوں سے دو موٹے آنسو، چمکیلے موتیوں کی طرح گر پڑے۔ سر نے نفی میں جواب دیا تھا لیکن آنسوؤں نے اثبات میں۔

چوہدری کے جبڑے بھینچ گئے اور ناک کی اوپری سلوٹ ذرا گہری ہوگئی۔ کمرے کو ایک

بوجھل خاموشی نے ڈھانپ لیا۔ آخر چوہدری کی پاٹ دار آواز کمرے میں گونجی۔ ''دیکھو شانی! اگر تم آزادی اسے سمجھتی ہو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں تو یہ آزادی ہرگز نہیں۔ یہ تو بربادی ہوگی۔ تمہارے دشمن چیل کوؤں کی طرح تم پر جھپٹ پڑیں گے۔ چند دنوں میں تمہیں نوچ کر کھا جائیں گے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا، ہرگز نہیں کرسکتا۔''

''نہیں .. میں بالکل ٹھیک ہوں یہاں ..... آپ کہیں بھی تو شاید نہ جاؤں۔'' شانی نے اس کے لہجے کی حرارت محسوس کرتے ہوئے وضاحت کی۔

چند لمحے کے توقف کے بعد چوہدری نے کہا۔ ''ٹھیک ہے صبح میں چلا جاؤں گا۔ واپسی دو تین دن بعد ہوگی۔ امید ہے اس وقت تک تم ہر پہلو پر غور کرلوگی۔''

چوہدری اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ شانی مُنے کے پاس آلیٹی۔ چوہدری اس کی آزادی کی بات کررہا تھا۔ شانی کی آزادی اس گھوڑے کی طرح تھی جس کا پاؤں باندھ کر چراگاہ میں چرانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چوہدری اس سے فیصلہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کرنا تھا۔ فیصلہ تو حالات کررہے تھے۔ وہ تو وقت کی عدالت میں مجرم کی طرح گردن ڈالے کھڑی تھی......اور جبر کا استغاثہ اس کی آس امید کی دھجیاں اُڑا رہا تھا۔ ہاں، اس نے فیصلہ کیا کرنا تھا... ؟ اس نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور مُنے کو گلے سے لگالیا۔ اس کے کانوں میں ایک شہنائی رونے لگی اور شہنائی کا تعلق ہمیشہ شادی سے ہوتا ہے۔

اس کی آنکھ رات آخری پہر ایک نامانوس شور کے سبب کھلی۔ کوئی زور زور سے بول رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، مُنا اس کے ساتھ جڑ کر سویا ہوا تھا، وہ کسمسا کر رہ گیا، آواز چوہدری بشیر کے کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ شانی نے پہچان لیا۔ یہ جالاں کی آواز تھی وہ پریشان لہجے میں کوتاہ قد ڈولے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ شانی نے لحاف مُنے پر درست کیا اپنے بال سمیٹے اور چپل پہنتی ہوئی چوہدری کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کی لائٹ آن تھی منظر چونکا دینے والا تھا۔ چوہدری بشیر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا بایاں بازو دائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چوہدری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پہلو بدل رہا تھا۔ جالاں تیزی سے کولہے مٹکاتی ہوئی آئی اور اس نے پلاسٹک کی ایک بڑی بالٹی چوہدری کے بستر کے پاس قالین پر رکھ دی۔ اتنے میں ڈولا ایک بڑے جگ میں ٹھنڈا پانی لئے اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا چوہدری صاحب؟'' شانی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

چوہدری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ زبان سے جواب دے سکتا۔ اس نے بس نفی میں سر

ہلا دیا۔ اگر چوہدری جیسا بندہ اتنی تکلیف محسوس کررہا تھا تو پھر یقیناً تکلیف زیادہ تھی......اچانک شانی کی نگاہ نے ایک چیز نوٹ کی اور اس کی حیرت بڑھ گئی۔ چوہدری کا پٹی والا بازو کہنی سے اوپر تک بالکل سُرخ نظر آرہا تھا۔ ہاتھ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ کہنی اور کلائی کے درمیان کا کچھ حصہ پٹی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگہ بھی ایسے ہی غیر معمولی طور پر سُرخ ہوگی۔ یہ عجیب سی سُرخی تھی اس میں سوزش کے ابھار بھی شامل تھے۔ چوہدری نے بے چین ہو کر اپنا ہاتھ بالٹی کے اوپر رکھ دیا۔ جالاں نے جگ لیا اور یخ بستہ پانی کی دھار باندھ کر چوہدری کے بازو اور بازو کی پٹی پر ڈالنے لگی۔ چوہدری کی کیفیت سے پتا چلتا تھا کہ وہ متاثرہ بازو میں شدید جلن محسوس کررہا ہے۔ جالاں نے مزید پانی کی ضرورت محسوس کی تو ڈولے کے بجائے شانی خود فریج کی طرف لپک گئی لیکن فریج میں پانی نہیں تھا۔ صرف فریزر میں برف تھی وہ بھی سرد موسم کی وجہ سے فریزر میں چپکی ہوئی تھی۔ شانی برف اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے کی طرف سے چوہدری کے کراہنے کی آواز بلند ہورہی تھی۔ شانی سناٹے کی کیفیت میں تھی۔ جب پرسوں شام اس نے چوہدری کے بازو پر پٹی دیکھی تو اس کا خیال تھا کہ یہ کوٹھی میں ہونے والے کسی لڑائی جھگڑے کی نشانی ہے، مگر یہ تو کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ چوہدری کے بازو پر چھپاکی جیسے اثرات تھے۔

شانی پانی میں برف ڈال رہی تھی جب جالاں خالی جگ کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شانی کو گھورا پھر سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''اب تو راجی (راضی) ہوناں چوہدرانی؟''

''م......میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے......صرف تمہاری وجہ سے چوہدری صاحب نے حجرت صاحب (حضرت صاحب) سے جھگڑا کیا۔ ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ان کو دھکا دیا۔ حجرت صاحب کے بڑے مرید جی نے اس وقت کہہ دیا تھا۔ اب چوہدری صاحب کا ہاتھ سڑ کر کوئلہ بھی ہو جائے تو یہ ہمارے لئے حیرانی کی بات نہیں ہوگی.. ...اب دیکھ لو . . وہی کچھ ہو رہا ہے تمہاری اکھیوں کے سامنے ہو رہا ہے۔''

شانی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ چوہدری کی کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔

☆=====☆======☆

شانی کو جالاں پر غصہ تو بہت آیا مگر یہ لڑائی جھگڑے کا موقع نہیں تھا۔ شانی نے جگ میں برف والا پانی ڈالا اور چوہدری کے پاس پہنچی۔ چوہدری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے اور بازو پورے کا پورا سُرخ نظر آ رہا تھا۔ شانی نے سب سے پہلے وہ پٹی اتاری جو چوہدری نے کلائی اور کہنی کے درمیان باندھ رکھی تھی۔ پٹی کے نیچے کی کھال زیادہ سُرخ تھی اور سوجی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ متاثرہ حصے سے حرارت خارج ہو رہی ہو۔

شانی اور جالاں تھوڑا تھوڑا پانی چوہدری کے بازو پر ڈالتی رہیں۔ جتنی دیر پانی بازو پر گرتا رہتا تھا چوہدری کو قدرے سکون محسوس ہوتا تھا لیکن جونہی پانی ختم ہوتا تھا چوہدری پھر کراہنے لگتا تھا۔ شانی کے کہنے پر چوہدری کا ملازم ریاست ڈاکٹر کو لینے چلا گیا تھا.... چوہدری کی حالت دیکھ کر جالاں کے موٹے بھدے چہرے پر عجیب سا ہراس نظر آنے لگا تھا۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ جالاں چوہدری کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر رہی ہے۔

''یہ کب ہوا ہے؟'' شانی نے چوہدری کے بازو پر تھوڑا تھوڑا پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

''جمعرات کو سو کر اٹھا تو تھوڑی سی جلن ہو رہی تھی۔ دوپہر تک زیادہ ہو گئی۔ مرہم وغیرہ لگایا تھا۔ وقتی طور پر آرام آ گیا تھا۔'' چوہدری نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

چوہدری نے نفی میں سر ہلایا۔

''بازو پر ہی ہے یا کہیں اور بھی ہے؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''صرف بازو پر ہے۔'' چوہدری نے کراہ کر کہا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عورتوں کے سامنے اور خاص طور سے شانی کے سامنے کراہنا چوہدری کو بہت بُرا لگ رہا ہے۔ مگر تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ تھا اور مٹھیاں مضبوطی سے بند

تھیں۔

ڈاکٹر کے آنے تک شانی، شمائلہ اور جالاں سے جو کچھ ہو سکا وہ کرتی رہیں۔ گاڑی پورچ میں رکتے ہی ریاست اور ڈاکٹر تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی چوہدری نے اشارے سے شانی اور شمائلہ وغیرہ کو باہر جانے کا کہہ دیا تھا۔

چوہدری کے کمرے کا دروازہ تقریباً پون گھنٹے تک بند رہا۔ اس دوران میں ریاست ایک بار گاڑی لے کر کہیں بازار بھی گیا۔ پھر سادہ پانی اور قینچی وغیرہ کمرے میں منگوائے گئے۔ ڈاکٹر کے رخصت ہونے کے بعد شانی کمرے میں پہنچی تو چوہدری تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب قدرے سکون تھا۔ اس کی قمیص کا بازو کندھے تک قینچی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ پورے بازو پر کسی مرہم کا لیپ کیا گیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' شانی نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کافی بہتر ہے۔''

''کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے؟''

''کہتا ہے کہ سکن الرجی کی کوئی شکل ہے۔ پریشانی کی بات نہیں۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ اگر مزید کوئی مسئلہ ہوا تو ایک ٹیسٹ کرائیں گے۔''

''مم...... میرا خیال ہے کہ آپ لاہور میں کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی دکھائیں۔'' شانی نے فکرمندی سے کہا۔

چوہدری گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ یوں لگا کہ شانی کا ''فکرمند انداز'' اسے پسند آیا ہے۔ چوہدری کے دیکھنے کے انداز نے شانی کو اندر ہی اندر شرمسار کر دیا۔

دوسرے روز چوہدری اور مُنا لاہور واپس چلے گئے۔ مُنا کسی صورت جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کو آمادہ کرنے کے لئے شانی اور چوہدری کو بہت سے جتن کرنا پڑے.... یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شانی چھت پر تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج دور مغربی افق پر جھکتا جا رہا تھا۔ دھوپ ابھی باقی تھی لیکن خنکی میں اضافہ ہونے لگا۔ نیچے صحن میں کوتاہ قد ڈولا ایک ملازم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ وہ خاصا خوش مزاج واقع ہوا تھا۔ شانی چارپائی پر چت لیٹی تھی۔ اس کی نگاہیں دور نیلے آسمان کے پیش منظر میں اُڑتی اکا دکا پتنگوں پر تھیں۔ ایک خوش رنگ پتنگ بہت دیر سے فضا میں غوطے لگا لگا کر ابھر رہی تھی۔ پتا نہیں اس کی ڈور کس کے ہاتھ میں تھی۔ کون اسے کھینچ رہا تھا اور ڈھیل دے رہا تھا؟ پتنگ کی ہر حرکت نادیدہ ہاتھ کی حرکت کے تابع تھی۔ وہ جب چاہے اسے پستی میں گرا سکتا تھا۔ جب چاہے

بلندیوں سے ہمکنار کرسکتا تھا .. شاید زندگی بھی ایک پتنگ تھی اور تقدیر کے ہاتھ حالات کی ڈور سے اسے حرکت میں لاتے تھے۔ اچانک ایک چنچل آواز نے اسے چونکایا۔ ''کن سوچوں میں کھوئی ہوئی ہیں بیگم جی . '' یہ شمائلہ تھی۔ وہ اتنا باریک لباس پہنے ہوئے تھی کہ اسے لباس کہنا بھی مشکل تھا۔ اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اپنے زیر جامے کی نمائش کرتی وہ پورے گھر میں اسی طرح دندناتی پھرتی تھی۔ جیسے مرد ملازموں کی پارسائی کا امتحان لے رہی ہو۔ اپنے ہاتھوں پر انہماک سے مہندی لگاتے ہوئے وہ دھپ سے چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

شانی نے بُرا سا منہ بنایا لیکن کچھ کہا نہیں......وہ بولی۔ ''چوہدری جی جب آتے ہیں تو پورے کے پورے آجاتے ہیں۔ پر جب جاتے ہیں تو سارے کے سارے چلے جاتے ہیں۔ بھول ہی جاتے ہیں کہ کوئی کتنا انتظار کر رہا ہوگا۔''

شانی نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں کافی تجربہ ہے چوہدری صاحب کے آنے اور جانے کا۔''

''ناصر سے ان کی بہت بنتی ہے۔ ایک طرح سے دوستی ہے دونوں میں۔'' شمائلہ بولی۔

''عجیب بات ہے جب چوہدری صاحب آتے ہیں تو ''دوست صاحب'' کسی نہ کسی بہانے لاہور چلے جاتے ہیں.....'' شانی نے بھی شمائلہ کی طرح چبھتا ہوا لہجہ اختیار کیا۔

شمائلہ بے باک نظروں سے شانی کو دیکھتی رہی۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں رقابت کی چمک تھی۔ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ شانی کی بات کا جواب کسی نہایت تیکھی بات سے دینے جا رہی ہے، لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ بظاہر اس کی ساری توجہ اپنے ہاتھ پر مہندی لگانے پر مرکوز ہوگئی تھی تاہم اس کا ذہن مکمل طور پر شانی کی طرف تھا۔ کہنے لگی۔ ''میں اس وقت بھی آپ کو جانتی تھی جب آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ میں اپنے خیالوں میں آپ کی شکل بناتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آپ خوبصورت ہوں گی۔ کہتے ہیں کہ ایک عورت دوسری عورت کی تعریف کم ہی کرتی ہے۔ پر دیکھیں میں آپ کی تعریف کر رہی ہوں۔ چوہدری صاحب اگر آپ کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے۔''

شانی نے بیزاری سے کہا۔ ''میں اس معاملے میں بات کرنا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

وہ ڈھٹائی سے مسکراتی رہی۔ ''آپ غصے میں بھی اچھی لگتی ہیں......اور اچھی صورتوں پر

یہ چوہدری ایک دم لاٹو (لٹو) ہو جاتے ہیں اور یہ صرف چوہدریوں کی بات ہی نہیں ہے......مرد ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ کم ہی مرد ایسے ہوں گے جن کے پاس کھلا ڈُلا پیسہ بھی ہو۔ صحت بھی اچھی ہو اور زنانیوں پر ان کی نظر نہ ہو۔'' شانی اب بھی خاموش رہی۔ شمائلہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید اسے توقع تھی کہ شانی تبصرہ کرے گی۔ مایوس ہونے کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''یہ بات تو اب سب لوگوں کو پتہ چل چکی ہے جی کہ آپ چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی اللہ بخشے چوہدری فاخر کی بیوی رہ چکی ہیں... شاید اب چوہدری صاحب کا خیال ہے کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے۔ ویسے بھی اب چوہدری صاحب اپنی بیگم کے بعد اکیلے رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف آپ بھی اکیلی ہیں۔ اچھا ہے کہ آپ دونوں کا میل ہو جائے۔ پر ایک بات دماغ میں ضرور رکھنا بیگم جی......'' شمائلہ نے رازداری سے کہا۔ ''یہ چوہدری، وڈیرے اور زمیندار کسی کے ہوتے نہیں ہیں۔ اب دیکھیں نا، چوہدری جی کی ''پہلی'' میں کیا کمی تھی۔ پر وہ کوئی سکھی تو نہیں گئی نا۔ کتنے دکھ سہنے پڑے اسے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

شمائلہ عرف شیلا نے دائیں بائیں دیکھا۔ جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ جالاں یا ڈولا تو قریب نہیں ہیں۔ پھر اس نے شانی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''بیگم جی......دیکھیں، میں آپ سے جو کچھ کہہ رہی ہوں، آپ کے اچھے کے لئے کہہ رہی ہو۔ اگر کسی بارے میں آپ کے منہ سے چوہدری صاحب کے سامنے ایک لفظ بھی نکل گیا تو میری چمڑی اُتر جائے گی۔''

''اگر اتنا ڈر ہے تو پھر کیوں کر رہی ہو ایسی بات؟''

''صرف اس لئے کہ آپ اپنا اچھا بُرا دیکھ لیں۔ چوہدری صاحب بُرے نہیں ہیں۔ بہت سے دوسرے چوہدریوں سے اچھے ہیں پر پھر بھی چوہدری ہیں۔''

''اچھا بتاؤ۔ میں نہیں کہوں گی کسی سے۔''

''یقین کریں اس میں میرا کوئی لالچ نہیں۔ میں صرف آپ کا بھلا چاہتی ہوں۔''

''بہت مہربانی تمہاری۔''

وہ شانی کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا اپنا خاندان بھی تو زمیندار ہے۔ آپ کو پتا ہی ہوگا، ان زمینداروں کے بکھیڑے کیا ہوتے ہیں۔ چوہدری بشیر صاحب کی برادری میں تو یہ لڑائیاں جھگڑے اور بھی زیادہ ہیں۔''

"میں جانتی ہوں۔"

"آپ کو پتا ہے کہ چوہدری جی کی بیوی مقبول اپنے ماں پیو سے نہیں ملتی تھی۔"

"کیا مطلب؟" شانی نے چونک کر کہا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔ دل کی بیماری ایسے ہی لگ جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی دیمک تو ہوتی ہے ناں جو بندے کو اندر ہی اندر پولا (کھوکھلا) کر دیتی ہے۔"

شانی حیرانی سے شائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔

شانی کے استفسار پر شائلہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "شاید آپ کو پتا نہیں کہ بھابو مقبول کی ایک چھوٹی بہن بتول بھی جہیز میں چار مربعے زمین لے کر گئی ہے۔" شائلہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چوہدری بشیر اور مہر جی نے بڑی کوشش کی تھی کہ بھابو مقبول کی چھوٹی بہن بتول کا رشتہ چوہدری فاخر سے ہو جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ چار پانچ مربعے زمین بھی بتول کے ساتھ آئے جس کی قیمت لکھوں (لاکھوں) کروڑوں میں تھی۔ بے چاری بھابو مقبول نے بڑی کوشش کی کہ اس کی چھوٹی بہن اس کے دیور کی طرف آ جائے پر اللہ کو منظور نہیں تھا۔ بھابو مقبول کے ابا جی نے اپنے ایک بھائی کو زبان دے دی تھی۔ وہ ہر صورت میں اپنا قول نبھانا چاہتے تھے۔ بھابو مقبول بے چاری چکی کے دو پاٹوں میں تھی۔ خاوند ایک طرف دھکاتا تھا...... ماں پیو دوسری طرف دھکا دیتے تھے۔ آخر بھابو مقبول ہار گئی۔ وہ چھوٹی بہن کو دیور کے لئے نہ لا سکی۔ اس کے بعد چوہدری بشیر نے بھابو مقبول پر پابندی لگا دی کہ وہ اپنے پیو کو نہیں ملے گی۔ اگر ملے گی تو پھر طلاق کا کاغذ اس کے ہاتھ میں ہوگا...... میں نے ٹھیک کہا ہے بیگم جی، دل کی بیماریاں ایسے ہی تو نہیں لگتیں اور پھر بھابو مقبول کی عمر ہی کیا تھی۔"

شانی نے کہا۔ "لیکن شائلہ! بھابو اپنے میکے تو جاتی تھی۔ وہ میرے سامنے دو دفعہ اپنے گاؤں گئی ہے بلکہ جب حویلی میں آگ لگی، اس وقت بھی وہ اپنے گاؤں 'پار کے' میں تھی۔"

"وہ گاؤں تو جاتی تھی، پر اپنے پیو سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی شکل دیکھنا یا اس سے بات کرنا اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ایک بھائی کے گھر جاتی تھی۔ وہیں پر شاید چوری چھپے اس کی ماں آ کر اس سے مل جاتی تھی مگر اپنے باپ کو نہ ملنے کی اس نے قسم کھائی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی جس دن اس نے یہ قسم توڑی اس کا شادی کا بندھن بھی ٹوٹ جائے گا۔ اس قسم سے بس اسے چوہدری صاحب آزاد کرا سکتے تھے پر انہوں نے آخر تک ایسا نہیں کیا۔"

شانی سناٹے کی کیفیت میں تھی۔ وہ حیران تھی وہ اتنا عرصہ بھابو کے ساتھ رہی لیکن اتنی بڑی بات کا اسے پتا نہ چل سکا، اگر شائلہ کی باتیں درست تھیں تو پھر کتنا بڑا دکھ تھا جسے بھابو

نے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ شانی کو یاد آ رہا تھا کہ اپنے میکے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کچھ اداس سی ہو جایا کرتی تھی۔ شاید ایک دو بار اس کے آنسو بھی نکلے تھے تب شانی نے یہی سمجھا تھا کہ عام عورتوں کی طرح وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے آبدیدہ ہوتی ہے۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ کوئی بہت پیارا سا رشتہ زندہ ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ پھر شانی کو ایک اور بات یاد آئی اور اسے یقین ہونے لگا کہ شائلہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ حویلی میں آگ لگنے سے کچھ عرصہ پہلے مُنّے نے بے حد ضد کی تھی کہ وہ شانی کو اپنے ساتھ ننھیال لے کر جائے گا۔ ندیم بھی اس ضد میں شامل ہو گیا تھا۔ اس وقت شانی نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ بھابو اس سلسلے میں اپنے بچوں کی طرح پُرجوش نہیں ہے کسی نامعلوم وجہ سے وہ شانی کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی تھی۔ بعد میں فاخر کی وجہ سے جانے کا پروگرام ویسے ہی ٹل پٹ ہو گیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں بیگم جی......" شائلہ کی آواز نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔

شانی بولی۔ "لگتا ہے کہ تم کافی کچھ جانتی ہو چوہدری صاحب اور بھابو کے بارے میں۔"

"کافی کچھ تو نہیں جی...... ہاں، تھوڑا بہت کہہ سکتی ہیں۔ ہم تو عام بندے ہیں جی۔ آپ چوہدری زمیندار لوگ ہیں۔ آپ کی ساری باتوں کا پتا ہم کو کیسے لگ سکتا ہے۔"

شانی نے پوچھا۔ "بھابو اپنے جہیز میں کتنی زمین لائی تھی؟"

"پورے چار مربعے جی۔ اب یہ ساری کی ساری چوہدری کی ہے۔ ناصر کے اندازے کے مطابق وہ زمین بیچ کر اب لاہور میں ایک بڑا پلازہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دراصل چوہدری صاحب کی طبیعت بالکل شہری ہے۔ پنڈ میں ان کا دل نہیں لگتا۔ نہ ہی اپنے رشتے داروں سے ان کی بنتی ہے۔ ویسے بھی ان کے شوق ذرا دوسری طرح کے ہیں۔"

"کیسے شوق؟"

"چھوڑیں جی...... اب خود بھی تو کچھ سمجھیں ناں، ساری بات میرے منہ سے ہی نہ کہلوائیں۔" اس کے ساتھ ہی شائلہ نے ایک بار پھر شانی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چوہدرانی جی......! میں ایک بار پھر منت کر رہی ہوں، کہیں میرے بارے میں کوئی بات چوہدری صاحب سے نہ کہہ دینا۔ وہ بڑا بُرا حشر کر دیں گے میرا......"

شائلہ ہاتھ بھی جوڑتی رہی اور ساتھ ساتھ چوہدری کی باتیں بھی بتاتی رہی۔ شانی واضح طور پر محسوس کر رہی تھی کہ وہ جذبہ رقابت سے مجبور ہے۔ اسے یہ بات کسی طرح بھی ہضم نہیں

ہو رہی کہ چوہدری اس کی چار دیواری میں اس کی چھت کے نیچے کسی اور کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھے۔ اور شاید اس کے خاوند ناصر کو بھی یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی تو میاں بیوی کو چوہدری سے بہت کچھ اینٹھنا تھا۔ شمائلہ کو نئے ماڈل کی ٹویاٹا کار درکار تھی، یہ مکان بھی ابھی ادھورا پڑا تھا۔ اسے شایانِ شان طریقے سے مکمل کرنے کے لئے پچیس تیس لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ شمائلہ عرف شیلا کے زیورات میں ہیرے کا ایک بھی سیٹ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی میاں بیوی کی اَن گنت خواہشات تھیں۔ ان خواہشات کے حصول کے لئے ناصر اپنی نو بیاہتا بیوی کو اس گھر میں چھوڑ کر وقتاً فوقتاً ''ضروری کام سے'' لاہور جانا چاہتا تھا۔ شمائلہ بھی اپنے بستر پر ناصر کی جگہ کسی دوسرے کو دینے کے لئے پوری طرح آمادہ تھی۔ سارا سیٹ اَپ مکمل تھا مگر اب درمیان میں شانی آ گئی تھی۔

شمائلہ عرف شیلا کے بارے میں شانی کو اب تک جو کچھ معلوم ہو سکا تھا، اس کے مطابق وہ لاہور کی رہنے والی تھی، تاہم اس کی شادی یہاں مرید کے میں ہوئی تھی۔ اس نے دسویں جماعت میں سکول چھوڑ دیا تھا۔ سکول کے زمانے سے ہی وہ بڑی تیز طرار اور آنکھ مٹکا کرنے والی تھی۔ خوب بن ٹھن کر رہتی تھی۔ اس کا تعلق ایک متوسط شریف گھرانے سے تھا لیکن خود اس میں شرفا والی عادتیں کم ہی تھیں۔ دوسری طرف ناصر بھی رنگ رنگیلا شخص تھا۔ ان دونوں پر یہ ناقابلِ تردید حقیقت ثابت ہوتی تھی کہ نیک مردوں کے لئے نیک عورتیں اور بد مردوں کے لئے بد۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اگر شمائلہ ازدواجی رشتے کے تقدس کو پامال کر رہی تھی تو ناصر بھی اس کام میں یقیناً پیچھے نہیں تھا۔ ماڈرن اور دولت مند بننے کا بھوت بھی دونوں پر ایک ہی جیسا سوار تھا۔ مگر جاہلیت واضح طور پر ان کے آڑے آ رہی تھی۔

شمائلہ کے چھت سے اُترنے کے بعد بھی شانی دیر تک چھت پر رہی۔ وہ چوہدری کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو کچھ شمائلہ نے چوہدری کے بارے میں بتایا تھا، وہ نیا ضرور تھا مگر غیر متوقع نہیں تھا۔ شانی پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ بھابو کی ازدواجی زندگی دیکھنے میں جتنی پُرسکون لگتی تھی، حقیقت میں نہیں تھی۔ نادیدہ جبر بھابو کو پیستے رہتے تھے، اگر چوہدری بھابو کی تھوڑی بہت عزت کرتا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی جائیداد لے کر آئی تھی، لیکن اس جائیداد کو پوری طرح استعمال کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے چوہدری کو آزادی درکار تھی۔ ایسی آزادی حاصل کرنے کے لئے جاگیردار اور وڈیرے اپنی خاندانی بیویوں کو قتل تک کر دیتے ہیں، چوہدری نے ایسا تو نہیں کیا تھا تاہم اس نے کچھ اچھا بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی بیمار شریکِ حیات کے علاج میں اس نے مجرمانہ غفلت برتی تھی بلکہ یہ

کہنا چاہئے کہ دانستہ طور پر اس نے بیمار بیوی کو مناسب علاج سے محروم رکھا تھا۔ بھابو کے ذہن میں آپریشن کے حوالے سے بے جا ڈر موجود تھا۔ اس ڈر کو ختم کرنے کے بجائے چوہدری نے اسے مزید بڑھاوا دیا تھا۔ وہ قدرت اللہ کے حوالے سے بھابو کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا تھا اور ٹونے ٹوٹکوں کے تعاون سے بھابو کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔ یوں تو شانی کی آمد سے پہلے ہی چوہدری نے بھابو کی زندگی کی طرف سے بے پرواہی اختیار کر رکھی تھی۔ تاہم شانی سے ملاقات کے بعد عین ممکن تھا کہ اس بے پرواہی میں اضافہ ہو گیا ہو۔ چوہدری کے ارادے اب شانی کے حوالے سے بالکل واضح ہو گئے تھے اور یہ ارادے اور اس طرح کے ''دوسرے ارادے'' ایسے ہرگز نہیں تھے کہ بھابو کی زندگی میں پورے ہو سکتے۔

شانی جانتی تھی، سب کچھ جانتی تھی۔ چوہدری دہری شخصیت کا مالک تھا۔ بے شک وہ نارپور کے دوسرے چوہدریوں سے مختلف تھا لیکن اپنے انداز میں اس کی سنگ دلی اور مطلب پرستی ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا شانی اس کے بچھائے ہوئے جال سے نکل سکتی ہے......؟ اس کا جواب فوری طور پر نفی میں تھا۔ وہ اس بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سوچ چکی تھی۔ لہٰذا جب وہ اس جال سے نکل نہیں سکتی تھی تو پھر اس کے سامنے کون سا رستہ رہ جاتا تھا۔ وقت اس سے ایک اور قربانی مانگ رہا تھا۔ یوں تو کئی ایک وجوہات تھیں جن کے لئے یہ قربانی ضروری ہو گئی تھی۔ تاہم سب سے بڑی وجہ مُنا تھا۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ اگر وہ اس قربانی سے گریز کرے گی تو ایک معصوم زندگی تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گی۔ اس انداز میں سوچتے ہوئے اس کے کانوں میں بھابو کے الفاظ گونجتے تھے۔ ان الفاظ کی تہہ میں ایک ایسی التجا چھپی تھی جس کے تاثر کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں تھا...... بھابو نے اسے التجائی لہجے میں کہا تھا۔ ''شانی! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم ان کو سنبھال لو گی ناں......؟''

''ان'' سے بھابو کی مراد مُنا تھا اور مُنے کے علاوہ ندیم اور چوہدری بشیر تھے۔ اس فقرے کے اندر بہت کچھ چھپا ہوا تھا اور شانی نے اس کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ یہ ایک خاموش تمنا تھی جو آج تک شانی کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔ وہ جب اس خاموش تمنا کو مُنے کے رویے کے پس منظر میں دیکھتی تو یہ اور بھی اہم ہو جاتی تھی۔ شانی کے ساتھ مُنے کی ایسوسی ایشن اتنی زیادہ تھی کہ وہ اس سے دور ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پھر بستر سے لگ جائے گا۔

وہ ایک خنک رات تھی۔ شانی مُنے کے بارے میں سوچتی سوچتی سو گئی تھی۔ رات کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ لحاف اس کے اوپر سے کھسک کر ٹانگوں کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ سیدھی

لیٹی ہوئی تھی اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں موجود ہے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دروازے میں چوہدری بشیر کھڑا تھا۔ اس کے بازوؤں میں مُنا تھا۔ مُنے کا سر چوہدری کے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ مُنے کے شوز چوہدری کے دوسرے ہاتھ میں تھے۔ شانی لحاف اپنے گھٹنوں سے ہٹا کر نیچے اُترنے والی تھی جب چوہدری آگے آیا اور اس نے شانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔

شانی نے کچھ کہنا چاہا تاہم چوہدری نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

شانی جیسے اٹھی تھی ویسے ہی دوبارہ لیٹ گئی۔ وہ پریشان سوالیہ نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھ رہی تھی، چوہدری نے جھک کر ہولے سے مُنے کو شانی کے پہلو میں اس طرح لٹا دیا کہ مُنے کا ایک بازو شانی کے گلے میں تھا۔ پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر تنقیدی نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ منظر کو مزید اُجاگر کرنے کے لئے اس نے کمرے کی دونوں ٹیوب لائٹس بھی آن کر دیں۔ شانی سمجھ گئی کہ اب اس پر پھر وہی ''فوٹو گرافی والا'' موڈ طاری ہے۔ شانی اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ اس نے لحاف کو اپنی کمر سے اوپر تک کھینچنا چاہا مگر چوہدری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا، شانی کو جوں کا توں رہنے کی ہدایت دیتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ بمشکل پندرہ بیس سیکنڈ بعد وہ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں اس کا بھاری بھرکم کیمرہ اور فلیش لائٹ وغیرہ تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے بڑے فدویانہ انداز میں شانی اور مُنے کی تین چار تصویریں بنائیں۔ اس نے شانی کو اپنے بال تک نہیں سنوارنے دیئے تھے۔ تصویریں اتارنے کے بعد وہ کچھ ایزی ہو گیا۔ اس نے کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور شانی سے چائے کی فرمائش کی۔ شانی چائے بنانے کے لئے کچن میں آ گئی۔ وہ کمرا اور کچن کا درمیانی دروازہ کھول کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل شانی کے سراپا پر تھیں۔ جیسے یہ نگاہیں کئی دنوں کی بھوک چند منٹ میں ہی مٹانا چاہتی ہوں۔

شانی نے ان نظروں کے اثر سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کئی دن انتظار کرایا اور اب آئے ہیں تو اچانک آ گئے ہیں۔''

''بس اُدھر حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا ہے۔ آج بھی بڑی مشکل سے نکل پایا ہوں۔ کوٹھی سے بارہ بجے روانہ ہوا تھا۔ اب میرا خیال ہے کہ ڈیڑھ بج رہا ہے۔'' شانی نے وال کلاک دیکھا، ڈیڑھ بجنے والا تھا۔

''آ..... آپ کے بازو کا کیا حال ہے؟''

چوہدری نے بازو سے قمیص اٹھائی، وہاں ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ اور کلائی پر ہلکی سی سوزش بھی موجود تھی۔ وہ بولا۔ ''اس دن کے بعد شدید درد تو نہیں ہوا پر ابھی مسئلہ پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوا ہے۔ کسی وقت ایک دم جلن ہونے لگتی ہے۔ بہت تیز... جیسے گرم سوئیاں چبھ رہی ہوں۔''

''آپ سے کہا تھا، کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔''

''چلو..... دکھالیں گے..... تم بتاؤ کیسی ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس ہر وقت باہر کے حالات کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ میرے لئے تو یہاں بالکل بلیک آؤٹ ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔''

''تم بے خبر ہی رہو تو بہتر ہے..... کبھی کبھی بے خبری بندے کی صحت کے لئے اچھی ثابت ہوتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ باہر حالات خراب ہیں؟''

''خراب تو ہیں لیکن بس سے باہر نہیں ہیں۔ میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس ہلچل میں تم میرے ساتھ رہنا۔''

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں۔'' شانی نے نگاہ ملائے بغیر پوچھا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا ہے۔'' چوہدری نے سگریٹ سلگایا۔

کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ کھڑکیوں سے باہر آدھی رات کا سناٹا سنسناتا رہا۔ چوہدری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک ٹوٹا ہوا موبائل فون ملا ہے انیکسی سے۔ پتا نہیں کس کا تھا۔''

شانی نے گھوم کر دیکھا اور اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ وہ اس موبائل سیٹ کو کیونکر نہ پہچانتی۔ یہ کئی ہفتے اس کے پاس رہا تھا۔ اسی پر وہ شیری اور رستم سے رابطہ کیا کرتی تھی۔ پھر ایک شام، غم اور مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر اس موبائل سیٹ کو چکنا چُور کر کے اس نے رستم کی طرف کھلنے والے ہر دروازے کو بند کر دیا تھا اور آج یہ ٹوٹا پھوٹا سیٹ چوہدری کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ چوہدری کی بھاری آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میرے ہاتھوں زہرا کی اچھی خاصی مرمت ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ موبائل فون اس کے پاس رہا ہوگا۔ اس نے رو رو کر قسمیں کھائی ہیں کہ یہ اس کا نہیں ہے۔ باقی رہی جالاں، تو

اسے تو ایسی چیزیں استعمال کرنی ہی نہیں آتیں۔ پتا نہیں یہ کس کا تھا اور کس نے پھینکا وہاں تمہارے کمرے میں۔"

شانی نے اپنے ہاتھوں اور ہونٹوں کی لرزش پر بمشکل قابو پایا اور بولی۔ "یہ میرے کمرے میں تھا؟"

"ہاں..... وارڈروب کے پیچھے جو خلا سا ہے اس میں سے فردوس کو ملا ہے۔ صفائی کرتے ہوئے۔"

شانی کا دل بے پناہ تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ چوہدری کی نظریں اس پر تھیں اور یہ نظریں جیسے کچھ کھوج رہی تھیں۔ پھر اچانک چوہدری نے ایک اور حملہ کیا۔ یہ پہلے سے بھی شدید تر تھا۔ شانی کو اپنے جسم پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ چوہدری نے اپنی واسکٹ کی جیب سے پستول کی ایک گولی نکالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کے شانی کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے کمرے کی ڈریسنگ میز کے نیچے سے ملی ہے۔ پتا نہیں یہ وہاں کیسے پہنچ گئی۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے انیکسی کی اچھی طرح صفائی کرائی تھی۔ تب وہاں یہ موبائل سیٹ تھا نہ یہ گولی تھی۔ یعنی بات یہ ہے کہ دونوں چیزیں تمہارے انیکسی میں آنے کے بعد وہاں پہنچی ہیں۔ اب پتا نہیں یہ کیسے ہوا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کتے کی بچی زہرا کچھ چھپا رہی ہے۔ شاید اس کا باہر کے کسی بندے سے رابطہ تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی حرامی ملنے آتا ہو اس سے۔ یہ جوان نوکرانیاں بھی خطرناک شے ہوتی ہیں۔"

شانی کا گلا خشک تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے بولنے کی کوشش بھی کی تو آواز اس کے منہ سے نکل نہیں سکے گی۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے گولی کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سینے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ اس بڑے سائز کی گولی کو بڑی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یہ رستم کے پستول کی گولیوں میں سے ایک تھی۔ یہ گولیاں شانی نے اپنے ہاتھ سے پستول میں سے نکالی تھیں۔ بعدازاں چھت پر سے چوہدری کے کارندوں کے ہاتھوں رستم کا انجام دیکھنے کے بعد وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے یہ گولیاں کمرے میں تپائی کے نیچے دیکھی تھیں۔ تب یہ گولیاں چوہدری کی نظر میں آنے سے بال بال بچی تھیں۔ شانی نے بدحواسی کے عالم میں یہ گولیاں تپائی کے نیچے سے نکال لی تھیں۔ رات کو اسے موقع ملا تھا، وہ انیکسی کے عقبی صحن میں آئی تھی اس نے سیوریج کا چھوٹا ڈھکن اٹھا کر گولیاں گٹر میں پھینک دی تھیں۔ اب یہ ایک گولی کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل کے

نیچے سے چوہدری کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شانی نے جو گولیاں پھینکیں وہ پانچ تھیں یا پھر رستم کے پستول میں چھ سے زیادہ گولیاں تھیں۔

"کیا بات ہے۔ تم ایک دم پریشان ہوگئی ہو؟" چوہدری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نن..... نہیں..... میں پریشان تو نہیں..... حیران ہوں۔ زہرا تو بالکل سیدھی سادی لڑکی ہے۔ میرے خیال میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"لوگ دیکھنے میں کچھ لگتے ہیں، اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔" چوہدری کا لہجہ رمزیہ تھا۔

شانی نے جھرجھری محسوس کی۔ چوہدری کچھ دیر تک ساکت نظروں سے شانی کا چہرہ تکتا رہا پھر بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔ "ایک عجیب اتفاق اور ہوا ہے۔ یہ گولی ویسے ہی پسٹل میں استعمال ہوتی ہے جیسا رستم سیال کے پاس تھا۔ ایک ہی کیلیبر ہے ایک ہی ساخت ہے۔"

کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے شانی کا ہاتھ لرز گیا اور کچھ چائے سنگ مرمر کی شیلف پر بکھر گئی۔ "لیکن..... یہ گولی کمرے میں کہاں سے آئی؟" شانی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑو، دفع کرو اس بات کو۔" چوہدری نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ "تم مجھے گرما گرم چائے پلاؤ..... اور میں تمہیں تمہاری پسند کی فلم دکھاتا ہوں۔"

"میری پسند کی؟"

"ہاں..... تمہاری انوری اپنے بچوں سمیت شارجہ پہنچ چکی ہے اور مزے میں ہے۔"

"سچ.....؟"

"بھئی! میں تو تم سے سچ ہی بولتا ہوں۔ کیا تم نہیں بولتی ہو؟" چوہدری کا لہجہ پھر معنی خیز ہوگیا۔

شانی کو لگا جیسے وہ اس سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ ابھی ایک دم وہ خونخوار لہجہ اختیار کر لے گا۔ دھاڑ کر کہے گا۔ میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ میں سب جانتا ہوں..... تیرے اور رستم کے بارے میں کچھ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کے بعد اپنی قمیص کے نیچے سے سیاہ رنگ کا بھرا ہوا پستول نکالے گا اور چار فٹ کے فاصلے سے اس کی ساری گولیاں اس کے جسم میں اتار دے گا۔ شانی نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ وہ چائے کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے درمیان کچن کے فرش پر پڑی ہے اور اپنے ہی خون میں لت پت تڑپ رہی ہے۔ چوہدری جان کنی کے عالم میں بھی اس پر ٹھوکروں کی بارش کر رہا ہے۔

چوہدری نے شانی کے لرزتے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا اور بڑی نرمی سے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔ چائے کی چند چسکیاں لینے کے بعد اس نے اپنے

چرمی بیگ میں سے ایک ویڈیو فلم نکالی اور اٹھ کر وی سی آر میں انسرٹ کر دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد ٹی وی آن ہو گیا اور شانی سکرین پر انوری اور اس کے بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھنے لگی...... یہ واقعی شارجہ کے کسی گھر کا اندرونی منظر تھا۔ کھڑکی میں سے شارجہ کی خوبصورت بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انوری صاف ستھرا لباس پہنے کھانا بنا رہی تھی۔ دونوں چھوٹے بچے مختلف کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ اٹھکیلیاں کر رہے تھے، چھوٹا بچہ جسے وہ کاکا کہتی تھی، کیمرے کو دیکھ کر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انوری نے اسے اٹھایا، اس کا منہ چوما۔ اس کی ممتا بھری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اتنے میں انوری کا شوہر اس فلیٹ نما گھر میں داخل ہوا۔ دھوپ سے بچاؤ کے لئے اس کے ہاتھ میں چھاتا موجود تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی۔ کیمرامین کی ہدایت پر وہ بھی بیوی کے پاس آن کھڑا ہوا اور شرماتے شرماتے بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر باقی دونوں بچے بھی ان کے ساتھ آن ملے وہ ''گروپ فوٹو'' کی طرح ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ انوری جذباتی ہو گئی۔ کیمرے کی طرف دیکھ کر رونے لگی۔ اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

''میری بی بی جی سے میرا اسلام کہنا۔ ان سے کہنا کہ میں بہت خوش ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا کچھ مل جائے گا مجھے...... میں رات دن رو رو کر ان کے لئے دعائیں کرتی ہوں۔ اللہ کرے میری بی بی جی کو کبھی تتی ہوا نہ لگے۔ ساری دنیا کی خوشیاں ان کے حصے میں آئیں......''

آٹھ دس منٹ کی اس فلم میں انوری اور اس کے بچے مکمل طور پر خوش و خرم نظر آئے تھے۔ فلم ختم ہونے کے بعد چوہدری نے شانی کو بتایا کہ انوری کے خاوند کو ایک مقامی فرم میں گارڈ کی نوکری مل گئی ہے۔ اس کا بڑا بچہ پڑھنا نہیں چاہتا لیکن چھوٹے دونوں کو سکول میں داخل کرا دیا جائے گا۔

فلم کے دوران میں شانی پر سے وہ دباؤ کسی حد تک کم ہو گیا تھا جو فلم سے پہلے چوہدری کی باتوں نے اس پر ڈالا تھا۔ فلم ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر وہ دباؤ شانی کو پیسنے لگا۔ کیا چوہدری سب کچھ جان چکا تھا؟ کیا وہ حقیقت کے قریب پہنچ چکا تھا......؟ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ رستم پر بے پناہ تشدد کیا گیا ہو اور اس نے چوہدریوں کو اپنے اور شانی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو۔ شانی نے سنا تھا کہ جسمانی تشدد بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی کر دیتا ہے اور وہ اذیت سے بے بس ہو کر اپنے ہونٹوں کے بند تالے کھول دیتے ہیں۔ یہ بات تو اب یقینی تھی کہ کوٹھی میں پکڑے جانے کے فوراً بعد رستم کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ کئی دن بعد تک

بھی زندہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر بہیمانہ جسمانی تشدد کا امکان بھی موجود تھا۔ خاموشی ایک بار پھر گھمبیر ہوتی جا رہی تھی۔ چوہدری نے آج بے حد پریشان کن گفتگو کی تھی لیکن اس کی خاموشی گفتگو سے بھی زیادہ پریشان کن تھی۔ شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کھوجی نظریں جسم کے اندر تک گھس رہی ہیں اور ہر ریشے میں چبھ رہی ہیں۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ جیسے اس چبھتی اور زخمی کرتی ہوئی خاموشی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

پھر وہ گہری سانس لے کر اپنے چرمی بیگ کی طرف جھکا۔ اس نے بیگ کی زپ کھول اور لفافے میں بند کوئی شے نکالی۔ شانی کے دل کی دھڑکن کچھ اور بڑھ گئی۔ اب پتا نہیں وہ موبائل اور گولی کے بعد شانی کو کیا دکھانے جا رہا تھا۔ تاہم اس مرتبہ شانی کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ چوہدری نے لفافے میں سے جو چیز نکالی وہ سرخ مخمل کی ایک ڈبیا تھی۔ چوہدری نے مستطیل شکل کی ڈبیا کھولی۔ سونے کا ایک بیش قیمت جڑاؤ نیکلس شانی کی آنکھوں کے سامنے چمکنے لگا۔ نیکلس کی شکل روایتی گلوبند سے ملتی جلتی تھی۔ ایک انچ چوڑی پٹی تھی جو ایک سنہری بکل کے ذریعے بند ہوتی تھی۔ اس پر چھوٹے چھوٹے جم اسٹون دمک رہے تھے۔ سامنے والا حصہ دل کی شکل میں تھا اور بے حد دلکش تھا۔ درمیان میں ایک بڑے سائز کا نیلم جڑا ہوا تھا۔

شانی نے نیکلس دیکھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو اسے دیوار سے دے مارتی، لیکن مجبوریوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کو دیکھے، اس کو چھوئے اور تعریف کرے اور اس نے یہ سب کچھ کیا۔ چوہدری کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ نیکلس شانی کو اپنے ہاتھ سے پہنانا چاہتا تھا۔ آخر اس کا مدعا اس کی زبان پر آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''اگر تم کہو تو میں یہ تمہارے گلے میں ڈال دوں......؟''

شانی جانتی تھی وہ بظاہر اجازت مانگ رہا ہے لیکن اصل میں حکم دے رہا ہے...... حالات نے اسے لفظوں اور رویوں کے نئے معنی سمجھا دیئے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا رخ قدِ آدم آئینے کی طرف کر لیا۔ چوہدری اس کے عقب میں آ گیا۔ شانی نے اپنے لانبے ریشمی بالوں کو سمیٹا اور انہیں کندھے کے اوپر سے آگے کی طرف کر لیا۔ یوں اس کی گردن عقب سے عریاں ہو گئی، چوہدری نے بڑے فلمی انداز میں شانی کو نیکلس پہنایا۔ وہ لرزہ براندام ساکت کھڑی رہی۔ چوہدری نے اسے اور خود کو آئینے میں دیکھا۔ شانی کے کندھوں پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ پھر اس کے جلتے ہونٹ شانی کی گردن سے چھونے لگے..... اس نے شانی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ خود کو خود سے دور کر لیا۔

ایسے لمحوں میں وہ ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ تصویر کی طرح ساکت ہو جاتی تھی......اور تصویریں، بے شک خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان میں زندگی کی حرارت نہیں ہوتی، ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔

وہ وہیں آئینے کے سامنے کھڑا اسے لپٹاتا رہا۔ ایک سرگوشی شانی کے کانوں میں سرسراتی رہی۔ ''ہم شادی کریں گے شانی ...... جو کچھ بھی ہے......ہم شادی کریں گے۔''

چوہدری کے اس فقرے میں ''جو کچھ بھی ہے'' کے الفاظ خاصی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا تعلق اس گفتگو سے تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدری اور شانی میں ہوتی رہی تھی۔ اسی دوران میں مُنا جاگ گیا۔ اس کے پکارنے کی آواز آنے لگی...... شانی، چوہدری سے علیحدہ ہو کر جلدی سے مُنے والے کمرے میں آ گئی۔ پھر مُنا اور شانی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

☆======☆======☆

شانی صبح دیر سے جاگی۔ مُنا اس کی چھاتی میں منہ گھسائے بے خبر سو رہا تھا...... اٹھتے ساتھ ہی شانی کے ذہن میں سب سے پہلا خیال موبائل اور گولی کا آیا۔ اسے لگا جیسے دل پر گھونسا لگا ہے۔ گزر جانے والی رات کی وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو چوہدری اور اس کے درمیان ہوئی تھیں۔ کیا آج پھر چوہدری ان دونوں چیزوں کے بارے میں اس سے سوال و جواب کرے گا؟ یہ سوال ایک ٹیس بن کر شانی کے سینے میں ابھرا۔ ایک بات تو شانی کو بڑی اچھی طرح معلوم تھی۔ اگر رستم اور اس کے درمیان معمولی سا تعلق بھی ثابت ہو جاتا تو اس پر قیامت گزر جاتی۔ تارپور کے دیگر چوہدری تو رہے ایک طرف پھر شاید چوہدری بشیر بھی اسے معاف نہ کر پاتا۔ ابھی تک اس تعلق کے بارے میں باتیں تو کئی لوگ کر رہے تھے، لیکن ٹھوس ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا۔

ایک بار پھر شانی کی ساری سوچیں موبائل سیٹ اور گولی کے گرد گھومنے لگیں۔ موبائل سیٹ میں موجود سم تو شانی نے اسی وقت تسلی بخش طریقے سے ضائع کر دی تھی لیکن موبائل سیٹ کے حوالے سے اس سے واقعی غلطی ہوئی تھی، اسے یہ ٹوٹا پھوٹا سیٹ باغیچے میں کہیں دفن کر دینا چاہئے تھا۔ گولی کے حوالے سے جو کچھ ہوا وہ بالکل اتفاقیہ تھا۔ اپنی دانست میں شانی نے تمام گولیاں سیوریج میں پھینک دی تھیں مگر ایک گولی نہ جانے کس طرح ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے سے نکل آئی تھی۔ اب شانی چوہدری کا سامنا کرتے ہوئے ڈر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر چوہدری نے کچھ سوالات کیے تو ان کے جوابات کیا ہوں گے......مگر پھر اچانک صورتِ حال بدل گئی۔

جالاں تیزی سے اندر داخل ہوئی، اس نے خشمگیں نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولی۔

''چوہدرانی! آپ یہاں لیٹی ہو۔ وہاں پتا بھی ہے کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا ہو رہا ہے......؟''

''چوہدری جی کا بُرا حال ہو رہا ہے پیڑ (درد) سے......'' جالاں نے انکشاف کیا۔

شانی نے غور سے سنا تو اسے چوہدری بشیر کی مدھم کراہیں سنائی دیں۔ یہ ویسی ہی کراہیں تھیں جو چند دن پہلے اس نے سنی تھیں۔ بے حد برداشت کے باوجود یہ کرب ناک آوازیں چوہدری کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ شانی جلدی سے دوپٹا لیتی ہوئی چوہدری کے کمرے کی طرف لپکی۔ اسے دیکھ کر شانی کو دھچکا لگا۔ وہ رات والے چوہدری سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ رنگ زرد تھا۔ ہونٹ تکلیف کی شدت سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اس نے قمیص اتار پھینکی تھی اور پشت چھت کی طرف کیے بیڈ پر لیٹا تھا۔ شانی کی نگاہ اس کے بازو اور کمر پر پڑی اور وہ کانپ گئی۔ آج اس کا بازو ہی متاثر نہیں تھا پشت کے بڑے حصے پر بھی سُرخی اور ورم کے ابھار نظر آ رہے تھے۔ ڈولا اور ریاست وغیرہ نے بالٹی پاس رکھی ہوئی تھی اور جگ میں ٹھنڈا پانی بھر بھر کے چوہدری کے متاثرہ حصوں پر گرا رہے تھے۔ پانی کے اس بہاؤ سے بیڈ شیٹ، فوم، قالین، سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ پانی ڈالے جانے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہوتی تو چوہدری کی حالت بُری ہو جاتی تھی۔

شانی کو دیکھ کر چوہدری نے اپنی کراہیں روکنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ شانی بے تاب ہو کر اس کا سر سہلانے لگی۔ ''کوئی دوا نہیں لی آپ نے؟'' شانی نے پوچھا۔ چوہدری نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ ''کوئی دوا ساتھ لائے ہیں آپ؟'' شانی نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں......بھول گیا ہوں۔'' چوہدری نے بمشکل جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔

''بیگ میں دیکھو، شاید ایک آدھ گولی پڑی ہو۔''

شانی بڑی تیزی سے چوہدری کا چرمی بیگ کھنگالنے لگی۔ بروفین اور پونسٹون جیسی دردکش گولیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا چوہدری کی تکلیف ایسی تھی کہ اس طرح کی پین کلرز کچھ اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر بھی شانی نے جیسے تیسے ایک گولی اسے کھلا دی۔ چوہدری کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی یہ دیکھ کر لرز گئی کہ سُرخی اور سوجن دھیرے دھیرے پھیل رہی ہے۔ بازو اور کندھا تو پورے کا پورا انگارہ ہو رہا تھا، اب پشت پر بھی اثرات بڑھ رہے تھے۔

''میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' شانی بے تاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''فون کر دیا ہے۔ وہ بس آ ہی رہے ہوں گے۔'' جالاں نے خشک لہجے میں کہا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ چوہدری کی ساری مصیبت کا ذمے دار اسے سمجھ رہی

ہے۔ڈاکٹر کے آنے میں پانچ دس منٹ مزید لگے۔تب تک چوہدری کا بُرا حال ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور چوہدری کو طبی امداد دینے لگا۔

جالاں کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔اس پر خوف تھا اور غصہ بھی۔غصہ غالباً شانی کے لئے تھا اور خوف اپنے لئے......وہ خاصی توہم پرست نظر آتی تھی...... شانی اس کے منہ سے تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک اور پیر پرستی کی باتیں سنتی رہتی تھی۔جالاں کو غالباً پختہ یقین تھا کہ چوہدری صاحب کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف اس لئے ہے کہ انہوں نے حضرت صاحب کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی تھی۔وہ اس ''جسارت'' کے ڈانڈے شانی سے ملا رہی تھی اور اسے بھی برابر کا گناہ گار سمجھ رہی تھی۔اس کے علاوہ شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے حوالے سے بھی خوف کا شکار ہے۔ظاہر ہے کہ وہ چوہدری کی خاص ملازمہ کی حیثیت سے چوہدری کا ساتھ دے رہی تھی اور یوں قدرت اللہ یعنی حضرت صاحب کی ناراضی مول لے رہی تھی۔

شانی کو دیکھ کر اس نے منہ بنایا اور بولی۔''چوہدرانی! تمہاری گل بات بہت مانی جاتی ہے یہاں......میں تو کہتی ہوں۔چوہدری صاحب کو اچھا مشورہ دو۔ان سے کہو کہ جا کر حجرت صاحب سے معافی مانگ لیں اور اچھا ہے کہ تم بھی ساتھ چلی جاؤ۔دونوں ہاتھ جوڑ دو ان کے سامنے۔ایسے لوگ بڑے وڈے دل کے ہوتے ہیں۔ماف کرنے میں جیادہ دیر نہیں لگاتے۔''

''معافی تو اس کو مانگنی چاہئے۔اس نے بھابو کی جان لی ہے۔پتا نہیں کتنوں کی جان لے چکا ہے۔وہ پیر نہیں بہروپیا ہے۔''

''توبہ یااللہ......توبہ یااللہ......'' جالاں نے بار بار کانوں کو ہاتھ لگائے۔''چوہدرانی تُو سچ مچ اپنے ساتھ منحوسی لے کر آئی ہے۔تُو بہت کچھ برباد کر کے جائے گی یہاں سے۔اللہ والوں کے بارے میں اس طرح بولتی ہے۔تیری زبان میں......'' اس نے خود کو بمشکل یہ طیش آمیز فقرہ مکمل کرنے سے روکا اور پاؤں سے زمین کو کوٹتی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی۔

اتنے میں شائلہ اُڑی اُڑی رنگت کے ساتھ آ موجود ہوئی۔''چوہدرانی جی......جالاں کہتی ہے کہ چوہدری جی کی تکلیف ڈاکٹر کے بس کا روگ نہیں ہے۔یہ کوئی دوسرا چکر ہے۔کسی نے عمل کیا ہے چوہدری پر؟''

''کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتی ہو؟''

''میرے یقین رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔پر آپ دیکھ ہی رہی ہیں جس طرح

کی تکلیف چوہدری صاحب کو ہے یہ کبھی دیکھی سنی نہیں۔مجھے تو اللہ دی قسمے ڈر لگنے لگا ہے، لگتا ہے کہ کوئی پرچھانواں سا ہمارے آس پاس گھوم رہا ہے۔رات کو انڈیا کی ایک فلم دیکھی تھی۔اس میں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں دکھائی گئی تھیں۔آخر یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے ناں تو لوگوں کے دماغوں میں اور زبانوں پر آتا ہے ناں۔''

ڈاکٹر تقریباً ایک گھنٹے بعد چلا گیا۔اس نے چوہدری کو ڈرپ لگائی تھی۔دو تین انجکشن بھی دیئے تھے۔اس کے علاوہ متاثرہ جسم پر مرہم کا لیپ کیا تھا۔ڈاکٹر نے دو تین ٹیسٹ لکھے تھے اور کہا تھا کہ یہ کسی اچھی لیبارٹری سے جلد از جلد کروا لئے جائیں۔ڈاکٹر کے پاس ایم بی بی ایس کے علاوہ ڈی ڈی وی کی ڈگری بھی تھی......اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ سکن سپیشلسٹ ہے اور اپنے کام میں مہارت رکھتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد چوہدری کو نیند آگئی اور وہ سکون کی نیند سو گیا۔شانی چاہتی تھی کہ وہ لاہور جا کر ٹیسٹ کروائے مگر وہ یہ کام کل پر ڈال رہا تھا۔ایسا رویہ عام دیکھنے میں آتا ہے مریض حتی الامکان ہسپتالوں اور لیبارٹریوں وغیرہ کے چکر سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے امید رہتی ہے کہ شاید ان بکھیڑوں میں پڑنے سے پہلے ہی افاقہ ہو جائے۔اکثر اوقات یہ امید پوری نہیں ہوتی، لیکن کبھی کبھار ہو بھی جاتی ہے۔

چوہدری کے سو جانے کے بعد شانی نے مُنے کو جی بھر کر پیار کیا اور شام تک اس کی ناز برداریوں میں لگی رہی۔وہ بھی جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا تھا۔چند لمحوں کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہو رہا تھا۔شام کو شانی مُنے کے ساتھ بیٹھی لوڈو کھیل رہی تھی۔چوہدری دوسرے کمرے میں محوِ خواب تھا۔اتنے میں جالاں اپنے فربہ جسم کو ہلکورے دیتی کمرے میں آئی۔وہ سخت پریشان لگ رہی تھی۔رنگ بھی زردی مائل ہو رہا تھا۔وہ سائیڈ ٹیبل کی درازوں میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔پھر بیڈ اور کرسیوں کے نیچے جھانکنے لگی۔''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

''میرا ایک تویج (تعویذ) تھا۔پتا نہیں کہاں گر گیا ہے۔'' وہ اپنے بازو کے مسلز کو ٹٹولتے ہوئے بولی۔

''کس طرح کا تھا؟'' شانی نے پوچھا۔

''کالے رنگ کا......چمڑے میں مڑھا ہوا تھا۔کل تک تو باجو میں تھا......'' اس کا لہجہ خشک تھا۔جیسے یہ امر مجبوری شانی سے مخاطب ہو رہی ہو۔

کچھ دیر بعد وہ جس طرح بوکھلائی ہوئی آئی تھی، اسی طرح باہر نکل گئی۔آس پاس کے

کمروں سے اٹھاپٹخ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ غالباً وہ بدحواسی میں اپنا تعویذ تلاش کر رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد شائلہ کی شکل نظر آئی۔ وہ بھی پریشان لگ رہی تھی۔ شائلہ نے مُنے کو بہانے سے باہر بھیج دیا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے چوہدرانی جی۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟''

وہ آنکھوں کو پورا کھول کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔ ''جالاں کے پیٹ پر بھی اسی طرح کی خارش نظر آ رہی ہے۔ ماس بالکل لال ہو گیا ہے، ابھار بھی نظر آ رہے ہیں...... مم...... مجھے تو لگ رہا ہے...... یہ وہی...... چوہدری جی والا چکر ہے۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' شانی کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''نہیں جی...... مجھے تو وہی چکر لگ رہا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔ میرا تو ڈر کے مارے سانس گھٹ رہا ہے۔ جالاں بھی بڑی ڈری ہوئی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا بول رہی ہے، کہہ رہی ہے کہ ایک کی وجہ سے سارے برباد ہو جائیں گے۔ سب کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ آپ کو الزام دے رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ آس پاس جو کچھ بھی ہو رہا ہے، آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

شانی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''کہاں ہے جالاں......؟''

''اپنے کمرے میں ہے۔''

''تعویذ مل گیا ہے اس کا؟''

شائلہ نے اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے شائلہ عرف شیلا کو اپنے ساتھ لیا اور جالاں تک پہنچی۔ وہ تب تک لحاف اوڑھ کر لیٹ چکی تھی۔ اس نے منہ سر لپیٹا ہوا تھا اور بالکل بے حس و حرکت نظر آتی تھی۔ شانی نے ملائمت سے آواز دی۔ ''جالاں...... کیا ہوا ہے جالاں؟''

دوسری تیسری آواز پر وہ لحاف کے اندر سے بولی۔ ''کچھ نہیں ٹھیک ہوں۔''

شائلہ نے کہا۔ ''منہ سے رضائی تو ہٹا جالاں۔''

اس نے جلے کٹے انداز میں لحاف ایک طرف پھینکا اور اپنے گنبد نما سانولے پیٹ پر سے کرتہ ہٹا کر بولی۔ ''لو دیکھ لو......''

شانی اور شائلہ نے آگے جھک کر دھیان سے دیکھا۔ ناف سے ذرا اوپر دائیں پہلو پر سُرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔ یہ دھبے ان دھبوں سے ملتے جلتے تھے جو چوہدری کے جسم پر پھیل گئے تھے۔ تاہم پورے یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ وہی تکلیف ہے۔ شائلہ غالباً پہلے بھی

جالاں کے گنبد نما پیٹ کا معائنہ کر چکی تھی۔ شائلہ نے کہا۔ ''جالاں! اب تو لالی کچھ کم نظر آتی ہے لگتا ہے کہ فرق پڑ گیا ہے۔'' جالاں نے جواب نہیں دیا، بس ایک ناراض سی ہوں کر کے رہ گئی۔ شانی نے کرتہ اس کے پیٹ پر برابر کرتے ہوئے کہا۔

''جالاں! پریشان نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ یہ چوہدری صاحب جیسی تکلیف ہو۔ اس طرح کی لالی تو عام طور پر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو پھر ڈاکٹر کو دکھا لیں گے۔'' جالاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور نفرت کی پرچھائیاں تھیں۔ شانی اور شائلہ کے واپس مڑتے ہی اس نے فوراً لحاف پھر سر پر تان لیا۔

چوہدری لمبی نیند کے بعد رات دس بجے کے قریب بیدار ہوا۔ شانی اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ اسے کھانا کھلایا، دوا پلائی، کپڑے تبدیل کرنے میں اس کی مدد کی۔ اس کی تیمارداری میں خلوص اور ہمدردی تھی، چوہدری جیسا بھی تھا، جو کچھ بھی کر رہا تھا لیکن فی الوقت اسے ہمدردی اور مدد کی ضرورت تھی۔ چوہدری کے کام کرتی ہوئی وہ بڑی تیزی سے کمرے میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ چوہدری اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مُنا بھی آس پاس موجود تھا۔ تاہم چوہدری اسے اپنے پاس آنے نہیں دے رہا تھا۔ چوہدری کی تکلیف کے پیشِ نظر یہ احتیاط اچھی تھی۔

اس دوران میں چوہدری کے میزبان ناصر نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نئے نکور کھڑ کھڑ کرتے کپڑوں میں تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں چمک اور لمبوترے چہرے پر حرام کی صحت مندی تھی۔ اس نے چوہدری کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی عام تکلیف نہیں ہے۔ شاید کسی بدخواہ نے چوہدری صاحب پر کچھ کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں مرید کے میں ہی ایک نہایت مانے ہوئے عامل صاحب ہیں۔ ہر طرح کے عمل کی کاٹ کرتے ہیں خاص طور سے جلد کی بیماریوں میں تو ان کا علاج اپنی مثال آپ ہے۔ وہ عامل صاحب کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ لے آیا تھا۔

چوہدری بشیر نے دوٹوک انداز میں ناصر کی تجویز رد کر دی۔ ''کوئی عمل شمل نہیں ہوا مجھ پر...... مجھے الٹے رستے پر نہ ڈالو۔ صبح لاہور چلیں گے۔ کارڈیکس والوں سے ٹیسٹ کرائیں گے۔ یہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک زیادہ تر اَن پڑھ لوگوں کے ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔''

ناصر اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شانی نے بھی چوہدری پر زور دیا کہ صبح ڈاکٹر کے تجویز کردہ ٹیسٹ ضرور کرائے۔ چوہدری خود بھی خاصا فکرمند ہو گیا تھا۔ اس نے اسی وقت موبائل پر لاہور میں اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے رابطہ کیا اور اس سے کل

کے ٹیسٹوں کے بارے میں ڈسکشن کرنے لگا۔

شانی سوچنے لگی۔ یہی چوہدری تھا اور یہی اس کی سوچیں تھیں لیکن بھابو کی بیماری کے حوالے سے اس کی رائے کتنی مختلف تھی۔ اب وہ جھاڑ پھونک کو اَن پڑھ لوگوں کے ڈھکوسلے کہہ رہا تھا لیکن تب وہ انہی ڈھکوسلوں کو اپنی بیوی کے لئے عین مناسب سمجھ رہا تھا۔ تب وہ جدید علاج کے نقصان گنواتا تھا۔ اب فائدے بیان کر رہا ہے۔ کتنا تضاد تھا اس کے رویے میں۔ رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب چوہدری پھر تکلیف محسوس کرنے لگا۔ پشت اور بازو کے متاثرہ حصوں کی سُرخی بڑھنے لگی اور شدید جلن محسوس ہونے لگی۔ مُنّے کو سلا کر شانی چوہدری کی تیمارداری میں لگ گئی۔ وہ ہر طرح سے اس کی دلجوئی کر رہی تھی۔ وہ ایک بالادست دشمن تھا لیکن وہ پھر بھی اس کے لئے ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ وہی ہمدردی جو چند دن پہلے اس نے بابر کے لئے محسوس کی تھی اور اس سے پہلے قاسم برلاس کے لئے محسوس کی تھی اور اس نامعلوم شخص کے لئے محسوس کی تھی جس کے سینے کی ہڈی میں خنجر پھنس گیا تھا اور اس سے پہلے نہ جانے کس کس سنگ دل کے لئے محسوس کی تھی۔ ہمدردی اور محبت اس کی فطرت تھی، وہ اس سے جدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ناصر نے چوہدری کو ایک SOS انجکشن لگایا اور دس پندرہ منٹ بعد اس کی طبیعت پھر سے سنبھل گئی۔ نیند اب چوہدری کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... وہ شانی سے باتیں کرتا رہا۔ شانی نے چوہدری کے سامنے جالاں کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ اس نے چوہدری کو بتایا کہ جالاں کے پیٹ پر تھوڑی سی خارش نظر آ رہی ہے لیکن وہ اس بارے میں بہت پریشان ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ اسی طرح کی تکلیف ہے اور پھیل جائے گی۔

چوہدری نے شانی سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' شانی نے جواب دیا۔ ''جلد پر سُرخی ہے اور ابھار بھی نظر آ رہے ہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ جالاں نے کوئی خاص جلن محسوس نہیں کی۔ بہرحال یہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ مجھے فکر یہ ہے کہ کہیں جالاں بدحواسی میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔''

''حرکت سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' چوہدری نے پوچھا۔

''وہ خاصی توہم پرست بھی لگتی ہے۔ قدرت اللہ کی باتیں بھی کرتی رہتی ہے۔ اس کو وہم ہے کہ آپ کے ہاتھ میں اس لئے تکلیف ہے کہ آپ نے اس ہاتھ سے قدرت اللہ کو دھکا

دیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گھبرا کر کوئی ایسا کام کر جائے جو ہمارے لئے نقصان دہ ہو۔''

''کیا مطلب......؟''

''کہیں وہ قدرت اللہ یا اس کے کسی چیلے چانٹے سے تو رابطہ نہیں کر لے گی؟''

چوہدری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ جالاں بڑی پرانی نوکرانی ہے اور ہمارے بڑے احسان ہیں اس پر..... دادا جی مہر نے بھی اسے اپنے بڑے قریب رکھا ہوا تھا۔''

''لیکن..... آپ کے ساتھ تو اس کا تعلق اتنا پرانا نہیں ہے ناں..... میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ ذرا اس کا خیال رکھیں۔''

چوہدری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری رائے کی قدر کرتا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو تو میں ریاست سے کہہ دیتا ہوں کہ صبح سے اس پر نظر رکھے۔ باقی مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''اللہ کرے آپ کا یقین درست ثابت ہو۔'' شانی نے کہا۔

لیکن صبح سویرے ثابت ہو گیا کہ چوہدری کا یقین درست نہیں تھا اور شانی کی تشویش سو فیصد درست تھی۔ جالاں گھر میں موجود نہیں تھی۔

ابھی فجر کی اذان ہی ہوئی تھی۔ باورچی خانے میں شانی نے چوہدری کے لئے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ کیتلی لینے کے لئے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ جب اتفاقاً اس کی نظر جالاں کے کمرے پر پڑی، جالاں اپنے بستر پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ باتھ روم میں بھی تاریکی تھی۔ شانی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کمرے میں جا کر دیکھا۔ جالاں کہیں نہیں تھی۔ اس نے اردگرد کے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بیرونی گیٹ مقفل تھا۔ شانی کو صحن میں گھومتے دیکھ کر ریاست بھی جاگ گیا۔

شانی نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ ریاست نے کہا کہ گیارہ بجے کے قریب اس نے گیٹ اپنے ہاتھ سے مقفل کیا تھا۔ گیٹ اب بھی مقفل تھا اور اس کی واحد چابی ریاست کے پاس تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر جالاں گھر میں موجود نہیں ہے تو پھر وہ رات دس گیارہ بجے سے پہلے ہی یہاں سے نکل گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں شائلہ، ناصر اور ڈولے وغیرہ سمیت سب جاگ گئے اور جالاں کو ڈھونڈنے لگے۔ دس پندرہ منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ جالاں کسی کو بتائے بغیر بڑی خاموشی کے ساتھ گھر سے چلی گئی ہے۔ اس اطلاع نے چوہدری کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ ''اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔''

''کہاں جا سکتی ہے وہ؟'' چوہدری خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''وہ بڑی وہمی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ کہیں ..... قدرت اللہ کے پاس ہی نہ جا پہنچے۔''

''نہیں وہ اتنی بڑی بیوقوفی نہیں کر سکتی۔'' چوہدری نے زور دے کر کہا۔ تاہم اس کے لہجے میں کھوکھلا پن صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

چوہدری نے موبائل فون نکالا اور اپنے کسی کارندے سے رابطہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اسے گفتگو میں آزادی دینے کے لئے شانی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور چھٹی حس کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اگر جالاں کی کسی بیوقوفی کی وجہ سے نارپور کے چوہدریوں کو چوہدری بشیر کے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔ ایسی صورت حال میں سب سے زیادہ خطرہ شانی کے لئے تھا۔ چوہدری بشیر جو کچھ بھی تھا لیکن چوہدریوں کی چوہدراہٹ کا حصہ تھا۔ وہ ان کا اپنا خون تھا۔ وہ اس کے ساتھ دشمنی میں شاید ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔ شانی غیر تھی۔ نہ صرف غیر تھی بلکہ دشمن کی بیٹی تھی۔ وہ درندہ صفت لوگ اس کی زندگی اور آبرو کو لوٹنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔

شانی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی اور مستقبل قریب کا نقشہ اپنے تصور میں کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ جالاں کا گھر سے غائب ہونا نیک شگون ہرگز نہیں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے شانی کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس زیرِ تعمیر مکان کے پہلو میں لوہے کا ایک عارضی دروازہ لگایا گیا تھا۔ یہ دروازہ ایک بغلی گلی میں کھلتا تھا۔ اس زنگ آلود دروازے پر ایک قفل پڑا رہتا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ اس قفل کی چابی سٹور روم میں ایک کیل سے لٹکی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا کہ احتیاطاً اسے یہ دروازہ کھول دینا چاہئے تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں گھر سے نکلنے کے لئے اسے استعمال کیا جا سکے۔ شانی نے سٹور روم سے چابی لی اور بغلی دروازے کا زنگ آلود تالا کھول دیا..... تاہم تالا کھولنے کے بعد شانی نے اسے دوبارہ اس طرح سیٹ کیا کہ وہ دیکھنے میں بند ہی محسوس ہوتا تھا۔

اچانک ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور شانی سرتاپا کانپ گئی۔ وہ دوڑ کر قریبی کمرے میں آئی۔ یہاں سے اسے نیم تاریک صحن کا منظر دکھائی دیا۔ وہ بھونچکی رہ گئی مکان کا عارضی مین گیٹ جو بوسیدہ لکڑی کا تھا کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی گیٹ کو توڑتی ہوئی صحن کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ بھاری بھرکم ٹریکٹر وحشت سے چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی ایک ''آنکھ'' تصادم کے سبب ٹوٹ گئی تھی مگر دوسری روشن تھی۔ ٹرالی میں

سے دیہاتی افراد چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اتر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں، کلہاڑیاں اور برچھیاں تھیں۔ شانی کو ان میں شعلہ مزاج قادرا بھی نظر آیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد شانی کو برآمدے کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی وحشت ناک للکاریں سنائی دینے لگیں۔ چاروں طرف ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا، یہی وقت تھا جب شانی کے کانوں میں ایک روتی ہوئی باریک آواز آئی۔ ''تاتی تاتی'' یہ اس کا مُنا تھا۔ وہ قریبی کمرے میں تھا اور دھما چوکڑی کی آوازیں سن کر جاگ گیا تھا۔ شانی بغلی دروازے کے بالکل پاس تھی۔ اگر وہ چاہتی تو دروازہ کھول کر فوراً باہر گلی کی تاریکی میں پہنچ سکتی تھی لیکن وہ مُنے کو اس ال میں چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

کمرے کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ مُنا گھبراہٹ میں باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا شانی وہاں ہوگی۔ شانی نے دوڑ کر اسے بانہوں میں اٹھایا لیکن جب وہ کمرے سے نکلنے کے لئے دروازے پر آئی تو ٹھٹک گئی، گھنی مونچھوں اور چوڑے چکلے چہرے والا ایک نارپوری دیہاتی اس کے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمکیلے پھل کی چھوٹی کلہاڑی نظر آ رہی تھی۔ شانی اور مُنے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک ابھری۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتا ایک طرف سے ریاست عقاب کی طرح آیا اور اس دیہاتی سے بھڑ گیا۔ دروازے پر ان کے درمیان زبردست کشمکش ہونے لگی..... شانی مُنے سمیت دیوار کے ساتھ چپک گئی اور دروازہ خالی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا انتظار تھا مگر طویل محسوس ہو رہا تھا۔

اسی دوران میں شانی کی نگاہ کھڑکی کی جالی میں سے گزر کر چوہدری بشیر کے کمرے کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا شائلہ کا شوہر ناصر دہلیز پر خون میں لت پت پڑا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور کسی تیز دھار آلے کی ضرب سے اس کا ایک کان کٹ گیا تھا۔ یہ کان بس گوشت کے چند ریشوں کے ذریعے اس کے چہرے سے لٹکا ہوا تھا۔ کمرے میں تین چار افراد چوہدری بشیر سے گتھم گتھا تھے اور چوہدری بشیر کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے اچانک چوہدری نے ایک شخص کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لی۔ بڑے طیش کے عالم میں اس نے اپنے سامنے والے شخص پر کلہاڑی کا وار کیا۔ کلہاڑی سر پر لگی اور پھسلتی ہوئی کندھے پر آئی۔ وہ شخص پیچھے کی طرف گرا۔ شانی نے قادرے کی چنگھاڑ سنی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں تھا اس نے اپنے پستول کا رخ چوہدری کے سینے کی طرف کر دیا۔ تاہم قادرے کا ایک ادھیڑ عمر ساتھی

قادرے سے لپٹ گیا اور اسے چوہدری بشیر پر فائر کرنے سے روک دیا۔ اسی اثناء میں ایک بٹے کٹے دیہاتی نے چوہدری بشیر کو عقب سے اپنی بانہوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ چوہدری کا کلہاڑی والا ہاتھ بھی اسی شکنجے میں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوہدری گرفت میں آ گیا۔ کئی افراد اس کے ساتھ لپٹ گئے۔

یہ سب کچھ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ مُنا کیکڑے کی طرح شانی سے چمٹا ہوا تھا۔ شانی نے اس کا چہرہ اپنے سینے میں یوں چھپایا ہوا تھا کہ اردگرد کا ہر منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا..... شانی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ گرانڈیل ریاست نے اپنے مدِمقابل کو فرش پر گرا لیا تھا۔ اب وہ اس کی کلہاڑی چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شانی نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ وہ ریاست اور اس کے مدمقابل کو پاؤں کی طرف سے پھلانگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ کسی قریبی کمرے سے اس نے شائلہ کے چلانے کی آواز سنی۔ دو تین سیکنڈ میں شانی اس بغلی دروازے کے سامنے تھی جس کا تالا اس نے تھوڑی ہی دیر پہلے احتیاطاً کھولا تھا۔ اس نے کھٹکا ہٹایا اور دروازے کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ باہر تاریکی تھی اور ٹھنڈی ہوا تھی۔ اردگرد کے مکانوں میں لائٹس آن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ناصر کے مکان میں فائرنگ ہوئی تھی۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں کا چونکنا لازمی تھا۔ اسی دوران میں ایک بار پھر اوپر تلے کئی فائر ہوئے۔ پہلے رائفل گرجی پھر پستول کی آواز سنائی دی پھر ریپیٹر کا دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد پھر رائفل گرجی یہ عمل اسی ترتیب سے دو تین بار دہرایا گیا۔ تب تک شانی مُنے کو سینے سے لگائے مکان سے دو ڈھائی سو میٹر دور آ چکی تھی۔ یہ قصبے کی مضافاتی آبادی تھی۔ سامنے ہی کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ امرود، جامن اور لیچی کے درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ شانی کھیتوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر بھاگتی چلی گئی۔

دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے، کوئی سایہ سا تھا لیکن یہ کوئی انسان نہیں لگتا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ تاریکی میں کوئی کتا یا اس طرح کا دوسرا جانور اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ شانی نے بھاگتے بھاگتے دو تین بار مڑ کر عقب میں دیکھا۔ ایک جگہ وہ لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ اس کے سنبھلنے تک وہ سایہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ یہ کوتاہ قد ڈولا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بیگم جی..... جلدی کریں..... مجھ کو لگتا ہے وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

''تت..... تم نے دیکھا ہے؟''

''نہیں صرف آوازیں سنی ہیں۔'' ڈولا شانی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے بولا۔ کچھ

آگے جا کر ڈولا ایک دوسری پگڈنڈی پر مڑ گیا۔ یہ بل کھاتی پگڈنڈی کماد کے طویل کھیت میں سے گزرتی تھی۔

''اُدھر کہاں جا رہے ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس طرف معراج دین کا ٹیوب ویل ہے۔ معراج میرا جاننے والا ہے۔ وہ ہمیں اپنے پاس چھپا لے گا۔'' ڈولے نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

شانی چند لمحے تذبذب میں رہی پھر ڈولے کے پیچھے چل دی۔ وہ کبھی بھاگنے لگتے تھے، کبھی تیز تیز چلنے لگتے تھے۔ گاہے گاہے وہ مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتے تھے۔ ڈولا اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی پریشان مینڈک شانی اور مُنے کے آگے پھدکتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک شانی کو پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈولے نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست ہے۔ کچھ لوگ ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ غالباً گھوڑوں پر سوار تھے۔ شانی کو اپنے عقب میں ٹارچیں چمکتی نظر آئیں اور مدھم آوازیں سنائی دیں۔ اگلے دو تین منٹ میں وہ لوگ بالکل قریب پہنچ گئے۔ ان کی تعداد پندرہ بیس کے قریب تھی۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اب شانی اور ڈولے کے لیے بہتر تھا کہ وہ کہیں چھپ جائیں۔ بائیں طرف برساتی نالا تھا۔ نالے کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک سرکنڈے پھیلے ہوئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں گھڑسواروں سے بچنے کے لئے سرکنڈوں میں گھس گئے۔ تب تک گھڑسوار ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ سرکنڈوں کی دھاریں بہت تیز تھیں۔ ان کے پاؤں کے نیچے کیچڑ تھا اور خودرو گھاس تھی۔ مُنے کو سرکنڈوں کی کاٹ سے بچانے کے لئے شانی نے اسے اپنی چادر میں اور اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ ڈولے کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔ ''بیگم جی زیادہ آگے نہ جائیں۔ یہاں سانپ ہیں۔ لوگ اِدھر آنے سے ڈرتے ہیں۔''

ڈولے کی بات میں وزن تھا۔ ایسی جگہیں اکثر موذی کیڑوں کا مسکن ہوتی ہیں لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان سرکنڈوں سے باہر بھی سانپ موجود تھے۔ یہ سانپ انسانوں کی شکل میں تھے اور یہ اتنے زہریلے تھے کہ ان کی موجودگی میں یہ سرکنڈے عافیت کی جگہ محسوس ہوتے۔

وہ تینوں ایک نسبتاً خشک جگہ پر ٹھہر گئے۔ سرکنڈوں کی لمبائی کئی جگہوں پر تیرہ چودہ فٹ تک تھی۔ وہ ہوا میں آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ سرسرا رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اُجالے کی آمیزش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ شب کی تیرگی اب بس پندرہ بیس منٹ کی مہمان تھی۔

''ان کو شک پڑ گیا ہے شاید۔'' ڈولے نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ ... آس پاس ہی گھوم رہے ہیں۔" شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔

سرکنڈوں کے اردگرد گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں لگا کہ کچھ افراد آگے نکل گئے ہیں جب کہ کچھ سرکنڈوں کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔ اسی دوران میں ڈولے نے سرگوشی کی۔ "بیگم جی، لگتا ہے کہ ٹریکٹر ٹرالی بھی اِدھر ہماری طرف آرہی ہے۔"

شانی نے دھیان سے سنا اسے آواز سنائی نہیں دی۔ یوں لگتا تھا کہ ڈولے کی سننے کی حس خاص طور سے تیز ہے۔ چند سیکنڈ بعد واقعی ٹریکٹر کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ تین چار منٹ مزید گزرے اور پھر ٹریکٹر ٹرالی سرکنڈوں کے عین سامنے پہنچ گئی۔ بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شاید جو گھڑ سوار آگے گئے تھے وہ بھی پلٹ کر سرکنڈوں کی طرف آگئے تھے۔

ایک للکارتی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر شانی کے کانوں میں پڑی۔ "باہر نکل آ حرامزادی! نہیں تو اندر ہی بھون کر رکھ دیں گے۔"

پھر ایک دوسری آواز ابھری۔ اس آواز نے شانی کو کئی غلیظ گالیوں سے نوازا اور شانی کو سرکنڈوں سے باہر آنے کے لئے وارننگ دی۔ یہ جان کر شانی کا رہا سہا خون بھی خشک ہوگیا کہ یہ قادرے کی آواز تھی۔ وہی جنونی چوہدری زادہ جس کے نزدیک شانی کی واحد سزا فوری موت تھی۔ فوری اور دردناک۔

بپھرے ہوئے نارپوری چوہدری سرکنڈوں کے اردگرد دندناتے رہے اور شانی کے لئے بدترین الفاظ استعمال کرتے رہے۔ ان الفاظ میں شانی کے پیدا کرنے والوں پر نفرت اور غیظ وغضب کی بوچھاڑ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ شانی کے جسم کے ہر ہر حصے کو چیرنے پھاڑنے اور توڑنے پھوڑنے کی دھمکیاں تھیں۔

دفعتاً گولیوں کے کئی دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی قادرے کی چنگھاڑ ابھری۔

"آخری بار کہہ رہا ہوں کتیا! باہر آجا ورنہ ماردوں گا۔"

ایک بات واضح تھی۔ قادرا اور اس کے ساتھ اس نیم تاریکی میں ان خطرناک سرکنڈوں کے اندر گھستے ہوئے کترا رہے تھے۔ ایسی جگہوں پر سانپ، بچھو، جنگلی بلے اور بعض اوقات سؤر تک ملتے ہیں۔ جنہیں پنجاب کے دیہات میں "بھارلے" کہا جاتا ہے اور ان سے خصوصی طور خوف کھایا جاتا ہے۔

فائرنگ کے ساتھ ہی مُنے نے سسکنا اور باریک آواز میں رونا شروع کردیا...... دوسری طرف ڈولا بھی سہم سا گیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ صورتِ حال اتنی جلدی اور اتنی زیادہ خراب ہوجائے گی۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرکنڈوں کے تین اطراف میں قادرا اور

اس کے ساتھی موجود ہیں۔ جب کہ چوتھی طرف برساتی نالا تھا۔ یقیناً نالے پر بھی ان کی گہری نظر تھی دفعتاً تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہوگئی۔ شانی نے اپنے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹتی دیکھیں۔ وہ مُنے سمیت کیچڑ زدہ زمین پر گرگئی۔ ڈولا بھی تڑپ کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اس دوران میں تڑتڑ کی آواز سے کئی خوفناک برسٹ چلے۔ کئی گولیاں شانی اور ڈولے سے بس دو تین فٹ کے فاصلے سے گزریں۔ ...شانی نے مُنے کو اپنے جسم کے نیچے چھپالیا تھا، جیسے مرغی چوزوں کو پروں میں ڈھانپتی ہے۔ ایک آوارہ کتا خوفناک آوازیں نکالتا ہوا آیا اور شانی کے عین سامنے گر کر بُری طرح تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگی تھی اور اب وہ نزع کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مُنے کا خوف عروج پر پہنچ گیا۔ پہلے اس کے ہونٹوں سے ڈری ہوئی آوازیں نکلیں پھر وہ بُری طرح چلانے لگا۔

شانی کو اپنی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایسے مرحلوں سے گزر رہی تھی کہ موت میں اسے عافیت نظر آنے لگی تھی لیکن مُنے کی زندگی کے لئے وہ خطرہ کیسے مول لے سکتی تھی۔ اگر اگلا برسٹ شانی اور مُنے پر آتا تو پھر باقی کیا بچتا تھا۔ سرکنڈوں سے باہر وحشی چوہدری للکار رہے تھے، چنگھاڑ رہے تھے۔ شاید یہ چوہدری نہیں تھے۔ یہ وہی جذبۂ انتقام تھا جو قرنوں سے آگ اور خون کے دریا بہاتا اور انسانی نسلوں کو نابود کرتا آیا ہے۔ آج اس ملگجے اندھیرے میں، ان یخ بستہ سرکنڈوں کے کنارے وہی جذبۂ انتقام ایک نہتی بے آسرا عورت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ مگر اس جذبہ انتقام کی زد میں چوہدریوں کا اپنا خون بھی آرہا تھا۔ وہ غالباً بے خبر تھے کہ شانی کی بانہوں میں پانچ چھ سال کا ایک معصوم بچہ سمٹا ہوا ہے اور وہ چوہدری بشیر کا لختِ جگر ہے۔

ہاں شانی اس کے لئے خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ پھر فائرنگ شروع ہوتی، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پکار کر بولی۔ "گولی مت چلاؤ۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں گولی مت چلاؤ" اس کی آواز میں دنیا جہاں کا درد سمٹا ہوا تھا۔

جب وہ کھڑی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سرکنڈوں کے ایک حصے میں شدید فائرنگ کے سبب آگ بھڑک اٹھی ہے۔

چند ہی سیکنڈ میں چار پانچ رائفل بردار اور کلہاڑی بردار اس کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ مظلومیت کی تصویر، بے بسی کا نمونہ، سر جھکائے مُنے کو سینے سے لگائے بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ ایک دل دوز ہچکی گا ہے بگا ہے اس کا سینہ دہلا دیتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں، وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ آئندہ چند سیکنڈ میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ غیظ

وغضب کی زیادتی کے سبب اسے اسی جگہ فوری طور پر جان سے مار دیا جاتا۔ دوسری صورت میں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ لوگ اسے مارتے پیٹتے اپنے کسی ڈیرے پر لے جاتے اور اسے موت سے پہلے موت کا مزہ چکھایا جاتا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ اپنی آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ نارپوری چوہدریوں کے غضب سے بگڑے اور تمتمائے ہوئے چہرے دیکھ سکتی۔ شانی اور منّا کیچڑ میں لتھڑ چکے تھے۔ شانی کے پاؤں پر کیچوے رینگ رہے تھے اور اس سے دو فٹ کی دوری پر ہلاک شدہ کتے کا خون آلود منہ بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا۔

حسب توقع سب سے پہلے بڑی بے دردی کے ساتھ منّے کو اس سے چھینا گیا۔ منّے کی اندوہناک چیخیں مزید بلند ہوگئیں۔ وہ ''تاتی...... تاتی اور ابو......'' پکارتا جا رہا تھا۔ چند لمحے بعد ایک زناٹے کا تھپڑ شانی کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر کسی شخص سے ٹکرائی۔ پھر ایک اور تھپڑ اور اس کے بعد ایک اور۔ کسی نے اسے بالوں سے پکڑا اور گھما کر سرکنڈوں کے نیچے دلدلی زمین پر پھینک دیا۔ اس کے جسم پر کئی ٹھوکریں لگیں اور ایک پھنکارتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''حرامزادی، سؤرنی، بڑا شوق تھا تجھے بھاگنے کا......اب بھاگ...... بھاگ جتنا بھاگ سکتی ہے۔''

شانی نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ اپنی حالت زار کو، نہ منّے اور ڈولے کو...... نہ اپنے وحشی دشمنوں کو، اسے بس اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈولے کو بھی زمین پر گرا کر مارا پیٹا جا رہا ہے۔ وہ باریک آواز میں چلا رہا تھا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں، میں تو نوکر ہوں جی۔''

پھر شانی کو کیچڑ آلود بالوں سے پکڑا گیا اور اس طرح کھینچا جانے لگا کہ وہ کبھی گر پڑتی تھی، کبھی اٹھ کر دو قدم چل لیتی تھی، غلیظ اور بدترین گالیاں اس کے کانوں میں زہریلے خنجر اتار رہی تھیں۔ اسے ٹریکٹر کے انجن کی آواز سنائی دی، منّے کے رونے چلانے کی آواز بھی اس طرف سے آ رہی تھی، شانی نے چند سیکنڈ کے لئے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سُرخ رنگ کی ٹریکٹر ٹرالی میں چھ سات افراد سوار تھے۔ آٹھ دس افراد ٹرالی کے اردگرد دکھائی دے رہے تھے۔ ٹرالی کے پس منظر میں خشک سرکنڈوں میں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھوئیں کے مرغولے دکھائی دیتے تھے۔ ٹرالی پر منّا ایک ادھیڑ عمر شخص کی گرفت میں تھا اور فریاد کناں تھا۔ شانی کی نگاہ ٹرالی پر کھڑے ایک سرخ و سپید شخص پر پڑی۔ اس باریش شخص کو شانی نے پہچان لیا۔ یہ قدرت اللہ (حضرت صاحب) کے مریدوں میں سے ایک تھا۔

اس شخص کی یہاں موجودگی ثابت کرتی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے، شانی کے اندیشوں کے مطابق ہوا ہے۔ اپنی تکلیف سے ڈری ہوئی جالاں چوہدری بشیر سے ساری وفاداری بھلا کر قدرت اللہ کے پاس پہنچی تھی۔ قدرت اللہ سے قادرے اور حشام وغیرہ کو معلوم ہوا تھا کہ چوہدری بشیر اور شانی کہاں ہیں۔ انہوں نے فوراً شب خون مارا تھا اور سب کچھ تہہ و بالا کر دیا تھا۔

شانی کو ٹریکٹر ٹرالی میں سوار نہیں کیا گیا بلکہ پاس ہی کھڑی ایک کیچڑ زدہ جیپ میں دھکیل دیا گیا۔ جیپ میں داخل ہوتے ہوئے شانی نے دیکھا۔ ایک لمبے دیہاتی نے ڈولے کی ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھا کر کسی بے جان شے کی طرح ٹرالی میں پھینک دیا۔ ڈولے نے دو لڑھکنیاں کھائیں اور خوفزدہ انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شانی کو قادرے نے بڑی بے دردی سے اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیان خلا میں گھسیڑ دیا۔ اس کے اوپر ایک کالی چادر اس طرح ڈال دی گئی کہ اردگرد کا ہر نیم روشن منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ قادرا پھنکارا۔ ''اسی طرح مرغی بن کر بیٹھی رہ اِدھر......ورنہ ابھی ذبح کرکے کھال اتار دوں گا تیری۔''

چوہدری بشیر کے رشتے داروں میں سے بھی تین چار افراد جیپ میں سوار ہوگئے۔ ایک بھاری آواز نے قادرے سے پوچھا۔ ''بشیرے کا کیا بنا ہے؟''

''اس کے ہتھ کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ باقی ٹھیک ہے۔''

''کہاں ہے وہ......؟''

''اسے نذیر کی گاڑی میں پنڈ بھیج دیا ہے۔ اس کا وڈا چچا ریاست بھی ساتھ ہے۔''

''اس کے چمچوں میں سے کوئی پار تو نہیں ہوا؟''

''نہیں......بس پھٹڑ ہوئے ہیں۔ ایک دو کو کلہاڑیاں لگی ہیں، دو کو گولیاں شولیاں لگی ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اب فٹافٹ نکلو یہاں سے۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے پلس پہنچ جائے۔'' بھاری بھرکم آواز نے کہا۔

جیپ ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور اونچے نیچے راستے پر تیزی سے ہچکولے کھانے لگی۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ ٹریکٹر ٹرالی اور گھوڑے وغیرہ پیچھے آرہے ہیں۔ جیپ میں ایک خوفناک خاموشی تھی۔ ویسی ہی خاموشی جیسی طوفان سے پہلے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سگریٹوں کا دھواں تھا اور شراب کی بو تھی۔

☆======☆======☆

تقریباً ایک گھنٹے بعد شانی ایک خالص دیہاتی علاقے میں موجود تھی۔ یہ درحقیقت نارپور کی طرف کی کوئی آبادی تھی۔ شانی کو ایک حویلی میں لے جایا گیا۔ وہ پھڑپھڑاتی ہوئی بے بس چڑیا کی طرح کچے فرش پر پڑی تھی۔ (یہ کمرے کا فرش تھا ایسے فرش کو چکنی مٹی اور بھوسے سے اس طرح لیپا پوتا جاتا ہے کہ پختہ فرش جیسی صفائی نظر آتی ہے) دیواروں پر مختلف نقش و نگار تھے اور ایک بڑی دیوار پر رائفلیں اور کلہاڑیاں وغیرہ آویزاں تھیں۔ رنگین پایوں والے ایک بڑے پلنگ پر ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک شخص پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک زخم کا نشان ناک کے پاس سے شروع ہو کر کنپٹی تک چلا گیا تھا۔ اس نشان کے سبب ادھیڑ عمر شخص کا کرخت چہرہ اور بھی کرخت اور بھیانک نظر آتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ یہ شخص فاخر اور بشیر کا تاؤ (تایا) حشام ہے...... اپنی شادی کے موقع پر یا شادی کے بعد غالباً ایک دو بار ہی اس شخص کو شانی نے دیکھا تھا...... نارپور کے بہت سے کرخت چہروں کی طرح شاید یہ چہرہ بھی شانی کو یاد نہ رہتا مگر چہرے پر موجود زخم نے شانی کے ذہن پر نقش چھوڑا تھا۔ شانی کو پتا چلا تھا کہ حشام کے چہرے پر یہ زخم لٹھ بازی کی نشانی ہے۔ بدنما چہرے والے اس شخص نے شعلہ بار نظروں سے شانی کو گھورنے کے بعد سنگین لہجے میں کہا۔ ''برات کو نئے خصم کے ساتھ سونے والی کنجری کا بھی کوئی اصول ہوتا ہے لیکن تُو تو اس سے بھی گئی گزری ہے۔ حرامزادی! تُو نے کیا سمجھا تھا اپنے بہن خور یار کے ساتھ مل کر نارپور کو آگ لگائے گی اور بھاگ جائے گی۔ کتے کی بچی! تیرے جیسیوں کو تو ہم دھرتی کی ساتویں تہہ سے بھی گھسیٹ کر نکال لیتے ہیں۔''

''میرا کوئی قصور نہیں۔''

''ہاں تیرا کوئی قصور نہیں۔ قصور تجھے پیدا کرنے والے کتے اور کتی کا ہے۔ تیرے جیسی منحوس کو پیدا کرنے سے اچھا تھا کہ تیری ماں کوئی بڑا سا پتھر پیدا کرتی اور پھر اس سے اپنا اور اپنے حرامی خصم کا سر توڑ لیتی۔''

شانی سسکتی رہی۔

''تُو نے برباد کر دیا ہے ہم سب کو برباد کر دیا ہے۔'' تاؤ حشام پھر دہاڑا اور ایک دم اٹھ کر شانی پر پل پڑا۔ اس نے شانی پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ وہ اس کے غضب کے سامنے گیند کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر لڑھکتی رہی۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے تھے۔ پھر بھی کراہیں بے ساختہ نکل رہی تھیں۔ وہ کئی بار دیوار سے ٹکرائی، کئی بار پلنگ اور کرسیوں پر گری۔

کچھ دیر بعد چوہدری حشام ہانپ کر دور ہٹ گیا۔ شانی پھٹے پرانے خون آلود کپڑے کی طرح کچے فرش پر پڑی تھی۔ بند دروازوں کے باہر سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ بڑی کرخت آوازیں تھیں اور آپس میں جھگڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ غالباً بحث اس بات پر تھی کہ شانی اور اس کے خانوادے کے ساتھ بدترین سلوک کیا ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف چوہدری ہشام بھی ہانپ کر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ غالباً وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجرمہ کے لئے بدترین سزا کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی سزا جو ہولناک ہو اور جس کا دورانیہ بھی زیادہ ہو۔ شانی پہلو کے بل فرش پر پڑی تھی۔ اس کا ایک بازو کسی شدید چوٹ کے سبب بالکل سن ہو رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون اس کی پیشانی پر رینگتا ہوا اس کے رخسار پر گر رہا تھا۔ یہاں سے یہ خون شانی کے آنسوؤں کے ساتھ ''دوآبہ'' بناتا ہوا فرش پر گلکاری کر رہا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے اپنے بازو کی اوٹ سے ایک نگاہ اپنے ظالم و جابر منصف چوہدری حشام پر ڈالی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ جسم پر گرد تھی اور لباس میلا کچیلا تھا۔ اس کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے شانی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ شانی کو یاد آیا چوہدری بشیر نے اسے بتایا تھا کہ حشام اور قادر وغیرہ دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ حشام نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ جب تک شانی مل نہیں جاتی وہ نہائے گا نہ جوتی اور کپڑے پہنے گا، نہ بستر پر سوئے گا۔ آج وہ تاؤ حشام کی یہ صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

اس دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ تاؤ حشام شانی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا کسی نوکرانی کی مدھم آواز سنائی دی۔

''مالک......! پانی گرم ہو گیا ہے۔''

تاؤ حشام دروازے کو باہر سے مقفل کرتا ہوا حویلی کے کسی دوسرے حصے میں چلا گیا۔ شاید کافی دنوں بعد وہ آج نہانے کے لئے گیا تھا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ پھر کھلا۔ شانی بے سدھ سی اپنی جگہ پڑی رہی۔ اس مرتبہ کچھ عورتوں نے اندر جھانکا...... یہ چار پانچ عورتیں تھیں۔ ان کی صورتیں شانی کے لئے اجنبی تھیں۔ یہ سب دیہاتی حلیے میں تھیں۔ وہ دروازے کے باہر سے یہ شانی کو دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی۔

ایک بولی۔ ''دیکھو خبیث کو...... صورت سے ہی نحوست ٹپک رہی ہے۔ میرا بس چلتا تو مقبول (بھابو) کے ساتھ ہی اس کی قبر بھی بنا ڈالتی۔ اتنی سوہنی کڑی کی جان لے لی چڑیل

نے۔''

ایک نسبتاً جوان عورت نے کہا۔''اکیلی مقبول کی بات نہیں ہے۔ پورے گھر کو کھا گئی ہے یہ۔''

تیسری بولی۔''ایسی کو تو عورت کہنا بھی عورت کے نام پر بٹا ہے۔ دوسرے دن خصم بدلتی ہیں ایسی کسبیاں۔ مقبول کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور یہ اس کے بندے کے ساتھ سونے کی تیاریاں کر رہی ہے۔''

''وہ بھی ایک نمبر کا جھنڈو (بیوقوف) ہے۔'' پہلے والی بڑبڑائی۔

نسبتاً جوان عورت نے کہا۔''کمینی! اگر تھوڑی سی بھی غیرت ہوتی ناں تجھ میں تو اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتی یا پھر کسی کھوہ میں چھلانگ لگا دیتی۔''

ایک عورت نے دور ہی سے شانی پر تھوک دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو مارنے پیٹنے کے لئے اندر تو آنا چاہتی ہیں لیکن اس کی نحوست سے ڈرتی بھی ہیں۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی اس پر لعن طعن کرتی رہیں۔ اتنے میں وہی باریش شخص دروازے پر نمودار ہوا جسے شانی نے ٹریکٹر ٹرالی پر دیکھا تھا۔ عورتیں دائیں بائیں اوجھل ہو گئیں اور وہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کے تعویذ تھے۔ ایک تعویذ کے کالے دھاگے کو شانی کی کمر کے گرد گرہ دینے کے بعد وہ نفرت انگیز سرگوشی میں بولا۔''اس کو گرانا مت..... نہیں تو تیرے بازو میں سوراخ کر کے اسے پرونا پڑے گا۔''

یہ کوئی دافع بلا قسم کے تعویذ تھے اور ان کا تعلق یقیناً شانی کی ''نحوست'' سے تھا۔

شانی نے وہ رات روتے سسکتے گزاری۔ مُنے کا خیال ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا۔ کس حال میں تھا۔ نہ جانے کیوں شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت صاحب اور اس کی بیبیاں بھی آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ ابھی تک اسے ان میں سے کسی کی صورت نظر نہیں آئی تھی لیکن اس کی چھٹی حس بار بار ان کی موجودگی کا اعلان کر رہی تھی۔

شانی کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بازو سے رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ سر کے زخم کا خون خود ہی بہہ بہہ کر بند ہو گیا تھا۔ ایک عورت اس کے کمرے میں کھانے کی چنگیر رکھ گئی تھی۔ اس میں انڈے کا آملیٹ، دہی اور پراٹھا تھا۔ یہ سب چیزیں ویسی کی ویسی ہی دھری رہیں۔ دس گیارہ بجے کا وقت تھا جب شانی کو مُنے کی پہلی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا رونا دردناک ہوتا گیا۔ اس کے رونے کی آواز سے ہی شانی جان گئی کہ وہ تکلیف میں ہے۔

شانی کو پتا تھا کہ وہ ابھی پوری طرح بیماری سے بحال نہیں ہوا ہے۔ کبھی کبھی اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس نے کوٹھی میں اس پر غلبہ پایا تھا۔ اسے تیز بخار ہو جاتا تھا۔ گردن کے پٹھوں میں کھچاؤ سا پیدا ہونے لگتا تھا اور اس کی باتوں میں ربط نہیں رہتا تھا۔

مُنے کی کیفیت کو محسوس کر کے شانی تڑپ اٹھی۔ مُنے کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ تکلیف میں تھا۔ شانی دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ ساتھ ساتھ پکار رہی تھی۔''دروازہ کھولو..... خدا کے لئے دروازہ کھولو۔''

اس کی آواز بے اثر ثابت ہوئی تو وہ کھڑکیوں کی طرف آ گئی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں پیٹنے لگی۔ شاید اس کی آواز مُنے تک بھی پہنچی تھی۔ وہ مزید شدت سے رونے چلانے لگا۔ ''تاتی..... تاتی'' اس نے پکار کر کہا تو شانی کا کلیجہ جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ اس کی ماں نہیں تھی لیکن اس کے لئے ماں جیسی محبت ہی محسوس کرتی تھی۔ بھابو کے جانے کے بعد تو وہ جیسے لاشعوری طور پر اسے اپنا بچہ ہی سمجھنے لگی تھی۔ وہ دیوانہ وار کھڑکیوں سے نبرد آزما ہو گئی۔ انہیں کھینچنے لگی، جھنجھوڑنے لگی۔ اس کے لمبے بال کھل گئے۔ اوڑھنی بکھرے ہوئے سینے سے ڈھلک کر فرش پر جا گری..... وہ بے حد کمزور اور بے بس تھی لیکن ان لمحوں میں کمزور و بے بس نہیں رہی تھی۔ وہ بس ایک ماں تھی اور اس کا بچہ اسے پکار رہا تھا جب بچہ درد کرب میں ڈوب کر اپنی ماں کو پکارتا ہے تو وہ ہر آہنی دیوار سے ٹکرا جاتی ہے۔ یہی ماں کی فطرت ہے، یہی قدرت کا قانون ہے۔

شانی نے اتنے ہیجانی انداز میں کھڑکیوں کو جھنجھوڑا کہ ان میں سے ایک کھڑکی کی چٹخنی اکھڑ گئی۔ شانی نے پٹ کھولا۔ دوسری طرف جالی یا گرل نہیں تھی۔ شانی نے چوکھٹ پر پاؤں رکھا اور پھلانگ کر باہر آ گئی۔ وہ مُنے کی آواز پر مقناطیس کی طرح کھنچ رہی تھی۔ مُنا ایک سامنے والے کمرے میں موجود تھا، ابھی وہ اس کمرے سے دور ہی تھی کہ ایک عورت اس کے سامنے آئی۔ اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ شانی نے اسے ایک لحظے میں پہچان لیا۔ یہ قدرت اللہ کی منجھلی بیوی عریسہ فراتی تھی۔

''کیا کر رہی ہو، کہاں جا رہی ہو؟'' عریسہ چلا کر بولی۔ اس کے لہجے میں حیرت آمیز خوف تھا۔

''پیچھے ہٹو۔'' شانی نے ہیجانی انداز میں کہا۔''مجھے میرے مُنے کے پاس جانے دو۔''

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایک دوسری آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چند خاص قسم کی اگربتیاں تھیں اور ان

میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ اسی کمرے سے نکلی تھی جہاں مُنا تھا۔ شاید وہ مُنے کی تکلیف کا علاج بہروپیے قدرت اللہ کے کسی ٹونے ٹوٹکے کے ساتھ کر رہی تھی۔ شانی کو یوں آزاد اور اپنے سامنے دیکھ کر صدف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ شاید اسے شانی سے اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی۔ بھابو کی موت سے چند لمحے پہلے شانی کا دھکا کھا کر صدف دیوار سے ٹکرائی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے صدف کا رنگ پیلا پڑا۔ پھر سُرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں شانی کے لئے حقارت اور نفرت نظر آنے لگی۔ اس نے اگربتیاں ایک طرف پھینک دیں اور شانی کا راستہ روکنے کے لئے تن کر کھڑی ہو گئی۔ شانی کے دل میں نفرت نہیں تھی۔ نہ اسے کسی سے لڑنا جھگڑنا تھا، وہ تو بس ایک ماں تھی اور اپنے روتے بچے تک پہنچنا چاہتی تھی......اور صدف ان دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔

شانی نے سسک کر کہا۔ ''خدا کے لئے..... مجھے مُنے کو دیکھنے دو۔''

صدف نے بے رحمی سے اسے دھکا دیا۔ شانی لڑکھڑا کر عریسہ پر گری۔ عریسہ نے عقب سے شانی کی گردن کو اپنے توانا بازو کے شکنجے میں لینا چاہا۔ شانی نے بے حد جھنجھلاہٹ سے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ صدف نے آگے بڑھ کر زناٹے کا تھپڑ شانی کے رخسار پر مارا پھر ایک دو ہتڑ شانی کو رسید کیا۔ غالباً وہ آج اس گزری ہوئی رات والا بدلہ بھی چکا دینا چاہتی تھی۔ دو ہتڑ کھا کر شانی، مُنے کی طرف ہی گئی۔

''خدا کے لئے..... مجھے جانے دو۔'' وہ پکاری۔

عریسہ اور صدف دونوں نے اسے کمر سے دبوچ لیا اور پیچھے کی طرف کھینچنے لگیں۔ ساتھ ساتھ وہ نوکرانیوں کو آوازیں بھی دے رہی تھیں۔ شانی جب کسی طرح آگے نہیں جا سکی اور مُنے کی آہ و فغاں نے اس کے سینے میں آتش بھڑکا دی تو وہ جھلا کر پلٹی اور اس نے عریسہ کو گھما کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ صدف ابھی تک اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی زمین پر گر گئیں۔ زمین پر گرنے سے پہلے ان دونوں کے جسم ایک کرسی سے ٹکرائے اور اسے توڑ کر رکھ دیا۔ زمین پر گرنے کے بعد شانی کے ہاتھ میں جو پہلی چیز آئی وہ اس ٹوٹی ہوئی کرسی کا ایک پایہ تھا۔ شانی نے اس پائے سے ڈاکٹر صدف کو کئی ضربیں لگائیں۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے...... مجھے جانے دو.....''

کمر اور کندھے پر شدید چوٹیں کھانے کے بعد صدف کی گرفت شانی پر سے ختم ہو گئی اب اس کی سوکن عریسہ کی باری آئی۔ لکڑی کی ضربوں سے اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ

خوف سے چیختی ہوئی ایک انواڑی کرسی پر گر گئی۔۔ تاہم اس دوران میں دو نوکرانیاں اندر داخل ہو گئیں۔ یہ صحت مند جسموں والی دیہاتی نوکرانیاں تھیں۔ انہوں نے شانی کو دبوچنا چاہا مگر انہیں بھی ویسی ہی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کمزور و ناتواں لڑکی ایک ''ماں کی تڑپ'' پانے کے بعد ناتواں نہیں رہی تھی۔ شاید وہ یہ جنگ جیت ہی جاتی اور ان عورتوں کو پچھاڑ کر مُنے تک پہنچ ہی جاتی مگر اس دوران میں ہٹی کٹی جالاں دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

جالاں کے تیور خطرناک تھے۔ اس کے چوڑے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ بڑے دنوں سے صبر کر رہی تھی۔ وہ بڑے دنوں سے اپنے غیظ و غضب کو دبا کر چھوٹی چوہدرانی کا احترام کرنے پر مجبور تھی لیکن آج تو میدان کھلا تھا۔ آج تو اس ناتواں لڑکی کی ہمدردی میں آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ دل کی حسرت نکال سکتی تھی۔ وہ شانی کے عقب سے نمودار ہوئی اور اس نے شانی کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دروازے سے ٹکراتی ہوئی زمین بوس ہو گئی.... شانی کا گرنا اس کے لئے قیامت ثابت ہوا۔ صدف، عریسہ، دونوں نوکرانیاں اور جالاں ساری بھڑوں کی طرح اس سے چمٹ گئیں۔ چند سیکنڈ بعد شانی نے محسوس کیا کہ بھاری بھرکم جالاں اس کے سینے پر چڑھی بیٹھی ہے اور بڑی وحشت سے اس کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اس کے منہ سے شانی کے لئے بدترین صلواتیں نکل رہی تھیں۔ شانی کا ذہن دھندلانے لگا۔ اس کا جسم تو پہلے ہی ضربوں سے چُور تھا اب سانس بھی سینے سے بچھڑنے لگی۔

دھوتی کُرتے والی ایک اور موٹی تازی نوکرانی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں نمک مرچ کوٹنے والا ڈنڈا تھا۔ غالباً وہ یہ ڈنڈا ہتھیار کے طور پر لائی تھی لیکن اس کے پہنچنے تک بازی الٹ چکی تھی۔ شانی نے زور لگا کر جالاں کو اپنے سینے سے ہٹانا چاہا مگر وہ گوشت کی پہاڑی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ چند لمحے بعد جالاں کی ہانپتی ہوئی آواز شانی کے کانوں میں پڑی، وہ قدرت اللہ کی بیوی کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔ ''بی بی صاحبہ، آپ جائیں۔ اپنا حرج نہ کریں۔ آج تو ہم پھولن دیوی کی ساری اکڑ اس کی ناک کے رستے نکال دیں گے۔ ایک دم تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔''

کچھ دیر بعد شانی نے صدف اور عریسہ کو دروازے سے باہر جاتے دیکھا۔ جالاں کے کہنے پر ایک عورت نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ جالاں نے شانی کے سینے پر چڑھے چڑھے کئی طمانچے اس کے منہ پر مارے پھر ایک عورت سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''رشیداں! کپڑے اتار دے اس حرامجادی کے.....ایک تار نہ رہے اس کے پنڈے پر۔''

پھر وہ دوسری عورت کو مخاطب کر کے بولی۔ ''شاہدہ! تُو ایک چارپائی سے رسی کھول کر لا۔ آج رات بھر اس کو چھت سے الٹا نہ لٹکایا تو جالاں نام نہیں میرا۔''

شاہدہ نامی عورت شتابی سے باہر نکل گئی۔ تنومند رشیداں شانی کے کپڑے پھاڑنے کے لئے آگے بڑھی۔ شانی گوشت کی پہاڑی کے نیچے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی گردن پر جالاں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اسے لگتا تھا کہ گردن ہلائی بھی تو ٹوٹ جائے گی۔

پھر شانی کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر ساتھ والے کمرے کی کھڑکی پر پڑی۔ اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ جالی کے ساتھ مُنا چپکا ہوا تھا۔ وہ ناقابلِ بیان کرب کے ساتھ رو رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھیں اپنی ''تاتی'' کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ''تاتی'' جو دشمنوں کے درمیان یکسر بے آسرا اور بے بس تھی۔ رشیداں نے پہلے دائیں طرف سے شانی کی قمیص پھاڑی پھر اس کے ہاتھ زیریں لباس کی طرف بڑھے۔ یہ سب کچھ شانی کے لئے اذیت ناک تھا لیکن اس سے بھی اذیت ناک بات یہ تھی کہ اسے ایک چہرہ نظر آیا...... یہ ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔

شانی نے پوری آنکھیں کھول کر اس چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اس کے ڈوبتے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے شناخت کر لیا۔ یہ بابر تھا۔ وہی جس نے کچھ دن پہلے درختوں کے جھنڈ میں برستی بارش کے دوران میں شانی سے زبردستی کی کوشش کی تھی۔ بعدازاں وہ چوہدری بشیر کے عتاب کا شکار ہوا تھا۔ اس کی لاش نابود کرنے کے لئے قیمہ کوٹنے والی مشین لائی گئی تھی۔ شانی تب بابر اور اس کی موت کے درمیان دیوار بنی تھی۔ یہ سب باتیں ایک سیکنڈ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئیں۔

بابر کی گھنی مونچھیں کھڑکی سے داخل ہونے والی روشنی میں دمک رہی تھیں۔ اس کے کرخت چہرے پر بیس بائیس روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ عجیب نظروں سے شانی کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ ایک دشمن کی نظریں تھیں لیکن...... ان میں دشمنی کے سوا بھی کچھ تھا...... وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اندر آیا تو شانی سے چمٹی ہوئی بے رحم عورتیں ساکت ہو گئیں۔ جالاں نے شانی کی گردن پر گرفت قائم رکھی تاہم وہ اس کے سینے سے اُتر آئی۔

بابر کی بھاری آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''چلو، دفع کرو اسے بہت ہو چکی اس کے ساتھ۔''

''پر چوہدری جی! اس سؤرنی نے مارا ہے حضرت صاحب کی بیبیوں کو...... اتنا شور شرابا مچایا ہے کہ کچھ نہ پوچھیں جی۔''

''مجھے پتا لگ گیا ہے۔ سب کچھ...... یہ اپنی بیڑی میں خود وٹے ڈال رہی ہے پر ابھی اسے لے جا کر کمرے میں بند کرو۔ شام کو اس کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔''

''لیکن......''

''تمہیں کہا ہے ناں، ابھی جا کر اسے کمرے میں بند کرو۔'' بابر نے تیزی سے جالاں کی بات کاٹی۔

جالاں نے بادلِ نخواستہ شانی کی گردن چھوڑ دی۔

''مم...... مجھے مُنے سے ملنے دو۔ خدا کے لئے مجھے ملنے دو۔'' شانی نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں کہا۔ وہ ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔

بابر کے چہرے پر چند لمحے کے لئے تذبذب کے آثار نظر آئے، پھر وہ بیزار لہجے میں بولا۔ ''ابھی اسے کمرے میں لے جاؤ۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے۔''

''نہیں، میں اس طرح نہیں جاؤں گی۔ مجھے مُنے کو دیکھنے دو۔'' شانی اَڑ گئی۔ کچھ دیر تک یہ کشمکش جاری رہی پھر بابر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اسے لے آتا ہوں۔ مگر اسے دیکھ کر تم کو اپنے کمرے میں واپس جانا ہوگا۔''

شانی نے آنسو بہاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

منا اب کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ شاید اسے ہٹا لیا گیا تھا۔ بابر لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی چار پانچ منٹ بعد ہوئی۔ مُنا اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اب اونگھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شانی کو اندازہ ہوا کہ خبیث صدف نے اس کا رونا بند کرنے کے لئے اسے کوئی ''ٹرینکولائزر'' دے دیا ہے۔ اس نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور شانی کو دیکھ کر سسکنے لگا۔ شانی نے فرش پر بیٹھے بیٹھے اس کا منہ چوما، ہاتھ چومے، پاؤں چومے۔ اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ بس تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گیا۔ بابر کے اشارے پر جالاں نے اسے شانی کی گود سے کھینچا اور واپس لے گئی۔

کچھ بھی تھا۔ ایک ''ماں'' کی تڑپ بچے تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی۔ شانی کو دوبارہ اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اسی روز دوپہر کو کمرے کی تمام کھڑکیوں کی چٹخنیاں بھی تبدیل کر دی گئیں۔

☆======☆======☆

اگلے دو تین روز شانی نے اسی کمرے میں گزارے۔ یہ کچی دیواروں، کچے فرش اور نیچی چھت والا ایک خالص دیہاتی کمرہ تھا۔ بجلی چوبیس گھنٹے میں بس آٹھ دس گھنٹے ہی آتی

تھی۔ رات کو اکثر لالٹین روشن کرنا پڑتی تھی۔ جالاں شانی کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک گہرا نیل تھا۔ یہ اسی دھینگا مشتی کی نشانی تھا جو اس روز مُنے تک پہنچنے کے لئے ہوئی تھی۔ اس دن کے بعد جالاں نے شانی کو ہاتھ نہیں لگایا تاہم اس کی آنکھیں شانی پر مسلسل قہر برساتی رہتی تھیں۔

شانی کو چوبیس گھنٹے میں بس شام کے بعد تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے نکالا جاتا تھا۔ یہ ایک درمیانے سائز کا حویلی نما مکان تھا۔ کھلے احاطے میں مویشی اور گھوڑے وغیرہ موجود تھے۔ کہیں پاس سے ہی ڈیزل انجن کی کوکو بھی سنائی دیتی رہتی تھی۔ اس دن کے بعد بابر نظر نہیں آیا تھا۔ ہاں تاؤ حشام کی جھلک ایک بار شانی نے ضرور دیکھی تھی۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، داڑھی منڈھی ہوئی تھی اور پہلے دن کی نسبت صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ یہ وحشی بلی مار اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرنے والا تھا؟ اس سوال کا جواب سوچ سوچ کر شانی کا دماغ شل ہو گیا تھا۔ شانی کو سب سے زیادہ پریشانی مُنے کے سلسلے میں تھی۔ وہ ابھی تک حویلی میں ہی تھا مگر شانی کو اس کی شکل نظر آتی تھی اور نہ آواز سنائی دی تھی۔

یہ چوتھے دن کا ذکر ہے، شانی کو ڈولا نظر آیا۔ وہ عجیب حلیے میں تھا۔ اس نے چولی اور گھگھرا پہن رکھا تھا، ہاتھوں میں چوڑیاں اور ناک میں نتھنی تھی۔ اپنی مردانہ شباہت اور چھوٹے چھوٹے بالوں کے ساتھ وہ مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ وہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا۔ دونوکرانیاں اس کے ساتھ آئی تھیں، انہوں نے حسب معمول دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

ڈولے کا چہرہ معمول کے مطابق مسکراتا ہوا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ خداداد مسکراہٹ تھی جو مستقل طور پر اس کے چہرے سے چمٹی رہتی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ ٹرے میں شانی کے لئے گوشت گوبھی کا سالن اور تندوری روٹیاں لے کر آیا تھا۔

شانی نے کہا۔ ”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے ڈولے؟“

”میں نے خود تھوڑی بنایا ہے۔ انہوں نے بنا دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں یہ کپڑے پہن کر شرمندہ ہو جاؤں گا۔ منہ چھپانے لگوں گا لیکن آپ کو پتا ہے باجی جی...... میں اس قسم کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا، ڈانس کر کے دکھاؤ، میں نے وہ بھی دکھا دیا، پھر کہنے لگے، قلابازیاں لگا کر دکھاؤ، میں نے وہ بھی لگا دیں۔ آپ کو پتا ہی ہوگا میں سرکس میں کام کرتا رہا ہوں۔“

”نہیں، مجھے تمہارے بارے میں بہت کم پتا ہے۔“

”چلیں، اب چل جائے گا جی۔ میں اب ایک دو دن آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ آپ کو بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ تھوڑا سا کھانا کھائیں۔“ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ٹرے شانی کی طرف کھسکاتے ہوئے بولا۔

شانی نے نفی میں سر ہلایا تو ڈولے نے کہا۔ ”دیکھیں باجی جی اگر آپ نے کھانا نہ کھایا تو پھر میرا یہاں آنا بالکل بے کار ہوگا اور آپ جانتی ہیں کہ بے کار بندے کی بات کوئی نہیں مانتا۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آپ نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ کل ساری رات آپ روتی بھی رہی ہیں۔ اس طرح تو آپ اپنا نقصان کرلیں گی۔ میں نے کل وڈے چوہدری سے کہا تھا کہ اگر آپ مجھے باجی جی کے پاس رہنے دیں تو میں انہیں کھانا کھلاؤں گا اور ان کا رونا دھونا بھی بند کرادوں گا۔ اب آپ سوچ لیں۔ اگر تھوڑا سا کھانا کھالیں گی تو میری عزت رہ جائے گی اور یہ امید بھی پیدا ہو جائے گی کہ یہ لوگ مجھے آپ کے ساتھ رہنے دیں۔“

دو چار منٹ میں ڈولے نے شانی کو قائل کرلیا۔ اس نے خود پر جبر کر کے چند لقمے لئے اور پانی پیا۔ اس کے بعد شانی کی زبان پر سب سے پہلا سوال مُنے کے بارے میں ہی آیا۔ ڈولے نے شانی کو بتایا۔ ”بچہ اس حویلی میں ہے لیکن اب ایک دوجے کمرے میں ہے۔ دو دن پہلے آپ نے اس کی آواز سن کر کھڑکی توڑ دی تھی۔ اب وڈے چوہدری جی نہیں چاہتے ہوں گے کہ اس کی آواز آپ کے کانوں تک آئے۔“ وڈے چوہدری سے ڈولے کی مراد تاؤ حشام ہی تھا۔

”وہ اب کیسا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”اب ٹھیک ہو رہا ہے۔ بخار بھی اُتر رہا ہے۔ دن میں ایک دو بار ضد پر اُتر آتا ہے۔ آپ کو آوازیں دیتا ہے پر زیادہ نہیں روتا۔ جلد ہی سو بھی جاتا ہے۔ شاید وہ ڈاکٹرنی اس کو کوئی دوا شوا دے دیتی ہے۔“

”کون ڈاکٹرنی؟“

”وہی...... آپ نے مار مار کر جس کے کھنے سینک دیئے تھے۔ اس کی سوکن بھی نیل و نیل ہو گئی تھی۔“

”وہ دونوں یہیں پر ہیں؟“

''ہاں جی! ایک مرید بھی ہے ان کے ساتھ وہی گول منہ اور داڑھی والے۔ پتا چلا ہے کہ وہ بھائی صاحب بھی کل پرسوں تک یہاں آرہے ہیں جن کو حضرت صاحب کہا جاتا ہے۔ یہاں تو بڑی قدر ہے جی ان حضرت صاحب کی۔ پتا نہیں کہ پہلے سے تھی یا اب ہوگئی ہے۔ ہر کام حضرت صاحب سے یا ان کی بیبیوں سے پوچھ کر کیا جاتا ہے۔ اب بھی جب میں یہاں آرہا تھا تو وہ دونوں جالاں کو پلنگ پر لٹا کر اس کے ساتھ اللہ جانے کیا کر رہی تھیں۔

''کیا کر رہی تھیں؟''

''وہ جی، جالاں کو پیٹ پر پھر وہی ساڑ سا نکل آیا ہے۔ اب تو اس کی ٹانگوں پر بھی ہے اس لئے تو وہ آج آپ کو کھانا دینے بھی نہیں آئی ہے۔ بڑی جلن پڑ رہی تھی اس کو۔ پلنگ پر پھنسنے کی طرح ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی۔ اللہ معاف کرے، بالکل وہی حالت ہو رہی ہے جو چوہدری بشیر صاحب کی تھی۔''

شانی کے لئے یہ اطلاع سنسنی خیز تھی۔ اس کا دھیان چوہدری بشیر کی طرف چلا گیا جب قادرا اور تاؤ حشام وغیرہ اسے مرید کے سے اٹھا کر لائے، چوہدری بشیر بُری طرح بیمار تھا۔ اگلے روز لاہور میں اس کے ٹیسٹ وغیرہ ہونے تھے۔ خبر نہیں تھی کہ اب وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اس نے شانی کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا تھا مگر وہ پھر بھی اسے یاد کر رہی تھی۔ اس کی صحت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''چوہدری بشیر کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟'' شانی نے ڈولے سے پوچھا۔

ڈولا اپنی کلائی کی چوڑیوں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ ''کل چوہدری حشام صاحب آئے تھے۔ اپنے ایک بندے سے بات کر رہے تھے۔ تھوڑی سی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی وہ شاید کہہ رہے تھے کہ بشیرے کو لاہور کے ہسپتال بھیج دیا ہے۔''

شانی نے ڈولے کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ چوہدری حشام آئے تھے..... کیا وہ یہاں نہیں رہتے ہیں؟''

ڈولا اپنی آواز مزید دباتے ہوئے بولا۔ ''جی نہیں! وہ کہیں اور رہتے ہیں۔ یہاں تو بس انہوں نے دو تین بار چکر لگایا ہے۔ یہاں ان کا ایک پتر رہتا ہے۔ زیادہ عمر کا نہیں ہے بس پندرہ سولہ سال کا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ چرس کا نشہ کرتا ہے۔ وہ حویلی کے دوسرے حصے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔''

''بیوی کے ساتھ؟ تم تو کہہ رہے ہو کہ پندرہ سولہ سال کا ہے؟''

''بیوی بھی تو زیادہ بڑی نہیں ہے۔ بس گُڈی سی ہے میں نے بس دور ہی سے ایک بار

دیکھا ہے مجھے تو وہ ''اُس بازار'' کی ہی لگی ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ نکا کے سرخی پاؤڈر لگایا ہوا تھا۔ رات کو حویلی کے اس حصے سے چھم چھم ناچنے کی آواز بھی آتی ہے۔''

''مجھے تو کبھی آواز نہیں آئی۔'' شانی نے کہا۔

''لیکن مجھے آجاتی ہے۔ میرے کان کافی تیز ہیں۔'' ڈولے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شانی کو یاد آیا جب قادرے اور تاؤ حشام وغیرہ سے بچنے کے لئے وہ اور ڈولا نالے کے کنارے سرکنڈوں میں گھس گئے تھے تو ڈولے نے نہ جانے کتنے فاصلے سے ٹریکٹر کی آواز سن لی تھی اور شانی کو پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کی سونگھنے کی حس بھی قابل ذکر تھی۔ شمائلہ کے گھر میں وہ ہانڈی کے جلنے یا لگنے کی بو ابتدائی مرحلے میں چھت پر سے سونگھ لیتا تھا۔ غالباً قدرت نے اس کا ''قد'' لے کر بدلے میں کچھ دیگر صلاحیتیں عطا کر دی تھیں۔ وہ عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ موجودہ حالات میں شانی غم کے اتھاہ اندھیرے میں تھی۔ مار پیٹ کے سبب اس کا سارا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا۔ آنکھیں اکثر رستی رہتی تھیں کچھ بھی..... ہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر ڈولے کی آمد اسے بُری نہیں لگی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ڈولے کے ذریعے اسے اردگرد کے حالات کا کچھ علم ہو رہا تھا۔ ڈولے کے ذریعے شانی کو دو اہم ترین باتوں کا پتا چلا۔ پہلی یہ کہ جالاں پر پھر ''جلدی بیماری'' کا حملہ ہوا تھا اور دوسری یہ کہ قدرت اللہ یہاں تاؤ حشام کے ڈیرے پر قدم رنجہ فرمانے والا تھا۔

قدرت اللہ کی بیویوں سے ہاتھا پائی کرنے کی سزا جالاں نے شانی کو جی بھر کر دی تھی۔ اگر بابر درمیان میں نہ آتا تو وہ پتا نہیں کس حد تک جاتی مگر ابھی بھی اس سزا کو ختم تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اصل صورت حال تو قدرت اللہ کے آنے کے بعد ہی واضح ہونا تھی۔ ڈولا اور شانی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں کے دوران پتا نہیں کیوں شانی کو چوہدری بشیر سے آخری ملاقات یاد آتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ چپکے ہوئے موبائل فون اور گولی کا خیال بھی ذہن میں آتا رہا، پھر شانی کے مضروب بازو اور کندھوں میں درد ہونے لگا۔ وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے پلنگ پر لیٹ گئی۔ ڈولا چادر بچھا کر کچے فرش پر دراز ہو گیا۔ ڈولے کے ہر انداز میں بے ضرر سی بے تکلفی تھی۔ پندرہ بیس منٹ اسی طرح گزرے پھر ایک دور افتادہ آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ کوئی شخص حویلی سے باہر گاؤں کی گلی سے گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کی پُرسوز آواز دوپہر کی خاموشی میں تیر رہی تھی۔

میریاں گلاں یاد کریں گی

رو رو کے فریاد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آواں گا

اس گداز آواز نے شانی کا دھیان رستم کی طرف موڑ دیا۔ اس کا خیال آتے ہی شانی کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ کہاں تھا؟ کیا وہ کبھی اسے دیکھ سکے گی؟ اگر اس نے موت کی سرحد پار نہیں کی تھی اور ابھی زندہ تھا تو کیا کبھی وہ اس کے سامنے آئے گا؟ اگر وہ اس کے سامنے آیا تو وہ کیا کرے گی؟ ایسی تو ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو کسی کی چھوٹی سی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھی تھی پھر اس سے ایسا کیونکر ہوا تھا۔ شاید یہ جو کچھ کیا تھا "محبت" نے کیا تھا۔ محبت جو نام ہی تپتے صحراؤں میں ننگے پاؤں چلنے کا ہے۔ محبت کڑے امتحان لیتی ہے۔ سخت ترین آزمائشوں سے گزارتی ہے مگر صلہ بھی تو دیتی ہے۔ یہ کیسی آزمائش تھی کہ آزمائش سے گزرنے والا ہی باقی نہیں رہا تھا۔

"اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا مجھ سے۔"

پچھتاوے کے آتشیں آنسو اس کے رخساروں پر پھیلنے لگے۔ چوہدری بشیر کی سلامتی کا سوچتے سوچتے اس نے اس شخص کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا جو بے لوثی میں اپنی مثال آپ تھا۔ جو قدم قدم پر اس کے لئے دلفگار دکھ سہتا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ جانکاہ منظر شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگا جب رستم ایک خالی پستول کے ساتھ خونخوار ملی ماروں کے [illegible] تھا اور جان کنی کے عالم میں آخری مزاحمت [illegible]

یہ اس سے اگلے دن کا واقعہ ہے۔ شانی کو اپنے اردگرد ہلچل محسوس ہوئی۔ ڈولے نے کہا
"باجی بی! مجھے لگتا ہے کہ حضرت صاحب آ گئے ہیں۔"

شانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ خود کو آنے والی ساعتوں کے لئے تیار کرنے لگی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس بہروپیے عامل کی طرف سے اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ قریباً ایک گھنٹہ سخت تناؤ میں گزارا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ قدرت اللہ جالاں کا معائنہ کرنے میں مصروف ہے۔ بالآخر قدموں کی چاپ سنائی دی پھر دروازہ کھلا اور شانی کو تاؤ حشام کی بھیانک شکل نظر آئی۔ اس کے ساتھ قدرت اللہ تھا۔ وہ پتلون کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وہ کسی بھی زاویے سے عامل یا پیر فقیر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود اسے ماننے والے اس پر اندھا اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ دونوں کمرے کے وسط میں کھڑے ہو گئے۔ قدرت اللہ کے ایک مرید نے ڈولے کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ شانی ڈری ہوئی پلنگ کے بازو پر بیٹھ گئی۔ تاؤ حشام کڑک کر بولا۔ "کتے کی بچی کس شان سے پلنگ

پر چڑھی بیٹھی ہے۔ نیچے اتر... نیچے اتر۔"
اس نے شانی کو کھینچ کر فرش پر پٹخ دیا۔

قدرت اللہ نے تاؤ کو روکنے کی ادھوری کوشش کی پھر توجہ سے شانی کو دیکھنے لگا۔ شانی لرزاں و ترساں سر جھکائے فرش پر بیٹھی رہی۔ قریباً ایک منٹ کے مراقبے کے بعد قدرت اللہ کی سپاٹ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ تاؤ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ "اس پر نحوست کے سائے ہیں۔ آپ اس سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔"

"یہ نحوست کیسے دور ہو گی حضرت جی؟"

"یہ نحوست شاید اس بے چاری کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہے۔ ہم اس کو مکمل طور پر تو ختم نہیں کر سکتے ہیں۔ ہاں اس کے اثر کو گھٹا ضرور سکتے ہیں۔" وہ حسب عادت نگاہ جھکائے جھکائے بولا۔

"گھٹاؤ حضرت جی...... ضرور گھٹاؤ۔" تاؤ حشام نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد قدرت اللہ اور تاؤ حشام آگے پیچھے باہر نکل گئے۔ شانی فرش پر بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہاتی [illegible] ...... تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا۔

[illegible] تھوڑی دیر پہلے ہی کی نورانی رشیداں آئی اور اس نے ڈولے کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ ڈولے کے باہر جاتے ہی دو تنومند افراد اندر آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں تو چمکتی ہوئی لاٹھی تھی، دوسرے کے کندھے پر کاربین جھول رہی تھی۔ ان افراد کے اندر آنے کی وجہ چند ہی سیکنڈ بعد شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ موٹی مریدنی نے شانی کو قریب پڑی چارپائی پر لیٹنے کا حکم دیا۔ شانی نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو رائفل والے نے آنکھیں نکالیں۔ "بی بی! جو کچھ کہہ رہے ہیں اسی طرح کر۔ نہیں تو ہم دوسرا طریقہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ چار و ناچار وہ بان کی چارپائی پر سیدھی لیٹ گئی۔

شانی نے حکم مان لیا تو موٹی تازی مریدنی کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا۔ وہ بولی۔ "گھبرا نہ بی بی... تیرے ساتھ کوئی ظلم زیادتی نہیں کر رہے۔ علاج کرنے لگے ہیں تیرا۔"

"کیسا علاج؟"

"دیسی علاج...... جونکیں لگانی ہیں تجھے۔"

"جونکیں؟ وہ کیوں؟"

"بی بی! تُو نے ساری عمر پنڈ میں گزاری ہے۔ تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ جونکیں کیوں

لگاتے ہیں۔ بندے کے اندر جو گندا خون ہوتا ہے، جونکیں چوس لیتی ہیں۔ بندے کا روگ کٹ جاتا ہے۔''

شانی اسے کیسے بتاتی۔ وہ بیمار نہیں ہے۔ بیمار تو وہ لوگ خود ہیں۔ ٹونے ٹوٹکوں اور جھاڑ پھونک کو اپنا ایمان بنا کر زندگی برباد کر رہے ہیں مگر یہ بحث کا موقع نہیں تھا۔ وہ مفتوح تھی اور فاتح کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہی عین حقیقت ہوتی ہے۔

باریش شخص کے ہاتھ میں رسی کے دو ٹکڑے تھے۔ مریدنی نے شانی کے دونوں بازو چارپائی کے دونوں بازوؤں کے متوازی رکھے اور رسی کے ٹکڑوں کو بان کے اندر سے نکال کر شانی کی دونوں کلائیاں چارپائی کے دونوں بازوؤں سے باندھ دیں۔ ازراہِ مہربانی شانی کا دوپٹا شانی کے بدن پر درست کر دیا گیا۔ اس کے بعد شانی نے جو منظر دیکھا وہ بڑا لرزہ خیز تھا۔ دو افراد اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں درمیانے قد کے تھے اور گول مٹول نظر آتے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور جسم کالے بھجنگ تھے۔ لباس کے نام پر ان کے جسموں پر فقط سفید لنگوٹ نظر آتے تھے۔ ان کی عمریں بیس پچیس کے درمیان ہوں گی۔ وہ کافی حد تک ہم شکل بھی تھے۔ اس بات کا پتا شانی کو بعد میں چلا کہ وہ تو جڑواں بھائی ہیں۔ ان کے حوالے سے کراہت آمیز چیز یہ تھی کہ ان کے چہروں اور جسموں پر چھوٹے بڑے مہاسے نظر آتے تھے۔ وہ دونوں شانی کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور اس مرتبہ حضرت قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ نقاب میں تھا اور فقط آنکھیں دکھائی دیتی تھیں ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس کی آنکھوں میں شانی کے لئے سرد مہری اور غصہ تھا۔ شانی کو اس کے ہاتھ میں ایک نشتر اور سپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی نظر آئی۔

''یہ .... یہ کیا کر رہے ہو تم میرے ساتھ؟'' شانی کسمسائی۔

''آرام سے لیٹی رہو۔'' فربہ اندام مریدنی نہایت کرخت آواز میں بولی۔ ''جو کچھ تُو کر چکی ہے اس کے بدلے میں تیری کھال بھی اتار دی جائے تو کم ہے۔ ہم تو تیرا علاج کر رہے ہیں۔''

رائفل بردار کے تیور بھی خطرناک نظر آنے لگے تھے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اس نے مزاحمت کی تو شاید مریدنی مار پیٹ پر آمادہ ہو جائے گی۔ صدف آگے بڑھی تو اس نے تحکم سے کہا۔ ''مٹھی بند کرو۔''

شانی نے اپنے لرزتے ہاتھ کی مٹھی بند کی۔ صدف نے بڑی مہارت کے ساتھ شانی کی

کلائی کی ایک شریان کاٹ دی۔ خون ابلنے لگا۔ جڑواں بھائیوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے ہولناک انداز میں اپنے سیاہ ہونٹ شانی کی زخمی کلائی پر رکھ دیئے۔ وہ بڑے اطمینان سے شانی کا خون چوسنے لگا۔

اسی دوران میں صدف دوسری کلائی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہاں بھی وہی عمل دہرایا گیا اور دوسرے شخص نے اس کلائی کے زخم پر منہ رکھ دیا۔ شانی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر خاموش تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اپنے جسم پر سے اس کی ''ملکیت'' ختم ہوگئی ہے۔ یہ اب ان لوگوں کا جسم ہے جنہوں نے اسے فتح کیا ہے۔ وہ اب اپنی مرضی سے اسے توڑ مروڑ رہے ہیں۔

مریدنی شانی کے پاؤں کی طرف کھڑی ہوگئی تھی اور ہونٹوں میں مسلسل کچھ بدبدانے لگی تھی۔ رائفل بردار ایک طرف رکھے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ صدف اپنا کام کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔ توام بھائیوں کی طرف خون چوسنے کا عمل جاری رہا۔ وہ بڑی رغبت سے خون کو اپنے منہ میں جمع کرتے اور پھر گھونٹ بھر لیتے تھے۔ ایک دوبار انہوں نے باقاعدہ ڈکار بھی لی۔ وہ خون چوسنے کے عمل میں ماہر نظر آتے تھے۔ ان کے بھدے ہونٹ دونوں شریانوں سے چپکے ہوئے تھے اور سانس ان کے نتھنوں سے آجا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے قدرت اللہ کی مریدنی نے جن جونکوں کا ذکر کیا تھا، اب شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ''جونکیں'' یہی دونوں بھائی تھے۔

یہ خونی عمل قریباً آدھ گھنٹہ جاری رہا۔ شانی کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے ایک ہلکی سی غنودگی اس کی پلکوں کو بوجھل کرنے لگی۔ شاید وہ مر رہی تھی مگر مرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی اتنی آسانی سے اسے کوئی نہیں مرنے دے گا۔ بالآخر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور صدف اندر داخل ہوئی۔ اس کے آتے ہی موٹی تازی مریدنی نے اپنا وظیفہ بند کر دیا۔ خون آشام ''جونکوں'' میں سے ایک نے اپنے جان لیوا ہونٹ شانی کی نازک کلائی پر سے ہٹا لئے۔ صدف نے اس کلائی پر کسی پاؤڈر کا چھڑکاؤ کیا پھر دوا میں بھیگی ہوئی تھوڑی سی روئی رکھی اور کس کر پٹی باندھ دی۔ تب وہ دوسری کلائی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

دونوں انسانی جونکوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ آنکھوں میں نشہ سا تھا۔ اپنے خون آلود ہونٹ پونچھتے اور شانی کو بھوکی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ دونوں موٹی مریدنی کے ساتھ باہر چلے گئے۔ وہ جب تک کمرے میں رہے تھے، ان کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مریدنی واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ جوس سے بھرا ہوا جگ تھا۔ ''لو یہ مسمی کا جوس پی لو۔'' اس نے شانی کو اٹھا کر بٹھاتے ہوئے

کہا۔

شانی کو چکر سا آ گیا۔ یوں لگا جیسے وہ دوبارہ چارپائی پر گر جائے گی۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ مریدنی نے اصرار کے ساتھ اسے جوس پلایا۔ قدرے ہمدرد لہجے میں بولی۔

''حضرت صاحب کا یہ عمل کوئی ایسا ویسا نہیں ہے۔ بڑے بڑے روگ کٹتے ہیں اس عمل سے۔ دیکھنا تیرے اندر کا سارا میل کچیل بھی ڈھل جائے گا۔ ایک آدھ بار تھوڑی سی تکلیف ہوگی اس کے بعد بالکل ہلکی پھلکی ہو جائے گی تُو۔''

شانی نے چونک کر مریدنی کی طرف دیکھا۔ مریدنی کی بات سے اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ خونی عمل یہیں پر ختم نہیں ہوگا۔ ابھی اسے ایک دو بار مزید اس خونخواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☆======☆======☆

رات نیم سرد اور تاریک تھی۔ دور کہیں گاؤں کے کسی کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا۔ گاؤں کی شمالی جانب آوارہ کتوں کا کوئی بہت بڑا گروہ رات کے گشت میں مصروف تھا اور گاہے بگاہے بے طرح شور مچانے لگتا تھا۔ کچے کمرے میں لالٹین کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ شانی پلنگ پر تھی۔ ڈولا نیچے کچے فرش پر روئی کا گدیلا بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ گاؤں کی گلی سے کوئی دل جلا گاتا ہوا گزر گیا۔

میریاں گلاں یاد کریں گی
رو رو کے فریاد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آواں گا

شانی محویت سے سنتی رہی۔ اچانک ڈولے کی آواز نے شانی کو چونکا دیا۔ ''باجی جی! میری بات کا بُرا تو نہیں مانیں گی؟''

''کیا بات ہے؟''

''باجی جی! مجھے لگتا ہے، آپ کسی سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بہت زیادہ محبت۔''

''کیا مطلب؟''

''باجی جی! آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ، آپ کی آواز۔ یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ آپ نے...... آپ نے کہیں چوٹ کھائی ہے۔ بہت گہری چوٹ۔''

شانی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تاہم اس نے اپنی کیفیت چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ سنجیدگی سے بولی۔ ''فضول باتیں مت کرو۔''

ڈولے نے جھجکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''باجی جی! کیا آپ واقعی کسی سے محبت نہیں کرتیں؟''

''کرتی ہوں...... اس بچے کے ساتھ جو میرے ساتھ یہاں آیا ہے۔ میری اس میں جان ہے اور اس کی جان شاید مجھ میں ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جو مجھے جان سے پیارے ہیں۔''

''نہیں باجی جی! میں اور طرح کی محبت کی بات کر رہا ہوں۔ وہ محبت جو باقی ساری محبتوں سے وکھری ہوتی ہے۔''

''ڈولے تم بیکار کی باتیں کر رہے ہو۔'' شانی نے بیزاری ظاہر کی۔

''باجی جی! میں بھی ان باتوں کو بیکار ہی سمجھا کرتا تھا۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی سوچتا تھا کہ پیار شیار کوئی شے نہیں۔ یہ بس دودھ کا ابال ہے ختم ہو جاتا ہے لیکن پھر پتا چلا کہ ایسا نہیں ہے۔''

شانی نے غور سے ڈولے کو دیکھا۔ زنانہ کپڑوں میں، ساڑھے تین فٹ کا معمولی شکل و صورت والا بونا، جس نے شاید میٹرک تک بھی نہیں پڑھا تھا فلسفیوں کی طرح بات کر رہا تھا۔ اس کی شکل پر عجیب سی معصومیت تھی اور اس معصومیت میں دھیما سا کرب تھا۔ شانی کو اس کی بات میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم نے کسی سے محبت کی ہے۔''

اس نے ایک لمبی آہ کھینچی، اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو بالوں پر پھیرا اور بولا۔

''محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے باجی جی! جرم تو یہ ہے کہ بندہ محبت کو بدنام کرے، اس کا تماشا بنائے۔''

''کون ہے وہ؟'' شانی نے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ''ایک لڑکی ہے جی پر میری طرح اپنا آدھا قد آسمان پر نہیں چھوڑ آئی ہے۔ اونچی لمبی خوبصورت ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کبھی مجھے نہیں مل سکتی لیکن سیانے کہتے ہیں ناں جی کہ جو شے مل نہ سکے اس سے اور بھی زیادہ محبت ہوتی ہے۔'' لگتا تھا ڈولا خود بھی شانی کو بہت کچھ بتانا چاہتا ہے۔

رات لمبی اور خاموش تھی۔ شانی نے ڈولے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں شانی کو اپنی زندگی کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا۔

ڈولے کے والد امام مسجد تھے اور بہت اللہ لوک قسم کے شخص تھے۔ ان کی وفات کے

بعد ڈولے کے چچا نے اس کی پرورش کی۔ ڈولے کے چچا کی رہائش ملتان میں تھی۔ ملتان سے فلم انڈسٹری کو بڑے بڑے لوگ ملے ہیں۔ ڈولے کو بھی فلموں میں آنے کا شوق چرا گیا تھا اس نے کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ وقتی طور پر سرکس چلا گیا۔ ملتان کی ایک متوسط آبادی احمد نگر میں ڈولے کے چچا کا گھر تھا۔ اس گھر کے ساتھ ہی نئے کرائے دار رہنے کے لئے آئے۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام سنبل اور چھوٹی کا کوکب تھا۔ پتا نہیں ڈولا کیسے بڑی لڑکی سنبل کے تیرِ نظر کا شکار ہو گیا۔ وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگا لیکن یہ خاموش محبت تھی اور یک طرفہ بھی تھی۔

سنبل کی چھوٹی بہن کوکب عجیب خاموش سی لڑکی تھی، اس کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال ہوگی۔ وہ ایک دم گم صم اور اکیلی رہتی تھی۔ بڑی بہن کی طرح وہ بھی خاصی خوبصورت تھی۔ دونوں بہنوں میں پیار بھی حد سے زیادہ تھا۔ ان دونوں کا باپ سیف احمد ایک معمولی کریانہ فروش تھا اور کتابوں کی جلدیں وغیرہ بھی بناتا تھا۔ ملتان آنے سے پہلے وہ پاک پتن میں دکان کرتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سنبل کے ساتھ ڈولے کی وابستگی گہری اور شدید ہوتی چلی گئی اور خاموش محبت کا یہ عجیب سفر آج تک جاری تھا۔ یہ کوئی آٹھ دس ماہ پہلے کی بات ہے سنبل کی چھوٹی بہن کوکب بیمار ہو گئی، اسے بخار رہتا تھا اور وہ روز بروز کمزور ہوتی چلی جارہی تھی یوں لگتا تھا کہ چھوٹی سی عمر میں کوئی روگ اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔

ایک روز ڈولے نے اصرار کے ساتھ سنبل سے پوچھا تو اس نے اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں سب کچھ ڈولے کو بتا دیا۔ ڈولے نے ایک سچے ہمدرد اور خیر خواہ کی حیثیت سے یہ سب کچھ سنا اور سنبل سے مدد کا وعدہ بھی کیا۔ سنبل نے اپنی لاڈلی بہن کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے۔ وہ لڑکا بھی اسے بہت چاہتا ہے لیکن لڑکے کے ماں باپ جو بہت بڑے چوہدری ہیں اس تعلق کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے نہ صرف لڑکے کو کوکب کے ساتھ ملنے سے روک دیا بلکہ غریب کریانہ فروش سیف کو پاک پتن سے نقل مکانی کر کے ملتان آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب کوکب اور اس لڑکے کے درمیان رابطہ یکسر ختم ہو چکا ہے۔

ڈولے نے اگلے آٹھ دس روز میں غور و فکر کیا تھا اور آخر اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ وہ سنبل کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اسے سنبل اور کوکب کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ وہ خود بھی محبت کے درد کو سمجھتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ کوکب کا علاج کیسے اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ ایک

دن خاموشی کے ساتھ ملتان سے نکلا اور لاہور آ پہنچا۔ کوکب جس لڑکے سے محبت کرتی تھی اس کا نام سنبل نے ڈولے کو راجو بتایا تھا۔ راجو کے بارے میں سنبل اور کوکب کو صرف اتنا پتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی کپڑے کی ایک بڑی مل کا مالک ہے۔ یہ مل لاہور کے قریب جی ٹی روڈ کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ ہی دوائیاں بنانے کا مشہور کارخانہ ہے۔

ڈولا کسی نہ کسی طرح کھوج لگاتا چوہدری بشیر تک پہنچ گیا۔ ڈولے کو اپنے راستے پر آگے بڑھنے کا فن آتا تھا۔ وہ بشیر کے کارندوں میں بھرتی ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ چوہدری بشیر کا تو کوئی بھائی ہی نہیں ہے۔ ایک چھوٹا بھائی فاخر تھا جو کچھ عرصہ پہلے قتل ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ راجو نے کوکب اور سنبل وغیرہ سے جھوٹ بولا تھا۔ بہرطور ڈولا اس سلسلے میں مزید تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اسی حوالے سے وہ ابھی تک چوہدری بشیر کے کارندوں میں موجود تھا۔ اسے ایک دو چھوٹے موٹے سراغ بھی ملے تھے، بہرحال ان کے بارے میں وہ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ کہیں چوہدریوں کو کسی طرح کا شک نہ پڑ جائے۔

ڈولے کی روداد بھی اس کے قد و قامت کی طرح عجیب تھی۔ وہ ایک خوبرو سرو قد دوشیزہ سے یک طرفہ محبت کرتا تھا اور اس دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ داستانی کرداروں کی طرح اس کی اشک شوئی کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

شانی کے اگلے دس بارہ روز مزید سنگین صورتِ حال میں گزرے۔ وہ مُنے سے مسلسل دور تھی...... ہاں یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مُنا ابھی تک اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ ان دس بارہ دنوں میں قادرے، بابرے یا تاؤ حشام میں سے کسی کی صورت دکھائی نہیں دی نہ جانے وہ سب کہاں تھے۔ بابر کا کردار ایک نئے روپ میں سامنے آیا تھا۔ شانی اسے پھر سے دیکھنا چاہتی تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ وہ کس حد تک بدلا ہے۔ اس کے اندر آنے والی تبدیلی گو معمولی تھی مگر اس نے شانی کے دل پر اثر کیا تھا، اس کی آنکھوں میں نمی جگائی تھی ...... یہ بات تو ظاہر تھی کہ بابر کو چوہدری بشیر کی قید سے چھڑوانے والے وہی لوگ تھے جو شانی اور ڈولے کو پکڑ کر یہاں لائے تھے...... جالاں کے بارے میں ڈولے نے بتایا تھا کہ وہ اس چار دیواری میں موجود نہیں ہے۔ اس کی خراب حالت کی وجہ سے یہ لوگ اسے یہاں سے لے گئے تھے۔ اگر جالاں کی حالت اچھی نہیں تھی تو پھر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ چوہدری بشیر کی حالت بھی بہتر نہیں ہوگی۔

موٹی تازی مریدنی فضیلت کے اندازے کے عین مطابق شانی کو دوبارہ پھر اسی ''جونکوں والے'' تکلیف دہ عمل سے گزارا گیا۔ اس کی دونوں کلائیاں مزید دو بار زخمی ہوئی تھیں مزید دو بار کریہہ المنظر توام بھائیوں نے بڑی رغبت سے اس کا خون چوسا تھا، چھوٹی چھوٹی ڈکاریں لی تھیں اور اپنے سیاہ ہونٹ اس کے خون سے سرخ کئے تھے۔ ان دونوں موقعوں پر فربہ اندام مریدنی فضیلت شانی کے پاؤں کی طرف موجود رہی تھی اور اس کے ہونٹ تیزی سے ہلتے رہے تھے۔ دونوں موقعوں پر شانی کو بے تحاشا مشروب بھی پلایا گیا تھا۔ یہ مسمی کا جوس تھا مگر لگتا تھا کہ اس میں کچھ ملایا بھی جاتا ہے۔ تیسری بار عمل کے بعد صدف نے کمرے کی چوکھٹ سے آویزاں سیاہ تعویذ اتار لیا تھا اور اس کی کمر سے لٹکنے والا تعویذ بھی کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ غالباً یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ شانی کے اندر کی نحوست کسی حد تک کم ہوگئی ہے۔ تیسری بار اس عجیب وغریب عمل کے موقع پر شانی کے جسم سے گو زیادہ خون نہیں چوسا گیا تھا مگر اس نے بے طرح کمزوری محسوس کی تھی۔ وہ چلتے ہوئے ڈگمگا جاتی تھی اور ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے تھے۔

بہرطور اگلے اڑتالیس گھنٹے میں اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت وہ ڈولے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ڈولا اپنی دلچسپ باتوں سے شانی کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ شانی کی ایک زخمی کلائی کی بینڈیج بھی تبدیل کر رہا تھا۔ اچانک بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی اور تاؤ حشام کی آواز ابھری۔ وہ شانی کی طرف ہی آرہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کے قفل میں چابی گھومی اور تاؤ حشام دکھائی دیا۔ سرخ آنکھوں والا قادرا اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ قادرے کے ماتھے پر پٹی نظر آرہی تھی۔ تاؤ حشام کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور شانی پر پل پڑا۔

''حرامزادی، کتی...... تجھے چیر کر رکھ دوں گا میں۔'' وہ اسے لاتوں اور گھونسوں سے پیٹتے ہوئے بولا۔

شانی کی حالت پہلے ہی پتلی تھی۔ اس مار پیٹ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا سر دو تین بار پکی دیوار سے ٹکرایا۔ کلائیوں سے پھر خون رسنے لگا۔ وہ تاؤ حشام کی ٹھوکروں سے اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کر رہی تھی، باقی جسم اس نے تاؤ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ بیس پچیس سیکنڈ بعد تاؤ کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا، پھنکار کر بولا۔ ''تیرے پچھلوں کو تیری لاش نہیں بھیجوں گا۔ لاش کا قیمہ بھیجوں گا۔ بہن خور، مال زادے سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو۔ ایک ایک کو زمین میں

نہ گاڑا تو نام نہیں۔''

اندازہ ہوتا تھا کہ شانی کے وارثوں کی طرف سے نارپوری چوہدریوں کو کوئی گہری زک پہنچی ہے۔ شاید دونوں پارٹیوں میں کہیں تصادم وغیرہ ہوا تھا۔ قادرے کے ماتھے کی چوٹ بھی اسی سمت اشارہ کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ شانی کے بچے کھچے وارثوں نے کچھ نہ کچھ مزاحمت تو کرنی تھی۔ اب ان کے لئے یہ بات راز نہیں رہی تھی کہ شانی نہ صرف زندہ ہے بلکہ چوہدریوں کی تحویل میں ہے۔ چچا رئیس تو ہر طرف سے منہ موڑ کر انگلینڈ میں جا بسے تھے۔ تاہم عین ممکن تھا کہ تایا معصوم، چچی پروین اور خالو اعجاز وغیرہ اسے چوہدریوں کے چنگل سے نکالنے کے جتن کر رہے ہوں۔

اب یہ بات بھی شانی کی سمجھ میں اچھی طرح آرہی تھی کہ تاؤ حشام اور قادرے وغیرہ نے اسے نارپور سے دور اس الگ تھلگ حویلی میں کیوں رکھا ہے۔ وہ اس کی موجودگی کو پوشیدہ رکھ رہے ہیں۔ رنگ والی والوں سے اور چوہدری بشیر سے بھی۔ شانی کی چھٹی حس گواہی دیتی تھی کہ اس کے اردگرد سخت ہلچل مچی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ بہرحال یہ سارا ہنگامہ شانی کی نگاہوں سے اوجھل رہا تھا اور اب اس حویلی میں بھی اوجھل تھا۔

مار پیٹ کے بعد تاؤ حشام نے بے رحمی سے شانی کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور پھنکارا۔ ''ایسے ڈیلے پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہی ہے سورنی! یہ آنکھیں نکال کر ہتھ پر رکھ دوں گا۔ حرام کی جنی! کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو؟''

''یہ خود کو ہیروئن (ہیروئن) سمجھتی ہے تاؤ! اپنے ہیرو کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ آئے گا اور ٹھاہ ٹھاہ گولیاں چلاتا ہوا، اسے گھوڑے پر لاد کر لے جائے گا۔'' قادرے نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہا...... ہیرو۔'' تاؤ تمسخر کے ساتھ پھنکارا۔ مسکراتے ہوئے اس کے رخساروں کا زخم عجیب شکل اختیار کر جاتا تھا۔ مونچھوں کو تاؤ دے کر وہ بولا۔ ''وہ کنجری کا پتر...... نہیں آئے گا۔ وہ ختم ہو گیا ہے۔ ایک دم...... ہیجڑا...... بلکہ ہیجڑے سے بھی بدتر۔ جو ہمارے سامنے پھنے خان بنتے ہیں ہم ان کا یہی حال کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے تاؤ، اسے ایک بار اس کے درشن کرا ہی دو۔'' قادرے نے تجویز پیش کی۔

تاؤ حشام گہری نظر سے شانی کی طرف دیکھتا رہا۔ آنکھوں میں انتہا درجے کی سفاکی تھی

پھر وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور سر ہلا کر بولا۔ ''چل اٹھ...... چل اٹھ تجھے تیرے ہیرو کا حال دکھاؤں۔''

شانی سکتے کی سی کیفیت میں تاؤ حشام کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا بدنما زخم بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا اور آنکھوں سے آگ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر تاؤ اور قادرا واقعی رستم کی بات کر رہے تھے تو پھر یہ صورتِ حال شانی کے لئے بے حد تعجب خیز تھی۔ پہلا انکشاف تو یہ تھا کہ رستم زندہ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اسی چار دیواری میں کہیں موجود ہے۔ حیرت، خوف، خوشی اور اذیت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ دم بخود بیٹھی رہی۔

اچانک تاؤ حشام نے شانی کے بکھرے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک جھٹکے سے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ''چل آ تجھے دکھاؤں...... میں اکڑنے والوں کی اکڑ کس طرح نکالتا ہوں...... چل۔'' وہ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے بولا۔

قادرے نے کوتاہ قد ڈولے کو ٹھوکر ماری اور وہ شانی کے آگے آگے دور تک لڑھک گیا۔ ''چل چھوٹے! تُو بھی دیکھ لے۔'' قادرا پھنکارا۔

ایک راہداری میں سے گزر کر انہوں نے نیم پختہ سیڑھیاں طے کیں اور حویلی کی بالائی منزل پر آگئے۔ یہ خالص دیہاتی حویلی تھی۔ کچی دیواروں پر روغن سے پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں تھیں اور رنگ برنگے شیشے تھے۔ دروازے لکڑی کے موٹے تختوں کے تھے اور ان پر بھی پھول بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ بالائی منزل پر شانی کو نیلی پگڑیوں والے دو مسلح پہرے دار نظر آئے۔ انہوں نے تمسخر اور حقارت کے انداز میں شانی اور ڈولے کی طرف دیکھا۔ شانی ننگے پاؤں اور ننگے سر تھی۔ اس کا دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا اور وہ خود کو ذہنی طور پر رستم کو دیکھنے کے لئے تیار کر رہی تھی لیکن کیا وہ واقعی رستم کو دیکھنے جا رہی تھی۔

تاؤ اسے اور ڈولے کو لے کر ایک نیم تاریک کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے سے آگے ایک بالکل مختصر سا صحن تھا۔ بمشکل دس ضرب دس کا ہوگا۔ اس کے چاروں طرف کمروں کے دروازے تھے اور سلاخ دار کھڑکیاں تھیں۔ یہاں پہنچ کر شانی نے کئی دن بعد سورج کی روشنی دیکھی۔ تاؤ نے شانی اور ڈولے کو کسی حوالاتی کی طرح کمرے کے فرش پر بٹھا دیا پھر وہ قادرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دکھا ذرا اسے اپنے سلطان راہی کی شکل۔''

قادرا مختصر صحن میں گیا اور اس نے ایک نیلی پگڑی والے پہرے دار سے کچھ کہا۔ پہرے دار نے ادب سے سر جھکایا اور کرتے کی بغلی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک دروازے کا

تالا کھول دیا۔ پھر اندر جا کر اس نے سلاخ دار کھڑکی کے تینوں پٹ بھی کھول دیئے۔ اس نے کمرے کی لائٹ جلائی تو اندر کا سارا منظر پوری طرح واضح ہو گیا۔

شانی کا دل جیسے اس کی پسلیوں کے اندر برف کا گولا بن گیا تھا۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا...... اس نے رستم کو دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی نہایت ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے...... جو شخص کسی میلے کچیلے چیتھڑے کی طرح فرش پر پڑا تھا وہ رستم ہی تھا...... ہاں رستم ہی تھا لیکن اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ سیاہ ہو کر پھٹ گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اس کے لمبے بال بالکل خشک اور بدحال تھے۔ داڑھی میں تنکے اور گرد و غبار نظر آ رہا تھا۔ سب سے انوکھی اور تکلیف دہ شے رستم کا لباس تھا۔ اس کے جسم پر زنانہ لباس تھا۔ گلابی شلوار اور گلابی پھولوں والی سفیدی مائل قمیص۔ رستم کمزور ہو چکا تھا پھر بھی یہ لباس رستم کے جسم پر تنگ تھا یا تو یہ کسی لمبی تڑنگی دیہاتن کا لباس تھا یا پھر خاص طور سے رستم کے لئے سلوایا گیا تھا۔ شانی حیرت اور خوف سے گنگ ہو گئی...... اس کی نگاہیں پہلو کے بل فرش پر پڑے نیم جاں رستم کو دیکھتی چلی گئیں۔

''کیسا لگا تجھے اپنے ہیرو کا ایکشن؟'' قادرے نے شانی کی پیٹھ پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

شانی کا سر جھک گیا۔ دو آنسو گرے اور اس کی اپنی ہی جھولی میں جذب ہو گئے۔ تاؤ نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر سیدھا کیا۔ ''چوہدری ارشاد کی لاڈو رانی ابھی سے کیوں سر جھکاتی ہے۔ ابھی تو تجھے تیرے یار کی اور بھی جی داریاں دکھانی ہیں۔'' پھر اس نے نیلی پگڑی والے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس ببر شیر کو تھوڑا سا راتب ڈالو۔ دیکھیں کھا بھی سکتا ہے کہ نہیں۔''

نیلی پگڑی والے نے مونچھوں کو تاؤ دے کر اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ وہ چاروں جس نیم تاریک کمرے میں موجود تھے وہاں سے رستم انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ بہر حال وہ رستم کے کمرے کا سارا منظر بہ آسانی دیکھ رہے تھے۔ فرش پر پرالی بچھی تھی۔ ایک طرف ایک میلا کچیلا لحاف پڑا تھا۔ شانی نے ایک بات مزید نوٹ کی۔ رستم کے دونوں ہاتھ پشت پر نائیلون کی مضبوط رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ رستم کے جسم کے جو حصے لباس سے باہر تھے ان پر زخموں کے چھوٹے بڑے نشان نظر آ رہے تھے۔ اس کا جسم بہ زبانِ حال پکار رہا تھا کہ اس پر تشدد کی انتہاء کی گئی ہے۔

قادرا اس صورتِ حال کو بے حد انجوائے کر رہا تھا۔ وہ سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر بار بار طویل کش لیتا تھا۔ نامی گرامی رستم سیال جس نے اس کے بندے کی ٹانگیں توڑ دی تھیں اور جس کی وجہ سے اس کے پیارے کتے کی جان گئی تھی اور اس کے علاوہ بھی جس کے بے شمار چھوٹے بڑے ''گناہ'' تھے آج ایک حقیر کیچوے کی طرح اس کے سامنے پڑا تھا۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ زنانہ لباس رستم کے بدن پر کیونکر آیا۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ رستم اس قدر لاچار ہو سکتا ہے۔ شاید بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی حالت میں یہ لباس اس کے جسم پر چڑھایا گیا تھا۔

اس دوران میں نیلی پگڑی والا رستم کا کھانا لے آیا۔ یہ کھانا بھی اپنی مثال آپ تھا۔ ایک گول چنگیر میں روٹی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ غالباً ان ٹکڑوں کے اوپر ہی تھوڑا بہت سالن بھی لیپ کر دیا گیا تھا۔ نیلی پگڑی والے نے کمرے میں جا کر یہ گول چنگیر رستم کے چہرے کے قریب رکھ دی۔ ''جناب سیال صاحب! اٹھ کے روٹی شوٹی کھا لو۔'' پہرے دار نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔

رستم شاید کافی دیر سے بھوکا بھی تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے روٹی کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک رخسار بدستور فرش سے لگا ہوا تھا۔ بے حد نقاہت بھرے انداز میں وہ اٹھا۔ ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ مسلسل تاریکی میں رہنے سے وہ روشنی میں ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پا رہا۔ وہ چند سیکنڈ تک چنگیر کی طرف دیکھتا رہا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے ہو سیال صاحب...... جلدی کرو۔'' پہرے دار نے رستم کے پہلو میں اپنے گھٹنے سے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔

پھر شانی کی آنکھوں نے دوسرا حیرت انگیز اور بدترین منظر دیکھا۔ رستم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر خود کو چوپائے کی طرح جھکایا اور چوپائے کی ہی طرح چنگیر سے اپنے منہ میں روٹی کے ٹکڑے اٹھانے شروع کر دیئے۔ شانی کا دل دہل گیا۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے کلیجے کو مٹھی میں مسلنے لگا۔ اس نے سنا تھا کہ انسانی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ بے پناہ جسمانی تشدد مضبوط ترین لوگوں کو بھی توڑ پھوڑ کر چکنا چور کر دیتا ہے اور وہ دیکھ رہی تھی۔ رستم سیال کو چوپائے کی طرح روٹی کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ منہ میں روٹی لینے کے لئے چنگیر کی طرف جھکتا تھا تو اس کے گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوتے تھے۔ شاید اس زاویے سے کچھ جسمانی چوٹیں اسے زیادہ تکلیف دیتی تھیں۔

اس کی دونوں کلائیاں پشت پر بندھی تھیں اور شانی ان میں سے وہ کلائی دیکھ سکتی تھی

جس پر کچھ عرصہ پہلے پرانے زخم کے گہرے نشان تھے۔ ہاں یہ وہی کلائی تھی جو رستم نے شانی کی زخمی کلائی کے بدلے میں زخمی کی تھی۔ شانی نے رستم کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا اور اس کی اپنی چوڑیوں نے اس کی کلائی گھائل کر دی تھی۔ رستم نے اس زخمی کلائی کا بدلہ خود سے یوں لیا تھا کہ پیچ کس مار مار کر اپنی کلائی کی کھال ادھیڑ دی تھی۔

رستم کو یوں کھاتے دیکھ کر شانی کا دل اور آنکھیں دونوں رونے لگے۔ ڈولا بھی دم بخود تھا۔ تاؤ نے شانی کے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''لاڈو رانی، فلموں اور کتابوں والی ''ببر شیریاں'' اور دلیریاں بس فلموں اور کتابوں میں ہی چلتی ہیں۔ یہاں تو یہ حشر ہوتا ہے رستم زمانوں اور پھنّے خانوں کا۔ مرجاتے ہیں یا دو دن کی مار کے بعد اتنے ہولے (ہلکے) ہو جاتے ہیں کہ پیشاب کی دھار میں بہہ جاتے ہیں۔''

قادرے نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے پہرے دار کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ببر شیر صاحب کو پانی بھی پلاؤ۔ یہ نہ ہو کہ ناراض ہو جائیں۔''

پہرے دار نے ایک بار پھر سر کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ خبیث ایک بار پھر دائیں طرف اوجھل ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ پندرہ بیس سیکنڈ بعد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی تھا لیکن یہ پانی کسی گلاس یا برتن میں نہیں تھا، جوتی میں تھا۔ یہ چمڑے کی ایک پرانی سی براؤن ملکیشن تھی۔ پہرے دار نے بڑے اطمینان سے یہ پانی سے بھری ہوئی جوتی رستم کے سامنے جا رکھی۔

فاصلہ کافی تھا پھر بھی شانی کو رستم کے مدقوق چہرے پر چند سیکنڈ کے لئے کرب اور تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن پھر شانی کو آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ وہ اپنی ضرورت پوری کر رہا تھا۔ سر جھکا کر جوتی میں سے پانی پی رہا تھا۔ پتا نہیں پہلے اسے بے رحم تشدد کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ رستم جیسے لوگوں کو جھکانا اور اس حد تک جھکانا آسان تو نہیں ہوتا ہے لیکن یہ ہوا تھا اور شانی دیکھ رہی تھی۔

پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں وہ رستم کے حوالے سے کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ کس وقت کیسے کیسے جذباتی مناظر اس کے پردۂ تصور پر لرزتے تھے۔ وہ سوچتی تھی، وہ ایک دن طوفان بن کر آئے گا۔ دیواریں توڑ کر، رکاوٹوں کو روند کر، وہ سب کو تہہ و بالا کر دے گا۔ وہ دن نار پوری چوہدریوں کا یوم حساب ہوگا۔ وہ رستم کے قہر سے پناہ مانگیں گے۔

اس کی آنکھوں سے دکھ اور ندامت کے آنسو گرنے لگے۔ وہ بند آنکھوں سے رونے لگی۔ اب اس میں سکت نہیں تھی کہ رستم کی حالتِ زار کو مزید دیکھ سکے۔ اس کا دل چاہا وہ

چوہدری حشام کے پاؤں پکڑ لے اور اس سے درخواست کرے کہ وہ یہاں سے اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے قادرے نے ایک بار پھر اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ تاؤ حشام کی نظر بچا کر اس نے شانی کی کمر میں ایک چٹکی لی اور بولا۔ ''اب بتاؤ، تمہارے اس ہیرو کو ہیرو نہیں یا ہیجڑا!؟''

''اوئے ہیجڑے کو ہیجڑا نہیں کہو گے تو اور کیا کہو گے۔'' تاؤ نے قادرے کے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''یہ بات ہمارے کہنے کی نہیں ہے تاؤ۔ مزہ تو تب ہے کہ یہ بھی مانے۔'' اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا۔

''تو پھر کوئی ڈانس شانس دکھا دو اس ہیجڑے کا۔''

''تمہارا مطلب ہے تاؤ...... یہ ہمیں نچ کر دکھا دے گا۔''

''اوئے نچے گا کیوں نہیں۔ اس کے تو اگلے پچھلے نچیں گے قبروں سے نکل نکل کر۔ چوہدریوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے یہ...... کوئی مذاق مخول نہیں ہے۔'' پھر وہ پہرے دار سے مخاطب ہو کر با آواز بلند بولا۔ ''اوئے چیمے! نکال ذرا اپنا ڈنڈا پیر...... اور ٹھمکا لگوا اس کتے کے تخم سے۔''

نیلی پگڑی والے نے اپنی کالی سیاہ مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہ کام پہلے بھی کر چکا ہے اور اب بھی یہ کام کر کے اسے خوشی ہو گی۔ وہ سر کو اثبات میں ہلاتا ہوا ایک بار پھر داہنی طرف اوجھل ہو گیا۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے دھما چوکڑی اور گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گاہے بگاہے کسی شخص کو کسی نامعلوم شے سے ضرب لگانے کی صدا بھی بلند ہو رہی تھی۔ ضرب کھانے والا کرب سے چیخ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ایک عورت بھی فریادی آوازیں بلند کر رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس حویلی میں رستم ہی اکیلا معتوب نہیں ہے کچھ اور افراد بھی تاؤ حشام کے دستِ ستم کا شکار ہیں۔

چند سیکنڈ تک آوازیں قریب آ گئیں۔ ان آوازوں کو سن کر شانی کا رہا سہا خون بھی خشک ہو رہا تھا۔ تب اس نے مار کھانے والوں کو دیکھا۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔ یہ ایک نوجوان جوڑا تھا۔ دونوں شہری لگتے تھے۔ نوجوان نے پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ لڑکی جرسی اور شلوار قمیص میں تھی۔ دونوں کے کپڑے بُری طرح پھٹے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا، درجنوں کتوں نے بیک وقت ان پر حملہ کیا ہے۔ نوجوان کی سیاہ پینٹ میں سے اس کا سفید انڈرویئر جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کی نیلی جرسی کمر سے جھول رہی تھی۔ لڑکی کا لباس بھی بے طرح پھٹا ہوا تھا اور

وہ اپنی برہنگی چھپانے کے لئے اپنے بازوؤں کو سمیٹے ہوئے تھی۔ چوہدری حشام کے نیلی پگڑی والے کارندے نوجوان کو چمڑے کے دیسی جوتوں سے پیٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہٹا کٹا پولیس والا بھی تھا۔ وہ نامکمل وردی میں تھا اور لگتا تھا کہ نیند سے اٹھ کر آیا ہے۔ اس کے کندھے پر پھول وغیرہ بھی نہیں تھے قمیص بھی پتلون سے باہر تھی۔ نوجوان جوڑے کو دھکے دینے اور تھپڑ مارنے میں وہ بھی اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایک چیز دیکھ کر شانی چونکی۔ پولیس والا مضروب نوجوان کو گلے سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے نوجوان کے گلے میں رسی وغیرہ ڈالی ہوئی ہے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ رسی نہیں اسٹیتھ سکوپ ہے۔ غالباً یہ بدقسمت نوجوان ڈاکٹر تھا۔ لڑکی اس کی ساتھی یا بیوی ہو سکتی تھی۔ اس دیہی علاقے میں وہ دونوں نہ جانے کیسے اور کیونکر ان بلی ماروں کے شکنجے میں آئے تھے۔

رستم کے ساتھ والے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں کو اندر دھکیل دیا گیا۔ وہ روشنی میں پہنچے تو شانی نے دیکھا۔ ان دونوں کی ناک مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ نوجوان کی ناک سے تو غالباً خون بھی رس رہا تھا۔ یقیناً یہاں لانے سے پہلے دونوں سے زمین پر لکیریں نکلوائی گئی تھیں۔ (ناک زمین پر رگڑوائی گئی تھی)

ایک چوہدری زادے نے نوجوان کی کمر پر کئی جوتے رسید کئے اور گالیاں دیتے ہوئے اسے مرغا بننے کا حکم دیا۔ لڑکی چوہدری زادے کے پاؤں میں گر پڑی۔ ''خدا کے لئے معاف کر دو۔ خدا کے لئے اب بخش دو۔ بہت ہو چکی ہے، بہت ہو چکی ہے۔''

چوہدری نے تنک کر کہا۔ ''اسی طرح بول جس طرح پہلے بول رہی تھی۔ بتا ناں کیا کرتا ہے تیرا ماما...... اور کیا بیچتا ہے تیری ماں کا خصم؟''

''مجھ سے غلطی ہو گئی...... مجھے پتا نہیں تھا...... خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔'' اس نے مضبوطی سے چوہدری کے پاؤں پکڑ لئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی ناک سے رقیق مادہ بہہ رہا تھا اور آنسو بھی اس میں شامل ہو رہے تھے۔ ادھوری وردی والے پولیس اہلکار کے چہرے پر ذرا سی نرمی نمودار ہوئی۔ اس نے حقارت سے ڈاکٹر اور اس کی ساتھی کی طرف دیکھا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''چلو چھڈو چوہدری صاحب آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔''

چوہدری چند لمحے تک سفاک نظروں سے لڑکی اور اس کے ساتھی کو دیکھتا رہا پھر اس نے نوجوانوں کی پسلیوں میں دو تین ٹھوکریں رسید کیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کے باہر آتے ہی سارے کارندے بھی باہر نکل آئے۔ کمرے کے بھاری دروازے کو باہر سے

مقفل کر دیا گیا۔ قیدی بن جانے والوں نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی کوئی نکتہ اعتراض پیش نہیں کیا۔ غالباً انہیں مزاحمت کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ مار پیٹ سے چھٹکارے کو ہی چھٹکارا سمجھ رہے تھے۔ کتنی جلدی تبدیل ہوتے ہیں الفاظ کے مفہوم اور انسان کے احساسات۔

یہ ساری کارروائی بمشکل دو تین منٹ کے اندر مکمل ہو گئی۔ نئے قیدیوں کو سپردِ زنداں کرنے کے بعد بپھرے ہوئے ''داروغے'' واپس چلے گئے۔ قرب و جوار میں پھر پہلے کا سا ماحول پیدا ہو گیا۔ چوہدری قادرا بھی یہ دو تین منٹ کا تماشا دیکھنے کے لئے چھوٹے صحن کی طرف چلا گیا تھا۔ دروازہ مقفل ہونے کے بعد وہ واپس آ گیا۔

تاؤ حشام پلنگ پر بیٹھا تھا۔ چوہدری قادرا بھی پھیل کر ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ شانی اور ڈولا حوالاتیوں کی طرح فرش پر بیٹھے تھے۔ قادرے نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

''ساڈے نال رہو گی تو ایسے ہی مزے کرو گی۔ بڑے بڑے تماشے دکھائیں گے تمہیں۔''

تاؤ حشام نے دیسی شراب کی بوتل کھول لی تھی۔ اس کی بو سارے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ تاؤ اب قدرے کم غصے میں تھا اور اس ساری صورتِ حال سے لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ''اوئے چیمے! کدھر مر گیا۔ آ ذرا تھوڑا سا تماشا دکھا دے اس خسرے (ہیجڑے) کا بھی۔''

تاؤ کا فقرہ مکمل ہوتے ہوتے چیمہ دائیں طرف سے نمودار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں گھنگھرو تھے۔ ویسے ہی گھنگھرو جو رقاصائیں باندھتی ہیں۔ وہ بے تکلفی سے رستم والے کمرے میں داخل ہوا۔ رستم پانی پینے کے بعد پرالی پر بے سدھ پڑا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت، ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ پہرے دار چیمہ نے گھنگھرو رستم کے پاؤں میں باندھے۔ چیمہ کے ایک ساتھی نے اس کی مدد کی۔

شانی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر ماؤف تھا۔ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ چیمہ کے حکم پر رستم ناچنا شروع کر دے گا۔ رستم سیال جو بالکل مختلف شخص تھا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا۔ جو پولیس کو تگنی کا ناچ نچاتا تھا جس کے لئے مرنا یا مار دینا ایک معمولی فعل تھا۔ کیا وہ اس حد تک مجبور ہو چکا تھا اس حد تک؟

وہ ساکت و جامد بیٹھی دیکھتی رہی۔ ''اٹھ جاؤ سیال صاحب۔'' پہرے دار نے بے رحمی سے رستم کی پیٹھ پر ٹھوکر رسید کی۔

چیمہ کے ساتھی نے خودکار رائفل اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس نے بھی رائفل کے بیرل سے رستم کو ٹہوکا دیا۔ چیمہ چند سیکنڈ تک رستم کے اٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر وہ کمرے کے

گوشے کی طرف گیا۔ وہاں چمڑے کی ایک چوڑی بیلٹ پڑی تھی جس کے سرے پر موٹا سا چمکیلا بکل تھا۔ دور سے دیکھنے پر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی پولیس والے کی بیلٹ ہے۔ شاید یہ وہی پولیس والا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ڈاکٹر اور اس کی ساتھی کی ''خیر خیریت'' دریافت کر رہا تھا۔

چیمہ نے بیلٹ اٹھائی اور بڑی سفاکی سے اس کی دو شدید ضربیں رستم کی پشت پر رسید کیں۔ رستم کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے لیکن ہونٹ بند ہی رہے۔ شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکی نکل گئی۔

''ہائے اوئے...... بڑے درد ہو رہے ہیں اپنے ڈھولن ماہی کے۔'' قادرے نے فقرا کسا۔ کمرے میں چیمے کی وحشی آواز گونجی۔ ''سیال صاحب! اٹھتے ہو یا پھر شروع ہو جاؤں۔''

پھر شانی کی آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ رستم ایک جھٹکے سے اٹھا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لمبے بال تین چوتھائی چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ داڑھی کے بالوں میں پرالی کے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ وہ جیسے گہری غنودگی میں تھا۔ اس نے نقاہت بھرے انداز میں ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پاؤں متحرک ہوئے۔ گھنگھرو چھن چھنانے لگے۔ دونوں پہرے داروں کے چہروں پر مسکراہٹیں نمودار ہوئیں۔ رائفل بردار پہرے دار آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا اور اسٹیل کی ایک تھالی کو الٹا کر کے اس پر تھاپ دینے لگا۔

اور وہ ناچ رہا تھا۔ زنانہ کپڑوں اور گھنگھروؤں کے ساتھ بے حد مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کے کندھوں تک جھول رہے تھے۔ اس کے جسم پر اتنے زخم تھے کہ پانچ دس سیکنڈ میں ہی خون کے قطرے اس کی پنڈلیوں پر رینگنے لگے۔ دھپ دھپا دھپ...... چھن چھنا چھن...... آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ رستم کے ناچنے میں دھمال کا سا انداز تھا۔ شانی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆======☆======☆

رات کا وقت تھا۔ شانی اور ڈولا واپس اپنے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ دونوں گم صم بیٹھے تھے۔ ڈولا ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا لیکن آج اس کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں شانی کی آنکھوں سے لگاتار آنسو رس رہے تھے۔ ڈولے نے شانی کے ایک زخمی پاؤں پر آئیوڈیکس لگاتے ہوئے کہا۔ ''باجی جی! میرا اندازہ درست نکلا ناں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ.....آپ محبت کرتی ہیں۔''

شانی نے جواب نہیں دیا بس بھیگی پلکیں جھکا کر پاؤں کی جانب دیکھتی رہی۔ ڈولا کچھ دیر خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''باجی جی.....وہ دیکھنے میں کتنا حوصلہ مند لگتا تھا پھر انہوں نے مار مار کر اسے توڑ پھوڑ دیا ہے۔ کتنا بے بس ہو گیا ہے وہ.....''

''ہوں۔'' شانی بس ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

''باجی جی! میں نے تو ایک بات سوچ رکھی ہے اگر اللہ نہ کرے کسی وقت مجھے اس حد تک مجبور ہونا پڑا ناں..... تو میں خود کو مار لوں گا۔ یہ سب کچھ..... مجھ سے تو برداشت نہیں ہوگا۔'' ڈولے کے لہجے میں رستم کے لئے افسوس اور ندامت تھی۔

شانی کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کچھ اور رواں ہو گئے۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو ڈولے..... تم اسے غلط سمجھ رہے ہو کوئی بھی اسے نہیں سمجھ رہا۔''

''کیا مطلب باجی؟''

شانی کرب ناک آواز میں بولی۔ ''ڈولے..... وہ بے بس نہیں ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔ وہ بہت گہرا ہے۔ وہ اکیلا ان سب پر بھاری ہے۔ وہ ان کا ستیاناس کر سکتا ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں باجی..... وہ تو اس کو نچار ہے ہیں۔'' ڈولا کرب سے بولا۔

شانی نے روتے ہوئے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ڈولے، وہ ان کے سامنے نہیں ناچ رہا تھا۔ وہ..... کسی اور کے سامنے ناچ رہا تھا۔ تم نہیں سمجھو گے ڈولے..... تم نہیں سمجھ سکتے۔'' شانی کے لہجے میں عجیب ڈرامائی کیفیت تھی۔

ڈولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شانی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی ذہنی صحت پر شک کر رہا ہو۔

شانی نے بے قراری سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپایا۔ ''وہ یہ سب کچھ کسی اور کے لئے کر رہا ہے ڈولے۔ وہ سزا بھگت نہیں رہا، سزا دے رہا ہے۔ بڑی سخت سزا دے رہا ہے۔ بڑا ظالم ہے وہ..... تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

اس کا دل جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ بھاری بھرکم زنجیریں اسے اپنے لپیٹے میں لے رہی تھیں۔ اس کے حسین بدن اور ذہن کو نادیدہ بندشیں جکڑتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ کراہنے لگی۔ وہ جو جالاں، تاؤ حشام اور قادرے کی ماریں کھا کر بھی لب بستہ رہی تھی اب کراہنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ ''ہائے'' نکل رہی تھی۔ یہ محبت کی ضربیں تھیں، یہ عشق کا جبر تھا۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اس رقصِ مستانہ کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی ہر ہر ادا کو بھانپ رہی تھی۔ کہیں سنا ہوا پنجابی کا ایک چو مصرعہ شانی کے کانوں میں گونجنے لگا۔ ان

مصرعوں کا مطلب کچھ اس طرح کا تھا۔

میرا محبوب مجھے جس آگ میں پھینکے وہی میرے لئے گلزار ہے۔

میرا محبوب مجھے جس حال میں رکھے میں اس میں خوش ہوں۔

اس چن ماہی کے لئے تکلیف سہنا میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی راحت ہے۔

اس کی خواہش پر مر جانا مجھے ہزار زندگیوں سے پیارا ہے۔

جب کوٹھی میں چوہدریوں کے نرغے میں آکر رستم نے نکلنے کی کوشش کی تھی اسے اپنا پستول خالی ملا تھا۔ شاید تب اس نے وہی کیفیت محسوس کی جو مرزا صاحباں کی داستان میں مرزا نے اپنے ٹوٹے ہوئے تیر دیکھ کر کی تھی۔ تب اس کا دل غم و اندوہ سے لبریز ہو گیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ شانی چاہتی ہی نہیں کہ وہ یہاں سے نکل سکے۔ اس کی شدید جذباتی رو اسے بہا کر ''خود اذیتی'' کی طرف لے گئی تھی۔ وہ اس قید کو شانی کی دی ہوئی قید اور ان صعوبتوں کو شانی کی دی ہوئی صعوبتیں قرار دے رہا تھا..... اور ان کو چوم چوم کر آنکھوں سے لگا رہا تھا۔

اس رات چوہدری حشام، جسے تاؤ حشام کہا جاتا تھا، شراب پی کر شانی کے قید خانے میں گھس آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور پیشانی کا زخم ہمیشہ سے زیادہ تمتما رہا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ڈولے کو لاتیں رسید کیں اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ کر وہ شانی کی طرف متوجہ ہوا۔ شانی پلنگ سے کھڑی ہو چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ تاؤ نے اسے گھسیٹ کر فرش پر پٹخ دیا تھا۔ آج وہ اس پشیمانی سے گزرنا نہیں چاہتی تھی۔

تاؤ پلنگ پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا اور عجیب خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ بس دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ دشمن کی بیٹی کے لئے بدترین سزا کیا ہو سکتی ہے۔ کوئی ایسی سزا جو اس کے جسم کے ہر ہر ریشے اور دماغ کے ہر ہر خلیے کو شدید ترین عذاب سے دوچار کر دے۔ پتا نہیں وہ اتنا کیوں سوچ رہا تھا۔ ایک معروف سزا تو وہ اسی وقت..... ابھی شانی کے لئے شروع کر سکتا تھا۔ وہی سزا جو فاتح مرد کی طرف سے مفتوح اور کمزور عورت کے لئے شاید روزِ اول سے لکھ دی گئی ہے۔ کہیں اس سزا کو زنا بالجبر کہا جاتا ہے، کہیں اسے ونی کا نام دیا جاتا ہے اور کہیں ساک کا۔ اس کے مختلف روپ ہیں لیکن ''اصل'' ایک ہی ہے۔ شانی کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ایسی صورتِ حال کے لئے خود کو کئی دنوں سے تیار کر رہی تھی اور بھرپور مزاحمت کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہی مزاحمت جو پاک دامن عورت کی فطرت کا حصہ اور اس کے

اہم ترین فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ پارسا عورتیں اس مزاحمت کو کشاں کشاں موت کی سرحد تک پہنچا دیا کرتی ہیں۔

شانی ایک ''مجرم بت'' کی طرح تاؤ حشام کے روبرو ساکت کھڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا سایہ کچی دیوار پر لرز رہا تھا۔ تاؤ حشام اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھنکارتا رہا۔ کوئی شے اسے اظہارِ غضب سے روک رہی تھی۔ کوئی نادیدہ رکاوٹ تھی جو شانی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی پھر وہ مغلوب الغضب ہو کر اٹھا۔ اس نے شانی کو بالوں سے پکڑا اور گھما کر فرش پر دے مارا۔ شانی پشت کے بل گری تھی۔ تاؤ حشام نے بے دریغ اپنا پاؤں شانی کی گردن پر رکھ دیا۔ شانی کا منہ کھل گیا۔ اسے لگا جیسے ابھی اس کا دم رک جائے گا یا گردن ٹوٹ جائے گی۔.....اس نے اپنی گردن پر سے دباؤ کم کرنے کے لئے اضطراری حرکت کے تحت تاؤ کا پاؤں پکڑ لیا تاکہ گردن پر کم سے کم دباؤ پڑے۔ اس کی پھنکار شانی کے کانوں میں گونجی۔ ''ارشادے کی لاڈو بیٹی! میں تیری حیاتی کیڑے مکوڑوں سے بدتر بنا دوں گا۔''

شانی کی طرف تھوکتا ہوا وہ آتشیں گولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز شانی نے خود کو حویلی کے دوسرے حصے میں پایا۔ حویلی کے اس حصے میں لانے سے پہلے شانی کو نوکرانیوں والے بوسیدہ کپڑے پہنا دیئے گئے۔ سب نوکرانیوں کا لباس ایک جیسا تھا۔ سفید کُرتے اور کالی دھاریوں والی دھوتی۔ کئی نوکرانیاں شانی کو دھکیلتی ہوئی اس چار دیواری میں لے آئیں۔ شانی کا اپنا لباس بھی سفید کرتے اور سیاہ دھوتی پر مشتمل تھا۔ دوپٹا ندارد تھا۔ یہاں کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کسی اور گھر میں آ گئی ہے۔ شانی کو ایک کھلا صحن دکھائی دیا۔ یہاں ایک طرف اصطبل اور ڈھور ڈنگروں کے لئے جگہ بنائی گئی تھی۔ صحن کے چاروں طرف آٹھ دس دیہاتی طرز کے کمرے تھے۔ ایک چوبارہ بھی تھا جس پر جانے کے لئے کچی سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں۔ حویلی کے اس حصے کو خوب اچھی طرح لیپا پوتا گیا تھا اور نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ یہاں شانی کو ڈیزل سے چلنے والا ایک چھوٹا سا جنریٹر بھی نظر آیا۔ بیرونی چار دیواری دس بارہ فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے بہت سے ٹکڑے لگے تھے۔ یہاں ٹیلی ویژن، وی سی آر اور فریج وغیرہ کی سہولت بھی موجود تھی۔ حویلی کے اس حصے کا مالک اور کرتا دھرتا تاؤ حشام کا وہی پندرہ سولہ سالہ بیٹا تھا جس کا ذکر چند روز پہلے ڈولے نے کیا تھا۔ ڈولے نے بتایا کہ یہاں وہ اپنی کم عمر بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ تاہم اس چار دیواری میں آنے کے دس بارہ گھنٹے بعد بھی شانی کو تاؤ کا بیٹا یا بہو نظر نہیں آئے۔ یہاں بس چند شوخ چشم نوکرانیاں تھیں جو آپس میں اٹکھیلیاں کرتی

اور کانوں میں سرگوشیاں پھونکتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ساری تقریباً نوجوان ہی تھیں۔ ایک دو کے سوا سب کے لباس کالی دھوتی اور سفید کُرتے پر مشتمل تھے۔

وہ شانی کو بڑی تضحیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور اس کے پاس آنے سے کترا رہی تھیں۔ ان میں سے دو کمروں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھیں۔ شانی کچھ دیر تک کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر پھرتی رہی پھر ان کے پاس جا بیٹھی جو سبزی بنا رہی تھیں۔ وہ منہ پھیر کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ شانی کی موجودگی انہیں ناگوار گزر رہی تھی۔

اتنے میں ایک قدرے بڑی عمر کی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے شانی کو یوں بیٹھے دیکھ کر لڑکیوں سے کہا۔ ''نی بلقیس! اس کو بھی کسی کام پر لگاؤ نا۔''

بلقیس نے ناپسندیدگی کے انداز میں سر کو جھٹکا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

عورت ان کے پاس بیٹھ گئی اور سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''نی، اب یہ پاک صاف ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مالک اسے ادھر بھیجتے ہی کیوں۔ حضرت صاحب کے حکم سے پانچ چھ میر رت (خون) تو نکل گئی ہو گی اس کے پنڈے سے۔ سارا گند میل بھی ساتھ ہی نکل گیا ہو گا۔ اب گھبرانے کی بات نہیں۔ لگاؤ اس کو کام پر۔''

''چل بھئی، لگ جا کام پر۔'' ایک لڑکی نے سبزی والی چھری شانی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا، لہجے میں ناگواری تھی۔

شانی نے ابھی چھری کی طرف ہاتھ بڑھایا نہیں تھا کہ لمبی تڑنگی نوکرانی رشیداں عرف چھیدو اندر داخل ہوئی، یہ وہی عورت تھی جس نے جالاں کے ساتھ مل شانی کو مارا پیٹا تھا اور کپڑے اتارنے کی کوشش کی تھی۔ نوکرانی ہونے کے باوجود اس کے گلے میں سونے کا چھوٹا سا لاکٹ تھا۔ وہ شانی کو دیکھ کر پھنکاری اور لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ہائے ہائے، اس کو کس کام پر لگا رہی ہو۔''

بلقیس بولی۔ ''ہم کہاں لگا رہے ہیں ماسی۔ آپاں کلثوم لگا رہی ہے۔''

رشیداں عرف چھیدو نے غصے سے سر ہلایا۔ ''نہیں نہیں! مالک نے کہا ہے، اسے وہاں رکھنا ہے مال ڈنگر کی طرف۔'' پھر وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''چل اٹھ نی! میں تجھے تیرا کام بتاؤں۔''

وہ شانی کو لے کر بھینسوں اور گھوڑوں کی طرف آ گئی۔ پانچ چھ صحت مند بھینسیں، دو گائے، تین دیسی چھترے اور چار گھوڑے۔ یہ سارے جانور شانی کی ذمے داری ٹھہری۔ چھیدو نے اسے سمجھایا۔ ''ان کی صفائی رکھنی ہے۔ نہلانا دھلانا بھی ہے۔ چارا دانہ وقت پر دینا

ہے۔ مالک ہڈ حرام نوکروں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ مار مار کر کھال اتار دیتا ہے۔'' تب اس نے ایک تازی گھوڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ چھوٹے مالک کی گھوڑی ہے اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔''

شانی کو اس کے فرائض بتانے کے بعد چھید و دوسری لڑکیوں کی طرف چلی گئی۔ وہاں گوبر اور پیشاب کی بو کے درمیان کھڑی شانی حالات کی ستم ظریفی پر غور کرتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی تھی۔ اپنے بابل کے آنگن میں شہزادیوں کی سی شان سے رہتی تھی۔ آج وہ نوکروں سے بھی بدتر حالت میں یہاں کھڑی تھی۔ اسے ادنیٰ مزدوروں کی طرح کام کرنا تھا اور بات صرف قید بامشقت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں اس کی عزت و ناموس اور زندگی پر بھی ہر وقت خطروں کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اسے یہاں چھوٹے مالک کی نوکرانی بنایا گیا تھا اور وہ یہاں کی نوکرانیوں کے رنگ ڈھنگ اچھی طرح دیکھ رہی تھی۔

منا، شانی سے دور ہو چکا تھا۔ اس کی آواز شانی نے کئی دنوں سے نہیں سنی تھی۔ اس کے لئے شانی کے دل میں ہر وقت سہمی ہوئی دعائیں نکلتی رہتی تھیں۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مُنا یہاں موجود نہیں ہے۔ یقیناً تاؤ حشام یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ مُنے کے اغوا کا الزام اس کے سر آجائے۔ ایسے میں چوہدریوں کے خاندان کے اندر ہی بہت بڑا فساد برپا ہو سکتا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ مُنا چوہدری بشیر کے پاس واپس پہنچ چکا ہے۔ تاہم اس بارے میں شانی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتی تھی۔

باقی رہا رستم، تو رستم اس چار دیواری میں موجود تھا۔ شانی نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا، اس کے بعد اس میں کچھ اور دیکھنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کا دل تو پہلے ہی زخموں سے چُور تھا اب وہ سرتاپا زخم بن گئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے منہ سے درد میں ڈوبی ہوئی ''ہائے'' نکل جاتی تھی۔ کسی وقت وہ بالکل مختلف انداز میں سوچنے لگتی۔ وہ سوچتی تھی، جو کچھ ہو رہا تھا اس سے بڑھ کر اب اور کیا ہوگا۔ وہ اس طرح تڑپے کہ اس پنجرے کی ساری تیلیاں بکھر جائیں۔ اس کا محاصرہ کرنے والی ساری دیواروں کے چیتھڑے اُڑ جائیں۔ وہ کچھ ایسا کرے کہ جس کے بعد بے موت مرنے کا غم دل میں باقی نہ رہے...... وہ اب ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں اس کے پاس کھونے کے لئے بہت کم تھا۔ وہ کیا کر سکتی تھی؟ کیا کر سکتی تھی؟ وہ سوچنے لگی۔ کیا وہ کسی طرح رستم تک پہنچ سکتی تھی؟ اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکتی ہے؟ اس کے ٹوٹے ہوئے حوصلے کی کرچیاں جمع کر سکتی ہے؟ یا پھر کچھ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ

اپنے طور پر اس چار دیواری سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے؟ یہاں سے نکل کر وہ کسی طرح پنڈی پہنچ جائے۔ وہاں شیری، زوار اور رستم کے دیگر جاں نثار ساتھیوں کو بتائے کہ ان کا دوست کہاں اور کس حال میں ہے؟ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس چار دیواری میں بھی پہرے داری اور نگرانی کے کافی انتظامات ہیں لیکن یہ انتظامات اتنے سخت اور مکمل نہیں تھے جتنے کوٹھی اور انیکسی وغیرہ میں تھے۔ یہاں سے نکلنا دشوار اور جان لیوا ضرور ہو سکتا تھا لیکن ناممکن نہیں۔ پھر پیر بابا کی جادوئی آواز اس کے تصور میں گونجنے لگی...... انہوں نے کہا تھا۔ ''میرا بچہ! یہ دنیا، اسباب کی دنیا ہے۔ انہونیاں بھی ان لوگوں کے لئے ظاہر ہوتی ہیں جو انہونیوں کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ تو میرا بچہ! بدترین حالات میں بھی ہمت نہیں ہارنی، حوصلہ چھوٹا نہیں کرنا۔ آگے بڑھنا ہے اور آگے بڑھنے والوں کو رستے ملتے ہیں۔''

شانی کو لگا، جیسے اس طوفانی رات میں ''رتھ'' کے اندر ملنے والے پیر بابا اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ کئی دنوں یا شاید کئی مہینوں کے بعد ایک عجیب طرح کا اطمینان شانی کے سینے میں اُترنے لگا۔ اسے لگا جیسے حالات بدل سکتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے اور وہ جو کچھ بھی ہوگا کم از کم اس سے تو بہتر ہوگا جو اس کے اردگرد موجود ہے۔ وہ سوچتی رہی، خیالات ذہن میں ابھرتے اور مٹتے رہے۔ ایک طوفان سا ہولے ہولے اس کے دل پر دستک دیتا رہا۔ کوئی اس کے کان میں سرگوشی کرتا رہا۔ ''کچھ ہونے والا ہے۔''

اس چار دیواری کے کرتا دھرتا ''چھوٹے مالک'' سے شانی کی ملاقات اگلے روز رات کو ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔ ڈولے کے بیان کے عین مطابق اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال ہی ہوگی۔ جسم بھی دبلا پتلا تھا۔ اس نے چمکیلے کپڑے کا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ کُرتے پر ست رنگی واسکٹ تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دور ہی سے ان میں نشہ تیرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اپنے مبینہ باپ تاؤ حشام کی طرح اس کا چہرہ بھی کرخت اور غصیلا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی کم عمر بیوی تھی۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ یعنی کم عمر ہونے کے باوجود وہ شوہر سے بڑی تھی۔ حیران کن طور پر وہ چست پتلون اور سویٹر میں تھی۔ اس نے بال شہری لڑکیوں کی طرح تراشے ہوئے تھے۔ میک اپ کے ذریعے اس نے خود کو فلمی ہیروئن کی طرح سجا رکھا تھا۔

شانی تب اصطبل سے صحن کی طرف آ رہی تھی۔ تاؤ کا بیٹا اسے دیکھ کر رک گیا۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے نشیلے، لڑکھڑاتے لہجے میں شانی سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب دیتی۔ ہٹی کٹی چھیدو تیزی سے قریب آئی۔ ''چھوٹے مالک! یہ تمہاری نئی نوکرانی ہے۔'' چھیدو نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

چھوٹے مالک کی مبینہ بیوی بُرا سا منہ بناتی ہوئی چوبارے کی طرف چلی گئی۔ چرس کے نشے میں ڈوبے ہوئے چھوٹے مالک نے شانی کو سرتاپا گھورا۔ ''اچھا...... اچھا...... جس کی بات ابّے نے بتائی تھی۔''

''ہاں... جی اب بالکل پاک ہوگئی ہے۔ حضرت جی نے پورے پندرہ دن عمل کرایا تھا اس پر۔ جونکیں لگتی رہی ہیں اس کو۔ سارا گندا خون نکل گیا ہے اس کا۔''

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے...... دیکھ لیں گے۔'' چھوٹے مالک نے مبہم انداز میں کہا اور اپنی رنگ برنگی بیوی کے پیچھے چوبارے میں چلا گیا۔

اگلے تین چار دن میں اس چار دیواری کے کئی ڈھکے چھپے گوشے شانی کے سامنے بے نقاب ہوگئے۔ اسے پتا چلا کہ چھوٹا مالک ایک نوعمر شیطان کی طرح ہے۔ جسے اس کی بیوی کہا جا رہا ہے، وہ اس کی بیوی نہیں رکھیل ہے۔ اس رکھیل کا انتظام تاؤ حشام نے اپنے نوعمر بیٹے کے لئے بڑے شوق سے کیا تھا۔ بازارِ حسن کی اس طوائف زادی کی نتھ اُتروائی میں اس کی ماں کو پچاس ہزار روپے ادا کئے گئے تھے اور اسے کئی مہینوں کے لئے پابند کیا گیا تھا اور بات صرف اس طوائف زادی ہی کی نہیں تھی تاؤ کے نشیلے بیٹے کے لئے یہاں کی ہر لڑکی تر نوالہ تھی۔ وہ اس چار دیواری کا راجا اندر تھا اور یہاں کی عورتیں اس کی خادمائیں تھیں۔ وہ نشے میں دھت کسی سانڈ کی طرح یہاں چکراتا تھا۔ کوئی بھی جوان نوکرانی، کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ اس کی دست درازی کا شکار ہو سکتی تھی۔

شانی یہاں کے اطوار دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ایک دن اس نے چوبارے کی سیڑھیوں پر چھوٹے مالک کی بانہوں میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ اسی شام اس نے دیکھا کہ باورچی خانے میں بہت سا دودھ ابل گیا ہے اور دودھ ابالنے والی بلقیس چھوٹے مالک کے ساتھ کمرے میں گھسی ہوئی ہے۔ وہ چھوٹا مالک عفریت کی طرح تھا۔ اس کے ہونٹوں کے ساتھ ہر وقت ''پکا سگریٹ'' لگا رہتا تھا اور بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح لال رہتی تھیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ ایسے گل کھلا رہا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ملازماؤں کی آپس کی جھجک بھی ختم ہو چکی تھی بلکہ شاید وہ بھی اس رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ وہ آپس میں فحش گوئیاں کرتی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہونے والے سلوک کو دلچسپی کے ساتھ بیان کرتی تھیں۔ باپ کتنا بھی گمراہ اور آوارہ مزاج ہو، اپنی نوعمر اولاد کے لئے اس قسم کا

ماحول پسند نہیں کر سکتا۔ تاؤ حشام ایسا کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ شانی کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال میخ کی طرح گڑ جاتا تھا۔

شانی کو جو کمرہ دیا گیا تھا، اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک لڑکی بیمار تھی۔ اس کی ادھیڑ عمر ماں رات دن اس کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھی۔ یہ چوتھے یا پانچویں دن کی بات ہے...... ایک نوکرانی حمیدہ کے ساتھ مل کر شانی نے بھینسوں کو چارا اور گھوڑوں کو راتب بنا کر دیا۔ اس کے بعد ان دونوں کو کھلے چھتروں (مینڈھوں) والے کمرے کی صفائی کرنا تھی لیکن وہ دونوں ہی تھک کر چور ہو چکی تھیں اس لئے یہ کام کل صبح پر چھوڑ دیا۔ شانی اپنے کمرے میں واپس آئی تو ساتھ والے کمرے میں مریضہ لڑکی کی حالت ابتر محسوس ہوئی۔ وہ بار بار ''ہائے میں مری'' کی تکرار کر رہی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی شانی ان کے کمرے میں چلی گئی۔ یہ بمشکل اٹھارہ بیس سالہ کی لڑکی تھی۔ آٹھ دس روز پہلے تک یہ حاملہ تھی پھر اس کا اپارشن ہوا۔ اپارشن کے بعد یہ شدید بیمار ہوگئی تھی۔ لڑکی کا نام صفیہ تھا۔

شانی نے صفیہ کی ماں سے صفیہ کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔ جو جواب اسے ملا وہ اس کے خدشے کے عین مطابق تھا۔ ادھیڑ عمر عورت نے دردناک لہجے میں کہا۔ ''یہاں سب کا ایک ہی خصم ہے گڑیے...... اوپر والے نے پتا نہیں کیا سوچ کر کھلی چھٹی دی ہوئی ہے پیو پتر کو...... میری ملوک دھی کا کچھ نہیں چھوڑا اس مُنڈے نے۔'' عورت کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شانی جان گئی کہ گناہ چھپانے کے لئے لڑکی کا حمل ضائع کر دیا گیا جس کے سبب اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

شانی نے پوچھا۔ ''کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تم نے؟''

عورت سہمی آواز میں بولی۔ ''ڈاکٹر کو کہاں دکھانے دیتے ہیں مالک۔ ایک حضرت صاحب ہیں ان کے تعویذوں کے آسرے پر ہی بیٹھے رہتے ہیں۔''

قدرت اللہ کا صحت مند چہرہ شانی کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ شانی نے دائیں بائیں دیکھ کر مزید دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''یہاں کوئی لیڈی ڈاکٹر یا ڈاکٹر نہیں ہے؟''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر کا کیا پوچھتی ہو۔ ایک ڈاکٹرنی ہے پنڈ میں پر اب تو وہ بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہ مرگئی ہے یا بھاگ گئی۔ بڑا بُرا ہوا ہے اس وچاری کے ساتھ اور میری دھی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر زیب النساء نے پچھلے ہفتے ہی کہہ دیا تھا کہ اناڑی دائی نے سارا کام کھراب کر دیا ہے۔ یہ اب تعویذ گنڈوں والا کام نہیں ہے۔ کڑی کو فوراً گوجرانوالہ یا لاہور لے جاؤ بس اسی بات پر مالکوں کا ڈاکٹرنی اور اس کے خاوند سے جھگڑا ہو گیا۔ بڑے مالک کے بھائی نے میاں بیوی کو گالیاں دیں اور ان کو تھپڑ مارے۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔ وہ کہاں گئے۔''

شانی کی نگاہوں میں چند دن پہلے کا وہ ہولناک منظر گھوم گیا۔ حویلی کے دوسرے حصے میں شانی اور ڈولے نے نوجوان ڈاکٹر اور اس کی ساتھی کو چوہدریوں کے ہاتھوں بہت بُری طرح ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔ شانی کے دل نے گواہی دی کہ ادھیڑ عمر عورت جس ڈاکٹر میاں بیوی کا ذکر کر رہی ہے یہ وہی ہیں۔ وہ سناٹے کی سی کیفیت میں اس واقعے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسی دوران میں چھیدو کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ نوکرانیوں کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ اس کی جھڑکیوں سے بچنے کے لئے شانی جلدی سے صفیہ کے کمرے سے نکلی اور اپنے ٹھکانے پر آ گئی۔ چھیدو کسی کرخت مزاج سپرینٹنڈنٹ کی طرح مختلف کمروں میں چکرا رہی تھی۔ وہ ہر چیز کو عقابی نظر سے دیکھتی تھی اور ہر تبدیلی کو نوٹ کرتی تھی۔ شانی نے لالٹین کی لَو مدھم کی اور گھٹنوں تک لحاف لے کر لیٹ گئی...... اچانک ایک کرب ناک چیخ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آہنگ اتنا دلدوز اور اعصاب شکن تھا کہ قرب و جوار کی شے جیسے سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگی۔

☆======☆======☆

اس نے ساتھ والے کمرے میں پہنچ کر دیکھا، صفیہ کی ماں دلدوز انداز میں چلا رہی تھی اور صفیہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ صفیہ کی حالت ٹھیک نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بالکل زرد ہو رہی تھی اور کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اسی دوران میں قدرت اللہ کی مریدنی فضیلت، دو نوکرانیوں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے صفیہ کی والدہ کو کھینچ کر کمرے سے نکال لیا اور اسے نوکرانیوں کے سپرد کرنے کے بعد خود صفیہ کی حالت سنبھالنے میں لگ گئی۔ اس نے ایک خاص پیالے میں سے پانی لے کر صفیہ کے چہرے پر چھینٹے دیئے پھر ایک کالے کپڑے سے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔

ایک نوکرانی نے صفیہ کی والدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ کرو ماسی کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی تو دو تین بار دورہ پڑا ہے صفو کو اللہ سے خیر مانگ۔ .. .وہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''ہائے میری دھی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔ یا اللہ میری صفو کو کچھ نہ ہو۔ اس کے بدلے تُو میری جان لے لے۔'' ادھیڑ عمر عورت نے روتے اور ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے کہیں سے ایک جائے نماز ڈھونڈی اور اسے بچھا کر سجدے میں گر پڑی۔ دو تین منٹ بعد مریدنی فضیلت نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور گھبرائے ہوئے انداز میں نوکرانی بلقیس کو بھی اندر بلا لیا۔ بند دروازے کے پیچھے کیا ہو رہا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا۔ فضا میں ایک سنسنی سی تیر رہی تھی۔ کئی ملازمائیں برآمدے میں اور صحن میں دم بخود کھڑی تھیں۔ کچھ ڈری ڈری سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اسی اثناء میں نوکرانی بلقیس اُڑی اُڑی رنگت کے ساتھ کمرے سے نکلی اور حویلی کے دوسرے حصے کی طرف بڑھی۔ شاید وہ کسی کو بلانے گئی تھی۔ صفیہ کی والدہ نے ایک بار پھر کمرے میں جانا چاہا مگر مریدنی فضیلت نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت کے رونے کے باوجود اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ چند منٹ بعد قدرت اللہ کا باریش مرید بہت تیز قدموں کے ساتھ کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ بلقیس اس کے ساتھ کبھی بھاگتی اور کبھی چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ مرید کے آواز دینے پر فضیلت نے اندر سے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئی۔ مرید زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ ایک دو منٹ میں ہی باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت اور شانی تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ .. صفیہ فوت ہو چکی تھی۔ اس کا نوخیز چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ یہ خوبصورت آنکھیں جیسے اس پہیلی پر غور کرتے کرتے بے نور ہو گئی تھیں کہ آغازِ شباب کے ان پہلے پہلے دنوں میں اس سے کیا قصور ہو گیا تھا کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں پر مہندی نہیں رچی تھی۔ ابھی تو اس کی سکھیوں نے سہاگ کے گیت نہیں گائے تھے۔ ابھی تو اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا زندگی میں۔

صفیہ کی والدہ پچھاڑیں کھا کھا کر گرنے لگی۔ دوسری عورتیں اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ حویلی کے اس حصے میں کہرام سا مچ گیا۔ شانی کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے۔ اسے بھابو کی موت یاد آ گئی تھی۔ دکھیاری ماں چودہ سالہ بیٹی کے رخسار چومتی چلی گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر بوسے دینے لگی۔ اس سے لپٹنے اور جھنجھوڑنے لگی۔

عورتیں اس روتی پیٹتی عورت کو کھینچ تان کر باہر لے گئیں۔ وہ دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتی رہی، پھر وہ واویلا کرنے لگی۔ ''ہائے حضرت جی! تم کہاں گئے ہو۔ تم تو کہتے تھے اگلی جمعرات کو وہ اپنے پاؤں پر چل کر اپنے پنڈ جائے گی۔ .. دیکھو حضرت جی۔ . دیکھو وہ اپنے

پاؤں پر چل کر نہیں جا رہی، وہ دوسروں کے کندھوں پر جا رہی ہے۔ اب کہاں چلے گئے ہو تم۔ اب میری سنتے کیوں نہیں ہو؟''

ایک عورت نے سختی سے صفیہ کی ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہ بر کتے ایسی باتیں نہ کر۔ ایسی باتوں کا وبال پڑتا ہے۔ جو اللہ کی مرضی تھی وہ ہو گیا۔ اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔''

وہ مسلسل آہ و بکا کرتی رہی۔ عورتیں اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہیں۔ شانی کے سینے میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ یہاں وہی کچھ ہوتا تھا جو شاید پرانے زمانے کے ظالم و جابر حکمرانوں کے درباروں میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ مخلوقِ خدا کو بدترین اذیتوں سے گزارتے تھے اور رونے بھی نہیں دیتے تھے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد حویلی سے باہر شور و غل سنائی دیا۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان میں سے ایک آواز زیادہ تلخ اور بلند تھی۔ یہ کوئی جواں سال شخص تھا جو تاؤ حشام کے کارندوں سے تند لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''اتنے بے رحم نہ بنو۔ تم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ تم نے بھی ایک دن قبر میں اُترنا ہے۔'' اُڑتے اُڑتے سے جملے شانی کے کانوں میں پڑے۔

پھر شور و غل تیز ہو گیا۔ کئی افراد نے نعرہ زنی جیسا انداز اختیار کر لیا۔ یوں لگا جیسے ایک چھوٹا سا جلوس ہے۔ جو کسی مسئلے پر ایوانِ اقتدار کے سامنے سراپا احتجاج ہے۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا۔ کچھ کڑکتی برستی آوازیں آئیں اور شور و غل کی صدا پست ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ بس ایک وہی جواں سال شخص تھا جو اب بھی گاہے بگاہے نہایت تلخ آواز میں بولتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد شانی کی ساتھی ملازمہ حمیدہ باہر سے آئی۔ شانی نے اس سے پوچھا ''باہر کیسا شور تھا حمیدہ؟''

وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''صفو کے رشتے دار تھے۔ اس کی میت اپنے گاؤں شامیوال لے جانا چاہتے تھے۔ وڈے مالک جی (تاؤ حشام) نے منع کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صفو کو یہیں پر دفنایا جائے گا۔''

''ایک بندہ بڑی اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ وہ کون تھا؟''

''اس وچاری کا چاچا ہے۔ رو رو کر اس کا بُرا حال ہے۔ اس کو بڑی مشکل سے لے کر گئے ہیں چوہدری صاحب کے بندے۔''

''صفو کے یہ رشتے دار آئے کہاں سے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ کمبوہ برادری ہے۔ اس برادری کے بہت سے لوگ یہاں پاس ہی ایک گاؤں شامیوال میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آس پاس کے پنڈوں میں بھی یہ لوگ موجود ہیں۔''

''تاؤ حشام میت کو یہاں سے بھیج کیوں نہیں رہا؟''

حمیدہ نے ڈرے ہوئے انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ''شاید چوہدریوں کو ڈر ہے کہ شور شرابا شروع نہ ہو جائے۔ پچھلی سردیوں میں کمبوہوں کی ایک عورت چھوٹے مالک کی جیپ کے نیچے آ کر مر گئی تھی۔ یہ لوگ اس کی لاش اٹھا کر گوجرانوالہ لے گئے تھے اور سڑک بند کر دی تھی۔ شاید وڈے مالک کو ڈر ہے کہ اب بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ نہ ہو جائے۔''

چھوٹے مالک کا خطاب یہاں اسی پندرہ سولہ سالہ لڑکے کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یہاں ''راجا اندر'' بن کر رہ رہا تھا۔ ایک سال پہلے وہ یقیناً اور بھی کم عمر ہو گا۔ وہ چرس کے نشے میں بھی رہتا تھا۔ غالباً اسی نشے میں ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے کسی عورت کو کچلا تھا۔ شانی نے پوچھا۔ ''پھر کیا بنا اس عورت کے مرنے کا؟''

''بننا کیا تھا جی، مالکوں کے ہتھ بڑے لمبے ہیں۔ الٹا لینے کے دینے پڑ گئے۔ جن لوگوں نے جلوس نکالا تھا ان میں سے چار پانچ کو پُلس پکڑ کر لے گئی۔ بعد میں ان کے گھر والے چوری چوری آ کر وڈے مالک کے سامنے ہتھ جوڑتے رہے۔'' حمیدہ نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ''اب بھی یہ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اگر چپ رہیں گے تو وڈے مالک سے کچھ رقم شقم مل جائے گی۔ اگر شور ڈالیں گے تو الٹا مشکل میں پھنسیں گے۔ پرانی تکلیف بھول جائے گی، نئی تکلیفیں شروع ہو جائیں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وڈا مالک اور اس کا پُتر جو چاہے کرتے رہیں۔ کوئی ان کے خلاف آواز نہ نکالے۔''

حمیدہ بولی۔ ''وڈا مالک اکیلا نہیں ہے۔ پُلیس کا وڈا تھانیدار اس کے ساتھ ہے اور حضرت صاحب اس کے ساتھ ہیں، وڈے تھانیدار کی دشمنی تو شاید کوئی مول لے بھی لے مگر حضرت صاحب کی دشمنی کون مول لے سکتا ہے۔'' حمیدہ نے خوفزدہ انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جن سے حضرت صاحب ناراض ہو جاتے ہیں اللہ ماف کرے.... اللہ ماف کرے۔ کسی ویری دشمن کو ایسی سزا نہ ملے۔'' حمیدہ کے چہرے پر خوف کے تاریک سائے تھے۔

''سزا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''سزا تو سزا ہی ہوتی ہے جی۔ اور سب کو پتا ہے کہ حضرت صاحب کے پاس جنات اور دوسری ہوائی چیزیں ہیں۔ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ہم نے اپنی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں جی۔ ابھی کچھ دن پہلے کچھ لوگوں نے حضرت صاحب کے ساتھ بدتمیزی کی تھی...... وہ سارے اب بھگت رہے ہیں۔ وہ جو موٹی عورت جالاں یہاں حویلی میں آئی تھی وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھی۔ شاید آپ نے بھی دیکھا ہو، اس کے سارے پنڈے پر ساڑ نکل آیا تھا۔ ساری کی ساری سوج گئی تھی۔ رات دن روتی کُرلاتی تھی اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتی تھی۔ پتا نہیں کہ بچی بھی ہے کہ نہیں۔ دس پندرہ دن پہلے مالکوں نے اسے شہر بھجوا دیا تھا۔''

شانی کے لئے یہ نئی اطلاع تھی کہ جالاں کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی...... اور اب وہ شہر میں ہے۔ اگر جالاں کی تکلیف بڑھ گئی تھی تو پھر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ چوہدری بشیر بھی بُری حالت میں ہوگا۔ وہ تو جالاں سے پہلے بیمار ہوا تھا۔ اب حمیدہ بتا رہی تھی کہ کچھ اور لوگ بھی اس تکلیف کا شکار ہوئے ہیں۔ اس بارے میں شانی نے حمیدہ سے پوچھا تو وہ بولی۔ ''وڈے مالک کا ایک بھتیجا چوہدری بشیر لاہور میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا کپڑے کا کارخانہ ہے۔ اس پر کوئی جھگڑا شگڑا ہوا تھا۔ سنا ہے کہ چوہدری بشیر نے حضرت صاحب کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ چوہدری بشیر کے بندوں نے حضرت صاحب کے مریدوں کو دھکے دیئے تھے...... جن جن لوگوں نے یہ کام کیا تھا وہ سب کے سب سزا بھگت رہے ہیں۔ ان میں وڈے مالک کا بھتیجا چوہدری بشیر بھی ہے۔ سنا ہے کہ اس کی حالت جالاں سے بھی زیادہ خراب ہے۔''

شانی حیرانی کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ شاید حمیدہ اس بارے میں مزید کچھ بتاتی مگر اسی اثناء میں کچھ دیہاتی عورتیں روتی پیٹتی اندر آ گئیں۔ یہ بدنصیب صفیہ کی رشتے دار تھیں۔ چوہدریوں نے ان پر ''احسان'' کرتے ہوئے انہیں مرنے والی کا منہ دیکھنے کی سہولت فراہم کی تھی۔ بہرحال کسی مرد کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ان بیس پچیس عورتوں کے اندر آتے ہی حویلی کا منظر مزید سوگوار ہو گیا۔

اس رات آخری پہر نوعمر صفیہ کو خاموشی کے ساتھ گاؤں کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ فضا میں سراسیمگی، خوف اور نادیدہ جبر کی لہر تھی۔ ایک ہنستی کھلکھلاتی خوش رُو لڑکی منوں مٹی کے نیچے جا کر سو گئی تھی...... چوہدریوں کا بس چلتا تو شاید اس کی قبر بھی نہ بناتے۔ اس کے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیتے یا کہیں جلا کر راکھ کر دیتے۔

تین چار روز تک سوگواری کی کیفیت موجود رہی۔ نوکرانیوں کا آپس میں ہنسی مذاق منقطع رہا۔ چھوٹا مالک اور اس کی رنگ برنگی رکھیلیں بھی کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ حویلی کے کسی نامعلوم کمرے سے رات کے وقت صفیہ کی ماں کے رونے کی باریک آواز آتی پھر بتدریج یہ سب کچھ بدل گیا۔ صفیہ اور اس کی ماں والے کمرے کو دھو کر اچھی طرح صاف کیا گیا۔ نئی چادریں بچھائی گئیں۔ نئے تکیے رکھے گئے۔ صفیہ کی ذاتی اشیاء ایک نیلے میز پوش پر ڈھیر کی گئیں۔ خوشبو والا تیل، دو کنگھیاں، کانچ کی چوڑیاں، کسی میلے ٹھیلے سے خریدے جانے والے رنگین پراندے اور سستے سے جھمکے، ایک سرمے دانی، ایک بوسیدہ سا بٹوا جس میں چند روپے کی ریزگاری تھی۔ یہ سب کچھ میز پوش میں لپیٹ کر اس کی ماں تک پہنچا دیا گیا۔ ایک کہانی ختم ہو گئی۔ کوئی نئی کہانی شروع کرنے کے لئے وہ نیم پختہ کمرا کسی نئے مکین کا منتظر تھا لیکن کیا کہانیاں واقعی ایسے ختم ہو جاتی ہیں؟

ظلم واقعی اسی طرح چھپ جاتا ہے؟ صفیہ مر جاتی ہے لیکن مارنے والوں کے ہاتھ پر اس کا خون تو چمکتا رہتا ہے۔ یہ خون دستانوں کے اندر سے بھی اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے اور یہ خون صرف قاتلوں کے ہاتھوں پر ہی نہیں جمتا، پورے معاشرے کے ہاتھوں پر جمتا ہے اور یہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے...... انصاف طلب کرتا ہے۔

ہاں چند دن بعد بتدریج سب کچھ معمول پر آ گیا۔ رنگیلے شہزادے کی جھلک پھر نظر آنے لگی۔ جواں سال نوکرانیاں (جو دراصل رکھیلیں ہی تھیں) اپنے مستقبل کو بھول کر پھر چہلیں کرنے لگیں۔ ان کی گناہ آلود سرگوشیاں پھر فضا میں تیرنے لگیں۔ بیوی نما رکھیل کے کمرے میں ٹی وی اور وی سی آر چلنے لگا۔ اس چار دیواری میں شانی کی حیثیت ایک کم ترین ملازمہ کی تھی۔ کالی دھوتی اور سفید قمیص میں وہ روزانہ تقریباً سولہ گھنٹے کام کر رہی تھی...... ڈھور ڈنگر اور چار عدد گھوڑوں کی ساری دیکھ بھال شانی اور حمیدہ کے سپرد تھی۔

انہیں گوبر تک اٹھانا پڑتا تھا اور پھر اپلے تک تھاپنے پڑتے تھے۔ باسی روٹی کے ٹکڑوں اور چھان بورے وغیرہ کو رات ہی پانی میں بھگو دیا جاتا تھا۔ صبح سویرے اس میں کھل بنولہ اور بھوسا وغیرہ ملا کر بھینسوں کے لئے ''کُتاوا'' تیار کیا جاتا تھا۔ اسی طرح گھوڑوں کے آگے چارا دانہ ڈالا جاتا تھا۔ سردی میں جانوروں کو نہلانا اور اس کے چھپروں کے نیچے سے صفائی کرنا دشوار ترین کام تھا۔ گوبر سنبھالنے اور اپلے تھاپنے کے لئے دوپہر کا وقت مقرر تھا۔ سہ پہر کے فوراً بعد ایک بار پھر چارا باہر سے آ جاتا تھا لیکن کبھی کبھی حمیدہ اور شانی کو خود بھی دستی ٹوکے پر چارا کترنا پڑتا تھا۔ ان پُر مشقت کاموں کے دوران ڈشکری چھیدوان کے آس پاس موجود رہتی

تھی اور سُستی کی صورت میں بلالحاظ گندی گالیاں دینے لگتی تھی۔ خاص طور سے شانی کے ساتھ اس کا رویہ زیادہ سخت تھا۔ وہ شانی کو کسی کسی وقت طنزیہ انداز میں "رجیہ سلطانہ" کہہ کر بھی پکارتی تھی۔ اس خطاب کا تعلق یقیناً اس مار کٹائی سے تھا جو چند دن پہلے شانی اور حضرت صاحب کی بیبیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس حویلی میں چند ہی لوگوں کو معلوم تھا کہ شانی نار پور کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا انہیں تاؤ حشام وغیرہ نے غالباً زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ شانی کو ڈولے کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

ایک دن دودھ والے برتن راکھ سے اچھی طرح مانجھنے کے بعد شانی اور حمیدہ ذرا ستانے کے لئے چارپائی پر بیٹھی ہی تھیں کہ چھیدو کی صورت نظر آگئی۔ وہ دونوں پھر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج انہیں تین چار گھنٹے ہرا چارا بھی کترنا تھا۔ پہلے شانی "متھے" دیتی رہی اور حمیدہ ٹوکا چلاتی رہی۔ پھر ٹوکا چلانے کی باری شانی کی آگئی۔ یہ بڑا مشقت والا کام تھا۔ سردی کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں شانی اور حمیدہ پسینے سے تر ہوگئیں۔ اس وقت شانی دستی ٹوکے کو گھما رہی تھی جب اچانک اس کی نگاہ سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی۔ چوبارے کو جانے والی کچی سیڑھیوں کے بالائی سرے پر پندرہ سولہ سالہ چھوٹا مالک کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حسب معمول سُرخ تھیں۔ چہرہ کھچا ہوا اور رخساروں کی ہڈیاں نمایاں تھیں، اس نے اپنا عمومی لباس یعنی چمکیلا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ، گلے میں سونے کا کنٹھا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں، ٹھوڑی اور کلوں کی نچلی جانب سیاہی مائل بال نظر آتے تھے۔ شانی نے اسے دھیان سے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر اندر چلا گیا۔ مشقت کے سبب شانی کی پتلی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک رہی تھی، سر بھی ننگا تھا۔ اس نے بے ساختہ دوپٹا درست کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن دوپٹا وہاں کہاں تھا؟ چھوٹے مالک کے اس عشرت کدے میں نوکرانیوں کو جو "یونیفارم" دی جاتی تھی اس میں دوپٹا ناپید تھا۔ یعنی سرے سے وہ لباس ہی ختم کر دیا گیا تھا جو رنگیلے شہزادے اور جواں سال "لونڈیوں" کے جسموں کے درمیان رکاوٹ بن سکتا تھا۔ شانی نے اپنی بھیگی ہوئی قمیص جسم کے مختلف حصوں سے جدا کی اور ایک بار پھر ٹوکے کی دستی گھمانے میں مصروف ہوگئی۔ تاہم اس دوران اس کے کام میں پہلے جیسا انہماک نہیں تھا۔ دوران مشقت اپنا ڈولتا ہوا جسم اسے بُری طرح محسوس ہو رہا تھا۔

چارا کترنے کے بعد وہ دونوں ستانے کے لئے بیٹھ گئیں۔ اس مرتبہ چھیدو نے ذرا مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں آرام کرنے دیا۔

سورج ڈھلنا شروع ہوگیا تھا، سائے لمبے ہو رہے تھے۔ بیرونی دیوار پر شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے ہزاروں رنگ برنگے ٹکڑے درجنوں طرح کی شعاعیں منعکس کر رہے تھے۔

بڑے دروازے سے باہر کسی پہرے دار نے خودار رائفل کا برسٹ چلایا۔ تڑتڑ کی ہولناک آواز نے قرب و جوار کو لرزا دیا۔ پرندے شاخوں سے پرواز کر گئے۔ یہ ہوائی برسٹ تھا۔ اس طرح کے برسٹ دن میں دو چار بار ضرور چلائے جاتے تھے۔ غالباً اس طرح اپنے نادیدہ دشمنوں کو خبردار کیا جاتا تھا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی کی حماقت نہ کریں۔ اس حویلی کے نمک خوار پوری طرح چوکس اور مسلح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہوائی فائرنگ آس پاس کی رعایا (اہل دیہہ) کو بھی مرعوب رکھتی تھی اور انہیں وقتاً فوقتاً یاد دلاتی رہتی تھی کہ حویلی مضبوط اور طاقت ور ہے۔

اُپلے تھاپنے کے لئے بہت تھوڑا وقت بچا تھا۔ شانی اور حمیدہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تازہ اور باسی گوبر کا ڈھیر موجود تھا۔ اس گوبر کو خشک گوبر کے چُورے اور بھوسے کے ساتھ ملا کر گول گول تھاپا جاتا تھا اور پھر سوکھنے کے لئے زمین یا دیواروں پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ پہلے دنوں کے اپلے جو نیچے سے گیلے ہوتے تھے انہیں اکھاڑ کر جوڑے کی صورت میں جھونپڑی کی طرح زمین پر کھڑا کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ دوسری طرف سے بھی سوکھ جائیں۔ حمیدہ نیم خشک اپلوں کو جھونپڑی کی صورت کھڑا کرنے لگی۔ شانی نے قمیص کی آستینیں اڑسیں اور حسب معمول دل پر جبر کرتی ہوئی گوبر کے ڈھیر کے پاس آبیٹھی

فائرنگ کے بعد پرندے پھر آ آ کر درختوں کی شاخوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ ایک مرغا اور مرغی آگے پیچھے بھاگتے ایک بچھڑے کے پاؤں کے درمیان سے گزر گئے۔ بچھڑا اچھلا اور گوبر آلود پانی کے چھینٹے بلقیس کے چہرے پر پڑے۔ وہ بچھڑے اور اس کے پیدا کرنے والوں پر لعن طعن کرنے لگی۔ شانی نے ابھی گوبر میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ چھیدو دندناتی ہوئی وہاں پہنچ گئی.....

"نی رجیہ سلطانہ آج تُو نے گوئے (اُپلے) نہیں تھاپنے۔" چھیدو نے حکم صادر کیا۔

"پھر کیا کرنا ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"آج تُو نے چتکبرے گھوڑے کو کھر کھرا کرنا ہے۔" چھیدو کے بجائے بلقیس نے کہا۔ لہجہ طنزیہ تھا۔

شانی گھبرا گئی۔ اسے پہلے ہی ڈر تھا کہ کہیں چھیدو اسے کسی گھوڑے کو کھریرا کرنے کا نہ کہہ دے۔ اس نے اپنی حویلی میں ملازموں کو درجنوں دفعہ گھوڑوں کا کھریرا کرتے دیکھا

تھا۔ آہنی کنگھے سے گھوڑے کے فالتو بال اور گرد وغیرہ صاف کی جاتی تھی۔ وہ کھریرا تو کر سکتی تھی لیکن اسے گھوڑے کی دوستی سے بہت زیادہ ڈر لگتا تھا۔ اس کا پھیکا چہرہ دیکھ کر بلقیس زہریلے انداز میں مسکرائی، دوسری نوکرانیاں بھی دلچسپی سے شانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کی آنکھوں میں رمزیہ کیفیت تھی۔ اس کیفیت کے ساتھ ایک گدلی سی بیہودہ چمک بھی نظر آ رہی تھی۔

چھیدو نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''نی تُو تچی مچی کھر کھرے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ کوئی کھر کھرا شر کھرا نہیں کرنا۔ چل اٹھ نہا دھو کر دوجے کپڑے پہن لے اور خشبو بھی لگا لے تھوڑی سی۔ مری ہوئی مچھیوں کی بو آ رہی ہے پنڈے سے۔ چل اٹھ جا۔''

نوکرانیوں کی شوخ نظریں مسلسل شانی پر تھیں۔ شانی تب تو بات کی تہہ تک نہیں پہنچی لیکن شام کے بعد جب وہ اپنے نیم گیلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اچانک اس کے پورے جسم میں ایک تیز سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے دوپہر کا وہ منظر یاد آیا جب تاؤ حشام کے نشئی بیٹے نے اسے چوبارے کی سیڑھیوں پر سے دیکھا تھا۔ اس کی بیمار آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ کہیں ..... کہیں وہ نشے باز لڑکا آج اسے کسی امتحان میں تو نہیں ڈالنے والا؟ شانی نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

رات نو بجے کے بعد اس کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ یہ گاؤں کی رات تھی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہی قرب و جوار میں خاموشی چھانا شروع ہو جاتی تھی۔ نو بجے کے قریب چھیدو آئی اور شانی سے بولی۔ ''نی کیا کر رہی ہے ادھر، چل آ میرے ساتھ اوپر ایک کمرے کی صفائی کرنی ہے۔''

شانی تذبذب میں تھی۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے تھے مگر چھیدو کے ساتھ جائے بغیر گزارا بھی نہیں تھا۔ وہ طویل سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

چھیدو اسے لے کر سیڑھیاں چڑھی اور چوبارے میں آ گئی۔ ایک کمرہ تو وہ تھا جس میں چھوٹا مالک اپنی رکھیل ''کوں'' کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا کمرہ تھا۔ چھیدو نے اس دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور شانی سے بولی۔ ''اس کو ذرا ٹھیک ٹھاک کر دے۔''

شانی نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ ایک طرف دیہاتی طرز کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف رنگین پایوں والا پلنگ تھا۔ ایک ٹی وی، وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈر بھی کمرے میں موجود تھے۔ الماری میں پنجابی فلموں کی بے شمار آڈیو کیسٹس کا ڈھیر تھا۔ دیواروں پر فلمی ایکٹرسوں کے پوسٹر چسپاں تھے۔ شانی نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ ان

پوسٹرز میں زیادہ تر ایکٹرسوں نے پتلون قمیص یا ٹی شرٹ اور ٹراؤزر وغیرہ پہن رکھے تھے۔ ان کے بال جدید انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ شاید ایسے پوسٹرز ڈھونڈ ڈھونڈ کر لگائے گئے تھے۔ عین ممکن تھا یہ تاؤ کے بیٹے کا ہی کام ہو۔ شانی کو یاد آیا کہ وہ اپنی بغل میں جو ''جھرک چھلو'' لئے پھرتا ہے وہ بھی ایسے ہی کپڑوں اور حلیے میں نظر آتی ہے۔ پتا نہیں، اس معاملے کا کیا پس منظر تھا۔

شانی نے ادھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹیں، کرسیوں کی گدیاں وغیرہ درست کیں۔ بستر کی چادر ٹھیک کی۔ اسی اثناء میں تاؤ کا لڑکا اندر آ گیا۔ شانی کی رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ بعین وہی کچھ ہو رہا تھا جس کا اندیشہ تھا۔

لڑکے نے دروازے کی اندر سے کنڈی چڑھائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے سگریٹ لگا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی ایک تیز بو سارے کمرے میں پھیل گئی۔ شانی کو چرس کی بو کا تجربہ نہیں تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھا کہ یہ چرس ہی کی بو ہے۔ وہ اتنی تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے اور خود فراموشی کے حصول کے لئے اتنی شدت سے چرس نوشی کر رہا ہے۔ شانی نے اس کے سراپا کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے ایک بگڑے گھرے لڑکے کی طرح لگا۔ شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیوں اس طرح برباد کر رہے ہو خود کو؟ یہ نشہ تمہیں اندر سے جلا کر راکھ کر دے گا۔''

وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ''زیادہ استانی بننے کی کوشش نہ کر۔ میں کاکا نہیں ہوں۔''

''لیکن کام تو تم کاکوں والے ہی کر رہے ہو۔ بندہ اپنی عمر سے چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اپنی عقل سمجھ سے ہوتا ہے۔''

وہ کرسی پر کچھ اور بھی پھیل کر بیٹھ گیا۔ یوں لگا کہ شانی کے بات کرنے سے اس کی وہ بے نام جھجک ختم ہو گئی ہے جو اسے بے تحاشا کش لینے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پہلی بار بے باکی سے شانی کے سراپا کی طرف دیکھا اور نئے سگریٹ کو آگ لگا دی۔ شانی نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔ ''مجھے یقین ہے اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو تم کم از کم اس حالت میں نہ ہوتے۔ ماں جیسی بھی ہو مگر .....''

''اوئے ..... زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔'' تاؤ کے بیٹے نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اور چہرہ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ اس نے نئے سگریٹ کو پاؤں سے ملا اور شانی سے نظر چرا کر آتشیں لہجے میں بولا۔ ''چل کپڑے اتار اپنے۔''

شانی کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ گئیں۔ وہ اس نوعمر لڑکے کی دیدہ دلیری پر ششدر رہ گئی۔ یہ دیدہ دلیری اسے کس نے دی تھی؟ شاید تاؤ حشام کے اثر و رسوخ اور اس کی بے مہار طاقت نے... اور شاید ان عورتوں کی ناتوانی اور مجبوری نے جو اس کمرے میں اس چیچی کے ساتھ محصور ہوتی تھیں اور شاید اس معاشرے نے بھی جو لوگوں کو بس اپنے ہی دکھ پر چیخنا سکھاتا ہے۔

شانی ساکت کھڑی تھی۔ کمرے میں بلب کی زرد روشنی تھی۔ جنریٹر چلنے کی دور افتادہ آواز بتا رہی تھی کہ یہ واپڈا کی روشنی نہیں ہے۔ تاؤ کے بیٹے نے شانی کو ساکت کھڑے دیکھا اور ایک بار پھر نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ ''سنا نہیں تُو نے میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

شانی نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔ ''کچھ خدا کا خوف کر..... چھوٹے۔''

چھوٹے کے لفظ نے جیسے اسے اور بھی سیخ پا کر دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور تن کر کھڑا ہو گیا... اس نے اپنے چمکیلے کُرتے کے نیچے سے بھرا ہوا سیاہ پستول نکالا اور عجیب لہجے میں پھنکارا۔ ''میں نے تجھے کہا، زیادہ استانی بننے کی کوشش نہ کر۔ وہ کر جو کہہ رہا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں کی طرح اس کی انگارہ آنکھیں بھی بول رہی تھیں اور یہ کہہ رہی تھیں ''میں سب جانتا ہوں تیرے بارے میں تُو دشمن کی بیٹی ہے اور بدترین سلوک کی حق دار ہے۔''

شانی پتھر کی طرح جامد کھڑی رہی۔ پستول لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے ہاتھ کی ایک ایک ہڈی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس دوران میں بجلی کی رَو بحال ہو گئی۔ رَو بحال ہونے سے الماری میں رکھا ہوا ڈیک خود بخود آن ہو گیا۔ غالباً رَو منقطع ہونے سے پہلے وہ آن تھا۔ ایک بے ہودہ پنجابی گانا کان پھاڑ دینے والے شور کے ساتھ کمرے میں گونجنے لگا۔ لڑکے نے ڈیک بند کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی شور میں بلند آواز سے بولا۔ ''دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے میری طرف۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں گولی مار دوں گا... میں سچ کہتا ہوں۔'' وہ ہیجانی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے بریٹا پسٹل کی سرد نال شانی کی کنپٹی سے لگا دی۔

شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ شاید اس کیفیت کو لڑکے نے شانی کی پسپائی سمجھا۔ وہ اس کی کنپٹی پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جلدی کر... شاباش... جلدی کر۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں ہاتھ سے خود بھی شانی کا لباس کھینچنے کی کوشش کی۔

شانی گھومی اور اس کا تھپڑ اتنی زور سے لڑکے کے گال پر پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم

پیچھے ہٹ گیا۔ اگر ڈیک کا شور نہ ہوتا تو شاید اس طوفانی تھپڑ کی آواز نیچے تک جاتی۔ کم از کم کوکی نام کی اس رکھیل تک تو ضرور جاتی جو آج ''چھٹی'' منا رہی تھی اور ساتھ والے کمرے میں موجود تھی۔ تھپڑ کھا کر لڑکے کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کسی زخم کھائے جانور کی طرح شانی کی طرف جھپٹا اور پستول کی نال اس کی گردن میں گھسیڑ دی۔ شانی کو یوں لگا کہ پستول کی نال اس کے گوشت میں گھس کر ہڈی تک پہنچ جائے گی۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ وہ چنگھاڑا۔ ''تُو نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ میں تیری جان نکال لوں گا۔ میں قتل کر دوں گا تجھے۔''

شانی بے باکی سے اس کی شعلہ فشاں آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ ایک عجیب سا یقین اور نامعلوم سا اطمینان اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ وہی کیفیت جس کا تعلق اس کے خداداد وجدان سے تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چلا دو گولی... مار دو مجھے۔''

''میں... سچ مچ... مار... دوں... گا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ لہجے میں جنونی کیفیت تھی۔

''مار دو... سچ مچ۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

''میں کہتا ہوں... اتار دے کپڑے... نہیں تو میں نے... نہیں تو میں نے گھوڑا دبا دینا ہے۔'' اس کی آواز میں بے حد وحشت تھی۔

''دبا دے گھوڑا۔'' شانی کا لہجہ مضبوط تر تھا۔ وہ ہر طرح کی صورتِ حال کے لئے تیار تھی۔ جیسی زندگی وہ جی رہی تھی۔ اس میں موت کی کوئی حقیت نہیں رہ گئی تھی۔

چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوجے میں پیوست رہیں۔ یہ بے پناہ گھمبیر لمحے تھے، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور فرطِ غضب سے سرتاپا لرز رہا تھا۔ پھر اس نے شانی کو دھکیل کر پلنگ پر گرانا چاہا۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھ کر کرسیوں پر گرے، لڑکے کا پستول والا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔ پستول سے میگزین نکل کر دور جا گرا۔ شانی بالکل بپھری ہوئی تھی۔ ایک جلالی کیفیت نے اسے سرتاپا ڈھانپ لیا تھا اور اس نے کئی زناٹے کے تھپڑ لڑکے کے منہ پر رسید کئے۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی۔ ''بے غیرت..... بدذات..... کمینے۔''

یہ سارا شور شرابا ڈیک کی سماعت شکن آواز میں دب کر رہ گیا تھا۔ شانی کے طوفانی تھپڑ کھا کر تاؤ کا بیٹا جیسے ہکا بکا رہ گیا۔ یوں لگا جیسے اس کا نشہ ہرن ہو رہا ہے اور اس کے اندر کی

ساری سختی وجبروت سنائے میں آرہی ہے۔ وہ ساکت نظروں سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس موقع پر کیا کرے۔ جنگلی جانور کی طرح شانی پر پل پڑے..... یا یونہی بیٹھا رہے۔ شانی کا طیش اپنے عروج پر تھا۔ وہ اس کا گریبان جھنجھوڑ کر چلائی۔ "گولی کیوں نہیں چلاتا کمینے.... پکڑ پستول...... چلا گولی...... میں تیرے سامنے ہوں۔ چلا گولی۔"

وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

وہ ہیجانی انداز میں آگے بڑھی۔ اس نے ٹی وی ٹرالی کے نیچے پڑا ہوا میگزین اٹھایا اور اسے پھر سے چھوٹے مالک کے پسٹل کے ساتھ اٹیچ کیا۔ پسٹل بدستور چھوٹے مالک کے ہاتھ میں تھا۔ شانی نے پسٹل کی نال پکڑ کر اپنے سینے پر دل کے مقام پر رکھ لی۔ دوسرے ہاتھ سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "چلا گولی۔ اب سوچتا کیا ہے۔ میں تیار ہوں تیرے ہاتھوں مرنے کے لئے۔"

وہ پتھر کی مانند ساکت تھا، اس کا رنگ لمحوں میں زرد ہو گیا تھا۔ شانی کے ہیجان نے اسے مسمرائز کر دیا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ شانی نے پھر ایک جھٹکے سے پسٹل کی نالی اپنے سینے میں دھنسائی۔ اس کی شہادت کی انگلی کو اپنے ہاتھ سے موڑ کر ٹریگر پر رکھا اور چیخ کر بولی۔ "تُو تو بڑا شیر جوان بنتا تھا۔ اب اتنا سا گھوڑا بھی نہیں دبا سکتا..... کمینے۔ میں نے نہیں کپڑے اتارنے تیرے سامنے..... قتل کر دے مجھے..... قتل کر دے۔"

شانی نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ بال بکھر گئے۔ سیاہ پسٹل اس کے ہاتھ میں کسی بے کار کھلونے کی طرح دبا ہوا تھا...... اسے بُری طرح پیٹنے کے بعد شانی نے فرش پر بیٹھ کر اپنا سر گھٹنوں میں دیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ڈیک پر نی میل سنگر کی آواز زور و شور سے گونج رہی تھی۔ "آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے......"

کئی منٹ تک رونے کے بعد شانی نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ تاؤ کا بیٹا جوں کا توں فرش پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک طرف جھکا ہوا تھا اور اس کا سارا وزن اپنے دائیں ہاتھ پر تھا۔ اس دباؤ کے سبب اس کا دایاں کندھا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ پسٹل اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ خون آلود تھا۔ گریبان پھٹنے سے سینہ اور پیٹ عریاں ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بے حد گھمبیر لیکن خاموش آنسو۔ جب اس نے محسوس کیا کہ شانی اس کی جانب دیکھ رہی ہے تو اس کے رونے میں شدت آ گئی۔ آنسو گرنے کی رفتار تیز ہو گئی اور سینے سے گاہے بگاہے ایک ہچکی بلند ہونے لگی..... یہ ایک بالکل مختلف صورتِ حال تھی۔ اس صورتِ حال نے بتدریج شانی کے دل پر اثر کرنا شروع کیا۔ وہ ایک دو

منٹ تک ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھی اور طوفان مچاتے ہوئے ڈیک کو آف کر دیا۔ اس کے بعد وہ لڑکے کے قریب آئی۔ کئی سیکنڈ تک سوچتی رہی تب اس نے بیٹھ کر اشک بار لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے ایک نہایت غصیلے جھٹکے کے ساتھ شانی کا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور پلنگ پر اوندھا گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اس مرتبہ شانی نے اسے رونے دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے سینے کا زہریلا غبار اس کی آنکھوں کے راستے نکل رہا ہے۔ وہ کم و بیش دس منٹ تک اسی طرح روتا اور ہچکیاں لیتا رہا۔ تب بتدریج اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ شانی نے اس کا بریٹا پسٹل دراز میں رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے قریب جا بیٹھی۔ اس مرتبہ اس نے شانی کا ہاتھ اپنے کندھے سے نہیں جھٹکا۔ شانی دھیرے دھیرے اس کا کندھا سہلانے لگی۔ پھر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ اسی طرح اوندھا لیٹا رہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے رستے رہے۔ اس کے رخسار پر شانی کی انگلیوں کے گہرے نشان تھے۔ اس کا سر شانی کے زانو سے چھو رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ شانی کو ایک بچے کی طرح لگا۔ ایک نادان بچہ جو کسی غلطی کے سبب بے طرح رسوا اور پشیمان ہوا تھا۔ شانی اس کے سُرخ رخسار کو نرمی سے سہلانے لگی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور تاؤ حشام کا بیٹا آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رات اپنے نصف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنریٹر ایک بار پھر چلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی فراہم کی ہوئی توانائی سے بلب کی روشنی کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس روشنی میں شانی نے تاؤ کے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے پر جب جنس کا بھوت سوار تھا تو یہ بدصورت اور کریہہ نظر آتا تھا لیکن اب یہ دھلا دھلایا تھا اور اس کے کرخت نقوش میں ایک طرح کی حلاوت داخل ہو گئی تھی۔ بظاہر معمولی تبدیلی تھی لیکن شانی کو نظر آ رہی تھی۔

شانی کے ساتھ کشمکش میں تاؤ کے بیٹے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہو گیا تھا۔ اب اس نے پھٹے ہوئے کُرتے کی جگہ دوسرا کرتہ پہن لیا تھا۔ کُرتے کی یہ تبدیلی شانی کی موجودگی میں ہی ہوئی تھی۔ شانی نے اس کے سینے پر دو جگہ ایک نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ دیہات کے میلے ٹھیلوں میں لوگ انمٹ سیاہی سے ایسے نام اور پھول بوٹے اپنی جلد پر نقش کرواتے ہیں۔ جو نام شانی نے لکھا ہوا دیکھا وہ کوکی تھا۔ کوکی اس رنگین تتلی کا نام تھا جو اس چار دیواری میں ہمہ وقت تاؤ کے بیٹے کے ساتھ نظر آتی تھی۔ وہ بظاہر ایک عام سی بازاری لڑکی تھی۔ شانی نے اب تک اس چار دیواری میں جو کچھ دیکھا تھا، اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ یہ لڑکی یہاں بس عارضی دل لگی کا سامان ہے۔ مگر اب سینے پر کندہ اس کا نام دیکھ کر شانی کو اپنی رائے ناقص

محسوس ہونے لگی۔

بڑی حکمت، نرمی اور بڑے اصرار کے ساتھ شانی نے تاؤ کے بیٹے کو گفتگو پر آمادہ کرلیا تھا۔ اس کے لب و لہجے میں ابھی تک خفگی اور طیش موجود تھا۔ بہرحال یہ غنیمت تھا کہ وہ شانی کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس نے شانی کو جو کچھ بتایا۔ اس سے شانی کو تاؤ حشام، تاؤ حشام کی بیوی بچوں اور اس چار دیواری کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

یہ جگہ نارپور سے قریباً تین میل دور تھی۔ قریب ترین پختہ سڑک بھی یہاں سے کم و بیش پچیس میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اس گاؤں کا نام میانہ معلوم ہوا۔ تاؤ حشام نے اپنے چچیرے ممیرے بھائیوں کی طرح بس ایک شادی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اس نے اعلانیہ طور پر چار شادیاں کی تھیں۔ دو بیویاں تو نارپور میں تھیں۔ ایک ڈسکہ میں اور ایک یہاں اس گاؤں میانہ میں۔ یہ سب سے چھوٹی بیوی تھی۔ اسے مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس بیوی سے تاؤ کا صرف ایک بچہ تھا اور وہ یہی "چھوٹا مالک" تھا۔ چھوٹے مالک کا اصل نام معراج دین تھا۔ تاؤ اسے پیار سے راجو کہتا تھا۔ راجو کی ماں تاؤ کی لاڈلی بیوی تھی۔ اسی طرح راجو بھی لاڈلا تھا۔ یہ لوگ خاندان کے دوسرے افراد سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے۔ راجو کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ اس حویلی کے رہنے والے فاخر کی شادی یا بھابو کی تدفین جیسے واقعات میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ ہاں راجو کو یہاں کے کچھ دوسرے مکینوں کی طرح اتنا پتا ضرور تھا کہ شانی اس کے چچازاد فاخر کی بیوی تھی اور اس کی پہچان یہاں دشمن کی بیٹی کے طور پر ہے۔

شانی نے چھوٹے مالک یعنی راجو سے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تمہارا ابا تم سے پیار کرتا ہے۔ اگر وہ سچ مچ پیار کرتا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہاری حرکتوں سے روکتا کیوں نہیں ہے۔"

"کون سی حرکتیں؟"

شانی جرأت سے بولی۔ "یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو۔ رات دن نشے کے سگریٹ پھونکتے ہو۔ شراب پیتے ہو۔ نوکرانیوں کے ساتھ ہر حرکت کرتے ہو۔ ایک لڑکی تم نے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ کیا تمہارے ابے کو ان باتوں کا پتا نہیں؟"

ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ شانی کی بات پر بھڑک اٹھے گا لیکن پھر اس نے اپنی تلخی پر قابو پایا۔ اس نے ایک گہری سانس آہ کی طرح لی اور قدرے بے پرواہی سے بولا۔ "ابا مجھ کو کیوں روکے گا۔ ابے نے ہی تو یہ سب کچھ کر رکھا ہے۔"

"کیا مطلب۔ یہ لڑکیاں تمہارے آلے دوآلے ابے نے جمع کی ہوئی ہیں؟"

"ہاں۔ اسی نے کی ہوئی ہیں۔" اس کے لہجے میں غصے کی لہر سی محسوس ہوئی۔

"کیوں؟"

"بس..... بے کوئی بات۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟" شانی نے بڑے خلوص اور دردمندی سے اس کی سُرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے پکے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور کہا۔ "میرا ابا میرا دھیان کسی کی طرف سے ہٹانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ..... کوکی میرے دماغ سے نکل جائے بالکل ہی نکل جائے۔"

شانی نے حیرت سے کہا۔ "لیکن..... کوکی تو تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"نہیں ... یہ وہ کوکی نہیں ہے۔" اس نے بڑے درد سے کہا۔ "اس کا تو بس نام کوکی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کوکی نام کی دو لڑکیاں ہیں؟"

"نہیں کوکی ایک ہی ہے۔ یہ جو میرے ساتھ رہتی ہے اس کا نام تو میں نے کوکی رکھا ہے۔"

شانی پہلے تو الجھی لیکن پھر جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ تاؤ حشام کا یہ نشئی بیٹا کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی اس سے دور ہوگئی تھی۔ اب اس کا غم غلط کرنے کے لئے اس نے بگڑے تگڑے چوہدریوں جیسا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ خود کو چرس اور شراب کے نشے میں غرق کر رہا تھا۔ اس کے ابے نے بھی اس حوالے سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق پتر سے پورا پورا تعاون کیا تھا۔ اس نے اپنے نوعمر بیٹے کے اردگرد جوان نوکرانیوں کی بھیڑ لگا دی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ تندمزاج بیٹا ان رنگ رلیوں میں کھو کر اپنی ناقابلِ قبول ضد بھول جائے گا اور لگتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ نوعمر بیٹا اپنا رونا دھونا چھوڑ کر اردگرد کے خوبصورت کھلونوں سے کھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ جس لڑکی کی زلفوں کا اسیر تھا، اس کا نام کوکی تھا۔ اپنا دل بہلانے کے لئے اس نے اپنی رکھیل کا نام بھی کوکی رکھ لیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شانی نے اس کے سینے پر کوکی کا نام لکھا دیکھا تھا۔ یہ اس گمشدہ محبت کی نشانی تھی۔ وہ اپنی رکھیل کو پتلون شرٹ پہناتا تھا کیونکہ کوکی کو اس نے زیادہ تر اسی لباس میں دیکھا تھا۔ اس کے کمرے میں جو فلمی پوسٹر آویزاں تھے ان میں بھی یہی پہناوا دکھائی دیتا تھا۔

یہ "چھوٹے مالک" کا ایک بالکل مختلف روپ سامنے آیا تھا۔ شانی کو یوں لگا جیسے یہ

بگڑا ہوا چوہدری زادہ گمراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی ہے۔ اس کے ابّے کا کردار بھی قابلِ مذمت تھا۔ ایک غلط کار بیٹے کو راہِ راست پر لانے کے لئے ایک بے راہرو باپ نے گمراہ کن راستہ اختیار کیا تھا۔

شانی نے پوچھا۔ ''وہ لڑکی جس سے تم پیار کرتے ہو، اب کہاں ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کچھ پتا نہیں۔ ابّے نے اور بھا قادر نے اسے پتا نہیں کہاں غائب کر دیا ہے۔''

''تم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں کی تھی۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ یوں لگا جیسے اس لڑکی کا ذکر اب اسے تکلیف دے رہا ہے۔ وہ ایک تلخ حقیقت کو بھول کر اپنی بدمستی میں گم رہنا چاہتا تھا۔

''لڑکی اسی پنڈ کی تھی؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کہاں کی تھی؟''

''پاک پتن کی۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

شانی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ چونک کر راجو کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھنے لگی۔ پاک پتن شریف کا ذکر تو شانی نے کوتاہ قد ڈولے سے سنا تھا۔ اس نے غور کیا...... اور پھر ایک دم کئی کڑیاں اسے آپس میں ملتی محسوس ہوئیں۔ تاؤ کے اس بیٹے کا نام راجو تھا اور اس لڑکے کا نام بھی راجو تھا جس سے پاک پتن کی کوکب پیار کرتی تھی اور ڈولا جسے ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔ پھر ایک اور بات شانی کی سمجھ میں آئی۔ کوکی شاید کوکب کا ہی گھریلو نام تھا...... یقیناً یہی بات تھی۔

شانی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک کہانی کے خدوخال اس کے سامنے واضح ہو گئے۔ کوتاہ قد ڈولا، کوکب نامی لڑکی سے پیار کرنے والے لڑکے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آ پہنچا تھا...... اور وہ ٹھیک جگہ پہنچا تھا۔ یہ وہ چار دیواری تھی جہاں راجو نام کا مطلوب ''چوہدری زادہ'' موجود تھا۔

''اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟'' راجو قدرے غصے میں بولا۔

''کچھ نہیں...... بس...... ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔''

''کیا بات؟''

''تم بڑے تھوڑے دل کے ہو۔ بلکہ میں کہوں گی کہ بزدل ہو۔''

''دیکھو، میں نے اب تک تمہارا بڑا لحاظ کیا ہے۔ بڑا لحاظ کیا ہے۔'' اس کی سرخ

آنکھوں میں ایک بار پھر نمی تیرنے لگی۔

''بہادر وہ نہیں ہوتا جو بے لحاظ ہو۔ بہادر تو وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پالیتا ہے۔ اس حساب سے تو تم نے بہادری ہی دکھائی ہے۔ میں جو تمہیں بزدل کہہ رہی ہوں تو ایک اور وجہ سے کہہ رہی ہوں۔''

وہ غصیلی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

شانی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی سے پیار کرنا اور پھر ہمت ہار دینا بھی تو بزدلی ہے...... تم نے ہمت ہار دی ہے۔ اس لڑکی کو بھول بھال کر اپنی عیاشیوں میں پڑ گئے۔ وہی کچھ کرنے لگے جو تمہارا ابا چاہتا ہے۔ اپنے ابّے کے سامنے اور زمانے کے سامنے ہار مان لی ہے تم نے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔''

''ہاں، غلط کہہ رہی ہو۔'' وہ کھوکھلی آواز میں بولا۔ ''میں نے..... میں نے بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اسے۔ پتا نہیں اس کے ماں پیو اسے لے کر کہاں چلے گئے ہیں۔ یا پھر ڈر کر شاید پاک پتن میں ہی کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں اپنے یار بیجا گجر کے ساتھ ان کے پیچھے کراچی تک گیا ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ مجھے تو لگتا ہے...... مجھے تو لگتا ہے۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

شانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو راجو! اگر مجھے کچھ بتانے ہی لگے ہو تو ساری بات بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

اس نے غصیلی نظروں سے شانی کو گھورا۔ جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا ہو، تم میرے پیو کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ایک بے بس عورت ہو۔ تم میری کیا مدد کرو گی۔

شانی نے اصرار سے کہا۔ ''تم کیا کہنے لگے تھے...... تمہیں کیا لگتا ہے۔''

اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے اور ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے...... کہ شاید وہ حرامزادی مجھ سے پیار شیار کرتی ہی نہیں تھی۔ بس دل لگی کر رہی تھی مجھ سے۔ اگر اس کے دل میں کچھ ہوتا تو کیا وہ اس طرح لک (چھپ) کر بیٹھی رہتی۔ اسے تو میرے تھاں ٹھکانے کا بھی تھوڑا بہت پتا تھا۔ وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتی۔ کوئی سناں (پیغام) ہی مجھ تک پہنچا دیتی۔'' اس نے آنکھ سے بہنے والے آنسو کو الٹے ہاتھ سے پونچھنے کی کوشش کی۔

''کیا پتا اس نے کوشش کی ہو۔ لڑکی تو پھر لڑکی ہوتی ہے۔ اسے سو طرح کے بندھنوں نے باندھ رکھا ہوتا ہے۔ وہ ایک حد تک ہی جا سکتی ہے ناں اور پھر اس بے چاری کی عمر ہی کتنی ہو گی۔ ابھی تو تمہاری عمر بھی پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں لگتی۔ وہ تم سے کچھ چھوٹی ہی

ہوگی۔"

"میں 17 ویں سال میں چڑھ چکا ہوں۔ وہ مجھ سے بس تھوڑی ہی چھوٹی تھی۔"

"بہرحال تم دونوں چھوٹی عمر میں ایک بڑے چکر میں پھنس گئے ہو۔ یہ عمر تو سکول جانے اور ہنسنے کھیلنے کی ہوتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں حیران ہو رہی ہوں تمہاری عمر دیکھ کر اور تمہارے کام دیکھ کر۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس ناراض نظروں سے فرش کو گھورتا رہا۔ شانی نے اس سے پوچھا کہ کوکی نام کی اس لڑکی سے اس کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی۔ کچھ دیر تک ہچکچانے اور تذبذب میں رہنے کے بعد راجو نے جو کچھ بتایا، اس سے صورتِ حال پوری طرح واضح ہوگئی۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ راجو ہی وہ چوہدری زادہ تھا جس کی تلاش میں ڈولا جگہ جگہ بھٹکتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ راجو نے اپنے اور کوکی یعنی کوکب کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا۔

یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات تھی۔ پاک پتن شریف کے میلے میں تاؤ حشام کے کچھ گھر والے پاک پتن پہنچے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم میلے کی تاریخوں سے پہلے ہی شہر میں ڈیرا جمانا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی رہائش کے لئے مکانات کرائے پر اٹھائے جاتے ہیں۔ تاؤ حشام کے گھر والے قریباً تین ہفتے پہلے پاک پتن پہنچ گئے تھے۔ راجو بھی ان میں شامل تھا۔ جس گھر میں راجو اور اس کے عزیزوں نے رہائش رکھی اس کے ساتھ والے مکان میں کریانہ فروش سیف اللہ کی رہائش تھی۔ سیف اللہ کی دو بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے چھوٹی کوکب تھی۔ کوکب اور اس کی بڑی بہن دونوں کالج اور سکول میں پڑھ رہی تھیں دونوں اپنے آپ کو خوب سنوار کر رکھتی تھیں۔ چھوٹی کوکب نے شہری لڑکیوں کی طرح باقاعدہ بال ترشوا رکھے تھے اور نئی تراش کے کپڑے پہنتی تھی۔ اسے کپڑوں کی ڈیزائننگ کا شوق تھا اور وہ شام کے وقت ایک ڈیزائننگ سکھانے والے سکول میں بھی جاتی تھی۔ پاک پتن میں قیام کے دوران ہی راجو اور کوکب کی نگاہیں لڑ گئیں۔ یہ تعلق دو تین ہفتوں کے اندر ہی طوفانی محبت میں بدل گیا اور میانہ گاؤں کا یہ نوعمر چوہدری زادہ شہری کوکب پر مر مٹا۔ عرس ختم ہونے کے دس بارہ روز بعد ہی راجو پھر پاک پتن آ دھمکا اور کوکب کے اردگرد منڈلانے لگا۔ کوکب بھی بُری طرح اس چکر میں پھنس چکی تھی۔ غریب کریانہ فروش سیف اللہ نے چوہدری زادے راجو کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اس سے کہا کہ وہ ایک عزت دار بندہ ہے یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ کوکب کی عمر ابھی تھوڑی ہے لیکن اگر وہ واقعی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو پھر اپنے

ماں باپ کو پاک پتن بھیجے تاکہ اس معاملے کو کوئی مناسب شکل دی جا سکے۔

راجو نے واپس میانہ آ کر اپنے چچازاد قادرے اور باپ حشام کو سب کچھ بتایا اور ان کو مجبور کیا کہ وہ پاک پتن جا کر کوکب کے بڑوں سے بات کریں۔ چوہدری حشام کے لئے یہ سب کچھ قطعی طور پر ناقابلِ قبول تھا۔ وہ بیٹے کو ہم پلہ لوگوں میں بیاہ کر لمبی جوڑی جائیداد حاصل کرنے کا پروگرام رکھتا تھا۔ اس نے معاملے کی سنگینی دیکھی تو وہی کچھ کیا جو ایسے موقعوں پر سرمایہ دار، زمیندار اور وڈیرے کرتے ہیں۔ اس نے پاک پتن پہنچ کر کریانہ فروش سیف اللہ کو بُری طرح ڈرایا دھمکایا اور بیٹی سمیت روپوش ہونے پر مجبور کر دیا۔

بعدازاں تاؤ حشام نے جو کچھ کیا، وہ شانی کے سامنے تھا اور راجو بھی اس سے مکمل طور پر بے خبر نہیں تھا۔ تاؤ حشام نے نوعمر بیٹے کو اس کی لگن سے چھٹکارا دلانے کے لئے اپنے مزاج کے مطابق قدم اٹھایا۔ نشہ تو وہ پہلے ہی کرتا تھا۔ اب تاؤ نے اس کے لئے جنس کو بھی ارزاں اور عام کر دیا۔ اس کے اردگرد جوان لڑکیوں کی بھیڑ لگا دی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ عورتوں کے درمیان چند مہینے گزار کر، راجو کی نئی نئی جوانی کا ابال ٹھنڈا ہو جائے گا اور کوکی کا بھوت اس کے سر سے اُتر جائے گا۔ اگر دیکھا جاتا تو تاؤ حشام اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ باپ کی یہ "کامیابی" بیٹے کو مکمل بربادی کی طرف لے جا رہی تھی۔

شانی نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے راجو کی باتیں سنیں اور اس کرب کو محسوس کیا جو یہ بگڑا ہوا چوہدری زادہ ابھی بھی اپنے سینے کی گہرائی میں محسوس کرتا تھا۔

شانی نے نرمی سے اپنا ہاتھ راجو کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں تو پھر؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ ذرا حیرانی سے بولا۔

"اگر میں کہوں کہ میں کوکب کے سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں تو کیا تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو گے؟"

"تم کوکب کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں کچھ نہیں جانتی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ میں کسی نہ کسی طور تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ مگر جب تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو دل بجھ جاتا ہے۔ اگر وہ لڑکی واقعی تم سے محبت کرتی ہے تو پھر تمہیں اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھی ضرور بجھ جائے گا۔ سچی بات یہ ہے راجو کہ تم نے اپنے آپ کو بہت ہی نیچے گرا لیا ہے۔"

وہ بدستور الجھی ہوئی نظروں سے شانی کا چہرہ تک رہا تھا۔ ''تم تو ایسے باتیں کر رہی ہو جیسے تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔'' وہ بولا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی نیچے صحن کی طرف سے رونے کی باریک لیکن تیز آواز سنائی دی۔ نوحے کی طرح بلند ہوتی اور ڈوبتی ہوئی آواز۔ یہ صفیہ کی ماں تھی جو بدنصیب بیٹی کو یاد کر کے رات کے سناٹے میں آہ و بکا کر رہی تھی۔ درد کچھ ایسا تھا اس کے رونے سے دل پگھلتا محسوس ہوتا تھا۔ عورت کی آواز سنی تو راجو کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

شانی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے غلط نہیں کہا راجو! تم نے خود کو بہت نیچے گرا لیا ہے۔ اتنا نیچے کہ سوچ کے دل کانپ جاتا ہے۔ یہ لڑکی تمہاری وجہ سے مری ہے اور اس سے پہلے بھی پتا نہیں کیا کیا تمہارے ہاتھوں ہو چکا ہے۔''

اس کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے تمتمانے لگا لیکن اس بار وہ بولا کچھ نہیں۔ بس ایک جھٹکے سے اٹھا۔ سگریٹوں کی ڈبیا اپنی جیب میں ڈالی۔ پستول اپنے چمکیلے کُرتے کے نیچے لگایا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز کئی چبھتی ہوئی نظروں نے شانی کو دیکھا۔ ان میں دیگر نوکرانیوں کے علاوہ چھیدو کی طنزیہ مسکراہٹ والی نگاہ بھی شامل تھی۔ وہ شانی کی تمام حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھی، جیسے ان حرکات وسکنات سے کل رات کی ساری روداد جان لینا چاہتی ہو۔ بلقیس اور فرزانہ کی دبی دبی سرگوشیاں بھی شانی نے سنیں۔

وہ حمیدہ کے ساتھ اپنے روزمرہ کے کام میں لگی رہی۔ شام سے ذرا پہلے وہ تھک کر چُور ہو چکی تھی لیکن آج اسے ایک اضافی کام بھی کرنا پڑ گیا۔ دودھ دھونے والا ملازم اللہ رکھا کہیں گیا ہوا تھا۔ چھیدو نے دو بھینسوں کو دھونے کی ذمہ داری شانی پر ڈال دی۔ وہ اپنی حویلی میں کبھی کبھی شوقیہ دودھ دھویا کرتی تھی مگر آج تو یہ سب کچھ قید بامشقت کا حصہ تھا۔ شانی گھٹنوں میں پیتل کی بالٹی دبائے دودھ کی دھاروں کا رخ درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب تاؤ حشام قادرے اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ چھوٹا مالک یعنی راجو بھی ان کے ساتھ تھا۔ شانی کو دودھ دھوتے دیکھ کر تاؤ بھڑک اٹھا۔

گرج کر چھیدو سے کہنے لگا۔ ''چھیدو کم بختے! اس حرامزادی کو کس کام پر لگایا ہے تُو نے۔ دودھ سڑ جائے گا جانوروں کا ... میں نے تجھ سے کہا تھا اس منحوس کے لئے نیچ کام

ڈھونڈنے ہیں۔ گوبر اور گھوڑی کی لدّ ٹوکرے میں ڈال کر رکھا کر اس کے سر پہ ''

قادرے کے دانت نکل آئے۔ راجو بھی ہولے سے مسکرایا لیکن تیسرے شخص کا چہرہ تقریباً سپاٹ ہی رہا، یہ بابر تھا۔ یہ دوسری بار تھی کہ اس چار دیواری میں شانی نے بابر کی شکل دیکھی تھی۔ بہر حال یہ احساس اسے اکثر ہوتا رہتا تھا کہ بابر اور قادرا وغیرہ اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔

تاؤ کی کنپٹی کا زخم ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ غالباً وہ ہلکے نشے میں تھا۔ اس نے شانی کو بالوں سے پکڑا اور بھینس کے پہلو سے اٹھایا اور برآمدے کی طرف دھکیل دیا۔ بالٹی گر گئی اور دودھ گوبر پر بکھر گیا۔ تاؤ نے اپنا دیسی جوتا اتارا اور شانی کے کندھوں اور پشت پر بے دریغ ضربیں رسید کیں۔ وہ لڑکھڑا کر گر گئی اور اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ تاؤ حشام کی پھنکار اس کے کانوں میں گونجی۔ ''حرامزادی! تُو نے حویلی کو ساڑا تھا۔ تیرے ایک ایک انگ کو علیحدہ علیحدہ آگ لگاؤں گا۔ تُو دیکھتی رہ کرتا کیا ہوں تیرے ساتھ۔'' پھر تاؤ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کمال بے باکی سے بولا۔ ''اوئے راجو! یہ بن بیاہی زنانی ہے تیری۔ میری بات سمجھ رہا ہے ناں تُو؟''

راجو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کوئی آکڑ شاکڑ تو نہیں دکھاتی تجھے؟'' راجو نے نفی میں سر ہلایا۔ تاؤ شانی کو سنانے کے لیے بلند آواز میں بولا۔ ''اگر آکڑ دکھائے تو بتانا مجھے۔ اسے باغ والے ڈیرے پر بھیج دوں گا۔ پندرہ دی ڈشکروں کی روٹی شوٹی پکائے گی تو مت ٹھکانے آجائے گی اس کی۔'' تاؤ نے ''روٹی شوٹی'' معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

تین چار منٹ تک شانی کو سب کے سامنے ذلیل کرنے کے بعد تاؤ حشام، بیٹے کے ساتھ اوپر چوبارے کی طرف چلا گیا۔ قادرا اور بابر بھی اس کے ساتھ تھے۔ چوبارے پر تین چار فٹ اونچی پکی منڈیر تھی۔ اس منڈیر میں رخنے سے بنے ہوئے تھے، جیسے قبائلی علاقوں کے مکانوں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ایسے رخنے کسی ہنگامی صورتِ حال میں مورچہ بند ہونے اور فائرنگ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ پنجاب کے جن دیہات میں شانی گھومی تھی۔ وہاں اس قسم کا منظر اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

تاؤ حشام، قادرا اور بابر وغیرہ چوبارے کی چھت کا جائزہ لینے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آنے والے دنوں میں انہیں کسی طرح کا خطرہ لاحق ہے۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دھیان اپنے میکے کی طرف اور اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ اسے تلاش

کر رہے تھے؟ اگر کر رہے تھے تو کس شدت سے کر رہے تھے؟ چوہدری بشیر کے درجنوں پچیرے، ممیرے اور خلیرے بھائیوں کی حویلیوں میں سے وہ مطلوبہ حویلی کیسے ڈھونڈ سکتے تھے۔ ایسے اور اس طرح کے بے شمار سوالات شانی کے ذہن میں کلبلانے لگے۔

ایک دو بار اس کی نگاہ بابر کی نگاہ سے بھی ٹکرائی۔ تاہم بابر کا چہرہ سپاٹ رہا اور اس کی نگاہ میں بھی کسی طرح کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ شانی کمرے میں گھس کر کچھ دیر تک آنسو بہاتی رہی پھر سنبھل گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اب تکلیف اور شرمساری کے احساسات اس پر تادیر اثر نہیں کرتے۔ تاؤ وغیرہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد شانی کو ایک صورت نظر آئی اور اس کے بجھے ہوئے دل میں ہلکی سی لہر پیدا ہوئی۔ یہ ڈولا تھا۔ آج کئی دنوں بعد اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ اب وہ زنانہ کپڑوں میں نہیں تھا۔ اس نے وہی پہلے والی بوسیدہ پتلون اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو ملازموں کے نہ آنے کی وجہ سے اسے دو تین روز کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اپنی خوش طبعی کے برعکس وہ کافی سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ قید و بند کی طوالت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اسے واپسی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی اور مستقبل بھی مخدوش تھا۔

شام کے بعد کھانے کے وقت شانی کھانے کی چنگیر اپنے سامنے رکھ کر بیٹھی رہی۔ اس کا ایک لقمہ اٹھانے کو دل نہیں چاہتا تھا...... اور یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی روزانہ ہی ایسا ہو رہا تھا۔ وہ چنگیر سامنے رکھ کر بیٹھی رہتی۔ آنسو اس کے حلق میں گرتے رہتے۔ اسے رستم کی حالت زار یاد آتی اور اس کے کھانے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا۔ اس کا دل سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔ وہ رستم تک پہنچنے اور کسی طرح اس کی مدد کرنے کے حیلے سوچتی رہی... آج بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ڈولا اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''باجی جی! آپ کتنی دیر سے ایک ہی نوالہ ہاتھ میں گھما رہی ہیں۔''

شانی نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''ڈولے! رستم کے بارے میں کسی نئی بات کا پتا چلا۔''

ڈولے نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ہاں جی۔''

شانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ڈولے نے بھی کھانے کی چنگیر ایک طرف کھسکا دی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ اہم اور گھمبیر۔ شانی کا دل تیز رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے کچھ ہو جائے گا۔ وہ رونے لگے گی یا پھر غش کھا کر گر جائے گی۔ رستم کے حوالے سے پچھلے چند دن شانی نے بڑی تکلیف میں گزارے تھے۔ اس کا

خیال ایک لحظے کے لئے بھی اس کے دل سے جدا نہیں ہوا تھا۔ وہ خشک آنکھوں کے ساتھ دن رات روتی رہی تھی۔

ڈولے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''باجی! مجھے پتا چلا ہے کہ یہ لوگ ایک دو دن میں رستم کو پولیس کے حوالے کرنے والے ہیں۔''

''پولیس کے حوالے؟'' شانی نے حیرانی سے کہا۔

''جی ہاں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے رستم کے بارے میں اپنے دل کی ہر حسرت نکال لی ہے۔ اب شاید وہ چاہتے ہوں گے کہ پولیس بھی کھل کھلا کر اس سے اپنا حساب چکا لے۔ سنا ہے کہ پولیس کے ساتھ رستم کا پرانا ٹاکرا تھا۔ چند مہینے پہلے بھی پنڈی کے قریب رستم نے پولیس کی ایک پارٹی کو بُری طرح مارا پیٹا تھا۔ اس لڑائی میں زخمی ہونے والا ایک پولیس اہلکار دو ہفتے پہلے ہی ہسپتال میں مرا ہے۔ اخباروں میں اس خبر کا چرچا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی رستم کے خلاف قتل کا تازہ مقدمہ بھی درج ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق چوہدری یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ رستم کسی بھی صورت پھانسی سے بچ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب انہیں قانون کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا ہے؟''

''یہ ساری باتیں دو دن پہلے حویلی کے بڑے کمرے میں ہوئی ہیں۔ چھ سات بڑے بڑے چوہدری وہاں موجود تھے۔ تاؤ حشام اور قادرا وغیرہ بھی تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ رستم کے ساتھی اور دوست اسے بڑے زور و شور سے تلاش کر رہے ہیں۔ لاہور اور نارپور میں چوہدریوں کے ساتھ ان کی ایک دو جھڑپیں بھی ہوئی ہیں جن میں تین چار بندے زخمی ہوئے ہیں۔'' ڈولے نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ''باجی جی! رستم کا کوئی دوست زوار نام کا بھی ہے؟''

''ہاں ہے تو۔'' شانی نے کہا۔

''چوہدریوں کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہی دوست سب سے زیادہ بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ وہ کافی اثر و رسوخ والا ہے اور لڑائی بھڑائی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ شاید چوہدریوں کو شک پڑ گیا ہے کہ رستم کے یہ دوست یہاں میانہ گاؤں تک پہنچ جائیں گے اس لئے وہ فٹافٹ رستم کو پولیس میں دے رہے ہیں۔''

''اور کیا سنا ہے تم نے؟''

ڈولے کا چہرہ بجھ سا گیا۔ یوں لگا کہ اسے کرب محسوس ہوا ہے۔ وہ پہلے تو چپ رہا پھر

گہری سانس لے کر بولا۔ ''باجی جی! جو کچھ میرے کانوں تک پہنچا ہے اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ رستم کو سرِعام ذلیل کر کے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا کہ پورے علاقے میں رستم سیال کی دہشت ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے اور بہت سے شاید اب بھی کانپتے ہوں گے۔ چوہدری چاہتے ہیں کہ رستم کی دہشت کی جگہ اب ان کی دہشت قائم ہو۔ وہ رستم کو لوگوں کے سامنے جتنا ذلیل کریں گے ان کی پگڑیوں کے شملے اتنے ہی اونچے ہوں گے.....''

''کیا کریں گے وہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''مم...... مجھے نہیں پتا جی...... پر بندے کو ذلیل کرنے کے سو طریقے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ رستم کی گرفتاری کے وقت کوئی ڈرامہ رچایا جائے۔ یہ بتایا جائے کہ رستم کو عام دیہاتیوں نے پہچانا اور پکڑا......اور پھر مار مار کر پولیس کے سپرد کر دیا۔'' ڈولے نے چند لمحے توقف کیا، پھر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے جی کہ رستم کو جان بوجھ کر بھاگنے کا موقع دیا جائے اور پھر دیہات کے لوگوں سے کہا جائے کہ اسے پکڑ لیں۔''

''پر یہ ساری کی ساری باتیں تم نے سن کیسے لیں؟'' شانی نے پوچھا۔

ڈولے نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح حویلی کے بڑے کمرے میں چوہدریوں کا اجلاس ہوا تھا اور کس طرح حقوں کی چلمیں بھرنے وغیرہ کے دوران میں اس نے اپنے کان ان کی گفتگو پر لگائے رکھے۔

ڈولا کافی آزردہ دکھائی دیتا تھا اور اس آزردگی کی وجہ یہ گفتگو ہی تھی جو پرسوں رات اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ ڈولا شانی کے حوالے سے بھی خاصا دکھی تھا۔ وہ یہاں شانی کی بدتر حالت دیکھ رہا تھا اور دیگر لوگوں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ شانی چھوٹے مالک کی Keep کے طور پر رہ رہی ہے۔ شانی نے اس کے خیال کی نفی کی اور اسے تسلی دی۔ شانی کو ڈولے اور اردگرد کے دیگر احوال کی سن گن بھی ملی۔ ڈولے سے اس اطلاع کی تصدیق ہوئی کہ جالاں اور چوہدری بشیر کے علاوہ بھی کئی لوگ پُراسرار جلدی بیماری کا شکار ہوئے ہیں... ڈولے کے مطابق یہ کہا جا رہا تھا کہ بیماری کا شکار ہونے والے لوگ وہی ہیں جو پچھلے ماہ لاہور والی کوٹھی میں حضرت صاحب کے ساتھ ''گستاخی'' کے مرتکب ہوئے تھے۔

اس رات شانی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ڈولا کام کاج کے بعد حویلی کے مردانے میں واپس چلا گیا تھا۔ (شانی نے ابھی جان بوجھ کر اسے یہ خبر نہیں سنائی تھی کہ وہ جس لڑکے کی تلاش میں ہے، اس کا کھوج لگ گیا ہے) ایک آہٹ کے سبب شانی کی آنکھ کھلی۔ اس نے لائٹ کا بٹن دبایا مگر روشنی نہیں ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ لائٹ گئی ہوئی ہے اور جنریٹر بھی شام سے خراب ہے۔ سونے سے پہلے اس نے لالٹین کی لو مدھم کر کے اسے بستر کے نیچے کھسکا دیا تھا۔ اس نے لالٹین نکالی۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ کھڑکیاں اندر سے بند تھیں، لیکن دروازے کو کنڈی نہیں چڑھائی گئی تھی۔ یہاں رات کو دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس دروازے کو بھیڑا جا سکتا تھا۔ ساری ملازمائیں ایسا ہی کرتی تھیں...... اکیلی عورت جب اپنی خواب گاہ کو اندر سے کنڈی لگاتی ہے تو ایک طرح سے اپنا اختیار استعمال کرتی ہے...... وہ اختیار جس کا تعلق اس کی عزت و ناموس کی سلامتی سے ہوتا ہے لیکن یہاں تو کسی کو ایسا اختیار حاصل ہی نہیں تھا۔ جو کچھ حاصل تھا چھوٹے مالک کو حاصل تھا اور وہ جب اور جس وقت چاہے من مانی کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہاں شب و روز دروازے کھلے رہتے تھے اور سروں پر دوپٹا رکھنے کی ممانعت تھی۔ شانی کو یاد آیا کہ تین دن پہلے دوپہر کے وقت صرف دھوپ سے بچنے کے لئے اس نے سر پر ایک تولیہ رکھا تھا۔ چھیدو چیل کی طرح جھپٹ کر آئی تھی اور تولیہ کھینچ کر دور پھینک دیا تھا۔

یکایک شانی کو اپنے خیال سے چونکنا پڑا۔ آہٹ دوبارہ سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ وہ خاصی واضح تھی۔ شانی کے ذہن میں سب سے پہلے یہاں کے ''راجا اندر'' کا خیال ہی آیا۔ وہ اس کے دروازے کے سامنے موجود تھا لیکن اگر یہ وہی تھا تو پھر اسے یوں دبے پاؤں آنے اور رکے رہنے کی کیا ضرورت تھی؟

اچانک دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گیا لیکن وہ چھوٹا مالک نہیں تھا اس کی لمبی چوڑی جسامت ہی بتا دیتی تھی کہ وہ تاؤ کا پتر راجو نہیں ہے۔

''سلاماں لیکم۔'' اس نے اندر آتے ہی آہستگی سے کہا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ اسے دیکھ کر شانی چلانا ہی شروع نہ کر دے۔

شانی یک ٹک سے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا آگے آیا اور شانی نے دیکھا اس کا چہرہ ایک کالے منڈاسے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پاؤں میں گرگابی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازے کو بھیڑ لیا تھا۔ اچانک اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے پستول نکالا اور شانی کی گردن سے لگا دیا۔ ''اگر آواز نکالو گی تو یہیں پر ڈھیر کر دوں گا۔ ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگاؤں گا۔'' وہ بے حد کرخت لہجے میں بولا۔

شانی جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ ڈھاٹا پوش کے بائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا سیاہ کپڑا تھا۔ اس نے کپڑا ایک طرف رکھا اور ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو کچھ اور مدھم کر دی پھر اس نے

سیاہ کپڑے کو پھیلایا اور شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ برقع پہن لو فافٹ......''

''کیوں؟''

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''کہاں؟ کون ہو تم؟''

''سوال نہیں کرنے، صرف وہ کرنا ہے جو کہہ رہا ہوں۔'' اس نے پستول بے رحمی سے شانی کی پسلیوں میں گھسیڑا۔ اس کے لب و لہجے نے شانی کو سمجھا دیا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موقع پڑنے پر ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اگلے ایک منٹ تک وہ سخت کشمکش میں رہی۔ دوسری طرف پستول بردار کا لہجہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ شانی کو اپنے ہاتھ برقع کی طرف بڑھانے پڑے۔ اس نے جان بوجھ کر بہت آہستہ آہستہ برقع پہنا۔ ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی تیزی سے مصروف تھا۔ اہم ترین سوال یہی تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

جب وہ برقع پہن کر بٹن وغیرہ بند کر چکی تو پستول بردار کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا وہ بولا۔

''ایک بات ذہن میں رکھنا، میں تمہارا دشمن نہیں خیر خواہ ہوں، تمہاری مدد کر رہا ہوں۔''

''لیکن......''

''لیکن شیکن کچھ نہیں...... جو میں کہہ رہا ہوں کرتی جاؤ۔ یہ تمہارے بھلے میں ہے۔''

پتا نہیں کیوں، شانی کو نامعلوم شخص کے لہجے میں سچائی کی جھلک نظر آئی۔ درپیش حالات کے باوجود اسے یہی لگا کہ وہ اس کا خیر خواہ ہے۔ اس نے شانی کو چپل پہننے کا حکم دیا۔ پھر دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر برآمدے میں جھانکنے لگا۔ جھانکنے کے بعد اس نے جلدی سے شانی کا بازو پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ جنریٹر بند ہونے کی وجہ سے چاروں طرف تاریکی چھائی تھی۔ بس اوپر چوبارے میں لالٹین یا گیس لیمپ کی مدھم سی روشنی موجود تھی۔ چھوٹے مالک کے کمرے سے ریڈیو بجنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یقیناً ٹرانسسٹر ریڈیو نہیں ہو گا، ایس پی جون نغمہ سرا تھا۔ محبت کے دم سے یہ دنیا حسیں ہے۔

محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

محبت کا وعدہ وفا کرنے والو

نمازِ محبت ادا کرنے والو...... چھوٹا مالک جس کے کمروں سے گھنگھروؤں کی آواز آیا کرتی تھی یا پھر ''سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے'' جیسے گانے گونجا کرتے تھے، آج ایک گداز اور

سوز بھرا نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ شاید کل رات کے تہلکہ خیز تجربے نے اس کے ذہنی رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کی تھی۔ وہ جنس کی بدبو سے نکل کر ایک بار پھر محبت کی مہک کی طرف رجوع کر رہا تھا۔ بہر حال یہ ایک قیاس تھا۔ اس مرحلے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

شانی کا ہاتھ بدستور پستول بردار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور حویلی کی ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ برقع شانی کے جسم پر قدرے لمبا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ شانی کی کالی دھوتی برقعے میں چھپ گئی تھی۔ بصورتِ دیگر دھوتی پر برقع مضحکہ خیز نظر آتا...... وہ آگے بڑھے...... ڈربے میں بند کسی مرغ نے بے وقت کی اذان دی اور ڈھارے کی طرف ایک چھترے نے اپنے منہ سے ''بھے بھے'' کی سستی بھری آواز نکالی۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر شانی نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ ایک بند بوری کے اندر بے چین حرکت ہو رہی تھی اور غوں غاں کی بہت مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ غالباً کسی پہرے دار کی مشکیں کس کے اور اس کا منہ باندھ کر اسے بوری میں بند کر دیا گیا تھا۔

پستول بردار نے بڑی آہستگی سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ دروازے سے باہر رکھوالی کے دو لحیم شحیم کتے پرالی کے ایک گٹھے کے قریب بے سدھ پڑے تھے۔ وہ مُردہ نہیں تھے کیونکہ ان کے پیٹ کی حرکت سانس کی آمد و رفت کی نشاندہی کرتی تھی۔ انہیں کچھ کھلا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ یہاں شانی کو دیسی جوتی کا ایک پاؤں اور ایک مفلر بھی زمین پر پڑا نظر آیا۔ یہ چیزیں یہاں تھوڑی دیر پہلے ہونے والی کشمکش کی نشاندہی کرتی تھیں۔

پستول بردار شانی کو ساتھ لئے ایک بند ٹریکٹر کے قریب سے گزرا اور تیزی سے مکئی کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ وہ شانی کو اپنے ساتھ کھینچتا جا رہا تھا...... گاہے بگاہے وہ بے ساختہ بول اٹھتا۔ ''گھبراؤ مت۔ چلتی جاؤ۔'' بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

یہ ایک تاریک اور نیم خنک رات تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تھے جن کے سبب تاروں کی روشنی بھی وقفے وقفے سے دکھائی دیتی تھی۔ ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ دونوں بڑی تیزی سے قریباً ایک فرلانگ دور آ گئے۔ گاؤں کے مدھم خدوخال ان کے دائیں جانب تھے۔

کھیتوں کے درمیان انہیں تھوڑی سی خالی جگہ نظر آئی۔ یہاں سے شٹالا وغیرہ کاٹا گیا تھا۔ یہاں شانی کو دو سائے دکھائی دیئے۔ ان کے پاس ہی ایک دیہاتی تانگہ کھڑا تھا۔ قریب پہنچ کر شانی کو پتا چلا کہ جو دو سائے کھڑے ہیں ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ عورت نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن رکھا ہے۔ مرد کی عمر بائیس چوبیس سال ہو گی۔ وہ اپنے

لباس اور حلیے سے کوچوان دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں ایک تیسرا لمبا تڑنگا شخص مکئی کے پودوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ پستول بردار کی طرح اس کے چہرے پر بھی سیاہ ڈھاٹا تھا۔ اسے دیکھ کر پستول بردار نے کہا۔

''لو جی! آپ کا کام ہو گیا ہے۔''

کوچوان نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو بھین جی (بہن جی) بیٹھ جاؤ۔'' کافی عرصے بعد شانی نے اپنے لئے ''بھین جی'' کا لفظ سنا تھا۔ سخت پریشانی اور غیر یقینی کیفیت کے باوجود اسے یہ لفظ اچھا لگا ای دوران میں ''دیہاتی آسمان'' سے بدلیاں ہٹ گئیں اور تاروں کی نمایاں روشنی قرب و جوار کا منظر اجاگر کرنے لگی۔ ....شانی نے نئے آنے والے ڈھاٹا پوش کو دیکھا۔ اس کی فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں، پتا نہیں کیوں شانی کو یہ آنکھیں بُری نہیں لگیں۔

پستول بردار کا لہجہ بھی اب بہت نرم اور ہمدردانہ تھا۔ اس نے شانی کو بازو سے پکڑ کر تانگے پر بٹھایا اور بولا۔ ''فکر نہیں کرنا۔ میں بھی تانگے کے پیچھے آؤں گا۔ چانن ہونے سے پہلے ہم تمہیں محفوظ جگہ پر پہنچا دیں گے۔''

شانی حیرت سے ان نامعلوم دیہاتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ جب بندے کی مصیبتیں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو آسمان سے فرشتے اُترتے ہیں.....کیا آج رات بھی اس کام کے لئے کوئی فرشتہ یا فرشتے اُترے تھے۔ یا پھر یہ بھی انسان ہی تھے۔ انسان جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں، کئی روپ بدل سکتے ہیں۔ کوچوان نما شخص کی آواز نے شانی کو ایک بار پھر چونکایا۔ ''بھین جی! بیٹھ جاؤ تانگے پر۔''

ایک لحظے کے لئے شانی کے دل میں آیا کہ وہ تانگے کی طرف قدم بڑھائے مگر پھر اگلے ہی لمحے رستم کا خیال بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے ذہن میں آ سمایا......وہ یہاں اس چار دیواری میں موجود تھا اور بے پناہ اذیتیں جھیل رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی کی وجہ بھی وہ خود ہی تھی۔ تو کیا وہ اسے یہاں چھوڑ کر چلی جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ رستم کا غم طوفانی لہروں کی طرح اس کے دل و دماغ سے ٹکرایا اور اس کی ہستی کو تہہ و بالا کر گیا۔ اس کے پاؤں مکئی کے اس کھیت میں جم کر رہ گئے.. کل رات تک وہ دیر تک سوچتی رہی تھی کہ رستم تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اس حوالے سے اس کے ذہن میں ایک موہوم سا نقشہ بھی بنا تھا، لیکن آج رات سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

اس مرتبہ پستول بردار نے ذرا اکڑے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو، ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم جلدی سے تانگے میں بیٹھ جاؤ۔''

فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن اسے لمحوں میں کرنا ضروری تھا۔ اگر ان لوگوں کی کوشش سے شانی واقعی آزاد ہو جاتی تو وہ رستم کی آزادی کے لئے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ وہ زوار اور شیری تک پہنچ کر انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے معلوم تھا کہ ایک بڑا پولیس افسر حاجی حیات خان رستم کے گہرے دوستوں میں سے ہے۔ چند ہی لمحے میں درجنوں خیالات اس کے ذہن میں آئے اور چلے گئے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے قدم تانگے کی طرف بڑھا دیئے۔

برقع پوش عورت شانی کے ساتھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کوچوان جو تنومند شخص تھا، اگلی سیٹ پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد تانگا ایک ہچکولے کے ساتھ حرکت میں آ گیا۔ دونوں ڈھاٹا پوش افراد تیزی سے مکئی کے پانچ فٹ اونچے پودوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ گاؤں کی طرف سے برسٹ چلنے کی آواز آئی، لیکن خطرے کی بات نہیں تھی، یہ معمول کا برسٹ تھا۔

ایک سخت ناہموار کچے راستے پر چلنے کے بعد تانگا ایک نہر کی پٹری پر آ گیا۔ یہ پٹری بھی خاصی ناہموار تھی تاہم کچے راستے سے بہتر ہی تھی۔ کھیتوں میں کہیں کہیں ٹریکٹر یا ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ قرب و جوار گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ تینوں مکمل خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ برقع پوش عورت نے تو ایک بار بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ پستول بردار نے شانی سے کہا تھا کہ وہ بھی تانگے کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے، لیکن عملی طور پر ایسا ہوا نہیں تھا۔ تانگے کے پیچھے دور دور تک کسی کے آنے کے آثار نہیں تھے۔ غالباً پستول بردار نے صرف شانی کی تسلی کے لئے ایسا کہا تھا۔

گھمبیر خاموشی کو توڑنے کے لئے شانی نے کوچوان سے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں بھائی؟''

''بھین جی! ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا تاہم اس ٹھہراؤ کی تہہ میں پریشانی کی لہر بھی محسوس ہوتی تھی۔

گھوڑے کو اونچے نیچے راستے پر ہانکتے ہوئے کوچوان گاہے بگاہے عقب میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ جیسے اسے تعاقب کا اندیشہ ہو۔ یہی اندیشہ شانی کے ذہن میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار ''رکھوالے کتوں'' کے بے سدھ جسم آ جاتے تھے اور حرکت

کرتی ہوئی بند بوری تصور میں نمایاں ہو جاتی تھی۔

برقع پوش عورت بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ شانی کوچوان سے اس کے بارے میں پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ ایک آواز نے ان تینوں کو بُری طرح چونکا دیا۔ ''ٹھہرو بھئی۔'' یہ خاصی اونچی آواز تھی جو کیکر کے درختوں میں سے آئی تھی۔ کوچوان نے منہ سے بچ بچ کی آواز نکال کر تانگا روک دیا۔ شانی نے برقع کی اوٹ سے دیکھا، ایک ہٹا کٹا گنجا پولیس والا توند مٹکاتا تانگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں چھریرے جسم کا سنتری تھا۔ کیکر کے درختوں میں پولیتھین کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی سی نظر آ رہی تھی۔ جھونپڑی کے سامنے پولیس کی نمبر پلیٹ والی ایک کھٹارا موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل کے کیریئر پر سبز لہسن کا ایک بڑا گٹھا اور گنے کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں کسی غریب کاشتکار نے نذرانے کے طور پر پولیس والوں کو دی ہوں گی۔

گنجے پولیس والے نے جو اپنے کندھے کے پھول سے اے ایس آئی ظاہر کرتا تھا، گرج کر کوچوان سے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو بھئی...... خیر سے؟''

کوچوان شاید اس سوال کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے نیچے اُتر کر غم زدہ آواز میں کہا۔ ''میری سس فوت ہوگئی ہے جی۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے اطلاع آئی ہے۔ بالکل بھلی چنگی تھی۔ ہمیں تو یقین نہیں آ رہا جی۔''

''کہاں جانا ہے خیر سے؟'' تھانیدار نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''نالی پور جناب۔''

''یہ ساتھ کون ہے خیر سے؟'' لگتا تھا کہ ''خیر سے'' تھانیدار کا تکیہ کلام تھا۔ کوچوان نے بدستور غم زدہ آواز میں کہا۔

''یہ سفید برقع والی میری بڑی (بیوی) ہے جی اور دوسری اس کی بھین ہے۔ ہمارے گھر رہنے آئی ہوئی تھی۔''

''میانہ سے آئے ہو؟'' تھانیدار نے درست قیافہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جی مائی باپ۔''

تھانیدار اور اس کے ماتحت نے ایک بار ٹٹولنے والی نظروں سے شانی کے کالے برقع اور دوسری عورت کے سفید برقع کو دیکھا اور پھر ایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے غالباً وہ انہیں جانے کی اجازت دینے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن...... اسی دوران میں ایک اور شخص پولیتھین کی جھونپڑی میں سے نکل آیا۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھا اور اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی

اور سر کے بالوں کو مہندی لگا رکھی تھی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس شخص کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کوچوان ایک دم بے چین ہو گیا تھا۔

داڑھی والے کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ ذرا ڈگمگاتا ہوا تانگے کی طرف آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے کوچوان کو دیکھا اور بولا۔ ''اوئے صدیق، تُو یہاں کیسے؟''

''مم...... میری سس فوت ہوگئی ہے چاچا کرامت۔''

''اوہو۔'' چاچا کرامت نے ہونٹ سکیڑے، پھر اس کا دھیان پیچھے گیا، اس نے پوچھا۔ ''یہ ساتھ کون کون ہے؟''

کوچوان صدیق کے بجائے تھانیدار نے کہا۔ ''اک۔ اس کی گھر والی ہے خیر سے۔ دوسری گھر والی کی بھین ہے۔''

چاچا کرامت جس کے طور اطوار پولیس کے مخبروں جیسے تھے، ٹارچ کی روشنی ایک ساتھ سفید اور کالے برقع پر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اوئے یہ تیری گھر والی نے برقع کب سے لینا شروع کر دیا ہے؟''

''کک...... کبھی کبھی لے لیتی ہے۔'' صدیق نے کہا۔

چاچا کرامت جیسے چونک سا گیا۔ وہ گھوم کر تانگے کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی سفید برقع پر ڈالی اور بولا۔ ''گڑیے! کیا ہوا تھا ماں جی کو؟''

برقع پوش کی رگوں میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ معاملہ خراب ہو رہا تھا۔

''اوئے! تُو بولتی کیوں نہیں۔'' اس مرتبہ تھانیدار نے غصے سے کہا۔

یہی وقت تھا جب شانی کی نگاہ عقب میں دور مکئی اور کماد کے وسیع کھیتوں کی طرف گئی۔ کیکر اور شیشم کے درختوں کے اندر کچھ روشنیاں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ متحرک روشنیاں تھیں اور یہ اسی جانب سے بڑھ رہی تھیں جہاں سے وہ تینوں آئے تھے۔ شانی کے دل نے پکار کر کہا کہ تاؤ حشام کو حویلی میں اس کے نکل جانے کی خبر ہو گئی ہے۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ اسی دوران میں شاید کوچوان صدیق نے بھی فاصلے پر متحرک روشنیاں دیکھ لی تھیں۔ اس کی حرکات و سکنات میں پہلے سے زیادہ اضطراب آ گیا۔ گنجا تھانیدار تیزی سے آگے بڑھا، اس نے اپنا ہاتھ سفید برقع کی طرف بڑھایا، اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ برقع تک پہنچتا، برقع میں تیز حرکت پیدا ہوئی۔ برقع میں چھپے ہوئے شخص نے اپنی ٹانگ کی بھرپور ضرب تھانیدار کے سینے پر لگائی، اس کے ہونٹوں سے اوغ کی کربناک آواز نکلی اور وہ اپنی توند سمیت پٹڑی پر

گرا۔ برقع پوش کے دونوں ہاتھوں میں لمبی نال کا ماؤزر دبا ہوا تھا۔ تھانیدار کو زمین بوس کرنے کے بعد اس نے بے دریغ چاچا کرامت کی ٹانگوں پر فائر مارا۔ وہ چیخ کر دائیں پہلو گر گیا۔ اس دوران میں سنتری نے کندھے سے اپنی تھری ناٹ رائفل اتارنا چاہی تھی کہ کوچوان صدیق نے اسے اپنے جن جپھے میں لے کر اور گھما کر تانگے کے "بم" سے مارا اور رائفل اس کے سوکھے سڑے ہاتھوں سے چھین لی۔ تھانیدار ابھی تک زمین پر گرا ہوا تھا برقع والے شخص نے اسے ڈرانے کے لئے اس کے قریب زمین پر فائر کئے...... ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تھانیدار بدحواسی میں اٹھ کر پٹڑی سے نیچے اُتر گیا۔ برقع پوش نے پھرتی کے ساتھ تانگے سے اُتر کر موٹر سائیکل کی چابی اگنیشن میں سے کھینچ لی اور واپس تانگے میں آ بیٹھا اس کا چہرہ ابھی تک برقع میں چھپا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا سخت جان اور پھرتیلا شخص لگتا تھا۔

کوچوان صدیق پہلے ہی اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ اس نے ٹخ ٹخ کی آواز نکال کر چابک ہوا میں لہرایا اور گھوڑے کو دوڑا دیا۔ کرامت نامی شخص وہیں پٹڑی کی مٹی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے لباس کے کسی حصے سے دیسی شراب کی کپی نکل کر زمین پر لڑھک گئی تھی۔

اونچی نیچی پٹڑی پر تانگا دو دو فٹ تک اچھلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ برقع پوش نے اپنا برقع چہرے سے ہٹا کر سر پر رکھ لیا۔ وہ نہایت چوڑے جبڑوں اور عقابی آنکھوں والا ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص تھا۔ چہرے پر زخموں کے چھوٹے بڑے نشان اس کی جنگجوانہ طبیعت کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے ماؤزر میں کچھ مزید گولیاں بھریں اور شانی کو تسلی تشفی دی۔

فاصلے پر حرکت کرنے والی روشنیاں مسلسل دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا اور نہ ہی اس کی نوعیت کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور دراز دیہاتی علاقہ تھا۔ تاؤ حشام کی حویلی میں بس ایک دو گاڑیاں ہی تھیں۔ زیادہ تر آمد و رفت ٹریکٹر ٹرالیوں اور گھوڑوں پر ہی ہوتی تھی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں صورتِ حال کافی حد تک تبدیل ہو گئی۔ متحرک روشنیاں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ اب سرد ہوا کی لہروں پر کبھی کبھی کسی انجن کی مدھم آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ پہلے یہ روشنیاں منتشر سی تھیں اور غالباً ان کی رفتار بھی کم تھی۔ مگر اب وہ ایک قطار میں آ رہی تھیں اور ان کا رخ سیدھا تانگے کی ہی جانب تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا تھ کہ پیچھے آنے والوں کو گنجے پولیس والے اور اس کے ماتحت کی معاونت حاصل ہو گئی ہے۔ برقع والے شخص نے جب دیکھا کہ صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے تو وہ کوچوان صدیق سے مخاطب ہو کر بولا۔ "صدیق! اس طرح چلتے رہے تو پکڑے جائیں گے۔ تم تانگہ آبادی کی طرف موڑ دو۔"

"پر یہاں تو مڑنے کا رستہ بھی نہیں ہے۔" صدیق بولا۔

"کوئی بات نہیں تم تانگہ کھیتوں میں اتار دو۔ رستہ نکل آئے گا۔" برقع پوش نے مضبوط لہجے میں کہا۔

تانگہ پہلے خطرناک زاویے سے آگے کو جھکا پھر سبزی کے کھیت میں اُتر گیا یہ سفر پہلے سے بھی دشوار ثابت ہوا۔ صدیق اور برقع پوش کو گاہے بگاہے اُتر کر تانگے کو کھڈوں میں سے کھینچنا پڑ رہا تھا۔ دوسری طرف متحرک روشنیاں قریب تر آتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ دو جیپیں تھیں۔ ایک دو موٹر سائیکل تھیں۔ جو چار روشنیاں خاصے فاصلے پر تھیں وہ شاید ٹریکٹر ٹرالیوں کی تھیں۔ موٹر سائیکل زیادہ تیزی سے قریب پہنچ رہے تھے۔ پھر شانی کو رائفل کے فائر سنائی دیئے۔ روشنیوں کے رخ اور فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں نے تانگے کو نہر کی پٹڑی سے اُترتے دیکھ لیا ہے۔ اب تصادم کے امکانات بڑھ گئے تھے۔

جونہی راستہ ہموار ملا کوچوان صدیق نے تانگے کی رفتار بڑھا دی۔ گھوڑا سخت ہانپا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے مالک کے اشارے پر پوری جان لگا دی۔ سامنے ہی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ایک مسجد کے بلند مینار تاروں بھرے آسمان کے پیش منظر میں نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ "میرا خیال ہے تانگہ چھوڑ دیں۔" برقع پوش نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

کوچوان صدیق نے سر ہلا کر تائید کی۔ انہوں نے تانگہ روکا اور نیچے اُتر آئے۔ کوچوان صدیق نے گھوڑے کی راسیں خاص طریقے سے گھوڑے کے عقبی تختے پر باندھ دیں۔ اس کے بعد اس نے چابک ہلا کر منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکالی۔ گھوڑا ایک بار پھر ہموار راستے پر بھاگنا شروع ہو گیا۔ یہ راستہ آبادی کے پہلو کو چھوتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ گھوڑے کے بھاگنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی طرح خالی تانگے کے ساتھ کافی دور تک جائے گا۔

کوچوان صدیق اور برقع پوش شخص شانی کو لے کر تیزی سے آبادی میں داخل ہوئے۔ آبادی میں داخل ہونے سے پہلے برقع پوش نے تھانیدار کی موٹر سائیکل کی چابی چارے کے کھیتوں میں پھینک دی اور برقع اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔ ماؤزر بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ برقع پوش کے انداز سے عیاں تھا کہ اسے گاؤں میں اپنی منزل کا پتا ہے۔ رات کے اس آخری پہر گاؤں کی گلیاں یکسر سنسان تھیں۔ بس کہیں کہیں ٹھٹھرے ہوئے آوارہ کتوں اور بلیوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ایک گلی میں بندھے ہوئے دو گدھوں کے قریب سے گزرے۔ سردی سے بچاؤ کے لئے ان کی پشت پر بوریئے باندھ دیئے گئے تھے۔ رات کے اس پہر ہر خوابیدہ شے کی طرح جانور بھی نیند یا گہرے مراقبے میں دکھائی دیتے تھے۔ ایک تنگ سی گلی میں بہت

سے چھوٹے چھوٹے شامیانے لگے تھے۔ یہ میلوں ٹھیلوں میں لگائی جانے والی عارضی دکانیں تھیں۔ یہ دکانیں بھی گہری تاریکی اور خاموشی میں غرق تھیں۔ اس گلی سے گزرنے کے فوراً بعد برقع پوش ایک بند دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے دروازے پر زور سے دستک دی اور پکار کر بولا۔ ''جبرو! دروازہ کھول...... جلدی کر جبرو دروازہ کھول۔''

اس نے تین چار بار زور سے دستک دی۔ اندر لالٹین کی روشنی چمکی، پھر کھٹ پھٹ کی آوازیں آئیں اور دروازہ کھل گیا۔ لمبے قد اور لمبے بالوں والا ایک کالا سا شخص سامنے کھڑا تھا۔ برقع پوش کو دیکھ کر بولا۔ ''بادشاہ تم؟''

''او ہاں۔ پیچھے ہٹ۔'' برقع پوش نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور شانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اس نیم پختہ مکان میں اوپر نیچے تین چار کمرے تھے۔ برقع پوش جسے بادشاہ کہا گیا تھا، شانی اور کوچوان صدیق کے ساتھ بالائی کمرے میں چلا گیا۔ یہاں شانی کو بھرے بھرے جسم والی ایک جواں سال لڑکی نظر آئی۔ اس کے بال خاصے لمبے تھے اور وہ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ کمرے میں گھنگھروؤں کے جوڑے، طبلے اور سارنگی وغیرہ دیکھ کر شانی کو پتا چل گیا کہ یہ ناچنے گانے والے لوگ ہیں، ادھیڑ عمر عورت غالباً نائیکہ تھی۔ کالی رنگت والے جبرو کے چہرے پر چیچک کے بے شمار داغ تھے اور وہ صورت سے ہی دلال قسم کی شے نظر آتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ برقع پوش بادشاہ اور لمبے بالوں والی لڑکی میں پرانی شناسائی ہے۔ بادشاہ نے مختصر الفاظ میں دونوں عورتوں کو بتایا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور انہیں فوری طور پر پناہ کی ضرورت ہے۔

لمبے بالوں والی تیز طرار لڑکی نے زیادہ سوال جواب کئے بغیر شانی، بادشاہ اور کوچوان صدیق کو ایک پچھلے کمرے میں پہنچا دیا۔ دروازے کو باہر سے تالا چڑھا دیا۔ باقی دروازے بھی بند کر دیئے اور لالٹینیں وغیرہ بجھا دیں۔

چار پانچ منٹ اسی طرح گزرے......اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس گاؤں کی سوئی ہوئی پُرسکون آبادی دیکھتے ہی دیکھتے ہلچل کا شکار ہوگئی۔ دو تین گاڑیاں، ایک دو موٹر سائیکل اور کئی گھڑ سوار شور مچاتے گاؤں میں گھس آئے۔ ان کے بلند للکارے اور آوازے گاؤں کے ایک کونے سے دوسرے تک گونجنے لگے۔ گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے جانے لگے۔ لالٹینیں وغیرہ روشن ہونے لگیں۔ قریبی گلی سے چند گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اور باتیں کرتے گزر گئے۔ ایک دو فقرے شانی اور بادشاہ کے کانوں میں بھی

پڑے۔

ایک بھاری آواز نے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ پنڈ کے اندر ہی ہیں۔ تاؤ کو قبرستان والے رستے پر ناکا لگا دینا چاہئے۔''

''آگے ماں کے سر میں جائیں گے، ڈیک نالے میں چنگا بھلا پانی ہے۔''

رات کا باقی حصہ خاصی سنسنی اور افراتفری میں گزرا۔ گاؤں کی پوری آبادی ہی جیسے جاگ پڑی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ تاؤ حشام کے کارندے گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ مشکوک لوگوں کے ساتھ گالم گلوچ بھی کر رہے ہیں۔ گاؤں کے پرلے کنارے سے ایک دو بار فائرنگ کی آوازیں بھی آئیں۔ بہرحال غنیمت تھا کہ وہ لوگ اس مکان تک نہیں پہنچے۔ جب دن چڑھ گیا تو قدرے سکون محسوس ہوا۔ لمبے بالوں والی لڑکی کا نام نیناں تھا۔ وہ یہاں بابا کرماں والا کے عرس پر دھمال ڈالنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک دیہاتی طوائف تھی اور مقامی بدمعاش بادشاہ کے ساتھ اس کی جان پہچان حال ہی میں ہوئی تھی۔ کمرے میں آ کر نیناں نے بادشاہ کو بتایا کہ جبرو گاؤں سے سن گن لے کر آیا ہے۔ تانگہ ڈیک نالے کے پاس ''پرانے پنڈ'' سے ملا ہے۔ چوہدریوں کے ہرکاروں نے وہاں ایک ایک گھر کی تلاشی لی ہے۔ اب زیادہ لوگ نالے کے ساتھ ساتھ اگلے دیہات کی طرف نکل گئے ہیں۔ کچھ ''پرانے پنڈ'' میں ہیں اور تھوڑے بہت یہاں گاؤں میں ہیں۔ جبرو کے مطابق پولیس والے بھی بھاگنے والوں کو سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں لیکن ان کا زور بھی ''پرانے پنڈ'' کی طرف تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے لیکن ابھی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا...... لمبے بالوں والی نیناں نے پچھواڑے والے کمرے کے اندر ہی تینوں کے لئے کھانے کا انتظام کیا۔ یہ کھانا حلوہ پوری، دہی کلچے اور چائے پر مشتمل تھا۔ شانی نے بس دو چار گھونٹ چائے پی۔ اس نے بادشاہ نامی شخص سے کئی بار پوچھا کہ وہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟

وہ ہر بار اس سوال کو ٹال گیا۔ کبھی مسکرا کر، کبھی کوئی دوسری بات شروع کر کے اور کبھی صرف خاموش رہ کر۔ وہ جو کچھ بھی تھا لیکن مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے چند گھنٹے پہلے ایک شخص کو گولیاں ماری تھیں......اور پولیس مقابلے کی فضا پیدا کی تھی۔ اس کے باوجود وہ پُرسکون تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار نظر آتا تھا۔ شانی نے اس سے دوسرا سوال یہ پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی بادشاہ نے مبہم

انداز میں ہی دی۔ اس نے کہا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ تک پہنچائے گا جہاں وہ بالکل محفوظ رہے گی اور جہاں چاہے جاسکے گی۔

دن چڑھنے کے بعد شانی نے چوبارے کی ایک کھڑکی سے اردگرد کا منظر وضاحت سے دیکھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ آبادی اسے کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ خاص طور پر گاؤں کی مسجد کے مینار اور گاؤں کے وسط میں مزار کا سفید اور سبز گنبد۔ ایک دم اسے پتا چلا کہ یہ کٹھولی گاؤں ہے۔ کٹھولی گاؤں اس کی جنم بھومی رنگ والی سے صرف بارہ تیرہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ کم نہیں تھا تو بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ یہ ہوائیں اس کی رنگ والی کو چھو کر آرہی تھیں۔ ان جھونکوں میں اس کے کھیتوں کی مہک تھی۔ عین ممکن تھا کہ سامنے اُڑتے پرندوں کی ڈار کچھ دیر پہلے اس کے میکے کے اوپر سے گزری ہو۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اپنے گلی کوچوں سے قریب ہونے کے باوجود کتنی دور تھی وہ۔ وہ نم ناک نظروں سے دیکھنے لگی۔ یہ وہی کٹھولی گاؤں تھا جہاں وہ اپنی سہیلی سکینہ کے ساتھ بڑی رازداری کے ساتھ پہنچی تھی۔ اس کے مرحوم بھائی عادل نے لٹھ بازی کے مقابلے میں ہارنے کے بعد چوہدری فاخر کو مزہ چکھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ شانی یہاں پہنچی تھی اور چوہدری فاخر کے دوستوں کو خبردار کیا تھا۔ بعدازاں کٹھولی کے دو بدمعاشوں نے شانی اور سکینہ کو گھیر لیا تھا اور رستم نے بروقت مداخلت کر کے انہیں بچایا تھا۔

یہ سارے مناظر چند سیکنڈ کے اندر شانی کے پردۂ تصور پر چمک گئے۔ شانی نے چوبارے کی کھڑکی کی درز میں سے دیکھا۔ گاؤں کے اطراف میں اور اطراف کی گلیوں میں بہت سی ''شامیانہ دکانیں'' سجی ہوئی تھیں۔ کھیل تماشوں کے تمبو اور جھولے وغیرہ بھی تھے۔ یقیناً یہ سب میلے کی تیاریاں تھیں۔ شانی کو ایک دو جگہ پولیس والے بھی نظر آئے۔ یقیناً چوہدری کے کارندے بھی اپنے شکار کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

پتا نہیں کیوں رہ رہ کر شانی کے ذہن میں ایک خیال اٹھتا تھا۔ اس کے دل سے آواز آتی تھی کہ اسے تاؤ حشام کی آہنی گرفت سے نکال کر یہاں لانے والا تاؤ حشام ہی کا کوئی بندہ ہے۔ کوئی باہر کا بندہ اتنی بلند دیواروں اور رکاوٹوں کو اتنی آسانی سے نہیں گرا سکتا تھا۔ درجنوں کمروں میں سے سیدھا شانی کے کمرے تک پہنچنا، حویلی کے جنریٹر کو بند یا خراب کرنا، پہرے دار کی مشکیں کسنا، کتوں کو بے ہوش کرنا، یہ اور اس جیسے کئی دوسرے کام اسی جانب اشارہ کرتے تھے۔ جب وہ اس انداز میں سوچتی تو آپوں آپ اس کے ذہن میں بابر کا خیال آجاتا تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگتا کہ یہ جو کچھ کیا ہے، اس کل کے دشمن اور آج کے دوست

نے کیا ہے۔ شانی نے اس کرخت دشمن کی آنکھوں میں احسان مندی اور وابستگی کی ایک ایسی جھلک دیکھی تھی جس کی گہرائی کو صرف وہی محسوس کرسکتی تھی۔ شانی کی نگاہ میں بار بار اس دوسرے ڈھاٹا پوش (نقاب پوش) کی آنکھیں آجاتی تھیں جو انہیں کل رات مکئی کے کھیت میں تانگے کے پاس ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ آنکھیں بابر کی ہی ہوں اور عین ممکن تھا کہ اب وہی بابر اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مل کر شانی کو ڈھونڈ بھی رہا ہو۔

رات ہوئی تو شانی کے دل میں عجیب سا مدوجزر پیدا ہونے لگا۔ وہ بظاہر تاؤ حشام کی گرفت سے نکل کر دور آگئی تھی لیکن اس کی ڈوریں ابھی تک وہیں تاؤ کی حویلی سے بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ایسی ڈوریں تھیں جنہیں بڑی سے بڑی زمینی طاقت بھی توڑ نہیں سکتی تھی۔ ان ڈوروں کا تعلق رستم سیال سے تھا۔ رستم سیال جو تاؤ کی حویلی کے ایک تاریک کمرے میں چاول کی چھال پر سراپا زخم اور مجسم حسرت بنا پڑا تھا۔

حویلی کی بات اور تھی۔ وہاں چاروں طرف آہنی دیواریں تھیں اور موت کے پہرے تھے۔ یہاں کٹھولی گاؤں کے اس چوبارے میں بھی وہ گو خطرات کے گھیرے میں تھی لیکن یہ خطرات ایسے تھے کہ ان سے ٹکرا کر راستہ بنایا جاسکتا تھا۔ بادشاہ اور کوچوان صدیق کا خیال تھا کہ انہیں کم از کم دو تین دن مزید یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی یہاں سے آگے نکلنے کا سوچا جاسکے گا لیکن شانی میں اب مزید انتظار کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ رات کو جب کٹھولی گاؤں کے اس مکان میں سب سو گئے اور قریبی برآمدے میں مالک مکان جبرو کے خراٹے گونجنے لگے تو شانی ادھ کھلی کھڑکی میں آبیٹھی اور یہاں سے نکل جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے کانوں میں ڈولے کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ڈولے نے کہا تھا کہ رستم کو بس ایک دو دن میں ذلت آمیز طریقے سے پولیس کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ ڈولے نے یہ بھی بتایا تھا کہ پولیس بے حد سرگرمی سے رستم کو تلاش کر رہی ہے کیونکہ پنڈی میں رستم کے ہاتھوں زخمی ہونے والے پولیس اہلکار نے کئی ماہ تک ہسپتال میں زیرعلاج رہنے کے بعد دم توڑ دیا ہے۔

رستم کی مدد کے لئے وقت بہت کم تھا۔ شانی کو بہرصورت یہاں سے نکلنا تھا اور کسی طور رستم کے ساتھیوں تک اپنی آواز پہنچانی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کام کے لئے راولپنڈی ہی پہنچے۔ اگر وہ اس دور دراز جگہ سے نکل کر کسی ایسے مقام تک پہنچ جاتی جہاں سے فون کیا جاسکتا تھا تو بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ وہ جانتی تھی یہاں سے نکلنے میں جان کا شدید خطرہ ہے لیکن یہ جان اور یہ زندگی اسے اتنی عزیز ہرگز نہیں رہی تھی کہ وہ اسے بچانے

کے لئے منصوبہ بندیاں کرتی۔ اس کی زندگی اس وقت صرف دو ہستیوں کے گرد گھومتی تھی۔ مُنا اور رستم...... اور یہ دونوں جان لیوا مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ مُنا کسی نامعلوم مقام پر اس کے لئے بلک رہا تھا اور رستم زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں تھا۔ پھر وہ کیوں بچاتی اور سنبھالتی اپنی ترس ناک زندگی کو۔ اسے نیناں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کل میلے کا بھرپور دن ہوگا۔ خاص طور سے شام کے وقت بہت رش ہو جائے گا۔ شانی اس رش کے بارے میں اور اس نیم تیرگی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کل شام یہاں کھوسلی گاؤں میں ڈیرا ڈالنے والی تھی۔ یہ گہما گہمی اور نیم تیرگی اس کی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے کمرے میں لٹکا ہوا نیناں کا کریم رنگ کا برقع دیکھ لیا تھا یہ برقع اسے یہاں سے نکلنے میں بہت مدد دے سکتا تھا۔ اس نے کل شام کے لئے اپنے ذہن میں ایک نقشہ سا بنایا اور پھر اس نقشے میں رنگ بھرنے لگی۔ کھوسلی گاؤں کی گلیوں میں پولیس کے سنتریوں کی سیٹیاں تھیں اور پہرے داروں کے آوازے تھے۔

"جاگدے رہنا بھائیو۔" زندگی میں پہلی بار...... بالکل پہلی بار شانی ایک ایسے انداز سے سوچ رہی تھی جسے عام زبان میں منصوبہ بندی یا پلاننگ کہا جاتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کے سینے میں آنسوؤں کا طوفان جمع ہو رہا تھا۔

رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے شانی کو کسی قریبی کمرے سے طبلے کی دھن دھن اور گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دی۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیناں ایک طبلہ نواز کے ساتھ دھمال کی ریہرسل میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور وہ انہیں ناچنے کے دوران بڑے جوش سے دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی۔ یہ لمبے بال اس نے خاص طور سے دھمال وغیرہ کے لئے ہی پال رکھے تھے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ شانی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں آج صبح سے ہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی اہم واقعے کی اطلاع دے رہی تھی۔

دفعتاً شانی کی نگاہ نیناں سے ہٹ کر کمرے کی دیوار پر گئی اور وہ بُری طرح چونک گئی۔ وہاں ایک جانے پہچانے شخص کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ وہی بہروپیا حضرت صاحب تھا۔ شانی حیران رہ گئی۔ ایک دو منٹ بعد یہ دیکھ کر شانی کی حیرت میں اضافہ ہوا کہ نیناں نے اپنا رقص ختم کرنے کے بعد تصویر کے سامنے باقاعدہ جھک کر تعظیم پیش کی پھر وہ شانی کی طرف مڑی اور اسے دیکھ کر ذرا چونک سی گئی۔

"یہ کون ہے؟" شانی نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے پیرو مرشد ہیں۔ بڑے اونچے درجے والے ہیں۔ ان کی ایک نظر سے قسمت بدلتی ہے۔ تم ان کو جانتی ہو؟" نیناں کے لہجے میں حیرانی تھی۔

شانی نے ایک لمبی آہ بھر کر نفی میں سر ہلایا۔ نیناں حضرت صاحب کی شان میں قصیدے پڑھنے لگی۔ ادھیڑ عمر نائیکہ بھی اس حوالے سے زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف ہو گئی۔ ان کی باتوں سے نتیجہ نکلتا تھا کہ حضرت صاحب کا شمار اس صدی کے گنے چنے کامل پیروں میں ہوتا ہے اور یہ شانی کی بدقسمتی ہے کہ وہ علاقے کے اتنے بڑے فیض بخش درویش کے تعارف سے محروم ہے۔ ادھیڑ عمر عورت کی تو زبان رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے "بہروپیے" کی غائبانہ تعریفوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جاہل عورت کی باتیں ختم ہوئیں تو شانی نے نیناں سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے نیناں سے کہا کہ وہ اس دھوتی کرتے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔

"ہاں یہ تمہارے لئے ضروری ہے۔" نیناں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھہرو میں تمہارے لئے کوئی جوڑا دیکھتی ہوں۔"

وہ اندر گئی اور چند منٹ بعد ایک نسبتاً سادہ سی شلوار قمیص لے آئی۔ "لو یہ پہن کر دیکھ لو۔ بالکل نیا ہے۔ میں نے ایک بار بھی نہیں پہنا۔"

شانی نے اندر جا کر اپلوں اور گتاوے کی بُو میں کپڑے بدلے۔ لباس اسے ٹھیک آیا تھا۔ نیناں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ "ہائے نی، تیری کمر تو مجھ سے بھی پتلی ہے۔"

شانی سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ نیناں کی تعریفی نظریں بدستور شانی کے سراپا پر تھیں۔ وہ بے باکی سے بولی۔ "بڑی "بندے مار" قسم کی کُڑی ہے تُو...... تجھ پر تو عاشق ہونے کو دل کرنے لگا ہے۔"

شانی کے چہرے پر شرم اور غصے کی ملی جلی سُرخی پھیل گئی۔ وہ ٹٹولنے والی نظروں سے شانی کو دیکھتی رہی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہی ہو۔ "کیا کیا پواڑے ڈال کر آئی ہو اپنے پیچھے؟"

شانی اپنی توجہ ہٹانے کے لئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ نیناں کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اب شانی کے مکمل کوائف جاننے کے لئے اس سے دھیمے دھیمے سوال جواب شروع کر دے گی...... تاہم اسی دوران میں بادشاہ کی تیز آواز سنائی دی۔ اس نے نیناں کو ایک لوفر سا خطاب دینے کے بعد اس سے چائے پلانے کی فرمائش کی تھی۔

نیناں اپنے لمبے بالوں کے نیچے پتلی کمر لچکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شانی بہروپیے قدرت اللہ اور علاقے میں اس کے اثر و رسوخ کے بارے میں سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ یہ شخص بڑی تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتا جا رہا تھا۔

سہ پہر کے فوراً بعد ہی کھولی کی رونق میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ گلی کوچوں میں رنگ برنگے کپڑوں والے مرد و زن اور بچے ہجوم کرنے لگے۔ ڈھول ڈھمکے، باجے گاجے کا شور، خوانچہ فروشوں کی آوازیں، لاؤڈ سپیکروں پر ہونے والے مختلف اعلانات، جنریٹرز کی گھوں گھوں، پنجابی گانوں کی کان پھاڑ دینے والی موسیقی، جھولوں کی چوں چوں، جھولنے والوں کی پُرمسرت چہکاریں۔ وہ سب کچھ موجود تھا جو دیہی میلوں ٹھیلوں کا خاصہ ہوتا ہے..... قرب و جوار میں تیل کی مٹھائیوں اور پکوڑوں کی مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی اور دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی کی نگاہیں گاہے بگاہے کریم رنگ کے اس ریشمی برقعے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو کمرے میں کھونٹی پر لٹکا تھا۔ وہ اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اس کی ہر سوچ ملیامیٹ ہو جائے گی اور اس کی ''سوچوں'' کی جگہ ایک اور طرح کا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔

ابھی چوبارے کی مغربی کھڑکی میں سورج غروب ہونے کا منظر باقی تھا۔ خنک ہوا کے جھونکوں میں پرندوں کی ڈاریں دکھائی دینے لگیں۔ اچانک کوئی شخص بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھا۔ میلے کے شور میں سے اس کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''نیناں..... او نیناں کدھر ہو تم؟''

نیناں ساتھ والے کمرے سے باہر نکلی (بادشاہ بھی کمرے میں تھا) ''کیا ہوا؟'' نیناں نے مختصر برآمدے میں آ کر پوچھا۔

''ایک بڑی دھماکو خبر ہے بھئی۔'' جبرو نے پنجابی لہجے میں کہا۔ ''رستم سیال پکڑا گیا ہے۔''

''کیا.....؟'' نیناں نے چیخ کر کہا۔

''او سچ کہہ رہا ہوں..... رستم سیال پکڑا گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے..... قبرستان کی طرف مولوی حشمت کے مکان کے پاس سے..... اللہ دی قسم خود دیکھ کر آیا ہوں میں۔ وہ رستم ہی ہے۔ لوگ اسے مارتے اور کھینچتے ہوئے ادھر ہی لا رہے ہیں۔'' جبرو کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

شانی پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے کان جیسے سن ہو گئے تھے۔ اتنے میں

بادشاہ بھی اپنی دھوتی اور قمیص سنبھالتا ہوا باہر نکل آیا۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''رستم سیال پکڑا گیا ہے۔'' ایک بندے نے سیڑھیوں پر نمودار ہو کر گواہی دی۔ ''وہ دیکھو جی..... وہ دیکھو..... لوگ اسے پکڑ کر لا رہے ہیں اس طرف۔'' اس نے شمال کی طرف انگلی اٹھائی۔

شانی نے دیکھا۔ وہ نہ دیکھتی تو اچھا تھا۔ شانی نے سنا، وہ نہ سنتی تو اچھا تھا..... مشتعل دیہاتیوں کا ایک جم غفیر تھا..... وہ ہلکورے لیتا اور چنگھاڑتا دھاڑتا ہوا میلے کے مرکز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس جمِ غفیر کے درمیان کوئی تھا۔ کوئی تھا جسے گھسیٹا جا رہا تھا، مارا جا رہا تھا، جس پر مغلظات کی بارش ہو رہی تھی، کھینچنے والے بے شمار تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ نظر نہیں آتا تھا۔ بس محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ان کے درمیان ہے۔ چوبارہ نما جگہ پر سے کھولی گاؤں جہاں تک نظر آتا تھا وہاں تک ہلچل دکھائی دینے لگی تھی۔ اُڑتی دھول میں مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''کون پکڑا گیا؟..... واقعی پکڑا گیا؟ سچ مچ پکڑا گیا؟'' لوگ سفید اور سبز گنبد والے مزار کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ یہ مزار اس چوبارہ نما جگہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

اور پھر وہ شانی کو نظر آیا..... ہاں یہ وہی مظلوم تھا۔ وہی قسمت کا مارا تھا جس کی نگاہ نے کسی کو چاہنے کی حماقت کی تھی۔ جس کے دل نے کسی کو اپنے اندر بسایا تھا اور باقی ہر شے کو باہر نکال دیا تھا۔ ہاں یہ وہی تھا جس نے پوری زندگی ایک لمحے کی خطا پر قربان کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ وہ شانی کو نظر آنے لگا۔ آج وہ زنانہ کے بجائے مردانہ لباس میں تھا۔ اس کے گلے میں رسی تھی۔ اس کی قمیص لیر و لیر تھی۔ اس کی شلوار کو جیسے کئی کتوں نے ایک ساتھ بھنبھوڑا تھا۔ اس کے لمبے بال اس کی ریشمی داڑھی میں کہیں الجھے ہوئے تھے۔ ہجوم میں جو لوگ سب سے آگے تھے، وہ یقیناً تاؤ حشام اور چوہدری قادرے وغیرہ کے کارندے ہی ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں کوکوں والی چمکیلی لاٹھیاں، بندوقیں اور کلہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بظاہر لوگوں کو اسے مارنے سے روک رہے تھے کہ وہ زخم زخم رستم کو جان سے ہی نہ مار ڈالیں۔

رستم کو مزار کے سامنے چوبارے میں اوندھے منہ گرا دیا گیا۔ وہ گرد میں اَٹ گیا اور خاک کا حصہ نظر آنے لگا۔ پُرجوش لوگ اسے دیکھنے کے لئے دھکم پیل کرنے لگے۔ ایک دوجے پر گرنے لگے۔ چوہدریوں کے نیلی پگڑیوں والے ہرکارے انہیں لاٹھیوں سے دھکیل کر پیچھے ہٹا رہے تھے۔ ایک شخص نے رستم کے گلے میں سے رسی کا پھندا نکال لیا۔

میلے کی ساری آوازیں دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی تھیں۔ ان آوازوں میں ایک نئی طرح کا شور غالب آ گیا تھا۔ یہ پُرجوش لوگوں کا شور تھا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر پر ایک بھاری آواز

ابھری۔ کسی نے تقریر کرنے والے لہجے میں کہا۔ "دیکھنے والے دیکھ لیں۔ برے کا انجام برا ہوتا ہے۔ یہ جو پاٹا پرانا کتا آپ کے سامنے مٹی میں لیڑا (لتھڑا) پڑا ہے۔ یہ کل کا رستم سیال تھا، جو ماں بہن کو ماں بہن نہیں سمجھتا تھا، جو بندے کو کیڑے کی طرح مارتا تھا۔ جس کی اکھ میں سؤر کا بال اور جس کی گردن میں لوہے کا سریا تھا۔ آج یہ موت کو ترس رہا ہے۔ دیکھنے والے دیکھ لیں۔"

مجمع میں سے کسی نے رستم کے سر پر ٹھوکر ماری اور پوچھا۔ "چوہدری جی! یہ پکڑا کیسے گیا؟"

جواب ملا۔ "خوشی کی بات ہے کہ اس بھین بدمعاش کو زنجیریں ڈالنے کا ثواب ہمارے پنڈ کے حصے میں آیا ہے۔ یہ حرامزادہ اپنے دو چچوں کے ساتھ مولوی حشمت کے گھر کے ساتھ کماد کے کھیت میں چھپا ہوا تھا۔ پکی بات ہے کہ یہ تینوں رات پڑنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی لمبی واردات کا پروگرام تھا ان کتوں کا۔ سب سے پہلے مختار ارائیں نے اسے دیکھا۔ اس نے ممبر مجید کو خبر دی۔ اس کے بعد چوہدری حشام کے جی دار جوانوں نے اچانک ہلہ بول کر اسے چھاپ لیا۔ اس کے ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ پر امید ہے کہ وہ بھی پکڑے جائیں گے۔"

بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی پولیس کو بلانے کا کہہ رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کا منہ کالا کرو اور گدھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگواؤ۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے گلے میں رسی ڈال کر گلیوں میں گھسیٹا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورے دینے والوں میں نارپو چوہدریوں کے کارندے پیش پیش تھے۔ یہ سارا ڈرامہ انہی کا سٹیج کیا ہوا تھا۔ اس دوران چند ہٹے کٹے پولیس والے بھی اس بے پناہ ہجوم میں نظر آنے لگے۔

نارپور کے ایک خوبرو جوان چوہدری نے مائیک ہاتھ میں لیا اور گلا پھاڑ کر چلایا۔ "یہ ہمارے بزرگوں کا قاتل ہے۔ اس نے حویلی کو آگ لگائی۔ اس نے ہماری نسل کو ختم کرنا چاہا۔ اس کی سزا تو یہ ہے کہ اسی جگہ اسی مٹی پر، زندہ زندہ اس کی کھال اتاری جائے اور پھر اس کے ٹوٹے کر دیئے جائیں پر ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ ہم اسے پلس کے حوالے کریں گے۔ ہاں ایسا کرنے سے پہلے ہم اسے مزہ ضرور چکھائیں گے۔"

"ہاں مزہ چکھائیں گے۔" بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

ہجوم میں پھر سے دھکم پیل ہونے لگی۔ پولیس والے اس دھکم پیل میں گم ہوتے دکھائی دیئے۔ نوجوان چوہدری لال پیلا ہو کر اور للکار کر بولا۔ "بھا قادر! ڈالو اس کتے کے گلے میں

رسی اور پورے پنڈ میں گھسیٹو اس کتے کے تخم کو۔ آئندہ کسی کو رستم سیال بننے کی جرأت نہ ہو۔ امر اس نے "پھر وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کسی شخص پر دھاڑا۔ "پیچھے ہٹو۔ پیچھے ہٹو۔ کوئی پانی نہ پلائے اس خنزیر کو۔ کوئی نہ پلائے۔"

ایک دم شور وغل بڑھنے لگا۔ شانی نے دیکھا۔ لوگ گلیوں میں تھے، چھتوں پر تھے اور کھڑکیوں میں تھے۔ نیناں، نائیکہ، کوچوان صدیق، بادشاہ، جبرو سب چوبارے کی ادھ کھلی کھڑکیوں سے چمٹے ہوئے تھے اور یہ ڈرامائی منظر دیکھ رہے تھے اور وہ جو اس خونی ڈرامے کی ذمے دار تھی، وہ بھی دم بخود دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی رستم کے پستول سے گولیاں نکالی ہیں۔ جیسے ابھی ابھی اسے بے رحم حالات کے سپرد کیا ہے۔

پھر اس نے دیکھا، سرخ چمکیلے کپڑوں والا قادر آگے بڑھا اور اس نے رسی پھر سے رستم کے گلے میں ڈال دی۔

یہ قیامت کے لمحے تھے، یہ حشر کی گھڑیاں تھیں۔ شانی محسوس کر رہی تھی کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہو گئی ہے۔ دو طاقتیں تھیں جو اسے بے پناہ قوت سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ ایک طاقت کہہ رہی تھی۔ شانی تو اب بھی آگے نہ بڑھی تو پھر کب بڑھے گی۔ اب بھی تیرا دل موم نہ ہوا تو پھر کب ہوگا۔ وہ تیرے لئے مر رہا ہے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ سسک سسک کر، بھوکا پیاسا، بے یار و مددگار، تیرے لئے ترسا ہوا اور اپنے ہی لہو میں ڈوبا ہوا۔ اگر تو اب بھی بس دیکھتی ہی رہی تو کیا کبھی تو اپنے آپ کو معاف کر سکے گی؟ اور کیا مرنے کے بعد تیری روح سکون پا سکے گی؟

جواب نفی میں تھا۔ جواب یہ تھا کہ اب بھی بس تماشائی بن کر نہ رہ جا۔ اگر کچھ اور نہیں کر سکتی تو چل پھر خود بھی تماشا بن جا۔ نکل جا اس چاردیواری سے اور اسی کشتی میں سوار ہو جا جس پر وہ تیرا دیوانہ سوار ہے۔ ڈوب جا اس کے ساتھ۔ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مر جا۔ یہی راہِ محبت میں بے بس ہو جانے والوں کا وطیرہ رہا ہے۔

دوسری طاقت کہہ رہی تھی۔ شانی جہاں زہر کے اتنے پیالے پیئے ہیں۔ یہ آخری پیالہ بھی دل کڑا کر کے پی جا۔ اگر تو اس چاردیواری سے نکلی تو تیرے ساتھ ہی تیرے خاندان اور تیرے بزرگوں کی عزت کا جنازہ بھی نکل جائے گا۔ جو بات آج تک بس ایک قیاس ہے، ٹھوس حقیقت بن جائے گی۔ دنیا پر ثابت ہو جائے گا کہ ہاں..... وڈی آپا کی نیک بیٹی، چوہدری ارشاد کی دھی رانی، ایک ڈاکو قاتل سے پیار کرتی تھی۔ اس سے "معاملہ" تھا اس کا۔ ہزاروں نکیلی انگلیاں رنگ والی کی طرف اٹھ جائیں گی۔ بے شمار زہریلی نگاہیں تیرے

پیاروں کا جینا حرام کردیں گی۔ تُو دنیا کی ہی نہیں، ان سب کی گناہ گار ٹھہرے گی جواب بھی چپکے چپکے تیری سلامتی اور عزت کی دعائیں مانگتے ہیں اور یہ سب کر کے بھی تُو کیا کرلے گی؟ اس بدنصیب کو تو تُو پھر بھی نہ بچا سکے گی۔ پی لے، یہ زہر کا آخری پیالہ بھی۔ اپنے سامنے اور اپنے ماں باپ کی روحوں کے سامنے سرخرو ہو جا۔

طاقتیں کھینچ رہی تھیں۔ دباؤ بے پناہ تھا۔ لمحے بڑے محدود تھے۔ شانی کو لگا جیسے اس کی ہستی مٹ جائے گی۔ وہ دوطرفہ کھچاؤ سے ریزہ ریزہ ہوکر کٹھولی گاؤں کی اس نیم تاریک فضا میں بکھر جائے گی.... اور پھر وہ واقعی بکھر گئی۔ وہ ٹوٹ گئی.... ہار گئی، محبت و ہمدردی کا منہ زور جذبہ کسی طوفانی لہر کی طرح اس کے اندر سے اٹھا اور ہر مصلحت و اندیشے کو تنکے کی طرح بہا لے گیا۔ اس لہر کی بے پناہ طاقت کے سامنے چٹان صفت شانی نے خود کو سنگریزے کی طرح بے حقیقت پایا۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا وہ کب کمرے سے نکلی، کب سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اسے پہلا جھٹکا تب لگا جب وہ نصف سے زائد سیڑھیاں طے کرچکی تھی۔ اسے پیچھے سے پکڑنے والا بادشاہ تھا۔ اس نے شانی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ’’کیا کرتی ہو؟ دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ لوگ ٹوٹے کردیں گے تمہارے۔‘‘

’’خدا کے لئے چھوڑ دو۔‘‘ شانی کراہی۔ اس نے اپنا جسم جھٹکا تو بادشاہ جو غیر متوازن کھڑا تھا، لڑکھڑا کر گر گیا۔ شانی کی آستین پھٹی اور وہ بادشاہ کی گرفت سے نکل گئی لیکن اسی دوران میں اوپر سے نیناں نے ملازمہ اکی کو آواز دی۔ ’’اکی! اسے روکو۔ یہ باہر نہ نکلے۔‘‘

اکہرے جسم کی اکی نے شانی کے سامنے آنا چاہا۔ مگر منہ زور ہوائیں ایسے نہیں رکا کرتیں۔ جو جھاگ اُڑاتے پانی.... بندوں کے پیچھے بہت دیر تک جمع ہوتے ہیں۔ وہ بہت طاقت سے نکلتے ہیں۔ اکی نے شانی کو روکنے کی کئی ناکام کوششیں کیں اور پھر بیرونی دروازے تک پہنچتے پہنچتے ہمت ہار دی۔

اب شانی گلی میں تھی۔ چوراہے کی طرف اس کے جھپٹنے کا منظر دیدنی تھا۔ یہ ایک ایسی غیر مرئی لپک تھی جس کے تاثر کو شاید لفظوں میں بیان نہ کیا جاسکے۔ لوگ مڑ مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر دم بخود رہ جاتے تھے۔ وہ ہجوم سے ٹکراتی، رستہ بناتی، دھکے کھاتی اور دھکے دیتی بڑھتی چلی گئی..... پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک نسوانی جسم تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے خود کو رستم پر برسنے والی چمکیلی لاٹھیوں کے سامنے ڈال دیا۔

کچھ دیر کے لیے جیسے ہر شے دم بخود ہوگئی۔ ہر جاندار و بے جان شے نے اپنی سانس روک لی۔ لاٹھیاں اور چھڑیاں برسانے والے ہاتھ بھی رک گئے۔ بس دور کہیں کسی چلتے رہ

جانے والے لاؤڈ سپیکر پر یہ نغمہ گونجتا رہ گیا۔ بوہے باریاں تے کنداں ٹپ کے..

پھر سب سے پہلے سُرخ کپڑوں والے چوہدری قادرے کی غضب ناک آواز ہی گونجی تھی۔ ’’اوہو.... لو بھئی دیکھ لو سارے۔ آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ یہ اُچی پگ والے چوہدری ارشاد کی دھی ہی ہے نا؟ میری نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟‘‘

ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔ لوگ ان کے گرد گھیرا تنگ کرتے چلے گئے۔ تاؤ حشام نے دہاڑ کر کہا۔ ’’لو بھائیو! اب تو کسی کو شک نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ہے حرامی رستم سیال اور یہ ہے اس کی حرافہ معشوق۔ دونوں ہیر رانجھا بن کر آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان دونوں نے ہی مل کر حویلی میں لاشیں گرائیں اور حویلی کو ساڑ کر سواہ کیا۔ اب سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو تم لوگ۔‘‘

شانی کھڑی ہوگئی۔ نہ جانے اس میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ’’میں اس اللہ والے کے مزار کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ حویلی کو آگ کسی نے نہیں لگائی۔ کسی نے حویلی کو جان بوجھ کر نہیں جلایا۔ وہاں ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ زیادہ گولیاں حویلی والے ہی چلا رہے تھے۔ کوئی گولی تیل کے ڈرموں میں لگ گئی اور آگ لگ گئی......‘‘

تاؤ بولا۔ ’’واہ......واہ......سبحان اللہ......کیا بات ہے۔ کیا عشق ہے۔ ایک قاتل بدمعاش کی جان بچانے کے لئے دولت بی بی کی پوتری اور چوہدری ارشاد کی شرماں والی دھی رانی ساری خلقت کے سامنے صفائیاں پیش کررہی ہے......اس سارے سین کی تو مووی بننی چاہئے۔ واہ......واہ۔‘‘

وہ بولتی چلی گئی۔ ’’پاک کتاب لاکر میرے سر پر رکھ دو۔ میں جو کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے اور......رستم کے درمیان کوئی ’’بات‘‘ نہیں ہے۔ کوئی ایسا واسطہ نہیں ہے جس کی وجہ سے مجھے اور میرے بزرگوں کو شرمندہ ہونا پڑے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں اگر آپ......‘‘

شانی کی بات منہ میں رہ گئی۔ تاؤ نے گالیاں بکتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ رستم کے عین سامنے گری۔ شانی جانتی تھی رستم اسے یک ٹک دیکھ رہا ہے اور دیکھتا چلا جارہا ہے۔ شاید وہ اپنی حس بصارت پر یقین کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ رستم کے عین سامنے گر کر شانی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لمبے گرد آلود بالوں نے اس کے نقوش ڈھانپ رکھے تھے۔ ان بالوں کے اندر سے اس کی آنکھیں چمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان خون سے لتھڑی آنکھوں

میں جیسے زندگی ایک لہر کی طرح سرایت کرتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ آنکھیں بتدریج زندہ ہو رہی ہیں۔

شانی نے روتے روتے رستم کی طرف دیکھا۔ پھر ایک درد بھری آواز بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ ''رستم! مجھے معاف کر دو۔''

رستم کی آنکھیں کرب میں ڈوب گئیں۔ یوں لگا جیسے اس فقرے نے اس کے زخم زخم جسم پر دوا رکھنے کے بجائے تیزاب ڈال دیا ہو۔ اس فقرے کی سبب جو اذیت اس نے محسوس کی تھی وہ اس کی آنکھوں میں نمی لے آئی۔ اس نے خشک زخمی ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لئے۔

ان کے گرد قیامت کا شور تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دو ان زانیوں کو۔''

کسی نے کہا۔ ''پتھر مار مار کر مار دو۔''

وہ دونوں ان تمام آوازوں اور اذیتوں سے دور ہو گئے۔ ان لمحوں میں وہ بس ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شانی نے کرب میں ڈوب کر کہا۔ ''تمہیں کہا تھا نا رستم! مجھ سے دور ہو جاؤ۔ میری نحوست تمہیں برباد کر دے گی۔ کہیں کا نہیں چھوڑے گی... میں نے کہا تھا۔''

رستم کا اندرونی کرب بڑھ گیا۔ اس بات نے پہلی بات سے بڑھ کر اسے دکھ پہنچایا تھا۔ آنکھ کی نمی آنسو بن کر چھلک گئی اور مٹی میں جذب ہو گئی۔

''مم... میں کچھ نہیں کر سکتی رستم! میں تم سے زیادہ بے بس ہوں۔ میں بس اتنا کر سکتی ہوں کہ تمہارے ساتھ مر سکتی ہوں... مم... میں آ گئی ہوں مرنے کے لئے۔''

رستم کا کرب بیکراں ہو گیا۔ اس کے جسم میں پہلی بار جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس مختصر جنبش میں ایسی طاقت تھی جسے الفاظ کے احاطے میں لانا ناممکن تھا... رستم کے زخم زخم جسم میں کوئی شے کروٹ لے رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بیدار ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دیوی
3

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف کمپوزر۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

کسی نے عقب سے دو زوردار ٹھوکریں رستم کی پشت پر ماریں مگر لگا کہ یہ ٹھوکریں رستم کو نہیں کسی اور کو ماری گئی ہیں۔ وہ بدستور شانی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے سیاہ ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آواز شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ آواز شانی تک پہنچانے کی جدوجہد میں اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ رستم کی گردن پر دو تین گہرے زخم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان زخموں نے اس کے بولنے کی صلاحیت متاثر کی ہے۔ شانی اس طرف کچھ اور جھک گئی۔

کچھ نوجوان لڑکے کہیں سے ایک گدھا گھیر کر لے آئے۔ شور بلند ہو رہا تھا۔ ''گدھے پر بٹھاؤ...... منہ کالا کرو۔'' جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔

چوہدری کے کارندوں کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ گدھے کی پشت پر چوبی پالان بندھا ہوا تھا..... اسے کھولا جانے لگا۔ کچھ لڑکے گدھے کے گلے میں ڈالنے کے لئے رسی تلاش کرنے لگے۔

دوسری طرف چار آنکھیں ایک دوجے کو دیکھ رہی تھیں۔ رستم نے ایک بار پھر اپنے سینے کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنی آواز شانی کے کانوں تک پہنچانی چاہی۔ اس کے ہونٹوں سے بس بیٹھی ہوئی ایک مدھم سرگوشی ہی نکل پائی۔ ''بی بی... آپ... کیوں آئیں؟''

وہ سسکی۔ ''تم بڑے ظالم ہو رستم...... تم مارتے ہو...... اور رونے بھی نہیں دیتے۔''

وہ پھر بے حد قوت صرف کر کے بہت مدھم آواز میں بولا۔ اس مرتبہ اس نے کل پانچ الفاظ کہے۔ پانچ الفاظ کا ایک انوکھا اور بظاہر بے معنی جملہ۔ اس نے کہا ''بی بی..... آپ... میرے ساتھ چلیں۔''

وہ شدت سے رونے لگی۔ وہ بے اختیار تھی۔ وہ اس سے بڑھ کر بے اختیار تھا اور وہ یوں جانے کی بات کر رہا تھا جیسے ابھی تک انیکسی کے کمرے میں... رات کے سناٹے میں بیٹھا ہو۔ وقت کی ساری راسیں اس کے ہاتھ میں ہوں۔

شانی نے ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سرتاپا کانپ گئی۔ پوری جان سے لرز گئی۔ زخم زخم رستم کی اشک بار آنکھیں شاید وہی بات کہہ رہی تھیں جو اس نے کچھ عرصہ پہلے انیکسی کے کمرے میں کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''بی بی! چوہدریوں کے یہ دو ٹانگوں والے کتے گنتی میں دوگنا یا تین گنا بھی ہوں تو میں انہیں چیر کر نکل جاؤں گا۔ یہ دروازے، یہ دیواریں اور یہ بندوقڑیاں ہمارا راستہ نہیں روک سکتیں۔ آپ بس ایک بار چلنے کی ہامی بھریں، پھر دیکھیں میں ان کرائے کے ٹٹوؤں کو کس طرح ادھیڑ کر نکلتا ہوں۔''

شانی نے دیکھا، رستم کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھولتی جا رہی ہیں۔ اس کے اعضا میں سختی پیدا ہو رہی ہے۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت بتدریج اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ اس کے زخمی ہونٹوں نے ایک بار پھر زخمی سرگوشی کی۔ ''بی بی جی... آؤ... یہاں سے چلے جائیں۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''کیسے جاؤ گے رستم... کیسے جاؤ گے۔ یہ تو تمہیں دو قدم نہیں چلنے دیں گے۔ ابھی... اسی جگہ مار دیں گے۔''

''نہیں بی بی!'' اس نے بڑے کرب سے نفی میں سر ہلایا۔ خون اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا اور اس کے دائیں کان سے ٹپک رہا تھا اور پتا نہیں کہاں کہاں سے رس رہا تھا۔

''نہیں رستم... یہ فلم نہیں ہے۔ یہ زندگی ہے... یہ بڑی ظالم ہے... یہ مار دے گی۔ ابھی دو منٹ میں ہم دونوں کو ختم کر دے گی۔''

اس کی آنکھوں میں جنون تھا لیکن اس جنون میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے مہیب سمندر اوپر سے پُرسکون ہوتے ہیں۔ اس نے عجیب ڈرامائی لہجے میں نہایت مدھم سرگوشی کی۔

''بی بی! بس ایک بار میرا... ہاتھ پکڑ لیں۔ بس ایک بار... پھر... میں رکوں گا نہیں۔''

اس نے اپنا خون آلود کمزور ہاتھ شانی کی طرف سرکا دیا۔ ہواؤں میں اس کے فقرے کی گونج تھی۔ ''پھر میں رکوں گا نہیں... پھر میں رکوں گا نہیں۔''

شانی ششدر تھی۔ وہ جانتی تھی، کیا ہونے والا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں ان دونوں کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ رستم اپنی پوری قوت سے تڑپ پھڑکتا تو بھی دو چار بندوں کو گھائل کر سکتا

تھا۔ اس کے بعد وہی ہونا تھا جو حقیقت میں ہوتا ہے... اور جو افسانوں میں نہیں ہوتا۔

وہ عقل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور ٹھیک دیکھ رہی تھی لیکن کوئی دوسرا عشق کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور شاید وہ اپنے طور پر ٹھیک دیکھ رہا تھا۔

چند سیکنڈ صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ قیامت کی کشمکش تھی۔ عقل کے پاؤں ٹھوس زمین پر تھے اور مضبوطی سے جمے ہوئے تھے مگر عشق کی بلاخیزی پہاڑی دریاؤں کا مزاج رکھتی ہے۔ یہ پاؤں ٹکنے نہیں دیتی۔ یہ دلیل اور منطق کی دھجیاں اُڑا دیتی ہے۔ آگ میں کودتی ہے۔ کچے گھڑے پر تیر جاتی ہے۔ شانی کے جسم و جاں میں ایک عجیب بے نام لہر اٹھی۔ اس لہر نے اسے گرد و پیش سے یکسر بے گانہ کر دیا۔ اس نے روتے روتے اپنا ہاتھ ہولے سے بڑھایا اور رستم کے زخمی ہاتھ میں دے دیا۔

کائنات کی گردش جیسے تھوڑی دیر کے لئے رک گئی... اور ساتھ ہی شاید شانی کا دل بھی۔ وہ چند سیکنڈ تک زمان و مکاں کی قیود سے آزاد تھی۔ پھر شانی نے رستم کا ہاتھ اٹھایا اور بے ساختہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گرے اور رستم کے ہاتھ پر پھسل گئے۔ اس ہاتھ پر زخم تھے، چوٹیں تھیں اور سگریٹ سے داغے جانے کے نشان تھے۔ شانی نے اس ہاتھ اور کلائی کو کئی جگہ سے چوما اور اسے اپنے گھٹنے پر رکھ کر اس پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ دیکھنے کی سکت ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ بس مر جانا چاہتی تھی بڑی جلدی کے ساتھ۔ اس نے اپنی آنکھوں میں مُنے کی تصویر سجا لی تھی اور جان لیوا ضربیں سہنے کے لئے تیار تھی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے محسوس کیا کہ رستم کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے جدا ہو گیا ہے۔ شاید رستم نے خود ایسا کیا تھا یا کسی نے اسے کھینچ لیا تھا۔ اس کے بعد جو آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچیں، ان سے پتا چلا کہ رستم ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ کسی سے ٹکرایا ہے۔ چند چیخیں بلند ہوئیں، چند للکارے گونجے۔ شانی کو اپنے ارد گرد گھمسان کا رن پڑتا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن وہ اس قسم کو نبھا نہ سکی۔ اس نے دیکھا گیس کے ہنڈولوں اور بلیوں اور بانسوں سے لگی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں رستم کسی خون آلود عفریت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے قریب موجود کسی چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹے دستے کی کلہاڑی چھین لی تھی اور اب دیوانہ وار اسے چلا رہا تھا۔ جو

سامنے آرہا تھا، زخم کھا رہا تھا اور گر رہا تھا۔ شانی اور رستم کے گرد لوگوں کا حلقہ جو کچھ دیر پہلے بہت تنگ ہوگیا تھا، اب وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ ایک ہولناک ہراس تھا جو اس مختصر سی جگہ پر پھیل گیا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ تماشے کی خاطر ہجوم میں لایا جانے والا کوئی خونی جانور اچانک آزاد ہوگیا ہے۔ پھر رستم نے اچانک تڑپ کر ایک گری ہوئی رائفل اٹھالی۔ وہ اس رائفل کو سیدھا کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے لئے مہلت درکار تھی۔ اس کے سینکڑوں دشمن اسے اتنی مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ شدید ہراس کے چند سیکنڈ گزر گئے تھے۔ قادرے نے جیسے ہوا میں جست لگاتے ہوئے نیم جان رستم کو عقب سے دبوچ لیا اور گھما کر زمین پر دے مارا۔ رستم، شانی کے قریب گرا تھا۔ اس نے شانی کا ہاتھ تھام لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ شانی کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ آنکھیں بند کر کے چناب میں کود جانے والی دیوانگی تھی اور دیوانگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ابھی رستم پوری طرح اٹھا بھی نہیں تھا کہ درجنوں افراد اس سے چمٹ گئے۔ رائفل پکے پھل کی طرح اس کے "ہاتھ کی شاخ" سے جدا کرلی گئی۔ اسے مارا اور گھسیٹا جانے لگا مگر اس کا ہاتھ بدستور شانی کی کلائی پر تھا۔ کئی افراد شانی کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگے مگر یہ انسان کی گرفت نہیں تھی۔ یہ جذبے کی گرفت تھی اور جذبہ بھی وہ جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ شانی کا ہاتھ نہیں چھڑا سکے۔ وہ رستم کے ہاتھ پر ایک ٹوٹی ہوئی لاٹھی کی ضربیں لگانے لگے۔ اس کے بازو کو نوچنے کھسوٹنے لگے اور گرفت کمزور کرنے کے لئے اسے دانتوں سے کاٹنے لگے لیکن وہ ہاتھ... وہ کمزور ہاتھ شانی کی کلائی پر جما رہا۔ ہاں... جی دار مرد جب اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھامتا ہے تو پھر یہ گرفت مستقل ہوتی ہے۔ لاؤڈ سپیکر پر آواز پکار رہی ہے۔

ڈونگے پانیاں دے وچ دیوے پئے بلدے
مقدراں دے لکھے ٹل نیئوں سکدے

شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنے اردگرد قیامت کا شور سن رہی تھی۔ رستم کو یوں مارا جارہا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ربڑ کا پتلا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی کمزور مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھا جیسے مزاحمت نہ کر رہا ہو، اتمام حجت کر رہا ہو۔ ان کے اردگرد جو شور تھا اس کی نوعیت اب بدل گئی تھی۔ للکاروں کا آہنگ اور ہوگیا تھا۔ جملے بھی نئے تھے۔ ان جملوں میں اب پولیس کا ذکر نہیں تھا۔ فوری سزائے موت کا ذکر تھا۔

ایک موٹی بھدی آواز گونجی۔ "ماردو ان زانیوں کو۔ اسی جگہ ٹوٹے کردو۔"

ایک دوسری آواز نے تائید کی۔ "ہاں ماردو، پار کردو دونوں کو۔"

فضا کی سنسنی خیزی یک لخت ہی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ ان بند آنکھوں سے ہی نارپوری چوہدریوں کے وحشت سے بگڑے ہوئے چہرے اور ان کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ مشتعل ماحول نے چوہدریوں کو یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ اسی جگہ اسی وقت اپنے کلیجے ٹھنڈے کرلیں۔ اسے اور رستم کو مار کر اور لاشیں گلیوں میں گھسیٹ کر اپنے خونی انتقام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی راہ میں آسکے۔ یقیناً اس بپھرے ہوئے ہجوم میں کچھ لوگ مختلف سوچ بھی رکھتے ہوں گے۔ دو چار ایسے بھی ہوں گے جو رستم اور شانی پر رحم کھا رہے ہوں گے۔ شاید ان سب میں بابر بھی ہو۔ میانہ کا چھوٹا مالک بھی ہو...... لیکن انتقام کے اس چیختے چنگھاڑتے طوفان میں ان کی آوازیں کچھ معنی نہیں رکھتی تھیں۔ شاید اسی لئے وہ بھی خاموش ہوگئے تھے۔

لیکن ظلم تو ظلم ہوتا ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ خون تو خون ہوتا ہے، ٹپکتا ہے تو جم جاتا ہے۔ جب فرعون خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو ایک موسیٰؑ ضرور اس کے دعوے کو باآواز بلند رد کرتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہی خدا کا نظام ہے۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ نارپور کے چوہدری جب شانی کا ہاتھ کسی صورت رستم کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکے تو ایک للکارتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "رک جا چوہدری قادرے، رک جا، پیچھے پلٹ جا۔"

سماعت شکن شوروغل چند لمحے کے لئے تھما۔ آواز نے پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ کہا۔ "قانون کو اپنے ہتھ میں نہیں لینے دیں گے یہ ظلم ہے، یہ ناانصافی ہے.... یہ نہیں ہونے دیں گے۔"

"ہاں، یہ نہیں ہونے دیں گے۔" کئی آوازوں نے پہلی آواز کا ساتھ دیا۔

"یہ کون لوگ تھے؟ یہ کیا کہہ رہے تھے؟" شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ شاید یہ وہی لوگ تھے جن کو قدرت جابروں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے لئے کھڑا کرتی ہے۔ قدرت انہیں وسیلہ بناتی ہے اور اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے۔

پہلی آواز نے ایک بار پھر للکار کر کہا۔ "قانون سب کے لئے اک سا ہونا چاہئے۔ چوہدری! اس بندے کو چھوڑ دو۔"

"تم قانون کے مامے مت بنو۔ مارے جاؤ گے۔" ایک چوہدری گرجا۔

"زیادہ زور سے چلاؤ گے تو جھوٹ سچ نہیں ہوجائے گا چوہدری!" پہلی آواز گرجی۔

"ہماری پردہ دار عورتوں کے ساتھ تمہارے پتر منہ کالا کریں گے تو یہ ہماری عورتوں کی قسمت... اگر تمہاری عورت کے ساتھ ایک ڈاکو نے رشتہ جوڑا ہے تو وہ موت کا حق دار

ہے واہ واہ کیا بات ہے۔ کتنا کھرا انصاف ہے۔ تجھے تو وڈی کچہری کا جج ہونا چاہئے تھا چوہدری حشام۔'' آواز میں بے پناہ زہر تھا۔

یہ زہر بھری آواز کس کی تھی؟ پھر شانی نے پہچان لیا۔ یہی زہر بھری آواز جواں سال صفیہ کی موت کے بعد تاؤ حشام کی حویلی میں گونجی تھی۔ بعد میں نوکرانی حمیدہ نے شانی کو بتایا تھا کہ یہ صفیہ کے چاچے کی آواز ہے۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔ آج اس میں پہلے کی نسبت سو گنا زیادہ زہر تھا اور آج یہ آواز اکیلی بھی نہیں تھی۔ بیسیوں دیگر آوازیں اس کے ساتھ شامل تھیں۔ ایک بلند لہر تھی جو لہروں کے درمیان سے اٹھی تھی اور زور پکڑتی جا رہی تھی۔

ہاں ..... صفیہ مر جاتی ہے لیکن ..... مارنے والوں کے ہاتھوں پر اس کا خون چمکتا رہتا ہے اور یہ خون صرف قاتلوں کے ہاتھ پر ہی نہیں جمتا، پورے معاشرے کے ہاتھوں پر جمتا ہے۔ یہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور انصاف طلب کرتا رہتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شانی کے اردگرد شور وغل کے سارے زاویے اور آہنگ بدل گئے۔ اسے یوں لگا جیسے دو متحارب گروہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ چاروں طرف زلزلے کی کیفیت محسوس کر کے شانی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ خدا کی پناہ ناقابلِ یقین منظر تھا۔ لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ سر پھٹ رہے تھے۔ کلہاڑیوں کے پھل بڑی بے رحمی کے ساتھ جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ شانی نے اپنے عین سامنے ایک شخص کے چہرے پر کلہاڑی کا بلیڈ لگتے دیکھا۔ اس کی سانولی پیشانی سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ ڈکراتا ہوا دو ٹیوب لائٹوں پر گر کر انہیں چکنا چور کر گیا۔ تین افراد ایک شخص کو لاٹھیوں سے دیوانہ وار پیٹ رہے تھے اور وہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھالوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شانی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ایک چوہدری کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں اور وہ لڑنے والوں کے قدموں تلے مٹی کی طرح روندا جا رہا تھا۔

شانی کا ہاتھ ابھی تک رستم کے خون آلود ہاتھ میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ہاتھ شانی کے جسم کا حصہ بن چکا ہے۔ شانی کو رستم کے دائیں ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو دکھائی دیا۔ چوہدری قادرے کی طرف سے کیا جانے والا کلہاڑی کا ایک طوفانی وار رستم نے جھک کر بچایا اور چاقو دستے تک اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ قادرا چلا کر دہرا ہوا اور پھر اوندھے منہ گر گیا۔ تماشے کے لئے لایا جانے والا گدھا قادرے کو تقریباً لتاڑتا ہوا کسی جانب نکل گیا۔ دو کلہاڑی بردار یہ منظر دیکھ کر بڑی وحشت سے رستم پر جھپٹے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہنچتے، کمبوہ برادری کے دو لٹھ بازوں نے انہیں روک لیا۔ اسی دوران میں رستم نے ایک اور شخص کو بڑی وحشت

سے زخمی کیا اور شانی کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر حقیقت اس پر واضح ہوئی۔ ایک سٹارٹ جیپ پر کمبوہ برادری کے تین افراد کھڑے تھے اور رستم کو پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔ یہ ایک کھلی جیپ تھی۔ چند ہی سیکنڈ میں رستم اور شانی دونوں جیپ پر تھے۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے فائرنگ ہوئی۔ جیپ میں موجود ایک کمبوہ پٹ سے جیپ کے فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی رستم بھی دہرا ہو گیا۔ شانی کے دماغ میں فوراً آیا کہ رستم کو گولی لگ گئی ہے، تاہم چند لمحے بعد رستم سیدھا ہوا تو یہ بھیانک خیال غلط ثابت ہوا۔ رستم کے ہاتھ میں مضروب کمبوہ کے ہاتھ سے گرنے والا ماؤزر تھا۔ اس نے ماؤزر سیدھا کیا اور پلٹ کر کئی فائر کئے۔ شانی ایک بار پھر آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے جیپ کی طرف بڑھنے والے دو تین کلہاڑی برداروں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جیپ ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھی۔ شانی اور رستم دونوں فرش پر گر گئے۔ یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ وہیں گرے رہے۔ جیپ نے کئی شامیانوں کے بانس اکھاڑے اور توڑے ...... اور قرب و جوار کو تاریکی میں ڈبوتی ہوئی مزار کی مخالف سمت میں بڑھی۔ مزار کے اردگرد سماعت شکن شور تھا اور فائرنگ کی پُرہول آوازیں تھیں۔ شانی نے دیکھا ماؤزر رستم کے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے تھما ہوا ہے اور لمبے بالوں کے اندر سے اس کی آنکھیں یوں چمک رہی ہیں جیسے جھاڑیوں میں کوئی خوفناک درندہ گھات لگائے بیٹھا ہو۔ وہ عقب میں دیکھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

شانی اور رستم ایک جھونپڑا نما مکان میں موجود تھے۔ اس میں تین کمرے تھے۔ ایک برآمدہ اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ یہ بستی ایک بڑے ڈیک نالے کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی اور رستم کو یہاں تک لانے والے افراد نے اپنی کھٹارا جیپ کافی دور درختوں کے درمیان چھوڑ دی تھی اور پیدل یہاں تک پہنچے تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے اٹھا کر بستی تک لایا گیا۔ باقی دو افراد میں سے ایک نہایت گٹھے ہوئے جسم اور گھنگریالے بالوں والا تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کی شخصیت رعب دار اور متاثر کن تھی۔ اس کا ساتھی ستائیس اٹھائیس سال کا چھریرے بدن والا شخص تھا۔ اس کا رنگ اپنے ساتھی کی نسبت صاف تھا اور ناک کا بانسا بھی کافی اونچا تھا۔ شانی کو پتا چلا کہ یہی

صفیہ کا چاچا عارف کمبوہ ہے۔ اس کے چہرے پر وہی تمتماہٹ اور چمک تھی جو انقلابی سوچ رکھنے والے نوجوانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ سونے کی بالیوں والا سانولا شخص اور عارف کمبوہ دوست ہیں اور فی الوقت شانی اور رستم "سانولے شخص" کی بستی میں مہمان کی حیثیت سے موجود ہیں۔

میلے کے خونریز ہنگامے سے اس بستی تک پہنچنے کا سفر قریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ سارا کچے کا سفر تھا۔ اس جھونپڑا نما مکان میں بھی شانی اور رستم کو قریباً ایک گھنٹہ ہو چلا تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق یہ رات نو بجے کا وقت تھا۔ رات تاریک و نیم سرد تھی۔ کمرے میں ایک لالٹین روشن تھی۔ کچے فرش پر کھجور کی ایک بڑی چٹائی بچھائی گئی تھی۔ دو عدد بان کی چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ایک کونے میں تین جستی ٹرنک تھے۔ ایک پرچھتی پر المونیم کے برتن اور گھٹیا چینی کی پلیٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ کھڑکی کے پاس بہت سے چھاج، چنگیر اور ٹوکرے دھرے تھے ... جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر کے رہنے والے سرکنڈوں سے ایسی اشیاء بنانے کا کام کرتے ہیں۔

عارف کمبوہ اور اس کا گٹھیلے جسم والا مسلح ساتھی شانی اور رستم کو تسلی دینے اور کچھ ضروری اشیاء فراہم کرنے کے بعد کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ باہر جاتے ہی انہوں نے رکھوالی کے کتے چھوڑ دیئے تھے اور بستی کے پہرے داروں کو چوکس کر دیا تھا۔ اب شانی اور رستم اس نیم روشن کمرے میں تنہا تھے۔ رستم چٹائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ دونوں گھٹنے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور پیشانی گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ شانی کو اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس لمبے خون آلود بال ہی نظر آتے تھے۔ رستم نے جیب سے جو ماؤزر اٹھایا تھا وہ اب اس کے پہلو میں دھرا تھا۔

شانی بہت دیر تک اپنے اندر حوصلہ جمع کرتی رہی پھر اس نے ہولے سے کہا۔ "رستم!"

"جی بی بی جی!" اس نے گھٹنوں میں سر جھکائے جھکائے بے حد بھرائی اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے بہت دکھ دیا ہے تمہیں۔"

اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "خدا کے لئے بی بی!" اس کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"رستم! میں خون خرابے کو روکنا چاہتی تھی۔" وہ دل فگار آواز میں بولی۔ "مجھے ڈر تھا رستم کہ چوہدری بشیر کے ساتھ تمہاری لڑائی ہو جائے گی۔ تم چوہدری کو مار دو گے۔ پھر کوٹھی کے لوگ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مم..... مجھے مُنّے کا بھی ڈر تھا۔ اگر انیکسی میں گولیاں چلتیں تو وہ معصوم بھی لپیٹ میں آ جاتا..... مم میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں نے تمہارے پستول سے گولیاں....." وہ کوشش کے باوجود بات مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

چند سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ "رستم! مجھ سے جو کچھ ہوا وہ کسی اور کے لئے نہیں تھا صرف مُنّے کے لئے تھا۔ مُنّے کی زندگی کے لئے تھا اور شاید تھوڑا بہت بھابو کے لئے تھا۔ میری اس غلطی کے لئے تم جو چاہو سزا مجھے دے سکتے ہو۔ میں اُف نہیں کروں گی.....اور میں صرف بات ہی نہیں کر رہی، میں دل و جان سے ہر کفارے کے لئے تیار ہوں۔ یہ ماؤزر تمہارے سامنے پڑا ہے۔ بے شک مجھے گولی مار دو۔"

"خدا کے لئے بی بی..... خدا کے لئے۔" اس نے ایک بار پھر بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ چہرہ بدستور گھٹنوں میں چھپا تھا۔

"میں جانتی ہوں رستم! تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ تمہیں بدترین ذہنی اور جسمانی تکلیفیں دی گئی ہیں اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں گناہ گار ہوں تمہاری۔ مجھے بتاؤ رستم! میں کیسے مداوا کر سکتی ہوں۔ کس طرح تمہارے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہوں۔ تم جو کہو رستم! میں کرنے کے لئے تیار ہوں اور میں جانتی ہوں، سب کچھ کرنے کے بعد میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی، کچھ بھی نہیں رستم!"

ایک سسکی رستم کے گھٹنوں کے عقب سے بلند ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ خدا کی پناہ! اس کے چہرے پر دنیا جہاں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ آنکھیں انگارہ تھیں۔ آنسو آتشیں سیال کی طرح سُرخ آنکھوں سے اُتر کر خون آلود داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ پیشانی کی رگ جیسے بے پناہ اذیت کے زیر اثر تڑپ رہی تھی۔ اس نے شانی کی طرف دیکھا اور بڑی عاجزی سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "نہ بی بی!" اس کے زخمی ہونٹ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

ان دو الفاظ میں اذیت، منت سماجت، التجا اور فریاد کے سارے رنگ سمٹ آئے تھے۔

شانی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور انہیں رخسار سے لگا کر ان پر اپنے آنسو گرانے لگی۔ اس کا سارا جسم لرزاں تھا۔ اچانک شانی کی نگاہ چٹائی پر پڑی۔ خون کے دو تین قطرے ٹپ سے کھجور کی چٹائی پر گرے ..... پھر ایک اور گرا۔ یہ خون رستم کے سر سے رس رہا تھا۔ یوں تو اس کے جسم پر کئی زخم تھے، تاہم سر کا کوئی زخم ابھی تک خون اگل رہا تھا۔ شانی نے

اس کے لمبے بالوں میں سے خون کا ماخذ ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہی۔ سارے بال خون میں لتھڑے تھے اور سر سے چپکے ہوئے تھے۔ عارف کمبوہ جو چیزیں اس کمرے میں رکھوا گیا تھا ان میں گرم دودھ کا جگ، مکئی کی روٹی، گرم پانی کی بالٹی، ٹھنڈے پانی کی بالٹی، زخموں پر لگانے کے لئے ایک دیسی مرہم، روئی اور پٹیاں وغیرہ شامل تھیں۔

جب شانی رستم کے سر کا خونچکاں زخم ڈھونڈنے میں ناکام ہوئی تو اس نے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا کر اسے نیم گرم کیا۔ بالٹی کا باقی ٹھنڈا پانی اس نے ایک گھڑے میں انڈیل دیا۔ ٹھنڈے پانی والی خالی بالٹی اس نے رستم کے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کا سر دھونا چاہتی تھی۔ رستم کے چہرے پر شدید ہچکچاہٹ کے آثار تھے مگر شانی کا مصمم ارادہ اور دوٹوک رویہ دیکھ کر اسے اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پانا پڑا۔ شانی نے بڑی نرمی اور احتیاط سے رستم کا سر دھویا۔ سر کے وسط اور عقب میں دو زخم زیادہ گہرے تھے۔ ایک زخم کو تو ''اسٹچنگ'' کی ضرورت تھی مگر یہ سہولت یہاں میسر نہیں ہوسکتی تھی۔ مقامی طریقہ کار کے مطابق شانی نے ایک انگیٹھی میں سے کچھ راکھ لے کر ان زخموں سے خون کا اخراج بند کیا اور پھر ایک چوڑی پٹی ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر باندھ دی۔ سر کے عقبی زخم کے لئے ایک پٹی کو سر کے گرد بل دینا پڑا۔ اس پٹی نے پیشانی کے ایک زخم کو بھی ڈھانپ لیا۔ یہ سب کرتے ہوئے شانی نے اپنی دودھیا کلائی کے نیل کو چھپائے رکھا تھا۔ یہ نیل کسی کی ناقابل شکست گرفت کی نشانی تھی۔ رستم کی قمیص دھجیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ دھجیاں شانی نے رستم کے جسم سے علیحدہ کردیں۔ رستم کی کمر دیکھ کر آنسوؤں کا ایک آبشار شانی کے حلق میں گرنے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر ایسا کر کے وہ ماحول کو گھمبیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے صاف روئی نیم گرم پانی میں بھگوئی اور بڑی احتیاط سے رستم کی کمر کو خون آلود گرد سے صاف کیا پھر وہ اپنی نفیس کی پوروں سے زخموں پر راکھ اور مرہم لگاتی گئی۔ ایک دو جگہوں پر اسے پٹی بھی باندھنا پڑی۔ جسم کی اندرونی چوٹوں اور پٹھوں کی ٹوٹ پھوٹ کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

جب وہ رستم کی پنڈلیوں اور پاؤں کی چوٹوں کی طرف آئی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ وہ شانی کو اپنی خدمت گزاری کرتے ہوئے مزید نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اصرار کر کے ساتھ روئی اور مرہم وغیرہ شانی کے ہاتھ سے لے لئے۔

شانی نے اسے دودھ پلایا۔ وہ روٹی کے چند ٹکڑے بھی دینا چاہتی تھی۔ تاہم اسے اندازہ

ہوا کہ رستم کے گلے کی اندرونی چوٹیں زیادہ سنگین ہیں۔ دودھ جیسی رقیق چیز بھی اسے حلق سے اُتارنا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل چند الفاظ بول سکتا تھا۔ شانی نے کہیں پڑھا تھا کہ گلے کے اندر ایک صوتی خانہ (ساؤنڈ بکس) ہوتا ہے۔ اسے نقصان پہنچے تو بندے کی گویائی متاثر یا سلب ہوسکتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔ شانی اپنے آنسو خاموشی سے حلق میں گراتی رہی اور پارہ پارہ رستم کی دیکھ بھال میں مصروف رہی۔

شانی اور رستم نے اگلے چوبیس گھنٹے اسی بند کمرے میں گزار دیئے۔ شانی اس بستی میں اسی لباس کے ساتھ آئی تھی جو اسے رقاصہ نیناں نے کٹھولی گاؤں میں فراہم کیا تھا۔ یہ ایک ناچنے والی کا لباس تھا اور شانی کو اپنے جسم پر کانٹا محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی میلے کی دھینگا مشتی میں یہ کپڑے خستہ حال ہو چکے تھے۔ ایک مقامی عورت نے شانی کو ایک شلوار قمیص دی۔ وہ کافی کھلی تھی، تاہم شانی کو تن ڈھانپنے سے غرض تھی۔ رستم کے پھٹے پرانے لباس کی جگہ بھی اسے ایک دھوتی کرتہ فراہم کردیا گیا تھا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں تین چار بار عارف کمبوہ اور اس کا ساتھی کمرے میں آئے۔ ایک بار ان کے ساتھ ایک قبول صورت عورت بھی تھی۔ عارف کمبوہ کے ساتھی کا نام دراج تھا۔ وہ ذات کا مہتم تھا ....اور ڈیک نالے کے کنارے آباد اس مہتم بستی کا سردار تھا۔ بستی کے زیادہ تر لوگ سرکنڈوں اور بانس سے مختلف اشیاء تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں شکار کو بھی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔ دراج مہتم اور عارف کمبوہ میں یارانہ تھا۔ عارف کمبوہ نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور میلے میں ہونے والی لڑائی کے بعد شانی اور رستم کو اپنے گاؤں میں لے جانے کے بجائے دراج کے پاس اس مہتم بستی میں لے آیا تھا۔ عارف کمبوہ نے شانی اور رستم کو بتایا کہ میلے میں ہونے والی لڑائی میں تین بندے جان سے مارے گئے ہیں۔ ان میں دو نارپوری اور ایک کمبوہ ہے۔ قریباً تیس افراد کو گولیوں اور کلہاڑیوں کے زخم آئے تھے اور انہیں گوجرانوالہ اور وزیرآباد کے ہسپتالوں کی طرف روانہ کردیا گیا تھا۔ عارف کمبوہ کی زبانی شانی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ تاؤ کا بھتیجا چوہدری قادرا شدید زخمی ہے۔

عارف کمبوہ بڑے ہیجانی لہجے میں بولتا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنتا تھا اور کمبوہ برادری کے دوسرے مقامیوں کے برعکس کچھ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ اس کے کرتے کے نیچے ہر وقت پستول کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ دوسری طرف دراج مہتم سرتاپا بستی کا سردار دکھائی دیتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مگر نہایت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ لوہے کی طرح ٹھوس اور جنگلی سانڈ کی طرح طاقت ور ہے۔ وہ جب دن کے وقت شانی اور رستم کے

پاس آیا تو اس کے کندھے پر ایک خوفناک کلاشنکوف لٹک رہی تھی اور کمر کے گرد گولیوں کی ڈبل بیلٹ تھی۔ مرنے اور مار دینے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔

اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے جذبے سے کہا۔ ''ہم مہتم ہوتے ہیں۔ یاروں کے لئے سر کٹا دیتے ہیں۔ کسم پیدا کرنے والے کی، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تم دونوں کی طرف میلی نجر سے نہیں دیکھ سکتا۔''

عارف کمبوہ بولا۔ ''علاقے میں بڑی ٹینشن ہے۔ نار پور کے بلی مار چوہدری زنانیوں کی طرح چوڑیاں ڈال کر بیٹھ گئے ہیں اور پولیس کو آگے کر دیا ہے۔ پولیس نے ہمارے تین دیہاتوں سے ساٹھ کے قریب بندے پکڑے ہیں۔ انہیں مارا پیٹا گیا ہے۔ ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ ہم بھی سب کچھ اپنے سینے پر لکھ رہے ہیں۔ ایک ایک زیادتی کا بدلہ لیں گے۔''

شانی نے کہا۔ ''آپ لوگ ہماری خاطر بہت تکلیف اٹھا رہے ہیں...... یہ بہت بڑا احسان ہے آپ کا.... لیکن...... کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟ میرا مطلب ہے اگر نار پور والے اس طرف آ گئے تو......؟''

دراج نے سینہ پھیلایا اور اپنی کلاشنکوف پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! یہ ایک سیکنڈ میں دس گولیاں نکالتی ہے۔ اک پھرلانگ (فرلانگ) تک جو شے سامنے آئے اس کو پھڑکا کر رکھ دیتی ہے.... سمجھو کہ اکھ جھپکنے کی دیر میں دس بندوں میں موری کر سکتی ہے۔ اگر بلی ماروں نے ادھر آنے کی بھادری (بہادری) کی تو کسم سے لاشوں کا ڈھیر لگا دیں گے۔ مہتموں کا بچہ بچہ تم دونوں پر جندڑی وار دے گا۔ ہم جبان دے کر پیچھے ہٹنے والے لوک نہیں ہیں۔''

''دلل ...... لیکن...... بھائی، ہم اپنے لئے کسی طرح کا خون خرابا نہیں چاہتے۔'' شانی نے کہا پھر وہ عارف کمبوہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اگر کسی طرح تم ہم دونوں کو کسی قریبی قصبے تک پہنچا دو تو یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہوگا۔ ہم پکی سڑک کے راستے اس علاقے سے نکل جائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر کسی طرح رستم کے دوستوں سے رابطہ کرا دو۔ میرے پاس دو فون نمبر موجود ہیں۔''

عارف کمبوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بی بی! آپ غلط سوچ رہی ہو۔ یہاں سے نزدیک ترین پکی سڑک بھی پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ باقی رہی ٹیلی فون کی بات تو اس کی کوشش کی جا سکتی ہے مگر جس قسم کے حالات ہیں، بہتر یہی ہے کہ ابھی کسی باہر کے بندے کو یہاں بلا کر اس کی جان کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ پولیس اور بلی ماروں کے بندے چپے چپے پر تم دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں خاص طور سے پولیس والے بہت شیر ہو رہے ہیں۔ ہسپتال میں ان

کا ایک بندہ بہت دیر تک بیمار رہنے کے بعد پندرہ بیس دن پہلے مرا ہے۔ وہ اس بندے کا قتل رستم پر ڈال رہے ہیں۔''

دراج نے سینہ پھلا کر شانی کو مخاطب کیا۔ ''او نکڑی (چھوٹی) تو خون شون کی باتیں چھوڑ۔ ہم نے پھیسلہ کیا ہے کہ تم دونوں کا اصل مسئلہ ہی حل کر دیں گے۔ ایک دم کھلاص، سب کچھ صاف۔ ہم اگلے دو دن کے اندر اندر تم دونوں کی شادی کر دیں گے۔ تم دونوں کلمے پڑھ کر ایک ہو جاؤ پھر دیکھیں گے کہ تم کو کون مائی کا لال ایک دوجے سے دور کرتا ہے۔''

شانی حیرت سے دراج کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ کتنی آسانی سے کتنی بڑی بات کر دی تھی اس نے۔ رستم بھی سرخ آنکھوں سے دراج کو دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔ دراج نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''رستم! تم بھادر (بہادر) پیو کے بھادر پتر ہو اور بھادروں کی کدر کرنا مہتموں کے کھون میں شامل ہے۔ میں دیکھوں گا تم دونوں کو ایک ہونے سے کون روکتا ہے۔ میں دیکھوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ عارف کمبوہ کو اپنے ساتھ لے کر طاقتور سانڈ کی طرح جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات کو عجیب واقعہ ہوا۔ نیم جان رستم چٹائی پر لیٹا تھا۔ شانی چارپائی پر نیم دراز تھی۔ شانی کے بہت اصرار کے باوجود رستم نے دوسری چارپائی پر لیٹنا پسند نہیں کیا تھا۔ شانی کا ذہن ہزار ہا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سوچوں کی اس یلغار میں گاہے بگاہے دراج کا وہ عجیب و غریب فقرہ بھی ابھر کر گونجتا تھا اور شانی کو شرمندگی کے سمندر میں ڈبو دیتا تھا۔ دراج نے پتا نہیں کیوں ایسی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شانی اور رستم کو ایک کر دے گا۔ کتنی بڑی، کتنی مہیب بات کتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی اس نے۔ سوچتے سوچتے شانی کی آنکھ لگ گئی...... اس کی آنکھ شور سے کھلی۔ اس نے جلدی سے چٹائی کی طرف دیکھا۔ رستم موجود نہیں تھا۔ بس خالی گدیلا تھا اور پھول دار تکیہ تھا۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ اس نیم پختہ مکان سے باہر زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ پہلا خیال شانی کے ذہن میں یہی آیا کہ نار پوری چوہدری یا پولیس کے لوگ موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ اس نے اوڑھنی لے کر چپل پہنی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی میں اسے عجیب منظر نظر آیا۔ رستم کے ہاتھ میں وہی کلاشنکوف تھی جو کل شانی نے دراج کے کندھے پر دیکھی تھی۔ دو تین مہتم رستم سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے روکنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے رستم نے دو افراد کو کلاشنکوف کے کندے سے کاری ضربیں لگائیں اور خود کو چھڑا کر لنگڑاتا ہوا بستی کی مخالف سمت میں بھاگا۔ دو دن میں ہی اس کے نحیف و زخمی جسم میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے

آ گئی تھی۔

شانی نے دیکھا کہ ایک شخص رستم کے پیچھے لپک رہا ہے۔ یہ بستی کا سردار دراج تھا۔ اس نے چند قدم بھاگنے کے بعد رستم کو عقب سے دبوچ لیا۔ دونوں اوپر نیچے کچی زمین پر گرے۔ دراج، رستم کو صرف روکنا چاہتا تھا...... رستم بھی خود کو دراج سے صرف چھڑانا چاہتا تھا لیکن چند ہی سیکنڈ میں یہ جدوجہد باقاعدہ لڑائی میں بدل گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کاری ضربیں لگائیں۔ اب باقی لوگ مداخلت نہیں کر رہے تھے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ ان کا نہایت زور آور اور پھرتیلا سردار زخمی رستم پر قابو پا لے گا مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ بے شک دراج سانڈ کی طرح طاقت ور اور چیتے کی طرح پھرتیلا تھا مگر اس کے مقابل کوئی عام شخص نہیں تھا، رستم سیال تھا۔ لڑائی بھڑائی میں جس کی صلاحیت یکتا تھی۔ جس کے بارے میں لاہور کے ایک پولیس افسر نے کہا تھا۔ ''یہ شخص اپنے مدِمقابل کو قتل کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔'' زخمی ہونے کے باوجود چند ہی سیکنڈ میں رستم نے دراج مہتم کو لتاڑ کر رکھ دیا۔ دونوں کیچڑ سے بھرے ہوئے ایک جوہڑ میں لڑ رہے تھے اور لت پت ہو رہے تھے۔ رستم کے سر کی ایک خوفناک ٹکر دراج کے چہرے پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل جوہڑ میں گرا۔ رستم کلاشنکوف لہراتا ہوا کنارے کی طرف بڑھا، تاہم اس دوران میں دراج کے دوست عارف کمبوہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عقب سے رستم کو دبوچ لیا۔ اردگرد کھڑے افراد نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رستم کو روکنے کے لئے اس سے چمٹ گئے۔ رستم کے جسم میں جیسے کوئی جناتی قوت تھی۔ وہ درجن بھر افراد کی گرفت سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ شاید نکل بھی جائے۔ غنیمت یہی تھا کہ اس نے ابھی تک فائر نہیں کیا تھا۔

جونہی شانی کا سکتہ ٹوٹا وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور مشعل برداروں کے درمیان سے رستہ بناتی رستم کے سامنے آ گئی۔ وہ غضب کے عالم میں سینے کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا مگر آواز چند فٹ سے زیادہ دور نہیں جا رہی تھی۔ جو الفاظ شانی کی سمجھ میں آ سکے وہ یہ تھے۔ ''زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو مار دوں گا، ختم کر دوں گا۔''

اس کے بدن میں ناقابلِ مزاحمت طوفان کی ہلچل تھی لیکن جب شانی نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے تو یہ طوفان جیسے ایکا ایکی اپنے کناروں میں سمٹنے لگا۔ شانی نے اس کے دونوں کندھے تھام لئے۔ ''نہیں رستم نہیں رستم...... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' اس نے بار بار کہا۔ رستم کے اعضاء کی تشنجی کیفیت دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی۔

چند منٹ بعد رستم، شانی کے ساتھ ایک بار پھر جھونپڑا نما کمرے میں موجود تھا۔ کیچڑ

میں لتھڑی ہوئی کلاشنکوف زخمی دراج کے پاس واپس پہنچ چکی تھی۔ رستم کے کئی پرانے اور نئے زخم خون اُگلنے لگے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر چہرہ شانی کی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ اس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بال پنڈلیوں پر جھول رہے تھے۔ شانی نے بے ساختہ اس کے کندھے پر سر رکھا اور سسکنے لگی۔ ''نہیں رستم! میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سب اکٹھے ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کے ساتھ ہے۔ عام لوگ ان کے ساتھ ہیں......''

وہ خاموش بیٹھا رہا جیسے جواب دینا ہی نہ چاہتا ہو۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ جواب دیتے ہوئے اس سے کوئی گستاخی ہو جائے گی۔

اس کے کئی زخموں کے منہ پھر کھل گئے تھے۔ شانی ایک بار پھر اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ عارف وغیرہ نے احتیاط کے طور پر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اگلے روز رستم دیر تک سویا رہا۔ شانی جاگتی رہی اور اس کے اردگرد موجود رہی۔ رستم سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے لمبے بالوں کی ایک لٹ خم کھا کر اس کی ناک سے چھو رہی تھی۔ ناک سے آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ یہ لٹ حرکت کرتی تھی اور رستم کی نیند میں خلل ڈالتی تھی۔ شانی محویت سے دیکھتی رہی۔ اس کا دل چاہا اس لٹ کو آہستگی سے ہٹا کر رستم کے کان کے پیچھے اڑس دے مگر ایسا کرتے ہوئے اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ شرم ایک سنسناہٹ کی طرح اس کے جسم میں دوڑ جاتی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کے نقوش میں عجیب سی حلاوت تھی، تاہم حالتِ نیند میں بھی یہ ''حلاوت'' تکلیف اور دکھ سے متاثر نظر آتی تھی...... وہ دیکھتی رہی اور اس کے سینے میں کچھ رستا رہا۔ پھر اس نے ہمت کی اور رستم کی کیچڑ آلود لٹ آہستہ سے اس کے چہرے سے ہٹا کر اس کے کان کے پیچھے اڑس دی۔

یکا یک دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور شانی بُری طرح چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی شکستہ کھڑکی کی درزوں میں سے دو تین عورتیں اندر جھانک رہی تھیں۔ شانی نے دیکھا تو وہ ہنستی ہوئی تیزی سے پلٹ گئیں۔ یہ مہتم عورتیں تھیں۔ انہوں نے گھاگھرے اور چولیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ شانی اپنے آپ میں خجل سی ہو گئی اور رستم سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔

شام کے وقت جب شانی، رستم کو ہلدی ملا دودھ پینے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک بار پھر کچھ لڑکیاں اور بچے کھڑکی کے آس پاس نظر آئے۔ ان کی دبی دبی ہنسی بھی شانی کو سنائی دی۔

شام کے فوراً بعد وہی عورت کمرے میں داخل ہوئی جو تین دن پہلے عارف کمبوہ اور دراج مہتم کے ساتھ اندر آئی تھی۔ شانی جان چکی تھی کہ یہ مکھیا دراج کی بیوی ہے۔ اس کا نام ماکھو ہے۔ یہ سانولے رنگ کی اٹھائیس تیس سالہ اور قدرے فربہ عورت تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے وزنی کڑے اور کانوں میں جھمکے وغیرہ اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتے تھے۔ یہ گھاگھرا چولی کے بجائے کڑھائی دار شلوار قمیص پہنتی تھی۔ کُرتے کے گریبان پر بے شمار سیپیاں اور چاندی کے ستارے وغیرہ جڑے ہوئے تھے۔ بستی کی دیگر اہم عورتوں کا لباس بھی اسی طرح کا تھا۔ ماکھو کے ساتھ دو تین عورتیں بھی کمرے میں آئیں۔ عارف کمبوہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

ماکھو سنجیدہ تھی لیکن دوسری عورتوں کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ ماکھو نے اپنائیت بھرے لہجے میں شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”چل نکڑی! تو ہمارے ساتھ دوسرے کمرے میں آجا۔ بندے اور جنانی کا ایک ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ وہاں ہم آپس میں گل بات بھی کرتے رہیں گے۔ تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔“

بات تو ماکھو کی صحیح تھی لیکن شانی کو رستم کی فکر بھی تھی۔ شانی نے تذبذب کی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ عارف کمبوہ بولا۔ ”میری بہن! اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں ناں، ہر طرح خیال رکھیں گے۔“

شانی جب سے عارف کمبوہ سے ملی تھی، اس کے لہجے میں شانی کو سچائی، جذبہ اور خلوص ہی دکھائی دیا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عارف جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ رستم پتھر کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے فی الوقت سب کچھ شانی پر چھوڑ دیا ہے۔ (رستم کے دل و دماغ کے اندر کیا چل رہا تھا اس بارے میں شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا)

شانی نے رستم سے ایک دو باتیں کیں۔ اسے دوا اور مرہم پٹی کے بارے میں چند ہدایتیں دیں اور ماکھو کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ عارف کمبوہ کمرے میں رستم کے پاس ہی رہ گیا۔ شانی کو جس دوسرے مکان میں لایا گیا، وہ پہلے مکان کے ساتھ ہی تھا، تاہم قدرے بڑا اور کشادہ تھا۔ یہ پختہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ بیرونی چار دیواری جو آٹھ دس فٹ اونچی تھی کچی تھی، صحن بھی کچا تھا۔ مکان کے کسی بھی حصے میں پلاستر نہیں کیا گیا تھا۔ کمروں کی دیواروں پر سستی قسم کی دو چار رائفلیں اور کلہاڑیاں آویزاں تھیں۔ اس نیم پختہ مکان کو سرکنڈوں سے بنی ہوئی اشیاء سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہی سردار دراج اور اس کی بیوی ماکھو کا ٹھکانہ تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں شانی کو یہاں وی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

بستی بھر کی عورتیں اسے دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور ان کی سرمہ لگی آنکھوں میں شوخی کروٹ لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں سے کئی نے چاندی، شیشے اور پلاسٹک وغیرہ کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کے رنگ گندمی یا سانولے تھے۔ بالوں کو خاص انداز میں مینڈیوں کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ شانی ان کے لئے ایک عجوبے کی طرح تھی۔

شانی کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ دودھ، مکئی اور جوار کی روٹی، گُڑ والے چاول، مرغی کا گوشت یہاں کے خاص کھانے تھے۔ رات کو ماکھو نے کہا۔ ”کسی چیز کی جرروت ہو تو بالکل شرم نہ کرنا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اور رستم دو چار دن میں ہی بھلے چنگے ہو جاؤ۔“

شانی بولی۔ ”میں نے تمہارے خاوند سے منت کی تھی کہ کسی طرح رستم کے ساتھیوں تک رستم کے بارے میں اطلاع پہنچا دو۔ پتا نہیں کہ اس نے کچھ کیا ہے کہ نہیں۔“

ماکھو پھسکڑا مار کر شانی کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ”تم اتنا پھکر کیوں کرتی ہو۔ ہوک سی جندڑی ہے تمہاری۔ اس کو اتنی مصیبت میں مت ڈالو۔ وہ عارپھ (عارف) ہے ناں میرے بندے کا یار، وہ آج اپنے پنڈ واپس جا رہا ہے۔ وہ پڑھا کو اور ہوشیار بندہ ہے۔ وہ ٹھیک موقع دیکھ کر رستم کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں جرور بتا دے گا۔“

”وہ واپس کیوں جا رہا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”اس کا جانا جروری ہے نکڑی! وہ جیادہ دیر اپنے پنڈ سے غیب رہے گا تو پُلس کو اس پر شک ہوگا۔ پُلس والے ہر جگہ تم دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اللہ مولا کا شکر ہے کہ ابھی وہ ہمارے علاقے سے دور دور ہیں......“

اگلے دن عجیب واقعہ ہوا۔ بہت سی عورتیں مکان کے برانڈے میں جمع ہوگئیں اور کوئی مقامی گیت گانے لگیں۔ سازوں کے طور پر ڈھولکی کے علاوہ اک تارہ، بانسری، طبلہ وغیرہ استعمال کئے جا رہے تھے۔ یہ خوشی کا گیت تھا جس میں دریا کے کنارے سرکنڈوں میں مُیاروں کے ناچنے اور محبوب سے ملنے کا ذکر تھا۔ ان لڑکیوں کا ذکر تھا جو اپنے نازک کومل ہاتھوں سے سرکنڈوں کے چھلکوں اور سوکھی ہوئی داب سے خوبصورت آرائشی چیزیں بناتی ہیں۔ ایسی چیزیں جن کو دیکھ کر شہری بابو...... بنانے والیوں کے اَن دیکھے ہاتھوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی کئی خوشی بھرے گیت مہتم لڑکیوں نے گائے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ شاید ان لوگوں کا کوئی تہوار قریب آ رہا ہے۔

رات کو مشعلوں کی روشنی میں بہت سے مرد و زن اور بچے جمع ہوئے۔ بچوں میں سے کچھ نیم سرد موسم کے باوجود بالائی لباس نہیں پہنے ہوئے تھے۔ پہلے گانے بجانے کا سلسلہ ہوتا رہا پھر مکان کے سامنے احاطے میں موجود مردوں کے جمگھٹے میں سے کچھ مردوں نے اٹھ کر ڈھول کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک سفید شراب بھی پی رہے تھے۔ الاؤ کے گرد ناچتے ہوئے ان کے چہرے تمتمانے لگے اور حرکات و سکنات میں ایک خوشی بھرا جوش نمایاں ہوتا چلا گیا۔ صحن کے اندر عورتیں مسلسل گانے بجانے میں مصروف تھیں۔ شانی کمرے کی کھڑکیوں میں سے یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک گھڑ سوار مردوں کے جمگھٹے کی طرف نمودار ہوا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ اور کندھے پر رائفل تھی۔ تین چار مزید کلہاڑی بردار افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ تیزی سے صحن کی طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ اندر موجود عورتیں دروازہ اپنی طرف سے بند کرتیں، وہ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ پگڑ والے ہٹے کٹے نوجوان نے رائفل سونتی تو عورتیں چیخ اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک نوجوان لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس بجی سنوری لڑکی نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن پگڑ والے نوجوان نے اسے لپک کر دبوچ لیا۔ باقی عورتوں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر کلہاڑی بردار نے للکارے مار کر عورتوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ دھینگا مشتی میں بجی سنوری لڑکی کا لباس پھٹ گیا۔ تنومند نوجوان نے ایک نعرہ مارا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ مردوں کی طرف سے کئی افراد مزاحمت کے لئے آگے مگر پگڑ والے نے بائیں ہاتھ سے لڑکی کو کندھے پر دبوچے رکھا اور دائیں ہاتھ سے کئی ہوائی فائر کئے۔ شانی نے دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ اپنے یا پگڑے والے کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ جب پگڑ والا لڑکی کو لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو لڑکی نے یہ خون آلود ہاتھ ایک ادھیڑ عمر شخص کے کندھے پر ثبت کر دیئے جیسے اس کے کندھے پر اپنی نشانی چھوڑ کر جا رہی ہو۔ شانی نے دیکھا کہ ڈھولک بجانے والی کچھ عورتیں اس ہنگامے کے باوجود مسلسل ڈھولک بجا رہی تھیں۔ باہر الاؤ کے گرد کچھ مہتمم مرد بھی بدستور محو رقص تھے۔ اچانک شانی کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کچھ کھیل تماشے کا حصہ ہے۔ خوشی منانے کے اس مقامی طریقے میں غالباً کسی قدیم واقعے کی جھلک پیش کی گئی تھی۔ مختلف برادریوں اور قبیلوں میں شادی کے لئے لڑکیوں کو اغوا کرنے کی رسم بہت پرانی ہے۔ پگڑ والے نے لڑکی کو اپنے آگے سفید گھوڑے پر بٹھایا اور الاؤ کا ایک چکر مکمل کرنے کے بعد اسے گھوڑے سے اُتار دیا۔ وہ بھاگتی اور ہنستی ہوئی عورتوں کے درمیان واپس آ گئی۔ اس نے ہاتھوں پر غالباً کسی پرندے کا خون لگایا تھا۔ اس خون کی چھاپ اس نے اپنے ''اغوا'' کے وقت اپنے باپو کے کندھے پر لگائی تھی۔ یہ ناچ گانا رات دس گیارہ بجے تک جاری رہا۔ کھیاد راج اس میں پیش پیش تھا، تاہم عارف کمبوہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رات سونے سے پہلے ماکھو نے اسے بتایا کہ عارف واپس چلا گیا ہے۔ شانی نے ماکھو سے ناچ گانے کے بارے میں پوچھا۔ ماکھو نے اس کا کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ جب شانی نے پوچھا کہ کیا یہ سب کسی تہوار کے حوالے سے ہے تو ماکھو نے مبہم انداز میں اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے صاف محسوس کیا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ شانی نے ماکھو سے رستم کی خیر خیریت دریافت کی پھر گفتگو کا رخ مقامی حالات کی طرف مڑ گیا۔

ماکھو نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شانی کو جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ یہ مہتموں کی بستی ہے اور ڈیک نالے کے کنارے اس طرح کی دو بستیاں اور بھی ہیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش تو نہیں تھے، تاہم سیلانی مزاج رکھتے تھے اور آوارہ گردی کی عادتیں ان میں موجود تھیں۔ یہ زبردست قسم کے شکاری بھی تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو مسلمان ہونے کے باوجود اب بھی جنگلی سؤر کا گوشت کھا جاتے تھے یا شاید وہ ویسے ہی لامذہب لوگ تھے۔ ماکھو نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ نرسل (سرکنڈا) سے گھریلو استعمال کی مختلف اشیاء بنانا ان لوگوں کا پیشہ ہے۔ ویسے یہ خود کو راجپوتوں کی شاخ قرار دیتے تھے۔ عموماً شہروں اور قصبوں سے کچھ فاصلے پر چھپروں یا نیم پختہ مکانوں میں رہائش رکھتے تھے۔ مقامی کمبوہ برادری کے ساتھ ان لوگوں کے اچھے تعلقات تھے۔ ماکھو سے باتوں کے دوران میں شانی کو ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کمبوہ برادری کے مقامی لوگوں نے لڑکی کی موت کا مسئلہ ابھی تک اٹھا رکھا ہے۔ وہ صفیہ کی قبر کشائی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے ماکھو گاہے بگاہے شانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی تھی اور اس کے بال سنوارنے لگ جاتی تھی۔ وہ شانی کے لئے سچی ہمدردی محسوس کر رہی تھی اور ماضی کے حوالے سے اسے کریدنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس نے شانی کو بتایا۔ ''ہمارے ایک پیر و مرشد ہیں۔ سر پر ہتھ رکھ کر بندے کا ہر دکھ درد دور کر دیتے ہیں۔ میں تمہیں ان سے ضرور ملاؤں گی۔ تم دیکھنا کتنا چین ملتا ہے تمہیں۔ پھر سے جندہ نہ ہو جاؤ تو میرا نام بدل دینا۔''

اسی دوران میں شانی نے کھڑکی سے دیکھا۔ بہت سے مشعل بردار مہتم ایک چارپائی اٹھائے بستی کی طرف آ رہے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ شاید کوئی جنازہ ہے۔ مگر چارپائی پر جو بھاری بھرکم جسم تھا وہ حرکت کر رہا تھا۔ وہ سر تا پا ایک سفید چادر میں چھپا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

ماکھو بولی۔ ’’ہماری آبادی کی ایک جنانی (عورت) ہے۔ شہر میں نوکری کرتی تھی۔ اُدھر بیمار پڑگئی۔ وہاں وڈے ہسپتال میں ایک مہینے تک اس کا علاج شلاج ہوتا رہا ہے۔ اب ٹھیک ہوگئی ہے اور واپس آئی ہے۔‘‘

چارپائی والی عورت کو ایک قریبی جھونپڑے میں لے جایا گیا۔ یہ خاصا بڑا مکان نما جھونپڑا تھا۔ کافی رات ہونے کے باوجود یہاں بہت سے مرد و زن جمع ہوگئے اور خوشی بھری آوازیں آنے لگیں۔

☆======☆======☆

اگلے روز دوپہر کو شانی نے کمرے کی کھڑکی سے عجیب منظر دیکھا۔ بہت سے مہتم مکان کے صحن اور باہر گلی میں جھنڈیاں لگا رہے تھے۔ صحن اور گلی کو خوب اچھی طرح صاف بھی کیا گیا تھا۔ دو افراد مسلسل ڈھول اور بانسری بجانے میں مصروف تھے۔ ایک گیدڑ کے گلے میں پنا ڈال کر اسے گلی کے بیچوں بیچ باندھا گیا تھا۔ اس گیدڑ کی پشت ایک پھول دار ریشمی کپڑے سے ڈھانپی گئی تھی۔ صحن کے ایک گوشے میں پیتل کے دو بڑے بڑے پتیلوں میں کچھ پکایا جارہا تھا۔ ایک مہتم لڑکی اپنی چاندی کی تھلی چمکاتی ہوئی شانی کے پاس سے گزری تو شانی نے پوچھا۔ ’’بہن! یہ کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’ہم کو کیا پتا؟‘‘ لڑکی نے کہا اور مسکراتی ہوئی آگے نکل گئی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت آگے بڑھی۔ اس نے محبت سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ’’نکڑی! آج تیری ڈھولک ہے۔ کل ویاہ ہونا ہے تیرا.....رستم سیال کے ساتھ۔‘‘ شانی کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑا مار دیا تھا۔ وہ حیرانی سے ادھیڑ عمر مہتم عورت کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ ویاہ یعنی شادی کا لفظ اس کی سماعت کو مفلوج کر رہا تھا۔

’’یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟‘‘ شانی نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

’’ہائے ہائے نکڑی! اس میں اتنا حریان ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہارا ویاہ ہو رہا ہے، کوئی تمہیں اٹھا کر تو نہیں لے جا رہا ہے۔ ہمارے وڈوڈیرے ایک جمانہ پہلے کہہ گئے ہیں جب کسی جوان جنانی کا کھاوند مرجائے تو اس پر چادر ڈالو۔ اس کام کا اتنا بڑا اجر ہے کہ کوئی کھیال بھی نہیں کرسکتا۔ جتنا اجر چادر ڈالنے والوں کو ہوتا ہے اتنا اس کو بھی ہوتا ہے جس پر چادر ڈالی جائے۔ (شادی کی جائے)‘‘

شاید بوڑھی عورت کچھ اور بھی کہتی مگر شانی کے ذہن میں تو آندھی چل رہی تھی۔ وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں آگئی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ رات کو جو کھیل تماشے ہوئے

بھی وہ بھی اسی ’’شادی‘‘ کی تقریب کا حصہ ہی تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیسے ہو رہا تھا؟ کیا رستم کو اس ساری صورتِ حال کا علم تھا؟ اگر اسے علم تھا تو کیا یہ سب اس کی مرضی سے ہو رہا تھا؟ عورتوں نے شانی کے سامنے کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی مگر عارف کمبوہ اور دراج وغیرہ تو رستم کے سامنے کھل کر بات کرتے تھے۔ چار دن پہلے دراج نے شانی اور رستم کے سامنے ہی کہا تھا کہ وہ کلمے پڑھوا کر ان دونوں کو ایک کردے گا۔ رستم کی صورت شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شانی سے پوچھے بغیر رستم یہ سب کچھ کیسے ہونے دے رہا تھا۔ اتنا بڑا قدم اور ایسی بے خبری کے عالم میں.....ایسی من مرضی کے ساتھ۔ شانی کے سینے میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سینے کے اندر کوئی عظیم الشان شے ٹوٹ رہی ہے۔ اس میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔

وہ ایک بار پھر کھڑکی میں آگئی۔ آنکھوں میں موجود نمی نے اردگرد کے مناظر کو دھندلا رکھا تھا۔ وہ رستم سے ملنا چاہتی تھی.....وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی کبھی کبھی دل کی آرزو بڑی جلدی پوری ہوجاتی ہے۔ جونہی شانی کھڑکی میں آئی، رستم اسے مکھیا دراج کے گھر سے نکلتا دکھائی دیا۔ دو مہتم جن کے کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اس کے عقب میں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے رستم پر نگاہ رکھی ہوئی ہے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ باہر آنے کے بعد رستم کچھ بھی کرسکتا ہے.....شانی آج کئی دن بعد اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹیاں بندھی تھیں۔ چال میں بھی لنگڑاہٹ موجود تھی، تاہم اس نے لباس بدلا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ریشمی لاچہ اور کرتہ تھا۔ اپنے کندھے کے زخم کو بائیں ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اس نے جنگلی گیدڑ کی طرف دیکھا۔ مہتم بچوں نے اس کے سامنے کھانے پینے کی بہت سی مزیدار اشیاء ڈال دی تھیں۔ رستم کو دیکھ کر یہ بچے رستم کے گرد جمع ہوگئے اور خوف آمیز اپنائیت سے اسے دیکھنے لگے۔ رستم کے چہرے پر بھی حیرانی کے تاثرات تھے پھر اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور وہ کھڑکی میں شانی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دونوں کئی سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں سوالات تھے.....وہ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، یہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو رہا ہے؟

شانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر رستم کے چہرے پر نظر آنے والے کرب میں اضافہ ہوگیا۔ وہ ایک دم زیادہ بے قرار و بے چین نظر آنے لگا۔ ان دونوں کے درمیان پچیس تیس میٹر سے زیادہ فاصلہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے مگر بات نہیں کرسکتے تھے۔ تب شانی نے دیکھا کہ رستم ایک جواں سال مہتم سے کچھ پوچھ رہا

ہے۔ یہ مہتم ٹکھیا دراج کی بیوی ماکھو کا بھائی تھا۔ ان دونوں کے درمیان قریباً دو منٹ تک بات ہوئی پھر شانی نے دیکھا کہ رستم ایک دم مشتعل ہو گیا ہے۔ کچھ وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی جو تین چار دن پہلے ہوئی تھی۔ وہ اپنے زخمی جسم کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا رنگی برنگی جھنڈیوں کی طرف بڑھا اور انہیں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا۔ پھر اس کا دھیان پیتل کے بڑے بڑے دیگچوں کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کرتا، اس نے دونوں دیگچے زمین پر الٹا دیئے۔ چاروں طرف افراتفری پھیل گئی۔ بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ مہتم عورتیں دروازوں میں سمٹ کر چلانے لگیں۔ رستم نے ایک ڈھولچی کو پکڑا اور اس سے ڈھول چھین کر دیوار سے دے مارا۔ زوردار دھماکے کے سبب خوش خوراکی کرتا ہوا گیدڑ بے طرح خوفزدہ ہوا اور اپنا رسہ تڑانے کی مضحکہ خیز کوشش کرنے لگا۔ کئی مہتم مردوں نے رستم کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری قوت سے چلا رہا تھا، تاہم اس کی آواز اتنی بیٹھ چکی تھی کہ بمشکل اس کے اپنے کانوں تک ہی پہنچ سکتی ہوگی۔

یہ منظر دیکھ کر شانی کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹی اور بے دم سی ہو کر کمرے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ واقعات میں عجیب سی تیزی آ گئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ باہر موجود ہنگامہ اب سرد ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد شانی نے محسوس کیا کہ رستم اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ غالباً اکیلا آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا پھر بھی اس نے دستک دی۔ شانی نے کہا۔ ”آ جاؤ!“

وہ آ گیا۔ وہیں دہلیز پار کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ گلے کی رگیں پھول گئیں۔ بس کھی کھی کی آواز نکل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے کرب کے ساتھ صحن میں الٹے ہوئے دیگچوں اور بکھری ہوئی جھنڈیوں کی طرف اشارہ کیا پھر شانی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس نے نہیں کیا۔ نہ ہی اس کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ شانی کے سینے میں مدوجزر تھا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے پتا تھا رستم...... مجھے پتا تھا۔“

وہ اس کے قریب چلی آئی۔ وہ بولا۔ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ بمشکل شانی کے کانوں تک پہنچ پائے۔ ”میں نے نہیں...... سوچ بھی نہیں سکتا......“

شانی نے آنسو بہاتے ہوئے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

اس موقع پر رستم سے مزید کیا کہے۔ وہ اس کے زخموں کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آواز کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی جو پہلے سے زیادہ خراب اور ناقابل سماعت تھی... لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کرب، مایوسی اور بے چارگی کے ایسے تاثرات تھے جو صرف دیکھے جا سکتے تھے، بیان نہیں کئے جا سکتے تھے۔ شاید ہی ویسے ہی تاثرات تھے جو ایک عرصہ پہلے رنگ والی کی حویلی میں شانی کا طمانچہ کھا کر اس کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہہ پاتی، وہ مڑا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے انداز میں تسلیم و رضا کی ایک ایسی کیفیت تھی جو ایک شدید لیکن میٹھی چبھن کی طرح شانی کے سینے میں گہرائی تک اُتر جاتی تھی۔ وہ درد سے بے حال ہوتی تھی مگر یہ درد اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ عجیب دیوانہ تھا وہ۔ بے مثال جذبے اور رویے تھے اس کے۔ کسی وقت تو وہ شانی کو اتنا انوکھا لگتا تھا کہ وہ بالکل چکرا جاتی تھی۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتا تھا۔ تاؤ حشام کے بندی خانے میں رستم کے حوالے سے شانی نے جو کچھ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ خود فراموشی کی کیفیت، وہ اذیت پسندی، وہ رقص مستانہ...... رستم کے جانے کے بعد وہ دیر تک کمرے میں بند رہی۔ ہاں، اس کے سینے میں مدوجزر تھا۔ آنسو بے وجہ ہی آنکھوں سے امڈے پڑ رہے تھے۔

رستم کی حالتِ زار لمحہ لمحہ اس کے دل پر چرکے لگا رہی تھی۔ اچانک کچھ قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ شانی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے درمیانی عمر کی قریباً دس مہتم عورتیں کھڑی تھیں۔ ان میں ماکھو سب سے آگے تھی۔ یہ ساری عورتیں ممتاز حیثیت کی حامل تھیں کیونکہ ان سب نے چاندی کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ وہ اپنے کپڑے سنبھالتی اور زیورات کڑکڑاتی ہوئی شانی کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ ماکھو نے محبت سے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔

”نکڑی! یہ بر تیرے لئے بڑا چنگا ہے۔ وہ جنانی بڑی کھش قسمت ہوتی ہے جسے کوئی بندہ اپنے من سے چاہتا ہے... اور وہ چاہتا ہے تجھے...... دیکھ ہم دس جنانیاں تیرے چاہنے والے کی سپھارش بن کر تیرے پاس آئی ہیں۔ ہماری برادری کے دس بڑے کھاندان ہیں۔ ہر کھاندان کی ایک بڑی جنانی تیرے سامنے ہے اور تیری منت کرتی ہے کہ تُو اپنے چاہنے والے کی ووہٹی بن جا۔ وہ ہر طرح سے تیرے لئے اچھا ہے۔ وہ ان ساری دشمنیوں کے سامنے دیوار بن جائے گا جو تیرے چاروں پاسے ال رہی ہیں۔ اگر وہ...“

''یہ آپ.... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شانی نے بے حد پریشانی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہم وہی کہہ رہی ہیں نکڑی جو تیرے اپنے من میں بھی ہے۔'' ایک دوسری عورت نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''شرع میں شرم نہیں۔ شرم تو لُچے پن میں ہوتی ہے۔ یہ تو وہ کام ہے جس میں اللہ کھش اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھش۔ تم دونوں ایک دوجے کو چاہتے ہو۔ بس یہی بات یاد رکھو، باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ جگ والوں کو تو کوئی کھش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔''

ماکھو نے شانی کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ''من جا نکڑی! من جا! نہیں تو پتا ہے کیا ہوگا؟'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بڑے پیار سے بولی۔ ''ہم سب کے سب۔ سارے بستی والے بھک ہڑتال کر دیں گے.. تیری جان مصیبت میں ڈال دیں گے۔''

اچانک ایک شور سا شانی کے کانوں میں داخل ہونے لگا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پہلو بدلا اور گردن لمبی کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں بیسیوں مہتم گھر کے سامنے جمع ہو چکے تھے اور ابھی مزید آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے، مرد سب شامل تھے۔ قریباً چالیس پچاس عورتیں اور لڑکیاں اگلی صف میں تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ کئی ایک کے ہاتھوں میں دف نما ساز تھے۔ اچانک انہوں نے ایک ساتھ سروں کو جنبش دی اور گانا شروع کر دیا۔ یہ ایک قدیم پنجابی گیت تھا۔ اس میں گورمکھی اور مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ دوہے کی طرز کے اس گیت کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

من جا پیاری من جا
ہماری راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
اس کے جسم میں کانٹے ٹوٹے ہیں
اپنے پرائے سب اس کے چھوٹے ہیں
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو
بڑا پیاسا ہے اپنا روپ پلا دے اس کو
گلے لگا لے اس کو

تُو اس کی ووہٹی بن جا
من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
پنج دریاؤں کی کوکھ سے ابھرنے والے اس قدیم گیت کی لے بلند ہو رہی تھی..

☆======☆======☆

شانی کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا.. ؟ گیت کے اولین بول بار بار دہرائے جا رہے تھے۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا

شانی کے سامنے بیٹھی ہوئی دس ممتاز مہتم عورتیں مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے محبت ٹپکتی تھی۔ شانی کی ابتر حالت دیکھ کر ماکھو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی باقی عورتیں بھی اپنے لباس سنبھالتی اور زیورات کڑکڑاتی اٹھ گئیں۔ ماکھو نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''نکڑی! آکھری پھیسلہ تو تُو نے ہی کرنا ہے اور تُو یہ پھیسلہ کھوب سوچ کر، کر.... یہاں پر آپاں (ہم) سب کی منت تجھ سے یہی ہے کہ تُو رستم سیال کے ساتھ جوڑی بنا لے۔''

سب عورتوں نے اسے پیار دیا۔ ایک دو نے ماتھا بھی چوما پھر وہ ایک ایک کر کے باہر نکل گئیں۔ باہر ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ بن باسی شہر کے باسیوں سے کہیں زیادہ محبت کرنے والے ثابت ہو رہے تھے۔ ہر کوئی اسے چاہتا ہے۔ خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہے اور شاید رستم کے حوالے سے بھی ان کے احساسات یہی تھے۔

یہ ہنگامہ آدھ پون گھنٹہ جاری رہا پھر مکھیا دراج کے ڈانٹنے پر لوگ بکھرنے لگے اور دھیرے دھیرے منتشر ہو گئے۔

وہ رات شانی کے لئے امتحان کی رات تھی۔ مکھیا دراج کے گھر کے ایک کچے کمرے میں لالٹین کی لَو تھرتھرا رہی تھی۔ کمرے سے باہر شب کی تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں رکھوالی کے کتوں کا شور تھا اور گیدڑوں کی آوازیں تھیں۔ شانی کبھی بان کی چارپائی پر بیٹھ جاتی تھی، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی۔ اس کے اندر سے ایک آواز ابھر رہی تھی۔ یہ آواز اس سے کہہ رہی تھی۔

''شانی! تیری وجہ سے رستم کو جو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسے مسلسل کئی ہفتوں تک دکھ، اذیت اور ذلت کی عمیق گہرائیوں سے گزرنا پڑا ہے اور یہ سب کچھ تیری

وجہ سے ہوا ہے۔ بے شک تُو اس سے ویسی محبت نہیں کرتی جیسی وہ تجھ سے کرتا ہے لیکن تُو محبت تو کرتی ہے۔ تُو اس محبت سے رستم کے جان سوز زخموں پر زندگی کا مرہم رکھ سکتی ہے۔ تُو اپنا آپ رستم کے سپرد کر کے اس کے جانکاہ دکھوں کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتی ہے۔ وہ تیری وجہ سے بدترین عذابوں سے گزرا ہے۔ اب تیرے لئے موقع ہے کہ تُو اپنی غلطیوں کی تلافی کر۔ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر خود کو رستم کی دسترس میں لے آ......اور تُو یہ کر سکتی ہے، کیونکہ تُو اسے زندہ درگور نہیں دیکھ سکتی۔ تُو اس کو چاہتی ہے......تُو چاہتی ہے اور ایسا کرنا شاید تیرے لئے بھی زندگی کا راستہ کھول دے۔ رستم کی پناہوں میں آ کر تُو ریزہ ریزہ ہونے سے بچ جائے۔''

پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا کہ رستم کس انداز سے سوچ رہا ہے۔ کیا موجودہ حالات میں وہ اس شادی کے لئے تیار ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی سوچ دوسروں کی سوچ سے مختلف ہو کیونکہ جب سے وہ آزاد ہوا تھا۔ اس کا رویہ بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ شانی اس کے بارے میں کسی قسم کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کسی وقت اسے لگتا تھا کہ جیسے یہ وہ رستم ہی نہیں ہے۔

☆======☆======☆

رستم کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے بال چہرے پر جھول رہے تھے۔ جھونپڑے کی کچی دیوار پر اس کا سایہ مہیب نظر آتا تھا۔ اس کے سینے میں ایک طوفان تھا۔ اس طوفان کے بارے میں صرف وہ جانتا تھا کسی اور کو پتا نہیں تھا اور نہ پتا لگ سکتا تھا۔

اتنے میں مکھیا دراج اور عارف کمبوہ اندر داخل ہوئے اور ہولے سے رستم کے قریب بیٹھ... رستم نے اپنی آتشیں نگاہوں سے انہیں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا لینے آئے ہو۔

دراج نے عارف کمبوہ کو ٹہوکا دیا۔ عارف نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''رستم! خدا کے لئے خود کو سنبھالو، تم بالکل جھلے لگتے ہو... غیر... اجنبی... نہ کچھ سنتے ہو، نہ سمجھتے ہو کسی وقت تو لگتا ہے کہ تمہیں دوست دشمن کی پہچان بھی نہیں رہی۔''

دراج نے کہا۔ ''ہاں بھانیا! آپاں دشمن نہیں دوست ہیں اور تیرے لئے دوستوں کی طرح سوچ رہے ہیں۔ تجھے کھبر نہیں کہ آپاں تیرے کتنے پاپڑ بیل رہے ہیں۔''

عارف نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''رستم! اب یہ بات بالکل ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ تم چھوٹی چوہدرانی کو دل و جان سے چاہتے ہو وہ بھی تم کو پسند کرتی ہے... تم دونوں کی سخت ضرورت بھی ہے کہ تم ایک دوجے کے ہو جاؤ۔ ایک دوجے کا سہارا بن جاؤ۔ خاص طور پر

چھوٹی چوہدرانی کے لئے تو یہ بات بہت ضروری ہے۔''

رستم نے انگارہ آنکھوں سے عارف کو گھورا، پھر وہ بے حد مدھم اور بیٹھی ہوئی آواز میں پھنکارا۔ ''چلے جاؤ، خدا کے لئے چلے جاؤ۔''

عارف کمبوہ کا چہرہ ایک لمحے کے لئے پھیکا پڑا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''دیکھو رستم، تم بنا بنایا کام خراب مت کرو۔ اوپر والا تمہارے دل کی تمنا بڑی سخاوت سے پوری کر رہا ہے۔ تمہیں چھپر پھاڑ کر دے رہا ہے۔ انکار کرو گے تو بہت بڑی ناشکری کرو گے۔ بے وقوفی کرو گے۔''

دراج نے کہا۔ ''آج آپاں کے دس کھاندانوں کی دس بڑی زنانیاں چھوٹی چوہدرانی کے پاس گئیں تھیں۔ انہوں نے دیر تک چوہدرانی سے بات کی ہے... وہ... وہ بڑی حد تک مان گئی ہے......اس نے۔''

''بڑی حد تک نہیں......وہ بالکل مان گئی ہے۔'' عارف کمبوہ نے دراج کی بات کاٹتے ہوئے رستم کا ہاتھ دبایا۔ ''ہاں رستم وہ مان گئی ہے......وہ بے وقوف نہیں ہے۔ ہر اونچ نیچ سمجھ رہی ہے اور پھر تُو اس کا پیار بھی ہے۔''

رستم نے آنسوؤں سے بھری ہوئی سُرخ آنکھیں عارف پر مرکوز کیں۔ ''جھوٹ مت بول ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بی بی جی کو جتنا جانتا ہوں کوئی اور نہیں جان سکتا۔''

''تیرے سر کی قسم رستم! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہم سب نے مل کر اسے منا لیا ہے۔ ہم شرع کے مطابق تم دونوں کو ایک کریں گے تمہارا بیاہ کریں گے۔''

رستم کے سارے جسم میں لرزش سی نمودار ہوگئی تھی۔ اس لرزش کے سبب اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی بھی تھرکنے لگا۔ وہ جیسے اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ اس ''بات'' کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ رستم کی ہمت اس بوجھ کی نسبت بہت کم تھی۔ وہ ششدر تھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم غلط کہتے ہو۔'' وہ بولا۔

''تم ابھی آٹھ دس گھنٹوں میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔'' عارف کمبوہ نے پورے یقین سے کہا۔

رستم کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ تنہائی چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ دونوں یہاں سے چلے جائیں۔

وہ دونوں اٹھ گئے۔ اٹھتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا کمرے سے باہر نکل کر دراج نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ لوہا گرم ہو رہا ہے۔ ایک دو آخری چوٹ کی

جروورت ہے۔ میرا کھیال ہے کہ اگر اس موقع پر رستم کو یقین ہو جائے کہ چھوٹی چوہدرانی مان گئی ہے تو وہ بھی ہرائی پلٹی بات بھول جائے گا۔"

عارف نے ملبورن کا سگریٹ سلگایا اور سرگوشی میں دراج سے بولا۔"اب ذرا بھرجائی کو چھوٹی چوہدانی کی طرف بھیج۔" دراج اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

شانی بےقراری سے کمرے میں ٹہل رہی تھی، اس کے اندازے کے مطابق رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ یہ زندگی کس کام کی تھی؟ یہ کسی بھی وقت دشمنی کی آگ میں جل کر خاکستر ہو سکتی تھی۔ اگر یہ کسی کے کام آ جاتی، کسی کے زخموں کا مرہم بن جاتی تو کیا برائی تھی لیکن دوسری طرف بہت سے مہیب سوال بھی اٹھتے تھے۔ وہ اپنوں سے دور تھی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ اس کا ناتا جڑ رہا تھا جو قانون کے کاغذوں میں قاتل اور ڈاکو تھا۔ پولیس پھانسی کا پھندا لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور ماکھو اندر آ گئی، اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری سی تھی۔ عجیب دہقانی گرم جوشی کے ساتھ وہ آگے بڑھی اور اس نے شانی کو گلے سے لگا لیا۔ اس کا سر اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔"نکڑی! سیانے کہہ گئے ہیں...

سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ سوبت (صحبت) یاراں

جو کچھ بھی اس جندگی سے مل جائے لے لینا چاہئے۔ چاہے گھڑی دو گھڑی کی کھشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور نکڑی! تمہاری کھشی تو اللہ نے چاہا تو بڑی لمبی ہونی ہے۔ تم دونوں ویاہ کر کے کہیں دور نکل جانا۔ پٹھانوں کے علاقے کی طرپھ...... وہاں پلس کی ہوا بھی تم دونوں کو نہیں لگے گی۔ میں سچ کہتی ہوں نکڑی.....! کدرت نے یہ بڑا ہی اچھا موکع تم دونوں کو دیا ہے۔"

"لیکن۔ "

"لیکن شیکن نہ کر میری نکڑی.....!" ماکھو نے اُسے اپنے ساتھ بھینچ کر ماتھا چوما۔ "ابھی دراج اور عارپھ دونوں رستم کے پاس گئے تھے۔ بڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے ہیں بڑے اونچے دماک (دماغ) والے ہیں یہ دونوں۔ رستم کو ویاہ کے لئے راجی کر کے ہی اٹھے ہیں۔ ابھی آ کر انہوں نے مجھے بتایا ہے۔"

شانی نے پوری آنکھیں کھول کر ماکھو کی طرف دیکھا۔"تم... سچ کہہ رہی ہو ماکھو یا...؟"

"تو کیا اپنی نکڑی بہن سے جھوٹ بولوں گی۔"

شانی گم صم کھڑی تھی۔ ماکھو اپنے ساتھ جو ٹوکری لائی تھی وہ زمین پر پڑی تھی۔ اس نے جھک کر بانس سے بنی ہوئی ٹوکری اٹھائی اور شانی کے سامنے اس کا ڈھکن اٹھایا۔ یہ ٹوکری اوپر تک چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں سے بھری ہوئی تھی، سینکڑوں پھول ہوں گے۔ ہلکی ہلکی مہک کمرے میں پہلے سے موجود تھی، اب یہ اور تیز ہو گئی۔ اس نے ٹوکری سامنے کھڑکی کی دہلیز پر رکھی اور بولی۔"یہ بھی آپاں کی (ہماری) ایک رسم ہے۔ یہ پھول بستی کے لوگوں نے اکٹھے کئے ہیں۔ ہر بچے بڑے نے ایک ایک پھول دیا ہے۔ یہ کاہو کے پھول ہیں۔ یہ جنگلی پھول پیار کی نشانی ہوتے ہیں۔ میں یہ پھول یہاں تیری کھڑکی میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ اگر سویرے تک تیرا جواب ہاں میں ہوا تو یہ سارے پھول اپنے دوپٹے میں ڈال کر ٹوکری کھالی کر دینا......اور......اور مجھے یکین ہے نکڑی! تیرا جواب، جرور ہاں میں ہو گا۔ سویرے یہ ٹوکری کھالی ملے گی۔"

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ شانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی اس کی سرمہ لگی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ شانی کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ فی الوقت اس کی خواہش تھی کہ ماکھو جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔

وہ بڑی دانا عورت تھی اس کی دہقانی دانائی نے اسے بتا دیا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہئے اور وہ چلی گئی۔

شانی کمرے میں تنہا رہ گئی۔ ہاں وہ تنہا رہ گئی۔ پھولوں کے ساتھ، روزن سے جھانکنے والے چاند کے ساتھ اور کہیں دور بجتی بانسری کے ساتھ۔

وہ سوچتی رہی، خیالات کے لشکر اس کے دل و دماغ پر یلغار کرتے رہے۔ آج تک اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ نہ ہی کبھی اپنے مستقبل کی کوئی شکل متعین کی تھی لیکن مستقبل کا ایک موہوم سا خاکہ اس کے ذہن میں بھی تھا۔ فاخر سے جدا ہونے کے بعد یہ موہوم سا خاکہ اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا اور بس کبھی کبھار ہی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ اس خاکے میں ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پھولوں سے ڈھکا ہوا اور جھرنوں میں گھرا ہوا، سر شام اس گھر میں خوشبوئیں بکھر جاتی تھیں، ستارے جھروکوں سے جھانکتے تھے۔ اس گھر میں ایک بچے کی چہکاریں اور شرارتیں بھی تھیں۔ بچہ کون تھا؟ ہاں یہ وہی معصوم تھا جو ماں کی موت کے

بعد شانی کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ مُنا تھا۔ اس گھر میں شانی اور مُنا آگے پیچھے بھاگتے تھے ...اس گھر میں چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں والے ایک مرد کا ہیولا بھی تھا۔ یہ مرد کون تھا؟ کون تھا جو بھاری قدموں سے آتا تھا......شانی اور مُنے کو ایک ساتھ اپنی محبت بھری بانہوں میں لے کر بھینچ لیتا تھا اور پھر...... پھر کسی اچھے سے کھانے کی فرمائش کرتا تھا۔ اس تصوراتی گھر میں ایک صاف ستھرا، خوشبودار بستر بھی تھا۔ ایسا بستر جس پر گھنے بالوں اور بوجھل سانسوں والا کوئی جسم شانی کو روندتا نہیں تھا۔ اس کے کومل جسم کو اپنی اذیت رسانی سے کچلتا نہیں تھا۔ بلکہ اس ریشمی بستر کے گرد نرم، خوشبودار محبت کا چمکیلا حصار رہتا تھا۔ اس مرد کا ہیولا اس بستر کو اور بھی دل نشیں بنا دیتا تھا، کون تھا یہ مرد؟ اس مرد کی شکل شانی کو واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی......لیکن ... لیکن وہ بہت حد تک شانی کو جانا پہچانا لگتا تھا۔ اس کے لمبے بال تھے۔ اس کی چھوٹی سی ریشمی داڑھی تھی۔ اس کے شانے چوڑے اور ہموار تھے۔ وہ بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولتا تھا۔ وہ کچھ رستم سے ملتا جلتا تھا اور کبھی کبھی شانی کو لگتا تھا کہ وہ رستم ہی ہے۔ آج بھی وہ اسے اپنے تصور کے موہوم سے خاکے میں دیکھ رہی تھی لیکن آج اس کی شکل شانی کو ہمیشہ سے واضح نظر آ رہی تھی۔

شانی نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اس کی نگاہ اپنی کلائی پر پڑی، دودھیا جلد پر نیل ابھی تک موجود تھا۔ یہ کھولی گاؤں میں رستم کی ناقابل شکست گرفت کا نیل تھا۔ کھولی گاؤں کے میلے اور خونی ہنگامے کا سارا منظر ایک بار پھر شانی کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ چوہدریوں کے ہاتھوں بے بس ہونے کے باوجود رستم بے بس نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی بھیڑ اور لاٹھیوں کی بارش میں اس نے شانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ شاید اگر وہ ہمت ہار جاتا تو وہ صدائے احتجاج بلند نہ ہوتی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد کا سارا منظر بدل دیا تھا۔ داناؤں نے سچ کہا ہے، جب سروں میں سودا ہو اور ارادے مصمم ہوں تو دیواروں میں در بنتے ہیں۔

سوچتے سوچتے شانی کا ذہن تھک گیا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز حالت میں لیٹ گئی۔ غنودگی کی کیفیت میں اس کا اپنا ہیولا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہ رنگ والی کی چھوٹی بی بی کا ہیولا تھا۔ بھاری بھرکم کپڑوں میں لپٹا ہوا، زیورات سے سجا ہوا۔ ہیولے نے اس سے کہا۔

''آج ایک آخری فیصلہ کر لے شہناز، تُو چاہتی کیا ہے لیکن جو فیصلہ بھی کرنا ہے اس سے پہلے یہ سوچ لینا تُو رنگ والی کے اُونچے شملے والے چوہدری ارشاد کی دھی رانی ہے۔''

''میں سب جانتی ہوں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کوئی انسان چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اس

کا کردار اسے چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تُو خود کو رستم کے بستر پر لٹائے گی۔ اپنا آپ اس کے سپرد کر دے گی ہمیشہ کے لئے۔''

''اگر اس کے ساتھ، دستور کے مطابق میری شادی ہوتی ہے... تو پھر ایک بیوی کی حیثیت سے اسے محبت دینا میرا فرض ہوگا اور میں یہ کروں گی۔''

''شاید تُو غلط کہہ رہی ہے۔ تُو یہ شادی اس لئے نہیں کرے گی کہ رستم سے بے حد محبت کرتی ہے۔ تُو یہ شادی اس لئے کرے گی کہ تیری وجہ سے رستم بہت سی تکلیفوں سے گزرا ہے۔ تُو یہ شادی ایک کفارے اور سزا کے طور پر کرے گی۔ رستم تیرے جسم سے خوشی کشید کرے گا۔ اس سے کھیلے گا، اسے فتح کرے گا۔ اس طرح تجھے احساس ہوگا کہ تُو اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر رہی ہے۔ یہ شادی نہیں ہے، یہ تو ایک تلافی ہے۔''

''اگر ایسا بھی ہے تو اس میں کیا حرج ہے اور یہ فقط تلافی ہی تو نہیں ہے۔ اس میں محبت بھی تو ہے اور محبت تلافی کے ساتھ مل کر حسین ترین ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس محبت کو ازدواجی رشتے کی طاقت ملے گی تو اس میں اور شدت آئے گی۔''

''سوچ لے شہناز......! وہ تجھے پوجتا ہے اور پوجا بس اس کی ہوتی ہے جس کا حصول نہیں ہوتا۔ جب تُو حاصل ہو جائے گی تو دیوی نہیں رہے گی۔ فقط گھر والی کہلائے گی۔''

''اگر ایسا ہے تو مجھے یہ بھی قبول ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ وہ مختلف ہے، اس کا پیار بھی مختلف ہے اور وہ باتیں بھی سب سے جدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہیر رانجھا مل بھی جاتے تو زندگی کی آخری سانس تک ہیر رانجھا ہی رہتے۔''

''سب اسی غلط فہمی میں ہوتے ہیں شہناز.....! کہ ان کا پیار انوکھا ہے۔ آخر میں وہی ہوس کی کہانی نکلتی ہے۔ تاج محل مت بناؤ شہناز کیونکہ یہ گر جاتے ہیں۔''

''غلط کہتی ہو۔ میں نے کسی سے سنا تھا، تاج محل بنانے چاہئیں.....کیونکہ کبھی کبھی سچ مچ کے تاج محل بن جاتے ہیں اور وہ گرتے نہیں۔ انہیں دریائے جمنا کے کنارے ہر کوئی دیکھ سکتا ہے... چھو سکتا ہے۔''

''کتابوں، کہانیوں کی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔''

اس سے پہلے کہ شانی جواب دیتی اسے لگا کہ درجنوں، بیسیوں مہتم عورتیں اور بچے ہاتھوں میں کاہو کے پھول لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ گا رہے تھے۔

تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے . . اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے۔
دیکھ نی! اس کے بھیڑے حالوں کو . دیکھ نی! اس کے پاؤں کے چھالوں کو۔

مسکراتے چہروں والے لوگ امڈتے چلے آئے۔ شانی کا مخالف ہیولا ان چہروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش بڑھتی چلی گئی۔ چڑیوں کے چہکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مویشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں اس وسیع جھونپڑا بستی کے طول وعرض میں جلترنگ بکھیرنے لگیں۔ شانی بڑے وقار کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کے سامنے کھڑکی کی دہلیز پر بانس کی ٹوکری پڑی تھی۔ اس میں کاہو کے پھول تھے۔ اسے لگا، یہ پھول نہیں بلکہ آنکھیں ہیں جو اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔

شانی کے سینے میں ایک میٹھی سی لہر اٹھی۔ ایک ایسی کیفیت جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، وہ دھیرے دھیرے کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ پھول اس کے سامنے تھے۔ وہ ان پھولوں کے حوالے سے آخری فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ رات کو ماکھو نے اسے بتایا تھا کہ اگر اس کا جواب ہاں میں ہو تو وہ ان پھولوں کو اپنی اوڑھنی کے دامن میں بھر لے اور شانی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ان پھولوں کی جگہ اب اس کی اوڑھنی کا دامن ہی ہے۔

وہ ٹوکری کے پاس پہنچ کر اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان پھولوں کو چھونے لگی، ان پر شبنم کی ہلکی سی نمی تھی اور خوشبو ان کے مساموں سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی، یکایک حیا کی لہر سے شانی کے رخسار تپ گئے۔ اسے لگا جیسے وہاں چھپی سینکڑوں نگاہیں اس کھڑکی کی طرف دیکھ رہی ہیں اور شاید ان نگاہوں میں کہیں رستم کی نگاہ بھی ہے۔ شانی نے اپنی بوجھل پلکوں سے اس چار دیواری کی طرف دیکھا جہاں رستم کا قیام تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس "چار دیواری" کو نہیں اس میں موجود رستم کو دیکھ رہی ہے۔

اس کے رخساروں کی تپش بڑھ گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ یہ کام وہ اندھیرے میں کر گزرتی تو زیادہ اچھا تھا۔ وہ جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر میں ماکھو اپنے زیورات کڑکڑاتی کمرے میں پہنچ جائے گی۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے سوال ٹوکری اور پھولوں کے بارے میں ہی کرنا تھا۔

ایسے میں شانی اس پر اپنی مرضی واضح کر سکتی تھی۔ اسے بتا سکتی تھی کہ اس کا جواب "ہاں" میں ہے۔ پھر شاید ماکھو خود ہی ٹوکری پکڑ کر شانی کی اوڑھنی میں الٹ دیتی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور تصور کی نگاہ سے ماکھو اور اس کی ساتھی عورتوں کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھنے لگی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر شانی کو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چاپ کے ساتھ زیورات کی کڑکڑاہٹ بھی تھی، یقیناً ماکھو اس کی طرف آ رہی تھی۔ شانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور رخسار پھر تپنے لگے۔

ماکھو تیزی سے اندر آئی۔ شانی سے کچھ کہے بغیر اس نے چارپائی پر سے دری اور پھولدار چادر کھینچ لی، پھر وہ ان برتنوں کی طرف بڑھی جس میں رات کو شانی نے کھانا کھایا تھا۔ اس نے وہ برتن دوسرے برتنوں سے علیحدہ کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے تب وہ دندناتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ پلٹی، کھڑکی کی دہلیز پر پھولوں والی ٹوکری رکھی تھی۔ اس نے بڑی نفرت سے ٹوکری بھی پھولوں سمیت نیچے پھینک دی۔

شانی ہکا بکا تھی۔ ماکھو دروازے سے باہر نکلنے لگی تو شانی نے آواز دی۔ "کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے.....؟"

ماکھو جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

شانی ششدر تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ ٹوکری سے پھول نہ اٹھانے کی وجہ سے تو ماکھو اس قدر برہم نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو ایک علامتی سی رسم تھی۔ یقیناً بات کچھ اور تھی اور یہ جو بات بھی تھی خاصی گھمبیر تھی۔

ابھی شانی اسی ادھیڑ بُن میں تھی کہ نیچے گلی سے تین چار افراد کے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شانی بے تاب ہو کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ایک جواں سال مہتم عورت اپنے ننگ دھڑنگ بچے کو گود میں اٹھائے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ شانی نے اسے آواز دی۔ "بہن بات سنو.....بہن!"

اس عورت نے ایک ڈری ہوئی سی نگاہ شانی پر ڈالی اور جواب دیئے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اسی دوران میں وہ بڑی عمر کی عورت شانی کے پاس پہنچی جس نے دو دن پہلے بھی شانی سے بات کی تھی اور بڑی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس کا نام داری تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتیلی تھی جس میں گرم پانی کے اندر نیم کے پتے تیر رہے تھے۔ شانی کو دیکھ کر اس کا چہرہ کرخت ہو گیا، بالکل اجنبی لہجے میں بولی۔ "حرامجادی، اوتری، نکھتری، تجھے اپنی نوست (نحوست) پھیلانے کے لئے یہی جگہ ملی تھی؟"

"مم..... میں نے کیا کیا ہے ماسی؟"

"تُو نے کیا نہیں کیا ہے۔ ...نی! تُو کُتے کی رن ہے۔ تیرے ہتھ بھی گل کر جھڑ جائیں تو یہ کم ہے۔"

"مجھے کچھ بتاؤ تو ماسی؟"

"تُو نے حجرت صاحب کی بیبیوں پر ہتھ اٹھایا ہے۔ ان کو مارا ہے۔ تُو نے حجرت صاحب کو دکھ دیا ہے۔ ان کا پاک برتن توڑا ہے۔ تیری جبان میں کیڑے پڑیں۔ تُو نے پیرو مرسد کے کھلاف باتیں کی ہیں۔ آپاں تم کو کبھی ماف نہیں کریں گے، نہ تیرے سنگی ساتھیوں کو....."

"میری بات تو سنو ماسی۔"

"کھبر دار کتیا۔ جو ہتھ لگایا مجھے تو اپنا پرچھانواں دور رکھ مجھ سے۔" ماسی داری تیزی سے ایک طرف کو کھسکتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ شانی مزید کچھ کہتی، وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُترتے ہوئے نیچے چلی گئی۔ شانی آنکھوں میں آنسو لئے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہ بے ارادہ ماسی داری کا تعاقب کر رہی تھی۔ ماسی داری نے دراج کے مکان کے سامنے والا کھلا احاطہ پار کیا اور دوسرے سرے پر بنے ہوئے جھونپڑوں کی طرف چلی گئی۔ اس طرف ایک بڑے جھونپڑے کے سامنے ایک چارپائی بچھی تھی۔ اس چارپائی کے اردگرد کوئی ایک درجن مہتم عورتیں موجود تھیں۔ چارپائی پر ایک بھاری بھرکم عورت لیٹی تھی۔ شانی کو یاد آیا یہ وہی بیمار عورت ہے جسے دو دن پہلے رات کے اندھیرے میں شانی نے دیکھا تھا۔ مقامی لوگ اس کی چارپائی کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے، ماکھو نے بتایا تھا کہ یہ عورت شہر میں کام کرتی تھی، وہاں سخت بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئی تھی اور اب ہسپتال سے واپس اپنے گھر آئی ہے۔

شانی نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ آج بھی وہ عورتوں کی اوٹ میں تھی کچھ دیر بعد سامنے کی عورتیں اِدھر اُدھر ہوئیں تو شانی کو بیمار عورت کی صورت نظر آئی یکایک شانی کے جسم میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ یہ بیمار عورت جالاں تھی، شانی کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل کر گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر کھرنڈ سے تھے اور یہ کھرنڈ جسم کے سارے ننگے حصوں پر بھی تھے۔ وہ اب بھی بھاری بھرکم تھی لیکن نسبتاً پہلے سے کمزور ہو چکی تھی۔

یکایک ساری صورتِ حال شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ جالاں مہتم تھی اور اسی مہتم بستی کی رہنے والی تھی۔ اسے شانی کے بارے میں کیا معلوم نہیں تھا......اور اسے جو کچھ معلوم تھا اس نے مقامی لوگوں کو بتا دیا تھا۔ شانی نے دو تین دن پہلے بھی ماکھو سے کسی پیرو مرشد کا ذکر سنا

تھا، ماکھو نے کہا تھا کہ پیرو مرشد دعا کریں گے، اب اس کے سارے بگڑے کام سنور جائیں گے۔ اب شانی پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ پیرو مرشد بہروپیا پیر قدرت اللہ ہی تھا۔

شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے مرد و زن جالاں کے جھونپڑے کے اردگرد اور سامنے کے کھلے احاطے میں جمع ہو گئے۔ ان سب کے چہروں پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ان کی غصیلی نگاہیں گاہے بگاہے اس کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں جس کے عقب میں شانی موجود تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جالاں ہاتھ نچا نچا کر بلند آواز میں کچھ کہہ رہی تھی مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب آواز شانی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ بڑی مختلف صورتِ حال تھی، کل تک یہی لوگ تھے، یہی جگہ تھی لیکن چہرے مسکرا رہے تھے، آنکھوں سے شانی کے لئے محبت چھلک رہی تھی۔ آج سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ایک دم سہم سی گئی۔ کچھ دیر پہلے نگاہوں میں جو خواب سجے تھے وہ چکنا چُور ہونے لگے۔ خوشی کتنی مدت کے بعد ملی تھی اور کتنی تھوڑی مدت کے لئے ملی تھی۔ وہ تو ابھی ایک بار کھل کر مسکرائی بھی نہیں تھی کہ آنکھوں میں پھر سے نمی اُترنے لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو ننھے ننھے پھول کھڑکی کی دہلیز پر اس کے لئے مہک رہے تھے.....اور اس کی "ہاں" کے لئے بے قرار نظر آتے تھے، وہ اب نیچے دھول میں پڑے تھے اور لوگ انہیں رُوندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی شانی نے گھوم کر دیکھا۔ عارف کمبوہ تیزی سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ شانی کے پاس پہنچ کر وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بی بی ... ! اس خبیث عورت نے سارا کام خراب کر دیا ہے۔ یہ شہر کے ہسپتال میں ہی کہیں مر جاتی تو اچھا تھا۔"

عارف کا اشارہ یقیناً جالاں ہی کی طرف تھا۔ شانی نے پوچھا۔ "کیا کہا ہے اس نے؟"

"وہ سب کچھ جسے سن کر یہ مہتم آگ بگولا ہو سکتے تھے۔ قدرت اللہ کو یہ مہتم برادری جتنا مانتی ہے اتنا کوئی اور نہیں مانتا۔ وہ اس پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ اب تمہارے حوالے سے جالاں کی باتوں نے انہیں غم و غصے سے بھر دیا ہے، تمہارے اور رستم کے لئے ان کی ساری کی ساری محبت، خوف اور نفرت میں بدل گئی ہے۔ میں بڑی غلط سلط باتیں سن کر آ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ....." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ بات مکمل کر کے اسے شانی کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔

اتنے میں مکھیا دراج بھی اندر آ گیا۔ شانی نے دیکھا کہ کلاشنکوف اس کے کندھے سے لٹک رہی ہے۔ اس کی چوڑی پیشانی پسینے سے تر تھی شانی سے نظر ملائے بغیر عارف سے

مخاطب ہوکر بولا۔ ''مالہ کھراب ہوتا جا رہا ہے۔ حجرت صاحب کا بڑا مرید جالب آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ اس نے جالاں کے ساتھ مل کر لوگوں کو بہت بھڑکا دیا ہے۔ کوئی اور مالہ ہوتا تو مجھے سنبھالنے میں جرا دیر نہ لگتی۔ پر یہ بڑا نا جک مالہ ہے۔ ایسی لڑائی کو لوک ایک منٹ میں کافر مسلمان کی لڑائی بنا لیتے ہیں۔''

''وہ دیکھو..... میرا خیال ہے کہ دوسرے پنڈ سے بھی لوگ آ رہے ہیں۔'' عارف نے کھڑکی میں سے دور کچے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی اور مکھیا دراج نے ایک ساتھ پلٹ کر دیکھا، چھوٹی بڑی ٹولیوں کی صورت میں درجنوں افراد تیز قدم اٹھاتے اس جھونپڑا بستی کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں وغیرہ تھیں۔ اپنے حلیے اور شکل وصورت سے وہ بھی مہتم ہی نظر آتے تھے۔ ماکھو نے شانی کو بتایا تھا کہ ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف دو تین مزید مہتم بستیاں موجود ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے وسط میں کھلی جگہ پر ہجوم میں اضافہ ہونے لگا۔ لوگوں کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ مکھیا دراج کے خاص آدمی جو لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے، ہجوم کو ایک حد سے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ خاص آدمیوں میں سے دو تین کے پاس دیسی ساخت کی رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

مکھیا دراج نے ایک گہری سانس لی تو اس کا چوڑا سینہ دیوار کی طرح نظر آنے لگا۔ وہ مستحکم آواز میں بولا۔ ''نکڑی! تم کو پریشان ہونے کی جرورت نہیں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ میں نیچے جا کر ان لوگوں سے بات کرتا ہوں۔''

عارف کمبوہ نے کہا۔ ''کیا یہ اچھا نہیں کہ سب کے سامنے جانے کے بجائے تم دس بندوں کو اندر بلا کر بات کر لو۔ (غالباً دس خاندانوں کی دس عورتوں کی طرح دس مردوں کو بھی اکائی کی طرح سمجھا جاتا تھا)

ابھی دراج نے عارف کمبوہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اچانک سیڑھیوں کی طرف سے شور وغل سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے افراد سیڑھیوں پر دندناتے ہوئے اوپر آنے لگے۔ ان کے للکارے بڑے خوفناک تھے۔ وہ ایک دوسرے کو مشورہ دے رہے تھے ۔ باہر نکالو اس کو ۔ ٹوٹے کر دو۔ ۔ تھاں مار دو......

دراج کے سانولے چہرے پر خون کی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے بلا تامل اپنی خوفناک کلاشنکوف کندھے سے اُتار کر ہاتھ میں لے لی۔

جو افراد سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر نمودار ہوئے، ان کی تعداد دس کے لگ بھگ تھی۔ ان میں پانچ چھ نوجوان تھے۔ چھوٹی داڑھی والا جو نوجوان سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں چھوٹے سے دستے والی چمکیلی کلہاڑی تھی۔ وہ شکل وصورت سے دراج کا قریبی رشتے دار لگتا تھا۔

یہ پُرغضب ٹولی مکھیا دراج کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونکی شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ دراج یہاں موجود ہوگا۔ دو تین سیکنڈ خاموشی رہی پھر سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا داڑھی والا نوجوان کڑک کر بولا۔ ''حرامجادی! یہاں چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے..... باہر نکل..... تُو نے حجرت صاحب کی بیبیوں پر ہتھ نہیں اٹھایا..... ہماری ماؤں پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تُو نے ہم سب کی عجت کا جناجہ نکالا ہے۔ آپاں تجھے اس کی سجا جرور دیں گے۔''

مکھیا دراج اور عارف کمبوہ آگے بڑھ کر مشتعل ٹولی اور شانی کے درمیان آ گئے۔ دراج اپنی پاٹ دار آواز میں پھنکارا۔ ''تمہارا دماک کھراب ہو گیا ہے؟ کھبردار اگر کسی نے اسے ہتھ لگایا تو۔ ۔ ۔ ابھی اس پر صرف الجام لگا ہے۔ الجام سچا ہے یا جھوٹا، اس کا پھیسلہ ابھی نہیں ہوا، جب تک پھیسلہ نہیں ہوتا یہ بے کسور ہے، بالکل بے کسور ہے۔''

''پھیسلہ ہو گیا ہے چاچا..... ماسی جالاں نے اک اک بات بتا دی ہے اس حرامجادی کی۔ اب آپاں کو کسی تھانے کچہری کی جرورت نہیں ہے۔''

ایک بہت مشتعل شخص نے نوجوان کے پیچھے سے چھوٹے دستے کی کلہاڑی پھینک کر شانی کو ماری، شانی خوف سے چیخ کر ایک طرف سمٹی، کلہاڑی اس کے پہلو سے ہوتی ہوئی پُرشور آواز کے ساتھ بڑے جستی ٹرنک سے ٹکرائی۔

اب مکھیا دراج کے لئے اپنی اتھارٹی ثابت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کلاشنکوف کا آہنی دستہ گھما کر کلہاڑی پھینکنے والے شخص کے جبڑوں پر دے مارا وہ ڈکرا کر لڑکھڑایا اور سیڑھیوں سے نیچے گر گیا۔ داڑھی والے نوجوان نے دراج کی بغل میں سے نکل کر شانی کی طرف آنا چاہا۔ اس کا راستہ عارف کمبوہ نے روکا اور اسے زوردار دھکے سے پیچھے ہٹا دیا۔ اسی دوران میں مکھیا دراج نے ایک اور شخص کے پیٹ میں لات ماری اور باقیوں کی طرف اپنی کلاشنکوف سیدھی کر لی۔

یہ لوگ شانی پر جھپٹنا تو چاہتے تھے مگر اپنے سردار سے دست وگریباں ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ سردار یعنی مکھیا دراج گرجا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ ۔۔ جان سے مار دوں گا...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

داڑھی والے نوجوان سمیت وہ لوگ سیڑھیوں کی طرف پسپا ہو گئے اور پھر نیچے اُتر گئے، تاہم احاطے میں شور وغل کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ کئی پتھر اُڑتے ہوئے آئے اور اس کھڑکی سے ٹکرائے جس کی دہلیز پر کل شب پھولوں بھری ٹوکری رکھی گئی تھی۔

مکھیا دراج نے عارف کمبوہ کے کان میں چند سرگوشیاں کیں اور شانی کی طرف تسلی دینے والے انداز میں دیکھتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ سیڑھیوں کی طرف آنے والے چوبی دروازے کو وہ باہر سے مقفل کر گیا تھا۔

اچانک شانی کو بستی کے جنوبی حصے سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے دکھائی دیئے۔

''ہائے اللہ ... یہ کیا ہے۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

عارف نے اپنے ہونٹ سکوڑے۔ تشویش ناک انداز میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے لوگوں نے کلینک کو آگ لگا دی ہے۔''

''یہاں کون سا کلینک تھا؟'' شانی نے حیرانی نے پوچھا۔

''ابھی بن رہا تھا۔ دو جھونپڑے کھڑے کئے گئے تھے۔ ہم ہی بنا رہے تھے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

جدھر سے دھواں اٹھ رہا تھا، اسی طرف سے لوگوں کا شور بھی بلند ہو رہا تھا۔ وہ نعرہ زنی کا انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔

شانی کا دھیان رستم کی طرف چلا گیا۔ ''رستم کہاں ہے......؟'' شانی نے عارف سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے۔ لوگ بھی بہت غصے میں ہیں، کہیں خون خرابا نہ ہو جائے۔''

''دراج اسی کی طرف گیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، وہ سب سنبھال لے گا۔'' پھر وہ کھڑکی سے نیچے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھیں ...... دراج کے ذاتی ملازموں نے گھر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

شانی نے دیکھا۔ یہ دس پندرہ صحت مند مہتم تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں... ایک دو رائفلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگوں کو مکھیا کے گھر سے دور رہنے کا کہہ رہے تھے۔ لوگ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

شانی، جالاں کی لگائی ہوئی یہ آگ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ عقیدوں

کی وجہ سے لوگ کتنی جلدی اور کتنی شدت سے بدلتے ہیں۔ یہی ہنستے مسکراتے لوگ تھے جو کل تک شانی کے لئے اپنی بہترین خواہشات کا اظہار کر رہے تھے، آج اپنے عقیدے پر زد پڑنے کی وجہ سے اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پانچ دس منٹ بعد ہجوم احاطے سے گلیوں کی طرف منتشر ہو گیا نعروں اور للکاروں میں بھی کمی آ گئی، مگر فضا میں شدید تناؤ کی کیفیت بدستور موجود رہی۔ عارف کمبوہ بڑی چوکس حالت میں شانی کے پاس موجود تھا۔ شانی جانتی تھی کہ اس کی قمیص کے نیچے پستول لگا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہانپتا ہوا مکھیا دراج دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اس نے اپنے دوست عارف کو بتایا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں۔ لوک کابو میں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پنچوں کو بھی بلایا ہے۔ مل بیٹھ کر کوئی پھیسلہ کرتے ہیں۔''

پھر وہ رخ پھیر کر شانی سے مخاطب ہوا۔ ''نکڑی۔ ! تجھے پھکر کرنے کی کوئی جرورت نہیں۔ بالکل بھی جرورت نہیں۔ تم دونوں دراج کے پرونے (مہمان) ہو اور اپنے پرونوں کی حفاجت کرنا دراج کھوب اچھی طرح جانتا ہے۔''

''لیکن......لوگ بہت...... غصے میں نظر آتے ہیں۔'' شانی ہکلا کر بولی۔

''اوئے...... ! ایسی کی تیسی ان کے غصے کی۔ پیدا کرنے والے کی کسم، تم دونوں کی کھاطر مجھے دس بیس بندے پھڑکانے پڑے تو ایک سیکنٹ میں پھڑکا دوں گا۔''

شانی الجھی ہوئی نظروں سے کبھی عارف اور کبھی دراج کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے یہ خون خرابے والی باتیں خوفزدہ کرتی تھیں۔ اس نے دراج سے پوچھا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ رستم کے کسی ساتھی سے رابطہ کریں، پولیس اور دوسرے محکموں میں بھی رستم کے کئی جاننے والے ہیں۔ وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

دراج کے بجائے عارف بولا۔ ''ایک بندے کو اس کام پر لگایا تو ہوا ہے میں نے لیکن ابھی اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔ یا شاید وہ بھی کہیں نارپوری چوہدریوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔''

دراج کے باہر جانے کے بعد عارف کمبوہ نے سگریٹ کے کئی گہرے کش لئے۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ ''کیا سوچ رہے ہو بھائی؟'' شانی نے پوچھا۔

عارف نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔ ''دراج یاروں کا یار ہے۔ وہ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لے گا مگر ہماری حمایت سے ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔''

''نقصان سے تمہاری کیا مراد ہے بھائی ...؟''

"تینوں مہتم بستیوں کے تقریباً سارے لوگ ہی ایک طرف ہو گئے ہیں۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ میں تو یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ دراج کے گھر والے اور ذاتی نوکر چاکر بھی اس معاملے میں اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ یہ تو دراج کا رعب اور اثر ورسوخ ہے جس کی وجہ سے لوگ ابھی کنٹرول سے باہر نہیں ہوئے۔ دراصل ان لوگوں نے قدرت اللہ کو اپنے دماغوں پر اتنا زیادہ سوار کر رکھا ہے کہ ان کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان سے برداشت نہیں ہوتی اور جو کچھ جالاں اور جالب وغیرہ بتا رہے ہیں وہ تو بہت زیادہ ہے۔"

"لیکن...... یہ جالاں تو خود بھی چوہدری بشیر کی حمایت میں قدرت اللہ کے خلاف چلتی رہی ہے۔"

"وہ اپنی اس غلطی کو مانتی ہے اور کہتی ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے اس نے بہت زیادہ سزا بھگتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنا جلا ہوا پنڈا دکھاتی ہے اور توبہ کرتی ہے۔" عارف کمبوہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "ان علاقوں میں قدرت اللہ کو پہلے بھی بہت زیادہ مانا جاتا تھا لیکن جب سے قدرت اللہ اور اس کے مریدوں سے جھگڑا کرنے والوں کے بیمار ہونے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس پر لوگوں کا اعتقاد اور بھی پکا ہو گیا ہے۔ اس عجیب بیماری کی واقعی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ صرف چوہدری بشیر کے گھرانے اور گھرانے سے تعلق رکھنے والے ہی بیمار ہو رہے ہیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی اوپر والا لوگوں کے یقین کا امتحان بھی تو لیتا ہے۔" شانی نے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن فی الوقت سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہئے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس بستی میں اب ہمارا رہنا خطرناک ہے۔ اب پولیس زیادہ دیر یہاں سے دور نہیں رہے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں رہنے سے دراج کی مشکلیں بڑھیں گی۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں، پولیس کے مخبر اور بلی ماروں کے کارندے دور دور تک بکھرے ہوئے ہیں۔"

"تمہارے گاؤں کی طرف جانے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی پولیس کی نگرانی میں ہے۔" شانی نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن کچھ بھی ہے شانی بہن یہاں سے تو نکلنا ہوگا۔" عارف کمبوہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں اپنی چیزیں وغیرہ سنبھال لو۔"

دروازے پر دراج کے دو وفادار ملازموں کو چھوڑنے کے بعد عارف اسی جھونپڑا نما مکان کی طرف بڑھا جہاں رستم قیام پذیر تھا۔ شانی اوپر کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی عارف نے احاطہ پار نہیں کیا تھا کہ دو گھڑ سوار اس کے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں راستے کی گرد میں اٹے ہوئے تھے اور پتا چلتا تھا کہ دور سے آئے ہیں۔ دونوں نے اپنے سر منہ بڑے بڑے سفید صافوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ایک شخص کے گھوڑے کے پیچھے ایک دوسرا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے پر گھریلو استعمال کا کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ کچھ زرعی دوائیں تھیں اور غالباً بیجوں کے دو تھیلے تھے۔ دونوں گھڑ سواروں نے عارف سے کچھ باتیں کیں، شانی کو عارف کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نظر آئی۔ اس نے دو تین بار تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک بار پھر دونوں افراد سے مصافحہ کیا اور انہیں بڑے احترام سے لے کر اس جھونپڑے میں چلا گیا جہاں رستم اور کھیا دراج موجود تھے۔ جھونپڑے کے عقب میں تقریباً آدھ فرلانگ کی دوری پر جلے ہوئے کلینک سے ابھی تک دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

شانی بے قراری سے کمرے میں گھومتی رہی، کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتی، کبھی کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی۔ کھڑکی میں کھڑے ہونا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر اس کے لئے بیگانگی اور کدورت کے آثار تھے، بچوں کی نگاہ بھی اس پر پڑتی تھی تو ان میں خوف سا اُمڈ آتا تھا۔ کتنی جلدی بدلا تھا سب کچھ۔ ابھی تک شانی کو قدرت اللہ یا اس کی بیبیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ اس دور دراز بستی میں فی الوقت موجود نہیں ہیں۔ دونوں گھڑ سوار ابھی تک جھونپڑے میں موجود تھے۔ دراج اور رستم وغیرہ کے ساتھ ان کی ملاقات طویل ہوتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں شانی کو احساس ہو رہا تھا کہ دونوں گھڑ سوار اہم ہیں اور ان کا تعلق موجودہ صورت حال سے بھی ہے۔ ان دونوں کے گھوڑے ایک چھپر تلے باندھ دیئے گئے تھے۔ اب وہ دانہ پانی لینے کے بعد ستا رہے تھے۔ شانی کی خواہش تھی کہ عارف جلد از جلد واپس آئے اور اسے صورت حال سے آگاہ کرے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا۔ پھر شانی کو دونوں گھڑ سوار رستم کے جھونپڑے سے نکلتے نظر آئے۔ ان کے چہرے بدستور منڈاسوں میں چھپے ہوئے تھے۔ عارف کمبوہ اور کھیا دراج بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ سیدھے اسی کمرے کی طرف آئے جہاں شانی موجود تھی۔ شانی کا دل انجانے خدشوں سے دھڑکنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گھڑ سوار اور عارف کمبوہ شانی کے کمرے میں تھے، کھیا دراج کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ عارف نے شانی سے مخاطب ہو کر جذباتی لہجے میں کہا۔ "دیکھو

بہن! کون آیا ہے؟''

گھڑسواروں میں سے ایک جو عمر میں قدرے بڑا نظر آتا تھا، آگے بڑھا اور اس نے اپنے سر اور چہرے سے منڈاسا ہٹا دیا۔ شانی سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے اس کی زبان جیسے گنگ ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے اس کے تایا معصوم کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے اور ان کی نیم سفید داڑھی سے ذرا اوپر ان کے سُرخ ہونٹ تھراتے چلے جا رہے تھے۔

پھر شانی حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلی۔ ''تایا جی......!'' اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی اور وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ تایا معصوم نے بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ تایا بھتیجی کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ شانی کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ تایا معصوم اس کے سر اور پیشانی کو چومتے چلے جا رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد یہ رقت آمیز منظر ختم ہوا۔ شانی اور تایا معصوم چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عارف اور دوسرا گھڑسوار باہر جا چکے تھے تاکہ تایا بھتیجی آزادی کے ساتھ ایک دوجے سے بات کر سکیں۔ شانی روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو لگتا ہے تایا! آپ مجھے بھول ہی گئے ہیں۔ بس میرے حال پر چھوڑ دیا ہے مجھے..... آپ کو کیا پتا میں کیسے کیسے عذابوں سے گزری ہوں۔''

''بیٹی! اگر تم تکلیفوں سے گزری ہو تو ہم پر بھی ہر روز قیامت ٹوٹتی رہی ہے۔ سمجھو کہ مر مر کر جیتے رہے ہیں۔''

''تایا! میری چچی پروین کیسی ہیں؟ اور خالو اعجاز اور آمنہ پھوپھی اور فوزیہ..... میں آمنہ پھوپھی کو بہت یاد کرتی رہی ہوں..... آپ سب کو بہت بہت یاد کرتی رہی ہوں۔''

''سب ٹھیک ہیں میری بیٹی..... سب ٹھیک ہیں۔''

''اور زینت، صغراں، بابا خادم حسین، بابا فخری اور مختاری اور ثناءاللہ۔'' وہ ایک ایک کا نام لے کر اس کے بارے میں پوچھتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ تایا معصوم مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

وہ ذرا چپ ہوئی تو وہ رقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''نارپور کی حویلی میں آگ لگنے کے بعد تو ہم تجھے گنوا ہی بیٹھے تھے دھی رانی۔ ہمیں یہی لگا تھا کہ تُو ہمیں ہمیشہ کے لئے وچھوڑا دے گئی ہے۔ تیری چاچی نے تو روروکو خود کو منجھی سے لگا لیا تھا.. رات دن تیرا نام لے کر آہیں بھرتی تھی اور ایک چاچی ہی کیا، پوری حویلی سوگ میں ڈوبی رہتی تھی۔ خادم حسین کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ حویلی چھوڑ کر ہی کہیں چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ پھر ہمیں یہ

پتا چلا کہ تُو زندہ سلامت ہے اور اپنے خاوند کے رشتے داروں کے پاس کہیں لاہور میں ہے۔ پہلے تو اس خبر کو ہم نے افواہ سمجھا لیکن بعد میں یہ سب کچھ سچ نکلا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ تیرے سسرالی رشتے دار تیری جان کے لئے خطرہ بن گئے ہیں اور تیرے ایک جیٹھ نے تجھے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم نے تجھ تک پہنچنے اور تجھے ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ بڑی لمبی اور تکلیف دہ کہانی ہے میری دھی رانی، تجھے تسلی سے سب کچھ بتاؤں گا۔ اس وقت..... اس وقت تو ہمیں بس جلدی سے ایک دو فیصلے کرنے ہیں۔ ہمارے آس پاس حالات بہت خراب ہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔''

''آ..... آپ کے ساتھ کون ہے تایا جی.....؟''

''یہ پولیس والا ہی ہے۔''

''پولیس والا.....؟'' شانی کے چہرے پر تشویش گہری ہوگئی۔

''ہاں..... لیکن یہ ہماری مدد کے لئے یہاں آیا ہے۔ شاید تم نے اس کے بارے میں سنا ہی ہو..... یہ رستم سیال کا دوست ہے۔ ایس پی ہے۔ حاجی حیات نام ہے اس کا۔''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ حاجی حیات کے بارے میں اس نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا۔ تایا معصوم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم نے ہی عارف کمبوہ وغیرہ سے کہا تھا کہ رستم کے دوستوں تک اس کے بارے میں اطلاع پہنچائیں۔ پرسوں رات کمبوہ برادری کا ایک بندہ کسی طرح حاجی حیات کے ایک ماتحت تک پہنچا اور وہاں سے حاجی حیات تک اطلاع پہنچی۔ حاجی حیات بہت اچھا بندہ ہے۔ ہم تجھے ڈھونڈنے کے لئے جو کوششیں کرتے رہے ہیں ان میں حاجی حیات بھی شریک رہا ہے۔ پرسوں بھی جیسے ہی اس تک اطلاع پہنچی، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر رنگ والی پہنچا اور مجھ سے ملا..... رنگ والی سے ہمارے یہاں تک پہنچنے کی روداد بھی کافی لمبی ہے، راستے میں چپے چپے پر پولیس اور نارپوری چوہدریوں کے کارندے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم مقامیوں کے بھیس میں یہاں پہنچے ہیں۔ شاید تم نے دیکھا ہی ہو، ایک گھوڑے پر ہم نے سامان لادا ہوا ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

تایا معصوم نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور اٹھتے ہوئے بولے۔ ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے میں حاجی صاحب کو اندر بلا لوں۔''

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تایا معصوم اٹھے اور دوسرے گھڑسوار کو اندر لے آئے۔ عارف کمبوہ بھی ساتھ ہی آیا۔ دوسرے گھڑسوار کا چہرہ اب منڈاسا نما پگڑی سے آزاد تھا۔ یہ

بھرے بھرے چہرے اور چھوٹی داڑھی والا ایک بارعب شخص تھا۔ اس کے سر اور داڑھی میں دس پندرہ فیصد سفید بال نظر آتے تھے۔ اس نے شانی کی طرف دیکھ کر اپنائیت سے السلام علیکم کہا۔ شانی نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ پھر وہ چاروں بیٹھ گئے۔

حاجی حیات نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''پوچھنے اور کہنے کے لئے تو بہت سی باتیں ہیں لیکن اس وقت ہمیں صرف بہت ضروری باتیں ہی کرنا ہوں گی۔ وقت بہت کم ہے۔ اس علاقے میں پیر قدرت اللہ کے ماننے والے ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعے تم دونوں کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع مقامی پولیس تک پہنچ چکی ہوگی یا بس پہنچنے والی ہوگی۔ اس کے بعد پولیس کو یہاں پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ ہرگز نہیں لگے گا۔'' ایس پی حاجی حیات نے چند لمحے توقف کر کے اپنی متاثر کن آنکھوں سے شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی بی بی! اس تھوڑے سے وقت میں تمہیں دو اہم فیصلے کرنے ہیں اور یہ دونوں فیصلے بہت ضروری ہیں۔''

شانی نے چہرہ پھیر کر دیکھا، تایا معصوم اور عارف کمبوہ دونوں باہر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے شانی اور تایا معصوم کمرے میں تنہا تھے۔ اب حاجی حیات اور شانی تنہا تھے۔ حاجی حیات نے گھمبیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''رستم میرا بہت پرانا دوست ہے۔ ہم نے بہت مشکل موقعوں پر ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رازداں بھی ہیں۔ میری ساری ہمدردیاں رستم کے ساتھ ہونی چاہئیں اور ہیں بھی...... لیکن میں اس موقع پر وہی بات کہوں گا جو وقت اور حالات کے مطابق مجھے کہنی چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی کروں گا کہ تم یہ بات مان لوگی۔''

شانی نے کہا۔ ''تایا معصوم اور آپ میرے بڑوں کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ظاہر ہے آپ ہمارے فائدے کی بات ہی کہیں گے۔''

حاجی حیات نے سگریٹ کا ایک چھوٹا سا کش لے کر کہا۔ ''میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ رستم تمہیں بے انتہا چاہتا ہے، اتنی شدید چاہت میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے، تم بھی اسے ناپسند نہیں کرتی ہو لیکن یہاں سوال حالات کا ہے..... حالات سراسر رستم کے خلاف جا رہے ہیں اور اتنے خلاف ہیں کہ شاید تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے ایس پی حیات کا لہجہ دکھ سے بھر گیا۔ اس دکھ میں گہری تشویش بھی شامل تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پنڈی میں رستم کے ہاتھوں شدید زخمی

ہونے والا پولیس ملازم ہسپتال میں دم توڑ چکا ہے۔ دفعہ 302 کیا بلا ہے، یہ تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن جب اس دفعہ کا اطلاق کسی سرکاری یا پولیس ملازم کے حوالے سے ہوتا ہے تو پھر یہ طوفان مچا دیتی ہے۔ محکمے کا بندہ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سنگین واقعے کے چند ہی دن بعد رستم کے ہاتھوں ایک قتل اور ہو چکا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے تم اس واقعے کی چشم دید گواہ بھی ہو۔''

''مم..... میں کچھ نہیں ''

''یہ کوئی ایسی پرانی بات تو نہیں ہے شانی بی بی ..... ! کٹھولی کے میلے میں جو ہنگامہ ہوا اس میں مرنے والوں کی تعداد اب پانچ ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک شخص سراج لوہار رستم کی چلائی ہوئی گولیوں سے مرا ہے۔ جب تم دونوں عارف وغیرہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر میلے کے ہنگامے سے نکلے تو رستم نے پیچھے آنے والے چار پانچ بندوں پر ماؤزر سے فائرنگ کی تھی۔ اس فائرنگ میں سراج موقع پر ہلاک ہوا۔ اس قتل کی ایف آئی آر بھی خاص رستم کے نام سے کٹی ہے۔ بے شک ان دونوں واقعات کے سبب رستم کے خلاف پولیس کی کارروائی تیز تر ہو گئی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی رستم پر کئی ایک سنگین کیس بنے ہوئے ہیں ان میں دفعہ 302، ڈکیتی کی دفعات 390 اور 391، حملے کی دفعات 325 اور 326 جیسے کئی کیس شامل ہیں۔ شاید تمہیں حیرانی ہو رہی ہو کہ میں اپنے ہی دوست کے خلاف تمہیں یہ ساری باتیں اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہا ہوں۔''

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس سکتہ زدہ سی بیٹھی رہی۔

حاجی حیات چند لمحے تامل کرنے کے بعد بولا۔ ''شانی بی بی! اگر میرے دل کی بات پوچھتی ہو تو میں یہی چاہوں گا کہ رستم تم سے جدا نہ ہو اور نہ تم رستم سے لیکن یہ وقت جذبات سے سوچنے کا نہیں۔ اگر جذبات سے سوچیں گے تو پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا اور شاید تم دونوں بھی اپنی زندگیاں نہ بچا سکو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ایک بار پھر حاجی حیات کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''اس وقت رستم کے لئے سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ وہ پولیس کی خوفناک چڑھائی سے بچ کر نکل جائے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرے، لیکن میں جانتا ہوں وہ اکیلا نہیں جائے گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے گا...... اور ہو سکتا ہے...... ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ جانا چاہو لیکن اگر تم دونوں نے یہ فیصلہ کیا تو یہ بالکل تباہی کی طرف لے جائے گا۔ مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ رستم کے لئے بچ نکلنے کے امکانات سو میں پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی اسی صورت

میں جب وہ مزید وقت ضائع نہ کرے۔ اگر وہ پولیس والوں اور نار پوریوں کے جان لیوا گھیرے سے بچ کر نکلنا چاہتا ہے تو اسے سرتوڑ کوشش کرنا پڑے گی اور جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، اس کوشش میں کوئی اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکے گا۔ سردار دراج اور عارف کمبوہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اسے ڈیک نالا پار کرا کے چھ سات میل آگے پہنچا دیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟''

شانی نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

حاجی حیات بولا۔ ''اب تم سوچو، اگر رستم کو اپنے ساتھ تمہاری جان بھی بچانا پڑی تو کیا ہوگا۔ وہ خود یہاں سے نکل سکے گا نہ تمہیں نکال پائے گا اور بات صرف اس علاقے سے یا پنجاب سے نکل جانے کی ہی نہیں ہوگی اس کے بعد بھی خود کو چھپانے کے لئے اسے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ ان سارے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب ترین راستہ یہی ہے کہ رستم یہاں سے اکیلا جائے اور تم خود کو پولیس کے سامنے پیش کر دو ''

''جی ...؟'' شانی نے چونک کر حاجی حیات کی طرف دیکھا۔

وہ تسلی بخش انداز میں بولا۔ ''میں نے تمہارا سارا کیس دیکھا ہے۔ ساری اونچ نیچ کا جائزہ لیا ہے۔ میں نے اور تایا معصوم نے دو دن پہلے لاہور کے ایک بڑے وکیل سے مشورہ بھی کیا ہے۔ تمہارے خلاف کوئی سنگین الزام عائد نہیں اور نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہے۔ نار پور کے چوہدریوں کی طرف سے جو الزام لگائے گئے ہیں، ان کی قانونی حیثیت بڑی کمزور ہے۔ اپنے تجربے کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دو تین پیشیوں میں ہی تمہاری ضمانت ہو جانی ہے۔ میرے ہوتے ہوئے اللہ نے چاہا تو تمہیں پولیس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ رہی چند ہفتے جیل میں رہنے کی بات تو اس کا انتظام بھی ہم مل جل کر کر لیں گے۔ جیل تمہارے لئے جیل نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ہم ''میڈیکل بیس'' پر تمہارے لئے کوئی بہتر حل سوچ لیں گے۔''

شانی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ غیر جذباتی طور پر سوچا جاتا تو ایس پی حیات کی بات میں وزن تھا۔ ...لیکن کیا رستم ایک بار پھر اس سے جدا ہو جائے گا؟ تن تنہا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے لئے؟ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ بے حال ہونے لگی۔ ایس پی حیات نے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں اپنے جگری دوست کی جانبداری نہیں کر رہا۔ میں وہی بات کہہ رہا ہوں جو فی الوقت تمہارے اور رستم کے لئے بہتر ہے۔ تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں

جانتا ہوں یہ فیصلہ مشکل ہے لیکن دل کڑا کر کے اس آزمائش سے گزر جاؤ۔ رستم کو اور خود کو فوری آفت سے بچا لو، زندگی باقی رہے گی تو زندگی کے سارے امکانات بھی باقی رہیں گے۔ کیا پتا دو چار مہینے یا دو چار سال بعد زندگی کے کسی بھی موڑ پر حالات ایک بار پھر تمہیں اور رستم کو ایک دوسرے کے پاس لے جائیں۔''

شانی کو یوں لگا جیسے اس کا سینہ گلے تک نمکین آنسوؤں سے بھر گیا ہے۔ ۔ اک ماہی بڑی دور سے آیا تھا۔ اس کا چہرہ زخموں نے گہنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جان یوا مسافتوں کی گرد اور پاؤں کے چھالے تھے۔ وہ تو ابھی دو پل کو ستایا بھی نہیں تھا۔ ابھی تو شانی کی انگلیاں اس کے پارہ پارہ جسم کو سہلا بھی نہیں سکی تھیں کہ ایک بار پھر اذنِ سفر ہو گیا تھا اور سفر بھی ایسا جس میں واپسی کے امکانات معدوم تھے۔

حاجی حیات کی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں شانی بی بی! وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے گا۔ اس کی خواہش ہوگی کہ وہ تمہیں چوہدریوں اور پولیس والوں کے گھیرے سے نکال کر کہیں بہت دور لے جائے۔ دیکھنے میں یہ خواہش بڑی خوبصورت لگتی ہے لیکن تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں بھی معلوم ہوگا، حقیقتیں بڑی تلخ اور کڑوی ہوتی ہیں...... رستم کی اس خواہش کے رستے میں بس تم ہی دیوار بن سکتی ہو ... میں چاہتا ہوں کہ تم رستم سے خود بات کرو۔ جو کچھ میں نے تمہیں سمجھایا ہے تم اسے اپنے طور پر سمجھا دو۔ اس سے صاف لفظوں میں کہہ دو کہ تم اس کے ساتھ جا کر اس کی اور اپنی زندگی شدید خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے قائل کر سکتی ہو۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......'' شانی روہانسی ہو کر بولی۔

اسی دوران میں عارف نے حاجی حیات کو باہر بلایا۔ اس کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔ حاجی حیات اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو منٹ بعد شانی کے تایا معصوم اندر آ گئے، گہری تشویش ان کے سُرخ و سپید چہرے پر درج تھی۔ انہوں نے اندر آ کر ایک بار پھر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ گلوگیر آواز میں بولے۔ ''میری دھی رانی، مجھے پتا ہے تُو شرماں والی بیٹی ہے۔ اپنی ماں کی طرح تیرے سینے میں بھی سونے کا دل ہے۔ تُو غلط رستے پر نہیں چل سکتی۔ میں تیرے نام کے ساتھ رستم سیال کا نام سن رہا ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو ضرور اس کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔ ہمیں تجھ پر پورا بھروسہ ہے دھی رانی...... لیکن اس وقت مسئلہ اور ہے۔ تیری وجہ سے رستم اور رستم کی وجہ سے تیری جان خطرے میں پڑ رہی ہے۔ تقدیر کا پھیر ہے کہ رستم اس وقت سخت مصیبتوں میں جکڑا گیا ہے۔''

''تایا ! اس کی مصیبتوں کی بڑی وجہ تو میں ہی ہوں۔ پنڈی میں مجھے بچاتے ہوئے وہ پولیس والوں سے لڑا تھا۔ چوہدریوں سے اس کی دشمنی بھی میری وجہ سے بھڑکی ہے۔ کٹھولی کے میلے میں بھی وہ میری وجہ سے پہنچا تھا اور پھر وہاں سے بھاگتے ہوئے بھی جب اس نے گولیاں چلائیں تو اس کے پیچھے میں کھڑی تھی ......''

''شانی ! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ تو نہ بھی بتائے تو سمجھ رہا ہوں لیکن اب بات یہ ہے کہ پولیس زہریلی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اعلیٰ افسروں نے ہر صورت اسے زندہ یا ... میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم ...؟''

شانی سر جھکائے سسکیاں لیتی رہی۔

تایا معصوم نے بات جاری رکھی۔ ''ایس پی حیات خان کو پتا چلا ہے کہ لاہور کا ایک بڑا کرخت ڈی ایس پی رستم کو پکڑنے کے کام پر لگایا گیا ہے۔ یہ بڑا ظالم بندہ ہے۔ لوگ اس کے نام سے ڈرتے ہیں اور بات صرف پولیس کی ہی نہیں ہے۔ نارپور کے سارے چوہدری بھی اپنے اندر کی لڑائیاں بھول کر رستم کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں رستم کے لئے صرف ایک ہی رستہ بچا ہے۔ وہ کسی طرح غیر علاقے کی طرف نکل جائے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔ باقی رہی تمہاری بات تو تمہارا معاملہ اور ہے۔ ہم اسے کسی نہ کسی طرح سنبھال لیں گے۔ رستم کے ساتھ اس وقت سب سے بڑی ہمدردی اور محبت یہی ہے کہ اسے کسی طرح موت کے اس گھیرے میں سے نکال دیا جائے اور یہ کام تم کر سکتی ہو شانی۔''

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''تایا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایس پی صاحب کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال کر کسی پکی سڑک تک پہنچا دیں۔ آخر ان کا عہدہ ہے، اتھارٹی ہے..... رستم کہتا تھا، اگر ہم ایک دفعہ پکی سڑک تک پہنچ جائیں تو پھر میانوالی سے ہوتے ہوئے بنوں یا کوہاٹ کی طرف نکل سکتے ہیں۔''

تایا معصوم نے بڑے کرب سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں شانی! تم سمجھ نہیں رہی ہو .. اس کام کے لئے وقت بہت پہلے گزر گیا ہے۔ اب تو بس ایک آدھ گھنٹے کی بات ہے۔ کئی تھانوں کی پولیس مل کر اس علاقے کی طرف بڑھ رہی ہے اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عارف کے بندے نے یہی اطلاع اسے دی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''یہ بڑی زیادتی ہو گی تایا جی. وہ ہمارے لئے ..... صرف ہمارے لئے .....'' وہ بات مکمل نہ کر سکی،

اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

تایا نے اس کی پیشانی چومی، سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ہم اس کی مدد کر رہے ہیں دھی رانی! ہم نے بروقت یہاں پہنچ کر اسے خطرے کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے میں بھی اس کی مدد کریں گے۔ جہاں تک ہو گا، اس کا ساتھ دیں گے۔ کوشش کریں گے کہ وہ ہماری حفاظت میں دور سے دور نکل جائے۔''

شانی نے سر اپنے گھٹنوں پر جھکا لیا، اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ تایا معصوم اس کے سگے تایا نہیں تھے لیکن وہ سگوں کی طرح ہی ان کا احترام کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے بھلے کے لئے کہہ رہے ہیں لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی، حالات نے کیا قیامت ڈھائی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنی زندگی کی حسین ترین ساعتوں سے گزری تھی، اس کے دل و دماغ اور اس کی روح نے بڑے جذب کے ساتھ رستم کے قرب کو قبول کیا تھا اور اپنے اندر سمویا تھا . اور اب وہ جدائی کے زہر سے بھرا ہوا پیالہ اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔

کشاکش کی گھڑیاں بڑی کٹھن اور جانکاہ تھیں، تایا معصوم مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ آخر وہ ہاری ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا وہ اکیلا جائے گا؟''

''ہو سکتا ہے اکیلا جائے .... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عارف کمبوہ یا دراج اپنا کوئی با اعتماد ساتھی اس کے ساتھ کر دیں۔''

''تایا.....! اسے اکیلا نہ بھیجیں۔'' وہ تایا کا ہاتھ تھام کر کسی بچی کی طرح سسکی۔

''تم فکر نہ کرو شانی! ہم اس کے لئے جو بہتر سے بہتر کر سکتے ہیں، کریں گے۔ بس اب تم جاؤ اور جلدی سے اسے یہ ساری بات سمجھا دو۔ وقت بہت کم ہے۔''

تایا معصوم اٹھ کھڑے ہوئے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رستم کے سامنے کیسے جائے۔ اس سے کیا کہے اور کیسے کہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ موجودہ حالات میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

تایا معصوم اور حاجی حیات کی باتوں سے بالکل عیاں ہو گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے رستم سے جو طویل ملاقات کی ہے، اس میں رستم نے شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی ہے۔ پھر شانی کا دھیان اپنی کلائی کی طرف چلا گیا۔ وہاں نیل موجود تھا۔ کتنی محبت بھری اور کتنی سخت گرفت تھی یہ۔ اس وقت شانی کو محسوس ہوا تھا کہ شاید ساری دنیا مل کر بھی اس کی کلائی رستم کے ''محافظ ہاتھ'' سے چھڑا نہیں سکتی ہے لیکن .... اب وہ خود اس کلائی کو چھڑانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دو تین منٹ شدید کشمکش میں گزارنے کے بعد وہ اٹھی۔ اس نے اپنا سر منہ چادر میں لپیٹا اور ایک گہری سانس لے کر تایا معصوم کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ وہ رستم کی طرف جا رہی تھی۔ کمرے سے باہر عارف اور حاجی حیات خان موجود تھے۔ ان دونوں نے شانی کو تائیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے حد بوجھل قدموں کے ساتھ زینہ اُتری اور احاطے میں آ گئی۔ احاطے میں پہنچ کر تایا معصوم نے اس کا شانہ سہلایا اور خود وہیں ٹھہر گئے۔ اس سے آگے شانی کو اکیلا جانا تھا۔ پندرہ بیس قدم کا فاصلہ تھا مگر شانی کو صدیوں کی ''مسافت'' لگ رہی تھی۔ سینے میں درد کی بلند و بالا لہریں تھیں۔ وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جو کچھ رستم سے کہنے جا رہی ہے، کہہ بھی پائے گی یا نہیں۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں جا کر کیا صورتِ حال پیش آئے۔ جذبات کا دھارا اسے کس طرف بہا لے جائے۔ نہ ہی اسے یہ اندازہ تھا کہ اس کی بات پر رستم کا ردِعمل کیا ہوگا۔ ہاں... اس کے دل سے یہ گواہی ضرور آ رہی تھی کہ اگر وہ فیصلہ کن انداز میں بات کر سکی تو رستم اس کی بات کو رد نہیں کرے گا لیکن بڑی قیامت تو یہی ''فیصلہ کن انداز'' والی تھی۔ وہ زخم زخم رستم کے سامنے کہاں سے لائے گی یہ انداز ؟

اور پھر وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں رستم موجود تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے سامنے دیکھا لیکن رستم موجود نہیں تھا، کمرا خالی تھا۔ جھونپڑے نما کمرے کی عقبی کھڑکی کھلی تھی اور پٹ ہوا کے ساتھ ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ شانی کے دل نے پکار کر کہا۔ وہ چلا گیا ہے ..... اسے زندگی کی کٹھن ترین آزمائش سے بچا کر، اپنے سارے درد بھرے سوال اپنے ہونٹوں میں دبا کر، اپنی ساری آہیں اپنے سینے میں چھپا کر۔ وہ حالات کا مارا، خاموشی سے کسی جانب نکل گیا ہے۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا۔ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل جیسے کراہنے لگا۔ کہیں گہرائی سے یہ آواز آنے لگی۔ ''رستم .....! مجھے اتنا موقع تو دیتے..... میں تمہیں بتا سکتی، میں پتھر نہیں ہوں۔ اگر تھی بھی تو پگھل رہی ہوں..... آج سویرے جب سورج طلوع نہیں ہوا تھا، میں نے اپنے دل کی دھرتی پر تمہاری محبت کا سورج اپنے ہاتھوں سے اُگایا تھا اور اس کی بے پناہ روشنی کو تسلیم کیا تھا۔ کاش میں جانے سے پہلے تمہیں بتا سکتی۔''

اسی دوران میں باہر سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ ایک مہتم مکھیا دراج سے کہہ رہا تھا۔ ''آپاں دونوں نے ابھی ایک منٹ پہلے کھد (خود) اسے دیکھا ہے جی..... اس نے کالی چادر لپیٹی ہوئی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ہے ؟''

''وہی تھا جی۔ لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ آپاں کے دیکھتے دیکھتے کانوں (سرکنڈوں) میں گھس گیا۔ ابھی جیادہ دور نہیں گیا ہوگا جی۔''

''ٹھہرو... میں اندر دیکھتا ہوں۔'' دراج کی آواز آئی۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ دندناتا ہوا جھونپڑے میں داخل ہوا۔ کلاشنکوف اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس نے خالی جھونپڑے میں نگاہ دوڑائی۔ شانی کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کی حیرت مزید بڑھی۔ ''نکڑی! کہاں ہے وہ... ؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ نہیں ہے.....'' شانی نے روتے ہوئے کہا۔

پانچ دس منٹ کے اندر یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہو چکی تھی کہ رستم سیال کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے ڈیک نالے کی طرف نکل گیا ہے۔ دو تین افراد اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے کالی چادر میں لپٹے ہوئے رستم کو سرکنڈوں میں گھستے دیکھا ہے۔

اس واقعے کے صرف پچیس تیس منٹ بعد ہی مکھیا دراج کے کارندوں نے اسے اطلاع دی کہ تقریباً چار جیپوں اور دو گاڑیوں پر سوار پولیس کی بھاری جمعیت تیزی کے ساتھ بستی کی طرف آ رہی ہے۔

ایس پی حاجی حیات نے مکھیا دراج کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ کسی کو کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف شانی بی بی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اگر یہ دو چار مقامی لوگوں کو ساتھ لے کر گئے بھی تو ہم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انہیں واپس لے آئیں گے، اس پولیس پارٹی میں ایک انسپکٹر اور ایک اے ایس آئی اپنے خاص بندے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔''

مکھیا دراج کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں تھے۔ اس نے اپنا دیوار جیسا سینہ تان کر کہا۔ ''سرکار... آپ کے حوصلہ دینے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ فکر نہ کریں اپنی حفاظت کرنا آپاں خوب جانتے ہیں۔ اس ڈیک نالے کے کنارے [illegible] ایک آواج پر ایک جان ہو سکتے ہیں۔ آپاں نے کبھی پولیس کو جیادتی [illegible] کی ہے نہ اب [illegible] دیں گے۔''

حاجی حیات نے کہا۔ ''تمہاری ہمت قابلِ تعریف ہے دراج [illegible] بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پولیس ملازم کے قتل کی وجہ سے [illegible]''

مکھیا دراج کو تمام ضروری ہدایات دینے کے [illegible] سے چلے گئے۔ تایا معصوم شانی کے ساتھ ہی رہے۔ بستی میں [illegible]

☆======☆======☆

ڈیک نالے کے کنارے نجتم بستی سے اوپر کی طرف تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر اونچے سرکنڈوں اور بلند جنگلی گھاس کے اندر رستم موجود تھا۔ اس کے سامنے چار عدد لاشیں پڑی تھیں۔ تین لاشیں کم و بیش سو میٹر پیچھے تھیں۔ چوتھی نالے کے عین کنارے پر کیچڑ اور سیاہی مائل گارے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ چاروں کے چاروں افراد ابھی ابھی مرے تھے، چوتھا بندہ جو نالے کے عین کنارے پر موجود تھا ابھی تک نزع کے عالم میں جنبش کر رہا تھا مگر اس کے بچنے کا امکان صفر تھا کیونکہ ایک فٹ لمبے تیز دھار چھرے نے اس کی ساری انتڑیاں پیٹ سے باہر نکال دی تھیں اور اس کے سینے و گردن پر تیز دھار چھرے کے تقریباً ایک درجن جان لیوا گھاؤ تھے۔ تیز دھار چھرا رستم کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی خم دار نوک سے خون ٹپک رہا تھا اور ایسا ہی خون رستم کی آنکھوں سے بھی ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔

یہ چار افراد جو مرے پڑے تھے ان میں تین باوردی پولیس والے تھے اور چوتھا نارپوری چوہدریوں کا خاص کاماں چھیدا تھا۔ ابھی تین چار منٹ پہلے یہ لوگ زندہ تھے۔ انہوں نے بڑی رعونت اور قطعیت کے ساتھ رستم کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جس کا رستہ روکنے کی کوشش کی گئی تھی، وہ رکنے کے لئے نہیں نکلا تھا اور نہ اسے روکا جا سکتا تھا۔ وہ بہت سفاک لوگ تھے لیکن ان کا مدمقابل ان سے کہیں زیادہ سفاک نکلا تھا۔ اس نے دو تین منٹ میں انہیں خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ تین افراد جو پیچھے مرے پڑے تھے، ان میں سے دو کو ماؤزر کے فائر لگے تھے۔ تیسرے کے سینے میں دل کے مقام پر چھرے کا گھاؤ تھا۔ چوتھا شخص جس کے جسم پر اے ایس آئی کی وردی تھی، نالے کے کنارے جا کر قتل ہوا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور رستم نے پیچھا کر کے اسے مارا تھا۔ زیادہ وحشت سے اسی شخص کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ میانہ گاؤں کے پولیس سٹیشن کا نکا تھانیدار مظہر چوہدری تھا۔ یہ تاؤ حشام کا رشتے دار بھی تھا۔ تاؤ کے پالتو کتے کی طرح حویلی میں دم ہلاتا پھرتا تھا۔ تاؤ کی حویلی میں رستم پر بہیمانہ تشدد کرنے میں یہ پیش پیش تھا اور بات صرف تشدد کی نہیں تھی۔ تاؤ کی حویلی میں رستم کو ایک بہت بڑے ذہنی صدمے سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ ایسا صدمہ جس نے اسے بالکل ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رستم کو پکڑنے کے پندرہ بیس گھنٹے بعد ہی چوہدریوں نے رستم کو اس کے قریبی دوست آفندی کی دردناک موت دکھا دی تھی۔ یہ آفندی وہی تھا جسے کچھ عرصہ پہلے چوہدریوں نے بادامی باغ لاہور سے پکڑا تھا اور اس سے رستم کا اتا پتا پوچھتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی تھیں۔ درحقیقت رستم اور چوہدری کی ''لڑائی'' میں تیزی اسی واقعے کے

بعد آئی تھی۔ رستم نے آفندی کی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کا بدلہ لینے کے لئے لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی پر ہلا بولا تھا اور قادرے کے خاص ملازم شادے کی ٹانگیں توڑنے کے علاوہ اس کا لاڈلا کتا بھی مار دیا تھا۔ اب اسی آفندی کو قادرے وغیرہ نے لاہور کے ہسپتال سے اغوا کیا تھا اور اسے تاؤ کی حویلی میں پہنچایا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر ابھی تک پلاسٹر چڑھے ہوئے تھے۔ ان پلاسٹروں سمیت آفندی کو رستم کی کوٹھڑی کے عین سامنے چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ آفندی ساری رات ناقابلِ برداشت درد سے چیختا اور کراہتا رہا تھا۔ اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ رات آفندی کے لئے ہی نہیں رستم کے لئے بھی زندگی کی دردناک ترین رات تھی...... صبح دم چوہدریوں نے نیم جان آفندی کے منہ پر ایک بڑا شاپر چڑھا دیا تھا، چھت سے الٹا لٹکا ہوا آفندی دم گھٹنے سے مچھلی کی طرح تڑپا مچلا تھا اور پھر ختم ہو گیا تھا۔ ایک دلیر اور یار باش شخص کا یہ بڑا المناک انجام تھا۔

تاؤ کی کوٹھڑی میں پیش آنے والے سارے مناظر رستم کے حافظے پر انگاروں کی طرح پیوست تھے۔ وہ اب کسی منظر کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا، وہ بس آگے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک طوفان تھا۔ اس طوفان کی شدت اور اس کے پھیلاؤ کو صرف وہی جان سکتا تھا۔ کسی اور کے لئے اس کا ادراک ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے جاں بلب اے ایس آئی مظہر کی گردن پر پاؤں رکھا...... پاؤں کے دباؤ کے سبب مظہر کے حلق سے خرر خرر کی بھیانک آواز نکلی۔ پھر اس کی آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اُس پار جا چکا تھا۔

اے ایس آئی کا پسٹل آٹھ دس قدم پیچھے گرا تھا۔ رستم نے یہ پسٹل اٹھا کر قمیص کے نیچے لگایا۔ پھر وہ تیزی سے باقی تینوں لاشوں کے پاس پہنچا۔ اردگرد کے سرکنڈے خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کے مُردہ ہاتھوں میں سرکاری رائفل ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ رستم کی جوتی کا ایک پاؤں کامے چھیدے کے پہلو میں پڑا تھا۔ رستم نے یہ ''پاؤں'' پہنا۔ اپنی کالی چادر اُتار کر ایک طرف پھینکی کامے چھیدے کی چادر خاکی رنگ کی تھی اور یہ ایک طرف سرکنڈوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک فٹ لمبے چھرے کو مقتول کی وردی سے صاف کیا اور ایک سوتی کپڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کے نیچے رکھ لیا۔ ذرا فاصلے پر پیلے رنگ کی اونچی جنگلی داب میں تین گھوڑے ایک ٹاہلی سے بندھے ہوئے تھے۔ یقیناً ان کا تعلق یہاں رستم کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں میں سے تھا۔ ذرا دیر کے لئے رستم کے جی میں آئی کہ ان میں سے ایک گھوڑا اپنی سواری کے لئے استعمال کرے۔ تاہم اگلے ہی لمحے اس نے

اپنا یہ خیال خود ہی رد کر دیا۔ گھوڑے کی بجائے وہ پیدل زیادہ محفوظ تھا۔ اس نے ایک خونی نگاہ مقتولوں پر ڈالی اور اپنے لمبے بالوں کو جھٹک کر چہرے سے ہٹایا اور لہلہاتے سرکنڈوں میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا...... آج...... بہت عرصے بعد وہ ایک بار پھر سراپا ڈاکو رستم سیال نظر آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی رگوں میں خون کی جگہ آتشیں لاوا دوڑ رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ ہر خطرے اور مصلحت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے پہلے ایک تاریک رات کو اس کی آنکھوں میں ایک من موہنی صورت سمائی تھی۔ اس صورت کے طفیل اس کی زندگی میں ایک انقلاب آیا تھا۔ اس نے آگ اور خون سے منہ موڑ کر پھولوں اور مسکراہٹوں کی طرف رجوع کرنا چاہا تھا، اس نے اپنے اندر مری ہوئی ''زندگی'' کو پھر سے زندہ کرنا چاہا تھا۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے اپنے فیصلے پر قائم رہا تھا۔ بے پناہ صعوبتوں کے باوجود اس نے اپنے قدم نئے راستے پر جمائے رکھے تھے لیکن آخر وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ مجرم، شرافت اور انسانیت کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کا ماضی اپنے ہزار ہا ہاتھوں سے انہیں واپس کھینچ لیتا ہے۔ رستم بھی واپس کھینچ لیا گیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ من موہنی صورت اب اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ وہ تو زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ جسم کے ایک ایک ریشے میں سما چکی تھی۔ مگر اسے اس صورت سے دور ہونا پڑا تھا۔ کھیادراج کی بستی چھوڑنے سے پہلے وہ ایک شدید ترین کشمکش سے گزرا تھا۔ آخر فیصلہ پسپائی کے حق میں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا بی بی سے کیا کہا جا رہا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بی بی نے آ کر اس سے کیا کہنا ہے، وہ بی بی کو اس کڑی آزمائش میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا تھا اور بی بی کو محفوظ ہاتھوں میں چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا تھا اور اب وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد وہ ایک پختہ سڑک پر تھا اور لوکل روٹ پر چلنے والی ایک کھٹارہ بس میں بیٹھا تھا۔ اس لاری نما بس میں مسافروں کے علاوہ دنیا جہان کا اسباب بھی موجود تھا۔ پھلوں کی پیٹیاں، سبزی کی گٹھیں، کپڑے کے تھان، مرغیاں، انڈے اور پتا نہیں کیا کیا۔ بس بار بار رکتی تھی۔ مسافر چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے، بچے روتے تھے، عورتیں چلاتی تھیں۔ بس کی چھت پر خبر نہیں کیا کیا چڑھایا اور اتارا جا رہا تھا۔ رستم سیال خاکی چادر میں لپٹا ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گرد بیٹھی اور کھڑی سواریوں کا ہجوم تھا اور یہ ہجوم اس کے لئے بہت مفید تھا۔ وہ کسی نشے باز کی طرح اپنا چہرہ چادر میں چھپائے بے سدھ پڑا رہا۔ مگر وہ اردگرد سے بے خبر نہیں تھا۔ ہر آہٹ اور آواز پر اس کے کان تھے۔ ایک شخص نے دوسرے

سے کہا۔ ''آج جگہ جگہ پولیس کھڑی نظر آ رہی ہے۔''

''کہیں ڈاکہ شاکہ پڑا ہو گا ماشٹر صاحب!'' دوسرے نے کہا۔

ماشٹر یعنی ماسٹر صاحب نے مزاحیہ انداز میں کسی شاعر کا یہ قطعہ پڑھا۔

ادھر ناکے پہ ناکہ چل رہا ہے
اُدھر ڈاکے پہ ڈاکہ چل رہا ہے
وہاں منصوبہ بندی کا ہے شور
یہاں کاکے پہ کاکا چل رہا ہے

ایک جٹ زمیندار نے اطلاع دینے والے لہجے میں کہا۔ ''سنا ہے کاچھی پور کی طرف ڈیک نالے کے کنڈے پلس مقابلہ ہوا ہے۔ کئی پلس والے مرے ہیں۔ آلے دوالے کے پنڈوں میں بڑی ترتھلی مچی ہوئی ہے۔''

ماسٹر صاحب بولے۔ ''پلس والے کہاں مرتے ہیں پلس مقابلے میں...... ایسے ہی افواہ اُڑی ہو گی۔''

''نہیں جی...... سنا ہے مرے ہیں پلس والے۔'' بس کی آخری سیٹ سے ایک دیہاتی کی آواز آئی۔

رستم کے آگے بیٹھے ہوئے ایک پگڑی والے نے دانتوں سے گنا چھیلتے ہوئے کہا۔ ''اک ادھ مر گیا ہو گا۔ اب اس کے بدلے پتا نہیں کتنے بے قصوروں کو اگلی دنیا دکھائیں گے یہ لوگ۔''

بہت سے لوگ ایک ساتھ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔

رستم اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔ تنگ سڑک کے کنارے کچے میں چند پولیس والے دو موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ کھڑے کرا کے تلاشی لے رہے تھے۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر دو پولیس والے ایک پرائیویٹ کار میں دھول اُڑاتے کسی گاؤں کا رخ کر رہے تھے۔

رستم کے ہونٹوں پر ایک بہت مدھم اور زہریلی مسکراہٹ چمک گئی۔ انتقام در انتقام کا سلسلہ خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ اپنے جس دوست کی ٹانگوں کا بدلہ لینے کے لئے رستم نے شادے کی ٹانگیں توڑی تھیں، اسے چوہدریوں نے رستم کے سامنے تڑپا تڑپا کر جان سے مار دیا تھا۔ اب پولیس والے پنڈی میں زخمی ہو کر مرنے والے ساتھی کا بدلہ چکانے جوق در جوق نکلے تھے۔ اس ایک کے بدلے انہیں تین پٹی بھائیوں کی تازہ بہ تازہ لاشیں مزید اٹھانا پڑی تھیں، دفعہ 302 ضرب 3 ......

پون گھنٹے تک مزید سفر کرنے کے بعد رستم جی ٹی روڈ پر پہنچ چکا تھا۔ یہ گجرات کا علاقہ تھا۔ کسی بس پر سوار ہونے کے بجائے اس نے ایک ٹرک اڈے کا رخ کیا اور ایک ٹرک والے سے لفٹ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ٹرک راولپنڈی جا رہا تھا۔ ڈرائیور ایک صحت مند وزیر آبادی تھا۔ اس نے رستم کو اپنے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھالیا اور اونچی آواز میں عیسیٰ خیلوی کا گانا لگا دیا۔ ''چن کتھاں گزاری آئی رات وے......''

رستم کے سر پر حقیقی معنوں میں خون سوار تھا۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ اگر راستے میں کہیں پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو وہ گرفتاری نہیں دے گا۔ مارے گا یا مر جائے گا۔ ڈیک نالے کو پار کرتے ہوئے وہ چار قتل آج ہی کر چکا تھا۔ اب چار چھ اور بھی کر دیتا تو بات ایک ہی تھی۔ اس کے ماؤزر میں اب بھی آٹھ گولیاں موجود تھیں۔ بیلٹ میں تقریباً بیس گولیاں اور لگی ہوئی تھیں۔ اعشاریہ 38 کے سرکاری پسٹل میں بھی چھ گولیاں موجود تھیں اور پھر وہ خم دار چھرا جس سے اس نے دو قتل کئے تھے۔ چھرے اور ماؤزر کا انتظام رستم مہتم بستی سے ہی کر کے چلا تھا۔

عیسیٰ خیلوی اور ملنگی کی آواز سے گونجتا ہوا یہ ٹرک راولپنڈی جا رہا تھا۔ راولپنڈی جہاں رستم کا جگری دوست زوار تھا۔ شیری تھی اور بہت سے دیگر جاں نثار تھے لیکن رستم پنڈی نہیں جا رہا تھا۔ نہ وہ زوار یا کسی اور ساتھی سے ملنا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے کسی جان پہچان والے سے ملنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا اب پولیس اسے زیادہ دیر زندہ نہیں رہنے دے گی۔ اس بقایا مختصر زندگی کے لئے وہ کسی کا احسان مند ہونا نہیں چاہتا تھا اور نہ کسی پیارے کو مصیبت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب باقی کی جتنی لڑائی تھی وہ اسے تنہا لڑنا تھی۔ درحقیقت زخمی ٹانگوں والے آفندی کو چھت سے الٹا لٹکے دیکھنے کے بعد اس میں کسی اور سنگی ساتھی کو جان کنی میں دیکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

یہ پوٹھوہار کا علاقہ تھا، رات تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ گوجر خان سے تقریباً آٹھ کلومیٹر شمال مشرق کی طرف ایک قصبے سے نیم روشن مکان کے دروازے پر رستم نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ درمیانی عمر کے ایک دراز قد شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی پر سے کٹا ہوا تھا۔ رستم کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔

''اوئے تم... اوئے کہاں چلا گیا تھا تُو... تیرا انتظار کر کر کے آنکھیں بھی دکھنے لگی ہیں۔'' اس نے رستم کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔

اسی دوران میں اندر ایک دروازے کی چق میں حرکت پیدا ہوئی۔ تینتیس چونتیس سال

کی بھرے ہوئے جسم والی ایک خوش شکل عورت باہر نکلی۔ اس نے دوپٹہ اپنے سر پر درست کیا اور صحن کی نیم تاریکی میں دھیان سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کون ہے جی... ؟''

گھر والا بلند آواز سے بولا۔ ''ہماری گورنمنٹ کے بھائی صاحب آئے ہیں اور کون ہے... ساری خدائی اک پاسے... جورو کا بھائی اک پاسے۔''

''ہائے اللہ رستم ہے!'' عورت تڑپ کر بولی۔

پھر وہ تیزی سے رستم کی طرف آئی اور خوشی سے چیختی ہوئی رستم سے لپٹ گئی۔ رستم کا سر جھکا کر وہ بار بار اس کا ماتھا اور سر چومنے لگی۔ رستم کے لباس کے نیچے ماؤزر اور پسٹل لگے ہوئے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ بہن کو ان اشیاء کی سختی محسوس نہ ہو۔ اس نے جلد ہی خود کو بہن کی گرم جوش بانہوں سے آزاد کرالیا۔

میاں بیوی رستم کو تیزی سے اندر لے آئے۔ اندر بلب کی مدھم روشنی میں چارپائیوں پر ایک لڑکا لڑکی سو رہے تھے۔ لڑکا آٹھ نو سال کا اور لڑکی پانچ چھ سال کی تھی۔ لڑکی شاید پڑھتے پڑھتے سوئی تھی۔ ایک کتاب اس کے سینے پر دھری تھی، دوسری تکیے پر۔ کمرے میں آ کر رستم کی بہن اور بہنوئی نے غور سے رستم کو دیکھا۔ بہن کی آنکھوں میں حیرت آمیز تشویش کا سیلاب آگیا۔ ''ہائے میں مری رستم... یہ کیا ہوا ہے۔ کیا پھر کوئی......؟''

''نہیں آپو... نہیں...'' وہ تیزی سے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ڈیڑھ دو ہفتے پہلے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ راوی کے پل پر ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ کافی چوٹیں آئیں۔ پھر ساتھ ہی بخار بھی ہوگیا... اب تو کافی ٹھیک ہوگیا ہوں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' رستم بھرائی ہوئی مدھم آواز میں بولا۔

''ہائے اللہ تُو تو داغوں داغ ہو رہا ہے رستم......! اتنی چوٹیں... کہیں کچھ چھپا تو نہیں رہا...؟''

''آپو......! تجھ سے کیا چھپاؤں گا۔'' رستم نے بہن کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے۔

''اور رستم! تیری آواز... ؟ کیا ہوا ہے آواز کو......؟'' رستم کے بہنوئی نے پوچھا۔

''یہ گلے پر بھی چوٹیں آئی ہیں۔'' رستم نے ٹھوڑی اوپر اٹھا کر چوٹیں دکھائیں۔ ''اب تو پھر بھی تھوڑی بہت آواز نکل رہی ہے۔ پہلے تو لگتا تھا کہ گونگا ہوگیا ہوں۔''

''بیوی جی... ! سالا صاحب کو کہیں بٹھاؤ بھی۔ کیا اسی طرح کھڑے کھڑے دو گھنٹے کا انٹرویو لو گی؟''

بہن نے چونک کر دوپٹے کے پلو سے رستم کا چہرہ پونچھا پھر اس کے لئے ساتھ والے

کمرے سے کرسی گھسیٹ کر لائی۔ تینوں بیٹھ گئے۔ بہن کی آنکھوں میں خوشی اور دکھ کے ملے جلے آنسو تھے۔ یہ آنسو چھپانے کے لئے اور چائے پانی لینے کے لئے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

بہنوئی اکرام نے بڑے دھیان سے رستم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو یہاں سے کہیں نکلنے نہیں دیتے ہو اور خود یہاں آتے نہیں ہو۔ ہم منہ اٹھا اٹھا کر تمہارا راستہ دیکھتے رہتے ہیں۔ سرمد اور عاشی بھی اٹھتے بیٹھتے ماموں جی..... ماموں جی کرتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق تم کوئی چار مہینے کے بعد آئے ہو۔''

''ہاں .... اتنے تو ہو گئے ہوں گے۔'' رستم نے بالوں کی لٹ اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ چار مہینے بعد آئے ہو۔ کافی چوٹیں شوٹیں بھی لگوا آئے ہو لیکن گڑی کہاں ہے، میرا مطلب ہے ہماری چھوٹی بھرجائی۔''

رستم نے سر جھکایا۔ بہنوئی اکرام کی سوالیہ نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ خاموشی طویل ہوئی تو اکرام نے کہا۔ ''یار! منڈے تو شادی کے بعد چپ ہوتے ہیں۔ تُو پہلے ہی ہو گیا ہے، کہیں شادی کر کے ہی تو نہیں آیا ہے؟''

''نہیں بھیا اکرام..... شادی نہیں کی۔''

''اور گڑی... ؟''

''وہ بھی نہیں آئی؟''

...ام گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس کے کندھے پر اپنے اکلوتے ہاتھ ...کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا تُو حیران کرنا چاہتا ہے مجھے اور زاہدہ کو۔ گڑی ضرور تیرے ...ہوئی ہے... ادھر اُدھر چھپا آیا ہو گا۔ ہم جانتے ہیں۔ تیری یہ عادت پرانی ہے۔''

''نہیں بھیا اکرام، وہ اب..... شاید نہیں آئے گی۔'' رستم گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے خواہ مخواہ ایک بات کو اپنے دماغ میں بٹھا لیا ہے۔''

''اوئے تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ کیوں نہیں آئے گی وہ، یہاں تیری بہن ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہے۔ تیری ووہٹی کے لئے کپڑے بنائے ہیں اس نے۔ چادریں کاڑھی ہیں۔ بھانڈے خریدے ہیں۔ وہ تو بے چاری...''

''بھیا...'' رستم نے گمبھیر لہجے میں بہنوئی کی بات کاٹی۔ ''میں نے کہا ہے ناں وہ نہیں آئے گی۔ شاید کبھی نہیں...''

''پر..... کیوں؟'' اکرام نے بہت پست آواز میں لیکن بڑے زور سے کہا۔

''بس کہا ہے ناں.... اس کا خیال چھوڑ دو۔ تم بھی اور آپو بھی۔ بالکل چھوڑ دو اور ہو سکے تو میرا بھی چھوڑ دو۔''

اکرام کے چہرے پر زرد رنگ لہرا گیا۔ اس نے تعجب سے رستم کی طرف دیکھا۔ ''رستم! یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم... بالکل بدلے ہوئے لگتے ہو۔ کیا ہوا ہے آخر؟ کہیں پھر... ؟''

''کچھ نہیں بھیا؟'' رستم نے ایک بار پھر بے زاری سے کہا۔ ''تمہیں کہا ہے ناں وہ گڑی میرے ساتھ نہیں ہے۔ اب کوئی اور بات کرو۔''

اکرام تھوڑی دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا بہن سے نہ کچھ کہنا اس بارے میں... رو رو کر بُرا حال کر لے گی۔ پتا نہیں کیا کیا آس لگائی ہوئی ہے اس نے......''

اتنے میں زاہدہ ایک ٹرے میں دودھ کا بڑا گلاس رکھ کر لے آئی۔ ساتھ میں سوجی اور میدے سے بنے ہوئے لڈو تھے۔ رستم نے دودھ پینا شروع کیا تو وہ بے چینی سے اس کے زخموں اور چوٹوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ملیح چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ یقیناً اپنے شوہر اکرام کی طرح وہ بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی کہ رستم کو یہ چوٹیں کسی عام ایکسیڈنٹ اور لڑائی میں لگی ہیں۔

وہ اندر سے لال دوا اور روئی وغیرہ لے آئی۔ وہ رستم کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ زخم بہت گہرے ہیں۔ اس کی کوشش بہت معمولی ہے۔ رستم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آپو......! میرے پاس دوا وغیرہ ہے۔ میں سویرے خود لگاؤں گا۔''

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد اکرام نے کہا۔ ''رستم! تم بہت تھکے ہوئے ہو... میرا خیال ہے کہ اب لیٹ جاؤ۔ سویرے آرام سے بات کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بیوی کو بھی اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

اس نیم پہاڑی قصبے میں رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ رستم رنگین پایوں والے بستر پر چت لیٹا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ پلکوں کے کنارے نم تھے۔ اس کی آنکھوں میں میلے کا وہ منظر تھا، جب اس نے جذبے کی شدت سے مغلوب ہو کر اپنا ہاتھ بی بی کی طرف بڑھایا تھا۔ ایک شدید کشمکش کے بعد بی بی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ لمحے رستم کی زندگی کے یادگار ترین لمحے تھے، ان لمحوں میں اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ چاہے تو بلند و بالا پہاڑ

سے ٹکرا کر اس میں سے اپنے اور بی بی کے لئے راستہ بنا سکتا ہے، ان لمحوں میں جو خوشی رستم نے محسوس کی تھی، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا لیکن پھر.. اگلے دو تین روز میں ہی رستم کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ خوشی دیرپا نہیں ہے۔ درحقیقت نامہربان حالات نے رستم کی زندگی کا نقشہ ایک بار پھر تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس تبدیلی کا آغاز راولپنڈی کے پولیس مقابلے کے بعد ہوا تھا۔ بعدازاں بلی مار چوہدریوں کے ساتھ سرد لڑائی نے گرم جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب اوپر تلے اس کے ہاتھوں سے کئی قتل ہو چکے تھے۔ قانون اور وہ، ایک بار پھر پوری شدت سے ایک دوجے کے آمنے سامنے تھے۔ نارپوریوں نے بھی ہر اگلی پچھلی کسر نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر بی بی نے اس سے دور رہنے کا فیصلہ کیا تھا، تو ٹھیک ہی کیا تھا۔ رستم کے اپنے اندر سے بھی یہی آواز آ رہی تھی کہ وہ اپنی آگ میں بی بی کو گھسیٹے گا تو اس سے بڑی خودغرضی اور کوئی نہیں ہو گی اور یہ خودغرضی عشق کی بدترین توہین کے زمرے میں آئے گی۔ مہتم بستی چھوڑنے سے پہلے اس کی ملاقات بی بی کے تایا معصوم اور اپنے دوست حاجی حیات خان سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کی رائے بھی یہی تھی کہ رستم کو اکیلے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اس ملاقات میں بی بی کے تایا کا کہا ہوا ایک فقرہ جیسے رستم کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا اور یہ فقرہ سننے کے فوراً بعد ہی رستم نے مہتم بستی چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ تایا معصوم نے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔ ”شانی کی زندگی اور ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے رستم۔ تم کسی نیک ماں کے بچے ہو۔ مجھے یقین ہے تم ہم پر رحم کرو گے۔“

رستم سرتاپا کانپ گیا تھا۔ بی بی کا ایک بزرگ اس سے رحم کی درخواست کر رہا تھا ..... وہ بی بی جس کی پیشانی پر ایک شکن دیکھنے سے بہتر رستم سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں کی روشنی چھن جائے اور اس کا جسم جان سے محروم ہو جائے ..... اور پھر وہ چلا آیا تھا۔ ہر ناتا توڑ کر، ہر آس کا گلا گھونٹ کر۔ حقیقت زہر سے کڑوی، آگ سے بڑھ کر تلخ اور موت سے زیادہ نامہربان تھی مگر اس حقیقت کو اپنے خون میں گھول کر پی گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ ..... وہ اپنی بی بی کو خداحافظ کہہ آیا تھا۔

اس کی بند آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ وہ بستر پر بے حرکت لیٹا رہا۔ جسم کی چھوٹی بڑی چوٹیں درد کا احساس جگاتی رہیں۔ اس کے بند ہونٹوں کی ”خاموشی“ کراہتی رہی۔ وہ جانتا تھا آپو بڑی خاموشی کے ساتھ دو مرتبہ آ کر اسے دیکھ چکی ہے۔ ابھی رات بھر میں اس نے نہ جانے ایسے کتنے چکر لگانے تھے۔ وہ اس کے لئے ہمیشہ سے ایسی ہی دیوانی تھی۔ جب رستم کی والدہ فوت ہوئی تو رستم کی عمر انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ آپو زاہدہ نے اسے بڑی بہن

کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ ایسے ٹوٹ کر محبت کی تھی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو۔ وہ رستم کو ایک کامیاب اور نیک نام آدمی دیکھنا چاہتی تھی لیکن رستم ڈاکو بن گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا۔ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رستم کے ”ڈاکو رستم“ بننے کی کہانی نئی نہیں تھی۔ وہی جبر ناانصافی ..... اور پھر ردِعمل کی صدیوں پرانی کتھا۔ وہی فسانہ لہو رنگ، وہی حکایتِ خونچکاں ..... رستم کو وہ رات کبھی بھول نہیں سکتی تھی اس رات دیرینہ دشمنی کا دیو چنگھاڑتا ہوا آیا تھا اور ایک ہنستے بستے گھر کو تہہ و بالا کر گیا تھا۔ آپو کی شادی کامونکی کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپو کا خاوند اکرام زمینداری کرتا تھا۔ سات آٹھ ایکڑ زمین تھی۔ اکرام کی زمین کے ساتھ حسن آباد کے نمبرداروں کے کھیت تھے۔ نمبردار گھرانے سے اکرام کے گھرانے کی پرانی رنجش چلی آ رہی تھی۔ وہ طاقتور اور بااثر لوگ تھے۔ اکرام معمولی کاشتکار تھا، نمبرداروں کے بیٹے اکثر اکرام کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ آپو کے ساتھ اکرام کی شادی کو بہ مشکل ایک سال ہوا تھا کہ ایک جھگڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا پانی کی باری پر ہوا تھا، نمبرداروں کے ایک کامے نے وقت سے پہلے ہی اکرام کا پانی کاٹ کر اپنے کھیتوں کو لگایا، اکرام نے اسے روکنا چاہا اور بات بڑھ گئی۔ نمبرداروں کی بہن جو حاکو کہلاتی تھی، خود بھی کھیتوں میں کام کی نگرانی کرتی تھی۔ وہ اس وقت کھیتوں پر موجود تھی۔ اس نے اکرام کو گالیاں دیں اور اکرام نے اسے تھپڑ مار دیا۔

اس بات کا پتا اکرم کے سسر یعنی رستم کے والد کو لگا تو وہ فوراً اکرام کے گاؤں پہنچے۔ انہوں نے اکرام کو سمجھایا کہ اسے عورت پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ یہ اس سے ایک بڑی غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے اکرام کو ساتھ لیا اور نمبرداروں کی حویلی پہنچے تاکہ اکرام کو معافی منگوا سکیں۔ نمبرداروں نے ان کے لئے حویلی کا دروازہ نہیں کھولا اور بہانہ بنایا کہ بڑے نمبردار صاحب گاؤں سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ رستم کے والد اور اکرام ناکام گھر واپس آ گئے تھے۔

رستم ان دنوں لاہور میں تھا اور اپنے دوست آفندی کے ساتھ مل کر بادامی باغ میں لوہے کی ڈھلائی کا کام شروع کر رہا تھا۔ اسے بہن کے سسرال میں ہونے والے جھگڑے کی خبر پہنچی تو گاؤں گیا۔ وہ رات گئے پہنچا تھا۔ ابھی وہ بہن کے گھر سے کچھ دور ہی تھا کہ اسے ایک ہولناک خبر ملی۔ اس کی بہن کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے پتا چلا کہ نمبردار کرامت کے بیٹوں نے حملہ کر کے اس کے بہنوئی اکرام کو شدید زخمی کر دیا ہے اور اس کی بہن آپو زاہدہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ رستم کی رگوں میں لہو کی جگہ سیال آگ بہنے لگی۔

وہ تیزی سے نمبرداروں کے ڈیرے پر پہنچا۔ اس کی آپو کو وہیں پر لے جایا گیا تھا۔ جب وہ ڈیرے پر پہنچا اس نے اپنے زخمی باپ کو نمبردار کے بیٹوں کے قدموں پر سر رکھے دیکھا۔ وہ دردناک انداز میں روتے ہوئے ان سے رحم کی درخواستیں کر رہا تھا۔ نمبردار کے بیٹے اسے ٹھوکریں رسید کر رہے تھے...... وہ ٹھوکریں کھا کر ان کے پاؤں سے دور نہیں ہو رہا تھا اور وہ کیسے ہوتا۔ ڈیرے کے بند دروازوں کے پیچھے اس کی بیٹی تھی۔ اس کی جان اور آبرو دونوں خطرے میں تھے۔

رستم نے باپ کو اس حالت میں دیکھا تو سراپا آگ بن گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا جوان خون اسے ہر اندیشے سے بے نیاز کر کے نمبرداروں سے ٹکرا دیتا، اس کا زخمی باپ بازو پھیلا کر اس کے سامنے آ گیا۔ ''نہیں رستم ......'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ہم ان سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمیں ان سے نہیں لڑنا۔ غلطی ہماری ہے...... ہمیں معافی مانگنی چاہئے، ہمیں معافی مانگنی چاہئے۔''

رستم بدستور بپھرا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اسے تھپڑ مارے اور جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پھر وہ رستم کی طرف سے نمبرداروں سے معافی مانگنے لگا۔ ''یہ بچہ ہے، ناسمجھ ہے اس کی طرف سے میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ غلطی ہماری ہے۔ ہم تمہارے گناہ گار ہیں۔ ہمارے ساتھ جو جی چاہے کر لو لیکن میری بچی بے قصور ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔''

جبر، عاجزی کا خون پیتا ہے اور مزید پھلتا پھولتا ہے۔ اس کے چہرے پر مزید سرخی آتی ہے۔ وہاں اس منحوس رات کو اس منحوس ڈیرے کی ناپاک دہلیز پر بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ بیٹی کے درد سے کراہتے ہوئے بوڑھے کی ساری آہ و بکا بے کار جا رہی تھی۔ ہاں...... ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رستم کے رستم ڈاکو بننے کی کہانی بہت پرانی ہے۔ وہی داستانِ لہو رنگ، وہی حکایتِ خونچکاں۔

بوڑھا بک رہا تھا۔ اس کا جواں سال بیٹا باپ کے حکم سے ساکت کھڑا تھا۔ پھر کسی اندرونی کمرے سے زاہدہ کی کرب ناک چیخیں سنائی دی تھیں۔ ''بچاؤ...... خدا کے لئے بچاؤ۔''

جب زاہدہ اس انداز میں فریاد بلند کرتی ہے تو کوئی رستم اپنی جگہ ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا اور نہ ہی کوئی باپ مزید صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ رستم کے باپ نے اغوا کنندگان کے بے رحم قدموں سے سر اٹھایا تھا اور غم سے بے حال ہو کر ڈیرے کے بند دروازوں کی طرف لپکا تھا۔ یہ لپک ایک طرح سے جوان بیٹے کے لئے بھی اشارہ تھی کہ اب وہ مزید

ساکت کھڑا نہ رہے۔ رستم نے یہ اشارہ وصول کیا تھا اور دیوانہ وار نمبردار کے بیٹوں کی طرف بڑھا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور طوفان کی بدترین یورش سے مشابہ تھا۔ نوجوان رستم اپنی بڑی بہن کی حفاظت کے لئے سراپا قہر بن کر ڈیرے والوں سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی لیکن اس ایک گولی کے بدلے اپنے دشمنوں کے جسموں میں اس نے کم و بیش پانچ برسٹ اُتار دیئے۔ یہ برسٹ انہی سے چھینی گئی ایک سیون ایم ایم گن سے مارے گئے تھے۔ نمبردار کرامت علی کے دو بیٹوں اور ایک داماد سمیت چار افراد موقع پر ہلاک ہوئے (جب کہ نمبردار کرامت کا ایک اور کاما ہسپتال میں پہنچ کر چل بسا) اپنی آپو کو لے کر جب رستم اسلحہ لہراتا ہوا ڈیرے سے باہر نکلا تو دور دور کسی مدِمقابل کا پتا نہ تھا۔ جو دو چار بچ نکلے تھے وہ جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ رستم کا والد ڈیرے کے برآمدے میں زخمی پڑا تھا۔ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا اس کے چہرے پر جان کنی کی کیفیت تھی مگر بیٹی کا ہاتھ بھائی کے مضبوط اور محفوظ ہاتھ میں دیکھ کر یہ کیفیت یوں غائب ہو گئی تھی جیسے صحرا کی دھوپ گھٹاؤں کی آمد سے غائب ہوتی ہے۔ رستم اور اکرام کے ساتھیوں نے رستم کے باپ کو ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن اس ''سرخرو بوڑھے'' نے راستے میں ہی جاں، جانِ آفریں کے سپرد کر دی تھی۔ اکرام کو بھی نہایت مخدوش حالت میں لاہور کے میو ہسپتال پہنچایا گیا۔ حاکو کو تھپڑ مارنے کے جرم میں نمبرداروں نے اس کا جسم زخم زخم کر دیا تھا اور دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ زیادہ خون بہہ جانے کے سبب لگتا تھا کہ اکرام بچ نہیں پائے گا لیکن اس کی زندگی باقی تھی لہٰذا اسے بچانے کے لئے ڈاکٹروں کی کوششیں کامیاب رہیں۔

اس کے بعد کی کہانی طویل تو ہے مگر اَن سنی اور انوکھی نہیں، رستم کے دشمن طاقت ور تھے اور پولیس اکثر طاقت وروں کے ساتھ ہوتی ہے۔ انصاف کی توقع عبث تھی۔ رستم کچھ عرصہ کراچی میں چھپا رہا پھر علاقہ غیر کی طرف نکل گیا۔ وہیں اس کے تعلقات ایک بڑے ڈکیت گینگ سے بن گئے۔ ''ڈیرے والے'' خونی واقعے کے تقریباً ایک سال بعد ایک تاریک رات میں رستم ایک بار پھر اپنی آپو زاہدہ کے گاؤں میں نمودار ہوا لیکن اس رات وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کے گروہ کے کئی خطرناک آدمی تھے۔ انہوں نے پہلے نمبردار کی حویلی پر حلہ بولا اور نمبردار کرامت کے دو بھائیوں کو قتل کر کے ان کی تجوری سے کئی لاکھ کے زیورات اور کئی لاکھ نقد لوٹ لئے۔ نمبردار کرامت نے اکرام پر کئی مقدمات بنوا رکھے تھے اور اس کی

تین چوتھائی زمین پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ اس زمین کی قیمت ''ڈاکو رستم سیال'' نے نمبردار کرامت کی تجوری سے پوری کر لی تھی۔ اکرام ان دنوں ضمانت پر گھر آیا ہوا تھا۔ ڈاکے اور قتل کے بعد رستم نے بیمار بہن اور بہنوئی کو اپنے ساتھ لیا اور علاقہ غیر میں لے آیا۔ رستم اب ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ واپس جائیں لیکن دوسری طرف وہ انہیں اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے انہیں کچھ عرصہ بڑی رازداری کے ساتھ ہری پور میں رکھا۔ پھر انہیں گوجر خان کے اس قریبی قصبے میں لے آیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی بہن اور بہنوئی کے لئے یہ مقام محفوظ ترین ہے۔ ان کی یہاں موجودگی کے بارے میں آج تک زوار اور شیری کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ رستم نے بڑی بہن اور بہنوئی سے اپنے سر پر ہاتھ رکھوا کر یہ قسم لے رکھی تھی کہ وہ کسی بھی صورت اس قصبے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ ان دونوں کا کوئی ایسا تھا بھی نہیں جس کے لئے انہیں باہر نکلنے کی شدید تمنا ہوتی۔ اب ان کے دو بچے تھے اور انہوں نے اپنی مختصر سی دنیا اسی چھوٹے سے گاؤں نما قصبے کے اندر بنالی تھی۔ قصبے کے ساتھ ہی کچھ زمین تھی جسے اکرام، کھیت مزدوروں کے ذریعے کاشت کرواتا تھا۔ اس زمین سے اسے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ اس کا چھوٹا سا گھرانہ خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس قصبے میں اکرام ...... محمد شریف کے نام سے مقیم تھا اور مقامی لوگ اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ رستم کی آپو زاہدہ ...... بھی اصل نام کے بجائے نسرین کے نام سے یہاں مقیم تھی۔

سوچتے سوچتے رات کے کسی پہر اسے نیند آگئی ...... صبح سویرے آنکھ کھلی تو ٹانگوں پر دباؤ کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا آپو زاہدہ پائنتی کی طرف بیٹھی ہولے ہولے روئی کے ساتھ اس کی پنڈلیوں کے زخموں کو صاف کر رہی ہے۔ رستم نے جلدی سے روئی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ ''آپو، کیا کرتی ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ...'' وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

آپو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے ماں کی طرح دیکھتی ہوں۔ تیری ذرا سی تکلیف پر دل رونے لگتا ہے۔ یہ تو پھر اتنے سارے زخم ہیں۔''

رستم نے اسے اپنی چوٹوں کے حوالے سے تسلی تشفی دی۔ کچھ دیر بعد آپو اس موضوع کی طرف آگئی جس سے رستم بچنا چاہتا تھا۔ اس نے آنکھوں میں تھوڑی سی شوخی بھر کر رستم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''رستم! جاتے ہوئے تم نے کہا تھا۔ اس مرتبہ آؤں گا تو کُڑی (لڑکی) ساتھ لے کر آؤں گا۔ بتا، لایا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں۔'' رستم نے توقف کے بعد ہولے سے کہا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کر... '' آپو زاہدہ نے تھوڑا سا مزید جھک کر رستم کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ وہ خاموش رہا۔

''کیا بات ہے رستم ...... تُو ایک دم اُکھڑا اُکھڑا لگتا ہے۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

رستم کے جی میں آئی کہ کہہ دے ...... ہاں مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ شاید کبھی نہیں۔ مگر پھر اسے بہنوئی اکرام کی بات یاد آئی۔ اکرام نے کہا تھا بہن سے کوئی دل شکنی کی بات نہ کرنا ...... وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپو! کوئی مسئلہ نہیں ہے بس ابھی وہ نہیں آئی ہے۔''

''کیوں نہیں آئی ہے، ابھی کتنا انتظار کرانا ہے اس نے ......؟''

''آپو! ہمارا اس پر کوئی زور تو نہیں ہے ناں۔ ہم اس کا رستہ دیکھ سکتے ہیں پکڑ کر تو نہیں لا سکتے ...... اگر ...... فرض کیا وہ نہ بھی آئے تو یہ دکھ بھی سہنا پڑے گا ہمیں۔''

''خبردار ...... ایسی بات کی تو۔'' آپو نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''کیوں نہیں آئے گی وہ ...... اسے آنا پڑے گا۔ تُو نے جس طرح چاہا ہے اسے وہ پتھر اور لوہے کی بھی ہو گی تو موم ہو جائے گی۔ اگر نہ ہو گی تو پھر وہ عورت ہی نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو آپو! میں نے کیا کیا ہے اس کے لئے۔ اگر کچھ کیا ہے تو اس نے کیا ہے۔''

''کیوں نہیں کیا تم نے ......'' آپو نے لاڈ سے اس کا سر چوما۔ ''تُو نے اس کے لئے خود کو بدلا ہے۔ اپنے سارے سنگی ساتھی چھوڑے ہیں۔ اپنی ہر دوستی دشمنی بھلائی ہے۔ حلال کی روٹی روزی کی طرف آیا ہے۔ نیکی کا رستہ چنا ہے۔ اپنی پوری حیات کا نقشہ بدل کر دکھایا ہے تُو نے۔ وہ اوپر والا کیوں تیری مدد نہیں کرے گا اور وہ خود کیوں تیری طرف نہیں آئے گی۔ وہ آئے گی اور اسے آنا پڑے گا، اگر رستے میں کوئی چھوٹی موٹی رکاوٹ بھی آئی ہے تو دور ہو جائے گی، تُو دیکھ لینا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں رات دن تم دونوں کے لئے دعا کرتی ہوں۔''

رستم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بڑی بہن کی باتیں اس کے دل کو مزید زخمی کر رہی تھیں۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا، رستم اپنا بہت کچھ لٹا آیا ہے اور جو باقی بچا ہے وہ بھی جلد لٹانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اب بھی اسے نیکی کے رستے کا راہی سمجھ رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ صوبے بھر کی پولیس پھانسی کا پھندا لے کر اس ''راہی'' کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ وقت کے سارے اشارے ماضی کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ سارے کے سارے۔

آپوزاہدہ اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی الماری کی طرف گئی۔ وہاں سے وہ سُرخ رنگ کا ایک خوبصورت کامدار جوڑا نکال لائی۔ ''یہ دیکھ رستم، میں نے تو تیری دوہٹی کا جوڑا بھی بنالیا ہے۔ سمجھ لے روپے میں سے بارہ آنے کام میں نے مکمل کر لئے ہیں۔ ایک بڑا ہار اور دو چوڑیاں تو میں نے اسے اپنے زیوروں میں سے ڈالنی ہیں۔ تُو جو مرضی کہہ لے لیکن یہ کام تو میں نے کرنا ہی کرنا ہے۔ بے بے جی کے دیئے ہوئے چار کڑوں میں سے دو کڑے بھی تیری دوہٹی کے ہیں۔ باقی جو زیور چاہئے وہ تُو مجھے شہر سے خود لا دینا۔ کم از کم تین سیٹ تو ضرور ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ ڈیڑھ لاکھ کا خرچا ہو جائے گا...... پچھلی دفعہ تُو نے بتایا تھا کہ لاہور میں آفندی کے ساتھ لوہے کا کام چل نکلا ہے۔ ابا جی کہا کرتے تھے، چلتے کام میں سے ضرورت کے مطابق پیسہ نکال لیا جائے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آئی چلائی ہوتی رہتی ہے......'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آفندی کے ساتھ معاملہ ٹھیک چل رہا ہے ناں؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' رستم نے کہا۔

''وہ خود بھی ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر رات بھر ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ رسے سے اُلٹے لٹکے رہنا ٹھیک ہوتا ہے تو وہ ٹھیک ہی ہے اور اگر اسی حالت میں تڑپ تڑپ کر صبح دم جان دے دینا ٹھیک ہوتا ہے تو وہ ٹھیک ہی ہے لیکن وہ یہ کہہ نہیں سکا۔

اسی دوران میں آپو زاہدہ کے دونوں بچے سرمد اور عاشی بھی جاگ گئے۔ وہ ماموں...... ماموں کہتے ہوئے رستم کے دونوں پہلوؤں میں بیٹھ گئے۔ پہلے تو وہ اس کی چوٹوں اور زخموں کو دیکھ کر پریشان ہوئے پھر دھیرے دھیرے معمول پر آگئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ عاشی حسبِ عادت اس کے ساتھ لگ کر بیٹھنے اور گود میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرکاری پسٹل کو رستم نے رات کو ہی چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا لیکن ماؤزر اور ایک فٹ لمبا چھرا ابھی تک اس کی قمیص کے نیچے تھے۔ رستم کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھولوں جیسی یہ بھانجی جان لیوا اسلحے کی سختی سے نہ چھو جائے۔ ایسے میں بڑی بہن کے سامنے یہ راز فاش ہو سکتا تھا کہ رستم خوفناک ہتھیاروں کے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ وہ بھانجی کو خود سے ذرا فاصلے پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا اور بات صرف بھانجی کی ہی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اب ''ساری دنیا'' کو ہی خود سے ذرا دور رکھنے کی کوشش کرے۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے گرد موت کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ زیادہ دیر جیتے جاگتے لوگوں میں نہیں رہ سکے گا۔

وہ بھانجے اور بھانجی سے بڑی محبت سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اس سے ''شہروں کے شہر'' لاہور کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا ماموں لاہور سے نہیں خونخوار تاؤ حشام کی حویلی سے نکل کر آیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں لاہور کے نظاروں کی بجائے سرکنڈوں میں بکھری ہوئی لاشوں کے مناظر ہیں...... اور اس کے لباس میں لاہور کی کوئی سوغات نہیں ہے، سرکنڈے کاٹنے والا ایک فٹ لمبا چھرا ہے۔ ایسا چھرا جس کی دھار پر کئی مقتولوں کا خون ہے۔

آپوزاہدہ اس کے لئے دیسی گھی میں مرغی بھون رہی تھی۔ حلوہ بنا رہی تھی۔ پراٹھے تیار کر رہی تھی اور وہ اس کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باورچی خانے کی طرف سے آپوزاہدہ کی آواز آئی۔ ''رستم! اٹھ جا پیشی (ظہر) کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز پڑھ لے۔''

رستم نے ''اچھا'' کہا اور کمرے کی طرف جانے کی بجائے سُستی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر چلا گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ لمحہ بہ لمحہ اس کے رگ و پے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ آگ اتنی شدید تھی کہ ارد گرد سے آنے والی آوازیں اس کی پھنکاروں میں دب کر رہ جاتی تھیں۔ اس کی روح جیسے اس آگ کی جان لیوا تپش میں رقصِ بسمل کر رہی تھی۔

رات گیارہ بجے کے قریب رستم کو ایک ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے اپنے بہنوئی اکرام سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اکرام نے اپنی سمجھ کے مطابق شاید اچھا ہی کیا ہو لیکن رستم کے نقطہ نظر سے یہ ہرگز مناسب نہیں تھا۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور زوار اور شیری اندر آگئے۔ ان کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی ایک اور لڑکی بھی تھی۔ زوار تیزی سے آگے بڑھا۔ پھر اس کا چوڑا سینہ رستم کے کشادہ سینے سے آن ملا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ شیری بھی آنکھوں میں آنسو لئے سامنے کھڑی تھی۔ رستم نے بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی ساتھی لڑکی اندر چلی گئی تھی۔

رستم نے شکوہ کناں نظروں سے بہنوئی اکرام کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ زوار نے نگاہوں کے اس ٹکراؤ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''رستم! بھائی اکرام کو گھورنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے صرف اطلاع دی تھی کہ تم آئے ہوئے ہو۔ باقی کی ساری کارروائی ہماری اپنی ہے اور تم تفصیل سے سنو گے تو مان لو گے کہ ہمارا یہاں آنا خاص طور سے میرا آنا بہتر تھا۔''

رستم اور زوار اندر کمرے میں چلے گئے۔ اچانک ہی بارش شروع ہوگئی تھی۔ شاید اولے بھی پڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کمبل لپیٹ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ آپو ان کے لئے چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے آئی۔ زوار نے کہا۔

"کہاں چھپ گئے تھے یار! تیرے لئے اتنی خاک چھانی ہے میں نے کہ سمجھو خاک کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ شیری اور نادیہ نے میری جان کھا رکھی تھی۔ رات دن مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتی تھیں۔ انہیں شک تھا کہ میں جانتا ہوں اور تمہیں پتا ہی ہے، میں کتنا جانتا تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ تمہارے پاس شانی کا ایک موبائل نمبر ہے اور تم اس نمبر کی کھوج میں لاہور گئے ہو۔ اس کے بعد ایک دم خوفناک خبریں آنا شروع ہوگئیں۔ پہلے پتا چلا کہ لاہور پولیس نے تمہیں چوہدری بشیر کی کوٹھی کے اندر سے پکڑ لیا ہے۔ تم شدید زخمی حالت میں ہو۔ پھر اطلاع آئی کہ پولیس کی گاڑی تمہیں ہسپتال لے جا رہی تھی کہ راستے میں تمہارے ساتھیوں نے تمہیں چھڑا لیا ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ کون سے ساتھی ہیں جنہوں نے چھڑایا ہے۔"

"نہیں زارے! میں چوہدریوں کے پاس ہی تھا۔"

"وہ تو تمہاری حالت دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے۔" زوار نے رستم کے زخموں پر تاسف بھری نگاہ دوڑا کر کہا۔ پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔ اس نے پوچھا۔ "آفندی کو ہسپتال سے اٹھا لیا گیا ہے۔ کچھ پتا ہے اس کے بارے میں؟"

"ہاں پتا ہے۔ جان سے مار دیا ہے انہوں نے۔" رستم کی آواز کرب میں ڈوبی تھی۔

"کک...... کیسے؟" زوار نے ششدر لہجے میں پوچھا۔

"وہ ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ رات بھر چھت سے الٹا لٹکا رہا اور صبح سویرے دم توڑ گیا۔" رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

"اوہ میرے خدا!" زوار اندوہ کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "شانی صاحبہ کہاں ہیں؟"

"بی بی جی پر بھی بڑی سختیاں کی گئی ہیں زارے! میں سب کچھ بھول سکتا ہوں لیکن دو باتیں نہیں۔ ایک آفندی کی موت اور دوسری بی بی جی کے ساتھ ہونے والی گستاخیاں۔ شاید...... شاید آفندی کی موت بھی کبھی بھول ہی جائے لیکن بی بی جی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا اور نہ معاف کروں گا۔" رستم کے لہجے میں ایسی آتش تھی جس نے زوار جیسے شخص کو بھی لرزا دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہیں ڈھونڈنے کے لئے جو جو کوششیں کی ہیں ان کی تفصیل میں جاؤں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ مختصر یہ سمجھو کہ دو دفعہ پولیس سے ٹاکرا ہو چکا ہے اور دو ہی دفعہ نارپور کے بلی ماروں سے مارا ماری ہوئی ہے۔ بلی ماروں سے آخری جھگڑا کوئی تین ہفتے پہلے نارپور کے قریبی گاؤں سلطان پورہ میں ہوا ہے۔ دو بندے ان کے زخمی ہوئے تھے، دو ہمارے۔ یہ دیکھو تمہارے پیار کی ایک نشانی۔" زوار نے پنڈلی پر سے پتلون اٹھا کر رستم کو گولی کا زخم دکھایا۔ گولی ایک طرف سے گوشت کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم ابھی کچا تھا پوری طرح بھرا نہیں تھا۔

رستم نے ایک سرد آہ بھری۔ "میرا خیال چھوڑ دے زارے! بس مجھے میرے حال پر رہنے دے۔"

"میں بھائی اکرام کی طرح بے خبر نہیں ہوں رستم! میں جانتا ہوں تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو۔ ویسے تو بھائی اکرام کو بھی تھوڑا بہت شک ہو چکا ہے۔ انہوں نے فون کر کے مجھے اور شیری کو اسی لئے یہاں بلایا تھا کہ ہم تم سے اندر کی بات معلوم کریں۔"

"کون سی اندر کی بات؟"

زوار کے چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک روز پہلے کا مڑا تڑا اخبار برآمد کیا۔ اخبار کے اندر کے صفحے پر ڈیک نالے کے کنارے قتل ہونے والے پولیس اہلکاروں کی خبر نمایاں سُرخی کے ساتھ موجود تھی۔ خبر کا متن کچھ اس طرح تھا۔

"کٹھولی گاؤں کے میلے میں ایک دیہاتی کو قتل کر کے فرار ہونے کے بعد رستم سیال نے ایک اور خونی واردات کی ہے۔ رستم اور اس کے ساتھیوں نے مہتم بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے چار افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ ان میں سے تین حاضر سروس پولیس اہلکار ہیں۔ اس طرح اب تک رستم کے ہاتھوں جان گنوانے والے پولیس ملازمین کی کُل تعداد پانچ ہو چکی ہے۔ اس تازہ کارروائی کے بعد رستم کو زندہ یا مُردہ پکڑنے کے لئے "پولیس کارروائیاں" تیز تر ہوگئی ہیں۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے حوالے سے شہرت پانے والے ڈی ایس پی ریاض کو رستم کی گرفتاری کا مشن سونپا گیا ہے۔ آج گوجرانوالہ میں ایک پریس کانفرنس کے دوران میں ڈی آئی جی صاحب نے اس بارے میں تفصیلات بتائی ہیں۔ دریں اثناء اطلاع ملی ہے کہ مبینہ طور پر رستم کی منظورِ نظر شہناز بی بی (شانی) نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ شہناز بی بی کے وکیل معروف ایڈووکیٹ ہمدانی کا کہنا ہے کہ میری مؤکلہ

شہناز بی بی چوہدری کا رستم سیال سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بارے میں جو کچھ بھی کہا جا رہا ہے وہ الزام تراشی کے زُمرے میں آتا ہے اور یہ الزام تراشیاں شہناز بی بی کے سابقہ سسرالیوں کی طرف سے کی جا رہی ہیں......"

رستم خبر دیکھ چکا تو زوار نے پوچھا۔ "کیا شانی بی بی واقعی پولیس کے پاس ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ بی بی کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ بھی تو نہیں تھا۔"

"خیال ہے... سے کیا مطلب ہے؟ کیا آخر میں بی بی سے تمہاری بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" رستم نے کہا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ بی بی نے جو کچھ کیا اپنے طور پر کیا۔ تمہیں اعتماد میں نہیں لیا؟"

"وہ اپنے بارے میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہیں زوار! وہ کوئی ہماری باندھی ہوئی تو نہیں ہیں۔"

"یار! یہ کیسی بات کر رہے ہو۔ تمہاری اچھی بھلی زندگی ایک بار پھر تباہی کے رخ پر مڑ گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف بی بی کو بچانے کے چکر میں ہوا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس وقت بی بی تمہارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوتیں لیکن اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو پھر بھی...... یہ تو ہونا چاہئے تھا کہ بی بی جو کرتیں مشورے سے کرتیں۔"

"مشورہ کیا کرنا تھا؟ انہوں نے جو کیا وہی مناسب رستہ تھا زارے۔"

"لیکن کیا آخر میں ملاقات بھی نہیں ہوئی تمہاری۔ پرسوں تک تم دونوں ساتھ تھے۔"

"بی بی کے آنے سے پہلے میں خود ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔"

زوار نے رستم کی آنکھوں میں جھانک کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بی بی کا فیصلہ تمہارے بارے میں کیا ہونا ہے۔"

رستم کے چہرے پر ایک دم خون کی سُرخی دوڑ گئی۔ "نہیں زارے! دوست ہو کر زخم مت لگاؤ۔ میں بی بی کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہے، اچھا کیا ہے۔ آئندہ بھی وہ جو کریں گی اچھا کریں گی۔ تم نہیں جانتے زارے، بی بی کے تو احسان ہی احسان ہیں۔ مہربانیاں ہی مہربانیاں ہیں۔ یہ زندگی...... یہ زندگی انہی کی دی ہوئی ہے زارے! پیدا کرنے والے کی قسم، ایسی سو زندگیاں ان پر قربان۔ تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ اگر..." رستم کی آواز بھرا گئی۔ بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

زوار نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے بس یہ کہا تھا رستم کہ بی بی کو تم سے آئندہ کے بارے میں مشورہ کرنا چاہئے تھا۔"

"پھر وہی بے وقوفوں والی بات کر رہے ہو۔" رستم بولا۔ "وہ بی بی کی زندگی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنے کا انہیں پورا حق ہے۔ میں ان کی زندگی میں دخل دینے والا کون ہوتا ہوں۔ میرے لئے ان کا مقام بہت اونچا ہے زارے! تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، نہیں سمجھ سکتے۔"

زوار عجیب نظروں سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ رستم کے لہجے کا کرب اور گہرائی کو محسوس کر کے وہ اندر تک لرز گیا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا جیسے رستم کسی اور دنیا کا بندہ ہے۔ وہ جس رستم کو جانتا تھا وہ دھیرے دھیرے ایک انوکھے جذبے کی وسعتوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص سے مخاطب ہے جو بس عشق کھاتا ہے، عشق پہنتا ہے، عشق اوڑھتا اور عشق میں ہی سانس لیتا ہے۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "رستم! ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں بات نہیں کرتا لیکن یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"اب کوئی ارادے نہیں ہیں زارے! جدھر یہ طوفان لے جائے گا اس طرف چلا جاؤں گا۔"

"ایک بات بھول نہ جانا رستم!" زوار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہر بندے کا اپنا اپنا طوفان ہوتا ہے لیکن ہم دونوں کا طوفان ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور آئندہ بھی ایک ہی رہے گا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں یاد ہوگا رستم! جب تم بی بی کے لئے بدلے...... تو تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی بدل لیا۔ مجھے کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر اسی راستے پر لے آئے جس پر تم خود تھے...... اور میں آ گیا۔ ساری دشمنیاں، سارے حساب کتاب اور ہنگامے بھلا دیئے میں نے۔ ہر جرم سے ہاتھ کھینچ لیا اور اب ایک بار پھر تم بدل رہے ہو اور اس بار بھی تم اکیلے نہیں بدلو گے۔ اگر بدلیں گے تو دونوں ساتھ بدلیں گے۔"

رستم نے اپنی آتشیں نگاہیں اٹھا کر زوار کو گھورا۔ "نہیں زوار! میں ایسا نہیں کرنے دوں گا تمہیں۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہارا گھر ہے، تمہارا ہونے والا بچہ ہے۔ تمہاری ایک زندگی ہے۔ میں اس زندگی کو کسی صورت تباہ نہیں ہونے دوں گا۔"

"میری زندگی میں تم بھی شامل ہو رستم! اگر تم تباہ ہو رہے ہو تو پھر میں تباہی سے بچ

نہیں سکتا۔"

"نہیں زارے!" رستم نے زوار کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "ایسا مت سوچو۔"

اس کمرے میں تابڑ توڑ بارش کے دوران میں وہ کمبلوں میں لپٹے بیٹھے رہے۔ ان کے سامنے سگریٹوں کے ٹکڑے گرتے رہے اور ان کی طویل بحث مختلف نشیب و فراز طے کرتی رہی۔ ایک لمبی اور تکلیف دہ کوشش کے بعد رستم زوار کا ابال کم کرنے میں کامیاب رہا۔ کم از کم وقتی طور پر تو یہی لگا کہ اس نے زوار کو نیم قائل کر لیا ہے۔ رستم نے زوار سے بحث کرتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا کہ اس کے ساتھ مل کر پولیس کے آگے آگے بھاگنے سے بہتر ہے کہ زوار خود کو یکسر علیحدہ رکھے اور اپنے ڈھنگ سے حاجی حیات خان کے ساتھ مل کر رستم کی مدد کی کوشش کرے۔

بحث کے آخر میں جیسے رستم کو اچانک کوئی بات یاد آئی ہو اور اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون آئی ہے؟"

زوار نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔ "میرے جواب سے تمہاری پُوشل پر پھر پاؤں آ جائے گا۔ آگ بگولہ ہو جاؤ گے۔"

"اچھا نہیں ہوں گا آگ بگولہ۔"

"وہ نادیہ ہے۔" زوار نے انکشاف کیا۔ "ہر صورت ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ہم اسے زیادہ سختی سے روک نہیں سکے۔"

کچھ دیر کے لئے رستم گم صم ہو گیا۔ نادیہ کی آمد کی اطلاع اس کے لئے واقعی پریشان کن تھی۔

کمرے کی فضا گھمبیر تر ہو گئی۔ زوار نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں تمہارے بعد اس کی کیا حالت رہی ہے رستم۔ بیچ میں ایسے لگنے لگا تھا کہ ختم ہی ہو جائے گی۔ سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اب بھی پوری طرح سنبھلی نہیں۔ رنگ زرد ہے۔ وزن کم ہو گیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ نیم بے ہوش ہونے لگتی ہے۔"

رستم سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہے۔ زوار بولا۔ "ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے دل پر بہت اثر لیا ہے۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ یہ اس اثر سے نکلے اور خوش رہے۔ اب یہ بات تو ہم ہی جانتے ہیں کہ یہ کیسے خوش رہ سکتی ہے یا پھر تم جانتے ہو۔"

"یار! تمہیں اسے یہاں نہیں لانا چاہئے تھا۔" رستم بجھے بجھے لہجے میں بولا۔

"میں نے نہیں لانا تھا لیکن شیری سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ بالکل ہلدی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی گر جائے گی۔ دونوں رونے لگیں۔ ماسی زینب نے مجھے جھڑکا کہ اگر اسے ایسے ہی رُلانا ہے تو گلا گھونٹ کر ختم کر دو۔"

قریباً دس منٹ بعد نادیہ کسی قصوروار کی طرح سر جھکائے رستم کے سامنے بیٹھی تھی۔ زوار اسے چھوڑ کر باہر جا چکا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ دبلی ہو گئی تھی لیکن بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ شاید زوار نے اس کے بارے میں کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ اس نے قدرے کھلے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ ہنسلی کی ہڈیاں ابھری دکھائی دیتی تھیں۔ دبلا لیکن ہیجان خیز بدن گردن سے نیچے آگے تک نظر آتا تھا۔

"میرا آنا بہت بُرا لگا ہو گا۔" وہ نظر جھکائے جھکائے بولی۔

"نہیں۔ میں نہال ہو گیا ہوں خوشی سے۔" رستم کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"تمہیں اس حالت میں دیکھ کر جان نکل گئی ہے رستم! اتنی چوٹیں، اتنے زخم! یہ سب کیسے ہوا؟"

"میں یہ سب کچھ زوار کو بتا چکا ہوں۔ اس سے پوچھ لینا۔"

وہ کتنی ہی دیر تک شکوہ کناں نظروں سے رستم کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اتنے عرصے بعد ملے ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھو گے کہ میں کیسی ہوں؟"

"اچھی بھلی میرے سامنے بیٹھی ہو۔"

اس کی کٹورہ آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ دل فگار آواز میں بولی۔ "مرتے مرتے بچی ہوں۔ سمجھو جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے۔ بت ہی بت ہے۔ اندر سے بالکل خالی ہوں اور لگتا ہے کسی دن یہ بت بھی نہیں رہے گا۔"

"میں نے کہا تھا ناں تم بہت اچھی اداکارہ ہو۔ اپنا وہ کام جاری رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"رستم! گھبراؤ مت۔ میں اب تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں جان گئی ہوں کہ تمہارے پاس مجھے دینے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ مجھے..... مجھے تمہارے اور شانی کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔"

رستم کراہ کر بولا۔ "بہتر ہے کہ تم اپنی زبان پر بی بی کا نام مت لاؤ۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی۔ "ٹھیک ہے نہیں لاؤں گی لیکن دل میں ان کے لئے جو نیک خواہشات ہیں ان پر تو تم پابندی نہیں لگا سکتے ناں۔"

"فلمی باتیں مت کرو اور نہ میرے سامنے اداکاری کی ضرورت ہے۔" رستم نے زچ ہو کر کہا۔ بولتے ہوئے اس کے گلے کی رگیں اب بھی پھولتی تھیں اور آواز بیٹھ جاتی تھی۔

رستم نے کندھوں پر چادر درست کرنے کے لئے پلو کو حرکت دی تو قریب رکھا ہوا کپ الٹ گیا اور ٹھنڈی چائے فرش پر گر گئی۔ پاس ہی رستم کی جوتی پڑی تھی، کچھ چائے جوتی کے اندر چلی گئی۔ نادیہ نے بے ساختہ جوتی اٹھائی اور اپنی رنگین اوڑھنی کے پلو کو جوتی کے اندر گھسا کر اسے صاف کرنے لگی۔

رستم نے جوتی اس سے واپس لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتی ہو؟"

"کیوں، اس میں کیا برائی ہے۔ تمہاری جوتی ہے، کسی غیر کی تو نہیں۔" وہ بے حد لگاوٹ سے بولی۔

"میں کون ہوتا ہوں تمہارا۔" وہ بھنا کر بولا۔

نادیہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم میرے بادشاہ ہو۔" وہ والہانہ انداز میں کہہ گئی۔

"دیکھو میرے پاس بے کار کی باتوں کے لئے وقت نہیں۔" رستم نے جھنجھلا کر اس کے ہاتھوں سے جوتی چھینی۔

وہ اطمینان سے بولی۔ "بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ من مرضی کرنے والے۔ چاہے تو بے وجہ خوش ہو جائیں، چاہے تو جوتیوں میں بیٹھنے والے خدمت گاروں کو بھی دھتکار دیں۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟"

اس کی آنکھیں نیم باز ہو گئیں۔ اس نے آگے جھک کر رستم کی جوتیوں کو سیدھا کر کے رکھا تو کھلے گریبان میں سے اس کا چمکیلا جسم دور تک نظر آنے لگا۔ دیگر خطوط بھی واضح تر ہو گئے یوں لگتا تھا وہ اپنے چنگھاڑتے، دہاڑتے جسم کے خطوط کو فطری انداز میں نمایاں کرنے کا فن بڑی اچھی طرح جانتی ہے۔ رستم کے سوال کے جواب میں وہ بولی۔ "جان کی امان پاؤں تو بتا دوں، کیا چاہتی ہوں؟"

رستم خاموش رہا۔ وہ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بولی۔ "بادشاہ کی ایک ملکہ ہوتی ہے جس سے وہ بے حد پیار کرتا ہے۔ وہ اس کے سر پر عزت کا تاج رکھتا ہے۔ تخت پر اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔ وہ اس کے لئے تخت و تاج کا وارث پیدا کرتی ہے۔ اس کے شہزادے، شہزادیوں کی ماں بنتی ہے۔ کہانی میں شروع سے آخر تک وہ چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس کہانی میں ایک اور کردار بھی ہوتا ہے۔ ایک کنیز کا، ایک زرخرید لونڈی کا۔ وہ محل کی کسی غلام

گردش کے کسی کونے میں چپ چاپ زندگی بسر کرتی ہے۔ اپنے سارے شباب اور خوبصورتی کے ساتھ وہ بادشاہ کے کسی اشارے کی منتظر ہوتی ہے۔ اس کا دل اور جسم بادشاہ کی ملکیت ہوتا ہے۔ جب کبھی لونڈی کی قسمت جاگتی ہے، بادشاہ شب کی تاریکی میں کسی خواجہ سرا کو بھیجتا ہے اور اسے اپنی خلوت میں بلا لیتا ہے۔ وہ شاداں آتی ہے اور بڑی محبت سے خود کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اپنی پوری جوانی میں لونڈی کو ایسی چالیس پچاس راتیں بھی مل جائیں تو وہ اسے بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہے۔"

"تم یہ فضول بکواس بند کر دو تو اچھا ہے۔" رستم پھنکارا۔

وہ بدستور خواب ناک لہجے میں بولی۔ "تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے رستم؟ میں اپنے لئے ملکہ کا نہیں لونڈی کا کردار چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں ملکہ کا کردار تم کسی اور کو دے چکے ہو۔"

رستم تیزی سے اٹھا اور جوتی پہن کر چادر جھٹکتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باورچی خانے میں شیری، زوار، زاہدہ اور بھائیا اکرام بیٹھے تھے۔ زاہدہ اصل صورت حال سے یکسر بے خبر تھی اس لئے وہ خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ زوار کی طرف اشارہ کر کے شیری سے کہہ رہی تھی۔ "اس کو جلدی سے ایک بچے کا باپ بنا دو پھر اس کے لڑائی جھگڑے ایک دم ختم ہو جائیں گے۔ بالکل اچھا بچہ بن جائے گا۔"

"ہماری گورنمنٹ اپنے تجربے کی بات کر رہی ہے۔" بھائیا اکرام نے ہولے سے کہا۔

"ہمارے تجربے آپ لوگوں کی ہوشیاری کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔" شیری نے منہ بنا کر کہا۔ "کسی نے سچ کہا ہے، مرد حضرات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں اور کچھوے کی طرح خود کو اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں۔"

"ہر بُری مثال کے لئے مذکر کا صیغہ کیوں استعمال کرتی ہو؟ کچھوا ہی تو نہیں چھپاتا، کچھوی بھی تو خود کو چھپاتی ہے۔" زوار نے بے دلی سے فقرہ کسا۔

"لو جی، ایک اور کچھوے صاحب آ گئے ہیں۔" آپو زاہدہ نے رستم کو آتے دیکھ کر کہا۔ باقی سب خاموش رہے۔ آپو زاہدہ خود ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "دیکھو بھئی اسے گود میں کھلاتی رہی ہوں۔ بچپن میں اسے گڈا بنا کر اس کے چہرے پر سہرا سجاتی رہی ہوں۔ اب اصلی سہرا سجانے کا وقت آیا ہے تو یہ کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں کرتا۔"

بھائیا اکرام نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "سہرا باندھنے کا وقت آیا نہیں، گزرا جا رہا ہے۔"

''اور نہیں تو کیا۔'' آپو نے تائید کی۔ ''اس کی عمر کے تین تین بچوں کے باپ ہیں۔''

رستم کے چہرے پر مسکراہٹ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کچھ یہی کیفیت زوار کی تھی۔

زوار رستم کو لے کر چھت پر چلا گیا۔ سطح مرتفع پر قصبے کے نشیب و فراز نظر آ رہے تھے نیچی چھت والے گھروں میں بلب اور ٹیوب لائٹس کی روشنی تھی۔ جہاں روشنیاں ختم ہوتی تھیں وہاں سے آگے گہری تاریکی تھی۔ رستم کی آنکھیں اس تاریکی میں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تاریکی میں خطروں کے سانپ منڈلا رہے ہیں۔ بے شمار قاتل آنکھیں اسے ڈھونڈنے کے لئے شہر شہر، گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھیلی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے، کچھ نہایت مؤثر لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب رستم کو تادیر زندہ نہیں رہنے دیں گے۔

''اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' زوار نے بے حد گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں بتا تو چکا ہوں سب کچھ..... آج صبح سویرے نکل جاؤں گا۔''

''شیرے کے پاس جاؤ گے؟'' زوار نے رستم کے ایک پرانے ساتھی کا نام لیا۔

''دیکھوں گا، شاید وہی مل جائے۔'' رستم نے مبہم انداز میں جواب دیا۔

''میں کیا کروں؟'' زوار نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔

''کچھ عرصہ کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤ۔ جن دوستوں سے رابطہ ہو ان کو بھی پوری طرح ہوشیار کر دو۔ پولیس انہیں تنگ کرنے کی کوشش کرے گی۔ جو ایک دو نام میں نے تمہیں بتائے ہیں، ان کے لئے تو زیادہ خطرہ ہے۔ انہیں تو ایک دو ماہ تک بالکل نظر نہیں آنا چاہئے۔ اگر پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو سامنے آئے بغیر فون کے ذریعے حاجی حیات سے رابطہ کرنا...... وہ پوری طرح چوکس ہے۔''

''اپنی بی بی جی کی طرف سے تو اطمینان ہے تمہیں؟'' زوار نے پوچھا۔

''اطمینان نہ ہوتا تو انہیں چھوڑ کر کیوں آتا۔ وہ اپنے وارثوں میں پہنچ چکی ہے۔ انہیں قانونی چکروں سے نکالنے کے لئے بڑے اچھے وکیلوں کا انتظام کر لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حاجی بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہے گا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''اور میں بھی بے خبر نہیں رہوں گا۔''

''لیکن تمہاری طرف سے کون باخبر رہے گا؟'' زوار نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''میری طرف سے باخبر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' رستم نے عجیب روکھے لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہے کہ مجھے آہستہ آہستہ بھولنے کی کوشش کرو۔ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں اس پر میرا اکیلے رہنا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی یہ راستہ زیادہ لمبا نہیں ہے۔''

''میں تمہیں گولی مار دوں گا رستم۔'' زوار نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا۔

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''گولی تو اب کھانی ہی ہے۔ تم نہ مارو گے تو پولیس مار دے گی۔''

''یہ خیال دل سے نکال دو رستم! ایسا موقع آیا تو میں تم سے پہلے مرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اچھا چھوڑو، یہ دکھ دینے والی باتیں۔ میں نے بھائیا اکرام اور آپو کو کچھ نہیں بتایا۔ تم نے بھی نہیں بتانا۔ خاص طور سے آپو کے کان میں تو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہئے..... اسے یہی معلوم رہنا چاہئے کہ میں آفندی کے پاس واپس لاہور گیا ہوں۔ وہاں کام کی مصروفیت کچھ ایسی ہے کہ جلدی واپس نہیں آ سکتا۔ بھائیا اکرام کو بھی میں سختی سے کہہ جاؤں گا کہ وہ اس آبادی سے باہر نکل کر اپنے اور اپنے بچوں کے لئے جان کا خطرہ مول نہ لے..... بھائیا اکرام کو یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے سارا انتظام کر رکھا ہے۔ اسے کھاد اور بیج وغیرہ کے لئے بھی یہاں خود نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔''

''نادیہ کا کیا کرنا ہے؟'' زوار نے بے حد بجھے لہجے میں کہا۔

''تم یا میں اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ اب بھی اس کے لاکھوں چاہنے والے ہوں گے۔ اس کا اصل ٹھکانہ فلمی دنیا ہی ہے۔ پیسہ، شہرت، ترقی سب کچھ اسے وہاں سے مل سکتا ہے۔''

''لیکن وہ تو کہتی ہے.....''

''خدا کے لئے زوارے۔'' رستم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اس لڑکی کا ذکر میرے سامنے مت کرو۔ میں جو جو کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں اس کے سامنے اس فلم ایکٹریس کی حیثیت مکھی کے پر جتنی بھی نہیں۔''

کچھ دیر تک دونوں چھت کی تاریکی میں خاموش کھڑے رہے۔ درد کی ایک نادیدہ لہر سی ان دونوں کے درمیان چل رہی تھی۔ رستم اپنے دوست کے دکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے گزرے مہینوں میں بہت سے خطرے مول لے کر دیوانوں کی طرح رستم کو تلاش کیا تھا۔ اب رستم ملا تھا..... لیکن بچھڑ جانے کے لئے..... اور یہ ایسا وچھوڑا تھا جو امیدیں چھین رہا تھا اور انتظار بھی۔ اچانک زوار آگے بڑھا اور اس نے جذباتی انداز میں رستم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ دونوں دوست کتنی ہی دیر تک ایک دوجے سے بغل گیر رہے۔ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ ''اپنا خیال رکھنا یار۔'' زوار نے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں کہا۔

’’اور تم بھی۔‘‘ رستم نے کہا۔’’کبھی کبھی آپو کے بارے میں معلوم کرتے رہنا اور شیری کو بھی خوش رکھنا۔‘‘

زوار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔’’یہاں سے جاؤ گے کس طرح؟‘‘

’’تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘

’’چھ سات میل تک تو راستہ ایسا ہے کہ چھوٹی گاڑی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تم زخمی بھی ہو یار۔ میری رائے تو یہی ہے کہ تم میری والی گاڑی پر نکلو۔ جہاں تک گاڑی لے جا سکو وہاں تک لے جاؤ۔ اس کے بعد اسے چھوڑ کر پیدل آگے بڑھ جانا۔‘‘

’’اور گاڑی کا کیا ہوگا؟‘‘

’’میں اسے کسی طرح منگوا لوں گا۔ یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے اس بارے میں سوچ لیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں پتا ہے میری گاڑیاں بے شناخت ہوتی ہیں۔‘‘

دونوں دوست الوداعی انداز میں بغل گیر ہونے کے بعد بھی دیر تک چھت پر رہے اور باتیں کرتے رہے۔

☆======☆======☆

رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی لیکن سویرا ابھی تک شب کے حصار سے نکلا نہیں تھا۔ رستم ایک سفید کار ڈرائیو کرتا ہوا اونچے نیچے راستے پر جا رہا تھا۔ وہ بھائیا اکرام کے لباس میں تھا۔ سر پر ایک جالی دار ٹوپی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک شال نے اس کے بالائی جسم کو چھپا رکھا تھا۔ پوٹھوہار کی ٹھنڈی ہوا کھڑکیوں کے راستے گاڑی میں داخل ہوتی تھی اور اس کی ریشمی داڑھی میں سرسراتی تھی۔

رستم کی منزل پوٹھوہار کی لامتناہی گھاٹیاں اور کھائیاں تھیں۔ وادیِ سون ایک اسرار کی طرح اس کے اردگرد حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق کی طرف دریائے جہلم اس کی حد بندی کرتا تھا اور مغرب کی طرف دریائے سندھ۔ اس کے شمال کی جانب کالا چِٹا رینج اور مارگلہ کی بلند پہاڑیاں تھیں۔ یہ گھاٹیوں، کھائیوں، سرنگوں، کھوہ نما غاروں اور چھوٹی بڑی جھیلوں والی بے آباد وادی تھی جو ہمیشہ سے مفرور ملزموں، مجرموں اور تارک الدنیا افراد کو اپنی پُر پیچ وسعتوں میں پناہ دیتی رہی ہے۔

جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ راستہ دشوار گزار ہو رہا تھا۔ نشیب و فراز بڑھتے جا رہے تھے۔ چیڑ کے چھوٹے بڑے پودے، خودرو گھاس اور نیم پہاڑی پودے جگہ جگہ راستے کو گنجلک

کر رہے تھے۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے زوردار جھٹکا لگا۔ جسم کے کئی حصوں سے ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھیں۔ دائیں جانب پسلیوں کے زخم سے خون رسنے لگا۔ خون کی نمی اور حرکت رستم نے اپنی جلد پر محسوس کی۔ کس بات پر اسے بی بی یاد نہیں آتی تھی؟ اس بات پر بھی آئی۔ بی بی نے کہا تھا۔’’یہ زخم گہرا ہے۔ پسلی تک چلا گیا ہے، اس کی زیادہ احتیاط کرنا۔‘‘

’’ہاں...... کس بات پر بی بی یاد نہیں آتی تھی؟‘‘

ایک اور موڑ سامنے آیا۔ رستم نے رفتار آہستہ کر دی پھر بھی ایک دو جھٹکے لگے۔ رستم کو یوں لگا جیسے گاڑی کی ڈکی ٹھیک سے بند نہیں ہوئی۔ اس نے ایک بھر بھرے سے ٹیلے کے پاس گاڑی روک لی۔ پرندوں کی ڈاریں چہکارتی ہوئی سر پر سے گزر گئیں۔ دور دور تک کسی متنفس کا نشان نہیں تھا۔ اس نے چابی لگا کر ڈکی کھولی اور سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ ٹویوٹا کی کشادہ ڈکی خالی نہیں تھی۔ اس میں کوئی موجود تھا۔ یہ نادیہ تھی۔ وہ پہلو کے بل گٹھڑی سی بنی پڑی تھی اور آنکھیں پٹ پٹا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہلکی گلابی شلوار پر موبل آئل کے دھبے تھے اور گلابی پھولوں والی سفید قمیص فالتو ٹائر کے کیچڑ سے آلودہ ہو رہی تھی۔ دوپٹہ اس کے پہلو میں پڑا تھا۔

’’یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟‘‘ رستم از حد حیرت اور غصے سے بولا۔

وہ خوفزدہ انداز میں اٹھ بیٹھی پھر ہمت کر کے بولی۔’’میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے رستم۔‘‘ اس کے لہجے میں پختہ ارادہ تھا۔

رستم نے اس کے بالوں پر ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر ڈکی سے باہر کھڑا کر دیا۔ اس کی ایک سینڈل ڈکی کے اندر رہ گئی تھی۔ وہ اس نے نکال کر اپنے دودھیا پاؤں میں پہن لی۔’’تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاید۔‘‘ رستم نے بے حد زہریلے لہجے میں کہا۔

’’چلو، یہی سمجھ لو لیکن میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ نہیں مانگوں گی۔ کوئی پریشانی نہیں دوں گی تمہیں لیکن مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ پلیز رستم خدا کے لئے۔‘‘ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

’’میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔‘‘ رستم پھنکارا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نادیہ کار کی ڈکی میں کیسے پہنچی۔ جب وہ بھائیا اکرام، آپو اور زوار سے رخصت ہو کر گھر سے نکلا تو شیری اور نادیہ چارپائیوں پر سوئی ہوئی تھیں۔

بڑی جھلاہٹ کے عالم میں رستم نے کار کا دروازہ بند کیا اور اپنا بایاں ہاتھ گیئر لیور کی طرف بڑھایا۔ نادیہ نے آگے بڑھ کر اسٹیئرنگ تھام لیا۔’’نہیں رستم! تم مجھے یوں چھوڑ کر نہیں

جاسکتے۔ ایسا مت کرو۔“

رستم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ نادیہ کسی صورت اسٹیئرنگ نہیں چھوڑ رہی اور گاڑی کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ گئی ہے تو اس نے بھنا کر اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور ہلکی سی خوفزدہ چیخ کے ساتھ ایک چار پانچ فٹ گہرے کھڈ میں گر گئی۔ اس کی پشت نکیلے پتھروں سے ٹکرائی تھی۔ رستم نے اس کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے۔

”دفع ہو جاؤ۔“ رستم دہاڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کے دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں ڈنک مار رہی تھیں اور پورے جسم میں انگارے بھر گئے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ تک وہ ایسے ہی گاڑی چلاتا چلا گیا۔ پھر اچانک اس کے ذہن کا زہریلا ابال کم ہونا شروع ہوا۔ وہ قدرے منطقی انداز میں سوچنے لگا۔ وہ اس کو ایک کھائی میں دھکا دے کر چھوڑ آیا تھا۔ ممکن تھا وہ زخمی ہو گئی ہو۔ ویسے بھی یہ ایک لق دق ویرانہ تھا۔ جوان اکیلی لڑکی کا تو سایہ بھی اس کا دشمن ہوتا ہے۔ یہاں کوئی آوارہ گرد اسے مل جاتا تو کیا ہوتا؟

پتا نہیں کیوں اپنی بی بی جی کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجنے لگے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ”رستم! نادیہ کو دکھ نہ دینا۔ تمہاری وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے ہیں تو لگتا ہے، میں گناہ گار ہوں۔“

وہ یہ الفاظ کیسے بھول سکتا تھا اور بات صرف ان الفاظ ہی کی نہیں تھی۔ ہر وہ لفظ جو بی بی کی زبان سے نکلا تھا، اس کے کانوں تک پہنچا تھا۔ . . اس کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو چکا تھا۔

بی بی کے الفاظ کا خیال آتے ہی اس کے وحشی، پتھریلے دل میں عجیب سی نرمی نمودار ہو گئی۔ تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے بریک پیڈل دبایا اور گاڑی ایک ڈھلوان پر رک گئی۔ چند لمحے وہ شدید شش و پنج کی کیفیت میں رہا۔ پھر گاڑی دھیرے دھیرے ریورس ہونے لگی۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ گاڑی نے تقریباً چار منٹ میں طے کیا اور اس کھڈے کے کنارے پہنچ گئی جہاں نادیہ گری تھی۔ نادیہ اب وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ ذرا دور ایک پتھر پر بیٹھی تھی اور چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رو رہی تھی۔ اس کی دونوں کہنیاں بری طرح چھلی ہوئی تھیں۔ دائیں کان سے بہنے والا خون اس کے کندھے تک پہنچ رہا تھا۔

گاڑی کی آواز سننے کے باوجود اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رکھا۔ رستم گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ”کیا چاہتی ہو تم؟“

نادیہ نے آنسوؤں سے تر بتر آنکھوں کے ساتھ رستم کو دیکھا پھر ایک دم اٹھ کر اس کی

ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ”اپنی نوکرانی بنا کر مجھے اپنے ساتھ رکھ لو رستم! میں کچھ نہیں مانگوں گی تم سے..... کچھ نہیں کہوں گی۔“ اس نے اپنے گھٹنے پتھریلی زمین پر ٹیک رکھے تھے۔

اس کا ہیجان خیز جسم رستم کو اپنی بے پناہ موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ رستم نے اپنی ٹانگوں کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا مگر وہ جونک کی طرف چمٹ گئی تھی۔

”اچھا ٹانگیں چھوڑو میری۔“ رستم نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹانگیں چھوڑ دیں اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ رستم گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ آگے بیٹھے یا پیچھے۔ پھر رستم کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ رستم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ وہاں سے بہنے والا خون ہی اس کے کان کو رنگین کر رہا تھا۔ وقتِ رخصت زوار نے ایک بڑا سفری تھیلا گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس میں ضروری استعمال کی کئی چیزیں موجود تھیں۔ روئی اور کاٹن کی پٹی بھی تھی۔ رستم نے روئی اور کاٹن کی پٹی نادیہ کی طرف بڑھائیں۔ اس نے لرزاں ہاتھ سے یہ چیزیں پکڑ لیں اور خود ہی اپنے سر سے رستا ہوا خون روکنے میں مصروف ہو گئی۔ رستم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ رستم کا ذہن مسلسل اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ نادیہ آپو کے گھر کے اندر سے کار کی ڈکی میں کیسے پہنچ گئی۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس نے اس لڑکی سے جتنی جان چھڑانا چاہی تھی، یہ اتنی ہی اس کے گلے پڑی تھی۔ اب وہ ایک ایسے مقام پر اس کے ساتھ تھی جہاں سے وہ اسے پیچھے دھکیل سکتا تھا اور نہ اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

قریباً ڈھائی کلومیٹر مزید سفر کرنے کے بعد رستم ایک جگہ رک گیا۔ درحقیقت اس سے آگے گاڑی چلانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک سرخی مائل نیم پتھریلے ٹیلے کے دامن میں خودرو جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ رستم گاڑی کو اس جھنڈ کے نیچے لے گیا۔ انجن بند کر کے اس نے دروازے لاک کئے اور باہر نکل آیا۔ نادیہ بھی نکل آئی۔ خستہ حالت میں بھی وہ تو بہ شکن نظر آتی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر گرد تھی مگر چال ڈھال وہی تھی جو کیمرے کے سامنے ہوتی تھی۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اونچے نیچے سرخی مائل ٹیلے نظر آتے تھے۔ پوٹھوہار کی یہ وسیع و عریض سطح مرتفع اپنے سارے رنگوں، دلچسپ زاویوں اور انوکھے نشیب و فراز کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ کوئی ہوا کی آواز پر کان دھرتا تو وہ اس سے پانچ لاکھ سال پرانی تہذیب کی سرگوشیاں سن سکتا تھا۔

ایک کانٹے دار جھاڑی کے نیچے ایک خار پشت کا پنجر پڑا تھا۔ ایک نیولا اس پنجر کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ نادیہ ڈر کر پتھروں سے ذرا دور ہٹ گئی۔ وہ ہٹی تو جنگلی گھاس کے اندر سے ایک اور نیولا نکل کر بڑی سرعت سے پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

رستم نے جس مقام پر گاڑی کھڑی کی تھی وہ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی زوار اور وہ دو چار مرتبہ یہاں آچکے تھے۔ رستم نے گاڑی کی چابی گاڑی کی عقبی نمبر پلیٹ کے پیچھے گھسا دی۔ اگر زوار یا اس کا کوئی ساتھی گاڑی لینے یہاں پہنچتا تو یقیناً یہ بات ان کے علم میں ہوتی تھی کہ چابی نمبر پلیٹ کے پیچھے موجود ہے۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے رستم نے اپنی انگلیوں کے نشان گاڑی کے اسٹیئرنگ اور ہینڈلوں وغیرہ سے صاف کر دیئے تھے۔

اس طرف سے تسلی ہونے کے بعد اس نے سفری بیگ کندھے سے لٹکایا اور دشوار گزار راستے پر سفر شروع کر دیا۔ نادیہ بلا توقف اس کے پیچھے چل دی۔ گاہے بگاہے جب اس کا پاؤں کہیں الٹا سیدھا پڑتا تو اس کی کراہ سی نکل جاتی۔ بہرحال وہ چلتی چلی گئی...... رستم بے حد خشک لہجے میں بولا۔ "جو کچھ تم کر رہی ہو اچھا نہیں کر رہی۔ ذلیل ہو کر مرو گی۔"

"میں نے تمہیں بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا رستم کہ تمہارا ساتھ ہو تو مجھے سب کچھ قبول ہے۔"

"تم فلمی عورت ہو۔ فلموں اور کہانیوں کی باتیں کرتی ہو۔ مرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا تم سمجھتی ہو اور ان جنگلوں میں، میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جو بلک بلک کر مرنے کی دعائیں مانگتی ہیں۔"

"میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ تمہیں پتا ہے اس علاقے میں کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور نہ تمہیں پولیس کی بے رحمی کا کچھ اندازہ ہے۔ تمہاری جیسی لڑکی جب اس علاقے سے پولیس کے ہتھے چڑھتی ہے تو پھر اس کی بربادی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔"

"وقت پڑا تو سب کچھ جھیل لوں گی۔"

رستم چلتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس رکنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جتنی جلدی، جتنا دور چلا جائے گا اتنا ہی پولیس سے محفوظ ہو گا۔ پوٹھوہار کی گہرائی اور اس گہرائی کے دور افتادہ نشیب و فراز اس کی سلامتی کے ضامن تھے۔ اسے رہ رہ کر نادیہ پر بے پناہ طیش آ رہا تھا۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا کہ اپنی چادر کے نیچے سے ماؤزر نکالے اور اس کی ایک گولی سیدھی نادیہ کی پیشانی پر داغ دے لیکن پھر کسی وقت وہ مختلف انداز میں سوچنے لگتا۔ وہ

زبردستی آ رہی تھی اور اسے واپس بھیجنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اس نے واپس جانا بھی نہیں تھا تو پھر کیا ہو سکتا تھا؟ بی بی نے ایک دفعہ کہا تھا۔ "رستم میری بات مان لو۔ نادیہ تم پر ہزار جان سے فدا ہے۔ اپنی محبت کے خراج میں وہ تمہیں بہت کچھ دے سکتی ہے۔ جو کچھ وہ بے حد عاجزی سے دے رہی ہے، اسے قبول کر لو۔"

گزرے دنوں میں بی بی کے یہ فقرے ہزاروں مرتبہ اس کانوں میں گونجے تھے اور اب بھی گونج رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بی بی کے حکم سے سرتابی کر کے ایک بہت بڑا گناہ کر رہا ہے۔ اب جب کہ وہ بی بی سے اور بی بی کی دنیا سے رخ موڑ کر ایک نئی جگہ پر جا رہا تھا اور شاید اس کے پاس زندگی کے دن بھی گنے چنے تھے تو کیا وہ بی بی کی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ کیا اس فلم ایکٹرس کو بی بی کی خاطر اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا؟ یہ بڑا کٹھن سوال تھا۔ بہت ہی کٹھن۔ اس سوال کا فی الحال کوئی جواب رستم کے پاس نہیں تھا۔

چمکتے سورج کے نیچے، سُرخی مائل ٹیلوں کے درمیان وہ چلتا جا رہا تھا......اور نادیہ اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے فضا غیر مانوس ہوتی جا رہی تھی اور ماحول الگ تھلگ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زمین و آسمان کے درمیان اونچی نیچی گھاٹیوں، ٹیلوں اور خودرو نباتات کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ ایک کھوہ نما راستے میں سے گزر رہے تھے جب اچانک پاس ہی کہیں آہٹ سنائی دی۔ شاید کوئی جانور تھا۔ چادر کے اندر رستم کا ہاتھ ماؤزر کے دستے پر مضبوط ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ آہٹ دوبارہ ہوئی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی جانور نہیں ہے۔ اچانک دو افراد مخروطی ٹیلوں کے عقب سے یوں نمودار ہوئے جیسے زمین سے اُگ آئے ہیں۔ ان میں سے ایک شلوار قمیص اور دوسرا پتلون قمیص میں تھا۔ دونوں کے لباس خستہ اور چہرے گرد آلود تھے۔ وہ شکلوں سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹریل ٹو رائفل تھی۔ گولیوں والی بیلٹ (بیلٹ اسٹریپ) اس کے کندھے پر تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں پیپسی کی نصف بھری ہوئی بوتل تھی۔ وہ دونوں رستم اور نادیہ کو دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے۔ "کون ہو بھئی ادھر کہاں بھٹک رہے ہو؟" رائفل والے نے چونکتے ہوئے لہجے میں رستم سے پوچھا۔

"یہی بات میں تم سے پوچھوں تو؟" رستم نے کہا۔

رائفل والے کی گرفت رائفل پر مضبوط ہو گئی۔ "زیادہ ٹرٹر نہ کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ کون ہو؟" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم کون ہو؟''

''ہم پولیس کے بندے ہیں۔'' چیپی والا بولا۔

اس کے ساتھ ہی رائفل والا ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس نے رائفل رستم کی طرف سیدھی کرلی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ چادر کے نیچے رستم کے پاس اسلحہ موجود ہے۔ ''ہاتھ کھڑے کرو۔'' وہ گرجا۔ ''دونوں ہاتھ کھڑے کرو۔''

اس سے پہلے کہ صورت حال کوئی اور رخ اختیار کرتی، رستم کے دائیں پہلو سے ایک جیم شحیم شخص برآمد ہوا۔ وہ خاکی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے دھیان سے رستم کو دیکھا پھر دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ ''اوئے لالے دی جان! تم یہاں! پیدا کرنے والے دی قسم، مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔''

اس نے رستم سے علیحدہ ہوکر اسے پھر غور سے دیکھا اور ایک بار پھر لپٹ گیا۔ اس کے لپٹنے سے رستم کی کئی چوٹوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ تاہم اس نے خود پر ضبط کیا۔ تب نو وارد کی نگاہ ان دو افراد پر پڑی جو رستم کے سامنے تن کر کھڑے تھے۔ اس نے رائفل بردار کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''اوئے دلاور! گتے دے پتر! یہ کیا کر رہے ہو۔ نیچے کرو اس بندوقڑی کو۔ جانتے نہیں یہ کون ہیں؟ یہی رستم ہیں... رستم سیال......''

ڈرپل ٹو رائفل والے نے دیدے پھاڑ کر رستم کی طرف دیکھا۔ دوسرے شخص کا بھی یہی حال تھا پھر وہ دونوں رستم کی طرف آئے۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہاتھ ماتھے پر لے جا کر رستم کو سلام کیا جیسے وہ کوئی بڑا پولیس افسر ہو اور دو سنتری اسے سیلوٹ پیش کر رہے ہوں۔

رائفل بردار نے کہا۔ ''مم... میں بڑا شرمندہ ہوں جی۔ مجھے پتا نہیں تھا... مم... میں نے...''

''اوئے کیا بکری کی طرح مم... مم... مم... کر رہا ہے۔ معافی مانگ سیال جی سے۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔'' رستم بولا۔

''معاف کردیں جی! آپ تو پیرومرشد ہیں۔ مائی باپ ہیں۔ ہم تو آپ کے دیکھے بغیر آپ کے شاگرد ہیں۔ تابعدار ہیں۔''

دوسرے شخص نے بھی ڈرتے کانپتے لہجے میں معذرت پیش کی پھر دونوں سر جھکا کر ایک طرف کھڑے ہوگئے جیسے انہیں ڈر ہو کہ ان کی نظر رستم کی ساتھی لڑکی پر پڑ جائے گی اور یوں وہ معافی مانگنے کے فوراً بعد دوسرے جرم کے مرتکب ہو جائیں گے۔

لمبے تڑنگے شخص نے نادیہ کی طرف مؤدب نظروں سے دیکھ کر سلام کیا پھر وہ رستم کے

چہرے کی چوٹوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''لالے دی جان! تم تو چنگے بھلے زخمی ہو۔ لگتا ہے کہیں لمبا چوڑا اٹا کرا ہوا ہے۔''

''ایسے ہی سمجھ لو۔''

''کوئی اور تو نہیں ہے ساتھ؟''

''نہیں۔'' رستم نے جواب دیا۔

''چلو آؤ پھر اگلے ڈیرے پر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' لمبے تڑنگے شخص نے کہا اور رستم سے زبردستی اس کا سفری بیگ لے لیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ تنگ پہاڑی گزرگاہ میں ایک ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ رائفل بردار اور اس کا ساتھی سب سے پیچھے تھے اور رستم کے پیچھے یوں چل رہے تھے جیسے دو غلام اپنے آقا کے پیچھے چل رہے ہوں۔ رستم نے لمبے تڑنگے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گوہرے! مجھے اس بات کی امید نہیں تھی۔''

''کس بات کی؟''

''یہی کہ تم سے یا تمہارے کسی ساتھی سے اتنی جلدی ملاقات ہوجائے گی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگلے ڈیرے پر کوئی نہیں ہوگا اور ہمیں ابھی دس بارہ کلومیٹر اکیلے ہی چلنا پڑے گا۔''

''بس سمجھو کہ تمہاری قسمت اچھی تھی اور ہماری تم سے زیادہ اچھی تھی کہ یہاں ملاقات ہوگئی۔ بس ہم بھی کسی چکر میں یہاں آئے ہوئے تھے۔'' گوہر نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''کیسا چکر؟''

''ابھی بتاتا ہوں لالے دی جان! ویسے تم دس پندرہ منٹ اور یہاں نہ آتے تو سمجھو ہم یہاں سے جل (جا) چکے تھے۔'' گوہر نے ایک پتھر پھلانگتے ہوئے کہا۔

نادیہ کو پھلانگنے میں دشواری ہوئی تو اس نے امداد طلب نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی تمنا تھی کہ رستم اس کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو یہ پوری نہیں ہوئی۔ اسے چھوتے ہوئے بھی رستم کو کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے خود ہی جیسے تیسے وہ رکاوٹ دور کی۔ گوہر نے سرگوشی میں رستم سے پوچھا۔ ''یہ میڈم کون ہے؟ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ یہ کہیں... ٹی وی شی وی میں تو نہیں آتی؟''

''نہیں، فلموں میں کام کرتی ہے۔'' رستم کے لہجے میں بیزاری تھی۔

گوہر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ اپنے موٹے دیدے گھما کر بولا۔ ''اوہو، ان کا نام تو شاید نادیہ ہے۔ بڑی مشہور ہیں یہ... لیکن لالے دی جان! یہ تیرے ساتھ کیسے؟''

"بس ہے یہ بھی کوئی مسئلہ۔"

"بڑا خوبصورت مسئلہ ہے۔" گوہر نے بے ساختہ کہا پھر ذرا گھبرا کر رستم کی طرف دیکھا جیسے یہ جاننا چاہتا ہو کہ رستم نے بُرا تو نہیں منایا۔

قریباً ایک فرلانگ مزید چلنے کے بعد وہ سُرخ ٹیلوں میں گھری ہوئی ایک ناہموار جگہ پہ پہنچے۔ ایک طرف بارش کے پانی کا قدرتی تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے تین برقع پوش عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے گول ٹوپی والے دیسی برقعے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی تین آدمی اور دو خچر تھے۔ آدمی اور خچر حلیے کے لحاظ سے مقامی آدمی نظر آتے تھے۔ خچروں پر لکڑیاں اور المونیم کے برتن وغیرہ لدے تھے۔

"یہ کیا ہے بھئی؟" رستم نے اس مختصر سے قافلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"دل پشوری۔" گوہر نے مختصراً جواب دیا۔

رستم جانتا تھا، گوہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ نہیں تھا، چھوٹا سا طائفہ تھا۔ اس قسم کے طائفے پہلے بھی کئی باران پہاڑیوں میں آچکے تھے اور انہوں نے آتے ہی رہنا تھا۔ مرد کی تماش بین نگاہ اور عورت کے تھرکتے جسم کا رشتہ نہ جانے کب سے قائم ہے اور کب تک قائم رہنا ہے۔ رستم جانتا تھا۔ ان دیسی برقعوں میں تین عورتیں نہیں، تین تڑپتی پھڑکتی رقاصائیں ہوں گی۔ ان کے ساتھ ان کے تین مرد نہیں تھے۔ تین سازندے تھے۔ خچروں پر سامان کے نیچے طبلے، سارنگی اور ہارمونیم وغیرہ ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ پاکستانی یا انڈین شراب کی چار چھ بوتلیں بھی ان خچروں کے بوجھ میں شامل ہوں۔ پولیس کے مخبروں کی مٹھی گرم کرنے کا حوصلہ ہو تو ایسے قافلے ان پہاڑیوں میں تو کیا کسی بھی جگہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

"یہ رنگ بازی کس سلسلے میں ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"یہ تو تمہیں وڈے ڈیرے پر جا کر بتاؤں گا۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔

وڈا ڈیرا یا ڈیرہ جس جگہ کو کہا جاتا وہ پوٹھوہار کی مزید گہرائی میں واقع ہے۔ اگلے ڈیرے سے اس کا فاصلہ کم وبیش ڈھائی دن کی مسافت پر تھا۔ رستم خاموش رہا۔ گوہر کا خیال تھا کہ رستم زیادہ اصرار کرے گا تو وہ بتا دے گا۔ رستم کی خاموشی پر وہ بھی خاموش ہو گیا۔

"یہ ناچیاں یہاں کیسے پہنچی ہیں؟" رستم نے پوچھا۔

"جس طرح پہلے پہنچا کرتی ہیں۔ تراب دادا خود چھوڑ کر گیا ہے۔ بیس ہزار ایڈوانس لیا ہے، باقی کا ساٹھ ہزار اور لڑکیاں چار دن بعد 'رتو موڑ' سے آ کر لے جائے گا۔"

"اس نے تو ایک بار کہا تھا اب ناچیاں لے کر آؤں تو اپنی بہنوں کو لے کر آؤں۔"

"دیکھ لالے دی جان! اب پھر لے کر آ جاتا ہے۔ منہ بھر کر سؤر کھانے کو ملتا ہے نا اور یہی حال ان ناچیوں کا ہے۔ سارے خطروں کا پتا ہے ان کو پھر بھی آ جاتی ہیں۔ جتنا دس راتوں میں پسینہ بہانے کے بعد کماتی ہیں اتنا ایک رات میں مل جاتا ہے اور پھر تحفے تحائف بھی ہوتے ہیں۔" گوہر نے ایک بار پھر آنکھ دبائی۔

نادیہ ایک جانب پتھر پر بیٹھ گئی۔ رستم دیکھ رہا تھا یہاں موجود تقریباً ہر مرد وزن نادیہ کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ایک ایکٹریس کی حیثیت سے وہ اسے پہچانتے تھے یا پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ برقع پوش ناچیاں بھی آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ انہوں نے اب اپنے برقعے چہروں سے ہٹا لئے تھے۔ ان میں سے ایک جو دبلی پتلی تھی بالکل نوخیز معلوم ہوتی تھی۔ باقی دونوں کی عمریں بیس چوبیس سال کے درمیان نظر آتی تھیں......

رستم نے پوچھا۔ "ناچیاں اور ان کے سازندے یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

گوہر بولا۔ "ہم اگلے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ ناچیاں ناچ بھی ساتھ تھے۔ دلاور اور کاٹھیا کو شبہ ہوا کہ کوئی آسے پاسے موجود ہے۔ ہم سارے یہاں ٹھہر گئے اور یہ دونوں تمہاری طرف جل گئے۔ (چلے گئے) تھوڑی دیر بعد میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ وہاں جا کر جو کچھ دیکھا وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔"

کچھ دیر بعد ایک مرتبہ پھر دشوار گزار راستے پر سفر شروع ہوا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ اترائی چڑھائی کے سبب گرمی محسوس ہونے لگی۔ رقاصاؤں نے اپنے برقعے اُتار کر کندھوں پر ڈال لئے۔ وہ نادیہ کے ساتھ ساتھ رستم کو بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید دلاور وغیرہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ رستم کون ہے۔

گوہر نے اپنے ساتھ ساتھ چلنے والی طوائف سے کہا۔ "چاندی! کوئی گانا شانا ہی سنا دے ہمیں۔ سفر آسانی سے کٹ جائے گا۔"

وہ بولی۔ "آپ لوگ گانا سنتے کب ہو۔ آپ تو گانا دیکھتے ہو۔"

"پر تیرے پنڈے کے ساتھ ساتھ تیری آواز بھی بڑی میٹھی ہے، چاندی بائی۔ آواز اچھی ہو تو پھر گانا سنا بھی جا سکتا ہے۔"

"چڑھائی چڑھ چڑھ کے سانس تو چڑھا ہوا ہے۔ آواز کیا نکلے گی گوہر اجی۔"

رستم کو دیکھ کر بولی۔ "ان کو تو دیکھ کر میری آواز ویسے ہی بند ہونے لگی ہے۔"

"پہلے جاتی ہوا نہیں؟"

''کافی پرانی بات ہے۔ ایک دفعہ کوئی سندھی سائیں ڈیرے پر مہمان آیا تھا۔ میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجرے کے لئے گئی تھی۔ وہاں دیکھا تھا ان کو پھر تو یہ بہت دن نظر ہی نہیں آئے۔''

''اب آیا کریں گے نظر...... تُو بے فکر رہ۔'' گوہرے نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اوئے تُو بڑی پھاپھا کٹنی ہے۔ مجھے باتوں میں لگا کر اصل بات بھلا رہی ہے، چل چلتے چلتے کوئی اچھا سا گانا سنا دے۔''

''وہی بارش والا استاد جی۔'' عقب سے دلاور نے ہولے سے لقمہ دیا۔

''چل وہی سنا دے۔ دیکھ رستم سیال صاحب خود یہاں موجود ہیں تیرا گانا سننے کے لئے۔''

''یہ تو بہت بڑے لوگ ہیں جی۔ ہماری حقیقت ہی کیا ہے ان کے سامنے اور رستم صاحب کے ساتھ جو میڈم ہیں یہ بھی بڑے اونچے درجے کی فنکارہ ہیں۔ ایک دنیا مانتی ہے ان کو۔ ان کے سامنے گاؤں گی تو یہ چھتر ماریں گے مجھے۔''

نادیہ کافی پیچھے آ رہی تھی۔ اس لئے یہ باتیں اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں گوہرا بولا۔ ''ہم چھتر نہیں پڑنے دیں گے تجھے۔ چل گا شاباش!''

رستم نے بے زاری سے کہا۔ ''یارا کیوں مجبور کر رہے ہو اسے۔ کہیں جا کر بیٹھنے تو دو۔''

گوہرا مسکرایا۔ ''لالے دی جان! میٹر چل رہا ہے ان تینوں ٹیکسیوں کا۔ چلو ان پر سفر نہیں کرتے لیکن ان میں بیٹھ کر ٹیپ شیپ تو چلا سکتے ہیں نا؟''

رستم نے ایک بار پھر بے زاری سے سر ہلایا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ راستہ دشوار تھا لیکن وہ کہیں رک کر سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ تمازت کی وجہ سے رقاصاؤں کے رخسار تمتما رہے تھے۔ سازندوں میں ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی خاصا تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی حالت بھی پتلی تھی تاہم وہ انوکھے تیز تیز قدموں سے میڑ ستے راستے پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ سخت مٹی کی خودرو جھاڑیاں جگہ جگہ راستہ روک لیتی تھیں۔ ایک جگہ انہیں جنگلی سور کی مختصر جھلک نظر آئی کچھ ایک جگہ نیا، چیتا سا خرگوش بڑی پھرتی سے بھاگتا ہوا ان کے سامنے سے گزر گیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے مخروطی ٹیلوں کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک دھوپ غائب ہوگئی اور بادل چھا گئے۔ ایک سرنگ نما راستے سے گزر کر جب وہ ایک چھوٹی سی پیالہ نما جگہ پر پہنچے تو دن میں ہی گہرا اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ یہی جگہ

''اگلا ڈیرہ'' کہلاتی تھی۔ سنگریزوں سے اَٹی ہوئی ایک پہاڑی کے اندر ایک قدرتی ہال سا بن گیا تھا کچھ عرصہ پہلے تک وادی سون میں پناہ لینے والے اشتہاری ڈاکو اور قاتل اس جگہ کو ایک بہت محفوظ ٹھکانہ تصور کرتے تھے۔ یہاں بارش کے پانی کا ایک قدرتی تالاب بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہاں سے اردگرد کے علاقے پر دور تک نظر رکھی جا سکتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ یہ جگہ پہلے کی طرح محفوظ نہ رہی۔ یہاں دو تین پولیس مقابلے بھی ہوئے۔ اس کے بعد یہاں پناہ لینے والے ''پناہ گزین'' اس جگہ کو چھوڑ گئے اور پوٹھوہار کی پُراسرار گہرائیوں میں کچھ اور آگے نکل گئے۔

کم و بیش تین دن کی مسافت پر یہ دوسری جگہ رتو ڈیرہ یا صرف ڈیرہ کہلاتی تھی۔ متروکہ ڈیرے کو اگلا ڈیرہ کہا جاتا ہے۔ (یہ رتو ڈیرے سے ''آباد دنیا'' کی طرف آتے ہوئے اگلا ڈیرہ تھا) بہرحال ابھی یہ ڈیرہ پوری طرح ویران نہیں ہوا تھا۔ گاہے بگاہے ''پناہ گزین'' اسے آباد کرتے رہتے تھے۔ جیسے یہ آج آباد ہوا تھا۔ رستم نے طائرانہ نظروں سے ڈیرے کے اندرونی منظر کا جائزہ لیا۔ اس ہال نما غار کی دیواریں نیم گول سنگریزوں سے اَٹی ہوئی تھیں۔ انہیں پنجابی میں ''گی ٹے'' کہا جاتا ہے...... دیواروں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ برسوں تک یہاں لوگ قیام کرتے رہے ہیں۔ آگ جلائے جانے کی وجہ سے چھت سیاہ تھی اور خورد و نوش کی نشانیاں چکنائی کے دھبوں کی صورت میں یہاں موجود تھیں۔ دیواروں پر معاشرے سے بھاگے ہوئے دل جلوں نے مختلف اشعار اور عبارتیں لکھ رکھی تھیں۔ مارکر وغیرہ سے بے ڈھنگی تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں اور گمنام فون نمبر وغیرہ لکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ لکھنے والے نہ جانے اب کہاں تھے۔ پولیس مقابلوں میں مر چکے تھے؟ پھانسی پر چڑھ گئے؟ جیلوں میں سڑ رہے تھے؟ یا پھر رستم، گوہرے اور دلاور وغیرہ کی طرح بدحالی [illegible] اور زندگی کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رستم ایک مدت بعد اس جگہ آیا تھا پھر بھی اسے ہر چیز مانوس لگ رہی تھی۔ دہانے پر گولیوں کے نشان، تالاب کے کنارے دو گمنام ڈاکوؤں کی قبریں۔ بارش کے پانی کا بیضوی تالاب اور وہ برجی نما ابھری چٹان جہاں سے تاوان کے لئے اغوا کر کے لائی جانے والی ایک گوجری نے کود کر خودکشی کی تھی۔ اس چٹان کے ساتھ ہی ایک دوسرا ٹیلہ بھی رستم کو کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس ٹیلے کو اردگرد نگاہ رکھنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جن دنوں زوار اور رستم یہاں آیا کرتے تھے اور نادر کاکا نامی ڈکیت یہاں کا کرتا دھرتا تھا، ایک نگران ہمہ وقت ایک فوجی دوربین لے کر اس ٹیلے پر بیٹھا رہتا تھا...... پوٹھوہار کی چھوٹی چھوٹی سیاہ ابابیلیں اس

کے سر پر چکرایا کرتی تھیں۔

''کس سوچ میں کھو گئے لالے دی جان! دیکھو موسم کتنا رنگ دار ہو رہا ہے کچھ کھاؤ پیو۔''

''نہیں گوہرے! اس وقت دل کچھ نہیں کر رہا۔''

''میڈم صاحبہ سے پوچھ لو۔'' گوہرے نے کہا۔

رستم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نادیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس دوران ہی اچانک زور سے بادل گرجا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے نیم تاریکی میں آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تن گئی ہے۔ بارش کی آواز کا انسان کے مزاج سے پُراسرار تعلق ہوتا ہے۔ جوں جوں پانی کی لے تیز ہوتی ہے، دلوں کے اندر رقص کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بارش کے ہنگامے نے زور پکڑا تو گوہرے اور اس کے ساتھیوں کی ترنگ میں بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ موج مستی کرنا چاہ رہے تھے مگر رستم کی موجودگی انہیں مؤدب رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

بالآخر گوہرے نے اپنے ساتھیوں کی سفارش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''لالے دی جان! اپنا موڈ ذرا ٹھیک کرلے۔ تیری صورت دیکھ کر میرے بندوں کا خون خشک ہو رہا ہے۔''

''میں نے کسی کو منع نہیں کیا ہے۔ جو جی چاہے کرو۔'' رستم گھمبیر لہجے میں بولا۔

''جو جی چاہے...... میں تو بہت کچھ آجاتا ہے لالے دی جان۔ فی الحال تو یہ لوگ پیاسے ہو رہے ہیں۔ ذرا ہونٹ تر کرنا چاہتے ہوں گے۔''

''تو کرلو ہونٹ تر۔'' رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس طرح بات نہیں بنے گی۔ تیری بڑی دہشت ہے ان لوگوں پر۔ تُو تھوڑی سی نرمی دکھائے گا تو پھر ان کی جان میں بھی جان آجائے گی۔''

''کیا کروں میں؟''

گوہرا تھوڑی دیر تک تجربہ کار نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا پھر اپنے چھ ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''او کاٹھیا! جا خچر پر سے اُتار کر لا ایک لال پری......''

کاٹھیا کے کالے چہرے پر رونق آگئی۔ ''اچھا گوہرا جی۔''

اس نے ساتھیوں کو سنانے کے لئے زور سے کہا اور تیزی سے خچروں کی طرف گیا۔ بڑی شتابی سے اس نے ایک خچر پر سے کچھ سامان نیچے اُتارا اور نیچے سے انڈین شراب کی

ایک بوتل لے کر بھاگم بھاگ گوہرا کے پاس آگیا۔ کاٹھیا کی ایک آنکھ کا فوکس گوجرانوالہ پولیس کی بے رحمانہ مار پیٹ کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔

گوہرا نے بوتل کی سیل توڑی اور دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈال کر اس میں پانی ملا دیا۔ پھر ایک گلاس رستم کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بارش پر ایک نظر ڈالی اور آنکھیں بند کر کے بولا۔ ''چل لالے دی جان! ایک اس ''گھر والی'' کے نام جو ہم جیسے ڈاکوؤں کی زندگی میں کبھی بھی نہیں آتی...... کبھی نہیں۔''

اس نے گلاس زبردستی رستم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ آج بہت عرصے بعد رستم نے گلاس تھاما تھا۔ جب سے بی بی اس کی زندگی میں آئی تھی اس بدبودار شے سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی اور اس جیسی بہت سی دوسری اشیاء بھی اس کی زندگی سے نکل گئی تھیں لیکن اب...... اب پتا نہیں دل کے موسم میں کیسی تبدیلیاں آئی تھیں، کیسے طوفانی جھکڑ چلے تھے۔ جسم اور روح میں سب کچھ تہہ و بالا ہوگیا تھا کسی وقت تو اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے کچھ بدلا ہی نہیں تھا۔ وہ سب جاگتی آنکھوں کا خواب تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا ہے۔

وہ کتنی ہی دیر تک شدید کشمکش میں رہا۔ آنسوؤں کا ایک آبشار سا اس کے حلق کے اندر گرتا رہا۔ بی بی کے لئے کیا کچھ چھوڑا تھا اور یہ سب کچھ چھوڑ کر دل میں کیسی کیسی آسیں پالی تھیں۔ اسے لگا جیسے بی بی اسے دیکھ رہی ہے۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہے۔ ''تم نے تو ایک رات چناب کے کنارے بڑا اونچا دعویٰ کیا تھا۔ اتنی جلدی ہار گئے؟ بس اتنی ہی ہمت تھی؟''

''ہاں بی بی جی! اتنی ہی ہمت تھی۔ اپنے لئے سو بار بھی موت قبول ہے۔ آپ کے پاؤں میں کانٹے کی چبھن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ بس اتنی ہی ہمت تھی۔'' اس نے تصور میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بدبودار سیال اس کے ہونٹوں سے لگا اور حلق سے نیچے اُترتا چلا گیا۔

''اوئے خوش کردیا لالے دی جان۔'' گوہرے نے نعرہ لگایا اور ایک ہی سانس میں سارا پیگ چڑھا گیا۔

رستم نے دیوار سے ٹیک لگا کر خود کو نیم دراز کیا اور اپنی چادر سر تک تان لی۔ اس کے یوں ''اوجھل'' ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد محفل رنگ پر آگئی۔ بارش بھی شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ ابھی سورج ڈوبنے میں بہت دیر تھی مگر اندھیرا چھایا محسوس ہوتا تھا۔ گوہرے نے اوپر تلے کئی جام چڑھائے اور ترنگ میں آگیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو تین مستی میں

آ گئے اور اٹھ کر رقص کرنے لگے۔ خاص طور سے دلاور بڑے موڈ میں تھا۔ اس نے ہانک لگائی۔ ''استاد جی! وہی بارش والا۔'' استاد جی یعنی گوہرے کو بھی یہ تجویز پسند آئی۔ وہ جھومتے ہوئے اٹھا اور رقاصہ چاندی کو پکار کر کہنے لگا۔ ''اوئے لالے دی جان چاندی! دیکھ لے موسم بھی تیرے گانے جیسا ہو گیا ہے، اب تُو ذرا نچ کے دکھا ہی دے۔''

''ہاں ہاں۔ اب تو دکھا ہی دے۔'' دو تین آوازوں نے گوہرے کا ساتھ دیا۔

دلاور دوڑ کر گیا اور دوسرے خچر کے سامان کو الٹ پلٹ کر کے اس میں سے ہارمونیم نکال لیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے افراد بھی ساز وغیرہ نکال لائے۔ اسی دوران میں گوہرے نے چاندی کو قائل کر لیا کہ وہ بارش کا گانا، بارش میں ہی گائے گی۔

تھوڑی ہی دیر بعد جنگل میں منگل کا سماں نظر آنے لگا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی، چھوٹے چھوٹے تیز رفتار نالوں کا شور تھا۔ بارش کی بوچھاڑ کے اندر چاندی بارش کا گانا گا رہی تھی۔ پھر دلاور مست ہو کر کھوہ میں سے نکل آیا اور چاندی کے ساتھ ساتھ رقص کرنے لگا۔ باقی سب کھوہ کے اندر تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ آوازے کس رہے تھے۔ عجیب افسانوی سا منظر تھا۔

''آ جاؤ۔ تم سب بھی آ جاؤ۔'' دلاور نے ہانک لگائی۔

اس کے دو تین اور ساتھی بھی اس جشنِ برسات میں شریک ہو گئے۔ طبلے کی تھاپ پر تھرکنے لگے، مچلنے لگے۔ کسی نے الاؤ جلا دیا۔ کوئی مارخور کے گوشت کے خشک ٹکڑے لے آیا اور چبانے لگا۔ شراب کام دکھا رہی تھی۔ ہنگامہ بڑھ رہا تھا پھر یوں ہوا کہ گوہرا خود بھی باہر نکل گیا اور ساتھیوں کے ساتھ موسلا دھار بارش میں بھیگنے اور ناچنے لگا۔ وہ سب سے لمبا تڑنگا تھا اور ناچتے ہوئے دیو کی طرح لگتا تھا۔ کسی نے ٹپے کی طرز پر تان لگائی۔

نی توں کنیں کانٹے پائے ہوئے نے
ساڈے نالوں بُٹن چنگے جیہڑے سینے نال لائے ہوئے نے

اب تین سازندوں کے علاوہ صرف رستم اور نادیہ ہی کھوہ کے اندر رہ گئے تھے۔ رستم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ شاید نادیہ پر بھی یہ سہانا موسم اور مستی بھرا ماحول تھوڑا بہت اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے ناچتے گاتے مرد و زن کو دیکھ رہی تھی۔ پوٹھوہار کے ویران نشیب و فراز کا یہ نیا منظر نامہ اس کے لئے بھی انوکھا تھا۔ گوہرے نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''میڈم جی! آپ بھی آ جائیں۔ ذرا بھیگ کر دیکھیں۔ مزہ نہ آئے تو پیسے واپس۔''

پھر شاید گوہرے نے ہی چاندی کو اشارہ کیا تھا۔ وہ ناچتی ناچتی آئی اور بڑی ادا سے

نادیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ آنے اور ناچنے کی دعوت دے رہی تھی۔

نادیہ انکار کرتی رہی مگر چاندی اور دیگر افراد کا مستی بھرا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر وہ رستم کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر بولی۔ ''پتا نہیں، میرا ناچنا بادشاہ سلامت کو اچھا لگے یا نہیں۔''

''کون بادشاہ سلامت؟'' چاندی نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہاں پاس ہی تو بیٹھا ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

چاندی نے نادیہ کی نگاہوں کا رخ دیکھ کر جان لیا کہ وہ کسے بادشاہ کہہ رہی ہے، مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ بادشاہ ہیں تو پھر آپ ملکہ ہوئیں۔ اتنے پیارے موسم میں آپ اپنی مرضی چلا سکتی ہیں۔''

''میں ملکہ نہیں کنیز ہوں۔'' وہ رستم کو سنانے کے لئے قدرے بلند آواز میں بولی۔ رستم بے حرکت بیٹھا رہا۔ ناچنے گانے والی ٹولی کا اصرار اور جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ گوہرے کے اشارے پر چاندی نے جیسے کھینچ کر نادیہ کو اٹھا لیا۔

نادیہ کچھ دیر تو پس و پیش سے کام لیتی رہی، اپنے سر کی چوٹ کا بہانہ بناتی رہی پھر چاندی کے ساتھ محوِ رقص ہو گئی۔ نادیہ کے پاؤں حرکت میں آئے تو مست ٹولی کا جوش و خروش اور بڑھ گیا۔ سازوں نے آہنگ بدلا۔ طبلے پر زوردار تھاپ پڑنے لگی۔ ہارمونیم کومل سُروں سے اونچے سُروں پر آ گیا۔ ''ہائے ہائے یہ مجبوری، یہ موسم اور یہ دوری۔ تیری دو ٹکیاں دی نوکری میں میرا لاکھوں کا ساون جائے۔''

گوہرا، دلاور، کاٹھیا اور دیگر افراد ناچنے کے دوران میں شراب خانہ خراب کے گھونٹ بھی بھر رہے تھے۔

رستم کی نگاہ نادیہ پر پڑی۔ اس کا جسم عام موسم میں بھی قیامت تھا۔ آج تو آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا اور بجلی جیسے کڑک کڑک کر ٹیلوں کی سیاہی مائل چوٹیوں کو چھُونا چاہتی تھی۔ وہ دھیمے انداز میں لیکن پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اس کے رقص کے سامنے دیگر رقاصاؤں کا رقص ماند پڑ گیا تھا پھر وہ ناچتے ناچتے کھوہ کے اندر آ گئی۔ بڑے والہانہ انداز میں رستم کے اردگرد ناچنے لگی۔ جیسے وہ رستم کو شمع اور خود کو پروانہ سمجھ رہی ہو۔ اس کے توبہ شکن جسم میں ایک خاموش اور مؤدب دعوت تھی۔ اس کے بالوں سے اُڑنے والے چھینٹے رستم کی چادر پر گر رہے تھے۔

اس دوران میں بدمست گوہرے نے چاندی کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور اسے اٹھائے

اٹھائے رقص کرنے لگا۔ شراب، موسم اور شباب کے ساتھ مل کر سہ آتشہ ہوگئی تھی اور اس کی آگ جسموں میں پھیلتی جارہی تھی۔ گوہرا چاندی کو اٹھائے اٹھائے کھوہ کے اندر آیا اور اسے تاریک ترین گوشے میں لے گیا لیکن یہ تاریک ترین گوشہ بھی اتنا تاریک ہرگز نہیں تھا کہ انہیں دوسروں کی نگاہوں سے چھپا سکتا۔

گوہرے کے ارادے واضح ہونے لگے تو نادیہ نے رقص روک دیا۔ دیگر رقاصائیں اور سازندے بھی بے چین نظر آنے لگے۔ رستم یہ ساری صورتِ حال ناخوشگوار احساس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور گوہرے کو آواز دے کر بولا۔ ''میری بات سنو گوہرے۔'' رستم کی دوسری آواز گوہرے کے کانوں تک پہنچ پائی۔ اس نے چاندی کو گود سے اُتارا اور رستم کی طرف پلٹا۔

''کیا بات ہے لالے دی جان......'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' رستم نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''اوئے میرے جگر دے ٹکڑے۔ یہ ٹیکسی ہے اس کا میٹر......''

''یہ عورت ہے۔'' رستم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اور جو دوسرے یہاں نظر آرہے ہیں۔ وہ بھی ٹیکسیاں اور رکشے نہیں ہیں، بندے ہیں۔''

''تو پھر کیا کروں میرے جگر۔'' اس نے شرابیوں کی طرح ہاتھ نچایا۔

''یہ رنگ رلیاں کسی اور وقت کے لئے چھوڑو...... یہ موقع ٹھیک نہیں ہے۔''

گوہرے کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نظر آئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''اوئے لالے دی جان! تیرے لئے تو ہم دنیا چھوڑ سکتے ہیں، تُو رنگ رلیوں کی بات کررہا ہے......'' پھر وہ زور سے آواز دے کر بولا۔ ''اور رنگ رلی! آجا واپس۔ آجا شاباش۔''

چاندی اپنا لباس درست کرتی ہوئی واپس سازندوں کے پاس جابیٹھی۔ وہ خود بھی ہلکے سے نشے میں تھی یا پھر شاید موسم ہی کا خمار تھا۔ گوہرا اپنے ہونٹ رستم کے کان کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے ایک بات بتاؤ جگر! زندگی جو ہے ناں شہد کے چھتے کی طرح ہے۔ مکھیوں کو دائیں بائیں کرکے جتنا شہد نچوڑا جاسکے، نچوڑ لینا چاہئے اور پھر ہم کون سے زندہ لوگ ہیں۔ نادر کاکا کہا کرتے تھا، ہم تو ان مرغیوں کی طرح ہیں جن کی گردن قانون کی چھری نے کاٹ کر علیحدہ کردی ہو پر وہ پھر بھی اِدھر اُدھر پھدکتے پھر رہی ہوں۔ کتنی دیر پھدک لیں گے۔ دو تین ہفتے، دو تین مہینے یا پھر ایک دو سال۔ آخر تو شاں شاں کرتی گولیاں ہونی ہیں یا پھانسی کا رسہ۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تُو جہاں چاہے ننگا ہوکر ناچنے لگے۔''

گوہرے نے ایک بہکا ہوا قہقہہ لگایا اور چھوٹی بوتل سے ایک بڑا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''تجھ سے ایک پتے کی بات کہوں لالے دی جان۔''

رستم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''اگر تیرے دل میں کوئی عشق وشق کی بات اب بھی ہے ناں تو اسے خلاص کردے۔ بالکل خلاص۔''

''کیا مطلب؟'' رستم کی تیوری چڑھ گئی۔

''میں کافی کچھ جانتا ہوں لالے دی جان! باہر کی ساری خبریں ہم سے اوجھل تو نہیں ہوتی ناں۔ میرے پاس تو ایک دو اخبار بھی پڑے ہیں جن میں تیرا اور تیری معشوق کا ذکر ہے۔''

''گوہرے، میں فضول باتیں سننا نہیں چاہتا۔'' رستم کے لہجے میں ایک مدھم دہاڑ تھی۔

گوہرا اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''وہ چھوٹی ناچی دیکھ رہے ہو ناں جو بال نچوڑ رہی ہے۔ اس کا نام شبانہ ہے گجرات کی ہے۔ وہی سوہنی مہینوال والا پنڈ۔ دو سال پہلے اس کو بھی کسی مہینوال سے عشق ہوگیا تھا بلکہ یوں کہو کہ عشق چڑھ گیا تھا۔ بس وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ اس پر شرافت کا بھوت سوار ہوگیا۔ کہنے لگی گھر بساؤں گی، میرا میاں کلرکی کرے گا۔ میں اس کے لئے آلو مٹر پکاؤں گی اور اس کے بچوں کو دودھ پلاؤں گی، یوں قمیص اونچی کرکے۔'' گوہرے نے باقاعدہ اپنی قمیص اونچی کرکے اسٹائل بنانے کی کوشش کی۔

پھر نشے میں سر جھٹک کے بولا۔ ''لیکن کیا ہوا۔ وہی جو پہلے پاکستان اور انڈیا کی سات آٹھ سو فلموں میں ہوچکا ہے۔ ماں اور نانی کے بہت منع کرنے کے باوجود بھی اس نے شادی رچائی اور کنجر خانے سے چلی گئی۔ طوائف کنجر خانے کو چھوڑتی ہے لیکن کنجر خانہ تو اسے نہیں چھوڑتا ناں۔ یہ بس ایک سال ہی شریفوں میں رہی پھر شوہر کی طرف سے مار پیٹ کا سلسلہ شروع ہوا...... مار اسے ہی نہیں پڑتی تھی، اس بچے کو بھی پڑتی تھی جو ابھی پیٹ میں تھا۔ پچھلی چھوٹی عید کو بچہ ضائع کرا کے اور چہرے پر بہت سے نیل لے کر اپنے کنجر خانے میں واپس آگئی۔ اب یہ پھر یہاں جنگل ہورہی ہے۔ پیسے کی خاطر ناچے گی، سب کچھ کرے گی......''

''تم یہ سب کچھ مجھے کیوں سنا رہے ہو؟'' رستم نے کڑے لہجے میں کہا۔

''اس لئے جگر! کہ ہماری اور ان طوائفوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کوئی ''بی بی'' مل جاتی ہے۔ اس کے چکر میں آکر ہم سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے سگے

ساتھیوں کو ''رب راکھا'' کہہ دیتے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کی قسمیں وعدے کر لیتے ہیں لیکن بیبیاں تو پھر بیبیاں ہوتی ہیں جگر وہ زیادہ دیر تک ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ وہ کنارہ کر لیتی ہیں، دھتکار دیتی ہیں، یا پھر مروا دیتی ہیں۔ شرافت آباد میں جس طرح طوائفوں کے لئے جگہ نہیں ہوتی اسی طرح ڈاکوؤں کے لئے بھی نہیں ہوتی۔ دونوں کو اپنے اپنے کنجر خانے میں واپس آنا پڑتا ہے۔''

رستم ساکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے سے دہک اٹھے تھے۔ گوہرا رستم کی کیفیت سے بے خبر اپنی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ ''ہاں، یہ بیبیاں ایسی ہی ہوتی ہیں اور تیری ''بی بی'' تو کچھ زیادہ ہی شرافت کی ماری ہوئی تھی۔ وہ تجھے لٹکاتی رہی، بھٹکاتی رہی اور ساتھ ساتھ فائدے بھی اٹھاتی رہی۔ جب ساتھ دینے کا وقت آیا تو کم ذات کھوتی کی طرح دولتی جھاڑ دی اس نے اب دیکھا لینا کچھ ہی دیر بعد وہ کسی چوہدری، جیسے، راجپوت، ملک یا ٹوانے کے ساتھ بیاہ رچائے گی اور ہنس ہنس کر آلو مٹر پکائے گی۔''

اچانک جیسے بجلی سی چمک گئی۔ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے اور مخمور گوہرے کو تو بالکل ہی نہیں چلا۔ دیکھنے والوں نے بس یہی دیکھا کہ رستم کے ہاتھ گوہرے کے گریبان پر آئے۔ پھر بے پناہ طیش اور رفتار سے گوہرے کو دھکیلتا ہوا وہ سنگی دیوار سے ٹکرایا۔ گوہرے کے منہ سے کرب ناک چیخ نکل گئی۔

☆======☆======☆

اس کی پشت بہت زوردار طریقے سے سنگلاخ چٹان سے ٹکرائی تھی۔ ٹکرانے کے بعد وہ بُری طرح ڈگمگایا۔ اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی بوتل چکنا چور ہو گئی۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت لئے اس نے رستم کی طرف دیکھا۔ رستم پر جنون سوار تھا۔ اس کے سر کی خوفناک ٹکر گوہرا کی پیشانی پر لگی پھر اس نے گوہرا کو گھما کر دوسری چٹان سے دے مارا۔

دو تین شدید چوٹیں سہنے کے بعد گوہرا ذرا سنبھل گیا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور ان لوگوں میں سے تھا جن کو شراب عارضی طور پر مزید طاقت ور اور پھرتیلا بنا دیتی ہے۔ اس نے رستم کے طوفانی مکوں کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہیں ہوا تو وہ بھی بھنا گیا۔ اس نے ایک دبی دبی چنگھاڑ کے ساتھ رستم کے سینے پر سر سے ٹکر رسید کی اور اسے سر سے ہی دھکیلتے ہوئے زمین پر گرانا چاہا۔

مزاحمت کی یہ کوشش گرانڈیل گوہرا کو خاصی مہنگی پڑی۔ وہ رستم کو گرانے میں تو کامیاب ہوا لیکن اس پر غالب نہ آ سکا۔ معاملہ اس کی سوچ کے برعکس ہوا، رستم اس کے اوپر تھا اور رستم میں حیوانی طاقت پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں گھونسوں اور لاتوں سے گوہرا کو دھنک کر رکھ دیا۔

کھوہ کے اندر موجود ہر فرد سکتے میں تھا۔ رقاصاؤں کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل رہی تھیں۔ گوہرا کے قریبی ساتھی دم بخود کھڑے تھے۔ وہ اپنے سردار کے بُرے حال کو دیکھ رہے تھے، مگر ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں کیونکہ ان کا سردار کسی اور سے نہیں رستم سیال سے برسرِ پیکار تھا اور رستم سیال کے مدِمقابل آنے کا ان میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رستم کی وحشیانہ ضربوں سے بچنے کے لئے آخری کوشش کے طور پر گوہرا نے ایک قریب پڑی کلہاڑی پکڑ لی۔ چھوٹے دستے کی یہ کلہاڑی لکڑیاں چیرنے کے لئے

یہاں رکھی گئی تھی۔ گوہرا کا ایک اچٹتا ہوا وار رستم کے کندھے پر لگا۔ دوسرا اس نے تیزی سے جھک کر بچایا۔ پھر گوہرا کا کلہاڑی والا ہاتھ رستم کی گرفت میں آ گیا۔ گوہرا نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی کھینچنی چاہی دونوں ہاتھوں کی گرفت تھی۔ رستم کا گھٹنا حرکت میں آیا۔ ضرب گوہرا کی کلائی اور کہنی کے درمیان لگی، گوہرا کی دردناک کراہ تو سب نے سنی لیکن اس کڑاکے کی آواز شاید کسی تک نہ گئی ہو جو ہڈی ٹوٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ کلہاڑی پکے ہوئے پھل کی طرح گوہرا کے ہاتھ سے جدا ہوگئی۔ اگلے لمحات گوہرا کے لئے قیامت کے تھے۔ رستم نے اس قوی ہیکل ڈکیت کو اتنا مارا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ الاؤ میں گرنے سے گوہرا کے بال جھلس گئے۔ اس کے ناک، منہ اور کانوں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کی کراہیں کھوہ کے در و دیوار کو لرزانے لگیں، اس وقت یہی محسوس ہوتا تھا کہ رستم اسے جان سے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے گوہرا کے ساتھی دلاور نے ہمت کی۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور اس نے اپنے سردار کو رستم سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے رستم اور گوہرا کے درمیان آتے ہوئے کہا۔ ''سیال صاحب! چھوڑ دیں۔ خدا کے لئے چھوڑ دیں......بس کریں۔''

رستم نے اپنا الٹا ہاتھ اتنی وحشت سے گھمایا کہ اس کی ضرب نے دلاور کو کئی فٹ پیچھے گرا دیا۔

گوہرا کے سر کے جھلسے ہوئے بال رستم کی مٹھی میں تھے۔ وہ اس کے چہرے کو سنگلاخ زمین پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''معافی مانگ..... حرامزادے معافی مانگ، نہیں تو تیری جان لے لوں گا۔'' اس کی آواز میں وہی کڑک تھی جو کھوہ سے باہر تاریک آسمان پر لپکنے والی بجلی میں تھی۔ یہ آواز سننے والے کے رگ و پے میں سرایت کرتی اور جسم کے ایک ایک ریشے کو لرزاتی تھی۔

دلاور چوٹ کھا کر گر گیا تھا۔ پھر نادیہ نے ہمت کی۔ نیم بے ہوش گوہرا کو رستم کے جان لیوا شکنجے سے نکالنے کے لئے وہ آگے بڑھی اور ان دونوں کے درمیان آگئی۔ ''رستم! یہ مر جائے گا چھوڑ دو اسے......خدا کے لئے چھوڑ دو اسے۔''

نادیہ کو دیکھ کر دلاور نے دوبارہ ہمت کی اور نادیہ کے ساتھ مل کر کٹے پھٹے گوہرا کو رستم کی وحشیانہ زد سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کو دیکھ کر گوہرا کے ساتھی کاٹھیا اور جیدا وغیرہ بھی آگے بڑھے اور رستم کو گوہرا سے جدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کھوہ میں کہرام سا مچ گیا۔ رستم کرب ناک انداز میں چیخ رہا تھا۔ ''معافی مانگ......کتے، میری بی بی سے معافی مانگ

نہیں تو میں چیر ڈالوں گا تجھے۔''

رستم کی گرفت اتنی سخت تھی کہ پانچ چھ افراد بھی مل کر اس گرفت کو ختم نہیں کر پا رہے تھے۔ اس گرفت میں اور اس منظر میں کھولی گاؤں کے میلے والے خونی ہنگامے کا رنگ تھا۔

دلاور نے رستم کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''سیال صاحب! سردار کے بدلے ہم معافی مانگتے ہیں، ہم سب مانگتے ہیں۔ اسے چھوڑیں۔ یہ مر جائے گا۔''

اور گوہرا واقعی قریب المرگ تھا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو خوفناک طریقے سے مڑا ہوا تھا۔ بال جھلس گئے تھے۔ چہرہ لہو سے تر بتر تھا اور لگتا تھا کہ ایک آنکھ ضائع ہوگئی ہے۔

رستم نے جب دیکھا کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا ہے تو اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ نادیہ سمیت کئی افراد نے رستم کو تھاما ہوا تھا اور سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے... کھوہ سے باہر بارش اب بھی ہو رہی تھی لیکن پہلے سے دھیمی تھی۔

گوہرا کو چھوڑنے کے بعد رستم آنکھوں میں آتشیں آنسو لئے کھوہ سے باہر نکل آیا اور دہانے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے پر کلہاڑی کا اچٹتا ہوا بلیڈ لگا تھا۔ یہاں سے قمیص پھٹ گئی تھی اور جلد پر کٹ لگنے سے خون رسنے لگا تھا لیکن اسے کسی طرح کی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اصل تکلیف تو دل میں تھی، بی بی کے بارے میں گوہرا کی زبان سے بے ہودہ الفاظ سننے کے بعد اس کے کانوں میں جو زہر گھلا تھا اس کی تلخی شاید کئی دنوں تک برقرار رہنی تھی۔

کھوہ کے اندر شور مچا ہوا تھا۔

''پانی پلاؤ۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔

''جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ آگ کے قریب لے جاؤ۔'' کسی دوسرے نے کہا۔

''پہلے خون تو بند کرلو۔'' کسی تیسری آواز نے مشورہ دیا۔

کھوہ میں موجود مرد و زن گوہرا کو ہوش میں لانے میں کوشش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی مرہم بھی۔

رستم کچھ دیر دہانے کے سامنے بیٹھا رہا۔ بارش تواتر سے اس کے تپتے ہوئے جسم پر گر رہی تھی اور اس کی رگوں میں دوڑتی آگ کی تپش کو دھیرے دھیرے کم کرنے لگی۔ وہ اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا اس اونچے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے پوٹھوہار کے اس علاقے کو دور دور

تک دیکھا جاسکتا تھا۔ تاہم اس وقت کچھ زیادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بادلوں کی شام کاذب کے بعد اب شام صادق بھی نشیب وفراز پر اُتر آئی تھی۔ ہر طرف تاریکی کی چادر کھلتی جارہی تھی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی چوٹیاں اور کھائیاں اس تاریکی میں روپوش ہورہی تھیں۔

رستم کا سارا لباس شرابور ہوگیا تھا۔ لمبے بال بھیگ کر گردن اور چہرے سے چپک گئے۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھا رہا۔ پولیتھین میں لپٹا ہوا ماؤزر اس کی قمیص کے نیچے تھا اور سرکنڈے کاٹنے والا وہ چھرا بھی جو مہتم بستی سے ساتھ لے کر چلا تھا۔ مہتم بستی چھوڑنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ اس چھرے اور ماؤزر سے چار جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا تھا، ان میں سے تین پولیس اہلکار اور ایک نارپوری چوہدریوں کا کارندہ تھا۔ شاید اس وقت زیادہ راحت، اسے اے ایس آئی کو قتل کر کے ہوئی تھی۔ یہی شخص تھا جس کی نگرانی میں چوہدری حشام کی حویلی میں اس پر ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔

اچانک ایک آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا۔ ''سیال صاحب؟''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ چاندنی تھی۔ بارش اسے تربتر کررہی تھی۔ وہ ہاتھ میں مرہم پٹی کا سامان لئے کھڑی تھی۔ یہ سامان اسے نادیہ نے رستم ہی کے سفری بیگ سے نکال کر دیا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ چاندنی کو نادیہ ہی نے بھیجا ہے۔ یقیناً رستم کے موڈ کو دیکھتے ہوئے وہ خود آنے سے کترا رہی تھی۔

''کیا ہے یہ؟'' رستم پھنکارا۔

''پپ۔۔۔ پٹی کرلیں۔ آپ کا کندھا زخمی ہے۔''

''کرلوں گا۔۔۔ اسے اندر لے جاؤ۔''

''اگر آپ کہیں تو میں کردوں؟'' وہ ہکلائی۔

''میں نے کہا ہے ناں، ابھی مجھے ضرورت نہیں۔''

وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر جیسے ہمت کر کے بولی۔ ''میڈم نادیہ نے کہا ہے۔ اگر آپ نے کھانا۔۔۔''

''میں نے کچھ نہیں کھانا۔'' وہ گرجا۔ ''اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ جاؤ۔''

وہ رزکر واپس مڑی۔ ٹیلے سے اُترتے ہوئے اسے پاؤں جما کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ تین چار میٹر نیچے گئی ہوگی کہ رستم نے اسے آواز دی۔ ''سنو۔''

''جی۔'' وہ ڈگمگا کر رہ گئی۔

''وہ ہوش میں آ گیا ہے؟''

''ہاں جی۔۔۔۔۔ نہیں جی۔۔۔۔۔ لیکن اب کچھ ٹھیک ہے۔''

''کیا مطلب؟ ہوش میں ہے کہ نہیں؟'' رستم کی آواز میں زہر تھا۔

''ہاں جی، کچھ کچھ ہوش میں ہے۔'' وہ بوکھلائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

اس کے جانے کے بعد رستم نے اپنا سر ایک بار پھر گھٹنوں میں دیا۔ بارش دھیمی مگر مسلسل ہورہی تھی۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ وہیں سے جڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ تاؤ حشام کی حویلی میں گزرے ہوئے روز و شب اس کے ذہن میں انگاروں کی طرح پیوست تھے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔۔۔ لاہور میں جب وہ چوہدری بشیر کی کوٹھی سے نکلنے کے لئے انیکسی سے باہر آیا تھا تو اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس کی محبوب ترین ہستی نے اسے دشمنوں کے مقابل پہنچنے سے پہلے ہی نہتا کردیا ہے۔ کوٹھی کے احاطے میں چوہدری کے خونخوار کارندوں سے گھمسان کی لڑائی لڑتے ہوئے جب اس نے رکھوالی کے کتے پر فائر کیا تو اسے پتا چلا کہ پسٹل خالی ہے۔ بعدازاں وہ اپنے دفاع میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایک دم ہی اس کی ہمت جیسے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ اسے پکڑ کر دو تین جگہ رکھا گیا پھر تاؤ حشام کی دور دراز حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ اس حویلی کی کوٹھڑی میں رستم نے اپنے بچپن کے دوست آفندی کی دردناک موت کا دکھ جھیلا۔ جس وقت آفندی مر رہا تھا، رستم کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر زخموں سے چُور پڑا تھا اور اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک دھاگا تک نہیں تھا۔ آفندی کے مرنے کے دو دن بعد اسے جوتی میں پانی پیش کیا گیا اور جانور کو دینے والے انداز میں روٹی اس کے سامنے زمین پر ڈالی گئی۔ یہ پانی اور روٹی چار روز تک اسی طرح پڑے رہے، حشام کے کارندوں اور اے ایس آئی مظہر کی ضد تھی کہ رستم کو اسی طرح کھلائیں اور پلائیں گے۔ وہ اس ضد کے سامنے سر کیسے جھکا سکتا تھا۔ کئی دن پہلے ہی زندگی اور موت کا فرق اس کے لئے تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ پانچویں روز اے ایس آئی مظہر نے تازہ روٹی اور پانی اس کے سامنے رکھوائے تھے۔ رستم کے ہاتھ پشت پر بندھے رہتے تھے۔ اس نے رستم کے سر پر ٹھوکر مارکر کہا تھا۔ ''ماں کے۔۔۔ زندہ رہنا ہے تو یہی کھانا اور پینا پڑے گا۔ ورنہ لاش بن کر قبر میں اتر جاؤ گے۔'' رستم نے دل ہی دل میں اس کی نادانی پر لعنت بھیجی تھی۔ لاش بننا اور قبر میں اترنا اس کے لئے کون سا مشکل تھا۔ وہ لاتعداد مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا چکا تھا اور یہ موت تو پھر بی بی کی چاہ اور بی بی کی راہ میں آرہی تھی۔ وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اس بدترین طریقے سے کھانے پینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ اور پھر تین دن مزید گزر گئے۔ رستم کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ اور اناج کا ایک دانہ نہیں گیا تھا۔ زخموں سے

پُور اس کی زندگی تیزی سے موت کے اندھے غار کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ نظر دھندلا گئی تھی اور اردگرد کی آوازیں اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف جا رہا تھا لیکن دکھی نہیں تھا۔ اس کے دل میں اطمینان تھا۔ یہ بی بی کی راہ اور بی بی کی چاہ تھی۔

لیکن ایک دن جب وہ کھوٹھڑی کے فرش پر پڑا تھا اور سانس اس کے سینے میں اٹک رہی تھی، ایک عجیب خیال نے اس کا اطمینان غارت کر دیا۔ یہ زندگی اور یہ جسم اس کے کہاں تھے؟ یہ تو اس کی بی بی کے تھے، بی بی کی اجازت کے بغیر وہ انہیں کیسے ختم کر سکتا تھا۔ حشر کے دن بی بی اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ سکتی تھی۔ وہ سب کچھ تو میری امانت تھا۔ تم نے اپنی انا کی خاطر وہ سب کچھ ختم کیوں کیا؟ اسے لگا کہ وہ کم ہمتی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس ڈر سے کہ اس زندگی اور اس جسم کو عشق کے مزید ستم نہ سہنا پڑیں، وہ قبر میں اُتر رہا ہے۔ خود کو اپنی لاش میں چھپا رہا ہے۔

اسی دن وہ گھسٹتا ہوا اس جوتی کی طرف گیا تھا جس میں تین دن کا باسی پانی پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تر ہوئے تھے۔ اس کے سوکھے گلے میں زندگی کی نمی داخل ہوئی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے بالکل ندامت نہیں ہوئی۔ اسے یہی لگا کہ وہ بی بی کی خواہش اور مرضی کے مطابق ایسا کر رہا ہے۔ جب ایک بار اس نے اپنا آپ ''عشق کی رضا'' میں مار لیا تو پھر بعد کے مرحلے بھی اس کے لئے آسان ثابت ہوئے تھے۔ اسے تازہ روٹی فراہم کی گئی جو اس نے جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل جھک کر اور دانتوں سے اٹھا کر کھائی۔ اس کے اندر ایک جذب کا موسم تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے بی بی کی رضا اور خوشی کے لئے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بی بی کرا رہی ہے اور جب بی بی کرا رہی تھی تو پھر شرم کیسی، ذلت کیسی؟

کنجری بنیاں میری شان نہ گھٹ دی
مینوں نچ کے یار مناون دے

اسے یاد تھا، بی بی کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد وہ گھنٹوں اور پیہروں شاہ جی کے مزار پر سرنیہوڑائے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں ٹائیلوں کے ڈبی دار فرش پر ایک بزرگ، سبز چغہ پہنے آنکھیں بند کئے مسلسل رقص کیا کرتے تھے اس وقت تک جب تک تھک کر گر نہ جاتے۔

پھر ایک دن حشام کی حویلی میں نیم بے ہوش اور زخموں سے چُور رستم پر بھی ایک ایسا ہی

مرحلہ آیا تھا۔ وہ شدید ترین بخار میں پھنکتے ہوئے فرش پر پڑا تھا۔ وہ اب برہنہ نہیں تھا۔ دو دن پہلے اس کے جسم پر زنانہ لباس چڑھا دیا گیا تھا۔ حشام کے کارندوں نے اس کے پاؤں میں گھنگھرو باندھے اور اسے ناچنے کا حکم دیا۔ اس دن کئی چھوٹے بڑے چوہدری اس کی کوٹھڑی کے سامنے تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔

رستم کے غنودگی سے بھرے ہوئے ذہن میں مزار کا ایک واقعہ تازہ ہو گیا۔ ایک انگلینڈ پلٹ پاکستانی سیٹھ لاہور سے سفر کر کے شاہ جی کے مزار پر پہنچا تھا۔ تین دن کے بعد اس کے اکلوتے بیٹے کو میانوالی جیل میں پھانسی ہونی تھی سیٹھ اور سیٹھانی رو رو کر مزار پر دعا مانگتے رہے۔ پھر کسی مقامی شخص نے اپنے عقیدے کے مطابق کہہ دیا۔ ''سیٹھ جی! نچ کے یار مناؤ۔'' اور نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے رستم نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ سوٹڈ بوٹڈ سیٹھ نے کوٹ اُتارا تھا۔ سفید قمیص، پتلون سے باہر نکالی تھی اور سفید ریش بزرگ کے ساتھ مل کر دھمال ڈالنے لگا تھا۔ وہ بہت تنومند تھا۔ اس کی توند ہل رہی تھی، مونچھیں لرز رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو دھاروں کی صورت بہہ رہے تھے۔

اس روز اچانک رستم کی سمجھ میں آیا تھا کہ بات ناچنے یا نہ ناچنے کی نہیں، بات تو اپنی انا، اپنی شان اور ظاہری ہیئت کو کسی کی رضا کی خاطر ملیامیٹ کرنے کی ہے۔ قطرے کی طرح اپنی ہستی کو مٹانا اور کسی عظیم پانی کا حصہ بن جانا۔

رانجھا رانجھا کردی نی، میں آپے رانجھا ہوئی
رانجھن ماہی آکھو مینوں، ہیر نہ آکھو کوئی

رستم کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ سیٹھ اپنے بیٹے کو بچا پایا یا نہیں لیکن اسے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ قدرت، راہِ محبت کے مسافروں سے آن بان کی قربانی کس طرح وصول کرتی ہے۔ اس واقعے کے ذہن میں تازہ ہوتے ہی رستم کے لئے عشق کا یہ امتحان بھی آسان ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس نے اپنی آنکھیں جذب سے بند کر لی تھیں اور اس کے زخمی پاؤں حرکت کرتے چلے گئے تھے۔ اسے عجیب کیف محسوس ہوا تھا۔ وہ نارپوری کے ذلیل چوہدریوں کے سامنے نہیں اپنی بی بی کے سامنے ناچ رہا تھا۔ وہ ایک اونچی مسند پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹ باہم ملے ہوئے تھے، اس کے رخساروں پر دنیا کے حسین ترین گلاب کھلے تھے، اس کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک تھی، وہ اپنے دیوانے کی اطاعت گزاری کو مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، خوبرو ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن تھی جیسے سوچ رہی ہو اپنے اس دیوانے کو اس ''جاں سوزی'' کا کیا صلہ دے؟ اور وہ اپنے پاؤں کو حرکت دیتا چلا گیا

تھا۔

اچانک ایک آواز نے رستم کو دوبارہ خیالوں سے چونکا دیا۔ اس مرتبہ نادیہ خود تھی۔ بارش اب تھم گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا جسم پر کپکپی طاری کر رہی تھی۔ نادیہ نے اپنے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ وہ چند فٹ کی دوری پر کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟'' رستم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''دلاور اور کاٹھیا وغیرہ کے پاس ایک وائرلیس سیٹ ہے۔ وہ اس پر کسی لالہ سے بات کر رہے تھے۔ اس کو تمہارے بارے میں اور گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' نادیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میں جانتا ہوں وائرلیس کے بارے میں......اور لالہ کے بارے میں بھی۔ پریشانی کی بات نہیں۔ تم جاؤ۔''

وہ خاموش کھڑی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ خاموشی طویل ہوتی جا رہی ہے تو کہنے لگی۔ ''گوہرا بہت زخمی ہے۔ اس کے زخموں کا خون بڑی مشکل سے بند ہوا ہے اس کی بائیں آنکھ بھی بُری طرح زخمی ہوئی ہے۔ ماتھے کے ایک حصے کی کھال اُتر کر آنکھ کے اوپر لٹک رہی ہے۔ یہ لوگ اسے چھری سے کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کرنے دو جو کرتے ہیں۔'' رستم نے بےزاری سے کہا۔

''دلاور اور کاٹھیا کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ صبح سویرے یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔''

''وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔''

''لیکن اس زخمی گوہرے کا کیا ہوگا؟''

''اس فکر میں تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔'' رستم کے لہجے میں دباڑ کا رنگ تھا۔ نادیہ جیسے سہم کر سکڑ گئی۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی۔ پھر پاؤں جما جما کر نشیب میں اُتر گئی۔ کھوہ کے اندر الاؤ کی روشنی تھی اور کچھ سائے حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔

اگلے روز صبح سویرے یہ قافلہ رتو ڈیرے یا وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات ہی میں دلاور، کاٹھیا اور جیدے وغیرہ نے کافی کام کیا تھا۔ ایک خچر کا پالان اکھاڑ کر اس کی چار لکڑیوں کو دو دو کر کے جوڑا گیا تھا پھر ان لمبی لکڑیوں کے ساتھ ایک ترپال کو اس طرح منسلک کیا گیا تھا کہ اسٹریچر کی شکل بن گئی تھی۔ اسی اسٹریچر پر زخمی گوہرا کو لیٹا کر اس پر چادر ڈال دی

گئی تھی۔ گوہرا نیم بے ہوشی میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ بائیں آنکھ پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بازو کے گرد بھی لکڑیاں جوڑ کر پٹی باندھی گئی تھی۔

آج موسم خوشگوار تھا۔ انہوں نے گھاٹیوں اور سطح مرتفع کی تنگ گزرگاہوں پر اپنا سفر تیزی سے شروع کیا۔ رستم آگے تھا۔ اس کے ساتھ کاٹھیا تھا۔ نادیہ، رستم کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس سے پیچھے گوہرا کا اسٹریچر اور رقاصائیں تھیں۔ گروہ کے باقی افراد سب سے آخر میں تھے۔

بے حد تھکن کے باوجود انہوں نے رات نو بجے تک مسلسل سفر کیا اور دوسرے پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ یہ ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی ایک نیم ہموار جگہ تھی۔ رات آرام کرنے کے بعد صبح سویرے وہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔ جوں جوں وہ وادی سون کی گہرائیوں میں اُترتے جا رہے تھے، گردوپیش کے مناظر عجیب تر اور راستے دشوار ہو رہے تھے۔ رستم ان راستوں سے کئی بار گزر چکا تھا لیکن یہ ایسی بھول بھلیاں تھیں کہ ہر بار حافظے پر زور دے کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ پرسوں شام والے سنگین واقعے کے بعد بے تکلفی اور تفریح کا ماحول یکسر ختم ہو گیا تھا۔ رستم کے موڈ کے پیشِ نظر سب گم صم اور کسی حد تک سہمے ہوئے تھے۔ صرف نادیہ ہی تھی جو گاہے بگاہے اس سے بات کرنے کی جرأت کر لیتی تھی۔ اس سفر میں ایک جگہ ایسی بھی آئی جہاں رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ایک پُرپیچ راستے پر انہوں نے تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح سفر کیا۔ بعدازاں یہ پٹیاں کھول دی گئیں۔ گوہرا کو شدید بخار تھا اور اسی بخار کی غنودگی میں وہ ہولے ہولے کراہتا اور بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ بھی بُری طرح سوج گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت انہوں نے نشیب میں کچھ جنگلی سادھوؤں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی جھلک دیکھی۔ اس جھلک نے نادیہ کو [illegible] جو پہلے ہی اس سفر کی طوالت سے پریشان تھی اور پریشان نظر آنے لگی۔

شام سے ذرا پہلے رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں پر پھر سے پٹیاں باندھ دی گئیں وہ وڈے ڈیرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں وہ ایک دوسرے کے سہارے سے چلنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ وڈے ڈیرے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ دو ڈھائی دن کا سفر انہوں نے چھتیس گھنٹوں میں مکمل کر لیا تھا۔

یہ ڈیرہ تین چار چھوٹے چھوٹے کھوہ نما غاروں پر مشتمل تھا۔ ایک سائبان نما پتھر کے نیچے بھی چھوٹے چھوٹے پتھروں سے دیواریں کھڑی کر کے تین چار کمرے بنائے گئے تھے

لیکن ڈیرے کی اصل گنجائش وہ قدرتی سرنگ تھی جو ڈھلوان کی شکل میں دس بیس فٹ گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اتنی گہرائی میں جانے کے بعد یہ سرنگ کم از کم پانچ چھ شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ کچھ شاخیں تو دو تین سو میٹر آگے جا کر بند ہو جاتی تھیں یا اتنی تنگ ہو جاتی تھیں کہ بے کار ہی ہو کر رہ جاتی تھیں لیکن دو شاخیں بہت آگے تک نکل جاتی تھیں۔ یہ آگے جا کر مزید تقسیم ہو جاتی تھیں اور بھول بھلیوں کی طرح سطح مرتفع کے نیچے گھومتی تھیں۔ ان سرنگوں کے دوسرے دہانے ڈیرے سے ڈھائی تین کلومیٹر کی دوری تک تھے۔ ان سرنگوں کی دیواریں بھربھرے پتھروں اور سنگریزوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک دو جگہ ان سنگریزوں میں سے تھوڑا تھوڑا پانی بھی رِستا تھا جسے ضرورت کے لئے جمع کر لیا جاتا تھا۔ سرنگوں کے جو حصے استعمال میں نہیں تھے اور تاریک تھے، وہاں ہر طرح کے حشرات الارض پائے جاتے تھے اور ایک خاص قسم کی بُو بسی تھی جو برسات میں بڑھ جاتی تھی۔

رستم یہ جگہ درجنوں بار دیکھ چکا تھا۔ وہ یہاں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھا... ایک ایک ٹیلہ، ایک ایک جھاڑی اس کے حافظے پر نقش تھی، شام کے جھٹپٹے میں وہ قرب و جوار کو شناسا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیرے سے تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ دس بارہ قبریں تھیں۔ رستم ہر قبر میں رہنے والے کو جانتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں یہاں دو تین قبریں مزید بنی تھیں۔ ایک قبر بالکل نئی تھی۔ رستم کو قبر پر چند مرجھائے ہوئے پھول بھی نظر آئے۔

قبروں سے آگے ڈیرے کا کنواں تھا، کنوئیں سے آگے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ چٹانی سائبان تلے بنے ہوئے کمرے اسی جھنڈ سے متصل تھے۔ یہاں پہنچنے سے ذرا پہلے ہی رقاصاؤں اور سازندوں کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دی گئی تھیں اور گوہرا کے اسٹریچر کو چار تازہ دم افراد نے سنبھال لیا تھا۔ کھوہ نما مقامات کو حجرے کہا جاتا تھا۔ سرنگوں کو کھوندریں اور سائبان تلے بنے ہوئے کمروں کو ''چھجا'' کہا جاتا تھا۔

رستم کو کھوندروں کی طرف سے ہلکی روشنی دکھائی دی اور اس کے ساتھ موسیقی کی مدھم آواز بھی آئی۔ پکوان کی خوشبو بھی قرب و جوار میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف کچھ جھنڈیاں سی لگی دکھائی دیں۔ یہ جھنڈیاں کپڑے کے رنگ برنگے ٹکڑوں اور کاغذوں سے مقامی طور پر ہی تیار کی گئی تھیں۔ مزید آرائش کے لئے ویڈیو کیسٹوں کے فیتوں کو کاٹ کاٹ کر جھالروں کی صورت میں آویزاں کیا گیا تھا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ یہاں کوئی تقریب یا چھوٹا موٹا جشن ہے۔ رستم اور دیگر افراد کی آمد کو محسوس کر کے ڈیرے کے مکینوں میں ہلچل نظر آنے لگی۔ جلد ہی

بہت سے افراد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ سب کے سب گرد آلود بالوں اور بے ترتیب داڑھیوں والے خستہ حال افراد تھے ہر ایک کے پاس چھوٹا موٹا ہتھیار ضرور دکھائی دیتا تھا۔ رستم ان میں سے بہت سوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ تاہم کئی ایک نئے چہرے بھی تھے۔ جن کو رستم جانتا تھا، وہ بے حد حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو کہ رستم پھر ان کے درمیان موجود ہے۔

زخمی گوہرا کو فوراً حجروں کی طرف لے جایا گیا۔ باقی افراد کھوندروں کی طرف چلے گئے۔ چند افراد نے رستم کے ساتھ پُرجوش معانقہ کیا۔ ان میں سے ایک بوسیدہ پینٹ شرٹ والا نوجوان بھی تھا۔ پھر وہ لوگ اسے چھجے کی طرف لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رستم چھجے کے آرام دہ کمرے میں موجود تھا۔ یہاں فرش پر ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے تھے۔ لکڑی کی الماری، ٹی وی، پنکھا اور بہت سی دیگر سہولتیں یہاں موجود تھیں۔ ایک طرف دیوار پر دوسری جنگِ عظیم کی خوفناک مشین گن M6-42 آویزاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو ٹرپل ٹو رائفلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس دیوار پر ایک شیلف بھی تھا جس پر شراب کی بوتلیں اہتمام سے سجائی گئی تھیں۔ اس کمرے میں رستم کے سامنے جو شخص بیٹھا تھا اس کا نام لالہ فرید تھا اور نادر کاکا کے بعد یہی شخص یہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لالہ فرید نے رستم کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا تھا اور اس کا حال احوال پوچھا تھا۔ اب وہ دونوں تفصیلی گفتگو کی طرف بڑھ رہے تھے۔

لالہ فرید ملیشیا رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے گرم شال کے نیچے اپنے چوڑے چکلے کندھوں کو ایک بے قراری جنبش دی اور پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''پرسوں رات دلاور نے وائرلیس پر تمہارے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا۔ میں نے اس سے کہا میری بات کراؤ رستم سے۔ وہ بولا کہ تم قریب نہیں ہو پھر اس نے گوہرا کے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا۔ پریشانی تو بہت ہوئی لیکن یہ یقین تھا کہ اگر تم نے گوہرا کو مارا ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی تمہارے پاس ضرور ہوگی۔''

''چھوٹی موٹی وجہ نہیں تھی۔'' رستم گھمبیر لہجے میں بولا۔

رستم کے لہجے کی گھمبیرتا کو محسوس کر کے فرید نے کہا۔ ''چلو، اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ کہ تم نے مہاریں کیسے موڑیں ہم تو تمہارا رستہ دیکھ دیکھ کر تھک گئے تھے۔''

''انجان نہ بنو، تمہیں بہت کچھ پتا ہے۔''

''لیکن بہت کچھ نہیں بھی پتا۔''

''تو تم پوری تفتیش کرنا چاہتے ہو؟'' رستم کے لہجے میں ہلکی سی گرج آ گئی۔

''نہیں یار! تم سے تفتیش کروں گا بھلا؟ میں تو جاننا چاہ رہا تھا کہ...''

''تم جو کچھ جاننا چاہتے ہو، سب بتا دوں گا لیکن ابھی اس بارے میں کوئی بات نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔''

''میرے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ اس کی رہائش تمہاری بیوی کے ساتھ ہو تو بہتر ہے۔ مجھے جہاں کہو گے، وہیں پڑ جاؤں گا۔''

''کیسی بات کرتے ہو رستم! اس ڈیرے پر جتنا حق میرا ہے اتنا ہی تمہارا ہے۔ تم جہاں کہو، تمہارے آرام کا انتظام کر دیتا ہوں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم بھی یہیں رہو۔ میں ساتھ والا کمرہ تمہارے لئے خالی کرا لیتا ہوں۔ ہاں یہی زیادہ مناسب ہے۔''

اسی دوران میں کاٹھیا اندر آیا، اس نے جھک کر سلام کیا اور ادب سے بولا۔ ''لالہ! ناصر نے گوہرا بھائی کی مرہم پٹی کر دی ہے۔ ایک دو ٹیکے بھی لگا دیئے ہیں۔ اگر کچھ اور کرنا ہے تو آپ آ کر دیکھ لیں۔''

لالہ فرید نے رستم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ دونوں چلتے ہیں۔''

''نہیں، تم اکیلے ہو آؤ۔ میں ابھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔'' رستم کے لہجے میں زہر تھا۔

فرید طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کاٹھیا سے کہا۔ ''رستم کے ساتھ آنے والی میڈم صاحبہ کو اندر اپنی بھرجائی کے پاس لے جاؤ۔ ان دونوں کے لئے چائے پانی کا انتظام علیحدہ سے کرواؤ۔''

کاٹھیا نے ایک بار پھر سر جھکایا اور باہر چلا گیا۔

رستم دری پر چت لیٹ گیا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ بہت تھکا دینے والا سفر تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ رستم کو خاص تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ تھکاوٹ، نہ تکلیف، نہ دکھ۔ وہ بالکل پتھرا چکا تھا آج کم و بیش ڈھائی برس بعد ڈیرے پر آیا تھا۔ یہاں بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن بہت کچھ جانا پہچانا بھی تھا۔ ابھی ذرا دیر پہلے فرید نے ناصر کا ذکر کیا تھا۔ ناصر بھی رستم کے لئے جانا پہچانا نام تھا۔ یہ ایک نوجوان ڈاکو تھا اور رستم یہ تھا کہ میڈیکل کے آخری سال میں ایک ٹریفک سارجنٹ کو قتل کرنے کے الزام

میں یہ قانون کے شکنجے میں پھنسا اور پھر پھنستا ہی چلا گیا۔ وہ اپنی سوزکی کار پر امتحانی سینٹر پیپر دینے جا رہا تھا۔ وقت محدود تھا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک اشارے پر وہ ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت کے لئے لیٹ ہوا۔ سارجنٹ نے اشارہ توڑنے کے الزام میں اسے روک لیا۔ اس نے بہت منت سماجت کی۔ سارجنٹ کو بتایا کہ اس کا کیریئر داؤ پر ہے۔ وہ لیٹ ہو گیا تو امتحان نہ دے پائے گا۔ سارجنٹ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ہر صورت گاڑی بند کرنے کے درپے تھا۔ ناصر نے گاڑی بھگا دی۔ سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر اس کا جارحانہ تعاقب کیا اور گاڑی کو روکنے کی کوشش کی۔ ناصر نے بھی نہ رکنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ آخر ایک جگہ اس نے زوردار طریقے سے موٹر سائیکل کو گاڑی کی سائیڈ ماری۔ سارجنٹ پھسلتا ہوا ایک وین سے ٹکرایا اور اس کے نیچے کچلا گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ناصر کی ہنستی بستی زندگی بھی کچلی گئی۔ وہ فرار ہو گیا۔ بعدازاں اس کے ہاتھوں پولیس کا ایک ٹاؤٹ قتل ہوا اور وہ اشتہاری ہو کر اپنی ماں اور دو بہنوں کو روتا چھوڑ کر ان خرابوں میں آ بسا، کبھی واپس نہ جانے کے لئے۔

یہ ویرانہ ایسی ہی اَن گنت کہانیوں سے اٹا ہوا تھا۔ بے شک کچھ لوگ فطرتاً بھی جرائم پیشہ تھے لیکن زیادہ تر ایسے ہی تھے جنہیں بے انصاف معاشرے نے مجرم بنایا تھا۔ رستم خود بھی تو ان دوسری قسم کے لوگوں میں شامل تھا۔ کئی برس بیت چکے تھے لیکن اپنے بوڑھے باپ کا خون آلود جسم جیسے آج بھی اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ لرز رہا تھا، ہچکیاں لے رہا تھا اور بےزبان خاموشی کہہ رہا تھا۔ ''رستم تیری آپو بڑی کمزور ہے۔ اس کی طاقت بن جانا۔ اسے زندہ درگور نہ ہونے دینا۔'' اور وہ بن گیا تھا طاقت۔ اس نے اپنی آپو کو حالات کی قاتل لہروں سے صاف نکال لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے نکالتے نکالتے وہ خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد فرید لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر تردد تھا۔ مخملی گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے لمبی سانس لی اور بولا۔ ''گوہرا کو کافی چوٹیں آئی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ناصر جیسا بندہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ اب بھی آنکھ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دو تین دن بعد اندازہ ہو گا کہ روشنی بچ سکتی ہے یا نہیں۔''

رستم خاموش رہا۔ چہرے پر گہرا کرب تھا۔ فرید نے چند لمحے انتظار کیا جیسے چاہ رہا ہو کہ رستم بھی اس بارے میں بات کرے۔ رستم نے بات نہیں کی تو وہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

کھونڈر یعنی سرنگ سے گانے بجانے کی آوازیں کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ دو چار رقاصائیں یہاں پہلے سے بھی موجود تھیں۔ شاید انہیں کہیں اور سے لایا

گیا تھا۔ ناچ گانا ہو رہا تھا اور فرید کے ساتھیوں کے مخمور آوازے گھاٹیوں میں گونج رہے تھے۔

رستم نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی تو آوازیں مزید واضح ہو گئیں۔ کسی ٹھیٹ پنجابی شخص نے ٹپے کی طرز پر تان لگائی۔

''اٹھ آنے دوانی دے

متھے اُتے چمکدے لگدے، تیرے کنڈل جوانی دے۔''

ایک اردو بولنے والے نے کہا۔

''بدلی کی چھایا ہے۔

او، پتلی کمر والی، دل تجھ پر آیا ہے۔''

کسی نے سرائیکی میں بول اٹھائے۔ پھر ایک دم بہت سے افراد آوازے بلند کرنے لگے۔

رستم نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا تماشا ہے؟''

فرید کی گھنی مونچھوں کے نیچے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے بالوں سے بھرے سینے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''کچھ نہیں یار! بڑے دنوں سے یہ لوگ بور ہو رہے تھے۔ میں نے کہا، تھوڑی سی دل پشوری کر لیں۔''

''اور دل پشوری کے لئے تم شہر سے رقاصاؤں کو اکٹھا کر کے لے آئے ہو۔''

''یار کوئی زبردستی اٹھا کر تو نہیں لایا۔ سودا کر کے لائے ہیں۔ ایڈوانس دیا ہے باقی کی بھی ایک ایک پائی ادا کریں گے اور انہیں رتو موڑ تک واپس چھوڑ کر آئیں گے اور یہ آئی بھی اپنی خوشی سے ہیں یار۔''

''لگتا ہے تم نادر کاکا کی باتیں بھولتے جا رہے ہو۔ وہ کیا کہا کرتا تھا...... عورت اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لے کر آتی ہے اور وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ مفرور کے لئے عورت کے بازو پھانسی کا پھندا ہوتے ہیں۔''

''مجھے سب یاد ہے رستم! پر وقت کے ساتھ بہت کچھ بھولتا بھی تو ہے۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے اور بہت کچھ بھلاتی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی برسوں میں تم نے سیکھا کم ہے اور بھلایا زیادہ ہے۔''

وہ گہرا کش لے کر بولا۔ ''تمہارے ساتھ بھی تو عورت آئی ہے۔''

''مجھے پتا تھا تم یہ بات ضرور کہو گے۔ اس کا جواب بھی ہے میرے پاس۔ اس لڑکی کو

میں نہیں لایا، یہ زبردستی آئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے جلد سے جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں۔''

''عورت آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ جتنی خوبصورت اور جوان ہوتی ہے، اس سے بچنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔''

''میرے بارے میں سب جانتے ہو، پھر بھی یہ بات کہہ رہے ہو؟''

''میرا خیال تھا کہ میں اور نادر کاکا تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ ایک دم غلط۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اس طرح راستہ بدلو گے۔''

رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ''دیکھو فرید! بات اسی رخ پر جا رہی ہے، جس رخ پر جانے سے گوہرا کے ساتھ میری لڑائی ہوئی ہے۔''

فرید کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پہلے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہے گا لیکن پھر اس نے تحمّل کا ثبوت دیتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ مسکرا کر بولا۔ ''چلو چھوڑو ان باتوں کو۔'' پھر وہ شیلف کی طرف بڑھا۔ ایک چمکتی دمکتی بوتل پر اس نے بڑی ''شفقت'' سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''کیا خیال ہے، ذرا ہونٹ گیلے کر لیں؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فی الحال میں لیٹنا چاہتا ہوں۔''

رستم کے لیٹنے کا انتظام کرنے کے لئے فرید باہر چلا گیا۔ کھوندر یعنی سرنگ میں ہنگامہ ہائے ہُو جاری تھا۔

فرید کے اصرار پر تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد رستم چھجے کے ایک چھوٹے کمرے میں رات بھر سوتا رہا۔ یہ کمرہ اس کے جانے کے بعد بنا تھا۔ رات کو غنودگی کی کیفیت میں اسے کئی بار احساس ہوا کہ کھڑکیوں سے باہر شور و غل بپا ہے۔ ساز بج رہے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے اور سریلی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ کسی وقت کئی افراد مل کر آوازے لگانے لگتے تھے یا پھر نعرے بلند کرتے تھے۔ ایک دو بار ہوائی فائرنگ بھی کی گئی۔

صبح رستم کی آنکھ کھلی تو سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ رستم کے پاؤں اور کندھے کی چوٹیں کچھ تکلیف دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اس نے کھڑکی کھولی۔ یوں لگتا تھا کہ ڈیرے میں موجود ہر فرد محوِ خواب ہے۔ چھجے اور حجروں کے درمیانی احاطے میں اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ یہاں کھانے پینے کے بہت سے برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ چچوڑی ہوئی ہڈیاں، ضائع ہو جانے والے چاول، شراب کی دو چار بوتلیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ احاطے کے درمیان رات کو کافی بڑا الاؤ

روشن کیا گیا تھا۔ اس الاؤ کے آثار اب راکھ اور ادھ بجھے انگاروں کی صورت میں موجود تھے۔ ڈیرے کے چند افراد الاؤ کے ارد گرد نیم پتھریلی زمین پر ہی سو رہے تھے۔ رات کو رقاصاؤں پر جو نوٹ نچھاور کیے گئے تھے ان میں سے کچھ اب بھی یہاں وہاں پڑے تھے۔ دو تین رائفلیں اور کلہاڑیاں بھی سونے والوں کے قریب ہی پڑی تھیں۔ صبحِ نو کی ان اولین گھڑیوں میں جیسے یہ ہتھیار بھی سو رہے تھے۔

اچانک ایک منظر نے رستم کو بُری طرح چونکا دیا۔ کھوندر کے دہانے کے پاس بھی ایک چھوٹے الاؤ کے آثار موجود تھے۔ یہاں ایک ٹنڈ منڈ بیری کے پاس ایک عورت اور مرد کمبل لپیٹے زمین پر بے خبر پڑے تھے۔ نیند میں کمبل مرد پر سے کھسک گیا تھا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔ عورت کا بالائی جسم بھی کمبل سے باہر تھا اور برہنہ تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گوری چٹی ٹانگ بھی پاؤں سے پنڈلی تک کمبل سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ شکل سے جواں سال طوائف نظر آتی تھی، مرد کے سرہانے کی طرف کوئی چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر رستم کو پتا چلا کہ یہ شراب کی بوتل ہے۔

کھلے آسمان کے نیچے یہ واہیات منظر دیکھ کر رستم کی آنکھیں جل اٹھیں۔ وہ کھڑکی بند کرنے جا ہی رہا تھا کہ ایک دم رک گیا۔ اسے ایک متحرک جسم دکھائی دیا۔ یہ ایک چار پانچ سالہ بچہ تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید اور گھونگھریالے بال قدرے سنہری تھے۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ فرید کا بیٹا ٹیپو ہے۔ جب رستم یہاں سے گیا تو ٹیپو فقط دو ڈھائی سال کا تھا۔ آج رستم نے مدت بعد اسے دیکھا تھا اور ایسی جگہ دیکھا تھا کہ اعصاب سن ہو کر رہ گئے تھے۔ بے شک وہ ٹیپو ہی تھا۔ غالباً وہ رات کو جلدی سو گیا تھا اور اب صبح سویرے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی ماں سو رہی تھی ورنہ وہ اسے اس جانب کہاں آنے دیتی۔ وہ ملیشیا رنگ کا کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک ڈالی تھی۔ شہتوت کے سبز پتوں کے عقب سے وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس مٹیالے کمبل کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے مرد اور عورت برہنہ پڑے تھے۔ وہ دس پندرہ سیکنڈ تک بے حد تجسس سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر درخت کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

رستم نے عمیق سانس لے کر کھڑکی بند کر دی۔

وہ کافی دیر تک اپنی جگہ گم صم پڑا رہا۔ ڈیرے کے ماحول میں اسے ایک ناگوار تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور وہی چار پانچ سالہ بچہ اندر آ گیا جسے رستم نے کچھ دیر پہلے شہتوت کے درخت کے پاس

دیکھا تھا۔ ''سلام چاچا'' اس نے توتلی زبان میں کہا۔

''وعلیکم السلام'' رستم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ماتھا چوما۔ ''تم ٹیپو ہی ہو ناں؟''

بچے نے شرما کر سر ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ رستم نے کپ لے لیا۔ دروازے کے پیچھے سے نسوانی آواز ابھری۔ ''رستم بھائی! آپ کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہوں بھرجائی۔'' رستم کا جواب مختصر تھا۔

''ہم آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔''

''میں بھی بھولا نہیں تھا۔''

دوسری طرف خاموشی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے بولنے والی عورت رستم سے مزید بات کی توقع کر رہی ہے لیکن رستم یکسر خاموش تھا۔ اس پر وہی گھمبیر موڈ طاری تھا۔ جس نے پچھلے کئی دنوں سے اسے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد رستم نے عورت سے پوچھا۔ ''فرید سویا ہوا ہے کیا؟''

''نہیں، جاگ گئے ہیں۔ بلاؤں انہیں۔''

''ہاں۔۔''

کچھ دیر بعد فرید تولیے سے منہ پونچھتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے کی نمایاں خصوصیت اس کی نہایت گھنی مونچھیں اور بہت بڑی بڑی آنکھیں تھیں، جسم مضبوط اور قد دراز تھا۔ لگتا تھا کہ رات کو اس نے بھی خوب مے نوشی کی ہے۔ چہرے پر تمتماہٹ ابھی تک موجود تھی۔ رستم نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ دو افراد احاطے میں بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہے تھے۔ ایک پوٹھوہاری بلی ہڈیوں کے گرد منڈلا رہی تھی۔ الاؤ کے گرد سونے والے اب جا چکے تھے۔ کھوندر کے قریب مٹیالے کمبل کے نیچے برہنہ جوڑا اب موجود نہیں تھا۔ رستم نے کھڑکی بند کر دی۔

فرید نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''کافی بڑا ہو گیا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''تم بھی جلدی تو نہیں لوٹے ناں۔''

''ایک ہی ہے یا۔۔۔؟''

''نہیں۔ بس یہی جیتا جاگتا ہے۔''

رستم نے بچے سے کہا۔ ''جاؤ بیٹا۔۔۔۔۔ باہر کھیلو۔''

وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ رستم نے فرید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد ہے، جب

میں یہاں تھا تو یہ دو ڈھائی سال کا ہوگا۔تم کہا کرتے تھے،اسے اپنے ساتھ یہاں اس دوزخ میں نہیں رکھوں گا۔کہیں دور بھیج دوں گا۔''

''میرا پکا پروگرام تھا لیکن......مسئلہ یہ تھا کہ تمہاری بھرجائی مہناز بھی جاتی تھی۔ میں ایک دوراہے میں پھنس گیا تھا۔ٹیپو کو یہاں سے بھیجنا چاہتا تھا اور مہناز کو ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سچی بات پوچھتے ہو تو مہناز کے بغیر زندگی بے کار محسوس ہوتی ہے......اور اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔''

''تو پھر اس کو پیدا کیوں کیا تھا؟''

''بس ہوگئی غلطی لیکن اب اس غلطی کو درست کرنے کے بارے میں سوچ لیا ہے۔پکا پکا ارادہ کرلیا ہے کہ ٹیپو کو اس کے ماموں کے پاس کراچی بھیج دوں گا۔وہاں سے یہ ماموں کے ساتھ قطر چلا جائے گا۔مہناز بھی راضی ہوگئی ہے۔''

''ماں اور بیٹے کو جدا کروگے؟''

''باپ اور بیٹا بھی تو جدا ہوں گے۔تم جانتے ہی ہو،ایسی جدائیاں سون میں پناہ لینے والوں کا نصیب ہوتی ہیں اور ان کے لئے ہم سب کو تیار رہنا پڑتا ہے۔''

رستم نے گہری سانس لی۔''مجھے لگتا ہے جب تک تم اس معصوم کو اس دوزخ سے روانہ کروگے تب تک اس کی معصومیت ختم ہوچکی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟''

رستم نے کڑی نظروں سے فرید کو گھورا۔''میں تمہیں بہت مضبوط سمجھتا تھا فرید!لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم دن بدن کمزور پڑتے جارہے ہو۔''

''کیا کمزوری دیکھی ہے تم نے؟''

''یہ جو رات بھر یہاں ہوتا رہا ہے،کمزوری نہیں تو اور کیا ہے؟ شراب پی کر ناچ گانا کرتے رہے ہو تم سب۔کیا نادر کاکے ہوتے ہوئے تم یہ سب کرسکتے تھے؟''

فرید کا چہرہ تمتما گیا۔''میں سمجھتا ہوں کہ کئی معاملوں میں نادر کاکا بھی غلط تھا۔''

''کئی معاملوں میں نہیں،وہ تھا ہی غلط۔اس نے تمہیں ڈیرے پر جگہ دی،تمہیں ذمے دار بنایا۔تمہیں صلاح مشورے میں شریک کیا اور پھر آخری وقت میں تمہیں سرداری کا رتبہ دیا۔''

''سرداری کا رتبہ تو تمہیں بھی مل رہا تھا لیکن تب تک تمہارے ارادے کچھ اور ہوچکے تھے۔تم شریف آباد جاکر شریفوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہتے تھے۔''فرید نے کہا۔

''یہ ایک علیحدہ بات ہے۔میں بات کررہا ہوں اس گندگی جو تم یہاں گھول رہے ہو اور بیوی بچے کے سامنے گھول رہے ہو۔''

''یہ گند نہیں ہے،چھوٹی موٹی خوشی ہے اور ایسی خوشیاں منانے کا حق ہے ان لوگوں کو۔ کچھ بھی ہے ابھی یہ لوگ زندہ ہیں،سانس لے رہے ہیں،باقی رہی بات بیوی کی تو میں نے انہیں اس ماحول سے بالکل الگ تھلگ رکھا ہوا ہے۔''

''تم نے جو الگ رکھا ہوا ہے وہ ابھی میں نے تھوڑی دیر بعد دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ابھی جب تم سب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے میں نے کھڑکی کھول کر اس ۔طے میں دیکھا تھا۔تمہارے ساتھی مدہوش پڑے تھے اور ان میں سے ایک رقاصہ بھی تھی۔ایک بندے کے ساتھ ایک ہی کمبل کے نیچے پڑی تھی۔اور یہ نظارہ صرف میں نے ہی نہیں،میرے ساتھ تمہارے بیٹے ٹیپو نے بھی کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی ایسے تماشے دیکھتا رہا ہوگا۔''

فرید حیرت سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔رستم نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔''وہ شہتوت دیکھ رہے ہو ناں،اس کے پیچھے کھڑا تھا ٹیپو اور وہ طوائف وہاں کھونڈر کے پاس پڑی تھی،اپنے عارضی خصم کے ساتھ۔''

فرید چند لمحے خاموش رہا۔یوں لگا جیسے اسے جواب نہیں سوجھ رہا۔کبھی کبھی بندے کا لاجواب ہونا ہی اسے بھڑکا دیتا ہے۔فرید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔وہ تپ کر بولا۔''رستم کیا بات ہے؟ تم جب سے آئے ہو اکھڑی اکھڑی باتیں ہی کررہے ہو۔مجھے لگتا ہی نہیں کہ میں اس رستم سے مل رہا ہوں جسے میں جانتا ہوں۔یار!کیا ہوگیا ہے تمہیں؟اگر تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی ہے تو اس میں دوسروں کا کیا گناہ ہے۔تم نے آتے ساتھ ہی سب کو ڈرا سہا کر رکھ دیا ہے۔کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کررہے ہو۔گوہرا کو مار مار کر الگ بے حال کردیا ہے......''

''تم اصل بات سے ہٹ رہے ہو فریدے!میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم اپنے آلے دوالے اتنا گند کیوں بکھیر رہے ہو۔کہاں گئے تمہارے اصول اور تمہارے اونچے ارادے......''

''تم تو مجھ سے یہاں کا سارا حساب کتاب مانگو گے۔پلسیوں کی طرح مجھ سے پوچھ گچھ کروگے اور اگر میں نہ بتاؤں تو پھر میرے ساتھ بھی مارا ماری کروگے۔میری کھلوی ادھیڑ

دو گے۔"

"میں تمہیں مارنے والا کون ہوتا ہوں۔ تم یہاں کے کرتا دھرتا ہو، مالک ہو۔ الٹا تم مجھے یہاں سے دھکا مار کر نکال سکتے ہو اور نکالے جانے سے اچھا ہوتا ہے کہ بندہ خود نکل جائے۔"

"تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ چکرایا ہوا ہے۔ پہلے اپنے دماغ کے چکر اتارو۔ خود کو اور دوسروں کو عذاب میں نہ ڈالو۔" فرید نے کہا اور بھنایا ہوا باہر نکل گیا۔

رستم اٹھ کر کمرے کی مختصر جگہ میں ٹہلنے لگا۔ اس کے سینے میں کرب کا دھواں تھا۔ ...بہرحال فرید اور رستم کی یہ تلخی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ بمشکل پانچ منٹ بعد فرید واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر تمتماہٹ نہیں تھی۔ اعصاب کا تناؤ بھی کم نظر آ رہا تھا۔ وہ سگریٹ کے گہرے کش لیتا رستم کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رستم کو سگریٹ پیش کی۔ رستم نے سر کو نفی میں جنبش دی۔ پانچ دس سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر فرید نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "رستم تمہیں یہاں آ کر کچھ باتیں بُری لگی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوا ہے لیکن اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔"

رستم نے اپنے سینے کی تپش کو جھیلتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری طرح میں بھی جانتا ہوں کہ نادر کاکا نے یہاں کچھ اصول بنائے تھے۔ ہمارے یہاں کے رہن سہن میں عورت کا دخل بہت کم تھا اور یہ معاملہ اب سے تین چار مہینے پہلے تک ویسے ہی چل رہا تھا لیکن تین چار مہینے پہلے ایک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔"

اس نے توقف کر کے نیا سگریٹ لگایا اور بولا۔ "شاید یہاں آتے ہوئے تمہاری نظر قبروں پر پڑی ہو۔ وہاں تمہیں ایک نئی قبر نظر آئی ہو گی۔ دائیں طرف جنتر کے پاس..... نظر پڑی تھی تمہاری؟"

"ہاں، تم آگے بات کرو۔"

"پتا ہے یہ قبر کس کی ہے؟ یہ میرے بھانجے ابا گیر کی ہے۔ جن دنوں تم یہاں سے گئے انہی دنوں اس کے یہاں آنے کے اسباب پیدا ہوئے تھے۔ گجرات کے موضع جمالی میں دس ایکڑ اراضی کے تنازعے میں ابا گیر نے اپنے ایک تایازاد پر گولی چلائی جس سے اس کی ٹانگ ضائع ہو گئی۔ ابا گیر کا چھوٹا بھائی بھی زخمی ہوا۔ ابا گیر کا تایا اثر ورسوخ والا تھا۔ پولیس میں اس

کی جان پہچان بھی تھی۔ اس نے ابا گیر پر کئی کیس بنوا دیئے۔ اس کا ارادہ ابا گیر کو پولیس مقابلے میں مروانے کا تھا۔ ابا گیر کو کسی نے بتا دیا کہ وہ جب بھی پکڑا گیا اسے مار دیا جائے گا..... وہ بھاگ کر یہاں میرے پاس آ گیا۔ بالکل جوان تھا وہ..... جب یہاں آیا مشکل سے انیس بیس سال کا ہو گا۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔"

فرید نے ایک رنگین تصویر رستم کو دکھائی۔ یہ گھونگھریالے بالوں والے ایک نہایت صحت مند لڑکے کی تصویر تھی۔

رستم کو فرید کی آنکھوں میں گہرے دکھ کے آثار نظر آئے۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "ابا گیر ہمارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم میں سے بہت سوں کو گولی مار دینے کا آرڈر ہے۔ ہمارے سروں کی قیمتیں مقرر ہیں۔ وہ ایک معمولی جرم کر کے ہمارے بڑے جرموں میں حصے دار بننا کیوں چاہتا ہے لیکن شاید وہ پولیس سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ خاص طور پر ڈی ایس پی ریاض سے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اس کا کیس ڈی ایس پی ریاض کے سپرد ہو گیا ہے اور یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ریاض بندے کو مکھی کی طرح مار دیتا ہے۔ وہ یہاں سے واپس نہیں گیا اور ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ یہیں تھا۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ جہاں بیٹھتا تھا رونق لگا دیتا تھا۔ اس کی موت نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز غم سے لبریز ہو گئی۔

"کیا ہوا تھا اسے؟"

"ہونا کیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔" فرید نے کہا اور گم صم ہو گیا۔

تقریباً نصف منٹ بعد اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔ "وہ پچھلے ڈھائی سال میں دس بارہ دفعہ ہمارے ساتھ کام (ڈکیتی) پر گیا۔ وہ ان سارے اصولوں پر چلتا تھا جو ہم نے نادر کاکا کے ساتھ مل کر بنائے تھے لیکن ایک اصول ایسا بھی تھا جس پر چلنا اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ جوان تھا۔ ابھی زندگی میں اس نے کچھ دیکھا نہیں تھا کہ اس ویرانے میں آ پھنسا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے اندر عورت کے لئے تجسس تھا۔ ایک دو مرتبہ اس سے غلطی ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ نادر کاکا اس بارے میں کتنے سخت ہیں۔ نادر کاکا ان دنوں بہت بیمار تھے لیکن گروہ کے کاموں پر ان کی کڑی نظر رہتی تھی۔ میرے کہنے پر ابا گیر سنبھل گیا۔ اس کے بعد اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ نادر کاکا کے مرنے کے بعد بھی وہ سنبھلا ہی رہا، لیکن اس کے اندر ہلچل شاید وہیں پر رہی۔ وہ ہمارے گروپ میں سب سے کم

عمر تھا اور ابھی تک عورت اس کے لئے ان دیکھی شے تھی۔ کوئی چار مہینے پہلے اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ جہلم میں پولیس کے ایک مخبر سیٹھ خلیق خان نے ہمارے مراد گروپ کے دو بندوں کو دھوکے سے اپنے ٹرک اڈے پر بلایا اور پولیس مقابلے میں مروا دیا۔ اس واقعے کی خبر اخباروں میں بھی سرخیوں سے چھپی تھی۔ اس دھوکے کا بدلہ لینے کے لئے مراد گروپ نے سیٹھ خلیق کے گھر پر چڑھائی کی۔ سیٹھ خلیق تو ہاتھ نہیں آیا لیکن اتفاق سے اس کی بیوی ہاتھ لگ گئی۔ یہ اس کی تین بیویوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ مراد کے ساتھی اسے اٹھا لائے۔ اس لڑکی کا نام ثنا تھا۔ ہم نے اس لڑکی کی واپسی کے لئے خلیق سے دو کروڑ کا مطالبہ کیا۔ ہمیں پتا تھا کہ ایک ڈیڑھ کروڑ تو وہ دے ہی سکتا ہے۔ خلیق سے بات چیت چل رہی تھی۔ لڑکی کو یہیں دوسرے حجرے میں رکھا گیا تھا۔ ہم ہر طرح اس کی حفاظت کر رہے تھے اور معاملہ طے ہونے پر اسے حفاظت سے واپس پہنچانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے مگر ایک دن ابا گیر کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ابا گیر نے رات کو اکیلے بیٹھ کر شراب پی اور اس کے حجرے میں گھس گیا۔ اس نے لڑکی کے کپڑے پھاڑے اور اس سے زیادتی کی کوشش کرنے لگا۔ یہ رات دس گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے۔ لڑکی چلا رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ ابا گیر نے حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا اور اسے آوازیں دیں کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نشے اور لڑکی کی قربت کی وجہ سے وہ بالکل اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کاٹھیا اور جیدے کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک وزنی پتھر مار مار کر دروازے کی کنڈیاں توڑ دیں۔ میرے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ میں حجرے میں گھسا، ابا گیر وہاں نہیں تھا۔ وہ لڑکی کو لے کر پچھلے دروازے سے تین نمبر کھوندر (سرنگ) میں چلا گیا تھا۔ فرش پر بس لڑکی ثناء کے پھٹے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

میں ان دونوں کے پیچھے کھوندر میں گیا۔ لڑکی کے رونے چلانے کی آوازیں کھوندر کے درمیان سے آ رہی تھیں میں نے پھر ابا گیر سے کہا کہ وہ لڑکی چھوڑ دے۔ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔ اس نے جواب میں کہا ''ماموں! چلا جا۔ میں نے ابھی اسے نہیں چھوڑنا۔'' اس کی آواز نشے کی وجہ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

میں آگے بڑھا تو اس نے گولی چلا دی۔ اس کے پاس AK56 رائفل تھی اور تمہیں پتا ہی ہے کہ وہ کیا بلا ہوتی ہے۔ میں نے اسے دو تین بار سمجھایا لیکن اس نے ایک نہیں سنی، مجبوراً مجھے بھی گولی چلانا پڑی۔ لڑکی کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ بے ہوش ہو گئی

تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر فائر کئے۔ وہ مجھے لڑکی سے دور رکھنے کے لئے گولی چلا رہا تھا اور میں اس لئے چلا رہا تھا کہ وہ لڑکی کو چھوڑ کر آگے نکل جائے۔ اسی دوران میں وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ بھاگ کر ایک پتھر کے پیچھے پوزیشن لے رہا تھا۔ میں نے اسے زخمی کرنے کے لئے اس کی ٹانگوں میں گولی ماری لیکن شاید اس کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ گولی اس کی ناف میں لگی۔ وہ وہیں گرا اور پانچ دس منٹ کے اندر ختم ہو گیا۔ یہ نئی قبر میرے اسی بائیس سال کے کنوارے بھانجے کی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فرید کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

رستم بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے گولڈ لیف کی ڈبیا سے سگریٹ لیا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ لڑکی؟''

''اسے بعد میں صرف پندرہ لاکھ کے بدلے ہمیں چھوڑنا پڑا۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔ اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں کھوئے رہے۔ چھجے کے اس کمرے سے باہر جنریٹر کی مدھم ''گھوں گھوں'' سنائی دیتی رہی اور ٹیلی ویژن چلنے کی آواز آتی رہی۔ رات کے جشن کے بعد تھک ہار کر سو جانے والے اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے اور روزمرہ کے کاموں کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے ناشتے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ غالباً پراٹھے اور حلوہ وغیرہ تیار ہو رہا تھا۔

لالہ فرید گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور سرخی ایک ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ جواں سال بھانجے کی تصویر کا اوپری کنارہ اس کی قمیص کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ وہ ایک گہری اور بوجھل سانس لے کر بولا۔ ''ابا گیر مر گیا لیکن میرے دماغ میں کئی سوال چھوڑ گیا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ یہاں آنے والے لوگ یہاں کیوں پہنچے......اور انہیں یہاں آنا چاہئے تھا یا نہیں......بہرحال یہ بات صاف ہے کہ وہ لوگ بھی بندے بشر ہیں۔ ان میں بھی وہ ساری سوچیں اور ضرورتیں موجود ہیں جو عام لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یہ پولیس کے ہاتھوں مرنے یا پھانسی چڑھنے سے پہلے برسوں تک اس ویرانے میں اکیلے بھٹکتے ہیں۔ بہت سی دوسری حسرتوں کی طرح ان کے دل میں عورت کی حسرت بھی ہوتی ہے اور اس حسرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ میں نہیں کر سکتا، تم بھی نہیں کر سکتے، نادر کا کا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہی ہو مارگلہ میں نادر کاکا کی رکھیل تھی جس سے ملنے کے لئے وہ تڑپتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جان پر کھیل کر وہ اس سے ملنے جاتا بھی تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ناں؟''

رستم خاموش رہا۔

فرید بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ابا گیر کے مرنے کے بعد میرے دل پر بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ مجھے لگا ابا گیر کی جگہ مجھے مرنا چاہئے تھا۔ میں نے تو دنیا دیکھی ہے، برتی ہے، اب ان پہاڑوں میں بھی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ اپنے بچے کا منہ چومتا ہوں۔ ابا گیر کی جگہ مجھے مرنا چاہئے تھا۔ میں کئی دن تک انہی سوچوں میں غرق رہا۔ ایک دفعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کچھ ملکوں میں اب حکومتیں یہ انتظام کر رہی ہیں کہ کبھی کبھی قیدیوں کو بھی اپنی بیویوں سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ مطلب یہ کہ انسان قید ہو کر رہتا تو انسان ہی ہے۔ اگر ہمیں ان پہاڑیوں کا قیدی سمجھ لیا جائے تو پھر ہمارے لئے بھی اسی طرح کی رعایت ہونا ضروری ہے۔ ہر ہفتے نہ سہی، ہر مہینے نہ سہی، سال میں دو چار بار ہی سہی، کبھی کبھار ہی سہی۔ ان پہاڑوں کے قیدیوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے بہت سوں کی بیویاں ہی نہیں ہیں۔ جن کی تھیں سب مہناز کی طرح اس قتل گاہ میں آنے کی ہمت نہیں کر سکتیں۔ تو پھر ان سے کون ملنے آئے گا، کون ان کے ادھورے پن کو دور کرے گا؟ یہ سوال بار بار میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ جاتا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہی کچھ کروں گا جو نادر کا کا کے دور کے شروع شروع کے سالوں میں ہوتا رہا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک حد کے اندر ہوگا۔ وہ افراتفری نہیں ہوگی جو ان دنوں میں مچا کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ہمیں اگلا ڈیرہ چھوڑنا پڑا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب پھر رنگ برنگی طوائفیں اور کسبیاں ڈیرے والوں کا رانجھا راضی کرنے کے لئے یہاں کے دورے کیا کریں گی؟''

''میں نے کہا ہے ناں رستم! یہ سب کچھ طریقے کے مطابق ہوگا اور ایک حد کے اندر ہوگا۔ تمہیں پتا ہی ہے، میں ان معاملوں میں کتنا سخت ہو جاتا ہوں۔ یار! تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا مجھے اگر تم بھی ایسی باتیں کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔'' فرید کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آ گئی۔

رستم نے فرید کے پیکٹ سے دوسرا سگریٹ لیا اور قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''لیکن ان قسموں وعدوں کا کیا ہوگا جو تم سب نے نادر کا کا کے ساتھ کئے تھے اور جن میں تم سب سے آگے آگے تھے۔''

''ان قسموں وعدوں میں سب سے بڑا وعدہ یہی تھا کہ کام (ڈکیتی) کے دوران میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا اس کی عزت سے نہیں کھیلا جائے گا۔ یہی وعدہ تھا ناں ....؟

اور میں سمجھتا ہوں رستم! کہ اگر ہم اس سب سے بڑے اور ضروری وعدے کو توڑنا نہیں چاہتے تو پھر ہمیں تھوڑی سی نرمی برتنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس سب سے خاص ''وعدے'' کو بچانے کے لئے کر رہا ہوں۔ جو کچھ ابا گیر کے ساتھ ہوا وہ ہم سب کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ ذرا سوچ، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں اور اگر غلط ہے بھی تو حالات کی مجبوریاں اور ہماری بدقسمتیاں یہ غلطی کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔''

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس کے تاثرات فرید کو بتا رہے تھے کہ وہ اس سے مزید بحث نہیں کرنا چاہتا۔

اتنے میں پردے کے پیچھے سے ناشتے کی خوشبو اور مہناز کی آواز ایک ساتھ ابھری۔ مہناز، فرید سے کہہ رہی تھی کہ وہ ناشتے کی ٹرے پکڑ لے۔

رات کو پھر جشن ہوا لیکن آج یہ سلسلہ ایک نمبر کھوندر کے اندر تھا۔ آگ وغیرہ بھی اندر ہی جلائی گئی تھی۔ گانے بجانے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں لیکن بہت مدھم تھیں۔ رقاصہ چاندی ڈیرے کے چھڑوں کو وہی بارش والا مقبول گانا سنا رہی تھی اور زبردست داد پا رہی تھی۔

لالہ فرید اس جشن میں شریک نہیں ہوا تھا اور آج چھجے کے کمرے میں رستم کو کمپنی دے رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دونوں ناصر سے مل کر آئے تھے۔ ناصر پچھلے ڈھائی سالوں میں پہلے سے کچھ سانولا ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ یہاں ڈیرے پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے وہ مضروب گوہرا کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے دو نمبر سرنگ میں اپنا ایک چھوٹا سا کلینک بنا لیا تھا۔ یہ کلینک لکڑی کی دو الماریوں اور ایک چھوٹی تپائی پر مشتمل تھا۔ یہیں پر ایک لکڑی کے تخت پر گدیلا بچھا کر [illegible] لٹایا گیا تھا۔ اس کے ٹوٹے بازو پر ناصر نے باقاعدہ پلاستر کیا تھا اور آنکھ کے اردگرد [illegible] ساتھ ہی یہ امید ظاہر کی تھی کہ گوہرا کی آنکھ بچ جائے گی۔

دو دن پہلے ہونے والی بارش کے سبب ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ پوٹھوہار کے مخروطی نیلے ایک سرد تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نادیہ ایک ٹرے میں چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے کر اندر آئی۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ یہاں فرید کی بیوی کے ساتھ مطمئن ہے۔

اس کی موجودگی میں فرید نے نظریں جھکائے رکھیں، جیسے وہ ڈکیت نہ ہو کسی درس گاہ میں بیٹھا ہوا واعظ ہو۔ وہ چلی گئی تو فرید نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو

ایک بات پوچھوں رستم؟''

''پوچھو۔''

''بی بی اب کہاں ہے؟''

''اپنے گھر والوں کے پاس۔''

''بی بی کو تو پولیس سے کوئی ڈر نہیں؟''

''ڈر تو ہے لیکن زیادہ نہیں، بی بی کے وارث اس معاملے کو بڑی اچھی طرح سنبھال سکتے ہیں۔''

چند لمحے بعد فرید نے جیسے ہمت کر کے کہا۔''اس کا مطلب ہے بی بی شانی سے تمہارا راستہ جدا ہو گیا ہے۔''

''شاید۔''

''ہمیشہ کے لئے؟''

''ہاں۔'' یہ ایک لفظ کہتے ہوئے رستم کو آگ کے ایک سمندر میں سے گزرنا پڑا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ رستم کی چائے اس کے سامنے پڑی ٹھنڈی ہوتی رہی۔ کافی دیر بعد فرید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔''رستم، تمہیں ایک مشورہ دوں۔ چاہے تو مان لینا چاہے نہ ماننا، لیکن بُرا نہ منانا۔''

''کہو۔''

''اگر بی بی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئے ہو تو پھر اس لڑکی سے شادی کر لو جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ یہ لڑکی تمہیں بہت چاہتی ہے اور شاید تم بھی اسے ناپسند نہیں کرتے۔ اگر ناپسند کرتے تو تمہارے ساتھ یہاں نہ ہوتی۔''

رستم اسے کیسے بتاتا۔ اس کی اپنی پسند اور ناپسند تو ختم ہو چکی ہے اور جو کچھ تھا وہ بی بی کی مرضی میں غرق ہو چکا تھا اور یہ ایکٹرس بھی بی بی کی مرضی کی وجہ سے یہاں نظر آ رہی ہے۔ وہ بی بی کے ساتھ تعلق میں بہت آگے جا چکا تھا۔ اب تو اسے اپنے جسم سے بھی بی بی کی خوشبو آتی تھی۔ اپنے اردگرد کی ہر خوبصورت شے میں بی بی کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سینے میں اگر دھڑکن تھی تو بی بی کے لئے تھی اور اگر وہ سانس لیتا تھا تو یہ بھی بی بی کے لئے لیتا تھا۔

کچھ ہوش نہیں رہتا، کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں انسان نہیں رہتا

سات آٹھ دن مزید گزر گئے۔ رستم کے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے تھے۔ اس کی آواز

اب بھی بھرائی ہوئی تھی تاہم پہلے سے صاف تھی، ویسے بھی وہ بہت کم بولتا تھا۔ ٹانگ کے ایک زخم کی وجہ سے چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ سینے میں مسلسل روشن رہنے والی آگ کے سبب اس کی آنکھیں ہر وقت جلتی رہتی تھیں اور چہرہ ایک گھمبیر خاموشی کی زد میں رہتا تھا...... اس کے تیور دیکھ کر کسی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی صرف فرید، اس کی بیوی یا نادیہ ہی ضرورت کے وقت اس سے بات کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ نادیہ، فرید کی بیوی مہناز اور بچے ٹیپو کے ساتھ ایک کمرے میں رہ رہی تھی۔ فرید بھی رستم کے ساتھ سو جاتا تھا۔ کبھی ساتھ والے کمرے میں۔

رقاصائیں صرف تین چار دن کے لئے یہاں آئی تھیں لیکن پھر ان کا قیام بڑھ گیا۔ وہ آٹھویں روز ڈیرے سے روانہ ہوئیں۔ وہ تحفوں اور نوٹوں سے لدی پھندی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈیرے پر معمول کی زندگی لوٹ آئی۔ ڈیرے پر بکریوں کے تین چھوٹے ریوڑ موجود تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ اناج باہر سے ہی آتا تھا۔ ڈیرے پر ڈاکوؤں اور مفروروں کے تین گروہ موجود تھے۔ ایک کو نادرکا گروپ کہا جاتا تھا۔ دوسرے کو مراد گروپ اور تیسرا گجراتی گروپ۔ ان تینوں گروپوں کا سردار فرید ہی تھا۔ نادرکا گروپ اور گجراتی گروپ تو یہاں پہلے سے موجود تھے، مراد گروپ رستم کے جانے کے بعد وارد ہوا تھا۔ ان تینوں گروپوں کے کل افراد [illegible] تھے لیکن ان میں عورتیں صرف چار ہی تھیں۔ ایک فرید کی بیوی مہناز جسے ... بڑے سب بھرجائی کہتے تھے۔ ایک حسنے گجراتی کی بیوی شاہدہ اور ایک ادھیڑ عمر عورت حنیفاں، جو چند سال پہلے اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آئی تھی اور اسی ماحول کا حصہ بن چکی تھی۔ چوتھی عورت نادیہ تھی جو سات آٹھ دن پہلے رستم کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔

یہاں ڈیرے پر دو جنریٹرز موجود تھے جن سے ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ چلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دو چار خاص خاص جگہوں پر بلب بھی روشن کئے جاتے تھے۔ یہاں موجود لوگوں کے پاس جدید ترین اسلحہ، ہینڈ گرینیڈ اور راکٹ تک موجود تھے۔ ڈیرے تک آنے والے راستے دو ہی تھے اور یہ خاصے دشوار گزار تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر یہاں بارودی سرنگیں بھی بچھا دی گئی تھیں۔ ڈیرے پر دو طاقتور وائرلیس سیٹ موجود تھے۔ ایک بالکل جدید ماڈل کا جرمن سیٹ تھا اور اس کی رینج 80 کلومیٹر سے زائد تھی۔ اس وائرلیس سیٹ کو خاص تکنیک کے ذریعے تقریباً تیس کلومیٹر دور ایک دوسرے لانگ رینج وائرلیس سے لنک کیا جاتا تھا اور گوجر خان کے ایک قریبی گاؤں میں بات چیت کی جاتی تھی۔ جگ وال نامی اس

گاؤں سے لالہ فرید کے دو مخبر اسے آباد دنیا کی تازہ ترین خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ رستم کمرے میں دری پر چت لیٹا تھا۔ اس کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ گریبان ادھ کھلا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ گریبان کے اندر تھا اور وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ اپنے بالوں بھرے سینے کو سہلا رہا تھا۔ سینے پر کئی جگہ ''B'' کا حرف گدا ہوا تھا۔ جن دنوں وہ رنگ والی کی حویلی میں بی بی کی خاطر بطور مالی کام کر رہا تھا اور ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اس کے دل کی حالت عجیب ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ عاشق لڑکے کی طرح سوچنے لگتا تھا۔ انہی دنوں اس نے برف توڑنے والے ایک چھوٹے سُوئے کی مدد سے اپنے سینے کو لہولہان کیا تھا اور کئی جگہ بی بی کے نام کا پہلا حرف ''B'' اپنے سینے میں گودا تھا۔ آج بھی وہ ان حروف پر اپنی پوریں گھماتا تھا تو اسے وہی لذت ملتی تھی جو ان حروف کو کندہ کرتے ہوئے ملی تھی۔

اچانک ایک آواز نے اسے چونکایا۔ فرید لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو کپ تھے۔ وہ آلتی پالتی مار کر رستم کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے سیٹ (وائرلیس) پر نظام سے میری بات ہوئی ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

نظام اس پیامبر کا نام تھا جو جگ وال گاؤں سے اسے ارد گرد کی خبریں پہنچاتا تھا۔

رستم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے فرید کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فرید نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کملوں جھلوں کی طرح تمہیں ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ گوجرانوالہ، گجرات، جہلم کے ضلعوں میں یہ لوگ چپہ چپہ چھان رہے ہیں۔ امید ہے کہ ایک دو ہفتے میں تمہارے سر کی قیمت بھی مقرر ہو جائے گی۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ لاہور کے اعلیٰ افسروں نے تمہاری تلاش کا کام اسی حرامزادے قصائی ڈپٹی ریاض کے سپرد کیا ہے۔ وہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ گوجرانوالہ میں موجود ہے اور ہر طرف اپنے شکاری کُتے چھوڑ رہا ہے۔'' رستم کے چوڑے سینے میں ایک لہر سی نمودار ہو کر اوجھل ہو گئی۔ وہ ریاض کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ انسپکٹر تھا۔ اس کی دہشت بے مثال تھی۔ اسے جرائم پیشہ حلقوں میں ہٹلر کا خطاب دیا جاتا تھا۔ اب یہ ہٹلر پچھلے دو ڈھائی سالوں میں مزید زہریلا اور ہلاکت خیز ہو گیا تھا۔ رستم کم از کم تین ایسے افراد کو جانتا تھا جنہوں نے ریاض ہٹلر کے ہاتھوں گرفتاری کے خوف سے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ صرف دو سال پہلے رستم کے جگری دوست زوار کا ایک دوست، ریاض سے بچنے کے لئے ایک پلازہ کی پانچویں منزل سے کودا اور ہلاک ہوا تھا۔

فرید کی آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکایا۔ ''ایک اطلاع تمہارے مطلب کی بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''نظام نے شانی بی بی کے بارے میں بھی کچھ باتیں معلوم کی ہیں۔''

رستم کے چہرے پر عجیب چمک نمودار ہوئی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرید نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا دوست حاجی حیات خان دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ ورنہ حالات جتنے خراب ہیں شانی بی بی نے بڑی سخت مصیبت میں گرفتار ہو جانا تھا۔ بہرحال وہ گرفتار تو اب بھی ہے لیکن اسے سپیشل پروٹوکول مل رہا ہے۔ اس کا صرف تین روزہ ریمانڈ دیا گیا تھا۔ لیڈیز پولیس کی نگرانی میں اس سے معمول کی پوچھ گچھ ہوئی۔ اب وہ جوڈیشنل ریمانڈ پر ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں ہے۔ پانچ دن پہلے اسے میڈیکل بیس پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا ہے جہاں وہ مکمل آرام سے ہے۔ عدالت میں جو چالان پیش کیا گیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مزید کیس سامنے نہ آیا تو دو چار پیشیوں میں بی بی کی ضمانت ہو جائے گی۔''

فرید نے اس حوالے سے رستم کو کچھ مزید تفصیلات بتائیں جنہیں رستم نے بے حد دھیان سے سنا پھر اس نے فرید سے پوچھا۔ ''چوہدریوں کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟''

''بالکل ہے۔ وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکارتے پھر رہے ہیں کہ تم ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہو۔ فی الحال وہ بی بی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اب ان کا سارا غصہ عارف کمبوہ اور دراج مہتم پر اُتر رہا ہے لیکن وہ دونوں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے ہیں۔ عارف کمبوہ تو ابھی ویسے ہی موقع سے غائب ہے۔ وہ مناسب وقت پر سامنے آئے گا۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے وہ...... بڑا جی دار اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے نارپور کے چوہدریوں کے خلاف کمبوہ برادری میں ایسی لہر پیدا کر دی ہے جسے اب آسانی سے روکا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں اب کئی اور برادریاں بھی عارف کا ساتھ دے رہی ہیں۔ خاص طور سے جب سے وہ لڑکی والا معاملہ ہوا ہے۔''

''کون سی لڑکی؟''

''صفیہ نام کی ایک لڑکی چوہدریوں کی کسی حویلی میں کام کرتی تھی۔ چوہدری کے ایک کم عمر نشئی لڑکے نے اس پر بُری نظر ڈالی اور کئی مہینے تک اس کی عزت سے کھیلتا رہا۔ لڑکی حاملہ ہو گئی تو اس کا بچہ ضائع کرا دیا گیا۔ اسی چکر میں لڑکی کی جان چلی گئی۔ یہ سراسر قتل کا کیس کا

تھا۔اب لڑکی کے وارث قبر کشائی کر کے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف گرایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں کچھ جل رہا ہے۔ وہ بولا۔ "عارف کمبوہ اور دراج مہتم کے بارے میں پوری خبر رکھو۔ انہوں نے بڑے مشکل وقت میں میری اور بی بی کی مدد کی ہے۔ میں بھی انہیں مشکل میں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

"تم نے کہہ دیا۔ سمجھو میرے لئے فرض ہو گیا۔" فرید بولا۔

"ایک خاص بات اور ہے فرید! میں بی بی جی کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ آج میں تم سے خود اسی بارے میں بات کرنے والا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم اس کام کے لئے سیٹ (وائرلیس) استعمال کریں، اچھا ہوا تم نے خود کر لیا۔ تم نظام سے سیٹ پر کب بات کرتے ہو؟"

"مہینے میں دو بار کبھی کبھی تین بار بھی ہوتی ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ہمارا رابطہ نظام سے ضرور ہو۔ میں نظام کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ذمے دار بندہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو ذمے داری ہم اسے دیں گے وہ ضرور پوری کرے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ہماری باخبری کے بارے میں بی بی جی کو بھنک نہ پڑے۔"

"بے فکر رہو، میں اس بارے میں نظام کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

کچھ دیر بعد رستم سونے کے لئے لیٹ گیا۔ فرید زخمی گوہرا کی مزاج پرسی کے لئے دو نمبر کھوندر کی طرف چلا گیا۔ گوہرا اب پہلے سے کافی بہتر تھا۔ رستم نے ابھی تک اس کی عیادت نہیں کی تھی لیکن اب وہ عیادت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رستم کو لیٹے ہوئے آدھ پون گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اسے کہیں پاس سے شور سنائی دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا ہاتھ سیدھا اپنے ماؤزر کی طرف گیا۔ ماؤزر قمیص کے نیچے اڑس کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کھوندر نمبر دو کے سامنے لالہ فرید کسی سے لڑ رہا تھا۔ لڑنے والا شاید مراد گروپ کا کوئی بندہ تھا۔ رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے فرید نے اسے زوردار تھپڑ مارا۔ اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ پھر فرید نے بڑی وحشت کے عالم میں اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ وہ طیش سے چیخ رہا تھا۔ "حرامزادے! تیری یہ ہمت! اپنی حیثیت دیکھ...... اپنی اوقات دیکھ کتے!"

رستم دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اسی دوران میں رستم نے دیکھا کہ تنومند حلیے کا ایک نوجوان جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، تیزی سے موقع کی طرف بڑھا... رستم نے پہچان لیا، یہ مراد گروپ کا لیڈر مراد تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح جوگرز پہن رکھے تھے اور سر کے پچھلے حصے پر گول ٹوپی اٹکائی ہوئی تھی۔ مراد ماضی میں نامی گرامی باکسر رہا تھا۔ اس کا تعلق کراچی کے علاقے لیاری سے تھا۔ مراد کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ گہرے نشے میں ہے۔ اس نے پہلے یہ کوشش کی کہ فرید اس کے ساتھی کو مارنا بند کر دے لیکن پھر فوراً ہی خود بھی بھڑک گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے فرید کا گریبان پکڑا اور دایاں مکا تان کر چلایا۔ "چھوڑ دے لالہ..... چھوڑ دے!"

فرید نے اسے دھکا دیا تو وہ مقناطیس کی طرح دوبارہ فرید کی طرف آیا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا طوفانی مکا فرید کے چہرے پر لگتا۔ رستم آڑے آ گیا۔ اس نے مراد کا فولادی مکا اپنے بازو پر روکا اور جواب میں اس کے سینے پر زوردار لات رسید کی۔ مراد لڑکھڑایا اور پھر شعلہ جوالا بن گیا۔ رستم نے سنا تھا کہ اس بندے کے مکوں میں جناتی طاقت ہے اور واقعی وہ اپنے اسٹائل سے ایک وحشی نیگرو باکسر ہی لگتا تھا۔ شاید رستم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا ادھین مکا کھا کر ہی لمبا لیٹ جاتا لیکن وہ رستم تھا۔ وہ اپنی ساری پرانی وحشتوں کے ساتھ مجسم قہر تھا۔ جان لیوا غموں کی آگ نے اس کی رگوں میں لہو کی جگہ لاوا دوڑا رکھا تھا۔ اس نے جھکائی دے کر مراد کے دو تین خوفناک مکے خالی دیئے پھر ایک ایسی زوردار ٹکر اس کی پیشانی پر ماری کہ وہ حجرے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ رستم نے پلک جھپکتے میں قمیص کے نیچے سے ماؤزر نکالا اور اس کی سرد نال مراد کی شہ رگ پر رکھ دی۔

یہ منظر دیکھا تو فرید تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے رستم کا ماؤزر والا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ "نہیں رستم...... نہیں۔ یہ نشے میں ہے، پیچھے ہٹ جاؤ۔"

ایک دم کئی افراد بیچ میں کود پڑے اور مراد اور رستم کو ایک دوسرے سے دور ہٹا دیا۔ پانچ دس منٹ کے بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ڈگمگاتا ہوا مراد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھوندر کی طرف چلا گیا۔ رستم، فرید اور دلاور وغیرہ کے ساتھ حجرے کی طرف آ گئے۔ کمرے میں پہنچ کر رستم نے فرید سے پوچھا۔ "کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ بندے کو کیوں مار رہے تھے تم؟"

فرید چند سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ڈبیا سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔ "رستم! اگر مجھے دوست سمجھتے ہو تو میری ایک بات مان لو، نادیہ سے شادی کر لو اور اگر خود نہیں کر سکتے تو پھر...... کسی اور سے کرا دو۔"

''کیا بکواس ہے۔اس لڑائی کا نادیہ سے کیا تعلق ہے؟''

''اسی سے ہے۔''فرید نے گہرا کش لیا اور دھواں نیم وا کھڑکی کی طرف چھوڑا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مراد کے جس بندے کی پٹائی کی ہے میں نے اس کا نام ماجد ہے۔ چکوال میں ایک لڑکی ہے جس سے پیار کرتا ہے یہ...... پرسوں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی معشوق کو یہاں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے پوچھا، کیوں؟ کہنے لگا، اگر دوسرے رکھ سکتے ہیں تو وہ بھی رکھ سکتا ہے۔اس کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میڈم نادیہ رستم کی بیاہتا بیوی ہے۔ مجبوری کے تحت اس کے ساتھ آئی ہے۔اس وقت تو وہ چپ ہوگیا لیکن شاید اسے کسی نے بھڑکایا۔آج پھر مجھ سے وہی تکرار شروع کردی۔ کہہ رہا تھا کہ ہم سے اندر کی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔ میڈم، رستم صاحب کی بیوی نہیں اگر بیوی ہوتی تو ان کے ساتھ رہتی۔وہ علیحدہ رہ رہی ہے۔''

رستم خاموشی سے فرید کی باتیں سنتا رہا۔آخر بولا۔''تم چاہتے کیا ہو فرید؟''

فرید تدبر سے بولا۔''یہاں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میڈم نادیہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے اور مجبوری کے تحت تمہارے ساتھ آئی ہے لیکن کچھ ماجد کی طرح شک کا شکار ہیں۔ مجھ سے زیادہ تم ان معاملات کو سمجھ سکتے ہو رستم۔اس طرح کے شک ٹھیک نہیں ہوتے...... نااتفاقی پیدا کرتے ہیں، دلوں میں فاصلے پیدا کرتے ہیں۔ میں تم پر کوئی بات ٹھونس نہیں سکتا، صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور مشورہ یہی ہے کہ تم نادیہ سے نکاح کرلو اور اس کے ساتھ رہو اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتے تو پھر کسی اور سے اس کا نکاح کرا دو لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ وہ اس بات کو کسی صورت پسند نہیں کرے گی۔''

رستم خاموش رہا۔فرید بھی خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد فرید بولا۔''ایک طریقہ اور ہے۔تم نادیہ کو بظاہر بیوی بنالو۔اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا شروع کردو۔ شک کرنے والوں کا شک دور ہوجائے گا اور جن کی نظر میلی ہے، وہ بھی صاف ہوجائے گی۔ مہناز کو سب بھرجائی کہتے ہیں، تمہاری میڈم کو چھوٹی بھرجائی کہنے لگیں گے۔ ٹنٹا ختم ہوجائے گا۔''

رستم کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔''لیکن اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا اور بیوی نہ ہوتے ہوئے بھی اسے بیوی کہنا......''وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

''یار! تمہاری اتنی باتیں مانی ہیں۔ میری خاطر ایک بات نہیں مان سکتے تم...... مجھے

تمہاری مدد کی ضرورت ہے یار اور یہ مدد کرنے میں تمہارا کچھ بگڑتا بھی نہیں۔ میڈم نادیہ تو تمہاری بے دام کی غلام ہے تم جس طرح کہوگے وہ اسی طرح رہے گی تمہارے ساتھ۔ چون و چرا نہیں کرے گی۔''

رستم اور فرید کے درمیان اس موضوع پر ڈیڑھ دو گھنٹے بات ہوئی۔آخر رستم نیم رضامند نظر آنے لگا۔اس کی نیم رضامندی کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ڈیرے پر آنے کے بعد فرید اپنے بیوی بچے سے دور ہوگیا ہے۔ نادیہ چونکہ مہناز اور ٹیپو کے ساتھ رہتی تھی اس لئے فرید کو علیحدہ کمرے میں رہنا اور سونا پڑ رہا تھا۔

دو دن بعد نادیہ، رستم کے کمرے میں آگئی۔ اس نے ادھر اُدھر بکھری ہوئی چیزیں بڑے سلیقے سے لکڑی کی الماری میں رکھیں۔ کمرے کی خوب صفائی ستھرائی کی اور کچھ پھول لاکر شراب کی ایک خالی بوتل میں سجائے۔ کھانا معمول کے مطابق ایک ہی کچن میں پکا تاہم رستم اور نادیہ نے اپنے کمرے میں کھانا کھایا۔

نادیہ، مہناز کے فراہم کردہ کپڑوں میں تھی۔ یہ کپڑے اسے کھلے تھے پھر بھی اس کا سیماب بدن لباس کے اندر مچلتا، بل کھاتا محسوس ہوتا تھا۔رات کو جب لالٹین کی لو مدھم کرکے وہ چٹائی پر سونے لگے تو رستم نے گھمبیر لہجے میں کہا۔''میری ایک بات بہت دھیان سے سن لو، مجھے یہ سب کچھ سخت مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا ہے۔اپنے دل میں کسی طرح کی غلط فہمی کو جگہ مت دینا۔نہ اب نہ آئندہ کبھی۔''

''میں دوسروں کو اپنے اور تمہارے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''وہی جو تمہیں فرید نے بتایا ہے۔ہم دونوں شادی شدہ ہیں، لیکن ایک بار پھر تمہیں بتا دیتا ہوں، نہ مجھ سے کوئی توقع رکھنا، نہ کسی طرح کی بھونڈی حرکت کرنا اور وہ جو بادشاہ اور لونڈی والی بات تم بار بار دہراتی ہو،اسے دہرانے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''اتنے بے حس نہ بنو رستم، مجھے اس چھوٹی سی خوشی سے تو محروم نہ کرو۔ یقین کرو میں کوئی طنز نہیں کرتی ہوں۔ جب خود کو تمہاری لونڈی کہتی ہوں اور تمہیں ایک بادشاہ کی طرح دیکھتی ہوں تو ایک عجیب سا سکون ملتا ہے مجھے۔لگتا ہے کہ کچھ نہ ملتے ہوئے بھی بہت کچھ مل گیا ہے۔''

''پھر وہی بک بک؟''رستم نے تپ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہتی۔''وہ کانپ کر بولی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

""اس کمرے میں تمہیں اسی طرح رہنا ہوگا جیسے ایک عورت غیر محرم کے سامنے رہتی ہے۔""

""مم... میں سمجھی نہیں۔""

""یہ چادر لو اپنے اوپر اور چہرہ اور سر بھی ڈھک کر رکھو۔"" رستم بے حد بے زاری سے بولا۔ نادیہ نے فوراً عمل کیا لیکن رات کے پچھلے پہر جب رستم پانی پینے کے لئے اٹھا تو اس نے لالٹین کی مدھم روشنی میں دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ بے ترتیب اور آڑی ترچھی۔ اس کا ہیجان خیز جسم نگاہوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ رستم کی پیشانی پر ناگواری کی گہری شکنیں ابھریں۔ اس نے ایک طرف پڑا کمبل دور ہی سے اس پر پھینک دیا۔

اگلے روز شام کو مراد خود رستم کے پاس پہنچا۔ اس نے گزشتہ رات ہونے والے واقعے پر رستم سے معافی مانگی اور بتایا کہ وہ نشے میں تھا۔ اسی دوران میں فرید بھی آ گیا۔ تینوں کھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ مراد کے جانے کے بعد فرید نے رستم کو بتایا۔ ""آج میں نے کھل کر اعلان کر دیا ہے۔""

""کس بات کا؟"" رستم نے پوچھا۔

""یہی کہ تم اور نادیہ میاں بیوی ہو۔ وہ ساری چہ میگوئیاں ختم ہو گئی ہیں جو اب تک ہو رہی تھیں۔ یہ ہم سب کے لئے بہت اچھا ہوا ہے۔ تمہیں یاد ہے، نادر کاکا کہا کرتے تھے کہ پوٹھوہار کے یہ ٹیلے پولیس کی گولیوں سے تو نجات دے دیتے ہیں لیکن آپس کی نااتفاقی پولیس کی گولیوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔""

رستم خاموش رہا۔ اس کے لمبے بال ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے اس کی پیشانی پر جھولتے رہے۔

فرید نے کہا۔ ""گوہرا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے، میرا خیال ہے اب تمہیں بھی جا کر اس کا حال پوچھ لینا چاہئے۔""

""کہاں ہے وہ؟""

""ابھی ناصر کے دواخانے میں ہی ہے۔""

اسی روز رستم، فرید کے ساتھ گوہرا کے پاس گیا اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ گوہرا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ""میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچا۔ اس کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔""

""معافی تو مجھے بھی مانگنی چاہئے۔ میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھا۔"" رستم نے

گوہرا کا زخمی ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

""کوئی بات نہیں لالے دی جان۔ تُو آ گیا ہے میرے لئے یہی بہت ہے۔ تیرے سر کی قسم، دل شیشے کی طرح صاف ہو گیا ہے میرا۔"" گوہرا نے جوش سے کہا۔

مختصر سے شکوے شکایت کے بعد دونوں بالکل نارمل ہو گئے۔

اتنے میں مراد اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ گجراتی گروپ کا حسنا گجراتی تھا۔ حسنے کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی تھے۔ یہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ اسلحہ شناس اور ماہر نشانہ باز بھی تھا۔ جب سے رستم ڈیرے پر آیا تھا حسنا بہت خوش اور پُرجوش نظر آتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ بالکل ویسا جیسا کرکٹ کے کھلاڑیوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے یہ بیگ گوہرا اور رستم کے درمیان فرش پر رکھا اور اس کی لمبی زپ کھول دی۔ بیگ کے اندر اسلحہ تھا۔ ایک پرانی مگر صاف ستھری لشکارے مارتی ہوئی ایل ایم جی تھی اور اس کے کوئی دو سو راؤنڈ تھے، ایک سیون ایم ایم رائفل تھی، ایک 30 انچ کی ایم ون کاربین، ایک معروف کولٹ 45 امریکن پسٹل اس کے راؤنڈز اور سائیلنسر وغیرہ تھے۔

""یہ سب تمہارے لئے ہے رستم بھائی۔"" حسنے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

رستم نے بیگ سے سیون ایم ایم نکال لی۔ اسے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ""یہ تو وہی ہے جو میرے پاس تھی۔""

""ہاں...... دیکھ لو اب تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ ہر مہینے اسے صاف کر دیتا ہوں۔ تیل دیتا رہا ہوں اور تمہارا نام لے کر تین چار فائر کر دیتا ہوں۔"" حسنے نے سینہ پھلا کر کہا۔

رستم نے عجیب جذب کے عالم میں اس رائفل پر ہاتھ پھیرا۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھوں کو کوئی کھوئی ہوئی شے واپس مل گئی ہے۔

""چلا کر دیکھو رستم بھائی۔"" حسنے نے کہا۔

""ہاں ہاں، چلا ڈالا لے دی جان۔"" گوہرا نے کہا۔

رستم اٹھا اور فرید، مراد، حسنے وغیرہ کے ساتھ سرنگ سے باہر آ گیا۔ یہ چاندنی رات تھی۔ مدھم ہوا جھاڑیوں میں سرسرا رہی تھی۔ پوٹھوہار کے ٹیلے حدِ نگاہ تک چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ رستم نے 20 گولیوں والا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے یکے بعد دیگرے چار فائر کئے۔ رائفل سے شعلے نکلے اور دور ایک نیلے پ

ایک چھوٹی سی کانٹے دار جھاڑی، جڑوں سے کٹ کر نشیب میں جا گری۔

رستم کے تینوں ساتھیوں کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ رستم کی آمد نے انہیں بے حد تقویت بخشی تھی۔ ان کے دل گواہی دے رہے تھے کہ نادر کا کا والا ترنگ آمیز دور واپس آ رہا ہے۔ فرید نے وہسکی کی ایک بوتل کی سیل توڑی اور اسے خاص انداز سے رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم چند لمحے ساکت کھڑا رہا...... پھر اس نے بوتل پکڑی اور ایک جھٹکے سے کئی تیز ابی گھونٹ اپنے حلقے سے نیچے اُتار لئے۔ جس طرح باری باری حقے کا کش لیا جاتا ہے اسی طرح ان چاروں نے باری باری بوتل کو ہونٹوں سے لگایا۔

کہیں پاس ہی سرنگ کے کسی حصے میں ٹیپ ریکارڈر پر یہ گانا بج رہا تھا۔

تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع جلتی رہے پروانہ چلا جائے گا

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ رستم اپنے کمرے میں تھا۔ نادیہ کھانا پکانے مہناز کے پاس گئی ہوئی تھی۔ چھریرے جسم کا ناصر جسے ڈاکٹر ناصر بھی کہا جاتا تھا، رستم کے پاس بیٹھا تھا اور بڑی توجہ سے اس کے پاؤں کے زخم پر بینڈ یج کر رہا تھا۔ اسی دوران میں لالہ فرید تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس نے اطلاع دی کہ آج پھر ''سیٹ'' پر نظام سے بات ہوئی ہے۔

رستم ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرید نے بتایا۔ ''تین پولیسوں کی اکٹھی موت نے بڑا سیاپا ڈالا ہوا ہے۔ اخباروں میں بھی خبریں آ رہی ہیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ کئی بے گناہوں کو پکڑا گیا ہے اور شاید کئی ابھی پکڑے جائیں گے۔ زوار کی تلاش بھی بڑے زور و شور سے ہو رہی ہے۔ وہ اپنے پنڈی والے گھر سے بھی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔''

''بی بی کا کیا حال ہے؟''

''وہ جیل کے ہسپتال میں ہے، حاجی حیات خان اپنے وعدے کا پاس پورا کر رہا ہے۔ اس نے ابھی تک بی بی یا اس کے وارثوں کو کوئی معمولی تکلیف بھی نہیں ہونے دی لیکن اس کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آ رہا۔ سارا کام خفیہ ہاتھوں سے کروا رہا ہے۔ آخر وہ پولیس والا ہے۔ اپنے محکمے کے سارے اچھے برے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

''عارف یا دراج کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔ ان کے بارے میں تو بات نہیں ہوئی، ہاں رنگ والی کے بارے میں وہ بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ نارپور کے چوہ... اور رنگ والی کے لوگوں کے درمیان تصادم کا

خطرہ تھا۔ پولیس نے دونوں طرف کے کچھ بندے پکڑے ہیں اور اسلحہ وغیرہ بھی قبضے میں لیا ہے۔''

''ڈی ایس پی ریاض کے بارے میں کوئی اطلاع؟''

''ہاں...... ریاض ہٹلر بھی رنگ والی کے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ نظام بتا رہا تھا کہ اس نے رنگ والی میں مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ ڈاک خانے میں بھی ہے۔ چوہدری ارشاد کی حویلی میں آنے والا ہر خط پولیس کی نظر سے گزرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ٹیلی فون چیک کرنے کے لئے بھی کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ ریاض ہٹلر کی وجہ سے مقامی پولیس بھی ایک دم چوکس ہو گئی ہے۔ راہ چلتوں کو پکڑ پکڑ کر پوچھ گچھ کر رہی ہے۔''

اس رات رستم کمرے سے نکل کر ٹیلوں کی طرف چلا گیا۔ پوری رات کا چاند دھیرے دھیرے مشرق سے بلند ہو کر آسمان کے وسط کی طرف جا رہا تھا۔ کہیں کسی کھوہ میں کوئی نامعلوم پرندہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چکور رستم کے سر پر سے پرواز کرتا ہوا چاند کی سمت چلا گیا۔ وہ الگ تھلگ ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ ہوا اس کے سینے میں جلنے والی آگ کو بھڑکاتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہے۔ بی بی کی صورت نگاہوں میں پھرتی رہی۔ بڑی دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور بوجھل قدموں سے چلتا کمرے میں آ گیا۔ نادیہ کندھوں تک کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس نے لالٹین کی لو مدھم کر رکھی تھی۔ رستم نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کی پھر الماری سے ایک کاغذ اور قلم نکال لیا۔ آج دوپہر رنگ والی کے حوالے سے فرید کی باتیں سن کر رستم کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا تھا۔ اب وہ اسی خیال پر عمل درآمد کرنے جا رہا تھا۔

اس نے بڑے کرب کے عالم میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا یہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا۔ تایا معصوم جن سے رستم کی آخری ملاقات مہتم بستی میں ہوئی تھی۔ اس مختصر ملاقات کے بعد ہی رستم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بی بی کو مہتم بستی میں اس کے وارثوں کے پاس چھوڑ کر چپ چاپ نکل جائے گا۔

رستم نے لکھنا شروع کیا۔ ''حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو، لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تم نے... تمہاری بھتیجی نے ایک ... لیے شخص کو واپس جرم اور گناہ کی دلدل میں دھکیلا ہے جو بڑی ... سے نکلا تھا۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے معصوم علی اور نہ تمہاری بھتیجی نے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا

ہے۔تم جھوٹی شرافت کی پگڑیاں سر پر سجانے والے لوگ ہو۔تم لوگ باتیں سنا سکتے ہو عمل نہیں کر سکتے۔ میں نے کیا کچھ نہ کیا تم لوگوں کے لئے۔بی بی بے رحم دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔تم لوگ تو کیا تمہاری ہوا بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے جان پر کھیل کر اسے ڈھونڈا اور اسے بچانے کی کوشش میں خود نارپوریوں کے ظلم کا شکار ہوا۔ میرے جسم کے ایک ایک حصے پر تمہاری بھتیجی کے نام کے زخم ہیں۔میرے دوستوں کی جان قربان ہوئی ہے،تم لوگوں کی آن بچانے کے لئے۔پورے پنجاب کی پولیس پھانسی کا پھندا لے کر میرے پیچھے دوڑ رہی ہے۔اپنے پرائے سب میرے لئے ختم ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ تمہاری بھتیجی کی خاطر ہوا۔

اگر تمہارے دل میں رتی بھر بھی انصاف ہوتا تو وہ نہ کرتے جو مہتم بستی میں تم نے کیا۔ اگر بی بی کسی وجہ سے ڈانواں ڈول بھی تھی تو تم اس کو حوصلہ دیتے۔اسے سمجھاتے کہ جس نے تمہاری خاطر پوری دنیا کو ٹھکرایا ہے اسے نہ ٹھکراؤ۔اس سے بڑھ کر پیار تمہیں کوئی نہیں دے سکتا۔آنکھیں بند کر کے اس کا ہاتھ تھام لو اور ڈور خدا پر چھوڑ دو۔

لیکن تم نے اس کے الٹ کیا۔وہ تو پہلے ہی بے وفائی کی ہوا میں ڈول رہی تھی۔تم نے اس کے پاؤں ہی زمین سے اکھاڑ دیئے۔اسے زندگی کی طرف کھینچ کر مجھے موت کی طرف دھکا دے دیا لیکن موت تو اپنے وقت پر آتی ہے مولوی معصوم علی اور زندگی بھی ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی جیسی ہم چاہتے ہیں۔ میں نے ماضی کو ناپاک کپڑے کی طرح لپیٹ کر تمہارے شرافت آباد کے گندے نالے میں پھینک دیا ہے۔اب میں تم لوگوں کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے،اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے،لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔''

رستم نے خط ختم کیا تو اس کی آنکھوں سے آتشی آنسو بہہ رہے تھے۔خط تہہ کر کے اس نے قلم دور پھینک دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔گرم آنسو اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔یہ آنسو بہ زبان خاموشی پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔''بی بی جی،یہ سب جھوٹ ہے۔جو لکھا ہے سب جھوٹ ہے،میری مجبوریوں کو معاف کر دینا بی بی۔میری خطاؤں کو بخش دینا۔''

دو دن بعد رستم نے یہ خط دلاور اور کاٹھیا کے حوالے کر دیا۔وہ اپنے کسی کام سے مارگلہ کی طرف جا رہے تھے۔لفافے پر رنگ والی کی حویلی کا ایڈریس تھا۔رستم نے انہیں سمجھا دیا

کہ یہ خط کہاں سے اور کیسے پوسٹ کرنا ہے۔رستم جانتا تھا کہ یہ خط حویلی پہنچنے سے پہلے پولیس کے پاس پہنچے گا اسے امید تھی کہ ایسا ہی ہوگا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا۔وہ جس راہ پر جا رہا تھا اس میں بہتر یہی تھا کہ بی بی کی راہ سے علیحدہ رہے۔

☆======☆======☆

یہ تقریباً دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔ہوا میں ہلکی سی تمازت محسوس ہوتی تھی۔شامیں کچھ طویل ہو گئی تھیں۔شانی کی قید کا آج آخری دن تھا۔اس کی ضمانت ہو چکی تھی۔کل وہ رہا ہو رہی تھی۔جیل کے ہسپتال کے چوکور کمرے میں وہ نیم سفید بستر پر نیم دراز تھی۔اس کے ریشمی بال اس کے بائیں کندھے سے ایک آبشار کی طرح گرتے ہوئے اس کے ہموار پیٹ تک چلے گئے تھے۔سامنے ایک خاتون وارڈن سٹول پر بیٹھی کروشیا کا کام کر رہی تھی۔ادھیڑ عمر نرس کی آواز سامنے ڈاکٹر کے کمرے سے آ رہی تھی۔شانی کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔اس کے سامنے دو راستے تھے۔ایک رنگ والی اس کی حویلی کی طرف جاتا تھا۔دوسرا عارف کمبوہ اور کمبوہ بستی کی طرف۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف کا رخ کرے۔کل بھی خالو اعجاز،عارف کمبوہ،وکیل ہمدانی صاحب اور دیگر افراد سے اس کی بات چیت ہوئی تھی مگر وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

فطری طور پر اس کی خواہش رنگ والی واپس جانے کی تھی۔وہ اپنی جنم بھومی اپنی حویلی کو دیکھنا چاہتی تھی،اپنی سہیلیوں سے ملنا چاہتی تھی۔رنگ والی کے ہر گلی کوچے میں پیادہ گھومنا چاہتی تھی۔مگر ''عقل'' ایک دوسرا فیصلہ دے رہی تھی۔ خالو اعجاز اور دیگر افراد سے اسے رنگ والی کے جو حالات معلوم ہوئے وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔شانی کو معلوم ہوا تھا کہ وہاں بے حد تناؤ ہے۔نارپور کے چوہدریوں اور شانی کے وارثوں میں کئی بار تصادم کی نوبت آئی ہے اور دو چار بار تو تصادم ہو بھی چکا ہے۔اس ٹکراؤ میں اب تک دونوں طرف کے چھ سات بندے مارے جا چکے ہیں۔درجنوں زخمی ہوئے ہیں۔طاقت اور اثر و رسوخ کے معاملے میں نارپور کے چوہدریوں کو رنگ والی پر واضح برتری حاصل تھی۔تعداد میں بھی یہ زیادہ تھے۔شانی کے اباجی کی وفات اور چاچا مشتاق کے قتل کے بعد حویلی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور آپس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔بہت سی زمین گروی پڑی تھی۔یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ رنگ والی واپس گئی تو نارپوری چوہدری مزید بپھر جائیں گے۔وہ شانی کو اب بھی بڑے چوہدری مہر کی قاتلہ سمجھتے تھے اور اس کو بدترین سزا دینا چاہتے تھے۔یہ امر بالکل واضح تھا کہ شانی کے رنگ والی جانے کے بعد تصادم میں شدت آئے گی اور یہ تصادم رنگ والی کے لئے جتنا

نقصان دہ تھا وہ صرف شانی ہی سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے میکے کو اپنے سابقہ سسرالیوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ کہانی بہت مختلف ہوتی۔ شانی اپنے غالب اور سخت گیر شوہر کے ساتھ سر جھکا کر واپس اپنے سسرال گئی تھی تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے خونی رشتوں کو معاشی اور سماجی جبر سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ حویلی کو اور اس کے ساتھ رنگ والی کو قانونی شکنجوں میں جکڑے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے خود ایک شکنجے میں جکڑی گئی تھی۔

ان باتوں کے علاوہ ایک خاص سوچ بھی بار بار شانی کے ذہن کو تہہ و بالا کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ اب وہ رنگ والی جا کر خوش نہیں رہ سکے گی۔ ابھی وہ رنگ والی گئی نہیں تھی لیکن اس کا تصور اسے سب کچھ دکھا رہا تھا۔ وہ چہکتی مہکتی بارونق حویلی اب بھائیں بھائیں کرتی تھی۔ امی، ابا جی، چاچا مشتاق، بھائی عادل...... چاچا رئیس، اب ان میں سے کوئی وہاں نہیں تھا۔ نہ کسی کی صورت نہ آواز، نہ قدموں کی چاپ۔ اب وہ وہاں جا کر کس کے سینے پر سر رکھے گی۔ کس بھائی کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گی۔ اب کون ہے وہاں جو اس کے ساتھ صبح دم گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلے گا اور اس کے لطیفوں پر ہنس ہنس کر دہرا ہوگا؟ کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں تھا...... اور تو اور اب وہ بھی نہیں رہا جو اس کی محبت کی ڈور میں بندھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ حویلی میں آیا تھا۔ مالی کے روپ میں پودوں کو پانی دیتا تھا۔ ایک محافظ کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتا تھا...... اور...... چاندنی راتوں میں گھاس پر جائے نماز بچھا کر بڑے جذب سے نماز پڑھا کرتا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا وہاں۔ اس کے کانوں میں ایک بھولا بسرا گیت گونجنے لگا۔

عجیب ہے یہ زندگی کبھی ہے غم کبھی خوشی
وہاں ہیں اب ویرانیاں، جہاں تھیں رونقیں کبھی

شانی کی زندگی کا دوسرا راستہ کمبوہ بستی کی طرف جا رہا تھا۔ علاقے میں کمبوہ ایک طاقت ور برادری تھی۔ ان کا سب سے بڑا دیہہ جوہر آباد تھا۔ عارف بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔ عارف کمبوہ اپنے باپ اور بیوی جمیلہ کے ساتھ تین مرتبہ شانی سے ملنے یہاں آ چکا تھا ان کا اصرار تھا کہ حالات کے پیش نظر شانی کا رنگ والی میں جانا ٹھیک نہیں۔ وہ جوہر آباد آ جائے، یہاں وہ ہر طرح محفوظ رہے گی اور تسلی سے آئندہ کی منصوبہ بندی کر سکے گی۔ شانی کے خالو اعجاز بھی اسی حق میں تھے۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد خالو اعجاز نے دوسری شادی کی تھی۔ یہ شادی کمبوہ برادری میں ہوئی تھی اور ان کی سسرال اس دور دراز بستی جوہر آباد میں ہی تھی۔

اسے خالو اعجاز سے پتا چلا کہ ان کی بیوی اور عارف کی بیوی آپس میں کزن ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آزادانہ آنا جانا بھی ہے۔

سات آٹھ دن پہلے شانی کو وکیل ہمدانی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ رنگ والی کے بجائے فی الحال جوہر آباد چلی جائے۔ ہمدانی صاحب کے اس مشورے کے پیچھے شانی کو اے ایس پی حاجی حیات خان کی رائے بھی نظر آئی تھی۔ وہ سخت شش و پنج میں تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عارف کمبوہ شانی کو بڑے اخلاص سے بہن کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ ایک نہایت پُرجوش شخص تھا۔ وہ علاقے میں چوہدری قادر اور تاؤ حشام جیسے جابروں کا مقابلہ بڑی جرأت سے کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ پیر قدرت اللہ جیسے بااثر شعبدہ باز کے خلاف بھی خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آیا تھا۔ مہتم بستی کی طرح جوہر آباد میں بھی اَن پڑھ توہم پرستوں کی کمی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایسے لوگ تھے جو قدرت اللہ کو پہنچی ہوئی ہستی سمجھتے تھے اور اس کی نافرمانی کرنے والے کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے۔ عارف بڑی جرأت کے ساتھ ایسے لوگوں سے برسرِپیکار تھا۔ وہ صفیہ والے معاملے کو عدالت میں لے کر گیا تھا اور وہاں اس کی بھرپور پیروی کر رہا تھا۔ اس نے نہ صرف مہتم بستی کے جلے ہوئے کلینک کی جگہ نیا کلینک بنوایا تھا بلکہ اپنی بستی کے اجاڑ ہسپتال کو بھی نئے سرے سے بنانے سنوارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ شانی کو بھی ان کاموں میں شریک کرنے کا خواہش مند تھا۔

اچانک کچھ آہٹیں ابھریں اور شانی چونک گئی۔ کوئی کمرے کے دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ یہ وارڈن عورت نہیں تھی (جسے یہاں مقدم بھی کہا جاتا تھا) موٹی بھدی نرس بھی نہیں تھی اور شاید عارف کمبوہ یا تایا معصوم بھی نہیں تھے۔ تایا معصوم تو آج کل ویسے بھی بیمار تھے۔ یہ کوئی اور تھا اور پھر وہ اندر آ گیا۔ شانی ششدر رہ گئی۔ وہ اس نورانی چہرے والے شخص کو جانتی تھی۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ اسے تب بھولتی اگر وہ لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی اور شیلا کے گھر کے درمیان بیتنے والی اس خوف ناک رات کو بھولتی جب ایک بجے، جنگل میں وہ بابر کے رحم و کرم پر تھی۔ سفید براق داڑھی والے پیر بابا نے اسے قیامت سے بچایا تھا۔ پھر وہ اسے اپنی جھونپڑا بستی میں لے کر گئے تھے...... اور اس کے دل اور جسم کے زخموں پر اپنی مہربان انگلیوں سے مرہم رکھا تھا۔ آج وہی پیر بابا سفید دھوتی، سفید لمبا کرتہ اور بیٹھی ہوئی پگڑی پہنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرمے کی خوش نما سیاہی اور ہونٹوں پر وجدانی مسکراہٹ تھی۔ ان کے ساتھ ان کا سوکھے سڑے جسم والا مرید سرمد تھا۔ وہ پیر بابا سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا۔

شانی نے اپنے سر پر اوڑھنی درست کی اور جلدی سے اٹھ کر ''سلام بابا'' کہا۔

پیر بابا نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا کر شانی کو پیار دیا اور منہ میں کوئی دعا پڑھی۔

شانی لرزتی آواز میں بولی۔ ''پیر بابا! اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ آپ یہاں . ؟''

''ہاں میرا بچہ ....'' وہ مخصوص لہجے میں بولے۔ ''صبح سویرے سے آیا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچ سکا ہوں۔ گیٹ پر وہ لال ٹوپی والا سنتری بڑا سخت ہے، اخروٹ کی طرح لیکن اندر سے تو اخروٹ بھی نرم ہوتا ہے ناں۔ بس بات بن ہی گئی۔''

شانی نے کرسی کو اپنی اوڑھنی کے پلو سے صاف کیا اور پیر بابا سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔

مرید سر مد ادب سے بولا۔ ''پیر بادشاہ، آپ کہیں تو میں باہر بیٹھوں؟''

''جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ بھائی۔'' پیر بابا کسی ریڈیو آرٹسٹ کی سی گونجدار آواز میں بولے۔

مرید باہر چلا گیا۔ ہسپتال کے سفید ٹائلوں والے کمرے میں کچھ دیر تک بس وال کلاک کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔

''آ .آپ کے لئے کیا منگواؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ ''کچھ نہیں اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں۔ بس دو چار باتیں کروں گا تم سے۔ پھر مجھے جانا ہے۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔

شانی کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ بابا جی کو اس کے بارے میں پتا کیسے چلا؟ وہ یہاں کیسے پہنچے؟ وہ اندر کیسے چلے آئے۔ ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

پیر بابا نے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک قیمتی پتھر نکالا۔ یہ ایک نگینہ تھا اور شانی اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ پیر بابا بولے۔ ''تمہیں یاد ہوگا، میں نے تم سے پوچھا تھا، یہ کیا ہے؟ تم نے کہا تھا شاید ہیرا ہے۔ میں نے کہا تھا، ہاں ہیرا ہی ہے لیکن آج سے لاکھوں سال پہلے یہ ایک پتھر تھا۔ میں نے کہا تھا ناں؟''

شانی آنکھوں میں نمی لے کر بولی۔ ''ہاں بابا۔''

پیر بابا کی نگاہیں نگینے پر مرکوز تھیں وہ بولے۔ ''پتھر کا ہیرا بننا ایک انہونی ہے لیکن اس انہونی تک پہنچنے کے لئے اس پتھر کو ایک طویل آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ زمین کی اتھاہ

گہرائیوں میں لاکھوں سال تک دبا رہتا ہے۔ زمین کی حرکت کرتی ہوئی پرتوں میں بے حد و حساب وزن اور گرمی برداشت کرتا ہے۔ ہر طرح کی موسمی سختیاں جھیلتا ہے اور تب جا کر ہیرا بنتا ہے۔ ہیرے ایسے ہی بنتے ہیں۔ کندن بھی ایسے ہی بنتے ہیں اور سیپوں میں موتی بھی ایسے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ اس جنبش سے دو موتی اس کی آنکھوں سے نکل کر ریشمی رخساروں پر پھسل گئے۔

پیر بابا نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ شانی کے سر پر پھیرا۔ شانی کو لگا سر کے بالوں سے پاؤں کے تلووں تک سکون کی ایک ناقابلِ بیان لہر دوڑ گئی ہے۔ پیر بابا نے حقیقت شناس لہجے میں کہا۔ ''میرا بچہ! ہمت نہیں ہارنی۔ رستہ کیسا بھی مشکل ہو مگر چلتے رہنا ہے۔ منزل کی پرواہ بھی نہیں کرنی۔ منزل کیا ہے، یہ تو ہم خود بھی نہیں جانتے۔ اوپر والا چاہے تو راستے کو منزل بنا دے، چاہے تو منزل بھی منزل نہ رہے اور میں جانتا ہوں تُو منزل کی پرواہ کئے بغیر چل سکتی ہے۔ میں نے تیری پیشانی پر ایک ایسا ستارہ دیکھا ہے جو بہت بلندی پر چمکتا ہے۔ ہاں میرا بچہ میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

وہ چپ رہی۔ اس کا دل چاہا وقت کی گردش تھم جائے۔ بابا کا ہاتھ کبھی اس کے سر پر سے نہ اٹھے جو بابا اس کے سامنے تھا وہ ماضی کا خوبرو ایکٹر وارثی تھا...... آج کا منڈھے ہوئے سر، لمبی داڑھی اور مدقوق چہرے والا پیر بابا۔ وہ دلگیر آواز میں بولی۔ ''میں کیا کروں بابا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، میں کس طرف جاؤں؟''

وہ کچھ دیر لب بستہ رہے پھر رمزیہ لہجے میں بولے۔ ''تجھے آگے بڑھنا چاہئے دھی رانی! پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں اور ابھی پیچھے ویرانی کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ جب ویرانیاں نہیں رہیں گی تو پھر دیکھ لینا پیچھے بھی......'' وہ چونک کر بابا کا چہرہ تکنے لگی۔

اسے لگا جیسے یہ رہنما صرف اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے ہی یہاں آیا تھا، فقط اسے راستہ دکھانے کے لئے۔ شانی کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی پلکیں جھکی رہیں۔ پیر بابا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ پھر شانی بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں فی الحال.... اپنی حویلی کے بجائے جوہر آباد جانا چاہتی ہوں۔ میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں جو نارپور کے چوہدریوں اور قدرت اللہ جیسے لوگوں کے خلاف لڑائی لڑ رہے ہیں۔ میں نے... ''

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہاں پیر بابا نہیں تھے۔ وہ اٹھی اور لپک کر دروازے تک پہنچی۔ اس نے پہلے بائیں اور پھر دائیں

طرف دیکھا چالیس پچاس قدم دور اس کو بس سرمد کی ایک جھلک دکھائی دی، وہ پیر بابا کے پیچھے چلتا ہوا ایک موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

ایک روز بعد شانی کمبوہ بستی جوہرآباد میں موجود تھی۔ یہ خاصی بڑی بستی تھی۔ یہاں میٹرک تک سکول موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا ہسپتال اور ڈاک خانہ بھی تھا۔ ساٹھ فیصد مکان کچے تھے یعنی گارے مٹی سے بنائے گئے تھے۔ چالیس فیصد پختہ اور نیم پختہ تھے۔ شانی کے خالو اعجاز بھی شانی کی چھوٹی خالہ کے ساتھ جوہرآباد آئے تھے۔ شانی نے خالو کی سسرال میں قیام کیا۔ یہ چار پانچ کمرے کا مکان تھا۔ صحن کچا تھا، چھت بھی لکڑی کی تھی۔ دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان پر پلاستر نہیں تھا۔ صحن میں نیم کے دو درختوں تلے ہینڈ پمپ لگا تھا اور پانی کے گھڑے پڑے تھے۔ یہاں خالو اعجاز کے بوڑھے سسر کے علاوہ ایک بیٹا اور بہو رہتے تھے۔ عارف کمبوہ کا گھر بھی اسی گلی میں بس دو مکان چھوڑ کر تھا۔

شانی دوپہر کے وقت کمبوہ بستی میں پہنچی۔ اس کی آمد نے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے اسے دیکھا جانے لگا۔ کچھ چہروں پر دلچسپی کے آثار تھے اور کچھ پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ ملا جلا ردِعمل تھا۔ شانی جانتی تھی یہاں بیشتر بستی کی طرح پیر قدرت اللہ کے لئے اندھی عقیدت نہیں ہے، کچھ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے فریبی اور دھوکے باز قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ اسے دھوکے باز سمجھتے تھے ان کے لئے شانی ایک باحوصلہ اور دلیر چوہدرانی تھی، جس نے چھوٹی سی عمر میں بڑا کام کیا تھا۔ قدرت اللہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس کے اثر و رسوخ کو للکارا تھا۔ شانی کے ہاتھوں قدرت اللہ کی بیبیوں کی پٹائی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی لیکن وہ لوگ جو قدرت اللہ کی شعبدہ بازیوں کا شکار تھے یقیناً شانی کو گمراہ اور گناہ گار قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ نحوست کا چلتا پھرتا پیکر تھی اور یہ نحوست کسی بھی وقت کسی پر بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔

سہ پہر کو عارف اور اس کی بیوی جمیلہ آئے اور شانی کو اپنے ساتھ بستی میں گھمانے لے گئے۔ سکول کی عمارت کے ساتھ ہی عارف نے کچھ زمین مقامی لوگوں کے چندے سے حاصل کی تھی۔ یہاں وہ بچوں کے کھیل کود کے لئے چھوٹا سا میدان بنوا رہا تھا۔ اس میدان کے گرد چار دیواری بنائی گئی تھی اور لوگوں کے بیٹھنے کے لئے سٹیڈیم کی طرز پر چار پانچ کچی سیڑھیاں تعمیر کی گئی تھیں۔

پھر عارف اور جمیلہ اسے بستی کا ہسپتال دکھانے لے گئے۔ اس خستہ حال عمارت کی دیواروں سے اُپلے اکھاڑ کر رنگ و روغن کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ دو کمروں کی ٹوٹی ہوئی چھتیں بھی مرمت کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ یہ موٹی دیواروں اور محرابی دروازوں والی عمارت انگریزوں کے دور کی تھی۔ نانک چندی اینٹوں نے اس مختصر عمارت کو آثارِ قدیمہ کا سا رنگ دے دیا تھا۔

شام کے وقت عارف کسی ضروری کام سے چلا گیا۔ شانی خالو اعجاز اور خالہ کے پاس واپس آ گئی۔ دیہی علاقوں میں رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا جاتا ہے۔ آٹھ بجے تک وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ خالو اعجاز لالٹین لے کر وسیع صحن کے آخری سرے پر گئے اور ایک لمبے چوڑے شخص کو لئے اندر آ گئے۔ اس شخص کو گھر کے بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا گیا۔

دو چار منٹ بعد خالو اعجاز شانی کے پاس آئے اور بتایا۔ ''یہاں کا ایس ایچ او آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' شانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں، کوئی ایسی بات نہیں لیکن تم اس سے مل لو۔''

شانی خالو اعجاز کے ہمراہ بیٹھک نما کمرے میں پہنچی۔ ہٹے کٹے دیہاتی تھانیدار نے کھڑے ہو کر شانی کو سلام کیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور اس کی قمیص کے نیچے پستول کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد تھانیدار نواز بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''بی بی جی! آپ میرے علاقے میں آئی ہیں۔ آپ کی حفاظت میری ذمے داری بنتی ہے۔ گوجرانوالہ کے وڈے آفس سے بھی پیغام آیا ہے کہ آپ کا خاص خیال رکھا جائے۔''

''مجھے کسی حفاظت کی ضرورت نہیں۔'' شانی نے روکھے لہجے میں کہا۔

''پر ہمیں تو آپ کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے جی۔ ہم تنخواہیں کس کام کی لیتے ہیں۔ آپ آزادی سے بستی میں گھوم پھر رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے کوئی اُبی نبی ہو جائے تو ہم کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی ہے؟''

''آپ سب جانتی ہیں بی بی۔ بلکہ ہم تو آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''تھانیدار صاحب! کھل کر بات کریں۔ پہیلیاں نہ بوجھوائیں۔'' شانی نے کہا۔

وہ کھنکھار کر بولا۔ ''دیکھیں جی! اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ رستم سیال پھر

اپنے پرانے گروہ سے جا کر مل گیا ہے۔ آج سے صرف آٹھ دن پہلے...... پچھلی جمعرات کو اسی گروہ کے بندوں نے یہاں سے پندرہ بیس میل دور پرانی روڈ کے قریب واردات کی ہے۔ ایک زرعی بینک کی گڈی سے کیش لوٹا ہے اور ایک بندہ قتل کیا ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ اصل بات کا پتا تو بعد میں چلے گا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ واردات میں رستم خود بھی شامل تھا۔''

''تم اس بات سے کیا مطلب نکالنا چاہتے ہو نواز صاحب!'' خالو اعجاز نے کہا۔

''دیکھیں جی! میری بات کا بُرا نہ منائیں۔ بی بی جی اور سیال کے بارے میں سب کچھ اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ یہ باتیں جھوٹی یا سچی تو ہو سکتی ہیں لیکن ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ رستم سیال کے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔ وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وڈے آفسراں سے جو پیغام آیا ہے اس میں بھی کہا گیا ہے کہ رستم کی طرف سے خطرہ ہے۔ خاص طور سے جس علاقے میں آپ لوگ آ گئے ہیں یہاں خطرہ زیادہ ہے۔''

''خبردار کرنے کا بہت شکریہ۔'' شانی نے کہا۔

''میری درخواست ہے کہ آپ زیادہ آزادی سے نہ گھومیں پھریں۔ اس سے ہماری مشکلیں بڑھ جائیں گی۔''

''آپ نے کچھ اور کہنا ہے یا اب ہمیں اجازت ہے؟'' شانی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اجازت تو آپ مجھے دیں، نوکر ہم ہیں۔ آپ تو نہیں ہیں۔'' تھانیدار نواز نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واپس اپنے کمرے میں آ کر شانی تادیر بستر پر لیٹی رہی۔ رستم کا نام بے پناہ شدت سے اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ یہ نام تو اب جیسے ہر سانس کے ساتھ اس کے سینے میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے لہو میں سرایت کرتا تھا اور سانس کے ساتھ باہر آتا تھا، کیسا شخص تھا وہ......؟ کتنا پیارا لیکن کتنا ظالم۔ وہ بظاہر بے ضرر تھا اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر رہتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی رہتی تھیں لیکن شانی کے دل و دماغ پر اس کا تسلط کہاں تک تھا، یہ صرف شانی ہی جانتی تھی۔ وہ اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر روز ایک نئی زنجیر کو حرکت دیتا تھا اور شانی کو اس میں جکڑ لیتا تھا۔ وہ اب تک ایسی لاتعداد زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان زنجیروں کو کیسے توڑے......؟

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ تھا کہ پولیس نے اب رستم سیال کو کسی قیمت پر زندہ نہیں

چھوڑنا۔ جب وہ ایسی بات سنتی تھی تو اسے لگتا تھا جیسے رستم کی نہیں، خود اس کی اپنی موت کی بات ہو رہی ہے۔

شانی کے ذہن میں ڈیڑھ دو ماہ پہلے کے مناظر گھومنے لگے۔ ان دنوں وہ حوالاتی کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جیل میں تھی۔ ایک دن خاتون پہرے دار کے ساتھ جو پولیس افسر شانی کے کمرے میں داخل ہوا تھا اس کی دہشت تھانوں سے لے کر اخباروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ شانی نے پہلے بھی کئی بار اس کا نام سنا تھا لیکن اس دن پہلی بار اس نے ڈی ایس پی ریاض کی شکل دیکھی تھی۔ وہ شکل سے ہی بے رحم قصائی نظر آتا تھا۔ کانوں کے نیچے گوشت پھولا ہوا، جبڑے چوڑے، ناک موٹی اور کانٹے دار مونچھوں تلے ہونٹ سانولے سے۔ اس شخص کو دیکھ کر شانی کے جسم میں ایک سرد لہری دوڑی۔ جو سب سے پہلا احساس اسے ہوا وہ یہ تھا کہ یہ شخص ذرا سی بات پر آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتا ہے اور بہت کچھ خاکستر کر سکتا ہے۔

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کو ایک خط دکھایا تھا۔ شانی ہینڈ رائٹنگ پہچانتی تھی۔ یہ رستم کی تھی۔ شانی کو خط پڑھوانے سے پہلے ریاض نے اسے بتایا تھا کہ یہ خط رنگ والی کے ڈاک خانے سے پولیس کے ہاتھ کیسے لگا۔ اس کے بعد ریاض نے خط شانی کے ہاتھ میں تھما دیا...... رستم کا یہ مبینہ خط شانی کے تایا معصوم کے نام تھا، خط یوں شروع ہوا تھا۔ ''میں حیران ہوں تمہارا نام معصوم ہے۔ تم رنگ والی کی مسجد میں امامت کراتے ہو۔ لوگ تمہیں عالم دین سمجھتے ہیں لیکن تمہاری سمجھ بھی وہی ہے جو رنگ والی کے کسی جاہل سے جاہل شخص کی ہو سکتی ہے......''

اس آتشی خط کا اختتام ان الفاظ پر تھا...... ''ایک بات یاد رکھنا۔ جو ناانصافی تم لوگوں نے کی ہے اس کا صلہ تمہیں ضرور ملے گا۔ میں اس ناانصافی کو بھولوں گا نہیں۔ بے شک ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن وقت کبھی بھی ہمیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں رہا۔''

اس خط کو پڑھنے کے بعد شانی کو شدید ترین شاک محسوس ہوا لیکن پھر فوراً ہی وہ اس شاک سے نکل بھی آئی تھی۔ اچانک اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ خط رستم کا نہیں اور اگر رستم کا ہے تو اس نے اپنے ہوش و حواس میں نہیں لکھا اور اگر اپنے ہوش و حواس میں لکھا ہے تو پھر اس کا وہ مقصد نہیں جو بظاہر نظر آ رہا ہے۔ یہ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ملنے والی گواہی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن رستم سیال اس قسم کے رویے کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ جب دل کی گہرائیوں سے گواہی مل گئی تو شانی بھی رنج کے بحرِ بیکراں سے نکل آئی تھی۔

قصاب صورت ریاض نے کہا۔ ''دیکھ لے مسماۃ شانی! تُو اس بھگوڑے کو کیا سمجھتی رہی

ہے اور وہ کیا نکلا ہے۔ اگر تیرے دل میں اس خط کے بارے میں کوئی شک ہے تو میں بڑے سے بڑا حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ یہ اسی بھگوڑے کا خط ہے اور ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر تجھے اور تیرے وارثوں کو اس طرح کے اور بھی "محبت نامے" ملیں۔"

"آ.....آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" شانی نے پوچھا تھا۔

"چاہنے کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم دے کیا سکتی ہو۔" ڈی ایس پی ریاض کا لہجہ اس کی شکل سے بڑھ کر زہریلا تھا پھر اس نے ایک دم نرم لہجے میں کہا۔ "قانون کے ہاتھ مضبوط کرو گی تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ نہیں تو یہ لیٹرا کسی وقت کچھ بھی کر جائے گا تم لوگوں کے ساتھ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری تھوڑی بہت شرم کرے گا مگر تمہارے والی وارثوں کا جینا تو حرام کر سکتا ہے ناں. . ."

اس روز ڈی ایس پی ریاض نے شانی کے ساتھ طویل گفتگو کی تھی۔ کبھی ڈرا دھمکا کر کبھی نرمی سے، کبھی چالبازی سے اس نے شانی کے ہونٹوں کے تالے کھولنے چاہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی رستم کا کوئی سراغ بتائے تاکہ اسے جلد از جلد قانون کی گرفت میں لایا جاسکے۔ اس کی باتوں سے شانی کو اندازہ ہوا کہ رستم کی واحد قریبی عزیز اس کی ایک بہن ہے۔ بہن اور بہنوئی کا کھوج لگ جائے تو رستم تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ ریاض کی پوچھ گچھ کا سارا زور اس بات پر تھا کہ شانی اسے رستم کے بارے میں نہیں بتا سکتی تو اس کی بہن کے بارے میں ہی کوئی سراغ دے۔

شانی اس بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی ہوتی تو بھی اس نے کچھ نہیں بتانا تھا، ناکام ہو کر ریاض نے شانی کو ننگی گالیاں دی تھیں۔ شاید وہ اس سے آگے بڑھ کر اس سے مار پیٹ بھی کرتا لیکن وہ جانتا تھا نادیدہ ہاتھ شانی کے پیچھے ہیں۔ اگر وہ ایک حد سے آگے بڑھا تو یہ ہاتھ حرکت میں آجائیں گے۔

جیل میں پیش آنے والے یہ سارے واقعات ایک دو منٹ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ وہ بستر پر لیٹی رہی اور سوچتی رہی کہ رستم اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ کیا سوچ رہا ہوگا؟ رستم کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل ندامت اور دکھ سے بھر جاتا تھا۔ وہ جاں گسل لمحے ذہن میں تازہ ہو جاتے تھے جب وہ رستم کے بہت نزدیک آتے آتے بہت دور چلی گئی تھی۔ مہتم بستی میں کمرے کی کھڑکی میں سردار کی بیوی ماکھو پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری رکھ گئی تھی۔ شرم کے مارے اس ٹوکری کے پھول شانی نے اپنی اوڑھنی میں نہیں ڈالے تھے لیکن اس کی مرضی تو وہی تھی جو ماکھو چاہتی تھی اور ساری بستی چاہتی تھی۔ وہ کئی

راتوں کی جاں گسل کشمکش کے بعد رستم کا ہاتھ تھامنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ وہ صبح اس کی زندگی کی حسین صبح بنی اور پھر کچھ ہی دیر بعد تاریک ترین صبح بن گئی۔ رستم اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ ہاں وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح کوئی بھی شکوہ زبان پر لائے بغیر، ایک بھی آنسو بہائے بغیر.... اور وہ اشک بار آنکھوں کے ساتھ دہلیز پر کھڑی سوچتی رہ گئی۔ وہ اس سے بات تو کر سکتی ایک بار، صرف ایک بار اسے بتا تو سکتی کہ کچھ دیر پہلے اس نے کتنا حسین فیصلہ کیا تھا۔ رستم کے چلے جانے کے بعد اس نے اتنی شدید حسرت محسوس کی تھی کہ اسے اپنی جان کی ہر ہر رگ ٹوٹتی محسوس ہوئی تھی لیکن اب، جب تین ماہ گزرنے کے بعد وہ اس بارے میں سوچتی تو اسے لگتا تھا کہ شاید جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ زندگی کا وہ شدید ترین جذباتی موڑ کوئی شدید نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا۔ اگر اس دن تایا معصوم اور حاجی حیات کی آمد سے کچھ دیر پہلے وہ رستم کو اس دل نواز فیصلے سے آگاہ کر دیتی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد یہ دل نواز فیصلہ اندوہناک جدائی میں بدلتا تو پھر یہ جانکاہ اذیت کئی گنا بڑھ جاتی اور اب جو حالات سامنے آرہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس فیصلے کا شانی کے لبوں تک نہ آنا ہی بہتر تھا۔

پچھلے چند مہینوں میں جس دوسرے خیال نے دن رات شانی کے ذہن کو جکڑے رکھا تھا، وہ مُنے کا خیال تھا۔ مُنے کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں جیسے ایک سیال محبت ہلکورے لینے لگتی تھی اور اس کی خوشبو پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتی تھی۔ وہ کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟ اسے کیسے یاد کرتا ہوگا؟ بھابو کے الوداعی الفاظ تو جیسے ہر وقت شانی کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے۔ "مُنے کو سنبھال لوگی ناں......؟"

اب تک کی زندگی میں شانی کی آنکھوں نے جو حسین ترین سپنا دیکھا تھا، وہ ایک ہی تھا......اس سنہری سپنے میں شانی کے ساتھ دو ہنستے مسکراتے چہرے اور تھے۔ ایک مُنے کا، دوسرا رستم کا۔ کسی سرسبز ڈھلوان پر، پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے سے گھر میں ہفت رنگ شام جھروکوں سے جھانکتی تھی اور آنگن میں اُترتی تھی۔ مُنا شانی کی بانہوں میں مچلتا تھا اور شانی......رستم کی بانہوں کا سہارا پاتی تھی۔

شانی کی اب تک کی معلومات کے مطابق مُنا لاہور میں چوہدری بشیر کے پاس ہی تھا۔ چوہدری بشیر خوفناک جلدی بیماری سے حال ہی میں صحت یاب ہوا تھا۔ اپنے بھائی بندوں سے اس کی صلح ہو چکی تھی۔ تاہم قادرا اور تاؤ حشام سے اَن بن اب بھی موجود تھی۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شانی نے اپنے وکیل ہمدانی صاحب کے ذریعے چوہدری بشیر کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ ایک بار مُنے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اس پیغام کا جواب منفی صورت میں ملا تھا۔ چوہدری بشیر نے مُنے کو

لانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا میرا بچہ پہلے ہی مریض ہو چکا ہے، میں اس کی بیماری میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔

اچانک کچھ آوازوں نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں گونجی تھیں اس کے ساتھ ہی عارف کی موٹر سائیکل کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شانی نے کھڑکی سے جھانکا۔ کشادہ صحن میں آگے ایک تانگہ کھڑا تھا اور دو تین گھوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تانگے میں دو شہری لڑکیاں اور ایک ٹی شرٹ والا نوجوان موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سفری بیگ تھے۔ عارف بہت خوش دکھائی دیا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا اور بولا۔ ''شانی بہن......! تمہارا آنا مبارک ثابت ہوا ہے۔ ایک معاملہ کئی ہفتوں سے اٹکا ہوا تھا، آج ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟''

''ڈاکٹر......دونوں لیڈی ڈاکٹرز گوجرانولہ کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دو دن تک ہم ہسپتال میں علاج معالجہ شروع کر دیں گے۔''

اسی دوران میں کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب کے سب عارف کے ہم خیال تھے۔ تینوں ڈاکٹرز کا استقبال پھولوں کے ہار ڈال کر کیا گیا۔ عارف کا ایک پُرجوش ساتھی کہیں سے ڈھول اٹھا لایا، کچھ نوجوان ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ دو افراد نے ٹرپل ٹو رائفل سے ہوائی فائر کر کے خوشی کا اظہار کیا۔

اب شانی کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے عارف خاموشی کے ساتھ جس کام کے لئے گیا تھا وہ یہی ڈاکٹر کو لانے والا کام تھا۔ عارف کی بیوی جمیلہ سرگوشی کے انداز میں شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''عارف کی کئی مہینوں کی محنت رنگ لائی ہے۔ ایسے دور دراز علاقے میں کوئی ڈاکٹر آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ویسے بھی چوہدریوں کے خوف نے ہر کسی کو ڈرا سہا رکھا ہے۔''

''یہ ڈاکٹر کہاں سے آ رہے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''بیچارے کل سے سفر میں ہیں۔ آج انہوں نے تقریباً آٹھ گھنٹے تک کچے میں تانگے پر سفر کیا ہوگا۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں ان کی حالت کیسی ہو رہی ہے۔''

ڈاکٹروں نے عارف کے گھر میں قیام کیا۔ اگلے روز ہسپتال کو تیار کرنے کے لئے مزید تیزی سے کام کیا گیا۔ مرمت طلب چھتوں کا کام کل ہی مکمل ہو گیا تھا۔ چھوٹی سی لیبارٹری بھی تیار تھی۔ ایک خستہ حال ایکسرے مشین یہاں موجود تھی تاہم اسے ورکنگ پوزیشن میں لانے

کے لئے بہت محنت درکار تھی۔ ڈسپنسری، عمارت کی ڈیوڑھی میں بنائی گئی۔ عارف اور اس کے ساتھی پتا نہیں کہاں کہاں سے ایلوپیتھک دوائیں اکٹھی کر کے یہاں لائے تھے۔ ایک لمبوترے کمرے میں بان کی چارپائیاں ڈال کر اسے وارڈ کی شکل دے دی گئی تھی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خود بھی بڑھ چڑھ کر اس کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر کا نام نعمان تھا اور وہ بھی فلاحی جذبے سے معمور نظر آتا تھا۔

سہ پہر کے وقت بستی کا چوہدری نواب دین موقع پر پہنچا۔ وہ سفید دھوتی، کُرتے اور سفید پگڑی والا ایک دانا کمبوہ تھا۔ اس کی عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ شانی بھی اس وقت ہسپتال کی عمارت میں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ کے ساتھ موجود تھی۔ چوہدری نواب دین عارف کو ایک طرف لے جا کر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ دونوں کے جملے شانی کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

نواب دین نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو پُتر! جو کچھ بھی کرو عقل مندی اور پیار سے کرو۔ ہم نے پنڈ میں لڑائی نہیں ڈالنی اور نہ کسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ میرے لئے تم میں اور شاہی میں کوئی پھرک (فرق) نہیں ہے۔ جیسے تم اس پنڈ کے پُتر ہو، وہ بھی ہے۔''

''اب کیا بات ہوئی ہے چاچا؟'' عارف نے پوچھا۔

''کوئی کھاص بات نہیں۔ پر ایک بات تو ہے ناں۔ شاہی اور اس کے یاروں کو ہسپتال کا دکھ ہے۔ ابھی شاہی کا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا عارپھ کے یار دوست ہمارے گاہکوں کو کھراب کر رہے ہیں۔ استانے (آستانے) پر آ کر لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ جھاڑ پھونک چھوڑو، اپنی جندگیاں برباد نہ کرو۔ ڈاکٹری الاج کراؤ۔ شہر سے وڈے ڈاکٹر آ گئے ہیں۔''

''بکواس کر رہا ہے وہ۔ میں نے کسی کو آستانے پر نہیں بھیجا اور نہ کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے۔ وہ اُلو کا پٹھا شاہی جان بوجھ کر فساد کرنا چاہتا ہے۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ شاید ایک دو بندے یہاں سے استانے کی طرپھ گئے ہیں۔ انہوں نے استانے پر کھڑے مریجوں (مریضوں) سے بات بھی کی ہے۔ میں نے کھد دیکھا ہے۔''

''چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔ میں ساروں سے کہہ دیتا ہوں کہ خیال رکھیں۔ شاہی کی دُم پر کسی کا پاؤں نہ آئے۔''

دو چار باتیں کرنے کے بعد چوہدری نواب دین وہاں سے چلا گیا۔ شانی نے عارف

سے پوچھا۔ ''یہ شاہی کون ہے؟''

''اسی فراڈیئے قدرت اللہ کا خفیہ چمچہ ہے حرامزادہ۔ یہاں جھاڑ پھونک کرتا ہے۔ لوگوں کو الٹی سیدھی دیسی دوائیاں بھی دیتا ہے۔ گاؤں میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو قدرت اللہ دوسرے علاقوں میں ذرا وسیع پیمانے پر کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے مختلف دیہات اور علاقوں میں اپنے ایسے کئی مقامی چوہے چھوڑ رکھے ہیں۔ کئی علی الاعلان قدرت اللہ کے شیطانی ہاتھ پر بیعت ہیں، کئی ناجائز اولاد کی طرح ''چوری چھپے کے شاگرد'' ہیں اور اس کا کام آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ کُتے کا تخم بھی ان میں سے ایک ہے۔''

''آستانہ کیا ہے؟''

''بڑے کی ماں کا سر ہے۔'' عارف نے جل کر کہا۔ ''بس ایک دو کمرے ہیں شاہ دین والے کنویں کے پاس۔ وہاں شاہی نے رنگ برنگے جھنڈے لگائے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو ڈرانے اور پھسلانے کے لئے عجیب عجیب چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ صبح اور شام کے وقت وہاں پھسکڑا مار کر بیٹھتا ہے اور تعویذ گنڈا کرتا ہے۔ قدرت اللہ کو پیروں کا پیر اور کرامات کا شہنشاہ مانتا ہے۔''

''لوگ جاتے ہیں اس کے پاس؟''

''ان اَن پڑھ لوگوں کی کیا بات کرتی ہو شانی بہن! یہ تو اس مداری کے گرد بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں جو رسی سے نیولا باندھ کر صرف آدھ گھنٹہ تک تقریر جھاڑتا ہے اور آخر میں پانچ سو کے تعویذ بیچ کر چمپت ہو جاتا ہے۔ پانچ چھ مہینے پہلے تک اس کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ نہیں تھی لیکن پھر وہ خارش کی بیماری والا شوشہ اُڑا اور لوگوں میں یہ مشہور ہوا کہ یہ بیماری بس ان لوگوں کو ہی ہوئی ہے جنہوں نے لاہور میں قدرت اللہ کے ساتھ بدتمیزی کی یا پھر اس بدتمیزی کی حمایت کی۔ ایسی باتیں ان سادہ لوح دیہاتیوں میں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں اور ان کے دلوں میں پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس بات کے پھیلنے کے بعد سے صرف شاہی کا کام ہی نہیں بڑھا، اس جیسے دوسرے سارے چوہے بھی دُم پر کھڑے ہو کر ناچ رہے ہیں۔''

اگلے روز پانچ کمروں، ایک برآمدے اور ایک ڈیوڑھی والے اس مختصر سے ہسپتال میں کام شروع ہو گیا۔ تینوں ڈاکٹرز نے اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لیں۔ عارف نے یہاں دو کمپاؤنڈر بھی مہیا کر دیئے تھے۔ خود عارف کی بیوی جمیلہ نرس کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ہسپتال میں علاج کے آغاز کے حوالے سے دو تین بینرز بھی جوہر آباد کو آنے والے راستوں پر لگا دیئے گئے تھے۔ دو تین قریبی دیہات میں میریہ کے اثرات پائے جا رہے تھے۔ عارف اور

اس کے ساتھیوں کو توقع تھی کہ پہلے دن ہی کافی لوگ ہسپتال کا رخ کریں گے۔

دوپہر تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ شانی اور اس کے خالو اعجاز گھر کی چھت پر کھڑے تھے۔ منڈیر کے جھروکوں سے ہسپتال کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ دوپہر تک زیادہ سے زیادہ چھ سات مریضوں نے ہی ہسپتال کا رخ کیا تھا۔

''لگتا ہے کہ مقامی لوگوں کا رجحان تعویذ گنڈے کی طرف زیادہ ہے۔'' شانی نے خیال آرائی کی۔

خالو اعجاز بولے۔ ''اصل میں ہسپتال کے بند ہونے سے بھی اثر پڑا ہے۔ آج تقریباً تین مہینے بعد ڈاکٹر یہاں آئے ہیں اور ہسپتال کے دروازے کھلے ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ متوجہ ہو جائیں گے لیکن شرط یہی ہے کہ ڈاکٹرز یہاں ٹکے رہیں اور عارف دوائیوں کی کمی نہ ہونے دے۔''

اتنے میں خالو اعجاز کا سالا جمشید بھی چھت پر چلا آیا۔ یہ ایف اے پاس تھا اور یہاں بستی میں ڈیزل کی ایجنسی چلاتا تھا۔ اس کا شمار بھی عارف کے نوجوان ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ شاہی کے آستانے پر کافی رش لگا ہوا ہے۔ مریضوں کے علاوہ بہت سے تماشائی بھی موجود ہیں۔''

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' خالو اعجاز نے پوچھا۔

''خاص بات کیا ہونی ہے بس ڈرامے ہی ہیں بھاجی! چوہدری حشام کے پنڈ سے جونکیں آئی ہیں۔ کئی دنوں سے ان جونکوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ اب اگلے تین چار دن آستانے پر لوگوں کو جونکیں لگیں گی اور دوسرے لوگ تماشا دیکھیں گے۔'' پھر جمشید شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''باجی جی! آپ کو پتا ہے جونکوں کا؟''

شانی کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جونکوں سے جمشید کی کیا مراد ہے۔ وہ جونکوں کے بارے میں جانتی تھی بلکہ تاؤ حشام کی حویلی میں ان کو بھگت بھی چکی تھی۔ اس کے ذہن میں گہری سانولی رنگت والے وہی جڑواں بھائی آ گئے جنہوں نے کئی بار بڑی رغبت سے اس کا خون پیا تھا اور قدرت اللہ کے کسی سفلی علم کی تکمیل کی تھی۔

جمشید نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے باجی! آپ جانتی ہیں۔''

''ہاں میں نے دیکھا ہوا ہے...... یہ دو بھائی ہیں۔ اب کہاں ہیں یہ؟''

''شاہی کے ٹھکانے پر...... آج صبح ہی یہاں پہنچے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے اُمڈ آئے ہیں۔ بہت سے لوگ ان سے خون چوسوانے کے لئے بے تاب ہیں۔ عجیب تماشہ

ہے۔لوگ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ یہ انسانی جونکیں صرف گندہ اور بیمار خون ہی پیتی ہیں۔صحت مند خون مریض کے جسم کے اندر رہتا ہے۔''

اب عارف کی اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ شاہی نامی یہ عامل قدرت اللہ کا ہی چیلا چانٹا ہے۔

اگلے دو تین دن میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔صبح نو بجے سے سہ پہر پانچ بجے تک ہسپتال میں صرف آٹھ دس مریض ہی آتے تھے۔دوسری طرف شاہی کے آستانے پر رش لگا رہتا تھا۔لوگ اسے بہت مانتے تھے۔شانی کم از کم تین ایسی عورتوں سے ملی جنہوں نے شاہی کے آستانے سے علاج کروایا تھا اور صحت یاب ہوئی تھیں۔شانی نے اس بارے میں ڈاکٹر نعمان سے بات کی۔ڈاکٹر نعمان نے کہا۔''شانی صاحبہ! آپ جو کچھ بتا رہی ہیں یہ پہلے سے میرے علم میں ہے۔یہ بات آپ کو بھی پتا ہوگی کہ شاہی صرف جھاڑ پھونک نہیں کرتا، مریضوں کو پُڑیاں اور چٹکیاں وغیرہ بھی دیتا ہے۔اتائیوں کی طرف سے اس طرح مریضوں کا علاج اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔یہ لوگ بڑی بے دردی سے لوگوں کو ''اسٹیرائڈز'' کا استعمال کروا رہے ہیں۔تکلیف کیسی بھی ہو مریض کو وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا ہے لیکن آگے چل کر وہ بُری طرح پچھتاتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ شاہی بھی ''اسٹیرائڈز'' استعمال کرتا ہوگا۔''

''یہاں لیبارٹری میں ٹیسٹ کی سہولت نہیں ہے ورنہ میں ابھی آپ کو ثبوت پیش کر دیتا۔آپ شاہی کی دی ہوئی چٹکی یا پُڑیا کا نمونہ گوجرانوالہ یا لاہور بھجوائیں، آپ کو مکمل ثبوت مل جائے گا۔''

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، دونوں لیڈی ڈاکٹرز فرحین اور شائستہ پاس ہی بیٹھی تھیں۔وہ قدرے گم صم دکھائی دیتی تھیں۔ڈاکٹر نعمان میں بھی پہلے دن جیسا جوش و جذبہ نظر نہیں آ رہا تھا۔یہ لوگ تعمیری جذبے کے ساتھ یہاں آ تو گئے تھے مگر اب انہیں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ڈاکٹر نعمان ایک مریض کو دیکھنے کھیتوں کی طرف چلا گیا تو شانی فرحین اور شائستہ کے پاس آ بیٹھی۔پہلے دنوں کے برعکس دونوں کچھ ڈری ہوئی اور مایوس سی تھیں۔ان میں شائستہ خاموش طبع تھی لیکن فرحین باتیں کرتی تھی۔اس کے والد بھی ڈاکٹر تھے اور گوجرانوالہ میں سوشل کاموں میں حصہ لیتے تھے۔

شانی نے فرحین سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹالنے لگی۔بوریت کا بہانہ کرنے لگی لیکن شانی ٹوہ میں لگی رہی۔آخر فرحین نے رازداری سے اسے بتایا۔آج سویرے ایک عورت کلینک میں آئی تھی۔وہ کبڑی بھی تھی اور اس کا چہرہ بھی کچھ خوفناک سا تھا۔اس نے کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جو ہمیں پہلے معلوم نہیں تھیں۔

''کیا کہا ہے اس نے؟'' شانی نے پوچھا۔

فرحین بولی۔''وہ کہتی ہے کہ یہ ہسپتال اس لئے اجاڑ پڑا ہے کہ یہاں ''کچھ'' ہے مطلب کہ سایہ وغیرہ۔'' شانی چونک کر فرحین اور شائستہ کی طرف دیکھنے لگی۔فرحین بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''عورت کا کہنا ہے کہ یہاں کوشش کے باوجود کوئی ڈاکٹر نہیں ٹھہرتا۔اس سے پہلے یہاں دو ڈاکٹر مارے بھی جا چکے ہیں۔ایک لاہور کا تھا، دوسرا گجرات کا۔دوسری موت یہاں تین چار مہینے پہلے ہی ہوئی ہے۔یہ دونوں موتیں ابھی تک ایک سوال ہیں۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''آپ ٹھیک کہتی ہیں، یہاں ہسپتال میں دو موتیں ہو چکی ہیں۔اس بات کا پتا مجھے ابھی دو دن پہلے ہی چلا ہے لیکن ڈاکٹر فرحین! یہ موتیں کوئی معمہ نہیں ہے۔بس اتفاق کے تحت ایسا ہو گیا ہے۔جنوری میں مرنے والا ڈاکٹر اسد پہلے سے کچھ بیمار تھا۔وہ یہاں اپنے دفتر میں ہی سو رہا تھا۔اسے شدید برین ہیمرج ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔گجرات کے ڈاکٹر رات کو آندھی میں چھت پر سے چارپائی اتارنے گئے، ان کا پاؤں پھسلا اور وہ گر کر جاں بحق ہو گئے۔''

شائستہ نے کہا۔''لیکن یہاں کے لوگ ان دونوں واقعات کو کسی اور طریقے سے بیان کرتے ہیں؟''

''تو کیا آپ ان کے اس بیان پر یقین رکھتی ہیں؟ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ اس عمارت میں بھوت پریت ہوں گے جو یہاں آنے والے ڈاکٹرز کو قتل کر دیتے ہیں۔''

''نہیں میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔میں تو مقامی لوگوں کی سوچ بتا رہی ہوں۔وہ کہتے ہیں کہ موت کے بعد ڈاکٹر اسد کی گردن پر پُراسرار نشان تھے اور ان کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ڈاکٹر رانا کے بارے میں بھی ان کا یہی کہنا ہے کہ وہ گرے نہیں تھے، رات کے وقت کسی وجہ سے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور انہوں نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔''

''آپ لوگوں کی باتیں چھوڑیں ڈاکٹر شائستہ! آپ پڑھی لکھی باشعور ہیں، کیا آپ ان باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟'' شائستہ کی بجائے فرحین نے جواب دیا۔

''ہمیں ایسی باتوں پر یقین نہیں لیکن مقامی لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی کا آپ کو بھی

اندازہ ہوگا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہوسکتا ہے اوپر تلے ہونے والی ان دونوں موتوں میں کسی کا ہاتھ ہو۔ مثلاً انہی لوگوں کا جو یہاں ہسپتال، سکول اور پلے گراؤنڈز وغیرہ کے خلاف ہیں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ یہ طاقت ور لوگ ہیں۔ یہاں کے ماحول میں یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر رانا کو چھت پر سے دھکا دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر اسد کے ساتھ بھی کچھ اس طرح کا معاملہ ہوسکتا ہے۔''

''سوچنے کو تو پھر کچھ بھی سوچا جاسکتا ہے ڈاکٹر فرحین لیکن جو لوگ آپ کو اپنی ذمے داری پر یہاں لائے ہیں وہ آپ کی حفاظت کے اہل بھی ہیں۔ آپ اس بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔''

شانی دونوں لیڈی ڈاکٹرز کا اعتماد بحال کرنے میں مصروف ہوگئی اور کافی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔

اگلے روز دوپہر کو عارف کمبوہ نے شانی کو بتایا کہ مہتم بستی سے مکھیا دراج کا بھائی اور بھاوج ہسپتال میں آئے ہوئے ہیں۔ مکھیا کی بھاوج سخت بیمار ہے۔ اسے چارپائی پر ڈال کر چار گھنٹے میں مہتم بستی سے یہاں لایا گیا ہے۔ شانی مکھیا دراج کی بھاوج کو جانتی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہوگئی۔

وہ خالو اعجاز کو بتا کر خالہ فیروزہ کے ساتھ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں ایک بیٹھک کے سامنے چند بوڑھے کمبوہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک لڑکا انہیں دو دن کا باسی اخبار سنا رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر کمبوہ بزرگوں کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آئے اور جب وہ ان کے قریب سے گزری تو انہوں نے رخ پھیر لیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، یہاں جوہر آباد میں اس قسم کی سرد مہری سے کئی بار شانی کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس سرد مہری کے ڈانڈے قدرت اللہ سے جاکر ملتے تھے۔ بے شک یہی لوگ تھے جنہوں نے شانی اور رستم کو میلے میں نارپوریوں کی بے رحم یلغار سے بچایا تھا لیکن جب بات قدرت اللہ اور اس کی بیبیوں کی ہوتی تھی تو ان میں سے بہت سے لوگ شانی کو غیر نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ شانی ہسپتال میں پہنچی۔ دراج کا چھوٹا بھائی سراجا سامنے ہی موڑھے پر بیٹھا بھٹا کھا رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی ہی کی طرح چوڑا چکلا اور ٹھوس تھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل اور مونچھیں چمکیلی تھیں۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی طلائی بالیاں اس کی امارت کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز میں

شانی پر ڈالی اور شانی کے سوال کا جواب بڑی مشکل سے دیا۔ اس کی بیوی زری چارپائی پر سیدھی لیٹی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر فرحین اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی۔ شانی نے زری کو دیکھا اور حیران رہ گئی۔ چند مہینے پہلے وہ ایک سانولی لیکن خوبرو اور دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال تھی لیکن آج وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں اور ان پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہونٹ سیاہی مائل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پانچ چھ سالہ بچی بڑی معصومیت سے ماں کے دبلے پتلے پاؤں پر سر رکھے سو رہی تھی۔

شانی نے زری کو السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی بس ہونٹوں کی جنبش سے جواب دیا اور نگاہ کا رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔

شانی کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ جواں سال زری کی دونوں کلائیوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ شانی ان پٹیوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ وہ خود بھی اس تکلیف دہ مرحلے سے گزر چکی تھی۔ یقیناً یہ خون آشام توام بھائیوں کی خونخواری کے نشان تھے۔ اس کم نصیب عورت کا علاج بھی اس سے پہلے پیر قدرت اللہ کے زیر سایہ ہوتا رہا ہے۔

شانی ڈاکٹر فرحین کو ایک طرف لے گئی اور پوچھا ''کیا ہوا ہے اسے؟''

''جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' فرحین افسردگی سے بولی۔ ''اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ پہلی بچی کے بعد دو بچے مرچکے تھے۔ کسی سنیاسی نے تیسرے بچے کی پیدائش کے وقت کہا اس کا ناڑو کاٹنے کی بجائے گرم لوہے سے داغ کر اُتارا جائے۔ ناڑو (ماں اور نومولود بچے کی درمیانی نس) کو داغ کر علیحدہ کیا گیا جس سے ماں کے جسم میں انفیکشن ہوگیا۔ یہ معمولی انفیکشن بہ آسانی ٹھیک ہوسکتا تھا لیکن ٹوٹے ٹوٹکوں نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ بعد میں اس بی بی کے پیٹ میں درد رہنے لگا۔ اب ہوتے ہوتے حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس کی جان خطرے میں نظر آتی ہے...... اگر یہ لوگ اسے بچانا چاہتے ہیں تو فوراً اسے لاہور لے جائیں۔''

شانی کا دل غم سے لبریز ہوگیا۔ مہتم بستی میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس سلوک کے لئے کسی کو قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ اگر کوئی قصوروار تھا تو وہ ''جاہلیت'' اور دقیانوسیت تھی۔ وہ بے چین ہوکر زری کے پاس جا بیٹھی۔ اس کے بال اپنی انگلیوں سے سنوارنے لگی۔ اس کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ مہتم عورت اس سے سیدھے منہ بات نہیں کررہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کی دل جوئی میں لگی رہی۔

پھر وہ دراج کے بھائی سراجے کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے دراج اور ماکھو کا حال احوال پوچھا۔ اس نے بڑی دردمندی کے ساتھ سراجے سے گذارش کی کہ وہ اپنی جواں سال

بیوی کو مزید نہ گھسیٹے۔ اسے فوراً لاہور لے جائے اور کسی اچھے ڈاکٹر یا مستند معالج کو دکھائے۔

سراجا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ بیوی کی زیادہ تکلیف کی وجہ سے اسے یہاں لے تو آیا ہے مگر اس صورتِ حال سے خوش ہرگز نہیں ہے۔ اس کی سوئی وہیں جھاڑ پھونک پر اٹکی ہوئی ہے۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو سراجے! اس کی عمر ابھی مرنے کی نہیں ہے۔ اسے بے موت مت مارو۔ اس پر اور اپنی بچی پر رحم کرو۔ اسے لاہور لے جاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

وہ کتنی ہی دیر سراجے کی منت کرتی رہی۔ آخر اس نے محسوس کیا کہ سراجے کے ماتھے پر سوچ اور تذبذب کی شکنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ شانی کا رویہ اس کی ہٹ دھرمی میں دراڑیں پیدا کر رہا تھا۔ بعد میں جمیلہ اور عارف نے بھی سراجے کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ایک ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام ہو چکا تھا اور اس کے ذریعے جواں سال زری کو گوجرانوالہ اور وہاں سے لاہور لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ وقتِ رخصت شانی نے زری کا ماتھا چوما اور اس کی آنکھوں کے نم گوشوں کو صاف کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

شانی ان کے جانے کے بعد بھی ہسپتال میں رہی اور عارف کی بیوی جمیلہ کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے کام کرتی رہی۔ ان کاموں میں اس کے زخمی دل کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اس کا دھیان اپنے جاں گسل دکھوں کی طرف سے ہٹ رہا تھا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ شام سے ذرا پہلے عارف کی زبانی شانی کو یہ غم ناک خبر ملی کہ سراجے کی بیمار بیوی زری مہتم بستی میں چل بسی ہے۔ شانی نے حیران ہو کر عارف سے پوچھا۔ ''وہ لوگ اسے لاہور لے کر نہیں گئے تھے؟''

عارف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راستے میں ہی انہوں نے ٹرالی کا رخ مہتم بستی کی طرف موڑ دیا۔ ایک بڑے بوڑھے کے کہنے پر وہ اسے ''مٹھا پانی'' لے گئے۔ اس گاؤں میں ایک کنواں ہے جس کا پانی گرمیوں میں بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لوگ شفا کے لئے اس پانی سے مریضوں کو کپڑوں سمیت نہلاتے ہیں۔ سراجے کی بیوی کو بھی نہلایا گیا اور واپس مہتم بستی لایا گیا۔ سانس کی شکایت تو اسے یہیں پر ہو گئی تھی۔ کل رات حالت اور بگڑ گئی۔ آج صبح نو دس بجے کے قریب اس نے دم دے دیا۔''

اس اطلاع نے شانی کے علاوہ ڈاکٹرز کو بھی افسردہ کیا۔ خاص طور سے فرحین غم زدہ ہوئی، شانی اس وقت ہسپتال میں ہی تھی۔ ہسپتال میں مایوسی کی فضا تو پچھلے چار پانچ دن سے

ہی موجود تھی، اب یہ مایوسی مزید گہری ہونے لگی۔ دونوں لیڈی ڈاکٹرز خاص طور سے اداس اور دل برداشتہ نظر آتی تھیں۔ شانی شام کے بعد بھی ان کے پاس رہی اور ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتی رہی۔ عموماً شام کے وقت بجلی چلی جاتی تھی اور ہسپتال کے کمروں میں لالٹینیں جلانا پڑتی تھیں۔ تاہم عارف نے اب جنریٹر ٹھیک کروا لیا تھا اور توقع تھی کہ کل سے الیکٹرک روشنی میسر ہو گی۔ شانی، فرحین اور شائستہ کو اس بارے میں بتا رہی تھی جب کھڑکیوں سے باہر نیم تاریکی میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی پھر اچانک کمرے کی کھڑکی کا شیشہ زوردار چھناک سے ٹوٹا اور کوئی سیاہ چیز دھپ سے فرحین، شائستہ اور شانی کے درمیان میز پر آ گری۔ فرحین کی کربناک چیخ ابھری۔ لالٹین کی روشنی میں شانی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، میز پر سیاہ رنگ کا ایک دیسی مرغ پھڑک رہا تھا۔ اس کا سر غائب تھا اور گردن سے ابلنے والے خون کے چھینٹے چاروں طرف بکھر رہے تھے۔ وہ تینوں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگیں اور برآمدے میں جا کھڑی ہوئیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے بھی چلانے کی آواز آئی۔ یہاں تانگے کے نیچے آنے والا ایک ادھیڑ عمر دیہاتی زیرِ علاج تھا۔ شانی اور فرحین لپک کر وہاں پہنچیں تو یہاں بھی ایک بھیانک منظر نظر آیا۔ کٹی ہوئی گردن والا ایک سیاہ مرغ زندہ مرغ کی طرح فرش پر کھڑا تھا اور پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پھر وہ چکرا کر گرا اور اس کی گردن سے ابلنے والا خون چاروں طرف بکھرنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ والا ادھیڑ عمر دیہاتی بھی چارپائی سے فرش پر گر گیا تھا۔

شائستہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''مائی گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

اتنے میں کھڑکی ٹوٹنے کا ایک اور چھناکا سنائی دیا۔ ایک سر کٹا سیاہ مرغ لیبارٹری میں آ کر گرا اور پورے کمرے میں پھڑپھڑانے لگا۔ اس مرغ کے گرنے کے ساتھ ہی شانی کو ایک نعرہ بھی سنائی دیا۔ اس نے دوڑ کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ نیم تاریکی میں اسے ایک گھڑسوار نظر آیا۔ ایک ڈھاٹا پوش شخص دوڑتا ہوا گیا اور جست لگا کر گھڑسوار کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پھر ایک اور گھڑسوار نمودار ہوا اور تینوں نعرے بلند کرتے ہوئے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

اس واقعے کے فوراً بعد ارد گرد کے بہت سے افراد اکٹھے ہو گئے۔ تینوں سر کٹے مرغ خون کے بہت سے چھینٹے اُڑانے کے بعد ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہراس تھا اور وہ بتا رہے تھے کہ یہ کسی نے کوئی ٹونہ کیا ہے۔ مرغ پھینکنے اور نعرے بلند کرنے والے دونوں افراد کی صورت کوئی نہیں دیکھ پایا تھا۔ انہوں نے چہرے ڈھاٹوں میں چھپائے ہوئے

تھے۔اس واقعے کے کچھ دیر بعد عارف کمبوہ اور جمشید وغیرہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ ڈاکٹرز کو تسلی تشفی دینے لگے۔ عارف کمبوہ نے اسی وقت تین رائفل برداروں کو ہسپتال کے پہرے پر مقرر کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''نعمان صاحب! ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ ان کو پکڑیں گے اور آپ کے سامنے ان سے اقرار کروائیں گے۔''

عارف کے دیگر ساتھیوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹرز کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔

تاہم اگلے روز دس بجے کے قریب شانی یہ نہایت مایوس کن خبر سن رہی تھی کہ دونوں لیڈی ڈاکٹرز اپنا بوریا بستر باندھ کر واپس روانہ ہو چکی تھیں۔ عارف نے شانی کو یہ خبر سنائی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اب کیا ہو گا عارف؟'' شانی نے پوچھا۔

''ڈاکٹر نعمان بھی شاید دو چار دن میں چلا جائے گا۔ ہسپتال ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو بڑا ظلم ہو گا۔ لوگ ان نوسر بازوں کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں۔ ان کی جانیں جا رہی ہیں، زندگیاں حرام ہو رہی ہیں۔''

''جو کچھ ہمارے بس میں ہے، کر تو رہے ہیں لیکن ابھی قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔'' عارف کے لہجے میں ہلکی سی تھکن تھی۔

تھکن کی یہ کیفیت سیدھی شانی کے دل میں لگی۔ چند دن پہلے وہ کتنا پُر امید تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوش کی چمک تھی۔

شانی اور عارف کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر عارف کو چوہدری نواب کا ایک کارندہ بلانے کے لئے آ گیا اور وہ اس کے ساتھ چل دیا۔

شانی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر جواں سال زری کی شکل گھوم جاتی تھی اور اس بچی کی بھی جو روتے روتے ماں کے پاؤں پر سر رکھ کر سو گئی تھی... ایسی نہ جانے کتنی مائیں اور کتنی بچیاں ہر روز اتائیت کی بھینٹ چڑھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی تھیں۔ پھر شانی کے ذہن میں بھابو اور مُنے کا خیال آیا۔ وہ بھی تو ایسی ہی جاہلیت کا شکار ہو کر ایک دوجے سے جدا ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' خالو اعجاز کی آواز نے اسے چونکایا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''خالو! یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو دوسروں کا بھلا نہیں

ہونے دے رہے۔''

''سب کچھ تمہارے سامنے ہے شانی بیٹا۔ زمینداروں اور وڈیروں کی چوہدراہٹ اسی طرح قائم رہتی ہے کہ علاقے میں علم اور عقل کی روشنی نہ پھیلے۔ پھر جب پیر قدرت اللہ جیسے لوگ بھی ان چوہدریوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو جہالت کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔''

''اب ہسپتال کا کیا ہو گا؟''

''لگتا تو یہی ہے بیٹا کہ یہ ایک بار پھر بند ہو جائے گا۔''

''ہمیں کوئی حل سوچنا ہو گا خالو جی۔''

خالو اعجاز نے حسبِ عادت اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ''جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے اس کا ایک ہی حل ہے شانی۔''

وہ چونک کر خالو کا سرخ و سپید چہرہ تکنے لگی، خالو نے اپنے قدرے فربہ جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو اس علاقے میں واپس لانا ہو گا جو یہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ لوگ اس کام کو بہت حد تک سنبھال چکے تھے۔ اپنے تجربے کے زور پر وہ آگے بھی بڑھ رہے تھے۔ لوگ ان پر بھروسا کرنے لگے تھے۔''

''آپ کن کی بات کر رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر بہروز، ڈاکٹر محسن اور زیب النساء وغیرہ۔ شاید تمہیں معلوم ہوا ہی ہو گا۔ ڈاکٹر محسن اور ڈاکٹر زیب النساء اردگرد کے دیہات میں بڑے بھرپور طریقے سے کام کر رہے تھے۔ ان کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی تھی۔ وہ یہاں جوہر آباد کے ہسپتال میں بھی ٹائم دے رہے تھے لیکن پھر وہ عارف کی بھتیجی صفیہ والا واقعہ ہو گیا۔

چوہدری حشام کے بیٹے نے اسے اپنی حویلی میں رکھیل بنا کر رکھا اور اس سے زیادتی کرتا رہا۔ بعد میں اس کا حمل گرایا گیا اور وہ قبر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر زیب النساء نے صفیہ کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بیٹی کی جان بچانے کے لئے اسے فوراً لاہور کے ہسپتال میں لے جائے۔ چوہدریوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کنواری لڑکی کو حاملہ کرنے والا یہ معاملہ میانہ گاؤں سے باہر جائے اسی بات پر چوہدریوں کا ڈاکٹر زیب النساء اور اس کے خاوند ڈاکٹر محسن سے شدید جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا وہ دونوں خوف کے مارے ہی کہیں روپوش ہو گئے یا چوہدریوں نے دونوں کو کہیں غائب کر دیا۔ جہاں تک میری اطلاع ہے ابھی تک ان کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ بہر حال عام لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ ان کے ساتھ نارپوری چوہدریوں نے ہی کچھ کیا ہے۔''

شانی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے پردۂ تصور پر تاؤ حشام کی حویلی میں دیکھے ہوئے مناظر ایک بار پھر گھومنے لگے۔ تاؤ کے کارندوں کا ڈاکٹر میاں بیوی کو مارتے پیٹتے ہوئے حویلی میں لانا، ان کو ننگی گالیاں دینا، ذلیل کرنا اور پھر کال کوٹھڑی میں بند کر کے چلے جانا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خالو کو بتا دے کہ اس نے تین چار ماہ پہلے تاؤ حشام کے قید خانے میں کیا دیکھا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ خیال دل میں ہی دبا لیا۔

''آپ نے تیسرے کس ڈاکٹر کا نام لیا ہے؟'' شانی نے خالو سے پوچھا۔

''ڈاکٹر بہروز! وہ سینئر ڈاکٹر تھا۔ مستقل طور پر یہاں نہیں رہتا تھا مگر باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔ علاقے میں جتنا کام ہو رہا تھا اس پر بہروز کی گہری نظر تھی۔ مہتم بستی میں اپنی جیب سے اس نے کلینک بنوایا تھا اور بہت سے لوگوں کی مخالفت مول لی تھی۔ تمہیں معلوم ہی ہے یہ کلینک بستی والوں نے بعد میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حیرانی ہوتی ہے کہ کہ شعبدہ بازوں کے بہکاوے میں آ کر یہ لوگ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودتے ہیں۔''

''ڈاکٹر بہروز اب کہاں ہے؟''

''اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ چوہدریوں کے ڈر سے بیرون ملک چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر بہروز کا آگے پیچھے بھی کوئی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ اصل میں ہے کہاں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چوہدریوں نے اسے اغوا کر کے مروا دیا تھا۔ اس سلسلے میں لاہور کے چند ڈاکٹروں نے ایک کیس بھی فائل کیا تھا۔ پتا نہیں اس کیس کا کیا بنا۔''

شانی کے ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کی خوبرو پیشانی پر جھول رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

خالو اعجاز کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس گورکھ دھندے میں الجھی رہی۔ اس کے ذہن پر یہ بدترین خدشہ یلغار کرتا رہا کہ ڈاکٹر بہروز، محسن اور زیب النساء وغیرہ نارپوریوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا ان کی قید میں ہیں۔

سہ پہر کے وقت شانی حسبِ معمول جمیلہ کے ساتھ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ چادر اوڑھ کر نکلتی تھی۔ آدھا چہرہ چادر کے پلو سے ڈھکا رہتا تھا۔ ہسپتال کی طرف جاتے ہوئے اسے دو چیزیں اکثر پریشان کرتی تھیں۔ ایک تو بیٹھک کے سامنے بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے بوڑھے...... دوسرے ایک شلوار قمیص والا سانولا سا شخص جو اکثر اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ شانی کو شک تھا کہ یہ پولیس والا ہے۔

آج بھی وہ بیٹھک کے سامنے سے گزری تو بوڑھوں نے چہ میگوئیاں کیں۔ ان کی

زبانیں بے شک خاموش رہتی تھیں لیکن ان کے چہرے کہتے تھے۔ تُو ایک شریف لڑکی نہیں ہے۔ تیرا ناتا ایک بدنام ڈاکو سے ہے۔ ہم نے کٹھولی کے میلے میں تجھے اس ڈاکو سے لپٹتے دیکھا ہے۔ اس کے حصے کی لاٹھیاں اپنے جسم پر کھاتے دیکھا ہے۔ تُو ناپاک ہے۔ تُو گمراہ ہے۔ تیری گمراہی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ تُو نے حضرت صاحب کی بیبیوں کو مارا۔ حضرت صاحب کا پاک برتن توڑا۔ اب تُو ہماری خیر خواہ بن کر اس بستی میں آ گئی ہے۔ ہم لعنت بھیجتے ہیں تیری خیر خواہی پر اور تیرے سائے سے بھی بچنا چاہتے ہیں۔۔

اور یہ تاثرات بیٹھک کے سامنے بیٹھے بوڑھوں کے ہی نہیں تھے بلکہ بستی کے اکثر بڑے بوڑھے شانی کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

شانی ہسپتال میں پہنچی تو وہاں آج معمول سے زیادہ اداسی نظر آئی۔ ڈاکٹر نعمان ڈیوڑھی میں سو رہا تھا۔ عارف ایک رجسٹر میں حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ شانی عارف کے پاس جا بیٹھی۔ ''کیا بات ہے شانی بہن! تم کچھ پریشان لگتی ہو؟''

''مجھے لگتا ہے عارف...... ایک پولیس والا میری نگرانی کرتا ہے۔''

عارف نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''ایک پولیس والا نہیں.... میرے اندازے کے مطابق دو تین پولیس والے ہوں گے۔ ایک کو تو میں اچھی طرح جانتا بھی ہوں۔ وہ پولیس ملازم نہیں ہے لیکن کام پورا پورا پولیس والا کرتا ہے۔''

''کون ہے؟''

''ابھی نہیں، بعد میں بتاؤں گا۔''

''ایسا کیوں کر رہے ہیں یہ لوگ؟''

''ان سے پوچھو گی تو یہی کہیں گے کہ تمہاری حفاظت کے لئے، کیونکہ تمہیں کئی طرف سے خطرہ ہے۔ قدرت اللہ کا کوئی سرپھرا پیروکار تمہاری جان لے سکتا ہے یا رستم سیال کوئی خطرہ بن سکتا ہے لیکن اصل بات یہ نہیں ہے۔''

''اصل بات کیا ہے؟''

''ان پلسیوں کا خیال ہے کہ شاید رستم تمہاری طرف آنے کی کوشش کرے تو وہ اس کو پکڑ سکیں لیکن وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ جو کچھ پولیس والے اب سوچ رہے ہیں اس نے بہت پہلے سوچ لیا ہوگا۔ وہ جانتا ہے، تین پلس والوں کے اکٹھے قتل کے بعد ریاض بٹلر نے ہر طرف اس کے لئے شکنجے لگائے ہوئے ہیں۔''

''اب وہ کہاں ہے؟'' شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''مفرور ڈاکو کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت کہاں ہوگا۔ وہ روپوش ضرور ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ کہیں دبک کر بیٹھا ہو۔ تھانیدار نواز نے تمہیں بینک کی گاڑی لوٹنے والی واردات کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اب پتا چلا ہے کہ اس واردات میں جو سینئر گارڈ قتل ہوا ہے وہ نارپور کا تھا اور چوہدری قادرے کا قریبی رشتے دار تھا۔ اس سے پہلے بھی لاپتا گھڑسواروں کی طرف سے ہونے والی واردات میں نارپور کے دو چوہدری بال بال بچے تھے۔ علاقے میں رستم اور اس کے ساتھیوں کا خوف بڑھ رہا ہے۔''

اندھیرا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ شانی نے عارف سے کہا۔ ''جنریٹر ٹھیک ہوگیا ہے تو اسے چلا دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک تو ہوگیا تھا لیکن رات کو کوئی کُتے کا بچہ اس کی ساری بڑی تاریں کاٹ گیا ہے۔ اب پھر اسے چالو کرنے میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ یہ شاہی کے کسی بندے کا کام ہے۔ میں نے چوہدری نواب کو آخری وارننگ دی ہے کہ وہ شاہی اور اس کے چیلوں کو سنبھال لے۔ ورنہ انہیں دن میں تارے نظر آجائیں گے۔''

دو دن مزید گزرے۔ ان میں کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا لیکن تیسرے دن صبح سویرے شانی کو اوپر تلے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر ڈاکٹر نعمان کے بارے میں تھی۔ وہ بھی لاہور واپس چلا گیا تھا۔ کہا تو اس نے یہی تھا کہ وہ دوست کی شادی میں شرکت کر کے تین چار دن تک واپس آجائے گا لیکن اس کے ساتھ کام کرنے والی نرس کا کہنا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا . . دوسری خبر زیادہ دھماکہ خیز بلکہ سکتہ زدہ کردینے والی تھی۔

چھ بجے کے لگ بھگ شانی کو گھر سے باہر شور سنائی دیا۔ شور سن کر خالو اعجاز اور جمشید وغیرہ فوراً باہر چلے گئے۔ شانی نے وسیع صحن عبور کیا اور بیرونی دروازے پر پہنچی۔ اس نے پٹ وا کر کے باہر جھانکا اور اس کی روح تک کانپ گئی۔ وہ ایسا ہی لرزا دینے والا منظر تھا۔

ایک مشکی گھوڑا ہانپا ہوا اور پسینے میں تربتر کھڑا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بہت دور سے یہاں پہنچا ہے۔ گھوڑے کی رکاب میں گھڑسوار کا پاؤں اس بُری طرح الجھا ہوا تھا کہ بس جکڑ کر رہ گیا تھا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد گھڑسوار گھوڑے کے ساتھ بہت دور تک گھسٹتا رہا تھا۔ شاید کئی کلومیٹر تک۔ اس المیے نے براؤن شلوار قمیص والے گھڑسوار کے بالائی دھڑ کو خوفناک حد تک مسخ کر دیا تھا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر خالی ہوگئی تھی۔ اونچی نیچی جگہوں سے ٹکرا ٹکرا کر کندھے اُکھڑ گئے تھے اور پسلیاں ریڑھ کی ہڈی سے علیحدہ ہو کر خوفناک منظر پیش

کر رہی تھیں۔ شانی ایک بار دیکھنے کے بعد اس لاش کو دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ اس نے خالہ فیروزہ اور ان کی والدہ کو بھی یہ منظر دیکھنے سے منع کر دیا۔

کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ گھوڑا کہاں سے آیا ہے۔ ...اور بدترین موت کا شکار ہونے والا گھڑسوار کون ہے۔ گھڑسوار کے سینے پر گولی کا زخم بھی ڈھونڈ لیا گیا۔ عارف کے چند نوجوان ساتھیوں کا اندازہ تھا کہ یہ گھڑسوار میانہ کا ہے۔

اسی دوران میں چند اور گھڑسوار بھی دھول اُڑاتے نمودار ہوئے۔ عارف، جمشید اور ان کے درجنوں پُرجوش ساتھی چوکس ہوگئے۔ چند ایک نے اپنی رائفلیں بھی کندھوں سے اُتار لیں۔ گھڑسوار قریب پہنچے تو یہ ثابت ہوگیا کہ وہ میانہ سے ہی ہیں۔ یہ کل چار افراد تھے ان میں دو نیلی پگڑیوں والے بھی تھے اور نیلی پگڑی تاؤ حشام کے گرگوں کا طرہ امتیاز تھی۔ ان میں سے ایک شخص کی شکل شانی کو جانی پہچانی لگی۔ پھر اس نے پہچان لیا۔ وہ اس مکروہ چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی۔ تاؤ کی حویلی میں اس شخص نے رستم کو چمڑے کی بیلٹ سے مارا تھا۔ تاؤ اور قادرا اسے ''چیمہ'' کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ چیمہ تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور سربریدہ لاش کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ لپٹنے سے اس کے اپنے سارے کپڑے بھی خون آلود ہوگئے۔ وہ مرنے والے کو ''میرا بھائی'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس کے جسم کو چوم رہا تھا۔

عارف نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا اس بندے کو؟''

''تمہیں نظر نہیں آرہا۔'' چیمہ کراہا۔ ''یہ مر گیا ہے۔ ختم ہوگیا ہے اور اس کے ختم ہونے میں تمہارا بھی قصور ہے۔ تم سب کا قصور ہے۔ کٹھولی کے میلے میں تم اس حرامی رستم کو نہ بچاتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا...... میرا بھائی قتل ہوا ہے اور تم سب بھی اس قتل کے ذمے دار ہو۔''
آخری الفاظ کہتے کہتے چیمے کی آواز بلند تر ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آتشی آنسو گرنے لگے۔

ایک نیلی پگڑی والے نے آگے بڑھ کر مرنے والے کا رکاب میں پھنسا ہوا پاؤں آزاد کرا دیا۔ چیمے نے کٹی پھٹی لاش کو گود میں اٹھایا اور کچھ دور پڑی ایک کھری چارپائی پر ڈال دیا۔ ایک مقامی شخص نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔

عارف نے نیلی پگڑی والے سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے بھئی؟''

نیلی پگڑی والے کا رنگ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح متغیر تھا اور وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس نے ناراض لہجے میں انکشاف کیا۔ ''ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں نے میانہ پر حملہ کیا ہے۔ اندھا دھند گولیاں چلا کر انہوں نے کئی بندے مار دیئے ہیں۔ وہ چوہدری

حشام، چھوٹے چوہدری راجو اور ایک ملازم ساجن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔“

عارف کمبوہ اور دیگر لوگوں نے سخت حیرت کے عالم میں یہ اطلاع سنی۔

عارف نے کہا۔ ”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے؟“

”یہ دیکھو، میرے پاؤں پر گولی لگی ہے۔“ نیلی پگڑی والے نے پنڈلی سے اپنا لاچہ اٹھاتے ہوئے عارف کو زخم دکھایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”ہم نے رستم سیال اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کیا۔ کچھ نہیں تو آٹھ دس میل تک ہم ان کے پیچھے رہے۔ فائرنگ بھی ہوتی رہی لیکن پھر وہ لوگ رکھ میں پہنچ گئے اور وہاں سے ٹیلوں کی طرف نکل گئے۔ چیمہ کا بھائی بھی پیچھا کرنے والوں میں تھا۔ اسے رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی گولی لگی ہے۔“ نیلی پگڑی والے کے لہجے میں ناراضی کی جھلک بدستور موجود تھی۔ اس واقعے نے پورے جوہرآباد میں شدید سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ چیمہ اپنے بھائی کی موت اور تاؤ حشام کے اغوا پر مسلسل واویلا کر رہا تھا۔

عارف کے ساتھیوں میں سے ایک نے نیلی پگڑی والے کے زخمی پاؤں کا خون روکنے کی کوشش کی لیکن ایک ادھیڑ کمبوہ نے پھنکار کر کہا۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی ہمدردی کی جرورت نہیں۔ یہ ہماری صھپیہ (صفیہ) کے قاتل ہیں۔ ہم ان کے جخم (زخم) پر پیشاب بھی نہیں کریں گے۔“ جواں سال کمبوہ پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ خوفناک، سربریدہ لاش لے کر واپس روانہ ہو گئے۔

ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر تصدیق ہو گئی کہ تقریباً تیس کلومیٹر دور میانہ گاؤں میں صبح منہ اندھیرے ایک خوفناک واردات ہو چکی ہے۔ اس واردات میں چوہدری کے پانچ بندے موقع پر ہلاک ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد دوگنا تھی۔ چپے چپے پر پولیس اور رضاکاروں کی موجودگی کے باوجود رستم سیال میانہ گاؤں کی حویلی سے اپنے شکار کو اچک کر لے گیا تھا۔

اس واقعے کی جو مزید تفصیلات سامنے آئیں، ان سے معلوم ہوا کہ رستم سیال خود اس واردات میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ایک پرانے ساتھی حسنا گجراتی کے موجود ہونے کے شواہد بھی ملے ہیں۔ چند دن پہلے تک میانہ گاؤں کے اردگرد سخت پہرہ تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ پولیس والے بھی رات کو نگرانی پر رہتے تھے لیکن تین چار دن پہلے ڈی ایس پی ریاض گاؤں آیا تھا۔ اس نے چوہدری حشام اور دیگر گاؤں والوں کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں رستم یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی میانہ کی طرف آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

آج یہ جرأت ہو گئی تھی اور بڑے سنسنی خیز انداز میں ہوئی تھی۔ میانہ کے کئی گھروں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ آنے والے چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو جانوروں کی طرح باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تاؤ حشام کی حویلی میں کئی عورتیں اور جوان نوکرانیاں بھی موجود تھیں لیکن ڈاکوؤں نے کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ قتل اور زخمی بھی وہ لوگ ہوئے تھے جنہوں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ معلوم ہوا کہ رستم اور اس کے ساتھی میانہ کے قریبی کھیتوں میں موجود تھے۔

صبح منہ اندھیرے وہ چھوٹے مالک راجو کی رہائش گاہ کی طرف سے حویلی میں گھسے۔ پہلے انہوں نے کتوں کو گولی ماری اور پہرے داروں پر قابو پایا۔ پھر چھوٹے مالک کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ تب وہ للکارے مارتے اور اندھادھند فائرنگ کرتے حویلی کے بڑے حصے میں چلے گئے۔ جب تاؤ حشام پکڑا گیا تو وہ نیم برہنہ تھا اور حویلی کی انچارج نوکرانی چھیدو کے ساتھ سو رہا تھا۔ حویلی کے اس حصے میں شدید فائرنگ ہوئی۔ رستم کے ایک دو بندے بھی زخمی ہوئے حویلی کے دس بارہ افراد یہاں خاک وخون میں لوٹ گئے۔ تاؤ حشام نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ رستم بے حد وحشت کے عالم میں تھا۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ اس نے تاؤ کو بڑی بے دردی سے مارا اور لہولہان کر دیا۔ بتانے والے بتا رہے تھے کہ تاؤ جو پہلے ہی نیم عریاں تھا، بالکل ننگا ہو گیا۔ ڈاکو اسے اسی حالت میں حویلی سے باہر لائے۔ تاہم جب بعد میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تو اس کے زخمی جسم کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔

تاؤ اور اس کے بیٹے کی اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ جوہرآباد میں بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو کر تبصرے کرنے لگے۔ عارف اور نواب دین نے گاؤں کی سیکورٹی سخت کر دی۔ مسلح کمبوہ نوجوان گاؤں کی حدود پر گشت کرنے لگے۔

پتا نہیں کیوں شانی کی آنکھوں میں رہ رہ کر کنھولی گاؤں کے میلے کا منظر گھوم رہا تھا۔ جب رستم کے سامنے تاؤ حشام کے بندوں نے شانی کو مارا تھا۔ شانی کے دل سے آواز آئی کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اگر رستم یہاں سے بچ گیا تو وہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ اس کی توہین کا بدلہ بدترین طریقے سے لے گا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل سے آواز آ رہی تھی کہ آج جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی میلے والے واقعے سے تعلق رکھتا ہے ...... وہ اندر تک لرز گئی اس کے دل و دماغ پر انجانے اندیشے یلغار کرنے لگے۔

اسی دوران میں عارف تیزی سے اندر آیا اس نے کہا۔ ”شانی ... میں نہیں چاہتا کہ تمہارے لئے کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو۔ میں نے گھر سے باہر تین بندوں کا پہرہ لگا دیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں کسی دوسرے گھر بھجوادوں۔"

"میرے خیال میں تو اس کی ضرورت نہیں عارف۔"

"چلو..... اس بارے میں بھی دیکھ لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آج کسی وقت پولیس یہاں پہنچے اور ہم سے پوچھ گچھ کرے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو ہمارا جواب بالکل صاف ہونا چاہئے۔ رستم سیال اور حسنا گجراتی وغیرہ سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ نہ ہم ان کے قول وفعل کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں تو خود رستم سیال کی طرف سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں۔ پولیس اس بارے میں اچھی طرح سے جانتی ہے۔"

"تمہارا مطلب رستم کے خط سے ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"بالکل..... اس خط کو بنیاد بنایا جائے تو ہم پر بوجھ بہت کم ہوسکتا ہے۔"

ابھی شانی اور عارف میں بات ہو ہی رہی تھی کہ جمشید تیزی سے اندر آیا۔ "بھائی عارف! مہتم بستی سے سردار دراج کا بندہ آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

عارف شانی کو سمجھا بجھا کر جمشید کے ساتھ باہر نکل گیا۔ عارف کی بیوی جمیلہ اور جمشید کی بیوی تابندہ آ گئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار تھے۔

تابندہ نے سر بریدہ گھڑ سوار کی لاش دیکھی تھی۔ اب وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی۔ جمیلہ نے کہا۔ "کام بہت خراب ہو گیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ نارپوری اکٹھے ہو کر کہیں ہمارے پنڈ پر نہ چڑھ دوڑیں۔"

"ہمارا پنڈ کمزور تو نہیں ہے۔" دیہاتی مزاج کی تابندہ نے سینہ تان کر کہا۔ "ایک ایک نارپوری کو زمین نہ چٹوائی تو ہم کمبوہ کہاں کے ہوئے۔ ابھی تو ہماری جوان گروی کی موت کا قرضہ بھی باقی ہے ان حرامیوں پر۔"

"لیکن خون خرابہ بہت ہوگا اور یہ نہیں ہونا چاہئے۔" میٹرک پاس جمیلہ نے تحمل سے کہا۔

"دہائی خدا کی یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا۔ حسنا ے اور اس کے پتر لوڈانوں نے اغوا کیا ہے۔ ہمارے سر پر کیوں چڑھ رہے ہیں نارپوری؟" تابندہ تپ کر بولی۔

دھوپ چڑھ آئی تھی۔ بظاہر گاؤں میں روزمرہ کے کام شروع ہو گئے تھے۔ مویشی گھنٹیاں بجاتے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ کمبوہ عورتیں سروں پر گھڑے رکھے، ہاتھوں میں بٹیاں لٹکائے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ کچے گھروں کے صحنوں اور برانڈوں سے چولہوں کا دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس سب کے باوجود ایک سراسیمگی بھی گاؤں میں موجود تھی

اور ایک لہر کی طرح لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بڑے بوڑھے ٹولیوں کی صورت میں کھڑے قیاس آرائیاں کرنے میں مصروف تھے۔ گاؤں کے رضا کار نوجوان بندوقیں اور کلہاڑیاں اٹھائے گشت لگا رہے تھے، اچانک شور اٹھا۔ "پولیس آ گئی..... پولیس آ گئی۔"

سراسیمگی کی فضا گھمبیر تر ہو گئی۔ کھڑکیاں دروازے بند ہونے لگے۔ اہل دیہہ چار دیواریوں کے اندر سمٹنے لگے۔ ہر چہرے پر کچھ سوالات تھے۔

پولیس کیا کرنے آئی ہے؟

کتنی تعداد میں آئی ہے؟

پولیس والے کس طرح کی پوچھ گچھ کریں گے؟ کیا ریاض ہٹلر بھی پولیس پارٹی کے ساتھ ہے؟ آخری سوال خاصا اہم اور پریشان کن تھا۔

شانی بھی یہ ساری کیفیات دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس کی جیپ اور دو ٹرک نما نیلی گاڑیاں گاؤں میں داخل ہونے والے راستے پر نمودار ہو گئیں۔ ان کے عقب میں گاؤں کے کتے شور مچاتے چلے آ رہے تھے۔ ان گاڑیوں کے ہمراہ مقامی تھانے کی نفری بھی تھی اور یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ فضا میں جیسے ایک غیر مرئی آواز گونجنے لگی۔ "کچھ ہونے والا ہے۔"

پھر خالو اعجاز دھواں دھواں چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے شانی سے کہا۔ "پولیس آ گئی ہے اور ڈپٹی ریاض بھی ساتھ ہے۔"

ڈپٹی ریاض کا لفظ شانی کے کانوں میں تیر کی طرح لگا۔ اس شخص سے ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں شانی کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ گالیاں بکنا تو اکثر پولیس والوں کا شیوہ ہوتا ہے، پھر بھی شانی نے اس شخص کو دل کی گہرائیوں سے ناپسند کیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ آئندہ اس شخص سے کبھی ملاقات نہ ہو لیکن آج وہ پھر شانی کے آس پاس موجود تھا۔

ڈپٹی ریاض کی آمد نے ڈرے سہے لوگوں کو کچھ اور ڈرا دیا۔ بالکل جیسے درندے کی آمد سے جنگل سہم جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا۔ "شہر سے پولیس کے وڈے افسر ڈپٹی ریاض صاحب آئے ہیں اور چوہدری نواب کے ڈیرے پر موجود ہیں۔ وہ کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ گاؤں والوں کو اطلاع ہے کہ وہ ابھی کام کاج پر نہ جائیں۔ جو لوگ کھیتوں پر ہیں وہ بھی گھروں میں واپس آ جائیں۔ اعلان ایک دفعہ پھر کیا جاتا ہے شہر

سے پولیس کے وڈے افسر۔۔۔''

اس اعلان نے مزید ہراس پھیلا دیا۔ شانی نے دیکھا خالو اعجاز کی بوڑھی ساس برآمدے میں مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی ہے۔ یقیناً دوسرے گھروں میں بھی اس قسم کی صورتِ حال ہوئی ہوگی۔

تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ گلی میں کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر زوردار دستک ہوئی۔ خالو اعجاز دروازے پر پہنچے۔ باہر حسب اندیشہ پولیس موجود تھی۔ ڈپٹی ریاض ہٹلر بھی موجود تھا۔ شانی نے دیکھا وہ باوردی پولیس والوں کے درمیان بغیر وردی کے تھا۔ اس نے براؤن پینٹ اور قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں تلے دار کھسہ تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں شاید شراب کی سرخی تھی۔ وہ خالو اعجاز کو تقریباً دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ تین باوردی پولیس والے بھی اندر گھس آئے۔

''تمہاری بھانجی کہاں ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی خالو اعجاز سے سوال کیا۔

''اندر ہے۔''

''بات کراؤ اس سے۔'' ڈی ایس پی کا لہجہ دھیما تھا لیکن اس دھیمے پن کے پیچھے کرختگی چھپی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ خالو جواب میں کچھ کہتے وہ بولا۔ ''صرف بات کرنی ہے اس سے اور کچھ نہیں۔ مسجد میں لے جا کر حلف لے لو مجھ سے۔'' پھر اس کی عقابی نظر نے چق کے نیچے سے شانی کے پاؤں دیکھ لئے۔ وہ تیزی سے برآمدہ پار کر کے اندر آ گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے خالو اعجاز کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''صرف دو منٹ، کچھ نہیں کہوں گا اسے۔''

خالو اعجاز کا منہ کھلا تھا۔ وہ جیسے مسمرائز ہو گئے تھے۔ جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے، کہہ نہیں پا رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے دروازہ بھیڑ کر بند کر دیا۔ ایک رائفل بردار دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شانی کا دل اس کے سینے میں کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض کی دہشت اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

ریاض اس کے سامنے آن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دھیمے لہجے میں بولے گا یا آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا۔ آنکھیں نشے کی وجہ سے انگارہ تھیں۔

''اپنا منہ دوسری طرف کرو۔'' وہ کرخت لیکن دھیمے لہجے میں بولا۔

''مم... میں سمجھی نہیں۔''

''میں فارسی میں پشتو ملا کر نہیں بول رہا۔ سیدھی سادی بکواس کر رہا ہوں، اپنا منہ دیوار کی طرف کر۔''

شانی سنبھل کر بولی۔ ''آ...... آپ ہوش میں ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟''

اس نے اپنا لہجہ تھوڑا سا نرم کر لیا۔ ''اوئے بی بی جان... ! کچھ نہیں کہوں گا تجھے۔ اپنا منہ ذرا دوسری طرف کر لے۔'' نرم ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ شانی اندر تک لرز گئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا رخ ڈپٹی ریاض کی طرف سے پھیر لیا۔

اسے زپ کے کھلنے کی آواز آئی پھر پانی گرنے کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ناگوار بُو شانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کچھ دیر بعد شانی نے مڑ کر دیکھا۔ ڈپٹی ریاض شیشے کے ایک خوبصورت جگ میں پیشاب کرنے کے بعد بڑی بے پرواہی سے زپ بند کر رہا تھا۔ ''بیٹھ جا ادھر'' اس نے شانی کو اپنے سامنے موڑھے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔

شانی ہکا بکا سی بیٹھ گئی۔ ریاض ہٹلر کا عجیب وغریب رویہ اسے ماؤف کر رہا تھا۔ اس نے گندے ہاتھوں سے ہی جیب سے ٹوتھ پک نکالی اور دانتوں میں خلال شروع کر دیا۔ گوشت کے چند ریزے دانتوں سے نکالنے کے بعد اس نے ایک گونج دار ڈکار لی اور پتلون کی جیب سے ایک ریوالور نکال لیا۔ پھر اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر شانی کو تین گولیاں دکھائیں اور عجیب خوفناک لہجے میں بولا۔ ''دیکھ بی بی جان! یہ تین گولیاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تیرے ایک رشتے دار کا نام لکھا ہوا ہے۔ کس کس کا نام ہے، یہ میں تجھے ابھی نہیں بتاؤں گا۔''

بڑے اطمینان کے ساتھ اس نے ریوالور واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا سرکاری پسٹل اس کی کمر سے بندھے ہوئے سیاہ ہولسٹر میں تھا۔ شانی سکتہ زدہ تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بندہ جو کہہ رہا ہے وہ کر سکتا ہے۔ پھر وہ اپنا بدبودار چہرہ شانی کے قریب لے آیا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا بی بی جان! میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ حاجی حیات خان، نہ اس کا کوئی ہوتا سوتا۔ جب میں کچھ کرنا چاہوں گا ناں، تو کوئی کنگ کماٹا یا دانی خاں کا سالا مجھے روک نہیں سکے گا۔ یہ ریوالور جو میں نے تجھے دکھایا ہے ناں، تیرے ہی رشتے داروں کے لئے ''سیف'' پڑا رہے گا اور جس دن اسے نکالوں گا، اسی دن مسجد میں تین جنازوں کا اعلان ہو جائے گا۔ سمجھ رہی ہے ناں میری بات؟''

اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہا۔ ''اور اس دھوکے میں بھی نہ رہنا کہ میں کچھ جانتا نہیں ہوں۔ کس کے دماغ میں کتنے کیڑے ہیں، سب گنے ہوئے ہیں میں نے... مجھے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ بس اتنا ہی کرنا جتنا میں سہہ سکوں۔ یہ دیکھو... میں نا

جوڑ دیتا ہوں تمہارے سامنے۔‘‘ اس نے باقاعدہ شانی کے سامنے ہاتھ جوڑے لیکن اس عمل میں اتنا زہر تھا کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شانی روح کی گہرائی تک کانپ گئی۔

وہ کچھ دیر تک اپنے دانت کھر چتا رہا پھر ایک اور ڈکار لے کر اچانک بولا۔ ’’رستم کہاں ہے؟‘‘

’’مم... مجھے کیا پتا......؟‘‘ شانی ہکلائی۔

’’مجھے پتا ہے..... لیکن میں وہاں جاؤں گا تو وہ کُتے کا تخم پوٹھوہاری پتھروں کے پیچھے سے پٹاخے چلائے گا۔ میرے بندے برباد کرے گا۔ اس کے لئے مجھے وہاں کسی اور کو بھیجنا پڑے گا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ چل اُٹھ۔‘‘ شانی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ بولا۔ ’’چل اُٹھ کا مطلب ہوتا ہے چل اُٹھ۔ میرے ساتھ چل میں تجھے گوجر خان لے جاتا ہوں۔ وہاں سے بس دو ڈھائی دن کا پیدل سفر ہے۔ اپنے حرامی یار کے پاس چلی جا۔ اسے تھوڑی سی لش پش دکھا، دو چار جھپیاں ڈال، ایک دو راتیں اور اس کے ساتھ سو لے۔ پھر اس سے فرمائش کرے گی ناں تو وہ اپنی بہن کو بھی اپنے ہاتھ سے کوٹھے پر پہنچا دے گا، چوہدری حشام کی رہائی تو کوئی بات ہی نہیں مسماۃ شانی۔‘‘

شانی کے بے پناہ خوف پر ایک دم رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا جلال غالب آ گیا۔ اس نے پہلی بار طیش بھری نظروں سے ریاض ہنلر کا چہرہ دیکھا اور بولی۔ ’’تم ہوش میں تو ہو... ؟ جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

شانی اور ریاض ہنلر کی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ دونوں بے حد گھمبیر انداز میں خاموش رہے۔ پھر اچانک ریاض ہنلر نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ ’’او نے، تُو تو ایسے ڈر گئی ہے جیسے ابھی تجھے مشکی گھوڑے پر بٹھا کر تیرے یار کے پاس پارسل کر رہا ہوں۔ ابھی نہیں ابھی نہیں... ابھی ذرا چھری تلے سانس لے۔ سب پتہ ہوگا اور اگر تو چاہے گی ناں تو وہ جنازوں والا کام بھی ڈال دوں گا لیکن وقت آنے دے۔‘‘ ریاض کے چہرے پر بشاشت تھی لیکن آنکھیں تندور کی طرح دہک رہی تھیں۔

☆======☆======☆

اسی دوران میں باہر سے شور وغل کی آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے بہت سے افراد ایک ساتھ تند و تیز لہجے میں بول رہے تھے۔

ریاض ہنلر نے شانی کی طرف سے توجہ ہٹا کر باہر کھڑے رائفل مین کو مخاطب کیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ’’اوئے حکم دین! یہ باہر کس کی بہن کو بچہ ہو رہا ہے... ؟‘‘

حکم دین نے اٹین شین ہو کر کہا۔ ’’سر! کچھ بندے اسلحہ نہیں دے رہے۔ خواہ مخواہ بحث کر رہے ہیں۔‘‘

شانی کو وہیں چھوڑ کر ڈپٹی ریاض پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی لپک کر کھڑکی پر پہنچی اور باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ گلی میں بہت سے افراد جمع تھے۔ دو چار پائیاں گلی کے بیچوں بیچ پڑی تھیں۔ ان پر بہت سی بندوقیں، پسٹل، ریوالور اور ان کا ایمونیشن ایک ڈھیر کی صورت میں موجود تھا۔ شانی نے دیکھا جمشید ایک ہٹے کٹے پولیس والے سے الجھ رہا تھا... کے ساتھ ساتھ پولیس والے کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

ڈی ایس پی ریاض دندناتا ہوا اس منظر میں داخل ہوا۔ ’’کیا بات ہے...‘‘ اس نے جمشید سے پوچھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ جمشید جواب میں کچھ کہتا، ریاض کا طوفانی تھپڑ جمشید کے رخسار پر پڑا۔ چناخ کی آواز جیسے پورے جوہر آباد میں گونج کر رہ گئی... پھر ایک اور تھپڑ پھر ایک اور۔ جمشید لڑکھڑاتا ہوا دس پندرہ قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آگ دہکنے لگی لیکن تنی ہمت بہرحال اس کی نہیں تھی کہ وہ ریاض کا ہاتھ پکڑ سکتا یا اس پر جوابی حملہ کرتا۔ ریاض نے اپنا سرکاری پسٹل نکالا اور اس کی نال بے دریغ جمشید کے سر سے لگا دی۔ خوفناک آواز میں گرجا۔ ’’کتے کے بچے! کھوپڑی توڑ کر بھیجا نالی میں بہا دوں گا۔ کوئی پوچھے گا نہیں کہ کیوں کیا

ہے میں نے ایسا۔ ....''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں عارف کمبوہ جیپ سے اُتر کر دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ''کیا بات ہے صاحب؟'' اس نے ریاض کے سامنے پہنچ کر کہا۔

ریاض نے جمشید کے سر سے پستول ہٹایا اور عارف کو سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام عارف ہے۔''

''اچھا اچھا۔ تم عارف ہو۔'' وہ جمشید کو چھوڑ کر پوری طرح عارف کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''چھوٹا سا زمیندار ہوں جی۔''

ریاض نے ایک بار پھر عارف کو سرتاپا گھورا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''زمیندار تو چھوٹا سا ہے لیکن پنگا بہت بڑا لیتے ہو۔'' وہ اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں کندھے پر رکھ کر بازو کی لمبائی بتاتے ہوئے بولا۔ دوسرے لفظوں میں وہ ''پنگے'' کی لمبائی بتا رہا تھا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب۔''

''سنا ہے لیڈری شیڈری کرتے ہو۔ لوگوں کو اپنے پیچھے لگاتے ہو۔ ان سے نعرے لگواتے ہو زندہ باد..... مُردہ باد..... زندہ باد۔''

''ایسی بات نہیں ہے سر......''

''یعنی میں بکواس کر رہا ہوں۔ لگو گھوڑا ہوں میں۔ کچھ پتا نہیں ہے مجھے!''

''نہیں سر..... میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میرا مطلب......''

''زیادہ مطلب کے مامے نہ بنو تم۔'' مقامی ایس ایچ او نواز احمد نے عارف کو ٹوکا۔ ''وڈے صاحب جو کہہ رہے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ پنڈ کے لوگ تمہاری بات مانتے ہیں۔ ان..... کہو کہ سرکاری آرڈر کے مطابق اپنا اسلحہ لے کر یہاں آجائیں۔ کسی کے پاس سے بعد میں کوئی چھوٹی موٹی شے بھی نکل آئی تو بڑی بُری طرح ذلیل ہوگا۔''

عارف نے گہری سانس لی اور ڈپٹی ریاض کی طرف دیکھ کر جرأت سے بولا۔ ''سر میں لیڈر نہیں ہوں اور نہ بننا چاہتا ہوں لیکن اگر پنڈ والے میری تھوڑی بہت بات مانتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ اگر آپ کا آرڈر ہے کہ اسلحہ جمع ہونا چاہئے تو ضرور ہونا چاہئے کسی سے بعد میں ایک گولی بھی نہیں نکلنی چاہئے لیکن میری درخواست ہے کہ یہ آرڈر سب کے لئے ایک جیسا ہو۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ڈپٹی ریاض پھنکارا۔

''آپ نقصِ امن کے تحت اسلحہ جمع کر رہے ہیں تو پھر دونوں فریقوں کا اسلحہ ایک ساتھ جمع ہو..... اگر آپ ہمیں نہتا کر کے چلے جائیں اور پھر پندرہ منٹ بعد میانہ کے غنڈے بندوقیں لے کر ہم پر چڑھ دوڑیں تو ہم کیا کریں گے۔''

ریاض کا چہرہ اندرونی طیش کی وجہ سے انگارہ ہوگیا۔ ایک لحظے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ایک زناٹے کا تھپڑ عارف کے چہرے پر بھی جڑ دے گا لیکن پھر پتا نہیں کیسے یہ تھپڑ ٹل گیا۔ ریاض پھنکارا۔ ''تیرا کیا خیال ہے میرے دودھ کے دانت ابھی گرے نہیں ہیں۔ میں روٹی کو توتی کہتا ہوں۔ اِدھر آ، میں دکھاؤں تجھے اِدھر آ۔'' اس نے عارف کا بازو کندھے کے قریب سے پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا پولیس کے بڑے ٹرک کی طرف لے گیا۔ ٹرک کے پچھلے حصے کو ترپال نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اپنے پسٹل والے ہاتھ کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے ترپال پیچھے ہٹادی۔ ٹرک میں بہت سا اسلحہ ایک ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ ریاض ہٹلر وہیں کھڑے کھڑے تلخ لہجے میں عارف سے بولنے لگا۔ وہ گاہے بگاہے ٹرک کے اسلحے کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا۔

وہ دونوں کافی فاصلے پر کھڑے تھے اس لئے آوازیں شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ ریاض غالباً عارف کو بتا رہا تھا کہ وہ یہ اسلحہ میانہ گاؤں سے ہی اکٹھا کر کے لایا ہے اور اس حوالے سے عارف کا اندیشہ بالکل غلط ہے۔ عارف نے دو تین بار اثبات میں سر ہلایا اور ڈپٹی ریاض کے نہایت تند و تیز رویے سے دامن چھڑا کر ان لوگوں کی طرف چلا گیا جو ایک ہجوم کی صورت میں راستے کے کنارے کھڑے تھے۔ عارف نے ان کے سامنے پہنچ کر تقریر کرنے والے انداز میں چند باتیں کہیں۔

دور ہی سے پتا چل رہا تھا کہ لوگوں پر عارف کی باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ لوگ منتشر ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں چارپائیوں پر اسلحے کا ڈھیر اونچا ہونے لگا، اکثر لوگ اپنے لائسنس وغیرہ بھی ساتھ دے رہے تھے۔ ایک محرر جمع ہونے والے اسلحے کی تفصیل ایک کاغذ پر درج کرتا جا رہا تھا۔ ڈی ایس پی ریاض اپنے چند باوردی ماتحتوں کے ساتھ دندناتا ہوا چوہدری نواب کی حویلی کی طرف چلا گیا۔ وہ جب تک موقع پر موجود رہا تھا ہر نگاہ بس اسی پر مرکوز رہی تھی۔

ریاض کے جانے کے بعد شانی نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف سے موڑا۔ خالو اعجاز بھی اس کے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ناک سکوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''شانی یہ بُو کیسی ہے؟''

شانی کا دھیان سیدھا اس جگ کی طرف چلا گیا جو تپائی کی اوٹ میں پڑا تھا۔ اس کا دل مالش کرنے لگا۔ خوبصورت آرائشی جگ میں پیشاب تھا اور جگ سے باہر ہوم سویٹ ہوم کے الفاظ انگریزی میں لکھے تھے۔

کتنا خوفناک اشارہ تھا ریاض ہٹلر کا۔ اس نے اپنی حاجت روائی کے لئے ''ہوم سویٹ ہوم'' والا جگ استعمال کیا تھا۔ شاید اس طرح ریاض نے بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی جبلت پر اُتر آئے تو کسی بھی سویٹ ہوم کو برباد کرسکتا ہے۔ اس کی ''سویٹ نیس'' کو گندگی میں لتھڑ سکتا ہے۔ خالو اعجاز اب پیشاب والے جگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شانی جلدی سے باہر نکل آئی۔

پولیس والے گاؤں کی گلیوں میں دندنا رہے تھے۔ گاہے بگاہے ان کے کرخت للکارے بھی گونجتے تھے۔ شانی کمرے میں تھی اور اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہونے والے تھے۔ خاص و عام میں یہ اندوہناک اطلاع پہلے ہی گردش کر رہی تھی کہ پولیس نے اب رستم اور اس کے چند قریبی ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ اب اس تازہ ترین واقعے کے بعد تو پولیس کا رویہ مزید جارحانہ ہو جانا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ریاض ہٹلر نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ اس نے شانی کو اشارہ دیا تھا کہ وہ مغویوں کی بازیابی کے لئے اسے رستم کی طرف بھیج سکتا ہے بعد میں اس نے خود ہی اس بات کو مذاق میں ٹال بھی دیا تھا۔ اب یہ بات تو وہی جانتا تھا کہ درحقیقت اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ وہ جتنا خطرناک تھا اتنا ہی شاطر بھی لگتا تھا۔ وہ ابھی تک گاؤں میں تھا۔ شانی کو ڈر لگ رہا تھا کہ وہ کہیں پھر نہ آن دھمکے۔ اس کا تصور شانی کے جسم پر عجیب سی کپکپی طاری کر دیتا تھا۔

گیارہ بجے کے بعد گاؤں میں گھر گھر کی تلاشی ہوئی۔ پولیس والے تین تین چار چار کی ٹولیوں میں آتے تھے۔ گھر کے مکینوں کو گھر سے باہر کھڑا کر دیتے تھے۔ گھر کے اندر گھس کر ہر شے کو الٹ پلٹ دیتے تھے۔ مشکوک افراد کو چوہدری نواب کی حویلی میں لے جایا جاتا تھا وہاں ریاض ہٹلر خود ان سے پوچھ گچھ کرتا تھا۔ پتا چلا کہ چند افراد کو مارا پیٹا بھی گیا ہے اور کچھ کو مسجد میں لے جا کر ان سے حلف لیا گیا ہے۔ پورے جوہر آباد میں سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ پولیس والوں کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوہر آباد والوں پر رستم کو پناہ دینے کا شک بھی کر رہے ہیں۔

اگلے دن ظہر سے تھوڑی دیر پہلے پولیس اپنے خوفناک ڈی ایس پی ریاض ہٹلر سمیت

جوہر آباد سے واپس چلی گئی۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ جیسے ایک نہایت سخت شکنجے سے آزاد ہوئے تھے۔ تاہم خطرے کی تلوار بدستور سر پر لٹک رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اگلے چند دن بلکہ چند ہفتوں تک پولیس کا یہاں آنا جانا لگا رہے گا۔

وہ رات عجیب سے تناؤ میں گزری۔ گاؤں کی فضا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ شانی کے ذہن میں پہلا خیال پولیس کا ہی آیا لیکن جب خالو اعجاز نے دروازہ کھولا تو عارف ہیجانی انداز میں اندر داخل ہوا تو شانی کو اندازا ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

عارف نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ''جمشید کہاں ہے؟'' اسی دوران میں جمشید بھی آنکھیں ملتا پہنچ گیا۔ ''کیا ہوا عارف بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

تاؤ حشام کے پنڈ سے بندوں سے بھری ہوئی پانچ ٹرالیاں آئی ہیں۔ وہ لوگ قبرستان کے ساتھ والے میدان میں کھڑے ہیں...... اور للکارے مار رہے ہیں۔ پندرہ بیس گھڑ سوار بھی ان کے ساتھ ہیں۔ بلکہ شاید اس سے زیادہ ہوں گے۔''

ابھی عارف کی بات منہ میں ہی تھی کہ گلی میں شور اٹھا۔ چند گھڑ سواروں کے سر شانی کو چار دیواری کے اوپر نظر آئے۔ عارف اپنی بات ادھوری چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ جمشید بھی ایک لاٹھی سونت کر اس کے پیچھے گیا۔ گھڑ سوار یقیناً چوہدری حشام کے کارندے تھے۔ ان میں سے دو تین نے نیلی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ گلی میں عارف اور حشام کے کارندوں میں زوردار مکالمہ ہوا۔

حشام کا کارندہ کرخت آواز میں چلایا۔ ''چوہدری قادر نے سناں (پیغام) بھیجا ہے۔ پولیس کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔ ہمت ہے تو کھلے میدان میں آؤ..... دو دو ہاتھ کرو۔ پتا چل جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔''

''پولیس کو ہم درمیان میں نہیں لائے۔ تم لائے ہو۔ ایسے کام ہیجڑے کرتے ہیں مرد نہیں۔'' عارف کا ایک ساتھی گرج کر بولا۔

''تو آجاؤ پھر کھلے میدان میں۔ ابھی پتا چل جائے گا...... کس نے ماں کا کتنا دودھ پیا ہوا ہے۔''

تند و تیز مکالمہ جاری رہا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ غیظ و غضب کی یہ نئی لہر کل سویرے ہونے والے واقعے کی وجہ سے اٹھی ہے۔ پھٹے ہوئے سر کی لاش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ اس موقع پر حشام کے کارندوں اور مقامی کمبوہوں میں تلخ کلامی ہوئی

تھی۔ ایک بوڑھے کمبوہ نے کہا تھا کہ ہم میانہ والوں کے زخموں پر پیشاب بھی نہیں کریں گے اس کے بعد گالم گلوچ تک نوبت چلی گئی تھی۔

نیلی پگڑیوں والے گھڑ سوار جس طرح بپھرے ہوئے آئے تھے، اسی طرح دندناتے اور پھنکارتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی گاؤں میں ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ نوجوانوں کے چہرے تمتمانے لگے۔ بوڑھوں کے جسم تن گئے۔ بیشتر عورتوں کی آنکھوں میں بھی غیظ وغضب کی چنگاریاں نظر آنے لگیں۔

عارف کی بیوی جمیلہ اسے روکتی ہی رہ گئی لیکن وہ ایک چمک دار لاٹھی لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اُدھر جمشید نے ایک کلہاڑی پکڑ لی۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور وہ سرتاپا قہر نظر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی تابندہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی کوئی ہتھیار تھام کر جمشید کے ساتھ نکلنے کو تیار ہے۔ جمشید لمبے ڈگ بھرتا دروازے کی طرف بڑھا تو تابندہ نے چلا کر کہا۔ ''ٹھہر جاؤ جی...... ایک سیکنڈ کے لئے رکو۔''

وہ لپک کر اندر کمرے میں گئی اور ایک بڑی صافا نما چادر لے آئی۔ اس نے ایک چکلا اٹھایا۔ لکڑی کا گول چکلا اس نے بڑی مہارت سے خاوند کے سر پر رکھا اور اوپر صافے کو پگڑی کی طرح اس طریقے سے لپیٹ دیا کہ چکلا اس میں چھپ کر رہ گیا۔ پگڑی کے دو تین بل اس نے جمشید کی ٹھوڑی کے نیچے سے بھی گزار دیئے۔ یہ سر کے لئے ایک بڑا مضبوط سا سیفٹی گارڈ بن گیا۔ جمشید کلہاڑی سنبھالتا ہوا چیتے کی طرح زقندیں بھرتا باہر نکل گیا۔

شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ بستی کے لوگ اس طرح کی لڑائیوں میں ماہر ہیں۔ دو تین منٹ کے اندر درجنوں پیدل اور گھڑ سوار ''لڑاکے'' تیار ہو چکے تھے۔ اکثر کے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ چمکتی ہوئی میخوں والی لاٹھیاں، کلہاڑیاں، ڈنڈے، سریئے غرض جس کے ہاتھ میں جو شے لگی تھی وہ لے کر نکل آیا تھا۔ شانی کو چند ہاتھوں میں رائفلیں بھی نظر آئیں۔ یقیناً یہ چند رائفلیں اسلحہ جمع کرنے کے موقع پر چھپائی گئی تھیں۔ کمبوہ بستی کے مکینوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ عورتیں اور بچے اس لڑائی کا نظارہ دیکھنے کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے۔ جو زیادہ دلیر تھے وہ میدان کی طرف جا رہے تھے۔

شانی نے بے چین ہو کر خالو اعجاز سے کہا۔ ''انہیں کوئی روکتا کیوں نہیں۔ یہ کیوں خون خرابے کی طرف جا رہے ہیں۔ پولیس کہاں ہے؟''

''پولیس کے پانچ چھ سپاہی صبح نظر آئے تھے۔ اب تو وہ بھی نہیں ہیں۔ شاید خطرہ دیکھ کر اِدھر اُدھر کھسک گئے ہیں۔''

''یہ لوگ کیا کریں گے؟ ایک دوسرے کو ماریں گے۔ ایک دوسرے کی جان لیں گے۔ اس سے کون سا مسئلہ حل ہوگا۔ کون سی خوشی ملے گی ان لوگوں کو؟''

''بس ان دور دراز دیہاتوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ پہلے خون پسینہ ایک کر کے فصلیں اُگاتے ہیں۔ پھر لڑتے ہیں، مرتے ہیں اور فصلوں کی کمائی مقدموں میں اجاڑتے ہیں۔''

''لیکن رنگ والی میں تو ایسی بدامنی نہیں تھی خالو۔ مجھے تو لگ رہا ہے میں کسی پرانے دور میں پہنچ گئی ہوں۔''

وہ خالو اعجاز اور جمیلہ کے ساتھ چھت پر آ گئی۔ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا تھا لیکن سورج کا چہرہ گرد وغبار کے دبیز بادل کے عقب میں تھا۔ قبرستان کے ساتھ ایک وسیع کلری میدان تھا۔ کم و بیش چار ایکڑ سے زائدہ رقبہ ہوگا۔ اس میدان میں بہت سی ٹریکٹر ٹرالیاں، گھوڑے اور تانگے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ ٹرالیوں پر سے مسلح افراد چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اُتر رہے تھے۔ دوسری طرف گاؤں سے باہر نکلنے والے افراد دو قطاروں میں میدان کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے، ان کی لاٹھیوں کے کوکے اور کلہاڑیوں کے پھل چڑھتے سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کا وحشی جوش تھا جو چاروں طرف لہریں لے رہا تھا۔ شانی کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں تو اس کے میکے رنگ والی میں بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن اتنے وسیع پیمانے پر دنگے فساد کا منظر اس نے نہیں دیکھا تھا۔

دو چار منٹ کے اندر وسیع میدان میں کم و بیش پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے۔ ابھی مزید لڑاکے اور تماشائی بھی میدان کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے سامنے یوں صف آراء ہوگئیں جیسے پرانے زمانے میں دو لشکر خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان تقریباً سو قدموں کا فاصلہ تھا۔

پھر شانی نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ نارپوری چوہدریوں کی طرف سے پانچ بندے ہاتھوں میں لاٹھیاں سونت کر آگے بڑھے۔ یہ سب کے سب ہٹے کٹے اور جوان تھے۔ وہ میدان کے درمیان پہنچ کر کھڑے ہوگئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر للکارے مارنے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر بکرے جیسی آوازیں بلند کیں۔ یہ ایک طرح سے دعوتِ مبارزت تھی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے خالو؟'' شانی نے بڑے اضطراب سے دریافت کیا۔

لیکن اس نے مڑ کر دیکھا تو خالو وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ بھی میدان کی طرف جا چکے تھے۔ بس تابندہ اور جمیلہ کھڑی تھیں۔ تابندہ کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ شانی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''نارپوریوں نے ہم سے پانچ جوان منڈے مانگے ہیں۔ ڈانگ

سوٹے کے لئے..... اب دیکھیں کون کون نکلتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے جمشید تو ضرور نکلے گا۔''

شانی نے دیکھا کہ چند سیکنڈ کے لئے کمبوہوں کی طرف سے بھی پانچ بندے نکل کر آگے آ گئے۔ ''دیکھا، میں نے کہا تھا نا...... جمشید ضرور نکلے گا۔'' تابندہ جوش سے بولی۔

جمشید واقعی موجود تھا۔ کل اسے ڈپٹی ریاض سے تھپڑ پڑے تھے۔ غالباً آج وہ ان تھپڑوں کے داغ دھونا چاہتا تھا۔ شانی نے دیکھا کہ عارف بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ مگر چند افراد اسے روک رہے تھے۔ ان میں چوہدری نواب بھی شامل تھا۔ یہ لوگ عارف کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹانے میں کامیاب رہے۔

پانچ نارپوریوں کے مقابلے میں پانچ کمبوہ میدان کے درمیان پہنچ گئے۔ نارپوریوں کی طرف سے جو لڑاکے آگے آئے تھے ان میں سے کم ازکم دو کو شانی اتنی دور سے بھی پہچان سکتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو نارپور کی حویلی میں شانی کے مرحوم شوہر چوہدری فاخر کے ساتھ لٹھ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ اپنے فن میں یکتا لٹھ باز تھے۔ ان میں سے ایک کا نام نوراحمد اور دوسرے کا شاید شوکت تھا۔

ظاہر ہے کہ جوہرآباد والوں نے بھی ان ماہر لٹھ بازوں کے مقابلے میں ماہر لٹھ باز ہی اُتارے تھے۔ جونہی یہ لٹھ باز ایک دوسرے کے مقابل پہنچے ایک ٹریکٹر ٹرالی پر کھڑے دو ڈھولچیوں نے ڈگا لگانا شروع کر دیا۔ لٹھ بازوں نے آتشیں نعرے بلند کئے اور ایک دوسرے پر پل پڑے، شانی کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ اتنے فاصلے سے بھی صاف سنائی دے رہی تھی اور اس کے ساتھ لٹھ بازوں کی چنگھاڑیں اور کراہیں بھی۔ جوڑ برابر کا تھا۔ کبھی ایک طرف کے دو تین لٹھ باز اوپر چڑھ جاتے تھے، کبھی دوسری کے۔ گرد و غبار تیزی سے پھیل رہا تھا۔

سب سے پہلے جوہرآباد کا ہی ایک لٹھ باز زمین بوس ہوا۔ وہ شاید چوٹ کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا۔ قریب کھڑے چند کمبوہ اسے گھسیٹ کر دور لے گئے۔ اس کا مدِمقابل نارپوری ایک ٹانگ پر اچھلنے لگا اور فاتحانہ للکارے مارنے لگا۔ تاہم اس دوران میں جمشید نے بھی اپنے حریف کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس نے گرے ہوئے حریف کے سر پر چند زوردار لاٹھیاں رسید کیں اور جب دیکھا کہ وہ مرگیا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے تو وہ بھی پیچھے ہٹ گیا اور فاتحانہ انداز میں اچھلنے لگا۔

تابندہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر اپنے شوہر کو داد دے رہی تھی۔ پھر وہ جوش سے چیخنے لگی۔ ''مارو ان کو...... ہڈیاں توڑ دو ان کتوں کی...... یہ قاتل ہیں...... بچوں کے

لٹیرے ہیں۔''

اسی دوران میں عارف کے قریبی دوست صداقت کے ہاتھ سے لاٹھی نکل گئی۔ اس کا مدِمقابل نورا تھا اور وہ بہت خطرناک تھا۔ صداقت نے عقل مندی یہ کی کہ پیچھے ہٹنے کی بجائے دوڑ کر نورے سے لپٹ گیا اور گتھم گتھا ہو گیا۔ دونوں مست سانڈوں کی طرح ایک دوجے کو کاری ضربیں لگانے لگے۔

جمیلہ نے ایک طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''وہ دیکھو حرامزادے شرابیں پی رہے ہیں۔''

شانی نے جمیلہ کے بتائے ہوئے رخ پر نگاہ دوڑائی، ایک ٹرالی پر بہت سے نارپوری جنگجو لڑائی کے لئے تیار کھڑے تھے، ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ انہیں منہ لگا لگا کر یوں پی رہے تھے جیسے پانی پی رہے ہوں۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی عام لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور لٹھ باز غضب کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دوڑے اور بات صرف لاٹھیوں کی نہیں، اب بہت سے افراد کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ شانی کے دل میں موجود بدترین خدشہ یہ تھا کہ کہیں فائرنگ شروع نہ ہو جائے۔ بے شک سارے آتشیں ہتھیار کل پولیس نے جمع کر لئے تھے، اس کے باوجود شانی کو تین چار کمبوہ افراد کے پاس رائفلیں دکھائی دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا اندازہ تھا کہ جمشید اور عارف وغیرہ کے پاس بھی کم ازکم پستول تو موجود ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے فریق کے پاس بھی تھوڑا بہت اسلحہ موجود ہو سکتا تھا۔

دونوں طرف سے کم ازکم تین سو افراد بھاگتے ہوئے آئے اور ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ یہ ایک بالکل جنگی منظر تھا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' شانی نے جمیلہ سے پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

جس کا ہاتھ اس نے تھاما تھا وہ خود بھی لرز رہی تھی۔ ''جمیلہ! کہیں گولی نہ چل جائے۔'' شانی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں چلے گی گولی۔ ایسی لڑائیوں میں جو گولی چلاتا ہے وہ کم ہمتا سمجھا جاتا ہے۔''

چند سیکنڈ کے اندر سبھی کچھ گرد و غبار میں چھپ گیا۔ ''یا اللہ! کرم کر۔'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اسی دوران میں تڑتڑ کی خوفناک آواز ابھری۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ شانی نے دہل کر کہا۔ ''دیکھا، چل گئی نا گولی!''

تابندہ چمک کر بولی۔ ''یہ ہمارے مردوں نے نہیں، نار پوریوں نے چلائی ہوگی۔''

لیکن یہ فائرنگ نار پور والوں نے نہیں کی تھی، نہ ہی جوہرآباد والوں نے، یہ فائرنگ پولیس کی طرف سے تھی۔ پولیس کی دو جیپیں اور ایک بڑا ٹرک تیزی سے میدان کی طرف آرہے تھے۔ جیپ میں موجود پولیس اہلکار دو خودکار رائفلوں سے برسٹ چلا رہے تھے۔ دھوئیں سے صاف پتا چلتا تھا کہ برسٹ اگلی جیپ سے ہی چلائے جا رہے تھے۔ پھر ٹرک میں سے بھی ہوائی فائرنگ ہونے لگی، دونوں جیپیں اور اہلکاروں سے بھرا ہوا ٹرک بڑی تیزی سے دنگے کی جگہ پر پہنچ گئے۔ اگلی جیپ میں سے ڈی ایس پی ریاض جست لگا کر نیچے اُترا وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے پستول سے ہوائی فائر کیے اور للکار للکار کر کچھ کہا۔

ٹرک سے کئی باوردی اہلکار چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ ان کے ہاتھوں میں موٹے بیرل والی رائفلیں تھیں۔ انہوں نے آناً فاناً بلوائیوں پر آنسو گیس کے شیل چلانا شروع کردیئے۔ یہ شیلنگ اتنی تیزی اور شدت کے ساتھ کی گئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہونا شروع ہوگیا۔ بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے ٹریکٹر ٹرالیوں پر چڑھ گئے۔ ان میں سے کچھ افراد ایسے بھی نظر آئے جنہوں نے اپنے کندھوں پر یا ہاتھوں میں اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا رکھا تھا۔ جن لوگوں کا تعلق جوہرآباد سے تھا، وہ جوہرآباد کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

میدان میں کم و بیش دو درجن افراد بے سدھ پڑے نظر آرہے تھے۔ پتا نہیں ان میں سے زخمی کتنے تھے اور کتنے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور پولیس ٹرک بھاری نفری کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ اس ٹرک کے پہنچتے ہی پولیس نے بلوائیوں پر چارج کیا۔ کچھ گروہ جو ابھی تک گتھم گتھا تھے، اس چارج کی زد میں آگئے۔ پولیس والوں نے انہیں پکڑنا شروع کردیا۔

شانی نے دیکھا کئی کمبوہ دو زخمیوں کو ڈنڈا ڈولی کرکے گاؤں کی طرف بھاگے آرہے تھے۔ ان کے عقب میں ایک زخمی گھوڑا بھی لنگڑاتا اور ہنہناتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ایک گھوڑا لڑائی کے میدان میں بھی گرا پڑا تھا۔ دھول ذرا صاف ہوئی تو ہر طرف جوتیاں، لاٹھیاں، پگڑیاں اور زخمی دکھائی دیئے۔ یہ لڑائی بہ مشکل تین چار منٹ جاری رہی تھی مگر اس نے تباہی مچا دی تھی۔ بلوائیوں کے منتشر ہوتے ہی پولیس والے سارے میدان میں بکھر گئے۔ جن لوگوں کو پکڑا گیا تھا، انہیں ٹرکوں پر چڑھایا جانے لگا۔ وہ ابھی تک جوش و خروش میں نعرے بلند کر رہے تھے۔

نار پوریوں سے بھری ہوئی ٹریکٹر ٹرالیاں بڑی تیزی سے دور ہوتی چلی جارہی تھیں۔ گھڑسوار ٹرالیوں کے ساتھ نہیں تھے، انہوں نے اپنے لئے علیحدہ راستہ منتخب کیا تھا۔ ایک پولیس جیپ کچھ فاصلے تک ٹرالیوں کے پیچھے گئی لیکن پھر واپس پلٹ آئی۔

کچھ لوگ چار پائیاں لے کر لڑائی کی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں کی نگرانی میں لوگوں کو زمین سے اٹھا اٹھا کر چار پائیوں پر ڈالنا شروع کردیا۔ شانی کی بے تاب نگاہیں خالو اعجاز اور عارف کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ آنسو گیس کے اثرات ہوا کے ساتھ گاؤں تک پہنچ گئے تھے۔

جلد ہی جمیلہ نے عارف کو اور شانی نے خالو اعجاز کو ڈھونڈ لیا۔ مگر تابندہ کو جمشید کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ تقریباً بیس افراد کو چار پائیوں اور چادروں وغیرہ میں ڈال کر گاؤں کی طرف لایا جارہا تھا۔ پولیس کی نفری نے لڑائی والی جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

جواں سال تابندہ جمشید کو ڈھونڈ رہی تھی اور چاروں طرف چکرائی ہوئی پھر رہی تھی۔ پولیس والے اسے آگے جانے نہیں دے رہے تھے۔ ایک دم کچھ عورتوں نے ایک چار پائی کی طرف دیکھا اور کہرام مچ گیا۔ عورتیں سینہ کوبی کرنے لگیں اور ان کے واویلے سے در و دیوار لرزنے لگے۔ چار پائی پر ایک جواں سال لڑکے کی لاش تھی۔ ایک اوھیڑ عمر عورت پچھاڑیں کھا کھا کر زمین پر گر رہی تھی۔

جمیلہ نے غم ناک لہجے میں کہا۔ ''یہ صداقت کی ماں ہے۔''

''کیا یہ صداقت کی لاش ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

جمیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر لڑھک گئے۔ کراہ کر بولی۔ ''صداقت کی ماں نے تو اس ایک بچے پر ساری زندگی قربان کی ہوئی تھی۔''

تابندہ کو ابھی تک اس کا شوہر نہیں ملا تھا۔ وہ بوکھلائی پھر رہی تھی مگر پھر اسے قرار آگیا کیونکہ اس نے جمشید کو دیکھ لیا تھا۔ وہ گرفتار ہونے والوں میں شامل تھا، وہ آٹھ دس دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ٹرک سے نیچے اُتر رہا تھا۔ ان پکڑے جانے والوں میں دو نار پوری بھی تھے۔ ان کی نیلی پگڑیاں ان کے گلے میں پڑی تھیں۔ ان سب کے ہاتھ سن کی ایک رسی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے باندھے گئے تھے۔ دو چار کو لوہے کی ہتھکڑی بھی لگی تھیں۔ جمشید بھی ان میں شامل تھا۔ اس کے سفید لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کے سینے پر کندھے کے

قریب غالباً کلہاڑی کا پھل لگا تھا۔ یہاں سے قمیص پھٹ گئی تھی اور زخم سے خون رس رہا تھا۔

دوسرے کمبوہ نوجوانوں کی طرح جمشید بھی سینہ تان کر ٹرک سے اُترا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ زخم کو اپنے سینے پر تمغے کی طرح سمجھ رہا ہے۔ تابندہ کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا تھا۔ اتنے میں ایک اور چارپائی کو دیکھ کر کچھ عورتوں نے فرطِ غم سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس چارپائی پر بھی لاش تھی۔

اگلے ایک گھنٹے میں جوہر آباد سخت غیر یقینی کیفیت کا شکار رہا۔ ہر چہرے پر سوال تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ تین لاشیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ تینوں لاشیں کمبوہ برادری کے افراد کی تھیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی بیس سے کم نہیں تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد شانی کے خالو اعجاز ستے ہوئے چہرے کے ساتھ چوہدری نواب کی حویلی سے واپس آئے۔ انہوں نے دل فگار آواز میں شانی کو بتایا۔ ''پانچ بندوں کی جان گئی ہے، تین ہمارے گاؤں کے ہیں..... دو میانہ کے..... میانہ والے اپنی دونوں لاشیں ٹرالی میں ڈال کر لے گئے ہیں۔''

''زخمی کتنے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''بیس پچیس بندوں کو معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن سات آٹھ زیادہ زخمی ہیں۔ فی الحال گاؤں کے ہسپتال میں ہی ان کا علاج ہو رہا ہے، زخمیوں میں چوہدری حشام کے دو کارندے بھی ہیں۔''

''اپنے کچھ زخمی وہ کنجر کے بی اپنے ساتھ بھی تو لے گئے ہیں۔'' ایک موٹی تازی کمبوہ عورت نے بڑی نفرت سے کہا۔

''بہرحال..... یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارا نقصان زیادہ ہوا ہے۔ وہ لوگ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ ہم تو بے خبر پڑے ہوئے تھے۔''

خالہ فیروزہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سب سے زیادہ دکھ صداقت کا ہو رہا ہے۔ آج صبح سویرے میں نے اسے گلی میں ہنستے کھیلتے دیکھا ہے۔ اپنی بھینس لے کر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی ماں تو اس کے ساتھ ہی مر جائے گی۔''

دوسری عورت کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شانی نے پوچھا۔ ''جمشید کا کیا بنا تھا؟''

''وہ لڑتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ ایک اور گڑبڑ یہ ہوئی ہے کہ اس کے پاس سے پستول

برآمد ہوا ہے۔ پتا نہیں اب کیا بنتا ہے اس کا۔''

بہت سی عورتیں گلی میں سے روتی ہوئی گزریں۔ ان میں سے صداقت کی کوئی چاچی، پھوپھی یا مامی صداقت کا نام لے لے کر دہائی دے رہی تھی۔ خالہ فیروزہ اور جمیلہ بھی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان عورتوں کے ساتھ فوتگی والے گھر کی طرف چل دیں۔

شانی دم بخود تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کسی کمرے میں گھس جائے اور دروازہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ان ''منحوس رسم و رواج'' کا ماتم کرے جو قاتل دشمنی کو جنم دیتے ہیں اور جوان بیٹوں اور بھائیوں کا خون پلا پلا کر اسے جوان کرتے ہیں۔ پھر رسم و رواج کی پالی ہوئی یہ قاتل دشمنی عفریت بنتی ہے اور لاتعداد صداقتوں کو ان کی بیوہ ماؤں سے جدا کرتی ہے۔

پلک جھپکتے میں کتنا بڑا سانحہ ہو گیا تھا۔ تین گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور دس پندرہ زخمی گاؤں کے چھوٹے سے ہسپتال میں پڑے کراہ رہے تھے۔

☆======☆======☆

تین دن مزید گزر گئے۔ لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے بعد دفنایا جا چکا تھا۔ صداقت کی بیوہ ماں نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ اس نے جوان بیٹے کی لاش کو دولہے کی طرح سجایا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔ کلائی پر گھانا باندھا تھا اور سر پر جھلمل تاروں والا سہرا سجایا تھا۔ وہ اسے دولہے کا لباس نہیں پہنا سکتی تھی۔ کیونکہ مرنے والے کا لباس تو پہلے سے طے ہوتا ہے، یعنی چند گز سفید لٹھا۔

ان مناظر نے شانی کے ذہن پر گہرا بہت گہرا اثر کیا تھا۔ اسے اپنے چہیتے بھائی عادل کا وقتِ رخصت یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسا لمبا تڑنگا تھا۔ سینہ دیوار کی طرح چوڑا، چال میں شیر کا سا بانکپن۔ ابھی اس کے مرنے کے دن کہاں تھے۔ ابھی صداقت کے مرنے کے دن بھی نہیں تھے مگر دشمنی کا عفریت جوانوں کا خون ہی زیادہ رغبت سے پیتا ہے..... صداقت کے سر کے پچھلے حصے پر کلہاڑی کا پھل لگا تھا۔ وہ لڑائی کے میدان میں ہی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ مرنے والے دیگر افراد میں ایک کو کلہاڑی کے وار لگے، دوسرے کو سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ عارف کی زبانی شانی کو معلوم ہوا کہ شدید زخمی ہونے والے پانچ افراد کو لاہور بھیجا جا چکا ہے۔ ان شدید زخمیوں میں ایک بندہ وہ بھی تھا جس کے ساتھ عام لڑائی سے پہلے جمشید نے مقابلہ کیا تھا۔ اس کے سر پر جمشید کی لاٹھیاں لگی تھیں۔ اس لڑائی کے بعد پولیس نے جوہر آباد گاؤں سے پندرہ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ حشام کے گاؤں سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد تیس سے زیادہ تھی۔ دونوں دیہات میں پولیس کی بھاری نفری تعینات کر دی گئی تھی۔

اب جب کہ لڑائی کو تین دن سے زیادہ گزر گئے تھے، لوگوں نے جوش کے بجائے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اپنے نقصانات کا جائزہ لینے لگے۔ تابندہ اب کافی افسردہ نظر آتی تھی۔ دوسرے گرفتار شدگان کے ساتھ جمشید بھی تھانے پہنچ چکا تھا۔ تھانہ، جوہر آباد اور میانہ گاؤں کے درمیان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ جوہر آباد سے ٹھیکرا کا فاصلہ چھ کلومیٹر سے کم نہیں تھا۔

تابندہ کے ساتھ ساتھ شانی کی خالہ فیروزہ بھی بے حد پریشان تھیں۔ جمشید اگر تابندہ کا شوہر تھا تو فیروزہ کا بھائی تھا اور بھائی بھی اکلوتا۔ ڈپٹی ریاض کی دہشت اس قدر تھی کہ تمام گرفتار شدگان کے لواحقین 'ماہی بے آب' بنے ہوئے تھے۔ سب لوگ سفارشوں کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ جمشید کے لئے کچھ کرنے کو شانی کے خالو اعجاز بھی آج صبح سویرے گوجرانوالہ روانہ ہو گئے تھے۔ تنہا تھانے جاتے ہوئے ہر شخص گھبرا رہا تھا۔ جو تین چار مرد و زن گئے وہ خوفزدہ ہو کر واپس آئے تھے۔

شانی کمرے سے باہر نکلی تو اس نے جواں سال تابندہ کو دیکھا۔ ساتھ میں اس کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ تابندہ نے جمشید کے کچھ کپڑے اور کھانے پینے کا سامان ایک پوٹلی میں باندھ رکھا تھا۔ وہ یہ چیزیں جمشید کو تھانے میں پہنچانا چاہتی تھی۔ سہارے کے لئے وہ بھائی کو ساتھ لے جا رہی تھی۔ بوڑھا سسر اسے جانے سے منع کر رہا تھا۔ ''نہیں میری دھی! جوان کڑی کا تھانے میں کوئی کام نہیں۔ میں نے تجھے نہیں جانے دینا۔''

تابندہ کی شادی چھ سات مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ شوہر سے اس کی وابستگی بہت زیادہ تھی۔ جب تک بچے نہیں ہوتے، عورت اکثر بچوں کی محبت بھی شوہر کو ہی دیتی رہتی ہے۔ وہ بے تاب ہو کر بولی۔ ''پر چاچا! اس نے وہی کھون والے گندے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں دو دن سے اس نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔''

سسر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''دیکھ تابی! وہ ڈپٹی بڑا سخت بندہ ہے۔ میں نے تجھے وہاں نہیں جانے دینا۔ اگر تو نہیں مانتی تو میں آپ چلا جاتا ہوں۔'' وہ اپنی بوڑھی ہڈیوں کو کڑکڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ جوان بیٹے کا دکھ اس کی بوڑھی آنکھوں میں لہریں لے رہا تھا۔

شانی مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''چاچا جی......! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی نہ جائے۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے خالو جان کے آنے کے بعد کریں۔''

''اور اگر خالو آج واپس ہی نہ آئے تو؟'' تابندہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

شانی نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ ''تابی! اب یہ مصیبت آ گئی ہے تو اسے

حوصلے سے جھیلنا ہوگا۔ تھوڑا سا ٹائم لگے گا لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تابندہ سسک کر بولی۔ ''ماسٹر انیس کہہ رہے تھے۔ اس بات کا ڈر ہے کہ پولیس کہیں جمشید پر قتل کا کیس نہ ڈال دے۔''

''ایسی باتوں پر کان نہ دھر تابی۔ جب جمشید نے قتل کیا نہیں تو پھر اس پر قتل کا کیس کیوں بنے گا۔''

شانی کچھ دیر تک تابندہ کو سمجھاتی بجھاتی رہی۔ اس کام میں جمیلہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تابندہ نے تھانے جانے کا ارادہ ترک کیا اور کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے دودھ مکھن میں پلی ہوئی ایک صحت مند پنجابن نظر آتی تھی۔ ہلکا پھلکا لباس اس کے جوبن کو سنبھالنے سے عاجز دکھائی دیتا تھا۔

دوپہر سے تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور مسئلہ ہو گیا۔ گاؤں کا ایک نوجوان جو اپنے گرفتار بھائی کو کھانا دینے تھانے گیا ہوا تھا، بڑا گھبرایا ہوا واپس آیا۔ وہ سیدھا جمشید کے گھر پہنچا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر خالو اعجاز کے بارے میں پوچھا۔ شانی نے اسے بتایا کہ وہ گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے عارف کے متعلق پوچھا۔ عارف بھی گاؤں میں نہیں تھا۔

شانی نے کہا۔ ''جو بات ہے ہمیں بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تھانے میں پولیس والے جمشید کو بڑی بُری طرح مار رہے ہیں۔ میں نے خود اس کے رونے چلانے کی آوازیں سنی ہیں۔ اس کا کچھ کر سکتے ہیں تو کریں ورنہ وہ اس کا حشر کر دیں گے۔''

تابندہ بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ جمشید کا باپ بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا دودھیا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ تابندہ نے چادر سر پر لی اور لرزتے لہجے میں بولی۔ ''میں تھانے جاؤں گی۔''

تابندہ کا انیس بیس سالہ بھائی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بظاہر دلیر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا رنگ بھی متغیر تھا۔

شانی چند لمحے سوچتی رہی، پھر ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ''نہیں تابی! میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔ چل تُو اندر چل کر بیٹھ۔''

''پر جمشید کو کون بچانے جائے گا؟''

''میں جاؤں گی۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں باجی.....'' تابندہ کے بھائی نے کہا۔

''نہیں، تم بھی یہیں رہو۔ میں اور چاچا چلیں گے لیکن اگر چاچے نے نہیں جانا تو میں کسی اور کو ساتھ لے لیتی ہوں۔''

بوڑھا دیناں لرزتا ہوا زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مم..... میں چلتا ہوں دھی رانی۔''

خالہ فیروزہ کا چہرہ بھی شانی کو فق نظر آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ شانی نے تابندہ سے کہا۔ ''خالہ کو لے کر اندر جاؤ.....اور پریشانی کی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تابندہ دوڑ کر اندر گئی.....چند سیکنڈ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا، رومال شانی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ''باجی! اگر جمشید کو چھڑانے کے لئے کچھ دینا دلانا پڑے تو دے دینا۔''

شانی نے رومال کھول کر دیکھا۔ اس میں بہت سارے نوٹ تہہ در تہہ رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ تابندہ کی شادی پر سلامیوں کے پیسے تھے۔ چھ سات ہزار روپیہ ہوگا۔ اس کے علاوہ سونے کی چار بھاری چوڑیاں بھی تھیں۔ مصیبت میں عورت بے چاری کا دھیان کتنی جلدی اپنے زیوروں کی طرف جاتا ہے۔ باپ بیٹے اور بھائی وغیرہ کی مصیبت پر یہ زرد دھات فوراً صندوق سے نکلتی ہے اور ہتھیلی پر آ جاتی ہے۔ شانی نے رومال تابندہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''بیوقوف مت بنو..... اسے اپنے پاس رکھو۔''

وہ بے چارگی کے عالم میں شانی کو دیکھ کر رہ گئی۔ شانی نے کپڑوں اور کھانے والی پوٹلی لی اور جمشید کے والد کے ساتھ باہر گلی میں آ گئی۔ راستے میں عارف کا ایک قریبی دوست ماسٹر انیس بھی ڈرتے ڈرتے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گاؤں کے باہر سے وہ ایک خستہ حال دیہاتی تانگے پر بیٹھے اور تھانے روانہ ہو گئے۔

راستے میں شانی کے دل کی دھڑکنیں درہم برہم ہوتی رہیں لیکن جب وہ تانگے سے اُتر کر تھانے کے دروازے میں داخل ہوئی تو رنگ والی کی نوجوان چوہدرانی کا اعتماد اس کے اندر عود کر آیا۔ اس کی جسمانی لرزش بھی معدوم ہو گئی۔ وہ اپنے سر پر چادر درست کرتی ہوئی سیدھا اس کمرے میں پہنچی جس کے دروازے پر ایس ایچ او کی تختی لگی تھی وہ چق اٹھا کر اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی انسپکٹر نواز بیٹھا نظر آیا، دو ماتحت اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ نواز نے شانی کو پہچانا تو کولہوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اوہو ہو.....بڑی قسمت ہے ہماری کہ آپ خود چل کر ہم نوکروں کے پاس تشریف لائی ہیں۔'' اس نے شانی کو کرسی پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔

شانی بیٹھ گئی۔ چاچا دیناں اور عارف کا دوست انیس بھی ڈرتے ڈرتے عقبی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ''ہاں جی! آپ کیا پئیں گی۔ ٹھنڈا یا گرم؟''

''ڈی ایس پی صاحب کہاں ہیں؟'' شانی اس کا طنزیہ لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''وہ ذرا تفتیش وغیرہ کر رہے ہیں۔ آ جاتے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں۔'' انسپکٹر نواز احمد نے چبھتے لہجے میں کہا۔ لہجے کے ساتھ ساتھ نواز کی نظریں بھی چبھتی ہوئی تھیں یہ نظریں جیسے اس کی بے دھیانی میں شانی کے پورے سراپا کو ٹٹول چکی تھیں۔ بڑی کمینی سی بے ساختگی اور عمومیت تھی ان نظروں میں۔

شانی کو بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ یوں لگا جیسے دو تین تنومند بکروں کو ایک ساتھ ذبح کیا جا رہا ہو۔ خدا کی پناہ۔ یہ انسانی آوازیں تھیں۔ غالباً تین افراد تشدد کے کسی بے رحم شکنجے میں تھے اور ایک ساتھ کورس کی شکل میں چلا رہے تھے۔ ان کی کربناک آوازوں کو سن کر شانی اندر تک دہل گئی۔ جواں سال انیس بھی خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تقریباً ایک منٹ تک دیوانہ وار چلانے کے بعد بدنصیب افراد کی آوازیں کچھ دھیمی پڑ گئیں۔ وہ بلکتے لہجے میں کچھ بول رہے تھے۔ غالباً مارنے والوں کی منت سماجت کر رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے کہ وہ بے قصور ہیں۔ قدرے تسلی کی بات یہ تھی کہ ان میں جمشید کی آواز نہیں تھی۔

''یہ کن لوگوں کو مار پڑ رہی ہے؟'' شانی نے دردناک چیخ و پکار سے دھیان ہٹانے کے لئے کہا۔

''بس ہیں جی دو تین موٹی کھال والے۔''

''پر کون ہیں؟''

''دو آپ کے جوہر آباد کے ہیں، ایک میانے کا۔ بدھ کے دن لڑائی میں ہی پکڑے گئے تھے، ان سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا ہے۔''

''برآمد ہوا ہے تو ان کو عدالت میں بھیجو۔ سزا دینا تو عدالت کا کام ہے۔'' شانی نے کہا۔

''اوہو ہو..... آپ تو بڑا چنگا بولتی ہیں۔ آپ کو تو وکیل شکیل ہونا چاہئے۔ پر کچھ ہماری مجبوریاں بھی ہوتی ہیں ناں جی.....''

''کیسی مجبوریاں؟''

''ابھی ان سے کافی کچھ بکوانا ہے جی۔ مزید اسلحہ بھی برآمد کرنا ہے۔''

اسی دوران میں تینوں افراد ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے چلانے اور دہائیاں دینے لگے۔ انسپکٹر کے نیم سیاہ ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ایک فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''حرامزادے، فلمیں دیکھ دیکھ کر ساون اور سلطان راہی بنتے ہیں ۔ یہ پتا نہیں ہوتا کہ جب اصلی تھانے میں اصلی چھتر پڑتے ہیں تو کس طرح بانگیں نکلتی ہیں . . .''

اسی دوران میں کسی ساتھ والے کمرے میں گھنٹی بجی۔ انسپکٹر جلدی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھانے کا ماحول اس قدر گھمبیر تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایس ایچ او کے کمرے سے باہر ایک نشے باز بھکارن کو باقاعدہ ہتھکڑی لگا کر ستون سے باندھا گیا تھا۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ ایک جہاز ٹائپ شخص بھی برآمدے میں پڑا تھا۔

دو تین منٹ بعد انسپکٹر اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''چلیں جی! آپ کو صاحب نے بلایا ہے۔''

شانی اٹھی تو چاچا اور انیس بھی اٹھ گئے۔ انسپکٹر بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ''اوئے تم دونوں ادھر کا چینے جا رہے ہو۔ بیٹھو یہاں .. بی بی کو جانے دو۔''

وہ ٹھٹک کر دوبارہ بیٹھ گئے شانی ایس ایچ او کے پیچھے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑی وہ اس شخص سے جتنا دور رہنا چاہ رہی تھی اتنا ہی اس کا سامنا ہو رہا تھا۔ ایس ایچ او نے چق ہٹائی اور شانی کو ایک کشادہ کمرے میں کرسی پر بٹھا کر باہر چلا گیا۔ خطرناک صورت ریاض ہٹلر نے صرف بنیان اور ٹریک سوٹ کا دھاری دار ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس کے کندھوں اور بازوؤں پر نہایت گھنے بال تھے۔ وہ وائرلیس سیٹ پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وائرلیس کے شور میں دوسری طرف کی آواز دبی دبی تھی۔ یہ بھی شاید کوئی پولیس والا ہی تھا جو کہہ رہا تھا۔ ''جناب! یہ دونوں اونچی سوسائٹی کی طوائفیں ہیں۔ وزیروں مشیروں سے رابطے ہیں ان کے۔ ابھی ٹیلی فون کھڑکنے لگیں گے۔''

''اوئے کھڑکنے دو ٹیلی فون۔ بس پکڑ لاؤ دونوں کو ۔ اور جو اُن کے پیچھے آئے اس کُتے کے تخم کو بھی بٹھاؤ تھانے میں۔ میں دیکھ لوں گا ان رانی خان کے سالوں کو بھی، کڑا کے نہ نکال دیئے ان سب کے تو ''

''دفعہ کون سی لگانی ہے جناب؟''

''اوئے تم اندھے ہو نذیر .. تمہیں نظر نہیں آتا یہ کیا کر رہی ہیں، ہمارے ناک کے نیچے۔'' اس کے بعد ریاض ہٹلر نے شانی کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر دونوں طوائفوں اور ان

کے طرف داروں سے کئی ناز یبا رشتے جوڑے اور وائرلیس بند کر دیا۔

کچھ دیر تک جیسے وہ بے خیالی میں شانی کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر دائیں طرف والی کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور سگریٹ سلگا کر شانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بی بی جان! کس سجن کی کھچ (کشش) یہاں کھینچ لائی ہے تمہیں؟''

''میں جمشید کے لئے آئی ہوں۔ ہمارا رشتے دار ہے وہ۔''

''تمہارا رشتے دار ہوا تو پھر ہمارا بھی ہوا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

''گھبرانے کی بات تو ہے ڈی ایس پی صاحب۔ اسے یہاں تھانے میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔''

''واہ.....تشدد۔'' ریاض نے بے حد زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ اچھا لفظ ملا ہوا ہے لوگوں کو، اخباروں میں دیکھو تو تشدد، ٹی وی پر دیکھو تو تشدد، ہر طرف یہ واویلا ہے۔ جس کو ٹھیک سے پیچھا دھونا نہیں آتا وہ بھی تشدد پر لیکچر جھاڑتا پھرتا ہے۔ کوئی تشدد وغیرہ یہاں نہیں ہوا بی بی جان۔ جب کروں گا تو چھپا کر نہیں کروں گا۔ سب کو پتا چل جائے گا اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ یہ تشدد ہوتا کیا ہے۔''

شانی نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں خبر ملی ہے کہ آج صبح یہاں جمشید کو بہت بُری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔''

''بہت بُری طرح نہیں۔ بہت معمولی طرح۔ بس تشدد کی تھوڑی سی جھلکی دکھائی تھی اسے، زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ الٹا لٹکا ہو گا۔ ایک گھنٹہ کوئی ٹائم نہیں۔ اس میں تو بندے کی ناک بہنی بھی شروع نہیں ہوتی۔''

''لیکن کیوں......؟ آپ نے کیوں کیا ایسا؟''

''یہ تو اس بدتمیزی کی تھوڑی سی سزا تھی جو اس حرامی نے گاؤں میں دکھائی تھی لوگوں سے کہا تھا کہ اسلحہ جمع نہ کراؤ۔ اس کے جو باقی جرم ہیں ان کی سزا تو ابھی شروع نہیں ہوئی۔ کل ان لڑکوں کو مجسٹریٹ کے پاس لے جا رہے ہیں ریمانڈ کے لئے ......اصل کہانی تو اس کے بعد شروع ہو گی۔''

ریاض ہٹلر کے لہجے میں جو خطرناکی پوشیدہ تھی، اس نے شانی کو اندر تک لرزا دیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''جمشید کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے؟''

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا خالو اس حرامی کے لئے کوئی تگڑی سفارش ڈھونڈنے تو

گیا ہے گوجرانوالہ ... دیکھو آکر کیا توپ چلاتا ہے۔''

''مجھے پتا نہیں کہ خالو کیا کر رہے ہیں۔ میں تو آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ جمشید کے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔''

''مجرم کو چھوڑنا میرا کام نہیں۔ یہ تو قانون اور عدالت کی ذمے داری ہے۔ باقی اس چوکھرے کا کیس معمولی نہیں ہے۔ 302 بھی لگ سکتی ہے اس میں۔''

شانی کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ نگاہوں میں تابندہ اور خالہ فیروزہ کے دل گیر چہرے گھوم گئے۔ تابندہ تو شاید گاؤں میں یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ جب چاچا، انیس اور شانی واپس آئیں گے تو ان کے ساتھ جمشید بھی ہوگا لیکن یہاں تو بڑی لمبی اور تکلیف دہ کہانی نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ریاض سے کچھ پوچھتی... چق سے باہر شور سنائی دیا۔ سنتری اور دیگر اہلکار کسی عورت کو روک رہے تھے اور وہ کمرے کے اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی روتی بلکتی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''وڈے صاحب! میری فریاد سن لو۔ وڈے صاحب! میرا پتر مر جائے گا۔ وڈے صاحب! میں غریب مسکین عورت ہوں۔''

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ عورت ان تین بدنصیبوں میں سے کسی کی ماں ہے جو لاک اَپ میں ذبح ہونے والے بکروں کی طرح چلا رہے ہیں۔ ریاض پہلے تو خاموشی سے سنتا رہا۔ جب شور زیادہ بڑھ گیا اور عورت دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئی تو وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''اچھا چھوڑ دو... آنے دو اس کو...''

اہلکاروں نے عورت کو چھوڑ دیا... وہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے۔ وہ لپک کر آئی اور اس نے ریاض کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''خدا کے لئے وڈے صاحب! میرے پتر کو بچا لیں۔ اس کو پہلے ہی مرگی پڑتی ہے، وہ مر جائے گا۔ وہ مر جائے گا۔'' عورت نے روتے ہوئے اپنا سر ریاض کے گھٹنوں سے لگا دیا۔ ریاض نے گہری سانس لی اور ادھیڑ عمر عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ شانی کو لگا جیسے وہ اس سے تسلی کی کوئی بات کہنے جا رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئی کہ ریاض نے ایک طوفانی تھپڑ عورت کے گال پر دے مارا۔ وہ تقریباً الٹ کر دروازے کے پاس جا گری۔ ریاض کسی جنگلی جانور کی طرح اٹھا اور عورت کو بے دریغ ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ چند سیکنڈ کی مار پیٹ سے عورت نیم بے ہوش ہوگئی۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور گریبان سے سو سو کے سات آٹھ نوٹ نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ ریاض دھاڑا۔ ''حرامی غریب ہے اور رشوت دینے کے لئے چھاتی سے نوٹ لگائے پھرتی ہے۔'' پھر وہ اپنے اے ایس آئی سے

بولا۔ ''یہ نوٹ قبضے میں لو اور اندر کرو اس کتے کی رن کو بھی...''

عورت نیم بے ہوش تھی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ریاض کے کالے بوٹ کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لئے ڈپٹی جی... میرا پتر مر جائے گا۔''

''مر جائے گا تو اور جم لینا۔ ابھی بڑی تڑ ہے تیرے جثے میں۔ ایک کے بجائے دو تین بھی جم سکتی ہے۔''

اہلکار عورت کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ ایک عورت اور خاص طور سے ایک ماں کی یہ تذلیل شانی کی آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ اسے لگا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ یہاں سے ایک ماں کو گھسیٹ کر نہیں لے جایا گیا تھا..... انسانیت کے جنازے کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ ظلم کرنے والے نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ ماں تو سب کی ماں ہوتی ہے۔ کیونکہ ماں کوئی عورت نہیں ہوتی۔ ماں ایک جذبہ ہوتا ہے، ایک نورانی جذبہ۔

عورت کے ساتھ ہی ریاض بھی باہر نکل گیا۔ وہ کسی کام سے انسپکٹر نواز کے کمرے میں گیا تھا پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی جھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ سر ہلا کر بولا۔ ''دماغ خراب کر دیتے ہیں یہ لوگ۔''

ادھ کھلی کھڑکی سے رونے چلانے والے تینوں حوالاتیوں کی آوازیں گاہے بگاہے ابھرنے لگتی تھیں۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ ریاض ہٹلر نے یہ کھڑکی جان بوجھ کر کھولی تھی۔ وہ اس کے اعصاب کو مکمل طور پر توڑنا چاہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک فائل دیکھنے کے بعد اس نے سر اٹھایا اور بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ''اب تُو کیا چاہتی ہے؟''

''میں چاہتی ہوں کہ میری خالہ کے بھائی کے ساتھ مار پیٹ بند کی جائے اور اس کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی نقل دی جائے۔''

''نقلیں شقلیں بھی مل جائیں گے تجھے...... پر...... یہ خالہ کا بھائی تو ماموں ہوتا ہے۔''

''ماموں ہی سمجھ لیں۔''

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے شانی کو گھورتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''اچھا چل آ میرے ساتھ۔ دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں شور شرابا بہت ہے۔''

شانی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں تھانے کا کچا صحن پار کر کے دوسری طرف والے کمرے میں آ بیٹھے۔ یہ بھی دفتر ٹائپ ہی تھا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ ایک طرف کپڑے کے تھیلوں میں رائفل کی کئی سو گولیاں پڑی تھیں۔ گتے

کے ڈبوں میں آنسو گیس کے شیل، رائفلوں کے خالی میگزین، ہتھکڑیاں اور پتا نہیں کیا کچھ رکھا تھا۔ ایک طرف الماری میں استری شدہ وردیاں تہہ در تہہ نظر آ رہی تھیں۔ چونکہ اس آفس نما کمرے کی لمبائی کافی زیادہ تھی اور اس کے ایک حصے کو سٹور کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہاں واقعی خاموشی محسوس ہوئی۔ یہاں پہنچ کر ریاض ہٹلر کا رویہ قدرے نرم ہو گیا۔ یعنی انیس بیس کا فرق پڑ گیا۔ ''ایک دو کش لے لوں۔ تجھے بُرا تو نہیں لگے گا؟'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

شانی نفی میں سر ہلانے کے سوا بھلا کیا کر سکتی تھی۔

اس نے دروازے میں سے ڈیڑھ فٹ لمبی شراب کی بوتل نکال لی اور گلاس میں ڈال کر پینے لگا۔ اس شراب نوشی کو وہ ''کش'' کہہ رہا تھا۔ شانی اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گئی۔ وہ تھانے کے اندر ڈیوٹی ٹائم میں ایک ''فی میل'' سائل کے سامنے دھڑلے سے پی رہا تھا۔ الکحل کی ناگوار بُو سے شانی کا دل مالش کرنے لگا۔ تاہم وہ ہونٹ بھینچے ساکت بیٹھی رہی۔

کچھ دیر بعد ریاض ہٹلر نے شانی کو تیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''دیکھ میں تجھ پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈال رہا۔ مجھے پتا ہے تیرے پیچھے بڑا مضبوط ہے۔ میں صرف اپنی رائے تجھے دے رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بات تیرے دماغ میں آ جائے گی۔''

''کیسی بات؟''

اس نے گلاس میں سے ایک اور ''کش'' لے کر کہا۔ ''تُو نے لڑائی کا نتیجہ دیکھ ہی لیا ہے ناں۔ دو چار منٹ کی مارا ماری میں پانچ لاشیں گری ہیں۔ پچاس کے قریب بندے پھٹل ہوئے ہیں۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ فائرنگ نہیں ہوئی...... لیکن یہ ابھی اسٹارٹ ہے۔ آنے والے دنوں میں اور بہت سی عورتوں نے بیوہ ہونا ہے، کئی لوگوں نے ہاتھ پاؤں تڑوا کر بیٹھنا ہے، جو درجنوں مقدمے بننے ہیں اور تھانوں میں جو چھتر ولیں وغیرہ ہونی ہیں وہ علیحدہ ہیں۔ یہ بربادی کا ایک بڑا لمبا اور بندے مار قسم کا چکر ہے...... میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سگریٹ سلگا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اگر تُو چاہے تو دونوں پنڈوں بلکہ ارد گرد کے کئی پنڈوں کو اس خونی چکر سے نکال سکتی ہے۔ بہت کچھ برباد ہونے سے بچ جائے گا۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے وہ سب چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے اغوا

کی وجہ سے ہے۔ دونوں پنڈوں میں عداوت آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ نارپور کے چوہدری رستم سیال...... دراج اور عارف وغیرہ کو ایک ہی شے سمجھ رہے ہیں۔ کچھ کا تو اب یہ خیال ہے کہ رستم گوجر خان کی طرف جانے کی بجائے جوہر آباد میں ہے اور عارف نے اسے چھپا رکھا ہے۔ بہر حال میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟''

شانی سوالیہ نظروں سے ریاض کی طرف دیکھنے لگی۔

ریاض بولا۔ ''وہ پوٹھوہار کی طرف چلا گیا ہے۔ اپنے پرانے ٹھکانے پر...''

''مم...... میں...... کیا کر سکتی ہوں؟''

''تُو بہت کچھ کر سکتی ہے، لیکن اگر چاہے تو...... نہ چاہے تو پھر کچھ بھی نہیں۔''

''میں سمجھ نہیں پا رہی۔''

''مجھے پتا ہے رستم اور اس کے ساتھی لالہ، حسنا وغیرہ جس جگہ پر ہیں وہاں پولیس نہیں جا سکتی۔ کوئی بھی ان کی مرضی کے خلاف وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ اگر پہنچنا چاہے گا تو پھر اسے ٹھیک ٹھاک بندے قربان کرنے پڑیں گے، ہو سکتا ہے کہ چالیس پچاس یا اس سے بھی زیادہ لاشیں اٹھانی پڑ جائیں۔ ان گینڈے کے تخموں نے وہاں بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر تک لگا رکھے ہیں۔ فی الحال میں اس مسئلے کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ فی الحال میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ چوہدری اور اس کا لڑکا سلامتی سے واپس آ جائیں...... اگر اس سلسلے میں وہ کوئی تاوان وغیرہ مانگتے ہیں تو نارپور والے وہ بھی دے دیں گے لیکن یہ کام کرنے کے لئے کوئی درمیان کا بندہ ضروری ہے اور میرا خیال ہے...... بلکہ میں جانتا ہوں کہ وہ درمیان کا بندہ تُو بن سکتی ہے۔''

''یہ...... کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں...... نہیں ہو سکتا......'' ریاض کے لہجے میں ہلکی سی گرج آ گئی۔

''میرا کوئی تعلق نہیں ہے رستم یا اس کے ساتھیوں سے۔''

''اوہو...... واہ واہ...... کیا بات ہے، کیا ڈائیلاگ ہے۔ میرا کوئی تعلق نہیں ہے رستم سے......'' ریاض کے لہجے میں شدید طنز تھا۔ پھر وہ بے حد خطرناک آواز میں بولا۔ ''میری زبان نہ کھلوا بی بی جان نمیں تو تیری ساری ''نیک پروینی'' کا بھانڈا گوجرانوالہ کے چوک میں پھوڑ دوں گا۔ دیکھنے والوں کا اتنا رش پڑ جائے گا کہ لوگ ''میڈم باوری فلم'' بھی بھول جائیں گے...... دیکھ...... میری کھوپڑی مت گھما۔ میں سب جانتا ہوں، کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے۔''

''یہ غلط ہے۔ رستم سے اب میرا کوئی واسطہ نہیں۔'' اس نے بے باکی سے شانی کو

تھوڑی پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔

''اب واسطہ نہیں، لیکن پہلے تو تھا ناں اور میں اتنا کاکا نہیں ہوں جتنا تُو سمجھ رہی ہے۔ ''واسطے'' اتنے جلدی ختم نہیں ہوتے۔ لو پر اوپر سے تُو جو مرضی کہتی رہ لیکن تیری بُکل میں چور تو چھپا ہوا ہے ناں اور وہ حرامی بھی تیرے تائے کو جتنے مرضی خط لکھتا رہے، پر دل تو اس کا تیرے لئے ہی میاؤں میاؤں کرتا ہے۔''

شانی کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

ریاض ہٹلر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔ شانی کی ٹھوڑی چھوڑ کر اس نے تھوڑی سی ''مائع بدبو'' مزید اپنے حلق میں اتاری اور بولا۔ ''دیکھ، میں تجھ پر کوئی زبردستی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے تجھے بس ایک راستہ دکھایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس راستے پر چل کر تُو دونوں پنڈوں کے بہت سے لوگوں کو بربادی سے بچا سکتی ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں یہاں بہت خون خرابا ہونا ہے۔ یہ آگ اتنی پھیلنی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا ہے وہ پاگل دا پُتر کسی اور کی بات چاہے نہ مانے لیکن تیری ضرور مان لے گا۔ صرف تُو ہی اس سے چوہدری اور اس کے لڑکے کو چھڑوا سکتی ہے۔ باقی رہی وہاں جانے کی بات تو میں تجھے پہنچانے کا پورا انتظام کر دوں گا۔ جہاں تک گاڑی جائے گی تجھے لے جائیں گے۔ اس سے آگے بھی کوشش کریں گے کہ گھوڑے یا ڈولی وغیرہ پر جا سکے۔ ہو سکتا ہے چند گھنٹے یا ایک دن تجھے پیدل سفر کرنا پڑے لیکن ایک بات میں پھر کہتا ہوں اور بار بار کہوں گا، یہ سب کچھ تُو اپنی مرضی سے کرے گی۔ میری طرف سے کوئی پریشر نہیں۔''

شانی سٹپٹا گئی، وہ پریشر ڈال بھی رہا تھا اور کہہ رہا تھا، کوئی پریشر نہیں۔ ابھی چند دن پہلے اس نے ریوالور دکھایا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اس میں تین گولیاں اس کے تین رشتہ داروں کے نام کی ہیں۔ اس نے جنازوں والی بات بھی کی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جمشید کے حوالے سے جو دہلا دینے والی باتیں کی تھیں وہ بھی پریشر کے زمرے میں ہی آتی تھیں اور تو اور وہ خود بھی سراپا پریشر تھا۔ وہ نرم اور سخت، دونوں طریقوں سے کام لے رہا تھا۔ شانی جانتی تھی اگر وہ اس کا کچھ لحاظ کر رہا ہے تو یہ صرف اور صرف ایس پی حاجی حیات خاں کی وجہ سے ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ حاجی حیات پوری طرح شانی کے عقب میں موجود ہے۔ اس کی عیار نظریں شانی کے سراپا پر تھیں۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تُو ایک دو دن آرام سے سوچ لے لیکن جو بھی فیصلہ کرنا یہ سوچ کر کرنا کہ تُو ایک بہت بڑا

کام کرے گی اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کام صرف تُو ہی کر سکتی ہے اور ہاں ایک بات اور۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''اگر تیرا فیصلہ ہاں میں ہوا تو ایک کام ضرور ہونا ہے حاجی حیات نے بھاگے بھاگے تیرے پاس آنا ہے، اس نے کہنا ہے اوئے پاگلے! یہ کیا کر رہی ہے۔ کون کرا رہا ہے تجھ سے یہ سب کچھ، اگر اس وقت تُو نے میرا نام لینا ہے تو پھر ابھی بتا دے۔ اگر حاجی نے کچھ کہا اور میرا کھوپڑ گھوم گیا تو پھر بڑا سیاپا پڑ جانا ہے اور جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ ہونا ہے وہ بھی کہنے سننے کے لائق نہیں، میری بات سمجھ رہی ہے تُو؟'' شانی نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس خوفناک افسر کے سامنے بالکل مسمرائز ہو رہی تھی۔ اس کا حلق خشک تھا اور جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہی لرزش جو کبھی نارپور کی حویلی میں فاخر کے سامنے اس پر طاری ہوتی تھی۔ شاید سارے جابر لوگوں کی موجودگی ماحول پر ایک جیسا اثر چھوڑتی ہے۔ اس نے ہمت جمع کر کے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ میری بات کا رستم پر وہ اثر ہو گا جو آپ سمجھ رہے ہیں لل لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس کے لئے یہ ضروری تو نہیں کہ میں خود کسی دور دراز جگہ پر جاؤں ... یہ مقصد خط وغیرہ کے ذریعے بھی......''

''مجھے پتا تھا تُو یہ بات کہے گی۔ مجھے پتا تھا۔'' اس نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''لیکن بات یہ ہے بی بی جان کہ یہ بہت بڑا ٹینٹا ہے۔ خط بازی سے ٹھیک ہونے والا نہیں، میں نے اس پر بہت دماغ کھپایا ہے۔ بس یہی راستہ سمجھ میں آتا ہے جو تجھے بتایا ہے۔ اگر تُو کچھ ٹھیک کرنا چاہتی ہے تو ایک بار تو تجھے وہاں جانا ہی پڑے گا۔ اپنی زبان سے اس ماں کے......کو سمجھانا پڑے گا۔'' وہ گالی دے کر بولا۔

شانی نے محسوس کیا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اس شخص کے روبرو اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''اچھا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔''

''سوچ لے......لیکن پھر کہتا ہوں۔ یہ بات صرف میرے اور تیرے درمیان رہنی چاہئے۔ انکار کرنا ہو گا تو مجھے ہی کرنا اور اگر اچھا فیصلہ کر کے تھوڑی سی ہمت کر لے گی تو فائدے میں رہے گی اور اوروں کا بھی فائدہ ہو گا۔''

شانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جمشید......میرا مطلب ہے....'' بات اس کے ہونٹوں میں الجھ گئی۔

''اوہ! تجھے کہا تو ہے، وہ تیرا رشتے دار ہے تو پھر ہمارا بھی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ اس

کے لئے جو سامان لائی ہے۔ سب انسپکٹر مرید احمد کو دے دے۔ وہ پہنچا دے گا۔"

"لیکن ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"فی الحال یہ تو مشکل ہے لیکن حوصلہ رکھ میں تجھے ملا بھی دوں گا اس سے۔" ریاض کا لہجہ اٹل تھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جمشید کے حوالے سے کچھ اور کہتی اس نے تیزی سے وائرلیس سیٹ آن کیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔ شانی باہر آ گئی۔

وہ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ گھر واپس پہنچی۔ تابندہ دروازے میں ہی کھڑی انتظار کر رہی تھی جیسے اسے آس ہو کہ شاید جمشید ساتھ ہی آ جائے گا۔

شانی نے اسے تسلی دی اور کہا۔ "وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں ڈی ایس پی سے بات کر کے آئی ہوں۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"وہ گھر کب آئے گا؟"

اس کا سسر بولا۔ "دیکھ دھی رانی! مصیبت آ تو پھٹا پھٹ جاتی ہے لیکن اسے جاتے ہوئے تھوڑی دیر لگتی ہے۔ بس تُو مولا سے کرم مانگ۔ وہ جو کرے گا اچھا کرے گا۔"

تابندہ سسکی لے کر رہ گئی۔ اس کے تو ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی ابھی نہیں چھوٹا تھا۔ شانی کی خالہ فیروزہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

خالو اعجاز ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے گوجرانوالہ سے واپس آئے تھے۔ ان کے چہرے پر سفر اور پریشانی کی گہری تھکان تھی۔ صحن میں لگے ہینڈ پمپ پر منہ دھو کر وہ شانی کے پاس آ گئے۔ شانی نے انہیں اور دیگر گھر والوں کو ڈی ایس پی سے ملاقات کی ساری تفصیل بتائی تاہم وہ باتیں اپنے تک ہی رکھیں جنہیں ریاض نے چھپانے کے لئے کہا تھا۔ خالو اعجاز کی باتوں سے شانی کو معلوم ہوا کہ ان کا گوجرانوالہ کا دورہ تقریباً رائیگاں ہی گیا ہے۔ وہ ایک ایم این اے کی سفارش لینے گئے تھے، مگر ایم این اے اسمبلی کے اجلاس میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اس کے سیکرٹری نے بتایا کہ ان سے رابطہ ممکن نہیں۔ خالو اعجاز نے اندازہ لگایا تھا کہ ڈپٹی ریاض کا نام سن کر ایم این اے کنی کترا گیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا تو فون پر بھی کچھ نہ کچھ کوشش کر سکتا تھا یا کسی اور ذریعے سے اپنی سفارش متعلقہ اہلکاروں تک پہنچا سکتا تھا۔ اب دو روز بعد خالو اعجاز، تایا معصوم کے ساتھ لاہور جانے اور ایک صوبائی منسٹر سے رابطہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

شانی رات گئے تک سوچتی رہی اور ہولتی رہی۔ تھانے میں بہیمانہ تشدد کے مناظر اس کی سوچ کو مجروح کرتے رہے۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لوگ اپنے مسئلوں کے حل کے لئے تھانوں میں جانے سے کیوں کتراتے ہیں اور کیوں حق پر ہوتے ہوئے بھی حق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اگلے روز شانی ہسپتال پہنچی تو وہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ حالانکہ دو دن پہلے تک یہاں لڑائی میں زخمی ہونے والے کم و بیش دس افراد موجود تھے اور یہاں کا کمپاؤنڈر ایک لیڈی ہیلتھ ورکر کے ساتھ مل کر ان کا علاج کر رہا تھا۔ اب وہ دونوں بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔ چند بچیاں ہسپتال کے احاطے میں "کیڑی کاڑا" کھیلنے میں مصروف تھیں۔ ایک بکری کمروں میں آوارہ پھر رہی تھی اور ایک بچہ ابلا ہوا بھٹا کھانے کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ہسپتال کی یہ حالت شانی سے دیکھی نہیں گئی۔ اس نے کمپاؤنڈر سے پوچھا۔ "کیا بات ہے رمضان......! مریض کہاں گئے؟"

"چلے گئے ہیں جی سارے۔ رات کو اس کبڑی عورت نے انہیں ڈرا دیا۔ کہنے لگے آج چاند کی دسویں ہے، دسویں سے چودھویں تک چار راتیں اس چھت کے نیچے رہنے والوں کے لئے منحوس ہوتی ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے ان چار راتوں میں ہی ہوتا رہا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ دیہاتی ایسی باتوں پر کتنی جلدی یقین کرتے ہیں۔ اتفاق سے کل ایک زخمی فدا حسین کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ بخار میں الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔ سارے مریضوں نے بستر بوریا سمیٹا اور عارف صاحب کے منع کرنے کے باوجود چلے گئے۔"

شانی تنہا ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھ گئی، اس کے ذہن میں رہ رہ کر خالو اعجاز کی یہ بات گونجنے لگی کہ اگر اس ہسپتال کو اور علاقے کے دوسرے صحت مرکزوں کو آباد کرنا ہے تو پھر ان لوگوں کو واپس لانا ہوگا جو یہاں سے چلے گئے ہیں...... یا پھر بھیج دیئے گئے ہیں وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ وہ سوچنے لگی۔ خالو اعجاز نے ان تینوں کے نام بھی بتائے تھے لیڈی ڈاکٹر زیب النساء، اس کا شوہر ڈاکٹر محسن اور ان کا سینئر ساتھی ڈاکٹر بہروز۔ پتا نہیں کیوں شانی کے ذہن میں ایک اتھا سا ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ زیب النساء اور ڈاکٹر محسن اب بھی حشام کی قید میں ہیں۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔ ایک عجیب سا درد اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور پھر وہیں اس تنہا کمرے میں اس اکیلی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ عجیب اور انوکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ جوں جوں سوچتی گئی اس کے جسم میں عجیب سنسناہٹ پیدا ہوتی گئی۔ وہ ان تینوں

کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرسکتی تھی ۔ضرور کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک اور بات بھی محسوس کررہی تھی ریاض ہٹلر کی ساری باتیں غلط نہیں تھیں۔ ان میں چند ایسی بھی تھیں جن میں شانی کو وزن محسوس ہوا تھا۔ مثلاً یہ بات کہ اگر رستم نے تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کو مار دیا تو علاقے میں دشمنی کی آگ بہت شدت سے بھڑکے گی اور اسے بجھانا مشکل ہو جائے گا۔

اسی دوران میں شانی کی نظر خالو اعجاز پر پڑی وہ شاہی سے باتیں کرتے ہسپتال کی طرف آرہے تھے۔ حضرت قدرت اللہ کے چیلے کی حیثیت سے شاہی یہاں خاصا مقبول تھا۔ اس کے آستانے پر ہروقت مریضوں کا رش رہتا تھا۔ مریض یہ جانے بغیر کہ وہ نہایت نقصان دہ دوا (اسٹیرائیڈز) استعمال کررہے ہیں، شاہی سے بہت خوش تھے۔ شاہی زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ بہ مشکل تیس سال کا ہوگا۔ قد چھوٹا، رنگ سانولا اور بال کندھوں تک تھے۔ یہ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ وہ حرام کی روٹیاں کھا کھا کر خوب گٹھا ہوا بھی تھا۔ وہ خالو اعجاز سے باتیں کرتا ہوا ہسپتال تک پہنچا۔ پھر خالو تو ہسپتال کے اندر آگئے اور وہ ہسپتال کے ویران در و دیوار پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالتا ہوا اپنے آستانے کی طرف مڑ گیا۔

لیڈی ہیلتھ ورکر چائے لے آئی۔ شانی اور خالو اعجاز آفس نما کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ خالو اعجاز نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکالا۔ یہ دو دن پہلے کا تھا۔ ''یہ خبر دیکھو......'' خالو اعجاز نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

شانی نے خبر دیکھی سرخی تھی۔ ''جہلم سے تقریباً تیس کلومیٹر آگے جنگل میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان اندھا دھند فائرنگ۔ ڈاکو روپوش ہوگئے۔''

خبر کا متن اس طرح تھا۔ ''چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے سنسنی خیز اغوا کے بعد پولیس رستم اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنے کی کوشش کررہی ہے۔ اسی سلسلے میں کل جہلم شہر سے تقریباً بیس کلومیٹر مغرب کی طرف پولیس پارٹی اور ڈاکوؤں میں تصادم ہوا۔ کم و بیش ایک گھنٹے تک خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ ہوتی رہی۔ اس میں دو پولیس والے بھی زخمی ہوئے تاہم کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔ شام کے فوراً بعد ڈاکوؤں نے تاریکی کا فائدہ اٹھایا اور جنگل میں روپوش ہوگئے۔ آپریشن انچارج ڈی ایس پی ریاض کا کہنا ہے کہ ڈاکو وارتیں کرنے کے بعد پوٹھوہار کی گہرائی میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں ان کی محفوظ پناہ گاہیں ہیں۔ ان پناہ گاہوں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔''

شانی خبر پڑھ چکی تو خالو اعجاز بولے۔ ''لگتا ہے کہ پولیس کے افسر شش و پنج میں ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ وہ ڈاکوؤں کے پیچھے زیادہ آگے تک جائیں گے تو پھر انہیں شدید جانی نقصان

اٹھانا پڑے گا۔ چوہدری اور اس کے بیٹے کی جان کا خطرہ اس کے علاوہ ہوگا۔''

وہ دونوں کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس دوران میں چائے ختم ہوگئی لیڈی ورکر خالی برتن لے کر چلی گئی تو شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے خالو۔''

''کیسی بات؟''

''حالات میں بہت بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ کسی وقت تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں رنگ والی میں بھی فساد نہ ہو جائے۔ میں نے بلی ماروں کی یہ دھمکی بھی سنی ہے کہ وہ حشام کے بدلے میں ہماری حویلی سے کسی کو اغوا کریں گے......لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں؟''

''میرا دل چاہ رہا ہے خالو......کہ میں خود رستم سے ملوں۔ اس سے کہوں کہ وہ ایسی آگ سے نہ کھیلے جو سب کو جلا کر راکھ کردے۔''

خالو نے حیرت سے شانی کو دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہارا مطلب ہے کہ تم رستم کے پاس جاؤ گی؟''

''ہاں خالو! ہمیں ہی اس کے پاس جانا ہوگا۔ کیونکہ وہ تو اپنا کام کرکے جاچکا ہے۔ وہ تو اب یہاں آئے گا نہیں۔ پولیس کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو پوٹھوہار میں بہت اندر لے گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم پہاڑوں میں رستم کے پیچھے جاؤ گی......؟'' خالو کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس بارے میں ڈی ایس پی ریاض سے میری بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے بندے مجھے جہلم سے آگے پہاڑوں میں کافی آگے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ فاصلہ میں اکیلے طے کرلوں یا کسی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی لیکن ایک بات ہے خالو۔ اگر ہم نے کچھ نہ کیا اور حالات جوں کے توں رہے تو بڑا فساد یقینی ہے علاقے میں۔''

چوہدری اعجاز کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ بولے۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں بیٹی! لیکن جو کچھ تم بتا رہی ہو یہ ممکن نہیں۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ ڈاکو تو پھر ڈاکو ہوتا ہے۔ اس کی نیت کا بھروسا نہیں کیا جاسکتا اور ڈاکوؤں کے گڑھ میں کس کی نیت کیا ہو، کیا پتا۔''

شانی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے ہمت کی اور آنکھیں جھکا کر بولی۔ ''خالو......رستم کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں... وہ ...وہ بہت عزت کرتا ہے میری۔

مجھے یقین ہے وہ میری بات ٹالے گا نہیں۔ خود کو اور دوسروں کو اس خطرناک جنجال سے نکال لے گا۔ میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر کے ہی آپ سے بات کی ہے۔''

''شانی...... کہیں...... ڈی ایس پی ریاض نے تو ایسا کرنے کے لئے نہیں کہا؟''

''نہیں خالو...! اس نے صرف بات کی تھی کہ پولیس اس موقع پر رستم کے پیچھے جانا نہیں چاہتی۔ ایسا کرنے میں پولیس اہلکاروں کی جانوں کو خطرہ ہے اور یہ خطرہ بھی ہے کہ حشام اور اس کا بیٹا ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ معاملہ بات چیت کے ذریعے حل ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔''

''لیکن اس میں ڈی ایس پی کی کوئی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ شاطر بندہ ہے۔ اگر وہ زیادہ سختی نہیں کر رہا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جانتا ہے، حاجی حیات ہمارے ساتھ ہے۔ ورنہ میرے خیال میں تو وہ اب تک رستم کو پھانسنے کے لئے تمہیں گرفتار کر چکا ہوتا۔''

''کیا مطلب خالو؟''

''وہ بہت بڑا خبیث ہے۔ اسے اب بھی شک ہو گا کہ اگر تم مصیبت میں پھنسو گی تو رستم تمہیں بچانے کے لئے آئے گا۔''

شانی کو اس گفتگو کے دوران عجیب سی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اوڑھنی کے نیچے اپنے ریشمی بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا اور موضوع کو تھوڑا سا بدل کر بولی۔ ''مجھے لگتا ہے خالو! اگر میں نے یہ قدم اٹھا لیا تو میں اس ویران ہسپتال کے لئے کچھ کر سکوں گی۔ شاید کافی کچھ کر سکوں گی۔''

''کیا مطلب؟''

''بس، میرے ذہن میں ایک خیال سا ہے۔ ابھی اس کی کوئی واضح شکل نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک بڑی تبدیلی لا سکتی ہوں۔''

''تم تو پہیلیاں بوجھوا رہی ہو۔''

''ابھی خود میں بھی ''پہیلی'' ہی بوجھ رہی ہوں۔''

خالو اعجاز نے گہری سانس لی۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ باقی گھر والے تمہیں یہ قدم اٹھانے کی اجازت دیں گے۔ تایا معصوم، تمہاری چچی پروین اور باقی لوگوں کو بھی یہ گوارا نہیں ہو گا کہ تم نارپوریوں کی رہائی کے لئے رستم کے پیچھے جانے کا رسک لو۔''

''اسی لئے تو میں نے آپ سے بات کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ انہیں اس پروگرام کی

خبر نہ ہو۔ کم از کم میرے یہاں سے جانے تک۔''

''شانی! تم بہت بڑی الجھن میں ڈال رہی ہو مجھے۔''

''خالو......'' شانی نے بڑی محبت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اپنی بیٹی پر بھروسہ کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گی۔ یقین کریں میری اس کوشش سے بہت سوں کا بھلا ہو گا۔ ...پلیز خالو۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے چہرے پر گہرا تردد تھا۔ ہولے سے بولے۔ ''ابھی میں جمشید کی پریشانی سے نہیں نکلا تھا، تم نے ایک اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''آپ جمشید کی طرف سے بھی پریشان نہ ہوں۔ میرے جانے سے جہاں اور کئی بہتریاں آئیں گی وہاں مجھے یقین ہے کہ جمشید کی مشکلیں بھی کم ہوں گی۔ اس کے لئے بہت جلد کوئی اچھا راستہ نکل آئے گا۔''

خالو بھانجی میں چند منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ خالو اعجاز بدستور رضامندی اور نارضامندی کے درمیان تھے۔

شانی جانتی تھی کہ خالو کسی اور کو بتائیں نہ بتائیں لیکن حاجی حیات کو ضرور اس صورتِ حال سے آگاہ کریں گے اور انہوں نے شانی کے سامنے کہہ بھی دیا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے وہی ہوا جس کی شانی کو توقع تھی۔ حاجی حیات کا ''اہلکارِ خاص'' سب انسپکٹر اختر سادہ کپڑوں میں جوہرآباد پہنچ گیا۔ اس کے آنے کی خبر مقامی پولیس کو بھی نہیں تھی۔ وہ سیدھا شانی کے پاس پہنچا۔ شانی اس وقت خالو اعجاز کے سسر اور تابندہ کے پاس صحن میں بیٹھی تھی۔ تابندہ کو مدانی کی ڈوریاں ہلاتے اور لسی میں سے مکھن نکالتے دیکھ رہی تھی۔ ایک دیہاتی زور تھا تابندہ کی بانہوں میں لیکن جب سے جمشید حوالات میں گیا تھا وہ پہلے جیسی توانائی نظر نہیں آتی تھی تابندہ میں۔ شانی، تابندہ کے پاس سے اٹھ کر بیٹھک میں اختر کے پاس آ گئی۔ سب انسپکٹر شانی سے عمر میں کافی بڑا ہونے کے باوجود اسے چھوٹی باجی کہتا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بولا۔ ''چھوٹی باجی...! یہ کیا سن رہے ہیں ہم؟''

''ٹھیک ہی سن رہے ہیں۔''

''یعنی آپ پوٹھوہاری علاقے میں رستم کے پاس جانا چاہتی ہیں؟''

''ہاں اختر بھائی...! میں اس سنگین مسئلے کو حل کرانا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں اس میں میرے لئے تھوڑا سا رسک بھی ہے لیکن بہت بڑے خون خرابے سے بچنے کے لئے میں یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔''

''کہیں.. اس بارے میں... .ڈپٹی صاحب نے تو آپ پر کسی طرح کا پریشر نہیں ڈالا؟'' اختر نے پوچھا، یہ وہی سوال تھا جو کل خالو اعجاز نے بھی کیا تھا۔

''نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے خود اس بارے میں سوچ بچار کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس موقع پر جتنی اچھی طرح میں رستم اور اس کے ساتھیوں کو سمجھا سکتی ہوں کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے شانی کو ایک بے نام سی جھجک محسوس ہوئی۔ جیسے وہ اپنے اور رستم کے تعلق کو لوگوں کے ذہنوں میں مزید واضح کر رہی ہو لیکن یہ سب کچھ تو پہلے ہو گیا تھا۔ شاید اسی وقت جب شانی نے بھرے میلے میں خود کو زخمی رستم کے اوپر گرایا تھا اور اس کے حصے کی لاٹھیاں بھی اپنے جسم پر کھائی تھیں۔

شانی نے اختر کے سامنے وہ ساری باتیں کہہ ڈالیں جو اس سے پہلے خالو اعجاز سے کہیں تھیں۔ ایس آئی اختر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بیچ بیچ میں سوالات بھی کئے۔ آخر میں وہ بولا۔ ''چھوٹی باجی! آپ کی کچھ باتوں پر واقعی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان میں کسی نہ کسی کو تو آگے بڑھ کر بہتری کی کوشش کرنا پڑے گی لیکن میری ذاتی رائے تھوڑی سی مختلف ہے۔ نارپور کے چوہدریوں سے آپ کو ہمیشہ دکھ اور تکلیف ہی پہنچی ہے۔ اب وہ اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں خود ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ انہیں اس مشکل سے نکالنے کے لئے آپ کا اتنا بڑا رسک لینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''جو کام عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہوتے ہیں، انہیں سمجھنے میں تھوڑی سی مشکل تو ہوتی ہے...... پتھر کے بدلے پتھر تو ہر کوئی مارتا ہے لیکن پتھر کے بدلے پھول دینے سے ہی ہم اپنے اردگرد اچھی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں نا کہ آگ کو آگ سے نہیں پانی سے بجھایا جاتا ہے۔''

اختر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی باجی! آپ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں اور میں سننا بھی چاہتا ہوں لیکن فی الحال وقت بہت کم ہے، مجھے ابھی تقریباً چالیس کلومیٹر سفر کر کے واپس جانا ہے اور حاجی حیات صاحب کو آپ کے پروگرام سے آگاہ کرنا ہے۔''

شانی نے کہا۔ ''بھائی! تم انہیں اپنی طرف سے بھی قائل کرنے کی کوشش کرنا... ان شاءاللہ جو کام میں کرنے جا رہی ہوں، اس میں سے خیر کا پہلو ضرور نکلے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا لیکن اگر انہوں نے اتفاق نہ کیا اور آپ کے لئے کوئی پیغام دیا تو وہ پیغام بھی میں آج رات یا کل سویرے آپ تک پہنچا دوں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' شانی نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ایس آئی اختر شانی سے رخصت ہو کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد شانی نے بھی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے گھر کے باہر موجود ایک سفید پوش اے ایس آئی کے ذریعے ٹھیکرا تھانے میں ڈپٹی ریاض کو پیغام بھیجا کہ وہ جلد آ کر اس سے ملے۔ اپنی روانگی کے حوالے سے وہ کل رات سے ہی ضروری انتظامات کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے مہتم بستی کے سردار دراج سے بھی مشورہ کیا تھا اور عارف کمبوہ تو ہر مشورے میں شریک ہوتا ہی تھا۔

☆======☆======☆

رات تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تو رخصت ہو چکی تھی۔ تاہم رات کے وقت اب بھی ہلکی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ اس خنکی کی ایک وجہ غالباً تیز ہوا بھی تھی۔ شانی ایک پولیس جیپ میں سوار تھی۔ اس جیپ میں شانی کے ساتھ جو پولیس آفیسر سوار تھا، وہ پورے ملک میں دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بدمعاش اور شریف دونوں ہی اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص عرصے سے اپنی جیب میں ''قتل کرنے کا لائسنس'' ڈالے پھرتا ہے۔ اسے یونہی ہٹلر کا خطاب نہیں دیا گیا تھا۔ اس جیپ میں شانی اور ریاض ہٹلر کے علاوہ دو افراد اور بھی موجود تھے۔ ایک سردار دراج اور دوسرا عارف کمبوہ کا قریبی دوست بلاول اعوان۔

شانی کی صوابدید پر ہوتا تو وہ بلاول کی بجائے عارف کو ہی اپنے ساتھ لانا چاہتی، لیکن عارف کا آنا مشکل تھا۔ چند دن پہلے گاؤں سے باہر میدان میں جو خونی لڑائی ہوئی تھی اس نے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ ان مسائل سے نمٹنا اکیلے چوہدری نواب کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ عارف کو تقریباً روز ہی تھانے بھی جانا پڑ رہا تھا...... جمشید کے علاوہ بھی اس کے کم و بیش چھ ساتھی فوجداری مقدمے میں پھنس گئے تھے۔ ان میں سے ایک گوجرانوالہ کے ہسپتال میں زخمی پڑا تھا جس کی دیکھ بھال بھی عارف کے ذمے تھی۔

سردار دراج بخوشی شانی کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا تھا، اس کا سینہ ایک دیوار کی طرح تھا اور یہ دیوار شانی کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے اور بھی اونچی اور وسیع ہو گئی تھی۔ سردار دراج کو اپنے ساتھ لانے سے شانی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مہتموں پر سے پولیس کا دباؤ کم ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس عمل سے مہتموں اور نارپوریوں کی باہمی دشمنی پر بھی پانی کے کچھ چھینٹے پڑ سکتے تھے۔ یہ دشمنی کٹھولی گاؤں کے میلے والے واقعے کے بعد ایک دم چمک اٹھی تھی۔ سردار دراج اور عارف کمبوہ شانی اور رستم کو موت کے گھیرے سے نکالنے کے لئے مشتعل

نار پوریوں سے بھڑ گئے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے اور نار پوری منہ تکتے رہ گئے تھے۔ یہ بہت بڑی چوٹ تھی چوہدری حشام اور اس کے ساتھیوں کے لئے۔

جس جیپ پر وہ سوار تھے وہ ایک لینڈ روور تھی۔ یہ گاڑیاں طاقت اور سخت جانی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر ان سے بہتر ساتھی اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جیپ کے اندر کافی گنجائش تھی۔ ڈپٹی ریاض اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ ڈرائیور ایک لاہوری اے ایس آئی تھا۔ پچھلی نشست پر شانی تھی۔ اس کا سراپا ایک گہرے نیلے رنگ کی چادر میں چھپا تھا۔ اس نے چہرہ بھی چادر کے پلو میں چھپا رکھا تھا۔ صرف آنکھیں اور پیشانی کا زیریں حصہ نظر آتا تھا۔ پچھلی نشستوں پر سردار دراج اور بلاول اعوان موجود تھے۔ گاہے بگاہے دونوں دھیمے لہجے میں آپس میں باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ بلاول شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے ایک بریٹا پسٹل اور اس کی تقریباً سو گولیاں تھیں۔ چوڑے چکلے سردار دراج نے ایک نیم گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر کے نیچے لائسنس یافتہ کلاشنکوف موجود تھی کچھ دیگر اسلحہ بھی اس کی چادر تلے موجود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کا نہایت دشوار گزار سفر طے کر کے وہ لوگ ایک چھوٹی سی پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک بڑی سڑک سے مل گئی۔ یہاں پہنچ کر ڈپٹی ریاض کے موبائل فون نے کام کرنا شروع کر دیا اور جب فون نے کام کرنا شروع کیا تو اسے وقفے وقفے سے کالیں آنا شروع ہوگئیں۔ یوں لگتا تھا کہ پنجاب کے سارے تھانوں کو صلاح مشوروں کے لئے جس شخص کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہی ڈپٹی ریاض ہے۔ ڈپٹی ریاض بھی اپنے مخصوص جارحانہ و حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ شانی کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنی گفتگو میں گندی گالیاں بھی بک رہا تھا۔ کبھی کسی ملزم کی رشتے دار خواتین سے نازیبا رشتے جوڑتا تو کبھی اپنے کسی ماتحت کی ماں بہن ایک کر دیتا۔ اس کی باتوں سے اس کی بے پناہ شعلہ مزاجی کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ لاہور کے کسی تھانیدار کو اس نے حکم دیا۔ فلاں بندے کو اتنے چھتر مارو کہ اس کی پشت پر سے کھال دو دو انچ ابھر جائے۔ بس اسے مرنا نہیں چاہئے باقی سب کچھ کر ڈالو۔ کسی مفرور لڑکے کے باپ کو اس نے فون پر دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ پروفیسر! انسان بن جا ....ورنہ تیری آنکھوں کے سامنے تیری بیٹی کی عزت کا جنازہ نکلوا دوں گا۔ کل شام تک مجھے تیرے بیٹے کی گرفتاری چاہئے۔ اگر نہیں تو پھر کل نو بجے لیڈی پولیس پہنچ جائے گی تیری بیوی اور بیٹی کو تھانے لانے کے لئے۔“

چند منٹ بعد کسی سیکرٹری سے ریاض ہٹلر کا مکالمہ ہوا۔ اس سیکرٹری نے چند لڑکوں کی

رہائی کے لئے ریاض سے سفارش کی۔ ریاض نے جس بے پرواہی سے سیکرٹری کو انکار کیا اور اسے لتاڑا اس سے ریاض کے پیچھے موجود خفیہ ہاتھ کی طاقت کا اندازہ شانی کو ہوا۔

سفر کے دوران شانی اور دراج وغیرہ سے بھی ڈپٹی ریاض کی تھوڑی بہت بات چیت ہوتی رہی تاہم وہ زیادہ وقت اپنے وائرلیس سیٹ اور موبائل کے ساتھ ہی مصروف رہا۔ راستے میں جہاں جہاں کسی ناکے یا پولیس پوسٹ پر پولیس اہلکاروں نے ڈپٹی ریاض کو پہچانا، اسے بھرپور انداز میں تعظیم پیش کی۔ مختلف جگہوں پر ایڑیاں بجتی رہیں اور ہاتھ سیلوٹ کے لئے اٹھتے رہے۔

شانی کا خیال تھا کہ وہ لوگ پہلے جی ٹی روڈ پہنچیں گے۔ وہاں سے گوجر خان کے گردونواح تک جائیں گے اور پھر ٹیلوں میں سفر کریں گے لیکن دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے باوجود جب جی ٹی روڈ نہیں آئی تو شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ کوئی شارٹ کٹ استعمال کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ڈرائیور اور ڈپٹی ریاض کے درمیان جو بات ہوئی اس میں چکوال روڈ کا ذکر آیا۔ شانی کی معلومات کے مطابق چکوال روڈ، گوجر خان کے آس پاس سے ہی جی ٹی روڈ میں سے پھوٹتی تھی۔

رات دو بجے کے قریب جیپ نے ایک بار پھر پختہ سڑک چھوڑ دی اور ناہموار راستے پر سفر شروع کر دیا لیکن اس مرتبہ ان کے اردگرد درخت اور میدان نہیں تھے۔ سیاہ بھوتوں جیسے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ مدھم چاندنی ٹیلوں کو اور بھی پُر اسرار بناتی تھی۔ ان ٹیلوں میں داخل ہوتے ہی ایک اور پولیس موبائل بھی ان کی ہم سفر ہوگئی۔ اس گاڑی میں کم و بیش آٹھ مسلح اہلکار موجود تھے۔ یہ گاڑی ان کے پیچھے آرہی تھی۔ ڈپٹی ریاض نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت شارٹ کٹ ہم نے استعمال کیا ہے جی ٹی روڈ کی طرف سے جاتے تو دو گھنٹے اور لگ جاتے۔“

”اندازاً کتنے بجے پہنچیں گے؟“ شانی نے پوچھا۔

”پہنچنے کی بات تو ابھی بہت دور کی ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ گاڑی کا سفر کتنا ہے؟“

”تقریباً ایک گھنٹہ۔“

وہ ایک گھنٹہ بے حد کٹھن تھا۔ جیپ خطرناک زاویوں سے دائیں بائیں جھکتی تھی اور آگے پیچھے بھی۔ اپنی نشست پر موجود رہنے کے لئے شانی نے بڑی مضبوطی سے ہینڈلز پر گرفت قائم کر رکھی تھی۔ جیپ کی رفتار بھی خاص تیز نہیں تھی۔ کسی وقت تو شانی کو لگتا تھا کہ اس

سواری سے پیدل چلنا بہتر ہے۔ ایک جگہ پر انہیں پہیہ تبدیل کرنا پڑا۔ ایک مقام پر پیچھے آنے والی گاڑی ایک کھڈے میں پھنس گئی۔ یوں انہیں متوقع وقت سے ایک گھنٹہ زیادہ لگ گیا۔ یہ بالکل سنسنان پہاڑ تھے۔ کہیں روشنی کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی تھی۔ جب مدھم چاندنی بدلیوں کی اوٹ میں چھپ جاتی تھی تو یہ لینڈ اسکیپ اور بھی ہیبت ناک ہو جاتے تھے۔

شانی سوچ رہی تھی اور اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ ''روشن بستیوں سے نکل کر یہ تم نے کہاں بسیرا کر لیا ہے رستم؟''

بالآخر جب دونوں گاڑیاں ٹیلوں کے درمیان ایک تھوڑی سی ہموار جگہ پر رکیں تو صبح صادق کی روشنی مشرقی افق سے پھوٹنا شروع ہو چکی تھی۔ مکھیا دراج، بلاول اور شانی جیپ سے باہر آ گئے۔ ہوا سرد تھی۔ شانی کو یہاں اور بھی سات آٹھ جیپیں اور لوڈر وغیرہ نظر آئے۔ یہاں دو خیمے لگے تھے۔ دو تین جگہ الاؤ بھڑک رہا تھا اور لوگ اس کے اردگرد بیٹھے تھے۔ یہ سب مسلح تھے۔ ان کے کندھوں پر رائفلیں دور ہی سے نظر آتی تھیں۔ وہ تینوں ڈپٹی ریاض کے عقب میں چلتے ہوئے ایک بڑے خیمے کی طرف آ گئے۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ خیمے پولیس والوں کے ہیں۔ باوردی پولیس اہلکاروں نے پتھریلی زمین پر کھٹاک کھٹاک سیلوٹ مار کر ڈپٹی ریاض کا استقبال کیا۔ ڈپٹی ریاض نے شانی، مکھیا دراج اور بلاول سے خیمے کے اندر چلنے کے لئے کہا۔ خود وہ دوسرے خیمے کی طرف چلا گیا۔

خیمے کے اندر کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ تین چار بستر بچھے تھے۔ پولیس اہلکاروں کی وردیاں اور دو رائفلیں بھی خیمے میں آویزاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک سب انسپکٹر انوار نے ان کا استقبال کیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ وہ عام پولیس والوں کے برعکس پڑھا لکھا اور قدرے شائستہ نظر آتا تھا۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ شاید پہلے سے تیار پڑے تھے۔ یہ سامانِ خورد و نوش ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ سب انسپکٹر انوار جلد ہی ان سے گھل مل گیا۔ انوار سمیت دیگر پولیس اہلکار بھی پُرتجسس نگاہوں سے شانی کو دیکھتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس کے کوائف سے آگاہ تھے اور غالباً یہ بھی جانتے تھے کہ رستم سیال کی روداد میں اس کا کیا کردار ہے۔ شانی نے خیمے کے اندر آ کر بھی نیلی چادر اپنے چہرے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی، اس نے چائے کا کپ بھی نقاب کے نیچے سے ہی ہونٹوں سے لگایا۔

بلاول احمد نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔ ''یہ آگ کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں...... میرے خیال میں یہ پولیس والے تو نہیں......؟''

انوار نے بلاول احمد کی تائید کی۔ ''یہ نارپور کے چوہدری اور ان کے کارندے وغیرہ ہیں۔ بڑے غصے میں یہاں پہنچے ہیں۔ آگے جانا چاہتے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے روکا ہے۔''

''آگے کہاں جانا چاہتے تھے؟'' شانی نے پوچھا۔

''رستم کی طرف۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں۔ جب جوش آتا ہے تو ہوش روانہ ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ پولیس رستم کے پیچھے جانے میں سستی کر رہی ہے۔ اس لئے یہ کام اپنے ذمے لینا چاہئے۔ ایک نشئے باز گائیڈ نے بھی ان کو بہکایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انہیں رستم کے ٹھکانے تک پہنچا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر کل ان کو روکا نہ جاتا تو ان میں سے بہت سے اب تک اللہ بیلی ہو چکے ہوتے یا سخت مصیبت میں ہوتے۔ یہ پہاڑیاں بالکل بھول بھلیوں کی طرح ہیں۔ انگریزوں کے زمانے سے یہ ویرانہ ڈاکوؤں اور مفروروں کا محفوظ ٹھکانہ رہا ہے۔ سو پچاس بندے تو یہاں یوں غائب ہو سکتے ہیں کہ ان کا نشان تک نہ ملے۔''

''اب یہ نارپوری کیا کہتے ہیں؟''

''کہنا کیا ہے، بس بیٹھے ہوئے ہیں، کہتے ہیں جب تک بڑا اور چھوٹا چوہدری رہا نہیں ہوتے یہاں ہی ڈیرہ ڈالیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ دیر رکیں گے نہیں۔ کل یا پرسوں تک ان کا راشن پانی ختم ہو جائے گا تو واپس چلے جائیں گے۔''

مکھیا دراج بولا۔ ''کہیں کسی اور طرف سے آگے جانے کی کوشت (کوشش) نہ کریں یہ لوگ؟''

''امید تو نہیں کہ ایسا ہوگا۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''آگے جانے کے دو تین ہی خاص رستے ہیں۔ وہاں ہم نے نظر رکھی ہوئی ہے لیکن پھر بھی اگر انہوں نے بے وقوفی کی تو خود ہی پچھتائیں گے۔''

اچانک کچھ فاصلے پر شور سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو کھلے آسمان تلے دو تین جگہ آگ بھڑکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب یہ بلند غصیلی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''دراج کتا!'' بہت سی دیگر آوازوں نے کورس کی شکل میں کہا۔ ''ہائے ہائے'' ایک بار پھر آواز گونجی۔ ''دراج کتا'' دیگر آوازوں نے اسی انداز میں ہائے ہائے کہا۔

مکھیا دراج بظاہر اطمینان سے بیٹھا رہا لیکن اس کی عقابی آنکھوں میں گہری سرخی اُتر آئی۔ بولا۔ ''نکڑی! میرا کھیال ہے کہ ان شہدوں نے مجھے پچھان لیا ہے۔ اب کھوتوں جیسی آوا جیں نکال نکال کر اپنی اوکات بتا رہے ہیں۔''

انسپکٹر انوار جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی ان کی بولتی بند کرواتا ہوں۔“

”انسپکٹر صاحب! کسی سے غصہ نہیں کرنا۔ آرام سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔“ شانی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

سب انسپکٹر باہر چلا گیا۔ بلاول احمد نے کہا۔ ”لگتا ہے صرف کھیا کو پہچانا ہے ان لوگوں نے۔ ورنہ ہماری عزت افزائی بھی ضرور شروع ہو جاتی۔“

شانی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ کھیادراج نے اپنی لاڈلی کلاشنکوف پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کھوتا جو سب سے اونچی آواز میں بول رہا ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ چوہدریوں کا کرائے کا ٹٹو ہے۔ اس ٹٹو کی تو ایسی کھمبر لوں گا کہ جندگی بھر روتا رہے گا۔“ شانی نے ذرا کڑی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”ابھی نہیں نکڑی، ابھی نہیں۔ پھر کسی وکت کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو وہی ہوگا جو تُو کہے گی۔“

تھوڑی ہی دیر بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ پولیس والوں کے للکارے گونجے اور غصیلی آوازیں خیموں سے دور چلی گئیں۔

چائے اور بسکٹوں کا ناشتہ ان کے جسموں میں تھوڑی سی توانائی لے آیا تھا۔ ابھی اندھیرا چھٹا نہیں تھا کہ وہ لوگ اس پڑاؤ سے آگے روانہ ہو گئے۔ دیہاتی طرز کی ایک ڈولی لائی گئی۔ ڈولی کے درمیان میں سے ایک لمبا بانس گزرتا تھا۔ دو بڑی چادروں کے ذریعے ڈولی کو ڈھانپا گیا تھا، ڈولی خیمے کے دروازے کے عین سامنے رکھ دی گئی۔ ڈپٹی ریاض تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا اور شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چل اٹھ جا بھئی۔ تیری سواری آ گئی ہے۔“

”لیکن...... میں پیدل......“

”جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔“ ریاض نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ”رستے میں کسی کے کندھوں پر چڑھنا پڑے گا تو پھر شرم آئے گی تجھے۔“ اس کے نارمل لہجے میں بھی تیز کاٹ چھپی رہتی تھی۔

شانی ڈولی میں بیٹھ گئی۔ ڈولی میں بیٹھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ دو بانسوں والی ڈولیاں دیکھتی تھی جنہیں چار کہار اٹھاتے تھے۔ یہ ایک بانس والی تھی اسے دو کہاروں نے اٹھانا تھا۔ تاہم یہ دونوں کہار غیر معمولی طور پر ہٹے کٹے اور مضبوط تھے۔ انہوں نے پوٹھوہاری طرز کی شلواریں اور شلوکے پہن رکھے تھے۔ ڈولی میں ٹھنڈے پانی کے تھرماس

اور بسکٹوں کے دو ڈبے پہلے سے رکھے تھے۔ آٹھ دس افراد پر مشتمل یہ قافلہ آگے جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ڈپٹی ریاض ساتھ نہیں جا رہا تھا اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا۔ ڈپٹی ریاض کی موجودگی اردگرد کے ہر نفس کو سہمائے رکھتی تھی، وہ خود بڑی غلیظ اور شعلہ بار زبان بولتا تھا۔ یہ زبان کم از کم خواتین کے سننے کے لائق تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ جان کر کہ ریاض اب آگے نہیں جا رہا، شانی سمیت یقیناً کئی افراد نے بھی اطمینان کی سانس لی تھی۔ وقتِ رخصت ڈپٹی ریاض ہٹلر نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں شانی کو کچھ مزید ہدایات دیں اور پھر روانہ کر دیا۔

دونوں تنومند پوٹھوہاریوں نے ڈولی اٹھائی تو شانی کو ایک عجیب جھولتا، ہلکورے لیتا ہوا احساس ہوا۔ دشوار راستوں پر ان کا سنسنی خیز سفر شروع ہو گیا۔ دھیرے دھیرے دن کی روشنی قرب و جوار کو نمایاں کرنے لگی۔ شانی نے اپنے اردگرد ٹیلوں، گھاٹیوں اور کھائیوں کے لامتناہی سلسلے دیکھے۔ اسے کئی جگہ جنگلی بیری، پیلو اور کھباڑی کے درخت نظر آئے۔ پہاڑیوں میں نظر آنے والی دراڑیں اور کھوہیں تجسس کو ابھارتی تھیں اور ذہن میں سوال پیدا کرتی تھیں۔ کہار بڑی مشاقی سے ڈولی کو ٹیڑھی میڑھی راہوں پر درمیانی رفتار سے اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ دو کہار اور بھی تھے۔ وہ سب سے آخر میں آ رہے تھے۔ انہیں پہلے کہاروں کے تھکنے کے بعد ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔ مکھیادراج اور بلاول احمد ڈولی کے پہلو میں چل رہے تھے اور کبھی کبھی شانی سے بات بھی کر لیتے تھے۔ سب انسپکٹر انوار اور اس کے پانچ ماتحت سادہ کپڑوں میں اس قافلے کے ہمراہ تھے۔ ان لوگوں کے پاس جدید اسلحہ اور وائرلیس موجود تھے۔ پروگرام کے مطابق ان لوگوں کو ایک خاص حد تک پہنچ کر واپس آ جانا تھا۔

شانی کا ذہن خیالات کے تانے بانے میں الجھا تھا۔ رستم سے دوبارہ ملنے کا خیال ایک دم اس کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔ وہ پچھلے چند دنوں میں سینکڑوں مرتبہ سوچ چکی تھی کہ رستم کس کیفیت اور کس حال میں ہوگا۔ وہ اس سے کس طرح بات کرے گا۔ اس کا رویہ کیسا ہوگا؟ وہ اپنا مدعا کیسے اس تک پہنچائے گی اور اگر رستم نے انکار کیا تو کس لہجے میں کن الفاظ میں اصرار کرے گی۔ اصرار کر بھی سکے گی یا نہیں؟ اس انداز میں سوچتے ہوئے کسی وقت عجیب سا خوف بھی اس کے سینے میں لہریں لینے لگتا تھا، اخبارات میں جو خبریں آ رہی تھیں اور لوگ جس طرح کی باتیں کر رہے تھے، ان سے یوں لگتا تھا کہ رستم شدید ہیجانی کیفیت کا شکار ہو چکا ہے۔ مہتم بستی چھوڑنے کے بعد ایک جنون کی سی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے تبدیل ہوا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مہتم بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے اس نے جو خونی واردات کی تھی وہ اس کی اس ہیجانی بلکہ جنونی کیفیت کی طرف

اشارہ کرتی تھی۔ اکٹھے چار افراد کے قتل نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا تھا۔ زیادہ سنسنی خیز بات یہ تھی کہ ان چار مقتولوں میں سے تین پولیس والے تھے۔

رستم کے بارے میں سوچتے سوچتے شانی کے ذہن میں تینوں مغویان یعنی تاؤ حشام، اس کے بیٹے راجو اور ان کے نوکر کا خیال آنے لگا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ تاؤ حشام نے اپنی حویلی میں جو کچھ شانی کے ساتھ کیا تھا وہ آتشیں میخوں کی طرح شانی کے ذہن میں گڑا ہوا تھا۔ اسے بے دردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی توہین کی گئی تھی۔ بعدازاں تاؤ حشام نے اسے ایک زرخرید نوکرانی کی حیثیت سے اپنے بیٹے کے حوالے کر دیا تھا۔ بیٹے کو علی الاعلان اس حقیقت سے آگاہ کیا تھا کہ یہ نوکرانی اس کے استعمال کی چیز ہے۔ وہ اس نوکرانی سے جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ تاؤ حشام کے بیٹے کا خیال آتے ہی اس کی شکل شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگی اور پھر وہ اندھیری رات بھی اس کی نگاہوں میں گھوم گئی جب ایک بند کمرے میں تاؤ کا نوعمر بیٹا اسے انوکھے روپ میں نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس نے بڑی بے باکی سے شانی کو بے لباس ہونے کا حکم دیا تھا۔ شانی شدید غضب کے عالم میں اس پر پل پڑی تھی اور مار مار کر اسے بے حال کر دیا تھا اور پھر شانی کے علم میں تاؤ کے بیٹے کی وہ رومانی کہانی آئی جو ابھی تک شانی کے ذہن میں نقش تھی۔ تاؤ کا نوعمر بیٹا راجو کسی سے پیار کرتا تھا اور یہ کوکب نامی وہی لڑکی تھی جس کے ''محبوب'' کو ڈھونڈنے کے لئے کوتاہ قد ڈولا دربدر پھر رہا تھا۔ ڈولے کا خیال آتے ہی اس کی شباہت اور ساری حرکات و سکنات بھی شانی کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ شانی کو ابھی تک علم نہیں ہو سکا تھا کہ ڈولا کہاں اور کس حال میں ہے۔ راجو اور ڈولے سے شانی کی آخری ملاقات کئی ماہ پہلے تاؤ کی منحوس حویلی میں ہی ہوئی تھی۔ راجو اور کوکب کے رومانی معاملات جاننے کے بعد شانی کے دل میں خواہش جاگی تھی کہ کاش وہ ان دونوں کے لئے کچھ کر سکے لیکن پھر اچانک ہی حالات کی آندھی اسے اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی۔

اب وہ ایک بار پھر تاؤ حشام اور راجو کے قریب جا رہی تھی۔ وہ ان کے حالات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

ڈولی کے پہلو میں چلتے ہوئے کھیاوراج کی آواز آئی۔ اس نے شانی کو مخاطب کرتے ہوئے ہولے ہولے سے کہا۔ ''میرا کھیال ہے نکڑی! کوئی ڈیرہ آ گیا ہے، یہاں تالاب بھی ہے... بندوکڑیوں والے بھی نجر آ رہے ہیں۔''

شانی نے ڈولی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا یہ جگہ ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ ایک

چٹان ان ٹیلوں میں زیادہ بلندی تک چلی گئی تھی۔ سامنے ہی کسی غار کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ بلاول احمد نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسی جگہ کو اگلا ڈیرہ کہا جاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو'' کھیاوراج نے تائید کی۔ ''آپاں (ہم) نے اگلے ڈیرے کی جو نشانیاں سنی ہوئی ہیں وہ یہی ہیں۔''

کچھ دیر بعد ڈولی پتھریلی زمین پر رکھ دی گئی۔ یہ دس گیارہ بجے کا وقت تھا، دھوپ جسم میں چبھ رہی تھی۔ بلاول احمد نے ڈولی کے دونوں طرف کے پردے اٹھائے۔ ہوا کی آمدورفت سے شانی کو قدرے سکون محسوس ہوا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس مقام پر کافی تعداد میں باوردی پولیس اہلکار موجود تھے۔ دو اونچی جگہوں پر ہیوی مشین گنیں بھی رکھی تھیں۔ ان گنوں پر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ غار کے اندر بھی لوگ موجود تھے۔ شاید وہاں کھانا پکایا جا رہا تھا۔

سب انسپکٹر انوار نے شانی کے پاس آ کر کہا۔ ''آئیں جی ! آپ کھوہ کے اندر چلیں۔ تھوڑی دیر آرام کر لیں اور کھانا شانا کھا لیں، پھر آپ کے سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہو گا۔''

شانی باہر نکل آئی۔ بیٹھ بیٹھ کر اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ وہ غار میں پہنچی۔ ایک حصے میں چادریں وغیرہ تان کر اسے باقی غار سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں باقاعدہ گدے بچھے تھے اور تکیے وغیرہ رکھے تھے۔ ''یہاں سے اور کتنا سفر باقی ہے؟'' شانی نے سب انسپکٹر سے دریافت کیا۔

''تقریباً 30 گھنٹے کا سفر ہے...... اور یہ سفر آپ کو پیدل کرنا ہو گا۔ ڈولی بھی دو تین کلومیٹر سے آگے نہیں جا سکتی۔ اب دو طریقے ہیں۔ ایک تو آپ کھانا وغیرہ کھا کر یہاں سے روانہ ہو جائیں اور راستے میں ٹوپا نامی جگہ پر رات گزار لیں یا پھر رات یہیں رہیں اور صبح منہ اندھیرے نکل جائیں۔''

''راستہ دکھانے کے لئے کون ہو گا ہمارے ساتھ؟'' شانی نے پوچھا۔

انوار نے ایک کالے بھجنگ کہار کی طرف اشارہ کیا جس کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح تھیں۔ ''اس کا نام جاجی بھا ہے۔ یہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر جاجی آپ کے ساتھ نہ بھی ہو تو آپ نے آسانی سے منزل پر پہنچ جانا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''رستم، حسنا اور لالہ وغیرہ کی سی آئی ڈی بڑی تیز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان ٹیلوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ جان گئے ہیں کہ ہم کتنے ہیں، کون کون ہیں اور کس مقصد کے

لئے آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کے مخبر علاقے میں موجود ہیں اور وائرلیس کے ذریعے ان سے رابطہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دستی پیغامات بھی پہنچائے جاتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ رستم نکڑی کے بارے میں جان گیا ہوگا؟'' دراج نے پوچھا۔

''سو فیصد'' سب انسپکٹر انوار نے جواب دیا۔ ''جب آپ یہاں سے محفوظ علاقے پر پہنچ جائیں گے تو لالہ اور رستم کے ساتھی خود آپ کو لینے پہنچ جائیں گے اور اگر آپ کے سامنے نہ بھی آئیں تو آپ کے اردگرد ضرور موجود رہیں گے۔ پھر جب وہ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے آنے میں کسی طرح کا خطرہ نہیں تو آنکھ مچولی ختم کر دیں گے۔''

''لیکن اگر یہاں گھومتے ہوئے کسی اور آوارہ گرد یا آوارہ گردوں سے واسطہ پڑ گیا تو پھر؟'' شانی نے پوچھا۔

''ایسا نہیں ہوگا'' انوار نے اعتماد سے کہا۔ ''سمجھو کہ اس سے آگے لالہ اور رستم وغیرہ ہی کی عملداری ہے۔''

''او ہو تو کسی طرح کا پھکر نہ کر نکڑی! آپاں جو تیرے ساتھ ہیں۔ کسم پیدا کرنے والے کی، تجھے تتی ہوا نہیں لگنے دیں گے۔'' دراج اپنی چوڑی چھاتی کو خود ہی تھپتھپا کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں محبت آمیز خلوص کی متاثر کن چمک تھی۔

مشورے کے بعد شانی نے فیصلہ کیا کہ خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کیا جائے اور کھانا کھا کر ابھی روانہ ہوا جائے۔

کھانے میں تازہ روٹی، چاول اور مارخور کا گوشت شامل تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کے خانساماں نے بالکل چھوٹے سائز کی مچھلیاں بھی پکائی تھیں۔ انہیں یونگ کہا جاتا تھا۔ شانی نے سب انسپکٹر انوار کے اصرار کے باوجود بس چند لقمے لئے۔ کھانے کے دوران میں اس کی نگاہ اسی بلند چٹان پر پڑی جو یہاں پہنچتے ہی دکھائی دی تھی۔ یہ عجیب وضع چٹان ایک دم نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ سب انسپکٹر انوار نے شانی کو چٹان کی طرف متوجہ دیکھا تو بولا۔ ''یہ بڑی خاص چٹان ہے۔ جن دنوں اس ڈیرے پر ڈاکوؤں کا تسلط تھا ایک جوان گوجری نے یہاں سے کود کر اپنی جان دے دی تھی۔ ڈاکو اس چٹان کے ساتھ والے ٹیلے کو مچان کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ یہاں سے دوربین کے ذریعے دور دور تک نظر رکھتے تھے۔ بعض اوقات یہاں سے فائرنگ بھی کی جاتی تھی۔''

''اب بھی کوئی چٹان پر موجود تو ہے۔'' بلاول احمد نے کہا۔

''اب یہ پولیس کا بندہ ہے۔ اردگرد نظر رکھے ہوئے ہے۔''

''ڈاکو یہاں سے کب گئے؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ تقریباً تین سال پہلے تک وہ یہاں موجود تھے۔ پھر دو تین بار پولیس یہاں تک پہنچی اور اس سے ان لوگوں کی جھڑپ ہوئی۔ آہستہ آہستہ وہ یہ ڈیرہ چھوڑ کر آگے نکل گئے لیکن اب بھی کبھی کبھار کوئی ٹولی یہاں وارد ہو جاتی ہے۔ بلکہ چند ماہ پہلے جب رستم بھی فرار ہو کر یہاں پہنچا تو اس نے ایک دن یہاں گزارا۔ سنا ہے کہ یہاں اپنے ایک ساتھی گوہرا کے ساتھ اس کی زوردار لڑائی بھی ہوئی تھی۔'' رستم کے ذکر نے شانی کے جسم میں کرنٹ سا دوڑا دیا۔

انوار اور بلاول وغیرہ باتیں کرتے رہے۔ شانی چور نظروں سے ان درودیوار کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ رستم ان گنت مرتبہ یہاں آ چکا ہوگا۔ بسیرا کر چکا ہوگا۔ اس کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ کسی وقت وہ خود سے ہی الجھنے لگتی تھی، سوچتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لاشعوری طور پر رستم کو دیکھنا چاہتی ہے، اس سے ملنا چاہتی ہے اور اسی لئے یہ دور دراز کا سفر کر رہی ہے۔

لیکن فوراً دوسرا خیال اس پر غالب آ جاتا تھا ....نہیں ایسا نہیں ہے.... وہ کمزور لمحہ گزر چکا ہے جب وہ اپنی زندگی کو رستم سے منسوب کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ وہ ایک جذباتی لمحے کا ناپائیدار فیصلہ تھا۔ اب وہ اور رستم دو مختلف راستوں کے راہی ہیں۔ دلوں کے موسم اپنی جگہ ہیں اور وہ رہیں گے لیکن باہر کی رُت حتمی جدائی کی رُت ہے۔

کھانے کے فوراً بعد وہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب اس سے آگے کا سفر انہیں پولیس کے تحفظ کے بغیر کرنا تھا۔ فقط جاجی ان کے ساتھ تھا۔ پھر بھی کچھ دور تک چند پولیس اہلکاران کے ساتھ رہے۔ تقریباً دو کلومیٹر تک آنے کے بعد مسلح پولیس اہلکار واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے سامان کے دو تھیلے انہوں نے دراج اور بلاول احمد کو تھما دیئے تھے۔ ان میں کھانے کا سامان، پانی کے تین گیلن اور گرم چادریں وغیرہ تھیں۔ ان کے علاوہ تین ٹارچیں، فرسٹ ایڈ اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل بھی سامان کا حصہ تھی۔ اب دراج اور بلاول دونوں رائفل سے مسلح تھے۔ دراج کے کمربند میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ جاجی کے پاس سرکنڈے کاٹنے والا ایک لمبا چھرا تھا جو دراج نے اسے دیا تھا۔ اس کے علاوہ چمکیلے کوکوں والی ایک نہایت مضبوط لاٹھی بھی اس کے پاس تھی۔ اس لاٹھی کے بالائی سرے پر ایک خم دار چھری فکس کی جا سکتی تھی۔

شام سے ذرا پہلے وہ اگلے ڈیرے سے تقریباً بارہ کلومیٹر دور آ چکے تھے۔ شانی کا تھکن

سے بُرا حال تھا لیکن وہ اپنی حرکات وسکنات سے اس تھکن کو ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

جاجی سب سے آگے جا رہا تھا۔ وہ اپنی لاٹھی کو ٹیکتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ وہ بے حد سخت جان اور کسی حد تک خاموش طبع شخص تھا۔ گاہے بگاہے وہ ماہیے کی طرز پر کچھ گانے بھی لگتا تھا۔ اس کی آواز بھاری لیکن سُر میں تھی۔

ہتھ وچ پا لنک نے
اوڈھولا نئیں ملدا مرضی دا مالک نے
ساوا گھا ہوسی
روز قیامت عادل آپ خدا ہوسی
ہتھ وچ چھج ماہیا
دیدن سجناں دا، مکے داحج ماہیا

اچانک جاجی کی آواز تھم گئی۔ وہ خود بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے پیچھے دراج، بلاول اور شانی بھی رک گئے۔ وہ اپنے سے صرف دو تین قدم کے فاصلے پر بڑے دھیان سے کسی شے کو دیکھ رہا تھا۔ کھائی سے گزرنے والے اس راستے پر تھوڑی بہت دھول بھی موجود تھی اس دھول میں شانی کو کچھ بھی نظر نہیں آیا، مگر جاجی کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی لاٹھی کو بڑی احتیاط سے سونتا، سانس روک کر اسے سُر سے بلند کیا اور پھر بڑی پھرتی اور مہارت سے کسی شے پر دے مارا۔ یہ دیکھ کر شانی کا منہ کھلا رہ گیا کہ ایک تقریباً چار فٹ لمبا سانپ اچھل کر ایک طرف گرا اور دو چار بار اینٹھ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جاجی کی لگائی ہوئی ضرب نے سانپ کا سر اس بُری طرح کچلا تھا کہ وہ دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون مٹی اور ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ سانپ کے گہرے بھورے جسم پر زرد دائرے سے نظر آ رہے تھے۔

جاجی نے کہا۔ ''یہ بہت خطرناک سانپ ہے جی۔ اسے کریٹ کہا جاتا ہے لیکن عام دیہاتی اسے سنگ چُور کہتے ہیں۔''

''لیکن..... یہ ایک دم آ کہاں سے گیا؟'' بلاول احمد نے حیرت سے کہا۔

''آ نہیں گیا جی۔ یہ ہمارے سامنے ہی تو تھا۔ میرا ایک قدم اور اٹھتا تو پاؤں اس پر پڑ جاتا۔ اصل میں یہ خود کو مٹی دھول میں اس طرح چھپاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔''

جاجی نے لاٹھی کی مدد سے سانپ کو الٹا پلٹا اور بولا۔ ''یہ مادہ ہے جی۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔''

شانی ایک طرف سمٹ کر کھڑی تھی۔ بلاول اور دراج وغیرہ سانپ کو بغور دیکھ رہے تھے اچانک شانی کی نگاہ کھیا دراج کے عقب میں گئی۔ خودرو درختوں میں ایک پرچھائیں سی نظر آئی۔ کسی شخص نے الٹی کلہاڑی سے بلاول کے سر پر وار کیا۔ ایک ثانیہ پہلے بلاول کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے ایک طرف سمٹا۔ کلہاڑی اس کے سر پر لگنے کی بجائے کندھے پر لگی اور وہ دو چار قدم لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ایک دوسرے شخص نے دراج کو عقب سے اپنے چھپے میں جکڑنا چاہا لیکن شاید اس نے اس کام کے لئے غلط بندے کا انتخاب کیا تھا۔ بے پناہ جسمانی طاقت والے دراج نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ خود کو گھمایا اور عقب میں موجود فرد کو ایک درخت سے دے مارا۔ درخت کی چوٹ کھانے کے باوجود نووارد نے دراج کو نہیں چھوڑا تو دراج پشت کے بل پتھریلی زمین پر گر گیا۔ یہ دوسری چوٹ عقب میں موجود حملہ آور کے لئے کارگر ثابت ہوئی۔ اس کی گرفت دراج پر سے ختم ہو گئی۔ دراج نے گھوم کر اسے نیچے لے لیا اور بُری طرح مارنے لگا۔

حملہ آوروں کی تعداد چار تھی۔ انہوں نے گہری رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھیں۔ تیسرے حملہ آور نے رائفل سیدھی کی اور بے دریغ دراج کو نشانہ بنانا چاہا۔ اگر وہ گولی چلا دیتا تو یہ یقیناً دراج کی پشت پر لگتی۔ شانی نے بے تاب ہو کر رائفل پر جھپٹا مارا اور رائفل کا رخ تبدیل ہوا اور اس کے ساتھ ہی فائر بھی ہوا۔ گولی پتھر میں لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک حملہ آور بھی اپنی ٹانگ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

رائفل بردار نے بھنا کر شانی پر چڑھائی کی اس کی ٹانگ شانی کے کولہے پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر سنگریزیوں پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار وحشیانہ انداز میں اس پر جھپٹتا دراج اپنے مقابل سے فارغ ہو کر رائفل بردار کے سامنے آ گیا۔ دراج کے سر کی انتہائی خوفناک ٹکر رائفل بردار کے سینے پر لگی۔ دونوں پتھروں پر گرے۔ دراج نے کسی ماہر پہلوان کی طرح اپنے حریف کو نیچے لیا اور اس کی رائفل کو یوں جکڑا کہ وہ بے کار ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف بلاول بھی اپنے مدمقابل کو سنبھال چکا تھا۔ اس کا مدمقابل ایک جھاڑی کی شاخوں میں پھنس گیا تھا۔ بلاول نے اسے گردن سے دبوچا ہوا تھا اور اس کی ناف میں گھٹنے رسید کر رہا تھا۔ ایک حملہ آور تو زخمی ٹانگ کے سبب پتھریلی زمین پر لوٹ پوٹ تھا مگر چوتھے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ نیچے تقریباً چودہ پندرہ فٹ گہری کھائی میں گرا پڑا ہے۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ لڑائی دراج اور بلاول احمد جیت چکے

تھے۔مگراس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قطعی طور پر غیر متوقع تھا۔دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں اور اچانک آٹھ کے قریب افراد رائفلوں اور کلہاڑیوں سے مسلح موقع پر پہنچ گئے یہ بھی پہلے حملہ آوروں کے ساتھی دکھائی دیتے تھے۔انہوں نے آتے ہی ہوائی فائر کئے شام کے جھٹپٹے میں شعلے سے لپکے اور ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔دوافراد نے اپنی خودکار رائفلیں کھیا دراج کے سر سے لگادیں۔دو ہٹے کٹے افراد نے بلاول کو اس کے مدمقابل کے اوپر سے کھینچ لیا اور ہٹا کر پیچھے لے گئے۔

جس شخص کی پنڈلی زخمی ہوئی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے زخم کو دبا رکھا تھا اور وہیں پر پڑا ہوا تھا۔اس سارے ہنگامے میں جاجی اپنی لاٹھی سمیت بے تعلق ہی کھڑا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اندازہ ہوا کہ نئے آنے والوں کا رویہ شانی دراج وغیرہ کے ساتھ دوستانہ ہے۔اب وہ پہلے افراد کو غصیلی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان سے سوالات کر رہے تھے۔ان کی دونوں رائفلیں اور ایک کلہاڑی بھی نئے آنے والوں نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔یہ سب افراد بھی شلواروں قمیصوں میں تھے۔داڑھیاں بڑھی ہوئی،چہروں پر دھول۔وہ سب کے سب آتشیں یا تیز دھار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ان میں سے ایک دراز قد شخص سرکردہ لگتا تھا۔اسے یہ لوگ دلاور کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔دلاور کے اشارے پر دوافراد شانی،دراج اور بلاول کو لے کر کچھ فاصلے پر ایک پتھر کی اوٹ میں چلے گئے۔چند افراد نیچے تاریک کھائی میں اُترے اور زخمی شخص کو اوپر لے آئے۔وہ بے ہوش نظر آتا تھا۔ٹارچوں کی روشنی میں اس کے زخم وغیرہ دیکھے گئے۔کئی افراد آپس میں تلخ کلامی بھی کر رہے تھے۔ صورت حال الجھی ہوئی نظر آتی تھی۔

دراج نے شانی سے پوچھا۔"نکڑی! تجھے کہیں چوٹ شوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں بس معمولی سی کمر پر لگی ہے لیکن بلاول کو کافی زور سے رائفل لگی ہے۔"

بلاول احمد نے کندھا دباتے ہوئے کہا۔"نہیں کچھ زیادہ نہیں۔" پھر وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔"اگر آپ رائفل پر جھپٹا نہ مارتیں تو سردار کو گولی لگ جانی تھی۔"

کھیا دراج نے ستائشی نظروں سے شانی کو دیکھا۔شاید وہ کچھ کہتا لیکن اس سے پہلے شانی بول اٹھی۔"ہم کہاں پھنس گئے ہیں دراج!یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھ کو لگتا ہے کہ ہم پھنس گئے تھے لیکن اب نکل آئے ہیں۔" دراج بولا۔

"کیا مطلب؟"

"اندازا ہو رہا ہے کہ یہ جو دوجی پارٹی پہنچی ہے رستم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے

ہے۔"

"اور پہلے کون تھے؟" بلاول احمد نے پوچھا۔

"ہوں گے کوئی اٹھائی گیرے۔اتنا بڑا الاقا ہے۔کئی طرح کے چور لپھنگے یہاں پھرتے ہوں گے۔"

بلاول احمد نے قریب کھڑے رائفل بردار کو آواز دے کر پوچھا۔"بھراجی!یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟"

"دومنٹ جی......ابھی سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔"

اور واقعی دومنٹ میں سب کچھ کلیئر ہو گیا۔یہ جرائم پیشہ افراد کی ٹولی تھی (یعنی چار افراد کی ٹولی) پولیس سے چھپتی چھپاتی اور وارداتیں کرتی اس طرف آنکلی تھی۔بعد میں آنے والے افراد کا تعلق اس ویرانے کے اصل "مالکوں" یعنی لالہ اور اس کے گینگ سے تھا۔ان لوگوں کو بذریعہ وائرلیس سیٹ اس امر کی اطلاع تھی کہ اگلے ڈیرے سے کچھ لوگ وڈے ڈیرے کی طرف آرہے ہیں اور ان کی حیثیت رستم سیال کے خاص مہمانوں کی ہے۔پچھلے آدھ گھنٹے سے گینگ کے بندے شانی دراج وغیرہ کے آس پاس موجود تھے۔

آوارہ گردوں کو پکڑ کر ان کی مشکیں کس دی گئیں۔کھائی میں گرنے والا شخص بھی اب ہوش میں آچکا تھا۔اس کے سر کندھوں پر گہری چوٹیں آئی تھیں۔اس کی کمر سے گولیوں کی بیلٹ کے علاوہ ایک تھیلا بھی بندھا تھا۔اس تھیلے میں پانچ چھ شکار شدہ پرندے تھے۔ٹارچوں کی روشنی میں دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ پرندہ سسی ہے۔انہیں غلیل سے مارا گیا تھا۔ایک دوسرے شخص کے پاس بہت سی فلم ایکٹرسوں کی عریاں تصویریں تھیں۔اس کے علاوہ ایک واک مین بھی اس سے برآمد ہوا۔

دلاور نامی شخص نے اپنے بارہ بندوں میں سے چھ کو ان بندھے ہوئے افراد کے پاس چھوڑا اور خود شانی کے سامنے آکر ازحد احترام سے بولا۔"بی بی صاحبہ!ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں سمجھی نہیں۔" شانی نے چہرے پہ چادر کا نقاب درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں لالہ اور رستم صاحب نے اس طرف بھیجا تھا۔ان کو ڈر تھا کہ کہیں آپ راستہ نہ بھولیں یا پھر رستے میں کسی طرح کا مسئلہ نہ بنے۔جیسا کہ اب بن بھی گیا تھا۔"

"خیر ان شہدوں کو تو ہم سنبھال ہی چکے تھے۔" بلاول احمد نے کہا۔

"بالکل جی!یہ آپ کی ہمت ہے۔اس کی داد دینی پڑتی ہے لیکن پھر بھی ہمیں خوشی ہے

کہ ہم موقع پر پہنچے اور آپ کا ساتھ دیا۔"

"اوئے ساتھ تم نے چھنکنا دیا۔" دراج مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "ساتھ تو تم نے ان کا دیا جن کو آپاں کے پیچھے سے نکال کر ان کی جندڑی بچائی۔"

دلاور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اسے چپ دیکھ کر دراج نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور دلاور کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ "نہیں بھئی نہیں۔ میں مجاک کر رہا تھا۔ تم بالکل موکے پر پہنچے ہو۔"

دلاور مسکرانے لگا اور اس کے ساتھی بھی۔

"ان لوگوں کا اب کیا کرنا ہے؟" بلاول احمد نے راہزنوں کے بارے میں پوچھا۔

"یہ ہم پر چھوڑ دیں جی..." دلاور ادب سے بولا۔ "ایسے کئی ٹٹوؤں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنے کے بعد ان کو چھوڑ دیں گے جہلم سائیڈ پر۔"

"جس کو گولی لگی ہے اس کا کیا ہوگا؟" شانی نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی! گولی ماس پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ خون بند کر دیا ہے ہم نے۔" دلاور نے کہا۔ شانی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد مؤدب ہو جاتا تھا اور بات صرف دلاور ہی کی نہیں تھی باقی مسلح افراد بھی گردنیں جھکائے نگاہیں زمین میں گاڑھے کھڑے تھے۔ شاید وہ شانی کی سمت دیکھنا بھی ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔

"لالہ اور رستم یہاں سے کتنے فاصلے پر ہوں گے؟" شانی نے پوچھا۔

"ابھی بہت فاصلہ ہے بی بی صاحبہ... ہمیں ٹوپا نام کی جگہ پر رات گزارنا ہوگی۔ صبح سویرے پھر چلنا پڑے گا۔ ہم نے تو بڑا مشکل، شارٹ کٹ لگایا ہے اس لئے جلدی پہنچے ہیں۔"

دلاور کے ساتھی باندھے گئے افراد کی جیبوں کی تلاشی لے رہے تھے اور ہر کام کی چیز نکال کر اپنی جیبوں میں منتقل کر رہے تھے۔

دلاور نے انہیں کچھ ضروری ہدایات دیں اور شانی وغیرہ کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔

انہوں نے رات تقریباً دس بجے تک سفر کیا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ان ہیبت ناک گھاٹیوں کا سفر بے حد دشوار اور سنسنی خیز تھا۔ دراج اور حاجی شانی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بلال احمد عقب میں تھا اس نے اپنا مضروب کندھا مسلسل ایک ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔

جب وہ ٹوپا نامی جگہ پر پہنچے تو تھکن سے بے حال تھے۔ یہاں دو افراد پہلے سے موجود

انہوں نے ایک چٹانی سائبان کے نیچے آگ جلا کر چائے بنا رکھی تھی۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لئے جو شے میسر تھی وہ بھنے ہوئے چنے اور گڑ تھا۔ شانی نے تھوڑے سے چنے لئے اور پانی پی کر ایک دری پر لیٹ گئی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ حشرات الارض، وسوسوں اور خطروں سے بھرے ہوئے اس تاریک ویرانے میں بھی شانی کو نہ جانے کب نیند آ گئی۔ سونے سے پہلے بس اسے اتنا احساس ہوا تھا کہ بلاول احمد اپنی عقابی آنکھوں کے ساتھ اور دراج اپنی چوڑی چھاتی کے ساتھ اس کے آس پاس موجود ہیں۔

اگلے روز صبح سویرے ان کا سفر پھر شروع ہوا۔ گھاٹیاں دشوار اور راستے مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ دلاور کے سارے کے سارے ساتھی شانی کے سامنے بے حد مؤدب تھے۔ اونچی آواز میں بولتے تک نہیں تھے۔ جیسے وہ سارے ادنیٰ غلام ہوں اور ایک ذی وقار شہزادی ان کے جلو میں سفر کر رہی ہو۔ پتا نہیں کہ کس نے انہیں اس قدر مؤدب رہنے کا کہا تھا یا پھر وہ اپنے طور پر ہی شانی کو اتنا پروٹوکول دے رہے تھے۔ ان نشیب و فراز اور بھول بھلیوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں ڈاکوؤں کے تعاقب میں یہاں آنے سے کیوں کترا رہی ہیں۔

رات کے تقریباً نو بجے کا وقت تھا جب وہ لوگ ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئے۔ دلاور کے ساتھیوں نے پہلے شانی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ معذرت کی پھر ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ دیں۔ تاہم شانی کو اس پابندی سے آزاد رکھا گیا (راستے میں بھی ایک مقام پر پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ اس وقت بھی شانی کے ساتھ رعایت برتی گئی تھی) جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں انہیں ایک ایک فرد نے سہارا دے دیا۔ چند پیچ دار راستوں کے سفر کے بعد وہ لوگ کھلی جگہ پر آ گئے، شانی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی [illegible] آنے والا ہے۔ اب کچھ ہی دیر بعد وہ اور رستم چار ماہ کے طویل عرصے کے بعد آمنے سامنے ہوں گے۔ وہ کیسے اس کی نگاہوں سے نگاہ ملائے گی، کیسے اس کا سامنا کرے گی۔ وہ تو بے وفا ہے۔ وہ تو اسے شدید ترین خطرات میں تنہا چھوڑنے والی ہے... جب رستم بستی میں وہ ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا تھا، پولیس اسے تر لقمہ بنانا چاہ رہی تھی، وہ ایک طرف ہو گئی تھی۔ اب جب وہ مضبوط تھا اور پولیس کو تگنی کا ناچ نچا رہا تھا۔ وہ پولیس ہی کی خواہش پر اپنی کچھ باتیں منوانے کے لئے اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ کیوں کر رہی ہے ایسا؟ اسے کیا حق پہنچتا ہے ایسا کرنے کا؟ وہ سوچتی رہی اور اس کے قدم لرزتے رہے۔

☆======☆======☆

رستم اپنے کمرے سے باہر ایک ہموار چٹان پر بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے ملائم بال جنوبی ہوا میں ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ اس کے شفاف دانتوں میں گھاس کا ایک تنکا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ دو دن پہلے اسے ''سیٹ'' پر نظام کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ شانی مہتم بستی کے سردار دراج اور عارف کمبوہ کے قریبی ساتھی بلاول کے ساتھ جیپ میں سوار پوٹھوہاری علاقے میں داخل ہوئی ہے۔ یہ لوگ کسی خاص مشن پر نظر آتے ہیں۔

بعد میں کوئی بارہ گھنٹے بعد نظام نے دوسری مرتبہ وائرلیس رابطہ قائم کیا۔ اس بار نظام نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ شانی بی بی اور ان کے تین ساتھی اگلے ڈیرے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں وہ تھوڑی دیر قیام کریں گے۔ بعد ازاں وہ پولیس کی حفاظت کے بغیر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہوں گے۔ رستم کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی، بی بی کیوں کر رہی تھیں ایسا؟ وہ کیوں اس طرح اپنے آپ کو شدید خطروں میں ڈال رہی تھیں۔ کہیں ان سے یہ سب کچھ وہ خبیث ڈپٹی ریاض ہٹلر تو نہیں کروا رہا تھا۔ اگر وہ کروا رہا تھا تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ اَن گنت سوالات رستم کے دماغ میں ابھرے تھے۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے بی بی جی سے نہیں ملنا ہے۔ کسی صورت نہیں۔ اس نے اس وقت دلاور کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اگلے ڈیرے کی سمت نکل جائے۔ وہ بی بی اور ان کے ساتھیوں کو آگے آنے سے روک دے۔ ان پر واضح کر دے کہ رستم ڈیرے پر موجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان سے ملنا چاہتا ہے۔

دلاور حکم کا بندہ تھا۔ فوراً دس بارہ بندے لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد رستم تذبذب کا شکار رہا تھا۔ اس نے لالہ اور حسنا سے بھی مشورہ کیا۔ خود اپنے آپ میں بھی بُری طرح الجھتا رہا۔ یہ بات واضح تھی کہ بی بی، چودھری حشام اور اس کے بیٹے کی رہائی کے لئے اس سے ملنے آ رہی ہیں۔ دلاور وغیرہ کے روانہ ہونے کے ایک گھنٹے بعد رستم نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ اسے یوں لگا کہ بی بی جی کو اپنی طرف آنے سے روک کر وہ ان کی توہین کرنے کا مرتکب ہو گا اور یہ اسے کسی طور، کسی حال میں گوارا نہیں تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس کا عشق اسے ایسا کرنے کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دلاور کے پیچھے گیا اور کوئی پانچ میل دور اسے جا لیا۔ اس نے دلاور سے پہلی ہدایت واپس لے کر نئی ہدایات دیں اور ان ہدایات کے مطابق اسے شانی بی بی کو احترام اور حفاظت کے ساتھ ڈیرے تک لانا تھا۔

اب ان واقعات کو دو دن گزر چکے تھے۔ رستم اور لالہ کے اندازے کے مطابق یہ قافلہ

اب کسی بھی وقت وڈے ڈیرے پر پہنچنے والا تھا۔ رستم کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ وہ بی بی کا سامنا کیسے کرے گا؟ ان سے کیوں کر بات کر سکے گا؟ وہ کس لہجے میں اسے مخاطب کرے گی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ تھا۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ واقعی کسی طرف نکل جائے۔ بی بی کو اپنی صورت ہی نہ دکھائے۔ کسی وقت اس کے دل میں آتی کہ وہ اردگرد کی ساری پھولدار جھاڑیوں کے پھول اکٹھے کروائے اور انہیں بی بی کی راہوں میں نچھاور کر دے۔

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور پوٹھوہار کے پار سے آنے والا قافلہ ڈیرے پر پہنچ گیا مشعلوں کی روشنی میں وہ دیکھ سکتا تھا۔ گہری نیلی چادر میں لپٹی ہوئی بی بی ان میں موجود تھیں۔ ان کا حسین چہرہ نقاب میں چھپا تھا۔ فقط آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ مزید بیٹھا نہیں رہ سکا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ قافلے کی آمد کا شور سن کر نادیہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم اس کے انداز کو نظر انداز کرتا ہوا تیزی سے ڈھلوان پر اُترا اور بی بی کے روبرو پہنچ گیا۔

''سلام بی بی۔'' اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر کہا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

بی بی کے نقاب میں ہونٹوں کے مقام پر جنبش پیدا ہوئی۔ وہ اس کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔

کھیا دراج تیزی سے آگے آیا اور بڑے جوش سے رستم کے ساتھ معانقہ کیا۔ ''دیکھ لے سیال! آکھر آیاں نے تجھ کو ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ کیا کہتے ہیں ڈھونڈنے سے رب بھی ملتا ہے۔'' بلاول احمد نے بھی رستم سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد لالہ اور حسنا نے۔ سب سے ملنے کے بعد تقریباً پندرہ منٹ بعد شانی، دراج، رستم، لالہ اور بلاول چھجے کے نیچے بڑے کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے دیہاتی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ شانی کا چہرہ بدستور نقاب کی اوٹ میں تھا فقط آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ چائے کے دوران میں تقریباً خاموشی ہی رہی۔ کہیں پاس سے ہی رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے فقط ایک بار دھیان سے شانی کی طرف دیکھا اس کے بعد نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایسا لگتا تھا شانی کے سامنے ایک طرح کا رعب حسن اس پر حاوی ہو جاتا تھا۔ جسم میں لرزش اور زبان میں لڑکھڑاہٹ نمودار ہوتی تھی۔

چائے کے بعد بلاول اور حسنا باہر چلے گئے۔ اب صرف شانی، رستم، دراج اور لالہ کمرے میں تھے۔ شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے رستم کی طرف دیکھا۔ ''رستم! چوہدری

حشام اور راجو یہاں ڈیرے پر ہیں؟''

''جی بی بی ...'' وہ معمول کی طرح بولا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیا ضرورت پڑ گئی تھی اس کی؟'' شانی نے بے ساختہ پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''بی بی جی! چوہدری نے میری توہین کی آپ کی توہین کی۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

''توہین کا بدلہ لینے کا یہ کون سا طریقہ تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح کرنے سے، ذلت اور خون خرابے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں کیا پتا کہ وہاں ہمارے دیہات میں کیا قیامت مچی ہوئی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے بی بی! لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''وہ لوگ زخمی تو نہیں؟'' شانی نے ذرا توقف سے پوچھا۔

رستم نے نفی میں جواب دیا۔ لالہ نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

شانی کے بالوں کی ایک لٹ اس کی نیلی اوڑھنی سے نکل کر اس کے کندھے پر جھولنے لگی تھی۔ رستم کی نظریں بے اختیار اس لٹ پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایک بھولی بسری رات یاد آ گئی تھی شانی کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''کیا ہم ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں؟''

یہ سوال لالہ سے پوچھا گیا تھا۔ لالہ نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا ''جیسے آپ کی مرضی لیکن آپ سب کافی تھکے ہوئے ہیں۔ اگر چاہیں تو صبح.....''

''او نہیں بھائیا۔'' دراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اب بھی پانچ چھ میل کی دوڑ لگا سکتا ہوں اور ہماری نکڑی بھی کوئی ملوکڑی نہیں ہے۔ بڑا جگرا ہے اس کے اندر دیکھو چائے پی کر ایک دم پھریش ہو گئی ہے۔''

رستم اور لالہ ان دونوں کو لے کر کھوندر یعنی سرنگ نمبر دو کی طرف آ گئے۔ حشام، اس کے بیٹے اور نوکر کو یہیں پر رکھا گیا تھا۔ راستے میں کئی افراد نے جھک کر تعظیم پیش کی۔ یہ تعظیم رستم، لالہ اور مہمانوں کے لئے تھی۔ جلد ہی وہ چاروں پانچوں سرنگ کے اندر اس کوٹھڑی نما مقام پر موجود تھے جہاں چوہدری حشام اور راجو کو رکھا گیا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں تاؤ حشام فرش پر لیٹا دکھائی دیا۔ وہ سو رہا تھا۔ نوعمر راجو جسے حویلی میں چھوٹے مالک کہا جاتا تھا کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور نیل کٹر سے پاؤں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

رستم کو معلوم تھا کہ باپ بیٹے کو دیکھ کر شانی اور دراج وغیرہ کو شدید جھٹکا لگے گا۔ وجہ

ظاہر تھی۔ دونوں زنانہ لباس میں تھے۔ ان کے ہاتھ تو نہیں باندھے گئے تھے تاہم ان کے سامنے پانی ربڑ کے دو تین جوتوں میں رکھا تھا۔ روٹی کے ٹکڑے بھی پتھریلے فرش پر پھینک دیئے گئے تھے۔ سالن ان ٹکڑوں کے اوپر ہی لیپ کر دیا جاتا تھا۔

رستم نے دیکھا، بی بی کی آنکھوں میں شدید دکھ کے آثار نظر آئے۔ ''یہ ... یہ کیا ہے رستم ...؟''

''یہ لوگ جو کچھ کرتے تھے بی بی جی! یہ اسی کا جواب ہے۔''

''لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔''

''معاف کیجئے بی بی! یہ اسی لائق ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک ہو سکتا ہے ان کے ساتھ۔'' لالہ نے کہا۔

''ہمارے دماغوں کے ایسے ہی فیصلوں نے اس دنیا کو یہاں رہنے والوں پر تنگ کر رکھا ہے اس راستے پر چلا جائے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی بھائی صاحب۔'' شانی نے روانی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ لالہ جواب میں کچھ کہتا رستم نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ وہ چپ رہے۔ بی بی کی آنکھوں میں جلالی رنگ نظر آیا۔ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا رنگ۔ رستم کو لگا اس رنگ نے بی بی کی آنکھوں کو اور بھی حسین کر دیا ہے۔

بی بی نے رستم کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں رستم! یہ ٹھیک نہیں فوراً ختم کرواؤ اسے..... پلیز ختم کرو.....'' اس کے ساتھ ہی اس نے بے قراری سے اپنے مرمریں ہاتھ کو دائیں بائیں جنبش دی۔ وہ جیسے سرتاپا کانپ گئی تھی۔

''ٹھ..... ٹھیک ہے بی بی۔'' رستم نے سر جھکا لیا۔

وہ سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑے تھے۔ یہاں سے وہ تو حشام اور لڑکے کو دیکھ سکتے تھے لیکن ان کی نظر شانی اور دراج وغیرہ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ دراج نے رستم سے پوچھا۔ ''ان دونوں بدبختوں کے ساتھ ایک مالاجم کو بھی تو کابو کر کے لائے تھے تم لوگ؟ وہ کہاں ہے؟''

''وہ دوسری کوٹھڑی میں ہے۔'' رستم کی بجائے لالہ فرید نے جواب دیا۔ ''حرامی دن رات واویلا کرتا تھا۔ ان دونوں کو بھی نہیں سونے دیتا تھا۔''

شانی فوراً ہی پلٹ آئی۔ رستم کو اس کی فقط آنکھیں نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔

رستم نے جو کچھ کیا تھا وہ اس سے زیادہ کرنا چاہتا تھا۔ حشام اور اس کے کارندوں نے اس کے سامنے بی بی کی توہین کی تھی، سینکڑوں لوگوں کے سامنے انہیں ننگی گالیاں دی تھیں۔ انہیں گھسیٹا تھا اور لاٹھیاں برسائی تھیں۔ اس وقت وہ خود زخموں سے چُور تھا لیکن بی بی کی اس حالت کو دیکھ کر وہ ایک شدید جنونی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آئی تھی اس میں اتنی توانائی کہ وہ تار پوریوں سے بھڑ گیا تھا۔ ...دن گزرتے رہے تھے لیکن وہ کھولی میلے کے مناظر کو اور بی بی کی توہین کو بھولا نہیں تھا۔ اس کے سینے میں ہمہ وقت ایک آگ روشن رہتی تھی اور آخر کار وہ بی بی کی توہین اور آفندی کی موت کی پاداش میں تاؤ حشام اور اس کے بیٹے کو اٹھا لایا تھا۔

اب بی بی کچھ اور طرح کی سوچ لے کر یہاں پہنچ گئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ حشام اور اس کے بیٹے اور نوکر کی رہائی کی بات کریں گی۔

بی بی جو کہتی تھیں وہ رستم کے لئے حکم ہو جاتا تھا اور ابھی اسے یہ حکم ملا تھا کہ حشام اور اس کے بیٹے کو بہتر حالت میں رکھا جائے۔ اب وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا لیکن اس سے پہلے وہ تاؤ اور اس کے بیٹے کو آخری بار ذلیل ضرور کرنا چاہتا تھا خاص طور سے تاؤ کو۔ بی بی، وراج اور بلاول احمد پیچھے کے آرام دہ کمروں کی طرف چلے۔ فریدان کے ساتھ تھا۔ وہ بی بی کو اپنی بیوی مہناز سے ملانے جا رہا تھا۔ اب بی بی کو صبح تک وہیں رہنا تھا.... رستم اپنے کمرے کی طرف گیا۔ رستم کو دیکھ کر نادیہ نے جلدی سے چادر اپنے سر پر درست کی۔ اس کا توبہ شکن جسم چادر کے اندر سے بھی کچھ نہ کچھ ہلچل دکھاتا رہتا تھا۔ رستم نے اسے ایک موٹی اوڑھنی لا کر دی تھی، مگر نادیہ اسے استعمال نہیں کر رہی تھی اور اس کے پاس معقول وجہ بھی تھی۔ ان پوٹھوہاری ٹیلوں کا موسم دن بدن گرم ہوتا جا رہا تھا۔

نادیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''شانی باجی کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہے لیکن جب تک میں نہ کہوں تم ان کے سامنے نہیں آؤ گی۔'' رستم نے تحکم سے کہا۔

''میری یہ مجال کہاں۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''تم اپنے کمرے میں ہی رہو۔''

''ٹھیک ہے لیکن کھانا؟ میرا مطلب ہے تم ان کے ساتھ ہی کھاؤ گے نا......؟''

''مجھے ابھی بھوک نہیں۔'' رستم نے رکھائی سے کہا اور سرنگ کی طرف چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اس کوٹھڑی میں تھا جہاں حشام اور اس کا بیٹا بند تھے۔ رستم کے ہاتھ

میں شہتوت کی تقریباً چار فٹ لمبی بڑی مضبوط اور لچکیلی چھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت کروٹیں لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر نوعمر راجو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حشام کروٹ کے بل سویا ہوا تھا۔ رستم نے بے دریغ حشام کی پشت پر چھڑی سے ضرب لگائی۔ شائیں کی تیز آواز کے ساتھ ہی گوشت اور چھڑی کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ حشام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ساٹن کی گلابی شلوار اور سلک کی پھولوں والی چست قمیص کے ساتھ وہ حد درجہ مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔ رہی سہی کسر کلائیوں کی چوڑیوں اور ناک میں جھولتی ہوئی پیتل کی نتھ نے پوری کر دی تھی۔

اٹھتے کے ساتھ ہی تاؤ حشام بوکھلا کر کھڑا ہوا اور اس نے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ بھاری جسم کے سبب پہلی کوشش میں ناکام ہوا لیکن دوسری کوشش میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر گہری چوٹوں کے نشان تھے۔ غالباً ایک دن پہلے اس کی ناک سے بہنے والا خون اس کی گھنی مونچھوں کے آس پاس جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔

رستم نے زہرناک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اوئے کھوتے دے کھر! تجھے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کے لئے کس نے کہا ہے؟ ایک ٹانگ پر اس وقت کھڑا ہونا ہے جب میں کہوں۔''

چوہدری حشام جلدی سے دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ راجو اس سے بس چند قدم کی دوری پر تھا۔ درمیان میں چند آہنی سلاخیں تھیں۔ یہ ایک ہی کوٹھڑی کے دو حصے تھے۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن مدد نہیں کر سکتے تھے۔

حشام سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان لالٹین کی روشنی میں کچھ اور بھی سیاہ نظر آتا تھا۔ یہ فرعون صفت چوہدری تھا۔ اس کی فرعونیت کا یہ عالم تھا کہ اس درجے ذلیل و لاچار ہونے کے باوجود بھی اس کی گردن میں تھوڑا سا بل موجود تھا۔ آنکھوں میں خاموش اکڑ تھی۔ جیسے یہ آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے اب میں تمہارے بس میں ہوں۔ کر لو جو کرنا ہے لیکن اگر میری باری آئی تو پھر میں بھی دل کی حسرت نکالوں گا۔ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔

رستم نے بے پرواہی سے حشام کی نتھلی میں انگلی گھسائی اور اسے کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے آیا۔ جب رستم نے نتھ کی مدد سے چوہدری حشام کو کھینچا تو تکلیف سے بچنے کے لئے اس کے ہاتھوں نے بے ساختہ رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ جس طرح بلند و بالا اونٹ کو نکیل کی مدد سے زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے رستم نے بھی نتھ کی مدد سے چوہدری حشام کا سر زمین سے لگا دیا۔

وہ اب کسی چوپائے کے سے انداز میں فرش پر تھا۔ زنانہ لباس میں اس کا یہ پوز بے حد مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی چوپایہ جوہڑ سے پانی پینے کی کوشش کر رہا ہے۔ رستم کی انگلی بدستور اس کی نتھ میں تھی۔

''بول شانی بی بی تیری بیٹی جیسی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''شانی بی بی میری بیٹی جیسی ہے۔'' حشام کی میکانکی آواز ابھری۔

''شانی بی بی تیری بہن جیسی ہے۔''

''شانی بی بی میری بہن جیسی ہے۔''

''شانی بی بی تیری ماں جیسی ہے۔''

''شانی بی بی میری ماں جیسی ہے۔''

''بول میں نے اپنی ماں بہن پر ہاتھ اٹھایا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔''

''میں نے اپنی ماں بہن پر ہاتھ اٹھایا، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔''

رستم نے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی، وہ ڈگمگاتا ہوا پانی سے بھرے جوتے کے اوپر گرا۔

راجو کوٹھڑی کے دوسرے حصے میں پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

رستم نے اسے پکارا۔ ''اوئے حشام کے انڈے، ادھر دیکھ میری طرف۔''

راجو نے جیسے بدک کر سر اٹھایا۔

رستم نے کہا۔ ''آج سے تم دونوں کے ساتھ تھوڑی سی رعایت کر رہا ہوں اور پتا ہے تمہیں کہ اس رعایت کی وجہ کیا ہے۔ اس رعایت کی وجہ وہی بی بی جی ہیں جنہیں تم نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے رسوا کیا تھا۔ بھرے میلے میں جن کی بے عزتی کی تھی۔ آج وہ تمہارے لئے سفارش بنی ہوئی ہیں۔ تمہارے لئے پیدل چل چل کر پاؤں میں چھالے ڈالے ہوئے ہیں انہوں نے۔ تمہارے جیسے کتے، ان کے پاؤں چاٹنے کے لائق بھی تو نہیں ہیں۔''

رستم نے بے پناہ نفرت سے چوہدری حشام کی طرف تھوکا اور اسے قہرناک نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔

پوٹھوہار کے ٹیلوں کو اب رات کے اندھیرے نے مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ سیاہ آسمان پر تاروں کی برات تھی۔ شمال سے جنوب کی طرف ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ رستم کے لئے

یہ خیال بڑا ہی راحت افزا تھا کہ بی بی اس ڈیرے میں موجود ہے۔ اس فضا میں سانس لے رہی ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن بی بی کے قدم اس ویرانے میں پڑیں گے۔ اس کا دل چاہا وقت یہاں تھم جائے۔ زمین و آسمان کے قلابے میں جو شے بھی ہے، یہیں پر رک جائے۔ دنیا کے سمندر میں یہ ڈیرہ ایک جزیرے کی طرح ہو۔ کوئی اس جزیرے پر آ سکے اور نہ یہاں سے جا سکے۔ آہ...... کتنا خوش کن تصور تھا یہ کہ بی بی یہاں موجود ہے...... لیکن اس تصور کو کب تک قائم رہنا ہے، اس کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ اسے ریتلی زمین پر قدموں کے چند نشان نظر آئے۔ اس نے ٹارچ نکالی اور دھیان سے نشانوں کو دیکھنے لگا۔ یہ مہمانوں کے قدموں کے نشان تھے۔ ایک چوڑا چکلا پاؤں دراج کا تھا۔ ایک لمبا مردانہ جوتی کا نشان بلاول کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ایک درمیانی سائز کی زنانہ جوتی کا نشان بی بی کا تھا۔ وہ ان نشانوں کو دھیان سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ یہ بی بی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اسے یہ نشان دیکھنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

ایک آواز نے اسے چونکایا۔ ''کہاں جا رہے ہو رستم؟'' یہ حسنا گجراتی تھا۔

''کہیں نہیں۔ بس ذرا ہوا خوری کو دل چاہ رہا تھا۔''

''ہونٹ گیلے کرو گے؟'' اس نے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

رستم چپ رہا۔ حسنے نے جیب سے ایک کوارٹر بوتل نکالی اور ڈھکنا کھول کر رستم کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے دائیں بائیں دیکھا پھر بدبودار تیزابی محلول کے تین چار گھونٹ حلق سے اُتار لئے۔ حسنا بولا۔ ''رستم بھائی۔ ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گے؟''

''ہاں کہو۔''

''میں سوچتا تھا اپنا رستم بھائی جس لڑکی پر فدا ہوا ہے، پتا نہیں وہ کیسی ہوگی۔ آج اس سوال کا جواب اور اس جیسے دوسرے سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔''

''کیا جواب ملا؟''

''رستم بھائی تم سچے ہو۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ تو پردے میں تھیں۔''

''میں نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں، پیشانی دیکھی ہے۔ انہیں چلتے پھرتے دیکھا ہے لیکن جو کچھ دیکھا ہے بڑی پاک نظروں سے دیکھا ہے۔ مجھے اس وقت گجراتی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ بلکہ یہ دو شعر ہیں۔ حسنے نے یہ دو شعر پڑھے اور پھر رستم کو اس کا مطلب بتاتے ہوئے بولا۔ ''وہ خوبصورت ہے اور ایسی خوبصورت ہے کہ اس کے سامنے جھکنے اور سر جھکانے

کو دل چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے دیکھا جائے اور اس سے محبت نہ کی جائے۔''

رستم نے تاریکی میں ہاتھ بڑھایا اور حسنے کے ہاتھ سے بوتل لے کر دو تلخ گھونٹ مزید لئے۔ اس کے سینے میں عجیب سا درد جاگا ہوا تھا۔ حسنے نے پوچھا۔ ''رستم بھائی کبھی اپنے دل کی بات کہی اس سے؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں یار جی بنا کہے کا پیار بھی کوئی پیار ہوتا ہے۔''

''یہی تو پیار ہوتا ہے حسنے۔ ایسا پیار کسی سے کچھ مانگتا نہیں۔ یہ اپنا صلہ خود ہوتا ہے۔ اس میں جدائی اور ملاپ کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ سمجھو ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔''

''تمہاری باتیں میری کھوپڑی میں تو نہیں آرہیں..... لیکن ایک بات کی پریشانی بھی ہے مجھے؟''

''کس بات کی؟''

''چھوٹی بھرجائی (نادیہ) کی۔ وہ بیوی کے طور پر تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ جب شانی بی بی کو پتا چلے گا تو انہیں تو بڑا شدید جھٹکا لگے گا۔''

رستم نے گہری سانس لی۔ ''ہاں یہ تو ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے تو شاید یہ اچھا ہی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''میری طرف سے ان کا دل پورا پورا کھٹا ہو جائے گا۔ اگر ان کے دل پر کوئی بوجھ بھی ہے تو وہ نہیں رہے گا۔''

شاید حسنا کچھ مزید بات چیت کرتا لیکن اسی دوران میں سرنگ نمبر دو کی طرف کسی نے اونچی آواز میں کیسٹ پلیئر لگا دیا۔ آواز گونجنے لگی۔ نور جہاں نغمہ سرا تھی۔

''صدا ہوں اپنے پیار کی، جہاں سے بے نیاز ہوں
کسی سے جو نہ کھل سکا، وہ زندگی کا راز ہوں''

رستم نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ مہمانوں کی آمد کے بعد کوئی اونچی آواز میں ٹیپ نہیں لگائے گا۔ کہیں ہوائی فائرنگ نہیں ہوگی اور نہ ہی گالم گلوچ کیا جائے گا۔ حسنا تیزی سے اٹھ کر چلا گیا تاکہ کیسٹ پلیئر بند کرا سکے۔

رستم وہیں بیٹھا رہا۔ تاروں کی روشنی میں مخروطی ٹیلوں کی چوٹیاں چمک رہی تھیں.....

درخت جھومتے تھے، تارے بھی جیسے پلکیں جھپک جھپک کر آنے والے مہمان کو دیکھنا چاہتے تھے۔ یوں لگتا تھا، آج اس خرابے کی قسمت جاگی ہوئی ہے لیکن ایسا کب تک رہنا تھا۔ شاید کل یا پھر پرسوں آنے والوں کو واپس چلے جانا تھا۔ اس کے بعد جدائی کی پھر وہی تاریک شب تھی۔ تاریک اور لامتناہی۔ یہ رات شروع ہوئے برسوں بیت گئے تھے۔ یہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی اس میں صبح کاذب کے سے آثار نظر آتے تھے لیکن یہ صرف بصری واہمے ہوتے تھے۔ معدوم ہو جاتے تھے۔ ایسا ہی ایک مرحلہ مہتم بستی میں قیام کے دوران میں آیا تھا، علاقے کے ہزاروں مہتم سردار دراج کی قیادت میں بی بی سے رستم کی شادی کرانے پر تل گئے تھے۔ وہ سرتاپا کانپ گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ بی بی اس صورت حال کو قبول کریں گی۔ وہ بے حد ڈر گیا تھا۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں بی بی یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھی اس منصوبے میں شریک ہے۔ اس نے بی بی کے سامنے پہنچ کر اپنی پوزیشن صاف کی تھی اور پھر اگلی صبح وہ سب کچھ ہوگیا جس کا کسی نے تصور نہیں کیا تھا۔ پوری مہتم آبادی پیر قدرت اللہ کی طرف الٹ گئی اور شانی بی بی کی بدترین مخالفت پر اُتر آئی۔ اس کے بعد گزرنے والا ہر لمحہ رستم کو بی بی سے دور کرتا گیا اور اب وہ رستم سے قریب ہو کر بھی ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر تھی اور رستم گہرائی سے سوچتا تھا تو اسے خیال آتا تھا کہ یہ فاصلے ٹھیک ہی ہیں..... وہ اب پھانسی کے تختے کا مسافر تھا..... یا پھر کسی دھواں دھار پولیس مقابلے میں خودکار رائفل کا ایک برسٹ اس کا مقدر تھا۔ زندگی کے ان بچے کھچے دنوں کے لئے وہ بی بی کی زندگی کو تہس نہس کرتا تو یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ بلکہ بدترین خودغرضی کے زُمرے میں آتا تھا۔

اچانک اسے اپنے عقب میں نرم قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور پھر ایک ہاتھ دھیرے سے اس کے کندھے پر آگیا۔ رستم کے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے..... صرف ایک لمحے کے لئے اس کے تصور میں یہ خیال ابھرا کہ یہ بی بی ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خیال کا تاج محل دھڑام سے نیچے آگرا۔ یہ نادیہ تھی۔ ''کیا بات ہے رستم۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''بس ویسے ہی تمہیں کہا تھا، اپنے کمرے میں رہنا۔''

''شانی اور بھابی مہناز وغیرہ وہاں گھوم پھر رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ میرے والے کمرے میں آجائیں گے۔ میں یہاں چلی آئی۔'' وہ رستم کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

رستم پتھر پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے نیچے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی۔

اکثر وہ ایسے ہی کرتی تھی۔ اس کے پارہ صفت بدن میں کوئی ایسی بات تھی کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یہ جسم دیکھنے والوں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رستم نے اسے پابند کر رکھا تھا کہ وہ گھر میں اور گھر سے باہر ایک بڑی چادر اوڑھ کر رکھے گی۔ پھر بھی ہر وقت نادیہ کے حوالے سے ایک اندیشہ سا رستم کے ذہن میں رہتا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک ویرانہ تھا۔ یہ معاشرے سے بھاگے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کا ٹھکانہ تھا۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو مدت سے عورت کو بس دور ہی سے دیکھ رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے اندر فطری طور پر عورت کے لئے ایک مہیب خلا موجود ہوتا ہے۔ انہیں صرف عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شکل و صورت، عمر، صحت، آمادگی باقی کسی شے کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے ہیں کہ کوئی ضعیف العمر عورت یا کوئی کمسن فاتر العقل بچی کسی کی وحشت کا نشانہ بن جاتی ہے۔ وہ تو ایک چلتی پھرتی قیامت تھی۔ گناہ کی دعوت جیسے اس کے سراپا پر جلی حروف میں لکھی تھی۔ کسی وقت رستم کے ذہن میں یہ مہیب اندیشہ جاگتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں ''کسی کی طلب'' کے نکیلے دانت اسے چیر پھاڑ کر چلے جائیں گے۔ وہ سوچتا تھا کاش وہ اس کے ساتھ یہاں نہ پہنچتی۔ وہ ایک ایسی چھچھوندر کی طرح تھی جسے نگلا جا سکتا تھا نہ اُگلا۔

نادیہ کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''رستم! اگر تم چاہتے ہو کہ میں شانی جی کو یہاں نظر نہ آؤں تو مجھے کہیں اور بھیج دو۔ میں دو چار دن سرنگ میں کاٹ لوں گی یا جہاں تم کہو گے۔''

''اچھا سوچتا ہوں اس بارے میں۔'' رستم نے کہا۔

وہ ہاتھ کی چوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔ ''رستم! میں تمہارے اور شانی جی کے درمیان کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوں۔ نہ آئندہ کبھی مجھے رکاوٹ سمجھنا۔ میں تو بس ... '' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ شاید وہ وہی بادشاہ اور کنیز والی بات دہرانے لگی تھی۔ رستم کی ڈانٹ یاد کر کے ارادہ بدل دیا۔

رستم نے نادیہ سے پوچھا۔ ''بی بی کہاں ہیں اب؟''

''باجی مہناز کے ساتھ ہیں۔ لالہ بھی وہیں ہیں۔ ابھی ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید شانی جی نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ لالہ نے بتایا تھا کہ تم باہر نکلے ہوئے ہو۔''

رستم خاموش رہا۔ نادیہ نے کہا۔ ''شانی جی اور ان کے ساتھی چوہدری حشام کی سفارش

کے لئے آئے ہیں کیا؟''

''شاید۔''

''تو پھر تم انہیں چھوڑ دو گے؟''

''شاید۔ چھوڑنا پڑے گا۔'' دل میں اس نے کہا، چوہدری کو رہا کرنا ایک طرف اگر بی بی جی خود اسے بھی باندھ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو وہ انکار نہیں کر سکتا لیکن وہ جانتا تھا کہ بی بی ایسا کہیں گی نہیں۔ وہ کبھی اسے یہ مشورہ نہیں دے گی کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کرے۔ اب حوالگی کے مرحلے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

نادیہ نے کہا۔ ''بہتر تو وہی ہوگا جو تم کرو گے لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ حسنا یا مراد وغیرہ اس بات پر اعتراض کریں۔''

''کس بات پر؟''

''یہی کہ تم نے چوہدری اور اس کے بیٹے کو کچھ لئے دیئے بغیر چھوڑ دیا۔''

''جب اعتراض کریں گے تو پھر دیکھا جائے گا لیکن تم میری ایک بات پورے دھیان سے سن لو اور اسے یاد بھی رکھنا ہے۔'' نادیہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔ رستم نے کہا۔ ''بی بی سے اگر تمہاری بات ہو تو انہیں کسی طرح کی الجھن میں نہیں ڈالنا۔ انہیں یہی بتانا ہے کہ ہم میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہیں۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔'' نادیہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے نادیہ کو اس حوالے سے چند مزید ہدایات دیں اور اسے تسلی ہوگئی۔ نادیہ کے علاوہ اسے کسی طرف سے اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ نادیہ اور لالہ کے علاوہ اصل صورتِ حال کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ رستم اور نادیہ حقیقی میاں بیوی ہیں۔

وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رستم اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا جب نادیہ ایک دم کراہ اٹھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک تیز دہشت ناک چیخ نکلی۔ اس نے تڑپ کر اپنا پیٹ پکڑ لیا۔

''ہائے میں مری۔'' وہ چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ریشمی قمیص ناف کے قریب سے دبوچ لی۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس نے مٹھی میں کوئی شے پکڑی ہوئی ہے۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑائی اور پتھروں پر گر گئی۔ اس دوران میں رستم اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نادیہ کے لباس میں کوئی رینگنے والی شے گھس گئی ہے۔ وہ گری ہوئی نادیہ کے پاس پہنچا، وہ مسلسل ''ہائے میں مری'' کی تکرار کر رہی تھی۔ رستم نے ایک جھٹکے سے اس کی ریشمی قمیص پھاڑ دی۔ مدھم روشنی میں اس کا ہموار پیٹ سنگ مرمر کی طرح چمکنے لگا۔ پیٹ کے وسط

سے خون رس رہا تھا۔ یہ قریباً آٹھ انچ لمبا پوٹھوہاری چھپکلا تھا۔ اس نے اپنے پنجے اور دانت نادیہ کی نازک جلد میں گاڑ رکھے تھے۔ رستم نے چھپکلے کو نادیہ کے جسم سے جدا کر کے دور ایک پتھر سے پٹخ دیا۔

نادیہ کے چلانے کی آواز دور تک گئی تھی۔ چھجے اور حجروں کی طرف سے کئی افراد تیزی سے موقع کی سمت بڑھے۔ نادیہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گئی۔ اس کے پاؤں میں سخت موچ آئی تھی۔

☆======☆======☆

کھانے کے بعد شانی اور مہناز لیٹ گئے۔ ننھا ٹیپو شانی کے ساتھ بڑی جلدی بے تکلف ہوگیا تھا اور اس کے پاس لیٹنا چاہتا تھا لیکن مہناز نے اسے سمجھایا کہ چاچی بہت دور سے سفر کر کے آئی ہے۔ تھکی ہوئی ہے۔ اسے سونے دو۔

یوں تو شانی سونے کے لئے لیٹی تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رستم اس کے اردگرد کہیں موجود تھا۔ اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ ایک دو بار اس کا دل چاہا کہ مہناز سے رستم کے بارے میں کچھ پوچھے لیکن جب بھی اس نے پوچھنا چاہا، ایک بے نام سی جھجک آڑے آ گئی جس میں حیا کی آمیزش بھی تھی۔

رستم مہتم بستی سے بہت آزردہ خاطر ہو کر گیا تھا۔ وقتِ رخصت شانی اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ تسلی کے دو لفظ بھی نہیں بول سکی تھی۔ کیا اب وہ اس سے کوئی بات کرے گا۔ اپنے باہمی تعلق کے حوالے سے کچھ کرے گا اسے؟ لیکن کیا کہے؟ کہنے کے لئے تھا ہی کیا؟

اس کے دل نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر لو۔ ایک دفعہ اپنی طرف سے رستم کا گلہ دور کر دو۔ اسے کہہ دو کہ تم سب کچھ اس پر چھوڑتی ہو۔ اپنی اور اس کی زندگی کے بارے میں وہ جو فیصلہ بھی کرے گا تم اسے قبول کرو گی۔''

فوراً ہی رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی بھاری کپڑوں اور رسم و رواج کے گہنوں میں جکڑی اس کے سامنے آ گئی۔ معترض لہجے میں بولی۔ ''لیکن اگر اس نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کو کہا تو پھر کیا کرو گی؟''

''وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' دل سے آواز آئی۔ ''اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو مہتم بستی سے چپ چاپ کیوں نکل آتا۔''

''لیکن وہ تو سرتاپا تمہاری محبت میں غرق ہے۔ تمہیں پانا اس کے لئے دنیا کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اگر یہ خواہش تمہارے سامنے آ گئی تو پھر؟''

''ایسا نہیں ہوگا.....اور اگر ہوا.....تو میں انکار کر دوں گی۔ میں اسے کہہ دوں گی.....میں اسے کہہ دوں گی، میری زندگی رنگ والی، جوہر آباد، میانہ کے ہزاروں لوگوں کے ساتھ منسوب ہو چکی ہے۔ ان کے بے پایاں دکھوں اور صعوبتوں کے نام ہو چکی ہے۔ میں اب اپنے لئے نہیں، ان کے لئے جینا چاہ رہی ہوں۔''

شانی کا چوہدرانی والا روپ اس کے سامنے آیا۔ اس روپ نے کہا۔ ''غلطی کر رہی ہو۔ محبت کے دریا بڑے تند اور پُرشور ہوتے ہیں۔ انہیں پار کرنے والے کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں۔ پاؤں پھسلتے دیر نہیں لگتی۔ تم بھی کہنے کچھ جاؤ گی لیکن کیا پتا کیا کہہ جاؤ۔''

اچانک شانی کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک خوفزدہ نسوانی چیخ سناٹے میں گونجی تھی۔ پھر یہ نسوانی چیخ ہیجانی انداز میں تکرار کرنے لگی۔ ''ہائے میں مری.....ہائے میں مری۔'' کچھ فاصلے پر لیٹی ہوئی مہناز بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ باہر کو لپکی تو شانی بھی چپل پہن کر اس کے عقب میں گئی۔ باہر تاروں کی مدھم روشنی میں ٹیلے دور تک نظر آتے تھے۔ کچھ دوسرے افراد بھی دوڑتے ہوئے آواز کی سمت جا رہے تھے۔ وہاں اونچے نیچے سرخی مائل پتھروں کے قریب کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔

اتنے میں ایک شخص چھجے کی طرف لوٹا تو مہناز نے پوچھا۔ ''رزاق کیا ہوا ہے وہاں؟''

وہ احترام سے بولا۔ ''بھرجائی! وہاں رستم جی کی ووہٹی کو کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔''

''رستم جی کی ووہٹی'' کے الفاظ شانی کی سماعت پر بم کا خوفناک دھماکا ثابت ہوئے۔ وہ حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رستم جی اور ان کی ووہٹی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھرجائی جی کی چادر میں شاید لالی والی چھپکلی گھس گئی تھی۔ ان کے پاؤں میں بھی موچ آ گئی ہے۔''

پھر شانی نے دیکھا چند مشعلوں کی روشنی میں رستم کمروں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی گود میں ایک لڑکی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو شانی کو لڑکی کی صورت نظر آئی وہ دنگ رہ گئی۔ یہ نادیہ تھی۔ معروف فلم ایکٹریس نادیہ۔ شانی کے ساتھ نادیہ کی آخری ملاقات راولپنڈی میں ہی ہوئی تھی۔ پھر وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکی تھیں اور آج ایک عرصے بعد نادیہ، رستم کی ''ووہٹی'' کی حیثیت سے اس کے سامنے تھی۔ وہ ششدر دیکھتی رہ گئی۔ رستم اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ شانی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ مہناز اور لالہ تفصیل معلوم کرنے کے لئے رستم کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ شانی گم صم سی واپس آ گئی۔

وہ بستر پر نیم دراز ہوئی تو ایک دم بہت سا نمکین پانی پتا نہیں کہاں سے اس کے حلق میں جمع ہوگیا۔ اَن گنت سوچوں نے تیزی سے اسے گھیر لیا۔ اس کا مطلب تھا...... نادیہ نے بالآخر رستم کو حاصل کر ہی لیا تھا۔ چلو اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا۔ وہ خود بھی تو ایسا ہی چاہتی تھی۔ بار بار رستم سے اصرار بھی کر چکی تھی۔ بہت مناسب بات تھی لیکن...... لیکن یہ سینے میں تپش سی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سانس گھٹ سا کیوں رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور لیٹنے کے بجائے کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگی۔ تنگ کمرے کے اندر لالٹین کی لَو بہت نیچی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ نادیہ اور رستم کو یہاں اکٹھے دیکھے گی۔

نادیہ کیسے پہنچی تھی یہاں؟ یا رستم اسے خود لے کر آیا تھا؟ یا پھر دونوں اکٹھے آئے تھے۔

اتنے میں لالہ کے گھر چھوٹے موٹے کام کرنے والی ادھیڑ عمر عورت حنیفاں اندر داخل ہوئی۔ وہ خاصی لمبی تڑنگی اور مضبوط تھی۔ بڑی تیزی سے قدم اٹھاتی تھی۔

شانی نے پوچھا۔ ''یہ رستم کی بیوی رستم کے ساتھ یہاں آئی تھی؟''

''آہو بی بی جی! بڑا پیار کرتی ہے رستم سے۔ نہیں تو کون اس طرح کسی کے لئے جنگل بیابان میں اپنی جندڑی رولتا ہے۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں ہے اس کا۔ پھر بھی رستم کی باندی ہے۔''

''اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔'' شانی نے جان بوجھ کر کہا۔

''شاید آپ نے کہیں اخبار میں اس کی تصویر دیکھی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ یہ فلموں اور ٹیلی ویژن میں کام شام کرتی تھی۔ ڈیرے کے سارے بندے اس کو جانتے ہیں جی۔ اسی لئے رستم اس سے سخت پردہ کرواتا ہے۔''

شانی کچھ دیر خاموش رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''رستم بھی اسے بہت چاہتا ہوگا؟''

حنیفاں نے ذرا چونک کر شانی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''بہن جی، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ رستم بس اس کے ساتھ گزارہ کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ رج کے سوہنی ہے۔ خدمت گار بھی ہے اور اس کی آواز بھی بڑی سوہنی ہے جی۔ ایک دن کمرے میں اکیلی بیٹھی گا رہی تھی۔ میں اور مہناز بی بی چپ کر کے سنتی رہیں اور حیران رہ گئیں۔ بڑے گن ہیں اس میں لیکن رستم اس سے بہت کم سیدھے منہ بات کرتا ہے۔''

اسی دوران میں لالہ کی بیوی مہناز بھی آگئی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بتایا۔ ''وچاری نادیہ کے ساتھ بُری ہوئی ہے۔ سینے سے ذرا نیچے اسے دو جگہ کاٹا ہے کرلے (چھپکلے) نے۔ رستم پاس نہ ہوتا تو پتا نہیں کیا ہوتا اس کے ساتھ۔ پاؤں بھی بُری طرح مڑ گیا ہے وچاری کا۔'' پھر ذرا توقف کر کے اس نے شانی سے پوچھا۔ ''تم نے پتا کیا ہے اس کا؟''

شانی چند لمحے سوچتی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی۔ ''ہاں میرا خیال ہے مجھے جانا چاہئے۔''

مہناز بولی۔ ''چلو آؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔ میں خود چلی جاتی ہوں۔'' شانی اٹھتے ہوئے بولی۔

چھجے کے نیچے یہ تیسرا کمرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ان کمروں کی چھت قدرتی سائبان کی شکل میں تھی۔ پتھروں کے ذریعے اس وسیع سائبان کے نیچے تین کمروں اور ایک طویل برآمدے کی دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ پلاستر اور رنگ سے انہیں بنا سنوار دیا گیا تھا۔ ان کمروں کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ پوٹھوہار کے اس دور دراز ویرانے میں واقع ہیں۔ حیرت انگیز طور پر یہاں بہت سی شہری آسائشیں موجود تھیں۔ شانی کو پنکھے اور بلب وغیرہ بھی نظر آئے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں جنریٹرز وغیرہ موجود ہیں اور بوقتِ ضرورت چلائے جا سکتے ہیں۔

چھجے کے ساتھ ہی دو سرنگوں کے دہانے تھے۔ ان میں سے ایک سرنگ تو وہی تھی جس میں کچھ دیر پہلے شانی اور دراج وغیرہ نے چوہدری حشام اور راجو کی ہیئت کذائی دیکھی تھی۔ دوسری سرنگ میں مشعلوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی زیادہ تھی۔ اس روشنی سے اور دہانے پر نظر آنے والی آمد و رفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کافی لوگ قیام پذیر ہیں۔

شانی اوڑھنی درست کرتی ہوئی رستم اور نادیہ کے کمرے تک پہنچی۔ اب وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا...... اور بکھر رہا تھا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے پر دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے رستم کی آواز آئی۔

''میں اندر آ سکتی ہوں؟'' شانی نے پوچھا۔

رستم لپک کر دروازے پر آیا اور دروازہ پورا کھول دیا۔ ''آئیں بی بی آئیں۔''

شانی کمرے میں داخل ہوئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ تین چار مخملی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک قدِ آدم الماری، لکڑی کا ایک ریک، ایک چھوٹا آئینہ اور اس قسم کا کچھ دیگر سامان کمرے کی آرائش کا حصہ تھا۔ دو کھونٹیوں پر رستم اور نادیہ کے کپڑے ساتھ ساتھ لٹکے دیکھ کر شانی کے سینے میں درد کی ایک لہر سی ابھر کر ڈوب گئی۔ نادیہ ایک گدیلے پر لیٹی تھی۔ اس نے اپنا منہ سر چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ بوسیدہ پتلون قمیص والا ایک نوجوان اس کے پاؤں پر پٹی باندھ کر آخری گرہ لگا رہا تھا۔ اس نے شانی کو سلام کیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''رستم

بھائی! چھوٹی بھرجائی کو آرام کی ضرورت ہے۔ آرام کرے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ انفیکشن کا انجکشن میں نے لگا دیا ہے۔ اگر پاؤں میں درد ہو تو ایک پین کلر گولی کھلا دیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"مہربانی ناصر۔"

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔" نوجوان نے کہا اور سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

نادیہ نے شانی کو دیکھ اور پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شانی جلدی سے آگے بڑھی اور اسے اٹھنے سے روک دیا۔ دونوں بیٹھے بیٹھے ہی ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ نادیہ سسکوں سے رونے لگی۔ شانی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"آپ کتنے عرصے بعد ملی ہیں شانی۔ اس دوران میں کیا کچھ ہو گیا۔" نادیہ نے کہا۔

شانی نے اسے گلے لگا کر تھپکا۔ "میرے گمان میں بھی نہیں تھا نادیہ کہ یہاں تجھے دیکھوں گی اور اس طرح دیکھوں گی۔"

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ شانی زانو تہہ کر کے بیٹھ گئی۔ رستم نے جلدی سے اس کے پیچھے گاؤ تکیہ رکھ دیا۔ لالٹین کی روشنی میں رستم کا طویل سایہ ایک ساتھ نادیہ اور شانی پر پڑ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے حال احوال پوچھا۔ نادیہ نے کہا۔ "مجھے آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی لیکن رستم کا کہنا تھا کہ ابھی دوسرے لگ مل رہے ہیں۔ میں صبح تک انتظار کر لوں۔"

شانی نے ایک ہاتھ سے نادیہ کے بال سنوارے اور کسی انجانے جذبے کے تحت اس کا ماتھا چوم لیا۔ "نادیہ، تمہیں یہاں دیکھ کر دکھ بھی ہوا ہے اور خوشی بھی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ یہ جگہ تم جیسی لڑکی کے رہنے کے لئے نہیں ہے اور خوشی اس بات کی ہے کہ کچھ بھی ہے رستم تمہارے ساتھ ہے۔ شادی مبارک ہو نادیہ..... اور رستم تمہیں بھی۔" شانی نے رستم کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

نادیہ نے ایک عجیب نگاہ رستم پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ ایک بے نام سناٹا کمرے میں ٹھہر گیا۔

"میری بہن کو کوئی تکلیف تو نہیں دے رہے ہو؟" شانی نے رستم سے پوچھا۔

"اس سے پوچھ لیں بی بی۔"

"دیکھو اگر اسے کچھ دکھ ہوا تو سمجھو مجھے ہوا۔"

رستم سر جھکائے باہر چلا گیا۔ شانی اور نادیہ باتیں کرنے لگیں۔ وہی باتیں جو دو

سہیلیاں بہت عرصے بعد مل کر کرتی ہیں۔ پرانی باتیں دہرائی گئیں۔ زوار اور شیری کا ذکر ہوا۔ شانی نے اپنے چیدہ چیدہ حالات سے نادیہ کو آگاہ کیا۔ جواباً نادیہ نے بھی ایسا کیا..... اپنی اور رستم کی شادی کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل نادیہ نے نہیں بتائی۔ اسی دوران میں مہناز گرما گرم چائے لے کر آ گئی۔ تینوں گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ باہر تاریکی میں رکھوالی کے کتے شور مچاتے رہے اور چٹانوں پر موجود رات کے نگران پہرے دار مخصوص آوازے بلند کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد شانی پھر نادیہ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس سے دیر تک باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب وہ نادیہ اور رستم کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کر رہی تھی، مہناز نے کہا۔

"کہاں جا رہی ہو شانی؟"

"نادیہ کی طرف۔ اب تو وہ جاگ گئی ہو گی؟"

"وہ قریباً ساری رات ہی جاگتی رہی ہے۔ اسے پاؤں میں بڑا درد ہو رہا تھا۔ شاید ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ رستم اسے صبح سویرے دو نمبر کھونڈر (سرنگ) میں لے گیا تھا۔ یہاں ڈاکٹر ناصر کا چھوٹا سا ہسپتال بھی ہے نا۔ میرا خیال ہے اب کچھ دن نادیہ اور رستم وہیں پر رہیں گے۔"

شانی کو جھٹکا سا لگا۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ رستم جان بوجھ کر نادیہ کو یہاں سے لے گیا ہے۔ تکلیف کا بس بہانہ ہی ہے۔ اصل میں وہ نہیں چاہتا کہ نادیہ اور شانی تادیر بات چیت کریں۔ رات کو بھی اس نے محسوس کیا تھا کہ شاید رستم نے ہی مہناز کو چائے دے کر کمرے میں بھیجا تھا..... اور یوں نادیہ اور شانی کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ وہ ایک دکھ بھری سانس لے کر رہ گئی۔ اگر رستم ایسا کر رہا تھا تو کیوں۔

دوپہر کو کھیادراج، بلادل احمد اور شانی میں طویل صلاح مشورہ ہوا۔ وہ زیادہ دیر تک یہاں رک نہیں سکتے تھے۔ اب چوہدری اور اس کے بیٹے کی رہائی کے لئے حتمی بات چیت کی ضرورت تھی۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد یہ بات چیت ہوئی۔ اس گفتگو میں صرف چار افراد موجود تھے۔ شانی، رستم، کھیادراج اور لالہ۔ کمرہ بالکل بند تھا۔

شانی نے رستم سے باقاعدہ درخواست کی کہ وہ چوہدری، اس کے بیٹے اور نوکر کو رہا کر دے۔ رستم نے ایک نظر شانی پر ڈالی اور گھمبیر لہجے میں کہا۔ "بی بی! میں انہیں رہا کرنے کے لئے یہاں نہیں لایا۔ میری دلی خواہش ہے کہ ان حرامزادوں کی قبریں اب یہیں ڈیرے کے قبرستان میں بنیں۔ ہاں نوکر جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔"

شانی نے کہا۔''میں جانتی ہوں رستم، یہ ظالم لوگ ہیں۔اس سے بھی بدترین سزا کے حق دار ہیں لیکن بات صرف ان دونوں باپ بیٹے کی نہیں ہے۔ان کی وجہ سے پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں ہے۔ایک خونی لڑائی چند دن پہلے جوہر آباد میں ہو چکی ہے۔اس میں پانچ بندے مرے ہیں اور درجنوں زخمی ہوئے ہیں اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا ہے۔میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ ان باپ بیٹا کی جان بخش دو۔''

''بی بی! میں اپنے دوست کی موت بھول سکتا ہوں۔اپنا ہر بدلہ بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن انہوں نے آپ کی توہین کا جو جرم کیا ہے وہ معافی کے قابل نہیں۔''

''رستم! میں جانتی ہوں تمہیں اس کا بہت دکھ ہے لیکن جب میں خود معاف کر رہی ہوں.....تو تم بھی کر دو۔''

دراج بولا۔''نکڑی ٹھیک کہتی ہے رستم! یہ اتنی دور سے صرف اس لئے چل کر آئی ہے کہ تم ان حرامیوں کو اب معاف کر دو۔''

رستم کی آنکھوں میں آتشیں نمی تھی۔وہ اپنی بی بی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہا۔تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر رستم نے سر جھکائے جھکائے کہا۔''ٹھیک ہے بی بی، جیسے آپ کہتی ہیں۔ہم آپ کو انکار نہیں کر سکتے۔اللہ کرے آپ کی توقع پوری ہو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ اپنے شر سے باز نہیں آئیں گے۔''

''اس بارے میں بھی واپس جا کر نارپوریوں کے ساتھ تفصیل سے بات ہونی ہے۔ہم نے اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہے۔'' شانی نے کہا۔پھر ذرا توقف سے بولی۔''لیکن میں یہاں تم سے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''جی بی بی۔''

شانی نے رستم اور لالہ کی طرف ایک ساتھ دیکھا۔''میں چاہتی ہوں کہ آپ ان تینوں کو یونہی رہا نہ کریں۔اس کے لئے اپنے طریقے کے مطابق تاوان لیں۔''

شانی کی بات سے لالہ کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو گئی۔غالباً وہ خود بھی اس قسم کی کوئی بات سننا چاہتا تھا۔رستم حیران نظر آ رہا تھا۔

شانی نے تدبر سے کہا۔''میں نے دراج اور بلاول سے مشورہ کیا ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ ان تینوں کو یونہی رہا کر دینے سے آپ کے اپنے ساتھیوں میں کسی طرح کی مخالفت پیدا ہو..... مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں تین گروپ ہیں اور تینوں کی اپنی اپنی رائے ہو سکتی ہے۔''

رستم اور لالہ خاموش رہے۔ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ شانی کی بات سے

اختلاف نہیں کر رہے۔

شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''چوہدریوں کے لئے تاوان دینا کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں ہے۔انہوں نے خود اس کی پیشکش کی ہے۔اس صورتِ حال میں ان سے کچھ نہ لینا ٹھیک نہیں ہوگا لیکن اس حوالے سے میں ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''جی بی بی۔''

شانی نے کہا۔''فرض کیا تم نے ان تینوں کے لئے نارپوریوں سے تاوان طلب کرنا ہوتا تو تمہارے ذہن میں کتنی رقم ہوتی؟''

لالہ فرید بولا۔''بی بی سچ جانیں ہم ان بدمعاشوں کو چھوڑنے کے لئے یہاں نہیں لائے تھے۔اس لئے کبھی رقم کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''پھر بھی۔اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی تو تمہارے ذہنوں میں ان تینوں کی رہائی کے لئے آخری رقم کیا ہوتی؟''

فرید نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔گردن مسلسل جھکی ہوئی تھی۔ایک عجیب سے والہانہ احترام نے اس کے سراپا کو جکڑ رکھا تھا۔فرید نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹاتے ہوئے کہا۔''شانی بی بی! اگر ہمارے اپنے پر ہوتا تو ہم ان لٹیرے نارپوریوں سے ان تینوں کی رہائی کے بدلے 50 سے کم وصول نہ کرتے لیکن اب آپ کی بات ہے۔آپ جو کہیں گی ہمیں قبول ہوگا۔بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم آپ کے لئے ان کتوں کو بغیر کسی شرط کے بخش دیں۔''

شانی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔''میں چاہتی ہوں کہ آپ تاوان کی رقم کم کر دیں لیکن اس کے بدلے آپ نارپوریوں سے تین بندوں کی رہائی کا مطالبہ کریں۔یہ تین بندے میرے یقین کے مطابق اس وقت چوہدریوں کی حبس بے جا میں ہیں۔''

رستم نے چونک کر پوچھا۔''بی بی! یہ کون ہیں۔''

''یہ تینوں ڈاکٹر ہیں۔ان میں سے دو میاں بیوی ہیں۔ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر محسن۔تیسرے سینئر ڈاکٹر کا نام بہروز علی ہے۔''

''بہروز علی کا نام تو ہم نے بھی سنا ہوا ہے بی بی جی۔جوہر آباد، میانہ اور آس پاس کے علاقوں میں کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر بہروز کی بڑی شہرت تھی۔وہ ہر جگہ پر قدرت اللہ کے تعویذ گنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا اور لوگ اس پر بڑا یقین کرنے لگے تھے۔'' فرید نے کہا۔

''لیکن پھر وہ اچانک چلا گیا۔کہتے ہیں کہ اسے اچھی نوکری مل گئی تھی اور وہ پاکستان

سے باہر نکل گیا۔" رستم نے کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔" شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ نار پوریوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر بہروز کی گمشدگی کے بارے میں تو لاہور کے کچھ ڈاکٹروں نے کیس بھی کر رکھا ہے۔ مجھے نوے فیصد یقین ہے کہ ان تینوں کو نار پور کے چوہدریوں نے اٹھوایا ہے بلکہ زیب النساء اور ڈاکٹر محسن کے اغوا کی تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے ان دونوں کو خود چوہدریوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے اور روتے بلکتے دیکھا ہے۔ یہ سب کچھ میانہ کی حویلی میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر میاں بیوی کو مار کوٹ کر جس کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا وہ رستم کی کوٹھڑی کے بالکل ساتھ تھی۔ اب چوہدری حشام اور اس کا بیٹا یہاں ہمارے پاس ہیں۔ ان سے پوچھو گے تو وہ سب کچھ بتائیں گے۔ کم از کم زیب النساء اور محسن کے بارے میں تو وہ سب کچھ جانتے ہیں۔"

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف پھینکا۔ اس کی سرخی مائل آنکھیں ایک لمحے کے لئے شانی کی آنکھوں سے چار ہوئیں پھر جھک گئیں۔ وہ بولا۔ "حویلی میں ساتھ والی کوٹھڑی سے مجھے تین چار دن کسی لڑکی کے رونے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ شاید یہ وہی ڈاکٹر ہو جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں۔"

"چلیں... ابھی چل کر اس بلی مار سے پوچھ لیتے ہیں۔" فرید نے کہا۔

"نہیں۔ اس حرامی کو یہاں بلاتے ہیں۔" رستم نے زہرناک لہجے میں کہا۔ پھر باہر نکل کر وہ کسی کو تاؤ حشام کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد تاؤ حشام ان کے سامنے کمرے میں موجود تھا۔ آج وہ زنانہ کی بجائے مردانہ لباس میں تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور رنگ دار لاچہ پہن رکھا تھا۔ سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے پشت پر باندھے گئے تھے۔ گھنی مونچھوں والا ایک نہایت تنومند پوٹھوہاری اسے بازو سے پکڑ کر اندر لایا۔ وہ لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے اور جسم پر کئی زخم تھے۔ سب سے نمایاں اور رستا ہوا خون اس کی ناک پر تھا۔ یہ نتھ کا زخم تھا۔ وہی زخم جو طاقت ور ہمیشہ سے کمزور و ناتواں کو لگاتا آیا ہے۔ آج یہ زخم ایک جابر کی ناک پر نظر آیا تھا تو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ وہ چاروں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔

"بیٹھ جا نیچے۔" رستم نے تحکم سے کہا۔

چوہدری نے فرش پر بیٹھنے کے لئے گھٹنوں کو خم دیا تو شانی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

"نہیں چوہدری ادھر بیٹھو۔" اس نے ایک موڑھا نما کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

چوہدری نے ایک نظر شانی کو دیکھا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ کتا اس لائق نہیں ہے بی بی! آپ اس پر ترس نہ کھائیں۔" فرید نے چوہدری کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شانی نے ہاتھ کے اشارے سے فرید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رستم کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ چوہدری کو ٹانگ مار کر فرش پر گرا دیتا۔ چوہدری سے مخاطب ہو کر بے حد زہریلے لہجے میں بولا۔ "تو نے میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر محسن کو رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں کہاں ہیں اب؟"

چوہدری نے فاتر العقل لوگوں کی طرح ارد گرد دیکھا پھر منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"اونچا بول۔" رستم نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ چوہدری کا سیاہی مائل رنگ پھیکا پڑ گیا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سر جھکائے جھکائے بولا۔ "لیڈی ڈاکٹر میانہ میں ہی ہے......"

"اور اس کا خاوند......؟"

"وہ نہیں ہے۔" حشام بڑبڑایا۔

"وہ کہاں ہے؟" رستم پھنکارا۔

"پ...... پتا نہیں۔" حشام نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

رستم نے طیش کے عالم میں بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ تاؤ حشام کرسی سے اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ پتھریلے فرش پر گرا۔ رستم نے غضب سے مغلوب ہو کر اس کا گریبان پکڑا اور جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "یہ کیوں نہیں کہتا حرامی کہ تو نے مار دیا ہے اسے۔ جان لے لی ہے۔"

چوہدری کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ رستم ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ نوجوان خوبرو ڈاکٹر محسن میانہ گاؤں کی قاتل حویلی میں اپنی جان ہار چکا ہے۔ اس کی بیوی زندہ ہے اور وہ بھی شاید اس لئے کہ چوہدری اور اس کے شرابی ہرکاروں کی "خدمت" کر سکے۔

شانی سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ تاؤ حشام کے لئے رستم کا قہر بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک باہر سے شور اور بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ رستم نے تاؤ کو چھوڑا اور کھڑکی کھولی۔ پچھلے پہر کی زردی مائل دھوپ میں ایک شخص بگٹٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک پتھر پھلانگا اور کھباڑی کے

درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ پانچ چھ رائفل بردار اور کلہاڑی بردار اس کے پیچھے تھے۔

''کون ہے یہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''چوہدری کا کاماں (نوکر) ہے۔'' رستم نے تیزی سے جواب دیا اور فرید کے ساتھ باہر کو لپکا۔

شانی سمجھ گئی کہ چوہدری کے نوکر نے موقع دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس ویرانے میں اسے حماقت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ سارے باہر نکل آئے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر نیچے وسیع نشیب میں بھاگتے ہوئے نوکر کو دیکھنے لگے۔ وہ کافی دور جا چکا تھا۔ رستم نے کوئی شارٹ کٹ استعمال کیا تھا اور بھاگتے ہوئے شخص کے کافی قریب پہنچ گیا تھا۔۔۔ دونوں میں قریباً سو گز کا فاصلہ تھا۔ رستم کے ہاتھ میں یقیناً پستول وغیرہ نہیں تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس شخص کو رکنے کے لئے کہہ رہا ہے لیکن وہ رک نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک مقام پر پہنچ کر رستم رک گیا۔۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ انہوں نے بھاگنے والے کا جسم فضا میں اچھل کر نیچے گرتے دیکھا۔ زمین میں دبی ہوئی طاقت ور بارودی سرنگ نے اس کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔

☆======☆======☆

شانی اور مہناز سکتہ زدہ کھڑی تھیں۔ رستم انہیں خاصے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ دھماکے سے ایک یا دو سیکنڈ پہلے رستم نہ صرف بھاگتے بھاگتے رک گیا تھا بلکہ گھٹنے زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے یاس زدہ انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ دھماکے والی جگہ سے گرد و غبار کا ایک مرغولہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس مرغولے میں مرنے والے کے کپڑوں کی سفید دھجیاں بھی نظر آئی تھیں۔

حیرت اور افسوس کے چند لمحے گزر گئے تو لالہ فرید، سردار دراج، بلاول اور بہت سے دوسرے لوگ جائے حادثہ کی طرف بڑھے۔ رستم بھی اب اٹھ گیا تھا اور اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں تاؤ کا بدنصیب ملازم بھاگنے کی کوشش میں بارودی سرنگ سے ٹکرایا تھا۔ یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا تھی۔ تاؤ حشام اور راجو کے ساتھ ساتھ اس کی رہائی بھی عمل میں آنے والی تھی۔ اپنی جلد بازی کے سبب وہ قید زندگی سے ہی رہا ہو گیا تھا۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد چند مقامی افراد پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ میں مرنے والے کی باقیات لے کر چھجے میں پہنچ گئے۔ لالہ فرید اپنے بندوں سے باز پُرس کر رہا تھا کہ یہ شخص سرنگ سے نکلا کیسے؟

پتا چلا کہ وہ پیٹ درد کا بہانہ کر رہا تھا اور کوٹھڑی کے فرش پر لوٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر اسے دیکھنے کے لئے اندر گیا۔ اتفاق سے اس کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر ناصر کو دھکا دے کر گرایا اور راستے میں آنے والے ایک شخص کے سر پر اس نے آہنی راڈ سے ضرب لگائی۔ وہ وحشت کے عالم میں چنگھاڑ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مسلسل بند رہنے سے اس پر جنون سوار ہو گیا ہو۔ اس شخص کے بارے میں پہلے بھی یہی اطلاع تھی کہ وہ ہر وقت واویلا کرتا رہتا

تھا۔

تاؤ حشام کو بھی اپنے کارندے کی ہلاکت کی خبر مل گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں آیا۔ شاید اسے اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی نوکر چاکر ایسے لوگوں کے لئے کیڑے مکوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ شانی میانہ کی حویلی میں حشام کا سلوک نوکروں اور نوکرانیوں سے دیکھ ہی چکی تھی۔ نوکر کے مرنے کی خبر سن کر حشام نے بس ایک بار ناپسندیدگی سے سر ہلایا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ شانی کو وہ کچھ بدحواس بلکہ فاتر العقل سا محسوس ہوا۔

''چوہدری کو کیا ہوا ہے؟'' شانی نے قریب کھڑے لالہ فرید سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بی بی جی! بالکل بھلا چنگا ہے۔ یہ پکا شرابی ہے۔ ایسے شرابیوں کو اگر آٹھ دس روز کڑوا پانی نہ ملے تو ان کا سواستیاناس ہو جاتا ہے۔''

''اوپر سے تھوڑی بہت مار بھی لگائی ہوگی رستم نے۔'' دراج نے دھیمی آواز میں کہا۔

پورے ڈیرے میں سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ جہاں تک دھماکے کی آواز گئی، وہاں تک لوگ چونکے تھے۔ اب وہ چھجے کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ آگے جا کر مرنے والے کی باقیات بھی ملاحظہ کر رہے تھے۔ یہ جو کچھ ہوا تھا اس میں ڈیرے والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی صورتِ حال میں ایک شدید قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس موت کی ذمے داری کسی نہ کسی طور تو ڈیرے والوں پر عائد ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو حشام اور اس کے ساتھی کسی طور بھی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ ابھی بارودی سرنگ کے دھماکے سے کچھ دیر پہلے جو اطلاع شانی کو ملی تھی وہ کچھ کم اندوہناک نہیں تھی۔ چوہدری حشام کے تاثرات سے واضح ہو چکا تھا کہ میانہ کی حویلی میں وہ ڈاکٹر محسن کی جان لے چکا ہے۔

رات نو بجے کے لگ بھگ شعلوں کی روشنی میں مرنے والے ملازم ساجن کو ڈیرے کے چھوٹے سے قبرستان میں نوجوان اباگیر کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ کچھ لوگ اپنے اردگرد والوں کو زندگی میں رُلاتے رہتے ہیں لیکن ان کی موت پر کوئی رونے والا نہیں ہوتا۔

اگلے روز رات کو وہ میٹنگ پھر وہیں سے شروع ہوئی جہاں دھماکے کے سبب ختم ہوئی تھی۔ حشام کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے پھر چھجے کے کمرے میں لایا گیا۔ لالہ فرید، رستم، دراج اور شانی بھی کمرے میں موجود تھے۔

حشام کے سانولے چہرے پر چوٹوں کے تازہ نشان تھے۔ کل حشام کے منہ سے ڈاکٹر

محسن کے لاپتا ہونے کی اطلاع سن کر رستم غصے سے بے قابو ہوا تھا اور اس نے حشام کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ بات چیت شروع ہونے کے بعد تاؤ حشام نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ڈاکٹر محسن میانہ کی حویلی میں زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ رستم کے پوچھنے پر اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔ ''اسے سرسام ہو گیا تھا۔ بخار اس کے سر کو چڑھ گیا تھا۔ الٹی سیدھی باتیں کرتا تھا۔ رات کو پانی پینے کے لئے اٹھا تو گر گیا اور اس کا سر منجی (چارپائی) کے پاوے کے ساتھ لگا۔ پھر وہ اٹھ نہیں سکا۔''

''بکواس کرتا ہے تُو۔'' رستم نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''تیرے منہ میں کتے سے زیادہ پلید زبان ہے۔ تُو نے اس کو مارا ہوگا۔ تڑپا تڑپا کر اور رُلا رُلا کر۔ آفندی کی طرح اسے بھی چھت سے الٹا لٹکایا ہوگا اور اس کی جان نکلنے کا تماشا دیکھا ہوگا۔''

''نہیں...... میں اپنے پُتر کی قسم کھاتا ہوں، مجھ سے کوئی بھی وڈی سے وڈی قسم لے لو۔ وہ بیمار ہونے سے مرا تھا۔''

''پر اگر وہ بیمار بھی ہوا ہوگا...... تو کیوں ہوا ہوگا؟'' رستم پھنکارا۔ ''کتے کے تخم! تُو نے اس کے لئے جینا حرام کر دیا ہوگا۔ اس بھلے مانس بندے کو موت اور زندگی کے درمیان لٹکا دیا ہوگا۔ وہ بے چارہ شہر میں اپنا گھر بار چھوڑ کر تم لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے یہاں آیا تھا...... تم نے اسے زخم زخم کیا اور موت کے منہ میں دھکا دے دیا۔ تم......'' اس کے ساتھ ہی رستم کے ہونٹوں سے حشام کے لئے بے ساختہ ایک گندی گالی نکل گئی۔

گالی دینے کے بعد وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ غالباً اسے یہ احساس بے حد شدت کے ساتھ ہوا تھا کہ شانی کے سامنے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

حشام سر جھکائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیسے ایک مجرم بغیر کسی وکیل دلیل کے کٹہرے میں ہو۔ لالہ فرید بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چوہدری! تم کہتے ہو کہ تم نے ڈاکٹر محسن اور اس کی بیوی ڈاکٹر زیب کو ایک ہی کمرے میں یا کوٹھڑی میں رکھا ہوا تھا؟''

حشام نے اثبات میں سر ہلایا۔

فرید بولا۔ ''اب تم بک رہے ہو کہ ڈاکٹر محسن شدید بیمار تھا اور وہ پانی پینے کے لئے اٹھا تھا کہ گر گیا۔'' حشام خاموش رہا۔ فرید نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔ ''ڈاکٹر کی بیوی اس وقت کہاں تھی؟''

رستم پھنکارا۔ ''وہ حویلی کے کسی شرابی چوہدری کے کمرے میں ہوگی اور کہاں ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا تھپڑ اس نے چوہدری کے سانولے چہرے پر مارا۔ چوہدری کا

سر بڑے زور سے دیوار سے ٹکرایا اور ناک کے زخم سے تازہ خون بہنے لگا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ شانی کی موجودگی کے سبب رستم خود پر بے پناہ ضبط کر رہا تھا۔ ورنہ شاید وہ اسی جگہ مار مار کر چوہدری کی کھال اس کے جسم سے علیحدہ کر دیتا۔ شانی نے ہاتھ کے اشارے سے رستم کو اشارہ کیا کہ وہ تحمل کا ثبوت دے۔

''اس کی لاش کہاں دفن کی تم لوگوں نے؟'' شانی نے حشام سے پوچھا۔

''قبرستان میں...... رات کے وقت۔'' حشام نے مختصر جواب دیا۔

''اور ڈاکٹر زیب اب واقعی حویلی میں ہے یا کہیں اور رکھا ہے اسے؟''

''نہیں، حویلی میں ہے۔'' حشام نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اور ڈاکٹر بہروز کہاں ہے؟''

حشام خاموش رہا۔ رستم نے ایک بار پھر بھڑک کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔ ''حرامزادے! بی بی کیا پوچھ رہی ہیں تجھ سے؟ ڈاکٹر بہروز کہاں ہے؟''

''وہ...... نار پور...... میں تھا۔'' حشام نے اٹک کر جواب دیا۔

اس نے ''تھا'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ کہیں وہ بھی تو جان کی بازی نہیں ہار چکا تھا۔

''وہ زندہ ہے یا مر گیا؟'' رستم نے حشام کے سر کو بُری طرح جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''زندہ ہے...... پر میں ڈیڑھ دو مہینے سے اسے ملا نہیں۔'' حشام نے رستم کی برہمی دیکھ کر جلدی سے جواب دیا۔

دو چار منٹ کی مزید پوچھ گچھ کے بعد لالہ فرید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں حشام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا فیصلہ ہے کہ اگر تم اور تمہارا بیٹا یہاں سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہو تو تمہیں دونوں ڈاکٹروں کو چھوڑنا پڑے گا اور انہیں حفاظت سے جوہر آباد عارف کمبوہ کے پاس پہنچانا پڑے گا۔''

''دوسری شرط تاوان کی ہے۔'' رستم نے ٹھوڑی پکڑ کر حشام کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

''تمہارے وارثوں کو 20 لاکھ روپیہ دینا ہوگا۔ اس میں ایک پیسے کی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ نہ ہی دونوں ڈاکٹروں کی فوری واپسی میں کوئی رعایت ہوگی۔'' (کچھ دیر پہلے شانی، رستم، فرید وغیرہ نے علیحدہ سے مشورہ کیا تھا اور اس میں ان مطالبوں کو حتمی شکل دے دی گئی تھی)

گروہ کے سردار کی حیثیت سے فرید نے کہا۔ ''حشامے، جو کچھ تُو کر چکا ہے اس کے بعد تم باپ بیٹا پر دہی ڈال کر تازی کتے چھوڑ دیئے جائیں تو یہ بھی کم ہے۔ بی بی جی کو دعائیں دو جن کی کوشش سے تمہاری جان بچنے کی صورت پیدا ہوئی ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لے، جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہوگی...... تیرے وارثوں کو بس ہاں یا نہ میں جواب دینا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں ہم تجھے ٹیپ ریکارڈر دیں گے۔ اپنے پچھلوں کے ساتھ تُو نے جو بھی بک بک کرنی ہے اس میں کر لینا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں شانی نے بلاول سے کہہ کر ایک طویل خط چوہدری حشام کے لواحقین کے نام لکھا۔ اس خط میں یہاں کی تمام صورتِ حال وضاحت سے بیان کی گئی اور دونوں مطالبات کا ذکر بھی تفصیل سے کر دیا گیا۔ آخر میں شانی نے خصوصی طور پر یہ جملے لکھوائے۔

''لالہ گروپ کے لوگوں سے طویل بات چیت کے بعد یہ سب کچھ طے ہوا ہے۔ یہ لوگ مزید کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہمارا جواب بس ہاں یا نہ میں ہونا چاہئے۔ لالہ فرید کا ایک بندہ دلاور کھیا دراج اور ایک تیسرے شخص کے ساتھ آپ کی طرف آ رہا ہے۔ یہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ ڈاکٹر بہروز اور لیڈی ڈاکٹر زیب جوہر آباد میں عارف کمبوہ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ رقم بھی کیش کی صورت میں دلاور کے حوالے کرنا ہوگی۔ دلاور کے واپس پہنچتے ہی یہ لوگ چوہدری حشام اور چھوٹے چوہدری راجو کو رہا کر دیں گے۔ یہ لالہ فرید اور اس کے ساتھیوں کی ذمے داری ہوگی کہ وہ ہمیں حفاظت سے اگلے ڈیرے پر پولیس فورس تک پہنچائیں۔ اس خط کے ساتھ چوہدری حشام اور چھوٹے چوہدری راجو کی ٹیپ شدہ آواز بھی ارسال کر رہے ہیں۔ وہ دونوں بالکل خیریت سے یہاں موجود ہیں۔''

خط لکھنے کے دوران میں رستم نے چوہدری حشام اور راجو کی آواز بھی ریکارڈ کر لی تھی۔ راجو نے تو چوہدری قادر کو مخاطب کرتے ہوئے دو تین جملے ہی بولے تھے۔ ان جملوں میں اس نے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہے لیکن جلد سے جلد ان ویران پہاڑیوں سے نکل کر اپنے گاؤں میں آنا چاہتا ہے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کو یاد کر کے وہ آبدیدہ ہو گیا تھا اور اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم چوہدری حشام نے پندرہ بیس منٹ کی ٹیپ ریکارڈ کروائی تھی۔ اس میں چوہدری نے اپنے پچھلوں کو بتایا تھا کہ رقم کہاں سے اور کیسے حاصل کرنی ہے۔ ایک جگہ اس نے چوہدری بشیر کا نام بھی لیا تھا اور قادر سے کہا تھا کہ چوہدری بشیر

کے ذمے پچھلے سال کی کپاس کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ واجب الادا ہے۔ یہ روپیہ چوہدری بشیر سے لے لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے گوجرانوالہ کے ایک بینک سے رقم نکلوانے کے لئے اپنے ایک بھتیجے کو بھی کچھ ہدایات دی تھیں۔

ریکارڈنگ کے آخر میں اس نے چوہدری قادر سے کہا تھا کہ ڈاکٹر بہروز جہاں اور جس حالت میں بھی ہے اسے میانہ پہنچایا جائے اور وہاں سے لیڈی ڈاکٹر کو لے کر دونوں کو حفاظت سے جوہر آباد میں عارف کمبوہ یا چوہدری نواب کے حوالے کیا جائے۔ چوہدری نے اپنے لواحقین کو اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ ڈپٹی ریاض کا نام لے کر اس سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس سارے معاملے میں کسی طرح کا ''بل فریب'' نہ رکھا جائے کیونکہ یہاں ان دونوں کی جان کو شدید خطرہ ہے۔

یہ ریکارڈ شدہ کیسٹ خط سمیت کھیا دراج کے حوالے کر دی گئی۔ شانی نے وقتِ رخصت دراج کو کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ اگلے دن صبح سات بجے کے قریب کھیا دراج، دلاور اور اس کا ایک ساتھی مظفر گھوڑوں پر سوار اگلے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ شانی نے دراج کو جو ضروری ہدایات دی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ فی الحال حشام کے ملازم کی موت کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا۔

اب صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ شانی اور بلاول وغیرہ کو کم از کم تین چار دن یہاں مزید رہنا تھا۔ تین چار دن سے پہلے دراج اور دلاور کی واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی بلکہ ہو سکتا تھا کہ اس سے زیادہ وقت لگ جاتا۔

شانی کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پرسوں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رستم نے یہاں شادی کر لی ہے اور اس کی بیوی کوئی اور نہیں نادیہ تھی۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران ہی شانی نے نادیہ کو بہت اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا۔ اس نے رستم کے لئے نادیہ کے والہانہ پیار کو بھی محسوس کیا تھا۔ ان دنوں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ نادیہ کسی طرح رستم کی زندگی میں آ جائے اور وہ دونوں آزاد علاقے کی طرف کہیں نکل جائیں۔ شانی نے محسوس کیا تھا کہ نادیہ، رستم کی زندگی میں خوشیاں لا سکتی ہے اور اس کا اتنا خیال رکھ سکتی ہے جتنا شاید کوئی اور نہ رکھ سکے۔

اب وہی ہوا تھا جو شانی نے ماضی میں چاہا تھا۔ رستم نہ صرف آباد دنیا سے دور، ان پہاڑوں میں چلا آیا تھا بلکہ نادیہ بھی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھی۔ پھر اب اس کے سینے میں دھواں سا کیوں بھر رہا تھا۔ وہ اتنی گھٹن کیوں محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک طرف تو جہ

دل سے نادیہ کو مبارک باد دینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اس کے گلے میں نمکین پانی بھی جمع ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی شے اچانک گم ہو گئی ہو۔

وہ نادیہ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن نادیہ کو رستم نے اوجھل کر دیا تھا۔ پرسوں شانی کو معلوم ہوا کہ وہ دو نمبر سرنگ میں تھی اور وہاں مقامی کلینک میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔ شانی دوسرے کمرے میں لالہ فرید کی بیوی مہناز کے پاس پہنچی جو برتن مانجھ رہی تھی۔ شانی نے پوچھا۔ ''حنیفاں کہاں ہے؟''

مہناز نے جواب دیا۔ ''وہ دواخانے (کلینک) میں نادیہ کے پاس ہے۔ رات کو رستم بھی وہیں تھا۔''

''کیوں خیریت ہے؟''

''نادیہ کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ اسے الٹی بھی ہو رہی تھی۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں جس چھپکلے نے اسے کاٹا تھا اس میں چار کالی بھڑوں جتنا زہر ہوتا ہے، ابھی اسے ٹھیک ہونے میں تین چار دن لگیں گے۔''

شانی نے مہناز کو ساتھ لیا اور نادیہ کو دیکھنے سرنگ کی طرف چل دی۔ شانی کو یہاں ڈیرے پر خاص پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتی اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا جاتا۔ اس سے بات کرتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ یہاں تک کہ یہاں کا کرتا دھرتا لالہ فرید بھی بے حد احترام سے بات کرتا تھا۔ لالہ کا ایک قریبی ساتھی کانھیا، شانی اور مہناز کے عقب میں تھا اور بڑے ادب سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔

سرنگ میں داخل ہو کر شانی کلینک کے سامنے پہنچی تو اطلاع پا کر ڈاکٹر ناصر خود باہر آ گیا۔ شاید وہ چند سال پہلے تک شکل وصورت سے ڈاکٹر لگتا ہوگا مگر اب تو یہاں کے ماحول میں خود بھی جرائم پیشہ اشتہاری ہی نظر آنے لگا تھا۔ داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکار کی طرح تھیں۔ سر کے بال بھی خاصے لمبے تھے۔ بہرحال اس کا لباس اسے دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ ایک بوسیدہ سی پتلون قمیص میں دکھائی دیتا تھا۔ شانی نے اس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بی بی جی! چھوٹی بھرجائی یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کمرے میں ہیں۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے اور چونکہ یہاں شور شرابا زیادہ رہتا ہے اس لئے انہیں وہاں رکھا گیا ہے۔''

''کیا اب ان سے ملا جا سکتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''آپ کو انکار بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا وہ سو رہی ہیں؟''

''ہاں سو تو رہی ہیں۔ رات جاگتی رہی ہیں اب میں نے انہیں ہلکا سا ٹرنکولائز کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پھر مل لوں گی۔'' شانی نے کہا اور واپس مڑی۔

ڈاکٹر ناصر بولا۔ ''وہ جاگیں گی تو میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔''

پتا نہیں کیوں شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نادیہ سے دور رکھا جا رہا ہے۔ بے شک وہ بیمار بھی تھی۔ کل بلاول نے بھی شانی کو بتایا تھا کہ نادیہ کو بخار ہے اور متلی وغیرہ ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود شانی کو اس میں کچھ پردہ داری محسوس ہوتی تھی۔ شانی نے سوچ لیا کہ وہ اس معاملے میں زیادہ کرید نہیں کرے گی اور اگر رستم کی خواہش ہے کہ شانی اس کی بیوی سے زیادہ نہ ملے تو وہ اس خواہش کے مطابق چلے گی۔

صبح شانی بہت سویرے اٹھ گئی۔ ابھی پوٹھوہار کے مخروطی ٹیلوں سے شب کی تاریکی پوری طرح چھٹی نہیں تھی۔ ہلکی خنک سی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سحر خیز پرندوں کی قطاریں نیم تاریک آسمان کے پیش منظر میں دکھائی دے رہی تھیں۔ شانی کمرے سے نکل آئی۔ کھباڑی، بیری اور گوندلی کے درخت اوس میں بھیگے ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ ڈیرے پر ہو کا عالم طاری تھا۔ سرکنوں میں لوگ سو رہے تھے۔ چھپے اور حجروں کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔ سامنے ہی وہ کمرہ دکھائی دیا جہاں رستم اور نادیہ کی رہائش تھی۔ آج یہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ شانی آہستہ آہستہ چلتی اس کمرے تک آئی۔ نادیہ دو دن سے زیر علاج تھی۔ کمرے میں ہر شے بے ترتیب نظر آ رہی تھی۔

شانی کچھ دیر تک کمرے کو دیکھتی رہی پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے کمرے کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ رستم اور نادیہ کی ہر چیز اس نے سلیقے سے رکھی۔ رستم کے دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر کے لکڑی کی الماری میں رکھے۔ ان کپڑوں کو چھوتے اور سنبھالتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔

باتھ روم کے دروازے کے پاس ایک کونے میں کچھ ان دھلے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے کھونٹیوں پر لٹکانے کے لئے کپڑے اٹھائے۔ رستم اور نادیہ کے کپڑے باہم الجھے ہوئے تھے۔ جیسے ایک دوسرے میں گم ہوں۔ ایک بار پھر ایک شدید ٹیس اس کے سینے میں ابھری۔ کچھ ان دیکھے مناظر کا تصور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں گھس آیا۔ ایک

خلوت، ایک ریشمی اندھیرا، کچھ سرگوشیاں۔ وہ اس تصور کو ذہن سے جھٹکنے کے لئے خواہ مخواہ چیزوں کو تیزی سے ادھر سے اُدھر رکھنے لگی۔ اس نے ایک قمیص الماری میں رکھنے کے بجائے کھانے والی ٹرے میں رکھ دی اور پلیٹیں ٹرے میں رکھنے کی بجائے کپڑوں والی الماری میں گھسا دیں۔ پھر وہ خود ہی سٹپٹائی اور ترتیب کو درست کیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل ایک دم رونے کو چاہا۔ وہ تو ایسی نہیں تھی۔ سخت ترین حالات میں بھی خود کو سنبھالے رکھتی تھی۔ نہ آنکھ نم ہونے دیتی تھی نہ چہرے پر بے چارگی آنے دیتی تھی۔ رنگ والی کی وڈی چوہدرانی کی طرح اپنا سر اونچا اور دل مضبوط رکھتی تھی۔ مگر آج صورتِ حال کچھ مختلف تھی۔ ... نامعلوم وجوہ کی بناء پر آنسوؤں کا تند ریلا آنکھوں کے بند توڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی اور رونے لگی۔ گرم ابلتے ہوئے آنسوؤں نے بڑی خاموشی سے اس کے چہرے کو تر بتر کیا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ رو رہی تھی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیوں رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد دل کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ وہ اچھی طرح چہرہ دھو کر باہر آ گئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں مہناز جاگ نہ گئی ہو لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں پہنچ جاتی۔ کمرے میں اور اردگرد بدستور ہُو کا عالم طاری تھا۔ رونے کے بعد شانی کی طبیعت میں عجیب طرح کا سکون آ گیا تھا۔ کل شانی نے رستم کا لباس دیکھا تھا۔ وہ کافی گندہ تھا۔ اسے بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ ایک دھلی ہوئی قمیص تو شانی کو نظر آئی لیکن اس کے ساتھ ہم رنگ شلوار نہیں ملی۔ دوسری قمیص کی شلوار تو موجود تھی مگر قمیص کی جیب اُدھڑی ہوئی تھی اور گریبان کے بٹن بھی نہیں تھے۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دل چاہا کہ وہ رستم کے آنے سے پہلے اس کے کپڑے پہننے کے لئے تیار کر دے۔ اس نے الماری سے سوئی دھاگہ تلاش کیا اور بٹن ڈھونڈ کر انہیں قمیص پر ٹانکنے کے بعد ادھڑی ہوئی جیب کو درست کیا۔ اب استری کا مرحلہ تھا۔ استری یہاں کوئلوں والی استعمال ہوتی تھی۔ شانی کچن میں گئی۔ مہناز، اس کا چچا اور اللہ فرید بدستور گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ یہاں اسے کون دیکھ رہا تھا۔ شانی نے انگیٹھی میں پڑے لکڑی جلا کر کوئلے بنائے اور ایک چمٹے کی مدد سے انہیں استری میں رکھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ رستم کے دھلے ہوئے کپڑے استری کر رہی تھی۔ بعد میں ایک دو جوڑے اس نے نادیہ کے بھی استری کر ڈالے۔ اس دوران میں قریبی کمرے سے مہناز کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شانی نے رستم کا جوڑا الماری میں لٹکایا اور کچن میں آ گئی۔ مہناز کے کچن میں پہنچنے سے پہلے اس نے چائے تیار کر لی۔

اب مہناز کو ناشتہ بنانے کی جلدی تھی۔ وہ بولی۔ ''آج کافی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی رستم

آ جائے گا اس نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اپنی طرف سے اتنا لاپرواہ ہو رہا ہے۔'' شانی نے چونک کر مہناز کی طرف دیکھا جیسے اس کے تاثرات جاننا چاہ رہی ہو کہ کہیں مہناز، رستم اور اس کے حوالے سے کچھ جانتی تو نہیں ہے لیکن مہناز کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا۔

مہناز آٹا گوندھ رہی تھی جب کمرے میں ننھے ٹیپو نے رونا شروع کر دیا۔ مہناز اس کے پاس گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کے کان میں درد ہو رہا ہے۔ مہناز اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ شانی نے اس سے کہا۔ ''چلو تم بچے کو دیکھو، میں ناشتہ بناتی ہوں۔''

''نہ بھئی نہ۔'' مہناز نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں میرے بندے سے مجھے پھینٹی لگوانی ہے۔ تم ہماری خاص الخاص مہمان ہو۔ تم سے روٹیاں پکواؤں گی تو سب ڈنڈا لے کر میرے دوالے ہو جائیں گے۔''

''میں اپنی خوشی سے کر رہی ہوں۔ اس میں ایسی کون سی بات ہے۔''

ایک دو منٹ تک دونوں میں خاصی بحث ہوئی۔ آخر شانی نے اپنی بات منوالی۔ ٹیپو بھی مسلسل روتا رہا تھا۔ مہناز اس کے پاس چلی گئی۔

شانی ناشتہ تیار کرنے لگی۔ لاہور میں لفافہ میکر ''جنتے'' اور اس کے بیٹے گلابے کا گھر چھوڑنے کے بعد شانی نے کوئی گھریلو کام نہیں کیا تھا۔ آج اتنے دن بعد ناشتہ تیار کرتے ہوئے اسے عجیب لگ رہا تھا اور بہت اچھا بھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ رستم کے لئے کر رہی ہے۔ ایک بار پھر اس سے جدا ہو جانے سے پہلے، وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ روزمرہ کے چھوٹے موٹے معمولی کام۔ کیا خبر پھر کبھی ایسا موقع ملے یا نہیں۔ وہ ایک دو آخری اور بہت ضروری باتیں بھی رستم سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگلے ایک دو دن میں اسے یہ باتیں کہنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔

اس نے بڑی چاہتوں سے پرتوں والے پراٹھے بنائے، انڈوں اور پیاز کا آملیٹ بنایا اور ساتھ میں رستم کا پسندیدہ سوجی کا حلوہ بھی تیار کیا۔ کچھ دیر بعد رستم اور بلاول ساتھ ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ بلاول رستم کے ساتھ بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ اکثر رستم کے ساتھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ خوش گفتار اور بے تکلف شخص تھا۔ اس کی دلیری اور ہمت بھی ہر شبے سے بالاتر تھی۔ اگلے ڈیرے سے روانہ ہونے کے بعد جب ان کا واسطہ آوارہ گردوں کی ٹولی سے پڑا تھا، بلاول نے دراج کے ساتھ مل کر جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس واقعے میں بلاول کی

حاضر دماغی بھی کھل کر سامنے آئی تھی۔

رستم، فرید اور بلاول ناشتہ کرنے لگے۔ وہ برآمدے میں ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ شانی باورچی خانے کی کھڑکی میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں رستم پر تھیں۔ رستم کے لمبے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے استخوانی چہرے پر جھول رہی تھیں۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ سو نہ سکا ہو۔ وہ بہت بے دلی سے کھا رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لے رہا تھا۔ شانی کھڑکی کی اوٹ سے اسے دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا کوئی بہت بڑا بوجھ ہے جو رستم کو روندرہا ہے۔

کیا واقعی ایسا تھا؟ یا شانی کو محسوس ہو رہا تھا..... ؟

''کیا دیکھ رہی ہو شانی؟'' عقب سے مہناز کی آواز ابھری۔

شانی ٹھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''کچھ نہیں..... بس..... یونہی کھڑی تھی۔''

وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر زیرلب مسکرا کر ہولے سے بولی۔ ''سچ کہتے ہیں، عورت زندگی میں ایک ہی دفعہ پیار کرتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم جانتی ہو شانی اور تھوڑا بہت میں بھی جانتی ہوں۔ فرید نے مجھے بتایا تھا۔ اخبار میں بھی تمہارے اور رستم کے بارے میں کچھ باتیں آئی تھیں۔ پرانے اخبار اس ڈیرے تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔''

شانی کو تھوڑا سا غصہ آیا لیکن مہناز کے لہجے میں پیار، ہمدردی اور دانائی کی ایسی لہر تھی کہ وہ اپنے غصے کا اظہار نہ کر سکی۔

مہناز بولی۔ ''تمہاری طرح میں بھی عورت ہوں۔ عورت کی مجبوریاں سمجھتی ہوں۔ تمہارے خاندان کی عزت تھی، تمہارے بزرگوں کی نیک نامی تھی اور بات صرف تمہارے میکے کی ہی نہیں تھی۔ تمہارے سسرالی بھی تم پر پورا حق جتا رہے تھے اور پھر شاید تمہاری قسمت کا پھیر تھا کہ تمہیں پیار بھی ایک ایسے مرد سے ہوا جو لوگوں کی نظر میں ڈاکو، قاتل تھا..... تمہاری جگہ کوئی بھی دلیر سے دلیر عورت ہوتی، وہ اس پیار میں بس ایک حد تک ہی جا سکتی۔''

شانی اب بھی جواب میں کچھ نہیں کہہ سکی۔

مہناز سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایک موقع پر تم نے اس حد کو توڑا بھی ہے۔ کٹھولی کے میلے میں سینکڑوں لوگوں کے سامنے تم نے خود کو رستم پر گرایا اور اس کے حصے کی لاٹھیاں اپنے پنڈے پر کھائیں۔ وہ بڑی جرأت والا کام تھا لیکن..... لیکن یہاں تم سے ایک غلطی بھی ہوئی شانی کم از کم میں تو اسے غلطی ہی سمجھتی ہوں۔ تم پتا نہیں کیا

سمجھتی ہوں؟''

''کون سی غلطی؟'' شانی نے ہولے سے پوچھا۔

''جب کٹھولی کے میلے والا سارا واقعہ ہوگیا تو پھر ہر چیز کھل کر سامنے آگئی۔ تمہارے اور رستم کے پیار کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی شک شبہ بھی باقی نہ رہا۔ جب کٹھولی کے میلے والی خبر ہم تک پہنچی تو میرا اور فرید کا خیال تھا کہ اب تم دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ بالکل جس طرح ایک موقع پر مجھے اور فرید کو ضرورت تھی۔ ہمارے اور تمہارے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا شانی۔ سمجھو کہ یہ بھی ایک شریف گھر کی لڑکی اور ایک اشتہاری مجرم کے پیار کی کہانی ہے۔ اس وقت میں نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کیا تھا اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے فرید کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم اور رستم ایک ہو جاؤ گے لیکن پھر پتا چلا کہ رستم کسی اور لڑکی کے ساتھ پوٹھوہار کی طرف آیا ہے اس کے بعد ''

''دیکھو مہناز آپا، یہ میرے ذاتی فیصلے ہیں اور ذاتی زندگی کے بارے میں فیصلے ہر کوئی کر سکتا ہے۔'' شانی کا لہجہ روکھا تھا۔

''تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے شانی! لیکن میں اس غلطی کی بات کر رہی ہوں، جو میرا خیال ہے کہ تم سے ہوئی ہے۔ میری رائے میں یا تو کٹھولی میلے والا واقعہ نہیں ہونا چاہئے تھا یا پھر اس وقت رستم کے ساتھ نادیہ کے بجائے تمہیں ہونا چاہئے تھا۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ میں صرف ''بڑی'' ہونے کی حیثیت سے اپنے دل کی بات تم سے کہہ رہی ہوں۔''

شانی خاموش رہی، اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار تھے۔ وہ مہناز کو کیسے بتاتی کہ وہ اتنی پتھر نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جا رہا ہے اور اگر پتھر ہے تو بھی مہتر بستی میں گونجنے والے ایک محبت بھرے گیت کی حرارت میں یہ پتھر پگھل گیا تھا۔ ہزاروں دھڑکنوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا تھا، من جا پیاری من جا...... اور وہ ساری مصلحتوں اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے دل کو منانے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حالات کو کہیں سے کہیں لے گیا۔ پھر اسے اپنے بزرگوں کی یہ نہایت وزنی دلیل ماننا پڑی کہ اگر وہ رستم کے ساتھ رہی اور اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگی تو وہ پولیس کے مہلک ترین گھیرے سے نکل نہیں سکے گی اور پھر وہ کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا تھا اور اب چند ماہ گزرنے کے بعد شانی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ جو کچھ ہوا بے شک بہت غم ناک تھا لیکن شاید یہی واحد راستہ تھا۔

شانی نے جوہر آباد اور رنگ والی میں عام لوگوں کی تکلیفیں اور دکھ دیکھے تھے۔ اس نے وہاں جاہلیت اور توہم پرستی کے وہ مہیب سائے دیکھے تھے جن کے ڈانڈے پیر قدرت اللہ اور

اس کے چیلے چانٹوں سے ملتے تھے۔ یہ سب کچھ اسے بے حد عجیب اور بے حد ناقابل قبول لگا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ اس نے رنگ والی کی حویلی میں 20 سال گزار دیئے تھے لیکن وہ اپنے اردگرد کے حالات کی گہرائی میں نہیں اتر سکی تھی۔ ان دکھوں کی اصل کاٹ محسوس نہیں کر سکتی تھی جو سب کے ''عام شخص'' کو لہولہان کر رکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں شانی کے دل و دماغ میں یہ بات سمائی تھی کہ اپنی ماں (وڈی آپا) کی طرح اسے بھی ان لوگوں کے لئے جینا ہے۔ زندگی کاٹنے کا کوئی بہانہ تو ہونا چاہئے تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں مہناز سے کچھ کہتی، ایک شخص باورچی خانے کی طرف آیا اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کیا بات ہے؟'' مہناز نے اندر سے پوچھا۔

''بھرجائی! لالہ صاحب کہتے ہیں اگر بی بی جی نے چوہدری کے لڑکے سے ملنا ہے تو آجائیں۔ لالہ اور رستم صاحب اُدھر ہی جا رہے ہیں۔''

''کیا تم نے کچھ کہا تھا فرید سے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''ہاں، میں چوہدری کے بیٹے سے ایک دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' شانی اپنی اوڑھنی سنبھالتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی، لالہ فرید اور رستم کے ساتھ سرنگوں کی طرف جا رہی تھی۔ شانی کا چہرہ نقاب میں چھپا تھا، فقط آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لالہ اور رستم شانی سے ایک قدم پیچھے چل رہے تھے۔ راستے میں ملنے والے لوگ احتراماً دائیں بائیں ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ سرنگ میں داخل ہوئے۔ دہانے سے تیس چالیس فٹ آگے تک سورج کی روشنی جاتی تھی۔ اس سے آگے تاریکی میں دن کے وقت بھی لالٹین اور گیس لیمپ وغیرہ روشن تھے۔ وہ اس کوٹھڑی تک پہنچے جسے آہنی جنگلے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں حشام اور دوسرے میں اس کے بیٹے کو رکھا گیا تھا۔ فی الوقت صرف بیٹا ہی نظر آ رہا تھا۔

لالہ نے بتایا۔ ''حشام مرہم پٹی کے لئے ڈاکٹر ناصر کی طرف گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آجائے گا۔''

شانی نے کہا۔ ''وہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔''

''جیسے آپ کہیں بی بی!'' لالہ نے کہا اور آگے جھک کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

راجو جو مردانہ شلوار قمیص میں تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹھوڑی اور کانوں کے نیچے داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ یہی حال اس کے سر کے بالوں کا بھی تھا۔ وہ خاصا کمزور اور لاچار نظر آ رہا تھا۔ اس نے شانی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بہرحال اس

نے شدید حیرت ظاہر نہیں کی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری حشام نے اسے یہاں شانی کی موجودگی کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا ہے۔

شانی اندر گئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تاہم اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ شانی اس کے قریب ہی میلی کچیلی چٹائی پر بیٹھنے لگی تو رستم نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھہریں بی بی!'' اس نے اپنے کندھے کی چادر اُتار کر شانی کی طرف بڑھائی تا کہ وہ اسے نیچے بچھا سکے۔ شانی نے شکریہ کے ساتھ چادر واپس کر دی اور راجو کے قریب تھوڑی سی جگہ اپنی اوڑھنی کے پلو سے صاف کر کے وہیں چٹائی پر بیٹھ گئی۔

''کیسے ہو راجو؟'' شانی نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے کا رخ شانی کی طرف نہیں پتھریلی دیوار کی طرف تھا۔

''میں تم دونوں کو یہاں سے لے جانے کے لئے آئی ہوں راجو! مجھے پوری امید ہے ہم ایک دو دن میں واپس روانہ ہو جائیں گے۔''

اب راجو نے ذرا سا چونک کر شانی کی سمت دیکھا۔ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں راجو! بس دو بندوں کا انتظار ہے، وہ میانہ گئے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ واپس آتے ہیں، ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

پھر شانی چونک گئی، راجو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے۔ وہ بہت غم زدہ نظر آتا تھا۔ کسی جذبے سے مغلوب ہو کر شانی نے راجو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اور شدت سے رونے لگا۔ بس آنسو گر رہے تھے آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سر شانی نے اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔

یہ لڑکا اس چوہدری زادے سے مختلف تھا جس سے شانی کی ملاقات چند ماہ پہلے میانہ کی حویلی میں ہوئی تھی۔ وہ تو چمکیلے لاچے کُرتے میں ملبوس، غرور کے نشے میں ڈوبا ہوا، زمین کو اپنے پاؤں سے روندتا ہوا چلتا تھا۔ نوعمری میں ہی اس کی آنکھوں میں ہر وقت سرخ ڈورے تیرتے تھے اور اپنے اردگرد موجود جوان نوکرانیوں کو وہ کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا تھا۔ حشام کی حویلی کا وہ حصہ اس چوہدری زادے کے لئے جنس کا اکھاڑہ تھا۔ وہ وہاں جس وقت اور جس سے چاہے کشتی لڑنا شروع کر دیتا تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اسے روک سکے۔ صفیہ جیسی نہ جانے کتنی خوبرو لڑکیاں اس کم عمری میں ہی راجو کے ہاتھوں روندی گئی تھیں۔ آج فرعون صفت چوہدری کا یہ بے لگام و سرکش بیٹا واقعی ایک نوعمر لڑکا نظر آ رہا تھا۔ حالات کی سختی و بے رحمی نے اسے اذیت کی بھٹی میں تپایا تھا اور اس کے اندر کا بہت سا میل کچیل اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔

شانی نے ایک ہاتھ سے اس کا سر اپنے شانے سے لگائے رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر پھیر کر اسے دلاسا دیتی رہی..... رستم اور لالہ اسے یہاں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ صرف بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کرخت صورت رائفل مین دروازے سے باہر نگرانی کے لئے کھڑا تھا۔

یہی کوٹھڑی تھی جس میں راجو کو کئی روز تک اذیت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسے عورتوں والے کپڑے پہننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ غالباً اسے چوہدری حشام کی طرح جوتے میں پانی وغیرہ پینے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا لیکن مار پیٹ تو یقیناً اس کے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ شانی کو اس کے ہاتھوں اور کلائیوں پر نیل نظر آئے۔ پاؤں پر بھی ضربات اور سوجن کے آثار تھے اس کا لباس بے حد خستہ ہو چکا تھا۔ نہانے کی سہولت نہ ہونے کے سبب جسم سے بُو اٹھ رہی تھی۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ راجو سے بات چیت کرنے کے لئے یہ کوٹھڑی اور یہ ماحول ہرگز مناسب نہیں ہے۔

اس نے باہر کھڑے کرخت چہرہ موچھل کو اشارے سے بلایا۔ وہ بڑے احترام سے نگاہ جھکائے ہوئے اندر آ گیا۔ شانی نے اسے ہدایت کی کہ وہ راجو کے نہانے اور اس کے کپڑے وغیرہ بدلنے کا انتظام کرے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور راجو ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تاہم اس مرتبہ یہ پہلے والی کال کوٹھڑی نہیں تھی۔ یہ دو نمبر سرنگ کا ایک اور حصہ تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا کمرہ تھا، یہاں دیواروں کو پلاستر کیا گیا تھا۔ الماریوں میں کچھ دوائیں وغیرہ رکھی تھیں۔ یہ غالباً مرغیوں اور مویشیوں کے استعمال کی دوائیں تھیں۔ یہاں فرش پر دری بچھی تھی اور لکڑی کی دو تین کرسیاں رکھی تھیں۔ شانی اور راجو کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ راجو بہتر حالت میں دکھائی دیتا تھا۔ جب شانی نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہاں آنے سے پہلے کوکب کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟ تو وہ بولا۔ ''پچھلے دو تین مہینوں میں یہی تو کرتا رہا ہوں۔ دو تین بار پاک پتن شریف بھی گیا ہوں۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں اس کے ماں باپ اسے لے کر کہاں چھپ گئے ہیں۔'' راجو کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''کہتے ہیں راجو کہ ڈھونڈنے والے کو رب بھی ملتا ہے۔ تم اگر واقعی کوشش کر رہے ہو تو پھر تمہیں بھی کوکب مل جائے گی۔''

''کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید وہ بدل گئی ہے۔ پاک پتن میں جہاں وہ رہتی تھی، وہاں ساتھ والے گھر میں اس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ وہ ہم دونوں کے چکر کے بارے میں

سب کچھ جانتی تھی۔ کوکی اسے اپنا اتا پتا بتا سکتی تھی۔ وہ اسے بھی کچھ بتا کر نہیں گئی۔ شاید اس لئے کہ میں کہیں ڈھونڈتا ہوا اس تک نہ پہنچ جاؤں۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں راجو کہ وہ تم سے پیار ہی نہیں کرتی۔ ہوسکتا ہے کہ اسے گھر چھوڑتے وقت اتنا موقع ہی نہ ملا ہو یا پھر اس کے ماں باپ نے اسے سختی سے منع کر دیا ہو۔ تمہیں بتایا تھا نا راجو کہ لڑکیوں کی بہت مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بار بار سوچنا پڑتا ہے۔ بے شمار باتوں کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔"

"پھر اب میں کیا کروں۔ میں اخبار میں اشتہار دینے سے تو رہا۔ ہم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔ کسی وقت تو دل کرتا ہے کہ خود کو پستول سے گولی مارلوں۔" وہ ایک دم آزردہ ہوگیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

"پھر وہی مایوسی اور بے وقوفی کی باتیں۔" شانی نے اسے ڈانٹا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ تمہارا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش کا مطلب صرف اسے ڈھونڈنا ہی نہیں۔ اپنے آپ کو بدلنا بھی ہے۔ کیا تم نے خود کو بدلنے کی کوشش بھی کی ہے؟"

راجو نے سر جھکا لیا۔ "میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ تم اپنے اندر کوئی تبدیلی لائے ہو؟" شانی نے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "اور کیا تبدیلی لاؤں۔ سب کچھ تو چھوڑ دیا ہے۔۔ چار مہینے ہوگئے ہیں نشے والے سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اب تو خالی سگریٹ بھی چھوڑ دیا ہے۔ وی سی آر کی اور گانوں کی ساری کیسٹیں نہر میں پھینک دی ہیں۔ اس کنجری کو بھی واپس بھیج دیا ہے جو ابے (چوہدری حشام) نے میرے ساتھ چھوڑی ہوئی تھی۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"اور وہ نوکرانیاں جو ہر وقت تمہارے آلے دوالے رہتی تھیں؟"

"ان میں سے بس دو تین ہی ہیں۔ پر اب......" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا تاہم اس کی بات شانی کی سمجھ میں آگئی۔

شانی کچھ دیر غور سے راجو کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ واقعی بدلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی کمزور سی چمک اس کے اندر ہونے والی صفائی کی گواہی دے رہی تھی۔ شانی کے ہونٹوں پہ ایک غیر محسوس مسکراہٹ آگئی۔ وہ بولی۔ "اگر تم ٹھیک ہوگئے ہو راجو تو سمجھو کہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔"

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"شاید تمہارے دماغ میں آیا ہو کہ خود کو تبدیل کرنے کا یہ کیسا صلہ ملا ہے تمہیں۔ بجائے اس کے کہ کوکب کے بارے میں تمہاری پریشانیاں دور ہوتیں، تمہیں اور طرح کی مصیبتوں نے جکڑ لیا ہے۔ تم اپنے گھر اور گھر والوں سے دور یہاں اس ویرانے میں پہنچ گئے ہو اور ہر طرح کے دکھ جھیل رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں اٹھتا ہے ناں یہ سوال؟" راجو چپ رہا۔ اس کی خاموشی اثبات میں جواب دے رہی تھی۔ شانی نے کہا۔ "یہی تو قدرت کا امتحان ہوتا ہے۔ وہ انسان کے صبر اور حوصلے کی آزمائش کرتی ہے اور جو پورے یقین کے ساتھ اس آزمائش سے گزر جاتے ہیں، خود کو ڈانواں ڈول نہیں ہونے دیتے وہ اپنے دل کی مرادیں پاتے ہیں۔"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ نیم تاریک سنگ کے کسی دور دراز گوشے سے میوزک کی مدھم آواز ابھرتی رہی۔ کمرے سے باہر رائفل بردار موچھل کسی مجسمے کی طرح ساکت اور بہ داب کھڑا رہا۔ آخر راجو اپنے سر کے گیلے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"لیکن میری سمجھ میں آرہا ہے۔" شانی ترنت بولی۔ "میرا خیال ہے تمہاری آزمائش کی گھڑیاں ختم ہورہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

شانی نے زیر لب مسکرا کر گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ "تمہارا ابا جب مجھے پکڑ کر اپنی حویلی میں لایا تھا تو میرے ساتھ ایک بالکل چھوٹے قد کا بندہ بھی تھا۔ اسے ڈولا کہتے ہیں۔ تم بھی یقیناً اسے جانتے ہو۔"

راجو نے شانی کی طرف دیکھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"جانتے ہو وہ بندہ کہاں سے آیا ہے؟"

"کہاں سے؟"

"اسی لڑکی کی طرف سے جس کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں بھول چکی ہے یا اس نے تم سے پیار ہی نہیں کیا تھا۔"

"تت ...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ بندہ جسے ہم ڈولا کہتے ہیں، تمہاری کوکی کی طرف سے آیا ہے۔ تمہیں دربدر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس لئے کہ کوکی کو تمہارے وچھوڑے نے بستر سے لگا رکھا ہے۔ وہ تمہارے غم میں بیمار ہے۔ تمہیں دیکھنے کے لئے ترس رہی ہے۔"

راجو حیرت سے شانی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ "تمہیں کس نے بتایا ہے یہ سب

کچھ؟'' راجو نے پوچھا۔

''خود ڈولے نے۔ حویلی میں تمہارے باپ نے اسے میرے ساتھ ہی بند کر دیا تھا۔ میری طرح اسے بھی بہت مارا پیٹا گیا تھا۔ زنانہ کپڑے پہنائے گئے تھے۔ سردیوں کی ایک طویل رات میں لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر اس نے مجھے اپنی روداد سنائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کوکب اور اس کی بڑی بہن سنبل نے گھر والوں سے چوری اسے تمہاری تلاش میں بھیجا ہے۔ وہ دونوں بہنوں کی بتائی ہوئی نشانیوں کے ذریعے تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔''

''کوکی کا وہ کیا لگتا ہے؟'' راجو نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کوکی کا کچھ نہیں لگتا۔ پر اس بے چارے کو کوکی کی بڑی بہن سنبل اچھی لگتی ہے۔ وہ چپکے چپکے بڑے عرصے سے اسے چاہتا ہے۔ کوکی تمہارے غم میں بیمار تھی اور اس کی بیماری نے سنبل کو بے حال کر رکھا تھا۔ ڈولے سے یہ سب دیکھا نہیں گیا۔ وہ تمہیں تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔''

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ اسے کوکی نے میری تلاش میں بھیجا ہے۔''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہاری جدائی میں بستر سے لگی ہوئی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈولا تمہیں ڈھونڈنے نکلا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا ناں کہ اس کی وجہ سے ڈولا تمہاری کھوج میں نکلا ہوا ہے اور پھر تمہیں ڈھونڈنے کے لئے ڈولے کو جو ایک دو سراغ دیئے گئے ہیں وہ کوکی اور سنبل نے ہی تو دیئے ہیں۔ ان بے چاریوں کو بس اتنا پتا تھا کہ تمہارا ایک بڑا بھائی کپڑے کی ایک بڑی مل کا مالک ہے۔ یہ مل لاہور کے قریب جی ٹی روڈ کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ دوائیاں بنانے کا مشہور کارخانہ ہے۔''

شانی کو راجو کے چہرے پر عجیب سی روشنی نظر آئی۔ اس کی بجھی بجھی آنکھیں بھی جیسے کسی اندرونی احساس سے دمک اٹھیں۔ اس نے پُرامید نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈولا کوکی کا پتا جانتا ہے؟''

''تو اس کا اور مطلب کیا ہو سکتا ہے؟''

''مجھے ابھی تک تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

''میانہ پہنچنے کے بعد تمہیں یقین کرنا پڑے گا۔''

''ہم... کب جا رہے ہیں واپس؟'' راجو نے بے ساختہ پوچھا۔ شانی کو پہلی بار اس کے لہجے میں واپسی کی تڑپ محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے تو یوں لگا تھا کہ اسے واپس جانے کی خوشی نہیں یا پھر وہ واپسی کی اطلاع پر یقین نہیں کر پا رہا۔

''تمہیں بتایا ہے ناں۔ تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔ میں پوری کوشش کر رہی ہوں کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو سکیں۔ تم بس دعا کرو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر ہمت کر کے بولا ''ڈولے نے اور کیا بتایا ہے اس کے بارے میں؟'' اس کا اشارہ کوکی کی طرف تھا۔

شانی زیرلب مسکرائی۔ ''وہی کچھ بتایا ہے جو تم سننا چاہتے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ تمہارے وچھوڑے میں بے حال ہے۔ تمہارے انتظار میں ایک ایک گھڑی گن کر گزار رہی ہے۔''

''پر اس کے باباجی اب کیا کہتے ہیں؟''

''وہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو تم سننا چاہتے ہو لیکن یہ ساری باتیں میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتی۔ فی الحال بڑی مشکل سے وقت نکال کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ مجھے کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ کل یا پرسوں پھر تمہارے پاس آؤں گی۔ اس وقت تک تم بالکل فریش ہو جاؤ۔ فریش سمجھتے ہو ناں؟ تازہ بہ تازہ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ راجو سے مل کر شانی نے ڈاکٹر ناصر کے کلینک کا رخ کیا۔ وہ نادیہ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ آج ڈاکٹر ناصر اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔

وہ ابھی دو نمبر سرنگ میں واقع کلینک نما گوشے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے چند زوردار آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ کوئی شخص خوف زدہ انداز میں دوسرے شخص کو پکار رہا ہے اور کسی کام سے منع کر رہا ہے۔

رائفل بردار موچھل باڈی گارڈز کے انداز میں شانی کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کیسی آوازیں ہیں؟''

اس نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اب یہ ایک کے بجائے دو یا تین آوازیں تھیں۔ شانی نے بھی رائفل بردار کے پیچھے ہی پیچھے قدم بڑھائے۔ ڈیرے کے وسط میں تیس چالیس فٹ اونچی پانی کی ایک پختہ ٹینکی بنائی گئی تھی۔ اس ٹینکی میں ایک بڑے ڈونکی پمپ کے ذریعے پانی چڑھایا جاتا تھا۔ دو افراد جو غالباً ٹینکی کی صفائی وغیرہ کے لئے اوپر چڑھے تھے، ٹیلوں میں ایک شخص کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے اور اسے ڈیرے کی طرف واپس بلا رہے تھے۔

وہ شخص ڈیرے سے تقریباً دو سو گز دور موجود تھا اور اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹیکری پر چڑھے ہوئے افراد کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ شانی نے اس شخص کو غور سے دیکھا اور چونک گئی۔ وہ اس کا ساتھی بلاول تھا۔ شاید وہ چہل قدمی کرتا ہوا ٹیلوں میں آگے نکل گیا تھا اور ایسی جگہ پر تھا جہاں اسے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں لالہ فرید بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر بلاول کو واپس آنے کی تاکید کی۔ بلاول محتاط قدموں سے واپس آنے لگا۔

لالہ فرید ایک پہرے دار پر برسنے لگا۔ ''اس طرف کون تھا ڈیوٹی پر؟''

''شاید اسلم تھا جی۔'' پہرے دار نے ڈر کر جواب دیا۔

''اگر اس بندے کو کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ یہ لوگ مہمان ہیں۔ انہیں یہاں کی اونچ نیچ معلوم نہیں۔ یہ تم لوگوں کی ذمے داری ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھو۔''

ان باتوں کے دوران ہی بلاول اعوان دو افراد کے ساتھ واپس پہنچ گیا۔ لالہ فرید نے نرم الفاظ میں اسے سمجھایا کہ ڈیرے سے زیادہ دور جانا خطرناک ہے۔ خاص طور سے جس سمت پر وہ جا رہا تھا، وہاں بارودی سرنگیں ہیں اور بارودی سرنگیں جو حشر کرتی ہیں اس کا تماشا تو تین دن پہلے سب نے دیکھ ہی لیا تھا۔''

بلاول کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے لالہ سے معذرت کی۔ لالہ نے وہیں کھڑے کھڑے اسے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ کون کون سے ٹیلے محفوظ ہیں اور کس کس سمت جانا خطرناک ہے۔

بلاول نے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن نہیں کہ خطرناک جگہوں پر خبردار کرنے کے لئے کچھ ایسی نشانیاں لگا دی جائیں جن کا صرف مقامی لوگوں کو پتا ہو۔''

''یہ تجویز بُری نہیں۔'' فرید نے کہا۔ ''اس بارے میں ہم نے بھی سوچا تھا اور ہو سکتا ہے اس پر عمل بھی کیا جا سکے۔ اندھیرے میں یہ آ سکتی بات میں اس سے پہلے بھی دو دفعہ اس طرح کا حادثہ ہوتے ہوتے رہا ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ بارودی سرنگیں بچھانا آسان ہوتا ہے لیکن ان سے بچنا اور انہیں ختم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ فوج میں اس کے لئے باقاعدہ نقشے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔''

''خیر ایسی بات نہیں، نقشہ تو یہاں بھی بنایا گیا ہے اور باقاعدہ ہر چیز کا ریکارڈ رکھا گیا ہے۔'' لالہ فرید نے کہا۔

اسی دوران میں رستم اور حسنا گجراتی بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہفتے والے حادثے کی بات ہونے لگی جس میں حشام کے نوکر کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ لالہ فرید نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک دفعہ تو ہماری جان ہی نکل گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''جب تم اس بندے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آگے نکل گئے تو ایک دو سیکنڈ کے لئے ایسے لگا کہ تم بھی کسی سرنگ پر چڑھ جاؤ گے لیکن پھر تم نے وقت پر بریک لگا لئے۔''

''میں اسے بچانا چاہتا تھا اور آخر وقت تک کوشش کرتا رہا۔ پر ایک جگہ پہنچ کر مجھے رکنا پڑا۔'' رستم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

رستم باتیں کر رہا تھا اور شانی چپکے چپکے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی صورت، اس کی آواز کو ہمیشہ کے لئے اپنے حافظے میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ آج کل اس کے دل کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کا ایک باب بند ہونے کو ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب شانی، مہناز کے پاس بیٹھی تھی اور نوعمر مینو بی دلچسپ باتیں سن رہی تھی۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ مہناز نے دروازہ کھولا۔ سامنے رستم موجود تھا۔ شانی نے دیکھا اس کے چہرے پر دبا دبا جوش ہے۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے شانی سے چار ہوئیں، پھر رستم کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح جھک گئیں۔ عقیدت آمیز محبت کے بوجھ نے نگاہوں کو زمین سے چپکا دیا۔ وہ پُرحرارت لہجے میں بولا۔ ''بی بی جی! آپ کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔''

''کیا رستم؟'' شانی اٹھ کر دروازے میں آ گئی۔

''ہمیں اپنے ذریعے سے اطلاع ملی ہے کہ بلی ماروں نے دونوں مطالبے مان لئے ہیں۔ دونوں ڈاکٹروں کو رہا کر کے جوہر آباد عارف کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زیب اور ڈاکٹر بہروز اس وقت جوہر آباد میں ہیں۔ جوہر آباد کی ساری آبادی انہیں دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی ہے۔ لوگ بہت خوش ہیں۔ وہ ڈاکٹر بہروز کو کندھوں پر اٹھا کر جوہر آباد کے ہسپتال تک لے گئے ہیں۔''

''واقعی؟'' شانی کی آواز میں مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔

''جی بی بی۔ اور دوسرا مطالبہ بھی آج شام تک پورا ہو جائے گا۔ وہ لوگ تمام تک رقم دلاور کے حوالے کر دیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ دلاور اور دراج آج رات تک وہاں سے روانہ ہوکر پرسوں تک یہاں پہنچ جائیں گے۔'' شانی نے خوش ہوکر کہا۔

''جی بی بی۔'' رستم نے تائید کی۔

شانی رستم کے تاثرات دیکھ کر ایک دم چونک گئی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں غم کی ایک لہر بھی تھی۔

اس لہر کو محسوس کر کے شانی بھی افسردہ ہوگئی۔ ہاں یہ خوش ہونے کا مقام تھا اور افسردہ ہونے کا بھی۔ جو مہمانوں کی طرح آئے تھے انہیں مہمانوں کی طرح جانا بھی تھا۔ اب ان کا مختصر قیام گزرنے والے ہر پل کے ساتھ ''مختصر تر'' ہوتا جانا تھا اور پھر ایک گھڑی آنی تھی جب ہاتھ خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھنے تھے اور نگاہوں نے ایک دوسرے کو الوداعی انداز میں دیکھ کر رخ پھیر لینا تھا اور کون جانتا تھ کہ اس کے بعد ملاقات ہونی تھی یا نہیں۔ جدائیوں کا چناب پوری شدت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ گزرنے والے ہر پل کے ساتھ اس کا پاٹ زیادہ چوڑا اور اس کا پانی زیادہ طوفانی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک کنارے پر رستم ''اندھے بہرے قانون'' کی جان لیوا زد میں تھا۔ دوسری طرف شانی اپنے حالات میں جکڑی ہوئی تھی۔ شانی کے دل میں ایک بار پھر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ جانے سے پہلے تنہائی میں رستم سے چند باتیں کر لے۔ چند ایسی باتیں جو اس کے دل و دماغ پر پڑے ہوئے نہایت گراں بوجھ کو تھوڑا سا ہلکا ہی کر دیں۔

اگلے روز شانی صبح سویرے نادیہ کو دیکھنے سرنگ میں گئی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر ناصر اسے انکار نہیں کر سکا۔ وہ اسے ساتھ لے کر سرنگ کی گہرائی میں چلا گیا۔ یہاں دن کے وقت بھی لالٹینیں اور گیس لیمپ روشن تھے۔ کہیں کہیں مشعل بھی بھڑکتی دکھائی دی یہ جگہیں عجیب و غریب تھیں اور دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ شانی سوچتی تھی کہ اگر ایسی سرنگیں یا ایسے غار انسانی ہاتھوں نے بناتے ہوتے تو شاید ہزاروں افراد کو برسوں تک کام کرنا پڑتا۔ یہ سرنگیں باہر کے موسمی اثرات سے مکمل طور پر محفوظ تھیں۔ یعنی سردیوں میں گرم اور گرمی میں نہایت ٹھنڈی۔ یہ آگے جا کر شاخ در شاخ پھیلتی تھیں کئی جگہ یوں لگتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے حجرے یا کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں یہ برآمدوں کی شکل اختیار کرتی تھیں اور کہیں مستطیل Halls کی۔ ان کی دیواروں میں شفاف سنگریزے تھے اور کہیں بڑے بڑے پتھر بھی۔ جہاں سنگریزے یا پتھر بھر بھرے تھے وہاں انسانی ہاتھوں نے پلاستر وغیرہ کر رکھا تھا۔ آوازیں ان شاخ در شاخ غاروں میں گونجتی تھیں اور کسی کسی جگہ پر حیران کن طور پر قدرتی ہوا کے

جھونکے محسوس ہوتے تھے۔ یہاں بسیرا کرنے والے چونکہ زیادہ تر مرد ہی تھے لہٰذا شراب اور سگریٹ وغیرہ کی بُو واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ صفائی ستھرائی کا بھی وہ معیار نہیں تھا جو اس دلفریب جگہ پر ہونا چاہئے تھا۔ شانی، ڈاکٹر ناصر اور رائفل بردار موچھل ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں اوپر کسی قدرتی روزن سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

تقریباً ایک سو میٹر چلنے کے بعد وہ تینوں ایک ایسی حجرہ نما جگہ پر پہنچے جہاں نادیہ اور رستم موجود تھے۔ نادیہ ایک پتھریلے چبوترے پر گدیلا ڈالے لیٹی تھی اور رستم اس کے پاس قریب بیٹھا گہرے سبز رنگ کا سیب چھیل رہا تھا۔

شانی کو دیکھ کر نادیہ بے قراری سے اٹھ بیٹھی۔ شانی اسے روکتی ہی رہ گئی۔ نادیہ کے پیٹ پر سینے سے ذرا نیچے پٹی بندھی تھی اور پاؤں پر بھی لچک دار پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی حالت خاصی بہتر لگتی تھی وہ اور شانی باتیں کرنے لگیں۔

شانی قریباً دو گھنٹے نادیہ اور رستم کے پاس رہی۔ اس نے نادیہ سے تو خوب باتیں کیں تاہم رستم سے علیحدہ میں بات کرنے کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔ شام کو وہ واپس آئی تو اس کی افسردگی بڑھی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ رستم سے بات کر ہی نہیں پائے گی۔ جونہی دلاور اور دراج واپس آتے انہیں یہاں سے فوراً جانا تھا۔

رات کو جب ٹیپو سو گیا تو شانی نے ہمت کر کے مہناز سے بات کی۔ ''آپا! میں جانے سے پہلے رستم سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو کر لو۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رستم کے ساتھ ہر وقت کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔''

وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''اس کا حل نکال لیتے ہیں.... کل حسنا، مراد اور مراد گروپ کے کچھ بندے شکار پر جا رہے ہیں...... یہ لوگ کارتوسوں والی بندوق سے خرگوش اور پرندے وغیرہ مارتے ہیں۔ دوپہر دو بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ رستم ساتھ نہیں جا رہا نادیہ کی وجہ سے۔''

''تو تم رستم کو یہاں بلاؤ گی؟''

''ہاں، اس کے لئے ایک اچھا بہانہ ہے۔ ٹیپو کے کان میں درد ہے۔ جب یہ بیمار ہوتا ہے تو بہت ضدیں کرتا ہے۔ کل سے کہہ رہا ہے کہ چاچو رستم کو بلاؤ اور چاچی نادیہ کو بھی۔ میں نے ان سے باتیں کرنی ہیں، نادیہ تو آ نہیں سکتی لیکن رستم آ جائے گا۔ میں نے کل بھی حنیفاں کے ہاتھ اسے سنا (پیغام) بھیجا تھا۔ کل پھر بھیجتی ہوں۔''

''وہ آ گیا تو پھر؟''

''میں اور تم پہلے سے ٹیپو کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ وہ جب آئے گا تو میں کچھ دیر بعد ٹیپو کو کسی بہانے باہر لے جاؤں گی۔ کمرے میں تم دونوں اکیلے ہو گے، جو بات کرنی ہو گی کر لینا۔''

سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے مہناز نے کہا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے کچھ لوگ بندوقیں وغیرہ لے کر نکل گئے۔ ان کے پاس پرندے پکڑنے والا ایک بڑا جال بھی تھا۔ بلا دل مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اس ٹولی کے ساتھ تھا۔ لالہ فرید کا پروگرام پہلے تو ڈانواں ڈول نظر آیا لیکن پھر وہ بھی چلا گیا۔ دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے مہناز نے رستم کو پیغام بھیجا اور وہ چلا آیا۔

شانی اور مہناز اس وقت ٹیپو کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ ٹیپو کا کان سوجا ہوا تھا اور اسے ہلکا سا بخار بھی ہو گیا تھا۔ رستم کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری نیند نہیں لے رہا۔ اس کے لمبے بال جو کنگھی کے بغیر ہی بڑے سجے ہوئے نظر آتے تھے، بوسیدہ ہو رہے تھے۔ رستم نے اندر آ کر سلام کیا اور پھر ٹیپو کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ٹیپو کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔ اندازہ ہوا کہ رستم کی کمپنی اسے اچھی لگتی ہے۔ رستم اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر رستم کی گود میں بیٹھ گیا اور رستم کی چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی میں انگلیاں چلانے لگا۔

''چاچی نادیہ کیوں نہیں آئی؟'' ٹیپو نے پوچھا۔

''وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دو دن میں ہو جائے گی۔''

''کیا اس کا بھی کان خراب ہو گیا ہے؟''

''نہیں اس کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی۔ تم نے دیکھا تو تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں جب تک چاچی شانی سے کھیلوں گا۔''

مہنا نے کہا۔ ''تمہیں بتایا ہے، یہ چاچی نہیں باجی ہے۔ باجی شانی۔''

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں پھر مہناز باہر گئی اور واپس آ کر بولی۔ ''ٹیو پانی گرم ہو گیا ہے چلو دو منٹ میں نہا کر واپس آ جاؤ۔''

''بخار میں نہلانا ٹھیک رہے گا؟'' رستم نے پوچھا۔

''ناصر نے کہا تھا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔''

ٹیپو نے ٹھنکنا شروع کر دیا۔ مہناز اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔ کمرے میں رستم اور شانی رہ گئے۔ مطلع صبح سے اَبر آلود تھا۔ اب ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر

کھباڑی اور بیری کے پیڑ خاموشی سے بھیگ رہے تھے۔ بکریوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ سرسبز ڈھلوان سے اُتر رہا تھا اور ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دور ایک اونچی چٹان پر ایک سیاہ بادل کسی دیو ہیکل پرندے کی طرح منڈلا رہا تھا..... رستم اور شانی خاموش بیٹھے تھے۔ پھر اس خاموشی کو شانی نے ہی توڑا۔ ''رستم! میں جانتی ہوں، تمہارے لئے چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ تمہارے دوست کی جان لی ہے۔ یہ تمہارے ہاتھوں بدترین سزا کے حق دار تھے۔ میرے کہنے پر تم انہیں چھوڑ رہے ہو، تمہارا یہ احسان میرے دل پر نقش رہے گا۔ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھی ہے۔''

''بی بی! آپ کا حکم پورا کرنے کے لئے تو میں بڑی سے بڑی آزمائش سے گزر سکتا ہوں۔ یہ تو ایک چھوٹی سی بات تھی۔''

''نہیں رستم! یہ بہت بڑی بات ہے۔ کوئی اور چاہے نہ سمجھے لیکن میں سمجھتی ہوں۔ میرے کہے کا مان رکھنے کے لئے تم نے خود پر بڑا جبر کیا ہے۔''

''آپ شرمندہ کر رہی ہیں بی بی۔''

شانی کچھ دیر خاموش رہی۔ وہ بے خیالی میں کھڑکی سے باہر خاموشی سے بھیگتے ہوئے پیڑوں، ممیاتی ہوئی بکریوں اور چوٹی پر ٹھہرے ہوئے بادل کو دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''رستم! میرے دل پر بوجھ ہے۔ مجھے لگتا ہے۔ میں تمہارے لئے وہ نہیں کر پائی جو مجھے کرنا چاہئے تھا اور تم میرے لئے وہ سب کچھ کرتے رہے جس کی میں حق دار نہیں تھی۔ تم نے میرے لئے بہت کچھ کھویا ہے رستم! میرے لئے بہت کچھ جھیلا ہے۔''

''آپ میرے دکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہی ہیں بی بی۔ [illegible] سب سے بڑا گلہ ہی یہی ہے کہ میں اپنے حالات سے مجبور ہو کر اور آپ کی خاطر [illegible] اپنی زندگی بچانے کے لئے اس ویرانے میں آ چھپا ہوں۔ میں اپنے [illegible] ملامت کروں وہ کم ہے بی بی۔ آپ [illegible] آپ مجھے حکم دیں بی بی! میں آپ کے لئے کیا کروں۔ میری یہ زندگی تو اب ویسے بھی چند دنوں کی ہے۔ اگر یہ آپ کے کسی کام آ جائے تو میرے لئے مرنا بہت آسان ہو جائے گا بی بی۔''

''ایسی باتیں کر کے مجھے رُلانا چاہتے ہو؟'' شانی نے کہا۔

''نہیں بی بی! میں تو بس حقیقت بتا رہا ہوں۔ اس میں کوئی طنز نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں اور میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ مجھے آپ سے کوئی گلہ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ نے ابھی کہا

ہے کہ میں آپ کو رُلانا چاہتا ہوں۔ اس فقرے میں آپ کی اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی اس اپنائیت کے بدلے میں اپنی کھال آپ کے قدموں میں بچھا سکتا ہوں تو پھر گلے شکوؤں کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔"

"تم کچھ بھی کہو رستم! لیکن میں جانتی ہوں کہ میری طرف سے تمہارے ساتھ کئی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ یہ زیادتیاں ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہیں اور مجھے تکلیف دیتی ہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ "ان میں سے ایک زیادتی وہ طمانچہ بھی ہے جو میں نے تمہیں مارا تھا۔ مجھے وہ بات ابھی نہیں بھولی ...اور مجھے پتا ہے، تمہیں بھی بھولی نہیں ہوگی۔"

رستم کا سر کچھ اور جھک گیا۔

شانی نے کہا۔ "کتنی بیوقوف ہوں۔ غلطی ایک مدت پہلے کی، معافی اب مانگ رہی ہوں لیکن میں جانتی ہوں جب تک معافی نہیں مانگوں گی۔ میرا چین ایسے ہی حرام ہوتا رہے گا، ہاں رستم۔ میں نے تمہیں بلا وجہ طمانچہ مارا تھا۔ میں اپنی اس غلطی پر شرمندہ ہوں اور......"

"بی بی! آپ نے بلا وجہ کہاں مارا تھا؟" رستم نے اس کی بات کاٹی۔ "میں نے آپ کے سامنے آپ کے چچا کی برائی کی تھی۔ ان کے خلاف آپ کو بھڑکانا چاہا تھا......"

"لیکن تم نے جو کیا ٹھیک کیا تھا۔ وقت نے بعد میں ثابت کیا کہ چاچا رئیس واقعی ہماری جڑیں کاٹ رہے تھے۔ ہمیں مصیبتوں میں پھنسا کر انگلینڈ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔" رستم نے کچھ کہنا چاہا مگر شانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ "نہیں رستم، سچ کو سچ ہی رہنے دو۔ وہ میری غلطی تھی، میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے اپنی اس حرکت پر اتنی ندامت ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ پلیز رستم۔"

شانی کی بات سن کر رستم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اسے جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔

شانی بولی۔ "میری دوسری بڑی غلطی یہ تھی رستم کہ حویلی میں آگ لگنے کے بعد میں تمہارے ساتھ پنڈی گئی اور پھر پنڈی میں تمہیں کچھ بھی بتائے بغیر ایک دن چپکے سے کہیں نکل گئی۔ میں جانتی ہوں میری اس حرکت نے تمہیں بے حد پریشان کیا تھا۔ تم دیوانوں کی طرح میری تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے، پتا نہیں کہاں کہاں دھکے کھاتے رہے اور میں لاہور میں بیٹھی رہی۔ اپنی اس غلطی کے لئے بھی میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

"بی بی ایسا مت کہیں خدا کے لئے... میں اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔"

شانی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ رستم کی بات کو خاطر میں لائے بغیر بولتی چلی گئی۔ "میں نے تم سے بہت کچھ لیا ہے رستم اور بدلے میں تمہیں کچھ نہیں دے سکی۔ کچھ بھی نہیں۔ بس تمہارے دکھوں میں اضافہ کیا ہے۔ میری خاطر تمہیں حشام کے بے پناہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ تمہارے پیارے دوست آفندی اور گونگے مختار کی جانیں بھی میری ہی خاطر گئیں۔ میری ہی وجہ سے ریاض ہٹلر جیسے قاتل پولیس افسر تمہارے خون کے پیاسے ہوئے اور جب بستی میں تم ہر طرف سے گھر گئے تو میں نے چپ چاپ اپنا راستہ تمہارے راستے سے الگ کر لیا۔ مجھے اس کے لئے بھی تم سے معافی مانگنی ہے رستم، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی ہے۔" شانی نے باقاعدہ اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنے ہی کندھے میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

رستم نے تڑپ کر شانی کے ہاتھ تھام لئے لیکن پھر اس نے ہاتھ پیچھے بھی ہٹا لئے۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اشک بار لہجے میں بولا۔ "خدا کے لئے بی بی! مجھے اتنی تکلیف نہ دیں۔ میں یہ سہہ نہیں سکتا۔" اس کے ساتھ ہی وہ جانے کے لئے اٹھ گیا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شانی کی اجازت کے بغیر کمرے سے نکل جاتا۔ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔ شانی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند سیکنڈ اسی طرح گزرے۔ پھر شانی نے چہرے سے ہاتھ اٹھائے۔ اس کا چہرہ سرخ گلاب کی طرح تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک سچے موتیوں کے لشکارے جیسی تھی۔ اس نے کہا۔

"رستم تم کہیں ملک سے باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔ لوگ بارڈر پار کر جاتے ہیں یا پھر لانچ وغیرہ کے ذریعے مسقط، دبئی کی طرف نکل جاتے ہیں۔ تم یہاں رہو گے تو زیادہ دیر پولیس سے بچ نہیں پاؤ گے۔ وہ ریاض ہٹلر بڑا زہریلا بندہ ہے رستم۔ وہ پولیس کی وردی میں بھیڑیا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ایس پی حاجی حیات خان نہ ہوتا تو یہ ریاض ہٹلر تم تک پہنچنے کے لئے کئی درجن بندوں کی جان لے چکا ہوتا اور شاید میں بھی... ان میں سے ایک ہوتی۔"

رستم کی آنکھوں میں یک بارگی آگ کے کئی الاؤ بھڑک اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گلے اور پیشانی کی رگیں پھول گئیں۔ وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "بی بی! اپنے پہلے سوال کا جواب تو آپ نے خود ہی دے دیا ہے۔ ملک چھوڑ کر اس لئے بھی نہیں جا سکتا کہ ریاض ہٹلر، چوہدری بشیر اور پیر قدرت اللہ جیسے لوگ آپ کے ارد گرد موجود ہیں۔ یہ بڑے بے رحم لوگ ہیں بی بی اور ان سے ٹکرانے کے لئے جس بے رحمی اور بے حسی کی ضرورت ہے وہ اب

میرے اندر واپس آ چکی ہے۔ دوسری بات آپ نے ریاض ہٹلر کے بارے میں یہ کی ہے کہ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں بی بی! وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ اس کے پیچھے بڑے بڑے ہاتھ ہیں اور پولیس کی پوری فورس بھی ہے۔ عام حالات میں میرے جیسا بندہ شاید اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات میں آپ کو پورے یقین اور ایمان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ ہاں بی بی! پورے یقین اور ایمان کے ساتھ۔ اگر اس شخص نے کبھی اپنا ناپاک ہاتھ آپ کی طرف بڑھانے کی غلطی کی تو وہ اس کی زندگی کا بدترین دن ہوگا۔ میری جان رہے نہ رہے لیکن میں اسے بدترین مثال بنا دوں گا۔''

رستم کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ شانی سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ اسے لگا جیسے رستم کے لہجے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ کوئی وحشی جنونی۔ جو تن تنہا کسی لشکر سے ٹکرانے اور اسے تہہ و بالا کرنے کی ہمت اور طاقت رکھتا ہے۔

شانی نے مناسب سمجھا کہ وہ یہ آگ اگلتا ہوا موضوع بدل دے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''رستم! مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری ایک بہن اور بہنوئی ہیں۔ پولیس نے ان دونوں پر بھی مقدمے بنا رکھے ہیں۔ تم نے انہیں کہاں چھپا رکھا ہے؟ کیا وہ یہیں پر ہیں؟ میرا مطلب ہے یہاں تمہارے پاس ڈیرے پر؟''

رستم کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی! بہن اور بہنوئی کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا؟''

''یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ بات حاجی حیات یا ڈپٹی ریاض ہٹلر سے معلوم ہوئی ہوگی اور زیادہ امکان یہی ہے کہ ریاض ہٹلر سے معلوم ہوئی ہوگی۔''

''ہاں۔ ریاض نے مجھ سے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں جیل میں تھی تو وہ میرے پاس آیا تھا اور دیر تک اس بارے میں سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ میں اس بارے میں کچھ جانتی نہیں تھی اور اگر جانتی بھی ہوتی تو ریاض کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔''

''کیا کسی اور نے بھی اس بارے میں آپ سے بات کی؟'' رستم نے پوچھا۔

''جوہر آباد میں مجھے ایک شخص نے بتایا تھا کہ چند برس پہلے تمہارے بہنوئی کا کسی سے جھگڑا ہوا تھا اور یہ جھگڑا اتنا بڑھا تھا کہ بات قتل و غارت تک پہنچ گئی تھی۔ تمہاری بہن کو بچاتے ہوئے تمہارے والد قتل ہو گئے تھے اور جواب میں تم نے چوہدریوں کے کئی بندے مار دیے

تھے۔ اس کے بعد تم باقاعدہ ڈاکوؤں کے ساتھ مل گئے اور اپنے دشمنوں سے سارے حساب چکانے لگے۔''

''ہاں بی بی! ایسا ہی ہوا تھا اور ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے اور رونے پیٹنے کے باوجود انصاف نہیں ملتا تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے کچھ انوکھا نہیں کیا۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ تمہیں ایسا کرنا چاہئے تھا یا نہیں لیکن فی الوقت میرے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہاری بہن، تمہارے بہنوئی اور ان کے بچوں کو بھی پولیس اور نار پوریوں سے خطرہ ہے۔ کیا تمہارے خیال میں وہ محفوظ جگہ پر ہیں؟''

''ہاں بی بی، میں نے اپنی طرف سے تو اس بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ انہیں ایک محفوظ ٹھکانہ دیا ہے۔ اس ٹھکانے کے بارے میں میرے دوست زوار کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ زوار کے جسم کی ایک ایک بوٹی علیحدہ کر دی جائے تو بھی وہ کسی کو آپو زاہدہ اور بھائی اکرام تک نہیں پہنچا سکتا۔''

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے خوشی ہے کہ تمہاری زندگی میں نادیہ آ گئی ہے۔ میں نے کہا تھا ناں کہ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے پیار کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ اپنی خوش حال زندگی کو ایک طرف رکھ کر اور تمہاری ساری تکلیفوں اور مصیبتوں میں حصے دار بن کر تمہارے ساتھ اس خطرناک ویرانے میں موجود ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ نادیہ کو اپنی زندگی میں لانا تمہارا اپنا فیصلہ ہے یا میری خواہش پر تم نے ایسا کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں، میں تمہاری بہت بہت شکر گزار ہوں۔ میرے دل و دماغ پر بہت زیادہ بوجھ ہے رستم لیکن جب نادیہ کو تمہارے ساتھ دیکھتی ہوں تو اس بوجھ میں تھوڑی سی کمی آ جاتی ہے۔ میری خواہش ہے اور میری دعا بھی ہے کہ تم ایک دوسرے کا سہارا بنو اور اپنی زندگی کو مصیبتوں سے نکالنے میں کامیاب رہو۔''

شانی نے بات مکمل کی تو اسے رستم کے چہرے پر عجیب سا رنگ نظر آیا۔ جیسے کوئی ٹیس اس کے سینے میں اٹھی ہو اور اس کی شدت نے اسے نیم جان کر دیا ہو۔ ایک لمحے کے لئے شانی کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کے ہونٹ ایک دفعہ لرز کر ساکت ہو گئے۔ یہ ہونٹ بولتے بولتے چپ ہو جاتے تھے اور یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ پچھلے برسوں میں کتنے مواقع ایسے آئے تھے جب شانی کو لگا تھا

کہ یہ ہونٹ بہت شدت سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن پھر ان پر لگی ہوئی خاموشی کی مہر برقرار ہی تھی اور ہر بار جب ایسا ہوا تھا، شانی کو لگا تھا کہ ایک اور زنجیر نے اس کے سراپا کو جکڑ لیا ہے۔ اب ایسی اَن گنت زنجیریں شانی سے لپٹی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیا ناتا تھا رستم کے بند ہونٹوں میں اور ان زنجیروں میں۔ یہ بڑی سخت بندشیں تھیں، یہ بڑے بے رحم شکنجے تھے، شانی بظاہر آزاد اور خودمختار ہوتے ہوئے بھی آزاد و خودمختار نہیں تھی۔ خودمختار ہونا تو دور کی بات ہے کسی وقت تو وہ کسمسا بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے لگتی تھی۔ وہ کیوں نہیں توڑ سکتی ان تصوراتی بندھنوں کو......

کھڑکی سے باہر برسنے والی بارش اب مدھم پڑ گئی تھی۔ ٹیلے کی چوٹی پر منڈلاتا ہوا بادل بکھرنے لگا تھا۔ کھباڑی، بیری اور گوندلی کے پیڑ ہوا سے ہولے ہولے جھومنے لگے تھے۔ دوسرے کمرے میں ٹیپو نے شاید نہا لیا تھا۔ وہ رستم کے پاس واپس آنے کی ضد کر رہا تھا۔ مہناز اسے روک رہی تھی اور تولیے سے اس کا جسم صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''کیا ننگا ہی جائے گا۔ کپڑے تو پہن لے بے حیا۔''

شانی سمجھ گئی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ امید تھی کہ اگلے ایک دو دن میں کھیا دراج اور دلاور وغیرہ واپس ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ان سب کی یہاں سے واپسی تھی۔ امید نہیں تھی کہ اب دوبارہ یوں تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شانی نے کہا۔ ''رستم، تم منہ سے کچھ کہو یا نہ کہو لیکن میں جانتی ہوں تمہاری مجھ سے کچھ توقعات تھیں اور میں مانتی ہوں یہ توقعات بے جا بھی نہیں تھیں۔ تمہیں حق تھا اس انداز میں سوچنے کا۔ میں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے سبب ان توقعات پر پورا نہ اُتر سکی۔ تمہیں بالکل ناجائز طور پر دکھ دیئے، آنسو دیئے اور انتظار دیا۔ میں ان سارے دکھوں اور آنسوؤں کے لئے تم سے ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔ اگر تم میرے لئے دل میں تھوڑی سی بھی جگہ رکھتے ہو تو مجھے سچے دل سے معاف کر دینا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، اگر تم سچے دل سے معاف نہیں کرو گے تو میں کہیں بھی چلی جاؤں، کچھ بھی کر لوں، سکون سے جی نہیں سکوں گی۔ زندگی کا یہ سفر اب زیادہ لمبا تو نہیں لگتا لیکن جتنا بھی ہے میرے لئے عذاب جیسا ہے۔ میرے اس سفر کو تم ہی قابلِ برداشت بنا سکتے ہو رستم۔''

''بی بی! مجھے شک تھا کہ آپ نے مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ بے شک یہ ایک مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ ہے لیکن اسے میرے لئے اور تکلیف دہ تو نہ بنائیں۔ میں آپ سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں، نہ مانگ سکتا ہوں لیکن...... لیکن اتنا تو کریں بی بی کہ

مسکراتے ہوئے الوداع کہہ دیں۔''

رستم نے ''الوداع'' کا لفظ اس انداز میں کہا کہ شانی پھر تڑپ گئی۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں انتہا درجے کا کرب بھر کر بولی۔ ''رستم! میری بات مان لو۔ تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ باڈر پار کر جاؤ۔ یہ لوگ..... یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کے ارادے دیکھے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے خون کی پیاس ہے۔ ڈپٹی ریاض بڑی تیزی سے گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ وہ بڑی جلدی یہاں پہنچ جائے گا۔ تم لوگ سرکاری طاقت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو؟''

شانی نے بڑے کرب سے رستم کو دیکھا۔ وہ بھی سر اٹھا کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں چار رہیں۔ پھر رستم کے ہونٹوں کے پیچھے ایک بہت پھیکی بالکل غیر محسوس مسکراہٹ ابھری۔ اس نے نظر جھکا لی۔ ہولے سے بولا۔ ''ٹھیک ہے بی بی! میں اس بارے میں سوچوں گا۔''

انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض بحث سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بات اس نے ہونٹوں سے کہی ہے، دل سے نہیں۔

''ہائے اللہ چاچی! تم رو رہی ہو؟'' ٹیپو کی آواز نے شانی کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ بھیگے بال پیشانی سے چپکے تھے۔

شانی نے جلدی سے اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ ٹیپو پہلے کی طرح رستم کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ ''چاچو، تم نے رُلایا ہے چاچی شانی کو؟'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ہاں میں نے ہی رُلایا ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

''تو آپ گندے ہیں؟''

''ہاں گندہ ہوں۔ اسی لئے گندے کام ہوئے مجھ سے۔''

اسی دوران میں مہناز بھی ٹیپو کو آواز دیتی اندر آ گئی۔ ماحول کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ ذرا چونکی، پھر ٹیپو کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے بابا جانی آ رہے ہیں۔ آواز آ رہی ہے ناں گولی کی؟''

ٹیپو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹیلوں کی طرف سے گاہے بگاہے شاٹ گن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ لوگ واپس آتے ہوئے شاید پرندوں وغیرہ پر فائر کر رہے تھے۔

''اچھا بھرجائی...... اچھا بی جی، میں چلتا ہوں۔'' رستم نے اٹھ کر دونوں کو ایک ساتھ سلام کیا اور الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔

شانی گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے دل کا ایک گوشہ بالکل ویران اور تاریک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر میں شکار پارٹی واپس آ گئی۔ ان لوگوں نے دو بڑے تھیلوں میں شکار کئے ہوئے پرندے اور جنگلی خرگوش وغیرہ بھر رکھے تھے۔ یہ لوگ کہیں سے ایک بڑا خار پشت بھی پکڑ کر لائے تھے۔ اسے ایک جال میں لپیٹا گیا تھا اور اوپر سے نائیلون کی رسی کے بل بھی دیئے گئے تھے۔ بلاول اعوان بھی شکار پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے انجوائے کیا ہے۔ شکار کو صاف کرنے اور پکانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شانی کو اس سارے کام میں بالکل دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ گوشت پکنے کی بُو اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ تھوڑے سے چاول کھا کر جلد ہی سونے کے لئے لیٹ گئی۔ جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی رات گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ مہناز اور ٹیپو بھی سو چکے تھے۔ ایک دم شانی کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھ کسی آہٹ کی وجہ سے کھلی ہے۔ شاید کوئی کھٹکا ہوا تھا۔ شاید کوئی بلی یا دوسرا جانور تھا۔ اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے کھڑکی کے سامنے سے ایک پرچھائیں گزرتے ہوئے دیکھی۔ یہ کوئی شخص تھا جو چوروں کی طرح جھک کر چلتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ گزر گیا تھا۔

شانی ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ مہناز کو جگائے۔ اس نے مہناز کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سارے دن کی تھکی ماندی ابھی ابھی سوئی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گئی۔ دروازے اور کھڑکی کی کنڈیاں اچھی طرح چیک کیں۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا، تاہم لوہے کی گرل موجود تھی۔ اس نے گرل کے ٹھنڈے لوہے سے چہرہ لگایا اور باہر جھانکا۔ باہر ڈیرہ خاموشی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر شے محوِ خواب تھی... بس کسی فاصلے سے کسی بکری یا کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ شانی نے جھرجھری سی لی اور کھڑکی کا یہ پٹ بھی اچھی طرح بند کر دیا۔

کافی دیر تک مختلف خیالات اسے پریشان کرتے رہے۔ وہ ایک نہایت غیر محفوظ جگہ پر تھی۔ یہ خطرناک ترین جرائم پیشہ افراد کا ٹھکانہ تھا۔ ان کے تین گروہ تھے اور تینوں ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک۔ اگر وہ یہاں اس دور دراز جگہ پر پہنچی تھی تو صرف اس آسرے پر کہ یہاں رستم موجود تھا اور رستم کے ہوتے ہوئے شاید کوئی بھی جگہ اس کے لئے خطرناک نہیں تھی۔ خاصی دیر تک سوچوں میں گرفتار رہنے کے بعد وہ بتدریج پھر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ دھماکے کی خوفناک آواز سے کھلی تھی۔ یہ شاید پمپ ایکشن گن کا دھماکہ تھا۔ شانی کے ساتھ ہی مہناز بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں نے جلدی سے اپنے سروں

پر اوڑھنیاں کھینچیں۔ "کیا ہوا آپا؟" شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

"شاید حجرے کے سامنے گولی چلی ہے۔" مہناز نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک دم کئی افراد کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کمرے سے باہر بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ مہناز اور شانی ایک ساتھ باہر نکلیں۔ تین چار افراد نے ایک شدید زخمی شخص کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا ہوا تھا اور اس سرنگ کی طرف دوڑے جا رہے تھے جہاں ڈاکٹر ناصر کا کلینک تھا۔ سامنے ہی ایک حجرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک شخص نے تالا ہاتھ میں اٹھا کر لالہ فرید کو دکھایا۔ "یہ دیکھیں جی۔ تالا توڑ کر اندر گھسا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے۔"

لالہ فرید نے پکار کر کہا۔ "چاروں طرف گھیرا ڈال لو۔ وہ یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔"

ایک شخص نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "ساری لائٹس جلا دو۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اردگرد موجود کئی بلب روشن ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی لالٹینیں بھی گردش کرتی نظر آئیں۔ لالے فرید کے رائفل بردار ساتھی پلک جھپکتے میں چاروں طرف پھیل گئے۔

"شاید اس سامنے والے کمرے میں گھسا ہے۔" ایک سندھی ٹوپی والے نے انگلی سے اشارہ کر کے ہیجانی لہجے میں کہا۔

مراد گروپ کا ایک بندہ تیزی سے شانی اور مہناز کے قریب آیا۔ "وڑی اِدھر لفڑا ہے۔ اپن کا خیال ہے آپ دونوں اندر چلی جائیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شانی اور مہناز واپس کمرے کی طرف مڑیں۔ ابھی شانی نے دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ بائیں جانب تاریک گوشے سے ایک شخص بجلی کی طرح لپکا اور سیدھا شانی کے پاس آیا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کسی پتھریلی شے سے ٹکرائی ہے۔ وہ ڈگمگا کر کئی قدم آگے چلی گئی۔ اس پر جھپٹنے والے شخص نے بے حد تیزی سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ شانی کی گردن اس کے بازو کے شکنجے میں تھی۔ کوئی سرد آہنی چیز شانی کے سر سے آ لگی۔ یہ پستول یا ریوالور کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ گردن پر قائم ہونے والی گرفت میں ایسا وحشیانہ پن تھا کہ شانی کو محسوس ہوا، اس نے سر کو جنبش دی تو منکا ٹوٹ جائے گا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ خبردار۔ گولی مار دوں گا۔" کسی نے وحشت سے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

شانی کی طرف مدد کے لئے بڑھنے والے دو تین مسلح افراد ٹھٹک کر رک گئے۔ ان میں

رستم کا قریبی ساتھی حسنا گجراتی بھی تھا۔شانی کی نگاہ حجرے کے کھلے دروازے میں گئی۔ یہاں ایک اور شخص بے حس وحرکت پڑا تھا۔ یقیناً وہ مر چکا تھا۔اس کے پاس ہی پتھریلے فرش پر بہت سے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کوئی نامعلوم شخص حجرے کا تالا توڑ کر کچھ چرانے کی نیت سے حجرے میں گھسا تھا۔ اس نے ایک شخص کو جان سے مار ڈالا تھا اور اب شاید اپنی جان بچانے کے لئے شانی کو اپنی ڈھال بنایا تھا۔

شانی کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔اسے دبوچنے والا ٹھیک ٹھاک جسمانی قوت کا مالک تھا۔خوف آمیز دہشت نے اس کی طاقت میں مزید اضافہ کیا تھا۔ وہ شانی کو ہیجانی انداز میں کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا پندرہ بیس قدم پیچھے لے گیا۔ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد موجود افراد کو جنونی لہجے میں دھمکا بھی رہا تھا۔''خبردار، کوئی پاس نہ آئے۔ اسے گولی مار دوں گا۔ خدا قسم جان لے لوں گا اس کی۔''اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا۔

شانی کو آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔ پھر ایک دم جیسے اس کے جسم میں ہزاروں وولٹ کا کرنٹ دوڑ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یہ کسی اور کی نہیں بلاول کی آواز تھی۔ بلاول جو عارف کمبوہ کا قریبی ساتھی تھا۔ جو ایک طویل اور پُرخطر سفر طے کر کے ان کے ساتھ یہاں ڈیرے پر پہنچا تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ شانی نے بے حد استعجاب کے عالم میں سوچا۔

کہیں اس کی سماعت دھوکا تو نہیں کھا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

''بلاول۔''اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا لیکن یہ آواز اتنی گھٹی ہوئی تھی کہ اس کے حلق سے باہر نہیں نکل سکی۔

پھر اچانک شانی کی دھندلائی ہوئی نگاہ رستم پر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے سامنے آیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی نال کا سیاہ پستول اور دوسرے ہاتھ میں بھڑکتی ہوئی مشعل تھی۔ اس کا چہرہ تمتایا ہوا تھا۔ لمبے بال ہیجانی انداز میں لہرا رہے تھے۔

اسے دیکھ کر بلاول گرجا...... ہاں وہ بلاول ہی تھا۔''میرے قریب کوئی حرام زادہ نہ آئے۔ میرے سر کو خون چڑھا ہوا ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔''اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پستول کی نال اتنے زور سے شانی کے سر پر دبائی کہ شانی کا سر بائیں طرف مڑ کر تقریباً کندھے سے جا لگا۔ رستم نے یہ منظر دیکھا اور اپنے قدم روک لئے۔

شانی کے دل نے گواہی دی کہ اس نے ٹھیک کیا ہے۔ سننے والے اور دیکھنے والے صرف سن اور دیکھ رہے تھے، مگر شانی خوفناک گرفت کو بھی محسوس کر رہی تھی جس نے اسے جکڑا ہوا تھا۔ یہ ایک جنونی گرفت تھی اور یہ ایسا جنون تھا جس میں شدید خوف بھی شامل ہوتا ہے۔ ایسا جنون شاید زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

رستم نہ صرف خود رک گیا بلکہ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیگر افراد کو بھی روک لیا۔

بلاول شانی کے کان میں پھنکارا۔''تیرا قیمہ کر ڈالوں گا۔ چپ چاپ چلتی جا۔ چپ چاپ۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر پستول کی نال بے پناہ شدت سے شانی کے سر میں گھسیڑی۔ شانی کا سر پھر کندھے سے چھو گیا۔ اسے لگا کہ سر کی کھال چھل گئی ہے اور خون رسنے لگا ہے۔

بلاول اسے کھینچتا ہوا سرنگ نمبر تین کے اندر لے گیا۔ یہ سرنگ نسبتاً کم آباد تھی۔ یہاں دوسری سرنگوں کے مقابلے میں روشنی بھی تھوڑی تھی۔ وہ سرنگ کے اندر تقریباً 200 فٹ آگے جانے کے بعد ٹھہر گیا۔ اگر وہ اس سے آگے جاتا تو سرنگ کا دہانہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ زور سے بولا تو اس کی آواز سرنگ کے طول میں دور تک گونجی۔''اندر آنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ ابھی اس حرام زادی کا بھیجا نکال کر دیوار سے چپکا دوں گا۔''

شانی کے کانوں میں بدبودار سانسیں زہریلی پھنکاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ حملہ آور کے پسینے کی بُو اور جسم کی حیوانی حدت شانی کے جسم میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس کی اوڑھنی کہیں راستے میں ہی گر گئی تھی۔ چپل بھی اُتر چکی تھی۔ اب وہ ٹھنڈے پتھریلے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرنگ کے دہانے پر درجنوں مشعلیں، لالٹینیں اور لیمپ وغیرہ نظر آنے لگے۔ ان چیزوں کی سرخی مائل روشنی میں رائفلوں کے بیرل، کلہاڑیوں کے پھل اور دیگر ہتھیار چمک رہے تھے۔ رات کا سناٹا ایک ہیجانی شور کی زد میں آ گیا تھا۔ جیسے صور پھونکا گیا اور ڈیرے کی اتھاہ خاموشی میں ایک قیامت جاگ گئی ہو۔

چند منٹ اسی طرح گزرے پھر دہانے کی طرف سے لالہ فرید کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔

''بی بی کو چھوڑ دو۔ کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں کچھ نہیں چاہتا۔ بس تم میں سے کوئی کتا اندر نہ آئے۔ میں لاش گرا دوں گا اس کی ایک سیکنڈ میں۔''

کچھ دیر تک اسی طرح کے فقروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر رستم کی آواز سنائی دی۔''تم کچھ بتاؤ گے نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ کیا چاہتے ہو؟''

رستم کی آواز سن کر وہ جیسے چند سیکنڈ کے لئے کچھ سوچنے لگا۔ جب وہ دوبارہ بولا تو اس کی آواز میں وحشت کا عنصر تھوڑا سا کم تھا۔ ''تم اکیلے اندر آجاؤ لیکن ہتھیار نہ ہو تمہارے پاس۔ کانوں کی کھڑکیاں کھول کر سنو ہتھیار نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

دہانے کے قریب جمع ہو جانے والی روشنیوں کے جمگھٹے میں سے ایک روشنی علیحدہ ہوئی اور آہستہ آہستہ قریب آنے لگی۔ روشنی سرنگ کے جس حصے سے گزرتی تھی وہ روشن ہو جاتا تھا اور جب روشنی آگے بڑھ جاتی تو عقب میں پھر تاریکی پھیل جاتی تھی۔ اس سرنگ میں دن کے وقت تو تھوڑی بہت آمد و رفت نظر آتی تھی لیکن اس وقت بالکل ویرانی کی کیفیت تھی۔ یقیناً اکا دکا افراد یہاں موجود بھی تھے لیکن وہ صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے سامنے آنے کا رسک نہیں لے رہے تھے۔

رستم کے ہاتھ میں ایک گیس لیمپ تھا، وہ اسے اٹھائے ہوئے قریباً سوڈیڑھ سو فٹ اندر آگیا۔ ''بس رک جاؤ۔'' بلاول گرجا۔

رستم رک گیا..... اور گیس لیمپ سرنگ کے پتھریلے فرش پر رکھ دیا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' رستم نے تحمل سے پوچھا۔

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے نکل جاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ وعدہ ہے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں وعدوں پر... اور وعدے کرنے والوں پر۔ مجھے گارنٹی چاہئے۔ پوری پوری گارنٹی۔ میں صحیح سالم اگلے ڈیرے تک واپسی چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہئے اور اس سے کم بھی کچھ نہیں۔''

''تم کس گارنٹی کی بات کر رہے ہو؟''

''اس گارنٹی کی۔'' بلاول نے شانی کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر بے رحم جھٹکا دیا، شانی کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔ ''میں یہ گارنٹی چاہتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ اگلے ڈیرے پر پہنچ کر اسے چھوڑ دوں گا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اپنی جان تلی (ہتھیلی) پر رکھ لی ہوئی ہے لیکن مرنے سے پہلے اگر میں اسے نہ ماردوں تو میں اپنے باپ کا نہیں کسی کتے کا تخم ہوں۔ بے شک میری قبر پر لکھوا دینا یہاں ایک کتے کا بچہ سو رہا ہے۔'' بلاول بے پناہ وحشت

سے بولتا چلا گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر رستم کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ ''گارنٹی کے طور پر میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھوا لو۔ جس طرح کی تسلی چاہتے ہو تمہیں مل جائے گی۔''

''مجنوں ہونا ں۔ خون کے اندر عاشقی پٹا کے مار رہی ہے لیکن جائے گی تو میرے ساتھ یہی لیلیٰ جائے گی۔ نہیں تو یہیں پر ہم دونوں کی لاشیں گریں گی۔'' بلاول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کی گرفت ایک بار پھر سخت ہوتی جا رہی تھی۔

رستم اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بلاول دھاڑا۔ ''جاؤ مشورہ کر لو اپنے یاروں اور چمچوں کڑچھوں سے۔ مجھے دس پندرہ منٹ کے اندر بتا دو۔ میری بات منظور ہے یا میرے ساتھ اپنی اس کیبی کی لاش بھی اٹھانی ہے یہاں سے۔''

رستم کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ سب کچھ بڑی مشکل سے برداشت کر رہا ہے۔ وہ گھوما اور واپس دہانے کی طرف چلا گیا۔ شانی، بلاول کی گرفت میں جکڑی سرنگ کی دیوار کے ساتھ کھڑی رہی۔ رستم کے جانے کے بعد بلاول نے شانی پر سے اپنی جنونی گرفت قدرے نرم کر دی تاہم وہ اس کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہیجان دیکھ کر شانی کو یہ شدید خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اضطراری طور پر ہی ٹریگر نہ دبا دے۔ شانی کا جسم پوری طرح بلاول کے جسم سے پیوست تھا لیکن یہ صورتِ حال اس قسم کی تھی کہ جسموں کا اتصال اور لمس بے معنی ہو گیا تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش جنس جیسی طاقت ور جبلت کو بھی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ سرنگ میں لالٹینیں روشن تھیں۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ موجود تھا۔ کھیتی باڑی کا بے کار ہو جانے والا سامان، مویشیوں کا خشک چارہ، لکڑی کی خالی پیٹیاں، کنڈم ہو جانے والا اسلحہ، ایک بہت بڑا خراب جنریٹر اور گھوڑوں کے ساز وغیرہ...... یہ سرنگ کچھ آگے جا کر دو شاخوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ ایک شاخ قدرے روشن اور دوسری تاریک تھی۔

چند منٹ بعد رستم دوبارہ سرنگ میں آگیا۔ اس مرتبہ رستم کے ساتھ لالہ فرید بھی تھا۔ لالہ فرید کی آمد پر بلاول نے اعتراض کیا لیکن جب رستم نے یہ یقین دلایا کہ وہ دونوں بالکل غیر مسلح ہیں تو وہ ذرا سا نرم پڑ گیا۔ رستم، فرید اور بپھرے ہوئے بلاول احمد میں ایک بار پھر مکالمہ شروع ہوا۔ رستم اور فرید کا کہنا تھا کہ بے شک بلاول کے ہاتھوں ایک بندہ قتل اور ایک سخت زخمی ہوا ہے پھر بھی وہ اسے یہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ دے دیتے ہیں لیکن وہ شانی

بی بی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات نہ کرے۔ اس کے بدلے وہ جسے چاہے ضمانت کے طور اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

بلاول احمد یہ شرط ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا اس نے کہا۔ ''اگر تمہاری نیتیں صاف ہیں اور تم واقعی مجھے جانے کا راستہ دے رہے ہو تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ساتھ بی بی ہے یا بی با ہے۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔''

''یہ عورت ذات ہیں۔ ہمارے لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔'' فرید نے کہا۔

''میرے لئے یہ بہت عزت کی جگہ پر ہے۔ اس کی وجہ سے تو میری جان بچی ہوئی ہے۔'' بلاول نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''دیکھو، عورت کو ایسے معاملوں میں گھسیٹنا جوانمردی نہیں ہے۔'' رستم بولا۔

''بات جوانمردی کی نہیں۔ ابھی تو تمہارے گھیرے سے نکلنے کا سوال ہے۔ بعد میں کسی وقت جوانمردی بھی دیکھ لیں گے۔''

پانچ دس منٹ کی بات چیت میں بلاول ٹس سے مس نہیں ہوا، نہ ہی ایک لمحے کے لئے اس نے اپنے پسٹل کی نال شانی کے سر سے علیحدہ کی۔ رستم نے تھوڑا سا آگے آنے کی کوشش کی تو وہ دیوانے لہجے میں گرجنے برسنے لگا۔ ''خبردار، آگے نہ آؤ۔ میں لاش گرادوں گا۔ میں گرادوں گا لاش۔ میں کہتا ہوں میں گرادوں گا۔''

رستم رک گیا۔ بلاول ڈرے ہوئے انداز میں شانی کو کچھ اور گہرائی میں لے گیا۔ یہاں آنے سے اسے یہ نقصان ہوا کہ سرنگ اور سرنگ کا نصف دہانہ اس کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ پھر بھی اسے یہ تسلی تو ہوئی کہ وہ رستم اور فرید سے دور ہٹ گیا ہے۔

کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ رستم اور فرید عارضی طور پر دہانے کی طرف گئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی مشعلوں کی روشنی بھی اب ذرا فاصلے پر چلی گئی تھی۔ مناظر اوجھل ہوجانے کی وجہ سے بلاول اعوان کچھ پریشان ہوگیا لیکن اب وہ دوبارہ آگے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے تھوڑا سا مزید پیچھے ہٹنا مناسب سمجھا۔ گاہے بگاہے وہ شانی کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے فحش زبان میں کوئی دھمکی بھی دے دیتا تھا۔

شانی کی درخواست پر اس نے شانی کی گردن پر سے گرفت ذرا نرم کردی تھی، تاہم اب گردن کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی مٹھی میں جکڑ لئے تھے۔ شانی اب شاید سراسیمگی کی کیفیت سے کافی حد تک نکل آئی تھی۔ اس کا ذہن ''مزاحمت'' کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اغوا کنندگان اور یرغمال بنائے جانے والے افراد جب اعصابی اور

جسمانی طور پر تھک جاتے ہیں تو معاملات ان کی گرفت سے نکلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں ان کے خلاف اچانک ہونے والی کارروائی مؤثر ثابت ہوتی ہے لیکن یہ شخص تو ابھی تازہ دم تھا۔ موت کے خوف نے اس کے جسم میں بلا کی چستی اور چوکسی بھر رکھی تھی۔ وہ نشے میں بھی نہیں تھا۔ اس نے شانی کو عقب سے جکڑا ہوا تھا اور قریباً پون گھنٹہ گزرنے کے باوجود تھوڑی دیر کے لئے بھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ معمولی سا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

شانی کے ذہن میں اس شخص کے حوالے سے بے شمار سوالات اُبھر رہے تھے۔ عارف کمبوہ پر کسی طرح کا شبہ کرنا تو ''نادانی'' تھی۔ یہ شخص عارف کا ساتھی ہونے کے باوجود اس کا ساتھی نہیں تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ پولیس سے ملا ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ریاض ہٹلر سے ملا ہوا ہے۔ وہ دراج اور شانی کے ساتھی کی حیثیت سے یہاں پہنچا تھا اور پہنچ کر اپنی کارروائیوں میں مصروف ہوگیا تھا۔ شانی کو یاد آیا کہ تین دن پہلے وہ کس طرح لالہ فرید سے کرید کرید کر بارودی سرنگوں اور یہاں موجود اسلحے وغیرہ کے بارے میں سوالات پوچھ رہا تھا۔ اس نے لالہ فرید سے بارودی سرنگوں کا خاص طور سے ذکر کیا اور کہا تھا کہ بارودی سرنگوں کا کوئی نقشہ وغیرہ ہونا چاہئے۔ وہ ساری باتیں چند لمحوں میں شانی کے ذہن میں گونج گئیں۔ یوں لگتا تھا کہ پولیس افسروں نے بلاول کو آلہ کار بنا کر یہاں کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا ہے۔ ڈیرے والوں کی خوش قسمتی کہ وہ یہاں مشکوک حالت میں دیکھ لیا گیا.... اور اب وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے شانی کو یرغمال بنائے ہوئے تھا۔

چند سیکنڈ بعد شانی کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ یہ فائر کی آواز تو نہیں تھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی کریکر یا بڑے سائز کا پٹاخہ چلا ہے۔

بلاول سرتاپا لرز گیا۔ شانی کی گردن پر اس کی گرفت ایک بار پھر بے حد ظالمانہ ہوگئی۔ شانی کو لگا سانس رک جائے گا۔ وہ چلا کر بولا۔ ''یہ کیا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے ؟'' اس کی آواز سرنگ میں دور تک گونجی۔ ''یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ شانی کو دھمکیاں دیتا اور گھسیٹتا ہوا کچھ اور آگے لے گیا ساتھ ساتھ وہ باہر والوں سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

جواب میں لالہ فرید کی آواز آئی۔ اس نے کچھ صفائی پیش کی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے۔

دو چار منٹ مزید گزر گئے۔ بلاول احمد کی بے چینی اب بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رستم اور ادلہ وغیرہ کو گندی گالیاں دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے با آواز بلند ایک الٹی میٹم بھی دے ڈالا۔ ''میں تمہیں دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد اسے گولی مار کر خود کو بھی مار لوں گا۔ یہ خالی دھمکی نہیں ہے حرام زادو۔ میں تمہیں کر کے دکھا دوں گا۔''

اس کی آواز جنون کی شدت سے پھٹی ہوئی تھی۔ اچانک شانی کی تیز حس شامہ نے ایک بُو سی محسوس کی۔ یہ ہلکی لیکن نامانوس بُو تھی۔ پہلے تو شانی نے سمجھا شاید یہ سرنگ کی اپنی بو باس ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اسے اپنا یہ خیال رد کرنا پڑا۔ بُو سرنگ کی گہرائی سے نہیں دہانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ شانی کو لگا جیسے یہ بُو سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر حواس کو پریشان کر رہی ہے۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد یہ بُو بلاول احمد کے دماغ تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے ناک سے سوں سوں کی آواز نکال کر چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ کیسی بُو ہے؟'' اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

اگلے چند سیکنڈ میں بُو تیز ہو گئی۔ شانی کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور رخسار پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہیں۔ شانی کے دل نے گواہی دی کہ اس ہلکی لیکن تیز اثر بُو کا تعلق اس دھماکے نما آواز سے ہے جو تھوڑی دیر پہلے سنائی دی تھی۔

یکا یک بلاول چنگھاڑا۔ ''یہ کیسی بُو ہے۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ میں گھوڑا دبا دوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

سرنگ کے خم پر ایک مشعل کی روشنی نظر آئی۔ بلاول نے طیش اور بدحواسی کے عالم میں اس روشنی پر فائر جھونک مارا۔ سرنگ میں ہونے والا دھماکہ دور تک گونجا۔ بارود کی تیز بو شانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ بلاول ہیجانی لہجے میں چنگھاڑا۔ ''اگلی گولی تمہاری اس بہن کی کھوپڑی میں ماروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل شانی کے سر سے ہٹا لیا۔ پسٹل والے ہاتھ سے اس نے غالباً اپنی ناک چٹکی میں دبا رکھی تھی۔ شانی کی گردن پر اس کے مضبوط بازوؤں کا شکنجہ کچھ اور بھی کسا گیا۔ شانی کے حلق سے کھیں کھیں کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ شانی کو کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا نیم تاریک سرنگ کی طرف بڑھا۔ سرنگ کی یہ شاخ قدرے تنگ اور ناہموار تھی۔ اس شاخ میں گھستے ہی بلاول نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک ٹارچ نکالی اور اسے اپنا پورا منہ کھول کر منہ میں دبا لیا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں شانی کو دیواروں پر جالے اور گرد و غبار دکھائی دیا۔ یہاں وہاں چمگادڑوں کے پر بھی دکھائی دیئے۔ حواس کو مختل کرنے والی نامانوس بُو سے بچنے

کے لئے بلاول شانی سمیت آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک شانی کی نگاہ ٹارچ کے روشن دائرے میں آنے والے ایک پتھر پر پڑی۔ اس پتھر پر سیاہ رنگ سے مردے کی کھوپڑی اور دو ہڈیوں کا نشان بنایا گیا تھا۔ ساتھ ہی دائیں طرف تیر کا نشان تھا۔ جیسے ظاہر کیا گیا ہو کہ اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ بلاول تو جیسے اندھا بہرا ہو رہا تھا۔ اسے یہ نشان نظر نہیں آیا اور نظر آتا بھی تو وہ شاید رکنے کی عقل مندی نہ کرتا (ٹارچ اس کے منہ میں آ جانے سے کم از کم اتنا فائدہ ہوا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے گندے الفاظ شانی کے کانوں میں نہیں پڑ رہے تھے) وہ دس پندرہ قدم مزید آگے بڑھا۔ یہاں کسی نے سرنگ کی دیوار پر سیاہ روشنائی سے ''خطرہ'' لکھ رکھا تھا۔ شانی نے بلاول کو اس طرح متوجہ کرنا چاہا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ بلاول بڑی درندگی اور طاقت سے شانی کو کھینچے لئے چلا جا رہا تھا۔ شانی کے نازک پاؤں سرد سنگریزوں کی وجہ سے زخمی ہو چکے تھے۔ ٹخنوں پر کئی ضربیں بھی آئی تھیں۔ تاہم اسے زیادہ فکر اپنی گردن کی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ گولی کا شکار نہ بھی ہوئی تو گردن ٹوٹنے سے ضرور مر جائے گی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں پھر بس دو ہی چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ رستم اور منا ''کہاں ہو منے؟ کہاں ہو رستم؟'' اس کے دل نے پکار کر کہا۔ ''میرا دم سینے میں گھٹ رہا ہے۔ میرا ذہن اندھیرے میں ڈوب رہا ہے۔ پتا نہیں کہ اب یہ اندھیرا کبھی چھٹ سکے گا یا نہیں۔''

اس کی سانس رک رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنی گردن کو بلاول کے شکنجے سے چھڑانا چاہا۔ مگر یہ ایسے ہی تھا جیسے چھرے والی بندوق سے ہاتھی کو گرانے کی کوشش کی جائے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کہ شانی کوئی اور کوشش کرتی اچانک ہی بلاول کا پاؤں پھسلا۔ وہ شانی سمیت چار پانچ فٹ کی گہرائی میں گرا۔ شانی کے جسم کو شدید جھٹکا لگا لیکن یہ گرنا تو صرف ایک ابتداء تھی۔ اصل اور خوفناک مرحلہ بعد میں آیا۔ جونہی بلاول نے شانی سمیت اٹھنے کی کوشش کی اس کا پاؤں گہرے اندھیرے میں پھر پھسلا۔ اس کا منحوس بازو ابھی تک شانی کی گردن میں تھا، تاہم اس کے پستول اور ٹارچ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کا پاؤں پھسلنے سے شانی کی گردن کو بھی شدید جھٹکا لگا۔ پھر یکا یک زمین اس کے زخمی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ شانی کو لگا جیسے وہ آسمانی جھولے میں ہے اور تیزی سے نیچے آ رہی ہے۔ ایک دم ہی بڑی تیز ہوا اس کے جسم سے ٹکرانے لگی۔ اس قبر نما غار میں یہ ہوا کیسی؟ اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن نے جواب دیا۔ یہ بادِ مرگ ہے۔ یہ موت کی ہوا ہے۔ وہ جانے کتنی بلندی سے نیچے پتھریلی زمین پر گر رہی تھی۔ بلندی سے پتھریلی بے رحم زمین پر گرنے کا احساس کیا ہوتا

ہے؟ شانی کو معلوم نہیں تھا۔ نہ ہی اسے پتا تھا کہ موت کی آمد کیسی ہوتی ہے لیکن وہ وقت سے پہلے ان دونوں چیزوں کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنی ہی دہشت زدہ چیخ گونجی۔ یہ سب کچھ بے حد بھیانک تھا۔ اسے لگا وہ زمین آسمان کے درمیان معلق ہوگئی ہے۔ نہ مری ہے، نہ زندہ رہی ہے۔ اسے اپنے اردگرد نمی کا احساس ہوا۔ وہ پانی میں تھی۔ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تاریک پانی۔ اس نے پاؤں زمین پر لگانے کی کوشش کی مگر پانی گہرا تھا۔ اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگی وہ رنگ والی کے پاس سے گزرنے والے سوئے (چھوٹی نہر) میں اپنی سکھیوں سکینہ اور صغراں کے ساتھ کپڑوں سمیت نہایا کرتی تھی۔ پھر جب وہ ذرا بڑی ہوئیں اور راہ گیروں نے چور نظروں سے انہیں دیکھنا شروع کر دیا تو انہوں نے دن کے بجائے شام کے بعد نہانا شروع کر دیا۔ گرمیوں کی حبس زدہ شاموں میں وہ پانی میں خوب اودھم مچاتیں اور حویلی کی نوکرانیاں انوری، مختاری وغیرہ راہ گیروں کو نہر سے دور رکھنے کے لئے اردگرد موجود رہتیں۔

وہ بڑی اچھی تیراک تھی۔ آج یہ تیراکی اس کے کام آئی۔ شل ہوتے ذہن کے باوجود اس نے اپنی بچی کھچی توانائی جمع کی اور سرد پانی میں تیرنے لگی۔

''بچاؤ..... بچاؤ.....'' اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے پکارا۔

اس کی آواز یوں گونجی جیسے لاہور کی سیر کے موقع پر مقبرہ جہانگیر، بادشاہی مسجد یا لاہور میوزیم کے بڑے بڑے ہالوں میں گونجتی تھی۔ ''یا خدا! میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں، وہ خونی قاتل کہاں ہے؟'' اس نے گہرے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سوچا۔

پانی میں ایک خاص قسم کی بُو باس تھی۔ جیسے اس میں گندھک یا چونے وغیرہ کی آمیزش ہو۔ اچانک شانی کے ہاتھ میں کسی چکیلے پتھر کا ابھرا ہوا کنارہ آیا۔ شانی نے اس مخروطی پتھر پر گرفت مضبوط کی اور بہاؤ کی طرف جانے سے بچ گئی۔ تھوڑی سی کوشش کر کے وہ پانی سے نکل آئی۔ تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ بس اپنی آواز کی گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی گہرائی میں ہے اور چھت بہت اونچی ہے۔ شاید کئی منزلہ بلڈنگ کی اونچائی کے برابر۔ اسے اپنے بالکل قریب پانی بہنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے پاؤں بُری طرح زخمی تھے۔ بلندی سے گرتے ہوئے اس کا ایک کندھا بُری طرح مڑا تھا اور اب اکڑا سا محسوس ہوتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ گرتے وقت بلاول اس کے ساتھ تھا۔ نشیب کی طرف جاتے ہوئے اس کا سر شدت کے ساتھ کسی شے سے ٹکرایا تھا اور شاید وہ کرب ناک انداز میں چیخا بھی تھا۔

وہ کہاں تھا؟ کیا مر چکا تھا یا زخمی حالت میں کہیں اس کے آس پاس موجود تھا۔ اس دوسرے خیال نے شانی کے جسم میں سرد پھریری دوڑا دی۔ اس نے اپنے چہرے کا رخ بلندی کی طرف کیا اور ایک بار پھر ہیجانی انداز میں چلائی۔ ''کوئی ہے..... بچاؤ..... کوئی ہے۔ میری مدد کرو۔''

اس کی آواز کسی بلند و بالا گنبد نما چھت کے اندر گونجی اور اس گونج کی شدت پر وہ حیران رہ گئی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بلندی سے گری ہے۔ بس یہ معلوم تھا کہ وہ اس بلندی سے گر کر زندہ ہے۔ کیا واقعی وہ زندہ اور سلامت ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کو ٹٹولا۔ پاؤں کے تلوؤں پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہاں سے خون رِس رہا تھا۔

دفعتاً اسے آس پاس کہیں حرکت کا احساس ہوا۔ کوئی زندہ جسم اس کے قریب موجود تھا۔ اپنی جان بچانے کے فطری عمل کے تحت اس نے نیچے بیٹھ کر تاریکی میں ہاتھ چلائے۔ وہ کوئی پتھر ڈھونڈنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں جو شے آئی وہ ایک چوبی دستے والی خستہ حال مڑی تڑی بندوق تھی۔ پتا نہیں یہ کب اور کس نے اوپر بلندی سے پھینکی ہوئی۔ اسے یہاں پڑے ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ گزر چکا تھا اور اب یہ اس تاریک کھوہ میں شانی کا ہتھیار تھی۔ شانی کے کپڑے اور بال بھیگ کر جسم اور چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ اس نے قریباً پانچ کلو وزنی بندوق کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور سامنے تاریکی میں گھورنے لگی۔ اب کچھ وقت گزر چکا تھا اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے لگی تھیں۔

وہ فاصلے پر دیکھ رہی تھی لیکن جو شے اسے نظر آئی وہ اس کے چہرے سے فقط پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہ بھی ایک چہرہ تھا..... تاریکی میں نظر نہیں آتا تھا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ یہ بلاول کا چہرہ تھا۔ وہ کسی شے کا سہارا لیتا ہوا شانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''خبردار..... پیچھے ہٹ جاؤ.....'' شانی رائفل سونت کر پھنکاری۔

اس کے ساتھ ہی وہ دو تین قدم پیچھے کی طرف ہٹی۔ وہ زیادہ پیچھے نہیں جا سکتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہے۔ نہ دائیں بائیں کا کچھ معلوم تھا۔ وہ بلاول والی غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اعصاب شکن بُو سے بچنے کے لئے تیزی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا اور گہری کھائی میں آ گرا تھا۔ وہ ہمت کر کے رک گئی۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بلاول کی حالت بہت بُری تھی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس کا ایک بازو تقریباً کندھے سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس کا سر اس بُری طرح پھٹا تھا کہ

ہڈی کا فریکچر پیشانی تک آ گیا تھا۔ اب اس کا چہرہ شانی کی آنکھوں سے بس تین چار فٹ کی دوری پر تھا۔ وہ ایک کھردری دیوار کا سہارا لے کر شانی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں یقیناً کوئی تیز دھار ہتھیار تھا۔ اس ہتھیار کا لوہا پتھریلی دیوار سے رگڑ کھا کر آواز پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے زخمی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔

''رک جاؤ۔'' شانی پورے زور سے چلائی۔

پھر اس نے رائفل دستے کی طرف سے گھما کر پوری طاقت سے بلاول کی کنپٹی پر ماری۔ وہ ایک طرف لڑھکا۔ چند ثانیے بعد تاریک پانی میں چھپاک کی آواز پیدا ہوئی اور خاموشی چھا گئی۔ شانی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ سردی اور ہیجان سے اس کا سارا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اب خاصی بلندی سے کچھ آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ سنبھل سنبھل کر اس اندھی کھائی کے کنارے کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر اوپر اندازاً پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر مشعلوں اور لالٹینوں کی سرخی مائل روشنی دکھائی دینے لگی۔ نیچے سے دیکھنے پر یہ بلندی خوفناک نظر آتی تھی۔ کچھ مشعلیں بالکل کنارے پر پہنچ گئیں۔ شانی نے چہرہ اوپر کیا۔ سینے میں ہوا بھری اور زور سے چلائی۔ ''میں یہاں ہوں۔ ..... نیچے..... پانی کے پاس۔''

چند سیکنڈ بعد لالہ فرید کی بے قرار آواز ابھری۔ ''بی بی جی! آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔'' شانی روتے ہوئے بولی۔

''زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' یہ آواز رستم کی تھی۔

''نہیں، زیادہ نہیں آئیں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔ شاید پانی میں گر گیا ہے۔''

''کوئی آواز تو نہیں آ رہی آس پاس سے؟'' فرید نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی تو نہیں۔''

فرید نے پھر کچھ کہا لیکن گونج اتنی زیادہ تھی کہ مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔

''کیا کہہ رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' شانی نے روہانسا ہو کر کہا۔

اس مرتبہ رستم نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی آواز شانی تک پہنچائی۔ ''آپ جہاں ہیں وہیں کھڑی رہیں۔ ایک قدم بھی ادھر اُدھر نہ جائیں۔ ہم آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''اور اس کتے کی طرف سے بھی ہوشیار رہیں۔'' یہ آواز شاید حسنا گجراتی کی تھی۔

شانی سمٹ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ ٹوٹی پھوٹی رائفل اب بھی مضبوطی سے اس کے ہاتھوں میں دبی تھی۔ اس کی انگلیاں دکھنے لگیں۔ اس نے رائفل پر اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

کندھے کا کھچاؤ ٹھنڈا ہو کر زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اب اندازہ ہونے لگا کہ جسم پر اور بھی کئی چھوٹی بڑی چوٹیں اور خراشیں موجود ہیں۔ پاؤں کے نیچے پتھر چپک رہے تھے۔ مطلب تھا کہ خون کا رساؤ موجود ہے۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ذرا دھیان سے اوپر کی سمت دیکھا۔ سینے میں اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اب اس کی آنکھیں کافی کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اوپر کنارے پر جو روشنیاں موجود تھیں ان کے سبب بھی دیکھنے میں کچھ مدد مل رہی تھی۔ وہ جہاں موجود تھی یہ کوئی کھائی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بہت بڑا گڑھا تھا۔ یہ تو ایک دراڑ تھی۔ ایک خوفناک دراڑ۔ اس دراڑ کی دیواریں بالکل عمودی تھیں۔ بلکہ عمودی سے بھی آگے کی چیز تھیں۔ دراڑ کا پھیلاؤ نیچے سے زیادہ اور اوپر سے کم تھا۔ اس طرح دراڑ کے بالائی حصے کی دونوں دیواروں کا زاویہ عمودی سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہاں سے اتر کر نیچے آنا کسی کے لئے آسان نہیں تھا۔ شانی اس پانی کو دیکھنے لگی جس میں گرنے سے اس کی جان بچی تھی۔ یہ بالکل مٹیالے رنگ کا پانی تھا یہ زمین کی کسی نامعلوم پرت سے نکل کر نامعلوم پرت کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی چوڑائی اندازاً پچاس پچپن فٹ رہی ہو گی۔ گہرائی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ کہیں سے گہرا اور کہیں سے اتھلا ہے۔

شانی نے کچھ عرصہ پہلے ایک میگزین دیکھا تھا۔ جس میں دنیا کی زمین دوز قدرتی سرنگوں اور غاروں کا احوال بیان کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایسے غار دنیا کے بیشتر حصوں میں موجود ہیں۔ خاص طور سے سطح مرتفع کے علاقوں میں۔ ایسے غار زمین میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں میٹر گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور نیچے جا کر شاخ در شاخ تقسیم ہوتے ہیں۔ یہاں باقاعدہ آبی گزرگاہیں موجود ہوتی ہیں۔ ایسے پانیوں میں آبی حیات پائی جاتی ہے اور ایسی مچھلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کی آنکھیں پیدائشی طور پر ناپید ہوتی ہیں۔ آنکھوں کی عدم موجودگی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ آبی مخلوق لاکھوں سال سے اندھیرے میں پیدا ہو کر اندھیرے میں مرتی رہی ہے۔

شانی کو اس مضمون میں پڑھی ہوئی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن اپنے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ ان پر غور نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں ابھی تک وہ دھند بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سرنگ میں پھٹنے والے کریکر کی عجیب بو تھی۔ یقیناً وہ کوئی ایسی گیس تھی جو

ذہن کو مختل کر کے بندے کو لاچار کر سکتی تھی...... اور شانی کو محسوس ہوا کہ اس بُو نے اتنی گہرائی میں بھی اس کا پیچھا چھوڑا نہیں ہے۔ شاید یہ عام ہوا سے بھاری تھی اور طویل سرنگ کے دہانے سے آنے والی ہوا نے اسے آہستہ آہستہ اس گہری دراڑ میں دھکیل دیا تھا۔

شانی کو یہ سب کچھ بیدار آنکھوں کے بھیانک خواب جیسا لگ رہا تھا۔ وہ تو مہناز کے ساتھ کمرے میں واپس جانے کے لئے مڑی تھی۔ پھر اچانک ہی یہ سب کچھ ہو گیا تھا وہ اس بیسیوں فٹ گہری دراڑ میں موجود تھی اور غالب امکان تھا کہ اس کے اردگرد ایک لاش یا شدید زخمی شخص بھی موجود ہے۔

بلندی سے آوازیں آرہی تھیں۔ پتا نہیں کیا صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ نیچے اُترنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے کوہ پیمائی کا سامان درکار تھا یا کم از کم کسی طویل مضبوط رسے کی ضرورت تھی۔ پچاس ساٹھ فٹ لمبا رسہ۔

بلندی سے رستم کی آواز آئی اور اسے یوں لگا کہ رگ رگ میں زندگی بخش توانائی بھر گئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بی بی! آپ ٹھیک ہیں ناں؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔''

''ہم نیچے آنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' شانی خاموش رہی۔ وہ پھر پکارا۔ ''آپ میری بات سن رہی ہیں ناں؟''

''سن رہی ہوں۔''

''آپ جہاں کھڑی ہیں وہاں سے بالکل نہ ہلیں۔ ہم نیچے آرہے ہیں۔''

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ پتا نہیں وہ لوگ اوپر کیا کر رہے تھے۔ مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ شانی کو اپنے پاؤں پر کچھ رینگتا محسوس ہوا۔ یہ غالباً کوئی مکڑی نما کیڑا تھا۔ شانی نے اسے چٹکی میں پکڑ کر دور پھینک دیا۔

کچھ دیر بعد شانی کو ایک شخص کے آثار دکھائی دیئے۔ وہ کسی رسے کے ذریعے نیچے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رسہ اس کے جسم سے بندھا ہوا تھا اور وہ قریباً ساٹھ فٹ کی بلندی پر ہوا میں جھول رہا تھا۔

شانی کا دل بے ساختہ دھڑکنے لگا۔ ''یااللہ خیر'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اسے نہیں پتا تھا کہ نیچے آنے والا کون ہے۔ بس اس کے دل میں ایک شک سا تھا۔

قریباً دس منٹ میں نیچے آنے والے نے بمشکل پندرہ بیس فٹ طے کئے لیکن پھر یہ ہوا کہ اس کے پاؤں دیوار پر ٹک گئے۔ اب وہ ہوا میں جھولنے کی بجائے عمودی دیوار پر قدم جما جما کر

نیچے آنے لگا۔ غالباً اس کی پشت پر ایک بیگ تھا جس میں ٹارچ روشن کر کے اس [illegible] تھی کہ اس کی تھوڑی بہت روشنی اطراف میں پھیل رہی تھی۔

''رستم سنبھل کر۔'' بلندی سے فرید کی ڈری ہوئی آواز آئی۔

اور شانی جان گئی کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ اس جان لیوا ڈھلوان پر نیچے اُترنے والا وہی ہے جو برسوں سے اس کی بے لوث محبت میں دکھ اٹھا رہا ہے۔

شانی کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد شانی نے دیکھا کہ رستم ایک مقام پر ٹھہر گیا ہے۔ وہ اپنی کمر سے رسہ کھول رہا تھا۔ ''رسہ کیوں کھول رہے ہو؟'' شانی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

رستم نے جواب نہیں دیا۔ شانی نے دوبارہ پوچھا۔ وہ پھر بھی نہیں بولا۔ تاہم شانی کو خود ہی اندازہ ہو گیا کہ رسے کی لمبائی بس اتنی ہی تھی۔

شانی کی بے چینی کئی گنا بڑھ گئی۔ تقریباً عمودی دیوار پر رستم کو بقایا پینتیس چالیس فٹ کا فاصلہ بغیر کسی سہارے کے طے کرنا تھا۔ ''رستم سنبھل کر۔'' وہ کرب کی انتہا کو چھو کر بولی۔

''بے فکر رہیں۔'' رستم کی ہانپتی ہوئی لیکن مضبوط آواز ابھری۔

وہ سنبھل سنبھل کر اُترتا رہا اور شانی اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتی رہی۔ شانی اور بلاول دوسرے زاویے سے گرے تھے۔ اگر خدانخواستہ رستم دیوار سے علیحدہ ہو کر گرتا تو نیچے تاریک سنگلاخ زمین تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ رستم کے اُترنے سے جو چھوٹے چھوٹے پتھر گر رہے تھے وہ پانی کے بجائے پتھریلی زمین پر گر رہے تھے۔

بالآخر مشکل ترین گھڑیاں گزر گئیں۔ رستم نے آخری چھ سات فٹ جست لگا کر طے کئے اور شانی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ رستم کا چہرہ ایک ڈھاٹا نما کپڑے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے پشت پر بندھے کینوس کے تھیلے میں سے ٹارچ نکالی اور اسے شانی کے سراپا پر دوڑایا۔ وہ اس کی جسمانی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ شانی بھی گرنے کے بعد پہلی بار اپنے سراپا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاؤں زخمی تھے۔ گھٹنے سے بھی شلوار خون آلود ہو رہی تھی۔ ہاتھوں کی دو تین انگلیوں کے ناخنوں سے بھی خون رِس رہا تھا۔

اب تک شانی جانے کیسے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک سنبھالنے والے کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سکت ختم ہو گئی۔ وہ جیسے تیورا کر سنگلاخ زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا سر کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔ اوپر سے ٹارچوں کی روشن لائنیں تہہ تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ان Light Beams کی حرکات کسی ڈسکو شو کے مناظر سے مشابہ تھیں لیکن یہ ڈسکو شو نہیں

تھا۔ یہ ایک سنگین ترین حادثے کے تشویشناک لمحات تھے۔

اوپر سے لالہ فرید بار بار استفسار کر رہا تھا۔ ''رستم پہنچ گئے ہو؟''

رستم نے اپنی سانسیں درست کیں اور پکارا۔ ''ہاں پہنچ گیا ہوں۔ میں بی بی کے پاس ہوں۔ بی بی ٹھیک ہیں۔''

''بلاول؟''

''وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔'' رستم نے ٹارچ کا دائرہ ادھر اُدھر پھینکتے ہوئے کہا...... ایک جگہ پر پتھر پر بہت سا خون دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ یقیناً یہ خون شدید زخمی بلاول کے سر یا بازو سے بہا تھا۔ رستم نے ٹارچ کے دائرے کو مزید حرکت دی تو اسے آبی گزرگاہوں کے عین کنارے پر ایک شکاری چاقو پڑا نظر آیا۔

شانی سمجھ گئی۔ یہ چاقو شانی کے ہاتھوں شدید چوٹ کھانے کے بعد بلاول کے ہاتھ سے گرا تھا۔ یقیناً یہی چاقو تھا جس کے دیوار پر رگڑ کھانے کی آواز شانی نے تاریکی میں سنی تھی۔

''نیچے گرنے کے بعد بلاول آپ کو نظر آیا؟'' رستم نے پوچھا۔

شانی نے چند لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''میں نے اسے اس رائفل سے چوٹ لگائی تھی۔ وہ پانی میں گرا اور آگے نکل گیا۔'' شانی نقاہت سے بولی۔

رستم بے قراری سے پانی کے اوپر ٹارچ کا روشن دائرہ دوڑانے لگا۔ طاقت ور ٹارچ کی روشنی کافی حد آگے تک جا رہی تھی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ وہ بچا ہوگا۔'' شانی نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

کھائی میں موجود اعصابی گیس کی بُو ابھی تک اس کے حواس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ غالباً اسی بُو سے بچنے کے لئے رستم نے ایک بڑے کپڑے سے اپنے سر اور چہرے کو لپیٹ رکھا تھا۔ اب شانی سے بات کرنے کے لئے اس نے یہ کپڑا چہرے سے ہٹایا تھا۔

ٹارچ کا روشن دائرہ حرکت کرتا ہوا شانی کے عقب میں گیا تو اس کا دل کانپ گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ملبے کا ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ شانی کو یوں لگا جیسے کافی مدت پہلے یہاں کسی نے پتھروں سے سیڑھیاں تعمیر کی تھیں۔ یہ سیڑھیاں پچیس تیس فٹ نیچے ایک دوسری کھائی تک جاتی تھیں۔ اس کھائی میں بھی پانی جمع تھا لیکن یہ ٹھہرا ہوا ایک گدلا پانی تھا۔ یہ

پتھریلی سیڑھیاں تقریباً مسمار ہو چکی تھیں۔ اب اگر کوئی تاریکی میں ان پر قدم رکھتا تو لڑھکتا ہوا پچیس تیس فٹ نیچے جا گرتا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا پانی سے نکلنے کے بعد زیادہ حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''بی بی! آپ کا دل شاید لیٹنے کو چاہ رہا ہے۔'' رستم نے اس کی نقاہت دیکھتے ہوئے کہا۔

شانی اثباتی انداز میں خاموش رہی۔

رستم نے اپنی پشت پر بندھا ہوا تھیلا کھولا۔ پھر تھیلے کی زپ کھولی اور اس میں دیگر سامان کے علاوہ ایک موٹی گرم چادر موجود تھی۔ رستم نے چادر کو دو تین بار تہہ کر کے بچھونے کی شکل دے دی۔ شانی بے دم سی تھی۔ چادر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے کپڑے نم تھے اور اسے سردی محسوس ہو رہی تھی لیکن یہاں کپڑے تھے اور نہ ان کپڑوں کو سکھانے کا کوئی وسیلہ تھا۔

رستم نے بیگ میں سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا۔ ''بی بی! اگر آپ کہیں تو میں یہ دوا آپ کے پاؤں پر لگا دوں؟''

''نہیں، میں خود لگا لیتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس نے ٹارچ کی روشنی میں زخمی پیروں کو پائیوڈین سے صاف کیا اور ان پر اینٹی بائیوٹک مرہم لگا دیا۔ گھٹنے پر بھی گہری خراشیں تھیں۔ یہاں سے شلوار کا کپڑا پھٹ گیا تھا۔ شانی نے گھٹنے پر بھی مرہم لگایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم سنسنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بڑی تیزی سے نیند آ رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر نیم دراز ہو گئی۔ سب سے زیادہ تکلیف اس کی گردن میں تھی۔ ذرا سا ہلنے پر بھی گردن سے ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ بلاول نے قریباً ایک گھنٹے تک مسلسل اس کی گردن کو اپنی بے رحم گرفت میں جکڑے رکھا تھا۔

شانی کے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اردگرد کے مناظر اور آوازیں اسے خود سے دور جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ رستم اس کے قریب موجود تھا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ گاہے بگاہے شانی کے اردگرد حرکت کرتا تھا۔ پھر شانی کو اندازہ ہوا کہ اوپر پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے کوئی بھاری بھر کم شے نیچے پھینکی گئی ہے۔ یہ شے دھپ کی زوردار آواز سے پتھریلی زمین پر گری رستم آگے جا کر اسے اٹھا لایا۔ دیکھنے میں یہ ایک بہت بڑا ''بستر بند'' نظر آتا تھا۔ رستم نے اسے کھولنا شروع کیا۔ روئی کے تین چار موٹے لحافوں کے اندر کچھ سامان لپیٹ کر پھینک دیا گیا تھا۔ اس میں دو ٹارچیں تھیں۔ ایک رائفل اور اس کی گولیاں تھیں۔ کھانے پینے کا کچھ

سامان تھا۔ ایک سویٹر تھا۔ ایک زنانہ اور ایک مردانہ جوڑا، اوڑھنی اور چپل وغیرہ تھے۔ یہ اشیاء دیکھ کر شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ جلدی یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ کم از کم آج کا دن تو نہیں۔

اس نے خمار آلود آواز میں رستم سے پوچھا۔ ''ہم کب باہر نکلیں گے؟''

''بی بی جی! اس میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔ شاید آج شام یا کل صبح تک۔''

''لیکن کیوں؟''

''یہاں سے نکلنے کے لئے ایک لمبا اور مضبوط رسہ چاہئے بلکہ شاید دو رسے اور فقط رسوں سے ہی کام نہیں چلے گا بی بی۔ فرید اور مراد وغیرہ کا خیال ہے کہ انہیں لوہے کی ایک چرخی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔ رسے تو شاید یہ لوگ خود یہیں پر تیار کر لیں۔ مگر لوہے یا لکڑی کی چرخی کا مسئلہ ہے......''

رستم بتا رہا تھا اور شانی کو یہ آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ غنودگی بڑھتی جا رہی تھی۔

''آپ..... آپ کپڑے بدلیں گی؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ سر ہلاتے ہوئے اس کی گردن میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ شروع میں گردن کی تکلیف زیادہ نہیں تھی لیکن اب گردن ہلانا دشوار ہو رہا تھا۔

رستم نے بڑی آہستگی سے ایک لحاف شانی پر ڈال دیا اور ایک کمبل کو تہہ کر کے تکیے کی طرح شانی کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ شانی کے گیلے کپڑے اس کے جسم کی حرارت سے ہی خشک ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ حالتِ نیند میں بھی اسے اپنی گردن کی تکلیف کا احساس ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ بلاول کے پستول کی مسلسل رگڑ سے سر پر جو گہری خراشیں آئی تھیں وہ جلن کا احساس پیدا کرتی رہیں۔ پھر اسے لگا کہ وہ گہری غنودگی میں کراہتے ہوئے، اپنی گردن کو سہلا رہی ہے۔ تب رستم کی دور افتادہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''بی بی جی! میں گردن پر دوا لگا دوں؟'' ہاں شاید یہی کہا تھا اس نے۔

شانی جواب میں خاموش رہی۔ یہ نیم رضامندی کا انداز تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنی گرم گردن پر مرہم کی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ یہ پٹھوں کے کھچاؤ کو دور کرنے والی کوئی VIX قسم کی دوا تھی۔ VIX کی تیز خوشبو شانی کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس نے اپنے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ رستم کی نرم انگلیاں دھیرے دھیرے اس کی گردن کو سہلا رہی ہیں۔ یہ عجیب و غریب احساس تھا۔ اس میں انتہا درجے کی راحت تھی لیکن ساتھ ساتھ شانی کے اندر کروٹ لیتا ہوا گریز بھی تھا۔ وہ رستم سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔ مگر

وہ کہہ نہیں سکی تھی یا شاید اس نے اتنے مدھم لہجے میں کہا تھا کہ یہ بات رستم کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔

اس کا ذہن ایک بار پھر نیند کی تاریکیوں میں اُتر گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر گہری غنودگی کی کیفیت میں لیٹی رہی۔ اس کے اردگرد تاریکی تھی۔ بس اس تاریکی میں ٹارچ کی روشنی نظر آتی تھی یا یہ احساس ہوتا تھا کہ دور اوپر دراڑ کے سرخ روشنیوں والے کنارے پر کچھ لوگ موجود ہیں اور گاہے بگاہے بلند آواز میں رستم سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جب وہ مخاطب ہوتے تھے تو ان کی آوازیں دیر تک دراڑ کے وسیع خلا میں گونجتی تھیں اور شانی کو ایک طلسماتی دنیا میں لے جاتی تھیں۔

غنودگی کی ہی کیفیت میں شانی کو ایسا لگا کہ وہ اس تاریک غار میں نہیں ہے۔ وہ کہیں اور ہے۔ اس کے کانوں میں ہزاروں مہتم مردوزن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ ایک زبان ہو کر گا رہے تھے۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو
من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا

غنودگی ہی کی کیفیت میں اس نے اپنے سامنے چمکتی دھوپ میں لہلہاتے سرکنڈے دیکھے۔ ان سرکنڈوں کے پیش منظر میں وہ ہزاروں مہتم قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کاہو کے خوش رنگ پھول تھے اور آنکھوں میں شانی کے لئے محبت تھی۔

پھر ایک نہایت خوفناک کرخت آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ کوئی خوفناک انداز میں چنگھاڑا تھا۔

شانی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے لگا اس کا پورا جسم لرز رہا ہے۔ چند فٹ کے فاصلے پر رستم اس کے سامنے موجود تھا اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا بی بی؟''

وہ خود بھی سوچنے لگی۔ کیا ہوا تھا۔

ایک عجیب سا خوف شانی کے سینے میں لہریں لینے لگا۔ ایک بے نام ڈر اس کے کشیدہ اعصاب کو جکڑتا چلا گیا۔ وہ بیدار تھی لیکن لگتا تھا کہ اس کا ذہن بیدار نہیں ہے۔ قرب و جوار نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ بلندی سے اُبھرنے والی آوازیں جیسے سینکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے سے زمانوں کا سفر طے کرنے کے بعد آ رہی تھیں۔۔۔ یہ کن کی آوازیں تھیں۔ یہ کون سا قبیلہ تھا؟ وہ خود تاریخ کے کس دور سے گزر رہی تھی؟

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ وہ اس سے چند فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے کے ایک حصے کو روشن کر رہی تھی۔ شانی نے جیسے سہارے کے لئے اس کا بازو تھام لیا۔ اس کا بازو مضبوطی سے تھامے تھامے اس نے اپنا سر کمبل سے بنے ہونے تکیے پر ٹکا دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر غنودگی کی ہلکی دھند میں اُترنے لگا۔ وہ کسی کی آواز پر ڈری تھی۔ وہ کون تھا؟ اس نے چلا کر کہا تھا۔ ''میں تجھے زندہ درگور کر دوں گا۔''

شاید وہ پیر قدرت اللہ تھا۔ اسی کی آواز میں ایسی گرج اور اتنی پُراسراریت ہو سکتی تھی۔ شانی کے لئے اتنی نفرت بھی شاید اسی کی آواز میں تھی۔ اس آواز کو یاد کر کے شانی کے جسم کی کپکپی بڑھ گئی۔ اس نے دُھندلائے ذہن کے ساتھ سوچا، یہ کیسی کپکپی ہے۔ خوف ہے، سردی ہے یا بخار ہے؟ ایک بار پھر مدہوشی کی کیفیت میں گم ہونے سے پہلے اسے بس اتنا یاد رہا کہ وہ پہلو کے بل لیٹی ہے اور اس کے ہاتھوں کی گرفت رستم کے بازو پر قائم ہے۔ نہ جانے اسی طرح وہ کب دوبارہ سو گئی۔ نیند کی حالت میں بھی اسے مسلسل کپکپی محسوس ہوتی رہی۔

نیند اور نیم بیداری کے یہ دورانیے وقفے وقفے سے آتے رہے۔ نیم بیداری یا غنودگی کے ایک ایسے ہی دورانیے میں اسے لگا کہ اسے آگ کا ایک الاؤ میسر آ گیا ہے۔۔ اس کے ہاتھوں میں رستم کا توانا بازو بدستور موجود تھا۔ وہ رستم کے بالکل قریب لیٹی ہوئی تھی۔ اس قدر قریب کہ اس کا چہرہ رستم کی گردن سے چھو رہا تھا۔ وہ رستم سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں سوچا۔ کیا وہ مر چکی ہے؟ کیا یہ دوسری دنیا ہے جہاں چوہدری فاخر یا چوہدری بشیر کے بجائے رستم سیال اس کا شریکِ سفر ٹھہرا ہے۔ کیا وہ واقعی رستم سیال ہے یا صرف ایک الاؤ ہے جو اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو حرارت پہنچا رہا ہے اور وہ اسے رستم سمجھ رہی ہے۔ وہ پوری طرح بیدار ہونا چاہتی تھی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنا چاہتی تھی۔ اگر وہ واقعی رستم سیال تھا اور وہ مری بھی نہیں تھی اور یہ دوسری دنیا بھی نہیں تھی، تو پھر اسے رستم سے دور ہٹ جانا چاہئے تھا۔ رستم اور اس کا میل ممکن نہیں تھا اور۔۔۔ وہ کسی اور کی امانت تھا۔۔۔

اس نے پوری طرح بیدار ہو کر اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں، آنکھوں اور پلکوں پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ غنودگی کی سنہری دھند چند لمحوں کے لئے چھٹتی محسوس ہوئی لیکن ایک بار پھر سی جانب سے گہرے سنہری، گاڑھے مرغولے امڈ امڈ کر آنے لگے۔ ان میں عجیب سا خمار تھا۔ شانی نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔۔۔۔ اگر وہ زندہ ہے تو شاید اسی خمار آلود دھوئیں کے زیرِ اثر ہے جو اس نے سرنگ میں محسوس کیا تھا۔ ہاں یہ ویسا ہی خمار ہے، یہ ویسی ہی بے خودی ہے۔ کتنا سکون ہے، کتنی راحت ہے، کاش حرکت کرتا ہوا وقت رک جائے، کاش کائنات کی گردش تھم جائے۔ وہ انہی سنہری مرغولوں میں کسی کا بازو تھامے، کسی کی گردن سے چہرہ لگائے ساکت پڑی رہے۔ کوئی اسی طرح اس کے قریب رہے، اتنا قریب کہ سر سے پاؤں تک اس کے پُرحرارت جسم کا لمس محسوس ہوتا رہے۔ اس نے بازو پر گرفت مضبوط کی اور الاؤ کے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

☆=======☆======☆

رستم، شانی کے قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے حواس خمسہ پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ پچھلے 20 گھنٹے کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے شانی اور بلاول احمد کے دراڑ میں گر جانے کے آٹھ دس منٹ بعد رستم نے شانی کی آواز سنی تھی اور اس کے بعد اس کے لئے ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کنارے پر موجود رہتا۔ فرید، حسنے اور گوہرا وغیرہ نے اسے بہت منع کیا تھا۔ تھوڑے سے صبر کے مشورے دیئے تھے لیکن وہ یہ مشورے قبول نہیں کر سکا تھا اور پھر ایک نہایت کٹھن اور پُرخطر کوشش کے بعد دراڑ میں اُتر کر شانی تک پہنچ گیا تھا۔۔۔

یہاں پہنچنے کے بعد جو واقعات رُونما ہوئے تھے وہ بھی ایک اُنہونے سپنے کی طرح تھے اور اب۔۔۔۔ اب شانی اس کے قریب موجود تھی۔ اتنی قریب کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ اس کی ساری حسیات جیسے اونگھ رہی تھیں۔ اس میں کچھ دخل غالباً اس ایک فٹ لمبے سرخ شیل کا بھی تھا جو رستم کے منع کرنے کے باوجود فرید نے سرنگ میں پھینکوا دیا تھا۔ یہ اعصاب شکن گیس کا شیل تھا یہ خاص قسم کی گیس صحت کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے بغیر دل و دماغ پر نشہ آور دوا کی طرح اثر کرتی تھی۔

شانی پچھلے کم از کم دو گھنٹے سے ہلکے بخار کی کیفیت میں بھی تھی۔ اسے کپکپی محسوس ہو رہی تھی۔۔ اسی کیفیت میں اس نے رستم کا بازو تھاما تھا اور اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔ اب وہ رستم کے پہلو میں اس طرح موجود تھی کہ اس کا تپا ہوا چہرہ رستم کی گردن سے پیوست تھا اور وہ خود

بھی۔

یہ عجیب ہیجان تھا، یہ عجیب لمس تھا۔ رستم کے لئے باہوش وحواس یہ سب کچھ جھیلنا بے حد مشکل تھا۔ اس کی حالت اس شخص جیسی تھی جو چند گھونٹ پانی کے لئے ترس رہا ہو اور اسے ایک عظیم الشان لہریں مارتے دریا کے روبرو کھڑا کر دیا جائے یا تاریک قید خانے میں موم شمع کی ایک کرن کے لئے تڑپنے والے کو ٹھاٹیں مارتی دھوپ کے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ وہ اتنی روشنی، ایسی پُرشکوہ تجلی جھیلتے ہوئے سرتاپا لرز رہا تھا۔ وہ اس کے قریب تھی۔ اس کی سانس جس کی مہک پر وہ دنیا بھر کی خوشبوئیں وار سکتا تھا، اس کے سینے سے چُھو رہی تھی۔ اس کے جسم پر پھیل رہی تھی اور اس کا لمس جو اس کے لئے کائنات کی حسین ترین شے تھا، اسے ان طلسماتی گھڑیوں میں میسر تھا۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ ایک قاتل بھی تھا۔ لوگ کہتے تھے اس کے سینے میں پتھر کا دل ہے۔ وہ موت کا مقابلہ ہی نہیں کرتا اس کا پیچھا بھی کرتا تھا لیکن آج وہ ڈر رہا تھا۔ رعبِ جلوہ، پندارِ حسن اس کو لرزہ براندام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ تھیں، اس کا سینہ شق تھا۔ وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ وہ دیوی تھی اور اس کی بانہوں میں تھی۔

''بی بی جی۔'' وہ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ وہ بدستور اس کی بانہوں میں رہی۔ بس اس کے ہونٹوں نے اس کی گردن پر حرکت کی۔ شاید غنودگی میں اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

ہونٹوں کی یہ حرکت رستم کی گردن نے محسوس کی لیکن اس کا اثر اس کے دل اور روح کی اتھاہ گہرائیوں تک گیا۔

وہ کچھ اور بھی اس کے ساتھ پیوست ہوئی۔ اس کے نم بال رستم کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا انگارہ بدن رستم کے ہر گریز کو راکھ کر رہا تھا۔ بڑی محبت.... بڑی نرمی اور دل گداز وارفتگی سے رستم نے دیوی کے نم بالوں کو چوم لیا ایک بار...... دوبار۔ پھر اس کی پیشانی کو، پھر اس کے رخسار کو، پھر دیوی کے آتشیں ہونٹوں کو، پھر گردن کو۔ وہ جیسے چوم نہیں رہا تھا پرستش کر رہا تھا۔ خراجِ بندگی ادا کر رہا تھا۔ چومنے کے لئے رونا ضروری نہیں ہوتا لیکن پرستش اور بندگی کو اشکوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور وہ اشک بار تھا۔ وہ اس کے جسم کو چومنے لگا، ایک نازک گلاب کی طرح اس نے دیوی کو اپنی بانہوں میں لیا اور اس احتیاط کے ساتھ اپنے سینے سے لگایا کہ گلاب کی کوئی پنکھڑی بھی دبنے یا مڑنے نہ پائے۔ ہاں یہ محبت تھی اور پرستش تھی اور دیوانگی تھی۔

... وہ گہری غنودگی میں تھی اور عجیب کیفیت میں تھی۔ جیسے کچھ بھی سمجھ نہ پا رہی ہو۔ اس کی زندگی میں تو بس ایک روندنے اور بھنبھوڑنے والا مرد آیا تھا۔ جو اس کے کومل جسم پر اپنی وحشت کے نشان چھوڑتا تھا، اسے توڑتا موڑتا تھا اور نڈھال کر کے چھوڑ جاتا تھا۔ اول اسے چوہدری فاخر کہتے تھے۔

رستم دیوی سے پیار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ کوئی سپنا ہے، جادو ہے؟ یا صرف فریب احساس اور واہمۂ نظر۔

ایک دم وہ کانپ گیا۔ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک دہل گیا۔ دیوی مکمل ہوش میں نہیں تھی لیکن اس کا اپنا ذہن تو برا بھلا کام کر رہا تھا۔ بے شک وہ پرستش کر رہا تھا لیکن کہاں پرستش ختم ہوگی، کہاں بے ادبی شروع ہو جائے گی۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ پرستش کی حد سے آگے چلا جاتا تو پرستش بدترین جرم بن جاتی۔ پھر اس جرم کی پاداش میں اسے بار بار زندہ کر کے مارا جاتا تو یہ بھی کم ہوتا۔ وہ ایسے جرم کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو دیوی کی پیشانی پر ایک شکن کا متحمل نہیں تھا۔ وہ یکایک پیچھے ہٹ گیا۔ پنجاب کے نامور ڈکیت کا دل خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ پرستش کے آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی ریشمی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ بڑی ٹارچ کی پھیلی ہوئی روشنی میں وہ روبرو تھی۔ لحاف اس کے بدن سے تھوڑا سا سرک گیا تھا۔ وہ سراپا حسن اور دلکشی۔ وہ پنجاب کا عطر تھی۔ گجرات کی سوہنی، تخت ہزارے کی ہیر، سوہنے پنڈ کی صاحباں اس کے وجود میں یکجا ہو گئی تھیں۔ ان لمحوں میں رستم کو لگا کہ اس کے جسم کے ہر پیچ و خم پر ہیر اور مرزا صاحباں جیسی ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

وہ دوزانو بیٹھا رہا۔ ایک عابد کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ اس کا پریشان ذہن سوچتا رہا کہیں پرستش نے بے ادبی کی حد کو چُھو تو نہیں لیا... اور اگر ایسا ہوا ہے اور مکمل ہوش میں آنے کے بعد دیوی نے اس بارے میں ناراضی ظاہر کی تو وہ اس ناراضی کو کیسے جھیل پائے گا۔ اس نے لحاف پھر سے شانی کے اوپر سرکا دیا ان لمحوں میں وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس صورتِ حال پر خود بھی حیران ہو۔

رستم ننگے پاؤں فرش پر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کا سر شانی کے پاؤں کی طرف آ گیا۔ جس طرح نازک آبگینوں کو تھاما جاتا ہے، ایسے ہی رستم نے شانی کے دونوں پاؤں تھامے اور ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ہونٹ جو آنسوؤں سے تر تھے۔

''بی بی، اگر غلطی ہوئی ہے تو معاف کر دینا۔'' اس نے خودکلامی کے انداز میں [illegible] پھر

عجیب کیفیت کے زیرِ اثر اونگھنے لگا۔

نہ جانے وہ کب تک سویا رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس کا سر بی بی کے پاؤں پر نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ٹارچ کی روشنی بے حد مدھم ہو چکی تھی۔ اس نے دوسری ٹارچ جلائی۔ کلائی کی گھڑی دیکھی۔ رات گزر چکی تھی۔ نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا بی بی ایک طرف کمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے۔

کتنی ہی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ رستم کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بات کرتا۔ رات کے مناظر نگاہوں کے سامنے تھے۔ ذہن چکرا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی کہ بی بی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے لیکن نہیں دیکھ سکا۔ بی بی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ خاموشی گھمبیر ہوتی چلی گئی۔ آخر بی بی کی آواز نے ہی خاموشی توڑی۔ ''تم نے کہا تھا کہ صبح تک ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ صبح ہو چکی ہے۔''

''لل...... لیکن ابھی سورج نہیں نکلا بی بی۔ میرا اندازہ ہے کہ اگلے ایک دو گھنٹے میں ہمیں نکال لیا جائے گا۔''

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ نہایت بوجھل اور بے ڈھنگی خاموشی، رستم نے ہمت کر کے کہا۔ ''بی بی، آپ کا... بخار کیسا ہے اب؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور آپ کی گردن کا درد؟''

''وہ بھی پہلے سے بہتر ہے۔''

''بی بی! آپ کچھ کھائیں گی؟ کھانا موجود ہے۔''

''نہیں۔''

''اور دوا؟''

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

ایک بار پھر بے ڈھنگی خاموشی۔ اس خاموشی میں بس پانی بہنے کی آواز تھی اور بہت اوپر بلندی سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ دراڑ کے کنارے پر چرخی وغیرہ نصب کی جا رہی ہے۔

خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔ رستم نے ہمت جمع کر کے کہا۔ ''بی بی... آپ... ناراض ہیں؟''

اس سوال کا جواب چند سیکنڈ بعد آیا۔ ''نہیں۔'' یہ جواب بھی پہلے جوابوں کی طرح

بہت مختصر تھا۔ تاہم بی بی کے انداز سے عیاں تھا کہ یہ جواب بیتی ہوئی رات کے تسلسل میں ہے۔

شانی اپنی جگہ سے لنگڑاتی ہوئی اٹھی اور کینوس کے بیگ سے خود ہی فرسٹ ایڈ بیگ نکال لیا۔ پہلے اس نے اپنی گردن پر VIX لگائی۔ پھر پاؤں اور گھٹنے پر دوا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ رستم کے ذہن میں ابھی تک تجسس تھا کہ بلاول کہاں گیا؟ وہ اسے زندہ یا مُردہ حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ٹارچ لی اور آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

ایک آٹومیٹک رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ ابھی وہ دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ اسے بھورے پتھروں پر ایک سیاہ رنگ کی چیز پڑی نظر آئی۔ یہ ایک پستول تھا۔ رستم نے پستول اٹھا لیا۔ یقیناً یہ بلاول کے ہاتھ سے گرا تھا۔ اس میں پانچ گولیاں موجود تھیں۔ ایک گولی اس بدبخت نے سرنگ میں چلائی تھی۔ رستم نے یہ پستول قمیص کے نیچے لگا لیا۔ وہ دس پندرہ قدم مزید چلا۔ آگے جا کر کھائی ایک دم تنگ ہو گئی تھی۔ یہاں پانی میں چھوٹے بڑے پتھر بھی پڑے تھے۔ بہتے پانی کی مسلسل رگڑ سے یہ گول یا نیم گول ہو چلے تھے۔ اچانک رستم کی ٹارچ کا روشن دائرہ ایک جسم پر پڑا۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ یہ بلاول کی لاش تھی۔ لاش اوندھی پڑی تھی اور دو پتھروں کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قریباً 24 گھنٹے پہلے ہی مر چکا ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں رستم نے دیکھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے تقریباً اکھڑ چکا تھا۔ سر پر سامنے کی طرف سے ایک گہرا مہلک زخم تھا۔ یہ زخم کسی بھی شخص کی جان لینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے علاوہ بلاول کے بائیں رخسار پر بھی چوٹ کا گہرا نشان دکھائی دیا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ نشان شانی کی رائفل [illegible] سے لگائی گئی چوٹ کا ہے۔

بلاول کی صورت دیکھ کر رستم کا خون کھولنے لگا۔ اس کے کانوں [illegible] لگے۔ غیظ و غضب کی ایک ایسی بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی کہ اسے خود کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا۔ بلاول لاش کی شکل اختیار کر چکا تھا اور لاش قابلِ احترام ہوتی ہے لیکن وہ اس لاش کا احترام نہیں کر سکا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ دفعہ ٹریگر دبایا اور بلاول کی کھوپڑی اور چہرہ اُڑا کر رکھ دیا۔ دراڑ کے خلا میں رائفل کے دھماکے اتنی شدت سے گونجے کہ کہرام مچ گیا۔ کسی نامعلوم جگہ سے کچھ چمگادڑیں اڑیں اور پر پھڑپھڑاتی مزید تاریکی میں گھس گئیں۔

شانی کے چلانے کی آواز رستم کو صاف سنائی دی۔ ''کیا ہوا رستم، کون ہے یہاں؟''

رستم نے بلاول کے مسخ چہرے پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈالی اور اپنے لہجے کو سنبھال کر بولا۔ ''کوئی نہیں بی بی۔''

''گولی کیوں چلائی؟''

''یونہی شک ہوا تھا جی ..... کوئی نہیں ہے۔''

اسی دوران میں اوپر سے بھی پُرتشویش آوازیں سنائی دینے لگی۔ حسنے گجراتی کی گھبرائی ہوئی آواز رستم کے کانوں تک پہنچی۔ ''رستم بھائی کیا پھڈا ہوگیا ہے، فائر کیوں کئے؟''

رستم نے منہ اوپر اٹھایا۔ دونوں ہاتھوں کا بھونپو سا بنا کر زور سے بولا۔ ''کچھ نہیں ہے یار..... بس شک ہوا تھا۔ سب ٹھیک ہے۔''

''جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'' حسنے نے پکار کر کہا۔

''نہیں بول رہا جھوٹ۔'' رستم قدرے بےزاری سے بولا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بی بی ٹارچ پکڑ کر اِدھر آئیں اور بلاول کی بگڑی ہوئی خوفناک شکل دیکھیں۔ وہ بلاول پر آخری نظر ڈال کر واپس مڑا اور بی بی کی طرف آ گیا۔

''کیا دیکھا تھا تم نے؟'' بی بی نے اس کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر پوچھا۔

''مجھے لگا تھا کہ اندھیرے میں کوئی ہلا ہے۔ تھوڑا سا کھڑکا بھی ہوا تھا۔''

شانی نے مزید دو تین سوال کئے۔ پتا نہیں کہ وہ رستم کے جوابوں سے پوری طرح مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن چپ ضرور ہوگئی۔

کچھ دیر بعد فرید کی بھاری آواز اس دراڑ کے وسیع خلا میں گونجی۔ ''رستم، اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ میں نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

رستم نے کہا۔ ''کہا ہے ناں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم نیچے نہ آؤ ابھی کتنی دیر لگے گی؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔ ہم نے چرخی تیار کرلی ہے۔ بس جلدی یہ رسہ نیچے پھینکیں گے۔'' پھر اس نے ذرا توقف کیا اور پوچھا۔ ''کیا بی بی، اکیلی اوپر آسکتی ہیں میرا مطلب ہے زخمی تو نہیں؟''

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

رستم نے فرید سے پوچھا۔ ''کیا رسے سے باندھنا ہے؟''

''نہیں۔'' فرید نے نفی میں جواب دیا۔ ''ہم نے جھولے کی طرح بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تم رسہ پھینکو گے تو دیکھ لیں گے کیا کرنا ہے۔''

جواب میں فرید نے پھر کچھ کہا لیکن زیادہ گونج کے سبب بات سمجھ میں نہیں آئی۔

رستم نے کن انکھیوں سے بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ مسمار سیڑھیوں کے قریب کسی تصویر کی طرح بیٹھی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی بی بی اور سیڑھیوں کو ایک جادوئی ٹچ دے رہی تھی۔ ایسی تصویریں رستم نے کیلنڈروں اور انگریزی رسالوں میں دیکھی تھیں۔ وہ جیسے ساکت بیٹھی ان سیڑھیوں کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔ یہ کب اور کس نے بنائی تھیں... ؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس گہری تاریک دراڑ میں انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی کچھ اور چیزیں بھی موجود تھیں.....؟

اچانک رستم نے شانی کو بری طرح چونکتے اور سیڑھیوں سے پیچھے ہٹتے دیکھا۔ وہ نہ صرف ہٹ گئیں بلکہ کھڑی بھی ہوگئیں۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ نظر آئیں۔

''کیا ہوا بی بی؟'' رستم نے بی بی سے فاصلہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... وہ..... میں۔'' بی بی ہکلا کر رہ گئیں۔

رستم نے ٹارچ کی روشنی شانی کے اردگرد پھینکی۔ اسے بھی بظاہر کوئی شے نظر نہیں آئی۔ بی بی سیڑھیوں سے ہٹ کر کھردری سیاہ دیوار کے پاس آگئیں اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے گردن کے گرد بام لگا کر ایک گرم کپڑا باندھ رکھا تھا۔

رستم ابھی تک الجھن میں تھا۔ پھر وہ بھی گہری سانس لے کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ یہاں کئی قسم کے حشرات الارض بھی موجود تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ بی بی کسی کیڑے وغیرہ سے ڈری ہیں اور اب اپنا ''فطری نسوانی خوف'' چھپانے کے لئے چپ ہوگئی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اوپر سرخ روشنیوں والے کنارے پر ہلچل میں اضافہ ہوگیا۔ پھر اسے وہ شے نظر آئی جس کا وہ اور بی بی (خاص طور سے بی بی) بڑی شدت سے انتظار کررہے تھے۔ یہ ایک رسہ تھا۔ جو کنارے سے دراڑ میں لٹکایا گیا تھا اور اب آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔

رستم نے سامان وغیرہ سمیٹنا شروع کردیا۔ بی بی اس کی مدد کررہی تھیں۔ وہ انہیں روکنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کے ہونٹوں پر تالا سا لگ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ طویل رسہ تاریک خلا میں لہراتا ہوا تہہ تک پہنچ گیا۔ یہ دراصل دو رسے تھے۔ یوں تو یہ ایک رسہ ہی دو بندوں کا وزن اٹھانے کے لئے کافی تھا۔ تاہم مزید احتیاط کے طور پر دوسرا رسہ بھی ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ رسوں کے نچلے سرے پر ایک حلقہ سا بنایا گیا تھا۔ اس حلقے میں ایک کشن باندھ کر

بیٹھنے کے لئے جگہ بنادی گئی تھی۔

پہلے اس طویل رسے کے ذریعے بی بی کو اوپر پہنچایا گیا۔اس کے بعد رستم نے کھوہ میں موجود سامان کو رسے سے منسلک کر کے اوپر بھیجا۔ بی بی اوپر جاچکی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بلاول کی مسخ لاش کے پاس پہنچا۔ کچھ سیاہ چوہے اس کے اردگرد موجود تھے۔ رستم نے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی۔تھوڑی سی نقدی،فون انڈکس اور چند کاغذات برآمد ہوئے۔ رستم نے یہ اشیاء رکھ لیں۔ بلاول پولیس کے ایک مخبر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔اس کے لباس سے برآمد ہونے والی اشیاء سے اس کے کردار پر روشنی پڑ سکتی تھی۔

بلاول نے سرنگ میں بی بی پر پستول تاننے کے بعد انہیں غلیظ گالیاں دی تھیں۔اس کی پاداش میں رستم نے اس کی کھوپڑی ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالی تھی۔اب وہ اس گہری تاریک قبر کے گدلے پانی میں سیاہی مائل چوہوں کی خوراک بننے کے لئے موجود تھا۔رستم نے اس پر آخری نفرت بھری نگاہ ڈالی اور رسے کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

اب وہ ایک بار پھر تاریک قبر سے باہر روشن دنیا میں تھے۔ یہاں پھوٹھوہار کے رنگ برنگے ٹیلوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔اوپر گہرا نیلا آسمان تھا اور پرندوں کی قطاریں تھیں۔ رستم قریباً 32 گھنٹے اس گھٹاٹوپ تاریکی میں رہا تھا۔اس لئے اس کی آنکھیں روشنی میں کھلنے سے انکار کرنے لگی تھیں۔

قریباً سارا ڈیرہ تین نمبر سرنگ میں انہیں دیکھنے کے لئے موجود تھا۔سب سے پہلے مہناز نے آگے بڑھ کر شانی کو گلے سے لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔ پھر فرید، حسنا اور گوہرا وغیرہ رستم سے بغل گیر ہوئے۔ پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے گرنے کے بعد شانی کو صرف چند ضربیں آئی تھیں۔ وہ گہرے پانی میں گری تھی۔گرا تو بلاول بھی پانی میں تھا لیکن اس سے پہلے اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اور بُری طرح گھائل ہوا تھا۔

شانی اور رستم کو چھجے کے آرام دہ کمروں میں لے جایا گیا۔ڈاکٹر ناصر نے فوری طور پر شانی کو طبی امداد دی اور انفیکشن ٹیٹنیس کے ٹیکے لگائے۔فرید نے شکرانے کے طور پر دو بڑی دیگوں میں میٹھے چاول پکانے کی ہدایت کی۔

بلاول اور اس کے کردار کے بارے میں گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ رستم کو معلوم ہوا کہ بلاول کی نقل و حرکت پچھلے دو دن سے مشکوک تھی۔ رات کو اس نے تالا توڑا اور اس حجرے میں گھس گیا جہاں لالہ فرید اور سابقہ سردار نادر کاکا کی ذاتی اشیاء موجود تھیں۔ یہاں ایک

الماری میں کرنسی، وائرلیس سیٹ اور ذاتی نوعیت کے کاغذات موجود تھے۔ بلاول اس الماری میں ہاتھ مار رہا تھا جب مراد گروپ کے شوکت بھائی نے اسے دیکھ لیا۔اس سے پہلے کہ وہ شور مچا سکتا بلاول نے درندگی سے حملہ کر کے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ اسی دوران میں حسنا گروپ کا میاں سعید چونک کر اندر گیا۔ بلاول نے اس کے پیٹ میں شکاری چاقو مارا اور اسے بھی شدید گھائل کر دیا۔

میاں سعید نے زخمی ہو کر بھی اپنی رائفل سے فائر کر دیا۔فائر کی آواز نے سب کو چوکنا کر دیا اور بلاول گھبرا کر چھجے کے تیسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہاں سے اس نے اچانک حملہ کر کے شانی کو دبوچا۔

یہ ساری تفصیل رستم کو حسنا گجراتی اور گوہرا سے معلوم ہوئی۔ اچانک گوہرا نے چونکتے ہوئے کہا۔''لالے دی جان! کچھ پتا ہے دلاور اور کھیا دراج واپس پہنچ گئے ہیں۔''

''یہ تو اہم خبر ہے تم نے پہلے کیوں نہیں سنائی۔ کیسا رہا ہے معاملہ؟''

''ایک دم ٹچن ٹاچ۔ دونوں باتیں مان لی گئی ہیں۔ مال بھی پہنچ گیا ہے یہاں۔''

''لیکن یہ سب دھوکے کا کھیل تھا۔اب نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔''حسنے نے کہا۔ حسنا بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پولیس اور بلی ماروں نے ڈبل کراس کیا تھا۔ اپنے بندے چھڑانے کے ساتھ ساتھ ڈیرے کے دفاع میں نقب لگانے کی زہریلی کوشش بھی کی تھی اور رستم جانتا تھا اس کا ماسٹر مائنڈ کون ہوگا۔ بہرحال وہ حسنا کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتا تھا۔ جب تک اس بارے میں بی بی کا خیال اسے معلوم نہ ہو جاتا وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور نہ کسی کو کہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ بولا۔''ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا ٹھیک نہیں حسنے۔''

''کیوں ٹھیک نہیں رستم بھائی؟''مراد کا ایک بندہ تیزی سے بولا۔''یہ کھلی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ہمیں دشمن کو کسی طرح کی رعایت نہیں دینی۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ہی دھوکا نہیں کیا بی بی اور سردار دراج وغیرہ کے ساتھ بھی کیا ہے اور یہ دھوکا کرنے والا وہی زہریلا سانپ ہے جسے لوگ ریاض ہٹلر کہتے ہیں۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اب یہ لوگ ہمیں زیادہ مہلت نہیں دیں گے۔ بہت جلد یہاں ایک بہت بڑا آپریشن ہوگا جس میں بارود بارش کی طرح برسایا جائے گا اور ہمیں ان ٹیلوں میں بھگا بھگا کر کتوں کی موت مارا جائے گا اور جب ہم نے مرنا ہی ہے تو پھر ہم بھی ان سے کسی طرح کی رعایت کیوں کریں۔''

مراد کا ایک اور ساتھی بولا۔''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے وڑی کہ اپن کو اپنا چھوٹے

سے چھوٹا پتا بھی ہاتھ میں رکھنا چاہیے۔''

مراد کا ایک دوسرا ساتھی اپنے ساتھی کی مخالفت میں بولا۔'' بکواس نہ کر دوڑی اس طرح کا پھیسلہ کرنا اپن کا کام نہیں ہے۔ لالہ فرید جانے اور اس کا کام۔''

''اوئے، تمیز سے بولنے کا ہے۔ بکواس کس کو کہہ رہا ہے؟''

''اپنا مغز گھوم گیا تو اور بھی بہت کچھ بولے گا۔ جاؤ پھوٹو یہاں سے۔''

دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر پہلے والے کو دھکا دینا چاہا لیکن رستم درمیان میں آ گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ دوسرے شخص کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ وہ منہ میں بڑبڑایا لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ رستم سے کچھ کہہ سکتا۔

بہرحال تھپڑ کا رزلٹ آدھ پون گھنٹے بعد سامنے آ گیا۔ گوہرا نے آ کر رستم کو بتایا۔

''لالے دی جان! مراد بڑے غصے میں ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے الٹا ہو رہا ہے۔ قاصدوں کے بھیس میں پولیس کے ٹاؤٹ یہاں پہنچ رہے ہیں اور ان کے کہنے پر چوہدری اور اس کے بیٹے کو پھوکٹ میں چھوڑا جا رہا ہے۔ چوہدری کے وارث ایک کروڑ بھی آرام سے دے سکتے تھے۔''

''اس سے کہنا جا کر چوہدری کو پھر اغوا کرلائے۔ ایک کی بجائے دو کروڑ لے لے۔'' رستم نے تپ کر کہا۔

ترچھی آنکھ والے کاٹھیا نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ''اس کی زبان چاقو کی طرح تیز ہے۔ بولتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ ابھی کہہ رہا تھا کسی کی نیت اس کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ کیا پتا بلاول کے ساتھ آنے والوں میں سے بھی کوئی مخبر ہو۔''

رستم کی آنکھیں ایک دم جل اٹھیں۔ گوہرا کا رنگ اُڑ گیا۔ اسے شاید اگلے ڈیرے پر اپنی پٹائی یاد آ گئی تھی۔ کاٹھیا کے منہ سے بھی ایسی بات نکلی تھی جو رستم کو خوفناک حد تک مشتعل کر سکتی تھی۔ اور حقیقت یہی تھی کہ رستم مشتعل ہو چکا تھا۔ مراد کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما اور وہ ایک آتشیں بگولے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پورا جسم تن گیا تھا۔

ہاں یہی شخص تھا جس کے بارے میں ایک بڑے پولیس افسر نے کہا تھا۔ ''یہ شخص خالی ہاتھ بھی بندے کو مار دینے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔'' رستم کا انداز دیکھ کر گوہرا کا ایک ساتھی بجلی کی طرح باہر نکل گیا۔ اس نے قریبی کمرے میں جا کر لالہ فرید کو اطلاع دی۔ لالہ فرید بھی ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر رستم کے پاس پہنچ گیا۔ رستم اس وقت دروازے سے نکل چکا تھا۔ فرید نے اسے بانہوں میں لیا اور پورے زور سے دھکیل کر واپس کمرے میں لے گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اگلے تین چار منٹ میں بند کمرے کے اندر دو پرانے دوستوں میں شدید تکرار بلکہ زور آزمائی ہوتی رہی۔ فرید، رستم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ مراد کی طرف جائے اور ڈیرے پر ابتری پھیلے۔ جس قسم کے حالات یہاں پیدا ہو چکے تھے ان سے نمٹنے کے لئے انہیں مکمل اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت تھی۔ جلد ہی رستم بھی اپنے طیش کو لگام دینے میں کامیاب رہا۔ ویسے بھی وہ بی بی کی موجودگی میں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

فرید نے کہا۔ ''ہمیں اس مسئلے کا حل مل بیٹھ کر سوچنا ہے اور اپنے ہر ساتھی کی بات سننی ہے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے بی بی کی حالت ایسی نہیں کہ وہ ابھی سفر کر سکیں۔ انہیں کم از کم چار پانچ روز آرام کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر ناصر کا کہنا ہے کہ ان کی گردن میں کافی تکلیف ہے۔''

''لیکن فرید! تم مرادے کو سمجھا دو۔ اگر وہ اب اس طرح کی بات کرے گا تو میں چپ نہیں رہوں گا۔''

فرید نے یقین دہانی کرائی۔ رستم، فرید، حسنا اور گوہرا وغیرہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ چائے کا دور چلا اور رستم نے اپنے ساتھیوں کو دراڑ میں پیش آنے والے سارے حالات سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ تاہم بی بی کی ہدایت پر اس نے یہ نہیں بتایا کہ دراڑ میں بلاول کو آخری چوٹ بی بی نے لگائی تھی۔ اس نے کہا۔ ''لگتا یہی ہے کہ وہ بدبخت نیچے گرتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکرایا اور پانی میں پہنچتے ہی ڈوب گیا۔ میں نے پانی میں آگے تک جا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا کھوج نہیں ملا۔''

فرید نے رستم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور وہ فائرنگ؟''

رستم نے طویل سانس لی۔ ''وہ سیاہ رنگ کے موٹے چوہے تھے جیسے کبھی کبھی سرنگ میں بھی ملتے ہیں۔ مجھے اندھیرے میں لگا کہ شاید کوئی آ رہا ہے۔''

فرید چند لمحے رستم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر موضوع بدل کر بولا۔ ''بی بی سے آئندہ کے بارے میں بات ہوئی ہے؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔''

فرید نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ پولیس ہمارے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے اور ممکن ہے کہ چوہدری اور اس کے بیٹے کے چلے جانے کے بعد یہ کارروائی اور یقینی ہو جائے۔''

"لیکن اس کی بھی تو کوئی ضمانت نہیں کہ وہ یہاں رہیں گے تو کارروائی نہیں ہوگی۔" رستم نے کہا۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔" فرید نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

رستم نے اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیچھے کی طرف گرایا۔ اس کی عقابی آنکھیں کھڑکی سے باہر پوٹھوہار کے ٹیلوں اور ان پر چمکتی ہوئی دھوپ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "مجھے نہیں لگتا فرید! پولیس اور ایجنسیاں اتنی جلدی یہاں گھسنے کا فیصلہ کریں گی۔"

چاروں دوست اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ اس دوران میں حنیفاں ایک بڑی گول ٹرے میں مہک دیتے ہوئے میٹھے چاول لے کر آ گئی۔ فرید اٹھتے ہوئے بولا "تم لوگ کھاؤ۔ میں مراد کی طرف جا رہا ہوں۔"

اس نے دو تین پلیٹیں ایک چھوٹی ٹرے میں رکھیں اور لے کر مراد کی طرف چلا گیا۔

شام سے کچھ دیر پہلے رستم اپنے کمرے میں پہنچا۔ خوبرو نادیہ ڈاکٹر ناصر کے کلینک سے واپس آ چکی تھی۔ واپس آنے کے بعد اس نے کمرے کی کئی چیزوں کو ادھر سے اُدھر کیا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی لیکن رستم کو یہ سب بہت بُرا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ نادیہ کو بُری طرح جھڑک دے لیکن پھر اس نے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ اس میں بھلا نادیہ کا کیا قصور تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کمرے کو کس نے سنوارا تھا اور یہ سنوارنا رستم کے لئے کتنا اہم تھا۔

چار دن پہلے رستم کو مہناز کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ صبح سویرے شانی بی بی اس کے کمرے میں گئی تھیں اور شاید کچھ دیر وہاں رہی تھیں۔ رستم کے بس میں ہوتا تو اس کمرے کو تا قیامت اسی حالت میں رہنے دیتا۔ ہاں وہ دیوانہ تھا اس کی انوکھی محبت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

اس نے کپڑے بدلے۔ یہ کپڑے بھی اب اس کے لئے بے حد...... بے حد اہمیت کے حامل ہو چکے تھے۔ صرف وہی جانتا تھا کہ کیوں؟ یہ کپڑے "دیوی" کے کپڑوں سے مس ہوئے تھے۔ اس کے جسم سے چھوئے تھے۔ وہ ان کپڑوں کو ہمیشہ ایسے ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے لباس بدلا اور پہلے کپڑے ایک بڑے شاپر میں بڑی احتیاط سے الماری میں مقفل کر دیئے۔

ایک دم اسے یاد آیا کہ جو لباس اس نے بدلا ہے اس کی قمیص کی جیب تو اُدھڑی ہوئی تھی۔ گریبان کے کچھ بٹن بھی غائب تھے۔ اب بٹن بھی موجود ہیں اور جیب بھی سلی ہوئی تھی۔

اس کے دل میں ایک نیا خیال آیا اور خوشگوار دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ اس نے نادیہ سے پوچھا۔ "یہ بٹن تم نے لگائے تھے؟"

"نہیں۔" نادیہ نے نفی میں سر ہلایا، پھر بولی۔ "شاید مہناز آپا نے لگا دیئے ہوں گے۔"

"اور استری؟"

"وہ بھی شاید انہوں نے کی ہوگی یا شاید حنیفاں نے۔"

رستم نے مزید تحقیق مناسب نہیں سمجھی اور باہر آ گیا۔ سورج دور مغربی ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ جنوب کی طرف ہلکی سی لالی تھی..... اور ہوا چل رہی تھی۔ ہاں یہ وہی جنوب تھا جہاں بی بی رہتی تھیں۔ جہاں انہیں جانا تھا۔ آج نہیں تو دو دن بعد...... یا چار دن بعد۔ انہیں چلے جانا تھا اور شاید رستم نے بھی چلے جانا تھا۔ رستم کا سفر زیادہ لمبا تھا۔ پولیس رپورٹوں اور قانونی دستاویزات میں اس کی موت طے ہو چکی تھی۔ واپسی کا کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی گنجائش۔ وہ درجنوں افراد کا قاتل تھا اور ان میں کئی پولیس والے بھی شامل تھے۔ آخری کارنامہ وہ مہتم بستی کے قریب ڈیک نالے کے کنارے انجام دے چکا تھا۔ اس نے چار افراد کو مارا تھا اور ان میں تین پولیس والے تھے۔ ہاں وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

لیکن ..... کل رات اسے جو کچھ ملا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اسے آنے والی موت کا اب ذرا بھی دکھ نہیں رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس بے مثال آسودگی اور خوشی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا اور اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی ..... وہ تو صرف بی بی کا ہاتھ چُھونے کے بدلے اپنی پوری زندگی نچھاور کر سکتا تھا۔ قدرت نے اسے دیا تھا اور اتنا کہ اس کے دامن میں سمٹ نہیں رہا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں کسی پُرسکون جگہ جا بیٹھے۔ وہاں کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہونے والا نہ ہو۔ وہ کل بیت جانے والی طلسمی رات کو بار بار یاد کرے، بار بار ان بے بہا مناظر کا تصور ذہن میں لائے جنہوں نے اس کی زندگی کا مول ادا کر دیا تھا۔ وہ ان جادوئی مناظر کو پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بار بار ذہن میں لانا چاہتا تھا۔

اور وہ ایک سرخی مائل ٹیلے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ یاد کرنے لگا اور خود کو یقین دلانے لگا کہ ایسا کیوں تھا۔ بخار اور غنودگی کے عجیب و غریب خمار میں کپکپاتی ہوئی بی بی نے اس کے بازو کو بڑی شدت سے تھام رکھا تھا۔ پھر انہوں نے اپنا چہرہ اس کی خوش نصیب گردن میں گھسا دیا تھا۔ پھر ان کے ہونٹوں نے رستم کی گردن پر حرکت کی تھی۔ انہوں نے کچھ کہا تھا لیکن رستم کو یہ گمان...... کہیں زیادہ...... کہیں زیادہ زندگی بخش لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے

ہونٹوں سے اس کی گردن کو چھوا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا؟ پھر یہ ہوا تھا کہ رستم ایک ناقابلِ بیان جاں افزا روح پرور لہر میں بہہ گیا تھا۔ اس نے بی بی کو چوما تھا۔ ان کے نم بالوں کو، ان کی گرم پیشانی کو، ان کے رخسار کو، ان کے ہونٹوں کو، ان کے جسم کو۔ وہ ایک ایک لمس کو یاد کرنے لگا۔ اس کی گہرائی میں کھونے لگا۔ اسے لگا کہ صدیاں بھی بیت جائیں تو وہ اسی طرح بیٹھ کر اس گرم خوشبودار لمس کو یاد کر سکتا ہے۔ ایک ہزار سال تک پیشانی کا لمس، ایک ہزار سال تک رخسار اور ایک ہزار سال تک ہونٹوں کا لمس۔ وہ دیوانوں کی طرح سوچ رہا تھا اور اس دیوانگی پر دینا جہان کو قربان کر سکتا تھا۔ یہ دیوانگی اسے راحت دے رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ کچھ گنگنائے یا پھر یونہی ان ٹیلوں میں گھومتا رہے۔ کسی چلبلے نوجوان کی طرح بھاگ بھاگ کر ڈھلوانوں پر چڑھے اور اُترے۔ مدبھری ہوا سے بغل گیر ہو کر کنکر اٹھا اٹھا کر باری باری تالاب میں پھینکے اور پانی پر بننے والے دائروں کو دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ زندگی نے اسے سیراب کر ڈالا ہے۔ اب اسے اور کچھ بھی نہیں چاہئے۔ ان حسین ترین یادوں کو اپنے سینے اور اپنی آنکھوں میں سجا کر اسے جلدی سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہئے، یا پھر مر جانا چاہئے۔

اچانک ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ آج صبح تاریک غار میں پیش آنے والے ایک واقعے کو یاد کرنے لگا۔ بی بی مسمار شدہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ اچانک وہ بُری طرح چونکی تھیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ رستم نے اپنے طور پر گمان کیا تھا کہ شاید وہ کسی کیڑے یا چھپکلے وغیرہ سے ڈر گئی تھیں لیکن اسے بی بی کے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کیوں ڈری تھیں؟ یہ ایک معمولی سی بات تھی مگر رستم کو وہاں دراڑ میں پیش آنے والا ہر واقعہ ہر ہر بات یاد کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

اچانک ایک آہٹ نے رستم کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ حسنا گجراتی اس کی طرف آ رہا تھا۔ ایک ایل ایم جی اس کے کندھے پر تھی اور ایک چھوٹی ٹارچ اس نے حسبِ معمول اپنی جیب میں ڈال رکھی تھی۔

رستم کو اس کا یوں آنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بے تکلف دوست کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکا۔

حسنے نے رستم کو مسکراتی نظروں سے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر گجراتی کے وہی دو شعر پڑھے جو چند دن پہلے بھی پڑھے تھے۔ ان شعروں کا مطلب تھا "وہ خوبصورت ہے اور ایسی خوبصورت ہے کہ اس کے سامنے جھکنے اور سر جھکانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں

کہ اسے دیکھا جائے اور اس سے محبت نہ کی جائے۔"

رستم بس خاموشی سے حسنے کو دیکھتا رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔ "کہاں گھوم رہے ہو؟"

"بھراجی، یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بس ہوا کھا رہا تھا۔"

"مجھے تو لگتا ہے، کسی کا غم کھا رہے تھے۔"

رستم نے بالوں کو انگلیوں میں تھام کر پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "حسنے میں کالج کا منڈا نہیں ہوں اور نہ ہی تم نئے نئے جوان ہوئے ہو کہ ہم اس طرح بیٹھ کر عاشقی معشوقی کی باتیں شروع کر دیں۔"

"عاشقی کے لئے کوئی عمر نہیں ہوتی یار جی اور رتم کون سا بڈھے ہو گئے ہو۔ پینٹ قمیص پہن کر کلین شیو ہو جاؤ تو کالج کے مُنڈے ہی لگو۔"

"اچھا، اب کیا مسئلہ ہے۔ کس لئے آئے ہو؟" رستم نے مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

حسنا نے جواب دینے کے بجائے جیکٹ کی جیب سے وسکی کی چھوٹی بوتل نکالی اور ہونٹ تر کرنے کے بعد اسے رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ بس ایک سگریٹ دے دو۔"

حسنا نے دو سگریٹ نکالے ایک اپنے ہونٹوں میں دبایا اور دوسرا رستم کی طرف بڑھا دیا۔ دو تین گہرے کش لینے کے بعد بولا۔ "رستم بھائی! میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم چھوٹی بھرجائی کے ساتھ زیادہ خوش نہیں ہو۔ ایسے لگتا ہے کہ چھوٹی بھرجائی سے تمہارا رشتہ مجبوری کا رشتہ ہے۔ پتا نہیں کیا مجبوری ہے؟" اس نے چند لمحے توقف کر کے ایک اور کش لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ تمہارا دل اب بھی بی بی جی پر ہے اور شاید دوسری طرف بھی کچھ ایسی ہی بات ہے..... میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ایسی باتیں چھپانے سے چھپتی نہیں ہیں بلکہ چھپانے سے اور بھی ظاہر ہوتی ہیں۔"

"تم اپنی بات مختصر کرو تو بہتر ہے۔" رستم نے روکھے لہجے میں کہا۔

وہ بے خوفی سے بولا۔ "رستم بھائی، میں نہیں جانتا کہ تمہارے اور بی بی جی کے ساتھ کیا مجبوریاں ہیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اگر بی بی تمہاری زندگی میں آ جائے تو تمہاری زندگی کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔"

حسنے کی بات سن کر رستم نے سر کو مایوسی سے جھٹکا اور بدمزہ ہو کر سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا۔ "پتا نہیں حسنے! تم کس زندگی کی بات کر رہے ہو۔ یہ زندگی جو ہم جی رہے ہیں زندگی نہیں

ہے۔ یہ تو موت کا انتظار ہے اور انتظار بھی ایسا جس میں ہر گھڑی مر مر کر جینا پڑتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بی بی کو اپنی اس پھٹکاری ہوئی زندگی میں گھسیٹ لاؤں؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اس نجس زندگی میں آنے کے لئے تیار ہو جائیں گی؟'' اس نے ایک بار پھر شدید مایوسی اور کرب کے عالم میں سر جھٹکا۔ اس کا سارا موڈ غارت ہونے لگا۔ اس نے حسنے کے ہاتھ سے بوتل لی اور کئی تیزابی گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لئے۔

حسنے نے نیا سگریٹ رستم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''پتا ہے یہ بات مجھ سے کس نے کہی ہے؟''

''کس نے؟''

''بھر جائی جی (مہناز) نے۔ ان کو بہت اچھی لگی ہیں بی بی جی۔ میرے سامنے دیر تک ان کے گن گاتی رہی ہیں اور رستم بھائی، سچی بات یہ ہے کہ بی بی کو جو بھی دیکھتا ہے۔ جو بھی ان سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کوئی خاص بات ہے ان کے اندر۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جادو سا ہے۔''

پھر حسنا بتانے لگا کہ بھر جائی مہناز، ماسی حنیفاں اور دیگر لوگوں کے خیالات بی بی جی کے بارے میں کیا ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اتنے بڑے حادثے سے بی بی کے بچ جانے کو لوگ معجزہ کہہ رہے ہیں اور اسے نیک شگون سمجھ رہے ہیں۔

حسنا حسب عادت بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بی بی کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ مگر اس وقت رستم مکمل تنہائی چاہتا تھا۔ اسے گزرنی ہوئی رات کا تصور کرنا اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی شے بھی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ حسنا کچھ دیر تک اس کوشش میں رہا کہ رستم اس کی باتوں میں دلچسپی لے، پھر ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔

رستم بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ نیلوں سے ...نکالا سیاہ آسمان روشن تاروں سے بھر گیا۔ ہوا کچھ اور بھی مست ہو گئی۔ کوئی چکور رسیلی آواز نکالتا ہوا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ رستم بے خیالی میں اپنی قمیص کے بٹنوں کو ہولے ہولے سہلا رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں میں ایک سرور سرایت کر رہا تھا۔ ایک دم رستم چونکا۔ اسے کچھ دور ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ یوں لگا کہ کوئی عورت ہے۔ رستم تیزی سے اٹھ کر اس سمت میں گیا۔ ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اس نے دیکھا۔ وہ واقعی عورت تھی۔ وہ اپنا سراپا چادر میں لپیٹے ڈیرے کی مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ یہاں ڈیرے پر عورتیں تو بس تین چار ہی تھیں۔ مہناز، حنیفاں، نادیہ اور بی بی وغیرہ۔ وہ ان میں سے کون ہو سکتی تھی۔ یہ حنیفاں تو ہرگز نہیں ہو سکتی وہ خاصی لمبی تڑنگی ہے۔ مہناز کا

جسم بھی ذرا سا بھاری تھا۔ تو پھر نادیہ یا بی بی؟

یہ بی بی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی ان کے پاؤں زخمی ہیں اور وہ اتنی تیزی سے چل نہیں سکتی تھیں۔ تو پھر نادیہ؟ اگر یہ نادیہ تھی تو ڈیرے سے اتنی دور کیوں آئی اور اتنی عجلت میں کہاں جا رہی تھی......؟ رستم نے کچھ فاصلہ رکھا اور پیچھے چلتا رہا۔ ایک دو منٹ بعد وہ ایک چھوٹی سی کھوہ میں داخل ہو گئی۔ رستم کا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیا معاملہ تھا؟ وہ چار پانچ منٹ تک اپنا لائحہ عمل سوچتا رہا پھر بڑی احتیاط سے کھوہ کی طرف بڑھا۔ وہ کھوہ کے دہانے پر پہنچا تو اس کا تجسس مزید جاگ گیا۔ اندر سے سسکاریوں کی نسوانی آواز آئی۔ گو یہ آواز مدھم تھی مگر رستم پہچان گیا۔ یہ نادیہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تکلیف میں تھی اور اس کے منہ سے ''اُف ... اُف'' کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔

رستم ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھا۔ وہ بلی کی چال چلتا کھوہ کے خم پر پہنچا تو اسے ٹارچ کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ نادیہ نے اپنی قمیص عقب سے اس طرح اٹھائی ہوئی تھی کہ اس کی شفاف پشت کندھوں تک عریاں ہو گئی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ وغیرہ قمیص کے اندر چھپ گیا تھا۔ ایک شخص جس کی صرف پشت ہی رستم کو نظر آ رہی تھی، کسی نکیلی شے سے نادیہ کی کمر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ''اُف ... آہستہ۔'' وہ سسک رہی تھی۔

☆======☆======☆

رستم حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یہ سب کچھ بہت شرم ناک محسوس ہوا۔ نادیہ نے قیص تو اپنی کمر سے اوپر اٹھا رکھی تھی لیکن اس کا جسم سامنے سے بھی نیم عریاں ہو رہا تھا۔

بڑے سائز کی ٹارچ ایک پتھر پر رکھی تھی۔ اس کی روشنی نادیہ کے بدن کے ہیجان خیز نشیب و فراز پر تھی۔ رستم نے غور سے دیکھا، لکھنے والے کے ہاتھ میں کوئی قلم یا بال پوائنٹ وغیرہ نہیں تھا۔ یہ بڑے سائز کی ایک سوئی تھی جس سے لحاف وغیرہ سینے کا کام لیا جاتا ہے۔ پنجاب میں اسے ''گھند وئی'' بھی کہتے ہیں۔ وہ شخص جو درمیانی عمر کا لگتا تھا، بڑے انہماک اور دلچسپی سے نادیہ کی شفاف جلد پر گھند وئی سے خراشیں ڈالتے ہوئے کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ لرز رہی تھی اور گاہے بگاہے اس کے ہونٹوں سے ''ہائے... اُف اللہ'' کی آواز نکل جاتی تھی۔

لکھنے والے نے بوسیدہ سی جیکٹ اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے بال گردن پر سے قدرے لمبے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ نادیہ کی تکلیف اسے مزہ دے رہی ہے اور وہ لکھنے کے ساتھ ساتھ نادیہ کے عریاں بدن کا نظارہ بھی کر رہا ہے۔ اس نے نادیہ کی قمیص تھوڑی سی مزید اوپر اٹھائی۔ نادیہ نے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر قمیص کو تھام لیا جیسے وہ مزید عریانی سے بچنا چاہتی ہو۔ تاہم اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی لکھنے والے ڈشکرے نے اس کے کندھے بھی عقب سے عریاں کر دیئے۔

نادیہ نے بےزاری سے کچھ کہا لیکن الفاظ رستم کی سمجھ میں نہیں آئے۔ اب لکھنے والے کا انداز رستم سے ڈھکا چھپا نہیں رہا، وہ واضح طور پر نادیہ کی عریانی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے نادیہ کو کس چکر میں پھنسایا ہوا تھا۔ نادیہ کے پہلو پر لکھنے کے لئے اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے نادیہ کا پسینہ صاف کیا۔ اس کے ہاتھ نے بڑی بےباکی سے اور یقیناً بدنیتی سے نادیہ کے بائیں پہلو پر اوپر سے نیچے حرکت کی۔ نادیہ نے پھر کچھ کہا۔ غالباً اپنی بےزاری

کا اظہار کیا۔

اب یہ سب کچھ دیکھنا رستم کے بس میں نہیں رہا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر لکھنے والا چونکا اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ تیس پینتیس سالہ شخص فرید کے ساتھیوں میں سے تھا۔ رستم کو اس کا نام معلوم نہیں تھا لیکن شکل دیکھی بھالی تھی۔ رستم کو دیکھ کر اس شخص کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رستم نے اسے گریبان سے پکڑا اور بڑی وحشت سے گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر جا گرا۔

نادیہ کی دہشت زدہ چیخ رستم کے کانوں میں گونجی۔ اس نے نادیہ کو جلدی سے اپنی قیص سیدھی کر کے کھڑے ہوتے دیکھا۔

رستم اسے نظرانداز کر کے لمبے بالوں والے کے پیچھے بھاگا۔ وہ پندرہ بیس قدم آگے جا چکا تھا۔ اس نے مڑ کر رستم کو دیکھا اور پھر شدید خوف کے عالم میں قریباً بیس فٹ کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے وہ ایک چھوٹی جھاڑی پر گرا اور وہاں سے اٹھ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ رستم چھوٹا سا چکر کاٹ کر نیچے اُترا اور اس نے لمبے بالوں والے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔

''رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔'' رستم نے چلا کر کہا۔

لیکن وہ بے حد خوفزدہ تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ رستم نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ ان نشیب و فراز میں رستم نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جلد ہی وہ اپنا اور بھاگنے والے کا فاصلہ کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی دوران میں اچانک ایک گھاٹی کے موڑ پر پانچ چھ افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے بھگوڑے کو دبوچ لیا۔

یہ ڈیرے کے پہرے داروں میں سے تھے اور رستم کی آواز سن کر یہاں پہنچے تھے۔ ان میں کاتھیا بھی شامل تھا۔ بھگوڑے کو اوندھے منہ زمین پر گرا دیا گیا۔ کاتھیا نے اس کے ہاتھ پیچھے موڑے اور ایک مفلر کے ذریعے مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے۔ رستم نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

رستم کو دیکھ کر وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''رستم صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ مم میں بے قصور ہوں۔ بالکل بے قصور ہوں۔''

رستم نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ ''تیری ساری بے قصوری میں نے اپنی

آنکھوں سے دیکھی ہے حرام زادے۔" پھر رستم کاٹھیا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اسے لے کر ڈیرے پر پہنچو۔ میں ابھی آرہا ہوں اور اچھی طرح تلاشی بھی لے لو اس کی۔" کاٹھیا نے ادب سے سر جھکایا۔

رستم انہیں چھوڑ کر واپس کھوہ میں پہنچا۔ کھوہ میں پڑی ہوئی ٹارچ ابھی تک روشن تھی۔ مگر نادیہ وہاں نظر نہیں آرہی تھی۔ رستم سمجھ گیا کہ وہ واپس ڈیرے پر چلی گئی ہے۔ رستم نے دیکھا۔ ایک طرف پتھر کی درز میں دو اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ ایک کالے رنگ کی لیموتری سی ڈائری بھی وہاں پڑی تھی۔ ڈائری میں پتا نہیں کیا کیا اوٹ پٹانگ لکھا گیا تھا۔ پرانی کتابوں اور انگریزی رسالوں سے کاٹی ہوئی کچھ خوفناک تصویریں بھی ڈائری میں تھیں۔ جانوروں اور جانور نما انسانوں کی بڑی بھیانک شکلیں تھیں۔ رستم نے تھوڑی سی تگ و دو کی تو اسے ایک اور چونکا دینے والی شے نظر آئی۔ یہ انڈین وہسکی کی ایک کوارٹر بوتل تھی۔ اسے ایک پتھر کے پیچھے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ رستم نے یہ ساری چیزیں جن میں دو تین تعویذ بھی شامل تھے، اپنی تحویل میں لیں اور واپس ڈیرے کی طرف چل دیا۔

ڈیرے واپس پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس بات کی تصدیق کی کہ نادیہ آچکی ہے یا نہیں؟ وہ آچکی تھی اور اپنے کمرے میں تھی۔ چھجے کے نیچے بہت سے لوگ جمع تھے اور گیس لیمپ کی روشنی میں ہلچل کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً لمبے بالوں والا بھگوڑا یہیں موجود تھا۔ اس کی طرف جانے کے بجائے رستم پہلے اپنے کمرے میں گیا۔ وہ اس سارے چکر کے بارے میں نادیہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کمرے میں ایک طرف نادیہ شال میں لپٹی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حسنے گجراتی کی بیوی شاہدہ اور حنیفاں بھی اس وقت نادیہ کے پاس موجود تھیں۔ رستم نے اشارہ کیا تو وہ دونوں باہر چلی گئیں۔

رستم کمرے کا دروازہ بند کر کے نادیہ کے سامنے آبیٹھا۔ "یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟" وہ بے حد تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

رستم نے اسے شانے سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا۔ "میرے سامنے زیادہ ایکٹنگ نہ کرو۔ مجھے بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ لفنگا وہاں کیا کر رہا تھا تمہارے ساتھ؟ اور کب سے ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟"

"مم... میں اس سے دم کرانے گئی تھی۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"کیا تکلیف تھی تمہیں؟" رستم پھنکارا۔ "اور کیا دم کر رہا تھا وہ حرامی۔ وہ خبیث تو دو دو مہینے نہاتا نہیں ہے۔ دن رات تمباکو اور شراب پیتا ہے۔ وہ کیا دم کرے گا تمہیں اور جس طرح کا دم وہ کر رہا تھا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس بدبخت نے تمہیں ننگا کر کے بٹھایا ہوا تھا۔"

"وہ... وہ کہتا تھا۔ اس عمل کا یہی... طریقہ ہے۔ وہ میری کمر پر... کچھ لکھ رہا تھا۔"

"اور اگر وہ کہتا کہ عمل کے لئے باقی کپڑے بھی اُتار دو۔ تو کیا تم اتار دیتیں؟"

"وہ.... میں... دراصل۔" نادیہ ہکلا کر رہ گئی۔

"تم پڑھی لکھی بنتی ہو۔ خود کو شہرن کہتی ہو۔ فلموں میں کام کرتی ہو۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے تم نے۔ لعنت ہے تم پر اور تمہاری عقل پر۔ تم جیسی عورتیں ہی ان مشٹنڈے عاملوں کے ہاتھوں بے آبرو ہو جاتی ہیں اور ایسی مت ماری جاتی ہے کہ بار بار بے آبرو ہونے کے لئے جاتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی ہیں۔ ننگی تصویریں کھنچواتی ہیں۔ بلیک میل ہوتی ہیں۔ اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی برباد کر دیتی ہیں۔" رستم طیش کے عالم میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور سسک رہی تھی۔ رستم نے ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے اس کی پشت سے قمیص اٹھائی۔ قمیص کا چاک پھٹ گیا اور نادیہ کی کمر کا کچھ حصہ عریاں ہو گیا۔ یہاں شفاف جلد پر گھنڈوئی کی نوک سے بہت سی خراشیں ڈالی گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ لفظ ہی رستم کی سمجھ میں آسکے۔ "رانی ماتا... رات کا راجا... بنگالن گوری..." اسی طرح کے بے معنی الفاظ تھے اور کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ کہیں کہیں ان خراشوں سے خون بھی رسا تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" رستم نے اس کی کمر پر قمیص کو برابر کرتے ہوئے کہا۔

وہ سسک کر چپ ہو گئی۔ رستم کا پارہ چڑھا اور تیز ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کا دل چاہا کہ نادیہ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دے لیکن ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اسے دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ کسی بات پر رستم کو نادیہ پر بہت طیش آیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اسے مار ڈالے گا۔ مگر پھر اچانک غصہ خود بخود کم ہو جاتا تھا۔ ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ نادیہ بے چاری ہے۔ اس کے دل نے اور دل میں پیدا ہونے والے جذبات نے اسے مجبور کر رکھا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کچھ نہیں جانتی۔ اپنے نفع نقصان سے بے گانہ ہو چکی ہے۔ یہ سب دل کا

قصور تھا اور دل پر انسان کا اختیار کیسے ختم ہوتا ہے، اس بارے میں رستم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔

کمرے کے گوشے میں سکڑ سمٹ کر بیٹھی ہوئی نادیہ پر اسے بے اختیار ترس آ گیا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا پھر دوبارہ نادیہ کے پاس آ بیٹھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''تم اچھی بھلی سیانی ہو۔ مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔ تم جو کچھ کر رہی تھیں وہ بالکل غلط تھا۔ وہ خبیث وہاں اس کھوہ میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں لچا پن دیکھا ہے اور یہ دیکھو، یہ کیا ہے۔''

رستم نے اپنے نیفے میں اُڑسی ہوئی شراب کی چھوٹی بوتل نکال کر نادیہ کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ ''یہ بھی مجھے وہیں سے ملی ہے۔ اس بدمعاش نے ایک پتھر کے پیچھے چھپا رکھی تھی۔ ایسے لوگ تم جیسی عورتوں کی مت مار دیتے ہیں اور جب سمجھتے ہیں کہ مت واقعی ماری جا چکی ہے تو پھر سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ شکر کرو تم کسی بڑی مصیبت سے بچ گئی ہو۔''

نادیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر دوبارہ سسکنے لگی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو شاید... مجھ سے غلطی ہوئی ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہتے تھا۔ مم ..... میں اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔ میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

''کیا کہا تھا اس نے تم سے؟''

''اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مجھے شاہدہ نے بتایا تھا کہ عظمت نے بڑے مشکل چلّے کاٹے ہوئے ہیں۔ یہ کئی طرح کے نوری عمل کرتا ہے اور ڈیرے کے لوگ اسے بہت مانتے ہیں۔ پھر ایک دن قبرستان کے پاس یہ مجھے ملا۔ وہاں یہ ایک بیری کے نیچے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ گھونگھٹ کے پیچھے سے ہی میں نے اس سے دو چار باتیں کیں۔ ... مجھے میرے بارے میں کچھ بتایا۔ مجھے لگا کہ اس کی باتیں بالکل صحیح ہیں۔ بس پھر میں اس کے چکر میں آ گئی۔ یہ دو تین دفعہ مجھے قبرستان میں ہی ملا۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے دل کے سکون کے لئے سات راتوں والا چھوٹا چلہ کاٹ رہا ہوں۔ چلہ پورا ہو گیا تو ایک عمل کروں گا۔ اس کے بعد تمہیں کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ سات دن پورے ہو گئے تو اس نے مجھے وہاں کھوہ میں بلایا اور میری دونوں پنڈلیوں پر پیچھے کی طرف کچھ لکھا۔ ایک دن چھوڑ کر پھر مجھے جانا تھا لیکن میں جا نہ سکی۔ اس سے اگلے دن چھپکلے والا مسئلہ ہو گیا تھا۔ میں زخمی ہو کر ... کے دواخانے میں پہنچ گئی۔ کل جب تم شانی جی کو کھائی سے نکالنے کے لئے گئے ہوئے تھے اور باقی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ یہ عظمت پھر مجھ سے ملا۔ اس نے کہا کہ ''آدھا عمل کالے جادو کی مار سے زیادہ خطرناک ہے۔ مجھے جلد از جلد عمل پورا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا کہ میں بیمار بھی اسی لئے ہوتی ہوں کہ عمل پورا نہیں ہوا ہے۔ اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں چلی گئی۔''

اسی دوران میں باہر سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں جہاں لوگ جمع تھے۔ نادیہ کو کمرے میں چھوڑ کر رستم مجمعے کے سامنے پہنچا۔ یہاں فرید کے ساتھی دلاور اور کاٹھیا بڑے غصے میں تھے اور عظمت کے ساتھ مار پیٹ کر رہے تھے۔ عظمت ان کی ٹھوکریں کھا کر پتھریلی زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' رستم نے قریب جا کر پوچھا۔

''رستم بھائی! یہ دیکھو اس کے سامان میں سے کیا نکلا ہے۔'' دلاور نے ایک کالے شاپنگ بیگ میں رکھی ہوئی چند تصویریں رستم کی طرف بڑھائیں۔

رستم نے دیکھا یہ تاش کے پتوں پر بنی ہوئی حیا سوز تصویریں تھیں۔ دو سفید فام لڑکیاں اور تین لڑکے شیطان کے چیلوں کی حیثیت سے مصروفِ کار نظر آتے تھے۔ مرد و زن کا وہ عظیم اور بے مثال تعلق جو کائنات کا جوہر ہے، جو زندگی کا حسن ہے، ان تصویروں میں ایسی مکروہ حالت میں دکھائی دیتا تھا کہ ابکائی آنے لگتی تھی۔

دلاور نے کہا۔ ''کھونڈر میں اس کے سامان کی تلاشی لی گئی ہے تو ایک تکیے کے نیچے سے یہ ملی ہیں اور اس کے علاوہ یہ دیکھیں۔'' دلاور نے ایک ریشمی کپڑے کی سیاہ تھیلی رستم کی طرف بڑھائی۔ اس میں انسانی اور حیوانی بالوں کے گچھے، مختلف قسم کی چھوٹی بڑی سوئیاں، دو طلائی انگوٹھیاں، پلاسٹک کی ننھی منی انسانی کھوپڑیاں اور اسی قسم کی اشیاء تھیں۔

تصویریں دیکھ کر رستم کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ اس نے عظمت کو زمین سے اٹھایا اور گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا مجمعے کے کمرے میں لے گیا۔ فرید اور حسنا بھی اس کے ساتھ تھے۔ تاہم چند قدم آگے جا کر فرید نے حسنے کو اشارہ کیا اور وہ رستم کے ساتھ کمرے میں نہیں گئے۔

بند کمرے میں رستم نے عظمت سے پوچھ گچھ کی۔ وہ بُری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ رستم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ منت سماجت کرنے لگا اور ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ (اس کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ رستم نے کھول دیئے تھے)

رستم نے اس کی گردن اپنے آہنی پنجے میں دبوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے تھے تم اس کے ساتھ؟''

"مجھ سے میری مری ہوئی ماں کی قسم لے لیں جی۔ میرا کوئی بُرا ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو چھوئی بھر جاتی ہیں جی۔ میں اس طرح کی کسی بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر یہ تو آپ کا معاملہ تھا جی ... میں بھلا آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ کون ہے جو آپ کو نہیں جانتا۔ کسی کی موت ہی آئی ہوگی جو آپ کی عزت کی طرف آنکھ اٹھائے گا۔ میں تو صرف ... میں تو صرف......"

رستم نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ عظمت کے منہ پر مارا۔ "تم تو صرف ٹھرک پوری کر رہے تھے لیکن اس سے آگے جانے کا انتظام بھی تم نے کر رکھا تھا۔ کیا پتا کسی وجہ سے قسمت تم پر مہربان ہو ہی جاتی۔ اس لئے احتیاطاً تم نے شراب کی بوتل بھی وہاں چھپا رکھی تھی۔"

"ششش ... شراب کی بوتل؟" عظمت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"ہاں یہ بوتل۔" رستم نے بوتل اس کے سامنے لہرائی۔

"مم ... مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں جی۔ مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔"

"اور ان تصویروں کا بھی تمہیں کچھ پتا نہیں ہوگا۔ کسی جن بھوت نے شرارت سے تمہارے تکیے میں گھسیڑ دی ہوں گی۔"

عظمت کے سیاہ ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ رستم نے دو تین تھپڑ مزید اس کے منہ پر جڑے۔ اس کے ہونٹوں سے خون تو پہلے ہی بہہ رہا تھا۔ اب ناک سے بھی رِسنے لگا۔ وہ سرتاپا کانپ رہا تھا۔ رستم پھنکارا۔ "دیکھ سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ اس سے پہلے کیا کچھ کرتا رہا ہے اور اس کے بعد کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر خود نہیں بتائے گا تو پھر مجھے پوچھنا پڑے گا اور تجھے پتا ہی ہے میرے پوچھنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں جی......" وہ پھر قسمیں کھانے اور منتیں ساجتیں کرنے لگا۔

رستم نے اسے فرش پر گرا کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ گردن پر پاؤں رکھنے کا عمل شاید سننے میں اتنا خوفناک نہ ہو لیکن جو شخص اس عمل سے گزرتا ہے، وہ ہی اس کی دہشت ناکی کو جان سکتا ہے۔ گردن انسانی جسم کا ایک نازک عضو ہے۔ جب پاؤں کا سارا بوجھ گردن پر آتا ہے تو جسم مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بندے کا سانس تو رک ہی رہا ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس نے کسی طرح کی مزاحمت کی یا خود کو چھڑانا چاہا تو گردن کا کڑاکا نکل جائے گا۔ پولیس والے اکثر یہ حربہ اختیار کرتے ہیں۔ کوئی ایک اہلکار حوالاتی کی گردن پر پاؤں رکھ دیتا ہے اور دوسرا اس کی چھترول کرنے لگتا ہے۔

عظمت کی گردن پر پاؤں کا دباؤ پڑا تو اس کی زبان باہر نکل آئی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس کے منہ سے کھیں کھیں کی اذیت ناک آواز نکلی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور سر کے اشارے سے رستم کو بتایا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تاہم رستم نے فوری طور پر اس کی گردن آزاد نہیں کی۔ چند سیکنڈ مزید اسی طرح گزارے، بالآخر عظمت کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ وہ رستم کے پاؤں تلے مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اس نے دونوں ہاتھوں سے رستم کا پاؤں تھام رکھا تھا۔ رستم نے پاؤں پیچھے ہٹایا تو وہ بُری طرح کھانسنے لگا اور پھر الٹی کرنے لگا۔ رستم خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو رستم کے کہنے پر اس نے اپنے گلے سے صافہ نما کپڑا اُتارا اور فرش کو صاف کر کے کپڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ بس ایک دو منٹ میں ہی اس کا سارا دم خم ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد رستم نے جو کچھ پوچھا اس کا جواب فوراً ملا۔

سب سے پہلے تو عظمت نے تسلیم کیا کہ کھوہ سے ملنے وال انڈین شراب کی بوتل اسی کی ہے اور اس نے وہاں چھپائی تھی۔

رستم نے پوچھا۔ "یہ جادو ٹونا کہاں سے سیکھا تم نے؟"

"پیر شاہی سے جی جو جوہر آباد میں رہتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟"

"یہ ذات کا تیلی ہے جی۔ حضرت صاحب کے شاگردوں میں سے ہے۔"

حضرت صاحب کا نام سنتے ہی رستم کے اعصاب تن گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بہروپیے عامل کے ڈانڈے کس شیطان سے ملتے ہیں۔ رستم نے عظمت کے پیر اور پیر کے پیر کو ایک گالی دی اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اس کا جی چاہا کہ قمیص کے نیچے سے چاقو نکالے اور اس بدمعاش عامل کو یہیں فرش پر بکری کی طرح لٹا کر ذبح کر دے لیکن خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے عظمت سے پوچھا۔ "نادیہ سے تمہارا رابطہ کیسے ہوا؟"

"انہوں نے خود کیا تھا جی...... میں اپنی مری ماں کی......"

"قسمیں نہ کھا۔" رستم نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ "جو بھی بکواس کرنی ہے بس کرتا جا۔"

وہ لرز کر بولا۔ "انہوں نے خود رابطہ کیا تھا جی۔ انہوں نے کہا تھا، وہ عمل کرانا چاہتی ہیں۔"

"کیسا عمل؟"

"دراصل..... ان کی سوچ عجیب سی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ آپ کے دل میں ان کے جسم کی چاہت پیدا ہو۔ آپ ان کو اپنے قریب رکھیں اور میاں بیوی والا حق ادا کریں۔"

رستم نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "اس میں عجیب بات کیا ہے۔ اکثر عورتیں ایسا چاہتی ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مرد ان کی طرف زیادہ توجہ دے۔"

"لل..... لیکن وہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور چاہتی تھیں جی۔"

"کیا مطلب؟"

عظمت نے اپنی گردن سہلا کر آنکھوں میں آنے والے آنسو پونچھے اور بولا۔ "وہ بیوی کے ساتھ ساتھ سوکن بننا بھی چاہتی تھیں۔ ان کی تمنا تھی کہ آپ ایک اور شادی کریں اور یہ شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو جسے آپ دل سے چاہتے ہیں اور بڑی مدت سے چاہتے ہیں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا رستم صاحب! وہی کہہ رہا ہوں جو انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے ان سے اس لڑکی کا نام پوچھا مگر انہوں نے نہیں بتایا۔ کہنے لگیں کہ میں نے جو عمل بھی کرنا ہے نام کے بغیر ہی کروں۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ اپنی من پسند شادی کریں لیکن وہ بھی آپ کی بیوی رہیں۔ آپ کی من پسند بیوی کی نوکرانی اور خدمت گار بن کر رہنا بھی انہیں قبول ہے۔"

"اس کام کے لئے کتنی رقم لی تم نے اس سے؟"

"نن..... نہیں جی۔ رقم نہیں لی۔" وہ ہکلایا۔

"پھر جھوٹ؟" رستم نے اس کا گریبان پکڑا۔

اس کا رنگ پھر سیاہ پڑ گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے سر جھکایا اور لرزاں آواز میں بولا۔ "میں نے کچھ نہیں لیا تھا جی..... انہوں نے خود دیا۔ وہی سونے کی دو انگوٹھیاں ہیں جی، جو میرے سامان سے نکلی ہیں۔ انہوں نے زبردستی دی تھیں۔"

"انگوٹھیاں، اس نے زبردستی دی تھیں اور باقی جو رہ گیا تھا اس کے لئے تم زبردستی کرنے والے تھے۔"

"مم..... میں سمجھا نہیں جناب؟"

"لیکن میں سمجھ گیا ہوں اور دیکھ بھی لیا ہے۔ تمہارے عمل کی قیمت انگوٹھیاں نہیں، اس کی آبرو تھی اور تم آہستہ آہستہ اسی "قیمت" کی طرف بڑھ رہے تھے۔"

"نہیں جناب..... بالکل نہیں..... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری زبان میں

کیڑے پڑیں اگر میں جھوٹ بولوں۔" اس نے پہلے اپنے کانوں اور پھر رستم کے پاؤں کو ہاتھ لگائے۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم نے اس کا آدھا جسم ننگا کر رکھا تھا۔ تم نے وہاں شراب کی بوتل چھپائی تھی۔ تم اس کی کمر پر تعویذ نہیں لکھ رہے تھے، اپنی حرام کاری کا رستہ سیدھا کر رہے تھے۔ تم جیسے شیطان عاملوں نے گھروں کے گھر برباد کئے ہیں۔ ان گنت سیدھی سادی عورتوں کو چکلوں اور قبرستانوں تک پہنچایا ہے۔ تم کچھ نیا نہیں کر رہے تھے۔ یہ بڑی پرانی بدکاری ہے جسے تم جیسے حرامی شعبدہ باز پیری فقیری کا نام دیتے ہیں۔"

عظمت نے رستم کا طیش دیکھا تو ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ پہلے تو وہ اس بات سے قطعی انکار کرتا رہا کہ نادیہ کے حوالے سے اس کی نیت میں کوئی فتور تھا لیکن جلد ہی کسی حد تک مان گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ نادیہ کی پنڈلیوں پر تعویذ لکھتے وقت وہ اس کے خوبصورت جوان جسم سے آنکھیں نہیں چرا سکا۔ اس نے اسے دوسری مرتبہ آنے اور کمر پر تعویذ لکھوانے کا جھانسا دیا لیکن یہ سب کچھ اسی حد تک تھا۔ اس سے آگے جانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور آج کے بعد اس نے نادیہ کو بلانا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا۔

رستم نے اس سے پوچھا کہ وہ شاہی کا چیلا ہونے کے باوجود یہاں ان پہاڑوں میں کیا لینے آیا اور اس کے ارادے کیا تھے۔ جواب میں عظمت نے روتے ہوئے، اٹک اٹک کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا..... "وہ میانہ کے قریب ایک گاؤں میں تعویذ گنڈے کا کام کرتا تھا۔ اس نے مردوں کے لئے ایک خاص قسم کا کشتہ بنایا۔ اس نے یہ کام نیک نیتی سے کیا تھا لیکن اس کا نتیجہ صحیح نہیں نکلا۔ اس کے ایک نوجوان شاگرد نے یہ کشتہ اپنی مرضی سے کھایا اور مقدار سے زیادہ کھالیا۔ وہ بے ہوش ہو کر ہسپتال پہنچا اور چند گھنٹے بعد مر گیا۔ اس کی موت کا سارا الزام اس (عظمت) کے سر پر آ گیا۔ مخالفوں نے دعویٰ کیا کہ اس کی نظر اپنے شاگرد کی نوبیاہتا بیوی پر تھی اور اس نے زہر دے کر شاگرد کو مارا ہے۔ دونوں الزام بالکل غلط تھے لیکن یہ بات نہیں تھی کہ وہ پاک صاف تھا۔ اس سے بہت سی غلط کاریاں بلکہ شرمناک غلط کاریاں ہوتی رہی تھیں۔ شاید ان کے بدلے میں وہ ایک ناکردہ جرم میں پھنس گیا تھا۔ وہ پولیس سے بھاگ کر پہلے گجرات اور پھر جہلم آ گیا۔ یہاں اس کی ملاقات کانٹھیہ کے ایک اشتہاری دوست سے ہو گئی۔ وہ ایک ایم پی اے کے ڈیرے پر ٹھہرا ہوا تھا اور لوٹ کے مال سے عیاشی کر رہا تھا۔ اس نے عظمت کو بھی خوب عیاشی کروائی۔ پھر ایک دن انہیں پتا

چلا کہ ایم پی اے انہیں پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ بات ایم پی اے کی جواں سال بیوی نے بتائی جو اشتہاری غازی خان کو ''خاص'' نظر سے دیکھنے لگی تھی۔ غازی خان وہاں سے فرار ہوا اور ساتھ ہی عظمت کو بھی فرار ہونا پڑا۔ اب وہ عرصہ دو سال سے یہاں وڈے ذیرے پر تھا۔''

عظمت کی روداد سننے کے بعد بھی رستم کے طیش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس روداد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس کے جرم کی شدت کو کم کرتی یا اس کے لئے رحم کے جذبے کو ابھارتی۔ وہ ایک Typical بدمعاش عامل تھا اور کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔

رستم نے دو مسلح افراد کو بلا کر اس کے ہاتھ پشت پر بندھوائے اور اسے ایک مجرم کی حیثیت سے سرنگ میں بھجوادیا۔

عظمت نے جو کچھ نادیہ کے حوالے سے بتایا اگر سچ تھا تو یہ نادیہ کی شخصیت کو اور بھی الجھاتا تھا۔ وہ رستم کے لئے ایک معمے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس کا رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ رستم کے سختی سے منع کرنے کے سبب بادشاہ اور کنیز والی بات اس کے سامنے نہیں دہراتی تھی لیکن بہ زبانِ حال وہ یہ بات رستم کے سامنے کہتی رہتی تھی۔ اس کا رویہ وہی شاہ اور کنیز والا تھا۔ خادمہ کی طرح رستم کے اردگرد گھومنا، اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ جانا، اپنے ہوش ربا جسم کو ہر لمحے رستم کے لئے دستیاب ظاہر کرنا۔ یہ سب اشارے کنائے اس کی خاص سوچ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اب وہ اپنی خود ساختہ کہانی کے تیسرے کردار یعنی ملکہ کو سامنے لانے کے لئے بھی کوشاں ہوگئی تھی۔ اس نے عظمت کے سامنے رستم کی من پسند شادی والی بات کی تھی۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ اشارہ بی بی کی طرف تھا۔ وہ عجیب تضاد کا شکار نظر آتی تھی۔ ایک طرف بی بی اور رستم کو ایک دیکھنا چاہتی تھی، دوسری طرف یہ خواہش بھی رکھتی تھی کہ رستم اس کے جسم میں دلچسپی لے، اسے اپنے تصرف میں لائے۔ رستم جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جا کر نادیہ کو کھری کھری سنائے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس پر زیادہ سختی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو بی بی کا فرمان اس کے کانوں میں گونجنے لگتا تھا۔ دوسرے اس کے اپنے اندر سے بھی ایک آواز بلند ہوتی تھی جو اسے نادیہ سے درگزر کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔

وہ نادیہ کے حوالے سے زبردست الجھن کا شکار تھا۔ ابھی چند دن پہلے اس کے ذہن میں شدت سے خدشات جاگے تھے۔ اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں اس ویرانے میں کسی سرپھرے کی ''وحشت'' نادیہ کی خوبصورتی کو نوچ کھسوٹ کر نہ رکھ دے۔ آج یہ صورتِ حال

ذرا مختلف انداز میں سامنے آگئی تھی۔ نادیہ ایک ہوس کار عامل کی سازش کا شکار ہونے سے بچی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے روز پھر بی بی، فرید اور سردار دراج کے ساتھ ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ اس مرتبہ مراد گروپ کا مراد اور حسنا گجراتی بھی میٹنگ میں موجود تھے۔ پورے معاملے پر کھل کر بات ہوئی۔ بی بی کا موقف یہ تھا کہ بلاول والے معاملے کو نظرانداز کیا جائے اور باقی معاہدے پر پہلے کی طرح ہی عمل کیا جائے۔ بی بی بات کر رہی تھی اور رستم ہمہ تن گوش تھا۔ اس کے لئے بی بی کی بات سے زیادہ ان کی آواز اہم تھی۔ وہ اس آواز کو کانوں میں نہیں اپنے دل میں اُتار رہا تھا اور اسے اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ بی بی کہہ رہی تھیں۔ ''بے شک پولیس نے چال چلی ہے۔ ہمیں دھوکا دیا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اس دھوکے سے محفوظ رہے ہیں۔ دھوکا دینے والا بھی کیفرِ کردار کو پہنچا ہے۔ اس کی واپسی تو دور کی بات ہے اس کی لاش بھی واپس نہیں جا سکتی۔ دوسرے بندے کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہی اس کی زندگی چلی گئی ہے۔ میرا مطلب ساجن سے ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''لیکن بی بی جی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاض ہٹلر ایک دغاباز دشمن ہے اور اس سے عنقریب ہمارا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔ اگر چوہدری اور اس کا بیٹا ہمارے پاس ڈھال کی صورت میں رہیں تو ممکن ہے کہ ریاض ہٹلر اور اس کے ساتھی یہاں حملہ کرنے سے باز رہیں یا کم از کم انہیں سوچ بچار کرنی پڑے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے بھائی کہ ایسی صورت میں الٹا اثر ہو۔ اگر کارروائی کچھ عرصے بعد ہونی ہے تو وہ چھ سات دن میں ہی ہو جائے۔'' شانی نے کہا۔

''بی بی جی! ہمیں اس وقت رقم کی نہیں اپنی سلامتی کی ضرورت ہے۔ اگر جان ہی نہ رہی تو پھر یہ تاوان کی رقم کس کام کی۔'' مراد نے دلیل پیش کی۔ ''بہتر تو یہ ہے کہ ہم رقم کے بجائے چوہدری اور اس کے بیٹے کو اپنے پاس رکھیں بلکہ اگر ایک دو اور ایسے بندے بھی اغوا کر کے یہاں لا سکیں تو اچھا ہے۔''

فرید نے مراد کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا بھی خیال یہی تھا کہ بندے اغوا کرنے سے کارروائی ٹالی نہیں جا سکتی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح پولیس مزید پھرتی دکھانے کی کوشش کرے۔

ایک طویل بحث کے بعد یہ طے ہو گیا کہ پروگرام کے مطابق چوہدری اور اس کے بیٹے

کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شانی بی بی کوشش کریں گی کہ ڈپٹی ریاض کو کسی فوری اقدام سے باز رکھیں اور اسے بتائیں کہ یہ صورتِ حال دونوں فریقوں کے لئے کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

شانی نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔

شانی کے پاؤں اب کافی بہتر تھے۔ گردن کی حرکت بھی بحال ہو رہی تھی...... رستم شانی کے ساتھ قریباً ایک گھنٹہ میٹنگ والے کمرے میں موجود رہا لیکن اس دوران میں ایک بار بھی دونوں کی نگاہیں نہیں ملیں۔ رستم کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی ہیں۔

شانی نے قریباً 36 گھنٹے مزید آرام کیا اور پھر چلنے کی تیاری کی۔ رستم کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہتا تھا کہ بی بی اب جلدی سے چلی جائیں۔ ان کے جانے سے پہلے کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو اس کے حسین ترین تصور کو گہنا دے... وہ ایک زندگی بخش نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس نشے کے خمار کا ٹوٹنا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ باقی کی زندگی پتا نہیں کتنی تھی لیکن جتنی بھی تھی وہ اس یاد کو سینے سے لگا کر گزار دینا چاہتا تھا۔ بی بی کا لمس، ان کی پیشانی کا...... بالوں کا... رخساروں کا... اور ہونٹوں کا۔ زندگی کے باقی دنوں کے لئے یہ زادِ راہ بہت تھا، بہت زیادہ تھا۔ پچھلے چھ سات دن میں رستم کو کئی بار اس ”تلخ خط“ کا بھی خیال آیا تھا جو اس نے پلاننگ کے تحت بی بی کے تایا معصوم کے نام لکھا تھا اور جس میں بی بی کے لئے بھی سخت باتیں لکھی تھیں۔ کئی بار رستم کا دل چاہا کہ اس خط کے بارے میں بی بی سے وضاحت کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ ضروری تو نہیں کہ ہر بات کی وضاحت ہی کی جائے۔ کچھ باتیں بغیر کہے سنے بھی تو سمجھ لی جاتی ہیں۔

اور پھر بی بی چلی گئیں۔ وقتِ رخصت وہ ان سے کوئی بات نہ کر سکا۔ بات کرنا تو درکنار بی بی کی نگاہ سے اس کی نگاہ بھی نہیں ملی۔ وقتِ رخصت بی بی گھوڑے پر سوار تھیں۔ کھیا دراج، چوہدری حشام اور راجو گھوڑوں پر تھے۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ حفاظت کے لئے ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ پانچ چھ میل کے سفر کے بعد گھوڑوں نے واپس آ جانا تھا اور انہوں نے پیدل آگے بڑھنا تھا۔ یہ خطرناک راستہ پاپیادہ ہی طے کیا جا سکتا تھا۔

روانگی کے وقت کھیا دراج، چوہدری حشام اور راجو کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ تاہم احتراماً بی بی کی آنکھیں بند نہیں کی گئیں۔ بی بی نے اس صورتِ حال سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے اشاروں کنایوں میں لالہ فرید سے کہا کہ ان کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھی جائے۔

بی بی کی یہ بات عقل مندانہ تھی۔ رستم نے اشارے میں فرید سے کہا کہ وہی کرنا چاہئے جو بی بی کہہ رہی ہیں۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد فرید نے بی بی کی آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی باندھ دی۔ ایسا کرنا بی بی کے حق میں بھی اچھا تھا۔ بعد میں چوہدری حشام یا راجو وغیرہ یہ کہہ سکتے تھے کہ شانی وڈے ڈیرے کے راستے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔

یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ درختوں اور ٹیلوں کے سائے لمبے تھے۔ رستم دیگر افراد کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا تھا اور اپنی بی بی کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ اب جیتے جی پھر ملنا ہوگا یا نہیں۔ وہ بی بی کو آخری لمحے تک دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ پتھر پر کھڑا رہا۔ بظاہر حسنے سے باتیں کرتا رہا لیکن اس کی نگاہیں بی بی اور اس کے قافلے پر مرکوز ہیں۔ بی بی کا آسمانی رنگ کا دوپٹہ اور کریم رنگ کی شال اس کی نگاہوں میں رہی۔ وہ دیکھتا رہا......اور بس دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ شاید نگاہوں سے اوجھل ہونے سے پہلے بی بی ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھیں گی لیکن انہوں نے نہیں دیکھا۔ دیکھتیں بھی کیسے؟ آنکھوں پر تو پٹی بندھی تھی۔

وہ کھڑا رہا۔ اس کے لمبے بال پوٹھوہار کی سحری ہوا میں جھومتے رہے۔ بی بی ایک ٹیلے کے پیچھے ایسے اوجھل ہو گئیں جیسے کسی حسین یادگار دن کا سورج غروب ہوتا ہے۔ پہلے تازی گھوڑا اوجھل ہوا، پھر بی بی کا دھڑ، پھر بی بی کے کندھے، پھر وہ پوری کی پوری اوجھل ہو گئیں۔ پوٹھوہار کی ہوا وہی رہی، ٹیلوں پر چمکنے والی وہ پہلی دھوپ بھی وہی رہی، اردگرد کے سارے مناظر بھی جوں کے توں رہے مگر رستم کو اچانک یوں لگا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہر منظر اور ہر آواز نے ایک سسکی بھری ہے اور کسی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا ہے۔

ہاں جانے والے نے بہت غم زدہ کیا تھا۔ مگر وہ جاتے جاتے حسین دل گداز یادوں کی جو دولت دے گیا تھا وہ ہفت اقلیم کے خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ یادوں کا یہ سرمایہ پا کر رستم کے دل میں جیسے کوئی حسرت ہی نہیں رہی تھی۔ اسے لگا کہ اب اگر کسی تپتی ہوئی دوپہر، یا خون رنگ شام، یا یخ بستہ رات میں سرکاری رائفل سے نکلنے والی گولیوں کی باڑ نے اس کا سینہ چھلنی بھی کر دیا اور وہ پوٹھوہار کے کسی ناہموار پتھر پر تڑپ تڑپ کر مر بھی گیا تو اس میں آنسو بہانے والی کوئی بات نہیں ہے۔

☆======☆======☆

یہ ٹھیکرا تھانے کے ایک کمرے کا منظر تھا۔ شانی، کھیا دراج اور چوہدری حشام وغیرہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں جوہر آباد میں پہنچے تھے۔ ریاض ہٹلر کمرے میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا، اس کی شیو ہمیشہ کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شانی اسے

وڈے ڈیرے پر پیش آنے والے تقریباً سبھی واقعات بلاکم و کاست بتا چکی تھی۔ وہ اپنی خطرناک آنکھیں شانی کی آنکھوں میں گاڑے سن رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ بڑی بے پرواہی اور غیر ذمے داری سے اپنی رانیں کھجانے لگتا تھا یا گونجدار ڈکار لینے لگتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک گندہ اور کرخت شخص نظر آتا تھا۔

شانی کے بیان کردہ دو واقعات نے اسے خاص طور سے چونکایا۔ ایک چوہدری کے نوکر ساجن کے مرنے کا واقعہ اور دوسرا بلاول کا المناک انجام۔

شانی نے کہا۔ ''بلاول کی طرح ساجن کے مرنے کا قصہ بھی میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں پوری ذمے داری سے یہ گواہی دے سکتی ہوں کہ ساجن نے اپنی غلطی اور جلد بازی کی وجہ سے جان گنوائی۔ اس بے چارے کو پتا نہیں تھا کہ اس کی رہائی کا معاملہ تقریباً طے ہو چکا ہے۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگا ..... اور اس ایریا کی طرف چلا گیا جہاں بے شمار بارودی سرنگیں ہیں۔ ڈیرے والوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور آخر تک اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ دھماکے سے اُڑ گیا۔''

ڈپٹی ریاض نے خالص تھانیدارانہ لہجے میں اس حوالے سے چند سوال جواب کئے پھر وہ بلاول والے واقعے کی طرف آ گیا۔ ''وہ مُنڈا تو چنگا بھلا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کر آئی ہو۔ کہیں مذاق شذاق تو نہیں کر رہی ہو مجھ سے۔'' وہ زہریلے انداز میں بولا۔

''دیکھیں ..... میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گی۔ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، وہ سچ ہوگا۔''

''بی بی جان! تم نے جو کچھ بتانا ہے بتاتی جاؤ۔ سچ جھوٹ کا پتا ہم خود ہی چلا لیں گے۔ اپنا تو کسب ہی یہی ہے۔ ..... ہاں بتاؤ ..... کیا ڈرامہ ہوا اس مُنڈے کے ساتھ؟''

''ڈرامہ اس کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس نے کیا ہے اور ڈرامہ بھی ایسا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔''

''منہ سے آگ نکالی تھی اس نے ..... یا عورتوں کی طرح بچہ پیدا کر دیا تھا۔''

شانی اس کی واہیات بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔ کیا مقصد تھا اس کا۔ وہ رات چوری چھپے لالہ فرید کے کمرے میں گھس گیا۔ وہاں سردار نادر کاکا کچھ سامان وغیرہ پڑا ہوا تھا۔ ایک پہرے دار نے اسے کمرے میں دیکھ لیا۔ وہ اس کے قریب گیا تو اس نے شکاری چاقو سے اس کی گردن کاٹ دی۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔ ایک دوسرا بندہ بھی اس کے ہاتھوں زخمی ہوا۔ پھر اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے سر پر پستول

رکھ دیا۔'' شانی نے اوڑھنی پیچھے کر کے اور بالوں میں مانگ نکال کر ڈپٹی کو وہ گہری خراشیں دکھائیں جو بلاول کے پستول کی وحشیانہ رگڑ سے نمودار ہوئی تھیں۔

بعد کا تقریباً سارا واقعہ بھی شانی نے ڈپٹی ریاض کے گوش گزار کر دیا۔ بس اس واقعے سے اس نے رستم کا ذکر حذف کر دیا۔ اس نے ڈپٹی ریاض کو یہ نہیں بتایا کہ اسے اندھی دراڑ میں سے نکالنے کے لئے جو شخص نیچے اُترا تھا وہ کون تھا۔ اس نے ایک کے بجائے دو تین افراد کا ذکر کیا تا کہ ریاض کا عیار ذہن رستم کی طرف نہ جا سکے۔

''اگر تمہاری بات پر یقین بھی کر لیا جائے تو اس بدبخت کی لاش تو ملنی چاہئے تھی۔ اگر تم اس اندھی دراڑ سے ہڈی پسلی سلامت لے کر نکلی ہو تو اس کو بھی نکلنا چاہئے تھا۔''

''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ اس کے سر پر گرتے ہی چوٹ لگی تھی۔ وہ پانی میں گرنے کے بعد پھر باہر نہیں نکل سکا۔ میں ہوش میں تھی اس لئے ہاتھ پاؤں چلا کر باہر نکل آئی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے جب بندہ کہیں پھنس جائے تو پھر باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں تو چلانے ہی پڑتے ہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا زہر تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ شاید اس کا اشارہ جمشید کی طرف تھا۔ وہ بُری طرح پولیس کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور ابھی تک حوالات میں تھا یا پھر شاید ریاض خود شانی کی طرف ہی اشارہ کر رہا تھا۔ شانی اپنی طرف سے بے حد احتیاط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے بلاول کے حوالے سے ڈپٹی پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں لگایا تھا۔ وہ بالکل انجان بنی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ ڈپٹی ریاض کسی بھی طرح مشتعل نہ ہو۔

''رستم سے ملاقات ہوئی؟'' ریاض نے اچانک تھانیدارانہ سوال کیا۔

''نن ..... نہیں۔'' شانی ہکلائی پھر سنبھل کر بولی۔ ''بس اسی طرح ملاقات ہوئی جس طرح دوسروں سے ہوئی۔''

''تیری جنڈری پر صدقے واری جانے کے لئے دراڑ میں کون کون اُترا تھا؟''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ وہ واقعی شکاری درندے کی طرح عیار تھا۔ وہ بولی۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں ..... وہاں اندھیرا تھا۔''

''تم نے بھی مجھے یہ بتایا کہ دراڑ میں تارچیں بھی لائی گئی تھیں۔''

''در ..... دراصل دراڑ میں اُترنے والوں نے گیس کی وجہ سے اپنے منہ سر لپیٹے ہوئے تھے۔'' شانی نے بات بنائی۔

''منہ لپیٹنے سے کیا ہوتا ہے بی بی! خون کے اندر عاشقی تڑف (تڑپ) رہی ہو تو سات پردوں کے پیچھے سے بھی معشوق کا مکھڑا نکل آجاتا ہے۔'' پھر اس نے ایک دم بات بدلی۔ ''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ تم دو بندوں کو واپس لے آئی ہو ... لیکن بندوں کو گنوا بھی آئی ہو۔ ایک تو حشام کا نوکر اور دوسرا بلاولی۔ یہ سارا معاملہ اور بھی الٹا سیدھا ہوگیا ہے۔ اس کی تفتیش آسان نہیں ہے۔ تمہارے اور مکھیا دراج کے سوا کوئی اور گواہ بھی نہیں ہے۔ اب تم دونوں ہی سچ سچ بتاؤ گے تو بات آگے بڑھے گی۔''

''میں سچ سچ ہی بتا رہی ہوں۔''

''اور دراج کیا بتا رہا ہے؟''

''وہ بھی سچ بتا رہا ہے۔''

''پھر میرے کھوپڑ میں ہی دماغ کی جگہ گوبر بھرا ہوا ہے شاید۔''

''کک ... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم دونوں میں سے ایک سچا ہوسکتا ہے دونوں نہیں۔ تم دونوں کے بیانوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا شادی کے بعد پیدا ہونے والے بچے اور شادی سے پہلے پیدا ہونے والے بچے میں ہوتا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دو چار دن بعد پھر تم سے ملاقات ہوگی۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

اب تاؤ حشام اور راجو کو ان کے وارثوں کے حوالے کیا جانا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ پولیس کی موجودگی میں انہیں چوہدری قادر، چوہدری احسان اور دیگر افراد کے سپرد کیا جانا تھا۔ یہ لوگ تھوڑی دیر میں میانہ گاؤں سے یہاں پہنچنے والے تھے۔ یہاں پٹواری کے گھر میں چوہدری اور اس کے بیٹے کو مہمان کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ شانی کی ہدایت پر خالو اعجاز ان دونوں کی خاطر مدارت میں مصروف تھے۔ شانی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خیر سگالی کے جذبات ابھارنے کی خواہش مند تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ نارپوری چوہدریوں، کمبوہ اور مہتم برادری میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کو کم سے کم کیا جائے۔ خیر سگالی کا ایک بڑا قدم تو اس نے اٹھا ہی لیا تھا۔ چوہدری اور اس کے بیٹے کو چھڑانے کے لئے وہ خود کو خطروں میں ڈال کر مفرور ڈکیتوں کے ڈیرے پر پہنچی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر سردار دراج کو بھی ساتھ لیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ مہتم برادری کی طرف سے بھی نارپوریوں کا دل کسی طرح صاف ہو۔ اب وہ اپنی طرف سے تاؤ حشام کو بھی عزت دینے کی کوشش کر رہی

تھی۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ اپنے ایک بدترین دشمن کے لئے اس نے اپنے دل میں گنجائش کیسے پیدا کرلی تھی۔ ٹھیکرا پہنچتے ہی تاؤ حشام اور راجو کو نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا گیا تھا اور ایک ڈاکٹر کو بلوا کو باپ بیٹے کی عمومی صحت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اب وہ دونوں خالو اعجاز کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سردار دراج بھی وہیں موجود تھا۔ تاؤ حشام بار بار بیٹے کا سر چوم رہا تھا۔ راجو تاؤ کی چہیتی بیوی کا بیٹا تھا اور تاؤ کے لئے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

تاؤ حشام اور راجو کے رخصت ہونے سے پہلے شانی ایک بار راجو سے ملنا چاہتی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ دوسرے کمرے میں کھانا کھا لیا گیا ہے تو اس نے ایک ملازمہ کو بھیجا اور راجو کو اپنے پاس بلا لیا۔ نہا دھو کر اور نیلا چہ کرتہ پہن کر راجو نکھرا نکھرا نظر آیا۔

شانی نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ''راستے میں تم سے بات کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''ہاں۔'' اس نے تائید کی۔ جیسے کہہ رہا ہو وہ بھی بات کرنا چاہتا تھا۔

شانی بولی۔ ''دیکھو، تمہارے من کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ تم اب آسانی سے اپنی کوکی تک پہنچ سکتے ہو لیکن تمہیں احتیاط بھی بہت کرنا پڑے گی۔ کہیں بنا بنایا کام بگڑ نہ جائے۔ سب سے پہلے تو تمہیں بڑی رازداری کے ساتھ ڈولے سے رابطہ کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک تمہاری حویلی میں ہی ہوگا۔''

''اور اگر نہ ہوا تو؟'' راجو کے انداز میں اندیشہ تھا۔

''نہ ہونے کا علاج بھی ہے ہمارے پاس لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ وہیں ہوگا۔ تم اسے بے شک میرا حوالہ بھی دے دینا۔ اس کے بعد اپنا تعارف کرا دینا لیکن ایک بار پھر کہتی ہوں کہ یہ سب کچھ رازداری سے کرنا۔ تمہارے ابا جی سمیت کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ رہا ہوں ساری گل۔'' راجو نے کہا۔

''اس کے بعد تم ایسا کرنا کہ کسی طرح ڈولے کو اپنی حویلی سے رہا کراؤ۔ کیا اسے رہا کرانے کا کوئی طریقہ ہے تمہارے دماغ میں؟''

''یہ میرے لئے بڑا آسان ہے۔ میں اسے رات کے وقت حویلی سے نکال دوں گا... حویلی میں سارے یہی سمجھیں گے کہ وہ کسی طرح پہرے داروں کو چکر دے کر نکل گیا ہے۔''

''لیکن اس کے بعد تلاش شروع ہوجائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے ابا جی کے کارندوں نے ڈولے کا کچھ اتا پتا بھی معلوم کر رکھا ہو۔ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ

سکتے ہیں۔کئی بے گناہوں کے لئے مصیبت ہوگی۔مجھ پر بھی شک کیا جاسکتا ہے۔''

''پھر ایک اور بات بھی ہے۔'' راجو نے شانی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔''ڈولے کے نکل جانے سے کئی پہرے داروں کی بھی شامت آئے گی۔''

شانی پُرسوچ انداز میں بولی۔''کوئی اور راستہ ڈھونڈو۔''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔''ایک طریقہ اور ہے۔ہاں یہ بالکل فٹ رہے گا۔''اس نے مطمئن انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا۔''میرا ایک یار ہے بخت خاں۔کوہاٹ کا رہنے والا ہے۔میرے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔اس کا باپ لکڑی کا بڑا تاجر ہے۔لاہور اور گوجرانوالہ میں بھی لکڑی دیتا ہے۔اس کے علاوہ اپنے گاؤں کا سردار بھی ہے۔میں ابے سے کہوں گا کہ مجھ سے بخت خاں نے ڈولے کو ایک مہینے کے لئے مانگ لیا ہے......ہاں یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔''راجو نے ایک بار پھر اپنی ہی تائید میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ایسا کرلو۔بہرحال سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ ڈولے کو لے کر بڑی خاموشی کے ساتھ کوکب کے پاس ملتان پہنچو۔اس کے والدین سے بات کرو۔ان کو بتاؤ کہ تم کوکب کے معاملے کو یونہی نہیں لے رہے ہو۔یہ تمہارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔تم ہرصورت میں اسی سے شادی کرو گے۔جواب میں وہ لازماً یہ کہیں گے کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں۔پہلے تم اپنے بڑوں کو مناؤ اور انہیں اس کام کے لئے یہاں بھیجو۔تم انہیں تسلی دو کہ تم پوری کوشش کر کے اپنے اباجی کو منالو گے اور اگر بالفرض نہ منا سکے تو بھی تم پیچھے نہیں ہٹو گے اور کوکب کو ہر حال میں اپناؤ گے۔تمہاری یہ باتیں ان پر ضرور اثر کریں گی اور ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کوکب سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت بھی دے دیں۔''

شانی کی بات سن کر راجو کی آنکھوں میں جیسے ایک ساتھ بہت سے دیے جل اٹھے۔یوں لگا جیسے کوکب کو دوبارہ دیکھنا اور اس سے ملنا اس کی زندگی کی بہت بڑی خواہش ہے لیکن پھر عین اسی وقت اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ سی نمودار ہوگئی۔وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔''تم ٹھیک کہتی ہو۔مگر مجھے ایک بات سے ڈر بھی لگتا ہے۔''

''کیسی بات؟''

''تم کہتی ہو کہ ڈولے کو کوکب اور اس کی باجی نے بھیجا ہے۔میں جب اسے بتاؤں گا کہ میں ہی وہ منڈا ہوں جس کا کوکب کے ساتھ معاملہ رہا ہے تو وہ حیران ہوجائے گا۔اس نے یہاں مجھے بہت کچھ کرتے دیکھا ہے۔میرا مطلب ہے کہ...... وہ......کنجری اور نوکرانیاں شوکرانیاں اگر یہ سب کچھ کوکب کو پتہ چل گیا تو پھر سارا معاملہ گڑبڑ ہوجائے گا۔میرا

مطلب ہے......''

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔''شانی نے اس کی بات کاٹی۔''تمہارا ڈر غلط نہیں ہے۔ایک لڑکی پیار میں سب کچھ برداشت کرتی ہے۔سارے زمانے سے لڑائی مول لے لیتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اس سے پیار کرنے والا کسی اور کی طرف دیکھے اور تم دیکھتے ہی نہیں رہے، بہت کچھ کرتے بھی رہے ہو۔یہ سب تمہارے ابے کی چال تھی۔وہ تمہیں ان گندے کاموں میں ڈال کر کوکی کی پاک صاف محبت سے دور کرنا چاہتا تھا اور تم اس چال میں آگئے لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا تم نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔تمہیں اس گندے کام میں دھکا دیا گیا ہے۔'' شانی چند سیکنڈ خاموش رہی پھر بولی۔''لیکن یاد رکھنا عورت کا دل ان معاملوں میں مرد سے بہت بڑا ہوتا ہے۔وہ معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔اگر تم کسی مناسب وقت میں کوکب کو یہ سب کچھ بتا بھی دو تو مجھے یقین ہے کہ وہ ہمت سے کام لے کر برداشت کرے گی لیکن فی الوقت یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''مگر ڈولا؟''

''دیکھو، تم خود بتا رہے ہو کہ تم نے پچھلے کئی مہینوں سے سارے بُرے کام چھوڑ دیئے ہیں۔تمہارے اندر آنے والی یہ تبدیلی حویلی میں رہنے والوں کو بھی تو نظر آرہی ہوگی اور ڈولا بھی ان میں شامل ہے۔تم بے شک اسے بتادینا کہ ایک رات حویلی میں میری اور تمہاری بات ہوئی تھی۔اسی ملاقات کے بعد تم نے اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔مجھے امید ہے کہ تمہاری بات ڈولے کی سمجھ میں آئے گی۔جب میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوگی تو میں بھی تمہاری باتوں کی تصدیق کردوں گی۔تم بے فکر رہو۔سب ٹھیک ہوجائے گا۔بس جیسا میں کہہ رہی ہوں، ویسا کرو۔سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ابھی تمہارے اباجی کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے کہ تمہیں کوکب کا کوئی کھوج ملا ہے۔اگر ایسا ہوا تو یہ اس بے چاری کے لئے اور اس کے گھر والوں کے لئے خطرناک ہوگا۔''

راجو اثبات میں سر ہلانے لگا۔

شانی نے اپنی چھوٹی انگلی سے چاندی کا ایک چھلا اُتار کر راجو کو دیا اور کہا۔''یہ ڈولے کو میری طرف سے دے دینا اور کہنا کہ تمہاری باجی نے دیا ہے۔اسے میری طرف سے سلام بھی کہنا لیکن ایک بات کا خیال تمہارے ساتھ ساتھ ڈولے کو بھی رکھنا ہے۔ابھی کچھ دنوں تک تم دونوں مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''لیکن کب تک؟''

''ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے اردگرد حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پولیس والے بھی سادہ کپڑوں میں میرے آلے دوالے موجود رہتے ہیں حالات کچھ اچھے ہوں گے تو میں خود تم دونوں سے رابطہ کرلوں گی۔''

کچھ ضروری ہدایات دے کر شانی نے راجو کو اس کے باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

اسی دوران میں شانی کے خالو اعجاز کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ شانی سے بولے۔ ''دیکھو بیٹا جی! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ چوہدری اور اس کے بیٹے کو فٹافٹ پولیس کے حوالے کر دینا چاہئے۔ یہاں اس گھر میں انہیں مہمانوں کی طرح رکھنا کسی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات کسی طور پر نہیں بھولنی چاہئے کہ علاقے کے لوگ چوہدری اور اس کے بیٹے کو صفیہ کا قاتل سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر راجو کا وجود تو وہ یہاں بالکل ہی برداشت نہیں کر سکتے۔''

''اب کیا بات ہوئی ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''عارف بڑا دکھی ہو رہا ہے۔ کچھ بھی ہے صفیہ اس کی بھتیجی تھی۔ وہ تو راجو کے نام سے ہی آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ وہ صرف تمہارے منہ کو چپ ہے۔ بہتر ہے کہ راجو اور اس کا باپ فوراً یہاں سے نکل جائیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''لیکن میں نے عارف سے خود بات کی تھی خالو! میں نے اسے کہا تھا کہ ہم ایک دو گھنٹے سے زیادہ چوہدری اور راجو کو اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔''

''مگر بیٹا جی بات صرف عارف کی ہی نہیں ہے۔ ساری کمبوہ برادری راجو کے خون کی پیاسی ہے اور اس میں ایسا غلط بھی کیا ہے۔ ان باپ بیٹے نے کیا کچھ نہیں کیا ہے کمبوہ عورتوں کے ساتھ۔ کبھی انہیں گاڑیوں کے نیچے کچلا، کبھی زبردستی نکاح کیا ہے، کبھی صفیہ کی طرح رکھیل بنا کر رکھا اور حمل ضائع کراتے ہوئے جان لے لی۔''

''آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں خالو! صفیہ کی موت کا دکھ مجھے بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے اسے دم دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ماں کے بین ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں لیکن ظلم اور تشدد کو ہم کب تک ظلم اور تشدد سے روکنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اس خوفناک کھیل کو ختم کرنے کے لئے کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہوگی تو کیوں نہ ہم یہ پہل کرلیں۔''

''لیکن مجرم کو سزا تو ملنی چاہئے۔'' خالو اعجاز نے کہا۔

''آپ کی یہ بات بھی بالکل صحیح ہے لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ قانون کی عمل داری نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو طاقت ور ہے وہی پولیس ہے، وہی جج اور وہی جلاد ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایسے دور دراز علاقوں میں ڈپٹی ریاض جیسے افسروں کے ہوتے ہوئے کسی مظلوم کو انصاف مل سکتا ہے۔ صفیہ کے قتل کو کتنے مہینے گزر چکے ہیں۔ اس کی قبر کشائی بھی ہوئی ہے۔ عارف نے اسے انصاف دلانے کے لئے پوری جان لڑائی ہے لیکن نتیجہ صفر ہے۔ چوہدری حشام کے پیسے اور اثر ورسوخ نے کام دکھایا ہے۔ اس نے کرائے کے دو ٹٹوؤں کی گرفتاری دے دی ہے اور بس۔'' شانی دکھ کے عالم میں بولتی چلی گئی۔ ''پھر ایک بات اور بھی ہے خالو اور یہ بات میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اصل مجرم راجو نہیں، اس کا باپ حشام ہے۔ راجو کی حیثیت ایک ناسمجھ لڑکے سے زیادہ نہیں۔ اسے اس گند میں دھکیلنے والا اس کا چالباز باپ ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں یہ بھی آپ کو تفصیل سے بتا چکی ہوں۔''

''لیکن بیٹی! چوہدری حشام اور راجو کے ساتھ ہماری ''نرمی'' کمبوہ برادری کو کسی طور برداشت نہیں ہوگی۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ تمہیں اور دراج کو باپ بیٹے کی رہائی کے لئے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ ان کو اگر اپنے کئے کی سزا رستم اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ملنے والی تھی تو مل جاتی۔ وہیں پوٹھوہار میں مر گئے ہوتے یہ دونوں حرامی۔''

''مگر خالو، ان کے مرنے سے دشمنی کی آگ تو ٹھنڈی نہ ہوتی بلکہ یہ تو اور بھڑکتی۔ کیا پتا اب تک بہت کچھ جل کر خاک ہو گیا ہوتا اور مجھے پورا یقین ہے کہ نارپوریوں اور کمبوہوں کے ساتھ ساتھ مہتم بھی زد میں آتے کیونکہ رستم کو ٹھولی میلے سے بچا کر نکالنے والوں میں مہتم بھی شامل تھے۔ اب دیکھیں اس آگ پر پانی کے کتنے چھینٹے پڑے ہیں۔ بے شک یہ بجھی نہیں لیکن بھڑک کر دوبارہ طوفان بھی تو نہیں بنی۔''

چوہدری اعجاز نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے سنتے رہے۔

شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور ہمیں بہت کچھ حاصل بھی ہوا ہے خالو! ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر بہروز کا واپس آ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے کچھ مقامی لوگوں سے بات کی ہے۔ وہ اس حوالے سے بہت خوش نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر بہروز کی واپسی سے علاقے میں بہت زیادہ تبدیلی آئے گی۔ ہسپتال بڑے اچھے طریقے سے آباد ہوگا۔ شاہی اور پیر قدرت اللہ کے اثر ورسوخ میں کمی آئے گی۔ کیونکہ ڈاکٹر بہروز ہی قدرت اللہ جیسے شخص کا توڑ ہو سکتا ہے۔''

چوہدری اعجاز بولے۔ ''یہ باتیں میری سمجھ میں تو آتی ہیں شانی، لیکن ان لوگوں کو کون سمجھائے گا۔''

''خالو جی! سچائی سورج اور دھوپ کی طرح ہوتی ہے۔ اسے ثابت نہیں کرنا پڑتا بلکہ یہ خود بخود عیاں ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس قدم سے اچھی تبدیلیاں آئیں گی اور لوگ انہیں محسوس بھی کریں گے۔ جوہرآباد میں فی الوقت سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ قبرستان والی لڑائی کے بعد درجنوں بندے گرفتار ہیں جن میں ہمارا جمشید بھی ہے۔ آج ڈپٹی ریاض سے اس بارے میں بھی میری بات ہوئی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ اس سلسلے میں تعاون کرے گا اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔''

''لیکن وہ تو کہتا ہے کہ میں چالان عدالت میں پیش کر چکا ہوں۔''

''غلط کہہ رہا ہوگا۔ اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوگا۔ ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ انصاف کرے تو جمشید پر کوئی سنگین الزام نہیں لگ سکتا۔''

اسی دوران میں ایک پولیس اہلکار نے خالو اعجاز کو باہر بلایا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ پولیس چوہدری اور راجو کو لے کر میانہ روانہ ہونے والی ہے۔

سہ پہر تک یہ ساری کارروائی مکمل ہوگئی اور شانی تانگے پر سوار ہو کر جوہرآباد روانہ ہوگئی۔ خالو اعجاز، ماسٹر انیس اور ایک پولیس اہلکار بھی ہمراہ تھا۔ جمشید چونکہ جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھا لہٰذا اس سے شانی یا خالو اعجاز کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

☆======☆======☆

جوہرآباد پہنچ کر شانی سب سے پہلے ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر بہروز سے ملنا چاہتی تھی تاہم اسے راستے میں ہی معلوم ہوگیا کہ فی الحال وہ دونوں جوہرآباد میں نہیں ہیں۔ وہ دو روز جوہرآباد رہنے کے بعد لاہور روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے گھر والے وہاں بے قراری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ خالو اعجاز کے مطابق ڈاکٹر زیب النساء کی حالت تو بہت پتلی تھی۔ وہ بے چاری مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ اسے میانہ کی حویلی میں مسلسل ذہنی و جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ حویلی میں ہی ایک چوہدری کے ساتھ اس کا زبردستی نکاح پڑھوا دیا گیا تھا۔۔۔ اور یہ واقعہ ڈاکٹر زیب النساء کے شوہر ڈاکٹر محسن کی موت کے صرف ایک مہینے بعد ہی وقوع پذیر ہوگیا تھا۔ یعنی عدت وغیرہ پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی پھر شادی کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر بہروز کی جسمانی حالت نسبتاً بہتر تھی لیکن وہ بھی پہلے سے بہت کمزور نظر آتے تھے۔ انہیں نارپور میں چوہدریوں کی نئی حویلی کے تہہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ یہاں وہ دو اشتہاری قاتلوں کے زخموں کا علاج کرتے رہے تھے اور مسلسل توہین و تذلیل کا شکار ہو رہے تھے۔ بہرحال ان ساری صعوبتوں کے باوجود ان کا حوصلہ پہلے کی طرح بلند اور عزم جوان

تھا۔ انہوں نے جوہرآباد پہنچتے ہی باقاعدہ ایک جلسے سے خطاب کیا تھا اور لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ جوہرآباد سے ان کی محبت کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ صرف دو ہفتوں بعد پھر ان کے درمیان موجود ہوں گے۔ عارف، جمشید، دراج اور ماسٹر انیس جیسے لوگ ان کے شانہ بشانہ ہوں گے اور یہ انقلابی قافلہ پھر سے رواں دواں ہوگا۔

جمشید کے گھر میں سب سے پہلے تابندہ ہی آ کر شانی سے لپٹی۔ وہ شانی کے گلے لگ کر دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ پھر عارف کی بیوی جمیلہ پھر خالہ فیروزہ۔۔۔ اسی طرح بہت سی عورتیں شانی کے گلے لگیں اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ وہ شانی کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ نرم و نازک لڑکی واقعی ایک دشوار گزار سفر طے کر کے نامعلوم پہاڑیوں میں ڈکیتوں کے ڈیرے تک پہنچی تھی اور وہاں سے کامیاب واپس لوٹی تھی۔

کچھ دیر تک عورتوں نے اسے گھیرے رکھا۔ پھر شام کے سائے گہرے ہوتے ہی یہ بھیڑ چھٹ گئی۔ جوہرآباد میں چراغ جل اٹھے۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر شانی نے تابندہ اور خالہ فیروزہ سے دیر تک باتیں کیں۔ لالٹین کی روشنی میں تابندہ اور فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو چمکتے رہے۔ یہ جمشید کے نام کے آنسو تھے، جسے بیٹھے بٹھائے مقدمہ قتل کے عذابوں نے جکڑ لیا تھا۔ فیروزہ نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''شانی! تم نے پولیس کے لئے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے۔ زخمی ہوئی ہو۔ اب تو ڈپٹی ریاض کو چاہئے کہ تم جس پر انگلی رکھو، وہ اسے چھوڑ دے لیکن وہ اسی طرح لوہے کا کھمبا بنا ہوا ہے۔ اس کے کارندے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رشوتیں کھا رہے ہیں۔''

''آپ حوصلہ رکھیں خالہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تھوڑا سا وقت لگے گا۔''

''ماسٹر انیس کہتا تھا کہ ڈپٹی نے جمشید کا چالان بنا کر عدالت میں دے دیا ہے۔ اب جو کرنا ہے عدالت نے ہی کرنا ہے۔'' تابندہ روہانسی آواز میں بولی۔

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔'' شانی نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''میری بات ہوئی ہے ڈپٹی سے۔ ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''تو کیا جمشید رہا ہو جائے گا؟'' تابندہ کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''دیکھ تابندہ، مصیبت آتو فٹافٹ جاتی ہے لیکن اسے جاتے ٹائم لگتا ہے۔ جب ایک دفعہ پرچہ کٹ جاتا ہے ناں تو پھر پولیس بھی کارروائی کی پابند ہو جاتی ہے۔ بہرحال میری بہن! میں تجھے اتنا یقین دلاتی ہوں۔ اب جمشید پر قتل عمد کا کیس نہیں بنے گا صرف لڑائی

جھگڑے اور مار پیٹ کی دفعات لگیں گی۔لہٰذا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میرے دل میں بڑے بُرے بُرے خیال آتے ہیں آپا۔ میں دیر تک راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں وہم بیٹھ گیا ہے کہ ڈپٹی کے ہاتھوں جمشید کو کچھ ہو جائے گا۔سنا ہے کہ یہ بندہ اپنے سامنے اکڑنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا اور جمشید اکڑا تھا اس کے سامنے۔''

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن اب ہم اس کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔'' شانی نے اعتماد سے کہا۔

خالہ فیروزہ بولی۔''ڈپٹی کے نیچے کام کرنے والے پُلسیے بھی ڈپٹی کی طرح بدمعاش ہیں۔ جمعرات تک جمشید ٹھیکرا کے حوالات میں ہی تھا۔میرے منع کرتے کرتے بھی یہ جمشید سے ملنے تھانے گئی۔'' اس نے تابندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہاں ڈپٹی سے چھوٹے افسر نے دو گھنٹے تک اسے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ساتھ میں اس کا چھوٹا بھرا گلزار بھی تھا۔افسر نے اسے دو سیر کڑاہی گوشت لانے کے لئے بازا بھیج دیا اور خود اس کے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔ ...''

''بڑی بے حیائی کی باتیں کیں جی اس نے۔ مجھے تو رونا آرہا تھا۔'' تابندہ بولی۔

''قسمت چنگی تھی کہ اتنے میں گلزار واپس آگیا۔دو گھنٹے ہمیں بٹھا کر اس افسر نے بس دو منٹ جمشید سے ہماری بات کرائی اور پھر باہر نکال دیا۔''

''میں نے تم سے کہا بھی تھا تابندہ! جوان عورتوں کو تھانے جانا ہی نہیں چاہئے۔وہاں کا ماحول عورتوں کے لئے ہے ہی نہیں۔ بہرحال جو ہو گیا سو ہو گیا۔اب میری یہ نصیحت یاد رکھنی ہے۔تمہیں پولیس کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

خالہ بولی۔''بدھ کے دن ثریا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ثریا کا خاوند اور جیٹھ بھی لڑائی کے بعد سے تھانے میں ہیں۔وہ خاوند سے ملنے گئی تھی...... چھوٹے تھانیدار نے اسے خوب ڈرایا دھمکایا۔ کہنے لگا تیرا خصم تو گیا کام سے۔دس بارہ سال تو باہر نہیں آئے گا۔اتنے میں تیرا پنڈا ڈھیلا پڑ جائے گا۔اچھا ہے کہ کوئی اور خصم ڈھونڈ لے۔نئیں تو میرے پاس آجا۔ تیرے سارے کام سیدھے ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ خصم صاحب بھی باہر آجائیں   توبہ توبہ ۔ یہ تو حال ہے ان لوگوں کا۔'' خالہ فیروزہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

رات کو شانی باہر برآمدے میں سوئی۔موسم اب کافی بدلا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ برآمدے سے آگے کھلا احاطہ تھا۔ ہینڈ پمپ کا لوہا مدھم چاندنی میں

چمک رہا تھا۔اس سے آگے دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ موتیے، رات کی رانی اور گیندے کے پھول مہک رہے تھے۔ برآمدے کے محرابی دروں سے آسمان کا جو حصہ نظر آتا تھا وہ تاروں سے بھرا ہوا تھا۔

شانی نے ان ٹمٹماتے تاروں کو دیکھا اور اچانک اسے کوئی یاد آگیا..... وہ یاد آیا اور اتنی شدت سے آیا کہ وہ دنگ رہ گئی۔شاید اب تک وہ اپنی مصروفیات میں گم رہی تھی اور اسے ٹھیک سے یاد کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔کئی دنوں کے بعد وہ آج رات قدرے فارغ تھی اور اچانک کسی کی یاد نے دھاوا بول دیا تھا۔جیسے یہ یاد بظاہر او جھل ہونے کے باوجود دل و دماغ میں تسلسل کے ساتھ سرایت کر رہی ہو اور اب یکا یک نمودار ہو گئی ہو۔

اس نے گھبرا کر اپنی بائیں طرف دیکھا۔ دو چارپائیوں پر تابندہ اور خالہ فیروزہ سو رہی تھیں۔شانی کو لگا کہ اگر وہ جاگ رہی ہوتیں تو اس کے دل و دماغ پر اچانک حملہ آور ہونے والے خیالات شاید ان دونوں پر بھی ظاہر ہو جاتے۔ شانی نے ایک گہری سانس لے کر کروٹ لی۔اپنے دونوں ہاتھ باہم ملا کر رخسار کے نیچے رکھے اور محویت سے ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔

ہاں یہی ستارے اس وقت پوٹھوہار کے ان سنسان ٹیلوں پر بھی چمک رہے تھے جہاں وہ موجود تھا۔ جہاں وہ سانس لیتا تھا۔ جہاں ایک سرنگ کے اندر وہ اندھی دراڑ موجود تھی جو ایک رات کے لئے اس کا اور شانی کا مسکن بنی تھی۔اس اونگھتی ہوئی خمار آلود رات اور اس اندھی دراڑ کو یاد کر کے شانی کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔اسے محسوس ہوا کہ پلک جھپکتے میں اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آگیا ہے۔

وہ سب کچھ ایک عجیب و غریب سپنے جیسا تھا۔ایک جادوئی سپنا، ایک طلسم، ایک اونگھتا ہوا رنگین واہمہ۔ وہ کیا تھا؟ اور کیا نہیں تھا؟ اس کا تصور کرتے ہی شانی شرم سے پانی ہونے لگی لیکن اس شرم میں ایک طرح کی لذت، ایک انوکھی سنسناہٹ بھی شامل تھی۔ ایک ایسی سنسناہٹ جس کا اس سے پہلے شانی کو کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک بالکل نئی ان دیکھی، انجانی کیفیت تھی اور اتنی حسین جس کا شانی نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔

ان جادوئی لمحوں میں، ان وارفتہ لمحات میں اس نے شانی کو چوما تھا۔اس کے چہرے کو، اس کی گردن اور اس کے شانوں کو۔ بڑی ہی نرمی سے بڑی ہی خوشبودار محبت سے۔ پھر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔جیسے وہ مجسم پھول ہو اور وہ بڑی نزاکت سے اسے بانہوں میں سمیٹ رہا ہو۔ان لمحوں میں شانی کی سماعت نے اس کی دھڑکن سنی تھی اور یہ دھڑکن کہہ رہی

تھی۔

میں اس شخص کا دل ہوں جس کا نام رستم سیال ہے
اور میں تم سے محبت کرتا ہوں
اور اتنی محبت جتنی کوئی انسان دوسرے انسان سے کر سکتا ہے
اور آج سے نہیں
صدیوں سے، زمانوں سے
روزِ اول سے زمینی اور آسمانی ''خداؤں'' کی جتنی پرستش کی گئی ہے
وہ سب جمع ہو کر میری محبت میں شامل ہے
اور روزِ آفرینش سے اب تک انسانی ذہنوں میں برتر لوگوں کے لئے جتنی بھی عقیدت پیدا ہوئی ہے
وہ سب جمع ہو کر میرے عشق کا جز ہے

(((......ہاں شانی کو اس جادوئی وقت کا ہر لمحہ یاد تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مرد و عورت کا رشتہ اتنا نفیس، اتنا مہربان اور محبت بھرا ہو سکتا ہے۔ اس نے تو بس سکھی سہیلیوں سے یہی سنا تھا کہ ''شادی'' مرد کی خوشی اور عورت کی قربانی کا نام ہے۔ شادی سے پہلے اسے رنگ والی کی عورتوں نے یہی سمجھایا تھا کہ اسے سسرال جا کر اپنے شوہر کو خوش رکھنا ہے۔ اس کی خوشی میں کسی طرح روڑے نہیں اٹکانے۔ شادی کے پہلے دن سے ہی اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں ڈھال لینا ہے۔ دن میں اور رات میں، کسی بھی وقت، کسی بھی حال میں وہ اسے اپنی تنہائی میں بلائے، اسے پہنچ جانا ہے۔ کیونکہ یہ مرد کا حق ہے اور عورت کا فرض ہے۔)))

سسرال پہنچ کر شانی کو واقعی مرد کی اس بالادستی کا پورا پورا تجربہ ہوا تھا۔ بلکہ یہ تجربہ اس کی معلومات اور توقعات سے زیادہ کڑا تھا۔ یہ دہری آزمائش تھی۔ فاخر نے اسے دو طرفہ امتحان سے گزارا تھا۔ جب شانی کے نوخیز جسم میں لہر جاگتی تھی اور وہ بڑی محبت سے شوہر کی بانہوں میں سمانا چاہتی تھی، وہ اسے یکسر نظرانداز کرتا تھا اور جب کبھی وہ اپنے تفکرات کے سبب خود ''گریز'' کا شکار ہوتی تھی، وہ بپھرے ہوئے آبی ریلے کی طرح اس کی طرف لپکتا تھا۔ اسے جھنجھوڑتا اور پٹختا تھا اور غتربود کر کے رکھ دیتا تھا۔ مرد و زن کا بس یہی جارحانہ تعلق شانی کی سمجھ میں آیا تھا۔

پھر اسے ایک چھوٹا سا تجربہ چوہدری بشیر کے گھر میں بھی ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے شانی

کو بلیک میل کیا تھا۔ مُنے کے بلکنے سے مجبور ہو کر شانی نے خود کو ایک بے جان شے کی طرح چوہدری بشیر کے آگے پھینک دیا تھا۔ وہ کسی ارنے بھینسے کی طرح اسے اٹھا [illegible] تک لے گیا تھا اور بڑی وحشت سے چومتا رہا تھا۔ اس کے جارح ہونٹوں کے نادیدہ نشان شانی آج تک اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی اور ان نشانوں کا تصور اس کے دل میں کراہت جگاتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان نادیدہ نشانات کو اپنی جلد سے کھرچ ڈالے۔

ہاں..... شانی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ مرد و زن کا رشتہ اتنا لطیف، مہربان اور محبت بھرا ہو سکتا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ اب تک کنواری تھی، بالکل اَن چھوئی۔ اس اندھیری رات میں، ان طلسمی گھڑیوں میں، کسی نے پہلی بار اسے چھوا تھا اور یہ چھونا ایسا دل گداز اور حیرت ناک تھا کہ اس نے شانی کے اندر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ شانی کو وہ لمس یاد آ رہا تھا، وہ نرمی اور خوشبو یاد آ رہی تھی اور اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہونے لگا۔ اسے لگا کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود رستم کو یاد کر رہی ہے۔ بے پناہ شدت اور طلب سے۔ وہ رستم کو پہلے بھی یاد کیا کرتی تھی لیکن تب کے اور اب کے یاد کرنے میں فرق تھا۔ یہ مختلف یاد تھی۔ اس میں جسم و جاں اور دل و دماغ کی تمام تر چاہتیں شامل ہو گئی تھیں۔

وہ بے حال ہونے لگی..... بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ان منہ زور خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ بڑے سرکش تھے۔ کوہی ندی کے ریلوں کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ کچے اور ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اس کیفیت سے فرار چاہتی تھی مگر فرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر راستے پر وہ کھڑا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ناقابلِ شکست محبت کی جوت تھی۔ اس کا سینہ دیوار تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اس کی خاموشی ہزار تکلم پر بھاری تھی۔

''کیا بات ہے شانی! نیند نہیں آئی؟'' ایک آواز نے شانی کو بُری طرح چونکایا۔ یہ خالہ فیروزہ کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے چارپائی سے اٹھ کر اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

''کک..... کچھ نہیں خالہ، بس یونہی۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

خالہ کے سر پر موٹی اوڑھنی تھی۔ وہ سوئی سوئی آنکھوں سے شانی کو دیکھتی رہیں۔ پھر ایک گہری سانس لے کر شانی کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی برآمدے کے کچے فرش پر رینگ رہی تھی۔

خالہ نے عجیب لہجے میں شانی سے پوچھا۔ ’’جہاں تُو گئی تھی وہاں رستم ملا تھا تجھے؟‘‘

’’کیوں خالہ، آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟‘‘

خالہ نے ایک نگاہ تابندہ پر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ گھر کے دیگر افراد بھی نیند کی آغوش میں تھے۔ خالہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’شانی جو کچھ ہوا ہے، یہ سب کچھ بہت تکلیف دینے والا ہے، تیرے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔ لوگ جب تیرا نام رستم کے نام کے ساتھ لیتے ہیں. سچ کہتی ہوں... ہمارے دلوں پر چھری چل جاتی ہے۔ تیرے تایا معصوم کی بیماری کی وجہ بھی یہی ہے۔ انہیں لوگوں کے بہت سے طعنے سننے پڑتے ہیں اور تو اور رنگ والی میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی نظروں میں اب حویلی کی وہ عزت نہیں رہی ہے۔‘‘

’’لیکن خالہ! میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لئے مجھے یا میرے بڑوں کو شرمندہ ہونا پڑے... ‘‘

’’کٹھولی گاؤں کے میلے میں جو کچھ ہوا وہی کچھ کم نہیں تھا شانی...... لیکن اب تو اس سے بھی بڑا کام ہوا ہے۔ پولیس والوں نے چوہدری حشام کو چھڑانے کے لئے تجھے رستم کی طرف بھیجنا چاہا اور تُو فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔ اس طرح تُو نے خود ہی یہ بات مان لی کہ رستم کے ساتھ تیرا ناتا ہے۔‘‘

’’مجھے پتا تھا خالہ! یہ بات کہی جائے گی..... اس کے باوجود میں وہاں گئی کیونکہ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ میں نے جو کچھ کیا یہاں کے لوگوں کی بھلائی کے لئے کیا اور آئندہ بھی جو کروں گی اسی لئے کروں گی۔ رستم کچھ لوگوں کی نظر میں بہت بُرا ہوگا لیکن کچھ لوگوں کی نظر میں وہ اچھا ہے اور میں بھی اسے اچھا سمجھنے والوں میں سے ہوں۔ باقی یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں خالہ! میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جو خاندان کی عزت کو خراب کرے۔ میں کوئی ناسمجھ بچی نہیں ہوں۔ دنیا کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے میں نے۔ آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔‘‘

’’کس طرح بے فکر رہیں شانی۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔‘‘

’’مجھے ان باتوں کی کوئی فکر نہیں ہے خالہ! میرے اندر کی سچائی سورج اور دھوپ کی طرح ہے۔ یہ ظاہر ہو کر رہے گی۔‘‘

’’شانی تُو نہیں سمجھتی۔ یہاں پر قدرت اللہ اور اس کے ماننے والوں کا کتنا اثر ہے۔ لوگ ان کی جھوٹی بات پر بھی آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں اور تیرے والی بات تو سچ

ہے۔ تجھے پتا نہیں، قدرت اللہ اور اس کی بیبیاں تیرے بارے میں کیا کہتی پھر رہی ہیں۔‘‘

’’مجھے ان کی باتوں کی پرواہ نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔‘‘

’’یہ بات بھی غلط ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں سے ڈرنا پڑتا ہے۔ اگر تُو ڈرتی نہیں تھی تو دراج اور بلاول وغیرہ کے ساتھ چوروں کی طرح کیوں چلی گئی تھی۔ تجھے بتا کر جانا چاہئے تھا۔ تیرے جانے کے بعد میں رنگ والی گئی۔ وہاں سب ہی تجھ سے ناراض تھے اور سب سے زیادہ تیری چچی پروین۔ رو رو کر اس کا بُرا حال تھا۔‘‘

’’وہ دوبارہ ملیں تو ان سے کہہ دینا خالہ! میرے لئے اب نہ روئیں۔ اگر زیادہ رونا آجائے تو سمجھ لیں کہ میں حویلی میں لگنے والی آگ میں بچی ہی نہیں تھی۔ یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ اس کی کوئی اور دنیا ہے۔‘‘

’’شانی یہ کہنا آسان ہے..... خون کی کشش بڑی زور والی ہوتی ہے۔‘‘

اچانک تابندہ نے کروٹ لی اور غنودگی کی حالت میں اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے کراہتی ہوئی آواز نکلی۔ ’’جمشید..... جمشید کیا ہوا؟‘‘ اس کے ساتھ ہی وہ ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر سے نیچے تک جا رہی تھی۔ نو بیاہتا جسم اکیلے پن کی تصویر نظر آتا تھا۔

شانی جلدی سے تابندہ کی طرف گئی۔ خالہ فیروزہ نے لالٹین کی لَو اونچی کی۔ شانی نے تابندہ کو دلاسہ دیا اور دوبارہ چارپائی پر بٹھا دیا۔ تابندہ کچھ دیر بڑبڑاتی رہی پھر ایک آہ بھر کر بستر پر لیٹ گئی۔ شانی نے اس کے اوپر کھیس ڈال دیا۔ خالہ فیروزہ بھی اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئیں۔ شانی اپنی چارپائی پر آگئی۔ اس نے کروٹ بدل کر اپنا رخ تابندہ کی طرف کر لیا۔ کچھ دیر بعد تابندہ دوبارہ بوجھل سانس لینے لگی۔ وہ سو گئی تھی تاہم نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے چلے جانے والے شوہر کا دکھ اس کی ہر سانس میں سمایا ہوا تھا۔

اچانک ساتھ والے گھر کے ایک حصے سے کوئی بچہ زور سے رو دیا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گئی۔ وہ غالباً چھ سات سالہ بچہ تھا۔ اس کے رونے کی آواز نے شانی کی سوچوں کا رخ کسی اور طرف موڑ ڈالا۔ وہ مُنے کو یاد کرنے لگی لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھولا ہوا ہو۔ وہ تو ہر وقت یاد ہی رہتا تھا۔ رستم اور منا، یہ دو ہی تو نام تھے جن کا تعلق شانی کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے تھا۔ وہ توتلی زبان میں اسے ’’تاقی‘‘ کہنے والا اپنی معصوم آنکھوں سے اس کے دل کو چھونے والا کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کس حال میں تھا؟

ایک دم بے شمار سوالات اس کے ذہن پر یلغار کرنے لگے۔ کل اسے خالو اعجاز کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ چوہدری بشیر صحت یاب ہو چکا ہے اور اب اپنی لاہور والی کوٹھی میں ہی مقیم ہے۔ مُنا بھی اس کے ساتھ تھا۔ مُنے کے بارے میں شانی نے کرید کرید کر خالو اعجاز اور خالہ فیروزہ وغیرہ سے پوچھا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ چوہدری کے پاس ہے اور چوہدری کچھ دن پہلے اسے ایبٹ آباد میں اپنے بڑے بھائی ندیم کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہاں مُنا بیمار ہو گیا اور چوہدری بشیر کو جلدی واپس لاہور آنا پڑا۔

شانی کا دل مُنے کے لئے رونے لگا۔ اپنے دل پر اس کا بس نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر سوچتی تھی۔ وہ کیا لگتا تھا اس کا؟ وہ کیوں اس کے لئے دیوانی تھی؟ وہ ماں کی محبت سے محروم ہونے والا دنیا کا پہلا بچہ تو نہیں ہے۔ نہ ہی وہ پہلا بچہ ہے جسے باپ کی حقیقی شفقت نہیں ملی پھر وہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک کیوں نہیں دیتی۔ وہ بہت کوشش کرتی تھی لیکن اس کے نوخیز جسم کے اندر چھپی ہوئی ہزاروں لاکھوں سال پرانی ''ماں'' اس کی کوئی پیش چلنے نہیں دیتی تھی۔ مُنے کو یاد کرتے ہی اس کی چھاتی میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لے اور اس کے گرد اپنی بانہوں کا ناقابلِ شکست حصار قائم کر دے۔ ایک دائمی حصار!

☆======☆======☆

یہ ساتویں آٹھویں روز کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا، بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شانی گھر پر موجود تھی (جب سے وہ واپس آئی تھی گھر سے نکلی ہی نہیں تھی) عارف کمبوہ، ماسٹر انیس اور خالو اعجاز بھی شانی کے ساتھ موجود تھے۔ اطلاع تھی کہ ڈاکٹر بہروز آٹھ دس دن میں جوہر آباد واپس آ رہے ہیں اور ہسپتال کو نئے سرے سے آباد کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بھی یہاں لا رہے ہیں، ان کے ارادے بڑے بلند ہیں۔ یہ پتا چلا کہ ڈاکٹر بہروز شانی سے ملاقات کے بھی شدید خواہش مند ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی رہائی کے لئے شانی کے بہت احسان مند تھے۔ ڈاکٹر بہروز اور ڈاکٹر زیب النساء نے رہائی کے بعد چوہدری حشام وغیرہ پر کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ دراصل یہ سب کچھ اس معاہدے کا حصہ تھا جو چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کی رہائی کے موقع پر کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محسن کی موت بھی ابھی تک ایک معمہ تھی۔ چوہدریوں کا کہنا یہی تھا کہ اسے حویلی میں سرسام ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کی موت ہوئی۔

شانی، عارف اور چوہدری اعجاز میں بات جاری تھی جب بابا دیناں تیزی سے اندر

داخل ہوا۔ اس نے اپنے داماد چوہدری اعجاز سے مخاطب ہو کر مخصوص لہجے میں کہا۔ ''پتر جی! باہر ایک بندہ آیا ہے۔ دھی شانی سے ملنا چاہتا ہے۔ اپنا نام قیصر شاہ بتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔''

''قیصر شاہ؟'' شانی نے حیرت سے زیر لب دہرایا۔

''کیا کھیال ہے۔ اس کو اندر لے آؤں؟'' بابا دیناں نے پوچھا۔

''نہیں چاچا! میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔'' عارف کمبوہ نے کہا۔

قریباً چار پانچ منٹ بعد عارف دو افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ شانی نے اپنے سر پر اوڑھنی درست کر لی۔ اندر آنے والوں میں ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اس کی چادر اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا۔ بارش کے سبب کچھ سردی ہو گئی تھی۔ شاید اسی سردی سے بچنے کے لئے بچے نے سوتی چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اسی چادر کو دیہاتی انداز میں منہ سر کے گرد بھی لپیٹ رکھا تھا۔ چادر بارش سے گیلی تھی۔

اچانک شانی کو احساس ہوا کہ نیلے رنگ کی گیلی چادر میں لپٹا ہوا بچہ۔ بچہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ڈولے کی شکل گھومی۔ عارف کمبوہ بھی چونکتی ہوئی نظروں سے ''بچہ نما'' کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شانی کو دیکھ کر ''بچہ نما'' نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ وہ ڈولا تھا۔ شانی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ خالو اعجاز اور ماسٹر انیس وغیرہ بھی حیران ہوئے لیکن ان کی حیرانی اور شانی کی حیرانی میں فرق تھا۔ شانی کے خیال میں تو ڈولے کو اس وقت ملتان میں کوکب اور سنبل وغیرہ کے پاس ہونا چاہئے تھا اور شاید راجو کو بھی وہیں ہونا چاہئے تھا مگر ڈولا حیران کن طور پر یہاں جوہر آباد میں نمودار ہو گیا تھا۔

شانی اٹھی اور ڈولے کو لے کر قریبی کمرے میں آ گئی۔ تاہم اٹھنے سے پہلے اس نے خالو اعجاز، عارف اور انیس کو ہدایت کر دی تھی کہ مہمانوں کی آمد کے بارے میں کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔

کمرے میں پہنچ کر ڈولے نے بڑی عقیدت سے شانی کو دوبارہ سلام کیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جذبات کی نمی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''باجی جی! اس کا نام قیصر ہے۔ یہ رشتے میں میرا بھتیجا ہے لیکن دیکھنے میں میرا چاچا لگتا ہے۔''

قیصر نے سر جھکا کر دوبارہ سلام کیا۔ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی لگتا تھا۔ ڈولے نے

کہا۔ ’’اس کے ساتھ آنے سے مجھے بڑا سہارا ہوا ہے جی۔ نہیں تو اس علاقے میں کسی نہ کسی نے مجھے پہچان لینا تھا۔‘‘

’’اس وقت کہاں سے آرہے ہو تم؟‘‘ شانی نے اپنی حیرت دباتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے ڈولے نے اپنے لمبے تڑنگے بھتیجے کو اشارہ کیا تو وہ باہر چلا گیا۔ ڈولے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’شاید آپ کو یقین نہ آئے باجی جی! میں اور قیصر اس وقت سیدھے ملتان سے آرہے ہیں۔‘‘

غالباً ڈولا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لمبے سفر کی تھکان تھی۔ شانی نے اسے نواڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ باہر ہلکی بارش بدستور جاری تھی۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ شانی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی اچھی طرح بند کردی..... پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ’’چھوٹے چوہدری راجو سے ملاقات ہوئی تمہاری؟‘‘

’’ہاں باجی! بڑی لمبی چوڑی بات ہوئی۔ چوہدری راجو نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو آپ نے اس سے کہا تھا۔ مجھے پہلے تو یقین نہیں آیا کہ یہی وہ منڈا ہے جسے ڈھونڈنے کے لئے میں کئی مہینوں سے خجل خراب ہو رہا ہوں۔ پر جب اس نے آپ کا حوالہ دیا اور آپ کا چھلا بھی دکھایا تو مجھے کچھ کچھ یقین آیا۔ بہرحال جی! یہ سب تو آٹھ نو دن پہلے کی باتیں ہیں۔ اب اس وقت میرے پاس آپ کے لئے کچھ خاص خبر ہے۔‘‘ ڈولے کے چھوٹے سے چہرے پر پریشانی کی گہری لکیریں تھیں۔

’’راجو تو خیر سے ہے ناں؟‘‘ شانی نے پوچھا۔

’’ہاں جی۔ وہ خیر سے ہے۔ پر اس کی وجہ سے بہت گڑبڑ بھی ہوگئی ہے۔ معاملہ اتنا خراب ہوگیا ہے کہ وہاں ملتان میں بھی میری سمجھ میں نہیں آیا اور مجھے مجبور ہو کر یہاں آپ کے پاس آنا پڑا۔ آپ کو پتا نہیں، کتنی مشکلوں سے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ ہر گھڑی خطرہ تھا کہ کہیں چوہدریوں کا کوئی بندہ مجھے پہچان نہ لے۔‘‘

’’ایسی کیا آفت آپڑی ہے؟‘‘ شانی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

’’آفت ہی سمجھیں جی۔‘‘ ڈولے کی آواز بھرا گئی۔ ’’اگر کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو میں آپ کے پاس آتا ہی کیوں؟‘‘

’’کیا پہیلیاں ہی بوجھواؤ گے؟‘‘

’’کوکب کی شادی ہو رہی ہے جی۔ بس دو تین ہفتے کے اندر۔‘‘

’’کس کے ساتھ؟‘‘

’’جس کے ساتھ کوکب کی منگنی اس کے ماں پیو نے کی ہے۔ راجو کو پتہ چلا تو اس کا بُرا حال ہوگیا ہے۔ اتنا رولا ڈولا ہے اس نے کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کملا ہو جائے گا یا اپنے آپ کو کچھ کر لے گا۔‘‘

شانی نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ’’ڈولے، مجھے شروع سے بتاؤ۔ اس طرح کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔‘‘

ڈولے نے اپنی آنکھوں سے نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے جی! صبح منہ اندھیرے چھوٹے چوہدری راجو نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور چل پڑا۔ پہلے ہم گوجرانوالہ پہنچے۔ وہاں سے لاہور، لاہور میں کچھ دیر رکنے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ قریباً سات گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اگلے روز صبح سویرے ملتان پہنچ گئے۔ ہم نے راستے میں ہی یہ پروگرام بنایا کہ پہلے میں اکیلا جاؤں گا اور کوکب کے ابا جی سے ملوں گا۔ کوکب اور سنبل کے ابا جی کو میں سیف چاچا کہتا ہوں۔ میں ان کی کریانے کی دکان پر پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ مجھے تقریباً چھ مہینے بعد دیکھ رہے تھے۔ انہیں بڑا شکوہ تھا کہ میں انہیں بتائے بغیر خاموشی سے چلا گیا۔ وہ میرے بارے میں بہت پریشان رہے تھے۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں ان کی بیٹی کے لئے ہی ’’خوشی‘‘ ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا لیکن شاید مجھے کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی۔‘‘ بولتے بولتے ڈولے کی آواز بھرا گئی۔

وہ چند سیکنڈ تک خود کو سنبھالتا رہا پھر بولا۔ ’’چاچا سیف سے مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی اور چھوٹی دونوں بیٹیوں کے رشتے طے کردیئے ہیں۔ کچھ دن بعد دونوں کی ایک ساتھ ہی رخصتی ہے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے چاچا سیف سے پوچھا کہ کوکی تو بیمار تھی؟ انہوں نے بتایا کہ اب وہ اچھی ہے۔ میں چاچا سیف کے گھر بھی گیا۔ وہاں شادی کی تیاری زور و شور سے جاری تھی۔ میں نے کوکی کو دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ چاچا سیف ٹھیک نہیں کہہ رہے تھے۔ کوکی اب بھی بیمار ہی نظر آتی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔ راجو کو میں نے بڑے ڈاک خانے کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔ میں راجو کے پاس پہنچا۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں اسے یہ سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر یہ سوچ کر میں نے راجو کو سب کچھ بتا دیا کہ اگر وہ کوکی کی اس شادی کو روکنے کے لئے کچھ ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے تو مارے۔ مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ راجو تنا جوش دکھائے گا اور ایسی کم عقلی کی بات کرے گا کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ راجو کسی طرح کوکی اور سنبل سے ملے اور انہیں بتائے کہ وہ کوکی کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ

ہے لیکن وہ کوکی اور سنبل سے ملنے کے بجائے ان کے ابا جی کے پاس چلا گیا۔ اس نے پہلے تو ان کے ساتھ آرام سے بات کی اور انہیں بتایا کہ وہ اور کوکی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ کوکی کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن جب چاچا سیف نے طیش سے بات کی تو راجو بھی بھتے سے اکھڑ گیا۔ اس نے بھی چند سخت باتیں کیں اور چاچا سیف سے کہا کہ وہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ وہ کوکی سے محبت کرتا ہے اور اگر کوکی کی ڈولی اٹھی تو ساتھ میں اس کا جنازہ بھی اٹھے گا۔ اسی روز شام کے بعد پتا نہیں کس طرح راجو نے ایک باغ میں کوکی سے ملاقات بھی کر لی۔ اس ملاقات کا پتا مجھے دو تین دن پہلے ہی چلا ہے۔ اس ملاقات میں کوکی نے روتے ہوئے راجو کو بتایا کہ ان دونوں کے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو رہے ہیں اور اس کی شادی لاہور کے ایک امیر شخص سے ہو رہی ہے۔ اس شخص کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔

کوکی سے ملنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد راجو کا میٹر کچھ اور گھوم گیا۔ وہ پھر چاچا سیف سے ملا۔ اس نے چاچا کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے یہ شادی نہ روکی تو وہ ان کے گھر کے سامنے اپنے آپ کو کچھ کر ڈالے گا۔ چاچے نے کہا کہ وہ جو کرنا چاہے کر لے لیکن یہ شادی اب نہیں رکے گی۔ راجو ابھی تک وہیں ہوٹل ڈیلیکس میں ہے۔ وہ بہت بپھرا ہوا ہے جی۔ میں نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔“

”کیا کہا ہے تم نے؟“ شانی نے پوچھا۔

”وہی جی..... جو کہنا چاہئے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ محبت صرف پا لینے کا نام ہی نہیں۔ کسی کو کھو کر بھی تو ساری زندگی اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔ شاید تم دونوں کی قسمت میں میل نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ہمیں اتنی دیر نہ ہوتی۔ ہم ڈیڑھ دو مہینے پہلے یہاں پہنچ جاتے۔ اس وقت سب کچھ آسان ہو سکتا تھا لیکن اب جگ ہنسائی اور بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوکی نے بھی اس سے ایسی ہی باتیں کی تھیں لیکن وہ کسی صورت مانتا نہیں بلکہ مجھے تو لگتا ہے جی کہ میں اسے جتنا سمجھاتا ہوں وہ اتنا ہی بھتے سے اکھڑتا ہے۔“

”اب وہ اکیلا ہی ہے وہاں؟“

”نہیں باجی جی! اس کا ایک پرانا یار پیجا گجر ہے۔ جب چند مہینے پہلے راجو پاک پتن آیا اور آس پاس کے علاقے میں کوکب کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، یہ پیجا گجر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اب پھر راجو نے پیجا کو وہاں بلا لیا ہے۔ کوکب کے گھر کے سامنے ایک ویڈیو شاپ ہے۔ شاپ میں بیٹھنے والے لڑکے سے راجو اور پیجا نے یاری گانٹھ لی ہے۔ دونوں ہر وقت وہاں بیٹھے

رہتے ہیں۔ راجو نے چاچے سیف کو دھمکی بھی دی ہے [illegible] بھگا کر لے جائے گا۔“

”چاچے سیف نے جواب میں کچھ نہیں کہا؟“

”کہا ہے جی۔ بہت کچھ کہا ہے۔ چاچا سیف بھی اب پیچھے [illegible] رہا۔ اس نے چھوٹی بیٹی کا رشتہ اونچی جگہ کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے [illegible] پیتا بندہ ہے اور کافی رعب والا بھی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چاچے کو زیادہ فکر نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ راجو کی کسی بے وقوفی کی وجہ سے کوئی بڑا مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔ پرسوں رات ایک بجے کے قریب میں نے ایک جیپ چاچے سیف کے گھر کے سامنے کھڑی دیکھی تھی۔ اس وقت راجو اور پیجا ویڈیو شاپ پر موجود تھے۔ سویرے میں نے ہوٹل میں جا کر راجو کو بہت سمجھایا۔ اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑے ہیں لیکن وہ کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ کہتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔“ ڈولے کے لہجے میں ان گنت اندیشے تھے۔

”لیکن تم یہاں کیوں آ گئے؟ تمہیں حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔“

”میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے جی۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے باجی! وہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

شانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جب اس نے راجو کو یہاں سے روانہ کیا تو اسے اندیشہ تھا کہ تاؤ حشام کی وجہ سے راجو اور کوکب کے ملاپ میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوں گی لیکن یہاں بالکل مختلف صورتِ حال پیش آئی تھی۔ تاؤ حشام سے پہلے خود کوکب کے گھر والے [illegible] اس ملاپ کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے اور رکاوٹ بھی ایسی تھی جو [illegible] ختم کر رہی تھی۔ کوکب کی منگنی ہو چکی تھی اور صرف چند دن بعد اس کی شادی ہو رہی تھی۔

شانی، کوکب سے ملی نہیں تھی..... نہ وہ اس کا مزاج جانتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں [illegible] یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ لڑکی حشام کے بیٹے سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے اور شاید حشام کے بیٹے کے دل میں بھی اس کی محبت کی شدت بہت زیادہ ہے۔ یہ نوعمری کی محبت تھی۔ ایسی محبت، پیار کرنے والوں کو دیوانہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

شانی خود بھی تو اپنی زندگی کے ایسے ہی انوکھے موسم سے گزر رہی تھی۔ وہ کوکب اور راجو کی کیفیات کو بڑی اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈولے! اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟“

ڈولے نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے بالوں میں پھیرا اور غم زدہ لہجے میں بولا ''باجی! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سنبل اور کوکب کی شادی طے ہو چکی ہے۔ اب واویلا کرنے سے بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ راجو کو کنٹرول کرنے کا ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دی جائے۔ چوہدری حشام بڑا سخت بندہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کو سنبھال ہی لے گا۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ راجو غم سے بے حال ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔ اگر اس پر زیادہ سختی ہوئی تو اس کی مایوسی مزید بڑھ جائے گی۔ ایسے میں وہ کوئی خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پھر سے اپنے پرانے طور طریقوں کی طرف لوٹ جائے۔ تم نے تو اسے حویلی میں دیکھا ہی تھا۔ وہ کس طرح نشے میں غرق تھا اور عورتوں کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ پھر اس دلدل میں جا گرے۔''

''اس لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ پتا نہیں کہ یہ آپ کو ٹھیک لگے یا نہیں لیکن میری دلی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح آپ راجو سے ملیں۔ اس سے بات کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جتنی اچھی طرح اسے آپ سمجھا سکتی ہیں کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اسے سنبھالنے کے لئے یہاں سے ملتان جاؤں؟'' شانی نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں باجی، میں یہ تو نہیں کہہ رہا لیکن اگر ہمیں راجو کو کسی بڑے حادثے سے بچانا ہے تو پھر آپ کو راجو سے بات کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ دیکھیں مجھ پر اور آپ پر زیادہ ذمے داری آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری وجہ سے ہی یہ معاملہ آگے بڑھا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں باجی۔''

''ہاں۔ کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن یہ جو کچھ ہوا ہے بے خبری میں ہوا ہے۔ اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ کوکب کی شادی تین چار ہفتوں میں ہونے والی ہے تو میں راجو کو تمہارے اور کوکب کے بارے میں کیوں بتاتی۔''

''شاید اسی کو قسمت کا چکر کہتے ہیں جی۔''

رات کو شانی دیر تک جاگتی رہی اور اس نئے بکھیڑے کے بارے میں سوچتی رہی۔ شاید ڈولا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ڈولے اور شانی پر اس معاملے کی بہت زیادہ ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ وہی دونوں اس سوئے ہوئے مسئلے کو پھر سے جگانے والے تھے۔ اب یہ مسئلہ نہ صرف جاگ گیا تھا بلکہ ایک دم ہی بہت گھمبیر ہو گیا تھا۔ ڈولے کی تفصیلی گفتگو سننے کے بعد نہ جانے کیوں

شانی کے دل سے بھی یہ آواز آنے لگی تھی کہ اگر اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی گئی تو پھر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔

دراصل یہ سارا معاملہ بُری طرح بگڑ چکا تھا۔ شانی کی معلومات کے مطابق جب پاک پتن میں دو چار ہفتوں کے اندر کوکب اور راجو کا طوفانی عشق پروان چڑھا تھا تو سیف نے راجو کے ساتھ زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ تب سیف نے راجو سے کہا تھا کہ اگر وہ کوکب سے واقعی شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر اپنے ماں باپ کو لائے اور اس بارے میں ڈھنگ سے بات کرے لیکن جب راجو کے بزرگ اس معاملے میں آئے تھے تو ایک دم سب کچھ تہس نہس ہو گیا تھا۔ چوہدری حشام سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کریانہ فروش سیف جیسے کسی شخص سے اپنا رشتہ جوڑے۔ کوکب جیسی لڑکی اس کے بیٹے کی تنہائی کا کھلونا تو بن سکتی تھی، اس کی بیوی نہیں۔ وہ تو اپنے سے کسی بڑے چوہدری کے ساتھ ناتا جوڑنا چاہتا تھا۔ جس کی بیٹی مربعوں کے حساب سے زمین اپنے جہیز میں لے کر آئے اور جس کو بہو بنا کر حشام کی پگڑی کا شملہ مزید چند انچ اونچا ہو جائے۔ وہ کریانہ فروش کی بیٹی کے لئے اپنے بیٹے کی بات کیسے مان سکتا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا تھا جو ایسے موقعوں پر حشام جیسے ہٹ دھرم لوگ کرتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو میانہ میں چھوڑ کر خاموشی سے واپس پاک پتن آیا۔ اس نے سیف کو بُری طرح ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر کہیں روپوش ہو جائے ورنہ بیٹی کی عزت اور جان دونوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

سیف جیسا سفید پوش حشام جیسے کرخت چوہدری کا دباؤ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ اپنی فیملی سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ملتان میں آ چھپا تھا لیکن اب ڈولے کی کوششوں کے سبب وہ ایک بار پھر چھوٹے چوہدری (راجو) کے روبرو تھا۔ ڈولے بے چارے نے تو جو کچھ کیا، اچھی نیت سے کیا تھا۔۔۔ اور ایسا کرتے ہوئے بہت سی تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں لیکن اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا تھا۔ سب کچھ تہس نہس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ سیف کو اپنی بے عزتی اور تذلیل یاد تھی جو چوہدری حشام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اب اس نے اپنی بیٹی کے لئے ایک خوش حال اور بارسوخ خاوند ڈھونڈا تھا اور اب وہ چھوٹے چوہدری یا بڑے چوہدری کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

شانی کے دل میں کوکی اور راجو کے لئے عجیب سا درد جاگ اٹھا۔ ہاں شانی کے سینے میں ایسا دل تھا جو کسی کی ذرا سی تکلیف محسوس کر کے تڑپ اٹھتا تھا اور دل کے اس تڑپنے میں اپنے پرائے کی تشخیص بھی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس معاملے میں بے وقوفی کی حد تک

آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ خود کو سمجھاتی تھی، سنبھالتی تھی۔ بے جا کے اضطراب سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک تند ریلے میں بہہ جاتی تھی اور اس کی فطرت اسے بہاتی چلی جاتی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے روز شانی، ڈولے اور اس کے بھتیجے قیصر شاہ کے ساتھ ایک تانگے پر سوار میانہ کی طرف جا رہی تھی۔ عارف کمبوہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ شانی شام ہوتے ہی بڑی رازداری کے ساتھ جوہرآباد سے نکل آئی تھی۔ اس نے ایک بوسیدہ سا برقع اوڑھ رکھا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹی پھوٹی جوتی تھی۔ جوہرآباد سے اس کی روانگی کا علم صرف خالو اعجاز اور خالہ فیروزہ کو تھا۔ جوہرآباد سے نکل کر انہوں نے تین چار میل پیدل سفر کیا تھا پھر ایک تانگے پر سوار ہو گئے تھے۔ اب یہ تانگہ ایک طویل سفر کے بعد انہیں نہر پر پہنچانے والا تھا۔ وہاں سے انہیں دوسرا تانگا لینا تھا یا کسی ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ کی مدد حاصل کرنا تھی اور پکی سڑک تک پہنچنا تھا۔

رات تقریباً بارہ بجے کے قریب وہ نہر پر پہنچے۔ یہاں انہوں نے دو تین گھنٹے ایک چھوٹے سے دیہاتی چائے خانے پر گزارے۔ یہاں وی سی آر پر پاکستانی فلم لگی تھی اور اکا دکا مسافر آ جا رہے تھے۔ صبح تین بجے کے قریب انہیں ایک ایسا تانگا مل گیا جو انہیں پختہ سڑک تک پہنچا سکتا تھا۔ شانی اور ڈولا تانگے کی پچھلی نشست پر موجود تھے۔ عارف کمبوہ اور قیصر آگے تھے۔ عارف کمبوہ کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول اور کئی درجن گولیاں موجود تھیں۔ یہ لائسنسی اسلحہ تھا۔ اگر عارف ساتھ نہ ہوتا تو شانی رات کے وقت اس خطرناک علاقے میں سفر نہ کر سکتی۔ عارف ایک مضبوط شخص تھا اور اس کے ہوتے ہوئے شانی کو تسلی رہتی تھی۔

وہ تقریباً دس بجے کے بعد گوجرانوالہ پہنچ سکے۔ شانی کو لگا جیسے وہ ایک عرصے کے بعد کسی شہر کا ٹریفک اور گہما گہمی دیکھ رہی ہے۔ گوجرانوالہ کے گلی کوچے دیکھ کر اسے کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ کبھی کبھار وہ اپنے ابا جی اور بھائی وغیرہ کے ساتھ رنگ والی کی کچی گلیوں سے نکل کر یہاں گوجرانوالہ آیا کرتی تھی۔ تب اسے یہ شہر ایک بہت بڑی دنیا لگتا تھا لیکن اب وہ اس سے بڑے شہر راولپنڈی اور لاہور وغیرہ دیکھ چکی تھی۔ اب گوجرانوالہ اس کے لئے ''بہت بڑی دنیا'' نہیں تھا۔

یہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر لاہور روانہ ہوئے۔ ڈولا شانی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سر سے نیلی چادر ہٹا دی تھی۔ عارف اور قیصر کو بس کے اگلے حصے میں نشست ملی

تھی۔ ڈولے نے شانی سے پوچھا۔ ''یہ عارف صاحب کیا کرتے ہیں؟''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اسٹوڈنٹ لیڈر ہوں۔ بڑے زور سے بات کرتے ہیں اور ان کی بات میں اثر بھی ہوتا ہے۔''

''بس سمجھو کہ یہ اپنے علاقے کا لیڈر ہی ہے۔ یہ ڈاکٹر بہروز کے خاص ساتھیوں میں سے ہے۔ یہ لوگ مل جل کر علاقے میں نئی روشنی لانا چاہتے ہیں۔ چوہدراہٹ کا اثر کم کرنا چاہتے ہیں۔''

''آپ نے عارف صاحب کو کیا بتایا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم بے فکر رہو۔''

''میرے دل میں بڑی امید پیدا ہو گئی ہے باجی جی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ اور عارف مل کر اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔''

''بس تم دعا کرو۔'' شانی نے کہا۔

چند لمحے کے توقف کے بعد ڈولے نے شانی سے پوچھا۔ ''آپ نے اپنے آنے کے متعلق گھر میں کیا بتایا ہے؟''

''گھر میں صرف خالو اور خالہ کو اصل بات کا پتا ہے۔ باقیوں کو یہی معلوم ہے کہ میں جمشید سے ملنے گوجرانوالہ جیل آئی ہوں۔''

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں بس لاہور میں بادامی باغ کے وسیع و عریض اڈے پر پہنچ گئی۔ یہاں سے انہیں ملتان کی بس پکڑنا تھی۔ معلوم ہوا کہ ملتان کے لئے اگلی ایکسپریس بس کچھ لیٹ ہے اور دو گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔ وہ انتظار گاہ میں آ بیٹھے۔ اس بس سٹینڈ کے اردگرد وسیع و عریض لاہور پھیلا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان شہر، سینکڑوں شاہراہیں، ہزاروں گلیاں، اَن گنت گھر۔ شانی کا دھیان آپ ہی آپ لاہور کے نواح میں واقع اس گھر کی طرف چلا گیا جہاں ایک بہت بڑی چار دیواری میں چوہدری بشیر رہتا تھا اور چوہدری بشیر کے ساتھ مُنا بھی رہتا تھا۔ اس کو توتلی زبان میں تاتی کہنے والا اور اس کی گود کو ماں کی گود سمجھنے والا۔

ایک عجیب سی بے تابی شانی کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اسے لگا کہ اس کا دل اندر سے رو رہا ہے۔ وہ مُنے کے شہر سے ہو کر گزر رہی تھی، مُنے سے ملے بغیر۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر اس کے اندر سے ایک عجیب لہر اٹھی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو بہن؟'' عارف نے پوچھا۔

''کہیں نہیں۔ بس ایک فون کرنا ہے۔'' شانی نے کہا اور انتظار گاہ سے باہر نکل آئی۔
سامنے ہی ایک پی سی او تھا۔ ماحول پُرسکون تھا، کیبن بنے ہوئے تھے۔

شانی کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک کیبن میں چلی گئی۔ اس کے شولڈر بیگ میں کوٹھی کے دونوں نمبر موجود تھے۔ ان میں سے ایک چوہدری بشیر کے بیڈ روم کا تھا، دوسرا کامن روم کا۔ اب شام ہونے والی تھی۔ شانی جانتی تھی عموماً اس وقت چوہدری بشیر فیکٹری سے گھر آ جاتا ہے۔ اس نے تصوّر کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ کپڑے بدل کر کامن روم کے نیلے صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا ہے۔ ماسی فردوس، زہرا یا کوئی اور نوکرانی اس کے لئے چائے بنا رہی ہے۔ مُنا ذرا سہما سا ایک طرف لیٹا ہے۔ مُنے کی صورت نگاہوں میں گھومتے ہی شانی کا تذبذب ختم ہوگیا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لیں۔ پھر لرزاں انگلیوں کے ساتھ چوہدری بشیر کی رہائش گاہ کا نمبر پریس کیا۔ پہلی دو تین کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ شانی نے دوسرے نمبر پر ٹرائی کی۔ دوسری طرف چند سیکنڈ تک گھنٹی بجی پھر ایک ایسی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی جس نے اسے سرتاپا محبت اور خوشی سے معمور کر دیا۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم کا ہر ذرہ جی اٹھا ہے۔ یہ مُنا تھا۔ اس کی معصوم آواز ابھری۔ ''ہیلو کون؟ کون بول رہا ہے جی؟''

شانی کا دل چاہا، وہ اسے پکارے۔ اسے بتائے کہ وہ کون بول رہی ہے لیکن وہ ایسا کر کے اس معصوم کو کسی ہیجان میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔ ''ہیلو، آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' معصوم آواز پھر اُبھری۔

شانی نے اپنی سسکی ضبط کرنے کے لئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اچانک ریسیور مُنے کے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔ ''ہیلو کون؟''

یہ چوہدری بشیر کی آواز تھی۔ وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے شانی کو بہت سی مصیبتوں سے بچایا تھا اور بدلے میں بہت سی نئی مصیبتیں شانی کی جھولی میں ڈالی تھیں۔ اس نے شانی پر احسان کئے تھے لیکن ہر احسان کو ایک جبر سے نتھی کر دیا تھا۔ اس کی بارعب آواز سنتے ہی شانی کو اپنے چہرے پر نہایت ناپسندیدہ ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا اور اس کا دل کراہت سے بھر گیا۔

''ہیلو کون بول رہا ہے؟'' اس مرتبہ چوہدری نے نسبتاً بلند اور کرخت آواز میں پوچھا۔

شانی اب بھی خاموش رہی۔ ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا گیا۔

شانی ریسیور کان سے لگائے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ چند سیکنڈ

بعد اس نے ایک بار پھر ہمت کی اور چوہدری بشیر کے نمبر پریس کئے۔ ایک دو سیکنڈ بعد دوبارہ چوہدری بشیر کی آواز ابھری۔ ''ہیلو ... کون؟''

شانی خاموش رہی۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے چند سیکنڈ مزید بات نہ کی تو چوہدری حسبِ عادت فون بند کر کے ریسیور کریڈل پر سے اٹھا دے گا۔ وہ ہمت کر کے بولی۔ ''ہیلو میں...... میں شانی...... بات کر رہی ہوں۔''

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ بس چوہدری کی بوجھل سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ کیا واقعی یہ تم ہو؟''

''ہاں.... میں شانی ہوں۔'' وہ سسک کر بولی۔

''آج کیسے یاد کر لیا تم نے؟'' چوہدری کی آواز میں شدید طنز تھا۔

''میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ یقیناً ان میں سے بہت سی شکایتیں ٹھیک بھی ہوں گی لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا ہے۔''

''ہاں سب کچھ اس کے بس میں چلا گیا ہے...... جس کے بس میں تم خود چلی گئی ہو۔'' بشیر کے لہجے میں زہر تھا۔

''جج...... جی؟ میں سمجھی نہیں!''

''اب میں اس میں سمجھنے سمجھانے والی کیا بات ہے۔ کٹھولی کے میلے والے قصے کے بعد ساری دنیا جانتی ہے کہ چوہدری ارشاد کی شرماں والی دھی رانی کس قاتل ڈکیت کے بس میں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے۔''

''خدا کے لئے چوہدری صاحب، میں پہلے ہی زخمی ہوں، مجھے اور زخمی نہ کریں۔''

''میں زخمی کہاں کر رہا ہوں، زخمی تو تم نے کیا ہے، ہم دونوں باپ بیٹے کو اور اتنی بے دردی سے کہ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی ہے۔''

''مم..... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے.....''

''ہاں تم نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن تمہارے کمرے سے ملنے والی وہ گولیاں اس ڈکیت رستم کے پستول کی تھیں۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن تمہارے سامان سے ملنے والا وہ موبائل سیٹ بھی رستم سے گپ شپ کرنے کے کام آتا تھا۔ تم نے میرے گھر میں رہ کر میرے گھر میں نقب لگائی ہے شانی۔ میرے پاس پورے ثبوت موجود ہیں۔ تم نے کھلی دغابازی کی

ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا چوہدری، کبھی موقع ملا آپ کو بتاؤں گی۔ اب تو بس ایک درخواست کرنے کے لئے فون کیا ہے۔"

"کوئی اور زخم لگانا ہے؟" چوہدری کی آواز میں درد تھا۔

شانی چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "مجھے ایک دفعہ مُنے سے ملا دیجئے۔ بس ایک دفعہ اسے بس دو چار دن کے لئے میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اسے خود آپ کے پاس واپس پہنچاؤں گی۔"

"نہیں شانی! اب بس ہمیں معاف ہی کر دو تو بہتر ہے۔ میں نے اپنے بچے کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا ہے۔ اب وہ تم سے دور رہے تو بہتر ہے۔"

"میں بھی شاید یہی چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے دور رہے لیکن اسے اس طرح تو مجھ سے جدا نہ کریں۔ اس طرح کرنے سے وہ اپنے آپ میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ میں دو تین ملاقاتوں میں خود ہی اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ پیدا کرلوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔" بشیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"منا تمہارے بغیر جینا سیکھ رہا ہے۔"

"آپ صحیح نہیں کہہ رہے۔ . میں جانتی ہوں...... میں نے ابھی اس کی آواز سنی ہے۔ مجھے اس کی آواز بتا دیتی ہے کہ وہ کتنا دکھی یا کتنا خوش ہے۔"

"تم نے میری آواز بھی تو سنی ہے۔ میری آواز تمہیں کیا بتاتی ہے؟" چوہدری بشیر کے لہجے میں زہریلی کاٹ تھی۔

شانی سسکنے لگی۔ دوسری طرف چوہدری یکسر خاموش تھا۔ آخر شانی نے کراہ کر کہا۔ "اچھا مجھے اس کی آواز ہی سنا دیں۔"

"میں نرا کھوتا نہیں ہوں۔ تھوڑی بہت عقل اللہ نے مجھے بھی دی ہوئی ہے۔ تم اپنی آواز سنا کر اس کے اور میرے سکون کو پھر سے برباد کرنا چاہتی ہو۔"

"نہیں ..... میں نہیں بولوں گی۔ بس اس کی آواز سنوں گی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"سوری۔ میں یہ نہیں کرسکتا۔ میں اس کے لئے پورا سیٹ اَپ بنا رہا ہوں۔ اس کے لئے اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اور تمہاری بے رحمی اب ہم باپ بیٹے سے دور رہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

شانی جب انتظار گاہ میں واپس پہنچی تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیا بات ہے باجی جی! آپ کی آنکھیں. . ." ڈولے نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ اُدھر بسوں کا دھواں بہت زیادہ تھا۔" شانی نے بات بنائی اور ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ مُنے کی صدا اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چوہدری کی آواز بھی۔ اس نے کہا تھا، میں اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔ پتا نہیں اس سے چوہدری کا کیا مطلب تھا۔

☆======☆======☆

وہ لوگ رات بارہ بجے کے قریب ملتان پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ ڈولے کے بیان کے مطابق یہ جگہ ہوٹل ڈیلیکس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ راجو اور اس کا دوست پیجا گجر ہوٹل ڈیلیکس میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے دو کمرے لئے۔ ایک میں شانی ٹھہری تھی۔ دوسرے میں ڈولا اور عارف کمبوہ۔ قیصر اپنے گھر واپس چلا گیا تھا۔

شانی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور آئندہ حالات کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ راجو اس کی بات مانے گا یا نہیں۔ اسی طرح اسے سیف کے رویے کے بارے میں بھی کچھ اندازہ نہیں تھا۔ رات آخری پہر وہ سو گئی۔ صبح وہ قدرے دیر سے اٹھی۔ اسے ڈولے نے جگایا تھا۔ زوردار دستک کی آواز سن کر شانی ہڑبڑاتی ہوئی بستر سے نیچے اُتر آئی۔ اس نے دروازہ کھولا، ڈولے کے چہرے پر ہیجان کے آثار تھے۔ "باجی! وہاں چاچے سیف کے گھر کے سامنے جھگڑا ہوا ہے۔"

"کس کا جھگڑا؟"

"تین بندوں نے راجو کو بُری طرح مارا ہے اور گاڑی میں ڈال کر کہیں لے گئے ہیں۔ ابھی قیصر نے آکر مجھے بتایا ہے۔"

"یااللہ خیر۔" شانی کے چہرے پر گہری تشویش اُمڈ آئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"راجو کا دوست پیجا اس کے ساتھ نہیں تھا؟"

"نہیں جی۔" قیصر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "وہ دو دن سے راجو کے ساتھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید کہیں گیا ہوا ہے۔ آپ جلدی چلیں جی۔ پتا نہیں وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہیں۔ کہیں اس کی جان ہی نہ لے لیں۔"

"وہ تھے کون؟" شانی نے پوچھا۔

''ان میں سے ایک کوکب کا ماما خلیل ہے۔ دو بندے باہر کے تھے۔ وہ جیپ پر آئے تھے۔ اسی جیپ پر لے گئے ہیں راجو کو۔'' ڈولے نے جواب دیا۔

''عارف کو جگاؤ۔'' شانی نے ڈولے سے کہا۔

دو منٹ بعد عارف بھی اس کے سامنے تھا۔ شانی نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ قیصر نے ٹیکسی رکوائی اور وہ چاروں اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی تیزی سے حیات کالونی میں واقع کریانہ فروش سیف کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

راستے میں قیصر نے بتایا کہ پرسوں رات بھی راجو اور کوکی کے ماے خلیل میں تلخ کلامی ہوئی تھی۔ خلیل نے راجو کو بُرا بھلا کہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اب وہ ویڈیو کی دکان پر بیٹھا نظر نہ آئے ورنہ وہ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دے گا۔ راجو نے کہا تھا وہ کسی کو تنگ نہیں کرتا، صرف یہاں بیٹھتا ہے اور اسے بیٹھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کل سویرے چاچے سیف اللہ نے اینٹیں لگوا کر چھت کی منڈیر اونچی کروا دی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کوکی بھی راجو کو دیکھنے کے لئے چھت پر آتی تھی۔

ٹیکسی نے ابھی ڈیڑھ دو کلومیٹر ہی طے کئے ہوں گے کہ سامنے سے آنے والے ایک موٹر سائیکل سوار نے ٹیکسی میں ڈولے کو پہچان لیا اور ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ نوجوان قیصر کا دوست تھا۔ اس نے قیصر اور ڈولے وغیرہ کو بتایا کہ راجو کا پتا چل گیا ہے۔

تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں تھانے جا رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اسے تھانے لے گئے ہوں۔ راستے میں شہاب فیکٹری کے ساتھ درختوں میں کچھ بندے جمع تھے۔ مجھے شک گزرا۔ میں نے رک کر دیکھا تو وہ راجو تھا۔ اس کے ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک حاجی صاحب اسے گرم دودھ پلا رہے تھے۔ اب بھی وہ وہیں ہے۔ میں حاجی صاحب سے کہہ کر آیا ہوں کہ اس کا خیال رکھیں۔ میں ابھی دس پندرہ منٹ میں واپس آرہا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ اسے مار کوٹ کر وہاں پھینک گئے ہیں۔'' عارف کمبوہ نے کہا۔

''بالکل جی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ سر پر بھی چوٹ آئی ہے۔ پتلی حالت ہے وچارے کی۔'' قیصر کے دوست نے کہا۔

ٹیکسی کا رخ فوراً شہاب فیکٹری کی طرف موڑ دیا گیا۔ ٹیکسی کو گنجان علاقے سے نکل کر کھلی سڑک تک پہنچنے میں بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا، دفتروں اور سکولوں

کالجوں کی طرف بھاگنے والوں کا رش تھا۔ وہ ٹریفک کے اژدھام سے بمشکل نکل کر بڑی سڑک پر آئے اور شہاب فیکٹری کی طرف روانہ ہوگئے۔ قیصر کا دوست نذیر بھائی اپنی موٹر سائیکل پر ٹیکسی کے آگے تھا۔

وہ لوگ موقع پر پہنچے۔ فیکٹری کے ساتھ کچھ خالی پلاٹ تھے اور درخت وغیرہ نظر آرہے تھے۔ دو تین کھوکھا نما دکانیں بھی تھیں۔ ایسی ہی ایک دکان پر ایک سفید ریش حاجی صاحب اور دو تین مزید افراد بیٹھے تھے۔ راجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قیصر کے دوست نذیر نے حاجی صاحب سے راجو کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ ''اسے روکنے کی بڑی کوشش کی پر وہ رکا ہی نہیں۔ کہتا تھا میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے کہا ابھی تمہارے یار بیلی آتے ہیں، تمہیں گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں گے پر وہ نہیں مانا۔ ایک ویگن والے کو ہاتھ دے کر روکا اور بیٹھ کر نکل گیا۔''

''ویسے وہ ٹھیک تھا۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' ایک دوسرے بزرگ نے کہا۔ ''اس کے سر کا خون بند ہوگیا تھا۔ کہہ رہا تھا میں تھانے جا رہا ہوں۔''

''کہاں گیا ہوگا؟'' شانی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''کہیں تھانے ہی نہ چلا گیا ہو۔'' ڈولے نے سرگوشی کی۔

''یا پھر واپس ہوٹل؟'' قیصر نے کہا۔

شانی نے اپنے برقع کا نقاب درست کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ پھر سیف کے گھر نہ چلا گیا ہو۔''

عارف نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وہ چاروں ایک بار پھر لپک کر ٹیکسی میں بیٹھے اور ٹیکسی حیات کالونی کی طرف روانہ ہوگئی۔

''ذرا تیز چلو ڈرائیور۔'' شانی نے اضطرابی کیفیت میں کہا۔

ڈرائیور نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ شانی کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ صورتِ حال سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ جیپ والے افراد اسی بااثر شخص کے کارندے تھے جس کے ساتھ کوکی کی شادی طے ہوئی تھی۔

ٹیکسی حیات کالونی میں داخل ہوئی اور ایک چھوٹی گلی میں پہنچ کر رک گئی۔ شانی کو سامنے ہی سیف اللہ کا مکان نظر آگیا۔ اس کی نشانی یہ تھی کہ چھت کی تین فٹ اونچی منڈیر پر تازہ تازہ کچھ اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دم شانی کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ ڈولے اور

قیصر وغیرہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دور گلی کے آخری سرے پر لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق ڈولا اور قیصر وہیں پر ٹیکسی سے اُتر گئے۔ وہ دونوں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ شانی وغیرہ کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ انہیں اتارنے کے بعد ٹیکسی آگے بڑھی اور سیدھی ہجوم کے قریب جا کر رک گئی۔ شانی اور عارف کمبوہ باہر نکلے...... منظر سنسنی خیز تھا۔ دو ہٹے کٹے افراد راجو پر جھپٹ رہے تھے۔ محلے کے ایک دو افراد انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں افراد راجو کو بے رحمی سے مارنے لگے۔ راجو جو پہلے ہی زخمی تھا، زمین پر گر پڑا۔ اس کے جسم پر لباس دھجیوں کی صورت میں تھا، اب یہ لباس اور بھی تار تار ہو گیا۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے حملہ آوروں کی طرف بڑھا۔ شانی کا خوف بھی چھوٹی چوہدرانی کی دلیر فطرت کے عقب میں اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ بھی اپنے سر اور چہرے کو برقع سے آزاد کرتی ہوئی عارف کے پیچھے لپکی۔ راجو سے چمٹے ہوئے ایک حملہ آور کو عارف نے دبوچا اور جھٹکے سے دور پھینک دیا۔ دوسرے شخص نے پلٹ کر عارف کو مکا رسید کرنا چاہا۔ قدآور عارف نے ایک طرف جھک کر خود کو بچایا، پھر اس کی زوردار لات مدِمقابل کے سینے پر لگی۔ وہ ڈکراتا ہوا ویڈیو شاپ کے اندر گرا اور اس کے شوکیس کو چکنا چور کر دیا۔ ویڈیو شاپ کی حالت پہلے ہی بہت ابتر ہو رہی تھی۔

ایک حملہ آور نے عقب سے عارف کے سر پر ہاکی رسید کرنا چاہی۔ شانی چیل کی طرح جھپٹی اور اس کے سامنے آگئی۔ اس شخص کی اٹھی ہوئی لاٹھی شانی نے اپنی گرفت میں لے لی اور چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف عارف اپنے دونوں حریفوں کو ٹھیک ٹھاک ضربیں لگا چکا تھا۔ وہ بے حد مشتعل نظر آ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کی دلیر آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ''خبردار پیچھے ہٹ جاؤ۔ جان سے مار دوں گا۔'' وہ حملہ آوروں کو وارننگ دے رہا تھا۔

دوسری طرف ہاکی بردار اور شانی میں زور آزمائی بدستور جاری تھی۔ ہاکی پر شانی کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ ہاکی بردار اپنے ہی زور میں پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ شانی نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کر کے ہاکی چھین لی۔ وہ طیش سے پھنکاری۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے تم نے، وہ اکیلا ہے۔ بے سہارا ہے۔ تم جو چاہو اس کے ساتھ کر سکتے ہو۔'' اس نے ہاکی دور پھینک دی۔

حملہ آوروں کو شاید اچانک اور اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ وہ دور ہٹ گئے

تھے۔ عارف کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ پستول کسی بھی وقت شعلہ اگل کر کسی کو موت کے سفر پر روانہ کر سکتا ہے۔ محلے کے کچھ معززین نے عارف کو گھیر لیا تھا اور اس سے درخواست کر رہے تھے وہ فائر نہ کرے۔

یکایک شانی کی نگاہ راجو پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ وہ ویڈیو شاپ کے بکھرے ہوئے شیشوں کے اوپر پڑا تھا۔ اس کا زخمی سر ایک دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ اس کا ریشمی کڑھائی والا کرتہ تار تار ہو کر اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس کی بنیان بھی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے اکھڑے جسم پر کئی ضربات نظر آ رہی تھیں۔

شانی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ اس کا زخمی سر اپنی گود میں رکھا۔ ''راجو اٹھ جاؤ۔ اٹھ کر بیٹھ جاؤ، شاباش۔'' شانی نے اسے ہمت دلائی... لیکن پھر اچانک اس کے جسم میں کرب ناک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ راجو کو صرف ضربات کا صدمہ ہی نہیں تھا، اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہو چکا تھا۔ کیا ہوا تھا؟ اس کی حالت کیوں غیر ہو رہی تھی؟ ایک ساتھ کئی سوال شانی کے ذہن میں ابھرے۔

اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے راجو کی ٹھوڑی تھامی اور چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کی ایک باچھ کے قریب شانی کو جھاگ کے بلبلے سے دکھائی دیئے۔

''راجو کیا ہوا ہے؟ کیا کیا ہے تم نے؟'' اس نے راجو کو جھنجھوڑا۔

راجو کے سینے سے خرخر کی عجیب آواز نکلی۔ اس کی پتلیاں چڑھتی جا رہی تھیں۔

شانی چلائی۔ ''عارف..... دیکھو اسے۔ اس نے کچھ کھا لیا ہے۔''

عارف نے پستول قمیص کے نیچے لگایا اور لپک کر شانی کی طرف آیا۔ ایک دو افراد اور بھی لپکے۔ راجو کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔ یہ مار پیٹ کا اثر ہرگز نہیں تھا۔ ''لگتا ہے شانی اس نے کچھ کھا لیا ہے۔'' عارف نے کہا۔

''کوئی گاڑی روکو عارف۔ اسے ہسپتال پہنچائیں۔ اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔'' شانی کی آواز فرطِ غم سے لرز رہی تھی۔

''گاڑی ہے میرے پاس۔ میں لاتا ہوں۔'' ہجوم میں سے ایک شخص بولا۔

راجو کی ابتر حالت دیکھ کر کوکی کا ماموں اور دیگر حملہ آور تتر بتر ہو گئے تھے۔ چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ راجو کی حالت دیکھنے کے لئے لوگ امڈ پڑے۔ راجو شیشے کی کرچیوں پر نیم دراز تھا۔ اس کا سر شانی کی گود میں تھا۔ شانی کے برقع کا بالائی حصہ اُتر کر اس کے

کندھوں پر تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ الم و اضطراب کی تصویر نظر آتی تھی۔ ایک گاڑی تیزی سے شانی اور راجو کے قریب آ کر رکی۔ راجو کو اٹھا کر پچھلی نشست پر لٹایا گیا۔ شانی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ عارف اور ایک محلے دار بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راجو اب نیم بے ہوش تھا۔ گاڑی تیزی سے نشتر ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ شانی، راجو کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش نہ ہو جائے لیکن وہ دھیرے دھیرے کسی اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی راجو کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک وہ مکمل بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور ہونٹ نیلے ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے کوئی زہریلی شے کافی بڑی مقدار میں کھائی تھی۔ یہ میڈیکولیگل کیس تھا۔ ہسپتال والوں نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے باہر شانی، عارف اور محلے کے ایک دو افراد موجود تھے۔ شانی کے دل سے خیر کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ ویڈیو شاپ کے سامنے ہونے والی لڑائی میں عارف نے پستول نکال لیا تھا۔ شانی چاہتی تھی کہ پولیس کے آنے سے پہلے عارف کہیں ادھر ادھر ہو جائے لیکن وہ بے فکر نظر آ رہا تھا۔ اس نے شانی کو بھی تسلی دی۔

ایک جاں گسل انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ لڑکے نے بھاری مقدار میں گندم میں رکھنے والی زہریلی گولیاں نگل لی تھیں۔ اس کا معدہ واش کر دیا گیا ہے اور دیگر طبی امداد بھی دی ہے لیکن اس کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد راجو کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا اور اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

اسی دوران میں پولیس کے دو افراد بھی کارروائی کے لئے پہنچ گئے۔ یہ سارا معاملہ عارف نے خود ہینڈل کیا۔ اس نے پولیس اہلکاروں کو ایک کارڈ بھی دکھایا۔ یہ کارڈ ایس پی حاجی حیات خان کے بااعتماد ماتحت ایس آئی اختر نے ہی اسے دے رکھا تھا۔ پولیس والوں نے زیادہ مین میخ نہیں نکالی اور واجبی کارروائی کر کے چلے گئے۔

شانی نے عارف سے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا۔ راجو تو بالکل بے ہوش ہے۔''

اتنے میں وہی ڈاکٹر نظر آیا جس نے راجو کا معدہ صاف کیا تھا۔ شانی نے ڈاکٹر سے یہی سوال پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''محترمہ، ہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دوائی کی کافی مقدار معدے میں گئی ہے۔ قریباً دس بارہ گولیاں تو ہوں گی۔ شاید اس سے بھی زیادہ ہوں۔ پھر معدہ واش ہونے تک کافی ٹائم بھی گزرا ہے اور پھر اسے کافی چوٹیں بھی آئی ہیں جن میں اس کا خون بھی بہت بہا ہے۔ آپ لوگ دعا کریں۔''

''اسے کب تک ہوش آ جانا چاہئے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اگلے تین چار گھنٹے اہم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں مزید صفائی بھی کرنا پڑے۔''

وہ بڑا تکلیف دہ دن تھا۔ راجو کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ اس کی سانس بار بار اُکھڑ جاتی تھی اور منہ سے خون رسنے لگتا تھا۔ اگلے آٹھ گھنٹے میں اسے دوبارہ آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ کئی نالیوں نے اس کے جسم کو جکڑ رکھا تھا۔ آخر جب اس کی حالت بہتر نہیں ہوئی تو شانی نے اشک بار لہجے میں عارف سے کہا۔ ''عارف! ہمیں راجو کے وارثوں کو اطلاع دے دینی چاہئے۔ اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو..... ؟'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

عارف نے کہا۔ ''لیکن اطلاع پہنچائے گا کون؟''

''اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایس پی حاجی حیات صاحب یا سب انسپکٹر اختر سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ وہ میانہ میں تاؤ حشام تک اطلاع پہنچا دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی مقامی پولیس افسر کو کہا جائے اور وہ وائرلیس وغیرہ پر تھانہ ٹھیکرا تک خبر پہنچانے کی کوشش کرے۔''

کچھ دیر تک اس بارے میں عارف اور شانی میں مشورہ ہوتا رہا۔ اسی دوران میں عارف نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ چیزیں شانی کے حوالے کیں۔

ان میں سے کچھ چیزیں راجو کے پھٹے ہوئے کرتے سے برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک طلائی انگوٹھی اور ایک طلائی زنجیر تھی۔ کرتے سے برآمد ہونے والی اشیاء میں سات آٹھ سو کی نقدی، ایک دو رسیدیں اور کچھ کاغذات تھے۔ ان کاغذات میں دو خط بھی تھے۔ ایک خط کوکی نے راجو کو لکھا تھا۔ دوسرا راجو نے کوکی کو لکھا تھا۔ کوکی والا خط تو راجو تک پہنچ گیا تھا لیکن راجو والا خط اس کے پاس ہی رہ گیا تھا۔

کوکی والے خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پچھلے چار پانچ دنوں کے اندر ہی لکھا گیا ہے۔ کوکی نے لکھا تھا۔ ''راجو! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے کہا ہے کہ میں تم سے ملوں۔ میں ایک بار تو کسی طرح ملی، اب دوبارہ تم سے نہیں

مل سکوں گی۔ ابا جی اور ماموں خلیل ہر وقت مجھ پر نظر رکھتے ہیں۔ اب شادی تک میرے گھر سے نکلنے پر پابندی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ ساری پابندیاں توڑ دوں اور اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن راجو میں اپنے ماں باپ کو اور دکھ نہیں دے سکتی۔ اب تو جو کچھ ہے سہنا پڑے گا۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کچھ کھا کر مر جاؤں لیکن مروں گی تو ماں باپ کی عزت مٹی میں ملے گی۔ ٹھیک ہے میرے مُردے کو ڈولی میں ڈال کر بھیج دیں یہ لوگ لیکن میں تمہیں بتا دوں راجو میں زیادہ دیر جیوں گی نہیں۔

تم سے کچھ اور نہیں کہنا راجو! بس ایک آخری درخواست ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ میں جانتی ہوں یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن میری خاطر راجو صرف میری خاطر۔ تم چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی لوٹ کر نہ آنا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی تمہاری اس قربانی کو یاد کرتی رہوں گی۔ تمہارے نام کے آنسو ہمیشہ میری آنکھوں میں رہیں گے۔''

اس سے آگے کچھ غم ناک شعر لکھے گئے تھے اور راجو کو خدا حافظ کہا گیا تھا۔

اسی خط کا جواب راجو نے لکھا تھا یا اپنے دوست سے لکھوایا تھا لیکن یہ خط کوکب یعنی کوکی تک پہنچ نہیں سکا تھا۔ راجو کا مختصر خط کچھ یوں تھا۔ ''کوکی! میں تیرے پیار میں بہت آگے جا چکا ہوں۔ اب میری واپسی نہیں ہو سکتی۔ تم نے لکھا ہے کہ میں نے آنے میں بہت دیر کر دی لیکن تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم پاک پتن سے آ گئیں اور اپنا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔ اگر تم مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی ہو تو میں بھی جھلوں کی طرح جگہ جگہ تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔ اگر تم پاک پتن میں اپنی سہیلی کو ہی کچھ بتا جاتیں تو میں تم تک پہنچ جاتا لیکن یہ بھی نہ ہوا۔

تمہارے لئے مرنا مشکل ہوگا لیکن میرے لئے تو نہیں ہے۔ میرا کون ہے پیچھے رونے والا۔ ایک باپ ہے وہ بھی بس نام کا ہی باپ ہے۔ جس طرح تمہارے باپ کو اپنی بے عزتی نہیں بھول رہی، اسی طرح میرے باپ کو وہ دولت نہیں بھول رہی جو وہ میری شادی کے ذریعے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ لوگ مجھے تم کو نہیں دیں گے لیکن یہ مجھے مرنے سے تو نہیں روک سکتے۔ میں تمہارے گھر کے سامنے اپنی جان دے دوں گا۔ تمہاری ڈولی اٹھنے سے پہلے میرا جنازہ اٹھے گا۔ ٹھیک ہے پھر میرے مرنے کے بعد تم جس کی چاہے ہو جانا۔ لوگ کہتے ہیں کہ مرنا مرنا سب کرتے ہیں مگر مر کر کوئی نہیں دکھاتا۔ میں تمہیں مر کر بھی دکھا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

خط پڑھتے ہی شانی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے آئی سی یو کے دیوار گیر شیشے کے پار دیکھا۔ وہ نوخیز عاشق مختلف مشینوں اور نالیوں میں جکڑا ہوا بے حرکت پڑا تھا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی اس کے چہرے پر۔

وہ رات امید و بیم کی کیفیت میں گزر گئی۔ ڈاکٹر پوری کوشش کر رہے تھے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کدھر جائے گا۔

شانی مسلسل شیشے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ مریض کی حالت ایسی تھی کہ ڈاکٹر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

صبح سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی امید کی کچھ کرنیں بھی نظر آئیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض کے وائٹل سائنز کچھ بہتر ہوئے ہیں۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ گہری بے ہوشی سے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آ گیا ہے۔ شانی اسٹاف سے اصرار کر کے اندر چلی گئی۔ اس نے راجو کو قریب سے دیکھا۔ اس کے چہرے اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی پلکوں کی مدھم جنبش محسوس کی اور اطمینان کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے اندر ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ ایک انوکھی لہر۔ وہ عارف کو راجو کے پاس چھوڑ کر ہسپتال سے باہر نکلی اور ایک تانگے پر سوار ہو کر سیدھی حیات کالونی پہنچ گئی۔ اس نے برقع ہسپتال میں ہی چھوڑ دیا تھا اور سر پر موٹی اوڑھنی لے لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کوکی اور اس کے گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہوگا لیکن وہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ چکی تھی۔

اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ شانی دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہی سیف اللہ ہوگا۔ وہ اکہرے بدن کا تھا۔ بال سفید تھے بس کہیں کہیں سیاہی نظر آتی تھی۔ کسی وقت وہ ایک خوبرو شخص رہا ہوگا مگر اب بڑھاپے اور مالی مشکلات نے اس کے چہرے کو عام سا چہرہ بنا دیا تھا۔ کئی تلخ سلوٹیں اس کے چہرے پر موجود تھیں۔

''جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ شانی کو کل والے قصے کے حوالے سے پہچان نہیں پایا تھا۔

''میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔ آپ کا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گی۔''

''لیکن ؟'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ پھر بولا۔ ''ایک منٹ ٹھہریں۔ میں دوسرا دروازہ کھولتا ہوں۔''

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد بیٹھک نما کمرے کی چٹخنی کھلی اور سیف نے شانی کو اندر بلا لیا۔ یہاں فرش پر ایک دری بچھی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ سے پتا چلتا تھا کہ یہ ایک

سفید پوش شخص کا گھر ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں ڈھولک اور گلاب کے مرجھائے ہوئے گجرے پڑے تھے۔ غالباً پرسوں ہونے والی شادی کے سلسلے میں یہاں ڈھولک بجتی رہی تھی۔ سیف نے شانی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیٹی! میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''آپ کا بیٹی کہنا اچھا لگا ہے۔'' شانی نے ممنونیت سے کہا۔

''بیٹی کو بیٹی نہیں کہوں گا تو اور کیا کہوں گا؟''

''میں بھی آپ کو باپ کی جگہ سمجھ کر آپ سے ایک بات کہنے آئی ہوں..... میں آپ سے راجو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' سیف کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ وہ شانی کو غصیلی نظروں سے تکتا رہا۔ پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''تم کیا لگتی ہو راجو کی؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میرا کوئی رشتہ تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے لئے اسی طرح اجنبی ہے جیسے آپ کی بیٹی کوکب۔ بس ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے کچھ دن راجو کی حویلی میں رہنا پڑا ہے۔ میں نے وہاں رہتے ہوئے راجو کو دیکھا اور پرکھا ہے اور اس کی سچائی اور محبت کو محسوس کیا ہے جو اس کے دل میں آپ لوگوں کے لئے موجود ہے۔''

''کیا تم اس کی وکالت کرنے کے لئے یہاں آئی ہو؟'' سیف کا لہجہ بگڑ گیا۔

''نہیں انکل! میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ نشتر ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ کبھی لگتا ہے بچ جائے گا، کبھی لگتا ہے ختم ہو جائے گا۔ اس کی حالت نازک ہے۔ اس نے جو کچھ کیا غلط کیا ہے لیکن اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا کوئی آوارہ گرد نہیں ہے۔ وہ آپ کی بیٹی کو دل سے چاہتا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے۔''

''دیکھو! اس خبیث کے ساتھ میری بیٹی کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے۔'' سیف نے وارننگ دینے والے انداز میں اپنی انگلی شانی کی طرف اٹھائی۔ غصے سے اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

''معاف کیجئے انکل! آپ کی بیٹی کے ساتھ اس کا نام آچکا ہے۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے دیکھنے میں بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے سینے میں دل بھی بہت اچھا ہوگا۔ آپ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ آپ ان بچوں کو بے گناہی کی سزا دے رہے ہیں۔ اگر اس سارے معاملے میں کوئی قصوروار تھا تو وہ چوہدری

حشام تھا۔ بلاشبہ اس نے آپ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ آپ کے ساتھ بدتمیزی سے بولا اور ڈرایا دھمکایا۔ سزا تو اس کو ملنی چاہئے تھی اور سزا یہ تھی کہ آپ اس کی خواہش سے الٹ کرتے لیکن آپ تو ان دونوں بچوں کو جدا کر کے حشام کی ہی آرزو پوری کر رہے ہیں۔''

''میں کسی کی آرزو پوری نہیں کر رہا اور نہ کسی کی آرزو برباد کر رہا ہوں۔ میں صرف وہ کر رہا ہوں جو ایک بیٹی کے باپ کی حیثیت سے مجھے کرنا چاہئے اور یہ میرا حق بھی ہے۔ مجھے کسی باپ بیٹے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں کیوں پھنسوں اس دلدل میں۔ میں ایک غریب کمزور بندہ ہوں۔ اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں لیکن اگر کسی نے مجھ پر کچھ ٹھونسنے کی کوشش کی تو میں چپ چاپ نہیں سہوں گا۔ منہ توڑ جواب دوں گا۔''

''منہ توڑ جواب تو آپ اسے دیں گے جو آپ سے لڑے گا۔ وہ جو آپ کی بیٹی کو چاہتا ہے، وہ تو نوعمری میں دنیا سے ہی منہ موڑ کر جا رہا ہے۔ کیا آپ اس کی لاش کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ یا اس بیٹی کو جو آپ کے سامنے زبان بھی نہیں ہلا سکتی؟''

سیف دہاڑ کر بولا۔ ''دیکھو تم نے پھر میری بچی کے ساتھ اس کا نام لیا ہے۔ تم نے پھر بکواس کی ہے۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا یہ بکواس نہ کرنا۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہے میرے گھر میں اس طرح کی بات کرنے کی۔ تم ہو کون؟ آئی کہاں سے ہو؟ کون ہو تم؟'' وہ بڑے زور سے چنگھاڑا۔

''آپ میری بات سنیں۔ آپ تو.....''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' اس نے چلا کر شانی کی بات کاٹی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو نکلو یہاں سے..... نکلو۔'' اس نے دروازے کی طرف انگلی اٹھائی۔

اس سے پہلے کہ شانی اسے کوئی سخت جواب دیتی، اچانک کسی اندرونی کمرے سے ہلکی سی چلانے کی آواز آئی۔ یہ کوئی عورت تھی۔ سیف کا چہرہ متغیر ہوا۔ وہ شانی کو وہیں چھوڑ کر اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شانی نے کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا۔ اندرونی کمرے میں بلب روشن تھا۔ اسی روشنی میں شانی کو ایک لڑکی فرش پر پڑی نظر آئی۔ ایک فربہ اندام عورت نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ ایک لڑکی اس کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ گھبراہٹ میں چیخ رہی تھی۔ ''پانی لاؤ ثریا۔ جلدی کرو۔''

ایک اور عورت بھاگی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ وہ بے ہوش لڑکی کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگی۔

سیف کا رنگ ہلدی تھا۔ وہ بھی تیزی سے فرش پر بیٹھ گیا اور لڑکی کو اخبار سے ہوا دینے

لگا۔

شانی سے رہا نہیں گیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ اس دوران میں سیف اللہ کسی ڈاکٹر کو بلانے دوڑ گیا تھا۔ شانی نے لڑکی کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ دبلی پتلی لیکن خوبصورت تھی۔ اس کے چہرے کی اہم خوبی نقوش کی معصومیت تھی۔ اس کے بال بے حد نفاست سے تراشے گئے تھے۔ شانی سمجھ گئی کہ یہی کوکی ہے۔ جو لڑکی اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرتے ہوئے رو رہی تھی وہ یقیناً اس کی بڑی بہن سنبل تھی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' شانی نے بے ساختہ پوچھا۔

''دل گھٹ گیا ہے۔'' پانی لانے والی عورت نے دیہاتی لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک دو بار پہلے بھی ایسے ہوا ہے۔''

اتفاقاً شانی کے شولڈر بیگ میں کورامین کے ڈراپس موجود تھے۔ یہ اس نے جوہر آباد کے ہسپتال سے تابندہ کے لئے منگوائے تھے۔ وہ جلدی سے کوکی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا سر اونچا کیا تاکہ اس کا منہ کھلے اور وہ آسانی سے سانس لے سکے۔ اس کے گلے میں دوپٹے نے سختی سے بل کھا رکھا تھا۔ شانی نے یہ بل ڈھیلا کیا۔ پھر تھوڑا سا پانی منگوایا اور اس میں قطرے ڈال کر چمچ سے کوکی کو پلانے کی کوشش کی۔

اسی دوران میں سیف ہانپتا ہانپتا ہوا واپس آ گیا۔ ڈاکٹر نہیں ملا تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''میں ٹیکسی لاتا ہوں، اسے ہسپتال لے جاتے ہیں۔''

شانی نے کہا۔ ''ایک منٹ ٹھہریں، دوا کا اثر دیکھنے دیں۔''

سب آنسو بہا رہے تھے۔ شانی نے دیکھا سیف کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔

کوکی کی والدہ دل گیر لہجے میں بولی۔ ''یا اللہ! میری بچی کو کچھ نہ ہو۔ اس کے بدلے میری جان لے لے۔ اس کی ساری بلائیں مجھے دے دے۔ ہائے میری بچی!'' وہ اس کی ٹھنڈی ٹھار پیشانی چومتی چلی گئی۔

ذرا دیر بعد کوکی کی سانس ہموار ہوگئی اور اس کی پلکوں میں بھی جنبش پیدا ہوئی۔ گھر والوں کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ اسے اٹھا کر پلنگ پر ڈالا گیا۔ بالکل ہلکی پھلکی تھی وہ۔

اچانک نہ جانے کوکی اور سنبل کی والدہ کو کیا ہوا۔ انہوں نے زمین پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''خدا کے لئے کوکی کے ابا! اس پر رحم کریں۔ اسے یوں بے موت نہ ماریں یا اس سے پہلے مجھے مار دیں۔'' وہ شوہر کی ٹانگوں سے چمٹ گئیں اور بلکنے لگیں۔

سیف نے انہیں بمشکل اپنے قدموں سے اٹھایا۔ وہ خود بھی اشک بار تھا۔ پھر وہ تیزی

سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شانی بھی وہیں رہی اور دوسروں کے ساتھ مل کر کوکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد کوکی سنبھل گئی۔ اس کی آنکھیں شفاف جھیل جیسی تھیں اور اس کے باقی چہرے کی طرح ہی معصوم نظر آتی تھیں۔

کوکب کے گرد موجود عورتیں جو باتیں کر رہی تھیں، ان سے شانی کو معلوم ہوا کہ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اسی کمزوری کے سبب اسے ایک دو دفعہ پہلے بھی غشی کی کیفیت سے گزرنا پڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے ابا جی کو بیٹھک میں گرجتے برستے سنا تھا اور بے چاری کو پھر اختلاجِ قلب ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی تھی۔

پورے گھر میں سوگواری کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ شادی والا گھر تھا اور یہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ایک نادیدہ خوف تھا جس نے گھر کی خواتین کو آسیب کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتی تھیں اور گاہے بگاہے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھنے لگتی تھیں۔

سنبل نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔ ''باجی! ابو جی آپ سے غصہ ہو رہے تھے؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں بیٹی؟'' ثریا نامی عورت نے پوچھا۔

''بس میرا ہی قصور تھا۔'' شانی اشک بار ہو کر بولی۔

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' سنبل نے پوچھا۔ وہ دلکش آواز کی مالک تھی۔

''ہسپتال سے۔ جہاں راجو زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ شانی سے کوئی اور سوال پوچھا جاتا وہ تیزی سے واپس بیٹھک نما کمرے میں آ گئی۔ سیف بڑے غمناک انداز میں گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ شانی چند سیکنڈ کھڑی رہی پھر اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ''ابھی آپ کی بیوی نے جو بات کہی ہے وہی میں بھی آپ سے کہتی ہوں۔ خدا کے لئے اپنی بیٹی پر رحم کریں۔ اسے یوں بے موت نہ مرنے دیں۔''

''کیا کروں میں؟ کیا کروں؟'' سیف کراہتی ہوئی بلند آواز میں بولا۔

''دیکھیں، آپ پھر بلند آواز میں بات کر رہے ہیں۔ آپ کے اسی طرح بولنے سے کوکب کو کچھ ہوا ہے۔''

سیف کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ شانی

مسلسل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ دوبارہ بولی۔ ''میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آپ کسی اور کی طرف دیکھنے کی بجائے صرف اپنی بیٹی کی طرف دیکھیں اور کوئی بہتر فیصلہ کریں۔''

سیف نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تم جاؤ یہاں سے۔ میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آ رہا۔'' اس کا ہاتھ اپنی پیشانی پر تھا۔

شانی سمجھ گئی کہ اب اس کے بیٹھنے سے اس کا جانا زیادہ سودمند ہے۔

وہ وہاں سے سیدھی ہسپتال آئی۔ اس کی آنکھوں میں مسلسل کوکب کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کتنی معصومیت، کتنی سادگی تھی۔ اس کی عمر یقیناً سولہ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنے چہرے سے بچی نظر آتی تھی اور یہ بچی خاموشی کی زبان میں اپنے باپ سے کہہ رہی تھی، میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے۔ مجھے موت کی سزا نہ دو۔ ابھی میں نے دنیا میں کچھ دیکھا نہیں۔

شانی ہسپتال پہنچی تو عارف بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ راجو کی حالت قدرے بہتر ہے۔ شانی نے کہا۔ ''پھر کیا خیال ہے؟ ابھی میانہ میں اطلاع پہنچائی جائے یا نہیں؟''

''بہتر تو یہ ہے کہ اب ذرا دیکھ لیا جائے۔'' عارف نے کہا۔

شانی کی اپنی رائے بھی یہی تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں راجو کی حالت میں اُتار چڑھاؤ آتا رہا لیکن اس کی طبیعت مجموعی طور پر بہتری کی طرف مائل رہی۔ دو تین مرتبہ شانی نے اندر جا کر اس سے مختصر بات بھی کی۔ اس نے زبان سے کسی بات کا جواب نہیں دیا، بس اثبات یا نفی میں سر ہلاتا رہا۔ شانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت بھی نمودار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے مسلسل نم تھے۔

☆======☆======☆

اگلے روز شانی پھر حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔ اسے اس بات کا اندیشہ تھا کہ سیف بُری طرح بگڑے گا لیکن وہ ان اندیشوں کے سبب اس معاملے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ خلاف توقع سیف بالکل گم صم اور آزردہ خاطر تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کچھ تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتا تھا لیکن شانی کو دیکھ کر بیٹھ گیا۔

شانی نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے کل چھوڑا تھا۔ اس نے سیف سے کہا۔ ''انکل! آپ نے مجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہوئی ہے۔ آپ مجھ سے کہیں بڑھ کر عقل و

بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ یہ عشق محبت کا کوئی عام معاملہ نہیں ہے۔ یہ دونوں واقعی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے بڑے ڈاکٹر سے خود بات کی ہے۔ وہ راجو کے بچنے کو معجزہ قرار دے رہے ہیں۔ یہاں کوکب کی حالت بھی میں نے دیکھی ہے۔ پلیز انکل...... پلیز اس بارے میں کچھ سوچیں۔''

سیف نے عجیب بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں...... اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب وقت گزر گیا ہے۔''

''پلیز انکل۔'' شانی نے بڑی اپنائیت سے سیف اللہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''نہیں، اب نہیں۔ پوری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ کارڈ بھیجے جا چکے ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا ہو چکا ہے۔ میرا ہونے والا داماد کبھی نہیں مانے گا۔ بہت بڑا طوفان آئے گا۔''

''کوئی طوفان نہیں آئے گا اور نہ آنا چاہئے۔ جس شخص سے کوکب کی شادی ہو رہی ہے اسے بھی سوچنا چاہئے۔ ساری زندگی جھوٹ کے ساتھ گزارنے سے بہتر ہے کہ اس وقتی اَپ سیٹ کو برداشت کرلیا جائے۔''

''نہیں، یہ بہت مشکل ہے۔ تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ ہم دو طرف سے مارے جا رہے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ راجو کے گھر والے یہ کام ہونے دیں گے۔ راجو کا باپ جتنا سخت ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس کی سختی دیکھ کر ہی میں نے پاک پتن میں اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔''

شانی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں انکل سیف! چوہدری حشام وغیرہ کی طرف سے میں آپ کو مکمل اطمینان دلاتی ہوں۔ اس کا بیٹا...... سب سے لاڈلا بیٹا، زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا ہے۔ وہ اگر اب بھی نہیں سمجھے گا تو اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔ اسے اب سب کچھ ماننا پڑے گا۔''

''مم...... مگر جن لوگوں میں کوکب کا رشتہ طے ہوا ہے وہ اب کسی صورت پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ وہ بڑے زور والے ہیں۔ چوہدری حشام کا ماننا یا نہ ماننا تو بعد کی بات ہے، پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ کوکب کے سسرالی اپنی منگ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بہت بڑا بکھیڑا ہے، اس میں بدنامی اور دکھ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اب یہ سب کچھ جھیل سکوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میرے حال پر رحم کرو۔ جو کچھ طے ہو چکا ہے اسے ہو جانے دو۔ اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکاؤ۔''

شانی سمجھ گئی کہ بیٹی کے جگر پاش اشکوں نے باپ کے پتھریلے سینے میں دراڑ پیدا کر دی ہے۔ وہ اب مختلف انداز سے سوچ رہا ہے لیکن اب اس کے ذہن میں دو خوف ہیں، ایک

جگ ہنسائی کا... اور دوسرا اپنے سمدھیوں کا۔ پہلا خوف بھی زیادہ اہم نہیں رہا تھا۔ کیونکہ ویڈیو شاپ والے واقعے کے بعد اور راجو کی خودکشی کی نہایت سنگین کوشش کے بعد کوکی اور راجو کی بات راز نہیں رہی تھی جو تماشا لگنا تھا وہ تو لگ ہی چکا تھا لیکن دوسرا خوف شدید تھا۔

شانی کے پوچھنے پر پتا چلا کہ کوکی کا ہونے والا شوہر لاہور کا کوئی صنعت کار ہے۔ خاصی بڑی پراپرٹی اور حیثیت کا مالک ہے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ وہ جواں سالی میں ہی کلی طور پر خودمختار ہے۔ گارڈز کا ایک دستہ ہر وقت اس کے ہمراہ رہتا ہے۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہونے لگی۔ سیف کی بیوی شانی کے پاس آ بیٹھی اور سیف اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک موٹر سائیکل کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، جس سے پتہ چلا کہ سیف کہیں چلا گیا ہے۔

شانی جلد ہی سیف کی بیوی سے گھل مل گئی۔ کچھ دیر بعد سنبل اور ثریا بھی شانی کے پاس آ بیٹھیں۔ شانی نے کل کوکب کو ہوش میں لانے میں ان کی بڑی مدد کی تھی۔ وہ تینوں عورتیں شانی کی ممنون نظر آ رہی تھیں۔ شانی نے ان سے اپنا مختصر تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ وہ راجو اور کوکب کی سچی ہمدرد کی حیثیت سے یہاں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ راجو کے گاؤں میانہ میں رہی ہے۔ وہاں راجو سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ راجو ایک اچھا لڑکا ہے لیکن اس کے باپ نے اسے غلط ماحول میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ راجو پاک پتن والی لڑکی کو بھولا نہیں ہے اور اس کا غم اندر ہی اندر اسے کھا رہا ہے۔ اس سارے قصے میں شانی نے ڈولے کا ذکر بوجوہ گول کیا۔

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی دوران کوکب بھی نقاہت سے چلتی ہوئی وہاں آ گئی۔ اس نے شانی کو سلام کیا اور سوگوار سی ایک طرف بیٹھ گئی۔ کوکب کی والدہ عطیہ نے شانی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی! یہی باجی ہیں جنہوں نے کل تمہیں دوا کھلائی تھی اور تمہیں ہوش دلایا۔''

کوکب یعنی کوکی نے ایک بار پھر سلام کیا۔ ''ابو کہاں گئے ہیں؟'' اس نے کمزور آواز میں ماں سے پوچھا۔

''ہسپتال... ڈاکٹر نے بلایا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔'' عطیہ بیگم نے جواب دیا۔

''کیوں آنٹی خیر ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''کوکی کے چھوٹے چاچا ہسپتال میں ہیں۔ پانچ چھ مہینے پہلے اس کا موٹر سائیکل پر ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ کمر کی ہڈی پر چوٹ آئی تھی۔ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پچھلے مہینے آپریشن ہوا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے۔''

شانی نے دیکھا کہ کوکی کے گلے میں دوپٹہ کل کی طرح مضبوطی سے لپٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے گلے کو باندھ کر رکھنا چاہتی ہے یا کچھ چھپا رہی ہے۔

شانی نے نرمی سے کہا۔ ''تم اس طرح دوپٹہ کیوں لپیٹتی ہو۔ کل اسی وجہ سے تمہارا دم گھٹنے لگا تھا۔''

کوکی نے دوپٹے کا بل ذرا ہلکا کر دیا۔ عطیہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر اسے بالکل ہی کھول دیا۔ ذرا جھنجھلا کر بولیں۔ ''کیوں کرتی ہے اس طرح، چھوٹا سا نشان ہی تو ہے۔ اب تو ویسے بھی مدھم پڑ گیا ہے۔''

شانی نے دیکھا کوکی کی گردن کی نہایت ملائم اور شفاف جلد پر ایک سیاہی مائل نشان موجود تھا۔ شانی سوالیہ نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ عطیہ بیگم کے بجائے کوکی کی چاچی ثریا نے جواب دیا۔ ''تین مہینے پہلے کوکی کانی بیما ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک اللہ والے سے نوری عمل کرایا تھا۔ اسی کا نشان ہے۔''

''نوری عمل کا نشان؟'' شانی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی! کوٹ لکھپت میں بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے ہیں۔ میرے ماموں سسر اور اس کے تینوں بچوں کو دماغ کا دورہ پڑتا تھا۔ دنیا جہان کے ڈاکٹروں سے علاج کرا کے دیکھ لیا۔ لاکھوں ہی خرچ کیے ہوں گے۔ پر آرام آیا تو پیر مستان جی سے آیا۔ اب بالکل بھلے چنگے ہیں اور ایسے ہزاروں ہی لوگ ہیں جن کو پیر مستان شاہ سے فیض پہنچا ہے۔ اللہ سوہنے نے بڑی شفا دی ہے ان کے ہاتھ میں۔''

''لیکن یہ نشان؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہاں سے گندہ خون نکالا تھا انہوں نے۔ اس خون کے نکلنے سے کوکی پر ''اثر'' ختم ہوا تھا۔ پیر صاحب کی کرامات یہی ہے کہ مریض کے پنڈے میں سے بس وہی خون نکالتے ہیں جس میں بیماری ہوتی ہے..... باقی خون اسی طرح پنڈے کے اندر رہتا ہے۔''

ثریا اپنی بول چال سے اَن پڑھ نظر آتی تھی اور حلیہ بھی ایسا ہی تھا۔

شانی کچھ چونک سی گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ پیر صاحب ہیں کون؟''

''یہ پہلے فیصل آباد میں تھے۔ وہاں ان کے ہزاروں ماننے والے ہیں۔ پھر یہاں

لاہور آگئے لیکن فیصل آباد سے لوگ اب بھی یہاں آتے ہیں۔ ایک پیران پیر ''حضرت صاحب'' ہیں، یہ پیر مستان ان کی لڑی میں سے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کے شاگردوں میں سے ہے۔''

شانی نے آنٹی عطیہ اور سنبل وغیرہ کے چہرے دیکھے۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ ثریا کی باتوں سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہیں۔ اسی دوران میں کسی مرد نے دیہاتی لہجے میں ثریا کو آواز دی۔ ''او ثریا اِدھر آ۔ یہ کاکے نے موتر کردیا ہے میرے کپڑوں پر۔''

ثریا اپنے قدرے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

آنٹی عطیہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''بکواس کرتی ہے۔ کوئی نوری عمل شمل نہیں ہے۔ میری گڈی کا تو ستیاناس ہی اس پیر کے پاس جانے سے ہوا ہے۔ نہ یہ وہاں جاتی نہ یہ رشتہ ہمارے پلے پڑتا۔ اب ایسے بُرے پھنسے ہیں کہ نہ مر کر جان چھوٹتی ہے نہ زندہ رہ کر۔ پتا نہیں کیوں اللہ کو بھی ترس نہیں آتا ہماری حالت پر۔'' آنٹی عطیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

شانی نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ ہمت نہ ہاریں۔ اللہ ضرور مدد کرے گا۔''

ثریا نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر شانی کے سینے میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ ثریا نے واضح طور پر ''حضرت صاحب'' کا نام لیا تھا۔ اس حضرت صاحب نے اپنے چیلوں چانٹوں کے ذریعے پتا نہیں کہاں کہاں پنجے گاڑ رکھے تھے۔ شانی کو ''گندہ خون نکالنے'' والی بات سے ہی شک گزرا تھا۔ اب اس شک کی پوری تصدیق ہوگئی تھی۔

شانی نے اس بارے میں آنٹی عطیہ سے تھوڑی سی تفصیل چاہی تو انہوں نے بتایا۔ ''یہ ثریا اور اس کا بندہ عنایت ہی ہمیں لے کر گئے تھے کوٹ لکھپت میں۔ آنے جانے اور دوسرے خرچوں پر کوئی چودہ ہزار روپیہ لگ گیا تھا ہمارا۔ چھ ہزار تو سیدھا سیدھا اس جھوٹے پیر نے ہی لے لیا تھا۔ ساتھ میں مار مار کر میری گڈی کا بھی حشر کردیا...... اللہ کی مار ہو ایسے لوگوں پر۔'' آنٹی عطیہ کی آواز میں گہرا کرب تھا۔

''کیا کیا تھا اس نے؟'' شانی نے پوچھا۔

''کہتا تھا لڑکی پر اثر ہے۔ اس لڑکی کے اندر جو چیز ہے اسے باہر نکالنا پڑے گا اور اس کے لئے لڑکی کو تھوڑی بہت تکلیف بھی دینا پڑے گی لیکن یہ تکلیف لڑکی کو نہیں اس کے اندر کی چیز کو ہوگی۔ بس وہی ڈھکوسلے جو ایسے لوگ کرتے رہتے ہیں۔ اس خبیث نے ہمارے سامنے ہماری جوان بچی کو الٹا لٹکا دیا۔ اس کے جسم پر بے رحمی سے چٹکیاں کاٹیں اور چمڑے کے ایک لمبے پتلے ٹکڑے سے اسے پیٹا۔ وہ کہتا تھا یہ شیر کا چمڑا ہے۔ مار مار کر اس نے لاسیں

(لکیریں) ڈال دیں میری بچی کے پنڈے پر۔ یہ روتی تڑپتی رہی۔ اس خبیث نے اسے چارپائی سے باندھ رکھا تھا۔ اگلے روز ہم سے کہنے لگا۔ اس کے اندر کی چیز بڑی ڈھیٹ ہے۔ ابھی تک ڈیرہ جمائے بیٹھی ہے، دوسرا عمل کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے اس نے ہم سے تین ہزار روپے اور لے لئے۔ کوکی کو ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ ساتھ میں ایک موٹی تازی مریدنی بھی تھی۔ پیر اور مریدنی نے دو تین جگہ سے کوکی کا خون پیا۔ وچاری کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔ ہاں سچ کہہ رہی ہوں بیٹی! انہوں نے سچ مچ اپنے منہ سے کوکی کا خون پیا۔''

آنٹی عطیہ نے بڑے دکھ کے عالم میں کوکی کے جسم پر زخموں کے تین چار ماہ پرانے نشان دکھائے۔ ایک نشان بائیں کلائی پر تھا۔ دوسرا گردن پر۔ تیسرا نشان دکھانے سے وہ قاصر تھی کیونکہ وہ اس کی قمیص کے نیچے تھا۔ کوکی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔

آنٹی عطیہ نے کہا۔ ''اتنا کچھ کر کے بھی کوکی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ یہ بالکل گم صم ہوگئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہوجاتے تھے اور غش سا آجاتا تھا۔ جس دن پیر اور اس کی مریدنی نے خونی عمل کیا، اس سے اگلے ہی دن ہوٹل میں اسے پھر غش آگیا۔ کوکی کے ابو نے جا کر پیر مستان سے بات کی اور اس سے کہا کہ اتنا خرچہ کر کے بھی لڑکی کی وہی حالت ہے۔ ابھی تو ہم یہیں پر ہیں، اگر واپس ملتان پہنچ کر یہ معاملہ ہوا تو پھر وہاں سے بھاگے آئیں گے؟ اپنی عادت کے مطابق انہوں نے پیر مستان سے ایک دو سخت باتیں بھی کیں۔ پیر مستان نے یہ بات مانی کہ لڑکی کو ٹھیک ہو کر ہی یہاں سے جانا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ بڑے ''حضرت صاحب'' تین دن بعد لاہور آنے والے ہیں۔ ان سے ملاقات کے لئے ہفتوں پہلے ٹائم لینا پڑتا ہے لیکن وہ کوشش کر کے لڑکی کو دکھا دے گا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کام کے لئے مزید رقم بھی نہیں لے گا۔ بس ہمیں دو تین دن مزید ہوٹل کا کرایہ برداشت کرنا پڑے گا۔ پیر مستان کے ایک مرید نے ہمیں بتایا کہ حضرت صاحب مُردوں کو بھی اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس وہ خاص جونکیں ہیں جو بُرے سے بُرے آسیب اور مرض کو بندے کے خون میں سے یوں چوستی ہیں کہ بیماری کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ انسانی صورت کی یہ دو ہم شکل جونکیں دور و نزدیک مشہور ہیں اور بڑے بڑے نامی لوگ ان سے اپنا خون چسواتے ہیں۔'' آنٹی عطیہ نے چند لمحے توقف کیا اور بولیں۔ ''ہماری تو بیٹا مت ہی ماری ہوئی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا کرتے جا رہے تھے۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسے لوگوں کی زبان میں پتا نہیں کیا جادو ہوتا ہے۔ کبھی ذرا

دھمکا کر، کبھی امید دلا کر اپنی بات منوا لیتے ہیں۔"

"تو پھر آپ مزید تین دن کے لئے رک گئے؟"

"تین دن کیا بنی! پانچ دن لگ گئے۔ جس دن وہ حضرت صاحب آئے، ہم نمازِ فجر کے وقت سے پیر مستان کے ڈیرے پر موجود تھے۔ پیر مستان کا ٹھکانہ کسی مزار وغیرہ پر نہیں۔ یہ ایک بڑی سی فیشن ایبل کوٹھی ہے۔ پوری کوٹھی پر ہرا رنگ کیا گیا ہے۔ دیواروں اور دروازوں پر پتا نہیں کیا لکھا ہوا ہے۔"

سنبل نے کہا۔ "پیر مستان کے پیر حضرت قدرت اللہ کے قول لکھے ہوئے ہیں۔ کچھ تعویذوں کے ہندسے ہیں اور کچھ عربی کے لفظ بھی ہیں لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔"

آنٹی عطیہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے قریباً آٹھ گھنٹے تک اپنی باری کا انتظار کیا۔ وہاں بہت رش تھا۔ رش کی وجہ سے ثریا کی اپنی طبیعت بھی خراب ہوگئی اس کے بچہ ہونے والا تھا ناں، ان دنوں۔ بہرحال دوپہر کے بعد پیر مستان نے کوکی کا دوپٹہ اور ہاتھ کی دو چوڑیاں اندر منگوائیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بھی چکر ہی تھا۔ وڈے حضرت صاحب کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ سارے مریضوں کو دیکھ سکتے۔ دو گھنٹے بعد پیر مستان خود باہر آیا اور اس نے دوپٹہ اور چوڑیاں ہمیں واپس کرتے ہوئے بتایا کہ کسی اور عمل وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت صاحب نے جو عمل کرنا تھا مریضہ کی ان چیزوں پر کر دیا ہے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ اول تو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی تو پہلے ٹیلی فون یا خط کے ذریعے رابطہ کرنا ہے۔

ابھی ہم کوٹھی سے نکل ہی رہے تھے کہ کوکی کو پھر چکر آنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ پاس ہی ایک بڑی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ والے نے دروازہ کھولا اور ہمیں کہا کہ کوکی کو اندر سیٹ پر لٹا دیں۔ یہ بڑی شاندار جیپ تھی۔ اس کے اندر ہی فریج وغیرہ بھی تھا۔ ہم نے کوکی کو پانی پلایا اور ہوا دی۔ وہ سنبھل گئی۔ جیپ والے شخص کا نام امان اللہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور گورا چٹا بندہ بھی جیپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے منہ اور ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے نشان تھے۔ جیسے کچھ دن پہلے اسے چھالے وغیرہ نکلے ہوں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ ہم نے بادامی باغ والے لاری اڈے کا بتایا۔ اس نے کہا کہ ہم گورنمنٹ کی بس پر جائیں وہ زیادہ اچھی رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اس طرف جا رہا ہے ہمیں گورنمنٹ اڈے پر اُتار دے گا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ اپنی جیپ روکی۔ یہ ایک بہت بڑے ڈاکٹر کی دکان تھی۔ یہ ڈاکٹر

جیپ والے کا دوست تھا۔ اس نے ہمیں جیپ سے اُتارا اور سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے کوکی کو دیکھا اور کچھ دوائیاں لکھ کر دیں۔ اس نے کہا بچی بالکل ٹھیک ہے، کوئی بیماری شیماری نہیں ہے اسے..... بس کمزوری ہے یا پریشانی ہے۔ اس کی شادی کر دو، سولہ آنے ٹھیک ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سے فارغ ہو کر ہم اڈے کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیپ والے دوسرے بندے کا نام بشیر تھا۔ یہ لاہور میں ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ملتان میں بھی کام شروع کر رہا ہے اور آج کل وہیں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ مجھے بڑے پیار سے ماں جی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا ماں جی! اب آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ اس نے کوکی کے ابو کو یہاں ملتان کا ہی ایک پتا دیا اور کہا کہ وہ اگلے پیر کو یہاں آ کر اس سے ملیں۔ وہ ان کے لئے کسی نوکری کا انتظام کر سکتا ہے۔

اس نے کوکی کے بارے میں کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر احتیاط سے دوائیں کھائے گی تو دو چار ہفتوں میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اس نے کہا کہ پیری فقیری میں بھی بہت ملاوٹ آ چکی ہے۔ ان میں کچھ ٹھیک لوگ بھی ہوں گے لیکن زیادہ تر فراڈ ہیں یا اناڑی ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر ہم نے کبھی کوئی دم درود وغیرہ کرانا ہو تو پھر شاگرد پیشہ لوگوں کے بجائے استاد سے ملنا چاہئے۔ جیسے خود حضرت صاحب ہیں۔

ہم ملتان واپس آگئے۔ اس کے بعد ملتان میں ہی کوکی کے ابو کی بشیر سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ بشیر کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ اس بیوی سے اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بچہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے، دوسرا بشیر کے پاس ہے۔ بشیر چند دن بعد اپنی جہاز جتنی جیپ لے کر ہمارے گھر بھی آیا۔ وہ ہم سے بڑی محبت سے ملتا رہا۔ کوکی کے ابو نے تو ملازمت نہیں کی لیکن کوکی کے ماموں خلیل کو بشیر نے اپنی نئی فیکٹری میں اچھی ملازمت دلا دی ہے۔ اپنے چھوٹے دیور (کوکی کے چاچو) کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتایا ہی ہے۔ اس کی کمر کی ہڈی بہت خراب ہوگئی تھی۔ سرکاری ہسپتال میں دھکے مل رہے تھے اور پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن بہت مہنگا تھا۔ کم از کم ایک لاکھ روپیہ لگتا تھا۔ یہ آپریشن بھی بشیر کی مدد سے ہوا۔ ان ہی دنوں میں کوکی کے ابو نے مجھے بتایا کہ بشیر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کا خیال ہماری کوکی کی طرف ہے۔ میں حیران رہ گئی۔ کہاں وہ کروڑ پتی اور کہاں ہم کرائے کے ایویں سے مکان میں رہنے والے...... بے شک کوکی خوبصورت تھی، اب صحت مند بھی تھی لیکن پھر بھی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کوکی کے ابو سے بہت کہا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ

لیں۔ بے شک وہ دولت مند ہے لیکن عمر کا کچھ بڑا ہے، رنڈوا ہے اور بچے بھی ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری بچی کی مرضی ہو۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ کوکی کے دل سے اب بھی وہ پاک پتن کے عرس والا لڑکا نہیں نکلا ہے۔ وہ اس کے لئے چھپ چھپ کر روتی ہے لیکن تمہیں تو پتا ہے بیٹی! ان مردوں کی سوچیں وکھری ہی ہوتی ہیں۔ عورت کے مشورے کو تو یہ کسی گنتی میں ہی نہیں لاتے اور تو اور میرا سگا بھائی خلیل بھی اڑ گیا کہ نہیں بشیر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہماری بچی کی قسمت کھل گئی ہے، شہزادیوں کی طرح رہے گی .. بس جٹ منگنی والی بات ہوئی اور رشتہ طے ہو گیا۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ اب آہستہ آہستہ پتا چل رہا ہے کہ بشیر کی پہلے والی ساری ہمدردی اور محبت اس رشتے کے واسطے ہی تھی۔ تم دیکھ ہی رہی ہو میری بچی کی عمر کتنی ہے۔ ابھی ہم دو تین سال تک اسے رخصت کرنے والے نہیں تھے۔ پر بشیر چاہتا تھا کہ یہ کام جھٹ پٹ سے نپٹ جائے ہو۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ہم نے بہانہ بنایا کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی کیسے کر دیں۔ اس نے کوشش کر کے بڑی کا رشتہ بھی ہماری ہی من پسند جگہ پر طے کرا دیا۔ اب کوئی عذر نہیں رہ گیا تھا۔ مجبوراً ہمیں شادی کی تاریخ دینا پڑی۔"

آنٹی عطیہ کی باتیں سن کر شانی کے ذہن میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پیر مستان اور پیر قدرت اللہ کے آستانے کی "برکتوں" سے سیف اللہ کو جو "مایہ ناز رشتہ" ملا تھا وہ نارپور کے چوہدری بشیر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ صورت حال شانی کے لئے بھونچکا کر دینے والی تھی۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ملتان آتے ہوئے اس نے جس شخص سے فون پر بات کی تھی اور جسے منے کے حوالے سے واسطے دیئے تھے، وہ ملتان پہنچتے ہی ایک نئے روپ میں اس کے سامنے آئے گا۔ فون پر چوہدری بشیر کے کہے ہوئے یہ الفاظ شانی کے کانوں میں گونج گئے۔ "میں اس گھر کو پھر سے آباد کر رہا ہوں۔"

ان الفاظ نے شانی کو الجھایا تھا لیکن اب یہ الجھن باقی نہیں رہی تھی۔

آنٹی عطیہ نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک تصویر نکال کر شانی کو دکھائی۔ "یہ ہے اس کا ہونے والا شوہر۔" آنٹی نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔

شانی نے دیکھا۔ چوہدری بشیر اس کے سامنے تھا۔ گھنی مونچھیں، توانا گردن، عینک کے پیچھے دو سرد گہری آنکھیں، اس کے بائیں رخسار پر صرف ایک دو مدھم نشان نظر آ رہے تھے۔ یہ تصویر غالباً اس وقت اتاری گئی تھی جب چوہدری کی جلدی بیماری اختتام پذیر تھی۔

چوہدری بشیر کا ذکر کوکی کو سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ سسک کر اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی

سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"میں اسے دیکھتی ہوں۔" سنبل نے کہا اور وہ بھی کوکی کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اسی دوران میں گھر کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ثریا باہر گئی اور اس نے آ کر بتایا کہ فیکٹری سے دو تین بندے آئے ہیں، گھر کو باہر سے رنگ و روغن کرنے کے لئے۔ بشیر صاحب نے بھیجے ہیں۔ بشیر صاحب کل شام سے ملتان آئے ہوئے ہیں۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ یہ گھر اس کی توقع سے بڑھ کر کشادہ اور سجا ہوا ہے۔ غالباً اس گھر کی سجاوٹ اور کشادگی میں بھی چوہدری بشیر کا عمل دخل تھا۔

شانی نے آنٹی عطیہ کے ساتھ چند تسلی بخش باتیں کیں اور انہیں بتایا کہ اس سے جو کچھ بھی ہو سکا راجو اور کوکی کے لئے ضرور کرے گی۔ اس کی بات سن کر آنٹی عطیہ باقاعدہ رونے لگیں۔ پتا نہیں انہیں شانی کی تسلیوں پر یقین آیا کہ نہیں لیکن وہ غم زدہ ضرور ہو گئی تھیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوکی کے ساتھ ساتھ سنبل کی طرف سے بھی بہت فکر مند تھیں۔ ظاہر ہے کہ کوکی کے حالات کا اثر سنبل کے رشتے اور شادی پر بھی پڑ سکتا تھا۔

شانی ٹیکسی پر واپس نشتر ہسپتال روانہ ہوئی تو اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بے شمار سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے۔ روحانیت کیا ہے؟ روحانیت کے نام پر شعبدے باز لوگوں کی عزت اور جان سے کھیل رہے ہیں۔ اس جدید دور میں بھی جو لوگ ایسے نوسر بازوں کے ہتھے چڑھتے ہیں اور بار بار چڑھتے ہیں ان کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ سوچتی رہی اور اپنے آپ میں ہولتی رہی۔ چند دن پہلے وہ یہاں سے بہت دور پوٹھوہار کے سنسان ٹیلوں میں تھی۔ .....اس ویرانے میں جہاں رستم آباد تھا۔ اپنی واپسی سے دو دن قبل اسے پتا چلا تھا کہ وہاں کسی فراڈیئے عامل نے نادیہ کو اپنی باتوں کے جال میں میں الجھایا تھا اور اسے نیم برہنہ کر کے اس کی کمر پر تعویذ نویسی کی تھی۔ یہ شعبدہ باز ہر جگہ موجود تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق دھوکا دے رہے تھے اور اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہ لوگ..... یہ مادہ پرست لوگ روحانیت کو بدنام کر رہے تھے۔ ان کے کرتوت کی وجہ سے لوگوں کا یقین اٹھ رہا تھا۔

پھر وہ دوسرے زاویے سے سوچنے لگی۔ کیا ایسی چیزوں کا وجود حقیقت ہے جو حواس خمسہ اور انسانی علم کے دائرے سے باہر ہیں؟ کیا واقعی ابھی جدید علوم کو ایک غیر مرئی کائنات چھونے کے لئے ایک لمبا سفر کرنا ہے؟ ٹیکسی ملتان کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور شانی کا ذہن

ہزار گنا تیز رفتار سے ایک انجانے رستے پر دوڑ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر پوٹھوہار کے سنسان ویران پُراسرار ٹیلے یاد آ گئے اور وہ اندھی دراڑیں یاد آ گئی جس میں اس نے رستم کے ساتھ ایک رات گزاری تھی۔ شانی کو یاد آیا کہ اس رات کی صبح وہ اپنے کپڑے بدل کر قدیم سیڑھیوں کے سامنے بیٹھی تھی۔ یہ مسمار سیڑھیاں اس نیم تاریک دراڑ میں کسی ہزاروں سال پرانے کھنڈر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ رستم اس وقت چند فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اچانک ہی شانی کے نتھنوں میں گلاب اور گجرے کی ملی جلی خوشبو گھسی تھی۔ وہی خوشبو جس کا تعلق ماضی کے ایک ناقابل فہم واقعے سے تھا۔ ابھی شانی اس خوشبو پر ہی غور کر رہی تھی کہ اسے سیڑھیوں پر ایک ہیولا نظر آیا تھا۔ شانی سرتاپا لرز گئی تھی۔ اسے لگا تھا یہ نگینہ کا ہیولا ہے۔ ہاں وہی نگینہ جو نارپور کی حویلی میں آگ لگنے کے دوران میں مری تھی اور اپنے مرنے کے دو دن بعد شانی کو ریٹائرڈ حوالدار کے گھر میں ملی تھی۔ شانی کی نظر ایک لمحے کے لئے پتھرا گئی۔ وہ مسمار سیڑھیوں کے آخری زینے سے قریباً دو فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ شانی کو بس اس کی ایک جھلک نظر آئی۔ شانی کو لگا نگینہ کے چہرے پر دنیا جہاں کی خوشی سمٹی ہوئی ہے اور اس کی دیہاتی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمک رہی ہیں۔ شانی ایک دم ڈر کر سیڑھیوں سے پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی نگینہ کا ہیولا بھی گم ہو گیا تھا۔ رستم نے شانی کو یوں ڈر کر پیچھے ہٹتے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا تھا۔ ''کیا ہوا بی بی؟''

''کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔'' شانی نے نفی میں جواب دیا تھا اور ہکلا کر رہ گئی تھی۔ رستم نے الجھے ہوئے انداز میں ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں کے آس پاس پھینکا تھا اور پھر ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ سارے کا سارا منظر شانی کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ملتان کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ سب کیا تھا؟ کوئی وہم؟ تخیل؟ بصری دھوکا؟ یا جاگتی آنکھوں کا خواب؟ دراڑ میں نشہ آور گیس کے سبب اس کا ذہن مسلسل اونگھتا رہا تھا۔ کیا حوالدار کے گھر کی طرح ایک بار پھر اس کے اونگھتے ذہن نے کوئی تصوراتی منظر اسے دکھا دیا تھا؟ یعنی رستم؟ کیا رستم کو بھی نگینہ کے حوالے سے دھوکا ہی ہوا تھا۔ حوالدار کے گھر میں رستم نے جو باتیں کہی تھیں وہ شانی کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک بار پھر اس کے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ایسی باتوں پر یقین کرنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں تھی لیکن اس نے نفسیات اور مابعد النفسیات کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ کیا یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا؟

اسی الجھے سلجھے معاملے کے بارے میں سوچتی ہوئی وہ نشتر ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں جا پہنچی۔ وہ عارف کے پاس پہنچی تو وہ کچھ پریشان نظر آیا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ راجو اب ہوش میں آ چکا ہے لیکن اس کی ذہنی حالت درست نہیں ہے۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بہت واویلا کیا ہے۔ ڈرپس وغیرہ اُتار دی تھیں، بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا ٹیکہ لگا دو۔ سٹاف نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور کوئی سکون آور انجکشن دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔ پولیس والا بھی آیا ہوا تھا اس کا بیان لینے کے لئے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا۔''

شانی اندر گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ کوئی کثافت نظر نہیں آ رہی تھی اس پر۔ اس کی آنکھوں کے نیچے وہ سفید پپڑیاں سی تھیں جو آنسوؤں کے خشک ہونے سے بنتی ہیں۔ یہ چہرہ جیسے خاموشی کی زبان میں شانی سے کہہ رہا تھا ... کیا محبت کرنا جرم ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کی سزا اتنی کڑی کیوں ہے؟ کیا لڑکیوں میں مر جانا یا ساری عمر سینے میں گھاؤ لے کر زندہ رہنا ہی میرا مقدر ہے؟

''نہیں!'' شانی کے دل نے پکار کر کہا۔ اس کے سینے سے ایک لہر اٹھی۔ اس لہر نے اس کی نس نس میں ایک بے نام توانائی بھر دی۔ وہ راجو کے ہاتھ کو چھوڑ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی۔ عارف سامنے ہی کھڑا تھا۔ شانی کے تاثرات دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شانی؟''

''میں ایک کام سے جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟'' عارف نے چونک کر پوچھا۔

''میں آ کر بتاؤں گی۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''لیکن اس طرح اکیلی؟ کسی کو ساتھ لے جائیں۔''

''نہیں۔ وہاں مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔'' شانی نے کہا اور عارف کو تسلی دے کر ہسپتال سے باہر آ گئی۔

سیف کے گھر میں ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ چوہدری بشیر کل سے ملتان آیا ہوا ہے۔ یہاں ملتان میں اس کی ٹیکسٹائل فرم کا نام وغیرہ بھی شانی کو پتا چل گیا تھا۔ لاہور کی طرح یہاں بھی چوہدری کی رہائش ٹیکسٹائل مل کے ساتھ ہی ایک کوٹھی میں تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ مزاروں، مسجدوں اور قدیم عمارتوں کا شہر ملتان ڈھیرے ڈھیرے جگمگانا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا

میں ایک خوشگوار حرارت تھی۔ اس نے ٹیکسی لی اور عثمانیہ ٹیکسٹائل پہنچ گئی۔ وہ صورتِ حال کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ موجودہ حالات میں اگر کوئی اور راجو کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ راجو کا باپ نہیں ہے، چوہدری بشیر ہے۔ راجو کے باپ کے حوالے سے اسے یقین تھا کہ وہ چہیتے بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کر اپنی ہٹ دھرمی پر کسی صورت قائم نہیں رہ سکے گا۔ اب یہ معاملہ چوہدری بشیر، اس کے ارادے اور اس کی بے پناہ انا پرستی کا تھا۔ پچھلے پانچ چھ ماہ میں چوہدری بشیر بہت تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں کئی طرح کی تھیں۔ چوہدری بشیر پیر قدرت اللہ جیسے لوگوں کے خلاف تھا اور انہیں بہروپیا قرار دیتا تھا لیکن جب وہ خود جلدی بیماری میں مبتلا ہوا تو اس کی ساری روشن خیالی ڈانواڈول ہوگئی۔ اب قدرت اللہ (حضرت صاحب) کے بارے میں اس کے خیالات وہ نہیں رہے تھے جو پہلے تھے۔ اسی طرح آج سے پانچ چھ ماہ پہلے تک وہ شانی پر دل و جان سے فدا تھا۔ اس کی خاطر اپنی پوری برادری سے ٹکر لینے پر تیار تھا لیکن اب وہ ایک سولہ سالہ لڑکی کو دلہن بنانے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ وہی جاگیردارانہ سوچ جس میں عورت کو پالتو جانور کی طرح ضرورت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

اور آج اس نیم گرم شام میں شانی اسی چوہدری بشیر سے ملنے اور اس سے کچھ سوال پوچھنے جارہی تھی۔ شانی نے چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اس نے پلو میں نقاب کی صورت چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے پر تھا۔ عثمانیہ ٹیکسٹائل کے ساتھ واقع کوٹھی بہت وسیع تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چار دیواری کے اندر دس بارہ کنال رقبہ احاطے کے طور پر موجود تھا۔ کوٹھی کی اصل بلڈنگ ایک طویل ڈرائیو وے سے آگے نظر آرہی تھی۔ احاطے میں کافی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی تقریب وغیرہ ہے۔ ایک طرف تین چار کنال کے رقبے میں ایک قنات بھی دکھائی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے شانی ٹیکسی سے اُتری اور کرایہ دے کر کوٹھی کی سمت آئی۔ گیٹ پر موجود دو تنومند گارڈز اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''جی میڈم!'' ایک گارڈ نے اسے سرتاپا گھور کر پوچھا۔

''مجھے چوہدری بشیر صاحب سے ملنا ہے۔''

''آپ نے ٹائم لیا ہوا تھا؟'' ایک گارڈ نے پوچھا۔

شانی نے نفی میں سر ہلایا اور ایک پرچی گارڈز کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ چوہدری صاحب کو دکھا دیجئے۔'' پرچی پر شانی نے اپنا اصل نام شہناز ارشاد لکھا تھا۔

گارڈ پرچی لے کر چلا گیا۔ اس کی واپسی میں کافی دیر ہوئی۔ شانی کو احاطے سے

اُبھرنے والی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ رنگ برنگی قنات کے پیچھے کوئی کھیل تماشا ہو رہا ہے اور وہاں کافی تعداد میں تماشائی موجود ہیں۔ یہ تماشائی گاہے بگاہے تالیاں بجاتے تھے یا نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے تھے۔ قنات کے پیچھے دودھیا روشنی نظر آرہی تھی اور ہلکا سا میوزک بھی تھا۔

کافی انتظار کے بعد گارڈ واپس آیا اور شانی کو اندر لے گیا۔ شانی دھڑکتے دل کے ساتھ قنات تک پہنچی۔ قنات کے پیچھے کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہاں کھلی جگہ پر آرام دہ کرسیاں اور صوفے وغیرہ لگے تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے درمیان کافی وسیع جگہ خالی تھی۔ اس خالی جگہ کو ایک چھ فٹ اونچے آہنی جنگلے کے ذریعے باقی پنڈال سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ یہاں ریسلنگ والا ایک بڑا گدا بچھا ہوا تھا اور مختصر کپڑوں میں دو یورپین لڑکیاں کشتی میں مصروف تھیں۔ ان کے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ بُری طرح ہانپ رہی تھیں لیکن ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

پنڈال کی اگلی قطار میں جو آرام دہ صوفے رکھے تھے، ان پر کوئی یورپین اور مقامی مہمان تشریف فرما تھے۔ ان سفید فام مرد و زن کے درمیان شانی کو چوہدری بشیر بھی نظر آیا۔ وہ سفید براق شلوار قمیص میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ اس کا سنہری کھسہ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ شانی نے پندرہ بیس میٹر کی دوری سے چوہدری بشیر کی طرف دیکھا لیکن وہ تماشے میں بُری طرح مگن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے شانی کی آمد کی خبر ہی نہیں یا وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے۔ شانی کو بعد میں پتا چلا، چوہدری کو خبر ہی نہیں تھی۔ دراصل وہ دیگر مہمانوں کی طرح نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے ملازم نے اسے شانی کے نام والی پرچی دکھائی اور اس نے ٹھیک سے پڑھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ملازم نے سمجھا کہ اسے شانی کو لانے کا اذن مل گیا ہے۔

شانی خاموشی سے وہاں کھڑی یہ طوفانِ بدتمیزی دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا یہاں باقاعدہ شرطیں وغیرہ لگی ہوئی ہیں۔ سفید فام مہمانوں سمیت بہت سے لوگ زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سرخ لباس والی لڑکی کی دونوں عریاں ٹانگیں دہری ہو کر اس کی پیشانی سے چھو رہی تھیں اور وہ خود کو چھڑانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی مگر دوسری لڑکی حاوی نظر آتی تھی۔ یہ ٹی وی پر دکھائی جانے والی نورا کشتیوں جیسی فائٹ نہیں تھی۔ اس میں حقیقی غیظ و غضب اور زور آزمائی نظر آرہی تھی۔ دونوں لڑکیاں زور آزمائی کے دوران میں فرطِ غضب سے چیخ بھی رہی تھیں۔ ایک دو منٹ تک یہ شدید کشمکش جاری رہی۔ حوا کی دو بیٹیاں درجنوں

مردوں کے سامنے اپنے وقار اور نسوانیت کا تیاپانچا کرتی رہیں۔ پھر مقامی ریفری نے گنتی کی اور تماشائیوں کے بلند شور میں ایک لڑکی کو فاتح قرار دے دیا۔ چوہدری بشیر کے قریب بیٹھا ہوا ایک سفید فام جوڑا اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگا۔ دونوں نے جوشیلے انداز میں ایک دوسرے کے کئی طویل بوسے لئے اور Hurry کے نعرے بلند کئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جوڑا کوئی بڑی شرط جیت گیا ہے۔ ہارنے والی لڑکی مردانہ چال چلتی اور لنگڑاتی ہوئی ایک طرف اوجھل ہوگئی۔ جیتنے والی اپنے ساتھی مردوں کے کندھوں پر سواری کرنے لگی۔

شانی نے سوچا کہ شاید اب چوہدری اس کی طرف متوجہ ہوگا لیکن وہ تو اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ جام لنڈھانے میں مصروف تھا۔ غیر ملکی مہمانوں میں ایک دو عورتوں کے لباس موسم کی نسبت سے بے حد مختصر تھے۔ ایک عورت کی عریاں ٹانگوں پر اس کے ساتھی مرد کے ہاتھ مسلسل رینگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ مے نوشی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسی دوران میں دوسری کشتی شروع ہوگئی۔ یہ مردانہ کشتی تھی۔ ایک مقامی پہلوان تھا اور دوسرا انگریز۔ مقامی پہلوان کا جسم خاصا کسرتی تھا اور وہ جدید کشتی میں طاق نظر آتا تھا۔ تماشائی ایک بار پھر اس کھیل میں پوری طرح غرق ہوگئے۔ اپنے اپنے پہلوان کے حق میں جوشیلے نعرے بلند کئے جانے لگے۔ یہ رومن سٹائل کی کشتی تھی جس میں حریف کو ضربات نہیں لگائی جاتیں صرف پچھاڑا جاتا ہے۔ ایک گارڈ کے کہنے پر شانی ایک طرف پڑی خالی کرسیوں کی طرف بڑھی اور بیٹھ گئی۔ کشتی دم بدم زور پکڑ رہی تھی۔ ہیجان خیز میوزک ان مناظر کو اور بھی تاثر انگیز بنا رہا تھا۔

شانی سمجھ گئی تھی کہ وہ غلط وقت پر یہاں آ گئی ہے۔ وہ اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کوٹھی کی طرف سے دو تین افراد کے چلانے کی آواز آئی پھر کوئی عورت خوفزدہ انداز میں چیختی چلی گئی۔ بہت سے تماشائی مڑ کر کوٹھی کی عمارت کی طرف دیکھنے لگے۔ عمارت کا داخلی دروازہ بمشکل پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میوزک تھم گیا۔ ریفری نے کشتی رکوا دی۔ یکایک کوٹھی کے کسی اندرونی حصے سے کوئی بڑا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دو تین عورتیں مل کر چلانے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے پنڈال میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لمبا تڑنگا چوہدری بشیر نشے میں ڈولتا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ تمام تماشائی بھی اکھاڑے کی طرف سے منہ پھیر کر عمارت کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ سراسیمگی کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ کوٹھی کے اندر سے ایک شخص تیزی سے باہر نکلا۔ یہ کوئی ملازم تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں بشیر سے کچھ کہا اور

انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ اسی دوران میں دو تین افراد مزید باہر نکل آئے اور اس جانب اشارہ کرنے لگے۔ وہ سب ہانپ رہے تھے اور ان کے رنگ فق تھے۔ چوہدری بشیر چند لمحے تو متذبذب رہا پھر دو تین گارڈز کے ساتھ وہ داخلی دروازے سے اندر گھس گیا۔ زخمی شخص دہشت زدہ انداز میں بار بار چند کھڑکیوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور پسینہ بہہ رہا تھا۔ اسی دوران میں کوٹھی کے عقب سے گرے ہاؤنڈ کتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید انہوں نے بھی اس خوف کو محسوس کر لیا تھا جسے کوٹھی کے ملازمین محسوس کر رہے تھے۔ دفعتاً شانی کو عمارت کی لبوتری کھڑکیوں کے عقب سے ایک مدھم آواز سنائی دی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ کسی جانور کی آواز تھی۔ کس جانور کی تھی؟ یہ بات شانی نہیں جان سکی۔ ایک طیش بھری چیختی ہوئی باریک لیکن وحشی آواز۔ ان کھڑیوں کے پیچھے کوئی تھا اور وہ جو بھی کوئی تھا اس کی موجودگی مکینوں کو سخت ہراساں کر رہی تھی۔ اندر سے اکھاڑ پچھاڑ کی آوازیں آ رہی تھیں اور گاہے بگاہے وہ آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

پھر ایک فائر ہوا۔ یہ بڑے بور کی رائفل کا فائر تھا۔ دھماکے کی آواز دور تک گئی۔ یہ فائر لبوتری کھڑکیوں کے عقب میں ہوا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ظہور پذیر ہوا وہ لبوتری کھڑکیوں کی طرف سے نہیں دائیں جانب ایک بڑے بلوری دروازے کی طرف سے ہوا۔ ایک زوردار چھناکا ہوا اور ایک چھ سات فٹ اونچا سیاہ جسم تیزی سے باہر آیا۔ شانی کانپ اٹھی۔ یہ ایک قوی ہیکل جنگلی ریچھ تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی انگارہ آنکھیں دودھیا روشنی میں چمکیں۔ اس کی خوفناک تھوتھنی کھلی تھی اور اندر سے لمبے سفید دانت جھانک رہے تھے۔ وہ اتنی تیزی سے حملہ آور ہوا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

سب سے پہلے اس کی زد میں وہی نیم برہنہ سفید فام لڑکی آئی جس نے شرط جیتنے کے بعد اپنے ساتھی مرد کو کئی طویل بوسے دیئے تھے۔ ریچھ نے اسے پنجہ مارا اس کا مختصر بالائی لباس ٹشو پیپر کی طرح کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا اور وہ دہشت سے چیختی ہوئی کئی فٹ دور جا گری۔ اس کے بعد ایک مقامی سیٹھ ریچھ کے پنجوں کی ضربات کھا کر سوئمنگ پول میں گرا۔ پھر ایک اور عورت ریچھ کے ہتھے چڑھی۔ یہ مقامی تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ ریچھ نے اسے اپنے خونی پنجوں میں دبوچا اور ایک لمحے میں اس کی شہ رگ ادھیڑ کر رکھ دی۔ بدنصیب عورت چلاتی ہوئی اوندھے منہ گری۔ بچہ اب بھی اس کی بانہوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دو یا تین سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ درجنوں تماشائی مڑے اور دیوانہ وار چلاتے ہوئے خونی جانور کی مخالف سمت میں بھاگے۔ شانی بھی بھاگنے والوں میں شامل تھی۔ اس

سے دو قدم آگے وہ لمبی تڑنگی عورت بھاگ رہی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے میدان جیتا تھا۔

شانی دس پندرہ قدم تک بھاگنے والوں میں شامل رہی لیکن پھر وہ رک گئی۔ اس کے کانوں میں مسلسل بچے کی وحشت زدہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ ''ممی...... ممی!'' وہ مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ زخمی عورت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ صرف اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ریچھ کے قاتل پنجے کسی بھی لمحے اس تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کس کا بچہ ہے؟ اور اسے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ یہی کافی تھا کہ وہ بچہ ہے اور موت کے منہ میں ہے...... شانی ایک کمزور و ناتواں ہستی تھی لیکن اس کے اندر چھپی ہوئی عورت کمزور نہیں تھی۔ وہ رک تو پہلے ہی چکی تھی، اب وہ مڑی اور بچے کی طرف بھاگی......

☆======☆======☆

چار پانچ سالہ بچہ خوف سے چیخ رہا تھا۔ ''ممی...... ممی۔'' ریچھ کی خوفناک سیاہ پشت شانی کی طرف تھی۔ شانی کو اپنے اور ریچھ کے درمیان ایک کام کی شے نظر آئی۔ یہ ایک ٹوٹے ہوئے صوفے کا چوبی بازو تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے رک گئی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ اس نے وہ موٹا چوبی بازو اٹھایا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر خونی جانور پر پل پڑی۔ لکڑی کی دو نہایت شدید ضربیں ریچھ کی کنپٹی پر لگیں۔ وہ منہ سے ایک طیش بھری آواز نکال کر پلٹا اور شانی پر جھپٹا ... خدا کی پناہ...... اس کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔ سفید دانت خطرناک انداز میں تھوتھنی میں سے جھانک رہے تھے۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا ایک چوڑا پٹا اور موٹی رسی بھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس موذی جانور کو کہیں باندھا گیا تھا اور یہ وہاں سے رسی تڑا کر بھاگ نکلا ہے۔

حیوانی بُو کا ایک ناگوار جھونکا شانی کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ ریچھ کی قاتل تھوتھنی اسے اپنے چہرے سے بمشکل تین فٹ کے فاصلے پر نظر آئی۔ شانی نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بار پھر پورے زور سے جانور کے منہ پر وار کیا۔ گوشت اور لکڑی کے ٹکرانے سے ''بھد'' کی لرزہ خیز آواز ابھری، پھر دوسری... پھر تیسری۔ شانی نے الٹے قدموں سے پیچھے ہٹتے ہوئے تین ضربیں لگائیں۔ ریچھ کی سیاہ تھوتھنی سے اُڑنے والے خون کے چھینٹے اسے صاف دکھائی دیئے۔ اس کے کانوں میں اَن گنت وحشت زدہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ یہ اس کے اردگرد موجود مرد و زن تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ مشتعل جانور کا جوابی وار بڑا سخت ہوگا...... جانور کے نوکیلے پنجوں نے ابھی اسے چھوا نہیں تھا لیکن اسے ان پنجوں کی

بے پناہ کاٹ کا اندازہ تھا۔

کیا مجھے کوئی بچانے آئے گا...... یہ سوال بے پناہ شدت سے شانی کے ذہن میں گونجا۔ اچانک اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ نشیب میں گری۔ پانی کا زوردار چھپاکا ہوا۔ وہ سوئمنگ پول میں گری تھی۔ نیم سرد پانی نے ایک ساعت میں اس کے سارے جسم کو بھگو دیا۔ لکڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا، بپھرے ہوئے جانور نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شانی کے پیچھے پول میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح شانی کے پیچھے تھا۔ یہ سوئمنگ پول کا اتھلا حصہ تھا۔ شانی کے پاؤں پول کے فرش کو چُھو رہے تھے...... لیکن یہ اس کی زندگی کے بدترین لمحے تھے، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

پھر شانی نے یکے بعد دیگرے تین خوفناک دھماکے سنے۔ اسے لگا کہ دو مرتبہ ریچھ کے جسم کو شدید جھٹکا لگا ہے۔ چند سیکنڈ بعد نسبتاً قریب سے ایک اور دھماکہ ہوا۔ شانی نے دھماکے کے ساتھ ہی اپنی بائیں جانب سے ایک شعلہ بھی لپکتے دیکھا۔ ریچھ پلٹ کر پانی میں گرا۔ ایک بار پھر زوردار چھپاکا ہوا...... شانی کو پول کے نیلگوں پانی میں ایک دم سرخی تیرتی نظر آئی۔ یقیناً یہ ریچھ ہی کا خون تھا۔ چلانے کی آوازیں چاروں طرف سے بدستور بلند ہو رہی تھیں۔ کچھ افراد پانی میں کودے، انہوں نے شانی کو سنبھالا اور سہارا دے کر باہر نکال لیا۔ چند افراد اس مقامی سیٹھ کو بھی سہارا دے رہے تھے جو خونی جانور کے دھکے سے پانی میں گرا تھا۔

پھر شانی کو اپنے سامنے چوہدری بشیر دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ غالباً اس کا سارا نشہ اب ہرن ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شانی کو دیکھنے لگا۔ ایک انگریز عورت تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے اپنی گرم شال شانی کے کندھوں پر ڈال دی۔

''تمہیں کوئی زخم تو نہیں آیا؟'' کسی عورت نے شانی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' شانی نے جواب دیا۔

ایک دوسری عورت نے آگے بڑھ کر شانی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ چند فٹ کے فاصلے پر کہرام مچا ہوا تھا۔ جس عورت کی شہ رگ پر ریچھ نے پنجہ مارا تھا، وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ چند افراد نے اسے ہاتھوں میں اٹھایا اور گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ عورت کو بچانے کی ''رسمی'' کوشش کی جا رہی تھی۔ جس بچے کو شانی نے بچایا تھا وہ گورا چٹا سفید فام تھا۔ اس کے بال سنہری مائل تھے۔ گردن پر چند خراشوں کے سوا اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ اب وہ اسی انگریز عورت کی گود میں تھا جس نے ذرا دیر پہلے شانی کو گلے سے لگا کر سسکیاں لی

تھیں۔

اب وہ بچے سمیت ایک بار پھر شانی کے گلے سے لگ گئی اور اس کا بھیگا ہوا سر چومنے لگی۔ اس نے انگلش میں کہا۔ ''تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میں ذرا واش روم تک گئی تھی باہر آ کر دیکھا تو قیامت مچی ہوئی تھی۔''

''وہ عورت کون تھی جس کے پاس بچہ تھا؟'' ایک مہمان نے اردو میں پوچھا۔

''وہ اس کی آیا تھی۔'' چوہدری بشیر نے بھاری آواز میں کہا۔

''پتا نہیں، بچتی بھی ہے یا نہیں۔'' ایک اور شخص نے خدشہ ظاہر کیا۔

چوہدری بشیر ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے شانی کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ شانی یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی۔

دور دور تک بکھر جانے والے مہمان اب سمٹ کر جائے واردات کی طرف آ رہے تھے۔ کچھ لوگ تالاب کے پاس مر جانے والے ریچھ کے گرد جمع تھے، اس کا بہت بڑا سیاہ جسم پانی میں ڈولتا ہوا خوفناک لگ رہا تھا۔ کوٹھی کے احاطے میں ہر طرف الٹی ہوئی کرسیاں، بکھری ہوئی جوتیاں اور دیگر سامان دکھائی دے رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے بیٹی کو اندر لے جاؤ۔ ساری بھیگ گئی ہے بے چاری۔'' ایک بڑی عمر کے شخص نے شانی کے بارے میں مشورہ دیا۔

چوہدری بشیر اور دیگر افراد شانی کو لے کر کمروں کی طرف آ گئے۔ راستے میں شانی نے سفید فام بچے کو اٹھایا اور کئی بار اس کا منہ چوما۔ ایسا کرتے ہوئے شانی کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔

''یہ ہیں کون؟'' مہمانوں میں سے کسی کی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میری عزیزہ ہیں۔'' چوہدری بشیر نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شانی، چوہدری بشیر کے ساتھ ایک کمرے میں موجود تھی۔ انگریز عورت کی گرم شال ابھی تک شانی کے کندھوں پر تھی۔ چوہدری بشیر نے ایک ملازمہ کو شانی کے پاس چھوڑا اور گیس ہیٹر لگوا دیا۔ شانی سے بولا۔ ''تم چاہو تو کپڑے وغیرہ بدل سکتی ہو۔ میں باہر کا ہنگامہ نمٹا کر ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ باہر چلا گیا۔ ملازمہ شانی کے قریب خاموش کھڑی تھی۔ شانی نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ یہ زہرا تھی۔ لاہور والی کوٹھی کی وہی نوعمر ملازمہ جو اکثر ''ہیڈ نوکرانی'' جالاں کے جبر و تشدد کا شکار رہتی تھی۔ کوٹھی میں کئی مرتبہ زہرا کو جالاں کی زبردست مار پیٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا اور پھر ایک مرتبہ چوہدری بشیر نے بھی اسے مارا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ وہ موبائل سیٹ چوہدری کی نظر میں آ گیا تھا جس پر شانی، رستم سے رابطہ رکھتی تھی۔ چوہدری کو شک گزرا کہ شاید اس موبائل کا تعلق زہرا سے ہے۔

ایک لمحے میں شانی کو سب کچھ یاد آ گیا۔ زہرا نے حیرانی سے کہا۔ ''چوہدرانی جی! آپ پھر یہاں آ گئی ہیں؟ آپ کیوں آئی ہیں یہاں؟''

''بس زہرا... آنا پڑا ہے اگر وقت ملا تو تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ خونی جانور یہاں کوٹھی میں پہنچا کس طرح تھا؟''

زہرا نے برا سا منہ بنایا۔ ''چوہدرانی جی! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ان کوٹھیوں اور حویلیوں میں مالک لوگ کیا کیا تماشے کرتے ہیں۔ یہاں بھی آج کچھ الٹے سیدھے تماشے ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کہ آپ نے دیکھا ہے یا نہیں، ابھی باہر احاطے میں انگریز لڑکیوں کی کشتی ہو رہی تھی۔ وہ آدھی سے زیادہ ننگی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بھی شرم آتی تھی۔ اس کے بعد ریچھ اور کتوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی پر بڑی بڑی شرطیں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے باہر دیکھا ہی ہوگا، کچھ انگریز لوگ بھی تماشا دیکھنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ یہ چوہدری جی کے یار بیلی ہیں۔ کویت میں ان کے ساتھ رہے تھے۔''

بات اب شانی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ریچھ اور کتوں کی لڑائی دیہی علاقوں میں ایک خاص تفریح ہے اس نامعقول کھیل کو دیکھنے کے لئے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں کھلے میدانوں میں جمع ہوتے ہیں اور شور شرابا کرتے ہیں۔ آج یہ لڑائی اس وسیع و عریض کوٹھی کے احاطے میں ہونے والی تھی۔

''لیکن یہ ریچھ کھل کیسے گیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ ایک نہیں ہے جی دو ریچھ ہیں۔ بہت سے لڑاکے کتے بھی پچھواڑے میں بندھے ہوئے ہیں۔ دراصل چوہدری جی کے کارندوں ارشد حسین وغیرہ نے ریچھوں کو ذرا تیز کرنے کے لئے انہیں شراب پلائی ہے۔ اس ریچھ نے شاید کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ رسی تڑا کر بھاگ نکلا اور باورچی خانے کے کھلے دروازے سے اندر گھس آیا۔ یہاں کافی توڑ پھوڑ کی ہے جی اس نے۔ کئی دروازے اور شیشے برباد ہوئے ہیں۔ شادی کے لئے بہت سی رنگ دار بتیاں چوہدری جی لاہور سے لے کر آئے تھے وہ بھی کرچی کرچی ہو گئیں۔''

شانی چونک گئی۔ اس نے پوچھا ''کس کی شادی ہو رہی ہے یہاں؟''

زہرا نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا پھر سرگوشی میں بولی۔ ''آپ کو نہیں پتا جی؟'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ زہرا دو تین سیکنڈ خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔ ''میری جان پہلے ہی بڑی

مصیبت میں آئی رہتی ہے جی۔ آپ کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے کچھ کہا ہے۔"

"زہرا! تمہیں میرا پتا ہی ہے۔" شانی نے اسے تسلی دی۔

وہ بولی۔ "چوہدرانی جی! چوہدری صاحب ویاہ کر رہے ہیں۔ یہاں ملتان کی ہی ایک کُڑی ہے۔ سنا ہے کہ عمر کی بھی زیادہ نہیں ہے لیکن ہے سوہنی۔ اگلے ہفتے چوہدری جی اسی کوٹھی سے اس کُڑی کی جنج لے کر جائیں گے۔"

"تمہیں پکا پتا ہے؟" شانی نے پوچھا۔ زہرا نے ایک بار پھر پورے زور و شور سے تصدیق کی۔ شانی نے زہرا سے پوچھا۔ "مُنا کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہاں ہی ہے جی۔ اوپر والی منزل پر سو رہا ہے۔ آج کل فردوس اس کی آیا بنی ہوئی ہے۔"

مُنے کا ذکر سن کر شانی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھے اور دروازوں، دیواروں سے ہوا کی طرح گزرتی ہوئی مُنے تک پہنچ جائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔ شانی نے زہرا سے مُنے کے بارے میں چند مزید باتیں پوچھیں۔ اسی دوران میں باہر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ زہرا صورتِ حال جاننے کے لئے باہر گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس نے بتایا کہ زخمی ہونے والی عورت چل بسی ہے۔ اس کی گردن شرابی ریچھ کے پنجے سے بُری طرح زخمی ہوئی تھی اور ہسپتال پہنچنے تک اس کے جسم کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔

اتنے میں بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شانی اس چاپ کو بڑی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ چوہدری بشیر آ رہا تھا، اپنی تمام تر چودھراہٹ اور رعب و دبدبے کے ساتھ۔ اس کے آتے ہی زہرا اپنی اوڑھنی درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ چوہدری نے دروازہ بھیڑ دیا اور شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کہ وہ اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر آیا ہے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ نشہ اُتر چکا ہے۔ وہ بولا۔ "میرے دماغ میں کئی سوال اٹھ رہے ہیں لیکن سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے بروقت ہمت کی اور کوشش کر کے سٹیفن کے بچے کو موت کے منہ سے بچایا۔ بچے کی والدہ گریس تمہاری بے حد شکر گزار ہیں اور تم سے دوبارہ ملنا چاہتی ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا چوہدری صاحب! جو کچھ ہوا اللہ کی طرف سے ہوا، میں تو صرف وسیلہ بنی ہوں۔"

"میں تمہیں یہاں دیکھ کر بہت زیادہ حیران ہوا ہوں۔ ابھی تک میری سمجھ میں کچھ نہیں

آ رہا۔" چوہدری بولا۔

شانی نے کہا۔ "میں نے کچھ دیر پہلے آپ کے لئے چٹ بھجوائی تھی۔ پتا نہیں کہ آپ کو ملی ہے یا نہیں۔"

"کیسی چٹ تھی؟"

"میں نے آپ سے آپ کے گھر میں آنے کی اجازت مانگی تھی۔"

چوہدری نے ذرا چونک کر اپنی گرم واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ چٹ نکل آئی۔ چوہدری نے چٹ پڑھی۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلی بار چٹ دیکھ رہا ہے۔ ایک لمبی سانس لے کر اس نے چٹ دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ اس کی نظر بے ساختہ شانی کی طرف گئی۔ شانی کے جسم پر نم لباس تھا اور اس کی نسوانیت کو نمایاں کر رہا تھا۔ چوہدری کی پاٹ دار آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ "دو دن پہلے لاہور میں جب تمہارا فون آیا تو میں نے ہرگز نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی تم سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"بس آپ سے ایک دو باتیں کرنا تھیں، اس لئے یہ ملاقات ضروری تھی۔"

"میں جانتا ہوں، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم مُنے سے ملنا چاہتی ہو لیکن تم میری مجبوریاں سمجھنے کی کوشش بالکل نہیں کر رہی ہو۔ مُنے سے ملنے اور اسے اپنانے کا ایک وقت تھا۔ جو تم کھو چکی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی کافی کچھ کھو چکا ہوں۔ اب میں بڑی مشکلوں کے بعد مُنے کو سنبھالنے میں کامیاب ہوا ہوں...... میں اس کی بہتری کے لئے بہت کچھ سوچ رہا ہوں اور بہت کچھ سوچ بھی چکا ہوں۔ چند دن میں ایک دو بڑی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ میں اپنی زندگی کو بڑی مشکل سے نئی Shape دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب میں اس بات کی اجازت کسی کو ہرگز نہیں دوں گا کہ وہ مجھے یا میرے بچے کو پھر سے ڈسٹرب کرے۔"

شانی نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ "آپ جن ایک دو تبدیلیوں کی بات کر رہے ہیں ان کے بارے میں، میں بھی تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ آپ شادی کر رہے ہیں۔"

بشیر چند سیکنڈ تک شانی کا چہرہ تکتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہاں، میں کر رہا ہوں شادی۔ تمہاری دغابازی کے بعد میں اس طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ زندگی کی شکل ہی پہچانی نہیں جاتی تھی لیکن اب امید پیدا ہو رہی ہے کہ شاید جینے کا کوئی راستہ نکل آئے۔"

"دغابازی" کا لفظ سیدھا شانی کے دل پر لگا لیکن وہ اس لفظ کی وضاحت طلب کر کے

چوہدری بشیر سے کسی لمبی بحث کا آغاز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کس طرح اسے دغاباز کہہ سکتا تھا۔ اس کے اور شانی کے درمیان مُنّے کے سوا کوئی رابطہ نہیں تھا، کوئی ناتا نہیں تھا۔ اگر چوہدری بشیر کے دل میں ''کچھ'' تھا تو وہ یک طرفہ تھا۔ اس یک طرفہ جذبے کے زیرِ اثر وہ شانی کے قریب آنے کے لئے حربے استعمال کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنے معصوم بچے کو بھی حربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ مُنّے کے ذریعے شانی کو بلیک میل کرنے کی مسلسل کوشش کی تھی اور ایک موقع پر کامیاب بھی ہوا تھا۔

شانی کو اپنے چہرے پر ماضی کا وہی کراہت آمیز لمس محسوس ہونے لگا جب اس کے چہرے سے چوہدری کی بدبودار سانسیں ٹکرائی تھیں اور اس کی پشت پر ایک سخت دیوار تھی۔

اس نے چوہدری کا زہریلا لفظ بڑے تحمل سے برداشت کیا اور بولی۔ ''چوہدری بشیر! آپ اونچی حیثیت اور رُتبے کے مالک ہیں۔ آپ کو خدا نے بہت کچھ دیا ہوا ہے۔ آپ جس طرف نظر اٹھائیں گے آپ کو اپنے لئے اچھی سے اچھی شریکِ حیات نظر آئے گی۔ اس حوالے سے آپ کو کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مم..... میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے لئے کوئی بہتر شریکِ حیات ڈھونڈیں۔''

چوہدری نے چونک کر شانی کو دیکھا۔ ''کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو جو میرے گھر آ رہی ہے؟'' شانی نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چوہدری کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور ''جلدی بیماری'' کے جو دو تین داغ ہنوز اس کی پیشانی اور رخسار پر موجود تھے مزید نمایاں ہو گئے۔ ''تم کہاں ملی ہو اس سے؟'' وہ کڑے لہجے میں بولا۔

''بس اتفاق سے ملاقات ہو گئی ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ پاک پتن کے کریانہ فروش سیف کی بیٹی آپ کی بیوی بننے والی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس بارے میں تفصیل نہیں پوچھیں گے۔''

چوہدری بشیر کچھ دیر تک شانی کو گھورنے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا تم سے تفصیل، لیکن تمہیں کیا کمی نظر آئی ہے اس لڑکی میں؟''

''لڑکی میں کوئی کمی نہیں ہے چوہدری صاحب! اس بے چاری کو تو ماں باپ جس ڈولے میں بٹھائیں گے وہ بیٹھ جائے گی اور زندگی بھر ڈولے میں بیٹھنے کا حق بھی ادا کرتی رہے گی۔ کمی ان حالات میں ہے جن سے وہ گزر رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی ان حالات کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں.....''

''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ کوئی لڑکا ہے جو کوکب اور اس کے گھر والوں کو پریشان کر رہا ہے۔ گھر کے سامنے ایک دکان پر اڈا بنا کر بیٹھا رہتا ہے، کوکب کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ ایسے لوفروں کی شہری علاقوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میرے دو بندے سیف کے محلے میں گئے تھے اور اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔''

''اس کے بعد کسی واقعے کا آپ کو پتا نہیں؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''پرسوں پتا چلا تھا کہ اس نے کوئی زہریلی شے کھا کر خودکشی کا ڈرامہ رچایا ہے۔'' چوہدری نے بےزار لہجے میں کہا۔

''اس نے ڈرامہ نہیں رچایا، وہ مرتے مرتے بچا ہے۔ مجھے اس لڑکے سے کوئی غرض نہیں اور نہ کوئی تعلق واسطہ ہے لیکن میں جو کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ بہت بُری طرح لڑکی کے چکر میں ہے۔ جہاں تک لڑکی کی بات ہے، وہ پوری طرح اپنے ماں باپ کی فرمانبردار ہے۔ وہ اس کے لئے جو فیصلہ کریں گے وہ اس پر سر جھکا دے گی لیکن۔'' شانی کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''بات مکمل کرو۔'' چوہدری تحکم سے بولا۔

''چوہدری جی، شاید وہ لڑکی آپ کو وہ محبت اور خوشی نہ دے سکے جس کے آپ شادی کے بعد حق دار ہوں گے۔ آپ انجان نہیں ہیں۔ آپ ان معاملوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔'' چوہدری بےزاری سے بولا۔ ''فلموں اور کہانیوں والے عشق اب اس نئے زمانے میں نہیں ہوتے اگر کسی کے سر پر اس قسم کا بھوت سوار ہو بھی تو شادی کے بعد ایک دو مہینے میں اُتر جاتا ہے۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے حالات کو اور اپنی ہونے والی بیوی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''سب ٹھیک تو ہو جائے گا چوہدری صاحب..... کیونکہ آپ جیسے لوگ سب ٹھیک کر لیتے ہیں مگر بات تو سچی محبت اور سچی خوشی کی آ جاتی ہے.....''

''سچی محبت اور خوشی۔'' چوہدری نے خوب چبا کر کہا۔ ''کیا تم مجھے دے سکتی ہو یہ سچی محبت اور خوشی؟'' یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ براہِ راست شانی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

شانی لرز کر رہ گئی۔ ہونٹ ایک لمحے میں خشک ہو گئے۔ چوہدری نے زہریلے الفاظ کی بوچھاڑ کی۔ ''تمہارے پاس کہاں سے آئے گی محبت اور خوشی۔ تم تو یہ سب کچھ اعلیٰ خاندان

کے ایک اعلیٰ چشم و چراغ کو دے چکی ہو۔ وہ بندہ جس کی نیک ناموں کی تفصیل پنجاب کے ہر تھانے میں لکھی ہوئی ہے۔ جس نے درجنوں سہاگ اجاڑے ہیں، اَن گنت بچوں کو یتیم کیا ہے۔ جو پتا نہیں کتنی عزتوں کا لٹیرا اور کتنے بے گناہوں کا قاتل ہے۔ سوچتا ہوں تو دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ کہاں رنگ والی کی وڈی آپا اور اُچے شملہ والا چوہدری ارشاد...... اور کہاں ان کی یہ بیٹی جس نے ایک ڈاکو سے ڈنکے کی چوٹ پر یارانہ لگا رکھا ہے ......"

"خدا کے لئے چوہدری...... خدا کے لئے۔ مجھ پر ایسے الزام نہ دھریں جنہیں میں برداشت نہ کرسکوں۔ میں پہلے ہی بہت زخمی ہوں، مجھے اور زخمی نہ کریں۔"

شانی باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ موٹے موٹے آنسو اس کے ہاتھوں اور جھولی میں گرے۔ چوہدری خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر رحم کی کوئی رمق نمودار نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد شانی نے کہا۔ "میں یہاں صرف اس لئے آئی ہوں کہ آپ کو اس شادی سے روک سکوں۔ آپ یہ شادی نہ کریں، یہ ہی آپ کے لئے اچھا ہوگا۔ آپ کے لئے بہترین رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ کوئی اور ڈھونڈ لیں اپنے لئے جو دل و جان سے آپ کی شریکِ حیات بن سکے۔ میں یہ بات پورے خلوص سے کہہ رہی ہوں۔"

چوہدری اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم کیسے کوکب اور اس کے گھر والوں سے ملی ہو؟ کہاں جوہر آباد اور کہاں ملتان شہر۔ تم یہاں پہنچی کیسے ہو؟"

"میں نے آپ سے سب سے پہلے یہی درخواست کی تھی کہ آپ مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھیں گے، کیونکہ اس سے آپ کو کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا لیکن وہ ساری باتیں میں آپ کو بتا سکتی ہوں جن سے آپ کو کچھ حاصل ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

شانی نے الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو پتا ہے کہ جس لڑکے نے کوکب کے لئے خودکشی کی ہے، وہ کون ہے؟"

"نہیں ...... مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو پتا ہوتا تو شاید آپ اس معاملے کی سنگینی کو زیادہ اچھی طرح محسوس کرسکتے۔" شانی نے کہا، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "وہ لڑکا رشتے میں آپ کا کزن ہے...... میانہ کے تاؤ حشام کا بیٹا ہے۔"

"تاؤ حشام کا؟" چوہدری نے بے حد حیرت سے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ بڑی نظر آنے لگیں۔ وہ کچھ دیر تک غیر یقینی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔ "لیکن تاؤ حشام کے تو کئی بیٹے ہیں، تم کس کی بات کررہی ہو؟"

"سب سے چھوٹے راجو کی۔"

چوہدری کا بھاری بھرکم چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ شانی نے چوہدری کو اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ تاہم اس کے چہرے کی سختی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ شانی نے آخر میں چوہدری کو یہ بھی بتادیا کہ کوکب اب بھی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ کل بھی وہ اپنے والد کے ذرا اونچا بولنے کی وجہ سے چکرا کر گرگئی اور بے ہوش ہوگئی۔ کیا پتا وہ چوہدری کے گھر جاکر بھی ایسے ہی حالات کا شکار رہے یا حالات اس سے بھی ابتر ہوجائیں۔

چوہدری نے سب کچھ سننے کے بعد ایک گہری سانس لی۔ "شادی کی ساری تیاری ہوچکی ہے۔ یہ معاملہ اب اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ واپسی ممکن نہیں ہے۔ بہرحال تم نے جو ایک دو باتیں بتائی ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ میں اس معاملے پر سوچ بچار کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

شانی کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اس نے کہا۔ "آپ بہت ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ہر پہلو پر غور کرلیں۔ اس کے علاوہ آپ راجو کے بارے میں بھی پوری تصدیق کرلیں۔ میں نے آپ کو کچھ غلط نہیں بتایا ہے۔"

کچھ دیر بعد شانی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے چوہدری کی طرف ایک کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں ہوٹل فاران میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ آپ نے اگر کچھ مزید پوچھنا ہو تو یہاں فون کرکے مجھ سے پوچھ لیں پھر آپ جو فیصلہ کریں اس کے بارے میں مجھے بتا دیجئے گا۔"

چوہدری بشیر نے کارڈ لے لیا اور پتھریلے تاثرات کے ساتھ شانی کو دیکھتا رہا۔ شانی دبیز قالین پر پاؤں دھرتی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے کندھوں پر ابھی تک سفید فام گریس کی شال تھی۔ اسے یہ شال لوٹانی تھی اور اپنی چادر واپس لینی تھی۔ وسیع کمرے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے شانی محسوس کررہی تھی کہ چوہدری کی پُرتپش نگاہیں اس کا تعاقب کررہی ہیں۔ اس کے بدن کی ہر جنبش کا جائزہ لے رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سات آٹھ قدم کا فاصلہ جلدی سے طے ہوجائے اور وہ چوہدری کی

نگاہوں کی زد سے باہر نکل جائے۔ ابھی وہ دروازے سے دو تین قدم دور تھی کہ چوہدری کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''مُنّے سے ملنا چاہتی ہو؟''

شانی بے ساختہ پلٹی اور امید بھری نظروں سے چوہدری کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا تھا۔ چوہدری اٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا شانی کے پاس آ گیا۔ اس کی پُرتپش نگاہوں نے سر سے پاؤں تک شانی کا جائزہ لیا۔ اس نے بڑی بے باکی سے شانی کا نرم کندھا تھاما اور بولا۔ ''تم یہ شادی رکوانے کے لئے یہاں آئی ہو۔ مجھے ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تم ایسا کیوں چاہتی ہو، بہرحال تمہارے کہنے پر میں یہ شادی روک سکتا ہوں۔ تم مُنّے سے بھی مل سکتی ہو۔ اس کے علاوہ بھی تمہاری جو شرطیں ہوں گے مجھے قبول ہوں گی لیکن اس سب کے بدلے میں میری بھی ایک شرط ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری کا لہجہ بالکل ڈرامائی ہو گیا۔ شانی اس کو دیکھ رہی تھی۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس نے اپنے موٹے ہونٹوں کو حرکت دی۔ ''میں سب کچھ بھول کر، اب بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اگر تم ہاں کہہ دو، تو میں سیف اللہ اور کوکب والے معاملے کو فل اسٹاپ لگا دوں گا۔''

شانی حیران نگاہوں سے چوہدری کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ ایک لمحے میں جیسے اس کی رگوں سے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ چوہدری کو کیا جواب دے۔۔۔ اس کے لب بس تھرا کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ چوہدری کے کرخت چہرے سے نگاہ ہٹا کر واپس مڑ جاتی چوہدری نے بلند آواز میں فردوس کو پکارا اور کہا۔ ''منے کو یہاں لے کر آؤ۔''

شانی جیسے پتھرا گئی۔ اسے لگا کہ قدم زمین میں گڑ گئے ہیں۔ وہ آگے جا سکتی ہے نہ پیچھے۔ چند سیکنڈ بعد بالائی منزل پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ پھر شانی کو لمبی تڑنگی فردوس سیڑھیوں پر دکھائی دی۔ وہی نوکرانی، جس کا سر ایک مرتبہ شانی نے لہولہان کر دیا تھا۔ شانی کے سامنے وہی تھا جو اس کے سپنوں میں آتا تھا جو کبھی منظر، کبھی آواز اور کبھی لمس بن کر اس کے اردگرد موجود رہتا تھا۔ شانی تڑپ گئی اور وہ تو تھا ہی بچہ۔ وہ چلایا اور فردوس سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے شانی کی طرف آیا۔ شانی بھی سب کچھ بھول گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور مُنّا اس سے لپٹ گیا۔ وہ اس سے یوں چمٹا جیسے اس کے جسم کا ہی حصہ ہو۔ شانی اسے بے تحاشا چومنے لگی۔ چوہدری نے اشارہ کیا اور فردوس ان تینوں کو کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔ شانی مُنّے سے پیوست تھی لیکن محسوس کر رہی تھی کہ چوہدری ان دونوں کو گہری نظروں

سے دیکھ رہا ہے۔ مُنّا اس سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شانی اسے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ ایک بار پھر اس کا منہ سر چومنے لگی۔ ''تاتی! تم کہاں تلی (چلی) گئی تھیں۔ میں تم کو ڈھونڈتا رہا۔ میں بڑے دنوں تک روتا رہا لیکن تم مجھے چپ کرانے کے لئے نہیں آئیں۔ تم کیوں نہیں آئی تاتی؟'' وہ بڑے معصوم لہجے میں اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''مم۔۔۔۔۔۔ میں بیمار ہو گئی تھی بیٹا۔ ہسپتال میں تھی۔'' شانی نے اسے بہلایا۔

مُنّے نے ذرا پیچھے ہٹ کر دھیان سے شانی کا چہرہ دیکھا۔ اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے رخسار سہلائے۔ ''اب تو تم بیمال نہیں ہو ناں۔ اب تو تم نہیں نہیں جاؤ گی؟'' مُنّے نے پوچھا۔

''اچھا بیٹا، نہیں جاؤں گی۔'' وہ اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

مُنّے نے چوہدری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابو جی! میں نے نئی امی نہیں لینی۔ میں تاتی کے ساتھ ہی رہوں گا۔ آپ سالے دلوا جے بند کر دیں۔ تاتی اب کہیں نہیں جائیں گی۔''

چوہدری نے کہا۔ ''بیٹا! تمہاری چاچی دروازے بند کرنے سے نہیں رکے گی۔ اس کے دل ۔۔۔ ایک چور دروازہ ہے، وہ بند ہو گیا تو پھر شاید رک جائے۔ ورنہ ہم دونوں کو ہمیشہ ہی اس کی راہ دیکھنا پڑے گی۔''

''نہیں۔۔۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔'' مُنّے نے ایک بار پھر بے تاب ہو کر شانی کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور اسے بھینچ لیا۔

شانی نے بہت کوشش کی لیکن وہ خود کو مُنّے سے جدا نہ کر سکی۔ آخر اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''کیا، میں مُنّے کو ایک دن کے لئے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں؟''

وہ بے رحمی سے بولا۔ ''تم ایک دن کی بات کرتی ہو، میں چاہتا ہوں تم ہر وقت اس کے ساتھ رہو۔'' اس کا جملہ معنی خیز تھا۔

''میں فی الحال ایک دن کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے لے جاؤ، لیکن جو بات میں نے کہی ہے اس پر غور ضرور کرنا۔''

اس سے پہلے کہ شانی باہر نکلتی، دروازے پر دستک ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد وہی انگریز عورت اندر داخل ہوئی جس کے بچے کو شانی نے بچایا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ نظر آ رہی تھیں۔ یہ گریس تھی۔ اس نے ایک بار پھر تشکر کے انداز میں شانی کے دونوں ہاتھ

لئے۔ اس نے بشیر کی طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ذرا دیر مس کے ساتھ بات کرلوں؟''

''ضرور'' چوہدری بشیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''آپ نشست گاہ میں آرام سے بات چیت کرلیں۔''

گریس نے انگلش میں چوہدری کا شکریہ ادا کیا اور شانی کے ساتھ نشست گاہ کی طرف آگئی۔ مُنا بدستور شانی کی بانہوں میں تھا۔ نشست گاہ میں جانے کے لئے دونوں برآمدے میں پہنچیں تو احاطے میں بدستور افراتفری کے آثار نظر آئے۔ تالاب کے کنارے کئی افراد مُردہ ریچھ کی لاش کے گرد جمع تھے۔ زیادہ تر مہمان واپس جاچکے تھے لیکن کچھ ابھی تک یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ دونوں پہلوان عورتیں برآمدے میں ایک جانب لوہے کی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ اب وہ پورے لباس میں تھیں۔ شانی کی بس ایک نگاہ ان پر پڑی۔ نہ جانے کیوں وہ شانی کو خجل سی نظر آئیں۔ شاید انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ایک عام سی دبلی پتلی لڑکی نے ان سے زیادہ دلیری اور جسمانی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ احاطے میں بکھری ہوئی کرسیوں کو اکٹھا کیا جارہا تھا......

شانی اور گریس نشست گاہ میں آبیٹھیں۔ یہاں گریس کا انگریز شوہر بھی موجود تھا۔ یہ چوڑے شانوں والا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں۔ عمر قریباً تیس بتیس سال ہوگی۔ اس نے بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر شانی کا شکریہ ادا کیا۔ جس وقت ریچھ نے ڈیوی نامی بچے اور اس کی مقامی آیا پر حملہ کیا، یہ شخص چوہدری بشیر کے ساتھ کوٹھی کے اندر تھا۔ بعد میں شور شرابا سن کر یہ لوگ باہر نکلے۔ ریچھ پر ایک گولی چوہدری بشیر اور دوسری اسی اسٹیفن نامی شخص نے ایک گارڈ سے رائفل لے کر چلائی تھی۔

وہ تینوں کچھ دیر تک اس جانکاہ حادثے پر تبصرہ کرتے رہے۔ اسٹیفن نے بھی تصدیق کی کہ ریچھ کے رکھوالوں نے اسے زیادہ مستی میں لانے کے لئے شراب پلائی تھی۔ یہ ایک سنگین معاملہ تھا اور اب چوہدری بشیر کے اہلکار کوشش کررہے تھے کہ اس معاملے کو کسی طرح دبایا جاسکے۔ گریس نے بڑے جذباتی لہجے میں شانی سے کہا۔ ''میں اب تمہاری یہ چادر دینے والی نہیں ہوں اور نہ ہی اپنی چادر تم سے واپس لوں گی۔ یہ ہمارے پاس ایک دوسرے کی نشانی رہے گی۔''

وہ بہت جذباتی نظر آرہی تھی۔ شانی کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''میں اور اسٹیفن انگلینڈ سے آئے ہیں۔ چوہدری بشیر سے ہماری دوستی اس وقت کی ہے جب یہ کویت میں

تھے۔ یہ ہمیں بہت دفعہ پاکستان آنے کا کہہ چکے ہیں۔ اب یہاں پنڈی میں اسٹیفن اور ان کے دوست رائٹ کو ایک کام بھی تھا۔ ہم نے سوچا یہ دونوں کام ہوجائیں گے۔'' گریس دیر تک اپنے بارے میں بتاتی رہی۔

وہ ایک اچھی خاتون لگتی تھی، لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو محسوس ہوا کہ وہ یہاں اپنی آمد کے حوالے سے کچھ چھپا رہی ہے۔

شانی وہاں سے سیدھی ہوٹل پہنچی۔ مُنا اس کے ساتھ تھا اور شانی کو لگتا تھا کہ پوری کائنات اس کے ساتھ ہے۔ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک...... پھولوں سے لدے ہوئے چھوٹے سے گھر کا جو خواب دیکھا کرتی تھی اس میں دو ہی تو کردار تھے۔ ایک منا، جو اس کی بانہوں میں جھولا جھولتا تھا اور دوسرا فراخ شانوں اور چوڑے سینے والا وہ مرد جو بھاری قدموں سے چل کر آتا اور شانی اور مُنے کو ایک ساتھ بڑی محبت سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا تھا۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دیوی

4

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ———— ۲۰۰۹ء
مطبع ———— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ———— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ———— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

ہوٹل پہنچ کر شانی کی گردن میں سخت اینٹھن ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے پرانی چوٹ پھر سے دکھنے لگی ہے۔ پوٹھوہار میں سون کے قریب رستم اور لالہ کے ڈیرے پر شانی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے آثار تا حال اس کے جسم پر موجود تھے۔ دراڑ کی تاریک گہرائی میں گرتے ہوئے شانی کی گردن پر بھی ضرب آئی تھی اور تین چار دن تک وہ ٹھیک سے گردن گھما نہیں سکی تھی۔ اب جو کچھ چوہدری بشیر کی کوٹھی پر ہوا تھا اس نے ایک بار پھر شانی کی گردن کے مہرے ہلا ڈالے تھے۔ اس نے ڈسپرین کی گولیاں لیں اور چائے منگوائی۔

چائے پیتے ہوئے وہ ان حالات پر غور کرنے لگی جو آج شام کے بعد پیش آئے تھے۔ شانی کو وہ سب کچھ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ ریچھ کا جھپٹنا، شانی کا اس کے منہ پر لکڑی سے وار کرنا اور پھر ''آیا'' کی ادھڑی ہوئی گردن۔ اسے جھرجھری آ گئی۔ مشتعل ریچھ کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک خیال شانی کے ذہن میں آ گیا۔ بظاہر یہ بالکل غیر متعلق خیال تھا، لیکن کچھ نہ کچھ ناتا ہوتا ہے دو خیالوں میں، جو وہ باہم ملتے ہیں۔ شانی کے ذہن میں فاخر کا خیال آیا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا جسم شانی کے تصور میں چمکا۔ وہ بھی تو خواب گاہ میں اسی طرح شانی پر جھپٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی سرخی تھی۔ ایسا ہی بھنبھوڑنے اور چیرنے پھاڑنے والا رویہ ہوتا تھا اس کا۔ وہ ایک بار پھر کانپ سی گئی۔

ہوٹل میں آ کر شانی نے مُنے کو خوب پیار کیا۔ اسے بہت کچھ کھلایا پلایا اور اس کی ڈھیروں باتیں سنیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے آنسو بھی پونچھتی رہی۔

ٹیلی فون پر تین چار بار شانی کا رابطہ عارف سے ہوا۔ عارف مسلسل ہسپتال میں تھا۔ یعنی راجو کی تیمارداری کر رہا تھا۔ عارف کے مطابق راجو کی حالت مسلسل بہتر ہو رہی تھی لیکن اس کی ذہنی کیفیت ابتر تھی۔ وہ بار بار ہذیان بکنے لگتا تھا، اپنے مخصوص دیہاتی لب و لہجے میں

ڈاکٹروں کی منت کرتا تھا کہ وہ اسے زہر کا ٹیکہ لگا دیں، وہ مزید جینا نہیں چاہتا ہے۔ عارف زیادہ تر وقت راجو کے سرہانے گزار رہا تھا اور یہ احتیاط کر رہا تھا کہ راجو کسی طرح خود کو نقصان نہ پہنچائے۔ عارف کے مطابق اس نے حاجی حیات کے ماتحت سب انسپکٹر اختر تک راجو کی شدید بیماری کی اطلاع پہنچا دی تھی اور امید تھی کہ اب تک ڈپٹی ریاض کی وساطت سے یہ اطلاع تاؤ حشام تک پہنچ چکی ہوگی۔

مُنا اور شانی رات دیر تک جاگتے رہے۔ اُن دنوں کی باتیں کرتے رہے جب وہ ایک دوسرے سے دور تھے۔ شانی بڑی حکمت کے ساتھ مُنے کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اب اپنی امی کی محبت بھی اپنے ابو میں ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

وہ ترت بولا۔ ''وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں تو پھر میلے واسطے نئی امی کیوں لاتے ہیں۔ تم کو میلی امی کیوں نہیں بناتے؟''

شانی آہ بھر کر رہ گئی۔ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا ابو تو اس کام کے لئے بس ایک اشارے کا منتظر ہے۔ شانی نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو مُنے! میں تمہاری امی نہیں بن سکتی کیونکہ میں تمہاری چاچی ہوں۔ ہاں، میں تمہیں اسی طرح پیار کرتی رہوں گی جیسے امیاں کرتی ہیں۔ میں تمہیں ملتی رہوں گی۔ اسی طرح کبھی کبھی تمہیں اپنے ساتھ لے جاتی رہوں گی۔ ہم اکٹھے گھومے پھریں گے۔ سیر کیا کریں گے۔''

''تم غلط کہتی ہو، تم چلی جاتی ہو، میں تمہیں ڈھونڈتا رہتا ہوں اور لوتا رہتا ہوں۔ ابو کہتے ہیں، تم کسی اور سے شادی کر لو گی۔ تم اچھی نہیں ہو۔ مجھے پتا ہے ابو جھوٹ کہتے ہیں۔ تم بلی اچھی ہو میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ کہیں نہیں۔''

شانی اسے لے کر باہر ٹیرس میں آ گئی۔ وہ بولتا چلا گیا۔ ''تاتی میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ میں شلالت بھی نہیں کلوں گا۔ تم جو کہو گی میں کلوں گا۔''

شانی اسے لے کر گھومتی رہی۔ اسے بہلاتی رہی۔ اگلے روز حسبِ وعدہ شانی نے مُنے کو واپس چوہدری بشیر کے پاس پہنچانا تھا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل ثابت ہوا۔ مُنے اور شانی میں وہی تعلق تھا جو مقناطیس اور لوہے کے چھوٹے سے ٹکڑے میں ہوتا ہے۔ وہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اس کی اشک بار آنکھیں شانی کو دہلا رہی تھیں۔ اسی دوران میں نشتر ہسپتال سے عارف کی کال آ گئی۔ عارف کی آواز سنتے ہی شانی کو اندازہ ہو گیا کہ گڑبڑ ہے۔ عارف نے

کہا۔ ''شانی بہن! تم جلدی آؤ یہاں معاملہ خراب ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''راجو نے شیشے کا گلاس توڑ کر اپنی گردن زخمی کر لی ہے۔ بہت سا خون نکلا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگایا ہے پر وہ واویلا کرتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میانہ سے تاؤ حشام اور چار پانچ بندے بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ ڈاکٹروں سے لڑ رہے ہیں۔ تاؤ کے بندوں نے بڑا ہنگامہ کیا ہے۔ سارے ہسپتال میں تماشا بنا ہوا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' شانی نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ مُنے کو جلد از جلد چوہدری بشیر تک پہنچا کر ہسپتال جائے...... مُنے کے ساتھ وہ ہسپتال جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے ہوٹل کے سامنے سے ایک ٹیکسی لی۔ مُنے کو بہت سی ٹافیاں، چاکلیٹس اور آئس کریم وغیرہ دلائی اور پھر عثمانیہ ٹیکسٹائل پہنچ گئی۔ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا کہ چوہدری بشیر اس وقت واش روم میں تھا۔ شانی نے منہ بسورتے مُنے کو فردوس اور زہرا کے سپرد کیا اور واپس آ گئی۔ ابھی وہ چوہدری کی کوٹھی سے بمشکل آدھا کلومیٹر دور ہی آئی ہوگی کہ اس کی نگاہ ایک سرخ ہنڈا کار پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اسے ہنڈا کار میں تاؤ حشام نظر آیا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر سفید پگڑ بہت نمایاں تھا۔ اس کے عقب میں خطرناک صورتوں والے تین چار ڈشکرے بیٹھے تھے۔ شانی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ ''ڈرائیور گاڑی روکو۔'' شانی نے بے ساختہ کہا۔

ٹیکسی کے بریک چرچرائے اور وہ رک گئی۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ تاؤ کی سرخ کار چوراہے کے سگنل پر ٹھہری ہوئی تھی۔ چوراہے پر رش بہت زیادہ تھا۔ شانی کوشش کرتی تو تاؤ کو روک سکتی تھی۔ اس نے سو کا نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کی جھولی میں پھینکا اور دروازہ کھول کر تیزی سے چوراہے کی سمت گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ تاؤ حشام سارے معاملے سے باخبر ہو چکا ہے اور اب وہ کسی بُرے ارادے سے چوہدری بشیر کی طرف جا رہا ہے۔ شانی کو یہ بھی معلوم تھا کہ بظاہر تاؤ حشام اور چوہدری بشیر میں صلح ہو چکی ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں کدورت موجود ہے۔ شانی نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور اس سے پہلے کہ گاڑی حرکت میں آ جاتی، وہ ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر تاؤ حشام نے بھی اسے دیکھ لیا۔ شانی نے تاؤ حشام کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ بہرحال اس کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی ایک سائیڈ پر لگا دی۔ شانی کو تاؤ کے ساتھ چوہدری بابر بھی بیٹھا نظر آیا۔ وہی لمبا تڑنگا نوجوان چوہدری جس نے ایک جنگل میں ایک

طوفانی رات میں جنس کے دیو سے مغلوب ہو کر شانی کو ایک درخت سے باندھا تھا اور اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

شانی نے تاؤ حشام کو گاڑی سے باہر آنے کے لئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد شانی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک سایہ دار درخت تلے کھڑی تاؤ سے بات کر رہی تھی۔ شانی کا اندازہ درست تھا تاؤ اور اس کے بندے چوہدری بشیر کی طرف ہی جا رہے تھے۔ تاؤ پھنکارتے ہوئے بولا۔

''تُو کس خوشی میں بشیر کی حمایت کر رہی ہے۔ اس کُتے کو ہم تجھ سے زیادہ جانتے ہیں اپنے ہاتھوں سے اس سانپ کو دودھ پلایا ہوا ہے۔ اس نے دشمنی کی ہے میرے پُتر سے، ویر کمایا ہے۔ میں کھوتا نہیں ہوں۔ ساری بات سمجھ میں آگئی ہے مجھے، اگر میرے پُتر کو کچھ ہوا تو اس کا ذمے دار بشیرا ہوگا۔ کنجر کے تخم کو شرم نہیں آئی۔ اپنے سے اٹھارہ سال چھوٹی کُڑی سے ویاہ رچانے چلا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ہمارے ہوتے ہوئے وہ کیسے کرتا ہے یہ رنگ بازی۔''

شانی نے کہا۔ ''چوہدری حشام! میں تمہیں بڑی سے بڑی قسم کھا کر یقین دلا سکتی ہوں۔ چوہدری بشیر کو پتا نہیں تھا کہ یہ لڑکی راجو کی پسند ہے۔ یہ تو پیر قدرت اللہ سے دم کرانے گئی تھی کہیں۔ وہیں پر چوہدری بشیر نے اسے دیکھا۔ میں سچ کہتی ہوں اس میں دشمنی وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا۔''

''پر اب تو اسے پتا چل چکا ہوگا ناں کہ یہ کُڑی کس سے ویاہ کرنا چاہتی ہے۔ اب وہ کیوں اَڑا ہوا ہے اپنی گل پر؟''

شانی نے کہا۔ ''دیکھو چوہدری حشام! تمہیں ذرا تحمل سے کام لینا ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اس بارے میں بات کی ہے بشیر سے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گی اور یہ شادی رک جائے گی۔''

''کیسے رک جائے گی۔ ہمیں تو پتا چلا ہے کہ کارڈ بانٹے جا چکے ہیں۔ تیل مہندی کی تیاری ہو گئی ہے۔ دیگیں کھڑکانے کے لئے نائی آ رہے ہیں۔'' چوہدری حشام کے ساتھ آنے والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔

تاؤ حشام کے چہرے کا بدنما داغ سورج کی روشنی میں کچھ اور بھی دمک اٹھا۔ وہ سینہ پھلا کر بولا۔ ''تُو زیادہ چوہدرائن نہ بن اس معاملے میں۔ ہم اپنے معاملے خود نمٹا سکتے ہیں جب تُو پیدا نہیں ہوئی تھی ہم اس وقت بھی اپنے فیصلے آپ کرتے تھے۔''

چوہدری حشام شانی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ ''خدا کے لئے چوہدری۔'' شانی روہانسی ہو گئی۔ ''بنا بنایا کام خراب نہ کرو۔ میں قسم کھاتی ہوں بشیر نے یہ

کام دشمنی میں نہیں کیا۔''

شانی کو روہانسا دیکھ کر بابر نے دبے لفظوں میں شانی کی حمایت کی، بولا۔ ''تاؤ! چلو تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ کیا کرتی ہے۔''

''ایویں، ہمیں چکر دے رہی ہے۔ مجھے چنگی طرح پتا ہے بشیرا اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہیں ہے۔''

بابر تین چار قدم چل کر تاؤ حشام کے پاس چلا گیا اور سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ چوہدری حشام کا چہرہ بدستور تمتما رہا تھا اور گردن اکڑی ہوئی تھی...... شانی نے سوچا...... یہ وہی حشام ہے جو پوٹھوہاری ٹیلوں کے اندر ''وڈے ڈیرے'' میں زنانہ کپڑے پہن کر کوٹھڑی کے فرش پر چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ رستم کی صورت دیکھ کر ہی اس کا رنگ ہلدی ہو جاتا تھا۔ اب رہائی کے بعد چند ہی دنوں کے اندر اس کی ساری اکڑفوں پھر سے عود کر آئی تھی۔ وہی مثال کُتے کی دم کو سو سال بھی حقے کی نالی میں رکھو تو وہ سیدھی نہیں ہوتی۔ بابر اور حشام میں چار پانچ منٹ تک بات ہوئی۔ حشام قدرے ڈھیلا نظر آنے لگا۔ اس سارے معاملے میں حشام کا کردار احمقانہ رہا تھا۔ بلکہ سارا کھیل ہی اس کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جب اسے پتا چلا کہ اس کا لاڈلا پُتر ایک کریانہ فروش کی بیٹی سے پیار کر بیٹھا ہے تو اس کی چوہدراہٹ نے فوراً اپنا پھن پھیلا لیا۔ اس نے کریانہ فروش سیف اللہ کو ڈرا دھمکا کر اور ذلیل کر کے پاک پتن چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن اب...... جب وہ اپنے بیٹے کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ رہا تھا، اس کی چوہدراہٹ نے ایک بار پھر پھن پھیلا لیا تھا۔ تاہم اس مرتبہ یہ غیظ و غضب اپنے بیٹے کی حمایت میں تھا۔ بورژوائی طبقے کا وہی اندازِ فکر جو عام لوگوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

کچھ دیر بعد بابر شانی کی طرف آیا۔ اکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم آج انتظار کرتے ہیں۔ اگر بشیرے کی طرف سے معاملہ سیدھا ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو پھر...... کل بازوؤں کے زور پر فیصلہ ہو جائے گا۔ ہم اس کُڑی کو بشیرے کی ڈولی میں نہیں بیٹھنے دیں گے۔''

شانی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''راجو کا اب کیا حال ہے؟''

''بہت بُرا حال ہے۔ ہم اب ہسپتال چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی کچھ دیر میں وہاں آتی ہوں۔'' شانی نے کہا اور کچھ سوچتی ہوئی دوسری طرف مڑ گئی۔ اس کا رخ دوبارہ چوہدری بشیر کی کوٹھی کی طرف ہو گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ

اب وہ پیدل جارہی تھی۔ ایک مصروف سڑک کے کنارے ہونے والی اس ساری گفت وشنید کو راہ گیر بڑی متجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ شانی نے خود کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ تیز چبھتی ہوئی نظروں کی پرواہ کئے بغیر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی چلی جارہی تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ ایک بار پھر عثمانیہ ہاؤس کے مین گیٹ پر کھڑی تھی۔ گارڈز اب اسے اچھی طرح جان گئے تھے۔ غالباً چوہدری بشیر نے بھی انہیں ہدایت کردی تھی کہ شانی کی آمدورفت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

شانی نے وسیع وعریض احاطہ پار کیا اور اندرونی حصے میں داخل ہوگئی۔ ایک دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے جوان سال گریس کی آواز سنائی دی وہ شاید فون پر کسی سے بات کررہی تھی وہ کہہ رہی تھی۔ ''اب اس کام سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں ہے بڑے بھائی! بہتر ہے کہ تم خود آجاؤ......'' شانی آگے نکلتی چلی گئی۔ راستے میں ایک دو ملازموں نے اسے سلام کیا۔ پھر اسے زہرا نظر آگئی۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ''چوہدری جی کہاں ہیں؟''

''وہ اوپر ہیں۔''

''اور مُنا؟''

''وہ فردوس کے پاس ہے جی۔ ابھی ابھی بے چارے کو چوہدری جی سے بڑی ڈانٹ پڑی ہے۔'' شانی نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ''دوا نہیں کھارہا تھا۔ روتا چلا جارہا تھا۔''

''اب کہاں ہے وہ؟''

زہرا نے اسے کمرہ دکھایا۔ شانی ساگوانی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ فردوس فرش پر سے ایک شیشی کی کرچیاں چن رہی تھی۔ تھوڑی سی دوا بھی فرش پر گری ہوئی تھی۔ مُنا بستر پر اوندھا پڑا تھا۔

شانی کو دیکھ کر فردوس چونکی۔ ''یہ کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''دوا والی شیشی توڑ دی ہے مُنے نے۔ چوہدری جی کو پتا چلا تو اسے گالیاں پڑیں گی ہی، میری بھی شامت آئے گی۔'' وہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔

شانی کی آواز سن کر مُنا تیزی سے اٹھا اور اس کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ ''تاتی! تم گئی نہیں ہو؟'' وہ اس کا رخسار چومتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ابھی نہیں لیکن تم نے دوا کیوں نہیں پی۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ابو یا ماسی کو تنگ نہیں کرو گے۔''

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ ''اور دوا ہے؟'' فردوس نے اثبات میں جواب دیا۔ شانی نے دوا لانے کو کہا۔ فردوس دوا لے کر آئی تو شانی نے اپنے ہاتھ سے مُنے کو پلائی۔ وہ واقعی کڑوی کسیلی تھی تاہم شانی کے ہاتھ سے پینے میں مُنے نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ ''چوہدری صاحب کو بتاؤ میں آئی ہوں۔ ان سے بات کرنی ہے۔''

فردوس بولی۔ ''میں نے ابھی بتایا ہے انہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مُنے کو دوا پلا کر اوپر آجاؤ۔''

شانی نے مُنے کو ایک بار پھر فردوس کے سپرد کیا اور اوپر چلی گئی۔ فردوس نے بتایا تھا کہ پہلی راہداری میں چوتھا دروازہ ہے۔ شانی نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ پہلی دستک پر ہی اندر سے چوہدری کی بھاری آواز آئی۔ ''آجاؤ۔''

شانی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر گئی۔ اندر پہنچتے ہی وہ بُری طرح چونکی۔ اس کشادہ کمرے میں شانی کی بہت سی تصویریں آویزاں تھیں۔ کئی تصویریں تو بڑے پوسٹر کے سائز کی تھیں۔ انہیں بڑی نفاست سے دیواروں پر آویزاں کیا گیا تھا۔ کچھ تصویریں قیمتی فریموں میں تھیں۔ ان میں ایک وہی تصویر تھی جو چوہدری نے لاہور والی کوٹھی میں شانی کو بستر پر لٹا کر کھینچی تھی۔ کھڑکی کی طرف سے روشنی اندر داخل ہورہی تھی۔ شانی کی شکل تو پوری طرح نظر نہیں آتی تھی لیکن اس کے جسمانی خدوخال بے حد نمایاں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شانی کی بجائے شانی کے جسم کی تصویر ہے۔ یہ تصویر کھینچنے کے دوران میں چوہدری بشیر کے ہاتھ بڑے تکلیف دہ طریقے سے شانی کے جسم سے ''ہم کلام'' ہوئے تھے اور شانی کو رونے پر مجبور کردیا تھا۔ ان تصویروں میں شانی کی وہ تصویر بھی تھی جس میں چوہدری نے اس کے سر پر پھول بکھیرے تھے۔ زیادہ تر تصویریں مُنے کے ساتھ تھیں۔

شانی ان تصویروں کو دیکھ کر خجل سی ہوگئی۔ اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چوہدری نے اسے جان بوجھ کر اس کمرے میں بلایا ہے۔ ''بیٹھ جاؤ'' چوہدری نے ایک قیمتی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ شانی بیٹھ گئی۔ کمرے میں کچھ دیر تک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ چوہدری نے پوچھا۔ ''پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

شانی جانتی تھی کہ چوہدری کی طرف سے پہلا سوال یہی ہوگا اور وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے اسی کا جواب سوچ رہی تھی۔ یہ شانی کی زندگی کا مشکل ترین سوال تھا۔ اس کا جواب دینے کے لئے اسے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنا تھا۔ جو چیز اس کے کانپتے

دل کو تھوڑا سا ... مضبوط کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ رستم شادی کر چکا ہے۔ وہ اور نادیہ ایک ہو چکے ہیں۔

شانی نے اپنے نچلے ہونٹ کو نرمی سے دانتوں تلے دبایا اور ہولے سے بولی۔

''چوہدری! یہ بہت بڑا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ میں اکیلے ابھی نہیں کر سکتی ہوں۔ مم...... مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔''

''میں تیار ہوں، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس شادی کی ساری تیاری مکمل ہو چکی ہے اگر میں یہ شادی روک دیتا ہوں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا فیصلہ میرے اور مُنے کے حق میں ہی ہوگا؟''

شانی نے ایک دکھ بھری طویل سانس لی اور بولی۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ میری زندگی میں کوئی اور نہیں آئے گا...... اور نہ اس حوالے سے آپ کسی قسم کی کوئی بات سنیں گے۔''

شانی نے محسوس کیا کہ چوہدری کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی ہے لیکن اس نے بظاہر کسی طرح کے اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ بدستور اکھڑے لہجے میں بولا۔ ''شانی، تم اصل سوال سے ہٹ رہی ہو...... مجھے اور مُنے کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ ضرورت کب پوری ہوگی؟''

شانی کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی گود میں گر گئے۔ ''میں نے کہا ہے ناں ..... مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔''

شانی کے آنسوؤں نے شاید چوہدری کے دل پر تھوڑا سا اثر کیا۔ وہ بڑے دھیان سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کسی طرح سے اس شادی کو دو ہفتے آگے کر دیتے ہیں۔ اس دوران میں تم بھی اچھی طرح سوچ لو۔ پھر جو بھی فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق چلیں گے۔''

''آپ اس شادی کو ہتھیار کے طور پر کیوں استعمال کر رہے ہیں۔'' شانی روہانسی ہوگئی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ کوکب، آپ کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ وہ آپ کو..... وہ آپ کو سچی خوشی نہیں دے سکتی۔''

''سچی خوشی تو شاید میرے نصیب میں ہی نہیں۔'' چوہدری معنی خیز لہجے میں بولا پھر ذرا توقف کر کے اس نے بات جاری رکھی۔ ''ٹھیک ہے شانی! میں اس شادی کو تین ہفتے آگے کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے کسی بھی فیصلے پر پہنچنے کے لئے یہ کافی وقت ہے۔''

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چوہدری کسی طور بھی اپنے شکنجے کو ڈھیلا کرنے پر تیار

نہیں تھا۔ تاہم ایک ذرا سا ریلیف شانی کو ضرور محسوس ہو رہا تھا اور وہ یہ کہ فوری بلا ٹل رہی تھی۔ ورنہ تو دو روز بعد چوہدری کی رسمِ حنا تھی۔ تین ہفتے خاصا وقت تھا۔ کوئی کرشمہ ہو سکتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شانی بھی کسی حتمی فیصلے تک پہنچ سکتی تھی۔

بڑا انوکھا جبر تھا چوہدری کا۔ اس نے شانی کو کبھی ریپ نہیں کیا تھا۔ بگڑے ہوئے جاگیرداروں کی طرح اس پر ہنٹر نہیں برسائے تھے لیکن وہ جو کچھ کرتا تھا وہ ان مظالم کی طرح ہی تکلیف دہ تھا وہ ایک معصوم بچے کے ساتھ شانی کی دیرینہ وابستگی کو بلیک میلنگ کے لئے استعمال کرتا تھا اور اب چند دن بعد ہونے والی شادی کے حوالے سے ایک اور کارگر ہتھیار اس کے پاس آ گیا تھا۔

شانی عثمانیہ ہاؤس سے سیدھی نشتر ہسپتال پہنچی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ گیا کہ راجو کی گردن پر سفید رنگ کی ایک بڑی پٹی نظر آ رہی تھی۔ یہ پٹی راجو کی دوسری ''خودکشی'' کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ راجو کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر سو رہا تھا۔ اب وہ ''آئی سی یو'' سے باہر آ چکا تھا اور ایک پرائیویٹ کمرے میں تھا۔ کمرے میں عارف اور پیجا گجر کے علاوہ تاؤ حشام اور اس کے مسلح کارندے بھی موجود تھے۔ انہوں نے کمرے میں رش ڈال رکھا تھا۔ اسٹاف جز بز نظر آتا تھا۔ شانی نے بابرے سے کہا کہ مریض کے پاس صرف ایک یا دو بندے رہیں باقی باہر آ جائیں۔

بابرے نے کمرہ خالی کرا لیا۔ تاؤ حشام کی خشمگیں نظریں بار بار شانی کے چہرے کا طواف کرنے لگتی تھیں۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ شانی سے کچھ نہایت تلخ قسم کی باتیں کہنا اور پوچھنا چاہتا ہے۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا۔ بابرے کے روکتے روکتے بھی لمبے ڈگ بھرتا شانی کی طرف آ گیا۔ ''ہاں کڑیے! تُو نے کیا کیا ہے؟'' وہ اجڈ لہجے میں بولا۔

''میں نے آپ سے کہا ہے ناں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' شانی نے کہا۔

''اوئے پریشانی کی بات کیوں نہیں۔'' تاؤ کے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ''وہاں کوکی کے گھر میں تیل مہندی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

''اب ختم ہو جائیں گی تیاریاں۔ ہفتے کو کوکب کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔'' شانی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ ہفتے کو نہیں ہوگی تو کب ہوگی؟'' تاؤ نے پوچھا۔

''ابھی آپ اس معاملے کو ختم سمجھیں اور میں ہاتھ باندھ کر آپ سے درخواست کرتی

ہوں کہ اپنے دماغوں کو ٹھنڈا رکھیں۔ ہلڑ بازی سے بنا بنایا کام بگڑے گا۔ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی۔''

بابرے نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور تاؤ حشام کو ایک طرف لے جا کر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بابرا اس معاملے میں مثبت کردار ادا کر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ کافی بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ تیز طراری اور اجڈ پنے کی بجائے شانی کو اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا دکھائی دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد شانی نے بابرے کو سمجھایا کہ ان لوگوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ہسپتال میں ڈیرہ ڈالنے کے بجائے گاؤں واپس چلے جائیں۔ صرف ایک یا دو بندے احتیاطاً یہاں رہ لیں اور اگر واپس جانا ممکن نہیں تو پھر یہاں کے کسی ہوٹل میں ایک دو کمرے لے لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بابرے کو یہ تاکید بھی کی کہ چوہدری بشیر کے ساتھ کسی طرح کے تصادم کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ فوری طور پر کوکب سے شادی کرکے اسے گھر میں ڈال سکتا ہے۔

ہسپتال سے شانی سیدھی حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔ سیف اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا کھانا لے کر ہسپتال گیا ہوا تھا۔ جونہی شانی اندر داخل ہوئی کوکب کی والدہ اور بڑی بہن امید بھری نظروں سے شانی کی طرف دیکھنے لگیں۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی لیکن جب شانی مسکرائی تو ان دونوں کے چہروں کی چمک بڑھ گئی۔ اس دوران میں کوکب کی چاچی ثریا بھی اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی پہنچ گئی۔ کوکب دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ یہ عورتیں عجیب تذبذب میں تھیں۔ شادی کی تیاری کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ یہ امید بھی کر رہی تھیں کہ یہ شادی کسی طرح رک جائے۔ کمرے میں چاروں طرف جہیز کے کپڑے بکھرے تھے۔ دو عورتیں عروسی جوڑے ٹانکنے میں مصروف تھیں۔ دیگر سامان بھی پیک کیا جا رہا تھا۔ شانی نے ثریا کے ہاتھ سے ایک مخملی جوڑا لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ ''ابھی چھوڑ دو سب .. ہفتے کو کوکب کی شادی نہیں ہو رہی . اور بڑی امید ہے کہ اب یہ معاملہ ویسے ہی ٹل جائے گا۔'' شانی نے کہا۔

''تت تم سچ کہہ رہی ہو۔'' آنٹی عطیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں آنٹی جی، میں ابھی کچھ دیر پہلے بات کرکے آرہی ہوں چوہدری بشیر سے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟'' ثریا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''میں نے کوکب پر کسی طرح کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ بڑے طریقے سے اسے سب کچھ سمجھایا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بڑی حد تک سمجھ گیا ہے۔''

شانی نے چند ایک باتیں گھر والوں کو بتائیں۔ وہ سن رہے تھے لیکن انہیں بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران میں شانی نے راجو کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اس نے گردن پر شیشہ مار کر خود کو زخمی کرلیا ہے اور ڈاکٹروں نے اسے ٹرنکولائزر دے رکھی ہے۔ راجو کی بات شروع ہوئی تو سنبل نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کا اندرونی دروازہ بند کردیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسرے کمرے میں ان باتوں کی بھنک بھی کوکی کے کانوں تک پہنچے۔ اس کی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ آنٹی عطیہ نے شانی کے دونوں ہاتھ تھامے اور روتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی! اگر کچھ کرسکتی ہے تو کر، مجھے لگتا ہے کہ میری بچی بے موت ماری جائے گی۔''

شانی نے آنٹی عطیہ کو گلے سے لگایا۔ ''میں ہوں نا آنٹی، آپ حوصلہ رکھیں۔''

آنٹی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بیٹی! اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمارا بال بال بشیر کے قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر اس نے ناراض ہو کر انکار کیا تو پھر ہمارے لئے بڑی مصیبت ہوجائے گی۔ میرے دیور کے علاج کا سارا خرچا اٹھا رہا ہے۔ خلیل بے روزگار پھر رہا تھا، بشیر نے اسے اچھی نوکری پر لگایا ہوا ہے۔ جس چھت کے نیچے ہم بیٹھے ہیں اس کے لئے بشیر نے رقم دی ہے۔ اگر......''

''آپ بے فکر رہیں آنٹی جی! میں یہ سب باتیں جانتی ہوں۔ اللہ نے چاہا نے آپ پر بشیر کی ناراضی کا کوئی بوجھ نہیں آئے گا۔''

اسی دوران میں کمرے کا اندرونی دروازہ ہولے سے کھلا اور سامنے سرو قد کوکب کھڑی نظر آئی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے اور بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ جسم دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھرپور نسوانیت رکھتا تھا۔ وہ کانچ کی گڑیا جیسی تھی۔ ''سلام باجی۔'' اس نے کہا اور سوگوار سے انداز میں شانی کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے ہلکا زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ شانی نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا تو نہ جانے کیوں چند آنسو کوکب کی آنکھوں سے گر گئے۔ شانی کو لگا جیسے اس نے یہاں کمرے میں ہونے والی کچھ امید بھری باتیں سن لی ہیں۔ شانی نے اسے اپنے کندھے سے لگایا تو وہ ایک دم سسکنے لگی۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا میری بہن۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' شانی نے کہا۔

وہ روتے روتے بولی۔ ''باجی! کیا ہوا تھا اس کو؟''

شانی سمجھ گئی۔ کوکب نے راجو کے زخمی ہونے کے بارے میں سن لیا تھا۔ ''کچھ نہیں کوکی، وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' شانی نے تسلی دی۔ ''بس گردن پر شیشے سے چھوٹا سا کٹ لگا ہے۔ میں ہسپتال سے ہی آرہی ہوں۔ وہ آرام سے سو رہا تھا۔''

''باجی! وہ مرجائے گا۔ وہ زندہ نہیں رہے گا۔'' کوکی کی آواز کرب ناک تھی۔

''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔'' شانی نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''کچھ نہیں ہوگا اسے اور نہ ہی تمہیں۔'' شانی نے کوکی کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

دوسرے کمرے سے کسی عورت کی آواز آئی۔ وہ ثریا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بڑی باجی! مہندی کے دن کے لئے کتنے چاول صاف کرنے ہیں؟''

ثریا نے دبی دبی خوشی کے ساتھ کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں کرنے چاول صاف۔ میں ابھی آکر بتاتی ہوں تجھے۔''

شانی... سیف اللہ سے بھی ملنا چاہتی تھی۔ وہ کافی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ آخر سیف اللہ موٹر سائیکل پر گھر آیا۔ گھر کی عورتیں کونے کھدروں میں دبک گئیں یا اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آنے لگیں۔ صرف آنٹی عطیہ ہی شانی کے پاس بیٹھی رہ گئیں۔ شانی نے اب تک کی پیش رفت کے بارے میں سیف اللہ کو تفصیل سے بتایا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''انکل! ہمارے لئے ایک اور اچھی خبر بھی ہے۔''

''اچھی خبر اور ہمارے لئے؟'' سیف اللہ کے لہجے میں کرب تھا۔

''ہاں انکل! شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ بیٹے کی حالت کا سن کر چوہدری حشام یہاں آچکا ہے۔ وہ اب ایک بالکل بدلا ہوا شخص ہے۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم نظر آتی ہے۔ وہ اب وہی کرنا چاہتا ہے جو اس کے بیٹے کی خواہش ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ چوہدری بشیر سمیت کسی بھی بندے سے ٹکر لے سکتا ہے۔''

''لیکن وہ میرے ساتھ جو کر چکا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اپنے بیٹے کو بیمار دیکھ کر اس کے کلیجے پر ہاتھ پڑا ہے لیکن جب میری غریب بچی بستر سے لگی ہوئی تھی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ یہ راجو اب خودکشیوں کے ڈرامے رچا رہا ہے، یہ بھی کہاں تھا اُس وقت۔'' سیف نے کرب کے عالم میں کہا۔

''راجو اس معاملے میں تقریباً بے قصور ہے انکل۔ میں آپ کو اس بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گی۔''

سیف اللہ الجھن کے انداز میں اپنی پیشانی مسلتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ اسے اب

یہ فکر کھا رہی تھی کہ اگر کوکی کی شادی ملتوی ہوتی ہے تو ساتھ میں سنبل کی بھی ہوگی۔ وہ دوسری بیٹی کے سسرالیوں کو کیسے قائل کرے گا۔ شانی نے سیف اللہ سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ یہ کام بھی چوہدری بشیر کے ذریعے ہی ہوگا۔

اگلے روز شانی صبح سویرے ہسپتال چلی گئی اور اس نے عارف کمبوہ کو ہوٹل بھیج دیا...... عارف کچھ تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ پچھلے تین چار دن سے مسلسل راجو کے سرہانے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ تاؤ حشام اور اس کے ساتھی بھی ابھی ملتان میں ہی تھے۔ انہوں نے ایک قریبی ہوٹل میں دو کمرے کرائے پر لے لئے تھے۔ دوپہر کے وقت شانی نے راجو کو بستر پر ہی اٹھا کر بٹھایا۔ گلے کے زخم کے سبب اسے نگلنے میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اسے مائع اشیاء دی جائیں۔ شانی نے اسے جوس پلانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ راجو کی آنکھوں کے گوشے مسلسل نم تھے۔ وہ ہر شخص سے ناراض نظر آتا تھا کراہ کر بولا۔

''تم سب لوگ مجھ سے بات چھپاتے ہو۔ کوئی بھی مجھے ٹھیک نہیں بتاتا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ کون سا دن ہے؟ اس کی شادی ہوگئی ہے یا نہیں؟''

شانی نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ ''راجو! کیا مجھ پر بھی یقین نہیں کرو گے؟''

شانی نے اتنی محبت اور ایسے جذبے سے کہا تھا کہ راجو انکار میں جواب نہیں دے سکا۔ اس کی خاموشی نے شانی کو حوصلہ دیا۔ اس نے اپنا سارا خلوص اپنے لہجے میں سمیٹا اور اخبار راجو کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو...... یہ آج کا تازہ اخبار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑکا تمہارے سامنے یہاں رکھ کر گیا ہے۔ یہ دیکھو..... یہاں کیا تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ آج 12 تاریخ اور جمعرات ہے۔ کوکی کی شادی 14 تاریخ ہفتے کو تھی یعنی ابھی بھی تین دن باقی ہیں۔''

راجو نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اخبار پر نگاہ دوڑائی اور منہ پھیر لیا۔

شانی نے اس کا سرد ہاتھ دبایا اور کہا۔ ''اگر تم میری بات پر اعتبار کر سکو تو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ شادی اب نہیں ہوگی۔''

راجو نے چونک کر شانی کو دیکھا۔ اس کی زندگی سے خالی آنکھوں میں ایک ساعت کے لئے امید کی کرن نظر آئی اور بجھ گئی۔ وہ منہ پھیر کر بولا۔ ''مجھے خواہ مخواہ کی تسلیاں نہ دو۔ میں سمجھ گیا ہوں اب موت کے سوا میرا کوئی علاج نہیں اور میں دکھا دوں گا مر کر۔ سیف کو بھی اور اس کی بیٹی کو بھی۔'' اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رس رہے تھے۔

شانی نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ''میرے ہوتے ہوئے تجھے کچھ نہیں

ہوگا راجو......اور نہ تمہاری کوکی کو۔ میں نے سب ٹھیک کرلیا ہے۔ پرسوں کوکی کی شادی نہیں ہورہی۔ اب اس کی شادی ہوگی تو تمہارے ساتھ ہوگی یہ تم سے وعدہ ہے میرا۔"

شانی کے لہجے میں موجود سچائی نے راجو کو ایک بار پھر چونکا دیا۔ وہ پلٹ کر شانی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ امید، شک، موہوم سی خوشی اور شاید تھوڑی سی ندامت بھی۔ شانی اس ندامت کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اس ندامت کا تعلق اس رات سے تھا جب راجو۔ شانی کے سامنے ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے نہیں ایک "مرد" کی حیثیت سے آیا تھا اور اس نے اپنے "نادان جوش" کے زیر اثر شانی کو اپنے بستر پر گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔ خیر اب یہ پرانی بات تھی۔ شانی سب کچھ بھول چکی تھی اور راجو بھی بالکل بدل چکا تھا۔

شانی بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ سہلاتی رہی اور پورے یقین کے ساتھ اس کی امید بندھاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہونے لگا۔ وہ شانی کی باتیں دھیان سے سننے لگا۔ شانی نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جس شخص کے ساتھ کوکی کا بیاہ ہونے جارہا تھا وہ راجو کا اپنا رشتے دار چوہدری بشیر ہے۔ تاہم اس نے راجو کو بتایا کہ وہ اس شخص سے ملی ہے اور اسے اس معاملے کی ساری اونچ نیچ سمجھائی ہے۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ شادی ملتوی ہوگئی ہے۔

راجو کے نوخیز چہرے پر امید کی کرنیں جگمگانے لگیں۔ شانی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی اور سمجھاتی رہی کہ وہ خود کو اور کوکی کو تماشا نہ بنائے۔ صبر سے کام لے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

اسی دوران میں تاؤ حشام، بابر اور دیگر افراد بھی ہسپتال آگئے۔ راجو کے کمرے سے باہر شانی نے تاؤ حشام سے بات کی اور اس سے کہا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ معاملات اس کے بیٹے کے لئے ٹھیک ہوجائیں تو اسے جاکر سیف اللہ سے ملنا چاہیے اور اس کی دلجوئی کرنی چاہیے۔ تاؤ حشام کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اس کی چوہدراہٹ و ہٹ دھرمی اسے کریانہ فروش سیف اللہ کے پاس جانے کی اجازت نہیں دے گی۔

کچھ دیر بعد شانی نے علیحدگی میں بابر سے بات کی اور اس سے کہا کہ اگر چوہدری حشام یہ ہمت نہیں کر رہا تو وہ خود کرلے۔ راجو کے عزیزوں میں سے کسی ایک کا سیف اللہ کے پاس جانا اور اس کی اشک شوئی کرنا ضروری ہے۔ بابر نے یہ بات مان لی اور شانی سے کہا کہ وہ تاؤ

کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا اگر وہ راضی نہ ہوا تو پھر وہ خود چلا جائے گا۔

راجو کی حالت بہتر ہورہی تھی لیکن ابھی چھ سات روز تک اس کا ہسپتال سے فارغ ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اگلے روز شانی نے عارف کو ساتھ لیا اور لاہور چلی گئی۔ یہاں اس کی سیشن کورٹ میں تاریخ تھی۔ تاریخ بھگت کر وہ دوسرے روز پھر واپس ملتان آگئی۔ عارف بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ابھی تک فاران ہوٹل میں مقیم تھے۔ شانی جانتی تھی کہ جوہر آباد میں ڈاکٹر بہروز وغیرہ کے استقبال اور ہسپتال کے افتتاح کے لئے عارف واپس جانا چاہتا ہے مگر یہاں شانی کو تنہا چھوڑ کر جانے کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بشیر اور کوکب کی شادی ملتوی ہوچکی تھی۔ بہانہ یہ بنایا گیا تھا کہ چوہدری بشیر کی ہمشیرہ بے حد بیمار ہیں (اس کی ایک دور پار کی رشتے دار واقعی بہت بیمار تھی..... چوہدری نے موقع کی مناسبت سے اسے بہن قرار دے دیا تھا) یہ چھٹے ساتویں روز کی بات ہے شانی ہوٹل میں تھی اور ہسپتال میں راجو کے پاس جانے کی تیاری کررہی تھی......اسے چوہدری بشیر کا فون موصول ہوا۔ وہ اسے عثمانیہ ہاؤس میں بلا رہا تھا۔ اس نے کوئی ضروری بات کرنا تھی۔

شانی ہسپتال جانے کی بجائے عثمانیہ ہاؤس پہنچ گئی۔ وہ وہاں پہنچی تو سب سے پہلے فردوس سے ہی ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ مُنا کل رات سے ٹھیک نہیں ہے۔ اسے بخار ہوگیا ہے۔ کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں، بے تحاشا ضدیں کررہا ہے۔

شانی مُنے کے پاس پہنچی۔ وہ بیڈروم میں تھا اور بڑی بے دلی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر وہ اٹھا اور بھاگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شانی نے اسے اٹھالیا اور چومنے لگی۔ مُنا اس کی گردن میں منہ چھپا کر بولا۔ "تم کیوں نہیں آتی ہو؟ تم نے کہا تھا اتوار کو آؤں گی تم نہیں آئیں ابو بھی مجھے تمہارے پاس لے کر نہیں گئے۔"

"بس ایک بہت ضروری کام پڑ گیا تھا بیٹا۔ میں نے تمہیں بتانے کے لئے فون بھی کیا تھا ابو نے نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" مُنے نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی شانی کی گود سے نہیں اترا۔ اس نے شانی کی گردن کو بُری طرح بھینچا ہوا تھا۔ شانی کا سانس رکنے لگا۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا اتوار کو نہ آنے کی سزا دے رہے ہو۔ میرا سانس رک رہا ہے۔"

مُنے نے گردن پر گرفت تھوڑی سی نرم کردی۔ کئی بار بڑی وارفتگی سے شانی کا رخسار چوما۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر گراسی لان میں خوشگوار دھوپ پھیلی تھی۔ ایک چھوٹا سا ہرن

قلانچیں بھر رہا تھا۔ کھڑکی کے عین سامنے دو مور گھوم رہے تھے۔ ایک مور نے اپنے پنکھ پھیلائے تو شانی اور مُنا بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ مُنا بدستور شانی کی گود میں تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے کندھوں پر دو ہاتھ ہیں۔ وہ تیزی سے مڑی اس کے عقب میں چوہدری بشیر موجود تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ وہی کیفیت جو ایک دو مرتبہ پہلے بھی شانی نے محسوس کی تھی۔ وہ خود کہتا تھا، تم خوب صورت ہو لیکن جب میں مُنے کو تمہارے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ تمہاری خوبصورتی مکمل ہو گئی ہے۔ تب اپنے جذبات پر قابو رکھنا میرے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اب بھی جذباتی نظر آ رہا تھا تاہم مُنے کی موجودگی شاید اسے اخلاقی دائرے میں رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ شانی نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور پلو کو گھما کر سر پر لے لیا۔۔۔۔ چوہدری کی نہایت گرم نگاہیں شانی کو سر سے پاؤں تک چھونے لگیں۔ چند لمحے بعد وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''منا! تم تھوڑی دیر کے لئے آنٹی گریس کے پاس جاؤ۔ میں تمہاری چاچی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مُنا بے چوں چرا شانی کی بانہوں سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ چوہدری نے دروازہ بھیڑ دیا۔ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شانی سے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' شانی بیٹھ گئی۔

چوہدری نے الماری کی طرف قدم بڑھائے شاید وہاں سے شراب کی بوتل نکالنا چاہتا تھا لیکن پھر جیسے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے فقط امپورٹڈ سگریٹ سلگانے پر اکتفا کیا اور شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہاں بھئی، پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

''کیسا۔۔۔ فیصلہ؟'' شانی نے ذرا سہم کر پوچھا۔

چوہدری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''لو جی، ابھی تک یہی پتا نہیں کہ کیا فیصلہ کرنا ہے۔ بھئی میں تمہاری اور اپنی شادی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نکاح چار پانچ دن کے اندر ہو جائے۔ رخصتی چاہے ایک یا دو ہفتے کے بعد ہو جائے۔''

شانی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''لیکن۔۔۔ لیکن میں نے آپ سے کچھ وقت مانگا تھا۔''

''وقت سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا تم دو چار مہینے یا دو چار سالوں کی بات کر رہی ہو۔'' چوہدری کی تیوری چڑھ گئی۔

''میں نے دو چار سال کی بات تو نہیں کی لیکن دو تین مہینے تو۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔ میرا مطلب

ہے کہ۔۔۔۔''

چوہدری ایک دم بھڑک گیا۔ شانی کی بات کاٹ کر بولا۔ ''میری بات سنو شانی بیگم! میں نرا اُلو کا پٹھا نہیں ہوں۔ اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوں۔ سارا دن ہر رنگ کے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے میرا۔۔۔۔ میں تمہارے ہاتھوں دوسری مرتبہ ہرگز بے وقوف نہیں بنوں گا۔ تم نے تھوڑی سی مہلت کی بات کی تھی اور تھوڑی سی مہلت مہینوں کی نہیں ہوتی۔ میں نے یہ شادی تین ہفتوں کے لئے آگے کی تھی تین ہفتے پورے ہونے سے پہلے پہلے تمہارا اور میرا نکاح ہو جانا چاہیے۔ میں اس سے کم کسی بات پر راضی نہیں ہوں۔''

''مگر چوہدری۔۔۔۔''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ میں سیدھا بندہ ہوں، سیدھا سیدھا معاملہ چاہتا ہوں۔ کچھ بھی ہو جمعے کے دن ہمارا نکاح ہو جانا چاہیے۔ رخصتی کا وقت بعد میں طے کر لیں گے۔''

''لیکن۔۔۔۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ۔۔۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

وہ بے حد سرد لہجے میں بولا۔ ''دیکھو شانی بیگم! اب تو جو کچھ بھی ہونا ہے اتنی جلدی ہونا ہے اگر تم ڈولے کے ساتھ اتنی جلدی ناصر کے گھر سے غائب ہو سکتی ہو اور اتنی جلدی تاؤ حشام کے گھر سے نکل سکتی ہو۔۔۔۔ اور پھر پوٹھوہار پہنچ سکتی ہو، تو پھر اتنی جلدی یہ شادی بھی ہو سکتی ہے اور یہ اتنی جلدی ہی ہو گی اور اگر نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں ہو گا ہم دونوں اپنے رستے پر چلنے کے لئے آزاد ہیں۔ میں نے تم پر زبردستی پہلے کی ہے نہ اب کروں گا۔''

شانی روہانسی ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں کوکی اور راجو کے امید بھرے چہرے گھوم گئے۔ اس کے کانوں میں آنٹی عطیہ اور سنبل کی سسکیاں گونج گئیں۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''میں ہرگز نہیں جانتی تھی کہ آپ اس طرح کی بات کریں گے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ آپ مجھے کچھ سوچنے کا وقت تو دیں۔''

چوہدری کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا وہ بولا۔ ''سوچ لو۔ ابھی دن چڑھا ہے۔ شام کے بعد تک سوچ لو۔ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا یہاں کمرے میں ٹیلی فون بھی موجود ہے کسی سے رابطہ کرنا چاہو تو وہ بھی کر سکتی ہو لیکن شام کے بعد تمہارا فیصلہ حتمی ہونا چاہیے۔ تمہارے پاس دو راستے ہوں گے یا تو مجھے اور مُنے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی جاؤ گی یا مجھے نکاح کا دن بتا دو گی۔''

شانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے سر جھکایا اور بے قراری سے نفی میں ہلانے لگی۔ پتا نہیں کیوں؟ بے وجہ بے سبب، ان لمحوں میں ایک دور افتادہ گیت کی آوازیں

اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو
من جا پیاری من جا

وہ سر جھکائے جھکائے سسکی۔ ''نہیں چوہدری...... اتنی جلدی...... یہ کیسے......''

الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ چوہدری ایک دم بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی برائے نام شائستگی اور تہذیب بھی ناپید ہوگئی۔ وہ اپنے نارپوری بھائی بندوں کی طرح ایک دم اجڈ اور جھگڑالو نظر آنے لگا۔ پھنکار کر بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں۔ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تُو کچھ نہیں کرے گی پرنالہ وہیں کا وہیں رہنا ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس سارے معاملے پر۔ لعنت بھیجتا ہوں۔'' وہ بڑے غضب کے عالم میں پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مُنے نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں مور کے دو تین پَر تھے۔ یہ شاید اس نے زمین سے اٹھائے ہوں گے۔ اس نے یہ پَر شانی کے بالوں میں اڑس دیئے.. اور تالی بجاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ کتنا خوش نظر آ رہا تھا وہ۔ غالباً اس نے اپنے ابو کو آتشیں بگولے کی طرح کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بہت سی تصویریں اٹھا لایا اور شانی کو دکھانے لگا، پھر وہ اپنی کتابیں اور ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا۔ اس نے ڈرائنگ کی کاپی پر دو تین جگہ شانی کی تصویر بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کھلونے اٹھا لایا اور شانی کے اردگرد سجا دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو اپنے میں مگن و مصروف رکھنا چاہتا ہے...... اسے ڈر ہے کہ اگر وہ شانی کو مصروف نہ رکھ سکا تو وہ یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنے لگے گی۔

اس کی بے چین کیفیت دیکھ کر شانی نے اسے دلاسا دیا کہ وہ ابھی دو تین گھنٹے یہیں ہے، کہیں نہیں جائے گی۔ وہ ابھی تک ہلکے بخار میں تھا۔ شانی کو ڈر تھا کہ کہیں یہ بخار بڑھ نہ جائے۔ وہ اس کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دماغ گھن چکر بنا رہا۔ آنسو اندر ہی اندر اس کے حلق میں گرتے رہے۔ چوہدری بشیر کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیسے ہینڈل کرے۔ اسے امید تھی کہ شاید دو تین گھنٹے تک اس کا دماغی

ابال کم ہو جائے اور وہ اس سے بہتر حالت میں بات کر سکے۔

چوہدری پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں نظر آ رہا تھا نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

شانی نے فردوس اور زہرا سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر انہیں بھی علم نہیں تھا۔ غالباً وہ اس وسیع کوٹھی ہی کے کسی کمرے میں موجود تھا۔ شام سے ذرا پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے شانی کے سارے اندازے غلط ثابت کر دیئے اور وہ ہکا بکا رہ گئی۔

زہرا نے کہا۔ ''چوہدرانی جی! آپ نے دیکھا ہے، باہر کون آیا ہے؟ دو بڑی گاڑیاں آئی ہیں۔ ایک جیپ بھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ چوہدری صاحب کے ہونے والے وہی رشتے دار ہیں۔''

شانی نے جلدی سے دوسرے کمرے کی کھڑکی میں پہنچ کر باہر جھانکا اور ششدر رہ گئی۔ اس کے پورے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے آنٹی عطیہ اور سنبل کو دیکھا۔ وہ ایک مرسیڈیز گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ کوئی لڑکی موٹی چادر میں لپٹی لپٹائی مرسیڈیز سے باہر آ رہی تھی۔ شانی بس، اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی۔ وہ کوکی تھی۔ گاڑی سے نکلتے ہوئے اسے ثریا نے سہارا دیا۔ کوکی کا ماموں خلیل اور والد سیف اللہ بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ شانی کافی فاصلے سے دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ ان کے چہرے ستے ہوئے ہیں ان کی حیثیت یہاں عثمانیہ ہاؤس میں جبری مہمانوں کی سی ہے۔ سیف اللہ کے چند دیگر عزیز بھی مہمانوں میں شامل تھے۔ تاہم ان میں کوکی کے ماموں خلیل کے سوا کوئی اور خوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آنے والوں میں لمبی داڑھی والا ایک بزرگ بھی شامل تھا۔ ان کے سر پر ڈبی دار صافہ تھا۔

ان لوگوں کو بڑے احترام کے ساتھ عثمانیہ ہاؤس کے مہمان خانے کی طرف لے جایا گیا۔ مہمان خانہ کم و بیش ایک کینال کے رقبے میں واقع تھا اور اصل عمارت سے کم و بیش 50 میٹر کی دوری پر تھا۔ مہمان سُست قدموں سے مہمان خانے میں چلے گئے اور دروازے پر مسلح گارڈز گشت کرنے لگے۔

''یہ سب کیا ہے زہرا؟'' شانی نے ازحد حیرانی اور کرب سے پوچھا۔

زہرا کے بجائے سینئر ملازمہ فردوس نے جواب دیا، سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے شک پڑتا ہے چوہدرانی جی! چوہدری جی نے اپنے سسرال والوں کو شادی کے لئے یہاں کوٹھی کے اندر ہی بلا لیا ہے۔ سنا ہے کہ باہر کسی لڑکے کا پھڈا بھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ شادی آج ہی ہونی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے فردوس کا لہجہ بے حد ڈرامائی ہو گیا۔

’’تت... تم کیسے کہہ سکتی ہو؟‘‘ شانی نے پوچھا۔

فردوس نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کرلی۔ ’’بس مجھے شبہ ہورہا ہے جی۔ ابھی ایک گڈی میں گلاب اور موتیے کے کافی جیادہ پھول کوٹھی میں لائے گئے ہیں۔ ساتھ میں پھول سجانے والے دو لڑکے بھی تھے۔ وہ وڈے کمرے کی طرف گئے ہیں۔ پتا نہیں کیا کررہے ہیں وہاں۔‘‘

شانی کے اندر ہلچل مچ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ حالات نے ایک سنگین پلٹا کھایا ہے۔ چوہدری طیش میں آکر ایک ایسا کام کرنے جارہا تھا جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک دم شانی کے ذہن میں آیا کہ جو باریش شخص دیگر افراد کے ساتھ تھا وہ یقیناً نکاح خواں ہے۔ اس کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ شانی نے جو کچھ دیکھا کافی فاصلے سے دیکھا تھا۔ اس کے باوجود اسے کوکی اور اس کے اہلِ خانہ کے چہروں پر بے حد رنج اور ہراس نظر آیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ چوہدری کے شدید دباؤ کے تحت یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ دیر بعد زہرا گھبرائی ہوئی آئی اور اس نے شانی سے کہا۔ ’’چوہدری جی! ماسی فردوس کا اندازہ بالکل درست ہے۔‘‘

’’کیا ہوا؟‘‘ شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

’’آج یہاں شادی ہورہی ہے جی۔ جی ہاں..... میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔ چوہدری جی کے سونے والے کمرے کو سجایا جارہا ہے۔ مسہری بنائی جارہی ہے۔‘‘

’’اوہ میرے خدا! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔‘‘ شانی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا۔

زہرا بولی۔ ’’وہ ہٹی اور اس کے گھر والے مہمان خانے میں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ہٹی کو وہیں پر تیار کیا جائے گا۔ چوہدری جی اپنے دوستوں کو لے کر مہمان خانے میں جائیں گے اور وہاں پر نکاح ہوگا۔‘‘

’’یہ سب کیا ہے زہرا؟ زہرا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ کیا اس طرح بھی شادیاں ہوتی ہیں؟‘‘

’’اس خانوادے میں سب کچھ ہوسکتا ہے چوہدرانی جی۔‘‘ زہرا اپنی آواز کو مزید پست کرتے ہوئے بولی۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی کھلی تھیں۔

شانی کی پریشانی دیکھ کر مُنا بھی سہم گیا تھا۔ جیسے بچہ اپنی والدہ کے تفکر کو اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ قریباً آدھا گھنٹہ اسی طرح شدید اضطراب اور تذبذب کی کیفیت میں گزر گیا......

پھر چوہدری بشیر آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اندر آتے ہی مُنے کو

باہر جانے کا حکم دیا۔ مُنا سہم کر باہر چلا گیا۔ چوہدری بڑی تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

وہ شانی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز کو سمجھتے ہوئے شانی بھی بیٹھ گئی۔

چوہدری نے امپورٹڈ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں اپنی گھنی مونچھوں کے اوپر سے برآمد کیا۔ ایک دھیمی لیکن دھاڑتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ’’شانی، میں سیف صاحب کی بیٹی کوکب سے شادی کررہا ہوں۔ یہ شادی آج رات ہی ہورہی ہے۔ میں نے سارے انتظام مکمل کرلئے ہیں۔‘‘

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ تین ہفتے......‘‘

’’ہفتوں کی بات تب تھی جب مجھے کچھ نظر آتا کہ تم کسی فیصلے پر پہنچ رہی ہو۔‘‘ چوہدری نے پھنکار کر شانی کی بات کاٹی۔ ’’اور مجھے تو نظر یہ آرہا ہے کہ تم صرف وقت گزار رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔ میں اب تمہارے ہاتھوں اور دھوکا کھانا نہیں چاہتا۔‘‘

’’میں کوئی دھوکا نہیں دے رہی۔ میں نے وہی کہا ہے جو میرے دل میں ہے لیکن مجھے اس کے لئے وقت چاہیے۔ یہ کوئی چھوٹا فیصلہ نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ اس کے لئے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کا مشترکہ اجلاس ہونا چاہیے بلکہ اسے اقوام متحدہ میں پیش کرنا چاہیے۔‘‘ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ پھر اس نے بڑی طاقت سے سگریٹ کو اپنے جوتے تلے مسلا اور کہا۔ ’’دیکھو شانی بیگم! میں پریکٹیکل آدمی ہوں۔ خوابوں میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔ میں نے تم سے کسی طرح کی زبردستی کرنا ہوتی تو کئی مہینے پہلے کرسکتا تھا لیکن میں نے تمہیں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے پورا وقت اور پوری آزادی دی ہے۔ اب میں اس گورکھ دھندے میں مزید نہیں پڑسکتا۔ بہرحال میں نے تمہیں جو پیشکش آج صبح کی تھی، اس پر میں اب بھی قائم ہوں۔ میری بات بالکل صاف اور کلیئر ہے اگر تم نکاح کے لئے تیار ہو تو میں یہ شادی اب بھی روک دیتا ہوں لیکن.....‘‘ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

شانی نے لرز کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو سختی تھی وہ شانی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بالکل پتھر نظر آرہا تھا۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ ’’لیکن اب تمہیں یہ نکاح آج ہی کرنا ہوگا۔ آج اور اسی جگہ۔ نکاح خواں آچکا ہے، اسے ایک نکاح پڑھا کر یہاں سے جانا ہے۔ کوکب کا یا پھر تمہارا۔‘‘

شانی پسینہ پسینہ ہوگئی۔ چوہدری نے ایک بہت بڑی بات کہہ ڈالی تھی۔ ایک نہایت سنگین دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا اسے۔

"آپ ایسی بات کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ......"

"آج میں نے ایسی ہی بات کرنی ہے۔" چوہدری پھنکارا۔ "تمہیں آج اور ابھی فیصلہ کرنا ہے کہ تم مجھ سے نکاح کر رہی ہو یا نہیں۔"

شانی سناٹے کی کیفیت میں تھی۔ اس نے بمشکل تھوک نگلا اور بولی۔ "میں یہ فیصلہ اکیلی کیسے کرسکتی ہوں۔ مجھے مشورہ کرنا ہے۔ تایا معصوم ہیں، خالو اعجاز ... اور چچی پروین، پھوپھو آمنہ......"

"تم سارے کام اپنی ان چچیوں اور پھوپھیوں سے پوچھ کر نہیں کرتی ہو۔" چوہدری کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔ "یہ فیصلہ آج ہوگا، یا پھر کبھی نہیں ہوگا اور مجھے جلد باز یا مطلب پرست بھی نہ سمجھنا۔ ایسی بات ہوتی تو میں تمہاری فوری رخصتی کی شرط بھی رکھ سکتا تھا ... لیکن میں ایسا نہیں کر رہا۔ میں تم پر کچھ بھی زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتا۔"

بات ختم کر کے چوہدری نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "شام کے چھ بجے ہیں میں نے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے انتظار کرنا ہے۔ دس بجے تک میرا اور کوکب کا نکاح ہو جائے گا۔ وہ میری بیوی اور مُنے کی نئی ماں بن کر میری رہائش گاہ میں آجائے گی۔ اس دوران میں اگر تم سوچنا چاہتی ہو تو مزید سوچ لو اور اگر مشورہ کرنا چاہتی ہو تو مشورہ کر لو۔"

اس کے ساتھ ہی وہ مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھی رہی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ چوہدری جاتے جاتے مُنے کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔

اچانک بغلی دروازہ کھلا اور زہرا اندر آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور وہ کچھ ڈری ڈری سی بھی تھی۔ شانی کی چھٹی حِس نے کہا کہ وہ یہاں دروازے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھی اور شاید اس نے چوہدری کے ساتھ ہونے والی اس کی ساری گفتگو سنی ہے۔ چند سیکنڈ بعد شانی کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ زہرا کے ہونٹ ڈر کی وجہ سے ہلکے نیلے ہو رہے تھے۔ وہ بولی۔ "چوہدری صاحب بڑے غصے میں ہیں۔ میں نے ان کو بہت کم اس طرح سے دیکھا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ مم...... میں نے ان کی ساری باتیں سنی ہیں۔ وہ آپ سے شادی کرنے کا کہہ رہے تھے ناں؟"

شانی اثباتی انداز میں خاموش رہی۔ زہرا اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بولی۔ "چھوٹی چوہدرانی! وہ آپ سے یہی کہہ رہے تھے ناں؟"

"نہیں، وہ صرف نکاح کی بات کر رہا تھا۔"

"ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا جی۔ کیا خبر نکاح کے بعد یہ آپ سے کہیں کہ بس اب تم بیوی ہو۔ اب کہیں نہیں جاؤ گی۔ زبردستی کے نکاح اور رخصتیاں تو یہ لوگ کرتے ہی رہتے ہیں۔ پچھلے مہینے چوہدری قادر کے چھوٹے بھائی نے کیا کیا ہے؟ اپنے کالج کی ایک سہیلی کو کوٹھی دکھانے کے بہانے کوٹھی میں لایا اور شام تک اس کو مار پیٹ کر اس سے نکاح بھی کر لیا۔ کُڑی کے ماں پیو تھے نہیں، بس ایک نانی تھی وہ روتی پیٹتی ہی رہ گئی۔"

شانی بے قراری سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس گھمبیر مشکل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے یوں لگنے لگا کہ یہ ساری کوٹھی اپنی چھتوں سمیت دھڑام سے اس پر آگرے گی اور وہ چیخ بھی نہیں سکے گی۔ چوہدری اسے صرف اور صرف چار گھنٹے کا وقت دے کر گیا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں وہ کہاں جاسکتی تھی کس سے مشورہ کرسکتی تھی۔

اس کے ذہن میں پہلا نام عارف کا ہی آیا۔ وہ اب تک ایک مخلص اور باتدبیر ساتھی ثابت ہوا تھا۔ شانی نے زہرا سے کہا کہ فردوس کو بلاؤ۔ فردوس کی حیثیت یہاں سینئر ملازمہ کی تھی۔ شانی نے فردوس سے کہا۔ "چوہدری جی تک میرا پیغام پہنچا دینا۔ میں کسی کام سے جارہی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ میری واپسی تک وہ کسی طرح کا کوئی فیصلہ نہ کریں۔"

فردوس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی نے کہا۔ "میرے الفاظ دہراؤ۔ میں نے کیا کہا ہے؟"

فردوس نے شانی کے الفاظ دہرا دیئے۔ "میں کسی کام سے جارہی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ میری واپسی تک وہ کسی طرح کا کوئی فیصلہ نہ کریں۔"

شانی عثمانیہ ہاؤس سے نکلی اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھا ہسپتال پہنچی۔ عارف کمبوہ یہاں موجود تھا۔ تاؤ حشام تو دکھائی نہیں دیا تاہم اس کے ایک دو کارندے راجو کے پاس تھے۔ شانی، عارف سے مشورے کے لئے یہاں آئی تھی لیکن یہاں آکر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور اس سنگین ترین مسئلے کے حوالے سے عارف اسے کیا تجاویز دے سکتا ہے۔

شانی آدھے گھنٹے تک عارف کے پاس رہی لیکن اپنے اندر کی طوفانی ہلچل کے حوالے سے ایک لفظ بھی عارف سے نہ کہہ سکی۔ راجو کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ وہ خود چل کر باتھ روم تک گیا اور پھر شانی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے سارے سوالات کوکی اور اس کے گھر

والوں کے بارے میں ہی تھے۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ کوکی کیا سوچ رہی ہے؟ کوکی کے سسرالی اب کیا کہتے ہیں؟

شانی نے راجو کے ان سوالوں کے مناسب جواب دیئے۔ وہ راجو کے سامنے مسکرانے اور مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اپنے دل کی حالت کا اسے ہی پتا تھا، راجو اسے بے حد بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک عجیب سا دھیما پن آ گیا تھا اس کے برتاؤ میں۔ عارف نے شانی کو یہ بتا کر حیران کیا کہ پرسوں راجو نے اپنا سونے کا کنٹھا (ہار) جو بارہ ہزار سے کم کا نہیں تھا ایک فقیر کو خیرات کر دیا ہے۔ جلد ہی وہ راجو کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ شہر کے در و بام برقی روشنی سے جگمگا اٹھے تھے۔ وہ چلتی ہوئی ہسپتال سے باہر کھلی سڑک پر نکل آئی۔ فٹ پاتھ صاف ستھرا تھا۔ دو رویہ درخت نیم گرم ہوا میں جھوم رہے تھے۔ شہر کے باسی اپنی مصروفیات میں مگن تھے کچھ تیز رفتار قدموں کے ساتھ اور کچھ تیز رفتار گاڑیوں میں اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے درمیان فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی ایک تنہا لڑکی کرب کے کتنے بڑے سمندر سے گزر رہی ہے۔ وہ ہنستے بستے ملتان کے باسیوں کے درمیان تھی لیکن ان سے بہت بہت دور تھی۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کوئی مشورہ دینے والا نہیں تھا۔ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو نہیں سکتی تھی۔

پتا نہیں کیوں اسے بار بار رستم یاد آ رہا تھا۔ آج کل وہ اسے جس طرح یاد آ رہا تھا پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلے شاید وہ صرف ایک خیال تھا، اب وہ ایک ٹھوس حقیقت بن گیا تھا۔ پوٹھوہار کے رنگین ٹیلوں میں ایک گہری دراڑ کے اندر شانی نے اس حقیقت کو جسم اور روح کی تمام شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی ان لمحوں کو، شاید مر کر بھی نہیں۔ ان لمحوں نے اسے محبت اور زندگی کے نئے معنوں سے آشنا کیا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ مرد و زن کا تعلق کتنا حسین اور کتنا خوشبودار ہوتا ہے۔ وہ جادوئی لمحے شانی کی رگ رگ میں سما گئے تھے اور ان لمحوں نے شانی کو رستم کے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر لمس میں رستم کا لمس محسوس کرتی تھی، اس کو ہواؤں میں رستم کے پسینے کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ وہ مانتی نہیں تھی لیکن جانتی اچھی طرح تھی کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں یہ خواہش پیدا ہو چکی ہے کہ وہ کسی موقع پر پھر سے اس لمس کو محسوس کرے پھر سے ان مہربان ہونٹوں کے لمس سے آگاہ ہو۔ ایک بار پھر اس پسینے کی مہک اس کی سانسوں میں داخل ہو۔ چاہے ایک بار لیکن وہ۔ رستم سے منہ موڑنا، پہلے کبھی اتنا مشکل نہ تھا۔ اس کی ہر ہر رگ میں کھچاؤ پیدا

ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ یوں تو اس کی زندگی کا کوئی راستہ رستم کی طرف نہیں جاتا تھا۔ وہ دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے لیکن پھر بھی ایک بے نام ڈور تو تھی..... ایک نامعلوم آس تو تھی لیکن اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس میں یہ بے نام ڈور اور نامعلوم آس بھی ناپید ہو جانا تھی۔

''میں کیا کروں...... کدھر جاؤں؟'' اس کے اندر سے یہ سوال ایک کرب ناک پکار بن کر ابھرا۔

اس کے اندر کی عورت نے کہا۔ ''شانی! تجھے اب تسلیم کر لینا چاہیے کہ تُو اس سے محبت کرتی ہے۔ تیری روح اور تیرے جسم میں اس کی چاہت ہے اور شاید جتنی محبت وہ شخص تجھے دے سکتا ہے، دنیا میں کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اگر زندگی نے کسی موڑ پر کسی انہونی کے سبب تجھے اس شخص کا ساتھ مل گیا تو پھر یہ زندگی ..... زندگی نہیں رہے گی ایک حسین ترین سپنے کی تعبیر بن جائے گی۔ ایک ایسا سپنا جو اس رُوئے زمین پر شاید ہی کسی آنکھ نے دیکھا ہو۔ تیری زندگی تجھے دیئے گئے سارے دکھوں اور زخموں کے قرض یوں تارے گی کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔ تُو اس شخص کی طرف جانے والے راستوں کو ہمیشہ کے لئے بند نہ کر۔ تُو یہ راستے بند کر کے اپنے جینے کا راستہ بند کر دے گی۔''

رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا ہیولا شانی کے سامنے آ گیا۔ یہ اس کا اپنا ہی ہیولا تھا لیکن یہ بھاری بھرکم لباس اور سونے چاندی کے وزنی زیورات سے سجا ہوا تھا۔ اس ہیولے کے پس منظر میں پُرکھوں کی وہ حویلی تھی جس نے نسل در نسل اس علاقے میں اپنی شان قائم رکھی تھی اور خاندانی روایات کی پاسداری کی تھی۔ یہ ہیولا گویا ہوا۔ ''شانی! کیوں رہی سہی عزت بھی اب خاک میں ملا رہی ہو۔ تُو کچھ بھی کہے لیکن رستم ایک بدنام ڈاکو ہے۔ تُو اس ڈاکو کا ہاتھ تھامے گی تو تیرے خاندان کی آنے والی نسلیں تجھے کبھی معاف نہیں کریں گی اور آنے والی نسلوں کی بات تو بعد کی ہے۔ تیرے جو بچے کھچے رشتے رہ گئے ہیں ان پر کیا گزرے گی۔ وہ اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔ لوگ ان کا جینا حرام کر دیں گے۔''

شانی کے اندر کی آواز نے رستم کا دفاع کیا۔ ''لیکن وہ ڈاکو نہیں ہے۔ اسے حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے بھی تو ہیں جو اس کا نام لے لے کر جیتے ہیں۔ جن کے نزدیک اس کا مقام عام لوگوں سے بہت اونچا ہے۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔'' چھوٹی چوہدرانی کے ہیولے نے تاویل پیش کی۔ ''ہر ڈاکو یہی کہتا ہے کہ اسے حالات نے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ

ڈاکو ہے۔ درجنوں افراد کا قتل اس کے ہاتھوں سے ہو چکا ہے۔ کیا تُو ایسے شخص کا ہاتھ تھامنے کی تمنا دل میں پال رہی ہے، جو کسی بھی وقت پوٹھوہار کے ٹیلوں میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن سکتا ہے۔"

"یہ دلیل بہت کمزور ہے۔" شانی کے اندر سے آواز ابھری۔ "محبت کی چند گھڑیاں بھی مل جائیں تو یہ "بے محبت" کی سو سالہ زندگی پر بھاری ہوتی ہیں......"

"لیکن تُو یہ کیوں نہیں سوچتی۔ وہ اپنا رخ بدل چکا ہے۔ وہ نادیہ سے شادی کر چکا ہے۔ اب اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔ اس کو خدا حافظ کہنے کے لئے اس سے بہتر وقت اور کون سا ہوگا...... ہاں شانی خدا حافظ کہہ دے۔ دل کی گہرائیوں سے الوداع کر دے... اور وہ سب کچھ حاصل کر لے جو اس کے بدلے تجھے اور تیرے ذریعے دوسرے لوگوں کو مل رہا ہے۔ چوہدری بشیر کے پاس چلی جا۔ اپنے روتے سسکتے مُنے کو گلے سے لگا کر بھینچ لے۔ کوکی کو بچا لے۔ راجو کو موت کے منہ سے کھینچ کر زندگی کی طرف لے آ۔ ایک بااثر چوہدرانی بن کر علاقے کے لوگوں کے لئے وہ سب کچھ کر گزر جو کرنا چاہتی ہے......قربانی اور ایثار تیرے خاندان کی روایت ہے اور یہ سب کچھ تجھے خاص طور سے اپنی ماں کے ذریعے ملا ہے۔ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس روایت کی امین بن جا......"

شانی نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی۔ اسے لگا کہ ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ کلیجے کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے۔ اس نے سوچا، کاش رستم کا لمس پانے سے پہلے یہ گھڑی آ گئی ہوتی۔ فیصلہ کرنا اتنا کٹھن اور جان لیوا نہ ہوتا۔

اس نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اسے دس بجے تک ہر صورت عثمانیہ ہاؤس میں پہنچنا تھا۔ تقریباً آدھ پون گھنٹہ تو اسے راستے میں ہی لگ جانا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، آج چوہدری بشیر نے ہر صورت اپنے الٹی میٹم پر عمل کرنا ہے۔ اگر وہ مقررہ وقت تک اپنی "رضامندی" لے کر اس کے پاس نہ پہنچی تو وہ کوکی سے نکاح کر لے گا۔

فیصلے کے بے پناہ بوجھ سے اس کا جسم لرزنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی تو وہ یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتی تھی کہ عثمانیہ ہاؤس پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ چوہدری نے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ نکاح کرے گا لیکن زہرا نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کیا خبر جی کہ نکاح کے بعد چوہدری صاحب کہیں کہ بس اب تم بیوی ہو، اب کہیں نہیں جاؤ گی شانی کی نگاہ میں حجلۂ عروسی گھوم گیا جو عثمانیہ ہاؤس کے ایک کمرے میں بڑی جلدی

میں آراستہ کیا گیا تھا۔

اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا لیکن فیصلہ تو کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا......اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ یہ ایثار اور قربانی کا فیصلہ تھا۔ وہ اٹھی اور تن تنہا عثمانیہ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رِستے چلے جا رہے تھے۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ٹیکسی مل گئی۔ وہ عثمانیہ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ سڑکیں جگمگا رہی تھیں۔ گاڑیوں کا رش تھا۔ ضلع کچہری کے قریب سڑک زیر تعمیر تھی اور ٹریفک بلاک ہو رہی تھی۔ شانی کی نگاہ بار بار گھڑی کی طرف اٹھتی تھی......سوئیاں حرکت میں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ زیادہ تیزی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

شانی نے بچپن میں آتش دان کے سامنے بیٹھ کر اباجی سے ایک کہانی سنی تھی۔ بادشاہ ایک شخص کو پھانسی کی سزا دیتا ہے۔ اس شخص کو چند بہت ضروری کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ اس شخص کا ایک دوست بادشاہ کو ضمانت دیتا ہے کہ میرے دوست کو اپنے ناگزیر کاموں کے لئے جانے دیا جائے اگر یہ مقررہ وقت پر نہ آسکا تو اس کی جگہ میں تختۂ دار پر لٹک جاؤں گا۔ کہانی کے آخر میں اسی طرح سفر کی طوالت اور وقت کی کمی سامنے آتی ہے۔ اپنے ضامن دوست کو پھانسی سے بچانے کے لئے وہ شخص تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پھانسی گھاٹ تک پہنچتا ہے اور خود کو سزا کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

"ڈرائیور! مجھے جلدی پہنچنا ہے کسی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"میڈم! آگے پیچھے سے بلاک ہے ٹریفک، اب کیا کروں۔ تھوڑی دور ایک کٹ ہے لیکن وہاں تک پہنچیں گے تو پھر ہے ناں۔"

شانی نے مزید دس منٹ تک بے صبری سے انتظار کیا۔ اب بمشکل اتنا ہی وقت تھا کہ وہ آگے جا کر کوئی اور ٹیکسی لیتی اور منزل تک پہنچتی۔ اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے باہر نکل آئی۔ وہ رش سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے عثمانیہ ہاؤس کے ایک بند کمرے میں عروسی جوڑا پہنے کوکی اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوب رہی ہے اور منتظر نگاہوں سے شانی کا راستہ دیکھ رہی ہے۔ شانی کو دوسری طرف کی سڑک پر ایک ٹیکسی کھڑی نظر آئی۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ یہی وقت تھا جب اسے اپنی دائیں جانب تیز چمک محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے پہیوں سے چرچراہٹ کی طویل احتجاجی آواز بلند

ہوئی۔ شانی کو لگا کہ کوئی سخت چیز اس کے گھٹنوں سے ٹکرائی ہے، وہ ہوا میں لہرائی اور کئی میٹر پیچھے گری۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

شانی کو ہوش آیا تو اس کی نگاہوں کے سامنے سب سے پہلے ایک سفید چھت آئی۔ اُسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ایک نرس اس سے چند فٹ کی دوری پر موجود تھی۔ وہ اس کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ شانی کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کہاں اور کیوں ہے؟

پھر جیسے کوئی رکی ہوئی مشین برقی رو بحال ہونے سے ایک دم چل پڑتی ہے، اس کا ذہن بھی کام کرنے لگا۔ نوخیز کوکی کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کی نگاہوں میں آیا..... اسے یاد آیا کہ وہ کوکی تک پہنچنے کے لئے سڑک عبور کر رہی تھی...... ''اوہ میرے خدا۔'' وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یوں اٹھنے سے اس کے سر میں ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ بے ساختہ اپنے سر پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک بڑی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نرس نے ناراض ہو کر کہا۔ ''کیا کرتی ہیں آپ؟ سوئی نکل گئی ہے۔''

نرس نے شانی کو دوبارہ لٹانے کی کوشش کی لیکن شانی نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ ''کیا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے بتاؤ ..... پلیز مجھے بتاؤ، مجھے جانا ہے۔''

اس نے وقت دیکھنے کے لئے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ سائیڈ کی دیوار پر وال کلاک موجود تھا۔ سوئیاں ساڑھے پانچ کا وقت بتا رہی تھیں۔ ساڑھے پانچ؟ اسے تو دس بجے عثمانیہ ہاؤس پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے سات گھنٹے اوپر ہو چکے ہیں۔ وہ سرتاپا لرز گئی۔

اس نے ڈرپ کو کھینچ کر اپنے بازو سے علیحدہ کیا اور بستر سے نیچے اُتر گئی۔ ایک نوجوان ڈاکٹر تیزی سے اس کے پاس آیا۔ ''آپ یہ کیا کر رہی ہیں بی بی۔ آپ کو چوٹ لگی ہے۔ ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔''

''نہیں ..... مجھے جانا ہے۔ آپ کو پتا نہیں، مم میرا جانا کتنا ضروری تھا۔ اوہ میرے خدا۔ میں کیا کروں۔ میں کہاں ہوں اور کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟''

جواب میں نوجوان ڈاکٹر نے اسے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ یہ ایک سیمی پرائیویٹ ہسپتال کا وارڈ ہے۔ گل فشاں ٹاؤن کے قریب سڑک پار کرتے ہوئے وہ ایک کار سے ٹکرائی تھی۔ کار والا دو افراد کے ساتھ اسے یہاں لایا ہے۔ وہ رات بھر یہاں رہا تھا۔ صبح چلا گیا تھا، اب پھر آ گیا ہے۔

شانی نے چونک کر پوچھا۔ ''رات بھر سے کیا مطلب؟ اب کیا وقت ہوا ہے؟''

''اب شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

شانی نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ساڑھے سات گھنٹے نہیں، ساڑھے اُنیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ کوکی کا حسین لیکن غم زدہ چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا ڈاکٹر کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اسے بتا رہا تھا۔ ''آپ کار سے ٹکرانے کے بعد بجلی کے ایک پول سے ٹکرائی تھیں۔ دو ڈھائی گھنٹے تک بالکل بے ہوش رہی تھیں۔ بعد میں آپ کو سکون بخش دوا دی گئی۔ آپ کے دائیں گھٹنے اور کندھے پر بھی چوٹ آئی ہے لیکن یہ چوٹیں زیادہ سنگین نہیں ہیں۔

''مجھے جانے دیں۔'' شانی کراہ کر بولی۔ ''میری..... چھوٹی بہن سخت مصیبت میں ہے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔''

ڈاکٹر نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن شانی نے دھکیل کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ بیڈ کے قریب ہی اس کی جوتی پڑی تھی اس نے جوتی پہنی اور ننگے سر وارڈ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ وارڈ کے دیگر مریض اور اسٹاف اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں بڑی عمر کا ایک کلین شیو شخص سامنے نظر آیا۔ وہ شانی کو دیکھ کر چونکا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی گاڑی سے وہ ٹکرائی تھی۔

وہ شانی کو دیکھ کر ہکلایا۔ ''آ..... آپ کدھر جا رہی ہیں؟ ابھی آپ کو ...''

''آپ پیچھے ہٹ جائیں۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''میری بہن مشکل میں ہے۔''

وہ باہر نکلی تو وہ پیچھے پیچھے آیا۔ ''دیکھیں..... آپ اس طرح نہ جائیں اور اگر جانا ہے تو پھر میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔''

شانی نے ایک لمحہ تامل کے بعد کہا۔ ''کدھر ہے آپ کی گاڑی؟''

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ آگے بڑھا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''آپ کی شال اور شولڈر بیگ بھی گاڑی میں ہی ہے۔''

شانی تھوڑا سا لنگڑا رہی تھی اور اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس مہربان چہرے اور مہربان لہجے والے شخص کے ساتھ اس کی ہونڈا گاڑی میں بڑی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ شانی کی شال اور بیگ وغیرہ اسے واپس مل گئے۔ ادھیڑ عمر شخص نے

کہا۔ ”میں کل ساری رات آپ کا اتا پتا جاننے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہوا مجھے بڑا افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی شدید چوٹ آئی۔“

”نہیں جی..... مجھے یقین ہے کہ اس میں قصور میرا ہی تھا۔ میں ہی بدحواس ہو گئی تھی۔“

وہ شخص ذرا تذبذب سے بولا۔ ”میرا نام سعید کرمانی ہے۔ میں گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔ ابھی آپ نے کہا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ اگر میں کسی طرح آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں تو بتائیں۔“

”نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔“ شانی نے قطعیت سے کہا۔ ”آپ مجھے بس ’ہری کوٹھی شاپ‘ تک پہنچا دیں۔“

عثمانیہ ہاؤس ”ہری کوٹھی شاپ“ سے بس تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ شانی کا سینہ بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ عثمانیہ ہاؤس میں کیا صورتِ حال ہے۔ امید تو نہیں تھی کہ کوکی ابھی تک محفوظ ہو گی لیکن چند فیصد چانس ضرور تھا۔ شاید..... شاید کچھ ایسا ہو گیا ہو کہ کل شادی نہ ہو سکی ہو۔

مطلوبہ اسٹاپ کے سامنے اُتر کر شانی نے سعید کرمانی کا شکریہ ادا کیا اور مزید کچھ کہے بغیر عثمانیہ ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ اسے دور ہی سے عثمانیہ ہاؤس کا وسیع آہنی گیٹ نظر آ گیا۔ گیٹ پر فٹ بال کے سائز کے بڑے بڑے دودھیا بلب روشن تھے۔ شانی گیٹ پر پہنچی۔ اسے اندر چہل پہل نظر آئی۔ مسلح گارڈز نے شانی کو پہچاننے کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر کا منظر دیکھ کر شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے احاطے کے وسط میں کوکی اور چوہدری بشیر کو دیکھا۔ کوکی زرق برق عروسی لباس میں تھی اور چوہدری کے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ سر جھکائے بالکل خاموش چوہدری اور کچھ دیگر افراد بیڈمنٹن کا ایک میچ دیکھ رہے تھے۔ یہ میچ چوہدری کے غیر ملکی مہمانوں کے درمیان ہو رہا تھا..... ایک طرف خوش اندام گریس تھی، دوسری طرف سنہری بالوں والی ایک اور لڑکی۔ گریس نے ہلکی سی شرٹ اور نیکر پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں اس کا جواں جسم مچل رہا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے تماشائیوں میں کوکی کے والد سیف اللہ، ماموں خلیل، بہن سنبل اور دیگر رشتے دار شامل تھے۔ وہ شکلوں سے ہی مرعوب اور دبے دبے دکھائی دیتے تھے۔

شانی دھیرے دھیرے چلتی بیڈمنٹن کورٹ کے قریب پہنچ گئی۔ سب کھیل میں گم تھے۔ شانی کی نگاہ کوکی کے چہرے پر پڑی۔ اس ایک نگاہ نے ہی جیسے ہر بات شانی کے سامنے

کھول کر رکھ دی۔ کوکی ایک خوبصورت مومی گڑیا کی طرح پتھریلے چوہدری بشیر کے پہلو میں غم زدہ اور خاموش بیٹھی تھی۔ بکھری بکھری اور زرد زرد سی۔ اس کی صبح اس کی رات کا فسانہ کہہ رہی تھی۔ وہ ایک نوخیز کلی نہیں رہی تھی۔ کل رات سہاگ کی سیج نے اس کی دوشیزگی لے کر اسے لڑکی سے عورت بنا دیا تھا اور اسے عورت بنانے والا، گردن اکڑائے اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ ہاں، وہ ہار چکی تھی پیار کی بازی اور اس کے ساتھ ساتھ راجو بھی ہار چکا تھا۔ شانی کے سینے سے ایک گہری ٹیس اٹھی اور وہ بے حال سی ہو گئی۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ یہیں سے واپس مڑ جائے اور روتی ہوئی کہیں دور نکل جائے لیکن اسی دوران میں چوہدری بشیر کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ واضح طور پر چونکا اور پھر ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی نگاہ ملی۔ پھر چوہدری، تماشائیوں میں سے نکل کر سیدھا اس کی طرف آیا۔

شانی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ شال اس کے سر پر تھی لیکن پیشانی پر بندھی ہوئی پٹی نظر آ رہی تھی۔ چوہدری سفید لٹھے کے کلف لگے کھڑ کھڑ کرتے سوٹ میں تھا۔ چمک دار کھسے کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بے حد تیز نظروں سے شانی کو سرتاپا گھورا..... غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اب کیا لینے آئی ہو؟“

”شش..... شادی ہو گئی ہے؟“ شانی نے ایک بے معنی سوال کیا۔ جو کچھ وہ دیکھ چکی تھی اس کے بعد یہ سوال بے معنی ہی تھا لیکن شاید دل میں اب بھی امید کی کوئی موہوم کرن موجود تھی۔

چوہدری زہر بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں دس بجے تک تمہارا انتظار کروں گا لیکن میں نے دو گھنٹے مزید تمہاری راہ دیکھی تھی یہاں موجود لوگ اس بات کے گواہ ہیں..... اور اب تم مجھے کوئی کہانی گھڑ کر مت سنانا۔ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جان چکا ہوں۔“

”میں سچ کہتی ہوں۔ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں رات بھر ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی ہوں۔“

”کیا ہوا تھا؟“

”سڑک پار کرتے ہوئے ایک کار سے ٹکرائی تھی۔ سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔“

چوہدری نے شانی کے تاثرات کا جائزہ لے کر ایک لمبی سانس لی اور پہلو بدل کر بولا۔

”خیر! یہ ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو کچھ اور ہو جاتا لیکن یہ بات تو طے تھی کہ تمہارا جواب بالآخر انکار میں ہی ہونا تھا اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔“

''ایسا نہیں ہے۔ میں یہاں ہی آ رہی تھی۔'' شانی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پتا نہیں کہ اسے یہ بات کہنی چاہیے تھی یا نہیں۔

چوہدری کی گھنی مونچھوں کے نیچے ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک ایسی بات کہی جس کی توقع شانی کو ہرگز نہیں تھی۔ کم از کم فی الوقت تو نہیں تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے، اگر ایسی بات ہے تو اب کیا بگڑ گیا ہے۔ ہم اپنی اپنی جگہ واپس آ جاتے ہیں۔ تم کہتی ہو تو میں چھوڑ دیتا ہوں سب کچھ۔'' وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے یہ حقیقی زندگی کا نہیں، گڈی گڈے کے کھیل کا ذکر ہو رہا ہے۔

شانی لرز کر رہ گئی۔ ''سب کچھ'' سے چوہدری کی مراد کوکی ہی تھی۔ کوکی جس کی دوشیزگی وہ سہاگ کی سیج پر چھین چکا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس نے کتنی بڑی متاع لے لی ہے کوکی سے۔ جو کچھ وہ حاصل کر چکا تھا اس کی قدر و قیمت کوئی عورت ہی جان سکتی تھی اور وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے بازار میں فروخت ہونے والی کسی پروڈکٹ کا ذکر کر رہا ہو۔

شانی کا دل چاہا کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر ایک تھپڑ چوہدری بشیر کے رخسار پر دے مارے اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل جائے لیکن وہ کہاں کر سکتی تھی یہ سب کچھ؟ وہ تو شاید کوکی ہی کی طرح حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ایک بے بس ہستی تھی، جسے ایک سانس لینے کے بعد دوسرا سانس لینے کے لئے بھی معاشرے کی اجازت درکار تھی۔

اسی دوران میں چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے پہلے نمبر چیک کیا پھر شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم بیٹھو، مُنّے سے ملنا ہے تو اس سے مل لو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔'' اس نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا اور کہا۔ ''بیگم صاحبہ کو اُدھر کرسی پر بٹھاؤ۔''

چوہدری نے کال ریسیو کی اور باتیں کرتا ہوا عمارت کے داخلی دروازے کی طرف چلا گیا۔ شانی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اب کوکی اور اس کے گھر والوں کا سامنا کرتی۔ کتنی امیدیں دلائی تھیں اس نے انہیں۔ کتنا حوصلہ دیا تھا لیکن وہ ہونی کو ٹال نہیں سکی تھی۔

اچانک شانی کو عمارت کی چھت کی طرف سے ایک باریک چہکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ چھت پر مُنّا موجود تھا۔ اس نے منڈیر کے اوپر سے شانی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یقیناً زینے سے اُتر کر نیچے آ رہا تھا شانی کے پاس۔

لیکن شانی کے دل و دماغ میں تو زلزلہ برپا تھا۔ وہ سرتاپا آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے مُنّے کی آواز سن کر جھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ مُنّے سے ملے بغیر ہی واپس جانے کے لئے مڑ

گئی۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ پر تھی جب اسے اپنے عقب میں مُنّے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکارتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ جیسے لوہے کا ننھا سا ذرہ مقناطیس کی طرف لپکتا ہے۔ شانی اسے نظرانداز کرتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی۔ ایک گارڈ نے شانی کو متوجہ کیا۔ ''میڈم! ننھے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

شانی سنی ان سنی کر کے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہسپتال میں راجو کے پاس موجود تھی۔ عارف کمبوہ شانی کی وجہ سے پریشان تھا اور ہوٹل کے علاوہ کئی جگہ شانی کے لئے فون کر چکا تھا۔ شانی کے سر پر پٹی اور چال میں لنگڑاہٹ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہوا۔ شانی نے اسے مختصر الفاظ میں کل رات پیش آنے والے سارے واقعات بتائے۔ عارف کو مکمل رازداری کا پابند کرنے کے بعد شانی نے اس پر یہ انکشاف بھی کر دیا کہ کل رات عثمانیہ ہاؤس میں ہی کوکب اور بشیر کی شادی ہو گئی ہے۔

عارف بے حد آزردہ خاطر نظر آنے لگا، پھر وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''لیکن شانی بہن! اس مُنڈے کا کیا ہو گا یہ تو جھلا کملا ہو رہا ہے اس لڑکی کے لئے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''آپ کو پتا ہے آج سویرے کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس نے کھڑکی میں سے ایک لڑکی کو دیکھا۔ اسے شک گزرا کہ وہ شاید کوکی ہے۔ میں باہر ناشتہ کرنے گیا ہوا تھا۔ یہ اٹھ کر اس لڑکی کے پیچھے چل دیا۔ نرسیں روکتی رہ گئیں لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ اس سامنے والے چھوٹے برآمدے تک یہ اس کڑی کے پیچھے گیا جب تسلی ہوئی کہ یہ کوئی اور ہے تب واپس آیا۔ رات کو نیند میں بھی بڑبڑا کر اسی کا نام لیتا ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے اس کی حالت دیکھ کر۔''

شانی ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ اسی دوران میں راجو کی نگاہ شانی پر پڑ گئی۔ اس نے آواز دے کر شانی کو اندر بلا لیا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ شانی اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ بولا۔ ''تم نے کہا تھا، شادی تین ہفتے کے لئے رکی ہے۔ اب کافی دن باقی نہیں، اب کیا کرنا ہے؟''

شانی کے دل پر گھونسا لگا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ کھیل پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ وہ جس کوکی کے نام پر سانس لے رہا ہے وہ کسی کی منکوحہ بن چکی ہے۔ شانی کو چپ دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ ''کل ابا کہہ رہا تھا کہ میں تم سے ساری بات کھول کر پوچھ لوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم دیکھتے

رہ جائیں اور چپ چپیتے کوئی کام ہو جائے۔''

شانی نے کہا۔''حوصلہ رکھو راجو۔ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔''

''کل بھائی بابر پھر کوکی کے ابا جی سے ملنے ان کے گھر گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔''

''کہیں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔'' شانی نے کہا۔ اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود اسے بھی بڑی شدت سے محسوس ہوا۔

''تم کل ملی ہو اس سے؟'' راجو نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں...... کل تو نہیں ملی۔ کوشش شاید آج ملوں گی۔''

راجو کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تکیے کے غلاف میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور شانی سے کہنے لگا۔''میرا یہ خط اسے دے دینا...... اور اگر...... اگر وہ کوئی خط دے تو مجھے لا دینا۔''

شانی نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر خط راجو سے لیا اور اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔ شانی کے لئے اپنے آنسو روکنے مشکل ہو رہے تھے۔ راجو نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''بدھ کے روز بھائی بابر جا کر کوکی کے ابا جی سے ملے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے ابا جی ناراض تو ہیں پر لگتا ہے کہ دو تین وار کوشش کی جائے تو من جائیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ من جائیں گے ناں؟''

''ہاں۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے آنسو چھپانے کے لئے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ایک خوش لباس اور سنجیدہ صورت عورت نے اس کا راستہ روک لیا۔

''کیا آپ راجو کی عزیز ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ ہی کا نام شانی تو نہیں؟'' عورت نے شانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شانی نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔ وہ مسکرائی اور اس نے گرم جوشی کے ساتھ شانی سے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام راحت ہے۔ میں یہاں پر سائیکاٹرسٹ کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ راجو کا کیس بھی مجھے ریفر کیا گیا ہے۔ میں نے کل اور پرسوں راجو سے بات کی تھی۔ اس کی باتوں سے ہی مجھے آپ کا نام بھی معلوم ہوا۔ میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس پندرہ بیس منٹ کا وقت ہوگا؟''

''کیوں نہیں...... آپ فرمائیں۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' عورت نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور شانی ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جواں سال عورت کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بولی۔''راجو جس خطرناک کیفیت سے گزر رہا ہے ہم اسے سائیکالوجی کی زبان میں Suicidal Behavior کہتے ہیں۔ جب ایسا رویہ ٹین ایجرز میں ظاہر ہوتا ہے تو زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ محبت کا شکار ہونے والے نوعمر لڑکے لڑکیاں بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی محبت کو ایک چیلنج کے طور پر لیتے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنی محبت کی شدت ثابت کرنے کے لئے جان تک گنوا دیتے ہیں۔ میں راجو میں جو علامات دیکھ رہی ہوں وہ سب کی سب تشویش ناک ہیں۔''

''میں آپ سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں ڈاکٹر۔'' شانی نے کہا۔

''میں محسوس کرتی ہوں مس شانی کہ ماضی میں یہ لڑکا تنہائی کا شکار رہا ہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد نے اس کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ نشے کا سہارا لینے پر بھی مجبور ہوا۔ اب صورتِ حال ایسی ہے کہ یہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اسے ذرا سی ٹھیس بھی مزید لگی تو یہ بالکل ختم ہو سکتا ہے۔ اس کی بحالی کی واحد امید یہی ہے کہ اسے مزید کوئی ٹھیس نہ لگے اور ہم مسلسل Counceling کر کے اسے شدید ڈپریشن میں سے باہر نکالیں۔''

راحت نامی اس سائیکاٹرسٹ نے پندرہ بیس منٹ تک شانی سے سیر حاصل گفتگو کی۔

شانی باہر نکلی تو اس کے دل پر بوجھ پہلے سے زیادہ تھا۔ راحت نے جو باتیں بتائی تھیں ان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شانی راجو کو دیکھتی تھی تو اس کی چھٹی حس کہتی تھی یہ لڑکا اپنے دیوانے پن میں کچھ بھی کر گزرے گا۔ شانی کو اس کی آنکھوں میں بے پناہ غم کے ساتھ ساتھ جنون کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔

وہ باہر نکلی اور ہسپتال کے وسیع گراسی لان میں ایک بنچ پر جا بیٹھی۔ وہ ایک بار راجو کا سامنا کر چکی تھی اب دوبارہ سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے شولڈر بیگ کھولا اور وہ خط نکال کر پڑھنے لگی جو راجو نے کوکی کے نام لکھا تھا۔ راجو چند ابتدائی جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ وہ بمشکل لکھ سکتا تھا۔ املاء اور ہینڈ رائٹنگ وغیرہ ابتر تھے۔ فقرے بھی شکستہ اور ٹوٹے پھوٹے تھے لیکن اصل چیز تو لفظوں میں چھپا ہوا نفسِ مضمون ہوتا ہے اور وہ متاثر کن تھا۔ اس میں نوعمری کی محبت کی بے پناہ تڑپ نظر آتی تھی...... خط کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

''کوکی! میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ اگر ہمارے بڑوں نے ہمیں ملنے نہ دیا تو میں اپنی جان لے لوں گا اور میں نے سچ مچ گولیاں کھالی تھیں۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں شاید اوپر والے کو ہم پر رحم آگیا ہے۔ شانی باجی نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری شادی رک گئی ہے۔ شانی باجی کو پوری امید ہے کہ اب یہ شادی نہیں ہوگی۔ وہ ہم دونوں کے میل کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہیں۔ تم بھی حوصلہ رکھو۔ ہوسکتا ہے کہ اوپر والا ہمارے لئے کوئی رستہ نکال دے اور اگر نہ بھی ہوا...... تو پھر میرے لئے آخری رستہ تو ہے ہی۔ میں اپنے وعدے پر پکا ہوں کوکی۔ میں تمہیں کسی کی دوہٹی بنتے ہوئے نہیں دیکھوں گا۔ اس سے پہلے ہی اپنی قبر میں پہنچ جاؤں گا۔ چاچا سیف مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے چاچے سیف پر کوئی غصہ نہیں ہے۔ وہ تمہارے ابا جی ہیں تو میرے لئے بھی عزت کی جگہ پر ہیں۔ تم جانتی ہو کہ اس سے پہلے پاک پتن میں جو کچھ ہوا تھا اس میں میرا قصور تھا نہ تمہارا۔''

خط کے آخر میں دو تین بے ڈھنگے شعر لکھے تھے۔ ویسے ہی شعر جو ٹرکوں اور رکشاؤں کے پیچھے لکھے نظر آتے ہیں۔

دل درد کرتا ہے، صنم کوئی دوا بھیج
کاغذ کے ایک پرزے پر تصویر اپنی بنا بھیج

لیکن بات ان شعروں کی نہیں تھی۔ بات اس جذبے کی تھی جو ان شعروں اور اس ٹوٹے پھوٹے خط کے پیچھے تھا۔ اگر اعلیٰ وارفع الفاظ کے پیچھے منافقت اور ہوس ہو تو وہ تحریر کو بھسم کر دیتی ہے لیکن اگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے پیچھے سچائی کی طاقت ہو تو وہ ایک بے ڈھنگے سے محبت نامے کو بھی شاہکار بنا دیتی ہے۔ شانی کو یہ محبت نامہ بھی کسی شاہکار سے کم نہیں لگا۔ اس کے ساتھ ہی شانی کے اندر دبے ہوئے اندیشے بھی ایک بار پھر ابھر کر شور مچانے لگے۔ راجو نے اپنے خط میں یہ بات وضاحت سے دہرائی تھی کہ وہ کوکی سے جدائی کی صورت میں اپنی جان دے دے گا۔

شانی اپنی عجیب فطرت سے مجبور تھی۔ وہ راجو اور کوکی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا چکی تھی۔ وہ ان دونوں کے لئے ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، اب کیا کرے۔ راجو کو اس کی زندگی کی سب سے اندوہناک خبر پہنچانے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری طرف حقیقت کو جھٹلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اچانک وہ چونک گئی۔ اس نے تاؤ حشام، بابر، قادرے اور چند دیگر افراد کو دیکھا۔ وہ ہسپتال کی پارکنگ سے عمارت کی طرف آرہے تھے۔ تاؤ حشام

وغیرہ ایک قریبی ہوٹل میں ہی قیام پذیر تھے۔ وہ دن کے وقت زیادہ تر ہسپتال میں ہی رہتے تھے۔ شانی کو جس چیز نے چونکایا وہ تاؤ حشام اور قادرے وغیرہ کے تاثرات تھے۔ تاؤ حشام کے چہرے پر چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت قادرے کی بھی تھی۔ ان کے پیچھے لمبے چوڑے ڈشکرے ہاتھوں میں اسلحہ لئے دہشت کی فضا پیدا کرتے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے آرہے تھے۔

شانی کی چھٹی حس نے پکار کر کہا...... تاؤ حشام اس بات سے آگاہ ہو چکا ہے کہ چوہدری بشیر نے چالاکی کے ساتھ کوکب سے شادی رچالی ہے۔ اب شاید وہ شانی یا عارف کمبوہ کا گریبان پکڑنے راجو کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بہت بڑی غلطی کر رہا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ راجو کی زندگی کے لئے بہت خطرناک تھا... اور شاید اور بھی بہت سی زندگیوں کے لئے۔ شانی ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ تاؤ اور اس کے ساتھیوں کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی...... وہ تیزی سے اپنے راستے پر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ شانی ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور چند قدم بھاگ کر تاؤ حشام کے سامنے آگئی۔

''کہاں جا رہے ہو چوہدری؟'' اس نے پوچھا۔

شانی کا اندازہ درست نکلا۔ شانی کو دیکھ کر چوہدری کی سرخ آنکھیں کچھ اور بھی دہک گئیں۔ وہ بڑے قہر سے بولا۔ ''رکوالی تم نے شادی؟ سنبھال لیا سارا معاملہ؟''

''م...... میری بات آرام سے سنو چوہدری! یہ ہلڑ بازی کا موقع نہیں ہے۔''

''اوئے، اب باقی کیا رہ گیا ہے کہ ہم آرام سے تمہاری بات سنیں۔ بشیرے نے جو کچھ کرنا تھا اس نے کر لیا ہے اور تُو نے بھی جو کروانا تھا کروالیا ہے۔'' قادرے نے کڑک کر کہا۔

''ابھی بہت کچھ باقی ہے چوہدری! ابھی راجو باقی ہے۔ اسے یہ سب کچھ معلوم ہوگیا تو وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی جان چلی جائے گی۔ ہمیں اب بھی جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے۔'' شانی نے دلیری سے چوہدری حشام اور قادرے کا راستہ روک لیا۔

تاؤ حشام پھنکارا۔ ''تُو منصف اور پنچ نہ بن...... بس بستر گرم کرنے والی زنانی رہ اور یہی تیری اوقات ہے۔ یہ ہم مردوں کے معاملے ہیں اور ہم اپنے معاملے نمٹانا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''یہ معاملہ نمٹانے کی بات نہیں ہے چوہدری، تمہارا بیٹا بستر سے لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر بتا رہے ہیں کہ اس کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے پہلے اسے سنبھل لینے دو، پھر جو چاہے کرتے رہنا۔''

قادرے نے کہا۔ ”تُو زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ ہمیں پتا ہے تُو نے اندر خانے بشیرے کو بھی خصم بنایا ہوا ہے۔ پہلے ہمارے سینے میں بھانبھڑ جلائے ہیں تُو نے۔ اب صبر کرنے کے مشورے دے رہی ہے۔“

شانی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی تلخ زبان میں کچھ کہتی۔ جواں سال چوہدری بابر آگے آیا اور ماتھے پر تیوری ڈال کر بولا۔ ”اب کیا چاہتی ہے تُو؟ ہم جا کر بشیرے کا گریبان بھی نہ پکڑیں۔ ہمارے بچے کی زندگی تباہ کر دی ہے اس نے...... ہم ہسپتالوں میں خجل ہوتے رہیں اور وہ سولہ سال کی کڑی کے ساتھ عیش کرتا رہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

شانی نے اپنے لہجے کو دھیما کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو میں بشیر کی نہیں تمہاری طرف داری کر رہی ہوں۔ راجو کی طرف داری کر رہی ہوں۔ اگر مجھ پر یقین نہیں تو ڈاکٹروں سے پوچھ لو۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ ابھی وہ اس شادی والے معاملے سے بالکل بےخبر رہے۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

قادرا گرجا۔ ”وہ بےخبر ہی رہے گا۔ پر آج ہم نے بشیرے کے ہتھ پیر توڑے بغیر اسے چھوڑنا نہیں ہے۔“

”چوہدری سمجھنے کی کوشش کرو۔ راجو کا اب کوکی کے بغیر زندہ رہنا بڑا مشکل ہے اسے کوکی چاہیے کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں۔ میں چوہدری بشیر سے بات کر رہی ہوں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ابھی تو امید کی کرن نظر نہیں آتی، لیکن کیا پتا کچھ دنوں میں آ جائے۔ کیا پتا چوہدری کوکی کو چھوڑنے پر تیار ہو جائے۔“

”واہ...... واہ کیا بات ہے۔“ قادرا زہریلے انداز میں بولا۔ ”ایک جوٹھی کڑی کو ہمارے گھر کی نوں (بہو) بنانے کا سوچ رہی ہو۔ ہم تھوکتے بھی نہیں ایسی کڑی پر اور تمہارا بھی دُر فٹے منہ۔“ قادرے نے باقاعدہ ہاتھ لہرا کر شانی پر لعنت ڈالی۔

شانی نے تیزی سے کہا۔ ”بات جوٹھی اور کنواری لڑکی کی نہیں چوہدری...... بات راجو کی زندگی بچانے کی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ کوکی اسے نہ ملی تو وہ بےموت مرے گا اور اس کی موت کے ذمے دار تم لوگ ہو گے۔“ شانی نے اپنی انگلی چوہدری کے چہرے کی طرف اٹھا کر کہا۔

قادرے کا چہرہ ایک بار پھر انگارہ ہو گیا۔ نتھنے پھول گئے۔ تاہم اس کے بولنے سے پہلے ہی بابر ابول اٹھا۔ تاؤ حشام سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایک دو باتیں واقعی

غور کرنے کی ہیں۔ اس طرح کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ سامنے کینٹین میں جا کر بیٹھتے ہیں۔“

چوہدریوں کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔ اسی اثناء میں عارف کمبوہ بھی آ گیا۔ وہ سب لوگ کینٹین کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی وہ کینٹین سے کچھ دور ہی تھے کہ شانی کو مین گیٹ کے پاس ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ یہ سب انسپکٹر اختر تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ تاہم اپنے قد کاٹھ کے سبب دور ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے بھی دور سے شانی کو دیکھ لیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ حاجی حیات خان کا کوئی اہم پیغام لے کر یہاں آیا ہے۔ اس سے فوری طور پر بات کرنا ضروری تھا لیکن یہاں چوہدریوں والی مصیبت نے بھی اسے گھیر رکھا تھا۔

جب تاؤ حشام اور قادرا وغیرہ کینٹین میں بیٹھ گئے تو شانی، راجو کو ایک نظر دیکھنے کے بہانے واپس ہسپتال کی عمارت کی طرف آ گئی۔ ہسپتال کے ایک نسبتاً سنسان گوشے میں اسے سب انسپکٹر اختر کھڑا نظر آ گیا۔ شانی اس کے ساتھ تیسری منزل پر چلی گئی۔ یہاں بالکل خاموشی تھی۔ اختر نے کہا۔ ”بی بی، آپ کے لئے ایس پی کی طرف سے ایک خاص پیغام ہے۔“

”خیریت کا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن حالات یہ ہیں شانی بی بی! کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں پوٹھوہار میں ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں پر بھرپور ریڈ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ افسر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر اب بھی لالہ، رستم، حسنے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف طاقت سے کارروائی نہ کی گئی تو پھر معاملات مزید خراب ہو جائیں گے۔“

شانی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تاہم وہ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات تو کافی دنوں سے گردش کر رہی ہے۔ خاص طور سے ڈیک نالے کے کنارے پولیس اہلکاروں کے مرنے کے بعد سے۔“

”لیکن اب حالات میں کچھ زیادہ ہی تیزی آ گئی ہے۔ ڈپٹی ریاض کا کہنا ہے کہ گرینڈ آپریشن میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ کامیابی مزید مشکل ہو جائے گی۔ دوسری طرف پولیس کو کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں جن سے پتا چلا ہے کہ رستم ایک بار پھر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر کوئی خاص کارروائی کرنا چاہ رہا ہے۔ اب خبر نہیں کہ اس کا نشانہ کون ہوگا، لیکن اگر

کارروائی کے بعد حالات اور سنگین ہو جائیں گے۔ اخبار پہلے ہی پوٹھوہار کی خبروں سے بھرے پڑے ہیں۔ پولیس اور انتظامیہ پر اس مطالبے کا بے حد دباؤ ہے کہ رستم کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اب یہ پولیس اور انتظامیہ کی آن بان کا مسئلہ بن چکا ہے۔

حاجی حیات صاحب نے کہا ہے کہ آپ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لئے رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ایک بیان دیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کی پوری مذمت کریں۔

حاجی حیات صاحب کو پتا چلا ہے کہ ایک معروف اخبار کا نمائندہ آپ کا انٹرویو لینے کے لئے خاص طور سے لاہور سے جوہر آباد پہنچنے والا ہے۔ اخبار والے آپ کی تفصیلی سٹوری چھاپنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ سے پوٹھوہار کے سفر کے بارے میں پوچھیں گے اور یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ میانہ کے چوہدری اور اس کے بیٹے کو ڈاکوؤں سے چھڑانے میں کیسے کامیاب ہوئیں۔"

"لیکن یہ باتیں تو اخبار والے پہلے پوچھ چکے ہیں اور ڈپٹی ریاض سے بھی بیان لے چکے ہیں۔"

"مگر اب وہ سب کچھ تفصیل سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی اجازت سے آپ کی ذاتی زندگی اور حالات کے بارے میں بھی سوالات پوچھیں۔ آپ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار رہیں۔ اس کے علاوہ یہ آپ کے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ آپ رستم اور اس کے ساتھیوں کی غیر قانونی کارروائیوں کے بارے میں بھی اپنا مؤقف بیان کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔ آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہو لیکن آپ کی زبان سے رستم اور اس کے ساتھیوں کی مذمت ہونی چاہیے۔"

شانی نے مرے ہوئے سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر جیسے کراہ کر بولی۔ "لیکن رستم! اب کیا کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ساری افواہ بازی ہے۔ وہ تو پولیس سے چھپ کر وہاں بیٹھا ہے۔ وہ بار بار کیوں نکلے گا اپنی پناہ گاہ سے باہر۔"

"بی بی شانی! آپ کی طرح ہمیں بھی رستم سے ہمدردی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس شخص کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ نہ ہی اس کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ گرفت میں نہیں آ سکا۔ یہ شخص ایک ہی وقت میں رحم دل اور سفاک...... بہت زیادہ محتاط اور بہت زیادہ بے پرواہ...... بہت ٹھنڈا اور بہت گرم دماغ بھی ہے۔"

"وہ جانتا ہے کہ تاؤ اور اس کے بیٹے کے اغوا کے بعد پولیس چوکس ہے۔ انہوں نے

راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہوگی۔ یہ تو جان بوجھ کر مصیبت کو گلے لگانے والی بات ہے۔"
شانی کے لہجے میں گہری مایوسی تھی۔

سب انسپکٹر اختر نے کہا۔ "شانی بی بی! میں پھر اپنی بات دہرا دیتا ہوں۔ حاجی حیات خان کا کہنا ہے کہ آپ کے اپنے ذاتی خیالات جو بھی ہیں لیکن دو چار دن کے اندر اندر رستم اور اس کی کارروائیوں کے خلاف آپ کا ایک بیان ضرور ریکارڈ پر آ جانا چاہیے۔"

شانی کا بجھا ہوا دل مزید بجھنے لگا۔ وہ رستم کے لئے شدید خطروں کی بُو محسوس کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

رستم ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ذرا نشیب میں پوٹھوہار کا ویرانہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر شام کی سرخی تھی۔ نیم گرم ہوا میں رستم کے لمبے بال ہولے ہولے اس کی فراخ پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں تھیں۔ اس کی نگاہوں کا رخ جنوب کی طرف تھا...... ہاں جنوب...... جہاں کوئی رہتا تھا۔ جہاں اس کے سانسوں کی مہک پھیلتی تھی، جہاں اس کا تبسم چمکتا تھا۔ جہاں کسی گھر کی چار دیواری میں اس کی آواز گونجتی تھی اور نرم گرم راتوں میں اس کی زلفیں تکیے پر پریشان ہوتی تھیں۔ وہ کون تھا؟ یہ وہی تھی جس کا پیار رستم کے جسم کے ہر گوشے میں رچ بس چکا تھا۔ وہ سانس لیتا تھا تو وہ سانس کے ساتھ اس کے جسم میں داخل ہوتی جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تھا تو وہ مجسم تصویر بن کر نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ اسے تو اب اپنے جسم سے بھی اسی کی خوشبو آتی تھی۔ دراڑ والے واقعے سے پہلے بھی اس کا پیار بے مثال تھا لیکن اب "دیوی" کو چھونے کے بعد اس کی پرستش کرنے کے بعد یہ پیار اور بھی بیکراں ہو گیا تھا۔ اسے اس پیار کے سوا کچھ نظر آتا تھا نہ سنائی دیتا تھا اور نہ ہی شاید کچھ محسوس ہوتا تھا۔

اچانک آہٹ ہوئی اور رستم اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، اس کا بے تکلف دوست حسنا گجراتی دبے پاؤں آیا تھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ حسبِ معمول ایک سیون ایم ایم رائفل اس کے گلے میں تھی...... وہ بھنے ہوئے چنے چبا رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

دو چھپے دیاں کلیاں نوں
پردیسی چلے گئے وطناں نوں
خالی رہ گیاں گلیاں نے

"تم بس ہر وقت اپنی ہی لائن پر رہا کرو۔" رستم نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"تم بھی تو اپنی ہی لائن پر ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ شاید دوسروں کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہیں یار جی! تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں اور پھر تمہارے تو چہرے پر ہی سب کچھ لکھا مل جاتا ہے۔"

"کیا لکھا مل جاتا ہے؟"

"جب سے بی بی جی واپس گئی ہیں، تمہارے چہرے پر لکھا ہے میں دنیا کا سب سے اداس بندہ ہوں۔ پوٹھوہار کی ویرانی میں دس گنا ویرانی روز ڈال لی جائے تو میرے دل کی ویرانی پھر بھی زیادہ ہوگی۔"

"یار! تیری یہ بکواس میں پہلے بھی بہت دفعہ سن چکا ہوں، اب کوئی کام کی بات کر۔"

"یہ بکواس ہی کام کی بات ہے رستم! میں جانتا ہوں تم بی بی جی سے بہت پیار کرتے ہو بلکہ اس کو عشق کہنا چاہیے لیکن یہ سب کچھ تم نے اپنے تک رکھا ہوا ہے بی بی کو کچھ بتاتے نہیں ہو۔ جب تک تم کچھ بتاؤ گے نہیں ان کو تمہاری حالت کا کیسے پتا چلے گا۔ یہ سب کچھ اپنے دل میں لے کر ہی شاید تم، ہم سب کے ساتھ اگلے جہان میں کوچ کر جاؤ گے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اب ہماری زندگیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت چل چلاؤ والی گھنٹی کھڑک سکتی ہے۔ اس گھنٹی سے پہلے کم از کم اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لو۔"

"تم اس بات کو نہیں سمجھتے حسنے! یہ بھڑاس نہیں ہے، یہ تو برفانی کالی راتوں میں زندہ رکھنے والی آگ ہے۔ شاید اس آگ کی گرمی نے ہی مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔"

"چلو یار آگ ہی سہی۔ پر تم بی بی جی کو کچھ بتاؤ گے تو انہیں پتا چلے گا ناں۔"

"حسنے! ساری باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں کچھ باتیں کہے سنے بغیر جانی جاتی ہیں۔"

حسنے نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس دوران میں لالہ فرید آتا دکھائی دیا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کی سیاہ ایل ایم جی اور گولیوں والی بیلٹ چمک رہی تھی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور ان دونوں کے قریب ہی پتھروں پر بیٹھ گیا۔ لالہ فرید "کالا چیتا رینج" کی طرف گیا ہوا تھا اور چار پانچ روز بعد واپس آیا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں ڈیرے پر رستم نے ہی قائم مقام سردار کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ علیک سلیک اور حال احوال پوچھنے کے بعد تینوں دوستوں نے سگریٹ سلگائے اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔

لالے فرید نے پوچھا۔ "رستم، یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تُو پھر رنگ والی اور نارپور کی طرف جانا چاہ رہا ہے....."

"ہاں فرید، میرا جانا ضروری ہوگیا ہے۔ چار دن پہلے نظام نے سیٹ (وائرلیس) پر جو

اطلاع دی ہے، وہ شاید ابھی تم تک نہیں پہنچی۔"

"کیا اطلاع ہے؟" فرید نے چونک کر پوچھا۔

"بی بی جی نے حشام اور اس کے بیٹے کے بدلے جو دو ڈاکٹر چوہدریوں سے رہا کرائے تھے، ان میں سے ایک کا نام ڈاکٹر بہروز ہے..... ڈاکٹر بہروز کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔"

"کس وجہ سے؟" فرید نے پوچھا۔

"اسی حرامی پیر قدرت اللہ کی وجہ سے۔ پیر قدرت اللہ جان گیا ہے کہ اس کا سب سے بڑا حریف نہ صرف آزاد ہوگیا ہے بلکہ خم ٹھونک کر میدان میں بھی آرہا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میدان میں آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر بہروز والا ٹنٹنا ختم کردیا جائے۔ اس کے لئے ڈاکٹر کو روڈ ایکسیڈنٹ میں مارنے کی سازش تیار کی گئی ہے۔ یہ سارا منصوبہ لاہور میں تیار ہوا ہے اور لاہور میں ہی اس پر عمل بھی ہونا تھا۔"

"نظام کو یہ سب کیسے پتا چلا؟"

"نظام کو میں نے ہی کہا تھا۔ بی بی کے جانے کے بعد میرے دل میں ڈر تھا کہ پیر قدرت اللہ اپنے طور پر کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کرے گا۔ اس خبیث کی جڑیں گہری اور ہاتھ لمبے ہیں۔ میں نے نظام سے کہا تھا کہ وہ اپنے ایک ہوشیار بندے کو پکا پکا قدرت اللہ کے پیچھے لگا کر رکھے۔ بس اسی احتیاط کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لاہور والی سازش کا پتا چل گیا ہے۔"

"کیا پروگرام تھا ڈاکٹر کے خلاف؟"

"ڈاکٹر آج کل روزانہ لاہور میو ہسپتال میں آرہا ہے، اس کے پاس چھوٹی سوزوکی کار ہے۔ وہ ملتان روڈ کی طرف سے آتا ہے اور رات دس گیارہ بجے واپس جاتا ہے۔ محصول چونگی کے قریب اس کی کار کو بجری سے بھرے ہوئے ٹرک کے ساتھ ٹکر مارنے کا پروگرام تھا۔ ٹرک ڈرائیور کے ایک ساتھی کی وجہ سے یہ ساری بات سامنے آئی ہے۔ نظام کے بندے نے ٹرک ڈرائیور کو بڑی عقل مندی سے شیشے میں اُتارا ہے اور اس سے ساری بات پوچھی ہے۔"

"تم نے ڈاکٹر بہروز کو ہوشیار کردیا ہے؟" فرید نے رستم سے پوچھا۔

"ہاں، نظام ہی کے ہاتھ اسے پیغام بھجوا دیا ہے۔ وہ اب گھر سے باہر نہیں نکل رہا ہے۔ نظام کے اصرار پر اس نے فی الحال میانہ آنے کا پروگرام بھی کینسل کردیا ہے۔"

"لیکن نظام نے جو روڈ ایکسیڈنٹ والی بات بتائی ہے، اس کی تصدیق بھی کسی طرح

ہونی چاہیے۔'' فرید نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آج تصدیق ہو جائے گی۔ نظام نے پرسوں کہا تھا کہ وہ اس شخص کو ''سیٹ'' پر لانے کی کوشش کرے گا جس سے یہ ساری باتیں پتا چلی ہیں۔''

فرید نے پتھر سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے چند گہرے کش لئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ ٹیلے تاریکی میں مدغم ہو رہے تھے۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''تو تم قدرت اللہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں..... یہ بندہ زمین پر ایک گندے بوجھ کی طرح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے پہلے میں اس کا قصہ پاک کر دوں۔''

''کیا کرو گے؟''

''میں قدرت اللہ کے آستانے میں گھس جاؤں گا۔ قدرت اللہ سمیت اس کے جتنے بندوں کو قتل کر سکا، کر دوں گا۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد مارا گیا تو میری غائبانہ نماز جنازہ یہاں پڑھ لینا۔ اگر واپس آ گیا تو اکٹھے مریں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، پولیس اب تمہیں یہاں سے نکل کر کسی شہر یا بستی تک پہنچنے دے گی؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟ اگر تم کالا چیتا رینج سے ہو کر واپس آ سکتے ہو تو میں بھی نار پور سے ہو کر آ سکتا ہوں۔''

''تم نے مجھ سے پوچھا ہی کب ہے۔ میں نہیں جا سکا کالا چیتا۔ تم جانتے ہو علاقے میں جانے کے دو تین ہی تو راستے ہیں۔ ان راستوں پر بھی پولیس پہنچ چکی ہے اور اگر وہاں پولیس پہنچ چکی ہے تو پھر اگلے ڈیرے کی طرف بھی ضرور ہو گی۔''

پولیس کے پہنچنے کی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ چند لمحوں کے لئے رستم اور حسنا دونوں چپ ہو گئے۔ رستم نے فرید کے ہاتھوں سے سگریٹ لیا اور کش لے کر بولا۔ ''اگر تم کالا چیتا نہیں گئے تو کہاں رہے اب تک؟''

''بس موقع کی تلاش میں رہا کہ شاید نگرانی ختم ہو اور راستہ مل جائے، مگر پھر یہی نتیجہ نکلا کہ یہ نگرانی نہیں ہے، وہاں پولیس والوں نے پکا پکا ڈیرہ لگایا ہوا ہے۔ وہاں مجھے ایک بڑے سائز کی دوربین اور ایک بھاری رائفل بھی نظر آئی۔ یقینی بات ہے کہ اور رائفلیں بھی ہوں گی۔ خواہ مخواہ خود کو شدید خطروں میں ڈالنا عقل مندی نہیں تھی اور بات صرف یہاں سے نکلنے ہی کی نہیں، واپس آنے کی بھی تو تھی۔''

''لیکن مجھے تو واپس آنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے جھپیاں ڈال کر اور کہا سنا معاف کروا کر جاؤں گا۔'' رستم کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ ابھری۔

''اور وہ تمہاری بیوی..... میرا مطلب ہے چھوٹی بھرجائی؟'' حسنے نے پوچھا۔

''اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رستم سنگ دلی سے بولا۔ ''اگر میں واپس نہ آ سکا تو اس کا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔''

ماحول پر ایک دم اداسی چھا گئی۔ اپنی طرف بڑھنے والی موت کی چاپ تو وہ سارے ہی سن رہے تھے۔ خصوصاً جب سے ڈپٹی ریاض کا نام ان کے کانوں میں پڑا تھا، وہ جان گئے تھے کہ اب ٹیلوں میں فیصلہ کن مرحلہ آنے والا ہے لیکن رستم کی طرف سے اتنی جلدی جدائی کی باتیں ہونے لگیں گی، انہیں علم نہیں تھا۔

رستم نے اپنے بازو اوپر اٹھائے اور ایک شاندار انگڑائی لی۔ پھر ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''یارو! پریشان ہونے والی بات نہیں۔ پریشانی تو تب ہو کہ ہم یہاں سکون آرام سے رہ رہے ہوں اور یہاں سے باہر جانے میں میرے لئے موت کا خطرہ ہو۔ موت کا خطرہ تو یہاں بھی ہر وقت منڈلا رہا ہے۔ میں یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کروں گا تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ میں تم سے دو چار ہفتے پہلے مر جاؤں گا لیکن اگر میں نکل گیا اور میں نے قدرت اللہ کی گردن ادھیڑ دی تو یہ بہت بڑی بات ہو گی۔ اس سے بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا۔''

لالہ فرید مسلسل نفی میں سر ہلاتا چلا گیا۔ ''نہیں رستم! میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں ایسا کرنے سے زبردستی روکتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمارے لئے یہاں سے نکلنے کا وقت تقریباً گزر گیا ہے۔ پولیس نے ناکہ بندی کر لی ہے اور گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یہ ناکہ بندی مضبوط ہوتی جائے گی۔ اب یہ لوگ بالکل نہیں چاہتے کہ چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کے اغوا جیسا کوئی اور واقعہ ہو... مجھے لگتا ہے کہ تم ڈیرے سے نکل کر خود کو سخت خطرے میں ڈالو گے۔''

''میں اس خطرے کا سامنا کر لوں گا فرید..... مجھے مت روکو۔'' رستم نے بڑے کرب سے کہا۔ ''اور میرا یہ وعدہ بھی ہے تم دونوں سے کہ اگر بچ گیا تو یہاں واپس آؤں گا۔''

فرید نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو اس سے بھی بڑی بے وقوفی ہو گی بلکہ دیوانہ پن

ہوگا۔''

''یار، یہی دیوانہ پن تو ہماری شان ہے۔ ہم سرپھرے نہ ہوں تو ان پہاڑوں میں کیوں پہنچیں۔'' رستم نے پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں ڈیرے کی روشنیوں کی طرف سے کاٹھیا کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ وہ رستم کو بتا رہا تھا کہ ''سیٹ'' پر نظام موجود ہے۔ وہ بات کرنا چاہتا ہے۔

وہ تینوں اٹھ کر چھجے کی طرف چلے گئے۔ یہاں ایک کمرے میں وائرلیس سیٹ موجود تھا اور اس پر سگنل موصول ہو رہے تھے۔ ایک سرخ بلب روشن تھا اور مائیک سے نکلنے والی شائیں شائیں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ رستم نے وائرلیس سیٹ پر جھکتے ہوئے کہا۔

''میں رستم ہوں، کہو کیا بات ہے؟''

''رستم بھائی، وہ ٹرک ڈرائیور میرے ساتھ ہے جس نے مجھے ڈاکٹر صاحب والی بات بتائی ہے۔ آپ چاہیں تو خود اس سے بات کر سکتے ہیں۔''

''ہاں کراؤ بات۔''

چند سیکنڈ بعد ایک بھاری اور قدرے پریشان آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ ''میرا نام عبداللہ ہے جی۔ میں ٹرک چلاتا ہوں اور پنڈی سے بجری لے کر لاہور آتا ہوں۔ لاہور سے فرنیچر وغیرہ لاد کر پنڈی پہنچاتا ہوں۔ اقبال بالا میرے جاننے والوں میں سے ہے جی۔ وہ بھی ٹرک ڈرائیور ہے پر وہ نشہ وغیرہ کرتا ہے۔ لالچی بھی ہے اور لالچی اس لئے ہے کہ اسے ایک عورت کو پیسے کھلانے پڑتے ہیں۔ لاہور میں ایک عورت سے اس کا یارانہ ہے۔ بہت کچھ اس پر لٹاتا رہتا ہے پر اس عورت اور اس کی ماں کا پیٹ بھرنے میں نہیں آتا۔ پچھلے سال بالے نے چار پانچ مہینوں کی جیل بھی کاٹی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے بھی اس پر کیس بنا تھا۔ ٹرک میں سے چرس نکلی تھی۔ وہ خود بھی نکا کر چرس پیتا ہے۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ بالے نے ایک بندے سے لمبی رقم پکڑی ہے۔ اس رقم کے بدلے اس نے ایک ڈاکٹر کی گاڑی کو ٹکر مارنی ہے۔ اس معاملے کی پوری پوری سیٹنگ ہو چکی ہے۔ میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پر میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میں نے پہلے بھی ہاتھ باندھے تھے اب پھر باندھتا ہوں۔ اس معاملے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔ باقی میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بتایا ہے سچ ہے۔ آپ، بس اس ڈاکٹر صاحب کی جان بچانے کی کوشش کریں۔''

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ بالے کو رقم دینے والا پیر قدرت اللہ کا بندہ ہے۔'' فرید نے

پوچھا۔

''بالے نے نشے کی حالت میں مجھے خود بتایا ہے۔ اس کا پورا نام پتا بتایا ہے۔ آپ خود بھی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

رستم اور فرید نے اس شخص سے دو چار باتیں مزید پوچھیں، پھر نظام خود لائن پر آ گیا۔ اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ڈیرے پر ایک دو دغا باز ضرور موجود ہیں۔ یہ لوگ مخبری کر رہے ہیں۔ ڈیرے کی خبریں باہر نکل رہی ہیں۔ اب بھی یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ رستم اور اس کے ساتھی کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ شاید چوہدری حشام کی طرح پھر کسی کو اغوا کرنا ہے۔ پولیس والے کافی چوکس نظر آ رہے ہیں۔ پرسوں ٹھکیرا تھانے میں ڈپٹی ریاض نے علاقے کے چار پانچ ایس ایچ اوز بلا رکھے تھے۔ ان سے لمبی میٹنگ ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

''میں ایک مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں جی۔ اگر آپ کو اچھا لگے تو مان لیں ورنہ کوئی ناراضگی نہیں ہے۔'' نظام نے کہا۔

''ہاں...... ہاں، بولو۔''

''چوہدری حشام اور اس کے بیٹے والے معاملے پر پولیس بڑی چوکس ہے۔ سنا ہے کہ وڈے ڈیرے کو جانے والے راستوں کی ناکہ بندی بھی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کچھ دیر کے لئے خاموشی کی جائے تو شاید بہتر ہو۔''

''تمہارے مشورے میں ناراضگی والی کوئی بات نہیں۔ اس بارے میں سوچتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد رستم نے فرید سے کہا۔ ''ابھی تم نے نظام کی بات سنی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہاں مخبر موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا شک درست ہے۔ آؤ، میں تمہیں کچھ دکھاؤں۔''

رستم نے فرید اور حسنے کو ساتھ لیا اور دو نمبر سرنگ کی طرف آ گیا۔ یہاں گیس لیمپ روشن تھے اور سپرٹ کی ہلکی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے سلاخ دار کوٹھڑیوں کے سامنے پہنچے یہ وہی کوٹھڑیاں تھیں جہاں چند دن پہلے چوہدری حشام اور راجو بند تھے۔ حشام اور راجو والی کوٹھی میں اب ایک بندہ نظر آ رہا تھا۔ یہ عظمت نامی وہی بہروپیا عامل تھا جسے کچھ دن پہلے رستم نے ٹیلوں سے پکڑا تھا۔ یہ وہاں ایک کھوہ میں نادیہ کی عریاں پشت پر کچھ اوٹ

پٹانگ لکھ رہا تھا بعد ازاں کھوہ میں سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی تھی اور عظمت کے دیگر سامان میں سے جادو ٹونے کی اشیاء کے علاوہ اخلاق سوز تصویریں بھی ملی تھیں۔

میلا کچیلا عظمت کوٹھڑی کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کا سر گھٹنوں میں تھا۔ شاید اونگھ رہا تھا۔ رستم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو عظمت بدک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ بُری طرح سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں پر بھی چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ ایک آنکھ کے اوپر پیشانی پر گہرا زخم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر عظمت پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ وہ کرب ناک چیخیں مارنے لگا۔ پہلے اس نے کوٹھڑی کے ایک گوشے میں سمٹنے کی کوشش کی پھر تھوڑا سا اشتعال دکھایا اور ادھ کھلے دروازے سے باہر نکلنے کے لئے بھاگا مگر رستم نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دوبارہ فرش پر پٹخ دیا۔

وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ اس نے رستم کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑانے لگا۔ ''مجھے معاف کردو ..... میں توبہ کرتا ہوں ..... میں اب کچھ نہیں کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا، اس نے رستم کے پاؤں چھوڑے اور فرید کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ ''میں آپ کا مجرم ہوں۔ میں مانتا ہوں، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ میں معافی مانگتا ہوں۔''

رستم نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اسے واویلا ختم کرنے کو کہا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور اپنے ہیجان پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رستم نے فرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ حرام زادہ مخبری کرتا ہے ہماری...... اس کے ایک ساتھی کا بھی پتا چلا ہے لیکن وہ اس وقت ڈیرے پر نہیں ہے۔'' پھر رستم نے عظمت سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اس کُتے کا؟''

''راشد..... راشد ٹیڈی۔'' عظمت نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

رستم بولا۔ ''دوسرا انکشاف یہ ہے کہ یہ صرف پیر قدرت اللہ کا چیلا ہی نہیں ہے اس کا سگا بھتیجا بھی ہے۔ ڈیڑھ دو سال پہلے اس نے اپنے ایک شاگرد کی بیوی پر بُری نظر ڈالی اور شاگرد کو زہریلا کشتہ کھلا کر مار ڈالا۔ بعد میں اس پر قتل کا کیس بنا اور یہ بھاگ کر پہلے گجرات اور پھر جہلم آ گیا۔ بعد میں کاٹھیا کے ایک دوست کے ذریعے یہ لعنتی یہاں پہنچ گیا اور اس کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ یہ عامل شاہی کا شاگرد تھا۔ یہ خبیث براہِ راست پیر قدرت اللہ کا شاگرد تھا اور اب بھی ہے۔ آج سے کوئی چار مہینے پہلے گوجر خان کے ایک ہوٹل میں قدرت اللہ نے اس سے ملاقات کی اور اسے آمادہ کیا کہ یہ اگلے ڈیرے اور وڈے ڈیرے کے حالات کے بارے

میں اسے بتاتا رہے۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ راشد ٹیڈی خود کو حکیم بھی بتاتا ہے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔ آج کل بھی کہیں نکلا ہوا ہے۔ یہ خبیث اسی چکر میں مخبری بھی کرتا ہے۔''

عظمت کا سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔ وہ جیسے بے زبان خاموشی ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ حسنے نے آگے بڑھ کر ایک زوردار ٹھوکر عظمت کی پسلیوں میں رسید کی اور دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے تُو کہاں کا ''عظمت'' ہے تُو تو ذلالت ہے نری۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے عظمت پر گالیوں کی بارش کردی۔

وہ ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ فرید نے کہا۔ ''اس خنزیر کی سزا تو یہی ہے کہ اسی جگہ اس کی کھوپڑی میں تین چار سوراخ کر دیئے جائیں لیکن چلو، آ لینے دو اس کے حرامی یار کو بھی واپس۔''

☆======☆======☆

رستم بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کے پروگرام کے مطابق ڈیرے پر اس کی یہ آخری رات تھی اور شاید یہ اس کی زندگی کی بھی آخری رات ہوتی۔ وہ جانتا تھا اب یہاں سے نکل کر کسی بستی تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ کسی بھی جگہ باوردی یا سادہ لباس والی پولیس سے اس کا ٹکراؤ ہوسکتا تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک کام جان بوجھ کر کرنے جا رہا تھا۔ بی بی کو چُھونے کے بعد اس کے دل کی حالت کچھ عجیب ہو چکی تھی۔ پہلے پانچ چھ دن تو اسے یہی لگا تھا کہ وہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک سیراب ہو گیا ہے۔ اب اسے کسی چیز کی حسرت نہیں۔ وہ باقی کی مختصر زندگی ان یادوں کے سہارے بہ آسانی گزار سکتا ہے لیکن پھر بتدریج اس پر ایک اور احساس غالب ہوتا چلا گیا۔ بی بی سے ملنے کی خوشی اور سیرابی اپنی جگہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک مہیب خلا بھی پیدا ہوا تھا۔ بے حد مہیب اور اذیت ناک۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بی بی کے بغیر جتنے ماہ، جتنے دن اور گھنٹے زندہ رہے گا، ایک خوفناک سولی پر لٹکتا رہے گا۔ اب موت اسے پہلے سے زیادہ پیاری لگنے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب جلدی سے مر جائے......اور اگر مرنے سے پہلے وہ بی بی کے رستے کے ایک دو کانٹے صاف کر دیتا تو اس سے اچھی بات اور کیا تھی۔ پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کسی تاریک گوشے کے اندر یہ موہوم سی امید بھی موجود تھی کہ شاید وہ ایک بار پھر اپنی بی بی کو دیکھ سکے، ان کی مہربان موجودگی کو محسوس کر سکے۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر تاریکی آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ اس ٹکڑے پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ بی بی کے جانے کے بعد یہ ستارے بھی جیسے اداس ہو گئے تھے۔ متلاشی نظروں سے ان ٹیلوں کو تکتے رہتے تھے۔ کہاں تھی وہ؟ جس کے دم قدم سے یہ ڈیرہ چند دن تک جگمگایا تھا، مسکرایا تھا اور گل و گلزار ہوا تھا۔ وہ جیسے سب کو ہی اداس کر گئی تھی۔ مہناز،

شاہدہ، حنیفاں، ٹیپو سب ہی اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ کچھ ایسی بات تھی اُس میں کہ وہ دلوں کو تسخیر کر لیتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد یہاں کی ہر شے رستم کو کاٹنے کے لئے دوڑنے لگی تھی۔ کسی وقت رستم بالکل ایک نوخیز عاشق کی طرح سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ایک دن اس کا دل چاہا کہ وہ رات کے وقت خاموشی سے تیسری سرنگ میں چلا جائے۔ وہ چرخی اور رسی ابھی تک وہیں لٹک رہی تھیں جنہوں نے رستم اور بی بی کو اندھی دراڑ سے نکالا تھا۔ رستم کا دل چاہا کہ وہ ٹارچ لے کر دراڑ میں اُتر جائے۔ اس جگہ کو پھر سے دیکھے جہاں اس نے بی بی کے ساتھ رات گزاری تھی۔ اس ہموار پتھر کو دیکھے جس پر وہ بی بی کے ساتھ دراز ہوا تھا، ان کے بہت قریب چلا گیا تھا۔ وہاں لیٹ جائے اور آنکھیں بند کر کے اس وقت کی کیفیت کو محسوس کرے لیکن پھر اسے لگا کہ شاید دراڑ میں اُترنے کے بعد وہ مزید دکھی ہو جائے گا۔

اچانک اسے اپنے پہلو سے چند فٹ کی دوری پر ایک مدھم آواز سنائی دی۔ یہ نادیہ کی آواز تھی۔ وہ رستم کی ہدایت کے مطابق پاؤں سے گردن تک کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ رستم سمجھا تھا کہ شاید وہ سو چکی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بڑی دبی ہوئی آواز میں بولی۔ ''رستم! صبح تم جا رہے ہو؟''

رستم بُری طرح چونک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید نادیہ اس کی روانگی سے آگاہ نہیں......پہلے تو اسے نادیہ کی باخبری پر غصہ آیا لیکن پھر اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں......ایک ضروری کام ہے۔''

''کیا یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ یہ ضروری کام کیا ہے؟''

''نہیں۔'' رستم نے دوٹوک جواب دیا۔

''لیکن رستم! یہ تو بتا دو کہ تم اتنا شدید خطرہ مول کیوں لے رہے ہو۔ گوہرا بتا رہا تھا کہ باہر جانے والے راستوں پر پولیس آگئی ہے اور یہ لوگ ٹیلی اسکوپس کے ذریعے دور دور تک نظر رکھ رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟'' رستم کے لہجے میں کاٹ تھی۔

''میں نہیں جانتی، لیکن فی الحال یہاں سے نکلنے کی کوشش ٹھیک نہیں ہے۔ گوہرا بتا رہا تھا کہ اس سے پچھلے سال بھی اسی موسم میں پولیس اور رینجرز نے اگلے ڈیرے کی طرف ٹیلوں پر مورچے بنائے تھے مگر پھر ایک دو مہینے بعد واپس چلے گئے تھے۔''

''لیکن اس بار شاید وہ واپس جانے کے لئے نہیں آئے۔''

کچھ دیر کمرے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ بس ایک کونے میں رکھی لالٹین کی مدھم لَو تھرتھراتی رہی۔ اطراف کے سنسان ٹیلوں سے گیدڑوں اور کتوں کی مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔

آخر نادیہ کی آواز ابھری۔ ’’کب تک واپس آؤ گے؟‘‘

’’یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔‘‘

’’ایسی بات ہے تو...... پھر مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔‘‘

ایک دم رستم کا پارہ چڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس پر پھٹ پڑے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے خود پر ضبط کر لیا۔ نہ صرف ضبط کر لیا بلکہ جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی بہت نرم تھا۔ ’’نہیں نادیہ! تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا لیکن جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ شاید آٹھ دس دن کے اندر۔ باقی یہاں تمہیں کسی طرح کی تکلیف پہلے ہوئی ہے نہ اب ہوگی۔ تم یہاں چھوٹی بھرجائی ہو۔ فرید تمہیں بہن کی طرح سمجھتا ہے۔‘‘

’’پپ... پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے رستم۔‘‘

’’ڈر کہاں نہیں ہے۔ یہ تو ساری وادی ہی ڈر ہے اور اس ڈر کو تم نے اپنی مرضی سے اپنایا ہے۔‘‘ رستم کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

جب سے وہ دونوں یہاں آئے تھے، پہلا موقع تھا کہ رستم نے ایسے نرم لب و لہجے میں نادیہ سے بات کی تھی۔

وہ بولی۔ ’’تمہارا ساتھ ہو تو کوئی ڈر...... ڈر نہیں ہے رستم لیکن تمہارے بغیر ہر زندہ اور بے جان شے بھی ڈراتی ہے۔‘‘

ایسے جملوں پر اکثر نادیہ کو ڈانٹ سننا پڑتی تھی لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ رستم نے کہا۔ ’’اچھا اب سو جاؤ۔ صبح مجھے جلدی جاگنا ہوگا۔‘‘

’’کک... کہو تو میں...... تمہارے پاؤں دبا دوں؟‘‘

’’نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سو جاؤ تم۔‘‘

’’نہیں...... میرا...... دل چاہ رہا ہے۔‘‘ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس لہجے میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ رستم دوٹوک انداز میں انکار نہیں کر سکا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو رستم نے کہا۔ ’’پاؤں نہیں، بس سر دبا دو۔‘‘

وہ کھسک کر اس کے سر کی طرف آ گئی اور دبانے لگی۔ رستم کے سر میں واقعی ہلکا درد تھا۔ وہ اپنے نرم و نیم گرم ہاتھوں سے دباتی رہی۔ رستم کو نیند آ گئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا جب

رستم کی آنکھ کھلی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج نادیہ اپنی جگہ پر نہیں بلکہ اس کے قریب لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی طرف رستم کی پشت تھی۔ نادیہ کا ایک ہاتھ رستم کے شانے پر تھا وہ گاہے بگاہے اس ہاتھ کو ہولے سے حرکت دیتی تھی جیسے رستم کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی ہو اور یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ وہ جاگ رہی ہے۔

رستم کا دل چاہا کہ پلٹ کر یہ ہاتھ اپنے کندھے پر سے جھٹک دے اور نادیہ کو بھی دور پٹخ دے لیکن پھر وہ اپنی جگہ بے سدھ پڑا رہا۔ کھڑکی سے باہر آسمان کا رنگ بتا رہا تھا کہ اب جلد صبح ہونے والی ہے۔ وہ صبح، جو رستم کو ایک اَن دیکھے سفر پر روانہ کرتی۔ شاید نادیہ سے آخری ملاقات تھی۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے بے حد تحمل سے کام لے رہا تھا۔ اب ان آخری گھڑیوں میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا..... اگر وہ اس طرح بدمزگی سے بچتا تھا تو یہ بھی ایک طرح سے بی بی کی خواہش کا احترام ہی تھا۔ وہ لیٹا رہا۔ سکرین کی حسین ساحرہ، فلم ایکٹریس نادیہ اس کی پشت پر اس کے بالکل قریب موجود رہی۔ اس کا ہاتھ بدستور رستم کے شانے پر تھا۔ گاہے بگاہے اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی رستم سے ٹکرا جاتا تھا۔ پھر کسی وقت لگتا تھا کہ وہ سو گئی ہے لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ وہ ہر وقت سراپا دعوت رہتی تھی۔ اپنے ہیجان خیز جسم کو رستم کی وحشتوں کے سپرد کرنے کے لئے بے تاب لیکن یہ ’’وحشی‘‘ تو کسی اور دنیا کا باسی تھا۔ اس کے دل و دماغ میں تو پیار محبت کے پیمانے کچھ اور تھے۔ یہ بالکل متضاد کیفیت تھی۔

کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے میں صبح نَو کے اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ مرغوں کی بانگیں سنائی دینے لگیں۔ حجروں کے سامنے موجود پٹھان چوکیدار نے اپنا آخری آواز بلند کیا اور سونے کے لئے چلا گیا۔ رستم اٹھ بیٹھا۔ اس نے لالٹین کی لَو اونچی کی تو ایک دم کھڑکی بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ نادیہ اس کے قریب عجیب حالت میں تھی۔ وہ ایک طرح سے رات کو رستم کے کمبل کے اندر ہی گھس آئی تھی..... اور وہ مادر زاد برہنہ تھی۔ لباس کا ایک تار نہیں تھا اس کے جسم پر۔ وہ خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی لیکن رستم جانتا تھا کہ یہ ایک اداکارہ کی اداکاری ہے۔ رستم کو اس کی پشت پر اُن آڑھی ترچھی لکیروں کے مدھم نشان نظر آئے جو عامل عظمت نے کھینچی تھیں۔ ایسی ہی چند لکیریں اس کی شفاف پنڈلیوں پر بھی تھیں۔ یہ وہی بے معنی الفاظ تھے جنہیں لکھوانے کا مقصد رستم کی جسمانی قربت حاصل کرنا تھا پھر اس نے یوں کروٹ بدلی جیسے واقعی بے خبری کی نیند سو رہی ہو۔ اب وہ سرتاپا رستم کے سامنے تھی۔ ایک لمحے کے لئے صرف ایک لمحے کے لئے رستم کی نگاہ اس کے خیرہ کن بلوری جسم پر پڑی، پھر اس نے رخ پھیر لیا۔ نادیہ کی یہی حرکتیں اسے رستم کی نظر سے گراتی تھیں۔ وہ اپنے تباہ کن جسم کو رستم کے

لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ آج رستم کی ذراسی شہ پا کر وہ کپڑوں سے باہر ہوگئی تھی۔

ایک سیکنڈ کے لئے رستم کا دل چاہا کہ ایسی زوردار ٹھوکر نادیہ کے چہرے پر مارے کہ اس کی شکل بگڑ جائے یا پھر ویسے ہی شوٹ کر دے اسے لیکن ایک بار پھر بی بی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اپنی پوری شان، دبدبے اور محبت کے ساتھ۔ رستم نے زور سے جبڑے بھینچے، اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہوگیا تھا۔ نادیہ کی طرف دیکھے بغیر اس نے کمبل نادیہ پر پھینک دیا۔ یہ کمبل اس نے جیسے نادیہ پر نہیں ''گناہ کی کھلی دعوت'' پر پھینکا تھا۔ پھر وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ فرید، حسنے اور مراد سے رخصت ہو کر جا رہا تھا۔ اس کی روانگی کا علم بس چار پانچ بندوں کے سوا کسی اور کو نہیں تھا۔ اب نادیہ بھی ان میں شامل تھی۔ فرید نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ یا حسنا اس کے ساتھ چلے جائیں گے لیکن رستم نے ایک نہیں مانی۔ تاہم ان کے بہت مجبور کرنے پر اس نے گوہرا کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ گوہرا اب بالکل صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ دونوں پوری طرح مسلح تھے۔ رستم کی چرمی جیکٹ کے نیچے کولٹ پسٹل تھا اور پچاس کے قریب راؤنڈ تھے۔ اس کے علاوہ وہ بڑے پھل کا چھرا ابھی اس کے ساتھ تھا جو وہ چند ماہ پہلے مہتم بستی سے لے کر چلا تھا۔ یہی وہ چھرا تھا جس سے رستم نے ڈیک نالے کے کنارے پولیس اہلکاروں کو ذبح کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے تقریباً 200 راؤنڈ بھی رستم کے پاس تھے۔ یہ راؤنڈ کینوس کے ایک شولڈر بیگ میں تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے سفری بیگ رستم اور گوہرا کی پشت پر موجود تھے۔ ان میں پانی، کھانے کا سامان اور نارچیں وغیرہ تھیں۔

ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ڈیرے کے بیشتر افراد سو رہے تھے۔ رستم نے فرید اور حسنے سے دیر تک معانقہ کیا۔ ایک دروازے کی اوٹ سے نادیہ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ فرید کی بیوی مہناز باورچی خانے کی طرف سے آئی۔ ''رستم بھائی! کہاں کی تیاری ہے؟'' وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔ اس کی آواز میں حیرت کا عنصر تھا۔ غالباً اس نے رستم کو فرید اور حسنے سے معانقہ وغیرہ کرتے دیکھا تھا اور چونک گئی تھی۔

''نہیں، کوئی زیادہ لمبا پروگرام نہیں۔ ایک دو دن میں لوٹ آؤں گا۔'' رستم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار جنوب کی سمت روانہ تھے۔ کافی فاصلے پر پہنچ کر

رستم نے مڑ کر دیکھا۔ فرید اور حسنا اسی جگہ ساکت و جامد کھڑے تھے اور رستم کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ رستم نے ایک بار پھر ہاتھ لہرایا۔ انہوں نے جواب دیا۔ رستم اور گوہرا ایک نشیب میں اُترے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ وڈا ڈیرہ اپنی سرکنوں، جھجروں، درختوں اور نیوں سمیت نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ بس پانی کی بلند و بالا ٹینکی نظر آتی رہی، کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہوگئی۔

رستم اور گوہرا نے تقریباً آٹھ گھنٹے گھوڑوں پر سفر کیا۔ پھر ایک جگہ گھوڑے چھوڑ دیئے۔ یہ گھوڑے ایک گشتی پارٹی ڈیرے پر واپس لے گئی۔ یہ گشتی پارٹی دلاور اور اس کے دو ساتھیوں پر مشتمل تھی۔ رات ایک کھوہ میں بسر کرنے کے بعد اگلے روز رستم اور گوہرا کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ سفر کا مشکل ترین مرحلہ اگلے روز دوپہر بارہ بجے کے بعد آیا۔ ان کی معلومات کے مطابق وہ اب ایسے علاقے میں تھے جہاں پولیس سے مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ رستم اور گوہرا کے لئے یہ علاقہ اپنی ہتھیلی کی طرح جانا پہچانا تھا۔ ہر نشیب و فراز سے آگاہی تھی انہیں لیکن اب حالات ایسے تھے کہ انہیں ہر قدم پھونک کر رکھنا تھا۔

وہ ستانے کے لئے ایک محفوظ آڑ میں بیٹھ گئے اور صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ ابھی تک انہیں کہیں بھی کوئی مشکوک نقل و حرکت نظر نہیں آئی تھی تاہم وہ جانتے تھے کہ یہاں لوگ موجود ہوں گے ابھی کچھ دیر پہلے ایک موڑ کاٹتے ہوئے انہیں بلندی پر شیشے کی چمک نظر آئی تھی۔ یہ دور افتادہ چمک ٹیلی اسکوپ کے عدسے کی بھی ہوسکتی تھی۔

رستم نے ایک پتھر سے ٹیک لگائی اور اطراف میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمارے سامنے دو رستے ہیں گوہرا۔ ایک یہ کہ ہم زیادہ دشوار رستہ استعمال کریں جہاں پلیسوں سے سامنا ہونے کا چانس کم سے کم ہو لیکن تم جانتے ہی ہو اس رستے پر ہم رات کے وقت سفر نہیں کرسکیں گے اور اگر کریں گے تو ٹارچ ضروری ہوگی اور روشنی خطرناک ہوسکتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر عام رستے سے ہی نکلیں۔''

گوہرا نے ایک اطمینان بھری انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''لالے دی جان! میں نے سوچنے کا کام تم پر چھوڑ دیا ہے۔ جس رستے پر ڈالو گے، چل پڑوں گا۔ بس جس وقت ٹھاہ ٹھاہ کرنے کا وقت آئے، مجھے بتا دینا اور پھر دیکھنا جوہر اپنے گوہرا کے۔''

رستم کی پیشانی پر مسلسل سوچ کی لکیریں تھیں۔ ''ایک بات اور بھی غور کرنے کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس طرح ہم سوچ رہے ہیں اسی طرح پلیسے بھی سوچ رہے ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! ہم اوکھے راستے (مشکل راستے) سے نکلنے کا سوچ رہے ہیں ناں، ہوسکتا ہے کہ انہیں بھی شک ہو کہ ہم ایسا کریں گے۔ جب ہم مشکل چڑھائی پر گوڈے گٹے چھلا کر اوپر پہنچیں تو وہاں ٹھاہ ٹھاہ شروع ہو جائے۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔ پچھلے سال بھی چتواڑ والی چڑھائی کی طرف ایک ایسی ہی جھڑپ ہوئی تھی۔''

''تو پھر... عام رستہ اور رات کا وقت۔ ڈھائی تین بجے کے بعد۔''

''بالکل ٹھیک۔''

اچانک رستم بات کرتے کرتے چونک گیا۔ اس کی نظر نشیب میں بکریوں کے ایک چھوٹے سے ریوڑ پر پڑی ایک مرد اور دو عورتیں بکریوں کو ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ یہ تینوں مقامی تھے۔ عورتوں کے کولہوں سے ایک ایک بچہ چمٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کے سر پر دودھ یا پانی کا برتن بھی تھا۔ وہ قریباً 100 میٹر کی دوری سے گزرے۔ یہ ریوڑ آگے نکل گیا تو ایسے ہی ایک اور چھوٹے سے ریوڑ کے آثار نظر آئے اس میں بکریوں کے علاوہ چند بھیڑیں بھی شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ایک بھوری بھینس تھی۔ دو پوٹھوہاری انہیں ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے گرد اور دھوپ سے بچنے کے لئے انہوں نے حسبِ رواج اپنے چہرے اور سر صافوں سے ڈھانپ رکھے تھے۔

رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آؤ گوہرا۔''

گوہرا نے دھیان سے رستم کا چہرہ دیکھا اور وہ بھی سمجھ گیا۔

ان دونوں نے ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے قریباً نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ ایک چھوٹا سا کلاوا کاٹ کر وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پیچھے والے ریوڑ کو ابھی گزرنا تھا۔ انہیں دو تین منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بکریوں کی ممیاہٹ اور چرواہوں کی ٹخ ٹخ سنائی دی۔ وہ دونوں گھات لگائے بیٹھے رہے۔ پہلے ریوڑ گزرا اور پھر دونوں لمبے چوڑے چرواہے دکھائی دیئے۔ ایک کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی اور دوسرے کے ہاتھ میں دس بارہ فٹ لمبی دستے والی کلہاڑی تھی جسے ''چھوی'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اونچے درختوں سے پتے وغیرہ اُتارنے کے کام آتی ہے۔

رستم اور گوہرا کے لئے دونوں افراد پر قابو پانا چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ بے چارے آواز تک نہیں نکال پائے تھے۔ ایک شخص کا سر بڑے زور سے ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ نیم بے ہوش ہوگیا تھا۔ دوسرا گوہرا کی گرفت میں تھا۔ گوہرا کا مضبوط ہاتھ اس کے

ہونٹوں پر جما ہوا تھا لیکن ریوڑ کی چند بکریوں کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ اس واقعے کے بعد بُری طرح ممیائی اور اچھل کود دی تھیں۔ رستم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آگے جانے والے چرواہوں کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ بہرحال دونوں ریوڑوں کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ یہ اندیشہ باطل ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں بکروال ایک سرمئی ٹیلے کے غار نما خلا میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے کپڑے رستم اور گوہرا کے جسم پر تھے۔ بکروالوں کو مجبوراً برہنہ کرنا پڑا تھا۔ رستم اور گوہرا نے اپنے کپڑے اُتار کر سفری تھیلوں میں ٹھونس لئے تھے۔ آگے جا کر اس لباس نے پھر کام دینا تھا۔ دونوں بکر والوں کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی گئی تھیں اور منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے گئے تھے۔ ان کی برہنگی چھپانے کے لئے رستم نے ایک ایک گرم چادر ان پر ڈال دی۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھوکے پیاسے اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں۔ گوہرا نے ایک تیز دھار چاقو دونوں افراد کو دکھایا اور اسے کھوہ کے اندر تیں چالیس گز کی دوری پر پھینک دیا اب وہ کوشش کر کے اس چاقو تک پہنچ سکتے تھے اور اپنی بندشیں کاٹ سکتے تھے۔ تاہم اس کام کے لئے انہیں کم و بیش سات آٹھ گھنٹے لگنے تھے۔

رستم نے سو سو کے چند نوٹ ان دونوں کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ''پریشان نہ ہونا تمہاری بکریاں صحیح سلامت مل جائیں گی اور تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ اس بارے میں کسی کو بتانا نہیں۔''

دونوں خوف زدہ افراد نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ رستم اور گوہرا کھوہ نما خلا سے باہر نکل آئے۔

سورج ڈوبنے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا، جب وہ بکریاں ہانکتے ہوئے خطرناک ترین جگہ سے گزرے۔ پولیس کے حوالے سے ان کے اندیشے بالکل درست تھے۔ لالہ فرید نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لمبے چوڑے پروگرام کے تحت اس علاقے کی ناکہ بندی کی جا رہی ہے۔ پہاڑی گزرگاہ کی دونوں جانب پولیس کی نفری نظر آئی۔ ایک دو چھولداریاں بھی دکھائی دیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر بڑے سائز کی ''ٹیلی سکوپ'' سٹینڈ پر فٹ تھی اور اس کے عقب میں ایک سفید پوش پولیس اہلکار موجود تھا۔ یقیناً وہ اس ریوڑ کو دیکھ رہا تھا جو پہاڑی گزرگاہ کے درمیان ہلکی پھلکی دھول اُڑاتا آگے بڑھ رہا تھا۔

''لالے دی جان! ذرا دائیں طرف دیکھو۔'' گوہرے نے گردن گھمائے بغیر کہا۔

ایک بھر بھرے پتھر کی اوٹ میں جرمن ساختہ MG42 گن، گولیوں کی بیلٹ سمیت چھوٹے سٹینڈ پر لگی ہوئی تھی۔ اسے بارش وغیرہ سے بچانے کے لئے اس پر ایک

بڑی شیٹ ڈال دی گئی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی یہاں بھاری اسلحہ موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چرواہوں کے انداز میں ہی بکریاں ہانکتے اور منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکالتے ''پل صراط'' پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کے سر اور چہرے صافوں میں پوشیدہ تھے۔ کسی بھی وقت انہیں روک کر ان کی شناخت کی جا سکتی تھی۔ دونوں اس صورتِ حال کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ ایسے موقعوں پر رستم کی کیفیت عجیب ہو جاتی تھی، ایک درندگی سی اس کے رگ و پے میں اُتر جاتی تھی اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکن جنگ کے نقارے کی طرح تھی۔

انہیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ تین چار مسلح اہلکار ستانے والے انداز میں ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ رستم اور گوہرا ان سے فقط تیس چالیس میٹر کی دوری سے گزرے۔ ایک پولیس اہلکار نے دور کھڑے اپنے کسی بے تکلف دوست کو مخاطب کرتے ہوئے ہانک لگائی۔ ''اوئے اسحاقے! دیکھ تجھ سے تو یہ بکرا ہی اچھا ہے۔ چار پانچ بکریوں کے ساتھ اس جنگل میں اکیلا عیش کر رہا ہے۔ ایک تُو ہے کہ جنگل میں چھڑا اور شہر میں بھی چھڑا۔''

''اتنا ہی درد ہے تو تُو دیکھ دے نہ اپنی فیملی میں سے کوئی۔ امیر علی کہتا تھا، تیری ایک سالی بڑی سوہنی ہے۔ مکھن ملائی کی طرح۔''

''اوئے حرامی! کھوتے دے پتر! سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ اب تجھے آدھی گھر والی چاہیے کہ پوری۔''

''جس کے ساتھ تُو نے سہاگ رات منائی تھی وہ بھی تو تیرے تائے کے وڈے پتر کی سالی تھی ناں۔'' اسحاقے نے معنی خیز انداز میں چوٹ کی۔

پہلے شخص نے تلملا کر دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ پھر اس کی بہن کا رشتہ پنجابی فلموں کے ایک مشہور ولن سے جوڑ دیا۔

اس گالم گلوچ کے درمیان ہی رستم اور گوہرا بکریوں اور بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے درہ نما جگہ سے آگے نکل آئے۔ اگلا ریوڑ خاصی آگے نکل چکا تھا۔ اب اس کی اُڑائی ہوئی دھول بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ''لالے، کیا خیال ہے بچ بچا ہو گیا ہے؟'' رستم نے گوہرے سے پوچھا۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے لالے دی جان، پر ابھی دو تین میل آگے نکلیں گے تو پھر تسلی ہو گی۔'' گوہرے نے اپنی ''چھوی'' سے ایک اڑیل بھیڑ کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''راستہ تھوڑا سا بدل نہ لیں؟'' رستم نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' گوہرا نے تائید کی۔ ''اگلے ایجڑ (ریوڑ) سے میل نہیں ہو گا۔''

انہوں نے کچھ آگے جا کر رخ تھوڑا سا تبدیل کر لیا۔ ان کے لباس کے نیچے وزنی ہتھیار موجود تھے۔ اپنے سفری تھیلے انہوں نے چارے کی ایک بڑی گٹھڑی میں رکھ دیئے تھے۔ رستم کی پسندیدہ سیون ایم ایم بھی اسی گٹھڑی میں تھی۔ اس گٹھڑی کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہ بہ آسانی بھینس کی پشت پہ لد گئی تھی۔

وہ چلتے رہے شام گہری ہونے سے پہلے وہ پہاڑی گزرگاہ سے تین چار میل آگے آ چکے تھے۔ اب وہ واقعی محسوس کر رہے تھے کہ خطرے سے باہر ہیں۔ ٹیلوں میں ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ مغربی افق ابھی تک سرخ تھا، جیسے دور کہیں ٹیلوں کے پیچھے آگ بھڑک رہی ہو۔ بائیں طرف جنتر، بیری، گوندلی اور جنگلی انجیر کے درختوں کے پیچھے لامتناہی ٹیلوں سے آگے جنوب میں...... جہاں بی بی رہتی تھی۔ کسی ہنستی بستی آبادی کے روشن روشن گھر میں ان کی آواز گونجتی تھی۔ رستم نے تصور کی نگاہ سے بی بی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی؟ عین اس وقت، ان لمحوں میں وہ کیا سوچ رہی ہو گی؟

دن کے وقت سرخی مائل رنگ کے یہ کم بلندی والے ٹیلے بے آباد ہی نظر آتے تھے لیکن رات ہوتے ہی کہیں کہیں روشن نقطے نمودار ہو جاتے تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان ویرانیوں میں بھی جگہ جگہ زندگی موجود ہے۔ کسی کسی جگہ کوئی کھیت یا کنواں بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ خچر یا گھوڑے گدھے پر سواری کرتے ہوئے افراد دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرح سے یہ نیم آباد علاقے کی شروعات تھی۔ وہ ایک بڑے جھونپڑے کے قریب سے گزرے۔ یہ غالباً درختوں کی کٹائی کرنے والے کسی ٹھیکیدار کا جھونپڑا تھا۔ درجنوں مزدور دن بھر کی تھکاوٹ اتارنے کے لئے چائے یا قہوہ پی رہے تھے اور ڈھولک پر گیت گا رہے تھے۔ ان کے سامنے الاؤ بھڑک رہا تھا۔ باجرے کی گرم روٹی کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ چار پانچ مزدور مستی میں آ کر الاؤ کے گرد لڈی رقص کر رہے تھے۔ رقص کے دوران میں وہ دو دفعہ تالی بجاتے تھے اور تالی کی آواز ڈھول کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر عجیب سماں پیدا کرتی تھی۔ ان کی آوازیں قرب و جوار میں گونج رہی تھیں۔

بھئی بھنا چھولے
اج مینڈے ماہی آ وَنا کوٹھے تے کاں بولے
کوٹھے تے آ کاواں
سدیئواری نوں جنڈ ڈھولے دے تاں لاواں

ایک شخص نے رستم اور گوہرا کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہا۔ ''ہاں بھئی سجنو! کوئی دودھ شودھ بھی ہے تمہارے پاس؟''

گوہرا نے کہا۔ ''نہیں لالے! رستے میں دے دیا ہے ایک اللہ والے کو۔''

''ایک اللہ والا یہاں ہمارے پاس بھی بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑا بہت بھی نہیں ہے دودھ؟''

''نہیں لالے ہوتا تو آپ سے دودھ اچھا تھا۔''

دائیں طرف اونچے نیچے راستے سے ایک چھکڑا گزر رہا تھا۔ اس پر جلانے کی خشک لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ تھوڑا آگے گئے تو کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک تو پولیس کی جیپ لگتی تھی، اس کے پیچھے ایک سفید کار تھی۔ رستم اور گوہرا ذرا چونک گئے۔ دونوں گاڑیاں دھیمی رفتار سے ان کے پاس سے گزر گئیں۔ تاہم آگے جا کر دونوں رک گئیں۔ پھر دونوں گاڑیاں ریورس ہوئیں اور رستم اور گوہرا کے سامنے آ کر ٹھہر گئیں۔ جیپ کے پچھلے دروازے سے ایک باوردی پولیس والے نے سر باہر نکالا۔ پوٹھوہاری لہجے میں بولا۔ ''ہاں بھئی کون ہو؟ اس وقت کدھر کو جل رہے ہو؟''

''اپنے گراں (گاؤں) کی طرف جا رہے ہیں جی۔ رستے میں ایک بھیڑ گم ہو گئی تھی، اس لئے دیر ہو گئی۔''

جیپ سے دو افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اُترے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی ٹارچیں تھیں۔ ان میں سے ایک سیدھا چارے والی بڑی گٹھڑی کی طرف گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا، دوسرے نے پلک جھپکتے میں رستم اور گوہرا کے صافے چہروں سے اُتار دیئے۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا...... رستم اور گوہرا دونوں مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ وہ آخر تک ساکت جامد کھڑے رہے۔ وہ آخری چانس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور آخری چانس یہ تھا کہ پولیس والے ان دونوں کو شناخت کرنے میں ناکام رہتے۔ حالانکہ اس کی امید بہت کم تھی۔ خاص طور سے رستم کی شناخت اس کے لمبے بالوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کی وجہ سے بہت آسان تھی۔

''کون ہو تم؟'' ٹارچ والے نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی دو اور رائفل بردار چھلانگیں لگا کر جیپ سے اُترے لیکن اس سے کہیں تیزی کے ساتھ ایک اور چیز رستم کی طرف آئی۔ رستم جیسا شخص بھی ایسی تیزی اور پھرتی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ سیاہ جیپ کے اگلے بائیں دروازے سے کوئی اچھل کر باہر نکلا اور ایک ہی ساعت میں رستم نے اپنی گردن پر سرد لوہے کا بے رحم لمس محسوس کیا۔ یہ پسٹل تھا۔ یہ کسی کا

پسٹل تھا؟ رستم کا اپنی قمیص کے نیچے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی رگوں میں خون کی گردش انتہا کو چھو گئی۔ اس کے سامنے ایک جانا پہچانا سا چہرہ تھا۔ اس نے باوردی افسر کے کندھے دیکھے۔ پھولوں کی تعداد اس امر کی تصدیق کر رہی تھی کہ اس کے سامنے اس راستے پر اس تاریک ویرانے میں مشہور و معروف ڈی ایس پی ریاض کھڑا ہے۔

ڈپٹی ریاض، ہٹلر جس کی دہشت کے سبب زدار کے دوست نے اونچی عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی...... اور ایسے نہ جانے کتنے واقعات اس شخص سے وابستہ تھے...... یہ ڈپٹی ریاض سے رستم کا پہلا سامنا تھا اور یہ بڑے غلط وقت میں ہوا تھا...... ہاں یہ وقت ڈپٹی ریاض کے لئے بڑا غلط تھا۔ رستم ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رکھتا تھا لیکن آج تو اس کی جان ہی ہتھیلی پر تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے زندگی اور موت اس کے لئے ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں اور آج ڈپٹی ریاض اس کے سامنے تھا۔

جیسے شعلہ لپکتا ہے...... جیسے بجلی چمکتی ہے...... جیسے بارود دھماکے سے پھٹ پڑتا ہے اسی طرح رستم سیال کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کی کلائی کی طوفانی ضرب ڈپٹی ریاض کے پسٹل والے ہاتھ پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی رستم کی ایسی زوردار ٹانگ ڈپٹی ریاض کے پیٹ میں لگی کہ وہ اُڑ کر اپنی جیپ کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ اس کی کیپ اُتر کر دور جا گری۔ ڈپٹی کے ماتحت سکتہ زدہ تھے۔ شاید ان کے سان گمان میں بھی ایسا منظر نہیں تھا۔ پھر جیسے سامنے والا پوٹھوہاری رائفل بردار ہوش میں آیا۔ اس نے رستم کی طرف رائفل سیدھی کی لیکن تب تک رستم کا کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور پوٹھوہاری رائفل بردار سینے پر گولی کھا کر پیچھے الٹ گیا۔

دوسری طرف گوہرا بھی رستم کو دیکھ کر شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس نے چھوی کی شدید ضرب سے ایک مسلح ہیڈ کانسٹیبل کو دور پھینک دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا پسٹل قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔ دوسری طرف ڈپٹی ریاض ایک بار پھر رستم پر حملہ آور ہوا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اس کے منہ سے ایک گندی گالی نکلی اور اس نے رستم کے جبڑے پر ایک فولادی مکہ رسید کیا۔ ''تیری میں......'' اس کا یہ فقرہ غلیظ ترین تھا اور لہجہ خطرناک ترین۔

اس مکے کے لمس نے رستم کو مدمقابل کی زبردست جسمانی توانائی کا احساس تو دلایا مگر رستم کو وار کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ رستم کی ٹانگ ایک بار پھر گھوم کر ڈپٹی ریاض کی پسلیوں پر لگی تھی۔ وہ مکہ مارنے کا عمل پورا کر کے فالو تھرو میں تھا۔ ضرب نے اسے نشیب میں لڑھکا دیا۔

''بھاگو گوہرے!'' رستم نے کہا۔

گوہرا اور وہ ایک ساتھ بھاگے..... اور ایک ساتھ ہی نیچے جھکے۔ یہ جھکنا ان دونوں کی زندگیوں کا ضامن بن گیا۔ سفید کار سے نکلنے والے ایک سادہ پوش اہلکار نے اپنی خودکار رائفل سے برسٹ چلایا۔ شعلے ان دونوں کے سروں کے اوپر چمکے۔ ریوڑ کی کئی بکریاں زمین پر گریں۔ دوسرا برسٹ چلنے سے پہلے وہ دونوں نشیب میں چھلانگ لگا چکے تھے۔ وہ ڈھلوان زمین پر پندرہ بیس فٹ تک پشت کے بل پھسلے اور جنتر کی گھنی جھاڑیوں میں گرے۔ ان کے آگے ٹیلوں کی بھول بھلیاں تھیں اور دشوار گھاٹیاں تھیں...... اور یہ پوٹھوہار تھا۔ تاریکی میں لپٹا ہوا، اسرار میں چھپا ہوا۔ وہ ایک ایسا پشت پناہ تھا جس کا سینہ دیوار اور بازو فصیل تھے۔ وہ زمانوں سے پناہ دینے والوں کو پناہ دیتا رہا تھا اور پناہ کا حق ادا کرتا رہا تھا اور یہ پوٹھوہار اپنی اس روایت پر اتنا مستحکم تھا کہ اکثر اچھے اور بُرے اور دوست دشمن کی تمیز بھی بھول جاتا تھا۔ اس کا کام بھاگنے والوں کو برستے تیروں اور سنسناتی گولیوں سے بچانا تھا اور حتی الامکان ان کی زندگیوں کی حفاظت کرنا تھا۔ انگریزی دور میں ریاستی جبر و ستم اور ناانصافی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے ''سرپھرے'' سون کے اسی ویرانے میں پناہ گزین ہوتے رہتے تھے۔ امیر... علی اکبر اور جہان خان کو کون بھول سکتا ہے جن کے کریڈٹ پر درجنوں نہیں سینکڑوں وارداتیں تھیں اور جو انہی ٹیلوں میں فرنگیوں کو تگنی کا ناچ نچاتے رہے تھے اور پھر چراغ بالی جو مجبوروں اور بے کسوں کے لئے امید کی علامت تھا اور مصری خان اعوان جس نے کسی معمولی شخص سے نہیں اکبر اعظم سے ٹکر لی تھی اور طورہ خان جو انگریز کے لئے دہشت بن کر زندہ رہا اور تختہ دار پر جھولنے تک ان ہی ویرانوں کی پناہ حاصل کرتا رہا..... اور پھر ملک محمد خان جو اسی سرزمین سے اٹھا، انہی نشیب و فراز میں بھٹکا اور بے شمار لوگوں کے لئے ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اس ویرانے کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ یہاں ہمیشہ کچھ لوگ بھاگتے رہے تھے اور کچھ ان کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ یہاں زندگی بچانے اور زندگی لینے کا کھیل صدیوں سے جاری تھا اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس تاریک رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے جنتر، بیری، انجیر اور جھلکیرڈی کے درختوں کے درمیان رستم اور گوہرا بھاگ رہے تھے۔

ان کے عقب میں پنجاب پولیس کا ایک نہایت خوفناک افسر ڈپٹی ریاض تھا۔

رستم اور گوہرا کو کچھ گرج دار للکارے کافی دور سے سنائی دے رہے تھے۔ غالباً امکان یہی تھا کہ یہ ڈپٹی ریاض کی گھن گرج ہے۔ وہ اپنی نفری کو نیم دائرے کی شکل میں پھیلا کر رستم

کے پیچھے آرہا تھا۔ ٹارچوں کی روشنیاں تیز رفتار پولیس والوں کی متحرک پوزیشن کو ظاہر کر رہی تھیں۔ گاہے بگاہے سیون ایم ایم اور سیمی آٹو میٹک رائفلوں کے فائر بھی ہوتے تھے اور گولیاں سنسناتی ہوئی اور شاخوں کو توڑتی ہوئی ان کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔

رستم بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ فائرنگ کی یہ مسلسل آوازیں آس پاس موجود پولیس کی نفری کو ان ٹیلوں کی طرف کھینچ لائیں گی اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو ایک اور امکان موجود تھا۔ ڈپٹی ریاض کی جیپ میں وائرلیس سیٹ ہو سکتا تھا۔ اس سیٹ کو استعمال کر کے منٹوں میں اردگرد موجود اہلکاروں کو یہاں اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ رستم جانتا تھا کہ اس معاملے میں ڈپٹی ریاض جیسا شخص کسی قسم کی سُستی نہیں کرے گا۔ جو شخص اس کی زد میں آیا تھا وہ کوئی اور نہیں رستم تھا۔ کئی پولیس اہلکاروں کا قاتل، درجنوں ڈکیتیوں اور خونریزیوں کا ملزم، وہ اس وقت پنجاب پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب افراد میں سے تھا۔

رستم نے بھاگتے بھاگتے گوہرا سے پوچھا۔ ''پسٹل کے کتنے راؤنڈ ہوں گے تمہارے پاس؟''

''پندرہ بیس سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی ایمونیشن تو بھینس پر رکھا تھا...... اور تمہارے پاس؟''

''میرے پاس تو ساٹھ کے قریب ہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' گوہرا نے ہانپتی آواز میں کہا۔ ''یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہو گئی ہے۔ سیدھا ڈپٹی ریاض سے آٹکرائے ہیں۔''

''دیکھ لیتے ہیں اس ڈپٹی کو بھی۔'' رستم کے لہجے میں آگ تھی اور زہر تھا۔ اس آگ کو محسوس کر کے گوہرا جیسا بندہ بھی کانپ گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر رستم رک گیا۔ وہ نیم تاریکی میں گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو رستم بھائی؟'' گوہرا نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہم غلط رخ پر جا رہے ہیں۔ آگے نالے والی کھائی ہے۔ ہم پکڑے جائیں گے۔''

''تو پھر؟''

''دائیں طرف چلو۔'' رستم نے کہا۔

وہ تاریکی میں چھپی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں پھلانگتے، دائیں رخ پر چل دیئے۔ رستم کے ہاتھ میں 38 بور کا کولٹ پسٹل تھا۔ جب کہ گوہرا کے ہاتھ میں چھوٹے بیرل والی ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ان کی ٹارچوں کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ تین

طرف سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جلد ہی وہ اتنے قریب آ گئے کہ ان کی چلائی ہوئی گولیاں رستم اور گوہرا کے لئے شدید خطرہ بن گئیں۔ اب ان دونوں کے لئے پوزیشن لینا ضروری ہوگیا تھا۔ پوٹھوہار میں وادی سون کے نواح کے ٹیلے عجیب وغریب ساخت رکھتے تھے۔ ان ٹیلوں کے درمیان چلتے چلتے بندہ خود کو اچانک ایک کشادہ میدان، ایک تنگ گھاٹی یا گہری کھائی کے کنارے پا سکتا ہے۔ کہیں کہیں ٹیلوں کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مشرق کے رخ پر چلنے والا تھوڑی ہی دیر میں خود کو جنوب یا شمال کی طرف جاتے ہوئے پاتا ہے اور جسے وہ جنوب یا شمال سمجھ رہا ہوتا ہے، بعد ازاں وہ مغرب نکلتا ہے۔ رستم اور گوہرا بھی کھائی سے بچتے بچتے ایک مسدود گزرگاہ پر آ گئے۔

دائیں طرف سے نمودار ہونے والے پولیس اہلکار رستم اور گوہرا کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ رستم اور گوہرا نے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لی اور جوابی فائر کرنے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے جوابی فائر کئے تھے۔ کولٹ پسٹل اور ٹریل ٹو رائفل کے شعلے فضا میں چمکے تو پولیس اہلکاروں کی پیش قدمی رک گئی۔ رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آوازیں ٹیلوں کے درمیان دور دور تک گونجنے لگیں۔

چند گولیاں رستم اور گوہرا کے بہت نزدیک بھربھرے پتھروں سے ٹکرائیں اور بہت سی پتھریلی مٹی ان دونوں کے سروں پر گری۔ گوہرا نے ''مٹی گرانے والوں'' کو کئی کلاسیکل گالیاں دیں اور دانت پیس کر یکے بعد دیگرے کوئی ایک درجن فائر کئے۔

''سنبھل کے گوہرے، راشن پانی کے حساب سے فیر نکالو۔'' رستم نے تنبیہہ کی۔

وہ ایک ہموار جگہ پر تھے۔ ان کے عقب میں اونچے مخروطی ٹیلے تھے۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ کر ان ٹیلوں پر چڑھتے تو لازمی گولیوں کا نشانہ بنتے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے۔

گاہے بگاہے دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی پھر دائیں طرف کھباڑی اور بیری کے درختوں کے پیچھے سے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔ کوئی شخص میگافون پر بولا۔ ''رستم! تُو بھاگ نہیں سکتا یہاں سے۔ تیرے لئے اچھا ہے کہ ہاتھ کھڑے کر کے سامنے آ جا۔''

''کون ہو تم؟'' رستم نے زہرآلود لہجے میں پکار کر پوچھا۔

''میں ڈپٹی ریاض ہوں اور وارننگ دے رہا ہوں تجھے۔ جان بچانی ہے تو ہتھیار پھینک دے۔''

رستم خاموش رہا۔ فضا میں بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ فائرنگ کی وجہ سے ہونے والے زبردست شور کے سبب درختوں سے اُڑ جانے والے پرندے اوپر بلندی پر بول رہے تھے۔

رات کے وقت انہیں ان کے گھونسلوں میں بے آرام کر دیا گیا تھا۔ شاید اسی لئے ان کی آوازوں میں احتجاج کی جھلک تھی۔

ڈپٹی ریاض پھر پھنکارا۔ ''رستمے! ان پتھروں میں کتے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ تُو قانون کا سامنا کر لے۔ تُو اور تیرا ساتھی ہاتھ کھڑے کر کے سامنے آ جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ ہم گولی نہیں چلائیں گے۔''

''کتے کی موت کسے آئے گی، اس کا فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔ میں بھی تجھے وارننگ دیتا ہوں۔ آگے آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ایسی جگہ گولیاں ماروں گا کہ تیری لاش بھی منہ چھپائے گی۔'' رستم جوابی طور پر پھنکارا۔ اس کی آواز میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''میں نے صحیح سنا تھا تیرے بارے میں۔ تیری کھوپڑی میں خنزیر کا دماغ فٹ ہے۔'' ریاض نے میگافون کے بغیر اپنی آواز رستم کے کانوں تک پہنچائی۔

''اور میں نے بھی صحیح سنا تھا۔ تیری ماں کو تیرے پیو کے نام کا پتا نہیں۔'' رستم نے بے باکی سے کہا۔

ایک ساتھ کئی فائر ہوئے اور بہت سی مٹی اُڑ کر دوبارہ رستم اور گوہرا کے کپڑوں پر گری۔ گوہرا نے ایک بار پھر زیرلب گالیاں دیں۔ جوابی طور پر رستم اور گوہرا نے بھی کئی فائر کئے۔ ٹریل ٹو کی آواز خوفناک تھی اور یہ آواز پولیس والوں کو ان سے دور رکھے ہوئے تھی۔ اگلے پانچ منٹ میں دونوں طرف سے گاہے بگاہے فائر ہوتے رہے۔ رستم نے کھردری زمین پر اوندھے لیٹے گوہرا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''مجھے لگتا ہے یہ حرامی ریاض ٹائم پاس کر رہا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اور نفری موقع پر پہنچ جائے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' گوہرا کی آواز میں ہلکی سی تشویش تھی۔

''اگر ہمیں یہاں سے نکلنا ہے تو پھر اس کے لئے یہی وقت اچھا ہے۔ بعد میں کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

''تو ٹھیک ہے لالے دی جان۔ فائر کرتے ہوئے چڑھائی چڑھ جاتے ہیں۔''

''نہیں، یہ زیادہ خطرناک ہے۔ ہمیں سامنے سے ہی نکلنا ہوگا۔'' رستم نے کہا۔ گوہرا سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ رستم کا ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے کچھ ٹٹول بھی رہا تھا۔ اس موقع پر یہ بڑی قیمتی شے تھی۔ یہ ایک ہینڈ گرینیڈ تھا۔ ایسے چند ہینڈ گرینیڈ کافی عرصے سے ڈیرے پر موجود تھے۔ یہ بہت پرانے تھے، دوسری جنگِ عظیم کے دور کے تھے شاید، لیکن قابلِ استعمال

حالت میں تھے۔ ان میں سے چند کو ٹیلوں میں چلا کر دیکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر ناصر نے بتایا تھا کہ ان کو اسٹک بم بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی ساخت آئس کریم کون سے مشابہ تھی۔ اسٹک کی طرف سے پکڑ کر انہیں خاصے فاصلے تک پھینکا جا سکتا تھا۔ ان کا ٹی این ٹی بے حد طاقت ور تھا۔ سابقہ سردار کو یہ بم اور کچھ دیگر اسلحہ فاضلکا کے انڈین سمگلر سے ملا تھا۔

رستم نے ڈیرے سے چلتے ہوئے ایک ہینڈ گرینیڈ احتیاطاً اپنے لباس میں رکھ لیا تھا۔ تب اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت اتنی جلدی آ جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ پولیس کی زد سے نکلنے کے بعد وہ یہ ہینڈ گرینیڈ اور اپنی سیون ایم ایم رائفل کہیں پتھروں میں چھپا دے گا اور آگے کے سفر میں صرف کولٹ پسٹل اپنے پاس رکھے گا لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ رستم کی پسندیدہ سیون ایم ایم چارے کے گٹھے سمیت پولیس کے قبضے میں جا چکی تھی اور ہینڈ گرینیڈ کی پن کھینچنے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ رستم نے گوہرا کو دکھانے کے لیے گرینیڈ اس کی طرف بڑھایا۔ گوہرا نے ایک پُرجوش آواز نکالی۔ اس نے گرینیڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور رستم کو واپس کر دیا۔ رستم کو گرینیڈ کے کھردرے لوہے پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ خون تھا۔

"تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔" رستم نے گوہرا سے پوچھا۔

"کچھ زیادہ نہیں لالے۔ انگوٹھے کی طرف گولی لگی ہے۔" گوہرا نے یوں کہا جیسے کانٹا چبھنے کی بات کر رہا ہو۔

رستم نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ رائفل کی گولی آر پار ہو گئی تھی، نہ جانے کس وقت گوہرے نے زخم پر رومال بھی باندھ لیا تھا۔ وہ ایک بے جگر شخص تھا۔

رستم اور گوہرا نے اپنی طرف سے فائرنگ بند کی تو پولیس اہلکار دھیرے دھیرے ان کی طرف کھسکنے لگے۔ گاہے بگاہے بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھرتی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس والے اپنی پوزیشن تبدیل کر رہے ہیں۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ رستم اور گوہرا پسپا ہو کر ٹیلوں پر چڑھیں گے اور وہ انہیں آسانی سے نشانہ بنائیں گے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ رستم اور گوہرا راہِ فرار تو اختیار کریں گے لیکن مختلف انداز سے۔

رستم نے بڑے صبر اور ہمت سے انتظار کیا۔ اس نے پولیس کے رائفل برداروں کو نزدیک آنے دیا۔ گرینیڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنے پسٹل کے ساتھ وہ نیا میگزین اٹیچ کر چکا تھا اور دو میگزین بھر کر اس نے کرتے کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ دوسری طرف گوہرا بھی اپنی ٹرپل ٹو کے ساتھ پوری طرح تیار تھا۔ وہ دونوں یکسر دم سادھے بیٹھے رہے۔ ان کے یوں

بیٹھنے سے ریاض ہٹلر یقیناً یہ اندیشہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کسی طرف کھسک نہ جائیں۔ رستم کی عقابی نظریں دو ٹیلوں کے درمیان اس تنگ راستے پر تھیں جو انہیں اس مسدود گزرگاہ سے نکلنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا اور پھر وہ موقع آ گیا۔ رستم نے گوہرا کے کان میں سرگوشی کی۔ "میں یہ دستی بم پھینکوں گا۔ اگر یہ پھٹا تو ٹھیک ہے، نہ پھٹا تو بھی ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے بھاگیں گے۔"

"فکر ہی نہ کرو لالے دی جان۔ بم نہ بھی پھٹے گا تو میری یہ رائفل بم بن جائے گی۔" اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ رائفل کو تھپکی دی۔

"تیار ہو؟"

"سولہ آنے تیار۔" گوہرا نے کہا۔

میگافون پر پھر آواز گونجی۔ "رستمے! لگتا ہے تیری موت......"

ڈپٹی ریاض کے فقرے کو رستم اور گوہرے کی ہم آہنگ للکار نے کاٹ دیا۔ رستم نے بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر اسے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ بم کا لوہا پتھروں سے ٹکرایا۔ ٹن ٹن کی آواز دو تین مرتبہ پیدا ہوئی...... پھر ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کے ساتھ پیدا ہونے والی چمک نے ایک ساعت کے لئے قرب و جوار کو روشن کر دیا۔ یہ روشنی ختم ہوتے ہی کئی کراہیں اور دردناک چیخیں گونجیں۔ رستم اور گوہرا اپنی جگہوں سے اٹھے اور برق کی رفتار سے دھماکے والی جگہ کی طرف بڑھے۔ کم از کم چار پولیس اہلکار زمین پر گرے ہوئے تھے۔ یہاں دھواں تھا اور بارود کی نہایت تیز بُو تھی۔

ایک سایہ رستم کے سامنے آیا۔ رستم نے بھاگتے بھاگتے پسٹل والا ہاتھ پورے زور سے مدمقابل کے منہ پر مارا، وہ ڈکراتا ہوا ایک نشیب میں اوجھل ہو گیا۔ چند قدم آگے ایک اور شخص نے رستم اور گوہرے کی طرف رائفل سیدھی کرنا چاہی اس مرتبہ گوہرے کی ٹرپل ٹو نے تین شعلے اگلے، وہ دونوں پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ایک نشیب میں اُترتے چلے گئے۔ انہیں اپنے عقب میں کافی فاصلے پر ڈپٹی ریاض کی شعلہ بار آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے تاہم اس کی آواز میں موجود شدید پریشانی اور ہزیمت رستم کے لئے بہت پُرلطف تھی۔

ہاں یہ پھوٹوہار تھا اور یہ وادی سون تھی اور تاریخ خود کو دہرا چکی تھی اور یہ تاریخ اب تک خود کو نہ جانے کتنی بار دہرا چکی تھی۔ ایسی ہی تاروں بھری راتوں میں، ایسے ہی تاریکی پوش ٹیلوں میں قانون کے اور معاشرے کے بے شمار باغی یہاں بھاگتے رہے تھے اور پیچھا کرنے

والے ان کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ پولیس اتنی آسانی سے رستم اور گوہرا کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی، تاہم وقتی طور پر وہ دونوں پولیس کو اپنے عقب سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وہ دونوں کبھی بھاگتے اور کبھی تیز چلتے ہوئے تقریباً دو میل آگے نکل آئے۔ اپنے پیچھے کافی فاصلے پر انہیں ٹارچوں کے روشن نقطے دکھائی دے رہے تھے۔ گاہے بگاہے فائر کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز ان دونوں کے لئے بڑی فرحت بخش تھی۔ یہ فائرنگ اس بات کا ثبوت تھی کہ پولیس والے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ وہ رستم اور گوہرا کے حقیقی رخ سے بے خبر ہیں۔ ''رستم بھائی اُدھر دیکھو۔'' گوہرا نے اپنے زخمی ہاتھ کی انگلی سے ایک وسیع نشیب کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں چند مدھم روشنیاں نظر آئیں۔ یہ غالباً دس پندرہ گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایسی چھوٹی بستیاں جنہیں مقامی زبان میں ڈھوک کہا جاتا ہے، اس علاقے میں کہیں کہیں نظر آ جاتی تھیں۔ رستم اور گوہرا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنا رخ ان ٹمٹماتی روشنیوں کی طرف کر لیا۔ گوہرا کے ہاتھ سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا اور ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھیک سے مرہم پٹی ہو سکے۔ رستم کے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں کو نفسیاتی چکمہ دینا چاہتا تھا۔ لق و دق ٹیلوں اور بھول بھلیوں میں پولیس سے بھاگنے والے کسی چھوٹی بستی کا رخ کم ہی کرتے ہیں۔

اونچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں اس بستی تک پہنچ گئے۔ یہاں نیچی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ یہ بستی یعنی ڈھوک ان کے اندازے سے بڑی تھی۔ کم و بیش پچاس مکان تو ہوں گے یہاں۔ یہاں ایک کنواں تھا اور اس کے اردگرد بہت سے درخت نظر آ رہے تھے۔ کہیں سے بکریوں کے ممیانے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ایک ڈھلوان پر چند کھیتوں کے آثار تھے۔ یوں لگا جیسے بستی کے کسی گھر میں شادی یا مہندی وغیرہ کی رسم ہے۔ ڈھولک بجنے کی آواز آ رہی تھی اور ایک گلی میں آرائشی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ رستم اور گوہرا بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوئے۔ اچانک ایک شخص تیزی سے ان کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور ایک بھاری چادر نے اس کا سر اور چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رستم کو اس کے دوسرے ہاتھ میں رائفل نظر آئی۔

رستم اور گوہرا کے عین سامنے پہنچ کر نو وارد نے لالٹین سر سے اونچی کی اور غور سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تساں کون او بھئی؟''

نو وارد کا لہجہ سخت تھا۔ رستم کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور اس کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ یقیناً گوہرا کی کیفیت بھی یہی ہوئی ہو گی۔ اس شخص کا دو تہائی چہرہ جلا ہوا تھا۔ ماضی کے کسی آتشیں حادثے کے سبب اس کی ناک چرمر ہو گئی تھی۔ ایک بھوں غائب تھی اور پیشانی کی کھال بڑے کریہہ انداز میں سکڑی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی کی وجہ سے یہ جلا ہوا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آتا تھا۔

''اوئے میں پوچھتا ہوں کون ہو تساں؟'' چوکیدار نما شخص نے اس مرتبہ زیادہ کرخت آواز میں اپنا سوال دہرایا۔

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا گلی کے موڑ پر تین چار گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ یوں محسوس ہوا گھڑ سوار آ رہے ہیں۔ رستم اور گوہرا اس موقع پر کسی پھڈے میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ رستم نے ایک نہایت زوردار جھانپڑ نو وارد کے چہرے پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر ایک پختہ دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔ اس کی رائفل بھی ایک طرف لڑھک گئی تھی اور رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا تھا۔ اس سے پہلے کہ نو وارد سنبھل کر شور مچاتا یا گھڑ سوار گلی کے موڑ پر نمودار ہوتے، رستم اور گوہرا تیزی سے ایک دوسری گلی میں مڑ گئے۔ انہیں اپنے عقب میں نو وارد کا واویلا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور آوازیں بھی ابھریں۔ یقیناً یہ گھڑ سواروں کی آوازیں تھیں۔

رستم اور گوہرا نے تیزی سے دو تین گلیاں پار کیں۔ انہیں اپنے عقب میں چند للکارے سنائی دیئے۔ رستم نے ایک دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ دونوں جلدی سے اندر چلے گئے۔ یہ ایک کشادہ صحن والا پہاڑی گھر تھا۔ اسے پتھریلی مٹی کے گارے سے پوتا گیا تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے گائے بندھی تھی۔ اندر دو کمروں میں لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک قدرے فربہ جسم کی عورت چمکیلے کپڑے پہنے اندرونی کمرے سے نکلی۔ رستم اور گوہرا برآمدے کے ایک تاریک گوشے میں چلے گئے۔ عورت نے گائے کے سامنے کھانے کی کوئی شے پھینکی اور جس تیزی سے آئی تھی اسی عجلت سے واپس چلی گئی۔ اندر کسی بچے کے رونے کی صدا ابھری۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

گلی میں بھی سکون تھا۔ شاید مسخ چہرے والا چوکیدار اور گھڑ سوار کسی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ گوہرا نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اب کیا کرنا ہے لالے دی جان؟''

''کہیں چھپنے کی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔''

''ہاں، آج کی رات تو چھپ کر ہی گزار لیں تو اچھا ہے۔ پلسیے ذرا ٹھنڈے پڑ جائیں

گے تو نکلنا آسان ہوگا۔"

"تو پھر جیسے تم کہو لالے دی جان۔ میں تو تیار ہوں۔"

رستم نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود بھی الجھن میں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ لکڑی کے تختوں میں قریباً آدھ انچ کی درز موجود تھی۔ اندر کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ایک بنی ٹھنی جوان لڑکی شیشے کے سامنے کھڑی جھمکے پہن رہی تھی۔ اس کے اونچے لمبے بھرپور جسم پر مورا کین کا کڑھائی دار کرتہ تھا اور گلابی رنگ کی چمکیلی تہہ بند (مجھلی) تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کے ڈورے تھے۔ دیوار پر لگے ہوئے گول آئینے کے سامنے وہ گھومی تو اس کی دلکش ناک میں برچیاں والا کوکا چمکنے لگا۔ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے آویزاں کرنے کے بعد لڑکی نے سر پر ہلمت رنگ دوپٹہ لیا اور ایک بار پھر خود کو گھما کر آئینے کے سامنے دیکھا۔ اس کے انگ انگ سے سرمستی پھوٹ رہی تھی۔ سامنے تپائی پر چاندی کے تین چار چُوڑے اور کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اگلے دو چار منٹ میں یہ زیور بھی اس دہقانی لڑکی کے جسم پر سج گیا۔

تب رستم کی نگاہ ایک جانب بچھی چارپائی پر پڑی۔ ایک پچیس تیس سالہ مدقوق اور نشئی سا شخص گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اور آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا ہے۔ تیار ہو کر لڑکی اس کے پاس پہنچی۔ اس نے ذرا شوخی کے انداز میں اپنی چوڑیاں زور سے اس کے کان کے پاس چھنکائیں۔ پہلے ایک کان کے پاس پھر دوسرے کان کے پاس۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ تب لڑکی نے اسے آواز دی۔ "ظفری...... او ظفری۔"

ظفری نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں کھول کر لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک نگاہ ڈال کر اپنا سر پھر گھٹنوں پر ڈال دیا۔ اسی دوران میں اندر سے بچے کے رونے کی آواز پھر آئی۔ کسی بڑی عمر کی عورت نے لڑکی کو پکارا۔ "مہراں...... او مہراں، کدھر دفع ہوگئی ہے؟"

"آئی بے بے۔" لڑکی نے پکار کر کہا اور تیزی سے چلی گئی۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئی تو اس کی چھاتی سے ڈیڑھ دو سال کی ایک بچی لگی ہوئی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر بچی کو دودھ پلاتی رہی اور ساتھ ساتھ اپنا ہار سنگھار بھی دیکھتی رہی۔ وہ درمیانی صورت کی لیکن پُرشباب تھی۔ نشئی شخص جو یقیناً مہراں کا مرد تھا اب پہلو کے بل چارپائی پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ چارپائی کے نیچے سگریٹ کے ان گنت ٹوٹے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد لڑکی نے دودھ پیتی بچی کو ذرا کھینچ کر خود سے جدا کیا اور مورا کین کا کرتہ سینے پر برابر کرنے کے بعد بچی کو چھوٹی چارپائی پر ڈال دیا۔

اسی دوران میں گوہرا کا پاؤں تاریکی میں کسی برتن سے ٹکرایا اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ گوہرا گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا تو دیوار کے قریب کھڑی ایک بائیسکل الٹ گئی۔ اندر کمرے میں مہراں بری طرح چونک گئی۔ وہ سیدھی کھڑکی کی طرف آئی اور کھڑکی کھول کر پوچھا۔ "کون؟" اس کی آواز میں خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب دہقانی دلیری بھی تھی۔

رستم اور گوہرا دیوار کے ساتھ لگے، دم سادھے کھڑے رہے۔

لڑکی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ چند ہی لمحے بعد وہ برآمدے میں نظر آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ اس کا دلیرانہ انداز متاثر کن تھا۔ جونہی لالٹین کی روشنی رستم اور گوہرا کے پاؤں تک پہنچی اور مہراں نامی لڑکی نے چلانے کے لئے اپنا منہ کھولا، رستم تیزی سے آگے گیا اور اس نے لڑکی کا کھلا ہوا منہ دبوچ لیا۔ اسے یقین تھا کہ لڑکی کلہاڑی سے وار بھی کرے گی۔ اس کا یہ یقین درست ثابت ہوا۔ لڑکی کا کلہاڑی والا ہاتھ بے باک انداز میں بلند ہوا، تاہم رستم نے اسے تھام لیا۔ کانچ کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ رستم نے لڑکی کو گھما کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب اس کی پشت رستم سے لگی ہوئی تھی اور اس کے بے قرار ہونٹوں پر رستم کی چوڑی ہتھیلی کا دباؤ تھا۔

وہ جنگلی گھوڑی کی طرح کڑیل اور زورآور تھی۔ رستم کو اسے سنبھالنے میں دقت پیش آئی، تاہم وہ ناکام نہیں ہوا۔ گوہرا نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالٹین لڑکی کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی ورنہ وہ گر کر ٹوٹ جاتی۔ رستم نے لڑکی کو کھلونے کی طرح اٹھایا اور ایک چھوٹے کمرے میں لے آیا۔ گوہرا نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کمرے میں رنگین پایوں والی تین چار پائیاں "ملٹی اسٹوری عمارت" کی طرح اوپر نیچے پڑی تھیں اور لکڑی کی پرچھتیوں پر پیتل اور کانچ کے برتن سجے ہوئے تھے۔ گوہرا نے کلہاڑی بھی لڑکی کے ہاتھ سے چھین لی۔

رستم نے کمرے میں پہنچ کر لڑکی کو بُری طرح جھنجھوڑا اور دانت پیس کر کہا۔ "آواز نکالی تو اسی کلہاڑی سے تیری گردن اُتار دوں گا۔"

مہراں نامی یہ لڑکی اب سہم گئی تھی لیکن پھر بھی پوری طرح حواس میں تھی۔ چونکہ وہ حواس میں تھی اس لئے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہسٹریائی انداز میں چلانا شروع کر دے گی۔ رستم نے تھوڑا سا وقفہ دے کر اس کے سرخی لگے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں سے رستم اور گوہرا کے چہرے دیکھنے لگی۔ وہ دونوں چرواہوں کے مقامی لباس میں تھے۔ چہروں پر طویل مسافت کی گرد تھی۔

رستم کا چہرہ دھیان سے دیکھنے کے بعد لڑکی کچھ چونک سی گئی۔ وہ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی دوران میں اتفاقاً گوہرا نے بھی رستم کو نام لے کر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔

''لالے دی جان! رستم بھائی، مجھے لگتا ہے کہ باہر کھڑاک شڑاک شروع ہو گیا ہے۔''

کھڑاک شڑاک سے گوہرا کی مراد پولیس کی آمد تھی۔ کسی بھاری رائفل سے چند گولیاں چلائی گئیں۔ پھر دو تین للکارتی ہوئی سی آوازیں سنائی دیں۔ اگر صرف فائر ہوتے تو سوچا جاسکتا تھا کہ شادی والے گھر میں خوشی منائی جا رہی ہے لیکن للکارتی ہوئی آوازیں اس امکان کو رد کر رہی تھیں۔ اب دو امکان تھے۔ یا تو پولیس ان کا پیچھا کرتے ہوئے اس ڈھوک میں پہنچ گئی تھی یا پھر یہ وہی چوکیدارا اور گھڑسواروں والا معاملہ تھا۔

مہراں نامی لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب خوف کی جگہ حیرانی نے لے لی تھی۔ رستم اور گوہرا کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی سے اپنے حواس پر قابو پالے گی۔ اس کا شباب مورا کین کے کرتے میں سے پھٹا پڑ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ رستم نے اسے چھوڑا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گئی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر رستم کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''کون ہو تساں؟'' اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تیرا کیا خیال ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''کدھرے تم رستم......سیال تو نہیں ہو؟'' اس نے رستم کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔

''کون رستم سیال؟''

''مم......میں نے کئی واری اخبار میں تیڈا فوٹو دیکھا ہے۔'' اس کا لہجہ بدستور کانپ رہا تھا۔ نگاہ رستم کے چہرے سے پیوست تھی۔

''اگر میں رستم سیال ہوں تو پھر؟''

مہراں کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر کے ساتھ ساتھ ایک لہر سی نظر آئی۔ یوں لگا جیسے وہ تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول گئی ہے۔ اپنے خاوند کو، اپنے بچے کو، اپنی ساس کو جو اب بھی گھر کے کسی کمرے میں بلند آواز سے بول رہی تھی......اور یہ بھی بھول گئی ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں دو اجنبی مردوں کے درمیان موجود ہے۔

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''مینڈا دل کہتا ہے کہ تم رستم سیال ہو اور اگر تم رستم سیال ہو تو

پھر مینوں اور میرے گھر والوں کو تم سے کوئی ڈر کھترا نہیں۔ میں تم کو بڑی چنگی طرح جاندی ہوں۔'' وہ کسی پروانے کی طرح رستم سیال کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ رستم یا گوہرا جواب میں کچھ کہتے۔ وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے بیلے کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں تھی (آ) رہی تھیں......کدھرے او... مم مینڈا مطلب ہے......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مطلب واضح تھا۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ کہیں بیلے کی طرف سے ہونے والی فائرنگ کا تعلق ان دونوں سے تو نہیں ہے۔

اسی دوران میں گھر کا بیرونی دروازہ زور سے بجایا جانے لگا۔ وہ چونک گئی۔ چند سیکنڈ تک آواز پر غور کرتی رہی پھر بولی۔ ''تساں دونوں اِدھر ہی ٹھہرو، میں دیکھ کے آوندی پئی آں۔'' (میں دیکھ کے آتی ہوں)

وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے دروازے کی طرف مڑی۔ گوہرے نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے روک لیا۔ جھٹکا لگنے سے اس کے بڑے بڑے جھمکے زور سے ہلے اور وہ گوہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ گوہرے نے اپنی چادر کے نیچے رائفل کی خوفناک نال برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھائی تو سارے گھر والوں کو تیرے سمیت بھون کر رکھ دوں گا۔''

وہ جواب دینے کے بجائے تعجب سے رستم کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہی ہو۔ ''رستم سیال! یہ تیرا ساتھی کیا کہہ رہا ہے؟ کیا یہ جانتا نہیں کہ میں تجھے جانتی ہوں۔ میں اس علاقے کے ان سینکڑوں ہزاروں لوگوں میں سے ایک ہوں، جو تجھے بن دیکھے چاہتے ہیں۔ جنہوں نے بن ملے، تجھے اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔ جو تیری دلیری اور ہمت کی باتیں سنتے اور سناتے ہیں۔ جن کے ہونٹوں پر تیری سلامتی کی دعائیں رہتی ہیں......''

رستم نے گہری نظر سے اس زور آور دہقان لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ لڑکی اسے نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اس نے ابرو سے اشارہ کیا۔ گوہرا نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رستم اور گوہرا اس نیچی چھت والے نیم تاریک کمرے میں ساکت کھڑے رہے۔ باہر جاتے ہوئے مہراں لالٹین اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

مہراں نامی اس لڑکی کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ لالٹین کی حرکت کرتی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ برآمدے سے گزر کر چھوٹے کمرے میں آ رہی ہے۔ وہ کھنکارتی

ہوئی آ رہی تھی تا کہ رستم اور گوہرا کو پتا چل جائے کہ وہ ہی آ رہی ہے۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں مرہم پٹی کا سامان بھی تھا۔

''کون تھا؟'' رستم نے پوچھا۔

''مینڈا سوہرا۔'' (میرا سسر) مہراں نے جواب دیا۔ ''وہ کہتا ہے ڈھوک میں کوئی غیر بندے تھی (آ) گئے نے۔ سراج نے اس کو دیکھیا ہے۔ پولیس بھی ڈھوک کے آلے دوالے چکرا رہی ہے۔ ماملہ بڑا گڑ بڑ ہے۔ اگر پولیس ڈھوک دے اندر تھی گئی تو پھر گھر گھر تلاشی لے گی۔'' وہ بڑی دلیری سے بات کر رہی تھی۔ اس کا لب و لہجہ گواہ تھا کہ وہ ساری صورتِ حال کو سمجھ چکی ہے۔ وہ جان گئی ہے کہ ڈھوک کے اندر نظر آنے والے دونوں اجنبی یہی ہیں جو اس کے گھر میں گھسے بیٹھے ہیں اور پولیس بھی ان دونوں کے پیچھے ہی بھاگی پھر رہی ہے اور یہ دونوں کوئی معمولی افراد نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک رستم سیال کا ساتھی ہے اور دوسرا خود رستم سیال ہے۔ وہی رستم سیال جس کے دوبارہ وادی سون میں آنے کے چرچے ہیں اور جس کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کے لئے آج کل پولیس کے جتھے ٹیلوں میں چکراتے رہتے ہیں۔

اس نے رستم اور گوہرا کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا کہ وہ دونوں بڑی احتیاط سے اس کے پیچھے آئیں، وہ انہیں چھپنے کے لئے ایک خاص جگہ فراہم کرتی ہے۔

گوہرا سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ وہ نگاہ کی زبان میں پوچھ رہا تھا کہ انہیں مہراں نامی اس لڑکی پر اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں۔ رستم نے ایک بار پھر مثبت جواب دیا۔ مہراں نے لالٹین اٹھائی اور دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے میں اینٹوں کی ایک چھوٹی سی میڑھی تھی۔ اس سیڑھی نے ان تینوں کو اوپر ایک چوبارے تک پہنچا دیا۔ مہراں نے اپنے ریشمی تہہ بند کے سرے سے بندھی ہوئی چابی کے ساتھ چوبارے کا مقفل دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی انہیں بادام کی خوشبو آئی۔ یہ تقریباً بارہ فٹ ضرب اٹھارہ فٹ کا ایک نیم پختہ کمرہ تھا۔ یہاں فرش سے چھت تک خشک میوے کی بوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ مہراں نے بتایا کہ یہ بادام اور سوکھی ہوئی خوبانی ہے۔ ان بوریوں کے درمیان ایک جگہ تھوڑا سا خلا تھا۔ اس خلا میں سے بس ایک شخص پھنس پھنسا کر گزر سکتا تھا۔ اس راستے میں سے گزرنے کے لئے مہراں رکوع کے بل جھک گئی۔ رستم اور گوہرا کو بھی جھکنا پڑا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ بوریوں کے عقب میں موجود ایک تھوڑی سی خالی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں فرش پر کھجور کی چھال کی ایک چٹائی بچھی تھی۔ مہراں نے جلدی جلدی اپنے دوپٹے کے پلو سے چٹائی کی گرد صاف کی اور

رستم سے کہا کہ وہ دونوں آج کی رات یہاں ان بوریوں کے درمیان گزار لیں۔ یہ ان کے لئے محفوظ ترین جگہ ثابت ہوگی۔

مہراں کے لہجے میں بے پناہ یقین اور خلوص کی جھلک تھی۔ اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ اس امر کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھ رہی ہے کہ آج رستم سیال اس کے گھر میں مہمان ہے اور وہ اپنی بساط کے مطابق اس کی مدد کر رہی ہے۔ وہ اس بات کو یکسر بھولی ہوئی تھی کہ اس طرح رستم کی مدد کر کے وہ اپنے اور اپنی فیملی کے لئے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی نگاہ گاہے بگاہے رستم کے چہرے کی طرف اٹھتی تھی اور اٹک کر رہ جاتی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اس گھر میں اپنے شوہر ظفری، اپنے ساس سسر اور بچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا سسر بوڑھا ہے اور بہت کم گھر پر رہتا ہے۔ اس نے یہاں پاس ہی ایک چھوٹا سا باغ ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ وہ اپنے سسر کے ساتھ باغ میں کام کرتی ہے اور گھر کا چولہا جلاتی ہے۔ اس کے خاوند کی تھوڑی سی کھیتی بھی ہے لیکن جب سے وہ نشے کا شکار ہو کر چار پائی سے لگا ہے، کھیتی اجاڑ پڑی ہے۔ اب وہ خود اس کھیتی کو آباد کرنے کا سوچ رہی ہے۔

وہ پاؤڈر اور عطر کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی ناک کا طلائی کوکا اور کانوں کے نقرئی جھمکے چمک رہے تھے۔ ''تم کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتی ہو؟'' گوہرا نے کہا۔

''ہاں، میں نے ویاہ والے گھر جانا ہے۔ وہاں اج ''ورتا دے'' کی رسم ہے۔ میری سس بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ پر میں جلدی آ جاؤں گی۔ تساں دونوں بالکل فکر نہیں کرنا۔ یہاں کوئی نہیں آسکدا۔''

رستم نے لالٹین کی لو مدھم کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہے کہ ہم دونوں کو یہاں اپنے گھر میں رکھ کر تم کتنا خطرناک کام کر رہی ہو؟''

اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور ہولے سے سر ہلا کر باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دونوں دروازے کے باہر تالا لگنے کی آواز سن رہے تھے۔

بوریوں کا درمیانی خلا بہت مختصر تھا۔ گوہرا اور رستم بمشکل پہلو بہ پہلو لیٹ سکتے تھے۔ مہراں جاتے جاتے لالٹین اور مرہم پٹی کا سامان کمرے میں ہی چھوڑ گئی تھی۔ رستم نے گوہرا کے ہاتھ کا زخم دیکھا۔ آٹھ ایم ایم کی گولی ہتھیلی پھاڑ کر نکل گئی تھی تاہم انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہڈیاں غالباً سلامت ہی رہی ہیں۔ مرہم پٹی کے سامان میں کھدر

کی ایک لمبی پٹی تھی۔ تھوڑی سی روئی تھی۔ اس کے علاوہ سنقنا نامی بوٹی سے بنایا گیا مرہم تھا۔ مقامی طور پر بنائے گئے اس مرہم کو سون کے باشندے اکسیر جانتے تھے۔ رستم نے اپنے ہاتھ سے گوہرا کی پٹی کی۔ گوہرا کو درد سے افاقہ محسوس ہونے لگا تھا اور نیند آرہی تھی۔ تاہم اس خلا میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ دونوں اطمینان سے سوسکتے یا لیٹ سکتے تھے۔ خاص طور سے گوہرا کے لئے خطرہ تھا کہ اس کا زخمی ہاتھ دکھ جائے گا۔

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ گوہرا نے کہا۔ ''لالے دی جان! پتا نہیں تیرے دستی بم نے کتنے بندے پار کیے ہیں؟''

''دو تین سے زیادہ کیا ہوں گے؟'' رستم نے کہا۔ ''اس طرح کے ہتھیار کھلی جگہ پر زیادہ تباہی نہیں کرتے۔''

''پھر بھی ایک دفعہ تو تڑتھلی مچ جاسی۔ مجھے لگتا ہے کہ اب تک بہت سی پولیس علاقے میں جمع ہو چکی ہوگی۔ کیا پتا کہ پورے علاقے کو گھیر لیا گیا ہو۔''

''ہاں، اب گھیرا تو ضرور ڈالنا ہے ان لوگوں نے۔'' رستم نے تائید کی۔

''لالے دی جان، پتا ہے میرا دل کیا چاہ رہا ہے؟ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرے پاس ایسے ہی چار پانچ دستی بم اور ہوں۔ یہ بم میں اپنے پنڈے پر باندھوں اور سیدھا سیدھا جا کر اس خبیث ریاض ہٹلر کو جپھی ڈال لوں۔ میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی ہزار دو ہزار ٹکڑا ہو جائے۔''

''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔'' رستم نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بی بی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔''

''نہیں، ان بکر والوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جنہیں باندھ کر کھوہ میں چھوڑ آئے ہیں۔ آج سردی ہے۔ اللہ کرے انہوں نے اپنی رسیاں کھول لی ہوں۔''

''ہاں ان کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ تم نے ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی پورا نہیں ہوسکا۔''

''کون سا وعدہ؟'' رستم نے پوچھا۔

''تم نے ان سے کہا تھا کہ ان کی بکریاں صحیح سلامت مل جائیں گی۔''

''ہاں یہ وعدہ واقعی پورا نہیں ہوسکا۔ پولیس والوں کے برسٹ سے چار چھ بکریاں تو ضرور جان سے گئی ہوں گی۔''

''اوپر والے نے بچالیا ورنہ بکریوں کے ساتھ ہی لیٹ جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ

گئی تھی۔''

''خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچو۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم اگلے ایک دو دن تک یہاں سے نکل سکیں گے۔ بلکہ شاید زیادہ دن لگ جائیں۔'' رستم نے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ ہم نے کون سا گڈی چڑھنا ہے۔ سونے کے لئے جگہ مل گئی ہے۔ ایک دو بوریاں پھاڑ کر خشک میوہ کھاتے ہیں اور جان بناتے ہیں۔ ریاض ہٹلر جیسے بندے سے ٹکر لینے کے لئے پنڈے میں گرمی تو پوری ہونی چاہیے نا؟''

''گرمی تو پوری سے بھی زیادہ ہے لیکن گرمی دکھانے کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔''

''چلو جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے، میں سولوں۔'' گوہرا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ایسے مخدوش حالات میں نیند کا آجانا گوہرا کی لاپرواہی اور بے جگری کا مظہر تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ بوریوں کے درمیان اس مختصر خلا میں رستم کے ساتھ سونا اس کے لئے آسان نہیں۔ ایک طرف بوریوں کے اوپر چڑھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ موجود تھی۔ گوہرا اوپر چڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں رستم اس کی بوجھل سانسوں کی آواز تسلسل سے سن رہا تھا۔

رستم بھی باداموں کی بوریوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پیش آمدہ حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس وقت وہ اور گوہرا پولیس کے ایک وسیع گھیرے کے اندر ہیں۔ ان سے لڑے بھڑے بغیر یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

پتا نہیں کب اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کی پلکیں بوجھل ہوگئیں اور وہ سو گیا۔ بھرا ہوا کولٹ پسٹل اس کی جھولی میں تھا۔ اس کی آنکھ کسی کی آمد کے سبب کھلی۔ یہ مہراں تھی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک تیز جھونکا اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہ لالٹین تھامے رکوع کے بل جھک کر آرہی تھی۔ کھلے گلے کے ریشمی کرتے میں اس کا غیر معمولی جسم نمایاں تھا۔ وہ کھیت میں مزدوری کرنے والی ایک سخت جان لڑکی تھی۔ پُرکشش لیکن جفاکش جسم کی مالک۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ وہ رستم کے قریب آبیٹھی۔ رستم کو تنہا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ''تساں کا ساتھی کدھر ہے؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ بوریوں پر چڑھ کر سو گیا ہے۔'' رستم نے جواب دیا۔

''میں تو ویاہ والے گھر سے تساں دونوں کے لئے روٹی لے کر آئی تھی۔'' اس نے کہا اور کھانے کی مہکار دیتی ہوئی پوٹلی کھول دی۔ یہ تین شاپر بیگ تھے۔ ایک میں نمکین چاول، دوسرے میں گوشت کا سالن اور تیسرے میں حلوہ تھا۔ حلوے کی خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ

"سیوڑیں حلوہ" ہے۔ میدے اور گوند سے تیار کیا گیا یہ حلوہ مقامی لوگوں کی پسندیدہ ترین ڈش تھا۔ ... پوٹلی میں اسٹیل کی دو پلیٹیں اور چمچ بھی تھا۔

مہراں نے کانپتے ہاتھوں سے یہ چیزیں رستم کے سامنے پروسیں اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی کو بھی کھانے کے لئے جگا لے۔

رستم جانتا تھا کہ گوہرا شراب کا پوا پی کر سویا ہے۔ وہ اب آسانی سے جاگنے والا نہیں تھا۔ اس نے گوہرا کے حصے کا کھانا ایک طرف نکال دیا۔ "یہ کس کی شادی ہے؟" رستم نے مہراں سے پوچھا۔

"شادی تو تین دن بعد ہے جی۔ یہ تو "چھک ورتانے" کی رسم تھی۔ چاچا جعفرا اپنے پُتر دا ویاہ بڑی دھوم دھام سے کر رہا ہے جی اور چاچے جعفر کو تساں بھی تھوڑا بہت جاندے ہو۔"

"میں جانتا ہوں؟"

"ہاں جی، تساں کو شاید یاد نہ ہو ڈھائی تین سال پہلے تساں نے چاچے جعفر کی دھی کی شادی میں بڑی مدد کی تھی۔ شادی سے چار دن پہلے چور اس وچاری کے داج (جہیز) کا سارا سامان لے گئے تھے۔ چاچا جعفر روتا کرلاتا رہ گیا تھا۔ تساں کی کوشش سے گجرات کے نامی چور کالو جہانے نے راتوں رات سارا سامان واپس چاچے جعفر کے گھر پہنچایا تھا اور چاچے کے پیروں کو بھی ہتھ لگایا تھا۔ مجھ کو چنگی طرح یاد ہے ساری ڈھوک نے تساں کی واہ واہ کی تھی.....؛"

رستم جواب میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے مہراں کے انداز سے کوفت ہو رہی تھی۔ وہ عجیب نظروں سے رستم کو دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق ہو۔ رستم سے بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹ سوکھ سوکھ جاتے تھے۔ رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "باہر کا کیا حال ہے۔ کوئی پولیس کا بندہ تو نہیں آیا ڈھوک میں؟"

جواب میں مہراں نے جو کچھ کہا اس سے پتا چلا کہ باہر حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پولیس نہ صرف ڈھوک کے اندر آئی ہے بلکہ آس پاس بھی گھوم رہی ہے۔ چھ سات گھروں کی تلاشی بھی ہوئی ہے۔ (یہ گھر اسی گلی میں تھے جہاں چوکیدار سراج نے رستم اور گوہرا کو دیکھا تھا اور رستم نے سراج کے چہرے پر زوردار جھانپڑ مار کر اسے گرایا تھا) مہراں نے بتایا کہ ایک وڈا تھانیدار اور دس پندرہ سپاہی اس وقت بھی ڈھوک میں موجود ہیں اور سراج وغیرہ سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔

بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر بڑے دھیان سے اور بے حد ستائشی نظروں سے رستم کو دیکھنے لگی۔ رستم نے جھنجھلا کر کہا۔ "کیا میرے منہ پر کچھ لکھا ہوا ہے؟"

وہ پہلے گھبرائی پھر شرما گئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی ناک کا کوکا اور بڑے بڑے جھمکے چمکے اور اس نے نگاہ جھکا لی، وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تساں مانو یا نہ مانو پر میں جان گئی ہاں کہ تساں رستم سیال ہو۔ میں نے کبھی سوچیا بھی ناں تھا کہ اک دیہاڑے رستم سیال میںڈے گھر وچ میںڈا امہمان بن کے تھیوے گا۔"

"تُو کیسے کہہ سکتی ہے کہ میں ہی رستم ہوں۔"

"میں نے بڑی جلدی تساں کو پہچان لیا تھا۔ اب ڈھوک میں پولیس والے بھی یہی بات کر رہے ہیں۔ اونہاں نے بتایا ہے کہ بیلے کے پار تساں دونوں کا پولیس کے ساتھ زور کا مقابلہ ہوا ہے۔ وہ تساں کے ساتھی کا نام گوہرا بتا رہے ہیں۔"

"مہراں تُو جو کچھ ہمارے لئے کر رہی ہے، اس کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے لیکن ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ بس کل کا دن کسی طرح گزر جائے، پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"نہیں جی نہیں، یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ ابھی تہاڈا باہر نکلنا بہت خطرناک ہے۔ ابھی تساں دوناں سکون سے یہاں رہو۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے جھمکے لہرانے لگے۔

رستم نے کہا۔ "تیرے گھر والوں کو پتا ہے کہ تُو نے ہمیں یہاں چھپایا ہے؟"

"نہیں جی۔ میں نے کسی کو شک نہیں پڑنے دیا۔ ویسے بھی میری سس تو آندے ساتھ ہی سوں ونجی اے (ساس تو آتے ساتھ ہی سو گئی ہے) سوہرا جی شادی والے گھر میں ہیں۔ باقی رہا میںڈا خاوند تو وہ ہویا نہ ہویا ایک جیسا ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے تنومند مہراں کے تنومند چہرے پر عجیب سی اداسی نظر آئی۔

"کیوں؟ تمہارے خاوند کو کیا ہوا ہے؟"

جواب میں مہراں نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ اس کا خاوند ظفری پیدائشی نکھٹو تھا۔ یہ مہراں کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ مہراں نے اپنا آٹھ تولے طلائی زیور بیچ کر ایک کھیتی ظفری کو لے کر دی تھی۔ اس زمین پر ذرا سی محنت کی جاتی تو وہ خوشحال ہو جاتے لیکن ظفری نے آباد زمین کو برباد کر دیا۔ اب وہ خود بھی برباد ہو رہا تھا۔ ایسے بُرے یاروں کی صحبت میں ہیروئن کا نشہ لگ گیا تھا۔ اب وہ کسی کام کاج کا نہیں تھا۔ ڈھوک کے سرپنچ دوسا کے ڈیرے پر بیٹھا رہتا تھا۔ سرپنچ کے ڈیرے سے ہی اسے ہیروئن بھی ملتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نشے میں ڈیرے پر ہی

مدہوش پڑا رہتا تھا۔ مہراں اسے گھر لانے کے لئے ڈیرے پر جاتی تھی تو سرپنچ کا چھوٹا بھائی اسے للچائی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ایک دو بار اس نے ظفری کے سامنے ہی اس سے فحش مذاق بھی کیا لیکن ظفری کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اب مہراں نے ظفری کے پیچھے ڈیرے پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ کافی دیر تک رستم کے پاس بیٹھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی۔ شاید وہ کچھ دیر مزید بیٹھتی لیکن اسی دوران میں گھر کے زیریں کمرے سے بچی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کہیں مینڈی کسں نہ جاگ جائے۔ میں جاتی ہوں۔ موقع ملا تو پھر آؤں گی۔''

اس نے لالٹین تھامی اور رکوع کی حالت میں چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔

اس کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ''موقع ملا تو پھر آؤں گی۔'' اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اب دوبارہ رستم کے پاس آنے کا کیا تک تھا۔ کیا وہ کل صبح کے حوالے سے بات کر رہی تھی......

رستم نے لالٹین کی لَو بالکل مدھم کر دی اور مختصر خلا میں پاؤں ذرا سکیڑ کر لیٹ گیا۔ ڈھوک کی تاریک گلیوں میں آوارہ کتوں کی آوازیں تھیں......اور کبھی کبھی گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونجنے لگتی تھیں۔ قرب و جوار میں سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

نیند رستم کی آنکھوں سے دور تھی، وہ جاگتا رہا اور سات آٹھ فٹ اوپر خشک میوے کی بوریوں پر سوئے ہوئے گوہرا کے مدھم خراٹے سنتا رہا۔ اس کے سینے میں ایک نیلی آگ روشن تھی۔ وہ جلد از جلد پولیس کے گھیرے سے نکلنا اور پیر قدرت اللہ کی اکڑی ہوئی گردن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ سرکاری گولیوں کا شکار ہو بھی جاتا تو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ قریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا، پھر اس گودام نما کمرے سے باہر چند آہٹیں سنائی دیں۔ رستم کچھ کھٹک گیا۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ مہراں ہو گی لیکن وہ کس ارادے سے آ رہی تھی۔ کہیں وہ کوئی چال تو نہیں چل رہی؟ کئی سوالات اس کے ذہن میں لپک گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے سیدھا لیٹا رہا۔ دروازے کا تالا کھلا، پھر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ رستم نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا وہ نوے کے زاویے سے جھکی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے میں بھی کچھ تھا۔ خلا کے اندر آ کر وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز توبہ شکن تھا۔ وہ منہ زور جسم کی مالک تھی لیکن فی الوقت کچھ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس نے لالٹین نیچے رکھ دی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پیتل کا لمبا گلاس تھا۔ رستم

نے اندازہ لگایا کہ اس میں دودھ ہو گا۔ اس نے آہستگی سے گلاس رستم کے قریب رکھ دیا۔ وہ ابھی تک زرق برق لباس میں تھی۔ جھمکے، کوکا، کانٹھی، جُوڑا، لپ اسٹک اور کاجل سب کچھ اس کے جسم کا حصہ تھا۔ رستم کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پُرتپش اور خود فراموش کیفیت نظر آئی۔ وہ آنکھیں موندے بے حرکت لیٹا رہا۔

وہ رستم کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد وہ کانپتی ہوئی جھکی۔ اس نے رستم کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہولے سے ہلایا۔ ایک بار......دو بار۔ رستم نے خود کو سویا ہوا ظاہر کیا۔ وہ اس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ رستم کو آواز دے کر جگائے یا واپس چلی جائے۔ اس کی چور نظریں اس کی سانسوں کی چڑھی ہوئی لَے اور اس کے تاثرات......یہ سب کچھ مل کر اس کے اندر کی ''خاص کیفیت'' کی چغلی کھا رہے تھے۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کمرے کے مختصر خلا میں مہراں کے جسم اور اس کی لپ اسٹک کی خوشبو صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ آخر دیر تک ہچکچانے کے بعد وہ دبی دبی لرزاں آواز میں بولی۔ ''تساں سو گئے او؟''

رستم بے حرکت لیٹا رہا۔ وہ چند سیکنڈ مزید بیٹھی رہی۔ تب اس نے لالٹین اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد رستم دروازے کو قفل چڑھنے کی مدھم آواز سن رہا تھا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے چلی آئی۔ گوہرا ہنوز سو رہا تھا۔ رستم ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ وہ ناشتہ لے کر آئی تھی۔ ایک چنگیر میں مکئی کی سوندھی سوندھی خوشبو والی بڑے گھیرے کی روٹی تھی۔ ساتھ میں دہی تھا اور انڈوں کا آملیٹ تھا جس میں پیاز ڈالا گیا تھا۔ آم کا روایتی اچار بھی ناشتے کا حصہ تھا۔

رستم نے کہا۔ ''تم بڑی جلدی آ گئی ہو۔ میرے ساتھی نے تو ابھی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''کیوں؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''وہ بہت زیادہ سوتا ہے۔''

''پر تساں تو نہیں سوتے، تساں ناشتہ کر لو۔''

''نہیں، ابھی مجھے بھوک نہیں۔'' رستم نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''باہر کا کیا حال ہے؟''

وہ ایک دم گم صم ہو گئی۔ رستم نے دوبارہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ باہر معاملہ ٹھیک نہیں

ہے۔ ڈھوک کے اندر بھی تھوڑی بہت پولیس ہے لیکن باہر بہت زیادہ ہے۔ آس پاس کے ٹیلوں اور دروں پر یہ لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس بُو گیر کتے بھی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اس پورے علاقے کو گھیرا ہوا ہے۔

رستم کے اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا کہ ٹائم جتنا زیادہ گزرے گا، ڈپٹی ریاض اتنی ہی زیادہ نفری یہاں جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

وہ خاموشی سے سوچتا رہا۔ مہراں بھی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اوپر بوریوں پر گوہرا کے مدھم خراٹے سنائی دیتے رہے۔ اچانک رستم نے دیکھا کہ مہراں رو رہی ہے۔ آنسو اس کے صحت مند چکنے رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔ ''کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''کج نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ایک دم زاروقطار رونے لگی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اس کی ہچکیاں اس کے پورے جسم کو دہلانے لگیں۔ وہ اب ایک سادہ سے لباس میں تھی۔ ایک پتلی سی اوڑھنی اس کے بھاری بھرکم بالوں کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا مہراں؟'' رستم نے پوچھا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت بُری ہوں۔ بہت بُری ہوں۔ تسی مجھ کو ماف کر دو۔''

''اوہو کیا ہوا ہے؟''

''مینڈے دل میں تساں کے بارے میں بڑا بُرا خیال آیا تھا۔ میں نے کیوں سوچیا ایسا؟ کیوں مینڈی مت ماری گئی؟'' وہ ہچکیوں سے روتی چلی جا رہی تھی۔

رستم سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ اسے رات کے وہ خمار آلود لمحات یاد آئے جب مہراں کسی عجیب لہر کے ساتھ ساتھ بہتی اس نیم روشن خلا میں آ گئی تھی۔ تب وہ سو رہی تھی نہ جاگ رہی تھی۔ نہ ہوش میں تھی نہ بے ہوش۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھا ریلا تھا اور اس کے چہرے پر ایک انجانی کیفیت تھی۔ ہاتھوں میں دودھ کا گلاس لئے اپنے زرق برق کپڑے اور گہنے چمکاتی وہ نہ جانے کس خیال کے تحت یہاں آئی تھی اور پھر جیسے آئی تھی ویسے چلی بھی گئی تھی۔

اب جو کچھ وہ بتا رہی تھی وہ اس کے اندر کی صاف گوئی اور سچائی کا غماز تھا وہ یہ سب کچھ نہ بھی بتاتی تو اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا لیکن وہ اتنی سادہ اور شفاف تھی کہ یہ بات بے ساختہ اس کی زبان پر چلی آئی تھی۔ رستم نے اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ گھٹنوں پر سر جھکائے تھوڑی دیر سسکتی رہی پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اچانک آگے جھک کر رستم کے دونوں پاؤں کو ہاتھ لگائے اور مڑ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ رستم اپنے پاؤں کو سمیٹنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

اوپر سے گوہرا کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''لالے دی جان، کیا وقت ہو گیا ہے؟''

''تیرے مرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ بہت ساری پولیس نے گھیرا ڈالا ہوا ہے علاقے کو۔''

''اوتو پھر کیا۔ مرنے مارنے کا سواد تو آئے گا ناں!'' گوہر نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس کا ہاتھ شاید کسی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی۔ پھر وہ بوریوں سے پھسلتا ہوا نیچے آ گیا۔

اس کا ہاتھ سوجا ہوا تھا لیکن اسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ وہ ندیدوں کی طرح رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ساتھ وہ کھوجی نظروں سے رستم کو دیکھتا بھی چلا جا رہا تھا۔ ''رستم بھائی! یہاں تو بڑی خدمتیں ہو رہی ہیں تمہاری اور تمہارے ساتھ میری بھی۔''

''کیوں ان خدمتوں سے تجھے کیوں تکلیف ہے؟''

''لالے دی جان، مجھے لگتا ہے کہ یہ کڑی تیری بڑی مداح ہے۔ شاید اس نے تیرے بارے میں بہت کچھ جان رکھا ہے۔ رات کو نیند میں بھی ایسے لگ رہا تھا کہ یہ تیرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ ہنس رہی ہے۔ چوڑیاں چھنکا رہی ہے۔ کیا یہ رات کو یہیں پر رہی ہے؟''

''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' رستم نے اسے ڈانٹا۔

''دماغ تو ٹھیک ہے لیکن ہاتھ ٹھیک نہیں ہے لالے دی جان۔ پورے بازو میں ٹرائیں پڑ رہی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب جو کچھ ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔ ہم آٹھ دس پولیس والوں کو مار کر یہاں سے نکل جائیں یا پھر یہ پولیس والے ہمارا کام تمام کر دیں۔''

گوہرا کھاتا رہا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا رہا۔ باداموں کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رستم اور گوہرا نے اپنے ہتھیار صاف کئے۔ خالی میگزین گولیوں سے بھرے اور پھر اپنے آپ کو آنے والی صورتِ حال کے لئے تیار کرنے لگے۔ انہیں ہرگز یہ گوارہ نہیں تھا کہ خشک میوے سے بھرا ہوا یہ کمرہ ان کے لئے چوہے دان ثابت ہو جائے۔ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اور پولیس کا گھیراؤ توڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے تھے۔

دوپہر سے ذرا پہلے کسی قریبی گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کمرے میں

ایک روزن موجود تھی۔ رستم نے تین چار بوریوں پر چڑھ کر روزن میں جھانکا تو اسے کچھ ہی فاصلے پر ایک گھر کا صحن نظر آیا۔ یہ شادی والا گھر ہی تھا۔ وہاں رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ کچھ لڑکیاں اور عورتیں ناچ رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے لڑکے کا بھیس بدل رکھا تھا۔ سر پر پگڑی، مردانہ لباس، مصنوعی مونچھیں اور ہاتھ میں لاٹھی۔ وہ ایک لڑکی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ناچ رہی تھی۔ پھر اس نے لڑکی کو بانہوں میں بھرا اور اس کا منہ چومنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے شرما کر چہرہ گھونگھٹ میں چھپا لیا۔ عورتیں اور لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ نقلی ''لڑکا'' کچھ دیر تک اصلی لڑکی سے دست درازی کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف ہٹ گئے۔

ٹیپ ریکارڈر پر انڈین گانا گونج رہا تھا۔ ''میرے ہاتھوں میں نو نو چوڑیاں ہیں، تھوڑا ٹھہرو سجن مجبوریاں ہیں۔'' ایک درمیانی عمر کی موٹی عورت گانے پر رقص کرنے لگی اور دیگر خواتین تالیاں بجانے کے ساتھ ساتھ قہقہے برسانے لگیں۔

پھر کچھ لڑکیوں نے ایک اور لڑکی کو دھکیل کر ناچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ مہراں تھی۔ اونچی لمبی دھریک جیسی مضبوط لیکن لچک دار۔ وہ پہلے تو شرماتی رہی پھر اس نے ناچنا شروع کر دیا۔ بیشک اس میں ایک دیہاتی کشش تھی۔ رستم کو اس کے مدقوق نشئی شوہر کا خیال آیا اور زندگی کی شدید ناہمواری کا احساس ہوا۔ اب ٹیپ پر گانا چل رہا تھا۔

ہائے ہائے مجبوری
یہ موسم اور یہ دوری
مجھے رو رہ کے تڑپائے

وے تیری دو ٹکیاں دی نوکری، میرا لاکھوں کا ساون جائے۔

مہراں اپنے مہندی لگے پاؤں کے ساتھ ریتلی زمین پر ناچتی رہی اور اس کے بالوں کا جُوڑا ڈھیلا ہوتا رہا۔ سہ پہر کے وقت مہراں ایک بار پھر خاموشی سے بالائی کمرے میں آئی۔ اس مرتبہ چھوٹی بچی اس کی گود میں تھی۔ وہ پیاری سی ہمکتی ہوئی بچی تھی اور کسی ننھی بچھڑی کی طرح بار بار مہراں کے توانا سینے پر منہ مار رہی تھی۔ مہراں ایک بار پھر کھانا لے کر آئی تھی۔ اب کھانے میں باجرے اور گندم کو ملا کر پکائی گئی خستہ روٹی تھی۔ ساتھ میں ساگ تھا۔ دودھ کی موٹی ملائی تھی جس میں شکر ڈالی گئی تھی۔ ساتھ میں ڈھوڈا تھا جسے وادی سون کی مرغوب سوئٹ ڈش کہا جا سکتا ہے۔

مہراں کی مٹھی میں کسی پرانے اخبار کا چھوٹا سا تراشا دبا ہوا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں

سے تراشا رستم کے سامنے کھولا اور بولی۔ ''یہ دیکھیں، یہ تساں کی تصویر ہی ہے ناں؟''

رستم نے دیکھا۔ یہ تین چار سال پرانی تصویر تھی۔ مہراں نے پتا نہیں کہاں سے لی تھی اور کیونکر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ رستم نے تصویر پھاڑ کر پھینک دی۔ مہراں کا چہرہ اُتر گیا۔

''ایسی چیزیں پاس نہیں رکھتے۔ مصیبت گلے پڑتی ہے۔'' وہ بے زار لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''شاید تساں کو پتا نہ ہو۔ تہاڈی ایسی تصویریں یہاں کئی لوگوں کے پاس موجود ہوں گی۔ لوگ تساں سے پیار کرتے ہیں۔''

گوہرا نے ذرا آنکھیں نچا کر کہا۔ ''لالے دی جان، میں نے کہا تھا ناں کہ لوگ تساں سے بڑا پیار کرتے ہیں۔''

رستم نے اپنی چھوٹی چھوٹی خوش نما داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ذرا گھور کر گوہرا کو دیکھا۔

مہراں اپنی بچی کو کندھے سے لگا کر ہلکورے دیتے ہوئے بولی۔ ''تساں دونوں سے ایک بات کرنی تھی۔''

''ہاں کہو۔'' رستم نے جواب دیا۔

''میں نے ایک بندے سے بات کی ہے۔ وہ تساں دونوں کو حفاظت کے ساتھ پولیس کے گھیرے سے نکال سکتا ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''بس ہے ایک۔ تساں اس کو نہیں جاندے۔ وہ اس علاقے کا کیڑا ہے۔ ایسے ایسے چور رستے جانتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

اس سے پہلے کہ مہراں کچھ کہتی سیڑھیوں کی طرف سے اس کے نشئی خاوند ظفری کی بیمار آواز سنائی دی۔ ''مہراں کدھر مر گئی ہے۔ او مہراں۔''

مہراں جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ظفری آوازیں دیتا ادھر کو تھی رہا ہے (آ رہا ہے) میں چلتی ہوں۔ بس تساں دونوں اج رات کے لئے تیار رہنا۔'' وہ یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف نکل گئی۔

''یہ کیا کہہ گئی ہے؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔'' رستم نے کہا۔

''رستم بھائی، کوئی چال نہ ہو ہمارے لئے۔''

''چالیں چلنے والی لگتی تو نہیں۔'' رستم نے کہا۔

شام کے سائے ڈھل گئے اور وادی سون کی طویل سنسان رات سر پر پہنچ گئی لیکن یہ بظاہر جتنی سنسان اور خاموش دکھائی دیتی تھی اتنی تھی نہیں۔ اس کے سینے میں ہلچل تھی اور واقعات تھے۔ واقعات جن کے اسباب ٹیلوں پر بکھرے ہوئے تھے اور جھاڑیوں میں گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹی چمگادڑ نہ جانے کہاں سے کمرے میں گھس آئی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر سر پٹختی رہی پھر باہر نکل گئی۔ شادی والے گھر سے برتنوں کے ٹکرانے اور بچوں کے چہکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

وقت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتا رہا۔ کمرے کے ایک روزن میں سے دور کچھ ٹیلوں کا بالائی کنارہ نظر آتا تھا۔ تاریکی اور سردی میں ڈوبا ہوا کنارہ۔ اس کنارے پر رستم اور گوہرا کو کبھی کبھار جگنو سے چمکتے نظر آتے تھے۔ یہ جگنو دراصل موت کے وہ ہرکارے تھے جو اس ویرانے میں رستم اور گوہرا کے لئے گھوم رہے تھے۔ پولیس مقابلہ کیا گیا تھا۔ پولیس پارٹی پر دستی بم پھینکا گیا تھا اور ڈپٹی ریاض جیسے پولیس افسر سے براہِ راست مارا ماری کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ معمولی نہیں تھا۔

اچانک رستم کو آہٹ محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ کمرے کے دروازے کے بالکل پاس کوئی موجود ہے اور وہ جو کوئی بھی تھا بہت دبے پاؤں چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ یہ کون ہوسکتا تھا۔ مہراں کا شوہر، سسر یا پھر اس کی ساس۔ ان دور دراز علاقوں میں لوگ رات کو بہت جلد سو جاتے ہیں۔ اب قریباً سونے کا وقت ہوگیا تھا۔ روشنیاں بجھتی جارہی تھیں۔ گلیوں اور راستوں سے آنے والی آوازیں کم ہوگئی تھیں۔

رستم کو عجیب سا شبہ ہونے لگا۔ اس کی چھٹی حِس گواہی دے رہی تھی کہ اس کمرے کے دروازے سے باہر کوئی پُراسرار سرگرمی جاری ہے۔ اپنے کولٹ پسٹل پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ گوہرا بھی اس صورتِ حال کو محسوس کر چکا تھا۔ اپنی ٹرپل ٹو اس نے گود میں رکھ کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا تھا۔ چند منٹ مزید گزر گئے۔ رستم کے حساس نتھنوں نے محسوس کیا کہ دروازے کے آس پاس جو شخص موجود ہے وہ سگریٹ پھونک رہا ہے۔ وہ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے اور ''تیل کی دھار'' دیکھتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد یوں لگا کہ وہ شخص دروازے پر سے ہٹ گیا ہے اور اردگرد خاموشی چھا گئی ہے۔

رستم نے لالٹین بجھا دی تھی۔ اب کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ رستم نے گوہرا کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''پر دروازہ تو بند ہوگا؟''

''نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مہراں جلدی میں تالا لگانا بھول گئی ہے۔''

دراصل جب سہ پہر کے وقت وہ یہاں آئی تھی تو اس کے آنے کے ذرا دیر بعد اس کے شوہر نے اسے آوازیں دینا شروع کر دیں تھیں۔ وہ گھبراہٹ میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند ضرور کیا تھا مگر تالا لگنے کی آواز نہیں آئی تھی۔

رستم نے پسٹل اپنے ہاتھ میں رکھا اور رکوع میں چلتا ہوا بوریوں کے درمیان سے گزر کر دروازے کی طرف آیا۔ دروازے کے اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ سن گن لینے کے بعد اس نے ہولے سے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ اس کے پٹ وا ہوگئے۔ دونوں پٹوں کے درمیان قریباً چار انچ کا خلا پیدا ہوا تو چھت کا باقی حصہ بھی نظر آنے لگا۔ پہلی راتوں کے چاند کی مدھم روشنی میں ''اپلوں کے ڈھیر'' یوں نظر آتے تھے جیسے برقعہ پوش عورتیں چھت پر اکڑوں بیٹھی ہوں۔ ایک طرف چارپائی پر چادر ڈال کر کوئی سبزی سوکھنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس سے آگے پرالی کا ڈھیر تھا...... یہ ڈھیر، گھر کی نچلی چھت پر تھا اور رستم سے کم و بیش 15 میٹر کی دوری پر تھا۔ رستم کو شک ہوا کہ اس پرالی میں کوئی موجود ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس موقع پر درست اندازہ لگانا دشوار تھا۔ وہ کوئی کتا یا بلی ہوسکتی تھی یا اس کے علاوہ کوئی اور جانور...... یا پھر حیوانِ ناطق یعنی انسان۔

گھر کی دیگر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ مکین سو چکے ہیں یا سونے والے ہیں۔ دفعتاً رستم نے ایک سایہ دیکھا جو دبے پاؤں سیڑھیوں کی طرف آرہا تھا۔ رستم ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ مہراں تھی۔ وہ پنجوں پر چلتی ہوئی آئی۔ اس کا انداز اس کے خوف کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچ کر رک گئی جیسے شدید تذبذب میں ہو۔ اسی دوران میں ایک شخص پرالی میں سے نمودار ہوا۔ رستم کو اس کی بس ایک جھلک نظر آئی۔ اس کے قد کاٹھ اور حلیے سے نہ جانے کیوں رستم کو شک ہوا کہ یہ وہی لالٹین بردار شخص ہے جس کے ساتھ اس بستی میں آتے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کریہہ چہرہ رستم کے تصور میں گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ زوردار جھانپڑ بھی یاد آگیا جو رستم نے اسے مارا تھا۔

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے مہراں کا بازو پکڑا اور اسے بڑی وحشت سے پرالی کے ڈھیر میں کھینچ لیا۔ دونوں پرالی میں اوجھل ہوگئے۔ پرالی کے اندر تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مہراں کو اپنی طرف کھینچنے والے شخص کی ''طلب'' مہراں کے جسم سے نبرد آزما ہے۔ رستم حیرانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ کل رات وہ ایک عجیب کیفیت کے زیرِ اثر رستم کے پاس آئی تھی لیکن آج صبح وہ اپنی رات والی کیفیت پر بہت نادم ہوئی تھی۔ اس

نے رستم کے سامنے آنسو بہائے تھے اور بہ زبان خاموشی خود کو ملامت کی تھی لیکن اب صرف چند گھنٹے بعد وہ ایک اور شخص کی بانہوں میں نظر آ رہی تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا۔

''کس سین میں کھو گئے ہو لالے دی جان؟'' گوہرے نے بالکل پاس سے سرگوشی کی۔

رستم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس بوریوں کے درمیانی خلا میں بھیج دیا۔ پرالی کے اندر کی ''سرگرمی'' جاری تھی۔ گاہے بگاہے کانچ کی چوڑیوں کی مدھم کھنک بھی سنائی دے جاتی تھی......رستم کو اندیشہ پیدا ہوا کہ پرالی کے اندر سے مہراں دروازے میں موجود جھری دیکھ لے گی اور مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا اور واپس گوہرا کے پاس آ گیا۔

گوہرا نے ٹوہ لینے کی کوشش کی کہ رستم نے دروازے میں سے کیا دیکھا ہے لیکن رستم نے ٹال دیا۔ یہ لڑکی ایک معمے کی طرح سامنے آئی تھی۔ قریباً بیس تیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی اندر آیا۔ ساتھ میں لالٹین کی روشنی بھی آ گئی۔ چوڑیوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ آنے والی مہراں ہی ہے۔

وہ ایک ہاتھ میں لالٹین لئے جھک کر چلی آ رہی تھی۔ اس کے بالوں میں ابھی تک پرالی کے دو چار تنکے موجود تھے۔ لباس بے ترتیب سا تھا۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ سفید چاول، روٹی، مرغی کا سالن اور دودھ تھا۔ پتا نہیں کیوں رستم کا دل نہیں چاہا کہ مہراں کے ہاتھ کا کھانا کھائے۔ وہ جیسے ایکا ایکی اس کی نظروں سے گر گئی تھی۔ بہرحال اس کے دل کی کیفیت اس کی زبان پر نہیں آئی۔ کچھ بھی تھا مگر وہ اب تک بہت اچھی میزبان ثابت ہوئی تھی۔

کھانا پروسنے کے بعد مہراں نے کہا۔ ''تساں دونوں جانے کے لئے تیار ہو؟''

''اگر تم بھیجنے کے لئے تیار ہو تو ہم بھی تیار ہیں۔'' گوہرا نے جواب دیا۔

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''میڈے بس میں ہو تو میں ساری حیاتی تم کو یہاں رکھوں۔ پر یہ تو تساں بھی جاندے ہو کہ جانا کی مجبوری ہے۔''

گوہرا کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ الوداعی لہجے میں بولی۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں تساں چلے جاؤ گے پھر شاید کبھی تساں سے میل نہ ہو۔ پر پچھلے دو دن مجھ کو ساری حیاتی یاد رہیں گے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ اب پولیس نے رستم اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر رہنا ہے... زندہ یا......'' آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ وہ بڑے افسردہ لہجے میں بولی۔

''میڈی اتنی عقل تو نہیں کہ تساں نوں مشورہ دے سکوں پر اتنا ضرور کہوں گی کہ تساں اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کہیں دور چلے جاؤ۔ کچھ دنوں کے لئے پولیس کی اکھیوں سے دور ہو جاؤ۔''

''اوئے بے وقوف یہاں سے نکلیں گے تو دور ہوں گے ناں۔'' گوہرے نے مرغی کا لیگ پیس ادھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اس کھانے کو آخری سمجھ کر کھا رہا تھا۔

''میڈا یقین ہے کہ تساں نکل جاؤ گے۔ جیہڑا بندہ تساں کو ساتھ لے کر جا رہا ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ سمجھو کہ جادوگر ہے وہ۔'' مہراں نے کہا۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' رستم نے پوچھا۔

''سراج۔ یہ وہی بندہ ہے جو تساں کو شروع میں ملا تھا۔ اصل میں یہ چوکیدار نہیں ہے۔ یہی ہماری ڈھوک کے سرپنچ کا چھوٹا بھائی ہے۔ تساں اس کو غلطی سے چوکیدار سمجھتے رہے ہو۔''

''سرپنچ کا چھوٹا بھائی۔'' رستم نے پوچھا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ سرپنچ کا چھوٹا بھائی تم پر بُری نظر رکھتا ہے۔ تنگ کرتا ہے تم کو۔ جب تم اپنے نشئی بندے کو ڈیرے سے واپس لانے کے لئے جاتی ہو، تو وہ تم سے چھیڑ خانی کرتا ہے۔''

''نن......نہیں۔ وہ دوسرا بھائی ہے۔'' مہراں نے کہا۔ رستم کو لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ رستم کچھ پوچھتا، گوہرا بول اٹھا۔ ''اس بندے کے تھوبڑے کو کیا ہوا ہے۔ کہیں جل گیا تھا؟''

مہراں کی آنکھوں میں کراہت کے سائے لہرائے اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس پر اس کی عورت نے تیزاب پھینک دیا تھا۔''

''واہ۔ یہ تو خوب کہی۔'' گوہرا نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ ''مردوں کے بارے میں تو سنا تھا کہ عورتوں پر تیزاب پھینکتے ہیں لیکن عورت نے......''

''ہاں اس کی عورت نے پھینک دیا تھا۔ اصل میں یہ وہی تیزاب تھا جو اس نے اپنی عورت پر پھینکنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ وہ سیانی نکلی اور پہل کر کے بھاگ گئی ڈھوک سے۔''

''مطلب ہے کہ یہ سارے بھائی ایک جیسے ہیں۔'' گوہرا نے تبصرہ کیا۔

اسی دوران میں باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ مہراں چونکتے ہوئے بولی۔

''میڈا خیال ہے کہ سراج آ گیا ہے۔ تساں تیار ہو جاؤ۔''

''ہم بڑی دیر سے تیار ہیں۔'' گوہرا نے کہا۔

رستم گہری نظروں سے مہراں کو دیکھ رہا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔

مہراں کا کردار ایک نئے رخ سے اس کے سامنے آرہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مہراں سے کچھ کہتا یا پوچھتا کمرے کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ مہراں نے ڈری ہوئی ہرنی کی طرح دروازے کی طرف دیکھا اور جھک کر باہر چلی گئی۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئی۔ اس کے ساتھ جو شخص تھا وہ بدنما چہرے والا سراج ہی تھا۔ اس کی ناک اونچی اور ٹھوڑی لمبی تھی۔ تیزاب کی مار نے اس کی آنکھ کو قریباً گول کر دیا تھا اور چہرے کی کھال کئی جگہ سے سکڑ گئی تھی۔

اس نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے رستم کو دیکھا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ یہ تسی ہو۔ نہیں تو اس دن تساں سے اس طرح گل نہ کرتا۔'' اس کا مخاطب رستم تھا۔

''چلو اس پرانی بات کو بھول جاؤ۔ میں نے بھی تو تمہیں تھپڑ مار دیا تھا۔ انجانے میں ایسا ہوتا ہے۔''

سراج کے پاس خاکی رنگ کی دو بڑی چادریں تھیں۔ یہ چادریں اس نے رستم اور گوہرا کو دے دیں۔ اس کے پاس سفید رنگ کی دو پگڑیاں بھی تھیں۔ یہ پگڑیاں رستم اور گوہرا نے منڈاسوں کی طرح اپنے چہروں سے لپیٹ لیں۔ ''چلو جی چلیں۔'' سراج نے کہا۔ ''یہی وقت ہے یہاں سے نکلنے کا۔ پلس والے ڈیرے پر کھانا شانا کھا رہے ہیں۔''

وہ دونوں سراج کے ساتھ اس نیم تاریک کمرے سے نکل آئے جہاں انہوں نے باداموں اور خشک خوبانیوں کے ساتھ تقریباً 24 گھنٹے بسر کئے تھے۔ وہ چھت پر پہنچے۔ ڈھوک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مہراں خاموش کھڑی تھی۔ ''مینڈے کولوں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو تساں ماف کر دینا۔'' وہ رستم کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔

''غلطی تو تم نے بہت بڑی کی ہے...... لیکن خیر۔'' رستم نے گہری سانس لی۔

وہ تینوں احتیاط سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئے۔ نیچے کے کسی کمرے سے بچی کے رونے اور نشئی ظفری کے کھانسنے کی آوازیں ایک ساتھ آرہی تھیں۔ برآمدے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ وہ تینوں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گلی میں پہنچ گئے۔ نیم پتھریلی گلی کے دونوں طرف گھروں کے چوبی کواڑ بند تھے۔ ان کواڑوں کے پیچھے چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی مدھم اور سہمی سہمی نظر آتی تھی۔ یہ ڈھوک، خاموشی کی ڈھوک بنی ہوئی تھی۔

قریباً نصف فرلانگ تک بستی سے باہر جانے کے بعد سراج درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں پہنچا۔ یہاں اُنیس بیس سال کا ایک دراز قد لڑکا بھی موجود تھا۔ وہ بھی مقامی

لباس یعنی تہہ بند اور چولے میں تھا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ اس کی چادر میں ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ وہ کچھ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس لڑکے نے بھی بڑی دلچسپی اور توجہ سے رستم کو دیکھا اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ لڑکے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ سراج نے اس سے رستم کا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔

''یہ کون ہے؟'' رستم نے سراج سے پوچھا۔

''فدا نام ہے جی اس کا...... فدا بہاول۔ ایک سال پہلے ڈھوک ہاناں میں ایک پولیس والے سے اس کی مارا ماری ہوئی تھی۔ یہ اس پولیس والے کا ایک دانت توڑ کر دوڑ گیا تھا۔ بعد میں یہ ہماری ڈھوک میں ''دتھی'' گیا۔ اب یہ ڈرا ہوا ہے۔ ڈھوک پولیس کے گھیرے میں ہے۔ اس کو خطرہ ہے کہ کہیں تلاشیوں اور شناختوں میں یہ بھی نہ پکڑا جائے۔''

''اب یہ کہاں جا رہا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''تساں دونوں کے ساتھ ہی یہاں سے نکل رہا ہے۔'' سراج نے جواب دیا۔

لڑکے نے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ زیادہ موٹا تازہ نہیں تھا لیکن پھرتیلا اور کسی حد تک دلیر نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی روشن تھیں۔ اسے دیکھ کر رستم کو وہ دن یاد آگئے جب اس نے بھی سماج کے ٹھیکیداروں سے ٹکر لی تھی۔ اپنی آپاں کی توہین کرنے والے خودسر بدمعاشوں کو للکارا تھا اور ان کو خونم خون کیا تھا۔ ان دنوں اس کے چہرے پر بھی ایسا ہی جوشیلا لڑکپن تھا۔

درختوں کے اس جھنڈ میں جنگلی انجیر، بیری اور کھنگر کے بہت سے درخت تھے۔ بھربھرے پتھروں اور کٹی پھٹی زمین نے اس جگہ کو گھیرا ہوا تھا۔ سراج انہیں لے کر ایک نشیب میں اُتر گیا۔ یہ نشیب ایک کھائی کی طرح تھا اور سامنے سے بند نظر آتا تھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ یہاں جھاڑ جھنکار اور خودرو گھاس کے درمیان ایک تنگ خلا موجود تھا۔

سراج ترچھا ہو کر اس خلا میں گھسا اور اس کے پیچھے رستم اور گوہرا بھی گھس گئے۔ آخر میں لڑکا فدا حسین آیا۔

اس طرح کی دراڑ نما جگہیں یہاں قدم قدم پر مل جاتی تھیں لیکن کون سی درز یا سرنگ منزل تک پہنچائے گی اور کون سی ایک ہی جگہ پر گھما گھما کر راہی کو دیوانہ کر دے گی یہ خاص خاص لوگ ہی جانتے تھے۔ کھرا اٹھانے والے کھوجیوں کی طرح یہ فن بھی یہاں ورثے میں ملتا تھا اور نسل در نسل چلتا تھا۔ دراڑ میں گھسنے کے بعد سراج نے اپنے لباس میں سے ایک ٹارچ نکال لی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ کئی جگہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ انہیں ترچھا ہو کر یا زمین پر رینگ کر گزرنا پڑا۔ زمین کی سطح سے بیسیوں فٹ نیچے ایسی قبر نما جگہوں میں

موجود ہونا ایک ایسا تجربہ ہے جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انسان خود کو حبس اور گھٹن کے ایک ناقابلِ بیان شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

یہ دراڑ قریباً ایک فرلانگ تک سیدھی چلتی رہی پھر شاخ در شاخ تقسیم ہونا شروع ہوگئی۔ ایسی بھول بھلیاں سامنے آ رہی تھیں کہ کئی جگہ کہنہ رہبر بھی ذرا چکرا جاتا تھا۔ اس سفر میں انہیں حشرات الارض، چوہوں اور چوہوں کی پیدا کردہ شدید بُو سے واسطہ پڑا۔ یہ سفر طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ ''یار! کہیں اسی طرح لاہور پہنچانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟'' گوہرا نے تنگ آ کر کہا۔

''بس دو ڈھائی فرلانگ اور ہے۔'' سراج نے کہا۔

''دو ڈھائی فرلانگ۔'' گوہرا نے زچ ہو کر پوچھا۔

''ہاں..... مگر اب راستہ ذرا سوکھا (آسان) ہو جاسی۔'' سراج نے جواب دیا۔

واقعی کچھ آگے جا کر یہ تنگ دراڑ قدرے کشادہ دراڑ میں تبدیل ہونے لگی۔ یہاں پتھر بہت بھر بھرے تھے۔ گول سنگریزوں سے اَٹی ہوئی دیواروں کا درمیانی فاصلہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو جاتا تھا...... بالآخر وہ منزل کے قریب پہنچ گئے۔ سراج کا پختہ خیال تھا کہ وہ پولیس کے گھیرے سے باہر آ چکے ہیں بلکہ اس کے اندازے کے مطابق انہوں نے کم و بیش تین فرلانگ سے زیادہ فاصلہ طے کیا تھا۔ دراڑ نشیب سے بلندی کی طرف جانے لگی، پھر وہ دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں راستہ ایک بار پھر نہایت تنگ ہوگیا۔ گوہرا کو زخمی ہاتھ کی وجہ سے بار بار کراہنا پڑ رہا تھا۔ کسی وقت وہ خود کو زخمی کرنے والے نامعلوم رائفل مین کو گالیاں بھی دیتا تھا۔

سراج نے ان تینوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود نوّے کے زاویے پر جھک کر چلتا ہوا دہانے کی طرف گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا سا پریشان تھا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کا بدنما چہرہ کچھ اور بھی بدنما دکھائی دیتا تھا۔ ایک عجیب سی کراہت جاگتی تھی دل میں۔ (اور مہراں چند گھنٹے پہلے اسی کراہت کے ساتھ پرالی کے ڈھیر میں موجود تھی)

''کیا بات ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' وہ بولا تو اس کے منہ سے بدبو کا بھبکا نکلتا محسوس ہوا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''باہر پلسیوں کی گاڑی موجود ہے۔ میںڈا خیال ہے کہ اس میں کوئی خرابی ہے۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا ہے۔ تین چار پلسیے اس کے آلے دوالے کھڑے ہیں۔''

''پھر کیا کرنا ہے؟'' گوہرے نے پوچھا۔

''ان کے جانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تساں بےفکر رہو۔ ہم خطرے والی جگہ سے کافی دور تھی گئے ہاں (آگئے ہیں) اگر یہ پولیس والوں کی ''ماں'' یہاں خراب نہ ہوتی تو ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

رستم نے خود دہانے کے پاس جا کر دیکھا۔ دہانہ کیا تھا بس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جہاں سے ایک بندہ پھنس پھنسا کر گزر سکتا تھا۔ رستم کو دس پندرہ گز کے فاصلے پر پولیس کی ایک جیپ آڑھی ترچھی کھڑی نظر آئی۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ چار اہلکار جیپ کے قریب موجود تھے۔ ان میں سے دو رائفل بردار سنتری تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید دو تین مزید افراد بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ سراج ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ فی الوقت یہاں سے نکلنا خواہ مخواہ مصیبت کو دعوت دینا تھی۔ انہیں ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ چاروں دہانے سے کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ قریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک ہموار اور کشادہ جگہ انہیں آرام کرنے کے لئے موزوں نظر آئی۔ یہاں ٹھنڈک بھی نہیں تھی۔ وہ نیم پتھریلی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سراج شکل و صورت سے کرخت لگتا تھا مگر رستم کے سامنے وہ بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے دبے دبے لہجے میں رستم سے ایک دو سوالات کئے اور روکھے پھیکے مختصر جواب پا کر خاموش ہوگیا۔

ابھی رستم اور گوہرا کو سراج کی ضرورت تھی۔ دہانے سے نکلنے کے بعد بھی انہیں تین چار میل تک سراجے کی رہنمائی میں جانا تھا، ورنہ شاید وہ اسے یہیں سے واپس کر دیتے۔ نوجوان لڑکے فدا کے پاس ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ اس نے پوٹلی میں سے آلو والے پراٹھے نکالے اور بڑے خلوص و اشتیاق سے رستم کو کھانے کی دعوت دی۔ رستم نے یہ دعوت قبول نہیں کی تاہم گوہرا نے ایک پراٹھا لے لیا۔ دہانہ یہاں سے کافی دور تھا اس لئے انہوں نے ایک ٹارچ روشن کر لی۔ ٹارچ کی زرد روشنی نے اردگرد کے منظر کو اور بھی پُراسرار کر دیا۔ یہاں شاخ در شاخ دراڑیں تھیں۔ ان دراڑوں میں چکرانے والی ہوا کسی وقت عجیب سی آواز پیدا کرتی تھی۔ پُرہول اور گونجتی ہوئی آواز۔ جیسے کوئی درندہ کسی کچھار میں چھپا ہوا اور گاہے بگاہے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہو۔

رستم نے ایک ٹارچ لی اور ان دراڑوں کو دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔ گوہرا نے سگریٹ سلگا لی اور ایک پتھر کو سرہانہ بنا کر نیم دراز ہوگیا۔ رستم قریباً آدھا گھنٹہ ان بھول بھلیوں میں چکرانے کے بعد واپس آیا تو گوہرا اور سراج سو رہے تھے۔ سراج غالباً نشے میں بھی تھا۔ اس کی نیند بے

خبری کی تھی۔

لڑکا فدا حسین جاگ رہا تھا۔ رستم کو واپس آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رستم کے بیٹھنے کے لئے جگہ اپنے کپڑے سے صاف کی۔ رستم اس کے پاس ہی بیٹھ گیا.....اس نے سراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے جانتے ہو؟''

''جی ہاں۔ اسے کون نہیں جانتا۔'' لڑکے نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ ڈھوک کے سرپنچ کا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی بیوی نے اس کے منہ پر.....''

''ہاں ہاں مجھے پتا ہے۔'' رستم نے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ شخص عورتوں کا رسیا ہے۔''

''بہت زیادہ جی۔ ایک وقت میں کئی عورتوں سے اس کا چکر رہتا ہے۔ آج کل ڈھوک کی دو عورتوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ ایک اس کے چھوٹے چاچے کی نوکرانی ہے۔ دوسری نشئی ظفری کی گھر والی ہے۔''

''نشئی ظفری کی گھر والی؟'' رستم نے فدا حسین کو کریدا۔

''جی ہاں۔ جوان لڑکی ہے اور سوہنی بھی ہے۔ نشے باز بندے کی وجہ سے وچاری کو گھر سے باہر نکلنا پڑا ہے۔ اپنے سورے (سسر) کے ساتھ مل کر باغیچے کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اب تو ویران کھیتی میں ہل چلانے کا بھی سوچ رہی ہے وچاری۔ اس کے بندے کو نشے میں غرق کرنے والا بھی یہی سراجا ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ہیروئن لا کر دے دیتا ہے اسے۔ ہیروئن پلا کر ظفری کو اپنے ڈیرے پر ہی سلا دیتا ہے۔ جب اس کی بیوی مہراں، ظفری کو لینے ڈیرے پر جاتی ہے تو اس سے چھیڑ خانیاں کرتا ہے۔ وچاری کی جان مشکل میں آئی رہتی ہے لیکن اب تو خیر مہراں نے ڈیرے پر جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

فدا حسین بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا تاکہ آواز سراجے کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

رستم نے پوچھا۔ ''سرپنچ دوسا کا کوئی اور بھائی بھی ہے؟''

''بس ایک تھا جی۔ وہ تین سال پہلے قتل ہو گیا تھا۔''

رستم کو یقین ہو گیا کہ مہراں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے بات پر پردہ ڈالنے کے لئے رستم کو بتایا تھا کہ سرپنچ کا جو بھائی اس سے چھیڑ خانی کرتا ہے وہ سراج نہیں ہے۔ اب لڑکا بتا رہا تھا کہ سرپنچ کا ایک ہی بھائی ہے۔

صورتِ حال رستم کے سامنے بالکل واضح ہو گئی تھی۔ آج اس تاریک رات میں ڈھوک شاہاں کی جفاکش مٹیار مہراں نے ایک عجیب کام کیا تھا۔ ایک انوکھی قربانی دی تھی۔ رستم اور

گوہرا کو پولیس کے مہلک گھیرے سے نکالنے کے لئے مہراں نے اپنا آپ کریہہ صورت سراج کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ رستم کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں نے اور اس کی زبان نے پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں کئی بار اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جو مہمان آج اتفاقاً اس کے گھر میں اُترا ہے، وہ پھر کبھی نہیں اُترے گا۔ نہ پھر کبھی ایسی راتیں آئیں گی، نہ پھر کبھی ایک اہم زندگی کو موت کے گھیرے سے نکالنے کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس نے سب کچھ بہت تیزی سے سوچا تھا اور پھر اس کی دیہاتی عقل نے اس سے ایک انوکھا کام کرا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر رستم اور گوہرا کو کوئی شخص پولیس کے محاصرے سے نکال سکتا ہے تو وہ سراجا ہے اور اگر کوئی ہستی اسے اس کام کے لئے آمادہ کر سکتی ہے تو وہ ہستی وہ خود ہے اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام غیر مشروط طور پر نہیں ہوگا۔ اس کام کے لئے ایک کڑی شرط تھی اور یہ شرط مہراں نے پوری کی تھی۔ رستم کو پرالی کے ڈھیر کو متحرک کرنے والی وحشت یاد آئی اور کانچ کی چوڑیوں کی کراہتی ہوئی سی کھنک سنائی دی اور اس کا دل غم سے بھر گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ مرد و زن کے حسین و نرم و نازک رشتے کو مکروہ گندی گالی کیوں بنا دیا جاتا ہے۔

اس نے سوئے ہوئے سراج پر ایک آتشیں نگاہ ڈالی۔ اس کا جی چاہا کہ پتھر اٹھا کر اس کا سر کچل دے۔ رستم کے علم میں یہ سب کچھ اس وقت آیا تھا جب سب کچھ ہو چکا تھا۔ اگر اسے پہلے بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ مہراں کو اس صورتِ حال سے کبھی نہ گزرنے دیتا۔ اب بھی وہ سراج کو معاف کرنے والا نہیں تھا۔ سراج کا جرم معمولی نہیں تھا۔ اس نے رستم کی مدد کے لئے اپنی ہی ڈھوک کی ایک بے بس لڑکی سے بھاری قیمت وصول کی تھی اگر اتفاقاً رستم گھر کی چھت پر پرالی کے ڈھیر میں ہونے والی نقل و حرکت دیکھ نہ لیتا تو اس کے علم میں کبھی یہ بات نہ آتی کہ سراج نامی اس شخص نے رستم کی مدد کیونکر اور کس جذبے کے تحت کی ہے۔ اب تک جو صورتِ حال رستم کے سامنے آئی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ سراج آئندہ بھی مہراں سے اپنے ''تعاون'' کا خراج وصول کرتا رہے گا۔ آج شب کی گناہ آلود تاریکی میں جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد رستم اٹھا اور دوبارہ دراڑ کے تنگ دہانے کی سمت گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ پولیس کی جیپ اب نظر نہیں آ رہی۔ وہ واپس آیا اور سراج کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ سراج ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بڑی سرور انگیز نیند تھی اس کی۔ چند گھنٹے پہلے اس نے اپنے اندر کی آگ سے چھٹکارا پایا تھا۔ اب وہ بڑا پُرسکون نظر آتا تھا۔

وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ پھر رستم کو اپنے روبرو دیکھ کر قدرے متوو ب ہو گیا۔

''تساں دیکھیا ہے کہ باہر کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں جیپ چلی گئی ہے۔''

وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تو پھر چلتے ہیں جی۔''

''چاچا سراج، تمہارے حصے کا پراٹھا پڑا ہے۔'' لڑکے فدا حسین نے کہا۔

''نہیں۔ پھر کھالوں گا۔''

''پھر کا کیا پتا۔ ابھی کھالو۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

فدا حسین نے پوٹلی کھولی اور ایک ایک پراٹھا رستم اور سراج کے سامنے رکھ دیا۔ سراج جھجک رہا تھا۔ رستم نے نوالہ توڑا تو وہ بھی کھانے لگا۔ ابلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ ادرک اور پیاز کے ٹکڑے اور انار دانہ بھی ڈالا گیا تھا۔ مزے دار چیز تھی۔

رستم نے سراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری مدد کا بہت شکریہ بھئی۔ تم نے خود کو خطرے میں ڈالا اور کافی محنت کی۔''

''بس جی۔ جب مجھے ظفری کی بیوی سے پتہ چلیا کہ تساں ہماری ڈھوک میں موجود ہو اور تساں کو مدد کی ضرورت ہے تو میرے دل پر ہتھ پڑا۔ میں نے سوچیا، اللہ نہ کرے اگر تساں کو ہماری ڈھوک میں کچھ ہوا تو میں ساری حیاتی اپنے آپ سے شرمندہ رہوں گا۔ اوپر والا تساں کو لمبی جندگی دے۔ ہم کو تساں کی بڑی لوڑ (ضرورت) ہے۔''

سراجا خوشامدیوں کے لہجے میں بول رہا تھا اور اس کے الفاظ سے منافقت کی بُو اُٹھ رہی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رستم پر احسان جتا رہا ہے اور مستقبل میں اس سے فائدے کی توقع بھی رکھتا ہے۔ پانچ چھ بڑے بڑے لقموں میں سراجے نے قریباً ایک فٹ قطر کا پراٹھا باآسانی ہڑپ کر لیا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا آخری کھانا کھالیا ہے۔

رستم نے بھی اپنا پراٹھا ختم کر لیا تو وہ چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا رخ دہانے کی طرف تھا۔ دہانے سے باہر نکل کر انہیں ہلکی سی سردی اور تیز ہوا کا احساس ہوا۔ مدھم چاندنی نے ٹیلوں کے بالائی کناروں کو تاریک آسمان کے پیش منظر میں نمایاں کر رکھا تھا۔ وہ ٹیلوں کے درمیان احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ ان کے عقب میں ڈھوک شاہاں کی چند ٹمٹماتی روشنیاں خاصی دور رہ گئی تھیں۔ بے شک خطرہ تو آگے بھی موجود تھا لیکن یہاں وہ محاصرے والی کیفیت نہیں تھی۔ ایک تنگ گزرگاہ سے گزرنے کے بعد وہ قدرے کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے آگے وہ اکیلے سفر کر سکتے تھے۔ ان کی بائیں طرف چالیس پچاس فٹ گہرا نشیب

تھا۔ دائیں طرف سطح مرتفع دور تک چلی گئی تھی۔ اس پر جھلیکھڑی..... کھنگر اور بیری کے پودے تھے۔ ہلکی ہوا سے رستم کے لمبے بال ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔ سراج اب واپس جانے کے لئے تیار تھا۔ وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''میںڈے خیال میں اب تساں کو ان چادروں اور پگڑیوں کی ضرورت نہیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ یہ چادریں اور پگڑیاں اسے واپس دے دی جائیں۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اب تمہیں بھی ان چیزوں کی ضرورت نہیں کیونکہ اب تم واپس ڈھوک نہیں جا رہے ہو، کہیں اور جا رہے ہو۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں جی؟'' سراجا قدرے حیران ہو کر بولا۔

''مجھے یہاں تک پہنچانے کی کیا قیمت لی ہے تم نے؟'' رستم کا لہجہ سفاک تھا۔

''کک...... کیسی قیمت سیال جی؟''

''ظفری کی بیوی کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟''

سراجے کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ پھڑکنا شروع ہو گئے۔ رستم نے ہاتھ بڑھا کر گوہرا سے ٹرپل ٹو رائفل لے لی۔ اس کا انداز خوف ناک تھا۔ سراج بے ساختہ تین چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''سس... سیال جی! تساں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مم...... میں نے تو......''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ رستم کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ معافی تلافی کا وقت گزر گیا ہے۔ رستم نے ٹرپل ٹو رائفل کو دستے کی بجائے بیرل کی طرف سے پکڑ لیا تھا۔ اچانک اس نے رائفل کو سر سے بلند کر کے ایک بھرپور وار سراجے کی پیشانی پر کیا۔ اس شدید وار سے ناریل کے چٹخنے کی سی آواز پیدا ہوئی۔ سراجا نشیب کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ چوٹ کھا کر وہ ڈکرایا اور الٹ کر کھائی میں گرا۔ نشیب کی طرف اس کا سفر چالیس پچاس فٹ سے کم نہیں تھا اور نیچے نوکیلے پتھر تھے۔ اس کے گرنے سے ''دھپ'' کی آواز پیدا ہوئی اور خاموشی چھا گئی۔

لڑکا فدا حسین تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رستم نے ٹرپل ٹو گوہرا کو واپس کی اور اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔

رستم اور گوہرا ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر نشیب میں اُترے۔ یہاں سراجا اوندھے منہ بے سدھ پڑا تھا۔ اس میں زندگی کے معمولی آثار باقی تھے۔ رستم کے اشارے پر گوہرا نے سراجے کی مشکل آسان کر دی۔ رائفل کے کندے کی دو شدید ضربوں نے سراجے کی کھوپڑی بالکل توڑ دی۔ گوہرا ٹارچ جلا کر سراج کے مرنے کی تسلی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ضرورت

نہیں تھی۔ ویسے بھی ٹارچ جلانا خطرناک تھا۔ رستم نے اسے روک دیا۔ نیم تاریکی میں ہی رستم نے سراج کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی ایک جیب سے وہ پانچ ہزار روپیہ برآمد ہوا جو اس نے فدا حسین سے اینٹھا تھا۔ اس کے علاوہ دو ڈھائی سو کی نقدی، سگریٹ، ہیروئن کی دو تین پڑیاں اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی اس کے کپڑوں سے برآمد ہوا۔

اس کی لاش کو وہاں پتھروں کے درمیان چھوڑ کر رستم اور گوہرا واپس اوپر کی طرف روانہ ہوگئے۔ رستم نے سراج کا پستول اور تھوڑی سی نقدی اس کی جیب میں واپس رکھ دی تھی۔

''یہ کس لئے؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''سراج کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ وہ رات کے وقت بلندی سے گر کر مرا ہے۔ اس کی جیبیں بالکل خالی نہیں ہونی چاہئیں۔'' رستم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

رستم چاہتا تھا کہ سراج کی جیب سے نکلنے والے پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ نوجوان فدا حسین کو واپس لوٹا دے لیکن جب وہ اس جگہ پر پہنچے جہاں سے سراج نیچے گرا تھا، تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ فدا حسین راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ سراج والے واقعہ کی وجہ سے وہ بہت دہشت زدہ ہوگیا تھا۔ رستم اور گوہرا نے اسے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آگے بڑھ گئے۔ رستم نے ایک الوداعی نظر نیچے نشیب میں ڈالی۔ تاریک نشیب جہاں بدنما بدفطرت سراج کی لاش دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ مہراں نے...... ڈھوک شاہاں کی مہراں نے آج رات جو کچھ اس کے لئے کیا تھا، اس کا صلہ دینا تو شاید ممکن نہیں تھا لیکن رستم نے اس کا کچھ نہ کچھ مداوا ضرور کر دیا تھا۔

اب رستم اور گوہرا کا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا۔ وہ جلد ہی ''رکھ پیل'' پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سے انہیں جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے اس ریلوے ٹریک تک پہنچنا تھا جو کندیاں اور سرگودھا کو آپس میں ملاتا ہے...... ہاں رستم کا رخ جنوب کی طرف تھا...... جہاں پیر قدرت اللہ تھا۔ اس کی پھیلائی ہوئی منافقت اور شعبدہ بازی تھی اور جہاں بی بی تھی۔ بی بی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ملنا چاہتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں موت تھی اور وہ اس موت سے تھوڑی سی مہلت چرا کر زندہ لوگوں کی طرف جا رہا تھا۔ پوٹھوہار کا ویرانہ اس کے عقب میں تھا اور آباد بستیوں کی طرف سے آنے والی ہوا اس کے جسم کو چھو رہی تھی اور اس کے لمبے چمکدار بالوں کو ہلکورے دے رہی تھی۔ چاند کافی دیر پہلے مغرب میں اوجھل ہو چکا تھا۔ اب رات کے پچھلے پہر آسمان پر پلکیں جھپکتے ستاروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

شانی بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ یہ ہوٹل کا کمرہ تھا۔ اس کا دل اداسی اور غم سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ سب انسپکٹر اختر نے جو کچھ بتایا وہ بہت تشویشناک تھا۔ اس نے حاجی حیات کا پیغام دیتے ہوئے شانی کو اطلاع پہنچائی تھی کہ پولیس، رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف گرینڈ آپریشن کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اب اعلیٰ حکام ڈاکوؤں کے اس ٹولے کو مزید مہلت دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اخباروں میں جو خبریں آ رہی تھیں وہ بھی اسی نوعیت کی تھیں۔

دوسری طرف راجو اور کوکی والا معاملہ بھی بدستور شدید الجھن کا شکار تھا۔ تین چار دن پہلے بہت بڑا ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ یہ خبر ملنے کے بعد کہ چوہدری بشیر نے کمسن کوکی سے شادی رچالی ہے، تاؤ حشام اور اس کے ساتھی غصے سے بے قابو ہوگئے تھے۔ وہ بے حد اشتعال کے عالم میں ہوٹل سے نکلے تھے اور عثمانیہ ہاؤس کا رخ کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ہسپتال میں شانی سے ان کا ٹاکرا ہو گیا تھا۔ شانی نے انہیں بتایا کہ کوکی کے حوالے سے راجو کی پوزیشن کتنی خطرناک ہے۔ وہ بس امید کے سہارے زندہ ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ ہونی ہوگئی ہے اور کوکی بیاہی جا چکی ہے تو وہ اپنی جان لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔ اس موقع پر بابرے نے بھی شانی کا ساتھ دیا تھا اور تاؤ حشام کو اس کے غصیلے ارادوں سے باز رکھنے میں شانی کی مدد کی تھی۔

صورت حال میں شدید تناؤ موجود تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوکی چوہدری بشیر کے عثمانیہ ہاؤس میں دو دن رہنے کے بعد اپنے گھر حیات کالونی واپس آ چکی تھی اور ابھی دوبارہ چوہدری کے پاس نہیں گئی تھی۔ کوکی کے اہلِ خانہ کی ''قید'' بھی شادی کے بعد ختم ہوگئی تھی اور وہ اپنے گھر میں تھے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بے حد توہین آمیز تھا۔ وہ چوہدری کے لئے اپنے غم و غصہ کو بہ مشکل دبا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ شانی نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شور سا سنائی دیا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔ نہ جانے کیوں شانی کی دھڑکن زیر و زبر ہوئی۔ پتا نہیں آج کل ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ جب کوئی دستک ہوتی تھی یا آہٹ سنائی دیتی تھی یا فون کی گھنٹی بجتی تھی، شانی کے دل میں بے وجہ اور بے سبب ایک اضطراب سا پیدا ہوتا تھا۔ نہ جانے کہاں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آواز اٹھتی تھی۔ بے نام آس کا ایک ستارہ سا چمک کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ اب بھی یہ خاموش فون سن کر وہ ایک دم ڈسٹرب سی ہوگئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عارف کمبوہ تھا۔ ''تم نے پہلے جواب ہی نہیں دیا۔'' عارف نے کہا۔

''آواز نہیں آئی تھی۔'' شانی نے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''راجو! تمہیں بلا رہا ہے شانی بہن۔ صبح سے قریباً دس دفعہ کہہ چکا ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بس ایک گھنٹے میں پہنچتی ہوں۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی نشتر ہسپتال میں راجو کے پاس اس کے کمرے میں تھی۔ وہ آج بہت ناراض اور چپ چاپ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات کو جاگتا اور روتا رہا ہے۔

''کیا حال ہے راجو؟'' شانی نے اس کے الجھے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''میرے حال کو چھوڑو۔ مجھے بس یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ کیا کر رہی ہو تم؟'' وہ بے حد بے زاری سے بولا۔ ''کوئی مجھے ٹھیک بات نہیں بتاتا۔ تین دن سے ابا بھی ملنے نہیں آیا۔''

''اب کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''وہی پرانی بات ہے۔ تم ہر روز مجھے تسلی دیتی ہو کہ کوکی میرا حال پوچھنے آئے گی۔ ہر روز میں صبح سے شام تک دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ کوکی تو ایک طرف اس کے گھر والوں میں سے بھی کسی نے صورت نہیں دکھائی ہے۔ دوسری طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

راجو کے تیور دیکھ کر شانی نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ دوبارہ راجو کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے اس کا کمزور ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''راجو! میں نے شروع میں تم سے کیا کہا تھا؟ یہی کہا تھا ناں کہ حوصلہ چھوٹا نہیں کرنا۔ راستے میں مشکلیں آئیں گی، اونچ نیچ بھی ہو گی لیکن ہمارا ارادہ مضبوط ہو گا تو منزل ضرور ملے گی۔ کہا تھا ناں میں نے؟''

راجو کے بگڑے ہوئے تیور قدرے بہتر ہو گئے۔ شانی اسے بڑے نرم اور مہربان لفظوں میں سمجھانے لگی۔ اپنی دانش مندی سے اس کے دل کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھنے لگی۔ وہ شانی کی باتوں میں بہتا چلا گیا اور قدرے پُرسکون ہو گیا۔ شانی نے اسے بتایا کہ جہاں کوکی کی شادی ہونے لگی تھی وہ رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب راجو کی طرف بات چل رہی ہے۔ کوکی کے گھر والوں میں سے زیادہ تر راضی ہیں صرف ایک دو بندے اعتراض کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا اعتراض بھی جلد دور ہو جائے گا۔''

''مجھے پتا ہے کون اعتراض کر رہا ہو گا۔ چاچا سیف ہو گا۔ اسے مجھ پر بڑا غصہ ہے اور ابے پر بھی۔ اگر...... اگر تم کہتی ہو تو میں...... اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔'' وہ رک رک کر بولا۔

شانی حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ سچ کہتے ہیں محبت لوگوں کو اور ان کے دلوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ نوخیز لڑکا کس قدر بدل گیا تھا۔ میانہ کی حویلی میں یہ ایک بگڑا تگڑا چوہدری زادہ تھا۔ بات بعد میں کرتا تھا، گالی پہلے دیتا تھا۔ زرق برق کپڑے پہن کر راجا اندر کی طرح حویلی کی چار دیواری میں دندناتا تھا لیکن آج حالات کی بھٹی میں تپ کر اس کا میل کچیل صاف ہو گیا تھا۔ یہ کوکی کے غریب باپ سے معافی مانگنے کی بات کر رہا تھا۔

''نہیں راجو، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کہ چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کی آنکھوں میں آس کے بجھے ہوئے دیے پھر جلنے لگے۔ وہ ذرا اوپر کو کھسکا اور تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کا ہاتھ شانی کے ہاتھ میں رہا اور وہ اسے تسلی دیتی رہی۔

راجو نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ''پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے... میرا دل چاہتا ہے کہ کوکی سے میرا ویاہ ہو جائے تو میں اسے لے کر کہیں دور نکل جاؤں۔ کسی دوسری جگہ جہاں نہ کوئی رشتے دار ہو نہ کوئی سجن، نہ کوئی دشمن۔''

''لیکن تمہیں تو کچھ آتا نہیں ہے۔ کیا کرو گے، اسے کھلاؤ گے کہاں سے؟''

''میں کوکی کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تم دیکھنا، میں کرنے پر آ گیا تو پیسے کے ڈھیر لگا دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں خواب تھے۔ شانی نے اسے بولنے دیا۔ وہ بولتا گیا۔ ''میری طرف سے اور ابے کی طرف سے کوکی کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں، میں اس کی ساری کسر پوری کر دوں گا۔ اتنا خوش رکھوں گا، اسے اتنا خوش رکھوں گا کہ وہ حیران ہو جائے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو سرگودھا شہر سے تھوڑی دور ہماری پندرہ ایکڑ نہری زمین ہے۔ اس میں امرود اور مالٹے کا ایک بڑا باغ بھی ہے۔ اس باغ میں میرے دادا کے زمانے کی ایک چھوٹی سی حویلی ہے۔ میں اس حویلی کو ٹھیک ٹھاک کراؤں گا۔ میں اور کوکی وہاں جا کر رہیں گے۔ بس ہم ہوں گے یا ایک دو نوکرانیاں ہوں گی اور کوئی نہیں ہو گا۔''

شانی اس کی رومانی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ''اتنی دور چلے جاؤ گے۔ نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ پریشان نہ ہو جاؤ گے۔''

اس نے اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ہسپتال کی سفید چھت کو گھورتے

ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ کوکی صرف اور صرف میرے لئے ہو.....اور میں صرف اور صرف کوکی کے لئے۔ کوکی پر کسی کی میلی نظر نہ پڑے اور تو اور اسے ہوا بھی چھو کر نہ گزرے۔ پتا نہیں میں کیوں ایسا ہو گیا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے، اسے ہر ایک سے چھپا لوں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور تب شانی کی طرف رخ پھیرا لیکن اس سے نظر ملائے بغیر بولا۔ ''کیا وہ بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچتی ہے؟''

''وہ تم سے بھی زیادہ سوچتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے تمہارا نام لیتا ہے تو اس کی آنکھوں میں اتنی پیاری چمک آتی ہے کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

راجو کہیں کھو سا گیا۔ جیسے تصور کی نگاہ سے اپنی کوکی کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک دیکھ رہا ہو۔ شانی کسی دوسری سوچ میں کھو گئی۔ یہ ایک تکلیف دہ سوچ تھی۔ راجو کے جذبات کوکی کے بارے میں وہی تھے جو ایک نوخیز عاشق کے ہو سکتے ہیں۔ وہ اسے صرف اور صرف اپنے لئے خاص دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ کوئی دوسرا مرد اسے ہاتھ لگائے.....اور اس سے جسمانی قربت قائم کرے۔ چند دن پہلے اس نے اپنی کوکی کو کسی دوسرے کا ہوتے دیکھا تو زہریلی گولیاں پھانک لی تھیں۔ زندگی سے منہ موڑ لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کی تھی لیکن ہوا پھر بھی وہی تھا جو قدرت کو منظور تھا۔ کوکی ایک اَن چاہی شادی کے نام پر بسترِ ہوس کی زینت بنی تھی اور کچلی مسلی گئی تھی۔ اب وہ کلی سے پھول بن چکی تھی اور یہ ایسا پھول تھا جس کی ہر پتی پر کسی دوسرے مرد کی موجودگی کے انمٹ نشان تھے.....سوال یہ تھا کہ کیا راجو کو یہ صورتِ حال قبول ہوگی۔ کیا وہ الھڑ دوشیزہ کی جگہ ایک کچلی مسلی کوکب کو قبول کرے گا۔

اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو پھر راجو بھی کون سا ''کنوارہ'' تھا۔ کوکی سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنے جاہل باپ کے بہکاوے میں آیا تھا اور اس نے خود کو عیش و عشرت میں گم کر دیا تھا..... کئی ماہ تک میانہ میں تاؤ حشام کی حویلی نے نشاط گاہ کا روپ اختیار کئے رکھا تھا۔ حویلی کی جوان نوکرانیوں نے عہدِ قدیم کی کنیزوں کا روپ دھار لیا تھا اور میانہ کے نوعمر ولی عہد کو عیش و طرب کے نت نئے جہانوں کی سیر کراتی رہی تھیں۔

اس اعتبار سے کوکی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ تو صرف ایک مرد سے آشنا ہوئی تھی اور وہ بھی سخت مجبوری اور گریز کی حالت میں لیکن کچھ بھی تھا شانی جانتی تھی کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں کا معاشرہ مردوں کے لئے لاتعداد رعایتیں فراہم کرتا ہے اور عورت کے لئے ایک دم سخت اور بے لچک ہو جاتا ہے.....جو کچھ بھی تھا اب راجو کے لئے

ضروری تھا کہ وہ اپنے لئے ایک درمیانی راستہ اختیار کرے۔ ایک ایسا راستہ جو اس کی اور کوکب کی زندگی اور محبت کا راستہ ہو۔

شانی، راجو سے یہ بات کرنے کے لئے کئی دنوں سے پَر تول رہی تھی۔ اب اس بات کو مزید التوا میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ شانی نے حوصلہ جمع کیا اور راجو سے کہا۔ ''راجو! میں تم سے ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟''

''ہاں پوچھو۔'' وہ اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں بولا۔

''تم کوکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ کوکی بھی تم کو بہت چاہتی ہے۔ تم ایک دوسرے کے لئے جان دینے کو تیار ہو...... ہو کہ نہیں؟'' راجو نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ماضی میں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، لیکن اب تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو کہ کوکی کے علاوہ کوئی اور لڑکی تمہارے قریب آئے۔ اسی طرح کوکی بھی نہیں چاہے گی کہ تمہارے علاوہ کسی کا سایہ بھی اس پر پڑے۔ وہ صرف اور صرف تمہاری بننا چاہتی ہے اور دن رات تمہاری بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بستر پر کیوں لگتی اور ڈولا کئی مہینوں تک تمہیں دربدر کیوں ڈھونڈتا پھرتا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے ناں؟''

''ہاں آ رہی ہے۔ پر اصل بات کیا ہے؟'' راجو کی آنکھوں میں ہلکا سا اندیشہ جاگ گیا۔

شانی بولی۔ ''راجو! تم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرو۔ خدانخواستہ..... خدانخواستہ چاچے سیف کے گھر میں کوئی ڈاکو گھس جاتا ہے۔ وہ کوکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ خدانخواستہ وہ اس کو بے بس کر کے اس کی عزت سے کھیل جاتا ہے۔ کوکی پوری کوشش کے باوجود کچھ نہیں کر سکتی......ایسے میں کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟'' راجو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تم بتاؤ ناں کیا ہوگا۔ کوکی کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس میں کوکی کا تو کوئی قصور نہیں ہوگا۔ وہ تو کمزور اور بے بس ہے۔ اس کے گھر والے اسے بچا نہیں سکے۔ اس نے ڈاکو سے خود کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی اور پھر مجبور ہو گئی۔ وہ جس طرح لوٹے جانے سے پہلے تم کو چاہتی تھی اس طرح بعد میں بھی چاہتی ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کرو گے؟''

وہ خالی خالی نظروں سے شانی کو دیکھتا رہا۔ وہ بات سمجھ رہا تھا لیکن جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شانی نے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسا ہو جائے تو اسے پیار کرنے والے کے پاس دو راستے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ اسے ناپاک اور جھوٹا سمجھ کر چھوڑ دے اور

اس کی بے بسی کے لئے اسے زندگی بھر کی سزا دے دے۔ دوسرا یہ کہ وہ لڑکی کو بے قصور و مجبور سمجھے اور اس سے اسی طرح پیار کرتا رہے جس طرح پہلے کرتا تھا۔ یہ خیال بھی دل میں نہ لائے کہ وہ بدل گئی ہے یا اس میں کچھ بدل گیا ہے۔ تم بتاؤ کہ اب ان میں سے کون سا راستہ انصاف کا ہے اور بہتر ہے؟''

راجو نے پریشان ہو کر کہا۔ ''لیکن...... تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔ کک...... کیا کوکی کے ساتھ...... میرا مطلب ہے...... ؟''

''کوکی کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ میں تمہیں ساری بات بتاؤں گی لیکن پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ ہم نے کچھ دیر کے لئے فرض کیا ہے کہ ایک ڈاکو نے کوکی کے گھر والوں کو اور کوکی کو بے بس کر کے اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ اس بُرے سلوک کے ساتھ تم کوکی کو معاف کر دو گے، اس کے آنسو پونچھو گے یا اس کو ہمیشہ کے لئے زندگی سے دور کر دو گے؟''

''میں اس کے آنسو پونچھوں گا...... اگر اللہ نہ کرے اس کے ساتھ کوئی زبردستی کر جائے تو اس میں وہ بے قصور ہے۔''

''تم اس کے جسم کو اُجڑا اور ناپاک تو نہیں سمجھو گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں؟''

''مم...... مجھے پتا نہیں لیکن...... تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم اس کے جسم کو اُجڑا اُجڑا کیوں نہیں سمجھو گے۔ اس لئے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتی ہے اور محبت دل سے کی جاتی ہے اور جب دل صحیح سلامت ہو تو پھر جسم میں آنے والی تبدیلی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''تمہاری باتیں پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں، لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا اور اصل بات جاننا چاہتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ اب بات فیصلہ کن مرحلے میں پہنچ چکی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور راجو کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''راجو! زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے اور اسے قبول کر لینے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ناپسندیدہ چیز کے اندر ہی کوئی نہ کوئی خوشی بھی ہمارے لئے چھپی ہوتی ہے۔ جیسے کانٹے کے ساتھ پھول، مکھی کے ڈنک کے ساتھ شہد اور گھٹن کے ساتھ بارش۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ آج میں تمہیں جو ناپسندیدہ بات بتا رہی ہوں...... اور جو تمہیں صدمہ بھی پہنچائے گی، وہ یہ

ہے کہ...... کوکی کے ساتھ واقعی ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ میں نے شروع میں جو ڈاکو اور زبردستی والی بات تمہیں بتائی ہے، وہ درست ہے۔''

راجو کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور کراہ کر بولا۔ ''یہ...... کیا کہہ رہی ہو تم...... تم ہوش میں تو ہو۔ کیا ہوا ہے کوکی کو؟''

شانی نے سر جھکایا۔ ''ہاں راجو! وہ ایک ڈاکو کے ہاتھوں لٹی ہے اور بڑی مجبوری کی حالت میں۔ اس پر جتنا بھی ترس کھایا جائے کم ہے۔''

راجو کی آنکھیں دکھ آمیز حیرت سے وا ہو گئیں پھر ان آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ''کب ہوا ایسا؟ کس نے کیا؟''

''میں تمہیں بتا دوں گی، لیکن ایک شرط پر...... تمہیں اپنے غصے پر قابو رکھنا ہوگا۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جانا ہوگا اور آگے کی طرف دیکھنا ہوگا۔''

اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو چھلکنے لگے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔''

''پھر وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی۔ نہ اس کے گھر والوں میں سے کوئی آیا ہے۔''

''اس کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔'' شانی نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''راجو! میں نے تمہیں صرف سمجھانے کے لئے بات کو دوسرے طریقے سے کیا ہے۔ کوکی کے ساتھ کسی ڈاکو نے بدسلوکی نہیں کی لیکن اس کے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے اور یہ شادی زبردستی کی گئی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکی۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا اور تو اور میں بھی کچھ نہیں کر سکی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ میں وہ شادی رکوانے کے لئے ہی جا رہی تھی اور میں رکوا بھی سکتی تھی لیکن راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پچھلے ہفتے...... میرے سر پر پٹی دیکھی تھی ناں تم نے؟ وہ اسی حادثے کی نشانی تھی۔''

راجو کانپ رہا تھا۔ ''تو تم نے، تم سب نے جھوٹ بولا کہ کوکی کی شادی رک گئی ہے اور اب اس کی شادی میرے ساتھ ہونے والی ہے۔''

''ہاں راجو، جھوٹ بولا تھا۔'' شانی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''لیکن یہ جھوٹ تمہاری بہتری کے لئے ہی تھا۔ تب تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ تمہیں کچھ بتایا جا سکتا۔ اب اگر میں تمہیں بتا رہی ہوں تو اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اب تم بہت حد تک اپنے حواس میں ہو اور دوسری یہ کہ اب حالات میں بہتری آ گئی ہے۔ وہ شادی جو بس نام کی شادی تھی

تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ کوکی اپنے گھر واپس آ چکی ہے۔ وہ شخص بھی کوکی کو آزاد کرنے پر رضامند ہے۔ میں نے کوکی کے گھر والوں کو راضی کرلیا ہے، چاچا سیف بھی تقریباً مان گیا ہے۔ میں کوکی کو تمہاری دلہن بنانا چاہتی ہوں اور اس کام کے لئے رستہ تقریباً ہموار ہے۔“

راجو سناٹے کی کیفیت میں بیٹھا تھا..... بالکل ساکت و جامد۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ راجو کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک بار پھر شدید ترین ڈپریشن کا شکا ہو جاتا اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ یہ امکان بھی تھا کہ اس کے سارے غم و غصے کا رخ کوکی کی جانب مڑ جاتا۔ وہ اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتا اور اس ساری صورتِ حال کے لئے اسے موردِ الزام ٹھہراتا۔ تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا اور شانی کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرتا۔

اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہوئے اور پھر وہ اَشک بار ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا او۔ چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ ”راجو..... راجو۔“ شانی نے دوبارہ پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب شانی نے محسوس کیا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم میں جنبش تھی، وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

”راجو! دیکھو میری طرف۔ میری بات سنو۔“ شانی نے اسے پلٹنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ایک تیز حرکت سے شانی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”باہر چلی جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

شانی بیٹھی رہی۔ وہ ایسے موقع پر باہر کیسے جا سکتی تھی۔ وہ تو اس سے نظر ہٹانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ (اس سے پہلے مایوسی کے عالم میں راجو جو کچھ کر چکا تھا، وہ بہت خطرناک تھا) وہ راجو کے بیڈ کے قریب کرسی پر موجود رہی۔ وہ اسی طرح لیٹا اور روتا رہا۔ شانی بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ چوہدریوں اور چوہدری زادوں میں عورت کے حوالے سے ایک خاص قسم کی سوچ پائی جاتی ہے۔ ان کے اپنے اندر تو بے شک ہزاروں عیب ہوں لیکن وہ اپنی ”عورت“ کو بے عیب و بے داغ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایسے شدت پسند بھی ہوتے ہیں جو داغی عورت کو جان سے مار ڈالتے ہیں اور اس حوالے سے نسل در نسل چلنے والی دشمنی کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد راجو رخ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ دکھ نہ سکون نرمی نہ سختی۔ وہ ساکت لیٹا تھا۔ شانی دھڑکتے دل سے اس کے ردِعمل کا انتظار کرتی

رہی۔ آخر اس نے شانی کی طرف دیکھا اور ان حالات کے بارے میں پوچھا جن میں کوکی کی شادی ہوئی تھی۔ شانی نے اس موقع پر کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے راجو کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اس نے سب سے پہلے تو راجو پر یہ انکشاف کیا کہ کوکی کی شادی کے حوالے سے ایک عجیب اتفاق ہوا ہے۔ جس شخص کے ساتھ کوکی کی شادی ہوئی ہے وہ راجو کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ وہ چوہدری امانت کا بیٹا اور راجو کا چچازاد چوہدری بشیر ہے۔

اب تک یہ بات راجو سے چھپائی گئی تھی۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے پر اسے شدید جھٹکا لگا۔ شانی نے اسے بتایا کہ اس رشتے میں کسی طرح کی خاندانی رنجش یا رقابت کا ہرگز دخل نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اتفاق تھا۔ یہ اتفاق جس طرح سے پیدا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی شانی نے تفصیل بتائی۔

بعدازاں شانی نے بتایا کہ معاملہ گڑبڑ ہونے کے بعد کس طرح چوہدری بشیر آناً فاناً کوکی اور اس کے گھر والوں کو اپنے گھر عثمانیہ ہاؤس میں لے گیا اور کس طرح وہاں جلدی میں کوکی کا نکاح ہوا۔ یہ ساری تفصیل راجو کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی تاہم وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ شانی نے کوشش کی کہ وہ جو کچھ راجو کو بتا رہی ہے اس میں چوہدری حشام اور چوہدری بشیر میں مخاصمت کا پہلو نمایاں نہ ہو۔

ساری باتیں سننے کے بعد راجو ایک بار پھر گم صم ہوگیا۔ اس کے تاثرات سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ یہ خاموشی بڑی بوجھل تھی۔ کسی وقت تو شانی کو لگتا تھا کہ نہیں پھر کوئی ہنگامہ وجود میں نہ آ جائے۔ پچھلی مرتبہ راجو نے بوتل توڑ کر شیشہ اپنی گردن پر چلا لیا تھا۔ وہ اب بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین۔

آخر تذبذب کی وہ کٹھن ترین گھڑیاں گزر گئیں۔ راجو نے شانی کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لے کر بولا۔ ”میں کوکی سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ جیسی بھی ہے میری ہے.....“ اس کی آواز ہوا کی لہروں میں پھیلی اور اس کی گونج تادیر شانی کے کانوں میں برقرار رہی۔

شانی نے بے اختیار اس کا سر اپنے کندھوں سے لگا لیا۔ وہ چپ چاپ کندھے سے لگا رہا۔ شانی نے کہا۔ ”تم نے ہاں کہہ دی ہے۔ بس اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ تمہیں اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے بڑی محبت اور بڑے یقین سے راجو کی پشت تھپتھپائی اور جذباتی انداز میں باہر نکل آئی۔ شاید ابھی راجو اس سے کچھ مزید سوالات پوچھنا چاہتا تھا لیکن شانی کی عجلت نے

اسے موقع نہیں دیا۔

شانی ہسپتال سے سیدھی عثمانیہ ہاؤس پہنچی۔ سفید فام اسٹیفن اور اس کی خوش اندام بیوی گریس، چوہدری بشیر اور ایک ملازم باغیچے کی طرف موجود تھے۔ وہ ایک پودے کے پاس سر جوڑے بیٹھے تھے اور بڑے انہماک سے کچھ کر رہے تھے۔ شانی کو لگا جیسے وہ کوئی پرندہ مرغی، بطخ وغیرہ ذبح کر رہے ہیں۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ شانی کی آمد سے بالکل باخبر نہیں ہوئے۔ نہ جانے کیوں شانی کو یہ انگریز جوڑا اور اس کی یہاں مصروفیت پُراسرار نظر آتی تھی۔

وہ اندرونی برآمدے میں پہنچی تو سب سے پہلے اسے مُنا ہی نظر آیا۔ وہ دوڑ کر آیا اور شانی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شانی نے اسے پیار کیا۔ وہ پچھلے سات آٹھ دن میں تین چار بار یہاں آ چکی تھی۔ بشیر سے بھی ملاقات ہوتی رہی تھی۔ مُنے نے شانی کی گود میں سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تاتی! تم کپلوں (کپڑوں) سمیت کیوں نہاتی ہو؟''

''میں نہاتی ہوں؟ تمہیں کس نے کہا؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے تمہاری تصویل دیکھی ہے۔''

''تصویر دیکھی ہے؟ کہاں؟'' شانی مزید حیران ہوئی۔

''آؤ، میں دکھاؤں۔'' مُنے نے شانی کی انگلی تھامی اور اسے لے کر خراماں خراماں اپنے ابو کے کمرے میں آ گیا۔ چوہدری بشیر کمرے میں نہیں تھا۔ مُنے نے الماری کا ایک پٹ کھولنے کی کوشش کی، لیکن الماری لاک تھی۔ وہ بندر کی سی پھرتی کے ساتھ کھڑکی کی طرف گیا اور اس کی چوکھٹ پر پاؤں دھر کر الماری کے اوپر پہنچ گیا۔ یہاں سے اس نے چابی حاصل کر لی۔ غالباً یہ ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ اس نے جہازی سائز کی الماری کا ایک پٹ کھولا۔ اندر چند پوسٹر سائز کی فوٹوز کو رول کر کے رکھا گیا تھا۔ مُنے نے ان میں سے ایک بڑے رول کو کھولا اور اپنی آنکھیں جھپک جھپک کر شانی کے سامنے پھیلا دیا۔ شانی بھی حیرت سے پلکیں جھپکنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ اسی کی ایک انلارج کی گئی فوٹو گراف تھی لیکن یہ تصویر اس نے نہیں کھچوائی تھی۔ وہ ایسی تصویر کھچوا ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بڑی بولڈ بلکہ شرمناک تصویر تھی۔ وہ کپڑوں سمیت سوئمنگ پول سے نکلی تھی اور کپڑے بھی پیاز کے چھلکے جیسے تھے۔ یہ اس کے جسم کو چھپانے کی بجائے دکھا رہے تھے۔ یہ بالکل فلمی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ چند سیکنڈ میں شانی سمجھ گئی کہ اس تصویر کے ساتھ کیا کیا گیا ہے۔ چوہدری بشیر کو فوٹو گرافی کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ وہ کمپیوٹر گرافکس کے ذریعے فوٹو گرافی میں نت نئے تجربے بھی کرتا رہتا تھا۔ اس تصویر پر بھی تجربہ کیا

گیا تھا۔ یہ لاہور کی کوٹھی میں چوہدری کے کیمرے سے کھینچی گئی عام سی تصویر تھی۔ چوہدری نے اپنی ذہنی عیاشی کے لئے اسے کمپیوٹر کی مدد سے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

اسی دوران میں کسی قریبی راہداری سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ چوہدری غالباً اپنے غیر ملکی دوست اسٹیفن کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ شانی نے جلدی سے تصویر کو رول کر کے اس پر ربڑ بینڈ چڑھایا اور الماری میں رکھ کر دروازہ مقفل کر دیا۔ چابی اس الماری کے اوپر ہی پھینک دی۔ بہ مشکل چار پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ دروازہ کھلا اور چوہدری بشیر اندر آ گیا۔ اسٹیفن بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اسٹیفن کے ہاتھ میں ٹشو پیپر تھا۔ وہ اس پیپر سے اپنے ہاتھوں کو پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ شانی کو صاف اندازہ ہوا کہ اسٹیفن کے ہاتھ پر خون کے دھبے ہیں۔ یقینی بات تھی کہ وہاں باغیچے میں کوئی پرندہ وغیرہ ذبح ہوا ہے۔

شانی اور مُنے کو کمرے میں دیکھ کر چوہدری اور اسٹیفن دونوں ہی ٹھٹکے۔ پھر بشیر نے خود کو تیزی سے سنبھالا اور بولا۔ ''شانی تم یہاں؟''

''میں ابھی ابھی آئی ہوں۔ مُنا مجھے زبردستی یہاں کھینچ لایا۔''

''وہ میں..... تاتی کو ان کی......''

''یہ مجھے میری ہیئر پن ڈھونڈ کر دے رہا تھا۔ حالانکہ میری ہیئر پن تو گم نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کس کی ہیئر پن دیکھی ہے اس نے۔'' شانی نے جلدی سے بات بدلی اور اس کے ساتھ ہی مُنے کے بازو پر ہلکی سی چٹکی بھی لی۔ وہ کم سن ہونے کے باوجود شانی کا اشارہ فوراً سمجھ جاتا تھا۔

اسٹیفن نے سر جھکا کر شانی کو سلام کیا۔ شانی نے بھی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ اسٹیفن نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے داغ دار ٹشو کو شانی سے چھپانے کی کوشش۔ پھر بشیر اور شانی کو ایک ساتھ ایکسکیوزمی کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

چوہدری بشیر کی موٹی کھال والی پیشانی پر ناگواری کی ایک موٹی شکن موجود تھی لیکن جلد ہی یہ شکن دور ہو گئی۔ اس نے شانی کو خوش دلی سے ویلکم کہا اور اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ شانی بیٹھی تو مُنا بھی اس کے ساتھ بیٹھا۔ ''اوئے مُنا! تم تو دم چھلہ بن کے رہ گئے ہو۔ دو منٹ ہمیں اکیلے بھی بیٹھ لینے دیا کرو۔'' چوہدری خلافِ معمول ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

مُنا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر جلدی سے باہر چلا گیا۔ چوہدری نے سگریٹ سلگانے کے لئے اپنا طلائی لائٹر، واسکٹ کی جیب سے نکالا اور بولا۔ ''میں پرسوں بھی تمہارا

انتظار کرتا رہا۔تم آئی ہی نہیں۔"

شانی نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔"بس،ایک حتمی فیصلے پر پہنچ رہی تھی۔"

"تو پھر... کیا ہوا فیصلہ؟" چوہدری کے لہجے میں شدید اضطراب پوشیدہ تھا۔

"کوئی نیا فیصلہ نہیں ہے۔وہی ہے جس پر پچھلی ملاقات میں بھی بات ہوئی تھی۔" شانی نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

چوہدری کے تنومند چہرے پر روشنی بکھر گئی۔اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لئے اور مطمئن نظر آنے لگا۔بولا۔"چلو ہم ایک بار پھر ساری تفصیل دہرا لیتے ہیں۔اس سے یہ ہوگا کہ سارے پوائنٹ ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہیں گے۔" شانی خاموش رہی۔وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"تو ہمارے درمیان طے ہوا ہے کہ میں کوکی کو آزاد کردوں گا۔وہ جب بھی مجھ سے طلاق لینا چاہے لے سکتی ہے۔شادی کے موقع پر میری طرف سے جو بھی چیزیں اس کے پاس گئی ہیں،وہ چاہے تو انہیں اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ہماری اس علیحدگی کی وجہ سے کوکی کی فیملی پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں آئے گا۔سیف کے بھائی کے علاج......سیف کے مکان......اور اس کے سالے کے لئے میں جو کچھ کر چکا ہوں اس کے لئے کسی طرح کا معاوضہ نہیں مانگوں گا اور وہ سب کچھ اب ماضی کا حصہ ہے۔ٹھیک ہے؟" جواب میں شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہدری بشیر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔"تمہارے پاس سوچ بچار کے لئے اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے پورے چھ مہینے ہوں گے۔تاہم یہ تمہارا وعدہ ہے کہ ان چھ ماہ میں کوئی دوسرا شخص،چاہے وہ کوئی بھی ہو،کسی بھی حوالے سے تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا۔جو کچھ ماضی میں ہوا وہ ہو گیا لیکن اب تم ہر پرانے ناتے سے علیحدہ رہو گی۔" چوہدری ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔جیسے چاہتا ہو کہ شانی اس موقع پر تائیدی انداز میں سر ہلائے لیکن پھر شاید اسے احساس ہوا کہ اس طرح باقاعدہ اقرار کروانا زیادتی ہے۔وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"ان چھ مہینوں میں تمہیں مُنے سے ملنے کی آزادی ہوگی۔اگر تم چاہو تو مہینے میں دو تین دن کے لئے اسے اپنے پاس بھی رکھ سکو گی۔تم فون پر بھی اس سے بات کر سکو گی۔"

مزید دس پندرہ منٹ تک شانی اور بشیر میں اس حوالے سے بات ہوئی۔پھر شانی جانے کے لئے اٹھ گئی۔وہاں سے شانی سیدھی حیات کالونی میں سیف اللہ کے گھر پہنچی۔کافی دنوں بعد آج اس کے دل میں ایک طرح کی خوشی اور اطمینان کا احساس تھا۔اس نے کوکی اور راجو

کے حوالے سے کافی معاملات درست کر لئے تھے۔وہ راجو کو بھی ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی اور دوسری طرف چوہدری بشیر سے بھی کوکی کی آزادی کے لئے بات ہو چکی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو صحن میں سیف اللہ کی موٹر سائیکل نظر نہیں آئی۔اس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے......شاید اپنے سالے کے پاس ہسپتال گیا ہوا تھا۔

جونہی شانی نے صحن میں قدم رکھا سنبل،ثریا،کوکی سب کی سب اسے امید بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ان نظروں میں امید کے ساتھ ساتھ اَن گنت اندیشے بھی تھے اور خاموش دعائیں تھیں۔شانی ان سب کو دیکھ کر مسکرائی۔ان سب کے چہروں پر بھی ہلکی سی روشنی پھیل گئی جیسے سورج کی تابانی سے ستارے چمک اٹھتے ہیں۔

سب سے پہلے کوکی کی والدہ نے ہی زبان کھولی۔وہ شانی کے قریب آتے ہوئے بولیں۔"لگتا ہے کہ میری بچی خیر کی خبر ہی لائی ہے۔"

شانی نے ان کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔"خیر کی خبر ہی ہے خالہ۔"

کوکی اور سنبل کی والدہ نے شانی کو گلے سے لگا لیا اور اس کا سر چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔"ہم ترس گئے ہیں کسی اچھی خبر کو بیٹی......بالکل ترس گئے ہیں۔"

سنبل اور ثریا کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔کوکی ساکت و جامد کھڑی تھی۔جیسے سکتے کی حالت میں ہو۔شانی نے آگے بڑھ کر اس کا نرم و نازک گال چھوا اور سنبل کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔"میری چوہدری بشیر سے بات ہو گئی ہے۔وہ کوکی سے علیحدہ ہونے کو تیار ہے۔اس کے علاوہ راجو سے بھی بات ہوئی ہے۔میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے اور اس نے سب کچھ سن لیا ہے۔اب سب کچھ ٹھیک ہے۔"

کوکی کی والدہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔انہوں نے شانی کو پھر گلے سے لگا لیا۔شانی ان سب میں گھر کر بیٹھ گئی اور انہیں سب کچھ تفصیل سے بتانے لگی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد گھر میں مسرت کا سا سماں تھا۔کوکی تو اندر کمرے میں جا چکی تھی لیکن باقی سب عورتوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔پڑوس سے دو خواتین بھی آ گئی تھیں۔ان سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔کسی نے چپکے سے ایک لڑکے کو پیسے دیئے اور وہ قریبی دکان سے مٹھائی لے آیا۔مٹھائی آئی تو کوتاہ قد ڈولا بھی ساتھ ہی آیا۔اس نے آنکھوں آنکھوں میں شانی سے پوچھا کہ کیا ہوا۔شانی نے آنکھوں آنکھوں میں بتایا کہ سب اچھا ہے۔اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما گیا۔

سنبل اور کوکی کی والدہ نے کہا۔"ڈولے!وہاں کیوں کھڑے ہو؟اندر آ جاؤ تم سے کیا

پردہ ہے۔''

وہ چھوٹے چھوٹے پاؤں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر آ گیا۔ کوکی کی والدہ نے اپنی بڑی بیٹی سنبل سے کہا۔ ''نی سنبل! ڈولے کا بھی منہ میٹھا کرا۔''

چنچل سنبل نے ڈبے سے برفی کی ایک بڑی ڈلی نکالی اور ڈولے کو تھمانے کی بجائے کہا۔ ''ڈولے، منہ کھولو...... شاباش منہ کھولو۔''

ڈولا پہلے تو شرماتا رہا، پھر اس نے اپنا مختصر سا منہ کھولا۔ سنبل نے پوری ڈلی اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ ڈولے کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے منہ چلا کر برفی کو نگلا۔ سنبل نے لہک کر کہا۔ ''بس ایک اور......''

ایک اور ڈلی اس نے ڈولے کے منہ میں ٹھونسی۔ ڈولے کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ''یہ تو برفی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے زہر بھی کھلاؤ گی تو میں آنکھیں بند کر کے کھا لوں گا۔''

سنبل نے مٹھائی کا ڈبا ڈولے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاؤ ڈولا بھائی۔''

ڈولے کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ ''ڈولا بھائی'' کا لفظ جیسے سیدھا اس کے دل پر لگا تھا۔ شانی بخوبی جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ جب شانی تاؤ حشام کی حویلی میں قید تھی، ڈولے نے اسے سنبل کے بارے میں اپنے سارے احساسات بتائے تھے۔ درحقیقت یہ سنبل کی بے لوث محبت ہی تھی جس کی خاطر ڈولا، راجو کو ڈھونڈتا ہوا ملتان سے لاہور اور پھر میانہ گاؤں پہنچا تھا۔ سنبل کے ساتھ کوتاہ قد ڈولے کا ''تعلق'' بہت انوکھا پن لئے ہوئے تھا۔ وہی انوکھا پن جو ''پیار'' کا لازمی جزو ہے۔ یہ پیار کا انوکھا پن نہیں تو کیا ہے کہ پیار اکثر وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے ہوتا ہے جیسے نہیں ہونا چاہیے اور جب ہوتا ہے تب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اپنی راہیں خود منتخب کرتا ہے اور ان راہوں پر اپنی من چاہی رفتار سے چلتا ہے۔ سنبل نے ڈولے کو ''ڈولا بھائی'' کہا تو اس کا چہرہ مٹی کے ٹوٹے ہوئے پیالے جیسا ہو گیا۔ وہ کھسیانے انداز میں ہنسا اور ایک گلاب جامن سنبل کے منہ کی طرف بڑھائی۔ اس کا چھوٹا سا ہاتھ لرز رہا تھا۔ سنبل نے گلاب جامن دانتوں میں دبا لیا۔ پھر مٹھائی کھانے اور کھلانے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس ہنگامے کا فائدہ اٹھا کر ڈولا خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سنبل کمرے کا دروازہ زبردستی کھلوا کر کوکی کے پاس چلی گئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ بند دروازے کے عقب میں چھوٹی بہن کو زبردستی مٹھائی کھلا رہی ہے...... گھر میں عجیب سا ماحول تھا۔ اس ماحول میں خوشی اور آنسو باہم ملے ہوئے تھے۔ ایک مسرت سامنے آ رہی تھی لیکن

ایک نہایت شدید صدمہ جھیلنے کے بعد۔

کوکی کی والدہ نے شانی کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''بیٹی! اب راجو کا کیا حال ہے؟...... مم...... میرا مطلب ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا ناں؟''

شانی نے دھیرے سے کہا۔ ''خالہ، وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ پچھلے دس پندرہ دن سے بالکل ٹھیک ہے۔ اسے تو ہم نے جان بوجھ کر ہسپتال میں داخل کرایا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ وقت سے پہلے باہر آئے اور اسے باہر کے حالات کا علم ہو۔ وہ کل صبح ہسپتال سے فارغ ہو جائے گا۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو آج جا کر اس کی عیادت کر سکتی ہیں۔''

''میں ضرور جاؤں گی بیٹی بلکہ ہم سب جائیں گے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ شانی ان کے بولنے کی منتظر رہی۔ وہ چند سیکنڈ بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''شانی بیٹی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ کیا راجو سب کچھ جاننے کے بعد بھی کوکی کو اپنانے کے لئے......''

''ہاں خالہ! ہاں۔ میں نے پورا یقین کرنے کے بعد ہی آپ سے بات کی ہے۔ آپ بالکل بےفکر رہیں۔''

خالہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہی بہت دکھ دیکھ لیا ہے۔ اب کوئی اور جھٹکا برداشت نہیں ہوگا۔''

''اب کچھ نہیں ہوگا خالہ۔'' شانی نے ان کا سر چوما۔

وہ بولیں۔ ''مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ چوہدری بشیر اتنی آسانی سے ہماری جان چھوڑ دے گا بلکہ مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس بات کا؟''

''کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے اور ہم پر کسی طرح کی سختی کرے۔''

''میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ اب کچھ نہیں ہوگا اور فرض کریں کچھ ہو تو میں ہوں ناں فیس کرنے کے لئے۔''

خالہ ڈبڈبائی ہوئی تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔ یہ حیرت بجا تھی۔ وہ جانتی نہیں تھیں کہ خوش رنگ چڑیا جیسی کوکی کو عقاب صفت بشیر کی طوفانی گرفت سے نکالنے کے لئے پس پردہ کیا قربانی دی گئی ہے۔

شانی نے اہل خانہ سے کل دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور راجو سے ملنے ہسپتال روانہ ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ تاؤ حشام بھی وہیں ہوگا۔ وہ اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرنا

چاہتی تھی   نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ سارا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے ہونے والا ہے۔ اس حوالے سے بہت سے دکھ جھیلے جا چکے تھے۔ بہت سی سزا مل چکی تھی اور بہت سی تلافی کی جا چکی تھی اور جب دکھ جھیل کر کفارہ ادا کر دیا جاتا ہے تو پھر اکثر بگڑے ہوئے معاملے سدھر جاتے ہیں۔

شانی ہسپتال کے وسیع گیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اُتر رہی تھی کہ عارف سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ شانی کو لگا کہ وہ گیٹ پر کھڑا شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پریشان لگتا تھا۔

''یا اللہ خیر!'' شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کا دھیان راجو کی طرف گیا۔

وہ تیر کی طرح شانی کی طرف آیا۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ عارف نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''شانی بہن! ایک عجیب خبر ہے تمہارے لئے، بلکہ ہم سب کے لئے۔''

''کیا ہوا؟'' شانی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''آؤ۔ کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

دو منٹ بعد وہ ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کینٹین میں بھانت بھانت کی بولیوں کا شور تھا۔ عارف نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''خبر رستم کے بارے میں ہے شانی بہن۔'' شانی کے دل کی دھڑکن انتہا کو چھو گئی۔ نہ جانے کیوں تصور میں ایک جسم آ گیا جو بان کی ننگی چارپائی پر پڑا تھا۔ اس پر خون آلود چادر تنی ہوئی تھی اور آس پاس ہٹے کٹے رائفل بردار پولیس والے کھڑے تھے۔ جیسے وہ شکاری ہوں اور ان کے سامنے ان کی ٹرافی پڑی ہو۔

''کک...... کیا ہوا عارف بھائی؟''

''تمہارے خیال میں رستم کہاں ہے؟''

''پوٹھوہار۔ سون کے آس پاس۔''

''وہ یہاں ہے۔ ملتان میں...... ابھی دو گھنٹے پہلے میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' شانی سکتہ زدہ رہ گئی۔ عارف کمبوہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رستم کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ گوہر احمد عرف گوہرا ہے۔ بہت خطرناک بندہ ہے وہ بھی۔''

''کک...... کہیں تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا عارف؟''

''دھوکا ہوتا تو اچھا تھا لیکن یہ دھوکا نہیں ہے۔ وہ یہاں ہے اور کسی خطرناک ارادے سے ہے۔'' عارف کی آواز بھی اندیشوں کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔

''اوہ خدایا۔'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ ''وہ...... وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟ کیوں اتنی جلدی خود کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود چل کر موت کے منہ میں آیا ہے۔ کیا اس کی عقل اتنا بھی کام نہیں کر رہی۔''

کچھ دیر تک دونوں بالکل گم صم...... سناٹے کی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ چائے اور پیٹز ان کے سامنے ٹھنڈے ہوتے رہے۔ بالآخر شانی نے بہ تکلیف وہ سکوت توڑا۔ ''عارف! اگر وہ واقعی رستم ہی ہے تو پھر وہ کیوں ہے یہاں؟ تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟''

عارف نے ایک گہری سانس لی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ شانی کہ وہ رستم ہی ہے۔ اس بات کا پورا یقین کر لو۔ رہی دوسری بات کہ وہ یہاں کیوں ہے اس کے بارے میں مزید سوچا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے بس ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے حسن پارک کے قریب ہوٹل انڈس کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ اس نے چہرہ چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ ایک کار سے اُترا اور بڑی تیزی سے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے گوہر عرف گوہرا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رستم کو دیکھ کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید...... میرا مطلب ہے شاید...... وہ تمہارے پیچھے یہاں پہنچا ہے لیکن پھر بڑی جلدی مجھے یہ خیال رد کرنا پڑا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بات کچھ اور ہے اور اس کے بعد میری پریشانی کچھ بڑھ گئی ہے۔ ہوٹل انڈس سے تھوڑی ہی دور ایک سڑک چھوڑ کر پیر قدرت اللہ کا مقامی ٹھکانہ ہے۔ یہ ایک بڑی کوٹھی ہے جس پر جھنڈے وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔ قدرت اللہ کو ماننے والے ایسے ٹھکانوں کو آستانہ یا استانہ کہتے ہیں۔ میں جس آستانے کی بات کر رہا ہوں، وہاں پچھلے دو دن سے بڑی رونق ہے۔ پیر قدرت اللہ تین روزہ دورے پر خود یہاں آیا ہوا ہے۔ کل اسے بہاولپور چلے جانا ہے۔ میں ابھی خود دیکھ کر آیا ہوں۔ آستانے کے باہر بہت لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ موٹر سائیکلوں کی دو قطاریں بھی نظر آ رہی ہیں۔ سیکورٹی گارڈ پہرہ دے رہے ہیں۔ مجھے یہ لگ رہا ہے کہ رستم یہاں قدرت اللہ کے لئے آیا ہے۔ وہ ضرور اس کے ساتھ کچھ کر گزرے گا۔''

شانی کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ایک خوف ناک ہنگامے کا تصور اس کے ذہن پر آ گیا۔ ایک ایسا ہنگامہ جس کا اختتام رستم کی موت پر ہو سکتا تھا۔ ''اوہ خدایا! یہ شخص کیا کر رہا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اس نے عارف کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ رستم، قدرت اللہ کو قتل......''

''ہاں، میرے ذہن میں تو یہی بات ہے۔''

"وہ کیوں سوچ رہا ہے ایسا۔ قدرت اللہ کو مارنے سے کیا ہوگا۔ کیا وہ برائی ختم ہو جائے گی جو اس بندے نے پھیلائی ہے؟ یہ تو اور پھیلے گی۔ اس کی جڑیں اور پکی ہوں گی۔ قدرت اللہ سے لڑنے کا طریقہ یہ نہیں ہے۔" شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔

عارف خاموش بیٹھا تھا۔ ہسپتال کے کسی گوشے سے نوحوں کی دردناک آواز اچانک بلند ہوئی اور فضا کو سوگوار کر گئی۔ راہِ اجل کا کوئی مسافر رستے کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد منزل پر پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک ایمبولینس کسی نئے مسافر کو لے کر شور مچاتی ہسپتال کے احاطے میں آئی اور ایمرجنسی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ آمدورفت کے ایسے مناظر ہسپتالوں کا معمول ہوتے ہیں۔ کینٹین کا بیرا آیا اور شور مچاتا شانی اور عارف کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھے۔ شانی نے کہا۔ "عارف! اگر تمہارا اندازہ درست ہے اور رستم قدرت اللہ کے لئے ہی یہاں موجود ہے تو پھر...... یہ بہت خطرناک ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے اس کام سے روک سکتے ہیں؟"

عارف نے رسان سے کہا۔ "مجھے کسی اور کا تو پتا نہیں لیکن اگر تم کوشش کرو شانی بہن تو شاید اسے روک لو لیکن ...." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"بات پوری کرو عارف۔" شانی بے چینی سے بولی۔

"لیکن اگر تمہیں یہ کام کرنا ہے تو پھر بہت جلدی کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہاں جو کچھ بھی ہونا ہے، اگلے تین چار گھنٹے کے اندر ہو جانا ہے۔" عارف کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

شانی نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ شام اب رات کا لبادہ اوڑھ چکی تھی۔ اسے تاریکی میں جان لیوا اندیشوں کی پھنکار سنائی دی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اور عارف کمبوہ ہوٹل انڈس کے سامنے ایک ٹیکسی سے اُتر رہے تھے۔ شانی نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ یہ وہ چادر نہیں تھی جس میں اس سے پہلے ملتان میں گھومتی پھرتی رہی تھی۔ یہ کریم کلر کی پلین چادر تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر شانی نے ایک سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کی موجودہ سرگرمی کسی کی نگاہ میں بھی آئے۔ راستے میں بھی شانی اور عارف اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ بہر حال اس قسم کے کوئی شواہد نہیں ملے تھے۔ ہوٹل انڈس کے سامنے پہنچ کر پہلے وہ دونوں گارمنٹس کی ایک دکان میں چلے گئے۔ یہاں نے شانی نے مُنے کے لئے ایک نیکر، شرٹ خریدی اور جرابوں کے دو جوڑے لئے۔ اس دوران میں عارف اردگرد کے ماحول کا

جائزہ لیتا رہا۔ دکان سے نکل کر وہ دونوں سیدھے انڈس ہوٹل پہنچے۔ یہ تو بعید از قیاس تھا کہ رستم اور گوہرا نے یہاں اپنے اصل نام درج کروائے ہوں گے۔

شانی ایک طرف لابی میں کھڑی ہو گئی۔ عارف نے استقبالیہ پر جا کر معلومات حاصل کیں۔ پروگرام کے مطابق وہ رستم کا حلیہ اور لباس وغیرہ بتا کر کمرہ نمبر جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں موجود شخص نے قدرے سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ نام جاننا چاہ رہا تھا۔ عارف ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ اسی دوران میں ایک طرف سے ایک ویٹر برآمد ہوا۔ وہ عارف سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کہیں آپ باجوہ صاحب کا تو نہیں پوچھ رہے جن کی داڑھی چھوٹی اور بال لمبے تھے۔ ان کے ساتھ گرے سوٹ کالی چادر اور پشاوری چپل والے ایک ملک صاحب تھے۔ ان کی ایک آنکھ پر چوٹ کا پرانا نشان ہے۔"

"ہاں بالکل وہی۔" عارف نے تیزی سے کہا۔

"وہ کمرہ نمبر 104 میں تھے، دوسرے فلور پر۔"

"کیا مطلب وہ جا چکے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے چیک آؤٹ ہوئے ہیں۔ انہیں میں ہی سروس دے رہا تھا۔" شانی کے جسم میں تشویش کی نئی لہر ابھری۔

عارف نے ویٹر سے پوچھا۔ "کیا وہ کسی سواری پر گئے ہیں؟"

"پتا نہیں جی۔ یہاں سے تو پیدل ہی نکل گئے تھے۔ کوئی خاص سامان وغیرہ تو ان کے پاس تھا نہیں۔"

شانی جانتی تھی کہ یہ ویٹر وغیرہ بڑے باخبر لوگ ہوتے ہیں۔ ہوٹل کے مہمانوں کے حوالے سے ان کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ اس نے ویٹر سے پوچھا۔ "تھوڑا بہت اندازہ ہے تمہیں کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ملتان سے باہر گئے ہیں یا نہیں؟"

ویٹر نے بتیسی نکالی۔ "میں کچھ کہہ نہیں سکتا جی۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "وہ دو دن یہاں رہے ہیں۔ بس ایک دفعہ کمرے سے باہر نکلے ہیں۔ کھانا بھی کمرے میں ہی منگواتے تھے۔ میں نے انہیں کسی سے ملتے بھی نہیں دیکھا۔ بس کل ایک لمبے قد کے شلوار قمیص والے صاحب ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ مجھے شکل سے پولیس والے لگتے تھے۔ پر ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ ویسے باجوہ صاحب بندے بڑے اچھے تھے۔ بڑے کھلے دل کے جی۔" باتونی ویٹر بولتا جا رہا تھا۔

شانی سمجھ گئی کہ رستم حسبِ عادت اس ویٹر کو ہزار دو ہزار کی ٹپ دے گیا ہے۔

شانی نے سوالیہ نظروں سے عارف کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں بات کی اور ویٹر سے رخصت ہوکر باہر نکل آئے۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک آہستہ آہستہ کم ہورہا تھا۔ عارف حسبِ معمول شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول لگا ہوا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف ہتھیار لگاتے ہی نہیں، اسے استعمال کرنے کے لئے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

باہر آنے کے بعد عاف نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''ویٹر کہتا ہے کہ وہ پیدل نکلے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ استانے پہنچ گئے ہیں۔''

''وہ یہاں سے چیک آؤٹ بھی کر گئے ہیں۔ یہ بھی خطرے کی طرف اشارہ ہے۔'' شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''پھر کیا کرنا ہے؟'' عارف نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے وہیں چلتے ہیں۔ قدرت اللہ کے اڈے کی طرف۔'' شانی نے جیسے وجدانی لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم ایک شارٹ کٹ لگا سکتے ہیں۔'' عارف نے سڑک کے پار ایک بیس تیس فٹ چوڑی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے سڑک پار کی اور نیم روشن گلی میں آگئے۔ ان کے قدموں میں تیزی تھی۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا وہ اس ''ہونے'' کو روک سکے گی، کیا رستم کے ساتھ اس کا آمنا سامنا ہوگا، کیا رستم اس کی بات مانے گا؟ ایسے اَن گنت سوال شانی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے اور اس کی دھڑکنوں میں تیزی لا رہے تھے۔ چند گھنٹے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رستم سے اتنی جلدی دوبارہ ملاقات ہوجائے گی۔ وہ تو سرے سے ملاقات کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ کسی کسی وقت اس کے سینے سے ایک گہری ہوک اٹھتی تھی اور وہ سوچتی تھی شاید وہ اور رستم آخری ملاقات کر چکے ہیں لیکن آج رات کے بطن میں ایک عجیب ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ اس ہلچل کے سبب حالات نے ایک تیز رفتار پلٹا کھایا تھا۔

وہ ابھی استانے سے دور ہی تھے کہ انہیں ایک اونچے جھنڈے پر لگا ہوا بلب نظر آنے لگا۔ اس بلند تر جھنڈے کے اردگرد مختلف رنگوں اور سائزوں کے کئی اور جھنڈے بھی لہرا رہے تھے۔ وہ ابھی استانے سے سو ڈیڑھ سو گز کی دوری پر تھے کہ عارف رک گیا۔ شانی نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ بولا۔ ''اگر ہم نے استانے کے اندر جانا ہے تو پھر...... ہماری تلاشی

ہوگی۔ اپنا پسٹل مجھے یہیں کہیں چھوڑنا ہوگا۔''

شانی نے ایک چھوٹی سی فروٹ شاپ کی طرف اشارہ کیا۔ شاپ بند تھی۔ دکان دار نے اپنی چھابڑیوں کے اردگرد سرکنڈوں کی چق تان دی تھی۔

عارف بھی غالباً اسی دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا وزنی پسٹل نکالا اور اسے چق کے نیچے ''سلپ'' کردیا۔ گلی کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو بھی یہ کام اس تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کی نظر میں نہ آتا۔ وہ دونوں ایک بار پھر استانے کی طرف چل دیئے۔ رہائشی علاقے میں یہ کوٹھی قریباً دو کینال رقبے پر تھی۔ اس پر پورے کا پورا سبز رنگ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر حضرت صاحب کے ''زریں اقوال'' جلی حروف میں لکھے تھے۔ ایک دو جگہ پنجابی کے شعر اور عربی عبارات بھی تھیں۔

کوٹھی کے باہر پندرہ بیس کاریں کھڑی تھیں۔ موٹر سائیکل، سکوٹر وغیرہ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دو چار تانگے اور ایک دو ٹیکسیاں سواریوں کے انتظار میں نظر آتی تھیں۔ کچھ لوگ ایک ریڑھی کے گرد جمع تھے۔ یہاں عالی دماغ حضرت صاحب اور ان کے خاص مریدوں کے تصنیف شدہ کتابچے رکھے گئے تھے۔ شانی اور عارف سیدھے گیٹ کی طرف بڑھے۔ یہاں دو باوردی گارڈز تھے۔ اس کے علاوہ دو پہرے دار بھی نظر آرہے تھے۔ شانی کو دیکھ کر ایک پہرے دار آگے آیا۔

''ہاں بی بی! کیا بات ہے؟'' اس نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں اندر جانا ہے۔'' شانی نے کہا۔

''اب وقت ختم ہوگیا ہے۔ آپ کل آؤ۔''

''لیکن کل تو حضرت جی نہیں ہوں گے۔''

''چھوٹے حضرت جی تو ہوں گے۔''

''لیکن ہمیں بڑے حضرت صاحب سے ملنا ہے۔ میں اور میرا بھائی بڑی دور سے آئے ہیں۔ آج دوپہر کے ساہیوال سے چلے ہوئے ہیں۔ بھاگم بھاگ پہنچے ہیں۔''

''اب میں کیا کرسکتا ہوں بی بی؟''

عارف نے لجاجت سے کہا۔ ''ابھی دو منٹ پہلے ایک عورت کو آپ نے بھیجا تو ہے اندر۔''

''وہ حضرت صاحب کی جاننے والی تھی۔''

''ہمیں بھی جاننے والا سمجھ لو جی۔'' عارف نے سو کا سرخ نوٹ جیب سے نکالتے

ہوئے کہا۔

پہرے دار کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اس نے نوٹ مٹھی میں دبایا اور کسی خورشید نامی عورت کو آواز دی۔ وہ بکری کی طرح منہ چلاتی اور کچھ کھاتی ہوئی آئی۔ اس نے شانی کی جامہ تلاشی لی۔ دوسری طرف پہرے دار عارف کے جسم پر ہاتھ پھیر کر تسلی کر چکا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گیٹ کے اندر تھے۔

☆=======☆=======☆

بدنما چہرے والے سراج کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے قریباً آٹھ گھنٹے بعد رستم اور گوہرا گوجرانوالہ جا پہنچے تھے۔ یہاں سے لاہور تک کا سفر انہوں نے ایک لوکل بس میں کیا تھا۔ لاہور پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بااعتماد مخبر نظام کی زبانی رستم اور گوہرا کو معلوم ہو گیا تھا کہ قدرت اللہ عرف حضرت جی لاہور میں موجود نہیں ہے۔ وہ صرف ایک دن پہلے ملتان چلا گیا تھا۔ وہاں اسے اپنے مقامی استانے پر تین دن قیام کرنا تھا۔ اس کے بعد کے پروگرام کا پتا نہیں تھا۔ رستم کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ لاہور میں رک کر قدرت اللہ کی واپسی کا انتظار کرتا۔ اس کے گرد موت کے متحرک سائے تھے اور کسی بھی وقت ''قضا'' سے اس کا آمنا سامنا ہو سکتا تھ۔ گوجرانوالہ سے اس نے اپنے اور گوہرا کے لئے نئے کپڑوں کا انتظام کیا اور آگے چل پڑا تھا۔

وہ بذریعہ ٹرین لاہور سے ملتان پہنچا تھا۔ یہاں وہ حضرت کے استانے کے قریب ہی انڈس نامی ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ یہاں پر اپنے ایک مقامی دوست جہانگیر حسین کی مدد سے رستم نے حضرت کے استانے اور استانے میں حضرت کی موجودگی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں اور آج وہ استانے پر اپنے ایکشن کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور وہ حضرت اور اس کے پیروکاروں کو یادگار سبق سکھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ جہانگیر سے مشورے کے بعد رستم نے اپنا پروگرام دوپہر کے وقت ہی تیار کر لیا تھا۔ گوہرا بھی اس مشورے میں بڑے جذبے اور امنگ کے ساتھ شریک رہا تھا۔

رات نو بجے کے قریب رستم اور گوہرا اپنی خونی کارروائی کے لئے حرکت میں آ گئے تھے۔ رستم نے اپنے کولٹ پسٹل پر قریباً آٹھ انچ لمبا جدید سائلنسر چڑھا لیا تھا۔ تین بھرے ہوئے میگزین اس کی جیکٹ کی جیبوں میں تھے، اس کے علاوہ گولیوں والی بیلٹ اور ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا تھا۔ گوہرا کے پاس موت کے قہقہے برسانے والی ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ رائفل کو اچھی طرح صاف اور چیک کرنے کے بعد اس نے اپنی سیاہ چادر کی بکل

میں یوں چھپا لیا کہ وہ اس کے جسم کا حصہ ہی بن گئی۔ پچھلے دنوں میں رمضان نامی ویٹر نے ان کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ جس طرح شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں، اسی طرح آوازوں سے آوازیں بھی مشابہ ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیوں رمضان جب بولتا تھا تو رستم کو اپنے مرحوم دوست آفندی کا لب ولہجہ یاد آ جاتا تھا۔ آفندی کے لہجے کی ایک جھلک سی رمضان کی آواز میں پائی جاتی تھی۔ (اور آفندی کو رستم کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی موت رستم کے سینے کا ایک رستا ہوا زخم تھی۔ اسے تاؤ حشام نے چھت سے لٹکا کر مارا تھا۔ اس جرم کے بدلے رستم تاؤ حشام کو دس بار بھی موت کے گھاٹ اُتارتا تو یہ کم تھا اور وہ ایسا کرنے کے لئے آزاد بھی تھا لیکن اپنی بی بی کے حکم کے سامنے اسے سر جھکانا پڑا تھا۔ سارے پنجاب کی پولیس مل کر بھی شاید جس شخص کو رستم کے قہر سے نہ بچا سکتی تھی اسے کسی کے ابرو کے ایک اشارے نے زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ ہاں رستم سمجھتا تھا کہ یہ ایک بڑی قربانی ہے جو اس نے بی بی کے حکم پر دی ہے۔)

وقتِ رخصت نہ جانے رستم کے دل میں کیا آئی کہ اس نے آفندی کے ''آہنگ'' والے ویٹر کو پورے پانچ ہزار روپے ٹپ میں دے ڈالے۔ اپنا کچھ غیر ضروری سامان بھی وہ ویٹر کے لئے چھوڑ گئے۔

نو بجے کے لگ بھگ وہ ہوٹل سے نکلے اور پیدل ہی استانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے سینے میں عجیب سا شور تھا۔ دل کی دھڑکن جنگ کے نقارے کی طرح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی کی زیادہ تر مشکلات کا ذمے دار یہی بہروپیا قدرت اللہ ہے۔ قدرت اللہ اور اس کی تینوں بیبیاں دل و جان سے شانی کی دشمن تھیں۔ لاہور والی کوٹھی میں شانی کے ساتھ قدرت اللہ کی بیبیوں کی باقاعدہ لڑائی ہو چکی تھی۔ اس لڑائی میں قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس لڑائی کے بعد سے قدرت اللہ اور اس کی بیویوں نے شانی سے دشمنی چکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے شانی بی بی کے خلاف ایک منظم پروپیگنڈا مہم چلائی ہوئی تھی اور بی بی پر سنگین الزامات لگا رہے تھے۔

تین پولیس اہلکاروں کے بالکل پاس سے گزرتے ہوئے وہ دونوں قدرت اللہ کے استانے کے سامنے پہنچ گئے۔ (پولیس اور رستم کا بیر بڑا پرانا تھا لیکن رستم جانتا تھا کہ دو دن پہلے اس بیر کو ''چار چاند'' لگ گئے ہیں۔ اس نے ریاض ہٹلر جیسے موذی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کے سینے پر لات مار کر اسے زمین چٹوائی تھی) یہاں گاڑیوں کی طویل قطار تھی اور پہرے دار دکھائی دے رہے تھے۔ رستم نے کچھ ضعیف العقیدہ عورتوں کو دیکھا۔ انہیں غالباً عمات کے

اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ عمارت کی بیرونی دیواروں کو ہاتھ لگا رہی تھیں اور چوم رہی تھیں۔ ایک دیہاتی شخص اپنے بیمار بچے کو دیوار کے ساتھ لگائے کھڑا تھا۔ دو افراد اندر جانے کے لئے پہرے دار کی منت سماجت کر رہے تھے۔ رستم اور گوہرا کلاوا کاٹ کر عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ چند گھنٹے پہلے بھی یہاں کا سروے کر چکے تھے۔ یہ ایک تیس فٹ چوری سڑک تھی۔ استانے کی دیوار بارہ فٹ سے کم اونچی نہیں تھی۔ دیوار پر خاردار باڑ کی دو لائنیں موجود تھیں۔ یہاں ایک ٹرانسفارمر کے پاس واپڈا کا خراب ٹرک کھڑا تھا۔ اس کے چاروں ٹائر فلیٹ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے۔ رستم اور گوہرا اردگرد کا جائزہ لیتے رہے پھر رستم ٹرک میں داخل ہوا۔ ٹرک کے اندر بہت سا زنگ آلود کاٹھ کباڑ موجود تھا۔ رستم اس کاٹھ کباڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے جیب سے تار کاٹنے والا پلاس نکالا اور دیور پر لگے تار کاٹ کر اندر جانے کے لئے جگہ بنالی۔ اس دوران میں گوہرا قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ عمارت کے اندر سے مردوزن کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی وقت کوئی عورت بڑے دردناک انداز میں چیختی تھی۔ وہ کسی بند کمرے میں تھی اس لئے بہت مدھم آواز ہی رستم کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد رستم اور گوہرا دونوں دیوار پھاند کر عمارت کے اندر پہنچ چکے تھے۔

دیوار کے ساتھ ساتھ کیلے اور امرود وغیرہ کے درخت تھے۔ زمین کچی تھی۔ جونہی گوہرا نیچے کودا، کوریڈور کی طرف کھڑے ایک پہرے دار کو شک ہو گیا۔ وہ متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف آیا۔ ''کون ہے بھئی؟'' اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی بدبختی اسے کس شخص کی طرف لے جا رہی ہے۔ رستم سفیدے کے ایک تناور درخت کے پیچھے موجود تھا۔ رستم سے چند فٹ کی دوری پر وہ شخص رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ واپس چلا جائے گا، لیکن تب ایک بار پھر اس کی بدقسمتی نے زور مارا اور وہ مزید تسلی کے لئے چار پانچ قدم آگے آیا۔ اس کی نظر رستم پر پڑی، اس سے پہلے کہ وہ چلانے کے لئے منہ کھولتا یا کندھے سے لٹکی گن کو حرکت میں لاتا رستم چیل کی طرح اس پر جھپٹا۔ اس کی گردن رستم کے بازو میں جکڑی گئی۔ رستم کے ہاتھ میں دبا ہوا ایک فٹ لمبا چھرا سیدھا پہرے دار کے پہلو میں گیا۔ گردن پر دباؤ کے سبب اس کے ہونٹوں سے کراہ تک نہیں نکل سکی۔ رستم نے وحشت کے عالم میں دو مرتبہ اس کا سر پوری شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ وہ مُردہ چھپکلی کی طرح رستم کی بانہوں میں جھول گیا۔ رستم نے ہولے سے اسے کچی زمین پر ڈال دیا۔

وہ دونوں چند لمحوں تک وہیں رہے اور اردگرد کی سن گن لینے کی کوشش کرتے رہے۔ اندر سے بار بار کسی بکری کے ممیانے کی تیز آواز آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے بگاہے کسی عورت کے رونے کی صدا بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز بے پناہ غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''یہ کیا تماشا ہے لالے دی جان؟'' گوہرا نے سرگوشی کی۔

''پتا چل جاتا ہے تھوڑی دیر میں۔'' رستم کا لہجہ سفاک تھا۔

''لالے دی جان! حضرت جی کے پیٹ میں یہ چھرا مجھے گھونپنے دینا، میری ایک بڑی پرانی آرزو پوری ہو جائے گی۔'' گوہرا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''چلو تم گھونپ دینا، لیکن پہلے وہ کنجر کا بچہ نظر تو آئے۔'' رستم نے جوابی سرگوشی کی۔

''لیکن چھرا مجھے دے دوناں۔ عین ٹائم پر کیسے دو گے؟''

''چلو ٹھیک ہے لیکن ٹرپل ٹو مجھے دے دو۔'' رستم نے سرگوشی کی۔

گوہرا نے ٹرپل ٹو رستم کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے چھرا اسے دے دیا جو اس نے کرتے کے نیچے لگا لیا۔ رستم نے رائفل کو بالکل تیار حالت میں کر کے اپنی چادر کے نیچے چھپا لیا۔ رائفل کے دو بھرے ہوئے فالتو میگزین اس نے واسکٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ وہ دونوں دھیمے قدموں سے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ان کے خیال میں یہ فیصلہ کن وقت تھا۔ اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ پہرے داروں کے پاس سے گزرے اور حیران کن طور پر سلامتی سے اندر پہنچ گئے۔ کسی نے انہیں روکا ٹوکا نہیں اور نہ ہی شناخت کیا۔ یہاں ایک ہال نما کمرے میں دو ڈھائی درجن افراد فرش پر بچھے قالینوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں عام لوگوں کے علاوہ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش پوش لوگ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ سب کے سب ''حضرت صاحب'' کے نیاز حاصل کرنے کے لئے اپنی باری کے منتظر تھے۔ کچھ افراد کی گود میں بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہال کو پردوں کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دوسرے حصے میں خواتین تھیں۔ سب لوگ دم سادھے بیٹھے تھے، بس کبھی کبھی کسی بچے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

دربار کے ایک بہت بڑے پالش شدہ دروازے کے سامنے ایک ہٹا کٹا محافظ کھڑا تھا۔ رستم اور گوہرا اگلی قطار میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ دروازے کے سامنے کھڑا باریش محافظ ایک موٹے دانوں کی تسبیح کو مسلسل انگلیوں سے گردش دے رہا تھا، تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عادتاً ایسا کر رہا ہے، پڑھ پڑھا کچھ نہیں رہا۔ عورتوں والے پورشن کی طرف سے گاہے بگاہے کسی عورت کے رونے کی بلند آواز سنائی دیتی تھی۔ یہی آواز رستم اور گوہرا نے باؤنڈری وال کے

پاس سے سنی تھی۔

ابھی رستم اور گوہرا کو بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پالش شدہ دروازے کے پٹ ذرا سے وا ہوئے اور ایک دربان نما شخص نے کسی کا نام لے کر آواز دی۔ رستم اور گوہرا کے قریب سے تین چار افراد اٹھے اور بے تابی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ رستم کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ ان افراد کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ رستم کے اٹھتے ہی گوہرا بھی اٹھ گیا۔ پکارے جانے والے افراد دروازے میں داخل ہوئے تو رستم اور گوہرا بھی داخل ہو گئے۔ رستم کو دربان نے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے اندر چلا گیا تاہم سب سے آخر میں آنے والے گوہرا کو دربان نے روک لیا۔ ”نہیں بھئی نہیں۔“ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”اب پورا پنڈ ہی اندر نہ گھس آؤ۔“

گوہرا نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔

ایک قالین پوش لابی سے گزر کر وہ ایک شاندار محرابی دروازے کے پاس پہنچے۔ یہاں ہر طرف ایک عجیب خوشبو پھیلی تھی۔ حواس کو مختل اور دھڑکنوں کو زیر و زبر کرتی ہوئی انوکھی مہک۔ رستم کے ساتھ اندر آنے والوں میں ایک بوڑھا شخص بھی تھا۔ وہ کسی گاؤں کا کھاتا پیتا زمیندار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے۔ انہوں نے کلف لگے کپڑے اور طلائی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھے کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی پریشان اور حواس باختہ نظر آتے تھے۔

رستم ان تینوں افراد کے ساتھ ہی اگلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض چوکور کمرہ تھا۔ رستم کو ایک جواں سال لڑکی بستر پر سیدھی لیٹی نظر آئی۔ اس کا خوب صورت چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری بے ہوشی میں نظر آتی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور دھیرے دھیرے موت کی طرف کھسکتی ہوئی۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بید کی چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر دو سوگوار عورتیں بیٹھی تھیں۔

تب رستم کی نظر بہروپئے حضرت قدرت اللہ پر پڑی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ داڑھی مونچھ حسب معمول یکسر صاف تھی۔ وہ بے ہوش لڑکی کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور ہونٹ بدبدانے والے انداز میں ہل رہے تھے۔ وہ کسی عمل میں مصروف تھا۔ قدرت اللہ کے عقب میں اس کی دو عدد بیویاں موجود تھیں۔ ان کے چہرے نقاب میں تھے، صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ انہوں نے ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھا رکھے تھے۔ چھوٹی بیوی

قدرت اللہ کے پہلو سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیالہ نما برتن تھا۔ برتن میں کوئی محلول تھا جس میں قدرت اللہ گاہے بگاہے انگلیاں ڈبوتا تھا اور بے ہوش لڑکی کے چہرے پر چھینٹا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دربان نے سوگوار عورتوں کو اشارہ کیا کہ وہ اٹھ کر باہر چلی جائیں۔ عورتیں سسکیاں لیتی اور اپنی مریضہ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی باہر چلی گئیں۔ دربان نے اندر آنے والے افراد کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رستم بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا اور ایک ٹیڈی (چھوٹے سائز کی) بکری ممیاتی ہوئی اندر آ گئی۔ بکری کا سفید نر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ان دونوں کی رسیاں ایک پہرے دار نے تھام رکھی تھیں۔ جانوروں کے اندر داخل ہوتے ہی قدرت اللہ کی نقاب پوش بیویاں ایک عقبی دروازے سے باہر چلی گئیں۔ وسیع و عریض کمرے کے ایک گوشے میں قالین پر پولی تھین کی ایک بڑی شیٹ بچھی تھی۔ اس کی پیمائش تقریباً بارہ ضرب بارہ فٹ تھی۔ اس پر کچھ پنجرے رکھے تھے اور پنجروں کے اردگرد خون بکھرا ہوا تھا۔ کئی پرندوں کے کٹے ہوئے سروں کو ایک ہار کی شکل میں پرویا گیا تھا۔ یہ ہار ایک دیوار کے ساتھ جھول رہا تھا۔ درست پتا چلانا مشکل تھا تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ اس بڑے سائز کے ہار میں تین درجن پرندوں کے سر پروئے گئے ہیں۔ ان میں کبوتر، طوطے اور اُلو وغیرہ کے سر پہچانے جا رہے تھے۔ پھر رستم کی نگاہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر پر پڑی۔ ایک اور ہار بھی پولی تھین کی خون آلود شیٹ پر پڑا تھا۔ یہ پہلے ہار سے بڑا تھا اور اس میں پرندوں کے سر نہیں تھے۔ اس میں چند بلیوں، دو تین کتوں اور ایک چھوٹی بکری کا سر تھا۔

اب دو مزید جانور یہاں لائے گئے تھے۔ یقیناً ان بے زبان جانوروں کو بھی کسی کریہہ عمل سے گزارا جانے والا تھا۔ رستم نے قدرت اللہ کے خونی عملیات کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا تھا لیکن دیکھنے کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔

کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ اس سناٹے کو بس نر اور مادہ کی ممیاتی ہوئی آوازیں توڑ رہی تھیں۔ نر اور مادہ کو پولی تھین شیٹ پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ آگے پیچھے چکرانے لگے۔ نر مستی میں دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے اس کیفیت میں لانے کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ رستم نے سن رکھا تھا کہ قدرت اللہ جو عملیات کرتا ہے ان میں انسانی اور حیوانی خون کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات کسی پرندے یا چوپائے کو اپنی مادہ سے اولین ملاپ کی حالت میں ہلاک کیا جاتا ہے اور اس کا خون سفلی عمل میں استعمال ہوتا

ہے۔ آج بھی کچھ ایسا ہی نظارہ رستم کے سامنے تھا۔

قدرت اللہ کے مریدوں میں سے ایک ہٹے کٹے مرید کے ہاتھ میں سٹیل کی ایک نہایت نوکیلی اور چمک دار سلاخ نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔ نر اور مادہ کے درمیان ایک دو منٹ آنکھ مچولی ہوئی پھر جونہی انہوں نے ''قانونِ فطرت'' کا مظاہرہ شروع کیا، جیسے بجلی چمکتی ہے، مشاق مرید نے آہنی سلاخ کا بھرپور وار بکرے کے بائیں پہلو پر کیا۔ کھچ کی آواز سے نیزہ نما سلاخ ایک فٹ تک بدنصیب جانور کے سینے میں گھس گئی۔ وہ کرب سے چیخا اور مادہ کے اوپر سے الٹ کر فرش پر گرا۔ دو مریدوں نے اس کے تڑپتے پھڑکتے جسم کو دبوچا اور تیسرے نے زور لگا کر سلاخ واپس کھینچ لی۔ دل کے مقام پر آنے والے گہرے گھاؤ سے خون فوارے کی طرح پھوٹنے لگا۔ سلاخ بردار مرید نے سلاخ ایک طرف پھینکی اور چینی کے ایک مرتبان نما برتن میں خون جمع کرنے لگا۔

مادہ ایک طرف لاتعلقی سے کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ اسے ادراک نہیں تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے وصل کے لئے تڑپنے والا ''جوانِ رعنا'' اب اپنے ہی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ ''شادی مرگ'' کا کھیل بہ مشکل پانچ منٹ جاری رہا۔ مرتبان میں خون بھر لیا گیا اور زندہ و مُردہ جانور باہر نکال دیئے گئے۔ اِدھر اُدھر بکھرنے والا خون ایک بڑے کپڑے سے صاف کیا گیا۔

اس کے بعد ایک مرید چینی کا منقش پیالہ لئے ان افراد کی طرف بڑھا جو رستم کے ساتھ اندر آئے تھے۔ چینی کا پیالہ یکسر خالی تھا اور مرید کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نشتر نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سفلی عمل کے لئے ابھی مزید خون اکٹھا کیا جائے گا اور یہ خون حیوانی نہیں انسانی ہوگا۔

مرید نے بوڑھے شخص کے پاس پہنچ کر اسے بائیں بازو سے آستین اوپر اٹھانے کو کہا۔ پھر بولا۔ ''مریضہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے بابا جی؟''

''یہ میری نوں (بہو) ہے۔'' بوڑھے نے جوابی سرگوشی کی۔

ہٹے کٹے مرید نے بوڑھے کی کہنی سے ذرا نیچے جگہ منتخب جگہ پر نشتر سے چرکہ لگایا۔ وہاں سے خون بہنے لگا اور پیالے میں گرنے لگا۔ آٹھ دس ''سی سی'' خون لینے کے بعد دوسرے مرید نے بوڑھے کے زخم پر اسپرٹ میں بھیگی ہوئی روئی کا ٹکڑا رکھ دیا۔

تب چینی کا منقش پیالہ نوجوان کے پاس پہنچا۔ ''مریضہ سے تمہارا رشتہ؟''

''یہ میری بیوی ہے۔'' نوجوان نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''بازو سے قمیص اوپر اٹھاؤ۔'' ہٹے کٹے مرید نے مشینی انداز میں ہدایت جاری کی۔

نوجوان نے آستین اوپر اٹھا دی۔ اس کا بایاں بازو کہنی سے نیچے کلائی تک جلا ہوا تھا۔ زخم چند دن پرانے تھے اور ابھی بھرے نہیں تھے۔ نشتر چلانے والا ہٹا کٹا مرید سوالیہ نظروں سے ''حضرت جی'' کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس زخمی بازو سے خون نکالا جائے یا نہیں۔ حضرت جی کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آئے۔ اس نے پہلی بار اپنی سرخی مائل آنکھیں اٹھائیں اور نوجوان سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''امیر اکبر جی۔''

''یہ بازو پر کیا ہوا ہے؟''

''جس ایکسیڈنٹ میں فوزیہ کو چوٹ لگی، اسی میں میرا بازو بھی جلا تھا۔ ہم خانیوال سے ملتان آ رہے تھے جی۔ ساہیوال کے قریب ہماری بس ویگن سے ٹکرائی اور پھر اس میں آگ لگ گئی۔ فوزیہ تو سر میں چوٹ لگتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے بس سے نکالتے نکالتے میرا بازو جلا تھا۔''

''حضرت'' نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولے۔ ''تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ پندرہ دن ہوئے ہیں ایکسیڈنٹ کو۔''

''جی حضرت جی۔''

''اس کے بعد یہ ایک بار بھی ہوش میں نہیں آئی؟'' قدرت کا اشارہ بیڈ پر پڑی لڑکی کی طرف تھا۔

''نہیں حضرت جی۔'' نوجوان نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے جواں سال بیوی سے بہت محبت تھی اور صرف شوہر ہی نہیں لڑکی کا سسر اور دیور بھی بہت آزردہ نظر آتے تھے۔

حضرت یعنی قدرت اللہ نے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''رہنے دو۔'' مطلب یہ تھا کہ جلے ہوئے بازو سے خون نہ نکالو۔

مرید لڑکی کے دیور کی طرف بڑھا۔ لڑکی کے سسر نے ہاتھ جوڑ کر ملتجی لہجے میں کہا۔ ''حضرت سرکار! میرے پتر کا گھر اُجڑنے سے بچا لیں۔ اس کے بدلے آپ جو چاہیں میں دینے کو تیار ہوں۔''

''کیا کرتے ہو بابا؟'' ایک مرید نے تیز سرگوشی میں بوڑھے کو جھڑکا۔ دوسرے نے غضبناک نگاہوں سے اسے گھورا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا

سہم کر چپ ہو گیا۔

بوڑھے کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کافی کچھ قدرت اللہ کی نذر کر چکا ہے اور ابھی کافی کچھ نذر کرنے کو تیار ہے۔

پیالہ بدست مرید دوسرے نوجوان کی طرف بڑھا۔ اس نے بائیں بازو سے آستین اوپر اٹھائی۔ ''مریضہ سے تمہارا رشتہ؟''

''میری بھرجائی ہے جی۔'' نوجوان نے کہا۔

سابقہ طریقے سے اس کا خون بھی حاصل کر لیا گیا۔ اب رستم کی باری تھی اور رستم پوری طرح تیار تھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور چادر نے اس کے چہرے کا ایک تہائی حصہ چھپا رکھا تھا اور چادر کے نیچے جان لیوا ٹرپل ٹو تھی۔ مرید رستم کی طرف بڑھا۔ یقیناً اس نے یہی پوچھنا تھا کہ......مریضہ سے تمہارا رشتہ؟

لیکن اس سے پہلے ہی اس کی نگاہ رستم کے چہرے سے چپک کر رہ گئی۔ شاید اس سے پہلے اس نے دھیان سے رستم کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ اسی دوران میں رستم نے محسوس کیا کہ ''حضرت جی'' بھی سخت چونکے ہوئے انداز میں رستم کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ''تم کون ہو؟'' مرید کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''تمہارا باپ۔'' رستم نے کہا اور چادر میں سے سیاہ رنگ کی ٹرپل ٹو رائفل نکال لی۔

یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی بہت بڑا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا ہے اور چاروں طرف اس کی کرچیاں بکھر گئی ہیں۔ سانس اٹک گئے اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' رستم دھاڑا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

''حضرت جی'' اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ اس کے تینوں چیلے بھی زرد چہروں کے ساتھ رستم کو دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اسے پہچان گئے تھے اور اس ''پہچان'' کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں دہشت کے مہیب سائے لہرا گئے تھے۔

پھر سب سے پہلے حضرت جی خود ہی بولا تھا۔ ''تم رستم ہو ناں؟''

''تمہیں کوئی شک ہے؟'' رستم بولا۔

''تت......تم کیا چاہتے ہو۔ تم سے کیا دشمنی ہے ہماری؟'' حضرت جی نے اپنی آواز کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا چھری کے نیچے سانس لے، ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی رستم نے تیزی سے چند قدم اٹھائے اور حضرت جی کے سر پر پہنچ گیا۔

اس کی رائفل کی بے رحم نال حضرت جی کی گردن میں دھنس گئی۔ وہ کراہتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ اس کے پاؤں کی ٹھوکر سے بکرے کے لہو والا مرتبان الٹا اور قالین پر گل کاری کر گیا۔ اس کمرے کے اندر رستم کے سوا کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید رستم کا خوفناک انداز کسی کو مزاحمت کی طرف مائل نہ ہونے دیتا۔

رستم نے قدرت اللہ سے کہا۔ ''اپنے اس موٹے کتے سے کہو کہ بال کمرے کے پہرے داروں کو اندر بلائے۔'' موٹے کتے سے رستم کی مراد وہ ہٹا کٹا چیلا تھا جس نے مریضہ کے لواحقین کا خون پیالے میں جمع کیا تھا۔

قدرت اللہ نے ذرا پس و پیش سے کام لیا تو رستم نے اسے بالوں سے پکڑ کر نہایت بے دردی سے جھنجھوڑ دیا۔ قدرت اللہ شاید جان گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے دوچار ہو چکا ہے لیکن وہ اتنی جلدی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر رستم کے صبر کا پیمانہ تو پہلے ہی لبریز تھا۔ اس نے قدرت اللہ کو دھکیلا اور دو قدم چل کر دیوار سے ٹکرا دیا۔ تصادم شدید تھا۔ قدرت اللہ کے ہونٹوں سے کرب ناک کراہ نکل گئی۔ اپنے پیرومرشد کی توہین کا یہ بدترین منظر دیکھ کر فربہ اندام مرید خاموش نہ رہ سکا۔ وہ ایک دبی دبی چنگھاڑ کے ساتھ رستم کی طرف آیا لیکن رستم تک پہنچنا اس کی ہمت و طاقت سے باہر تھا۔ رستم کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس میں سائلنسر لگا کولٹ پسٹل تھا۔ ''ٹھک'' کی آواز سے فائر ہوا اور فربہ اندام شخص عین پیشانی پر گولی کھا کر پٹ سے قالین پر گرا۔ تیز دھار نشتر جس سے شاید وہ رستم پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

دوسرا مرید بائیں پہلو سے رستم کی طرف آیا۔ وہ رستم سے زیادہ قریب تھا لیکن وہ مزید دس گنا قریب بھی ہوتا تو شاید رستم پر حملہ آور نہ ہو سکتا۔ سائلنسر لگے پسٹل سے چلنے والی اگلی دو گولیوں نے دوسرے مرید کی چھاتی اور گردن میں دو سوراخ کر دیئے۔ یہ شخص بھی اوندھے منہ قالین پر گرا اور جان کنی کے عالم میں لرزنے لگا۔ تیسرے مرید نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن رستم کی کڑکتی ہوئی آواز نے اس کے پاؤں زمین میں دھنسا دیئے۔ وہ دروازے سے تین فٹ دور رک گیا۔

دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے قدرت اللہ کی ناک لہولہان ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سفید رومال سے بار بار خون پونچھ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ بیڈ پر مریضہ اپنے قرب و جوار سے بے خبر پڑی تھی۔ اس کے لواحقین کے چہرے ہلدی ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے مسیحا ''حضرت جی'' کے کمرہ خاص میں انہیں گوشت و خون کے ایسے منظر دیکھنے کو

ہیں گے۔ وہ بس پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھے جا رہے تھے۔ رستم کو ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مریضہ کے جواں سال شوہر کو مخاطب کر کے پھنکارا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں۔''

وہ اتنا ڈر گیا تھا کہ اثبات میں سر بھی نہیں ہلا سکا۔ رستم نے پسٹل دوبارہ واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور رائفل بہ دست تیسرے مرید کے سر پر پہنچ گیا۔ ''ہال کمرے میں کتنے پہرے دار ہیں؟'' اس نے مرید سے پوچھا۔

''تت...... تین جی۔ دو اندر ہیں ایک باہر۔'' وہ مشینی انداز میں بولا۔

''ان تینوں کو اندر بلاؤ۔ نام لے کر۔ اگر چالاکی دکھاؤ گے تو ابھی اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔'' رستم نے قالین پر پڑی خون آلود لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

دبلے پتلے مرید نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے آواز دی۔ ''حشمت...... اندر آؤ۔ نورے اور خلیق کو بھی لاؤ۔''

قریباً دو منٹ بعد ہال کمرے میں موجود تینوں پہرے دار اندر خاص کمرے میں آ چکے تھے۔ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ ایک کے پاس میٹل ڈی ٹیکٹر تھا۔ کمرے میں موجود سنسنی خیز صورتِ حال دیکھ کر یہ تینوں پہرے دار جیسے ہپناٹائز ہو گئے۔ ان سے رائفلیں رکھوانے اور انہیں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کروانے میں رستم کو چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ ان تینوں کے ہاتھ ان کے سروں پر رکھے ہوئے تھے۔ (کمرے سے باہر ابھی تک کسی کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا)

تینوں پہرے داروں پر تسلی بخش طریقے سے قابو پانے کے بعد رستم نے دبلے پتلے پنجابی مرید کو ایک بار پھر باہر بھیجا۔ اس مرتبہ وہ گوہرا کو اندر کمرے میں لے آیا۔ کمرے کا خونی منظر دیکھ کر گوہرا کی باچھیں کھل گئیں اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے تعریفی نظروں سے رستم کو دیکھا اور سر ہلایا۔ پھر اس کی نگاہ قدرت اللہ پر پڑی اور ایکا ایکی اس کی آنکھوں میں خون کی شدید پیاس نظر آنے لگی۔

وہ رستم کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''خوش کر دیا، لالے کی جان۔ اب کیا کرنا ہے؟''

''سب سے پہلے تم باہر جاؤ اور ہال کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کر دو۔ کوئی باہر جا سکے اور نہ اندر آ سکے۔''

''لو جی۔ چٹکی بجاتے یہ کام کرتا ہوں۔''

اس نے ایک پہرے دار کی سیون ایم ایم رائفل اٹھائی اور دروازے کی طرف مڑا۔

''لیکن دیکھو...... کوئی زخمی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہوائی فائر کرنا۔''

''جو حکم لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا۔ اس پر موجودہ صورتِ حال کا مطلق اثر نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ موت کے شدید خطرے کو انجوائے کر رہا ہے۔ وہ جھومتا ہوا سا باہر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد رستم نے ہال کمرے کی طرف سے عورتوں کی دبی دبی چیخیں سنیں۔ اس کے ساتھ ہی گوہرا کی کڑکتی ہوئی پوٹھوہاری آواز سنائی دی۔ وہ لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا حکم دے رہا تھا۔ ایسے کاموں کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ قریباً ایک منٹ کے اندر اندر اس نے ہال کمرے کی صورتِ حال پر قابو پا لیا۔

رستم نے خاص کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ مختصر راہداری سے آگے ہال کمرے کی دیوار گیر کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ گوہرا ایک ٹیبل پر چڑھا ہوا تھا۔ رائفل بالکل تیار حالت میں اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مردوں اور عورتوں کا درمیانی پورٹ ایبل پردہ ہٹا دیا تھا۔ اب اس کی عقابی نظریں قریباً چار درجن مرد وزن کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک رستم کو چونکنا پڑا۔ اس کی نگاہ ہال کمرے کے سامنے سے نیچے اترنے والے اسٹائلش زینوں پر پڑی۔ اس نے قدرت اللہ کی ایک بیوی کو دیکھا۔ وہ بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے سیڑھیاں اترتے ہوئے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔ برآمدے کی طرف جانے والا دروازہ بند تھا تاہم ممکن تھا کہ باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہوتا۔

''رک جاؤ۔'' رستم دھاڑا۔

وہ نہیں رکی۔ رستم کے پاس دوسری وارننگ دینے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ کسی بھی لمحے نظر سے اوجھل ہو سکتی تھی۔ رستم نے اپنے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا۔ ایک بار پھر ''ٹھک'' کی دبی دبی آواز گونجی۔ قدرت اللہ کی بیوی چلا کر چھٹے ساتویں زینے سے پختہ فرش پر گری۔

''کیا ہوا ہے؟'' قدرت اللہ نے کرب ناک آواز میں پوچھا۔

''تیری ماں کا سر۔ چپ کھڑا رہ نہیں تو کھوپڑی توڑ دوں گا۔'' رستم نے پستول لہرایا۔

قدرت اللہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ غالباً اس نے اپنی بیوی کی ''سریلی آواز'' پہچان لی تھی۔ رستم کا اندازہ تھا کہ یہ قدرت کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ڈاکٹر صدف ہے۔ رستم کی معلومات کے مطابق قدرت کی منجھلی بیوی عریسہ فراتی ذرا بھاری جسم کی تھی۔

قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کے مُردہ چہرے کچھ اور بھی مُردہ ہو گئے۔ وہ رستم کی آنکھوں میں اپنے لئے بدترین صورتِ حال کے سائے دیکھ رہے تھے۔ جب صدف کو گولی لگی تو کمرے میں خوف و ہراس کی فضا عروج پر پہنچ گئی۔ ایک دبلے پتلے مرید نے کھڑے کھڑے اپنی شلوار گیلی کر لی تھی اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ قدرت اللہ کو بھی کھڑے رہنے کے لئے صوفے کے ہتھے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہ لوگ استانے پر آئے ہوئے سوالیوں کے لئے رعونت اور بے نیازی کی علامت تھے لیکن اب خود سراپا ”آفت زدہ“ نظر آ رہے تھے۔

جن پہرے داروں نے دیوار کی طرف منہ کر رکھا تھا، ان میں سے ایک نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رستم نے اسے ایک تسلی بخش گالی سے نوازا اور ساتھ ہی رخ دیوار کی طرف رکھنے کی ہدایت کی۔

اسی دوران میں رستم نے ہال کمرے میں ایک منظر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چند لمحے کے لئے اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں ہوا۔ گوہرانے جن مرد و زن کو اپنی رائفل سے کور کر رکھا تھا ان میں ایک جانا پہچانا چہرہ بھی تھا...... ہاں رستم کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ عارف کمبوہ تھا۔ وہی جوشیلا نوجوان جس نے مہتم سردار وراج کے ساتھ مل کر کھولی گاؤں میں رستم اور بی بی کی جان بچائی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت مونچھوں اور چوڑی پیشانی کے سبب رستم نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ بھی رستم کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھایا جیسے رستم کی طرف آنا چاہ رہا ہو۔

رستم نے سر کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا رستم کے پاس چلا آیا۔

”تم یہاں عارف؟“ رستم نے سرگوشی کی۔

”ہاں رستم بھائی ... اور میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔“

”کون؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے آپ اس لڑکی کو دیکھیں جو سیڑھیوں سے گری ہے۔“

عارف کا اشارہ قدرت اللہ کی بیوی صدف کی طرف تھا۔ وہ ٹانگ پر گولی کھا کر اوندھے منہ فرش پر گری تھی اور وہیں بے حس و حرکت پڑی رہ گئی تھی۔ ہال کمرے میں موجود لوگ دہشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

رستم نے ایک تنومند پہرے دار کو اپنی طرف بلایا اور عارف سے کہا کہ وہ پہرے دار

کے ساتھ مل کر قدرت اللہ کی بیوی کو اندر لے آئے۔

عارف نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ قریباً ایک منٹ بعد زخمی صدف کمرے میں صوفہ کم بیڈ پر دراز تھی۔ اس کے سر کے نیچے عارف نے ایک کشن رکھ دیا تھا۔ صدف نامی اس جواں سال ڈاکٹر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مکمل بے ہوش تھی۔ بظاہر کہیں سے خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ عارف نے اس کی شلوار کا پائنچہ اٹھا کر دیکھا۔ ٹانگ کا زخم زیادہ سنگین ثابت نہیں ہوا۔ کولٹ پسٹل کی گولی اس کی پنڈلی کا نرم گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ مرہم پٹی کے ذریعے یہاں سے رسنے والے خون کو روکا جا سکتا تھا۔ اس کی ناک کے ایک نتھنے سے بھی تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

اپنی چہیتی بیوی کی حالت دیکھ کر قدرت اللہ کی حالت پتلی ہوئی۔ وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھا۔ ”صدف...... صدف۔ آنکھیں کھولو۔“ وہ اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔

دنیا جہان کا کرب اس کی آواز میں سمٹ آیا تھا۔

رستم پھنکارا۔ ”دور ہو جاؤ اس سے۔ پیچھے ہٹو۔“

وہ ذرا ٹھٹکا پھر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

رستم کی آنکھوں میں لہریں مارنے والی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابھی تک یہاں جتنے فائر ہوئے تھے سائلنسر لگے پستول سے ہوئے تھے۔ عمارت سے باہر لوگوں کو اندر کی صورتِ حال کا ٹھیک ٹھیک پتا نہیں تھا لیکن یہ سچویشن تا دیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رستم کے سینے میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ یہاں دس پندرہ لاشیں گرانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ وہ قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کو ٹرپل ٹو سے چھلنی کرنے کا اصولی فیصلہ کر چکا تھا۔ غالباً اس کے اندر کا یہی ”تہیہ“ تھا جس نے قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کا خون...... موت سے پہلے ہی خشک کر ڈالا تھا۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن یہ راہ اچھی اور بُری دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شخص کی محبت غیر مرئی لہروں پر سفر کر کے دوسرے شخص پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یونہی نفرت بھی سفر کرتی ہے اور اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں نفرت اثر انداز ہو رہی تھی۔ سینے میں پھنکارتی ہوئی آگ اور انگلیوں میں سنسناتی ہوئی موت اثر انداز ہو رہی تھی۔ خون خشک تھا اور سانس سینے میں الجھ رہے تھے۔ قالین پر پڑی دونوں لاشیں ماحول کو مزید خوف ناک بنا رہی تھیں۔

اب ایک سیون ایم ایم رائفل عارف کے ہاتھ میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ رستم نے

اسے ہدایت کی کہ وہ اردگرد کے کمروں کا ایک چکر لگائے اور اگر قدرت اللہ کا کوئی اور ساتھی بھی یہاں موجود ہے تو اسے لے آئے۔ عارف بے حد ہتھیار شناس اور چوکس شخص کا نام تھا۔ اس کے جانے کے بعد چند دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی عورت کی دہشت زدہ چیخ سنائی دی۔ قریباً دو منٹ بعد عارف قدرت اللہ کی منجھلی بیوی عریسہ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک سفید دستانے موجود تھے۔ ان دستانہ پوش ہاتھوں سے وہ اب تک نہ جانے کتنے بے زبان جانوروں کو شوہر کے عملیات کی بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ اس کے ساتھ ایک موٹی تازی مریدنی اور مرید بھی تھا۔ مریدنی کے کپکپاتے ہاتھوں میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی لٹھے کی طرح سفید تھا۔ رستم نے ان تینوں افراد کو بھی قطار میں کھڑا کر دیا۔ اپنی چھوٹی سوکن صدف کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر عریسہ کا خوف انتہا کو پہنچ گیا، لگتا تھا وہ ابھی گر پڑے گی۔

عارف، رستم کی آنکھوں میں ہر دم بڑھتی ہوئی وحشت دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب بہت جلد کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے۔

وہ رستم کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''رستم بھائی! تم جانتے ہو میرے ساتھ اور کون یہاں آیا ہے؟''

''کون ہے؟'' رستم نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''شانی بی بی۔'' عارف نے کہا اور رستم کا پورا جسم سنسنا گیا۔

وہ چند سیکنڈ کے لئے کچھ نہیں بول سکا۔ پھر اس نے اپنے اعصاب کو سنبھالا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کہاں ہیں وہ؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہال کمرے میں موجود خواتین پر ایک تیز نظر ڈالی۔ یکا یک اس کے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ اسے کیسے نہ جانتا؟ کیوں نہ پہچانتا؟ وہ تو سانس کے ساتھ سفر کرتی تھی، وہ تو خون کے ساتھ رگوں میں دوڑتی تھی۔ دن میں اور رات میں، کھلی اور بند آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا اور وہ اس کے سامنے تھی۔ اس کا نقاب اس کی چادر اور نظر کی عینک، اسے رستم سے چھپا نہیں سکے۔ وہ سرتاپا آنکھ بن گیا اور بی بی کو دیکھنے لگا۔ وہ عورتوں والے حصے میں ایک ستون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب کسی کو سراپا آنکھ بن کر دیکھا جاتا ہے تو باقی حسیات ماند پڑ جاتی ہیں۔ رستم جیسا چوکس شخص بھی چند لمحوں کے لئے اپنے قریب کھڑے دراز قد گارڈ سے بے خبر ہو گیا۔ جھلی گارڈ جسے اپنی موت کا پورا یقین ہو چکا تھا برق رفتاری سے رستم کی طرف آیا۔ اس نے رستم کی رائفل پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی۔ رستم نے رائفل ایک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ گارڈ کی کوشش

اس حد تک کامیاب ہوئی کہ رائفل رستم کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دوسرے ہاتھ میں سائلنسر لگا پسٹل بدستور موجود رہا۔ رستم نے پلٹ کر فائر کیا۔ پہلی گولی گارڈ کے پیٹ میں لگی، دوسری آنکھوں کے عین درمیانی پیشانی پر۔ وہ ایک جھٹکے سے پشت کے بل اپنے پشت پناہ عزت مآب حضرت پیر قدرت اللہ صاحب کے قدموں میں جا گرا۔ خون اس کی چھاتی کے نیچے سے کسی فوارے کی طرح نکلا تھا۔ عریسہ اور مریدنی نے دہشت سے چلانا شروع کر دیا۔ عریسہ پر تو جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔

رستم نے دھاڑ کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ چپ نہیں ہوئی تو رستم نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان زمین پر فائر کیا۔ وہ دہشت سے کرلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور دھڑ سے قالین پر گر گئی۔ پھر اس میں اتنی ہمت ہی نہیں رہی کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ سکے۔ رستم نے وحشت کے عالم میں عریسہ کو بھی گولی کا نشانہ بنانا چاہا لیکن اس اثناء میں شانی بڑی تیزی سے رستم تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں رستم کے سامنے آ گئی۔ رستم قالین پر گری عریسہ پر فائر نہیں کر سکا۔

''نہیں رستم۔ ایسا مت کرو۔'' وہ تیز سرگوشی میں بولی۔

چند لمحوں میں رستم کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ بتدریج جھکتا چلا گیا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' رستم نے کراہتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

وہ رستم کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''رستم! پلیز دو منٹ ایک طرف آ کر میری بات سن لو۔''

رستم جس جگہ اور جس صورت حال میں کھڑا تھا، وہ ادھر سے اُدھر نہیں جا سکتا تھا لیکن دوسری طرف بی بی کا حکم تھا...... بلکہ دیوی کا حکم تھا۔ وہ شدید تذبذب میں کھڑا رہ گیا۔ رستم کے پہلو میں گوہر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اس کی تیز نظریں کمرے اور ہال میں موجود ہر متنفس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عارف کمبوہ ہال کمرے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی بھری ہوئی رائفل تھی۔ وہ ہال نما کمرے کے سکتہ زدہ حاضرین کو پُرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

پھر رستم کے لئے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بی بی نے رستم کی کلائی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ لے کر ایک بغلی کمرے میں آ گئی۔ اپنی کلائی پر بی بی کے ہاتھ کا لمس رستم کے لئے جادوئی اثر کا حامل تھا۔ کمرے میں پہنچ کر بی بی نے دروازہ بند کیا اور روتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''رستم! کیوں کر رہے ہو ایسا، کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میری جان کے دشمن بھی۔ تمہیں پتا نہیں...... تم کتنی تکلیف دے رہے ہو مجھے۔ کتنی

اذیت پہنچا رہے ہو۔ تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟''

رستم حیرت سے گنگ سنتا رہا۔ بی بی کے الفاظ اپنے اندر شدید ترین اپنائیت لئے ہوئے تھے۔ اس نے بی بی کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر پلکیں جھکا لیں۔ ''میں نے کیا کیا ہے بی بی؟''

شانی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''خدا کے لئے رستم۔ اگر تم نکل سکتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں اپنے سامنے مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔''

رستم نے بے ساختہ بی بی کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لئے۔ ''ایسا مت کریں بی بی۔ آپ حکم دیں۔''

''اسے حکم سمجھ لو، یا التجا یا کچھ بھی سمجھ لو۔ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ یہاں تمہارے ہاتھوں کئی بندے مارے گئے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں یہاں پولیس کی گاڑیوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''تو نہ چھوڑیں۔ زندہ رہنا کون چاہتا ہے۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''لیکن مرنے سے پہلے میں اس آستانے کی اینٹ سے اینٹ ضرور بجاؤں گا۔ میں یہاں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔''

بی بی نے اپنے ہاتھ رستم کی گرفت سے کھینچ لئے۔ قدرے سرد لہجے میں بولی۔ ''ابھی تم نے کہا ہے کہ میں التجا نہ کروں صرف حکم دوں۔ دیکھو، میں التجا کرتی ہوں اور اگر تم مانتے ہو تو حکم بھی دیتی ہوں، تم نے جو کچھ کرلیا وہ بہت ہے۔ اب قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کو کچھ نہیں کہو گے۔ ایک گولی نہیں چلاؤ گے۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ جیسے صدیوں پر بھاری تھے۔ بی بی دیوار کی طرح اس کے اور قدرت اللہ کے درمیان کھڑی تھی اور فقط کھڑی نہیں تھی ایک حکم بھی دے رہی تھی۔ تاؤ حشام جیسے ظالم کی معافی کے بعد یہ دوسری بڑی قربانی تھی جو بی بی اس سے طلب کر رہی تھی اور۔ ۔ ۔اور رستم کے پاس یہ قربانی دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہاں، وہ چند لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ رستم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ سینے میں بھڑکتا آتش فشاں ماند پڑنے لگا۔ اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر گھمبیر آواز میں بولا۔ ''بی بی! میں آپ کا حکم مانتا ہوں۔ میں اب یہاں کسی شخص کو کچھ نہیں کہوں گا لیکن یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میں قدرت اللہ اور اس کے ساتھیوں کو ایک سبق ضرور دینا چاہتا ہوں۔ میری آپ سے منت ہے، شاید آخری منت ہے۔ آپ مجھے اس کام سے نہ

روکیں۔''

دونوں چند سیکنڈ تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ''اب کسی کی جان تو نہیں لو گے؟'' شانی نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بی بی۔'' رستم نے حتمی جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اب آپ سے گذارش ہے کہ آپ یہاں سے چلی جائیں۔ آپ یہاں ہوں گی تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ یہاں سے نکل بھی نہیں سکوں گا۔'' کہنے کو تو وہ کہہ رہا تھا کہ چلی جائیں لیکن ایسا کہتے ہوئے اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی یہ بس وہی جانتا تھا۔ دوسری طرف شانی کو بھی کوئی چیز رکنے اور ٹھہرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے پاؤں زمین میں پیوست تھے۔ ہال کمرے اور خاص کمرے میں صورتِ حال بدستور سنسنی خیز تھی۔ گاہے بگاہے عورتوں کے سسکنے اور گوہرا کے دھاڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گوہرا نے صورتِ حال کو پوری طرح سنبھال رکھا تھا۔ عارف اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر اصرار کے ساتھ کہا۔ ''بی بی یہاں سے چلی جائیں۔''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے رستم کو دیکھ کر اور ہولے سے خدا حافظ کہہ کر واپس مڑی۔ اس کے قدم اٹھنے لگے لیکن کوئی نادیدہ اور بے حد مضبوط ڈوران دونوں کے درمیان موجود تھی۔ وہ شانی کے قدموں کو کھینچ رہی تھی۔ انہیں روک رہی تھی۔ وہ چل سکتی تھی، نہ رک سکتی تھی۔ یہ قامت کے لمحے تھے، یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ وہ دیوی تھی اور لاچار تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ رکی......اور واپس مڑی.. ....اور اس نے دیکھا تو پتھر کی ہو جائے گی۔ مگر نادیدہ ڈور بھی ناقابلِ شکست تھی۔ قدموں اور پورے جسم کو جکڑتی چلی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

بی بی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی اور رستم دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''دیوی رک جاؤ! کیا پتا کہ یہ آخری ملاقات ہو اور آخری بار ملاقات ایسی تو نہیں ہوتی۔ اپنے پجاری کو آخری بار خود کو چھو لینے دو......''

اور پھر وہ رک گئی۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ رستم کو مڑ کر دیکھا۔ نادیدہ ڈور موجود تھی اور بڑی مضبوط تھی جو بی بی کو جانے سے روک رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رستم کو یوں لگا کہ بی بی تیزی سے اس کی طرف آئیں گی......اور اس کے گلے لگ جائیں گی۔ اپنے بے مثال جسم کی ساری نرمی، گرمی اور حلاوت کے ساتھ۔ ان کے ہونٹ اس کی گردن کے قریب ہوں گے اور وہ سسکتی ہوئی سرگوشی کریں گی۔ ''رستم، میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

وہ لمحے جیسے برسوں پر بھاری تھے۔ وہ کھڑی رہی پھر وہ رستم کی طرف آئی لیکن تیزی سے نہیں، اپنے مخصوص وقار کے ساتھ۔ وہی ٹھہری ہوئی چال جو دیکھنے والے کو مرعوب کر دیتی تھی۔ آنکھوں کے شفاف آئینوں پر آنسوؤں کی چمک بدستور موجود تھی۔ بی بی نے کہا۔

''رستم! مجھے ڈر ہے۔ میرے جانے کے بعد......''

''نہیں بی بی! میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب میری طرف سے یہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

''لیکن کیا ہم...... یہاں سے اکٹھے نہیں نکل سکتے؟''

''بی بی، اکٹھے نکلنے کے بعد بھی تو راستے جدا ہی ہوتے ہیں۔ آپ پہلے نکل جائیں تھوڑی دیر بعد میں بھی نکل آتا ہوں۔'' رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

بی بی کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی نم ہو گئیں۔ آخر اس نے ایک گہری کرب

ناک آہ کو سینے میں دبایا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ اس مرتبہ اس کی چال میں استحکام تھا۔ رستم کو یوں لگا کہ کسی نے اس کے سینے میں ہاتھ ڈال کر کلیجہ کھینچ لیا ہے۔ حالات ایک بار پھر جیت گئے تھے۔ دلوں کی تڑپ پھر ہار گئی تھی۔ ان لمحوں میں رستم کو نہ جانے کیوں پنجابی کی ایک کہاوت یاد آئی۔ اس کہاوت کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ ''عشق کی بلا بڑی خوفناک ہے۔ یہ انسان کا خون پیتی ہے، ہڈیاں چباتی ہے لیکن مارتی نہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹکا کر رکھتی ہے۔ اس لئے اے پیارے چرواہے، بہتر ہے کہ تُو اپنی بانسری کو خاموش رکھ۔ عشق کرنے کے لئے لوہے کا کلیجہ چاہیے۔''

......اور وہ چلی گئی۔ رستم نے اسے ہال نما کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے عارف کمبوہ کے پاس رکی۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور سیدھی نکلتی چلی گئی۔ خاص کمرے میں موجود قدرت اللہ، اس کی بیوی عریسہ اور دیگر افراد متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بی بی کی صورت دیکھ سکے تھے اور نہ وضاحت سے آواز سن سکے تھے، تاہم ان کے دلوں میں یہ شک ضرور پیدا ہوا تھا کہ یہ بی بی ہے۔

بی بی کے چلے جانے کے بعد رستم دوبارہ قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کے سر پر پہنچ گیا۔ قدرت اللہ کے خاص کمرے کا منظر سنسنی خیز بلکہ تہلکہ خیز تھا۔ ایرانی قالین پر تین لاشیں پڑی تھیں جب کہ دو لڑکیاں گہری بے ہوشی کی حالت میں لیٹی تھیں۔ دو لاشیں قدرت اللہ کے مریدوں کی تھیں۔ تیسری جہلمی پہرے دار کی تھی۔ آخر میں مرنے والے پہرے دار کی عین پیشانی پر 38 بور کی گولی لگی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ یک ٹک چھت کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون قدرت اللہ کے پاؤں تک چلا گیا تھا۔ پہلے مرنے والے دونوں مرید بھی الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان کے جان لیوا زخموں سے بہنے والے خون نے بھی قالین پر خوب گل کاری کی تھی۔ ان میں سے ایک مرید کے جسم میں شاید ابھی کچھ جان باقی تھی کیونکہ اس کے پیٹ میں گاہے بگاہے خفیف جنبش پیدا ہوتی تھی۔ بے ہوش لڑکیوں میں سے ایک تو وہی مریضہ تھی جو اپنے شوہر امیر اکبر اور سسر وغیرہ کے ساتھ یہاں موجود تھی، دوسری قدرت اللہ کی چہیتی بیوی صدف تھی۔ مریضہ بیڈ پر اور صدف صوفہ کم بیڈ پر پڑی تھی۔ قدرت اللہ کی دوسری بیوی عریسہ کو گوہرا نے صوفے پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ شاید وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ کھڑی رہ سکتی۔ اس کا رنگ ہلدی اور ہونٹ سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کو کسی بھی وقت دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

قدرت اللہ کی نگاہیں بس اپنی چہیتی بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ رستم کو دیکھ کر وہ کراہا۔ ''دیکھو اس کا سانس پھنس رہا ہے اس کو... جلدی سے ہسپتال پہنچانا چاہیے۔''

''پہنچا دیتے ہیں ہسپتال بھی۔'' رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ہال کمرے کا بیرونی دروازہ بجنے لگا۔ کوئی دستک دے رہا تھا۔ رستم نے قدرت اللہ کے دبلے پتلے مرید کو پسٹل سے اشارہ کیا کہ وہ قریب آئے۔ وہ لرزتا کانپتا قریب آیا۔ اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ رستم نے کہا۔ ''دیکھو، دروازے پر کون ہے۔ اسے بتاؤ کہ حضرت جی عمل کر رہے ہیں، دروازہ کھولنے سے منع کیا ہے۔''

مرید نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ رستم بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے گیا۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ رستم کے اشارے پر مرید نے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''شوکت ہوں۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟''

''حضرت... عمل کر رہے ہیں۔ دروازہ بند کرا رکھا ہے۔''

''یہ اندر سے آوازیں کیسی آئی تھیں؟''

''کہا ہے ناں، عمل کر رہے ہیں۔'' مرید نے بمشکل جواب دیا۔

''کتنی دیر لگے گی؟''

اس مرتبہ رستم نے جواب دیا۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''بے کار کے سوال نہ کرو۔ یہ حضرت جی کو ہی پتا ہوگا کہ کتنی دیر لگے گی۔ جاؤ تم گیٹ پر۔''

باہر خاموشی چھا گئی۔ پہرے دار کچھ تذبذب میں رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ رستم دوبارہ خاص کمرے یعنی عملیات والے کمرے میں آ گیا۔ اس دوران میں گوہرا نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ دو مریدوں کی لاشیں گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں پہنچا چکا تھا پھر جہلمی پہرے دار کو بھی اس نے اسی طرح قالین پر کھینچ کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ رستم کو امید تھی کہ لاشوں کے منظر سے ہٹ جانے سے ہال کمرے میں موجود حاضرین کا خوف کچھ کم ہوگا۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جنہوں نے قرب و جوار سے نگاہ چرانے کے لئے سر گھٹنوں میں چھپا رکھے تھے۔ دو دہشت زدہ عورتوں نے اپنے بچوں کو گود میں چھپا کر ان کے اوپر اپنی اوڑھنیاں ڈال دی تھیں۔ ایک عورت بے دم سی ہو کر قالین پر لیٹ گئی تھی، دوسری عورت تسبیح پڑھنے کے ساتھ ساتھ اسے تسلی دے رہی تھی۔

رستم نے حاضرین کے سامنے پہنچتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہو۔ تھوڑی دیر میں تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

قالین پر لیٹی ہوئی عورت تسلی کے ان بولوں سے رقت زدہ ہو گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

عارف کمبوہ ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ (اس کا چہرہ ڈبی دار صافے میں چھپا ہوا تھا) اس نے ٹیلی فون کا مین تار ڈھونڈ لیا تھا اور اسے کاٹ دیا تھا۔ اب اس بات کا خطرہ بہت کم رہ گیا تھا کہ کوئی یہاں کی ہنگامی صورتِ حال کے بارے میں باہر اطلاع پہنچائے گا۔ (جو دو تین موبائل سیٹ ان لوگوں کے پاس موجود تھے وہ رستم نے پہلے ہی قبضے میں کر لئے تھے)

رستم نے سسکتی ہوئی عورت کے پاس جا کر اسے ذاتی طور پر تسلی دی پھر وہ قدرت اللہ کے پاس پہنچا۔ قدرت اللہ ایک بار پھر جذبات سے لاچار ہو کر اپنی بیوی کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ اسے شانوں سے جھنجھوڑ کر مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم دھاڑا۔ ''تمہیں کہا تھا ناں اس سے دور رہو۔''

وہ لرز کر پیچھے ہٹ گیا تاہم پھر سنبھل کر بولا۔ ''دیکھو، اس کی جان چلی جائے گی۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اس کو ہسپتال لے جانا ہوگا۔''

''ہسپتال میں کیوں؟ اس کا علاج یہیں ہوگا۔'' رستم پھنکارا۔

''کک...... کیا مطلب؟''

''تم جیسے مسیحا کے ہوتے ہوئے اس کو ہسپتال لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تم سب کچھ یہیں پر کر سکتے ہو تو پھر ہم اسے ہسپتالوں میں لئے لئے کیوں پھریں؟''

''م...... میں۔'' قدرت اللہ ہکلا کر رہ گیا۔

''ہاں ہاں کہو۔''

''میں...... کیا کر سکتا ہوں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی بے ہوشی گہری ہوئی ہے۔''

رستم نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بے ہوشی تو اس لڑکی کی بھی بہت گہری ہے۔ اس کے بھی سر پر چوٹ لگی ہے۔ یہ بھی پھنسے پھنسے سانس لے رہی ہے اگر تم اس کا علاج یہاں کر سکتے ہو تو اپنی بیوی کا بھی کر سکتے ہو اور تم ہی کرو گے میری جان۔''

قدرت اللہ کا زرد رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف کے عالم میں پھیل

گئیں۔ اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔ صدف کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے رستم کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ قدرت اللہ کو اسی کے سکوں میں جواب دے سکے اور یہ ناقابلِ فراموش جواب یوں اور بھی ذلت آمیز ہو گیا تھا کہ قدرت اللہ کے درجنوں عقیدت مند موقع پر موجود تھے اور ہال کمرے کے دیوار گیر شیشے سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔

قدرت اللہ نے اپنے سیاہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''دیکھو رستم! یہ بدلے چکانے کا وقت نہیں۔ میری بیوی مر رہی ہے۔ یہ ختم ہو جائے گی۔''

''یہ لڑکی فوزیہ بھی مر رہی ہے۔ یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ تم دونوں کا علاج کرو اور ابھی کرو۔ دیکھو کیسا اتفاق ہے۔ دونوں عورتیں ہیں، دونوں جواں سال ہیں۔ دونوں کا مرض بھی تقریباً ایک ہی ہے اور دونوں کو مسیحا بھی ایک ہی ملا ہے۔ چلو شاباش جلدی شروع کرو اپنا کام۔''

قدرت اللہ نے بے بسی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ مرید نے اپنی صوابدید سے کام لیتے ہوئے کالے رنگ کا ایک چوکور رومال صدف کے سینے پر رکھ دیا۔ اس رومال پر چمک دار کڑھائی کے ذریعے کوئی عبارت لکھی گئی تھی اور ہندسے وغیرہ نظر آرہے تھے۔ بالکل ایسا ہی ایک رومال مریضہ فوزیہ کے سینے پر بھی رکھا تھا۔

قدرت اللہ نے جھنجھلا کر مرید کو جھڑکا۔ ''پیچھے ہٹاؤ اس کو......''

غالباً قدرت اللہ نے ادھورہ فقرہ بولا تھا۔ پورا فقرہ یہ تھا۔ ''پیچھے ہٹاؤ اس کو، یہ کیا خرافات ہے۔'' مرید نے اپنے مرشد کو قدرے تعجب سے دیکھا اور رومال اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔

قدرت اللہ کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ وہ شخص جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں تھی، جو بولتا تھا تو ایک خلقت سانس روک کر سنتی تھی، وہ ان لمحوں میں ایک کیچوے کی طرح حقیر اور بکری کی طرح بدحواس نظر آنے لگا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا اور رستم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے اس کا فیض میرے اپنوں کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دوسروں کے لئے ہے۔ ...''

''تیرے جیسے نوسر بازوں کا یہ فقرہ اب بڑا پرانا ہو چکا ہے قدرت اللہ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے پاس جھوٹ، بددیانتی اور بے شرمی کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اب زیادہ ڈرامہ

کر۔ دیر کرنے سے تیری چہیتی بیوی کا جتنا نقصان ہوگا اس کا ذمے دار تُو خود ہے۔ چل شاباش شروع کر دے اپنا عمل۔''

''کک۔۔۔ کون سا عمل؟''

''وہی جو میرا اکبر کی بیوی پر کر رہا تھا۔''

''دیکھو رستم! اس کی حالت ٹھیک نہیں، یہ مر جائے گی۔''

''بکواس بند کر۔ تیرے ہوتے اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تیرے تو چیلے بھی مُردوں کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ تُو تو مہان گرو ہے۔ تیرے پاس جادو ٹونہ، تعویذ گنڈا، کالا، نوری علم اور مؤکل وغیرہ سب کچھ ہے۔'' اس کے بعد رستم نے دبلے مرید سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''او کیکڑے! بکرے بکری کا اور جوڑا ہے یہاں؟''

مرید نے سوالیہ نظروں سے قدرت اللہ کی طرف دیکھا، جیسے ہدایات لینا چاہتا ہو۔ رستم نے اس کے بے گوشت کولہے پر ٹانگ جمائی۔ وہ لڑکھڑا کر پولی تھین کی شیٹ پر گیا اور خون پر سے پھسل گیا۔ رستم پھنکارا۔ ''اپنے باپ کی طرف کیا دیکھتا ہے حرامی! میری بات کا جواب دے۔ بکرا بکری ہے یہاں؟''

مرید نے اپنا مضروب کولہا دبایا اور اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں جی! ایک جوڑا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اپنا عمل شروع کر قدرت اللہ۔ جوڑے کی ضرورت تو بعد میں پڑے گی۔''

اچانک بے ہوش ڈاکٹر صدف کے حلق سے گھیں گھیں کی مدھم آواز برآمد ہونے لگی۔ قدرت اللہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ رستم کی دھمکی کی پرواہ کئے بغیر وہ بیوی کے پاس پہنچا۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے صدف کی پلکیں اٹھا کر اس کی پتلیاں دیکھیں۔ اس کا ایک دستانہ اُتار کر اس کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کی پھر وہ رستم کے پاس آیا اور دردناک سرگوشی میں بولا۔ ''تم جو کہو گے، میں کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن ابھی مجھے میری بیوی کی زندگی بچا لینے دو۔''

رستم نے بڑی بے رحمی سے اپنا گھٹنا قدرت اللہ کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دور گیا اور اپنی ''مضروب جگہ'' کو دبا کر نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا پورا جسم تو پہلے ہی لرز رہا تھا، اب چہرہ بھی اذیت کا شاہکار ہو گیا۔ فربہ اندام مریدنی دیوار کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ اس نے چور نظروں سے اپنے عالی مرتبت مرشد کی حالت دیکھی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ عریسہ کے منہ سے بھی کرب ناک آوازیں نکلنے لگیں۔

رستم نے پھنکار کر قدرت اللہ کو وارننگ دی۔ ''کان میں پھس پھس نہیں کرنی۔ جو بات

بھی مجھ سے کہنی ہے، اونچی آواز میں کہو۔ سب کے سامنے۔ میں بھی اونچی آواز میں جواب دوں گا۔ ہاں بتاؤ اب، کیا کہہ رہے تھے؟''

''مم... میں اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج ہسپتال میں ہو سکتا ہے۔''

''اس کا علاج صرف ہسپتال میں ہو سکتا ہے تو پھر فوزیہ کا علاج یہاں کیسے ہو سکتا ہے یا تُو اپنی حرام زدگی تسلیم کر کے فوزیہ کا علاج بھی فراڈ تھا۔''

''مم... میں بندہ بشر ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ سمجھ لو کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔'' وہ اس موقع پر ہر بات ماننے کو تیار نظر آتا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''یہ غلطی نہیں، جرم ہے اور یہ جرم تم پہلی بار نہیں کر رہے، اس سے پہلے بھی ہزاروں بار کر چکے ہو۔ اپنے مریضوں کو اور عقیدت مندوں کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ جنہیں ہسپتالوں اور اچھے معالجوں کی ضرورت تھی وہ تمہارے سفلی عملوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے رہے ہیں... اس کی ایک مثال چوہدری بشیر کی بیوی مقبول (بھابو) بھی ہے۔ وہ اسی طرح سسک سسک کر تمہارے ہاتھوں مرگئی تھی۔ مری تھی یا نہیں؟''

قدرت اللہ خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

رستم نے بدستور بلند آواز سے کہا۔ ''ان سارے لوگوں کے سامنے اس بات کو مانو کہ تم جھوٹ بکتے رہے ہو، فراڈ کرتے رہے ہو۔ لوگوں کی زندگیاں لیتے رہے ہو۔ جس طرح آج اس لڑکی فوزیہ کی زندگی لے رہے تھے۔''

''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا لیکن کبھی غلطی لگ بھی سکتی ہے۔'' وہ کراہا۔

''پھر غلطی... یہ غلطی نہیں جرم ہے اور قتل ہے۔'' رستم دوبارہ پوری طرح بھڑ گیا۔ قدرت اللہ کا مزاحمتی رویہ اسے مشتعل کر رہا تھا۔ اس نے دبلے پتلے مرید کو اشارہ کیا کہ وہ ایک طرف رکھا ہوا پیالہ نما برتن لے کر آئے۔ یہ وہی برتن تھا جس میں ہلکے سرخ رنگ کا محلول بھرا ہوا تھا۔ جب رستم اس کمرے میں داخل ہوا تھا، قدرت اللہ اسی محلول میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر بے ہوش لڑکی پر عمل کر رہا تھا۔

رستم کے حکم پر مرید برتن لے آیا اور صدف کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ رستم نے قدرت اللہ کو اشارہ کیا۔ ''چلو شروع کرو اپنا کام۔ مجھے یقین ہے کہ اس بار تمہارے عمل میں زیادہ طاقت ہو گی۔ اب کوئی غیر نہیں تمہاری اپنی پیاری بیوی ''کومے'' میں ہے۔ اس بار تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ چلو شروع ہو جاؤ شاباش۔''

قدرت اللہ نے محلول والے ''مقدس برتن'' کی طرف بے حد عاجز نظروں سے دیکھا۔

رستم نے سائلنسر لگے پسٹل کو خطرناک انداز میں حرکت دی۔ ''میں فارسی نہیں بول رہا ہوں۔ چلو آگے بڑھو۔ شروع کرو عمل۔''

قدرت اللہ سکتہ زدہ کھڑا رہا۔ کبھی رستم کو اور کبھی صدف کو دیکھتا رہا۔ صدف کی سانس اب جھٹکوں سے آ رہی تھی۔ رستم نے آگے بڑھ کر محلول والا پیالہ مرید کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے قدرت اللہ کی طرف بڑھایا۔ ''میری جان! کیا کر رہے ہو۔ دیر ہو جائے گی۔ اپنی انگلیاں اس میں ڈبو کر بیوی کے چہرے پر چھینٹے دو۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے مرنے نہیں دو گے۔''

اچانک قدرت اللہ کی ساری عاجزی اور لاچاری طیش میں ڈھل گئی۔ اس نے پیالے کو ہاتھ مار کر دور پھینک دیا۔ پیالہ دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی کی طرف لپکا اور اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے حواریوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ ''جہانے، بالم، مجید... جلدی آؤ۔''

رستم نے اندازہ لگایا کہ وہ صدف کو اپنے بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کوشش میں وہ بے ہوش صدف کے اوپر ہی گر پڑا اور پھر ایک دم وہ بھنا کر رستم کی طرف پلٹا اور اس کے ہاتھوں سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی۔ یہ بالکل اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ وہ اور اس کے مرید و پہرے دار یہ بازی مکمل طور پر ہار چکے تھے۔ رستم نے ایک بار پھر اس کی ٹانگوں کے درمیان اپنے پاؤں سے بے رحم ضرب لگائی۔ پچھلی مرتبہ وہ صرف کراہا تھا، اب ڈکراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ قدرت اللہ کی اس بے مثال توہین پر مریدنی اور مرید پھر اونچی آواز میں رونے لگے۔ ہال کمرے میں حاضرین حیرت زدہ تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ آسمان گرا کیوں نہیں۔ زمین پھٹی کیوں نہیں۔ اگر عزت مآب حضرت صاحب کی اتنی شدید ترین توہین کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا تو پھر کب ہو گا؟

قدرت اللہ کی حالت دیدنی تھی۔ تھوڑا سا طیش دکھانے کے بعد وہ پھر منت سماجت پر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو رستم، ابھی مسئلہ ایک زندگی بچانے کا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم بعد میں کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ بڑے آرام سے اور تفصیل سے بات کروں گا۔ تمہاری جو باتیں درست ہوں گی، وہ بھی مان لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اندر بھی غلطیاں ہوں۔ بلکہ غلطیاں ہیں۔''

''لیکن ابھی تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد تو تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں

ہو سکتی۔" رستم نے سفاکی سے قدرت اللہ کی بات کاٹی۔"تم نے ایک بہت خاص پیالہ اپنے ہاتھوں سے توڑا ہے۔ ایسا ہی ایک پیالہ کچھ عرصہ پہلے بی بی سے ٹوٹا تھا۔ تم نے اب تک بی بی کی جان نہیں چھوڑی۔ ہر جگہ انہیں رسوا کر رہے ہو۔ پیالہ توڑنے کی سزا کے طور پر تمہاری ان دونوں بیویوں نے بی بی جی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔"

"تم تم کب کی بات کر رہے ہو۔ مجھے نہیں پتا؟"

"میں چوہدری حشام کی حویلی کی بات کر رہا ہوں۔ تم اتنے چوچے نہیں ہو، سب کچھ جانتے ہو۔ وہاں تمہاری ان دونوں بیویوں نے مشٹنڈی جالاں کے ساتھ مل کر بی بی کو زمین پر گرا کر مارا تھا۔ مارا تھا یا نہیں؟"

پینتیس چالیس سالہ فربہ اندام مریدنی ایک دم پلٹی اور تڑپ کر رستم کے پاؤں میں گر پڑی۔ اس نے اپنا سر رستم کے پاؤں پر رکھ دیا۔"خدا کے لئے . ہم پر رحم کریں۔ حضرت جی کو دکھ پہنچا تو ہم سب کو پہنچے گا۔ ہم سب کو رونا پڑے گا۔ یہ کرنی والے ہیں۔ . . "

رستم نے ٹھوکر مار کر مریدنی کو اپنے قدموں سے ہٹایا۔"تو کس نے منع کیا ہے تجھے اور تیرے حضرت جی کو، جو تیر چلانا ہے چلا لو۔ اپنے مؤکلوں اور جنوں بھوتوں کو آواز دے لو۔ میں تیار ہوں ان سے بھی ہتھ جوڑی کرنے کے لئے لیکن یہ بات بالکل صاف ہے۔ اس لڑکی کا علاج ہوگا تو یہیں پر اس حرامی قدرت اللہ کے ہاتھوں سے ہوگا۔"

کچھ دیر بعد گوہرا رستم کے قریب پہنچا۔ اس نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔"لالے دی جان لگتا ہے کہ کڑی آخری دموں پر ہے۔" گوہرے کا اشارہ ڈاکٹر صدف کی طرف تھا۔

وہ واقعی مر رہی تھی۔ قدرت اللہ نے بھی یہ دیکھ لیا۔ اس نے دردناک کرب میں ڈوبی ہوئی ایک خوفناک چیخ ماری اور ایک بار پھر بیوی کی طرف لپکا۔ وہ اس کے اوپر تقریباً گر پڑا۔ اسے جھنجھوڑنے لگا۔ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے زور لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اب اسے رستم کے پسٹل اور گوہرا کی رائفل کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بیوی کو اٹھا کر ہال کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ رک گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بیوی، اس کی دست راست آخری سانس لے رہی ہے۔ اس کا پورا جسم تشنج کی کیفیت میں تھا۔ اس کے دوسرے نتھنے سے بھی تھوڑا سا خون خارج ہونے لگا تھا۔ اس نے بیوی کو فرش پر رکھا۔ بیوی کے سفید کوٹ کی جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ کانپتے ہاتھوں سے نمبر پریس کیا۔ چند سیکنڈ بعد کرلاتی ہوئی آواز میں بولا۔"ڈاکٹر رشید.... ڈاکٹر رشید صاحب! آپ کہاں ہیں؟ جلدی آئیں۔ پلیز جلدی آئیں۔ صدف کی حالت خراب ہے۔ جی ہاں. . .

آستانے میں...... جلدی پہنچیں۔"

یہ وہی قدرت اللہ تھا جو ڈاکٹروں، مستند حکیموں اور معالجوں کو گندی گالیاں دیتا تھا۔ اس کے نزدیک اس کے عملیات کو ہر چیز پر فوقیت حاصل تھی۔ آج وہ اپنی بیوی کے لئے دیوانہ وار ایک ڈاکٹر کو آوازیں دے رہا تھا۔ اسی وقت اچانک کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دیا۔ رستم، گوہرا اور عارف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رستم نے سائلنسر لگا پسٹل واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور ٹرپل ٹو دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ وہ بڑی وحشت کے عالم میں قدرت اللہ کی طرف آیا۔ اگر بی بی سے کئے گئے وعدے کا پاس نہ ہوتا تو اس وقت قدرت اللہ کی کھوپڑی میں دو تین روشن دان کھولنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس نے رائفل کی نال قدرت اللہ کی گردن سے لگائی اور اس زور سے دھکیلا کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اس کا منہ تکلیف کی شدت سے کھل گیا۔ ایک پاؤں سے جوتی بھی اتر گئی۔ رستم نے رائفل کی نال پھرتی سے اس کے منہ میں ڈالی۔ وہ اس کے دانتوں سے ٹکراتی ہوئی حلق کے اندر چلی گئی۔ اس نے ابکائی لی اور پھٹی نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں بالکل لاش بن گیا تھا۔ یقیناً ان لمحوں میں اسے اپنی موت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید دم توڑتی بیوی بھی کچھ دیر کے لئے نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔

رستم نے ہیبت ناک لہجے میں کہا۔"دیکھ بہروپیئے! ابھی تُو نے ایک ڈاکٹر رشید کو آوازیں دی تھیں۔ اسی طرح کا ایک ڈاکٹر بہروز بھی ہے۔ اگر تیری وجہ سے ڈاکٹر بہروز کو کچھ ہوا تو میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں، تجھے مار کر تیری ٹانگ میں رسی باندھوں گا اور کتے کی طرح شہر کی گلیوں میں گھسیٹوں گا۔ اگر میں مارا گیا تو پھر یہ کام میرے ساتھی کریں گے۔ میری یہ بات ابھی کسی کاغذ پر لکھ لے اور سنبھال لے۔"

اس کے بعد گوہرا اور عارف کو اشارہ کرتے ہوئے وہ ہال کمرے کی طرف آیا۔ گوہرا اور عارف باہر کی سن گن لے رہے تھے۔ گوہرا نے قدرے اطمینان سے کہا۔"پولیس کی گاڑی آگے نکل گئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی خیریت ہی ہے۔"

"لیکن پھر بھی اب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔" عارف نے کہا۔

رستم نے رائفل ایک بار پھر اپنی چادر کے نیچے چھپا لی۔ وہ ہال کمرے میں حاضرین کے پاس پہنچا۔ سرخ و سپید رنگ والا ایک موٹا تازہ سیٹھ خوف زدہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ اس کے جسم پر چڑھی ہوئی چربی دیکھ کر نہ جانے کیوں ذہن میں پہلی بات یہی آتی تھی کہ

یہ شخص حرام خوری کرتا ہے۔اس کے بیوی جو عمر میں اس سے کم وبیش دس سال چھوٹی ہوگی اس کے بازو سے چمٹی بیٹھی تھی۔رستم نے اس سے پوچھا۔''سیٹھ گاڑی ہے تیرے پاس؟''

''ہے جی ...ل ...ل... لیکن۔''

''چابی نکال۔''رستم پھنکارا۔

سیٹھ نے چابی نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ساتھ ہی بولا۔''پر وہ آپ سے سٹارٹ نہیں ہوگی۔مم...... میرا مطلب ہے چور سوئچ...''

''اوئے ایسی کم تیسی چور سوئچ کی۔''گوہرا دھاڑا۔''میں تو تیری بیوی کا بھی چور سوئچ ڈھونڈ کر ایک منٹ میں سٹارٹ کرلوں گا اسے۔چابی نکال۔''

سیٹھ نے لرزتے ہاتھوں سے چابی گوہرا کے حوالے کردی۔

''کہاں ہے چور سوئچ؟''رستم نے پوچھا۔

سیٹھ نے سوئچ کی لوکیشن بتائی۔''نمبر کیا ہے گاڑی کا اور رنگ؟''رستم نے پوچھا۔

''سفید سوئفٹ ہے۔نمبر 1866۔''سیٹھ گوہرا کے تیور دیکھ کر مشینی انداز میں بولا۔

رستم نے قدرت اللہ کے دبلے پتلے مرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''چل کیکڑے! ہمیں یہاں سے باہر لے کر چل اور خبردار کوئی چالاکی دکھائی تو......چادر کے اندر سے گولی ماروں گا اور دوسری کی نوبت نہیں آئے گی۔''

دبلے پتلے مرید نے بڑی شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔اس نے رستم کو باور کرایا تھا کہ وہ چالاکی دکھانے کی حماقت بھولے سے بھی نہیں کرے گا۔اس کے بعد رستم نے سکتہ زدہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''ہمارے جانے کے بعد دس منٹ تک کوئی باہر نہ نکلے۔دوسری صورت میں ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہے۔''

حاضرین اس حد تک ڈر چکے تھے کہ دس منٹ تو کیا رستم انہیں دس گھنٹے کی وارننگ بھی دیتا تو وہ بھی انہیں قبول ہوتی۔رستم نے دبلے پتلے مرید کا ڈبی دار مفلر اس کے سر سے کھینچا اور اپنے منہ کے گرد لپیٹ لیا پھر رستم اور گوہرا مرید کو اپنے آگے لگا کر ہال کمرے سے باہر نکل آئے۔رستم اور گوہرا کے ہتھیار مکمل طور پر چادروں میں چھپے ہوئے تھے۔عارف پہرے دار کی رائفل خالی کرکے لابی میں چھوڑ آیا تھا۔احاطے میں بس دو چار افراد ہی موجود تھے۔ان میں سے ایک گارڈ پریشانی کے عالم میں مشتاق نامی کسی ساتھی کو آوازیں دے رہا تھا۔رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ مشتاق وہی گارڈ ہے جو قریباً ایک گھنٹہ قبل اس کے ہاتھوں سے شدید زخمی ہو چکا ہے یا داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔اس کے ساتھیوں کو اس کی گمشدگی کا خیال''بڑی

جلدی''آ گیا تھا۔

رستم مین گیٹ پر پہنچا۔دو ہٹے کٹے پہرے دار یہاں موجود تھے۔وہ شک کی نظروں سے رستم اور گوہرا کی طرف دیکھنے لگے لیکن وہ ان دونوں کو پہچاننے میں ناکام رہے یا شاید انہوں نے پہچان کر دم سادھ لیا۔پچھلے چند برسوں میں رستم نے بارہا یہ دیکھا تھا کہ اکا دکا پولیس والے اگر خطرناک اشتہاری ملزموں کو پہچان لیتے ہیں تو بھی وہ انجان بن جاتے ہیں۔انہیں اپنی جانیں دوسرے لوگوں کی طرح ہی پیاری ہوتی ہیں۔رستم، گوہرا اور عارف تیزی کے ساتھ باہر نکل آئے۔صرف ایک گارڈ نے دبلے پتلے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''نذیر صاحب! ابھی کتنی دیر لگنی ہے؟''اس کا مطلب تھا کہ اندر جمی ہوئی محفل''وجد اور کیف'' کتنی دیر چلنی ہے۔مرید نے ہکلاتے ہوئے کہا۔''بس دس پندرہ منٹ۔''

آستانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اب بھی سادہ لوح عقیدت مند موجود تھے۔کچھ دیواروں کو ہاتھوں سے چھو رہے تھے اور کچھ حضرت صاحب کی ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔رستم نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔اسموک گرے رنگ کی مارگلہ کے ساتھ سفید رنگ کی سوزوکی سوئفٹ موجود تھی۔نمبر 1866 تھا۔رستم اور اس کے ساتھی کار تک پہنچے، دروازے کھولے اور بیٹھ گئے۔چور سوئچ ڈھونڈنے میں رستم کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔رستم نے چادر کے اندر سے ہی رائفل کی نال مرید کے پیٹ میں چبھوئی۔وہ موت سے بچنے کے لئے سرتاپا التجا بن گیا۔اس کے کپڑوں سے ابھی تک پیشاب کی باس اٹھ رہی تھی۔

رستم نے کہا۔''دس منٹ تک کسی کو کچھ نہیں بتانا۔اگر بتاؤ گے تو مجھے پتا چل جائے گا۔''

مرید نے کسی بھک منگے کی طرح ہاتھ جوڑ دیئے۔''نہیں سر! کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

رستم کے لئے سر کے خطاب پر گوہرا زیرلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

ذرا ہی دیر میں وہ تینوں سوزوکی کار پر آستانے کی مخالف سمت میں مڑ رہے تھے۔اسی دوران میں ایک کار تیزی سے آستانے کے گیٹ کے سامنے آکر رکی۔اس میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نکلا۔اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔یقیناً یہی وہ ڈاکٹر رشید تھا جسے قدرت اللہ نے ہنگامی کال کی تھی۔

سوزوکی سوئفٹ بڑی سڑک پر آئی تو عارف نے کہا۔''رستم بھائی! اس سامنے والی گلی کے اندر سے نکلیں۔یہاں میری ایک چیز رہ گئی ہے۔''

رستم نے گاڑی تیزی سے گلی میں موڑ دی۔کچھ آگے جا کر عارف نے رستم کو گاڑی روکنے کا کہا۔وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔فروٹ شاپ کی چق کے نیچے سے ہاتھ

ذال کراس نے اپنا پستول نکالا اور پھرتی سے واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوئی۔ گاڑی میں پولی تھین کی چند چھوٹی چھوٹی تھیلیاں پڑی تھیں۔ ان تھیلیوں میں آٹے کے نمونے تھے۔ ایک وزیٹنگ کارڈ بھی ملا جس سے اندازہ ہوا کہ گاڑی کا مالک آٹے کا کاروبار کرتا ہے۔ ''میاں ممتاز آٹے والے'' گوہرا نے کارڈ پڑھ کر زیر لب دہرایا۔

''خود بھی تو حرامی آٹے کے بڑے توڑے جیسا ہی تھا۔'' رستم نے کہا۔

''اور بیوی دبلی پتلی سنیارے کے ترازو جیسی۔'' عارف نے رائے ظاہر کی۔

گوہرا ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''پتا نہیں لوگ آٹے کے توڑے کو سنیارنے کے ترازو پر کیسے تول لیتے ہیں۔''

گوہرے پر صورتِ حال کی سنگینی کا ذرا بھر بھی اثر نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ان شدید خطرات کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ رستم کے چہرے پر بھی کسی طرح کا ہیجان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں عارف ضرور تھوڑے سے تناؤ میں تھا۔ ابھی وہ قریباً ایک کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ انہیں اپنے سامنے سے پولیس موبائلز کے تیز سائرن سنائی دیے۔ پھر موبائلز نظر آئیں۔ یہ دو گاڑیاں تھیں اور آندھی کی رفتار سے قدرت اللہ کے آستانے کی طرف جا رہی تھیں۔ سوزوکی سونفٹ اور پولیس موبائلز نے آمنے سامنے سے ایک دوسرے کو کراس کیا۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ آستانے میں پیش آنے والے خونی واقعے کی خبر ''بریک آؤٹ'' ہو چکی ہے۔

''اب کدھر جانا ہے سر جی؟'' گوہرا نے رستم سے پوچھا۔ رستم کو ''سر جی'' کہہ کر وہ قدرت اللہ کے خوف زدہ مرید کی نقل اُتار رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''سٹیشن یا بس اڈے کی طرف جانا غلط ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہر سے باہر نکلتے ہیں اور ہائی وے پر پہنچتے ہیں پھر دیکھتے ہیں، کیا کرنا ہے۔''

عارف نے کہا۔ ''اس گاڑی کو جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہیے۔ پولیس والوں نے وائرلیس پر پیغام چلا دیا ہوگا۔''

رستم کے اپنے ذہن میں بھی یہی بات تھی لیکن جب تک کوئی دوسری گاڑی میسر نہ ہوتی اس گاڑی کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی وہ کچہری روڈ سے آگے نہیں گئے تھے کہ اچانک انہیں پتا چلا... پولیس پیچھے لگ گئی ہے۔ یہ ایک پولیس کار تھی۔ اس کی چھت پر ''ریوالونگ بلیو لائٹ'' صاف نظر آ رہی تھی۔ رستم نے جبڑے بھینچے اور گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ پولیس کار کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی سائرن کی کریہہ آواز رستم اور اس کے ساتھیوں کے کانوں میں گونجنے لگی۔ آگے ٹریفک سگنل پر کچھ رش تھا۔ رستم نے گاڑی بائیں

طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ پولیس کار بھی ذیلی سڑک پر آ گئی۔ رستم مشاقی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا تاہم اگلے دو چار منٹ میں حالات سنگین ہوگئے۔ مزاحم دو مزید کاریں ان کے پیچھے لگ گئیں۔ ان کے تیز سائرن رات کا سناٹا چیرنے اور فضا میں سنسنی پھیلانے لگے۔

رستم نے پوچھا۔ ''کتنی گاڑیاں ہیں؟''

''دو تو صاف نظر آ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تیسری موٹر سائیکل ہے۔'' عارف نے کہا۔

اس علاقے میں چھوٹی بڑی سڑکوں کا جال سا تھا۔ رستم برق رفتاری سے گاڑی کو مختلف سڑکوں پر موڑتا رہا۔ ایک موقع پر بلیو لائٹ والی پولیس کار زیادہ قریب آ گئی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تڑ تڑ کی ہیجان خیز آواز ابھری۔ پولیس کار سے سوزوکی پر تین فائر کیے گئے۔ ایک گولی گاڑی کی باڈی میں کہیں لگی۔

گوہرا نے بھنا کر ایک گالی دی اور رستم سے جوابی فائر کی اجازت طلب کی۔

''نہیں..... ابھی نہیں۔'' رستم نے تحمل سے کہا۔

سامنے سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو رستم نے بمشکل بچایا اور اپنا رخ پھر کچہری روڈ کی طرف کر لیا۔ راہ گیروں اور دکان داروں کے چہروں پر خوف کے سائے تھے۔ پولیس گاڑیوں کے سائرن، فائرنگ کی آواز اور سفید سوزوکی کی رفتار..... یہ سب کچھ لوگوں کو بتا رہا تھا کہ کوئی فلمی قسم کا سین یہاں حقیقت میں موجود ہے۔

کہنے کو تو رستم بھی گوہرا سے کہہ سکتا تھا کہ وہ پولیس کار پر گولی چلائے لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر پولیس والوں اور ان میں کیا فرق رہ جاتا۔ پولیس نے ایک بار ناحق راستے پر راہ گیروں کی پرواہ کیے بغیر فائرنگ کی تھی، رستم ابھی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ابھی اس سے بچنا چاہتا تھا۔ اچانک رستم کے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ اس کے ملتانی یار جہانگیر حسین کی موجودہ رہائش گاہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ اس وقت رستم اور گوہرا کی پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی۔ بلیو لائٹ والی کار پھر قریب آ گئی تھی۔ گوہرا، رستم کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ کی انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی۔ اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا۔ ''دو تین ہوائی فائر کر دو۔''

گوہرا نے عمل کیا۔ تاریکی میں دھماکوں سے شعلے چمکے اور پولیس کار ایک دم بہت پیچھے رہ گئی۔ رستم نے ایک راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی کو جہانگیر کی قیام گاہ کی طرف موڑ دیا۔ اب پولیس گاڑیوں کے سائرن عقب سے ہی نہیں دائیں بائیں سے بھی سنائی دے رہے تھے تاہم

ابھی یہ آوازیں خاصے فاصلے پر تھیں۔ نزدیک ترین گاڑی وہی بلیو لائٹ والی تھی۔ اس کا فاصلہ 200 میٹر کے قریب تھا۔

اچانک رستم نے بریک لگائے۔ گاڑی ایک نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہو کر رہ گئی۔ یہ نیم تاریک گلی تھی۔ گاڑی اس طرح رکی تھی کہ ذرا ترچھی ہو گئی تھی اور اس کا اگلا بمپر ایک دیوار سے ٹکرا کر پچک گیا تھا۔ یہ میاں ممتاز آنے والے کے لئے پانچ چھ ہزار کا نسخہ تو بن ہی گیا تھا۔ گاڑی ترچھی ہونے کے سبب راستہ بھی مسدود ہو گیا تھا۔ وہ تینوں تیزی سے باہر نکلے۔ ایک سائیکل سوار لڑکے نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اوپر ایک چوبارے کی کھڑکی کھلی اور پریشان چہرے والی ایک لڑکی نے نیچے جھانکا۔ وہ تینوں شتابی سے آگے بڑھ گئے۔ اس سے آگے شاخ در شاخ کئی چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ انہوں نے نیم تاریک گلیوں کا انتخاب کیا اور فرید ٹاؤن کی طرف بڑھنے لگے۔ جہانگیر کی رہائش فرید ٹاؤن میں ہی تھی۔

☆======☆======☆

آدھے گھنٹے بعد رستم، گوہرا اور عارف ایک آرام دہ ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یہ جہانگیر کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم تھا۔ جہانگیر خود بھی موجود تھا۔ اس کی عمر 30 سال سے اوپر تھی۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے بال لہریے دار تھے۔ ٹھوڑی کے نیچے زخم کا پرانا نشان اور روشن آنکھیں زندگی سے بھرپور تھیں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بدترین حالات میں بھی خوش رہنے اور زندگی سے رس نچوڑنے کا ہنر جانتے ہیں۔ رستم سے اس کی یاد اللہ اس دور سے تھی جب اس نے ایک بدمعاش انکم ٹیکس آفیسر کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس واقعے کے بعد دونوں میں دوستی پروان چڑھی۔ جہانگیر کچھ عرصہ رستم کے ساتھ وادی سون میں بھی رہ چکا تھا۔ اب وہ مجاز کے نام سے یہاں ملتان میں مقیم تھا۔ زندگی نے جہانگیر کو بے حد تلخیاں دی تھیں لیکن وہ بہت ہنس مکھ اور کھلے دل دماغ کا مالک تھا۔ خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا اس کا مشغلہ بن چکا تھا۔

اس نے فوراً رستم اور عارف کے لئے گرما گرم چائے بنوائی...... گوہرا کے لئے جانی واکر کی بوتل اور پکوڑوں کا انتظام کیا۔ اس کوٹھی میں صرف جہانگیر اور اس کا بااعتماد ملازم نوشیر ہی رہتے تھے۔ نوشیر فی الوقت جہانگیر کا باورچی، نوکر، مخبر بھی کچھ تھا۔ وہ بڑا کائیاں اور ہر فن مولا قسم کا شخص تھا۔

رستم اور اس کے ساتھی کھانے پینے لگے تو جہانگیر نے نوشیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے نوشے! جا موٹر سائیکل لے جا اور ذرا باہر کی خیر خبر لے کر آ۔"

وہ بڑی فرماں برداری سے سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ رستم نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "جہانے! تجھے پریشان تو نہیں کیا، اس وقت آ کر؟"

جہانگیر نے بڑا برا سا منہ بنایا۔ "اس بات کی بجائے تُو میری کھوپڑی پہ یہ بڑے والا گملا توڑ دیتا تو زیادہ اچھا تھا۔ کچھ خدا کے خوف کو ہاتھ مار رستم۔ اتنی دیر بعد بھی ہم ایک دوجے کو نہ سمجھے تو کب سمجھیں گے۔" وہ ایک دم اداس سا نظر آنے لگا۔

رستم زیرِ لب مسکرایا۔ "اچھا بابا غلطی ہو گئی۔"

جہانگیر نے جانی واکر کی بوتل سے اپنے لئے گلاس بناتے ہوئے کہا۔ "میری جان! ہمیں تو مزہ ہی اس بندے کو مہمان بنانے کا آتا ہے جس کے پیچھے آٹھ دس تھانوں کی پولیس لگی ہوئی ہو اور تمہاری تو بات ہی اور ہے۔ تم تو جانِ جگر ہو۔"

رستم، جہانگیر کو تفصیل سے بتانے لگا کہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے میں کیا واقعات پیش آئے ہیں اور کیا خون خرابہ ہوا ہے۔

جس دوران میں یہ گفتگو ہو رہی تھی قریبی سڑکوں پر گاہے بگاہے پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگتے تھے۔ فرید ٹاؤن ایک خالص رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں دس مرلہ اور ایک کنال کی کوٹھیاں تھیں تاہم بڑی سڑک ٹاؤن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ نوشا واپس آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سنسنی خیز خبریں لایا ہے۔ وہ جہانگیر کو بابو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ آنکھیں گھما کر بولا۔ "بابو شہر میں تو ترتھلی مچی ہوئی ہے۔ پولیس سارے شہر میں بھاگی پھر رہی ہے۔ میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ لاری اڈے اور سٹیشن پر بھی پولیس پہنچ چکی ہے۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"آستانے کی کیا خبر ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"سنا ہے وہاں چھ سات بندے قتل ہوئے ہیں اور ان میں حضرت صاحب کی ڈاکٹر بیوی بھی ہے۔"

ڈاکٹر بیوی کا سن کر رستم اور گوہرا کے کان کھڑے ہوئے۔ رستم نے پوچھا۔ "حضرت کی بیوی کے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے۔ وہ کیسے مری ہے؟"

"اس بارے میں زیادہ پتا نہیں چلا جی۔ صرف یہ سنا ہے کہ لاش ہسپتال میں ہے۔ باقی لاشیں بھی پولیس ہسپتال لے گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک آٹھ دس سال کی بچی یہاں کچہری روڈ کے قریب زخمی ہوئی ہے۔ اس کی گردن میں گولی لگی ہے۔ لوگ کہتے ہیں [illegible]

ایک سفید سوزوکی کار پر گولیاں چلا رہے تھے، یہ لڑکی زد میں آ گئی لیکن پولیس والوں کا کہنا ہے کہ بچی کو کار والوں کی گولی ہی لگی ہے۔"

عارف نے رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے رستم بھائی، مجھے اب جلدی سے شانی بہن کے پاس پہنچنا چاہیے۔ پولیس والے جانتے ہیں کہ شانی بھی ملتان میں ہی ہے۔ وہ آستانے میں ہونے والے واقعے کے ڈانڈے شانی سے اور مجھ سے ملانے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"چلو اتنی تسلی تو ہے کہ آستانے میں کسی نے بی بی کو دیکھا ہے اور نہ تمہیں۔" گوہرا نے کہا۔

"پھر بھی جتنی جلدی شانی بہن کے پاس پہنچ جاؤں اتنا ہی بہتر ہے۔" عارف نے کہا۔

رستم، عارف کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے عارف سے پوچھا۔ "بی بی جی تو وہاں تمہارے پنڈ جوہر آباد میں تھیں۔ یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"تاؤ کے لڑکے راجو کے لئے۔" عارف نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "تمہیں پتہ ہی ہے کہ راجو کتنا بگڑا تگڑا لڑکا تھا۔ وہ کسی اور کے ہاتھوں قتل ہوتا یا نہ ہوتا لیکن میرے ہاتھوں ضرور ہو جانا تھا۔ اس کی وجہ سے میری بھتیجی صفیہ موت کے منہ میں گئی اور ہم سب کو خون کے آنسو رونا پڑا۔ تم کو یہ سب باتیں پتا ہی ہیں رستم بھائی۔" رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ عارف بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایک موقع پر میں راجو کو شوٹ کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا لیکن شانی میرے اور راجو کے درمیان آ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر اور آنسو بہا کر اس نے راجو کی جان بچائی۔ کہنے لگی جو کچھ کیا تھا راجو نے نہیں کیا تھا، اس کے باپ نے کروایا تھا۔ باپ کے جرم کی سزا اس کے ناسمجھ بیٹے کو نہ دو۔ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہے، وہ بہت بدل چکا ہے اور بھی بدل جائے گا۔ دیکھنا ایک دن تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر تم سے معافی مانگے گا۔"

چند لمحے توقف کر کے عارف نے گہری سانس لی اور بولا۔ "رستم بھائی، شانی عجیب لڑکی ہے۔ انوکھی اور سمجھ میں نہ آنے والی۔ اس کی دلیلیں عقل میں نہیں آتیں لیکن پھر بھی ان میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ انہیں ماننا پڑتا ہے اور یہ بات تو کسی حد تک درست ہے کہ راجو بہت بدل گیا ہے۔ ہسپتال میں زیادہ تر میں ہی اس کے پاس رہا ہوں۔ شاید اس چیز نے بھی اس کے دل پر اثر ڈالا ہے۔ وہ میرے سامنے نظر نہیں اٹھاتا۔ کسی وقت مجھ سے اتنا شرمندہ نظر آتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ راجو ہی نہیں اب اس کا خبیث باپ

تاؤ حشام بھی اتنا زہریلا نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ اس کی حرام زدگیاں اب پہلے سے کم نظر آتی ہیں۔ وہ اب کئی موقعوں پر شانی کی بات سنتا ہے۔"

"کیا حشام بھی یہاں ملتان میں ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"ہاں، اصل میں کچھ دن پہلے یہاں بڑی سخت گڑبڑ ہو گئی تھی۔ شاید تم کو پتا ہو یا نہ ہو، راجو ایک لڑکی سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ یہ لڑکی پاک پتن شریف کی تھی۔ اسی لڑکی سے راجو کا دھیان ہٹانے کے لئے تاؤ نے میانہ کی حویلی میں جوان نوکرانیوں کا دستہ بھرتی کیا تھا۔ بعد میں اس نے راجو کو ان نوکرانیوں کے درمیان سرکاری سانڈ بنانے کی کوشش کی۔ بہرحال جب راجو کی عقل مت ٹھکانے پر آئی تو پاک پتن والی لڑکی کوکی کے لئے اس کا پیار پھر پوری طرح جاگ گیا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ راجو کو پتا چلا کہ چند دن بعد لڑکی کی شادی ہے۔ راجو لڑکی کے پیچھے ملتان آیا اور اس نے یہاں زہریلی گولیاں کھا لیں۔ شانی بھی اس کے پیچھے بھاگی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔ اب وہ دن رات راجو کو سنبھالنے میں لگی ہوئی ہے۔"

عارف یہ بات جان بوجھ کر چھپا گیا کہ کوکی کی شادی نارپور کے چوہدری بشیر سے ہونے جا رہی تھی۔ (وہ اس تفصیل میں پڑ کر رستم کو مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا)

رستم نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا۔ "مگر بی بی جی تمہارے ساتھ قدرت اللہ کے ٹھکانے پر کیسے پہنچیں؟"

"رستم بھائی! یہ سب ایک اتفاق ہی ہوا ہے۔" عارف نے پردہ پوشی کی۔ "شانی بی بی اب کیا کرے گی، اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ قدرت اللہ سے ملنے اور اپنی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ اسے یا مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ یہاں یہ خونی ڈرامہ ہو گا اور آپ دونوں سے بھی اس طرح ملاقات ہو جائے گی۔"

رستم گہری نظروں سے عارف کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کے بیان کی صحت جانچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عارف نے نظر پھیر لی۔

رستم کے دل میں یہ شک موجود تھا کہ ہو سکتا ہے عارف غلط کہہ رہا ہو۔ بی بی کسی طرح آستانے میں اس کی آمد سے باخبر ہو گئی ہوں اور اسے اس کے ارادے سے روکنے کے لئے وہاں پہنچ گئی ہوں۔

اس سے پہلے کہ رستم اس حوالے سے عارف سے کوئی مزید سوال پوچھتا۔ عارف کی مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔ جہانگیر کے ملازم خاص نوشے نے اندر آ کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ ایک بار پھر باہر کا چکر لگا کر آیا تھا۔ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں رستم سے

مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب قدرت اللہ کی بیوی کے بارے میں تازہ بہ تازہ خبر ملی ہے۔ وہ ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں ہی مرگئی تھی۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور دونوں نتھنوں سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد قدرت اللہ کی حالت بہت پتلی ہے۔ وہ ہسپتال میں تھوڑی دیر بے ہوش بھی رہا ہے۔ قدرت اللہ کے سینکڑوں مرید اور عقیدت مند ہسپتال میں اور آستانے کے سامنے جمع ہیں۔ انہوں نے آستانے کے اردگرد کی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی ہے اور نعرے لگائے ہیں۔ وہ پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کررہے ہیں۔“

”اور کیا معلوم ہوا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

نوشیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”کچھ لوگ شک کررہے ہیں کہ شانی بی بی بھی آستانے پر موجود تھیں۔ کسی نے انہیں دیکھا تو نہیں ہے لیکن لوگوں کو شک ہے کہ وہ وہاں پہنچی تھیں۔“

نوشیر نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہاں آستانے کے سامنے قدرت اللہ کے دو مریدوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا میں نے ابھی اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک مرید بی بی کو بُرا بھلا کہنے لگا تو دوسرے نے اسے سختی سے ٹوکا اور کہا کہ اگر نقاب والی لڑکی بی بی تھی تو پھر اس کو گالیاں دینے کی بجائے اس کا شکریہ ادا کرو۔ وہ نہ ہوتی تو رستم اور اس کے ساتھی سب کو بھون ڈالتے۔“

عارف اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”رستم بھائی! میرا خیال ہے کہ مجھے اب شانی بہن کے پاس پہنچنا چاہیے۔ اسے میری ضرورت ہوگی۔“

”کہاں ٹھہری ہوئی ہیں وہ؟“

”ہوٹل فاران میں۔“ عارف نے جواب دیا۔

رستم نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ پولیس بی بی کو اور تمہیں تنگ کرنے کی کوشش کرے۔ میں یہاں سے حاجی حیات کو فون کرتا ہوں۔ اگر کہتے ہو تو اسے یہاں ملتان میں بلوا بھی سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو دیکھ لیں گے۔“

”لیکن، ایک بات ذہن میں رکھنا عارف، بی بی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر اس خبیث ریاض ہٹلر کی طرف سے ہے۔ اگر وہ یا اس کا کوئی کارندہ تمہیں بی بی کے آس پاس بھی نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دو کہ اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔“

”تم بے فکر رہو، رستم بھائی۔“

رستم نے جہانگیر سے کہا کہ وہ عارف کو اپنا موبائل نمبر لکھوا دے۔ جہانگیر نے اسے ایک کی بجائے دو نمبر لکھوا دیئے۔ رستم نے کہا۔ ”تم سمجھ دار ہو عارف! تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب فون کے علاوہ ہمارا رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔“

عارف نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ کوٹھی سے بحفاظت نکلنے کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ سب سے پہلے عارف نے لباس تبدیل کیا۔ جہانگیر کے کپڑے اسے تھوڑے سے کھلے تھے لیکن پھر بھی کام چل گیا۔

جہانگیر کے گیراج میں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک ننھی منی ایف ایکس، دوسری سیاہ رنگ کی شاندار ہونڈا۔ بڑی گاڑیوں کو ٹریفک پولیس اور پولیس ناکوں والے عموماً کم ہی روکتے ہیں۔ جہانگیر نے عارف کو نوشے کے ساتھ روانہ کردیا۔

نوشیر عرف نوشا، عارف کو چھوڑ کر تقریباً ایک گھنٹے میں واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ عارف صاحب کو ہوٹل فاران میں چھوڑ کر آیا ہے۔ نوشے کے مطابق بی بی شانی بھی وہیں ہوٹل میں موجود تھیں اور عارف صاحب کا بے چینی سے انتظار کررہی تھیں۔

وہ رات رستم نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اسے بی بی کی طرف سے ان گنت اندیشے تھے۔ اس نے عارف کو تاکید کررکھی تھی کہ اگلے روز دوپہر سے پہلے پہلے وہ فون ضرور کرے اور بی بی کی خیر خیریت کے بارے میں بتائے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے جہانگیر کے موبائل پر عارف کا فون آگیا۔ یہ فون وہ ہوٹل کے کمرے سے ہی کررہا تھا۔ جہانگیر کے موبائل کی سم فرضی نام پر تھی، اس لئے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ یہ کال ٹریس کی جاسکے گی۔

عارف نے بتایا۔ ”رات تین بجے پولیس کی ایک گاڑی ہوٹل میں پہنچی تھی۔ اس میں ڈپی ریاض کا ایک سب انسپکٹر ماجد تھا۔ اس نے بی بی سے پوچھ گچھ کی کہ آج رات نو اور گیارہ بجے کے درمیان وہ کہاں تھیں۔ بی بی نے بتایا کہ وہ ہوٹل میں ہی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرنے لگا۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے ایک دو سخت باتیں کیں۔ کہنے لگا میں تمہیں تھانے لے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے سب انسپکٹر اختر کو فون کیا۔ اس نے حاجی حیات صاحب سے رابطہ کرادیا۔ حاجی حیات کی ڈانٹ کھا کر سب انسپکٹر ماجد واپس چلا گیا۔“

”بی بی پریشان تو نہیں تھیں؟“

”جب ماجد مجھے تھانے لے جانے کی بات کررہا تھا، اس وقت شانی کو بھی غصہ آگیا تھا

لیکن پھر وہ نارمل ہو گئیں۔"

"بی بی اب کہاں ہیں؟"

"وہ راجو کے پاس ہسپتال گئی ہیں۔ آج اس کی چھٹی ہو رہی ہے۔"

"چھٹی کے بعد وہ کہاں جائے گا؟"

"پہلے تو گاؤں واپس جانے کا پروگرام تھا لیکن اب بی بی کے کہنے پر پروگرام تبدیل ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تاؤ حشام اور اس کے ساتھی یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اب ہسپتال سے چھٹی کے بعد راجو کو بھی ہوٹل میں لے جایا جائے گا۔ پتا چلا ہے کہ میانہ سے دو تین عورتیں بھی کل یہاں ملتان پہنچیں گی۔ یہ لوگ سیف اللہ کے گھر جا کر راجو اور کوکی کی بات پکی کریں گی۔"

"بی بی کو کیا مصیبت پڑی تھی ان چکروں میں پڑنے کی؟" رستم نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ تو بی بی ہی بتا سکتی ہیں۔" عارف نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے رستم بھائی! شانی بی بی کی وجہ سے ہمارے پورے علاقے میں نفرت اور انتقام کی آگ کچھ سرد پڑتی محسوس ہو رہی ہے۔ اب تم دیکھو کہ تاؤ حشام جیسا خونی جانور بھی اپنے مدار سے ہٹا ہوا لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بدل رہا ہے اور وہ راجو کا چچا زاد بابرا اس میں تو بہت زیادہ تبدیلی آئی ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو رستم بھائی! شانی نے چوہدری بشیر سے بابرے کی جان بچائی تھی۔ بابرے نے شانی کو "رکھ" میں لے جا کر اس سے دست درازی کی کوشش کی تھی لیکن پھر اسے چوہدری بشیر کے ہاتھوں سے بچانے والی بھی شانی ہی تھی۔ سنا ہے چوہدری بابر نے شراب اور عیاشی چھوڑ ہی دی ہے۔ نماز پڑھنے لگا ہے اور ہاں، میں ایک اور بات بتانا تو بھول گیا تم سن کر حیران ہو گے۔" رستم کے استفسار پر عارف نے بتایا۔ "چند دن پہلے شانی ایک انجان انگریز بچے کو بچانے کے لئے ایک خونی ریچھ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کوشش کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے ریچھ کو شوٹ کر دیا۔ بچے کے والدین اب شانی کے نام کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ میں اس واقعے کے بارے میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔" فون لائن پر کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر رستم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "قدرت کی بیوی کی موت کا پتا لگ گیا ہے بی بی

کو؟"

"ہاں، آج صبح اخبار میں پڑھ لیا ہے انہوں نے۔ بڑی دکھی ہو گئی تھی۔ رونے لگ پڑی تھی۔ اسے تم پر بھی رنج ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سارے معاملے کا عینی شاہد ہوں۔ رستم بھائی نے اپنے وعدے کا پاس کیا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد آستانے میں کسی کو کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر صدف کی موت دماغ کی چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہ چوٹ اسے کچھ دیر پہلے سیڑھیوں سے گر کر آئی تھی۔"

رستم نے کہا۔ "عارف! اب تمہیں ایک بات کا دھیان اور رکھنا ہے۔ بی بی کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا خبر کہ وہ صدف کی ہمدردی میں قدرت اللہ کی طرف ہی چل پڑیں۔ خدانخواستہ انہوں نے ایسا کچھ کیا تو بہت خطرناک ہو گا۔ قدرت اور اس کے چیلے چھانٹے اس وقت "ایٹم بم" بنے ہوئے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں رستم بھائی! اپنی طرف سے تو پوری کوشش کروں گا، لیکن"

"لیکن کیا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" عارف الجھے الجھے لہجے میں بولا۔ "کسی وقت لگتا ہے کہ بی بی کی وجہ سے کوئی بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا لیکن کسی وقت یہ بھی لگتا ہے کہ بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ بہرحال تم بے فکر رہو رستم بھائی، میں نے سارے معاملے پر نظر رکھی ہوئی ہے۔"

کچھ دیر مزید رستم سے گفتگو کرنے کے بعد عارف نے اجازت طلب کی۔

اسی دوران میں نوشا تین چار بڑے لفافوں میں بہت سا پھل لے آیا اور جہازی سائز کے فریج میں ٹھونسنے لگا۔ دس بارہ کلو کچی مچھلی، صاف شدہ بٹیر اور دیسی مرغی کا گوشت اس کے علاوہ تھا۔ گوہرا کے لئے جانی واکر شراب کی کئی بوتلیں بھی پہنچ گئی تھیں۔

جہانگیر نے رستم اور گوہرا کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کے کپڑے کافی میلے ہو چکے ہیں۔ تم نوشے کو اپنا ناپ دے دو۔ یہ خود ہی جا کر مارکیٹ سے تمہارے کچھ جوڑے لے آتا ہے۔ یہ بڑا کائیاں شخص ہے۔ جو کام کرے گا ایک دم فسٹ کلاس کرے گا۔ اگر اس بندے سے تمہیں ذرا سی بھی شکایت پیدا ہو جائے تو میرا نام بدل دینا۔"

رستم نے کہا۔ "لیکن اگر تم سے شکایت پیدا ہو تو کس کا نام بدلیں؟"

"کیا مطلب ہے شہزادے؟" جہانگیر نے لاہوری لہجے میں دریافت کیا۔

''مطلب یہ ہے کہ اتنا لمبا چوڑا خرچا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ لمبا چوڑا خرچا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔''اوئے جانِ جگر! لمبا چوڑا خرچا تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ سب کچھ تو ابھی ہونا ہے۔ تم دونوں جتنے دن یہاں رہو گے، مغل شہزادوں کی طرح رہو گے بلکہ مغل شہزادے بھی کیا شے ہیں یار! تم دیکھنا تو سہی۔''

پھر اس نے مٹھی میں گولڈ لیف کا سگریٹ دبا کر ایک طویل کش لیا اور بولا۔''یار میرے! بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کی زندگی ہے ہی کتنی۔ کچھ خبر نہیں کس ویلے گھنٹی بج جائے۔ سچ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہم ان مرغوں کی طرح ہیں جن کی گردنیں کاٹی جا چکی ہوں لیکن وہ پھر بھی بھاگے پھر رہے ہوں۔ کتنی دیر بھاگیں گے؟ آخر تو گھمن گھیری کھا کر گرنا ہی ہے۔ تو مطلب یہ ہے میرے شہزادے...... کہ جتنے دن زندہ ہیں، زندہ رہنے کا ''حق حقوق'' تو ادا کریں۔ وہ کیا کہا تھا اپنے ٹیپو سلطان نے، شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کے سو سال سے اچھی ہوتی ہے۔''

''بات ہو رہی تھی فضول خرچی کی اور تُو کس طرف لے گیا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''یار! کیسی فضول خرچی۔ بس پانچ چھ جوڑے منگوا رہا ہوں تمہارے۔ ایک ایک ٹیلی ویژن تم دونوں کے کمرے میں۔ تھوڑی سی ولایتی شراب اور اگر گوہرے کو پسند ہو تو ملتان کے بازار حسن سے ایک دو ''سچل پیس'' رانجھا راضی کرنے کے لئے۔'' جہانگیر نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

رستم نے گہری سانس لی اور قدرے بےزاری سے بولا۔''دیکھ جہانے! اگر تیرے پاس کچھ پیسے ہیں تو اچھے بُرے وقت کے لئے بچا کر رکھ۔ اس طرح عیاشیوں میں نہ اُڑا۔''

جہانگیر نے رستم کی آنکھوں میں دیکھا۔''تم نے بچا کر رکھے ہوئے ہیں؟''

''مجھے بچانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اب مجھے زیادہ دیر جینا ہی نہیں ہے لیکن تیرے حالات تو اتنے خراب نہیں ہوئے۔ پولیس ابھی ہاتھ دھو کر تیرے پیچھے نہیں پڑی ہے۔''

''جینے مرنے کی بات نہ کرو۔ وہ تو کسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کیا پتا تم تیس سال اور نکال جاؤ۔ کیا پتا میں دو دن بعد پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں۔ اب کی بات کرو۔ جو کچھ ہے، آج ہے، اب ہے۔ آنے والی گھڑی کسی نے نہیں دیکھی۔ میں بھی آج کی بات کر رہا ہوں اور آج میں امیر ہوں۔ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے بہت کچھ ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ میرے شہزادے کہ تم بھی ایسے غریب نہیں ہو۔ تمہارے پاس بھی کافی کچھ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے چونک کر پوچھا۔

''تم کچھ بھول رہے ہو میرے جگر۔'' جہانگیر اسٹائل سے مسکرایا۔

اس سے پہلے کہ رستم کچھ کہتا، جہانگیر اٹھ کر اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا چرمی بیگ تھا۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا۔ اندر ہی اندر کچھ گنا اور پھر ہزار ہزار کے نوٹوں کے پچیس بنڈل نکال کر رستم کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔

قریباً پچیس بنڈل مزید اندر ہی پڑے تھے۔ یعنی یہ پچاس لاکھ کے قریب رقم تھی۔ رستم حیرت سے جہانگیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہانگیر بولا۔''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں یاد آ گیا ہوگا۔ پچھلے سال ہم نے جو ناجائز قبضہ چھڑوایا تھا، یہ اسی کی قیمت ہے۔''

رستم کو یاد آ گیا تھا۔ یہ قریباً پندرہ ایکڑ زمین لاہور کے انڈسٹریل ایریا میں تھی۔ ایک بدنام قبضہ گروپ جس کا سرغنہ ایک اجرتی قاتل فیاض جگی تھا، اس زمین پر اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ رستم اور جہانگیر نے مل کر یہ ناجائز قبضہ چھڑوایا تھا۔ اس کام کی طے شدہ رقم 50 لاکھ تھی۔ زمین کا مالک اتنی رقم دے کر بھی بہت فائدے میں رہا تھا۔ اگر وہ مقدمے بازی میں پڑتا تو کہیں زیادہ رقم خرچ ہوتی اور پتا نہیں کہ کتنا عرصہ لگتا۔

50 لاکھ کے نصف 25 لاکھ روپے رستم کے سامنے پڑے تھے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی لیکن رقم بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ رقم کی ''قدر و قیمت'' انسان کی ضرورت مقرر کرتی ہے اور رستم کے لئے اس بڑی رقم کی قدر و قیمت بڑی نہیں تھی۔ اتنے روپے کا اس نے کیا کرنا تھا۔ کہاں لے جانا تھا؟

وہ خالی نظروں سے نوٹوں کے اس ڈھیر کو تکتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک نمودار ہوئی۔ بالکل مدھم اور غیر محسوس چمک۔ اس نے نوٹوں کو ذرا دھیان سے دیکھا پھر جہانگیر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی ایک دو لکیریں نمودار ہوئیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جہانگیر نے مسکرا کر پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔''

''سارے کے سارے؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

''ہاں سارے کے سارے، بس تھوڑے سے نکال لو ہمارے خرچے کے لئے۔''

''خرچے کی بات اس وقت کرنا جب یہاں سے جاؤ گے، ابھی تم میرے مہمان ہو۔ خرچے شرچے کا لفظ تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔'' وہ پھنکارا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کیا طریقہ ہو کہ اگلے دس پندرہ دن میں، میں دس پندرہ لاکھ روپیہ تم دونوں پر اور خود پر خرچ کر سکوں۔''

''اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا۔ ''ہزار کے نوٹ سے سگریٹ سلگاؤ، ہزار ہزار کے نوٹوں سے چولہا جلاؤ اور ہزار ہزار کے نوٹوں کا بستر بنا کر اس پر لیٹو۔ جب نوٹوں کی استری ٹوٹ جائے تو نئے نوٹ بچھا لو۔''

''اونہیں یار اور بھی کئی طریقے ہیں۔ میں تجھے بتاؤں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

''مثلاً؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''مثلاً، پنجابی فلموں کی مشہور ہیروئن بلکہ سب سے بڑی ہیروئن کو جانتے ہو؟''

''عمر میں تو ساری بڑی ہیں۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''عاصمہ کی۔''

''ہاں جانتا ہوں بڑی پٹاخا شے ہے لیکن وہ تمہارے پیسوں کا کیا حل نکالے گی؟''

''تم پیسے کی بات کر رہے ہو..... کھوتے! وہ تو پوری پوری ٹکسال کھا جاتی ہیں۔''

ایک دم گوہرا کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ پرانا رنگین مزاج تھا۔ جہانگیر کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ذرا اداس لہجے میں بولا۔ ''لیکن یار! یہ اسکرین کی پریاں تو بڑی اونچی ہوائیں ہوتی ہیں۔''

''کوئی اونچی ہوا شوا نہیں ہوتی، بس ساری پیسے کی کھیڈ ہے۔ پیسا ہو ناں تو قسم پیدا کرنے والے کی تین دن بعد دبئی یا لندن میں سری دیوی تیرے باتھ روم میں نہا رہی ہوگی.....''

رستم نے بُرا سا منہ بنایا۔ جہانگیر نے ذرا شریر نظروں سے رستم کو دیکھا اور گوہرا کا بازو دباتے ہوئے بولا۔ ''چل آ ذرا پاسے ہو کر بیٹھتے ہیں۔ اِدھر باتیں کریں گے تو اپوزیشن کھڑاک شروع کر دے گی۔''

اگلے دو تین روز میں جہانگیر نے ان کی میزبانی پر پوری پوری توجہ دی۔ پتا نہیں، وہ کہاں سے ایک زبردست قسم کا خانساماں لے آیا۔ یہ شخص فوج کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ پاکستانی، چائنیز اور مغلائی کھانوں میں اسے زبردست مہارت حاصل تھی۔ وہ ہر طرح سے جہانگیر کے لئے قابلِ اعتماد بھی تھا۔ جہانگیر نے دو جہازی سائز کے ویڈیو سسٹمز کے علاوہ کچھ قالین اور تھوڑا سا فرنیچر بھی منگوا لیا تھا۔ یہ سب اشیاء نہایت قیمتی اور لگژری اسٹائل کی تھیں۔ اگلے دن

رستم نے دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ دو عدد زبردست شاور کیبن ایک ٹرک پر لدے چلے آ رہے تھے۔

رستم نے بھنا کر کہا۔ ''یار جہانے! یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ہمیں آٹھ دس دن سے زیادہ یہاں نہیں رہنا اور تم آٹھ دس برسوں کا انتظام کر رہے ہو۔''

''آٹھ دس دن تو نہیں، تمہیں کم از کم پندرہ بیس دن یہاں رہنا پڑے گا۔ پولیس والے شہر کے کونے کونے میں تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں اور جان جی! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے یہ دس پندرہ دن اتنے مزے میں گزریں کہ دس پندرہ مہینوں کی کسر پوری ہو جائے۔'' تب ایک بار پھر اس نے اپنا پسندیدہ گانا دہرایا۔

یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس یار، ہم نہ ہوں گے

وہ جب بھی یہ بول بولتا تھا ان میں ''یار'' کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیتا تھا۔ اخباروں میں آستانے کے بارے میں تواتر سے خبریں چھپ رہی تھیں۔ آستانے میں ہلاک ہونے والے پانچ افراد کے قتل کی ذمے داری سو فیصد رستم پر ڈالی جا رہی تھی۔ اسے ایک سفاک اور بے رحم قاتل قرار دیا جا رہا تھا۔ کرائمز رپورٹرز نے اس امر کو خاص طور سے اجاگر کیا تھا کہ رستم نے حضرت صاحب کی شدید زخمی بیوی کو ہسپتال پہنچائے جانے سے روکا اور اس امر پر اصرار کیا کہ اس کا علاج آستانے میں ہی روحانی طریقے سے کیا جائے۔ رستم کے اس بے جا اور بے رحم اصرار کی وجہ سے حضرت صاحب کی بیوی کی جان گئی۔

کچھ پڑھے لکھے لوگ اس صورتِ حال کو دوسرے زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قدرت اللہ کی اس بہیمانہ منافقت کو محسوس کیا تھا جسے رستم نے اجاگر کرنا چاہا تھا۔ ایک کالم نگار نے لکھا تھا جس وقت قدرت اللہ کی بیوی بے ہوشی کا شکار ہوئی عین اس وقت ایک اور لڑکی بھی اسی قسم کی بے ہوشی میں مبتلا ہو کر قدرت اللہ کے سامنے مریضہ کے طور پر موجود تھی۔ قدرت اللہ اور اس کی بیویاں اس مریضہ پر اپنے ٹونے ٹوٹکے آزما رہے تھے۔ قدرت اللہ نے اس مریضہ کو ہسپتال پہنچانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔ اسی قسم کی رائے کچھ اور لوگوں نے بھی ظاہر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ قدرت اللہ اور اس نوع کے دوسرے لوگ روحانی علاج کے نام پر سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ کینسر، ایڈز اور کالے یرقان جیسی بیماریوں کا علاج مٹی اور راکھ سے کرتے رہتے ہیں اور جب مریض لاعلاج ہو جاتے ہیں تو ان کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اسی حوالے سے اخبارات میں ایک بحث سی شروع

ہوگئی تھی۔

دوسری طرف پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے قدرت اللہ کے ہزاروں مرید بھی بے حد اشتعال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان مریدوں اور عقیدت مندوں میں ہر طبقے کے خواص وعام شامل تھے۔ یہ لوگ رستم کے ساتھ ساتھ پولیس کے محکمے کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر پولیس، رستم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف بروقت کارروائی کرتی تو یہ سانحہ رُونما نہ ہوتا۔ کچھ جگہوں پر ان لوگوں نے توڑ پھوڑ بھی مچائی تھی۔ خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پریشر کی وجہ سے پولیس کی کارروائیوں میں کچھ تیزی آئی ہے۔

یہ تیسرے چوتھے دن کی بات ہے۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ رستم شاور کیبن میں نہا کر باہر نکلا اور تولیے سے اپنے سر کے لمبے بال پونچھتا ہوا کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں فرش پر فرانسیسی شراب کی دو بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ادھ کھائے چرغے پڑے تھے اور تاش بکھرے ہوئے تھے۔ رستم تو سو گیا تھا لیکن رات ڈھائی تین بجے تک گوہرا اور جہانگیر کی محفل جمی رہی تھی۔ نوشا بھی اس محفل میں شریک تھا۔ رستم کو بیڈ روم میں گاہے بگاہے جہانگیر کی بے سُری آواز سنائی دیتی رہی تھی۔

یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس یار، ہم نہ ہوں گے

اس آواز میں کسی وقت گوہرا کی مخمور آواز شامل ہو جاتی تھی۔ وہ تال دینے کے لئے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا تھا اور پوٹھوہاری لب و لہجے میں گاتا تھا۔

بھٹی بھنا چھولے
اج مینڈے ماہی آونا، کوٹھے تے کاں بولے

رستم نے تاش کے پتے سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور ادھ کھائے چرغوں کے ٹکڑے بلیوں کے لئے گیراج کی چھت پر پھینک دیئے۔ اچانک وہ ٹھٹکا۔ ڈرائنگ روم کی طرف سے کسی عورت کے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ رستم نے ذرا آگے جا کر دیکھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اسے ڈرائنگ روم کا منظر نظر آیا۔ ایک جواں سال عورت گود میں ایک خوبرو بچہ لئے جہانگیر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ وہ بڑے التجا آمیز لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔

اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی چوٹی اس کی

پنڈلیوں پر جھول رہی تھی۔ اس کی گود کا ڈیڑھ دو سالہ بچہ، ماں کی حالت سے بے خبر چوٹی سے کھیل رہا تھا۔ پھر رستم نے دیکھا کہ جواں سال عورت نے روتے روتے جہانگیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور نیچے جھک کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

جہانگیر کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے شفقت کے انداز میں لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی آمیز لہجے میں کچھ کہا۔

تب رستم نے دیکھا کہ جہانگیر ڈرائنگ روم سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم نیم تاریکی میں تھا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی لہٰذا اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ لڑکی صوفے پر بیٹھ کر سسکنے لگی۔ گاہے بگاہے وہ اپنے بچے کا سر بھی چوم لیتی تھی۔ وہ شکل وصورت سے واقعی مصیبت زدہ لگتی تھی۔ جہانگیر اب ساتھ والے کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی مدھم آواز اب رستم کے کانوں تک پہنچنے لگی تھی۔

''جی وکیل صاحب...... میں مجاز ملک بول رہا ہوں۔'' جہانگیر نے کہا۔ ''جی ہاں...... جی ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔'' کچھ دیر تک وہ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا پھر بولا۔ ''میں آپ کی طرف ایک لڑکی بھیج رہا ہوں جی، میری بہن ہی سمجھیں جی۔ بے چاری مشکل میں ہے۔ اسے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کا شوہر پولیس حراست میں ہے...... جی ہاں...... جی ہاں۔ باقی باتیں یہ خود آ کر آپ کو بتا دے گی۔ اس کا بڑا بھائی بھی ساتھ ہوگا۔ ٹھیک ہے جی، بہت مہربانی۔ میں احسان مند ہوں۔''

جہانگیر نے فون بند کر دیا۔ وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ لفافے میں یقیناً رقم تھی اور اگر رستم کے اندازے کے مطابق یہ ہزار ہزار والے نوٹ تھے تو رقم یقیناً تیس چالیس ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ وہ ایک بار پھر ہمدردی کے انداز میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ رستم کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی رخصت ہوگئی تو رستم نے جا کر جہانگیر سے پوچھا۔ ''یہ کُڑی کون تھی جہانے؟''

جہانگیر کے چہرے پر قدرے تشویش نظر آئی۔ کہنے لگا۔ ''ڈیرے پر تجھے اپنا پرانا ساتھی کاٹھیا یاد ہے ناں؟''

''ہاں ہاں۔'' رستم چونک کر بولا۔ ''میں ابھی چھ سات دن پہلے اس سے ملا ہوں۔ وہ ڈیرے پر ہی ہے۔''

''یہ کاٹھیا کے چھوٹے بھائی خیام کی بیوی ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، خیام اپنے پانچ

ساتھیوں سمیت وڈے ڈیرے کے پاس سے پکڑا گیا ہے۔''

''وڈے ڈیرے کے پاس سے؟'' رستم نے حیران ہوکر پوچھا۔

''ہاں، بُری خبر یہ ہے کہ پولیس نے علاقے میں اپنا آپریشن شروع کردیا ہے۔ وڈے ڈیرے کے آلے دوالے بڑا سخت گھیرا ڈالا گیا ہے۔ اب ڈپٹی ریاض اور اس کا عملہ اس گھیرے کو تنگ کرتا جارہا ہے۔ تین دن سے وہاں مسلسل فائرنگ ہورہی ہے۔ کئی لوگ مرے ہیں اور کچھ پکڑے بھی گئے ہیں۔''

رستم سخت تشویش اور سناٹے کے عالم میں یہ خبریں سنتا رہا۔ جہانگیر گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ نیا سگریٹ سلگا کر وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم بڑے اچھے وقت پر نکل آئے ہو۔ اب وہاں حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ لگتا ہے کہ پولیس نے وہاں بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔''

''یہ خیام کی بیوی کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس بے چاری نے کیا کہنا ہے۔ یہ وہ سب کچھ بھگت رہی ہے جو اس جیسیوں کا نصیبا ہوتا ہے۔ یہ دو سال سے آس لگائے بیٹھی تھی کہ خیام ایک دن اچانک آئے گا۔ اس کے پاس ویزے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ ہوں گے۔ وہ اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ دبئی لے جائے گا جہاں خیام کے پیچھے پولیس نہیں ہوگی، نہ ہی وہ ایک اشتہاری ڈکیت کی بیوی کہلائے گی۔ وہ وہاں ایک نئی زندگی شروع کردیں گے لیکن تمہیں پتا ہی ہے یار! ایسے سپنے کہاں پورے ہوتے ہیں۔ خیام وڈے ڈیرے سے پکڑا گیا ہے۔ اب خوشاب کے کسی تھانے میں اس کی زبردست چھترول ہورہی ہے۔ اس کی بیمار ماں رو رو کر مرنے کے قریب ہے اور یہ بے چاری اس خوف سے کانپ رہی ہے کہ پولیس والے اس کے بندے کو ٹارچر کرکے مار ڈالیں گے یا پھر پولیس مقابلے میں پار کردیں گے۔ یہ بات تو وہ بھی جانتی ہے کہ وہ اب رہا نہیں ہوسکتا لیکن چاہتی ہے کہ وہ کم از کم تھانے سے چھوٹ کر جیل پہنچ جائے۔ یار! یہ بندہ بھی کیا شے ہے۔ اوپر والا اس مٹی کے پتلے کو کیسے کیسے توڑتا موڑتا ہے۔ جیل جانا کون پسند کرتا ہے لیکن یہ عورت دن رات بھاگ دوڑ کرکے اپنے بندے کو جیل پہنچانا چاہ رہی ہے۔''

یوں تو رستم، جہانگیر کی باتیں سن رہا تھا مگر اس کا دھیان وڈے ڈیرے اور وہاں کے حالات کی طرف تھا۔ وہ یہاں جہانگیر کی شاندار کوٹھی میں عیش کررہا تھا اور وہاں قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس نے گوہرا کو جگا کر اسے سب کچھ بتایا پھر موبائل فون پر اپنے مخبر خاص نظام سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چار

پانچ منٹ بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری طرف سے ہلکے سے شور کے ساتھ نظام کی آواز ابھری۔ ''کون؟''

''میں رستم بول رہا ہوں۔''

''اوہ خدایا! آپ کہاں ہیں؟'' نظام نے کانپتی آواز میں کہا۔

''تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ڈیرے کے کیا حالات ہیں؟''

''کچھ نہ پوچھیں جی۔'' نظام کی آواز رندھ گئی۔ ''لگتا ہے کہ ڈپٹی ریاض اور اس کی نفری نے وہاں کسی کو نہیں چھوڑنا۔ بڑے وسیع پیمانے پر آپریشن شروع ہوا ہے جی۔ ڈپٹی ریاض کے علاوہ اور بھی کئی بڑے افسر اس آپریشن میں شامل ہیں۔ کئی سو پولیس والے حصہ لے رہے ہیں۔ اجرال برادری کے کچھ مقامی لوگ بھی پولیس کے ساتھ ہیں۔ پرسوں ایک اجرالی سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ڈپٹی ریاض صاحب بالکل آتش فشاں بنے ہوئے ہیں۔ ان پر رستم نے باقاعدہ حملہ کیا ہے اور پولیس پارٹی پر دستی بم بھی پھینکا ہے۔ آج سویرے میں نے ایک ہیلی کاپٹر بھی وادی کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ پتا چلا ہے کہ پچھلے تین دن سے وہاں مسلسل فائرنگ ہورہی ہے۔ پولیس والے گھیرا تنگ کرتے جارہے ہیں۔ نہ کوئی علاقے سے باہر آسکتا ہے نہ اندر جاسکتا ہے۔''

''لالہ فرید اور حسنا وغیرہ کی کیا خبر ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''وہ ابھی تک تو خیریت سے ہیں۔ کل شام سیٹ (وائرلیس) پر ان دونوں سے بات ہوئی ہے۔ جس وقت بات ہورہی تھی اس وقت بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈیرے پر خوراک کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ بہت سے بندے مرے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں لیکن پھر بھی وہاں لوگوں کے حوصلے بلند ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ پولیس کو زیادہ آگے نہیں آنے دیں گے۔'' رستم نے نادیہ کی خیریت کے بارے میں پوچھا۔ نظام کو اس بارے میں معلوم نہیں تھا تاہم اس نے بتایا کہ ڈیرے پر موجود چاروں پانچوں عورتیں خیریت سے ہیں۔''

رستم نے پوچھا۔ ''مراد، ناصر اور کاٹھیا وغیرہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ بھی خیریت سے ہیں جی...... لیکن دلاور کے بارے میں بُری خبر ہے۔ دلاور کو جانتے ہیں ناں آپ؟''

''ہاں ...ہاں، کیا ہوا اسے؟''

''وہ مارا گیا ہے۔ وہ پرسوں شام گشت پر تھا۔ اتنے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ رائفل کا پورا برسٹ اس کی چھاتی پر لگا۔ چار اور بندے بھی مارے گئے۔ اس واقعے کا لالہ پر بڑا اثر ہوا

ہے۔ دلاور پر اسے بڑا بھروسہ تھا لیکن... لیکن آپ کہاں ہیں؟"

نہ جانے کیوں رستم نے خود کو ایک دم قصوروار محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا جہاں وہ ہے۔ اسے اپنے دکھ سکھ کے ساتھیوں کے پاس ہونا چاہیے تھا جن کے ساتھ اس کے جینے مرنے کے پیمان تھے، وہ وہاں ڈپٹی سیاض کے جان لیوا گھیرے میں زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار تھے اور وہ یہاں نت نئی ڈشیں کھانے اور اسٹیم باتھ لینے میں مصروف تھا۔

"ہیلو... رستم صاحب! ہیلو، آپ بول نہیں رہے۔" نظام نے پریشان ہو کر کہا۔

رستم نے گہری سانس لی اور پوچھا۔ "فرید یاسینے نے میرے بارے میں کوئی بات کہی تھی؟"

نظام بولا۔ "ہاں، لالہ فرید نے آپ کے اور گوہرا بھائی کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے کہا مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ لالہ نے کہا کہ اگر آپ سے میرا رابطہ ہو تو میں آپ کو بتا دوں کہ یہاں سون میں حالات بڑے خراب ہو گئے ہیں۔ آپ اب وہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔"

رستم کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے خود سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ وہاں اس ویرانے میں جسم کے پیاسے موت کا مقابلہ کریں اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے روپوش رہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا۔

پھر وہ نظام سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اب اگر لالے وغیرہ سے تمہاری بات ہو تو انہیں بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں اور ان سے زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت جلد ان سے ملاقات ہو۔"

"وائرلیس پر یا...؟"

"کسی بھی صورت میں۔" رستم نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "میں آج کسی وقت تم سے پھر بات کروں گا۔ تم فون پر مل جاؤ گے ناں؟"

"ہاں جی! دوپہر کو صرف ایک گھنٹے کے لئے میں نے کہیں جانا ہے۔ پھر یہیں رہوں گا۔"

رستم نے سلسلہ منقطع کیا اور ایک بار پھر بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

خانساماں کرامت نے لمبا چوڑا ناشتہ ڈائننگ روم میں سجا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ناشتہ نہیں بوفے ڈنر سجا ہوا ہے۔ وہ صبح چار بجے سے اپنے کام پر جت جاتا تھا۔ ناشتے میں

سینڈوچ، سوپ، حلوہ پوری، نہاری، آملیٹ، چکن ونگز، فروٹ جوسز اور پتا نہیں کیا کیا شامل تھا۔ پوری کوٹھی مہکنے لگی تھی۔ جہانگیر اور گوہرا دونوں خوش خوراک تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے ناشتے کی میز پر بیٹھتے تھے لیکن آج وہ دونوں بھی کچھ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ سون سے آنے والی خبریں تشویش ناک تھیں۔

"چلو رستم، تھوڑا سا کھا لو۔" جہانگیر نے کہا۔

"نہیں بالکل بھوک نہیں۔" رستم نے کہا اور صرف چائے کا ایک کپ لے لیا۔

رستم کی کیفیت دیکھ کر گوہرا اور جہانگیر نے بھی ہاتھ کھینچ لئے۔ یہ ناشتہ جو کم و بیش پندرہ آدمیوں کے لئے کافی تھا ویسے کا ویسا ہی میز پر پڑا رہ گیا۔ تینوں سر جوڑ کر نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ وہ کافی دیر تک تازہ صورت حال پر بات کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد مطلع ابر آلود ہونا شروع ہو گیا۔ ہوا بھی چلنے لگی۔ رستم کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ وہ اٹھا تو ان کی میٹنگ پھر شروع ہوئی۔

"اب کیا کرنا ہے لالے دی جان؟" گوہرا نے رستم سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش بھی تھا۔

رستم کی بجائے جہانگیر نے جواب دیا۔ وہ وہسکی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔ "ہمیں جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں تم دونوں کو یہ رائے ہرگز نہیں دوں گا کہ تم واپس سون کی طرف جاؤ۔ یہ تو سراسر بے وقوفی ہوگی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" گوہرا نے گلاس بھرتے ہوئے پوچھا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم سون سے باہر رہ کر ساتھیوں کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔"

"باہر رہ کر کیا کر سکتے ہیں؟" رستم نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"رستم! پولیس کے محکمے میں تمہارے تعلقات ہیں۔ مجھے پتا ہے اور بھی دو چار لوگ تمہاری بات سنتے ہیں۔ تم کسی طرح لالے اور ساتھیوں کو گھیرے سے نکالنے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

"میں حاجی حیات کے سوا کسی با اثر کو نہیں جانتا اور حاجی حیات بھی محکمے کا حاضر سروس ملازم ہے۔ وہ بس ایک حد تک ہی جا سکتا ہے۔ سون میں ہونے والا آپریشن بڑے بڑے مگرمچھوں کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ حاجی حیات وہاں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے پتا ہے، لاہور کا ایک منسٹر بھی تمہیں فون کرتا رہتا ہے۔ تم نے اس کی خاطر انڈین سمگلر گروجیت کو پار کیا تھا۔"

''لیکن مجھے تم سے زیادہ پتا ہے، وہ منسٹر بھی آج کل زیرِ عتاب ہے۔'' رستم نے بھی گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

اچانک رستم کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز سن کر رستم کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یہ بی بی تھی۔

''ج جی بی بی کک کیسے فون کیا؟''

جو جواب ملا، وہ مزید پریشان کن تھا۔ بی بی نے کہا۔ ''رستم! میں تمہاری طرف آ رہی ہوں۔''

''میری طرف......لیکن... میں تو ...'' وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔

بی بی نے کہا۔ ''میں تمہاری رہائش سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس چار پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

رستم کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس نے چند لمحے بعد ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! پولیس ہمیں ہر جگہ ڈھونڈ رہی ہے۔ کہیں آپ کا پیچھا کرتے ہوئے......''

''نہیں......نہیں۔'' بی بی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''ہم پوری احتیاط کر کے آ رہے ہیں۔ اس بارے میں بے فکر رہو۔''

بی بی جمع کا صیغہ استعمال کر رہی تھیں۔ رستم سمجھ گیا کہ عارف بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے عارف پر غصہ آیا۔ رستم نے اسے تاکید کی تھی کہ بی بی کو یا اسے خود یہاں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ وہ نا سمجھ نہیں تھا لیکن اس سے ناسمجھی والا کام ہوا تھا۔

رستم کی چھٹی حس نے گواہی دی تھی کہ بی بی یہاں اسے سمجھانے بجھانے کے لئے آ رہی ہے۔ اس نے آ کر یقیناً یہی کہنا تھا کہ وہ موت کی اس یورش سے بچ کر کہیں دور نکل جائے۔ اتنی دور کہ اس کے ساتھ زندگی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

لیکن وہ ایسے کیسے کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا اور آج ملنے والی اطلاعات کے بعد تو یہ کام بالکل ہی خارج از امکان ہو گیا تھا۔ وقت ایک بار پھر اسے بدترین ہنگاموں اور خطرات کی جانب کھینچ رہا تھا۔

رستم کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ اگر بی بی ایک بار اسے منع کر دیتی تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا تھا پھر بی بی کے حکم پر عمل کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا تھا پھر وہی کچھ ہونا تھا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ بی بی کے حکم پر اس نے بلا چوں و چرا رنگ والی کی حویلی چھوڑی تھی۔ بی بی کے حکم پر اس نے تاؤ حشام جیسے

درندے اور اس کے بیٹے کی جان بخشی کی تھی اور اب بی بی کے حکم پر اس نے قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کو معاف کیا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ بی بی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خود کچھ کہہ ڈالے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو بی بی کے یہاں آنے سے پہلے ہی کہیں دور نکل جائے۔ وقت بہت کم تھا۔ اسے جو فیصلہ بھی کرنا تھا بہت جلدی کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے جہانگیر کو اشارہ کیا کہ وہ وسکی کی بوتلیں اور سگریٹوں کے پیکٹ وغیرہ یہاں سے ہٹا دے۔ جہانگیر کی ہدایت پر نوشا کمرے کی صفائی کرنے لگا۔ رستم بے قراری سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ بی بی سے بات ہونے کے بعد اب اس کے لئے یہ بھی آسان نہیں تھا کہ یہاں سے نکل جاتا۔ اسی دوران میں کوٹھی سے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد کال بیل ہوئی۔ رستم کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اور بی بی نشست گاہ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بی بی آج سیاہ برقعے میں نظر آ رہی تھی۔ صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں۔ وہ اس روپ میں بھی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ رستم کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔ نظروں کے یوں پھیرنے میں اس کے دل پر جو گزری تھی یہ وہی جانتا تھا۔ یہ پودے کو جڑوں سے کھینچنے کا عمل تھا۔ یہ جان کو جسم سے نکالنے کی روداد تھی۔

شانی نے کہا۔ ''رستم! تم عارف سے ناراض مت ہونا۔ یہ مجھے یہاں نہیں لایا ہے، میں لائی ہوں اور مجبور کر کے لائی ہوں۔ اس میں عارف کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

رستم بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ رستم نے بہتر سمجھا کہ وہ اس خاموشی کو توڑنے میں پہل کرے۔ وہ بولا۔ ''بی بی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں بڑی پریشان کن خبریں ملی ہیں۔ ان خبروں کا تعلق وڈے ڈیرے سے ہے۔ وڈے ڈیرے پر پولیس کا بڑا آپریشن شروع ہو گیا ہے۔ وہ لوگ ڈیرے کا گھیراؤ تنگ کر رہے ہیں۔''

شانی نے ایک دکھ بھری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لگ رہا تھا کہ اب ایسا ہی ہونا ہے۔''

رستم کبھی کبھار شانی کے چہرے کی طرف نظر اٹھاتا تھا۔ عموماً یہ نظر تب شانی کے چہرے پر پڑتی تھی جب اسے کوئی خاص بات کہنا ہوتی تھی۔ اس نے بی بی کے چہرے پر نظر ڈالی اور ...''بی بی! میں نے وڈے ڈیرے سے آتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ... آیا تو واپس آؤں گا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس مصیبت کے وقت میں ان کے پاس واپس پہنچوں۔ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

شانی نے چونک کر رستم کی طرف دیکھا۔ رستم نے اپنی بات عام سے الفاظ میں کہی تھی لیکن الفاظ کے پیچھے جو توانائی، طاقت اور التجا تھی اس نے شانی کو اندر تک ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر رستم کی گہری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اس جگہ واپس جاؤ گے جہاں سے نکلنے کے لئے تمہارے ساتھی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ مر رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔''

''میں وہاں جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں بی بی۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں انہیں اس موقع پر اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق جو کچھ کر سکتا ہوں وہ کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس نے وڈے ڈیرے کو ایک بڑے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم دو جگہیں ایسی ہیں جہاں سے یہ گھیرا کافی کمزور ہوگا۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو رستم؟''

''ابھی میرے دماغ میں کچھ صاف نہیں ہے بی بی لیکن میرا خیال ہے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر ہم پانڈو نامی جگہ پر پولیس کو عقب میں الجھا لیں تو گھرے ہوئے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ گھیرے سے نکل گئے تو پھر سون کی بھول بھلیوں میں جان بچانے کی بڑی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ نے ان ٹیلوں کو دیکھا ہی ہے۔ وہ ہمیشہ زبردست پناہ گاہ ثابت ہوئے ہیں۔''

شانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس سے پہلے اس کی نگاہیں رستم کی نگاہوں سے ملیں۔ رستم کی آنکھوں میں اسے عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ ان آنکھوں میں گہرے کرب کے ساتھ ایک بے تاب التجا اس طرح شامل ہوگئی تھی کہ وہ گنگ ہوگئی۔ اسے لگا، رستم خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے، بی بی...... آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگ رہا ہوں۔ مجھے رکنے کا حکم نہ دیں۔

شانی کے سینے سے ایک گہری ہوک اٹھی۔ اسے لگا کہ وہ بیٹھے بیٹھے پتھرا گئی ہے۔ رستم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کہے گی وہ رستم مان لے گا۔ اگر ابھی مرنے کا حکم دے گی تو وہ بلا تامل اپنی جان بھی لے لے گا لیکن کیا رستم کی آنکھوں میں اس کی التجا پڑھنے کے بعد وہ کوئی دوٹوک حکم دے سکتی ہے؟ رستم کے الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔

''اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اس مصیبت میں ان کے پاس پہنچوں۔ اگر ایسا نہ کر سکا تو اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

اچانک رستم کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔ یہ فون سیٹ ان سیٹوں میں سے تھا جو

رستم اور گوہرا نے آستانے سے تلاشی کے دوران میں جمع کئے تھے۔ اب اس میں دوسری سم ڈالی گئی تھی۔ رستم نے شانی سے اجازت لے کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف نظام تھا۔ رستم نظام سے بات کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شانی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ عارف نے اسے اشارہ کیا، شانی عارف کے ساتھ برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر جا بیٹھی۔

عارف نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''شانی بہن! یہ سب کچھ وہی ہو رہا ہے جس کا مجھے اور تمہیں اندیشہ تھا۔ رستم دن بدن زندگی سے دور جا رہا ہے۔ اب وہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس جانا چاہتا ہے۔ یہ سراسر خودکشی ہے اور بعض لوگ اسے بے وقوفی بھی کہیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ رستم بھائی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ وہ سون میں جائے گا اور وہاں لالہ وغیرہ کے ساتھ ہی مارا جائے گا ..... یا پھر پکڑا جائے گا اور پھانسی کے پھندے پر پہنچ جائے گا۔''

''یہ سب کچھ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔'' شانی کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔

''میرا ایک مشورہ ہے شانی بہن! اگر تم مان لو تو۔ میں سمجھتا ہوں کہ بس اس مشورے پر عمل کر کے ہی تم رستم کو جانے سے روک سکتی ہو۔ اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔'' شانی سوالیہ نظروں سے عارف کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''جہاں تک میں رستم کی نیچر کو سمجھا ہوں وہ یاروں کا یار ہے۔ رشتوں ناتوں کے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔ اب رشتوں ناتوں کے لئے ہی وہ پھر سے سون میں جانے کا سوچ رہا ہے ناں۔ اپنے یاروں کے کندھے سے کندھا ملانے کے لئے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

عارف نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم رستم بھائی کے مزاج کے مطابق چل کر اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر سکتی ہو۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اگر تم رستم کو یہ بتاؤ کہ تم یہاں اپنی حفاظت کی خاطر آئی ہو تو وہ اپنے اور تمہارے ناتے کے لئے باقی ناتوں کو وقتی طور پر بھول جائے گا۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی۔''

عارف نے اردگرد دیکھا اور اپنے لہجے کو مزید پست کرتے ہوئے بولا۔ ''شانی بہن اگر تم اس سے کہو کہ تمہیں اس کی پناہ چاہیے ..... تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ تمہیں چاروں طرف سے خطروں نے گھیرا ہوا ہے۔ بے شک تم نے بہت سے

دشمنوں کو دوست بنایا ہے لیکن بہت سے دشمن اب بھی خطرناک حد تک دشمن ہیں جن میں ایک قدرت اللہ جی ہے۔ کسی وقت، کسی بھی وجہ سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر تم رستم سے کہو کہ تمہیں اس کا مضبوط سہارا درکار ہے اور تم اسی سہارے کے لئے یہاں پہنچی ہو... اور وہ تمہیں لے کر محفوظ جگہ چلا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ رستم بھائی باقی باتیں بھول جائے گا۔"

شانی کے سارے جسم میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے دل کی اتھاہ گہرائی میں بھی کہیں یہ خیال موجود تھا۔ اس نے چونک کر عارف کو دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں شانی بہن! میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی طاقت رستم کو موت کی طرف جانے سے روک سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف تم ہو..... ہاں شانی۔ اس کا اب سون کی طرف جانا موت کی طرف جانا ہی ہے۔ یہ ایک ایسا جذباتی فیصلہ ہے جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ تم اسے اس جذباتی فیصلے سے بچالو۔ آج میں بھی وہی بات کہنا چاہتا ہوں جو کچھ عرصہ پہلے مہتم بستی میں بہت سے مردوں، عورتوں نے کہی تھی۔ اگر تم رستم کے ساتھ کسی رشتے میں بندھ کر کہیں دور چلی جاؤ... کسی گمنام جگہ پر جا بسو تو تم دونوں کی زندگیاں بچ سکتی ہیں۔"

شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں عارف! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا شانی! جو کچھ اب ہونے جا رہا ہے یہ کسی نے کب سوچا تھا کہ ہوگا۔ اخباری خبروں سے پتا چلتا ہے کہ سون میں مفروروں کے خلاف آپریشن ایسے ہو رہا ہے جیسے کہیں جنگ لڑی جا رہی ہو۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وہاں موجود کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا۔"

شاید عارف اور شانی میں اس بارے میں مزید بات ہوتی لیکن اسی دوران میں رستم فون سن کر واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی تشویش اب پہلے سے گہری ہو گئی تھی۔ گوہرا، جہانگیر اور رستم کامن روم میں کھڑے ہو کر کھسر پسر کرنے لگے۔

باہر زور سے بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ شام سے پہلے ہی رات کا منظر پیدا ہو گیا تھا۔ شانی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ شاید یہ بے پناہ ذہنی دباؤ کا اثر تھا۔ وہ کئی طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عارف نے جو بات کہی وہ سو فیصد درست تھی۔ رستم کا واپس سون میں جانا ایک بے حد جذباتی فیصلہ ہوتا۔ اس فیصلے کا نتیجہ موت کے سوا شاید ہی کچھ اور نکلتا۔ عارف کی یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ رستم اور اس کے ساتھی گوہرا کو اس خودکشی سے صرف اور صرف وہ

خود ہی روک سکتی تھی لیکن رستم کو روکنے کے لئے اسے جو راستہ اختیار کرنا تھا، وہ بڑا کٹھن اور ناقابلِ مسافت تھا۔

شانی کو لگا کہ اس کا حلق خشک ہو رہا ہے اور ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ عارف نے غور سے شانی کا چہرہ دیکھا۔

"کیا بات ہے شانی! تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں۔ بس ذرا سر چکرا رہا ہے۔"

"تت..... تم لیٹ جاؤ شانی۔" عارف نے جلدی سے آگے بڑھ کر شانی کے شانے تھامے۔ شانی نے پہلے تو نفی میں سر ہلایا لیکن پھر آہستہ سے کراہتی ہوئی صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

اسی دوران میں رستم اور گوہرا نے بھی شانی کو دراز ہوتے دیکھ لیا تھا۔ رستم لپک کر شانی کی طرف آیا۔ "کیا ہوا بی بی؟" اس نے بے حد بے تابی سے پوچھا۔

شانی کی بجائے عارف نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ بس ذرا چکر سا آ گیا ہے۔"

جہانگیر نے پہلے نوشے کو آوازیں دیں، پھر خود بھاگ کر گیا اور گلاس میں پانی لے آیا تاہم اس دوران میں شانی خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی نمی تھی۔ رنگ اب بھی زردی مائل تھا۔

"کیا ہوا تھا بی جی؟" رستم نے دوبارہ لرزاں آواز میں پوچھا۔

"دراصل رستم بھائی! اس نے آج صبح صرف چائے کا ایک کپ پیا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا۔ پچھلے دو تین دن سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اوپر سے بھاگ دوڑ بھی بہت ہے۔ کمزوری نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا۔"

شانی نے تھوڑا سا پانی پیا اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ "نہیں، میں اب ٹھیک ہوں۔" پھر وہ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "چلو عارف اب چلتے ہیں۔" شانی کی آواز میں بے پناہ افسردگی تھی۔

"بالکل نہیں۔ میں اس طرح تو آپ کو ہرگز نہیں جانے دوں گا۔" جہانگیر نے کہا پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی موسم اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ آپ باہر نکلیں۔"

جہانگیر نے خانساماں سے کہا، وہ اسی وقت نیم گرم دودھ میں اوولٹین ملا کر لے آیا۔ جہانگیر کے اصرار پر شانی نے تھوڑا سا دودھ پیا۔ چند منٹ بعد خانساماں ایک اور ٹرے لئے

چلا آیا۔ اس میں چکن کارن سوپ اور کسٹرڈ وغیرہ تھے۔ عارف اور رستم نے اصرار کے ساتھ شانی کو تھوڑا سا کھانے پر مجبور کیا۔

بارش زور پکڑتی جارہی تھی۔ رات کی تاریکی میں گاہے بگاہے برق کوندتی تھی اور کوٹھی کے طول وعرض میں لہریئے سے لپک جاتے تھے۔ عارف کے کہنے پر شانی ساتھ والے کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

وہ لیٹ تو گئی لیکن آرام اس کی قسمت میں کہاں تھا۔ اس کا ذہن تو گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ رستم کو روکنا چاہتی تھی لیکن اسے روکنے کے لئے جو رکاوٹ درکار تھی وہ شانی کے پاس نہیں تھی۔ وہ کیسے چل پاتی رستم کا ہاتھ تھام کر۔ ان دونوں کے راستے جدا تھے اور منزلیں بھی۔ وہ نادیہ کا ہو چکا تھا۔ اب اس کا گھر تھا، بیوی تھی جو اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ دوسری طرف شانی بھی کچھ نئے بندھنوں میں باندھی گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر چکی تھی اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس رخ پر چلنا چاہتی تھی۔

وہ بند کمرے میں آنکھیں موندے بظاہر پُرسکون لیٹی رہی لیکن اس کے جسم وجاں میں ایک قیامت برپا رہی۔ ایک بار پھر اس کے اندر سے وہ آواز بلند ہونے لگی جو اس کے دل و دماغ پر ہزار ہا ستم توڑا کرتی تھی۔ اس آواز نے کہا۔ ''شانی! کیوں اپنے آپ سے بھاگ رہی ہے۔ کب تک بھاگے گی اور کہاں تک بھاگے گی۔ کیوں تُو یہ بات مان نہیں لیتی کہ تُو اپنی زندگی کو رستم کی زندگی کے ساتھ جوڑنا چاہتی ہے۔ بے شک یہ زندگی چند ہفتوں یا چند دنوں کی ہی کیوں نہ ہو، تُو رستم کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہے اور وہ جہاں تک چلتا رہے اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے...... ننگے پاؤں پتھروں پر اور کانٹوں پر اور انگاروں پر۔ جب تیرا ہاتھ رستم کے ہاتھ میں ہوگا تو پھر وہ کانٹے اور انگارے پھول بن جائیں گے۔ ہر جاں گُسل دکھ نشاط انگیز سکھ کا لبادہ اوڑھ لے گا۔ یہ سفر مختصر بھی ہوا تو ہزاروں سال کی بے کیف اور جامد زندگی سے بہتر ہوگا۔

''ہاں...... شانی، رستم خود کشی کر رہا ہے۔ اس خود کشی سے اسے تم اور صرف تم روک سکتی ہو۔''

اسے اونگھ سی آنے لگی۔ باہر گرج چمک اور بارش کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ وال کلاک نے رات کے نو بجائے تو عارف اور جہانگیر کمرے میں آئے۔ جہانگیر نے کہا۔ ''شانی بی بی! یہ آپ کے بھائی کا گھر ہے۔ یہاں رہتے ہوئے آپ کو کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ موسم خراب ہے اور آپ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔ صبح آرام سے ہوٹل چلی جائیے گا۔''

شانی رکنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے دل و دماغ میں جو شدید ترین کشمکش تھی وہ اسے رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کل رستم نے ہر صورت ملتان سے روانہ ہونا ہے اور اس کی منزل وہی ہے جہاں پنجاب پولیس پوری تیاریوں کے ساتھ مفروروں اور اشتہاریوں کا شکار کھیل رہی ہے۔ اگر اسے رستم کو روکنا تھا تو پھر اسے یہاں ٹھہرنا ہی تھا۔

وہ تذبذب میں نظر آئی تو جہانگیر کے اصرار میں توانائی آ گئی۔ اس نے شانی کو اپنے گھر میں رکنے پر نیم آمادہ کر لیا۔

جہانگیر اور عارف کے جانے کے بعد شانی ایک بار پھر سوچوں میں گم ہو گئی۔ وہ چاہتی تو رستم کی آنکھوں کی خاموش التجا کو رد کر کے اسے حکم دے سکتی تھی۔ وہ حکم دیتی تو وہ پہلے کی طرح قربانی دیتا اور رک جاتا لیکن کیا وہ ہمیشہ سے قربانیاں ہی لیتی رہے گی۔ کیا ایثار کا یہ سفر یک طرفہ ہی چلتا رہے گا۔

اس کے دل نے پکار کر کہا...... نہیں شانی! اگر تجھے رستم کو روکنا ہے تو پھر تجھے بھی اپنے اصولوں اور ارادوں سے ہٹ کر چلنا ہوگا...... جب کوئی آگ میں چھلانگ لگانے جارہا ہو تو پھر اسے عام ڈگر سے ہٹ کر پکارنا پڑتا ہے۔'' تو کیا وہ اسے پکارے؟'' شانی نے خود سے سوال کیا لیکن عین اس وقت تین نام ہتھوڑوں کی طرح اس کے ذہن پر برسے۔ نادیہ...... منا...... چوہدری بشیر۔ اگر وہ رستم کو پکارے گی تو ان تین ناموں کا کیا ہوگا؟

شانی کے اندر سے دوسری آواز آئی۔ ''کچھ نہیں ہوگا شانی! تم دیکھنا رستم سب کچھ سنبھال لے گا۔ اس کے لئے یہ بالکل مشکل نہیں کہ وہ مُنے کو چوہدری بشیر کی تحویل سے نکال لے۔ تم مُنے اور رستم کے ساتھ کہیں بہت دور نکل سکتی ہو۔ کہیں ایسی جگہ جہاں تم دونوں کی زندگیاں رستم کے مضبوط ترین حصار میں بالکل محفوظ رہیں گی۔''

''لیکن نادیہ؟'' پہلی آواز نے سوال کیا۔

''نادیہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وڈے ڈیرے پر پولیس کے جان لیوا گھیرے میں ہے۔ خدا کرے وہ بچ جائے اور پھر رستم سے آملے۔ ایسا ہوا تو بھی وہ خوش دلی سے رستم کو تمہارے ساتھ شیئر کر سکتی ہے۔ اس نے خود کہا تھا، شانی! میں ایک ادنیٰ خادمہ کی طرح آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہو جاؤں گی۔ چلیں خادمہ نہ سہی وہ برابر کی حیثیت سے تو رہ ہی سکے گی۔''

پہلی آواز نے کہا۔ ''لیکن یہ بھی دیکھو شانی، رستم نے شادی کی ہے۔ وہ ایک شادی شدہ شخص ہے۔ اگر وہ تمہاری محبت میں اتنا ہی آگے جا چکا ہوتا تو پھر شادی کیوں کرتا۔ لوگ تو

پوری زندگی بے نام آس کے سہارے گزار دیتے ہیں۔"

"یہ بڑی کمزور دلیل ہے۔" دوسری آواز نے پکار کر احتجاج کیا۔ "رستم نے یہ شادی بھی اس لئے کی تھی کہ یہ تمہارا حکم تھا۔ اس نے جیون ساتھی نہیں چنا بلکہ حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس شادی سے وہ جتنا "خوش" ہے اس کا پتا بھی تمہیں وڈے ڈیرے پر چل گیا تھا...... مہناز اور حنیفاں نے تمہیں بتایا تھا کہ رستم اس بندھن کو بس بندھن کے طور پر نبھا رہا ہے۔"

سوچتے سوچتے شانی کو پھر اونگھ سی آنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار پھر پوٹھوہار کے ان ہی ویران ٹیلوں میں ہے۔ تیسری سرنگ کے اندر بھاگتے بھاگتے وہ اندھی دراڑ میں گر گئی ہے۔ اس دراڑ میں رستم اس کے ساتھ ہے۔ وہ سردی اور بخار سے کانپ رہی ہے۔ پھر اسے رستم کا نرم گرم لمس ملتا ہے۔ اتنا پیارا، اتنا مہربان لمس کہ جس کی خوب صورتی کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لمس کی یاد نے شانی کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر اور گالوں پر ابھی تک رستم کے ہونٹوں کی گرمی موجود ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیا کے سرخ ڈورے تیر گئے۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔ کسی وقت بجلی چمکتی تھی اور کوٹھی کا وسیع لان روشن ہو جاتا تھا۔ لان کے پھول وار پودے، کیاریاں، گھاس اور سنگِ مرمر کا فوارہ، سب کچھ چند لمحے کے لئے روشن ہوتا اور پھر اتھاہ تاریکی میں ڈوب جاتا۔ شانی نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ قرب و جوار میں خاموشی طاری تھی۔ نیند میں گوہرا کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی...... شاید باقی لوگ بھی سو گئے تھے لیکن نہیں...... کوئی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ دور برآمدے کے آخری سرے پر تھا اور ٹہلنے والے انداز میں گھوم رہا تھا۔ شانی نے شیشے سے چہرہ لگا کر دھیان سے دیکھا۔ کچھ نظر نہیں آیا لیکن پھر ایک لمحے کے لئے برقِ آسمانی نے کوند کر رستم کی جھلک دکھائی۔ ہاں وہ رستم ہی تھا۔ اس کے سر کے لمبے بال دور ہی سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ کندھوں پر چادر لئے بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں غالباً سگریٹ تھا۔ وہ تنہا تھا۔ ان لمحوں میں شانی کے دل و دماغ میں ایک عجیب سوچ آئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کمرے سے نکلے اور رستم کے پاس پہنچ جائے۔ اس سے وہ سب کچھ کہہ دے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اسے بتا دے کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہے اور وہ اس کی پناہ میں آنا چاہتی ہے۔ وہ جانتی تھی، ایک بار صرف ایک بار اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر رستم باقی سب کچھ بھول جائے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہے گا کہ وہ خواہش کے باوجود کسی اور کے بارے میں کچھ سوچ

سکے۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے گا اور جس طرف وہ کہے گی چل پڑے گا۔

پتا نہیں کہ اس رات...... برسات...... اور حالات میں کیا بات تھی کہ شانی کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ساری سوچوں کا رخ رستم کی طرف ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وقت اپنے آپ کو دہرا رہا ہے۔ وہ ایک بار پھر مہتم بستی میں موجود ہے۔ سینکڑوں مہتم مرد و زن اور بچے قطار در قطار چمکیلی دھوپ میں کھڑے ہیں۔ ان کے سیاہی مائل چہرے حدت سے دہک رہے ہیں۔ وہ شانی کی طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور یک زبان گا رہے ہیں۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو

شانی کے جسم میں ہلکی سی لرزش نمودار ہو گئی۔ وہ دیوی تھی لیکن پتھر کی نہیں تھی۔ وہ بے حد باوقار تھی لیکن پھر بھی گوشت پوست کی انسان تھی۔ طاقت ور جذبے اس پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ شانی نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھا اور شال لے لی۔ بیڈ کے نیچے چپل موجود تھی۔ وہ چپل پہن کر مڑی۔ یہی وقت تھا جب اس کے شولڈر بیگ میں رکھے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے شولڈر بیگ کھول کو موبائل نکالا۔ دوسری طرف سے بلند ہونے والی آواز سن کر وہ سکتہ زدہ سی رہ گئی۔ یہ چوہدری بشیر تھا۔

"ہیلو شانی! کیسی ہو۔ میں نے تمہیں مبارک باد دینے کے لئے فون کیا تھا۔"

"کیسی مبارک باد؟" شانی نے خود کو شدید دھچکے سے سنبھال کر پوچھا۔

"آخر تم نے راجو اور کوکی کی منگنی کرا ہی دی۔ سنا ہے کہ تاؤ حشام بھی اب خوش ہے تم سے؟"

"مم...... مجھے تاؤ حشام کی خوشی سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے وہی کیا جو مجھے ٹھیک لگا اور میرا خیال ہے کہ یہ آپ کو بھی ٹھیک ہی لگا ہوگا۔"

"مجھے بھی اس سے کوئی غرض نہیں کہ مجھے کیا ٹھیک لگتا ہے۔ جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے وہ مجھے بھی قبول ہے۔" چوہدری بشیر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''آ... آپ کہاں ہیں؟''

''گھر میں۔ تمہیں اس لئے فون کیا تھا کہ طلاق کے کاغذات بالکل تیار ہو چکے ہیں۔ پرسوں سے میری گاڑی میں پڑے ہیں۔ خود آ کر لے جاؤ یا منگوا لو۔''

''شکریہ۔'' شانی نے کہا۔

''میرے لائق کوئی اور خدمت؟''

''مُنا کیسا ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے۔ آج دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے اور تم آج کہاں ہو؟''

''ہو...... ہوٹل میں۔'' شانی گڑبڑا گئی۔

دوسری طرف گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری کی آواز آئی تو آہنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔ ''میں نے کچھ دیر پہلے لینڈ لائن پر ہوٹل فون کیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ تم اور عارف دوپہر سے کہیں نکلے ہوئے ہو۔''

''بب...... بس ابھی واپس پہنچی ہوں۔''

دوسری طرف سے چند سیکنڈ تک گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ شانی ایک بات سوچ کر کانپ گئی۔ اس نے یہ کہہ کر غلطی کی تھی کہ وہ ہوٹل سے بول رہی ہے۔ ہوٹل ایک مصروف سڑک کے کنارے واقع تھا اور کمروں میں ہر وقت ٹریفک کا مدھم شور سنائی دیتا رہتا تھا۔ ہارنوں کی آوازیں بھی آتی تھیں لیکن یہ کوٹھی ایک پُرسکون رہائشی علاقے میں تھی۔ فون لائن پر سنائی دینے والی خاموشی چوہدری بشیر کو چونکا سکتی تھی اور شاید وہ چونک گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی چوہدری بشیر کی آواز پھر ابھری۔ اس مرتبہ آواز کا آہنگ بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ چوہدری نے کہا۔ ''شانی! تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے ایک وعدہ کر رکھا ہے..... اگر بھول گئی ہو تو میں تمہیں یاد کرا دیتا ہوں۔ یاد کرا دوں؟'' چوہدری کے لہجے میں ایک سخت مزاج شوہر کی سی سختی تھی۔

''جی... میں سمجھی نہیں۔''

''میرے ساتھ تمہارا وعدہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرو گی اور اس تیاری کے لئے چھ مہینے سے زیادہ نہیں لو گی۔ ان چھ مہینوں میں کوئی دوسرا شخص چاہے وہ کوئی بھی ہو، کسی بھی حوالے سے تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا...... اور ایک خاص بات یہ کہ .... جو کچھ ماضی میں ہوا وہ ہو گیا لیکن اب تم ہر پرانے ناتے سے علیحدہ رہو گی۔ یہ وعدہ

ہوا تھا ناں...''

پتا نہیں کیوں شانی کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس نے بمشکل کہا۔ ''کیا بات ہے۔ آپ یہ باتیں کیوں یاد دلا رہے ہیں؟''

چوہدری بشیر کا لہجہ مزید سنگین ہو گیا۔ وہ بولا۔ ''اس لئے یاد دلا رہا ہوں کہ ایک بار ڈسا جا چکا ہوں۔ اب دوبارہ ڈسوانا نہیں چاہتا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ حضرت صاحب کی بیوی اور مریدوں کو قتل کرنے کے بعد رستم ملتان سے نکلا نہیں، یہیں کہیں موجود ہے۔''

''مم...... مجھے نہیں پتا۔''

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ تمہیں پتا ہے...... اور تم اس سے ملنے پہنچی ہوئی ہو۔ میں تم پر کوئی شک نہیں کر رہا شانی بیگم اور نہ کسی طرح کا الزام لگا رہا ہوں لیکن میری ایک بات تم آج کان کھول کر سن لو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری کا لہجہ نہایت سنگین بلکہ جنونی ہو گیا۔ ''میں اب اور برداشت نہیں کروں گا۔ میں بڑا کمزور بندہ ہوں۔ زیادہ ہمت نہیں ہے مجھ میں...... میں سب کچھ ختم کر دوں گا...... تمہیں..... مُنے کو...... اور خود کو بھی۔''

آخری الفاظ اتنی وحشت سے کہے گئے تھے کہ شانی کی رگوں میں خون جم گیا۔ اس کی وہی کیفیت ہوئی جو آج سہ پہر کو ہوئی تھی۔ اسے چکر سا آ گیا۔ فون بند کرتے ہوئے اس نے دیوار کا سہارا لیا لیکن دیوار جیسے اس سے دور ہو گئی۔ اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور وہ گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا۔ دبیز ایرانی قالین نے اسے شدید چوٹ سے محفوظ رکھا لیکن وہ کچھ دیر کے لئے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔ بے ہوشی کا دورانیہ طویل نہیں تھا، شاید ایک منٹ یا دو منٹ۔ پھر یہ بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی۔ شانی کو احساس ہوا کہ وہ قالین پر پڑی ہے۔ کمرے کے باہر سے کوئی اسے پکار رہا ہے۔ یہ رستم تھا۔ شاید وہ دروازے سے اس کے ٹکرانے کی آواز سن کر اس کی طرف لپکا تھا۔ تب شانی نے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس کیا... دروازہ کھولا گیا اور پھر رستم کا لمس۔ ہاں وہی جانا پہچانا لمس جس نے اندھی دراڑ کی تیرگی میں شانی کو ایک انوکھے تجربے سے روشناس کرایا تھا۔ شانی اس لمس کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی تھی۔ بھرپور مردانہ لمس لیکن پھول سے بڑھ کر نازک اور مشک و عنبر سے زیادہ معطر۔ شانی نے محسوس کیا کہ رستم نے قالین پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا ہے اور اسے آوازیں دے رہا ہے۔ ''بی بی جی...... آنکھیں کھولیں .... بی بی جی......''

اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ کسی گہرے عمیق کنویں سے۔ شانی کا

ذہن بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بدستور سُن تھے پھر اس نے محسوس کیا کہ رستم نے اسے قالین سے اٹھایا ہے اور بستر کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ رستم کے بازوؤں میں تھی۔ اس کا سر رستم کی کشادہ چھاتی سے چُھو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لئے..... صرف ایک لمحے کے لئے شانی کے جی میں آئی کہ ان لمحوں میں اسے موت آ جائے۔ سب کچھ ختم ہو جائے۔ یہ لمحے امر ہو جائیں اور وہ یہ احساس لئے اس دنیا سے چلی جائے کہ اس نے اپنے من پسند مرد کی بانہوں میں جان دی ہے۔

رستم نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ بڑی نرمی سے شانی کے رخساروں کو تھپتھپانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اسے آواز بھی دے رہا تھا۔ ایک دم شانی کو ڈر لگا کہ کہیں اس رات کی طرح وہ پھر اسے اپنی بانہوں میں نہ لے لے۔ کہیں اس کے ہونٹ پھر بے تابانہ اس کے چہرے سے ہم کلام نہ ہو جائیں۔

ایک جھرجھری سی اس کے جسم میں جاگی۔ ایک نہایت لذت آمیز لیکن نہایت تکلیف دہ لہر۔ شانی نے بڑی کوشش کے ساتھ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف کی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کے حواس بتدریج واپس آ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس دوران میں عارف اور جہانگیر بھی پہنچ گئے۔ غالباً جب رستم نے دروازے کے باہر سے شانی کو پکارا تھا تو یہ آوازیں جہانگیر اور عارف کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ رستم کی طرح یہ دونوں بھی ازحد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ جہانگیر نے کہا۔ ''اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو میں انتظام کر لیتا ہوں۔ ایک بھروسے کا بندہ ہے یہاں فرید ٹاؤن میں۔''

''نہیں۔'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں۔''

''یہ تو آپ نے دوپہر کو بھی کہا تھا کہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' جہانگیر نے کہا۔

''یہ لیں جی۔ گلوکوز ملا پانی پئیں۔'' نوشا گلاس لے کر شانی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

شانی نے دو گھونٹ لئے اور واقعی بہتری محسوس کرنے لگی۔ چوہدری بشیر سے بات کئے اب اسے چار پانچ منٹ گزر چکے تھے، تاہم اس کی زہر آلود آواز ابھی تک شانی کے کانوں میں خنجر اُتار رہی تھی۔ ''میں اب برداشت نہیں کروں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں..... مُنے کو اور خود کو بھی۔''

اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ وہ دھیمے مزاج کا تھا لیکن اس کی رگوں میں تو وہی اجڈ نارپوری خون دوڑتا تھا۔ بڑے مہر جی کا خون جس نے درجنوں بے گناہوں کو قتل کرایا تھا اور ان گنت لوگ بجلی کے ٹوکے میں سے گزار دیئے تھے۔

چوہدری بشیر پڑھ لکھ گیا تھا۔ اسے انگریزی بولنا آ گئی تھی۔ اس کا لباس اور رکھ رکھاؤ شہریوں جیسا ہو گیا تھا مگر اس کی خصلت میں نارپوریوں کی خون آشامی اور ہٹ دھرمی بہ درجہ اتم موجود تھی۔ شانی ابھی اس کی منکوحہ نہیں بنی تھی لیکن شانی کے ساتھ اس کا رویہ ابھی سے سخت مزاج شوہروں جیسا تھا۔ وہ جب غصے میں پھنکارتا تھا تو شانی کو اس کے لب و لہجے میں فاتح کی جھلک نظر آتی تھی۔ شانی کو بہت واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر ایک ''حاکم مرد'' کی وہی کہنہ روح ہے جو عورت کو ایک زرخرید جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ یہ زرخرید جانور اپنے آقا کے بتائے ہوئے راستے پر بلا چوں چراں چلتا رہے تو ٹھیک، ورنہ اسے جسمانی اور ذہنی مار سہنا پڑتی ہے اور یہ مار کبھی کبھی اتنی اذیت ناک ہوتی ہے کہ اس کے مقابل موت سہل محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ عورت اور مرد کا رشتہ نہیں ہوتا۔ آقا اور ''زرخرید'' کا رشتہ ہوتا ہے۔ آقا کی بڑی سے بڑی غلطی قابلِ درگزر ہوتی ہے لیکن ''زرخرید'' کی چھوٹی سے چھوٹی بھول سخت ترین سزا کی حق دار۔

آج اسی آقا نے بالکل کھلے لفظوں میں شانی کو بدترین نتائج کی دھمکی دے دی تھی۔ اس نے مُنے کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے، انہیں سوچ کر ہی شانی کا کلیجہ سو ٹکڑے ہو گیا..... پھر اس کے ذہن میں راجو اور کوکی کا تصور ابھرا۔ ان کی منگنی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں کے مسکراتے آنسو شانی کے ذہن میں آئے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ برقی کوندوں کی طرح شانی کے ذہن میں لپک گیا۔

شانی کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ اس ہوک نے اس کے پورے جسم میں جیسے خون کی جگہ آنسو دوڑا دیئے۔ اس نے ایک درد بھری الوداعی نگاہ رستم پر ڈالی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے شال اپنے سر پر رکھ لی۔

''کہاں جا رہی ہیں بی بی؟'' رستم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے ہوٹل جانا ہے۔'' شانی کا لہجہ مستحکم تھا۔

''لیکن بی بی! موسم ٹھیک نہیں ہے..... اور آپ کی طبیعت بھی ایسی نہیں کہ آپ گھر سے باہر نکلیں۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

''نہیں بھائی صاحب! آپ کا بہت شکریہ لیکن میری مجبوری ہے۔'' پھر وہ عارف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''عارف! چلو چلیں۔''

عارف بھی تھوڑا سا حیران نظر آ رہا تھا تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ شانی کا موبائل اس کے بیگ میں نہیں، ہاتھوں میں ہے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ شاید شانی

نے کوئی خاص کال ریسیو کی ہے۔

رستم اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ بی بی جانے کا حتمی فیصلہ کر چکی ہے اور اب وہ رکے گی نہیں۔

شانی جانے سے پہلے رستم کے قریب رکی اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''رستم شکریہ۔''

''کس بات کا بی بی؟'' وہ کراہ کر بولا۔

''تاؤ حشام کو معاف کرنے کا...... اور قدرت اللہ کو چھوڑنے کا۔''

''بی بی! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' رستم کے لہجے میں دنیا جہان کا درد تھا۔ اس کے نام سے ایک خلقت کانپتی تھی لیکن اس وقت وہ دست بستہ اپنے ''عشق'' کے رُوبرو کھڑا تھا اور بالکل ناچیز نظر آ رہا تھا۔

''معاف کرنا اچھی بات ہے رستم ...... سب کو معاف کر دو۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور عارف کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

جہانگیر نے بے بسی سے رستم کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی کی چابی نوشاد کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ نوشا! بی بی جی جہاں کہیں انہیں چھوڑ آؤ۔''

☆======☆======☆

رستم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور گرج چمک، شب کی تاریکی کو طوفانی رنگ دیتی رہی۔ وقتِ رخصت بی بی کا کہا ہوا جملہ، کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود رستم کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''معاف کرنا اچھی بات ہے رستم۔ سب کو معاف کر دو۔''

یہ بہت گہرا جملہ تھا۔ اس کے کئی رنگ تھے اور مطالب تھے۔ ان میں سے ایک مطلب یہ بھی تھا کہ بی بی نے رستم سے اپنے بارے میں کہا تھا کہ وہ اسے معاف کر دے۔ اس سے ملتی جلتی بات بی بی ایک دفعہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ بی بی نے کہا تھا، رستم! میں حالات کے شکنجے میں ہوں۔ میرے دامن میں تمہارے لئے پریشانی اور دکھ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں تم اس کے مستحق نہیں ہو۔ مجھے معاف کر دو۔

بی بی کا یہ جملہ پچھلے چند گھنٹوں میں جتنی بار رستم کے ذہن میں آیا اس کے دل میں ایک گہرا چرکا لگا۔ بی بی کو کیا پتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔ ... وہ تو ہر حال میں خوش تھا۔ اس کا عشق ایسے مرحلے میں تھا کہ جہاں جدائی اور ملاپ کا مطلب ایک

ہی ہو گیا تھا۔ بس ایک لذت آمیز آگ تھی جس میں جلنا، جھلسنا اور کراہنا ہی اس کے لئے زندگی کا حسن تھا۔ یہ آگ ہی عشق کی سزا تھی اور اس کا انعام بھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب اس نے بی بی کو دبیز قالین سے اٹھا کر بستر تک پہنچایا تھا تو اس نے بی بی کو جسمانی طور پر بھی خود سے بہت قریب محسوس کیا تھا۔ تب اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہا تھا کہ کتنا اچھا ہو کہ اس کی زندگی کا سفر اسی جگہ، انہی لمحوں میں ختم ہو جائے۔ وہ بی بی کو بستر پر لٹائے اور پھر بی بی کے جسم سے علیحدہ ہونے سے پہلے ہی اپنی زندگی سے علیحدہ ہو جائے۔

پھر اس کا دل چاہا تھا، کاش ایسا ہو بی بی ہوش میں آنے کے بعد اس سے کہے۔ ''رستم، مجھے لے جاؤ۔ کہیں بہت دور...... ان بے رحم در و دیوار سے بچا کر دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں......'' اور وہ بی بی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دے اور کہے...... بی بی! ایسا ہی ہوگا۔ میں نے تو آپ سے کٹھولی کے میلے میں ہی کہہ دیا تھا کہ آپ ایک بار، صرف ایک بار میرے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لیں پھر میں آپ کو لے جاؤں گا۔ ہمارے سارے دشمنوں کا سارا اسلحہ، ان کی کھڑی کی ہوئی ساری دیواریں اور ان کی پہنائی ہوئی تمام زنجیریں مل کر بھی ہمارا راستہ روک نہیں سکیں گی۔

لیکن بی بی نے نہیں کہا تھا...... عشق کی یاری تو اَن کہی باتوں سے ہوتی ہے۔ محبت کا ناتا بند ہونٹوں سے رہتا ہے...... تھل کی سسی ہو، گجرات کی سوہنی، جھنگ کی ہیر یا پھر عشق کہانی کا کوئی بھی کردار، اس کی پہچان بند ہونٹ ہی ہوتے ہیں اور ان ہونٹوں کے پیچھے اشکوں اور لفظوں کا ایک بے کراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت رستم نے ایک بار پھر نظام سے رابطہ کیا۔ نظام نے وڈے ڈیرے کی خبریں دیتے ہوئے بتایا۔ ''معاملہ بڑی تیزی سے خراب ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس نے گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ بھاری اسلحے سے فائرنگ کی جا رہی ہے۔ پرسوں رات تین بندوں کی ایک ٹولی کسی طرح پولیس کے گھیرے سے نکل کر اگلے ڈیرے کی طرف آئی ہے۔ ان میں سے زاہد نام کا ایک بندہ تو کھائی میں گر کر مر گیا ہے۔ ایک کو رستے میں پولیس نے مار دیا ہے۔ ایک یہاں میرے پاس پہنچا ہے۔ اس کے مونڈھے میں بھی گولی لگی ہوئی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ڈیرے پر خوراک کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ منگل کے روز وہاں دودھ دینے والی پانچ بھینسیں گوشت کے لئے ذبح کی گئی ہیں لیکن یہ گوشت بھی دو تین دن سے زیادہ چلنے والا نہیں۔ پولیس کی مسلسل فائرنگ سے بکریوں اور مویشیوں کو گھاس والی ڈھلوانوں کی طرف لے جانا ممکن نہیں۔ اس وجہ سے ان کا دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ پچیس تیس بکریاں اور کچھ بھینسیں

فائرنگ کی وجہ سے مر بھی گئی ہیں۔"

"لالہ فرید سے بات ہوئی ہے؟"

"ہاں جی!...... آج صبح سویرے ہوئی تھی۔ میں نے لالے تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے لیکن لالے نے کہا کہ اب وڈے ڈیرے کی طرف آنا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ تو خود کو جان بوجھ کر مصیبت میں ڈالنے والی بات ہوگی۔"

"اور کوئی خبر؟"

"ایک اور بُری خبر ہے جی۔" نظام نے اٹکتے ہوئے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "لالے فرید کی گھر والی...... بھرجائی مہناز اور بیٹا ٹیپو دونوں گولی کا نشانہ بن گئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" رستم کی آواز بھرا گئی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں جی۔ یہ حادثہ کل صبح سویرے ہوا ہے۔ ٹیپو گھومتا ہوا ٹیلوں میں کافی آگے نکل گیا۔ اس وقت لالہ اور بھرجائی دونوں سو رہے تھے، کچھ دیر بعد بھرجائی جاگی اور ٹیپو کو ڈھونڈنے لگی۔ یہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی کہ وہ کافی آگے پہنچا ہوا ہے۔ وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگی۔ وہ بچہ تھا، شرارت میں آ کر وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ دونوں ماں بیٹا اُدھر ٹیلوں میں ہی ڈھیر ہوگئے۔ ان کی لاشیں اٹھانے کے لئے لالہ وغیرہ کو رات تک انتظار کرنا پڑا۔"

رستم کی آنکھوں میں شوخ آنکھوں والے خوبرو ٹیپو کی شکل گھوم گئی جو بڑے پیار سے اسے "چاچا" کہا کرتا تھا اور بے تکلفی سے اس کی گود میں گھس بیٹھتا تھا۔ رستم نے کئی بار لالے سے کہا تھا کہ وہ بیوی بچے کو موت کے اس نرغے سے نکال دے۔ وہ اس بات پر آمادہ بھی ہو چکا تھا کہ مہناز ٹیپو کو لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ امارات لے جائے، لیکن یہ سب کچھ نہیں ہونا تھا اور جو ہونا تھا وہ کل صبح سویرے ہو گیا تھا۔

رستم کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ اسے مہناز یاد آئی...... جو ہمیشہ ہر ایک سے گھونگھٹ کی اوٹ سے بات کرتی تھی۔ جس نے سینکڑوں ہی مکھن والے پراٹھے اور انڈے بنا کر لالے اور اس کے دوستوں کو بڑی محبت سے کھلائے تھے اور ان سب کی سلامتی کی دعائیں کی تھیں۔ وہ واقعی بھرجائی تھی۔ اس کے سینکڑوں دیور تھے اور ان میں سے ایک رستم بھی تھا جس کے ساتھ اس کو بہت انس تھا۔ رستم کو محبت کی خوشبو میں بسا ہوا آخری ناشتہ یاد آیا جو مہناز نے روانگی سے پہلے اسے کھلایا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے نظام سے پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟"

نظام نے اپنا ٹھکانا بتایا۔ رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اگلے دو دن کے اندر میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔"

نظام نے کہا۔ "رستم بھائی! قریباً پندرہ بندے اور بھی آگے جانے کے لئے تیار ہیں۔"

اس اطلاع نے رستم کی رگوں میں جوش پیدا کیا۔ وہ اس جملے کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ کل نظام نے بتایا تھا کہ کچھ مقامی لوگ ایسے ہیں جو پولیس کارروائی سے بہت مشتعل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کوئی نہ کوئی قریبی عزیز دیگر مفروروں کے ساتھ پولیس کے گھیرے میں ہے۔ علاقے میں اجرال برادری کے کچھ لوگ پولیس کی مدد کر رہے ہیں۔ اعوانوں کی ایک دوسری گوت سنگوال کی دشمنی اجرال برادری کے ساتھ چل رہی ہے۔ اتفاقاً سنگوالیوں کے کچھ عزیز و اقارب پولیس کے گھیرے میں بھی ہیں۔ اب یہ لوگ جوالا مُکھی بنے ہوئے ہیں اور اپنے بھائی بندوں کی مدد کرنے کے لئے پولیس سے مزاحمت کرنا چاہتے ہیں۔

نظام کے مطابق سنگوالیوں کا ایک جوان چوہان احمد اس معاملے میں بہت آگے تھا۔ چوہان اس علاقے کی اونچ نیچ کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتا تھا۔ چوہان کا کہنا بھی یہی تھا کہ اگر پانڈو کے مقام پر کوشش کی جائے تو پولیس محاصرے میں آنے والے لوگوں کو نکالا جا سکتا ہے۔

چوہان کی رائے، نظام کی زبانی سننے کے بعد رستم کی رائے مزید پختہ ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔

نظام سے بات چیت ختم کرنے کے بعد رستم پھر اپنا لائحہ عمل ترتیب دینے میں لگ گیا۔ اب وہ جلد از جلد نظام کے پاس جگوال پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نکل کر جگوال تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ یہاں چپے چپے پر پولیس اس کا ڈیتھ وارنٹ لئے گھوم رہی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں جہانگیر کے پاس بھی وہ زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح حرکت اس کے لئے خطرناک تھی اسی طرح سکونت بھی جان لیوا تھی۔ ہاں سکونت میں ایک اور اندیشہ بھی پوشیدہ تھا اور یہ کہ کہیں وہ اور گوہرا چوہے کی موت نہ مر جائیں۔

رستم اپنی ٹرپل ٹو رائفل سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب اس رائفل کا ساتھ خطرناک ہوگا۔ اس نے اور گوہرا نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پاس فقط پستول رکھیں گے۔ تیز دھار آلے کے نام پر رستم کے پاس جو لمبا چھرا تھا وہ آستانے میں گوہرا نے اس سے لے لیا تھا، قدرت اللہ کو قتل کرنے کے لئے۔ قدرت اللہ بچ گیا تھا اور وہ چھرا اب

پھر رستم کے پاس تھا۔ کولٹ پسٹل کا سائلنسر بھی رستم کے لئے ایک کارآمد شے تھا۔ انہوں نے اپنے پستول اچھی طرح صاف کئے اور گولیوں کے دو دو فالتو میگزین بھر لئے۔ بارش بند ہوگئی تھی لیکن بادل موجود تھے۔ رستم کا تجربہ بتاتا تھا کہ بارش کے دوران میں پولیس سے بچ کر نقل وحرکت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ رستم کی خواہش تھی کہ کل جب وہ جانے کے لئے نکلیں تو بارش ہو رہی ہو۔

دوپہر کے بعد جہانگیر نے ایک حجام کو کوٹھی پر ہی بلا لیا۔ اس نے رستم کے لمبے بال تراش کر عام سائز کے کر دیئے۔ داڑھی کو بھی تراش خراش کر سنوار دیا تھا۔ گوہرا نے اپنی جہازی سائز کی مونچھیں بالکل مختصر کروالیں اور سر پر استرا پھروالیا۔ جہانگیر نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے سر کے بالوں کو ہلکا براؤن رنگ دے رکھا تھا۔ یہی رنگ رستم نے بھی استعمال کیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال ہلکے بھورے نظر آنے لگے۔ جہانگیر نے رستم اور گوہرا کے لئے بازار سے چار چار جوڑے منگوائے تھے۔ ان میں ایک ایک جوڑا پتلون قمیص کا بھی تھ۔ رستم بھی کبھار پتلون قمیص پہن لیتا تھا اور یہ لباس اس کے کسرتی جسم پر جچتا بھی خوب تھا......اب بھی اس نے سیاہ پتلون کے ساتھ بوننزا کی چیک دار قمیص پہنی اور اوپر بند گلے کی جرسی زیب تن کر کے قمیص کا کالر باہر نکال لیا۔ اس لباس کے ساتھ وہ کیا سے کیا نظر آنے لگا۔ جہانگیر نے اسے دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''یار! ایک فلمی ہیروئن تو تم نے قابو کر ہی رکھی ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ جو روپیہ ہمارے پاس موجود ہے اس سے سید نور یا حسن عسکری کو قابو کرتے اور ایک زبردست فلم بنا ڈالتے۔ اس میں ہیرو تم خود ہوتے۔ میرا کیا ہے میں نے ولن کا کردار ادا کر کے بھی خوش ہو جانا تھا۔''

''نہیں، ایک بنا بنایا ولن ہمارے پاس موجود ہے لالے دی جان..... قدرت اللہ۔'' گوہرا نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

''اور سیکنڈ ولن ڈپٹی ریاض بن جاتا۔'' جہانگیر نے قہقہہ لگایا۔

''فلم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب اصلی فلم چلنے والی ہے۔ مار دھاڑ سے بھرپور اور امید ہے کہ ٹاکرا بھی ڈپٹی ریاض سے ہی ہونا ہے۔'' رستم نے پسٹل کو بیلٹ میں لگا کر اوپر موٹی جرسی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایک دم رستم کو جیسے خیال آیا، اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ اس نے جہانگیر سے کہا۔ ''دیکھو جہانگیر! ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں زندگی کے چانس کم ہیں اور موت کے زیادہ۔ تم نے میرا ایک کام کرنا ہے۔''

''ایک کام۔ تم ایک سو کام کہو میرے جگر...... بلکہ میری تو تمنا یہ ہے کہ کسی طرح میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں۔''

''فالتو باتیں نہ کرو۔ تم نے کہیں نہیں جانا۔ جو کچھ تم ہمارے لئے کر رہے ہو یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ جو کام میں تمہارے ذمے لگا رہا ہوں وہ ایک لڑکی تک کچھ رقم پہنچانے کا ہے۔ لڑکی کا نام پتا میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔ دو تین ہفتوں تک، دو تین مہینوں تک یا جب بھی ممکن ہو سکے تم نے میرے حصے میں سے یہ رقم وہاں پہنچانی ہے۔''

''یار! تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرا دل خون ہونے لگتا ہے۔ تم ایسی وصیتیں نہ کرو تو اچھا ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود واپس آؤ گے اور اپنے کام کرو گے۔''

''چلو، میں خود ہی کروں گا لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے بھی ذہن نشین رکھو۔''

اس کے بعد رستم نے اسے اس لڑکی کے بارے میں بتایا جس کی ''انوکھی مدد'' سے وہ پوٹھوہار میں پولیس کے مہلک گھیرے سے نکلا تھا۔ ڈھوک شاہاں کی مہراں جس نے ایک پتھریلے شخص کو اپنا کانچ سا جسم سونپا تھا اور اس کے بدلے اس سے رستم اور گوہرا کے لئے ایک رعایت حاصل کی تھی۔

جہانگیر نے جاننا چاہا کہ وہ اپنے حصے میں سے چار لاکھ کی خطیر رقم اس لڑکی کو کیوں دینا چاہتا ہے لیکن رستم نے یہ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اپنے حصے میں سے دو لاکھ روپے مزید رستم نے اپنے اور گوہرا کے ذاتی خرچے کے لئے علیحدہ کروا لئے۔ باقی رقم اس نے جہانگیر کے پاس رہنے دی اور اس سے کہا کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو یہ رقم وہ زوار یا شیری تک پہنچا دے۔

اسی دوران میں جہانگیر کا ہوشیار ملازم خاص نوشا اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ ''جناب آپ کے لئے ایک تازہ خبر ہے۔''

''کس بارے میں؟'' جہانگیر نے کہا۔

''بی بی جی کے بارے میں۔ پرسوں انہوں نے ایک بڑا خاص کام کیا ہے جی۔ بلکہ دو بڑے خاص کام کئے ہیں۔ چوہدری حشام کے بیٹے اور سیف اللہ کی بیٹی کی منگنی کرائی ہے بی بی جی نے...... دوسرا کام اس سے زیادہ خاص ہے۔ منگنی کے بعد بی بی جی نے چوہدری حشام اور چوہدری بشیر کو آپس میں ملایا ہے اور ان میں صلح کروائی ہے۔ ان لوگوں میں بڑی ثاش چلی آ رہی تھی لیکن اب انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا ہے اور اپنے معاملے ٔیاب کرنے کا عہد کیا ہے۔''

رستم خاموشی سے سنتا رہا۔ جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔"بی بی جی کی کیا بات ہے جی۔ کچھ نہ کچھ خاص ہے بی بی کے اندر۔ اتنی چھوٹی عمر میں وہ بڑے بوڑھوں والے کام بھی کر گزرتی ہیں۔ میں نے ان کی والدہ کے بارے میں سنا تھا۔ رنگ والی اور آس پاس کے علاقے کے لوگ ان کی عزت رانیوں مہارانیوں کی طرح کرتے تھے۔ خدا ترسی اور غریب پروری میں بڑا نام تھا ان کا۔"

اسی دوران میں کال بیل بجی اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوشا باہر گیا اور چند سیکنڈ بعد واپس آ کر اس نے بتایا کہ ایک لمبی گاڑی میں کچھ مہمان آئے ہیں۔ گاڑی کے شیشے کالے تھے اس لئے وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا تھا۔ جہانگیر کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ لمبے گھونگریالے بالوں والا ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر آیا اور تین چار منٹ تک جہانگیر سے کھسر پھسر کرتا رہا۔ وہ مٹھی میں دبا کر سگریٹ پی رہا تھا۔ رستم کو وہ چہرے مہرے سے اچھا شخص نہیں لگا۔ وہ شخص باہر گیا اور اس کے جانے کے دو منٹ بعد کوٹھی کا گیٹ کھل گیا اور نئے ماڈل کی ایک ہونڈا سوک کار اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چاند اور سورج طلوع ہو گئے ہیں۔ دو نہایت پُرکشش لڑکیاں، چمکتے کپڑوں میں اور جگمگاتے چہروں کے ساتھ اندر آ گئیں۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر جہانگیر کا چہرہ اندرونی مسرت سے سرخ ہو گیا۔

رستم دنگ رہ گیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کو وہ پہچان گیا۔ وہ پنجابی فلموں کی معروف ہیروئن عاصمہ تھی۔ اپنے تناور خوب شاداب جسم کی بدولت وہ فلم بین حلقوں میں بہت مقبول تھی۔ ساتھ میں جو دوسری لڑکی تھی وہ شکل و صورت سے عاصمہ کی بہن نظر آتی تھی تاہم وہ عاصمہ کے مقابلے میں کچھ کم عمر اور کافی دبلی پتلی تھی۔

عاصمہ کافی مہنگی اور مصروف ایکٹریس تصور کی جاتی تھی۔ چار پانچ دن پہلے جب جہانگیر نے گوہرا سے خوش گپیاں لگاتے ہوئے عاصمہ کو یہاں بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو رستم نے اسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے ہرگز یقین نہیں تھا کہ سلور سکرین کا یہ دمکتا ستارہ یوں شوبز کی روشنیوں سے نکل کر یہاں جہانگیر کی کوٹھی میں آ جائے گا لیکن آج اس ابر آلود شب میں رستم اسے یہاں دیکھ رہا تھا۔ یہ سب روپے کی کرشمہ کاری تھی۔

جہانگیر نے روپیہ خرچ کیا تھا۔ رستم کی طرح جہانگیر کے نزدیک بھی روپے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مہلت کم ہے اور روپیہ زیادہ۔ یعنی سفر کی نسبت زادِ سفر زیادہ تھا۔ اس نے غالباً سات آٹھ لاکھ روپے آفر کر دئیے تھے اور یہ دونوں کڑکتی بجلیاں گوہرا اور

جہانگیر کی دل پشوری کے لئے سر کے بل چل کر یہاں پہنچ گئی تھیں۔ ہر جگہ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں بھی اچھے لوگ تھے اور ایسے بھی تھے جو ایک رات میں دو تین لاکھ کما لینے کو ہی اپنے "فن" کی معراج سمجھتے تھے۔

جہانگیر کامن روم میں رستم کے پاس آیا تو اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ رستم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور رستم کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔"یار! بُرا نہ منانا، میں نے گوہرا سے وعدہ کر رکھا تھا۔ بس آج رات کی رعایت دے دو۔ اس کے بعد تم کہاں، ہم کہاں۔ نہ جانے پھر ملاقات بھی ہونی ہے یا نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم گوہرا کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہے ہو۔"

"چلو یہی سمجھ لو لیکن حقیقت یہ ہے یار کہ میں چاہتا ہوں، کل جب گوہرا یہاں سے جائے تو بہت خوش ہو۔"

پتا نہیں کہ جہانگیر حسین نے یہ بات کس لہجے میں کہی کہ رستم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے غصے کا گراف ایک دم نیچے آ گیا۔

دس بجے کے قریب محفل شروع ہو گئی۔ جہانگیر کی کوٹھی کافی بڑی تھی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر دبیز پردے کھینچ کر دروازے بند کر دیئے گئے۔ اب اندر جو بھی شور شرابا ہوتا، باہر کسی کو خبر نہ ہوتی۔ پتا نہیں کہ رستم کا موڈ کیسا ہو رہا تھا...... وہ بھی اس محفل میں جا بیٹھا۔ فرانس کی بہترین شراب اور خانساماں کرامت کے ہاتھ کے پکے ہوئے بہترین کھانے ڈرائنگ روم میں گردش کر رہے تھے۔ آڈیو سسٹم پر ہلکا سا میوزک لگا ہوا تھا۔ دونوں پریاں صوفوں پر براجمان تھیں اور اپنی مسکراہٹ کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ فلم سٹار عاصمہ بار بار اپنی کلائی کی طلائی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ غالباً وہ حسبِ عادت ایسا کر رہی تھی۔ ورنہ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جو بھاری رقوم خرچ کر کے انہیں یہاں لائے ہیں وہ "قیمت" پوری کئے بغیر انہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے اور یہ حساب کتاب صبح سے پہلے کہاں برابر ہونا تھا۔

شانی بی بی کا چہرہ آج بری طرح رستم کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اس نے نوشے کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی منتظر تھا۔ اس نے بوتل اٹھا کر رستم کا گلاس بھی بھر دیا۔ ایک گوشے میں ٹی وی مدھم آواز میں چل رہا تھا۔ عاصمہ کی چھوٹی بہن الماس نے سکرین پر نظر ڈالی اور چونک کر بولی۔"مجاز صاحب! ذرا آواز اونچی کیجئے گا۔"

مجاز یعنی جہانگیر نے ٹی وی کا والیم کھولا۔ خبریں آ رہی تھیں۔ ڈیفنس کے ایک گھر میں ڈاکے کی خبر تھی۔ نوعمر ڈاکو اہلِ خانہ کو رسیوں سے باندھ کر لاکھوں کے زیورات اور پرائز بانڈز

وغیرہ لے گئے تھے۔

خبر سننے کے بعد عاصمہ نے اپنے جسم کو نمایاں تر کرنے والی ایک لمبی سانس لی اور بولی۔ ''انتہا ہوگئی ہے جی! اب تو اس ملک میں رہنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ میری تو بس دو چار فلمیں سیٹ پر ہیں۔ ان کو مکمل کرا لوں۔ میں نے تو نکل جانا ہے فیملی کے ساتھ امریکہ یا کینیڈا۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اب تو کسی کو معافی نہیں ہے جی۔ بڑے بڑے اللہ والے لوگ اس رگڑے میں آئے ہوئے ہیں۔ اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا آپ نے۔ کوئی بہت بڑے پیر صاحب آئے ہوئے تھے یہاں ملتان میں۔ ان کی بیوی اور کئی مرید پھڑکا کر رکھ دیئے ڈاکوؤں نے۔ بدبختوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ کس پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ ایک اللہ لوک بندہ جس کی وجہ سے ایک خلقت کو فیض پہنچ رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا مجاز ملک صاحب کہ ایسے لوگوں پر آسمان ٹوٹ کر کیوں نہیں گر پڑتا۔''

رستم نے عاصمہ کے حیا سوز سراپے پر ایک تیز نظر ڈالی اور بولا۔ ''اب یہ آسمان بے چارہ کس کس پر ٹوٹ کر گرے۔ یہاں تو ہر طرف قہر مچا ہوا ہے۔ کوئی کس طرح لوٹ رہا ہے، کوئی کس طرح۔''

عاصمہ نے رستم کے تیکھے انداز کو محسوس کیا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے جہانگیر کو دیکھنے لگی۔ جہانگیر بولا۔ ''یہ اپنا یار ہے۔ لاہور سے آیا ہے۔ آپ کا پرانا فین ہے۔'' آخری فقرہ جہانگیر نے اپنی طرف سے جوڑا تھا۔ رستم کو اس حوالے سے تسلی محسوس ہوئی کہ دونوں ایکٹریسوں نے اسے یا گوہرا کو پہچانا نہیں تھا۔ ان دونوں نے اپنے حلیے میں جو تبدیلیاں کی تھیں وہ کامیاب تھیں۔

گفتگو کا رخ ایک بار پھر قدرت اللہ اور اس کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی طرف مڑ گیا۔ عاصمہ کی چھوٹی بہن کے خیالات اس بارے میں قدرے مختلف تھے۔ اس نے کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن باجی! کچھ سوال پیر صاحب کے بارے میں بھی تو پیدا ہوتے ہیں ناں۔ وہ اپنی ایک مریضہ کا علاج جھاڑ پھونک سے کر رہا تھا لیکن جب اس کی اپنی بیوی اسی تکلیف کا شکار ہوئی تو اسے لے کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا اور پھر اس نے درجنوں لوگوں کے سامنے اعتراف بھی کیا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ جو مریضہ اس کے پاس آئی تھی اس کا علاج بھی ہسپتال میں ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''الماس! یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں۔ میڈیا والوں نے کہانی بنائی ہے۔'' عاصمہ نے اپنے ریشمی بالوں کو پیشانی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''پر باجی! کوئی بات ہوتی ہے تو کہانی بنتی ہے۔ ڈاکوؤں نے وہاں پیر صاحب کی کوٹھی میں لوٹا کچھ نہیں، نہ ہی کسی کو اغوا کیا ہے۔ وہ صرف پیر صاحب کو سبق سکھانے آئے تھے۔ آخر پیر صاحب نے کہیں کوئی کام دکھایا ہوگا ناں۔''

''کوئی کام شام نہیں دکھایا۔'' عاصمہ بولی۔ ''مجھے اپنے فلمی صحافی گورایہ صاحب نے اس بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔ ڈاکوؤں کے سرغنہ رستم سیال کی ایک منظورِ نظر ہے جسے بی بی کہتے ہیں۔ اس بی بی کی ایک جیٹھانی کا علاج پیر صاحب کر رہے تھے۔ علاج کے دوران میں جیٹھانی کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تو بی بی نے چوہدراہٹ دکھائی اور بے وقوفی والا کام کیا۔ اس نے بھڑک کر پیر قدرت کی بیویوں پر حملہ کیا اور ''عمل'' میں استعمال ہونے والا سامان توڑ پھوڑ دیا۔ اس ہلے گلے کے دوران میں بی بی کی چہیتی جیٹھانی کی جان بھی چلی گئی۔ بس اس وقت سے یہ کشمکش چلی آ رہی تھی۔ اب پانچ چھ بندے قتل ہو گئے ہیں۔ دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رستم کی منظورِ نظر بی بی بھی اس خونی واقعے کے وقت موقع پر موجود تھی۔''

''پر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے میڈم۔'' جہانگیر نے دبے لہجے میں کہا۔

الماس نے کہا۔ ''کچھ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر بی بی واقعی وہاں موجود تھی تو پھر اسی کی وجہ سے پیر صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کی جانیں بچی ہیں۔ اخبار میں بھی صاف لکھا ہے کہ نقاب والی ایک لڑکی بپھرے ہوئے رستم سیال اور پیر صاحب کی دوسری بیوی کے سامنے آ گئی۔ یہ اسی کا کام تھا کہ خطرناک قاتل کو کھینچ تان کر موقع سے دور لے گئی۔ اس نے رستم سے باقاعدہ جھگڑا کیا اور اسے اس کے ارادے سے باز رکھا۔''

''ففے کٹنی ہوگی۔ پہلے آگ لگائی ہے اب چھینٹے مار رہی ہوگی۔'' عاصمہ نے حسبِ عادت گھڑی دیکھتے اور پیشانی سے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

''دل کے اندر کس نے جھانک کر دیکھا ہے باجی لیکن سنا یہ ہے کہ رستم وغیرہ سے اب بی بی کا تعلق واسطہ نہیں رہا۔ پچھلے دنوں میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔ سون میں چھپے ہوئے ڈکیتوں کے خلاف کچھ لوگوں کے بڑے سخت بیان آئے تھے۔ ان میں ایک بیان بی بی شہناز کا بھی تھا۔ والد، بھائی اور شوہر کی موت کے بعد وہ اب رفاہی کاموں میں حصہ لے رہی ہے۔ وزیر آباد کے قریب کسی گاؤں میں وہ ایک بڑا ہسپتال بھی بنوا رہی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ پیر قدرت اور بی بی کے درمیان جو چپقلش ہے اس میں ہسپتال کا چکر بھی ہوگا۔''

گفتگو کا رخ ایک بار پھر پیر قدرت اور رستم سیال کے ''ٹاکرے'' کی طرف مڑ گیا۔ اس

دوران میں گوہرا اور جہانگیر وہسکی سے شغل کرتے رہے، ہلکی آواز میں میوزک بجتا رہا۔ عاصمہ بار بار اپنے بال پیشانی سے جھٹکتی رہی اور جسم کو نمایاں تر کرنے والے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی لیکن جسم کمان کی طرح تنا ہوا تھا اور وہ کسی بھی طرح ایک نوخیز لڑکی سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ (اس کی بہن تو تھی ہی نوخیز) رستم نے سوچا، یہ عاصمہ جو آج لاکھوں دلوں پر راج کرتی ہے اگر اس عمر میں کسی گاؤں کے غریب گھرانے میں ہوتی، محنت مشقت کر کے ادنیٰ غذا کھاتی اور شوہر کے لئے لگاتار بچے پیدا کرتی تو اب تک شاید پکی عمر کی عورت بن جاتی۔ اس کا جسم تنی ہوئی کمان جیسا نہیں ٹوٹی ہوئی کمان جیسا ہوتا۔ یہ دولت کا کرشمہ تھا کہ وہ سرتاپا دلکش نظر آتی تھی اور یہ بھی دولت ہی کا کرشمہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں فرید ٹاؤن کی اس کوٹھی میں موجود تھی۔

دونوں بہنوں کی گفتگو اب بحث کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ عاصمہ نے کہا۔ ''الماس! رستم سیال جیسے بندوں کو میں تجھ سے زیادہ جانتی ہوں۔ نادیہ والا معاملہ تو تجھے بھی نہیں بھولا ہوگا، کچھ پتا ہے نادیہ اب کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟'' الماس نے ناخنوں کی پالش دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈکیتوں کے ڈیرے پر، جہاں آج کل پولیس نے چڑھائی کی ہوئی ہے۔ اسے وہاں اپنے ساتھ لے جانے والا رستم سیال ہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ وہاں سے زندہ بھی آتی ہے یا نہیں۔''

''مگر وہ تو خود اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ سب لوگ جانتے ہیں اور اس بات کا بھی کون سا پکا ثبوت ہے کہ وہ وہیں پر ہے۔''

''وہ خود پیچھے نہیں پڑی ہوئی تھی، بھی جو خدا ترس بی بی ہے ناں اسی نے پھنسایا تھا اس بے چاری کو اور اس کے ڈیرے پر ہونے کا ثبوت بھی تمہیں دو چار دن میں مل جائے گا۔ اس کی لاش کی تصویر اخبار میں چھپے گی یا پھر وہ پکڑی جائے گی اور پتا نہیں کس کس کے ہاتھوں مٹی پلید کروائے گی۔''

الماس نے بنس کر نفی میں سر ہلا دیا۔ دونوں پری چہرہ بہنیں اپنی رو میں گفتگو کر رہی تھیں اور اس بات سے بے خبر تھیں کہ جن کے بارے میں وہ گفتگو کر رہی تھیں وہ انہی کے سامنے موجود ہیں۔ عاصمہ نے بی بی کے بارے میں غلط لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔ اندرونی طیش سے رستم کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ جہانگیر کو یہی لگا کہ وہ پھٹ پڑے گا اور جس طرح اگلے ڈیرے میں اس نے گوہرا کی یادگار پٹائی کر دی تھی، اسی طرح اس فلم سٹار کی بھی کم بختی آ جائے

گی۔ بہرحال ابھی تک رستم نے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اور خاموش تھا۔ جہانگیر نے موضوع بدلنے کے لئے ٹی وی آف کر کے میوزک کی آواز کچھ بلند کر دی۔ حدیقہ کیانی کا ایک بہت تیز گانا لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بہنوں کے حسین پاؤں جیسے خود بخود تھرکنے لگے۔ اعضا کی شاعری ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے وسیع قالین پر رقص کرنے کے لئے جہانگیر کے بس ایک اشارے کی منتظر نظر آتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد دونوں نے اپنے خوش نما سینڈل اُتار کر ایک طرف رکھے۔ آنچل جو صرف خانہ پُری کے لئے کندھوں پر رکھے تھے، صوفوں پر پھینک دیئے اور قہقہے بکھیرتی ہوئی رقص فرما ہو گئیں۔ رستم نے اب وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ یہ آگ تیزابی محلول کی تھی اور اس غم کی بھی تھی جو تیزاب کی طرح رستم کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ اس کا عشق تو پہلے ہی بے کراں تھا لیکن سون کی اندھی دراڑ میں بی بی کو چُھونے کے بعد یہ عشق اور بھی لامحدود ہو گیا تھا۔ رستم کو لگتا تھا کہ اب اس کے پاس بس دو ہی راستے ہیں۔ وہ بی بی کو پالے یا پھر جلد از جلد اپنی روح کا ناتا اپنے جسم سے توڑ لے۔ ...اس کی انگلیاں اپنے سینے کی جلد پر رینگتی رہیں وہاں ''B'' کندہ تھا۔

وہ وسیع کوٹھی کے کمروں میں اِدھر اُدھر ڈولنے لگا۔ اسے کہیں چین نہیں تھا۔ گاہے بگاہے ایک عجیب سی کسک بھی سینے میں جاگتی تھی، ایک شبہ سا پیدا ہوتا تھا۔ بی بی ملتان میں تھی اور چوہدری بشیر بھی ملتان میں ہی تھا۔ چوہدری بشیر کے ساتھ یقیناً اس کا بیٹا بھی تھا۔ اس بیٹے سے شانی بے حد محبت کرتی تھی۔ یہ بچہ چوہدری بشیر اور بی بی کے درمیان ایک ناتے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا...... رستم کو لگتا تھا کہ بی بی ضرور چوہدری بشیر سے ملتی ہیں۔ بچے کی کشش انہیں چوہدری کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ اب اسے پتا چلا تھا کہ بی بی نے چوہدری حشام اور چوہدری بشیر میں صلح بھی کرائی ہے۔ اس واقعے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری بشیر سے بی بی کا ناتہ ہے۔ رستم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے دل میں جلن پیدا ہوتی۔ دماغ میں شکوے شکایات کا ریلا آتا لیکن وہ تو کچھ اور طرح کا عاشق تھا۔ اس کا عشق غیر مشروط تھا۔ نہ ملن سے کم ہو سکتا تھا نہ جدائی سے اور پھر وہ شکوہ کرتا بھی کیوں؟ وہ تو اس مسافر کی طرح تھا جو اسباب باندھ کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو۔ کسی بھی وقت اس کی گاڑی آ سکتی تھی۔ وہ ان دنوں اپنی بی بی سمیت پوری دنیا کو ایک مسافر کی نظر سے ہی دیکھ رہا تھا۔

کامن روم میں ٹہلتا ہوا وہ کوریڈور میں آیا۔ اس کی نگاہ ڈرائنگ روم میں پڑی۔ بند کھڑکیوں کی دوسری جانب دونوں پری چہرہ [illegible] رقص فرما تھیں۔ [illegible]

ہوئے گوہرا اور جہانگیر بھی ان کے ساتھ رقص فرما ہو گئے تھے۔ عاصمہ کی گوری گداز بانہوں میں ہفت رنگ چوڑیوں کی طویل قطاریں چمک رہی تھیں۔ گوہرا بڑے فدویانہ انداز میں ان چوڑیوں پر اپنی کھردری داڑھی رگڑ رہا تھا۔ اس کی ٹنڈ ٹیوب لائٹ میں شیشے کے گلوب کی طرح دمک رہی تھی۔ میوزک اونچی آواز میں بج رہا تھا لیکن ڈرائنگ روم سے باہر بہت مدھم آواز ہی آ رہی تھی۔ رستم نے خوش رنگ تیزابی محلول کا ایک گلاس اور چڑھایا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ باہر بجلی چمک رہی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مدھم لَے میں ایک آواز رستم کے کانوں میں گونجتی رہی۔ یہ عشق نہیں آساں...... یہ عشق نہیں آساں۔

صبح رستم نو بجے کے قریب جاگا۔ عاصمہ اور الماس جلدی جلدی واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ عاصمہ اپنے بال لپیٹ کر باندھ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں پر اب بس تھوڑی سی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً گوہرا نے ایک پُرجوش و بدمست رات گزاری تھی۔ عاصمہ نے منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے لپ اَسٹک لگائی اور آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کے جسم کی کمان کچھ ڈھیلی نظر آئی۔ رات اس نے بی بی کے بارے میں کچھ "سخت" باتیں کہی تھیں۔ شاید اسی سبب وہ گوہرا کے ہاتھوں کچھ "نرم" ہوئی تھی۔ الماس بھی جلدی جلدی اپنے بُندے وغیرہ پہن رہی تھی۔ رستم نے گوہرا کو دیکھا وہ بڑے مخمور انداز میں صوفے پر اوندھا لیٹا تھا۔ گوہرا کے مزاج میں عورت کے لئے رغبت تھی۔ اس رغبت کا مظاہرہ اس نے اگلے ڈیرے پر ناچی چاندی کے ساتھ کیا تھا، بعد میں اسی وجہ سے گوہرا اور رستم کے درمیان لڑائی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ناچی چاندی کو اپنے لئے بہت بڑی "نعمت" سمجھنے والا گوہرا شاید چند دن پہلے تک سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی فلم اسٹار کا قرب اسے حاصل ہو گا۔ پوٹھوہار کی ناچیوں نے تو بس "بارش والے گانے" کی نقل کی تھی۔ آج "بارش کا گانا" گانے والی خود گوہرا کے پہلو میں رہی تھی۔

وہ سو رہا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ پر بندھی ہوئی سفید پٹی پر آج پھر خون کے دھبے تھے۔ یقیناً رات کو اپنی تند و تیز مصروفیات میں وہ جہاں اور بہت کچھ بھولا رہا تھا وہاں اپنے ہاتھ کو بھی فراموش کئے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خمار آلود سکون تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی میں آخری عورت سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔

☆======☆======☆

رستم کی خواہش پوری ہوئی۔ جب رات کو وہ ملتان سے گوجر خان کے لئے روانہ ہوئے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ جانے سے پہلے جہانگیر حسین تادیر رستم کے ساتھ بغل گیر رہا۔ اس کی

آنکھوں میں نمی تھی۔ رستم نے کہا۔ "ایک آخری بات کہنا تم سے بھول گیا ہوں۔"

"حکم کر جگر۔"

رستم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جہانگیر، ہم اس اسٹیج پر ہیں جہاں ہم میں سے کسی کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسی باتوں پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟" جہانگیر نم آنکھوں کے ساتھ رستم کو تکتا رہا۔ رستم بولا۔ "اگر میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو تم نے میرے حصے کی باقی رقم زدار تک پہنچانی ہے۔ اس سے کہنا کہ یہ رقم جوہرآباد کے ہسپتال کے لئے ہے لیکن بی بی کو اس بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ان کے ذہن میں وسوسے پیدا ہوں گے کہ خبر نہیں یہ کیسی رقم ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بڑے یقین کے ساتھ بولا۔ "یہ رقم تم نے جہاں لگانی ہے اپنے ہاتھ سے لگاؤ گے۔"

"جو ہو گا، سامنے آ جائے گا۔" رستم نے کہا۔

پھر رستم اور گوہرا بڑی ہونڈا گاڑی میں بیٹھ کر کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ ڈرائیونگ نوشا کر رہا تھا۔ فرید ٹاؤن کی اس کوٹھی سے نکلتے ہوئے رستم نے کوٹھی کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر نگاہ دوڑائی لکھا تھا۔ "مجاز ملک۔" اس آبادی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مجاز ملک نہیں جہانگیر حسین ہے۔ وہ جہانگیر حسین جو کچھ عرصہ پہلے تک ایک شریف شہری اور دیانت دار کاروباری شخص تھا۔ پھر وہ مسلسل زیادتیوں کا شکار ہو کر جنونی ہوا اور اس نے بھرے بازار میں ایک بدمعاش انکم ٹیکس آفیسر کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ اشتہاری ہوا۔ دوسرے اشتہاریوں کے ساتھ مل کر کئی سنگین جرم کئے اور کیا سے کیا بن گیا...... اب مدت ہوئی اس کی بیوی کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔ باپ اور بھائی اس سے ملنا تو درکنار اس کا سایہ بھی اپنے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اب اس کا کوئی گھر بار نہیں تھا، کوئی رشتہ ناتا نہیں تھا۔ وہ موت کا راہی تھا...... گولی اور پھانسی کا پھندا دونوں اس کے تعاقب میں تھے لیکن ان حالات میں بھی وہ زندگی سے خوشی کشید کرنے کا ہنر جانتا تھا اور وہ ایسا کر رہا تھا۔ رستم نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو زندگی بھاگتے بھاگتے کیوں گزارنا پڑتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے کھانا، بھاگتے بھاگتے سونا اور بھاگتے بھاگتے قدرت کی رنگینیوں کو دیکھنا اور حسرت سے انہیں چھو کر آگے بڑھ جانا۔ شہر کے بیشتر حصوں میں برقی رَو غائب تھی۔ نیم تاریکی اور تیز بارش کے سبب وہ بہ حفاظت ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ بس ایک جگہ پولیس

نا کے پر انہیں گاڑی کی رفتار ہلکی کرنا پڑی۔ برساتی پوش پولیس اہلکار نے بے دلی سے گاڑی کے اندر جھانک کر انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

انہوں نے ملتان سے گوجر خان تک کے سیکنڈ کلاس ٹکٹ لئے اور گاڑی میں آ بیٹھے۔ رستم پتلون قمیص اور موٹی جرسی میں تھا۔ گوہرا نے کلف لگی سفید شلوار قمیص اور سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ صفاچٹ سر اور تراشی ہوئی مونچھوں کے سبب گوہرا کا حلیہ بھی تسلی بخش حد تک بدل گیا تھا۔ جوں جوں ٹرین شمال کی طرف بڑھتی رہی بارش میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ دونوں صبح سویرے لاہور سٹیشن پر تھے۔ یہاں بھی بارش ہو رہی تھی۔ لاہور سے رستم کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا دل چاہا تمام مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں اُتر جائے اور ان گلی کوچوں میں تادیر گھومتا رہے۔ گوہرا نے تازہ اخبار لے لیا تھا اور اسے اپنے چہرے کے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ رستم جانتا تھا اسے اخبار پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں، وہ صرف اپنا چہرہ چھپا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ اخبار کے پچھلے صفحے پر نظر آنے والی ایک مختصر خبر پر پڑی۔ نوجوان لڑکی کی خودکشی کی کوشش ناکام۔ لڑکی تھانے کی دوسری منزل سے کود گئی تھی۔

اس سرخی کے نیچے متن میں درج تھا۔ ''نوجوان لڑکی نے گوجرانوالہ تھانہ کی بالائی منزل سے نیچے پختہ سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ اس واقعے میں لڑکی کی ٹانگ اور ایک بازو ٹوٹ گیا۔ اسے لاہور میو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ لیڈیز پولیس کی سب انسپکٹر نادرہ درانی حوالاتی لڑکی سے تفتیش کر رہی تھی۔ لڑکی نے پہلے حملہ کر کے سب انسپکٹر کا چہرہ نوچنے کی کوشش کی، اس کے بعد کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ سب انسپکٹر ماجد موہلہ کا کہنا ہے کہ مسماۃ ''ج'' کو منشیات فروشی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ لیڈیز پولیس کی تحویل میں تھی۔''

اس مختصر خبر میں ماجد موہلہ کے نام نے رستم کو چونکا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماجد موہلہ ڈپٹی ریاض کا خاص ماتحت ہے اور عموماً جہاں ڈپٹی ریاض تعینات ہوتا ہے وہیں یہ سب انسپکٹر بھی ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ یہ بڑے سخت گیر لوگ تھے۔ اپنے شکنجے میں آئے ہوئے لوگوں کو موت اور زندگی کے درمیان لٹکا دیتے تھے۔ کوئی یونہی تو اپنی جان لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب انسان کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے تو وہ موت کو گلے لگاتا ہے۔

پھر رستم کو دھرجائی مہناز اور اس کے پھول سے بیٹے نیپو کا خیال آیا۔ ننھا بچہ تو جانی دشمن کا بھی برا نہیں لگتا۔ وہ قدرت کا عکس ہوتا ہے۔ وڈے ڈیرے کے نواح میں دور مار رائفل سے نیپو اور اس کی [illegible] ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ یہ سفاکی کی انتہا تھی اور رستم اچھی طرح جانتا تھا کہ اس سفاکی کے ڈانڈے ضرور ڈپٹی ریاض سے ملتے ہوں گے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے

مقصد کے حصول کے لئے بے رحمی کی آخری حدود کو چھو لیتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ریاض ہٹلر نے وڈے ڈیرے کے مکینوں کو مشتعل کرنے کے لئے یہ کارروائی کرائی ہو۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس افسران وڈے ڈیرے کے مکینوں کو ہر صورت ان کی محفوظ پناہ گاہوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ خاص طور سے بارودی سرنگوں کا حصار ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ پولیس اور دیگر ایجنسیوں کی یقیناً یہ کوشش ہوگی کہ ڈیرے کے مکین اس حصار سے آگے آئیں۔ ایک طرح سے لالہ اور اس کے ساتھیوں نے دانش مندی کا ثبوت ہی دیا تھا کہ ماں بیٹے کی لاشیں اٹھانے کے لئے دوسرے ٹیلے پر نہیں گئے تھے۔ اگر وہ دن کی روشنی میں آگے جاتے تو یقیناً مزید نقصان اٹھاتے۔ رستم کی معلومات کے مطابق پولیس اور ان کے مقامی مددگاروں کے پاس M642 کی دور مار گنیں تھیں۔ ایسی گنیں باآسانی دو تین میل تک اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہیں اگر ایسی گنز کو اچھی ٹیلی سکوپ کی مدد حاصل ہو تو وہ بہترین ٹارگٹ کلنگ کرتی ہیں۔

وہ لوگ سہ پہر چار بجے گوجر خان پہنچ پائے۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ مارگلہ اور مری کی پہاڑیوں کی طرف سے سیاہ بادل امڈ امڈ کر آ رہے تھے۔ سہ پہر کے چار بجے ہی گہری شام کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سٹیشن کے باہر ایک ہوٹل سے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی اور پھر بذریعہ ٹیکسی کار جگوال گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ٹوٹی پھوٹی نیم پختہ سڑک کا دشوار گزار سفر تھا۔ بارش اور کیچڑ کے سبب یہ مزید دشوار ہو گیا۔ وہ جنوب مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ چکوال کو جانے والی سڑک ان کی دائیں ہاتھ پر تھی اور لحہ بہ لحہ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ گوہرا ابھی تک سرور اور خمار کی کیفیت میں تھا۔ وہ غنودگی کی حالت میں اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتا تھا اور بار بار گنگناتا تھا۔ لک پتلا ٹھیار دا...... ہو لک پتلا۔ گوجر خان سے قریباً پندرہ کلومیٹر آگے آنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے دیہاتی بازار کے پاس سے گزر رہے تھے جب اچانک رستم چونک گیا۔ اس کی نگاہ ایک ٹی سٹال پر پڑی۔ بلب کی روشنی میں اس کو لکڑی کی بینچ پر ایک ایسا شخص بیٹھا نظر آیا جسے وہ جانتا تھا۔ وہ چوہان تھا۔ وہی چوہان جس کا تعلق سنگوال برادری سے تھا اور جس کے بارے میں نظام نے بتایا تھا کہ وہ وادی سون جانے اور پولیس سے مزاحمت کرنے کے لئے بے حد بے تاب ہے۔ نظام کے مطابق چوہان نے پندرہ بیس کے لگ بھگ ایسے بندے بھی تیار کر لئے تھے جو پولیس کا گھیرا توڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

رستم جانتا تھا چوہان ایک دلیر اور جانباز شخص ہے۔ درحقیقت چوہان کے [illegible] میں

اطلاع ملنے کے بعد رستم نے اپنے اندر ایک نئی روح محسوس کی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کے جسم اور دماغ میں اضافی توانائی آ گئی ہے۔ چوہان کو اس ٹی اسٹال پر بیٹھے دیکھ کر رستم کے لئے ممکن نہیں ہوا کہ وہ آگے بڑھ سکے۔ اس نے پنڈی وال ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دے دیا۔

''کیا ہوا صاحب، یہاں کیا کرسو؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''یار! ذرا تمہاری گاڑی کو دم آ جاسی۔ تم بھی تھوڑی سی چائے پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔'' رستم نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

ڈرائیور نے گاڑی بیک کر کے ٹی سٹال کے سامنے کھڑی کر دی۔ یہاں پان سگریٹ، کریانہ اور پھل کی کچھ دکانیں بھی تھیں۔ مسلسل بارش اور تھکاوٹ کے سبب ایک پھل فروش اپنی ٹھنڈی ٹھار دکان میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

چوہان نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر لیا تھا۔ رستم کو اس کی صورت واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ چوہان تھا بھی یا نہیں۔ رستم نے اردگرد کا جائزہ لیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور کو پوری امید تھی کہ اپنی ان سواریوں سے اسے کرائے کے علاوہ بھاری ٹپ بھی مل جائے گی۔ اس نے باہر نکل کر جلدی سے اپنی چوڑی چھتری کھولی اور رستم پر سایہ کر دیا۔ گوہرا گاڑی کے اندر ہی بیٹھا اونگھتا رہا۔ رستم اور ڈرائیور ٹی سٹال پر پہنچے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے شخص کے عین سامنے پہنچ کر رستم نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس شخص نے بھی رستم کو دیکھا۔ اس شخص کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ دفعتاً رستم کو اندازہ ہوا کہ وہ چوہان نہیں لیکن اس کی شکل، چھوٹی داڑھی اور قد وقامت چوہان سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی۔

رستم السلام علیکم کہتا ہوا اس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی کہنیاں لکڑی کی کھردری میز پر ٹکا دیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی دونوں سواریوں کی حیثیت و مرتبے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی تن فن سے ٹی سٹال والے دیہاتی کو حکم دیا۔ ''برتن اچھی طرح دھو لینا اور دودھ زیادہ ڈالنا ہے۔''

رستم نے اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صاحب! تمہاری شکل کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔''

نوجوان نے کندھوں پر چادر درست کر کے شہادت کی انگلی سے اپنی گھنی مونچھوں کو چھوا اور بولا۔ ''بس جی صورتوں سے صورتیں ملتی ہیں۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''لاہور سے۔ یہاں جگ وال گاؤں میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ چھوٹی نہر کے پاس کچھ زرعی زمین بڑی مناسب قیمت پر مل رہی ہے۔ وہ دیکھنے آئے ہیں اور

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''بورے والا کا۔'' نوجوان نے مختصر جواب دیا۔ اس کی آواز بھاری اور متاثر کن تھی۔

''جگ وال میں نظام نام کے بندے کو جانتے ہو؟''

''نہیں جی۔ دراصل میں شارجہ میں تھا۔ وہاں ورکشاپ ہے میری۔ دو تین ہفتے پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''چوہان نام کے کسی بندے کو جانتے ہو؟''

وہ چونکا، پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''آہو جی۔ وہ میرا وڈا بھائی ہے۔ ہم دونوں کی شکل کچھ ملتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''بس پرانی ملاقات ہے۔'' رستم نے مبہم جواب دیا۔

''وہ کل کراچی گیا ہے، ایک شادی میں۔ ایک دو اور کام بھی ہیں۔ ہفتے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔''

رستم بُری طرح چونکا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ واقعی کراچی گیا ہے؟''

''آہو جی۔ میں خود اسے گڈی چڑھا کر آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر بھی اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے۔''

رستم نے چہرے کے تاثرات پر کنٹرول رکھا مگر اس کے اندر شدید ہلچل مچ گئی۔ اس نے چوہان کے بھائی کو کریدا اور اگلے تین چار منٹ میں تصدیق ہو گئی کہ وہ واقعی کراچی پہنچا ہوا ہے۔ یہ معاملہ کچھ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ نظام کہہ رہا تھا کہ چوہان یہاں جگ وال میں ہے اور اپنے ساتھیوں سمیت سون جانے کے لئے بے قرار ہے۔ پتا نہیں کیوں اس سارے معاملے میں ہی رستم کو کچھ کجی محسوس ہونے لگی۔ ایسی صورت حال میں اس کی حسیات بہت تیز ہو جاتی تھیں۔ وہ مامون نامی اس شخص سے رخصت ہو کر ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ وہ اب جگ وال سے زیادہ دور نہیں تھے۔ رم جھم برستی بارش میں ٹیکسی پھر روانہ ہو گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد ٹیلوں کے دامن میں جگ وال کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ نظام جگ وال میں ڈیزل انجنوں کو ٹھیک کرنے کی ورکشاپ چلاتا تھا۔ اسی ورکشاپ کے گودام میں ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جہاں جرمن میڈ طاقتور وائرلیس سیٹ موجود تھا جس کے ذریعے نظام وڈے ڈیرے کے مکینوں کو آبادو دنیا کی خبریں فراہم کرتا تھا۔ پچھلے قریباً پانچ سال سے نظام نہایت کامیابی اور جان فشانی سے پیغام رسانی کا اہم ترین فریضہ انجام دے رہا تھا۔

ملتان میں فون پر جو پروگرام طے ہوا تھا اس کے مطابق رستم اور گوہرا کو جگ وال پہنچ کر سیدھا نظام کی ورکشاپ پر پہنچنا تھا۔ یہ ورکشاپ گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک پرانے مندر کے قریب واقع تھی۔ نہ جانے کیوں رستم کے ذہن میں آیا کہ وہ ورکشاپ جانے کی بجائے نظام کے گھر پہنچے اور اس سلسلے میں پوری رازداری برتے۔

انہوں نے کیچڑ اور گارے میں لتھڑی ہوئی ایف ایکس سوزوکی ٹیکسی گاؤں سے ایک کلومیٹر پہلے ہی فارغ کردی اور پیدل گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے اپنی چھتری رستم اور گوہرا کے حوالے کردی تھی کیونکہ جتنی اسے ٹپ ملی تھی اس میں وہ ایسی بیس تیس چھتریاں خرید سکتا تھا۔ نظام کی رہائش گاہ کا رستم کو علم تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاؤں کے ایک مضافاتی گھر کے دروازے پر دستک رہے تھے۔

نظام کی تیس پینتیس سالہ بیوی ایک دابو عورت تھی۔ ہمہ وقت نظام سے ڈری رہتی تھی حالانکہ نظام عام حالات میں سخت گیر شخص نہیں تھا۔ اس کا نام واجدہ تھا۔ واجدہ نے رستم کے چھوٹے چھوٹے بالوں اور پتلون قمیص کی وجہ سے اسے بہ مشکل پہچانا۔ گوہرا کو وہ سرے سے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ واجدہ اور نظام کی کل کائنات ایک بیٹا بیٹی تھے۔ بیٹا پنڈی میں کار ٹیپ ریپئرنگ کا کام کرتا تھا...... بیٹی غیر شادی شدہ تھی اور ان کے پاس ہی رہتی تھی۔ فی الوقت وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ رستم نے واجدہ سے پوچھا۔ ”آپا جی، بیٹی کدھر ہے؟“

”وہ دو مہینے پہلے لاہور چلی گئی ہے۔ اسے نرسوں کا کورس کرنے کا بڑا شوق ہے۔ بہت منع کیا لیکن نہیں مانی۔ اب وہاں ہوسٹل کی دال روٹی کھاتی ہے۔“

”بھائی نظام کدھر ہے؟“

”وہ ابھی تک ورکشاپ میں ہی ہیں۔ کہتے تھے کہ ایک کرنل صاحب کے پمپ کا انجن ٹھیک کرنا ہے۔ ضروری کام ہے، کل پر نہیں ڈال سکتا۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ پر اگر تم کہتے ہو تو گوانڈیوں کے منڈے کے ہاتھ ان کو گھر آنے کا پیغام بھیج دیتی ہوں۔“

”نہیں...... نہیں۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ آرام سے تمہارے ہاتھ کی بھنی ہوئی مرغی کھاتے ہیں اور جب بھائی نظام آئے گا تو اس سے سرداروں کے لطیفے سنیں گے۔“ رستم نے رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

واجدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لطیفے شطیفے تو ان کو بھول ہی گئے ہیں۔ پتا نہیں آج کل کیا ہو گیا ہے ان کو۔ چپ چپ سے رہتے ہیں۔ غصہ بھی بہت آتا ہے۔ پہلے تو میں سمجھتی تھی کہ شاید جمیلہ بیٹی کے لاہور جانے کی اداسی ہے لیکن یہ بات بھی نہیں۔“

”ہوتی ہیں کئی باہر کی پریشانیاں۔“ گوہرا نے لقمہ دیا۔

واجدہ بہت سیانی، سنجیدہ اور معاملہ فہم عورت تھی۔ اسے اردگرد کے حالات کی بھی کافی خبر رہتی تھی لیکن آفرین تھا اس کی طبع پر، کہ عورتوں کے مزاج کے بالکل برعکس پچھلے پانچ سالوں میں وہ نظام ہی کی طرح لالہ فرید کے ہر راز کی امین رہی تھی۔ اس نے اپنے مہندی لگے بالوں پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے کہ سون میں کام خراب ہوتا جا رہا ہے۔ وہاں بہت زیادہ پولیس آگئی ہے اور انہوں نے ڈیرے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“

”ہاں، یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ رستم نے کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے وہ زیادہ پریشان رہتے ہوں۔“ واجدہ نے ایک بار پھر کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو وہ پڑوسیوں کے لڑکے کو بھیج کر نظام کو ورکشاپ سے بلوا لیتی ہے۔ رستم نے پھر منع کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کرنل صاحب کے کام کا تو بس بہانہ ہے، نظام وہاں ان دونوں کا انتظار کر رہا ہے۔ اب رستم چاہتا تھا کہ وہ خود ہی واپس گھر آ جائے تو اچھا ہے۔ اسے ورکشاپ تک اپنی آمد کا پیغام پہنچانے میں خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔

ان دونوں نے چولہے کے قریب بیٹھ کر اُپلوں کی آگ سے اپنے گیلے کپڑے سکھائے۔ مکئی کی روٹی پودینے کی چٹنی اور آلو مٹر کے ساتھ کھائی۔ آلو مٹر آج کل رستم کو بہت اچھے لگ رہے تھے، شاید لاشعوری طور پر ان کے ساتھ کوئی یاد وابستہ ہو گئی تھی۔ دونوں نے ملائی والا دودھ پیا اور واجدہ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ لالٹین کی روشنی خواب ناک تھی برآمدے کی چھت ٹین کی تھی اور اس پر پڑنے والی بارش کے تڑیڑے آواز پیدا کرتے تھے۔ واجدہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”لوگ کہہ رہے ہیں کہ پولیس نے بہت جلد ڈیرے پر بڑا حملہ کرنا ہے...... وہاں بہت زیادہ اسلحہ جمع کیا گیا ہے اور دن میں کئی بار ہیلی کاپٹر اُڑنے کی آواز بھی آتی ہے۔“

”صرف پولیس کی بات ہوتی تو بھی کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا لیکن پتا چلا ہے کہ اجرال برادری کے لوگ بھی پوری طرح پولیس کی مدد کر رہے ہیں اور سارے خفیہ راستے پولیس افسروں کو بتا رہے ہیں۔“

”ایسی بات تو ہم بھی سن رہے ہیں۔“

رستم نے واجدہ کو کریدنے کی کوشش کی۔ ”اجرال برادری کے لوگوں کی سنگوالیوں سے پرانی دشمنی ہے۔ سنگوالیوں کے بہت سے لوگ بھی پولیس کے گھیرے میں آئے ہوئے ہیں۔

کیا سنگوالی بھی چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''غصہ تو ان کو بھی بہت ہوگا۔ پر کوئی کیا کرے۔ حاکموں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ بس اندر ہی اندر کڑھ رہے ہیں۔''

''مجھے پتا چلا تھا کہ سنگوال برادری کے کچھ لوگوں نے بھائی نظام سے کہا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں کو پولیس کے گھیرے سے نکالنے کے لئے [illegible] کی بازی لگانے کو تیار ہیں۔''

''یہ تو کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ باتیں تو ہوئی تھیں لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آیا تو کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ بس ایک چوہان تھا اور ایک اس کا دوست تھا۔ وہ دونوں شور مچاتے رہے پھر وہ بھی چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ اب تو میں نے سنا ہے کہ چوہان بھی لاہور یا کراچی چلا گیا ہے۔''

رستم کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔ اب تصدیق ہوگئی تھی کہ نظام نے اسے غلط خبریں دی تھیں اور ایسا پچھلے پانچ چھ برسوں میں پہلی بار ہوا تھا۔

واجدہ میدے اور گوند کا حلوا پکاتے ہوئے اپنی رَو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ ''رستم! تمہیں یہاں دیکھ کر میرا غم تھوڑا سا ہلکا ہوا ہے۔ جمیلہ کا ابا تو مجھے کچھ بتاتا ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی لالے اور حسنے کے ساتھ اُدھر ڈیرے پر ہی پھنسے ہوئے ہو۔ میں تو مشورہ دیتی ہوں کہ اب چھپتی چھپتی اس علاقے سے نکل جاؤ، یہاں کوئی جگہ بھی پولیس اور ان کے مخبروں سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ اجرال برادری میں بڑے بڑے اچھے لوگ بھی ہیں۔ پر اس وقت مخبری کا کام بھی زیادہ تر اجرالی ہی کر رہے ہیں۔''

رستم زیر لب مسکرایا۔ یہ ہمدرد عورت اسے یہاں سے دور نکل جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بہت دور سے خود اس علاقے میں پہنچا ہے اور ابھی مزید آگے جانا چاہتا ہے۔ اس قتل گاہ میں جہاں کچھ بے بس لوگ حالات کے شکنجے میں ہیں اور اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

وہ تینوں چولہے کے پاس بیٹھے رہے۔ ٹیلوں کے دامن میں یہ قصبہ نما بستی بڑی خاموشی سے بارش میں بھیگتی رہی۔ بس کبھی کبھار کوئی چوپایہ یا انسان کیچڑ زدہ گلی میں پاؤں سے چَپ چَپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ نظام کی واپسی کا انتظار بھی کرتے رہے۔ ساتھ والے گھر میں ٹی وی بلند آواز میں چل رہا تھا۔ شاید بچوں کا کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ پہلے ایک بچی نے پوٹھوہاری گیت دلکش آواز میں سنایا پھر ایک بچہ آیا۔ کمپیئر نے نام پوچھا۔ ''ریحان۔'' بچے نے جواب دیا۔

''کیا سناؤ گے بیٹا؟'' کمپیئر نے محبت سے پوچھا۔

''نظم...... عنوان ہے میری امی۔'' پھر بچے نے نظم سنانی شروع کی، وہ سادہ اور معمولی نظم کے الفاظ تھے لیکن ان میں موجود محبت کی لہر نے انہیں معمولی نہیں رہنے دیا تھا۔

امی میری پھول کے جیسی
صاف ہوا اور شہد کے جیسی
باتیں ان کی میٹھی میٹھی
آنکھیں چمکتی تاروں جیسی
اچھی باتیں سکھلاتی ہیں، اچھا کھیل کھلاتی ہیں
اللہ ان کو جیتا رکھے، ان کا ہمیشہ ہی پیار ملے

نظم سنتے ہوئے نہ جانے کیوں رستم کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اسے پھر ٹیپو یاد آ گیا۔ وہ بھی تو اتنی ہی عمر کا تھا۔ ایسے ہی اپنی ماں سے پیار کرتا تھا اور جسے پیار کیا جاتا ہے، اسے ستایا بھی جاتا ہے۔ وہ ماں کو ستانے کے لئے بھاگا تھا اور بھاگتا چلا گیا تھا۔ ماں بیٹا آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے اوجھل ہو گئے تھے.... کائنات کی حد سے آگے نکل گئے تھے لیکن انہیں مارنے کے لئے جس انگلی نے لبلبی دبائی تھی وہ رستم کے لئے ناقابلِ معافی تھی اور یقیناً ہر ذی احساس شخص کے لئے بھی ناقابلِ معافی تھی۔ لبلبی دبانے والی یہی ہے جس انگلی ہے جس نے پورے کرہ ارض کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ یہ انگلی ماؤں سے ان کے لختِ جگر چھینتی ہے۔ بہنوں سے بھائی اور بھائیوں سے بہنیں اور پتا نہیں کیا کچھ۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر واجدہ فوراً بولی۔ ''جمیلہ کے ابا آ گئے ہیں۔''

یہ اندازہ پندرہ سولہ سالہ رفاقت کا نتیجہ تھا، اس لئے بالکل درست ثابت ہوا۔ واجدہ نے دروازہ کھولا تھا تو نظام چھتری تانے اندر آ گیا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔ جسم ذرا سا بھاری لیکن مضبوط تھا۔ پیشانی چوڑی، سر کے بال گھنے لیکن کھچڑی تھے۔ وہ شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بڑے ہاتھ اس کے میکینکل مزاج کی نشاندہی کرتے تھے۔ صحن میں پہنچنے کے بعد اس نے رستم اور گوہرا کو چولہے کے قریب بیٹھے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ رستم کو ایک لمحے کے لئے تو محسوس ہوا کہ وہ صحن میں ہی رک جائے گا اور آگے نہیں آئے گا، تاہم پھر وہ خود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ آیا۔

رستم اور گوہرا کے بدلے ہوئے حلیوں کی وجہ سے اسے ان دونوں کو پہچاننے میں کچھ

دشواری بھی ہوئی۔ لالٹین کی روشنی میں دونوں کو دھیان سے دیکھنے کے بعد اس نے السلام علیکم کہا اور چھتری کو ایک طرف رکھتے ہوئے دونوں سے بغل گیر ہوگیا۔ رستم نے محسوس کیا کہ نظام کے جسم میں خفیف جنبش ہے اور اس کا انداز حقیقی گرم جوشی سے عاری ہے۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولا۔ ''رستم بھائی! تم دونوں کو تو وہاں ورکشاپ میں آنا تھا۔''

''بس اچانک ارادہ تبدیل ہوگیا۔ میں نے سوچا آج آپا واجدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا سیوئیں حلوہ کھایا جائے۔ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔''

''کب سے آئے ہو؟''

''بس ابھی ایک گھنٹہ ہوا ہے۔'' رستم نے جلدی سے کہا۔

نظام کی شلوار کا نچلا حصہ کیچڑ آلود اور گیلا تھا۔ وہ اپنے نم کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لو تم اپنی بھرجائی کے پاس بیٹھو۔ میں کپڑے بدل لوں پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔''

''کپڑے ٹھیک ہی ہیں۔ آگ کے سامنے بیٹھو سوکھ جائیں گے۔'' رستم نے کہا۔

''نہیں مجھے اوازاری (پریشانی) ہوتی رہے گی۔ میں بس دو منٹ میں آیا۔''

وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ رستم کے اندر بے حد بے قراری تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نظام اس کے ساتھ اور لالے کے ساتھ کسی طرح کا دھوکا کرسکتا ہے۔ رستم جیسا بندہ بھی نظام پر اور اس کی بیوی واجدہ پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرنے کا عادی تھا لیکن یہاں جو کچھ محسوس ہو رہا تھا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ سنگوال گوٹھ کا چوہان یہاں موجود نہیں تھا اور نظام کے مطابق وہ یہیں تھا۔

ابھی رستم نے نظام کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں اور پتلیوں کے اندر کوئی بہت گھمبیر اور سنگین راز ٹھہرا ہوا تھا۔

رستم سے ممکن نہیں ہوا کہ وہ وہاں رکا رہے۔ وہ نظام کے پیچھے گیا۔ واجدہ پوچھتی رہ گئی۔ ''کیا چاہیے رستم؟''

رستم اندرونی کمرے میں پہنچا تو نظام کپڑے بدلنے کی بجائے کسی کو فون کر رہا تھا۔ موبائل سیٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ نمبر ملا رہا تھا۔ ''کسے فون کر رہے ہو نظام؟''

رستم نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ ''مم ... میں چوہان کو کر رہا تھا۔ میں نے کہا اسے ادھر ہی بلا لوں۔''

''لیکن سنا ہے، چوہان تو یہاں ہے ہی نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''کون کہتا ہے؟''

رستم نے جواب دینے کی بجائے نظام کے موبائل کی سکرین کو دھیان سے دیکھا۔ وہ جس شخص کو کال کرنے جا رہا تھا، اس کا نام ماجد تھا۔ ایک دم رستم کے چودہ طبق روشن ہوگئے..... ماجد موہلہ ڈپٹی ریاض کے خاص ماتحت کا نام بھی تھا۔ رستم نے موبائل نظام کے ہاتھ سے لینا چاہا تو اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ ''کیا کرتے ہو رستم بھائی؟'' وہ گھبرا کر بولا۔

''یہ ماجد کون ہے؟'' رستم نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی موبائل نظام کے ہاتھ سے لے لیا۔ نظام کا رنگ سیاہی مائل ہوتا جا رہا تھا۔

یکایک فون کی بیل بجنے لگی۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس کے اندر آنے سے پہلے نظام نے مطلوبہ نمبر پر ایک دو بیل کردی تھیں۔ اب اس ''مس کال'' کے جواب میں مطلوبہ نمبر سے کال آگئی تھی۔ رستم نے انگوٹھے سے ریسیو کا بٹن دبا کر کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو......ہیلو......کون؟'' اس آواز نے رستم کو سکتہ زدہ کردیا۔ یہ ڈپٹی ریاض ہٹلر کی آواز تھی۔ اپنے ماتحت کے سیل فون پر وہ خود بول رہا تھا۔ رستم نے فون بند کردیا۔ یہی وقت تھا جب رستم کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ اگر اسے اپنا سر جھکانے میں ایک لحظے کی تاخیر ہوتی تو نظام کی چلائی ہوئی کلہاڑی اس کی کھوپڑی توڑ ڈالتی۔ اسے نظام سے ایسے تیز ردِعمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ نظام جیسا شخص اسے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بالکل بھونچکا رہ گیا۔

کلہاڑی رستم کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری تھی اور پڑچھتی پر سجے برتنوں میں دھنسی تھی۔ ایک زوردار چھناکا پیدا ہوا۔ رستم اس شدید ترین دھچکے سے سنبھلا نہیں تھا کہ نظام نے دوسرا وار کیا۔ یہ وار عمودی تھا۔ یعنی اوپر سے نیچے آرہا تھا۔ اس مرتبہ رستم پیچھے کی طرف گیا اور چھوٹے دستے کی تیز دھار کلہاڑی اس کی جرسی کو سینے سے ادھیڑتی چلی گئی..... خدا کی پناہ......نظام کے چہرے پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور باچھیں وحشی جانور کی طرح پھیل گئی تھیں۔ وہ وحشی جانور ہی کی طرح چنگھاڑا۔

''زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے رستم پر پے در پے وار کیے۔ کمرے کے مختصر خلا میں رستم کے لئے خود کو بچانا مشکل ہو رہا تھا پھر ایک موقع پر کلہاڑی کا دستہ رستم کے مضبوط ہاتھوں میں آگیا۔ رستم نے نظام کو کلہاڑی سمیت گھما کر دیوار سے دے مارا۔ اس کا خیال تھا کہ کلہاڑی نظام کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ نظام کے ہاتھوں میں ہیجانی قوت تھی۔

رستم اسے دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دونوں ایک رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر گرے اور اسے چکنا چُور کر گئے۔ کمرے میں کہرام مچ گیا۔ واجدہ اور گوہرا بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ گھبرائی ہوئی واجدہ نے ایک دو خوف ناک چیخیں بلند کیں لیکن گوہرا نے اس کا منہ دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔

نظام نیچے اور رستم اوپر تھا۔ وہ دونوں ٹوٹے ہوئے پلنگ کے چوکھٹے میں گرے تھے۔ رستم نظام سے کلہاڑی چھیننے کی کوشش کر رہا تھا مگر نظام کے مضبوط ہاتھ جیسے کلہاڑی کے دستے کے ساتھ ویلڈ ہو چکے تھے۔ رستم جیسا مضبوط شخص بھی نظام کے ہاتھوں سے دستہ چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ جس طرف کو زور لگاتا نظام کیچوے کی طرح اس طرف مڑ جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہذیان بک رہا تھا۔ ''میں نے کسی کی ماں کے ساتھ کیا بُرا کیا ہے؟ میں نے کسی کی بہن کے ساتھ کیا بُرا کیا ہے؟ میں کسی کُتے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں لاشیں گرا دوں گا۔''

کلہاڑی کے دستے پر اس کی گرفت ناقابلِ شکست تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ رستم اسے کوئی شدید چوٹ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ کلہاڑی چھڑانا قدرے آسان ثابت ہوتا۔

مجبور ہو کر رستم نے اس کی پسلیوں میں گھٹنے کی چوٹ لگائی اور پھر ایک جھٹکے سے کلہاڑی کھینچ لی۔ جس وقت وہ کلہاڑی دور پھینک رہا تھا۔ نیم دیوانے نظام نے ایک دوسرا کام کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی واسکٹ کے نیچے سے کھلا ہوا چاقو کھینچ لیا۔ بہرحال اب اس کے جنون کا انداز دوسرا ہو گیا تھا۔ اس نے یہ چاقو اپنی گردن میں گھونپنے کی کوشش کی۔ رستم کو ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو شاید وہ خود کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا لیتا۔ رستم نے اس کی کلائی جکڑ لی۔ وہ دردناک انداز میں چلانے لگا۔ ''مجھے مر جانے دو..... میری جان چھوٹ جانے دو ..... حرام زادو مجھے مر جانے دو۔''

وہ پوری طاقت سے رستم اور گوہرا کی گرفت میں مچل رہا تھا۔ واجدہ کے ہونٹوں سے دبی دبی اذیت ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر گوہرا نے نظام کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔ رستم بار بار نظام کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ نظام کی بلند آوازیں پڑوس کے مکینوں تک نہ پہنچ جائیں۔ بہرطور ابھی تک خیریت تھی۔ کمرہ اندرونی حصے میں تھا اور دروازہ بند تھا۔ دوسرے بادوباراں کا شور بھی آوازوں کو دبا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رستم نے نظام کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ایک مفلر باندھ دیا پھر ایک ازار بند سے نظام کے ہاتھ بھی پشت پر باندھنا پڑے۔

واجدہ کے لئے یہ سارا نظارہ دیکھنا تکلیف دہ تھا لہٰذا رستم نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ جب ہاتھ بندھ گئے اور منہ بھی بند ہو گیا تو نظام کی ہیجانی کیفیت اچانک ختم ہو گئی۔ اس نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

رستم نے واجدہ نے کہا۔ ''آپا! ہمیں اندازہ نہیں، لیکن یہاں کوئی زبردست گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہو گا اور نظام کو ساتھ لے جانا پڑے گا لیکن آپ نے پریشان نہیں ہونا۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میرے ہوتے آپ کو یا بھائی نظام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''پر ہوا کیا ہے رستم؟ کچھ پتا تو چلے۔'' واجدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''میں نے بتایا ہے ناں، مجھے ٹھیک سے پتا نہیں..... لیکن میں نے ابھی نظام کے فون پر ڈپٹی ریاض کی آواز سنی ہے۔''

واجدہ ڈپٹی ریاض کے بارے میں جانتی تھی۔ اس کا تاریک چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن رستم کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے فقط اتنا کیا کہ واجدہ کو اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔ وہ رستم کے ساتھ چمٹ سی گئی۔ ''کچھ نہیں ہو گا آپا۔'' رستم نے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''نظام کی جیپ کہاں ہے؟''

''پچھواڑے کی طرف کھڑی ہے۔ اس میں ڈیزل نہیں ہے۔ جمیلہ کے ابا صبح ہی لے کر آئے ہیں۔''

''کہاں ہے ڈیزل؟'' واجدہ نے برآمدے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں دس لیٹر کا ایک کین پڑا ہوا تھا۔ رستم بولا۔ ''ہم اس جیپ پر جا رہے ہیں۔ نظام بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ اگر کوئی یہاں آئے اور نظام کے بارے میں پوچھے تو اسے یہی بتانا ہے کہ وہ اکیلا جیپ پر گیا ہے۔ ہمارے یہاں آنے اور جانے کے بارے میں کسی کو بھنک تک نہیں پڑنی چاہیے۔'' واجدہ نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ نظام اور جیپ دونوں کل تک صحیح سلامت تمہارے پاس واپس پہنچ جائیں گے۔''

جس دوران میں رستم واجدہ سے باتیں کر رہا تھا اور اسے مختلف ہدایات دے رہا تھا اس وقت گوہرا چھتری لے کر باہر گیا اور گھر کے پچھواڑے کھڑی جیپ میں ڈیزل ڈال کر اور اسے اسٹارٹ کر کے دیکھ لیا۔ رستم نے گھر میں اپنی موجودگی کی ساری نشانیاں تیزی سے مٹائیں اور نظام کو کندھے پر لاد کر باہر لے آیا۔ گوہرا نے جیپ لا کر دروازے کے عین سامنے کھڑی

کردی تھی۔ رستم نے نظام کو پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ گہری تاریکی اور بارش میں گلی سنسان پڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں خستہ حال جیپ خستہ حال راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ رستم خود کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اگر ڈپٹی ریاض نے نظام جیسے شخص تک رسائی حاصل کی ہے تو کیونکر؟ اس کے ساتھ ساتھ اسے ڈپٹی ریاض کی بے پناہ خطرناکی کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ تینوں جگ وال گاؤں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے قریباً پانچ کلومیٹر آگے آ چکے تھے۔ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں گوروں کا قبرستان تھا۔ دس پندرہ لاوارث قبریں تاریکی اور بارش میں خاموشی سے بھیگ رہی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کبھی اس خطے پر حکومت کی تھی۔ آج ان کے وارث کہیں لندن یا مانچسٹر کی جگمگاتی روشنیوں میں دادِ عیش دے رہے تھے اور یہ یہاں اس جھنڈ میں نشانِ عبرت تھے۔ رستم نے شور مچاتی جیپ ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے اس کی لائٹس بجھا دی تھیں اور اب وہ نظام کی بندشیں کھول رہا تھا۔ نظام کا سارا جارحانہ پن اب ایک دلدوز خاموشی میں ڈھل چکا تھا۔

جونہی رستم نے اس کا منہ کھولا وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ اتنے سنجیدہ اور باوقار شخص کو یوں بچے کی طرح بلکتے دیکھ کر رستم کے دل پر چوٹ لگی۔ نظام کراہا۔ ''خدا کے لئے میری بچی کو بچا لو۔ میری جمیلہ کو بچا لو۔ وہ بڑی سوہل (نازک) ہے۔ وہ مر جائے گی۔''

رستم کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یوں لگا کہ اس کے کسی اندرونی خیال کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں شاید نظام کی بیٹی کا بھی کوئی ''لنک'' ہے۔ نظام ہیجانی انداز میں بولتا چلا گیا۔ ''جمیلہ ان کے پاس ہے۔ وہ اسے مار رہے ہیں۔ اس سے بڑا بُرا سلوک کر رہے ہیں۔ میں نے جمیلہ کی ماں کو کچھ نہیں بتایا۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ سب کچھ اکیلا جھیل رہا ہوں۔ وہ ڈپٹی ریاض میری بچی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ لاہور میں تھی، پولیس والے اسے وہیں سے لے گئے ہیں۔ نہ کہیں گرفتاری ڈالی ہے، نہ کہیں نام درج کیا ہے۔ پولیس کی عورتوں نے مار مار کر اس کا بُرا حال کر دیا ہے۔ میں خود اس سے مل کر آیا ہوں۔ وہ مر جائے گی رستم، اس کے مرنے سے پہلے میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔'' اس پر پھر ہیجان طاری ہونے لگا۔

رستم اور گوہرا نے جیپ کے اندر ہی اسے سنبھالا۔ وہ بے قراری سے سر پٹخنے لگا۔ رستم کے ذہن میں اچانک وہ خبر آئی جو ریل گاڑی میں آتے ہوئے اس نے پڑھی تھی۔ اس خبر میں کسی ''ج'' نامی لڑکی کا ذکر تھا جس نے گوجرانوالہ تھانے کی بالائی منزل سے کود کر خودکشی کی

کوشش کی تھی۔ اس مختصر خبر میں ریاض کے ماتحت ماجد موہلہ کا نام بھی موجود تھا... اب صورتِ حال واضح ہو رہی تھی۔ اخباری خبر کی وہ ''ج'' نامی لڑکی نظام کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جمیلہ ہی تھی۔ ایک ایک کر کے ساری کڑیاں مل گئیں اور رستم کا دماغ جوالا مکھی کی طرح کھولنے لگا۔ نظام کراہ رہا تھا۔ ''گوجرانوالہ کے تھانے میں پولیس کی عورتیں میری بچی کو زندہ درگور کر رہی ہیں۔ وہ میری ملوکڑی بچی کو ایسی بُری دھمکیاں دیتی ہیں جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ زندہ نہیں رہے گی، مر جائے گی...... اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کُتے کی طرح ڈپٹی ریاض کے پاؤں نہ چاٹوں تو کہاں جاؤں۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے بس میں کچھ نہیں رہا۔''

رستم نے اپنے ہاتھ سے نظام کے آنسو پونچھے اور دل گیر آواز میں پوچھا۔ ''تم نے ریاض کے لئے کیا کیا ہے نظام؟''

''وہ سب کچھ جس کے لئے تم مجھے دس بار کُتے کی موت مار سکتے ہو۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم ابھی تک آزاد ہو۔ تم میرے گھر کی بجائے ورکشاپ آتے تو اب تک ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوتے یا مر گئے ہوتے۔ اب پتا نہیں وہاں وڈے ڈیرے پر کیا ہونا ہے۔ ان کے لئے کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ ڈپٹی ریاض نے ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔'' نظام نوحہ کرنے کے انداز میں بول رہا تھا۔

''تم نے سیٹ پر کیا پیغام دیا ہے لالہ وغیرہ کو؟'' گوہرا نے پوچھا۔

''وہی جو اس حرامی (ریاض) نے کہا۔ وہ لوگ اس آس پر پانڈو درے کی طرف آئیں گے کہ وہاں پولیس نہیں ہے...... پانڈو درہ ان کا قبرستان بن جائے گا۔''

ڈپٹی ریاض کی خوفناک چال رستم پر آشکارہ ہو رہی تھی۔ اگر لالہ فرید، نظام کی ڈس انفارمیشن کے تحت پانڈو درے کی طرف آتا تو وہ خود بخود ایک زبردست دفاعی حصار سے محروم ہو جاتا۔ یہ حصار دو ہزار بارودی سرنگوں کی صورت میں اسے مہیا تھا اور یہی حصار پولیس اور اجرالیوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ رستم کی رگوں میں آگ دوڑ گئی۔ صورتِ حال اس کی توقع سے زیادہ خطرناک تھی.... وہ ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ سے باہر نکل آیا۔ اس کے انداز میں شیر کا بانکپن تھا۔

☆======☆======☆

''میں ڈپٹی ریاض کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' رستم نے زیرلب پھنکار کر کہا۔ اس کی پیشانی اور گلے کی رگیں شدتِ جذبات سے پھول رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے یوں محسوس ہوا کہ رستم، سسکتے ہوئے نظام اور حیران گوہرا کو وہیں چھوڑ کر کسی انجانی سمت میں روانہ ہو جائے گا۔ گوہرا نے بےقراری سے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے رستم؟''

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا، نظام بول پڑا۔ ''میری ورکشاپ پر پولیس بیٹھی ہے۔ تین بندے وردی میں ہیں اور چھ سات بغیر وردی کے۔ وہ پوری طرح چوکس ہیں۔ ''سیٹ'' ان کے قبضے میں ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ سیٹ (وائرلیس سیٹ) تک پہنچ سکو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہاں سخت خون خرابہ ہوگا اور اگر تم لوگ کسی طرح سیٹ تک پہنچ بھی گئے تو اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ درمیان والے سیٹ پر بھی ڈپٹی ریاض کے بندوں کا قبضہ ہے۔''

رستم اپنے اندر ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ (وادی سون کی گہرائی میں وڈے ڈیرے سے رابطہ رکھنے کے لئے لانگ رینج کے دو سیٹ استعمال کئے جاتے تھے۔ جگ وال کے سیٹ کو خاص تکنیک سے ایک دوسرے سیٹ کے ساتھ مربوط کیا جاتا تھا جو یہاں سے تقریباً پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس درمیان والے سیٹ کے بغیر وڈے ڈیرے تک کوئی پیغام ارسال نہیں کیا جا سکتا تھا اور نظام کے بقول درمیان والے سیٹ پر بھی پولیس مسلط ہو چکی تھی) اگر نظام کی بات درست تھی تو پھر ورکشاپ پر ہلہ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رستم زخمی شیر ہی کی طرح جیپ کے اردگرد چکرا کر رہ گیا پھر تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا اور جیپ میں دوبارہ نظام کے پاس آ بیٹھا۔ گوہرا باہر ہی کھڑا رہا۔ نظام نے ایک بار پھر بلکتے

ہوئے کہا۔ ''میں مجبور ہو گیا تھا۔ میں اولاد کی محبت میں لاچار ہو گیا تھا۔ تم جانتے ہو میں ایسا نہیں تھا، لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا۔ کاش مجھے اس سے پہلے موت آ جاتی۔ میں یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔'' وہ ایک بار پھر بےحد اضطراب کے عالم میں اپنا سر جیپ کی نشست پر پٹخنے لگا۔

رستم نے سگریٹ سلگانے کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر کہ سگریٹ کی روشنی خطرناک ہوگی سگریٹ مسل کر پھینک دیا۔ اس نے کئی بار اپنے سر کے ترشے ہوئے بالوں میں انگلیاں چلا کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تب نظام سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔''

نظام نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ڈپٹی ریاض تم لوگوں کی سوچ سے زیادہ خطرناک بندہ ہے۔ مجھے بالکل نہیں پتا کہ وہ کس طرح مجھ تک پہنچا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں کتنی احتیاط کرتا تھا۔ ورکشاپ کے جس تہہ خانے میں وائرلیس سیٹ ہے وہ بالکل الگ تھلگ ہے۔ وہاں بس ڈیزل انجنوں کا بیکار سامان پڑا ہے۔ میرے اور میرے چھوٹے بھائی انعام کے سوا آج تک وہاں کوئی نہیں گیا ہے پھر بھی پتا نہیں کس طرح پولیس کو خبر ہو گئی۔ پہلے ڈپٹی ریاض کا ایک سب انسپکٹر موہلہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کے آٹھ دس بندے تھے۔ انہوں نے مجھے ورکشاپ میں ہی چھاپ لیا اور سیٹ تک پہنچ گئے، لیکن میں نے ان کو نمبر (فریکوئنسی) بتانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے رات بھر مجھے برف کی سل پر لٹایا اور میرے پاؤں پر ڈنڈے مارتے رہے۔ یہ دیکھو میرے پاؤں۔'' نظام نے اپنے پاؤں دکھائے، وہ سوجے ہوئے تھے اور نیل پڑ چکے تھے۔ وہ آنسو پونچھ کر بولا۔ ''اگلے دن ڈپٹی ریاض نے لاہور میں نرسوں کے ہوسٹل سے میری جمیلہ کو اٹھوا لیا اور اسے زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا۔ چند گھنٹے بعد وہ انعام کو بھی ساتھ والے گاؤں سے پکڑ کر ورکشاپ میں لے آئے......اب میں زیادہ تفصیل کیا بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جمیلہ کے پکڑے جانے کے بعد میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں چپ چاپ پولیس والوں کی بات مانتا چلا جاؤں۔ ڈپٹی ریاض سادہ کپڑوں میں خود جگ وال آ گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ''سیٹ'' پر میری بات لالہ فرید سے کروائی اور مجھے سب کچھ لالہ سے کہنے پر مجبور کیا جو وہ چاہتا تھا۔''

''مثلاً کیا؟''

''وہ چاہتا تھا کہ لالہ فرید اور اس کے سارے ساتھی وڈے ڈیرے سے نکل کر پانڈو درے کی طرف آ جائیں۔ اس نے میرے منہ سے یہ بات لالے تک پہنچائی کہ پانڈو کی

طرف پولیس کی نفری نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ کہ سنگوال برادری کے مسلح جتھے نے پانڈو کی طرف سے پولیس کا گھیرا توڑنے کا پروگرام بنایا ہے اگر اندر سے لالہ اور اس کے ساتھی کوشش کریں تو بڑی آسانی سے پولیس کے گھیرے سے نکلا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی ریاض کے کہنے پر میں نے یہ بات بھی لالے فرید اور حسنا تک پہنچائی ہے کہ کل میں دوبارہ رابطہ کروں گا اور بتاؤں گا کہ سنگوالیوں کا جتھا ٹھیک کس وقت، کس جگہ اور کتنے بندوں کے ساتھ ہلہ بولے گا۔ عین اسی وقت پر لالے اور اس کے ساتھیوں کو بھی پانڈو درے پر موجود ہونا چاہیے۔''

رستم کے چہرے پر نظر آنے والی تشویش ذرا سی کم ہوئی۔ اس نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ فائنل پروگرام ابھی طے نہیں ہوا۔''

''ہاں، تم کہہ سکتے ہو کہ ابھی ایک بار مزید لالے سے بات ہوگی۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ پانڈو کی طرف آئیں گے لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کل کا دن انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ خود ہی پانڈو کی طرف چل پڑیں۔''

رستم اور گوہرا کے چہروں پر ایک ساتھ سوچ کی لکیریں ابھریں۔ رستم نے کہا۔''نظام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ کتنا خطرناک ہے۔ سب کچھ برباد ہو کر رہ جائے گا۔''

نظام کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔ رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''نظام! کیا تم کسی طرح ایک دو دن کے لئے سیٹ کو ناکارہ نہیں کر سکتے۔''

نظام نے بڑے کرب کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔''یہ بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی لیکن ایسا کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میں سیٹ میں خرابی ڈال بھی دوں تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ دن کے اندر ٹھیک کرا لیں گے۔ ان کے پاس پولیس کا ہی ایک بڑا کاریگر بندہ ہے۔ اس کے لئے یہ سب کچھ کرنا بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ الٹا نقصان یہ ہوگا کہ اگر کسی طرح انہیں پتا چل گیا کہ خرابی میں نے ڈالی تھی تو وہ مجھ پر اور جمیلہ پر اور زیادہ سختی کریں گے۔''

رستم کا دل گواہی دے رہا تھا کہ نظام ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس کی زبان پر وہی کچھ ہے جو اس کے دل میں ہے۔

گوہرا نے رستم کو اشارے سے اپنی طرف بلایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔''لالہ، حسنا اور مراد صرف نظام کی بات پر ہی یقین کریں گے۔ اگر ہم کسی طرح نظام کو واپس پولیس کے پاس

نہ جانے دیں تو ''غلط پیغام'' لالے وغیرہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

''تم ایک بات بھول رہے ہو۔'' رستم نے جواب دیا۔''انعام بھی تو پولیس کے قبضے میں ہے اور کبھی کبھی وہ نظام کی جگہ لالے سے بات کر لیتا ہے۔''

''میرے ہوتے ہوئے تو بس ایک دفعہ ایسا ہوا ہے۔'' گوہرا نے کہا۔

''لیکن میرے ہوتے ہوئے چار پانچ بار ہو چکا ہے..... ابھی کوئی دو ہفتے پہلے بھی جب نظام بیمار تھا، انعام نے ہی سیٹ پر بات کی تھی۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے؟''

''میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے۔ کسی طرح نظام ''سیٹ'' میں خرابی پیدا کر دے۔ زیادہ نہیں تو ہمیں ایک دن کی ہی مزید مہلت مل جائے گی۔ ہم اس دوران میں لالہ وغیرہ تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

گوہرا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رستم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''میرے دماغ میں ایک بات آ رہی ہے۔ اگر ہم کسی طرح اس جگہ پہنچ جائیں جہاں منحوس شکل والے سراجے کو کھڈ میں گرایا تھا تو ہمارا سفر آسان ہو سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے لالے وی جان..... وہی تنگ سرنگ والا رستہ؟''

''ٹھیک سمجھ رہے ہو۔''

گوہرا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے رستم کی بات پسند آئی تھی۔

وہ دونوں دوبارہ جیپ تک پہنچے۔ نظام اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور کسی مخبوط الحواس کی طرح بار بار اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ رستم اسے سمجھانے لگا کہ اس کی اور اس کی بیٹی کی سلامتی اسے ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان تقریباً نوے ساتھیوں کو بھی بچانا چاہتا ہے جو پولیس اور اجرالیوں کے گھیرے میں ہیں۔ وہ اس حوالے سے نظام کو سمجھانے لگ گیا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔

نظام بے حد کرب کے عالم میں بار بار یہی کہتا جا رہا تھا۔''اگر میری جمیلہ کی بات نہ ہوتی تو میں پہلے بھائی (انعام) کو گولی مارتا پھر خود کو مار لیتا۔ نہ ہم دونوں ہوتے نہ سیٹ پر لالے سے بات ہوتی.....''

رستم نے بڑی دشواری سے اسے تسلی دی اور اپنا نکتہ نظر اس کے ذہن میں ڈالا۔ رات دھیرے دھیرے دوسرے پہر کی طرف سرک رہی تھی۔ تاریک درختوں میں کھڑی اس کھٹارا جیپ کے اندر کچھ اہم فیصلے ہو رہے تھے۔

☆======☆======☆

اس رات کی صبح ہونے سے پہلے پہلے رستم اور گوہرا پوٹھوہار کے اندر کافی گہرائی میں چلے گئے تھے۔ وہ عام راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سات گھنٹے کے پیدل سفر میں ابھی تک پولیس یا پولیس کے کسی معاون سے ان کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ تاہم یہ صورتِ حال تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دونوں بخوبی جانتے تھے کہ جوں جوں ان کا فاصلہ وڈے ڈیرے سے کم ہوتا جائے گا خطرہ بڑھتا جائے گا۔

دن کی روشنی میں وہ مزید محتاط ہو گئے۔ وہ درختوں اور خودرَو جھاڑیوں کے درمیان سفر کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ نظام کے گھر سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے ایک گٹھڑی میں کچھ سامان جمع کیا تھا۔ یہ ایسا ہی سامان تھا جو دیہات میں شادی بیاہ کے موقع پر شہر سے خریدا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی طرز کے کپڑوں کے دو جوڑے بھی انہوں نے حاصل کئے تھے۔ اب وہ انہی کپڑوں میں تھے۔ دونوں نے کرتہ اور سفید مجھلی (دھوتی) پہن رکھی تھی۔ سروں پر مقامی طرز کی بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ ان پگڑیوں کے بڑے بڑے لڑ کمر پر یا سینے پر لٹکتے رہتے ہیں اور بہ وقتِ ضرورت بہ آسانی ان میں چہرہ چھپایا جا سکتا ہے۔ سفر کے دوران چہرہ چھپائے رکھنا رواج کا حصہ بھی تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے وہ ستانے کے لئے جھاڑیوں کے درمیان ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ گوہرا نے پوٹلی کھولی۔ اس میں قیمے والے پراٹھے اور دہی پودینے کی چٹنی تھی۔ یہ پراٹھے وہ نظام کے گھر سے ہی لے کر چلے تھے۔ رستم کا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں رہ رہ کر اپنے محصور ساتھیوں کا تصور اُبھر جاتا تھا۔ وہ بھوکے پیاسے موت کے گھیرے میں تھے۔ زخموں سے چُور وہ ایک ایک کر کے گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ جب آنکھوں کے سامنے لاشیں ہوں اور لاشوں پر رونے والے ہوں تو ایسے میں کھانے کو دل کہاں چاہے گا۔

گوہرا نے ایک لقمہ لیا پھر وہ پراٹھوں کو ناک سے قریب کر کے سونگھنے لگا۔ رستم کو بھی ہلکی سی باس محسوس ہوئی۔ دونوں پراٹھے خراب ہو چکے تھے۔ کھانے کے قابل نہیں تھے۔ گوہرا نے پراٹھے ایک طرف لمبی گھاس پر پھینک دیئے۔ ایک جانب سے سیاہی مائل نیولا برآمد ہوا اور ایک پتھر کے پیچھے دبک کر للچائی نظروں سے پراٹھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ تاہم وہ قریب آنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک اور موٹا تازہ نیولا برآمد ہوا..... پھر ایک اور۔ تینوں نیولے پراٹھوں سے قریباً پندرہ میٹر کے فاصلے پر کھڑے رہے۔ ان کے خدشات

انہیں خوراک کے پاس آنے سے روک رہے تھے لیکن ان کی بھوک انہیں دور جانے سے روک رہی تھی۔

پھر بھوک غالب آ گئی۔ قیمے اور گندم کی باس انہیں پراٹھوں کی طرف کھینچنے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے پراٹھوں کے قریب پہنچ کر پھر ایک دم جھپٹے اور انہیں کھینچ کر نامعلوم بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ رستم نے پتھر سے ٹیک لگا کر سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔

''دیکھا گوہرے! سب کچھ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ دانے دانے پر کھانے والے کی مہر ہے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو لالے دی جان۔'' گوہرا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یہ پراٹھے ہم کہاں سے لے کر چلے تھے لیکن یہ ہمارے لئے نہیں تھے۔ یہ اس جنگل میں گھومنے والے ان تین نیولوں کے لئے تھے۔''

رستم اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ گوہرا نے اوپر نیلے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس کی آنکھوں میں مستی سی بھر گئی۔ وہ بولا۔ ''سب تقدیر کا پھیر ہے جان جی۔ اب دیکھو، میں نے کبھی سفنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سینما کے پردے پر بجلیاں گرانے والی عاصمہ میرے انگ لگے گی۔ ہم تو تھیٹر اور سرکس میں اس کی نقل کرنے والی ناچیوں پر بھی سو جان سے عاشق ہو جاتے تھے۔ کہاں وہ بالکل اصلی...... سچی مچی کی سانس لیتی اور باتیں کرتی، میری ہک (چھاتی) سے لگی ہوئی تھی۔'' ان لمحوں کا تصور کر کے گوہرا ایک بار پھر نشے سے سرشار ہو گیا۔ اس کا زخمی ہاتھ اپنے سینے کو سہلا رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی تک وہاں فلم اسٹار عاصمہ کا لمس محسوس کر رہا ہو۔

اچانک رستم نے کان کھڑے کئے۔ وہ غور سے کچھ سننے لگا۔ ''کوئی آواز سنی تم نے؟''

گوہرا نے بھی غور کیا۔ ''ہاں، گونج سی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے یہ ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔''

دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر پروں کی بہت مدھم پھڑپھڑاہٹ سنائی دی... یقیناً یہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ وہ کافی فاصلے سے گزر کر مغرب کی سمت چلا گیا۔

گوہرا نے سفید رنگ کی وہ بڑی گٹھڑی کھولی جو وہ نظام کے گھر سے لے کر چلے تھے۔ اس گٹھڑی میں جہیز کا سامان تھا اور تھوڑی سی خشک مٹھائی بھی تھی۔ پیٹ پوجا کرنے کے لئے گوہرا نے یہ مٹھائی کھائی۔ جہیز کے سامان میں دلہن کے پانچ چھ جوڑے، چاندی کی چوڑیاں، چند نقلی زیورات اور میک اَپ کا سستا سا سامان تھا۔ اس سامان کو مقامی زبان میں ڈاج یا داج

کہا جاتا تھا۔ نظام کے گھر سے روانہ ہوتے وقت نظام کی بیوی نے رستم کے کہنے پر ایک پڑوسی کی مدد سے یہ سارا انتظام کیا تھا۔ رستم نے اس سامان کی باقاعدہ قیمت ادا کی تھی بلکہ دگنی قیمت دی تھی۔ اس گٹھڑی کا مقصد راستے میں پیش آنے والے خطرات سے بچنا تھا۔ اگر کہیں پولیس یا پولیس کے ٹاؤٹوں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ داج کی چیزیں لینے شہر گئے ہوئے تھے، اب واپس اپنی ڈھوک جا رہے ہیں۔

میدے، گھی اور چینی کی بنی ہوئی یہ مٹھائی شکر پارے کہلاتی تھی۔ گوہرا بڑی رغبت سے قریباً ایک کلو شکر پارے کھا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبی ڈکار لی۔ چادر کے نیچے اپنے پستول کو ٹٹولا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگالی۔ آخری عورت کے بعد گوہرا آخری کھابے سے بھی مستفیض ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی کا سفر بتدریج موت کی منزل کے قریب آ گیا تھا لیکن وہ بے خبر تھا جیسے ہر بشر ہوتا ہے۔

اچانک نشیب سے ایک انسانی آواز سنائی دی۔ اب تک کے سفر میں انہیں مختلف جنگلی جانوروں اور پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں لیکن یہ پہلی انسانی آواز تھی۔ یہ گانے کی آواز تھی۔ کوئی عورت دوہے کے انداز میں اپنی سُریلی آواز بکھیر رہی تھی، گاہے بگاہے ایک مرد کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہو جاتی تھی۔

رستم اور گوہرا کا تجسس بیدار ہوا۔ انہوں نے فوراً سگریٹ گل کئے اور پتھروں کی اوٹ سے نیچے نشیب میں دیکھا۔ پہلے تو کچھ دکھائی نہیں دیا پھر ڈھلتے سورج کی روشنی میں تین افراد نظر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ مردوں کے سروں پر پگڑ تھے۔ وہ مقامی دکھائی دیتے تھے۔ عورت بھی مقامی انداز کی سیاہ جھلی اور کُرتے میں تھی۔ وہ کہیں سے سفر کرتے ہوئے آئے تھے اور اب کھانا کھانے کے لئے نیم کے پیڑوں کے سائے میں بیٹھ گئے تھے۔

عہدِ قدیم سے چلا آ رہا ہے کہ جب بھی حضرت انسان کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جسم کو تھکن کے بعد آرام محسوس ہوتا ہے تو اس کا دل گنگنانے کو چاہتا ہے۔ غالباً یہ افراد بھی اسی کیفیت کے زیر اثر تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ عورت نے ایک پرات کو اوندھا کر کے اسے طبلہ بنا رکھا ہے۔ طبلہ بجانے کے ساتھ ساتھ وہ گا بھی رہی تھی۔ ایک مرد اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

رستم نے گوہرا کو اشارہ کیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ گوہرا نے تائیدی انداز میں سر ہلایا، تاہم اس کی نگاہیں بدستور مرد و زن پر رہیں۔

رات بھر کے سفر نے دونوں کو قدرے تھکا دیا تھا۔ ذرا ستا لینا بہتر تھا۔ جگہ ہموار اور

صاف ستھری تھی۔ دونوں لیٹ گئے۔ موسم گرم تھا تاہم ٹیلے کی بلندی کو چھونے والی ہوا تمازت کو بڑھنے نہیں دے رہی تھی۔ رستم کو اونگھ آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو سائے پہلے سے لمبے دکھائی دیئے۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ سویا رہا تھا۔ گوہرا اس کے پہلو میں نہیں تھا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دس پندرہ قدم کی دوری پر ایک چٹان نما پتھر کے پاس کھڑا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے نشیب میں نظر آنے والے تینوں مرد و زن اس کے ساتھ تھے۔ تینوں بھک منگوں کی طرح پتھریلی زمین پر بیٹھے تھے۔ دونوں مردوں نے گوہرا کے سامنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور کسی بات پر گھگھیا رہے تھے۔ دونوں مرد گہرے سانولے رنگ کے تھے۔ جواں سال عورت کے کانوں میں چاندی کے جھمکے اور ہاتھوں میں پلاسٹک کی بہت سی رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔ دو پٹاریاں، ایک کینوس کا بڑا تھیلا، اور دو عدد پیروں والی بینیں بھی ان کے پاس ہی دھری تھیں۔

رستم اٹھ کر ان کے قریب پہنچا۔ وہ تینوں کچھ اور بھی ڈرے ہوئے نظر آنے لگے۔ گوہرا نے کہا۔ ''لالے دی جان! میں ان کے پاس نہیں گیا تھا۔ یہ خود ہی چکراتے ہوئے اس طرف نکل آئے۔ ان کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگ رہی تھیں۔ میں نے انہیں یہاں بٹھا لیا۔''

رستم ایک لمحے میں جان گیا کہ گوہرا حسبِ عادت جھوٹ بول رہا ہے۔ عورت کی کشش اسے بڑی جلدی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ رستم کے سونے کے بعد یقیناً اس نے خود ہی پیش قدمی کی تھی اور ان کے پاس جا پہنچا تھا یا پھر جب وہ روانہ ہونے لگے تو انہیں گھیر کر یہاں لے آیا تھا۔ اب وہ انہیں یہاں بٹھا کر ان پر رعب ڈال رہا تھا۔

''کیا کہتے ہیں یہ؟'' رستم نے گوہرا سے پوچھا۔

گوہرا کی بجائے درمیانی عمر کا مرد ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''سرکار! اساں جھوٹ نئیں بول رہے۔ اساں جوگی لوگ ہیں۔ کیڑوں (سانپوں) کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ حق حلال کی روزی کھاتے ہیں۔ چور اچکے نئیں ہیں جی اساں۔''

گوہرا گرجا۔ ''چوروں ڈاکوؤں کے ماتھوں پر نہیں لکھا ہوتا۔'' پھر رستم کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیوں لالے دی جان! چوروں ڈاکوؤں کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے؟''

''کیا ہے ان پٹاریوں میں؟'' رستم نے پوچھا۔

جواں سال مرد نے فوراً دونوں پٹاریوں کے ڈھکنے کھول دیئے۔ دونوں میں سانپ تھے۔ ایک میں پانچ چھ فٹ کا کوبرا تھا۔ دوسرے میں ایک موٹا تگڑا اور غیر زہریلا سانپ تھا جسے مقامی زبان میں گوارہ کہا جاتا تھا۔

رستم کی نگاہ جواں سال عورت پر پڑی تو وہ ذرا سا چونکا۔ مردوں کی طرح عورت بھی بہت غریب اور مفلوک الحال دکھائی دیتی تھی۔ اس کی میلی کچیلی قمیص اس کے بازو کے نیچے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس پھٹے ہوئے حصے سے اس کا گندی جسم اور اندرونی لباس کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ رستم نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔ پھر اس نے گھور کر گوہرا کی طرف دیکھا...... گوہرا گڑبڑا گیا۔ رستم نے اسے اشارہ کیا اور ایک طرف لے گیا۔ "تمہیں کہا بھی تھا کہ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔" رستم نے ناراض سرگوشی کی۔

گوہرا دانا لہجے میں بولا۔ "رستم بھائی! یہ لوگ یہاں چپے چپے پر گھومتے پھرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ان سے ذرا بات شات کریں۔ ہمیں پتا چل جائے گا کہ پولیس کا زور کس طرف ہے اور ہمارے لئے کون سا رستہ ٹھیک رہے گا۔"

"وہ...... عورت کے کپڑے کیسے پھٹے؟" رستم نے اچانک سوال کیا۔

گوہرا مسکرایا۔ "مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے سر کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ پہلے ہی پھٹے ہوئے تھے۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اب لالے دی جان! ذرا یہ بھی غور کرو کہ یہ پھٹے کس جگہ سے ہیں۔ جہاں فوراً سے پہلے مرد کی نظر پڑے۔ اسی لئے تو مجھے شک ہو رہا ہے ان پر۔ شاید یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سانپ پکڑنے کے ساتھ ساتھ دو نمبر کام بھی کرتے ہوں۔"

"دو نمبر کرتے ہوں یا تین نمبر۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بکھیڑے میں نہ پڑو۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں گوہرے۔ عورت کے لئے بڑے ندیدے ہو تم۔"

گوہرا جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر رستم کا موڈ دیکھ کر چپ ہوگیا۔ وہ دونوں پھر ان تینوں کے پاس پہنچے۔ وہ زمین پر پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہرے مصیبت زدہ دکھائی دیتے تھے۔ اس مرتبہ عورت نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اساں تم سے جھوٹ نئیں بول رہے سرکار! جو کچھ بتایا ہے سچ بتایا ہے۔ یہ میرا جیٹھ مختار ہے، یہ میرا بندہ انورا ہے۔ اساں گریب اور شریف لوگ ہیں۔"

رستم نے جواں سال عورت کے جیٹھ مختار سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تم جانتے بھی ہو کہ یہ خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔ تم دونوں اس جوان عورت کے ساتھ یہاں گھوم رہے ہو اور گانے گا رہے ہو۔ تم نے اسے گلشن اقبال سمجھا ہوا ہے؟"

اچانک رستم کو ایک مختصر "بیپ" سنائی دی۔ جیسے کسی موبائل یا واکی ٹاکی سیٹ پر سگنل

موصول ہوا ہو۔ موبائل تو اس علاقے میں کام نہیں کرتا تھا پھر یہ "بیپ" کس چیز کی تھی۔ رستم کے حساس کانوں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ "بیپ" کی آواز جواں سال عورت کی طرف سے آئی ہے۔ بیپ کی آواز کے فوراً بعد ہی عورت نے اپنا ایک ہاتھ غیر محسوس طور پر اپنی میلی کچیلی اوڑھنی کے نیچے سرکا لیا تھا۔ یکا یک رستم کو شدید ترین خطرے کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ ردِعمل کے طور پر کچھ کرتا اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ بالکل غیر متوقع طور پر درمیانی عمر کے شخص نے اپنے لباس میں سے ایک ماؤزر برآمد کیا اور اس کا رخ رستم کے سر کی طرف کر دیا۔ "خبردار!" وہ بدلے ہوئے لہجے میں چنگھاڑا۔ "چالاکی دکھائی تو بھون کر رکھ دوں گا۔"

رستم جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ دوسرا شخص بھی اپنی دونوں رانوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر وہاں سے پسٹل برآمد کر چکا تھا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں ازار بند کی بجائے لاسٹک تھا اور اس نے پسٹل نکالنے کے لئے اپنی شلوار کے نیفے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں گوہرا کو کور کر لیا۔ جواں سال عورت نے اپنی میلی کچیلی اوڑھنی اُتار پھینکی۔ اس کی شلوار میں سامنے کی طرف ایک تھیلی نما جیب تھی۔ اس جیب میں سے اس نے سیاہ رنگ کا ایک اسمارٹ ساواکی ٹاکی نکال لیا اور خونی نظروں سے رستم و گوہرا کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ تم دونوں۔" درمیانی عمر کا وہ شخص گرجا، جس کا نام عورت نے مختار لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ سپیرا نظر آتا تھا لیکن اب وہ سرتاپا پولیس والا تھا۔ اس کا لب ولہجہ اور انداز گواہ تھا کہ وہ پولیس والا ہی ہے۔ اس نے اب اپنا ماؤزر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔ انگلی لبلبی پر تھی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ رستم کی ذرا سی جنبش پر گولی چلا دے گا۔ غالباً وہ رستم کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم نے گوہرا کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "اب خوش ہو لالے دی جان۔" اس نے گوہرا کی نقل اُتاری۔

گوہرا نے لاپرواہی سے سر جھٹکا، جیسے کہہ رہا ہو یہ دو بجوگڑے اور ایک بجوگڑی ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ابھی دیکھنا یہ تینوں ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑتے اور رحم کی بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔

درمیانی عمر والے شخص نے اپنی قمیص کی بغلی جیب میں سے ایک تہہ کیا ہوا لمبوترا کارڈ نکالا۔ جیسے رنگ ساز کمپنیوں کے کلر شیڈ کارڈز ہوتے ہیں۔ رستم نے دیکھا کہ اس کارڈ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویریں پرنٹ تھیں۔ غالباً یہ وہ خاص خاص اشتہاری اور مفرور ملزم تھے جو

یہاں پولیس کو درکار تھے۔ درمیانی عمر کے شخص نے کارڈ پر چھپی ہوئی کسی تصویر کا موازنہ رستم کے چہرے سے کیا۔ پہلے اس نے تصویر کو دیکھا پھر رستم کے چہرے کو، پھر تصویر کو...... پھر چہرے کو۔ یہ عمل تین چار بار دہرانے کے بعد اس کے چہرے پر شدید سنسنی نظر آنے لگی۔ رستم کو یوں لگا کہ وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ چوکس ہو گیا ہے۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور آنکھیں بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ اس نے تصویر اپنے ساتھی کو بھی دکھائی اور معنی خیز نظروں سے تیسری ساتھی کو دیکھا۔

درمیانی عمر کے شخص نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''میں سپیشل برانچ کا انسپکٹر آصف ہوں...... یہ میرا اے ایس آئی باجوہ ہے اور یہ اے ایس آئی فرخندہ چوہدری ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں موقعے پر مرنے کی بجائے خود کو قانون کے حوالے کرنا پسند کرو گے۔ قبر میں جانے سے جیل جانا تو بہرحال بہتر ہی ہے۔''

وہ خود کو با اعتماد اور پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ رستم کی دہشت نے اس پر اثر کیا ہے اور وہ ایک بہت مضبوط شخص ہونے کے باوجود اعصابی کشیدگی کا شکار ہے۔ رستم بخوبی جانتا تھا کہ ایسا مدِمقابل زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ فی الوقت پوزیشن ایسی تھی کہ یہ انسپکٹر کسی غلط فہمی کے سبب بھی اپنے ماؤزر کی لبلبی دبا سکتا تھا اور یہی اندیشہ اس کے ساتھی کی طرف سے بھی تھا۔ بلکہ ساتھی زیادہ ''ٹینس'' تھا۔

رستم اور گوہرا اپنے ہاتھ بلند کئے کھڑے رہے۔ ان کے ذہن بہت تیزی سے اس صورتِ حال کا حل سوچ رہے تھے۔ رستم کو پہچاننے کے بعد انسپکٹر اور سب انسپکٹر احتیاط کے طور پر دو دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے رستم اور گوہرا پر یوں نگاہیں گاڑ رکھی تھیں جیسے وہ بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے یا یکایک زمین میں سما جائیں گے۔

انسپکٹر نے اپنی ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''رابطہ کرو۔ ڈپٹی صاحب کو بتاؤ کہ دو سانپ پکڑے ہیں ہم نے اور اندازہ یہی ہے کہ یہ دونوں بڑے سانپ ہیں۔ دونوں کنگ کوبرے ہیں۔''

یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ لیڈی اے ایس آئی اپنے واکی ٹاکی کی طرف متوجہ ہو گئی اگر وہ ایک بار یہ پیغام وائرلیس پر چلا دیتی تو پھر پانی سر سے گزر جاتا۔ انہیں پیغام چلنے سے پہلے کچھ کرنا تھا مگر صورتِ حال ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ کچھ کر سکتے۔

''میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں لالے دی جان۔'' گوہرا نے کہا اور ہاتھ نیچے گرا

کر دو قدم سب انسپکٹر کی طرف بڑھا۔

''خبردار...... خبردار۔'' سب انسپکٹر وحشت سے چلایا اور گوہرا کے دو قدموں کے بدلے دو قدم پیچھے پلٹا۔

گوہرا غالباً یہی چاہتا تھا۔ سب انسپکٹر فاصلہ برقرار رکھنے کے لئے دو قدم پیچھے ہٹا تو اس کا دایاں پاؤں نشیب میں چلا گیا، وہ گرا تو نہیں تھا لیکن بُری طرح ڈگمگایا گوہرا نے یہ مہلت کافی سمجھی۔ وہ عقاب کی طرح سر جھکا کر سب انسپکٹر پر جھپٹا اور اسے رگیدتا ہوا دور لے گیا۔ انسپکٹر کی توجہ فقط ایک لحظے کے لئے اس واقعے کی طرف گئی۔ رستم کو اس سے آدھا وقت بھی ملتا تو وہ اپنے مدِمقابل کو معاف نہ کرتا۔ اس نے جست لگائی اور اُڑتا ہوا انسپکٹر آصف پر آیا۔ انسپکٹر نے آخری وقت میں بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہیں سکا۔ اس کے ماؤزر نے دھماکوں کے ساتھ تین گولیاں اُگلیں لیکن وہ آسمان کی طرف پرواز کر گئیں۔ رستم نے انسپکٹر کی پسٹل والی کلائی جکڑ لی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ایک پتھر آ گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے رستم کے منہ پر زوردار ضربیں لگانا چاہیں...... مگر وہ رستم کے چہرے کو چُھو نہ سکا۔ رستم نے خود کو پیچھے کی طرف ہٹا کر خود کو اس وار سے بچایا۔ اسی دوران میں رستم اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال چکا تھا۔ صرف ایک فٹ کے فاصلے سے اس نے انسپکٹر کے سر پر دو فائر کئے۔ انسپکٹر کی کھوپڑی سے خون کی دو دھاریں بہہ نکلیں۔

جس وقت گوہرا نے سب انسپکٹر پر چھلانگ لگائی تھی، سب انسپکٹر نے ایک گولی چلائی تھی۔ رستم کو خدشہ تھا کہ اس گولی نے گوہرا کو نقصان نہ پہنچایا ہو...... انسپکٹر آصف سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے بھی رستم کے ذہن میں گوہرا کے حوالے سے تشویش رہی تھی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں عدم آباد کا ٹکٹ تھمانے کے بعد رستم کو محسوس ہوا کہ اس کے عقب میں کوئی بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اسے لگا کہ یہ گوہرا ہے لیکن جب اس نے مڑ کر دیکھا تو دل اچھل کر رہ گیا۔ یہ گوہرا کا مدِمقابل سب انسپکٹر باجوہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور وہ رستم کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ رستم نے پھرتی سے کروٹ لی اور نیم مُردہ انسپکٹر کو اپنے اوپر کر لیا۔ سب انسپکٹر نے رستم پر تین فائر کئے۔ یہ فائر بدحواسی میں کئے گئے تھے لہٰذا تینوں رائیگاں گئے۔ صرف ایک گولی انسپکٹر آصف کے جسم میں کہیں لگی۔ رستم نے مُردہ انسپکٹر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر گولی چلائی۔ پہلی گولی ہی سب انسپکٹر کی پیشانی پر لگی۔ . . . وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا تقریباً رستم کے اوپر ہی آن گرا۔ اس کی پگڑی اچھل کر دور جا گری تھی۔

رستم نے خود کو بہ مشکل دونوں اہلکاروں کے نیچے سے نکالا اور گوہرا کی طرف آیا۔ گوہرا

نشیب میں اوندھے منہ پڑا تھا..... وہ مر چکا تھا۔ گولی سامنے سے اس کی شہ رگ میں لگی تھی اور عقب سے گردن پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کی گردن کے عقبی حصے پر خون اور گوشت کے چند چھوٹے چھوٹے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔

''گوہرا..... گوہرا۔'' رستم چلایا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

اس نے مڑ کر مُردہ اہلکاروں پر دو دو فائر مزید کئے۔ پھر ایک دم اس کا دھیان ان کی تیسری ساتھی کی طرف چلا گیا۔ رستم نے اہلکاروں کے ساماں میں موجود لانگ رینج کی سیون ایم ایم رائفل اٹھائی اور چند قدم بھاگ کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اسے لیڈی اہلکار دکھائی دی۔ وہ جان بچانے کے لئے تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک فرلانگ دور پہنچ چکی تھی۔ نشیب میں اس کا سراپا مزید دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا زندہ رہنا رستم کی زندگی کے لئے مزید خطرات کا باعث تھا۔ اس کے پاس واکی ٹاکی تھا جس پر وہ کسی بھی وقت اپنے محکمے کے لوگوں سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے رائفل کو ایک پتھر پر ٹیکا اور خود کو پُرسکون کرتے ہوئے جواں سال عورت کا نشانہ لیا۔ اس کی انگلی لبلبی پر پہنچی۔ اسے اپنے نشانے پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے دوسری گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

جواں سال عورت کے بھاگنے کے انداز میں دنیا جہاں کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ وہ گرتی پڑتی جا رہی تھی اور مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوٹی کھل گئی تھی اور بال بکھر گئے تھے۔ اسے مارتے ہوئے رستم کو افسوس ہو رہا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ مار دیا مر جاؤ والا کھیل ہے۔ اس کی انگلی لبلبی پر پہنچی لیکن عین اس وقت اس کے حساس کانوں نے ایک بار پھر ''بیپ'' کی مدھم آواز سنی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ واکی ٹاکی سیٹ چند میٹر دور گھاس پر پڑا تھا۔ یقیناً فرخندہ نامی یہ پولیس اہلکار بدحواسی میں بھاگتے ہوئے یہ سیٹ یہاں گرا گئی تھی۔ ہاں کبھی بدحواسی بھی زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔ رستم لیڈی اہلکار کو نشانہ بنائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

واکی ٹاکی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر گوہرا کی طرف آیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان انگاروں کے عقب میں آتشیں آنسو تھے۔ اس نے گوہرا کو سیدھا کیا۔ اس کی شہ رگ سے بہنے والا خون اس کے سینے تک چلا گیا تھا..... اس نے گوہرا کا سر اپنی گود میں رکھا۔ اس کی آنکھیں بند کیں۔ بے ترتیب مجھلی (دھوتی) اس کی نیم عریاں ٹانگوں پر برابر کی اور پگڑی کے پلو سے اس کا کھلا ہوا منہ باندھ دیا۔

''دیکھ لیا ناں، من مانی کا نتیجہ۔'' وہ گوہرا کو مخاطب کرتے ہوئے بڑبڑایا اور دو تین منٹ تک گم صم بیٹھا رہا۔ وہ زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے گوہرا کے لباس میں سے اس

کی ساری ذاتی اشیاء نکال لیں..... قریب ہی ایک قدرتی گڑھا موجود تھا۔ رستم نے باری باری تینوں لاشیں اٹھائیں اور گڑھے میں رکھ کر اوپر خشک ٹہنیاں اور گھاس پھونس ڈال دی۔ یہ عارضی انتظام تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس بہت جلد یہاں پہنچ کر تینوں لاشوں کو تحویل میں لینے والی ہے۔

اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ڈپٹی ریاض کے خاص ماتحت بھی اس کی طرح عیار اور حیلہ ساز تھے۔ ڈپٹی ریاض اپنے مخصوص انداز میں کام کر رہا تھا۔ اس کے لوگ بھیس بدل کر علاقے میں گھوم رہے تھے۔ یہ ''تین کی ٹولی'' بھی ان میں سے ایک تھی۔ لڑکی نما عورت کو یقیناً چارے کے طور پر ساتھ رکھا گیا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ علاقے میں بھٹکنے والے آوارہ گردوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے ایسی عورت ''نعمتِ غیر مترقبہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ سنسان ٹیلوں میں ایسی عورت کی دید کسی بھی جوان مرد کو اپنی پناہ گاہ سے نکلنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ ان ٹیلوں میں بھٹکنے کے ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔ اس گلوکاری کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا کہ اگر اردگرد کوئی ''شکار'' موجود ہے تو وہ اس آواز کی کشش سے دام میں چلا آئے۔ پوشیدہ حصے سے لباس کا پھٹا ہونا بھی ''دام'' کا حصہ ہی تھا۔

رستم کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اردگرد کوئی اور پولیس والا موجود نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو فائرنگ کے بعد کہیں آس پاس ہلچل کے آثار ضرور دکھائی دیتے۔ دوسرا ثبوت یہ تھا کہ لیڈی پولیس اہلکار وہاں سے بھاگی تو ضرور تھی لیکن اس نے کافی فاصلے پر جانے کے بعد بھی مدد کے لئے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا رستم اب جلد سے جلد یہاں سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔

اس نے گوہرا کا پسٹل گوہرا کے ساتھ ہی گڑھے میں دفن کر دیا تھا۔ گڑھے پر ایک الوداعی نگاہ ڈال کر اس نے داج (جہیز) کے سامان والی گٹھڑی اٹھائی اور آگے چل دیا۔ سانپوں کی دونوں پٹاریوں، بینوں اور اہلکاروں کے دیگر سامان پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا وہ نشیب میں اُتر گیا۔ اس کے قدموں میں خاطر خواہ تیزی تھی۔

رستم بے حد دشوار راستے پر بلا رکے سفر کرتا رہا اور آدھی رات کے وقت اس مقام تک پہنچ گیا جہاں سے چند روز پہلے اس نے شیطان صفت سراجے کو بلندی سے گرا کر موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر چند دن پہلے کی ساری باتیں رستم کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ چند دن پہلے جب وہ اس مقام پر پہنچا تھا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں والا گوہرا تھا، شکرا چشم سراجا تھا اور جواں سال لیکن ڈرا ڈرا سا

فدا تھا۔ جو شکرا چشم سراجے کو پانچ ہزار کا نذرانہ دے کر پولیس کے مہلک گھیرے سے نکلا تھا۔ سراجے کو موت کے گھاٹ اُترتے دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہو گیا تھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا تھا پتا نہیں کہ اب وہ کہاں تھا...... لیکن باقی دو افراد یعنی گوہرا اور سراجے کے بارے میں رستم کو پتا تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ کبھی واپس نہ لوٹنے کے لئے عدم آباد میں مقیم ہو چکے تھے۔

اب رستم ایسے مقام پر تھا کہ کسی بھی وقت پولیس یا پولیس کے مددگار اجرالیوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ ان لمحوں میں رستم کسی شکاری جانور ہی کی طرح چوکنا اور خطرناک نظر آ رہا تھا۔ اس کی تمام حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور قرب و جوار پر اس کی مکمل نگاہ تھی۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ علاقے میں موجود پولیس یہاں اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکی ہے اور ہر طرح سے ہائی الرٹ ہے۔

ٹیلوں کے درمیان واقع سرنگ نما راستے کا دہانہ ڈھونڈنے میں رستم کو تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن ناکامی نہیں ہوئی۔ وہ جب دہانے میں داخل ہو رہا تھا تو کچھ آوازیں ہوا کے دوش پر تیر کر اس کے کانوں تک پہنچیں۔ یہ جیپوں کے انجنوں کی آوازیں تھیں اور ان کے ساتھ جو دوسرا شور تھا وہ یقیناً پولیس کے بُو گیر کتوں کا تھا۔ تنگ و تاریک راستے میں قریباً پچاس کلومیٹر آگے جانے کے بعد رستم نے اپنے سامان میں سے ٹارچ نکال کر روشن کر لی اور نسبتاً تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ پولیس والوں کے ساتھ مار کٹائی میں اس کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی اور چلتے ہوئے یہ چوٹ تکلیف دے رہی تھی، لیکن اس چوٹ سے کہیں گہری چوٹیں اس کے سینے میں تھیں۔ جو ہر قدم پر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھیں۔ ان میں سے تازہ ترین چوٹ گوہرا کی موت تھی۔ وہ بالکل اچانک ہی رستم سے جدا ہوا تھا۔ صرف ایک گولی اس کے پہاڑ جیسے مضبوط اور سنگلاخ جسم کو چاٹ گئی تھی۔ زندگی ایسی ہی غیر متوقع اور غیر ہموار ہوتی ہے۔ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ گوہرا ایک دلیر اور جنگجو شخص کا نام تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا تھا۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح اسے بھی معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اسے ناگہانی موت مرنا ہے۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ وہ ایک ہنگامہ خیز موت مرے گا۔ ایسی موت جو ایک ڈاکو کے شایانِ شان ہوگی۔ وہ اپنے درجنوں مدِمقابل افراد کو موت کے گھاٹ اُتارے گا اور زخمی کرے گا۔ اس کے اپنے جسم پر بھی زخموں کے بے شمار تمغے سجیں گے۔ لیکن جو ہوا تھا وہ بالکل برعکس تھا۔ پسٹل کی ایک گولی نے چند سیکنڈ کے اندر اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ تاہم ایک بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی موت

دلیرانہ تھی۔ اس نے یہ دیکھنے کے بعد کہ لیڈی پولیس اہلکار واکی ٹاکی پر اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرنے جا رہی ہے اپنی جان کی بازی لگائی تھی اور 38 بور پسٹل کی پرواہ کئے بغیر سب انسپکٹر پر جا پڑا تھا۔

یہ دراڑ نما راستہ پہلے کشادہ تھا پھر تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس میں سے کئی شاخیں نکل رہی تھیں۔ رستم کو درست راستے پر رہنے کے لئے حافظے پر بہت زور دینا پڑ رہا تھا۔ ایک دو جگہوں پر وہ بُری طرح گڑبڑایا بھی۔ یہاں چوہوں اور چمگادڑوں کے ڈیرے تھے اور ویسی ہی پریشان کن بُو تھی جو وڈے ڈیرے کی سرنگ نمبر تین میں محسوس ہوتی تھی۔

کئی فرلانگ کے تکلیف دہ سفر کے بعد جب وہ دوسرے دہانے سے باہر نکلا تو افق پہ صبح صادق کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دراڑ نما سرنگ کا یہ دوسرا دہانہ درختوں کے ایک جھنڈ میں کھلتا تھا۔ رستم کچھ دیر تک اس جھنڈ میں رہ کر اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے کچھ فاصلے پر ڈھوک شاہاں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ڈھوک کے خدوخال آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میں سے نمودار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ رستم کو کچھ فاصلے پر کھیت نظر آئے۔ وہ ان کھیتوں کی طرف چل دیا۔ یہاں ایک چشمے سے اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے بالوں کی گرد صاف کی۔

کھیتوں سے آگے ایک باغیچے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ رستم کو یاد آیا کہ مہراں نے اسے باغیچے کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ باغیچہ اس کے سسر نے ٹھیکے پر لے رکھا تھا۔ مہراں کے سسر کی بینائی بہت کم تھی۔ مہراں اپنے سسر کے ساتھ مل کر باغیچے کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس کا نکھٹو نشئی شوہر گھر میں چارپائی توڑتا تھا۔ اب دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ رستم نے دور سے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص باغیچے میں گھوم رہا ہے۔ رستم نے مہراں کے سسر کو دیکھا تھا وہ ایک لمحے میں جان گیا کہ بوڑھا شخص مہراں کا سسر ہے۔ وہ دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بڑا سا پگڑ اور ہاتھ میں لمبی سی ڈنگوری تھی۔ ایک درخت پر ٹین کے دو خالی کنستر لٹک رہے تھے۔ بوڑھا شخص اپنی ڈنگوری کے ذریعے گاہے بگاہے ان کنستروں کو بجا کر زوردار آواز پیدا کرتا تھا۔ درختوں پر خوشہ چینی کرنے والے پرندے اُڑ کر باغ کے اردگرد پرواز کرنے لگتے تھے۔ رستم کی موجودگی کو محسوس کر کے بوڑھے نے اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ سے چھجا سا بنایا اور آنکھوں کو سکوڑ کر رستم کو پہچاننے کی کوشش کی۔

”کوئی راہی ہو؟“ اس نے رستم سے پوچھا۔

”ہاں میاں جی! نظر ڈال جا رہا ہوں۔ میںڈی بھتیجی کا دیاہ ہے۔ گوجر خان سے اس کے داج کا سامان لے کر آ رہیا ہوں۔ لمبے سفر سے تھک گیا ہوں۔ ذرا دم لینے آ گیا ہوں۔“

بوڑھے نے کہا۔''آج کل حالات بڑے خراب ہیں۔ دن دن میں اپنا سفر پورا کرلو۔ رات کے وقت پولیس لوگوں کو بہت تنگ کریندی ہے۔''

''باباجی! لگتا ہے کہ پولیس تو جھلی ہی ہوگئی ہے۔ جدھر دیکھو پلسیے اوران کے ٹوکیر کھے ہرل ہرل کرتے پھر رہے ہیں۔''

''پر جس کے لئے یہ جھلے ہو رہے ہیں۔ وہ اتنی جلدی ان کے ہتھ نہیں آئے گا۔''

''تساں کس کی بات کر رہے ہو؟''

''ٹیڈا کی خیال ہے میں کس کی بات کر رہا ہوں؟''

''کدھرے تساں رستم سیال......''

''ہاں ہاں......وہی تو ہے جس نے ان پلسیوں اور اجرالیوں کو تڑتھلی ڈالی ہوئی ہے۔ ایسے لوگوں سے ایسے لوگ ہی ٹکر لے سکتے ہیں۔ وہ یہاں سے پولیس کا گھیراؤ توڑ کر نکل گیا ہے۔ دستی بم مار کر کئی پولیس والے بھی مار دیئے ہیں اس نے اور تو اور یہ بھی سنا ہے کہ پولیس کے سب سے بڑے افسر سے بھی مارا ماری کی ہے اس نے۔''

''لیکن وہ کب تک بھاگے گا باباجی! آخر تو پکڑا جائے گا۔''

''نہیں پکڑا جائے گا۔ اس کے ساتھ دعائیں ہیں۔ اس نے جن لوگوں کے ساتھ اچھا کیا ہے وہ رب سے اس کی سلامتی مانگتے ہیں۔'' بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔''یہاں سب لوگ جانتے ہیں کہ رستم سیال اور اس کے ساتھی کبھی گرفتاری نہیں دیں گے اور اگر گرفتاری کی نوبت آ ہی گئی تو پھر وہ ہنس کر موت کو گلی (گلے) لگالیں گے۔''

''کیا پولیس یہاں تساں کے ڈھوک میں بھی آئی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آئی کیا ہے، وہ تو یہاں پکا ڈیرہ ڈال کر بیٹھی ہوئی ہے۔ پلس والوں کو شک ہے کہ رستم اور اس کا ایک ساتھی ڈیرے سے بھاگنے کے بعد ہماری ڈھوک میں آئے تھے۔ پلس والوں تے اس شک کی وجہ سے ڈھوک کے مسکین لوگوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔ پلس والے ہر روز لوگوں کو تفتیش میں بٹھاتے ہیں اور ڈراتے دھمکاتے ہیں......وہ سامنے چٹا مکان دیکھ رہے ہوناں تم، وہ ڈھوک کے پٹواری ڈاہرے کا ہے۔ پولیس کے افسر وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ دیسی مرغیاں اور تیتر دیسی گھی میں بھون کر کھاتے ہیں اور لوگوں کو اپنی لال لال آنکھیں دکھاتے ہیں۔ میںڈا خیال ہے کہ اب بھی دو تین افسر تو یہاں اس مکان میں ہیں۔''

رستم نے ٹوہ لینے کی غرض سے پوچھا۔''میاں جی! سنا ہے کہ یہاں کے چوہدری دوسا

صاحب کا ایک بھائی بھی مارا گیا ہے؟''

''نہیں نہیں۔ اسے پلس نے نہیں مارا۔ پلس تو دوسا کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتی ہے اور شرابیں پیتی ہے۔ دوسا کا بھائی سراجا اپنی موت مریا ہے۔ وہ کدھرے جا رہیا تھا۔ شاید نشے میں تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کھائی میں گر گیا۔ سر دو ٹوٹے ہوگیا تھا اس کا۔ شکل نہیں دیکھی جاتی تھی۔ ڈھوک کی بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالتا تھا۔ بُرے کاموں کا بُرا انجام۔'' بوڑھے نے آخری فقرے سرگوشی کے انداز میں کہے۔

رستم نے لاٹھی میں پروئی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اُتاری اور ایک بیری کے تنے کے ساتھ رکھ دی۔ بوڑھے نے ایک چھوٹی پوٹلی کھولی۔ اس میں کھانے کے برتن تھے۔ مکئی کی روٹی، رات کا بچا ہوا شلجم کا سالن، دہی اور شکر۔ وہ بولا۔''دور سے سفر کر کے آئے ہو۔ بھوک لگی ہوگی۔ چلو آؤ شاباش۔ میںڈے ساتھ دو برکیاں (لقمے) لے لو۔''

رستم نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر بوڑھے کا اصرار دیکھتے ہوئے کھانے میں شریک ہوگیا۔ روٹی کا پہلا نوالہ لیتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ مہراں کے ہاتھ کی روٹی ہے۔ وہ اس روٹی اور سالن کے ذائقے سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔

اس نے پوچھا۔''میاں جی! تساں اس باغ کے مالک ہو یا رکھوالی کا کام کرتے ہو؟''

جواب میں بوڑھے نے جو کچھ بتایا اس نے مہراں کے بیان کی تصدیق کر دی۔ بوڑھا مہراں کا سسر تھا اور پچھلے کئی برسوں سے وہ اس باغ کا ٹھیکہ لے رہا تھا۔ اس کی محنتی بہو مہراں بھی باغبانی میں سسر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آنے والی تھی اور پھر اس نے سارا دن یہاں اپنا خون پسینہ ایک کرنا تھا۔ بوڑھا بڑے سیدھے سادے انداز میں اپنی جفاکش بہو کی تعریفیں کر رہا تھا۔ اس نے باغ کے ساتھ ہی واقع ایک کھیتی رستم کو دکھائی اور بتایا کہ یہ ہریالی اس کی بہو کی محنتوں کا ثمر ہے۔

رستم کی آنکھوں کے سامنے مہراں کا کڑیل لیکن لچک دار سراپا گھوم گیا اور اس کی سیاہ آنکھیں جن میں سادگی، محبت اور ایثار کے جذبے موجزن دکھائی دیتے تھے۔ رستم نے بوڑھے سے پوچھا۔''میاں جی! تساں اپنی نوں (بہو) کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ انہیں دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔''

بوڑھا بولا۔''وہ ابھی تھوڑی دیر میں ایتھے ہی آجائے گی پُتر... میںڈا خیال ہے کہ جیون شاہ کے مزار تک گئی ہوگی۔ آج کل روز صبح سویرے وہاں دعا مانگ کر اور نیاز چڑھا کر آتی ہے۔ بڑی نیک، شرماں والی دھی رانی ہے۔ اللہ ہر کسی کو ایسی نوں دھی دے۔''

رستم خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ بوڑھے بخشو نے کہا۔ ''پتر! تیرے پاس داج کا سامان بھی ہے۔ تھوڑی دیر دم لے کر تو یہاں سے نکل جا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اپنی ڈھوک پہنچ جا۔ ڈاکو تو پھر بھی گریب مسکین بندے کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ پلس والے اور ان کے اجرالی یار آج کل بڑا بھوترے ہوئے ہیں۔ کسی کو ماف نہیں کریندے۔ بس اللہ مولا بچائے ان لوگوں سے۔'' بوڑھے بخشو نے اپنا دایاں ہاتھ باری باری دونوں کانوں کو لگایا اور ایک بار پھر تاسف بھری نظروں سے پٹواری کے چٹے مکان کی طرف دیکھا۔

رستم نے پوچھا۔ ''پٹواری کے گھر میں کتنے پولیس والے ہیں؟''

''چار پانچ بندے ہیں۔ پر سرکاری بندہ تو ایک بھی سو پر بھاری ہوتا ہے۔ اس لئے یہ اپنی من مرضی کر رہے ہیں۔ ڈھوک میں کوئی چوں چراں نہیں کر سکتا۔ سردار دوسا بھی وہی کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں۔ اس نے بھی تو اپنی کھال بچانی ہے ناں۔ ان میں ایک وڈا تھانیدار ہے۔ دوسرا چھوٹا ہے۔ وڈا زیادہ کرخت ہے۔ بالے کی جوان بیوی کو اس نے زبردستی کام کاج کے لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ ڈھوک میں سب کو پتا ہے کہ وہ دس دن سے پٹواری کے گھر میں ہے لیکن کسی کی مجال نہیں کہ کچھ کرے۔ سب کو اپنی عزت اور جان پیاری ہے۔''

رستم اس علاقے کے غریب، پسے ہوئے طبقے کی حالتِ زار اچھی طرح جانتا تھا......

اسے پتا تھا کہ ان دور دراز علاقوں میں سرکاری اہلکار جب اپنے کسی کام سے آتے ہیں تو اپنی من مانی کرتے ہیں۔ محکمہ آب کاری کا کوئی معمولی ملازم، زرعی بینک کا کوئی نمائندہ، مردم شماری کرنے والا کوئی اہلکار یا صرف حفاظتی ٹیکے لگانے والا ڈاکٹر دیکھ کر ہی ان لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں...... پولیس کا تھانے دار تو بڑی چیز تھا لیکن پھر بھی یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ معمولی نہیں تھا۔ ڈھوک کی ایک جواں سال عورت علی الاعلان پٹواری کے گھر میں تھی اور وہیں پر وڈا اور چھوٹا تھانے دار بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عوت وہاں صرف ''گھریلو کام کاج'' کے لئے تو نہیں تھی۔

رستم نے کہا۔ ''یہ تو بڑی شرم کی بات ہے میاں جی۔ پوری ڈھوک دو تھانے داروں کے ڈر سے چپ ہے۔ یہاں زیادہ نہیں تو آٹھ دس پڑھے لکھے بندے تو ہوں گے۔ کسی نے پولیس والوں سے پوچھا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

بوڑھا بخشو زیر لب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں دنیا جہان کا کرب تھا۔ کہنے کو یہ مسکراہٹ تھی لیکن ہزار نوحوں سے زیادہ دردناک۔ وہ کہنے لگا۔ ''پتر جس دی لاٹھی اُس دی بھینس بلکہ سب کچھ اس کا۔ یہ وچارا بالا بھی تو بولنے کے جرم میں ہی پکڑیا گیا ہے ناں۔

پلس کی پوچھ تاچھ میں پھنسا تو بالے کا ہمسایہ قطب دین تھا۔ اس کے گھر کے سامنے سے کھوجی کو دو بندوں کا کھرا ملیا تھا۔ پلس کا خیال تھا کہ یہ کھرا رستم سیال اور اس کے ساتھی کا ہے۔ پلس والے بالے کے ہمسائے قطب دین کو مار کٹ رہے تھے۔ اس مار کٹ میں وچارے کی دھوتی اُتر گئی۔ وہ اپنے گھر والوں کے سامنے ننگا ہو گیا۔ یہ بالا اپنے یار کو بچانے کے لئے آگے آیا۔ پلس والوں نے اسے بھی لٹا کر مارنا شروع کر دیا اور قطب کے ساتھ ہی کھینچتے ہوئے پٹواری کے گھر لئے گئے۔ بعد میں بالے وچارے کی شامت قطب سے بھی زیادہ آ گئی۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے نمکین لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''پلس والوں کو پتا چلیا کہ مستری ناجے بہاول کا لڑکا فدا بہاول اس بالے کا بھتیجا ہے۔ فدا بہاول نے ایک سال پہلے ایک پلس والے کا دانت توڑ دیا تھا اور ڈھوک باناں سے بھاگ گیا تھا۔ اس ایک سال پرانی گل کی وجہ سے بالے کی سخت شامت آ گئی۔ پلس والوں کو پتا چلیا کہ فدا بہاول اب تک بالے کے پاس ہی چھپا ہوا تھا۔ پلس والوں نے بالے پر الزام لگایا کہ اس کے پاس فدا کے علاوہ بھی مفرور اور اشتہاری آ کر ٹھہرتے رہتے ہیں۔ اے پلس والے بندے کو ایسے ہی گھیر گھار کر پھنسا لیتے ہیں۔ دو دن تک پٹواری کے گھر میں پلس والوں نے بالے کو اتنی مار لگائی کہ اس کی چانگریں (دردناک چیخیں) پوری ڈھوک سنتی رہی۔ بعد میں سرپنچ دوسا لوگوں کو دکھانے کے لئے بالے کا ہمدرد بن گیا اور پلس والوں سے اس کی جان چھڑائی۔ سب کو پتا ہے کہ لوگوں کو پھنسانے میں دوسا اور پٹواری ڈاہرا ہی ہیں۔ بعد میں ہمدرد بن کر ان کو چھڑاتے بھی ہیں۔ پٹواری ڈاہرا کا گھر تو بالکل تھانہ بنا ہوا ہے۔''

''بالے کی بیوی کیسے پہنچی ڈاہرے کے گھر میں؟''

''بالا چھوٹ کر گھر آیا تو دوسرے دن اس کی بیوی کو ''کام کاج'' کے لئے ڈاہرے پٹواری نے اپنے گھر بلا لیا۔ بہانہ یہ تھا کہ روز چھ سات بندوں کی روٹی پکانی ہوتی ہے۔ ڈاہرے کی اپنی دو بیویاں ہیں۔ ایک بچہ پیدا کرنے کے لئے پیو کے گھر گئی ہوئی ہے۔ دوسری کو ڈاہرے نے خود کہیں بھیج دیا ہے۔''

بابے بخشو نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی آواز کچھ اور دھیمی کی اور بولا۔ ''اصل میں ہوا یہ تھا کہ پٹواری ڈاہرے نے بالے کی جوان بہن کو بلایا تھا تھانے دار کی دل پشوری کے لئے۔ بالے کی بیوی نے اپنی ننان (نند) کو بچانے کے لئے قربانی دی اور خود چلی گئی پٹواری کے گھر۔'' بابے بخشو کی آواز گہرے کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

بابا بخشو جو کچھ بتا رہا تھا وہ رستم کے لئے ہرگز انوکھا نہیں تھا۔ دور دراز پسماندہ علاقوں میں زمانوں سے یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔ رستم جانتا تھا کہ لالہ فرید، حسنا گجراتی، مراد اور گوہرا جیسے لوگ ایسے ہی تو نہیں بنتے۔ خود رستم کی اپنی کہانی بھی کون سی مختلف تھی۔ اسے اپنے سینے میں آگ سی بھڑکتی محسوس ہوئی۔

دفعتاً بخشو نے اپنی کمزور آنکھیں سکوڑ کر پگڈنڈی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''وہ دیکھو...... وہ نسواری کپڑوں والا بندہ۔ مینڈا خیال ہے کہ وہ بالا ہی ہے۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہیں ناں؟''

رستم نے دیکھا۔ کچھ فاصلے سے اٹھائیس تیس سال کا ایک شخص ذرا لنگڑاتا ہوا سا گزر رہا تھا۔ آٹھ نو ماہ کے دو بچے اس کی گود میں تھے۔ غالباً یہ دونوں جڑواں تھے۔ جواں سال شخص کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں استری کئے ہوئے کچھ کپڑے تھے۔ رستم نے بوڑھے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں دو بچے بھی ہیں اس کے پاس۔''

''یہی بالا ہے۔'' بوڑھے بخشو نے کہا۔ ''شاید یہ پٹواری کے گھر جا رہیا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانے۔''

''دودھ پلانے؟''

''آہو پُتر! یہ بالے کے بچے ہی ہیں۔ دونوں جوڑے ہیں۔ ان کی ماں تو پٹواری کے گھر میں پھنسی ہوئی ہے۔ بچے رو رو کر بے حال ہوتے تھے۔ اب بالا دو تین ٹائم انہیں پٹواری کے گھر لے جاتا ہے، ماں سے ملوانے۔''

رستم کے سینے میں بھڑکتی آگ کچھ اور فروزاں ہوگئی۔ نس نس تڑخنے لگی۔ بوڑھے بخشو نے مقامی انداز میں بالے کو آواز دی۔ ''ہو بالے...... ہو...... اراں تھی (اِدھر آؤ)''

بالے نے ٹھٹک کر باغیچے میں بیٹھے رستم اور بخشو کی طرف دیکھا پھر لنگڑاتا ہوا ان کی طرف چلا آیا۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر نیل نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ اس مار پیٹ کی نشانیاں تھیں جو چند دن پہلے پٹواری ذاہرے کے گھر میں پولیس والوں نے اس سے کی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ کرتے میں پیوند تھے۔ وہ بے چارگی اور غربت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دونوں بچوں کے علاوہ شلوار قمیص کے تین عدد استری شدہ کلف لگے جوڑے تھے اور ایک ٹرانزسٹر ریڈیو تھا۔ وہ یہ سامان یقیناً اپنے پلس والے کرم فرماؤں کے لئے لے جا رہا تھا۔

بابا بخشو اور بالا [illegible] بیچ میں باتیں کرنے لگے۔ رستم انہیں باتیں کرنے کا موقع

دینے کے لئے اٹھ گیا۔ اس نے ایک کیکر سے مسواک توڑی اور چشمے کے پانی کے پاس بیٹھ کر مسواک کرنے لگا۔ مسواک کرتے ہوئے اس کی نگاہیں دور پٹواری کے چٹے مکان پر لگی ہوئی تھیں۔ اس دور دراز علاقے میں بھی پٹواری کے گھر کی چھت پر ڈش اینٹینا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کے گھر میں جنریٹر وغیرہ بھی ہوگا۔ دور کہیں ٹیلوں میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ پرندوں کی ایک ڈار مغربی افق سے نمودار ہوئی اور پرواز کرتے کرتے مشرقی ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ بہت اوپر گدلے آسمان پر کچھ چیلیں اور گدھ چکراتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں گرد آلود ہوا کا دباؤ تھا۔ یہ آندھی اور ابر آلود موسم کا اشارہ تھا۔

بالا کچھ دیر تک بخشو سے مصروف گفتگو رہنے کے بعد اٹھا اور اپنے راستے پر چل دیا۔ بخشو سے بات کرنے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ رنجور نظر آنے لگا تھا۔ رستم کو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ اس کے جانے کے بعد رستم پھر بخشو کے پاس آ بیٹھا۔ بوڑھے بخشو نے اپنے کندھے کے صافے سے آنکھوں کی نمی صاف کی اور آہ بھر کر بولا۔ ''اوپر والا بھی پتا نہیں کیوں ہم گریبوں کا تماشا دیکھتا رہتا ہے؟''

''کیا ہوا میاں جی؟''

''وہی جو اساں جیسے لوگوں کا نصیبا ہوتا ہے۔ بالے کے ساتھ تو وہی گل ہوئی ہے کہ جوتے بھی کھا لئے اور گنڈے بھی۔ بہن کو بچانے کے لئے بیوی کو پٹواری کے گھر میں بھیجا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہوا، اب بہن کو بھی بھیجنا پڑ رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بالے نے بتایا ہے کہ رات سے دو اور افسر شہر سے آئے ہوئے ہیں۔ پٹواری ذاہرے نے بالے سے کہا ہے کہ اکیلی شمشاد سے سارا کام کاج نہیں ہوتا۔ وہ ایک اور عورت کا انتظام کرے۔ ظاہری گل ہے ذاہرے کا اشارہ بالے کی بہن سندوری کی طرف ہے۔ وہ رو رہیا تھا اور کہہ رہیا تھا کہ اس سے تو اچھا ہے کہ وہ زہر کھا لے اور اپنی بہن اور بیوی کو بھی کھلا دے۔ وہ ڈھوک والوں کو بھی بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ سب کچھ ان کی اکھیوں کے سامنے ہو رہا ہے پر سب اپنی اپنی جانیں بچا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی اکھ اٹھا کر مصیبت کے ماروں کی طرف نہیں دیکھتا۔''

گرد آلود ہوا چلنے لگی تھی۔ رستم اور بخشو نے پگڑیوں کے پلو سے چہرے ڈھانپ لئے۔ بخشو کے بوڑھے چہرے پر دکھ کے ساتھ ساتھ اب تشویش بھی نظر آنے لگی تھی۔ یہ تشویش آندھی کے حوالے سے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب درختوں سے بہت سا کچا پھل گر جائے گا اور

اس کا نقصان ہوگا۔ رستم کو ایک بار پھر اس چار لاکھ روپے کا خیال آیا جو وہ اسی بوڑھے اور اس کے تنگ دست گھرانے کے لئے اپنے یار جہانگیر حسین کو ملتان میں دے آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رقم اگلے دو چار ہفتوں کے اندر ضرور اس گھرانے تک پہنچ جائے گی۔

رستم نے بخشو سے پوچھا۔ ''میاں جی! تساں دی نوں (بہو) نہیں آئی؟''

بخشو نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میڈا اخیال ہے، وہ تیری بہن خراب موسم دیکھ کر رک گئی ہے۔ میڈا اخیال ہے اب مجھے بھی چلنا چاہیے۔ بارش شروع ہوگئی تو مشکل ہو جاسی۔''

''کہتے ہو تو میں تساں کو تہاڈے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

''نہیں پتر! تیڈے پاس مہنگا سامان ہے۔ تم اپنا رستہ کھوٹا مت کرو۔ بس جلدی سے نکل جاؤ۔''

رستم خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جلد نکل جائے۔ اس کے پاس ضائع کرنے کو وقت بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ جتنی جلد فرید اور حسنے تک رسائی حاصل کر لیتا اتنا ہی ان کے لئے بہتر تھا لیکن اپنے اس نہایت قیمتی وقت میں سے وہ تھوڑا سا وقت ضرور نکالنا چاہتا تھا۔ کم از کم اتنا وقت جس میں وہ پٹواری ڈاہرا کے گھر میں گھس کر اپنے کولٹ پسٹل سے چھ سات فائر کر سکتا۔ ہاں یہ وقت نکالنا ضروری تھا۔ اس کی فطرت اسے اجازت ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ یہ ''وقت'' نکالے بغیر آگے بڑھ جائے۔

پوری طرح دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی ایک دفعہ پھر رات ہوگئی تھی۔ تیز گرد آلود جھکڑ کے بعد گھرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا اور گرج چمک کے ساتھ ہلکے چھینٹے پڑنے لگے۔

بوڑھا پلٹنے لگا تو رستم نے کہا۔ ''میاں جی! تساں کے کھلائے ہوئے شلجم اور مکئی کی روٹی ہمیشہ یاد رہے گی۔ بہت بہت شکرانہ۔''

''نہیں پتر! راہیوں کی سیوا کرنا تو ہر بندے کا فرض ہے۔'' بوڑھے بخشو نے اپنی لمبی ڈنگوری کو لاٹھی کی طرح نم زمین پر ٹیکا اور جھک کر چلتا ہوا بیری اور انجیر کے پیڑوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس نے رستم سیال سے بات کی ہے۔ اگر جانتا ہوتا تو شاید اسے سارا دن بھی یہاں رستم کے ساتھ کھڑے ہو کر بارش میں بھیگنا منظور ہوتا۔ رستم جانتا تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔ لالہ فرید اور حسنا بھی ڈاکو ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی ڈھوکوں اور آس پاس کے علاقے کے لوگ ان ڈاکوؤں کو ڈاکو نہیں سمجھتے تھے۔ جب بھی گھوڑوں پر سوار کوئی ٹولی کسی ڈھوک میں آنکلتی تھی تو مکینوں کے چہروں پر خوف و ہراس کی بجائے اپنائیت کی جھلکیاں نظر

آتی تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ ڈاکو ان غریب مسکین لوگوں سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ اگر کبھی مرغیاں انڈے یا دودھ وغیرہ حاصل کرتے بھی تو منہ مانگی قیمت دیتے تھے اور کبھی کبھی بغیر کچھ لئے بھی بہت کچھ دے جاتے تھے۔ پہلے سردار نادر کاکا کے بعد لالہ فرید نے بھی اپنے ساتھیوں پر مکمل کنٹرول رکھا ہوا تھا۔ خاص طور سے عورت ذات کے حوالے سے گروہ کے افراد پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ عورت چاہے اس پسماندہ علاقے کی ہوتی یا کسی شہری، اس کی طرف گروہ کا کوئی رکن بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن...... بالفرض اگر کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا تو گروہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق قصوروار کو کڑی سزا ملتی تھی۔ لالے فرید کا لاڈلا جواں سال بھانجا اباگیر اس کی ایک ''مردہ مثال'' تھا جسے لالے نے اپنے ہاتھوں سے گولی ماری تھی اور جس کی تازہ قبر وڈے ڈیرے کے قبرستان میں موجود تھی۔ اصول بنانا اور دعوے کرنا تو آسان ہوتا ہے لیکن ان پر بلاتخصیص عمل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لالے کے گروہ نے نہ صرف اصول بنائے تھے بلکہ عمل کر کے بھی دکھایا تھا۔ بے شک وہ قانون اور معاشرے کے مجرم تھے لیکن اپنے جیسے دیگر ''مجرموں'' سے انہیں علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔

بارش ہو رہی تھی لیکن بہت تیز نہیں تھی۔ ہاں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ابر آلود موسم جلد اختتام پذیر نہیں ہوگا۔

رستم نے جہیز کے سامان میں سے ایک شاپر نکال کر کولٹ پسٹل کے گرد لپیٹا۔ وہ بھرے ہوئے فالتو میگزین بھی شاپر میں رکھ لئے۔ اس شاپر کو کرتے کے نیچے اڑس کر اوپر سے چادر برابر کی اور چٹے مکان کی طرف چل دیا۔ جہیز کے سامان کی گٹھڑی اس نے وہیں باغیچے میں رکھی لکڑی کی پیٹیوں کے اندر چھپا دی تھی۔

پٹواری ڈاہرا کا چٹا مکان ڈھوک کے نواح میں واقع تھا۔ ڈھوک کی اصل آبادی اور اس مکان کے درمیان کٹی پھٹی زمین کا ایک خالی قطع تھا جس میں بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے نیم پختہ تالاب بنایا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک یقیناً یہاں مویشی اور لوگ موجود ہوں گے لیکن اب بارش کی وجہ سے سب کچھ سنسان پڑا تھا۔ صرف دو تین بطخیں پانی میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔

رستم عام سے انداز میں پٹواری کے مکان کے چاروں طرف گھوم گیا۔ داخلی دروازے کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ تھی۔ دوسری کھٹارا سی پک اَپ جس کی نمبر پلیٹ کے ساتھ پولیس کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ پک اَپ خراب نظر آتی تھی۔ اس کے اگلے دونوں پہیئے کھول کر ایک طرف رکھ دیئے گئے تھے۔ دن میں ہی رات کا سماں تھا۔ بارش

کچھ زور پکڑ گئی تھی۔ عقبی دیوار سے مکان کے اندر گھسنے میں رستم کو چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ پودوں کے درمیان گیلی زمین پر بے آواز کودا اور دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس کے انداز میں چیتے کا سا چوکنا پن تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہوگئی تھیں۔ ہاں، یہی وہ شخص تھا جس کے بارے میں پنجاب پولیس کے ایک نہایت تجربہ کار افسر نے کہا تھا...... یہ بندہ اپنے مدِمقابل کو بے بس کرنے اور جان سے مارنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔

چند قدم آگے رستم کو ایک چھوٹا سا برآمدہ نظر آیا۔ یہاں روئی کا ایک بڑا گدیلا بچھا ہوا تھا اور اس پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ گدے کے پاس سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے اور چائے کے کپ الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ایک ہٹا کٹا شخص جس کی پشت پر گھنے بال تھے صرف ایک نیکر پہنے اوندھے منہ گدیلے پر لیٹا تھا۔ درمیانی شکل وصورت کی ایک جواں سال مقامی عورت اس شخص کی پشت پر مالش کر رہی تھی۔ مشقت کے سبب وہ ہانپی ہانپی تھی اور اس کے شہد رنگ بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ تنومند شخص نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔ ”کیا بات ہے رانی! آج تیرے ہاتھ میں پہلے جیسی طاقت نہیں۔ میرا خیال ہے تُو نے ناشتہ نہیں کیا۔ جا پہلے ناشتہ کر آ۔“

”نہیں صیب جی۔ میں نے نہیں کرنا ناشتہ۔“

”اوئے۔ کھائے پیئے گی نہیں تو اتنا کم کاج کیسے کرے گی۔ چل جا شاباش تھوڑا بہت کھا پی لے۔“ اوندھے لیٹے شخص نے ذرا نرمی سے کہا۔

اتنی دیر میں داخلی دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ ”کون ہے اوئے؟“ اوندھے لیٹے شخص نے آنکھیں بند کئے پوچھا۔

”میں بالا ہوں سر جی۔ تساں کے کپڑے اور دودھ لے کر آیا ہوں۔“

”لے آ گیا تیرا خصم۔“ اوندھے لیٹے شخص نے کہا۔ ”جا بات سن لے اس کی اور اسے بول دینا اپنی ننان (نند) کے بارے میں بھی۔“

عورت اٹھی اور اوڑھنی درست کرتی ہوئی داخلی دروازے کی طرف چلی گئی۔ دروازے کے باہر سے بچوں کے رونے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید وہ بارش میں بھیگنے کے سبب احتجاج کر رہے تھے۔ بالا، رستم سے پہلے باغیچے سے نکل آیا تھا لیکن اب یہاں پہنچا تھا۔ غالباً وہ راستے میں دودھ لینے کے لئے رک گیا تھا۔

رستم نے دیوار کی اوٹ سے دیکھا۔ بالے نے دہلیز کے باہر سے ہی دونوں بچے،

ریڈیو، استری شدہ کپڑے اور دودھ کا منہ بند برتن اپنی بیوی کو تھما دیئے۔ بیوی یعنی شمشاد نے باقی چیزیں ایک طرف رکھ کر پہلے دونوں بچوں کو گلے سے لگایا اور ان کے منہ چومے۔ پھر شوہر سے نظریں چراتی ہوئی دیگر سامان کے ساتھ واپس آ گئی۔ بالے نے گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی۔

رستم کا خون اس کی رگوں میں ابالے کھانے لگا تھا۔ چادر کے نیچے اپنے قاتل پسٹل پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے گرجنے برسنے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ بھی کوئی پولیس والا تھا۔ پہلے تو رستم نے سمجھا کہ شاید مصیبت کی ماری شمشاد کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ گرجنے برسنے والے کا مخاطب بھی کوئی مرد ہی ہے۔ رستم دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتا ہوا اس کھڑکی کی طرف گیا جہاں سے گرجنے برسنے کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ بادل کی وجہ سے نیم تاریکی تھی اور کمرے میں گیس لیمپ روشن تھا۔ اس روشنی میں رستم کو درمیانے جسم کا ایک پولیس اہلکار نظر آیا۔ وہ ایک دوسرے باوردی اہلکار کے سامنے کھڑا تھا۔ باوردی اہلکار نے سر جھکا رکھا تھا۔ اس کے کندھے پر نظر آنے والے دو پھول بتا رہے تھے کہ وہ سب انسپکٹر ہے۔ ایک تیسرا شخص بھی کمرے کے ایک کونے میں موجود تھا اور بالکل مؤدب نظر آ رہا تھا۔ سادہ کپڑوں والے اس شخص کے چہرے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کا دو تہائی حصہ ان پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔

سب انسپکٹر نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ”سر جی! کام کاج کی مجبوری تھی، ورنہ آپ کو تو پتا ہی ہے، میں......“

”اوئے بکواس نہ کر میرے سامنے۔“ دوسرے شخص نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”کام کاج کی بات تھی تو کوئی بڑی عمر کی عورت بلا لیتے...... کوئی اور انتظام کر لیتے۔ میں جانتا ہوں تیری اور ناجے کی خصلت۔ اس بچوں والی بے گناہ عورت کو تم نے دس دن سے یہاں بند کر رکھا ہے۔ تم جیسے لوگ ہیں جنہوں نے اس محکمے کو بدنام کیا ہوا ہے۔ لوگ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں تمہیں۔ تمہاری ماں بہن ایک کرتے ہیں اور جو بددعائیں تم لوگ لیتے ہو اس کا کوئی حساب ہی نہیں۔“

”پر انسپکٹر جی......“

”چپ رہ۔“ انسپکٹر نے ایک بار پھر کڑک کر ماتحت کی بات کاٹی۔ ”کسی اور کی بات کا میں یقین نہ کرتا۔ پر رات خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ وہ تیرا شرابی اے ایس آئی

ناجا پٹواری سے بات کر رہا تھا۔ اسے ایک اور لڑکی لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں نے سب اپنے کانوں سے سنا ہے۔''

''وہ تو جی۔ آپ کے کام کاج کے لئے۔''

''اوئے بک بک نہ کر۔'' انسپکٹر کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔ ''کام کاج...... کام کاج...... میں جانتا ہوں تمہارے کام کاجوں کو۔ کیا تم نے سب کو اپنے جیسا رنگ باز سمجھا ہوا ہے۔ کیا سمجھتے ہو تم مجھے... کیا سمجھتے ہو۔'' انسپکٹر کا غصہ بھڑکتا جا رہا تھا۔

''دراصل پٹواری نے......''

''اوئے پٹواری اپنی ماں بہن کو کیوں نہیں لے آیا تمہاری مٹھی چاپی کے لئے۔ غریبوں کی بہو بیٹیوں کو کیوں گھسیٹ رہا ہے یہاں۔''

سب انسپکٹر اب تک خاموش تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب وہ جو بھی کہے گا اس سے انسپکٹر کا پارہ اوپر کو ہی جائے گا۔ جس شخص کے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اس نے پُراندیش نظروں سے صحن کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ ان کا میزبان پٹواری یہ باتیں سن لے گا۔

انسپکٹر نے اپنے ماتحت کی طرف فیصلہ کن انداز میں انگلی اٹھائی اور بولا۔ ''اب ختم کرو یہ تفتیش کا لعنتی تماشا۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں ٹانگیں چوڑی کر کے بیٹھے ہوئے۔ تمہیں اور ناجے کو ابھی میرے ساتھ واپس جانا ہوگا۔ چلو باندھو اپنا بوریا بستر۔''

سب انسپکٹر کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے یہ نادر شاہی حکم پسند نہیں آیا لیکن اس حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس چارہ بھی نہیں تھا۔ دوسری جانب کھڑکی سے باہر رستم کو ایک سایہ سا نظر آیا۔ غالباً یہ وہ تیسرا اہلکار اے ایس آئی ناجا تھا جو تھوڑی دیر پہلے برآمدے میں اوندھا لیٹا تھا۔ اب شور وغل سن کر وہ بھی اس کمرے کی طرف آ گیا تھا اور باہر ہی سے اندر کی صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''مم...... مجھے جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے سر جی...... لیکن...... گاڑی خراب ہے...... اسے ٹھیک ہونے میں ابھی چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جانے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے زیادہ ہی وقت لگ جائے۔ اگر آپ کہیں تو ہم کل صبح سویرے نکل پڑیں گے۔''

''نہیں... ابھی چلو تم۔ گاڑی کی خیر ہے۔ کل تمہارا یہ کانسٹیبل جبرو لے آئے گا۔'' انسپکٹر نے اس دراز قد شخص کی طرف اشارہ کیا جو چہرے پر پٹیاں باندھے کھڑا تھا۔

سب انسپکٹر منمنایا۔ ''لیکن یہ زخمی ہے۔ پتا نہیں اس سے گاڑی......''

انسپکٹر نے بھنا کر جبرو کو ایک گالی دی اور بولا۔ ''یہ چھترولیا بکرے کی بھنی ہوئی ٹانگ چیر سکتا ہے تو گاڑی بھی چلا کر لے آئے گا۔ تم تیاری پکڑو فٹافٹ۔''

سب انسپکٹر نے ناپسندیدگی کے انداز میں سر کو خفیف جنبش دی اور ''یس سر'' کہا۔

''اس عورت کو فوراً اس کے گھر بھیجو اور اس کے بندے کو بھی تفتیش سے خارج کرو۔ میں ملا ہوں اس سے۔ وہ مجھے بے گناہ لگا ہے۔ اگر کوئی بات سامنے آئی تو میں خود اس سے مل لوں گا۔''

''یس سر۔'' سب انسپکٹر نے سیلوٹ کے انداز میں ہاتھ ماتھے کو لگایا اور بجھا بجھا سا باہر چلا گیا۔ کانسٹیبل بھی باہر نکل گیا۔

انسپکٹر مضطرب انداز میں کمرے کے اندر چکرانے لگا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دو دفعہ بڑبڑانے والے انداز میں ہلے پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ رستم وہیں کھڑا رہا۔ یہ کھڑے رہنے کے لئے بہت محفوظ جگہ تھی۔ کولٹ پسٹل رستم کے ہاتھ میں تھا اور انگلی لبلبی پر۔ وہ یہاں قتل کرنے کے لئے آیا تھا اور اگر ایک مرتبہ اس کی انگلی لبلبی پر حرکت کرنے لگتی تو باہر بالے کی عورت کے سوا شاید ہی یہاں کوئی زندہ بچتا لیکن ایک شخص کی وجہ سے سارا منظر الٹ پلٹ ہو گیا تھا اور یہ ''ایک شخص'' ان ہی لوگوں میں سے تھا جنہیں رستم قتل کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس ''ایک شخص'' نے اپنے مثبت رویے سے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے تو جھک جھک کر اس کے پاؤں چومتے۔ پسٹل کی لبلبی پر رستم کی تنی ہوئی انگلی قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔

گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رستم کو تھوڑے فاصلے پر ایک نیچی چھت والے کمرے میں خشک گھاس کا ڈھیر نظر آیا۔ چھپنے کے لئے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ رستم بڑی احتیاط سے اس نیچی چھت والے کمرے میں چلا گیا۔ مقامی زبان میں ایسے کمروں کو ڈھارا کہا جاتا تھا۔ ایک دروازے کے سوا یہ مکمل طور پر بند تھا۔

رستم کے اندازے کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر بعد اس نے انسپکٹر کے علاوہ اے ایس آئی ناجے کو بھی وردی میں دیکھا۔ اس کے علاوہ دو سپاہی نظر آئے... وہ سب یہاں سے جانے کے لئے تیار نظر آتے تھے۔ ایک سپاہی نے دو تین سفری بیگ لٹکا رکھے تھے۔ ایک دوسرے سپاہی نے گھی کے دو ڈبے اٹھائے ہوئے تھے۔ یقیناً ان ڈبوں میں وہ دیسی گھی ہوگا جو یہاں کے لوگوں نے بطور نذرانہ سب انسپکٹر کو پیش کیا ہوگا۔ انسپکٹر کی نظر ان ڈبوں پر پڑی اور اس نے بڑے تلخ لہجے میں سپاہی کو جھاڑ پلائی۔ ''کھوتے دے پُتر! یہ کیا پکڑا ہوا ہے؟''

''جی... ...گیو ہے۔'' سپاہی نے لرزتے ہوئے کہا۔

''اس بھوتنی دے گیو کو اندر رکھ کر آ اور وہ کیا رکھا ہے برانڈے میں؟''

''وہ جی باسمتی چاول کا توڑا ہے۔''

''اس توڑے کو بھی اندر رکھ۔ پٹواری کی ماں بہن پکاتی رہے گی اسے......اور گیا کدھر ہے پٹواری؟''

''ان کی تاریخ ہے جی۔ وہ آدھی رات کے نکل گئے ہوئے ہیں شہر جانے کے لئے۔''

کچھ ہی دیر بعد انسپکٹر اپنے سب انسپکٹر اور اے ایس آئی سمیت ڈھوک شاہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ رستم نے ڈھارے میں چھپے چھپے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پٹواری کے جواں سال بیٹے اور دو تین دیگر افراد نے پولیس والوں کو رخصت کیا۔

رستم کے ذہن میں ایک نئی بات آ رہی تھی۔ اس نے انسپکٹر اور دیگر افراد کے درمیان جو گفتگو سنی تھی، اس سے اندازہ ہوا تھا کہ پٹواری کے گھر سے باہر کھڑی لوڈر گاڑی کو ٹھیک کیا جا رہا ہے۔ توقع تھی کہ چند گھنٹے میں یہ گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے بعد یہاں رہ جانے والے ہیڈ کانسٹیبل جبرو نے یہ گاڑی لے کر آگے جانا تھا۔ جبرو کی منزل بھی وہی تھی جہاں پولیس اور ان کے مددگار اجرالیوں کی بڑی جمعیت نے وڈے ڈیرے کو ایک وسیع گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ جبرو نے کچھ سفر پک اَپ لوڈر اور کچھ پا پیادہ طے کرنا تھا۔ رستم اگر کسی طرح اس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہی موقع پر پہنچ جاتا تو یہ اس کے لئے آسان ہوتا اور وقت کی بھی بچت ہوتی۔ رستم نے فیصلہ کیا کہ وہ جبرو کے آس پاس موجود رہے گا اور اس کے روانہ ہونے کا انتظار کرے گا۔

یہاں رازداری کے ساتھ موجود رہنے کے لئے اسے بڑی مناسب جگہ میسر آ گئی تھی۔ اب دن کے دس بجنے والے تھے لیکن ابر آلود موسم کے سبب وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رستم لمبی جنگلی گھاس کے خشک ڈھیر کے پیچھے نیم دراز رہا اور سوچتا رہا۔ دور کہیں ٹیلوں میں گولیاں چلنے کی مدھم آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ ممکن تھا کہ کسی شکاری نے کسی جنگلی جانور کو مارا ہو لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی اجرالی یا کسی پولیس والے نے لالہ کے کسی ساتھی کو شوٹ کیا ہو۔

پچھلے دنوں میں جو واقعات ہوئے تھے ان میں سے دو زیادہ اہم تھے اور مسلسل رستم کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے۔ پہلا، گوہرے کے مرنے کا اور دوسرا نظام سے ملاقات کا۔ نظام ایک بے حد مضبوط اور صابر شخص کا نام تھا لیکن وہ جس طرح بچوں کی طرح رویا تھا اس

سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بُری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ رستم دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ نظام کی بیٹی پولیس کے ستم سے بچ جائے۔

اچانک رستم بری طرح چونک گیا۔ اسے قدموں کی آہٹ اپنے بالکل قریب سنائی دی۔ پھر ایک نوجوان لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور گھاس کے ڈھیر پر رستم سے صرف تین چار میٹر کی دوری پر گر گئی۔ وہ دبی دبی آواز میں ہنس رہی تھی۔ اس کے کپڑے بارش کے پانی سے شرابور تھے۔ لڑکی کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان آیا اور لڑکی کے اوپر گر گیا۔ رستم اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈھارے کی نیم تاریکی میں اس نے لڑکی اور نوجوان کے جسم ایک دوجے سے گتھم گتھا دیکھے اور سانسوں کی تیز آواز سنی۔ ''بس...... بس......بس۔'' لڑکی نے شوخ سرگوشی کی۔ ''مینڈا دم گھٹ رہا ہے۔''

''دم نہیں گھٹ رہا......نخرے دکھا رہی ہے۔'' نوجوان نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا...... پیچھے ہٹ جا۔''

''ایک شرط پر، رات کو آئے گی۔''

''نہ بابا! تیڈے گھر میں پلس والے ہیں۔ مینڈے ہتھوں میں ہتھکڑی لگوانی ہے۔''

''اوئے میری جندڑی! چلے گئے ہیں پلس والے۔ ایک بندہ رہ گیا ہے وہ بھی شام سے پہلے نکل جائے گا۔ اس کی گڈی ٹھیک ہو رہی ہے۔ بس دو گھنٹے کا کام ہے......''

''اور تیڈا ابا؟''

''وہ تاریخ پر ہے۔ کل رات سے پہلے نہیں آئے گا۔''

ان دونوں کی باتوں سے پتا چلا کہ نوجوان کا نام دھید و تھا اور وہ پٹواری ڈاہرے کا بیٹا تھا اور لڑکی پڑوس کی تھی۔ رنگ رنگیلے موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ اس ڈھارے میں گھس آئے تھے۔

وہ چلے گئے تو رستم بھی یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا زیادہ دیر تک یہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ کسی بھی وقت کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈھوک شاہاں سے باہر نکلنے کا راستہ ایک ہی ہے۔ جبرو کو اپنی پک اَپ پر جب بھی یہاں سے نکلنا تھا، اسی راستے سے نکلنا تھا۔ رستم اس راستے کے کنارے کہیں بیٹھ کر جبرو کا انتظار کر سکتا تھا۔

بادل ایک بار پھر گھر کر آ گئے تھے۔ دن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا اور بجلی چمکنے لگی۔ رستم بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور دیوار پھاند کر باہر آ گیا۔ وہ گھوم کر گھر کے گیٹ کی طرف آیا۔ پک اَپ کے دونوں اگلے پہیّے لگا دیئے گئے تھے اور اسے دھکیل کر ایک

سایہ دار جگہ پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایک مکینک اس کے نیچے گھسا ٹھوکا ٹھاکی کر رہا تھا۔

رستم ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتا ہوا ڈھوک سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ قمیص کے نیچے اپنی ران پر کولٹ پسٹل کی سختی محسوس کر رہا تھا۔ یہ پسٹل اب اس نے پولی تھین میں لپیٹ کر دھوتی کی ڈب میں اڑس رکھا تھا۔ چلتے چلتے اس کی نگاہ ایک مزار پر پڑی۔ ڈھوک کی بیرونی حد کے ساتھ ہی یہ پختہ مزار درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک دم بارش تیز ہوگئی۔ تریڑا پڑنے لگا۔ تیز بارش سے بچنے کے لئے رستم مزار میں چلا گیا۔ مزار کے اندر اور برآمدے میں کافی لوگ موجود تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو تیز بارش سے بچنے کے لئے اندر گھسے تھے۔ رستم بھی ان میں کھڑا ہو گیا۔ دو مقامی بندے اس خونی واقعے کے بارے میں بات کر رہے تھے جس کا ایک کردار رستم خود تھا۔ ''کم از کم تین بندے مرے ہیں۔ کچھ کہہ رہے ہیں کہ اس سے زیادہ ہیں۔'' ایک شخص نے کہا۔

دوسرا بولا۔ ''میںڈا خیال اور ہے۔ ہوسکدا ہے کہ وہ سپیرے نہ ہوں۔ سپیروں کے بھیس میں ڈاکو ہوں۔''

''سپیروں کے بھیس میں پلس والے بھی تو ہوسکدے ہیں۔'' پہلے نے خیال آرائی کی۔ اچانک رستم کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی اور جم گئی۔ وہ مہراں تھی۔ ڈھوک شاہاں کی مہراں۔ دھریک کے درخت کی طرح لمبی اونچی، مضبوط لیکن لچک دار۔ اس کا رخ مزار کی طرف تھا لیکن رستم کی طرف بھی ہوتا تو وہ باآسانی سے اسے پہچان نہ سکتی۔ رستم کا حلیہ بہت حد تک بدلا ہوا تھا۔ رستم نے دیکھا وہ مزار کی جالی سے ماتھا ٹیکے گم صم بیٹھی تھی، اس کا لباس خستہ تھا اور آنکھیں روئی روئی تھیں۔ نہ جانے کیوں رستم کو اس کے چہرے پر گناہ کی ندامت نظر آئی۔ ہاں یہ گناہ کی ندامت ہی تھی۔ ایک پشیمان تاثر تھا جس نے اس کے دہقانی نقوش کو ڈھانپ رکھا تھا۔

رستم ستون سے لگا اسے دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا کہ مہراں اپنے اس گناہ پر ندامت کے آنسو بہانے اس مزار پر آتی ہے جو کچھ دن پہلے رات کی تاریکی میں اس سے ہوا تھا۔ وہ گناہ تھا، ایثار تھا، یا حالات کا تقاضا جو کچھ بھی تھا مہراں کے دل و دماغ پر اس کا بوجھ تھا۔ کسی بھی وجہ سے سہی لیکن اس نے اپنا جسم ایک غیر مرد کو سونپا تھا۔ اپنی ایک ''خواہش'' پوری کرنے کے لئے اس ''دراز دست'' کی ایک خواہش پوری کی تھی۔ اب شاید وہ اسی گناہ کی تلافی کے لئے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس مزار پر حاضری دیتی تھی اور منتیں مانتی تھی۔ رستم کا دل درد سے بھر گیا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے۔ اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھے۔ اس سے پوچھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی خاطر اپنے کومل جسم کو ایک کانٹوں والی جھاڑی میں کیوں پھینکا؟ لیکن پھر بہت سی دیگر خواہشوں کی طرح رستم نے یہ خواہش بھی سینے میں دبالی۔ جو ہو چکا تھا وہ ہو چکا۔ اب مہراں کے روز و شب میں پھر سے تلاطم پیدا کرنا بے کار تھا۔ یہ سوچ کر رستم کو گونا گوں تسلی ہوئی کہ عنقریب جہانگیر کی وساطت سے ایک نہایت معقول رقم اس تنگ دست گھرانے تک پہنچنے والی ہے۔

بارش ذرا مدھم ہوئی تو رستم کچھ دوسرے لوگوں کی طرح مزار کے احاطے سے نکل آیا۔ اس کا رخ ڈھوک کے نواح کی طرف تھا۔ بابے بخشو کے باغیچے میں چھپائی ہوئی داج کی گٹھڑی حاصل کرنے کے بعد وہ اس راستے کی جانب آ گیا جو ڈھوک سے باہر جانے کا واحد ذریعہ تھا۔ وہ اپنی گٹھڑی سمیت درختوں کے ایک جھنڈ میں چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ایک مسافر لمبے سفر کے بعد کچھ دیر تک آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے دیہاتی انداز میں اپنی چادر کو کمر کے پیچھے سے گزار کر گھٹنوں کے قریب گرہ دے لی۔ یوں ایک ''آرام دہ کرسی'' بن گئی۔ وہ اس کرسی میں ہولے ہولے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

رستم کو اپنی توقع سے کہیں کم انتظار کرنا پڑا۔ سہ پہر کے چار بجے تھے۔ بارش تھم چکی تھی مگر آسمان پر ہنوز گہرے بادل ٹھہرے ہوئے تھے۔ رستم کو نیلی پک اَپ ڈھوک کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ رستم تیار ہو گیا۔ گرم چادر کے نیچے اس کا پسٹل بالکل تیار حالت میں تھا۔ پک اَپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی نزدیک پہنچی تو رستم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

ڈرائیونگ کیبن میں زخمی ہیڈ کانسٹیبل ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ اس نے بے حد ناگواری سے رستم کی طرف دیکھا۔

''صیب جی، میں نے ڈھوک باناں کی طرف جانا ہے۔ اگر تساں کو تکلیف نہ ہو تو مجھے اپنے ساتھ بٹھالیں۔ میںڈے ساتھ یہ تھوڑا سا سامان بھی ہے۔''

ہیڈ کانسٹیبل جبرو نے طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی اور ایک غلیظ گالی دے کر بولا۔ ''تیرے لئے ہیلی کاپٹر کا انتظام نہ کرادوں ڈھوک باناں جانے کے لئے۔''

رستم جان گیا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اس نے چادر تھوڑی سی اوپر سرکائی اور خوفناک کولٹ پسٹل کی جھلک جبرو کو دکھائی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''زیادہ تن فن دکھائی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔''

جبرو کا زیادہ تر چہرہ تو پٹیوں میں تھا، جتنا نظر آ رہا تھا وہ حیرت اور خوف کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ پک اَپ لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دے گا مگر پھر رستم کے

تاثرات دیکھتے ہوئے اسے اس ''دلیری'' کی ہمت نہیں ہوئی۔ رستم نے پسٹل پھر اپنی چادر کے نیچے کیا اور لوڈر کے سامنے سے ہوتا ہوا دوسرے دروازے سے اندر آ گیا۔

''سیدھا چلو۔'' اس نے پسٹل باقاعدہ جبرو کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے کہا۔

اب جبرو بڑے دھیان سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والا خوف اب بڑھتے بڑھتے دہشت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ''کک.....کون ہو تم؟'' اس نے نہایت پُر اندیش لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم اپنے باپ کو پہچان گئے ہو۔'' رستم اطمینان سے بولا اور گٹھڑی اپنے پاؤں کے قریب رکھ دی۔

ہیڈ کانسٹیبل جبرو کی حالت پتلی ہو گئی۔ یوں لگا کہ وہ ڈرائیونگ کے قابل ہی نہیں رہا ہے۔ رستم نے ایک بار پھر اسے سنگین طریقے سے دھمکایا تو اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

ڈھوک سے نکلتے ہی دشوار گزار ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ ڈھوک پیچھے رہ گئی تھی اور ڈھوک کی مہراں بھی۔ لوڈر اچھلتی کودتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ جبرو ان راستوں کا شناور نظر آتا تھا۔ کئی جگہ یوں لگا کہ رستہ مسدود ہو گیا ہے مگر وہ آگے بڑھتا رہا۔

درحقیقت یہ راستے سخت جان جیپ یا گھوڑے، خچر وغیرہ پر ہی طے کئے جاسکتے تھے۔ سوزوکی لوڈر پر سفر طے کرنا ایسا ہی تھا جیسے شہر کی کسی کالجیٹ لڑکی کے سر پر پانی سے بھرے ہوئے دو گھڑے رکھ دیئے جائیں اور کوہے پر بچہ بٹھا دیا جائے۔

جبرو بالکل گم صم تھا۔ رستم کی باتوں کے جواب میں وہ بس ہوں ہاں ہی کر رہا تھا۔ رستم کے سوالوں کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ ہیڈ کانسٹیبل ہے اور اپنے انسپکٹر شاد کے حکم پر یہ گاڑی اپنے کیمپ تک لے کر جا رہا ہے۔ رستم نے پوچھا۔ ''یہ تیرے تھوبڑے کو کیا ہوا ہے؟''

وہ پہلے تو ہچکچایا پھر کہنے لگا۔ ''دستی بم کے چھینٹے پڑے تھے۔''

''دستی بم کے چھینٹے؟'' رستم نے تعجب سے پوچھا۔

جواب میں جبرو نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چند دن پہلے ڈپٹی ریاض کی قیادت میں جس پولیس پارٹی نے ان ٹیلوں میں رستم اور گوہرا کا پیچھا کیا تھا، ان میں یہ کانسٹیبل جبرو بھی شامل تھا۔ جب رستم نے پولیس کی زد سے نکلنے کے لئے دستی بم پھینکا تو اس سے متاثر ہونے والوں میں جبرو بھی تھا۔ اس کے چہرے پر دھات کے بہت باریک ٹکڑے اور بارود کے ذرے لگے تھے۔ اس دھماکے میں تین ہلاکتیں ہوئی تھیں جب کہ جبرو سمیت پانچ افراد زخمی ہوئے تھے۔

لوڈر نہایت دشوار راستوں پر چلتی رہی۔ اندھیرا ہونے کے بعد سفر مزید مشکل ہو گیا تھا۔ ہوا چلنے سے بادل بکھر گئے تھے اور کبھی کبھی بدلیوں کی اوٹ سے پوٹھوہار کا خوش نما چاند جھانکنے لگتا تھا۔ جبرو پر موت کا خوف طاری ہو چکا تھا۔ اسے بہت کم امید تھی کہ وہ زندہ بچ سکے گا..... وہ زندگی بچانے کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔ رستم کے سوالوں کے جواب وہ فر فر دے رہا تھا اور گاہے بگاہے ان الفاظ میں رستم کی سماجت بھی کر رہا تھا۔ ''رستم صاحب! آپ تو وڈا جوڑ ہو۔ میں تو ایک معمولی ملازم ہوں۔ حکم کا بندہ ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

رستم نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارے اندازے کے مطابق وڈے ڈیرے کے آس پاس کل کتنی نفری ہو گی؟''

''میں آپ کو ٹھیک سے تو نہیں بتا سکتا جی۔ پر جب ہم یہاں آئے تھے تو تین بڑے ٹرکوں پر آئے تھے۔ ہم سے پہلے بھی یہ تین ٹرک ملازموں کا ایک پھیرا لگا چکے تھے۔ کچھ ملازم چھوٹی گاڑیوں پر بھی یہاں پہنچے تھے۔''

''یہاں بھاری اسلحہ کتنا ہو گا؟''

''جہاں تک مجھے پتا ہے جی، یہاں کم از کم آٹھ بڑی رائفلیں ہیں ٹیلی اسکوپ والی۔ اس کے علاوہ کچھ M642 ٹائپ کی گنیں ہیں۔ چھوٹا اسلحہ بھی کافی ہے۔ کچھ اسلحہ اجرالی بھی لے کر آئے ہیں۔''

''اجرالی لوگ یہاں کتنے ہوں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اجرالی زیادہ تر پانڈو والی سائیڈ پر ہیں۔ وہاں ستر اسی بندوں کا جتھا ہے۔ اتنے ہی بندے اور ہیں جو ڈیرے کے آلے دوالے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ہر طرح سے پولیس کی مدد کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے ان سے بھاری انعام واکرام کے وعدے بھی کر رکھے ہیں۔''

''ڈپٹی ریاض خود کس سائیڈ پر ہے؟''

''وہ گھومتے رہتے ہیں جی۔ گھوڑے پر کافی دور تک نکل جاتے ہیں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں تو روزانہ تیس چالیس میل سفر تو کرتے ہوں گے لیکن میرا خیال ہے کہ اب وہ پانڈو کی طرف ہوں گے۔''

''پانڈو کی طرف کیوں؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''بب.....بس یونہی میرا اندازہ سا ہے۔''

رستم سمجھ گیا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ پانڈو والی بات بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ وہ رستم کو اس سازش کے تانے بانے کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا جس کے مطابق لالہ اور اس کے ساتھیوں کو پانڈو کی طرف بلایا جا رہا تھا۔

کانسٹیبل جبرو کی اس چھوٹی سی ''ادا'' نے رستم کو سمجھا دیا کہ وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ رستم نے اس سے پوچھا۔ ''پٹواری کے گھر میں بالے کی بیوی شمشاد سے کیا ہوتا رہا ہے؟''

پہلے تو جبرو نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن جب رستم نے سختی سے پوچھا تو اس نے بتایا بڑا اور چھوٹا صاحب شمشاد کے ساتھ سوتے رہے ہیں۔

''اور تم؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''نہیں جناب۔ ہم تو ملازم لوگ ہیں۔ ہماری تو اپنی عزت ان افسر لوگوں کی وجہ سے خطرے میں رہتی ہے۔ بات بات پر ہماری ماں بہن ایک کر دیتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے پٹواری کے گھر میں تم نے کوئی حرام زدگی نہیں کی؟''

اس نے بڑی شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تو جی وڈے صاحب (انسپکٹر) سے بالے کی سفارش کرتا رہا ہوں۔''

''کیسی سفارش؟''

''یہی کہ اس کے گھر والی واپس کر دیں۔ وہ زیادہ غریب بندہ تھا۔ پیسے نہیں دے سکتا تھا۔ اگر وہ چھوٹے صاحب کو دو ڈھائی ہزار کا انتظام بھی کر دیتا تو میں نے کوشش کر کے اس کی گھر والی کو گھر بھجوا دینا تھا۔''

رستم سن رہا تھا اور اس کا سینہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہ صرف ڈھوک شاہاں کی کہانی نہیں تھی، نہ ہی یہ صرف پٹواری ڈاہرے اور سب انسپکٹر ناجے وغیرہ کی کہانی تھی۔ یہ ہر دور دراز پسماندہ بستی کی کہانی تھی۔ ہر پٹواری، چوہدری اور بے ضمیر بالادست کی کہانی تھی۔ یہ کہانی ایک زہریلی کھیتی کی طرح تھی جس میں معاشرہ ظلم کے بیج بو کر ڈاکوؤں اور قانون شکنوں کی فصل کاٹتا تھا۔ ملنگی، بہرام، سلطانہ، جگا، محمد خان، چراغ بالی...... ایسے ہی درجنوں نام گنوائے جا سکتے تھے۔

جبرو نے رستم کو بتایا کہ انہیں قریباً دس کلومیٹر آگے ایک پولیس کیمپ تک جانا ہے۔ اس کیمپ سے آگے پیدل سفر ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیمپ سے دو اور افراد کو اس کا ہمسفر بننا ہے۔ ایک مقامی بندہ ملکا دین ہے اور دوسرا ایک حوالدار اجمل خان ہے۔ ملکا علاقے کا بھیدی ہے

اور وہ شارٹ کٹ رستے استعمال کر کے انہیں چار پانچ گھنٹے میں ہی موقع پر پہنچا دے گا۔

رستم نے پوچھا۔ ''ملکا تمہیں جانتا ہے؟''

''نہیں جی لیکن میں اسے جانتا ہوں۔ میں پچیس بندوں کے ایک جتھے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس جتھے کو ملکا ہی لے کر آیا تھا۔''

''اور حوالدار اجمل خان؟''

''مجھے اس کا پتا نہیں۔ اس بندے کو کسی خاص کام کے لئے افسروں نے حسن ابدال سے بلایا ہے۔''

رستم ہیڈ کانسٹیبل جبرو سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں ایک پلان بن رہا تھا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ ایسی تاریک راتوں میں کسی کو ٹھیک سے شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل جبرو کا دو تہائی چہرہ سفید پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا قد کاٹھ بھی رستم سے ملتا جلتا تھا۔ جو کچھ رستم سوچ رہا تھا اس میں رسک ضرور تھا لیکن لالے وغیرہ تک جلد سے جلد پہنچنے کے لئے وہ ہر رسک لینے کو تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پروگرام کے مطابق نظام نے وائرلیس سیٹ میں خرابی پیدا کر دی ہوگی۔ لہٰذا آج پولیس کے لئے ممکن نہیں ہوا ہوگا کہ وہ وڈے ڈیرے پر لالے سے رابطہ کر سکیں لیکن کل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ جیسے بھی ہو آج رات کی صبح ہونے سے پہلے رستم اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچ جائے۔ یہ بڑی اہم رات تھی۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

جب وہ لوگ پولیس کیمپ سے چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر رہ گئے اور رستم کو دور ٹیلوں کے درمیان کیمپ کی دو تین ٹمٹماتی روشنیاں نظر آنے لگیں تو رستم نے جبرو کو لوڈر روکنے کے لئے کہا۔

''پیشاب کرنا ہے جی؟'' کانسٹیبل نے بڑی حلیمی سے دریافت کیا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور نیچے اُتر آیا۔ دوسری طرف سے کانسٹیبل بھی اُترا اور لوڈر کے اگلے پہیوں کو چیک کرنے لگا۔ مسلسل ہچکولوں کے سبب پہیوں سے مدھم آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔

رستم کا موڈ عجیب ہو رہا تھا۔ اس نے پسٹل چادر کے اندر سے نکال لیا۔ بدلیوں کی اوٹ سے نمودار ہونے والے چاند کی مدھم روشنی ارد گرد کے ٹیلوں کو روشن کرنے لگی۔ پہیوں کا معائنہ کرنے کے بعد جبرو سیدھا ہوا اور تب اس کی نگاہ رستم کے پسٹل پر پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔

"اپنا منہ گاڑی کی طرف کرو۔" رستم نے اسے حکم دیا اور بیرل پر سائلنسر چڑھالیا۔

"مم...... مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جناب؟" وہ گھگھایا۔

"تمہاری ساری زندگی ہی غلطی ہے۔ منہ دوسری طرف کرو۔" رستم کے آخری الفاظ میں اتنی درندگی تھی کہ جبرو سرتاپا لرز گیا۔ اسے یہی لگا تھا کہ اگر اس نے تعمیل میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کی تو پسٹل کے بیرل سے شعلہ نکل پڑے گا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا رخ لوڈر کی طرف پھیر لیا۔ وہ شلوار قمیص اور سویٹر میں تھا، پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ اس کی دھلی دھلائی وردی لوڈر کی سیٹ پر رکھی تھی۔

وہ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا مالک تھا لیکن موت کے خوف نے اسے لرزے کا بخار چڑھا دیا تھا۔ سیدھا کھڑا رہنے کے لئے اسے لوڈر کا سہارا لینا پڑا۔ "سر جی! مم میری بات سنیں......" اس نے مڑکر کچھ کہنا چاہا۔

رستم نے زوردار لات اس کی پیٹھ پر جمائی اور پسٹل کی سرد نال اس کی گردن میں دھنسا دی۔ "سیدھے کھڑے رہو۔" وہ پھنکارا۔

وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ "کلمہ پڑھ لو، تمہارا آخری وقت آگیا ہے۔" رستم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ ایک بار پھر گھوما اور اس مرتبہ رستم نے سائلنسر لگے پسٹل سے فائر کیا۔ گولی جبرو کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ "اگلی بار گولی تین انچ نیچے سے گزرے گی۔" رستم کا لہجہ بھیانک تھا۔ جبرو ایک بار پھر کانپ کر سیدھا ہوگیا۔ "مم...... میں آپ کا بے دام کا غلام ہوں جی...... مم میں آپ کے پاؤں کی مٹی ہوں۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔ مم میں اس گندے محکمے کی نوکری ہی چھوڑ دوں گا۔ میں آپ کا وفادار نوکر بن جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے گولی نہ ماریں......" وہ ہذیانی انداز میں بولتا چلا جارہا تھا۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تیرے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے جبرو۔ سب کچھ سچ سچ بتادے۔ ایک لفظ بھی چھپا کر نہ رکھ۔ جب تیری کتی زبان سے سچ نکلے گا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا کہ تُو سچ بول رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تیرا محکمہ خراب نہیں ہے، تیرے جیسے خبیثوں نے اسے خراب بنایا ہے۔ انسپکٹر شاد بھی تو تیرے محکمے سے ہے اور حاجی حیات کا نام بھی تُو نے بڑی اچھی طرح سنا ہوگا۔ سنا ہے کہ نہیں؟"

جبرو نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔

"چل شاباش اب سچ بول۔ کوئی ایک بات بھی غلط نہیں کہنی۔"

"پوچھو جناب...... پوچھو۔" رستم کو اندازہ ہوا کہ وہ جان بچانے کے لئے سچ بولنے پر آمادہ ہوچکا ہے۔

"پہلے یہ بتا کہ کتنے بچے ہیں تیرے؟"

"مم...... میری شادی ٹوٹ گئی تھی جی۔ ایک بچی تھی وہ ماں کے ساتھ ہی چلی گئی۔"

"تیرے منہ پر ہی حرام کاری لکھی ہوئی ہے۔ مجھے پتا ہے تُو کوٹھے پر جاتا ہے۔" رستم نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا۔ "میں نے تجھے دیکھا ہے لاہور کے شاہی محلے میں۔"

"بب...... بس کبھی کبھی جی...... اب نکاح کرلینا ہے میں نے۔"

"پٹواری کے گھر میں بالے کی بیوی کے ساتھ کتنی بار منہ کالا کیا تھا؟"

"بب...... بس...... ایک بار جی۔" وہ تھوک نگل کر بہ مشکل بول پایا۔

"بالے سے دو ڈھائی ہزار روپیہ چھوٹے تھانیدار نے مانگا تھا یا تم نے؟ جھوٹ نہیں بولنا۔ بولو گے تو پھر تمہارا یہ "پیو" بولے گا اور تمہارے ناریل میں سوراخ کرے گا۔" رستم کا اشارہ پسٹل کی طرف تھا۔

جبرو بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مم...... میں نے مانگا تھا جی۔ میں اپنی یہ غلطی بھی مانتا ہوں۔ میں گناہ گار ہوں جی۔ مجھ سے بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن اب نہیں ہوں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں بالکل بدل جاؤں گا۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ سب کچھ۔"

"مجھے پتا ہے تجھے چھترولیا کہا جاتا ہے اور تُو ڈپٹی ریاض کے قریبی ماتحتوں میں سے ہے۔ ہے یا نہیں؟"

"ہوں جی...... ہوں جی۔" وہ فر فر بول رہا تھا۔ اب کی زبان دہشت کے "موبل آئل" سے لتھڑی ہوئی تھی اور کہیں بھی اٹک نہیں رہی تھی۔

"آج تک کتنی چھترولیں کی ہوں گی تم نے؟"

"ہزا...... ہزاروں کی ہیں...... بہت مارا ہے لوگوں کو۔"

"ان کو گندگی کھلائی ہے...... ان کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے منہ سے اپنی ماں، بہن کو گالیاں دیں۔ ان کو ننگا کرکے گدھوں پر بٹھایا ہے۔" رستم نے گویا جبرو کی بات مکمل کی۔

جبرو نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا رخ بدستور گاڑی کی طرف تھا۔

"اور اس کے علاوہ بھی لاچار لوگوں کے ساتھ وہ سب کچھ کیا ہے جو زبان پر لایا نہیں جاسکتا۔" جبرو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

رستم نے کہا۔ ''جبال عرف جبرو تم صرف ایک شخص نہیں ہو...... تم پوری ایک تاریخ ہو۔ اس تاریخ نے لوگوں کے جان مال کی حفاظت کرنے والے ایک پورے ادارے کو گندا کر رکھا ہے۔ تم ایک چھوٹے ملازم ہو لیکن تم اگر بڑے افسر بھی ہوتے تو یہی کچھ کرتے جو اب کر رہے ہو۔ بے شک تب تمہارے ہاتھ میں چھتر نہ ہوتا لیکن اپنے انداز میں لوگوں کی چھترول تم پھر بھی کر رہے ہوتے۔ اس لئے کہ تمہاری فطرت بد ہے۔ تمہارے منہ پر لکھا ہوا ہے کہ تم چیر پھاڑ کرنے والے جانور کی فطرت رکھتے ہو۔ زندگی میں محرومی کس کو نہیں ملتی، پر تم جیسے گھٹیا اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتے ہیں اور ایسا کرنا ان کا شغل بن جاتا ہے۔''

''میں سب مانتا ہوں جناب۔ آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کرتا لیکن اب میں وہ نہیں رہوں گا جو پہلے تھا۔''

رستم نے کہا۔ ''یہ تو بڑی پرانی بات ہے جبرو۔ جب تُو کسی شخص کو ننگا کر کے چھت سے الٹا لٹکاتا ہے اور اس پر ڈنڈے برساتا ہے تو وہ کیا کہتا ہے؟ یہ تو کبھی نہیں کہتا کہ میں پھر وہی کروں گا جو کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔ وہ تجھ سے معافیاں مانگتا ہے، تیرے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے اگلے پچھلوں کی توبہ لیکن تُو اسے چھوڑتا نہیں ہے۔ تجھے پتا ہوتا ہے کہ یہ سب زبانی کلامی باتیں ہیں اور چھترول کا کرشمہ ہیں اور تیرا اندازہ درست ہوتا ہے۔ تھانے کچہری کے چکر سے نکلنے کے بعد نوے فیصد مجرم وہی کرتے ہیں جو پہلے کرتے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں سر۔'' جبرو نے کہا۔ ''لیکن......''

ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ رستم کا پسٹل والا ہاتھ بے پناہ شدت سے گھوما۔ وزنی پسٹل کی ضرب جبرو کی عین کنپٹی پر لگی۔ ضرب اتنی شدید اور جچی تلی تھی کہ جبرو کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پتھریلی زمین پر جا گرا۔ اس کا سر دھپ کی آواز سے زمین پر لگا تھا۔

رستم نے تیزی کے ساتھ اس کے کپڑے اُتارے۔ پھر اس کے چہرے کی پٹیوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہیں بھی کھول دیا۔ اپنے کپڑے رستم نے جبرو کے جسم پر گھسیٹ دیئے۔ تب اس نے سائلنسر لگے پسٹل کو جبرو کی کنپٹی سے لگایا اور لبلبی دبا کر اس کی کھوپڑی اُڑا دی۔ گولی کے جھٹکے سے بے ہوش جبرو کا سر تیزی سے ایک طرف کو گیا۔ اس کا جسم ایک بار اینٹھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کی کنپٹی سے بہنے والا خون تیزی سے بھربھری مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ رستم نے اس کی لاش ایک قریبی گڑھے میں ٹھکانے لگائی اور پھر لوڈر کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ لوڈر کے ڈیش بورڈ میں سے رستم کو ہیڈ کانسٹیبل جبال عرف جبرو کے شناختی

کاغذات اور کارڈ وغیرہ مل گئے۔ اس کے علاوہ ڈیش بورڈ میں ہی سے کچھ روئی بھی ملی۔

رستم نے لوڈر کی اندرونی روشنی جلائی اور عقب نما آئینے کے سامنے جبرو ہی کے انداز میں پٹی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ پرانی پٹی کے نیچے اس نے تازہ روئی رکھ لی تھی۔ اسے پندرہ بیس منٹ لگے تاہم وہ ہو بہو جبرو کی نقل اُتارنے میں کامیاب رہا۔ رستم کا دو تہائی چہرہ اور تقریباً پورا سر پٹی کی زد میں آ چکا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اسے داج والی گھڑی کا خیال آیا۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا پھر یہ گھڑی ایک طرف پتھروں میں رکھ دی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا...... سون کے کسی غریب چرواہے کی بیٹی کے لئے۔

☆======☆======☆

جبرو کی اطلاعات درست تھیں۔ رستم جب کیمپ میں پہنچا تو پورا کیمپ ہی سو رہا تھا...... صرف دو چار افراد بیدار تھے اور ان میں سے وہ دو تھے جنہیں جبرو کے ساتھ پاپیادہ آگے روانہ ہونا تھا۔ ان میں سے درمیانی عمر کا قدرے صحت مند شخص حوالدار اجمل خان تھا۔ وہ نسواری رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے سر پر گول چمکیلی ٹوپی تھی۔ مقامی اجرالی شخص کلین شیو تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کا نام ملکا دین معلوم ہوا۔ دونوں افراد کے سفری بیگ تیار تھے۔ یہ کمر پر رکھنے والے بیگ تھے۔ ایسا ہی ایک تیسرا بیگ رستم کے لئے بھی تیار رکھا تھا۔ درحقیقت یہ رستم کے لئے نہیں ہیڈ کانسٹیبل جبرو کے لئے تھا اور جبرو یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور ایک گڑھے کے اندر ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس کیمپ میں تقریباً پانچ خیمے تھے۔ دو جیپیں بھی یہاں موجود تھیں۔ یہ پولیس جیپیں تھیں۔ وائرلیس سیٹ کے لئے انٹینا ایک اونچے ٹیلے پر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک خیمہ دوسروں خیموں سے علیحدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر سرخ ہلال کا نشان تھا۔ مطلب تھا کہ یہ عارضی ہسپتال ہے۔ خیموں میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ تین خیمے بالکل تاریک تھے۔

''کیسے ہو جبرو؟'' ایک آواز نے رستم کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

رستم نے دیکھا یہ بھی ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ وہ اس وقت بھی وردی میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پہرے وغیرہ کی ڈیوٹی پر ہے۔

''ٹھیک ہوں۔'' رستم نے کراہتے ہوئے بہت مدھم اور ناک میں گنگناتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا جبڑا دبایا اور مخاطب پر ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ بولنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔

''اگر زیادہ تکلیف ہے تو آج کا دن یہاں آرام کر لے۔ کل بھی کچھ بندوں نے یہاں

سے ڈیرے کی طرف جاتا ہے۔"

رستم نے نفی میں سر ہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ ٹھیک ہے۔

"چائے وغیرہ پی لو۔" کانسٹیبل نے ازراہِ ہمدردی کہا۔

رستم نے پھر نفی اور قدرے بےزاری سے سر ہلایا۔ جہاں اسے چائے کے لئے مدعو کیا جارہا تھا وہاں مدھم روشنی تھی۔ پہچانے جانے کا رسک نہ ہونے کے برابر تھا لیکن موجود تو تھا۔

ایک خیمے کے اندر کوئی عورت نیند کی حالت میں بُری طرح کھانس رہی تھی۔ پھر وہ کھانستے کھانستے ہی خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی اور ایک طرف بیٹھ کر قے کرنے لگی۔ خیمے کے اندر سے چھنتے والی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ رستم کو نظر آیا۔ یہ وہی لیڈی اہلکار تھی جو اپنے دو ساتھیوں کی موت کے بعد موقع سے بھاگ نکلی تھی۔ رستم اسے با آسانی شوٹ کر سکتا تھا لیکن اس نے رائفل کا ٹرائیگر نہیں دبایا تھا۔ اب وہ یہاں اپنے ساتھیوں میں موجود تھی اور عین ممکن تھا کہ اپنے ساتھی اہلکاروں کو رستم سیال کے ساتھ اپنے دلیرانہ معرکے کے قصے سناتی ہو۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ رستم پر ڈالی اور اپنے اسکارف سے منہ پونچھتی ہوئی واپس خیمے میں چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ تک کیمپ میں مزید رکنے کے بعد رستم اپنے دونوں ہمراہیوں کے ساتھ پیدل سفر پر روانہ ہوگیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کی "ریپیٹر" رستم کے کندھے پر تھی۔ اس کا اپنا کولٹ پسٹل قمیص کے نیچے لگا ہوا تھا۔ سفری بیگ یعنی "رک سیک" رستم کی کمر پر تھا۔ بدلیوں میں ڈوبتے ابھرتے چاند کی روشنی میں تنگ گھاٹیوں کے درمیان ان کا دشوار گزار سفر شروع ہوا۔ گاہے بگاہے وہ راستہ دیکھنے کے لئے اپنی ٹارچیں بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اجرالی ملکا دین آگے تھا۔ اس کے پیچھے حوالدار اور رستم تھے۔ حوالدار ایک باتونی شخص تھا۔ وہ مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا اور (اجرالی ملکا نے بھی تصدیق کی) کہ حوالدار نہایت ماہر نشانے باز ہے اور نشانہ بازی کے مختلف مقابلوں میں پولیس کی طرف سے بہت سے تمغے حاصل کر چکا ہے۔

حوالدار اور اجرالی کی گفتگو میں بہت جلد رستم اور لالے وغیرہ کا تذکرہ بھی شروع ہوگیا۔ وہ دونوں وڈے ڈیرے کے مکینوں کو بُرے لفظوں میں یاد کرنے لگے۔ رستم ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور خود پر ضبط کرتا رہا۔ حوالدار اجمل خان پنجاب پولیس کے ایک انسپکٹر شجاع کو اپنا پرانا دوست بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انسپکٹر شجاع سے خصوصی درخواست کر کے وڈے ڈیرے کی لڑائی میں شریک ہونے جا رہا ہے۔ اپنی اس شدید خواہش کی جو وجہ حوالدار

نے ظاہر کی وہ رستم کے لئے مزید چونکا دینے والی تھی۔ اس وجہ کا تعلق بہروپیے پیر قدرت اللہ سے تھا۔

حوالدار نے جوش سے کہا۔ "خو، اس ارامی (حرامی) لالے اور رستم نے امارے پیرومرشد کے خلاف محاذ کھڑا کر رکھا ہے۔ خاص طور سے رستم تو پیر صیب اور ان کی فیملی کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ام آپ کو کیا بتائے ملتان والے واقعے کے بعد سے امارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اس بدمعاش رستم نے ایسا ظلم کیا ہے کہ خدا کا خدائی کانپ گیا ہے۔ امارے پانچ پیر بھائی جان سے گئے ہیں اور سب سے بڑا قہر یہ ہوا کہ پیرومرشد کا زوجہ امارے درمیان نہیں رہا ہے۔ کاش امارا اپنا خاندان ختم ہو جاتا۔ امارا بچہ کٹ مرتا لیکن پیرومرشد کو اتنا بڑا دکھ نہ پہنچتا۔ ام نے قسم کھایا ہے کہ ان بدمعاشوں سے اس ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اگر اس کام میں جان دینے کا ضرورت ہے تو بخدا ام سب سے آگے بڑھ کر جان دے گا۔" حوالدار کے لہجے میں بجلی کڑک رہی تھی۔

اجرالی ملکا دین نے کہا۔ "پیر قدرت اللہ کے بارے میں تو میں نے بھی بہت کچھ سنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایسی جونکیں ہیں جو جسم سے صرف بیمار خون نکالتی ہیں۔"

"خو چہ! یہ تو بس ایک کرشمہ ہے۔ ازرت صیب (حضرت صاحب) کے پاس ایسا ایک سو ایک کرشمہ ہے۔ ایسا ایسا کرامات ہے ان کے پاس کہ عقل دنگ رہ جاتا ہے۔ ازرت صیب مہینے میں ایک بار امارے علاقے حسن ابدال میں تشریف لاتا ہے۔ ان سے ملنے والوں کا لائنیں لگ جاتا ہے۔ بہت زیادہ شفا ہے ان کے ہاتھ میں۔"

اجرالی ملکا نے ذرا دبی دبی آواز میں کہا۔ "لیکن خان صاحب! ہم نے ایک اور بات بھی سنی تھی حضرت صاحب کے بارے میں۔"

"کیسا بات؟"

"سنا تھا کہ حضرت صاحب کی بی بی کو ڈاکوؤں نے زخمی کر دیا تھا۔ وہ گر کر بے ہوش ہوگئی تھی لیکن حضرت صاحب اپنے روحانی طریقے سے اسے ہوش میں نہیں لا سکے تھے حالانکہ......"

"او یہ سب کہنے سننے کا باتیں ہیں۔" حوالدار اجمل نے غصے سے ملکا کی بات کاٹی۔

"ازرت صیب کے مخالف ایسی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ ازرت صیب کا بی بی بے ہوش نہیں ہوا تھا بلکہ گولی لگنے کے بعد پوراً ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ ام کو امارے پیر بھائی قربان علی نے خود بتایا ہے۔"

اجرالی نے کہا۔ ''کچھ بھی ہے جی لیکن وہاں ہوا ظلم ہے۔ وہ تو سنا ہے کہ رستم کو چاہنے والی کسی لڑکی نے آ کر رستم کا ہاتھ روک لیا، نہیں تو رستم نے پیر صاحب کی دوسری بیوی کو بھی مار چھوڑنا تھا۔ پتا نہیں کیا نام ہے اس لڑکی کا.....''

''بی بی کہتے ہیں۔'' حوالدار اجمل نے کہا۔ ''لیکن امارى سمجھ میں تو وہ بھی دوغلا عورت ہے۔ اس کا کیا پتا کہ اندر سے وہ اب بھی رستم کے ساتھ ہی ہو۔ ویسے تو وہ بڑا سماجی کارکن بنتا ہے لیکن خوچے تم کو مالوم ہی ہوگا کہ یہ عشق ماشوقی کا چکر اتنی جلدی ختم نہیں ہوتا۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ بی بی پکا پکا ماشوق تھا رستم کا۔ ایک گاؤں کے میلے میں اس نے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ اس خبیث کو چھپی ڈالا تھا، اس کے حصے کا لاٹھی بھی اپنی پیٹھ پر کھایا تھا.....''

یہ گفتگو اب رستم کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ جی تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ اس چرب زبان حوالدار کی گردن توڑ کر اسے نیچے کھڈ میں پھینک دے لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ فی الوقت کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گفتگو کا رخ موڑ دے۔

''اندازاً کتنا سفر رہ گیا ہے؟'' رستم نے ملکا سے پوچھا۔

''امید ہے کہ فجر سے پہلے پہنچ جائیں گے لیکن کوئی پتا نہیں کہ وہاں سے پھر آگے روانہ کر دیا جائے۔''

''آگے کہاں؟''

''تمہیں انسپکٹر شاد نے نہیں بتایا تھا.....زیادہ نفری کو آج سویرے پانڈو درے کی طرف چلے جانا ہے۔ لگتا ہے کہ وہیں پر اصل لڑائی ہونے والی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ لالہ اور اس کے ساتھی پانڈو درے کی طرف چلے جائیں گے؟''

''لگتا ہے کہ وہ یہی غلطی کر رہے ہیں لیکن یہ غلطی ہمارے لئے بڑی فائدہ مند ہے۔ دعا کرو کہ وہ یہ غلطی کر گزریں۔'' ملکا نے کہا۔

''امارا تو بس ایک ہی دعا ہے۔'' حوالدار نے نسوار کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ لڑائی جہاں بھی ہو لیکن اس میں امارا سامنا اس ارامی لالے اور رستم سے ضرور ہو۔ خدا قسم ان دونوں کو دیکھ کر ایک میل سے بھی گولی چلائے گا تو دونوں آنکھوں کے بالکل درمیان میں لگے گا۔ ناپ کر دیکھ لینا ایک ملی کا فرق نہیں ہوگا۔''

ملکا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن رستم تو ڈیرے سے نکل چکا ہے۔ اب وہ واپس اس آگ میں کہاں کودے گا؟''

''تم پولیس میں نہیں ہو اس لئے ایسا بات کر رہے ہو۔ ام ان ڈکیت لوگوں کو تم سے

زیادہ جانتا ہے اور جس طرح کا یہ بندہ رستم ہے، ام کو تو پورا یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے گا۔ یہ باغی لوگ ایسا ہی کریک ہوتا ہے اور سچ پوچھو تو ان کے کریک ہونے میں ہی ان کا شان ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا اجرو؟'' حوالدار نے رستم سے تصدیق چاہی۔

رستم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

حوالدار اجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ام اس کو چھوڑے گا نہیں ملکا۔ ام نے قسم کھا رکھا ہے اس سے اپنے پیر و مرشد کا بدلہ ضرور چکائے گا۔ اگر وہ یہاں نہیں ملے گا تو ام اس کو کسی اور جگہ ڈھونڈ لے گا۔''

رات پچھلے پہر وہ تینوں ستانے کے لئے ایک ٹیلے پر رک گئے۔ ہوا میں خنکی تھی، پوٹھوہار کا چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور اس کی کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ ایک چکور دل گداز صدا میں پکارتا ہوا ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ وہ چاند کا راہی تھا اور چاند اس سے بہت دور تھا۔ وہ بے چارا ساری زندگی بھی اُڑتا رہتا تو اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس کی پرواز بے سود اور اس کی سعی لاحاصل تھی۔ اس کا نصیبا یہی تھا کہ وہ اُڑتے اُڑتے ہانپ کر گرے اور مر جائے۔ سو وہ جتنی جلدی مر جاتا اس کے لئے اتنا ہی اچھا تھا۔ ہاں جب چاند تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو پھر اس کی چاہ میں ہانپ ہانپ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ رستم کو لگا کہ بی بی بھی ایک چاند ہی ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر۔ ایک تاب دار جسم جس سے نور کی ٹھنڈی کرنیں برستی ہیں اور اپنے اردگرد موجود لوگوں کو سرشار کرتی ہیں اور وہ خود... گناہ اور جرم کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ایک قابلِ نفرت شخص جس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہے اور تختہ دار کسی بھی وقت اس کے پاؤں تلے سے نکالا جا سکتا ہے۔ رستم جب اس انداز سے سوچتا تھا تو اس کا دل گواہی دینے لگتا تھا کہ وہ جس راہ پر جا رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ پیار صرف پا لینے کا نام ہی تو نہیں ہوتا۔ جدائی کے چناب کے دونوں کناروں پر رہ کر بھی تو پیار کیا جاتا ہے اور یہ بھی تو ضروری نہیں ہوتا کہ اس کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے لئے دونوں کناروں پر رہنے والے دونوں مکین لہروں کی نذر ہوں۔ کسی ایک مکین کے لہروں میں کودنے سے بھی تو کہانی ختم ہو سکتی ہے اور رستم ان لہروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے بڑی اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ بی بی کی زندگی کا رخ کس طرف ہے۔ بھابو مقبول کے بیمار بچے میں اس کی جان تھی اور وہ بچہ بھی شانی کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ بی بی شانی کے اردگرد کے دیگر حالات بھی اسے مجبور کرتے تھے کہ وہ انسانوں کے اس پُرخطر جنگل میں محفوظ پناہ حاصل کرنے کے لئے چوہدری بشیر کی حفاظت میں چلی جائے۔ چوہدری بشیر کی بیوی بننے کے بعد

وہ اپنے اردگرد کے حالات کو سدھارنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ بی بی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی نیک نام ماں وڈی آپا کی طرح لوگوں کے دل میں بسیرا کرے۔ ان کے مسائل کے حل کے لئے اور ان کی زندگیوں کو سدھارنے کے لئے اپنا آپ وقف کردے اور وہ ایسا کرسکتی تھی۔ قدرت نے اسے دوسروں سے جدا پیدا کیا تھا۔ اس میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اگر اسے چوہدری بشیر جیسا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا میسر آجاتا تو وہ بہت کچھ کرسکتی تھی۔

رستم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا۔ بی بی ایک بہت اونچی مسند پر بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے عقیدت اور محبت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اپنے مسائل بیان کررہے تھے۔ اپنے معاملات کے لئے اس سے رائے طلب کررہے تھے۔ وہ ان کے درمیان مسکرارہی تھی۔ اپنے نور کی کرنیں ان پر نچھاور کررہی تھی۔ پھر رستم کے تصور نے اسے جوہرآباد کے ہسپتال کا منظر دکھایا۔ خستہ حال عمارت کی جگہ ایک بڑی عمارت کھڑی ہوچکی تھی۔ بی بی اس شاندار ہسپتال کا افتتاح کررہی تھی۔ اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق علاقے کے لوگوں کے لئے صحت مند زندگی کا نیا راستہ کھول رہی تھی۔
چوہدری بشیر اس کے ساتھ تھا۔ ایک بہت بڑے پُرجوش ہجوم نے بی بی کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ پھر رستم نے اپنی بی بی کو ایک بہت بڑی پنچایت میں دیکھا۔ علاقے کے معززین اس کے سامنے مؤدب بیٹھے تھے۔ اس کے پُرشباب چہرے پر دانا لوگوں کا سا ٹھہراؤ تھا۔ وہ لوگوں کے فیصلے کررہی تھی، ان کے معاملات سلجھا رہی تھی۔ اپنے تصور میں وہ رستم کو اتنی پیاری لگی کہ اس کا دل چاہا اپنی آنکھیں بند کرلے اور زندگی کی آخری سانس تک بند رکھے...... ہاں زندگی، سب کچھ حاصل کرلینے کا نام ہی تو نہیں ہے اور رستم نے دھیرے دھیرے اپنے دل و دماغ کو تلخ ترین حقیقتوں کے لئے قائل کرلیا تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر دل ہی دل میں کہا۔
''کوئی شکوہ نہیں بی بی...... کوئی شکوہ نہیں...... جیسے آپ خوش ویسے میں خوش۔''
وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چند قدم چل کر کھائی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ نیچے نیم تاریکی میں سے دو گیدڑ چلاتے ہوئے گزرے اور ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے۔ رستم نے دور شمال مغرب کی طرف دیکھا۔ وڈا ڈیرہ اب زیادہ دور نہیں تھا اور وہاں رستم کے سنگی ساتھی تھے۔ جن کے ساتھ اس نے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور وہ سب بھوکے پیاسے موت کے گھیرے میں تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے حوالدار اجمل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جذبے ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں۔ ہاں یہ زندگی کو نفع نقصان کے ترازو پر نہیں تولتے۔ یہ بغیر حساب سب

کچھ لٹادیتے ہیں۔ یہ ننگے پاؤں انگاروں پر چلتے ہیں۔ یہ عین بہار میں صحراؤں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ کچے گھڑوں پر بپھرے چناب میں کودتے ہیں۔
رستم نے سفید پٹی کے اندر سے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی کے بالوں کو سہلایا اور زیرلب بڑبڑایا۔ ''میں آرہا ہوں لالے......''
قریباً تین گھنٹے بعد وہ تینوں وڈے ڈیرے کے نواح میں تھے۔ آج سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک پولیس یا کوئی دوسری ایجنسی یہاں تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی لیکن اب یہاں نہ صرف پولیس موجود تھی بلکہ انہوں نے اچھی جگہوں پر پوزیشن بھی لے رکھی تھی۔ رستم کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید یہاں پر ڈپٹی ریاض سے ملاقات ہوسکے۔
ڈیرہ قریباً آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پانی کی بلند و بالا ٹینکی نظر آرہی تھی اس کے علاوہ تینوں سرنگوں کے دہانوں پر جلتی مشعلیں بھی اپنی روشنی ظاہر کررہی تھیں۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ ''خوچے تھوڑا سا خوش ہوجاؤ۔'' حوالدار اجمل نے کہا۔ ''ام کو لگتا ہے کہ ام کو آرام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ ڈپٹی صیب اپنے جتھے کے ساتھ پانڈو کی طرف جاچکا ہے۔ اب ام کو شاید دوپہر کے بعد بھیجا جائے گا۔''
رستم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ پولیس کی پوزیشنوں پر زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔ ایک جگہ عینک والے ایک انسپکٹر صاحب نے ان کے کاغذات وغیرہ چیک کئے اور انہیں ایک چھولداری میں بھیج دیا گیا۔ انہیں آرام کرنے کا کہا گیا لیکن رستم کی قسمت میں آرام کہاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رات کے اس آخری پہر کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اگر گمراہ کن وائرلیس پیغام کے مطابق وڈے ڈیرے کے لوگ بارودی سرنگوں کے حصار سے نکل کر پانڈو درے کی طرف چلے گئے تو پھر ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچے۔ بے حد ضروری تھا کہ انہیں اس خوفناک سازش سے بچانے کے لئے ان تک فوری رسائی حاصل کی جائے۔
چھولداری میں نمدہ بچھا تھا اور لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ اجرالی ملکا اور اجمل نیم دراز ہوتے ہی اونگھنے لگے۔ بظاہر رستم بھی لیٹا رہا تھا وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ وقت ڈیرے کی طرف جانے کے لئے موزوں ترین ہے۔
چاند مغربی افق پر جھک چکا تھا۔ کچھ بڑی بدلیاں دھیرے دھیرے تیرتی ہوئی چاند کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں قرب و جوار پھر تاریکی میں ڈوبنے والے تھے۔ رستم نے ریپیٹر چیک کرنے کے بعد اپنے پسٹل کو ٹٹولا۔ سامان میں سے ایک ٹارچ نکال لی اور جانے کے لئے بالکل تیار ہوگیا۔ اپنا بھاری بھرکم سفری تھیلا اس نے چھولداری کے اندر ہی رہنے دیا

تھا۔ وہ ٹہلنے والے انداز میں چھولداری سے باہر نکل آیا۔ کچھ دور کینوس کے ایک سائبان تلے ایک چوکس سنتری موجود تھا۔ اس کے پاس ایک لالٹین رکھی تھی اور مونگ پھلی کے چھلکوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ایک جرمن ساختہ ایل ایم جی اس کے سامنے تھی۔

رستم سنتری کے سامنے سے گزر کر آہستہ آہستہ وڈے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگا۔

سنتری کچھ دیر تو خاموش رہا پھر پکار کر بولا۔ ''کدھر جار ہے ہو بھائی۔ آگے نہیں جانا۔''

رستم سنی اَن سنی کر کے چلتا رہا۔ سنتری نے پھر پکار کر کہا۔ ''آگے نہیں جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔''

رستم ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہونے کے سبب کچھ دیر کے لئے سنتری کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جب وہ دوبارہ سنتری کی نگاہ کی رینج میں آیا تو سنتری کی آواز کے ساتھ ایک اور پریشان آواز بھی شامل ہو چکی تھی۔ یہ دونوں افراد پکارے۔ ''رک جاؤ...... رک جاؤ۔''

رستم رکنے کے لئے نہیں چلا تھا۔ وہ نیچے جھک گیا اور دوڑنے لگا۔ شاید اب سنتریوں کو خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ انہوں نے دو فائر کئے۔ تاہم رستم کو صاف پتا چلا کہ یہ ہوائی فائر ہیں۔ وہ اب خاصی دوری پر آچکا تھا۔ یکایک اس نے پوری رفتار سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے عقب میں بہت سی آوازیں گونجیں، اس کے ساتھ ہی کئی ٹارچیں بھی روشن ہوگئیں۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ رستم کو زیادہ خطرہ سامنے سے تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ڈیرے میں موجود اس کے ساتھی اسے اپنی جانب آتا دیکھتے اور پولیس کا کوئی مہم جو سمجھ کر گولی چلا دیتے۔ رستم تقریباً دو سو میٹر مزید بھاگا اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، سامنے سے گولی چلی۔ یہ گولی چنگاری سی چھوڑتی ہوئی رستم کے آس پاس سے گزری۔ اس کے ساتھ ہی عقب میں دو بڑی بڑی سرچ لائٹس روشن ہوگئیں۔ یہ لائٹس پولیس کے سنتریوں نے روشن کی تھیں۔ تاہم رستم اب ان لائٹس کی زد سے دور نکل آیا تھا پھر سامنے سے دور مار رائفل کا ایک اور فائر ہوا۔ رستم حتی الامکان حد تک نیچے جھک گیا اور آگے بڑھتے ہوئے مزید احتیاط کرنے لگا۔ فرید، جسنے اور مراد وغیرہ کو یہ بتانے کے لئے کہ وہ دشمن نہیں دوست ہے، اس کے پاس ایک ذریعہ موجود تھا۔ یہ ٹارچ تھی۔ وہ اس ٹارچ کو خاص انداز میں پانچ بار جلا بجھا کر ان تک اپنا پیغام پہنچا سکتا تھا۔

اس نے ایک ٹیلے کی اوٹ لے کر ٹارچ والا ہاتھ اس طرح بلند کیا کہ وہ خود فائر سے محفوظ رہے لیکن ٹارچ کی روشنی ڈیرے تک پہنچ جائے۔ یکایک رستم کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ کوئی اس کے عقب میں موجود ہے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے

ہرگز توقع نہیں تھی کہ کوئی پولیس والا اس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈالے گا اور [illegible] چھوڑ کر رستم کے پیچھے بھاگا آئے گا۔ پولیس والے کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رخ سیدھا رستم کی پیشانی کی طرف تھا۔ پستول تھامے جانے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ اگر لبلبی دبائی گئی تو گولی رستم کی عین پیشانی پر لگے گی۔ رستم نے پہچان لیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ یہاں پہنچنے والا حوالدار اجمل خان تھا اور اجمل خان کا نشانہ خطا نہیں جاتا تھا۔

اجمل خان سنگین لہجے میں پھنکارا۔ ''اوئے، یہ ٹارچ نیچے رکھو اور دونوں ہاتھ کھڑا کرو۔''

رستم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ حوالدار اجمل نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔ ''ام کو تم پر پہلے ہی شک تھا۔ سچ بتاؤ، کون ہو تم؟ کیوں بھاگے ہو اس طرح؟'' وہ ہانپ رہا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' رستم نے بھی ہانپتے ہوئے آواز میں پوچھا۔

''امارا خیال ہے تم پولیس ملازم نہیں ہو، لالے اور رستم کے ساتھی ہو۔''

''اگر...... ایسا ہے تو پھر؟''

''ام کو بتاؤ کہ ایسا ہے یا نہیں؟'' اجمل خان کا لہجہ عجیب تھا۔ اس لہجے میں بے حد عجلت تھی۔ تین چار گولیاں چلنے کے بعد دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ پولیس والے اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈیرے سے بھی جواب آرہا تھا۔ وہ دونوں ٹیلے کی اوٹ میں تھے اور چنگاریاں سی اڑتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ دھماکوں نے رات کی خاموشی کا شیشہ چکنا چور کر ڈالا تھا۔ حوالدار اجمل خان نے سنسنی خیز لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ ''خو، تم چپ کیوں ہو، ام کو بتاؤ کہ تم لالے کے ساتھی ہو؟''

''ہاں ہوں۔'' رستم نے کہا۔

حسن ابدال کے ماہر ترین نشانہ باز نے اپنا پستول واسکٹ میں ڈال لیا اور بولا۔ ''ام تمہارے ساتھ جائے گا۔ چلو جلدی کرو، وہ لوگ ہمارے پیچھے نہ آجائے۔''

اب ٹارچ سے پیغام رسانی کا وقت نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس فائرنگ کی آڑ میں پولیس اہلکار کسی بھی لمحے ان کے پیچھے آسکتے تھے۔ رستم نے بڑے دھیان سے حوالدار اجمل کو سرتا پا دیکھا پھر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''خو، کیا بات ہے؟''

''میرے ساتھ جانا ہے تو اپنا پستول مجھے دے دو۔'' رستم کے لہجے میں ہلکی سی الجھن بھی تھی۔

حوالدار نے دو سیکنڈ کے لئے سوچا پھر پستول واسکٹ سے نکال کر رستم کو تھما دیا۔ اپنے سر کو پگھلے ہوئے سیسے کی مار سے بچانے کے لئے دونوں جھک گئے اور اسی حالت میں دوڑتے ہوئے ڈیرے کی سمت بڑھنے لگے۔ پوٹھوہار اپنی تاریخ دہرا رہا تھا۔ کچھ لوگ وادی سون میں بھاگ رہے تھے اور کچھ ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ آج کی رات فرق یہ تھا کہ بھاگنے والے پولیس کا گھیراؤ توڑ نہیں رہے تھے۔ اس ''گھیرے'' میں داخل ہو رہے تھے۔

☆=======☆=======☆

راجو اور کوکی کی منگنی کے بعد شانی کو اب جوہر آباد واپس جانا تھا۔ کوکی دیر تک شانی کے گلے لگی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے شانی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آپ نے مجھے بے موت مرنے سے بچالیا ہے۔''

شانی نے اس کی کمر تھپکی اور سر چوم کر خود سے جدا کر دیا۔ اسے اور عارف کو گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ حالات کی یہ کیسی ''کایا پلٹ'' تھی کہ وہ دونوں تاؤ حشام کے ساتھ ہی واپس جا رہے تھے۔ چند ماہ پہلے تک تاؤ حشام شانی اور عارف سے بات تک کرنے کا روادار نہیں تھا لیکن اب وہ شانی اور عارف کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی گاڑی میں ہی گوجرانوالہ اور پھر میانہ تک کا سفر کریں اور اس کی اس دعوت میں کوئی ہیر پھیر نہیں تھا۔ تاؤ حشام ایک بے حد جہاندیدہ اور خرانٹ شخص کا نام تھا۔ وہ بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ شانی نے رستم سے اس کی اور راجو کی جان بچا کر ایک ایسا کام کیا ہے جو شاید ہی رُوئے زمین پر کوئی اور کر سکتا۔ تاؤ حشام نے رستم پر ستم کے پہاڑ توڑے تھے اور اس کے قریبی دوست آفندی کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جواب میں رستم اسے اور راجو کو اٹھا کر وادی سون کی گہرائی میں لے گیا تھا۔ تاؤ جان گیا تھا کہ اب ان باپ بیٹے کی لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی......لیکن پھر شانی وہاں پہنچی تھی۔ وہی شانی جس کو ذلیل و رسوا کرنے میں تاؤ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ شانی نے تاؤ حشام، راجو اور ان کی موت کے درمیان ایک آہنی دیوار کا کام کیا تھا۔ وہ باپ بیٹے کو موت کے جبڑوں سے نہیں بلکہ موت کے حلق سے نکال کر لائی تھی اور اب یہ دوسرا ناقابلِ فراموش احسان تھا جو شانی کی طرف تاؤ حشام کے خانوادے پر ہوا تھا۔ شانی نے ایک بار پھر تاؤ کی سب سے چہیتی اولاد یعنی راجو کی زندگی بچائی تھی۔ اس نے بے لوث بھاگ دوڑ کی اور بالآخر ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سے امید کی روشن کرنیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

تاؤ حشام ایک ازیل شخص کا نام تھا لیکن راجو اور بابرے کی مسلسل کوششوں سے وہ آمادہ

ہو گیا تھا کہ شانی کو اپنی زبان سے اپنے ساتھ سفر کرنے کی دعوت دے۔ وہ علی الصبح 86 ماڈل کی ٹویوٹا کار میں ملتان سے روانہ ہوئے۔ اس گاڑی میں شانی اور عارف کے علاوہ راجو بھی تھا۔ تاؤ حشام دوسری گاڑی میں تھا۔ ابھی وہ لاہور سے قریباً سو میل دور ساہیوال کے آس پاس تھے کہ شانی کو موبائل پر چوہدری بشیر کا پیغام موصول ہوا۔ یہ موبائل سیٹ چوہدری بشیر نے ہی شانی کو فراہم کیا تھا۔ پیغام کے مطابق آج صبح مُنے کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی اور وہ بخار کی حالت میں ہذیان بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شانی کو بڑی شدت سے یاد کر رہا ہے۔

شانی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ چوہدری بشیر جھوٹ بول رہا ہے یا واقعی مُنے کی طبیعت زیادہ خراب ہے لیکن ایک بات واضح تھی کہ وہ اب اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اسے لاہور میں رکنا پڑے گا۔ (بشیر اور مُنا دو دن پہلے ملتان سے لاہور پہنچ چکے تھے) مُنے کی محبت نے شانی کے پاؤں زنجیر میں جکڑ لئے تھے۔ اپنی مرحومہ بھابو سے کیا ہوا وعدہ اب شانی کے لئے ایک ایسی شفقت بھری محبت میں تبدیل ہو چکا تھا جس سے نگاہ چرانا شانی کے لئے ممکن ہی نہیں رہا تھا اور اب تو مُنے کے علاوہ شانی کے پاؤں میں اور بھی کئی ایسی زنجیریں پڑ گئی تھیں جن کا دوسرا سرا صرف اور صرف چوہدری بشیر کے ہاتھ میں تھا۔

چوہدری بشیر کے بارے میں سوچا تو شانی کے کانوں میں پھر وہی الفاظ گونجنے لگے جنہوں نے چند دن پہلے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔ چوہدری بشیر کے لہجے میں اسی سپ گندل کا زہر تھا جو کبھی چوہدری کے دادا مہر جی کے لہجے میں ظاہر ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے جنونی لہجے میں کہا تھا کہ اب اگر اس کی مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو وہ مُنے سمیت بہت کچھ ختم کر ڈالے گا۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شانی کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اب اسے چوہدری بشیر کے پاس جاتے ہوئے ڈر آتا تھا لیکن اس کے پاس جائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ زنجیروں کے سرے اس کے ہاتھ میں تھے۔ نہ جانے پچھلے چند دنوں سے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس کا شوہر......اس کا کج ادا شوہر چوہدری فاخر پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور اسے پھر سے آزمائش کی بھٹی میں جھونکنے والا ہے......چوہدری فاخر، چوہدری بشیر کی شکل میں اس کے سامنے ظاہر ہو رہا تھا۔

ایک جگہ پر پٹرول لینے کے لئے کار رکی تو شانی اور عارف باہر نکل آئے۔ عارف نے کہا۔ ''کیا ہوا شانی بہن! تم کچھ گم صم ہو گئی ہو؟''

''عارف! مجھے شاید ایک دن کے لئے لاہور میں رکنا پڑے گا۔ تم راجو کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں ان شاء اللہ کل لاہور سے نکل پڑوں گی۔''

''میرا خیال ہے تمہیں چوہدری بشیر کی طرف جانا ہوگا۔'' عارف نے قیافہ لگایا۔

''ہاں یہی بات ہے۔ چھوٹے کی طبیعت پھر خراب ہے۔''

''شانی بہن! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ چوہدری مُنے کی بیماری کے ذریعے تمہیں بلیک میل کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مُنا تمہاری کمزوری ہے اور......''

''جو کچھ بھی ہے عارف! مجھے لاہور میں رکنا ہی پڑے گا۔''

''دیکھو شانی، میں تمہارے ساتھ آیا تھا اور تمہیں ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔''

''لیکن......''

''میں ہوٹل میں رہ لوں گا۔'' عارف کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

لاہور میں شانی اور عارف باقی قافلے سے علیحدہ ہوگئے۔ شانی نے تاؤ حشام اور راجو کو بتایا کہ اسے اپنے ذاتی کام سے ایک دن کے لئے لاہور میں رکنا پڑ رہا ہے۔

پروگرام کے مطابق عارف راوی روڈ پر ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا جب کہ شانی لاہور کے مضافات میں چوہدری بشیر کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ یہ وسیع وعریض کوٹھی ٹیکسٹائل مل سے اٹیچ تھی۔ اس کوٹھی اور یہاں کی انیکسی سے شانی کی بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ وہ کئی ہفتے تک یہاں کی انیکسی میں قید رہی تھی۔ یہیں پر چوہدری بشیر نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے۔ یہیں پر بھابو نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں اور اپنے مُنے کو شانی کے سپرد کیا تھا۔ یہیں پر شانی نے قدرت اللہ کی دو بیویوں کی پٹائی کی تھی اور نتیجے میں اسے چوہدریوں کے شدید غم وغصہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ٹیکسی سے اُتر کر شانی کوٹھی میں داخل ہوئی تو اس کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہی اونچی دیواریں، وہی پہرے داروں کی طرح ساکت کھڑے سرو اور سفیدے کے لانبے درخت، وہی پُر ہول خاموشی جو وسیع رہائشی عمارتوں کا خاصا ہوتی ہے۔

شانی کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ ایک موٹر سائیکل سوار تھا جو مینار پاکستان کے پاس سے شانی کی ٹیکسی کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ کبھی آگے نکل جاتا تھا کبھی پیچھے رہ جاتا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی تھی اور بال لمبے تھے۔ شانی کو اس ہٹے کٹے شخص کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کا گہرا تاثر دکھائی دیتا تھا۔ جب شانی چوہدری بشیر کی کوٹھی میں داخل ہوئی، یہ شخص گیٹ سے کچھ دوری پر رک گیا اور پھر واپس چلا

گیا۔ نہ جانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ اس شخص کا تعلق پیر قدرت اللہ والے معاملات سے ہے۔ کوٹھی کی چار دیواری میں آ جانے کے بعد شانی نے اطمینان کی سانس لی لیکن یہ خالص اطمینان نہیں تھا ... ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اب اس چار دیواری کے اندر اور طرح کے اندیشے شانی کے رُوبرو تھے۔

شانی ایک لمبی چادر میں تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ وہ رہائشی حصے کی طرف آئی تو اس نے گراسی لان میں مُنے کو انگریز بچے کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ یہ وہی بچہ تھا جسے شانی نے ملتان میں شرابی ریچھ کی دست برد سے بچایا تھا۔

مُنے کو کھیلتے دیکھ کر شانی کو جہاں اطمینان ہوا، وہاں ایک نئی طرح کی پریشانی بھی محسوس ہوئی۔ چوہدری بشیر نے مُنے کے حوالے سے درست اطلاع نہیں دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اب اوچھے ہتھکنڈوں پر آ گیا ہے۔ شانی کو اپنے پاس بلانے کے لئے اس نے مُنے کی بیماری کا حیلہ بنایا تھا۔

مُنے نے شانی کو دیکھ لیا تھا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں اتنا جوش تھا کہ شانی گرتے گرتے بچی۔ شانی نے اسے اٹھایا اور پیار کیا۔ اس کا جسم تھوڑا سا گرم تھا۔ غالباً ہلکا پھلکا بخار ہوا تھا۔ مُنے کو چومنے چاٹنے کے بعد شانی نے انگریز بچے کو گود میں لیا۔ اس دوران میں بچے کی انگریز والدہ مسز گریس بھی پہنچ گئیں۔ وہ شانی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔ شانی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ممنونیت کا ایک عجیب تاثر ابھر آتا تھا۔ شانی کو لگتا تھا جیسے گریس کی آنکھوں سے تشکر کے جذبات ایک پھوار کی طرح نکل رہے ہیں اور اس پر برس رہے ہیں۔ اس کے علاوہ گریس کی آنکھوں میں دیکھ کر شانی کچھ کھو سی جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ گریس کی آنکھیں اس کی اپنی نہیں ہیں۔ یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں اور وہ ان آنکھوں کو پہلے سے جانتی ہے۔ گریس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی شانی کی۔

رسمی باتوں کے بعد شانی نے مُنے سے پوچھا۔ ''آپ کے ابو کدھر ہیں؟''

''کملے میں ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔'' وہ توتلی زبان میں بولا۔

شانی گریس سے اجازت لے کر مُنے کے ساتھ اندر آ گئی۔ چند بلند و بالا محرابی دروازوں سے گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک قالین پوش لاؤنج میں پہنچے۔ چوہدری بشیر یہاں پھیل کر ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور جہازی سائز کے ٹی وی سیٹ پر کوئی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ سامنے شیشے کی قیمتی تپائی پر سگریٹ اور وہسکی رکھی تھی۔ کمرے میں حسب معمول

الکحل کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ شانی نے سلام کیا۔ چوہدری نے سرد نگاہوں سے شانی کو دیکھا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا۔ ''بڑی دیر لگائی تم نے آتے آتے۔''

''جب آپ کا فون ملا ہم ساہیوال کے قریب تھے۔ راستے میں بس کھانا کھانے کے لئے رکے تھے۔''

''وہ تمہارا کمبوہ بھائی کدھر ہے؟''

''وہ . . . وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ دراصل اسے بھی یہاں کچھ کام تھا۔''

چوہدری بشیر نے ایسی نظروں سے شانی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، میں اتنا بے وقوف نہیں کہ تمہاری بات پر یقین کرلوں۔ تاہم یہ بات اس نے زبان سے نہیں کہی۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر وہ بولا۔ ''منے کو کل تیز بخار ہوگیا تھا۔ آج دوپہر سے کچھ بہتر ہوا ہے۔''

شانی نے ایک بار پھر مُنے کا گال چوما اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ چوہدری بشیر نے بیل بجا کر ملازم کو چائے کا آرڈر دیا اور فلم دیکھنے میں محو رہا۔ ''یہ انڈیا والے آرٹ مووی اچھی بناتے ہیں۔'' وہ اسکرین پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

پھر اس نے ریموٹ کے ذریعے فلم ری وائنڈ کی اور فلم کے شروع کے ایک سین کو دوبارہ دیکھنا شروع کردیا۔ بیوی اس نوجوان سے مل کر آتی ہے جس سے وہ شادی سے پہلے محبت کرتی تھی۔ شوہر کے دل میں الاؤ بھڑک رہا ہے۔ وہ بیوی کو ایک نہایت خوب صورت اور قیمتی بنارسی ساڑھی تحفے میں دیتا ہے۔ بیوی ساڑھی پہنتی ہے۔ آئینے کے سامنے گھوم گھوم کر دیکھتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے لیکن اچانک اس کی نگاہ پلو پر پڑتی ہے۔ پلو سے ساڑھی تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہے۔ اسے رفو کیا گیا ہے۔ بیوی کا چہرہ اُتر جاتا ہے۔ وہ شوہر سے کہتی ہے۔ ''یہ تو پھٹی ہوئی ہے''

''کیا مطلب؟'' شوہر پوچھتا ہے۔

''اس میں نقص ہے جانی۔''

''ایسا نقص تو تمہارے اندر بھی ہے ڈارلنگ۔'' شوہر عجیب لہجے میں کہتا ہے۔

بیوی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ تھرتھر کانپنے لگتی ہے۔ شوہر باہر چلا جاتا ہے۔

چوہدری بشیر نے ایک بار پھر فلم ری وائنڈ کر کے سین دوسری بار دیکھا اور پھر خاموشی سے اسی جگہ سے دیکھنے لگا جہاں سے پہلے دیکھ رہا تھا۔

شانی کو اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ عرصہ پہلے کا ایک

اور واقعہ یاد آگیا۔ چوہدری بشیر کے مرحوم بھائی فاخر نے بھی نار پور کی حویلی میں ایک بار ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے شانی کو ''شوہر کی طلب اور بیوی کی گرم جوشی'' کا ایک سین ٹی وی پر بار بار دکھایا تھا۔ بشیر بھی فاخر ہی کا بھائی تھا۔ بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ دونوں کے مزاج مختلف ہیں لیکن آہستہ آہستہ ثابت ہو رہا تھا کہ دونوں کی خصلت ایک ہی ہے۔ بتدریج بشیر کا ایک نیا روپ شانی کے سامنے آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد فلم ختم ہوگئی۔ بشیر نے ٹی وی آف کردیا اور مُنے سے کہا کہ وہ باہر جاکر کھیلے۔ مُنا خود پر جبر کر کے شانی کی گود سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ شانی کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا...... چوہدری بشیر ابھی شانی کا شوہر نہیں بنا تھا لیکن ابھی سے ایک سخت گیر شوہر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولا۔ ''بدھ کے دن سہ پہر تین اور رات بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھیں؟''

''ہوٹل میں۔'' شانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''تمہیں یاد ہوگا، میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ تم ہوٹل سے جواب نہیں دے رہی ہو۔''

''پپ...... پتا نہیں کہ آپ کو ایسا کیوں لگا۔''

''میں جب بھی ہوٹل میں تم سے رابطہ کرتا تھا، تمہارے موبائل سے ٹریفک کا شور سنائی دیتا تھا، اس دن کچھ سنائی نہیں دیا...... کیوں؟''

وہ تھانے داروں کی طرح تفتیش کر رہا تھا۔ شانی کے اندر سے کسی وقت خوف اور کسی وقت طیش کی لہر اٹھ رہی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ کھڑکیاں دروازے بند ہوں...... لیکن...... آپ مجھ سے اس طرح پوچھ گچھ کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس لئے کر رہا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے اور اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس معاہدے کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ اگر معاہدے کی کسی ایک شق کی خلاف ورزی ہوگی تو پھر سارا معاہدہ ختم ہوجائے گا۔'' بشیر کے لہجے میں طیش کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔

شانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی بشیر نے ہاتھ بڑھا کر شانی کی کلائی بڑی مضبوطی سے پکڑلی۔ اس کی گرفت میں ہیجانی سختی تھی۔ وہ پھنکارا۔ ''میرے اور اپنے نئے دور کی ابتدا جھوٹ سے نہ کرنا۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتادو، بدھ کے دن تین بجے سے رات بارہ بجے تک تم کہاں تھیں۔ میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

شانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ واقعی جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ جو تھوڑی بہت غلط

بیانی اس نے مجبوراً کی تھی وہ بھی اس کے دل و دماغ پر مسلسل کوڑے برسا رہی تھی۔ درحقیقت اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں چوہدری! میں اس روز عارف بھائی کے ساتھ رستم کی طرف گئی تھی۔''

چوہدری بشیر کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ اور کالا ہو گیا۔ شانی کی کلائی پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ ''کیوں گئی تھیں؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب ہر پرانے تعلق کو بھول جاؤ گی۔''

''میں..... رستم کو سمجھانے گئی تھی..... آخری بار..... میں اس سے کہنے گئی تھی کہ پولیس نے اسے مارنے کا پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔ وہ کہیں رُوپوش ہو جائے یا ملک سے باہر چلا جائے۔''

''پھر وہ مانا؟'' چوہدری کا لہجہ عجیب تھا۔

''پتا نہیں میں نے اپنا فرض ادا کیا۔''

''تم نے منانے کی کوشش تو کی ہوگی۔'' چوہدری نے دوسرے ہاتھ سے وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں نے بس ایک ہی بار بات کی۔''

''تم دونوں نے اکیلے میں بات کی..... یا کوئی اور بھی موجود تھا اور دیکھو جھوٹ نہیں بولنا۔''

''اکیلے میں بات کی تھی۔'' شانی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''بہت خوب..... اکیلے میں بات کی تھی۔'' چوہدری کے لہجے میں کاٹ تھی۔ اس نے اپنی آتشیں نظریں شانی کی نگاہوں میں گاڑ دیں۔ ''اس نے..... تم کو چھوا، یا.....؟''

''چوہدری آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' شانی بھڑک گئی۔ ''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لئے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔''

چوہدری بشیر نے شانی کی کلائی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے شانی کے پورے جسم نے جھٹکا کھایا اور اس کے بال کھل گئے۔ چوہدری نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''صرف میری بات کا جواب دو..... صرف میری بات کا جواب دو..... اس نے تم کو چھوا..... چھوا یا نہیں؟''

شانی کے آنسو نکل پڑے۔ ''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

چوہدری اپنا بھاری بھرکم چہرہ شانی کے بالکل قریب لے آیا۔ ''کیسے مان لوں تم

کہہ رہی ہو کہ آخری ملاقات تھی..... آخری ملاقات میں تم اکیلی اس کے پاس رہیں۔ اس نے تم کو چھوا تک نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''دیکھیں، میں نے آپ کو بتایا ہے کہ رستم سے میری بات صرف تین چار منٹ کے لئے ہوئی تھی.....''

''شٹ اَپ۔'' چوہدری نے دانت پیس کر شانی کی بات کاٹی۔ ''میرے سامنے اس کا نام لے کر بات مت کرو۔ مت لو اس کا نام۔''

شانی نے خوف زدہ نظروں سے بشیر کے جنونی تاثرات دیکھے۔ اس کی کلائی پر بشیر کی گرفت سخت تر تھی۔ چوہدری بشیر پھر پھنکارا۔ ''اس سے تمہاری بات صرف تین چار منٹ ہوئی لیکن تم نو دس گھنٹے تک ایک چھت تلے اس قاتل ڈکیت کے ساتھ رہیں۔ باقی وقت میں تم کیا کرتی رہیں؟''

''مم..... میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ عارف نے مجھے دوا دے کر سلا دیا تھا۔ موسم بھی بہت خراب تھا اس لئے ہم ہوٹل نہ لوٹ سکے۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے کراہی۔ ''پلیز میری کلائی چھوڑ دیں۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔''

چوہدری نے اپنے جنون میں جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں انگارہ تھیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''دیکھو..... میں آخری بار تمہیں پھر معاف کر دوں گا۔ مجھے سچ سچ بتا دو۔ ان نو دس گھنٹوں میں کیا ہوا؟''

''میرے ساتھ ایسا سلوک مت کریں۔ میں اس کی حق دار نہیں ہوں۔ میں آخری بار رستم..... مم میرا مطلب ہے اس سے ملی تھی، اب وہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے..... اور میری کلائی چھوڑ دیں، مجھے درد ہو رہا ہے۔'' وہ سسکی۔

چوہدری نے بڑی ڈھٹائی سے سر ہلایا۔ ''تم سچ نہیں بول رہی ہو اور میں تمہیں سچ بولنے پر مجبور کر دوں گا۔'' شانی نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر میز کی دراز میں سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر شانی کی روح فنا ہو گئی۔ وہ شانی کا چہرہ دیکھ کر پھنکارا۔ ''گھبراؤ مت۔ تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اور بہت کچھ ختم کر دوں گا۔''

شانی کے دل نے گواہی دی کہ آج اس نے یہاں کوٹھی میں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ چوہدری بشیر کی وحشت کسی ایسے سانحے کا باعث بن سکتی ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ اس کا دھیان آپ ہی آپ مُنے کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اسے مُنے

کی زندگی کی طرف سے شدید خطرہ محسوس ہوا۔ کچھ ایسے جانور بھی ہوتے ہیں جن میں نر اپنے بچے کو مار دیتا ہے اور ایسا جنسی جبلت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شانی کو لگا جیسے یہاں بھی کوئی ایسا ہی شدید جذبہ مُنے کے لئے ''خطرہ'' بن رہا ہے۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اسے اپنی جان کی مطلق پرواہ نہیں تھی لیکن اپنی پیاری بھابو سے کیا ہوا وعدہ اس کی روح میں بسا تھا۔ اس کی کلائی بدستور چوہدری کی بے رحم گرفت میں تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا اور دونوں ہاتھ چوہدری کے سامنے جوڑ دیئے۔ ''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں اسے واپس رکھیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا...... نہ آئندہ کچھ ہوگا۔ ہمارے درمیان جو طے ہوا ہے میں اس کے مطابق ہی چل رہی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں۔''

چوہدری خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شانی کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور اس بند کمرے میں اسے بدترین سلوک کا نشانہ بنائے گا لیکن یہ بات بھی تھی کہ وہ روتی گرلاتی شانی کی بجائے ہنستی مسکراتی شانی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی شانی جس کے پیکر میں خودسپردگی اور آمادگی کی تمام تر رعنائی شامل ہو۔ بے شک یہ رعنائی کسی جبر کا نتیجہ ہی ہو لیکن ہو تو۔ اس کی جلتی نگاہیں شانی کے حسین سراپے پر مرکوز رہیں۔ یہ نگاہیں جیسے شانی کے جسم میں سوراخ کر رہی تھیں۔

وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''مجھے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دو کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں اور تم وہاں کیا کرتی رہی۔''

شانی نے رک رک کر سب کچھ بتا دیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں بھی شانی کی کلائی بشیر کی آہنی گرفت میں رہی۔ وہ جیسے اس کی کلائی کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر بھول ہی چکا تھا۔ اس کی انگلیاں شانی کے گوشت میں پیوست تھیں اور تکلیف کے سبب ہاتھ لرزتا جا رہا تھا۔ بشیر کی یہ لاشعوری گرفت شاید اس احساس ملکیت کی عکاس تھی جو وہ شانی کے حوالے سے رکھتا تھا۔ اس نے جیسے صرف کلائی کو نہیں پورے جسم کو اپنی ملکیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس نے ایک ایک بات پوچھی۔ کئی سوالات کئے۔ معاہدے کی ساری شرائط شانی کی زبان سے سنیں۔ اس گفتگو کے دوران میں شانی کو کئی بار بے حد توہین محسوس ہوئی۔ اس کے اندر کی باہمت چوہدرانی نے اسے کچوکے دیئے لیکن وہ یہ سوچ کر سب کچھ سہتی رہی کہ بشیر نشے اور طیش میں دیوانہ ہو رہا ہے...... اس کی دیوانگی کے جواب میں تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا ہی عقل مندی تھی۔

خبر نہیں کہ کب تک شانی کو بشیر کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑتا اور بالآخر یہ صورتِ حال کیا رخ اختیار کرتی کہ ایک دستک نے شانی کی مشکل آسان کر دی۔ بند دروازے پر یہ دستک مسز گریس نے دی تھی۔ وہ شانی کو بلا رہی تھیں۔

مسز گریس کی آواز سن کر بشیر چونک گیا۔ اس کے غضب کا چڑھا ہوا پارہ ایک دم اتر سا گیا۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل ترکش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور شانی سے بولا۔ ''جاؤ۔ گریس کی بات سن لو۔''

شانی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے۔

''اب جاتی کیوں نہیں ہو؟'' بشیر پھنکارا۔

''میرا...... بازو چھوڑیں گے تو جاؤں گی۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔

چوہدری بشیر نے جیسے چونک کر بازو چھوڑ دیا۔ شانی کی دودھیا کلائی پر انگلیوں کے نشان یوں ثبت تھے جیسے کلائی کو گھنٹوں تک رسی سے باندھے رکھا گیا ہو۔ کلائی چھوٹتے ہی نسوں میں رکا ہوا خون تڑپ کر ہاتھ کی طرف آیا اور اسے گلابی کر گیا۔ انگلیاں کپکپاتی چلی جا رہی تھیں۔ شانی اس ستم زدہ کلائی اور ہاتھ کو اپنی اوڑھنی میں چھپاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس بالکل پاس پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ اس نے رک کر آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا پھر دروازہ کھولتی ہوئی باہر آ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی اور گریس کوٹھی کے ایک شاندار سجے ہوئے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ گریس کے چہرے پر شانی کے لئے ترحم اور تشویش کے آثار تھے۔ نہ جانے کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ یہ ذہین آنکھوں والی غیر ملکی خاتون شانی کے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہے۔ شانی نے محسوس کیا تھا کہ ملتان کے عثمانیہ ہاؤس میں بھی شانی جب بھی چوہدری کے پاس پہنچتی تھی گریس اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔ جیسے اس کی دیکھ بھال کر رہی ہو اور اس کو کسی متوقع مصیبت سے بچانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

گریس بہت سادہ انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی تھی۔ شانی اس کی بات بہ آسانی سمجھ لیتی تھی۔ شانی ایک چیز دیکھ کر چونکی۔ گریس کے کندھوں پر جو چادر تھی وہ شانی کی تھی۔ گریس نے یہ چادر بڑی چاہت سے اپنے پاس رکھی تھی اور اپنی شال شانی کو دے دی تھی۔ یوں وہ اپنے تئیں شانی کی دوپٹہ بدل بہن بنی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ریچھ والے سانحے کے بعد ہوا تھا۔ شانی، بے ڈیوس کو خوفناک ریچھ سے بچانے کی کوشش میں سوئمنگ پول کے اندر جا گری

تھی۔ ریچھ کی ہلاکت کے بعد شانی کو پول سے باہر نکالا گیا تھا اور گریس نے شانی کے سر پر اپنی شال ڈالی تھی۔

گریس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم اپنی چادر پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔'' شانی بھی جواباً ہولے سے مسکرائی۔ گریس نے کہا۔ ''یہ چادر میرے پاس اس واقعے کی نشانی ہے جسے میں اور اسٹیفن زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ میں سچ کہتی ہوں شونی (شانی) میں جتنی بار اپنے بچے کا منہ چومتی ہوں تمہیں یاد کرتی ہوں۔ اگر تم اس شام جرأت نہ دکھاتیں تو شاید آج '' گریس کی آواز رندھ گئی۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

''میرا کوئی کمال نہیں تھا میڈم گریس۔ شاید یہ میرے اندر کی عورت تھی جو آپ کے معصوم بچے ڈیوس کو مشکل میں نہ دیکھ سکی۔''

''جو کچھ بھی ہے شونی! تمہارا احسان زندگی بھر میرے دل پر نقش رہے گا۔ میں تمہیں ہر وقت یاد کرتی ہوں۔ تمہارے بارے میں دوسروں سے پوچھتی رہتی ہوں۔ نوکرانی فردوس اور زہرا نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ کچھ باتیں میں نے اپنے طور پر بھی معلوم کی ہیں۔''

شانی پھر ہلکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''آپ نے میرے بارے میں تو بہت کچھ جان لیا میڈم! لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرے دماغ میں بھی آپ کے بارے میں کئی سوال ابھرتے ہیں۔''

گریس بولی۔ ''شونی! پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے میڈم نہ کہا کرو۔ جس طرح میں تمہیں بے تکلفی سے بلاتی ہوں اسی طرح تم بھی بلاؤ۔ مجھے یہ اچھا لگے گا۔ جو سوال تم نے کیا ہے اس کا جواب میں تمہیں دینا چاہتی ہوں لیکن ڈرتی بھی ہوں۔ اسٹیفن نے بہت سختی سے منع کیا ہوا ہے۔''

''تو پھر آپ رہنے دیں۔'' شانی نے جلدی سے کہا۔

''تم نے مجھے فقرہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ اسٹیفن نے منع کیا ہے مگر تم اتنی اپنی لگتی ہو کہ میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی اور پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس یہ بات بالکل محفوظ بھی رہے گی۔''

''آپ کی مہربانی ہے کہ آپ مجھے اس لائق سمجھتی ہیں۔''

''پھر وہی آپ جناب..... تم مجھے تم کہہ کر ہی بلایا کرو۔'' ذرا توقف کرنے کے بعد گریس نے اپنی گود میں بیٹھے ننھے ڈیوس کو چوما اور اسے باہر بھیج دیا۔ تب اس نے آہستہ آہستہ

شانی کو بتانا شروع کیا۔ ''کہتے ہیں کہ اچھی بات جہاں سے بھی ملے لے لینی چاہیے۔ لندن میں ہمیں ایک پاکستانی شہری سے ایک اچھی چیز ملی اور ہم اس کی تحقیق کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ وہ پاکستانی کون تھا اور وہ اچھی چیز کیا تھی؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص دارا نام کا ایک دیہاتی تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ اس کے پاس برطانیہ کی شہریت تھی اور وہ اپنے بیٹے اور پوتوں کے پاس دس بارہ سال سے انگلینڈ میں مقیم تھا۔ دارا نامی یہ شخص چار سال پہلے پاکستان آیا۔ یہاں سے وہ اپنے ایک مقامی انڈین دوست یوراج سنگھ کے لئے ایک نباتاتی دوا لے کر گیا۔ یہ دوا ان دواؤں میں سے تھی جو عام طور پر عمر رسیدہ افراد جسمانی قوت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مسز گریس بولی۔ ''اس دوا کے نتائج حیرت انگیز تھے۔ بوڑھا یوراج سنگھ ایک نئی شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ بعد میں کچھ اور لوگوں نے بھی یہ دوا استعمال کی۔ ان میں لندن کا ایک انگریز کیمسٹ فلپ فریزر بھی تھا۔ فلپ اس روایتی دوا کے نتائج سے بے حد متاثر ہوا۔ ان لوگوں نے دارا نامی شخص کو خاص طور سے اس پودے کے حصول کے لئے پاکستان بھیجا جس سے یہ دوا تیار کی جاتی تھی۔ یہ نایاب پودا ہے اور اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس کی نمو کا ایک خاص موسم ہوتا ہے اور اسے خاص طریقے سے ہی پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ دارا کو اس پودے کے حصول میں جزوی کامیابی ہوئی۔ وہ کچھ دوا تیار کر کے انگلینڈ لایا۔ انگلینڈ میں کیمسٹ فلپ نے یہ دوا پرائیویٹ طور پر اپنے حلقہ احباب میں کچھ لوگوں کو استعمال کرائی۔ اس کے نتائج حیران کن تھے۔ یہ بیش قیمت ایلوپیتھک دواؤں سے کہیں کم قیمت اور کہیں زیادہ مؤثر تھی۔ ایک خاص حلقے میں تہلکہ سا مچ گیا۔ اس دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دارا اس نایاب پودے کو اپنے طور پر کاشت کرنے اور پروان چڑھانے کا قدیم فن بھی جانتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس نے لندن میں اپنے گھر کی پھلواری میں کچھ ایسے پودے تیار بھی کئے تھے لیکن پھر اسی دوران میں ایک انہونا واقعہ ہوا......''

مسز گریس نے چند لمحے توقف کیا اور شانی تجسس سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

مسز گریس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر انکشاف کیا۔ ''ایک رات کسی نے بوڑھے دارا اور اس کے جوان بیٹے کو قتل کر دیا۔ دونوں کی لاشیں پُراسرار طور پر گھر کے پچھواڑے پھلواری میں پائی گئیں۔ دو سال گزر چکے ہیں۔ اس معاملے کی تفتیش ابھی تک جاری ہے۔

کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا ہے۔ اب آہستہ آہستہ یہ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا ہے لیکن حیرت انگیز پودے اور اس سے تیار کی جانے والی دوا کا معاملہ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں ہنوز تازہ ہے اور وہ اس کا کھوج لگانا چاہتے ہیں۔"

شانی کے ذہن میں ہلچل تھی۔ مسز گریس اسے جو کچھ بتا رہی تھی، اس سے شانی کے ذہن میں کچھ نہایت تلخ اور لرزہ خیز یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ گریس جس پودے اور نباتاتی دوا کی بات کر رہی ہے، وہ اس کے بارے میں پہلے سے جانتی ہے۔ اس نے اپنے خیال کی تصدیق کے لئے گریس سے پوچھا۔ "آپ جس پودے کی بات کر رہی ہیں اسے کیا کہتے ہیں؟"

گریس بولی۔ "یہ پودا بہت چھوٹا ہوتا ہے، جڑی بوٹی کی شکل میں۔ یہ بہت نایاب ہے۔ اس کا نام چوہدری بشیر نے "سانپ کی ڈالی" بتایا ہے۔ سنا ہے کہ چوہدری بشیر کے دادا بھی اس پودے کی کاشت اور نشوونما کا خاص طریقہ جانتے تھے۔"

شانی کے ذہن کی ہلچل کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔ غالباً چوہدری بشیر نے "سپ گندل" کا ترجمہ "سانپ کی ڈالی" کر کے بتایا تھا۔ سپ گندل وہی زہرناک آتشیں جڑی بوٹی تھی جو چوہدری مہر کے دیمک زدہ جسم میں نیلے شعلے بھڑکاتی تھی اور کہنہ سالی میں بھی عورتوں کو حریص نظر سے دیکھتا تھا۔ اس خطرناک دوا کی زہرفشانی شانی کے لئے کوئی ڈھکی چھپی شے نہیں تھی۔ بدقسمتی سے شانی نے اس زہرفشانی کو بھگتا تھا اور بہت قریب سے اس کا سنگین نظارہ کیا تھا۔ شانی کو نارپور کی حویلی میں آگ لگنے سے پہلے کے مناظر بھولے نہیں تھے۔ چوہدری مہر کا سفاک ہرکارہ اکبرا شانی کے لئے سرتاپا وحشت بن گیا تھا۔ عہد قدیم کے کسی حبشی غلام کی طرح اپنے کرم خوردہ آقا کو عصمت دری کا تماشا دکھانے کے لئے وہ شانی پر پل پڑا تھا۔ اس وقت اس کی رگوں میں اسی منحوس "سپ گندل" کا زہر تھا۔ یہ سپ گندل بے بس شانی کو سانپ ہی طرح ڈس چکی ہوتی اگر اس وقت رستم کسی ڈرامائی کردار کی طرح دلیرانہ، حویلی میں داخل نہ ہوتا اور حویلی کے بے لگام مکینوں کو تہس نہس نہ کرتا۔

"کس سوچ میں کھو گئی ہو؟" گریس نے پوچھا۔

شانی چونک کر بولی۔ "کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ "سانپ کی ڈالی" کے متعلق میں نے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس پودے سے بننے والی دوا بہت خطرناک ہوتی ہے۔ کھانے والے کو وحشی دیوانہ بنا دیتی ہے۔"

گریس پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "کچھ لوگ وحشی، دیوانہ وغیرہ بننا چاہتے ہیں اور بیمار ذہن کی عورتیں بھی ایسے دیوانوں کو پسند کرتی ہیں لیکن لندن میں کیمسٹ فلپ کے نزدیک اس دوا کی اہمیت کسی اور وجہ سے ہے۔"

"کیا مطلب؟" شانی نے پوچھا۔

"اس پودے سے بننے والی دوا کی ایک خاصیت تو وہ ہے جو تم بتا رہی ہو لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی ایک خاصیت ظاہر ہوئی ہے اور یہ خاصیت پہلی سے بالکل مختلف اور زیادہ حیران کن ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"ابھی مجھے بھی ٹھیک سے بتا نہیں شونی! اور شاید اسٹیفن بھی زیادہ نہیں جانتا۔ بس اتنی خبر ہے کہ اس دوا کے استعمال کے دوران میں اتفاقی طور پر اس کی ایک بالکل غیر متوقع خاصیت کا پتہ چلا ہے اور دوا کی یہی اثر انگیزی ہے جس نے کیمسٹ فلپ کو اس پودے میں اتنی دلچسپی ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے۔"

"یہ فلپ صاحب کون ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"ایک کروڑ پتی شخص ہیں۔ میرے شوہر اسٹیفن نے ڈی فارمیسی کر رکھی ہے۔ اسٹیفن اور میں فلپ صاحب کی فارماسیوٹیکل فرم میں ہی ملازمت کرتے ہیں۔"

"یعنی آپ دونوں مسٹر فلپ کی طرف سے اس خاص پودے پر تحقیق کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔" شانی نے پوچھا۔

مسز گریس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن یہ سارا معاملہ بالکل "کانفی ڈینشل" ہے۔ ہم بڑے رازدارانہ طریقے سے یہاں آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاص پودے اور دارا اور ان کے بیٹے کی ناگہانی موت میں گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کچھ لوگ اس پودے کی حوالے سے بڑا سخت رویہ رکھتے ہیں...... شاید وہ نہیں چاہتے کہ اس پودے کی مصنوعی کاشت اور پرورش کا طریقہ دوسرے لوگوں تک پہنچے یا شاید وہ لوگ کسی روحانی حوالے سے اس پودے کی پرداخت کو غلط سمجھتے ہیں۔"

"یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں آ رہی ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے ناں شونی! مسٹر دارا کا دعویٰ تھا کہ وہ اس نایاب پودے کی کاشت کا نایاب طریقہ جانتے ہیں اور اس خودرو پودے کو مصنوعی ماحول میں پروان چڑھا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ لندن میں یہ کوشش کر رہے تھے کہ مسٹر دارا یا ان کے بیٹے سے اس پودے

کی کاشت کروائیں اور کاشت کا طریقہ جانیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بڑی رقموں کی پیشکش بھی کی جا رہی تھی۔"

"اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دارا کو رقمیں آفر کرنے والی پارٹیوں میں سے ہی کسی نے دارا اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔"

"یہ امکان بھی رد تو نہیں کیا جا سکتا۔" گریس نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ "مجھے کہنا تو نہیں چاہیے شونی! لیکن صرف یاد دہانی کرا رہی ہوں کہ ہماری یہ گفتگو ہم دونوں بہنوں کے درمیان ہی رہنی چاہیے۔"

"آپ اس حوالے سے بالکل بےفکر رہیں۔" شانی نے کہا۔

گریس بولی۔ "دیکھو، میں کیا بات کرنے بیٹھی تھی اور تم گفتگو کو کس رخ پر لے گئی ہو۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں، زیادہ سے زیادہ اور میرا دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہاری باتیں کرتی رہوں۔"

"میرے میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"تم میں بہت خاص بات ہے۔" گریس شانی کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔ پتا نہیں کیوں شانی کو لگا کہ اس نے یہ آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں۔ پورا چہرہ نہیں صرف یہ آنکھیں۔ گریس نے محبت سے شانی کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "شونی! میں نے کوشش کر کے تمہاری بہت سی کہانی جان لی ہے۔ میں تمہیں جتنا جتنا جانتی گئی ہوں، میرے دل میں تمہارے لئے اتنی ہی ہمدردی اور محبت پیدا ہوتی گئی ہے۔ میں نے سنا تھا شونی کہ مشرقی لڑکی ایثار اور وفا کا پیکر ہوتی ہے۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے کچھ واقعات بھی سن رکھے تھے لیکن ان پر یقین نہیں تھا۔ تمہیں دیکھا اور جانا تو یقین آ گیا۔"

"آپ کیا جانتی ہیں میرے بارے میں؟"

"کافی کچھ۔ مجھے پتا ہے کہ تمہارے والد ایک زمیندار چوہدری تھے لیکن ان سے بڑے ایک چوہدری نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ تمہارے والد کی زمینیں بک رہی تھیں، ان پر قرضوں کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ صورتِ حال میں بہتری کا بس ایک ہی راستہ تھا۔ تم اس دوسرے چوہدری سے شادی کر لو جس کی وجہ سے تمہارے والد اور دیگر اہلِ خانہ کو سخت معاشی تنگی کا سامنا تھا اور تم نے شادی کر لی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ شادی فقط ایک نام کی شادی ہے۔ ورنہ اس "ناتے" کے ذریعے تم سے ایک پرانی خاندانی رنجش کا بدلہ چکایا گیا

ہے۔ اس شادی کے بعد سخت گیر شوہر اور سسرالیوں کے ہاتھوں جو کچھ تم پر بیتی یہ ایک علیحدہ کہانی ہے لیکن اس کہانی میں ایک کہانی اور بھی ہے۔ بڑی پیاری۔ . . بڑی نرم گرم اور گداز۔ ایسی کہانیاں جو عام طور پر صرف تصورات کا کرشمہ ہی ہوتی ہیں لیکن تمہارے حوالے سے یہ کہانی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔"

مسز گریس نے چند لمحے توقف کر کے ذرا شوخ نظروں سے شانی کو دیکھا اور بولیں۔ "یہ ایک خطرناک ڈاکو اور ایک نوعمر چوہدرانی کے پیار کی کہانی ہے۔ میں اس کہانی کے بہت سے نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکی ہوں اور جو باتیں رہ گئی ہیں وہ مجھے تم بتا سکتی ہو۔"

"مم...... میں سمجھی نہیں۔"

"مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر مجھ سے کچھ مت چھپاؤ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ بہت کچھ تو میں جان ہی چکی ہوں۔"

اس کے بعد مسز گریس نے رستم کے ساتھ شانی کے ناتے کے بارے میں ایسے واقعات بتائے جنہیں سن کر شانی کو گریس کی معلومات پر یقین کرنا پڑا۔ شانی نے سن رکھا تھا کہ یہ انگریز لوگ جب کسی چیز کو کھوجنا شروع کرتے ہیں تو بڑی تندہی اور جان فشانی دکھاتے ہیں۔ ان پر ایک دُھن سی سوار ہو جاتی ہے۔ اب شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ پچھلے دنوں میں گریس پر بھی اس قسم کی دُھن سوار رہی ہے۔ ملتان میں اور یہاں آنے کے بعد بھی وہ شانی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتی رہی ہے اور اب کافی کچھ جانتی ہے۔ شانی کو یہ دونوں انگریز میاں بیوی پُراسرار لگتے رہے تھے لیکن اب گریس کے ساتھ تفصیلی ملاقات کے بعد یہ پُراسراریت کچھ کم ہو گئی تھی۔ غالباً گریس ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ یہاں حیرت انگیز پودے سپ گندل کی کھوج میں آئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ اس پودے کی پرورش عجیب و غریب طریقے سے ہوتی ہے۔ شانی نے بڑے چوہدری مہر کو سپ گندل کی دیکھ بھال کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس پودے کو خون پلاتا تھا اور ایک کوبرا سانپ اس پودے کی کیاریوں میں چکرایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی خبر نہیں کہ کیا کیا ٹوٹکے کیے جاتے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ گریس کا شوہر اسٹیفن بھی چوہدری بشیر کے ساتھ مل کر اسی قسم کے ٹوٹکوں میں مصروف ہے۔ کچھ دن پہلے شانی نے ملتان کے عثمانیہ ہاؤس میں اسٹیفن کو خون آلود ہاتھوں کے ساتھ کسی نامعلوم کام میں مصروف دیکھا تھا۔

"تم بات کرتے کرتے کس سوچ میں کھو جاتی ہو؟" گریس نے محبت سے شانی کو دیکھا۔

"نہیں... نہیں... کچھ بھی نہیں۔" شانی ٹھٹک گئی۔

وہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر خلوص بھرے پیار سے بولی۔ "ایک بے تکلف بات کہوں؟"

"کک... کیا؟"

"تم بڑی دلکش ہو۔ تمہاری طرف دل کھنچتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم کسی بھی مرد کو دیوانہ بنا سکتی ہو۔" شانی کا رنگ حیا سے سرخ ہو گیا لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ گریس بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں نے رستم کو دیکھا تو نہیں لیکن کہتے ہیں کہ وہ روایتی جرائم پیشہ لوگوں کی طرح بدنما نہیں۔ جواں سال اور قبول صورت ہے...... شاید اس کی فطرت بھی غلط نہیں۔ وہ صرف غلط حالات کا شکار ہوا ہے۔"

رستم کے ذکر پر شانی کو کوفت ہونے لگی۔ اس نے یوں داخلی دروازے کی طرف دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ بشیر کہیں آس پاس موجود ہوگا اور رستم کے ذکر پر ایک دم آگ بگولہ ہو جائے گا۔ وہ جیسے کراہ کر بولی۔ "پلیز گریس! یہ ذکر نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا......؟ وہ جسے تم پیار کرتی ہو یا یہ حالات جنہوں نے تمہیں گھیرا ہوا ہے؟" گریس نے اعتماد سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" شانی کا لہجہ دل فگار تھا۔

گریس نے اپنے شہد رنگے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا، اپنے گداز ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور عجیب لہجے میں بولی۔ "مشرق اور مشرق کی پُراسراریت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور ان مشرقی لڑکیوں کے بارے میں بھی جو الف لیلہ کے کرداروں کی طرح ناقابلِ فہم ہوتی ہیں۔ ان کے سینے میں بڑے نازک لیکن بڑے مضبوط دل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں دنیا کے حسین ترین سپنے سجاتی ہیں لیکن مجبور ہو جانے کی صورت میں ان سپنوں کو اپنے ہاتھوں سے چکنا چور کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان پر جو کچھ بھی بیتے لیکن ان کی حالت دیکھنے والوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے پیاسے ہونٹوں کو ایثار کے سوئی دھاگے سے یوں سیتی ہیں کہ ہلکی سی آہ بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتی...... ہاں شانی! میں نے بہت کچھ سنا تھا ان لڑکیوں کے بارے میں لیکن یقین نہیں تھا کہ ایک دن ایک مشرقی لڑکی میرے روبرو بھی ہوگی۔ محبت، وفا اور ایثار کی پتلی۔ پھول سے بڑھ کر نازک اور چٹان سے بڑھ کر مضبوط۔"

"یہ...... آپ کیا کہہ رہی ہیں گریس؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہے۔" گریس نے غیر معمولی لہجے میں کہا۔ اس نے

ایک آہ نما سانس کھینچی اور خالی نظروں سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں خاندانی طور پر کرسچن ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا کوئی خصوصی مذہب نہیں ہے۔ مجھے کئی مذاہب کی اچھی باتیں بھاتی ہیں اور میں انہیں اپنے دل میں محفوظ کرتی ہوں۔ خاص طور سے میں نے تمہارے مذہب کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ "تم نے یہ مقولہ سنا ہی ہوگا کہ جب حبس بہت بڑھ جاتا ہے تو تیز ہوائیں چلتی ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ جب تاریکی بہت گہری ہو جاتی ہے تو پھر صبح کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ سنا ہے تم نے؟"

شانی خاموش رہی۔ گریس بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تمہاری زندگی میں بھی حبس اور اندھیرا گہرا ہو چکا ہے شونی! اب اور گہرا ہوگا تو تم زندہ نہیں رہ سکو گی۔ اب تمہیں بارش اور ہوا کی ضرورت ہے...... اب تمہیں میری ضرورت ہے۔"

شانی نے ایک بار پھر تعجب سے گریس کو دیکھا۔ "میں سمجھی نہیں گریس؟"

"میں نے بتایا ہے ناں کہ میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم چاہو یا نہ چاہو، میں تمہاری مدد کروں گی۔ میں تمہاری زندگی کو حبس اور اندھیرے سے نکالنے کے لئے تمہارے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گی اور یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے شونی، اس میں لمبی سوچ بچار شامل ہے۔"

"آپ کی باتیں بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"دراصل تم سمجھنا نہیں چاہ رہی ہو۔" گریس نے شانی کی چادر اپنے کندھوں پر درست کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے پنجرے کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے۔ تم اس کہنہ تاریکی سے نکلنا نہیں چاہتیں جس نے تمہیں مدتوں سے جکڑا ہوا ہے۔ شونی...... شونی! تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم نے پیار کیا ہے۔ کہاں سے آیا ہے یہ پیار؟ یہ تمہاری اپنی ایجاد نہیں ہے۔ یہ "اوپر والے" کا دیا ہوا ہے۔ یہ قدرت نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لہو میں شامل کیا ہے۔ اسے گناہ اس دنیا نے بتایا ہے اور دنیا کے دستوروں نے۔"

شانی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "گریس! آپ نے ایک ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے جو میرے لئے ختم ہو چکا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، میں ماضی سے اپنا ہر ناتا توڑ چکی ہوں۔"

"ناتے اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتے شونی۔ جب تک رستم زندہ ہے ماضی سے تمہارا ناتا نہیں ٹوٹ سکتا۔"

ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "وہ زندہ کہاں ہے...... وہ تو بس سانس

لے رہا ہے۔ اس کی سانس کی ڈور کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اب تک ''وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

''تم ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''امید ہے بھی کہاں؟'' وہ منمنائی۔ ''اس کے جرم اتنے زیادہ ہیں کہ اسے کئی بار پھانسی کی سزا بھی کم سمجھی جائے۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس کے ہاتھوں کئی پولیس والے قتل ہو چکے ہیں۔ پولیس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ پوٹھوہار کے اندر سون میں جو بڑا پولیس ایکشن ہو رہا ہے اس کی بڑی وجہ رستم ہی ہے۔''

رستم کا لفظ منہ سے نکلا تو شانی ایک دم ٹھٹک گئی۔ کچھ دیر پہلے بشیر کے کہے ہوئے الفاظ وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برسنے لگے۔ بشیر نے کہا تھا۔ ''اس کا نام تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔'' یہ کیسی جان لیوا پابندیاں تھیں۔ یہ کیسا زہرناک جبر تھا۔

''کچھ بھی ہے شونی! وہ زندہ ہے اور جب تک سانس میں سانس ہو امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے...... اور میں تمہیں نہیں چھوڑنے دوں گی۔'' گریس کے لہجے میں ایک انوکھے عزم کی جھلک تھی۔

''میرے پاؤں میں بڑی زنجیریں ہیں گریس۔ آپ انہیں نہیں دیکھ سکتیں اور نہ شاید سمجھ سکتی ہیں۔''

''میں دیکھ اور سمجھ کر ہی بات کر رہی ہوں۔ میں نے تمہاری زنجیریں گن لی ہیں اور ان کی مضبوطی بھی دیکھ لی ہے۔'' وہ اپنی دُھن میں بولی۔

''آپ میرے لئے کیوں دکھی ہو رہی ہیں۔ مجھے اب اپنے حالات پر صبر آ گیا ہے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

مُنا کھیلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شانی کے لئے بہت سے پھول تھے۔ اس نے ایک معصوم عقیدت کے ساتھ یہ پھول شانی کی جھولی میں ڈال دیئے اور خود اس کے پہلو سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کرکٹ بیٹ تھا۔ یہ بیٹ بڑا تھا اور اس کے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ گریس مسکرانے لگی۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی کلائی اوڑھنی سے باہر آ گئی۔ ایک دم شانی کو احساس ہوا کہ گریس کی تیز نظریں کلائی کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس نے جلدی سے کلائی اندر کر لی مگر اس پر انگلیوں کے نیلگوں نشان گریس سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''تو تم کہتی ہو کہ تم بالکل ٹھیک ہو لیکن میں جانتی ہوں تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو صرف ابتداء

ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے اور یہ تم بھی بڑی اچھی طرح جانتی ہو۔ تم ایک ہی گھر میں، دوسری بار روندی جانے والی ہو اور اس مرتبہ تمہاری سزا زیادہ کڑی ہوگی کیونکہ اب بات صرف ایک پرانی رنجش کے بدلے کی نہیں۔ بہت سی دیگر رنجشیں بھی تمہارے کھاتے میں جمع ہیں۔ تمہیں بڑے چوہدری مہر جی کی قاتلہ سمجھا جاتا ہے۔ تم پر نارپور کی حویلی کو جلانے کا الزام ہے۔ تم پر رستم کی محبت کا الزام ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔''

''آپ...... آپ سمجھ نہیں رہی۔ مجھے بڑی برائیوں میں سے ایک چھوٹی برائی چننی ہے۔ چوہدری بشیر جو بھی ہے لیکن مجھے تحفظ دے سکتا ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ یہاں کے معاشرے میں ایک عورت کے لئے مضبوط سہارے کی کتنی اہمیت ہے اور پھر چوہدری بشیر کا دیا ہوا سہارا مجھے مُنے سے بھی قریب رکھے گا۔ اس معصوم کی زندگی اور خوشی کے لئے میں خود کو کئی بار قربان کر سکتی ہوں۔ آپ شاید اس ناتے کو ٹھیک سے نہ سمجھ سکیں جو میرے اور اس بچے کے درمیان موجود ہے۔ ہم دونوں ''ایک مرنے والی'' کے ساتھ کئے گئے وعدے میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ دور نہیں ہو سکتے۔'' شانی نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مُنے کا سر چوما۔

گریس بڑے اطمینان سے مسکرائی۔ ''میں نے کہا ہے ناں کہ میں نے تمہاری ساری زنجیریں گنی ہوئی ہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں ان زنجیروں سے باخبر ہوتے ہوئے ہی کہہ رہی ہوں...... ہاں شونی، میں تمہیں اکسا رہی ہوں۔ تمہیں بغاوت پر آمادہ کر رہی ہوں۔ کیونکہ کبھی کبھی بغاوت نہ کرنا بدترین اخلاقی جرم بن جاتا ہے۔''

باتوں باتوں میں ایک دم شانی کو یاد آیا کہ گریس جیسی آنکھیں اس نے کہاں دیکھی تھیں۔ اس کے بدن میں سرد لہری دوڑ گئی۔ اسے مہر جی کی موت کے بعد کا وہ انوکھا واقعہ یاد آیا جو آج بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اسے عرق آلود کر دیتا تھا۔ اسے نگینہ یاد آئی۔ وہ جو اپنی موت کے بعد اس سے ملی تھی۔ وہ نگینہ تھی؟ یا اس جیسی کوئی اور تھی؟ یا صرف شانی کے اونگھتے ہوئے ذہن کا کرشمہ تھا؟ وہ جو کچھ تھا آج تک شانی کی عقل فہم سے باہر رہا تھا اور اب شانی کو یوں لگ رہا تھا جیسے گریس کی آنکھوں میں سے نگینہ جھانک رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مماثلت تھی لیکن اس مماثلت نے شانی کو ماضی کے اس ناقابلِ فہم واقعے کی یاد دلا دی تھی۔

شانی نے ایک بار پھر دھیان سے گریس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گریس مسکرائی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ آپ کی آنکھیں کسی سے ملتی ہیں۔''

''دیکھو، میں کیا بات کر رہی ہوں اور تم کیا بات چھیڑ رہی ہو۔ شونی...... شونی! میں تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ بہت ایثار ہو چکا، بہت آنسو بہائے جا چکے۔ اس سلسلے کو اب کہیں نہ کہیں تو رکنا ہے۔ کسی نہ کسی نے تو روکنا ہے تو کیوں نہ ہم روکیں۔''

شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی باتوں کا کیا جواب دے۔ وہ خاموش رہی۔ گریس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''شونی! تم نے میرے بچے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ مجھے تم سے بہت قریب لے آیا ہے۔ میں بھی تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور تم چاہو یا نہ چاہو، میں نے وہ کر گزرنا ہے اور مجھے اوپر والے پر یقین ہے کہ میرے کئے ہوئے سے تمہاری زندگی میں بہتری آئے گی۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

شانی حیرت سے گریس کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کتنا آہنی عزم تھا اس عورت کے لب و لہجے میں۔ اچانک لان کی طرف سے کھلنے والی دیوار گیر کھڑکی کا شیشہ ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹا اور ایک جسم جست کر کے اندر آ گیا۔ یہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ شانی کو بس اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور مہندی لگے بال ہی نظر آئے۔ وہ ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چمکیلے پھل والا کمانی دار چاقو تھا۔ شانی اسے فوراً پہچان گئی۔ یہ وہی شخص تھا جو مینار پاکستان سے موٹر سائیکل پر شانی کے پیچھے لگا تھا اور کوٹھی کے مین گیٹ تک آیا تھا۔ اب یہ شخص بلائے ناگہانی کی طرح اس کمرے میں موجود تھا۔ شانی کو اس کے چہرے پر لرزہ خیز جنون نظر آیا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں صرف اور صرف شانی پر مرکوز تھیں۔

''حرام زادی...... کتیا...... تیری تو میں......'' اس نے شانی پر بدترین گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ دیوانہ وار گھوما۔ شانی تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ پھل اس کی گردن کو چھوتا ہوا گزرا۔ جنونی حملہ آور نے دوسرا وار شانی کی ناف پر کیا لیکن اس سے پہلے ہی گریس تڑپ کر اس پر جا گری۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورے زور سے چلائی تھی۔ شانی نے دونوں کو اوپر نیچے نیلگوں قالین پر گرتے دیکھا۔ حملہ آور گریس کے نیچے تھا مگر نیچے ہونے کے باوجود کسی بھی لمحے گریس کو جان لیوا زخم لگا سکتا تھا۔ مُنا سکتہ زدہ کھڑا تھا شانی نے اس کے ہاتھ سے لکڑی کا بیٹ کھینچا اور آگے بڑھ کر ایک طوفانی ضرب حملہ آور کے چاقو والے ہاتھ پر لگائی۔

شانی کی لگائی ہوئی دوسری ضرب نے حملہ آور کے ہاتھ سے چاقو چھڑوا دیا۔ اسی دوران میں حملہ آور نے زور لگایا اور پلٹی کھا کر گریس کو اپنے نیچے کر لیا۔ گریس عام یورپین لوگوں کی طرح مضبوط جسم کی تھی لیکن لمبے تڑنگے حملہ آور کے نیچے چھپ کر رہ گئی۔ اس نے مردوں کی طرح مٹھی بھینچ کر حملہ آور کے جبڑے پر مکا رسید کیا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس

نے وحشیانہ انداز میں گریس کی گردن دبانا شروع کر دی۔ شانی نے چوہدری بشیر کے گارڈز کو مدد کے لئے پکارا اور اس کے ساتھ ہی عقب سے حملہ آور کے جھاڑ جھنکاڑ بال اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے۔ رنگ والی کی یہ چھوٹی چوہدرانی بظاہر نرم و نازک ہونے کے باوجود دودھ مکھن کی پلی تھی۔ خطرے کے وقت اس کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا اور جسم میں بے پناہ توانائی بھر جاتی تھی۔ اس نے زور لگا کر حملہ آور کو گریس کے اوپر سے کھینچ لیا۔

یہی وقت تھا جب چودھری کے دو تین کارندے دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ وہ شکاری جانوروں کی طرح حملہ آور پر جھپٹ پڑے۔ انہوں نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا اور رائفل کے بٹ مارے۔ وہ چند سیکنڈ میں لہولہان ہو گیا۔ اس حالت میں بھی وہ بار بار شانی کی طرف انگلی اٹھا رہا تھا۔ ''تُو نے پیر و مرشد کی بیوی کو مارا ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔''

کارندوں نے ایک بار پھر اسے رائفلوں کے کندوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بشیر دروازے پر نمودار ہوا۔ ان لمحوں میں یوں لگ رہا تھا کہ شاید کارندے حملہ آور کو جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ بشیر نے انہیں ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔ حملہ آور فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے اگلے دو تین دانت ٹوٹ گئے تھے، سر پھٹ گیا تھا، دونوں ٹانگیں لہولہان تھیں۔ تاہم اس کی آنکھیں اب بھی انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پتھریلی انگوٹھیوں اور گلے کے تعویذ وغیرہ سے اندازہ ہوا کہ وہ پیر قدرت اللہ کے مریدوں میں سے ہے۔

جب بشیر کے کارندے حملہ آور کو اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے، وہ اس وقت بھی شانی کو خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ چلا رہا تھا۔ ''میں قتل کر دوں گا تجھے بھی اور تیرے یار کو بھی۔ تم دونوں میرے گناہ گار ہو۔ تم دونوں ہو۔''

شانی کا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے چودھری بشیر کی جانب دیکھا۔ وہ ترچھی نظروں سے شانی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک ساعت کے لیے دونوں کی نظریں ٹکرائیں...... اس ایک ساعت میں ہی بشیر کی نظریں جیسے بہت کچھ کہہ گئیں۔ ان نظروں نے کہا۔ ''سن رہی ہو ناں چودھری ارشاد کی شرماں والی دمی رانی! لوگ تمہاری کتنی عزت افزائی کر رہے ہیں۔ علی الاعلان، تمہارا ناتا ایک نامی گرامی ڈاکو سے جوڑ رہے ہیں۔ میرا حوصلہ دیکھو! پھر بھی تمہیں بیوی کا درجہ دے رہا ہوں۔ تمہاری بدنامیوں کے لئے پردہ اور تمہاری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن رہا ہوں...... میرے پاؤں دھو دھو کر پیو تو یہ بھی تمہارے

لیے کم ہے......''

بشیر کے کارندے جنونی عقیدت مند کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے موقع سے دور لے گئے۔ اس کی آواز کافی دور سے بھی شانی کے کانوں تک پہنچتی رہی۔

شانی نے مُنّے کو دیکھا، وہ ایک طرف ڈرا سہما کھڑا تھا۔ شانی نے اسے پیار کیا پھر آگے بڑھ کر گریس کو گلے سے لگالیا۔ ''بہت شکریہ گریس! آپ بروقت آگے نہ آتیں تو میرا چاقو سے بچنا محال تھا۔''

''کیوں آگے نہ آتی؟ میری پیاری سی بہن میری آنکھوں کے سامنے مشکل میں تھی۔'' گریس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شانی کا ماتھا چوما۔

بشیر کے مسلح کارندے پوری کوٹھی میں بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں حملہ آور کا کوئی ساتھی بھی یہاں نہ موجود ہو۔

شیرا احاطے میں تھا اور غصے میں چیخ چیخ کر اپنے ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا...... حرامزادو! پورا لشکر کا لشکر یہاں گھوم رہا ہے۔ چالیس چالیس ہزار کی گن بغل میں لے رکھی ہے لیکن کوئی بھی کتا تمہاری ٹانگوں سے گزر کر کوٹھی میں آجاتا ہے لعنت ہے تم پر اور تمہاری سیکورٹی پر۔''

''یہ کون بندہ تھا؟'' گریس نے اپنی شرٹ کے پھٹے ہوئے گریبان کو سینے پر برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ یہ اس بہروپیئے پیر قدرت اللہ کا کوئی گماشتہ ہے۔ آپ کو پتا چلا ہی ہوگا، چند دن پہلے رستم اور اس کے ساتھیوں نے ملتان میں قدرت اللہ کے کچھ مریدوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ اسی 'بدلے' کے لیے یہاں گھسا ہے۔''

شانی اور گریس نے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، حملہ آور کو نیم کے درخت تلے ایک چارپائی سے باندھ دیا گیا تھا اور اب بشیر کے کارندے اسے طبی امداد دے رہے تھے۔ بشیر بھی وہاں موجود تھا لیکن اب ایک دم چپ ہو گیا تھا۔

گریس نے کہا۔ ''شونی! لگتا ہے چودھری باشر (بشیر) کا رویہ اس حملہ آور کے ساتھ زیادہ سخت نہیں ہے۔ کہیں چودھری باشر بھی تو پیر صاحب کے ماننے والوں میں سے نہیں؟''

''کچھ عرصہ پہلے تک تو نہیں تھا لیکن اب میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند ماہ پہلے کچھ لوگوں کو خاص قسم کی خارش کی بیماری ہوئی تھی۔ ان میں بشیر بھی شامل تھا۔ بشیر کی طرح بہت سے لوگوں کو یہ وہم ہے کہ یہ بیماری صرف ان لوگوں کو ہوئی تھی جنہوں نے قدرت اللہ

کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اس واقعے کے بعد نہ صرف چودھری بشیر کا رویہ قدرت اللہ کے بارے میں بدلا بلکہ اور بھی بہت سے لوگ اس کے عقیدت مند ہو گئے۔''

''کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ 'جلدی بیماری' صرف ان لوگوں کو ہوئی تھی جنہوں نے گستاخی کی؟''

''کہنے سننے میں یہی آیا ہے لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو میری نظر میں تو یہ ایک اتفاق ہی ہوگا۔ آپ ہمارے دیہات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہیں۔ یہاں ایسی باتوں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور سادہ لوح لوگ اپنی عقیدت کے زور میں رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔''

''اس خارش والے واقعے کے بارے میں سنا تو میں نے بھی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی کوئی روحانی چکر ہو؟'' گریس نے زیرلب مسکرا کر کہا۔

''میں نے کہا ہے ناں کہ ہمارے ہاں لوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ ایسے ایسے شوشے چھوڑتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔''

''کچھ بھی ہے شونی! تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ قدرت اللہ کا یہ اکیلا ہی 'جنونی دیوانہ عقیدت مند' نہیں ہوگا اور بھی بہت سے ہوں گے۔ یہ جو کچھ آج ہوا ہے' تمہارے لئے ایک سنگین وارننگ کی حیثیت رکھتا ہے۔''

شانی ایک لمبی سانس لے کر رہ گئی۔ اس کا جسم ابھی تک ہنگامے کی شدت سے لرز رہا تھا۔ اس کے اردگرد خطرات تو پہلے ہی کم نہیں تھے۔ اب وہ یہ گھیرا مزید تنگ محسوس کرنے لگی تھی۔

اسی دوران میں شانی کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل اس کے شولڈر بیگ میں رکھا تھا۔ بیگ کی زپ وہ کھلی رکھتی تھی۔ اس نے فون کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ نامعلوم نمبر تھا لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو لگا کہ یہ فون کال ریسیو کرنا اس کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنے گا۔ اس کی چھٹی حس کبھی کبھی اسے ایسے ہی واشگاف انداز میں خبردار کیا کرتی تھی۔ بہرحال اس نے بٹن دبا کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نہ صرف غیر متوقع تھی بلکہ اس نے شانی کے خدشات کی تصدیق بھی کردی۔

یہ ڈی ایس پی ریاض ہٹلر کی آواز تھی۔ ''ہیلو بی بی جان! کیسی ہو؟ تمہارا خادم ڈی ایس پی ریاض بول رہا ہوں۔''

''آ...... آپ...... ؟ تت...... تم؟'' وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"ہاں ہاں...... آپ بھی اور تم بھی۔ ڈی ایس پی ریاض۔"

"تمہیں...... کیسے معلوم ہوا میرا نمبر؟"

ریاض نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ "بی بی جان! ہمارا تو کام ہی "معلوم" کرنا ہے۔ یہ تو صرف نمبر ہے۔ تمہارے اس خادم کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ بتاؤں گا تو تیرے بڑوں کی دھوتی ڈھیلی ہو جائے گی۔"

"کس لیے فون کیا ہے؟" شانی گریس سے دور ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"پولیس کسی وقت کسی کو بھی فون کرسکتی ہے لیکن.... فی الوقت میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ وہ تیرا یار رستم پھر سے وڈے ڈیرے میں پہنچ گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس گھٹے کے تخم کو ضرور کسی پیر فقیر کی بددعا لگی ہے۔ اچھا بھلا ڈیرے سے نکل گیا تھا، اب پھر گندی موت مرنے وہاں چلا گیا ہے۔"

"میں فون بند کر رہی ہوں۔" شانی غصے سے بولی۔

"بند کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ پچھتانا پڑے گا تجھے اور تیرے پچھلوں کو۔"

ڈپٹی کے لہجے میں موجود دھمکی نے شانی کو لرزا دیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ "اگر تم نے بات کرنی ہے تو اپنی زبان درست کرو۔"

"میری زبان تو پیدائش سے پہلے ہی ایسی تھی، اب کیا ٹھیک ہوگی لیکن اگر تم اپنے یار کو تھوڑی سی چمک دمک دکھا تیں تو اسے ٹھیک کرسکتی تھیں۔ وہ وڈے ڈیرے کی اوکھلی میں اپنا سر پھنسانے سے باز رہ سکتا تھا۔ اچھی بھلی کراری، خستہ لڑکی ہو تم۔ اس بے وقوف کو دو چار جھپیاں ڈالنی تھیں، دو چار راتیں اس کے ساتھ سونے کا وعدہ کرنا تھا...... ہوسکتا ہے کہ وہ اتنی بڑی بے وقوفی کرنے سے باز آجاتا۔ پر اب کیا ہوسکتا ہے۔ اب تو اس کنجر کے بی کی لاش ہی آنی ہے ڈیرے سے اور دیکھنا ایسی ایسی جگہ گولی لگی ہوگی اسے کہ غسل دینے والا بھی شرمائے گا۔"

شانی کا چہرہ طیش سے سرخ ہوگیا تھا، اس نے فون بند کر دیا۔

دو چار منٹ بعد دوبارہ بیل ہوئی۔ اس مرتبہ نمبر دوسرا تھا۔ شانی نے کال ریسیو کی لیکن اس مرتبہ بھی ریاض کی منحوس آواز ہی کانوں میں پڑی۔ "دیکھو فون بند نہ کرنا۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" ریاض کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ وہ سنجیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

"جو کہنا ہے جلدی کہو۔" شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بی بی جان...... دراصل حاجی حیات اور کچھ دوسرے افسر مجھ سے ناراض ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے جوہر آباد میں تجھے تین میتوں والی دھمکی کیوں دی۔"

"تین میتوں والی؟" شانی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"اوئے اتنی جلدی بھول گئی ہے چھوٹی چودھرانی۔"

ریاض کے لہجے میں زہرناک طنز تھا۔ "میں وہی بات کر رہا ہوں...... تین جنازوں والی۔"

شانی کا جسم سنسنا گیا۔ اسے یاد آگیا کہ ڈپٹی ریاض نے کس طرح سے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں دکھائی تھیں اور کہا تھا کہ اس نے پولیس کے ساتھ تعاون نہ کیا تو اس کے عزیزوں میں سے تین کے جنازے اگلے کچھ دنوں میں ضرور اٹھائے جائیں گے۔ یہ دھمکی جب بھی شانی کے ذہن میں آتی تھی، اس کی رگوں میں خون سنسنا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہوتا تھا کہ فی زمانہ پولیس کے کچھ افسران کتنے بااختیار اور بے لگام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی جیبوں میں قتل کرنے کا لائسنس لیے پھرتے ہیں۔ پولیس مقابلے کے نام پر کسی بھی شخص کی جان لے لینا ان کے لیے چنداں دشوار نہیں ہوتا اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ آج تک ایسے پولیس اہلکاروں میں سے کتنوں کا سنجیدگی سے ٹرائل ہوا ہے اور وہ اپنی قرار واقعی سزا تک پہنچے ہیں؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ڈپٹی ریاض؟" شانی نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"میں اس جنازوں والی بات کے لئے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

"یا تم ہوش میں نہیں ہو...... یا میرے کان ٹھیک سے نہیں سن رہے ہیں ڈپٹی صاحب۔"

"تمہارے دونوں اندازے غلط ہیں۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔" ڈپٹی ریاض کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اس لہجے کے پیچھے کیا چھپا ہے، یہ جاننا کم از کم شانی کے لئے تو ممکن نہیں تھا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "ڈپٹی صاحب، آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ معافیاں مانگنا تو عوام کا کام ہے۔ آپ تو پولیس والے ہو اور "پولیس والے" بھی معمولی نہیں۔"

"دیکھو بی بی جان! طنز نہ کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ میں واقعی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

شانی خاموش رہی۔ ڈپٹی ریاض نے ایک بار پھر اصرار سے کہا تو وہ رکھائی سے بولی۔

"ٹھیک ہے، میں نے معاف کیا۔"

"نہیں نہیں بی بی جان... ایسے نہیں۔ میں خود آنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنا شرمندہ ہوتا دکھانا چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑنا چاہتا ہوں تمہارے سامنے۔"

"میرے لئے یہ کرنا مشکل ہے۔"

"لیکن میرے لئے نہیں۔ تم جہاں کہو گی، میں آجاؤں گا بلکہ میں اس کام میں زیادہ دیر بھی نہیں کرنا چاہتا اور بات یہ ہے کہ میرے ساتھ ملنے سے تمہارا بہت زیادہ فائدہ بھی ہوگا۔ قسم سے خوش ہو جاؤ گی تم۔"

شانی کو جھرجھری سی آ گئی۔ ریاض کا لہجہ اسے ہمیشہ ایسے ہی لرزا دیتا تھا۔ اسے حاجی حیات خان کی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے مہتم بستی میں بھی شانی سے بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ ریاض ہٹلر کے ساتھ جو بھی بات چیت ہو اس سے انہیں آگاہ کیا جائے اور اپنے طور پر کوئی فیصلہ بھی نہ کیا جائے۔ شانی کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا کہ حاجی حیات یا سب انسپکٹر اختر کے علم میں لائے بغیر ریاض ہٹلر سے ملاقات کرے۔

اس نے عذر تراشتے ہوئے کہا۔ "چوہدری بشیر میری طرف آ رہے ہیں۔ میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتی...... سوری۔" اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل فون بند کر دیا۔

اس کے جسم میں خفیف سی کپکپی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ریاض کی باتوں سے کسی نئے ہنگامے کی بو آئی تھی۔

اگلے روز دوپہر سے ذرا قبل شانی لاہور سے گوجرانوالہ اور وہاں سے جوہر آباد جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ مُنے سے جدا ہونا اس کے لئے ہمیشہ کی طرح ایک تکلیف دہ تجربہ رہا۔ روانگی سے پہلے گریس کے ساتھ شانی کی طویل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ گریس اور اس کا شوہر اسٹیفن جلد ہی شانی کے پیچھے آنے والے تھے۔ ان کا پروگرام نارپور پہنچنے کا تھا۔ نارپور کی حویلی تو جل چکی تھی لیکن حویلی کا جو بہت سا اسباب بچ گیا تھا، اس میں بڑے چوہدری مہر جی کا ذاتی سامان بھی موجود تھا۔ اس سامان میں سپ گندل گولیوں وغیرہ کی شکل میں موجود تھی۔ گریس اور اسٹیفن کو توقع تھی کہ مہر جی کے ذاتی سامان اور ذاتی ملازموں سے انہیں نایاب پودے کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہو سکیں گی۔"

شانی نے پوچھا۔ "گریس! کیا آپ کے شوہر اس دور دراز دیہاتی بستی تک جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے؟"

وہ مسکرائی۔ "مطلوبہ پودے کے کھوج کے لئے تو انہیں زمین کی ساتویں تہہ تک بھی

پہنچنا پڑے تو ضرور پہنچیں گے لیکن سچ پوچھو تو میری دلچسپی اب اس پودے سے زیادہ تم میں ہو گئی ہے۔ میں تمہارے آس پاس رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے حالات پر نظر رکھنا چاہتی ہوں اور تمہارے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں جو میں نے دل میں سوچ رکھا ہے۔"

وقتِ رخصت بشیر نے شانی سے مزید کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی نگاہیں ایک نہایت کرخت اور شکی مزاج شوہر کی نگاہیں تھیں۔ یہ نگاہیں شانی کو بہ زبان خاموشی وارننگ دے رہی تھیں۔ ایک بار پھر معاف کر رہا ہوں لیکن اگلی بار نہیں کروں گا۔

شانی ہوٹل میں پہنچی۔ وہاں سے عارف کو لیا اور بذریعہ بس گوجرانوالہ روانہ ہو گئی۔ شانی کے منع کرنے کے باوجود چوہدری نے دو مسلح گارڈز بھی شانی کے ہمراہ کر دیئے تھے۔ ان گارڈز کو جوہر آباد تک شانی اور عارف کے ساتھ رہنا تھا۔ گوجرانوالہ تک کا سفر خاموشی اور خیریت سے طے ہوا۔ راستے میں عارف نے تازہ اخبار شانی کو دکھایا۔ اس میں وادی سون میں پولیس ایکشن کے حوالے سے خبر موجود تھی۔ یہ خبر بھی ڈپٹی ریاض کی اطلاع کی تصدیق کرتی تھی۔ خبر کے مطابق رستم مبینہ طور پر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس وڈے ڈیرے پہنچ چکا تھا۔ نامہ نگار نے لکھا تھا۔ "رستم کی واپسی بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی ہے۔ اس نے نظر وال کے مقام پر بڑی بے خوفی سے ایک پولیس اہلکار جبار عرف جبرو کو قتل کیا۔ جبرو نامی یہ اہلکار چند روز پہلے رستم کے ہی ایک حملے میں زخمی ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر دستی بم کے آہنی ذرات لگے تھے۔ اس کا چہرہ بینڈیج میں چھپا ہوا تھا۔ رستم نے چالاکی کا ثبوت دیا اور مقتول جبرو کا لباس پہن کر اس کی بینڈیج میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور پولیس کیمپ سے وڈے ڈیرے پر جا پہنچا۔ رستم کی شناخت اس کے چھوڑے ہوئے فنگر پرنٹس سے ہوئی ہے۔ اس حوالے سے مزید اطلاعات آ رہی ہیں۔"

عارف نے کہا۔ "شانی! تمہیں بتایا تھا ناں، رستم وہاں ضرور پہنچے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ کاش ہم اسے روک سکتے۔"

"نہیں عارف! اس نے نہیں رکنا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے کیا ہوا وعدہ اسے واپس کھینچ رہا تھا۔" شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عارف نے اخباری خبر کی ذیلی سطور پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک اور غم ناک اطلاع ہے شانی بہن!"

"کیا؟" شانی لرز گئی۔

"رستم کا ساتھی گوہر راستے میں مارا گیا ہے۔"

"اوہ خدایا، یہ کیا ہو رہا ہے؟" شانی نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

بس سے اُترنے کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی کار پکڑی اور سفر کے اگلے مرحلے کے لئے تیار ہوئے۔ عارف اور شانی دونوں کو بھوک لگی تھی...... خاص طور سے عارف نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کھانا پارسل کرانے کے لئے ایک قریبی ریسٹورنٹ کی طرف چلا گیا۔ شانی ٹیکسی کار میں ہی بیٹھی تھی۔ گارڈز باہر جا کر کھڑے ہو گئے۔ موبائل کی بیل ہوئی۔ شانی نے کال ریسیو کی۔ آواز سن کر وہ پھر کانپ گئی۔ ریاض ہٹلر بول رہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے کسی دوسرے نمبر سے کال کی تھی۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ شانی کال ریسیو نہیں کرے گی۔ "دیکھو فون بند نہ کرنا، ورنہ تمہیں بُری طرح پچھتانا پڑے گا۔" ریاض نے کہا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"کہا تو ہے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں...... تین جنازوں والی بات کے سلسلے میں۔"

اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے۔

"میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ اب تم مجھے معاف کرو۔" شانی جھلا کر بولی۔

"دل سے کہہ رہی ہو یا اوپر سے۔"

"دل سے...... دل کی گہرائی سے۔"

"کاش تم سامنے ہوتیں۔ مولا کی قسم تمہارے پاؤں کو ہاتھ لگاتا۔ تمہارے سامنے کان پکڑتا، مرغا بن جاتا اور اقرار کرتا کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ اب بھی تم یہی سمجھو بی بی جان...... کہ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گا۔ کیا تم میری بات پر یقین کر رہی ہو؟"

"ہاں...... کر رہی ہوں۔" ریاض کا لہجہ شانی کو سراسیمہ کر رہا تھا۔

"میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ پیشگی معافی مانگ لیا کرتا ہوں۔" ریاض نے اطلاع دی۔

"کک...... کیا مطلب؟"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی...... پھر ایک ایسی آواز سنائی دی، جیسے بکرا ذبح کیا جا رہا ہو۔ کوئی دردناک آواز میں چیخا۔ "مجھے بچالو...... خدا کے واسطے بچالو۔ میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔"

شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ جمشید کی آواز

تھی۔ وہی خوبرو نوجوان جو جوہر آباد کے قبرستان میں ہونے والی لڑائی کے بعد پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ وہ خالو اعجاز کا سالا اور خالہ فیروزہ کا بھائی تھا۔ اس کی نو بیاہتا بیوی فرزانہ اس کی گرفتاری کے بعد سے دن رات تڑپ رہی تھی۔ ٹھیکرا کے تھانے میں ڈپٹی ریاض نے اسے الٹا لٹکایا تھا اور اس پر تشدد کیا تھا۔ آج وہ شاید پھر تشدد کے شکنجے میں تھا۔

"تم جمشید ہو ناں؟" شانی کراہی۔

"ہاں بہن! یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری جان لے لیں گے۔ انہوں نے پکا ارادہ کیا ہوا ہے۔"

"کہاں ہو تم؟"

وہ روتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے ایک بند ٹرک میں بٹھا کر ویران جگہ پر لے آئے ہیں۔ ایک اور حوالاتی بھی ہے ان کے ساتھ۔ یہ مجھے ٹرک سے اُتار کر بھگائیں گے اور پیچھے سے گولی مار دیں گے۔ خدا کے لئے شانی بہن یہاں آ کر مجھے بچالو۔ تم ہی بچا سکتی ہو۔"

اتنے میں کسی نے ریسیور جمشید کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ ڈپٹی ریاض ہی تھا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بے حد سفاک تھی۔ "مجھے پتا ہے، تمہارا دھیان سیدھا حاجی حیات کی طرف جا رہا ہوگا۔ اسے مدد کے لئے بلانے کا کیڑا دماغ میں حرکت کر رہا ہوگا لیکن پیاری بی بی جان...... ہاتھ باندھ کر درخواست کرتا ہوں۔ یہ حرکت نہ کرنا۔ جیسے ہی تم یہ حرکت کرو گی مجھے فوراً اسے پہلے پتہ چل جائے گا۔ بعد میں جو کچھ ہوگا وہ تو ہوگا ہی لیکن اس سے پہلے اس چھوکرے کی بتی بجھ جائے گی۔"

"یہ...... تم کیا کہہ رہے ہو ڈپٹی ریاض۔ ابھی...... تو تم معافی مانگ رہے تھے۔"

"میں نے تین جنازوں والی بات کے لئے تم سے معافی مانگی اور تم نے معاف کر دیا۔ اب یہ تین خون تو مجھے معاف ہی ہیں۔ بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔"

"کیا مطلب...... تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"قتل کرنا نہیں چاہتا، اسی لئے تو تمہیں اس کی آواز سنا رہا ہوں لیکن اگر تم یہاں نہیں آؤ گی یا اپنے خصم حاجی حیات کو بتانے کی کوشش کرو گی تو پھر پہلا جنازہ تو تیار ہو چکا لیکن اگر تم یہاں آجاؤ گی تو یہ بچ جائے گا اور تم پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"مم...... میں نہیں آسکتی۔" شانی ہکلائی۔

"تم آسکتی ہو۔ چوہدری بشیر سے کوئی بہانہ بنالو۔ عاشق معشوقی کرنے والوں کے پاس تو ایک سو ایک بہانے ہر وقت تیار پڑے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کوٹھی سے نکل آؤ گی تو

گوجرانوالہ پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔"

شانی کو اندازہ ہوا کہ ڈپٹی ریاض ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ چوہدری بشیر کی کوٹھی سے بول رہی ہے۔ یہ ایک بہتر صورت حال تھی۔ شانی نے کہا۔ "میں یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ چوہدری صاحب اجازت نہیں دیں گے۔"

"اوئے! اس نے ابھی تیرا گھونگھٹ تو اٹھایا نہیں اور تُو نے اجازتیں پہلے ہی مانگنا شروع کردی ہیں اس سے۔ اتنا چوڑ نہ کرا سے، شادی کے بعد تنگ کرے گا تجھے۔"

"فضول باتیں نہ کرو تم۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ پر حملہ ہوا ہے۔ ایک بندہ چاقو لے کر یہاں کوٹھی میں گھس آیا تھا۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے اس نے۔ چوہدری صاحب مجھے کبھی باہر جانے کی اجازت نہیں دے گے۔ تم فون پر بتادو کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"بات فون پر بتانے والی ہوتی تو اتنا لمبا چوڑا بکھیڑا کیوں پالتا۔ تمہیں بہ قلم خود آنا پڑے گا مسماۃ شہناز عرف شانی۔ ورنہ اس چھوکرے کی بتی گل ہوجائے گی۔"

"میں نہیں آسکتی۔" شانی جھلا کر بولی۔

"میں اسے مار رہا ہوں۔" ڈپٹی کا لہجہ ایک دم خوفناک ہوگیا۔ وہ نشے میں چُور لگ رہا تھا۔

"تمہارا کام صرف ملزم کو پکڑنا ہے۔ اسے سزا کورٹ دے سکتی ہے۔"

"واہ وا...... کیا بات ہے۔ کیا ڈائیلاگ ہے۔ نو سو چوہے کھانے والی گھابن بلی مجھے قانون سکھا رہی ہے۔ صدقے جاؤں تیرے اگلے پچھلوں پر۔ چل تُو بھی کیا یاد کرے گی۔ تجھے بتا دیتا ہوں کہ سچی اور جھوٹی دھمکی میں کیا فرق ہوتا ہے۔" ڈپٹی ریاض کے ڈکار لینے کی گندی سی آواز فون پر ابھری پھر اس نے اپنے کسی ماتحت کو مخاطب کر کے کہا۔ "اوئے رحمت...... چل ذرا اس چھوکرے کے لئے زحمت بن جا۔ وہ میرا دوسرا پستول نکال کر لے آ بیگ میں سے۔"

پس منظر میں جمشید کے رونے کی آواز آئی۔ وہ ملتجی لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دو دیہات کے درمیان ہونے والی لڑائی کا ایک کردار آج کس موڑ پر کھڑا تھا۔ وہ لڑائی میں بڑے جوش سے لڑا تھا۔ اس کی بیوی فرخندہ نے للکارے مار مار کر اپنے شوہر کی ہمت بندھائی تھی پھر جب جمشید کو ہتھکڑی لگی تھی، اس وقت بھی فرخندہ نے اسے شاباشی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں کو محسوس کر کے جمشید کا سینہ فخر سے کچھ اور بھی پھول گیا تھا لیکن اب یہ کہانی چلتے چلتے دو تین مہینوں میں ہی ایسے موڑ پر پہنچ گئی تھی کہ فرخندہ اور جمشید دونوں رو رہے تھے اور ان کے

لواحقین بھی سرتاپا فریاد بنے ہوئے تھے اور یہ صرف ایک جمشید کی کہانی نہیں تھی۔ اس لڑائی کے بعد ڈپٹی ریاض کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے درجنوں افراد تھانے کچہریوں سے چلے میں "قابلِ رحم" ہوگئے تھے۔

شانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ نہ ہی وہ یہ جان پارہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اسے ڈپٹی ریاض کے جنونی لہجے سے خوف تو آرہا تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کوئی انتہائی اقدام اٹھائے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ دل کو پھاڑ کر سو ٹکڑے کرنے والا تھا۔ پہلے گرجنے برسنے کی چند آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوئی چلایا...... یقیناً یہ جمشید ہی تھا۔ اس کی آواز پہلے قریب سے آئی پھر دور ہوتی چلی گئی۔ شاید وہ بھاگا تھا۔ تب اوپر تلے دو گولیاں چلیں اور سناٹا چھا گیا۔

شانی سکتہ زدہ تھی۔ چند سیکنڈ بعد (قریباً تیس سیکنڈ بعد) ڈپٹی ریاض کی وحشی آواز فون پر ابھری۔ "دیکھو، میں نے وعدے پر عمل کیا ہے۔ یہ پہلا جنازہ اسی خاص پسٹل سے تیار کیا ہے جو میں نے تمہیں دکھایا تھا۔ یہ پسٹل تیرے ہی تین رشتے داروں کے لئے علیحدہ رکھا ہوا ہے۔"

شانی کا سکتہ ٹوٹا۔ اس کا حلق لکڑی کی طرح خشک ہورہا تھا۔ وہ بہ مشکل بولی۔

"تم...... جھوٹ بول رہے ہو...... مجھے ڈرا رہے ہو۔ جمشید زندہ ہے۔"

"کھوپڑی میں موری ہوجائے اور اس میں سے بھیجا باہر نکل آئے...... تو بہت کم بے شرم ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہتے ہیں۔"

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے ڈپٹی ریاض! مجھے بتاؤ وہ زندہ ہے ناں؟" ٹیکسی کار سے باہر کھڑے دونوں گارڈز شانی کو بے حد پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

دوسری طرف سفاک خاموشی تھی۔ بس کسی کے رونے کی مدھم آواز آتی رہی۔ شانی نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ آواز جمشید کی ہی ہو...... وہ ایک بار پھر کراہی۔ "تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ مجھے بتاؤ ناں...... تم نے کچھ نہیں کیا ناں...... وہ زندہ ہے؟"

"تمہیں میری گتی زبان پر یقین کہاں آئے گا بی بی جان۔ لے میں تیرے ہی جاننے والے سے تصدیق کرا دیتا ہوں۔"

تب ڈپٹی ریاض دھاڑ کر بولا۔ "اِدھر آ جا چاچا، اپنی بھتیجی کو بتا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

چند سیکنڈ بعد جو آواز شانی کے کانوں تک پہنچی وہ جگر پاش تھی۔ شانی اس آواز کو بھی فوراً پہچان گئی۔ یہ اس کے تایا معصوم کی آواز تھی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

''شانی، اس ظالم نے مار دیا ہے جمشید کو۔ وہ سامنے جھاڑیوں میں اس کی لاش پڑی ہے۔'' تب ایک دم یوں لگا کہ تایا معصوم ڈی ایس پی پر جھپٹ پڑے ہیں۔ دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ تایا معصوم کی چلاتی ہوئی آواز فون کے ریسیور سے گزر کر شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''مجھے بھی مار ڈال...... میری بھی جان لے لے۔ ایک گولی مار دے میرے کلیجے میں بھی۔''

''تیری خواہش بھی ضرور پوری کروں گا بڈھے۔ اگر تیری یہ حرام زادی بھتیجی نہ مانی تو ابھی تیرے ہاتھ میں بھی ''اوپر'' جانے والی بس کا ٹکٹ تھماؤں گا۔''

یوں لگا کہ ڈپٹی ریاض تایا معصوم کو کھینچتا ہوا فون سیٹ کے قریب لایا ہے...... پھر وہ ماؤتھ پیس میں گرجا۔ ''اگلا جنازہ تیرے تایا معصوم کا ہوگا۔ میں جانتا ہوں ایسے ٹھرکی بڈھے نو سو چوہے کھا کے بھی معصوم کے معصوم ہی رہتے ہیں۔''

شانی چلائی۔ ''نہیں...... میرے تایا کو کچھ نہیں کہنا۔ یہ بے قصور ہیں، یہ بے گناہ ہیں۔ کیا کیا ہے انہوں نے؟ کیوں مارو گے تم انہیں؟''

''تیرے اس تایا معصوم نے تیرے خالو اعجاز اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس پارٹی پر حملہ کیا۔ جمشید کو چھڑانے کی کوشش کی۔ باقی تین بندے تو فرار ہوگئے لیکن یہ تیرا تایا معصوم اور جمشید پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوگئے۔ چچ چچ...... ایسے بڈھے بھی جن کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہیں پنگے لینے سے باز نہیں آتے۔'' ڈپٹی ریاض نے تاسف کا اظہار کیا۔

شانی کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈپٹی ریاض ایک گھڑی گھڑائی کہانی شانی کو سنا رہا ہے۔ یہ بڑی گھسی پٹی کہانی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ پولیس اور سرکاری وکیل اس کہانی کو ہر عدالت میں سچ ثابت کر کے دکھا سکتے ہیں۔

ڈپٹی ریاض کی سفاک آواز شانی کے کانوں میں گونجی۔ ''دیکھو بی بی جان! میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں۔ اگر تم واقعی لاہور میں بشیرے کی کوٹھی میں ہو تو ایک گھنٹے کے اندر گوجرانوالہ پہنچ سکتی ہو۔ میں تمہیں دو گھنٹے دیتا ہوں لیکن دو گھنٹے سے زیادہ تمہارا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمہیں دو گھنٹے کے اندر میرے پاس پہنچنا ہے ہر صورت...... ہاں، میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب مجھے تمہارا جواب ہاں یا ناں میں چاہیے۔ تم آرہی ہو یا نہیں؟''

''خدا کے لئے ڈپٹی! تایا کو کچھ نہیں کہنا۔''

''میرے سوال کا جواب دو۔ آرہی ہو یا نہیں؟''

''مم...... میں کیسے آؤں...... میں نے......''

''اوئے رحمت علی پسٹل لاؤ۔'' ڈپٹی ریاض نے شانی کی بات بے رحمی سے قطع کی۔

شانی سرتاپا کانپ گئی۔ اس نے اپنے خشک گلے سے بہ مشکل آواز نکالی۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''مجھے جواب دو۔ آرہی ہو یا نہیں؟'' ڈپٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

شانی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو کر ٹیکسی کی سیٹ پر ہی گر جائے گی لیکن اگر وہ گر جاتی تو شاید تایا معصوم کی لاش بھی گر جاتی۔ جمشید کی لاش کے پاس ہی کہیں وہ بھی جھاڑیوں میں اوندھے منہ گرتے اور ختم ہو جاتے۔

''مم...... میں آرہی ہوں۔ مجھے کہاں پہنچنا ہے؟'' وہ کراہی۔

''گڈ گرل۔'' ڈپٹی نے کہا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا، اپنے دماغ میں حاجی حیات والا کیڑا نہ رینگنے دینا۔ اگر تُو نے حاجی یا اس کے کسی کڑچھے کو انفارم کرنے کی کوشش کی تو میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو لیکن میں نے تیرے گھر سے دو اور جنازے ضرور بہ ضرور نکال دینے ہیں۔''

''نہیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ جمشید کی خونچکاں لاش شانی کے تصور میں تھی اور اس کے ساتھ ہی نوبیاہتا فرخندہ اور خالہ فیروزہ کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ لوگ نہ جانے کہاں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی آنکھیں اپنے جس پیارے کی راہ پر لگی ہیں وہ ایک خوفناک پولیس افسر کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔

ڈپٹی ریاض نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مسماۃ شانی! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم بشیرے کی کوٹھی میں ہو یا کہیں اور...... مجھے لگتا ہے جیسے تم کوٹھی کے اندر سے نہیں بول رہی ہو؟''

شانی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''میں کوٹھی میں نہیں ہوں۔ میں گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب ایک ٹیکسی کار میں ہوں۔ مجھے بتاؤ، مجھے کہاں پہنچنا ہے؟''

''پکی بات ہے کہ بشیرے نے تمہارے ساتھ دو تین کرائے کے مسلح ٹٹو بھی بھیجے ہوں گے، بھیجے ہیں ناں؟''

''دو گارڈز ہیں۔'' شانی نے اعتراف کیا۔

''اور وہ ماں کا لیڈر......کمبوہ؟''

''ہاں......وہ بھی ہے۔''

''اس وقت کہاں ہے وہ؟''

''بازار سے اپنے اور گارڈز کے لئے کھانا لینے گیا ہے۔''

''وری گڈ۔ اس کے آنے سے پہلے تم نکل آؤ۔ کرائے کے ٹٹوؤں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو شاباش۔ جتنی جلدی پہنچو گی، اتنی جلدی تمہیں فارغ کروں گا۔ یہاں سے کوئی بھی رکشہ وغیرہ پکڑلو۔ سیدھی نہر کے پاس جی ٹی روڈ پر آ جاؤ۔ میں تمہیں دوبارہ کال کر کے صحیح لوکیشن بتاتا ہوں اور ایک بار پھر ہاتھ پاؤں جوڑ کر درخواست ہے۔ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لانا۔''

پس منظر میں تایا معصوم کے بولنے اور کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔'' شانی کراہی۔

اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ اگر ان لمحوں میں اس نے ڈپٹی کی بات مان نہ لی تو جمشید کی طرح تایا معصوم کی جان بھی چلی جائے گی اور اس کے بعد تیسرا نمبر پتا نہیں کس کا ہوگا۔

وہ ٹیکسی کار میں سے نکلی۔ عارف کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ گارڈز کے لئے گوجرانوالہ کے مشہور تکے لانے کے لئے تھوڑا آگے چلا گیا تھا شاید۔

چوہدری بشیر کے ایک گارڈ نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ''میڈم جی خیریت تو ہے؟''

''ہاں خیریت ہے۔'' شانی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کہیں جانا ہے؟''

ایک لمحے کے لئے شانی کے جی میں آئی کہ اس سے کہہ دے کہ وہ ڈپٹی ریاض کی طرف جا رہی ہے لیکن پھر تایا معصوم کا خون میں نہایا ہوا جسم اس کی آنکھوں کے سامنے گھوما اور وہ بولی۔ ''تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ عارف کو بھی یہیں روکنا۔''

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک رکشا کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ گارڈ بے چین ہو کر بولا۔ ''میڈم! ہم میں سے کسی کو ساتھ لے جائیں۔''

شانی نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا اور رکشا میں گھس گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو خود بخود ڈھلکتے جا رہے تھے۔ جمشید کا مردہ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے ڈپٹی ریاض کی سفاکی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن آج پہلی بار وہ اس سفاکی کا احساس

روپ میں دیکھ رہی تھی۔

اسے عارف کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رستم نے وادی سون میں پولیس کے لیے ــ ــ نکلتے ہوئے ڈپٹی ریاض کے پیٹ میں لات مار کر اسے نشیب میں گرا دیا تھا۔ اس واقعے سے بعد سے ڈپٹی ریاض بالکل آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ ہینڈ گرینیڈ والے واقعے نے اس کی آتش فشانی میں اضافہ کیا تھا اور اب وہ نہایت سفاکانہ طریقے سے شانی کو اپنے پاس بلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس کے منہ سے آواز کے بجائے شانی کو شعلے نکلتے محسوس ہوئے تھے۔ پتا نہیں اس کے ارادے کیا تھے؟ شانی نے رکشا والے کو نہر کے پل کی طرف چلنے کا کہا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے جسم و جاں میں طوفان برپا تھے۔

☆======☆======☆

حوالدار اجمل خان اور رستم دوڑتے ہوئے وڈے ڈیرے تک پہنچے تھے۔ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر ایک جگہ رستم ایک چٹان کے پیچھے رک گیا تھا۔ اس نے اپنا ٹارچ والا ہاتھ بلند کر کے ٹارچ کو مخصوص انداز میں جلایا بجھایا تھا۔ وقفے وقفے سے اس نے اپنا یہ عمل تین بار دہرایا اور پھر سامنے سے ایک للکارتی ہوئی پُر جوش آواز رستم کے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ حسنے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو فائرنگ روکنے کا حکم دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹارچ کا اشارہ دیکھ لیا گیا ہے۔

اور پھر رستم اور اجمل خان وڈے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں حجے کے آس پاس مشعلوں کی روشنی تھی۔ رستم کو اپنے درجنوں ساتھی نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح اور مرنے مارنے پر تیار نظر آتے تھے۔ کچھ افراد نے رستم اور اجمل خان کی طرف رائفلیں تان لیں۔ سب سے پہلے حسنا گجراتی ہی رستم کے سامنے پہنچا۔ ”کون ہو تم؟“ اس نے پوچھا۔

”رستم۔“ رستم نے جواب دیا اور اپنے چہرے سے پٹی کھولنا شروع کر دی۔

ایک دم رائفلیں جھک گئیں۔ خستہ حال مدقوق چہروں پر روشنی سی نظر آنے لگی۔ رستم نے تیزی سے اپنی پٹی کے بل کھولے اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ رستم کی صورت دیکھتے ہی چند افراد نے ہوائی فائرنگ کر کے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی درجنوں افراد نے ہوائی فائرنگ کی اور پُر جوش نعرے لگانے لگے۔ ایک لہر سی تھی جس نے اردگرد موجود ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اجمل خان بھی حیرت سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جس بندے کے ساتھ گولیوں کی بارش میں بھاگتا ہوا یہاں پہنچا ہے وہ رستم ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رستم کے گلے سے لگ کر اس کا کشادہ شانہ چوما۔ اس کی آنکھوں میں رستم کو

آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ ابھی تک رستم کو اس شخص کی کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ خود کو قدرت اللہ کا پُر جوش عقیدت مند بتا رہا تھا اور رستم کو کچا چبانا چاہتا تھا لیکن اب وہ رستم کے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اب خبر نہیں تھی کہ وہ جھوٹ تھا یا یہ جھوٹ ہے۔ اجمل خان کا پستول ابھی تک رستم کے پاس ہی تھا۔

رستم نے دیکھا سرنگ نمبر ایک کے دہانے کے پاس بہت سے بیگ وغیرہ رکھے تھے اور ڈیرے پر موجود قریباً چالیس گھوڑے اور کچھ خچر وغیرہ ایک جگہ بندھے تھے۔ رستم نے خود کو حسنے کی ولولہ انگیز گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”فرید کہاں ہے؟“

”ابھی فائرنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں تھا۔“ کالھیا نے جواب دیا۔

رستم کے چاروں طرف اب مشعلیں بھڑک رہی تھیں۔ لوگ سرنگوں کے اندر سے نکل نکل کر احاطے میں جمع ہو رہے تھے۔ رستم ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا حجے کے پہلے کمرے میں پہنچا۔ دل سے ایک ہوک اٹھی۔ یہاں وہ مہناز اور اس کے بچے ٹیپو کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سامنے والے کمرے میں بیٹھ کر وہ کھانا کھاتا تھا۔ ننھا ٹیپو، کھانے کے دوران میں باورچی خانے اور کمرے کے درمیان چکراتا رہتا تھا۔ مہناز گھونگھٹ کی اوٹ سے پوچھتی تھی۔ ”رستم بھائی! کوئی اور چیز تو نہیں چاہیے۔“

لیکن آج یہ آواز نہیں تھی۔ مہناز نہیں تھی، اس کا بچہ نہیں تھا اور خود لالہ فرید بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم کو برآمدے میں لمبے تڑنگے جسم والی حنیفاں نظر آئی۔ وہ ایک گٹھڑی میں کچھ کپڑے وغیرہ رکھ رہی تھی۔

رستم کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا۔ رستم نے پوچھا۔ ”یہ کیا باندھ رہی ہو؟“

”سامان ہے بھاجی! لالے کا اور مرنے والی کا اور بچے کا بھی۔“ حنیفاں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔ ”ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں ناں۔“

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یقیناً اس احاطے میں پڑے ہوئے بیگ تھیلے اور گھوڑے خچر وغیرہ بھی اسی روانگی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

”لالہ کہاں ہے؟“ رستم نے تیزی سے پوچھا۔

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ”قبروں کی طرف گئے ہیں۔“

رستم حنیفاں کو وہیں چھوڑ کر ڈیرے کے مختصر قبرستان کی طرف لپک گیا۔ ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ اس نے تیزی سے طے کیا۔ قبرستان میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ قبرستان اب مختصر نہیں رہا

تھا۔ اس کا رقبہ تقریباً دوگنا ہوگیا تھا۔ کم وبیش بیس نئی قبریں نظر آرہی تھیں اوران میں سے دو قبریں بھرجائی مہناز اور ٹیپو کی تھیں۔ ایک جگہ کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں ہندوؤں کے انداز میں کسی مُردے کی چتا جلائی گئی ہے۔ وڈے ڈیرے پر سندھ سے تعلق رکھنے والا ایک ہندو بھی موجود تھا۔ اگر یہ واقعی چتا تھی تو پھر اسی ہندو لکھی رام کی ہوسکتی تھی۔ بیری کے ایک درخت کے دوشاخے میں ایک مشعل اُڑس دی گئی تھی۔ اس مشعل کی سرخ روشنی قریباً دس مربع میٹر جگہ کو روشن کررہی تھی۔ رستم کو اس روشنی میں فرید تنہا بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کی بیوی اور بچے کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ ماں بیٹا اسی طرح پہلو بہ پہلو لیٹے تھے جیسے زندگی میں لیٹتے ہوں گے۔ فرید نے رستم کا سایہ اپنے پہلو میں دیکھا لیکن گھوم کر رستم پر نگاہ نہیں ڈالی۔ ''یہ فائرنگ کیوں ہورہی تھی؟'' اس نے رستم پر نگاہ ڈالے بغیر پوچھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کوئی ساتھی اسے واپس بلانے کے لئے آیا ہے۔

رستم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ فائرنگ اس لئے ہورہی تھی کہ ایک دوست کو اپنے دوست سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔''

رستم کی آواز سن کر فرید تیزی سے پلٹا۔ اس کی آنکھیں رورو کر سوجی ہوئی تھیں۔ رستم کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر غم کا گہرا سایہ دکھائی دیا۔ ''اوئے میرے یار! تُو نے یہ کیا کیا؟ تُو کیوں یہاں آگیا؟''

''میں اس لئے یہاں آگیا کہ میں آجانے کے لئے گیا تھا۔''

''لیکن...... اب آنے کا کون سا وقت تھا رستم! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا یار۔'' لالے فرید کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ آگے بڑھا اور رستم کے گلے سے لگ گیا۔ دونوں دوست کتنی ہی دیر ایک دوسرے کی بانہوں میں کھڑے رہے۔ فرید کے سینے میں آنسوؤں کی ہلچل تھی مگر اس کی ''برداشت'' کا تقاضا تھا کہ غم زدہ آواز ہونٹوں کے حصار سے باہر نہ نکلے۔ رستم نے فرید کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پُرسا دینے والے انداز میں بولا۔ ''حوصلہ کرو فرید۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں قبرستان سے واپس ڈیرے کی طرف جارہے تھے۔ رستم نے چتا کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے فرید؟''

فرید نے تصدیق کی کہ ڈیرے کا اکلوتا ہندو لکھی رام مرگیا ہے لیکن اس کی موت پولیس کی گولی سے نہیں، بیماری سے ہوئی تھی۔ وہ سات آٹھ دن پہلے مرا تھا...... ڈیرے کے طول و عرض میں مشعلیں چکرارہی تھیں اور ہلچل نظر آتی تھی۔ احاطے سے تقریباً سو میٹر پہلے ہی رستم اور فرید درختوں کے ایک جھنڈ میں رک گئے۔ رستم نے کہا۔ ''فرید! یہ کہاں جانے کی تیاری

ہورہی ہے؟''

فرید نے کہا۔ ''پانڈو درے کی طرف!''

''کیوں؟''

''نظام کا پیغام آیا ہے۔ اس کے مخبروں نے بتایا ہے کہ پانڈو کی طرف سے پولیس والوں کا گھیرا بہت کمزور ہے۔ نفری نہ ہونے کے برابر ہے۔ نظام کا کہنا ہے کہ ہم کوشش کریں تو وہاں سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے باہر کے کچھ لوگ بھی ہماری مدد کرسکتے ہیں۔''

''باہر کے کون لوگ؟''

''سنگوال برادری کے بندے۔'' فرید نے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ مقامی اجرالی پولیس والوں کی مدد کررہے ہیں۔ اجرالیوں اور سنگوالیوں میں پرانی دشمنی چلی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگوالی پولیس کے خلاف بھی ہوگئے ہیں۔ وہ پولیس کا گھیرا توڑنے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ نظام نے بتایا ہے کہ وہ جتھوں کی صورت میں پانڈو درے کے پار جمع ہیں۔ ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ نظام کے مشورے پر عمل کریں۔ ہمارے پاس خوراک اور ایمونیشن ختم ہوتا جارہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس والے گولی چلائے بغیر ہی ہمیں ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

رستم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''فرید، جہاں تک مجھے اطلاع ملی ہے پانڈو کی طرف سنگوالیوں کا کوئی جتھہ نہیں ہے اور وہاں اتنی زیادہ پولیس کھڑی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''کیا مطلب؟'' فرید کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

''ہمارے ساتھ چال چلی جارہی ہے فرید...... اور یہ اتنی خطرناک چال ہے کہ اس میں ڈیرے کا کوئی بندہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ نظام پولیس کی حراست میں ہے۔ وہ جو بیان دے رہا ہے پولیس کے کہنے پر دے رہا ہے۔ اس کی جوان بیٹی گوجرانوالہ کے تھانے میں بند ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو رستم؟''

''میں تمہیں سو فیصد ٹھیک اطلاع دے رہا ہوں اور یہی اطلاع دینے کے لئے میں برستی گولیوں میں یہاں تک پہنچا ہوں۔'' فرید بے حد تعجب سے رستم کا چہرہ دیکھتا چلا جارہا تھا۔

''ہاں فرید! شکر کرو کہ میں بروقت پہنچ گیا ہوں...... اصل بات یہ ہے کہ ڈپٹی ریاض

اور اس کے ساتھی بارودی سرنگوں سے خوف زدہ ہیں۔ وہ کسی طرح تم لوگوں کو بارودی سرنگوں سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔"

فرید نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "اس حوالے سے تھوڑا بہت شک تو میرے دماغ میں بھی تھا۔ لیکن یہ جو تم نظام والی بات کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ میں نے ابھی چند گھنٹے پہلے اس سے بات کی ہے۔ وہ بڑے عام لہجے میں بول رہا تھا۔"

"میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کہہ رہا فرید...... خود اس سے مل کر آیا ہوں۔ اس کی ساری پٹا سنی ہے میں نے۔"

"پھر اب کیا مشورہ ہے تمہارا؟"

"مشورہ یہی ہے کہ ہم پانڈو کی طرف جائیں گے تو خودکشی کریں گے۔"

دونوں دوستوں نے کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کی۔ پھر یہ طے ہوگیا کہ وڈے ڈیرے سے باہر نہیں نکلا جائے گا۔ رستم کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ دونوں دھیمے قدموں سے ڈیرے پر پہنچے۔

واپس پہنچتے ہی رستم نے نادیہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ دوسری طرف لالہ فرید نے ساتھیوں کو نیا حکم سناتے ہوئے سامان کھولنے اور اپنی پوزیشنوں پر واپس جانے کی ہدایت کی۔ شروع میں اس نئے حکم کو حیرت اور پریشانی کے عالم میں سنا گیا تاہم جلد ہی تمام لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ پروگرام کی اس اچانک تبدیلی کا تعلق رستم کی واپسی سے ہے اور رستم اپنے ساتھ کوئی ایسی اطلاع لایا ہے جو اس الٹ پلٹ کا سبب بنی ہے۔

کچھ سامان خچروں پر لادا جا چکا تھا۔ اسے واپس اُتارا جانے لگا۔ لالہ اس کام کی نگرانی کرنے لگا۔ رستم نے جسنے سے پوچھا۔ "نادیہ نظر نہیں آرہی۔ کہاں ہے وہ؟"

"ابھی جب تم قبرستان کی طرف گئے تھے، وہ تمہیں ہی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ وہ تو میں نے ہی جھڑکا ہے کہ جا کر کمرے میں بیٹھ۔ ابھی آجاتا ہے تجھ سے ملنے۔"

"اب کمرے میں ہے؟"

"میرا خیال ہے، وہیں ہوگی۔"

رستم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا چھجے کی طرف آیا۔ نادیہ کمرے کے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رستم کو یوں لگا کہ وہ بھاگ کر آئے گی اور اس سے لپٹ جائے گی۔ یہ پرواہ بھی نہیں کرے گی کہ آس پاس موجود لوگ یہ منظر دیکھ سکتے ہیں لیکن پھر

شاید اس نے خود کو سنبھالا۔ رستم اس کے پاس پہنچا تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے ذرا کمزور دکھائی دیتی تھی۔ رستم کی سخت ہدایت کے مطابق اس نے اپنا ہیجان خیز سراپا ایک موٹی چادر میں چھپا رکھا تھا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد رستم نادیہ کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ یہاں کسی عطر کی ہلکی خوشبو تھی اور ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی تھی۔

"تمہارے لئے چائے بناؤں؟" نادیہ نے نظریں جھکائے جھکائے پوچھا۔

"نہیں۔" رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اگر آرام کرنا ہے تو بستر لگا دوں؟"

رستم کا جواب پھر نفی میں تھا۔ نادیہ کی نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ رستم ان جھکی نگاہوں کی وجہ بخوبی سمجھتا تھا۔ نادیہ کی اس کیفیت کا تعلق اس شب سے تھا جب رستم ڈیرے سے شہر جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اس شب نادیہ نے اپنے اندرونی اضطراب کا مظاہرہ بہت کھل کر کیا تھا۔ وہ رات کے آخری پہر رستم کے بالکل قریب چلی آئی تھی اور اسے مسلسل اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی تھی اور جب صبح دم رستم نے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا تھا تو ایک اور انکشاف ہوا تھا۔ نادیہ کے جسم پر لباس کا ایک تار نہیں تھا۔ اس وقت رستم کا جی چاہا تھا کہ ایک دو ٹھوکریں رسید کرکے نادیہ کے چہرے کا نقشہ تبدیل کردے تاہم وہ خود پر ضبط کرکے باہر چلا گیا تھا۔

رستم سوچنے لگا کہ اب اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ بات چھیڑنی چاہیے یا نہیں۔ اگر اس بات کو بالکل نظر انداز کردیا جاتا تو بھی خطرہ تھا کہ نادیہ کی حوصلہ افزائی ہوگی اور آنے والے دنوں میں وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرے گی۔ بات کرنا بھی کچھ زیادہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ایک اَن کہی...... "کہی" بن سکتی تھی اور اسے وجود مل سکتا تھا پھر رستم نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

نادیہ کی چادر ذرا سرکی تو رستم کو یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ وہ مختصر لباس میں تھی۔ اس نے مقامی طرز کا گھاگرا پہن رکھا تھا اور چولی اتنی چھوٹی تھی کہ نہ ہونے کے برابر۔ پیٹ عریاں ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہاں تم کسی فلم کی شوٹنگ کر رہی ہو۔ اوپر چادر ہے اور اندر وہی بے شرمی۔"

وہ دبے لہجے میں بولی۔ "میں نے جان کر تو ایسا نہیں کیا رستم! تمہیں پتا ہی ہے میرے

پیٹ پر زخم آیا تھا۔"

وہ اس چیتے کا ذکر کر رہی تھی جس نے کچھ روز پہلے جھاڑیوں میں نادیہ کے پیٹ میں دانت گاڑے تھے۔ رستم خاموش رہا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بھی نادیہ کا ایک بہانہ ہی ہے۔ اس کے پیٹ کا زخم اب تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہلکی سی سرخی باقی تھی۔

ایک طویل رات گزر چکی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ رستم ایک ہنگامہ خیز دن کے آغاز سے پہلے بس ذرا دیر ستانا چاہتا تھا، وہ کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ کچھ دور شہر کے اندر اب بھی کا دکا گولی چلتی تھی تاہم مسلسل فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا۔

"لالٹین بجھا دوں؟" نادیہ نے ہولے سے پوچھا۔

"نہیں رہنے دو۔" رستم بولا۔

"تم نے اپنے بال چھوٹے کرا دیئے ہیں اور رنگ بھی لئے ہیں لیکن لمبے بال تمہیں بہت اچھے لگتے تھے۔" نادیہ نے کہا۔

"میں نے تم سے اس بارے میں تبصرہ کرنے کو کہا ہے؟"

وہ کھسیانے انداز میں خاموش ہوگئی۔ رستم کی نگاہ کمرے کے ایک گوشے میں پڑی۔ یہاں چکنی سرخ مٹی سے بنائی گئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں پڑی تھیں۔ ان میں پوٹھوہار کا رہن سہن دکھایا گیا تھا۔ بیلوں کی جوڑی کے پیچھے چلتا ہوا کسان... ایک پتھر پر بیٹھ کر چھوٹا حقہ پیتا ہوا دیہاتی... ایک ننگ دھڑنگ بچہ...

"یہ کیا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"تمہارے انتظار کا وقت کاٹتی رہی۔ مجھے مجسمہ سازی اور اداکاری کا شوق ساتھ ساتھ ہی ہوا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے مجسمے بناتی ہوں۔" نادیہ نے کہا۔

رستم کو یاد آیا... جب وہ لوگ راولپنڈی میں تھے وہاں بھی نادیہ نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے چھوٹے مجسمے اپنے گھر میں سجائے تھے۔

اپنے ارد گرد کے تمام حالات اور مسائل کو وقتی طور پر فراموش کر کے رستم کچھ دیر اونگھتا رہا پھر سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو پوٹھوہاری ٹیلے موسم بہار کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ نادیہ اسی طرح خاموشی کے ساتھ رستم کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غالباً وہ نیند سے لڑتی رہی تھی۔ ڈیرے پر ابھی ناشتے کی تیاری شروع نہیں ہوئی تھی۔ رستم کو بھرجائی مہناز بری طرح یاد آئی۔ وہ بہت سویرے اٹھتی تھی اور خالص گھریلو عورتوں کی طرح اپنے "ڈاکو شوہر" کے لئے اور اس کے قریبی دوستوں کے لئے پیٹ پوجا کا انتظام شروع کر دیتی تھی۔

اب وہ اپنے بچے کو پہلو میں لے کر منوں مٹی کے نیچے سو رہی تھی۔ اس کا پالا ہوا [illegible] اور اس کا باورچی خانہ خاموشی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مہناز اور اس کے بچے کے ساتھ کوئی "انہونی" نہیں ہو سکی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو ایک مفرور ڈکیت کے بیوی بچوں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔

رستم کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اسے یاد آیا جب وہ یہاں تھا، ایک دن ننھا ٹیپو ماں کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ گیند سے کھیل رہا تھا۔ گیند بار بار باورچی خانے میں جاتی تھی۔ ایک بار گیند باورچی خانے میں آئی تو مہناز گیند پکڑ کر سیدھی رستم کے پاس لے آئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔ "یہ تم اپنے پاس رکھ لو اور اسے بالکل نہ دینا۔"

رستم نے گیند رکھ لی تھی۔ اگلے روز ٹیپو کو کہیں سے ایک اور گیند مل گئی تھی اور وہ پرانی گیند رستم کے پاس ہی پڑی رہ گئی تھی۔ انسان چلے جاتے ہیں، ان کی نشانیاں رہ جاتی ہیں۔ رستم نے سوچا کل وہ بھی نہیں ہوں گے، ان کی نشانیاں رہ جائیں گی۔ وہ اٹھا اور سامان میں سے ٹیپو کی گیند ڈھونڈنے لگا۔ پتا نہیں اس نے کہاں رکھی تھی۔ وہ سامان کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ایک چھوٹی الماری کے پیچھے سے رستم کو گیند مل گئی۔ رستم نے گیند ہاتھ میں لی اور اسے لگا جیسے وہ کھلونے کو نہیں کھلاڑی کو چھو رہا ہو۔ اچانک اس کی نگاہ الماری کے پیچھے ایک اور شے پر پڑی۔ کچھ اخبار میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔

رستم نے اخبار ہٹا کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ قریباً ایک فٹ لمبا چکنی مٹی کا مجسمہ تھا بلکہ یہ دو مجسمے تھے جو باہم ملے ہوئے تھے۔

رستم نے گھوم کر نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ فق نظر آیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو اور یہ واقعی ایک سنگین چوری تھی۔ رستم نے ذرا دھیان سے دیکھا تو اسے یقین ہونے لگا کہ یہ خود اس کا اور نادیہ کا مجسمہ ہے۔ رستم اپنے لمبے بالوں، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور اونچی ناک کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا اور نادیہ اپنے قیامت خیز عریاں جسم کی وجہ سے۔ رستم کا بالائی دھڑ بھی عریاں تھا۔ نادیہ کسی پالتو جانور کی طرح رستم کے قدموں میں بیٹھی تھی اور اس کی پنڈلیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے برہنہ جسم کے خطوط ہیجان انگیز تھے۔ یہ شرم ناک مجسمہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" رستم نے لرزاں لہجے میں کہا۔

"کک...... کچھ نہیں...... بب...... بس ایک Statue ہے۔" وہ ہکلائی۔

"میں تمہیں اندھا نظر آتا ہوں؟" رستم پھنکارا۔

"کیا...... ہوا...... رستم؟"

''حرام زادی...... کتیا...... مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہوا؟''

رستم نے مجسمہ فرش پر پٹخ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ قریب ہی چھڑی پڑی تھی۔ رستم نے طیش کے عالم میں چھڑی اٹھائی اور نادیہ کے جسم پر بے دریغ ضربیں لگائیں۔

''دفع ہو جا...... نکل جا اس کمرے سے...... میں کہتا ہوں نکل جا۔'' وہ ساتھ ساتھ دھاڑ رہا تھا۔

تین چار ضربوں کے بعد چھڑی ٹوٹ گئی۔ رستم نے اس کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا بھی نادیہ پر دے مارا۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ بس چھڑی سے بچنے کے لئے اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر گرج کر کہا۔ ''اٹھ جا یہاں سے...... اٹھتی کیوں نہیں؟''

وہ اسی طرح چہرہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی۔ رستم کا دل چاہا اسے اسی طرح اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دے۔ اگر اس عمل کی وجہ سے اس کی ایک دو ہڈیاں بھی ٹوٹتی ہیں تو ٹوٹ جائیں لیکن پھر جیسے ایک دم بی بی رستم کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اپنے بازو پھیلا کر اور اپنے سینے کو دیوار بنا کر۔ ''نہیں رستم...... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' بی بی کی آواز رستم کے تصور میں گونجی۔

یہ آواز کہاں نہیں گونجتی تھی۔ جہاں جہاں رستم کے اندر وحشت ابھرتی تھی، جہاں جہاں وہ اپنی فطرت کا اظہار چاہتا تھا...... یہ آواز اس کا گھیراؤ کر لیتی تھی۔ اب یہ آواز پھر رستم کو وارننگ دے رہی تھی۔ ''نادیہ! مجھے بہت پیاری ہے رستم، اسے دکھ دو گے تو سمجھو مجھے دکھ دو گے۔''

رستم کے تنے ہوئے رگ پٹھے ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے رخ پھیرا اور منہ میں بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے بستر پر چلا گیا۔ چت لیٹ کر اس نے اپنا بازو موڑا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے سینے میں پھنکارتے ہوئے شعلوں کو تحمل کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ دس پندرہ منٹ اسی طرح لیٹا رہا۔ اس کے اردگرد کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ نادیہ وہیں اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ رستم نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی چھڑی کے دونوں ٹکڑے نادیہ کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں یہ دونوں ٹکڑے اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھے تھے اور ان پر اپنا داہنا گال رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

نادیہ کی ان اداؤں سے رستم کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر ایک ہجوم رستم کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ کافی لوگ تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو مسلح افراد۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ سارے ڈیرے کے افراد ہی نہیں ہیں اردگرد موجود دیگر ایسے لوگ بھی ڈیرے پر جمع ہو گئے ہیں جنہیں قانون نے اپنے کاغذوں میں مجرم ٹھہرا رکھا ہے اور جو پولیس کی گولیوں کا ''نشانہ'' ہیں۔ رستم کی دید نے ڈیرے کے مکینوں میں نیا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ رستم ان کے لئے ایک آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بے شک یہاں کا سردار لالہ فرید تھا لیکن رستم ان لوگوں کو دیگر حیثیتوں سے محبوب تھا...... وہ پسے ہوئے مظلوم طبقے میں سے اٹھا تھا اور ''اینگری مین'' کی طرح خدائی ٹھیکیداروں کے خلاف مزاحمت کی علامت بن گیا تھا۔ پولیس کے محکمے میں رستم کے دوست بھی تھے لیکن بے لگام پولیس والوں کے خلاف اس کا رویہ ہمیشہ سے بہت سخت تھا۔ اب تک کئی اہلکاروں کا قتل اس کے کھاتے میں لکھا جا چکا تھا۔

ڈیرے کے مکین اپنا اسلحہ ہوا میں لہرانے اور نعرے لگانے لگے۔ ان کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ آخری گولی اور آخری سانس تک ڈیرے کا دفاع کریں گے۔ شروع میں تو کسی کو گوہرا کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اب رستم کے استقبال کی گرم جوشی کم ہوئی تو رستم کے ساتھیوں نے گوہرا کے بارے میں پوچھا۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب خاصا غم زدہ کر دینے والا تھا۔ گوہرا کی موت نے کچھ دیر کے لئے سب کو افسردہ کر دیا۔ وہ رستم سے اس واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ رستم نے سب کچھ بتایا۔ پولیس والوں اور اجرالیوں کے خلاف ڈیرے کے مکینوں کا غم و غصہ کچھ اور گہرا ہوا۔ کچھ دیر بعد رستم اپنے ساتھیوں لالہ فرید، حسنا گجراتی اور مراد کے ہمراہ میٹنگ والے کمرے میں چلا گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ڈیرے کے پُرجوش مکین اہم جگہوں پر ریت کی بوریاں اور درختوں کے تنے رکھ کر اپنا دفاع مضبوط کر رہے تھے۔ ان کے چہرے مدقوق لیکن حوصلے بلند تھے۔ رستم نے لالے فرید سے کہا۔ ''میرے ذہن میں صبح سے ایک بات آ رہی ہے۔ تم اسے تجویز بھی کہہ سکتے ہو۔''

''مجھے یقین ہے، یہ کوئی اچھی تجویز ہی ہوگی۔'' فرید نے کہا۔

''یہ بات پکی ہے کہ پولیس والوں نے اونچائی سے دوربینوں کے ذریعے ہم پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ میں نے ان کے پاس ایک دو بڑی دوربینیں بھی دیکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنا کوئی بھی ارادہ اپنے حریفوں پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ مثلاً آج صبح ہم نے پانڈو کی طرف

جانے کا ارادہ ختم کر دیا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ پولیس والوں کو اس تبدیلی کا پتا آسانی سے نہ چلے۔''

''ذرا کھل کر بتاؤ تو پتا چلے۔'' حسینے نے کہا۔

''بہتر ہے کہ ہم کچھ خچروں اور گھوڑوں پر سامان لدا رہنے دیں اور یہ جانور ایسی جگہوں پر کھڑے رہیں جہاں سے پولیس والوں اور اجرالیوں کی نظر ان پر پڑ سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی کر لیتے ہیں لیکن کیا اس سے کوئی خاص فائدہ بھی ہوگا۔'' لالہ فرید نے پوچھا۔

''بالکل ہوگا بلکہ بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔'' رستم نے کہا۔ ''پلسیوں اور اجرالیوں نے ہمارے خلاف جو چال چلی ہے، یہ ہم ان پر ہی الٹ سکتے ہیں۔ ڈپٹی ریاض اپنی زیادہ تر نفری پانڈو کی طرف لے گیا ہے۔ اب ہمارے سامنے والی پوزیشنوں پر بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ کل رات میں نے خود وہ ساری جگہ دیکھی ہے۔ وہاں پر پلسیوں اور اجرالیوں کا گھیراؤ بڑا کمزور ہو گیا ہے۔''

لالے فرید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ رستم کی بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ اپنی گردن کھجاتے ہوئے بولا۔ ''آج سویرے اس سے ملتی جلتی بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''لیکن باہر نکل کر حملہ کریں گے تو ہماری بارودی سرنگوں والا حصار تو خود بخود ختم ہو جائے گا۔'' مراد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس کے لئے ہم ایک طریقہ بنا سکتے ہیں۔'' لالے فرید نے جواب دیا۔ ''سارے لوگ باہر نہ نکلیں صرف تیس چالیس بندوں کی ایک ٹولی باہر نکل کر ہلہ بولے اور اگر ہلہ کامیاب ہو جائے تو پھر باقی لوگ بھی آگے بڑھیں اور باہر نکل آئیں۔ ورنہ سارے واپس ڈیرے پر آجائیں۔''

''اگر بالفرض ہلہ کامیاب ہو جاتا ہے اور ہم گھیرا توڑ کر نکل بھی جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ پولیس تو علاقے میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔'' مراد کے ایک ساتھی نے کہا۔

''یہ بات ہم کو بھی معلوم ہے بھرا جی۔'' حسینے گجراتی نے ذرا غصے سے کہا۔ ''مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ایک ہی جگہ مرنے کی بجائے یہاں سے نکلیں اور پہاڑیوں میں بکھر جائیں۔ یہ پہاڑیاں ہم جیسوں کی بڑی پرانی سجن ہیں۔ یہ ہمیں پلس کی گولیوں سے ضرور بچائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ دس بیس مر جائیں لیکن زیادہ تر بچ جائیں گے، تم دیکھ لینا۔''

لالہ فرید نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دور مخروطی ٹیلوں کو دیکھا۔ قریباً ایک میل کی دوری پر یہ تین چار ٹیلے ساتھ ساتھ واقع تھے۔ سورج کی روشنی میں ٹیلوں کا جھاڑ جھنکاڑ بہت نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ ان ٹیلوں کے آس پاس پولیس اور ان کے مددگاروں کی پوزیشنیں تھیں۔ لالہ فرید نے ایک درمیانی ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب سے خطرناک پوزیشن ہے۔ یہاں MG-08 لگی ہوئی ہے۔ یہ اجرالی سردار غلام کبیر کی گن ہے۔ اس نے گن مین سمیت پولیس والوں کے استعمال میں دی ہوئی ہے۔ اس تعاون کے بدلے اس حرامی نے انتظامیہ سے پورے دو پہاڑوں کا قبضہ حاصل کرنا ہے۔ اس گن کو کسی طرح چپ کروا دیا جائے تو ہمارا یہاں سے نکلنے کا کام روپے میں سے آٹھ آنے آسان ہو جائے گا۔''

فرید کے ساتھی ناصر نے تاسف انگیز لہجے میں کہا۔ ''چند دن پہلے اسی گن سے فائر کر کے بھر جائی اور کاکے کو مارا گیا ہے۔''

رستم نے ایک عجیب تاثر کے ساتھ فرید کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''تو سمجھو کہ آج رات یہ گن چپ ہو گئی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اندھیرا ہونے دو۔ میں اس گن کی بولتی بند کروں گا۔'' رستم کے لہجے میں شعلوں کی پھنکار تھی۔

''لیکن یہ بہت خطرناک کام ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ میں ساتھ جاؤں گا۔'' فرید نے حتمی انداز میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مریں تو دونوں مریں اور یہاں ڈیرے پر کوئی آگے لگنے والا نہ رہے...... یہ بے وقوفی ہوگی۔ تم مجھے اکیلا جانے دو۔ میرا خیال ہے کہ میں اکیلا یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتا ہوں۔ تم چالیس پچاس بندوں کا ایک جتھا لے کر گن سے ڈیڑھ دو سو میٹر کی دوری پر رہو۔ جیسے ہی تمہیں معلوم ہو کہ گن پولیس والوں کے ہاتھ سے نکل گئی ہے، تم باقی پوزیشنوں پر ہلہ بول دو۔''

''لیکن لالے کو کیسے پتا چلے گا کہ تم نے گن خاموش کرا دی ہے یا اس پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے؟'' مراد نے نکتہ اٹھایا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم اس کے لئے کوئی اشارہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی طریقے سے ہو...... اور کارروائی سے پہلے اس کی بھنک بھی پولیس کو

نہ پڑے۔" رستم نے کہا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ رستم اس کام کے لئے اکیلا جانا چاہتا تھا مگر لالہ اور حسنا اس کے لئے راضی نہیں تھے۔ اچانک رستم کو اجمل خان کا خیال آیا۔ وہ ماہر نشانہ باز تھا اگر اس موقع پر اس سے کوئی کام لیا جاسکتا تھا تو لیا جانا چاہیے تھا۔ ابھی تک رستم، اجمل خان کے حوالے سے الجھن میں تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اجمل درحقیقت کس نیت سے یہاں آیا ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔

چھجے کے کمرے میں ہونے والی یہ میٹنگ برخاست ہوئی تو دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ رستم سیدھا اس حجرے میں پہنچا جہاں اجمل خان کو رکھا گیا تھا۔ فرید کی ہدایت پر حجرے کے باہر ایک سندھی پہرہ دے رہا تھا۔ رستم اندر پہنچا تو اس نے اجمل خان کو کمرے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ رستم کو دیکھ کر اجمل خان ٹھٹک کر رک گیا۔ "آپ سے مل کر ام کو بہت خوشی ہوئی رستم صیب! آپ جانتا نہیں ام آپ کا کتنا بڑا عقیدت مند ہے۔ آپ سچ پوچھتا ہے تو ام صرپ آپ کے لئے ہی اتنی دور سے آیا ہے، صرپ آپ کے لئے۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟"

"رستم صیب! ام آپ کو کیا بتائے۔ قدرت اللہ ام کو کتنا بُرا لگتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قدرت اللہ اور اس کے چیلے امارے لئے رُوئے زمین کے سب سے خبیث لوگ ہیں۔ امارے دل پر ان لوگوں کا لگایا ہوا ایک بہت بڑا زخم موجود ہے۔"

"کیسا زخم؟" رستم نے پوچھا۔

"آج سے تین چار سال پہلے قدرت اللہ کے چیلے شاہی نے ام پر بہت بڑا ظلم کیا۔ امارا ایک بہت قیمتی چیز ام سے چھین لیا۔" اجمل کی آواز بھرا گئی۔

رستم سوالیہ نظروں سے اجمل خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ "ام کوہاٹ سے اٹھارہ میل آگے رودگڑی نام کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ امارے علاقے کا لوگ بہت سادہ دل ہے۔ پیروں فقیروں کو ماننے کا رواج تو ہمارے پورے ایریا میں ہی بہت زیادہ ہے مگر امارے دیہات میں یہ کام حد سے زیادہ گزرا ہوا ہے۔ شاید اس کا ایک وجہ تعلیم کا کمی بھی ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ امارے پورے گاؤں میں صرف میں ہوں جس نے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔"

حوالدار اجمل خان سانس لینے کے لئے رکا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ام جانتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہوگا، آپ کو مختصر مختصر بتاتا ہوں...... پیر

قدرت اللہ کا ایک چیلا شاہی مہینے میں ایک بار امارے علاقے کا چکر لگایا کرتا تھا۔ علاقے کا لوگ اس سے جھاڑ پھونک کراتا تھا اور تعویذ وغیرہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ ام شہر سے چھٹی پر گاؤں واپس آیا تو امارے گاؤں کے ماسٹر صاحب نے ام کو بتایا کہ شاہی ان کو اچھا بندہ نہیں لگتا۔ وہ مریض مردوں کے مقابلے میں مریض عورتوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ خاص طور پر وہ جوان بیبیوں کو زیادہ ٹائم دیتا ہے۔ وہ ان کو پردے میں علیحدہ بلاتا ہے اور دیر تک ان کو پردے میں رکھتا ہے، جو عورت اس کے سامنے اپنا چہرہ نہ کھولے وہ اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

ام نے ماسٹر صیب سے کہا کہ جو کچھ بھی ہے لیکن ابھی تک اس کے بارے میں کوئی ایسا ویسا بات سنا نہیں گیا۔ ماسٹر صیب نے جواب دیا کہ ابھی تک نہیں سنا گیا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی نہیں سنا جائے گا۔ اس قسم کا لوگ آہستہ آہستہ لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔

ماسٹر صیب کی بات سننے کے بعد ام دو تین دفعہ خود بھی بیماری کے بہانے شاہی کے پاس گیا، جو کچھ ماسٹر صیب نے بتایا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ شاہی کو جوان عورتوں کے علاج اور ان سے باتیں کرنے میں زیادہ دلچسپی تھا۔ ام کو یہ سب کچھ بُرا لگا۔ ام نے اس بارے شاہی سے بات کیا تو وہ بدبخت ایک دم بھڑک اٹھا۔ ام دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوا۔ اگلے دن شاہی اپنا بستر بوریا گول کر کے امارا گاؤں چھوڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ شاہی کے جانے کی وجہ کانسٹیبل اجمل ہے تو وہ سب ام پر چڑھ دوڑا۔ ام اس وقت کانسٹیبل تھا اور ہیڈ کانسٹیبل بننے والا تھا۔ لوگوں نے ام کو بُرا بھلا کہا اور مطالبہ کیا کہ ام شاہی سے معاپی مانگے۔ ام نے معاپی نہیں مانگا لیکن اماری طرپ سے امارے بڑے بھائی کو معاپی مانگنا پڑا۔ خود اس کے بعد شاہی نے اپنا کام جاری رکھا...... رستم بھائی! آپ اماری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہا۔"

"نہیں...... لیکن تم ذرا جلدی سے سب کچھ بتا دو۔"

اجمل بولا۔ "امارے اور قدرت اللہ کے اس چیلے کے درمیان ٹسل پیدا ہو گیا تھا لیکن ام خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ ام اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ جن دنوں ام چھٹی پر شہر سے گاؤں جائے ان دنوں شاہی گاؤں میں موجود نہ ہو۔ چند مہینے بعد کی بات ہے کہ امارے گاؤں میں اوپر تلے دو تین عورتیں کینسر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا۔ ان کو چھاتی کا کینسر تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ بہت عام بیماری ہے۔ ان موتوں کے بعد علاقے میں خوب وہراس پھیل گیا۔

لوگ اس بیماری سے بہت ڈرنے لگا۔ ان دنوں ایک اور عورت کو یہی تکلیپ ہوا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ وہ عورت شاہی کے جھاڑ پھونک سے ٹھیک ہوگیا یا شاید اس کو کوئی اور تکلیپ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس طرح لوگوں کے ایمان کا امتحان لیتا ہو۔ عورت کے ٹھیک ہونے سے شاہی پر لوگوں کا یقین اور بھی پکا ہوگیا، پھر ایک دن ام چھٹی پر شہر سے گاؤں آیا تو ام نے ایک عجیب بات سنا۔ ام کو مالوم ہوا کو امارے گاؤں کا اچھا بھلا عورتیں بھی سینے کی تکلیپ کا دم کرانے شاہی کے پاس جاتا ہے۔ خوچے اس شاہی نے سیدھے سادے لوگوں میں یہ بات مشہور کردیا تھا کہ بیماری کے حملے سے بچنے کے لئے جوان عورتوں کو دم کرانا چاہیے۔ یہ سن کر امارہ خون کھول گیا کہ لوگ اپنی جوان بچیوں کو لے کر شاہی کے پاس آتے ہیں اور وہ قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ان کو دم کرتا ہے۔ آپ ہماری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟"

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔

اجمل بولا۔" آپ شاید نہ جانتا ہو کہ شاہی قسم کا بہروپیا لوگ سیدھے سادے لوگوں کی مت اسی طرح مارتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا عزت گنوا دیتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں جی...... ایسے لوگ دوسروں کو مسمرائز کردیتے ہیں۔ اب یہ کوئی ماموٗلی بات تو نہیں تھا رستم صیب! لوگ اس داڑھی منڈے چھوکرے کو باباجی کہتے تھے اور وہ پردے کے پیچھے ان کی بہو بیٹیوں کے جسموں کو ہاتھ لگاتا تھا۔ ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ ام سیدھا شاہی کے ٹھکانے پر گیا۔ وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ ام نے اسے گریبان سے پکڑا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ امارے سر پر خون سوار تھا۔ لوگوں نے اسے بچالیا ورنہ ام نے اس کا ناریل توڑ دینا تھا۔" چھوٹے سے وقفے کے بعد اجمل خان نے بات جاری رکھی۔

"پورے علاقے میں ہلچل مچ گیا۔ کچھ لوگوں نے امارا حمایت کیا لیکن زیادہ نے ام کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔ شاید اس کا ایک وجہ یہ بھی تھا کہ ام پولیس والا تھا۔ پولیس والا اچھا ہو یا بُرا، لوگ اس کو غصہ کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ علاقے کے ایس ایچ او مردان خان کی بہن بھی شاہی اور قدرت اللہ کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ ام کو امارہ نوکری جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ دوسری طرپ اس حرامی شاہی نے صاپ کہہ دیا کہ اگر ام اور امارہ فیملی اس گاؤں میں رہے گا تو وہ کبھی اس گاؤں میں قدم نہیں رکھے گا۔ قدرت اللہ اور شاہی نے لوگوں کا دماغ اتنا خراب کر رکھا تھا کہ ... سارے کا سارا امارے خلاف اکٹھا ہوگیا۔ ماسٹر صیب کو تو بس لعن طعن کیا گیا لیکن ام کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔ امارا رشتہ گاؤں کے ہی ایک کاشت کار نذر گل کی بیٹی سے طے ہوچکا تھا۔ بس دو چار مہینوں تک شادی ہونے والا تھا...... نذر گل نے بھی

ام کو رشتہ دینے سے صاف انکار کردیا۔ ام کو اپنے والد والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اپنا باپ دادا کا گاؤں روگڑی چھوڑنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی منگیتر کو بھی۔ اس کی شادی پر ام بہت رویا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ ام کو اپنی مٹی اور اپنا گاؤں چھوڑنے کا ہے۔ قدرت اللہ اور شاہی نے امارے اپنوں کو امارے لئے غیر بنایا اور ام کو بے وطن کیا۔ ام اس دکھ کو کبھی بھولے گا اور نہ قدرت اللہ سے انتقام لینے کو۔"

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔" تمہاری کہانی دل کو لگتی ہے اور پتا نہیں یہ تم جیسے کتنے اور لوگوں کی کہانی بھی ہے لیکن راستے میں تم نے کچھ اور باتیں بتائی تھیں۔ تم نے مجھے اور فرید کو اپنا دشمن بتایا تھا اور بڑی نفرت دکھائی تھی۔"

"خوچے! وہ سب یہاں تک پہنچنے کے لئے تھا۔ ام نے اخبار میں سارا خبریں اچھی طرح پڑھا تھا۔ ام کو سب مالوم ہے کہ وہاں ملتان میں کیا ہوا اور یہاں وڈے ڈیرے پر کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے ملتان میں قدرت اللہ کے آستانے میں گھس کر جو کچھ کیا اس نے امارا سیروں خون بڑھا دیا۔ قسم پیدا کرنے والے کا، ام کو یہی لگا کہ آپ امارا کام کر رہا ہے اور آپ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ امارے...... امارے اپنے دل کا آواز ہے۔ ملتان میں آپ نے قدرت اللہ کو پتہ نہیں کیوں چھوڑ دیا۔ اِم کو اس کا رنج ہے لیکن آپ نے اس کو جو سزا دیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس سزا کی وجہ سے امارا کلیجہ پچاس فیصد تو ضرور ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ وہ بہروپن ڈاکٹر صدف قدرت اللہ کا سب سے لاڈلا بی بی تھا۔ اُس کا موت ان ہزاروں عورتوں کے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں جن کی زندگی قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کی وجہ سے برباد ہوا۔ ام آپ کا پرستار تو پہلے بھی تھا لیکن ملتان والے مالمے کے بعد تو ام نے اپنے دل میں پکا پکا پیسلہ کرلیا کہ ام سے جس طرح بھی ہوسکا آپ کی مدد کرے گا۔ ام کو اپنے پیٹی بھائیوں سے مالوم ہوا تھا کہ سون کے علاقے میں وڈے ڈیرے پر آپ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف ایک بڑا کارروائی ہونے والا ہے۔ ام نے آپ کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا۔ آگے کا کہانی ذرا لمبا ہے، بس آپ مختصر یہ سمجھ لیں کہ ام کوہاٹ میں ایس ایس پی اشفاق زمانی صیب سے ملا اور انہیں بتایا کہ ام رستم اور لالہ فرید کے خلاف سون میں ہونے والی لڑائی میں حصہ لینے کا شدید خواہش مند ہے۔ زمانی صیب کو پتہ ہے کہ ام زبردست قسم کا نشانہ باز ہے۔ یہاں وڈے ڈیرے کے آس پاس پولیس کو دو چار اچھے نشانے بازوں کی ضرورت تھا۔ امارہ کام بن گیا اور ام زمانی صیب کی مدد سے یہاں پہنچ گیا۔"

رستم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ اس کی آنکھیں اجمل کی آنکھوں میں پیوست

تھیں۔ ''رستم بھائی! آپ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں کہ کیا تم واقعی دوست ہو؟''

اجمل خان کے چہرے پر عجیب سی سرخی پھیل گئی۔ وہ گہری نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا، پھر ہولے سے بولا۔ ''ام آپ کو اوخے دے سکتا ہے۔''

''یہ اوخے کیا ہوتا ہے؟''

''ایک طرح کا امتحان۔ امارے قبیلے میں یہ بڑا پرانا رواج ہے۔ جب کسی کو اپنی وپاداری کا یقین دلانا ہو تو ام خود کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ ام چھ خانے والے پستول میں تین گولیاں ڈالتا ہے اور چرخی کو گھماتا ہے پھر ام میں سے جس کو امتحان دینا مقصود ہو وہ پستول کا نال اپنی پیشانی پر رکھ کر ایک فائر کرتا ہے، اگر وہ بچ جائے تو سچا ہوتا ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتا ہے تو آپ کے سر کا قسم، ام ابھی اور اسی وقت آپ کو اوخے دے سکتا ہے۔'' اجمل خان کا لہجہ بے حد جذباتی تھا۔

رستم نے ایک لمحے کی خاموشی اختیار کیا۔ اس خاموشی سے اجمل خان نے نہ جانے کیا مطلب نکالا، اس نے اپنا پستول نکالنے کے لئے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ وہ تو رستم پہلے ہی اس سے لے چکا تھا۔ بہرحال اجمل خان کا انداز اتنا فطری اور بے ساختہ تھا کہ رستم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چند لمحے تک اجمل خان کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے اجمل کا پسٹل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''لیکن یہ امتحان دینے کے لئے نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

رستم کے دوستانہ لب و لہجے کو محسوس کر کے اجمل خان کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔ وہ ایک بار پہلے بھی رستم سے بغل گیر ہو چکا تھا۔ اب اٹھا اور دوبارہ بغل گیر ہوا، پھر بے ساختہ اس نے رستم کا رخسار چوم لیا اور اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پسٹل کو اپنے بائیں ہاتھ میں بڑی مضبوطی سے تھام کر وہ جوش سے بولا۔ ''رستم بھائی! ام سچ کہتا ہے بیر قدرت اللہ کو ڈنڈا مار کر آپ امارا آئیڈیل بن چکا ہے۔ ام آپ کے لئے جان قربان کر سکتا ہے۔ آپ ام سے جو کہے گا ام کر کے دکھائے گا......''

رستم نے ہولے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اپنا ارمان نکالنے کے لئے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''ام سمجھا نہیں رستم بھائی۔''

''شاید تم نے یہ نہ سوچا ہو کہ ڈیرے پر پہنچنے کے بعد تم اتنی جلدی ایکشن میں نظر آؤ گے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ امارے لئے کوئی مارا ماری کا کام ہے؟'' اجمل خان کے لہجے میں جنگجو پٹھان کا روایتی جوش کروٹیں لینے لگا۔

''ایسا ہی سمجھ لو اور کام بھی میرے اندازے کے مطابق تمہاری طبیعت کے عین مطابق ہی ہوگا یعنی نشانہ لے کر گولی چلانے والا۔ قریباً سو فٹ کے فاصلے سے گولی چلانا ہوگی۔''

''پیدا کرنے والے کا قسم، ام آپ کے اندازے سے بڑھ کر کام کرے گا۔'' اجمل خان نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلایا۔

وہ رستم سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے دونوں میں برسوں کی جان پہچان ہو۔ اس کے لہجے میں خلوص کی فراوانی تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں مدتوں کے شناسا لگتے ہیں۔

رات نو بجے تک سارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ پولیس اور اجرالیوں کے گھیرے میں آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سو افراد جن میں تین عورتیں بھی تھیں، زندگی کے لئے ایک بھرپور کوشش کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ رستم کے مشورے پر آج دوپہر ہی فرید نے خچروں اور گھوڑوں پر کچھ سامان وغیرہ لدوا دیا تھا۔ اپنی دیگر مصروفیات سے بھی انہوں نے محاصرہ کرنے والوں پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ جلد ہی یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تاثر کے قائم ہونے سے یہ فائدہ تھا کہ ڈپٹی ریاض کو قتلِ عام کے لئے پانڈو درے پر ہوشیار اور چوکس رہنا تھا۔ اس کی زیادہ تر نفری بھی پانڈو کی طرف ہی موجود رہنا تھی۔

پروگرام کے مطابق لالہ فرید کی قیادت میں چالیس افراد کا ایک جتھا تاریکی میں بڑی احتیاط سے پیش قدمی کرتا ہوا قبرستان سے آگے نکل جانا تھا اور اس ڈھلوان تک پہنچ جانا تھا جو قبرستان کے نواح سے شروع ہو کر قریباً نصف میل دور پولیس کی پوزیشنوں تک پہنچتی تھی۔ رستم اور اجمل خان چالیس افراد کے جتھے سے قریباً 300 میٹر آگے تھے۔ ان کے پاس ایک سیون ایم ایم رائفل کے علاوہ دو پسٹل تھے، اس کے علاوہ ایک فٹ لمبے پھل کا تیز دھار چھرا رستم کی قمیص کے نیچے ایک چرمی تھیلی میں لگا ہوا تھا۔

رات کے تاریک سناٹے میں رستم اور اجمل خان خودرو گھاس اور جھاڑیوں میں بڑی احتیاط سے چلتے ہوئے پولیس کی پوزیشنوں کے قریب پہنچ گئے۔ آسمان پر تیرنے والی آوارہ بدلیاں ان کی بھرپور مدد کر رہی تھیں۔ چاند کی روشنی ان دبیز بدلیوں کے پیچھے اوجھل تھیں۔

ایک جگہ پہنچ کر رستم نے سرگوشی کی۔ ''اب ہمیں لیٹ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ دھیان رہے کسی طرح کی آواز پیدا نہ ہو۔''

''آپ بالکل پکر نہ کریں۔ ام آپ کے ساتھ ہے لیکن امارا ٹریننگ پولیس والا ہے۔''

''تم پولیس پوسٹ کے باہر رہو گے جب تک میں نہ کہوں اندر نہیں آؤ گے اور نہ ہی گولی چلاؤ گے۔''

اجمل خان نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔

دونوں پیٹ کے بل لیٹ گئے اور نہایت کھردری زمین پر کہنیوں کے بل کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

پولیس کی پوزیشن کے عین عقب میں ایک سرچ لائٹ موجود تھی۔ قریباً پانچ منٹ کے وقفے سے یہ لائٹ روشن ہوتی تھی۔ دائیں بائیں تھوڑی سی حرکت کرتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ پولیس کی پوزیشن سے قریباً 100 فٹ پیچھے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں رک کر رستم نے سرچ لائٹ کے روشن ہونے اور بجھنے کا انتظار کیا اور جب یہ عمل مکمل ہوگیا تو وہ دونوں ایک بار پھر زمین پر رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ رستم کو قوی امید تھی کہ اگلی بار سرچ لائٹ روشن ہونے سے پہلے وہ پوزیشن تک پہنچ جائیں گے۔

اگلے چار منٹ چار برسوں کے برابر تھے۔ ان دونوں کی کہنیاں اور گھٹنے وغیرہ چھل گئے تھے۔ ذرا سی آہٹ ان پر MG-08 کا مہلک دہانہ کھول سکتی تھی۔ انہیں پوسٹ سے باتیں کرنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پوسٹ میں موجود کسی شخص نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ موت اس کے کتنے قریب ہے۔

رستم نے رائفل اجمل خان کو تھما دی اور قمیص کے نیچے سے لمبا چھرا نکال لیا۔

اجمل خان نے رستم کے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے رستم صیب! اس پوسٹ پر کم از کم دو تین بندہ موجود ہے اگر آپ گولی چلائے بغیر ان پر قابو پانے کی کوشش کرے گا تو آپ کے لئے مشکل ہوگا۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' رستم کا لہجہ خشک تھا۔ ''میرے اشارہ کرنے سے پہلے تم یہاں سے آگے نہیں بڑھو گے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اجمل خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ یا خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط اور جنگجو شخص تھا۔

رستم اس کا شانہ تھپک کر آگے بڑھا۔ اس کی حرکات میں شکاری جانور کی سی تیزی اور

چوکسی تھی۔ چھرا اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ ریت کی بوریوں کے پیچھے کینوس کا خیمہ سا تھا۔ اس خیمے سے ابھرنے والی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں دو یا تین افراد تاش کھیل رہے تھے۔ ایک شخص کی آواز ابھری۔ ''اوئے باگڑو! ذرا دھیان سے دیکھ۔ یہ تیری ماں کا خصم نہلا ہے کہ دہلا ہے......''

دوسری آواز نے ٹھیٹ پنجابی میں کہا۔ ''یہ دہلا ہے اور یہ میری ماں کا خصم نہیں...... یہ میں خود ہوں اور ابھی تیری دُکی اور تکی کو اپنے نیچے دبانے والا ہوں۔''

جواب میں پہلا شخص بڑبڑایا اور بیٹھی ہوئی آواز والا شخص بُری طرح کھانسنے لگا۔ رستم سانس روک کر آگے کی طرف کھسکتا جا رہا تھا۔ یہ بڑے سائز کی گن واقعی بہترین جگہ پر ماؤنٹ کی گئی تھی۔ اس بلند جگہ سے دائیں اور بائیں دور تک ہدف کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر رستم کے سینے میں شعلے کچھ اور بھڑک اٹھے کہ اسی گن سے فائر کر کے چند روز پہلے ایک ماں اور اس کے بچے کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا ہے۔

رستم سانپ کی طرح رینگتا ہوا بوریوں کے پیچھے خیمے کے سامنے پہنچا۔ ایک مہین درز میں سے اس نے اندر جھانکا۔ اندر صرف دو افراد تھے۔ دونوں ہٹے کٹے اور خطرناک صورتوں والے تھے۔ وہ دونوں اجرالی تھے۔ ایک پولیس والے کی وردی تو خیمے میں لٹکی ہوئی تھی لیکن وہ خود وہاں موجود نہیں تھا۔

رستم نے اپنا ٹارگٹ مقرر کر لیا۔ اب وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ سرچ لائٹ کسی بھی وقت پھر سے آن ہو سکتی تھی۔ رستم برق رفتاری سے خیمے میں داخل ہوا۔ ہوا میں جست لگاتے ہوئے وہ اس اجرالی پر گرا جس نے صرف شلوار اور بنیان پہن رکھی تھی۔ رستم کا ایک فٹ لمبا چھرا اجرالی کے سینے میں دل کے مقام پر لگا۔ چھرے کے ہڈی اور گوشت سے ٹکرانے کا احساس رستم کے ہاتھ کے لئے تسلی بخش تھا۔ رستم کا دوسرا ہاتھ اجرالی کے ہونٹوں پر جم کر رہ گیا۔ مضروب اجرالی کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا تھا۔ وہ بُری طرح پھڑکا لیکن رستم کی گرفت ناقابلِ شکست تھی۔ عین انہی لمحوں میں رستم کی ٹانگوں نے دوسرے اجرالی کی گردن بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لی تھی۔ اس دوسرے اجرالی کے ہاتھ سے تاش کے پتے نکل کر ہوا میں بلند ہوگئے تھے۔ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح رستم نے چاہا تھا لیکن ایک چیز رستم کی مرضی کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ رستم کا خیال تھا کہ وہ دوسرے اجرالی کی گردن بہ آسانی اپنی ٹانگوں کے مخصوص دباؤ سے توڑ ڈالے گا لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ وہ شخص توقع سے زیادہ سخت جان نکلا تھا۔ اس کا منہ پورا کھلا ہوا تھا۔ وہ چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم

آواز اس کے منہ سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ بس خرخر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شخص اپنی تمام تر جسمانی قوت صرف کرتے ہوئے داہنی طرف جھکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رستم نے دیکھا وہاں ایک رائفل کی تیز دھار سنگین پڑی تھی۔ غالباً وہ شخص چاہ رہا تھا کہ سنگین تک اس کا ہاتھ پہنچ جائے اور وہ رستم کی ٹانگوں کے شکنجے پر کوئی کاری ضرب لگا سکے۔ رستم تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے اجرالی کو سنگین سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھرا دوسرے اجرالی کے دل میں ترازو ہو چکا تھا مگر ابھی رستم اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر وہ اس پر سے گرفت ختم کر کے دوسرے اجرالی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اسے پندرہ بیس سیکنڈ مزید درکار تھے۔ یہی پندرہ بیس سیکنڈ اس اجرالی کے لئے بھی قیمتی تھے جو اپنا ہاتھ سنگین تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک انچ سنگین کی طرف سرک رہا تھا۔ جب رستم نے محسوس کیا کہ پندرہ بیس سیکنڈ کی اس دوڑ میں وہ ہار جائے گا تو اس نے اپنا ہاتھ چھرے کے دستے پر سے ہٹا کر مضروب اجرالی کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے ایک وحشیانہ جھٹکا دیا اور اس کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی۔ ان لمحوں میں دوسرے اجرالی کا ہاتھ تقریباً سنگین تک پہنچ چکا تھا۔ رستم نے یک لخت اس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی سے آزاد کر دی۔ وہ اوندھے منہ سنگین کے اوپر گرا۔ اپنے پیٹ کے نیچے سے سنگین تلاش کرنے کے لئے اس نے دیوانہ وار اپنا ہاتھ چلایا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ رستم مقتول اجرالی کو چھوڑ کر عقاب کی طرح اجرالی پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلا سکتا، رستم نے چھرا عقب سے اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ وار میں اتنی طاقت تھی کہ چھرے کی نوک ٹھوڑی کے پاس سے باہر نکل آئی۔ اجرالی کا توانا جسم رستم کے نیچے بُری طرح پھڑکا، تھرایا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن سے ابلنے والا خون تاش کے پتوں کو رنگین کر رہا تھا اور انہیں رنگین کرنے کے بعد لکڑی کے اس چوکور باکس پر گر رہا تھا جس میں جرمن ساختہ Mg-08 کے اندر چلنے والی گولیوں کی طویل بیلٹ تہہ در تہہ رکھی تھی۔

رستم کی کارروائی کا پہلا مرحلہ کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے اردگرد کی سن گن لی اور احتیاط کے ساتھ خیمے سے نکل آیا۔ طے شدہ تفصیل کے مطابق اس نے نشیب میں یکے بعد دیگرے دو کنکر پھینکے۔ ذرا دیر بعد تاریکی سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ وہ جھک کر چلتا ہوا آیا اور رستم کے ساتھ خیمے میں داخل ہو گیا۔ یہ اجمل خان خان۔ خیمے میں اجرالیوں کی دو لاشیں دیکھ کر اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"رائفل تیار ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"ایک دم تیار جناب۔" اس نے جوش سے رائفل کو تھپکی دی۔

رستم اسے لے کر خیمے کے پردے کے پاس آیا۔ اسے ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ رستم نے ڈوری کھول کر باہر تاریکی میں دیکھنے کا راستہ بنایا۔

"وہ سامنے روشنی نظر آ رہی ہے؟" رستم نے سرگوشی کی۔

"بالکل نظر آ رہا ہے جناب۔ امارہ خیال ہے کہ یہ بھی کوئی چھولداری ہے۔ خو اس کے اندر کوئی بندہ بھی حرکت کرتا نظر آ رہا ہے۔"

"اس بندے کو اُڑانا ہے اور پہلے ہی فائر میں۔ دوسری گولی چلنے سے پہلے اس خبیث نے غائب ہو جانا ہے۔"

"ان شاء اللہ دوسری گولی کا نوبت نہیں آئے گا۔" اجمل کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔

"بس ٹھیک سے فائر کرو۔ اس بندے کے گرنے کے ساتھ ہی میں اپنے پسٹل سے دو ہوائی فائر کروں گا۔" (دو ہوائی فائر لالہ فرید اور اس کے جتھے کے لئے حملے کا اشارہ تھے)

"او کے رستم بھائی۔" اجمل خان نے کہا۔ رائفل اپنے کندھے سے لگائی۔ سانس روکا۔ انگلی لبلبی پر رکھی۔ آنکھ میچی۔ یہ ایک پروفیشنل کھلاڑی کا شاندار سٹائل تھا۔ رائفل نے دھاکے سے شعلہ اگلا۔ رستم نے پوسٹ پر نظر آنے والے ہیولے کو صاف طور پر لڑکھڑاتے دیکھا۔ مزید احتیاط کے طور پر اجمل نے فوراً ہی دوسرا فائر بھی کیا۔ ہیولا اچھلا اور اوجھل ہو گیا۔

اب یہ لالہ فرید کو مطلع کرنے کا وقت تھا۔ رستم نے اپنا کولٹ پسٹل برآمد کیا اور ایک مخصوص وقفے کے ساتھ اوپر تلے دو فائر کئے۔ یہ لالے فرید کے لئے طوفانی پیش قدمی کا اشارہ تھا۔

MG-08 ایسی جگہ پر نصب تھی کہ یہ صرف سامنے اور دائیں بائیں ہی فائر کر سکتی تھی۔ عقب میں اپنی ہی پوزیشنوں کو نشانہ بنانا اس گن کے لئے ممکن نہیں تھا۔ رستم اور اجمل نے یہ خیمہ چھوڑا اور درختوں کے قریبی جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ خیمے سے نکلتے ہوئے رستم اجرالیوں کی ایک ٹیلی سکوپ بھی اٹھا لایا تھا۔ اس ٹیلی سکوپ سے اس نے نیچے تاریکی میں کسی حرکت کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس کے کان ہر گھڑی لالہ فرید کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑا قیمتی وقت تھا...... اگر تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی تو سارا پلان چوپٹ ہو سکتا تھا۔

اب تک چار فائر ہو چکے تھے۔ اس فائرنگ نے قرب و جوار میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ ٹیلوں میں تین سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور تیزی سے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ سنتریوں اور اجرائی پہرے داروں کی ملی جلی آوازیں فضا میں ہیجان خیز ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

''ہاں جی.... آپ کے ساتھی نظر آئے؟'' اجمل خان نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں.... تم مشین گن پر نظر رکھو اگر کوئی گن کی طرف آنے کی کوشش کرے تو گولی مار دو۔''

''آپ بے فکر رہو رستم صیب۔ امارہ گولی دونوں آنکھوں کے درمیان لینڈ کرے گا۔'' اجمل خان نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کا رخ کچھ دیر پہلے فتح کیے جانے والے مورچے کی طرف تھا۔

رستم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ لالہ فرید تاخیر کر رہا تھا۔ اس نے تھوڑا سا آگے جا کر دوربین پھر آنکھوں سے لگائی۔ ''کدھر مر گئے ہو؟'' وہ بڑبڑایا۔

اجمل بھی رستم کے قریب آن کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے رستم بھائی! وہ لوگ نہیں آرہا۔ جب ام چلے تھے اس وقت تو وہ ایک دم تیار تھا۔'' رستم کی طرح اجمل خان کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ رستم کوئی جواب دیتا، دو ٹارچوں کے روشن دائرے دکھائی دیئے۔ دو یا تین افراد دوڑتے ہوئے MG-08 کی طرف آرہے تھے۔

''فائر کرو۔'' رستم نے حتمی لہجے میں کہا۔

اجمل خان نے بے دریغ گولی چلائی۔ ایک شخص زخمی ہو کر نشیب میں گرا اور اس کی بلند کراہ رستم اور اجمل کے کانوں تک پہنچی۔ ٹارچ کا ایک روشن دائرہ غائب ہو گیا، دوسرا تیزی سے پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

نشیب میں ابھی تک فرید اور اس کے ساتھیوں کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ''ام کو لگتا ہے جی کوئی گڑ بڑ ہو گیا ہے۔'' اجمل کی آواز میں پہلی بار پریشانی کے آثار محسوس ہوئے۔

ابھی بہ مشکل اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اوپر تلے دو گولیاں اجمل خان اور رستم کے درمیان خلا میں سے گزر گئیں۔

دونوں نے خود کو ایک ساتھ نیچے گرا لیا۔ یہ ٹارگٹ فائرنگ نہیں تھی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ پولیس والے اور اجرائی بدحواس ہو کر چاروں طرف گولیاں چلا رہے ہیں۔ دھماکوں کے

ساتھ ہر طرف شعلے لپکنے لگے۔

انہوں نے تقریباً ایک منٹ تک مزید انتظار کیا پھر انہیں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر تک مزید یہاں رکے تو کسی آوارہ گولی کا نشانہ بنیں گے یا پکڑے جائیں گے۔ زمین پر اوندھے لیٹے لیٹے رستم نے اجمل خان کا کندھا دبایا اور وہ دونوں واپس ڈیرے کی طرف بڑھے۔ پہلے انہوں نے ڈھلوان پر کرالنگ کی پھر رکوع کے انداز میں جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ بارودی سرنگوں والے ایریا میں پہنچ کر رستم آگے ہو گیا اور مقرر کردہ نشانیوں کے مطابق آگے بڑھنے لگا۔

رستم کے ذہن میں اَن گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ وہ اور اجمل خان لالے فرید سے قریباً آدھ پون گھنٹہ پہلے وڈے ڈیرے پر سے نکل آئے تھے، اس کے بعد نہ جانے وڈے ڈیرے پر کیا ہوا تھا؟ سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا تھا۔ اب تو یوں لگ رہا تھا کہ شاید فرید اور اس کا جتھا ڈیرے سے روانہ ہی نہیں ہو سکے ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکے......؟ اس سے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

رستم اور اجمل خان وڈے ڈیرے پر پہنچے تو یہاں کچھ اور ہی منظر دکھائی دیا۔ ہر طرف افراتفری نظر آرہی تھی۔ اس افراتفری کی ایک وجہ تو پولیس کی طرف سے دور مار رائفلوں کے ذریعے ہونے والی فائرنگ تھی مگر دوسری اور زیادہ اہم وجہ کچھ اور تھی۔ رستم کو سرنگ نمبر دو کے سامنے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ چار پانچ افراد ایک شخص کو چارپائی پر ڈالے پیچھے کی طرف سے نمودار ہوئے اور تقریباً بھاگتے ہوئے دو نمبر سرنگ میں داخل ہو گئے۔ وہ اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ لگتا تھا کہ مریض ابھی چارپائی سے نیچے گر جائے گا۔ تب رستم نے حسنے کے ایک قریبی ساتھی فرہاد کو دیکھا۔ اس نے ایک پتھر کے ساتھ بیٹھ کر دو دفعہ زور سے قے کی پھر تیورا کر پتھر سے ٹیک لگا لی۔ یوں لگا کہ وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔ دو افراد لپکے اور اسے بھی سہارا دے کر سرنگ کے اندر لے گئے۔ یہی سرنگ تھی جس کے اندر ڈاکٹر ناصر نے اپنا کلینک قائم کر رکھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' رستم نے ایک شخص کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''کسی نے زہر دے دیا ہے جی...... سب لوگ مر رہے ہیں۔ بُری حالت ہے۔'' اس شخص نے رستم کو پہچان کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا اور ایک طرف لپک گیا۔

رستم نے قریب سے گزرتے ہوئے مراد گروپ کے حفیظ سے پوچھا۔ ''لالہ اور حسنا کہاں ہیں؟''

حفیظ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ''حسنا صاحب تو شاید ختم ہو گئے ہیں۔ لالہ بھی بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔''

''اور مراد؟''

''مراد جی وہ بھی بے ہوش ہیں۔ ان کو خون کی الٹی ہوئی ہے۔''

رستم کی آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ سب کچھ نگاہوں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے سب سے پہلا خیال ڈپٹی ریاض کا ہی آیا اگرچہ یہ اس کی سازش تھی تو پھر ابھی تھوڑی دیر میں ڈیرے پر حملے کی کوشش بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر یہ سب کچھ کسی اور وجہ سے ہوا تھا تو پھر ضرورت اس امر کی تھی کہ ڈیرے کی صورتِ حال کا علم ڈیرے سے باہر کسی کو نہ ہو۔

رستم نے ڈیرے سے باہر جانے والے دونوں راستوں پر اپنے اعتماد کے بندے مقرر کئے اور پھر پریشان حال لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا وہ سرنگ کے اندر گھسا۔ اس کے سینے میں دل مشینی رفتار سے چل رہا تھا۔ کیا وہ ابھی تھوڑی دیر میں حسنے اور فرید کے مرے ہوئے چہرے دیکھے گا؟ ان لوگوں کے چہرے جو ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اس کے ساتھ موجود تھے اور ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ جن کی آنکھیں روشن تھیں اور جن کے سینے عالم جوش میں فولاد دکھائی دے رہے تھے۔

رستم پندرہ بیس میٹر تک سرنگ کے اندر گیا تو اسے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دیکھا مشعلوں کی روشنی میں کئی افراد گلے لگ کر آہ وزاری کر رہے تھے۔

''فرید...... حسنے۔'' رستم نے پکار کر کہا اور ہجوم کو چیرتے ہوئے ڈاکٹر ناصر کے دوا خانے کی طرف بڑھا۔

یہ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ لالہ فرید ایک چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ وہ اپنے منہ پر لگے ہوئے گیس ماسک کو غنودگی کی حالت میں ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ کلینک کے اندر اور باہر بہت سے مریض پڑے تھے۔ چار پانچ چارپائیوں پر تھے، باقی بے ہوش یا نیم بے ہوشی کی حالت میں فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی حسنا گروپ کے ایک شخص نے دم توڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں، منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ دو افراد اس کی لاش سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مار رہے تھے۔

''ناصر کدھر ہے......؟'' رستم نے ایک سندھی نوجوان کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''وہ اُدھر ہے سائیں! حسنا صاحب کو ٹیکہ لگا رہا ہے۔'' نوجوان نے ایک گیس لیمپ

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رستم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا گیس لیمپ تک پہنچا۔ حسنا زمین پر ہی لیٹا تھا، وہ مکمل بے ہوش تھا۔ ناصر کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے حسنے کو نس کا انجکشن لگا رہا تھا۔ ناصر کی ہدایت پر ایک شخص حسنے کے چوڑے چکلے سینے پر اپنے دونوں ہاتھوں سے بار بار دباؤ ڈال کر اس کے دل کو متحرک رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسنے کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ اس کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم نے حبس پیدا کر رکھا تھا۔

رستم گرجا۔ ''پیچھے ہٹو...... پیچھے ہٹو...... ہوا آنے دو۔''

اس نے کھینچ کھینچ کر حسنے کے ساتھیوں کو پیچھے ہٹایا پھر اپنی چادر کے پلو سے اسے ہوا دینے لگا۔ حسنے کی حالت مخدوش تھی۔

☆======☆==-==-=☆

وہ رات رستم کی زندگی کی پریشان کن راتوں میں سے ایک تھی۔ حسنے گجراتی سمیت لالہ فرید اور مراد وغیرہ کی زندگی بھی بچ گئی مگر تین افراد زہر خورانی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جو کچھ رستم کو معلوم ہوا اس سے پتا چلا کہ ڈیرے پر کارروائی سے پہلے آخری وقت میں پی جانے والی چائے کے سبب یہ المیہ رُونما ہوا۔ یہ چائے جو دراصل دودھ پتی تھی، ایک بڑے دیگچے میں حنیفاں نامی عورت نے تیار کی تھی۔ رستم اور اجمل خان کو بھی یہ چائے پی کر ہی ڈیرے سے روانہ ہونا تھا لیکن چونکہ چائے بننے میں تھوڑی سی تاخیر تھی اس لئے وہ پہلے نکل گئے۔

بعدازاں لالہ فرید اور اس کے ان پینتیس چالیس ساتھیوں نے یہ چائے پی جو اس کے ساتھ مسلح ہو کر اوپر جا رہے تھے۔ چائے پینے کے بعد دس منٹ کے اندر اندر کچھ افراد کا دل گھبرانے لگا اور انہیں قے شروع ہو گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے صورتِ حال بگڑتی چلی گئی۔ اب لمبی تڑنگی زور آور عورت حنیفاں ڈیرے سے غائب تھی اور اسے اردگرد کے ٹیلوں میں ڈھونڈا جا رہا تھا۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ رستم دو نمبر سرنگ کے دہانے پر موجود تھا۔ اس کے اردگرد تمتمائے چہروں والے مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر ناصر نے سرنگ سے باہر آ کر رستم کو لالے فرید اور حسنے وغیرہ کی طرف سے تسلی دی تھی۔ مراد بھی اب ٹھیک تھا اور سو رہا تھا۔ لالے فرید کے بعد رستم ڈیرے کے مکینوں کے لئے سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ سب کے سب موجودہ صورتِ حال میں رستم کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ رستم اور اجمل نے اپنی جان پر کھیل کر اپنا کام مکمل کیا تھا اور خطرناک مشین گن MG-08 پر کنٹرول

حاصل کرلیا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ بہر حال اب سب لوگوں نے پھر کمر کس لی تھی۔

ان کے سینوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو سسک سسک کر مرنے کے بجائے ''مارو یا مرجاؤ'' پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پورا زور لگا کر پولیس اور اجرالیوں کا گھیراؤ توڑ دیا جائے پھر جس کے جدھر سینگ سمائیں وہ اُدھر بھاگ نکلے۔ وہ رستم کے اشارے پر کٹ مرنے کے لئے تیار نظر آتے تھے۔

رستم اور راجمل کی ڈیرے پر واپسی سے پہلے ہی کچھ افراد حنیفاں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ رستم نے بھی یہاں پہنچنے کے بعد چار گھڑ سواروں کو اس تلاش پر مامور کیا تھا۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ حنیفاں نامی یہ عورت کسی سازش کا حصہ بنی ہے۔

رستم کی کلائی کی گھڑی رات کے آخری پہر تین بجے کا وقت بتارہی تھی۔ جب شمال کی جانب سے کچھ شور سنائی دیا۔ ایک گھڑ سوار اپنے ہانپتے ہوئے گھوڑے کے ساتھ موقع پر پہنچا۔ اس نے رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''رستم صاحب! حنیفاں پکڑی گئی ہے۔ شاہ، رنجی اور سجاول وغیرہ اسے یہاں لا رہے ہیں۔''

''کہاں تھی وہ؟'' رستم نے پوچھا۔

''کھائی کے پار کیکروں میں چھپی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے سجاول نے ہی اسے دیکھا۔ اس نے سجاول کے ساتھ مارا ماری کی۔ پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا لیکن پھر شاہ اور رنجی وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ تینوں نے مل کر بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔''

ذرا دیر بعد ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔ حنیفاں کو پکڑ کر لایا جارہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی مضبوط رسّی سے باندھے گئے تھے۔ رسّی کا سرا رنجی نامی شخص کے ہاتھ میں تھا اور وہ حنیفاں کو جھٹکوں سے کھینچتا ہوا لارہا تھا۔ شاہ اور سجاول وغیرہ حنیفاں کے عقب میں تھے۔ سجاول نے اپنے زخمی سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ خون سے اس کا چہرہ رنگین ہورہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گھوڑے کو ہانکنے والی مضبوط چھڑی تھی۔ یہ چھڑی وہ گاہے بگاہے بے رحمی سے حنیفاں کی کمر پر رسید کرتا تھا اور وہ تکلیف سے چلا اٹھتی تھی۔ حنیفاں کی حالت بھی دیدنی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ بس پھٹی ہوئی قمیص کی چند دھجیاں تھیں جو اس کے گلے میں جھول رہی تھیں۔ وہ درمیانی عمر کی تھی مگر بہت لمبی تڑنگی اور مضبوط تھی۔ وہ کئی قتل کرنے کے بعد اشتہاری ہوئی تھی اور وڈے ڈیرے پر ان ڈکیتوں اور مفروروں کے درمیان پہنچی تھی لیکن آج جو کچھ اس کے ساتھ ہورہا تھا وہ بہت المناک تھا۔ جسنے گجراتی اور مراد

وغیرہ کے ساتھی غصے سے دیوانے ہورہے تھے۔ سجاول نے عقب سے حنیفاں کو لات رسید کی۔ وہ لڑھکتی ہوئی رستم کے قدموں میں آن گری۔ اس کا ناک منہ پھٹ گیا تھا اور جسم کے مختلف حصوں سے خون رس رہا تھا۔ لگتا تھا کہ طویل مزاحمت اور واویلے کے بعد وہ نڈھال ہوگئی ہے۔ اب وہ بس جسم پر لگنے والی ہر ضرب کے بعد ہولے سے چلاتی تھی اور چپ ہوجاتی تھی۔

رستم نے اس کے عریاں جسم سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ ''تُو نے کیوں کیا ایسا؟ کیوں اتنا بڑا قہر توڑا ہم سب پر؟''

وہ خاموش رہی اور کراہتی رہی۔

رستم نے اس کے گرد آلود بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''بولتی کیوں نہیں؟ کیوں کیا تُو نے ایسا اور کون کون ہے تیرے ساتھ؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا'' اس کی بیٹھی ہوئی آواز میں خوف، تکلیف اور طیش یکجا تھے۔

''تُو نے کچھ نہیں کیا اور تُو ڈر کر بھاگ بھی اور وہاں کیکروں میں چھپی بھی۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔

یکا یک دو افراد نے بے حد طیش کے عالم میں حنیفاں کے ہاتھوں کو باندھنے والی رسّی نما رسّے کا دوسرا سرا ہوا میں اچھالا اور ایک شاخ پر سے گزار دیا۔ اس سے پہلے کہ رستم ان کو روک سکتا تین چار افراد نے رسّے کو زور سے کھینچا، حنیفاں کرب سے چیختی ہوئی فضا میں بلند ہوگئی۔ اب وہ جنگلی بیری کی ایک شاخ سے جھول رہی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں اس کے لٹکنے کا منظر لرزہ خیز تھا۔ اس کا عریاں جسم ہزیمت، اذیت اور آفت زدگی کی تصویر نظر آتا تھا۔

''یہ ایسے نہیں بکے گی...... بڑی کڑک ہے حرام زادی۔'' ایک شخص نے کہا۔'' سجاول اور رنجی نے اسے بے دریغ لکڑیوں سے پیٹنا شروع کردیا۔

اس سے پہلے کہ رستم اپنے ساتھیوں کو ایسا کرنے سے روکتا اور حنیفاں کی زبان کھلوانے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرتا، ایک طرف سے کتوں کا شور اور مشتعل افراد کے للکارے گونجے۔ چھ عدد خوفناک گرے ہاؤنڈ کتے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی آہنی زنجیریں رکھوالوں کے ہاتھوں میں تھیں، ایک ایک رکھوالے نے دو دو کتوں کو سنبھال رکھا تھا۔ یہ بھوکے کتے اپنے شکار پر جھپٹنے اور چیر پھاڑ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

رستم سمجھ گیا کہ یہ لوگ کیا چاہ رہے ہیں؟ یہ لوگ اپنے طور پر ہی حنیفاں کو سزائے موت دینے کا پختہ ارادہ کرچکے تھے۔ مقامی طور پر اس سزا کے لئے ''نیان'' کا لفظ استعمال کیا جاتا

تھا۔ کوئی شخص جب اپنے قبیلے، برادری یا گروہ سے غداری کرتا ہے تو بدترین سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس غداری کے نتیجے میں اگر کوئی موت واقع ہو جائے تو پھر ''نیان'' کی سزا جاری ہو جاتی تھی۔ اگر حنیفاں نے غداری کی تھی تو پھر یہ غداری نیان کی سزا تک پہنچتی تھی کیونکہ اس کے نتیجے میں ایک نہیں تین موتیں ہو چکی تھیں اور ابھی تین چار افراد ایسے تھے جن کی حالت مخدوش تھی۔

نیان کی سزا کے مطابق مجرم کو برہنہ کر کے درخت سے الٹا یا سیدھا لٹکا دیا جاتا تھا اور اس پر بھوکے کُتے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ کئی جگہوں پر یوں بھی ہوتا تھا کہ مجرم کو ویرانے میں لٹکایا جاتا تھا اور اس کے جسم پر تیز دھار آلے سے کٹ لگا دیئے جاتے تھے۔ رات کو جنگلی جانور خون کی بُو سونگھتے آتے تھے اور بدنصیب شخص کو چیر پھاڑ جاتے تھے۔

بپھرے ہوئے افراد دیوانہ وار حنیفاں کی طرف بڑھے۔ ''مار ڈالو کتیا کو...... ٹکڑے کر دو۔'' وہ دھاڑے۔

رستم ان کے سامنے آ گیا۔ ''یہ کیا بے وقوفی ہے؟ تم لوگ یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟''

ایک شخص چلایا۔ ''اس فیصلے کے لئے کسی عدالت کی ضرورت نہیں ہے جناب! سب کچھ سامنے ہے۔ یہ کتیا پولیس کی ٹاؤٹ ہے۔ اس نے ہمارے ساتھیوں کی جانیں لی ہیں۔ ہم بھی یہاں کے قانون کے مطابق اس کی جان لیں گے۔ نادر کاکا کے بنائے ہوئے اصول سب کے لئے برابر کے ہیں۔ کیا آپ ان اصولوں کو نہیں مانتے؟''

''میں مانتا ہوں اور اس کو سزا بھی ضرور ملے گی لیکن جوش میں بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو۔ ہمیں پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے یہ سب کچھ کس کے کہنے پر کیا اور اس کے ساتھ اور کون کون ہے؟''

بپھرے ہوئے افراد کے دماغ ذرا ٹھکانے پر آئے۔ یوں لگا کہ وہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ کُتے جو حنیفاں کے بالکل نزدیک پہنچ گئے تھے کھینچ کر پیچھے ہٹا لئے گئے۔

حنیفاں کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ بھڑکتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں اُس کا چہرہ پسینے اور لہو سے تربتر تھا۔ اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ایسے نظر آتا تھا کہ اس کے دونوں کندھے اکھڑ گئے ہیں۔

ایکا ایکی رستم چونک گیا۔ ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی تیزی سے رستم کی طرف آئی۔ مہناز کی موت کے بعد ڈیرے پر کل تین عورتیں رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو سامنے بیری

سے لٹکی ہوئی تھی۔ باقی دو نادیہ اور شاہدہ (حسنے کی بیوی) تھیں۔ یہ ان دونوں میں سے کون ہو سکتی تھیں۔ وہ قریب آئی تو رستم نے پہچان لیا۔ وہ شاہدہ تھی۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

اس نے رستم کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''بھائی جی! مجھ کو تساں نے ایک بڑی ضروری گل کرنی ہے۔ آپ حنیفاں کو کچھ نہ کہیں۔ یہ بے قصور ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تساں کو سب کچھ بتاتی ہوں جی۔ تساں ایک منٹ کے لئے میرے ساتھ آؤ۔'' شاہدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

رستم نے حنیفاں کو اُتارنے کا حکم تو نہیں دیا۔ تاہم شاہ اور سجاول وغیرہ کو اسے پیٹنے سے منع کر دیا۔ وہ لرزتی کانپتی شاہدہ کے ساتھ ایک قریبی حجرے میں چلا گیا۔ یہاں چربی کے تیل کا بڑا چراغ جل رہا تھا۔ پورے کمرے میں چربی کی سڑانڈ تھی۔

حسنے کی بیوی شاہدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مینڈے بس میں نہیں کہ میں یہ ظلم ہوتے ہوئے دیکھوں۔ حنیفاں بے قصور ہے بھائی جی۔ میں تساں کو بالکل سچ بتا رہی ہوں۔''

''تو پھر کون قصوروار ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

شاہدہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے اور ہچکی سی بندھ گئی تھی۔

''تم چپ کیوں ہو؟'' رستم کا لہجہ تیز تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک خود پر ضبط کرتی رہی پھر سسک کر بولی۔ ''تساں کو بہت دکھ ہوگا بھائی جی۔ تساں کو بتاتے ہوئے مینڈا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔''

''تم میری پرواہ نہ کرو۔ اگر واقعی تمہیں سچ کا پتا ہے تو بتاؤ۔ نہیں بتاؤ گی تو حنیفاں کی جان چلی جائے گی۔''

شاہدہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر سسک کر بولی۔ ''تساں...... کی گھروالی...... نادیہ۔''

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟''

وہ ہچکی لے کر کراہی۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھائی جی...... میں نے خود اپنی اکھیوں سے دیکھا ہے۔ نادیہ نے چائے کے دودھ میں کچھ ملایا تھا۔ یہ کام اس نے شام سے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ وہ مکر گئی کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ پھر میں نے سوچیا کہ شاید مجھے ہی وہم ہوا ہے، وہ کوئی غلط کام کیسے کر سکتی ہے۔ اللہ کی مار ہو مینڈی عقل پر۔ مجھ

میں عقل مت ہوتی تو اسی وقت پر چول (چھان بین) کر لیتی۔'' شاہدہ اپنا چہرہ چادر میں چھپا کر زار زار رونے لگی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس نے واقعی کچھ ملایا تھا؟''

''میں برآنڈے میں تھی۔ میں نے دیکھا، نادیہ جلدی سے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا...... پھر اس کا ہاتھ اپنی چادر میں سے نکلا اور اس نے دودھ میں کچھ ڈالا۔ مجھے تو شک پڑتا ہے جی کہ یہ سب کچھ عظمت کا ہی کیا دھرا ہے۔ نادیہ اب بھی اس سے ملتی ہے۔ اس کے کہے پر چلتی ہے۔ اللہ کی مار ہو اس خبیث پر...... کتے کی موت مرے حرام زادہ۔'' شاہدہ نے اوڑھنی پھیلا کر عظمت کو بددعا دی۔

عظمت...... پیر قدرت اللہ کا وہی چیلا تھا جسے رستم نے ایک دن نادیہ کے ساتھ ناگفتہ حالت میں پکڑا تھا۔ وہ نادیہ کو عریاں کر کے اس کی پشت پر گھندوئی سے کوئی ''جادوئی'' عبارت تحریر کر رہا تھا۔ بعدازاں اس کی تحویل سے فحش تصویریں، شراب اور سفلی عمل کی بہت سی اشیاء برآمد ہوئی تھیں۔ رستم نے عظمت کو مار کوٹ کر سرنگ نمبر دو کی کوٹھڑی میں ڈلوا دیا تھا۔ اس کے بعد رستم کو وادی سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ وہ قدرت اللہ کے اس بدبخت چیلے پر نگاہ نہیں رکھ سکا تھا اور اب...... حسنے کی بیوی شاہدہ بتا رہی تھی کہ نادیہ اب بھی اسی شعبدہ باز کے ''ٹرانس'' میں ہے اور اس سے ملتی ہے۔

رستم کا دماغ چٹخ گیا۔ اس توہم پرستی نے نہ جانے کس کس کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اب نادیہ کوئی اَن پڑھ، جاہل، گنوار نہیں تھی۔ ایک معروف اداکارہ رہی تھی۔ اس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ کبھی ایسی فلسفیانہ باتیں کرتی تھی کہ عالم فاضل کیا کرتے ہوں گے لیکن اس کا دماغ جس ڈگر پر چل پڑا تھا بس اسی پر چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک گمراہ کن عقیدے پر کاربند ہوئی تھی اور اب پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

شاہدہ نے جو کچھ بتایا تھا اگر سچ تھا تو پھر نادیہ ایک خوفناک صورتِ حال کا شکار ہونے والی تھی اور اس کی ذمے دار صرف اور صرف وہ خود تھی۔

رستم نے شاہدہ سے کہا۔ ''اب تک تم نے یہ بات کس کس کو بتائی ہے؟''

''میں نے کسی کو نہیں بتائی لیکن مجھے لگتا ہے کہ کاٹھیا کو بھی شک پڑ گیا ہے۔ جب چائے پینے کے بعد سب کو الٹیاں آنا شروع ہوئیں تو میں نے جا کر نادیہ کو جھنجھوڑ دیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ میندے کو لگتا ہے کہ اس وقت ہماری کچھ باتیں کاٹھیا نے بھی سنیں۔''

''تمہاری باتوں کے جواب میں نادیہ نے کیا کہا ہے؟''

''وہ کچھ بولتی نہیں۔ بس روتی جا رہی ہے۔'' شاہدہ نے ہچکیاں لیتے

رستم نے شاہدہ کو تاکید کی کہ ابھی وہ یہ ساری بات اپنے تک رکھے پھر وہ تیزی

آیا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں شاہ اور سجاول وغیرہ کو حکم دیا کہ وہ نیم بے ہوش لڑ
حنیفاں کو شاخ سے نیچے اُتار لیں۔

رستم کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے شاہ اور سجاول وغیرہ نے برہنہ حنیفاں کو نیچے اُتارا۔ وہ زمین پر ڈھے سی گئی۔ ایک شخص نے اس کے بدن پر چادر ڈالی۔

گرے ہاؤنڈ کتے اب کافی پیچھے ہٹا لئے گئے تھے لیکن وہ اب بھی شور مچا رہے تھے اور لپک لپک کر زخمی حنیفاں کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مشعلوں کا تیل جلنے کی بُو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ نسیم سحر کی پاکیزگی اس بُو سے یوں داغدار تھی جیسے کسی شریف زادی کے چہرے پر کسی غنڈے کی سانسوں کی باس پھیل رہی ہو۔ اس خون، اس بُو اور اس دھواں دھواں ماحول سے بہت اوپر نیم روشن آسمان پر پرندوں کی ڈاریں گزر رہی تھیں۔ ہر غم فکر سے آزاد، ہر آفت سے بے خبر۔

کاٹھیا اور شاہ وغیرہ کو حنیفاں کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر رستم لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف گیا۔ وہی کمرہ جس میں پچھلے تقریباً تین مہینے سے وہ خوبرو نادیہ کے ساتھ بظاہر شوہر کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ وہیں پر ہوگی۔ نادیہ سے رستم کو کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن کچھ بھی تھا، بی بی نے اسے ایک سہیلی کی حیثیت دی تھی اور رستم سے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ یہ بظاہر معمولی تعلق رستم کے لئے بہت گہرا تھا۔ رستم کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ شاہدہ کی کہی ہوئی بات غلط نکلے۔ نادیہ نے وہ سب کچھ نہ کیا ہو جس کے لئے وہ بدترین سزا کی مستحق ٹھہر سکتی ہے۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا، نادیہ وہاں نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی نکل کر گئی ہے۔ رستم نے وہ چھڑی دیکھی جس سے اس نے کل نادیہ کو پیٹا تھا۔ چھڑی ٹوٹ گئی تھی لیکن اب وہ چھڑی مرمت شدہ حالت میں رستم کے سامان کے پاس پڑی تھی۔ یقیناً اس کی مرمت نادیہ نے ہی کی ہوگی۔ چھڑی کے دونوں ٹکڑے قلم کی شکل میں ٹوٹے تھے۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ان پر سوت کی ڈوری بڑی مضبوطی اور محنت سے باندھ دی گئی تھی۔

رستم نے چھڑی اٹھا کر دیکھی پھر ایک طرف پھینک دی۔ وہ نادیہ کو آواز دیتا چھجے کے تینوں کمروں میں گھوما۔ آخر وہ درختوں کی طرف آیا۔ وہ اسے درختوں میں نظر آ گئی۔ وہ ایک

پتھر پر بیٹھی تھی۔ سر گھٹنوں میں گھسا رکھا تھا۔ اس کے بال زمین کو چُھو رہے تھے۔ اس کی کمر اور کندھوں کی جنبش ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہچکیوں سے رو رہی ہے۔

کچھ کہے سنے بغیر رستم نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔ رو رو کر نادیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

رستم نے واشگاف لہجے میں کہا۔ ''دیکھو نادیہ! میں تجھ سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں اور یہ سچ سننے کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ کروں گا...... کیونکہ یہ میری ذمے داری ہے۔ میں بڑی ہمدردی سے تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے بتا، میرے جانے کے بعد کیا ہوا ہے یہاں؟''

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ رستم کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گی لیکن جب وہ بولی تو یہ توقع غلط ثابت ہوگئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہاں رستم! یہ جو کچھ ہوا ہے، مجھ سے ہوا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے پردہ آ گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں گناہ گار ہوں۔ مجھے قتل کر دو۔ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو مجھے۔''

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ نادیہ کے اقبالی بیان کے بعد اس کے بے گناہ ہونے کی ہر امید دم توڑ گئی تھی، جو کچھ شاہدہ نے بتایا تھا وہی کچھ نادیہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی۔ غصے سے مغلوب ہو کر رستم نے ایک زوردار تھپڑ نادیہ کو رسید کیا۔ اس کے بال اچھل کر اس کے چہرے پر بکھر گئے اور وہ تھرا کر رہ گئی۔ ''کیوں یہ ظلم کیا تم نے؟ کس کے کہنے پر کیا؟'' رستم کی آواز میں بے پناہ دکھ اور غضب یکجا ہو گئے۔

وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں رہی پھر کراہ کر بولی۔ ''اُس کے کہنے پر؟''

''کون اُس، وہی حرامی...... کتے کا بچہ عظمت؟'' رستم پھنکارا۔

نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

رستم کے لئے اپنے طیش پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے نادیہ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ کراہنے لگی۔ رستم نے ایک جھٹکے سے اس کا تربتر چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''تُو جانتی ہے تُو نے کتنا بڑا قہر توڑا ہے۔ تین بندوں کی جان گئی ہے۔ ان تین موتوں کی وجہ سے یہاں جو کچھ ہونا ہے اس کا نظارہ بھی تُو جلد ہی کر لے گی۔ یہ لوگ کُتے کی موت مار دیں گے تجھے۔ بوٹی بوٹی علیحدہ کر دیں گے تیری۔ اس سے اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لے یا گولی مار لے خود کو۔'' رستم کے لہجے میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آیا تھا۔

وہ بس تھر تھر کانپتی جا رہی تھی، اس کا سر گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے

اندر سے ہی کہا۔ ''عظمت نے مجھ سے کہا تھا کہ اس دوا سے بس ہلکی سی بے ہوشی ہو گی۔ اس نے نہیں بتایا تھا کہ یہ اتنی تیز دوا ہے۔''

''دوا ہے؟'' رستم نے چیخ کر کہا۔ ''وہ زہر تھا زہر...... اس نے تین بندوں کی جان لی ہے اور ابھی ایک دو اور بھی مر جائیں گے۔''

وہ اٹھ کر نہایت بے قراری سے کمرے کے مختصر خلا میں ٹہلنے لگا۔ وہ گٹھڑی بنی اس کے سامنے دری پر بیٹھی رہی۔ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا لیکن یہ سپیدہ سحر رستم کو سیاہ ترین راتوں سے بڑھ کر تاریک لگ رہا تھا۔ احاطے کی طرف لوگوں کا شور تھا۔ گاہے بگاہے رونے کی اکا دکا آوازیں بھی آتی تھیں۔ یقیناً یہ مرنے والوں کا ماتم تھا۔ گرے ہاؤنڈ کتوں کی آوازیں اب قبرستان کی طرف سے آ رہی تھیں۔ دو تین منٹ کی چہل قدمی کے بعد رستم اپنے بے پناہ کرب اور اضطراب پر کسی حد تک قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ وہ خود کو سنبھالتا ہوا نادیہ کے پاس بیٹھ گیا۔

''سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی تم نے اس مشٹنڈے عامل سے رابطہ کیوں کیا؟'' رستم نے ہر ہر لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

''میں نے بڑی کوشش کی مگر خود کو اس سے دور نہ رکھ سکی۔ اس کی باتوں میں پتا نہیں کیا جادو ہے۔ میں ایک بار پھر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ میرا دماغ بند ہو گیا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔''

''کہاں ملتی رہی ہو اس سے؟''

''جہاں تم نے اسے بند کرایا تھا...... سرنگ میں۔''

''کیا پھر اس سے عمل کرانے کے لئے اس کے سامنے ننگی ہو کر بیٹھی تھی؟''

''نن...... نہیں۔ اس کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مم...... میں بس دو تین بار ملی ہوں۔ وہ کوٹھڑی کے اندر ہوتا تھا، میں سلاخوں والی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس سے بات کرتی تھی۔'' بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر اچانک ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''اس کی باتیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ کیسے جان لیتا ہے میرے بارے میں۔ وہ مجھے ایسی باتیں بتاتا ہے جو میرے سوا کسی اور کو پتا ہی نہیں ہیں۔ میں بے بس ہو جاتی ہوں۔''

''اب تمہیں اور زیادہ بے بس نہیں ہونا پڑے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ساری مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔'' رستم کا زہرناک لہجہ دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے اندرونی اضطراب کو بس میں کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر

سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’یہ شاندار چائے جوتم نے لالہ اور اس کے ساتھیوں کو پلائی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اب ذرا لگے ہاتھ مجھے یہ بھی بتا دو کہ اُس حرامی نے تمہیں اس کام کے لئے تیار کیسے کیا؟‘‘

’’اس کی باتوں نے میرے دماغ پر اثر کر دیا تھا...... وہ بار بار یہی بات کہہ رہا تھا کہ...... کہ......‘‘ وہ خاموش ہوگئی۔

رستم نے چند سیکنڈ انتظار کیا پھر اس کے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر بولا۔ ’’فلموں کی طرح رک رک کر ڈائیلاگ نہ مارو۔ جو بکواس شروع کی ہے اسے پورا کر۔‘‘

وہ ہکلا کر بولی۔ ’’عظمت کہتا تھا کہ جو چالیس لوگ تمہارے ساتھ پولیس کا گھیراؤ توڑنے کے لئے جا رہے ہیں ان میں سے...... بس دو بندے زندہ بچیں گے...... اور تم ان دو میں سے نہیں ہوگے۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘ رستم نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے مجھے بچانے کے لئے ان سب کو زہر کھلا دیا اور ساتھ میں مجھے بھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں تمہاری وہ محبت بھری چائے پینے سے بچ گیا۔ نہیں تو میں بھی زندگی و موت کے درمیان لٹکا ہوتا۔‘‘ رستم کا لہجہ زہرناک تھا۔

وہ منمنائی۔ ’’اس نے کہا تھا کہ میں کسی بھی طرح تم سب کو روک لوں۔ اگر میں نہ روکوں گی تو بہت بڑا گناہ کروں گی۔ اس نے کنویں کی مثال دی تھی...... اس نے کہا تھا کہ چالیس اندھے ایک کنویں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اس میں گر کر مرنے والے ہیں۔ وہ کنویں کو نہیں دیکھ سکتے لیکن تم دیکھ رہی ہو۔ انہیں کسی طرح بھی روکنا تمہارا فرض بنتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی باتوں میں اس طرح الجھایا کہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہوگیا۔ مجھے لگا، کل رات کے بعد میں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی رستم۔ میں۔ نے وہی کچھ کیا جو عظمت مجھ سے کہہ رہا تھا۔‘‘

روتے روتے نادیہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ’’رستم! مجھے معاف کر دو۔ معاف نہیں کر سکتے تو جو جی چاہے سزا دے دو لیکن مجھ سے منہ نہ موڑنا۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔‘‘

رستم تڑخ کر بولا۔ ’’بات میرے معاف کرنے یا سزا دینے کی نہیں۔ تمہاری وجہ سے تین ساتھیوں کی جان گئی ہے۔ ان کا خون تمہاری اور عظمت کی گردن پر ہے۔ لوگ بپھرے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اب یہاں میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘ رستم نے بے حد مایوسی کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ اس کا سینہ جل اٹھا۔ اسے لگا

جیسے بی بی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس کا حسین چہرہ، اس کی سمندر جیسی گہری آنکھیں اور اس کا باوقار سراپا رستم کے سامنے موجود ہے۔ وہ اس ساری صورتِ حال کو دیکھ رہی ہے۔ رستم سے کہہ رہی ہے۔ میں نے نادیہ تمہیں سونپی تھی۔ اسے سنبھالنا اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں بی بی سے بولا۔ ’’میں کیسے پورا کروں یہ فرض؟ کیا اس نے فرض پورا کرنے کی کوئی گنجائش رہنے دی ہے بی بی؟‘‘

نادیہ کا سر بدستور گھٹنوں میں تھا۔ اس کی بھاری چوٹی کے نیچے سے اس کی کمر کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں جلد پر پرانی خراشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ اس گھندوئی کی ڈالی ہوئی گہری لکیریں تھیں جو عظمت کے نامعلوم ’’عمل‘‘ کا حصہ تھیں۔ گردن سے ذرا نیچے گھندوئی کی نوک سے ’’بنگالن گوری‘‘ لکھا گیا تھا اور اب بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ اسی طرح کے بے معنی الفاظ نادیہ کی ساری پشت اور پنڈلیوں پر بھی تھے۔ یہ الفاظ رستم نے خود دیکھے تھے...... رانی ماتا...... رات کا راجا...... اماوس کا تارا...... کالی قبر...... اس کے علاوہ مختلف ہندسے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ نادیہ اس خبیث عامل کے ہاتھوں یہ تکلیف سہتی رہی تھی اور اس کی تفریحِ طبع کا سامان بنتی رہی تھی۔ یہ شیطان عامل پتا نہیں اس سے آگے بھی کہاں تک چلا جاتا؟ اگر کچھ دن پہلے رستم اسے کھوہ میں سے پکڑ نہ لیتا۔ رستم نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ’’دیکھ...... میں نے تجھے کتنا منع کیا تھا...... کتنا سمجھایا تھا مگر تم جیسی عورتوں کے دماغ جب ایک رخ پر چل پڑتے ہیں تو پھر رکتے نہیں ہیں۔ وہ عقیدے کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر اندھی گھوڑیوں کی طرح بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ سب کچھ لٹا کر بھی ان کو ہوش نہیں آتا۔ تمہاری جیسیوں کی عقل کا ماتم کرنے کے سوا بندہ اور کیا کر سکتا ہے۔‘‘

’’میں انجان نہیں ہوں رستم...... مم...... میں جانتی ہوں......‘‘

’’اسی بات کا تو زیادہ دکھ ہے کہ تم انجان نہیں ہو۔ پڑھی لکھی شہرن ہوتے ہوئے بھی تم نے وہی کچھ کیا ہے جو کسی دور دراز علاقے کی رہنے والی گنوار زنانی کرتی۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں...... شیطان عاملوں اور پیروں نے گھروں کے گھر برباد کئے ہیں اور ان لوگوں کا ہتھیار تم جیسی ڈھیٹ بے غیرت عورتیں ہیں۔ اپنے کسی نہ کسی لالچ یا تمنا کو روگ بنا کر وہ ان عاملوں کی جھولی میں گرتی ہیں اور سب کچھ برباد کر لیتی ہیں۔‘‘

’’جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا رستم...... لیکن خدا کے لئے میری نیت پر شک نہ کرنا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے لئے، شانی جی کے لئے میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی

تھی۔۔۔ تمہارے بغیر......تمہارے بغیر زندگی کا خیال کرنا بھی میرے لئے محال ہے۔ میرا سب کچھ تم ہو رستم۔۔۔ مم......مجھے لے کر یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ رستم۔ میں تمہاری کنیز ہونے کا حق ادا کر دوں گی۔''

وہ تڑپ کر رستم کے پاؤں میں گر پڑی۔ اپنا سر اس کے پاؤں پر پٹخنے لگی۔ اپنے تر بتر رخسار اس کے پیروں کے بالائی حصے پر رگڑنے لگی۔ لمبے بال اس کی چوٹی میں سے نکل گئے تھے اور رستم کے قدموں کو ڈھانپ رہے تھے۔ اس کا لباس جسم پر بے ترتیب ہو گیا تھا اور مضحکہ خیز لگ رہا تھا لیکن اسے اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ رستم نے سوچا اگر کوئی اچانک اندر آ گیا اور اس نے نادیہ کو اس عجیب و غریب حالت میں دیکھا تو کیا سوچے گا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں نادیہ کی ہیجانی گرفت سے چھڑائے اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ اسی طرح اپنے گھٹنے اپنے جسم کے نیچے دبائے اوندھے منہ دری پر پڑی رہی۔

رستم جب احاطے میں پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ بیشتر لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس سانحے کی اصل ذمہ دار نادیہ ہے......بڑھیا کے ذریعے یہ بات آؤٹ ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئی تھی۔ شروع شروع کے دنوں میں خوبرو نادیہ کو یہاں بہت سی حریص نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بعد میں جب وہ رستم کی ''بیوی'' بن گئی تھی تو اسے چھوٹی بھرجائی کہا جانے لگا تھا اور مہناز کی طرح بھرجائی کا پروٹوکول ہی دیا جانے لگا تھا لیکن آج لوگ یہ سن رہے تھے کہ اس چھوٹی بھرجائی نے ایک نازک ترین موقع پر انہیں سنگین دھوکا دیا ہے اور درجنوں افراد کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے......کیوں......کیسے......کس وجہ سے؟ اس طرح کے اَن گنت سوال ڈیرے کے مکینوں کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ رستم کو یوں لگا کہ سارے کے سارے تقریباً ڈیڑھ سو افراد کی سوالیہ نظریں رستم پر لگی ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کی دلی خواہش یقیناً یہ رہی ہو گی کہ چھوٹی بھرجائی اس الزام سے بچ جائے۔ انہوں نے جو کچھ سنا وہ غلط ہو۔

سب سے پہلے شاہ اور سجاول ہی آگے آئے۔ سجاول نے دبے لہجے میں کہا۔ ''رستم صاحب، لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا حنیفاں واقعی بے قصور ہے؟''

رستم خاموش رہا۔

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''وہ کہتی ہے، میں بے قصور ہوں۔ میں اس لئے چھپ گئی تھی کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔''

ایک تیسرا شخص احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ بے قصور ہے تو پھر کون ہے مجرم کس نے یہ جانیں لی ہیں؟''

سجاول نے کچھ دیر تک رستم کے بولنے کا انتظار کیا پھر دبے لہجے میں وہ بولا۔ ''رستم صاحب! کچھ لوگ چھوٹی بھرجائی کا نام لے رہے ہیں۔ کیا آپ نے چھوٹی بھرجائی سے بات کی ہے؟''

''ہاں، میں نے کی ہے۔ اس کی بات سے پتا چلتا ہے کہ یہ سب عظمت کا کیا دھرا ہے۔ اس نے دوا کے نام پر نادیہ کو دھوکے سے زہر دیا۔ نادیہ نے اسے بے ہوشی کی دوا سمجھ کر دودھ میں ملا دیا۔''

سجاول کا سر جھک گیا۔ اس کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ وہ رستم کی بات سے مکمل اتفاق نہیں کر رہا۔

شاہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی جی......اس حرامی عظمت کے بارے میں ہم سب کو پتا چل چکا ہے کہ وہ پیر قدرت اللہ اور پولیس کا ٹاؤٹ ہے۔ اس کے باوجود چھوٹی بھرجائی اس سے ملنے گئی۔ یہ تو آنکھوں سے دیکھ کر بھی سانپ کا منہ چومنے والی بات ہے۔''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کاٹھیا سے کہا۔ ''عظمت کو لے کر آؤ یہاں۔۔ میں نے اس سے......''

ابھی رستم کی بات منہ میں ہی تھی کہ ایک شخص تیزی سے آگے آیا اور رستم کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اُس حرامی نے یہاں آ کر کیا کرنا ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے چٹے دن کی طرح سب کے سامنے ہے۔'' یہ شخص مراد تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ڈاکٹر ناصر کی لگائی ہوئی بٹر فلائی ابھی تک اس کے بازو پر موجود تھی۔

رستم نے کہا۔ ''کیا سب کے سامنے ہے؟''

''یہی کہ یہ قتل تمہاری ایکٹرس بیوی نے کئے ہیں اور اس سازش میں پیر قدرت اللہ کا وہ حرامی چیلا بھی شامل تھا۔'' مراد نے تڑخ کر کہا۔

''دیکھو، ابھی یہ صرف ایک الزام ہے، اس کو ثابت ہونے دو پھر میں وہی کروں گا......''

رستم کا یہ فقرہ بھی ادھورہ رہ گیا۔ سرنگ کی طرف سے ایک بندے کی دردناک چیخ و پکار ابھری۔ وہ اپنا سر پیٹ رہا تھا اور زمین پر لیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیگر افراد اسے سنبھال رہے

تھے۔ یقیناً ڈاکٹر ناصر کے کلینک میں ایک اور شخص زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

مراد نے بڑے طنز سے کہا۔ ''یہ لو ....ایک اور ثبوت پیش ہو گیا ہے، تمہاری خدمت میں ..''

مراد کے کچھ ساتھی اشتعال میں نعرہ زنی کرنے لگے۔ ایک شخص آگے آیا اور اپنی AK57 گن فضا میں لہرا کر بولا۔ ''خون کا بدلہ خون ہے۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہوگی۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں ہونے دیں گے۔''

''ہاں کسی سے رعایت نہیں ہونے دیں گے۔'' مراد گروپ کے بہت سے لوگ ایک ساتھ بولے۔

دیکھتے ہی دیکھتے فضا سنگین ہوگئی۔ مراد گروپ کے لوگ اشتعال سے بے قابو ہونے لگے۔ وہ ہجوم کو چیر کر آگے آ گئے اور رستم کے عین سامنے کھڑے ہو کر نعرہ زنی کرنے لگے۔ مراد، رستم کے برابر آن کھڑا ہوا اور پکار کر بولا۔ ''آفتاب کا بھائی بھی مر گیا ہے۔ ہمارے مرنے والوں کی گنتی تین ہوگئی ہے۔ ہمیں ان تین موتوں کا حساب چاہیے اگر ہمارے ساتھ انصاف نہ ہوا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ہمیں انصاف چاہیے۔''

''انصاف چاہیے۔'' بہت سی آوازوں نے بیک زبان کہا۔

کچھ بپھرے ہوئے لوگوں نے دیوانہ وار چھپے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی شاید وہ نادیہ کو گھسیٹ کر یہاں لانا چاہتے تھے۔ اس موقع پر فرید اور رستم کے قریبی ساتھی ان کے راستے کی دیوار بن گئے اور انہیں دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

مراد نے ایک گرج کے ساتھ رستم کو مخاطب کیا۔ ''لالے کے بعد تم سردار ہو لیکن اگر تم انصاف کرنے میں ڈنڈی مارو گے تو پھر ہم خود فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

کاٹھیا چند دیگر افراد کے ساتھ عظمت کو کال کوٹھڑی میں سے لینے کے لئے گیا تھا۔ رستم نے گھوم کر دیکھا تو وہ واپس آ رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ قدرے زرد اور پسینے میں نہایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ رستم کا ماتھا ٹھنکا۔ عظمت اس کے ساتھ نہیں تھا۔ کاٹھیا تقریباً دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ رستم کے پاس آیا اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ''رستم بھائی! عظمت نے زہر کھا لیا ہے۔ وہ کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اس کی حالت ایک دم خراب ہے۔''

ایکا ایکی سراسیمگی میں اضافہ ہو گیا۔ ہر چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ رستم اور سجاول، رجی، شاہ وغیرہ دوڑتے ہوئے سرنگ کے اندر پہنچے۔ کوٹھڑیوں کے پاس کئی افراد جمع تھے۔ رستم نے

دیکھا کوٹھڑی کے فرش پر قدرت اللہ کا چیلا لمبا لیٹا تھا..... ڈاکٹر ناصر اور دیگر دو افراد اسے طبی امداد دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ عظمت کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ چند روز پہلے تک عظمت کے لمبے بال تھے لیکن جب وہ کھوہ میں نادیہ کے ساتھ پکڑا گیا تھا اور اس کے تکیے کے غلاف میں سے فحش تصویریں وغیرہ نکلی تھیں، سجاول اور شاہ نے دلاور کے ساتھ مل کر عظمت کا سر مونڈ دیا تھا۔ اب بھی وہ مونڈے ہوئے سر کے ساتھ ہی فرش پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھ کی گیڈ پر مکھی بھنبھنا رہی تھی۔

رستم کو دیکھ کر ناصر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ بچے گا۔''

''کوشش کر دیار۔ یہ مر گیا تو بہت کچھ پردے میں رہ جائے گا۔''

''اس کا معدہ واش ہو سکتا تو شاید امید پیدا ہو جاتی لیکن......''

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے غلیظ صورت بدبودار چیلے کے گلے سے گھنگرو کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ موت کی گھنٹی تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے آخری کوشش کے طور پر آکسیجن گیس کا سلنڈر منگوایا لیکن سلنڈر کے آتے آتے عظمت کے سانس پورے ہو گئے۔ اس کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ وہ جو صرف نام کا عظمت تھا، ذلت کی گہرائی میں گرنے کے بعد اپنے انجام اور پوچھ تاچھ سے بچنے کے لئے حرام موت مر گیا۔

ڈاکٹر ناصر نے رستم کو اخبار کی پڑیا میں رکھا ہوا ایک سفید رنگ کا پاؤڈر دکھایا۔ ''یہ وہ زہر ہے۔ خاصا طاقتور اور زود اثر ہے۔''

''کہاں سے ملا؟''

ڈاکٹر ناصر نے کہا۔ ''اس کی جیب میں سے..... ایسی ہی ایک اور پڑیا چھت کی درز میں بھی رکھی ہے لیکن اس میں تھوڑا سا پاؤڈر ہے۔ باقی اس نے شاید چھوٹی بھرجائی کو دے دیا ہوگا.....'' ڈاکٹر ناصر نے چھت کی ایک درز میں سے چھوٹا سا لمبوترا پتھر ہٹایا۔ پیچھے اخبار کے کاغذ سے بنی ہوئی دوسری پڑیا بھی موجود تھی۔ یہیں پر دو انگوٹھیاں اور دو طلائی جھمکے رکھے ہوئے بھی نظر آئے۔

ڈاکٹر ناصر نے ہولے سے کہا۔ ''یہ چھوٹی بھرجائی کے زیور ہیں۔''

رستم نے بھی پہچان لیا۔ یہ نادیہ کی چیزیں تھیں۔ دونوں انگوٹھیاں تو وہی تھیں جو اس سے پہلے بھی نادیہ نے عظمت کو جھاڑ پھونک کے معاوضے میں دی تھیں۔ رستم نے یہ واپس حاصل کی تھیں لیکن اب یہ پھر نادیہ کے ذریعے عظمت کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ مزید اضافے کے طور پر ساتھ میں جھمکے بھی تھے۔

رستم اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہ پولیس کے ٹاؤٹ اور پیر قدرت اللہ کے چیلے کا کمرہ تھا اور نادیہ بار بار منع کرنے کے باوجود یہاں آتی رہی تھی۔ اپنی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اب ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ رستم کی نگاہ سامنے دیوار پر پڑی۔ کسی دل جلے نے کوٹھڑی کی دیوار پر مارکر سے لکھ رکھا تھا۔ ''یہاں جھوٹے پیر کا چمچہ اور پولیس کا کتا بندھا ہوا ہے۔''

کوٹھڑی سے باہر مارکر سے عظمت کی برہنہ تصویر بنائی گئی تھی۔ نیچے لکھا تھا۔ ''حرامی جاسوس 007۔''

رستم نے سجاول سے پوچھا۔ ''پہرے دار کدھر ہے؟''

لمبا تڑنگا پہرے دار انور خان ایک طرف سے روتا ہوا برآمد ہوا اور رستم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ رستم نے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھا۔ ''کیا چھوٹی بھرجائی یہاں عظمت سے ملنے آئی تھی؟''

اس نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔ ''دو تین بار آئی تھیں جی...... لیکن وہ کوٹھڑی کے اندر نہیں گئی تھیں۔ باہر ہی رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بارے میں کسی کو پتا نہ چلے۔ وہ آپ کی بی بی صاحبہ ہیں جی۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں...... وہ میرے لئے ماں بہن ہیں جی۔''

''عظمت اور چھوٹی بھرجائی کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟''

''میں دور جا کر کھڑا ہو جاتا تھا جی۔ ہاں دیکھتا ضرور رہتا تھا کہیں یہ خبیث سلاخوں کے اندر سے ہی بھرجائی جی کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔'' انور خان نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''کبھی کوئی بات سنی تم نے؟'' رستم نے پوچھا۔

''بب...... بس ایک بار چند لفظ میرے کانوں میں پڑے تھے جی۔''

''کیا لفظ سنے تھے؟''

انور خان کے چہرے پر جھجک نمودار ہوئی۔ اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ بدل کر بولا۔ ''آپ ذرا علیحدہ آئیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

''نہیں جو بات بھی ہے سب کے سامنے کہہ دو۔'' رستم کے چہرے پر بلا کی سختی تھی۔

انور خان ذرا توقف سے گویا ہوا۔ ''جب بھرجائی جی پہلی بار عظمت سے ملنے آئیں،

رات دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میری سگریٹ کی ڈبی کوٹھڑی کے پاس رہ گئی تھی۔ میں ڈبی اور لائٹر اٹھانے کے لئے آیا۔ اس وقت بھرجائی جی کہہ رہی تھیں...... وہ کہہ رہی تھیں اپنی عزت آبرو کے سوا میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ بس میرے دل کی مراد پوری کردو۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ جو بھی کہو گے۔ عظمت گم صم نظر آتا تھا۔ جیسے ناراض ہو۔ بھرجائی جی کا لہجہ منت والا تھا...... میں نے بس یہی چند لفظ سنے تھے۔''

دوپہر تک وڈے ڈیرے کی صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی۔ ایک طوفان سا برپا ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ اشتعال مراد گروپ میں تھا۔ وہ اب علی الاعلان نادیہ کے لئے ''نیان'' کی سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حسنا گروپ کے دس بیس افراد بھی ان کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نادر کاکا کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل ہو۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ مجرم کون ہے؟ دیکھا جائے کہ جرم کیا ہے؟ جو سزا حنیفاں کے لئے تجویز کی جانے والی تھی اب وہی سزا نادیہ کے لئے ہونی چاہیے۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس واقعے کے دو ہی بڑے مجرم تھے۔ چیلا عظمت اور رستم کی بیوی نادیہ۔ عظمت نے خودکشی کر لی تھی، نادیہ کے لئے نیان سے کم کوئی سزا قابلِ قبول نہیں تھی۔

مراد گروپ کے زیادہ جوشیلے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نادیہ براہِ راست سازش کا حصہ بنی ہے۔ اس نے پولیس سے اپنے اور رستم کے لئے رعایت حاصل کرنے کے لئے عظمت کا ساتھ دیا اور وڈے ڈیرے کے اہم ترین لوگوں کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی۔

جو لوگ زیادہ جوشیلے نہیں تھے اور جو سارے معاملے کو معروضی انداز سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے نزدیک بھی نادیہ قابلِ معافی نہیں تھی۔ ان کا مؤقف تھا کہ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ عظمت ایک بدمعاش عامل اور پولیس کا ٹاؤٹ ہے، نادیہ چوری چھپے اس سے کیوں ملی اور اس کی آلۂ کار بنی۔ یہ لوگ نادیہ کو زیادہ سے زیادہ رعایت یہ دے رہے تھے کہ اس کو نیان کی سزا نہ دی جائے لیکن قتل کا بدلہ قتل وہ بھی کہہ رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک اور بات سامنے آئی اور یہ نادیہ کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ناصر، سجاول اور حسنا گروپ کا رجی دیگر تین سرکردہ افراد کے ساتھ اندر رستم کے پاس آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ کوئی اور سنگین معاملہ لے کر آئے ہیں۔

وہ کچھ دیر تک رستم کے سامنے چپ کھڑے رہے پھر ڈاکٹر ناصر نے ہمت کر کے کہا۔

''رستم بھائی! آپ کو لکھی رام کی موت کا پتا چلا ہوگا۔ پچھلے ہفتے اس کی موت اچانک ہوئی تھی۔ وہ بھی تقریباً اسی حالت میں مرا تھا جس میں آج رات چار بندے مرے ہیں۔ میرا خیال ہے

کہ لکھی رام کو بھی زہر دے کر مارا گیا ہے اور یہ وہی زہر ہے جس نے آج ہمارے سامنے چار لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" رستم نے پوچھا۔

"مجھے اور سجاول اور رجی وغیرہ کو یہ شک ہو رہا ہے کہ.....شاید لکھی رام کو بھی... میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟"

"تم کہنا چاہتے ہو کہ اسے بھی نادیہ نے مارا ہے؟"

ناصر نے کہا۔ "کبھی کبھی واقعات کی کڑیاں اپنے آپ جڑنے لگتی ہیں رستم بھائی۔" پھر وہ ادریس نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "جس رات لکھی رام مرا، اسی شام ادریس نے چھوٹی بھرجائی کو لکھی رام کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ لکھی رام پیتل کی گڑوی میں بکری کا دودھ لے کر آ رہا تھا۔ راستے میں اس نے نادیہ کو دیکھا جو گھاس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ لکھی رام نے بھی اس تلاش میں اس کا ساتھ دیا اور دو چار منٹ چھوٹی بھرجائی سے باتیں کیں۔ قریباً پانچ گھنٹے بعد لکھی رام کی طبیعت بگڑی۔ اسے خون کی الٹیاں ہوئیں اور وہ دو ڈھائی گھنٹے میں سورگ باشی ہو گیا۔"

"لیکن لکھی رام سے نادیہ کو کیا بیر ہو سکتا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"اس کا تو پتا نہیں جی لیکن وہ حرامی عظمت لکھی رام سے بیر رکھتا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے۔ لکھی رام خود بھی جھاڑ پھونک کر لیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے ہمالیہ کی چوٹیوں پر بہت سخت چلے کاٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے طور پر عظمت کو فراڈیا اور نوسرباز قرار دیتا تھا۔ دوسری طرف عظمت بھی یہی کہتا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے قبرستان کی طرف ان دونوں میں باقاعدہ مار کٹائی بھی ہوئی تھی۔ لکھی رام نے عظمت کے منہ پر ٹکر مار کر اس کے کئی دانت ہلا دیئے تھے۔"

رجی نے کہا۔ "رستم صاحب! آپ نے جس طرح پہلی بات کی تصدیق کی ہے، اسی طرح اس دوسری بات کی تصدیق بھی اپنی گھر والی سے کر لیں۔ آپ جو بھی نتیجہ نکالیں گے وہ ہم سب کو منظور ہو گا۔" رستم کی پریشانی دگنی ہو گئی۔

ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد رستم ایک بار پھر نادیہ کے پاس پہنچا۔ وہ غنودگی کی حالت میں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھی اعصاب کو پُرسکون کرنے والی دوا کھاتی تھی۔ آج شاید اس نے یہ دوا زیادہ مقدار میں کھائی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور زبان لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

رستم کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اپنا ہوش رُبا سراپا حسبِ ہدایت ایک موٹی

اوڑھنی میں چھپا لیا۔ اس کی آنکھیں اور پلکیں آنسوؤں کے شدید بہاؤ کے سبب ورم زدہ تھیں۔

وہ قابلِ رحم حالت میں تھی لیکن جب رستم اس کے کرتوتوں کی طرف دیکھتا تھا تو رحم کا جذبہ ذہن کے کسی گوشے میں سمٹ جاتا تھا۔ اس عورت نے صرف جسمانی ملاپ کو ہی محبت کی معراج سمجھا تھا۔ اس نے رستم کو اپنے غیر معمولی جسم کی دلکشی سے تسخیر کرنا چاہا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر انتہا تک جانے کو تیار ہو گئی تھی۔ رستم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "لکھی رام کے ساتھ کیا کیا تُو نے؟"

یہ سوال نادیہ کے سر پر بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا اور ہونٹ مرتعش ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تک رستم کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر آنسوؤں کا ایک نیا ریلا اس کی پلکوں کے نیچے اُمڈ آیا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بولی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا...... کچھ نہیں کیا۔ جو ہوتا رہا اپنے آپ ہوتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ لکھی رام کے ساتھ کیا کیا تُو نے؟"

اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ وہ چہرہ چھپا کر پہلو کے بل گاؤ تکیے پر گر گئی۔ "میں نے تم سے کہا تو ہے کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں دیوانی ہو گئی ہوں۔ تمہاری محبت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ ابھی پتا نہیں کیا کچھ ہونا ہے میرے ہاتھوں سے۔ اس سے پہلے تم مجھے ختم کر دو۔"

رستم کے سینے میں ایک اور چرکا لگا۔ بہ الفاظ دیگر نادیہ اپنے اس دوسرے جرم کا بھی اعتراف کر رہی تھی۔ کبھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پستول نکال کر واقعی اس کو شوٹ کر دے۔ کبھی اس کے لئے ترس کے جذبات ذہن پر غالب آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ رستم کو یہ یقین کرنا بھی بے حد مشکل ہو رہا تھا کہ نادیہ جو لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ بہرحال ایک فنکارہ بھی ہے، کسی جیتے جاگتے انسان کو موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

رستم لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے نادیہ سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر شدید تذبذب کا شکار رہی، پھر اشکوں کے سیلاب میں ڈوبتے ابھرتے اس نے سب کچھ رستم کے گوش گزار کر دیا۔ اس کی باتوں سے رستم کو جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب یہ تھا۔

لکھی رام کی موت کی ذمے دار بھی بالواسطہ طور پر نادیہ ہی تھی۔ عظمت نادیہ کی ہر دکھتی رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ کے اندر رستم سے جسمانی ملاپ کی خواہش اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ وہ اس کے لئے ہر انتہا تک جانے کو تیار ہے۔ وہ ایک شیطان

عامل کی حیثیت سے نادیہ کے جذبات سے کھیلتا رہا۔ اس نے نادیہ کو بتایا کہ اپنے بدن کو اپنے محبوب کے لئے پُرکشش اور ضروری بنانے کے لئے اسے ایک خاص الخاص عمل سے گزرنا ہوگا۔ نادیہ عظمت کی باتوں پر اندھا اعتماد کر رہی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بعض اوقات نادیہ کو اس کی ذات کے بارے میں ایسی باتیں بتا جاتا تھا جو نادیہ کے سوا کسی اور کو معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ درحقیقت اس کی یہی ''خاص صلاحیت'' نادیہ کو عظمت کا بے دام کا غلام بنا چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ عظمت کے ذلیل ہو کر کال کوٹھڑی میں جانے کے بعد بھی نادیہ اس کے پیچھے پڑی رہی تھی......اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہی تھی۔

اپنی مقناطیسی باتوں کے ذریعے عظمت نے نادیہ کو یہ باور کروادیا کہ اگر وہ کسی ہندو مُردے کی چتا کی راکھ سے اپنے جسم پر عمل کرائے تو اس کا محبوب جہاں کہیں بھی ہے، کھچ کر اس کی جانب آئے گا اور دیوانوں کی طرح اس سے وصل کی خواہش کرے گا۔

نادیہ پچھلے چند ماہ میں بتدریج ایسی سٹیج پر آچکی تھی کہ رستم سے جسمانی ملاپ کی خواہش اس کے لئے ہر شے سے مقدم ہو چکی تھی۔ یہ خواہش اس کے دل و دماغ میں جنون کا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ ہاں، یہ وہی اسٹیج تھی جہاں اچھے بھلے سمجھ دار تعلیم یافتہ لوگ بھی فارغ العقل ہوجاتے ہیں۔ جہاں آنکھوں کے سامنے ایک پردہ سا تن جاتا ہے اور وہی نظر آتا ہے جو دیوانہ دل دکھاتا ہے۔ اس ساری صورت حال کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ عظمت نے نادیہ کو لکھی رام کے لئے زہر دیا۔ پچھلے ہفتہ نادیہ پروگرام کے مطابق اس راستے میں کھڑی ہوگئی جہاں سے شام کے وقت لکھی رام کو دودھ لے کر نکلنا تھا۔ لکھی رام نے نادیہ کے گھونگھٹ کے باوجود پہچان لیا کہ یہ چھوٹی بھرجائی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''بھرجائی جی! یہاں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟''

نادیہ نے کہا۔ ''ابھی میرے کان سے چھوٹا جھمکا نکل کر یہاں گر گیا ہے۔''

لکھی رام جھمکا ڈھونڈنے میں نادیہ کی مدد کرنے لگا۔ اس نے دودھ والی گڑوی پاس ہی رکھ دی تھی۔ نادیہ نے موقع دیکھا اور اپنی اوڑھنی میں سے زہر کی پڑیا نکال کر گڑوی میں الٹ دی۔ اس کے بعد سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے عظمت اور نادیہ چاہتے تھے۔ اگلے روز سہ پہر کو لکھی رام کی چتا جل گئی۔ رات کے اندھیرے میں نادیہ نے چتا میں سے چند مٹھیاں راکھ اکٹھی کی۔ اسے بھیڑ کے دودھ میں ملایا۔ اس میں کچھ دیگر اناپ شناپ ڈالا اور عین آدھی رات کے وقت کمرہ بند کر کے اسے اپنے جسم پر ملا۔

یہ ساری باتیں نادیہ سے معلوم کرنے کے بعد رستم ایک طویل دکھ بھری، طیش آمیز سانس لے کر کمرے سے نکل آیا۔ ''میری بات سنو رستم......میری بات سنو'' نادیہ کہتی رہ

گئی۔

رستم نے کچھ نہیں سنا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب کہنے سننے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ شام کے فوراً بعد پولیس کی پوزیشنوں سے زوردار فائرنگ شروع ہوگئی۔ وڈے ڈیرے پر موجود افراد اپنی پوزیشنوں سے اس فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ ویرانہ گونج اٹھا اور ہر طرف شعلے سے لپکتے دکھائی دیئے۔ بہرحال اس فائرنگ سے صاف ظاہر تھا کہ یہ غصے کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ پولیس کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس فائرنگ کی آڑ میں وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دوسری طرف ڈیرے والے بھی علم رکھتے تھے کہ ان کی یہ فائرنگ پولیس اور اجرالیوں کے حصار کو توڑ نہیں سکتی۔

پندرہ بیس منٹ جاری رہنے کے بعد فائرنگ ختم ہوگئی۔ اس فائرنگ میں وڈے ڈیرے کے مکینوں میں سے کوئی شخص زخمی یا ہلاک نہیں ہوا۔ فائرنگ ختم ہونے کے بعد رستم سرنگ نمبر دو میں پہنچا، لالہ فرید، حسنا گجراتی وغیرہ کی عیادت کی۔ ان دونوں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ حسنا ڈاکٹر ناصر کے دیئے ہوئے ٹرنکولائزر کے باعث نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا اور گاہے بگاہے بڑبڑانے لگتا تھا۔ تاہم دیگر افراد میں سے ایک دو کی حالت اب بھی خطرے کے نشان سے قریب تھی۔

رستم واپس احاطے میں پہنچا تو مشعلوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں بہت سے لوگ درختوں تلے جمع تھے۔ ان میں مراد گروپ کے لوگ زیادہ پُرجوش نظر آرہے تھے۔ ان سب کی تیز چبھتی نظریں رستم کے چہرے پر لگی تھیں۔ یہ سوالیہ نظریں جلد از جلد رستم کا فیصلہ سننا چاہ رہی تھیں۔ بظاہر یہ لوگ پُرسکون تھے لیکن رستم جانتا تھا کہ ان کے سکون کے پیچھے ایک خوفناک طوفان موجود ہے۔ رستم کی زبان سے نکلا ہوا ایک غلط لفظ اس طوفان کو راہ دے سکتا تھا۔ اس کے بعد یہاں ایسا خون خرابا شروع ہوسکتا تھا جس کا انجام مکمل اور فوری تباہی تھا۔ اس نازک ترین موقع پر وڈے ڈیرے کے مکین آپس کا نفاق برداشت کرنے کے متحمل ہرگز نہیں تھے۔

ایک قائم مقام سردار کی حیثیت سے رستم کے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری آن پڑی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے یہ ذمے داری کس طرح نبھانی ہے۔

مراد گروپ کے ایک شخص نے مجمع میں سے باہر نکل کر کہا۔ ''رستم بھائی! ہم سب سمجھتے ہیں کہ اس عورت کے لیے اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ بات بھی اب کھل گئی ہے کہ ہمارے ساتھی لکھی رام کی جان بھی اسی نے لی تھی۔ اس عورت کے لئے کم ازکم سزانیان ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ سزا آج رات ہی اسے دی جائے۔''

"ہاں آج رات ہی دی جائے۔" کئی لوگوں نے بیک زبان کہا۔

"لاؤ اس حرام زادی کو باہر اور کپڑے اُتار کر الٹا لٹکاؤ اس بیری کے ساتھ۔ یہ عورت نہیں اپنے ہی لوگوں کا خون پینے والی ڈائن ہے۔ کوئی بدروح گھسی ہے اس کے اندر۔"

"ہاں ہاں لاؤ اس کو باہر۔" مجمع میں سے کئی آوازیں آئیں۔

لوگوں کا غم وغصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رستم نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "اس بات میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ وڈے ڈیرے کے اصول سب کے لئے ایک جیسے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے، میں نے اس کے بارے میں چھان بین کی ہے...... مجرم کو سزا ضرور ملنی چاہیے اور ملے گی۔"

مراد آگے بڑھا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "رستم بھائی! تم کھل کر بات کرو۔ فلم ایکٹرس نادیہ مجرم ثابت ہو چکی ہے۔ وہ اپنی زبان سے بھی اقرار کر چکی ہے۔ اسے ابھی یہاں لایا جائے اور نیان کی سزا دی جائے۔"

اس موقع پر فرید کا قریبی ساتھی مشتاق آگے آیا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کو لالہ فرید کا پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ لالہ نے کہا ہے کہ تینوں گروپوں میں سے تین تین بندے لے کر بند کمرے میں مشورہ کیا جائے۔ یہ بندے جو بھی فیصلہ کریں گے اس کے مطابق مجرمہ کو سزا دی جائے۔ ایک بار جو بھی فیصلہ ہو جائے اس پر بعد میں کوئی اعتراض نہ کرے۔"

مجمع میں سے کئی دبی دبی آوازیں ابھریں۔ مراد گروپ کے چند افراد نے احتجاجی انداز میں اپنے ہتھیار ہوا میں لہرائے۔ بہر حال دیگر افراد اس احتجاج میں شامل نہیں ہوئے۔ دو چار منٹ کی بحث وتمحیص کے بعد نو افراد کی ایک کمیٹی بن گئی اور بند کمرے میں چلی گئی۔

مرنے والوں میں سے دو افراد کی لاشیں ابھی تک دفنائے جانے کے لئے چار پائیوں پر رکھی تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں ہجوم نے ان کی آخری رسوم ادا کی تھیں تاہم ابھی تک انہیں سپرد خاک نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ ان کی قاتلہ کی سزا کا فیصلہ ہونے تک انہیں دفنایا نہیں جائے گا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد بند کمرے کا دروازہ کھلا اور مشورہ کرنے والے افراد باہر آئے۔ ان میں سب سے معمر شخص مشتاق آہوجہ تھا۔ مشتاق نے درجنوں ہتھیار بند لوگوں کے درمیان کھڑا ہو کر فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ مجرمہ کو سزائے موت دینے کا فیصلہ حتمی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی آج رات ہی کر دیا جائے گا لیکن دیگر باتوں اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجرمہ کو

نیان کی سزا نہیں دی جائے گی۔

مراد گروپ کا ایک شخص بھڑک کر بولا۔ "اس عورت نے بار بار منع کرنے کے باوجود ایک غدار سے رابطے رکھے، بار بار اس سے ملتی رہی۔ اس نے وڈے ڈیرے کو ملیا میٹ کرانے کی سازش میں حصہ لیا۔ اگر نیان کی سزا اس کو نہیں دی جاسکتی تو پھر یہ کن لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔"

مشتاق آہوجہ نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس شخص کے منہ پر مارا اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔

ایک لمحے کے لئے لگا کہ چنگاری بھڑک اٹھے گی لیکن پھر طوفان ٹل گیا۔ مشتاق آہوجہ کی عمر اس شخص سے دوگنا تھی جسے تھپڑ مارا گیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ دیگر لوگ بھی خاموش رہے۔ پورے مجمع کو ایک گھمبیر اور کسی حد تک سوگوار خاموشی نے ڈھانپ لیا۔ مشتاق آہوجہ نے رستم کا کندھا دبایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر قریبی کمرے میں آ گیا۔ سجاول، کاٹھیا اور شاہ وغیرہ بھی ساتھ تھے۔

مشتاق عمر میں کافی بڑا ہونے کے باوجود رستم کو رستم بھائی ہی کہتا تھا۔ اس نے کہا۔

"رستم بھائی! میں جانتا ہوں اس سزا کے فیصلے تک پہنچنے کے لئے تمہیں دل پر بہت بھاری پتھر رکھنا پڑا ہے لیکن اس نازک موقع پر یہ فیصلہ جتنا ضروری تھا، وہ بھی تم ہم سب سے زیادہ جانتے ہو۔ ہم سب دل کی گہرائی سے تمہارے احسان مند ہیں کہ تم نے وڈے ڈیرے کے لوگوں کو آپس میں مارا ماری سے بچا لیا ہے۔ اب میری تم سے منت ہے کہ اس کام کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔" رستم کی آواز گھمبیر تھی۔

"یہ کس طرح کرنا ہوگا؟" مشتاق آہوجہ نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"میں خود کروں گا۔" رستم نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "ان دونوں میتوں کو دفنانے کے بعد۔"

☆======☆======☆

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا لیکن اس میں خزاں کی گھٹن اور مایوسی شامل ہوگئی تھی۔ مرنے والے آخری دو افراد کو بھی ڈیرے کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جاچکا تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ ڈیرے کے جو افراد حفاظتی ڈیوٹی پر تھے، وہ اپنی اپنی پوزیشنوں پر جاچکے تھے، باقی آرام کرنے کے لئے سرنگوں میں چلے گئے تھے۔

دور پہاڑیوں پر دو طویل روشن لکیریں بار بار حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ پولیس والوں کی سرچ لائٹس تھیں۔ کل رات والے واقعے کے بعد یہ سرچ لائٹس زیادہ ''چوکس'' ہوگئی تھیں۔ اب وقفے وقفے سے روشن ہونے کی بجائے یہ مسلسل روشن تھیں۔ آج سہ پہر کے وقت دو تین بار ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ دوسری طرف ڈیرے کے مکین بھی اپنی پوزیشنوں پر بالکل ہوشیار تھے۔ ان کے پاس دوربین اور بڑے سائز کی ٹارچیں تھیں۔ ان ٹارچوں کی مدد سے وہ گاہے بگاہے اپنے اطراف کا جائزہ لے لیتے تھے۔ تاہم ڈیرے کا سب سے بڑا دفاع دو ہزار بارودی سرنگیں تھیں۔ ایک طرح سے یہ دو ہزار پہرے دار تھے جو رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی سے اپنی اپنی جگہوں پر دبکے ہوئے تھے اور ایک طویل عرصے سے اپنا ''فرض'' ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔

رستم بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ نادیہ اعصاب کو پُرسکون کرنے والی دوا کی بھاری ڈوز کے زیر اثر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ غنودگی میں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس کے چہرے کی ایک سائیڈ کو روشن کررہی تھی۔ اس ویرانے کے کٹھن حالات میں رہنے کے باوجود یہ چہرہ جاذب نظر تھا۔

نیم تاریکی میں رستم کا پاؤں سٹیل کے جگ سے ٹکرایا۔ آواز سن کر نادیہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے پچھلا ڈیڑھ گھنٹہ تقریباً سو

کر گزارہ ہے۔

رستم کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھی اور حسبِ معمول اپنی موٹی اوڑھنی سے جسم کو ڈھانپ لیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم؟'' میں آوازیں دیتی رہ گئی۔''

رستم اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس کی موت کے فیصلے پر مہر لگانے گیا تھا۔

رستم اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک عجیب کیفیت کے تحت نادیہ نے رستم کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''مجھے معاف کردو رستم! میں نے جو کچھ کیا... تمہاری محبت میں لاچار ہوکر کیا...... کچھ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔''

''میرے معاف کرنے سے کیا ہوگا؟''

''بس، تم معاف کردو۔ دوسرے سزا دینا چاہیں تو دے لیں...... لیکن تم معاف کردو گے تو وہ بھی کردیں گے۔ مم..... میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ کیا عظمت کی باتوں میں آکر کیا۔ پتانہیں اس نے کیا جادو کردیا تھا مجھ پر۔''

''اس کی جادوگری اسے لے ڈوبی ہے اور تمہیں بھی......'' آخری الفاظ رستم نے بہت دھیمے لہجے میں کہے تھے۔ نادیہ شاید سن نہیں سکی۔

''ہاں۔ مجھے پتہ چلا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے یا کسی نے مارا ہے اسے؟''

''نہیں، اس نے خودکشی کی ہے۔'' رستم کا لہجہ بے جان تھا۔

''رستم! مجھے پتانہیں کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے...... پر اگر تم میرے ساتھ ہو تو مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں ہر دکھ سہہ سکتی ہوں۔ ابھی جب میں اونگھ رہی تھی پتا ہے میرے دل میں کیا خیال آرہا تھا؟ میرے دل میں خیال آرہا تھا کہ تم مجھے یہاں سے نکال کرلے گئے ہو۔ تم نے مجھے اپنے سامنے گھوڑے پر بٹھایا ہے اور اپنی بندوق لہرا کر سب کو خاموش رہنے پر مجبور کردیا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ تم کو روک سکے یا تم سے کچھ پوچھ سکے۔ پھر ہم دونوں وزیرآباد جاپہنچے ہیں اور وہاں سے لاہور ...... لاہور میں شانی جی بھی موجود ہیں۔ وہ ایک بہن کی طرح مجھے گلے سے لگاتی ہیں، میرا منہ سر چومتی ہیں۔ ہم تینوں اکٹھے لاہور میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے کبھی ایسا ہوا، کسی نے دیکھا نہ سنا۔ میں اور شانی جی تمہارا پیار برابر بانٹ رہی ہیں اور کوئی جلاپا نہیں ہے، کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے۔ بلکہ شانی جی کی خواہش ہے کہ مجھے تمہارا پیار میرے حصے سے زیادہ ملے۔ اسی طرح میری تمنا ہے کہ شانی جی کو زیادہ پیار ملے۔ ایک ہی چار دیواری

میں ایک ہی چھت تلے ہم دونوں تمہارے ساتھ بہت خوش ہیں......"

وہ چند ساعت کے لئے رکی اور اپنی سرخی مائل آنکھوں سے رستم کو دیکھ کر بولی۔ "رستم ناراض نہ ہونا۔ یہ تو بس جاگتی آنکھوں کا خواب تھا......ورنہ......میں تو شانی جی کے ساتھ کوئی برابر کی تقسیم نہیں چاہتی۔ مجھے تو تم دونوں کی جوتیوں میں بیٹھنا بھی گوارا ہے۔ ایک پتھر کی طرح تم دونوں کے در پر پڑی رہوں گی اگر کبھی دل چاہے تو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لینا۔ ورنہ کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔"

"تم فلم کی عورت ہو نادیہ اور فلمی باتیں کر رہی ہو۔ درحقیقت تمہاری سوچ میں نقص ہے اور اسی نقص نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔ تمہارے نزدیک تمہارا جسم ہی تمہاری کُل کائنات تھا۔ تمہارا خیال تھا کہ اس ہوش ربا جسم کی ایک جنبش سے تم سنگ دل سے سنگ دل مرد کو موم کر سکتی ہو۔ جب میری طرف سے تمہارے اس جسم کو نظر انداز کیا گیا تو تم نے اسے اپنی ضد بنا لیا۔ تم نے مجھے اپنے جسم سے ہروانے کی ہر کوشش کی اور ہر کوشش کی ناکامی کے بعد تمہاری ضد اور پکی ہوتی گئی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو رستم۔ تمہاری یہی باتیں میرا دل خون کر دیتی ہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ جب تم نے دیکھا کہ میں تمہیں بی بی جی کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتا تو تم نے پینترا بدل لیا۔ تم نے بادشاہ ملکہ اور کنیز والی بات شروع کر دی۔ تم نے بی بی کو تسلیم تو کر لیا لیکن خود پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ تمہارے دل کے کسی چور خانے میں یہ امید موجود تھی کہ تم کسی دن اپنے جسم کی چکاچوند سے مجھے اندھا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی، پھر ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ملکہ اور کنیز والی کہانی میں سے ملکہ ویسے ہی نکل جائے......"

ایک دم نادیہ کی آنکھوں سے تازہ آنسو اُمڈ آئے۔ "ایسی باتیں نہ کرو رستم! تم تو میرے اپنے ہو۔ تم تو میرے دل کی حالت کو سمجھو۔ ایسی باتیں کر کے تم میرے دل سے ہر امید کھرچ دو گے۔ سارے سپنے چکنا چُور کر دو گے۔"

رستم نے دل میں سوچا، تم سپنوں کی بات کر رہی ہو، تمہاری تو زندگی ہی چکنا چُور ہو چکی ہے۔ ایک دم رستم کی سوچ کا دھارا بدل گیا۔ اسے روتی سسکتی، نادیہ پر ترس آیا اور پہلی بار اتنی شدت سے آیا کہ وہ اندر تک سنسنا اٹھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ نادیہ سے نہیں، سزائے موت کے ایک قیدی سے بات کر رہا ہے۔ ایسا قیدی جس کی اپیل اعلیٰ عدالت سے خارج ہو چکی ہو۔ نظرِ ثانی اور رحم کی اپیلیں بھی مسترد ہو چکی ہیں۔ اب بلیک وارنٹ اس کے ہاتھ میں ہے

اور وہ جلاد کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا ہے۔

صبح دم پھانسی پانے والا شخص چاہے کتنا بھی بُرا ہو، آخری رات میں اس سے درگزر اور ہمدردی کا سلوک ہی کیا جاتا ہے۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو رستم؟"

"نہیں کچھ نہیں۔" رستم نے نفی میں سر ہلایا اور بے دم سا گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔

وہ عجیب جذباتی انداز میں رستم کے جوتے اُتارنے لگی۔ اس سے پہلے اس کی ایسی حرکت پر رستم کو غصہ آجاتا تھا لیکن آج اس نے کچھ نہیں کہا۔

زندگی اور موت کے بارے میں رستم کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موت سے پہلے خود پر موت کو سوار کر لینا بے وقوفی ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے اسے زندہ ہی نظر آنا چاہیے۔ جب موت زندگی کو مہلت نہیں دیتی تو زندگی اپنے وقت میں سے موت کو کچھ حصہ کیوں دے۔ دوسری جو بات رستم کو دکھ دیتی تھی، وہ تکلیف سہہ کر مرنا تھا۔ رستم کو اچھی طرح یاد تھا، کسی کو تکلیف دہ موت سے بچانے کے لئے اس نے جو پہلا "خون" کیا تھا وہ ایک چیونٹے کا تھا۔ رستم اس وقت بہ مشکل پندرہ برس کا تھا۔ اس کی بہن آپو زاہدہ نے رسوئی سے کیڑے مکوڑے بھگانے کے لئے کیڑے مار دوا ڈالی تھی۔ رات سونے سے پہلے رستم نے رسوئی میں نگاہ دوڑائی۔ لالٹین کی روشنی میں اسے ایک چیونٹا (مکوڑا) نظر آیا۔ زہر اس کے اندر اُتر چکا تھا۔ وہ زمین پر الٹا پڑا تڑپ رہا تھا۔ رستم نے سوچا وہ تو جا کر سو جائے گا لیکن یہ چیونٹا مرنے سے پہلے کئی گھنٹے تڑپتا رہے گا۔ اسے چیونٹے کو مار دینا ایک بہت بڑی نیکی محسوس ہوا۔ اس نے چیونٹے پر پاؤں رکھا۔ کرچ کی مہین آواز آئی اور اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ اس کے بعد کے کئی واقعات میں بھی رستم نے چیونٹے کی موت کو مثال بنایا۔ اس نے درجنوں قتل کئے لیکن ہمیشہ Clean Killing کی۔ اپنے جس شکار کو مارنے کا فیصلہ کیا، اسے پھر تڑپایا نہیں۔

آج بھی اسے ایک قتل کرنا تھا اور آج کے قتل میں تو اس کی حساسیت اور بھی عروج پر تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کو مارنے کی ذمے داری اپنے سر لے چکا تھا جو اس کی دیوانی تھی اور اسی دیوانے پن میں کچھ ناقابلِ معافی غلطیاں کر چکی تھی۔ اس کا دل تاسف سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کاش نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

"کیا سوچ رہے ہو رستم؟" وہ پھر ہولے سے بولی۔

"سوچ رہا ہوں......جب میں شام کو یہاں آیا تھا تو کمرہ خالی تھا۔ تم یہاں نہیں تھیں۔

میں تمہیں ڈھونڈنے کے لئے پچھواڑے میں گیا تھا لیکن ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ شاید تم کہیں بھاگ گئی ہو اور اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو اچھا ہی ہوتا۔"

رستم کے لہجے میں اپنے لئے لچک پا کر نادیہ کی آنکھوں میں آنسو مسکرا اٹھے۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ بولی۔ "اگر تم چاہو تو میں اب بھاگ جاتی ہوں بلکہ ہم دونوں بھاگ جاتے ہیں۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے وہ بولی۔ "تمہیں یاد ہے جس شوٹنگ میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی، اس میں کچھ اسی قسم کے سین چل رہے تھے۔ میں اور میرا ہیرو باز سانسیوں کی بستی سے نکل کر بھاگ رہے تھے اور انہوں نے ہمارے پیچھے اپنے بوہلی کُتے لگا دیئے تھے...... یاد ہے ناں تمہیں؟"

وہ بولی۔ "تم بھول گئے ہو گے لیکن مجھے تو...... یاد ہے۔ ایک ایک بات ایک ایک لمحہ۔ شوٹنگ کے دوران میں اصلی غنڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ انہوں نے کتا مار شراب پی رکھی تھی اور بالکل اندھے ہو رہے تھے۔ میرا فلمی ہیرو، ہدایت کار اور دوسرے لوگ اصلی غنڈوں کو اور ان کے اصلی ہتھیاروں کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ میں ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک ٹیوب ویل کے کوٹھے میں لے جا کر میرے کپڑے اُتارنا چاہ رہے تھے۔ میں ان کی منتیں کر رہی تھی۔ یہ اصلی کہانی کا "فلمی سین" تھا اور پھر تم اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ تم شاید ابھی ابھی نہا کر آئے تھے۔ تمہارے جسم پر صرف ایک تہہ بند تھا۔ تمہارے لمبے بالوں اور داڑھی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ تم نے اور تمہارے ساتھی نے غنڈوں کو للکارا اور وہاں میں نے زندگی میں پہلی بار ایک زبردست اصلی لڑائی دیکھی۔ تم نے ان لوگوں کو مار بھگایا تھا اور تمہیں پتا ہے اس واقعے کے دو تین گھنٹے بعد ہی مجھے لگا تھا کہ مجھے میرا اصلی ہیرو مل گیا ہے اور میں تمہیں مدت سے جانتی ہوں۔"

"اچھا ہی ہوتا کہ میں اس وقت تمہیں نہ بچاتا۔ کم از کم تمہاری زندگی تو بچ جاتی۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا اور اگر سمجھانا چاہوں تو بھی تم سمجھو گی نہیں۔ شاید سمجھنا تمہاری عادت ہی نہیں ہے۔"

"خود سے دور رہنے کے سوا تم جو بھی سمجھاؤ گے سمجھ جاؤں گی۔" وہ رستم کے لہجے سے حوصلہ پا کر بولی۔

ایک بار رستم کے جی میں آئی کہ اسے بتا دے کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ پَو پھٹنے سے پہلے پہلے اسے موت کے انجانے سفر پر روانہ ہو جانا ہے لیکن پھر اس نے اپنے

اس خیال کو خود ہی رد کر دیا۔ وہی چیونٹے کی ترس ناک موت والی بات۔ مرنے والے کا اچانک آسان موت مر جانا رستم کو ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔

"لوگ میرے بارے میں کیا باتیں کر رہے ہیں رستم، مجھے سچ سچ بتاؤ؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں، صبح پتا چلے گا۔" رستم کا جواب گول مول تھا۔

"رستم! میں ابھی مرنا نہیں چاہتی، مجھے مرنے سے بچا لینا لیکن میرا وعدہ ہے میری زندگی تمہاری ہی امانت رہے گی۔ جب کہو گے تمہارے قدموں میں نچھاور کر دوں گی۔" نادیہ نے کہا۔

رستم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "اچھا، اس کے بارے میں سوچیں گے، اب سو جاؤ۔"

"میرے لئے فوری طور پر تو کوئی خطرہ نہیں ہے ناں؟" نادیہ نے رستم کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" رستم نے کہا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر اس پر کوئی الزام لگا بھی تو اس کا فیصلہ ہونے میں شہری عدالتوں کی طرح نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے اور یہ ڈیرہ اس سے بہت پہلے ہی ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

وہ اصل صورت حال سے آگاہ نہیں تھی۔ موت کسی شکاری جانور کی طرح اس شب کی تاریکی میں دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

رستم لیٹ گیا۔ وہ رستم کے موڈ سے شہ پا کر اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں لیٹی۔ اس کا ایک ہاتھ تاریکی میں سرک کر رستم کے بازو پر آ گیا۔ "تمہیں گرمی نہیں لگتی، موسم کافی بدل گیا ہے۔" وہ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔

رستم خاموش رہا۔ اس کا نازک ہاتھ رستم کے سینے کے بالوں پر پھسلنے لگا۔ وہ اس کے قریب کھسک آئی اور اس کے بازو سے لگ کر لیٹ گئی۔ اس کی گرم سانسیں رستم کی گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔ رستم، بی بی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خیالوں میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "بی بی! یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے اس کی حفاظت کی۔ اسے سنبھال کر رکھا۔ ایک حد کے اندر رہتے ہوئے یہ کوشش بھی کی کہ یہ ناخوش نہ ہو لیکن جو یہ چاہتی تھی بی بی، وہ میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ وہ میرے لئے ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بی بی! اب میں کیا کروں؟ یہ اپنی حرکتوں کے سبب اپنی بے وقت موت کو اپنے اوپر لازم کر چکی ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے لیکن یہاں کچھ بھی

میرے بس میں نہیں رہا۔ میں جو زیادہ سے زیادہ کرسکا ہوں، وہ یہی ہے کہ اسے ایک نہایت تکلیف دہ موت سے بچا کر آسان موت کی طرف لے آؤں۔ یہاں کے قانون کے مطابق اسے زندہ حالت میں کتوں کی خوراک بنایا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں جو کچھ کرنے جارہا ہوں اس کے لئے میں مجبور ہوں بی بی۔ مجھے معاف کردینا۔"

دور کہیں ایک ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑاتا ہوا ٹیلوں پر سے گزر گیا۔ پہرے دار کی تین چار تیز سیٹیاں سنائی دیں، پھر خاموشی چھا گئی۔

نادیہ کا ہاتھ رستم کے سینے پر تھا۔ وہ اس کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ قمیص کے اوپر سے ہی اس نے رستم کا کندھا چوما۔ پھر رخسار۔ پھر گردن...... رستم کی خاموشی سے حوصلہ پا کر اس کا سارا بدن جلنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد کے سارے حالات اور ماحول کو بھول کر رستم سے چمٹ گئی۔ وہ اسے چومنے لگی۔ سینے سے، ٹھوڑی سے، ہونٹوں سے...... وہ ساکت اور بے حس لیٹا رہا۔

شاید نادیہ کو توقع نہیں تھی کہ ایک سنگلاخ پتھر میں اس طرح کا گداز نمودار ہوگا۔ وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو رستم کے چہرے کو نمکین پانی سے تر کرنے لگے اور اس کے ہونٹ اس نم پانی پر پھسلنے لگے۔ اس کی گھنی زلفوں نے رستم کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح گزری۔ تب وہ نہایت جذباتی انداز میں سسکی۔ "رستم! میں تمہاری ادنیٰ کنیز ہوں۔ اگر مجھے کوئی حکم دینا چاہتے ہو تو دو۔"

"نہیں۔" رستم نے نرمی سے کہا۔

وہ اس سے لپٹی رہی، اس کے چہرے پر والہانہ انداز میں جھکی رہی۔ رستم بے حرکت لیٹا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا ہاتھ بہت دھیرے سے تکیے کی طرف بڑھا۔ تکیے کے نیچے بھرا ہوا کولٹ پسٹل موجود تھا۔ اس نے پسٹل نکالا اور اسے بڑی آہستگی کے ساتھ تاریکی میں حرکت دیتا ہوا نادیہ کی پشت کی طرف لے گیا...... پھر پسٹل آہستہ آہستہ نادیہ کے سر کی طرف بڑھنے لگا۔ قدرت اللہ کی پھیلائی ہوئی جاہلیت اور توہم پرستی کے نتیجے میں ایک اور جان جانے والی تھی۔

پسٹل بڑی آہستگی سے سرکتا ہوا نادیہ کی نرم ریشمی زلفوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی طرف بڑھنے والی موت سے بے خبر رستم میں مصروف تھی۔ اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ رستم کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سانسوں کی آمدورفت بے حد تیز تھی۔ رستم کی انگلی لبلبی پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں کمرے میں بچھی دری پر لیٹے تھے۔ لالٹین کی لو نہ ہونے کے برابر

تھی۔ کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا لہٰذا کھڑکی سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بدلیوں سے نمودار ہونے والی مدھم چاندنی گاہے بگاہے قرب وجوار کو نمایاں کردیتی تھی۔ بہار کی اس رات میں جنگلی پھولوں کی مدھم سی مہک بھی شامل تھی۔ ہاں یہ بہار تھی لیکن اس میں خزاں کی تمام تر اداسی اور سوگواری شامل ہوگئی تھی۔

لبلبی پر رستم کی انگلی ساکت ہوگئی...... چند لمحوں کے لئے وہ ٹھرا سا گیا۔ یہ نادیہ کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ وہ زندگی اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تھی...... اگر وہ کسی طرح بچ سکتی تو اس ویرانے سے دور لاہور کی جگمگاتی فلمی دنیا میں ایک شاندار مستقبل اس کا نصیب بن سکتا تھا...... لیکن وہ بچتی کیسے؟ اس نے اپنے لئے کوئی راستہ ہی باقی نہیں چھوڑا تھا۔ راستہ تو شاید کسی کے لئے بھی باقی نہیں تھا۔ وڈے ڈیرے کے سارے مکین موت کے ناقابلِ شکست گھیرے میں تھے لیکن یہ لڑکی تو فوری طور پر موت سے گلے مل رہی تھی۔ رستم کو اس کے دشمن بے رحم قاتل گردانتے تھے لیکن آج وہ سرے سے قاتل ہی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے بے قراری سے کھڑکی کی طرف دیکھا جیسے اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے کوئی راہ ڈھونڈنا چاہتا ہو۔

اسے مراد نظر آیا۔ کمرے سے قریباً سو فٹ کے فاصلے پر وہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ مدھم چاندنی میں بھی اس کا ہیولا بے حد مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی شاندار AK58 رائفل دور ہی سے دیکھی جاسکتی تھی۔ ٹہلتے ہوئے مراد کی نظریں گاہے بگاہے رستم کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جیسے وہ جلد از جلد فائر کی آواز سننا چاہتا ہو...... وہ فائر جس نے نادیہ کی سزا پر عمل درآمد کا اعلان کرنا تھا۔

پھر رستم کی نگاہ مراد کے عقب میں گئی۔ مراد سے بیس تیس قدم پیچھے اس کے درجنوں ساتھی بھی موجود تھے۔ وہ ایک الاؤ کے قریب بیٹھے تھے۔ وہ سب بھی مراد کی طرح بے قرار تھے۔ گاہے بگاہے ان میں سے کوئی شخص بلند آواز میں بولتا اور اس کی آواز کا غصیلا پن ہوا میں سرایت کرتا محسوس ہوتا تھا۔

رستم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ وڈے ڈیرے میں مراد گروپ کی طاقت اور ان کے اثر ورسوخ سے بخوبی آگاہ تھا۔ درحقیقت ڈیرے کے مکینوں میں سے بہترین ہتھیار اور ساز وسامان مراد گروپ کے لوگوں کے پاس تھا۔ مراد گروپ میں مراد کے علاوہ کم از کم آٹھ دس بندے ایسے تھے جو اپنے اپنے علاقے کے مانے ہوئے دادا اور گینگسٹر تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو سر دھڑ کی بازی لگا کر مشکل سے مشکل صورتِ حال کو اپنے بس میں کر سکتے تھے۔

اس موقع پر ان لوگوں کی مخالفت مول لینا اور اپنے ساتھیوں کو بدترین انتشار میں مبتلا کرنا رستم کے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا اور پھر یہ امر بھی ایک ٹھوس حقیقت رکھتا تھا کہ نادیہ سے سنگین ترین جرائم سرزد ہوئے تھے۔ نادیہ کو سزا سے بچانے کی کوشش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نادر کاکا کے بنائے ہوئے اصول کے پرخچے اپنے ہاتھوں سے اُڑا دیئے جاتے۔ آج تک یہ ڈیرہ ان ہی اصولوں کے مطابق چلتا تھا اور یہی اصول تھے جس نے تین چار مختلف گروہوں کو اکائی کی شکل دے رکھی تھی۔

ٹیبوں کے درمیان بے قراری سے ٹہلتا ہوا مراد اس وقت رستم کو بہت بُرا لگا لیکن اس کے ساتھ ہی رستم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یہ امتحان کا وقت ہے اور رستم کو بہ ہرصورت اس امتحان سے گزرنا تھا۔

ایک عجیب جذبے کے تحت رستم نے نیچے لیٹے لیٹے نادیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ جیسے بچے کو انجکشن لگتے وقت گود میں بھینچ لیا جاتا ہے۔ نادیہ کے ہونٹ بے قراری سے رستم کے ہونٹوں سے پیوست ہوئے۔ یہی وقت تھا جب رستم نے لبلبی دبادی۔ گولی دھماکے سے نکلی اور نادیہ کی کنپٹی میں اُتر گئی۔

☆======☆======☆

وہ صبح ... عجیب اداسی اور سوگواری کے ساتھ طلوع ہوئی۔ دھوپ دھیرے دھیرے پوٹھوہار کے مخروطی ٹیلوں کو روشن کرنے لگی۔ نادیہ کی لاش پچھلے چھ گھنٹے سے کمرے میں ہی پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی سے بہنے والا خون دری کے ایک بڑے حصے کو رنگین کر چکا تھا۔ یہ خون اب صاف کردیا گیا تھا لیکن نشان تو باقی تھا۔ کمرے کے اندر صرف شاہدہ اور حنیفاں موجود تھیں۔ حنیفاں تو تشدد والے واقعے کے بعد بالکل گم صم بلکہ پتھرائی ہوئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرتی تھی نہ کسی کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ اب بھی وہ سکتہ زدہ سی نادیہ کی میت کے سرہانے بیٹھی تھی۔ نادیہ کا جسم اسی موٹی اوڑھنی سے ڈھکا ہوا تھا جو وہ رستم کی ہدایت پر ہر وقت اپنے سیماب بدن پر اوڑھے رکھتی تھی۔ نادیہ کے پاؤں کی طرف شاہدہ بیٹھی تھی اور مسلسل سسک رہی تھی۔

رستم دور ایک ٹیبے پر خاموش بیٹھا تھا۔ جس پسٹل سے اس نے نادیہ کو ہلاک کیا تھا وہ اب رستم کے ہولسٹر میں تھا اور اسے اپنے پہلو میں کسی انگارے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ چھجے کے سامنے نادیہ کی تجہیز و تکفین کی بات ہو رہی تھی۔ حسنا گروپ کا ایک شخص بولا۔ ''مراد کا ساتھی ڈار کہہ رہا تھا، ہم جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ یہ عورت کا نہیں بدروح کا جنازہ ہے..

اس نے ہمارے پانچ ساتھیوں کا خون پیا ہے۔''

مشتاق آہوجہ گرجا۔ ''کہاں ہے وہ کتا! میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔''

ایک باریش بلوچی آگے بڑھ کر بولا۔ ''سائیں! اس نے جرم کیا تھا۔ مگر اب اس نے اپنے جرم کی سزا پالی ہے۔ ہمارے پیرومرشد کہا کرتے تھے کہ جو شخص چاہے مرد ہو یا عورت جب اپنے جرم کے بدلے میں سب سے بڑی سزا پاتا ہے یعنی اپنی زندگی دے دیتا ہے تو پھر وہ پاک ہوجاتا ہے۔ اس کی مٹی پر کوئی بوجھ، کوئی داغ دھبہ باقی نہیں رہتا۔ اس کی مٹی کو پوری عزت کے ساتھ مٹی کے سپرد کرنا چاہیے۔''

''ہاں..... ہم رستم بھائی کی گھر والی کو پوری عزت کے ساتھ دفن کریں گے۔'' مشتاق آہوجہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ''مراد کے اس بندے کو شرم آنی چاہیے جس نے ایسی گھٹیا بات کی۔''

''اس کے سر پر جوتے مارنے چاہییں۔'' لالہ کا ایک قریبی ساتھی بھڑک کر بولا۔

''چپ رہو۔'' مشتاق نے پھر ڈانٹا پھر ذرا تحمل سے بولا۔ ''اسی جھگڑے اور نااتفاقی سے بچنے کے لئے اتنی بڑی قربانی دی گئی ہے.... جو ہونا تھا وہ ہوگیا اور اب بھی آپس کا اتفاق نہ بچا تو لعنت ہے ہم سب پر۔''

کاٹھیا نے بھڑک کر کہا۔ ''اگر وہ لوگ جنازہ نہیں پڑھیں گے تو ہم چپ نہیں رہیں گے۔''

''کیوں نہیں پڑھیں گے جنازہ؟'' مشتاق چمک کر بولا۔ ''خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ وہ صرف ایک بندے کی کہی ہوئی بات ہے۔ مراد نے خود تو ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ میں خود جاتا ہوں اس کے پاس۔''

ابھی مشتاق آہوجہ کی بات منہ میں ہی تھی کہ مراد اور اس کے گروپ کے کئی افراد سروں پر رومال باندھے اور ٹوپیاں سر پر لیے ہجوم کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ وہ یقیناً نادیہ کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لئے آرہے تھے۔ نادیہ جو خوبصورتی کا مجسمہ تھی۔ جو ''چھوٹی بھرجائی'' کی حیثیت سے کئی ماہ تک اس ڈیرے پر رہی۔ جسے چور نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور جس کے بارے میں سرگوشیاں کی جاتی تھیں۔ ہاں وہی عورت جو اپنے جسم کی پکار سے مجبور تھی۔ جس نے اپنے آتشیں ہتھیار کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کیا۔ آخر وہ ٹھنڈی ہوگئی۔ لاش بن گئی اور اب اسے منوں مٹی کے نیچے دبانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ عورت کو پہیلی کہا جاتا ہے اور کئی پہیلیاں تو اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ انہیں

سوچنے والا ٹپٹا کر رہ جاتا ہے۔ دوپہر کے فوراً بعد سینما سکرین کے اس روشن ستارے کو وڈے ڈیرے کے ویران قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ تازہ بننے والی قبروں میں ایک اور قبر کا اضافہ ہوگیا۔ نارپور کے نواح میں ایک شوٹنگ سے شروع ہونے والی کہانی چند رنگین و سنگین موڑ مڑنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ بس ایک کمرے میں نادیہ کے استعمال کا سامان پڑا رہ گیا۔ اس کے شوخ کپڑے، اس کے سنگھار کی اشیاء جو اس نے ڈیرے سے ہی حاصل کی تھیں۔ اس کی موٹی اوڑھنی، اس کی بنائی ہوئی چند مورتیاں اور ایک ٹوٹی ہوئی چھڑی جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے جوڑا تھا۔ کمرے اسی طرح خالی رہ جاتے ہیں۔ جانے والے اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت عازم سفر ہو جاتے ہیں۔

رستم بالکل گم صم تھا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں۔

اچانک ایک شخص تیزی سے ڈیرے کے احاطے کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ بار بار مڑ کر اپنے عقب میں بھی دیکھ رہا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اپنے قریبی افراد کو بھی ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ اس جانب اٹھی تو اسے ڈھلتے سورج کی روشنی میں دو متحرک جسم دکھائی دیئے۔ یہ پولیس کی پوزیشنوں کی طرف سے ڈیرے کی طرف آ رہے تھے..... رستم نے شاہ سے دوربین لے کر آنکھوں سے لگائی۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ یہ دو گدھے تھے۔ ان کی پشتوں پر کچھ بندھا ہوا تھا۔ بظاہر یہ انسانی جسم دکھائی دیتے تھے۔

''کیا ہے رستم صاحب؟'' شاہ نے پوچھا۔

''دو گدھے ہیں۔ ان کے اوپر دو بندے بندھے ہوئے ہیں۔ بلکہ شاید دو لاشیں ہیں۔''

''کک..... کہیں یہ اپنے بندے ہی تو نہیں۔ میرا مطلب ہے شاہنواز اور باقر وغیرہ..... پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی تھی۔''

اس بارے میں رستم بھی جانتا تھا۔ یہ رستم کے یہاں آنے سے پہلے کی بات تھی۔ یہ لوگ بارودی سرنگوں کے حصار کے پاس سے پولیس کے ہتھے چڑھے تھے۔ یہ کُل چار بندے تھے۔ تین کا تعلق حسنا گروپ سے اور ایک کا مراد گروپ سے تھا۔ ان میں سے شریف نامی ایک بندے نے بلندی سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیا تھا تاہم تین کو پولیس والے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں رستم کے ذہن میں آپوں آپ ہی یہ خیال آیا کہ یہ لاشیں ان ہی میں سے دو کی ہیں۔

دونوں گدھے ایک جگہ رک گئے اور گھاس پر منہ مارنے لگے۔ انہیں وڈے ڈیرے کی طرف رواں رکھنے کے لئے پولیس والوں اور اجرالیوں کی پوزیشنوں سے چند فائر کئے گئے۔ دھماکوں کی آواز نے گدھوں کو بدکایا اور وہ گھاس چھوڑ کر بڑی تیزی سے وڈے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگے۔

رستم اب دوربین کے ذریعے بالکل صاف دیکھ سکتا تھا۔ ان گدھوں پر دو برہنہ لاشیں بندھی ہوئی تھیں۔ لاشوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کٹی پھٹی ہیں۔ خون کے دھبے اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

پندرہ بیس منٹ میں دونوں گدھے اتنے قریب پہنچ گئے کہ دوربین کے بغیر بھی انہیں صاف دیکھا جانے لگا۔ دونوں لاشوں کو سن کی رسیوں کے ذریعے اوندھی حالت میں جانوروں کی پشت سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک لاش کو لمبے بالوں کی وجہ سے دور ہی سے پہچان لیا گیا۔ یہ مراد گروپ کے باقر کی لاش تھی۔

شاہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''یہ لاش ہیرے کی ہے جی۔''

رستم جبڑے بھینچے بڑی خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ لاشیں ڈیرے پر پہنچیں تو ہجوم نے انہیں گھیر لیا۔ صرف وہی لوگ دور رہے جو رائفلوں کے ذریعے اپنی پوزیشنوں پر موجود تھے اور وہاں سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔

لاشوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پولیس تشدد ''تھرڈ ڈگری'' کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ دونوں لاشوں پر لباس کا تار تک نہیں تھا۔ دونوں کے پاؤں شدید ضربوں کے سبب سوج کر نیلے ہو چکے تھے۔ ہیرے کے پاؤں کے کئی ناخن بھی کھینچ لئے گئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت چمکیلی مونچھیں مونڈی نہیں گئی تھیں بلکہ بے دردی سے اکھاڑی گئی تھیں۔ ہیرے کی ناک کے نیچے گہرے زخم نظر آ رہے تھے۔ دونوں افراد کے نازک اعضا بھی بری طرح زخمی تھے اور موت سے پہلے اذیت کی ناقابلِ بیان کہانی کو بیان کر رہے تھے۔

دونوں کو پشت پر گولیاں ماری گئی تھیں۔ اس طرح غالباً یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ دونوں بھاگنے کی کوشش میں ہلاک ہوئے تھے۔ رستم کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کارروائی کا جواب ہے جو رستم اور اجمل خان نے دو دن پہلے کی تھی۔ انہوں نے نہ صرف پولیس والوں کے حصار میں گھس کر دو اجرالیوں کو جان سے مارا تھا بلکہ ان کے مضبوط ترین مورچے پر اپنا قبضہ بھی تقریباً قائم کر لیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر ڈیرے پر زہریلی چائے والا واقعہ نہ ہو جاتا تو پولیس اور اجرالیوں کو تارے نظر آ جاتے۔

مراد نے اپنے ساتھی باقر کی لاش پہچانی تو سخت جذباتی ہوگیا۔ لاشوں کو کھول کر چارپائیوں پر ڈالا گیا اور ان کے اوپر چادریں پھیلا دی گئیں۔ دونوں چادریں دیکھتے ہی دیکھتے خون سے رنگین ہوگئیں۔

مراد گرج کر بولا۔ ''ایسی زندگی سے موت اچھی ہے۔ ایک ایک کر کے مرنے کے بجائے اچھا ہے کہ ایک ہی بار سارے مرجائیں یا ان حرامیوں کا گھیرا توڑ کر نکل جائیں۔''

اس نے اپنی جدید آٹومیٹک رائفل ہوا میں بلند کی اور اوپر تلے کئی فائر کیے۔

تقلید میں اس کے درجن بھر ساتھیوں نے بھی رائفلیں آسمان کی طرف بلند کیں اور ٹرائیگر زدبائے۔ ہوائی فائرنگ سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔

مراد کا ساتھی نواز چلایا۔ ''ٹھیک ہے، مارو یا مرجاؤ۔ لڑتے ہوئے مریں گے تو عزت کی موت تو ملے گی۔ ...نہیں تو باقر اور ہیرے کی طرح تڑپ تڑپ کر مرنا ہوگا۔ یہ ڈپٹی ریاض انسان نہیں جانور ہے۔ اس جیسے درندے کے ہاتھ آنے سے تو بہتر ہے کہ لڑ کر اپنی جان دے دیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' بیس بائیس سالہ ایک مکرانی لڑکے نے تائید کی۔ ''یہ بارودی سرنگیں بھی زیادہ دیر تک پولیس والوں کا رستہ نہیں روک سکیں گی۔ وہ تو اپنے ہیلی کاپٹر کو بھی بار بار ہمارے اوپر سے گزارتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ایک ہی دفعہ سب ٹوٹ پڑیں۔ ...پھر جو بھی ہو دیکھا جائے۔''

نوجوان کے لہجے میں طیش تو تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈپٹی ریاض کے ہاتھوں گرفتاری کا خوف بھی اس کی آواز میں لہریں لے رہا تھا۔

رستم نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ''فضول بکواس نہ کرو۔ بلہ بولنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہوش سے کام لینا ہوگا۔ گھیرا توڑنے کی کوشش کریں گے تو وہ ایک ایک کو بھون ڈالیں گے۔ میرے خیال میں اب پولیس والے چاہتے بھی یہی ہیں کہ ہم طیش میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھائیں اور وہ ہمیں خودکار رائفلوں کی بوچھاڑ پر رکھ لیں۔''

مراد پھنکارا۔ ''تم کہتے ہو کہ بلہ بولنے کا وقت گزر گیا ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ یہ وقت کیوں گزرا۔ ہم سب تو پوری طرح تیار تھے اگر زہر کی وجہ سے سب کو الٹیاں شروع نہ ہو جاتیں تو سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو جانا تھا۔ یہ موقع ہم نے گنوایا ہے اور اس کی وجہ تمہاری ایکٹریس بیوی ہے۔''

اجمل خان خاموش کھڑا تھا مگر مراد کی گفتگو سن کر مزید خاموش نہ رہ سکا۔ وہ آگے آیا اور

مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ام نے دیکھا ہے کہ تم سب سے زیادہ بولتا ہے اور الٹا بولتا ہے۔ تم کہہ رہا ہے کہ رستم صیب اور اس کی بی بی کی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل گیا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ یہ موقع پیدا کس نے کیا تھا۔ رستم صیب نے ہی کیا تھا۔ ام ان کے ساتھ تھا، ام نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اجرالیوں کی پوزیشن پر حملہ کیا اور ان کا سب سے خطرناک گن MG-08 اپنے قبضے میں لیا۔ ام سمجھتا تھا کہ اتنی بہادری والے کام پر تم رستم صیب کا ہاتھ چومو گے لیکن تم الٹا ان کو ہی الزام دے رہے ہو۔''

مراد کا ساتھی نواز پھنکارا۔ ''خان! یہاں تمہاری پیدائش ابھی دو تین دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ تم زیادہ ماما بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑاؤ گے تو ایسا جواب دیں گے کہ دُم میں آگ لگ جائے گی۔''

اجمل خان نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ جواب دوں اور اگر دوں تو کتنا سخت دوں۔

رستم نے اجمل خان کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور بڑے گھمبیر انداز میں مراد کے ساتھی کی طرف بڑھا۔ رستم کا خوفناک انداز دیکھ کر وہ شخص گھبرا سا گیا اور بے ساختہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں محسوس ہوا کہ رستم اس پر اپنا پستول تان لے گا اور ہو سکتا ہے کہ گولی بھی داغ دے لیکن پھر اس شخص کے قریب پہنچ کر رستم نے جیسے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کیا۔ دھیمے لیکن بے حد سنگین لہجے میں بولا۔ ''جب ہم بات کر رہے ہیں تو تمہیں درمیان میں سؤر کی طرح چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے.... دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اردگرد موجود افراد کانپ کر رہ گئے۔ رستم نے مراد کی طرف انگلی اٹھائی اور بدستور اسی لہجے میں گویا ہوا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو مراد اور اپنے ساتھیوں کو بھی سمجھا دو، جب تک لالہ بیمار ہے میں سردار ہوں اور میں حکم عدولی برداشت نہیں کروں گا۔ میری بات سن رہے ہو نا، میں حکم عدولی برداشت نہیں کروں گا۔''

مراد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ رستم کا غیظ و غضب اور اندرونی دکھ جیسے مراد کو مسمرائز کر رہا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر مراد کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''جس طرح مجھ پر ذمے داریاں ہیں......اس طرح تم سب پر ہیں۔ اس نازک وقت میں اگر کسی نے بھی اپنی ذمے داری سے غفلت کی تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔''

مراد اور اس کے ساتھی سر جھکا کر سنتے رہے۔ رستم فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''پولیس پانڈو کی طرف سے واپس اپنی پہلی والی پوزیشنوں پر آچکی ہے۔ اب ہم حملہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اپنی اپنی پوزیشنوں پر جاؤ اور پوری طرح چوکس ہو جاؤ..... خاص طور پر مراد تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو چوکس ہونے کی ضرورت ہے۔ تمہارے پاس بہترین ہتھیار ہیں اور تمہیں جو پوزیشنیں دی گئی ہیں وہ بھی سب سے خاص ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں ان پوزیشنوں پر ہم وہ توجہ نہیں دے رہے جو ہمیں دینی چاہیے اگر وہاں ہماری توجہ ہوتی تو شاید شریف کو خودکشی نہ کرنا پڑتی اور ہیرا اور باقر بھی گرفتار نہ ہوتے۔ بہر حال جو ہو گیا، اب مجھے اس طرف سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔''

ان لمحوں میں رستم کا لہجہ واقعی ایک بااختیار سردار کا لہجہ تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مراد یہ لہجہ اور یہ باتیں سن کر شاید خاموش نہ رہتا لیکن اس وقت وہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف رستم کی باتیں سن رہا ہے بلکہ ان پر عمل کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ ''نادیہ والی قربانی'' نے رستم کو جیسے چند ہی گھنٹوں میں ایک بااثر سردار کی ساری توانائیاں بخش دی تھیں۔ اس کے ساتھی تو پہلے بھی اپنی جانیں لڑانے کے لئے اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے، اب دیگر افراد بھی اس کے حکم کو پوری اہمیت دے رہے تھے۔ وہ شعلہ جوالا نظر آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

شانی رکشہ پر سوار ہو کر نہر تک پہنچی۔ اس کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ریاض ہٹلر کے خوف نے آسیب کی طرح اس کے اعصاب کو جکڑ رکھا تھا۔ جمشید کی خونچکاں لاش اور تایا معصوم کی بے بسی کا تصور..... گاہے بگاہے اس کے سینے میں نشتر چبھو دیتا تھا۔

وہ ابھی پُل سے کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ اسے پولیس کی دو جیپیں نظر آ گئیں۔ ساتھ میں سفید رنگ کی ایک پرائیویٹ ٹویوٹا گاڑی بھی تھی۔ ڈپٹی ریاض کی ہدایت کے مطابق شانی نے رکشہ کچھ فاصلے پر رکوا دیا۔ شانی کرایہ دے کر نیچے اُتری۔ ایک طرف سے دو سفید پوش پولیس والے برآمد ہوئے۔

''آ جاؤ میڈم۔'' ایک لمبے تڑنگے شخص نے کہا اور شانی کو ساتھ لے کر جیپوں کی طرف آ گیا۔

اگلی جیپ کا رنگدار ''ونڈو گلاس'' نیچے اُترا تو ڈپٹی ریاض کی کرخت صورت شانی کو نظر آئی۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں اور سیاہ ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

''اندر آ جاؤ بی بی جان۔'' وہ بڑے دلار سے بولا۔

''تایا معصوم کہاں ہیں؟ اور تم نے کیا کہنا ہے مجھ سے؟''

''اندر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ یہاں سڑک پر کھڑے کھڑے تو ساری کتاب نہیں کھول سکتا۔''

شانی چند لمحے ہچکچاتی رہی پھر ادھ کھلے دروازے سے گزر کر جیپ کے اندر چلی گئی۔ جیپ میں الکحل اور تمباکو کی بُو تھی اور اس سے بھی زیادہ شدید بو..... شاید ڈپٹی ریاض کے گندے جسم اور بوجھل سانسوں کی تھی۔ وہ وردی میں تھا لیکن قمیص کو پتلون کے اندر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ٹوپی بھی سر پر نہیں تھی۔ اس کی کانٹے دار شیو ہمیشہ کی طرح بڑھی ہوئی تھی..... ہاں یہی وہ شخص تھا جس کے شر سے ایک خلقت پناہ مانگتی تھی۔

اس نے شانی کو مخمور نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''مجھے پتا تھا..... کچے دھاگے سے بندھی آئے گی سرکار میری۔ بیٹھ جاؤ بی بی جان۔ تسلی سے بیٹھ جاؤ۔''

شانی ایک نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ جمشید کی موت کا غم ایک وزنی پتھر کی طرح اس کے کلیجے کو مسل رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ اپنے برابر والی نشست کی طرف گئی۔ اسے رونے اور سسکنے کی آواز آئی۔ یہ تایا معصوم تھے لیکن ان کے سر پر ایک بڑا کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ سر کو بے قراری سے جنبش دے رہے تھے اور کپڑا اُتارنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کام کے لئے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کر رہے تھے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ تایا کے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر باندھ دیئے گئے ہیں۔ وہ تڑپ کر تایا کی طرف جھکی اور کپڑا ان کے سر سے ہٹا دیا۔ تایا کی حالت نے شانی کو ششدر کر دیا۔ وہ ننگے سر تھے۔ ان کی عینک کا ایک شیشہ تڑخ چکا تھا۔ بالائی ہونٹ بُری طرح سوجا ہوا تھا اور وہاں سے رِسنے والا خون ان کی سفید داڑھی کو ایک طرف سے رنگین کر رہا تھا۔ ان کا گریبان ادھڑا ہوا تھا اور ہاتھ پشت کی طرف ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کی بیلٹ سے منسلک تھی۔

شانی نے تڑپ کر تایا کو گلے لگا لیا۔ دونوں ہچکیوں سے رونے لگے۔ تایا معصوم علی نے روتے روتے کہا۔ ''شانی یہ تُو نے کیا کیا؟ مر جانے دینا تھا مجھے یہاں۔ اپنی جان عذاب میں نہیں ڈالنی تھی۔ وہ جوان جہان مر گیا۔ میں تو بڈھا ٹھہرا..... میرا کیا تھا۔'' وہ بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔

شانی نے انہیں بانہوں میں لے لیا۔ ''تایا جی! میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈپٹی ریاض کی زہرخند آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ''حوصلہ رکھو بابا۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ سب ٹھیک کرلے گی۔ یہ کرسکتی ہے ایسا۔''

اس کے ساتھ ہی ریاض نے شانی کو بے رحمی کے ساتھ بازو سے پکڑ کر تایا معصوم سے دور کردیا۔ ریاض کے اشارے پر ایک مسلح کانسٹیبل نے موٹی چادر پھر تایا معصوم کے سر پر ڈال دی۔ تایا معصوم اپنے سر کو بے قراری سے حرکت دینے لگے۔ وہ کپڑا ہٹانا چاہ رہے تھے۔ ان کی مزاحمت دیکھتے ہوئے ہٹے کٹے کانسٹیبل نے ہتھکڑی کی زنجیر کو بے دردی سے جھٹکا دیا اور اس طرح کھینچا کہ تایا معصوم سیٹ کے ساتھ پیوست ہوکر رہ گئے۔

شانی کی نگاہ جیپ کے فرش پر پڑی اور وہ پوری جان سے لرز گئی۔ یہاں خون کے دھبے تھے اور ایک خون آلود چپل بھی پڑی تھی۔ شانی کے دل نے گواہی دی کہ یہ مرنے والے جمشید کی چپل ہے۔ غالباً شانی کے آنے سے پہلے تک جمشید کی لاش اسی کشادہ جیپ کے فرش پر موجود تھی، اب اسے پیچھے والی گاڑیوں میں سے کسی ایک گاڑی میں منتقل کردیا گیا تھا۔

''کہاں ہے وہ مجھے اس کا چہرہ تو دکھاؤ۔'' شانی نے روتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔

''چہرہ دیکھ کر کیا کرو گی بی بی جان؟ مُردے کا ماتم چھوڑو۔ زندوں کی فکر کرو۔''

اچانک شانی کے شولڈر بیگ میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ شانی متوجہ ہوتی ریاض نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔ سکرین دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کمبوہ کا فون ہے۔ تیرے لئے پریشان ہو رہا ہوگا۔'' اس کے ساتھ ہی ریاض نے کال ریجیکٹ کردی۔

شانی کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے سگریٹ کا گاڑھا دھواں پھینکا اور بولا۔ ''ابھی کمبوہ کا فون دوبارہ آئے گا۔ اسے اپنی طرف سے مطمئن کردینا۔ اسے بتاؤ کہ تم اپنی مرضی سے ایک ضروری کام کے لئے آئی ہو۔ ابھی بتا نہیں سکتی ہو کہ کیا کام ہے۔ اس گنجے سے کہو کہ کرائے کے ٹٹوؤں کو چوہدری بشیرے کے پاس واپس بھیج دے اور خود بھی دُم ہلاتا ہوا جوہرآباد پہنچ جائے۔ تم ایک دو دن میں واپس آجاؤ گی۔''

''ایک دو دن؟'' شانی کا رنگ اور بھی زرد ہوگیا۔ ''تم نے تو کہا تھا...... بس آدھ پون گھنٹے کی بات ہے۔''

''جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔ کوئی چوں چرا نہیں چاہیے ورنہ ابھی پانچ منٹ میں اس ٹھرکی بڈھے کا حشر خراب کرکے ماردوں گا تیری آنکھوں کے سامنے۔'' ریاض سانپ کی طرح پھنکارا اور سیٹ کے نیچے رکھا ہوا پسٹل نکال لیا۔ شانی اس منحوس پسٹل کو بڑی اچھی طرح

جانتی تھی۔ یہ ریاض کے سرکاری پسٹل سے تھوڑا سا بڑا تھا۔ ریاض نے شانی کو اس کا نظارہ جوہرآباد میں جمشید کے گھر کرایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہی وہ پسٹل ہے جس سے وہ شانی کے عزیزوں کے تین جنازے اٹھوائے گا۔ ان میں سے ایک جنازہ وہ قریباً ایک گھنٹہ پہلے اٹھوا چکا تھا۔ شانی نے اپنے موبائل فون پر جمشید کو قتل ہوتے ''سنا'' تھا اور تایا معصوم نے ''دیکھا'' تھا۔

ڈپٹی ریاض نے پسٹل کی نال بے دریغ معصوم علی کی بوڑھی پسلیوں سے لگادی۔ وہ ایک بار پھر کراہے۔ ''ماردو...... ہاں ماردو۔''

اسی دوران میں موبائل کی بیل پھر ہونے لگی۔ ڈپٹی نے فون شانی کی طرف بڑھا دیا۔ شانی نے دیکھا دوبارہ عارف کمبوہ کی کال تھی۔ شانی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عارف کی بے حد پریشان آواز ابھری۔ ''شانی بہن! کہاں چلی گئی ہو تم؟ کیا ہوا ہے؟ گارڈ محمد دین کہہ رہا ہے کہ تمہیں کوئی فون آیا تھا اور تم روتی ہوئی چلی گئی ہو......''

شانی نے بے حد کوشش کرکے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ فون پر تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن بالکل خیریت سے ہوں۔''

جواب میں عارف نے سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ اس کے لہجے میں اَن گنت اندیشے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ عارف اس کی بات پر یقین کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال شانی نے عارف سے وہی کچھ کہا جو ڈپٹی ریاض نے اسے بتایا تھا۔ عارف کے شبہات میں رتی بھر بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے واضح طور پر اس شبہے کا اظہار کیا کہ کہیں وہ گوجرانوالہ پولیس کی تحویل میں تو نہیں ہے۔

شانی نے تردید کی۔ اس سے پہلے کہ عارف مزید سوالات کی بوچھاڑ کرتا...... ڈپٹی ریاض نے اپنا کرخت ہاتھ بڑھا کر موبائل شانی سے لے لیا اور آف کردیا۔

جیپ نہر کے پُل سے روانہ ہوگئی۔ اس کا رخ وزیرآباد کی طرف تھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' شانی نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

''تمہیں تھوڑی سی سیر کرانی ہے بی بی جان اور ایک رشتہ بھی دکھانا ہے تمہیں۔ چالیس پینتالیس سال کی عورت ہے لیکن ہڈ پیر کی ٹھیک ہے۔ چل جائے گی تمہارے تائے کے ساتھ۔''

شانی اشک بار سوالیہ نظروں سے ریاض کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور تیرا یہ تایا معصوم تو

بس نام کا معصوم ہے۔ اندر سے ایک نمبر کا ٹھرکی ہے۔ ابھی ایک جوان سی عورت بٹھا دو اس حرامی کی گود میں، دومنٹ میں مولا جٹ نہ بن جائے تو میرا نام بدل دینا......"

"بکواس بند کر کتے...... اللہ کے عذاب سے ڈر...... میری بیٹی کے سامنے...... میری بیٹی کے سامنے۔" معصوم علی کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ خود کو نشست سے علیحدہ کرنے کی ہیجانی کوشش کرنے لگے۔ کانسٹیبل نے انہیں مزید مضبوطی سے جکڑ لیا۔

ریاض نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہیں کہا تھا ناں کہ اس بڈھے میں بڑا کرنٹ ہے۔ اس کو موقع ملے تو دو تین شادیاں تو اب بھی کھڑکا سکتا ہے۔ ایسے بڈھوں کے بارے میں ہی کہتے ہیں......اتوں میاں تسبیح تے وچوں میاں کسی......"

ریاض نے چھوٹا سا ایک اور قہقہہ لگایا پھر ہاتھ بڑھا کر ستر سالہ بزرگ کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پھنکارا۔ "تیری بیٹی کے سامنے کیا کر دیا ہے میں نے؟ بول کیا کر دیا ہے......؟ تیرے اوپر کوئی کنجری چھوڑ دی ہے یا تجھ سے ڈانس کروایا ہے۔ کیا ظلم ہو گیا ہے مجھ سے؟" اس کے ساتھ ہی اس نے معصوم علی کی پیٹھ پر ٹھوکر رسید کی۔

اب یہ سب شانی کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر تایا معصوم اور ریاض ہٹلر کے درمیان آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ریاض کا گریبان پکڑا اور جھنجوڑنے لگی۔ "خدا کا خوف کرو...... خدا کا خوف کرو۔" وہ چلائی۔ "تمہیں بھی کسی نے پیدا کیا ہے، تمہارا بھی کوئی باپ ہوگا۔"

ریاض ایک دم غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ شانی کے منہ پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے شانی کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اسے نیچے تک ادھیڑ کر رکھ دیا۔ شانی کا بالائی جسم بائیں طرف سے عریاں ہو گیا۔ وہ چلائی اور اس نے اپنی اوڑھنی کو پھیلا کر جلدی سے خود کو ڈھانپا۔

ریاض گرجا۔ "حرامزادی اکڑ دکھاتی ہے۔ تیرے جیسیوں کو تو تیر کی طرح سیدھا کر دیتا ہوں میں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے شانی پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

شانی کا گریبان پھٹنے اور اس کے چلانے کی آواز یقیناً معصوم علی کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ وہ بھی چلانے لگے اور خود کو ہٹے کٹے کانسٹیبل کی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ کپڑا بدستور ان کے سر پر تھا اور اسے دوسرے کانسٹیبل نے مضبوطی سے ان کی گردن پر پکڑ رکھا تھا۔

ڈپٹی ریاض کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا، بائیں ہاتھ سے اس نے شانی کے بالوں کو

جکڑا اور جھنجھوڑ کر بولا۔ "اکڑ دکھائے گی تو کچھ نہیں بچے گا تیرا...... مٹی خراب کردوں گا تیری...... مر سکے گی نہ جی سکے گی۔ چپ بیٹھی رہ، بالکل چپ۔" اس نے پسٹل کی نال بے رحمی سے شانی کی گردن میں گھسیڑ دی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل والے ہاتھ سے ایک ضرب معصوم علی کی گردن کے پچھلے حصے پر لگائی۔ وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہے تھے......لڑھک کر نشست سے گر گئے۔ ڈپٹی ریاض پھنکارا۔ "او...... رحمے! بیٹھ جا اس ٹھرکی بڈھے کے اوپر...... اسے دبا کر رکھ اپنے نیچے۔"

شانی نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ہٹا کٹا کانسٹیبل ذرا ترس کھائے بغیر سیٹوں کے درمیان پھنسے ہوئے تایا معصوم کے اوپر یوں بیٹھ گیا جیسے کرسی پر بیٹھا جاتا ہے۔ تایا معصوم کے ہونٹوں سے اب گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ بالکل معمولی مزاحمت کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ بے ہوش ہو جائیں گے۔

"خدا کے لئے پیچھے ہٹ جاؤ...... خدا کے لئے۔" شانی نے ہٹے کٹے کانسٹیبل کو جھنجھوڑ کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شانی نے فریادی نظروں سے ریاض کی طرف دیکھا۔ "اس کو پیچھے ہٹاؤ...... میں...... کچھ نہیں کہوں گی۔ خاموش بیٹھوں گی، اس کو پیچھے ہٹا دو۔"

"تم تو اور بھی بہت کچھ مانو گی مسماۃ شانی! لیکن اس طرح کی شرطیں مت رکھو۔ اس بڈھے کا دماغ ذرا ٹھیک ہو لینے دو۔"

کانسٹیبل کچھ اور بھی چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ تایا معصوم کی سانس اب رک رہی تھی اور منہ سے کھیں کھیں کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔ انہوں نے مزاحمت بالکل ترک کر دی تھی۔ ایک ستر سالہ بیمار بوڑھا کہاں تک مزاحمت کر سکتا تھا۔ جیپ تیز رفتاری سے چلتی جا رہی تھی۔

"خدا کے لئے...... فار گاڈ سیک۔" شانی نے بے ساختہ ڈپٹی ریاض کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔

شانی کے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر دیکھ کر ڈپٹی ریاض زہرناک انداز میں مسکرایا۔ "اوئے تُو کملی ہوگئی ہے چھوٹی چوہدرانی! ہم تو تم لوگوں کے خادم ہیں۔ تمہارے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے ہم کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ ہماری دال روٹی چلتی ہے اور تُو میرے گوڈوں کو ہتھ لگا رہی ہے۔ توبہ توبہ...... اگر تیرے اس یار رستے کو پتا چل گیا تو وہ تو میری پھٹیاں اکھاڑ کر رکھ دے گا۔ بڑا "دراچھا" بندہ ہے وہ اور ہم غریب پلسیوں کا تو خاص طور پر ویری ہے۔ پیچھے کر لے بھئی اپنے ہتھ۔ مجھے اپنی ٹانگیں نہیں چیروانی اس شیر ببر سے۔" شانی کو گندی گالیاں دینے کے

بعد ریاض کا لہجہ ایک بار پھر بدل گیا تھا اور اب بظاہر نرم لیکن زہریلے لہجے میں بات کر رہا تھا۔
ایک بار تو شانی کا دل چاہا کہ وہ ریاض پر پل پڑے اور اس وقت تک اس کا سیاہی مائل چہرہ نوچتی رہے جب تک ہڈیوں پر گوشت کا ریشہ باقی ہو، اسے یہ بھی اچھی طرح پتا تھا کہ تایا معصوم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ ان کے سانسوں کی ڈور تادیر برقرار رہے۔

اس نے سنا تھا کہ تشدد انسان کو مسمرائز کر دیتا ہے جو شخص توہین آمیز انداز میں مخاطب کیے جانے پر سیخ پا ہو جاتا ہے، وہ بھی تشدد میں جکڑے جانے کے بعد ماں بہن کی گالیاں بھی خاموشی سے سن لیتا ہے۔ یہاں اس تیز رفتاری سے چلتی ہوئی جیپ میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔
ابھی کچھ دیر پہلے شانی اس بات پر آگ بگولہ ہوگئی تھی کہ ڈپٹی ریاض نے تایا معصوم کو ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجھوڑا تھا، ایک کانسٹیبل ان کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا اور ریاض انہیں ننگی گالیاں دے رہا تھا لیکن وہ اب خاموش رہنے پر مجبور تھی۔

اس نے ایک بار پھر روتے ہوئے ریاض ہٹلر کی منت کی مگر وہ قصائی بڑی لاپرواہی سے فون کال کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اپنے کسی ماتحت کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ڈی سی کے سگے بھائی کی شادی ہے..... ٹھیک ٹھاک پیسے لے کر آئے گی وہاں سے۔“

ماتحت نے کہا۔ ”لیکن اس کی ماں......“

”اوئے اس کی ماں کے.....“ ریاض نے ایک غلیظ گالی دی اور پھنکارا۔ ”جو للو پنجو پندرہ بیس ہزار دکھا دیتا ہے اس کے ساتھ بیٹی کو سونے کے لئے بھیج دیتی ہے۔ یہ ڈی سی صاحب کا بھائی ہے، یہاں جاتے ہوئے اسے کیا پیڑ پڑتی ہے۔“

فون کے مائیک سے ماتحت کی آواز آئی۔ ”اس کی ماں کہتی ہے، بچی ٹھیک نہیں ہے..... بخار ہے۔“

”بخار ہے تو نہانے والا کام نہ کرے اور اسے کہتا بھی کون ہے؟ بس دو چار ٹھمکے دکھا کر آجائے۔ ایک گھنٹہ آنے جانے کا......ایک گھنٹہ ڈانس......دو گھنٹے میں ڈھائی تین لاکھ روپیہ لے آئے گی اور اس حرامزادی کو موت چاہیے۔“

ماتحت نے کچھ کہا جو شانی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تایا معصوم مسلسل کانسٹیبل کے نیچے کراہ رہے تھے۔ ان کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔

شانی نے روتے روتے کانسٹیبل کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اسے تایا معصوم پر سے ہٹانے کی کمزور کوشش کی۔ کانسٹیبل نے سوالیہ نظروں سے ڈپٹی ریاض کی طرف دیکھا۔ اس نے فون کرتے کرتے آنکھوں سے اشارہ کیا......جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... چلو

ابھی معاف کرو، اس بڈھے کو۔
کانسٹیبل تایا معصوم کے اوپر سے اٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ بدستور پشت پر ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل کی بیلٹ میں تھی۔ دونوں کانسٹیبلوں نے سہارا دے کر تایا معصوم کو اٹھایا اور سیٹ پر بٹھانا چاہا لیکن وہ ایک طرف لڑھک گئے۔ گردن پر لگنے والی بے رحم ضرب نے انہیں نیم جان کر دیا تھا۔ شانی نے تڑپ کر ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ ان کی سفید داڑھی خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے تھرماس میں سے پانی نکالا اور ان کے چہرے پر چھینٹے مارے۔

اس دوران میں ڈپٹی ریاض نے موبائل پر اپنے ماتحت سے بات ختم کر لی۔ شانی تایا معصوم کے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ ریاض نے شانی کو بازو سے کھینچ کر واپس سیٹ پر بٹھا دیا۔ ”تم چپ کر کے یہاں بیٹھی رہو۔ تایا جی سے زیادہ لولو پوپو نہ کرو۔ ہم ہیں ان کی خدمت گزاری کے لئے......کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔“

شانی کو قہرناک نظروں سے دیکھنے کے بعد ڈپٹی ریاض نے نیا سگریٹ سلگایا اور موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیپ جی ٹی روڈ پر اُڑی جا رہی تھی۔ سفید کار بھی پیچھے آ رہی تھی مگر دوسری جیپ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق بدنصیب جمشید کی لاش اسی جیپ میں منتقل کی گئی تھی۔ شانی نے آبدیدہ نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ شیشے کی دوسری جانب سورج مغربی افق پر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ قریب سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے مسافر اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ شانی نے سوچا کسی گاڑی میں میوزک بج رہا ہوگا، کہیں لطیفے بازی ہو رہی ہوگی۔ کسی گاڑی میں لمبا سفر کاٹنے کے لئے مسافروں نے کوئی سیاسی بحث شروع کی ہوگی۔ ان میں سے کسی کو کیا معلوم کہ ان کے پاس سے گزرتی ہوئی پولیس جیپ میں ایک بے بس لڑکی......خوفناک افسر کے چنگل میں ہے اور وہ دونوں شاید ایک خطرناک ترین ڈکیت کے پاس جا رہے ہیں......ایک پولیس افسر، ایک لڑکی اور ایک ڈکیت کی کہانی۔

معصوم علی کی حالت میں معمولی سی بہتری نظر آئی۔ شانی میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ بہتری دیکھنے کے لئے تایا معصوم کی طرف بڑھے، وہ جیسے مسمرائز ہو چکی تھی۔ ہاں تشدد مسمرائز کرتا ہے۔ اچانک ریاض کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے سکرین پر نمبر پڑھا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر شانی کی طرف دیکھ کر پھنکارا۔ ”تمہاری آواز نہیں نکلنی چاہیے۔“

شانی نے بے ساختہ اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

ریاض نے کال ریسیو کی۔ ایک ہی لمحے میں اس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اس کے چہرے سے خشونت جاتی رہی اور لہجے میں نرمی سرایت کرگئی۔ ''حاجی صاحب! کیا حال چال ہے۔ آج اپنے اس خادم کی یاد کیسے آگئی۔''

حاجی صاحب کا لفظ سن کر شانی چونکی...... کہیں یہ حاجی حیات صاحب تو نہیں۔ یہ یقینی بات تھی کہ اس کی اچانک گمشدگی نے عارف کمبوہ کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پریشان کردیا ہوگا۔ ان میں حاجی حیات بھی شامل ہوسکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس حوالے سے ان کا دھیان ڈپٹی ریاض کی طرف گیا ہو۔ اگلے چند سیکنڈ میں شانی کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوگیا۔ دوسری طرف حاجی حیات ہی تھے۔ ریاض کے موبائل کے سپیکر کی آواز تھوڑی سی بلند تھی لہذا ریاض کے علاوہ مخاطب کی آواز بھی جیپ کے اندر سنی جاسکتی تھی۔

دوسری طرف سے حاجی حیات نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''ریاض! ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ رستم والے معاملے سے چھوٹی چوہدرانی شانی کو بالکل الگ رکھیں گے اور پولیس اسے کسی طرح تنگ نہیں کرے گی۔''

''حاجی صاحب! آپ تو بار بار دہرا کر شرمندہ کررہے ہیں۔ میں آپ کا نوکر ہوں جی۔ بس جو بات ہمارے درمیان طے ہوگئی سو ہوگئی لیکن...... اب کیا کوئی نیا واقعہ ہوا ہے؟''

''ہاں.... لاہور سے جوہر آباد آتے ہوئے شانی گوجرانوالہ سے غائب ہوگئی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے عارف کمبوہ نے اسے فون کیا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی لگتی تھی.... اس نے درمیان میں ہی فون بند کردیا ہے۔''

''یہ کیا معاملہ ہوسکتا ہے؟'' ریاض نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ وہ بڑی مہارت سے ایکٹنگ کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ ''کہیں، آپ مجھ پر تو کسی طرح کا شک نہیں کررہے۔''

حاجی حیات نے کہا۔ ''شک تو مجھے تھا...... پراب تو تم سے بات ہوگئی ہے، لیکن ایک بات اب بھی دماغ میں آرہی ہے۔ کہیں تمہارے کسی ماتحت نے......''

''نہیں نہیں...... حاجی صاحب...... آپ تو بادشاہوں والی بات کررہے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ میرا کوئی ماتحت میرے حکم سے باہر نہیں جاتا اور اگر آپ جناب کو مجھ پر شک ہے تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں؟ سوائے اس کے کہ آپ جو بڑی سے بڑی قسم اٹھوائیں وہ اٹھالوں۔'' ریاض کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔

''میں نے قسم اٹھوانے والی بات کی ہے؟'' حاجی حیات نے بھی قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ کے اس نوکر کے دل کو یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے جی کہ بی بی صاحبہ کے ساتھ کچھ بھی ہوا...... گردن میری ہی آپ کے پاؤں کے نیچے آنی ہے۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں تم سے بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنے مخبروں سے رابطہ کرکے دیکھ لو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے ایفی شینسی دکھائی ہو۔''

ریاض کے کرخت چہرے پر ایک دم خون کی یورش ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ حاجی حیات کو کوئی سخت جواب دے گا لیکن پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''آپ پیر قدرت کو کیوں نہیں دیکھتے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل چوہدری بشیرے کی لاہور والی کوٹھی میں پیر قدرت کے ایک بندے نے بی بی پر چاقو سے حملہ کیا ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے اس کی۔ کیا پتا پیر جی کا کوئی جوشیلا مرید پھر کام دکھانے کی کوشش کرجائے؟ بی بی جی کو بھی اس طرح خواہ مخواہ خطرے مول نہیں لینے چاہیے ناں۔''

اس نے کیا کیا ہے؟''

''جہاں پیر قدرت کی بیوی قتل ہوئی ہے وہاں بی بی خود موجود تھی۔''

''تم ملتان کی بات کررہے ہو...... پر تم بھول رہے ہو کہ بی بی کے وہاں جانے سے معاملہ بگڑا نہیں تھا بلکہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ اس بات کا اقرار خود قدرت اللہ کے چیلے بھی کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بی بی وہاں نہ آتی تو اور زیادہ خون خرابہ ہوتا اور ہوسکتا ہے کہ قدرت اللہ بھی اپنے ''اینڈ'' کو پہنچ گیا ہوتا۔''

''یہ تو میں اور آپ کہہ رہے ہیں ناں جی۔ لوگ تو اپنے ڈھنگ سے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ بی بی ہی رستے کو ملتان والے آستانے پر لے کر گئی تھی۔ بعد میں لوگوں کے سامنے سچا ہونے کے لئے اس نے رستے کا رستہ روکا۔ بہرحال جی ہمیں کیا...... ہمیں تو تفتیش کرنی ہے اور عدالت کو بندے دینے ہیں۔ عدالت جانے اور اس کا کام۔''

''میں تم سے کب کہہ رہا ہوں کہ تم عدالت لگاؤ۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ذرا اپنے طور پر بی بی کے بارے میں معلوم کرو۔''

حاجی حیات کی گفتگو میں ایک بار بھی معصوم علی کا نام نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک ان کی گمشدگی سے بے خبر تھے۔ اسی طرح جمشید کے ''پولیس مقابلے'' کی خبر بھی ان تک نہیں پہنچی تھی۔

ریاض کے ماتحتوں کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ غالباً وہ حاجی حیات کے

ساتھ اپنے ڈپٹی کی دروغ گوئی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے قدرے روکھے انداز میں حاجی حیات سے یہ کہتے ہوئے بات ختم کر دی کہ اگر اسے بی بی کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع ملی تو وہ فوراً آگاہ کرے گا۔

اس ساری گفتگو کے دوران میں معصوم علی نیم بے ہوش سے پڑے رہے۔ دونوں گاڑیاں جہلم میں داخل ہوئیں تو شام گہری ہو چکی تھی۔ اپنی قمیص کا پھٹا ہوا گریبان شانی نے مسلسل تھام رکھا تھا۔ ایک جگہ گاڑی روک کر ڈپٹی ریاض اور اس کے عملے نے کولڈ ڈرنکس لیں۔ اسی دوران میں ایک ہیڈ کانسٹیبل قریبی جنرل سٹور سے تین سیفٹی پن لے آیا۔ شانی نے ان سیفٹی پن کے ذریعے اپنے پھٹے ہوئے گریبان کو عارضی طور پر جوڑا۔

شانی کے تایا معصوم اب ہوش میں آ چکے تھے۔ تاہم ڈپٹی ریاض نے انہیں بڑے درشت الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ بزرگی یا بڑی عمر کے حوالے سے انہیں کوئی رعایت نہیں ملے گی۔ اگر وہ خاموشی سے چپ چاپ بیٹھے نہیں رہیں گے تو تایا بھتیجی دونوں سخت مصیبت میں پھنسیں گے۔ شانی کی چھٹی حِس اسے ایک خاص خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک بار پھر پوٹھوہار کے سفر پر ہے۔ اسے معلوم تھا کہ رستم دوبارہ سون میں پہنچ چکا ہے اور وڈے ڈیرے کو پولیس نے سخت ترین گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ بالآخر ڈپٹی ریاض وہی کر رہا ہے جس کی اس سے توقع تھی۔ وہ شانی کے ذریعے رستم کو بے بس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ ڈپٹی ریاض کو ایسا کرنے دے گی؟ کیا وہ یہ برداشت کر سکے گی کہ اس کی وجہ سے رستم اور اس کے ساتھی بدترین موت کا شکار ہو جائیں؟ کیا اس سے ہزار درجے بہتر نہیں ہوگا کہ وہ موقع دیکھ کر ریاض اور اس کے ہرکاروں پر ٹوٹ پڑے؟ خود مر جائے اور ان کو مار دے...... لیکن تایا معصوم......؟ ایک بار پھر یہ سوال شدت سے اس کے ذہن میں ابھرا۔ کیا تایا معصوم کو بھی اس کے ساتھ ہی مرنا پڑے گا؟ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ تو خود کر سکتی تھی لیکن تایا کی زندگی کا فیصلہ وہ کیسے کر سکتی تھی پھر اسے مُنے کا خیال آیا......

اپنے ان پیاروں کا خیال آیا جن کے چہرے دیکھے اسے زمانہ گزر گیا تھا۔ اسے رنگ والی کا خیال آیا وہاں کی گلیوں اور کھلیانوں کا، وہاں کے کنوؤں اور درختوں کا۔ رنگ والی کی شامیں اور دوپہریں اور چاندنی راتیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئیں۔ وہ ساری سکھیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آئیں جن کے ساتھ اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ان چہروں اور ان گلی کوچوں کو شاید اب کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ وہ وہی کیفیت محسوس کر رہی تھی جو کسی خونخوار ’’فش ایگل‘‘ کے پنجوں میں جکڑی ہوئی مچھلی کرتی ہوگی جب اسے چیر پھاڑ کے

لئے گھونسلے کی طرف لے جایا جاتا ہوگا۔

وہ ایک نیم پختہ سڑک پر ٹیلوں کے درمیان رواں دواں تھے جب ڈپٹی ریاض کے موبائل کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا مختار نامی ماتحت تھا۔ ریاض اسے مختارے کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔

’’ہاں مختارے کیا رپورٹ ہے؟‘‘

’’جناب دوپہر بارہ بجے کے قریب وائرلیس آئی تھی۔ آپ کے آرڈر پر عمل ہوا ہے جی۔‘‘

’’پار کر دیا ہے دونوں کو؟‘‘

’’بالکل جی۔ انہیں گدھوں کے اوپر باندھ کر گدھے ڈیرے کی طرف ہانک دیئے گئے تھے۔‘‘

’’پھر کوئی ری ایکشن ہوا ہے؟‘‘

’’بارہ ایک بجے تک تو نہیں ہوا تھا جی۔ انسپکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اگر کوئی حرکت نظر آئی تو وہ اطلاع دیں گے۔‘‘

’’حرامزادے...... ہیجڑے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ان کی ماں بہن کی مٹی پلید کرو گے تو بھی سامنے نہیں آئیں گے۔ انہیں پتا ہے ’’مائینز‘‘ کی حد سے آگے نکلیں گے تو کُتے کی موت مریں گے۔‘‘

’’اب کیا حکم ہے جناب؟‘‘

’’تم تسلی رکھو۔ میں ان ہیجڑوں کے لئے طاقت کا ایک خاص ٹیکہ لے کر آ رہا ہوں۔ خاص طور پر اس بڑے ہیجڑے کے لئے۔‘‘

’’انسپکٹر صاحب کے لئے کوئی آرڈر ہو تو بتا دیں۔‘‘

’’اگر رابطہ ہو تو اسے چوکس رہنے کا کہو۔ میرا خیال ہے کہ میں آج سویرے تک بیس کیمپ پر پہنچ جاؤں گا۔‘‘

ریاض ہٹلر نے اپنے ماتحت کو چند ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا اور تیز نظروں سے شانی کو گھورنے لگا۔ تاہم اس کی نگاہیں صرف شانی پر تھیں۔ دماغ کہیں بہت دور پہنچا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ریاض نے ڈھکے چھپے انداز میں ٹیکے اور ہیجڑے کا ذکر کیا تھا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بدزبان نے بڑے ہیجڑے کا لفظ رستم کے لئے استعمال کیا ہے جب طیش کے عالم میں اس کی پلید زبان حرکت کرتی تھی تو ہر حد کو پار کر جاتی تھی۔ وہ ایک دم جنونی

نظر آنے لگتا تھا۔صورتِ حال اب واضح ہو رہی تھی اور شانی کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ وڈے ڈیرے پر کشت وخون ہو رہا تھا۔ ریاض ہٹلر شاید رستم اور اس کے ساتھیوں کو طیش دلانے کی بہیمانہ کوششیں کر رہا تھا۔اس کے ماتحت نے لاشوں کو گدھوں پر باندھ کر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ کرنے کی بات کی تھی اور ایسا ریاض کے حکم پر ہی کیا گیا تھا۔

اس سفر کے دوران میں ریاض کو گاہے بگاہے فون موصول ہوتے رہے۔ان فون کالز سے ریاض کی بے پناہ طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پولیس افسر نہیں کسی بہت بڑی ریاست کا مطلق العنان حکمران ہے۔اس کی رعایا اس کے بے پناہ غیظ وغضب سے سہمی رہتی ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

ایک بڑے سیاسی خانوادے کے زمیندار نے بتایا کہ اس نے دیسی گھی کے تین کنستر ریاض کے سالے کے گھر پہنچا دیئے ہیں۔ جواب میں ریاض نے ناک بھوں چڑھائی اور اسے بتایا کہ اسے گھی کی ضرورت نہیں...... ہاں بڑی نہر کے پاس والی دو ایکڑ زمین کا سودا اگر وہ کرا دے تو پھر بات ہے۔ زمیندار نے کہا۔''گھبراؤ نہیں بادشاہو! آپ کے اس کام کے پیچھے بھی لگا ہوا ہوں۔''

ایک صحافی نے خوشامدانہ انداز میں اپنے کسی عزیز کی رہائی کی سفارش کی۔ جواب میں ریاض ہٹلر نے اسے تلخ ترش سنائیں اور کہا کہ وہ جس انگریزی اخبار میں بیس ہزار ماہوار کی نوکری کرتا ہے،اس کے مالک ایڈیٹر کو اس کے (ریاض) سامنے پتلون گیلی ہونے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

پھر بازارِ حسن کی ایک بڑی نائیکہ نے ریاض سے دس پندرہ منٹ گفتگو کی۔ نائیکہ کو لاہور کے بازارِ حسن میں اپنے ایک مخالف گروپ سے واواگیری کی شکایت تھی۔اس مخالف گروپ کی پشت پناہی ایک تماش بین صوبائی وزیر کر رہا تھا۔ جیپ میں سفر کرتے کرتے ریاض ہٹلر نے ڈائریکٹ ایک بڑی سیاسی جماعت کے چیئرمین کو فون کیا اور صاف لفظوں میں اس سے کہا۔''اپنے کتے کو پٹا ڈال کر رکھو۔''

''ورنہ کیا ہوگا؟'' سیاسی جماعت کے سربراہ نے کہا۔

''اس حرام زادے کے جسم سے ہر وہ شے کاٹ کر پھینک دوں گا جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔'' ریاض نے ترت جواب دیا۔''اور یاد رکھو لندن میں علاج کرانے کے لئے جس جس کتیا کے ساتھ تم لیٹتے ہو ان کے نام پتے بھی مجھے معلوم ہیں۔''

پہلے سیاسی لیڈر کی بولتی بند ہوئی پھر اس کا لب ولہجہ تبدیل ہوا اور وہ مفاہمت کی باتیں کرنے لگا۔

شانی نے اس بارے میں سنا تھا اور اب اسے خود بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض ہٹلر ڈی ایس پی ہونے کے باوجود ایس پی سے کہیں زیادہ پاور رکھتا ہے۔اس کے پیچھے کوئی بہت مضبوط ہاتھ تھا۔ یہ ہاتھ اسے اس کے عہدے سے کہیں زیادہ اتھارٹی فراہم کر رہا تھا۔اس کے علاوہ شانی نے ایک اور بات نوٹ کی تھی۔ بازارِ حسن کی نائیکائیں، دلال اور رقاصائیں وغیرہ ریاض ہٹلر سے خاص الخاص تعلق رکھتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے سارے مسائل اور باہمی جھگڑے نمٹانے کے لئے یہ لوگ ریاض ہٹلر سے رجوع کرتے ہیں۔ ریاض ان لوگوں کے ساتھ بھی بے حد بدتمیزی سے پیش آتا تھا اور انہیں ''اعلیٰ پائے'' کی گالیوں سے نوازتا تھا۔ یہ گالیاں سن کر شانی کے کان دکھنے لگے تھے۔شانی کو فون پر ہونے والے مکالموں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ڈپٹی ریاض کے طوائفوں سے تعلقات ہوں۔

جوں جوں وہ لوگ شہری آبادی سے دور آ رہے تھے، موبائل کے سگنل کمزور پڑتے جا رہے تھے پھر وہ یکسر ختم ہو گئے۔ کم از کم اس حوالے سے تو شانی کو سکون محسوس ہوا کہ وہ فون پر ڈپٹی ریاض کی بدزبانی سننے سے محفوظ ہو گئی ہے۔ تایا معصوم اب ہوش میں تھے مگر بالکل خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ان کی حد سے بڑھی ہوئی نقاہت اب انہیں بولنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ان کے ہاتھ بدستور ہتھکڑی میں تھے۔

اچانک وہ منمنائے۔شانی نے ان کی بات سننے کے لئے اپنا کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔''میں نے نماز پڑھنی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ کیسے پڑھیں گے؟'' شانی سسکی۔

''میرے ہاتھ کھلوا دو۔ میں تیمم کروں گا۔''

''تایا نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔'' شانی نے ڈپٹی ریاض سے کہا۔

''کڑکی میں پھنس کر تو ہر کسی کو نماز یاد آ جاتی ہے۔'' ریاض نے تمسخر کیا۔

''یہ ساٹھ سال سے پانچ وقت کے نمازی ہیں اور صرف نمازی نہیں مسجد میں امامت کرتے ہیں۔''

''سارے امام ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ پچھلے ہفتے ہم نے گوجرانوالہ سے ایک امام پکڑا ہے، وہ دس سال سے اسمگلنگ کا کیڑا بیچ رہا تھا۔لندن بھیجنے کے بہانے لوگوں سے پیسے بھی بٹورتا تھا۔''

"خدا کے لئے میرے تایا کے ہاتھ کھول دو۔ یہ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے۔ یہ تو اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔"

ریاض نے چکن برگر کا ایک بڑا سا نوالہ لے کر بیئر کا گھونٹ بھرا اور کانسٹیبل سے کہا۔ "کھول دو بڈھے کو۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

کانسٹیبل نے جیب سے چابی نکالی اور تایا معصوم کی ہتھکڑی کھول دی۔

انہوں نے کراہتے ہوئے تیمم کیا اور پھر نشست کے اوپر پہلو کے بل لیٹے لیٹے ہی اشاروں سے نماز پڑھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ شانی کو محسوس ہوا کہ گردن پر لگنے والی شدید ضرب کے اثر سے تایا ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔

دونوں گاڑیاں قریباً بارہ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد کچے راستے پر آ گئیں۔ پوٹھوہاری ٹیلوں کے درمیان یہ سخت ناہموار راستہ انہیں بتدریج وادی سون کی طرف لے جا رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض کے کارندوں نے جہلم سے کچھ فاسٹ فوڈ لیا تھا۔ یہ کم از کم پانچ ہزار کا کھانا ہو گا اور شانی کے اندازے کے مطابق ریسٹورنٹ والے نے اس کی قیمت نہیں لی تھی۔ آدھا کھانا پچھلی جیپ میں پہنچا دیا گیا تھا...... آدھا اس جیپ میں تھا۔ یہ جیپ میں موجود افراد کی ضرورت سے تقریباً دوگنا تھا۔ ظاہر تھا کہ آگے جا کر اس کھانے کو ٹیلوں میں ہی پھینکا جانا تھا۔

ڈپٹی ریاض نے اپنے مخصوص واہیات انداز میں شانی اور تایا کو بھی کھانے کی دعوت دی لیکن دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

مدھم چاندنی میں دشوار گزار راستوں پر دونوں گاڑیوں کا سفر جاری رہا۔ جیپ میں مرہم پٹی کا معمولی سامان موجود تھا۔ شانی نے جب دیکھا کہ تایا نماز سے فارغ ہو گئے ہیں تو وہ ریاض سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اگر تم کہو تو میں تایا کے ہونٹ پر دوا لگا دوں؟"

وہ سفاکی سے مسکرایا۔ "اتنے چھوٹے چھوٹے زخموں پر دوا لگاؤ گی تو پھر ہر وقت دوائیں ہی لگاتی رہو گی۔ ابھی چھری تلے سانس لو...... جب دوائیں لگانے کا وقت آئے گا تو تمہیں روکوں گا نہیں۔"

شانی سسک کر بولی۔ "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہارا کیا بگاڑا ہے ہم نے؟ تمہاری لڑائی رستم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہے۔ ہمارا اس لڑائی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

ریاض پھنکارا۔ "ذرا اپنے اس پاٹے (پھٹے) ہوئے گریبان کے اندر جھانکو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہی بات کہو کہ تمہارا رستے اور اس کے جینے مرنے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"مم...... میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ تم کچھ بھی سمجھ نہیں رہے ہو اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، یہ بھی بالکل غلط ہے۔ آخر ہم نے......"

شانی کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔ ڈپٹی کا خوف آسیب کی طرح اس کے اعصاب کو جکڑ رہا تھا۔

ڈپٹی ریاض اور اس کے مسکراتے چہروں والے ماتحتوں کی نظریں مسلسل شانی پر لگی تھیں۔ وہ جیسے اس کی بے بسی اور خوف سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے تمسخر آمیز غصے میں کہا۔ "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اچھے بھلے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ بڑھا کر اپنی بدبودار انگلیوں سے شانی کے ہونٹوں کو مسل دیا۔ سگریٹ کی بُو شانی کے اندر تک چلی گئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جو لیکچر تم مجھے پلانا چاہتی ہو...... وہ میں نے پہلے بھی بڑی دفعہ پیا ہوا ہے۔ چلو تم ایک دفعہ اور پلا دو۔ کہہ دو وہ ساری باتیں جو تمہارے اندر اچھالے مار رہی ہیں۔ کہہ دو کہ پولیس عوام کی خدمت گار ہے۔ اسے خدمت گار بننا چاہیے کیونکہ اسے عوام کے خون پسینے کی کمائی سے تنخواہیں ملتی ہیں اور پولیس کا کام تو صرف ملزموں کو پکڑنا ہے۔ پولیس والوں کو چاہیے کہ وہ تھانوں میں ملزموں کو پوری پوری عزت دیں، ان کے آرام کا خیال رکھیں اور ان کو چرغے شرغے کھلائیں کیونکہ وہ مجرم نہیں ہوتے...... ملزم ہوتے ہیں۔ وہ گناہ گار تب ہوتے ہیں جب عدالت میں مجرم ثابت ہوتے ہیں اور اگر وہ مجرم ثابت ہو بھی جائیں تو بھی انہیں سزا دینا پولیس کا نہیں عدالت کا کام ہوتا ہے...... کہہ دو...... کہہ دو یہ ساری باتیں......" ریاض نے دانت پیسے۔

شاید وہ شانی پر مزید برستا لیکن اس سے پہلے ہی جیپ میں رکھا ہوا طاقتور وائرلیس سیٹ جواب تک خاموش پڑا تھا جاگ گیا۔ پہلے اس پر بیپ بیپ کی آواز سے سگنل موصول ہوئے پھر ایک بھرائی ہوئی آواز اٹک اٹک کر سنائی دینے لگی۔ غالباً اب جیپ ایسے علاقے میں پہنچ گئی تھی کہ پولیس کے بیس کیمپ سے مواصلاتی رابطہ بذریعہ وائرلیس ہوتا۔

ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھی وائرلیس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پانچ دس منٹ تک وائرلیس سیٹ سے شوں شاں اور کھڑ کھڑ کی آوازیں آتی رہیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ شاید ٹیلوں کے کسی بلند سلسلے کی وجہ سے لہریں انٹرسیپٹ ہو رہی تھیں۔

تایا معصوم کے بالائی ہونٹ کا زخم قریباً دو انچ لمبا تھا۔ جیپ کے مسلسل جھٹکوں کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور خون قطروں کی صورت میں رس رہا تھا۔ جس کی وجہ سے نشست بھی خون آلود ہو رہی تھی۔

شانی نے ایک بار پھر ڈپٹی ریاض کی توجہ تایا معصوم کے زخم کی طرف دلائی۔ وہ درشت انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے اس بڈھے کے لئے تیری ممتا تڑپ تڑپ جا رہی ہے۔ چل پہلے سیٹ پر سے یہ گند صاف کر جو اس نے مار رکھا ہے..... پھر پٹی کر لے اس کی۔''

شانی نے روئی کے ایک بڑے ٹکڑے سے خون آلود سیٹ صاف کی۔ روئی کے دو بڑے ٹکڑوں سے اس نے وہ خون بھی جزوی طور پر صاف کر دیا جو فرش پر دو تین لوتھڑوں کی شکل میں تھا۔ یہ بدنصیب جمشید کا خون تھا اور پچھلے بارہ چودہ گھنٹے کے سفر میں اس خون کی دید شانی کو مسلسل تکلیف دیتی رہی تھی۔ حیرت کی بات تھی اسی خون کی موجودگی میں ریاض اور اس کے ساتھی اہلکاروں نے چکن برگر بھی کھائے تھے اور بروسٹ مرغیوں کی ٹانگیں بھی ادھیڑی تھیں۔ آج کی اس اندوہناک شب میں وہ غیر معمولی حد تک بے حس لوگوں کے ہمراہ سفر کر رہی تھی۔

اس نے تایا کے زخم کو دھیان سے دیکھا۔ غالباً جب انہیں اٹھا کر جیپ میں پھینکا گیا تھا تو انہیں جیپ ہی کی کسی دھاتی شے سے یہ کٹ لگا تھا۔ بلاشبہ اس کٹ کی سٹیچنگ کی ضرورت تھی لیکن یہ سہولت اس ویرانے میں کہاں میسر تھی۔ شانی نے اینٹی بائیوٹک پاؤڈر چھڑک کر خون کا رساؤ بند کیا پھر اوپر جالی دار پٹی اور کاٹن رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔ اس کارروائی کے دوران جیپ ڈرائیور نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ جیپ دو چار منٹ کے لئے روک لی۔ جتنی دیر شانی تایا کی مرہم پٹی کرتی رہی، ان کی آنکھیں بند رہیں اور ہونٹ مسلسل لرزتے رہے۔

جیپ ایک بار پھر روانہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وائرلیس سیٹ ایک بار پھر جاگ گیا، اس دفعہ بھرائی ہوئی آواز کافی واضح تھی۔

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی انسپکٹر ہے جو وڈے ڈیرے پر ہونے والے آپریشن میں شامل ہے اور جس کے بارے میں موبائل فون پر ایک دوسرے ماتحت مختار نے ریاض کو اطلاعات دی تھیں۔ انسپکٹر کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ ''جناب! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے یہاں۔''

''کیا نیا سیاپا ڈالا ہے؟'' ڈپٹی ریاض نے کہا۔

''وہ لوگ..... وہ لوگ جاوے کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔''

''ڈر لعنت ہے تم پر... کبھی کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔''

''سر! بالکل پتا نہیں چلا اور میرے خیال میں اس میں جاوے کی بھی غلطی ہے۔ میرے

اور دوسروں کے منع کرتے کرتے وہ آگے نکل گیا تھا۔ لگتا ہے کہ وہاں پاس ہی رستم کے ساتھی چھپے ہوئے تھے۔ وہ ایک دم نکلے انہوں نے حوالدار قدیر پر فائر کیا اور جاوے کو گن پوائنٹ پر ساتھ لے گئے۔''

''ایک بار پھر لعنت ہو تم سب پر۔'' ریاض پھنکارا۔ ''میں نے بار بار تم سے بکواس کی تھی کہ گن کے سامنے والی چھوٹی کھائی سے آگے نہیں جانا۔ کی تھی ناں بکواس؟''

''جج..... جی سر۔''

''اور وہ حرامی قدیر مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟''

''اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ نیچے ڈھلوان میں گر گیا تھا، وہاں سے بھاگ کر واپس آیا ہے۔''

''چلو اس کے واپس آنے کی بہت بہت مبارک ہو۔ اپنے ساتھیوں میں کوئی مٹھائی وغیرہ بانٹو۔ ڈھول شول بجاؤ۔ میں بھی ابھی آ کر اس جشن میں شریک ہوتا ہوں۔''

''بس..... سر بس غلطی ہو گئی۔'' ای دوران میں ایک اور بھاری بھرکم آواز وائرلیس سیٹ پر ابھری۔ ''جناب میں تساں دا خادم ولایت ماٹھی بول رہیا ہوں..... جو کچھ ہوا ہے اس پر ہم سارے بڑے بڑے شرمندہ ہیں جی۔ میڈے ساتھی بڑے غصے میں ہیں۔ اساں کو لگتا ہے کہ ابھی وہ لوک جاوا صیب کو لے کر زیادہ دور نہیں گئے اگر تساں کا حکم ہو تو ہم ان کے پیچھے جائیں۔''

شانی نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی پولیس کا معاون اجرالی بول رہا ہے۔

ریاض نے بدستور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ضرور ضرور..... پیچھے جاؤ اور دس پندرہ بندے ساتھ لے کر جاؤ۔ جہاں سے وہ لوگ جاوے کو لے کر گئے ہیں، وہاں سے آگے بارودی سرنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان سرنگوں پر چڑھ کے ذرا ڈانس شانس کرو گے تو تمہاری ٹانگیں ہوا میں اُڑتی نظر آئیں گی۔ بڑا اچھا سین ہوگا۔''

اجرالی ڈر کر چپ ہو گیا۔

انسپکٹر قاسم نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''اب..... آپ کا کیا حکم ہے سر؟''

''میرا حکم چل سکے تو میں تمہیں تمہاری ماں کی کوکھ میں واپس بھیج دوں۔'' ڈپٹی نے زہرناک لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے اور سیاہی مائل چہرہ کچھ اور بھی تمتما گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سگریٹ کے لمبے کش لے کر اپنے اندرونی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر

شانی کی آنکھوں میں نگاہیں گاڑ کر بولا۔ ''دیکھ رہی ہو تاں اپنے یار خصم کے کارنامے۔ اب سریا لال کر کے اس کے اندر گاڑ دوں تو شکایت نہ کرنا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے رستم اور اس کے ساتھیوں کو غلیظ ترین گالیاں دینا شروع کر دیں۔

شانی جان گئی تھی کہ اس وحشی کے سامنے زبان کھولنا اپنی مصیبت میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ وہ جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر بھی تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا سب انسپکٹر اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''لگتا ہے جناب کہ یہ لالہ اور رستما اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے دو لاشیں پارسل کی ہیں۔ یہ جاوا صاحب کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میرا تو خون کھول رہا ہے جناب۔ آپ جو سخت سے سخت ڈیوٹی مجھے دیں، میں کرنے کے لئے سو فیصد تیار ہوں۔''
سب انسپکٹر کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پکڑے جانے والے جاوا نامی شخص سے سب انسپکٹر کا قریبی تعلق تھا۔

دو دیگر اہلکاروں نے بھی نیم گنجے سب انسپکٹر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کی باتوں سے شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جواد عرف جاوا نامی بندہ اپنے ساتھیوں میں کافی مقبول ہے۔ وہ کوئی پہلوان نما شخص تھا اور دو چار بندوں کے لئے اس پر خالی ہاتھ قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ شانی کے اندازے کے مطابق اس شخص کا عہدہ انسپکٹر کے لگ بھگ تھا۔ نیم گنجا سب انسپکٹر اسے جاوا صاحب کہہ کر بلا رہا تھا جب کہ جیپ میں موجود ایک سادہ پوش انسپکٹر اسے صرف جاوا کہہ رہا تھا۔

ایک ہیلی کاپٹر پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے سروں پر سے گزرا۔ ڈپٹی ریاض کھڑکی کا شیشہ اُتار کر ہیلی کاپٹر کا رخ دیکھنے لگا۔ دیگر اہلکار بھی تاریک آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈپٹی ریاض نے ایک گونج دار ڈکار لی پھر دو منٹ کے لئے جیپ رکوا کر اس نے جھاڑیوں میں کھڑے کھڑے پیشاب کیا۔ دو تین اہلکار بھی جھاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہوئے۔ تایا معصوم نے غنودگی کی کیفیت میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''شانی پتر! عزت و آبرو سے وڈی کوئی چیز نہیں۔ کوئی بُرا وقت آیا تو ہنس کر جان دے دینا۔''

شانی نے جھک کر اپنا سر ان کے سر سے لگایا اور سسکی۔ ''آپ بے فکر رہیں تایا۔''

تایا معصوم چند سیکنڈ خاموش رہے پھر ہولے سے بولے۔ ''رستم کی وجہ سے تیری زندگی تباہ ہو گئی دھی رانی۔''

''نہیں تایا نہیں۔'' شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو خود میری وجہ سے آگ میں کودا ہے۔''

تایا ایک لمبی سانس لے کر رہ گئے۔ انہوں نے جیسے ایک دم ہی بحث کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اپنا زخمی ہاتھ انہوں نے ہولے سے شانی کے سر پر رکھا۔ ''شانی پتر! ان لوگوں نے اب مجھے زندہ نہیں چھوڑنا۔ دل میں ایک ہی پریشانی ہے۔ میری میت خراب نہ ہو۔''

''کچھ نہیں ہوگا تایا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' شانی نے سسک کر کہا اور ان کی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔''

شانی کا دل چاہا کہ اپنے زخمی تایا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اور اُڑ کر کہیں دور بہت دور لے جائے۔

اسی دوران میں ریاض دندناتا ہوا واپس آ گیا۔ ''اوئے! یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے.... تایا بھتیجی میں؟''

نیم گنجے سب انسپکٹر نے شانی کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ تایا معصوم سے دور ہٹ کر بیٹھے پھر ریاض کی شہ پا کر اس نے شانی کو باقاعدہ بازو سے کھینچ کر معصوم علی سے دور ہٹا دیا۔

ریاض نے اپنی بالوں بھری کلائی موڑ کر دستی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے! اچھو! اپنی اس ماں کی سپیڈ ذرا تیز کر۔''

ڈرائیور اچھو نے اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ جیپ جو پہلے ہی ناہموار راستے پر بُری طرح اچھل رہی تھی اب مزید اچھلنے لگی۔ شانی پچھلے دس گھنٹوں سے مسلسل جھٹکے کھا رہی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا لیکن وہ کم از کم زخمی تو نہیں تھی۔ تایا معصوم زخمی تھے۔ خاص طور سے گردن کی چوٹ انہیں بہت اذیت دے رہی تھی۔ تایا کی اذیت کے خیال نے شانی کو اپنی اذیت بھلا دی۔

شانی کے سر پر بے رحم آسمان تھا اور نیچے سنگلاخ زمین۔ آسمان اور زمین کا درمیانی خلا بہ وادی سون کی پُراندیش تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ طاقتور جیپ اس تاریکی کا سینہ چیرتی اچھلتی کودتی ایک خطرناک منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شانی نے اپنی کلائی کی سلور کلر کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوئیاں رات تین بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔

☆======☆======☆

رستم نے لالٹین کی لو تھوڑی سی اونچی کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ جو تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ڈیرے کے اس کمرے میں رستم کے علاوہ شاہ، کاٹھیا

اور آہوجہ وغیرہ موجود تھے۔ مراد اور اس کے دو ساتھی بھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ قریباً ساڑھے چھ فٹ کا ایک نہایت ہٹا کٹا مضبوط شخص سامنے لوہے کی ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اسے باندھنے کے لئے سن کی وہی رسیاں استعمال کی گئی تھیں جن سے باقر اور ہیرا کی لاشیں گدھوں کی پشت پر بندھ کر ڈیرے پر پہنچی تھیں۔

یہ ہٹا کٹا شخص سیالکوٹ، پسرور اور گوجرانوالہ کا نامی گرامی بدمعاش جاوا تھا۔ شروع میں یہ دیہاتی زبردست قسم کا لٹھ باز اور کلہاڑی باز تھا۔ بعد میں وہ لاہور آیا اور پولیس میں بھرتی ہونے کی کوشش کی۔ اسے ٹریفک پولیس میں کانسٹیبل کی نوکری مل گئی۔ اپنے اونچے قد کی وجہ سے وہ چوک میں کھڑا ایک جن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس کو خوف آمیز دلچسپی سے دیکھتے ہوئے گزرتے تھے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ مال روڈ کے چوک میں کھڑے ایک سارجنٹ نے دیر سے آنے پر اسے سخت سُست کہا اور گالی دے دی۔ جاوا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سارجنٹ پر پل پڑا۔ سینکڑوں لوگوں نے کانسٹیبل کے ہاتھوں سارجنٹ کی پٹائی کا یادگار تماشا دیکھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جواد عرف جاوا کی پیٹی اُتر گئی بلکہ اسے ایک سال کی قید بھی بھگتنا پڑی۔ ایک سال کی قید سے وہی کچھ ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔ جاوا جو کچا پکا بدمعاش تھا، پورا بدمعاش بن کر جیل سے نکلا۔ اس نے سیالکوٹ اور اردگرد کے علاقے میں تڑتھلی مچا دی۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑے اور بے شمار وارداتیں کیں۔ اس کی وارداتوں کا نشانہ زیادہ تر دیہاتی علاقے ہی تھے۔ اسے ''جاوا سپاہی'' اور ''جاوا ہڈی توڑ'' جیسے خطاب بھی دیئے جاتے تھے۔ لاٹھی اور چھری والی لاٹھی چلانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

پھر ایک روز غیر متوقع طور پر یوں ہوا کہ جاوے کو دوبارہ پولیس میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس مرتبہ وہ نہ صرف کرائم پولیس میں گیا بلکہ نہ جانے کس طرح ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہوا۔ شاید مقامی بدمعاشوں سے نمٹنے کے لئے سیالکوٹ پولیس کو کسی بدمعاش کی ضرورت تھی۔ یوں دادا گیری کی کوالیفیکشن جاوے کے کام آ گئی۔ پولیس میں آنے کے بعد بھی جاوا بدمعاش کا بدمعاش ہی رہا۔ وہ ڈپٹی ریاض کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا اور سفاکی میں خوب نام کما چکا تھا۔

جاوے کو قریباً ایک گھنٹا پہلے مراد اور اس کے چار ساتھیوں نے پکڑا تھا۔ جاوا بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پوزیشنوں سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ ایک اور بندہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ عین ممکن تھا کہ جاوے اور اس کے ساتھی کو تھوڑا سا وقت مزید مل جاتا تو وہ اپنی اگلی

پوزیشن سے مزید ڈیڑھ دو سو میٹر آگے پوزیشن بنا لیتے۔ اس موقع پر مراد نے واقعی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے کارروائی کر کے جاوے کو جھاپ لیا۔ اس کا ساتھی زخمی حالت میں فرار ہو گیا۔

جاوے کو پکڑ کر مراد نے ایک اہم کامیابی حاصل کی تھی اور اس طرح کسی حد تک رستم کے سامنے اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے تک جاوا زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ اب اسے مضبوط آہنی کرسی کے ساتھ رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ رستم، مراد اور آہوجہ اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ جواب میں وہ سب کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے قریباً سوا فٹ لمبے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

مراد نے کسی پروفیشنل باکسر کے انداز میں ایک بھرپور مکا جاوے کی چوڑی چکلی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ جاوے کی کرسی الٹتے الٹتے بچی۔ مراد نے اس کے گھنگریالے بال مضبوطی سے اپنی مٹھی میں جکڑے اور بے رحم جھٹکا دے کر پھنکارا۔ ''بکواس کرے گا یا گردن تڑوائے گا۔ بول ٹوٹل کتنی گنیں ہیں سامنے والی پوزیشنوں پر؟''

''تجھ کو بتایا تو ہے کہ میں نے گنی گئی نہیں اور گنی ہوتیں تو بھی تمہیں نہ بتاتا۔'' جاوا خون تھوک کر بولا۔ اس کی آواز بھاری اور لہجہ دیہاتی تھا۔

''اچھا یہ بتا دے وہ بوبلی کتا ریاض کہاں ہے؟'' مراد نے پوچھا۔

''ریاج صاحب سے تمہارے ملنے کی تمنا بڑی جلدی پوری ہوگی اور بڑی چنگی طرح پوری ہوگی۔ اب جیادہ دیر انتجار نہیں کرنا پڑے گا۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

مراد نے ایک بار پھر اس کی ٹھوڑی پر مکا رسید کیا۔ اس مرتبہ مکے میں زیادہ طاقت تھی۔ جاوا کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس کے گرنے سے ایک بڑی لالٹین چکنا چور ہو گئی اور جاوے کی ٹانگیں کھڑی ہو گئیں۔ تین افراد نے مل کر اس گرانڈیل کو بہ مشکل سیدھا کیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے لگا تھا۔

وہ وحشت آمیز انداز میں بولا۔ ''باندھ کر مار رہے ہو۔ اکیلے سے اکیلا آؤ اگر پیو کے ہو تو۔''

مراد کے سارے رگ پٹھے تن گئے تھے۔ اس نے اپنی قمیص اُتار کر پھینک دی۔ اس کا کسرتی جسم مشعلوں کی روشنی میں دمکنے لگا۔ وہ رستم کی طرف دیکھ کر پکارا۔ ''کھلوا دو اس حرامزادے کو۔ میں اس کو 'اکیلے سے اکیلے' کا مزہ چکھاتا ہوں۔''

مراد کی اس آفر کے ساتھ ہی جاوے کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ صورت سے ہی نہایت خطرناک لڑاکا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر لڑائی بھڑائی سے آنے والے زخموں کے کئی نشانات تھے۔ سامنے کا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ مراد سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اگر اپنے پیو کا نام پتا جانتے ہو تو اپنی بات پر قائم رہنا۔ دو دو ہتھ کرلو میرے ساتھ اگر جت گئے تو جو کہو گے وہ مانوں گا اور اگر ہار گئے تو پھر......؟''

''پھر چھوڑ دیں گے تمہیں۔'' مراد سینہ تان کر بولا۔

''منجور ہے۔ کھولو میری رسیاں۔''

ایک ساتھ ہی بہت سے لوگ بولنے لگے۔ مقابلے کی بات سن کر ارد گرد موجود لوگ بھی دروازے کے سامنے جمع ہو گئے۔ مراد کے چند قریبی ساتھی للکار کر بولے۔ ''ٹھیک ہے کھولو اس بدمعاش کو۔''

رستم نے ہاتھ اٹھا کر مجمع کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ موجودہ حالات میں اس قسم کے خونی تماشے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا تاہم اس کے پچانوے فیصد ساتھیوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ یہ تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ خود مراد کے چہرے پر بھی بے پناہ جوش تھا۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر باکسر تھا اور اس کے مکے کی دھوم تھی۔ چند ماہ پہلے جب نادیہ کے سلسلے میں تنازعہ ہوا تھا تو مراد اور رستم الجھ پڑے تھے۔ گو رستم نے مراد کی طبیعت صاف کردی تھی لیکن مراد کے ایک دو مکے اسے جھیلنے پڑے تھے۔ ان کا وزن اور شاک ابھی تک رستم کو یاد تھا۔

جونہی رستم نے نیم رضامندی ظاہر کی، لوگ ایک وسیع دائرے کی صورت میں کھلی جگہ پر جمع ہونے لگے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا لیکن لگتا تھا کہ دن کا وقت ہے۔ ہر شخص پوری طرح بیدار تھا۔ کچھ بڑی مشعلیں مخصوص مقامات پر گاڑ دی گئیں اور کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ رات آخری پہر کی ہوا میں مشعلوں کے شعلے دھیرے دھیرے پھڑک رہے تھے۔

جونہی جاوے کے گرد لپٹی ہوئی سن کی رسیاں کھولی گئیں، وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سفید شلوار اور بنیان میں تھا۔ اس کی قمیص کھینچا تانی کے دوران میں پھٹ کر اس کے جسم سے جدا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سے بہتا ہوا خون اپنی قمیص کی دھجیوں سے صاف کیا۔ اس کی قامت متاثر کن تھی۔ رسیوں کی مضبوط بندش نے اس کے بازوؤں اور سینے پر گہری سرخ دھاریاں ڈال دی تھیں۔

وہ پھنکار کر بولا۔ ''مزہ تو تب ہے کہ اس لڑائی میں جو مر جائے وہ ہار جائے..... جو جندہ رہے وہ جِت جائے۔''

یہ جاوے کا دوسرا خوفناک چیلنج تھا۔ ایسا چیلنج وہی کرتا ہے جسے اپنی بے پناہ طاقت پر بھروسا ہوتا ہے۔ مراد ایک سیکنڈ کے لئے متذبذب نظر آیا لیکن اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ تن گیا۔ وہ دھاڑا۔ ''ٹھیک ہے...... جو ہار گیا وہ مر گیا۔''

''چنگی طرح سوچ لے چن کھناں...... جندگی دوبارہ نہیں ملتی۔'' جاوے نے مراد پر نفسیاتی دباؤ ڈالا۔

''تُو بھی سوچ لے، جتنا بڑا جثہ ہوتا ہے جان بھی اتنی ہی پھنس پھنس کر نکلتی ہے۔''

''اپنے چمچوں کڑچھوں کو سمجھا لے اچھی طرح یہ نہ ہو کہ تُو مرنے لگے تو ان کی ممتا جاگ جائے اور وہ بیچ میں کد (کود) پڑیں۔''

''اس معاملے میں تُو بے فکر رہ۔'' مراد نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''ہمارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔''

جاوے نے اردگرد موجود ہجوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے اپنے دو ساتھیوں کی حسرت ناک لاشیں دیکھی تھیں جنہیں گدھوں پر باندھ کر یہاں بھیجا گیا تھا۔ اب وہ سب جاوے کو بھی ایک کٹی پھٹی لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جاوے نے رستم کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ہتھیار کون سا ہوگا؟'' اس کا مطلب تھا کہ لڑائی میں کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے گا۔

رستم نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''ہتھیار کوئی نہیں ہوگا۔ ہم خالی ہاتھ لڑیں گے اور میں خالی ہاتھوں سے ہی تیری کھوپڑی توڑوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی...... یہ جندگی موت کی لڑائی ہے۔ یہ خالی ہتھ نہیں ہوسکتی۔''

''نہیں خالی ہاتھ ہوگی اور حرامزادے میرا وعدہ ہے تجھے مرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔'' مراد نے اپنی کلائیوں کو وارم اَپ کرتے ہوئے کہا۔

جاوا مسکرایا تو اس کے ٹوٹے ہوئے دانت کا خلا نمایاں ہو گیا۔ ''میں اتنا کھوتا نہیں ہوں جتنا تُو سمجھتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' مراد کا لہجہ کڑا تھا۔

''تُو کراچی کا مانا ہوا بوکسر (باکسر) ہے۔ میں پیشاب کرتا ہوں تیری بوکسری پر یہ لڑائی ہتھیار کے ساتھ ہوگی۔ تیرا جو دل چاہے، وہ ہتھیار چن لے۔ میں تیار ہوں۔''

مراد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی اصل طاقت اس کی شاندار مکے بازی میں تھی لیکن جاوا توقع سے زیادہ عیار تھا۔ وہ اس لڑائی کے لئے ہتھیاروں کی طرف جا رہا تھا۔ مراد نے سوالیہ

نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔

رستم نے پوچھا۔ ''تُو کون سا ہتھیار چاہتا ہے؟''

جاوے کا سفاک چہرہ کچھ اور سفاک ہوگیا۔ ''لوہے کی شاموں والی لاٹھی میری پسند کا ہتھیار ہے لیکن میں اس حرامی مرادے کی طرح ڈرپوک نہیں ہوں کہ اسے اپنی پسند کی طرف کھینچوں۔ تم کوئی سا ہتھیار بھی مشورے سے طے کرلو۔''

مراد کی آنکھوں میں شعلے رقص کر گئے۔ وہ گرجا۔ ''ٹھیک ہے۔ لاٹھی، کلہاڑی، برچھا جو دل چاہے لے آؤ میں تیار ہوں۔'' اس نے اپنی پتلون کے پائنچے اُڑسے اور جوگر اُتار کر دور پھینک دیئے۔ مجمع میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

رستم نے گہری نظروں سے مراد کو دیکھا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا..... مراد جوش میں آکر غلطی کر رہا ہے۔ کسی بھی ہتھیار کے ساتھ یہ خطرناک دیو مراد پر بھاری رہے گا۔ رستم کے تصور کی نگاہ نے اسے پتھریلی زمین پر پڑی ہوئی مراد کی لاش دکھائی دی۔ اس کی نیلی جین خون سے سرخ ہورہی تھی اور اس کے سرہانے دیو ہیکل جاوا ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر بڑھکیں مار رہا تھا۔

رستم کا سینہ جل اٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے سر پر کسا ہوا رومال اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر یہ لڑائی ہتھیار کے ساتھ ہونی ہے تو پھر اس کے ساتھ میں لڑوں گا۔''

ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔ مراد نے احتجاجی انداز میں رستم سے کچھ کہنا چاہا لیکن رستم اس کے بولنے سے پہلے بول پڑا۔ ''تم چپ رہو مراد...... یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''لیکن اس نے ... ...''

رستم نے مراد کی بات تیزی سے کاٹی۔ ''دیکھ مرادا! میں نے تجھ سے کیا کہا تھا۔ لالے کے بعد یہاں میں سردار ہوں۔ میرا کہا ماننا پڑے گا۔''

''تو اب تم لڑو گے؟'' جاوے نے رستم کو مخاطب کیا۔

''کیوں؟ تمہیں کیوں اعتراض ہے۔ ابھی تم نے خود ہی کہا ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک آجائے۔''

''ہاں.....تم ہی آجاؤ۔ مجھے تمہاری ٹانگیں چیر کر جیادہ خوشی ہوگی۔'' جاوے کے چہرے پر نظر آنے والی ہیجانی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے چٹانی

سینے کو زور سے کوٹا اور نفرت سے زمین پر تھوکا۔

آہوجہ، کاٹھیا اور شاہ وغیرہ آگے آئے۔ شاہ نے دلگیر لہجے میں کہا۔ ''رستم بھائی! ہم آپ کو اس خطرے میں نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم کیا مرگئے ہیں سارے۔''

''تمہاری ہمدردی اپنی جگہ ہے لیکن میں نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔ اسے میرا حکم سمجھو۔'' رستم کا لہجہ بے لچک تھا۔

شاہ سرگوشی میں بولا۔ ''اللہ نہ کرے..... آپ کو کچھ ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ لالہ اور حسنا بھائی تو پہلے ہی بستر پر ہیں۔''

''اگر ان کے بغیر کام چل رہا ہے تو میرے بغیر بھی چل جائے گا۔ ویسے بھی تم بے فکر رہو۔ اس شہدے سے زیر ہونے والا نہیں ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے.....ابھی تھوڑی دیر میں تم اس حرامی کو زمین چاٹتا دیکھو گے۔''

رستم اپنی آستین اُڑستا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے درجنوں ساتھیوں نے پُرجوش نعرے بلند کیے۔ ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنے ساتھیوں کی کٹی پھٹی لاشیں دیکھی تھیں اب وہ جاوے کی لاش دیکھنا چاہ رہے تھے۔

جاوے نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس بات کی کیا جمانت ہے کہ اگر میں تمہیں جیت لوں تو یہ لوگ میرے ٹکڑے نہیں کردیں گے؟''

''میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ اس لڑائی میں نہ کوئی دخل دے گا اور نہ تمہاری جیت کے بعد کوئی تمہیں نقصان پہنچائے گا۔''

''اگر میں جیت گیا تو کیا یہ لوگ مجھے واپس جانے دیں گے؟''

رستم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''یہ بندہ اس لڑائی کو زندگی اور موت کی لڑائی بنا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑائی ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہوگی اگر یہ میری موت پر ختم ہو تو پھر اس بندے کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ جیسا اور جس حالت میں بھی ہو اسے بارودی سرنگوں سے آگے ٹیلوں کی طرف نکال دیا جائے۔''

سب خاموش رہے۔ رستم نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔ ''میں تم سب کی طرف سے ضمانت دے رہا ہوں۔ کیا تم میری ضمانت کو جھوٹا ثابت کرو گے؟''

آہوجہ نے ہمت کر کے کہا۔ ''ٹھیک ہے رستم بھائی۔ ہم تمہارے سامنے چوں بھی نہیں کر سکتے۔ تم ہمیں پہاڑ سے کودنے کو کہو گے تو ہم کود جائیں گے لیکن... ...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں... نادر کاکا کہا کرتا تھا لیکن کے آگے بہانے شروع ہوتے

ہیں۔'' رستم نے تیزی سے آہوجہ کی بات کاٹی۔

''ٹھیک ہے رستم بھائی۔ ہم وہی کریں گے جو تم کہتے ہو۔'' آہوجہ نے مری مری آواز میں کہا۔

جاوا میدان کے درمیان کھڑا تھا اور سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''تم نے سنا یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ اور یہ پولیس والے نہیں وڈے ڈیرے کے ڈاکو ہیں۔ زبان کے لئے جان دے دیتے ہیں۔ اگر تم نے مجھے جیت لیا تو وہی ہوگا جو یہ کہہ رہے ہیں۔''

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دلوں میں دھڑکن نقارے کی طرح گونج رہی تھی اور سانسوں کی لے بہت تیز تھی۔ اس خیال سے جاوے کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی کہ وہ زندہ رہنے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک بھرپور کوشش کر سکتا ہے۔

رستم کے اشارے پر ہجوم نے دائرے کو کچھ اور وسیع کر دیا۔ اس نے اپنی گھڑی اُتار کر آہوجہ کو تھمائی اور جوتے اُتار کر قمیص کی آستینیں اُڑس لیں۔

''کون سا ہتھیار چاہتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''کہا تو ہے..... مجھے لوہے کی شاموں والی لاٹھی پسند ہے لیکن اس کے علاوہ بھی جو تم چاہو مجھے منظور ہے۔''

''لوہے کی شاموں یا کوکوں والی لاٹھی تو شاید یہاں نہ ہو مگر کلہاڑی ہر سائز کی مل جائے گی۔''

''ٹھیک ہے مجھے تمہیں لمبے دستے والی کلہاڑی سے مار کر بھی خوشی ہوگی۔'' وہ بے پناہ اعتماد سے بولا۔

یہی وہ اعتماد تھا جو مدِمقابل کو لرزہ بہ اندام کر دیتا ہے لیکن اس کے مدِمقابل بھی کوئی عام شخص نہیں تھا۔ وہ بے شمار سورماؤں کو زمین چٹا چکا تھا۔ وہ خالی ہاتھوں سے بھی بندے کو یوں آناً فاناً قتل کر سکتا تھا جیسے آتشیں ہتھیار سے کیا جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں عقاب کی تیزی اور حرکات میں زخمی چیتے کی سی پھرتی تھی۔ وہ مدِمقابل کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اس کا ارادہ بھانپ لیتا تھا اور اس کی توقع سے پہلے وار کر دیتا تھا۔ وہ نام ہی کا نہیں کام کا بھی رستم تھا۔ بظاہر دیکھنے میں وہ دھیما اور ٹھہرا ہوا تھا لیکن جب کسی سے نبرد آزمائی کا مرحلہ آتا تھا تو اس کے جسم میں بجلیاں چمکتی تھیں اور وہ سرتاپا آگ بن جاتا تھا۔

رستم نے کاٹھیا وغیرہ کو حکم دیا اور پانچ منٹ میں لمبے دستے کی چار پانچ کلہاڑیاں موقع

پر پہنچ گئیں۔ ان کے دستے چھ سات فٹ لمبے تھے۔ دو کلہاڑیوں کے پھل اور دستے باقی کلہاڑیوں سے زیادہ موٹے اور وزنی تھے۔ ان کی تیز دھاریں مشعلوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

کلہاڑیاں میدان میں ایک پتھر پر رکھ دی گئیں۔ رستم نے جاوے کو دعوت دی۔ ''چن لو اپنے لئے کلہاڑی۔''

جاوے نے اپنے لئے موٹے دستے اور وزنی پھل والی کلہاڑی چنی۔ بڑے ماہرانہ انداز میں اس کے بلیڈ پر اپنی انگلیاں پھیریں اور دستے کو اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر دیکھا پھر اس نے کلہاڑی کو چابکدستی سے اپنے اردگرد گھمایا اور مطمئن نظر آنے لگا۔

رستم نے جاوے کی تقلید نہیں کی اور نسبتاً ہلکے پھل والی کلہاڑی لی۔ لٹھ بازی میں رستم کو بھی ملکہ حاصل تھا۔ کلہاڑی بازی اور لٹھ بازی کی بنیادی تکنیک میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ قدموں کا استعمال، اپنے گرد دفاعی حصار قائم کرنا، اپنے سر کو ہدف بننے سے بچانا اور مدِمقابل کے سر کو ہدف بنانا، یہ اصول کلہاڑی اور لاٹھی کے استعمال کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

ایک ڈھولچی کہیں سے ڈھول لے آیا تھا۔ وہ میدان کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نہایت سنگین لڑائی کا فیصلہ زندگی یا موت پر ہونا تھا لہٰذا منصف وغیرہ کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ (اس کے بجائے شاید ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو دیکھ سکے کہ ایک حریف اپنی جان کی بازی ہار گیا ہے) پھر بھی روایتی طور پر ایک منصف سر پر پگڑی لپیٹ کر اکھاڑا نما میدان کے درمیان آ گیا۔ ایک طرف رستم اور دوسری طرف جاوا ہاتھوں میں مہلک کلہاڑیاں لئے کھڑے تھے۔ حاضرین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ چہرے اندرونی غضب سے تمتما رہے تھے۔

بھاری بھرکم ڈھول پر چوٹ پڑی۔ عمر رسیدہ منصف نے ہاتھ لہرایا اور درمیان سے ہٹ گیا۔ دو نہایت مہلک لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ یہ خوفناک پھل کی کلہاڑیاں تھیں۔ دونوں میں سے کسی کا داؤ چل جاتا تو ایک ہی ضرب ''کافی'' ثابت ہو سکتی تھی۔ یعنی اس بات کا امکان موجود تھا کہ یہ سنسنی خیز لڑائی بس چند سیکنڈ میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ دونوں محتاط انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہولے ہولے اپنی جگہ بدلتے رہے اور ایک دوجے کے ارادے کو بھانپتے رہے۔

پھر پہلا وار جاوے نے ہی کیا تھا۔ ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ وہ حملہ آور ہوا۔ رستم نے اس کا وار اپنی کلہاڑی پر روکنے کے بجائے پیچھے ہٹ کر بچایا۔ دوسرا وار بھی ایسے ہی خالی دیا۔ تیسرا وار اس نے اپنی کلہاڑی کے دستے پر لیا اور جاوے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کر کے

اسے دور تک لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔

رستم کے ساتھیوں نے خوش ہو کر للکارے بلند کیے۔ ڈھولچی کے ڈھول کی تھاپ بلند ہوگئی۔ قرب و جوار اس آواز سے تھراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تماشائیوں کی آنکھوں میں جوش و خروش کے ساتھ عجیب طرح کا خوف بھی موجود تھا۔ وہ جانتے تھے یہ عام لڑائی نہیں ہے۔ ان کے سامنے موجود دونوں جیتے جاگتے انسانوں میں سے ایک کو بہر صورت ان کی آنکھوں کے سامنے مرنا تھا۔ لاش میں تبدیل ہونا تھا۔ یہ واقعہ کسی آتشیں ہتھیار کی گولی سے رُونما ہوتا تو اور بات تھی مگر یہاں تو تیز دھار کلہاڑیاں ٹکرا رہی تھیں۔ تماشائی جانتے تھے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے موت کم ہی واقع ہوتی ہے۔ کاری ضرب کھانے والا پہلے گرتا ہے پھر اس پر پے در پے وار کیے جاتے ہیں۔ گوشت اور ہڈیوں میں دھنسی ہوئی کلہاڑی اکھاڑی جاتی ہے، پھر دھنسائی جاتی ہے پھر اکھاڑی جاتی ہے۔ یہ لرزہ خیز منظر ہوتا ہے اور یہ منظر یہاں دکھائی دینے والا تھا۔

وہ سب پُر جوش تھے اور خوف زدہ بھی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ وہ اسے ہونے سے روک نہیں سکے تھے۔ جاوے نے مراد کو چیلنج کیا تھا پھر جاوا اور رستم خم ٹھونک کر میدان میں آگئے تھے اور اب خونی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ تماشائیوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن میں یہ سب دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ڈکیت قاتل ہونے کے باوجود وہ ان مناظر سے اپنی نگاہ مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ موقع سے ہٹ گئے تھے یا دائرے میں کھڑے لوگوں کے پیچھے جا بیٹھے تھے۔

دائرے کے اندر موت اور زندگی کا کھیل جاری تھا۔ اپنے پیٹ پر رستم کی زوردار ٹانگ سہنے کے بعد جاوا آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کی کلہاڑی برق کی طرح تڑپنے لگی، وہ جھپٹ جھپٹ کر رستم پر حملہ آور ہوا اور ہر جھپٹ کے ساتھ اس نے خاص انداز میں چنگھاڑ بلند کی۔ رستم نے اس کے زیادہ تر وار اپنے کلہاڑی پر روکنے کے بجائے اپنے جسم کو کلہاڑی کی زد میں آنے سے ہٹا کر بچائے۔ اس کی عقابی نگاہ حملہ آور کلہاڑی کے پھل پر تھی اور وہ اپنے جسم کو اس قاتل پھل سے دور رکھے ہوئے تھا۔ ایک دو مرتبہ جاوے کی کلہاڑی کا پھل سنگلاخ پتھروں سے ٹکرایا اور چنگاریاں سی پیدا ہوئیں۔ گاہے بگاہے رستم نے بھی جاوے پر وار کیا لیکن زیادہ تر وار جاوے نے کیے۔ اگلے دو تین منٹ میں جاوے کی کلہاڑی کا پھل تین بار رستم کے جسم سے چھوا۔ پہلی بار کندھے پر کٹ لگا۔ دوسری بار ران پر ہلکی سی چوٹ آئی۔ تیسری مرتبہ کلہاڑی الٹے رخ سے رستم کے پیٹ میں لگی۔

جاوے کے ہاتھ میں وزنی کلہاڑی تھی۔ تین چار منٹ کی مارا ماری میں اس کے بازو تھک گئے۔ وار میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔ ایک ایسے ہی وار کے خالی ہونے کے بعد جب جاوا اپنی کلہاڑی کو سنبھال رہا تھا۔ رستم نے پوری طاقت سے ایک جچا تلا وار کیا۔ تماشائیوں نے بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ کلہاڑی جاوے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ قریباً پندرہ فٹ دور پتھریلی زمین پر گری۔ تماشائیوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ جاوے نے تڑپ کر اپنی گری ہوئی کلہاڑی کی طرف جانا چاہا مگر رستم نے اس کا راستہ روک لیا۔

جاوے کو صرف اعزاز کے طور پر انسپکٹر کا عہدہ دیا گیا تھا ورنہ اس میں انسپکٹروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ صرف ایک بدمعاش تھا۔ اس کا ڈیل ڈول اسے ایک گرانڈیل بدمعاش ظاہر کرتا تھا۔ فنِ حرب میں ماہر، ایک خونخوار بدمعاش۔

جاوے کے چہرے پر رنگ سا لہرایا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور رستم کا وار بچانے کے لئے تیار ہوگیا۔ رستم کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ جاوے اور اس کی کلہاڑی کے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا عندیہ تھا کہ جاوا اپنی گری ہوئی کلہاڑی پھر اٹھا سکتا ہے۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔

جاوے نے چند سیکنڈ سوچا پھر اپنی گری ہوئی کلہاڑی کے بجائے ان کلہاڑیوں کی طرف بڑھا جو ادھیڑ عمر منصف نے ایک طرف چٹائی پر رکھ دی تھیں۔

''میں دوسری کلہاڑی لوں گا۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

منصف نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔

''اسے لینے دو۔'' رستم نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ جاوے نے نسبتاً پتلے پھل کی ہلکی کلہاڑی اٹھائی۔ شاید یہ بات اس کے دماغ میں آئی کہ وزنی کلہاڑی نے اسے تھکا دیا ہے۔ اب وہ رستم کی ہلکی کلہاڑی کا مقابلہ ہلکی کلہاڑی سے کرنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ پلٹا تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اب رستم کے ہاتھ میں وزنی کلہاڑی نظر آ رہی تھی۔ (یہ جاوے کی گری ہوئی کلہاڑی ہی تھی) جواد عرف جاوا کلہاڑی اٹھا چکا تھا۔ اب اسے اس بات میں سبکی محسوس ہوئی کہ رستم کے کلہاڑی بدلنے پر وہ پھر کلہاڑی بدل لے۔

رستم کے کندھے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، دوسری طرف جاوے کے منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس بہتے ہوئے خون نے اس کی ٹھوڑی کو رنگین کر کے چہرے کو مزید خوفناک بنا دیا تھا۔ منصف درمیان سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں کلہاڑیاں سونت کر پھر ایک

دوجے کے مقابل آئے۔ ایک دوسرے کو نگاہوں میں تولا۔ ڈیرے کے مکین رستم کی برتری کا اندازہ لگا چکے تھے۔ وہ اپنے سردار کی کامیابی کو واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا جوش وخروش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ رات کے اس آخری پہر ویران ٹیلوں میں زندگی اور موت کی جنگ دیکھنے کے لئے جیسے آسمان پر چمکنے والے ستارے بھی پلکیں جھپکنا بھول گئے تھے۔ ڈھول کی دھما دھم، مشعلوں کے بھڑکتے شعلے، تماشائیوں کے ہاتھوں میں لہراتے ہتھیار یہ سب کچھ مل کر ماحول کو کچھ اور بھی سنسنی خیز بنا رہا تھا۔

لڑائی ایک بار پھر شروع ہوئی۔ اس مرتبہ رستم کے پاس وزنی کلہاڑی تھی۔ اب وہ جادے کی ضربوں سے بچنے کے بجائے ان ضربوں کو اپنی کلہاڑی پر لے رہا تھا۔ اس کی وزنی کلہاڑی آسانی سے ان ضربوں کو جھیلنے لگی۔ یوں رستم کی جسمانی مشقت بھی کم ہوگئی۔ گو اس نے بروقت وار کر کے ایک مرتبہ جادے کی کلہاڑی اس کے ہاتھوں سے نکال دی تھی، اس کے باوجود وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جادا ایک نہایت خطرناک اور مشاق حریف ہے۔ اس پر کاری ضرب لگانے کے لئے بے حد مہارت اور صبر کی ضرورت تھی۔ لڑائی کے اس دوسرے مرحلے میں رستم نے جواد عرف جادے پر کئی تند و تیز وار کئے مگر وہ ہر بار دفاع کرنے میں کامیاب رہا۔

تین چار منٹ بعد جادا ذرا تھکا ہوا محسوس ہوا تو رستم نے یک دم اس پر چڑھائی کر دی۔ رستم کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ جادے کے قدم جمے نہ رہ سکے۔ وہ وار روکتا اور لڑکھڑاتا ہوا تماشائیوں کے اوپر گرا۔ اب تماشائیوں کے گھائل ہونے کا خطرہ تھا۔ رستم نے تو اپنا ہاتھ روک لیا لیکن جادے نے نہیں روکا۔ گرتے گرتے اس نے دونوں ہاتھوں سے وحشیانہ انداز میں کلہاڑی گھمائی۔ رستم نے جھک کر اپنا سر بچایا۔ کلہاڑی ایک بیٹھے ہوئے شخص کی پشت پر لگی اور پہلو کی طرف سے اس کا شکم چیر گئی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس شخص کا پہلو خون سے رنگین ہوگیا اور انتڑیاں باہر لٹک گئیں۔

کچھ لوگوں نے زخمی کو پکڑا اور کچھ مشتعل ہو کر جادے پر ٹوٹ پڑے۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ اس کی تکہ بوٹی کر ڈالیں گے لیکن پھر رستم کے علاوہ آہوجہ، رجی اور منصف وغیرہ آڑے آئے اور جادے کو بچایا۔ رستم نے آہوجہ کے ہولسٹر سے پستول نکالا اور اوپر تلے کئی فائر کئے "خبردار..... پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی آگے نہ آئے۔"

رستم کی للکار نے جادو کا اثر کیا۔ مشتعل افراد نے نہ صرف جادے کو چھوڑ دیا بلکہ کافی

پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ لوگ زخمی تماشائی کو لے کر دو نمبر کھوندر کی طرف دوڑ گئے۔

منصف نے جادے کے ہاتھ سے کلہاڑی لے لی اور اسے پیچھے ہٹا کر ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ رستم کے ہاتھ سے بھی کلہاڑی لے لی گئی۔ مقابلہ وقتی طور پر روک دیا گیا۔ تاہم تماشائیوں نے اپنا گھیرا بنائے رکھا اور ڈھولچی جوش وخروش سے ڈھول بجاتا رہا۔ مدمقابل پر رستم کی واضح برتری تھی اور اس برتری نے تماشائیوں کے چہروں پر چمک پیدا کر دی تھی۔ ان میں حسنا اور لالہ گروپ کے علاوہ مراد گروپ کے لوگ بھی شامل تھے۔

آہوجہ، کاٹھیا اور رجی وغیرہ رستم کو چھجے کے کمرے میں لے آئے۔ آہوجہ نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے۔ "مر جانے دینا تھا اس حرامزادے کو۔"

"یہ وعدہ خلافی ہوتی جو بات طے ہوئی ہے اس کے مطابق چلیں گے۔" رستم نے کہا۔

"تو پھر جب اس کی کلہاڑی ہاتھ سے چھوٹی تھی اس وقت مار دینا تھا۔ وہ تو اصول کے مطابق تھا۔" آہوجہ نے کہا۔

"تمہیں کون کہتا ہے کہ اسے مارنا ہے...... اسے زندہ رکھنا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اسے مارنا بے وقوفی ہوگی۔ اسے صرف ہرانا ہے۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ اگر وہ ہار گیا تو جو ہم کہیں گے وہ کرے گا اور جو پوچھیں گے بتائے گا۔"

"ایسے کتوں کی زبان کا کیا اعتبار رستم صیب۔" کاٹھیا نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ اس کی اکڑ ٹوٹ گئی تو ہمارے ساتھ تعاون کرے گا اور اگر نہیں کرے گا تو پھر کروانے کے طریقے ہیں ہمارے پاس۔"

کمرے سے باہر ادھیڑ عمر منصف اعلان کر رہا تھا۔ "مقابلہ تھوڑی دیر کے لئے روکا گیا ہے، آپ حوصلہ رکھیں۔ ابھی سب کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔ آپ لوگ اپنا گھیرا کھلا کر لیں اور اپنی جگہ سے آگے نہ آئیں۔ ابھی جو نقصان ہوا ہے وہ تم لوگوں کی ہلڑبازی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

چند لوگوں نے تماشائیوں کو پیچھے ہٹایا اور اکھاڑے کے اردگرد بٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ مسلح افراد تماشائیوں کے سامنے کھڑے ہوگئے تاکہ وہ آگے نہ آسکیں۔ شاہ نے ایک بڑی پٹی اپنی چادر میں سے پھاڑی اور رستم کے کندھے سے بہنے والا خون روکنے میں مصروف ہوگیا۔

دو افراد جادے کی مرہم پٹی کے لئے آگے بڑھے لیکن اس نے غصیلے انداز میں ان کی پیشکش ٹھکرا دی اور نفرت سے بار بار زمین پر تھوکتا رہا۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ

لوگوں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ اس مقابلے میں رستم کو جاوے کے سامنے آکر خواہ مخواہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔

☆======☆======☆

ڈپٹی ریاض، شانی اور معصوم علی کو لے کر پولیس کے بیس کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے آگے کا سفر گاڑی کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ کم از کم چھ گھنٹے تک دشوار گزار راستوں پر پیدل چلیں۔

ڈپٹی ریاض جیپ سے اُترا تو چاروں طرف پولیس والوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ ''ان دونوں کو اندر لاؤ۔'' خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک خیمے کی طرف چلا گیا۔ پولیس والے اس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

''دونوں'' سے ڈپٹی کی مراد شانی اور تایا معصوم تھے۔ شانی نیچے اُتر آئی۔ تایا معصوم کے لئے ایک اسٹریچر لایا گیا۔ شانی تایا کے اسٹریچر کے ساتھ ایک خیمے میں پہنچی۔ خیمے میں کیروسین کا لیمپ روشن تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا بلب بھی روشن تھا۔ یہ برقی روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت تھی۔ خیمے میں دو لیڈی پولیس اہلکار موجود تھیں۔ ان کی آنکھوں میں رتجگے کے آثار تھے۔ غالباً ڈپٹی ریاض کی آمد کے سبب انہوں نے رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارا تھا۔ اپنی اس شب بیداری کا سبب وہ شانی کو سمجھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے کدورت کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک لیڈی اہلکار وہی تھی جو چار پانچ روز پہلے سپیرن کے روپ میں گھوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ مرد اہلکار سپیروں کے روپ میں تھے پھر مرد تو رستم کے ہاتھوں کام آئے تھے اور یہ بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

''بی بی کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ گی۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' لیڈی سب انسپکٹر نے شانی کو دعوت دی۔

شانی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے چٹائی پر دوزانو بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ تایا کے سر پر رکھ دیئے۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہے تھے۔

''کوئی درد کی دوا ہوگی تمہارے پاس؟'' شانی نے ایک اہلکار سے پوچھا۔

وہ بے باکی سے بولی۔ ''ہم پولیس والیاں ہیں...... ہمارے پاس تو صرف درد ہی ہوتا ہے لیکن تم تو خاص بندی ہو۔ تمہارے لئے درد کی دوا بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

وہ ایک کونے میں گئی۔ یہاں اوپر تلے دو اٹیچی کیس دھرے تھے۔ اس نے اوپر والا

اٹیچی کیس کھولا اور اس کی پاکٹ میں سے اسپرین کی گولیاں نکال کر شانی کو تھما دیں۔

شانی نے پانی مانگا۔ ایک کولر میں سے پانی نکال کر اسے دیا گیا۔ شانی نے کسی نہ کسی طرح تایا کو دو گولیاں پانی میں گھول کر پلا دیں۔ اس نے ان کے شدید زخمی ہونٹ کی پٹی درست کی۔ اپنے پلو کو گیلا کر کے ان کا چہرہ صاف کیا۔ ان کے سر پر ہولے ہولے مساج کرنے لگی۔ تایا کی تکلیف نے اسے اپنی ساری پریشانی اور تکلیف بھلا ڈالا تھی۔

''یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟'' شانی نے لیڈی سب انسپکٹر سے پوچھا۔

وہ زہریلے انداز میں بولی۔ ''یہاں وڈے ڈاکٹر صاحب تو وہی ہیں جن کے ساتھ تم آئی ہو۔ ہر طرح کا علاج معالجہ وہی کریں گے۔'' اس کا اشارہ ڈپٹی ریاض کی طرف تھا۔

اسٹریچر کی بیلٹس نے تایا معصوم کو اسٹریچر کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ شانی نے یہ بیلٹس کھولنی چاہیں لیکن لیڈی سب انسپکٹر نے روک دیا۔

یہ پولیس کیمپ قریباً ایک ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ شانی کو آٹھ دس خیموں کی روشنیاں تو یہاں سے بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ وائرلیس کا ایک بہت بڑا انٹینا بھی ٹیلے کے اوپر نظر آ رہا تھا۔ بُوگیر کتوں کا شور رات کا سناٹا چیر کر کانوں میں زہر گھول رہا تھا۔ ایک بڑی سرچ لائٹ کا روشن دائرہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا ہوا ٹیلوں کے اوپر سے گزرا تو شانی کو مسلح پہرے دار اور چند گھوڑے دکھائی دیئے۔

شانی کے ذہن میں کھلبلی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بدترین وقت قریب آ رہا ہے۔ اسے اور تایا معصوم کو پکڑ کر اس ویرانے میں لانے کا مقصد بہت واضح تھا۔ ڈپٹی ریاض ہر وہ بُرے سے بُرا ہتھکنڈا استعمال کر رہا تھا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ ان ٹیلوں میں اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ رستم تھا اور وہ رستم کو اپنے بس میں کرنے کے لئے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ شانی کو یہاں گھسیٹ لایا تھا۔

شانی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کیا تم ڈپٹی ریاض کو اس بات کی اجازت دو گی کہ وہ رستم اور اس کے ساتھیوں کی تباہی کے لئے تمہیں استعمال کرے؟

اس کا حتمی اور فوری جواب نفی میں تھا۔ ایسا کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اب وہ ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ریاض اور اس کے ساتھی بذریعہ وائرلیس سیٹ رستم سے براہِ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ ریاض شانی کو رستم سے بات کرنے پر مجبور کرتا یا پھر شانی اور تایا معصوم کو اس طرح اذیت کے شکنجے میں جکڑتا کہ ان کی آہ و بکا رستم کے کانوں تک پہنچتی اور وہ سب کچھ بھول بھال کر ریاض کے قدموں

میں آن گرتا۔

شانی نے سوچا اگر ریاض نے خود یا لیڈی اہلکاروں کے ذریعے اسے اذیت پہنچائی اور اس اذیت رسانی کے ذریعے رستم کو تابع بنانے کی کوشش کی تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تہیہ کیا کہ وہ خود کو رستم اور اس کے ساتھیوں کے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دے گی اگر وہ زنجیر ہے تو اپنے ہاتھوں سے خود کو مار ڈالے گی۔ وہ جہاں تک تحمل سے کام لے سکتی تھی اس نے لے لیا تھا اور جہاں تک برداشت کر سکتی تھی وہاں تک برداشت بھی کر لیا تھا۔ اب وہ ریاض ہٹلر کے ہاتھوں مزید تکلیف اٹھانے سے بہتر سمجھتی تھی کہ مزاحمت کا حق ادا کرتے ہوئے خود کو ختم کر لے۔

تایا نیم وا نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ میری بات یاد ہے ناں دھی رانی۔ ...تُو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ تُو سو پنڈوں (دیہات) کے ماتھے کا جھومر ہے۔ تُو پنجابی مُٹیار کی آن بان ہے۔ آج وقت نے تجھے ایک سخت ترین دوراہے پر کھڑا کیا ہے...... اب گردن جھکنی نہیں چاہیے...... کٹ جانی چاہیے۔ شانی نے نگاہوں نگاہوں میں نیم جان تایا معصوم سے کہا۔ ایسا ہی ہوگا تایا...... اس پولیس والے کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوگی۔

ایک دم خیمے سے باہر افراتفری کے آثار نظر آئے۔ دو باوردی اہلکاروں نے ایک آرام دہ کرسی لا کر خیمے میں رکھ دی۔ دوسرا تپائی لے آیا۔ باہر کھڑے پہرے دار اٹینشن ہو گئے۔ ڈپٹی ریاض لمبے ڈگ بھرتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اس کے پیچھے تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ میں وہی آٹھ دس کلو وزنی وائرلیس سیٹ تھا جو اس سے پہلے جیپ میں رکھا تھا اور جس پر ریاض مسلسل بات چیت کرتا رہا تھا۔ وائرلیس کا ریسیور ریاض کے کان سے لگا تھا اور وہ باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر ریاض کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل وزنی وائرلیس سیٹ اٹھائے اس کے پہلو میں مؤدب کھڑا رہا۔ وائرلیس سیٹ میں سے شور کے ساتھ ساتھ کسی شخص کی نسبتاً باریک آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جی ہاں...... بڑی مشکل سے سیٹ تک پہنچا ہوں جی۔ شاید دو تین منٹ سے زیادہ بات نہ کر سکوں۔“

وائرلیس سیٹ میں سے ڈھول پیٹنے کی مدھم آواز بھی آ رہی تھی۔ ڈپٹی ریاض نے پوچھا۔

”یہاں ڈھول بج رہا ہے کیا؟ اوور۔“

”جی سر، ڈھول بج رہا ہے اور معاملہ بڑا گڑبڑ ہے۔ اوور۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ اوور۔“

”جاوا صاحب اور رستم میں مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ در...... دراصل [illegible] کی بات خود جاوا صاحب نے ہی کی تھی۔ پہلے مراد گروپ کے مراد اور جاوا صاحب [illegible] ہونے تھے لیکن جب جاوا صاحب نے خالی ہاتھ لڑنے کے بجائے کسی ہتھیار کے ساتھ لڑنے کا کہا تو رستم خود آگے آ گیا۔ دونوں میں پانچ چھ منٹ تک ٹھیک ٹھاک لڑائی ہوئی ہے۔ دونوں کو زخم آئے ہیں۔ پر...... رستم کا پلہ بھاری لگ رہا ہے جی۔ مجھے ڈر ہے کہ...... [illegible] میرا مطلب ہے کہ...... اللہ نہ کرے جاوا صاحب کی جان چلی جائے...... اوور۔“

ڈپٹی ریاض کے چہرے پر تشویش کی لکیریں پھیل گئیں۔ اس نے ہونٹوں میں بدبدا کر کسی کو غائبانہ گالی دی پھر اطلاع دینے والے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کیا وہ دونوں اب بھی لڑ رہے ہیں؟ اوور۔“

”نہیں جی...... لڑائی وقتی طور پر رکی ہوئی ہے۔ دراصل جاوا صاحب کی کلہاڑی سے لالہ گروپ کا ایک بندہ زخمی ہو گیا ہے۔ افراتفری پھیل گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لڑائی روک دی گئی ہے۔ کچھ بندے کہہ رہے ہیں کہ آدھ پون گھنٹہ اور انتظار کر لیا جائے، ابھی صبح ہو جائے گی۔ باقی مقابلہ دن کی روشنی میں ہو۔ اوور۔“

”جاوا زیادہ زخمی تو نہیں ہے؟ اوور۔“

”منہ کے دو زخم زیادہ گہرے ہیں جی...... ان زخموں کی وجہ سے وہ نڈھال نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس لڑائی میں رستم کو گرا سکیں گے لیکن اگر فرض کریں انہوں نے رستم کو گرا دیا تو پھر ان لوگوں نے گارنٹی دی ہے کہ وہ جاوا صاحب کو چھوڑ دیں گے۔ اوور۔“

ریاض ایک بار پھر زہریلے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں وائرلیس سیٹ پر گونج دار نعرے سنائی دیئے۔

”یہ کیا ہے؟“ ریاض نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سر، رستم کے ساتھی نعرے لگا رہے ہیں اور اسلحہ لہرا رہے ہیں۔ رستم کی وجہ سے ان لوگوں میں نیا جوش بھر گیا ہے جی۔ فی الوقت تو تینوں گروپ بالکل یک جان نظر آ رہے ہیں۔ ہر بندہ سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار نظر آتا ہے۔ اوور۔“

ریاض نے دانت پیسے۔ ”کوئی بات نہیں۔ ان کی دُم میں نمدہ فٹ کرنے کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اپنی جگہ چوکس رہو اور جیسے جیسے موقع ملے مجھے ان حرامیوں کے بارے میں خبر دیتے رہو۔ اوور اینڈ آل۔“

بات ختم کر کے ڈپٹی ریاض اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے ریسیور واپس ہیڈ کانسٹیبل کو تھمایا اور شانی سے کوئی بات کئے بغیر لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی پتھریلی زمین پر بوٹوں کی ایڑیاں بج اٹھیں۔ پولیس اہلکار اس کے آگے پیچھے بھاگتے نظر آئے۔

تایا معصوم شدید نقاہت کے عالم میں سو گئے تھے یا شاید وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے۔ ڈپٹی کے جانے کے بعد دونوں لیڈی اہلکار کونے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور شانی کو خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگیں۔ شانی کے کانوں میں وائرلیس سیٹ پر ہونے والی گفتگو کی بازگشت تھی۔ اس میں رستم کا ذکر ہوا تھا اور جہاں کہیں جب کبھی رستم کا ذکر ہوتا تھا...... شانی کے جسم میں آپوں آپ برقی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ یکا یک اس کے دل کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی ہو۔ یہ عجیب ناتا تھا۔ یہ ناقابلِ فہم تعلق تھا۔ وہ بدترین حالات سے گزر رہی تھی اور دیکھ رہی تھی کے اس کے اردگرد سب کچھ ختم ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ رستم کو دیکھنا چاہتی تھی، اس کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وڈے ڈیرے پر رستم نے نادیہ سے شادی کر لی ہے...... کوئی خلا سا ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن وہ رستم کو اور اس کی چاہ کو یکسر دل سے نکال نہیں سکی تھی۔ یہ چاہ کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی اور شاید اس کو آخری سانس تک موجود رہنا تھا۔

اس نے تصور کی نگاہ سے وڈے ڈیرے کے قیامت خیز حالات کو دیکھا اور محسوس کیا۔ اس کے دل سے رستم اور نادیہ دونوں کے لئے دعائے خیر نکلی اور بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اچانک دو لمبے تڑنگے باوردی پولیس والے تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے شانی کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو ڈپٹی صاحب بلا رہے ہیں۔“

شانی کی رگوں میں سرد لہر دوڑ گئی۔ شاید بدترین وقت آ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی لیڈی سب انسپکٹر تلخی سے بولی۔ ”تم نے سنا نہیں...... ڈپٹی صاحب بلا رہے ہیں۔“

شانی نے تایا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں تایا کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”تیرے تایا کے لئے بڑے تیماردار ہیں یہاں...... تُو اٹھنے والی بات کر۔“ سب انسپکٹر گرجی۔

شانی نے اٹھنے میں تذبذب کا مظاہرہ کیا تو دونوں لیڈی اہلکار اٹھیں اور شانی کو

بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”چل شاباش...... خواہ مخواہ اڑیل گھوڑی نہ بن۔“ لیڈی سب انسپکٹر نے کہا۔

شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ تایا معصوم شور سن کر جاگ گئے اور صورت حال دیکھ کر کسمسانے لگے۔ اسٹریچر کی بیلٹس نے انہیں اسٹریچر سے پیوست کر رکھا تھا اگر ان کے جسم میں اٹھنے کی توانائی پیدا ہو بھی جاتی تو بھی وہ اٹھ نہیں سکتے تھے۔

تایا کے اضطراب نے شانی کو بے حال کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں اشک تھے اور وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن آواز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اگر ان کا بس چلتا تو وہ اٹھ کر شانی کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے اور آخری سانس تک خود سے جدا نہ کرتے۔ تایا کی بے بسی و بے قراری دیکھ کر شانی نے مزاحمت ترک کر دی۔ وہ انہیں مزید اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ ایک نظر تایا پر ڈال کر وہ پولیس والوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اب سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا۔ پہاڑیاں اور ٹیلے دھیرے دھیرے تاریکی کی چادر سے باہر آ رہے تھے۔ مشرقی افق سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ اس افق کے پس منظر میں بیری، بکائن، جنگلی انجیر اور توت کے درخت تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ فضا کو مترنم کر رہی تھی۔ کسی کا ایک جوڑا صبح کی تازہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا شانی کی نگاہوں کے عین سامنے سے گزرا۔ یہ سارے خوبصورت مناظر تھے لیکن خوب صورتی کو محسوس کرنے کے لئے دل میں قرار ہونا ضروری ہوتا ہے، یہاں تو سینے کے اندر قیامت مچی ہوئی تھی۔ شانی کو فقط آگ، خون اور زخم نظر آ رہے تھے۔

شانی کو دو جیپوں کے قریب لگے ہوئے ایک نسبتاً بڑے خیمے میں لے جایا گیا۔ یہاں ڈپٹی ریاض ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ لیڈی اہلکاروں نے شانی کو ریاض کے عین سامنے ایک دوسری کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے دونوں پہلوؤں میں تن کر کھڑی ہو گئیں۔ سامنے لوہے کی تپائی پر مرد و زن کی عریاں تصویروں والا بدنام زمانہ رسالہ پلے بوائے پڑا تھا۔ ریاض نے ایک اے ایس آئی سے کہا۔ ”اوئے! یہ تم نے کیا گند بکھیرا ہوا ہے میز پر۔ ہٹاؤ اسے یہاں سے۔ دیکھتے نہیں رنگ والی کی شرماں والی چھوٹی چوہدرانی آئی ہے۔“

اے ایس آئی نے رسالہ گول کر کے ہاتھ میں لے لیا اور باہر چلا گیا۔ قریب ہی کچھ آہنی زنجیریں پڑی تھیں۔ ان کے ساتھ چمڑے کا ایک ٹکڑا (جس کے ساتھ ”دستی“ بھی تھی) موجود تھا۔ ناخن کھینچنے والا پلاس، تیز دھار خنجر، دو آہنی شکنجے اور اس طرح کی دوسری اشیاء بھی

ایسی جگہ رکھی گئی تھیں کہ شانی کی نظر ان پر پڑ سکے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اسے توڑنے کا نفسیاتی حربہ ہے۔

اس نے گہری سانس لی اور آنے والے حالات کے لئے تیار ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی مصیبت کا آغاز سوال جواب سے ہوگا لیکن یہاں تو جیسے سب کچھ پہلے سے طے تھا۔

ڈپٹی ریاض نے ہٹی کٹی اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو..... خاطر تواضع شروع کرو چھوٹی چوہدرانی کی۔''

وہ تو جیسے پہلے سے آتش فشاں بنی ہوئی تھیں۔ لیڈی سب انسپکٹر نے شانی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور نیچے گرانے کی کوشش کی۔ دوسری نے شرم ناک انداز میں شانی کو نوچا۔ اس ''حرکت'' سے شانی کا خوف ایک دم مزاحمت میں بدل گیا۔ اس کی فطری دلیری قوت بن کر اس کے بازوؤں میں سرائیت کرگئی۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ ایک اہلکار کے منہ پر مارا۔ وہ ڈکرا کر ڈپٹی ریاض پر جاگری۔ دوسری اہلکار نے شانی کو عقب سے جکڑا۔ شانی نے پلٹ کر اس پر کٹی کبوتری کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اتنی شدت سے کھینچے کہ وہ کراہتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

ڈپٹی ریاض نے اپنے اوپر گرنے والی اہلکار کے کولہوں پر ایک زوردار چپت لگائی اور گرجا۔ ''اوئے جھانسی دی رانی! پوری پرات بریانی کی کھاجاتی ہو۔ اب پیچھے کی طرف موت کیوں پڑ رہی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ہٹی کٹی کانسٹیبل کو شانی کی طرف دھکیل دیا۔

شانی نے ایک بار پھر اس کے منہ پر ایک کڑاکے دار تھپڑ رسید کیا۔ کچھ دیر کے لئے دونوں لیڈیز اہلکار بے بس دکھائی دیں۔ اسی دوران میں ایک مرد اور ایک لیڈی اہلکار مزید آگئے۔ ان چاروں نے مل کر شانی کو چت لٹا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے جکڑ لئے۔ وہ چاروں بُری طرح ہانپ رہے تھے اور شانی کی سانس بھی دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ شانی کے لمبے ریشمی بالوں نے بکھر کر اس کے چہرے اور سینے کو ڈھانپ لیا تھا۔ ڈپٹی ریاض نے تین فٹ لمبا بید اٹھایا اور شانی کے پاؤں کی طرف کھڑا ہوگیا۔ اچانک اس نے شانی کے ننگے تلوؤں پر ایک زوردار چوٹ کی۔ شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ بلند کراہ نکل گئی، پھر دوسری تیسری اور چوتھی ضرب لگی۔ چوتھی ضرب اتنی شدید تھی کہ ضبط کے باوجود شانی چلا اٹھی۔

''بس کردے ریاض..... میں کہتا ہوں بس کردے۔'' ایک آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس کا دماغ گھوم گیا۔

یہ رستم کی آواز تھی اور رستم یہاں کہاں تھا؟ وہ تو چھ گھنٹے کی مسافت پر [illegible] تھا۔ اچانک شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن نے کام کیا۔ یہ آواز خیمے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے وائرلیس سیٹ سے آرہی تھی۔ ایکا ایکی ساری صورت حال شانی کی سمجھ میں آگئی۔ ڈپٹی ریاض نے عیاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ شانی کے علم میں لائے بغیر اس نے شانی کی پُراذیت آوازیں رستم تک پہنچادی تھیں۔ خیمے میں وائرلیس سیٹ موجود تھا اور شانی کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی آن تھا۔

ڈپٹی ریاض کے ماتحتوں نے بڑے سائز کے اس وائرلیس سیٹ کو ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا اور یہ شانی کے منہ سے بس ڈھائی تین فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ ڈپٹی ریاض وائرلیس سیٹ کے بالکل قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سیٹ پر سے کپڑا ہٹایا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ ''یہ بات تو تُو بھی اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ ملزم کو زندہ درگور کرنے کے لئے ہمارے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں اور جب ملزم کوئی خوب صورت عورت ہو تو پھر یہ کام اور بھی آسان ہوتا ہے۔''

رستم کی ہیجانی آواز سیٹ پر ابھری۔ ''ریاض! اگر تُو نے بی بی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تیرے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے کرڈالوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں قیمہ بنادوں گا تیرا۔''

''اوئے کس کافر نے ہاتھ لگایا ہے تیری بی بی کو۔ میں نے تو صرف ڈنڈا لگایا ہے اور وہ بھی پولا پولا اگر یہ بھی بُرا لگا ہے تو معافی مانگ لیتا ہوں اس جینا لولو سے..... مانگوں معافی؟''

ریاض ہٹلر کے دھیمے لہجے میں زہر کا سمندر تھا۔

شانی چلائی۔ ''رستم! تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ میری جان جاتی ہے تو جانے دو۔ میں پہلے کون سی زندہ ہوں۔ خدا کے لئے رستم مجھے مرجانے دو۔''

ڈپٹی ریاض ہٹلر کے بے رحم اشارے پر اہلکاروں نے شانی کو اٹھانے کی کوشش کی پھر کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے خیمے سے باہر لے گئے۔ وادی سون کا گرم سورج..... آج جیسے سوا نیزے پر تھا۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دیوی

5

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

رستم کمرے میں وائرلیس سیٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ سیٹ پر ایک سرخ اور سبز بلب مسلسل سپارک کر رہے تھے۔ رستم کا سارا جسم غیظ وغضب کی زیادتی سے لرز رہا تھا۔ ریاض کی نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی منحوس آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ ''اوئے کس کافر نے ہاتھ لگایا ہے تیری بی بی کو۔ میں نے تو صرف ڈنڈا لگایا ہے اور وہ بھی پولا پولا اگر یہ بھی بُرا لگا ہے تو معافی مانگ لیتا ہوں اس جینا لولو سے۔ مانگوں معافی؟''

پھر بی بی کی چلاتی ہوئی آواز کچھ فاصلے سے ابھری۔ ''رستم! تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ میری جان جاتی ہے تو جانے دو۔ میں پہلے کون سی زندہ ہوں۔ خدا کے لئے رستم مجھے مرجانے دو۔''

بی بی کی آواز میں ایسا کرب تھا کہ رستم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس کے بعد دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ ان میں لیڈی اہلکاروں کی آوازیں بھی تھیں۔ یہ لوگ اس کی بی بی کو گھسیٹ کر باہر لے جا رہے تھے۔ رستم کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ بولا تو اس کی آواز شیر کی پہلی دھاڑ کی طرح دھیمی لیکن مہیب تھی۔ ''ریاض! اپنے لئے قیامت سے پہلے قیامت کا انتظام نہ کر۔ میری بی بی کو کچھ ہوا تو میں تجھے زندگی اور موت دونوں کے لئے ترسا دوں گا۔''

ریاض نے شرابی قہقہہ لگایا۔ ''واہ...... واہ...... کیا بات ہے۔ میری بی بی اور تُو کہتا ہے کہ بی بی سے اب تیرا کوئی تعلق نہیں۔ تُو نے اس کے ساتھ سونا بند کر دیا ہے اور وہ بھی یہی کہتی ہے کہ اب اس کا خصم کوئی اور ہے۔''

''دیکھ ریاض... دیکھ...... تُو نے وہ بدترین کام کر لیا ہے جو تجھ سے ہو سکتا تھا۔ تُو ایک عورت کو بے بس کر کے یہاں لے آیا ہے۔ اب اگر اس سے آگے بڑھا تو نتیجہ تیرے خیالوں

سے بھی بُرا ہوگا۔"

"اگر تُو چاہتا ہے کہ میں اور آگے نہ بڑھوں تو پھر وہ بات ماننی ہوگی جو میں کہہ رہا ہوں۔ تجھے وڈے ڈیرے سے نکل کر میرے پاس آنا ہوگا۔"

رستم اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ وہ زندگی کے مشکل ترین دوراہے پر کھڑا تھا۔ دونوں طرف قدم بڑھانے میں تباہی تھی لیکن ایک طرف بی بی تھی۔ بی بی جو زندگی تھی، عشق تھی اور کل کائنات تھی۔ جس کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا وجود بھی......وہ ساکت بیٹھا رہا۔ جرمن ساختہ ہائی پاور وائرلیس سیٹ سے شائیں شائیں کی آواز ابھرتی رہی۔ دوسری طرف ڈپٹی ریاض اس کے جواب کا منتظر تھا۔ کمرے سے باہر اکھاڑے کے اردگرد رستم کے ساتھی فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اور اپنے ہتھیار ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اجمل خان تقریر کرنے والے انداز میں ان کے سامنے بول رہا تھا۔ "ام قسم کھاتا ہے۔ ام نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس رات اگر یہ زہر والا معاملہ نہ ہوتا تو خو اپنے رستم صیب نے یہ بازی پلٹ دیا تھا۔ MG-08 پر امارہ قبضہ ہوگیا تھا۔ دوسری بڑی گن کا گن مین ام نے رستم صیب کے کہنے پر اپنے فائر سے اُڑا دیا تھا۔ رستہ تقریباً صاپ تھا، ام گھیرا توڑ کر نکل سکتے تھے......لیکن پریشانی کا بات اب بھی نہیں ہے یارو۔ رستم صیب اب بھی کوئی نہ کوئی رستہ نکالے گا اور سب سے بڑا بات یہ ہے کہ آپ سب لوگ پورے اتپاق کے ساتھ یہاں موجود ہیں اور ام کو یقین ہے کہ یہ اتپاق اور جوش 10 سال تک موجود رہے تو پولیس 10 سال بھی یہاں گھس نہیں سکتا ہے۔ ام خود پولیس والا ہے۔ اس لئے ام جانتا ہے کہ ام کتنے پانی میں ہے۔"

اجمل خان کی آخری بات پر زوردار قہقہے پڑے۔

وائرلیس سے ریاض کی آواز ابھری۔ "لمبی سوچ میں پڑ گئے ہو رستمے! وائرلیس کا چارج ختم ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے میرے پلے کچھ ڈال دو چن مکھناں۔"

رستم گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے......میں پہنچ جاؤں گا۔"

"پہنچ جاؤں گا۔" ریاض نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر رستم کی نقل اُتاری پھر سفاکی سے بولا۔ "میں تجھے ابھی ڈیرے سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لے لو۔"

"لیکن .. "

"لیکن نہیں......لیکن نہیں۔" ریاض کی آواز جنونی تھی۔ "پرفیکٹ بات کرو۔ ایک دم ٹھوس اور میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ خوب صورت عورت کو زندہ درگور کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں نکلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ لگ جائے۔"

"چلو دو گھنٹے لے لو لیکن کسی بھی چالاکی کے بغیر۔ چالاکی دکھاؤ گے تو ڈپٹی ریاض کی ساری ہمدردی اور محبت کھو دو گے اور ہاں ایک بات اور، میں جاوے کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے ڈھولچی سے کہو کہ ڈھول بجانا بند کرے اور کسی آوارہ کتیا کے ساتھ جا کر سو جائے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ نو مور لڑائی......نو مور دنگا۔ یہ مقابلہ ہار جیت کے بغیر ختم ہوگیا ہے۔"

رستم چند سیکنڈ سوچنے کے بعد بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے اتنی جلدی نکلنے نہیں دیں گے۔ اس کے لئے مجھے کوئی طریقہ ڈھونڈنا ہوگا۔"

"پہلے ایک گھنٹہ تھا، اب دو گھنٹے ہوگئے ہیں۔ اب تم طریقہ ڈھونڈنے کی بات کر رہے ہو۔" ریاض کے لہجے میں پولیس والوں کا مخصوص شک تھا۔

"دیکھو ریاض۔" رستم نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے اور میرے درمیان طے ہوگیا ہے کہ میں تمہارے پاس پہنچوں گا لیکن کس طرح؟ اس بارے میں مجھے ذرا سوچنے دو۔"

"کتنی دیر سوچنا چاہتے ہو؟"

"میں ابھی ایک گھنٹے میں تم سے خود رابطہ کرتا ہوں سیٹ پر۔"

"اوکے۔ میں انتظار کر رہا ہوں لیکن اس بات کا دھیان رکھنا۔ مجھے تمہاری بی بی کی آواز وائرلیس پر دوبارہ نہ سنوانی پڑے۔ اوور اینڈ آل۔"

اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم ہوگیا۔ رستم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قرب و جوار اس کی نگاہ میں گھوم رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب رجی نے آ کر بتایا تھا کہ وائرلیس پر کوئی آپ کو بلا رہا ہے تو رستم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ وائرلیس پر ڈپٹی ریاض خود موجود تھا۔ اس نے رستم کو اطلاع دی تھی کہ بی بی شانی اور ان کا تایا معصوم اس وقت بیس کیمپ پر اس کی تحویل میں ہیں اور وہ ان کے ساتھ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔

رستم نے ریاض کی بات کو جھوٹ سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ریاض نے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اب بی بی اور اس کے خانوادے سے اس کا کوئی تعلق واسطہ باقی نہیں رہا۔ اس نے ریاض کو بتایا کہ اس نے بی بی کی خاطر اپنے بدترین دشمنوں کو معاف کیا لیکن بی بی پر

عام لوگوں کی خدمت کا بھوت سوار ہے اور وہ آئے دن اس کے خلاف سخت بیان دیتی رہتی ہے۔

رستم کی پوری بات سن کر ڈپٹی ریاض نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا کہ چڑیا کوے کی یہ کہانی سکول کے کسی کاکے کو سنانا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بی بی کو وائرلیس سیٹ کے قریب کھینچ لایا تھا اور رستم کو بی بی کی کرب ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔

یہ سارا واقعہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رستم کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔

کاٹھیا تیزی سے اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''جناب! روشنی اچھی ہو گئی ہے۔ لوگ بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب کیا حکم ہے؟''

رستم نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔ پہلے سب لوگ ناشتہ وغیرہ کر لو..... پھر دیکھتے ہیں۔''

کاٹھیا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جناب! ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو۔''

''ہم میں سے کسی سے بھی کچھ کھایا پیا نہیں جائے گا۔ آپ پہلے اس حرامی کا قصہ پاک کر لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ویسے بھی جناب! وہ بالکل نڈھال ہو رہا ہے۔ ہم سب کو لگتا ہے کہ ایک دو منٹ سے زیادہ آپ کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔'' کاٹھیا نے آخری الفاظ سرگوشی کے انداز میں کہے تھے۔

''میں کہہ رہا ہوں ناں جاؤ۔ میں ابھی بتاتا ہوں اس بارے میں۔'' رستم نے اسے جھڑکا تو وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔

لوگوں کا جوش وخروش ماند پڑتا محسوس ہوا۔ بہرحال سردار کا حکم ماننا بھی وہ ضروری سمجھتے تھے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ حسب معمول کھانے پکانے کا عمل شروع ہوا۔ سرنگوں کے دہانوں پر، حجروں کے عقب میں اور احاطے میں چولہوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ چند مسلح افراد رائفلیں تانے جواد عرف جاوا کے سر پر موجود تھے۔ اس نے شراب منگوائی تھی اور گاہے بگاہے بوتل سے منہ لگا کر گھونٹ بھر لیتا تھا۔

کھانا کھایا جا چکا تو رستم پھر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھی مسلسل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ بات تو ان کے دماغ میں ہرگز نہیں آ سکتی تھی کہ رستم اس مقابلے سے کنی کترا رہا ہے۔ ہاں وہ یہ ضرور محسوس کر رہے تھے کہ وہ اس معاملے کو انجام تک پہنچانے میں تاخیر کر رہا ہے۔ کوئی تبدیلی تھی جو وہ محسوس تو کر رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

رستم تادیر اپنے کمرے میں رہا۔ ایک گھنٹے بعد مراد، آہوجہ اور کاٹھیا کو رستم نے اپنے پاس بلایا۔ وہ تینوں آ گئے اور دری پر بیٹھ گئے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔

آہوجہ کچھ دیر تک رستم کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر ہولے سے بولا۔ ''رستم بھائی! میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن عقل اور رتبے میں تم بڑے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم نے اس مقابلے کو یہیں پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو بہت اچھا ہے۔ وہ تمہاری جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ یہ تو رہا ایک طرف ہم ڈپٹی ریاض کو بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ تم سے اس طرح دُوبدو ہاتھ کرے۔ ان جیسے بونوں کے لئے تو کاٹھیا اور شاہ وغیرہ ہی کافی ہیں۔''

رستم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کو ہم جتنا تیز کریں گے یہ تیز ہوتا جائے گا۔ یہاں سے جاوے کی لاش جائے گی تو وہ لوگ کوشش کریں گے کہ یہاں بھی ایک دو لاشیں اور بھیجی جائیں۔ بہتر ہے کہ ہم وقت حاصل کریں اور ساتھ ساتھ اپنے دفاع کو مضبوط کرتے جائیں۔''

رستم کے ساتھی خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔ مراد نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو تم چاہتے ہو کہ اس حرامی کو واپس بھیج دیا جائے۔''

''واپس نہ بھیجا جائے لیکن مارا بھی نہ جائے۔''

''یہ تو یک طرفہ معافی ہو گئی۔ وہ بدذات تو بڑھکیں مار رہا ہے اور مقابلے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔''

''اسے لے جاؤ میرے سامنے سے۔'' رستم نے کہا۔

مراد نے گہری سانس لی۔ ''دیکھو رستم! ہم تو یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ تم جاوے سے خوف زدہ نہیں ہو۔ تم اسے آسانی سے لمبا کر لو گے مگر سارے لوگ یہ بات نہیں سمجھیں گے۔ ان میں سے بہت سارے لوگوں کے دماغ میں یہ شک پیدا ہوگا کہ تم پیچھے ہٹ گئے ہو۔ اگر...... اگر تم نے یہ لڑائی پوری نہیں لڑنی تھی تو پھر مجھے ہی پیچھے نہ ہٹایا ہوتا۔ میں اب بھی اس کی ٹانگیں چیر کر پھینک سکتا ہوں۔'' مراد نے دائیں ہاتھ کا مکا اپنی بائیں ہتھیلی پر مارا۔

''نہیں مراد! میرے خیال میں رستم بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' آہوجہ نے اسے ٹوکا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے کاٹھیا کا پہلو دبایا۔ یہ اٹھ کر باہر چلنے کا اشارہ تھا۔ وہ تینوں رستم کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔ مراد کا چہرہ تمتمایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی الجھن بلکہ ان تینوں کی الجھن غلط نہیں تھی۔ اس موقع پر جاوے کو چھوڑ دینا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ باہر آ کر کاٹھیا نے آہوجہ سے کہا۔ ''مجھے تو شک ہوتا ہے کہ رستم بھائی نے وائرلیس پر بات کرنے کے

بعد اپنا ارادہ بدلا ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' مراد نے ناراض لہجے میں کہا۔

رستم اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دل پر لگنے والی چوٹ کے بعد وہ کندھے کی تکلیف یکسر بھول گیا تھا۔

اس نے دروازہ بند کر کے وائرلیس سیٹ آن کیا۔ فوراً ہی ڈپٹی ریاض سے رابطہ ہو گیا۔ ڈپٹی جیسے اسی کا منتظر بیٹھا تھا۔

''ہاں، اب کیا پروگرام ہے تیرا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''بی بی کہاں ہیں؟''

''وہ بالکل خیریت سے ہے اور تمہاری خیریت نیک مطلوب چاہتی ہے۔ تو اپنا پروگرام بتا۔''

''میں یہاں سے رات کو نکل سکتا ہوں اور یہی مناسب ہوگا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر بات جیسے ریاض کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''چل ٹھیک ہے۔ رات کتنے بجے نکلے گا؟''

''نو بجے کے قریب لیکن تیرے ساتھیوں کو کیسے پتا چلے گا کہ یہ کون ہے۔ انہوں نے مجھ پر فائر کھولا تو پھر؟''

''میں ان سب کو انفارم کر دیتا ہوں۔ تم چھوٹی گھاٹی کی طرف سے آنا اور نشانی کے طور پر اپنے ہاتھ میں کوئی لاٹھی وغیرہ رکھ لینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''جاوے کا کیا کیا ہے تم نے؟''

''جاوے کی جان بخش دی ہے۔'' رستم کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میں نے بھی ادھر یہاں کسی کی جان بخشی ہے۔'' ریاض نے ترت جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اب کدھر ہے جاوا؟''

رستم نے جواب دیا۔ ''ادھر ہی ہے۔''

''وہ واپس کب آئے گا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہاں ہر چیز میرے بس میں نہیں ہے۔ میں عارضی سردار ہوں۔ بہر حال تمہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ جاوا فوری موت سے بچ گیا ہے ورنہ جیسے تم نے گدھوں پر لاشیں باندھ کر بھیجی تھیں، ایسے ہی اس کی لاش بھی خچر پر بندھ کر جاتی تھی۔ لوگ

بہت بپھرے ہوئے تھے۔''

''بہت شکریہ تمہارا۔ تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ تمہارے پاؤں کو ہاتھ لگاتا ہوں..... بس اب پروگرام کے مطابق پہنچ جاؤ۔ میں اپنے بندوں کو اطلاع دے دیتا ہوں۔ بی بی کو ہم نے کھانا شانا کھلایا ہے۔ وہ پورے عزت واحترام سے ہے اور رات دس بجے تک عزت واحترام سے ہی رہے گی۔ اوکے..... اوور اینڈ آل۔'' رابطہ منقطع ہو گیا۔

وہ دن رستم نے شدید ترین کوفت و اذیت میں گزارا۔ سہ پہر کے بعد وہ سرنگ نمبر دو میں گیا۔ اس نے ڈاکٹر ناصر کے کلینک میں لالے اور حسنا کی عیادت کی۔ دونوں کی حالت اب بہتر تھی لیکن وہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ (خاص طور سے حسنا) لالے کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دو تین دن تک اپنے رہائشی کمرے میں پہنچ جائے گا اور اپنے معمولات انجام دینے لگے گا۔

رستم نے یاس انگیز انداز میں ان سے ملاقات کی تاہم اپنے دلی تاثرات اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیئے۔ لالہ اور رستم چند منٹ تک وڈے ڈیرے کے دفاع کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ لالے نے کہا۔ ''ہمیں باہر کے دشمن کی طرح اندر کے دشمن سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ عظمت جیسے غدار کے بعد بھی ہمارے اندر ایک دو بندے ایسے ہیں جو غداری کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہماری خبریں باہر پہنچا رہے ہیں۔'' پھر لالہ نے ذرا توقف سے کہا۔ ''وائرلیس کی نگرانی آج کل کس کے پاس ہے؟''

''رنجی کے پاس۔'' رستم نے جواب دیا۔

''بظاہر تو رنجی ٹھیک بندہ ہے پھر بھی ہمیں پوری احتیاط کرنی چاہیے۔''

لالہ فرید اور حسنا گجراتی سے رخصت ہو کر رستم کلینک سے باہر نکل آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں سے اب ملاقات ہو گی یا نہیں اور ہو گی تو کس حالت میں۔ وہ بھاری قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ جواد عرف جاوے کو سرنگ نمبر دو کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تھا اور دو مسلح نگران اس پر مقرر کر دیئے گئے تھے۔ رستم نے سنا کہ وہ اس صورتِ حال پر بہت خوش ہے اور اسے اپنی فتح سے تعبیر کر رہا ہے۔ رستم کے پرستار اور ساتھی اس صورتِ حال پر قدرے ناخوش تھے۔ جاوے کے بچ جانے کے بعد انہیں اپنے ساتھیوں ہیرا اور باقر وغیرہ کی موت کا دکھ زیادہ شدت سے محسوس ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر رستم نے ایک خط لالے فرید کے نام لکھا۔ اس خط میں رستم نے

مراد، لالے اور حسنے کو اپنی ساری صورتِ حال سے تفصیلاً آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ وہ کیوں یہاں سے اچانک جانے پر مجبور ہوا ہے؟ اس نے آنے والے دنوں میں وڈے ڈیرے کے دفاع کے حوالے سے اپنے سارے مشورے بھی اس خط میں درج کئے۔ خوراک اور پانی کی قلت کے ایک دو حل بھی بتائے۔ آخر میں اس نے لکھا۔ ''میرے یارو! اگر زندگی ہوگی تو موت کے سارے گھیروں سے نکل کر پھر ملیں گے ورنہ اس خط کو آخری ملاقات سمجھنا۔ ہم سب ڈاکو ہیں۔ قانون کے مجرم ہیں اور دھیرے دھیرے اپنے اس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں جو وقت نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے۔ اس لکھے کو ٹالنا نہ ٹالنا بس قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ باقی میں نے تمہارا ساتھ نبھانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونے کے لئے خود چل کر یہاں پہنچا تھا۔ تمہاری ساری تکلیفوں اور مصیبتوں میں حصے دار بننا چاہا تھا لیکن لگتا ہے کہ اب میری اپنی مصیبتیں اور تکلیفیں مجھے زیادہ زور سے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ میں تم سب سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ میں تم سب سے معافی مانگتا ہوں۔''

خط مکمل کرنے کے بعد رستم نے ایک اخباری کاغذ میں لپیٹا اور ایسی جگہ رکھ دیا جہاں وہ آسانی سے لالے وغیرہ کے ہاتھ آسکے۔

خط کو محفوظ جگہ پر رکھتے ہوئے رستم کی نگاہ نادیہ کے کپڑوں، جوتوں اور دیگر سامان پر پڑی۔ درد کی ایک اور لہر اس کے سینے سے اٹھی اور وہ منہ پھیر کر دری پر لیٹ گیا۔

اس کے ذہن میں رہ رہ کر حاجی حیات، عارف کمبوہ اور سردار دراج وغیرہ کا خیال آرہا تھا۔ آخر یہ لوگ بی بی کی حفاظت کیوں نہ کر سکے اور سب سے بڑھ کر وہ چوہدری بشیر جو شادی سے بہت پہلے ہی خود کو شانی کا شوہر اور ولی سمجھنے لگا تھا۔ اپنی بے پناہ طاقت اور اثر و رسوخ کے باوجود وہ بھی دیکھتا رہ گیا اور بی بی ریاض ہٹلر جیسے خونی کے ہتھے چڑھ کر ان ویران ٹیلوں میں پہنچ گئی۔ اسے ان سب لوگوں پر بہت طیش آیا۔

مستقبل کے پردے میں کیا چھپا ہے؟ ڈپٹی ریاض اور دوسرے اعلیٰ پولیس افسر اب ان سے کیا چاہتے ہیں۔ بی بی کو کس طرح استعمال کیا جانے والا ہے؟ یہ اور ایسے بے شمار سوال رستم کے ذہن میں کلبلانے لگے۔

وہ رات تک جانے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر ناصر نے لالہ فرید کو وقت سے پہلے ہی اپنے کلینک سے فارغ کر دیا۔ فرید کی صحت کی خوشی میں بہت سے افراد احاطے میں جمع ہو گئے۔ مقامی رواج کے مطابق مکئی کی میٹھی روٹیاں پکا کر ان کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (بھورے) کئے گئے اور درختوں کے نیچے بکھیر دیئے گئے۔ ایک پوٹھوہاری نے دل سوز آواز میں ایک گیت سنایا۔ اس گیت کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

بیماری میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا
آلو بخارا نہ انار کا رس
نہ ہرن کے گوشت کا پلاؤ
نہ محبوب کے نمکین رخسار کی چمک
صرف صحت اچھی لگتی ہے
اور جب اوپر والے کی برکتوں سے
بہار کے موسم کی طرح آہستہ آہستہ صحت ہماری بیماری کو ڈھانپتی ہے
تو ساری خوشیاں، سارے رنگ اور سواد لوٹ آتے ہیں
ساون کی پہلی بارش برسانے والے
میرے پیاروں کو صحت دے

ابھی گیت ختم ہی ہوا تھا کہ اچانک سب کو بُری طرح چونکنا پڑا۔ لمبی تڑنگی حنیفاں بالکل عریاں حالت میں مجمع کی طرف آرہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں اس کا جسم سرتاپا نمایاں تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' کاٹھیا چلایا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

لالہ فرید اور رستم بھی ہکا بکا تھے۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ دو تین افراد تیزی سے حنیفاں کی طرف بڑھے۔ ایک شخص نے اپنی چادر اُتار کر حنیفاں کا جسم ڈھانپنا چاہا۔ حنیفاں نے تڑپ کر ہاتھ چلایا اور چادر پرے پھینک دی۔ ''ننگا رہنے دو مجھے۔'' وہ چلائی۔ ''سب کچھ تو دیکھ چکے ہو۔ اب کیا چھپاؤں گی تم سے۔'' اس کی آواز میں ناقابلِ بیان کرب تھا۔

رستم تیزی سے آگے بڑھا۔ حنیفاں نے اس کا ہاتھ بھی جھٹک دیا اور دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے بولی۔ ''چار سال پہلے میں سیالکوٹ کے سیٹھ کے گھر کام کرتی تھی۔ اس سیٹھ نے مجھے ننگا کرنا چاہا تھا۔ میں نے اسے مار دیا۔ اس کے بھائی کو مار دیا پھر جو جو میرے سامنے آتا گیا اس پر گولی چلاتی گئی۔ میں نے دولت مندوں کے سامنے کپڑے نہیں اُتارے اور تین قتل کر کے اپنے جیسے لوگوں میں آگئی۔ میں تم میں آگئی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم بھی سب میرے جیسے ہو۔ زور آوروں کے ڈسے ہوئے.... دولت مندوں کے مارے ہوئے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ زنانی کے لئے سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان سب کا زور صرف زنانی پر ہی چلتا ہے۔ ساری گالیاں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے ہوتی ہیں۔ ساری دشمنیاں سارے

بدلے زنانیوں سے چکائے جاتے ہیں......وہ کتنا بھی بچے، اسے ننگا ہونا ہی پڑتا ہے۔“

رستم نے بمشکل اپنی چادر حنیفاں پر ڈالی اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔ وہ اس کے سینے پر ڈھے سی گئی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ ”میں نے چار سال تمہاری روٹیاں پکائی تھیں۔ تم سب کو اپنے ٹبر (خاندان) کی طرح سمجھا۔ کسی کو بیٹا سمجھا، کسی کو بھائی، کسی کو پیو۔ تم سب نے مل کر مجھے ننگا کیا۔ مجھے بیری سے لٹکایا، میری چمڑی ادھیڑی، میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا۔ میں نے کیا گناہ کیا تھا۔“

”تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“ رستم کراہا۔ ”گناہ گار تو ہم ہیں۔ ہم نے جلد بازی کی۔ ہم تمہارے مجرم ہیں۔ میں نے پہلے بھی تم سے معافی مانگی تھی۔ اب پھر مانگتا ہوں۔ ہم سب معافی مانگتے ہیں۔“

”تمہارے معافی مانگنے سے میرا تن ڈھک نہیں جائے گا۔ میں ہمیشہ کے لئے ننگی ہو گئی ہوں۔“ وہ پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھی پھر پہلو کے بل گر گئی۔ اس کی کمر عریاں ہونے لگی۔ رستم نے جلدی سے چادر اس کی کمر پر درست کی پھر ایک اور چادر اس کے جسم پر آئی۔ ...پھر ایک اور۔ کئی چادروں نے اسے ڈھانپ لیا۔ وہ ان چادروں کے نیچے پڑی ہچکیاں لیتی رہی۔ فرید اس کے قریب ہی ننگی زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا سر دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

حنیفاں کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونج رہے تھے......ساری گالیاں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ساری دشمنیاں سارے بدلے زنانیوں سے چکائے جاتے ہیں۔ وہ کتنا بھی بچے، اسے ننگا ہونا ہی پڑتا ہے۔ رستم اپنی بی بی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بھی ایک فرعون صفت شخص کی گرفت میں تھی۔ اسے بھی ناکردہ گناہوں کی پاداش میں اس وادیٔ موت میں گھسیٹا گیا تھا۔ رستم یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہونا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ جو کچھ بھی ہوگا بہت بُرا ہوگا۔ بی بی اس کا عشق تھی اور عشق بھی ایسا جو زندگی میں یوں شامل ہوتا ہے جیسے خون میں سرخ رنگ۔ اس عشق کی ناموس اور آبرو کی خاطر وہ انسانی سوچ اور تصور کی حد سے آگے تک جا سکتا تھا۔

اس نے ایک بار نہیں دو بار ڈپٹی ریاض سے کہا تھا کہ اگر اس نے اس جنگ میں کسی بھی حوالے سے بی بی کو گھسیٹنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ اس کی سوچوں سے کہیں زیادہ ہولناک نکلے گا اور ڈپٹی نے گھسیٹا تھا اس کی بی بی کو .انہیں پابندِ سلاسل کر کے اس ویرانے میں لایا تھا۔ ان پر اپنی سفاک نگاہیں ڈالی تھیں، ان کے کانوں میں اپنے زہریلے الفاظ اُتارے تھے۔ اپنے گستاخ عملے کو ان پر تشدد کا حکم دیا تھا اور بی جی کے کراہنے کی آوازیں رستم کے کانوں

تک پہنچائی تھیں۔ ڈپٹی ریاض کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ وہ بہت ذہین فطین اور بہت نامور اور بہت کامیاب شخص ہونے کے باوجود اپنی زندگی کی بھیانک ترین غلطی کر چکا تھا۔ وہ بہت زیادہ کر چکا تھا اس سے بہت...... بہت کم بھی کرتا تو رستم اس پر قیامت ڈھا دیتا۔

رستم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کرے گا اور کیا کر سکتا ہے؟ لیکن اسے اتنا معلوم تھا اگر بی بی سے گستاخی کرنے والا اور اذیت دینے والا اس کے سامنے ہوا تو وہ اپنی ہر بے بسی کے چیتھڑے اُڑا دے گا اور اس شخص کے لئے حشر برپا کر دے گا۔ بس ایک وجدان تھا......ایک غیبی صدا تھی جو اسے یقین دلاتی تھی کہ یہ ہو کر رہے گا۔

حنیفاں اپنے گریہ کی شدت سے نیم جان ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے آ کر اسے کوئی سکون آور انجکشن دیا۔ کاٹھیا، رجی اور شاہ وغیرہ نے آہوجہ کے ساتھ مل کر حنیفاں کو ایک چارپائی پر ڈالا اور سرنگ نمبر ایک میں حسنے گجراتی کی بیوی شاہدہ کے پاس چھوڑ آئے۔ اس واقعے نے سب ہی کو متاثر کیا تھا۔ لالہ فرید نے رستم سے اس شب پیش آنے والے تمام واقعات کی تفصیل پوچھی۔ ان واقعات میں قدرت کے چہیلے عظمت کی خودکشی، حنیفاں کے ساتھ ہونے والا بہیمانہ سلوک اور آخر میں نادیہ کی سزائے موت کا واقعہ بے حد یاس انگیز تھا۔

یہ بات چیت رات آٹھ بجے کے قریب شروع ہوئی اور پھر چلتی چلی گئی۔ یہ رستم کے رخصت ہونے کا وقت تھا مگر اس کے ساتھی، اس کے دوست اسے گھیرے بیٹھے تھے۔ وہ آنے والے چند دنوں کے منصوبے بنا رہے تھے اور اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ ان کے درمیان بیٹھا ہوا رستم درحقیقت ان کے درمیان نہیں ہے۔ وہ ان سے جدا ہو چکا ہے۔ رستم کی خواہش تھی کہ یہ محفل جلد سے جلد اپنے اختتام کو پہنچے اور وہ ڈپٹی ریاض سے کئے گئے وعدے کے مطابق یہاں سے روانہ ہو جائے۔ کھانا کھایا گیا، قہوے کا دور چلا کچھ لوگوں نے شراب نوشی کی۔ یہ سب کچھ رستم کے اردگرد ہو رہا تھا مگر اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ سب گفتگو کسی دوسری جگہ ہو رہی ہے۔ یہ لوگ بھی کسی اور مقام پر بیٹھے ہیں۔

رستم رات بارہ بجے سے پہلے وڈے ڈیرے کو خدا حافظ نہیں کہہ سکا۔ اپنی چادر کے نیچے ں نے ایک ٹارچ رکھی۔ ایک پسٹل، اس کے دو درجن راؤنڈ اور مہتم بستی سے حاصل ہونے الا ایک فٹ لمبا چھرا...... یہ اس کا کل سامان تھا۔ وڈا ڈیرہ چھوڑتے وقت اسے یاد آ گیا کہ یاض نے اسے نشانی کے طور پر ایک لاٹھی بھی ہاتھ میں رکھنے کو کہا تھا۔ لاٹھی حاصل کرنے ے لئے اس نے ایک کلہاڑی کا پھل اُتار کر پھینک دیا۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیتے ہی اسے آج

صبح ہونے والی اپنی اور جواد عرف جاوے کی لڑائی یاد آ گئی۔ اس ادھوری لڑائی کے سبب رستم کے پرستاروں کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ بے شک انہوں نے کھل کر اس مایوسی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر چہروں سے سب کچھ ہویدا تھا۔ رستم نے دل ہی دل میں اپنے ان سارے بہی خواہوں سے بھی معذرت کی۔

جاوے کے بارے میں اس نے اپنے خط میں تفصیل سے لکھ دیا تھا۔ اس نے فرید سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جاوے کو فی الحال کچھ نہ کہا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے۔

تاریکی کی آڑ میں رستم ڈیرے سے نکل آیا اور قبرستان کے قریب سے ہوتا ہوا خاموشی سے مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔ ہندو لکھی رام کی چتا کی راکھ ابھی تک قبرستان کے نواح میں موجود تھی۔ اس راکھ کا تعلق بالواسطہ قدرت اللہ کی شیطانی خصلت اور سوچ سے تھا۔ اس راکھ سے شروع ہونے والی کہانی نے نادیہ اور عظمت سمیت کئی افراد کی جانیں لی تھیں۔ رستم چلتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بارودی سرنگوں کے خطرناک حصار کے قریب پہنچنے والا تھا۔ وہاں اسے مزید محتاط ہو جانا تھا۔ بارودی سرنگوں کے حصار سے آگے جانے کے لئے خاص نشانیاں تھیں۔ یہ نشانیاں جو پتھروں اور دیگر زمینی نشانات کی شکل میں تھیں، فقط چند افراد کو ہی معلوم تھیں۔ ان میں لالہ، رستم، مراد، کاٹھیا اور تین چار افراد شامل تھے۔ باقی لوگ ان افراد کی رہنمائی کے بغیر اس حصار سے آگے نہیں نکل سکتے تھے۔ پچھلے دو سال میں کم از کم پانچ ایسے افراد کی جانیں گئی تھیں جو غلطی سے اس طرف نکل آئے تھے۔ اس کے علاوہ چار پانچ مویشی بھی مارے گئے تھے۔ طاقت ور مائینز نے دھماکے سے انہیں اُڑا دیا تھا۔ اس صورت حال کا شکار ہونے والا آخری بندہ چوہدری حشام کا کارندہ ساجن تھا۔ جو وڈے ڈیرے سے فرار ہونے کی کوشش میں بدحواس ہو کر بھاگا تھا اور ایک مائن سے ٹکرا کر راہی عدم ہو گیا تھا۔

اچانک رستم کے حساس کانوں نے اسے خبردار کیا کہ کوئی اس کے عقب میں موجود ہے۔ کوئی انسان یا جانور۔ اس کا ہاتھ چادر کے نیچے اپنے پستول کے دستے پر پہنچ گیا۔ ایک موڑ کاٹنے کے فوراً بعد وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ جانور نہیں کوئی انسان تھا اور اکیلا تھا۔ وہ بھربھرے پتھر کے ساتھ چپکا رہا اور آنے والے کا انتظار کرتا رہا پھر اسے ہیولا نظر آیا۔ رستم تڑپ کر آگے بڑھا اور پستول کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ ''خبردار۔'' وہ گرجا۔ وہ شخص بھی تیزی سے گھوما اور اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھایا لیکن اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ ہتھیار نکال سکتا اور شاید اسے

ہتھیار نکالنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اجمل خان تھا۔ رستم اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اجمل بھی حیران ہوا تاہم اس کی حیرانی شاید اس وجہ سے تھی کہ وہ رستم کو خود سے آگے سمجھ رہا تھا جب کہ رستم اس کے عقب سے برآمد ہوا تھا۔

''کیوں میری دُم سے چپکے ہوئے ہو تم؟'' رستم نہایت خشک لہجے میں بولا۔

''وہ...... دراصل...... ام نے...... ام نے آپ کو قبرستان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ ام پریشان ہوا اور آپ کے پیچھے آئے بغیر نہ رہ سکا۔''

''ساری پریشانیوں کا ٹھیکہ تم نے کیوں لے لیا ہے۔ اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے ہو؟'' رستم نے دانت پیسے۔

''دراصل امارا نظر آپ پر پڑ گیا تھا۔''

''نظر پڑ گیا تھا، تمہاری نظر تو ہر وقت رہتی ہی مجھ پر ہے۔ جیسے میں تمہاری کوئی چیز چرا کر بھاگنے والا ہوں۔''

''رستم صیب! ام صرپ اور صرپ آپ کے لئے یہاں وارد ہوا ہے۔ اب امارا نظر آپ جناب پر نہیں رہے گا تو کس پر رہے گا۔ ام نہیں چاہتا کہ آپ پر جان قربان کرنے کا کوئی موقع ام سے ضائع ہو۔ یہ جان تو اب ویسے بھی چلے جانا ہے لیکن اگر یہ خاص آپ کے لئے قربان ہوگا تو خدا قسم ام کو مرنے میں مزہ آئے گا۔''

خان کے لب و لہجے میں موجود جذبے سے رستم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ صرف زبانی کلامی بات نہیں کر رہا تھا۔ حقیقتاً ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ بہر حال اس وقت خان کا یہاں پایا جانا رستم کے لئے کسی طرح بھی خوشی کا باعث نہیں تھا۔ ایک عجیب سی جھلاہٹ اسے محسوس ہونے لگی۔ وہ بولا۔ ''خان! تمہارے اندر مرنے کا جذبہ تو ہے لیکن تم اپنی جلد بازی سے اپنی جان بے کار میں دے دو گے۔ اب یہی دیکھ لو...... تم میرے پیچھے آ رہے تھے۔ یہاں سے آدھ فرلانگ آگے بارودی سرنگیں شروع ہو جاتی ہیں بلکہ شاید اس سے بھی تھوڑا فاصلہ ہے۔ کہیں پاؤں الٹا سیدھا پڑ جاتا تو تمہارے چیتھڑے اُڑ جانا تھے۔''

''آپ کے پیچھے آ رہا تھا رستم صیب! غلط راستے پر کیسے جا سکتا تھا۔'' وہ جذبے سے بولا۔ اس کے لفظوں میں معنویت تھی۔

رستم ٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا اس عجیب شخص سے کس طرح پیش آئے۔ رستم کی خاموشی سے شہ پا کر وہ بولا۔ ''ام کو لگتا ہے آپ ڈیرے کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو اس سے تمہاری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔''

اجمل خان ایک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔ تاروں کی روشنی میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خلوص آمیز بے قراری تھی۔ وہ بولا۔ ''رستم صیب! ام کو نہیں مالوم کہ آپ کہاں جا رہا ہے اور کیوں؟ ام کو یہ بھی مالوم نہیں کہ آج سویرے آپ نے اس ''پولیس کے پہلوان'' سے مقابلہ بیچ میں کیوں چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ بھی ام کو بہت سی باتوں کا پتا نہیں لیکن ام ایک بات بہت یقین سے کہہ سکتا ہے رستم صیب! آپ کے جانے سے آپ کے ساتھیوں کا دل آدھا رہ جائے گا اور شاید آدھا بھی نہ رہے۔ ام سمجھتا ہے کہ ان کا سارا جوش اور ہمت آپ کی وجہ سے ہے۔ لالہ فرید بے چارہ تو اس وقت بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں ہے اور اگر ہو بھی جائے تو بھی وہ اپنے ساتھیوں میں آپ کی طرح بجلی کی لہریں نہیں دوڑا سکے گا۔ اپنے تجربے کی وجہ سے ام یہ بات پورے یقین سے کہہ رہا ہے۔''

کہیں پاس ہی کوئی پرندہ بولا۔ قبرستان کی طرف سے دو بجو آگے پیچھے دوڑتے آئے اور ان کے پاؤں کے پاس سے گزر گئے۔

رستم نے کہا۔ ''تمہارا تجربہ میرے بارے میں کیا ارشاد کرتا ہے۔ کیا میں بغیر کسی وجہ کے یہاں سے جا رہا ہوں یا پھر تم مجھے کم ہمت سمجھ رہے ہو۔ ذرا دماغ سے سوچو، کوئی بات ہوگی جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔''

''ام آپ سے پورا اتفاق کرتا ہے مگر......''

''دیکھو اجمل خان! اگر تم واقعی مجھے عزت دیتے ہو تو پھر چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ لالے فرید کو میری جگہ سمجھو اور وہی کرو جو وہ کہتا ہے۔ میرے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہو گے تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ سمجھ لو کہ تم نے آج رات مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔ نہ مجھ سے ملے ہو۔''

اجمل خان نے کچھ کہنا چاہا۔ کہنے کے لئے منہ بھی کھولا لیکن پھر رستم کے تاثرات دیکھتے ہوئے اپنی بات ہونٹوں میں دبا لی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''رستم صیب! ام آپ کے لئے نقد جان دینے کے لئے یہاں آیا ہے۔ آپ ام کو جس جگہ کھڑا کرے گا ام ہو جائے گا۔ کوئی شکوہ نہیں کرے گا۔ کچھ نہیں کہے گا۔ آپ پیر قدرت اللہ کا دشمن ہے اور آپ نے اس خنزیر سے دشمنی کا حق ادا کیا ہے۔ ام آپ کا بے دام کا غلام ہے اور اپنے آخری سانس تک رہے گا۔''

''میں تمہارے خیالوں کی قدر کرتا ہوں اجمل خان۔ تم نے بڑی جلدی میرے دل میں

اپنے لئے جگہ بنائی ہے۔'' رستم نے تہہ دل سے کہا۔

''اب آپ سے کب ملاقات ہوگا؟'' اجمل خان نے دل گیر لہجے میں پوچھا۔

''جب تک بندہ زندہ رہے، ملاقات کا موقع تو باقی رہتا ہی ہے۔ کیا پتا یہ موقع کل ہی آ جائے۔ کیا پتا کبھی نہ آئے۔''

اجمل خان فرطِ محبت سے بے اختیار ہو کر رستم کے گلے لگ گیا۔ رستم نے اس کے کاندھے پر تھپکی دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے راستے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ رستم کا رخ پولیس کی پوزیشنوں کی طرف تھا اور اجمل خان کا رخ وڈے ڈیرے کی طرف۔ وادی سون کی فضا میں عجیب سا سکوت تھا۔ کچھ ہی دیر بعد خطرناک ترین راستہ شروع ہو گیا۔ یہاں بے شمار بارودی سرنگیں خونخوار شکاری جانوروں کی طرح گھات لگائے بیٹھی تھیں۔ بالکل بے حرکت...... یکسر خاموش...... ایک مدت سے زمین کے نیچے چھپی ہوئی تھیں لیکن ان میں سے ہر سرنگ کسی بھی وقت ایک دھماکے کے ساتھ قیامت برپا کر سکتی تھی۔ لالہ فرید اور اس کے ساتھی گاہے بگاہے ان سرنگوں کا معائنہ کرتے رہتے تھے۔ خاص طور سے تیز بارشوں کے بعد اگر چند بارودی سرنگیں ننگی ہو جاتی تھیں تو احتیاط کے ساتھ ان پر مٹی وغیرہ ڈالی جاتی تھی۔ محفوظ راستوں کی نشاندہی کرنے والی علامتوں کی حفاظت کی جاتی تھی اور انہیں گاہے بگاہے نمایاں کیا جاتا تھا۔ یہ نشانیاں پتھروں، پودوں اور درختوں کے کٹے ہوئے تنوں کی شکل میں تھیں۔ کہیں کہیں زمین میں چوبی میخیں بھی گاڑھی گئی تھیں تاہم عام شخص کے لئے انہیں دیکھنا اور سمجھنا آسان نہیں تھا۔ ان دو ہزار بارودی سرنگوں میں سے 80 فیصد ایسی تھیں جن کو بلاسٹ کئے جانے کے لئے 90 پونڈ وزن کی ضرورت تھی۔ یہ ساری سرنگیں بلی، کتے اور دیگر چھوٹے جنگلی جانوروں کے لئے بالکل بے ضرر تھیں۔ تاہم کچھ بارودی سرنگوں کی ''ڈیٹ لمٹ'' اس سے کم تھی اور وہ قدرے بڑے جانوروں کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

رستم بڑی احتیاط سے رک رک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ نشانی کو سمجھنے میں جہاں ذرا سا بھی شبہ ہوتا وہ رک جاتا تھا۔ پولیس کی پوزیشنوں کے عقب میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی گونج تھی۔ رستم جانتا تھا کہ یہاں ایک عارضی ہیلی پیڈ بنایا گیا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد پروں کی گونج پھڑ پھڑاہٹ میں بدلی اور پھر رستم کو کچھ فاصلے پر ہیلی کاپٹر کی روشنیاں ٹیلوں کے پیچھے سے بلند ہوتی نظر آئیں۔ وہ پھڑ پھڑاتا ہوا فضا میں اوپر اٹھا اور پھر ایک ٹرن لے کر جہنم کی طرف پرواز کر گیا۔

رستم اب پولیس کی پوزیشنوں کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب بھی اس کے دل میں یہ خواہش موجود تھی کہ اس نے جو کچھ سنا اور سمجھا ہے وہ جھوٹ ہو۔ بی بی ان ٹیوں میں موجود نہ ہو۔ اسے وائرلیس پر جو آواز سنائی گئی ہو وہ کسی اور کی ہو...... یا وہ ریکارڈ شدہ آواز ہو۔ یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے سراب اس کا ذہن اب بھی اسے دکھا رہا تھا لیکن حقیقت بھی اپنے ٹھوس وجود کے ساتھ ساتھ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ اس کے اندر سے آواز آتی تھی...... بی بی یہاں موجود ہیں اور ریاض کے شکنجے میں ہیں۔

''جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔'' بیس تیس میٹر کے فاصلے سے ایک گرج دار آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔

وہ پچھلے دو منٹ سے کسی ایسی ہی آواز کا منتظر تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔

''لاٹھی نیچے رکھ کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' رستم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

اس کے اردگرد افراد جمع تھے لیکن اس کے قریب آنے میں جان بوجھ کر تاخیر کر رہے تھے۔ غالباً سامنے آنے سے پہلے وہ اپنی پوری تسلی کر لینا چاہتے تھے۔

رستم کو ابھی تک اپنے عقب سے اندیشہ موجود تھا۔ عقب سے وہ اپنے ہی کسی ساتھی کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتا تھا۔

جب اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے تو اگلا حکم ملا۔ ''اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے آؤ۔'' رستم نے اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔

قریباً بیس تیس میٹر چلنے کے بعد وہ ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں آ گیا۔ اس کے اردگرد نادیدہ افراد کی نقل و حرکت موجود تھی۔ یکایک تین چار بڑی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ چھ سات افراد اطراف سے نمودار ہوئے اور رستم کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں دو اجرالی تھے، باقی باوردی پولیس والے۔ کم از کم چار خودکار رائفلیں رستم کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''اپنے ہتھیار نکال کر نیچے پھینک دو۔'' ایک انسپکٹر نے آرڈر جاری کیا۔

رستم نے چادر کے نیچے سے پستول، ٹارچ اور چھرا وغیرہ نکال کر خود سے دس پندرہ فٹ دور پھینک دیئے۔ ایک پولیس والے نے یہ چیزیں سمیٹ لیں۔ ''چادر بھی اُتار دو۔'' انسپکٹر نے کہا۔ رستم نے چادر اُتار کر دور پھینک دی۔

ایک ماہر پولیس اہلکار نے آگے بڑھ کر رستم کی جامہ تلاشی لی۔ اس کی پگڑی اُتاری۔ جوتے اتروائے۔ جیبیں بالکل خالی کر دیں۔ پوری طرح تسلی ہو جانے کے بعد رستم کے ہاتھ

پشت کی طرف موڑ کر ان میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔

''ہتھکڑی کیوں لگا رہے ہو؟'' رستم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میں خود چل کر یہاں تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''ڈپٹی صاحب کا آرڈر ہے۔''

ہتھکڑی لگ جانے کے بعد پولیس اہلکاروں کا رویہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے رستم کو باقاعدہ دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔

رستم تو آیا ہی آگے بڑھنے کے لئے تھا۔ اس کے علاوہ اس نے خود کو ہر طرح کے حالات کے لئے تیار بھی کر رکھا تھا۔

اچانک ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ رستم نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ تارے چمک رہے تھے پھر بھی بوندیں گری تھیں۔ شاید کسی چھوٹی سی بدلی نے رستم کی مصیبت پر چند اشک گرائے تھے پھر یہ بدلی آگے نکل گئی اور بوندیں تھم گئیں۔ رستم کو نہ جانے کیوں ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ اس وقت وہ ابھی ڈاکو نہیں بنا تھا۔ ابھی اس کی آپو زاہدہ کو سرعام رسوا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ابھی اس کے والد کے بوڑھے جسم میں گولیاں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی زندگی بڑی ہموار تھی۔ پنجاب کے اس خوب صورت گاؤں کے چھوٹے سے گھر میں وہ چھوٹا سا گھرانہ ابھی آباد تھا۔ ایسی ہی تاروں بھری راتوں میں چھت پر چارپائیاں ڈال کر لیٹتے تھے اور بچپن انہیں بے وجہ گدگداتا تھا۔

ایک رات ایسے ہی بن بادل کے بوندیں پڑی تھیں۔ رستم نے تک بندی کر کے اپنی سلیٹ پر ایک نظم لکھی تھی۔ بادل جھوم کے آتے ہیں۔ خوب بارش برساتے ہیں۔ موسم کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ ندیوں میں پانی بھرتے ہیں۔ پنچھی خوش ہو جاتے ہیں۔ میٹھے نغمے گاتے ہیں۔ بچے شور مچاتے ہیں اور بارش میں نہاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی الفاظ تھے۔

صبح یہ نظم اس نے ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ انہوں نے کہا۔ ''تم شاعر بننا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں، میں علامہ اقبال بننا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے رستم کی بچکانہ بات سن کر ایک گہری سانس لی تھی اور بولے تھے۔ ''اقبال روز روز پیدا نہیں ہوتے۔''

''تو روز روز کیا پیدا ہوتا ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ بولے تھے۔ ''روز روز بھوک پیدا ہوتی ہے، ناانصافی اور ظلم پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی وجہ سے بُرے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔''

”یہ بُرے لوگ کیا ہوتے ہیں ماسٹر جی؟“ رستم نے پوچھا تھا۔

ماسٹر صاحب نے جواب نہیں دیا تھا لیکن آج یہ جواب رستم کے پاس موجود تھا بلکہ وہ خود ہی اس سوال کا جواب تھا۔

وہ پولیس کی پوزیشنوں کے قریب پہنچا تو ایک دم بہت سے افراد اس پر ٹوٹ پڑے۔ اسے مکوں، ٹھڈوں اور بندوقوں کے کندوں سے مارنے لگے۔ ”دستی بم پھینکتا ہے حرامی۔“ ایک شخص طیش میں چیخا۔ وہ اسے گندی گالیاں بھی دے رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا..... پھر اٹھا اور پھر گر گیا۔ رستم جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہونا ہے۔ اس نے حال ہی میں کئی پولیس والے قتل کئے تھے۔ ان مرنے والوں کے یار، دوست اور عزیز اس کے لئے شعلہ جوالا تھے۔ ان کا بس چلتا تو شاید اسی جگہ پر مقدمہ چلا کر اسے پھانسی پر بھی لٹکا دیا جاتا۔ اسے مارنے پیٹنے والے وہ لوگ تھے جو عام حالات میں شاید اس کے سامنے اونچا سانس بھی نہ لے سکتے تھے لیکن اس وقت وہ مجمع کا حصہ تھے اور صورتِ حال کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

چند ہی سیکنڈ میں رستم کے ناک منہ سے خون رسنے لگا۔ اچانک ایک شخص تیزی سے آگے آیا۔ ”رک جاؤ..... نہ مارو۔“ وہ گرجا۔

یہ آواز رستم کو پہچانی ہوئی سی لگی۔ آنے والے نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کے ہاتھ روکے اور انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹایا۔ رستم گھٹنوں پر زور دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا، مشتعل افراد کو روکنے والا شخص وہی انسپکٹر شاد تھا جس کی جھلک رستم نے ڈھوک شاہاں کے پٹواری کے گھر میں دیکھی تھی۔ (انسپکٹر شاد کی ”خدمت گزاری“ کے لئے ایک مقامی سب انسپکٹر نے لڑکی کا انتظام کرنا چاہا تھا۔ انسپکٹر شاد اس پر برس پڑا تھا اور بے نقط سنائیں تھیں اور شاید انسپکٹر کے اسی عمل کی وجہ سے رستم کے ہاتھوں ان بدمعاش اہلکاروں کی زندگیاں بچ گئی تھیں)

آج وہی انسپکٹر ایک بار پھر عام پولیس والوں سے مختلف رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا.....

اس نے رستم کو اپنی حفاظت میں لیا اور ساتھیوں کی ناراضگی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک خیمے میں لے آیا۔ یہاں دو لالٹینیں روشن تھیں اور کھونٹیوں پر اہلکاروں کی وردیاں وغیرہ لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک طرف تین بستر بچھے تھے اور ٹرے میں چائے کے خالی برتن دھرے تھے۔ انسپکٹر شاد کی ہدایت پر ایک سنتری نے رومال سے رستم کے ہونٹوں اور ناک سے رسنے والا خون صاف کیا۔ ہتھکڑی بدستور رستم کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھا۔

سنتری پانی لینے کے لئے باہر چلا گیا تو رستم نے انسپکٹر سے پوچھا۔ ”ڈپٹی ریض کہاں ہے؟“

”تم کافی لیٹ پہنچے ہو۔ وہ تمہارا انتظار کرتے رہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ”ہیلی“ پر لاہور گئے ہیں۔ ضروری کام تھا۔“ انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کب آئے گا؟“

”کل کسی وقت، لیکن تم کیوں لیٹ ہوئے؟“

”مجبوری تھی۔ میں وہاں سے نکل نہیں سکا۔ میں نے ریاض کو بتایا تھا کہ میں لیٹ ہو سکتا ہوں۔“

”وہ بیس کیمپ سے آٹھ بجے یہاں پہنچ گئے تھے۔ تب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

رستم چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”بی بی کے بارے میں تمہیں پتا ہے؟“

”کیوں..... مجھے کیوں پتا نہیں ہوگا؟“ انسپکٹر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”کیا بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“

”یہیں پر ہے۔“ انسپکٹر شاد نے کہا۔

”کیا..... میں..... مل سکتا ہوں؟“

انسپکٹر شاد کے چہرے پر پیشہ ورانہ سختی دکھائی دی۔ ایک لمحے کے لئے یوں لگا کہ وہ کوئی کرخت بات کہے گا لیکن پھر اچانک اس کے چہرے کے عضلات نرم پڑ گئے۔ وہ عجیب نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ یہ وہی نظریں تھیں جن سے پھانسی پانے والے مجرم کو پھانسی سے ایک دن پہلے دیکھا جاتا ہے۔ رستم کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہاں حالات اس کے اور بی بی کے لئے بدترین رخ اختیار کرنے والے ہیں۔

”کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ انسپکٹر شاد نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

رستم بیٹھ گیا۔ شاد پہلے ہی کرسی پر تھا۔ عام پولیس والوں کی طرح اس کی توند تھوڑی سی نکلی ہوئی تھی لیکن جسم بھدا نہیں تھا۔

”تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج پہلی بار تمہیں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ دکھ ہوتا ہے تم جیسے لوگوں کو دیکھ کر۔ جوانی میں ہی اپنی زندگی برباد کر بیٹھتے ہو۔ کیا عمر ہوگی تمہاری؟“

”میں عمر کا حساب کتاب نہیں رکھتا۔“

”ہاں..... حساب کتاب تو اس چیز کا رکھا جاتا ہے جس کی قدر ہو۔ تم جیسے بے وقوف تو

زندگی کو کچرے کے ڈھیر سے اٹھائی شے سمجھتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولا تاہم اس تلخی کی تہہ میں افسوس اور ہمدردی کی مدھم لہر بھی تھی۔

سنتری پانی لے آیا۔ رستم نے سنتری کے ہاتھ سے ایک گھونٹ بھر کر بس کلی کی۔

سنتری باہر گیا تو رستم نے انسپکٹر شاد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "غیب کا علم اوپر والے کے سوا کسی اور کے پاس نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ زندگی سے دور اور موت سے قریب ہو رہا ہوں۔ میرے پاس جو تھوڑا سا وقت باقی ہے کیا اس میں، مَیں بی بی سے ملاقات نہیں کر سکتا..... بس ایک چھوٹی سی ملاقات۔"

"کیا میں شکل سے تمہیں نرا اُلو کا پٹھا نظر آتا ہوں۔" انسپکٹر شاد پھنکارا۔ "تمہیں تمہاری معشوق کا دیدار کرانے کے شوق میں بے روزگار ہو کر گھر بیٹھ جاؤں۔" اس نے تیکھی نظروں سے رستم کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

خیمے کے سامنے تین مسلح افراد موجود تھے۔ ایک سنتری رائفل بہ دست عین دروازے پر موجود تھا۔ یہ سارے لوگ رستم کی طرف سے از حد چوکنے نظر آتے تھے۔ گاہے بگاہے وہ رستم کی طرف پُرتشویش نظروں سے دیکھ بھی لیتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی اجرائی یا کوئی پولیس اہلکار خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکتا تھا۔ دلچسپی یا پھر غصیلے پن سے رستم کو تکتا تھا اور واپس چلا جاتا تھا۔

رستم آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ عاشق تھا اور اس کا عشق اس کے آس پاس کہیں موجود تھا۔ اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ اس کی خاطر رستم کے لئے اپنی جان قربان کرنا اتنا ہی آسان تھا جتنا شدید پیاس میں پانی کا گھونٹ بھر لینا اور جس شخص کے لئے جان دینا اتنا آسان ہو جائے وہ مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کے معنی تبدیل کر سکتا ہے، لاچاری اور اختیار کا مفہوم بدل سکتا ہے لیکن بات صرف موقع ملنے کی ہوتی ہے۔ رستم کو علم نہیں تھا کہ اسے یہ موقع ملے گا یا نہیں۔

انسپکٹر شاد اسے بے حد خشک اور روکھا جواب دے کر گیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں رستم کے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید ....شاید وہ کچھ کرے۔ اگر وہ چاہتا تو بی بی کو رستم کے رُوبرو لانے یا رستم کو بی بی کے رُوبرو لانے کے کئی جواز تھے۔ اس طرح کی ملاقات کو پولیس والے کئی بار ایک تفتیشی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دو شناسا ملزموں کو ایک دوسرے سے ملنے اور آزادانہ بات چیت کا موقع فراہم کرتے ہیں اور پھر اس ملاقات کو اپنی تفتیش میں پیش رفت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ملزموں کی "زندگی سے بے رغبتی" ختم

کرنے کے لئے بھی ایسی ملاقاتیں کرائی جاتی ہیں یا پھر انہیں اعصابی طور پر توڑنے کے لئے ان کے کسی پیارے کی حالتِ زار انہیں دکھائی جاتی ہے۔

رستم کرسی پر اکڑوں بیٹھا رہا اور اس بارے میں سوچتا رہا۔ بہار کی وہ پُرخزاں رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔ ہوا کے جھونکے خیمے کی دیواروں کو کبھی اندر اور کبھی باہر کی طرف دھکیلتے رہے۔

خیمے کے اندر آنے کے دو راستے تھے۔ سامنے کی طرف بڑا راستہ اور عقب میں ایک چھوٹا راستہ تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہر جاندار و بے جان شے ایک "اونگھ" میں محسوس ہوتی تھی۔ خیمے کے عقبی راستے کا پردہ ہٹا اور بی بی اندر آ گئیں۔ رستم دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص میں تھیں۔ ان کے پاؤں ننگے تھے لیکن سر پر ہم رنگ آنچل موجود تھا۔ وہ اس حال میں اور اس ماحول میں بھی دلکش نظر آتی تھیں۔ رستم دیکھتا رہ گیا۔ حالات کی ساری ستم ظریفیاں اور سفاکیاں ایک دم پس منظر میں چلی گئیں۔ سامنے صرف حسن رہ گیا اور عشق کی وہ حدت رہ گئی جس کے سامنے ہزار سورجوں کی تپش بھی ہیچ ہے۔

رستم کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بی بی نے رخ پھیرا۔ پردے کی دوسری جانب سے کسی نے ایک ٹرے بی بی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس ٹرے میں کھانا اور کچھ فروٹ وغیرہ تھا۔ بی بی نے چند قدم چل کر ٹرے ایک تپائی پر رکھی اور رستم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ رستم اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں تھے۔ ناک اور ہونٹ زخمی تھے۔

بی بی نے سسک کر کہا۔ "رستم! تم نے بات نہیں مانی ناں۔ میں نے تم سے کہا تھا.....نہ آنا۔"

پھر وہ بے ساختہ آگے بڑھیں۔ کوئی مصلحت یا شرم راستہ نہ روک سکی وہ رستم کے چوڑے سینے سے لگ گئیں۔ ایک خوشبو تھی جس نے رستم کے ہر آتشیں زخم کا منہ، مہک اور ٹھنڈک سے بھر دیا۔

رستم کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ بی بی کو اپنی باہوں میں لے لیتا اور اس طرح اپنے ساتھ لپٹاتا کہ وہ اس کے جسم کا حصہ بن جاتیں۔ وہ بس سیدھا کھڑا تھا اور بی بی کو اپنی چھاتی سے چمٹا ہوا دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔ یہ دیکھنا اور محسوس کرنا اتنا جاں فزا تھا کہ وہ اپنے اندر اور اپنے اردگرد کے ہر دکھ اور تکلیف کو بھول گیا تھا۔

بی بی سسک رہی تھیں۔ ان کے جسم کا تلاطم وہ اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔ بی بی کے

دونوں ہاتھ رستم کی پشت پر تھے۔ رستم نے بے ساختہ اپنی ٹھوڑی بی بی کے سر پر ٹکا دی۔ بی بی نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے رستم! انہوں نے تمہیں بہت مارا ہے اور پتا نہیں ابھی۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئیں۔ الفاظ ان کے ہونٹوں میں الجھ کر رہ گئے۔

ایک دل دوز ہچکی لینے کے بعد بی بی نے اپنی بات دہرائی۔ ''تمہیں کہا تھا ناں رستم! تم یہاں نہ آنا۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری موت کے بدلے میں انہیں اپنی ترقیاں اور اپنے تمغے نظر آرہے ہیں۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں رستم اور سب سے بڑھ کر یہ ڈپٹی ریاض۔ یہ انسان نہیں جانور ہے۔ اس نے ''اِن کاؤنٹر'' ڈال کر جمشید کو مار دیا ہے۔ تایا معصوم بھی میری طرح اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ سخت زخمی ہیں، پتا نہیں کہ بچتے بھی ہیں یا نہیں۔''

رستم کچھ دیر تک خاموش رہا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی تھی۔ دو لالٹینوں کی روشنی میں یہ نمی بہت واضح دکھائی دیتی تھی۔ بی بی اس سے الگ ہو کر کھڑی ہوگئیں اور اس کا زخمی چہرہ دیکھنے لگیں۔ رستم نے نظریں جھکائے جھکائے بے حد یقین سے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں بی بی۔ جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ریاض نے تایا معصوم کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے تو اب نہیں رکھ سکے گا اور آپ پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ وہ آپ کو بھی چھوڑ دے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے اس بارے میں۔''

''رستم! تم نے بہت غلط کیا ہے۔'' شانی نے بے قراری میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیوں اتنی بڑی قربانی دی تم نے میرے لئے؟ میرے لئے سب کچھ بھول گئے۔ اپنے آپ کو...... اپنے ساتھیوں کو...... اپنی بیوی کو۔ کیا نادیہ کا کوئی حق نہیں تھا تمہاری زندگی پر۔ اس کو کس کے سہارے چھوڑ کر یہاں آگئے ہو؟''

رستم کو جھٹکا سا لگا۔ وہ چونک کر شانی کو دیکھنے لگا۔ وہ نادیہ کو چھوڑ کر نہیں آیا تھا، نادیہ ہی دنیا چھوڑ گئی تھی۔ وہ اب کہیں نہیں تھی اور بی بی سمجھ رہی تھیں کہ وہ وڈے ڈیرے کے دوسرے محصورین کے ساتھ وہاں موجود ہے اور بی بی یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ دونوں باتیں غلط تھیں۔

رستم کے سینے میں دکھ بھر گیا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''یہاں آکر میں نے کسی کا حق نہیں مارا بی بی!'' پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''نادیہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

بی بی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے اس کی

طرف دیکھتی چلی گئیں، جیسے رستم کے الفاظ پر یقین نہ کر پا رہی ہوں۔ پھر ان کی شفاف آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو رستم؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں بی بی۔ نادیہ ختم ہوگئی ہے۔''

''کیا ہوا تھا اسے؟'' بی بی نے بے دم سا ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رستم بھی بیٹھ گیا۔ اس نے مختصر الفاظ میں بی بی کو نادیہ کے انجام سے آگاہ کیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ نادیہ کس طرح قدرت اللہ کے ایک شیطان چیلے کے دام میں الجھی اور کس طرح اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودی۔ بی بی دکھ کے سمندر میں غرق ہو کر یہ سب کچھ سنتی رہی۔ گاہے بگاہے انہوں نے رستم سے سوالات بھی کیے۔

رستم گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''بی بی! میں آپ کے حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر آپ ملتان کے آستانے میں میرا ہاتھ نہ روکتیں۔ مجھے اس زہریلے سانپ کا سر کچل لینے دیتیں۔ وہ جب تک زندہ رہے گا بھابو اور نادیہ جیسی نہ جانے کتنی عورتیں اس کے ہاتھوں اپنی جان گنواتی رہیں گی۔''

رستم نے دیکھا بی بی نے ایک بار پھر بے قراری سے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔

''نہیں رستم! تم سمجھ نہیں رہے۔ اس مسئلے کا حل قدرت اللہ کو قتل کرنا نہیں ہے۔ قدرت اللہ قتل ہو جائے گا تو اس کے چیلوں میں سے کوئی اور قدرت اللہ بن جائیں گے۔ وہ اس کے گدی نشین کہلائیں گے۔ قدرت اللہ کا مزار قدرت اللہ سے کہیں بڑھ کر لوگوں کو گمراہ کر دے گا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر کرب میں ڈوب کر بولیں۔ ''قدرت اللہ کو وہ شخص مارے گا جو اس کے عقیدے کو مارے گا...... اس کی سوچوں کو شکست دے گا اور یہ لڑائی بندوق سے نہیں لڑی جا سکتی۔''

بی بی بظاہر قدرت اللہ کی باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کا چہرہ نادیہ کی حسرت ناک موت کے دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رستم نے بی بی سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ مقامی قانون کے مطابق نادیہ کو بدترین موت سے بچانے کے لئے اس نے اسے اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہے۔ بی بی نے اس کی باتوں پر مکمل یقین کیا تھا۔ ان لمحوں میں رستم کے دل میں آئی کہ بی بی سے واقعی کچھ نہ چھپائے۔ آج ان کو یہ بھی بتا دے کہ اس نے نادیہ سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس سے ہمیشہ اتنی ہی دور رہی ہے جتنا ندی کا دوسرا کنارہ۔

لیکن پھر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ جو بات اب تک راز رہی تھی وہ اب بھی راز ہی رہ جاتی تو ٹھیک تھا۔ وہ بی بی کو اپنے جھوٹ سے آگاہ کرتا تو پھر اس کی کہی ہوئی کئی اور باتوں پر بھی بی بی کو جھوٹ کا شبہ ہونے لگتا۔ اس نے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ سچائیوں کی اپنی خوشبو ہوتی ہے اور یہ خوشبو اظہار اور الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ بی بی کو دیکھنے اور چاہنے کے بعد وہ دنیا کی ہر عورت سے دور چلا گیا تھا اور یہ سچائی بھی الفاظ کی محتاج نہیں تھی۔ یہ سچائی دل کے گنبد میں پوشیدہ رہ کر بھی ایک بہت بڑی دولت تھی۔

بی بی گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر بولیں۔

''رستم! کیا تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟''

''نن...... نہیں بی بی۔''

''کچھ چھپا تو نہیں رہے؟''

رستم نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ بی بی عجیب محویت کے عالم میں رستم کا چہرہ دیکھے جا رہی تھیں۔

''رستم! تمہارے ساتھی کیا سوچیں گے...... ایک عورت کی خاطر تم نے ان سے منہ موڑ لیا۔''

''بی بی! وہاں رہ کر بھی میں ان کے لئے اور اپنے لئے کیا کر سکتا تھا۔ وہاں موت یا گرفتاری کے انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ انتظار تو زیادہ کم ضرور ہو سکتا ہے لیکن صورت بدل نہیں سکتی۔ وہاں خوراک اور پانی کا ذخیرہ مسلسل کم ہو رہا ہے۔ اگر پولیس اور دوسری ایجنسیاں وڈے ڈیرے میں داخل نہیں بھی ہوتیں تو بھی زیادہ دیر مزاحمت جاری نہیں رہ سکتی۔ ہمیں صرف ایک موقع ملا تھا لیکن وہ بھی ضائع ہو گیا۔ کاش ہم فائدہ اٹھا سکتے۔''

''تم وہی زہریلی چائے والی بات کر رہے ہو؟'' بی بی نے پوچھا۔

''ہاں بی بی! نادیہ کی وہ غلطی ہم سب کو لے ڈوبی۔ ایسا موقع اب نہیں مل سکتا۔ ریاض اپنی بہت سی نفری پانڈو ورے کی طرف لے جا چکا تھا۔ ہم نے دو اجرالیوں کو قتل کر کے پولیس کی ایک خاص الخاص پوزیشن پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ اگر لالہ اور اس کے ساتھی ہلہ بول دیتے تو یہ گھیرا ٹوٹ جانا تھا۔''

بی بی گہری سوچ میں ڈوبی رہیں جیسے اس خوفناک صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی حل سوچ رہی ہوں۔ لیکن حل کہیں نہیں تھا۔ دور دور تک نہیں تھا۔ رستم کے ہاتھ آہنی ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے۔ ان کے اردگرد ان گنت مسلح پہرے دار اور خون خوار اجرالی تھے۔ ہر طرف سرچ لائٹس گردش کر رہی تھیں اور بو گیر کتوں کی لرزہ خیز آوازیں تھیں۔ لالٹینوں کی سرخ روشنی میں بی بی کا چہرہ تمتمایا ہوا نظر آتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''رستم! میری زندگی کوئی زندگی تو

نہیں ہے۔ تم نے مر جانے دیا ہوتا مجھے۔''

''نہیں بی بی۔'' وہ تڑپ کر بولا۔ ''میری زندگی سے آپ کی زندگی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ آپ کو زندہ رہنا چاہیے تھا اور آپ زندہ رہیں گی۔ آپ کی زندگی کے ساتھ بے شمار لوگوں کی بھلائی جڑی ہوئی ہے۔ لوگ آپ کو چاہتے ہیں، آپ سے حوصلہ اور امید پاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی زندگیاں سنوریں گی۔ آپ کا بہت نام ہوگا۔ آپ بہت اونچے مقام تک جائیں گی۔''

وہ سسک کر بولیں۔ ''مجھے نہیں چاہیے، ایسا نام اور مقام۔ تمہاری زندگی کے بدلے مجھے......'' آواز ان کے ہونٹوں میں اٹک گئی۔ وہ کچھ بھی بول نہ سکیں۔

''نہیں بی بی! ایسا مت کہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس طرح میری بالکل بیکار زندگی کا بھی تھوڑا سا مول پڑ جائے گا۔ آپ کی وجہ سے آپ کے اردگرد جو چانن پھیلے گا، اس میں ذرا سا حصہ میرا بھی ہوگا۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ آپ خوش ہوں گی میں بھی جہاں بھی ہوں گا خوش رہوں گا۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں بی بی آپ......''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا، بی بی اگر آپ مناسب سمجھتی ہیں کہ چوہدری بشیر سے شادی کر لیں۔ آپ کو ایک مضبوط سہارا میسر آ جائے گا اور آپ کے دشمن آپ سے دور ہٹ جائیں گے لیکن وہ یہ کہہ نہ سکا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بی بی اس بات پر کس طرح کا ردِعمل ظاہر کریں گی۔

اچانک خیمے کے پردے سے باہر انسپکٹر شاد کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ پھر پردہ اٹھا اور انسپکٹر شاد نے اندر جھانکا۔ اس نے اپنے چہرے پر پیشہ وارانہ سختی سجا رکھی تھی۔ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''شانی بی بی! میں تمہیں زیادہ ٹائم نہیں دے سکتا۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں باہر آنا ہوگا۔ ریاض صاحب کا کوئی پتا نہیں کہ کب واپس آ جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔

انسپکٹر شاد پردہ برابر کرتے ہوئے باہر چلا گیا۔

یہ بڑی دل گرفتہ کر دینے والی صورتِ حال تھی۔ رستم کو یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر بعد اسے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جانے والا ہے۔ بی بی نے اپنی گلابی اوڑھنی کے پلو کو تھوڑے سے پانی میں بھگویا اور رستم کے چہرے اور ہونٹوں پر جما ہوا خون صاف کرنے لگیں۔ انہوں نے رستم کے مٹی میں لتھڑے ہوئے بالوں کو بھی گیلی اوڑھنی سے صاف کیا۔ پھر ان کی نگاہ رستم کے کندھے پر پڑی۔ یہاں شاہ نے ایک پٹی باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی تھی۔ رستم کا

یہ زخم جاوے سے ہونے والی لڑائی کی نشانی تھا۔ شانی نے دل گداز توجہ کے ساتھ اس زخم کی پٹی بھی تبدیل کی۔

"رستم کچھ کھالو۔" انہوں نے غم کے بوجھ سے پسے لہجے میں کہا۔

رستم کو کھانے کی خواہش مطلق نہیں تھی لیکن یہ خیال اس کے لئے بے حد راحت افزا تھا کہ اگر وہ کھانے پر آمادگی ظاہر کرے گا تو بی بی اسے اپنے ہاتھ سے کھلائیں گی۔

اس نے کہا۔ "بی بی! آپ نے کچھ کھایا؟"

"اچھا...... میں بھی کھاتی ہوں۔" انہوں نے شاید رستم کو آمادہ کرنے کے لئے کہا۔

وہ ٹرے کو پاس لے آئیں۔ پلیٹ میں مرغی کا سالن تھا اور چولہے کی روٹی تھی۔ اس کے علاوہ کسٹرڈ اور کچھ فروٹ تھا۔ غم اور تکلیف کے سمندر میں یہ خوشی کا کیسا جزیرہ تھا۔ رستم بڑی محویت سے بی بی کے خوب صورت ہاتھ کو لقمہ بناتے دیکھتا رہا۔ پھر یہ لقمہ رستم کے ہونٹوں کی طرف آیا۔ رستم کے ہونٹوں نے بی بی کی انگلیوں کی نرم پوروں کو چھوا۔ وہ دو تین لقمے دے چکیں تو رستم نے کہا۔ "اور آپ......؟"

بی بی نے ایک چھوٹا سا لقمہ بنا کر اپنے منہ میں رکھا لیکن ان کے انداز سے عیاں تھا کہ ایسا انہوں نے صرف رستم کی دل جوئی کے لئے کیا ہے۔ وہ دیر تک لقمہ اپنے منہ میں رولتی رہیں۔ بے حد مشکل سے انہوں نے روٹی کا یہ ٹکڑا نگلا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے رستم نے بھی ٹرے کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اس کا دل چاہا کہ اگر اس کی ہتھکڑی کھل جائے تو وہ بی بی کے سامنے ہاتھ جوڑ دے اور ان سے کہے کہ وہ اب یہاں سے چلی جائیں۔ کیونکہ یہ ملاقات نہیں تھی، یہ تو صبر کا امتحان تھا۔ رستم کو اندازہ نہیں تھا کہ بی بی سے اتنا قریب ہو کر اتنا دور ہونا کتنا اذیت ناک ہوگا۔ وہ ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر انہیں چھونا چاہتا تھا۔ ان کے ہونٹوں کو، ان کی آنکھوں کو اور پیشانی کو، لیکن اس خیمے میں اور اس ہتھکڑی میں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا یہاں نادیدہ آنکھیں نگراں ہیں۔

بس اتنی ہی ملاقات کافی تھی...... بس اتنی ہی۔ اس سے زیادہ خوشی تو وہ بی بی کے تصور سے حاصل کر سکتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تھا تو سنگلاخ پہاڑوں میں بھی گل زار کھل جاتے تھے۔ وہ ہر رات چاندنی ہو جاتی تھی اور ہر موسم بہار کا موسم بن جاتا تھا۔ اس کے عشق نے اب اس کے تصور کو اتنی طاقت بخش دی تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اپنی بی بی کو اپنے سامنے جیتا جاگتا دیکھتا تھا۔ اپنے جسم اور روح کی ساری رعنائیوں کے ساتھ وہ "دیوی" اس کے سامنے آ جاتی تھی اور وہ ایک پجاری کی طرح اپنے آپ کو اس میں گم کر دیتا تھا۔

بی بی کی آواز نے اسے خیال سے چونکایا۔ انہوں نے کہا۔ "رستم! مایوسی گناہ ہے اور ہمیں آخری وقت تک ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ میں یہاں سے زندہ بچ گئی تو تمہارے لئے قانونی لڑائی لڑوں گی۔ اس کے لئے آخری حد تک جاؤں گی۔ بالکل آخری حد تک۔ وراثت میں مجھے جو کچھ بھی ملا ہے سب کچھ اس پر لگا دوں گی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک وڈے ڈیرے پر موجود مجرموں کے لئے عام معافی کی بات ہوتی رہی ہے۔ یہ پروگرام بنتا رہا ہے کہ انہیں ہتھیار پھینکنے کی آفر کی جائے لیکن کچھ اجرالی سردار اپنے مفاد کے لئے آڑے آتے رہے ہیں۔ ہم اس سارے معاملے کو پھر سے اٹھائیں گے...... اس بے جا خون خرابے کو روکیں گے۔"

رستم کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے لگتا ہے بی بی! اب اس کام کے لئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ پولیس والوں کو ترقیاں اور تمغے چاہئیں...... اجرالی سرداروں کو انعام کے طور پر چند پہاڑوں کی ملکیت چاہیے۔ ان لوگوں کے منہ سے رالیں ٹپک رہی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب یہ لوگ لالے اور انتظامیہ کے بیچ کسی طرح کا کوئی معاہدہ ہونے دیں گے۔ خاص طور سے ریاض ہٹلر جیسے افسر کے ہوتے ہوئے تو یہ بالکل ممکن نہیں۔"

"اس ڈر سے کہ انصاف نہیں ملے گا، انصاف لینے کی کوشش تو نہیں چھوڑنی چاہیے۔ یہ بھی بزدلی کی ایک قسم ہوگی رستم۔"

اچانک دور کہیں تاریک فضاؤں میں ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ رستم کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ بی بی نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ ان کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ انسپکٹر شاد نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ریاض شاید صبح تک لوٹے گا لیکن اس کے جلدی واپس آنے کا امکان بھی تھا اور لگتا تھا کہ وہ جلدی واپس آ گیا ہے۔ رستم کے جبڑے بھنچ گئے، وہ خود کو آنے والے بدترین حالات کے لئے تیار کرنے لگا۔ بی بی کی آنکھوں میں عجیب نم ناک احساس تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رستم کو اپنے آپ میں چھپا لینا چاہتی ہیں۔ ہر آفت ہر تکلیف سے بچا کر کہیں بہت دور لے جانا چاہتی ہیں لیکن بے بسی نے انہیں چاروں طرف سے آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔

ہیلی کاپٹر تھوڑی دیر بعد ہیلی پیڈ پر اُتر گیا۔ یہ ہیلی پیڈ پولیس کی پوزیشنوں کے پیچھے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر بنایا گیا تھا۔ وہ دونوں خیمے میں موجود رہے اور اس آفت کا انتظار کرتے رہے جو ڈپٹی ریاض کی شکل میں یہاں آنے والی تھی۔ بیس منٹ گزرے... تیس منٹ اور پھر ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ڈپٹی ریاض نہیں آیا۔ بالآخر ڈپٹی ریاض کی جگہ ایک بار پھر

انسپکٹر شاد کا چہرہ دکھائی دیا۔ اب وہ وردی کے بجائے سفید شلوار قمیص میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی کی جھلک تھی۔ اس کے اندر آتے ہی ایک کانسٹیبل نے فولڈنگ کرسی کھول کر خیمے کے وسط میں رکھ دی۔ تاہم انسپکٹر شاد کرسی کے بجائے رستم اور بی بی کے ساتھ ہی نیچے دری پر بیٹھ گیا۔

کانسٹیبل چلا گیا تو انسپکٹر شاد نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ قدرت کو تم دونوں کا کچھ دیر مزید ساتھ رہنا منظور ہے۔ ڈپٹی صاحب نہیں آئے۔ وہ صبح ہی آئیں گے۔''

شانی کے چہرے پر زردی کی جگہ ہلکی سی چمک نے لے لی۔ ہاں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ موت کے چند گھنٹے آگے کھسک جانے پر خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

''ہیلی کاپٹر پر کون آیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ کچھ اور لوگ ہیں۔'' انسپکٹر شاد نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''رستم! تم اپنے بے رحم ہاتھوں سے قانون کو توڑتے توڑتے اتنی دور نکل گئے ہو کہ کوئی تمہیں واپس لانا چاہے تو بھی نہیں لا سکتا۔ اب تمہاری کہانی انجام کے قریب آ گئی ہے۔ بہرحال مجھے تم سے بلکہ تم دونوں سے ہمدردی ہے۔'' اس نے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بی بی کی طرف دیکھا۔

''سگریٹ پیو گے؟'' شاد نے رستم نے پوچھا۔

رستم کا دل چاہ رہا تھا لیکن وہ بی بی کی موجودگی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

انسپکٹر شاد زیر لب مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں تم بی بی کی بہت عزت کرتے ہو اور اس کے علاوہ تم دونوں میں محبت کا رشتہ بھی ہے۔ تمہاری زیادہ تر کہانی میرے علم میں ہے لیکن بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے۔ کوئی چاہے بھی تو آپ دونوں کے لئے اب کچھ نہیں کر سکتا۔''

شانی نے تیکھی نظروں سے انسپکٹر شاد کو دیکھا اور کہا۔ ''اس ہمدردی کی کوئی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''ضروری نہیں کہ ہمدردی پیدا ہونے کی کوئی وجہ ہو لیکن ایک وجہ ہے بھی۔''

''کیا مطلب؟'' شانی نے پوچھا۔

''شانی بی بی! آف دی ریکارڈ بات کر رہا ہوں۔ میں تمہاری دلیری اور ہمت سے متاثر ہوں۔ تم جس طرح تن تنہا تاؤ حشام اور قدرت اللہ جیسے لوگوں کے سامنے ڈٹی رہی ہو یہ تعریف کے قابل ہے۔ میں تمہارے بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے شخص نے بتایا ہے جو ایک وقت میں تمہارا بدترین دشمن تھا۔''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''چوہدری بشیر کے چچازاد بھائی چوہدری بابر کا۔ اس نے تمہاری بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور تم سے بُرا سلوک کیا لیکن جب بدلے میں چوہدری بشیر نے اسے قتل کرنا چاہا تو تم چوہدری کے سامنے دیوار بن گئیں۔ اس وقت سے چوہدری بابر تمہارا بے دام کا غلام ہے۔ شاید تمہیں پتا ہی ہوگا۔ اس نے داڑھی رکھ لی ہے اور بہت مذہبی ہو گیا ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے۔''

شانی خاموش رہی۔ رستم بھی خاموش رہا۔ لالٹینوں کی لَو خیمے میں تھرتھراتی رہی۔ پوٹھوہار کے ٹیلوں میں ایک تاریک سنگین رات زخمی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔ شانی کو وہ وقت یاد آ گیا جب بابر نے رات کے اندھیرے میں اسے تاؤ حشام کی ظالم حراست میں سے نکالا تھا اور یہ کوئی اکیلا واقعہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی موقعوں پر بابر نے درپردہ شانی کی مدد کی تھی۔ انسپکٹر شاد نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔ ''شانی بی بی! میں نے سوچا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی تم سے ملاقات ہوئی تو میں تم سے بہت اچھی طرح پیش آؤں گا۔ تمہیں وہ عزت دوں گا جس کی تم حق دار ہو، لیکن افسوس ہم ایسے حالات میں ملے ہیں جب تمہاری حیثیت ایک قیدی کی ہے اور ڈپٹی صاحب کی غیر موجودگی میں، مَیں تمہارا نگران ہوں۔ تم دونوں کے لئے ڈپٹی صاحب کی ہدایات بڑی سخت ہیں۔ ان ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میں نے تم دونوں کو یہاں اکٹھا رکھا ہے۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔''

''شکریہ۔'' شانی نے نظر جھکائے جھکائے کہا۔

انسپکٹر شاد نے کہا۔ ''اب کنفرم ہو گیا ہے کہ ڈپٹی صاحب کل آٹھ نو بجے سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔ تم دونوں صبح تک آرام سے یہاں رہ سکتے ہو۔ باہر پہرا ضرور موجود ہے لیکن یہاں خیمے کے اندر کوئی نہیں آئے گا...... نہ ہی کسی کو معلوم ہے کہ اندر کون کون ہے۔''

وہ دونوں اب بھی خاموش رہے۔ انسپکٹر شاد ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے خاص ماتحت امجد کو آواز دی۔ اے ایس آئی امجد جلدی سے اندر آ گیا۔ رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اے ایس آئی کی حیثیت انسپکٹر شاد کے رازدار ماتحت کی ہے۔ انسپکٹر شاد نے امجد سے کہا۔ ''یہ دونوں لالٹینیں اٹھا لو۔ میرے خیمے میں ان کی ضرورت ہے۔''

امجد نے لالٹینیں اٹھا لیں اور انسپکٹر شاد کے ساتھ عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ خیمے میں گہری تاریک پھیل گئی۔ باہر جانے کے بعد انسپکٹر شاد ایک بار پھر مڑا اور خیمے میں جھانک کر شانی سے بولا۔ ''خیمے کا پردہ اندر سے باندھ لو۔''

ثنائی اٹھی اور اس کے خیمے کے دونوں پردوں کی ڈوریاں اندر سے باندھ لیں۔

وہ رستم کے قریب آ بیٹھی۔ رستم نے اس کے بدن کی بے مثال خوشبو محسوس کی۔ ہاں ایسی ہی خوشبو اسے بی بی کے تصور میں بھی آتی تھی اور یہ تصور اتنا مضبوط ہوتا تھا کہ حقیقت بن جاتا تھا۔

انسپکٹر شاد لالٹینیں اٹھا کر لے گیا تھا۔ ایک طرح سے اس نے اسے اور بی بی کو یقین دلایا تھا کہ ان کی نگرانی وغیرہ نہیں ہو رہی اور وہ اس خیمے میں ہر طرح کی تاک جھانک سے محفوظ ہیں۔ شانی بی بی کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہیں۔ خیمے کی تاریکی میں رستم کو بس ان کا ہیولا نظر آتا تھا۔ ہیولا جس سے خوشبو پھوٹتی تھی اور جو ایک دل نواز حدت رکھتا تھا۔ پھر بی بی سسک کر اس کے گلے سے لگ گئیں۔ بیٹھے بیٹھے انہوں نے خود کو رستم کے کشادہ سینے پر گرا دیا۔ ان کے ہاتھ رستم کی پشت پر گئے اور اس کی ہتھکڑی پر پھسلنے لگے۔ یوں لگا جیسے وہ ہتھکڑی کھولنا چاہ رہی ہیں لیکن یہ فولادی ہتھکڑی تھی۔ اسے کھولنے یا توڑنے کے لئے سخت ترین ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ بی بی بے بسی سے اپنے نازک ہاتھ اس ناقابلِ شکست فولاد پر پھیرتی رہیں۔ رستم کی کلائیاں سہلاتی رہیں۔ وہ ان جگہوں کو اپنی پوروں سے چھوتی رہیں جو ہتھکڑی کی براہِ راست گرفت میں تھیں۔

رستم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ بی بی کو جسم اور روح کی تمام تر گہرائی سے محسوس کر رہا تھا۔ بی بی کی دھڑکنوں کا ارتعاش رستم کے لہو میں چل رہا تھا۔ ایک دم اسے لگا کہ مرنا مشکل نہیں ہے۔ اس نے خود کو سیراب محسوس کیا۔ اسے لگا کہ اس نے زندگی سے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ وقتاً فوقتاً بی بی کی قربت کے جو چند لمحے اسے میسر آئے تھے وہ اتنے قیمتی تھے کہ ان پر کئی بھرپور زندگیاں قربان کی جا سکتی تھیں۔ اس نے اپنے ہونٹ بی بی کے ریشمی بالوں پر رکھ دیئے۔

رات دھیرے دھیرے صبح کی طرف سرک رہی تھی۔ صبح جو اندھیروں کو زوال پذیر کرتی ہے اور اجالوں کی نوید لاتی ہے، لیکن جو صبح آ رہی تھی یہ بالکل مختلف تھی۔ رستم جانتا تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد جب بادِ صبا چلے گی تو اس میں پھولوں کے بجائے خون کی مہک ہوگی۔ وہ خیمے کے قرب و جوار میں افراتفری سی محسوس کر رہا تھا۔ سپاہیوں اور اجرائی جنگجوؤں کی نقل و حرکت جاری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک آدھ دن میں وڈے ڈیرے کے مکینوں کے خلاف اہم کارروائی ہونے والی ہے۔ ہیلی کاپٹر ایک بار پھر تاریک فضاؤں میں پرواز کر گیا تھا۔

رستم پہلو کے بل دری پر لیٹا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔ تاریکی میں بی بی کا

ہیولا اس کے بالکل نزدیک تھا۔ بی بی کی کھوئی کھوئی آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔

''رستم...... یہ چناب پار کیوں نہیں ہوتا۔ گھڑے پکے بھی ہوں تو یہ پانی راستہ نہیں دیتا ہے۔''

''میں بھی یہی سوچتا ہوں بی بی۔'' رستم نے ہولے سے کہا۔

بی بی نے اپنے دونوں ہاتھ رستم کے کندھے پر رکھے۔ ''تم ہمت نہ ہارنا۔ ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہو۔ ڈپٹی ریاض جیسے ہزاروں مل کر بھی انہونی کو ہونی نہیں کر سکتے۔''

''بی بی! مجھ سے کوئی شکوہ تو نہیں؟'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

''اس سے بڑا شکوہ اور کیا ہوگا کہ تم نے میری خاطر اپنی زندگی ریاض کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔'' بی بی نے سسک کر کہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بی بی نے ایک دم پھر رستم کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

وہ اب رستم کے ساتھ ہی دراز ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کا سر اپنی بانہوں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ رستم کا زخمی چہرہ بی بی کے سینے میں چھپا ہوا تھا۔ بی بی کے جسم کی حدت اور خوشبو سانس کے رستے رستم کی نس نس میں اُترنے لگی۔ وہ روزِ حشر تک اسی طرح ساکت و جامد لیٹا رہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی بی بی کے جسم میں مدھم ارتعاش پیدا ہوتا تھا۔ یہ ان کے ہونٹوں سے نکلنے والی مدھم سسکی کو ظاہر کرتا تھا۔ پھر کبھی کبھی بی بی ایک گہرا سانس بھی لیتی تھیں۔ اس کے سوا ان کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ بی بی کے ریشمی بال اوڑھنی سے بچھڑ کر رستم کے کندھوں پر پھیل گئے تھے۔

طوفانوں اور حوادث کی یلغار میں بی بی کی مہربان بانہوں کا گھیرا رستم کے لئے اتنا جاں فزا تھا کہ وہ اس احساس کو لفظوں کے احاطے میں نہیں لا سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے ہی سہی لیکن وہ جیسے دنیا کے ہر غم و فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے جسم میں بی بی کے جسم اور ان کے ریشمی بالوں کی خوشبو اُتر رہی تھی۔ اسے لگا وہ پوٹھوہار کی اس سنگلاخ زمین سے نکل کر سپنوں کی حسین وادیوں میں کھونے لگا ہے...... جہاں گھنے پیڑ ہیں...... پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی ہوا ہے اور بی بی ہیں۔ بی بی کی پلکوں کے سائے، ان کے ہونٹوں کا لمس اور ان کے گداز جسم کی مہک، اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ ساری آفتوں کو بھول کر دھیرے دھیرے نیند کی پُرسکون وادی میں اُترنے لگا۔ یہ بڑی ہی خوب صورت نیند تھی۔

☆======☆======☆

رستم اس کی بانہوں میں سو گیا تھا۔ وہ اس کا سر اپنے سینے سے لگائے بے حرکت لیٹی

تھی۔ رستم ان لمحوں میں ڈکیت، قاتل اور گینگسٹر نہیں تھا، صرف ایک انسان تھا جو اپنے اردگرد کے خوفناک حالات کو یکسر فراموش کر کے کچھ دیر کے لئے نیند کی مہربان وادی میں کھو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں الٹی ہتھکڑی تھی اور یہ ہتھکڑی قانون کی اس طویل بھاگ دوڑ کا حتمی نتیجہ تھی جو قانون اب تک رستم کے لئے کرتا رہا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں اَن گنت گولیاں چلائی گئی تھیں، بے شمار لوگ مارے گئے تھے...... بہت سی سازشیں ہوئی تھیں اور کئی منصوبے بنے اور بگڑے تھے اور اب یہ فولادی ہتھکڑی قانون کی فتح بن کر رستم کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب رستم نے اس سے پوچھا تھا...... بی بی! مجھ سے کوئی شکوہ تو نہیں؟ تو شانی نے جواب میں کہا تھا...... اس سے بڑا شکوہ اور کیا ہوگا کہ تم نے میری خاطر اپنی زندگی ریاض کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شانی کے سینے سے کرب کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے اسے بے حال کر دیا۔ اسے لگا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہا۔ ملتان میں شانی نے چوہدری بشیر سے وعدہ کیا تھا کہ اب رستم کا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ وہ اس کے سائے سے بھی دور رہے گی لیکن سینے سے اٹھنے والی لہر نے شانی کو سب کچھ بھلا دیا۔ اسے صرف یہ یاد رہا کہ رستم اس سے بہت دور جا رہا ہے۔ وہ اب شاید اس انداز میں کبھی اس سے نہ مل پائے گی اور شاید دیکھ بھی نہ پائے گی۔ وہ رستم کے ساتھ ہی نیم دراز ہوگئی۔ اس نے رستم کا چہرہ بے ساختہ اپنی بانہوں میں لیا اور سینے سے لگا لیا۔

وہ دونوں اسی طرح لیٹے رہے اور لیٹے رہے...... بے حرکت و ساکت۔ کبھی کبھی ایک گہری آہ شانی کے سینے سے اٹھتی تھی اور یہ وہ واحد حرکت تھی جو ان دونوں کے جسموں میں پائی جاتی تھی۔

سورج کی بے رحم روشنی خیمے کی درزوں سے اندر داخل ہونے لگی۔ خنکی دھیرے دھیرے حرارت میں بدل گئی۔ خیمے کے عقبی راستے کی دوسری جانب شانی کو انسپکٹر شاد کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد وہ بولا۔ ''میں اندر آنا چاہتا ہوں۔''

شانی کے دل سے ہوک اٹھی۔ اس نے رستم کو ہولے ہولے سے ہلایا اور خود سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلے ہی نیم بیدار تھا۔ اس نے اپنے جسم کو موڑا اور شانی کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں عجیب کیفیت تھی۔ محبت، خمار اور دکھ یکجا ہو گئے تھے۔ شانی نے اپنے بال سمیٹے، اوڑھنی درست کی اور اٹھ کر پردے کی ڈوری کھول دی۔

انسپکٹر شاد نے باہر کھڑے کھڑے کہا۔ ''شانی بی بی! ڈپٹی صاحب بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم باہر آ جاؤ اور ذرا دھیان سے دیکھ لو کہ تمہاری یہاں موجودگی کا کوئی نشان باقی نہ رہ

جائے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور خیمے کا جائزہ لیا۔ اسی دوران میں اے ایس آئی امجد دونوں لالٹینیں واپس لے آیا اور خیمے میں رکھ دیں۔ انسپکٹر شاد کی ہدایت پر اس نے کھانے کی ٹرے اور برتن وغیرہ اٹھا لئے۔ انسپکٹر شاد منتظر نگاہوں سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہی واپس لے جانا چاہتا تھا۔ شانی کے گلے میں ایک دم بہت سے آنسو جمع ہو گئے۔ وہ رستم سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اب کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ رستم کے کندھے پر رکھے۔ اشک بار نظروں سے اسے دیکھا اور انسپکٹر شاد کے ساتھ باہر آگئی۔ قریباً یہی وقت تھا جب دور جنوب مشرق کی طرف ہیلی کاپٹر کے پروں کی آواز سنائی دینے لگی۔ یقیناً یہ ڈپٹی ریاض کی آمد تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ڈپٹی ریاض شانی کے سامنے دوسرے خیمے میں موجود تھا۔ یہ وہی خیمہ تھا جہاں شانی کو شروع میں لایا گیا تھا۔ دونوں لیڈی پولیس اہلکار بھی یہاں موجود تھیں اور مسلسل خشمگیں نظروں سے شانی کو دیکھ رہی تھیں۔

ڈپٹی ریاض آج پہلی بار مکمل وردی میں نظر آیا۔ اس کی شیو بھی بنی ہوئی تھی تاہم آنکھیں ہمیشہ کی طرح سرخ اور بال الجھے ہوئے تھے۔

وہ پھیل کر کرسی پر بیٹھ گیا اور شانی سے مخاطب ہو کر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''ہاں بی بی جان! کیا حال ہے تمہارا؟''

''میں تم سے تایا کا حال جاننا چاہتی ہوں؟''

''دیکھو تمہارے اس بڈھے کی کتنی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ اس کی اگلی پچھلی نسلوں میں سے کسی کو اتنا پروٹوکول نہیں ملا ہوگا۔ ایک ڈاکٹر ایک نرس چوبیس گھنٹے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اب اس کی حالت اچھی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی وہ اور موج میلا کرے گا دنیا میں۔ اس کے لئے تم بے فکر رہو۔''

''میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''چلو...... چلنے کی تیاری کریں۔''

شانی بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ادئے کہاں جا رہی ہو؟'' ڈپٹی ریاض ہٹلر نے پوچھا۔

''تایا کے پاس۔''

''تایا کے پاس نہیں...... اپنے گھر۔''

''کک کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں تیرے میرے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ تُو میرے لئے شراب بنائے گی اور میں پیوں گا۔ تُو میرا دل خوش کرے گی، میں تیرے مسئلے حل کروں گا۔'' ڈپٹی ریاض بے پروائی سے بولا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' شانی نے آنکھیں نکالیں۔

''تمہاری جیسی کو دیکھ کر ہوش کسے رہتا ہے۔'' ریاض ہٹلر نے شانی کے بال مٹھی میں لئے۔

شانی کی آنکھوں میں لہو سا اُتر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شعلہ بار لہجے میں کچھ کہتی ڈپٹی ریاض نے ایک گونج دار قہقہہ لگایا اور شانی کے بال چھوڑ دیئے۔ ''مذاق کر رہا ہوں بی بی جان...... تیرے ساتھ سوؤں گا تو حاجی حیات کی شلوار کے اندر بم چل جائے گا۔ غصے میں ایک دم مولا جٹ بن جائے گا وہ اور فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر رہا ہوں۔ تجھے پورے احترام کے ساتھ یہاں سے واپس بھیج رہا ہوں۔ حالانکہ اگر میں چاہوں تو تیرے والی وارث اگلے دو سو سال تک بھی تیرا کھوج کھرا نہیں ڈھونڈ سکتے۔''

شانی نے ایک گہری سانس لی۔ رستم کا کہا درست ثابت ہو رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ڈپٹی ریاض شانی کو چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ اس نے ڈپٹی ریاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تایا معصوم؟''

''تیرے تایا کی حالت ابھی اس قابل نہیں کہ وہ تیرے ساتھ جا سکے۔ ہماری حفاظت میں رہے گا۔ بہرحال اس کے بارے میں بھی میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ وہ کچھ دنوں میں زندہ سلامت تمہیں مل جائے گا لیکن اس کے بارے میں جو شرطیں ہیں وہ تمہیں بھی پتا ہوں گی۔''

شانی سوالیہ نظروں سے، ریاض کا چہرہ دیکھنے لگی۔

وہ بولا۔ ''تم تایا بھتیجی کی زبان پر یہ بات کبھی نہیں آنی چاہیے کہ تمہیں یہاں سون میں لایا گیا اور پولیس کی تحویل میں رکھا گیا۔ آج کل یا دس سال بعد جب بھی یہ بات تمہاری زبان پر آئے گی، تمہاری سویٹ سویٹ فیملی پر تین جنازوں والا قانون پھر سے لاگو ہو جائے گا اور تمہیں پتا ہے کہ میں بندے کو شوٹ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا۔''

''تم جو کہتے ہو، وہ ٹھیک ہے لیکن میں تایا کو لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ کسی

صورت نہیں۔'' شانی کی آنکھوں میں آتشیں آنسو اُمڈ آئے۔

''تم بھی بڑی بھولی ہو مسماۃ شہناز عرف شانی۔'' ریاض نے تھانیداری لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے پیارے تایا جانی کا علاج اس ویرانے میں کیا جا رہا ہے اور ڈاکٹر اور نرسیں بھی یہیں پر پیدا فرما لئے گئے ہیں۔ نہیں بی بی جان! میں نے اسے واپس لاہور پہنچا دیا ہے۔ رات کو ہیلی کاپٹر پر وہ بھی میرے ساتھ سوار تھا۔ ہم نے اسے بیس کیمپ سے پک کیا تھا۔ لاہور کے ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں بھرتی کروایا ہے میں نے اسے لیکن ایک بات بالکل کلیئر ہے۔ جب تک مجھے پوری تسلی نہ ہو جائے گی کہ تم تایا بھتیجی اپنی زبان بند رکھو گے تمہارے تایا کا سراغ نہیں دوں گا میں۔''

ریاض نے چند لمحے توقف کر کے بے پروائی سے اپنی رانیں کھجائیں اور بولا۔ ''میرے کاغذوں میں تمہارا تایا مفرور ہے۔ اس نے جمشید کو چھڑوانے کے لئے اپنے چند کارندوں کے ساتھ مل کر پولیس پارٹی پر گولی چلائی تھی۔ اس مقابلے میں جمشید مارا گیا اور حملہ آور بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔'' ریاض نے بڑی ڈھٹائی سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ وہ وہی گھڑی گھڑائی کہانی سنا رہا تھا جو اس نے شانی کو جیپ میں سنائی تھی۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تایا جی ابھی یہیں ہیں۔ تمہارے بیس کیمپ میں۔''

''بی بی جان! تم نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ میری کسی بات پر یقین نہیں کرنا۔ شاید میں ہوں ہی......'' ریاض نے خود کو ایک فحش گالی دی۔

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی ریاض نے ٹانگیں کھجاتے کھجاتے انسپکٹر شاد کو آواز دی۔ چند سیکنڈ بعد انسپکٹر شاد نے اندر آ کر ریاض کو سیلوٹ کیا۔ ریاض نے کہا۔ ''ہاں بھئی شاد! ہم تو ہیں بدمعاش۔ ہماری بات پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ تم بتاؤ وہ ٹھرکی بڈھا کہاں ہے اس وقت؟''

شاد نے کہا۔ ''اسے بیس کیمپ سے ہیلی کاپٹر پر لاہور بھیج دیا گیا ہے۔ وہاں اس کا علاج ہو رہا ہے۔''

''میرے کہنے پر تو یہ بیان نہیں دے رہے ہو؟''

''نہیں سر! وہی بتا رہا ہوں جو حقیقت ہے۔''

ڈپٹی ریاض نے اشارہ کیا۔ انسپکٹر شاد سیلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ریاض نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بُرے سے بُرے کام کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ دیکھو، میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ رستم مل جائے گا تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی، تمہیں چھوڑ دوں گا۔ چھوڑ رہا ہوں ناں؟ اسی طرح تیرے تائے کے بارے میں بھی جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل درست

ہے۔اس کی حالت کے بارے میں بھی تمہیں بالکل ٹھیک بتا رہا ہوں۔کل رات تک اس کے آثار اچھے نہیں تھے۔اسی لئے میں نے اسے ہیلی کاپٹر پر لاد کر لاہور بھیجا۔اب ایک دم فٹ ہے وہ۔اگر وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہ کرتا تو شاید اس کی یہ حالت بھی نہ ہوتی۔اس میں جوانی اچھالے مار رہی تھی اسی لئے زخمی ہوا ہے۔خود پر ہاتھ اٹھانے والوں کو میں کبھی معاف نہیں کرتا۔'' ریاض کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔

شانی کا دھیان آپوں آپ رستم کی طرف چلا گیا۔رستم نے بھی تو ریاض پر ہاتھ اٹھایا تھا۔اس کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے ڈھلوان پر لڑھکا دیا تھا۔رستم کی اس زوردار ٹانگ کی کافی شہرت ہوئی تھی اور اب رستم ریاض کے قبضے میں تھا۔مکمل بے بسی کی حالت میں۔ شانی کا سینہ جل اٹھا۔اس کے رگ و پے میں کرب کی لہریں دوڑ گئیں۔رستم کو ریاض ہٹلر کی دسترس میں لانے کی وجہ وہ خود بنی تھی اور اب وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے دل گیر لہجے میں ریاض سے کہا۔''م......میں تم سے رستم کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔''

''اوہو...... اوہو......عاشقی معشوقی کلیجے کے اندر بھانبھڑ جلا رہی ہے......بولو......کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اس کو کوئی تکلیف نہ دو۔وہ جیسے بھی آیا ہے لیکن خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے۔اسے تمہاری طرف سے رعایت ملنی چاہیے۔''

''ہائے ہائے، یہ کیا کہہ رہی ہو بی بی جان۔میں غریب مسکین اسے تکلیف دینے والا کون ہوتا ہوں۔میرے لئے تو وہ گورنر جنرل سے کم عزت والا نہیں ہے۔میں تو اسے قانون کے مطابق عدالت میں پیش کروں گا۔اب اگر عدالت اس کا ریمانڈ دے دے اور اس سے کچھ بیان وغیرہ لینے ہوں اور برآمدگی وغیرہ کرانا ہو تو پھر مجبوری ہوگی اور بات صرف میرے اکیلے کی تو نہیں ہے۔بڑے بڑے افسر اس کے درشنوں کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔اگر ان میں سے کسی کا گھر راستے نے پھوڑا ہوا ہے تو پھر یہ معاملے تو اسے ضرور بھگتنا پڑیں گے۔''

''تم انچارج ہو ریاض صاحب۔تم یہاں سیاہ سفید کے مالک ہو۔''

''ریاض صاحب۔'' ریاض نے چبا چبا کر دہرایا۔پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔''یہ تمہاری مہربانی ہے اگر تم اس نوکر کو کسی قابل سمجھتی ہو۔بہرحال میری طرف سے بالکل بے فکر رہو۔''

''لیکن......میں کہنا چاہتی ہوں۔'' شانی کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

وہ زہرناک انداز میں مسکرایا۔''گھبراؤ مت۔میں نے اس سے جو کچھ بکوانا ہوگا مارے بغیر بکواؤں گا۔بس گدگداریاں نکالوں گا اسے۔ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دوں گا اسے۔وہ ہنستے ہنستے سب کچھ بتا دے گا۔''

اس سے پہلے کہ شانی مزید کچھ کہتی، ریاض نے ایک بار پھر انسپکٹر شاد کو کڑاکے دار آواز دی۔وہ حکم کے جن کی طرح غالباً دروازے پر ہی کھڑا تھا۔اس نے اندر آ کر سیلوٹ کیا۔ ریاض فیصلہ کن لہجے میں بولا۔''شانی بی بی کو بڑے احترام کے ساتھ بیس کیمپ تک پہنچانا ہے۔وہاں سے جو پہلی جیپ واپس روانہ ہو اس میں بی بی جان کو سوار ہونا چاہیے۔میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟''

''یس سر!'' انسپکٹر شاد نے ادب سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ڈپٹی ریاض اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''م......میری بات سنو۔'' شانی نے کہا لیکن تب تک ریاض اپنے بھاری کولہوں کو حرکت دیتا باہر نکل چکا تھا۔وہ اپنے ماتحت پر برس رہا تھا۔''اوئے رحمت! کہاں مر گیا ہے تو۔ کُتے کے بچے! ابھی تک چار توس نہیں گرم ہوئے تجھ سے۔''

شانی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہ گئی۔وہ سمجھ گئی کہ ڈپٹی ریاض نے اپنی رابطہ لائن اس سے کاٹ دی ہے۔باہر سے ریاض کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ رحمت کو اس جنگلی بلے سے تشبیہ دے رہا تھا جس کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر وقت اپنی مادہ کو اپنے نیچے دبا کر بیٹھا رہے۔

بارہ بجے دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے شانی کو وڈے ڈیرے کے نواح سے روانہ کر دیا گیا۔وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن جانا بھی ضروری تھا۔اسے بھیجنے والے اسے رکنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔وہ اس ہوا کو زنجیریں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو اب تک ان کی پہنچ سے باہر تھی۔رستم پابہ زنجیر ریاض ہٹلر کی تحویل میں تھا۔

وہ روتی ہوئی روانہ ہوئی۔اس نے اپنا منہ، سر ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔وہ رستم اور اس کے سارے ساتھیوں کو موت کے خوفناک شکنجے میں چھوڑ کر جا رہی تھی۔اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔بلندی سے دور قریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر وڈے ڈیرے کے قبرستان کے آثار نظر آتے تھے۔شانی نے سوچا یہی قبرستان ہے جہاں نادیہ رستم کی مرحومہ بیوی ابدی نیند سو رہی ہے۔اس کے ہزاروں لاکھوں پرستاروں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ان کی ہیروئن ایک سنگلاخ ویرانے میں جان کی بازی ہارے گی اور خودرو

درختوں کے درمیان پتھروں کے نیچے دفن ہو جائے گی۔

شانی کا دل بھر آیا۔ اس نے وڈے ڈیرے اور اس کے سارے مکینوں کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ ان سب لوگوں کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شانی کے ساتھ واپس بیس کیمپ روانہ ہونے والوں میں سب انسپکٹر مختار کے علاوہ آٹھ مسلح پولیس اہلکار اور دو اجرالی تھے۔ یہ دونوں مقامی لباس مجھلی اور پگڑ وغیرہ میں تھے۔ ان کے پاس بھی جدید رائفلیں موجود تھیں۔ ان سب کو بیس کیمپ تک کا دشوار گزار سفر پیدل ہی طے کرنا تھا۔ امید تھی کہ رات سات آٹھ بجے تک وہ واپس بیس کیمپ پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے بذریعہ جیپ شانی کو گوجر خان یا جہلم وغیرہ پہنچایا جا سکتا تھا۔

یہ سفر دو تین گھنٹے تک مسلسل جاری رہا۔ ہوا میں خاصی تپش تھی۔ صرف دونوں اجرالی پُرسکون نظر آتے تھے کیونکہ وہ اس موسم اور ماحول کے عادی تھے۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ دونوں اجرالی شانی کو جانتے نہیں ہیں۔ یہی پوزیشن باقی اہلکاروں کی تھی۔ شانی ان کے لئے تقریباً اجنبی تھی۔ صرف سب انسپکٹر مختار مکمل حقیقت سے آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ شانی کون ہے اور کس مقصد سے یہاں پہنچی تھی۔ تایا معصوم کی حالت کے بارے میں شانی کو بے حد پریشانی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ جو پریشانی شانی پر حملہ آور ہو رہی تھی، وہ رستم اور اس کے ساتھیوں کی تھی۔ پولیس اور اجرالیوں کی تیاریوں سے بالکل واضح تھا کہ وہ وڈے ڈیرے کو ملیا میٹ کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ خاص طور سے ڈپٹی ریاض تو بالکل ہلاکو خان بنا ہوا تھا۔

رستم کا زخمی چہرہ بار بار شانی کی نگاہوں میں آتا تھا اور کوئی ڈور بے حد زور سے اسے اپنی طرف کھینچنے لگتی تھی۔ یہ کیسی کشش تھی......؟ یہ کیسا بندھن تھا...... ؟ یہ جو کچھ بھی تھا، بے حد بے رحم تھا۔ بہت ناقابلِ برداشت تھا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت شانی نے تب محسوس کی تھی جب ملتان کے آستانے میں وہ رستم کو چھوڑ کر باہر نکلی تھی۔ شانی کو لگا کہ اس بے پناہ کشش کے سبب اس کا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا اور رستم کی طرف اُڑتا چلا جائے گا یا پھر اس کے جسم کا ہر ہر جوڑ اکھڑ جائے گا اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔

''کیوں ہوتا ہے ایسا ..... کیوں؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

جواب کوئی نہیں تھا۔ اس وقت بھی نہیں تھا جب نادیہ رستم کی بیوی تھی اور نہ اب تھا جب وہ مر چکی تھی۔ اچانک شانی کے دل سے آواز آئی۔ ''شانی! یہ تُو کیا کر رہی ہے۔ رستم نے تیری مصیبت کا سنا ہے تو ہر دیوار کو گرا کر تجھے بچانے پہنچ گیا ہے۔ اب تُو اسے بدترین مصیبتوں میں چھوڑ کر یہاں سے جا رہی ہے۔ تُو کیوں جا رہی ہے؟ اگر تو اس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی تو مر تو سکتی ہے۔ مر جا اس کے ساتھ یہاں ان ویران پہاڑوں میں ..... ختم کر دے سب کچھ۔ اس عظیم جذبے کی لاج رکھ لے جو عرصے سے تیرے اور رستم کے درمیان موجود ہے۔ ہاں شانی! کسی کے جانے سے دنیا میں کچھ نہیں رکتا۔ کوئی نہ کوئی وسیلہ بن ہی جاتا ہے ہر کام کے ہونے کا۔ مُنے کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ سگی مائیں بھی تو اپنے نوخیزوں کو چھوڑ کر مر جاتی ہیں۔''

رستم کا زخمی چہرہ اتنی شدت سے شانی کے تصور میں ابھرا کہ اسے کچھ یاد نہ رہا۔ ایک ایسی بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے آپ کو بچا کر موت کے اس گھیرے سے نکل گئی تو خود کو ہرگز معاف نہ کر سکے گی۔ اس کے بعد جو بھی سانس آئے گا اس کے دل و دماغ پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ رکھ جائے گا۔

ایک تنگ پگڈنڈی پر چلتے چلتے اچانک وہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ ''کیا ہوا؟'' سب انسپکٹر نے قریب آ کر پوچھا۔

''میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں چٹان کی سی سختی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں بی بی؟'' سب انسپکٹر نے تیز سرگوشی کی۔

''وہی کہہ رہی ہوں جو مجھے کرنا ہے۔'' شانی نے کہا اور اٹل انداز میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم ڈپٹی صاحب کے حکم کے مطابق آپ کو واپس لے جانے کے پابند ہیں۔''

''تو پھر میری لاش لے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ مستحکم ارادے سے اٹھی اور واپس چل پڑی۔

سب انسپکٹر مختار اور دیگر اہلکار اس کے پیچھے لپکے۔ سب انسپکٹر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ''میری نوکری چلی جائے گی۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

''تو کیا میرے مرنے سے تمہاری نوکری بچ جائے گی۔'' وہ گرجی اور سب انسپکٹر کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

سب انسپکٹر نے ایک بار پھر دوڑ کر شانی کو کندھوں سے تھام لیا۔ ''ڈونٹ ٹچ می۔'' وہ چلائی اور ایک بار پھر سب انسپکٹر مختار کو زوردار دھکا دیا۔

''میں کہتا ہوں رک جاؤ۔'' مختار کا لہجہ بدل گیا۔ پیشہ وارانہ سختی عود کر آئی۔

شانی نہیں رکی تو اس نے پستول نکال لیا۔ ''تم نہیں رکو گی تو میں زبردستی روکوں گا۔'' وہ دھاڑا۔

شانی اپنے مخصوص وجدان کے زیر اثر تھی۔ وہ واپس جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اسے سو فیصد یقین تھا کہ سب انسپکٹر یا اس کا کوئی ساتھی اسے روک نہیں پائے گا۔ مختار کی دھمکی کی اس نے ذرا برابر پرواہ نہیں کی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

مختار کچھ دیر تک شدید تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پستول اس کے ہاتھ میں ایک بیکار شے کی طرح تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی پر گولی نہیں چلا سکتا۔ آخری راستہ زور آزمائی کا ہی رہ جاتا تھا۔ اس نے اپنے دو ہٹے کٹے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مختار کے ساتھ آگے بڑھے اور انہوں نے شانی کو بازوؤں سے دبوچ لیا۔

''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو...... یو باسٹرڈ۔'' وہ پھنکاری۔

''لگتا ہے کہ آپ کو عزت راس نہیں ہے۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

زبردست کھینچا تانی کا منظر شروع ہو گیا۔ شانی خود کو چھڑا کر ڈیرے کی طرف واپس جانا چاہتی تھی لیکن پولیس والے اپنے اعلیٰ افسر کے حکم کے مطابق اسے پوٹھوہار سے باہر لے جا رہے تھے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تھی۔ درد و کرب نے اسے ہر مصلحت سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ اور نہ کر سکتی تھی لیکن کم از کم رستم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مر تو سکتی تھی۔

اس نے پولیس اہلکاروں کو زوردار دھکے دیئے۔ ایک دو تھپڑ رسید کئے۔ چند سیکنڈ کے لئے یہی محسوس ہوا کہ وہ ان کے بس میں نہیں آئے گی اور خود کو چھڑا کر ٹیلوں کی طویل بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گی۔ مگر اسی دوران میں اچانک اوپر نیچے تین فائر ہوئے اور شانی سمیت سب چونک گئے۔ یہ فائر قریباً 150 میٹر کی دوری پر سرخی مائل ٹیلوں سے ہوئے تھے۔

سب انسپکٹر کی گرفت میں شانی نے دیکھا کہ کم و بیش بیس افراد ٹیلوں سے اُتر کر نیچے آ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ شہری دکھائی دیتے تھے۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ بڑی بڑی پگڑیوں اور گھیردار شلواروں والے اجرالی ان کے عقب میں تھے۔ اس کے علاوہ دو تین باوردی پولیس والے بھی نظر آتے تھے۔ ہوائی فائر شاید پولیس والوں کی طرف سے کئے گئے تھے۔ اتفاقاً شانی سے ہاتھا پائی کرنے والے سارے پولیس اہلکار سفید پوش وردیوں میں تھے۔ نئے آنے والے افراد نے بلندی سے ان سفید پوش افراد کو شانی سے ہاتھا پائی کرتے دیکھا تھا اور ہوائی فائر کر دیئے تھے۔

سب انسپکٹر مختار نے اپنے ساتھی سے چھوٹی دوربین لی اور آنکھوں سے لگا کر دھیان

سے آنے والوں کا جائزہ لیا۔ ''بیڑا غرق۔'' اس نے بے ساختہ کہا اور اس کے ہونٹ دائرے کے انداز میں سکڑ گئے۔

''کیا ہوا سر جی؟'' ایک ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ اخبار والے ہیں۔ کل ڈی آئی جی صاحب نے ان کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ڈیرے پر آپریشن کا آنکھوں دیکھا حال دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔'' وہ پریشانی سے بڑبڑایا۔

آنے والے بیس بائیس افراد کے پیچھے اب چند مزید مسلح پولیس والے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ وہ سب اونچی آواز میں بولتے ہوئے تیزی سے موقع کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شانی کو اب سب انسپکٹر نے چھوڑ دیا تھا۔ شانی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی مختار اور اس کے ساتھیوں کی طرح تجسس سے آنے والوں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر یہ لوگ کافی نزدیک پہنچ گئے۔ شانی کو ان لوگوں کے پاس دو ٹی وی کیمرے بھی دکھائی دیئے۔ مختار کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کی توقع کے بالکل برعکس تھی اور اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ڈپٹی ریاض صاحب بی بی کی آمد اور روانگی کو راز رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ کم سے کم افراد کے علم میں آئے لیکن یہاں تو سارا معاملہ ہی چوپٹ دکھائی دے رہا تھا۔ میڈیا کے چوکس ترین لوگ صورت حال کی رپورٹنگ کے لئے یہاں آموجود ہوئے تھے اور بدقسمتی سے ایسے موقع پر آئے تھے جب ایک دھماکہ خیز خبر ان کی منتظر تھی۔ شانی بی بی جس کو گوجرانوالہ، لاہور اور گردونواح میں سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا، نہ صرف پولیس کی تحویل میں تھی بلکہ وادی سون میں پائی جا رہی تھی۔

شانی نے دیکھا کہ سب انسپکٹر نے اپنا گنجا سر کھجا کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ دوسری طرف میڈیا کے ساتھ آنے والے پولیس اہلکار بھی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک شانی کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گئی۔ اس نے گریس کو دیکھا۔ وہ پتلون قمیص میں تھی۔ اس کے سر پر تنکوں کا ہیٹ تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگائے اور سفید جوگر پہنے وہ ایک خاتون اخبار نویس کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ ملتان میں گریس نے شانی کو بتایا تھا کہ اس کا تعلق صحافت سے بھی رہا ہے۔ کیا وہ ایک صحافی کی حیثیت سے یہاں موجود ہے؟ یہ سوال تیزی سے شانی کے ذہن میں ابھرا۔

گریس نے بھی شانی کو پہچان لیا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے لگی اور سب سے

پہلے شانی تک پہنچ گئی۔ ''شونی..... شونی! تم یہاں؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور پھر شانی سے لپٹ گئی۔

شانی نے بہ مشکل اپنی سسکیاں ضبط کیں۔ پولیس والوں کے ساتھ ہاتھا پائی اور کھینچا تانی میں شانی کا گریبان ایک بار پھر نیچے لٹک گیا تھا۔ یہ گریبان جی ٹی روڈ پر سفر کرتے ہوئے جیپ کے اندر ڈپٹی ریاض نے پھاڑا تھا اور ابھی تک سیفٹی پنوں سے جڑا ہوا تھا۔ شانی نے کانپتے ہاتھوں سے ایک بار پھر گریبان کی سیفٹی پنز درست کیں۔ گریس نے شانی کا سر چومتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا۔''

پھر وہ دیگر اخبار نویسوں اور کیمرامینوں کی طرف مڑی۔ ''دیکھ لیا آپ نے..... یہ شونی ہے جسے ہم سب جگہ جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ پولیس والے یہاں اس کے کپڑے پھاڑنے میں مصروف ہیں۔''

دس پندرہ اخبار نویس شانی کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں تجسس اور سنسنی تھی۔ ایک سینئر اخبار نویس نے شانی کو پہچاننے کے بعد سب انسپکٹر مختار کو مخاطب کیا اور پوچھا۔ ''یہ ہم سب کیا دیکھ رہے ہیں سب انسپکٹر؟''

تجربہ کار سب انسپکٹر اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تو ملازم ہوں جی..... جو حکم اوپر سے ملا ہے اس کے مطابق عمل کر رہا ہوں لیکن جہاں تک مجھے پتا چلا ہے یہ بی بی صاحبہ خود اس ممنوعہ علاقے میں پہنچی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی تھے جن کے بارے میں ریاض صاحب ہی جانتے ہیں۔ یہ آگے وڈے ڈیرے تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ افسروں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا ہے اور واپس بھیجا ہے۔ یہ میری ڈیوٹی لگی ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں اور سیف ایریا تک پہنچا دوں لیکن یہاں آ کر یہ اڑ گئی ہیں اور پھر واپس جانا چاہ رہی ہیں۔''

''یہ بکواس کر رہا ہے۔'' شانی کراہی۔ ''یہ لوگ..... یہ لوگ.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

ریاض کی کرخت صورت اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اس نے کسی کو اپنے اور تایا معصوم کے بارے میں اصل واقعہ بتایا تو پھر ایک جنازہ اور اٹھ جائے گا۔ شانی نے ڈپٹی ریاض کو جانچ لیا تھا۔ وہ شخص سب کچھ کر سکتا تھا۔ بدترین کام کر گزرنے کے بھی اس کے پاس ایک سو ایک بہانے تھے۔

گریس نے اسے دلاسا دیا۔ ''بتاؤ شونی! اصل بات کیا ہے۔ یہ سب میڈیا کے لوگ

ہیں۔ تم جو کہو گی وہ لاکھوں لوگوں تک پہنچ جائے گا اور سچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ بتاؤ میری پیاری بہن! یہ لوگ تمہیں کیسے لائے ہیں یہاں اور کیا تمہارے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟''

شانی کے سینے میں تلاطم تھا۔ وہ رو رو کر سب کچھ میڈیا کے سامنے کہہ دینا چاہتی تھی لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ بالآخر وہ اس ساری صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تنہا ہو گی۔ میڈیا کو تو نت نئی خبریں درکار ہوتی ہیں۔ چنگھاڑتی شور مچاتی خبریں چند روز بعد کسی دوسری خبر کے شور میں دب جاتی ہیں اور پھر عموماً سب کچھ فراموش کر دیا جاتا ہے۔ جس کی خبر ہوتی ہے، وہ ہوتا ہے اور پولیس ہوتی ہے۔ سب کچھ اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

وہ خاموش رہی۔ گریس نے شانی کا کندھا دبایا۔ ''بتاؤ شونی! گھبراؤ مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم سب ساتھ ہیں اور یہ کوئی عام اخبار نویس نہیں ہیں۔ عام ہوتے تو یہاں تک نہ پہنچ سکتے اور ہم سب پورا اسٹینڈ لیں گے تمہارے ساتھ۔''

یہی بات ذرا مختلف انداز میں ایک دوسرے اخبار نویس نے کہی۔

شانی بولی۔ ''میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ ابھی میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔ پلیز مجھے کچھ سوچنے دیں۔''

شانی کی خاموشی سے سب انسپکٹر مختار کو مزید حوصلہ ہوا، وہ بولا۔ ''اتنی بات تو آپ سب نے بھی دیکھ لی ہو گی جناب کہ ہم بی بی صاحبہ کو وڈے ڈیرے کی طرف لے جا نہیں رہے واپس لا رہے ہیں۔ وہاں بہت خطرہ ہے جی۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈپٹی ریاض صاحب کا آرڈر تھا کہ ہم بی بی کو بڑی عزت اور حفاظت کے ساتھ گوجر خان تک پہنچا دیں۔ پھر وہ جہاں جانا چاہیں آزاد ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو کم از کم ہم تو نہیں جانتے جناب۔ ہم تو تنخواہ دار نوکر ہیں جی۔''

''نوکر صاحب! محترمہ کے کپڑے بھی آپ نے ہی پھاڑے ہوں گے۔'' سینئر اخبار نویس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جی۔ یہ تو پہلے کے.....'' سب انسپکٹر ہکلا کر رہ گیا۔

''اور آپ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ بی بی اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ از خود یہاں تک پہنچی ہیں۔''

''جج..... جی۔''

''اور یہاں ہر طرف پولیس منڈلا رہی ہے۔ چپے چپے کی نگرانی ہو رہی ہے۔ بندہ تو کجا

کوئی چھوٹا موٹا جنگلی جانور بھی تمہاری مرضی کے خلاف یہاں نہیں گھس سکتا۔"

"لیکن پھر بھی جناب! یہ کافی بڑا علاقہ ہے۔ ہر جگہ تو نگاہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہی ایک کیمرہ مین نے ٹی وی کیمرہ آن کر دیا تھا۔ سب انسپکٹر جز بز نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کیمرہ مین سے کہا کہ وہ ریکارڈنگ نہ کرے۔ پھر وہ رخ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا۔

ایک بارعب اخبار نویس آگے بڑھا۔ اس نے شانی سے کہا۔ "بی بی! آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کو فوری طور پر تنہائی اور سکون کی ضرورت ہے۔"

"ہاں .... ہاں، شونی آؤ۔" گریس نے شانی کا بازو تھاما۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر سب انسپکٹر پلٹ آیا۔ "دیکھیں جی! آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ کارِ سرکار میں مداخلت نہ کریں۔ بی بی اس وقت میری تحویل میں ہیں اور میں افسروں کے حکم کے مطابق انہیں گوجر خان پہنچانے کا پابند ہوں۔"

سینئر اخبار نویس ضمیر احمد نے کہا۔ "ہم میڈیا کے لوگ ہیں۔ ہم پر بھی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ ہم بھی پابند ہیں کہ کسی اکیلی لڑکی کو چند پولیس والے ایک ویرانے میں کھینچ گھسیٹ رہے ہوں تو ہم اس کی مدد کریں۔" سفید ریش اخبار نویس نے بڑی شفقت سے شانی کا ہاتھ تھام لیا۔

سب انسپکٹر نے تھوڑی سی تکرار کی پھر بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب ایک قدرتی کھوہ میں موجود تھے۔ کھوہ سے باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ اس دھوپ کے سبب نباتات کی مہک بھی تیز ہو گئی تھی۔ میڈیا کی جو پارٹی یہاں پہنچی تھی اس کے ساتھ پولیس کا ایک دستہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ چار پانچ مقامی قلی بھی موجود تھے۔ انہوں نے پانی کے کین اور خورد و نوش کا دیگر سامان اٹھا رکھا تھا۔ گرمی کے سبب پانی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد سارے لوگ کچھ دیر کے لئے کھوہ سے باہر چلے گئے۔ گریس نے اپنے ساتھ آنے والی ایک خاتون صحافی کے کپڑے شانی کو پہننے کے لئے دیئے۔ کھوہ کے ایک تاریک گوشے میں جا کر شانی نے کپڑے بدل لئے۔ یہ اس کے جسم پر تقریباً ٹھیک آئے تھے۔

جب سارے لوگ کھوہ میں واپس آ گئے تو معمر اخبار نویس ضمیر احمد کے کہنے پر گریس نے شانی کو اپنے ساتھ لیا اور کھوہ سے باہر آ بیٹھی۔ یہاں ایک پتھر نے قدرتی سائبان بنا رکھا

تھا۔ ایک ہموار جگہ پر دری بچھا دی گئی تھی۔ وہ دونوں یہاں مکمل رازداری سے بات کر سکتی تھیں۔ سب انسپکٹر مختار اور اس کے ساتھی اہلکار چالیس پچاس فٹ کی دوری پر ایک درخت کے سائے تلے موجود تھے اور خفا خفا دکھائی دیتے تھے۔ سب انسپکٹر مختار کے ساتھیوں کے چہروں پر خفگی کے ساتھ ساتھ حیرت کا عنصر بھی تھا۔ دراصل یہ بات ان کے لئے بھی انکشاف سے کم نہیں تھی کہ وہ جس لڑکی کو اپنے ساتھ گوجر خان لے کر جا رہے تھے، وہ بی بی ہے۔

گریس نے شانی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "مجھے وڈے ڈیرے پر ہونے والی لڑائی دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں اس پارٹی کے ساتھ اس لئے آئی ہوں کہ میں تمہیں کھوجنا چاہتی تھی۔ سچ کہتے ہیں شونی، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ میں میڈیا پارٹی کے ساتھ سون میں گئی تو تمہارے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانوں گی۔ بہرحال یہ تو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ میں یہاں اتنی جلدی تمہیں دیکھ پاؤں گی اور وہ بھی ایسی حالت میں، جب پولیس والے تم سے کشتی لڑ رہے ہوں گے...... میں بہت حیران ہوں شونی۔"

"خود میری سمجھ میں کچھ نہیں رہا گریس کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا یہ بات صحیح ہے کہ تمہیں پولیس والے گوجرانوالہ سے زبردستی یہاں لے کر آئے ہیں؟"

شانی نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں گریس! ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ پلیز ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو...... پلیز۔" شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

گریس نے کہا۔ "اچھا شونی! صرف اتنا بتا دو کہ کیا تمہارے تایا معصوم کو بھی یہاں لایا گیا ہے؟"

شانی نے ایک بار پھر بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ "پلیز گریس! ابھی مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کرو۔"

گریس دھیان سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ گہری سانس لے کر وہ بولی۔ "ٹھیک ہے شونی! میں تمہیں مجبور نہیں کرتی، جب تمہارا دل چاہے بتا دینا اور اگر نہ چاہے تو نہ بتانا..... ٹھیک ہے؟"

شانی چپ رہی۔ آخر اس نے ایک طویل آہ کھینچی۔ "گریس! وہ سب مارے جائیں گے۔ شاید پولیس ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور پولیس والوں میں سب سے بے رحم ڈپٹی ریاض ہے۔ وہ رستم کو بھی گرفتار کر چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس کی جان لے سکتا

ہے۔ اگر تم کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا گریس۔''

گریس نے اپنے ہونٹ بھینچے اور گہری سوچ میں نظر آنے لگی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ''حالات واقعی خراب ہیں شونی۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے میں ڈیرے پر فیصلہ کن کارروائی کا پروگرام ہے۔ پولیس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بارودی سرنگیں ہیں۔ بارودی سرنگیں صاف کرنے والے کچھ ماہر افراد کل رات یہاں پہنچ چکے ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھی افسروں نے ان بارودی سرنگوں کا کوئی اور حل بھی نکال لیا ہے۔ یہ کیا حل ہے...... اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر ڈپٹی ریاض اس سلسلے میں کافی پُرامید ہے۔ اسی لئے یہ لوگ اڑتالیس گھنٹے میں کام نمٹانے کی بات کر رہے ہیں۔''

شانی نے کہا۔ ''گریس! ڈیرے پر موجود سارے لوگ تو مجرم نہیں ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جنہیں پولیس نے ہی ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ چند گناہ گاروں کے ساتھ سب کو مار دینا کہاں کا انصاف ہے۔ کیا کوئی ایسا راستہ نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں سے ہتھیار ڈلوانے کے لئے ان سے بات چیت کی جائے؟''

گریس بولی۔ ''میں نے سنا ہے، ڈپٹی ریاض کہتا ہے اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے یا تو ڈیرے کے ملزم غیر مشروط طور پر باہر آ کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیں یا پھر کارروائی کے لئے تیار رہیں۔''

شانی نے دل گیر آواز میں کہا۔ ''کوئی بھی خود کو اس کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس نے ڈیرے والوں میں اتنی دہشت پھیلا رکھی ہے کہ وہ اس کے ہتھے چڑھنے کے بجائے لڑتے ہوئے مرنے کو بہتر سمجھیں گے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، چند روز پہلے ڈیرے کے تین بندے ڈپٹی کے ہتھے چڑھے تھے۔ ان میں سے دو کو اس نے اتنی بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا کہ ان کی لاشیں بھی ڈپٹی سے پناہ مانگ رہی تھیں۔ بعد میں ان لاشوں کو خچروں یا شاید گدھوں پر لاد کر ڈیرے بھیجا گیا تاکہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں۔''

گریس نے کہا۔ ''رستم والی خبر سنا کر تم نے اور دکھی کر دیا ہے۔ رستم کی گرفتاری کیسے ہوئی اور کیا تمہیں یقین ہے کہ واقعی ایسا ہو گیا ہے؟''

''ہاں میں نے اسے خود دیکھا ہے ڈپٹی ریاض کے پاس۔ اسے الٹی ہتھکڑی لگا دی گئی ہے۔ ارد گرد بڑا سخت پہرا ہے۔''

گریس بڑے دھیان سے شانی کو دیکھ رہی تھی۔ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''شونی! کہیں

ایسا تو نہیں کہ رستم نے تمہیں ڈپٹی کے شکنجے سے نکالنے کے لئے گرفتاری دی ہو؟''

شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے گریس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔ تاہم اس نے اپنی زبان سے کسی طرح کا اقرار نہیں کیا۔ ''بولو شونی! کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''پلیز گریس! میں نے تم سے التجا کی ہے۔ ابھی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھو۔''

گریس خاموش ہو گئی لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے شانی کی خاموشی کو اس کا اقرار ہی سمجھا ہے۔ اس کی سرخ و سپید پیشانی پر سوچ کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ہولے سے بولی۔ ''شونی! کیا تم واپس ڈیرے پر جانا چاہ رہی ہو؟''

''ہاں گریس! مجھے لگتا ہے، یہاں ڈیرے پر سب کچھ ختم ہونے والا ہے .... شاید رستم بھی..... اور اگر وہ بھی ختم ہو رہا ہے تو پھر..... پھر میں واپس جا کر کیا کروں گی؟'' دو آنسو موٹی بوندوں کی طرح شانی کی آنکھوں سے گرے اور ہاتھوں کی پشت پر پھیل گئے۔

گریس نے کہا۔ ''تم بہت زیادہ مایوس نظر آ رہی ہو حوصلہ رکھو۔ ہم رستم کو اس طرح جان ہارنے نہیں دیں گے۔ اگر وہ گرفتار ہے تو پھر اس کے زندہ رہنے کا امکان مزید بڑھ جائے گا۔ ایک دفعہ وہ گرفتار حالت میں میڈیا کو نظر آ گیا تو پولیس والوں کے لئے اسے ختم کرنا آسان نہیں ہو گا۔''

''تو پھر جلدی چلو گریس! مجھے ڈر ہے کہ ہمارے واپس پہنچنے سے پہلے کچھ ہو نہ جائے۔ ڈپٹی ریاض بالکل جانور بنا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ لوگ کھانا کھا لیں تو ہم یہاں سے نکل پڑتے ہیں۔'' گریس نے کہا۔

''سب انسپکٹر تو رکاوٹ نہیں ڈالے گا؟''

''ضمیر صاحب جو ہیں ہمارے ساتھ۔ یہ ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتے ہیں اور میرا نہیں خیال کہ میڈیا کے نمائندوں کی موجودگی میں یہ سب انسپکٹر من مانی کرے۔''

صرف آدھ گھنٹہ قیام کے بعد یہ قافلہ چل پڑا۔ گریس کا اندازہ درست تھا۔ سب انسپکٹر مختار نے شانی کو گوجر خان لے جانے پر زور نہیں دیا۔ وہ دیگر لوگوں کے ساتھ ہی واپس ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جو پولیس اہلکار میڈیا والوں کے ساتھ آئے تھے، ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ انسپکٹر نے ضمیر احمد سے کہا۔ ''ضمیر صاحب! ہم نے آپ کی بات مانی ہے لیکن اس غریب ملازم (مختار) پر کوئی مصیبت نہیں آنی چاہیے۔ آپ اس بارے میں ریاض

صاحب سے خود بات کر لیجئے گا۔"

"گھبراؤ نہیں یار! میں خود بات کروں گا اور جو مزید باتیں کر سکا وہ بھی کروں گا۔" ضمیر احمد نے کہا۔

اس دوران میں دو دیگر اخبار نویس شانی کو کریدنے میں مصروف ہو گئے۔ تاہم گریس آڑے آئی اور اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ کچھ مجبوریاں ہیں۔ فی الوقت شانی اس حوالے سے کوئی بیان دینا نہیں چاہتی۔

قریباً تین گھنٹے کے کٹھن اور پُرپیچ سفر کے بعد وہ لوگ ان ٹیلوں میں پہنچ گئے جہاں ایک معرکے کے امکانات تھے۔ وادی سون کی تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرا رہی تھی۔ یہ سنسان ٹیلے ایسے ہی اَن گنت ہنگاموں کے راز اپنے سینوں میں دبائے صدیوں سے خاموش کھڑے تھے۔ کچھ بھاگنے والے بھاگتے رہے تھے اور کچھ پیچھا کرنے والے پیچھا کرتے رہے تھے اور پھر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی تھی۔ کبھی بھاگنے والے کامیاب رہے تھے اور کبھی پیچھا کرنے والے۔ مصری خان...... جو عہدِ اکبری میں بادشاہ وقت سے ٹکرایا۔ طورہ خان اور چراغ بالی جو انگریزی استبداد کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور محمد خان جو عہدِ حاضر میں مزاحمت کی علامت بنا اور اس کے علاوہ بھی بہت سے سپوت تھے جن کی مزاحمت کی روداد ان ٹیلوں میں بازگشت بن کر گونجتی تھی۔ یہ لوگ غیرت اور اَنا کی زندہ تصویر تھے۔ ان کی سوچ اس انداز کی تھی۔

جس نوں بولی پھٹ نہیں کیتا
اس نوں گولی پھٹ نہیں کیتا

وڈے ڈیرے کے اردگرد پولیس کے ساتھ ساتھ اجرالیوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ بڑا اجرالی سردار غلام کبیر از خود یہاں موجود ہے اور اپنے لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ ڈیرے کے اردگرد جہاں تک نگاہ جاتی تھی، پولیس اور اجرالیوں کی پوزیشنیں موجود تھیں۔ ڈیرے کے گرد گھیرا ابھی پہلے سے تنگ ہو گیا تھا۔ شانی نے دیکھا کہ ڈیرے کے شمالی کنارے سے گہرا سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے۔ بعد ازاں اسے معلوم ہوا کہ قریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں دور مار گن MG-08 سے مسلسل فائرنگ کی گئی تھی۔ اس فائرنگ سے ڈیرے کا بڑا جنریٹر تباہ ہو گیا تھا اور تیل کے ڈرموں میں آگ لگ گئی تھی۔

میڈیا کی آمد کے ساتھ ہی پولیس کی پوزیشنوں میں افراتفری نظر آنے لگی۔ سب لوگ چوکس ہو گئے۔ ڈپٹی ریاض اور ایک دوسرے ڈپٹی شہاب نے خود آ کر قافلے کا استقبال کیا۔

اس قافلے میں شانی کو دیکھ کر ڈپٹی ریاض حیران ہوا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ موجودہ لوگوں کی پرواہ کئے بغیر کڑک کر سب انسپکٹر مختار سے مخاطب ہوا۔ "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

اس سے پہلے کہ کوئی جواب میں کچھ کہتا سب انسپکٹر مختار آگے بڑھا اور اس نے ریاض کے قریب جا کر سرگوشیوں میں بات کی۔ یقیناً اس نے موجودہ صورتِ حال سے ڈپٹی ریاض کو آگاہ کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ میڈیا کے سامنے اس نے کیا مؤقف اختیار کیا ہے۔ شانی کو یقین تھا کہ یہ مؤقف ڈپٹی ریاض کا دیا ہوا ہی تھا۔

پوری بات سننے کے بعد ڈپٹی ریاض قہر آلود نظروں سے میڈیا پارٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ خاص طور سے شانی کے لئے اس کی نگاہوں میں بلا کی گرمی موجود تھی۔ اپنے اندرونی طیش کے سبب اس نے خود بات کرنا مناسب نہیں سمجھی اور اپنے ساتھی ڈپٹی شہاب کو اشارہ کیا کہ وہ بات کرے۔ خود وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔

ڈپٹی شہاب اور سینئر صحافی ضمیر احمد میں طویل مکالمہ ہوا۔ اس مکالمے کا بنیادی موضوع شانی ہی تھی۔ ڈپٹی شہاب نے بڑی ڈھٹائی اور غیر معمولی اعتماد سے وہی اسٹیٹمنٹ دیا جو اس سے پہلے اس کا ماتحت مختار دے چکا تھا۔ اس نے میڈیا کو بتایا کہ شانی اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ از خود یہاں پہنچی ہے۔ وہ ہر صورت رستم سے ملنا چاہتی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اس کام کے لئے اگر اس کی جان بھی چلی جائے تو اسے پرواہ نہیں ہے۔ اسے بڑی مشکل سے روکا گیا اور بتایا گیا کہ وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ بعد ازاں اسے پوری حفاظت کے ساتھ واپس بیس کیمپ کی طرف روانہ کیا گیا۔

شانی ڈپٹی شہاب کا اسٹیٹمنٹ سن رہی تھی اور اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اس نے فلموں اور ڈراموں میں ایسے مناظر دیکھے تھے۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر جھوٹے گواہ اپنے مخالفوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سفید جھوٹ بولتے تھے۔ اس وقت وہ سوچتی تھی ایسا کیونکر ممکن ہے لیکن آج اس کے اپنے اوپر یہ سب کچھ بیت رہا تھا۔ پولیس والے بڑے دھڑلے سے کوے کو سفید ثابت کر رہے تھے۔ نہ ان کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی نہ آنکھوں میں جھجک۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ کرب سے چیخی۔

"بی بی! تمہارے حواس بحال نہیں ہیں۔ تمہارے پنڈے کی گرمی نے تمہیں دیوانہ کر رکھا ہے۔" ڈپٹی شہاب نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''آپ بغیر ثبوت کے ایسی بات نہ کریں ڈپٹی صاحب۔''ضمیر احمد نے احتجاج کیا۔

''ہم ایک سو ثبوت دے دیں گے آپ کو اور یہ بھی بتائیں گے کہ یہ بی بی رستم تک پہنچنے کے لئے اور اس کی جان بخشی کے لئے ہمیں کیا کیا آفر کرتی رہی ہے۔''

''اللہ کے قہر سے ڈرو ڈپٹی صاحب۔ تمہیں ایسے بہتان لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں بی بی! ساری شرم ہمیں ہی آنی چاہیے، تمہیں کچھ نہیں آنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ تم اس ڈاکو کی خاطر کہاں کہاں پہنچی ہو اور کیا کیا پاپڑ بیلتی رہی ہو۔ اب تو یہ سارے صحافی بھائی بھی گواہ ہیں کہ ہم تمہیں یہاں سے واپس بھیج رہے ہیں اور تم بھاگ بھاگ کر اس آگ میں گھس رہی ہو۔''

''میں خود نہیں آئی ہوں۔'' شانی چلائی۔''تم......تم۔'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے ہونٹ دبا لئے اور سسکیاں لینے لگی۔ گریس نے مضبوطی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

ضمیر احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''ڈپٹی صاحب! آپ بی بی کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ یہ ہمارے ساتھ ہیں۔ واپسی پر یہ ہمارے ساتھ جائیں گی۔''

''لیکن یہ پرمیشن کے بغیر یہاں کس طرح رہ سکتی ہے اور ان کا کام بھی یہاں کیا ہے؟''

''پرمیشن کی بات چھوڑیں جی! پرمیشن آپ نے ہی دینی ہے۔ اگر ہماری طرف سے کوئی ضمانت چاہیے تو ہم دینے کو تیار ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کے کسی کام میں کسی طرح کا خلل نہیں پڑے گا۔''

تھوڑی دیر تک ڈپٹی شہاب اور ضمیر صاحب میں اس بات پر تکرار ہوئی۔ بالآخر ڈپٹی کو میڈیا کے سامنے اپنی ہٹ دھرمی چھوڑنا پڑی۔

اب شام ہونے والی تھی۔ دور نشیب میں ڈیرے پر چند روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ شمالی کنارے سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر اوپر تک جا رہے تھے۔ یہ ایک نہایت گرم دن تھا۔ بار بار پانی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ شانی جانتی تھی کہ ڈیرے پر خوراک اور پانی کی قلت بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈیرے پر موجود لوگ بھوکے پیاسے تھے اور اب ان پر دھوئیں کی آفت آ گئی تھی۔

میڈیا کے لوگوں کے لئے قریباً 2000 میٹر کی دوری پر چار خیمے لگائے گئے تھے۔ یہ خیمے ٹیلوں کی اوٹ میں تھے۔ ابھی وہ لوگ خیموں کی طرف جا ہی رہے تھے کہ اچانک فائرنگ

شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ پولیس کی اگلی پوزیشنوں سے شروع ہوئی تھی۔ پھر ڈیرے کی طرف سے بھی جواب آنے لگا۔ نیم تاریکی میں چنگاریاں چھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایک اجرالی جنگجو نے صحافیوں کو مخاطب کیا اور چلا کر بولا۔''گولی چل رہی ہے جی۔ تساں جلدی سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ جلدی کرو جی۔''

وہ سب لوگ ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے اپنے خیموں تک پہنچ گئے۔ چار پانچ منٹ تک فائرنگ کی زوردار آوازیں آتی رہیں۔ پمپ ایکشن، آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک کئی طرح کے ہتھیار استعمال کئے جا رہے تھے۔ ان میں نمایاں ترین آواز MG-08 گن کی تھی۔

صحافیوں کو مشروبات پیش کئے گئے اور چائے کافی کا انتظام کیا گیا۔ شانی اور گریس علیحدہ علیحدہ خیمے میں تھیں۔ یہاں میٹ بچھا تھا اور گیس لیمپ کی روشنی تھی۔ یہ جدید طرز کا خیمہ تھا جو کوہ پیما استعمال کرتے تھے۔ گریس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔''شونی! کیا تمہیں یقین ہے کہ رستم اس وقت ڈپٹی ریاض کی حراست میں ہے؟''

''میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا وہ اب بھی یہیں موجود ہے؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور آنسو پونچھ کر بولی۔''اگر ہم کچھ نہ کر سکے تو ڈپٹی ریاض اسے مار ڈالے گا۔ وہ اسے پولیس والوں کا قاتل کہتا ہے اور اس کے نزدیک رستم کی کم از کم سزا یہ ہے کہ اسے گولی مار دی جائے۔''

گریس نے کہا۔''اگر کسی طرح میڈیا والے ایک بار یہ دیکھ لیں کہ رستم گرفتار ہے تو پھر پولیس کے لئے اسے مارنا یا غائب کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ابھی ضمیر صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ وہ پولیس پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ انہیں قیدیوں کو دیکھنے کی اجازت دی جائے۔''

گریس اٹھ کر باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو سینئر صحافی ضمیر احمد اور ایک انگریزی اخبار کے کرائم رپورٹر عباس چشتی ان کے ساتھ تھے۔

وہ دونوں شانی سے مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ وہ شانی سے پوری تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن شانی کی زبان کو ریاض کی خوفناک دھمکی کا تالا لگا ہوا تھا۔ وہ دونوں صحافیوں کو بس یہ بتا سکی کہ رستم گرفتار ہو چکا ہے اور اس وقت یہاں ریاض کی کسٹڈی میں موجود ہے۔ اس پر بدترین تشدد کا امکان ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے یہیں پر ختم کر دیا جائے۔

ضمیر احمد نے کہا۔''کیا آپ ہمیں یہاں سے بتا سکتی ہیں کہ اسے کس خیمے میں رکھا گیا

ہے؟''

''یہاں سے وہ خیمہ دکھائی نہیں دیتا لیکن آپ کو آسانی سے پتا چل جائے گا۔ وہ پرانی طرز کی بڑی چھولداری ہے اور اس نیلے خیمے کے بالکل ساتھ ہے جہاں ریاض رہتا ہے۔''

''کیا وہاں کوئی اور قیدی بھی ہے؟''

''جب میں نے دیکھا تھا تو وہاں صرف رستم تھا لیکن اب ہوسکتا ہے کہ کوئی اور بھی ہو۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس والوں نے ڈیرے کے کچھ بندے پکڑ بھی رکھے ہیں۔''

''کتنے ہوں گے۔''

''مجھے ان کی ٹھیک تعداد کا پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ صرف ایک دو ہوں لیکن زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔''

شانی اور گریس کو تسلی دینے کے بعد دونوں حضرات پولیس حکام سے ملنے کے لئے چلے گئے۔

دور فاصلے پر اکا دکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ پولیس والوں کی نقل وحرکت جاری تھی۔ گاہے بگاہے اجرالیوں کے زوردار نعرے بھی سنائی دیتے تھے۔ یہ سب اجرالی مقامی لباس میں تھے اور اپنے بڑے بڑے پگڑوں کے سبب دور ہی سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے پاس پرانی طرز کی بندوقیں تھیں لیکن کچھ کے پاس جدید ہتھیار بھی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں بہت بڑے پگڑ والا ایک قد آور شخص سب سے نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اس کی مونچھیں تقریباً ایک چوتھائی چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دراصل داڑھی کے کچھ حصے کو بھی مونچھوں میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اس شخص کے پاس جدید آٹومیٹک رائفل اور انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں چمکتی تھیں۔ یہی اجرالی سردار غلام کبیر تھا۔ ایک ملازم بیش قیمت گڑگڑی (چھوٹا حقہ) لئے ہوئے ہر وقت سردار کے عقب میں رہتا تھا۔ شانی نے دیکھا تھا کہ دن کے وقت سردار نے دھوپ کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔

''کیا یہی اجرالی سردار ہے؟'' گریس نے شانی سے پوچھا۔

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کہتے ہیں کہ اس کی دس بیویاں ہیں اور چالیس سے زیادہ بچے۔ ابھی حال ہی میں ایک اٹھارہ سالہ لڑکی سے اس نے ایک شادی اور کی ہے۔''

گریس نے آنکھیں پھاڑ کر ہونٹ سکیڑے۔

شانی نے بتایا۔ ''ان اجرالی سرداروں میں عورت اور زمین کی بہت ہوس ہوتی ہے۔ اب جو دو تین سردار پولیس کے ٹاؤٹ بنے ہوئے ہیں وہ بھی زمین کے لالچ میں اندھے

ہو رہے ہیں۔ یہاں چار پانچ پہاڑ ایسے ہیں جن پر ان اجرالی سرداروں کی نظر ہے۔ لالہ فرید اور اس کے ساتھیوں کی وجہ سے یہ سردار ان پہاڑوں پر نہیں آسکتے۔ اب سنا ہے کہ ڈپٹی ریاض نے ان سرداروں سے پہاڑوں کی ملکیت کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدے کے بدلے یہ اجرالی ہر طرح پولیس سے تعاون کر رہے ہیں۔ خاص طور سے بڑا سردار غلام کبیر تو پولیس کا حصہ بنا ہوا ہے۔ یہاں انگریزوں کے دور کی جو بڑی مشین گنیں دکھائی دے رہی ہیں، یہ بھی سردار غلام کبیر کی ہیں۔''

گریس نے اپنے سنہری بال مٹھی میں جکڑے اور تاسف سے بولی۔ ''مائی گاڈ! دس بیویاں، چالیس بچے اور اب ایک اور اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی۔ ان قبائلی سرداروں کے بارے میں ایسی باتیں سنی تھیں لیکن اب سب کچھ اپنے تجربے میں آرہا ہے۔''

شانی نے گہری سانس لی۔ ''ان میں نیک نام سردار بھی ہیں، جنہوں نے ہر دور میں ظلم کے خلاف جنگ کی لیکن زیادہ تر وہ ہیں جو اپنے اردگرد کے لوگوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ سون کے اس دور دراز علاقے میں ہر طرح کی من مانیاں کرتے ہیں۔ زن، زر اور زمین کے لئے ان کی ہوس کبھی کم نہیں ہوتی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ لالہ اور اس کے ساتھیوں سے ان کی دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ نادر کاکا اور لالہ وغیرہ میں لاکھ برائیاں ہی لیکن عورت ذات کے معاملے میں وہ بالکل مختلف رہے ہیں۔ بلکہ جہاں کہیں کسی زمیندار وڈیرے کی طرف سے عورت پر جبر ہوا ہے، ان لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔''

شانی اور گریس کے درمیان اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ گریس نے شانی کو راستے میں پیش آنے والا ایک واقعہ سنایا اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے ایک زمیندار کے برکارے کو ایک جوہڑ کے اندر ایک غریب صورت عورت سے سرعام زیادتی کرتے دیکھا۔ عورت کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس کی دو بکریاں زمیندار کے باغ میں چلی گئی تھیں۔ پھر گفتگو کا رخ چوہدری بشیر اور اسٹیفن کی طرف مڑ گیا۔ گریس نے شانی کو بتایا۔ ''تمہاری گمشدگی کے سبب چوہدری باشیر (بشیر) از حد پریشان ہے۔ اس کو اپنے ان تینوں گارڈز پر بھی از حد غصہ تھا جن کے ہوتے ہوئے تم رکشے میں بیٹھ کر کہیں چلی گئی تھیں۔ اس نے مار مار کر ان گارڈز کی چمڑی ادھیڑی اور پھر نوکری سے نکال دیا۔ چوہدری باشیر کو تمہارے لاپتا ہونے کے سلسلے میں پولیس کے علاوہ چوہدری حشام وغیرہ پر بھی شبہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کا غصہ عارف مبوہ پر بھی اُتر رہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں عارف وغیرہ سے اس کا جھگڑا ہی نہ ہو جائے۔''

شانی نے گریس سے مُنے کے بارے میں پوچھا۔

گریس نے بتایا۔ ''اسے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ تم گاؤں گئی ہو اور چند دن بعد واپس آ کر اس کی ممی بن جاؤ گی۔ وہ خوش ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ ڈیوس اور وہ سارا دن لان میں کھیلتے ہیں۔''

''اور اسٹیفن؟'' شانی نے گریس سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

''وہ اپنے کام پر ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''لندن سے دو افراد اور آئے ہیں۔ ان میں ہمارے باس مشہور کیمسٹ فلپ فریز بھی ہیں۔ میں نے تمہیں ان کے بارے میں بتایا تھا ناں۔''

''ہاں، جن کی کمپنی میں تم اور اسٹیفن کام کرتے ہو۔''

''بالکل..... ہم فلپ صاحب کی فارماسیوٹیکل کمپنی میں ہی جاب کر رہے ہیں۔ فلپ صاحب اس پودے میں بے حد دلچسپی لے رہے ہیں جسے ہم ''سانپ کی ڈالی'' کہتے ہیں۔ تم نے اس کا کیا نام بتایا تھا؟''

''سپ گندل!'' شانی نے جواب دیا۔

''ہاں ساپ گندل۔'' گریس نے اپنے انگریزی لہجے میں سپ گندل کا تلفظ بگاڑا۔

''اسٹیفن اور فلپ صاحب اس پودے کی تلاش کے لئے دو مقامی افراد کے ساتھ گجرات کے مضافاتی علاقے کی طرف گئے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ کیمپنگ کا سامان بھی لے گئے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی واپسی سات آٹھ دن سے پہلے نہیں ہوگی۔''

''گریس! تمہیں اس کام میں کوئی خطرہ تو محسوس نہیں ہوتا؟ میرا مطلب ہے کہ اس سے پہلے اس پودے کے چکر میں تین قتل ہو چکے ہیں۔ تم نے خود ہی بتایا تھا ناں کہ لندن میں دارا نامی شخص اور اس کے بیٹے کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا تھا اور قاتل ایسے لوگ تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ اس پودے کا کھوج لگایا جائے یا اس کی کاشت کی جائے۔''

''وہ تو میں نے بس ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان موتوں کی وجہ کوئی اور ہو۔ بہر حال شونی! ہر کام میں تھوڑا بہت رسک تو پوشیدہ ہوتا ہے ناں۔''

شانی نے کہا۔ ''کیا آپ کے باس اس پودے کو لندن میں کاشت کرنا چاہتے ہیں؟''

''بظاہر تو ایسا ہوتا مشکل نظر آ رہا ہے۔ فی الحال ان لوگوں کا ارادہ ہے کہ اسے یہیں مقامی طور پر مصنوعی طریقے سے اگایا جائے اور پھر لندن میں استعمال کیا جائے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ اس پودے کی ایک خاصیت تو یہ ہے جسے بہت سے لوگ جانتے ہیں اور

تم بھی جانتی ہو۔ یہ ازدواجی تعلق رکھنے والے عمر رسیدہ مردوں کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ بے حد ناتواں جسموں میں بھی یہ آگ بھر دیتا ہے لیکن اس کی ایک دوسری اور زیادہ اہم خاصیت بھی ہے اور یہ خاصیت اتنی حیران کن ہے کہ مسٹر فلپ اور ان کے ساتھی ابھی تک اس کی سائنسی وضاحت ڈھونڈنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ پودے کی یہی خاصیت ان لوگوں کو اس پر کام کرنے کی طرف زیادہ راغب کر رہی ہے۔''

''تم نے پہلے بھی اس دوسری خاصیت کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی اندازہ ہے تمہیں؟''

''نہیں۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ پودے کی یہ افادیت میڈیکل کے حوالے سے ہے۔''

شانی اور گریس انتظار کا وقت کاٹنے کے لئے باتیں کرتی رہیں آخر ضمیر احمد اور عباس چشتی واپس آ گئے۔ وہ خیمے میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں پر نگاہ پڑتے ہی شانی نے جان لیا کہ وہ ناکام واپس لوٹے ہیں۔ ضمیر احمد گہری سانس لے کر ایک کشن پر بیٹھ گئے۔ عباس چشتی نے بھی ایک نشست سنبھال لی۔

''ڈپٹی ریاض پولیس کے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔''

''کیا کہتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''پہلے تو اس کے ماتحت نے انکار کیا کہ انہوں نے رستم یا اس کے کسی ساتھی کو پکڑا ہے۔ بعد میں ریاض خود آیا۔ اس نے مانا کہ رستم کی گرفتاری ہوئی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ گرفتاری کے کچھ ہی دیر بعد اسے ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاہور ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب وہ وہیں پر ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' شانی نے کہا۔

''ہم نے وہ چھولداری دیکھی ہے جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا۔ اردگرد کے خیمے بھی دیکھے ہیں۔ کم از کم یہاں تو کوئی بندہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہو۔''

''سو فیصد یہی ہے۔'' شانی نے کہا۔ ''یہ لوگ رستم کو یہاں سے نہیں بھیج سکتے۔ وہ یہیں پر رکھ کر اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔ پولیس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بارودی سرنگیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ رستم سے محفوظ رستے کی نشاندہی کرانا چاہتے ہوں۔''

''ہاں، یہ بات تو میرے ذہن میں بھی آ رہی ہے۔'' گریس نے کہا۔

''اور وہ کبھی نشاندہی نہیں کرے گا۔ میں آپ کو لکھ کر دے سکتی ہوں۔ وہ مر جائے گا لیکن اپنے دوستوں سے بے وفائی نہیں کرے گا۔'' شانی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

وہ چاروں خاموش رہے اور اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے۔ خیمے سے باہر پوٹھوہار کی رات اپنے سیاہ دامن میں اَن گنت حوادث چھپائے ان ٹیلوں میں چکراتی رہی، پھنکارتی رہی۔ گاہے بگاہے بہت فاصلے سے اکادکا فائر سنائی دے جاتے تھے۔

☆======☆======☆

رستم کو قریباً ایک کلومیٹر دور ایک دوسرے مقام پر لے جایا گیا تھا۔ خیموں کے جنوب کی طرف یہ بھی ایک قدرتی کھوہ تھی۔ ایسے مقامات پر وادی سون اور پورے پوٹھوہار میں جابجا ملتے ہیں۔ اس کھوہ کا دہانہ بہ وقتِ ضرورت لکڑی کے دو بڑے تختوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ کھوہ کے دہانے کے سامنے درختوں کے بہت سے کٹے ہوئے تنے تھے۔ غالباً اجرالیوں نے ان درختوں کو جنریٹر سے چلنے والے مشینی آرے کے ذریعے کاٹا تھا اور یہاں ڈال دیا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ ڈھلوان پر واقع یہ جگہ اس لئے صاف کی گئی ہے کہ فائرنگ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

کھوہ کے اندر رستم کو اپنے جیسا ایک اور قیدی بھی ملا۔ اس کے ہاتھ بھی الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاؤں میں بھی ایک زنگ آلود زنجیر دکھائی دے رہی تھی۔ اسے پہچان کر رستم چونک گیا۔ یہ مقصود احمد تھا۔ مقصود ان چار افراد میں شامل تھا جن پر پولیس اہلکاروں نے ڈیرے کے نواح میں چھاپہ مارا تھا۔ ان میں سے ایک شخص شریف نے تو بلندی سے کود کر جان دے دی تھی۔ باقی تین پکڑے گئے تھے۔ ان تین میں سے دو افراد یعنی باقر احمد اور ہیرے کی مسخ شدہ لاشیں گدھوں پر لد کر ڈیرے واپس پہنچ گئی تھیں۔ تیسرا بدنصیب مقصود یہاں رستم کے سامنے موجود تھا۔ مقصود کو ڈیرے پر پیار سے لڈو بھی کہا جاتا تھا۔ وہ لڈو ہی کی طرح گول مٹول چہرے اور نہایت ذہین آنکھوں والا ایک خوش باش شخص تھا۔ وہ بکرمنڈی لاہور کے ایک بھتا خور کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر مفرور ہوا تھا اور پھر جان بچاتا وڈے ڈیرے تک آ پہنچا تھا۔ وہ جس موت سے بھاگا تھا آج وہ اس پر حاوی ہو چکی تھی لیکن اس طرح حاوی ہوئی تھی کہ اسے زندہ رکھا تھا نہ مارا تھا۔ لڈو کے جسم کا ایک ایک حصہ بہیمانہ تشدد کی منہ بولتی تصویر تھا۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ لڈو کی ذہین آنکھوں کی جگہ دو زخم نظر آ رہے تھے۔ اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو چکی تھیں۔ زخم کچے تھے لیکن خون کا رساؤ وغیرہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک جانگیا تھا۔ کھوہ کے کھردرے فرش پر پڑا

وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

رستم کو کھوہ میں ڈالنے والوں نے اس کے پاؤں میں بھی زنگ آلود زنجیر ڈال دی اور باہر چلے گئے۔ رات ہو چکی تھی۔ کھوہ میں ایک بڑا گیس لیمپ روشن تھا۔ باہر سے اکادکا فائر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

لڈو نے کراہنا بند کر دیا تھا اور رستم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے خفیف آواز میں پوچھا۔

''میں رستم ہوں۔''

لڈو کے زخمی چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ چند سیکنڈ بعد اس کی شدید حیرت کو گہرے کرب نے ڈھانپ لیا۔ وہ اپنے مخصوص لاہوری انداز میں بولا۔ ''یا میڑے مالک یہ کیا ہو گیا۔ رستم بھائی آپ بھی پکڑے گئے۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''جو ہو گیا سو ہو گیا۔'' رستم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوڑ باقیوں کا کیا ہوا جی۔ میڑا مطلب ہے لالہ، حسنا صاحب اور مڑاد وغیرہ۔''

''وہ ابھی تک خیر سے ہیں۔''

''وہ خیڑ سے ہیں تو پھڑ آپ...... میڑا مطلب ہے کہ آپ کیسے پکڑے گئے؟'' مقصود ۔لڈو کا چہرہ دکھ کی تصویر تھا۔

رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ لڈو رستم کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر کراہا۔ ''ان لوگوں کے ہاتھ آنے سے بہتر ہے کہ بندہ ویسے ہی مڑ جائے۔''

''تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا؟''

''آپ یقین نہیں کڑیں گے جی۔''

''کروں گا...... تم بتاؤ۔''

''ہم تینوں جو پکڑے گئے تھے، ان میں سے بس مجھ کو ہی ڈیڑے سے باہر نکلنے کا رستہ آتا تھا۔ بس اسی لئے پلیس والوں نے مجھے زندہ رکھا تھا...... باقڑ اور ہیڑے کو تشدد کڑ کڑ کے میڑے سامنے ماڑ دیا۔ میں نے ان لوگوں کو بڑی تکلیف سے مڑتے دیکھا ہے جی۔ ان لوگوں نے باقڑ کے پیٹ میں گولی ماڑی اوڑ اسے تین گھنٹے تک تڑپتا چھوڑ دیا۔ وہ بیچاڑہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا رہا کہ ایک گولی اس کے سر پر بھی ماڑ دو۔ پڑ اس کی بات کسی نے نہیں سنی۔ آخڑ وہ مڑ گیا تو اس کی لاش کو ہیڑے کی لاش کے ساتھ ہی گدھے پر باندھ دیا گیا۔ اس

کی حالت یاد کرتا ہوں تو دل کرتا ہے ابھی مر جاؤں۔ کل سویرے میں یہاں سے باہر نکل گیا تھا۔ شاید کسی کھائی میں چھلانگ مار کر خود کو ختم کر لیتا، پر پہرا بڑا سخت ہے۔ انہوں نے پکڑ لیا اور میرے پیروں میں یہ سنگلی (زنجیر) ڈال دی۔"

"میں نے تمہاری آنکھوں کے بارے میں پوچھا تھا؟"

"وہی بتانے لگا ہوں جی۔" وہ عجیب کرب ناک انداز میں بولا۔ "اپنی اکھیاں میں نے خود نکالی ہیں۔ شیشے کی بوتل توڑ کر اس وقت تک اپنی اکھیوں میں مارتا رہا ہوں جب تک مجھے نظر آنا بند نہیں ہو گیا۔ اب میری نظر بالکل بند ہے بس ہلکی سی تھوڑی سی روشنائی اندر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے اک دو دن میں وہ بھی ختم ہو جائے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے اپنے آنسوؤں کا گھونٹ بھرا اور بولا۔ "میں نے ہر تکلیف سہی ہے جی پر اپنا قول نہیں ہارا۔ پلس کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ یہ مجھ سے ڈیرے تک جانے کے لئے رستے کی نشانیاں پوچھتے تھے۔ میں نے کچھ نہیں بتایا۔ پھر یہ دو بار مجھ کو کھینچ کھینچ کر سرنگوں (بارودی سرنگوں) کی طرف لے کر گئے۔ یہ مجھے اگے لگا کر ڈیرے کی طرف جانا چاہتے تھے پر میں ہر بار زمین پر لیٹ جاتا تھا۔ یہ مجھ کو گھسیٹتے تھے، مارتے تھے پر میں ایک قدم نہیں چلتا تھا...... پھر...... پھر جب تکلیف میری برداشت سے باہر ہو گئی رستم صاحب! تو میں نے موقع دیکھ کر اپنی اکھیاں ختم کر لیں۔"

رستم کا سینہ رنج و غم سے لبریز ہو گیا۔ اسے اور لالہ وغیرہ کو مقصود احمد عرف لڈو سے ایسی ہی توقع تھی۔ انہیں پتا تھا اگر اس پر ایسی آفت آئی تو وہ جان دے دے گا زبان نہیں کھولے گا۔

کچھ دیر تک کھوہ میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ بس باہر سے پہرے داروں کی آواز اور ان کے ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی رہی۔ آخر لڈو نے کرب میں ڈوبی پُراندیش آواز میں پوچھا۔ "رستم بھائی! وہ آپ سے بھی رستے کی نشانیاں پوچھیں گے۔ کیا انہوں نے ابھی تک نہیں پوچھیں؟"

"نہیں..... ابھی نہیں۔"

لڈو کی آواز انجانے خوف سے کانپنے لگی۔ "رستم بھائی! اس ڈپٹی ریاض کے بارے میں آپ نے بہت کچھ سنا ہو گا ... پر یہ اس سے بڑھ کر ظالم ہے اور جو اجڑالی سردار اس کا یار بنا ہوا ہے وہ بھی کچھ کم قسائی نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہی ہو گا، غلام کبیر نام ہے اس کا۔ وہ یہاں سامنے بیٹھ کر باقر اور ہیرے کے مرنے کا تماشا دیکھتا رہا ہے اور گڑگڑی پیتا رہا ہے۔

آپ... آپ بس کسی طرح یہاں سے نکل جانے کی کوشش کریں۔ یہاں رہنے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ میں سچ کہتا ہوں رستم بھائی! کسی طرح یہاں سے نکل جائیں اور ہو سکے تو جاتے جاتے میرا قصہ بھی پاک کر جائیں۔" لڈو کی آواز میں دردناک التجا تھی۔ اس کی آنکھوں سے کوئی سیال بہہ رہا تھا۔ شاید خون تھا، شاید آنسو تھے، یا پھر خون کے آنسو تھے۔

اسی دوران میں کھوہ سے باہر پولیس اہلکاروں کی ایڑیاں ٹھک ٹھک بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لڈو نے کراہ کر کہا۔ "میرا خیال ہے وہ آ گیا ہے۔"

لڈو کا خیال درست تھا۔ دو منٹ بعد ڈپٹی ریاض لمبے ڈگ بھرتا اندر داخل ہو گیا۔ وہ سول کپڑوں میں نظر آ رہا تھا۔ سیاہ پتلون تھی اس پر نیلی شرٹ۔ آدھی آستینوں میں سے اس کی بازوؤں کی مچھلیاں نظر آ رہی تھیں۔ حسبِ معمول وہ نشے میں نظر آتا تھا سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے دو سنتری فولڈنگ کرسیاں لئے آ رہے تھے۔ کرسیاں کھوہ میں بچھا دی گئیں۔ سامنے ایک چھوٹی فولڈنگ تپائی بھی رکھ دی گئی۔ ڈپٹی ریاض کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جنہیں وہ غور سے دیکھ رہا تھا اور پنسل کے ساتھ کہیں کہیں نشانات بھی لگا رہا تھا۔

رستم پر بس ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ ایک سب انسپکٹر اٹین شن حالت میں ریاض کی کرسی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ بھی کاغذات پر تھی۔ بالآخر ریاض نے کاغذات سے سر اٹھایا اور سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ان میں کل بیس بندے کام کے ہیں۔ لالے کے دو بھتیجے اور ایک ماموں اس میں شامل ہیں۔ حسنے کا ایک بھائی اور ایک بھتیجا ہے۔ اس کے علاوہ مراد کے چچازاد بھائی ہیں اور ایک تایا ہے۔"

"جیسے آپ کا حکم ہو جی۔" سب انسپکٹر نے ادب سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ان بندوں کی ایک لسٹ بناؤ اور ڈیرے پر پہنچا دو۔ ساتھ ہی اپنا پروگرام بھی کھول کر بتا دو۔ ان کتوں کو سمجھا دو کہ ان کے پاس اب چند گھنٹوں سے زیادہ کا وقت نہیں ہے۔ ہم ان کے رشتے داروں کو آگے لگا کر ڈیرے پر پہنچ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر۔" سب انسپکٹر نے اکڑ کر کہا۔

"پیغام بھیجنے سے پہلے ایک مرتبہ مجھے دکھا دینا۔" ڈپٹی ریاض نے کہا۔

سب انسپکٹر اور دیگر افراد کاغذات لے کر باہر نکل گئے۔ اب کھوہ میں ڈپٹی ریاض کے علاوہ بس دو مسلح اہلکار مزید رہ گئے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں وہ بھی مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ڈپٹی ریاض نے نیا سگریٹ سلگایا۔ ایک گہرا کش لے کر ناک سے

دھواں نکالتے ہوئے وہ خوفناک نظروں سے رستم کو گھورنے لگا۔

رستم دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ تکلیف، راحت، زندگی یا موت سے قطعی بے پرواہ دکھائی دیتا تھا۔ ڈپٹی نے لڈو کی طرف اشارہ کیا اور رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں یہ کُتے کا تخم میرے آنے سے پہلے تم سے کیا کہہ رہا تھا۔ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کی طرح میں تمہارا ابھی سوا ستیاناس کرنے والا ہوں۔ تم سے ڈیرے تک جانے کا محفوظ راستہ پوچھنے والا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اس حرامی نے تمہیں بھی اپنی طرح آنکھیں پھوڑ لینے کا مشورہ دیا ہو یا پھر حرام موت مرنے کی صلاح دی ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''غلط کہہ رہے ہو۔'' رستم ہولے سے بولا۔

''تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا رستے! مجھے پتا ہے کہ تم سے یہی کچھ کہا گیا ہے لیکن جو کہا گیا ہے غلط کہا گیا ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا کیونکہ مجھے پتا ہے تم اپنی کتی زبان سے کوئی لفظ بول کر نہیں دو گے اور مجھے تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ہم حل کر چکے ہیں۔ اب تم ایک بیکار شے کی طرح ہو۔ تمہیں کسی بھی وقت پرانے کپڑے کی طرح پھاڑ کر گندی موری میں پھینکا جا سکتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ایک زہریلی فاتحانہ مسکراہٹ نے ڈپٹی ریاض کا چہرہ ڈھانپ لیا۔

رستم نے کہا۔ ''پھر اب دیر کس بات کی ہے۔ جو کرنا ہے کر گزر۔ تیرے جیسے ہیجڑے کو زیادہ رسک نہیں لینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے میں بچ گیا تو تیری مٹی خراب کردوں گا۔''

''آسان موت مرنے کے لئے مجھے غصہ دلا رہے ہو لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ غصے میں آکر اپنا مزہ خراب کرلوں۔ عورت کے جسم اور دشمن کی موت کا سواد آہستہ آہستہ لینا چاہیے۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائیں اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھے۔

اس کے دونوں ماتحت اس کے رازداں سمراتے تھے اور باس کے حکم پر ہر طرح کی سفاکی کے لئے تیار تھے۔

ڈپٹی ریاض کچھ دیر تک سگریٹ کے لمبے کش لیتا رہا پھر آہستہ قدم اٹھاتا رستم کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے وزنی بوٹ کے نیچے رستم کے ننگے پاؤں کی انگلیاں پورے زور سے دبائیں اور رستم کے چہرے پر نظر آنے والے کرب کو جانچا۔

رستم نے سر اٹھا کر ڈپٹی کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔ ''بی بی کہاں ہیں؟''

''ہائے اوئے۔ موت کے منہ میں بھی مہینوال کی آنکھوں میں سوہنی کے جلوے۔

صدقے جاؤں تیری عاشقی کے۔''

''تمہارا وعدہ تھا بی بی اور ان کے تایا کے بارے میں۔''

''وعدہ پورا کردیا ہے میرے بھونڈ عاشق۔'' ڈپٹی ریاض نے کہا اور کھڑے کھڑے ایسی زوردار لات رستم کے منہ پر رسید کی کہ اس کا جبڑا اترنے کی آواز صاف سنائی دی۔ خون کی ایک پچکاری سی رستم کے ہونٹوں سے نکلی اور کھوہ کے پتھریلے فرش پر گری۔ رستم کے چہرے کے جن زخموں سے خون رسنا بند ہوگیا تھا وہ بھی پھر سے خون اُگلنے لگے۔

مقصود عرف لڈو نے اپنا سر فرش پر ڈال دیا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔

خوفناک ٹھوکر مارنے کے بعد ڈپٹی ریاض ٹانگیں پھیلائے رستم کے سرہانے کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے اپنے بوٹ کی نوک سے رستم کی پنڈلی کو چھوا۔ ''یہ ٹانگ چلائی تھی ناں مجھ پر؟'' وہ زہر بھرے لہجے میں پھنکارا۔

رستم نے ہونٹ نہیں کھولے۔ ریاض نے چار پانچ زوردار ٹھوکریں رستم کی پنڈلی، گھٹنے اور ران پر رسید کیں اور گالیاں بکنے لگا۔

ابال ذرا کم ہوا تو وہ ٹانگیں چوڑی کر کے دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے نیا سگریٹ ہونٹوں سے لگایا۔ ماتحت نے آگے بڑھ کر سگریٹ کو لائٹر دکھایا۔ ریاض کسی شکاری جانور کی طرح دانت نکوس کر بولا۔ ''اپنی معشوقہ کے لئے قربانی دی ہے تُو نے..... اب بکرا بھی بننا پڑے گا۔ تجھے ذبح بعد میں کریں گے، پہلے بوٹیاں اتاریں گے۔ آخر میں کوٹ لکھپت جیل میں رسے سے بھی لٹکا دیں گے۔ تُو نے پوری پوری قربانی دی ہے تو ہم بھی پوری پوری وصول کریں گے۔''

رستم بے پروائی سے کھوہ کی دیوار کو تکتا رہا۔ خون اس کی ٹھوڑی، گردن اور چھاتی کو رنگین کر چکا تھا۔ اسے اپنا جبڑا ہلاتے ہوئے بے حد دقت محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ جبڑے کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ جوں جوں چوٹ ٹھنڈی ہو رہی تھی تکلیف بڑھ رہی تھی لیکن اب وہ اپنے جسم اور روح کو ہر تکلیف کے لئے تیار کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ موت کی تکلیف جھیلنے کے لئے بھی تیار تھا۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ اس کی زندگی بی بی کے کام آرہی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ بی بی اس وقت کہاں ہوں گی۔ کیا ریاض واقعی سچ کہہ رہا ہے۔ ...وہ بی بی کو چھوڑ چکا ہے؟ اس کا دل گواہی دینے لگا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ بی بی کے پیچھے حاجی حیات جیسے لوگوں کا ہاتھ موجود تھا۔ ریاض بی بی کو تا دیر حبسِ بے جا میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بی بی کی زبان بندی کا انتظام کر کے ریاض نے اسے اور اس کے تایا کو چھوڑ دیا ہو۔

ریاض نے رستم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی معشوقہ کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ میں بھی سوچ رہا ہوں۔ پتا ہے کس کے بارے میں؟''

''کس کے بارے میں؟'' رستم نے بہ مشکل جبڑے کو حرکت دی۔

''تیری بہن کے بارے میں اور اس کے حرامی خصم کے بارے میں۔ ان دونوں بھگوڑوں کے خلاف تین تھانوں میں کم از کم آٹھ کیس درج ہیں۔ ان دونوں کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر تمہاری جان چھوٹے گی نہیں۔ اسی طرح کے دو چار سوال اور بھی ہیں۔ اگر ان کے جواب دے دو گے تو ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخنا نہیں پڑے گا اور نہ موت کے لئے ترلے ڈالنے پڑیں گے۔'' ڈپٹی ریاض نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، یہ بتانا پسند فرماؤ گے کہ تمہاری آپو زاہدہ اور اس کا خصم صاحب کہاں ہیں۔ اب تو خیر سے انہوں نے تین چار بچے بھی بنا لئے ہوں گے۔''

''میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم نے جو پروگرام چلانا ہے چلالو۔ میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں۔''

''دیکھ اوئے حوالدار نذیر...... اس کو کہتے ہیں عشق۔'' ریاض تمسخر سے بولا۔ ''جان بیلنے میں آگئی ہے۔ ابھی اس کے اندر کا سارا جوس نکل جائے گا لیکن بات عاشق کی نون میں ہی کر رہا ہے۔ دیکھنا اس کی قبر کے اندر سے بھی آواز آئے گی...... ہانے میں صدقے جانواں بی بی۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہے تجھے اور بی بی کہے گی نو پرابلم۔ میں چوہدری بشیر کا بستر گرم کر رہی ہوں اور تیرے لئے ہر روز دعائے خیر کرتی ہوں۔''

جب کبھی بھی رستم کے سامنے کسی نے بی بی کے بارے میں توہین آمیز بات کہی تھی رستم کے لئے اپنے غیظ وغضب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اب بھی ایسی ہی صورتِ حال تھی لیکن تصور اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔ زندگی بڑی بے رحم اور سخت غیر متوقع ہوتی ہے۔ بڑے بڑے بہادر کبھی یوں حالات کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں کہ ''ناچیز'' بن کے رہ جاتے ہیں۔ پھر سیمسن جیسے بہادر بونوں کا تماشا بنتے ہیں...... جیولیس سیزر اپنے ہی درباریوں کے قدموں تلے روندا جاتا ہے محمد بن قاسم جیسے جلیل القدر سپہ سالار کو واسط کے قید خانے میں بے بسی کی موت آ دبوچتی ہے شاہ جہاں جیسے عظیم فرماں روا کو دبوچ کر اس کی آنکھوں میں دہکتی سلائیاں پھیر دی جاتی ہیں...... ٹیپو سلطان کو لاشوں کے ڈھیر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے...... لیکن کیا بہادروں کے بے بس ہونے سے اور ان کے مرنے سے ان کی شجاعت پر کوئی حرف آتا ہے؟ نہیں۔ بہادر مر جاتے ہیں لیکن بہادری

زندہ رہتی ہے۔ تاریخ صرف کسی کردار کے انجام کو نہیں دیکھتی، اس کے حالات کو بھی دیکھتی ہے۔ جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔

رستم کوئی عظیم جنگجو نہیں تھا۔ وہ بس جنگجو تھا، بلکہ ڈاکو جنگجو تھا لیکن اپنے کردار سے اس نے خود کو ناقابلِ شکست ثابت کیا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے پولیس کے لئے اور اپنے دشمنوں کے لئے چھلاوا بنا رہا تھا۔ وہ ہوا کی طرح مٹھی سے نکلتا تھا اور نادیدہ سمتوں سے اپنے حریفوں پر جان لیوا ضربات لگاتا تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی میں وہ صرف دو دفعہ زیرِ دام آیا تھا اور دونوں مرتبہ ایسا بی بی کی وجہ سے ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ لاہور میں چوہدری بشیر کی وسیع وعریض کوٹھی کی حدود سے پکڑا گیا تھا...... تب بی بی نے ''صاحباں'' والا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے پستول میں سے گولیاں نکال لی تھیں اور وہ بے بس ہو کر چوہدری حشام کی خونی حویلی میں پہنچ گیا تھا۔ دوسری مرتبہ اب وہ شکنجے میں آیا تھا اور ڈپٹی ریاض کا یہ شکنجہ بہت سخت تھا۔ رستم اپنی تمام تر دلیری، پھرتی اور شجاعت کے باوجود ان لمحوں میں بے بس تھا۔

جب ڈپٹی ریاض نے دیکھا کہ بی بی کی توہین کے باوجود رستم نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر رستم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ وہ یوں مار رہا تھا جیسے اس کی ٹھوکر کی زد میں جیتا جاگتا انسان نہ ہو بلکہ ریت کی بوری ہو۔ وہ یہ بھی ہرگز نہیں دیکھ رہا تھا کہ ٹھوکر کہاں لگ رہی ہے۔ ایک دو ٹھوکریں رستم کے ٹوٹے ہوئے جبڑے پر لگیں اور اس کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکل گئیں۔ وہ پھنکارا۔ ''اوئے کتے کے تخم! اپنی غیرت کو آواز دے۔ میں تیرے سامنے تیری بی بی کی ماں بہن ایک کر رہا ہوں اور تیرے کان پر جوں تک نہیں چل رہی۔ کیسا عاشق ہے تُو؟ بی بی کو پتا چل گیا تو وہ تو کنوئیں میں کود کر مر جائے گی۔ وہ تو سمجھتی ہے کہ تُو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے کو...'' ایک بار پھر وہ بدترین زبان استعمال کرنے لگا۔

اچانک رستم کی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ اس نے دیکھا کھوہ کے ایک کونے میں سمٹا ہوا مقصود عرف لڈو اپنے پنجوں پر اچھلا اور ایک پرچھائیں کی طرح ڈپٹی ریاض پر جا پڑا۔ وہ پہلو کے بل ڈپٹی ریاض سے ٹکرایا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ڈپٹی ریاض گر جائے گا اور وہ اس کے اوپر گرے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ڈپٹی ریاض گرتے گرتے سنبھل گیا۔ لڈو کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ ان بندشوں کے باوجود اس کی کوشش حیران کن تھی۔ اس کے پیچھے کو مڑے ہوئے ہاتھوں میں سبزی کاٹنے والی ایک تیز دھار چھری دبی ہوئی تھی۔ خبر نہیں کہ اس نے یہ چھری کہاں سے اور کب حاصل کی تھی۔ اگر لڈو

پشت کے بل ریاض کے اوپر گرنے میں کامیاب ہو جاتا تو ریاض کو چھری سے کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ ریاض چونکہ گرنے سے بچ گیا تھا اس لئے چھری کا ہلکا سا کٹ ریاض کی بالوں بھری کلائی پر ہی لگ سکا۔ مقصود عرف لڈو پشت کے بل فرش پر گرا۔ دونوں اہلکاروں نے اسے فرش پر ہی دبوچ لیا اور چھری اس سے چھین لی۔

''کتے... حرامزادے..... ڈپٹی..... میں مار دوں گا تجھے۔'' لڈو سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور اہلکاروں کے ہاتھوں میں پھڑک رہا تھا۔

یوں لگا کہ اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا ہے۔ وہ ڈپٹی اور اس کے اہلکاروں کو ننگی گالیاں دینے لگا۔ پولیس افسروں کے نام لے لے کر ان کی خواتین سے اپنے رشتے جوڑنے لگا۔ اس کا کچھ اور بس تو نہیں چل رہا تھا، وہ بار بار پولیس والوں اور ریاض کی طرف منہ کر کے تھوک رہا تھا۔ آخ تھو...... آخ تھو...... گالیاں...... پھر آخ تھو۔

ڈپٹی ریاض نے پتلون کی جیب سے سفید رومال نکالا۔ اسی دوران میں دو مزید اہلکار دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے تو لڈو کو سنبھالنے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کی۔ دوسرے نے رومال ڈپٹی ریاض کی زخمی کلائی پر باندھ دیا۔ لگتا تھا کہ یہاں آس پاس ہی کوئی ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اہلکار نے ڈاکٹر کو بلانے کی اجازت چاہی۔ ریاض نے نفی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ رستم کی چھٹی حس نے کہا کہ مقصود عرف لڈو سنگین صورتِ حال کا شکار ہونے والا ہے اور پھر یہی ہوا۔

ریاض کسی درندے کی طرح لڈو کی طرف بڑھا۔ ہٹے کٹے چار اہلکاروں نے اسے فرش پر چت لٹا کر چاروں طرف سے دبوچ رکھا تھا۔ لڈو جنونی انداز میں ریاض کا نام لے لے کر گالیاں بک رہا تھا اور بددعائیں دے رہا تھا۔ ''اللہ کرے میری طرح برباد ہو جائے تُو بھی۔ اپنے بچوں کی شکلوں کے لئے تڑپتا ہوا مر جائے۔ تیری لاش کو قبر کی مٹی بھی نصیب نہ ہو۔''

''بڑی آواز نکلتی ہے تیری۔'' ریاض پھنکارا۔

اس نے اپنا بھاری بوٹ مقصود عرف لڈو کی گردن پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اپنے جسم کا تین چوتھائی وزن گردن پر ڈال دیا۔ لڈو کی آواز بند ہو گئی۔ اس کا چہرہ خون کے دباؤ سے سیاہ پڑ گیا۔ دو تین منٹ کے اندر وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا اور زبان ایک طرف لٹک گئی۔ اس کی آنکھیں نہیں تھیں، ورنہ وہ بھی خوفناک انداز میں کھلی رہ جاتیں۔

ریاض تب تک لڈو کی گردن پر کھڑا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا جب تک اسے یقین نہیں ہو گیا کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

''ہاں نذیرے! پار ہو گیا ہے؟'' ریاض نے حوالدار سے پوچھا۔

''جی سر ہو گیا ہے۔''

''اچھی طرح دیکھ لے۔''

حوالدار نذیرے نے لڈو کے زخمی سینے سے کان لگایا۔ پھر اس کے نتھنوں کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی آمدورفت محسوس کی۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''اپنے کرموں کی سزا پا گیا ہے جی۔''

''ٹھیک ہے۔ اس کی لاش کو بھی گدھے یا خچر پر باندھو اور بھیج دو اس کے سجنوں کی طرف۔ بڑی کھچ تھی اس کو ڈیرے کی۔''

''او کے سر۔'' دو ماتحتوں نے ایک ساتھ کہا اور لڈو کی حسرت ناک لاش کو ڈنڈا ڈولی کر کے کھوہ سے باہر لے گئے۔ باہر لے جانے سے پہلے اس کی بندشیں کھول دی گئیں۔ بندشیں بعد میں کھلی تھیں وہ آزاد پہلے ہی ہو گیا تھا۔ شاید اس نے آزاد ہونے کے لئے ہی پولیس والوں کو اس طرح بے تحاشا گالیاں دی تھیں۔ اگر ایسا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔

لاش باہر چلی گئی تو ریاض ایک بار پھر یوں کرسی پر براجمان ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

رستم کا چہرہ سپاٹ تھا، بالکل پوٹھوہار کے کسی پتھر کی طرح۔ رنج، تکلیف، امید، مایوسی کسی طرح کا کوئی تاثر نہیں تھا اس کے چہرے پر۔

ریاض کا پارہ اب مزید بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دو چار سالوں میں بہت ہیرو بنا رہا ہے تُو۔ بڑی چھلانگیں ماری ہیں تُو نے... بڑی ٹانگیں چلائی ہیں۔ اب تجھے آرام کرنا پڑے گا۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے حوالدار نذیر کو مخاطب کیا۔ ''کیوں نذیرے! اسے آرام کرانا چاہیے کہ نہیں؟''

''بالکل کرانا چاہیے جناب! یہ تو بھاگ بھاگ کر جھلا ہو جائے گا۔''

''چلو، پھر لاؤ سامان۔'' ریاض جنونی لہجے میں بولا۔

حوالدار اور ایک اے ایس آئی باہر چلے گئے۔ رستم بے حسی کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک وہ اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ یہ لوگ کیا کرنے والے ہیں۔ تقریباً دو منٹ بعد حوالدار دستی آرا لئے نمودار ہوا۔ آرے کے پیچھے بجلی کی موٹی کیبل تھی جو یقیناً جنریٹر سے منسلک تھی۔ اے ایس آئی کے ہاتھ میں سرخ پلاسٹک کا چھوٹا ٹب تھا۔

آرا اور ٹب دونوں رستم کے قریب رکھ دیئے گئے۔ ریاض نے رستم کے قریب آ کر ایک

اور زوردار ٹھوکر اس کی دائیں ٹانگ پر رسید کی اور دانت پیس کر بولا۔ ”رستمے یہی ٹانگ تھی ناں جو چلائی تھی مجھ پر؟“

رستم کے پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ چند لمحوں کے لئے اس کے اندر شدید ترین اضطراب پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانتا تھا تڑپنے مچلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ ہی کسی طرح کے مکالمے سے کوئی فائدہ تھا۔ ریاض کا ارادہ وہ اس کی سفاک آنکھوں سے پڑھ چکا تھا۔ یہاں اس کھوہ میں ریاض مختار کل بنا ہوا تھا اور اس نے وہی کرنا تھا جو وہ چاہ رہا تھا۔

رستم کی دونوں ٹانگوں میں پہلے ہی زنجیر موجود تھی۔ اس کی دائیں ٹانگ میں ایک اور زنجیر ڈال دی گئی اور ہٹے کٹے حوالدار نذیر نے اس زنجیر کو بڑی مضبوطی سے تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ دیگر اہلکاروں نے رستم کو بازوؤں اور گردن وغیرہ سے دبوچ لیا۔ رستم کے ہاتھ ابھی تک الٹی ہتھکڑی میں جکڑے تھے۔

جان بچانے کے فطری عمل کے تحت رستم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ سب بے سود تھا۔ اس نے ریاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بہادر دشمن نہیں ہو ریاض... کمینے دشمن ہو۔ باندھ کر مارنا کوئی مردانگی نہیں۔“

”تمہارے جیسے حرامی کو باندھ لینا مردانگی ہے۔“

”اس کے لئے بھی تم نے ایک کمزور عورت کا سہارا لیا ہے۔“

”محبت اور جنگ میں سب چلتا ہے۔ تمہارا بس چلتا تو تم بھی مجھے معاف نہ کرتے۔“

”معاف نہ کرتا لیکن تمہیں مردانگی دکھانے کا موقع تو ضرور دیتا۔ تمہارے اس پالتو گیٹے جاوے کو بھی تو دیا تھا۔“

”تمہاری بے وقوفی تھی۔ تمہاری ایسی ہی بے وقوفیوں نے آج تمہیں اس انجام تک پہنچایا ہے...“ ریاض نے کچھ اور بھی کہا لیکن دستی آرا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی پُرشور آواز میں ریاض کی آواز دب گئی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔

اس نے بڑی نفرت سے رستم کی داہنی ٹانگ پر ایک اور ٹھوکر رسید کی۔ پھر ایک تنومند اہلکار کو اشارہ کیا۔ اہلکار دستی آرا لے کر رستم کی ٹانگ کی طرف بیٹھ گیا۔ رستم نے آنکھیں بند کر لیں اور بی بی کا چہرہ تصور میں سجا لیا۔ بی بی کے تصور کے ساتھ ہی اس کے اندر کا اضطراب دھیما پڑ گیا۔ ”بی بی! آپ کی خاطر... بی بی آپ کی خاطر سب کچھ قبول ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔

آرے کی حرکت سے پیدا ہونے والی تیز ہوا اسے اپنی پنڈلی پر ٹخنے سے ایک بالشت اوپر محسوس ہو رہی تھی۔ اب آرے کے تیز رفتار مہلک دندانے کسی بھی وقت اس کی پنڈلی سے چھو سکتے تھے۔ اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی کہ یہ تکلیف کیسی ہوگی اور کتنی شدید ہوگی... کھوہ سے باہر فائرنگ کی آواز کبھی تیز اور کبھی دھیمی ہو جاتی تھی۔ کیا کوئی انہونی ہو جائے گی۔ کیا اس کی ٹانگ بچ سکے گی؟ کیا ریاض اس پر صرف نفسیاتی دباؤ ڈال رہا ہے؟ کیا وہ اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے؟ کیا وہ ٹانگ کاٹے گا نہیں صرف زخم لگائے گا؟ ایسے ہی اَن گنت سوال رستم کے ذہن میں اودھم مچا رہے تھے۔ اس نے اپنی مٹھیاں کس لی تھیں اور جبڑے بھینچ لئے تھے کہ اگر شور مچاتا ہوا آرا اس کی پنڈلی سے ٹکرائے تو وہ یہ تکلیف جھیل سکے۔

اور پھر اسے اپنی پنڈلی پر شدید ترین جلن محسوس ہوئی۔ جیسے دہکتی ہوئی سلاخ اس کی کھال میں اتار دی گئی ہو۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگ بُری طرح تھرا رہی ہے اور کٹ رہی ہے... اذیت اتنی زیادہ تھی کہ بہت کوشش کے باوجود وہ کرب سے چیخ اٹھا۔ اب آنکھیں بند رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ گھٹنے سے ذرا نیچے اس کی ٹانگ موجود نہیں تھی۔ وہ کٹ چکی تھی۔ وہ کہاں تھی؟ اس نے دل کڑا کر کے اپنی نگاہ کا زاویہ بدلا۔ نیچے پلاسٹک کے سرخ ٹب میں اس کا خون آلود پاؤں، آدھی پنڈلی سمیت موجود تھا۔ جسم کا یہ کٹا ہوا حصہ ابھی تک تھرا رہا تھا۔ اس کے اوپر خون مسلسل گر رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا، کہیں اس کا تصور اسے کوئی ڈراؤنا منظر تو نہیں دکھا رہا؟ لیکن نہیں... جو کچھ تھا حقیقت تھا اور سامنے تھا۔ جو ٹانگ اس نے ڈپٹی ریاض کے سینے پر رسید کی تھی، وہ کٹ چکی تھی اور اس کے سامنے پلاسٹک کے گول ٹب میں پڑی تھی۔ ایک سفاک شخص کا یہ بہیمانہ انتقام تھا۔ پھر رستم نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹی ریاض نے کھڑے کھڑے رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ پر تھوکا۔ ایک قہرناک نظر رستم پر ڈالی اور اسے زہر آلود گالیوں سے نوازتا ہوا باہر نکل گیا۔

رستم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنے ہوش کھو دے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ”وہ مرد نہیں ہے... اسے کمزور نظر نہیں آنا چاہیے۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔

اس کے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ شاید یہ خون کے تیز رفتار اخراج کے سبب تھا۔ اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد ایک نئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”مرنے دینا تھا اس خنزیر کو“

''نہیں ڈپٹی صاحب کا آرڈر ہے۔'' غالباً اے ایس آئی نے کہا۔

''ٹانگ ذرا اوپر اٹھا کر رکھو۔'' پہلی آواز نے دوسری کو مخاطب کیا۔

رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ میں درد کی شدید لہریں اٹھیں۔ کسی شخص نے اس کی ٹانگ کو تھوڑا سا بلند کر دیا۔ آیوڈین کی تیز بُو رستم کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کی پنڈلی سے خون کا اخراج روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کوشش کرنے والا شخص غالباً پولیس سرجن یا ڈاکٹر تھا۔ اس کی بقایا ٹانگ کو بے دردی سے ہلایا جلایا جا رہا تھا۔ کھوہ سے باہر فائرنگ کی آواز بتدریج شدت پکڑ رہی تھی۔

☆======☆======☆

رات ہو چکی تھی۔ پورے ڈیرے پر دھواں چھایا ہوا تھا۔ یہ دھواں سرنگوں میں بھی چلا گیا تھا۔ سرنگ نمبر 2 سے ڈاکٹر ناصر کے درجنوں مریض کھانستے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔ ڈیرے پر بہ مشکل اتنا پانی بچا تھا کہ ایک دن میں فی کس دو گلاس سے زیادہ نہیں پیا جا سکتا تھا۔ اس راشن بندی کے ذریعے بھی موجودہ پانی سے بہ مشکل ایک ہفتہ مزید گزر سکتا تھا۔ خوراک کی حالت بھی یہی تھی۔

چھجے کے بڑے کمرے میں لالہ اپنے قریبی ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ جنریٹر کی تباہی کے بعد ڈیرے پر فقط مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی سے ہی کام چلایا جا سکتا تھا۔ اس وقت بھی دو بڑی لالٹینوں کی روشنی میں لالہ ایک خط پکڑے بیٹھا تھا۔ یہ رستم کا چھوڑا ہوا خط تھا۔ خط سننے والوں میں حسنا گجراتی، مراد، کاٹھیا، شاہ اور دیگر سرکردہ افراد شامل تھے۔ لالہ رندھی ہوئی آواز میں پڑھ رہا تھا۔

''میں مجبور ہوں میرے دوستو۔ میں ہر دکھ جھیل سکتا ہوں لیکن بی بی کو ریاض جیسے درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے یارو! اگر زندگی ہوئی تو موت کے سارے گھیروں سے نکل کر پھر ملیں گے، ورنہ اس خط کو آخری ملاقات سمجھنا۔ ہم سب ڈاکو ہیں اور دھیرے دھیرے اپنے اس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں جو وقت نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے۔ اس لکھے کو ٹالنا یا نہ ٹالنا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ باقی میں نے تمہارا ساتھ نبھانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ تمہارے کندھے سے کندھا ملانے کے لئے خود چل کر یہاں پہنچا تھا۔ تمہاری ساری تکلیفوں اور مصیبتوں میں حصے دار بننا چاہتا تھا لیکن لگتا ہے کہ اب میری اپنی مصیبتیں مجھے زیادہ زور سے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ میں تم سب سے

شرمندہ ہوں لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ میں تم سب سے معافی مانگتا ہوں۔''

لالے نے خط ختم کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساتھیوں کے کہنے پر اس نے یہ خط دوسری مرتبہ پڑھا تھا۔

حسنے نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔ ''شاہ ٹھیک کہتا ہے۔ ترس ترس کر مرنے کے بجائے دلیری سے باہر نکلیں۔ ماریں یا مر جائیں۔ رستم بھائی اس وقت بُری سے بُری حالت میں ہوگا۔ اس کی مدد ہم پر فرض ہے۔ ہم یہ قرض نہیں چکا سکتے لیکن فرض چکانے کی کوشش میں جان کا نذرانہ تو دے سکتے ہیں۔''

کاٹھیا نے کہا۔ ''یہ جان تو ویسے بھی چلی جانی ہے۔ تو پھر کیوں نہ لڑتے ہوئے مریں۔ کیا پتا اس لڑائی میں جینے کا کوئی راستہ بھی نکل آئے۔''

''پولیس تو چاہتی ہی یہ ہے کہ ہم کسی طرح غصہ کھا کر باہر نکلیں اور وہ ایک ایک کو بھون ڈالیں۔'' مراد نے مایوسی میں سر ہلایا۔

''لیکن یہاں رہ کر بھی بچنے کی کون سی امید نظر آتی ہے۔ پانی اور خوراک ختم ہو رہی ہے۔ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔'' لالہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تو تمہارا خیال یہ ہے کہ رستم کو بچانے کے لئے ہم سب کو للکارے مارتے ہوئے باہر نکلنا چاہیے اور گولیوں سے چھلنی ہو جانا چاہیے۔'' مراد کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔ میں تو خود سب کو یہ بتا رہا ہوں کہ بارودی سرنگوں سے باہر نکلنا ہم سب کے لئے فوری موت کا سبب بن سکتا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ بارودی سرنگیں کب تک پولیس اور اجرالیوں کا راستہ روک سکیں گی اور پھر دوسری بات ہر گھڑی کم ہوتی ہوئی خوراک اور پانی کی ہے۔''

حسنا گرجا۔ ''انہوں نے جس طرح باقر اور ہیرے کو تڑپا تڑپا کر مارا ہے اسی طرح رستم بھائی کو بھی ماریں گے اور اسی طرح ہم سب کی مٹی بھی خراب کریں گے۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ بھوکے پیاسے مرنے یا ان کے ہاتھ آنے کے بجائے ایک ہی بار ان پر ٹوٹ پڑیں۔ لڑتے ہوئے مر جائیں یا گھیرا توڑ کر سون کے ٹیلوں میں گم ہو جائیں۔''

ابھی یہ بات جاری ہی تھی کہ ایک شخص ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک بند لفافہ تھا۔ اس نے لالے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''لالہ جی! چھوٹی کھائی کے پاس ایک بندہ پولیس کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر ہم کوئی جواب دینا چاہیں تو یہیں پر آ کر دے سکتے ہیں۔''

کمرے میں موجود چند افراد کی بے رونق آنکھوں میں ہلکی سی چمک نظر آئی۔ غالباً ان کے دلوں میں یہ خیال آیا تھا کہ پولیس کی طرف سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ شاید خون خرابے سے بچنے کے لئے کوئی درمیانی راہ نکل رہی ہے۔

لالے نے لالٹین کی روشنی میں لفافہ چاک کیا۔ اس میں سے ایک خط کے علاوہ چند فوٹو گرافس بھی برآمد ہوئے۔ فوٹو گرافس پر نگاہ پڑتے ہی لالے کے چہرے سے امید کا رنگ رخصت ہوگیا اور ایک طرح کی کرختگی چھا گئی۔ فوٹو گرافز دیکھنے کے بعد اس نے تحریر پر جلدی جلدی نگاہ دوڑائی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔

''کیا لکھا ہے لالہ! ہمیں بھی سناؤ۔'' حسنے نے کہا۔

''سننے سے پہلے، کچھ دیکھ لو۔'' لالہ بولا۔

اس نے فوٹو گرافز اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھائے۔ یہ قریباً بیس پچیس افراد کی گروپ تصویریں تھیں۔ جو جوان تصویروں کو دیکھتا گیا اس کا رنگ متغیر ہوتا گیا۔

ان تصویروں میں لالے، حسنے، مراد، آہوجہ، ناصر اور کاٹھیا وغیرہ کے قریبی عزیز شامل تھے۔ یہ سب کے سب بڑی پتلی حالت میں سون کے ٹیلوں میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پس منظر میں پانڈو درے کی گھاٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ بالکل اصلی تصویریں تھیں۔ سب افراد کے ہاتھ رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

ٹائپ کی ہوئی تحریر میں لکھا تھا۔ ''لالے! تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے سوراخوں سے نکل آؤ۔ یہ بارودی سرنگیں اب زیادہ دیر تمہاری حفاظت نہیں کر سکیں گی۔ کل کسی وقت تمہارے یہ عزیز ہمارے آگے لگ کر ہمیں ڈیرے تک پہنچا دیں گے۔ بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے ان میں سے جتنے لوگوں کی جان جائے گی، ان کا خون بھی تمہارے سر پر ہوگا۔ ان پر گولی چلاؤ گے تو بھی قاتل کہلاؤ گے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اب بھی [illegible] کو حوالے نہیں کرو گے تو بہت گھاٹے کا سودا کرو گے۔

اگر اس بات کا یقین نہیں ہے۔ یہ بندے واقعی یہاں موجود ہیں تو ہم وائرلیس سیٹ پر ان کی آوازیں تمہیں سنا سکتے ہیں اور ان کی اپیلیں بھی جو وہ جان بچانے کے لئے کر رہے ہیں۔ ہم تمہیں اس حوالے سے سوچنے کے لئے رات بارہ بجے کا وقت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد مزید ٹائم نہیں ملے گا۔''

ایک بوجھل خاموشی نے چھجے کے اس کمرے کو گھیر لیا۔ سب کے چہرے تمتمائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ مراد کے تاثرات بھی وہ نہیں تھے جو کچھ دیر پہلے تک تھے۔

لالہ فرید نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈپٹی ریاض کی طرف سے یہ بے اصولی کی حد ہے۔ وہ ہر اوچھا ہتھکنڈا استعمال کر رہا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ وہ کس قانون کے مطابق ہمارے رشتے داروں کو پکڑ کر یہاں لایا ہے۔ اب وہ انہیں ڈھال کے طور پر استعمال کرے گا اور ہمیں ان بے گناہوں کی موت کا تماشہ دکھائے گا۔''

شاہ بے حد جوش سے بولا۔ ''اسی لئے تو کہتا ہوں...... اب ایک ہی راستہ ہے مریں یا ماردیں۔''

''ہاں...... مریں یا ماردیں۔'' آہوجہ نے بھی فوراً تائید کی۔

اس مرتبہ مراد نے بھی مخالفانہ آواز بلند نہیں کی۔ اس کی نگاہیں ایک فوٹو گراف پر جمی تھیں اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے دو چچا زاد بھائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کی عمر بائیس تیئیس سال اور دوسرے کی صرف پندرہ سولہ سال کی تھی۔

حسنے گجراتی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''وہ کمینہ ان بے گناہوں کو آگے لگا کر سرنگوں والا ایریا پار کرے گا۔ ہم بالکل بے بس ہو جائیں گے۔ بالکل بے بس ہونے سے بہتر ہے کہ ہم ڈپٹی ریاض، سردار غلام کبیر اور ان کے ساتھیوں کو ان کی درندگی کا مزہ چکھا دیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہو جائے۔ مگر مرنے سے پہلے مقابلے کا حق تو ادا کر دیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے مراد؟'' لالے نے مراد کو ٹٹولا۔

مراد نے لمبی سانس لی۔ ''وقت تیزی کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ اگر ہمیں واقعی کچھ کرنا ہے تو پھر جلدی کرنا ہوگا۔ مجھے سب سے زیادہ اندیشہ ان دونوں بڑی مشین گنوں سے ہے۔ انہیں لگایا بھی بہت بلندی پر گیا ہے۔ وہ ہمیں سخت نقصان پہنچا سکتی ہیں۔''

حسنے نے مراد کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''سجناں! جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ جب مرنا ہی ہے تو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مشین گن کی گولی لگتی ہے یا پستول کی اور اگر قدرت نے ہمیں بچانا ہے تو توپ کے گولے سے بھی بچ جائیں گے۔ نہیں تو سر پر لگنے والا پتھر بھی کافی ہے۔''

کاٹھیا نے اپنی سیون ایم ایم رائفل کو جوش سے تھپتھپایا۔ اس کی اکلوتی سلامت آنکھ میں سرخی سی اُتر آئی تھی۔

اسی دوران میں باہر سے کئی افراد کے بولنے کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ مشعلوں کی کئی روشنیاں ایک طرف سے اکٹھی ہوگئی تھیں۔ آہوجہ نے اٹھ کر باہر جھانکا۔

''کیا ہوا گلزار ے؟'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

''ایک اور لاش آئی ہے جی...... خچر پر لدی ہوئی۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

میٹنگ برخاست ہوگئی۔ ایک دم سارے اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ سرنگ نمبر ایک کے دہانے کے سامنے ایک خچر کھڑا تھا۔ اس پر لاش بندھی ہوئی تھی۔ لاش کو فوراً ہی پہچان لیا گیا۔ یہ مقصود عرف لڈو تھا۔ چند دن پہلے وہ اپنے ساتھیوں باقر اور ہیرے کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ باقر اور ہیرے کی حسرت ناک لاشیں تو پہلے ہی موصول ہو چکی تھیں۔ آج مقصود لڈو بھی بالکل برہنہ حالت میں اپنے ساتھیوں کے درمیان واپس پہنچ چکا تھا۔

اس کی آنکھوں کی جگہ دو رستے ہوئے زخم تھے۔ اس کے جسم پر بے رحمانہ تشدد کے ان گنت نشان تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اس کا منہ کھلا تھا اور ہونٹ بالکل نیلے نظر آتے تھے۔ ہر دلعزیز مقصود کی لاش نے ڈیرے کے مکینوں میں غم و غصے کی ایک اور شدید لہر دوڑا دی۔ لالے نے تقریر کرنے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ''محاصرہ کرنے والوں'' کی طرف سے کیا پیغام موصول ہوا ہے اور انہوں نے کس طرح چند بے گناہوں کو اپنے لئے ڈھال بنانے کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔

لالے کی باتوں نے اس کے ساتھیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ مرنے مارنے کے لئے تیار نظر آنے لگے۔ اس موقع پر مراد کی را۔ بھی مکمل طور پر تبدیل نظر آئی۔ اس کے تاثرات بھی گواہ تھے کہ وہ ذہنی طور پر فیصلہ کن لڑائی کے لئے بالکل تیار ہے۔

جب ہتھیار لہرا رہے تھے اور ڈیرے کے مکین پُرجوش نعرے لگا رہے تھے، رجی نامی شخص دھیرے سے اس کمرے کی طرف کھسک گیا جہاں وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ اس ہنگامے کے دوران میں حنیفاں کے سوا اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ لمبی تڑنگی حنیفاں خاموشی سے اٹھی اور رجی کے پیچھے چل دی۔

☆======☆==== -☆

یہ منظر کھوہ کا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ڈپٹی ریاض پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اجرالی سردار غلام تا۔ فولڈنگ میز پر وہسکی کی بوتل اور مارخور کے لذیذ گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑے تھے۔ وہ ا زیادہ نہیں پی رہے تھے کیونکہ آج ہوش میں رہنے کی رات تھی۔ کسی بھی وقت وڈے ڈیرے کے خلاف گرینڈ آپریشن شروع ہو سکتا تھا۔

ریاض نے ہاتھ لہرا کر سب انسپکٹر مختار سے کہا۔ ''کسی اخبار والے کو اس طرف پھٹکنا بھی

ہیں چاہیے۔ ورنہ سیدھا شوٹ کردوں گا ڈیوٹی دینے والے کو۔ چلو، جاؤ اب ان کو چوکس ردو۔''

سب انسپکٹر نے زوردار سیلوٹ کیا اور باہر چلا گیا۔ ڈپٹی ریاض نے اپنے دوسرے سب ا پکٹر کو اپنا بیان لکھوانا جاری رکھا۔ ایک دفعہ رستم کو بے حد زہریلی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد بولا۔ ''ہاں تو میں کیا لکھوا رہا تھا...... آخری فقرہ بولو۔''

سب انسپکٹر نے پڑھ کر سنایا۔ ''دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب اگلی پوزیشن پر ودا ے ایس آئی محمد حسین اور حوالدار نذیر وغیرہ کو پتھروں میں ایک سایہ نظر آیا۔ انہوں نے للکارا تو سایہ مخالف سمت میں بھاگا......''

''ہاں ٹھیک ہے، آگے لکھو...... وہ اندھیرے میں دس پندرہ قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک دھماکہ ہوا اور دھواں پھیل گیا۔ محمد حسین اور نذیر وغیرہ احتیاط کے ساتھ موقع پر پہنچے۔ انہوں نے ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا کہ ایک بندہ شدید زخمی حالت میں پڑا تھا۔ بارودی سرنگ کی وجہ سے اس کا دایاں پاؤں ٹخنے اور گھٹنے کے درمیان سے اُڑ گیا تھا۔ محمد حسین اور نذیر نے اسے پہچان لیا۔ یہ ڈیرے کے مطلوب ملزموں میں سے بڑا ملزم رستم تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ کُتے کا تخم ڈیرے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا......''

سب انسپکٹر نے قلم روک کر پوچھا۔ ''کتے کا تخم لکھنا ہے جی؟''

ڈپٹی ریاض کے کالے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ ابھری۔ سردار غلام کبیر بھی مسکرانے لگا۔ ڈپٹی ریاض ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''چلو...... نہ لکھو...... نہ لکھنے سے یہ حرامی بندے کا تخم تھوڑی بن جائے گا...... یہ لکھو کہ رات کے اندھیرے میں ملزم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ڈیرے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا......'' ریاض لکھواتا گیا اور سب انسپکٹر محرر کی طرح لکھتا گیا۔

سردار غلام کبیر نے وہسکی کے دو گھونٹ بھر کر اپنی جہازی سائز مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا۔ ''میں ڈا کھیال ہے ڈپٹی جی! تھوڑی سی غلطی ہو رہی ہے تساں سے۔''

''کیا مطلب؟''

''بارودی سرنگ سے ٹانگ اور طرح سے کٹتی ہے، آرے سے اور طرح۔''

''اوئے چھوڑ و سردار! اتنی باریکیوں میں کوئی نہیں پڑے گا۔ ویسے بھی بارود کا زخم بڑا بُرا ہوتا ہے فوراً زہر پھیلاتا ہے۔ اس لئے زخم کے اوپر سے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا چاہیے۔''

رستم ایک کونے میں کھردرے فرش پر نیم جان پڑا تھا اور سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کے گھٹنے سے نیچے ایک بڑا ٹنڈ نظر آ رہا تھا اور اس ٹنڈ کے اوپر خون آلود پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ ابھی بھی

گا ہے بگا ہے خون کے قطرے پٹی میں سے ٹپکتے تھے۔ اس کا جبڑا ابھی اکڑ گیا تھا اور شدید ٹیسیں پورے چہرے اور گردن میں پھیل رہی تھیں۔ رستم کے سینے میں لوہے کا دل تھا لیکن آج یہ لوہا بھی لرزا ہوا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے پاؤں سے محروم ہو چکا ہے۔ اپنے کٹے ہوئے پاؤں پر ڈپٹی ریاض کے تھوکنے کا منظر ابھی تک رستم کی آنکھوں میں تازہ تھا۔

تکلیف اور دکھ کی اس شدید ترین کیفیت میں بھی اس کی نگاہوں میں بی بی کا تصور سجا تھا۔ وہ بار بار اس احساس کو تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کا سر بی بی کے سینے سے لگا ہوا تھا اور اس کا چہرہ ایک خوشبودار گرم گداز میں گم تھا۔ اس احساس کے نشے میں ڈوب کر ایسی ہزاروں اذیتیں جھیلی جا سکتی تھیں۔

اجرالی سردار غلام کبیر کا نشہ کچھ تیز ہو گیا تھا۔ اس نے شراب کی چمکیلی بوتل کو بڑے پیار سے سہلایا اور ترنگ میں بولا۔ ''یار ڈپٹی صاحب! عورت اور شراب کی بوتل آپس وچ کتنی ملتی جلتی ہیں۔ ذرا دیکھو ناں...... اس بوتل کا لک (کمر) بھی پتلا ہے۔ اس کا پنڈا بھی چمکیلا اور ملائم ہے۔ اس کا ڈھکن کھولنے کا بھی وکھرا ہی سواد ہوتا ہے۔ دونوں نشے سے بھری ہوتی ہیں اور جب دل وچ ترنگ ہو تو دونوں کو ایک ہی ڈیک (سانس) میں پی جانے کو جی چاہتا ہے۔ چاہتا ہے ناں؟''

رستم جانتا تھا کہ ڈپٹی ریاض بھی عورت کا رسیا ہے۔ خاص طور سے بازارِ حسن کی اٹھتی ہوئی نوخیز طوائفوں میں اس کی بہت دلچسپی تھی لیکن اس وقت وہ کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا اور اس سنجیدگی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال کے مطابق آج کی رات وڈے ڈیرے پر آپریشن کی رات تھی۔ اس نے سردار غلام کبیر کی بات کا جواب بس ہوں ہاں میں دیا اور مختلف کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ دو مسلح اہلکار اس کے دائیں بائیں ساکت کھڑے رہے۔

اتنے میں سب انسپکٹر مختار تیزی سے اندر داخل ہوا۔ ''جناب! وائرلیس پر پیغام ہے۔ آپ جلدی آئیں۔''

ڈپٹی ریاض ٹوپی سر پر رکھتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ غلام کبیر وہیں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا رہا اور گا ہے بگا ہے رستم پر طنزیہ فقرے کستا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ نشے کی حالت میں خاموش رہنا اس شخص کو بہت مشکل محسوس ہوتا ہے۔

اچانک یوں لگا کہ اردگرد ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ بہت شدید فائرنگ ہونے لگی۔ یہ

فائرنگ سامنے اور دائیں جانب سے ہو رہی تھی۔ کھوہ کے دہانے کے پاس سے کوئی شخص سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ..... پیچھے ہٹو۔ وہ بڑی تیزی سے آ رہے ہیں۔''

کسی اجرالی کو بھاگتے بھاگتے گولی لگی اور وہ کھوہ کے دہانے کے عین سامنے کربناک چیخ مار کر گرا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور شخص بھاری بھرکم آواز میں چلایا۔ ''پوزیشن چھوڑ دو۔ پیچھے آ جاؤ جلدی کرو۔'' یہ آرڈر میگافون کے ذریعے جاری ہوا تھا اور یقیناً دور تک سنا گیا تھا۔

رستم نے کھوہ کے اردگرد بے شمار بھاگتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ دوطرفہ فائرنگ سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ فائرنگ شروع ہونے کے ساتھ ہی اجرالی سردار اور دونوں اہلکار باہر لپک گئے تھے۔ اب کھوہ میں کوئی نہیں تھا۔ رستم کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اسے کھوہ کے گیس لیمپ کو بجھا دینا چاہیے۔ وہ اوندھے منہ رینگتا ہوا لیمپ کی طرف گیا اور اسے نیچے گرا کر بجھا دیا۔ کھوہ میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اوندھے منہ رینگنے میں سب سے اہم کردار کہنیاں ادا کرتی ہیں لیکن رستم کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اسے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ رینگنے میں بے حد کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کے تمام تر ساتھیوں نے ڈیرے سے نکل کر پولیس اور اجرالیوں پر زوردار حملہ بول دیا ہے اور اگر انہوں نے واقعی ایسا کیا تھا تو یہ موقع کے عین مطابق تھا۔ رستم کھوہ کے دہانے کے قریب تھا جب اسے لگا کہ کوئی شخص دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کی بوٹوں کی چاپ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی پولیس اہلکار ہے۔ پھر وہ کھوہ کے عین سامنے پہنچا۔ کھوہ کا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ رستم نے خود کو ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں سمٹا لیا تھا۔ آنے والے کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ سب انسپکٹر مختار یا اے ایس آئی شوکت ہے۔ وہ ان میں سے جو بھی تھا، اس نے بڑی افراتفری کے عالم میں رائفل کھوہ کی طرف سیدھی کی اور اندھا دھند تین چار برسٹ چلائے۔ مختصر کھوہ کے اندر تہلکہ مچ گیا۔ ہر طرف چنگاریاں اڑتی نظر آئیں اور پتھروں کے ٹکڑے بکھر گئے۔ کئی باریک سنگریزے رستم کے جسم کے ننگے حصوں سے ٹکرائے۔ وہ پتھر کے پیچھے کچھ اور سمٹ گیا۔ حملہ آور کا نشانہ یقیناً رستم ہی تھا۔ اگر رستم اپنی پہلی والی جگہ پر موجود ہوتا تو یقیناً چھلنی ہو گیا ہوتا۔ حملہ آور کی رائفل کے میگزین میں ابھی یقیناً چند گولیاں موجود تھیں۔ اس نے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر کے مزید احتیاط کے طور پر چھ سات فائر کئے اور پھر دوڑتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ وہ اپنی طرف سے رستم کا قصہ پاک کر گیا تھا۔

حملہ آور کے اوجھل ہونے کے باوجود رستم پتھر کے عقب میں موجود رہا۔ باہر ہونے والی فائرنگ اتنی شدید تھی کہ کوئی بھی آوارہ گولی اسے چاٹ سکتی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ

حملہ آور زوردار فائرنگ کرتے ہوئے آگے آ گئے ہیں اور پولیس پسپا ہو کر پیچھے چلی گئی ہے۔ جلد ہی اپنے ساتھیوں کے للکارے رستم کے کانوں میں گونجنے لگے۔

کسی شخص نے پکار کر کہا۔ ''کھڑے مت رہو۔ لیٹ جاؤ یا بیٹھ جاؤ۔''

پھر ایک اور اجرالی کے رونے چلانے کی آواز آئی۔ وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا تھا اور اب جان بخشی کی درخواستیں کر رہا تھا۔

اچانک لالے فرید کی جانی پہچانی آواز رستم کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اپنے ساتھی کاٹھیا سے کہہ رہا تھا۔ ''کھوہ کے اندر بھی دیکھو۔''

ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ کھوہ کے اندر چکرانے لگا۔ ٹارچ یقیناً کاٹھیا کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ خود پتھروں کی اوٹ میں تھا۔

''کوئی ہے؟'' کاٹھیا نے چلا کر پوچھا۔

''ہاں...... میں ہوں۔'' رستم نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے جبڑے سے درد کی ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھیں۔

ایکا ایکی کئی افراد دہانے کے سامنے آ گئے۔ ''رستم بھائی......!'' حسنے نے پکار کر [illegible]۔

رستم نے جواب دیا۔ کئی افراد کھوہ کے اندر آ گئے۔ ان کی ٹارچوں سے کھوہ روشن [illegible] گئی۔ کھوہ سے باہر اب بھی زوردار فائرنگ جاری تھی۔ گاہے بگاہے کوئی بڑا دھماکہ بھی سنا [illegible] جاتا تھا۔ یقیناً یہ دستی بم تھے۔

رستم کی حالتِ زار دیکھ کر لالہ، حسنا اور دیگر افراد کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا۔ سوال [illegible] کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو کچھ تھا سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ رستم نے کراہتے [illegible] کہا۔ ''میری ہتھکڑی کھول دو۔''

''کیسے؟'' لالہ فرید نے پوچھا۔

''وہ سامنے چابیاں پڑی ہیں۔'' رستم نے سات آٹھ فٹ کی بلندی پر ایک شیلف نما پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک شخص نے چابیوں کا گچھا اُتارا اور مطلوبہ چابی ڈھونڈ کر رستم کی الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ ایک پاؤں کٹ جانے کے سبب دونوں پاؤں کو باندھنے والی زنجیر بیکار ہو چکی تھی، اب اسے کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ''مجھے ایک رائفل دو۔'' رستم نے بے حد گھمبیر لہجے میں کہا۔

''لیکن ...... تم سخت زخمی ہو رستم۔'' [illegible] ...س بے پناہ کرب تھا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں ...... رائفل دو۔'' رستم جھلا کر بولا۔

لالے کے اشارے پر شاہ نے اپنی خودکار رائفل رستم کی طرف بڑھا دیا۔

''فالتو میگزین؟'' رستم نے پوچھا۔

ایک بھرا ہوا فالتو میگزین بھی رستم کو دے دیا گیا۔ گولیوں والی لمبی بیلٹ رستم نے اپنے گلے میں ڈال لی۔ پھر اس نے رائفل کو بیساکھی کی طرح استعمال کیا اور شدید درد کی پرواہ کئے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھی اس کی ہمت پر دنگ نظر آ رہے تھے۔ رستم کی شلوار کا خون آلود پائنچہ ہوا میں جھولنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ سب کھوہ سے باہر تھے۔ کھوہ سے باہر لڑائی کا میدان گرم تھا۔ پولیس والے اور ان کے معاون اجرالی اچانک حملے کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن انہوں نے اپنا گھیرا ٹوٹنے نہیں دیا تھا اور یہ ان کی کامیابی تھی۔ رستم نے اپنے اردگرد کم از کم دس لاشیں بکھری دیکھیں۔ یہ اجرالیوں اور پولیس والوں کی تھیں۔ شدید فائرنگ کے سبب کئی جگہ خشک ٹہنیوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اصلی معرکہ تقریباً 200 میٹر آگے ڈھلوان پر ہو رہا تھا۔ یہ پولیس والوں اور اجرالیوں کی دوسری دفاعی لائن تھی۔

رستم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے اس مقام کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی چاروں طرف پرواز کر رہی تھیں۔ رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ دیکھ کر اجمل خان کا چہرہ کرب کی تصویر بن گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''رستم بھائی! ام آپ کو ایسے چلتے نہیں دیکھ سکتا۔ امارا دل خون ہو رہا ہے۔ آپ اماری کمر پر سوار ہو جائیے۔ ام آپ کو اوپر لے جائے گا۔''

رستم نے دوٹوک لہجے میں انکار کر دیا۔ اس کے جسم میں ایک حیوانی قوت لہریں لے رہی تھی۔ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو وہ جیسے بالکل فراموش ہی کر چکا تھا۔ وہ تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ پھر ان سب کو اوندھے منہ پتھروں کے پیچھے لیٹنا پڑا۔ یہاں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ نکیجو اجرالی تابڑتوڑ گولیاں چلا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بنے ہوئے ہیں۔ سرگرمی میں وہ پولیس کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

گولیاں سنسناتی اور چنگاریاں چھوڑتی رستم کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔ پتھروں سے ٹکرا رہی تھیں...... درختوں کے تنوں میں گھس رہی تھیں اور انسانی جسموں میں بھی۔ شاہ، رستم سے بس دس پندرہ قدم آگے تھا۔ رائفل کا ایک پورا برسٹ اس کے سینے پر لگا اور وہ ڈھلوان پر لڑھک کر رستم کے پاس سے گزرتا ہوا نیچے کھائی میں جا گرا۔ اپنی تمام بھوک، پیاس اور تکلیف سمیت وہ ہر غم سے آزاد ہو گیا۔

لوگ دونوں طرف سے مر رہے تھے اور زخمی ہو رہے تھے۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ

کس کا پلڑا بھاری ہے۔ وڈے ڈیرے کے مکین موت کا گھیرا توڑ کر زندگی کی طرف نکلنا چاہ رہے تھے جب کہ اجرالی اور پولیس والے یہ گھیرا برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ رستم رک نہیں رہا تھا۔ وہ رائفل کو بیساکھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی لڑائی میں اتنے محو تھے کہ وہ رستم کو خطرناک طریقے سے آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکے۔

درحقیقت رستم موت وحیات سے یکسر لاتعلق ہو گیا تھا۔ اس کے سینے میں بس ایک ہی بھڑکتا ہوا شعلہ تھا۔ اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی وہ ریاض ہٹلر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ مرنے سے پہلے اس موذی کا سر کچل دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بارود کی بارش میں وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

انسان کے ارادے کچھ ہوتے ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ رستم کا ٹارگٹ ریاض ہٹلر تھا لیکن ریاض ہٹلر سے پہلے ہی رستم کو ایک اور ایسا شخص نظر آ گیا جس کا مرنا بے حد ضروری تھا۔ رستم اس کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ اجرالی سردار غلام کبیر تھا۔ رستم نے اسے سرچ لائٹ کے دائرے میں دیکھا۔ یہ سرچ لائٹ پولیس کے استعمال میں تھی لیکن اب لالے اور اس کے ساتھیوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ لالے کے ساتھیوں نے سرچ لائٹ کا رخ پھیر کر اپنے مدمقابل افراد کی طرف کر دیا تھا۔

رستم نے دیکھا غلام کبیر نے للکار مار کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ پھر ایک پتھر کی اوٹ سے نکل کر دوسرے پتھر کی اوٹ میں جانے کی کوشش کی۔ وہ دوڑتا ہوا گیا لیکن ابھی نصف راستے میں ہی تھا کہ رستم کی رائفل سے نکلنے والے دو شعلوں نے اسے جالیا۔ وہ ایک بلند کراہ کے ساتھ لڑکھڑایا اور بلندی سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا۔ قدرت نے جیسے اجرالی سردار کو خود بخود رستم کے قدموں میں پہنچا دیا تھا۔ رستم عقاب کی طرح اس پر جھپٹا۔ اس نے اجرالی سردار کا خم دار خنجر اس کی کمر کی بیلٹ سے کھینچ لیا۔ ایک گولی سردار کی ٹانگ اور دوسری کولہے میں لگی تھی۔ اس کا ہاتھ قیمتی انگوٹھیوں سمیت لہو میں لتھڑا ہوا تھا۔

رستم نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبائی اور پھنکارا۔ ''مجھے پہچانو۔''

سردار کا چہرہ گواہ تھا کہ اس نے رستم کو پہچان لیا ہے۔ وہ پوٹھوہاری لہجے میں چلایا۔

''بچاؤ... بچاؤ۔''

رستم نے خنجر دستے تک اس کے سینے میں دل کے مقام پر گھونپ دیا۔ پھر اس نے وحشت میں پے در پے وار کیے اور سردار کی گردن، چہرہ اور سینہ ادھیڑ ڈالا۔ خون کے گرم چھینٹے رستم کے چہرے اور ہاتھوں پر گرے۔ اس خون کی حدت اور بُو نے رستم کی وحشت کو فزوں تر

کر دیا۔ وہ جیسے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کٹی ٹانگ کو پتھریلی زمین پر گھسیٹتا اور کہنیوں کے بل رینگتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے اکلوتے پاؤں کی زنجیر پتھروں پر رگڑ کر آواز پیدا کر رہی تھی۔

اچانک اجمل خان کی آواز نے رستم کو چونکا دیا۔ ''رستم صیب! آپ اور آگے نہ جائیں۔ خو آگے بہت خطرہ ہے۔''

یہ جان کر رستم سٹپٹایا کہ اجمل خان یہاں بھی اس کے پیچھے تھا لیکن رستم رکنے کے لئے نہیں چلا تھا۔ اس نے جیسے اجمل خان کی آواز سنی ہی نہیں۔ خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے فقط ریاض کا چہرہ تھا۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا اور جب کوئی شخص حقیقی معنوں میں مرنے یا مار دینے کا تہیہ کر لیتا ہے تو پھر وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔

رستم موت کے منہ کی طرف رینگتا چلا گیا اور اجمل خان ایک اندھے عقیدت مند کی طرح اس کے پیچھے لگا رہا۔ جس وقت رستم اجرالیوں کی سب سے اگلی پوزیشن پر پہنچا۔ اجمل خان اس وقت بھی رستم کے پیچھے تھا۔ اس پوزیشن پر ایک چھوٹی مشین گن MG-16 کے پیچھے پانچ چھ اجرالی موجود تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے سردار غلام کبیر کو گولی کھا کر نشیب میں لڑھکتے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن تابڑ توڑ فائرنگ میں دو افراد کے زخمی ہونے کے بعد پھر واپس اپنی کمین گاہ میں گھس گئے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ دشمن قریب پہنچ گیا ہے لیکن یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سرتاپا موت بن کر ان کے سامنے ہے۔ پوزیشن پر پہنچتے ہی رستم نے اندھادھند فائرنگ کی اور پلک جھپکتے میں چار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صرف ایک اجرالی چلاتا ہوا بھاگا۔ اسے اجمل خان کی رائفل سے نکلنے والی گولی نے جا لیا اور وہ بھی بلندی سے لڑھکتا ہوا واپس اپنی MG-16 کے قریب آن گرا۔

رستم نے اس زخمی اجرالی پر بھی خنجر سے وحشیانہ وار کئے اور اس کی انتڑیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

رستم کا چہرہ اور ہاتھ تو مقتولین کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ رستم کے ہاتھوں مرنے والے آخری اجرالی کی دردناک چیخ وپکار نے بلندی پر موجود پولیس والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ رستم کو اوپر قریباً پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر میگافون پر ریاض ہٹلر کی آواز سنائی دی۔ ہاں وہ ریاض ہی کی آواز تھی۔ وہ سردار غلام کبیر کو مخاطب کر کے پکارا۔ ''سردار اپنے بندوں کے ساتھ پیچھے آ جاؤ......سردار......''

وہ جانتا نہیں تھا کہ سردار پیچھے نہیں آ سکتا وہ ''آگے'' جا چکا ہے۔ رستم نے اپنی رائفل سے 28 راؤنڈ والا نیا میگزین اٹیچ کیا اور ایک بار پھر اپنی آدھی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا اوپر چڑھنے

لگا۔ اس کا رخ میگافون سے آنے والی آواز کی طرف تھا۔ ہاں، جب کوئی شخص حقیقی معنوں میں مرنے یا مار دینے کا تہیہ کر لیتا ہے تو پھر وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ دیوانہ وار میگافون سے آنے والی آواز کی طرف رینگتا رہا۔ وہ تب بھی نہیں رکا جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے عقب میں اجمل خان کو گولی لگی ہے اور وہ کراہتا ہوا نشیب میں گر گیا ہے۔ وہ تب بھی نہیں رکا جب اسے اپنے بائیں کندھے میں انگارہ سا اُترتا محسوس ہوا اور تب بھی نہیں جب عقب میں اس کے اپنے ہی ساتھیوں کی طرف سے پھینکے جانے والے ایک ہینڈ گرینیڈ نے اس کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیا۔

وہ جانتا تھا کہ ریاض تک پہنچنا ناممکن ہے لیکن وہ آخری سانس تک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ وہ ظلم اور ناانصافی کے چہرے پر اپنے سنگین احتجاج کا نشان چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر اس نے رکاوٹیں عبور کر کے "ایوان ستم" کے کسی دریچے کا شیشہ بھی توڑ دیا تو مزاحمت کا حق ادا ہو جائے گا۔ وہ مزاحمت اور بغاوت کی علامت تھا اور ان زندہ جاوید باغیوں میں شامل ہو جانا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کے باوجود ان ٹیلوں میں دیوانہ وار جبر سے ٹکر لی۔ اسے نام یاد تھے۔ اسے کام بھی یاد تھے۔ برطانوی افسر شاہی کے دشمن امیر محمد، علی اکبر، جہان خان اور پھر چراغ بالی، طورہ خان اور ان کے درجنوں سرفروش ساتھی جنہوں نے انہی بھول بھلیوں میں شجاعت کی تاریخ رقم کی۔

رستم نے اندازے سے میگافون کی آواز کی طرف نشانہ لیا اور گولیاں چلانے لگا۔ اس کے سامنے تاریکی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولیاں آگے تک جا بھی رہی ہیں یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ گولیاں بلندی پر پتھروں سے ٹکرا کر ہی رہ جاتی ہوں..... لیکن وہ اندیشے کی وجہ سے اپنا ہاتھ روک نہیں سکتا تھا۔

اس نے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور وقفے وقفے سے ٹرائیگر پر انگلی کو حرکت دیتا رہا۔ وہ اوندھا لیٹا تھا اور اب ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کے کندھے سے بھی درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

رستم نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے اردگرد اس کے ساتھیوں نے جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ پولیس اور اجرائیوں کا گھیرا توڑ کر ان تاریک ٹیلوں میں بکھر جائیں۔ یہ گھیرا ٹوٹ جاتا تو ان کی زندگی کے 50 فیصد امکانات پیدا ہو جاتے لیکن گھیرا ٹوٹنا آسان نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پولیس والوں کو حملے کی بروقت اطلاع مل گئی ہے اور انہوں نے حملے سے کچھ ہی دیر پہلے اپنی اگلی پوزیشنوں سے پیچھے ہٹ کر اپنے

گھیرے کو بچا لیا ہے۔

رستم کو اپنی بائیں جانب پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے سے حسنا گجراتی کی گرجتی ہوئی بلند آواز سنائی دی۔ "چھوڑ دو مجھے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو، تم آگے نکلو۔"

اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید زخمی ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

سرچ لائٹ کا روشن دائرہ حرکت کرتا ہوا آگے بڑھا تو رستم کو خود سے چند قدم کے فاصلے پر کاٹھیا کی لاش نظر آئی۔ رائفل ابھی تک مضبوطی سے اس کے ہاتھوں میں تھمی تھی۔ اب اس کے مُردہ جسم پر تواتر سے گولیاں لگ رہی تھیں۔ اسی دوران میں رستم کو اندازہ ہوا کہ اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر موجود بڑی مشین گن MG-08 بھی چلنا شروع ہو گئی ہے۔ اس گن کے چلتے ہی رستم کے اردگرد اس کے ساتھی تیزی سے نشانہ بننے لگے۔ وہ جوش کے عالم میں للکارے مارتے ہوئے اوپر کی طرف جاتے تھے لیکن پھر نشانہ بنتے تھے اور اوپر سے پھسلتے ہوئے نیچے آ جاتے تھے۔ رستم جس پتھر کی آڑ میں تھا اس پر بھی مسلسل گولیاں برس رہی تھیں۔ رستم کے آگے خطرناک ڈھلوان تھی۔ وہ کتنی بھی کوشش کرتا مگر اپنی ایک ٹانگ کے ساتھ اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا لیکن وہ پیچھے بھی نہیں ہٹا، وہیں پڑا رہا اور فائر کرتا رہا۔ وہ اپنی رائفل کی کم از کم ایک گولی ڈپٹی ریاض تک پہنچانا چاہتا تھا۔ تاہم اس گولی کے ریاض تک پہنچنے کا امکان اتنا ہی تھا جتنا ایک ائرگن سے ایک ہاتھی کے مرنے کا ہوتا ہے۔

دھماکوں کی چکاچوند، گولیوں کی بارش اور مرنے والوں کی کراہوں کے درمیان رستم کو بھی یہی محسوس ہوا کہ وہ مر رہا ہے لیکن اسے اطمینان تھا کہ مرتے وقت اس کے ہاتھ میں رائفل ہے۔ اس رائفل کا رخ ڈپٹی ریاض کی طرف ہے اور وہ فائر کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں دُھند سی بھرنے لگی۔ اس کا دایاں بازو سن ہو گیا تھا۔ شاید یہاں بھی کوئی گولی لگ گئی تھی یا شاید اس کی جان نے اس کے جسم کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بی بی کا تصور پھر اپنے ذہن میں بسا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تصور اس کی آنکھوں میں ہو گا تو اس کے لئے مرنا بہت آسان ہو گا۔

وہ جانتا تھا کہ اب اس کی رائفل کے میگزین میں بس چار پانچ راؤنڈ ہی باقی ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں سے روشنی اور ہاتھوں سے سکت چھن جاتی وہ یہ آخری راؤنڈ بھی ریاض اور اس کے حواریوں کی طرف چلا دینا چاہتا تھا۔ یہی مزاحمت کا حق تھا۔ یہی باغی کا پندار تھا اور یہی بغاوت کی شان۔ اس نے نیم جانی کی حالت میں بلندی کی طرف دو فائر

مزید کیے۔ ایک اور انگارہ رستم کی پشت میں اترا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے عین عقب میں ایک للکارا بلند ہوا ہے۔ یہ مشتاق آہوجہ اور اس کے تین چار ساتھی تھے۔ وہ نیم جان رستم کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کی رائفلیں تابڑ توڑ شعلے اگل رہی تھیں۔ زخمی ہونے والے چند اجرالیوں کی دردناک چیخیں ابھریں لیکن پھر بڑی مشین گن کی ایک باڑ آئی۔ مشتاق آہوجہ اور اس کے ساتھی اس مہلک باڑ کی زد میں آئے اور گولیاں کھا کر پھسلتے ہوئے نیچے گرے۔ رستم بھی ان پھسلنے والوں کی زد میں آیا اور ان کے ساتھ لڑھکتا ہوا نیچے ایک نشیب میں گر گیا۔

☆======☆======☆

بے رحم...... خونی لڑائی کا یہ منظر شانی اور گریس بلندی سے دیکھ رہی تھیں۔ ابھی قریباً پندرہ منٹ پہلے اچانک شور اٹھا تھا کہ ڈاکو ڈیرے سے باہر نکل آئے ہیں اور زوردار حملہ کرنے والے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پولیس اور اجرالیوں میں افراتفری مچ گئی تھی۔ ہر طرف یہی شور بلند ہوا تھا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔ میڈیا پارٹی کو بھی پیچھے کی طرف لے جانے کی ہدایت ملی تھی۔ وہ سب افراتفری میں بھاگ رہے تھے جب اچانک بارودی سرنگوں کی طرف سے خوفناک فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا اور اب تو دونوں بڑی مشین گنیں بھی مسلسل موت کے قہقہے لگا رہی تھیں۔

شانی، گریس اور دیگر میڈیا پارٹی محفوظ دوری پر تھی۔ وہ پتھروں کی اوٹ میں تھے، تاہم درزوں میں سے نیچے کا ہولناک منظر دیکھ سکتے تھے۔ سرچ لائٹس کے روشن دائرے دیوانہ وار نشیب و فراز پر حرکت کر رہے تھے۔ ان دائروں کے اندر نظر آنے والے مناظر ہولناک تھے۔ شروع کے چار پانچ منٹ میں تو یہ محسوس ہوا تھا کہ شاید وڈے ڈیرے کے مکین زور لگا کر گھیرا توڑ دیں گے اور جان بچانے کے لئے سون کے ٹیلوں میں بکھر جائیں گے لیکن پھر ڈپٹی ریاض اور اس کے حواریوں نے سنبھالا لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنی پوری فائر پاور استعمال کر کے محصورین کے قدم روک دیئے اور اب تو دونوں بڑی مشین گنوں نے بھی سفاکانہ فائرنگ شروع کر دی تھی۔ شانی نے دیکھا گولیاں مینہ کی طرح برس رہی ہیں۔ ڈیرے کے بھوکے پیاسے قیدی چھوٹے گروپوں کی صورت میں ہلہ بول کر آگے بڑھتے تھے لیکن بلندی سے چلنے والی گولیاں انہیں بھون کر رکھ دیتی تھیں۔ وہ لڑھکتے ہوئے نیچے چلے جاتے تھے۔ آزادی کا سپنا آنکھوں میں لئے وہ مر رہے تھے اور مرتے چلے جا رہے تھے پھر بھی ان کا جذبہ دیدنی تھا۔ وہ ہتھیار پھینکنے یا پسپا ہونے کے بجائے آگے بڑھنے اور مرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔

شانی سسکی۔ ''گریس! یہ سب مر جائیں گے۔ کسی طرح یہ فائرنگ رکواؤ گریس۔''

گریس نے پاس کھڑے ضمیر احمد کو مخاطب کیا۔ ''یہ تو قتلِ عام ہے۔ پولیس کو فائرنگ روک دینی چاہیے اور باقیوں کو گرفتار کر لینا چاہیے۔''

''ہاں...... یہ ظلم ہو رہا ہے۔'' ضمیر احمد نے ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر ضمیر احمد اور چند دوسرے اخبار نویس بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں جھک کر دوڑتے ہوئے اس مقام کی طرف گئے جہاں ڈپٹی ریاض اور شہاب وغیرہ موجود تھے اور میگافون کے ذریعے چلا چلا کر احکامات دے رہے تھے۔

ابھی یہ اخبار نویس پندرہ بیس میٹر سے آگے نہیں گئے تھے کہ ایک آوارہ گولی ایک نوجوان رپورٹر کی ٹانگ کو زخمی کر گئی۔ یہ گروپ وہیں پتھروں کے پیچھے رک جانے پر مجبور ہو گیا۔

شانی کے جذبات اس کے بس میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ قتلِ عام کا یہ منظر مزید نہیں دیکھ سکی۔ ایک بلند لہر اس کے سینے سے اٹھی اور وہ اردگرد سے بالکل بے خبر ہو کر اوٹ سے نکلی اور دیوانہ وار اس پوزیشن کی طرف بھاگی جہاں ڈپٹی ریاض اور ڈپٹی شہاب وغیرہ موجود تھے۔ پتھروں کی اوٹ میں وہ بھاگتی چلی گئی۔ گریس اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ قریباً ایک منٹ میں وہ اس مقام تک پہنچ گئیں جہاں ڈپٹی ریاض ہاتھ میں میگافون لئے کھڑا تھا۔ اس کی دائیں طرف ورلڈ وار کی زمانے کی بڑی مشین گن گاہے بگاہے تڑتڑ کی خوفناک آواز سے آگ اگل رہی تھی۔

دو گولیاں سنسناتی ہوئی شانی کے سر پر سے گزر گئیں۔ وہ دیوانہ وار ڈپٹی ریاض پر جھپٹی اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ''بند کرو فائرنگ...... کیا سب کو مار دو گے...... کیا سب کو......؟''

انسپکٹر شاد نے جھپٹ کر شانی کو ڈپٹی ریاض سے جدا کیا اور کھینچ کر پیچھے لے گیا۔

''آپ کیا کرتی ہو بی بی...... یہ کیا طریقہ ہے؟''

شانی نے شاد کو دھکا دے کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں گریس نے ڈپٹی ریاض کا بازو جا پکڑا۔ وہ التجا کرنے والے لہجے میں بولی۔

''آفیسر! ان لوگوں کو فائرنگ روکنے کا کہو۔ بہت لوگ مر گئے ہیں۔ باقی بھی مر جائیں گے۔''

''تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہم فائرنگ روکیں گے تو وہ ہمارا خانہ خراب کر کے نکل جائیں گے۔'' ریاض اردو میں دہاڑا۔ ''تم پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''آپ لوگ فائرنگ روکیں اور انہیں ہتھیار پھینکنے کا کہیں۔'' گریس نے چلا کر کہا۔

''تم پیچھے ہٹو میڈم! ہمیں پتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔'' ڈپٹی ریاض نے گریس کو دھکا دیا اور وہ دور تک لڑکھڑا گئی۔

اسی دوران میں گریس نے دیکھا کہ نیچے موجود چند افراد نے جب محسوس کیا کہ وہ ہر طرف سے گولیوں کے نرغے میں ہیں تو انہوں نے مقابلے کو خودکشی سمجھا اور ہاتھ بلند کر کے خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہا۔ شانی نے پولیس والوں کی بے رحمی کی بدترین مثال دیکھی۔ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے والوں کو بھی دیدہ دانستہ گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ بڑی مشین گن کے دو تین زبردست برسٹ چلے اور یہ افراد تڑپتے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔ سرچ لائٹ کے روشن دائرے نے اس منظر کو بڑی وضاحت سے دکھایا۔ اندھا دھند فائرنگ میں ڈیرے کے مکینوں کا آگے بڑھنا اور چھلنی ہو ہو کر گرنا، اس قدر اندوہناک تھا کہ شانی اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکی۔ پولیس والوں کی آہنی گرفت میں اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بھی منظر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ یہ منظر سماعت کے راستے اس کے تصور میں داخل ہوتا رہا۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کے للکارے سنتی رہی جو نشیب سے دیوانہ وار اوپر کی طرف آتی تھیں اور پھر گولیوں سے چھلنی ہو جاتی تھیں۔ آخری گولی اور آخری آدمی تک لڑنے کی بات، شانی نے زندگی میں کئی بار سنی تھی لیکن آج وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔

دو چار منٹ میں یہ صورتِ حال برقرار رہی۔ پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ شاید ڈیرے کا آخری مکین بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

شانی نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ گریس بھاگ کر آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ گریس بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی لیکن ان لمحوں میں وہ بھی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

''شونی...... یہ کیا ہو گیا؟'' وہ کراہی۔

''کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''شاید۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

کسی اجرالی گروہ کا پُر جوش نعرہ سنائی دیا۔ پھر یوں لگا جیسے ہوائی فائرنگ کی جا رہی ہے۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ ڈھلوان پر کئی سرچ لائٹس کے روشن دائرے حرکت کر رہے تھے۔ منحوس ڈھلوان پر ہر طرف لاشیں بکھری دکھائی دیتی تھیں، یا پھر کچھ شدید زخمی تھے جو جان کنی کے عالم میں ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ جگہ جگہ پگڑیاں، جوتے اور ہتھیار

بکھرے دکھائی دیتے تھے۔

رستم کہاں ہو گا...... کیا وہ بھی ان لاشوں میں شامل ہے؟ شانی نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا...... یا پھر...... وہ ڈپٹی ریاض کی تحویل میں ہے؟'' کاش وہ ڈپٹی ریاض کی تحویل میں ہو۔'' شانی کے دل کی گہرائی سے صدا نکلی۔

گریس اور شانی ڈھلوان کے کنارے پہنچ گئیں۔ اب ڈھلوان پر کہیں مزاحمت نہیں تھی۔ بس قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی کسی زخمی کے کراہنے کی آواز آ جاتی تھی۔ سرچ لائٹس بڑی تیزی سے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ پولیس والے نیچے اترنے سے پہلے پوری تسلی کر لینا چاہتے تھے کہ کہیں کوئی ایسا شخص تو ڈھلوان پر موجود نہیں جو بظاہر مُردہ ہو لیکن قریب پہنچنے پر گولی چلا دے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے لاشوں پر بھی بے دریغ گولیاں برسائی تھیں۔

صرف آٹھ دس افراد ایسے تھے جو زخمی حالت میں نظر آ رہے تھے لیکن ان کو اٹھانے کے لئے بھی پولیس والے اور اجرالی نیچے نہیں اُتر رہے تھے۔

ایک انسپکٹر نے میگافون کے ذریعے زخمیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ہتھیار خود سے دور پھینک دیں اور ازخود لاشوں کے درمیان سے رینگ کر آگے آنے کی کوشش کریں۔ صرف دو تین زخمی ہی ایسا کر سکے۔ باقی وہیں پڑے اپنی آخری سانسیں گنتے رہے۔

گریس نے روتے ہوئے ڈی ایس پی ریاض کو مخاطب کیا اور بولی۔ ''جو مر گئے وہ مر گئے لیکن جو دو چار زندہ ہیں ان کو تو بچاؤ نیچے اُتر کر۔''

ریاض پھنکارا۔ ''ہمیں پتا ہے ہمیں کیا کرنا ہے۔ زخمیوں میں ہمارے اپنے بندے بھی ہیں۔ کیا ان کے لئے بھی ہمدردی ہے تم اخبار والوں کے پاس؟''

''سب کے لئے ہمدردی ہے لیکن تم نے جو کرنا ہے جلدی کرو۔'' ضمیر احمد نے اشک بار لہجے میں کہا۔

ڈپٹی شہاب کرخت آواز میں بولا۔ ''آپ سب لوگ فی الحال پیچھے ہٹ جائیں۔ ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ کسی بھی وقت دوبارہ فائرنگ ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنا کام اپنی مرضی سے کرنے دیں۔ اس کے بعد آپ کو رپورٹنگ کی اجازت ہو گی اور آپ لوگوں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جب تک ہم اجازت نہیں دیں گے یہاں کوئی کیمرہ نہیں چلے گا۔''

ڈھلوان پر دو جگہ شدید آگ بھڑک رہی تھی۔ خشک ٹہنیاں، جنگلی داب اور بہت کچھ جل رہا تھا۔ یہ آگ شدید فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں کے سبب بھڑکی تھی۔ اس آگ میں

جلتے ہوئے گوشت کی تکلیف دہ بُو تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہ انسانوں کا گوشت ہے۔ وہ انسان جو پہلے برستے بارود کے سبب لاشوں میں تبدیل ہوئے تھے اور اب آگ میں خاکستر ہو رہے تھے۔ اس اذیت ناک بُو سے بچنے کے لئے شانی اور گریس نے اپنا ناک منہ ڈھانپ لیا۔

ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا آیا اور اپنے پیندے میں سے ایک بڑا روشن دائرہ پھینک کر ڈیرے اور ڈھلوان کا فضائی جائزہ لینے لگا۔ اس کے پروں کی تیز ہوا سے آگ کے الاؤ مزید بھڑکتے ہوئے محسوس ہوئے۔

پولیس حکام کا رویہ بے حد سخت تھا۔ انہوں نے میڈیا کے لوگوں کو موقع سے ہٹایا اور کچھ فاصلے پر موجود خیموں میں بھیج دیا۔ ایک نہایت سوگوار خاموشی نے قرب و جوار کو ڈھانپ لیا۔

قاتل رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ درخت، پتھر، ٹیلے ہر شے یکسر خاموش دکھائی دیتی تھی۔ بس اس خاموشی میں پولیس والوں اور اجرالیوں کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں اور کبھی کبھی کوئی فائر بھی ہوتا تھا۔ ایسے فائر سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید کسی لاش یا نیم مُردہ شخص پر گولی چلائی گئی ہے۔ ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ بھی گاہے بگاہے قریب سے سنائی دینے لگتی تھی۔ اس پھڑپھڑاہٹ کے پس منظر میں پولیس کے بُو گیر کتوں کی آوازیں ڈوبتی ابھرتی تھیں۔

ایک اخبار نویس کے پاس اینٹی ڈارک ٹیلی سکوپ موجود تھی۔ اس نے ٹیلی سکوپ کے ذریعے دیر تک ڈھلوان کا جائزہ لیا اور واپس آ کر بتایا۔ ''اسپیشل پولیس کے لوگ ڈھلوان پر ترے ہیں۔ انہوں نے ہیلمٹ اور بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی ہیں۔''

''کتنے بندے ہیں؟'' ضمیر احمد نے پوچھا۔

''پندرہ بیس سے زیادہ نہیں۔''

''زخمیوں کو اٹھایا گیا ہے؟''

''ہاں، دو زخمیوں کو تو میں نے اسٹریچرز پر دیکھا ہے۔'' اخبار نویس ندیم شاہد نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ایک اہم اطلاع اور ہے۔ ہیلی کاپٹر عین ڈیرے کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ لگتا ہے کہ وہاں کچھ بندے اُتارے گئے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ وہاں ہیلی کاپٹر اتارنے کی کوشش بھی کریں۔ بارودی سرنگوں کے صاف ہونے تک ڈیرے تک جانے کا زمینی راستہ محفوظ نہیں ہے۔''

کچھ دیر بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ ٹیلوں کو ڈھانپنے والی تاریکی میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ اجالا جو صرف زندہ لوگوں کے لئے تھا..... جو مر چکے تھے وہ آج طلوع

ہونے والے سورج سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

نیم تاریکی میں شانی اور گریس کو کچھ لوگوں کے رونے اور بلند آہنگ میں بولنے کی آوازیں آئیں۔ یہ اجرالی تھے۔ وہ واویلا کر رہے تھے۔ پھر شانی اور گریس نے دیکھا کہ وہ ایک لاش کو گھسیٹ کر میدان میں لے آئے ہیں۔ وہ لاش پر پہلے ٹھوکریں برساتے رہے پھر اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ سرچ لائٹ کے روشن دائرے میں شانی کو لاش کا چہرہ نظر آیا اور وہ سر تا پا کانپ گئی۔ اسے اپنے حواس پر یقین نہیں آیا۔ وڈے ڈیرے کے سردار لالہ فرید کی لاش تھی۔ ابھی ہونے والی فائرنگ میں اس کے سر کا ایک حصہ اُڑ گیا تھا اور سفید قمیص کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔

شانی کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گرنے لگے۔ اسے چند دن پہلے رستم کی زبانی لالہ کی بیوی اور بچے کی موت کا پتا چلا تھا۔ آج لالہ خود بھی عدم آباد روانہ ہو گیا تھا۔ شانی نے سسک کر ضمیر احمد سے پوچھا۔ ''انکل! یہ لوگ لاش کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

''اس کی وجہ کا پتا مجھے ابھی ابھی چلا ہے۔'' ضمیر احمد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''اجرالیوں کا بڑا سردار غلام کبیر لڑائی میں مارا گیا ہے۔ ابھی جو رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی۔'' شانی اور گریس نے دیکھا کہ بہت سے پولیس اہلکاروں اور اجرالیوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں طرف جانی نقصان ہوا ہے۔

اجالا پھیلنے کے بعد ڈپٹی شہاب الدین میڈیا پارٹی کے پاس پہنچا اور اس نے ضمیر احمد سے کہا کہ میڈیا کے لوگ باہر نکل کر صورتِ حال ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ سب لوگوں کے ساتھ شانی بھی باہر نکلی۔ اس کا دل سینے میں بڑی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ فضا میں ابھی تک بارود اور جلتے ہوئے انسانی گوشت کی بُو تھی۔ ڈھلوان اور ڈیرے کی مختلف جگہوں سے سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ خیموں کے سامنے ایک طویل قطار میں ننگی زمین پر مرنے والوں کی لاشیں رکھی تھیں۔ یہ سب ڈیرے کے مکینوں کی لاشیں تھیں۔ ان لاشوں کو سفید چادروں سے ڈھانپا گیا تھا تاہم چند ایک کے سوا باقی کے چہرے کھلے تھے۔ ہر لاش کے سرہانے کوئی نہ کوئی ہتھیار رکھا تھا۔ مثلاً پستول، رائفل، شاٹ گن، دستی بم وغیرہ۔ اکثر لاشوں کے سرہانے خاکی رنگ کے چھوٹے لفافے بھی تھے۔ ان لفافوں میں مرنے والوں کی جیبوں سے برآمد ہونے والی ذاتی اشیاء تھیں۔ لاشوں پر ڈالی جانے والی تقریباً تمام چادروں پر خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ شانی

دھڑکتے دل کے ساتھ ان لاشوں کے پاس سے گزرنے لگی۔ دنیا جہاں کا خوف اس کے دل میں جمع ہو گیا تھا اور یہ خوف تھا ان لاشوں میں رستم سیال کو دیکھنے کا۔ اگر کوئی خیال اس کی ہمت بندھا رہا تھا تو وہ یہی تھا کہ رستم ان لڑنے والوں میں شامل نہیں تھا۔ وہ ڈپٹی ریاض کی تحویل میں تھا اور اب بھی ڈپٹی ریاض کی تحویل میں ہے۔

وہ ایک ایک چہرے کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ کئی جانی پہچانی صورتیں اس کی نگاہوں میں آئیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اس نے ہنستے بولتے اور کھاتے پیتے دیکھا تھا۔ آج وہ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے خاموش پڑے تھے۔ ان کے گرد آلود ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور چہرے مدقوق تھے۔ کراچی کا ہتھ چھٹ باکسر مراد، ہر دم مسکرانے والا حسنا گجراتی، چاق و چوبند کاٹھیا، باتدبیر مشتاق آہوجہ...... ایسے بہت سے لوگ تھے جو گولیوں سے چھلنی ہو کر خون آلود چادروں کے نیچے ساکت لیٹے تھے۔ وہ غلط تھے یا صحیح، یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن وہ سب حالات کے ڈسے ہوئے تھے۔ حالات نے ان کی زندگیوں کو ایک ایسے راستے پر ڈالا جو بہت پُر ہنگام اور پُر جوش تھا لیکن مختصر بھی تھا۔ اب ان کی زندگیاں یہ پُر جوش لیکن مختصر راستہ طے کر کے اپنے انجام کو پہنچ چکی تھیں۔ ایک بات طے تھی کہ یہ سب کے سب بہادر لوگ تھے۔ آخری گولی اور آخری آدمی تک لڑنے والے۔ اگر کسی طور معاشرہ ان کی بہادری اور جی داری کو مثبت راستہ دے سکتا تو یہ زندگی کا حق ادا کر سکتے تھے۔ ایسے کارنامے انجام دے سکتے تھے جنہیں مدتوں یاد رکھا جاتا لیکن اب وہ صرف "ہلاک شدہ مجرم" تھے۔

ہیلی کاپٹر کی آواز آ رہی تھی۔ وہ خیموں کے عقب میں واقع ہیلی پیڈ پر اُتر اتھا۔ اس میں سے دو تین لاشیں اتار کر لائی جا رہی تھیں۔ شانی کی دھڑکن کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کی رگوں میں آگ کی طرح دوڑتا ہوا خوف کچھ اور اذیت ناک ہو گیا۔ یہ کس کس کی لاشیں ہیں...... ان چادروں کے نیچے کون ہے؟ ایک اسٹریچر کو دیکھ کر شانی اور گریس دونوں بُری طرح چونکیں۔ یوں لگا جیسے اس اسٹریچر پر چادر کے نیچے ایک نہیں دو لاشیں ہیں۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس اسٹریچر کو دو کے بجائے چار افراد نے تھام رکھا تھا۔ شانی اور گریس کی نگاہیں اس اسٹریچر پر جم گئیں۔ دیگر دو اسٹریچرز کی طرح یہ اسٹریچر بھی لاشوں کے قریب رکھ دیا گیا۔ موقع پر موجود تمام پولیس مین اور اجرائی اس اسٹریچر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ایک اے ایس آئی نے انسپکٹر شاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ تینوں چاروں لاشیں ڈیرے سے آئی ہیں جناب۔"

"یہ کیا ہے؟" انسپکٹر شاد نے دوہری لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دو لاشیں ہیں جناب! ایک دوسرے سے جڑی ہوئی۔" اے ایس آئی نے کہا اور لاشوں پر سے چادر ہٹا دی۔

شانی کے ساتھ ساتھ دیگر افراد بھی چونکے۔ یہ ایک عورت تھی اور ایک مرد کی لاش تھی۔ لمبی تڑنگی عورت نے مرد کو عقب سے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ عورت کے بائیں بازو نے مرد کا گلا اس بُری طرح دبا رکھا تھا کہ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ مرد کی پسلیوں میں ایک خنجر بھی دستے تک گھسا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ یہ خنجر بھی لمبی تڑنگی عورت نے اس مرد کی پسلیوں میں اُتارا ہے۔

شانی نے پہچان لیا۔ یہ عورت حنیفاں تھی۔ وہی نڈر عورت جو اپنے ہاتھوں سے تین قتل کر کے ڈیرے پر پہنچی تھی اور جسے بعد ازاں اپنے ہی ساتھیوں کی طرف سے بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے انداز سے زندہ رہی تھی اور اب اپنے انداز سے ہی مری تھی۔ شانی نے مقتول کو بھی پہچان لیا۔ اس کا نام رنجی تھا۔

رنجی کی لاش دیکھ کر دو پولیس افسروں نے سرگوشیاں کیں اور ان کے چہروں پر تاسف کی جھلک نظر آئی۔ شانی کی چھٹی حس نے کہا کہ رنجی پولیس والوں کے لئے کام کر رہا تھا۔ اے ایس آئی نے اپنے افسروں کو بتایا۔ "رنجی اور اس عورت کی لاشیں وائرلیس سیٹ کے پاس سے ملی ہیں۔ کھلی جگہ رہنے کی وجہ سے دونوں کے جسم اکڑ گئے ہیں۔ انہیں علیحدہ کرنا مشکل ہو رہا تھا اس لئے ایسے ہی لے آئے ہیں جناب۔"

دیگر دونوں لاشوں کے چہروں پر ابھی تک چادر موجود تھی۔ اچانک سینئر اخبار نویس ضمیر احمد نے گریس کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ گریس ضمیر احمد کے پاس پہنچی تو وہ اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ ضمیر احمد کے پاس کوئی دردناک اطلاع تھی اور اس اطلاع سے پیدا ہونے والی سراسیمگی ان کے چہرے پر صاف پڑھی جاتی تھی۔ گریس بھی ایک دم بہت افسردہ نظر آنے لگی۔

شانی نے دیکھا کہ ضمیر احمد کے عقب میں ایک اور اخبار نویس موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چرمی بیگ تھا۔ چرمی بیگ میں کوئی وزنی شے تھی۔ پتا نہیں کیوں چرمی بیگ دیکھ کر شانی کو عجیب لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ چرمی بیگ میں کوئی انوکھی شے ہے۔ انوکھی اور دل و دماغ میں خوف و سنسنی جگانے والی۔

گریس نے نفی میں سر ہلایا اور مایوسی کے عالم میں کچھ کہا۔ شانی کا دھیان ایک بار پھر ان دو لاشوں کی طرف چلا گیا جو ابھی یہاں لائی گئی تھیں اور جن کو خون آلود چادروں نے

ڈھانپ رکھا تھا۔

''یہ کن کی لاشیں ہیں؟ کیا ان میں سے ایک لاش......؟'' وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈے پسینے سے تر ہو گیا۔

اس کے اندر سے آواز آئی۔ ''نہیں...... یہ کہانی اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ ''اُس'' کی لاش نہیں ہے۔''

وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے اس باوردی انسپکٹر کو دیکھنے لگی، جو دراز قد لاش کے چہرے سے چادر ہٹانے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔

شانی کے دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی تھی۔ اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں اور آنکھیں سفید چادر پر تھیں۔ سب انسپکٹر نے چادر کا کنارہ انگلیوں میں تھاما اور لاش کا چہرہ عریاں کر دیا۔ یہ لالے کے ایک دراز قد ساتھی اسحاق کی لاش تھی۔ اس کے دائیں رخسار پر دو گولیوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دوسری لاش ایک فربہ اندام کانسٹیبل کی تھی۔ گریس نے تسلی بخش انداز میں اپنے دونوں ہاتھ شانی کے کندھوں پر رکھے اور سرگوشی میں بولی۔ ''حوصلہ رکھو شونی! خدا بہتر کرے گا۔''

''گریس! میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔'' شانی بے دم ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

گریس نے تھرماس میں سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ اس نے دو گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ وہ ساری لاشیں دیکھ چکی تھی۔ ابھی تک اس کی نگاہیں بدترین منظر دیکھنے سے محفوظ رہی تھیں۔ کیا یہ نگاہیں آنے والی گھڑیوں میں بھی اس منظر سے محفوظ رہیں گی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کوئی حتمی جواب اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ وہ دل کی گہرائی سے یہ خواہش کرنے لگی کہ رستم ابھی تک ڈپٹی ریاض کی تحویل میں ہو۔ ڈپٹی ریاض نے میڈیا کے سامنے مؤقف اختیار کیا تھا کہ وہ رستم کو بذریعہ ہیلی کاپٹر یہاں سے روانہ کر چکا ہے۔ اس کی اس بات پر یقین کرنا بہت مشکل تھا، تاہم یہ امید کی جا سکتی تھی کہ رستم یہیں پر ہو اور ڈپٹی نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہو۔

پھر شانی کا دھیان اس چرمی بیگ کی طرف گیا جس میں اخبار نویس نے کوئی خاص چیز اٹھا رکھی تھی۔ شانی کے ذہن میں وہ سرگوشیاں آئیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گریس اور سینئر اخبار نویس ضمیر احمد میں ہوئی تھیں۔ شانی کو لگ رہا تھا کہ اس سے کوئی چیز چھپائی جا رہی ہے۔ اب بھی گریس اور ضمیر احمد صاحب ایک طرف کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ چرمی بیگ والا

...اس سال اخبار نویس بھی ان دونوں کے پاس ہی کھڑا تھا۔ پھر وہ لوگ تیزی سے اپنے ...یوں کی طرف چلے گئے۔ گریس واپس شانی کے پاس آ گئی۔

شانی نے روتے ہوئے کہا۔ ''پلیز گریس! مجھ پر رحم کرو۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ مت۔ کیا ...تم کا کچھ پتا چلا ہے، کیا وہ زخمیوں میں ہے؟''

''شونی! ابھی مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے جتنا تمہیں۔ کچھ بھی واضح نہیں ہے۔''

''کرائم رپورٹر راشد اور چشتی قیدیوں کی طرف گئے تھے، وہاں سے کیا پتا چلا ہے؟''

گریس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''ٹوٹل پندرہ بندے گرفتار ہوئے ہیں۔ ان میں سے ...ن بارہ زخمی ہیں۔ رستم ان میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مزید قیدی بھی ہوں لیکن پولیس والے میڈیا کو آگے جانے نہیں دیتے۔''

اسی دوران میں ضمیر احمد وہاں پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرہ غم کی تصویر تھا۔ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''بہت نقصان ہوا ہے۔ بہت جانیں گئی ہیں۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔''

''کتنے لوگ مرے ہوں گے؟'' گریس نے پوچھا۔

''100 کے لگ بھگ لاشیں تو میں نے خود دیکھی ہیں۔ ان میں 70 کے قریب ڈیرے والے ہوں گے باقی اجرالی یا پولیس والے ہیں۔ ڈیرے والوں کی بہت سی لاشیں ابھی تک گہری کھائیوں میں پڑی ہیں۔ انہیں وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ مرنے والوں کی صحیح ...اد کا علم تو شاید کبھی نہ ہو سکے۔ کئی لاشیں جل کر ختم ہو گئی ہیں۔''

''ڈیرے والوں میں سے کوئی بھاگنے میں بھی کامیاب ہوا ہے؟'' گریس نے پوچھا۔

''...ت مشکل ہے کہ کوئی نکل سکا ہو۔'' ضمیر صاحب نے ایک بار پھر مایوسی سے سر ہلایا۔ ''...لیس کا گھیرا بہت سخت تھا۔ اب بھی چاروں طرف دور تک پولیس اور اجرالی موجود ہیں۔''

گریس نے کہا۔ ''کچھ دیر کے لئے تو لگا تھا کہ شاید ڈیرے والے گھیرا توڑ کر نیلوں میں ...جائیں گے اور سارے نہیں تو کچھ لوگ جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں۔ جس طرح ان لوگوں نے اچانک سرنگوں کو پار کرنے کے بعد ہلہ بولا تھا مجھے ...ے لئے تو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ڈیرے کے اندر سے مخبری ہو چکی تھی۔ ...ہے کہ پولیس اور ان کے معاون تیزی سے پوزیشنیں چھوڑ کر پیچھے آ گئے اور یوں ...والوں کو اچانک حملے کا فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔''

شانی بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ لالے کا ساتھی رجی پولیس والوں سے ملا ہوا تھا۔ ابھی

تھوڑی دیر پہلے رمجی کی لاش دیکھ کر پولیس افسروں کے منہ لٹک گئے تھے۔"

"وہ عورت کون تھی جس نے اسے قتل کیا؟" ضمیر احمد نے پوچھا۔

"اس کا نام حنیفاں ہے۔ بڑی جی دار عورت تھی۔ پولیس والا بتا رہا تھا کہ حنیفاں اور رمجی کی لاشیں وائرلیس سیٹ کے پاس سے ملی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ رمجی پولیس والوں کو ڈیرے کے اندر کے حالات بتا رہا ہو، اوپر سے حنیفاں آگئی ہو۔ وہ بھاگنے لگا ہو اور حنیفاں نے پیچھا کر کے اسے مار ڈالا ہو۔" شانی نے کہا۔

"لیکن حنیفاں کی کمر پر بھی تو گولی لگی ہوئی ہے۔" گریس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ رمجی کا کوئی اور ساتھی بھی ڈیرے پر موجود تھا۔"

گریس کا اٹھایا ہوا نقطہ واقعی اہم تھا۔

شانی یوں تو گریس اور ضمیر صاحب سے باتیں کر رہی تھی لیکن اس کے دل و دماغ میں اور ہی طرح کا تہلکہ تھا۔ وہ صرف اور صرف رستم کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کے دل سے ایک ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھتی تھی اور اس کی اشک بار و بے قرار نظریں ڈیرے کے گرد و نواح کا طواف کرنے لگتی تھیں۔ ایک دردناک سانحے کے بعد ڈیرے سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور اردگرد کی گھاٹیوں میں لاشوں کو تلاش کیا جا رہا تھا۔

اجرالیوں نے اپنے سردار غلام کبیر کی موت کا سارا غصہ لالے فرید کی لاش پر اُتارا تھا۔ لاش پر گولیاں چلا کر اسے بُری طرح مسخ کر دیا تھا۔ میڈیا کے کچھ لوگ آگئے تھے اور انہوں نے ڈرتے ڈرتے بے گور و کفن لاش پر چادر ڈال دی۔

ہیلی کاپٹر بار بار ہیلی پیڈ پر اُتر رہا تھا اور وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب پولیس والوں نے ڈیرے پر بھی ہیلی کاپٹر اتارنے کے لئے جگہ تیار کر لی ہے۔

گریس شانی کو بار بار تسلی دے رہی تھی۔ ضمیر احمد صاحب نے ان دونوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات تک رستم کا اتا پتا ضرور لگا لیں گے۔ اس سلسلے میں وہ مسلسل مصروف نظر آ رہے تھے اور پولیس افسران سے گفتگو کر رہے تھے۔

صورتِ حال نہایت الجھی ہوئی تھی۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحیح جانی نقصان کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ بس یہ پتا تھا کہ چند افراد کے سوا کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا ہے اور یہ چند افراد بھی شدید زخمی تھے

دھیرے دھیرے ایک طویل دن ختم ہوا۔ شام کے سائے اس لہولہو ویرانے میں پھیل گئے۔ اب دو ہیلی کاپٹر مصروف تھے۔ سب سے پہلے لاشوں اور زخمیوں کو یہاں سے منتقل کیا

جا رہا تھا۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں کی باری آنا تھی۔ ایجنسی کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے لوگوں کو بتایا تھا کہ کل علی الصبح انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاہور پہنچا دیا جائے گا۔ یہاں سے جانے کی بات سن کر شانی کا دل ہولنے لگا۔ جب تک اسے رستم کے بارے میں حتمی اطلاع نہ مل جاتی وہ کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر رستم زندہ یا مُردہ حالت میں یہاں تھا تو پھر اس نے یہاں سے جا کر کیا کرنا تھا۔

وہ خاموش تھی لیکن اس کا دل مسلسل رو رہا تھا۔ کل سے اس نے پانی کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔ وہ بڑی بے قراری سے ضمیر صاحب کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی لیکن ضمیر صاحب تھے کہ آنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ان کی واپسی میں جوں جوں تاخیر ہو رہی تھی شانی کا دل بیٹھے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ شاید ان کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی جس کے سبب وہ شانی کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے۔

خیمے میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور ہولے سے کراہی۔ "رستم، کہاں ہو؟"

"شونی۔" گریس کی مدھم سرگوشی نے شانی کو چونکایا۔

شانی گھٹنوں سے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ خیمے میں ان دونوں کے سوا اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ خیمے سے باہر تاریکی تھی اور کچھ فاصلے پر پہرے داروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گریس نے ایک شال شونی کے کندھوں پر رکھی اور ہولے سے بولی۔

"شونی! آؤ میرے ساتھ۔"

شانی کا دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ گریس کے پاس کوئی اچھی خبر ہے۔ وہ میکانکی انداز میں اٹھ گئی اور امید بھری نظروں سے گریس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کوئی اطلاع ہے گریس؟"

"میں بتاتی ہوں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

"کوئی اچھی اطلاع ہے ناں؟" شانی کی آواز لرز رہی تھی۔

گریس نے جواب نہیں دیا اور شانی کا بازو پکڑتی ہوئی اسے باہر تاریکی میں لے آئی۔ وہ جیسے پہلے ہی اپنا راستہ اور رخ طے کر چکی تھی۔ خیمے سے نکلتے ہی وہ بیری اور جنتر کے خودرَو درختوں میں گھس گئی۔

گہری تاریکی میں انہوں نے ایک ڈھلوان پر سنبھل سنبھل کر تقریباً نصف فرلانگ فاصلہ طے کیا۔ شانی نے دو تین بار سرگوشی میں پوچھا۔ "گریس کہاں جانا ہے؟"

"بس تھوڑی دور۔" گریس نے ہر بار یہی جواب دیا اور چلتی رہی۔

شانی کو جھاڑیوں میں ایک سایہ نظر آیا۔ وہ جیسے پہلے ہی سے ان دونوں کا منتظر تھا۔ اس کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی چال ڈھال میں تیزی تھی۔ ایک صافہ سا اس نے مفلر کی طرح چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ گریس اور شانی کو لے کر وہ تیزی سے ایک سمت میں بڑھنے لگا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" شانی نے سوچا۔ ان کے اردگرد درختوں میں پہرے دار موجود تھے لیکن شلوار قمیص والے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہرے داروں کی پوزیشنوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ ان دونوں کو محفوظ راستے سے گزار کر لے جارہا تھا۔ ایک جگہ وہ رک گیا۔ یہاں ایک بڑی ٹارچ روشن تھی اور دو تین سائے حرکت کر رہے تھے۔

شلوار قمیص والے نے ان دونوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود پہرے داروں کی طرف چلا گیا۔

"یہ کون ہے گریس؟" شانی نے گریس کا بازو دباتے ہوئے سرگوشی کی۔

"انسپکٹر شاد، میرا خیال ہے تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ تمہاری مدد کرنا چاہ رہا ہے۔"

شانی سناٹے میں رہ گئی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو گریس؟"

"جو کچھ مجھے پتا چلا ہے وہی تمہیں بتا رہی ہوں۔ بے شک یہ پولیس والا ہے لیکن مجھے اس کے لہجے سے خلوص کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

انسپکٹر شاد کا کردار اب تک بالکل مختلف رہا تھا لیکن وہ اس حد تک جائے گا اس کی شانی کو توقع نہیں تھی۔

ایک دو منٹ بعد وہ شخص واپس آ گیا جس کے بارے میں گریس نے بتایا تھا کہ وہ انسپکٹر شاد ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے پہرے دار سنتریوں کو وہاں سے ہٹا کر دائیں جانب ایک ڈھلوان پر بھیج دیا تھا۔ جونہی راستہ صاف ہوا وہ تینوں پھر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ تاریکی میں درختوں کی شاخیں شانی اور گریس کے جسم پر خراشیں ڈال رہی تھیں۔ گاہے بگاہے ان کے لباس کانٹوں اور ٹہنیوں سے الجھ جاتے تھے۔ کئی دفعہ وہ دونوں گرتے گرتے بچیں۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی موجود تھا۔ بہرطور یہ تسلی تھی کہ پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں یہاں زبردست فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ ایسی

دھواں دھار فائرنگ میں جنگلی جانور عموماً عارضی طور پر علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تینوں ایک تنگ کھوہ میں داخل ہوئے۔ کھوہ کے راستے کو پتھر کی ایک لمبوتری سل سے بند کیا گیا تھا۔ ان کے مددگار نے زور لگا کر سل کو ہٹایا اور اندر جانے کا راستہ بنا لیا۔ شانی نے ایک بار پھر کانپتے لہجے میں کہا۔ "پلیز گریس! مجھے بتاؤ، رستم ٹھیک ہے ناں؟"

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔" گریس بولی۔

کھوہ کے ایک خم سے گزر کر وہ آگے بڑھے تو یہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر گہری تاریکی میں ایک آواز شانی کے کان میں پڑی۔ "روشنی باہر تو نہیں جائے گی؟"

"نہیں۔ میں نے سل آگے رکھ دی ہے۔" شانی اور گریس کے مددگار نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک ٹارچ روشن ہو گئی۔ شانی کو ٹارچ والے کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

وہ دوبارہ بولا تو شانی نے اسے پہچان لیا۔ یہ وڈے ڈیرے کا ڈاکٹر ناصر تھا کم از کم ایک شخص تو ایسا نظر آیا تھا جو وڈے ڈیرے سے بچ کر نکل آیا تھا اور شانی اسے پہچانتی تھی۔ پھر شانی کی نگاہ ٹارچ کے روشن دائرے کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی ایک بے سدھ جسم پر پڑی۔ یہ ایک لہولہان شخص تھا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ سب سے پہلے اس کی ٹانگوں پر پڑا۔ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے غائب تھی۔ اس کے جسم پر کم از کم دو گولیاں لگی تھیں اور دونوں جگہ سے خون رس رہا تھا۔

"یہ ایک ٹانگ والا شخص کون ہے؟" شانی نے تڑپ کر سوچا۔

تب ٹارچ کا روشن دائرہ اس شخص کے چہرے پر آ کر ٹھہر گیا۔ شانی سکتے میں رہ گئی۔ وہ رستم کو اپنے روبرو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا۔

"رستم۔ رستم۔" شانی نے دلدوز انداز میں کہا اور تڑپ کر اس کے سرہانے پہنچ گئی۔

رستم کے بال خون میں لتھڑے تھے۔ شانی نے بے ساختہ اس کا سر اپنے زانو پر رکھا اور زاروقطار رونے لگی۔ وہ پکارتی جارہی تھی۔ "رستم آنکھیں کھولو، رستم۔" لیکن وہ تو زندگی سے دور اور موت سے قریب نظر آ رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر رو چکی تو ڈاکٹر ناصر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گریس نے شانی کو سہارا دے کر اٹھایا اور رستم سے دور ہٹا دیا۔ ڈاکٹر ناصر نے اپنی

ٹارچ کا رخ شانی اور گریس کے مددگار کی طرف کیا۔ اس شخص نے اب اپنا صافہ چہرے سے ہٹا دیا تھا۔ بے شک وہ انسپکٹر شاد تھا۔ اس نے تسلی بخش نظروں سے شانی کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ شانی سسک اٹھی۔ وہ ناقابل یقین نظروں سے رستم کی کٹی ٹانگ کو دیکھتی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر ناصر خود بھی زخمی نظر آتا تھا۔ اس کی کلائی پر خون آلود پٹی بندھی تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے ٹارچ انسپکٹر شاد کو تھمائی۔ شاد نے ٹارچ کا رخ رستم کے زخمی کندھے کی طرف کر دیا۔ ڈاکٹر ناصر کے ہاتھ میں نشتر، قینچی اور دیگر اوزار تھے۔ وہ ایسے رخ سے بیٹھا گیا کہ شانی اور گریس کی نگاہوں سے رستم کا کندھا اوجھل ہو گیا۔ یقیناً رستم کے کندھے میں گولی تھی اور ڈاکٹر ناصر اسے نکالنا چاہ رہا تھا۔

گریس شانی کو لے کر کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ وہ شانی کو تسلی دے رہی تھی مگر دفعتاً وہ خود ہی چلا اٹھی۔

شانی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور وہ بھی دہشت زدہ رہ گئی۔ ایک اژدھا نما سانپ ایک گوشے میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ اس کا سر کسی بھاری پتھر کے ذریعے کچل دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوا تھا، کیونکہ زمین پر خون کے دھبے تازہ تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کارروائی انسپکٹر شاد نے کی تھی۔

انسپکٹر شاد نے کہا۔ ''اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے اچھی طرح تسلی کر لی ہے، آس پاس اب کوئی ایسی چیز نہیں۔''

شانی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''گریس! یہ سب کیا ہوا ہے؟ پلیز مجھے کچھ بتاؤ۔''

''ابھی مجھے بھی زیادہ معلوم نہیں۔'' گریس نے سرگوشی کی۔ ''بس اتنا پتا چلا ہے کہ انسپکٹر شاد کو رستم، لاشوں کے ڈھیر میں سے ملا ہے۔ وہ پہلے رستم کو بھی مُردہ سمجھا تھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی سانس چل رہی ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح رستم کو پہچاننے کے بعد وہ رستم کو یہاں لے آیا۔ اس کام میں شاد کے ایک قابل اعتماد ماتحت نے بھی اس کی مدد کی۔''

''رستم کی ٹانگ؟'' شانی سسکی۔

''ابھی اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ لگتا ہے کہ ٹانگ کل رات ہونے والی لڑائی سے پہلے کٹی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رستم نے کسی طرح یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی ہو اور بارودی سرنگ کے پھٹنے سے زخمی ہو گیا ہو۔''

''انسپکٹر شاد نے کیا بتایا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ شاید وہ بتانا نہیں چاہتا یا پھر اسے معلوم ہی نہیں۔''

''گریس! رستم کو گولیاں لگی ہیں؟''

''ہاں دو تو صاف نظر آ رہی ہیں۔ ایک کندھے میں، دوسری پسلیوں میں۔ مزید کا پتا ڈاکٹر ناصر کو ہو گا۔ رستم کے جبڑے پر بھی شدید چوٹ ہے، شاید ٹوٹ گیا ہے۔''

''گریس...... وہ بچ جائے گا ناں؟'' شانی کی آواز میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آیا۔

''تم دعا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری دعا اس کے لئے قبول ہو گی۔''

شانی نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور خاموشی کی زبان میں قادرِ مطلق کو پکارنے لگی۔

''اے مالک! میرے سارے پیارے مجھ سے چھن گئے۔ میرا باپ کہ جس کے سینے پر رخسار رکھ کر میں سوتی تھی، میری ماں جس کی گود میں سر رکھ کر میں دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہو جاتی تھی۔ میرا شیر جیسا بھائی جس کی چوڑی چھاتی میری مصیبتوں کے سامنے دیوار تھی، ایک ایک کر کے سب میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب بس ایک غیر بچا ہے جو اپنوں کی طرح ہے۔ جس کو دیکھ کر دل کی گہرائی میں جینے کی امنگ جاگتی تھی۔ جس کی مضبوط بانہوں کے نیچے عافیت کے سائے نظر آتے تھے۔ اب وہ بھی جا رہا ہے۔ اے میرے مالک! اگر میری زندگی کے بدلے اسے زندگی مل سکتی ہے تو دے دے۔ اگر میری زندگی میں کچھ راحتیں اور خوشیاں باقی ہیں تو میں ان ساری راحتوں اور خوشیوں کے بدلے بس اس کی ایک مسکراہٹ چاہتی ہوں۔ مجھے مانگنا نہیں آتا میرے مالک...... لیکن تُو میرے دل کا حال تو جانتا ہے۔''

وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسکتی رہی۔ آنسو آبشاروں کی طرح اس کے رخساروں پر چلتے رہے۔ ڈاکٹر ناصر جو خود بھی زخمی تھا، آہنی عزم اور بے مثال ہمت کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں رستم کے جسم سے گولیاں نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ سب کچھ ٹارچ کی روشنی میں ہو رہا تھا۔ ٹارچ جو ڈاکٹر ناصر کے مددگار انسپکٹر شاد کے ہاتھ میں تھی۔ شانی اور گریس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اس عجیب و غریب سرجری کے مناظر دیکھ سکیں۔

ڈاکٹر ناصر کا چرمی بیگ جس میں طبی امداد کا سامان تھا، رستم کے پاؤں کی طرف رکھا تھا۔ ڈاکٹر ناصر کی ہدایت پر انسپکٹر شاد گاہے بگاہے بیگ میں سے کوئی چیز نکالتا تھا اور ناصر کی طرف بڑھا دیتا تھا۔ ایک دو موقعوں پر ڈاکٹر ناصر کے لہجے میں بڑی پریشانی اور بے قراری محسوس ہوئی۔ اس بے قراری نے شانی کو بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپا دیا۔ اسے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ ابھی ڈاکٹر ناصر کوئی ایسی بات کہہ دے گا جو رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دے

گی۔ ڈاکٹر ناصر اور انسپکٹر شاد مسلسل سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

شانی نے نوٹ کیا کہ ڈاکٹر ناصر جو ڈیرے پر ہمیشہ جینز اور شرٹ میں نظر آتا تھا، مقامی طرز کی شلوار قمیص میں تھا۔ شاید یہ بھیس اس نے خود کو بچانے کے لئے بدلا تھا۔ نیم تاریک کھوہ میں ڈاکٹر ناصر ایک سخت جنگ میں مصروف تھا۔ شانی جانتی تھی، ایسے موقعوں پر مریض کے لئے درجنوں سہولتیں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔ آکسیجن کی فراہمی، خون کا انتقال، دھڑکن کی مانیٹرنگ کے آلات، لیکن یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سنگلاخ زمین تھی، ٹارچ کی روشنی تھی اور ایک دیوانہ ڈاکٹر پوری جاں فشانی سے اپنے مریض کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر ناصر اور شاد اپنا کام سمیٹ کر رستم کے پاس سے ہٹ گئے۔ شانی تڑپ کر رستم کے پاس پہنچی۔ وہ سیدھا لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زندگی کی رمق سے خالی تھا۔

شانی نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر ناصر کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں کرب، خوف اور امید کی لہریں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر ناصر کے مدقوق چہرے کو دنیا جہان کی سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔ وہ اپنے ڈھلکے ہوئے شانوں کے ساتھ ہمیشہ سے مختصر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ ''میں جو کر سکتا تھا میں نے کر دیا ہے۔ اب جو قدرت کو منظور۔''

شانی نے آگے بڑھ کر رستم کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سانس کی آمدورفت بہت مدھم تھی لیکن محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ خون سے بھیگی ہوئی بہت سی روئی اور رومال وغیرہ ڈاکٹر ناصر نے ایک شاپر میں ڈال کر کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ رستم کے کندھے اور پہلو پر بڑی بڑی سفید پٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر ناصر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے دونوں گولیاں نکال دی ہیں لیکن خون بہت ضائع ہوا ہے۔ کاش اب اسے خون لگایا جا سکتا۔''

''کچھ بھی کرو ناصر، لیکن...'' الفاظ شانی کے گلے الجھ گئے۔ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''میں نے بتایا ہے ناں بی بی! میں جو کر سکتا تھا کر دیا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے بڑے اہم ہیں۔ اگر یہ نکل گئے تو پھر رستم بھائی کے بچنے کی امید ہوگی۔''

چوبیس گھنٹے... شانی کو یوں لگا جیسے ناصر چوبیس برسوں کی بات کر رہا ہے۔

انسپکٹر شاد نے کہا۔ ''ناصر! میں تھوڑی دیر کے لئے جا رہا ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا اور اگر آیا بھی تو میں آس پاس ہی ہوں۔ سنبھال لوں گا۔ بس یہ

دھیان رکھنا کہ یہاں روشنی نہ ہو۔ میرے جانے کے بعد ٹارچ بھی بجھا دینا تو بہتر ہے۔ ویسے بھی اس کی بیٹری کمزور پڑ رہی ہے۔''

ڈاکٹر ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر ناصر اور انسپکٹر شاد کھوہ کے دہانے کی طرف چلے گئے۔ پتھر کی سل ہٹا کر شاد باہر نکل گیا۔ ناصر نے گریس کے ساتھ مل کر سل دوبارہ احتیاط سے دہانے پر رکھ دی۔ مزید احتیاط کے طور پر گریس نے کچھ گیلی مٹی ان درزوں میں بھر دی جو سل کے اردگرد موجود تھیں۔

ڈاکٹر ناصر نے اپنی جہازی سائز کی میڈیکل کٹ کھولی۔ اس میں کافی سامان اور دوائیں موجود تھیں۔ وڈے ڈیرے پر بھی یہ میڈیکل کٹ اکثر ڈاکٹر ناصر کی پشت پر نظر آیا کرتی تھی۔ جب کسی مریض کو سرنگ نمبر دو میں نہیں لایا جا سکتا تھا تو ناصر خود اس کے پاس پہنچتا تھا۔ یہ میڈیکل کٹ تب اس کی پشت پر ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے کٹ میں سے دو انجکشن نکالے اور ٹارچ کی روشنی میں یکے بعد دیگرے رستم کے بازو پر لگا دیئے۔ انسپکٹر شاد نے ٹارچ بجھانے کا کہا تھا لیکن رستم کی حالت کے پیش نظر ناصر نے ٹارچ نہیں بجھائی۔ اس نے ٹارچ کو ایسے زاویے سے زمین پر رکھا کہ اس کی روشنی رستم کے چہرے پر پڑتی رہی۔ پھر وہ تینوں رستم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔

گریس نے انگریزی میں ڈاکٹر ناصر سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر! تم خوش قسمت ہو ورنہ ڈیرے پر سے تو چند بندے ہی نکل سکے ہیں اور جو نکلے ہیں وہ شدید زخمی حالت میں گرفتار ہیں۔''

''میرے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بس ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ میں ایک گڑھے میں گر گیا جہاں اونچی گھاس تھی۔ میرے ہاتھ سے رائفل نکل چکی تھی۔ میرے چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ گڑھے سے نکلا تو بے موت مارا جاؤں گا۔ میں وہیں پڑا دبکا رہا۔''

''یہاں کیسے پہنچے تم؟'' شانی نے پوچھا۔

''گڑھے میں ایک اجرالی کی لاش پڑی تھی۔ ہری گھاس کے اندر اس کا سر کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ میں نے وہیں پڑے پڑے اپنے کپڑے اتارے اور اجرالی کے پہن لئے۔ اسی دوران میں میری نظر رستم بھائی پر پڑی۔ میں نے انہیں بلندی سے گرنے کے بعد گرتے دیکھا۔ یہ بے ہوش ہونے سے پہلے ان سے [illegible] تھے۔ ان کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود یہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔'' [illegible] نے چند سیکنڈ توقف کیا [illegible]

سی لے کر اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص اس حد تک بے بس ہو کر بھی لڑائی جاری رکھ سکتا تھا۔ یہ ایک پولیس والا تھا اور دو اجرالی تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے لاشوں کے ڈھیر میں رستم بھائی کو پہچان لیا تھا۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ رستم بھائی کو زندہ گرفتار کرنے کے چکر میں پڑ گئے۔ وہ بھائی (رستم بھائی) کے قریب آتے تھے اور بھائی رائفل کو لٹھ کی طرح استعمال کرتے ہوئے ان پر وار کرتے تھے۔ ایک شخص کو رائفل کے دستے سے ایسی چوٹ لگی کہ وہ لڑھکتا ہوا نیچے کھائی میں گر گیا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ باقی دو نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارنا چاہا لیکن اسی دوران میں کسی طرف سے ایک برسٹ آیا اور وہ دونوں چھلنی ہو کر رستم بھائی کے اوپر ہی جا گرے۔ کچھ دیر بعد لڑائی رک گئی۔ اس کے بعد لاشوں اور زخمیوں کو اٹھانے کا کام شروع ہوا۔ میں ابھی تک گڑھے میں دبکا ہوا تھا اور نکلنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران میں میں نے انسپکٹر شاد کو دیکھا۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی اور وہ لاشوں کی شناخت کر رہا تھا۔ انسپکٹر کا رائفل بردار اے ایس آئی بھی ہمراہ تھا۔ یہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ انسپکٹر نے لاشوں کے ڈھیر میں سے ایک جسم کھینچ کر باہر نکالا۔ اے ایس آئی نے اسے کندھے پر لادا اور وہ دونوں بڑی تیزی سے دائیں طرف نشیب کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے شک ہوا کہ انہوں نے لاشوں میں جس بندے کو نکالا ہے وہ کوئی اور نہیں رستم بھائی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بھائی کو اوپر لے جانے کے بجائے نیچے کیوں لے کر گئے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی خاص طرح کی جلدی نظر آتی تھی۔ میں ہمت کر کے گڑھے سے نکلا اور ان کے پیچھے چل دیا۔ راستے میں ایک دو جگہ میں نے دیکھا پولیس اہلکار لاشوں کو اٹھانے سے پہلے سرچ لائٹوں کے ذریعے اچھی طرح ان کا جائزہ لے رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی ”لاش“ ان پر حملہ نہ کر دے۔ اس وقت تک مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ بھائی کو اس طرح لے جانے والے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ بہرحال ان کی تیزی اور انداز سے مجھے دو باتوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک تو یہ کہ بھائی کی سانس ابھی چل رہی ہے اور یہ لوگ انہیں طبی امداد پہنچانا چاہ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ بھائی کو عام اجرالیوں اور پولیس والوں کی نگاہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ رستم بھائی کے ہمدرد ہیں۔ جب وہ رستم بھائی کو لے کر یہاں کھوہ میں پہنچے تو میں نے بھی سارے اندیشے ایک طرف رکھ دیئے اور اپنی میڈیکل کٹ کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے چلا گیا۔“

شانی اور گریس دھیان سے ناصر کی باتیں سن رہی تھیں۔ شانی نے کہا۔ ”ناصر! تمہاری

باتوں سے پتا چلتا ہے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے رستم، ریاض کی حراست سے نکل چکا تھا۔“

”ہاں جی، مجھے یہی پتا چلا تھا کہ پولیس والے پوزیشنیں چھوڑ کر پیچھے چلے گئے ہیں اور بھائی کو ایک پوزیشن پر سے رہا کرا لیا گیا ہے۔ ان کو الٹی ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جو وہیں پر چابی کے ساتھ کھولی گئی تھی۔“

ڈاکٹر ناصر کی بات ابھی جاری تھی کہ کھوہ کے دہانے پر آہٹ ہوئی۔ وہ تینوں بُری طرح چونک گئے لیکن پھر ڈاکٹر ناصر ایک دم مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے باہر سنائی دینے والی ٹھک ٹھک کی مدھم آواز سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والا انسپکٹر شاد ہی ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے آگے بڑھ کر سل ہٹانے میں انسپکٹر شاد کی مدد کی۔ انسپکٹر اندر آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ ساتھ اس کا قابلِ اعتماد ماتحت بھی تھا۔ ناصر کے بیان کے مطابق یہ خاصا لمبا چوڑا شخص تھا۔ کینوس کا ایک بڑا تھیلا سا اس شخص کی پشت پر تھا۔ ایسے ہی دو چھوٹے تھیلے انسپکٹر شاد کے دونوں ہاتھوں میں تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ ڈاکٹر ناصر نے پوچھا۔

”تم لوگوں کا راشن پانی۔ اس بڑے تھیلے میں پانی کے کین بھی ہیں۔ اگر احتیاط سے استعمال کرو گے تو یہ پانی یہاں چار پانچ روز تک چل جائے گا۔ میں جو زیادہ سے زیادہ کر سکتا تھا وہ کر دیا ہے۔ اب میرے لئے دوبارہ یہاں آنا شاید ممکن نہ ہو۔“

”ہمیں کب تک یہاں رکنا ہوگا؟“ شانی نے پوچھا۔

”کم از کم پانچ دن، لیکن اس کے بعد بھی تمہیں موقع محل دیکھ کر خود فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچنے میں ناصر تمہاری بہت مدد کر سکتا ہے۔ یہ یہاں کے راستوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہے۔“

گریس نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کی رات آپ یہاں رک جائیں؟“

”اگر ایسا ہو سکتا تو میں ضرور رکتا۔“ انسپکٹر شاد نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔ ”ڈی ایس پی ریاض پہلے ہی مجھ سے خفا ہے۔ اگر مزید خفا ہو گیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔“

اسی دوران میں فاصلے سے پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ شانی نے پوچھا۔ ”کیا اب بھی کچھ لوگ مزاحمت کر رہے ہیں؟“

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دراصل یہ اجرالی ہیں۔ اپنے سردار کی ہلاکت نے انہیں بہت مشتعل کر رکھا ہے۔ لاشوں پر بھی گولیاں چلانے سے باز نہیں آ رہے۔ غلام کبیران کا سب

سے بڑا سردار تھا۔ اس کی وجہ سے باقی سردار بھی اپنی دشمنیاں بھول کر ایک ساتھ لڑ رہے تھے۔ اب ہوسکتا ہے کہ ان کی آپس میں ہی ٹھن جائے۔"

شانی نے دل گیر لہجے میں پوچھا۔ "حسنا گجراتی، کاٹھیا اور مراد وغیرہ کی لاشیں تو ہم نے دیکھی ہیں کیا شاہ، ناصر اور مشتاق کا کچھ پتا چلا ہے؟"

"سب مارے گئے ہیں۔ کوئی نہیں بچا۔ بس دس پندرہ گرفتار ہوئے تھے ان میں سے بھی کچھ دیر پہلے تک تین ختم ہوگئے ہیں۔" انسپکٹر شاد کے لہجے میں افسوس اور پشیمانی یکجا تھے۔

انسپکٹر شاد اب بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر ناصر کو چند ضروری ہدایات اور ایک سائلنسر لگا بریٹا پسٹل دینے کے بعد وہ کھوہ سے روانہ ہوگیا۔ جاتے ہوئے اس نے ناصر کو بتایا کہ سامان میں پسٹل کے فالتو راؤنڈ اور ٹارچ کے کچھ بیٹری سیل موجود ہیں۔ انسپکٹر شاد اور اس کے صحت مند ماتحت کے جانے کے بعد شانی، گریس اور ناصر نے خود کو تنہا اور غیر محفوظ تصور کیا۔ تاہم جلد ہی انہوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو لیا۔ ... انسپکٹر جو کر سکتا تھا اس سے بڑھ کر اس نے کیا تھا۔ اب اس کی اپنی مجبوریاں تھیں۔

ڈاکٹر ناصر ایک بار پھر رستم کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ شانی اور گریس نے دل کڑا کر کے سب سے پہلے اژدھا نما سانپ کی لاش کو موقع سے ہٹایا۔ انہوں نے مُردہ سانپ کو گھسیٹ کر دہانے تک پہنچایا اور پتھر کی سل کو سرکا کر اسے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کھوہ کے ایک کونے میں چٹائی بچھائی اور بیٹھ گئیں۔ شانی کی نگاہیں رہ رہ کر رستم کے ہلدی چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہاں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ چہرہ ایک بے جان کپڑے کی طرح تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد رستم کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اس کی سانس رک رک کر آنے لگی اور ہونٹ تھوڑے سے کھل گئے۔ ناصر نے پریشانی کے عالم میں اسے ایک انجکشن دیا، پھر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کے پورے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ گردوپیش نگاہوں میں چکرانے لگے۔ تو کیا وہ اس سے جدا ہو رہا تھا؟ ہمیشہ کے لئے اس کی خاطر خود کو بدترین مشکلات کے سپرد کرنے والا، کیا آج پوٹھوہار کی اس ویران کھوہ میں زندگی کی بازی ہار رہا تھا۔ اپنے جسم پر کئی خونچکاں زخم لے کر کیا وہ اس سفر پر روانہ ہونے والا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

ڈاکٹر ناصر نے اپنی رسٹ واچ دیکھی پھر مایوسی کے عالم میں سر ہلایا اور رستم کے

سرہانے بیٹھ گیا۔ اس نے رستم کے ادھ کھلے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ لگائے اور اسے ماؤتھ ٹو ماؤتھ ٹریٹ منٹ دینے لگا۔ وہ بار بار اپنی سانس رستم کے سینے میں داخل کرتا تھا اور پھر اسے کھینچ لیتا تھا۔ اس نے شانی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے رستم کے سینے پر دباؤ بڑھائے اور گھٹائے۔ شانی اس ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ یہ ایک طرح سے رستم کے دل کو حرکت میں رکھنے کی آخری کوشش تھی۔

چار پانچ منٹ تک دونوں لگاتار اس کوشش میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر ناصر تھکا تھکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ دونوں نے اپنی جگہیں بدل لیں۔ ناصر کے بجائے شانی اپنی سانس رستم کے سینے میں داخل کرنے لگی اور ڈاکٹر ناصر سینے کی ٹریٹ منٹ میں لگ گیا۔

یہ مشکل ترین لمحے تھے۔ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا تھا۔ دھڑکن تھم سکتی تھی، سانس کی ڈور ٹوٹ سکتی تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ہونٹ رستم کے ہونٹوں سے ملے ہوئے تھے۔ وہ اپنی سانس رستم کے سینے میں داخل کر رہی تھی اور سانس ہی نہیں اپنی جان بھی داخل کر رہی تھی۔ ایک عجیب وجدانی کیفیت طاری تھی اس پر۔ آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تا کہ سانس کے بجائے وہ خود زندگی بن کر رستم کے سینے میں داخل ہوجائے۔

ناصر کی ہدایت کے مطابق پانچ چھ سانس رستم کے سینے میں داخل کرنے کے بعد وہ اپنا منہ اس کے منہ سے ہٹا لیتی تھی۔ آٹھ دس سیکنڈ کا وقفہ دیتی تھی اور پھر شروع ہوجاتی تھی۔ گریس رستم کی ہتھیلیوں کی مالش میں لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں شانی کی آنکھوں کے سامنے بھابو کا وقت رخصت آگیا۔ اس کے سینے میں جیسے کسی نے دہکا ہوا خنجر گھونپ دیا۔

وہ تینوں جو کچھ کر سکتے تھے کر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ رستم خشک ریت کی طرح آہستہ آہستہ ان کی مٹھیوں سے پھسل رہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔ اس کی سانس اب زیادہ اکھڑنے لگی تھی۔ "پلیز ناصر، پلیز کچھ کرو۔" شانی بلکی۔

ناصر کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ اس کے پریشان بال ماتھے پر جھول رہے تھے۔ وہ موجودہ طبی سہولتوں کے ساتھ بے بس دکھائی دیتا تھا۔ ناصر کے چہرے کی مایوسی پڑھ کر شانی اور بے تاب ہوگئی۔ اس نے تڑپ کر رستم کا چہرہ دیکھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا وہ وارفتگی کے عالم میں اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ ایک عجیب وجدانی لہر تھی اس کے بوسوں میں۔ وہ ساتھ ساتھ رستم کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ "آنکھیں کھولو رستم آنکھیں کھولو۔ دیکھو، میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میری غلطیاں معاف کر دینا رستم! میں نے تمہیں بہت

ستایا ہے، بہت دکھ دیئے ہیں۔ پلیز رستم مجھے معاف کر دو۔ پلیز واپس آ جاؤ۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ تم جیسا چاہو گے ویسا ہوگا۔ خدا کے لئے رستم..... خدا کے لئے۔"

وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ اسے بوسے دینے لگی۔ اپنی سانس اس کی سانس میں داخل کرنے لگی۔ چند لمحے کے لئے یوں لگا جیسے رستم کی سانس ہموار ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ناصر جو اپنے ہتھیار پھینک چکا تھا ایک بار پھر رستم کے سینے پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ گھٹانے اور بڑھانے لگا۔ گریس کے مساج میں بھی تیزی آ گئی۔

ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کھوہ کے اندر وہ تینوں دیوانہ وار اپنی کوششوں میں مصروف رہے۔ وہ پسینے سے تر تھے اور ہانپ رہے تھے۔ رستم کی سانس قدرے ہموار ہو گئی۔ دھڑکن بھی جو بالکل معدوم ہو چکی تھی، دوبارہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگی۔ ناصر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ "یس، ہی از کمنگ بیک۔ یہ واپس آ رہا ہے کوشش جاری رکھو۔"

ناصر کی جگہ گریس نے لے لی۔ ناصر نے کانپتے ہاتھوں سے "بی پی اپریٹس" نکالا اور رستم کے عریاں بازو کو گرپ کر کے بلڈ پریشر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ بلڈ پریشر دیکھنے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ اس نے شانی کو ماؤتھ ٹو ماؤتھ ٹریٹ منٹ سے روکا اور تیزی کے ساتھ ایک اور انجکشن تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ شانی بے دم سی ہو کر ایک طرف ڈھ گئی۔ اس کے ہونٹ رستم کے سر پر تھے۔

اگلے روز دوپہر تک رستم کی حالت مزید بہتر ہوئی۔ وہ اب بھی بے ہوش تھا مگر چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ زندگی کے امکانات اب موجود ہیں۔ شانی اس کی صورت دیکھتی تھی تو ایک ہچکی بے ساختہ اس کا سینہ لرزا دیتی تھی۔ اس ہچکی کا تعلق دیر تک بہنے والے آنسوؤں سے تھا۔ تاہم اس ہچکی میں خوشی کی ایک لہر بھی اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ خوشی...... جس کا تعلق رستم کی بہتر ہوتی حالت سے تھا۔ گو ڈاکٹر ناصر نے صاف کہا تھا کہ رستم کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں پھر بھی نہ جانے شانی کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ اب وہ سنبھل جائے گا۔ وہ اس سے معافی مانگ چکی تھی اور اسے اپنی غیر مشروط محبت کا یقین دلا چکی تھی۔ ہاں، اب اسے سنبھلنا ہوگا۔

گریس نے ایک ڈبے میں سے ٹن پیک سالن نکالا۔ ساتھ میں ڈبل روٹی کے پیس اور جوس تھے۔ "شونی! تھوڑا سا کھا لو۔ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔" گریس ملتجی لہجے میں بولی۔

"نہیں گریس! میں نے کچھ نہیں کھانا۔ تم ڈاکٹر ناصر کو کھلاؤ۔"

"دیکھو شونی! اگر جسم میں طاقت ہوگی تو ہم آنے والے حالات کا مقابلہ کر سکیں گے۔

ابھی پتا نہیں کیا کیا جھیلنا ہے۔"

"گریس! مجھے بھوک ہوگی تو کھا لوں گی۔" شانی نے رستم کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

رستم کے جسم میں اب کبھی کبھار تھوڑی سی حرکت بھی پیدا ہوتی تھی۔ یہ حرکت موت سے زندگی کی طرف واپس آنے کا اشارہ تھی۔

"یہ دیکھو، یہ کیا کر رہے ہیں؟" ڈاکٹر ناصر کی آواز آئی۔ وہ رستم کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" گریس نے پوچھا۔

ناصر نے شانی اور گریس دونوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ دبے پاؤں ناصر کے قریب پہنچ گئے۔ ناصر نے رستم کے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

شانی نے دیکھا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں رستم کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت بار بار حرکت کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رائفل کا ٹرائیگر دبا رہا ہے۔ وہ مزاحمت کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوا تھا اور شاید اس بے ہوشی کے عالم میں بھی اپنی ناقابل شکست مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھا۔

ڈاکٹر ناصر نے کہا۔ "کاش میرے پاس کوئی کیمرا ہوتا اور میں ان مناظر کو ریکارڈ کر سکتا۔"

"کون سے مناظر؟" گریس نے پوچھا۔

"بے ہوش ہونے سے پہلے رستم بھائی کے آخری مناظر۔ رائفل پھینکنے کے بجائے یہ آخری وقت تک رائفل کو استعمال کرتے رہے۔ یہ رائفل ان کے ہاتھ میں لاٹھی بن گئی تھی اور ابدالیوں کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ بے بس ہونے کے باوجود یہ آخری وقت تک بے بس نہیں ہوئے۔ بدترین سچویشن میں بھی انہوں نے ایک دشمن کی جان لے لی۔ ہی از اے ٹرو فائٹر۔"

"خدا نے چاہا تو یہ موت سے بھی ہار نہیں مانیں گے۔" گریس نے امید ظاہر کی۔

"اگلے آٹھ دس گھنٹے خیریت سے گزر گئے تو پھر ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر ناصر نے شانی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

سہ پہر کے وقت یکے بعد دیگرے دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ دھماکے وڈے ڈیرے کی طرف ہو رہے تھے۔ ناصر کا خیال تھا کہ ڈیرے کے اردگرد بارودی سرنگیں تباہ کی جا رہی

ہیں۔ وہ تینوں رستم سے کچھ فاصلے پر کھردری دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ شانی نے ناصر سے دریافت کیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ رستم کی ٹانگ بھی بارودی سرنگ کی وجہ سے ... ؟''

ناصر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اندازہ غلط تھا۔ میں نے زخم دیکھا ہے۔ یہ بلاسٹ کا ہرگز نہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

ناصر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''بھائی کی ٹانگ کاٹی گئی ہے۔ کسی تیز دھار آلے سے یا شاید آرے سے۔''

''اوہ گاڈ... لیکن کیوں؟'' گریس نے پوچھا۔

''اس کا حتمی جواب تو میرے پاس نہیں، لیکن ایک اندازہ ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ اندازہ درست ہوگا۔''

''کیسا اندازہ؟'' شانی نے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ڈی ایس پی ریاض ایک بہت زہریلے شخص کا نام ہے۔ یہ شخص اپنی معمولی سے معمولی اہانت بھی بھولتا نہیں ہے۔ یہ کہ رستم بھائی نے اس سے ہاتھا پائی کی اور اسے ٹانگ مار کر کھائی میں گرایا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ بھائی کی ٹانگ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ڈی پی ریاض کی وجہ سے ہوا۔ اس نے خود کیا یا اس کے کہنے پر کسی اور نے یہ ظلم ڈھایا ہے۔''

کھوہ میں ایک سوگوار خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ تینوں کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر ڈاکٹر ناصر نے ہولے سے کہا۔ ''خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ٹانگ تو واپس نہیں آسکتی۔ ہم جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ٹانگ کے زخم کو خراب ہونے سے بچائیں۔ اس کے لئے سخت کوشش کرنا پڑے گی۔ یہ کوئی معمولی زخم نہیں ہے۔ ہڈی کے اوپر گوشت چڑھنا لازمی ہے۔ اگر ہڈی ننگی رہ جائے تو وہ نیلی ہوجاتی ہے اور یہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔''

''تم لوگوں نے... رستم کو یوں ڈیرے سے نکلنے کیوں دیا۔ اسے روکا کیوں نہیں؟'' شانی روہانسی ہو کر بولی۔

''انہوں نے کسی کو پتا ہی نہیں چلنے دیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ خاموشی سے نکلے۔ ہمیں دو تین گھنٹے بعد معلوم ہو سکا۔ وہ بھی اس لئے کہ ان کا چھوڑا ہوا خط ملا۔''

''خط؟'' شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

ناصر نے ذرا توقف کرنے کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ بی بی ڈی پی ریاض کے پاس ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان کی زندگی

بچانے کے لئے مجھے ہر صورت میں اپنی گرفتاری دینا ہوگی اور میں یہ گرفتاری دینے جا رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے، ورنہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اگر میں نہ...''

ڈاکٹر ناصر کا گلا رُندھ گیا اور وہ بات مکمل نہ کر سکا۔

شانی نے بیٹھے بیٹھے اپنا سر گھٹنوں پر ڈال دیا اور سسکی۔ ''مجھے مر جانے دیا ہوتا۔ کیوں کیا انہوں نے لئے یہ سب کچھ؟ کیا حاصل ہوا اس سے؟''

گریس نے شانی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور تسلی آمیز انداز میں اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ڈاکٹر ناصر رستم کو دیکھنے کے لئے آگے چلا گیا۔ شانی نے سسک کر کہا۔ ''اس کی زندگی میرے لئے تباہ ہوگئی۔ ہمیشہ کے لئے معذور ہوگیا۔ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ بھی نہیں سکے گا اب۔ اس کا کیا ہوگا گریس؟''

''ابھی تو یہ سوچو کہ ہم سب کا کیا ہوگا۔ ہم مکمل طور پر گھرے ہوئے ہیں۔ کسی بھی وقت اس غار سے باہر لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے میں ہم چاروں کا پکڑا جانا یقینی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ناصر تو کسی صورت گرفتاری نہیں دے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح یہیں پر جان ہارنا پسند کرے گا۔''

شانی قدرے دھیمی آواز میں بولی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا گریس کہ تم اس کا پسٹل کہیں چھپا دو یا پھینک دو۔ ان ہتھیاروں سے ہمیشہ نقصان ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن یہی ہتھیار حفاظت بھی تو کرتے ہیں۔''

ایک آواز نے شانی اور گریس کو چونکا دیا۔ غنودگی کی حالت میں رستم کراہا تھا۔ شانی تیزی سے اس کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر ناصر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چمچ کے ذریعے تھوڑا تھوڑا دودھ رستم کے منہ میں ٹپکانے کی کوشش کرے۔

شانی نے رستم کا سر اپنی زانو پر رکھا اور چمچ کے ساتھ اسے دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ شروع میں دودھ باچھوں سے بہتا رہا لیکن پھر رستم نے نگلنا شروع کر دیا۔

رستم کے جسم پر ابھی تک خون آلود کرتا تھا۔ یہ کرتا دیکھ دیکھ کر شانی کا دل ہولتا تھا۔ ''کیا میں یہ کرتا اُتار دوں؟'' شانی نے ناصر سے پوچھا۔

ناصر نے اجازت دے دی۔ شانی نے ناصر کی میڈیکل کٹ میں سے ایک قینچی نکالی اور بڑی احتیاط سے میلا کچیلا خون آلود کرتا اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا۔ رستم کا چوڑا چکلا بالوں بھرا سینہ شانی کے سامنے تھا۔ اس سینے پر انگریزی کا حرف ''B'' کھدا ہوا تھا۔ یوں لگتا

تھا کہ کسی گرم سلائی سے یہ حرف جلد پر کندہ کر دیا گیا ہے۔ شانی نے لرزاں انگلیوں سے اس حرف کو چھوا۔ اچانک اس کے چہرے پر شرم کی مدھم سرخی پھیل گئی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس نشان کا تعلق خود اس سے ہے۔

ڈاکٹر ناصر نبض دیکھنے کے لئے رستم کی طرف آیا تو شانی نے جلدی سے ہاتھ "B" کے نشان پر رکھ دیا۔ جیسے کوئی چوری چھپانا چاہ رہی ہو۔ ڈاکٹر ناصر جتنی دیر نبض دیکھتا رہا شانی کا ہاتھ رستم کے سینے پر رہا۔ ناصر مسکرایا اور ہولے سے بولا۔ "آپ کچھ چھپا رہی ہیں شاید۔"

"کک... کیا مطلب؟"

"ڈاکٹر سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا۔" ناصر نے کہا اور دوسری طرف چلا گیا۔

شانی کے چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس سے پہلے وہ میلے والے واقعے کے بعد مہتم بستی میں بھی رستم کو قمیص کے بغیر دیکھ چکی تھی لیکن تب وہ اس نشان پر زیادہ دھیان نہیں دے پائی تھی۔

بہرحال جلد ہی شانی نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔ گیلے کپڑے سے اس نے رستم کا سینہ اور پیٹ اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے سوجے ہوئے چہرے اور خون آلود بالوں پر بھی گیلا کپڑا پھیرا۔ تب ایک سفید چادر سے اس کا جسم گردن تک ڈھانپ دیا۔

وہ اپنے آپ کو کمپوز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ناصر اور گریس وغیرہ سے اب کچھ بھی چھپانے کی کوشش بے کار تھی۔ کل رات رستم کے لئے اس کی بے خودی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور وہ سب کچھ سن چکے تھے جو وہ رستم کے لئے کہتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کئی بار رستم کے ہونٹ چومے تھے اور اسے اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔ اب کم از کم ناصر اور گریس کے لئے تو کچھ بھی راز نہیں تھا۔ ان گھمبیر لمحوں کا خیال کر کے ایک حیا آمیز جھرجھری شانی کے جسم میں پیدا ہوئی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر ناصر نے اشارے سے شانی کو اپنے پاس بلایا۔ ناصر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بی بی شانی! آپ کی ذمے داری کچھ بڑھنے والی ہے۔ امید ہے کہ ایک دو گھنٹے تک بھائی ہوش میں آ جائیں گے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کس طرح کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے چھلنی ہوتے دیکھا ہے۔ ان واقعات نے اور مناظر نے ان کے اندر جو وحشت بھری تھی اس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اب اگر ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے کسی طرح کی بے چینی اور طیش دکھایا تو آپ نے ہی انہیں سنبھالنا ہے۔ یہ اس قابل ہرگز نہیں کہ

اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش بھی کریں۔ اگر انہوں نے غصے میں آ کر چلانا شروع کر دیا تو یہ بھی ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ ان کی آواز باہر جا سکتی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں آپ؟"

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

گریس بولی۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر رستم کی طرف سے کوئی شدید کیفیت ظاہر ہو تو تم اسے ٹرنکولائزر وغیرہ دے دو۔"

"ٹرنکولائزر تو ہے میرے پاس، لیکن بہت تھوڑی مقدار میں ہے۔ وہ میں سخت ضرورت کے وقت استعمال کرنا چاہتا ہوں۔"

شام تک رستم ہوش میں آ گیا۔ وہ پہلے دیر تک کراہتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ خالی خالی نظروں سے کھوہ کی غیر ہموار چھت کو گھورتا رہا۔ یوں لگا جیسے وہ یادداشت کھو چکا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے کے تاثرات بہتر ہو گئے۔ اس نے سب سے پہلے سر اٹھا کر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھا۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ سانحہ واقعی اس پر گزر چکا ہے۔ تب ایک دم سے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ شانی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "نہیں رستم! تم زخمی ہو، اسی طرح لیٹے رہو۔"

رستم نے پوری توجہ سے شانی کو دیکھا۔ ایک دم اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ "بب... بی بی... آپ۔" اس نے سر دوبارہ ہوا بھرے تکیے پر ڈال دیا۔ ایک بار پھر تعجب سے چاروں طرف دیکھ کر نگاہیں بی بی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"رستم! تم بالکل محفوظ ہو یہاں سب خیریت ہے۔ ہم بڑی دیر سے تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

رستم نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا جیسے اپنے سنگی ساتھیوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔ لالہ... حسنا... مراد... آہوجہ اور شاہ وغیرہ... لیکن ان میں سے کوئی اس کے آس پاس نہیں تھا۔ سب اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ رستم نے جبڑے بھینچے اور آنکھیں بند کر لیں۔ شانی نے دیکھا دو آنسو اس کی آنکھوں کے بیرونی گوشے سے نکلے اور کنپٹیوں کی طرف رینگ گئے۔ ڈاکٹر ناصر جلدی سے آگے بڑھا اور رستم کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ "رستم بھائی! کسی طرح کی ٹینشن نہیں لینی۔ اس وقت تمہیں مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ کوئی بات نہ کرو۔ بس چپ چاپ لیٹے رہو۔"

رستم نے اپنے زخمی جبڑے کو بہ مشکل حرکت دی۔ مدھم آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

"ڈپٹی ریاض کہاں ہے؟"

"وہ دفع ہوگیا ہے۔ چلا گیا ہے یہاں سے۔ آپ سے کہا ہے ناں، ابھی کسی کے بارے میں مت سوچیں۔" ناصر نے کہا۔

"ہاں رستم! تمہیں مکمل سکون کی ضرورت ہے۔" شانی نے ہمت کرکے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

بی بی کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرکے رستم نے پھر آنکھیں نیم وا کردیں۔ اس کے چہرے پہ عجیب کیفیت تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے ایک چمچ کے ذریعے کوئی دوا رستم کے ہونٹوں میں ٹپکائی۔ کچھ ہی دیر بعد رستم پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ نیند بے ہوشی سے مشابہ تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں رستم پر نیند اور بیداری کے کئی ایسے وقفے آئے۔ اس کے جبڑے کی سوجن اب قدرے کم تھی۔ ڈاکٹر ناصر بڑی تندہی سے اس کی مرہم پٹی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کام میں اکثر شانی اس کی مدد کرتی تھی۔ تاہم شانی میں ابھی تک یہ ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ کا زخم دیکھ سکے۔ ہاں یہ زخم ایک دو بار گریس نے ضرور دیکھا تھا اور ناصر سے اس بارے میں تبصرہ بھی کیا تھا۔ گریس کے بے حد اصرار پر شانی پورے دن میں بہ مشکل سات آٹھ لقمے لیتی تھی۔ وہ زیادہ وقت رستم کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ان کے ذہنوں سے پولیس اور اجرالیوں کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے ڈیرے کی طرف جو فائرنگ کی آوازیں پچھلے تین چار دن سے آ رہی تھیں وہ اب معدوم ہوچکی تھیں۔ کسی طرح کی نقل وحمل کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس دن میں ایک آدھ بار ہیلی کاپٹر کی آواز ضرور سنائی دے جاتی تھی یا پھر کسی بارودی سرنگ کو بلاسٹ کیا جاتا تھا اور اس کے دھماکے سے پیدا ہونے والی گونج دور تک لہریں لیتی محسوس ہوتی تھی۔

گریس اور شانی کسی کو بتائے بغیر یہاں آئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ میڈیا پارٹی میں ان دونوں کو موجود نہ پاکر پولیس افسروں کو تشویش ضرور ہوئی ہوگی۔ شانی نے اس حوالے سے گریس سے پوچھا تو وہ بولی۔ "میرا دل کہتا ہے کہ ضمیر صاحب نے یہ معاملہ کسی نہ کسی طور سنبھال لیا ہوگا۔ میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاید افراتفری میں پولیس والوں کا دھیان ہی ہماری طرف نہ گیا ہو۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ ریاض نے مجھے اتنی آسانی سے نظر انداز کردیا ہوگا۔" شانی نے کہا۔

"لیکن شونی! ریاض کے سامنے اس سے بھی زیادہ ضروری کام موجود تھے۔ وہ ہر طرف

بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اگر وہ خاص طور سے ہماری تلاش میں ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی یہاں تک پہنچ گیا ہوتا۔ دیکھو چار دن خیریت سے گزر گئے ہیں۔ امید ہے کہ باقی ایک دو دن بھی گزر جائیں گے۔"

"لیکن پانی کا کیا کریں گے۔ پانی تو تیزی سے کم ہو رہا ہے۔"

"ناصر کہہ رہا تھا، وہ کل رات کے وقت کین لے کر نکلے گا اور کہیں نہ کہیں سے پانی ڈھونڈ لے گا۔ پانی مل گیا تو ہم آٹھ دس دن مزید یہاں آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ اس دوران میں رستم کی حالت مزید بہتر ہوجائے گی۔ اردگرد خطرہ بھی کم ہوجائے گا۔ پھر ہم یہاں سے نکلنے کا سوچیں گے۔"

"نہیں گریس، میرا نہیں خیال ہے کہ ہمیں ناصر کو پانی کے لئے باہر بھیجنا چاہیے۔ یہ بہت رسک والا کام ہوگا۔ احتیاط سے برتیں تو پانی دو تین دن مزید چل جائے گا۔ کیا پتا اس دوران میں انسپکٹر شاد ہمارے لئے کچھ کرگزرے۔ کہنے کو تو وہ کہہ گیا ہے کہ اس کے لئے دوبارہ یہاں آنا مشکل ہے لیکن ہوسکتا ہے......"

اچانک ان دونوں کو چونکنا پڑا۔ کھوہ سے باہر کچھ فاصلے پر آہٹیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ایک سے زیادہ افراد دبے پاؤں چلے آ رہے ہیں۔ کوئی شخص مدھم آواز میں بولا۔ شانی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کچھ یہی کیفیت گریس نے بھی محسوس کی ہوگی۔ وہ جس خطرے کا ذکر کر رہے تھے شاید وہ آن موجود ہوا تھا۔

شانی اور گریس کو چونکتے دیکھ کر ناصر بھی چونک گیا۔ وہ کھوہ میں جھک کر چلتا ہوا دہانے کے قریب پہنچا۔ یہاں موجود تقریباً چار ضرب تین فٹ کی سل نے دہانے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ درزوں میں سے اندر کی روشنی باہر نہ جائے گریس نے سل اور کھوہ کے درمیان گیلی مٹی بھر دی تھی۔

آہٹیں واضح تھیں۔ آنے والے دہانے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ناصر نے پسٹل کے بیرل سے تھوڑی سی مٹی کھرچی اور باہر جھانکنے لگا۔ شانی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر یہ پولیس والے تھے تو پھر صورت حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی تھی۔ وہ اور گریس دم بخود دہانے کی طرف دیکھتی جا رہی تھیں، جہاں ناصر نے سل کے ساتھ آنکھیں لگا رکھی تھیں۔ درزوں سے مٹی کھرچے جانے کے بعد دن کی مدھم روشنی کھوہ میں داخل ہونے لگی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔

ناصر نے اپنی آنکھیں تو درز سے لگائے رکھیں تاہم ہاتھ کے اشارے سے شانی اور

گریس کو قریب آنے کے لئے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' شانی نے اپنے ہراس کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ خود دیکھیں۔''

شانی نے بھی ایک درز سے آنکھیں لگائیں۔ اسے جھٹکا لگا۔ باہر پولیس نہیں تھی اور نہ ہی اجرالی تھے۔ یہ ایک لڑکا اور لڑکی تھے۔ لڑکی کی عمر بہ مشکل سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ لڑکا اُنیس بیس کا تھا۔ دونوں مقامی لباس میں تھے۔ لباس سے ظاہر تھا کہ دونوں کھاتے پیتے گھرانوں سے ہیں۔ دونوں پسینے میں شرابور اور تھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ خاص طور سے لڑکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کچھ سامان بھی اٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔ یہ سامان پانی کے ایک بڑے پلاسٹک کین اور ایک گٹھڑی کی شکل میں تھا۔

وہ دونوں دہانے کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہے۔ لڑکے کے کندھے سے رائفل اور گولیوں والی بیلٹ جھول رہی تھی۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اتار کر ایک طرف رکھیں۔

لڑکی کچھ سمٹی سمٹائی اور شرمائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے لڑکا بھی دیکھنے لگتا تھا۔

ان دونوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس ویرانے میں کوئی ان کے اس قدر قریب موجود ہے اور ان کی ہر حرکت ملاحظہ کر رہا ہے۔ لڑکے کی آواز ابھری۔ ''چل، جلدی کر پھر اسوں واپس بھی جانا ہے۔''

لڑکی نے آخری بار چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر اپنے کپڑے اتارنے لگی۔ ایک ایک کر کے اس نے تمام کپڑے اتار دیئے اور ایک مخروطی ٹیلے کے سامنے عریاں کھڑی ہوگئی۔ شانی، گریس اور ناصر دم بخود دیکھ رہے تھے۔ شاید شانی اس منظر سے نگاہیں ہٹا لیتی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ یہ صرف ''سیکس'' کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ اس سے کچھ جدا نظر آ رہا تھا۔ وہ دیکھتے رہے۔ لڑکی کی کمر پر مدھم سیاہی مائل نشان بھی نظر آئے۔ یہ شاید مار پیٹ کے سبب تھے۔

نوجوان لڑکے نے زمین سے چند مٹھی سرخ مٹی لی، اس میں کین سے تھوڑا سا پانی گرایا اور اسے گوندھ لیا۔ لڑکی اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی، اس نے عبادت کے انداز میں آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لڑکے نے گندھی ہوئی مٹی لڑکی کے جسم پر ملنا شروع کر دی، بالکل جیسے صابن ملا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھ لڑکی کے پورے جسم پر چل گئے۔ وہ مٹی کا مجسمہ نظر آنے لگی۔

''مینڈا دل گھبرا رہا ہے، جلدی کرو۔'' لڑکی نے کہا۔

لڑکے نے کین میں سے پانی، مٹی کے ایک کوزے میں نکالا اور اسے لڑکی کے جسم پر ڈال دیا۔ پھر وہ اسی طرح کوزے بھر بھر کر لڑکی کے جسم پر ڈالنے لگا۔ جلد ہی اس کا جسم مٹی سے صاف ہو گیا اور دھوپ میں دمکنے لگا۔ لڑکے نے گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر پھولوں کی کچھ رنگ برنگی پتیاں نکالیں اور انہیں لڑکی پر نچھاور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گٹھڑی میں سے ایک بوسیدہ جوڑا نکالا اور بولا۔ ''لے میری جندڑی! یہ پہن لے۔''

لڑکی نے وہیں کھڑے کھڑے لباس پہن لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ تب پہلی بار شانی کو احساس ہوا کہ لڑکی کا رخ مخروطی ٹیلے کی طرف ہے اور یہ ٹیلا ہی درحقیقت ان دونوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس ٹیلے کے روبرو کوئی کہنہ رسم ادا کر رہے ہیں۔

لڑکی کے بعد لڑکے نے اپنے بدن کے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اس مرتبہ لڑکی نے گندھی ہوئی مٹی میں ہاتھ ڈالا اور وہی کچھ کیا جو لڑکے نے کیا تھا۔ اس نے سرخی مائل مٹی لڑکے کے پورے جسم پر مل دی اور بعد میں مٹی کے کوزے میں پانی بھر بھر کر اسے نہلا دیا۔

وہ نہا چکا تو لڑکی نے گٹھڑی میں سے ایک غریبانہ سا مردانہ جوڑا نکالا اور لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔

لڑکا بولا۔ ''مینڈا خیال ہے تم کچھ بھول رہی ہو۔''

''او ہو مینڈی مت ماری گئی اے۔'' لڑکی کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر اس نے گٹھڑی میں سے (جو اب تقریباً خالی ہو چکی تھی) پھولوں کی پتیاں نکالیں اور لڑکے پر نچھاور کیں۔

لڑکے نے کپڑے پہنے اور لڑکی ہی کی طرح آنکھیں بند کر کے مخروطی ٹیلے کے سامنے نامعلوم الفاظ بولتا رہا۔ اپنے اُتارے ہوئے مہنگے لباس ایک کونے میں رکھے اور انہیں آگ لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں جوڑے خاکستر ہو گئے۔ لڑکے نے عجیب نفرت سے کپڑوں کی راکھ کی طرف دیکھا...... پھر دونوں نے فتح مندانہ نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ مسکرائے اور لپک کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ لڑکا بے تابی سے لڑکی کو چومنے لگا اور وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔ لڑکا جذبات سے مغلوب تھا اور اسے ایک ہموار چٹان پر لٹانا چاہ رہا تھا..... لیکن اس نے لڑکے کو خود سے علیحدہ کیا اور اپنے گیلے بالوں کو جھٹک جھٹک کر سکھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا جسم ہیجان خیز تھا۔

لڑکا ٹہلنے والے انداز میں کھوہ کی طرف آیا اور پھر بڑے دھیان سے دہانے کو دیکھنے

لگا۔ دہانے پر رکھی ہوئی سل اسے مشکوک نظر آ رہی تھی۔ یکا یک وہ چونک سا گیا۔ غالباً اسے نیم پتھریلی زمین پر قدموں کے نشانات دکھائی دے گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اسے کھوہ کے اندر سے کھانے پینے کی اشیاء کی مہک بھی آئی ہو۔

''کیا بات ہے؟'' لڑکی نے بالوں کو جُوڑے کی صورت باندھتے ہوئے کہا۔ لڑکے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد وہ اچانک تیزی سے پلٹا اور اپنی بندوق اٹھا لایا۔ اس کے بندوق تھامنے سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ اسلحہ شناس اور نڈر نوجوان ہے۔

وہ دوبارہ سل کے پاس آیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اندر لوگ موجود ہیں۔ اس نے اپنی طرف سے عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ سل کو ہٹانے کے بجائے وہ تیزی سے واپس مڑا اور اپنی ساتھی لڑکی کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔

شانی نے تیز سرگوشی کی۔ ''انہیں روکنا ہوگا۔''

ڈاکٹر ناصر جیسے پہلے سے ہی تیار تھا۔ اس نے شانی کے ساتھ مل کر تیزی سے سل کو سرکایا اور دونوں ہاتھ باہر نکال کر چلایا۔ ''رک جاؤ۔'' اس کے ہاتھوں میں پسٹل دبا تھا جس پر سیاہ رنگ کا سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔

لڑکے کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی خودکار رائفل کندھے سے لٹکا چکا تھا تاکہ خالی کین اٹھا سکے۔ اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ رائفل کندھے سے اتار کر اس کا رخ دہانے کی طرف کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ لڑکی بھی ششدر تھی۔ اس کے خوب صورت بالوں میں ابھی تک پھولوں کی چند پتیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ لڑکی کو دیکھ کر شانی کو یوں لگا جیسے وہ کچھ کر گزرنے کی فکر میں ہے۔

شانی نے گریس کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں تیزی سے باہر نکلیں اور لڑکی کو دبوچ لیا۔

ڈاکٹر ناصر بھی پسٹل سمیت باہر آ گیا۔ نوجوان لڑکے سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر وہ بولا۔ ''رائفل اتار کر دور پھینک دو۔''

لڑکا چند لمحے تذبذب میں رہا، پھر اس نے ناصر کے ہیجانی تاثرات دیکھے اور رائفل پتھروں پر پھینک دی۔ ناصر نے آگے بڑھ کر وزنی رائفل قبضے میں لی اور اسے کھوہ کے اندر پھینک دیا۔ ''چلو دونوں اندر۔'' ناصر نے پسٹل کو حرکت دیتے ہوئے حکم دیا۔

پہلے تو یوں محسوس ہوا کہ لڑکا اندر جانے سے انکار کر دے گا مگر پھر شاید دو شریف صورت

خواتین کو یہاں دیکھ کر اسے قدرے تسلی ہوئی اور وہ کھوہ کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر لڑکی نے بھی قدم بڑھا دیئے۔

کھوہ میں پہنچ کر نوجوان بولا۔ ''مجھ کو لگتا ہے کہ تساں لوگ وڈے ڈیرے سے بچ کر یہاں پہنچے ہو؟'' اس کے لہجے میں خوف کے بجائے اپنائیت تھی۔

ناصر چیخ کر گویا ہوا۔ ''ہمارے بارے میں اندازے بعد میں لگانا۔ پہلے اپنے بارے میں کچھ فرماؤ۔''

''میںڈا خیال ہے کہ تم ہمیں دوست سمجھ سکتے ہو۔''

''ہاں، تمہارے ماتھے پر دوست لکھا ہوا ہے۔'' ناصر نے زہریلے انداز میں کہا۔ پھر لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کو کہاں سے بھگا کر لائے ہو اور کیا کرنے والے تھے اس کے ساتھ۔''

''کچھ نہیں، اساں ایک دوجے کو پسند کرتے ہیں۔''

''جہاں تک میرا اندازہ ہے تم دونوں اجرالی برادری سے ہو۔'' ناصر نے کہا۔

''تساں دا اندازہ غلط نہیں۔ اساں اجرالی ہیں۔'' ابھی نوجوان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اس کا دھیان کچھ دور چٹائی پر لیٹے ہوئے رستم کی طرف چلا گیا۔ اب نوجوان کی آنکھیں نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ وہ ذرا چونک سا گیا اور مزید توجہ سے رستم کو دیکھنے لگا۔ یوں لگا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر یکا یک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ رستم کی طرف انگلی اٹھا کر ہکلایا۔ ''یہ... یہ کون ہیں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

نوجوان نے سنسنی بھرے انداز میں ان تینوں کے چہرے دیکھے، تب رستم پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ رستم سیال ہیں؟''

ان تینوں نے جواب نہیں دیا۔ نوجوان ناصر کے پسٹل کی پرواہ کئے بغیر اچانک جذباتی ہو کر اٹھا اور رستم کے قریب پہنچ گیا۔ ناصر گھبرایا۔ اس نے ابھی تک نوجوان کے لباس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ اگر اس کے پاس چاقو وغیرہ ہوتا تو وہ رستم کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ناصر پسٹل سمیت نوجوان کے سر پر پہنچ گیا۔ نوجوان نے عجیب عقیدت سے رستم کا ہاتھ اٹھا کر بار بار چوما اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ رستم دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔

نوجوان ہاتھ چوم کر چند قدم پیچھے ہٹ آیا اور بولا۔ ''رستم سیال کو زندہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اللہ سوہنا ان کو لمبی حیاتی دے۔ ان کی وجہ سے اساں بے موت مرنے سے بچ

گئے۔''

شانی نے نوجوان سے کہا۔''تم اِدھر آرام سے بیٹھ جاؤ اور ہمیں بتاؤ کہ کون ہو اور رستم سے کیا فائدہ پہنچا ہے تمہیں؟''

ڈاکٹر ناصر انگریزی میں بولا۔''مجھے تو لگتا ہے ڈرامے کر رہا ہے۔''اس کی مخاطب شانی تھی۔

شانی نے آنکھوں کے اشارے سے ناصر کو خاموش رہنے کو کہا اور نوجوان سے پوچھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''نام اور کام سب تساں کو بتاؤں گا جی۔ پر پہلے آپ مینڈا یقین کرلیں کہ میں تساں کا دشمن نہیں ہوں۔ دشمن تو وہ تھا جو رستم سائیں کے ہاتھوں کُتے کی موت مریا ہے۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اپنے سردار غلام کبیر کی......''اس کے ساتھ ہی نوجوان نے کئی زہریلی گالیاں سردار کے ساتھ جوڑ دیں۔

وہ تینوں حیران رہ گئے۔ واقعی محسوس ہو رہا تھا کہ نوجوان کے سینے میں سردار اور اس کے خانوادے کے لئے آگ بھری ہوئی ہے۔

یہ بات شانی اور گریس وغیرہ کے لئے بھی انکشاف سے کم نہیں تھی کہ اجرالی سردار رستم کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ شانی نے پوچھا۔''تمہیں کیسے پتا ہے کہ غلام کبیر کو رستم نے مارا تھا؟''

''دیکھنے والوں نے دیکھا ہے جی اور انہوں نے بتایا ہے۔ رستم صاحب نے ہی غلام کبیر کو گوسیاں ماری تھیں۔''فقرہ مکمل کر کے وہ ایک بار پھر دھیان سے رستم کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی ساتھی لڑکی بھی یہی کر رہی تھی۔

نوجوان اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''میں تساں کو سچ بتا رہا ہوں جی۔ رستم جی کو زندہ دیکھ کر مجھ کو جو خوشی ہوئی ہے میں تساں کو بتا نہیں سکتا۔ آلے دوالے یہی بات مشہور ہو گئی ہے کہ رستم سیال... خدانخواستہ...... مرنے والوں میں شامل ہیں۔''

''تم نے ابھی تک اپنا نام پتا نہیں بتایا۔''ناصر نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ پستول ابھی تک ناصر کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم اب اس کا رخ نوجوان کے سینے کی طرف نہیں تھا۔

''میرا نام ساگر ہے۔ میں یہاں سے کوئی تین میل نیچے روپائی گراں کا رہنے والا ہوں۔ یہ میری خالہ کی بیٹی ہے۔ اس کا نام چندو ہے۔''

''کیا کام کرتے ہو؟''

''میں غلام کبیر کی حویلی میں پہرے داری کرتا تھا۔ پر جب غلام کبیر نے چندو سے بیاہ رچالیا تھا تو میری ڈیوٹی حویلی سے ہٹا کر اپنے باہر والے ڈیرے پر لگا دی۔''

شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔''تمہارا مطلب ہے یہ لڑکی غلام کبیر کی بیوی تھی۔''

''ہاں جی۔''ساگر نے اثبات میں سر ہلایا۔''وہ بڈھا کھوسٹ تھا۔ یہ مشکل سے اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کُتے نے چندو کے ابے کو ڈھیر سارے روپے دیئے تھے۔''

شانی کو یاد آیا کہ اس نے سردار غلام کبیر کے بارے میں ایسی بات سنی تھی۔ اس نے حال ہی میں ایک کم عمر لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس سے پہلے اس کی دس بیویاں اور چالیس کے قریب بچے تھے۔''

''کیا یہ تمہاری منگیتر تھی؟''شانی نے ساگر نامی نوجوان سے پوچھا۔

''نہیں جی۔ پر ہم دونوں ایک دوجے کو پسند کرتے تھے۔ اگر یہ کتا سردار درمیان میں نہ آتا تو اب تک اساں دونوں کا ویاہ ہو جانا تھا۔ مینڈی قسمت خراب تھی جی۔ میں نے اپنی بہن کے ویاہ میں غلام کبیر کو بلایا۔ وہاں پر اس کی''کمینی نظر''چندو پر پڑ گئی۔ وہ چندو... کے چکر میں پڑ گیا۔ اس نے چندہ کے ابے کو حویلی میں بلایا اور ڈھیر سارے روپے کی جھلک دکھائی۔ اس کے علاوہ چار پانچ گائیاں (گائے) دینے کی زبان بھی کی۔ چندو کا ابا لالچی ہے۔ اس کی نیت بد ہو گئی۔ اس کو پتا تھا، بلکہ اور بہت سے لوگوں کو بھی پتا تھا کہ میں اور چندو ایک دوجے کو پسند کرتے ہیں۔ پر چندو کے ابے کی اکھیوں پر پٹی بندھ گئی۔ غلام کبیر کے چھوٹے بھائی کو فیض پیارا کہتے ہیں۔ وہ ایک اچھا بندہ ہے۔ اس نے بھی چندو کے ابے بخشے کو سمجھایا کہ وہ اپنی دھی رانی کی زندگی برباد نہ کرے۔ غلام کبیر کی پہلے ہی دس بیویاں ہیں۔ سال چھ مہینے بعد یہ ایک اور ویاہ کرلے گا اور تیری دھی کونے میں لگ جائے گی اور سب جانتے ہیں کہ غلام کبیر اپنی گھر والیوں کو مارتا بھی بہت ہے۔ ایک بیوی کا ہاتھ اور ایک کا گوڈا وہ پہلے ہی توڑ چکا ہے۔ کیوں اپنی معصوم دھی کو دوزخ میں دھکا دے رہا ہے پر بخشے نے ایک نہ سنی اور چندو کا ویاہ کر دیا۔''شانی کو یاد آیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے چندو کی کمر پر بھی مار پیٹ کے نشان دیکھے ہیں۔

شانی نے دیکھا چندو سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ دھیان سے چندو کی طرف دیکھنے لگی۔ تو یہ تھی وہ لڑکی جس سے سردار غلام کبیر نے آخری شادی رچائی تھی۔ وہ قبول صورت تھی اور شکل سے بھی معصوم نظر آتی تھی۔ سگے باپ نے روپے کی خاطر اسے دیدہ دانستہ ایک جہنم میں جھونکا تھا۔

سانگر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''غلام کبیر کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ چندو مینڈی پسند تھی۔ ویاہ کے بعد اس نے مجھے حویلی سے فارغ کر کے باہر کے کام پر لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک احسان مینڈے اوپر اور کیا۔ اپنے خرچے سے مینڈا ویاہ مینڈی برادری کی ایک کُڑی نا جی سے کروا دیا۔ نا جی رج کے سوہنی کُڑی ہے۔ مینڈے ساتھ ویاہ سے پہلے بھی وہ ایک بندے سے لکھت (طلاق) لے چکی تھی......ویاہ کے بعد مجھ کو اس کے اور کرتوتوں کا پتا بھی چلا۔ ویاہ کے چار پانچ مہینے بعد ہی وہ کنجری کہیں دفع ہو گئی اور میں نے سکھ کا ساہ لیا۔''

ناصر اب اپنا پستول ہولسٹر میں رکھ چکا تھا۔ اس نے کھوہ کی کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔ ''تم دونوں شادی شدہ ہونے کے باوجود اب بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو؟''

''وہ شادیاں کہاں تھیں جی، وہ تو بس زور زبردستی تھی۔ غلام کبیر کمینہ آدمی تھا۔ عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ چندو کے پنڈے پر اب بھی مار کے نشان ہیں اور سچ پوچھیں جی تو ایک دوجے سے دور ہو کر اساں دونوں کی محبت اور بڑھی ہے۔ اب تو......اب تو اساں کو لگتا ہے کہ اساں ایک دوجے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔'' سانگر جذباتی لہجے میں بولا۔

''کیا، اب غلام کبیر کے مرنے کے بعد تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے؟'' ناصر نے دریافت کیا۔

میں نے تساں کو بتایا ہے ناں کہ غلام کبیر کا چھوٹا بھائی فیض پیارا بڑا چنگا بندہ ہے۔ اس کی طرف سے اساں کو کوئی ڈر خطرہ نہیں ہے۔ ہم آزاد ہیں۔''

''یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم کیا کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے یہ نہانے والا چکر؟'' ڈاکٹر ناصر نے پوچھا۔

لڑکی چندو اور نوجوان سانگر کے چہروں پر ایک ساتھ شرم کی سرخی پھیل گئی۔ یہ تصور ان کے لئے پریشان کن تھا کہ کھوہ کے اندر سے ان کی حرکات وسکنات دیکھی جاتی رہی ہیں۔

سانگر نے ذرا توقف سے کہا۔ ''اساں اجرائیوں کی ایک خانہ بدوش برادری سے ہیں۔ اساں کی (ہماری) کچھ رسمیں بالکل او [illegible] ہیں۔ اساں دے رواج کے مطابق اساں اپنے آس پاس کوئی ایسا ٹیلہ دیکھتے ہیں [illegible] جناور جیسی ہو۔ پھر اساں اس ٹیلے کو برکت والا سمجھتے ہیں اور اس کے [illegible] ہے۔ تساں نے یہ سامنے والا ٹیلہ شاید غور سے نہیں دیکھا۔ اس کی شکل اونٹ [illegible] کی چوٹی اونٹ کی کوہان بناتی ہے اور دائیں طرف کا سرا اونٹ کی [illegible] جیسا [illegible] (ہمارے) واسطے یہ برکت والا ٹیلہ ہے۔

آسے پاسے اساڈی برادری کے جتنے بھی لوک ہیں وہ یہاں آ کر منتیں مانتے ہیں۔''

''تم نے کیا منت مانی ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

نوجوان سانگر کے چہرے پر ایک بار پھر شرم کی سرخی دوڑی۔ وہ بولا۔ ''اساں کوئی منت نہیں مانی جی۔ بس اپنے آپ کو پاک کیا ہے۔ اساڈا یقین ہے کہ اگر اس جگہ کی مٹی کو جسم پر مل مل کر نہایا جائے تو ہر گندگی دور ہو جاتی ہے۔ اج اساں کی ہر گندگی بھی دور ہو گئی ہے۔ اساں اسی طرح ہو گئے ہیں جیسے زور زبردستی کے ویاہ سے پہلے تھے۔ اب اساں ایک ہو جائیں گے اور یہ سب کچھ جس کی وجہ سے ہوا ہے وہ رستم صاحب ہیں۔ اساں زندگی بھر ان کا احسان نہیں دے سکتے۔''

سانگر پھر بے حس وحرکت پڑے رستم کو دیکھنے لگا۔ سانگر کی آنکھوں میں عقیدت کے ساتھ ساتھ غم کا رنگ بھی تھا۔ یہ غم یقیناً رستم کی حالتِ زار کی وجہ سے تھا۔ رستم ایک مفلوج، معذور اور کمزور شخص دکھائی دیتا تھا۔ انسان جسے تصور میں ہیرو دیکھتا ہے اسے حقیقت میں بھی ہیرو دیکھنا چاہتا ہے۔ اب تصور اور حقیقت آپس میں میل نہیں کھا رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ نوجوان سانگر کی آنکھوں میں دکھ کروٹیں لے رہا تھا۔

''رستم صاحب کی ٹانگ کیا لڑائی میں گئی ہے؟'' سانگر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

سانگر کی اس بات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ سانگر کچھ خجل نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تک کھوہ میں خاموشی طاری رہی پھر سانگر عجیب لہجے میں بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم تساں کون کون ہو۔ تساں یہاں کیسے پہنچے ہو اور تساں کے ارادے اب کیا ہیں لیکن میں ایک بات پورے سچے دل کے ساتھ تساں تینوں کو بتانا چاہتا ہوں۔ میں رستم صاحب کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مینڈے لئے جو حکم ہو وہ مجھے بتائیں، میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چاہے اس کے لئے مینڈی جان بھی جاتی ہو مجھے اس کی فکر نہیں ہے۔''

پتا نہیں کیا بات تھی۔ شانی کو سانگر نامی اس نوجوان کی باتوں میں گہری سچائی نظر آ رہی تھی۔ ایک منہ زور جذبہ تھا جو اس کی آواز میں لہریں لے رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ رستم کی حالتِ زار پر گھبراتا سف بھی تھا۔

''تم کیا کر سکتے ہو؟'' شانی نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مجھ کو لگتا ہے کہ [illegible] اس کھوہ میں پھنسے ہوئے ہو اور یہاں سے نکلنا چاہتے ہو اور تساں [illegible] چاہیے۔ کیونکہ رستم صاحب کی حالت اچھی نہیں ہے۔ باہر دور تک پلس کا خطرہ ہے۔ پر مینڈا خیال ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح تساں کو یہاں سے نکال سکتا ہوں۔''

ساگر کی آنکھوں میں دیہاتی ذہانت کی چمک تھی۔ وہ جو اندازے لگا رہا تھا وہ بالکل درست تھے۔ شانی کو یوں لگا جیسے مہربان انسپکٹر شاد کے بعد قدرت نے انہیں ایک اور مددگار فراہم کر دیا ہے۔ پردہ غیب سے ایک اور ہمدرد ان کے لئے ظہور پذیر ہو گیا تھا لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا وہ اکیلا یہ سب کچھ کامیابی سے کر سکتا ہے۔

گریس اس ساری گفتگو کے دوران میں خاموش بیٹھی رہی تھی۔ گفتگو اردو میں تھی اور اسے بہت کم الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر رستم کی طرف چلی گئی۔ ڈاکٹر ناصر نے رستم کے گھٹنے کی بینڈیج کھول رکھی تھی۔ گریس باریک بینی سے گھٹنے کے زخم کا معائنہ کرنے لگی۔ یہ زخم واضح طور پر آرے کا تھا۔ ایک بے رحم شخص نے رستم کے جسم کا وہ حصہ ہی کاٹ ڈالا تھا جس سے اسے ضرب لگائی گئی تھی لیکن ابھی اس کا انتقام پورا کہاں ہوا تھا۔ وہ ابھی رستم کو تشدد کی چکی میں پیسنا چاہتا تھا۔ اس سے رحم کی بھیک منگوانا چاہتا تھا اور پھر پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ ایک خطرناک ڈاکو اور ایک سفاک پولیس والے کی خونی کشمکش تھی اور ابھی اپنے انجام کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وڈے ڈیرے کی خون ریز لڑائی میں لاشوں کے ڈھیر کے اندر سے ایک ''لاش'' زندہ نکل آئی تھی اور یہ رستم تھا اور یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ بظاہر ختم ہو جانے کے باوجود یہ لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ انسپکٹر شاد سمیت ابھی تک کل پانچ افراد تھے جو یہ جانتے تھے کہ رستم ابھی تک زندہ ہے۔ اب ان پانچ افراد میں دو افراد مزید شامل ہوئے تھے۔ روپائی گاؤں کا ساگر اور روپائی گاؤں کی چندو۔ اب یہ لوگ نیم جان و نیم بے ہوش رستم کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

شانی اور ڈاکٹر ناصر کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا ساگر اور چندو اس بات کو راز رکھ سکیں گے کہ رستم ابھی تک زندہ ہے۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ اس سوال کے جواب پر ہی منحصر تھا کہ چندو اور ساگر کو یہاں سے جانے دیا جائے یا نہیں۔

اس بارے میں کافی دیر تک گفت و شنید ہوئی۔ پھر ساگر سل ہٹا کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی سرخی مائل مٹی تھی جس سے اس نے اپنی محبوبہ کا جسم مل مل کر دھویا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں جنگلی بیری کی ایک شاخ تھی۔ بلکہ یہ ایک ... تھا۔ اس پر موٹے کانٹے بھی موجود تھے۔ ساگر نے سرخی مائل مٹی کا ایک ڈلا اپنے سر رکھا اور کانٹے دار شاخ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لی۔ یوں مضبوطی سے پکڑنے کے سبب کانٹے اس کی ہتھیلیوں میں چبھ گئے اور انگلیوں کی پوروں سے لہو رسنے لگا۔ ساگر نے عجیب ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی دیکھا ہے

بس اپنے تک رکھوں گا۔ جان بھی چلی جائے تو کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

پھر اس نے اپنے خون آلود ہاتھوں سے مٹی کا ڈلا چندو کے سر پر رکھا اور کانٹے دار شاخ اس کی طرف بڑھا دی۔ اندازہ ہوا کہ وہ چندو کو بھی قسم کے عمل سے گزارنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے اسے منع کر دیا اور شاخ چندو کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ شانی اور گریس سے انگریزی میں مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں یہاں کے رسم و رواج کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ بیری کی کانٹے دار شاخ ہاتھ میں لے کر یوں جو قسم کھائی جاتی ہے یہ سب سے بڑی قسم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نوجوان اس قسم کا پاس ضرور رکھے گا۔ ایسے معاملوں میں یہ لوگ بڑے محتاط اور حساس ہوتے ہیں۔''

نہ جانے کیوں شانی کا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ ساگر نامی یہ نوجوان ان سب کے لئے امید کی کرن ثابت ہوگا اور کچھ نہ کچھ فائدہ انہیں ضرور پہنچائے گا۔ جہاں تک چندو کا سوال تھا وہ ایک بالکل سیدھی سادی اور بے ضرر لڑکی نظر آتی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ ساگر ہی اس کے لئے زندگی کا دوسرا نام ہے اور وہ وہی کچھ کرے گی جو ساگر اس سے کہے گا۔

شام کے سائے لمبے ہونے سے پہلے ہی نوجوان جوڑا وہاں سے چلا گیا۔ جانے سے پہلے ساگر نے ایک بار پھر رستم کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور چندو نے رستم کے اکلوتے پاؤں کو چھو کر اپنے نم بالوں کو ہاتھ لگایا جیسے رستم کے پاؤں کی مٹی سے اپنی مانگ بھر رہی ہو۔

☆======☆======☆

یہ دوسرے روز سہ پہر کا واقعہ ہے۔ بیداری کے ایک مختصر وقفے کے بعد رستم پھر پُرسکون نیند سو گیا۔ ڈاکٹر ناصر اسے مسلسل سکون آور ادویات دے رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیداری کے عالم میں رستم شدید بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ سکون آور دوا کے بغیر اس کی آنکھوں میں ہیجانی کیفیت دکھائی دیتی تھی اور کسی وقت یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی حالت کی پرواہ کیے بغیر اٹھے اور یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا۔

رات پچھلے پہر ڈیرے کی طرف ایک زبردست دھماکا ہوا تھا۔ شانی اور گریس وغیرہ کی طرح رستم بھی ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ وہ باقاعدہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور یوں لگا تھا کہ اس کی نگاہیں اپنی رائفل کو تلاش کر رہی ہیں۔ شانی لپک کر اس کے پاس پہنچی تھی اور اسے بانہوں میں لے کر دوبارہ لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

رستم کے غنودہ ذہن میں پتا نہیں کیا آیا تھا۔ وہ شانی سے بار بار پوچھنے لگا تھا۔ ''بی بی! آپ کے تایا کہاں ہیں؟ ریاض نے انہیں چھوڑ دیا ہے ناں؟ وہ ٹھیک ہیں ناں؟''

شانی نے کہا تھا۔ ''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔''

اب وہ پھر سو رہا تھا۔ شانی یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سمندر کی پُرسکون سطح کی طرح تھا جس کے نیچے مہیب طوفان پلتے ہیں۔ ان طوفانوں کا تصور شانی کے دل کو مٹھی میں جکڑ رہا تھا۔

اچانک کچھ آہٹوں نے ان تینوں کو ایک بار پھر بری طرح چونکا دیا۔ یہ زیادہ افراد تھے جو کافی تیزی سے ان کی طرف آ رہے تھے۔ ڈاکٹر ناصر نے ہولسٹر سے پسٹل کھینچ کر اس پر سائلنسر چڑھا لیا۔ سل کی اطراف سے نیم خشک مٹی ہٹا کر انہوں نے باہر جھانکا۔ شانی کو آٹھ کے قریب افراد نظر آئے۔ ان میں سے دو عورتیں تھیں۔ مردوں کی طرح یہ بھی مقامی لباس

میں تھیں۔ گھونگھٹ ان کے چہروں پر تھے۔ مردوں میں سے چار افراد نے لکڑی کا ایک تختہ کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ بظاہر یہ ایک جنازہ نظر آتا تھا۔ لاش پر جنگلی بیری کی بہت سی تازہ شاخیں رکھی تھیں۔ عورتیں عجیب انداز میں روتی ہوئی آ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور واویلا کر رہی تھیں۔

مردوں میں سانگر کو پہچان کر شانی بُری طرح چونکی۔ ''ڈاکٹر! کیا تم بھی وہی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہی ہوں؟'' شانی نے سرگوشی کی۔

''ہاں۔ یہ سانگر ہے۔ میرا خیال ہے یہ لوگ اندر آنا چاہ رہے ہیں۔''

شانی نے کہا۔ ''ڈاکٹر تم اندھیرے میں چلے جاؤ۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو سنبھال لینا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ناصر بولا اور کھوہ کے ایک دور افتادہ گوشے میں رُوپوش ہو گیا۔

سانگر نے سل کی دوسری طرف پہنچ کر ڈاکٹر ناصر کو پکارا۔ شانی اور گریس نے احتیاط کے ساتھ سل سرکا دی۔ عورتوں سمیت دو افراد تیزی سے اندر آ گئے۔ لکڑی کا تختہ اور اس پر موجود انسانی جسم بھی اندر گھسیٹ لیا گیا۔ سانگر کے ہاتھ میں آج پھر ایک گٹھڑی نظر آ رہی تھی۔ وہ بے حد عجلت میں نظر آتا تھا۔

ناصر نے اسٹریچر نما تختے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے سانگر؟''

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ''ہماری برادری کا ایک مزدور ہے۔ آج صبح سویرے مر گیا ہے بے چارہ۔ یہ اس کی ماں ہے۔ یہ بھرجائی ہے۔ یہ باقی کے رشتے دار ہیں۔''

''اسے یہاں کیوں لائے ہو؟'' ناصر نے پوچھا۔

''پہلے تساں میڈی پوری بات سن لو جی۔'' سانگر نے کہا۔ ''یہ بندہ آج صبح سویرے اوپر ڈیرے پر مرا ہے۔ وہاں دو تین سرنگیں اکٹھی پھٹی ہیں۔ تین مزدور اور بھی جان سے گئے ہیں۔ دوسروں مزدوروں کی طرح اس بندے کی لاش بھی اساں نے نیچے گاؤں میں لے کر جانی ہے۔ میں نے سوچا کہ اساں اس لاش کی آڑ میں رستم صاحب کو یہاں سے لے جائیں۔ یہ خدا کی طرف سے اساں کو ایک بڑا اچھا موقع ملا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

سانگر نے اپنی گٹھڑی کھولی۔ اس میں مقامی طرز کے بہت سے کپڑے تھے۔ پگڑی اور جوتے بھی تھے۔ دو تین زنانہ لباس بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سانگر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ کپڑے وغیرہ پہن کر ساڈے جیسا روپ دھار لیں اور یہاں سے نکل چلیں۔ مجھ کو

پورا یقین ہے کہ اساں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ رستم بھائی کو تختے پر لٹا دیا جائے۔" ناصر نے پوچھا۔

"بالکل۔ میں یہی چاہتا ہوں۔"

"اور یہ میت جو تم ساتھ لائے ہو؟"

"میں تساں کو اس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں۔" ساگر نے کہا اور پھر تفصیل کے ساتھ اپنے پروگرام سے ان تینوں کو آگاہ کرنے لگا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد مقامی مزدور کی ادھ جلی لاش کھوہ کے اندر ہی ایک گڑھے کے اندر دفن ہو چکی تھی۔ اس کے اوپر چھوٹے بڑے پتھر رکھ دیئے گئے تھے۔ جلدی میں دو چار رسمیں بھی ادا کی گئی تھیں۔ مرنے والے کے لواحقین اس بات پر مطمئن نظر آتے تھے کہ مرنے والے کو پاک ٹیلے کے مقدس نواح میں آخری آرام گاہ ملی ہے۔ یہ مزدور اور اس کے ساتھی صبح سویرے بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے جاں بحق ہوئے تھے۔ یہی وہ دھماکہ تھا جو آج علی الصبح شانی وغیرہ نے سنا تھا۔

رستم کو ڈاکٹر ناصر نے سکون آور ادویات کی بھاری ڈوز دی تھی۔ اس ڈوز کے سبب رستم نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نیم بے ہوشی کے سبب اسے اپنے زخموں کی شدید تکلیف سے بھی نجات ملی ہوئی تھی۔ شانی کے لئے یہ منظر دیکھنا بڑا تکلیف دہ تھا کہ رستم کو لکڑی کے تختے پر ایک لاش کے طور پر لٹا دیا گیا۔ اس کے اوپر جنگلی بیری کی بہت سی شاخیں ڈال دی گئیں۔

شانی کے علاوہ گریس اور ڈاکٹر ناصر بھی مقامی لباس میں نظر آرہے تھے۔ شانی اور گریس کی بانہوں میں مقامی طرز کی بہت سی چوڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ موٹی اوڑھنیوں اور لمبے گھونگھٹ کی وجہ سے ان کے چہرے اور بازو وغیرہ مکمل طور پر چھپ گئے۔ ساگر نے انہیں سمجھایا کہ "میت" کے پیچھے پیچھے انہیں کس طرح دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ کر چلنا ہے۔ نوحہ گری کی ذمے داری باقی دونوں عورتوں پر تھی۔

ڈاکٹر ناصر نے کہا۔ "اصل مسئلہ گریس صاحبہ کے گورے چٹے پاؤں کا ہے۔ ان کا کیا کریں گے؟"

"مینڈے دماغ میں اس کا حل ہے۔" ساگر نے کہا۔ "ان کو ابھی کیچڑ سے گزاریں گے۔ پاؤں گارے میں بھر جائیں گے۔ کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ بس مجھے ایک بات کا دکھ ہے۔ مینڈی ان دونوں بہنوں کو کئی میل تک ننگے پاؤں چلنا پڑے گا۔ یہ مجبوری ہے۔ یہاں

مرنے والے کے پیچھے ننگے پاؤں ہی چلا جاتا ہے۔ یہی رواج ہے۔"

پتھریلی راہ پر ننگے پاؤں چلنا واقعی ایک دشوار عمل تھا۔ تاہم شانی دیکھ رہی تھی کہ ساگر سمیت میت کے ساتھ آنے والے تمام مرد و زن ننگے پاؤں تھے۔

کھوہ سے روانہ ہونے سے پیشتر انہوں نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹا دیئے۔ سائلنسر لگا پسٹل اور گولیوں کی بیلٹ ناصر نے اپنے کرتے کے نیچے چھپالی تھی۔ ساگر کے پاس بھی چھوٹی نال کی رائفل موجود تھی جو اس نے اپنی چادر کے نیچے کیموفلاج کر رکھی تھی۔ باقی افراد کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ شانی نے ایک اور بات بھی نوٹ کی۔ ساگر کے علاوہ کسی مقامی شخص کو رستم کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ بس یہی جانتے تھے کہ وڈے ڈیرے کی لڑائی میں زخمی ہونے والے ایک شخص کو یہاں سے بچا کر لے جارہے ہیں۔

شام کے سائے طویل ہونا شروع ہو گئے تھے جب وہ کھوہ سے نکلے اور نشیب کی طرف چلنا شروع ہوئے۔ عورتیں ایک بار پھر گریہ زاری کرنے لگی تھیں۔ ان کی گریہ زاری میں حقیقت کا رنگ تھا۔ آج ان کا ایک پیارا ان سے جدا ہوا تھا۔ وہ اسے ان ٹیلوں میں دفن کر کے جارہی تھیں۔ باقی افراد کے سر بھی جھکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حقیقی آنسو اور چہروں پر غیر بناوٹی سوگواری تھی۔ ان میں سے چار افراد نے اسٹریچر نما تختے کو اپنے کندھوں پہ سہارا دے رکھا تھا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے شانی کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ چیک پوسٹ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ قریباً پچاس میٹر کی دوری پر راستے کے عین اوپر ایک طویل بانس تھا۔ اس کے قریب ہی دو خیمے نظر آرہے تھے۔ یہاں مسلح پولیس اہلکار موجود تھے۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں رائفلیں دور سے چمکتی نظر آرہی تھیں۔

وہ بہ خیریت اس چیک پوسٹ کے پاس سے گزر گئے۔ آگے نشیبی علاقہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ٹیلے اور ٹیلوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے بل کھاتے راستے تھے۔ قریباً نصف میل آگے جانے کے بعد انہیں پھر ایک پولیس کیمپ نظر آیا۔ یہاں بھی دور تک باوردی پولیس اہلکار اور لیویز وغیرہ کے لوگ دکھائی دیئے۔ اوپر بلاسٹ میں مرنے والے ایک اور مزدور کی لاش بھی یہاں موجود تھی۔ اس لاش کے ساتھ بھی درجن بھر مرد و زن تھے۔ یہ کچھ لوگ دیر ستانے کے لئے ایک درخت تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت مقامی انداز میں رو پیٹ رہی تھی۔ یہ لاش بھی ایک تختے پر رکھی تھی اور اوپر بیری کی بہت سی شاخیں ڈال دی گئی تھیں۔ دونوں "لاشیں" ساتھ ساتھ رکھ دی گئیں۔ شانی کو ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی رستم کے

سانس کا زیروبم محسوس نہ کرلے، یا دوا کا اثر کم ہونے پر رستم کسمسانے نہ لگ جائے لیکن اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

پانچ منٹ ستانے کے بعد دونوں ''لاشیں'' ایک ساتھ روانہ ہوگئیں۔ عورتوں کی نوحہ گری ماحول کو سوگوار کررہی تھی۔ اندھیرا ہونے کے بعد بھی یہ سفر جاری رہا۔ اب دیہاتیوں نے راستہ دیکھنے کے لئے لالٹینیں روشن کرلی تھیں۔ وہ جوں جوں وڈے ڈیرے سے دور ہورہے تھے شانی کے اندیشے ماند پڑتے جارہے تھے۔ اب اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ وہ آگے کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ مستقبل کی صورت گری میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس کی سب سے پہلی ترجیح رستم تھا۔ رستم کی زندگی، اس کی صحت اور اس کی سلامتی۔ وہ ان چیزوں کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار تھی۔

وہ نصف شب کے قریب ویران ٹیلوں میں واقع ایک چھوٹی سی ڈھوک میں پہنچے۔ اس ڈھوک میں بہ مشکل چالیس پچاس گھر ہوں گے۔ سب کچھ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس کتوں کی آوازیں تھیں یا ایک چوکیدار تھا جو لالٹین لئے بڑی سُست رفتاری سے گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ سانگر کے ساتھ جو عورتیں اس مختصر جلوس کے ساتھ ساتھ چلی تھیں وہ راستے کی ایک بستی میں ہی رک گئی تھیں۔ مرد بھی شاید وہیں رک جاتے لیکن رستم کے اسٹریچر نما تختے کو بھی اٹھانا تھا۔ رستم کو ڈھوک کے ایک نیم تاریک کمرے میں پہنچا کر اور کچھ دیر سانس لینے کے بعد یہ جفاکش دیہاتی بھی واپس چلے گئے۔ اب شانی، گریس اور ناصر کے ساتھ صرف سانگر رہ گیا۔ سانگر آج بھی اس بوسیدہ لباس میں تھا جو اس نے اپنی محبوبہ چندو کے ہاتھوں سے نہلائے جانے کے بعد پہنا تھا۔ اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ سردار غلام کبیر کی دی ہوئی پوشاک اتار کر اور اپنی محبوبہ کو پا کر وہ خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہے۔ اس نے راستے میں ڈاکٹر ناصر کو بتایا تھا کہ بیوہ کی ایک چھوٹی سی گھریلو تقریب کے بعد وہ چندو کو اپنے گھر لا چکا ہے۔

سانگر اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا کہ وہ رستم کو خطرناک ترین علاقے سے بہ حفاظت نکال لایا تھا لیکن ابھی خطرات پوری طرح ٹلے نہیں تھے۔ وہ کئی گھنٹے کے دشوار گزار سفر کے بعد وڈے ڈیرے سے بس پندرہ بیس میل دور ہی آسکے تھے۔ وہ جس گھر میں پہنچے وہ ڈھوک کے عام گھروں سے قدرے بڑا اور کشادہ نظر آتا تھا۔ یہاں ان کی ملاقات ایک بوڑھی اجرالی عورت سے ہوئی۔ اس کی عمر ستر اسّی سال کے قریب تھی۔ وہ عجیب داستانی سا کردار لگتی تھی۔ بالکل خاموش اور غمگین آنکھوں والی۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں وادی سون کی ساری کہی

اور اَن کہی کہانیاں موجود تھیں۔

انہوں نے سب سے پہلے رستم کے زخم دیکھے۔ سفر میں لگنے والے مسلسل جھٹکوں کے سبب پہلو کے ٹانکے متاثر ہوئے تھے اور خون رِسنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی میڈیکل کٹ کھول لی اور فوری طور پر اس زخم کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ رستم ابھی تک غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ شانی نے سانگر سے بوڑھی عورت کے بارے میں پوچھا۔

سانگر بولا۔ ''اس اماں کا نام ساوری ہے۔ اس کے تین بیٹے اسے چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ انہوں نے یہاں زمین بیچی تھی۔ وہ گوجر خان میں رہنا چاہتے تھے لیکن اماں ساوری کو اپنی اس حویلی سے پیار تھا اور اب بھی ہے۔ یہ اپنی آخری سانسیں یہیں لینا چاہتی ہے۔''

''اکیلی رہتی ہے یہاں؟''

''نہیں جی۔ بیٹوں کے چھوڑ جانے کے بعد اس نے ایک یتیم لڑکے کو دیکھ بھال کے لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس کا نام تاجا ہے۔ وہ یہیں کہیں پر ہوگا۔''

پھر اس نے اماں کو مخاطب کرتے ہوئے پوٹھوہاری لہجے میں پوچھا۔ ''اماں، او تاجا کتھے ای؟''

اماں نے مبہم سا جواب دیا جو شانی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھیں اس کی پریشانی کو سانگر نے بھی محسوس کیا۔ ''اماں۔ توں ٹھیک تے ہے ناں؟''

اماں نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈولتی ہوئی سی اندر چلی گئی۔ شانی نے کہا۔ ''سانگر! لگتا ہے اماں کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔''

''نہیں نہیں جی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مینڈے پر یقین کرو۔ میں اچانک نہیں آیا ہوں۔ اماں کو ساری گل بتا کر گیا تھا۔ اماں مینڈی دور کی رشتے دار ہے، مجھ کو اپنے پوتروں کی طرح چاہتی ہے۔ مینڈی ہر بات مانتی ہے۔ مینڈا خیال ہے اس کی طبیعت شاید خراب ہے۔''

سفر کی تھکان نے سب کا بُرا حال کررکھا تھا۔ اپنے اردگرد کے خطرات کو بھلا کر وہ کچھ دیر سو جانا چاہتے تھے۔ سامنے ہی تپائی پر چمڑے کا ایک پرانا بیگ پڑا تھا۔ اس بیگ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں شانی کا ذہن اس بیگ کی طرف منتقل ہوگیا جو اسے وڈے ڈیرے پر ضمیر احمد کے قریب نظر آیا تھا۔ ضمیر احمد کے ایک جونیئر ساتھی نے وہ وزنی بیگ پُراسرار انداز میں تھام رکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ سرخی مائل بیگ ابھی تک شانی کے دل و دماغ سے نکلا نہیں تھا۔ مقامی طرز کے بھاری بھرکم لباس میں گریس کو گرمی محسوس ہورہی تھی لیکن اپنے کپڑے اور جوتے

وغیرہ تو وہ لوگ وہیں کھوہ میں دفن کر آئے تھے۔ شانی کو ایک مردانہ قمیص دکھائی دی۔ سانگر سے پوچھنے پر پتا چلا کہ یہ اسی لڑکے کی ہے جو خدمت گار کی حیثیت سے اماں ساوری کے پاس رہتا ہے۔ شانی نے وہ ہلکا پھلکا جوڑا گریس کو دیا اور اسے کہا کہ وہ یہ بھاری بھرکم لباس بدل لے۔

گریس شلوار قمیص لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ابھی اسے گئے ایک دومنٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کی دردناک چیخ سنائی دی۔ شانی ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ڈاکٹر ناصر اور سانگر بھی بُری طرح چونکے اور دروازے کی طرف بڑھے لیکن ابھی وہ دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھے کہ دروازہ ایک پُرشور دھماکے سے کھلا۔ جو منظر دکھائی دیا وہ بھونچکا کر دینے والا تھا۔ گریس نیم عریاں حالت میں نظر آئی۔ وہ شلوار پہن چکی تھی لیکن قمیص کی صرف ایک آستین میں اس کا بازو گیا تھا۔ باقی قمیص سے اس نے اوڑھنی کا کام لیتے ہوئے اپنی عریانی ڈھانپ رکھی تھی۔ گریس کے عقب میں ایک ڈھاٹا پوش شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی جس کا بیرل گریس کی سرخ وسپید گردن میں گھسا جارہا تھا۔ گریس کی دبلی پتلی کمر حملہ آور کے آہنی بازو کی گرفت میں تھی۔

گریس اتنی جلدی ہار ماننے والی لڑکی نہیں تھی لیکن حملہ آور نے پلک جھپکتے ہی اسے بے بس کر ڈالا تھا۔ گریس نے مدد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''خبردار۔'' حملہ آور گرجا اور بیرل کچھ اور بھی گریس کی گردن میں گھسا دیا۔ گریس کراہنے لگی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

سانگر نے اپنی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن حملہ آور کے تیور دیکھ کر رک گیا۔ ڈاکٹر ناصر بھی اپنے پسٹل سے دور تھا۔ حملہ آور پھنکارا۔ ''دروازہ بند کر کے لالٹین کی روشنی کم کرو۔ ورنہ ام ایک ایک کو بھون ڈالے گا۔''

شانی نے دیکھا، اچانک ڈاکٹر ناصر کے تاثرات بدل گئے ہیں۔ وہ بڑے دھیان سے حملہ آور کے ڈھاٹا پوش چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کون ہو تم؟'' ناصر نے حملہ آور کی طرف انگلی اٹھائی۔

اب حملہ آور نے بھی ذرا غور سے ڈاکٹر ناصر کی طرف دیکھا۔ اس کی گرفت آپوں آپ گریس پر ڈھیلی پڑگئی۔ گریس کسی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ اس نے تڑپ کر خود کو حملہ آور کی پکڑ سے چھڑایا اور دور کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ حملہ آور کی نگاہیں مسلسل ڈاکٹر ناصر پر جمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ناصر دو قدم چل کر حملہ آور کے قریب آیا۔ ''میرا خیال ہے، میں نے تمہیں پہچان

لیا ہے۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''تم...... خان اجمل ہو؟''

حملہ آور نے ایل ایم جی کی مہلک نال ذرا نیچے جھکالی۔ ''امارا خیال ہے کہ ام بھی تمہیں پہچان رہا ہے۔ تم رستم صیب کا ساتھی ہے۔ ڈیرے پر تم علاج ملاج کرتا تھا۔ لل لیکن یہ باقی لوگ کون ہیں؟''

''تم یہ کپڑا منہ سے ہٹاؤ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں سب کچھ۔''

اس نے کپڑا ہٹا دیا۔ شانی کے سامنے بھرے بھرے چہرے والا ایک سرخ وسپید پٹھان تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پیشانی پر بھی پانچ چھ روز پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ ''زندگی مبارک ہو اجمل خان۔'' ڈاکٹر ناصر نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''تم کو بھی، لیکن......امارے رستم بھائی کا کیا خبر ہے؟'' اجمل خان کے لہجے میں حد درجے کی بے تابی اور تشویش تھی۔

ڈاکٹر ناصر نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم رستم بھائی سے زیادہ دور نہیں ہو۔''

''کیا مطلب؟'' اجمل خان کی آواز بھی لڑکھڑا گئی۔

''رستم بھائی سخت زخمی ہیں لیکن زندہ ہیں۔''

''او خدایا......او خدایا۔'' اجمل خان نے دونوں ہاتھ باندھ کر چھت کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ آنسوؤں اور تشکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن آواز گلے میں اٹک گئی۔ خوفناک گن اس کے ہاتھوں سے نکل کر چارپائی پر گر گئی۔ ''ام رستم بھائی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ کہاں ہے وہ؟'' اجمل خان ازحد بے قراری سے بولا اور اس کمرے کی طرف بڑھا جدھر ڈاکٹر ناصر نے اشارہ کیا تھا۔

ڈاکٹر ناصر نے ہاتھ بڑھا کر اجمل خان کو روک دیا۔ ''بڑے آرام سے اجمل خان۔ ان کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سو رہے ہیں انہیں جگانا نہیں۔''

اجمل خان نے باقاعدہ روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور دھیمے قدموں سے ساتھ والے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ لالٹین کی روشنی میں رستم دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ پانچ چھ روز میں ہی اس کے چہرے کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آنے لگے تھے۔ اجمل خان مجسمے کی طرح ساکت کھڑا یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ عقیدت تھی جیسے وہ پجاری ہو اور دیوتا کو دیکھ رہا ہو...... اس کی آنکھوں سے مسلسل اشک بہہ رہے تھے۔

ساتھ والے کمرے سے بوڑھی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ وہ سب چونک گئے۔

اجمل خان بھی چونک گیا۔ آنکھیں پونچھتا ہوا وہ تیزی سے مڑا، شانی نے سمجھا کہ شاید وہ بوڑھی عورت کی طرف جائے گا لیکن وہ ایک عقبی کمرے کی طرف لپک گیا۔ شانی اور گریس نے غور کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ اس عقبی کمرے کے اندر سے کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں ابھر رہی ہیں۔ اجمل خان نے تیزی سے دروازہ کھولا اور لالٹین اٹھا کر اندر چلا گیا۔ وہ سب بھی اس کے پاس پہنچے۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک پندرہ سولہ سالہ مقامی لڑکا موجود تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہوئے پاؤں سے دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

اجمل خان نے لڑکے کے منہ سے کپڑا نکالا اور پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔ ڈاکٹر ناصر نے بھی اس کام میں اجمل کی مدد کی۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکا آزاد ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں غیض وغضب کی چنگاریاں تھیں۔ چند سیکنڈ کے لئے یوں لگا جیسے وہ اجمل خان پر جھپٹ پڑے گا۔ سانگر نے اس سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں تاجے! میں آگیا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تاجے کے ہونٹ سے خون رس رہا تھا اور چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اجمل خان کے ساتھ شدید مزاحمت کی ہے، جس کے سبب اجمل خان کو اسے باندھنا پڑا۔

اجمل خان نے لڑکے کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''یار! ام کو معاپ کر دو۔ جو کچھ ہوا غلطی سے ہوا۔ ام کو کیا پتا تھا کہ اس گھر میں امارے رستم بھائی کو پناہ ملنے والا ہے۔''

''لیکن......تم یہاں پہنچے کیسے خان؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ام آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاتا ہے لیکن پہلے ام کو اتنا تسلی دے دو کہ رستم بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''رستم بھائی بہت مشکل حالت سے نکل آئے ہیں۔ امید ہے کہ اب معاملہ بہتری کی طرف جائے گا۔'' ناصر نے اجمل خان کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''اور یہ دونوں بیگم صاحبہ کون ہیں؟ کہیں ان میں سے ایک رستم بھائی والا بی بی تو نہیں ہے؟''

بات شانی کے کانوں تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور ظاہر کیا کہ جیسے اس نے کچھ سنا نہیں۔ کچھ دیر بعد شانی نے دوبارہ خان کی طرف دیکھا تو وہ بڑی عقیدت اور وارفتگی سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً ناصر نے سرگوشی کے لہجے میں اسے بتا دیا تھا۔

ناصر کے پوچھنے پر اجمل خان نے بتایا کہ وہ وڈے ڈیرے کی خون ریز لڑائی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ پر گولی لگی تھی اور سر پر بھی گہرا زخم آیا تھا۔ وہ پچھلے چار پانچ دن درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا رہا۔ یہاں بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے پتے بھی چبانا پڑے۔ بہت بڑی جسامت کے ایک جنگلی بلے سے اس کا سامنا ہوا جسے اس نے اپنی لانگ رینج گن سے شوٹ کیا۔ آج صبح اسے درختوں کے جھنڈ کے آس پاس مسلح اجرالیوں کی نقل وحرکت نظر آئی اور وہ وہاں سے کھسک گیا۔ دشوار راستوں پر سفر کرتا وہ تقریباً تین گھنٹے پہلے اس ڈھوک میں پہنچا تھا۔ پہلے اس نے شمالی سرے پر ایک اور مکان میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن وہاں مکین زیادہ تھے اور پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر وہ یہاں اس مکان میں آگیا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔ وہ حویلی کی رسوئی میں گھس گیا۔ ابھی دو چار لقمے ہی لئے تھے کہ یہ لڑکا (تاجا) طوفان کی طرح آ کر اس سے لپٹ گیا۔ بزرگ عورت بھی آ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے ان دونوں کو قابو کیا اور لڑکے کو باندھ دیا۔ بعد میں اس نے عورت کو دھمکی دی کہ اس نے اگر شور مچانے کی کوشش کی تو لڑکے کی جان چلی جائے گی۔

''اس کے بعد کا مالہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔'' اجمل خان نے کہا۔ ''آپ لوگ اس گھر میں آ گئے۔ ام لڑکے سمیت پچھلے کمرے میں گھس گیا اور اماں جی کو سمجھا دیا کہ وہ اپنا زبان کھولنے کا کوشش ہرگز نہ کریں لیکن پھر سارا مالہ الٹ ہوگیا۔ یہ انگریز بی بی صاحبہ کپڑے بدلنے کے لئے پچھلے کمرے میں آ گیا۔ دراصل اس کمرے کو اندر سے کنڈی نہیں لگتا تھا۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا مگر بی بی صاحبہ نے اندازہ لگا لیا کہ یہاں کوئی موجود ہے۔ دراصل لڑکا اپنے بند منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ بی بی صاحبہ ایک دم چلانے لگی۔ ام نے لڑکے کو چھوڑ کر مجبوراً ان کو پکڑ لیا اور آپ کے سامنے آ گیا۔''

اجمل خان نے ساری صورتِ حال واضح کر دی تھی اور اب بار بار تاجے اور بزرگ عورت سے معافی مانگ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ گریس کو بھی معافی طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

غالباً تاجے کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کے زخمی ہاتھ سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ ناصر نے کہا۔ ''اِدھر آؤ، میں تمہارے ہاتھ کی پٹی کر دوں۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی چوٹ موٹ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ اصل چوٹ تو امارے دل پر ہے اور دل کا یہ چوٹ ڈیرے پر ہونے والے قتلِ عام سے لگا ہے۔ اب رستم بھائی کا حالت دیکھ کر یہ چوٹ اور بھی درد کرنے لگا ہے۔ امارے بس میں نہیں ڈاکٹر ورنہ پیدا

کرنے والے کا قسم ہے ام اپنا جان اپنے برادر رستم کے جسم میں داخل کر دے۔'' پھر وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بی بی صاحبہ! ام آپ کا ادنیٰ غلام ہے۔ آپ جو حکم کرے گا ام پورا کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایک دم تیار ہے۔''

ساگر کی طرح اجمل خان بھی شانی کو سچا اور کھرا بندہ لگا۔ اس کی آنکھوں میں جاں نثاری کی چمک تھی۔ ڈاکٹر ناصر نے اجمل خان کا تعارف کراتے ہوئے شانی کو بتایا۔ ''اجمل خان پولیس میں حوالدار ہے اور نشانے بازی میں اس نے کئی ٹرافیاں جیت رکھی ہیں۔ رستم بھائی کے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے یہ وڈے ڈیرے میں آ گیا تھا۔''

''امارا بہت بڑا خوش قسمتی ہے کہ ام رستم بھائی کے ساتھ مل کر لڑا ہے اور اللہ کا حکم ہوا تو ام آئندہ بھی لڑے گا۔ یہ ثابت کر دے گا بی بی صاحبہ کہ جان کی بازی اور وفاداری کیا ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر ناصر نے رستم کے لئے نیا انجکشن تیار کرتے ہوئے کہا۔ ''خان نے وڈے ڈیرے کی لڑائی میں واقعی جی داری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ لڑائی سے پہلے رستم بھائی کے ساتھ پولیس کی پوزیشنوں تک گیا تھا۔ وہاں انہوں نے تین اجرائیلوں کو قتل کیا اور ایک اہم مورچے پر کنٹرول کر لیا لیکن اس کے بعد جو Set Back ہوا وہ آپ کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔ رستم بھائی کی ایکٹرس بیوی کی وجہ سے سارا کام بگڑ گیا۔''

شانی یہ ساری رُوداد رستم کی زبانی بھی سن چکی تھی اور ہر بار جب وہ یہ سب کچھ سنتی تھی تو اس کے دل پر خاص انداز سے چوٹ لگتی تھی۔

وہ سب رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں گندم اور مکئی کی روٹی، آلو انڈے کے سالن اور دہی کے ساتھ کھائی گئی۔ اس کے بعد چائے کے دور چلے۔ لڑکا تاجا صورتِ حال سے سنبھلنے کے بعد اب تندہی سے کام کر رہا تھا۔ بوڑھی عورت اماں ساوری بھی اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ساگر نے مقامی لب و لہجے میں اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس کے گھر میں گھسنے والا ڈاکو نہیں ہے بلکہ ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے سردار غلام کبیر کو قبر کے اندھیرے میں پہنچایا ہے۔ وہ بس اپنی جان بچانے کے لئے یہاں گھسا تھا۔ اماں ساوری اس بات پر مطمئن نظر آتی تھی۔

اماں ساوری کی کہانی عجیب تو تھی لیکن نئی نہیں تھی۔ وہ ان بے شمار بزرگ افراد میں سے تھی جو آخری دم تک اس چار دیواری کو چھوڑنا نہیں چاہتے جہاں انہوں نے زندگی گزاری ہوتی ہے۔ جہاں کے درودیوار میں ان کی یادوں کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ جوانی کی سرگوشیاں،

محبت کے قہقہے، بچوں کی چہکاریں، تہواروں کے رنگ، موسموں کی مہک، سب کچھ ان کے آس پاس موجود رہتا ہے۔ جوان اولادیں اس چار دیواری کو کھنڈر سمجھتی ہیں اور نئے خوب صورت آشیانوں کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہیں لیکن ''کھنڈر'' کی اصل قیمت تو ''کھنڈر والا'' ہی جانتا ہے۔

یہ اماں ساوری بھی اس ٹوٹی پھوٹی حویلی میں یادوں کے خزانے کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی اور اپنے آخری سانس اسی چار دیواری میں لینا چاہتی تھی۔

شانی کو بے اختیار اماں ساوری پر پیار آیا اور اس نے لالٹین کے پاس بیٹھے بیٹھے بڑی محبت سے اماں ساوری کے جھریوں بھرے ہاتھ تھام لئے۔ اماں کے ہاتھ تھامتے ہی پتا نہیں کیوں اسے اپنے بزرگ بھی یاد آ گئے۔ امی، ابا جی، ارشاد اور رنگ والی کی حویلی سے ان دونوں کی گہری محبت۔ کتنا خوب صورت گھرانہ تھا وہ۔ کتنے حسین شب و روز تھے۔ درودیوار میں چہکاریں گونجتی تھیں اور سہیلیوں کے جھرمٹ شانی کے گرد موجود رہتے تھے اور پھر ایک ایک کر کے سب کچھ بکھر گیا۔ تنکا تنکا ہو گیا۔ اب وہ حویلی یادوں کا کھنڈر تھی۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ ایک دم بوڑھی ہو جائے۔ زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جائے اور پھر اماں ساوری بن کر رنگ والی کی حویلی کے ویران کھنڈر میں جا بسے۔ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لینے کے لئے۔ اس نے واقعی خود کو ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنی حویلی کے درودیوار میں تنہا چکراتے محسوس کیا۔ وہ حویلی کے درودیوار پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہاں موجود اشیاء کو سہلا رہی تھی، انہیں صاف کر رہی تھی۔ وہ وہاں کی نگہبان تھی۔

لیکن پھر وہ ایک دم چونک گئی۔ وہ حویلی کی نگہبان نہیں تھی۔ وہ تو زخمی اور بیمار رستم کی نگہبان تھی۔ اسے اپنی تمام توانائیاں، اپنی تمام صلاحیتیں رستم کی صحت و سلامتی پر مرکوز رکھنا تھیں۔ وہ بہت لٹ چکا تھا۔ اس کے لئے بہت برباد ہو چکا تھا اور اب برباد ہوتے ہوتے موت کے کنارے تک آ پہنچا تھا۔ نہیں، اس سے آگے نہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔ مزید خود کو پتھر بنائے نہیں رہ سکتی تھی۔ اب اسے وہی کرنا تھا جو رستم کی زندگی کے لئے ضروری تھا۔ رنگ والی کی حویلی، نارپور کے درودیوار، لاہور کی وسیع و عریض کوٹھی اور وہاں کے مکین۔ وہ سب کچھ... سب کچھ فراموش کر دینا چاہتی تھی۔ **فی الوقت** وہ صرف رستم کو یاد رکھنا چاہتی تھی۔

اجمل خان کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے آگ روشن تھی۔ وہ سا... ستے ...ہہ رہا تھا۔ ''ام رستم بھائی کو یہاں سے نکالے گا اور پروردگار نے چاہا تو ایسے نکالے گا جیسے

مکھن سے بال نکلتا ہے۔ ام کوئی آنچ نہیں آنے دے گا اپنے برادر پر۔"

ساگر نے کہا۔ "خان بھائی! تم اکیلے نہیں، اساں دونوں یہ کام کریں گے۔ اساں دونوں برابر کی پریشانی لیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ ان سرداروں اور ان کے حضرت صاحب جیسے مرشدوں سے امارا آخری لڑائی ابھی باقی ہے۔ یہ تو بس وقپا (وقفہ) ہے۔ اس وقپے میں ام نے اپنے رستم بھائی کو بچانا ہے اور پھر سے کھڑا کرنا ہے۔ ایک دم اٹین شن کرنا ہے۔" خان نے نئے ولولے سے کہا۔

"میںڈے دماغ میں ایک طریقہ ہے۔ میں تساں کو اس بارے میں بتاتا ہوں۔" ساگر بولا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف چلے گئے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ ڈاکٹر ناصر بڑی تندہی سے رستم کی پٹیاں بدلنے میں مصروف تھا۔

شانی اور گریس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں۔ شانی عجیب نظروں سے ساگر اور اجمل خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کتنے فکرمند اور پُرعزم دکھائی دیتے تھے وہ دونوں۔ رستم سے ان کا خون کا رشتہ نہیں تھا، نہ ہی وہ ان کا کوئی سگا تھا لیکن وہ اس کے لئے سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے تیار تھے اور ان سے پہلے شانی انسپکٹر شاد سے مل چکی تھی جس نے رستم کی بے لوث مدد کی تھی۔ اپنی نوکری اور زندگی کو خطرے میں ڈال کر انہیں ایک جان لیوا گھیرے سے نکالا تھا اور کھوہ تک پہنچایا تھا اور اس سے پہلے شانی نے مہتم سردار دراج اور عارف کبوہ جیسے مخلص لوگ دیکھے تھے، جنہوں نے بے وجہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگاتے ہوئے رستم اور شانی کو نارپور کے چوہدریوں سے بچایا تھا۔ یہ سب لوگ اس بات کی علامت ہیں کہ معاشرے میں بُرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور شاید یہی لوگ ہیں جن کے طفیل گلی کوچوں میں زندگی ابھی تک رواں دواں ہے؛ سورج ڈوب رہا ہے اور دوبارہ "مشرق" سے طلوع ہو رہا ہے۔

وہ سوچتی رہی۔ اسے وہ دن یاد آئے جب وہ نارپور سے بھاگ کر لاہور پہنچی تھی۔ ایک اجنبی شہر تھا اور اجنبی لوگ۔ وہ اکیلی تھی۔ اسے ہر طرف خون آشام لوگ نظر آئے تھے۔ سکندرے سے کامی جیسے آوارہ غنڈے، عثمانی جیسے مفاد پرست، قاسم برلاس جیسے جابر اور زکریا جیسے لالچی۔ ان دنوں شانی کا اعتماد ہر شخص پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے سائے سے بھی بدکنے لگی تھی، لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ زندگی کے اس خارزار میں اسے بُرے لوگوں کے ساتھ اچھے لوگ بھی مل رہے تھے جن کے چہروں پر سچائی درج تھی اور جو کسی مفاد کے بغیر حق کا

ساتھ دینے کی فطرت رکھتے تھے۔ ایسا ہی ایک شخص لالٹین کی روشنی میں تندہی سے رستم کی مرہم پٹی کر رہا تھا اور ایسے ہی دو شخص کمرے کے ایک گوشے میں موجود تھے اور سرگوشیوں میں کوئی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

"تساں نے اور چائے پینی ہے؟" لڑکے تاجے نے دروازے میں آ کر پوچھا۔

اجمل خان نے کہا۔ "بچے! ام تو تم کو اور تکلیف نہیں دے سکتا۔ ام پہلے ہی بہت زیادہ شرمندہ ہے۔ تم ساگر بھائی سے پوچھ لو۔"

تاجے نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ چائے بنے گی کیونکہ ساگر بھائی کبھی چائے سے انکار نہیں کرتا۔"

تاجا چلا گیا تو خان نے ہولے سے کہا۔ "چائے اور نسوار تو انکار کرنے والا چیز ہی نہیں ہے۔ جہاں سے اور جب بھی ان چیزوں کا آپر ملے پورا قبول کر لینا چاہیے۔ ورنہ ان چیزوں کا بے عزتی ہو جاتا ہے۔"

بے پناہ دکھ کے باوجود خان کی بات سن کر شانی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شانی کو مسکراتے دیکھ کر اجمل خان کے چہرے پر چمک آ گئی۔ "امارہ بہن کو امارا بات اچھا لگا ہے تو ام اسی طرح کا ایک اور بات بھی سنا سکتا ہے۔ یہ چائے کا بالکل سچا بات ہے۔ امارے گاؤں میں ایک درزی کا نوے سالہ بیوی بہت لڑاکا تھا اور جتنا لڑاکا تھا چائے کا بھی اتنا ہی شوقین تھا۔ خدا خدا کر کے وہ پوت (فوت) ہو گیا۔ درزی صاحب نے حکم دیا کہ میت کے قریب کوئی بھی چائے کا نام نہیں لے گا۔ اسے ڈر تھا کہ بیوی صاحبہ اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔"

"خاوند لوگ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"لیکن وہ اتنا ہوشیار نہیں تھا۔ خود اس نے اپنے جملے میں تو "چائے" کا لپظ (لفظ) بولا تھا ناں۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بیوی صاحبہ کے جسم میں حرکت پیدا ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے یہ حرکت دیکھا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے آ کر انجکشن دیا تب کہیں جا کر وہ اللہ کا بندی پوت ہوا۔"

"ڈاکٹر نے فوت ہونے کا انجکشن لگایا تھا؟" ناصر نے پوچھا۔

"نہیں یار! اس نے تو ٹھیک کرنے کا لگایا تھا لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا ... آپ مذاق مت سمجھنا۔ یہ بالکل سچا بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جسم میں حرکت کسی اور وجہ سے ہوا ہو، لیکن ہوا ضرور تھا۔"

ڈاکٹر ناصر اور خان میں ہلکی پھلکی باتیں شروع ہوگئیں۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ خان ایک دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ اتنے زخم کھا کر اور اتنے بڑے سانحے سے گزرنے کے بعد بھی اس کی حِس مزاح برقرار تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بدترین حالات میں بھی چہرے پر مسکراہٹ موجود رکھنے والا شخص ہے۔

رات زیادہ ہوگئی تھی۔ سب سونے کے لئے لیٹ گئے۔ شانی دیکھ بھال کے لئے رستم کے کمرے میں ہی موجود رہی۔ وہ گریس کو بھی اپنے ساتھ موجود رکھنا چاہتی تھی لیکن گریس یہ کہہ کر کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے، دوسرے کمرے میں اماں ساوری کے پاس چلی گئی۔ گریس کے لہجے میں خفیہ سا پیغام تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ شونی! رستم کو تمہاری ضرورت ہے صرف تمہاری۔ اس کی اس ضرورت کو پورا کرو۔ اس کے زخموں کا مرہم بن جاؤ۔ اس کے مُردہ جسم میں زندگی دوڑا دو اور تم دوڑا سکتی ہو۔ کھوہ کے اندر تمہارے بے تاب بوسوں نے اسے موت سے زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا۔ یہ کرشمہ اسی امر کا اشارہ تھا۔

رستم کے پلنگ کے پاس ہی شانی چارپائی پر لیٹ گئی۔ وہ گہری غنودگی میں تھا۔ بس کبھی کبھی اپنی سرخ انگارہ آنکھیں کھول کر قرب و جوار کو دیکھتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

ڈاکٹر ناصر نے کہا تھا کہ دوا کی ایک خوراک رات بارہ بجے کے بعد دینی ہے۔ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی لیکن یہ آخری خوراک دینے کے بعد۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر گھڑی نے بارہ بجے کا وقت بتایا۔ وہ اٹھی اور رستم کے سرہانے بیٹھ کر بڑے سلیقے سے سیرپ کے دو چمچ اسے پلائے۔ جب وہ دوسرا چمچ پلا رہی تھی، رستم نے غنودگی کے عالم میں اپنے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ دوائی کے چند قطرے رستم کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھی میں جذب ہوگئے۔

شانی نے اپنی اوڑھنی کے پلو کو تھوڑے سے پانی میں بھگویا اور رستم کے سرہانے بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کے ہونٹوں اور داڑھی کو صاف کرنے لگی۔ جب وہ ایسا کر رہی تھی تو رستم نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی نگاہیں شانی کے چہرے پر جم سی گئیں۔ وہ دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس کے سیاہی مائل ہونٹوں سے بہت مدھم آواز نکلی۔ ”بی بی۔“

اس سرسراتی ہوئی آواز کے جواب میں شانی رستم کے چہرے پر کچھ اور جھک گئی۔ ”ہاں رستم۔“ اس نے کہا۔

رستم بس اسے دیکھتا ہی رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

شانی ایک بار پھر گیلے کپڑے سے اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال صاف کرنے لگی۔ رستم نے اپنے دائیں ہاتھ کو نحیف حرکت دی اور شانی کے متحرک ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایسا کرنے کے بعد اس کے زرد چہرے پر عجیب سی طمانیت نظر آئی جیسے وہ گہری غنودگی میں بھی شانی کو اپنے پاس محسوس کر رہا ہو اور اس قرب کے سبب اس کا سارا جسمانی اور ذہنی کرب کم ہوگیا ہو۔

شانی اسی طرح بیٹھی رہی اور دھیرے دھیرے اس کے سر کے بالوں کو سہلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ سو گیا ہے۔ اس کا سانس ایک مدھم گونج کے ساتھ سینے میں آنے اور جانے لگا۔ نیند رستم کے لئے بہت مفید تھی۔ وہ اس کی نیند کو توڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کا ہاتھ رستم کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رستم کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتی تو اس کے بیدار ہونے کا اندیشہ تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کی نگاہیں گاہے بگاہے رستم کے چہرے کی طرف اٹھتی رہیں۔ عجیب جذبے اس کے سینے میں ہلچل پیدا کرتے رہے اور اماں ساوری کی اس شکستہ مکان نما حویلی سے باہر پوٹھوہار کی ایک نیم گرم رات دھیرے دھیرے ڈھلتی رہی۔ بالآخر وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دیئے بغیر وہیں بیٹھی بیٹھی تکیے پر سر رکھ کر سو گئی۔

صبح بھی رستم کی طبیعت بحال رہی۔ شانی کی مسلسل تیمارداری اور ڈاکٹر ناصر کی اَن تھک محنت رنگ لا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد شانی، گریس، ناصر اور سانگر ساتھ والے کمرے میں بیٹھ گئے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگے۔ ناصر کا بجا طور پر یہ خیال تھا کہ اماں ساوری کی اس حویلی میں وہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ پورا علاقہ ہی ان کے قیام کے لئے مخدوش تھا۔ یقینی بات تھی کہ پولیس اور اجرالی چاروں طرف چوکس ہوں گے...... وہ ایسے لوگوں کو تلاش کر رہے ہوں گے جو ڈرامائی طور پر ڈیرے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ تعداد نہ ہونے کے برابر تھی پھر بھی پولیس اس معاملے سے غافل نہیں ہوسکتی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ”مجھے بھائی کے ایک ایسے دوست کا پتا ہے جس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ جو بڑے سے بڑے خطرے میں خوش دلی سے کود جاتا ہے۔ اس کا نام زوار ہے۔ یقیناً آپ کو بھی معلوم ہوگا۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”اگر کسی طرح زوار سے رابطہ قائم کیا جاسکے تو وہ جہاں بھی ہوگا بھائی کی مدد کے لئے دوڑا آئے گا۔“

ناصر کی بات میں وزن تھا۔ ایک لمحے کے لئے شانی کا ذہن بھی اس طرف منتقل

ہوگیا۔ ہر محکمے اور شعبے میں زوار کی دوستیاں موجود تھیں۔ وہ لوگوں کے کام کرتا تھا اور ان سے کام نکلوانا بھی جانتا تھا۔ موجودہ حالات میں وہ مدد کے لئے آگے آسکتا تھا۔ مگر پھر فوراً ہی شانی نے یہ خیال رد کر دیا۔ زوار ایک مہم جُو اور ہنگامہ خیز شخص تھا۔ رستم کی حالتِ زار دیکھ کر وہ بے حد مشتعل ہوسکتا تھا۔ اس کو کال کرنے میں ہنگامہ خیزی کا خدشہ تھا۔ شانی کا ذہن کسی اور رخ پر سوچ رہا تھا۔ وہ اس ٹوٹے پھوٹے رستم کو ان ہنگاموں اور ان خون ریزیوں سے دور، کہیں پُرامن گوشے میں لے جانا چاہتی تھی جہاں وہ اپنی روح اور اپنے جسم کے زخموں کو مندمل کر سکے۔ اپنے تمام دشمنوں اور ان کی بدخواہیوں سے محفوظ رہ سکے۔ وہ ایک بجھتے ہوئے دیے کو تیز ہوا کے رخ پر رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''نہیں ناصر، میں زوار کے مزاج کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ فی الوقت زوار جیسے دوستوں کا رستم کے قریب آنا مناسب نہیں ہے۔ رستم کے لئے ہی نہیں اور اس کے دوستوں کے لئے بھی نہیں۔''

''پھر یہاں سے نکلنے کا راستہ کیا ہوگا۔ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔''

''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ام سانگر کے ساتھ مل کر کچھ نہ کچھ کرے گا۔'' اجمل خان نے اپنے چوڑے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا کرو گے تم؟'' شانی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''آپ یہ پوچھیں کہ ام کیا نہیں کرے گا۔ جب آپ جیسا بہن امارے ساتھ ہے اور اس کا دعائیں امارے ساتھ ہے تو ام اپنے ہاتھوں پر دنیا اٹھا سکتا ہے۔ ام نے رات پروگرام بنالیا ہے۔''

''کیسا پروگرام؟'' ناصر نے پوچھا۔

''خو، ام اور سانگر بھائی کل رات یہاں سے نکل جائے گا۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے زمیندار کے پاس دو مزدا لوڈر ہے جن پر وہ نمک وغیرہ ڈھوتا ہے۔ ام اس سے مل کر لوڈر کا انتظام کرے گا اور اس پر رستم بھائی کو لے کر یہاں سے نکلے گا۔ ام ان کو علاقہ غیر میں لے جائے گا۔ اگر آپ جانا چاہے گا تو یہ اور بھی اچھا بات ہوگا بلکہ امارا دلی تمنا ہے کہ آپ بھی امارے ساتھ ہو۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح ٹرک پر نکلنا ہمارے لئے محفوظ ہوگا۔'' ڈاکٹر ناصر نے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ پولیس نے یہاں سے نکلنے والے سارے راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہوگی۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ پروگرام کے مطابق لڑکا تاجا باہر گیا۔ اسے سانگر نے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی صورت میں کسی شخص کو اندر نہیں لانا۔ کہنا ہے کہ کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر دستک دینے والے اور تاجے کے درمیان بات ہونے لگی۔ سانگر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمسائے کا لڑکا ہوگا۔ سویرے دودھ دینے کے لئے آتا ہے۔'' سانگر کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ ہمسائے کا لڑکا ہی تھا۔ تاجے نے اسے وہیں سے چلتا کیا۔ کچھ دیر بعد پھر دستک ہوئی۔ اس بار کوئی عورت اماں سادری سے ملنے آئی تھی۔ تاجے نے اسے بھی ٹرخا دیا۔ سارا دن اسی کشمکش میں گزرا۔ شام ہوئی اور پھر اندھیرا پھیل گیا۔ آٹھ بجے کے قریب پھر زوردار دستک ہوئی۔ سانگر کے خیال میں یہ پھر پڑوسی لڑکا تھا لیکن سانگر کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آنے والے ایک سے زیادہ تھے اور وہ مسلسل تاجے سے تکرار کر رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد تاجا اندر آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندے سانگر سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ سانگر بھائی اندر موجود ہیں۔

''تم انہیں پہچانتے ہو؟'' سانگر نے لڑکے تاجے سے پوچھا۔

''نہیں جی۔ ویسے بھی مجھ کو شکل سے اچھے بندے نہیں لگتے۔'' تاجا گھبرایا ہوا تھا۔

سانگر سمیت سب کا چونک جانا لازمی تھا۔ سانگر نے ڈاکٹر ناصر سے پسٹل لے کر اپنی چادر کے نیچے لگایا۔ اجمل خان بھی اپنی رائفل چیک کر کے چوکس ہوگیا۔ شانی اور گریس کو پچھلے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ رستم والے کمرے کا دروازہ ناصر نے اندر سے بند کر لیا۔

سانگر دروازے کی طرف بڑھا اور خان برآمدے میں گھات لگا کر کھڑا ہوگیا۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر پھر دو تین منٹ گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے صاف پتا چلتا تھا کہ آنے والے افراد سانگر کے لئے بھی اجنبی ہیں۔ پھر دروازے کو کنڈی لگنے کی آواز آئی اور قدموں کی چاپ ابھری لیکن یہ صرف سانگر کے قدم نہیں تھے۔ نو وارد بھی سانگر کے ساتھ اندر آگئے تھے۔

شانی اور گریس نے تاریک کمرے میں کھڑے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ دونوں ہٹے کٹے افراد تھے اور شکلوں سے ہی غنڈے لگتے تھے۔ وہ مقامی لباس میں تھے۔ ایک کے کان میں سونے کی بالیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی چادروں کے نیچے یقیناً اسلحہ بھی تھا۔ وہ دونوں بہت عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے داڑھی والا شخص بولا۔ ''باقی لوگ کدھر ہیں۔ میرا مطلب ہے بیبیاں وغیرہ۔''

سانگر نے کہا۔ ''دیکھو پہلوان! جب تک مجھ کو پتا نہ چلے کہ تم کون ہو اور تمہیں کس نے

بھیجا ہے، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

پہلوان نے اپنے تنومند ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔''جیرے! اس کی بات کراؤ استاد جی سے۔''

جیرے نے اپنی سوتی چادر کے نیچے سے ایک واکی ٹاکی نکالا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اس کا انٹینا باہر کھینچا اور کسی سے رابطے میں مصروف ہو گیا۔ واکی ٹاکی سے شور ابھرنے لگا تاہم کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی۔ جیرا دیر تک کوشش کرتا رہا اور ہیلو ہیلو بولتا رہا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

اسی دوران میں اجمل خان بھی رائفل سمیت دونوں نوواردوں کے سامنے آ گیا.... جس شخص کو پہلوان کہا جا رہا تھا وہ ساگر کو مخاطب کر کے بولا۔''تم پانچوں کے سوا اماں ساوری کے گھر میں کوئی اور تو نہیں آیا ناں؟ میڈا مطلب ہے اساں بے فکر ہو کر بات کر سکتے ہیں ناں؟''

''ہاں، کر سکتے ہو۔'' ساگر نے جواب دیا۔

پہلوان بولا۔''اساں سب کے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ میں تم کو سب کچھ کھول کر بتا رہا ہوں۔ جس جیپ پر اساں یہاں آئے ہیں یہ اساں نے اجرالی سردار موہرا اختر سے چھینی ہے۔ موہرا اختر وڈے ڈیرے پر مرنے والے اجرالی سردار غلام کبیر کا چچازاد بھائی ہے۔ شاید تمہیں اس کے بارے میں پتا ہی ہو......'' پہلوان نے چند سیکنڈ توقف کر کے سگریٹ سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''امید ہے کہ موہرا اختر کی جیپ چھینے جانے کا پتا دو تین گھنٹے تک کسی کو نہیں چلے گا لیکن جوں جوں ٹائم زیادہ ہوتا جائے گا جیپ کا پتا چلنے کا خطرہ بڑھتا جائے گا۔ میڈی بات سمجھ رہے ہو ناں تم۔ اساں چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جائیں۔''

ساگر نے کہا۔''لیکن جب تک اساں تمہارے استاد جی سے بات نہ کر لیں اور استاد جی اس بات کا ثبوت نہ دے دیں کہ وہ واقعی ہمارے ہمدرد ہیں، اساں تمہارے ساتھ کیسے چل پڑیں۔''

''دیکھو، میں نے تمہارے سامنے کوشش کی ہے، پر رابطہ ہی نہیں ہو رہا۔'' پہلوان نے کہا اور ایک بار پھر اپنے ساتھی جیرے کو واکی ٹاکی پر کوشش کرنے کا اشارہ دیا۔

جیرا پھر رابطے کی تگ و دو کرنے لگا۔ شائیں شائیں کی آواز کے سوا کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

پہلوان نے بے قراری سے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔''سائیں تساں سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر اساں اجرالی ہوتے یا اساں کا تعلق پولیس والوں سے ہوتا تو پھر اساں اکیلے اس مکان میں نہ آتے۔ اساں کے ساتھ پندرہ وی بندے ہوتے اور اساں گھیراڈال کر تم کو بے بس کر دیتے۔''

خان نے کہا۔''لیکن برادر! تم کو پتا کیسے چلا کہ ام اس مکان میں ہیں اور اتنے بندے ہیں۔''

''میں نے ساگر کو سب کچھ بتایا ہے خان جی۔'' پہلوان نے جواب دیا۔''ان ساری باتوں کا پتا استاد جی کو ہے۔ وہ تساں کو ہر صورت پولیس کے گھیرے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لڑائی کے بعد سے تساں کی پوری خبر رکھی ہوئی تھی۔''

شانی نے سوچا لڑائی کے بعد تو انسپکٹر شاد کے سوا ان کی خبر اور کسی کو نہیں تھی..... ساگر، اجمل خان اور پہلوان میں گفتگو جاری رہی۔ پہلوان نے کہا۔''اساں کو بتایا گیا تھا کہ یہاں ایک سخت بیمار بندہ بھی ہے۔ وہ کہاں ہے؟''

''یہیں پر ہے۔'' ساگر نے کہا۔''لیکن بات آگے تب ہی بڑھے گی، جب تم واکی ٹاکی پر اپنے استاد صاحب سے رابطہ کراؤ گے۔''

''تساں بار بار ایک ہی بات کر کے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہے ہو۔'' پہلوان نے جز بز ہو کر کہا۔''تساں کو پتا نہیں کہ یہ جگہ تساں کے لئے کتنی خطرناک ہے۔ کسی بھی وقت وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔''

شانی اور گریس بدستور تاریک کمرے میں موجود تھیں اور باہر ہونے والی بحث سن رہی تھیں۔ شانی صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ اب اس گفتگو میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیوں یہ ساری گفتگو سننے کے بعد اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ پہلوان اور اس کے ساتھ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے۔ انہیں ان کی بات مان لینی چاہیے۔ شانی کے اندر وہی لہر پیدا ہو رہی تھی جو کبھی کبھی اس کی بالکل سچی رہنمائی کرتی تھی۔ شانی کچھ دیر سوچتی رہی پھر وہ گریس کو ساتھ لیتی ہوئی باہر نکل آئی۔ دونوں افراد چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ پہلوان نے قدرے بھونڈے انداز میں شانی اور گریس کو ایک ساتھ سلام کیا۔ وہ دونوں صورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ مگر فی الوقت وہ ہمدرد بن کر یہاں آئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی سے معاوضہ لے کر یہ کٹھن کام کر رہے ہوں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ فی الحال ان کی صورتوں کو نظرانداز کیا جائے۔

شانی نے ناصر اور ساگر کو ایک طرف بلایا۔ دوسرے کمرے میں جا کر وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں ناصر! ان کی بات مان لیں۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے پیچھے انسپکٹر شاد کا ہاتھ ہو۔''

''لیکن یہ تو شاد کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ان کا استاد جی جانتا ہو۔''

''مگر استاد جی سے رابطہ ہو تو کچھ پتا چلے ناں۔ اس کے علاوہ ان کو منزل کا بھی پتا نہیں ہے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک چھینی ہوئی جیپ پر ہمیں وادی سون سے نکال دیں گے۔ آگے کوئی اور گاڑی ہمیں پک کرے گی۔''

''وہ تو جو بھی ہوگا ناصر، سامنے آجائے گا لیکن ایک بات مجھے صاف نظر آرہی ہے۔ ہم یہاں اماں ساوری کے مکان میں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ چھوٹی سی ڈھوک ہے۔ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کس گھر میں کیا ہو رہا ہے، یہ بھی سب کو پتا ہوتا ہے۔''

''پھر آپ کا کیا مشورہ ہے بی بی؟'' ناصر نے پوچھا۔ ''رستم بھائی کے بعد آپ ہی کی رائے میرے لئے زیادہ اہم ہے۔''

ساگر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ٹھیک ہے بی بی جی! جو تساں کہو گے اساں کو منظور ہے۔''

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ اماں ساوری کے گھر سے جانے کے لئے تیار تھے۔ یہ رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ ڈھوک سنسان تھی۔ جیپ واقعی دید کے قابل تھی۔ اس کا سائز اسٹیشن ویگن جتنا تھا۔ ٹائر نہایت چوڑے تھے۔ ماڈل بھی نیا ہی لگتا تھا۔ وہ گرد و غبار سے اَٹے ہوئے ہیرے کی طرح تھی۔ شانی نے ایسی زبردست جیپ شاید ہی کہیں دیکھی ہو۔

پہلوان اور جیرے نے جیپ کے پچھلے حصے میں رستم کے لیٹنے کا زبردست انتظام کر دیا تھا۔ وہ لوگ جیپ کو دروازے کے بالکل سامنے لے آئے اور پھر سب نے مل کر زخمی رستم کو جیپ میں منتقل کر دیا۔ بعدازاں اجمل خان، ساگر اور ناصر وغیرہ کے ساتھ شانی اور گریس بھی جیپ میں منتقل ہوگئیں۔ آرام دہ جیپ کے اندر ایئرکنڈیشن کی خوشگوار ٹھنڈک موجود تھی۔ ... ناصر نے دبے لہجے میں کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ اس جیپ کی قیمت نصف کروڑ کے لگ بھگ ہے۔''

''لیکن بڑی بے دردی سے استعمال ہو رہی ہے۔'' شانی نے فرش پر سگریٹ کے

ٹکڑے اور گنڈیری کے چھلکے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر اچانک اس کی نظر ایک اور شے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ یہ شراب کی خالی بوتل تھی۔ بوتل کے ساتھ ہی کسی عورت کا سینڈل اور زیر جامہ پڑا تھا۔ ہاں یہ قبائلی سردار غلام کبیر کے چچازاد بھائی کی جیپ تھی۔ اس میں اسی قسم کی اشیاء ملنی چاہیے تھیں۔ شانی نے ناصر وغیرہ کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لئے نامعلوم عورت کے ''لباس کا حصہ'' اپنے پاؤں سے نشست سے نیچے کھسکا دیا۔ رستم سکون آور دوا کے زیراثر غنودہ حالت میں تھا۔ شانی اس کے بالکل قریب موجود تھی۔

ناصر نے پہلوان سے پوچھا۔ ''کسی نے تمہیں ڈھوک میں آتے دیکھا تو نہیں؟''

''امید تو یہی ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ اساں گاڑی کی لائٹیں بجھا کر آئے ہیں اور ویسے بھی اساں نے گاڑی ڈھوک سے باہر درختوں میں کھڑی کی تھی۔''

''جب ہم یہاں آئے تھے تو ایک چوکیدار دیکھا تھا۔''

پہلوان مسکرایا۔ ''اساں نے بھی دیکھا تھا۔''

''تو اب کہاں ہے وہ؟''

''اس کے پر چوٹ لگانی پڑی تھی۔ کچا پکا بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسے باندھ کر درختوں میں ڈال آئے ہیں۔'' پہلوان نے اطمینان سے کہا۔

جیپ روانہ ہوئی تو ڈرائیونگ سیٹ پر جیرا تھا۔ وہ صورت سے ہی سنجیدہ اور خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے آگے بڑھنے سے پہلے جیپ کو ڈھوک کے گرد دو تین چکر دیئے۔ ایک دو کشادہ گلیوں کے درمیان سے جیپ کو گزارا۔ ایک دو جگہ ریورس کیا اور روکا جیپ کی لائٹس بدستور آف تھیں۔ شانی سمجھ گئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کچھ لوگ جیپ کا کھوج لگاتے اس ڈھوک تک پہنچے تو ٹائروں کے نشان انہیں سیدھا اماں ساوری کے گھر تک نہ پہنچا دیں۔ ویسے بھی وہ اماں ساوری اور تاجے کو سب کچھ سمجھا آئے تھے۔ ساگر نے ان سے کہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے تو وہ صاف کہہ دیں کہ آنے والوں نے بندوق کے زور پر انہیں یرغمال بنالیا تھا۔ تاجے کے چہرے پر آنے والے دو زخم اس بات کا ثبوت فراہم کر سکتے تھے۔

یہ تاریک رات تھی۔ راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ بلکہ یہ گاڑی کا راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ اس جیپ کی ہمت تھی کہ وہ بہت زیادہ ہلچل مچائے بغیر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس جیپ کی کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے پہلوان نے تمام پردے کھینچ دیئے اور

دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''جب سردار کے گھر کی عورتیں جیپ میں ہوتی ہیں تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اندر دیکھ سکے۔''

''اور دوسروں کی عورتوں کے بارے میں سردار کیا کہتا ہے۔'' سانگر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''دوسروں کے بارے میں......بس......اللہ ہی اللہ۔'' پہلوان نے جواب دیا۔ سانگر کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرانے لگے۔ شاید وہ غلام کبیر کے اس وحشیانہ سلوک کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے کم عمر چندو کے ساتھ روا رکھا تھا۔

بات کرنے کے ساتھ ساتھ پہلوان واکی ٹاکی سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہا تھا۔ دفعتاً وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا رابطہ اپنے استاد جی سے ہوگیا۔

''استاد جی!'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''تساں کے ساتھ رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔''

''سواریاں کہاں ہیں؟'' دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز آئی۔

''سواریاں تانگے میں بیٹھ گئی ہیں جی...... پر وہ پریشان ہیں جی۔ تساں سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''ہاں ہاں کراؤ بات۔'' بھاری آواز نے کہا۔

پہلوان نے واکی ٹاکی کے مائیک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اشاروں میں بات کرنی ہے۔ واکی ٹاکی کی آواز پولیس والے پکڑ بھی لیتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے واکی ٹاکی ناصر کی طرف بڑھا دیا۔

ناصر نے کہا۔ ''مدد کرنے کا شکریہ جی۔ پر آپ یہ سب...... کس کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ آپ کو تو ہم جانتے نہیں ہیں۔''

''یار! کیا یہ کافی نہیں کہ اس مشکل وقت میں، میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔'' استاد نے کہا۔

''لیکن پھر بھی ہمیں کچھ پتا تو ہونا چاہیے۔''

''تمہارے ایک دوست کے کہنے پر سب کچھ ہو رہا ہے اور یہ دوست وہ ہے جس نے تمہیں کھوہ کے اندر راشن پانی کے تین تھیلے دیے تھے۔ دو چھوٹے اور ایک بڑا...... سمجھ گئے ہو؟''

ناصر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''ہاں جی، سمجھ گیا۔'' پھر اس نے ذرا توقف سے

پوچھا۔ ''کیا اب ان سے دوبارہ ملاقات ہوگی؟''

''ابھی ملاقات کے چکر میں نہ پڑو یار! بس جان بچانے کی کوشش کرو اور پریشان نہیں ہونا۔ سمجھو کہ ہم سب تمہارے آس پاس موجود ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ واکی ٹاکی سے ابھرنے والی آوازیں ناصر کے ساتھ ساتھ سب نے سن لی تھیں۔ ان کے چہروں پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ تین تھیلوں والا اشارہ نہایت واضح طور پر انسپکٹر شاد کی طرف تھا۔ شانی کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ یہ شخص انہیں بالکل بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

انسپکٹر شاد کی صورت شانی کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے عام پولیس والوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر پیشہ ورانہ سختی بھی نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ مگر اس کے سینے میں ایک ہمدرد اور گداز دل موجود تھا۔ وہ غیر معمولی کردار کا مظاہرہ کر رہا تھا اور شانی کی توقع سے زیادہ ان کے لیے مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ ڈپٹی ریاض جیسے افسر کے بے پناہ خوف تلے اس طرح کی جرأت کرنا واقعی ''جرأت'' کا کام تھا۔

واکی ٹاکی پر رابطہ ختم ہو جانے سے شانی کے ذہن پر بوجھ بھی کم ہوگیا۔ اس نے اپنے طور پر جیپ سواروں کے ہمراہ چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب یہ فیصلہ کافی حد تک درست ثابت ہوگیا تھا۔

جیپ خطرناک راستوں پر بے حد دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور یوں آگے بڑھنے میں قدرے آسانی پیدا ہوگئی تھی۔ اس جیپ کی قدر و قیمت کا اندازہ انہیں پہلی چیک پوسٹ پر ہوا۔ اس چیک پوسٹ پر مسلح اجرالی نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو پولیس والے بھی تھے۔ جیپ کو دیکھتے ہی اجرالیوں کے ہاتھ اپنے ماتھوں تک چلے گئے۔ دو افراد نے بھاگ کر راستے کو بلاک کرنے والا بانس اوپر تک اٹھا دیا۔ کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ جیپ کے اندر کون ہے۔ کون ڈرائیو کر رہا ہے اور رات کے اس پہر یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

پوسٹ کراس کرنے کے بعد پہلوان نے اپنی کلاشنکوف کو پھر سے سیفٹی لاک لگا لیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''بس جی، روپے میں سے چھ آنے کام تو ہوگیا۔ بس دو مشکل جگہیں اور رہ گئی ہیں۔ ایک دو تین میل آگے ہے۔ دوسری کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد آئے گی۔''

''ان جگہوں سے بچ کر نہیں نکلا جاسکتا؟'' شانی نے پوچھا۔

''پھر پیدل چلنا پڑے گا اور اساڈے ساتھ مریض بھی ہے۔''

''لیکن پیدل چل کر بھی گارنٹی تو نہیں ہے ناں۔'' ڈرائیونگ کرتے جیرے نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''اوتساں فکر نہ کرو جی۔'' پہلوان نے شانی کو دلاسا دیا۔ ''بس اس جیپ کی کرامات دیکھو۔ کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ یہ اساں کو پل صراط پر سے بھی گزار کر لے جائے گی۔''

جھٹکوں کے سبب رستم کراہ اٹھا۔ ''پلیز آہستہ۔'' شانی نے تڑپ کر کہا۔

''سوری میڈم جی۔'' جیرے نے کہا اور رفتار مزید دھیمی کر دی۔

گریس اور شانی مسلسل رستم کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ جیپ میں واقعی کرامات موجود تھیں۔ راستے میں ایک جگہ چند اجرالی گھڑسوار نظر آئے۔ جیپ کو دیکھ کر وہ فوراً گھوڑوں سے اُتر آئے اور مؤدب کھڑے ہو کر ہاتھ ماتھے پر لے گئے۔ ان کے ساتھ موجود کتے بھی خاموشی سے دُم ہلاتے رہے۔

دوسری چیک پوسٹ پر باقاعدہ سرچ لائٹ موجود تھی۔ چند خیمے بھی لگے ہوئے تھے۔ خمیدہ بانس نے راستہ روک رکھا تھا۔ بانس کے درمیان Stop کا سرخ بورڈ لگا تھا۔ مسلح پولیس مین اردگرد کے ٹیلوں پر بھی موجود تھے۔ گاڑی بانس کے سامنے رکی۔ شانی کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اس نے دیکھا چادر کے نیچے اجمل خان کی گرفت اپنی خوفناک گن پر مضبوط ہو گئی ہے۔ ایک بار پھر خیریت گزری۔ اس وی آئی پی جیپ کو ایک بار پھر کسی تلاشی کے بغیر گزر جانے دیا گیا۔

اب راستہ قدرے ہموار ہو گیا تھا۔ انہوں نے نسبتاً تیز رفتاری سے سفر طے کیا اور اگلے پون گھنٹے میں دس بارہ میل کا سفر طے کر لیا۔ اب آخری پوسٹ قریب آ رہی تھی۔ اجمل خان نے پوچھا۔ ''پہلوان جی۔ اب روپے میں سے کتنے آنے کام باقی رہ گیا ہے؟''

پہلوان بولا۔ ''سمجھو خان صاحب! بارہ آنے کام ہو گیا ہے۔ چار آنے باقی ہیں۔''

''چار آنے کا آج کل کون سا حقیقت ہے برادر۔ چار آنے کا بکرمت کرو۔''

اسی دوران واکی ٹاکی کے سگنل موصول ہوئے۔ پہلوان نے انٹینا کھینچ کر ڈیوائس کو آن کیا۔ دوسری طرف سے استاد جی کی آواز آئی۔ ''تانگہ کہاں ہے؟''

''چھوٹے چشمے کے پاس۔'' پہلوان نے کہا۔

''معاملہ گڑبڑ ہے۔ موہرا اختر کی جیپ چوری ہونے کی خبر پولیس وائرلیس پر چل گئی ہے۔ اگلی پوسٹ والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے...... کیا تم راستہ نہیں بدل سکتے؟''

''نہیں جی۔ اب تو اساں بالکل پاس آ گئے ہیں۔ وہ سامنے پوسٹ کی بتیاں نظر آ رہی ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ اب رکو گے تو کام اور خراب ہوگا۔ پوسٹ کی طرف چلتے جاؤ۔ یہی ظاہر کرو کہ رک رہے ہو۔ قریب پہنچ کر رفتار تیز کر دینا۔ سواریوں سے کہو کہ سر نیچے کر لیں یا فرش پر لیٹ جائیں۔ دو چار بندے پھڑکانے پڑیں تو بے شک پھڑکا دو۔ اب رکنا نہیں ہے۔'' استاد کی آواز دہاڑ سے مشابہ تھی۔

گریس اور شانی نے ہراساں نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر واقعی پوسٹ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مسلح افراد کے ہیولے تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ ناصر، سانگر اور سب سے بڑھ کر اجمل خان ایک دم چوکس نظر آنے لگے تھے۔ اجمل خان کا پُرجوش چہرہ دیکھ کر یوں لگا کہ وہ کوئی دل پسند کھیل شروع کرنے والا ہے۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

پہلوان نے چلا کر کہا۔ ''تسی دونوں بیبیاں فرش پر بیٹھ جاؤ اور سر نیچے کر لو۔''

گریس اور شانی نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ خان، سانگر اور ناصر نے بھی سر نیچے جھکا لئے تھے۔ جیپ کی رفتار آہستہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ شانی نے ذرا سا سر اٹھا کر اٹھا۔ بانس کے پیچھے ایک گاڑی کو بھی آڑا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس گاڑی کے پیچھے مسلح اجرالیوں نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ جیپ سواروں کو دھمکانے کے لئے انہوں نے چند ہوائی فائر کئے۔

کسی شخص نے دھمکی آمیز آواز لہجے میں چلا کر کچھ کہا۔ اچانک طاقت ور جیپ کا انجن کسی جنگلی جانور کی طرح دہاڑا۔ جیپ نے ایک جھٹکا لیا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آگے بڑھی۔ بانس کو توڑ کر ایک دو اجرالیوں کو کچل کر وہ آڑھی کھڑی کار سے ٹکرائی۔ نسبتاً ہلکی کار وزنی جیپ کی زوردار ٹکر سے اچھل کر سیدھی ہو گئی۔

''فائر کرو۔'' ناصر چلایا۔

اس کے ساتھ ہی تڑتڑ کی خوفناک آواز سے اجمل خان اور ناصر کی رائفلوں نے شعلے اگلے۔ یہ ''پہل'' کارآمد رہی۔ وہ افراد جو دائیں بائیں سے جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنانا چاہ رہے تھے گولیوں کی باڑ پر آ گئے اور اچھل اچھل کر پیچھے کی طرف گئے۔ جیپ برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اجرالیوں کی طرف سے جوابی طور پر بس دو چار گولیاں ہی چل سکی تھیں۔ ان میں سے ایک گولی دائیں طرف کی عقبی کھڑکی میں لگی اور شیشے میں سوراخ کر کے جیپ کی چھت میں کہیں گم ہو گئی۔

اجمل خان نے خوش ہو کر اپنی شاندار ایل ایم جی کو تھپکی دی اور جوش سے بولا۔ ''اوئے امارا دل خوش کر دیا شیر کی بچی۔'' اس کا اشارہ گن کی طرف تھا۔

ناصر نے کہا۔ ''ابھی اس شیر کی بچی کو اور بہت سا کام کرنا پڑے گا۔ مجھے لگتا ہے وہ حرامی پیچھے آ رہے ہیں۔''

''گھبراؤ مت یار۔ آنے دو جو آتے ہیں۔ جو قریب آئے گا، ان شاء اللہ اس کا دانہ پانی ختم ہو جائے گا۔ اس ''شیر کا بچی'' کا مار دور تک ہے۔ یہ ایک کلومیٹر سے آگے تک ہر چیز کا صپایا (صفایا) کرے گا۔''

گن کی شکل وصورت سے ہی عیاں تھا کہ یہ لانگ رینج ہتھیار ہے۔ اس کے ساتھ بڑے سائز کا خم دار میگزین انچ تھا اور ایسے تین بھرے ہوئے میگزین اجمل خان نے اپنے سامنے نشست پر رکھے ہوئے تھے۔

شانی نے عقب میں دیکھا اور اسے ناصر کی بات کا ثبوت مل گیا۔ کم از کم چار ہیڈ لائٹس تیزی سے اچھلتی کودتی ان کے عقب میں آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ دو گاڑیاں ہیں۔ جس جیپ پر شانی اور دیگر افراد سوار تھے یہ بے شک زیادہ طاقتور اور جدید تھی۔ اس پر نسبتاً زیادہ برق رفتاری سے سفر کیا جا سکتا تھا لیکن مسئلہ شدید زخمی رستم کا تھا۔ وہ اس غیر ہموار راستے پر زیادہ رفتار برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

تین چار منٹ کے اندر عقب میں آنے والی گاڑیاں کافی قریب آ گئیں۔ اب کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہو سکتی تھی۔ زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ کوئی گولی جیپ کے ٹائر کو برسٹ کر دے گی اور اس کے سفر کو فل سٹاپ لگ جائے گا۔ اجمل خان نے شانی اور گریس کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں فرش پر لیٹ جائیں یا بیٹھ کر سر بالکل نیچے کر لیں۔ ام کو لگتا ہے کہ وہ لوگ اب گولی چلائے گا۔''

اجمل خان کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ ایک سنگل شاٹ جیپ پر فائر ہوا۔ پھر ایک اور.... پھر اور۔ چوتھی گولی جیپ کی باڈی میں کہیں لگی۔ جواب میں ناصر اور خان نے بھی عقبی گاڑیوں پر سنگل شاٹ فائر کیے۔ دھماکوں کی آوازوں سے رات کا سناٹا چکنا چور ہونے لگا۔

ایک دم شانی کے ذہن میں آیا کہ رستم نیم بے ہوش پڑا ہے۔ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں۔ نہ ہی صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کر سکتا ہے۔ جیپ کا نشانہ لینے والی کوئی گولی اس کے جسم میں اُتر سکتی ہے۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے رستم کے بالائی دھڑ کو اپنے جسم سے ڈھانپ لیا۔ فائرنگ میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اجمل خان والی گن کام

دکھا رہی تھی۔ اجمل خان چھوٹے چھوٹے برسٹ چلا رہا تھا۔ اچانک شانی نے دیکھا کہ عقب میں آنے والی دو روشنیاں بُری طرح ڈگمگائیں...... پھر وہ عجیب بے ڈھنگے انداز میں عمودی رخ پر ہو گئیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ عقب میں آنے والی ایک گاڑی الٹ گئی ہے۔

خان کا نعرہ گونجا۔ ''وہ مارا......'' اس نے ایک بار پھر ایل ایم جی کو تھپکی دی۔ ''تُو شیر کا بچی ہے۔ ایک دم شیر کا بچی۔''

ایک گاڑی کے الٹ جانے کے بعد دوسری گاڑی کا فاصلہ ایک دم بڑھ گیا۔ گاڑی تعاقب جاری رکھے ہوئے تھی لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ ایل ایم جی کی مار اور نشانے کے خوف سے فاصلہ بڑھانے پر مجبور ہے۔

''تساں کا نشانہ کام دکھا رہا ہے خان بھائی۔ ایک گاڑی ڈھ گئی ہے، دوسری کافی پیچھے رہ گئی ہے۔''

''اب اس کو قریب نہ آنے دینا خان۔ ایک بھی گولی ہماری جیپ کے ٹائر میں لگ گئی تو کام چوپٹ ہو جائے گا۔'' پہلوان نے بلند آواز سے کہا۔

شانی کو اس کی آواز میں تکلیف کی جھلک نظر آئی۔ غالباً ناصر نے بھی یہ کیفیت محسوس کر لی تھی۔ وہ بولا۔ ''پہلوان خیریت تو ہے؟''

''ہاں ہاں......بس ہاتھ پر لگی ہے۔''

ناصر نے ہاتھ بڑھا کر جیپ کی اندرونی لائٹ جلائی، پہلوان کا بایاں ہاتھ کانپتا جا رہا تھا اور لہولہان تھا۔ اچانک وہ سب چونک گئے۔ ایک گاڑی کی روشنیاں یکا یک بہت قریب دکھائی دیں۔ یہ گاڑی غالباً رستے میں گھات لگا کر کھڑی تھیں اور آناً فاناً ان کے پیچھے لگ گئی تھیں۔ یہ بھی ایک جیپ ہی تھی۔ اس جیپ میں سے زوردار فائرنگ ہوئی۔ شانی کے ساتھ والا شیشہ دھماکے سے چکنا چور ہو گیا۔ شانی اور گریس چلا اٹھیں۔ دو تین سیکنڈ بعد عقبی سکرین بھی زوردار آواز سے چکنا چور ہو گئیں۔ شیشے کی لاتعداد کرچیاں شانی، گریس اور رستم پر گریں۔ ایک گولی ڈرائیونگ سیٹ کی پشت کو پھاڑ کر ڈرائیور جیرے کی پیٹھ میں لگی۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ بائیں طرف جھک گیا۔ اسی دوران میں دو مزید طویل برسٹ آئے۔ جیپ کی پوری باڈی جھنجھلا اٹھی۔

اجمل خان اور سانگر نے بھی اندھا دھند فائرنگ کی۔ گولیوں کے گرم خول پوری جیپ میں بکھر گئے۔ ڈرائیور جیرا جان لیوا طور پر زخمی ہو گیا تھا۔ جیپ لہراتی ہوئی نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ اس موقع پر گریس نے حاضر دماغی اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ وہ ڈرائیور سے قریب

تر تھی۔ ڈرائیور بائیں پہلو پر گر چکا تھا تاہم اس کے ہاتھ اب بھی اسٹیئرنگ پر تھے۔ گریس اسے پھلانگتی ہوئی اسٹیئرنگ کے سامنے پہنچ گئی اور کسی نہ کسی طرح کنٹرول سنبھال لیا۔

پچھلی گاڑی کا بہتر نشانہ لینے کے لئے اجمل خان نے جیپ کی روف سلائیڈنگ ہٹا لی۔ وہ اپنا بالائی دھڑ باہر نکال کر فائرنگ کرنا چاہتا تھا۔ ناصر نے اسے بہت منع کیا لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ اس پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بالائی دھڑ چھت کے چوکور خلا میں سے باہر نکل گیا۔ شانی کا دل خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ جوش میں اجمل خان نے خود کو زبردست فائرنگ کے سامنے ایکسپوز کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اجمل خان کا زوردار نعرہ سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ایل ایم جی نے موت کا طویل قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی تصوراتی منظر سے کم نہیں تھا۔ پیچھے آنے والی جیپ میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور وہ آگ کا گولہ بن گئی۔ یہ گولہ آٹھ دس سیکنڈ تک دائیں بائیں لہراتا رہا پھر نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ باکمال نشانہ باز نے اپنا بہترین نشانہ لگا دیا تھا، لیکن کیا وہ خود بھی سلامت تھا؟

شانی نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "خان! نیچے ہو جاؤ...... خان؟"

لیکن وہ چھت کے چوکور خلا میں سے نیچے نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چھت کے اوپر اوندھے منہ گرا ہوا ہے۔

ناصر پکارا۔ "خان...... تم ٹھیک تو ہو؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر ناصر اور شانی نے خان کو تقریباً کھینچ کر جیپ کے اندر کیا۔ خان کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔ ایل ایم جی پر اس کے دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت تھی۔ ناصر اور شانی نے تیزی سے اس کے جسم کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔

"تم نیچے کیوں نہیں ہو رہے تھے؟" شانی نے غصے میں چیخ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بہن جی، امارا سامان گر گیا تھا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ آواز میں لرزش کا شائبہ تک نہیں تھا۔

مزید سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ان سب کی نظریں ڈرائیور جیرے پر جم گئیں۔ گولی اس کی کمر میں گھسی تھی اور پیٹ کے اندر ہی تھی۔ پسلیوں کا پنجرہ محفوظ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی جان بچ سکتی ہے۔ پہلوان کا ہاتھ زخمی تھا۔ لہٰذا ناصر اور ساگر نے جیرے کو کھینچ کر ساتھ والی نشست پر ڈالا اور نشست کو اس طرح اسٹریچ کر دیا کہ وہ بستر بن گئی۔

گریس نے چلا کر انگریزی میں کہا۔ "دایاں ٹائر برسٹ ہو چکا ہے۔"

وہ سارے چونک گئے۔ افراتفری میں انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ دیوہیکل جیپ دائیں پہلو پر جھکی ہوئی ہے اور بُری طرح تھرا رہی ہے۔

پہلوان کو گریس کی انگریزی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن بات وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ اس نے ناصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میم جی کو بتاؤ کہ گاڑی روکنی نہیں ہے۔ یہ بڑی ڈھیٹ جیپ ہے۔ خالی رموں پر بھی پندرہ بیس میل چل جائے گی۔"

ناصر نے انگریزی میں گریس سے کہا۔ "مس گریس! کیا میں ڈرائیونگ کروں؟"

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ مشاقی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولی۔ فی الوقت ڈرائیور تبدیل کرنے کی مہلت بھی نہیں تھی۔ گریس گاڑی چلاتی رہی۔ عقب میں دور تک کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور یہ بات اطمینان بخش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ تعاقب کرنے والوں کو مات دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دو گاڑیاں ایل ایم جی کا نشانہ بنی تھیں۔ ایک تو فقط الٹی تھی، دوسری بلاسٹ ہوئی تھی۔ امید نہیں تھی کہ دوسری جیپ میں موجود کوئی شخص زندہ بچا ہو گا۔ غالباً خان کا چلایا ہوا طویل برسٹ جیپ کے فیول ٹینک تک بھی گیا تھا۔ اسی سبب جیپ دھماکے سے پھٹی تھی۔ مجموعی طور پر کتنے افراد ہلاک و زخمی ہوئے تھے، اس بارے میں فقط اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"ابھی کتنی دور جانا ہو گا؟" ناصر نے ہانپتی آواز میں پہلوان سے پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ پانچ چھ میل کا سفر ہے۔" پہلوان کراہ کر بولا۔

بہرحال اب انہیں پہلوان کی چھوٹی چوٹ بھول گئی تھی۔ ان کی توجہ زخمی جیرے کی طرف تھی۔ وہ اب نیم بے ہوش نظر آتا تھا۔ ناصر نے چلتی جیپ میں اپنی میڈیکل کٹ کھول لی اور جیرے کی قمیص کاٹ کر اسے ابتدائی طبی امداد دینے میں مصروف ہو گیا۔

جیپ کی عقبی سکرین کی جگہ اب ایک بہت بڑا خلا تھا۔ دائیں طرف کی دو کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹ چکے تھے۔ باہر کی ہوا آزادانہ جیپ میں فراٹے بھر رہی تھی۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں، گولیوں کے خول اور خون کے دھبے تھے۔ تاہم ان سب کے حوصلے بلند تھے اور خاص طور سے اجمل خان کا۔ درحقیقت ان سب نے پچھلے آٹھ دس دن میں اتنی خون ریزی دیکھی تھی کہ آج رات کی مار اماری کچھ زیادہ بھیانک نہیں لگ رہی تھی۔

شانی نے کہا۔ "خان! تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔ کیا سامان گر گیا تھا تمہارا؟"

خان کے چہرے پر بڑی ہی ترنم آمیز مسکراہٹ ابھری۔ "کچھ بھی نہیں بہن جی! ام نے بتایا تو آپ سب امارا مذاق اڑائے گا۔"

ناصر نے ہولے سے کہا۔ "اگر مذاق والی بات ہے تو پھر وہ سامان یقیناً نسوار کی ڈبی ہوگی۔"

"نہیں نہیں برادر ... کچھ اور تھا لیکن ابھی ام سفر میں ہے اور سفر بھی کوئی ایسا ویسا نہیں ہے۔ ام منزل پر پہنچ کر آپ کو بتائے گا۔ ابھی آپ سب دعا کرے کہ ام سب بہ خیریت منزل پر پہنچ جائے۔"

ڈرائیونگ میں گریس کی خوبی واضح ہو رہی تھی۔ وہ مشاق ڈرائیور تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود پہلوان ضرور اسٹیئرنگ سنبھال لیتا۔ اب وہ ڈرائیونگ نشست کے بالکل قریب عقب میں بیٹھا تھا اور گریس کو راستہ بتا رہا تھا۔ لیفٹ...... رائٹ...... اَپ...... ڈاؤن جیسے لفظ تو وہ بول ہی سکتا تھا۔

دفعتاً شانی کے کان کھڑے ہوگئے۔ دور کہیں سے ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ آواز غالباً کسی اور نے نہیں سنی تھی۔ شانی نے کسی اور کو بتانا مناسب بھی نہیں سمجھا۔ وہ پہلے یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آواز گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے۔ آواز کچھ دیر برقرار رہی پھر دھیرے دھیرے کم ہو کر معدوم ہوگئی۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ اس کے سوا صرف ناصر نے یہ خطرناک آواز سنی ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کی تصدیق کی۔

شانی نے گریس سے کہا۔ "گریس! کیوں نہ ہم ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔"

"کیوں؟ کوئی خطرہ ہے؟" گریس نے پوچھا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم باقی کے سفر میں جتنی بھی احتیاط کر لیں کم ہے۔"

"لیکن امارا اسپیڈ اور کم ہو جائے گا۔" خان نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، دس منٹ زیادہ لگ جائیں گے۔" ناصر بولا۔

"ہاں جی، یہ بات تو ام نے بھی پڑھا ہے کہ دیر سے پہنچنا کبھی نہ پہنچنے سے اچھا ہے۔"

اجمل خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور اپنی گن کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کرنے لگا۔

گریس نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ کچھ دیر کے لئے تو بالکل اندھیرا محسوس ہوا لیکن چاند کی روشنی راستے کے خدوخال واضح کرنے لگی۔ رفتار خاصی سُست ہوگئی تھی لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا تھا۔ جھٹکے کم ہوگئے تھے۔ یہ صورتِ حال رستم کے لئے بہتر تھی۔ شانی مسلسل رستم پر سایہ فگن تھی۔ کبھی اس کا تکیہ درست کرتی تھی، کبھی اس کے خشک ہونٹوں پر گیلا

رومال پھیرتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے دو "کشنوں" کے ذریعے رستم کے زخموں کو جھٹکوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

شانی کے کان ہیلی کاپٹر کی آواز پر بھی لگے ہوئے تھے۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان کی گوناں گوں مشکلات میں اضافہ کرنے کے بجائے کسی اور طرف نکل گیا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ان کی تلاش میں تھا یا ویسے ہی اس ایریا میں سے گزر رہا تھا۔

مزید آدھ گھنٹے کے پُرخطر سفر نے انہیں اچانک ایک نیم پختہ سڑک پر پہنچا دیا۔ یہ سڑک کہاں سے کہاں جاتی تھی، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ سڑک کے کنارے چھوٹے پتھروں (روڑی) کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شاید اس کی مرمت کا "پنج سالہ" منصوبہ زیرِ عمل تھا۔

"یہاں چوتھے میل کے پاس ایک ایمبولینس اساں کا انتظار کر رہی ہے۔" پہلوان نے نوید دی۔

اس کی یہ نوید بالکل درست ثابت ہوئی۔ ویران سڑک کے کنارے ایک گاڑی کی سرخ بیک لائٹس نظر آئیں۔ پہلوان کے کہنے پر گریس نے جیپ ایمبولینس کے بالکل قریب روکی۔ ایمبولینس میں سے دو چاق و چوبند افراد برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دستی اسٹریچر تھا۔ پہلوان نے اُتر کر ان سے بات کی۔ جیپ کا عقبی دروازہ کھولا گیا اور سب سے پہلے رستم کو کشادہ ایمبولینس میں منتقل کیا گیا۔ اس کے بعد زخمی جیرے کی باری آئی۔ بعدازاں وہ سب بھی جیپ سے ایمبولینس میں منتقل ہوگئے۔

پہلوان نے قیمتی جیپ کا رخ نشیب کی طرف کیا پھر ساگر، اجمل خان اور پہلوان نے زور لگا کر جیپ کو نشیب میں لڑھکا دیا۔ وہ دور تک دوڑتی چلی گئی پھر درختوں میں گھس کر رک گئی۔ وہ تینوں بھی ایمبولینس میں آگئے۔ ایمبولینس تیزی سے روانہ ہوگئی۔ یہ ایک نئی آرام دہ گاڑی تھی۔ اب سڑک بھی بہتر تھی۔ سفر نسبتاً آرام دہ اور تیز رفتار ہوگیا۔ ایمبولینس کا سائرن رات کے سناٹے میں مسلسل ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ پانچ چھ میل آگے آنے کے بعد وہ ایک قدرے کشادہ سڑک پر آگئے۔ ناصر نے پہلوان سے پوچھا۔ "اب کہاں جانا ہے؟"

"کھلے علاقے کی طرف......" پہلوان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ ناصر مزید کچھ پوچھتا شانی کی نگاہ سامنے پڑی اور ایک بار پھر اس کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ایک پولیس ناکہ سامنے موجود تھا۔ لوہے کے اسٹینڈ رکھ کر سڑک کو جزوی طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ رائفل مین بالکل چوکس نظر آتے تھے۔ ایک اہلکار نے اسٹاپ والا سائن لہرایا اور ایمبولینس کو رکنے کا کہا۔

یوں محسوس ہوا کہ ایمبولینس کا ڈرائیور پہلے سے رکنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے گاڑی روکی، لیکن رکتے رکتے بھی کچھ آگے نکل گیا۔ ایمبولینس میں ڈرائیور کے علاوہ جو دوسرا شخص موجود تھا، یہ وہی تھا جس نے ڈرائیور کے ساتھ مل کر رستم کا اسٹریچر ایمبولینس میں پہنچایا تھا۔ یہ بانس کی طرح دبلا پتلا اور لمبا شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ خود کو کمپاؤنڈر بتا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں ناصر اور اجمل خان وغیرہ کو سمجھایا کہ گھبرانے کی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چادروں کے نیچے اجمل خان اور ساگر کی گنز بالکل تیار حالت میں تھیں اور کسی بھی لمحے آگ اُگل سکتی تھیں۔ شانی اور گریس ابھی تک مقامی لباس میں تھیں۔ انہوں نے اپنے چہرے گھونگھٹ میں چھپا لئے۔ رستم کے اوپر چادر پھیلا دی گئی۔ پہلوان نے بھی اپنا گھائل ہاتھ چادر تلے چھپا لیا۔ تین پولیس اہلکار لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ایمبولینس کی طرف آئے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر دو پھول اسے سب انسپکٹر ظاہر کر رہے تھے۔ باقی دو رائفل مین تھے۔

شانی جانتی تھی، اگر پولیس اہلکاروں نے ایمبولینس کے اندر جھانک لیا تو پھر خیریت نہیں گزرے گی۔ کمپاؤنڈر نما شخص نے ناصر اور اجمل خان کو پھر تنبیہہ کی۔ ''گھبرا کر گولی نہیں چلا دینی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

شانی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ سب انسپکٹر نے ڈرائیور والا دروازہ کھولا اور وہیں سے اندر جھانکا۔ دونوں رائفل مین سب انسپکٹر کے عقب میں چوکس کھڑے رہے۔ سب انسپکٹر نے ایمبولینس کی سواریوں پر طائرانہ نظر ڈالی پھر ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''تحصیل ہسپتال جی۔''

''کیا معاملہ ہے؟''

''ڈھوک وزیری کا بندہ ہے جی۔ سخت بیمار ہے۔''

شانی نے دھیان سے سب انسپکٹر کا چہرہ دیکھا اور بری طرح چونک گئی۔ یہ چہرہ شانی کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ سب انسپکٹر..... ایس پی حاجی حیات خان کے ماتحتوں میں شامل تھا۔ حاجی حیات سے مہتم بستی میں ملاقات ہوئی تھی تب بھی یہ سب انسپکٹر حاجی حیات کے ساتھ تھا۔ اس کا نام مالک تھا۔ سب انسپکٹر مالک نے اپنے دونوں رائفل مینوں کو گاڑی میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں دیا اور ڈرائیور سے ایک دو سوال پوچھ کر آگے بڑھنے کا اشارہ دے دیا۔

ایمبولینس کا سائرن پھر بجنا شروع ہو گیا اور وہ تیزی سے شمال کی سمت روانہ ہو گئی۔

شانی نے خود کو سناٹے میں محسوس کیا۔ واقعات کی کڑیاں مل رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ انسپکٹر شاد، پہلوان، جیرا، سب انسپکٹر مالک اور حاجی حیات خان دراصل ایک ہی مہم کا حصہ ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو پس پردہ ہیں اور رستم اور اس کے باقی ماندہ ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ غالباً ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت عمل کر رہے تھے اور ان کی نگاہیں ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ لوگ اماں ساوری کے گھر تک نہ پہنچ پاتے۔ جوں جوں شانی سوچ رہی تھی اس کے سینے میں نئی ترنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رستم کے قریبی دوست حاجی حیات خان نے رستم کو کلی طور پر ڈپٹی ریاض کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ وہ خود کو سامنے لائے بغیر اپنے دوست کو مشکل ترین حالات سے نکالنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

شانی کا دھیان ایک بار پھر انسپکٹر شاد کی طرف چلا گیا۔ وہ شانی اور رستم کے لئے جتنی کوشش کر رہا تھا وہ غیر معمولی تھی۔ انسپکٹر شاد نے بتایا تھا کہ وہ یہ کوشش صرف اس لئے کر رہا ہے کہ وہ چوہدری بابر کی باتیں سن کر شانی کے کردار سے متاثر ہوا ہے لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ انسپکٹر شاد بھی شاید اس سلسلے کی کڑی تھا جس کا آخری حلقہ حاجی حیات خان تھا۔

شانی کو مرحوم اباجی کی بات یاد آئی۔ ''وہ کہا کرتے تھے، دنیا گنبد کی آواز ہے۔ جو کہو گے وہی سنو گے۔ یہ گنبد کی آواز ہی تو تھی۔ رستم نے اپنے کچھ دوستوں کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ اب اس کے کچھ دوست اس کے لئے شدید خطرات مول لے رہے تھے۔ وہ پس پردہ تھے لیکن بھرپور جدوجہد کر رہے تھے۔ ایمبولینس ایک بار پھر رواں دواں تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ان کے اعصاب کی کشیدگی کم ہو رہی تھی۔ ان کے دل گواہی دینے لگے تھے کہ بالآخر وہ خون ریزی کی حدود سے باہر نکل آئے ہیں۔ ایمبولینس کے اندر طبی امداد کا سامان موجود تھا۔ ڈاکٹر ناصر نے آستینیں چڑھائیں اور پہلوان کے ساتھ مل کر رستم کو میڈیکل ایڈ دینے میں مصروف ہو گیا۔

رستم کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شانی نے اس پر جھک کر اپنا کان اس کے ہونٹوں سے قریب تر کیا۔ ''ہم کہاں ہیں؟'' رستم کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔

''وڈے ڈیرے سے بہت دور نکل آئے ہیں۔'' شانی نے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی تب رستم کے ہونٹ دوبارہ متحرک ہوئے۔ وہ گہری غنودگی میں

بول رہا تھا۔ ''آپو! بی بی سے کہنا مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔'' وہ بے خبری کے عالم میں شاید اپنی بہن سے مخاطب تھا۔

شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے ہونٹ رستم کے بائیں کان کے ساتھ لگائے اور سسک کر بولی۔ ''نہیں جاؤں گی رستم...... اب کہیں نہیں جاؤں گی۔''

گاڑی کے سامنے والے حصے میں اجمل خان اور ناصر کے درمیان ہلکے پھلکے جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ گھمبیر حالات کا ذرا سا اثر بھی اجمل خان کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

ناصر نے کہا۔ ''خان! تم نے تجسس پیدا کر دیا ہے۔ اس سامان کے بارے میں نہیں بتایا جو جیپ کی چھت پر گر گیا تھا۔''

''خو چے! تم بھی ایک دم پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ کوئی لمبا چوڑا سامان نہیں تھا۔ بس امارا بٹوا تھا۔ جیب سے گر گیا تھا گاڑی کی چھت پر۔ ام اس کو پکڑنے کی کوشش پرما (فرما) رہا تھا۔''

''کوئی بڑی رقم تھی؟''

خان کے چہرے پر خون کی سرخی لہرائی۔ ''نہیں بابا! رقم نہیں تھا۔ اس میں...... امارے ہونے والے بی بی کا پوٹو تھا۔''

ناصر نے چیرے کا خون صاف کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔''

''تم نے کیا کہا برادر؟''

ناصر نے بات بدلی۔ ''میں نے کہا ہے کہ اگر تم ہونے والی بیوی کی فوٹو کے لئے خود کو اتنے خطرے میں ڈال سکتے ہو تو بیوی کے لئے کیا کرو گے؟''

ایمبولینس کی رفتار اب کافی بڑھ گئی تھی۔ راستہ چکر دار تھا۔ اطراف سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ شانی نے رستم کا ہاتھ تھام رکھا تھا...... تاریک منظر پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

☆======☆======☆

یہ چھوٹا سا پہاڑی مکان ایک خوب صورت چشمے کے کنارے واقع تھا۔ چشمے کا پانی ایک چھوٹے سے آبشار کی صورت پتھروں پر گرتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا۔ قرب و جوار سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ خود رَو پھولوں کی خوشبو ٹھنڈی ہوا سے بغل گیر ہو کر در و دیوار میں چکراتی تھی اور جسم و جان کو بہار آشنا کرتی تھی۔ شانی اور دیگر افراد کل شام یہاں پہنچے تھے اور یہاں پہنچ کر شانی کو بہار اور خوشبو کا اصل مفہوم معلوم ہوا تھا۔

ایمبولینس انہیں چھوڑ کر فوراً واپس چلی گئی تھی۔ پہلوان اور سانگر بھی ایمبولینس والوں

کے ساتھ ہی لوٹ گئے تھے۔ زخمی چیرے کو انہوں نے کل راستے میں ہی ایک پرائیویٹ کلینک میں اتار دیا تھا۔ اب اس خوب صورت دو منزلہ پہاڑی مکان میں رستم اور شانی کے علاوہ صرف گریس، ناصر اور خان تھے۔ رستم کو ایک کشادہ ہوادار کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اس کی بائیں جانب لکڑی کی کھڑکی کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے آبشار کی جھلک نظر آتی تھی۔ خوش رنگ پھولوں گلاب، چنبیلی، مولسری اور گیندے کی مہک بھی اس کھڑکی کے ذریعے گھر میں راستہ بناتی تھی۔

اس خوبصورت گھر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں شانی کو لگتا تھا کہ اس نے یہ گھر پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ کہاں؟ شاید کسی تصویر میں...... یا شاید اپنے خیالوں میں اور تصورات میں۔ اسے سارے در و دیوار دیکھے بھالے لگتے تھے۔ وہ جیسے یہاں آنے سے پہلے بھی یہاں آئی ہوئی تھی، یہاں گھومی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو...... یہ مناظر سب اپنے اپنے سے لگ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کی زخم زخم روح کو ایک طرح کی راحت نصیب ہو رہی تھی۔ اس کے ارد گرد موجود سارے ہنگامے، سارے خطرات اور موت کے سائے کہیں دور رہ گئے تھے۔ بحرِ غم میں یہ چار دیواری ایک پُرسکون جزیرے جیسی تھی۔ اجمل خان اور ناصر بالائی پورشن میں تھے۔ ناصر آرام کر رہا تھا جب کہ خان بڑی لگن سے اپنی چہیتی ایل ایم جی صاف کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے لئے اسلحہ بڑی محبوب شے تھا۔ شانی اپنے خیالوں میں گم تھی۔ ابھی ابھی اس نے رستم کو دوا پلائی تھی۔ ناصر کے ساتھ مل کر اس کی پٹیاں بدلی تھیں۔ اب وہ باہر چھوٹے سے برآمدے میں بیٹھی تھی تاہم کمرے کی کھڑکی سے اس کی نگاہیں گاہے بگاہے رستم کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا یا اونگھ رہا تھا۔

اچانک گریس کی آواز نے شانی کو چونکا دیا۔ شانی یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ گریس اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ بولی۔ ''شونی میں پچھلے ایک منٹ سے یہاں بیٹھی تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم اپنے خیالوں میں اتنی مگن ہو کہ تمہیں میری آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔''

''واقعی نہیں چلا۔'' شانی پھیکے انداز میں مسکرائی۔

''ہاں، محبت میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔'' گریس نے روانی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' شانی کا جسم سنسنا اٹھا۔

گریس عجیب محویت کے عالم میں شانی کو دیکھتی رہی۔ وہ دونوں اب اپنے دیہاتی لباس بدل چکی تھیں۔ پہاڑی ہوا ان دونوں کے سروں پر سے سرگوشیاں کرتی گزر رہی تھیں۔ ایک طویل وقفے کے بعد گریس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شونی! تم میری

دوپٹا بدل بہن ہو۔ میری ایک بات مانو۔ رستم سے شادی کرلو۔ اسے تمہاری جتنی ضرورت اب ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔''

شانی سناٹے میں رہ گئی۔ گریس نے یہ بات اتنے گھمبیر لہجے میں کہی تھی کہ الفاظ شانی کے پورے جسم میں سرایت کر گئے۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو گریس؟'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں شونی! میں جانتی ہوں تمہارے پاس کئی اعتراضات ہوں گے۔ تم چوہدری بشیر سے اپنے وعدے کی بات کرو گی۔ تم اس چھوٹے بچے کی بات کرو گی، جو تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم موجودہ غیر یقینی حالات کی بات کرو گی اور اس کے علاوہ بھی تمہارے پاس کئی دلیلیں ہوں گی لیکن شونی! تم ان ساری دلیلوں اور مصلحتوں کو سچے جذبے کی بھرپور طاقت سے بکھیر سکتی ہو۔ ہمارے لئے وہی کچھ ہوتا ہے جو ہم آگے بڑھ کر حاصل کر لیتے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم سوچتے رہتے ہیں اور سازگار حالات کا انتظار کرتے رہتے ہیں، وہ اکثر ہمیں نہیں ملتا۔ ہاں شونی! ہمارا وہی ہے جو ہم آگے بڑھ کر پا لیتے ہیں۔''

شانی نے کچھ کہنا چاہا لیکن گریس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہ چار دیواری ایک عارضی ٹھکانہ ہے۔ معلوم نہیں یہ تمہیں اور رستم کو کتنے مہینے، ہفتے یا دن تحفظ فراہم کر سکے گا لیکن شونی محبت کی تو تھوڑی سی زندگی بھی بہت ہوتی ہے۔ چند دن، ہفتے یا مہینے جو کچھ بھی تمہیں اور رستم کو یہاں سے ملے وہ لے لو۔ وہ تمہارے لئے زخم زخم ہے شونی! اس کے زخموں پر تمہارے سوا اور کوئی مرہم نہیں رکھ سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ ہاں شونی! اس زخم زخم مایوس اور دکھی شخص کے لئے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھو۔ آگے بڑھو گی تو قدرت خود راستے پیدا کر دے گی......''

گریس بولتی رہی اور شانی سنتی رہی۔ اس کا دماغ جیسے سُن ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جو کچھ گریس کہہ رہی تھی وہ شانی کے اپنے اندر کی آواز بھی تھی لیکن ایسے حالات میں ... اتنی جلدی ... اس نامعلوم مقام پر یہ سب کیونکر ہو سکتا تھا۔ یہاں تو پل بھر کا پتا نہیں تھا۔ کیا کہا جا سکتا تھا کہ آج سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ڈپٹی ریاض یا اس کے کسی ہرکارے کے ہاتھ اس پہاڑی مکان کے دروازے پر دستک دے دیتے۔

رات کو شانی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ غنودہ حالت میں اس کے خیالوں نے ایک بار پھر وہی منظر دکھایا جو کئی بار اس کے پردۂ تصور پر لہرا چکا تھا۔ یہ مہتم بستی تھی۔ دور تک ڈیک نالے کے کنارے سرکنڈے لہرا رہے تھے۔ سینکڑوں مرد و زن اور بچے قطار اندر قطار

کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھول تھے۔ ان کے نیم عریاں سانولے جسم پسینے سے چمک رہے تھے۔ یہ بہ یک زبان شانی سے التجا کر رہے تھے۔ وہ گا رہے تھے۔

من جا پیاری من جا
راج دلاری من جا
تیرا ماہی بڑی دور سے آیا ہے
اس کا مکھڑا زخموں نے گہنایا ہے
دیکھ نی اس کے بھیڑے حالوں کو
دیکھ نی اس کے پاؤں کے چھالوں کو

گیت گونجتا رہا۔ شانی چونک گئی۔ گانے والیوں کی ایک قطار میں نگینہ بھی موجود تھی لیکن نہیں، وہ نگینہ نہیں تھی وہ تو گریس تھی۔ وہ گریس تھی لیکن اس کے چہرے پر نگینہ کی آنکھیں تھیں۔ ہو بہو نگینہ کی آنکھیں۔ یہ کیا اسرار تھا؟ یہ کیسا Illusion تھا؟ کیا یہ صرف ایک اتفاقیہ مشابہت تھی؟ اچانک شانی کے خیالات کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ جلدی سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساتھ والے کمرے سے ڈاکٹر ناصر اسے پکار رہا تھا۔ ڈاکٹر ناصر کی آواز میں ان گنت اندیشے تھے۔ ''......شانی بی بی......شانی بی بی۔'' اس کی آواز گونج رہی تھی۔

شانی نے چپل پہنی اور تیزی سے رستم کے کمرے کی طرف گئی۔ یہاں لالٹین کی روشنی میں ڈاکٹر ناصر اور گریس رستم کی پائنتی کی طرف نظر آ رہے تھے۔ رستم ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ ناصر اس کی کٹی ہوئی ٹانگ سہلانے میں مصروف تھا۔

''کیا ہوا؟'' شانی نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

''بھائی کی ٹانگ آپ نے تکیے کے اوپر رکھی تھی؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں...... یہ کہہ رہا تھا کہ درد ہو رہا ہے۔''

''لیکن میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ ٹانگ کے نیچے کوئی چیز نہیں رکھنی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ناصر! لیکن عام طور پر زخمی ٹانگ کو تھوڑا سا اوپر اٹھانے سے درد کم ہو جاتا ہے۔'' شانی نے دلیل دی۔

''دیکھیں، یہ عام معاملہ نہیں ہے۔'' ناصر کے لہجے میں ہلکی سی جھلاہٹ تھی۔ ''پلیز آپ وہیں کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔''

گریس نے بھی شانی کی طرف دیکھ کر تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

شانی ابھی تک اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکی تھی کہ رستم کی ٹانگ کا زخم دیکھ سکے۔

تاہم گریس اکثر ڈاکٹر ناصر کے ساتھ مل کر یہ زخم دیکھتی تھی۔ ایسے میں دونوں سرگوشی کے لہجے میں تبصرہ بھی کرتے تھے۔ شانی نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔ مگر شانی کے بار بار پوچھنے کے باوجود گریس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ وہ شانی کو بس اتنی ہی تسلی دے سکتی تھی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے شانی اور گریس کو باہر بھیج دیا اور خود رستم کی ٹانگ کی بھاری بھرکم پٹی کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

کمرے سے باہر آ کر شانی نے کہا۔ ''گریس! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ زخمی ٹانگ یا بازو کو تھوڑا سا اونچا رکھا جائے تو خون کا دباؤ زخمی حصے میں کم ہو جاتا ہے اور درد میں بھی کمی آتی ہے لیکن ناصر بالکل مختلف بات کر رہا ہے۔''

''کچھ بھی ہے شونی! وہ اپنے کام کو ہم سے زیادہ سمجھتا ہے۔''

''کل اس نے زخم کو بُری طرح چھیل کر تازہ بھی کیا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آئی۔''

''شونی! ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ رستم کا زخم خراب نہ ہو اور وہ جلد اچھا ہو جائے۔ اب اس کے لئے ڈاکٹر جو بھی راستہ اختیار کرے وہ ڈاکٹر کا کام ہے۔''

''کیا وہ ٹانگ کے زخم پر ایلوپیتھک کے علاوہ بھی کوئی دوا لگا رہا ہے؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے کل ایک بوتل میں دیسی ٹائپ کی دوا دیکھی تھی۔ شاید کوئی مرہم تھا۔''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بعض ایلوپیتھک دوائیں بھی ہربل دواؤں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تم سے کچھ اور کہنا چاہ رہی ہوں۔'' گریس شانی کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔

''کہو گریس۔'' شانی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''شونی! تم صرف پہلے دن رستم کے کمرے میں سوئی ہو۔ اس کے بعد علیحدہ کمرے میں آ گئی ہو۔ میرے خیال میں اجمل خان یا ڈاکٹر ناصر رات کے وقت اس طرح رستم کا خیال نہیں رکھ سکتے جس طرح تم رکھتی ہو۔ کل صبح سویرے میں نے دیکھا تھا خان، رستم کے قریب بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ بلکہ نیند کی حالت میں رستم کے اوپر ہی گرا ہوا تھا۔ بعد میں، میں نے جگایا تو وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اب بھی رستم دیر تک کراہتا رہا ہے تو میرے کانوں تک آواز پہنچی

ہے۔''

''لیکن...... گریس! میں اکیلی کس طرح سو سکتی ہوں... کمرے میں؟'' شانی کے لہجے میں الجھن تھی۔

''تم اس کمرے میں ہی نہیں اس کے پاس بھی سو سکتی ہو۔ طریقہ میں نے تمہیں بتایا تھا...... شادی۔'' گریس کے لہجے میں شوخی تھی۔

شانی کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ اس کے چہرے پر رنگ بکھر گیا۔ گریس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''شونی! دیر مت کرو۔ خدا کے لئے دیر مت کرو۔ اسے تمہاری ضرورت جتنی اب ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ تمہیں ایک سنہری موقع ملا ہے، اپنی ساری بے رخیوں کے داغ دھونے کا۔ ایسا نہ ہو کسی وجہ سے یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ پھر پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''لیکن میں کیا کروں؟'' شانی کی آواز میں بے قراری [illegible] تھا۔

''تم کچھ مت کرو میری بہن! تم بس فیصلہ کرو۔ اس کے بعد سب کچھ مجھ پر اور ناصر پر چھوڑ دو۔ ہم دونوں بات کر لیں گے رستم سے۔ سب کچھ ٹھیک کر لیں گے ہم۔ تمہیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔''

دائیں طرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ شب کی تاریک ہوا کی لہروں پر پھولوں کی خوشبو تھی اور کہیں دور سے آنے والی آواز کی مدھم بازگشت تھی۔ من جا... پیاری من جا... راج دلاری من جا......

شانی کے سینے میں ایک شدید ہلچل پیدا ہو گئی۔ گریس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ''شونی! صرف تم ہو جو اسے زندگی کی طرف لوٹا سکتی ہو۔ اگر تم نے اس سے منہ موڑ لیا تو کوئی اسے سہارا نہیں دے سکے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی طرح پگھل جائے گا۔''

شانی لرز گئی۔ گریس کی گرفت میں اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ دونوں کے درمیان گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اس خاموشی کو گریس نے ہی توڑا۔ وہ شانی کے ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری چپ کو کیا سمجھوں شونی! کیا تمہارا جواب ہاں میں ہے؟''

چند لمحے میں شانی جیسے برف اور آگ کے سات سمندروں پر سے گزر گئی۔ وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی۔ ''رستم کا ردِعمل پتا نہیں کیا ہو؟''

گریس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اس کے ردِعمل کو چھوڑو میری بہن! اگر تمہاری طرف سے ہاں ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

شانی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ آخر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''تم جو مناسب سمجھتی ہو کرو گریس۔''

گریس نے پُر جوش انداز میں شانی کو گلے سے لگا لیا اور اس کا سر چومنے لگی۔

شانی نے اگلے چوبیس گھنٹے عجیب کیفیت میں گزارے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے جسم سے ساری زندگی نچوڑ کر رستم کے جسم میں داخل کر دے۔ شاید یہ اس کی شدید ترین خواہش کے اثرات ہی تھے کہ رستم گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ بہتر ہو رہا تھا۔ اب وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ دو تین بار وہ اجمل خان یا ناصر کے سہارے سے باتھ روم تک بھی گیا تھا۔ اس کے چہرے کی خوفناک زردی بھی قدرے ماند پڑ گئی تھی۔

شانی کو رستم کے بعد جو دوسری بڑی فکر تھی وہ تایا معصوم کے بارے میں تھی۔ اسے ان کی موجودہ حالت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ شانی کی آنکھوں میں رہ رہ کر وہ دلدوز منظر لہراتا تھا جب جی ٹی روڈ پر جیپ کے سفر کے دوران میں ڈپٹی ریاض کی طرف سے تایا معصوم کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ مزاحمت کے دوران میں جیپ سے فرش پر گر گئے تھے اور ان کی عمر کا لحاظ کئے بغیر ایک ہٹا کٹا کانسٹیبل ان کو اپنے نیچے دبا کر بیٹھ گیا تھا۔ ان مناظر کا تصور ہی شانی کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔

رات کو شانی نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ ڈاکٹر ناصر اور گریس رستم کے کمرے میں تھے۔ رستم تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں کرسیوں پر تھے۔ وہاں سنجیدہ قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ شانی کے رخسار تمتما گئے اور وہ جلدی سے گھر کی چھت پر چلی گئی۔ اجمل خان بالائی منزل کے ایک کمرے میں اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے ریڈیو بج رہا تھا۔ اس کی محبوب گن محبوبہ ہی کی طرح اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اجمل خان کا ایک ہاتھ گن پر تھا۔ شانی اس پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی چھت پر چلی گئی۔ خوشگوار ہوا نے مچل کر اس کے بالوں کو پریشان کیا۔ وہ اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی اور ان حالات کے بارے میں بھی جو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اسے اپنی کلائی پر چوہدری بشیر کی ہوسناک ظالمانہ گرفت یاد آئی۔ پھر چوہدری کے وہ الفاظ یاد آئے جن کے ذریعے اس نے شانی کو اپنا پابند بنایا تھا۔ نوخیز کوکی کو طلاق بھی چوہدری نے اس شرط پر دی تھی کہ شانی اس سے چند ماہ کے اندر شادی کرے گی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کے واپس نہ جانے سے کوکی اور راجو پر کیا اثرات پڑیں

گے۔ کہیں چوہدری کوکی کو راجو سے واپس چھیننے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔ تسلی صرف اس بات کی تھی کہ کوکی اب تاؤ حشام کی بہو تھی اور وہ اس کی حفاظت کر سکتا تھا۔ دوسری حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ شانی کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ چوہدری بشیر اور دیگر لوگ اسے یقیناً لاپتا ہی تصور کر رہے تھے۔ وہ ایک لمبی آہ بھر کر چھت پر ٹہلنے لگی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مکان کی چار دیواری کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا گھر تھا۔ تاہم اس گھر کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ یہاں چند بکریاں، دو گائے اور کچھ مرغیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کل دن کے وقت شانی نے یہاں ایک عمر رسیدہ جوڑے کو دیکھا تھا۔ سفید براق بالوں اور روشن چہرے والا ایک شخص مرغیوں کو انجکشن لگا رہا تھا جب کہ عورت گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔ صرف دو روز پہلے ہی شانی کو معلوم ہوا تھا کہ یہ میاں بیوی دراصل ڈاکٹر ناصر کے والدین ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب ناصر مفرور ہوا تو حسبِ رواج پولیس نے ناصر کے گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ناصر کے بھائی کو دو تین بار پولیس پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اس کے والد کو بھی بار بار تھانے بلایا جاتا رہا۔ اس کے بعد یہ لوگ خاموشی سے نقل مکانی کر کے گھوڑا گلی کے اس دور دراز گاؤں میں آباد ہو گئے لیکن شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلوان وغیرہ انہیں یہاں کیوں لے آئے ہیں۔ کیا یہ پروگرام پہلے سے طے تھا یا بعد میں بنا۔

شانی اسی ادھیڑ بُن میں تھی کہ اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر ناصر اور گریس سرگوشیاں کرتے ہوئے چھت پر آ رہے تھے۔ شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ شانی بھی چھت پر ہے۔ شانی کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے۔

شانی ان کے پاس چلی گئی۔ گریس کے ہونٹوں پر اب ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''کس بات پر مسکرا رہی ہو؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس بات پر مسکرا رہی ہوں کہ مجھے تمہاری بزرگ بن کر تمہاری بات چلانا پڑ رہی ہے۔''

شانی کے چہرے پر سرخی لہرا گئی۔ وہ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی۔ ''ناصر! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم اس بستی میں کیوں آئے ہیں؟''

''کیوں؟ یہ آپ کو غیر محفوظ لگ رہی ہے؟''

''نہیں لگ تو بہت محفوظ رہی ہے مگر ہم تو پہلوان اور جیرے کی رہنمائی میں روانہ ہوئے تھے اور ان دونوں کو ہماری مدد کے لئے بھیجنے والے حاجی حیات تھے۔ حاجی حیات خان نے ... لئے یہ ٹھکانہ کیسے تجویز کر دیا؟''

''یہ حاجی حیات صاحب نے نہیں میں نے تجویز کیا ہے۔'' ڈاکٹر ناصر بولا۔ پھر چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''دراصل پہلوان اور جیرا تو ہمیں راولپنڈی سے آگے حسن ابدال کی طرف لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ جس علاقے کی بات کر رہے تھے وہ مجھے یہاں سے کم محفوظ لگا۔ جب ہم راستے میں رواۃ سے آگے تھوڑی دیر کے لئے رکے تو میں نے حاجی حیات صاحب کے کارِ خاص سب انسپکٹر اختر سے خود فون پر بات کی تھی۔ میں نے اختر صاحب کو بتایا کہ میرے پاس ایک زیادہ محفوظ ٹھکانہ موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم وہاں کافی دیر تک اطمینان سے رہ سکیں گے۔ سب انسپکٹر اختر کے ساتھ بات چیت کے نتیجے میں طے ہو گیا کہ ہم حسن ابدال کے بجائے مری روڈ اور گلیات کی طرف نکلیں گے۔''

''کیا اب حاجی حیات صاحب ہماری یہاں موجودگی سے مطمئن ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''بالکل مطمئن ہیں۔ ابھی صرف ایک گھنٹہ پہلے مجھے ان کا پیغام ملا ہے۔''

''کیسے؟'' شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ پہلوان آیا ہوا ہے۔ وہ عام راستے سے ہٹ کر آیا ہے اور خچر پر یہاں تک پہنچا ہے۔ بہت تھکا ہوا ہے اس لئے سو رہا ہے۔ صبح آپ سے ملاقات کراؤں گا۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟''

''اس نے یہاں کی صورتِ حال سب انسپکٹر اختر کو اور اختر نے حاجی حیات خان کو بتا دی ہے۔ حاجی صاحب گاؤں کی لوکیشن سے مطمئن ہوئے ہیں۔ ان کے لئے یہ بات بھی اطمینان کا باعث ہے کہ یہاں سے نزدیک ترین پولیس چوکی بھی چوبیس کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ انہوں نے پہلوان کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے کہ ہم بستی سے باہر نکلنے کی کوشش بالکل نہ کریں اور جہاں تک ہو سکے اس بات کو چھپائیں کہ ہمارے ساتھ ایک ایسا زخمی موجود ہے جس کی ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے ناصر! ابھی تک بستی میں سے کسی کو رستم کے بارے میں معلوم تو نہیں ہوا؟''

''نہیں ابھی تک کسی کو بھنک بھی نہیں پڑی۔ میں نے چاچا جی اور بے جی کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

ناصر والدہ کو بے جی کہتا تھا۔ بے جی کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک

آ جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ماں سے بے حد محبت کرتا ہے۔

پھر جیسے وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں شانی بی بی! آپ کے لئے ایک اور اچھی خبر ہے۔''

''کیا؟'' شانی کا دھیان فوراً تایا معصوم کی طرف گیا۔

''وڈے ڈیرے پر آپریشن سے پہلے رنگ والی سے آپ کے کچھ عزیزوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اب انہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں آپ کی چچی، آپ کے خالو اعجاز اور دو خالہ زاد بھائی بھی شامل ہیں۔''

''میرے تایا معصوم کا کچھ پتا چلا؟''

''وہ ابھی تک لاپتا ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے ضعیف العمری کے باوجود کچھ افراد کے ساتھ مل کر ایک لڑکے (جمشید) کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں لڑکا ہلاک ہو گیا۔ حملہ کرنے والوں میں سے کچھ لوگ لاپتا ہیں جن میں آپ کے تایا بھی شامل ہیں۔ تاہم عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ آپ کے تایا ڈپٹی ریاض کی تحویل میں ہیں یا اسے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں۔''

شانی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اسے معلوم تھا تایا کہاں ہیں۔ ڈپٹی ریاض نے اسے بتایا تھا کہ لاہور کے ایک کلینک میں ان کے زخموں کا علاج ہو رہا ہے اور جب تک وہ اس سارے معاملے میں اپنی زبان بند رکھے گی اس کے تایا خیریت سے رہیں گے۔ شانی کی زبان بند تھی اور اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کے تایا خیریت سے ہوں گے۔

شانی نے منڈیر پر سے دیکھا۔ ڈاکٹر ناصر کی والدہ بے جی اور والد دونوں گھروں کے درمیانی دروازے سے گزر کر آ رہے تھے۔ پچپن ساٹھ سالہ بے جی کے قدموں میں پُرشوق تیزی تھی۔ یہ مہربان صورت خاتون اس سے پہلے بھی دو دفعہ رستم کو دیکھنے آ چکی تھیں۔ اتفاقاً دونوں دفعہ رستم دوا کے زیرِ اثر سو رہا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر تواتر سے تسبیح پھیرتی رہی تھیں۔

شانی نے کہا۔ ''ناصر! لگتا ہے تمہاری بے جی رستم کو پہلے سے جانتی ہیں؟''

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایک مرتبہ میں، لالہ اور بھائی رستم کافی دن اس مکان میں پناہ گزین رہے تھے۔ ان دنوں لالہ کے پاؤں میں گولی کا زخم تھا اور وہ کچھ دن پولیس سے دور رہ کر اپنے زخم کو اچھا کرنا چاہتا تھا۔ رستم بھائی کو بھی یہاں شدید قسم کا ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ ان دنوں بے جی نے بھائی کی دن رات تیمارداری کی تھی۔ بھائی کو بھی بے جی اور چاچا سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا (ناصر والد کو مقامی رواج کے مطابق چاچا کہتا تھا) میں اور لالہ تو کچھ دن

بعد ڈیرے کی طرف واپس چلے گئے تھے لیکن بھائی پورے دو مہینے یہیں رہے تھے۔"

کچھ دیر بعد شانی، گریس اور ناصر چھت سے اُتر آئے۔ لالٹین کی روشنی میں بے جی رستم کے بالکل پاس موڑھے پر بیٹھی تھیں۔ رستم نیم دراز تھا۔ ان کا ہاتھ رستم کی پیشانی پر تھا۔ وہ کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ رستم چاچا جی سے بات کر رہا تھا۔ چاچا جی کے چہرے پر اندوہ کے گہرے سائے تھے۔ وہ گاہے بگاہے حسرت ناک انداز میں رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ لیتے تھے۔

شانی اور گریس اپنے کمرے میں آگئیں۔ گریس نے شانی کو ایک اخبار دکھایا۔ یہ دو دن پہلے کا اخبار تھا اور پہلوان اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس اخبار میں وڈے ڈیرے کے حوالے سے کچھ خبریں موجود تھی۔ حالانکہ وڈے ڈیرے کے آپریشن کو لگ بھگ پندرہ دن گزر چکے تھے پھر بھی خبروں میں اس کا چرچا موجود تھا۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ وڈے ڈیرے پر آپریشن کرنے میں جلدی کی گئی اور اس "جلدی" کے کئی ثبوت اب سامنے آگئے ہیں۔ اس تبصرے میں ڈاکوؤں کے لئے عام معافی کی تجویز کا بھی ذکر تھا۔ تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ مقامی سرداروں کی طرفداری کرتے ہوئے ڈاکوؤں کو عام معافی دینے کی کوششوں کو سبوتاژ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وڈے ڈیرے پر دو سو کے لگ بھگ افراد ہلاک اور درجنوں شدید زخمی ہوئے۔

ایک خبر میں شانی اور اس کے تایا معصوم کی گمشدگی کا ذکر بھی تھا۔ شانی کے بارے میں خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ پولیس کے سخت رویے کے سبب جان بوجھ کر رُوپوش ہوگئی ہے۔ تاہم شانی کے تایا معصوم کے حوالے سے خدشات ظاہر کئے جا رہے تھے۔ خبر میں بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جس پولیس مقابلے کے بعد معصوم علی لاپتا ہوئے وہ مشکوک تھا۔ اتنے ضعیف العمر شخص کا یوں موقع سے غائب ہو جانا بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسی خبر کے ایک حصے میں لالہ فرید، حسنا گجراتی اور مراد وغیرہ کی طرح رستم کو بھی ہلاک شدہ مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اس سے اشارہ ملتا تھا کہ درجنوں خاکستر لاشوں میں سے کسی ایک لاش کو رستم کی لاش سمجھ لیا گیا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ہلکے پھلکے شبہات موجود تھے۔

شانی اور گریس تادیر اخبار کا مطالعہ کرتی رہیں۔ اس سے انہیں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ گریس نے اخبار سنبھال کر رکھ دیا تاکہ فارغ وقت میں مزید مطالعہ کیا جا سکے۔ شانی کا خیال تھا کہ گریس اس گفتگو کے بارے میں بتائے گی جو کچھ دیر پہلے رستم سے ہوئی ہے لیکن اس کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ گریس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس کی خاموشی سے شانی نے

قیافہ لگایا کہ یہ گفتگو ابھی جاری ہے اور اس کا اگلا دور شاید کل ہوگا۔

اگلے روز صبح سویرے شانی نے ناصر کی والدہ بے جی کو دیکھا۔ وہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں۔ رستم کو صبح سویرے دوا کھانا ہوتی تھی لہٰذا وہ رستم کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ شانی نے خود کو ملامت کی کہ وہ وقت پر کیوں نہیں جاگ سکی۔ گھڑے کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر اور اپنے بال سمیٹ کر وہ جلدی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

بے جی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ شانی نے کہا۔ "نہیں بے جی! یہ میرا کام ہے۔ مجھے کرنے دیں۔"

انہوں نے بڑی محبت سے شانی کا کندھا چوما۔ "دھی رانی! میرا اور تیرا کام علیحدہ تو نہیں ہے۔ مجھے رستم پُتر کے لئے کام کر کے خوشی ہو رہی ہے۔"

"نہیں بے جی! آٹا مجھے گوندھنے دیں۔" شانی نے اصرار کے ساتھ کہا۔

"تو ٹھیک ہے، میں دودھ گرم کر لیتی ہوں۔" وہ مسکرائیں۔

انہوں نے آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ دھو لئے اور شانی نے ہاتھ آٹے میں ڈال لئے۔ رنگ والی کی حویلی میں وہ شوق سے ایسے کام کیا کرتی تھی۔ وہ چھوٹی چوہدرانی تھی لیکن اکثر نوکرانیوں کے ساتھ مل بیٹھتی تھی۔ ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے سبزی بناتی تھی، چاول چنتی تھی اور کبھی کبھی لیپا پوتی بھی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہردلعزیز تھی۔ ہر کوئی اس کے گن گاتا تھا۔ شانی کا اپنا فائدہ یہ ہوا تھا کہ چوہدرانی ہونے کے باوجود وہ گھریلو کام کاج میں عام لڑکیوں کی طرح طاق ہوگئی تھی۔

ناصر کی والدہ بے جی بڑے نرم لہجے میں بات کرتی تھیں۔ ان کی گفتگو سے شفقت کی پھوار سی چھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ انہوں نے شانی کو بتایا۔ "میں اور تمہارا چاچا اب یہیں پر آگئے ہیں۔ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں یہیں رہیں گے۔ رستم پُتر بھی یہی چاہتا تھا۔"

شانی نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میرا اور گریس کا دل بھی لگا رہے گا۔"

"یہ انگریزنی تمہاری سہیلی ہے؟" بے جی نے پوچھا۔ شانی نے اثبات میں جواب دیا۔ بے جی ہولے سے بولیں۔ "ان انگریزوں سے ہوشیار ہی رہنا چاہیے۔ میری دادی اللہ بخشے بتاتی تھیں یہ اوپر سے کچھ اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔"

"لیکن بے جی! سارے انگریز تو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ یہ بھی اور رستم کی خاطر اپنے بچے کو چھوڑ کر اور خود کو خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہے۔"

"یہ کیا کرتی ہے؟"

"اخبار والی ہے۔ اپنے ملک میں خبریں چھاپتی ہے۔ اگر یہ لوگ بھی نہ ہوں تو پھر غریب بے بس لوگوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

اچانک شانی کی نظر دیگچی پر پڑی۔ دودھ ابل رہا تھا۔ اس نے لپک کر دودھ چولہے سے اُتارا اور پھونکیں مار کر اس کا ابال کم کر دیا۔

دفعتاً شانی بُری طرح بدک گئی اور ہائے اللہ کہہ کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ براؤن رنگ کی ایک خوبصورت بلی اس کے پاؤں میں چکرائی تھی۔

بے جی نے شی شی کر کے اور پاؤں زمین پر مار کر بلی کو باہر نکالا۔ اجمل خان برآمدے میں مسواک کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "بہن جی! ام سمجھتا تھا کہ بس کمزور دل عورت ہی جانوروں سے ڈرتا ہے۔ آج پتا چلا کہ آپ جیسا دلیر خاتون بھی گھبرا جاتا ہے۔"

"بلی مجھے اکثر ڈرا دیتی ہے۔" شانی نے اوڑھنی درست کرتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ آپ کو بلی سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ بلی تو عورتوں کا سب سے زیادہ دوست ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"خو مطلب یہ کہ بلی چوہوں کو کھاتا ہے اور چوہوں سے زیادہ عورتوں کو کوئی شے نہیں ڈراتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔"

شانی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "خان بھائی! رستم جاگ گیا ہے؟"

"ہاں جی جاگ گیا ہے اور اب ذرا غسل خانے میں جانا چاہ رہا ہے۔"

"تو لے جاؤ نا غسل خانے میں۔"

"اصل میں... ام کو بہت تیز پیشاب لگا ہے بہن جی۔ ام تو ویسے ہی آپ کی ڈری ہوئی 'ہائے اللہ' سن کر رک گیا تھا۔" خان نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

شانی ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ خان بہانہ کر رہا ہے۔ وہ دو تین ہفتے سے یہی کر رہا تھا۔ وقت پر اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا۔ ناصر ویسے ہی بہت دیر سے اٹھتا تھا۔ رستم کو غسل خانے تک لے جانے کے لئے شانی کو ہی سہارا دینا پڑتا تھا۔ وہ رستم کے کمرے میں گئی۔ شرم سے اس کے گال تپنا شروع ہو گئے تھے۔ موجودہ حالات میں بھی رستم کے جسم کا لمس اس کے سینے میں ہلچل مچاتا تھا لیکن آج وہ یہ دیکھ کر ٹھٹکی کہ رستم خود ہی لاٹھی کے سہارے غسل خانے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ذرا سا ڈگمگایا۔ شانی تیزی سے آگے بڑھی۔ "میں سہارا دوں؟" اس نے

پوچھا۔

"نہیں بی بی جی۔ میں چلا جاؤں گا۔" رستم نے کہا۔

رستم کے الفاظ سے زیادہ اس کے لہجے نے شانی کو چونکایا۔ اس کے لہجے میں گریز تھا۔ شانی اسے الجھے ہوئے انداز میں دیکھ کر رہ گئی۔

دوپہر کو گریس اور ناصر پھر دیر تک رستم سے باتوں میں مصروف رہے۔ اس گفتگو کے بعد گریس باہر نکلی تو شانی کو پھر توقع پیدا ہوئی کہ گریس کچھ بتائے گی۔ گریس کے بتانے کے خیال سے شانی کا دل معمول سے زیادہ دھڑکنے لگا۔ غالباً گریس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ شانی اس سے کسی اظہار کی توقع کر رہی ہے۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ "ایک ہی دفعہ سب کچھ بتاؤں گی تمہیں۔ سسپنس رکھنے میں مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے۔"

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی ناصر کی والدہ بے جی ہاتھ میں پیالی لئے اندر داخل ہوئیں۔ پیالی میں سرسوں کا تیل تھا۔ انہوں نے شانی کے قدرے خشک بالوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "دھی رانی! کیا حال کر رکھا ہے تم نے بالوں کا۔ چلو آؤ، میں تمہیں تھوڑا سا تیل لگا دوں۔ پھر نہا لینا۔"

"رہنے دیں بے جی۔ میں خود ہی لگا لوں گی۔"

"مجھے پتا ہے تم لڑکیوں کا اور تمہارے ساتھ تو یہ انگریزنی بھی ہے۔ اس کی صحبت کا اثر بھی ہو گا تم پر۔ یہ انگریزنیاں تو شاید پوری حیاتی میں ایک بار بھی تیل نہیں لگاتی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو......" وہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئیں اور گریس کی طرف محتاط نظروں سے دیکھنے کے بعد بولیں۔ "کہیں یہ ہماری زبان تو نہیں سمجھتی؟"

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔

بے جی اسے اپنی دادی کے زمانے کی بات سنانے لگیں اور بتانے لگیں کہ ان کے زمانے میں ہندوستان کی انگریز عورتیں کیسے کیسے فیشن کیا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چارپائی پر بیٹھ کر شانی کو اپنے سامنے ایک چٹائی پر بٹھا لیا اور اس کے لمبے بال کھول کر شانوں پر بکھیر دیئے۔ پھر ان کی انگلیاں بڑی محبت سے اس کے بالوں میں چلنے لگیں۔ شانی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ رنگ والی کی حویلی اور اپنی والدہ کی بے شمار یادیں اس کے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

بے جی موٹے شیشوں کی عینک لگا کر بستی کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ کوئی ایک درجن چھوٹے بڑے بچے ان کے پاس پڑھتے تھے۔ ان میں سے تین چار بڑے لڑکے

قریبی جھرنے سے بہت سا پانی لا کر لوہے کی ایک بڑی ٹینکی میں جمع کر دیتے تھے۔ اس ٹینکی کے ساتھ باقاعدہ پائپ لگا ہوا تھا جو غسل خانے، صحن اور باورچی خانے تک جاتا تھا۔ سیوریج کا یہاں قدرتی انتظام موجود تھا۔ غسل خانے کا پانی ایک گہری دراڑ میں گرنے کے بعد پتھروں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا تھا۔ صحن کا پانی بھی اسی طرح نکل جاتا تھا۔

سہ پہر کے بعد شانی نے نہا کر دھلے ہوئے کپڑے پہنے اور لکڑی کی کنگھی سے بال سنوارے۔ بے جی نے اسے دانتوں پر ملنے کے لئے داتن (کیکر کی چھال) دی۔ ان کا دل رکھنے کے لئے شانی نے تھوڑی سی داتن ملی۔ اس کے مسوڑھے ہلکے نسواری ہو گئے اور دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ بے جی نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا اور نظر بد سے محفوظ رہنے کی دعا دی۔

ان لمحوں میں شانی کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر رستم والے کمرے میں گئی۔ ناصر اور گریس وہیں موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی شانی کو اندازہ ہو گیا کہ وہی کل والا موضوع چھڑا ہوا ہے۔ تینوں کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ ناصر دھیمے لہجے میں بہت زور دے کر کچھ کہہ رہا تھا۔ رستم نے دو تین بار نفی میں سر ہلایا اور بہت آزردہ نظر آنے لگا۔

آوازیں شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں لیکن مفہوم اس کی سمجھ میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان تینوں کے درمیان ہونے والی بات چیت الجھ گئی ہے۔ شاید رستم یہ سمجھ رہا تھا کہ شانی کی طرف سے اس پر رحم کیا جا رہا ہے اور وہ رستم کی زندگی میں صرف اس لئے آنا چاہ رہی ہے کہ اس کی معذوری کو سہارا دے سکے۔ شانی کے ذہن میں پہلے ہی یہ اندیشے موجود تھے۔ اب گفتگو کی صورتِ حال دیکھ کر یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔

تو کیا وہ رستم سے خود بات کرے؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا...... اسے سمجھائے کہ وہ اپنے لئے خود ترسی کا راستہ کیوں اختیار کر رہا ہے۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے اور کرنا چاہتی ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ اسے چاہتی ہے۔ رات ابر آلود تھی۔ گاہے بگاہے گرج چمک ہونے لگتی تھی۔ شام کے تھوڑی دیر بعد بارش ہونے لگی۔ یہ پہاڑی علاقے کی بارش تھی۔ اس کا اپنا رنگ ڈھنگ تھا۔ رستم لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکلا اور برآمدے میں آ بیٹھا۔ وہ سب بھی برآمدے میں جمع ہو گئے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا گیا۔ رستم ہمیشہ کی طرح گم صم تھا۔ اجمل خان کی ہلکی پھلکی گفتگو کے باوجود وہ گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ شانی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی ہلچل موجود ہے لیکن یہ ہلچل اس قدر شدید اور خوفناک ہو گی یہ شانی کو معلوم نہیں

تھا۔ شانی کا ارادہ تھا کہ رات سونے سے پہلے وہ گریس سے ساری تفصیلات پوچھے گی اور اس کے بعد مناسب ہوا تو کل سویرے خود رستم سے بات کرے گی لیکن کھانے کے فوراً بعد گریس نے بتایا کہ اس کے سر میں درد ہے۔ ناصر نے اسے دوا دی اور وہ جلد ہی بستر پر جا کر سو گئی۔

رستم کو دوا کی آخری خوراک کھلانے کی ذمہ داری شانی پر تھی۔ اس نے دوا کھلائی پھر نیم گرم دودھ پینے کو دیا۔ اس نے دو گھونٹ لے کر ایک طرف رکھ دیا۔

"کیا بات ہے؟"

"میں بعد میں پی لوں گا بی بی۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں بی بی! لیکن آپ میرے لئے اس قدر تکلیف نہ اٹھایا کریں۔" وہ کمزور آواز میں بولا۔

شانی کا دل چاہا کہ وہ باتیں کہہ دے جو کہنا چاہتی ہے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ اس سے پہلے گریس سے بات کرنا چاہتی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور گریس کے پاس لیٹ گئی۔ بارش جاری تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی چمکتی تھی اور پہاڑ دور تک روشن ہو جاتے تھے۔ بارش کے شور میں قریبی جھرنے کی وہ مدھم آواز دب گئی تھی جو اس مکان میں مسلسل سنائی دیتی رہتی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی لیکن وہ مسلسل کروٹیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ رستم کو دیکھنے کے لئے کھڑکی تک گئی۔ یہ دیکھ کر چونکی کہ وہ بستر پر نہیں تھا۔ غسل خانے کا دروازہ بند تھا اور بستر کے پاس بائیں پاؤں کی چپل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شانی نے اندازہ لگایا کہ وہ غسل خانے میں ہے لیکن پھر ایک چیز نے اسے ٹھٹکا دیا۔ غسل خانے میں جاتے ہوئے وہ لاٹھی دروازے پر چھوڑ جاتا تھا۔ یہ لاٹھی وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ تیزی سے رستم کے کمرے کی طرف گئی۔ تب ایک اور چیز پر اس کی نگاہ پڑی اور اسے یقین ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ سیون ایم ایم رائفل جو رستم کے سرہانے دیوار پر لٹکی رہتی تھی وہاں سے غائب تھی اور دیوار خالی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ رستم کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ پلاسٹک کی ایک بالٹی کو اس کے پاؤں سے ٹھوکر لگی۔ کچھ اشیاء کچے فرش پر بکھر گئیں۔ یہ سب رستم کی استعمال کی ہوئی اشیاء تھیں۔ خون آلود پٹیاں، روئی، انجکشنوں کے ٹوٹے ہوئے وائل، شیشیاں، گولیوں کے ریپر وغیرہ۔

"رستم...... رستم۔" شانی نے دھیمے لہجے میں اسے پکارا۔

بستر کے قریب پڑی لالٹین کی لو بہت نیچی تھی۔شانی نے لالٹین اٹھائی اور لو بلند کر کے باہر برآمدے میں آ گئی۔ آسمان سے مسلسل پانی برس رہا تھا۔ ٹین کی مخروطی چھتوں پر گر کر یہ پانی زوردار آواز پیدا کرتا تھا۔ برآمدے سے آگے پہاڑی ڈھلوان پر درخت جھومتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔اچانک بجلی زور سے چمکی۔سرسبز پہاڑ، پگڈنڈیاں اور درخت دور تک روشن ہو گئے۔قریباً 100 میٹر کی دوری پر شانی کو ایک شخص نظر آیا۔وہ لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا مخالف سمت میں جا رہا تھا۔شانی ایک لحظے میں پہچان گئی۔ وہ رستم تھا۔اس کی رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

''یہ کیا کر رہا تھا رستم؟ کیوں کر رہا تھا؟''

اس نے ناصر اور اجمل خان کو پکارنے کے لئے منہ کھولا لیکن آواز دینے سے پہلے ہی ارادہ بدل دیا۔ایک عجیب لہر سی اس کے اندر سے اٹھی۔ساری مصلحتیں اس لہر میں بہہ گئیں۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی۔شال لپیٹی، چھتری اٹھائی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر وہ اس پگڈنڈی پر آ گئی جہاں اس نے رستم کو دیکھا تھا۔وہ حتی الامکان تیزی سے رستم کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

ہوا زیادہ تیز نہیں تھی ورنہ اسے بڑے سائز کی چھتری سنبھالنا مشکل ہو جاتی۔ وہ پتھریلی ڈھلوان پر قدم جماتی نیچے اُترتی رہی۔اسے معلوم تھا کہ رستم کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہے، وہ جلد اس تک پہنچ جائے گی اور پھر یہی ہوا۔وہ جونہی ایک موڑ پر مڑی بجلی زور سے چمکی۔شانی کو بس پندرہ بیس قدم کی دوری پر رستم دکھائی دیا۔

''رستم.... رکو رستم۔'' شانی نے پکارا۔

پہاڑی بارش کے شور کے باوجود اس کی آواز رستم تک پہنچ گئی۔شانی نے اسے رکتے اور گھومتے دیکھا۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔اس کے ہاتھ حرکت میں آئے اور اس نے بے ساختہ رستم کو بھی چھتری کے نیچے لے لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو رستم؟ کہاں جا رہے ہو؟'' وہ اس کا بازو تھام کر زور سے بولی۔

رستم سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔شاید اسے توقع نہیں تھی کہ رات کے اس پہر کوئی یوں اس کے پیچھے آئے گا۔ وہ لاٹھی کے سہارے کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔موٹی کپڑے میں لپٹی ہوئی سیون ایم ایم اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔

''تم بولتے کیوں نہیں ہو رستم؟ یہ کیا کر رہے ہو؟''

وہ عجیب لہجے میں بولا۔''میں یہاں رک نہیں سکتا بی بی۔ مجھے جانے دیں۔''

''کیوں جانے دوں۔تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''جو بھی سمجھ لیں بی بی لیکن مجھے اب جانا ہے۔'' زخمی جبڑے کے سبب اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔چھتری شانی کے ہاتھ سے نکل گئی اور پتھریلی ڈھلوان پر گرتی جاتی ڈھلوان کی طرف چلی گئی۔اب وہ دونوں براہِ راست بارش کی زد میں تھے۔دائیں طرف ایک کھنڈر سا تھا۔شاید دس بیس سال پہلے کسی شوقین مزاج شہری نے اس خوبصورت مقام پر بنگلہ بنانے کی ٹھانی تھی لیکن اب بے چھت کی دیواروں کے اندر جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔شانی رستم کو سہارا دیتی ہوئی اس کھنڈر نما جگہ پر لے آئی۔ یہاں بارش اور ہوا کا زور کم تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ان پر درخت کا سائبان سا تھا۔شانی روہانسی ہوئی۔اس نے رستم کے دونوں کندھے تھامے اور آہستگی کے ساتھ اسے ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ خود کھڑی رہی۔''رستم! ایسا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟'' وہ کراہی۔

''خدا کے لئے بی بی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے زندہ رہنا بھی نہیں چاہیے۔ میں ان سب کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں جو میری آنکھوں کے سامنے بھوکے پیاسے مرے ہیں۔ان کی آوازیں مجھے بلا رہی ہیں بی بی۔ان کی آنکھیں میری راہ دیکھ رہی ہیں۔ لالہ، حسنا، آہوجہ......وہ سب مر گئے بی بی، پھر میں کیوں زندہ ہوں۔میں بھی مرنا چاہتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے.... مرنے سے پہلے بی بی! میں اس زمین سے ایک گندا بوجھ کم ضرور کروں گا۔ میں ریاض ہٹلر کو نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے مت روکیں۔''

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولتا چلا گیا۔کئی دن کی سنگلاخ خاموشی کے بعد اس کی زبان کھلی تھی تو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔''بی بی! میری کٹی پھٹی زندگی اب کسی کام کی نہیں ہے۔کسی دن اس نے اچانک بے وجہ ختم ہو جانا ہے۔ مجھے اس بے کار زندگی کو کسی کام میں لگانے دیں۔اگر ڈپٹی ریاض میرے ہاتھوں مر گیا تو یہ میری زندگی کی بہت بڑی قیمت ہو گی۔''

شانی نے اسے بولنے دیا۔اس کے اندر کا غبار کچھ کم ہوا تو شانی اس کا بازو تھام کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔وہ دھیمے لہجے میں بولی۔''رستم! میں تمہیں اتنا ہلکا شخص نہیں سمجھتی تھی۔تم ناپائیدار باتیں کر رہے ہو۔لڑائی میں بہادری سے لڑ کر ہار جانا صدمے کی بات نہیں لیکن ٹوٹ جانا بہت صدمے کی بات ہے۔تم ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی زبان بول رہے ہو۔تم

اس حالت میں ڈپٹی ریاض کو مارنے کی بات کر رہے ہو، جب کہ تم ٹھیک سے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ تمہیں چند قدم چلنے کے لئے بھی سہارے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ تمہارا جسم زخموں سے چُور ہے اور تم ایک بھیگی ہوئی رائفل لے کر ریاض کو مارنے نکل کھڑے ہوئے ہو۔ نہیں رستم! ریاض ایسے نہیں مرے گا۔ اس طرح صرف یہ ہوگا کہ اس کی چھاتی پر ایک اور تمغہ سج جائے گا۔ تمہیں زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کا تمغہ۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی رستم۔''
اس کے بھیگے بازو پر شانی کی گرفت کچھ اور مضبوط ہوگئی۔

''یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے بی بی! میں اپنے پیاروں کی موت کو نہیں بھول سکتا۔ وہ سب زندہ رہنا چاہتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ چند رعایتیں ملنے پر وہ ہتھیار ڈالنے کو بھی تیار تھے۔ بہت سے افسر ایسے تھے جو یہ رعایتیں دینا چاہتے تھے لیکن اس ڈپٹی ریاض نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنے مفاد کے لئے ان سب کو گولیوں سے بھون ڈالا... ایک ایک کو مار دیا۔'' رستم کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنا دایاں ہاتھ چھاتی پر رکھا۔ ''میرے سینے میں آگ ہے بی بی! یہ آگ مجھے اندر سے کوئلہ کر رہی ہے۔ میں کیا کروں؟''

شانی نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس آگ کو اپنے صبر و تحمل سے مدھم کرو۔ اسے اپنی طاقت بناؤ..... ایسی آگ بڑی قیمتی ہوتی ہے رستم! لیکن یہ تمہارے کام تب ہی آ سکتی ہے جب تمہارے جسم میں جان ہوگی۔''

رستم خاموش رہا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ بارش کا پانی اس کے بالوں، رخساروں اور داڑھی میں بہہ رہا تھا۔ شانی نے بات جاری رکھی۔ ''خود کو وقت دو رستم! ایسے جلد بازی کرو گے تو کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ اپنی آگ میں خود کو جلانے والے کام نہ کرو۔''

اچانک رستم نے غیر متوقع طور پر شانی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب کیفیت تھی۔ وہ کوئی بہت خاص بات کہنے کے وقت شانی کی طرف دیکھتا تھا۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی موقع تھا۔ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''بی بی! آپ مجھے رکنے دیں گی تو میں کچھ دن اور رک جاؤں گا۔''

''کیا مطلب؟ میں تمہیں رکنے نہیں دے رہی؟''

اس نے پھر سر جھکا لیا۔ ''ہاں بی بی! آپ کی حد سے زیادہ مہربانی اور نوازش مجھے رکنے نہیں دے رہی۔ میں اپنی نظروں میں آپ گرتا جا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر مر جاؤں گا۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو رستم! تمہارا لہجہ اجنبیوں جیسا ہے۔''

''میں وہی بات کہہ رہا ہوں بی بی جو سچ ہے۔ آپ میری ٹوٹی پھوٹی زندگی کا سہارا بننے کی بات کرتی ہیں۔ میں خاموش رہتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا کا خود غرض ترین بندہ ہوں۔ آپ..... آپ ایسی بات کیوں کرتی ہیں بی بی۔ میری بے کار زندگی اب چند ہفتوں یا مہینوں سے زیادہ نہیں چلے گی۔ پولیس مجھے ڈھونڈ کر مار دے گی یا میں ریاض کو مار کر مر جاؤں گا۔ آپ میری زندگی میں شامل ہو کر خود کو برباد کرنا کیوں چاہتی ہیں۔ میں آپ کو کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ آپ کا ایک مستقبل ہے بی بی! بے شمار لوگوں نے آپ سے اچھی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ وہ آپ کو اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں۔''

شانی کو لگا کہ آخری الفاظ میں رستم کا اشارہ مُنے اور چوہدری بشیر کی جانب ہے۔ ایک دم اس کے اندر کوئی شے بجھ گئی۔ اس نے رستم کے بازو پر سے اپنی محبت بھری گرفت ختم کر دی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بے حد افسردہ لہجے میں بولی۔ ''بہت افسوس کی بات ہے رستم! آج مجھے یوں لگا کہ تم نے کبھی مجھ کو دل سے اپنا سمجھا ہی نہیں۔''

شانی کے لب و لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی، رستم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ شانی نے غم ناک لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے..... جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میں اب تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ شاید میرا حق ہی نہیں تھا کچھ کہنے کا..... لیکن ایک بات یاد رکھنا رستم! میں نے جو کچھ کہا دل کی گہرائی سے کہا اور پورے خلوص سے کہا۔''

''بی بی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے...''

''میں سمجھ گئی ہوں رستم! اب مزید کیا سمجھاؤ گے۔ شاید تم نے کبھی سنجیدگی سے چاہا ہی نہیں کہ ہم دونوں ایک دوجے کی زندگی میں شامل ہوں۔ مہتم بستی میں تم عین وقت پر خاموشی سے نکل گئے تھے..... اس کے بعد تم نے نادیہ سے شادی کی اور یہ ثابت کیا کہ تم اپنے طریقے اور ڈھنگ سے زندگی گزارنے پر آمادہ ہو چکے تھے اور اب..... اب پھر تم مجھے اور ناصر، اجمل وغیرہ کو خاموشی سے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا سمجھاؤ گے تم۔ ٹھیک ہے رستم! وہی ہوگا جو تم چاہو گے۔ اس طرح طوفانی رات میں خود کو گھسیٹ کر مت نکلو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے آرام میں دخل اندازی نہیں کروں گی۔ نہ اب نہ پھر کبھی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ جو باتیں آج ناصر اور گریس نے تم سے کہی ہیں وہ پھر کبھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچیں گی۔ سمجھ لو..... یہ سب کچھ آج ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔''

شانی کے لہجے میں دنیا جہاں کا کرب سمٹا ہوا تھا۔ یہ بڑی افسانوی قسم کی صورتِ حال تھی لیکن

افسانہ بھی تو زندگی سے پھوٹتا ہے۔

رستم پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ شانی بھی بیٹھی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ رستم کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ شانی نے پھر اپنے لب کھولے۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ درد تھا۔ وہ بولی۔ ''اگر تم کہتے ہو تو میں چلی جاتی ہوں رستم! اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صبح کسی کو بتائے بغیر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں گی۔''

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سینے میں آنسوؤں کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر تھی جس نے شانی کے سراپے کو جکڑ لیا تھا۔ ان لمحوں میں واقعی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صبح کا انتظار بھی نہ کرے۔ ابھی کسی طرف کا رخ کرے اور نکل جائے۔

بجلی زور سے چمکی۔ چند لمحے بعد بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ نے نشیب و فراز کو ہلا دیا۔ بارش کی بوچھاڑیں تیز تر ہوگئیں۔ دیوانی ہوا کھنڈر کی محرابوں سے سر پٹخنے لگی۔ شانی نے واپس جانے کے لئے قدموں کو جنبش دی تو رستم بے ساختہ کراہ اٹھا۔ ''بی بی! ایسے ناراض ہو کر جائیں گی تو میں موت سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔ مجھے اس طرح نہ ماریں۔''

''مار تو تم مجھے رہے ہو۔'' شانی نے رسان سے کہا۔

''لیکن بی بی....'' رستم نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شانی قدم بڑھا چکی تھی۔ اس کے قدموں میں استحکام تھا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی تہیہ کر چکی تھی کہ اب یہاں نہیں رکے گی۔ آنسو آبشاروں کی طرح اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ رستم اس کے پیچھے آیا۔

''میری بات سنیں بی بی.....'' ڈھلوان پر رستم کی لاٹھی پھسلی۔ اس کی اکلوتی ٹانگ اسے سہارا نہ دے سکی اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ دو تین پلٹنیاں کھا کر اور کھنڈر کی ایک دیوار سے ٹکرا کر وہ ساکت ہوگیا۔ شانی تڑپ کر پلٹی۔ اس نے گھٹنوں کے بل ہو کر رستم کا سر اٹھایا۔ ''رستم۔ رستم چوٹ تو نہیں آئی؟'' رستم کے نچلے ہونٹ سے خون رس آیا تھا۔

پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ رستم اور شانی لپٹ گئے۔ اتنی شدت سے.....اتنی سختی سے کہ یک جان دو قالب ہوگئے۔ وہ کیچڑ میں لتھڑے اور بارش میں شرابور تھے۔ ان کے سروں پر بجلی چمکی اور بادل کڑکے۔ درخت دیوانہ وار جھومے اور بارش کی طوفانی بوچھاڑوں نے

کھنڈر کو نہ جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن وہ جیسے اردگرد کے ہر منظر اور ہر آواز سے بے خبر ہوگئے تھے۔ باہر کے طوفان سے کہیں بڑا طوفان ان دونوں کے اندر برپا تھا۔ بارش کے پانی سے کہیں زیادہ پانی ان کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ اس سیلابی پانی میں ساری دلیلیں، ساری مصلحتیں اور شکایتیں حقیر تنکوں کی طرح بہہ گئیں۔ جذبے کی شدت میں شانی نے اپنے ہونٹ رستم کی کٹی ہوئی پنڈلی پر رکھ دیئے۔ وہ ڈھلوان پر نیم دراز ایک دوسرے کو چومنے لگے، بھینچنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گلوگیر سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔

☆======☆======☆

قریباً تین ہفتے بعد کا ذکر ہے، موسم بہار کی پہلی بارش نے نشیب و فراز کو چمکا دیا۔ سب کچھ نکھرا نکھرا نظر آنے لگا۔ اس چھوٹی سی پہاڑی بستی کو عرف عام میں روکیٹ بھی کہا جاتا تھا۔ روکیٹ کے سارے پھول مہکے ہوئے تھے اور سارے درخت ہرے بھرے تھے۔ تین دن بعد رستم سے شانی کی شادی تھی۔ رستم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ زندگی اسے عجیب پلٹے دے رہی تھی۔ کچھ دن پہلے تک وہ خود کو دنیا کا بدنصیب ترین شخص سمجھ رہا تھا لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ اپنے اردگرد شادی کی تیاریاں دیکھ رہا تھا۔ اس الگ تھلگ پہاڑی بستی کے اس چھوٹے سے خوبصورت مکان میں وہ دیوی اس کی دلہن بننے والی تھی جس کی صرف ایک جھلک پر وہ دنیا جہان کی خوشیاں قربان کر سکتا تھا۔ وہ اپنے اردگرد ناصر، اجمل خان، ساگر اور بے جی وغیرہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ پُرجوش انداز میں تیاریاں کر رہے تھے۔ خصوصاً اجمل خان کی خوشی تو دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ گلی میں نکل کر خٹک ناچ شروع کر دیتا یا پھر چوراہے پر پہنچ کر اور ڈھول پیٹ پیٹ کر اس شادی کی منادی کرنے لگتا۔ وہ بدترین حالات میں بھی مسکرانے والا شخص تھا۔ بے جی کے پاؤں بھی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ بے جی اور چاچا ابراہیم رستم کو بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ بے جی کی خواہش تھی کہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی لیکن وہ شادی کی اہم رسمیں ادا کریں۔ اگر دو ماہ پہلے وڈے ڈیرے میں ہونے والے کشت و خون کا خیال ان کے ذہنوں میں نہ ہوتا تو وہ اس شادی پر کہیں زیادہ خوشی کا اہتمام کرتے۔ اب یہ تقریب بالکل مختصر پیمانے پر اور سادگی سے ہو رہی تھی۔

رستم اب کبھی کبھی گھر سے باہر بھی چلا جاتا تھا۔ بستی والوں کے لئے اب یہ بات راز نہیں رہی تھی کہ ان کے ہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو لاٹھی یا بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ تاہم چاچا ابراہیم نے اجمل اور ناصر کی طرح رستم کا اصل نام بھی بستی میں کسی کو نہیں بتایا

تھا۔

صبح کے وقت بے جی نے رستم کو بڑی محبت سے دودھ اور باقر خانی کا ناشتہ کروایا۔ اس بستی میں باقر خانی، بسکٹ اور اس قسم کی دیگر اشیاء شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ اونچے پہاڑوں میں گھری ہوئی ایسی بستیاں عام طور پر اپنی ساری غذائی ضروریات مقامی پیداوار سے ہی پورا کرتی ہیں۔ دودھ، دہی، انڈے، گوشت، روٹی، چاول سب کچھ یہیں دستیاب تھا۔

رستم نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر گہری سانس لی۔ اس کے بال اب پھر لمبے ہو چکے تھے۔ (یہ بال اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے ملتان میں کٹوا دیئے تھے) ناشتہ کرنے کے بعد وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکلا۔ وہ برآمدے میں بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ ابھی وہ دہلیز پر ہی تھا کہ اجمل خان نے اس کا راستہ روک لیا اور بے تکلفی سے بولا۔ ’’کدھر کو جاتا ہے برادر؟‘‘

’’ذرا برآمدے میں بیٹھوں گا۔ بارش کے بعد دھوپ اچھی لگ رہی ہے۔‘‘ رستم نے کہا۔

’’لیکن ام کو یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ اُدھر بالکونی میں امارا بہن بیٹھا ہے اور ام نہیں چاہتا کہ شادی سے پہلے آپ بار بار اس کو دیکھے۔‘‘

’’تو پھر کیا کروں؟‘‘

’’ام سے باقاعدہ اجازت لو۔ ام اُدھر پردہ کرائے گا۔ آپ پھر باہر آئے گا۔‘‘

’’تو کرالو پردہ۔‘‘

دونوں ہنسنے لگے اور باہر برآمدے میں آ گئے۔ اوپر کھڑکی کی بالکونی میں گریس موجود تھی۔ وہ مقامی لباس میں تھی اور اس ماحول میں رچی بسی نظر آتی تھی۔ اب تک اس نے اپنے شوہر سے فقط ایک مرتبہ رابطہ کیا تھا اور وہ بھی بڑی رازداری کے ساتھ۔ یہ پیغام رسانی چاچا ابراہیم کے ایک بے حد بااعتماد کارندے شریف کے ذریعے ہوئی تھی۔ شریف نامی یہ جواں سال شخص چاچا ابراہیم کے خاندانی ملازم کی حیثیت رکھتا تھا۔ شریف کے ذریعے گریس کے شوہر نے اسے کچھ عرصے کے لئے یہاں بستی میں رہنے کی اجازت دی تھی۔ اس نے بچے ڈیوس کو بھی شریف کے ذریعے ہی گریس کے پاس یہاں روکیٹ بستی میں بھیج دیا تھا۔

گریس بالکونی میں پیڑھی پر بیٹھی تھی اور بے جی سے مہندی گھولنے اور لگانے کا طریقہ سیکھ رہی تھی۔ بے جی اسے طریقہ سمجھانے کے ساتھ ساتھ چاول بھی چن رہی تھیں۔ اسی دوران میں ناصر اپنی میڈیکل کٹ سنبھالے ہوئے برآمدے میں آ دھمکا۔ ’’بھائی! کندھے کی پٹی بدلوا لیں۔‘‘

’’بدل لو بھئی! لیکن کندھے کی پٹی تو تم نے پرسوں بھی بدلی تھی۔ میرے خیال میں کندھے سے زیادہ ٹانگ کو پٹی کی ضرورت ہے۔ کل بھی تھوڑا سا خون رِسا ہے۔ یہ دیکھو۔‘‘ رستم نے ٹانگ کا ٹنڈ ناصر کو دکھاتے ہوئے کہا۔

سفید پٹی کے اوپر واقعی تھوڑا سا خون دکھائی دے رہا تھا۔

’’اس خون کی پرواہ نہ کریں بھائی۔ ابھی کچھ دن تک زخم کا تازہ رہنا ضروری ہے۔‘‘

رستم عجیب نظروں سے ناصر کو دیکھنے لگا۔ ’’اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ تم واقعی ڈاکٹر ہو تو ضرور تمہیں جھاڑ پلا دیتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔‘‘

’’کیا مطلب ہے بھائی؟‘‘

’’اتنی دیر میں زخم ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ لگتا ہے کہ تم جان بوجھ کر زخم کو تازہ رکھے ہوئے ہو...... کیا کوئی خاص وجہ ہے؟‘‘

’’کوئی خاص وجہ نہیں ہے بھائی! زخم بڑا ہے اس لئے ٹائم لے رہا ہے۔ بہرحال کل میں جو بینڈیج کروں گا اس میں سے خون کا رساؤ بالکل نہیں ہوگا۔ بے فکر رہیں۔‘‘

’’ہفتے کو جب تم پٹی کر رہے تھے، گریس بھی زخم سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی، اسے کیا پریشانی ہے؟ میرا مطلب ہے وہ کیوں دلچسپی لیتی ہے مرہم پٹی میں؟‘‘

’’دلچسپی یہی ہے کہ آپ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں اور ہم سب مل کر گا سکیں...... ویر ساڈا گھوڑی چڑھیا۔‘‘

اب ناصر کبھی کبھی رستم سے بے تکلف بھی ہو جاتا تھا۔ اجمل خان نے کہا۔ ’’ناصر بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہا ہے۔ رستم بھائی گھوڑے پر سوار ہوگا۔‘‘

’’نہیں یار! میں صرف شادی کے گانے کی بات کر رہا ہوں۔‘‘

’’اوہو...... پھر ٹھیک ہے۔‘‘ اجمل خان نے کہا۔ ’’جب رستم بھائی بالکل ٹھیک ہو جائے گا تو پھر ام ان کو اپنے ساتھ علاقہ غیر میں لے جائے گا۔ وہاں کرم ایجنسی میں ام ان کی شادی کا سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائے گا۔ وہاں ام پشتو کا ایک بڑا زبردست گانا بھی گائے گا، ان شاء اللہ۔‘‘

رستم نے اوپر بالکونی میں دیکھا۔ گریس، شانی کو کھینچ تان کر باہر کھلی ہوا میں لے آئی تھی۔ اب وہ بے جی کی ہدایت کے مطابق اس کے ہاتھوں پر مہندی لگانے کی فکر میں تھی۔

شانی اور رستم کی نگاہ ایک لمحے کے لئے ٹکرائی۔ رستم کے جسم میں جیسے اَن گنت شگوفے کھل گئے۔ شانی نے شرما کر رخ پھیر لیا۔ رستم کو اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے ایک تیز بہاؤ میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس بہاؤ کی تندی میں وہ وقتی طور پر اپنے بہت سے صدمے بھی بھول گیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ ان صدموں کی جاں گسل شدت کم ہو گئی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے اس کی زندگی کے اہم ترین موڑ کی طرف سرک رہا تھا۔ منٹ گھنٹوں میں اور گھنٹے پہروں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گھڑی قریب آ رہی تھی جس کا گزر رستم کے حسین ترین سپنوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''کیا یہ سب کچھ ہو جائے گا؟''

''کیا اسے حاصل کرنے کی خوشی وہ جھیل سکے گا؟''

ایسے اَن گنت سوال اس کے دل و دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ اس رات وہ واقعی بی بی اور ان کی زندگی سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا اچانک اور ناقابلِ مزاحمت تھا کہ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک نامعلوم کشش نے اتنی شدت سے انہیں ایک دوسرے کی جانب کھینچا تھا کہ کوئی شے راہ میں نہیں آ سکی تھی۔ وہیں اس کھنڈر میں اس چھاجوں برستے پانی کے نیچے اور ان چمکتی بجلیوں کے حصار میں سارے عہد و پیمان ہو گئے تھے اور اب آج سے دو دن بعد وہ عہد و پیمان عملی شکل پا رہے تھے۔

یہ ناصر کے چاچا یعنی والد کا کمال تھا کہ آج قریباً دو ماہ گزر جانے کے باوجود انہوں نے بستی والوں پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس چار دیواری میں جو ایک کٹی ٹانگ والا شخص موجود ہے وہ پورے ملک کی پولیس کو بڑی شدت سے مطلوب ہے۔ نہ ہی کسی کو یہ پتا تھا کہ ناصر اور اجمل خان وادی سون کے ڈیرے سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں اور انتظامیہ نے ان کے سروں کی گراں قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ بستی کے لوگوں کو یہی پتا تھا کہ ناصر چاچا ابراہیم کا بھتیجا ہے اور خان اس کا قبائلی دوست ہے۔ وہ دونوں یہاں مرغی خانہ بنانا چاہ رہے ہیں اور اس سلسلے میں مناسب جگہ کی تلاش میں ہیں۔ چاچا ابراہیم کو بستی میں میاں جی کہا جاتا تھا اور ان کی عزت کی جاتی تھی۔ وہ یہاں جڑی بوٹیوں کو سمجھنے والے حکیم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بستی کے سادہ لوح مکینوں کی طرح یہاں کا مکھیا ملک نور عباسی بھی زیادہ ہوشیار چالاک نہیں تھا۔ چاچا ابراہیم کی اس سے دوستی تھی اور وہ چاچا پر بہت اعتبار کرتا تھا کیونکہ اس کی بیمار بیٹی چاچا کے علاج معالجے اور مشوروں سے ہی بچ سکی تھی۔ چاچا کے بروقت مشورے سے نوری اسے راولپنڈی لے گیا تھا اور ہسپتال میں ایک بڑے آپریشن

کے ذریعے نوری کی بیٹی نے بیک وقت تین تندرست بچوں کو جنم دیا تھا۔ (جب کہ بستی کی ایک دایہ یہ نوید سنا رہی تھی کہ لڑکی کے پیٹ میں بچہ ہے ہی نہیں بلکہ رسولی وغیرہ ہے)

اس بستی میں رہتے ہوئے چاچا ابراہیم کو اگر کسی طرح کا کوئی اندیشہ تھا تو وہ انور ناگی نامی شخص سے تھا۔ ناگی متعلقہ پولیس چوکی کا حوالدار تھا اور مہینے میں ایک آدھ بار بستی کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ وہ نوری کے گھر میں ٹھہرتا تھا مکھن میں تلی ہوئی مرغی کھاتا تھا، گڑ کی شراب پیتا تھا اور کسی نہ کسی مد میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا بھتا وصول کر کے چلا جاتا تھا۔ صلے کے طور پر جب کبھی چار چھ مہینے بعد بڑا تھانیدار بستی کا چکر لگاتا تھا تو ناگی اسے سب مکینوں کے بارے میں سب اچھا کی رپورٹ دے دیتا تھا۔

چاچا ابراہیم اپنے ہم نوالہ و پیالہ نوری سے ہر بات کہہ لیتا تھا۔ ابھی تک بستی میں نوری واحد شخص تھا جسے چاچا ابراہیم نے رستم، ناصر اور خان کی اصلیت بتائی تھی۔

اگلے 36 گھنٹے رستم نے شدید ترین جذباتی کیفیت میں گزارے۔ وہ جانتا تھا دوسری طرف شانی بی بی کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی۔ لمحے جیسے وزنی پتھروں کی طرح گراں ہو گئے تھے اور آگے کو سرکتے ہی نہیں تھے۔ رستم جب تصور میں سوچتا تھا کہ وہ شب عروس کو اپنی بی بی کے رُوبرو ہوگا تو اس کا پورا جسم جیسے دھڑکن بن جاتا تھا۔ ایک انوکھی سنسناہٹ خون کے ساتھ اس کی رگوں میں دوڑنے لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ حقیقت میں نہیں ہے۔ وہ کوئی ناقابلِ یقین سپنا دیکھ رہا ہے۔

شادی سے ایک روز پہلے سانگر اپنی نوبیاہتا بیوی چندو کے ساتھ آ گیا۔ گھر میں تھوڑی سی مزید رونق ہو گئی۔ سردار غلام کبیر کی موت کے بعد نوخیز چندو کو آزادی ملی تھی۔ اب وہ واقعی زندہ نظر آ رہی تھی۔ رات کو گریس، چندو اور بے جی نے شانی کو باقاعدہ پیلا جوڑا پہنایا اور اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ بستی کے گھروں میں میٹھے چاول تقسیم کئے گئے، تاہم کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان چاولوں کے پیچھے اصل واقعہ کیا ہے۔ گریس ان ساری رسموں میں بڑی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے زبردستی رستم کے سر پر مہندی انڈیلی اور اس سے چھیڑ چھاڑ کی باتیں کرتی رہی۔ چندو اور بے جی نے مقامی انداز میں دو چار گیت بھی گائے۔ جب سے شادی کے دن مقرر ہوئے تھے شانی اوپر والی منزل پر چلی گئی تھی۔ اب اسے بیاہ کر نیچے والی منزل پر آنا تھا۔ ایک طرح سے بالائی منزل سے نیچے تک کا سفر شانی کے لئے میکے سے سسرال کا سفر تھا۔ اجمل خان کی خواہش تھی کہ وہ رستم کو چھوٹی سی بارات کی شکل میں اوپر کی منزل تک لے جائے۔ اس بارات میں سانگر، ناصر، چاچا ابراہیم، ان کا کارندہ شریف اور وہ خود شامل

ہوں۔ خان نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو رستم نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم اندر سے اب بھی پولیس والے ہی ہو۔ مجھے مزید زخمی کر کے بے کار کرنا چاہتے ہو۔''

''کیا مطلب ہے رستم بھائی؟''

''زخمی ٹانگ کے ساتھ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھاؤ گے تو یہی کچھ ہوگا۔''

''ام آپ کو کندھے پر اٹھائے گا جناب آپ کو جھٹکا تک نہیں لگنے دے گا۔ ام آپ کے لئے بالکل عربی گھوڑا بن جائے گا۔''

''چار ٹانگوں والے گھوڑے گرا دیتے ہیں تم تو پھر دو ٹانگوں والے ہو۔''

ناصر نے کہا۔ ''میں اپنے مریض کو اس رسک میں نہیں پڑنے دوں گا۔ بھائی نیچے ہی رہیں گے۔ یہیں پر نکاح ہوگا۔ ہم سب اوپر جا کر دلہن کو لے آئیں گے۔''

تھوڑی سی بحث وتمحیص کے بعد یہ معاملہ طے ہوگیا۔ رستم کے لئے کمرہ ناصر اور سانگر نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کی چوبی کھڑکی میں آبشار نما جھرنا نظر آتا تھا اور اس کے اردگرد بے شمار رنگ برنگے پھول اور پودے تھے۔ چیڑ اور چنار کے تین دیو قامت درختوں نے اس جھرنے کو اور بھی خوب صورت شکل دے دی تھی۔

اجمل خان جھرنے کے اردگرد موجود پھول ڈھیروں کے حساب سے توڑ لایا تھا۔ چندو، بے جی اور گریس نے دوپہر کے وقت دیر تک بیٹھ کر ان پھولوں سے لڑیاں پروئیں۔ بعد ازاں یہ لڑیاں رستم کے کمرے میں آویزاں کی گئیں۔ اس کے بستر کو بھی پھولوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ یہ فطری انداز کی نہایت سادہ لیکن دل آویز آرائش تھی۔ پھولوں کی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی۔ کچھ پھول دلہن کی آرائش کے لئے رکھ دیئے گئے۔ شادی کے لئے عروسی جوڑے کا اہتمام چندو نے کیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں سے یہ گلابی جوڑا بڑی چاہت سے تیار کر کے لائی تھی۔ اسے خوب صورتی سے کاڑھا گیا تھا اور اس پر گوٹا کناری، ستارے اور سیپاں وغیرہ جڑی گئی تھیں۔ ایک دن پہلے شانی نے یہ جوڑا پہن کر دیکھا تھا اور گریس کے الفاظ میں وہ اس لباس میں قیامت نظر آ رہی تھی۔ رستم کے لئے جوڑے کا انتظام بے جی نے خود کیا تھا۔ وہ خود کئی دن تک یہ بھاری بھرکم جوڑا بڑے چاؤ سے سیتی رہی تھیں۔ اس شادی میں نکاح خواں کے فرائض چاچا ابراہیم نے ادا کرنے تھے۔ وہ اس سے پہلے بستی میں کئی نکاح پڑھا چکے تھے۔ دلہن کے ولی کے طور پر اجمل خان موجود تھا۔ دولہا کے سرپرست کے طور پر نور عباسی کا نام تھا۔ دو دو گواہان کے دستخط وغیرہ بعد ازاں چاچا ابراہیم نے خود کرانا تھے۔

شادی کے روز مقامی رواج کے مطابق سہ پہر کے وقت رستم کو کھارے چڑھایا گیا۔ یہ بارات سے پہلے دولہا کے نہانے کی رسم تھی۔ نہانے کے بعد رستم نے بے جی کا تیار کیا ہوا جوڑا پہنا۔ یہ رنگین ریشمی کُرتے اور سبز رنگ کی دھاری دار مجھلی پر مشتمل تھا۔ سر پر ایک خوش رنگ صافہ تھا۔ یہ سارے کپڑے کڑھائی والے تھے۔ اس کڑھائی کے ہر دھاگے میں رستم کو بے جی کا پیار گندھا ہوا محسوس ہوا۔ اسے لگا کہ اپنی زندگی کے اس خوشگوار ترین موقع پر وہ تنہا ہونے کے باوجود تنہا نہیں ہے۔ بے شک اس کے ''اپنے'' اردگرد موجود نہیں لیکن کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو اسے اپنوں ہی کی طرح پیار کرتے ہیں۔

نکاح کے لئے شام کا وقت طے تھا۔ جونہی چراغ روشن ہوئے اجمل خان نے بہت سی موی شمعیں بڑے کمرے میں روشن کر دیں۔ چاچا ابراہیم نے ایک خاص قسم کا عطر در و دیوار پر چھڑک دیا۔ ان حسین لمحوں میں بھی دو صدمے ایسے تھے جو رستم کے دل کو مسلسل کچوکے لگا رہے تھے۔ ایک بڑی بہن آپو زاہدہ کا خیال، جو دن رات اس کی شادی کے سپنے دیکھتی تھیں۔ انہوں نے اس کی ہونے والی دلہن کے درجنوں جوڑے اور زیور تیار کر کے رکھے ہوئے تھے۔ ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ ان کے سینے میں یہ پھانس چبھتی تھی کہ ان کا اکلوتا بھائی بن بیاہا ہے اور موت اس کے تعاقب میں ہے۔

رستم کے لئے دوسرا صدمہ وڈے ڈیرے کے قتل عام کا تھا اور یہ صدمہ شدید ترین تھا۔ اس کے تصور میں آج اپنے دوستوں کے چہرے زیادہ شدت سے آ رہے تھے۔ وہ بھوکے پیاسے چہرے خون میں نہائے ہوئے اور گرد میں لتھڑے ہوئے۔ وہ ایک ایک کو سوچتا تھا اور اندازہ لگاتا تھا کہ اگر آج وہ ان کے ساتھ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ خاص طور پر اپنے ہم راز حسنا گجراتی کا خیال رہ رہ کر اس کے دماغ میں میخ کی طرح گڑ جاتا تھا۔ ان سب لوگوں کے دردناک انجام کا تصور اسے اپنی طرف کھینچتا تھا، اسے پکارتا تھا اور اس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ ایسے میں بی بی کا محبوب ترین تصور اس کے آڑے آتا تھا اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اسے روک لیتا تھا۔

چاچا ابراہیم نے رستم کا نکاح پڑھایا۔ ایجاب وقبول کے مراحل طے ہوئے۔ مبارک باد دی گئی۔ سب نے باری باری رستم کو مٹھائی کھلائی۔ شانی کی جھوٹی مٹھائی رستم کو کھلائی گئی اور رستم کی شانی کو۔ پھر کھانا ہوا۔ اس کھانے میں بھی بے جی، چاچا اور ناصر کی بے پناہ محبت رچی بسی تھی۔ کھانا تھوڑا تھوڑا پکایا گیا تھا تاہم یہ وہی تھا جو شادی بیاہ میں ہوتا ہے۔ پلاؤ، زردہ اور قورمہ وغیرہ۔

کھانے کے بعد گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ گھڑیاں قریب آ رہی تھیں جو رستم کے لئے زندگی کی معراج تھیں۔ اچانک رستم کو اندازہ ہوا کہ اجمل خان ارد گرد موجود نہیں ہے۔

''کہاں گیا وہ؟'' رستم نے ناصر سے پوچھا۔

''کہیں سچ مچ بستی میں اعلان کرنے نہ چلا گیا ہو۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس کا دل لوگوں کو یہ بتانے کے لئے مچلتا رہتا ہے کہ وہ عام شہری نہیں پولیس کا حوالدار ہے اور رستم سیال کے پیار میں جوگ لے کر اس بستی میں گھوم رہا ہے۔''

ساگر نے اجمل کو ایک دو آوازیں دیں، پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے جی وہ کچھ خیر خیرات کرنے گئے ہیں۔ ابھی ذرا دیر پہلے مجھ سے یہی بات کہہ رہے تھے۔''

شانی کو بالائی منزل سے نیچے لایا جا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ ایک باوقار دلہن دکھائی دیتی تھی۔ سرخ مقامی لباس میں پھولوں سے سجی ہوئی۔ گریس کے ساتھ زینہ بہ زینہ اُترتی وہ کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی یا کوئی اپسرا جو چاند سے اُتری ہو اور زمین کا ہر ذرہ اس کے احترام میں سرنگوں ہو گیا ہو۔

وہ بے جی، گریس اور چندو کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رستم کا دھیان ایک بار پھر اجمل خان کی طرف چلا گیا۔ وہ بتائے بغیر کہاں نکل گیا تھا۔ رستم جانتا تھا وہ سب نہایت مخدوش حالات سے گزر رہے ہیں۔ بے شک وہ پوٹھوہار سے باہر نکل آئے تھے لیکن ملک سے باہر تو نہیں نکلے تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے ہر وقت باخبر رہتا تھا۔

اچانک اوپر تلے ہونے والے زوردار دھماکوں نے سب کو چونکا دیا۔ یہ دھماکے مکان کے عقب میں قریباً بیس تیس میٹر کے فاصلے پر ہوئے تھے۔ ساگر اور ناصر دفعتاً کھڑے ہو گئے۔ ساگر بھاگ کر کمرے میں چلا گیا اور اپنی رائفل نکال لایا۔ ناصر کا چہرہ بھی دھواں تھا۔ وہ سخت تذبذب کے عالم میں کبھی رستم کی طرف دیکھتا تھا، کبھی داخلی دروازے کی طرف۔ دھماکوں کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ طاقت ور نہیں مگر ان کا فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ اچانک اجمل خان مسکراتے چہرے کے ساتھ جھومتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''کیسا لگا آپ کو آواز؟'' اس نے صحن میں پہنچتے ہی ہانک لگائی۔

''کیسا [illegible] نے پوچھا۔

''دھماکوں کا آواز۔ دراصل ام کو یہ خوشی بالکل ادھورا لگتا تھا۔ شادی ہو اور دھماکوں کا آواز بالکل بھی نہ ہو یہ تو ٹھیک نہیں ہے ناں جی۔ ام نے باہر درختوں میں دو گولہ چلا کر اپنا دل

ٹھنڈا کیا ہے۔''

''اوئے اجمل خان کے بچے! تم نے تو ہماری جان نکال دی۔'' ناصر نے دانت پیسے اور اجمل خان پر جھپٹا۔ اجمل خان بھاگ کر سیڑھیاں چڑھا مگر اوپر سے گریس اُتر رہی تھی۔ اس کی وجہ سے راستہ رک گیا۔ ناصر اور اجمل میں بڑی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ ناصر نے اجمل کو دبوچ لیا اور اس سے زور آزمائی کرنے لگا۔ اجمل خان کے جسم میں گینڈے کی سی بے مہار طاقت تھی۔ ناصر نے ساگر کو بھی مدد کے لئے بلا لیا۔ گریس اس دھینگا مشتی کو بڑے ''خشوع و خضوع'' سے دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس کھینچا تانی کو بھی شادی کی کوئی رسم سمجھ رہی تھی۔ اسی دوران میں چاچا ابراہیم آگے بڑھے اور انہوں نے گتھم گتھا دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔

.....اور اب رستم حجلہ عروسی میں تھا۔ یہ رنگوں کا گھیرا تھا، یہ خوشبوؤں کا حصار تھا۔ یہ ایک طلسماتی شب تھی اور یہ ناقابلِ بیان ساعتیں تھیں۔ وہ حسن و وقار کی دیوی تھی اور وہ اس کا پجاری تھا اور آج ان دونوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں تھی۔ رستم نے اپنی لاٹھی دیوار کے ساتھ رکھی اور مسہری کا سہارا لیتے ہوئے شانی کے قریب بیٹھ گیا۔ شانی بی بی کے حسین ہاتھوں پر مہندی کے خوب صورت پھول بوٹے تھے۔ ان کے کانوں اور گلے میں موتیے اور گلاب کی کلیوں کا زیور تھا۔ رستم جو اپنے دشمنوں کے لئے آہن اور فولاد تھا اب موم کی طرح نرم و ملائم دکھائی دیتا تھا۔ اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بی بی کا چہرہ چھوئے لیکن یہ جسارت تو اسے کرنا ہی تھی۔ اس نے بی بی کی ٹھوڑی کو انگلی سے اوپر اٹھایا اور کہا۔ ''بی بی! ایک دن آپ نے بڑے دکھ سے کہا تھا، گھڑے کچے بھی ہوں تو چناب کا پانی پیار کرنے والوں کو راستہ کیوں نہیں دیتا۔ دیکھ لیں آج چناب نے راستہ دے دیا ہے۔ اب تو آپ کو شکایت نہیں؟''

بی بی نے پلکیں جھکائے جھکائے نفی میں سر ہلایا۔

''بی بی! اُس رات کنڈر میں ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ ہم اب اپنی شادی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہم جو ہیں اور جیسے بھی ہیں، اب ایک دوسرے کو قبول

''ہاں، بات ہوئی تھی۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔

''لیکن میں اس بارے میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' رستم نے اپنا ہاتھ آہستہ سے شانی کے مہندی لگے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ شانی نے لرز کر رستم کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''بی بی! زندگی کا یہ نیا سفر شروع کرنے سے پہلے ایک سچ آپ کو بتا دینا چاہتا

ہوں۔"

"کیا؟"

"بی بی! میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اتنا پیار، جتنا آپ کی سوچ میں بھی نہیں آ سکتا۔"

"بس یہ کہنا تھا۔" شانی کے حسین چہرے پر شرم آمیز مسکراہٹ ابھری۔

"نہیں بی بی! کچھ اور بھی۔" رستم نے کہا اور شانی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لئے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر شانی سے نظر ملائے بغیر بولا۔ "بی بی! آپ کو پہلی بار نارپور کی حویلی میں دیکھا تھا۔ میں سخت زخمی تھا۔ آپ نے مجھے سنبھالا تھا۔ جب آپ کو دیکھا بی بی اس کے بعد کسی کو نہیں دیکھا۔ اس کے بعد کوئی عورت میری زندگی میں نہیں آئی۔ ہاں بی بی! کوئی عورت نہیں۔ نادیہ بھی نہیں۔"

شانی ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ دونوں کی نگاہیں کتنی ہی دیر ایک دوسرے میں گڑی رہیں۔ تب رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سچ کہہ رہا ہوں بی بی! آپ کے بعد مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اپنا آپ بھی نہیں۔ بس جدھر دیکھا آپ کو دیکھا...... آپ کے پیار کو دیکھا...... آپ کی خوشبو پائی۔ میں جانتا ہوں آپ میری اس خطا پر مجھ سے ناراض ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کے حکم کے خلاف چلا۔ میں نادیہ کو وہ خوشیاں نہ دے سکا جو وہ چاہتی تھی لیکن یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔ بی بی! جو کچھ میرے پاس تھا ہی نہیں وہ اسے کیسے دیتا۔ وہ ڈیرے پر میری بیوی بن کر رہی، لیکن صرف نام کی بیوی...... بہرحال اس بات کی مجھے تسلی ہے بی بی کہ میں نے اس کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتا تھا۔"

شانی کی نظریں بدستور رستم کی نظروں میں گڑی تھیں۔ شانی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ اس کے ہونٹ لرزے۔ یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر جذبات غالب آ گئے۔ اس نے ایک دم بازو بڑھا کر رستم کو گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے کندھے پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔ "تم کیا ہو رستم! مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آتی۔ تم نے ...... تم نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ جتنا سوچتی ہوں اتنا ہی تم میری سمجھ سے باہر ہو جاتے ہو۔"

"آپ بھی تو ایسی ہی ہیں۔ پیار کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں بی بی۔"

رستم نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ خوشبودار ریشم بن کر اس کے سینے میں سما گئی۔ ایسی خود سپردگی اور وارفتگی تھی اس کے انداز میں کہ رستم یک لخت عطر

ہواؤں کے دوش پر اُڑنے لگا۔ بی بی شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اب اس کا موقع نہیں رہا تھا۔ اس نے انتہا درجے کی ملائمت اور محبت سے اپنی بی بی کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ وہ جیسے جسم کو نہیں نازک ترین آبگینوں کو چھو رہا تھا۔ رخساروں کو نہیں گلاب کی کومل ترین پتیوں کو چوم رہا تھا۔ وہ محبت کر رہا تھا یا پرستش کر رہا تھا یا پرستش آمیز محبت کر رہا تھا۔ زندگی اپنے حسین ترین روپ میں اس پہاڑی مکان کے پھولوں سے آراستہ کمرے میں اُتر آئی تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنا جسم اور اپنی روح اپنے چاہنے والے کے حوالے کر چکی تھی۔

پیاری من گئی تھی، راج دلاری من گئی تھی۔

اس نے اپنے محبوب کے بھیڑے حالوں کو دیکھ لیا تھا، اس کے پاؤں کے چھالوں کو بھی گن لیا تھا۔ اب وہ سرتاپا محبت اور صلہ تھی۔ اس کا خمیر ہی محبت اور صلہ سے اٹھا تھا۔

☆======☆======☆

اگلی صبح دھلی اور نکھری نکھری تھی۔ رستم نے تکیے سے سر اٹھایا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ کھڑکی سے باہر جھرنا نما آبشار کا مدھم شور تھا۔ پھولوں پر اوس ٹھہری ہوئی تھی۔ نیلے آسمان کے پیش منظر میں پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی تھی۔ آبشار اور پرندوں کی آوازوں کے سوا چہار سُو خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو صبح کی اولین گھڑیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

رستم نے دیکھا کہ بی بی برآمدے میں ایک نواڑی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ بی بی کے نم بال اوڑھنی میں چھپے تھے۔ وہ جیسے بے دھیانی میں اپنے مہندی لگے پاؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ بی بی کے اُجلے چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ ایک ایسی نکھری نکھری طمانیت جس پر کسی حسین ترین تصویر کا شبہ ہوتا تھا۔ رستم بڑی خاموشی اور محویت سے اپنی بی بی کو دیکھتا رہا۔ وہ صبح کے اس روپہلی اجالے میں بی بی کے اس انہماک کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر بی بی مدتوں اس طرح بیٹھی رہتیں تو وہ بھی شاید مدتوں انہیں ایسے ہی دیکھتا رہتا۔

وہ جانتا تھا، بی بی اپنے ازدواجی دور میں بڑے سخت مرحلوں سے گزری ہیں۔ وہ شیشہ تھیں اور انہیں ایک پتھر شوہر ملا تھا۔ بلکہ شاید وہ شوہر تھا ہی نہیں۔ وہ تو ایک دشمن خانوادے کا دشمن فرد تھا جس نے ایک شبنم صفت لڑکی سے پھنکارتے شعلے کا سا سلوک کیا تھا۔ اس نے نازک دل بی بی کے سامنے ازدواجی رشتے کی ایک ایسی بھیانک مثال پیش کی تھی کہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید ہمیشہ کے لئے اسے "مرد" کی صورت سے ہی نفرت ہو جاتی لیکن وہ بی بی تھیں۔ مہر و محبت اور ایثار کی دیوی۔ جیسے دیومالائی پرندہ اپنے قفس میں راکھ ہوتا ہے اور اس راکھ سے پھر زندہ ہو جاتا ہے، بی بی بھی اپنے بے پناہ استقلال کے طفیل اپنی راکھ سے پھر

وجود میں آئی تھی۔

رستم کو سب کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا وہ آہستگی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صحن میں بھی سکوت تھا۔ چاچا ابراہیم کے سوا سبھی سو رہے تھے۔

''کہاں جا رہے ہو پتر؟'' صحن کے آخری سرے پر موجود چاچا نے اس سے پوچھا۔

''بس یونہی ذرا گھومنے جا رہا ہوں۔ دوپہر تک آ جاؤں گا۔'' رستم نے کہا۔

''ارے دوپہر تک؟'' چاچا نے حیرانی سے کہا۔ ''تمہاری بے جی تو ابھی تھوڑی دیر میں اٹھ کر تم دونوں کا ناشتہ تیار کرنے لگیں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ آپ سب ناشتہ کریں۔ میں دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔''

''دلہن کو بتا دیا ہے؟''

''نہیں چاچا! اسے آپ بتا دینا۔ ورنہ وہ جانے نہیں دیں گی۔''

''لیکن......؟''

''میری خاطر چاچا۔'' رستم نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔

چاچا ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ رستم کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتر! تم کہیں کسی وجہ سے ناراض تو نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے دھی رانی سے تو کوئی بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں چاچا نہیں۔'' رستم نے مسکرا کر چاچا کا کندھا دبایا۔ ''بس یوں ہی دل چاہ رہا ہے ذرا خاموشی سے دائیں بائیں ہونے کو۔''

چاچا نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل آیا۔ ابھی اس چھوٹی سی پہاڑی بستی میں بھی بیداری کے آثار نہیں تھے۔ اکا دکا مرغیاں اور دو چار بکریاں سرسبز نشیب و فراز پر گھوم رہی تھیں۔ چاچا ابراہیم کی وسیع پھلواری میں سے ہوتا ہوا رستم ایک ڈھلوان پر نکل آیا۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے جھرنے کا پانی اس ڈھلوان تک پہنچتے پہنچتے آبی گزرگاہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس نے لاٹھی ایک طرف رکھی اور اس آبی گزرگاہ میں اپنا اکلوتا پاؤں ڈال کر بیٹھ گیا۔ صبح سویرے یوں چلے آنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ نہ جانے کیوں یوں صبح سویرے بی بی کے سامنے آتے ہوئے اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا وقفہ چاہ رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ سب سے الگ ہو کر ذرا تنہائی میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یہ خوب صورت حقیقت تسلیم کرانا چاہتا تھا کہ یہ کوئی سپنا نہیں ہے، بی بی واقعی اس کی

ہو چکی ہیں۔ وہ انہیں حاصل کر چکا ہے، وہ گزری ہوئی ہر ہر خوب صورت ساعت کو اپنے ذہن میں دہرانا اور محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی یہ عادت ہمیشہ سے رہی تھی۔ اس کی زندگی میں خوب صورت مواقع زیادہ نہیں آئے تھے لیکن جتنے بھی آئے تھے انہیں اس نے اسی ڈھنگ سے اپنے دل و دماغ میں محفوظ کیا تھا اور سجایا تھا۔

رستم دیر تک اس درختوں سے گھری ہوئی تنہائی میں رہا۔ اس نے وہیں آبی گزرگاہ کے شفاف پانی میں نہا کر کپڑے بدلے اور سرسبز گھاس پر خاموش لیٹا رہا۔ وہ دوپہر کے بعد تک وہاں رہنا چاہتا تھا لیکن ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہی وہ سمجھ گیا کہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہا جا سکتا۔ اچانک ہی کچھ خیالات آندھی اور طوفان کی طرح اس پر حملہ آور ہوئے تھے اور اسے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ یہ وڈے ڈیرے کے خیالات تھے۔ آگ اور خون میں لپٹی ہوئی اس ہولناک رات کے تصورات۔ چھوٹے چھوٹے مناظر سرخ جھماکوں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ لالہ فرید، حسنا، مراد اور ان کے ساتھیوں کا اچانک حملہ۔ پولیس اور اجرائیلوں کی پسپائی۔ کھوہ کی تاریکی میں ایک پولیس والے کی اندھا دھند فائرنگ تاکہ رستم کو ہلاک کیا جا سکے۔ پھر رستم کی ہتھکڑی کا کھلنا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کا ڈپٹی ریاض اور سردار غلام کبیر کی پوزیشنوں پر دلیرانہ حملہ۔ پھر بے بسی، موت اور پسپائی۔ تب رستم کا دھیان اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کی طرف چلا گیا۔ وہ پاؤں جو برسوں تک اس کے جسم کا حصہ رہا تھا اب جسم کا حصہ نہیں تھا۔ وہ بے رحمی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ اس پاؤں نے ڈپٹی ریاض کو ضرب لگانے کی ناقابلِ معافی خطا کی تھی۔

یہ بڑی ہولناک سوچیں تھیں۔ رستم جتنی دیر ناصر اور اجمل وغیرہ میں گھرا رہتا تھا اور بی بی کے قریب ہوتا تھا یہ سوچیں اس سے ذرا فاصلے پر رہتی تھیں لیکن جونہی تنہائی ہوتی تھی یہ سب کچھ بڑی شدت سے اس پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اجمل خان اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''اوئے رستم برادر صیب! آپ امارا بہن کو پریشان کر کے یہاں آرام پر مار رہا ہے۔ پہلے دن سے ہی آپ نے اس معصوم پر ظلم شروع کر دیا ہے۔ وہ آپ کے لئے اتنا پریشان ہے کہ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔''

''میں چاچا کو بتا کر تو آیا تھا۔'' رستم نے کہا۔

''رستم بھائی، آپ ایک دم لاپرواہ ہے۔ آپ کو یوں اکیلے نہیں نکلنا چاہیے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امارا دشمن ام سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔ بی بی کے چہرے پر واقعی پریشانی تھی۔

پتا نہیں کیوں اسے اپنے لئے یہ پریشانی رستم کو بھلی لگی۔
کمرے میں پہنچتے ہی شانی نے شکایت کی۔ ''رستم! تم نے مجھے پریشان کردیا۔ بتا کر تو جانا تھا۔''

''آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔''

شانی غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ''ایک بات کہوں رستم۔'' وہ بالآخر گہری سانس لے کر بولی۔ ''مجھے آپ نہ کہا کرو۔ مجھے ہمیشہ یہ لفظ بوجھل لگا ہے اور اب شادی کے بعد تو یہ اور بھی بوجھل لگنے لگا ہے۔''

''نہیں بی بی! مجھ سے یہ لفظ نہ چھینیں۔ میں اس کے علاوہ آپ کو کسی لفظ سے پکار ہی نہیں سکتا۔''

''کیوں رستم؟'' وہ ذرا الجھن سے بولی۔ ''اب تو ہم اتنے قریب آگئے ہیں، اب تو یہ تکلف.....''

''نہیں بی بی! اب تو مجھے ''آپ'' کہنا اور بھی اچھا لگتا ہے۔''

وہ لاجواب سی ہوگئی۔ کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر شانی نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے رستم..... پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے یہی لفظ استعمال کریں گے۔''

''مجھے اس کی خواہش نہیں ہے بی بی لیکن اگر آپ ایسا چاہتی ہیں تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔''

''میری ایک اور شرط بھی ہوگی۔'' شانی دلگداز شرمیلے انداز میں مسکرائی۔

''کیا؟'' وہ سرتاپا تسلیم تھا۔

''اب بی بی نہیں چلے گا...... مجھے شانی کہنا ہوگا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر شانی کے سہارے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا شانی بی بی کہہ سکتا ہوں؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر مسکرائی۔ ''چلیں کچھ دن کے لئے ایسا ہی سہی لیکن پھر صرف شانی کہنا ہوگا۔''

اجمل خان نے دروازے سے باہر کھنکارا اور ہولے سے دستک دی۔ ''کیا بات ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''رستم بھائی، کیا آپ اماری بہن کو بھوکا ہی مارے گا۔ ناشتہ پھر سے تیار کیا گیا ہے۔

گریس صاحبہ بھی آپ کی خاطر بھوکا بیٹھا ہے۔''

رستم نے دروازہ کھولا۔ گھر میں گھومنے والی براؤن بلی آئی اور بڑی محبت سے شانی کے پاؤں میں لوٹنے لگی۔

بے جی سامنے ہی میز پر ناشتہ لئے بیٹھی تھیں۔ وہ بلی کو دیکھ کر حیران ہوئیں اور بولیں۔ ''یہ دو مہینے سے یہاں موجود ہے لیکن کسی کے پاس نہیں آتی۔ دیکھو میری بہو کے قدموں میں کس طرح لوٹ رہی ہے۔''

اجمل خان بولا۔ ''امارا بہن ہے ہی اتنا پیارا۔ کوئی اس سے محبت کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ امارے بہنوئی صاحب کو اس بلی سے سبق سیکھنا چاہیے۔''

سب ہنسنے لگے۔ بے جی نے آگے بڑھ کر شانی کا ماتھا چوما اور سر پر پیار دیا۔ ان کی آنکھوں سے سچی شفقت چھلکی پڑ رہی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''بے جی! اب میرے لئے بھی کوئی ڈھونڈ لیجئے۔''

''تیرے لئے میں اور میری بہو مل کر ڈھونڈیں گے۔'' بے جی نے کہا۔

رستم ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔ کل رات کے بعد بی بی کے لئے اس کی طلب کم نہیں ہوئی تھی بلکہ کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ بی بی کے لئے اس کے اندر ایک مہیب خلا پیدا ہو چکا ہے۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ ہی خلا بڑھ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ رات ہزاروں کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہ رات جب وہ اور اس کی دلہن پھر تنہا ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کریں گے۔

اسے معلوم تھا کہ شادی کے بعد چند ہفتوں یا مہینوں تک میاں بیوی عموماً ایک دوسرے میں بہت کشش محسوس کرتے ہیں۔ انہیں عموماً ایک دوسرے کے بغیر چند روز گزارنا بھی مشکل ہوتے ہیں لیکن رستم کا دل ایک اور طرح کی گواہی دے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا مرض لاعلاج ہے۔ اس میں شفا تو کجا افاقے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ اس کی جتنی بھی زندگی باقی ہے، وہ بی بی کی طلب میں ہی گزرے گی۔ وہ انہیں حاصل کر کے بھی ان کے روز افزوں عشق میں گرفتار رہے گا۔

رات کو سب دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر رستم کمرے میں چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب بی بی بھی جلد ہی کمرے میں آجائیں گی لیکن اجمل خان کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ گریس کو پشتو کے لہجے میں انگریزی بول کر سنا رہا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ گاہے بگاہے شانی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ ناصر اور اجمل خان کی

نوک جھونک بھی جاری تھی۔ بے جی ان سب کے لئے لوکھاٹ چھیل چھیل کر پلیٹ میں رکھ رہی تھیں۔ سچ ہے کہ بدترین حالات کے بعد بھی زندگی اپنے لئے راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔ مسکراہٹیں آنسوؤں کے درمیان سے اپنے لئے جگہ بناتی ہیں۔

کمرے میں رستم کا انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر اجمل خان کی خوش گفتاری پر طیش آ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ محفل برخاست ہوئی۔ سب اپنی اپنی جگہوں سے اٹھے تو بے جی ذرا لڑکھڑا گئیں۔ رستم جانتا تھا کہ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد کبھی کبھی ان کی ٹانگ میں بل پڑ جاتا ہے۔ شانی نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور پھر آہستہ آہستہ چلا کر دوسرے کمرے میں پہنچایا۔ کچھ دیر بعد رستم نے دروازے کی جھری سے دیکھا کہ بے جی چارپائی پر لیٹی تھیں اور شانی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ وہ چھوٹی چوہدرانی تھی اور درجنوں دیہات اسے وراثت میں ملے تھے۔ وہ چاہتی تو اس وقت بھی رنگ والی کی حویلی میں پہنچ کر ایک جاگیردارنی کی طرح زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس کا اپنا مزاج تھا اور یہ اس کے مزاج کی بات تھی کہ وہ آج رستم کی دلہن تھی اور اس چھوٹے سے مکان میں ایک عمر رسیدہ عورت کی خدمت ایک بیٹی کی طرح کر رہی تھی۔

رستم اسے بڑی محبت سے دیکھتا رہا لیکن اس دیکھنے میں ایک طرح کی بے چینی بھی تھی۔ اسے اپنی دلہن کا انتظار مشکل محسوس ہو رہا تھا اور دلہن تھی کہ سرکتی رات کی آہٹوں سے بے خبر بے جی کی مٹھی چاپی میں لگی ہوئی تھی۔

بے جی کی آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ وہ بی بی سے مخاطب تھیں۔ ”دھی رانی! چل اب بس کر۔ رات زیادہ ہو گئی ہے وہ تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔“

بی بی نے ایک نگاہ کمرے کے دروازے پر ڈالی اور شرم کا رنگ چہرے پر لہرایا۔ ”بس بے جی ..... دو منٹ اور۔“ اس نے ذرا چنچل انداز میں کہا۔

”انتظار کے دو منٹ بھی بڑے زیادہ ہوتے ہیں میری دھی۔“ بے جی نے زبردستی اپنی ٹانگیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

شانی نے بڑی محبت سے ان کا تکیہ درست کیا اور ان کے سرہانے پانی کا گلاس ڈھک کر رکھا۔ لالٹین کی لو نیچی کی اور ان کی ٹانگوں پر سرخ ڈورے والا سفید کھیس ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بال درست کرتی ہوئی کمرے کی طرف چلی آئی۔

رستم کے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ بی بی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے یوں لگا کہ کائنات کے سارے رنگ، ساری خوشبوئیں اور راحتیں اس کمرے میں سمٹ آئی ہیں۔

☆======☆======☆

شانی کو پیار کا اصل مفہوم معلوم ہوا تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ اگر مرد و زن کا تعلق سچی محبت، پُرخلوص چاہت اور ایک دوسرے کے احترام پر مبنی ہو تو کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ اس تعلق کے نشے میں کھوئی گئی تھی۔ ایسے میں جب کبھی اسے چوہدری فاخر کا خیال آتا تھا تو وہ حیران سی ہوتی تھی کہ وہ اس شخص کی حیوانیت کے ساتھ کیسے نباہ کرتی رہی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کا تصور کر کے شانی کا دل مالش کرنے لگتا تھا۔ ایسے میں رستم کی دلکش محبت اور اس محبت کا عملی اظہار اسے اور بھی مسحور کن محسوس ہوتا تھا۔ اس سحر میں کھو کر وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی مگر کچھ باتیں ایسی تھیں جو بھلائے نہیں بھول رہی تھیں۔

ان کی شادی کو اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اجمل خان اور ناصر گھر کی بالائی منزل پر قیام پذیر تھے۔ عموماً چاچا ابراہیم بھی اوپر ہی سوتے تھے۔ رستم اور شانی نچلی منزل پر تھے۔ بے جی اور گریس علیحدہ کمرے میں سوتی تھیں۔ گریس کا بچہ چنچل ؛ ہاں بھی اب اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ گریس کا شوہر اسٹیفن بہ دستور پاکستان میں تھا اور مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر نایاب پودے سپ گندل پر اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہ لوگ ٹیم کی شکل میں کام کر رہے تھے اور ان کی ریسرچ پوٹھوہار کے جنوبی علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم گریس کی ہدایت کے مطابق اسٹیفن ایک بار بھی اس پہاڑی بستی کی طرف نہیں آیا تھا۔ اپنے بچے کو یہاں لانے کے لئے گریس نے چاچا کے خاندانی ملازم شریف کی مدد لی تھی۔

شانی نے گھر کا بہت سا کام کاج خود سنبھال لیا تھا۔ وہ بے جی کو کچھ بھی کرنے نہیں دیتی تھی۔ ان دونوں میں اس بات پر تکرار ہوتی رہتی تھی۔ بے جی کہتی تھیں۔ ”نئی نویلی دلہن سے کام کراؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی تو میری ساس نے پورے تین ماہ مجھے تنکا تک ہلانے نہیں دیا تھا۔“

شانی کا جواب ہوتا تھا۔ ”بے جی! وہ آپ کا دور تھا، اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اب تو دلہن شادی کے اگلے روز پیپر دینے چلی جاتی ہے یونیورسٹی میں۔“

اب بھی دونوں میں اسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ شانی روٹیاں پکانا چاہ رہی تھی اور بے جی کو چولہے کے پاس نہیں آنے دے رہی تھی۔ ”نہیں بے جی! آپ کے گوڈوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آپ دھوپ میں بیٹھ کر زیتون کی مالش کریں۔“

”اپنے گئے گوڈوں کے لئے ہی تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ کرنے دو ورنہ ہڈحرام ہو جاؤں گی۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

''نہیں بے جی! اگر آپ نے ضد کی تو پھر میں گریس کو روٹیاں پکانے کے کام پر لگا دوں گی اور وہ پرسوں کی طرح آپ کو نئے ڈیزائنوں کی ایسی دردناک روٹیاں پکا کر کھلائے گی کہ آپ یاد کریں گی۔''

''دیکھ دھی رانی! صبح سے مشین کی طرح لگی ہوئی ہے تُو...... ناشتہ بنایا ہے...... کپڑے دھوئے ہیں، ہانڈی بنائی ہے...... تھوڑا وقت اپنے بندے کو بھی دیا کر۔ وہ کہے گا کہ میں نے ویاہ اپنے لئے کیا تھا یا ماں کے لئے۔''

''نہیں، وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں وہ۔ انہوں نے اپنی ماں کی کھوئی ہوئی محبت شاید آپ میں تلاش کر لی ہے۔ باقی رہی کام کی بات بے جی، تو وہ تو میں اپنے گھر میں بھی ایسے ہی کرتی تھی۔ میں کام کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی ہوں۔ آپ مجھے روکیں گی تو میں سمجھوں گی کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتیں۔''

بے جی نے شانی کو اپنے ساتھ لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ ''چند دنوں میں ہی ایسے لگنے لگا ہے کہ تجھ سے برسوں کا رشتہ ہے۔ تجھے اپنا نہیں سمجھوں گی تو کسے سمجھوں گی لیکن کچھ اپنی صحت کا بھی خیال رکھ ناں۔ کتنی دبلی ہوگئی ہے۔ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے۔ دودھ، دہی اور گھی میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور تُو ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تجھ پر تیری انگریزنی سہیلی کا اثر ہے۔ وہ نہ خود گھی مکھن کھاتی ہے نہ تجھے کھانے دیتی ہے۔ اس لئے تو سگریٹ جیسی ٹانگیں ہیں اس کی۔ پتلون کس کر اور بھی سوکھی سڑی لگنے لگتی ہے۔'' (گریس نے اپنے کچھ کپڑے بھی شریف کے ہاتھ منگوا لئے تھے)

''یہ تو آج کل رواج ہے بے جی۔''

''بھاڑ میں جائیں ایسے رواج۔ تُو اس کی باتوں میں نہ آ۔ خوب کھایا پیا کر۔ تیرے اور رستم کے لئے میں نے دس سیر گھی علیحدہ کر دیا ہے۔''

اسی دوران میں گریس کا بیٹا ڈیوس بلی کے پیچھے بھاگتا ہوا کمرے میں آیا اور شانی کو دیکھ کر رک گیا۔ اس نے شانی کا دامن پکڑا اور توتلی زبان میں ٹھنک کر بولا۔ ''آنٹی! مُنا یہاں کیوں نہیں آتا۔ میں اسے بہت یاد کرتا ہوں۔''

یوں اچانک مُنے کا ذکر سن کر شانی کے دل پر تیر سا لگا۔ وہ سارا دن کام کاج میں مصروف رہتی تھی اور حتیٰ الامکان کوشش کرتی تھی کہ مُنے کا خیال اس کے ذہن میں نہ آئے اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی تھی، لیکن کسی وقت کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی جو اس کے دفاعی حصار کو توڑ پھوڑ دیتی تھی۔ جیسے اب ہوا تھا۔

وہ بے دم سی ہو کر موڑھے پر بیٹھ گئی۔ ڈیوس بدستور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شانی نے اس کے نرم بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے ڈیڈی کے پاس ہے بیٹا۔''

''لیکن میں تو اپنی ماما کے پاس رہتا ہوں۔ مُنا آپ کے پاس کیوں نہیں رہتا۔ اس کی ماما تو آپ ہیں ناں۔''

''نہیں بیٹا! میں نہیں ہوں۔'' شانی نے کہا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے دھی رانی۔'' بے جی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ انہیں ڈیوس اور شانی کی انگریزی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہوں بے جی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھا چلو پیچھے ہٹو۔ یہ دو چار روٹیاں مجھے پکا لینے دو۔'' بے جی نے کہا۔

اس مرتبہ شانی نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور اپنے آنسو چھپاتی ہوئی خاموشی سے کمرے کی طرف چلی گئی۔

رستم گھر سے باہر تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور مُنے کی آخری باتیں یاد کر کے آنسو بہانے لگی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ اس کے لئے تو شانی سے چند دن کی دوری بھی مشکل ہوتی تھی۔ اچانک باہر سے رستم کی آواز آئی۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ شانی نے جلدی سے آنسو پونچھے۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور تولیے سے چہرہ اچھی طرح صاف کر لیا۔ آئینے کے سامنے بال سنوار کر اس نے خود کو حتیٰ الامکان حد تک نارمل کر لیا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ رستم کے سامنے ہمیشہ خوش نظر آئے گی اور اپنی کسی محرومی کا سایہ بھی اس پر نہیں پڑنے دے گی۔ وہ رستم کا ہر دکھ مٹا دینا چاہتی تھی اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے نہ ہوں۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو رستم موجود نہیں تھا۔ چاچا ابراہیم ایک طرف بیٹھے اپنی بھینسوں کے لئے کوئی دوا تیار کر رہے تھے۔ جڑی بوٹیوں کی مہک گھر میں موجود تھی۔ ''چاچا جی! رستم کہاں ہیں؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''واپس چلا گیا ہے احاطے میں۔ راوی بیمار ہے۔ اس کے لئے دوا لینے آیا تھا۔'' چاچا نے جواب دیا۔ راوی چاچا کی اس اصیل گھوڑی کا نام تھا جو دوڑنے میں بے مثال تھی۔ چاچا ابراہیم کے پاس جو بھی جانور تھے، بہترین نسل اور صحت کے تھے۔ ٹیڈی نسل کی بکریاں، نیلی بار کی بھینسیں، گولڈن چینی اور ایرانی مرغیاں۔ گولڈن نسل کی مرغیاں اتنی بڑی تھیں کہ انہیں مرغیاں کہنا مشکل تھا۔ ایک وسیع احاطے میں چاچا ابراہیم نے ٹیڈی بکریوں کی رہائش کا

انتظام کر رکھا تھا۔ یہیں پر ایک طرف بھینسوں کے لئے شیڈ اور دوسری طرف ولایتی مرغیوں کے لئے شیڈ تھے۔ انہی شیڈز کے عقب میں ایک پھلواری تھی۔ اس ساری جگہ کو چاچا ابراہیم مجموعی طور پر ''احاطہ'' کہتے تھے۔ آج کل احاطے کی دیکھ بھال کی ذمے داری رستم نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ صبح سویرے یوں اہتمام سے احاطے کا رخ کرتا تھا جیسے کسی ڈیوٹی پر جا رہا ہو۔ اجمل خان بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس احاطے میں مستعد کارندہ شریف بھی موجود رہتا تھا اور اس کے دو بیٹے بھی۔ تاہم اجمل خان اور رستم اپنے شوق سے اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ رستم صبح کا گیا شام کو گھر آتا تھا۔ شانی کے سوال کا جواب دے کر چاچا ابراہیم ایک بار پھر ہاون کے اندر دستہ چلانے میں مصروف ہوگئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے سر اٹھا کر شانی کو دیکھا اور بولے۔ ''میں نے رستم کو کئی بار کہا ہے کہ ابھی اس کی ٹانگ کا زخم اچھا نہیں ہوا، وہ کیوں اپنی جان جوکھم میں ڈال رہا ہے۔ اگر ضروری سمجھتا ہے تو احاطے کا ایک چکر لگا آیا کرے ورنہ گھر میں رہ کر آرام کیا کرے۔''

''دراصل وہ اپنے شوق سے جاتے ہیں چاچا۔ انہیں وہاں جانا اور جانوروں کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے۔ خاص طور سے آپ کے تینوں چاروں گھوڑوں سے تو انہیں بہت لگاؤ ہوگیا ہے۔''

''بھینسوں سے لگاؤ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بھوری بھینس جو تجھے اچھی لگتی ہے اسے بھی بڑی اچھی لگتی ہے۔ اس نے بھوری کا کوئی نام بھی رکھ دیا ہے۔ پتا نہیں کل کیا نام لے رہا تھا اس کا؟''

''رانو۔'' شانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہی کہہ رہا تھا۔'' چاچا نے تائید کی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''ویسے ایک لحاظ سے تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ مرد سارا دن گھر میں پڑا رہے تو بےزار ہو جاتا ہے اور شاید زنانی بھی ہو جاتی ہے۔ اچھا تو یہی لگتا ہے کہ مرد کام کاج کے بعد شام کو گھر آئے اور زنانی اس کا انتظار کر رہی ہو۔ میں سچی بات کہتا ہوں جب تم شام کو اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہو تو مجھے اور تمہاری بے جی کو بہت اچھا لگتا ہے۔''

شانی کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ بات بدلنے کے لئے وہ اس گھریلو بلی کوشی شی کرنے لگی جو مسلسل اس کے پاؤں میں لوٹ رہی تھی۔ اس بلی کو شانی سے بہت انس ہوگیا تھا۔ بے جی کے مسلسل دھتکارنے سے یہ کچھ دنوں کے لئے غائب ہوگئی تھی لیکن اب پھر گھر میں نظر آتی تھی۔

شام کو رستم گھر واپس آیا۔ شانی نے ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے اس کا استقبال کیا لیکن وہ اس کے چہرے پر بس ایک نگاہ ڈال کر ہی چونک گیا۔ وہ شانی کی اندرونی کیفیات کو بہت جلد محسوس کر لیتا تھا۔ شانی دوپہر میں روئی تھی تاہم کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی رستم نے شانی کی آنکھوں میں اس برسات کے آثار پڑھ لئے تھے۔ ''کیا بات ہے شانی! آپ کچھ دکھی لگ رہی ہیں؟''

''آپ کے دیر سے آنے کا دکھ کم تو نہیں۔'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''میں تو روز اسی وقت آتا ہوں۔''

''دن بڑے ہو رہے ہیں رستم! اب شام ساڑھے چھ بجے ہوتی ہے۔ جدائی لمبی ہوگئی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

رستم نے گہری سانس لے کر اپنی اکلوتی جوتی اتار کر ایک طرف رکھی اور بے خیالی میں شانی کی حنائی انگلیوں سے کھیلنے لگا۔ واضح تھا کہ وہ شانی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

''پانی پلاؤں؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں پلا دیں۔'' رستم بولا۔ اس کا ہاتھ بدستور شانی کے ہاتھ میں رہا۔

شانی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد رستم نے کہا۔ ''آپ پانی پلانے کا کہہ رہی ہیں اور جاتی بھی نہیں۔''

''آپ ہاتھ چھوڑیں گے تو جاؤں گی ناں۔'' شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''مجھے یہ منظور نہیں کہ عارضی طور پر بھی اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے چھڑاؤں۔''

''آپ کی یہی باتیں میری جان لے لیں گی۔'' رستم نے بے پناہ محبت سے کہا اور شانی کا ہاتھ چوم کر چھوڑ دیا۔ وہ پانی لینے چلی گئی۔

شروع میں رستم کو آپ کہتے ہوئے شانی کو ذرا عجیب لگا تھا لیکن اب یہ لفظ اتنا مناسب لگتا تھا کہ وہ اس کے سوا کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ پانی لے کر واپس آئی تو رستم بدستور اپنے خیالوں میں گم تھا۔ پانی پینے کے بعد وہ بولا۔ ''شانی! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ ایک دم اداس ہو جاتی ہیں۔ شاید...... منے کی یاد آپ کو ستانے لگتی ہے۔ وہ واقعی آپ سے بہت پیار کرتا تھا شانی۔''

''پیار تو بے شک کرتا تھا، لیکن مجھے یقین ہے رستم، وقت کا مرہم کام کرے گا۔ وہ آہستہ آہستہ بھول جائے گا۔''

''وقت کا مرہم ہر جگہ تو کام نہیں کرتا شانی بی بی۔'' رستم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کوئی اور بات کریں رستم۔'' شانی نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' رستم نے عجیب انداز میں گہری سانس لی۔

اسی دوران میں براؤن بلی آئی اور ایک بار پھر شانی کے پاؤں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ شانی نے پاؤں سمیٹے۔ رستم مسکرانے لگا۔ ''یہ بلی پھر آدھمکی ہے۔ لگتا ہے کہ آپ میں کوئی مقناطیس ہے جو ہر جاندار شے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔''

''لیکن کسی وقت تو میں خود بے بس ہو کر کسی کی طرف کھنچ جاتی ہوں۔'' شانی مسکرائی۔

رستم کی آنکھوں سے محبت کے سوتے پھوٹنے لگے۔ اس دوران میں بلی حوصلہ پا کر شانی کی گود میں چڑھ آئی۔ ''اوئے شیطان۔'' شانی نے کہا اور اسے پکڑ کر کمرے سے باہر چھوڑ آئی۔

''مجھے تو اس شتونگڑی سے رقابت محسوس ہونے لگی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''اگر آپ کو اس کی اصلیت کا پتا چلے گا تو مزید رقابت ہوگی۔'' شانی نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''یہ شتونگڑی نہیں شتونگڑا ہے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا۔''

''اوہ۔'' رستم نے تعجب سے کہا۔ پھر وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ سچ کہتے ہیں، زندگی بدترین حالات میں بھی مسکراہٹوں تک عارضی رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ رستم نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''میں ٹھیک کہتا ہوں شانی! آپ کے اندر کوئی مقناطیس ہے۔ انسانوں کے علاوہ جانور بھی آپ سے متاثر ہوتے ہیں۔ جس دن آپ فارم پر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ چاچا ابراہیم کی بھینسیں بھی زیادہ دودھ دیتی ہیں۔'' شانی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہنستے ہنستے وہ بولی۔ ''اور مجھے لگتا ہے کہ آج کل آپ کو میرے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔''

''میں چاہتا بھی نہیں کہ مجھے کچھ نظر آئے۔'' رستم نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے روز رستم کے جانے کے بعد شانی پھر گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ گریس تھوڑا بہت اس کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن وہ بے جی کو کام کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ کام کرنے کا ایک فائدہ شانی کو یہ بھی تھا کہ اس کا دھیان اپنے دکھوں کی طرف سے ہٹا رہتا تھا۔

بے جی کو ان کے بستر پر چائے دے کر اور چاچا ابراہیم کو نمکین پراٹھے اور دودھ کا ناشتہ سرو کر کے شانی واپس مڑی تو اسے کھڑکی میں ایک ہانپتا ہوا خچر نظر آیا۔ شانی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس خچر کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ پہلوان آیا ہوا ہے۔ پہلوان قریباً تین ہفتے بعد آیا تھا۔ وہ جب آتا تھا تو اس کے پاس باہر کی خبریں بھی ہوتی تھیں۔ (شانی کی معلومات کے

مطابق پہلوان کا ساتھی جیرا ہسپتال میں رُو بہ صحت تھا)

گریس کی زبانی شانی کو معلوم ہوا کہ پہلوان، اجمل خان کے پاس احاطے میں بیٹھا ہوا ہے اور دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اجمل خان گھر آیا تو شانی نے اس سے صورتِ احوال پوچھی۔ اجمل نے کہا۔ ''امارا بہن! بالکل بے فکر رہو۔ سب خیر خیریت ہے۔ لگتا ہے کہ پولیس کا تلاش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اچھا خبر بھی ہے۔''

شانی کا دھیان فوراً تایا کی طرف گیا لیکن اس بار بھی یہ اچھی خبر تایا کے بارے میں نہیں تھی۔ یہ خبر ڈپٹی ریاض کے بارے میں تھی۔ اجمل خان نے بتایا۔ ''ریاض ہٹلر پر اخبار والوں کی طرف سے بڑا سخت الزام لگایا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف کارروائی کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے۔ وڈے ڈیرے پر آپریشن کے موقع پر ریاض ہٹلر نے ملزموں کے بے گناہ رشتے داروں کو پکڑا اور ان کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کا کوشش کیا۔ ریاض ہٹلر کا پروگرام تھا کہ بارودی سرنگوں سے بچاؤ کے لئے ان بے گناہ لوگوں کو پولیس کے آگے آگے رکھا جائے۔ اس کے علاوہ ریاض ہٹلر پر الزام ہے کہ اس نے تین مقامی سرداروں سے رشوت وصول کیا۔ یہ رشوت اس لئے تھا کہ رستم، لالہ، حسنا اور مراد وغیرہ کو زندہ گرفتار نہ کیا جائے۔ موقع پر مار دیا جائے۔''

''کیا تم کہنا چاہتے ہو کہ ریاض معطل ہو گیا ہے؟''

''ہوا تو نہیں جی، لیکن ہو سکتا ہے کہ ہو جائے۔'' خان کے ہاتھ میں چند اردو اور انگریزی اخبار بھی نظر آ رہے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''پہلوان لایا ہے، آپ کے پڑھنے کے لئے۔''

شانی نے اخبار اس سے لے لئے۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے اخبار گریس کو دکھائے۔ اس دور دراز بستی میں یہ اخبار حالات سے آگاہی کا بہترین ذریعہ تھے۔ شانی اور گریس شوق سے ورق گردانی کرنے لگیں۔ سب سے پرانا اخبار 28 روز پہلے کا تھا۔ نئے اخبار پر تین دن پہلے کی تاریخ تھی۔ ان اخباروں میں بھی وڈے ڈیرے کے خونی آپریشن کی بازگشت موجود تھی۔ سینئر اخبار نویس ضمیر احمد نے اپنے اخبار میں پولیس کارروائی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا اور اس کی انکوائری وغیرہ کی بات کی تھی۔

28 دن پہلے کے اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر نے شانی کو چونکایا۔ سرخی تھی۔ ''معروف صنعت کار چوہدری بشیر کا بیٹا بازیاب۔ بچہ خود ہی گھر سے چلا گیا تھا۔'' خبر

کے متن میں درج تھا۔" دو دن تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ صنعت کار چوہدری بشیر کے بچے کو اغوا کیا گیا۔ اس سلسلے میں لاہور پولیس خاصی بھاگ دوڑ کرتی رہی ہے۔ کئی مشکوک افراد سے پوچھ گچھ بھی کی گئی۔ ان میں فیکٹری کے دو ملازمین بھی شامل تھے۔ بہر حال کل شام اس ڈرامے کا ڈراپ سین مثبت انداز میں ہوگیا۔ بچہ شاہدرہ کے علاقے سے مل گیا۔ پتا چلا ہے کہ بچہ خود ہی سڑکوں پر بے سمت گھومتا شاہدرہ ٹاؤن تک جا پہنچا۔ یہاں ایک خدا ترس نان بائی محمد صادق اسے مسجد میں لے گیا اور اعلان کرواتا رہا۔ بعد ازاں محمد صادق بچے کو اپنے گھر لے گیا۔ کل شام جب ٹی وی پر اشتہار چلا تو محمد صادق بچے کو اخبار کے دفتر لے آیا، جہاں سے اسے والد کے سپرد کر دیا گیا۔"

قریباً چار ہفتے پرانی اس مختصر خبر کو پڑھ کر شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ جس بچے کا ذکر تھا وہ منے کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ گم ہوا تھا اور پھر مل بھی گیا تھا لیکن اس کے گم ہونے اور ملنے میں جو درد کی کہانی تھی وہ شانی کو نہ جھنجھوڑ گئی۔ وہ بن ماں کا بچہ در بدر تھا۔ باپ کو اس سے جتنی محبت تھی شانی خوب جانتی تھی۔ منے کے حالات کا تصور کر کے شانی کا دل رونے لگا۔ یہ تو منے کے حالات کی بس ایک جھلک تھی۔ ایسے نہ جانے کتنے صدمے اس معصوم جان پر گزرے تھے اور گزر رہے تھے۔

"کیا بات ہے شونی؟" شانی کو رنجور دیکھ کر گریس نے پوچھا۔

شانی نے پہلے تو چھپانے کی کوشش کی لیکن پھر گریس کو اردو اخبار کی خبر کے بارے میں بتا دیا۔ اس خبر نے گریس پر بھی اثر کیا۔ منے کی حالت کا تصور کر کے وہ افسردہ ہو گئی۔

شانی کتنی بھی افسردہ ہوتی تھی مگر شام کو رستم کے استقبال کے لئے وہ بالکل تازہ دم اور خوش نظر آتی تھی۔ یہ اس کے اندر کی بے پناہ توانائی اور برداشت تھی۔ شام کو اس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے، بال سنوارے اور برآمدے میں آ گئی۔ اس دوران میں اجمل خان پریشان صورت لئے گھر میں داخل ہوا۔ شانی کو دیکھ کر بولا۔ "بہن جی! ادھر آپ آرام سے بیٹھا ہے اُدھر رستم بھائی سخت مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔"

شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کیا ہوا؟" وہ تیزی سے بولی۔

"رانو کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کل اس کا کٹا اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ آج وہ دودھ نہیں دے رہی۔ بہت مصیبت بنا ہوا ہے۔ ام چاچا ابراہیم کو لینے آیا ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ تو کہیں باہر نکلے ہیں۔" شانی نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ رانو، چاچا ابراہیم کی سب سے چہیتی بھینس کا نام تھا بلکہ یہ نام رستم اور اجمل نے ہی رکھا تھا۔

اجمل خان، چاچا ابراہیم کو ڈھونڈتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی کچھ دیر وہیں برآمدے میں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر گریس کو اپنے ساتھ لے کر احاطے کی طرف چل دی۔ رنگ والی کی حویلی میں وہ لڑکپن سے گائے اور بھینس کا دودھ دھوتی آئی تھی۔ یہاں تک کہ بچپن میں وہ اپنے ابا جی کی گود میں بیٹھ کر بھی یہ کام کیا کرتی تھی۔ جب دودھ کی سفید دھاریں پیتل کے برتن میں جلترنگ بجاتی تھیں تو اسے بہت مزہ آتا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دودھ دھونے کے فن میں ایک دم طاق ہو گئی تھی۔

گریس اور شانی چیڑ کے درختوں سے گھرے ہوئے راستے سے گزر کر احاطے میں پہنچیں۔ سورج مغرب میں سرسبز پہاڑوں کے عقب میں روپوش ہو چکا تھا، تاہم وہ ابھی غروب نہیں ہوا تھا اور شام کی تاریکی دور تھی۔ احاطے میں مرغیوں کی کڑکڑ، بکریوں کی ممیاہٹ اور بطخوں کی قیں قیں تھی۔ رستم، ناصر اور شریف شاندار بھوری بھینس رانو کے گرد جمع تھے۔ شانی نے دیکھا کہ بھینس کے تھن دودھ سے لبالب بھرے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا ہوانہ پھٹنے کو ہے لیکن وہ شریف کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ جونہی وہ بالٹی لے کر قریب پہنچتا وہ اپنی پچھلی ٹانگ چلاتی اور شدید ردعمل کا اظہار کرتی یہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ بھینس کے بیمار ہونے کا اندیشہ تھا۔

شانی کو دیکھ کر ناصر نے کہا۔ "لو جی، اب شاید بات بن جائے۔ سنا ہے کہ شانی بہن دودھ دھونے میں ماہر ہیں۔"

"یہاں تو مجھ سے زیادہ ماہر موجود ہیں۔" شانی کا اشارہ شریف اور رستم وغیرہ کی طرف تھا۔

"نہیں جی، آپ کی بات اور ہے۔ چاچا بھی آپ کی تعریف کر رہا تھا۔" ناصر نے کہا۔

پھر اس نے ملازم شریف کے بیٹے کو اشارہ کیا۔ اس نے دودھ کی خالی بالٹی شانی کے قریب رکھ دی۔

شانی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ "میں ایک شرط پر کوشش کروں گی۔ آپ سب باہر چلے جائیں۔ آپ نے بے چاری کو پریشان کر دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم جاتے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

احاطے میں بھینس کے پاس بس رستم، شانی اور گریس رہ گئے۔ شانی نے ہولے ہولے رانو کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ رانو پُرسکون نظر آنے لگی ہے۔ وہ ہاتھ پھیرتی پھیرتی اس کے چہرے تک چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھینس کا ہیجان ختم ہوا اور وہ

چارے پر منہ مارنے لگی۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے تھنوں سے چھیڑ چھاڑ کی جا سکتی ہے۔ شانی دودھ کی بالٹی کے ساتھ بھینس کی پچھلی ٹانگوں کی طرف بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دودھ کی تیز، جھاگ اُڑاتی دھاریں بالٹی میں گر رہی تھیں۔

بیس پچیس منٹ بعد شانی اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ رستم نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ گریس بھی متاثر دکھائی دے رہی تھی۔ رستم بولا۔ ''آپ کے اندر واقعی کرامات ہیں شانی۔ اس سے پہلے رانو کا اتنا دودھ کبھی نہیں ہوا۔''

ناصر اور اجمل خان وغیرہ بھی واپس آ گئے اور شانی کی کارکردگی سے متاثر ہوئے۔ اجمل خان نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''امارا تو خیال ہے کہ اگر صبح سویرے امارا بہن ایک ایک بار سارے جانوروں پر ہاتھ پھیر دے تو چاچا ابراہیم کو دُگنا دودھ مل جائے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد شانی، رستم اور گریس احاطے سے گھر کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اب تاریکی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ پہاڑی راستے کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں چراغ جل اٹھے تھے۔ پھلواری کے درمیان سے گزرتے ہوئے شانی کی اوڑھنی ایک پودے کے کانٹوں سے الجھ گئی۔ گریس نے کہا۔ ''شونی! تمہاری مقناطیسی شخصیت کی ایک اور کرامات۔ پھول بھی تمہارا دامن کھینچتے ہیں اور تمہیں اپنے درمیان رکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں جو ہوں وہی رہنے دیں، خواہ مخواہ بانس پر نہ چڑھائیں۔'' شانی مسکرائی۔

''وہ کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کہہ رہی۔'' رستم نے مدھم لہجے میں کہا۔

''آپ کو میری توقع سے زیادہ انگریزی آتی ہے۔'' شانی نے تبصرہ کیا۔

''کم از کم اتنی تو آتی ہے، جتنی آپ کی سہیلی کو اردو آتی ہے۔'' رستم بولا۔

اس طرح ہلکی پھلکی باتیں کرتے وہ گھر واپس آ گئے۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی تھی۔ روشنی میں پہنچ کر رستم مسکرانے لگا۔ ''یہ دیکھیں، آپ کا ایک عاشق آپ کی اوڑھنی سے لپٹ کر یہاں آ گیا ہے۔'' رستم کا اشارہ شانی کے پلو کی طرف تھا۔

شانی نے پلٹ کر دیکھا۔ سفید گلاب کا ایک پھول ابھی تک اوڑھنی کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر پھول کو اوڑھنی سے جدا کیا۔ ''یہ عاشق نہیں...... محبوب ہے۔ اس پر بلبل منڈلاتی ہے۔'' شانی نے کہا۔

''لیکن کچھ محبوب ایسے ہوتے ہیں شانی، جن پر محبوب بھی عاشق ہو جاتے ہیں۔''

''آپ کو بہت باتیں کرنا آ گئی ہیں۔''

''آپ نے سکھائی ہیں۔'' رستم نے کہا۔ شانی لاجواب سی ہو گئی۔ پھول ابھی تک اس

آج بھی اپنی اس خوش قسمتی اور راحت کو محسوس کرنا چاہتی تھی مگر گریس نے بے وقت مداخلت کر کے رستم کے خوشگوار موڈ کو ختم کر ڈالا تھا۔ وہ اس صورتِ حال پر کڑھتی رہی، پھر خود کو ملامت کرنے لگی...... اس نے اتنی باریک بینی سے اخبار کیوں دیکھے...... وہ کیوں اپنے ماضی کی طرف سے مکمل طور پر آنکھیں بند نہیں کر لیتی۔ کیوں سب کچھ بھول کر خود کو رستم کی بانہوں تک محدود نہیں کر لیتی؟ کیوں؟ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

☆======☆======☆

صبح دم رستم نے اپنی بی بی کو اپنے پہلو میں سوتے دیکھا۔ کچھ خوب صورت چہرے نیند کی حالت میں اتنے خوب صورت نہیں لگتے لیکن وہ نیند کی حالت میں بھی ویسی ہی دلکش تھی۔ پیشانی روشن، ہونٹوں کے درمیان ایک مہین سی درز، جس میں سے سفید براق دانتوں کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ سیدھی لیٹی تھی۔ بایاں ہاتھ پیٹ پر تھا۔ ان سے قمیص کچھ دب گئی تھی اور نشیب و فراز کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی سانس کی آمد و رفت اس منظر کو کچھ اور حسین بنا رہی تھی۔ کسی رانی مہارانی کا سا وقار تھا اس کی نیند میں بھی۔ اس سے پہلے رستم بی بی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد جھجک محسوس کرتا تھا اور جسم پر نگاہ ڈالنا تو بہت دور کی بات تھی لیکن اب وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا ... چھو سکتا تھا۔ اس نے انگشت شہادت سے بالوں کی لٹ کو بی بی کے چہرے سے ہٹایا اور گہری سانس لی۔

وہ بی بی کو غمگین نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تو دنیا جہان کی خوشیاں اپنی بی بی کے قدموں میں ڈھیر کرنے کا متمنی تھا۔ رات کو گریس کی باتیں سن کر اور بی بی کی کیفیت کو محسوس کر کے وہ اندر سے دکھی ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا، بی بی بے پناہ قوتِ برداشت کی مالک ہے۔ وہ بے پناہ دکھ یا جسمانی تکلیف کے عالم میں بھی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی شعاعیں فولادی دیواروں کے پار سے بھی محسوس ہو جاتی ہیں۔

رستم بہ آہستگی پلنگ سے اٹھ گیا۔ زخمی ٹانگ میں صبح کے وقت ہلکا ہلکا درد شروع ہو جاتا تھا لیکن بڑے بڑے درد جھیل چکنے کے بعد اس درد کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا کھڑکی میں آ گیا۔ اس نے پٹ کھولے۔ دن کا روپہلی اجالا دھیرے دھیرے نشیب و فراز کو نمایاں کر رہا تھا۔ جھرنے کی آواز موسیقی سے مشابہ تھی۔ اجمل خان ایک پتھر پر بیٹھا اپنی

گن کی صفائی میں مصروف تھا۔ اپنے اسلحے سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ جب گن صاف کرتا تھا، یوں لگتا تھا کہ اپنی محبوبہ کے گیسو سنوار رہا ہو۔ رستم کمرے سے نکل آیا۔ بے جی برآمدے میں جائے نماز پر تسبیح لئے بیٹھی تھیں۔ چاچا ابراہیم جانوروں کو چارہ ڈلوانے کے لئے احاطے کی طرف جا چکا تھا۔ اجمل خان اور ناصر بالائی منزل کے بجائے گھر کے ساتھ والے پورشن میں منتقل ہو چکے تھے۔ ان کے نیچے آ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رستم کو بالائی منزل پر جاتے ہوئے وقت محسوس ہوتی تھی۔ رستم ساتھ والے پورشن میں داخل ہوا تو ناصر غیر متوقع طور پر جاگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے ناصر! آج ”آدھی رات“ کو ہی جاگ گئے ہو؟“ رستم نے اس سے مذاق کیا۔

”پتا نہیں کیوں، میں آج آپ کے لئے پریشان ہوں۔“ ناصر نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیسی پریشانی؟“

”آپ کی ٹانگ کی۔“

”بھئی جو چیز رہی ہی نہیں، اس کی پریشانی کیسی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب مجھے ایک لنگڑے دوست کی حیثیت سے قبول کر لو۔“

”کیسے کر لوں بھائی۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو دل پر کلہاڑا سا چلتا ہے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟ جا کر ریاض ہٹلر کا گریبان پکڑنا چاہتے ہو؟“

”وقت آنے پر وہ بھی کریں گے بھائی! لیکن فی الحال میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ لاٹھی اور بیساکھی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔“

”لکڑی کی ٹانگ لگوانا چاہتے ہو؟ میرے خیال میں تو ایسا بوجھ اٹھانے سے بیساکھی اور لاٹھی ہی بہتر ہے۔ بہ وقت ضرورت یہ چیزیں ہتھیار کے طور پر بھی کام آ سکتی ہیں۔“

”نہیں رستم بھائی! میں سنجیدگی سے کسی اور حل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیسا حل؟“

”کوئی بھی حل۔“ ناصر نے مبہم انداز میں کہا۔

”اچھا تم سوچتے رہنا لیکن فی الحال میں تم سے ایک اور مسئلے پر صلاح لینے کے لئے آیا ہوں۔“

ناصر پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ رستم نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”ناصر! میں نے تم سے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ شانی بی بی کے دل میں ایک دکھ پل رہا ہے۔ یہ اس بچے کا دکھ ہے

جسے وہ اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتی ہیں۔ وہ بچہ جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی ایک چھوٹی سی جھلک میں نے چند ہفتے پہلے اخبار میں دیکھی ہے۔ میں نے تم سے چوہدری بشیر کا ذکر کیا تھا۔ بے شک وہ بچے کا سگا باپ ہے لیکن اگر میرے دل کی بات پوچھو تو میں سمجھتا ہوں کہ بشیر کے لئے اس بچے کی حیثیت ایک یرغمالی سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اس بچے کے زور پر شانی بی بی کو اپنے ساتھ باندھے رکھنا چاہتا ہے۔''

''آپ نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ بچہ بیمار ہے۔''

''ہاں اسے گاہے بگاہے تیز بخار ہوتا ہے اور وہ ہذیان بولنے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شانی بی بی سے جدا ہونے کے بعد اس کی تکلیف بڑھی ہوگی، کم نہیں ہوئی ہوگی۔ اس بیماری کے حوالے سے بھی ضروری ہے کہ وہ بچہ جلد از جلد چوہدری بشیر کی گرفت سے نکل جائے اور...... اور پہنچ جائے۔ مجھے پورا یقین ہے ناصر! اگر ایسا ہو جائے تو وہ بچہ اور شانی بی بی دونوں بہت خوش رہیں گے۔''

ناصر نے بڑے خلوص سے رستم کی آنکھوں میں دیکھا اور جذباتی انداز میں بولا۔

''بھائی! آپ اب بھی سردار ہیں۔ آپ صرف اشارہ کریں۔ ہم آپ کے حکم پر جان ہتھیلی پر رکھ لیں گے...... کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ بچہ چوہدری بشیر کے پاس سے یہاں پہنچ جائے۔''

''ہاں ناصر! میں یہی چاہتا ہوں لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم کہہ رہے ہو۔ اس کے لئے ہمیں کوئی خاص منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔''

''آپ بتائیں بھائی۔''

''سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ بچہ فی الوقت کہاں اور کس حال میں ہے۔ اس کی حفاظت وغیرہ کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ان معلومات کے لئے پہلوان ہماری مدد کر سکتا ہے۔''

''لیکن بھائی! اگر نظام سے رابطہ کیا جائے تو پھر؟ نظام ایسے کاموں میں ماہر ہے اور نازک ترین موقعوں پر ہماری مدد کر چکا ہے۔''

''لیکن تمہیں بتایا تھا ناں کہ وہ بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ ریاض ہٹلر نے وائرلیس پر قبضہ جمانے کے بعد ہمیں اپنے مطلب کی خبریں پہنچانے کے لئے نظام کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ سب کو پتا ہے۔ نظام کی جوان بیٹی کئی ہفتے گوجرانوالہ پولیس کے پاس رہی۔ لیڈی پولیس نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بدترین تھا۔ مار مار کر اس کی ہنسلی کی ہڈی توڑ

دی گئی اور بال کاٹ دیئے گئے۔''

''لیکن بعد میں لڑکی کو چھوڑ دیا گیا تھا......'' ناصر نے کہا۔

''کچھ بھی ہے ناصر! میرے خیال میں نظام اب خود میں اتنا حوصلہ نہیں پائے گا کہ پھر سے ہمارے لئے کام کر سکے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، پہلوان سے بات کر لیتے ہیں۔''

''لیکن اس سے پہلے میں اجمل خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ پہلوان کو ہم سے زیادہ جانتا ہے۔''

اسی دوران میں فائر کی آواز آئی۔ یہ فائر غالباً اجمل خان نے کیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ایک بڑے سائز کی کونج پر چھائیں کی طرح اوپر سے نیچے آئی اور دھپ سے صحن میں گری...... اسی دوران میں اجمل خان تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ کونج نیچے گرتے گرتے دم توڑ چکی تھی۔ اجمل خان نے اسے پکڑ کر فخریہ انداز میں رستم اور ناصر کی طرف دیکھا۔

''امارا نشانہ ملاحظہ پرمایا آپ نے۔'' اس نے اپنا تازہ شکار دکھاتے ہوئے کہا۔

اجمل کا نشانہ واقعی قابلِ داد تھا۔ گولی پرندے کی لمبی گردن میں سر کے بالکل قریب لگی تھی اور یہ اُڑتے پرندے کا نشانہ تھا۔

اس علاقے میں عام طور پر کونج نظر نہیں آتی تھی اور دن کے وقت تو اس کا امکان اور بھی کم تھا مگر اجمل خان کی خوش قسمتی اس پرندے کو ادھر کھینچ لائی تھی۔ ''ام اس کے کباب اپنے ہاتھ سے بنا کر آپ کو کھلائے گا۔'' اجمل نے سنجیدگی سے کہا۔

''چلو کباب بھی بن جائیں گے لیکن فی الحال تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''بس ایک سیکنڈ جناب۔'' اجمل نے کہا اور کونج بے جی کے سپرد کر کے واپس آ گیا۔

رستم اور ناصر نے اجمل سے مُنے کے بارے میں بات کی اور اس حوالے سے پہلوان کا تذکرہ بھی کیا۔

اجمل خان نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''رستم بھائی! ام اس بارے میں آپ سے خود بھی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ پہلوان جب پچھلی مرتبہ آیا تھا، اس نے ام کو بچے کے بارے میں ایک دو باتیں بتائی تھیں۔ اس وقت آپ کا شادی بالکل تازہ تازہ تھا، ام نے آپ کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔''

"کیا بتایا تھا؟" رستم نے پوچھا۔

اجمل نے کہا۔ "ام کو ڈر ہے کہ آپ ام پر غصہ کرے گا اور کہے گا کہ ام نے اتنا ساری باتیں اپنے تک کیوں رکھا اور پہلوان کو بھی منع کیا کہ وہ یہ باتیں آپ کو نہ بتائے لیکن امارا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ام آپ کو شادی کے موقع پر پکر مند (فکر مند) کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"چلو جو ہوا وہ ہوا، لیکن اب تو کچھ بتاؤ۔"

اجمل خان نے کہا۔ "خو، ام کو زیادہ پتا نہیں کہ اُدھر لاہور میں حالات کیا تھا۔ ام کو پہلوان کی زبانی ہی زیادہ باتوں کا پتا چلا ہے۔ اُدھر لاہور میں چوہدری بشیر شانی بی بی پر بُری نظر ڈالتا تھا۔ وہ بی بی کو بلیک میل کرنے کے لئے مُنے نام کے بچے کا استعمال کر رہا تھا۔ وہاں ملتان میں اس نے ایک غریب لڑکی کو اپنا دلہن بنایا۔ چوہدری بشیر سے کوکی کا جان چھڑانے کے لئے اور کوکی کا شادی ایک لڑکے راجو سے کرانے کے لئے شانی بی بی نے بڑا کوشش کیا۔ چوہدری بشیر کے ساتھ شانی بی بی کا معاملہ طے ہوا تھا۔ چوہدری بشیر نے کہا کہ وہ لڑکی کوکی کو آزاد کر دے گا لیکن شانی بی بی کو اس کے ساتھ شادی کرنا پڑے گی۔ کیا واقعی ایسا کوئی بات ہوا تھا رستم بھائی؟"

"تم اپنی بات مکمل کر لو پھر بتاؤں گا۔" رستم نے کہا۔

"پہلوان نے جو کچھ بتایا ہے جی اس کے مطابق آج کل چوہدری بشیر بہت زیادہ بپھرا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے شانی بی بی کو ریاض ہٹلر زبردستی اپنے ساتھ وڈے ڈیرے پر لے کر نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے آپ کے پیچھے وہاں پہنچا تھا اور اب بھی بی بی جان بوجھ کر کہیں چھپا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بی بی نے اپنا معاہدہ توڑ دیا ہے اس لئے وہ بھی کسی وعدے کا پابند نہیں ہے۔"

"تو کیا ارادہ ہے اس کا؟"

"اس نے پہلے تو کوکی کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوکی تو اب راجو نام کے لڑکے کا دلہن بن چکا ہے اور راجو اور تاؤ حشام وغیرہ کا پھیملی (فیملی) بہت مضبوط تھا۔ وہ کوکی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے بعد اس نے کوکی کا بڑا بہن سنبل پر چڑھائی کر دیا۔ اس کو ملتان سے اٹھوانے کا کوشش کیا۔ اس کوشش میں کوکی اور سنبل کا باپ کریانہ فروش سیف بھی زخمی ہوا۔ اتفاق سے پولیس موقع پر پہنچ گیا اور چوہدری بشیر کا یہ کوشش ناکام ہو گیا۔ اس کے بعد سے سنبل اور اس کا سارا پھیملی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ چوہدری بشیر بہت طیش میں ہے۔ سنا

ہے کہ وہ دن رات شراب پیتا ہے۔ اس کو پوٹوگرافی کا شوق ہے۔ پوٹوگرافی کے بہانے اس نے ترکی سے ایک ماڈل منگوائی تھی۔ اب اس کی تصویریں کھینچنے کے بجائے اس کے کپڑے کھینچ رہا ہے۔ اس کا ایک اور محبوبہ شائلہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ دن رات عیاشی میں پڑا ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ سنبل کی تلاش کا کام بھی جاری ہے۔ اس کی عیاشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور میں اس کا بچہ پوری رات گھر سے غائب رہا لیکن اس کو پتا بھی نہیں چلا۔ چھوٹا سا بچہ پورے چوبیس گھنٹے گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بعد میں وہ واپس ملا لیکن باپ کی مار پیٹ سے بیمار ہو گیا اور کئی دن لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں رہا۔"

اجمل خان کی گفتگو دس پندرہ منٹ جاری رہی۔ اس سے ساری صورتِ حال کا ایک نقشہ سا رستم کے ذہن میں کھنچ گیا۔

آخر میں اجمل خان نے کہا۔ "ام نے ایک دو روز میں آپ کو یہ سارا باتیں بتا دینا تھا، لیکن آپ نے پہلے ہی ذکر کر دیا۔"

"دراصل پہلوان کل جو پرانے اخبار لایا ہے اس میں سے ایک اخبار میں مُنے کے گم ہونے اور ملنے کی خبر موجود تھی۔" رستم نے کہا۔ اجمل تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔

ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اجمل! ہم اس بچے کو یہاں روکیٹ میں لانا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس سلسلے میں پہلوان کہاں تک ہماری مدد کر سکتا ہے؟"

اجمل خان کچھ دیر خاموش رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ام آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہے۔ خود، ام کو امید ہے کہ آپ امارا یہ درخواست قبول پرمائے گا۔"

"کیسی درخواست؟" رستم نے پوچھا۔

"آپ اس بچے کو لاہور سے یہاں لانے کا کام امارے سپرد کر دیں۔ ام آپ کو یقین دلاتا ہے کہ ام سے اچھا یہ کام کوئی اور نہیں کر سکے گا۔"

"لیکن ہم سب کی تصویریں تو لاہور کے سارے تھانوں میں لگی ہوں گی۔"

"آپ اس کا پکر نہ کریں۔ ام اس بارے میں سارا منصوبہ بندی کرے گا۔ بچے کو وہاں سے ایسے نکال کر لائے گا جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔ ان شاء اللہ خراش تک نہیں آنے دے گا بیٹا جی کو۔"

"سب سے اہم بات بھی یہی ہے، بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"بس جی! پھر آپ یہ کام پہلوان کے سپرد نہ کریں۔ یہ امارا اپنا کام ہے۔ ام اس کو خود کرے گا۔" اجمل خان نے بے حد اعتماد سے کہا۔

یہ بات تو رستم کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ اس کام کے لئے اجمل خان، پہلوان سے کہیں بہتر تھا۔ وڈے ڈیرے کی لڑائی میں رستم نے اجمل خان کی کچھ چھپی ہوئی صلاحیتیں دیکھی تھیں۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ خطرناک ترین صورتِ حال میں بھی پُرسکون رہتا تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ خطرے کو انجوائے کرتا تھا۔ لڑائی بھڑائی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر اس کا ذہن زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا تھا.... لیکن مسئلہ پھر وہی تھا۔ ناصر اور رستم وغیرہ کی طرح وہ بھی پولیس کو انتہائی مطلوب تھا۔

رستم، ناصر اور اجمل خان میں اس موضوع پر تادیر بات ہوئی۔ اجمل خان کا کہنا تھا کہ جب وہ سرحد پولیس میں تھا، اس کی داڑھی صاف تھی اور مونچھیں تھیں۔ اب مونچھیں صاف ہو چکی ہیں اور چھوٹی داڑھی رکھی جا سکتی ہے۔ سر کے بالوں کو صاف کرا کے وہ اپنا حلیہ کافی حد تک بدل سکتا ہے۔ اس نے بتایا۔ ''لاہور میں امارا ایک رشتے دار بھائی خناب گل ریڑھی پر بھنے ہوئے چنے اور مونگ پھلی بیچنے کا کام کرتا ہے۔ ام سیدھا اس کے پاس جائے گا۔ وہ امارے لئے سب انتظام کر دے گا۔ ام ریڑھی لے کر شہر کے ہر اس حصے میں پہنچ سکتا ہے جہاں جانا چاہیے۔ خناب گل لاہور کے چپے چپے سے واقف ہے۔''

ناصر نے کہا۔ ''اجمل خان! ایک بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ مُنے کے ایک مرتبہ گم ہو جانے کے بعد چوہدری بشیر اس کی طرف سے بہت ہوشیار ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ صرف یہی بچہ ہے جس کی وجہ سے شانی بی بی دوبارہ اس کی طرف آ سکتی ہیں۔ وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے لاہور سے نکالنے کے لئے خاص الخاص کوشش کرنا پڑے گی۔''

''بچہ سکول جاتا ہے یا نہیں؟'' اجمل خان نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وہ جانا شروع ہو گیا ہے۔''

''تو بس پھر آپ بے پکر رہیں۔ ان شاء اللہ آٹھ دس دن میں وہ یہاں امارے درمیان اماری بہن کے پاس ہوگا۔'' اجمل کے لہجے میں غیر متزلزل یقین تھا۔

''چلو اس بارے میں مزید سوچتے ہیں لیکن تم ابھی شانی بی بی یا کسی اور سے اس بارے میں کچھ نہیں کہو گے۔''

''ام نے اب تک نہیں بتایا تو اب کیسے بتائے گا۔ حالانکہ امارے لئے خود کو روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔''

رستم واپس پہنچا تو شانی اپنے بہت سے کام نمٹا چکی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے دہی بلویا تھا۔ مکھن نکالا تھا۔ خود ہی برتن صاف کئے تھے۔ اب وہ اُجلے اُجلے چہرے کے ساتھ حلوہ اور دیسی گھی کے پراٹھے تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ساتھ ساتھ وہ بے جی سے باتیں بھی کر رہی تھی تاکہ انہیں بوریت کا احساس نہ ہو۔ رستم کو دیکھ کر بے جی مسکرائیں۔ ''کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں پُتر! تُو نے مجھے ایسی بہو لا کر دی ہے جو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ انگریزنی دیکھو! ابھی تک گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔ اس کو بستر پر جا کر چائے بھی یہ خود ہی پلائے گی۔ پھر اس کے بچے کا منہ ہاتھ دھلائے گی، پھر اسے ناشتہ کرائے گی۔ مجھے تو دیکھ دیکھ کر ترس آنے لگا ہے۔''

''آپ کے بیٹا جی ہیں بڑے سخت۔ ان کے ڈر سے سب کچھ کرتی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''مجھے پتا ہے یہ جتنا سخت ہے۔ یہ تو خود بھی کڑھتا رہتا ہے تیری اس بھاگ دوڑ پر۔''

''آپ ان کی حمایت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا۔ دیکھیں کل شام انہوں نے کتنی مشقت کرائی ہے مجھ سے۔ پورا بیس کلو دودھ دھوایا ہے مجھ سے۔''

''دھی رانی سچ کہہ رہی ہے رستم پُتر؟''

''میں ان کی بات کو رد کیسے کر سکتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

بے جی نے ذرا گھور کر رستم کو دیکھا اور بولیں۔ ''دیکھ پُتر، خبردار جو میری دھی کو کسی طرح تنگ کیا تو اور اسے سخت ہاتھ بالکل نہ لگایا کر۔''

وہ آخری الفاظ اتنی روانی اور سادگی سے کہہ گئیں کہ انہیں خود بھی پتا نہیں چلا کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ وہ عام سے انداز میں پھر تسبیح پھیرنے لگیں۔ شانی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ رستم بھی کھسیانا ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

اسی دوران میں چاچا ابراہیم کھانستے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ اپنا حقہ تازہ کر کے لائے تھے۔ اب چلم میں آگ بھرنا چاہ رہے تھے۔ شانی کو روٹیاں اتارتے دیکھ کر وہ واپس پلٹے۔

''کہاں جا رہے ہو چاچا؟'' شانی نے پکارا۔

''کچھ نہیں۔ تم کام کر لو، پھر میں چلم بھر لوں گا۔''

''آپ کی چلم کے لئے میں نے آگ انگیٹھی میں جلا دی تھی۔ وہ بالکل تیار ہے آپ بھر لیں۔''

''تیرا دھیان تو ہر طرف رہتا ہے۔'' چاچا ابراہیم ذرا حیران ہو کر بولے۔ ''اب اتنے

چھوٹے چھوٹے کام بھی تُو ہمیں کرنے نہیں دیتی۔ اگر تُو یہاں سے چلی گئی تو ہم بڈھی بڈھے کا کیا ہوگا۔ ہم تو ناکارہ ہوکر رہ جائیں گے۔"

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں چاچا جی لیکن ایک بات میں آپ کو بتا دوں۔ میں زیادہ دن آپ کی چلم نہیں بھروں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا تو خود ڈاکٹر ہے، آپ پھر بھی حقہ پیتے ہیں۔"

"وہ تو کہہ کہہ کر ہار چکا ہے دھی رانی۔ یہ نہیں مانتے۔" بے جی بولیں۔

"میں دیکھتی ہوں کیسے نہیں مانتے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "خان بھائی کی نسوار چھڑوادی ہے، آپ کا گڑ چھڑوادیا ہے، ان کا حقہ بھی چھڑوادوں گی۔"

"تُو سب کچھ کر سکتی ہے دھی رانی، سب کچھ۔ میں پہلے ہی ہار مان لیتا ہوں لیکن مجھ پر ہاتھ ذرا ہولا رکھنا۔ میں دو تین مہینے میں آہستہ آہستہ چھوڑ دوں گا۔" چاچا ابراہیم کراہ کر بولے۔

دو دن بعد مُنے کے حوالے سے اجمل خان، پہلوان، ناصر اور رستم میں طویل میٹنگ ہوئی۔ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا گیا اور تفصیل طے کی گئی۔ اتنا تو رستم اور ناصر اچھی طرح جان گئے تھے کہ اجمل خان ایک قابلِ بھروسا ساتھی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے مشن کے دوران میں پکڑا بھی گیا تو کچھ اُگلے گا نہیں بلکہ اپنی جان دے دے گا۔ سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس کارروائی کے دوران میں بچے کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچ جائے۔ رستم کا سارا زور اسی بات پر تھا کہ اجمل خان صرف اسی صورت میں مُنے کو اٹھانے اور یہاں لانے کا کام کرے جب اسے کامیابی کا پورا یقین ہو جائے۔

اس نے اجمل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مُنے کو یہاں نہ بھی لا سکے تو یہ ناکامی نہیں ہوگی اور کچھ نہیں تو ہمیں اگلی کارروائی کے لئے ضروری معلومات تو مل جائیں گی۔ اس کام کی ہمیں کوئی ایسی بہت جلدی بھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہیں کوئی اچھا چانس ملے تو فائدہ اٹھالو۔ ورنہ لاہور میں ہی رُوپوش ہوکر انتظار کرو۔ مہینے، دو مہینے یا جتنا بھی وقت تم مناسب سمجھو لے سکتے ہو۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے پولیس کی چوکسی بھی کم ہو رہی ہے۔"

اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "رستم بھائی! آپ یہ کیوں بھول رہا ہے کہ ام خود بھی پولیس والا ہے۔ پولیس کے سرد گرم کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ باقی آپ کا سارا بات ام نے بڑی اچھی طرح اپنے کھوپڑے میں بٹھالیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ام اس معاملے میں کوئی

جلد بازی نہیں کرے گا۔"

"اور ایک اور خاص بات......ایک وقت میں صرف ایک کام۔" رستم نے کہا۔

"ام سمجھا نہیں برادر؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم صرف بچے کے لئے یہاں سے جا رہے ہو۔ کسی اور طرف دھیان نہیں دو گے اور نہ ہی یہ دھیان دینے کا وقت ہے۔"

اجمل خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ام آپ کا مطلب سمجھ گیا ہے رستم بھائی۔ بے شک امارے سینے میں اس خنزیر ریاض ہٹلر کے لئے بڑا ظالم آگ بھڑک رہا ہے لیکن ابھی ام اس کی طرف سے اپنا آنکھ بند رکھے گا۔ اپنے دل پر بہت بڑا پتھر رکھ کر اپنا کام کرے گا۔ ام وقت کا ڈیمانڈ سمجھتا ہے۔"

شام تک وہ چپکے چپکے تیاری میں مصروف رہے۔ صرف رستم اور ناصر کو معلوم تھا کہ اجمل خان پہلوان کے ساتھ لاہور کی طرف جا رہا ہے۔ باقی جانتے تھے کہ اجمل خان کو دشوار پہاڑی راستے پر سفر کرتے ہوئے خان پور کی طرف جانا ہے۔ جہاں اس کا ایک چچازاد بھائی رہتا ہے اور جسے بیماری کی وجہ سے اجمل خان کی مدد کی ضرورت ہے۔

شانی کو یوں اجمل کا یہاں سے جانا پسند نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس بستی سے نکلنے میں خطرات پوشیدہ ہیں۔ اگر درمیان میں اجمل کے چچازاد بھائی کی بیماری کا بہانہ نہ ہوتا تو شانی اجمل خان کی روانگی کی بھرپور مخالفت کرتی۔ پھر بھی پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ وہ سب بہت جلد خود کو ایک گھرانے کی طرح سمجھنے لگے تھے اور شانی کی گھرانے کے ہر فرد میں جان تھی۔ ناصر اس کے دیور کی طرح تھا، اجمل بھائی کی طرح، چاچا ابراہیم میں اس نے سسر کا پیار ڈھونڈ لیا تھا اور بے جی میں ساس اور ماں کا۔ اس کا پیار ایک روشنی کی طرح تھا جو چاروں طرف پھیلتی تھی اور اردگرد کے نفوس کو اپنے احاطے میں لے لیتی تھی۔ اجمل خان سے گریس کو بھی بہت لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ اس کی گلابی اردو سنتی تھی اور خود بھی گلابی اردو بول کر ہنستی تھی۔ اجمل کی روانگی پر وہ بھی افسردہ نظر آئی۔ اجمل نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ام زیادہ دن باہر نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس میں امارا اپنا ہی نقصان ہے۔ امارا نسوار پھر سے شروع ہو جائے گا۔"

سب ہنسنے لگے...... لیکن شانی بدستور سنجیدہ رہی۔ اس نے اجمل خان کے لئے آلو والے پراٹھے اپنے ہاتھ سے تیار کئے تھے۔ پہلوان چاول شوق سے کھاتا تھا، اس کے لئے قیمہ ملے چاول تھے۔ میٹھی سوجی جس میں کشمش اور بادام ڈالے گئے تھے، راستے کے لئے

تھی۔ یہ سب کچھ اس نے بڑی نفاست سے باندھ کر اجمل خان کے حوالے کیا۔

اجمل خان چلا گیا اور رستم سوچوں کے نرغے میں آ گیا۔ اسے اجمل کی ذہانت اور صلاحیت پر پورا بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مشکل حالات میں اپنے طور پر فیصلے کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ایک اہم مسئلہ اپنی شناخت چھپانے کا تھا۔ اگر وہ اس حوالے سے کامیاب ہو جاتا تو باقی مرحلے بھی طے ہو سکتے تھے۔ درحقیقت وہ اجمل کو اس خطرناک کام سے روکنا چاہتا تھا لیکن جب گفتگو کے دوران میں اس نے اجمل کا جذبہ اور غیر متزلزل یقین دیکھا تو اپنی رائے بدل لی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اجمل خان اپنی جان پر تو کھیل جائے گا لیکن اس کی وجہ سے ان سب پر یا مُنے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ حوصلہ افزاء بات یہ بھی تھی کہ وڈے ڈیرے کے واقعات کو اب ایک معقول عرصہ گزر چکا تھا۔ پولیس کارروائیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں اور ماسٹر مائنڈ ڈپٹی ریاض خود الزامات کی زد میں تھا۔

دن گزرنے لگے۔ بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی اس بستی میں باہر سے کوئی خبر نہیں آتی تھی...... یہاں کی زندگی بڑی سادہ اور خود کفیل تھی۔ ہموار زمین بہت تھوڑی تھی۔ کھیتی کے لئے ڈھلوانوں کو ہموار بنانے کی کوشش کی گئی تھی تاکہ آبپاشی کا پانی فصل میں ٹھہرا رہے۔ لوگوں نے گائے، بھینسیں اور بکریاں پال رکھی تھیں۔ سبزہ بہت زیادہ تھا، یہ جانور اکثر خود ہی گھوم پھر کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ رستم نے کئی مرتبہ بکریوں بلکہ گایوں کو بھی نہایت بلند اور خطرناک ڈھلوانوں پر چرتے دیکھا تھا۔ سیب، خرمانی اور چیری جیسے مزے دار پھلوں کے درخت بھی یہاں پائے جاتے تھے۔ بستی کا واحد جھرنا مکینوں کی ساری ضروریات پوری کر دیتا تھا۔ پُرشور شہروں کے مقابلے میں یہاں زندگی بہت دھیمی اور پُرسکون تھی۔ بلند پہاڑوں کی وجہ سے سورج کی روشنی دن گیارہ بجے کے قریب نمودار ہوتی تھی اور شام چار پانچ بجے اوجھل ہو جاتی تھی۔ بستی کے درمیان آٹھ دس دکانوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں دیہاتی زندگی کے لئے ضرورت کی ہر شے میسر آ جاتی تھی۔ بستی کی دوپہریں خاموش اور سنسان ہوتی تھیں، جب کہ سہ پہر کو لڑکے ایک چھوٹے سے میدان میں والی بال یا کرکٹ کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ راتوں کو آسمان اتنا شفاف ہوتا تھا کہ ستارے جیسے زمین پر اُتر آتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں جھرنے کی کھن کھن، سیبوں کی خوشبو اور چیڑ کے دیوقامت درختوں کی مہک شامل ہوتی تھی۔ یہاں سے دور شمال کی جانب خان پور اور ایوبیہ وغیرہ کے پہاڑ نظر آتے تھے۔ اکثر پہاڑی علاقوں کی طرح یہاں بارش معمول سے زیادہ ہوتی تھی۔ کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر پھولوں سے گھرے ہوئے شفاف جھرنے کو دیکھنا اور ٹین کے چھجوں پر بارش کی زوردار آواز

سننا رستم اور شانی کو بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ وہ کسی سپنوں کی وادی میں ہیں۔ یہ در و دیوار یہ گرد و پیش اور یہ پھولوں سے مہکی ہوئی کھڑکی..... سب کچھ انہیں دیکھا بھالا لگتا تھا۔ سارا دن احاطے میں گزار کر جب رستم لاٹھی ٹیکتا ہوا شام کو گھر آتا تھا تو ارد گرد کا حسن اسے اور شانی کو اپنے حصار میں لے لیتا تھا۔ زندگی ایک دم جگمگا اٹھتی تھی لیکن نہیں، ایک کمی ..... ایک کمی شاید موجود تھی اور اس کا قلق کبھی کبھی شانی کے آئینہ چہرے پر ہلکی سی دھندلاہٹ لے آتا تھا۔ اس ہلکی سی دھندلاہٹ کو محسوس کر کے رستم کے اپنے سینے میں بھی دھند بھرتی تھی...... اس دھند کے علاوہ رستم کے سینے میں بہت گہرائی کے اندر ایک جوالا مکھی بھی تھا۔ یہ جوالا مکھی بظاہر خاموش نظر آتا تھا مگر یہ خاموش نہیں تھا۔ یہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا، ابل رہا تھا اور اپنا حجم بڑھا رہا تھا۔ رستم اس طرف دھیان نہیں دیتا تھا اور دینا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن دھیان نہ دینے سے حقیقتیں باطل تو نہیں ہو جاتیں۔ آگ، خون، کرب ناک چیخیں اور دھماکے ..... یہ سب کچھ کبھی کبھی ایک چھپاکے کی طرح اپنی جھلک دکھاتے تھے اور اوجھل ہو جاتے تھے۔ وقت آگے کو سرک رہا تھا۔ اجمل خان کو یہاں سے گئے تقریباً تین ہفتے ہو گئے تھے۔

وہ ایک خمار آلود رات کی صبح تھی۔ رستم جاگنے کے بعد دیر تک بستر پر دراز رہا۔ رات بارش ہوتی رہی تھی اور محبت کی بارش بھی۔ اب کھڑکی سے باہر آسمان بالکل شفاف نظر آ رہا تھا۔ یہ پہاڑیوں کی بارشیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ٹوٹ کر برستی ہیں اور جب بادل چھٹتے ہیں تو لگتا ہے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہر شے پہلے کی طرح چمکیلی اور روشن نظر آتی ہے۔ رستم نے دروازے میں سے شانی کو دیکھا۔ وہ مکھن کا بڑا سا پیڑا بناتی ہوئی تیزی سے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ وہی اجلا پن، وہی نکھار، وہی چوکسی۔ بیتی ہوئی شب کا شائبہ تک نہیں تھا اس کے ساتھ...... پہاڑی بارشوں کی طرح بے نشان۔

رستم نے بارہا سوچا تھا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا ہے یا واقعی ایسا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ وہ مزید نکھر رہی تھی، اس کا سراپا مزید دلکش ہو رہا تھا۔ بستی کی عورتیں اسے دیکھتی تھیں تو دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ وہ چپکے چپکے اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور بے جی کو مشورے دیتی تھیں کہ وہ اپنی خوبرو بہو کو چار دیواری سے باہر نہ نکلنے دیا کرے۔ یہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ ان کے نزدیک ناگی پولیس والا جو مہینے میں ایک بار بستی کا چکر لگاتا تھا بہت بڑا افسر تھا اور ناگی کا افسر تو ان کے نزدیک ہر سیاہ سفید کا مالک تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک ناگی کے افسر کا اثر و رسوخ بے حساب تھا اور ایسے لوگوں سے اپنی بہو بیٹیوں کو دور رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

رستم دروازے میں سے شانی کو برآمدے میں آتے جاتے دیکھ رہا تھا، اسی دوران میں چاچا ابراہیم تیزی سے اندر آیا۔ وہ سیدھا رستم کے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا کہ رانو آج پھر اَڑی کر رہی ہے۔ دودھ نہیں اُتار رہی۔ چاچا اس کے لئے انجکشن لینے آیا تھا..... حالانکہ ایک انجکشن وہ اسے پہلے لگا چکا تھا۔

رستم نے کہا۔ ”آپ کی بہو صاحبہ انجکشن سے کم کام نہیں کرتی ہیں۔ ان کو لے جائیں۔ اس سے پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔“

”نہیں پُتر! بار بار اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی میرا تو ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے۔“

”میرا بھی نہیں تھا چاچا جی! لیکن اس دن آپ موجود نہیں تھے ورنہ یقین کر لیتے۔“

اس سے پہلے کہ چاچا ابراہیم مزید کچھ کہتا، رستم اٹھ کھڑا ہوا۔ ”شانی! کہاں ہیں آپ۔ آج پھر آپ کی ضرورت پڑی ہے۔“ رستم نے برآمدے میں آکر بلند آواز سے کہا۔

شانی رومال سے ہاتھ پونچھتی باورچی خانے سے نکل آئی۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ آپ کی سہیلی آج پھر روٹھی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے احاطے میں چلنا ہے۔“

”بس ایک روٹی رہ گئی ہے پکا لوں؟“

”پکا لیں۔“

اتنے میں بے جی بھی آواز سن کر باہر آگئیں۔ ”کہاں لے جا رہے ہو میری دھی کو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ذرا احاطے تک جانا ہے۔ ابھی آجاتی ہیں۔“ رستم نے کہا۔

”دیکھ آج پھر تُو اسے تنگ کرے گا ناں۔ اس دن دودھ نکال نکال کر دچاری کی کلائیاں پھوڑا بن گئی تھیں۔“

”نہیں بے جی! کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ مجھے تو اچھا لگتا ہے۔“ شانی باورچی خانے سے بولی۔

”چل چپ رہ تُو۔ زیادہ چالاک چست نہ بن۔ اللہ نہ کرے بیمار پڑ گئی تو پھر۔“ بے جی نے اسے پیار بھرے غصے سے ڈانٹا۔

رستم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے بے جی اب رانو سے شانی کی دوستی بڑھ گئی ہے۔ اب تو یہ اس کے پاس جا کر بھی کھڑی ہو جائیں گی تو وہ فرفر دودھ دینے لگے گی۔“

فرفر دودھ..... کے الفاظ پر شانی مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں احاطے میں تھے۔ دن کا اجالا نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ شریف اور اس کے دونوں لڑکے بھینسوں کا

دودھ دھونے اور سنبھالنے میں مصروف تھے۔ بکریاں ممیا رہی تھیں، مرغیوں کی کڑکڑاہٹ اطراف میں گونج رہی تھی۔ چاچے ابراہیم اور رستم کے ساتھ شانی کو دیکھ کر شریف اور اس کے بیٹے اِدھر اُدھر کھسک گئے۔ شانی نے اپنی آستینیں اڑسیں۔ اس کے سڈول گورے بازو کہنیوں سے اوپر تک عریاں ہوگئے۔ سرخ اور سبز رنگ کی چوڑیاں کلائیوں میں زیادہ دلفریب نظر آنے لگیں۔ رانو نے بھی جیسے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور گردن گھما گھما کر اسے دیکھ رہی تھی۔ شانی نے اس کے چمکیلے بھورے جسم پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ اس کے منہ کو سہلایا۔ رانو نے ایک دو بار اپنا خوبرو تھوبڑا شانی کے سینے سے رگڑا اور بالکل شانت ہو کر سبز چارے پر منہ مارنے لگی۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ وہ ”تیار“ ہے۔ چاچا ابراہیم کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی تھی۔

”کمال ہے بھئی۔“ وہ بڑبڑائے۔ ”رانو جیسی بھینسیں اس طرح کبھی رام نہیں ہوتیں۔“

شانی رانو کی پچھلی ٹانگوں کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے تازہ پانی سے رانو کے شاندار تھنوں پر چھینٹے مارے۔ اپنے ملائم ہاتھوں سے انہیں دھویا اور استوار کیا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن رانو کے لئے جیسے موسیقی کا کام دے رہی تھیں۔ جلد ہی تھن دودھ سے بھر گئے۔ ”ہوانے“ کی رگیں پھول کر چمک اٹھیں۔ پھر پیتل کی بالٹی میں کھن کھن دودھ کی دھاریں گرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد چاچا ابراہیم دودھ دھونے لگے۔ شانی بس پاس کھڑی رہی اور ہولے ہولے رانو کی بھوری جلد پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

رستم نے مسکرا کر ہولے سے کہا۔ ”آپ چاچا ابراہیم کی مرغیوں پر ایک ایک ہاتھ پھیر دیں تو ان کی پیداوار بھی دگنی ہو جائے گی۔“

”آپ کہتے ہیں تو میں یہاں احاطے میں ہی رہنا شروع کر دیتی ہوں۔“ شانی بھی مسکرائی۔

”لیجئے آپ کا ایک اور پرستار آگیا۔“ رستم نے کہا۔

ایک جانب سے براؤن بلی آئی اور شانی کے قدموں میں لوٹنا شروع ہوگئی۔ (یہ دراصل بلا تھا لیکن اسے بلی ہی کہا جاتا تھا اور اس کے لئے گھر میں مونث کا صیغہ ہی استعمال ہوتا تھا۔ صرف اجمل خان تھا جو اس کے لئے درست صیغہ استعمال کرتا تھا۔ یعنی بلی آ رہا ہے، بلی جا رہا ہے وغیرہ) شانی بلی کو سہلا رہی تھی، جب شریف کا پندرہ سولہ سالہ لڑکا تیزی سے اندر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ مہمان آئے ہیں۔

مہمانوں کے ذکر پر رستم کو جو پہلا احساس ہوا وہ خطرے کا تھا لیکن پھر اس کا دھیان اجمل خان اور پہلوان کی طرف چلا گیا۔ اس کا دوسرا اندازہ درست تھا۔ رستم کے پوچھنے پر لڑکے نے بتایا۔ ''جی خاں، خان صاحب آئے ہیں۔''

''ان کے ساتھ..... کوئی بچہ بھی ہے؟'' رستم نے بے تابی سے پوچھا۔

''آہو جی۔ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔''

رستم کے سینے میں خوشی کا شادیانہ بج اٹھا۔ شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ کس بچے کی بات کر رہے ہیں؟''

''ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔'' رستم نے کہا اور شانی کا بازو پکڑ کر گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''خیریت تو ہے رستم! آپ اتنی جلدی میں کیوں ہیں۔'' شانی نے پوچھا۔

''جلدی میں کہاں ہوں۔'' رستم نے اپنے تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں گھر کے اندر تھے، باہر گلی میں دو ہانپتے ہوئے خچر نظر آئے۔ شریف کا بڑا بیٹا ان کے آگے پانی رکھ رہا تھا۔ گھر کا صحن عبور کر کے وہ برآمدے میں داخل ہوئے اور پھر...... ایک دم رستم کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اجمل خان کامیاب لوٹ تھا۔ اس کے پہلو میں اس کی انگلی پکڑے مُنا کھڑا تھا۔ وہ بسکٹ کھا رہا تھا اور حیران حیران نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اجمل خان کے سر پر ایک پٹی نظر آ رہی تھی جس کا زیادہ تر حصہ اس نے اپنی ٹوپی کے نیچے چھپا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی خودرو داڑھی تھی۔

رستم کے پہلو میں شانی پتھر کا بت بنی کھڑی رہ گئی۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس نے بے حد استعجاب سے رستم کو دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہی ہو۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں رستم؟''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور ہولے سے مسکرا دیا۔

شانی کی آنکھوں میں ایک دم نمی کی جھلک نظر آئی۔ پھر اس نے مُنے کی طرف دیکھا اور رستم سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے مُنے کی طرف لپکی۔ اب مُنے نے بھی شانی کو دیکھ لیا تھا اور سراپا حیرت دکھائی دیتا تھا۔ شانی نے تڑپ کر اسے اٹھا لیا اور بے تحاشا اسے چومتی چلی گئی۔ ان دونوں کا جذبات انگیز ملاپ دیدنی تھا۔ ''منے۔ میرے منے۔'' وہ بار بار کہتی جا رہی تھی۔ مُنا بھی اپنی نازک بانہیں پھیلا کر اس سے چمٹا ہوا تھا۔ سب نم ناک آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

کتنی ہی دیر بعد شانی رستم کی طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ مسرت کے آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا۔ وہ پُرحیرت لہجے میں بولی۔ ''یہ سب کیا ہے رستم! منّا کیسے پہنچا ہے یہاں؟''

رستم بولا۔ ''یہ اپنے بھائی اجمل خان سے پوچھیں۔ اسی نے کیا ہے یہ سب کچھ۔''

شانی اجمل خان کی طرف پلٹی۔ ''اجمل بھائی! اسے تم لے کر آئے ہو؟ کیسے لائے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

اجمل مسکرا کر بولا۔ ''ام آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتائے گا۔ ابھی آپ اس کو جی بھر کر پیار کر لیں اور دیکھ لیں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اللہ کے فضل سے کہیں خراش تک نہیں آیا ہے۔''

''لیکن..... تم تو زخمی ہو۔ تمہارے سر کو کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''کوئی لمبا چوڑا کہانی نہیں ہے رستم بھائی۔ بس بجلی کے کھمبے سے تھوڑا سا چوٹ لگ گیا تھا۔ ام ابھی آپ کو سارا تفصیل بتائے گا۔''

تب یکایک رستم کی نگاہ ایک گوشے میں گئی۔ اس سے پہلے وہ نہیں جان سکا تھا کہ یہاں کون کھڑا ہے۔ یہاں روشن آنکھوں اور گندمی رنگت والا ایک کوتاہ قد شخص موجود تھا اور یہ رستم کے لئے ہرگز اجنبی نہیں تھا سب سے پہلے رستم نے اسے تاؤ حشام کی حویلی میں دیکھا تھا۔ تاؤ نے وہاں رستم پر ستم کے پہاڑ توڑے تھے اور یہ ڈولا نامی بونا بھی وہیں قیدی کی حیثیت سے موجود تھا۔ اس کے بعد ڈولے سے رستم کی ملاقات ملتان میں ہوئی تھی۔ اب وہ یہاں اس دور دراز پہاڑی بستی میں موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اجمل خان اور مُنے کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شانی اور رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رستم نے دیکھا، شانی نے بھی ڈولے کی موجودگی کو نوٹ کر لیا تھا اور اب وہ بہت حیران نظر آتی تھی۔ ڈولے اور شانی کی دوستی رستم کے لئے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ شانی نے حیرت آمیز مسرت کے ساتھ کہا۔ ''ڈولے! تم یہاں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم بھی مُنے کے ساتھ پہنچے ہو؟''

ڈولے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اجمل خان بولا۔ ''ام اس چھوٹو بھائی کا بہت مشکور ہے۔ اگر ام کو اس کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید ام بچے کو یہاں نہ لا سکتا۔ چھوٹو بھائی نے امارا اتنا ساتھ دیا ہے کہ ام سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

ڈولے نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر شانی کو سلام کیا اور رونے لگا۔ شانی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رستم نے ڈولے سے مصافحہ کیا اور اس کی پیٹھ تھپکی۔

''باجی جی! مجھے امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ آپ کو اور رستم بھائی کو دیکھ سکوں گا۔ مجھے اپنی قسمت پر یقین نہیں آرہا۔ وہاں اخباروں میں تو بہت بُری بُری خبریں تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ وڈے ڈیرے پر چند زخمیوں کے سوا کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔''

''میں بھی تمہارے بارے میں بڑی فکر مند تھی۔ مجھے کوکی اور راجو کی بھی بہت پریشانی تھی۔ وہ سب خیریت سے ہیں ناں؟ اور کوکی کی باجی سنبل اور امی اور انکل سیف؟'' وہ ایک ایک کے بارے میں پوچھتی گئی۔

ڈولے نے مبہم انداز میں جواب دیا اور بتایا کہ سب خیریت سے ہیں۔ ڈولے کی نگاہ بار بار رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ کی طرف اٹھ جاتی تھی اور چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوجاتے تھے۔ رستم دیکھ رہا تھا کہ مُنا عام شہری لباس کے بجائے مقامی طرز کی شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر گول ٹوپی تھی۔ یقیناً اجمل خان نے راستے میں اس کی شناخت چھپانے کے لئے اسے یہ کپڑے پہنائے تھے۔

اجمل خان، ڈولا اور پہلوان بے حد تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے خچروں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے چہرے گردآلود اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شانی نے بھاگ دوڑ کرکے ان کے نہانے اور کھانے وغیرہ کا انتظام کیا۔ گریس بھی اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ مُنے کی آمد نے گریس کو بھی مسرور کیا تھا۔ چوہدری بشیر کے گھر میں مُنے اور ڈیوس میں گہری دوستی ہوگئی تھی اور وہ اکٹھے کھیلتے رہتے تھے۔

کھانا وغیرہ کھا کر اجمل، ڈولا وغیرہ ساتھ والے پورشن میں چلے گئے اور اطمینان سے سوگئے۔ رستم اور شانی کا خیال تھا کہ شام کو اجمل خان جاگے گا اور کھانے کے بعد رات کو اپنی کتھا سنائے گا لیکن وہ تینوں اتنے تھکے ہوئے تھے کہ کھانے کے لئے بھی نہیں اٹھے۔ ان کی کتھا سننے کا پروگرام اگلے دن پر چھوڑ دیا گیا۔

مُنا جو دو تین گھنٹے گم صم نظر آیا اب پورے گھر میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ ڈیوس کے ساتھ کھیلتے کودتے وہ گاہے بگاہے شانی کی طرف پلٹتا تھا۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹتا تھا اور چٹ چٹ ایک دو بوسے لے کر پھر کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ اور اپنے گھر سے دور آگیا ہے۔ وہ پنجرے سے چھوٹنے والے پنچھی کی طرح آزاد ہوا میں پھڑپھڑاتا پھر رہا تھا۔ گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل ہوگئی تھی۔

جب وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے، شانی نے مُنے کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آئے؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''پہلے گالی (گاڑی) پر، پھر بس میں، پھر خان چاچا نے مجھے گھولے پر سیر بھی کرائی۔'' وہ خچر کو گھوڑا کہہ رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اپنے ابو کے پاس سے تم کیسے آئے؟''

''میں ابو کے پاس تھولی تھا۔ میں تو سکول جارہا تھا۔ نیلی والی گالی میں۔ خان چاچا نے مجھ کو ڈلائیول انکل (ڈرائیور انکل) سے چھین لیا۔ خان چاچا نے اسے بڑے زور سے مالا بھی۔ پھر بعد میں مجھے چھوتو بھائی نے بھی اٹھایا تھا۔''

وہ بچوں کے مخصوص انداز میں بے ربط باتیں کررہا تھا۔ چھوتو بھائی سے اس کی مراد یقیناً ڈولا تھی۔

رستم نے کہا۔ ''سنا ہے مُنے تم گم بھی ہوگئے تھے۔ سب لوگ تمہیں ڈھونڈتے رہے۔''

وہ خاموش ہوگیا اور چہرے پر افسردگی چھاگئی۔ رستم نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس واقعے کا ذکر چھیڑ کر اسے دل گرفتہ کیا جائے۔ شانی نے بھی آنکھ کے اشارے سے رستم کو منع کردیا۔ وہ دونوں اس کا جی بہلانے میں لگ گئے۔ رستم نے اسے ایک لطیفہ سنایا۔ شانی اس گدگداتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کچھ بھول بھال کر معصوم ہنسی ہنسنے لگا۔ وہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ لالٹین کی روشنی شانی اور مُنے کے چہروں پر منعکس ہورہی تھی۔ وہ دونوں ہنستے اور ایک دوسرے سے شرارتیں کرتے ہوئے رستم کو بہت بھلے لگے۔ رستم نے چوہدری کی رہائش گاہ پر ایک مرتبہ شانی کی ایک شاندار تصویر دیکھی تھی۔ اس تصویر میں شانی کی بانہوں میں مُنا نظر آرہا تھا۔ یہ فریم شدہ تصویر یقیناً چوہدری بشیر نے ہی کھینچی ہوگی۔ رستم کو چوہدری بشیر کے ذہن کی داد دینا پڑی تھی۔ اس نے شانی اور مُنے کو اس طرح یکجا کیا تھا کہ ایک عورت کی حیثیت سے شانی کہیں زیادہ پُرکشش لگنے لگی تھی۔ آج پھر رستم ایسی ہی کشش کا منظر دیکھ رہا تھا۔ مُنا شانی کی گود میں تھا۔ ننھا سا شلوار کرتہ اس کے بدن پر جچ رہا تھا۔ شانی بے ساختہ انداز میں اسے گدگدا رہی تھی، اپنے ساتھ لپٹا رہی تھی اور اس کی دل آویزی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ شانی کی ذات ہی نہیں اس کی نسوانیت بھی کہیں زیادہ دلکش نظر آنے لگی تھی۔ رستم شاعر نہیں تھا ورنہ وہ کوئی شعر کہتا...... اور چوہدری بشیر کی طرح فوٹو بھی نہیں کھینچتا تھا ورنہ ان لمحوں کو امر کرلیتا۔

اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی ہوا جھرنے کی

رم جھم پر رقص کرتی اندر آ گئی۔ مُنے کی ریشمی زلفیں اس کی پیشانی پر بکھر گئیں۔ شانی نے اپنے مہربان ہاتھوں سے اسے پیچھے ہٹایا۔ رستم کو یوں لگا جیسے آج اس کا چھوٹا سا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ شاید ایسے ہی گھر کا سپنا اس کی اور شانی کی آنکھوں میں تھا۔ ایسی ہی کھڑکی، ایسے ہی تاروں بھرے آسمان کا ٹکڑا، ایسی ہی مشک بار رات دھیرے دھیرے دل کے زینوں پر پاؤں دھر کر اُترتی ہوئی... رستم کا دل چاہا، وہ شانی کو مُنے سمیت اپنی بانہوں میں لے لے اور دیر تک سینے سے لگائے کھڑا رہے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شانی کے ساتھ ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کے باوجود اور بے تکلفی کی کئی منزلیں طے کرنے کے باجود رستم شانی کے سامنے رکھ رکھاؤ کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ شانی کے گرد وقار اور قرینے کا ایک ہالہ سا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ خوب صورت ہالہ برقرار رہے۔ اسے شانی کے ساتھ ساتھ اس ہالے سے بھی عشق ہو گیا تھا۔

شانی نے رستم کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کک...... کچھ نہیں۔''

''میں اب آپ کی آنکھوں میں دیکھ کر آپ کے دل کا حال پڑھ لیتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''کیا مطلب؟''

وہ مُنے سمیت رستم کے قریب چلی آئی۔ بہت آہستگی سے اس نے اپنا سر رستم کے شانے سے ٹکا دیا۔ اس کے ریشمی بدن کی مہک رستم کے مشام جاں میں اُتری۔ اس نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ وہ اپنا سر رستم کے شانے سے ٹکائے ٹکائے بولی۔ ''رستم! دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ میرے دل کا حال پڑھ لیتے ہیں تو میں کیسے نہ پڑھوں۔''

''میں نے کیا پڑھا ہے؟''

''یہ جو مُنا ہماری بانہوں میں ہے، آپ نے میرے دل کا حال ہی تو پڑھا ہے۔ چپکے چپکے پریشان ہوتے رہے۔ مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ میری خاطر اجمل خان کو اتنی دور بھیجا۔''

''مجھے تو شرمندگی ہے شانی! میں خود نہیں جا سکا۔ آپ میری ذمے داری ہیں۔ آپ کی خوشی کا خیال رکھنا میرا ذاتی فرض ہے۔''

''اس بارے میں کچھ نہ کہیے رستم! میں سب جانتی ہوں۔'' شانی نے بے ساختہ رستم کا شانہ چوم لیا۔ پھر اس نے مُنے کا گال چوما اور ہولے سے بولی۔ ''خدا کرے ہماری ان خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔''

رستم نے اپنے ہونٹ اس کے بالوں پر رکھ دیئے۔

کچھ دیر بعد جب رستم کھڑکی کی طرف مڑا تو ذرا سا چونک گیا۔ اسے لگا کہ جھرنے کے پاس سے ایک سایہ سا گزر کر احاطے کی طرف گیا ہے۔ چونکنے کی بات یہ تھی کہ یہ کسی عورت کا سایہ تھا۔ یہ بے جی نہیں تھیں۔ پھر یہ گریس کے سوا اور کون ہو سکتا تھا پتا نہیں کیوں رستم کے دل میں شک سا جاگ گیا۔

مُنا شانی سے کہانی سننے کی ضد کر رہا تھا اور وہ اس شرط پر آمادہ تھی کہ وہ پہلے آدھا گلاس دودھ پیئے۔ رستم ان دونوں کو مصروف چھوڑ کر ہولے سے باہر نکلا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ اس نے برآمدے سے گزرتے ہوئے ایک نگاہ گریس کے کمرے کی طرف ڈالی۔ یہاں ننھا ڈیوس چارپائی پر سو رہا تھا لیکن گریس نہیں تھی۔ رستم کا یہ شبہ پختہ ہو گیا کہ جھرنے کے پاس جو سایہ نظر آیا وہ گریس ہی کا تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے اس ڈھلوانی راستے کی طرف بڑھا جو پتھروں سے بنایا گیا تھا اور جس کی دونوں جانب چیڑ اور چنار کے درخت تھے۔ دن کے وقت یہاں پہاڑی کوؤں کی آوازیں تسلسل سے آتی تھیں۔

اچانک رستم کو رکنا پڑا۔ اس کو اپنے بالکل قریب دائیں جانب سے باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ ایک تناور درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ بولنے والوں میں ایک تو عورت تھی اور وہ یقیناً گریس تھی۔ دوسرا مرد تھا اور وہ ڈاکٹر ناصر تھا۔ تیسری آواز کو رستم نے تھوڑی سی کوشش کے بعد پہچانا۔ یہ چاچا ابراہیم کا دیرینہ ملازم شریف تھا۔ وہ تینوں بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ رستم کوشش کے باوجود ان کے الفاظ سمجھ نہیں سکا۔ جو دو تین اُڑتے اُڑتے سے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے، وہ بے معنی تھے۔ ان میں چمڑے کے بیگ، بارش اور جنریٹر کا ذکر تھا۔

تھوڑی دیر بعد رستم نے محسوس کیا کہ گریس اور ناصر درختوں کے جھنڈ سے گھر کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔ شریف احاطے کی طرف نکل گیا تھا۔

وہ سب چلے گئے تو رستم بھی احتیاط سے لاٹھی ٹیکتا واپس آ گیا۔ برآمدے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا، گریس واپس اپنے کمرے میں اپنے بچے کے ساتھ موجود تھی۔ ناصر غالباً اپنے کمرے میں تھا۔

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے رستم کو بار بار ناصر، گریس اور شریف کی پُراسرار ملاقات یاد آنے لگی۔ نہ جانے کیوں رستم کو اکثر محسوس ہوتا تھا کہ گریس اور ناصر اس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کوئی پردہ سا ہے جو انہوں نے اپنے اور اس کے درمیان تان رکھا ہے۔ پھر

رستم کا دھیان ان بے معنی الفاظ کی طرف چلا گیا جن میں چمڑے کے بیگ کا ذکر تھا۔ چمڑے کے بیگ کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں رستم کو مزید پُراسراریت کا احساس ہونے لگا۔ شانی نے اسے دو تین بار یہ بات بتائی تھی کہ وڈے ڈیرے کی تباہی کے بعد اس نے گریس اور اخبار نویس ضمیر احمد کو ایک چرمی بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس بیگ میں کوئی انوکھی سی شے ہے۔ بعدازاں ایک صحافی بڑی عجلت میں اس بیگ سمیت ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر لاہور کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی؟'' شانی نے ملائم لہجے میں پوچھا۔

''بس یونہی۔''

''ٹانگ میں درد تو نہیں ہو رہا؟''

''بالکل نہیں۔ آپ سو جائیں۔'' رستم نے کہا۔

مُنا شانی کے پہلو میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ شانی نے مُنے کے اوپر سے اپنا ہاتھ گزار کر رستم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تاروں بھری رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔

رستم کو رات گئے نیند آئی اور وہ صبح صبح پھر جاگ گیا۔ اسے جگانے والی شانی ہی تھی۔ وہ اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' رستم نے کہا۔

''ناصر آپ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ باہر کھڑا ہے۔'' شانی نے کہا

رستم نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور شانی سے کہا۔ ''اسے کہیں، میں آ رہا ہوں۔''

''میں اسے یہیں بلا لیتی ہوں۔'' شانی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ناصر اور شانی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شانی باہر جانے لگی تو ناصر نے کہا۔ ''آپ بھی بیٹھیں شانی بی بی جی' شانی بھی ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں گریس بھی اندر آ گئی، حالانکہ وہ بہت دیر سے جاگتی تھی۔

ناصر نے گہری سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ ''بھائی! آپ کو دس پندرہ دن کے لئے ہمارے ساتھ ایک جگہ پر جانا پڑے گا۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ نہ پوچھیں کہ کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رستم نے کہا۔

گریس ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''کیا آپ یہ سوچ سکتے کہ ہام آپ کو کسی ٹربل میں

ڈال سکتا؟''

''جب کوئی پریشانی کی بات نہیں تو پھر آپ بتا کیوں نہیں دیتے۔''

''بس ہمارا دل چاہتا کہ آپ ہام پر کونفی ڈینس شو کریں۔'' گریس مسکرائی۔

''ہاں رستم بھائی! ہم بعد میں آپ کو سب کچھ بتا دیں گے لیکن فی الحال آپ اس بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ یوں سمجھیں کہ ہم نے اس بارے میں کسی سے وعدہ کر رکھا ہے۔''

''لیکن کم از کم یہ تو بتا دو کہ مجھے کہاں جانا ہے اور اس کے لئے کس طرح کی تیاری کی ضرورت ہے؟'' رستم نے ناصر کو ٹٹولنا چاہا۔

''بس کچھ خاص نہیں۔ اپنے دو جوڑے ساتھ لے لیں اور صابن، تولیہ، دانتوں کا برش وغیرہ۔''

شانی نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ان کی...... ٹانگ کا کوئی معاملہ ہے؟''

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔'' ناصر نے کہا، گریس نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

رستم نے گہری سانس لے کر ناصر کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو بھئی! ایک بات میں تمہیں پہلے بھی کئی دفعہ صاف صاف بتا چکا ہوں۔ میں جیسا بھی ہوں، میں نے خود کو قبول کر لیا ہے۔ میرے لئے مصنوعی ٹانگ وغیرہ کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔''

''نہیں بھائی! میں آپ کا ذہن اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کوئی بھی کام آپ کی مرضی کے خلاف نہیں ہونے والا ہے۔ جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں وہ بات بالکل نہیں۔''

''تو پھر کیا ہے؟'' رستم نے کہا۔

ناصر نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد اپنا ہاتھ رستم کے ہاتھ پر رکھا۔ ''بھائی! اگر کبھی آپ مجھے اس طرح چلنے کا کہیں گے تو میں آنکھیں بند کر کے چل پڑوں گا۔ کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔''

ناصر نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی کہ رستم نے ایک دم بحث ختم کر دی۔ ''ٹھیک ہے بھئی! آگے بھی تم لوگ ہی مجھے اٹھائے اٹھائے پھرتے رہے ہو۔ اب بھی جہاں جی چاہے لے جاؤ۔''

ناصر اچانک خوش نظر آنے لگا۔ گریس کے چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی۔ کل رات گریس، شریف اور ناصر کی ملاقات کے بارے میں جان کر رستم کا ذہن بہت الجھ گیا تھا۔ رات بھر عجیب وسوسے دماغ میں سر اٹھاتے رہے تھے۔ مگر اب ناصر اور گریس کی باتیں سن کر اور ان کا رویہ دیکھ کر منفی خیالات رستم کے ذہن سے محو ہو گئے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بات

کچھ مختلف نوعیت کی ہے۔ پندرہ بیس فیصد امکان اس بات کا اب بھی موجود تھا کہ یہ معاملہ اس کی ٹانگ یا ٹانگ کے زخم سے متعلق ہو۔ تاہم اس کے علاوہ بھی کئی امکانات ہو سکتے تھے۔ روانگی کے حوالے سے ان میں آدھ گھنٹہ مزید گفتگو ہوئی۔

ناشتے کے فوراً بعد رستم نے تیاری شروع کر دی۔ شانی کو شدید دھچکا لگا تھا تاہم اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے ناصر اور گریس پر پورا اعتماد تھا۔ بلکہ اس نے رستم کو بھی یہ سمجھایا کہ اگر ناصر اور گریس کچھ بتا نہیں رہے تو اس میں کوئی بہتری ہوگی۔ رستم کا سفری بیگ تیار کرتے ہوئے وہ خود کو بہت سنبھالے ہوئے تھی، مگر جب طلوعِ آفتاب کے وقت رستم جانے کے لئے تیار ہوا تو اس کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔ شادی کے بعد کے خوب صورت ترین دنوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے تھے۔ حقیقی بات یہ تھی کہ ان دونوں کو صبح سے شام تک کا وقت کاٹنا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا، کہاں یہ کہ دو ہفتے کی جدائی پڑ رہی تھی، بلکہ ہو سکتا تھا یہ مدت کچھ مزید طویل ہو جاتی۔

وہ رستم کا کالر درست کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ''اب اتنے دن کیا کروں گی؟''

''آپ کو ایک کھلونا تو دیئے جا رہا ہوں۔'' رستم نے شانی کے کندھے سے لگے ہوئے مُنّے کا رخسار چوما۔

''گریس اور ناصر بھی آپ کے ساتھ رہیں گے؟'' شانی نے بات بدلی۔

''ابھی وہ اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتا رہے لیکن امید ہے کہ ان میں سے ایک واپس آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ گریس ہی آ جائے، کیونکہ چھوٹا ڈیوس ساتھ نہیں جا رہا ہے۔''

وقتِ رخصت ناصر، گریس اور شریف اتنی عجلت میں تھے کہ رستم، اجمل خان سے بھی ملاقات نہ کر سکا۔ وہ تا حال سو رہا تھا۔ کوئی زور آور کشش رستم کو مسلسل شانی کی طرف کھینچ رہی تھی مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

جانے کے لئے گھوڑوں کا انتظام تھا۔ یہ کُل چار گھوڑے تھے۔ چاچا ابراہیم کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا اور خچر اضافی لئے گئے تھے۔ ناصر کا کہنا تھا کہ یہ سفر زیادہ طویل نہیں ہے۔ مشکل سے چار پانچ گھنٹے لگیں گے۔ تحصیل مری کے بلند پہاڑوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں اور گھنے درختوں کے درمیان یہ سفر زیادہ طویل نہ ہونے کے باوجود مشکل تھا۔ شریف مسلسل رہنمائی کر رہا تھا۔ یہاں چشمے تھے، خودرو نباتات تھیں اور بادلوں کے مرغولے تھے جو گاہے بگاہے قرب و جوار کو ڈھانپ لیتے تھے۔ یہ خوب صورت علاقہ شہروں سے قریب ہونے کے باوجود الگ تھلگ اور اَن چُھوا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں مکانات

تھے لیکن بڑی بستی کہیں نہیں تھی۔ راستے میں انہیں بس ایک ہائیکنگ پارٹی دکھائی دی لیکن وہ اس سے بھی کنی کترا کر گزر گئے۔ جب سورج بلند مغربی چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا تو ان کی کلائی کی گھڑیاں فقط چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ایک الگ تھلگ پہاڑ کی چوٹی پر واقع وہ ایک وسیع عمارت کے سامنے پہنچے۔ پتھروں اور لکڑی سے بنی ہوئی یہ عمارت انگریزوں کے دور کی لگتی تھی لیکن یہ بے آباد نہیں تھی۔ اس کے لان نفاست سے تراشے گئے تھے...... پھول پودے خوب صورت تھے۔ رستم یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمارت کے پورچ میں تین چار ایسی جیپیں کھڑی تھیں جن کے ٹائر کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر رستم کو ایک سفید فام لڑکی نظر آئی۔ وہ بوشرٹ نیکر پہنے، گلے میں اسٹیتھ سکوپ لٹکائے برآمدے میں جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ گریس کا شوہر نامدار اسٹیفن تھا۔ وہ دونوں رستم وغیرہ کو دیکھ کر ٹھٹکے اور رک گئے۔ پھر وہ اپنا رخ بدل کر جلدی سے پورچ کی طرف آ گئے۔ ہلکی پھوار پڑنا شروع ہو گئی تھی اسی لئے وہ پورچ کی چھت کے نیچے ہی کھڑے رہے۔ دو تین مزید افراد بھی پورچ میں آ گئے۔ یہ سب استقبالیہ نظروں سے آنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ گریس مقامی لباس میں تھی اور راستے میں اس نے باقاعدہ گھونگھٹ بھی نکالے رکھا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے گھونگھٹ الٹ دیا اور بڑے اسمارٹ انداز میں گھوڑے سے اُتر آئی۔ یورپینز کے مخصوص انداز میں اس نے شوہر کے گلے سے لگ کر اسے Kiss کیا۔

رستم کو گھوڑے سے اُترنے میں ناصر نے مدد دی۔ شریف نے لاٹھی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اسٹیفن اور عریاں رانوں والی سفید فام ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر رستم کو ویلکم کہا۔ وہ چاروں اپنے میزبانوں کے ساتھ چلتے ہوئے دھیرے دھیرے عمارت کے اندر پہنچے۔ عمارت قدیم خوب صورتی کا شاہکار تھی۔ لکڑی کے بلند دروازے، لکڑی کا فرش اور پرانی طرز کے روشندان۔ عمارت کے اندر پہاڑی رہائش گاہوں کی مخصوص سیلن بھی تھی لیکن اسے ایئر فریشرز وغیرہ نے ڈھانپ لیا تھا۔ باہر کے مقابلے میں عمارت اندر سے آراستہ اور جدید دکھائی دیتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں وقتاً فوقتاً شوقین مزاج لوگ آتے رہتے ہیں۔

بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے قرب و جوار کو گہری دُھند جیسے دبیز بادلوں نے ڈھانپ لیا۔ انہیں قالین پوش ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کمروں میں لائٹس روشن ہوئیں تو پتا چلا کہ یہاں جنریٹر بھی موجود ہے۔ غور کرنے پر جنریٹر کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہاں جنگل میں منگل کا منظر تھا۔ ایک کمرے میں رستم کو ایسا ساز و سامان اور آلات نظر آئے جن سے شبہ ہوا کہ یہ کوئی چھوٹا سا آپریشن تھیٹر ہے۔ اچانک ایک عجیب اور قطعی غیر متوقع واقعہ

ہوا۔ ڈرائنگ روم کا ایک چھوٹا سا بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک لڑکی تیزی سے باہر آئی۔ اس نے اپنے عریاں بدن کے گرد بستر کی سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بال مرمریں شانوں پر منتشر تھے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس کے عقب میں ایک شرابی مرد نظر آیا۔ وہ بھی نیم عریاں تھا۔ رستم اور ناصر وغیرہ اس کی بس ایک ہی جھلک دیکھ سکے اور ششدر رہ گئے۔ جھریوں بھرے جسم والے اس بڈھے کی عمر نوے سال سے کم نظر نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح بڈھے کو دیکھ سکتے، اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔

لڑکی شرمسار انداز میں ان لوگوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے جسم پر بستر کی سفید چادر درست کی اور جلدی سے ایک ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

ناصر نے معنی خیز انداز میں رستم کی طرف دیکھا۔ جو شخص لڑکی کے عقب میں دکھائی دیا تھا، وہ خاصا عمر رسیدہ تھا۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی اس کی عمر پچاسی نوے کے درمیان تھی۔ وہ جس جوشیلے انداز میں لڑکی کے پیچھے آیا تھا، وہ حیران کن تھا۔ گریس بھی کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آئی۔ دھیان ہٹانے کے لئے وہ ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔

اسی دوران میں رستم کی نگاہ ایک اور منظر پر پڑی اور وہ پھر چونک گیا۔ ایک اور بوڑھا شخص داخلی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ خاصا موٹا تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں بھرا تھا۔ ٹھوڑی کا گوشت جھالر کی صورت لٹک رہا تھا۔ وہ بنیان اور نیکر میں ملبوس تھا۔ اس کا بازو ایک تنومند لڑکی کے بازو میں تھا۔ لڑکی چست پتلون اور ٹی شرٹ میں تھی۔ دونوں کے مختصر لباس بارش کے سبب بھیگے ہوئے تھے۔ بوڑھے نے ایک زوردار چھینک ماری۔ ایک لمحے کے لئے یوں لگا کہ چھینک کے جھٹکے کے سبب وہ گر جائے گا لیکن لڑکی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اسے سنبھال لیا۔ دونوں ہنستے ہنستے ایک دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی؟" رستم نے سوالیہ انداز میں ناصر کی طرف دیکھا اور سرگوشی کی۔

ناصر سوالیہ انداز میں گریس کی طرف دیکھنے لگا۔

اسی دوران میں اسٹیتھ سکوپ والی سفید فام لڑکی اور اسٹیفن واپس آ گئے..... ایک بڑی ٹی ٹرالی میں چائے، کافی اور دیگر لوازمات تھے۔ ڈرائنگ روم کافی وسیع تھا۔ سرخ قالین صاف ستھرا اور دیدہ زیب تھا۔ ڈرائنگ روم کے دونوں سروں پر آتش دان موجود تھے۔ سردیوں میں یقیناً یہ دونوں آتش دان بھی کم محسوس ہوتے ہوں گے، تاہم اب سردی قابلِ برداشت تھی۔ بارش کی وجہ سے ایک آتش دان میں آگ جلا دی گئی تھی۔ شیشے کی کھڑکیوں پر گرج چمک کے ساتھ بارش کے تریڑے پڑ رہے تھے۔ گرما گرم چائے وقت کی ضرورت

تھی۔

گریس کے شوہر اسٹیفن نے سفید فام لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈاکٹر مالینا ہیں...... اسسٹنٹ پروفیسر۔ اس چھوٹی سی عمر میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونا عجیب لگتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان میں کئی عجیب باتیں ہیں۔ یہ یہاں ریسرچ کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ دو ڈاکٹر صاحبان اور بھی ہیں۔ ایک تو انڈین ہیں، ڈاکٹر یوسف اور دوسرے آسٹریا کے ڈاکٹر رابرٹ۔"

رستم کو انگریزی پر عبور نہیں تھا...... نہ ہی وہ انگریزی بول سکتا تھا تاہم انگریزی میں کی جانے والی بات وہ کسی حد تک سمجھ ضرور لیتا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسٹیفن کسی ریسرچ کی بات کر رہا تھا۔ اس کا دھیان سپ گندل نامی پودے کی طرف چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس پودے کے پیچھے بہت سے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ گریس اور اس کے شوہر کی یہاں پاکستان میں آمد بھی اسی نایاب پودے کے سلسلے میں تھی۔ اسٹیفن اور گریس کا باس مسٹر فلپ نامی شخص اس ریسرچ پر بہت روپیہ خرچ کر رہا تھا اور کئی طرح کے خطرات مول لے رہا تھا لیکن ان بڈھوں کا اس ریسرچ سے کیا تعلق ہے؟ لیکن پھر ایک دم "بات" رستم کی سمجھ میں آنے لگی۔ اس کے ذہن میں نار پوریوں کے جدامجد مہر جی کا خیال آ گیا۔ وہ شیطان صفت بڈھا بھی تو نوے سال سے زیادہ عمر کا تھا۔ جب تک وہ فالج کے شدید حملے کا شکار نہیں ہو گیا تھا اس کی حرص، جوان عورتوں کے لئے کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ارد گرد خوش شکل نوکرانیاں رکھتا تھا اور اس کے کئی قصے زبان زد عام تھے۔ مہر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سپ گندل نامی پودے کو اُگانے اور اس کو پروان چڑھانے کا خاص ڈھنگ جانتا ہے۔

رستم کو اندازہ ہوا کہ یہاں موجود عمر رسیدہ افراد اور سپ گندل میں کوئی تعلق ضرور ہے لیکن اب دوسرا سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ رستم خود یہاں کیوں موجود ہے۔ اس عمارت میں موجود آپریشن تھیٹر نما کمرے کو دیکھ کر اس کا دھیان ایک بار پھر اپنی ٹانگ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اسے کٹی ہوئی ٹانگ کے سلسلے میں ہی یہاں لایا گیا ہے، لیکن یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ سوال رستم کے ذہن میں میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔

ایک پُرتکلف کھانے کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ رستم اور ناصر ایک ہی کشادہ بیڈ روم میں تھے۔ تیز رفتار شام تیزی سے دریچوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ بارش کم لیکن مسلسل تھی۔ دیودار، چیڑ اور پڑتل کے دیو قامت درخت ہوا میں جھومتے تھے اور ان کے عقب میں بجلی چمکتی تھی۔ رستم کے بولنے سے پہلے ہی ناصر بول پڑا۔ "میں جانتا ہوں

بھائی! آپ کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے ہیں اور یہ سوال اب سے نہیں بہت دیر سے ہیں..... میں آپ کو ان سوالوں کا جواب دینا چاہتا ہوں۔"

"بہت مہربانی ہے تمہاری۔ بہت جلدی جواب دینے کا خیال آ گیا ہے۔" رستم کا انداز طنزیہ تھا۔

وہ رستم کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "سب سے پہلے تو میں آپ سے اس بات پر معافی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ سے تھوڑا سا جھوٹ بولا۔ درحقیقت ہم یہاں آپ کو آپ کی ٹانگ کے سلسلے میں ہی لائے ہیں۔ یہاں پر آپ کی ٹانگ کا علاج کیا جائے گا۔ ڈاکٹر رابرٹ آسٹریا کے ایک ماہر ترین آرتھوپیڈک یعنی ہڈیوں کے سرجن ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر یوسف بھی جو امریکہ سے آئے ہیں ایک نہایت قابل سرجن شمار ہوتے ہیں۔ کل یہ لوگ آپ کی ٹانگ کا تفصیلی معائنہ کریں گے اور پھر علاج تجویز ہوگا۔"

"یار! یا تو میرا دماغ کام نہیں کر رہا یا تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" رستم نے شپٹا کر کہا۔ "علاج تو تب ہو جب میری ٹانگ خراب ہو۔ میری ٹانگ تو سرے سے ہے ہی نہیں۔"

ناصر تھوڑی دیر تک عجیب نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"آپ کی ٹانگ ہے۔"

رستم نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"آپ کی ٹانگ ہے بھائی..... یہاں اس عارضی ہسپتال میں اسے پھر سے آپ کے جسم کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔"

"مم..... میری ٹانگ؟ کہاں ہے میری ٹانگ؟" رستم کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ وہ ناصر کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شک کر رہا ہو۔

ناصر نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ "آپ کو وہ چمڑے کا تھیلا یاد ہے جس کا تذکرہ شانی بی بی نے کئی بار آپ سے کیا تھا۔ شروع شروع میں آپ نے خود بھی مجھ سے اس تھیلے کے بارے میں پوچھا تھا۔ وڈے ڈیرے کی لڑائی کے بعد وہ تھیلا! ایک اخبار نویس کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے، لیکن مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ صاف صاف بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس..... تھیلے میں..... آپ کی..... کٹی ہوئی..... ٹانگ تھی۔" ناصر نے ایک ایک لفظ

پر زور دے کر کہا۔

"کٹی ہوئی ٹانگ تھی؟ لیکن..... لیکن یہ تو کئی مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ ٹانگ اب تک پڑی ہوئی ہے؟"

"نہ صرف پڑی ہوئی ہے بلکہ اسی طرح تر و تازہ ہے..... اسے دیکھیں تو لگتا ہے کہ اسے ابھی آپ کے جسم سے علیحدہ کیا گیا ہے۔"

رستم ناقابلِ یقین نظروں سے ناصر کو دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ناصر نشہ نہیں کرتا ورنہ اسے ضرور گمان گزرتا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے لیکن آج اس بارش کی رات میں اور اس کمرے کی تنہائی میں ناصر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کیا تمہیں میرے ساتھ مذاق کرنے کے لئے کوئی اور بات نہیں سوجھ رہی۔" رستم نے اپنی ٹنڈ منڈ ٹانگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی! میں آپ سے اس قسم کے مذاق کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں جو کچھ آپ کو بتانے جا رہا ہوں، وہ میرے علم کے مطابق بالکل صحیح ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے دھیان سے سنیں گے۔"

وہ رستم کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ رستم نے دیوار سے ٹیک لگائی اور ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سناؤ۔"

ٹین کی چھتوں والی اس پہاڑی عمارت پر بارش تواتر سے گر رہی تھی۔ گاہے بگاہے زور سے بجلی چمکتی تھی اور ہوا میں جھومتے ہوئے بلند قامت درخت روشن ہو جاتے تھے..... ان درختوں کے پیچھے بہت فاصلے پر ایوبیہ اور نتھیا گلی وغیرہ کی چوٹیاں تھیں لیکن فی الوقت یہ دور کے سارے مناظر تاریکی اور بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ناصر نے بستر پر آلتی پالتی مار کر کمبل اپنے پیٹ تک کھینچ لیا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ "رستم بھائی! میری طرح آپ کے لئے بھی سپ گندل کا نام نیا نہیں ہے۔ آپ نے بھی اس عجیب پودے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہوگا۔ سپ گندل کی ایک خصوصیت تو وہ ہے جسے میں اور آپ اور ہم سب جانتے ہیں۔ یہ عمر رسیدہ افراد کے لئے غیر معمولی حد تک توانائی بخش ہے۔ اس کے اثرات کرشماتی ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اس پودے کی ایک کرشماتی خاصیت ہے اور یہ خاصیت پہلی خاصیت سے کہیں زیادہ اہم اور حیران کن ہے اور یہ دوسری خاصیت ہی ہے جس کی وجہ سے مسٹر اسٹیفن اور مسٹر فلپ جیسے لوگ زیادہ شدت سے اس جڑی بوٹی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔"

ناصر نے چند لمحے توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سپ گندل کی یہ دوسری خصوصیت بھی میڈیکل کے حوالے سے ہے۔ مختلف تجربوں کے دوران میں بالکل اتفاقیہ طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس پودے میں زخم کو مندمل کرنے اور زندہ اجسام کے ٹوٹے ہوئے ٹشوز کو آپس میں جوڑنے کی حیرت ناک خاصیت پائی جاتی ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ آج کل انسانی اور حیوانی جسم کے کٹے ہوئے اعضا کو جوڑنے کی سرجری ترقی کر گئی ہے۔ خدانخواستہ کسی شخص کی انگلی یا ہاتھ وغیرہ کٹ جاتا ہے اور یہ کٹا ہوا حصہ بروقت کسی اچھے سرجن تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے جڑنے کے امکان ہوتے ہیں لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ اس میں بہت سی پیچیدگیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہڈی کے ساتھ ہڈی کا جڑنا تو آسان ہوتا ہے لیکن گوشت اور پٹھوں کا صحیح طریقے سے جڑنا اور ان میں خون کی روانی بحال ہونا سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اسے ہم Proper Circulation Of Blood کہتے ہیں اور اسی سے سرجری کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ ہوتا ہے۔''

ناصر عام طور پر سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن کسی نازک موضوع پر بات کرتے ہوئے یا اہم امور پر سوچتے ہوئے وہ اسموکنگ کا سہارا لیتا تھا۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے بات جاری رکھی۔ ''رستم بھائی! میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ پٹھوں کا درست لنک اور خون کی نہایت باریک رگوں کا مربوط ہونا کتنا مشکل امر ہوتا ہے۔ جسم کا کٹا ہوا حصہ اگر چھوٹا ہو مثلاً انگلی کی پور وغیرہ تو اس کا جڑنا سہل ہوتا ہے۔ بڑے آپرشن میں یہ کام بے حد دشوار ہوتا ہے اور آپ کی تو ایک بٹا تین ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ ہم اس ٹانگ کو لے کر دنیا کے مہنگے سے مہنگے کلینک یا ہسپتال میں لے جائیں، کوئی اسے دوبارہ سے آپ کے جسم کا حصہ بنانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کٹنے کے چند ہی سیکنڈ بعد جسم کا حصہ طبی طور پر مُردہ ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر یہ لوگ اس کو زندہ کیسے کریں گے؟''

''یہی تو انوکھی بات ہے جی۔ میں نے سپ گندل کے حیرت انگیز اثرات ایک شخص کے پاؤں کی کٹی ہوئی تین انگلیوں پر دیکھے ہیں۔ یہ ایک کھیت مزدور ہے اور یہیں اس عمارت میں موجود ہے۔ معمولی سا لنگڑا کر چلتا ہے۔ اس کی انگلیاں جڑ سے کٹ کر علیحدہ ہو گئی تھیں۔ ہڈی کے کچھ ٹکڑے بھی غائب تھے۔ ان لوگوں نے خاص طریقے سے ان انگلیوں کی ہڈیاں مکمل کیں۔ اس طریقے کو ''بون گرافٹنگ'' کہا جاتا ہے۔ انگلیوں کو یوں جوڑا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف حرکت کرتی ہیں بلکہ ان میں ہر طرح کی حِس بھی باقی ہے۔ یعنی ان کے رگ پٹھے ہی نہیں، کٹے ہوئے اعصاب بھی بحال ہوئے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں، یہ بات حیرت

ناک ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے گہری سانس لی اور موضوع بدل کر بولا۔ ''وڈے ڈیرے کی لڑائی کے بعد آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ دو جواں سال اخبار نویسوں چشتی اور رضوان کو گھاس پر پڑی ہوئی ملی تھی۔ انہوں نے دل کڑا کر کے تازہ خون میں لتھڑی ہوئی یہ ٹانگ ایک بوری میں ڈال لی اور کیمپ میں لے آئے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ ٹانگ آپ ہی کے جسم سے جدا ہوئی ہے۔ اس وقت ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ٹانگ کو پھر سے آپ کے جسم کا حصہ بنانے کے لئے کہیں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے تئیں پولیس کی سفاکی کا بس ایک ثبوت ڈھونڈ کر لائے تھے لیکن جب گریس صاحبہ کو اس کٹی ہوئی ٹانگ کے بارے میں معلوم ہوا تو ان کے اندر کی ہوشیار عورت نے انہیں ایک دم چوکس کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا شوہر، ان کا باس اور دیگر افراد جو حیران کن ریسرچ کر رہے ہیں، وہ کس رخ پر جا رہی ہے۔ کٹے ہوئے انسانی اور حیوانی اعضا کو پھر سے جسم کا حصہ بنانے میں سپ گندل کا جو کردار سامنے آیا تھا، گریس صاحبہ اس سے بھی واقف تھیں۔ انہوں نے فوری طور پر سینئر اخبار نویس ضمیر احمد سے مشورہ کیا اور آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ کو فوری طور پر محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گریس صاحبہ کا اندازہ تھا کہ اگر ٹانگ کو ایک دو گھنٹے کے اندر ریفریجریٹر تک نہ پہنچایا جا سکا تو پھر یہ بے کار ہو جائے گی۔ اسے فوری طور پر مخصوص پٹیوں میں لپیٹ کر چمڑے کے ایک بیگ میں رکھا گیا اور اس بیگ کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایک گھنٹے کے اندر لاہور پہنچا دیا گیا۔ اس وقت ہیلی کاپٹر میں پولیس کے کئی افسر بھی سوار تھے۔ کسی کو خبر نہ ہو سکی کہ آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ ان کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ لاہور میں آپ کی ٹانگ پہلے ایک جدید پرائیویٹ کلینک۔ میں گئی پھر مسٹر اسٹیفن، مسٹر فلپ اور ڈاکٹر رابرٹ وغیرہ کی تحویل میں چلی گئی۔''

یہاں تک کہہ کے ناصر نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''اس کے بعد طبی طور پر آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ کیا کیا ہوتا رہا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کہانی کے کئی حصے آپ کے لئے غیر دلچسپ ہوں گے اور کچھ باتیں ایسی بھی ہوں گی جو آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکیں گی۔ میں آپ کو اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ کو اسپیشل ٹریٹ منٹ سے گزارا گیا ہے۔ اس کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اسے مسلسل ''ٹریٹ'' بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے لئے سپ گندل سے چند میڈیسن تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک میڈیسن وہ بھی تھی جو میں آپ کی ٹانگ کے زخم پر وقتاً فوقتاً لگاتا رہا ہوں۔''

''وہ سیاہ رنگ کا مرہم؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ ہم اسے فرسٹ آئنمنٹ کہتے ہیں۔ اس نے آپ کے زخم کو مندمل تو کیا ہے

لیکن ساتھ ساتھ کچا بھی رکھا ہے۔ یہ سب کچھ میں اور گریس ڈاکٹر رابرٹ کی ہدایت کے مطابق کرتے رہے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب آپ کی ٹانگ کو سرجری کے عمل سے گزارا جائے تو ٹانگ کے دونوں حصے ایک دوسرے کو جلدی قبول کریں۔"

رستم یہ سب کچھ بے حد حیرانی کے عالم میں سن رہا تھا۔ اس کے اندر ابھی تک بے یقینی کی کیفیت تھی۔ ناصر نے کہا۔ "آپ کبھی کبھی الجھ جاتے تھے۔ آپ کو لگتا تھا کہ میں اور گریس آپ کے زخم کو جان بوجھ کر مندمل نہیں ہونے دے رہے۔ آپ کا اندازہ درست تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کی ہدایت کے مطابق اس زخم کو ایک خاص طریقے سے کچا رکھنا ضروری تھا اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی حد تک یہ کام اچھے طریقے سے انجام دیا ہے۔"

ناصر کے خاموش ہونے کے بعد رستم بھی دو تین منٹ تک خاموش رہا۔ اس کے اندر الجھنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ اس کو گریس اور ناصر پر پورا اعتماد تھا لیکن دیگر لوگوں کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ خبر نہیں کہ وہ اس پر کس طرح کا تجربہ کرنے والے تھے۔ اس تجربے کے فائدے اور نقصان بھی رستم کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ جس ٹانگ کو یکسر فراموش کر چکا تھا وہ ناصر کے بقول ابھی تک جیتی جاگتی حالت میں موجود تھی اور اسے حیرت انگیز طریقے سے دوبارہ جوڑے جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ناصر سے پوچھا۔ "تم نے آخر وقت تک یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی ہے۔..... بتا دینے میں کیا حرج تھا؟"

"میرے نزدیک تو کوئی حرج نہیں تھا بھائی بلکہ میری تو خواہش تھی کہ آپ کو بتاؤں لیکن گریس صاحبہ نے سختی سے منع کر رکھا تھا اور میرا خیال ہے کہ گریس صاحبہ کو ان کے شوہر اسٹیفن اور ڈاکٹر رابرٹ وغیرہ نے منع کر رکھا تھا۔"

"اس کی وجہ؟"

"میری سمجھ میں تو یہی وجہ آئی ہے کہ یہ ایک بڑی انوکھی سی بات ہے۔ کئی مہینے پہلے جسم سے کٹ جانے والے پاؤں اور پنڈلی کو خصوصی طریقوں سے قابل استعمال رکھا گیا ہے اور اب انہیں پھر سے آپ کے جسم کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات پھیلتی تو کئی طرح کے الٹے سیدھے تبصرے ہوتے۔ خاص طور سے ڈاکٹر لائن کے لوگ تو اس پروگرام کو کبھی قابل عمل نہ سمجھتے۔"

"اگر میں یہ آپریشن نہ کرانا چاہوں تو؟" رستم نے پوچھا۔

"میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میری رائے میں آپ کو ہرگز انکار نہیں کرنا

چاہیے بھائی۔ آپ کو ایک سنہری موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ اور ڈاکٹر یوسف جیسے لوگ اس دور دراز علاقے میں آپ کے لئے موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپریشن کامیاب رہے گا اور اس کا نتیجہ حیران کن ہو گا۔"

"تم ڈاکٹر ہو لیکن یہ بات کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی ناصر۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشانی کیسی؟"

بارش اچانک رک گئی تھی۔ بھیگے ہوئے بلند درختوں کے عقب سے چاند جھلک دکھا رہا تھا۔ رستم بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے شانی کی یاد آنے لگی۔ اس سے جدا ہوئے چودہ پندرہ گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن لگتا تھا کہ طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ دور ہوتی تھی تو لگتا تھا کہ جسم کا کوئی حصہ خود سے جدا ہو گیا ہے۔ یہ کیسی کشش تھی..... یہ کیسا اسرار تھا یہ عشق کی کون سی قسم تھی؟ وہ سمندر کا پانی تو نہیں تھی..... وہ تو ٹھنڈے میٹھے پانی کا انمول چشمہ تھی پھر اسے پینے سے اس کی پیاس بھڑکتی کیوں تھی؟ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے اپنے بدن سے بی بی کے بدن کی خوشبو آ رہی ہے۔ وہ اس کے اندر شامل ہو گئی تھی۔ بے پناہ طلب بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے کے لئے اپنا بیگ کھولا۔ اس کا سارا سامان نہایت نفاست سے بیگ کے اندر رکھا گیا تھا۔ تہہ شدہ کپڑے بے حد قرینے سے استری کئے گئے تھے۔ اس نے رات کو پہننے والے کپڑے نکالے۔ اوپر ایک پرچی رکھی تھی۔ "شب بخیر رات کی دوا کھانا نہ بھولیں۔" یہ پرچی شانی ہی کی لکھی ہوئی تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ رات کی دوا وہ واقعی بھولا ہوا تھا۔

سفر کی تھکاوٹ کے سبب رات کو پُرسکون نیند آئی۔ صبح وہ نو دس بجے کے قریب اٹھا۔ موسم نکھرا ہوا تھا۔ بلند درختوں کے پتے چمکیلے اور روشن تھے۔ ان کے عقب میں نیلا آسمان جھلک دکھاتا تھا۔ گریس اور ناصر باہر گھاس کے ہموار قطعے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نیکر پوش ڈاکٹر مالینا بھی ان کے قریب موجود تھی اور اپنے چھوٹے سائز کے روسی کتے سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر واقعی یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔

نلکوں میں نیم گرم پانی موجود تھا۔ رستم نے منہ ہاتھ دھویا۔ تولیا نکالنے کے لئے اس نے ایک بار پھر بیگ کھولا۔ تولیے کی تہوں میں دوسری پرچی موجود تھی۔ "صبح بخیر..... ناشتا جلدی کریں۔ دوا کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔"

شانی کے قیافے درست ثابت ہو رہے تھے، وہ مسکرایا۔

دوپہر سے ذرا پہلے گریس، اسٹیفن اور ڈاکٹر رابرٹ اسے آپریشن تھیٹر نما کمرے میں

لے گئے۔ یہاں جدید قسم کے آلات موجود تھے۔ دو کمپیوٹر بھی پڑے تھے تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ ان چیزوں کو عارضی طور پر یہاں لایا گیا ہے اور رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ نیم گنجے سر اور نیلی آنکھوں والا ایک نہایت کم گو شخص تھا تاہم اسٹیفن خوب بولتا تھا۔ وہ گریس کے انداز میں گلابی اردو میں بھی بات کر لیتا تھا۔ قریباً دو گھنٹے تک رستم کی ٹانگ کے زخم کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ ٹانگ کے اندرونی معائنے کے لئے اسکریننگ مشین بھی استعمال کی گئی۔ ڈاکٹر رابرٹ نے رستم سے مختلف سوالات پوچھے۔ اس گفتگو میں گریس نے مترجم کے فرائض انجام دیئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر یوسف بھی آ گیا۔ ڈاکٹر یوسف کا تعلق انڈیا سے بتایا جا رہا تھا۔ وہ قدرے اونچی ناک والا اور دبلے پتلے جسم والا شخص تھا۔ درحقیقت ایک کمزور سے سراپے میں ایک طاقتور معالج چھپا ہوا تھا۔ وہ باریک آواز میں بات کرتا تھا۔

معائنے کے بعد ڈاکٹر رابرٹ اور یوسف نے رستم کو یقین دلایا کہ نہ صرف یہ کہ سرجری کے ذریعے اس کی ٹانگ جوڑ دی جائے گی بلکہ وہ بڑی اچھی طرح کام بھی کرے گی۔ بہت امکان ہے کہ پانچ چھ ماہ کے اندر وہ نارمل لوگوں کی طرح چلنے پھرنے لگے گا۔

رستم نے دل کڑا کر کے کہا کہ وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کا باقی حصہ دیکھنا چاہتا ہے۔

جواب میں ڈاکٹر یوسف بولا۔ ''ابھی نہیں رستم صاحب...... ہاں آپریشن سے قبل آپ کو دکھا دیں گے۔''

''ہام تم کو بے ہوشی کا میڈیسن نائیں دیں گے۔ وہ ٹانگ دکھا کر بے ہوش کریں گے۔'' اسٹیفن نے ہنستے ہوئے کہا۔

یوسف اور گریس بھی ہنسنے لگے پھر گریس سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''رستم بہت بہادر شخص کا نام ہے۔''

''نو ڈاؤٹ...... اس میں کوئی شک نائیں۔'' اسٹیفن نے تائید کی۔

''اس آپریشن کا پروگرام کب تک ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''بس دو چار دن کے اندر۔ ابھی ہم آپ کو کچھ ورزشیں بتاتے ہیں اور ایک دو میڈیسن دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر یوسف نے کہا۔

سہ پہر کو دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر قرب و جوار کو گہرے بادلوں نے ڈھانپ لیا اور بارش ہونے لگی۔ بادل کمروں کے اندر گھس آئے اور ہوا شائیں شائیں کرتی چیڑ اور دیودار کے بلند درختوں میں فراٹے بھرنے لگی۔ ڈرائنگ روم کے ایک سرے پر آتش دان کے پاس پرانی طرز کا ایک بڑا پیانو پڑا تھا۔ ایک عمر رسیدہ شخص اسے بجانے میں مصروف تھا۔ اس کے

سفید بال بکھرے بکھرے تھے اور چہرہ بھی جھریوں بھرا تھا۔ تاہم وہ ایک طربیہ دھن بجا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی کارکردگی پر خوش ہو کر خود ہی مسکرانے لگتا تھا۔

اس بوڑھے کا ایک ساتھی سامنے ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ اس کمرے میں ورزش کی دو تین چھوٹی مشینیں پڑی تھیں۔ یہ دوسرا بوڑھا جاگنگ مشین پر تیز تیز چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے لڑکھڑا جاتا تھا۔ ایک لڑکی جسے جواں سال عورت بھی کہا جا سکتا تھا، اسے سہارا دیتی تھی اور کھلکھلا کر ہنسنے بھی لگتی تھی۔ یہ دونوں وہی تھے جن سے اس عمارت میں آتے ساتھ ہی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ لڑکی بستر کی چادر میں لپٹی تیزی سے باہر نکلی تھی اور بوڑھا اس کے پیچھے آیا تھا۔

آج صبح تک یہ دونوں کچھ شرمندہ شرمندہ رہے تھے لیکن اب آزادی سے رستم اور ناصر وغیرہ کے سامنے گھوم پھر رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں کم و بیش پچپن سال کا فرق رہا ہوگا۔ لڑکی ہیجان خیز لباس میں تھی اور جاگنگ کرتے ہوئے بوڑھے کو برابر جوش دلا رہی تھی۔ ''تھوڑا سا تیز ڈیئر...... تھوڑا سا تیز...... تھوڑا سا اور۔'' ساتھ ساتھ وہ ہنس رہی تھی اور جاگنگ مشین کے اسپیڈ میٹر پر بوڑھے کی رفتار بڑھ رہی تھی۔

دو چار منٹ بعد بوڑھا بُری طرح ہانپ گیا اور لڑکی کے سہارے جاگنگ مشین پر سے اُتر آیا۔ اس کے ہانپنے کانپنے پر لڑکی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ وہ اسے کرسی تک لائی اور چہکی۔ ''آپ سے کچھ نہیں ہوتا۔ رفتار کل سے دو پوائنٹ کم ہے۔''

''تمہاری رفتار پوری کرتے کرتے میں اگلے جہان پہنچ جاؤں گا۔'' بوڑھا لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''جاگنگ سے کسی کو کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ اٹھلائی۔

''بوڑھے بندے کو کسی بھی شے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''بوڑھا وہ ہوتا ہے جو خود کو بوڑھا سمجھتا ہے۔'' لڑکی نے تولیے سے بوڑھے کے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے بوڑھے کو شوگر فری جوس کا ایک ٹن کھول کر دیا۔ بوڑھا جوس کی چسکیاں لیتا ہوا آیا اور رستم اور ناصر کے قریب بیٹھ گیا۔ پیانو بجاتے بوڑھے کی طرف دیکھ کر اس نے ہانک لگائی۔ ''او نذیرے! وہی کل والا بجا یار...... دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیا رے......''

نذیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی بات پر بوڑھا خود ہی دانت نکال کر ہنسنے لگا اور

دانت بھی زیادہ نہیں تھے۔ صرف اوپر والے دو ہی دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' ناصر نے بوڑھے سے سوال کیا۔

''یہ پوچھو، میں کہاں سے نہیں آیا۔'' بوڑھے نے ترت جواب دیا۔

''کیا مطلب ہے سر؟''

''مطلب یہ کہ میرا کوئی شہر نہیں ہے اور پاکستان کے سارے شہر میرے ہیں۔''

''زبردست..... آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت گھومے پھرے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

''پھرا تو میں خود ہوں لیکن گھمایا لوگوں نے ہے۔ ایک دم گھمایا ہے۔ مت مار ڈالی ہے۔''

''کوئی کاروبار کرتے رہے ہیں آپ؟''

وہ ہنسا اور اس کے پوپلے منہ میں سرخ سرخ زبان اپنی جھلک دکھانے لگی۔ اب وہ اپنی ہانپی ہوئی سانسوں پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ سر کو اثبات میں جنبش دے کر بولا۔ ''ہاں، پاکستان کے قریباً سارے شہروں میں میرا کاروبار رہا ہے۔ بہت دور دور تک گیا ہوں۔''

''سر! کیا کرتے تھے آپ؟'' ناصر نے پوچھا۔

''سر۔'' اس نے ناصر کا لفظ دہرایا۔ یوں لگا کہ اس خطاب نے اسے کافی مزہ دیا ہے۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں نے پاکستان کے تقریباً سارے شہروں میں بھیک مانگی ہے۔ لاہور، ملتان، کراچی اور کوئٹہ..... اب کتنے نام بتاؤں تمہیں۔''

رستم اور ناصر کو بوڑھے کے بیان پر بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ بے شک وہ قیمتی ٹریک سوٹ میں تھا اور جاگر وغیرہ پہن رکھے تھے پھر بھی اس کے لب و لہجے اور طور اطوار میں کوئی ایسی بات تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قلاش قسم کا شخص ہے اور اتفاقاً اپر کلاس میں آ گیا ہے۔ بہر حال یہ بھی اس کی خوبی تھی کہ اس نے حقیقت چھپائی نہیں تھی۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''یہ سچ سن کر تھوڑی سی حیرانی تو تم لوگوں کو ضرور ہوئی ہوگی..... ہاں بات ہے بھی حیرانی کی۔ یہ بڑے صاحب کا بڑا پن ہے کہ ان کی وجہ سے میرے جیسے بھکاری کو بھی اب لوگ سر کہہ دیتے ہیں۔''

''یہ بڑے صاحب کون ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اچھی بات ہے۔ جن کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہو، ان کا ہی پتا نہیں ہے۔ اسٹیپن صیب۔''

وہ اسٹیفن کو اسٹیپن کہہ رہا تھا اور ایسا کہتے ہوئے اس کے منہ سے تھوک کے بہت سے چھینٹے اُڑ گئے تھے۔ رستم نے الٹے ہاتھ سے اپنا رخسار صاف کیا۔

''اچھا..... اچھا۔ آپ اسٹیفن صاحب کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تو واقعی بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''اچھے بھی..... زندہ دل بھی..... اور ہنستے کھیلنے والے بھی۔ اپنے پیسے پر سانپ بن کر نہیں بیٹھتے۔ دوسروں پر خرچ کرتے ہیں اور اپنا بھی جو دل چاہتا ہے کرتے ہیں۔ دیکھو ہم تین بڈھوں کو کہاں کہاں سے اٹھا کر لائے ہیں۔ اچھا کھلا رہے ہیں، اچھا پہنا رہے ہیں۔ اس عمر میں ہم کو پھر سے جوانی کی بہار دکھا دی ہے۔ آج سے دو چار مہینے پہلے میں فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کے سامنے بھیک مانگتا تھا۔ وہیں پر ٹھرا پی کر ایک قصائی کے پھٹے کے نیچے سو جاتا تھا۔ اسٹیپن صاحب نے مجھے وہاں سے اٹھایا۔ مجھ پر مہربانیاں کیں اور آج میں یہاں پر ہوں۔ لگتا ہے میں پھر سے پیدا ہوا ہوں۔ پھر سے صحت اور جوانی ملی ہے مجھے۔ پہلے مرنے کو دل چاہتا تھا، اب زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ میری عمر چوراسی سال سے اوپر ہے لیکن لگتا ہے پھر سے چالیس کا ہو گیا ہوں۔ سچ کہتے ہیں کہ بندے کو پریشانی نہ ہو، بیماری نہ ہو، اس کو اچھی خوراک ملے تو وہ کبھی بڈھا نہیں ہوتا..... بس ایک لعنت رہ گئی ہے منہ میں۔ یہ بھی چھوٹ جائے تو میں آرام سے دس پندرہ سال اور نکال سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب جی؟'' ناصر نے پوچھا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں شریر مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھ کر اپنے سبز ٹراؤزر کی جیب میں سے وہسکی کا ٹن کوارٹر نکالا۔ ''ٹھرے سے اچھی ہے پر ہے تو پھر بھی شراب۔ اب چھوڑ دوں گا اسے۔'' بوڑھے نے کہا پھر ذرا توقف کر کے اس نے دائیں آنکھ دبائی اور بولا۔ ''گُڈی بھی یہی کہتی ہے۔''

''گُڈی..... آپ کا مطلب ہے لڑکی؟''

''کاکا جی! اتنے بھولے بادشاہ نہ بنو۔ مجھے پتا ہے کل یہاں آتے ساتھ ہی تم نے مجھے اور گُڈی کو دیکھ لیا تھا۔ میں اسی گُڈی کی بات کر رہا ہوں۔ نام تو اس کا کچھ اور ہے مشکل سا..... فضیلہ کہ فتیلہ..... پر میں اس کو گُڈی ہی کہتا ہوں۔ جب میں فیصل آباد میں تھا تو قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس گُڈی نے مجھے قبر کے اندر سے کھینچ لیا ہے اور اس کے پیچھے اصل مہربانی اسٹیپن صیب کی ہی ہے۔ بڑا اچھی بندہ ہے۔''

بوڑھے نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ ''یہ نذیر محمد جو سامنے بیٹھا باجا بجا رہا ہے، یہ بھی

میری ہی طرح گلیوں میں اپنی مٹی خراب کر رہا تھا۔ یہ مشہور قوال دیناں بخش کے پیچھے تالی بجاتا تھا پھر آہستہ آہستہ ترقی کر کے باجا بجانے لگا۔ اس نے چالیس سال تک دیناں بخش کے ساتھ باجا بجایا پھر دیناں بخش مر گیا اور ساتھ ہی اس کو بھی مار گیا۔ اس پر فاقے گزرنے لگے۔ اس کی گھر والی نے ساری زندگی اس کا خوب ساتھ نبھایا تھا۔ آخری عمر میں دونوں ایک دوجے کے سانس کے ساتھ سانس لیتے تھے۔ پر جب نذیرا بے روزگار ہوا تو جوان اولاد نے ان کو در بدر کر دیا۔ بیوی بیمار ہو کر مر گئی تو نذیرے نے بھی کراچی چھوڑ دیا اور لاہور آ گیا۔ یہ پچھلے دو تین سال سے لاہور میں تھا۔ سارا دن گلیوں میں پھرتا رہتا تھا۔ رات کو داتا دربار سے لنگر کھاتا تھا اور کہیں پڑ کر سو رہتا تھا۔ اب دیکھو موجیں کر رہا ہے یہاں۔ پہچانا ہی نہیں جاتا ہے۔ رنگ لال ہو گیا ہے۔ کمر آہستہ آہستہ سیدھی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی تو پتلون بھی پہن لیتا ہے اور جنٹل مین لگنے لگتا ہے۔''

بات کرتے کرتے بوڑھے نے ایک بار پھر نذیرے سے فرمائش کی۔ ''یار! ذرا سنا ناں کل والا گانا......دو ہنسوں کا جوڑا......''

نذیرے نے مسکرا کر انکار میں سر ہلایا اور طربیہ گانے کی دُھن بجاتا رہا۔ اس کا رنگ واقعی سرخ نظر آ رہا تھا۔

اسی دوران میں نیکر پوش ڈاکٹر مالینا اونچی ایڑی پر کھٹ کھٹ چلتی ان کے سامنے سے گزری۔ ناصر سے باتیں کرتے کرتے بوڑھے کی نظر بے ساختہ اس کی بل کھاتی کمر پر اٹک گئی۔ جب تک مالینا دروازے کے پیچھے اوجھل نہیں ہو گئی، بوڑھا نوجوانوں کی طرح اسے تکتا رہا۔ جیسے کسی لذیذ شے کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے، بوڑھے کے ہونٹوں پر بھی لعابِ دہن کی چمک تھی۔ ناصر اور رستم کو وہ بڑا دلچسپ شخص محسوس ہو رہا تھا۔

رستم نے بوڑھے کو ''بزرگو!'' کہہ کر مخاطب کرنا چاہا لیکن پھر جھجک گیا۔ اس نے کہا۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا ہمیں؟''

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر مسکراہٹ ابھری۔ ''نام تو ویسا ہی ہے جیسے آج سے اسّی نوے سال پہلے ہوتے تھے......محمد بوٹا......لیکن کُڑی مجھے پیار سے بوٹے کے بجائے بوبے کہتی ہے۔ مجھے بھی یہی نام چنگا لگنے لگا ہے۔''

''آپ کی شادی ہوئی تھی؟'' رستم نے پوچھا۔

''بڑی پرانی بات ہے۔ لگتا ہے کہ چار پانچ سو سال سے کنوارہ ہی ہوں۔''

''کیا مطلب جی؟''

''میری بیوی بھی میری ہی طرح منگتوں کی برادری سے تھی...... پر اچھی شکل صورت کی تھی۔ شادی کے چھ سات سال بعد ہی وہ بیمار ہو گئی اور ایسی بیمار ہوئی کہ بس بیمار ہی ہو گئی۔ پورے چودہ سال تک میں نے اس کی بیماری بھگتی۔ گلیوں میں منگ منگ کر اس کا علاج کرایا، پر اس کی حیاتی پوری ہو چکی تھی۔ ایک دن وہ اپنے تین بچوں کو چھوڑ کر مر گئی۔ ایک لڑکی تھی اور دو لڑکے۔ تینوں خیر سے جوان تھے۔ ان دنوں برادری کی ایک بڑی اچھی عورت کا رشتہ میرے لئے آیا۔ میری طرح اس کا اڈا بھی کلفٹن کے علاقے میں تھا۔ ہم دونوں ٹھیکیدار کے پیسے نکال کر کئی دفعہ تین تین سو کی دیہاڑی لگا لیتے تھے۔ زکوٰۃ، رمضان اور عید، شب رات پر اس سے بھی زیادہ پیسے ہو جاتے تھے۔ میں ابھی خود کو بالکل تندرست سمجھتا تھا۔ میں نے اس عورت سے شادی کرنا چاہی، لیکن ساری کی ساری برادری ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ مجھ پر سو طرح کی لعنت ڈالی گئی۔ ہر ایک نے کہا کہ گھر میں جوان اولاد ہے اور مجھ کو شادی رچانے کی پڑی ہوئی ہے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ میری اولاد تو جوان ہوئی ہے پر میں نے چودہ سال اس زنانی کی خدمت کرتے گزارے ہیں جو بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ او چھوڑو یار!'' بوڑھے نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''ان باتوں میں کیا پڑا ہے۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ اسٹیپن صیب سچ کہتے ہیں۔ پرانی باتوں پر جلنا کڑھنا بے کار ہوتا ہے۔ اپنا دھیان آگے کی طرف رکھنا چاہیے۔ جو خوشی مل جائے اسے آگے بڑھ کر جھپّی ڈال لینی چاہیے۔''

ڈاکٹر مالینا ایک بار پھر لٹک مٹک چلتی ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں داخل ہوئی۔ بوڑھے کی نگاہیں ایک بار پھر بے ساختہ اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ لگتا تھا کہ ''عورت'' کے لئے اس کے اندر کافی خلا موجود ہے۔ اس نے تقریباً ساری زندگی تنہائی میں گزاری تھی۔ اب اس کے اردگرد نہ صرف عورتیں تھیں بلکہ اس کے اندر ایک نئی ترنگ بھی موجود تھی۔ زندگی کے آخری حصے میں ہی سہی لیکن اس کے روز و شب نے ایک حیران کن پلٹا کھایا تھا اور وہ اس پلٹے پر بہت خوش تھا۔ یہ بھی اس کے ''اسٹیپن صیب'' کی مہربانی تھی کہ وہ چوراسی برس کی عمر میں خود کو نوجوان محسوس کر رہا تھا۔

اسی دوران میں کہیں اندر سے بوٹا کی ساتھی لڑکی نے اسے آواز دی۔

''ڈارلنگ...... بوبے ڈارلنگ۔''

وہ اپنے پوپلے منہ کے ساتھ مسکرایا۔ ''یہ دیکھو! میری مدھو بالا مجھے بلا رہی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ اٹھا اور اپنی نیم خمیدہ کمر کے ساتھ سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا اندر چلا گیا۔ ناصر نے رستم

کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں اور زیرِ لب مسکرا دیا۔

''دو بابے تو یہ ہو گئے۔ تیسرا کہاں ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''وہ بھی یہیں کہیں ہو گا...... میں نے دیکھا ہے اسے۔ کل وہی تو آیا تھا بارش میں بھیگتا ہوا۔ کافی موٹا ہے۔ زیادہ گھومتا پھرتا نہیں ہے۔ وہیں کمرے میں پڑا میوزک سنتا رہتا ہے یا اپنی مدھوبالا سے مساج کراتا رہتا ہے۔ یہ مدھوبالا سفید چمڑی والی ہے یعنی انگریز ہے۔''

''اچھا...... اس کی بھی مدھوبالا ہے۔''

''بالکل۔ تینوں کے تینوں اولڈ مین اس وقت موج میں ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں جی کہ جب اللہ دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کے دیتا ہے اور اس کے دینے کا کوئی وقت بھی نہیں ہے۔ یہ تینوں بابے اس عیش و آرام اور پروٹوکول کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے جو اب انہیں حاصل ہے۔''

''وہ اسے اسٹیفن صاحب کی مہربانی سمجھ رہے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ مہربانی بے مطلب نہیں ہے۔ اسٹیفن صاحب اور ان کے باس کو اپنے تجربے کے لئے بندے درکار تھے۔ یہ تینوں اس وقت سپ گندل پر ہونے والے تجربوں کا حصہ ہیں۔''

''آپ کی بات صحیح ہے لیکن کچھ بھی ہے ''تجربے'' مزے دار ہیں۔'' ناصر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''اب دیکھو، مجھے اپنے ''تجربے'' میں مزہ آتا ہے یا نہیں؟'' رستم نے اپنی ٹانگ کے ٹنڈ پر ہاتھ پھیرا۔

''نہیں...... نہیں۔ اس بارے میں آپ بے فکر رہیں۔ یہ تجربہ نہیں، علاج ہے اور میں اس کے بارے میں بہت پُرامید ہوں۔ میں نے بڑی باریک بینی سے سپ گندل کے اثرات کو دیکھا ہے اور حیران کن حد تک مفید پایا ہے۔''

وہ کچھ دیر وہیں بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران میں گریس اور اسٹیفن بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہیں آ گئے۔ گریس نے پتلون اور بند گلے کی جرسی پہن لی تھی۔ اسٹیفن کافی لمبا چوڑا تھا، وہ اس کے مقابلے میں قدرے دبلی تھی۔ نہ جانے کیوں ان دونوں کو دیکھ کر رستم کو احساس ہوتا تھا کہ میاں بیوی کی حیثیت سے دونوں کے تعلق میں زیادہ گرم جوشی نہیں ہے۔ اسٹیفن اپنے کام میں گم ہو جانے والا شخص تھا۔ ایسے لوگ اپنی لگن میں عموماً اپنے بیوی بچوں سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ آج کل بھی وہ ہمہ وقت ڈاکٹر رابرٹ اور ڈاکٹر یوسف کے ساتھ مصروف تھا۔ میاں بیوی تین مہینوں کے بعد ملے تھے پھر بھی زیادہ وقت ایک

دوسرے کے ساتھ نہیں گزار رہے تھے۔

گریس اور اسٹیفن کافی دیر تک رستم سے باتیں کرتے رہے۔ وہ دونوں اس آپریشن کے بارے میں بہت پُرامید تھے۔ انہیں یقین تھا کہ چند ماہ کے اندر اندر رستم عام لوگوں کی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ گریس نے رستم سے کہا۔ ''اگر تمہارا پرمشن ہو تو ہام کل یہاں سے جانا مانگتا۔ اُدھر بستی میں ڈیوس اکیلا اور شونی کو بھی ہمارا ضرورت ہے۔ ہام دو چار دن میں پھر یہاں آئیں گے۔ ہام کا کوشش ہو گا کہ شونی بھی ہمارے ساتھ ہو۔ اس ٹائم تک تم کا آپریشن ہو چکا ہو گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' رستم نے کہا۔

آج پھر ابر آلود رات تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بارش کی بوچھاڑیں تیز ہو جاتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے خانوں والی شیشے کی کھڑکیوں میں سے بجلی کے تڑپنے کا منظر دیکھنا خوب صورت تجربہ تھا۔ عمارت میں بھنے ہوئے گوشت، چائے اور تازہ سیبوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے آتش دان میں جلتی ہوئی آگ بڑی پیاری لگتی تھی۔ ناصر کمرے میں پہنچ کر جلد سو گیا لیکن رستم جاگتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی اس کے لئے پریشان ہو گی۔ وہ چاہتا تھا کہ گریس جلد از جلد واپس پہنچ جائے اور بی بی کو اس کی طرف سے تسلی تشفی دے۔

کسی قریبی کمرے سے بابے بوٹے کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی زندگی اسے گدگدا رہی ہے یا شاید اس کی مدھوبالا گدگدا رہی تھی۔ اسی دوران میں سنہری بالوں والی ایک سفید فام لڑکی لہرا کر چلتی ہوئی کمرے کی کھڑکی کے سامنے سے گزری۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ رستم کو پتا چلا تھا کہ یہ انگریز لڑکی اس تیسرے بابے کی مدھوبالا ہے جو زیادہ وقت میوزک سنتے ہوئے گزارتا تھا۔ ٹرے میں گرما گرم قہوہ تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ولایتی لڑکی اپنے دیسی بابے کو رات دیر تک جگانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

بابے بوٹے اور اس کی ساتھی لڑکی کی دبی دبی ہنسی اور باتوں کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہی۔ وہ لڑکی غالباً بابے بوٹے کے جسم کی مالش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ان کے کمرے کی روشنی گل ہو گئی۔ یہ دونوں مقامی لڑکیاں بڑی بے باک تھیں اور یقیناً کسی بڑے شہر سے لائی گئی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ کال گرل ہوں اور انہیں چار پانچ ہفتوں یا اس سے زیادہ وقت کے لئے معقول معاوضہ دیا گیا ہو۔ تیسری لڑکی انگریز تھی اور وہ اسٹیفن یا فلپ صاحب کی کوئی آزاد خیال ساتھی ہو سکتی تھی۔ باہر کی دنیا میں عزت آبرو کا تصور تقریباً ختم ہوتا جا رہا تھا۔

نوجوان نئے نئے تجربات کو زندگی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ایسے واقعات عام سننے میں آتے ہیں کہ کسی آزاد منش لڑکی نے فقط ایک وقت کے کھانے کے لئے بہ خوشی اپنا آپ کسی غیر مرد کو سونپ دیا۔ یہ فلسفہ بھی مقبول ہورہا ہے کہ جس طرح قدرت نے مرد کو طاقت دی ہے اور وہ اس طاقت کے ذریعے روزی کما سکتا ہے، اسی طرح قدرت نے عورت کو خوب صورتی اور نزاکت دی ہے اور وہ بھی ان چیزوں کے ذریعے اپنا رزق پیدا کرسکتی ہے۔ ایسے مادر پدر آزاد معاشرے میں ایک عورت اپنی عمر سے تگنی عمر کے مرد کے ساتھ رہنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتی اور وہ بھی شادی کے بغیر۔

رات دس گیارہ بجے کے لگ بھگ رستم کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو وال کلاک ایک بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ بارش بند تھی مگر نہایت تیز ہوا بھیگے ہوئے جنگل میں سے فرائے بھرتی گزر رہی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ ناصر سو رہا تھا۔ رستم کو اپنے اردگرد کسی ہلچل کا احساس ہوا۔ یہ ہلچل اس کمرے کی طرف تھی جہاں آج دوپہر رستم کی ٹانگ کا تفصیلی معائنہ ہوا تھا۔ یہ کمرہ آپریشن تھیٹر سے مشابہ تھا۔ کمرے کی جھلک کھڑکی میں سے نظر نہیں آتی تھی تاہم رستم کو اندازہ ہوا کہ وہاں ٹیوب لائٹس کی روشنی ہے اور اندر سے دبی دبی آوازیں بھی آرہی ہیں۔ کچھ دیر بعد رستم کو وہی نیکر والی ڈاکٹر مالینا نظر آئی۔ وہ بہت تیز تیز چلتی آپریشن تھیٹر نما کمرے کی طرف چلی گئی۔ یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ رستم کو شک ہوا کہ کہیں کسی بوڑھے کی طبیعت خراب نہ ہوگئی ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ باہر سے کوئی بیمار یا زخمی شخص یہاں لایا گیا ہو اور اب اسے ٹریٹ منٹ دی جارہی ہو۔

رستم وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے تین چار منٹ تک سن گن لیتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناصر کو جگائے تاکہ وہ صورتِ حال کا پتا چلا سکے لیکن اسی دوران میں اسے کھڑکی کے ادھ کھلے پردے میں سے ڈاکٹر مالینا دوبارہ نظر آئی۔ اب اس کے انداز میں تیزی نہیں تھی وہ گلے میں اسٹیتھ سکوپ لٹکائے نارمل لہجے میں اسٹیفن سے باتیں کرتی واپس اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ اسٹیفن کے ہاتھ میں کافی کا کپ بھی تھا۔ کچھ دیر بعد تھیٹر نما کمرے کی روشنیاں بھی بجھ گئیں اور قرب و جوار میں سکون نظر آنے لگا۔ لگتا تھا کہ جو مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ حل ہوگیا ہے۔

رستم اٹھ کر باتھ روم تک گیا پھر واپس آکر بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ اس کی ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد ہورہا تھا۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ ٹانگ کو دبانے لگا۔ ہولے ہولے گھٹنے کو دباتا ہوا وہ آخری سرے تک گیا جہاں پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک ٹنڈ تھا۔ اپنی ٹانگ کے اس حصے پر جب

بھی اس کی نگاہ پڑتی تھی اس کے پردہ تصور پر ایک کرخت چہرہ لہرا جاتا تھا۔ اپنی پوری نحوست اور سفاکی کے ساتھ۔ وہ اس چہرے کو بھلانا چاہتا بھی تو نہیں بھلا سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ اس عمارت سے باہر چنگھاڑتی ہوئی ہوا اب مدھم ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ اچانک رستم چونکا۔ آپریشن تھیٹر نما کمرے کی روشنیاں ایک بار پھر آن ہوئی تھیں۔ رستم نے تین افراد کے سائے دیکھے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی اسٹریچر نما شے تھی۔ بے حد خاموشی سے اور لکڑی کے فرش پر بلی کی چال چلتے ہوئے وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ رستم نے ان کے پیچھے اسٹیفن کو جاتے دیکھا۔ وہ بھی بڑے محتاط انداز میں جارہا تھا۔ جاتے جاتے اس نے کوریڈور اور کامن روم کی روشنیاں گل کردیں۔

ان مناظر نے رستم کے اندر ایک عجیب تجسس جگا دیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لاٹھی سنبھالی اور اس کے سہارے بے آواز چلتا کامن روم میں آگیا۔ اس ابر آلود رات میں اس عمارت کے اندر کچھ ہورہا تھا۔ کچھ ایسا، جس کو پراسرار کہا جاسکتا تھا ... رستم لاٹھی ٹیکتا ہوا کوریڈور میں داخل ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہیں سے بڑی خاموشی کے ساتھ اسٹریچر لے جایا گیا تھا۔ کوریڈور میں اگر قالین نہ ہوتا تو رستم کو اپنی لاٹھی کی آواز چھپانا مشکل ہوجاتی۔ وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا کوریڈور کے آخری سرے تک گیا۔ یہ عمارت کی عقبی سمت تھی۔ یہاں قریباً 500 گز میں ایک گراسی میدان تھا۔ اس کے چاروں طرف پودے اور درخت تھے۔ دن کے وقت یہ میدان خوب صورت دکھائی دیتا تھا لیکن رات کے اس پہر یہ بالکل تاریک تھا اور جھومتے درخت بھوتوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

کوریڈور کے آخری سرے پر جالی دار دروازہ تھا۔ رستم نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ عین اس وقت بجلی زور سے چمکی۔ ایک لمحے کے سب کچھ روشن ہوگیا۔ چیڑ، لوکاٹ اور چیری کے درخت، بارش میں بھیگی ہوئی سرسبز گھاس، بیڈمنٹن کا نیٹ اور نیٹ کے نیچے سے بھاگ کر گزرتی ہوئی ایک بلی۔

لیکن جس شے نے رستم کو شدت سے چونکایا، وہ مٹی اور پتھروں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ یوں لگا جیسے یہاں کوئی گڑھا کھودا گیا ہے۔ کل شام تک مٹی کا یہ ڈھیر یہاں موجود نہیں تھا۔ اس پہاڑی علاقے میں زمین کھودنا آسان نہیں تھا، لیکن یہاں زمین کھودی گئی تھی اور بہت مختصر وقت میں کھودی گئی تھی۔ سرگوشیوں جیسی مدھم آوازیں بھی رستم کے کانوں تک پہنچیں۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو ابھی اسٹریچر لے کر باہر نکلے تھے۔ رستم کے ذہن میں آیا کہ

اگر وہ زینے طے کرکے بالائی منزل پر چلا جائے تو بہ آسانی بالکونی میں سے نیچے جھانک سکتا ہے۔

وہ بڑی احتیاط سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ اس نے لکڑی کی تاریک بالکونی میں سے نیچے دیکھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اسے اسٹریچر فرش پر پڑا دکھائی دیا۔ اسٹیفن سمیت چار افراد اس کے گرد جمع تھے۔ اسٹریچر پر ایک لاش تھی ...... یہ محمد بوٹا کی لاش تھی۔ رستم کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ محمد بوٹا ہی تھا، جسے اس کی مدھو بالا پیار سے بوبے کہتی تھی اور جو چند گھنٹے پہلے ناصر اور رستم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا۔ اس کی ہر بات سے زندگی کا رس ٹپکتا تھا اور اس کے پوپلے منہ کی چھینٹے اُڑاتی ہوئی ہنسی دل آویز تھی۔ اب وہ مر چکا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں دونوں حیرانی کے عالم میں کھلے تھے۔ جیسے وہ سوچ رہا ہو... اتنی جلدی شروع ہو کر اتنی جلدی ختم؟

اسٹیفن اسٹریچر کے قریب بیٹھ کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ ''بالکل احمق ہو تم، ایک دم ناکارہ۔''

''کک... کیا ہوا سر؟'' اسٹیفن کا دیسی اسسٹنٹ انگریزی میں بولا۔

''تمہاری ماں کے گھر بچہ ہوا ہے۔'' اسٹیفن پھنکارا اور غصیلی نظروں سے اسسٹنٹ کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے بوڑھے محمد بوٹے کے بازو سے بی پی آپریٹس کھولا اور ایک طرف پھینک دیا۔

بلڈ پریشر چیک کرنے والا یہ آلہ ابھی تک بوٹے کے بازو سے اٹیچ رہا تھا۔ اس سے ان لوگوں کی بدحواسی ظاہر ہوتی تھی۔ وہ اس آلے کو بھی بوٹے کی لاش کے ساتھ ہی دفنانے جا رہے تھے۔

''اس کا بیگ کدھر ہے؟'' اسٹیفن ایک بار پھر پھنکارا۔ (اس کے سر پر ایک شخص نے چھتری تان رکھی تھی)

سب نے بیگ تلاش کرنے کے لئے دائیں بائیں دیکھا۔ ''اسی لئے کہتا ہوں ناں کہ تم لوگوں کے سروں میں دماغ کی جگہ گوبر بھرا ہوا ہے۔'' پھر وہ چیخ کر اپنے اسسٹنٹ سے بولا۔

''ج... اس کا تھیلا لے کر آؤ... جاؤ۔'' رستم کی سمجھ میں بس ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی آرہے تھے۔

اسسٹنٹ تیزی سے اندر گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بوٹے کا ایک خوب صورت سفری بیگ لے کر برآمد ہوا۔ یقیناً اس میں بوڑھے بوٹے کے استعمال کی اشیاء اور کپڑے وغیرہ تھے۔

اسٹیفن نے بے پروائی سے بھاری بھرکم بیگ لاش کے سینے پر ہی رکھ دیا۔ بارش میں بھیگے ہوئے افراد نے اسٹریچر اٹھایا اور درختوں کے درمیان موجود اس گڑھے کی طرف چلے گئے جس کی سرخی مائل سنگلاخ مٹی رستم نے بجلی کی چمک میں دیکھی تھی۔ اب یہ بات رستم کے لئے ہرگز راز نہیں رہی تھی کہ بوڑھا بوٹا کسی وجہ سے دم توڑ گیا ہے اور اب اس لاوارث کو اس کے مختصر سامان سمیت عمارت کے پچھواڑے درختوں میں دفن کیا جا رہا ہے۔ نہ اس کے لئے کسی نے آنسو بہائے تھے، نہ غسل دیا گیا تھا، نہ کفن پہنایا گیا تھا... بس خاموشی سے اس کا مدعا غائب کیا جا رہا تھا۔

اب رستم کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ رات کے درمیانی سہ پہر تھیٹر نما کمرے کی طرف جو ہلچل اور افراتفری نظر آئی تھی، وہ بوٹے کے سلسلے میں ہی تھی۔ غالباً بدقسمت بوڑھے پر ہارٹ اٹیک یا فالج وغیرہ کا حملہ ہوا تھا۔ اسے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس ناکام کوشش کے بعد اب اسے زمین بُرد کیا جا رہا تھا۔ شاید وہ ان لوگوں کے لئے انسان تھا ہی نہیں۔ وہ تجربہ گاہ میں استعمال ہونے والا ''مواد'' تھا۔ اب استعمال شدہ مواد کو کیمیائی فضلے کی طرح زمین میں چھپایا جا رہا تھا۔

ایکا ایکی رستم کو باقی ماندہ دونوں بوڑھوں کا خیال آیا۔ پتا نہیں کہ وہ کس حالت میں تھے؟ کیا ان کے ساتھ بھی کچھ ہو چکا تھا...... یا ہونے والا تھا؟ پھر رستم کو اس سرخی مائل مٹی کا یاد آیا جو گڑھے سے نکالی گئی تھی۔ مٹی کے حجم سے اندازہ ہوتا تھا کہ گڑھا زیادہ بڑا نہیں ہے۔ یہ غالباً ایک ہی شخص کے لئے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باقی دونوں معمر افراد ابھی اس ''حتمی انجام'' تک نہیں پہنچے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد رستم بڑی احتیاط سے نیچے آگیا۔ ناصر سکون سے سو رہا تھا۔ شریف ساتھ والے کمرے میں سو رہا تھا۔ گریس کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

رستم نے ناصر کو نہ جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں مل کر وال کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ رات کے ساڑھے تین کا وقت تھا۔ ہلکی بارش مسلسل ہو رہی تھی۔

''خیریت ہے بھائی؟'' ناصر نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے...... ایک بُری خبر ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' ناصر کا ہاتھ اپنے تکیے کی طرف بڑھا جہاں چھوٹا پسٹل رکھا ہوا تھا۔

''بابا بوٹا مر گیا ہے۔ یہ لوگ چوروں کی طرح اس کی لاش پچھواڑے کے درختوں میں دبا رہے ہیں۔''

یہ خبر ناصر کے لئے بھی زبردست حیرت کا باعث بنی۔

رستم نے کمرے کی اندرونی روشنی بجھا دی تھی۔ اب انہیں کھڑکی سے باہر کے مناظر صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اندھیرے میں ہی بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہیں گرانڈیل اسٹیفن نظر آیا۔ اس کے بال اور کپڑے بارش کے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اس کے بعد عمارت میں سناٹا چھا گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ بابے بوٹے کو دل کا دورہ پڑا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''یہی لگتا ہے۔'' ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس کی طاقت سے باہر تھا۔ شام کو آپ نے دیکھا ہی تھا، وہ لڑکی اسے جاگنگ مشین پر کس طرح بھگا رہی تھی۔''

رستم نے ایک گہری سانس لی۔ ''ناصر! مجھے تو یہ سارا معاملہ ہی سخت گڑبڑ لگ رہا ہے۔ کہیں میری ٹانگ جوڑنے کا لالچ دے کر مجھ پر بھی تو کوئی خطرناک تجربہ نہیں کیا جا رہا؟''

ناصر خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ اس نے دراز سے سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ ایک دو کش لے کر بولا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، گریس کو اس واقعے کے بارے میں بتانا چاہیے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ گریس کو تو اسی صورت بتانا چاہیے جب ہمیں یقین ہو کہ وہ اپنے شوہر کی ساتھی نہیں ہے۔''

ناصر نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں بھائی! وہ اور طرح کی عورت ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس سارے معاملے سے الگ ہے۔ وہ..... وہ واقعی چاہتی ہے کہ آپ کا علاج ہو۔ اسے شانی بی بی سے سچی ہمدردی ہے۔ اس ہمدردی اور محبت کا سلسلہ اس واقعے سے ملتا ہے جس میں بی بی نے گریس کے بچے کی جان بچائی تھی۔ باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' ناصر نے آخری الفاظ تھوڑے سے توقف کے بعد کہے۔

وہ دونوں اس سنسنی خیز صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے پھر اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سوچ میں گم ہو گئے۔

صبح جو کچھ ہوا ان کی توقع کے عین مطابق تھا۔ ناشتے کے موقع پر ناصر نے اسٹیفن سے پوچھا۔

''آج بزرگوار بوٹا صاحب نظر نہیں آ رہے؟''

اسٹیفن نے چھری سے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''بابا بوٹا چلا

گیا۔ آپ لوگوں کے سونے کے بعد کچھ لوگ اسے لینے آ گئے تھے۔''

''لینے آ گئے تھے؟'' گریس حیرانی سے بولی۔

''ہاں، یہ معاملہ آٹھ دس دن سے چل رہا تھا۔ بابے کا ایک بھانجا قطر سے آیا ہے۔ وہ کھاتا پیتا شخص ہے۔ بوٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بوٹا انکار کر رہا تھا .. آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہے کہ وہ یہاں کتنا خوش تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ چند دن بعد بھانجے اور بہن کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو وہ پھر دربدر ہو جائے گا۔ کل رات اس کا بھانجا اور ایک دوسرا رشتے دار اچانک پھر آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ بوٹے کی بہن آخری سانس لے رہی ہے اور ہر صورت اس کو دیکھنا چاہتی ہے۔ بوٹا ان کے ساتھ چلا گیا۔''

''مستقل طور پر؟'' گریس نے پوچھا۔

''ابھی تو ایسے ہی لگتا ہے کہ مستقل طور پر گیا ہے۔ سامان وغیرہ بھی لے گیا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں کی کشش اسے پھر کھینچ لائے۔''

اسٹیفن بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے تاثرات کسی اداکار کی طرح تھے۔ اسی دوران میں بابا نذیر بھی جمائیاں لیتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ شاید وہ بوٹے کا خالی کمرہ دیکھ کر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوال سجے ہوئے تھے۔ اسٹیفن ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ نذیر کو ایک طرف لے گیا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ صورتِ حال جو جھوٹ کا پلندہ تھی۔

رستم اب تک بڑے غور سے گریس کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ رستم کی نگاہ معمولی نہیں تھی۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ اس کا واسطہ شاطر ترین لوگوں سے پڑتا رہا تھا...... اسے محسوس ہوا کہ گریس کے حوالے سے شاید ناصر درست ہی کہہ رہا ہے۔ وہ رات کے سارے واقعے سے لاعلم ہی نظر آتی تھی۔

اسٹیفن کے جانے کے بعد ناصر اور رستم پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر کے ذہن میں اچانک کوئی نیا خیال آیا۔ اس کی ذہین آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''بھائی! آپ اپنے کمرے میں جانا چاہیں تو چلے جائیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''ابھی آ کر آپ کو بتاتا ہوں۔''

''دیکھنا، احتیاط سے۔ ہم ایک خطرناک جگہ پر ہیں۔''

ناصر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ رستم جانتا تھا کہ اس کی جینز کی جیکٹ میں پسٹل موجود ہے۔

رستم اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف گیا تو کوریڈور کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اس کمرے پر پڑی جہاں کل شام تک بابا بوٹا موجود تھا۔ آج اندر صرف بابے کی مدھو بالا تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہی تھی۔ اورنج جوس کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نگاہیں ٹی وی سکرین پر تھیں۔ وہ مزے سے جوس کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ کسی کی آلہ کار بنی ہوئی تھی اور اس نے ایک لاوارث بھکاری کے کشکول میں اپنی جان لیوا قربت کے چند سکے ڈال کر اسے چلتا کیا تھا۔

یقینی بات تھی کہ یہ جسم فروش لڑکی کل رات والے واقعے سے پوری طرح آگاہ ہوگی۔ قریب المرگ بوٹے کو اس کے پہلو سے کھینچ کر ہی طبی امداد کے لئے تھیٹر نما کمرے میں پہنچایا گیا ہوگا۔ رستم اس پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈالتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ناصر کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جس کام کے لئے گیا تھا، وہ ہو نہیں سکا۔ وہ اپنے ساتھ بس ایک پنسل ٹارچ ہی لایا تھا۔

''اس ٹارچ کا کیا کرنا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''کچھ ڈھونڈنا ہے جی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ ڈاکٹر رابرٹ اور مالینا وغیرہ ہیں کیا شے؟''

''اس ٹارچ کے ساتھ ان کے دانت گنو گے؟''

''نہیں بھائی! میں کچھ کاغذات ڈھونڈ رہا ہوں۔''

اس بلند پہاڑی علاقے میں بارش کثرت سے ہو رہی تھی۔ روزانہ شام سے پہلے ہی بادلوں کے مرغولے قرب و جوار کو ڈھانپ لیتے تھے اور نٹ کھٹ بچوں کی طرح کمروں میں گھس آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ٹین کی چھتوں پر بوندوں کے گرنے کی آواز آنے لگتی تھی پھر کبھی کبھی یہ صدا ایک دم اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ کان پڑی صدا سنائی نہیں دیتی تھی۔ آج شام بھی ایسا ہی ہوا۔

آج صبح گریس کو شریف کے ساتھ روکیٹ واپس چلے جانا تھا لیکن صبح سے ہی موسم کے تیور خراب تھے۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ بارش شروع ہو جائے گی۔ بارش تو شام سے پہلے شروع نہیں ہوئی تھی لیکن گریس اور شریف واپس بستی نہیں جا سکے تھے۔ گریس اپنے بچے کے لئے پریشان نظر آتی تھی۔ بے شک شانی اسے بڑی اچھی طرح سنبھال لیتی تھی لیکن وہ ماں

نعم البدل تو نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد کسی اندرونی کمرے سے کسی کے ڈکرانے کی زوردار آواز آئی۔ اس کے بعد کوئی کراہنے والے انداز میں بولا۔ رستم نے اسے پہچان لیا۔ یہ معمر نذیر کی آواز تھی۔ کل شام تک وہ بھی دیگر دو معمر افراد کی طرح بہت خوش تھا اور پیانو بجا رہا تھا لیکن آج شاید وہ کسی بوسیدہ ساز کی طرح خود بجنے لگا تھا۔ وہ ایک بار پھر ڈکرایا، اس کی آواز عمارت میں گونجتی محسوس ہوئی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اسے قے ہو رہی ہے پھر رستم اور شریف نے نیم پوش ڈاکٹر مالینا کو دیکھا۔ وہ گلے میں اسٹیتھ سکوپ لٹکائے کل رات کی طرح تیزی سے اندرونی کمروں کی طرف گئی۔ آج سردی کچھ زیادہ تھی۔ اس نے نیکر کے بجائے پتلون پہن رکھی تھی تاہم اس نے عریانی کی ''شرح'' برقرار رکھی تھی۔ آج اس کا گریبان وسیع و عریض تھا۔ اس وسعت کو جانچنے کی کوشش میں نگاہوں کو شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ وہ اپنے سڈول جسم کو ہلکورے دیتی اور بالوں کو پیشانی سے جھٹکتی تیزی سے راہداری میں غائب ہو گئی۔

''یا اللہ خیر۔'' رستم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ایسے لوگ جب بھی تیز تیز چلتے ہیں کوئی بدخبر ہی آتی ہے۔''

''میں جا کر دیکھوں؟'' شریف نے پوچھا۔

رستم نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ شریف عام سے انداز میں چلتا ہوا اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔

اس کی واپسی چار پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ (شریف کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ محمد بوٹا پر کیا بیتی ہے) وہ اپنے گلے میں مفلر درست کرتے ہوئے بولا۔ ''جب بوڑھے بیل سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو شام تک اس کے منہ سے رال نکلنے لگتی ہے اور وہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ ہم اپنی دیہاتی زبان میں کہتے ہیں کہ بیل کی ''مبری ٹائٹ'' ہو گئی ہے۔ مجھ کو لگتا ہے کہ یہاں بھی جو بڈھے بیل خرمستیاں کر رہے تھے ان کی مبری ٹائٹ ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا ہے انہیں؟''

''دونوں ہی بیمار ہیں جی۔ الٹی کر رہے ہیں۔ بُری حالت ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں حالت نہ سنبھلی تو سلاماں لیکم کہہ دیں گے۔ وہ تیسرے بابا جی چنگے رہے ہیں، بے ٹائم سے پہلے ہی بھانجے کے ساتھ چلے گئے ہیں۔''

رستم ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

رستم اور ناصر کو خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ یہ دونوں معمر افراد بھی کہیں بوٹے کے پیچھے پیچھے نہ ''روانہ'' ہو جائیں، لیکن دو تین گھنٹے میں ان کی حالت سنبھل گئی۔ دونوں ڈاکٹر ان دو تین گھنٹوں میں مسلسل مصروف رہے تھے۔

دن بھر کی پریشان کن سوچوں نے رستم کو تھکا دیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ ذرا ستانے کے لئے لیٹا تو اسے نیند آ گئی۔ کسی وقت اس کی آنکھ کھلی اور غنودگی کی کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ ناصر اس پر کمبل دے رہا ہے اور باہر گرج چمک کے ساتھ بارش جاری ہے۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وال کلاک رات بارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ دور کہیں دیودار اور چیڑ کے گھنے جنگلوں میں بندر چلا رہے تھے اور آوارہ کتوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ رستم نے دیکھا، ناصر اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ اس نے روئی کا لحاف اس طرح اپنے بستر پر پھیلا دیا تھا کہ بستر خالی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ رستم نے اس کی چپل کی غیر موجودگی سے جانا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔

وہ کیا کرتا پھر رہا ہے؟ رستم نے سوچا اور اسے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ٹانگ کی معذوری کا احساس شدت سے ہوا۔ اس کے دل سے آواز آئی کہ اسے ناصر اور شریف کے ساتھ فوراً اس چار دیواری سے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اسے بڑی شدت سے شانی کا خیال آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی ہوگی۔ اسے بڑی پریشانی کے عالم میں یہاں سے کسی کی واپسی کا انتظار ہوگا تاکہ اس سے یہاں کی صورت حال پتا چل سکے۔

چار پانچ منٹ بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ ناصر واپس آ رہا ہے لیکن ناصر اکیلا نہیں تھا۔ رستم کو اس کے ساتھ گریس بھی نظر آئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ بال منتشر تھے۔ وہ اور ناصر تیزی کے ساتھ کمرے کے اندر آ گئے۔ ناصر نے کھڑکی کے پردے اچھی طرح برابر کر دیئے۔ ٹارچ ناصر کی جیب میں تھی اور اس کے ہاتھ میں زرد رنگ کی ایک فائل نظر آ رہی تھی۔ ناصر کے چہرے پر گھمبیر تاثرات تھے۔ رستم نے فائل پر لکھے الفاظ پڑھے۔ جلی حروف میں ''مسٹر رستم'' لکھا تھا۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ اسی کی ڈاکٹری فائل ہے۔

دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ناصر نے کانپتے ہاتھوں سے فائل کھولی۔ اندر رستم کی رپورٹس وغیرہ تھیں۔ اس کی ٹانگ کے چھوٹے ایکسرے اور اسکریننگ کے رزلٹس بھی نظر آ رہے تھے۔ کئی جگہ سرخ اور سبز پوائنٹرز سے نشان لگائے گئے تھے۔ ناصر اور گریس کے

درمیان انگلش میں مکالمہ شروع ہو گیا۔ ناصر پریشانی کے عالم میں فائل کے ورق گریس کے سامنے پلٹ رہا تھا اور اسے ہراساں انداز میں کچھ دکھا رہا تھا۔ وہ نیلے رنگ کے ورق پر لکھی ہوئی ایک تحریر پر بار بار اپنی انگلی رکھتا تھا اور گریس سے پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے۔

دھیرے دھیرے گریس کے چہرے پر بھی گہری پریشانی نظر آنے لگی تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ ناصر کے سامنے وضاحتیں بھی کر رہی تھی۔

رستم نے کہا۔ ''یارو! خود ہی لڑتے رہو گے یا کچھ مجھے بھی بتاؤ گے۔''

ناصر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سوالیہ نظروں سے گریس کو دیکھا۔ گریس بھی واضح طور پر الجھی ہوئی تھی۔ ناصر نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! میں اس موقع پر آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں آپ کی یہ میڈیکل فائل ڈاکٹر رابرٹ کی الماری سے نکال کر لایا ہوں۔ اس میں آپ کی ٹانگ کے علاج کے بارے میں پوری تفصیل موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر رابرٹ اور یوسف اس کیس پر بے حد محنت کر رہے ہیں۔ ان دونوں کی قابلیت میں بھی کسی طرح کا شبہ نہیں ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جو میں آپ کو ہر صورت بتانا چاہتا ہوں۔''

''میں ہر بات سننے کے لئے تیار ہوں۔'' رستم نے کہا۔

ناصر نے ایک بار پھر گریس پر ایک سوالیہ نظر ڈالی اور بات جاری رکھتے ہوئے اپنی انگلی نیلے کاغذ کے کچھ اندراجات پر رکھی۔ ''یہ دیکھیں رستم بھائی! یہ ایک طرح سے آپ کے آپریشن کی فزیبلٹی رپورٹ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بڑی احتیاط سے آپ کے آپریشن کی کامیابی یا ناکامی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ دونوں ماہر ڈاکٹروں نے آپریشن کی کامیابی کا امکان چالیس فیصد رکھا ہے۔''

''یعنی ساٹھ فیصد امکان ناکامی کا ہے۔'' رستم مسکرایا۔

''جی ہاں بھائی! یہ لوگ صرف چالیس فیصد امکان پر یہ آپریشن کر رہے ہیں اور جو اگلی بات میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ زیادہ سنگین ہے۔ وہ بات سننے کے بعد مسکرانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔''

''اب بتا بھی دو یار۔''

''آپریشن کی ناکامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی ٹانگ جڑ نہیں سکے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم میں فوری طور پر زہر سرایت کر جائے گا۔ اس کے بعد علاج کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ اب آپ ساٹھ فیصد کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے زندگی کا امکان چالیس فیصد، مرنے کا ساٹھ فیصد؟'' رستم نے کہا۔

ناصر گھمبیر خاموشی سے رستم کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی خاموشی کا مطلب ''ہاں'' تھا۔

ناصر اور گریس ایک بار پھر انگریزی میں بات کرنے لگے۔ فائل ان کے سامنے تھی اور وہ پیچیدہ قسم کی پیشہ وارانہ گفتگو کر رہے تھے۔ گریس کی خوب صورت پیشانی پر سلوٹیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کی انگریزی میں سے بس کوئی کوئی فقرہ ہی رستم کی سمجھ میں آتا تھا۔

رستم نے ناصر سے اردو میں کہا۔ ''گریس کو کل رات والی بات تو نہیں بتائی؟'' یہ بات اس نے ایسے انداز میں کہی کہ گریس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔

ناصر نے رستم کی بات کا جواب نفی میں دیا۔ گریس فائل میں مگن تھی۔

رستم بولا۔ ''بہتر ہے کہ وہ بھی بتا دو۔ اس کو شوہر صاحب کے دوسرے کرتوتوں کا بھی پتا چلے۔''

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ناصر اور رستم بُری طرح چونک گئے۔ دوسری دستک پر ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جواب میں اسٹیفن کی آواز ابھری۔ ''ڈاکٹر ناصر! دروازہ کھولو۔''

اب دروازہ کھولنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اسٹیفن سلیپنگ گاؤن میں تھا۔ گاؤن کی ریشمی ڈوریاں اطراف میں لٹک رہی تھیں۔ وہ گریس کو دیکھ کر بولا۔ ''تم یہاں ہو، میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

پھر اس کی نگاہ گریس کے ہاتھ میں زرد فائل پر پڑی۔ اس کا اپنا رنگ بھی فائل کی طرح زرد نظر آنے لگا۔ ''یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میں بھی یہی پوچھ رہی ہوں کہ یہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا ہے اسٹیفن۔ تم نے تو کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔''

''کک...... کس بات کا؟''

''یہی جو ڈاکٹر رابرٹ نے اپنے تجزیے میں لکھی ہے۔ میں ڈاکٹر کی ہینڈ رائٹنگ پہچان سکتی ہوں۔'' گریس کی انگلی نیلے کاغذ کے وسط میں تھی۔ ''یہ کیا لکھا ہے؟ آپریشن کے کامیاب ہونے کا امکان چالیس فیصد۔''

اسٹیفن نے فائل گریس کے ہاتھ سے لے لی اور یوں جائزہ لینے لگا جیسے وہ اس تحریر کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کو اداکاری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔

گریس نے اپنا فقرہ پھر دہرایا۔ ''تم نے پہلے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر رابرٹ نے تمہارے سامنے کہا تھا کہ ناکامی کا امکان چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہے اور پھر یہ زہر پھیلنے کی بات...... یہ سب کیا ہے اسٹیفن؟''

اسٹیفن نے جلدی جلدی فائل کی ورق گردانی کی اور گریس سے بولا۔ ''ہم اتنی جلدی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے اس فائل کو تفصیل سے دیکھنا ہوگا...... چلو کمرے میں چلتے ہیں۔''

گریس کی آنکھوں میں ایک دم نمی آ گئی۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''اسٹیفی! مجھے یہ سارا معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔ میں اپنی دوست کے شوہر کے لئے ایسا کوئی رسک نہیں لینے دوں گی۔ یہ بہت بڑا رسک ہے اور میں نے...... جواب دینا ہے اپنی دوست کو۔''

''اچھا یہ ساری باتیں بیچ چوراہے پر کرنا کیا ضروری ہیں؟'' اسٹیفن ایک دم بھڑک کر بولا۔ ''یہاں کھڑی بک بک کرتی رہو گی تو میرا دماغ بند ہو جائے گا۔''

''میں بک بک نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی یہ کوئی پیچیدہ سوال ہے۔'' گریس کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ ''ڈاکٹر رابرٹ نے اپنے ان ذاتی کاغذوں میں جو لکھا ہے وہ بالکل صاف ہے۔ مریض کے بچنے کا امکان صرف چالیس فیصد ہے۔ ڈاکٹر یوسف نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ دیکھو نیچے تصدیق کی ہے یا نہیں؟'' گریس نے اپنی لرزاں انگلی نیلے کاغذ کے زیریں حصے پر رکھی۔

اسٹیفن نے ایک پُرطیش جھٹکے سے فائل بند کر دی اور پھنکارا۔ ''میں یہاں تمہاری کوئی بکواس نہیں سنوں گا۔ اپنے کمرے میں چلو۔'' اس نے گریس کا بازو پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔

گریس کا چہرہ بھی سرخ انگارہ ہو گیا تھا۔ وہ تپ کر بولی۔ ''دیکھو تم غلط بیانی کر رہے ہو اسٹیفی! تم نے...... تم نے یہ ساری فائل اچھی طرح دیکھی ہوئی ہے۔ پرسوں رات بھی تم نے چار گھنٹے تک اس فائل میں سر کھپائے رکھا تھا۔ تم اس کا ایک ایک لفظ جانتے ہو۔ اب تم اسے مزید تفصیل سے کیا پڑھو گے؟''

''تم کہنا چاہتی ہو کہ میں دھوکے باز ہوں۔ تیرے اور تیرے ان دوستوں کے ساتھ ناٹک رچا رہا ہوں۔''

''تو پھر میں اور کیا کہوں؟ تم...... جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم جھوٹ کہتی ہو تو پھر جھوٹ ہی سہی لیکن اب ہمیں ہر صورت اس

جھوٹ کو انجام تک پہنچانا ہے۔'' اسٹیفن کا لہجہ خطرناک ہوگیا۔ اس نے گریس کا بازو پکڑ لیا اور اسے دروازے کی طرف کھینچا۔

''اسٹیفن۔'' گریس احتجاجی انداز میں چلائی۔

ناصر کے لئے اب تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسٹیفن کو روکنے کی کوشش کی۔ اسٹیفن پوری طرح بھڑکا ہوا تھا۔ اس نے فائل پورے زور سے ناصر کے منہ پر ماری۔ فائل کا طمانچہ کھا کر ناصر کی آنکھوں میں برق لہرا گئی۔ وہ صرف ڈاکٹر نہیں تھا وڈے ڈیرے کا مفرور ڈاکٹر تھا۔ اس کے سر کی قیمت مقرر تھی۔ اس نے قوی ہیکل اسٹیفن کو زوردار دھکا دیا۔ وہ گریس سمیت لڑکھڑاتا ہوا دیوار تک چلا گیا۔ ناصر پلٹ کر اپنے بستر کی طرف آیا۔ یہاں تکیے کے نیچے اس نے پنسل ٹارچ اور پسٹل رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے پسٹل تک پہنچتا اسٹیفن نے فائل پھینک کر اپنے گاؤن کے اندر سے پسٹل نکال لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت اب بھی گریس کے بازو پر تھی۔ پسٹل نکالتے ہی اس نے ناصر کی ٹانگوں کے قریب فائر کیا۔ دھماکے سے نہ صرف کمرے کا مختصر خلا بلکہ پوری عمارت گونج اٹھی۔

''خبردار۔'' اسٹیفن چنگھاڑا۔ ''گولی ماردوں گا۔''

ناصر کو رکنا پڑا۔ اسٹیفن نے اب بیوی کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور پسٹل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کمرے کے دروازے کے پاس چلا گیا۔ وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ وہ ایک بار پھر دھاڑ کر ناصر سے مخاطب ہوا۔ ''لگتا ہے کہ تم لوگوں کو عزت راس نہیں ہے۔ ہاتھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ۔''

ناصر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ''اور تم بھی لنگڑے۔'' اسٹیفن نے اپنے جدید سیاہ پسٹل کو جنبش دی۔

رستم نے بھی دیوار کا سہارا لے کر اپنے جسم کو دو تین بار اچھالا اور پیچھے چلا گیا۔ دھماکے کی آواز نے عمارت میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ کمپاؤنڈ میں بندھا ہوا السیشن کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ عمارت کے بیشتر مکین بھی جاگ گئے تھے۔ دروازے کھل رہے تھے اور لائٹس آن ہورہی تھیں۔ اسٹیفن نے چلانے والے انداز میں اپنے کسی جیکب نامی ساتھی کو پکارا۔

جیکب بوتل کے جن کی طرح آن حاضر ہوا۔ اس کسرتی جسم والے سفید فام کو رستم نے کل رات اس وقت بھی دیکھا تھا جب فیصل آباد کے لاوارث بھکاری کو پچھواڑے کے درختوں میں دبایا جارہا تھا۔ جیکب درحقیقت یہاں موجود گارڈز کا ہیڈ تھا۔ اس کے ہاتھ میں

ری پیٹر تھا اور چہرے پر خشونت۔ جیکب کے پیچھے پیچھے ہی دو مزید افراد بھی اندر داخل ہوگئے۔ اسٹیفن نے ان میں سے ایک مقامی کو مخاطب کرکے کہا۔ ''جوزف! تم ان کے تیسرے ساتھی کو دیکھو۔ وہی لمبے منہ والا۔''

یہ اشارہ یقیناً شریف کی طرف تھا۔ جوزف نامی شخص پھرتی سے باہر نکل گیا۔ یہاں موجود چاروں پانچوں گارڈز چالاک و چست تھے۔ ان میں سے تین مقامی اور دو انگریز تھے۔ یہ سب کے سب پتلون قمیص اور جیکٹ وغیرہ پہنتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر رابرٹ اور یوسف بھی آنکھیں ملتے ہوئے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر یوسف شاید نشے میں تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور غور کرنے پر اس کی ٹھوڑی پر لپ اسٹک کے سرخ نشان بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ اسی دوران میں بوکھلایا ہوا شریف بھی گن پوائنٹ پر کمرے میں آن موجود ہوا۔

اسٹیفن نے اب تک جو گفتگو بھی کی تھی وہ انگریزی میں تھی۔ رستم کو تمام الفاظ تو سمجھ میں نہیں آرہے تھے تاہم بات کا مفہوم وہ جان رہا تھا۔ رابرٹ اور یوسف کمرے کی دھماکا خیز صورتِ حال دیکھ کر حیران تھے۔ اسٹیفن نے انہیں مختصر الفاظ میں پچویشن بتائی۔ دونوں ڈاکٹروں کے چہروں پر بھی تناؤ پیدا ہوگیا۔ ڈاکٹر یوسف، رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''واقعی تم لوگوں کو عزت راس نہیں ہے۔ بے وقوفی کی حد ہے۔ تمہارے علاج کے لئے جان مار رہے ہیں۔ دن رات ایک کررہے ہیں۔ لاکھوں کا نقصان کرکے اس ویرانے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ایسے چغد ہو کہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماررہے ہو۔ اس کٹی ٹانگ پر کروڑوں بھی خرچ کرڈالو گے تو دونوں پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکو گے لیکن ہم کررہے ہیں۔''

''لیکن کس قیمت پر؟'' ناصر بولا۔

''رسک کس کام میں نہیں ہوتا۔ تمہارے جیسے جب اپنے دماغ کا علاج کراتے ہیں تو اس میں بھی ستر اسی فیصد تک رسک ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔'' یوسف نے کہا۔

''میں دماغ کی سرجری کی نہیں ٹانگ کی بات کررہا ہوں۔ تم ہمارے عزیز پر ایک خطرناک تجربہ کررہے ہو۔ ایسا تجربہ جس میں تمہارے اندازے کے مطابق بھی موت کا امکان ساٹھ فیصد ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ ہو۔''

''یہ بھی تو سوچو کہ یہ آپریشن کوئی عام نتھو خیرا ڈاکٹر نہیں کررہا ہے۔ تم جیسے لوگ ساری زندگی بھی کماتے رہیں تو رابرٹ صاحب جیسے سرجن کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔''

ناصر کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن رستم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ ڈاکٹر یوسف کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ہم آپ

سے بات بڑھانا نہیں چاہتے۔ آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ ہر کام میں رسک ہوتا ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ میری ٹانگ کا علاج ہو۔ آپ مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت ...''

''رستم۔'' گریس نے تیزی سے رستم کی بات کاٹی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''رستم! تم کچھ نائیں جانتا۔ پر تم کو بہت بڑا رسک۔ یہ تم کو مار ڈالیں گے۔ یہ تمہارا لائف کی قیمت پر اپنا بینیفٹ سوچتا۔ یہ تم کو.....''

''شٹ اَپ.....شٹ اَپ۔'' اسٹیفن دہاڑا۔ اس نے گریس کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ ''تیرا دماغ بھی خراب کر دیا ہے ان حرامیوں نے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

دو منٹ بعد وہ ہانپتا ہوا واپس آیا۔ اس دوران میں جیکب اور اس کے ایک ساتھی نے ناصر، رستم اور شریف پر اسلحہ تانے رکھا تھا۔ اسٹیفن نے ڈاکٹر رابرٹ اور یوسف کو کمرے سے باہر بلایا۔ ان کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کی۔ وہ دونوں واپس چلے گئے۔ اسٹیفن نے کمرے میں آ کر جارحانہ لہجے میں جیکب کو حکم دیا۔ ''اچھی طرح تلاشی لو کمرے کی۔ کوئی ایسی ویسی شے یہاں نہیں ہونی چاہیے۔''

جیکب نے پھرتی سے سارا کمرہ دیکھ ڈالا۔ ناصر کے تکیے کے نیچے سے بھرا ہوا پستول ملا۔ الماری میں سے دو میگزین نکلے۔ اس کے علاوہ پھل کاٹنے والی چھری بھی جیکب نے اپنے قبضے میں کر لی۔ رستم، ناصر اور شریف دم بخود کھڑے تھے۔ کمرے کے بعد ان تینوں کے لباس بھی احتیاطاً ٹٹولے گئے۔

''دروازے کو لاک کرو۔ ایک بندہ باہر کھڑکی کے پاس موجود رہے۔'' اسٹیفن نے جیکب کو حکم دیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

پچھلے دو تین منٹ میں اس نے ایک بار بھی ناصر یا رستم سے نظر نہیں ملائی تھی۔ وہ بہت طیش میں نظر آتا تھا اور اس کے طیش کا رخ زیادہ تر گریس ہی کی طرف تھا۔ غالباً ابھی تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ زرد فائل گریس ہی یہاں لے کر آئی تھی۔

اسٹیفن کے جانے کے بعد جیکب نے کمرے کو باہر سے مقفل کیا اور مسلح جارج کو آہنی گرل والی کھڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جارج کے ہاتھ میں ری پیٹر تھا اور کارتوسوں والا تھیلا اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔

''لو جی.....اس کا مطلب ہے کہ ہم یہاں قید ہو گئے ہیں۔'' شریف نے اپنے سر کے

بالکل چھوٹے چھوٹے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' رستم نے کہا۔ ''تیرے بیٹے چاچا ابراہیم کی بھینسوں اور بکریوں کو اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ تُو سمجھ لے کہ کچھ دن کے لئے یہاں آرام کرنے آیا ہے۔''

ناصر بے حد سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''بھائی! مجھے شدید خطرے کی بو آ رہی ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح آپریشن سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

رستم مسکرایا۔ ''عجیب تماشا ہے۔ آج تک تو نیم حکیم قسم کے لوگ مریضوں کو آپریشن سے پہلے ہسپتالوں سے بھگاتے رہے ہیں.....آج خیر سے ایک ڈاکٹر یہ کام کر رہا ہے۔''

''یہ ہسپتال نہیں ہے رستم بھائی! یہ لوگ یہاں سپ گندل پر تجربے کر رہے ہیں۔ آپ نے بابے بوٹے کا انجام دیکھا ہے۔ ان گوری چمڑی والوں کے لئے ہم لوگ انسان تھوڑی ہیں.....مینڈکوں، چوہوں اور خرگوشوں کی طرح ہم بھی بس جاندار ہیں۔ نسلِ انسانی کی بہتری کے لئے ہمیں کسی بھی بدترین تجربے سے گزارنا ان کے نزدیک بالکل جائز ہے۔ ہر نئی دوا کا تجربہ ہمارے اوپر ہوتا ہے۔ ہر ہلاکت خیز ہتھیار کے تجربے کے لئے ہماری سرزمینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ہمارے مریضوں کو علاج کے بہانے یورپ اور امریکہ لے جا کر ان پر خطرناک سرجری کی ٹریننگ کی جاتی ہے۔''

رستم نے گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ ''یار ناصر! میں تیری طرح پڑھا لکھا تو نہیں ہوں پر اتنا جانتا ہوں کہ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جلاد کے ہاتھوں زندگی بخش سکتا ہے اور مہربان ڈاکٹر کے ہاتھوں سے موت دے سکتا ہے۔ یہاں تو زندگی کا چالیس فیصد چانس موجود ہے۔ وہاں وڈے ڈیرے کی لڑائی میں کتنے فیصد چانس تھا۔ شاید ایک فیصد بھی نہیں۔ مجھے یاد ہے جب میں اوپر سے پلٹنیاں کھاتا ہوا گڑھے میں گرا تھا اور لاشوں میں دب گیا تھا، مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ میرا سفر ختم ہو گیا ہے۔ اب میں کبھی سورج نہیں دیکھ سکوں گا لیکن میں نے سورج دیکھا اور کئی سورج دیکھے اور پچھلے چند مہینوں میں کئی ایسی خوشیاں بھی دیکھیں جن کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔''

''آپ کی یہ ساری باتیں صحیح ہیں بھائی! لیکن آنکھوں سے دیکھ کر اندھے کنویں میں گر جانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں اب سمجھ جانا چاہیے کہ یہ بے حد خطرناک لوگ ہیں۔ یہ آپ کو ایک نہایت خطرناک تجربے کا شکار بنا رہے ہیں۔ یہ کوئی عام سرجری نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ کے جسم کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں جسے کٹے ہوئے مہینوں بیت چکے ہیں۔ اس عرصے میں اس کٹی ہوئی ٹانگ کو مختلف کیمیائی تجربوں سے گزارا جاتا رہا ہے۔

وہ ہفتوں تک سپ گندل سے تیار کردہ بخارات میں پڑی رہی ہے اور کیمیائی اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی رہی ہے۔ بے شک آپ کے جسم کے اس حصے پر بہت محنت کی گئی ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس محنت کے نتائج مثبت ہی ہوں۔ یہ منفی بھی ہو سکتے ہیں اور منفی ہونے کے چانس بہت زیادہ ہیں۔ نہیں بھائی! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو قائل کر کے روکیٹ سے یہاں لانے والا میں ہی ہوں اور اب سب سے زیادہ ذمے داری بھی مجھ پر ہی آتی ہے۔ میں یہ سرجری نہیں ہونے دوں گا۔

رستم اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اپنی ٹانگ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''چلو! یہ بات تو تم مانتے ہوناں کہ مجھ پر تجربہ کیا جا رہا ہے اور اس پر بہت محنت کی گئی ہے۔ اب یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ یہ لوگ اس تجربے کو کامیاب کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''یہ لوگ مجھے جان بوجھ کر تو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ یہ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ان کی محنت رائیگاں نہ جائے۔ مطلب یہ کہ یہ ایک خطرناک تجربہ ضرور ہے لیکن ہے تو تجربہ ہی۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ڈاکٹر ہو۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ یہ تجربے پوری دنیا میں کیے جاتے ہیں اور ایسے تجربوں کے لئے بہت سے لوگ خود کو اپنی مرضی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو خدمتِ خلق کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ خود کو ''ڈاکٹر سائنس دانوں'' کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ ان پر جس طرح کی ڈاکٹری آزمائشیں چاہیں، کریں۔ گئے دنوں میں میں نے بڑی قتل و غارت کی ہے۔ کیا پتا مارا ماری کے جوش میں کئی بے گناہوں کو بھی مار دیا ہو۔ اس طرح سے اگر گناہوں کا تھوڑا سا کفارہ ادا ہو جائے تو کیا برا ہے...... میری بات غلط تو نہیں ہے؟'' رستم نے آخری فقرہ ذرا توقف سے کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں بھائی! لیکن آپ بالکل غلط مثال دے رہے ہیں۔ میڈیکل سائنٹسٹ رضا کاروں پر جو تجربے کرتے ہیں ان میں ایسا رسک نہیں ہوتا بلکہ دس گنا کم رسک بھی نہیں ہوتا۔''

''رضا کار...... رضا کار میں بھی تو فرق ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ گورے رضا کاروں کا جتنا دل ہوتا ہے وہ اتنی ''رضا کاری'' کرتے ہیں۔''

''بھائی! آپ نے دیکھا ہی تھا کہ گریس بھی کتنی پریشان نظر آ رہی تھی۔ جو ہم سمجھ رہے

ہیں، وہ آپ نہیں سمجھ رہے۔''

رستم نے ناصر کے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر ایک گہرا کش لیا۔ ''یار ناصر! اپنے اردگرد دیکھ لو۔ انہوں نے ٹھیک ٹھاک اسلحہ نکال لیا ہے۔ یہ لوگ اب ہمیں یہاں سے نکلنے تو دیں گے نہیں...... تو زبردستی کروانے کے بجائے کیوں نہ خوشی سے رضا کار بن جائیں۔ ہونا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ میں بچ جاؤں گا۔ شاید ابھی میرے کرنے کے کچھ کام باقی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وڈے ڈیرے کے اس گڑھے میں لاشوں کے اندر میری سانس چلتی نہ رہتی۔''

ناصر نے بستر پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنی پیشانی انگلیوں میں جکڑ لی۔ وہ رستم سے ہرگز متفق نظر نہیں آتا تھا۔

رستم کا دھیان گریس کی طرف چلا گیا۔ اسٹیفن اسے بہت طیش کے عالم میں لے کر گیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا۔

☆======☆======☆

روکیٹ کے پہاڑی مکان میں شانی بڑی بے چینی سے گریس اور شریف کا انتظار کر رہی تھی۔ وقتِ رخصت گریس نے کہا تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ دو دن میں لیکن کل چوتھی رات بھی گزر گئی تھی۔ شانی کو توقع تھی کہ آج تو وہ ہر صورت پہنچ جائے گی۔ ننھا ڈیوس بھی ماں کے لئے پریشان تھا۔ بے شک وہ شانی اور مُنے کے ساتھ بہت خوش رہا تھا لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اداسی بڑھ رہی تھی۔

شانی دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بار بار اس کی نگاہیں گھر کے دروازے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں پھر جب وہ کمرے میں جاتی تو کھڑکی میں سے دور تک نگاہ دوڑاتی۔ اسے سرسبز پہاڑوں کے اندر بل کھاتی پگڈنڈیاں نظر آتیں، ڈھلوانوں پر چرتی ہوئی گائیں اور بکریاں بادلوں کے مرغولوں میں چھپ جاتیں اور پھر ظاہر ہو جاتیں۔ درخت ہوا کے بوجھ سے ایک جانب کو جھکتے۔ جیسے وہ بھی شانی کی طرح بے تاب ہو کر کسی کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ اسی دوران میں چوڑا چکلا اجمل خان کھنکارتا ہوا صحن کی طرف سے برآمد ہوا۔ وہ ڈیوس کو بہلانے کے لئے کچھ بادام اور اخروٹ لے کر آیا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر اجمل خان نے پوچھا۔ ''شانی بہن! کچھ پتا چلا میم جی کا؟'' وہ گریس کو میم جی یا میم صیب کہہ کر ہی بلاتا تھا۔

''باہر سے تو تم آئے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔'' شانی نے کہا۔

''ام نے کہا شاید آپ کے پاس کوئی اچھا خبر ہو۔'' پھر اس نے عادت کے مطابق نسوار کی ڈبی نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن آدھے راستے میں ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ نسورا چھوڑ چکا ہے۔ اپنے ہاتھ کو وہ سر کی طرف لے گیا اور کھوپڑی کو سہلا کر بولا۔ ''ام تو اب سچ مچ پریشان ہونے لگا ہے۔ میم جی اور ناصر صیب نے کھل کر کچھ بتایا بھی نہیں ہے۔''

''کوئی وجہ ہوگی تو نہیں بتایا ناں۔''

''ویسے تو ام کو بھی آپ کی طرح میم جی اور ناصر صیب پر پورا پورا بھروسا ہے لیکن انہوں نے خواہ مخواہ اس معاملے کو پُراسرار بنا ڈالا ہے۔ امارا دل تو یہی کہتا ہے کہ یہ سارا چکر رستم بھائی کی ٹانگ کا ہے۔ ان کا زخم ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ شاید شریف کو کسی اچھے حکیم ڈاکٹر وغیرہ کا پتا ہو۔ سنا ہے کہ ان علاقوں میں بہت قابل قسم کے سنیاسی لوگ بھی گھومتا رہتا ہے۔ ان پہاڑوں میں ہزار ہا طرح کا جڑی بوٹی ہوتا ہے۔''

اسی دوران میں بے جی بھی تسبیح پھیرتی ہوئی آ گئیں۔ انہوں نے حسبِ معمول شانی کے قریب آ کر اس پر پھونکا پھر قریب ہی سوئے ہوئے مُنے کے چہرے پر پھونک ماری۔ وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ''دیکھو، آج بھی بارہ بجنے کو آئے ہیں۔ اگر وہ انگریزنی صبح سویرے نکلی ہوتی تو اب تک اسے اور شریف کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''پریشان نہ ہوں بے جی! وہ آ جائیں گے آج۔'' شانی نے یقین سے کہا۔

''دہائی خدا کی، چھوٹا سا بچہ ہے۔ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ یہ گوری چمڑی والے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ بس جس طرف دھیان ہو گیا ..... ہو گیا۔ باقی سب کچھ بھلا دیا۔ میں سچ کہتی ہوں دھی رانی! مجھے تو تمہاری اس سہیلی کی طرف سے خطرہ ہی رہتا ہے۔''

''نہیں بے جی! ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت ہمدرد اور بہت ذمے دار ہے۔ ضرور کوئی وجہ ہوگی جو دیر ہوئی ہے۔''

بے جی بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ شانی پیاز چھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اجمل خان ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''بہن جی! ام آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا چاہے یہ پیاز کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ آپ پیاز نہ کاٹا کریں۔''

''ٹھیک ہے میں ثابت پوتھیاں ڈال دیا کروں گی۔'' وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے مسکرائی پھر اچانک اس کے تاثرات بدلے۔ وہ موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''خان بھائی! تم نے ابھی تک تفصیل سے نہیں بتایا کہ مُنے کو یہاں کیسے لائے؟''

''پتا نہیں جی کیسے لے آیا۔ امارے دل میں بس اتنا بات تھا کہ اماری پیاری بہن کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہونا چاہیے۔ ام اور پہلوان یہاں سے سیدھا لاہور پہنچا تھا۔ وہاں امارا ایک رشتے کا بھائی ریڑھی پر چنے وغیرہ بیچتا ہے۔ اس کا نام خناب گل ہے۔ ام نے خناب والا ریڑھی لے لیا۔ خناب نے اپنے ایک ساتھی کا ریڑھی لے لیا۔ ام نے چار دن تک شاہدرہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں چنے بیچا۔ ام کو مالوم ہو گیا کہ بچہ کس وقت سکول جانے کے لئے گھر سے نکلتا ہے اور کتنے بجے واپس آتا ہے۔ ام کو گاڑی اور ڈرائیور وغیرہ کے بارے میں بھی سب کچھ پتا چل گیا۔ بس اس کے بعد ام نے ایکشن میں آنے کا تیاری کر لیا۔ اسی دوران میں امارا ملاقات چھوٹو بھائی سے بھی ہو گیا۔ یہ ملاقات بالکل اتپاق سے ہوا۔ بس قدرت کو منظور تھا کہ یہ چھوٹو بھائی امارے ساتھ یہاں پہنچے۔''

''ہاں ..... اس نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ کار سوار لڑکیاں اسے اقبال ٹاؤن کی ایک ویران سڑک پر پھینک گئی تھیں۔''

''ہاں جی۔ اللہ کا مار ہوا ایسا جہنمی لڑکیوں پر اور ان ماں باپ پر بھی جو ایسی امیرزادیوں کو سنبھال کر نہیں رکھتا۔ چھوٹو بھائی نے آپ کو بتایا ہی ہوگا۔ وہ اپنے پڑوسی کسی سیپ صاحب (سیف صاحب) کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ اقبال ٹاؤن کے علاقے میں ان کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ ان خبیث لڑکیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ پہلے لفٹ اور پھر سیپ صیب کا پتا بتانے کے بہانے اسے ایک کوٹھی میں لے گئیں ..... وہاں انہوں نے اس کا تماشا بنایا۔ خواس کو نشہ پلایا اور بہت بدتمیزی کیا۔''

اجمل خان بتاتے ہوئے جھجک رہا تھا تاہم شانی کو ڈولے کی زبانی کافی کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ یہ تکلیف دہ واقعہ اقبال ٹاؤن کے قریب پیش آیا تھا۔ ڈولا درحقیقت سنبل کی تلاش میں تھا۔ وہ مدت سے سنبل کا خاموش عاشق تھا اور سنبل کی فیملی چوہدری بشیر کی چیرہ دستیوں کے خوف سے اچانک غائب ہو گئی تھی۔ ڈولا دل کے ہاتھوں مجبور لاہور کی سڑکوں کی خاک چھان رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ کریانہ فروش سیف اللہ اپنی فیملی کے ساتھ لاہور کی طرف نکلا ہے۔ ایک شام وہ ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ یونیورسٹی کی چند اوباش لڑکیوں نے ڈولے کو لفٹ دی اور پھر سیف اللہ کا کھوج دینے کے بہانے اسے ایک کوٹھی میں لے گئیں۔ یہاں انہوں نے ڈولے کو نشہ آور مشروب پلایا اور اس کے ساتھ اخلاق سوز حرکتیں کرتی رہیں۔ بعدازاں وہ اسے شدید نشے کی حالت میں ایک سڑک پر ڈال کر چلی گئیں۔ اتفاقاً ڈولے کو اجمل خان اور اس کے رشتے دار خناب گل نے دیکھ لیا۔ وہ دونوں اس وقت چوہدری بشیر کی ٹیکسٹائل مل کا حدود اربعہ دیکھنے کے بعد واپس آ رہے تھے۔

اجمل خان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بہن جی! جب ام نے چھوٹو بھائی کو اٹھایا تو اس بے چارے کے جسم پر صرپ کرتہ اور جانگیا تھا۔ اس کی گردن، ٹانگوں اور منہ پر ناخنوں کا خراشیں بھی تھا۔ ام اس کو رکشا میں ڈال کر اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں ام کو اس کی جیبوں میں سے تھوڑا سا نقدی، ایک چابی اور دو تصویریں ملا۔ ان تصویروں کی وجہ سے ہی چھوٹو بھائی سے امارا واسطہ بنا۔''

''ہاں، ڈولے نے مجھے بتایا ہے کہ ان میں ایک تصویر میری بھی تھی۔'' شانی نے کہا۔

''جی بہن جی۔ یہ دو تصویریں اس لڑکی کی شادی کا تھا جس کا نام کوکی ہے اور جس کے لئے آپ نے بہت مشکل اٹھایا۔ ام نے تصویر میں آپ کو دیکھا اور پہچان کر حیران ہوا۔ بعد میں جب چھوٹو اچھی طرح ہوش میں آگیا اور اس کا خوپ بھی دور ہو گیا تو ام نے اس سے آپ کی تصویر کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو وہ کچھ بتانے سے انکار کرتا رہا لیکن جب ام نے اسے بتایا کہ ام کون ہے اور کس کے لئے وہاں لاہور میں موجود ہے تو آہستہ آہستہ چھوٹو بھی کھل گیا۔ اس نے ام کو اپنے اور آپ کے بارے میں بہت سا باتیں بتائیں۔ وہ ہر صورت آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ جتنی بار آپ کا نام سنتا تھا اتنی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتا تھا۔ وہ چوہدری بشیر کا بھی بہت سخت مخالپ تھا۔''

اجمل خان نے ایک بار پھر نسوار کی ڈبی تک ہاتھ پہنچانے کی ادھوری کوشش کی پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ''بہت جلد ام اور چھوٹو بھائی کو ایک دوسرے پر بھروسا ہو گیا۔ ام نے اس کو صاپ لفظوں میں بتایا کہ ام یہاں اس لئے آیا ہے کہ چوہدری بشیر کے بچے کو یہاں سے لے جاسکے۔ ام دونوں نے مل کر سارا پروگرام بنایا۔ چھوٹو دیکھنے کو تو چھوٹا لگتا ہے لیکن بہن جی اس کے اندر دل چھوٹا نہیں ہے اور ام کو لگتا ہے کہ اس بندے کو اللہ تعالیٰ نے کچھ خاص صلاحیت بھی عنایت پر مایا ہے۔ اس کا نظر اور اس کا کان بہت تیز ہے۔ خدا قسم ام تو حیران رہ گیا۔''

''جب تم نے مُنے کو ڈرائیور سے چھینا تو ڈولا بھی ساتھ تھا؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں جی، وہ بالکل ساتھ تھا۔ امارے لئے رکشے کا انتظام بھی تو چھوٹو بھائی نے ہی کیا تھا۔ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر کہیں سے ایک رکشہ اُڑا لایا۔ ام نے اس رکشے کا نمبر پلیٹ تبدیل کیا اور اسی پر اپنا کارروائی کیا۔ چھوٹو بھائی نے آپ کو تھوڑا بہت بتایا ہی ہو گا۔''

''نہیں، اس نے ایک دو باتیں بتائی تھیں۔ کہہ رہا تھا تفصیل خان صاحب کو ہی معلوم ہے۔''

اس بات پر اجمل خان تھوڑا سا خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ ''ام نے کارروائی سے پہلے

تین دن تک اس راستے کو اچھی طرح دیکھا تھا جہاں سے ڈرائیور بچے کو لے کر گزرتا تھا۔ یہ سارا راستہ مصروپ تھا۔ کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھا جہاں نیلی کار کو روکا جاسکتا۔ اس کام کے لئے ام نے تھوڑا سا ڈرامہ کیا اور وہ ڈرامہ کامیاب رہا۔''

اجمل خان نے تھوڑا سا توقف کر کے ''کارروائی'' کا منظر تازہ کیا اور بولا۔ ''اس وقت امارے ساتھ رکشہ میں چھوٹو بھائی اور خناب گل بھی تھا۔ ام رکشہ چلا رہا تھا، وہ دونوں پیچھے بیٹھا تھا۔ صبح جب چوہدری بشیر کا ہٹا کٹا ڈرائیور مُنے کو لے کر سکول روانہ ہوا تو ام تینوں رکشہ پر اس کے پیچھے تھا۔ اماری قمیص کے نیچے وہی پستول تھا جو ہم یہاں سے لے کر گیا تھا۔ بتی والے چھوٹے چوک سے ذرا پہلے ام نے رکشہ سے نیلی گاڑی کو سائیڈ مارا۔ نئی گاڑی کو بائیں طرف لمبا چوڑا ڈینٹ پڑ گیا لیکن ام رکا نہیں، ام نے رکشہ بھگا دیا۔ چوہدری کا ڈرائیور بھی اچھا خاصا غنڈہ ہے۔ اس نے امارے پیچھے گاڑی بھگایا۔ ام ایک چھوٹی سی سڑک سے گزر کر اسے گلستان کالونی کے قبرستان کے پیچھے لے آیا۔ اس نے امارے رکشے کے آگے گاڑی کھڑی کر دیا اور باہر نکلتے ہی چیل کی طرح ام پر جھپٹ پڑا۔ اس دھینگا مشتی میں امارا سر بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرایا اور زخمی ہوا لیکن ام نے بھی ڈرائیور صاحب کو تین چار بڑا ''پائے'' کا چوٹیں لگایا۔ اس دوران میں یہ ہوا کہ مُنا گاڑی سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ بڑا ہوشیار بچہ ہے۔ اگر اس وقت امارا چھوٹو بھائی پھرتی نہ دکھاتا تو مُنے کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ چھوٹو بھائی مُنے کے پیچھے بھاگا اور قبرستان کے درمیان سے اسے پکڑ لیا۔ اس دوران میں خناب گل نیلی کار کا ڈرائیونگ سنبھال چکا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک جب اس کا نظر ٹھیک تھا وہ ٹیکسی بھی چلایا کرتا تھا۔ جب ام نے دیکھا کہ چھوٹو بھائی مُنے کو واپس کار میں لے آیا ہے اور خناب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لیا ہے تو ام ہٹے کٹے ڈرائیور کو دھکیلتا ہوا پیچھے لے گیا۔ یہاں دس پندرہ فٹ نیچے ہرے ہرے بدبودار پانی کا جوہڑ ہے۔ ام نے ڈرائیور کو اس کی سفید سفید وردی سمیت جوہڑ میں گرا دیا۔ بس کے گرنے سے چھپاک کا جو آواز پیدا ہوا وہ ایک دم مزے دار تھا۔ ام کو اپنے سر کا چوٹ سوٹ بھول گیا۔ اس سے پہلے کہ دو چار لوگ وہاں اکٹھا ہو جاتا ام نیلی کار کو وہاں سے بھگا کر لے گیا۔ مُنے کو ام نے بہت مشکل سے سنبھالا۔ وہ کار کے اندر بہت شور مچا رہا تھا لیکن رنگ۔ ار شیشے بند تھے اس لئے ام بے فکر تھا۔ ام مُنے کو اسٹیشن کے علاقے میں لے گیا۔ یہاں ام نے کسی پرائیویٹ کار کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ مُنے کو اس دوسری کار میں ڈالنے کے بعد ام چوہدری بشیر کی کار گڑھی شاہو کی طرپ چھوڑ آیا۔ ام مُنے کو لے کر فوراً شیخوپورہ کی طرف ال گیا تھا۔ یہاں ام نے تین چار دن بڑی خاموشی سے گزارا۔ بعد میں ام سرگودھا اور

میانوالی کی طرف سے ہوتا ہوا پنڈی پہنچا۔ اس کے بعد کا واقعات تو آپ کو معلوم ہی ہے۔''

''تم نے بہت خطرہ مول لیا خان بھائی اور ساتھ ہی ڈوڈلے نے بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح منے کو اپنے پاس دیکھوں گی۔ دیکھو، وہ کتنا خوش ہے یہاں۔ دو چار دن میں ہی اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل گیا ہے۔''

''یہ بہت سمجھ دار بچہ ہے جی۔ جب ام اس کو نیلی کار سے کرائے کی کار میں سوار کرنا چاہ رہا تھا تو بہت پریشان ہو رہا تھا۔ ام کو ڈر تھا کہ یہ شور مچائے گا اور امارے لئے مصیبت بن جائے گا۔ امارے پاس بے ہوشی کا ٹیکہ بھی تھا لیکن سچا بات ہے کہ امارا ہمت نہیں ہو رہا تھا اسے ٹیکہ لگانے کو۔ اس موقع پر چھوٹو بھائی نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ یہ چھوٹو بھائی کو جانتا بھی تھا۔ چھوٹو بھائی نے اسے آپ کا فوٹو دکھایا اور سمجھایا کہ ام اسے آپ کے پاس لے جا رہے ہیں۔ جیسے ہی یہ بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گیا یہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے اپنا آنسو مانسو پونچھ لیا اور آپ کا باتیں کرنے لگا۔ یہ ایک دم ہوشیار بچہ ہے جی۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اجمل خان نے دروازہ کھولا۔ چاچا ابراہیم کا دوست اور بستی کا مکھیا نور عباسی جلدی سے اندر آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ شانی اس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''خیر تو ہے چاچا نوری؟''

''مجھے لگتا ہے کہ ناگی یہاں آئے گا۔ اسے کچھ شک پڑ گیا ہے۔'' وہ پھولی سانس کے ساتھ بولا۔

ناگی اس پولیس حوالدار کا نام تھا جو گاہے بگاہے اس دور دراز بستی میں چکر لگاتا تھا۔ بستی کے لوگوں کے لئے وہ پولیس افسر تھا اور وہ اس سے خوف کھاتے تھے۔

''کیسا شک چاچا؟'' شانی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اسے کسی نے بتایا ہے کہ یہاں اس گھر میں ایک انگریز گوری رہتی ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ لڑکی کون ہے؟''

''گریس تو کبھی کسی کے سامنے نہیں آئی اور نہ ہی وہ گھر سے کبھی نکلی ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ شریف یا اس کے بیٹوں میں سے کسی نے باہر بات کر دی ہو۔'' نوری نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا چاچا۔ شریف کے بیٹوں نے بھی گریس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ اگر انہوں نے اسے دیکھا بھی ہوگا تو مقامی کپڑوں میں دیکھا ہوگا اور گھونگھٹ میں دیکھا ہوگا۔''

''کہیں اس کے بچے پر تو کسی کی نظر نہیں پڑ گئی؟'' چاچے نے کہا۔ شانی نے جواب نہیں دیا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ چاچا نوری بولا۔ ''کچھ بھی ہے دھی رانی! ناگی یہاں آ کر تمہارا دروازہ ضرور کھٹکھٹائے گا۔ اب اسے جو بھی جواب دینا ہے اچھی طرح سوچ لو۔ اجمل خان اور ابراہیم سے بھی مشورہ کر لو۔ سب کا جواب ایک جیسا ہی ہونا چاہیے۔''

''لیکن چاچا! اگر ایک انگریز لڑکی یہاں اس گھر میں رہتی بھی ہے تو حوالدار ناگی کو اس پر کیا تکلیف ہے؟''

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے یا پھر اس کا افسر...... دراصل افسر کے دو تین کارندے اس سارے علاقے کے ذمے دار ہیں۔ یہاں سے کون جاتا ہے، کون آتا ہے... کون زمین وغیرہ بیچتا یا خریدتا ہے اور اس قسم کی دوسری ساری باتوں پر یہی کارندے نظر رکھتے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ ناگی جس طرح بات کر رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید اسے کسی طرح کا کوئی شک ہے۔''

''ناگی سے آپ کی ملاقات کہاں ہوا ہے؟'' اجمل خان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بارہ گلی میں۔ میں وہاں نمک مرچ لینے گیا تھا۔ وہ وہاں کے دو تین دکانداروں سے بھتا وصول کر کے اِدھر ہی آئے گا۔''

''چاچا! تم نے اسے گریس کے بارے میں کیا کہا؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہاں صرف تین بندے ہیں۔ ایک ابراہیم کا بھتیجا ہے، باقی دونوں اس کے دوست ہیں۔ وہ تینوں وہاں مرغی خانہ کھولنا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں پتا چلا ہے کہ یہ علاقہ مرغیاں پالنے کے لئے بہت اچھا ہے۔''

''میرے اور گریس کے بارے میں بھی کچھ بتایا؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں! میں نے بتایا کہ ان میں سے دو کی بیبیاں بھی ان کے ساتھ ہیں۔''

''رستم کا کیا نام بتایا؟''

''اسلم...... ناصر کا شفیق اور اجمل خان کا اکمل خان۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ اسلم کی ٹانگ ایک حادثے میں کٹی ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں بستی میں ہی اس کی شادی اس کی منگیتر سے ہوئی ہے۔ میں نے میم صاحب کو اجمل خان، میرا مطلب ہے کہ اکمل خان کی بی بی بتایا

ہے۔''

اس صورتِ حال پر اجمل خان کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی سرخی لہرائی۔ شانی، چاچا نوری اور اجمل خان نے پندرہ بیس منٹ تک صورتِ حال پر تبادلہ خیال کیا اور بیانات ازبر کر لئے تاکہ پولیس والے کے سامنے بیانوں میں فرق نہ آئے۔ چاچا نوری جلد ہی واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اجمل خان اور شانی کو سختی سے ہدایت کی کہ گریس کے بچے کو پولیس والوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ بچے کی انگریزی سن کر فوراً ہم سب جھوٹے پڑ جائیں گے۔

نوری کے جانے کے بعد شانی، ڈولے اور اجمل وغیرہ نے تقریباً دو گھنٹے بے چینی کی کیفیت میں گزارے۔ شانی نے نہ صرف ڈیوس کو ایک اندرونی کمرے میں سلا دیا تھا بلکہ گھر سے گریس کی موجودگی کے دیگر شواہد بھی اوجھل کر دیئے تھے۔ اس بات کا خدشہ تو بہت کم تھا کہ ''انگریز لڑکی'' میں حوالدار ناگی کی دلچسپی کا تعلق وادی سون کے واقعات سے ہوگا۔ وادی سون یہاں سے بہت دور تھی۔ اس دور دراز بستی سے تعلق رکھنے والے ایک حوالدار کو شاید سون میں پیش آنے والے سارے واقعات کا علم بھی نہ ہوتا پھر بھی بُرے سے بُرے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چاچا نوری کی ہدایت کے مطابق شانی نے بے جی کو بھی سارے بیانات رٹا دیئے تاکہ حوالدار ان سے کچھ پوچھے تو وہ الٹ پلٹ نہ کہہ دیں۔ چاچے ابراہیم کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ خود بالکل چوکس اور حاضر دماغ تھے۔

• انور ناگی کی آمد شام کے بعد ہوئی۔ چاچا نوری بھی اس کے ہمراہ تھے...... اجمل خان دروازہ کھول کر انہیں بیٹھک نما کمرے میں لے آیا۔ ناگی موٹی توند اور سانولی رنگت والا ایک خرانٹ صورت حوالدار تھا۔ وہ باقاعدہ وردی میں تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک موٹی فائل دبا رکھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے یہ فائل رعب دبدبے کے لئے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ کاغذوں کے اس پلندے میں اس کے کام کی شاید ہی کوئی شے ہو۔

بیٹھک میں انور ناگی نے اجمل خان اور چاچا ابراہیم سے پوچھ گچھ شروع کی۔ ساتھ والے کمرے کی جالی دار کھڑکی سے شانی بہ آسانی سن سکتی تھی اور حوالدار ناگی کے متکبرانہ تاثرات بھی دیکھ سکتی تھی۔ اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق وہ اس بستی کے سادہ لوح لوگوں میں خود کو یوں پیش کرتا تھا جیسے سارے ملک کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نہ جانے مکھن میں تلی ہوئی کتنی مرغیاں اور بکریاں اس کے گنبد نما پیٹ میں گم ہو چکی تھیں۔

اس کی پوچھ گچھ کے جواب میں چاچا ابراہیم اور اجمل نے وہی کچھ بتایا جس کی

ریہرسل وہ پہلے سے کر چکے تھے۔ حوالدار ناگی نے بڑے پُرسوچ انداز میں اپنی تیل میں چپڑی کھوپڑی کو سہلایا اور اجمل خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے خیرنال ہر علاقے کے پٹھان دیکھے ہیں۔ پٹھان پٹھان ہوتا ہے انگریز انگریز ہوتا ہے۔ مجھ کو جو انکوائری ملی ہے، اس کے مطابق وہ کُڑی انگریز ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو وہ پارا چنار کی پٹھانی ہے۔''

اجمل خان نے مسکین لہجے میں کہا۔ ''جناب! وہ امارا بیوی ہے۔ ام سے زیادہ کس کو پتا ہوگا کہ وہ انگریز نہیں ہے۔ ویسے آپ کے منہ میں گھی شکر ..... اگر ام کو کوئی انگریز بیوی مل جائے تو امارا قسمت بھی بدل جائے۔ یہاں مرغی خانہ کھولنے کے بجائے ام انگلینڈ میں چلا جائے اور موج کرے۔''

''دیکھو خان! میرے ساتھ مسخری کی بات نہ کرو۔ میں ذرا اور طرح کا تھانے دار ہوں۔ جو پوچھ رہا ہوں وہی بتاؤ خیرنال۔''

خان نے مسکین انداز سے اثبات میں سر ہلایا۔ یقیناً اسے بھی اس انکشاف پر ہنسی آئی ہوگی کہ یہ حوالدار نہیں ''تھانے دار'' ہے۔

''تمہاری بیوی میکے سے واپس کب آئے گی خیرنال؟''

''وہ اتنی دور کا سفر کر کے گیا ہے جی۔ آٹھ دس دن تو وہاں رہے گا لیکن یہاں آ کر بھی وہ آپ کو چہرہ نہیں دکھا سکتا۔ وہ پردہ دار بی بی ہے۔''

''اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے ہم لیڈی پولیس لے آئیں گے خیرنال۔'' ناگی نے سنگین لہجے میں کہا۔ ''خیرنال'' اس کا تکیہ کلام تھا۔

اجمل خان نے الجھے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو ام کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ آپ جیسے افسر کے ساتھ ایسا بے ہودہ مذاق کس نے کیا اور اگر کیا تو اس کا مقصد کیا تھا۔ فرض کیا امارا بی بی انگریز بھی ہوتا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا تھا۔''

''دیکھو خان! تم زیادہ ہوشیار نہ بنو۔ یہ قانونی معاملہ ہے اور سول بھی نہیں ہے، فوجداری ہے۔ اگر تم نے یا تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے جھوٹ بولا تو دفعہ 107 اور دفعہ 383 کے تحت بڑے بُرے پھنسو گے خیرنال۔''

''اتنا بے خیرا کام ''خیرنال'' کیسے ہو سکتا ہے جی۔'' اجمل خان نے بے ساختہ کہا۔

حوالدار ناگی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ ''خان! یہ جو تیری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے ناں ایک دم ٹھیک کر دوں گا میں۔ تجھے پتا نہیں ہے کہ تُو کتنے بڑے چکر میں پھنسنے والا ہے۔''

اجمل خان نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ ناگی نے اس سے تاثر لیا کہ اجمل ڈر گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو قانونی چکر سے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے جو کچھ سخت مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہر قسم کے خوف اور ڈر سے آزاد ہو چکا ہے۔ شانی کی نگاہوں میں وہ مناظر ابھی تک تازہ تھے جب وادی سون سے فرار ہوتے وقت اجمل خان نے تعاقب کرنے والی پولیس اور ان کے معاونوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا تھا۔ اس کی ایل ایم جی نے جیپ کی چھت پر سے موت کی سوغات تقسیم کی تھی۔ بعد میں ملنے والی اخباری اطلاعات کے مطابق اس لڑائی میں اجمل خان کے ہاتھوں کم و بیش آٹھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک گاڑی مکمل اور دوسری جزوی طور پر تباہ ہوئی تھی۔

اب یہ دیمک زدہ حوالدار، اجمل خان کو ایک انگریز لڑکی کے حوالے سے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ بظاہر عام سے نظر آنے والے کتنے خطرناک شخص کے سامنے بیٹھا ہے۔ وہ بھڑک کر بولا۔ ''اچھا ..... وہ لنگڑا کدھر ہے؟''

''وہ بھی اپنے گاؤں گیا ہے۔ دو چار دن تک آ جائے گا۔'' چاچا ابراہیم نے کہا۔

''اور تمہارا بھتیجا؟''

''وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔''

''اس لنگڑے دین کی بیوی کہاں ہے؟'' ناگی بدتمیزی سے بولا۔

''وہ وہ یہیں ہے جی۔'' ابراہیم نے کہا۔

''سنا ہے بڑی سوہنی ہے وہ ..... پھر ایک لنگڑے سے شادی کر لی اس نے ..... یہ کیا چکر ہے؟'' ناگی کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خباثت تھی۔

''وہ اس کے بچپن کی منگ ہے جی۔''

''کہیں یہ بھی تو انگریز کڑی کی طرح نسا نسائی (اغوا) کا چکر تو نہیں ہے؟''

''اللہ معاف کرے جی۔'' ابراہیم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''یہاں کوئی انگریز کڑی نہیں ہے جی اور نہ ہی یہاں کسی دھی رانی کو اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ یہ میرے بھتیجے کے پرانے یار ہیں جی۔ میں ان دونوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ نے جس طرح کی تفتیش بھی کرنی ہے کر لیں۔ ہم سچے ہیں۔ ہم کو کوئی ڈر نہیں ہے جی۔''

''اچھا اس لنگڑے کی بیوی کو بلاؤ ناں خیر نال '' ناگی نے حکم جاری کیا۔

شانی نے کھڑکی کی درز میں سے دیکھا، اجمل خان کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا اور پھر نارمل

ہو گیا۔ غالباً ایسا اس وجہ سے ہوا کہ ناگی بار بار رستم کی معذوری کا مذاق اڑا رہا تھا وہ اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ بی بی بھی پردہ دار ہے جناب۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اسے گھونگھٹ اٹھانے کے لئے نہیں کہوں گا۔ اسے بلاؤ تو سہی۔''

فی الحال ضرورت اس امر کی تھی کہ اس خرد ماغ پولیس اہلکار کو کسی طرح کا شک شبہ نہ ہونے دیا جائے۔ اجمل خان اور ابراہیم چاچا اسے ''خوف زدہ اور سادہ لوح'' دیہاتیوں کی حیثیت سے ملے تھے اور ایسے ملنا ہی بہتر تھا۔

اجمل خان بیٹھک نما کمرے سے اٹھ کر اندر شانی کے پاس آیا اور بولا۔ ''ایک کریک قسم کا موٹی توند والا بھینسا ہمارے ہاں تشریف لایا ہے خود کو شیر سمجھ رہا ہے اور منہ سے گدھے کی آوازیں نکال نکال کر ہم پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم اس کا کھال اتار کر اس میں باقاعدہ بھس بھر دیتا لیکن فی الحال ہم کو احتیاط سے کام لینا ہے۔ آپ دو چار منٹ کے لئے آ جائیں، وہ آپ کا بیان لینا چاہتا ہے۔''

کچھ دیر بعد شانی فربہ اندام حوالدار ناگی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک چادر سے لمبا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ نور عباسی کے سامنے ہی ناگی نے شانی سے چند سوالات کئے اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا۔ درحقیقت وہ اپنی افسری کا مزہ لینے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ غالباً اس نے بستی میں شانی کی دلکشی کا چرچا سنا تھا اور اب یہ خیال کر کے محظوظ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے بیٹھی اس کے تفتیشی سوالوں کا جواب دے رہی ہے۔ ''تمہاری پہلی شادی کب ہوئی تھی؟'' اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر پوچھا۔

''پہلے میری شادی نہیں ہوئی۔'' شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے جواب دیا۔

''پھر یہ بچہ؟''

''یہ..... میری..... بہن کا ہے۔ وہ فوت ہو چکی ہے۔ اس کا شوہر نشئی ہے۔ وہ مرتے مرتے اس بچے کی ذمے داری مجھ پر لگا گئی تھی۔'' شانی نے دیہاتی لہجے میں کہا۔

''چاچا ابراہیم کہتا ہے کہ تیرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے لیکن کوئی نہ کوئی رشتے دار تو تیرا ہو گا۔ کوئی تایا، چاچا..... کوئی پھوپھی، خالہ وغیرہ وغیرہ۔''

''نہیں، کوئی نہیں ہے۔''

ناگی نے ایک درد بھری ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر ہوتا تو شاید پھر تیری شادی کسی ڈھنگ کے بندے سے ہوتی۔'' وہ بڑبڑایا۔

غالباً اپنے تئیں اسے تکلیف پہنچ رہی تھی کہ ابراہیم نے اتنی خوب صورت لڑکی کی شادی ایک معذور شخص سے کردی ہے۔ کچھ اوٹ پٹانگ سوال کرنے کے بعد ناگی اپنی توند سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور تھانے داری انداز میں کہنے لگا۔ ”ابھی یہ معاملہ ختم نہیں ہوا۔ میں پھر آؤں گا۔ تم لوگ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میری اطلاع کے مطابق وہ لڑکی انگریز ہے۔ اگر یہ اطلاع درست نکلی تو تم سب کو تھانے کی ہوا کھانا پڑے گی۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی بوگس فائل سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”قانون سے ٹکر لینا آسان نہیں ہوتا۔ تمہاری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں..... کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ بڑے بڑے پھنّے خان قانون کے سامنے گوڈے ٹیک دیتے ہیں۔ یہاں تو اخبار نہیں آتے۔ تمہیں پتا نہیں ہوگا، پر باہر کے لوگ جانتے ہیں۔ پچھلے دنوں بڑے نامی گرامی ڈاکوؤں کا بیڑا غرق ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج کل بڑی سختی ہے تھانے کچہری میں۔ جو اس چکی میں چلا جاتا ہے آٹے کی طرح پس کر باریک ہو جاتا ہے۔“

ناگی نے بے خیالی میں اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا...... جیسے نامی گرامی ڈاکوؤں کو مارنے میں اس کا بھی بھرپور کردار رہا ہو۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اس حوالے سے کوئی جھوٹا قصہ بھی بیان کرنے لگتا لیکن اس دوران میں نور عباسی دہلیز سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔ مجبوراً ناگی کو بھی جانا پڑا۔

شانی کو وہ بے حد بودا، شیخی خور اور لالچی نظر آیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی بھی محکمے میں ہوں تو اسے بدنام کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ شانی کو بعد میں معلوم ہوا جاتے جاتے انور ناگی نے چاچا ابراہیم سے ایک ٹیڈی بکری بھی وصول کی۔

ناگی کے جانے کے بعد شانی اور اجمل خان دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ ناگی ”انگریز لڑکی“ کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے اور یہ کہ اس حوالے سے کس نے اطلاع دی ہے۔ اجمل خان کے جانے کے بعد شانی کچھ دیر تک مُنے اور ڈیوس سے باتیں کرتی رہی۔ اداس ڈیوس اور مُنے کو ایک دلچسپ کھیل میں الجھانے کے بعد وہ رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس کا دھیان مسلسل گریس کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ اب تک کیوں واپس نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے کے بعد ہی رستم کے بارے میں کچھ پتا چل سکتا تھا۔ وہ بار بار سوچنے لگتی تھی۔ رستم کیا کر رہا ہوگا..... کیا سوچ رہا ہوگا؟ اس نے کھانا کھایا ہے یا نہیں .... اس نے دوائی لی ہے یا نہیں؟ وہ اپنے ذہن میں سے ان خیالات کو جھٹک کر کچن کے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد اسے پتا چلتا تھا کہ وہ پھر رستم کے

بارے میں ہی سوچ رہی ہے۔ وہ اسے ایک ”خوب صورت عارضے“ کی طرح لاحق ہوتا جا رہا تھا۔ کسی کو پالینے کے بعد طلب کم ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا۔ شانی کو اب پتا چل رہا تھا کہ وہ اسے کتنی شدت سے چاہتی ہے۔ یہ چاہت اندر ہی اندر خاموشی سے پروان چڑھی تھی اور بے کراں ہوگئی تھی۔

”شانی کیا کر رہی ہیں؟“ اچانک رستم کی آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس نے تڑپ کر اپنے عقب میں دیکھا۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس کھلی کھڑکی میں سے ہوا کے سرسراتے جھونکے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری اور اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ وہ اپنی حالت پر مسکرائی تھی۔ پرسوں سے کئی بار ایسا ہوا تھا۔ کبھی اسے رستم کی آہٹ کا مغالطہ ہوتا، کبھی لگتا تھا کہ اس نے اسے پکارا ہے۔ کل صبح اسے بالکل یہی لگا کہ رستم کسی سے باتیں کرتا ہوا کھڑکی کے نیچے سے گزر کر جھرنے کی طرف گیا ہے۔ اس نے بھاگ کر کھڑکی کھولی تھی اور باہر جھانکا تھا لیکن یہ بستی ہی کے دو افراد تھے جو جنگل سے خشک لکڑیاں لے کر واپس آ رہے تھے۔

شانی نے کھڑکی بند کرنے کے بعد خود کو بستر پر نیم دراز کیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر دل ہی دل میں کہنے لگی۔ ”آجاؤ رستم! آجاؤ ناں۔“

بے جی کی آواز نے اسے چونکایا۔ ”کدھر ہو دھی رانی؟“

شانی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ بے جی کے ہاتھ میں چند اَن دُھلے کپڑے تھے۔ انہوں نے شانی سے پوچھا۔ ”یہ کپڑے غسل خانے میں ڈال دو شانی؟“

”ہاں ڈال دیں بے جی۔“

بے جی واپس مڑیں تو شانی جلدی سے ان کے پاس پہنچی۔ ان کپڑوں میں رستم کی ایک قمیص بھی تھی۔ شانی نے وہ قمیص باہر نکال لی۔ ”اسے دھونا نہیں دھی رانی؟“ بے جی نے پوچھا۔

”نہیں بے جی، یہ ٹھیک ہے۔“ شانی نے جواب دیا۔

بے جی نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں آنکھیں بند کر کے شانی پر بھروسا کرنے لگیں تھیں۔ یہ ان کا اپنا گھر تھا لیکن وہ شانی سے یوں ہر بات پوچھتی تھیں جیسے یہ شانی کا گھر ہو..... شانی اس صورتِ حال پر شرمندہ ہوتی تھی۔

بے جی کے جانے کے بعد شانی دوبارہ بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ رستم کی قمیص اس کے

سینے پر دھری تھی۔ اس قمیص میں سے رستم کے پسینے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی..... یہ مہک اسے اچھی لگ رہی تھی۔

اجمل خان، شانی اور چاچا ابراہیم کو رات تک گریس کا انتظار رہا لیکن ان کی کوئی خبر نہیں تھی۔ چاچا ابراہیم نے عندیہ ظاہر کیا کہ اگر کل دوپہر تک گریس اور شریف کی کوئی خبر نہ ملی تو وہ خود ان دونوں کے پیچھے جائیں گے۔ رات کو شانی بستر پر لیٹی۔ اس کی ایک جانب مُنا اور دوسری جانب منہ بسورتا ہوا ڈیوس تھا۔ ڈیوس کو شانی نے کھانسی کا سیرپ پلایا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد سو گیا لیکن مُنا جاگتا رہا۔ اس کی ایک ٹانگ شانی کے پیٹ پر تھی۔ اپنے ماحول اور اپنے باپ سے بچھڑنے کا ذرا بھر افسوس نہیں تھا اسے۔ ''مجھے کہانی سناؤ تاتی'' وہ بولا۔

''تمہیں بتایا ہے ناں، مجھے نہیں آتی۔''

''سب کی امیاں کہانی سناتی ہیں۔ تم بھی سناؤ۔ نہیں تو میں لو پڑوں گا۔'' (رو پڑوں گا)

شانی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر ایک گہری سانس لی اور کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''ایک تھا بادشاہ۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بہت بڑے مکان میں رہتی تھی۔''

''یوں کہو ناں محل میں لہتی تھی۔''

''ہاں محل میں رہتی تھی۔ ایک دن اسے ایک مسافر نے دیکھا اور دیکھتے ہی اسے پسند کرنے لگا۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ بادشاہ کی بیٹی سے شادی کرے گا۔ بادشاہ کی بیٹی کو بھی پتا چل گیا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ بندہ جو تھا ناں وہ ڈاکو تھا۔ لوگ اسے بہت ہی بُرا سمجھتے تھے۔ اس سے ڈرتے تھے اور اس کا نام سننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ بہت ہی مشکل تھا کہ بادشاہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہو جاتی۔ بادشاہ کی بیٹی خود بھی جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا لیکن ایک بات تھی......''

''کیا بات؟'' مُنے نے کہانی میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''بادشاہ کی بیٹی کو لگتا تھا کہ یہ بندہ اتنا بُرا نہیں ہے جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس کا دل آہستہ آہستہ اس بندے کی طرف کھنچنے لگا۔''

''دل کیسے کھنچتا ہے تاتی؟''

شانی کے چہرے پر سرخی لہرائی۔ اس نے مُنے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے......''

''بادشاہ کی بیٹی اس ڈاکو سے گلے ملنا چاہتی تھی؟'' اس نے بھولپن سے پوچھا۔

''ہاں... یہی سمجھو۔'' اس سے پہلے کہ شانی مزید کچھ کہتی کمرے کے دروازے پر بے تاب دستک ہوئی۔ ''کون؟'' شانی نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''میں ہوں باجی جی۔'' ڈولے کی آواز آئی۔

شانی اٹھ کر بیٹھ گئی اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔ ''آجاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ڈولا کچھ پریشان سا اندر داخل ہوا۔ شانی کے دبے ہوئے اندیشے جاگ گئے۔ انور ناگی چلا تو گیا تھا لیکن شانی اور اجمل خان وغیرہ کو خطرہ تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ کہیں یہ کوئی ایسا چکر ہی تو نہیں؟ شانی کے ذہن سے سوال ابھرا۔ ''خیریت تو ہے ڈولے؟'' شانی نے پوچھا۔

''خیریت ہی ہے جی پر......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا بات ہے..... تم بتاتے کیوں نہیں؟'' شانی نے اسے ہولے سے جھڑکا۔

''آپ کو پتا ہی ہے باجی..... میرے کان دوسرے لوگوں سے زیادہ تیز ہیں۔ مجھے کچھ آوازیں آ رہی ہیں۔''

''کیسی آوازیں؟'' شانی ڈر گئی۔

ڈولے نے جھرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے... وہاں پرلی طرف درختوں میں کچھ بندے چھپے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس رائفلیں بھی ہیں۔ وہ جھرنے کے نیچے سے گزر کر ہماری طرف آنے کی باتیں کر رہے ہیں۔''

شانی جانتی تھی کہ ڈولے کی سماعت حیران کن ہے۔ اس کے سونگھنے کی حس بھی غیر معمولی تھی۔ وہ ایک عام آدمی سے کم از کم تین گنا طاقت سے سونگھ سکتا تھا۔ جب تاؤ حشام نے شانی اور ڈولے کو چوہدری بشیر کی تحویل سے اغوا کیا تھا تب شانی نے پہلی بار ڈولے کی غیر معمولی قوتِ سماعت کا مشاہدہ کیا تھا۔ یقیناً وہ آج بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شانی کا دھیان ایک بار پھر انور ناگی کی طرف چلا گیا۔ شاید وہ پھر آ گیا تھا۔

شانی نے جھرنے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی اور درز میں سے باہر دیکھا۔ جھرنے کے پار چیڑ اور چنار کے بلند قامت درخت خاموش اور تاریک تھے۔ اچانک شانی نے محسوس کیا کہ درختوں میں سے کسی چھوٹی ٹارچ کے روشن دائرے نے حرکت کی ہے۔ یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ یقیناً موجود تھے۔ ورنہ عام طور پر شام کے بعد ان درختوں کی طرف کوئی نہیں جاتا تھا۔ ڈولے کی اطلاع کی تصدیق ہو رہی تھی۔

شانی نے کھڑکی بند کر کے لالٹین کی لو مدھم کر دی اور تیزی سے مسہری کی طرف آئی۔ سب سے پہلے اس نے ڈیوس کو گود میں اٹھایا اور اسے گھر کے سٹور نما کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ کف سیرپ کے زیر اثر سکون سے سو رہا تھا۔ گریس کے استعمال کی تمام اشیاء وہ حوالدار ناگی

کے آنے سے پہلے ہی ایک جستی پیٹی میں لحافوں کے نیچے رکھ چکی تھی۔ اب بظاہر گھر میں ایک سفید فام عورت کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں شانی کے ذہن میں یہی بات آ رہی تھی کہ اگر کچھ لوگ واقعی اس گھر میں گھسنا چاہتے ہیں تو پھر اس کا تعلق گریس سے ہوگا۔

وہ دوڑتی ہوئی گئی اور گھر کے دوسرے پورشن میں موجود اجمل خان کو صورتِ حال کی اطلاع دی۔ اجمل خان نے فوراً اپنی پسندیدہ رائفل اپنے ہاتھ میں کر لی اور پوری طرح چوکس نظر آنے لگا۔ شانی نے کہا۔ ''خان! اگر کچھ لوگوں نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تو تم ہوائی فائرنگ کرنا۔ اس سے بستی والے چوکس ہو جائیں گے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم ابھی دو چار فائر نکال دو۔''

''ٹھیک ہے شانی بہن! آپ اندر چلی جائیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہوگا ام سنبھال لے گا۔ کسی مائی کے لال میں اتنا جرأت نہیں ہے کہ امارے ہوتے ہوئے اماری بہن کو نقصان پہنچا سکے۔'' اس نے اپنی سیون ایم ایم پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہاں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہے خان۔ ہمارے ساتھ دو بچے ہیں۔ ان کی حفاظت سب سے ضروری ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جاؤ میری بہن۔'' اجمل خان نے آستینیں اُڑس لیں۔

شانی مُنے اور ڈیوس کو دیکھنے کے لئے اندر چلی آئی۔ مُنا جاگ رہا تھا۔ ڈیوا اس سے باتیں کر کے اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شانی نے لالٹین کی لَو مدھم کر کے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کہیں پولیس نے ان کا سراغ تو نہیں پا لیا تھا۔ پولیس کا خیال ذہن میں آتے ہی ریاض بٹلر کی ہولناک صورت شانی کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ کیا اس منحوس سے پھر ملاقات ہونے والی تھی؟

اس نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا، صحن میں اجمل خان دکھائی نہیں دیا۔ وہ سیڑھیوں پر نظر آیا۔ شاید وہ چھت پر جا کر اردگرد کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔ چاچا ابراہیم صحن کے وسط میں کھڑے تھے اور خان سے پوچھ رہے تھے کہ وہ اوپر کیوں جا رہا ہے۔ دفعتاً شانی کا دل سینے میں پھڑک کر رہ گیا۔ کچھ افراد بیرونی چار دیواری سے کود کر صحن میں آ گئے۔ ان کی تعداد پانچ سے کم نہیں تھی۔ وہ تقریباً ایک ساتھ ہی کودے تھے۔ ان کے کودنے سے جو ارتعاش پیدا ہوا وہ شانی نے اپنے پاؤں تک محسوس کیا۔ ان میں سے تین چار افراد کے ہاتھ میں کلہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کم از کم دو کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ یہ سارے افراد چوغہ نما لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سر منڈھے ہوئے تھے اور داڑھیاں

جھاڑ جھنکاڑ تھیں۔ رائفل برداروں نے اپنی رائفلیں اجمل خان کی طرف سیدھی کر لیں۔ اجمل خان نے بھی سیون ایم ایم ان پر سونت لی۔ ''خبردار۔'' اجمل خان دہاڑا۔

''خبردار۔'' دوسری طرف سے بھی یہی دھمکی دی گئی۔

چاچا ابراہیم صحن کے وسط میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ ایک کلہاڑی بردار نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کی کنڈی گرا دی۔ کنڈی گرتے ہی چار پانچ مزید افراد اندر گھس آئے۔ ان کے حلیے بھی پہلے افراد سے ملتے جلتے تھے۔ اجمل خان ابھی تک آدھی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ چار دیواری کے اندر صورتِ حال اچانک ہی بہت سنسنی خیز ہو گئی تھی۔ ''کون ہو تم؟ کیوں گھسا ہے امارے گھر میں؟'' اجمل خان خطرناک لہجے میں بولا۔

''تم بکواس بند کرو یہ بندوقڑی نیچے رکھ دو، ورنہ مارے جاؤ گے۔'' آنے والوں میں سے ایک شخص پھنکارا۔

''خو تم لوگ چاہتا کیا ہے؟'' خان کی رائفل بدستور تنی ہوئی تھی۔

''وہ میم کدھر ہے؟''

''کون سا میم؟''

''جس کو تم اپنی گھر والی بتاتے ہو۔''

''پتا نہیں تم کیا بکواس کرتا ہے۔ وہ میم نہیں ہے۔ وہ پٹھان ہے۔''

ایک سایہ سا سیڑھیوں پر خان کے عقب میں لہرایا۔ یہ ایک کلہاڑی بردار تھا۔ وہ غالباً چھت پر سے اُترا تھا۔ اس کا حملہ شدید تھا لیکن اجمل خان بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے جھکائی دیا۔ حملہ آور اپنی جھونک میں خان کے اوپر سے ہوتا ہوا نیچے پختہ فرش پر گرا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ اجمل خان نے رائفل کو جنبش دی۔ ایک لحظے کے لئے لگا کہ وہ فرش پر گرنے والے کو شوٹ کر دے گا لیکن پھر شانی نے دیکھا کہ نیچے کھڑے ایک کڑیل شخص نے اپنے دائیں ہاتھ کو پھرتی سے حرکت دی۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی ہوا میں تیرتی ہوئی اجمل خان کی رائفل پر لگی۔ یہ وار اتنا مکمل اور شاندار تھا کہ رائفل اجمل خان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے بے ساختہ اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کو تھام لیا۔ یقیناً یہ ہاتھ زخمی ہوا تھا۔

تین چار افراد لپک کر سیڑھیوں پر چڑھے اور انہوں نے اجمل کو دبوچنا چاہا لیکن وہ تر نوالہ نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے مختصر خلاء میں زبردست مار اماری ہوئی۔ دو چار سیکنڈ کے لئے لگا کہ شاید اجمل خان انہیں آگے لگا لے گا تاہم کچھ بھی تھا، وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مسلح بھی

تھے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ اسے زیر کرلیں گے۔ چاچا ابراہیم کو بھی دو افراد نے بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا تاہم وہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ شانی دوڑتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں اس نے ڈیوس کو سلایا تھا۔ ان لمحوں میں اسے ڈیوس کے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ ڈیوس کو حملہ آوروں کی نظروں سے بچانا چاہتی تھی کیونکہ انہیں ڈیوس نظر آ جاتا تو پھر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ سفید فام لڑکی بھی یہیں کہیں موجود ہے جسے وہ دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں۔

شانی نے سوتے ہوئے ڈیوس کو اٹھایا اور ایک بغلی دروازے سے نکل کر ساتھ والے پورشن میں چلی گئی۔ یہاں سے لکڑی کی ایک سیڑھی چھت پر جاتی تھی۔ وہ چھت پر پہنچ گئی۔ یہاں ایک طرف ٹین کا شیڈ تھا۔ اس شیڈ میں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ مرغی خانے میں استعمال ہونے والے برتن، ٹین کی چادریں اور جالیاں وغیرہ۔ وہ یہاں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ان لمحوں میں وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی۔

نیچے برآمدے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ حملہ آوروں نے اجمل خان کو بے بس کر لیا ہے۔ اب وہ دروازوں کو دھکے دے دے کر کھول رہے تھے۔ کلہاڑیوں کی ضربوں سے تالے توڑ رہے تھے اور گھر میں موجود ہر شے کو تہہ و بالا کر رہے تھے۔ انہیں انگریز لڑکی یا اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت درکار تھا۔

شانی کو امید تھی کہ یہ ثبوت انہیں مل نہیں سکے گا۔ ڈیوس کو وہ یہاں چھت پر لے آئی تھی اور گریس کے ذاتی استعمال کی اشیاء اس نے بڑی احتیاط سے کیموفلاج کر دی تھیں۔

دو تین منٹ بعد دو افراد دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں ان کے صفا چٹ سر اور جھاڑ جھنکاڑ داڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کلہاڑیوں کے پھل نیم تاریکی میں بھی چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے سفید لٹھے کا ایک ٹکڑا صافے کی طرح گردن سے لپیٹ رکھا تھا۔

''یہاں کوئی نہیں ہے یار۔'' ایک حملہ آور نے خیال ظاہر کیا۔

''ادھر ایک نظر ڈال لو۔'' دوسرے نے کاٹھ کباڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کلہاڑی بردار ٹین کے شیڈ کی طرف بڑھا۔ شانی نے دم سادھ لیا اور دل مضبوط کئے بیٹھی رہی۔ کلہاڑی بردار نے بے دلی سے کاٹھ کباڑ پر ایک نگاہ ڈالی اور واپس مڑ گیا۔ قریباً چار پانچ منٹ بعد یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ آنے والے عجیب الوضع افراد واپس چلے گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے ملتے جلتے حلیے کے لوگ

اس نے پہلے بھی دیکھے ہیں۔ کہاں؟ یہ فوری طور پر یاد نہیں آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ پانچ دس منٹ وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں لاتعداد اندیشے تھے۔ سب سے زیادہ اندیشہ اجمل خان کی طرف سے تھا... خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ اس کے دل سے بار بار دعا نکل رہی تھی، پھر اسے مُنے کا خیال آیا۔ وہ اندر سے تڑپ گئی۔

اسی دوران میں شانی کو چھت کے نیچے سے آوازیں سنائی دیں۔ ''شانی بہن... شانی بہن۔'' پھر چاچا ابراہیم کی صدا آئی۔ وہ بھی اسے پکار رہے تھے۔

وہ اٹھی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔ اجمل خان کا بایاں ہاتھ خاصا زخمی ہوا تھا۔ اس پر غالباً چاچا ابراہیم نے اپنا ایک پرانا کرتہ پھاڑ کر باندھ دیا تھا۔ یہ کرتہ بھی خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ اجمل خان کے چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ شانی نے جلدی جلدی اسے ٹٹولا۔ اجمل خان سینہ تان کر بولا۔ ''امارا بہن! ام بالکل ٹھیک ہے۔ کچھ نہیں ہوا ام کو اور تم نے بہت عقل مندی کیا کہ بچہ لوگ کو لے کر اوپر چلا گیا۔''

شانی نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ چند ہی منٹ میں پورا گھر تباہ حال دکھائی دینے لگا تھا۔ ان صفا چٹ سروں والے جنونی افراد نے کلہاڑیاں چلا چلا کر بہت کچھ برباد کر دیا تھا۔ دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ چمڑے کے صندوق ادھڑے ہوئے تھے اور الماریوں کے تختوں پر کلہاڑیوں کے نشان تھے۔

مُنا ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور شانی سے لپٹ گیا۔ شانی اس کو چومنے لگی۔ ڈولا اور چاچا ابراہیم بھی بہ خیریت تھے۔ بے جی گھر میں موجود ہی نہیں تھیں۔ ''یہ کیا چکر ہو رہا ہے اجمل خان! یہ کون لوگ ہیں؟ کس چکر میں ہیں؟'' شانی روہانسی آواز میں بولی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ لوگ صرپ میم جی کا بات کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کا معاملہ صرپ میم جی اور ان کے شوہر وغیرہ سے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ میم جی سے زیادہ اس کے شوہر کو ڈھونڈ رہا ہو...... یا پھر دونوں کو۔''

''تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''ان میں سے ایک بندہ کہہ رہا تھا... ام ان حرامیوں کو بچ کر نہیں جانے دے گا...... مطلب یہ کہ ان کو میم صیب کے علاوہ بھی کسی کا تلاش ہے۔''

اجمل خان کے ہاتھ میں ابھی تک رسّی کی بندش دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے دانتوں سے گرہ کھول کر رسی کلائی سے علیحدہ کر دی اور نشان زدہ کلائی کو مسلنے لگا۔ معلوم ہوا کہ

حملہ آوروں نے اجمل خان کو بے بس کرنے کے بعد سن کی رسّی سے باندھ دیا اور پھر سارے گھر میں اودھم مچایا۔ وہ بہت طیش میں دکھائی دیتے تھے لیکن سارے گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد ان کا غصہ کچھ ماند پڑ گیا تھا اور وہ جاتے جاتے اجمل خان کی سیون ایم ایم رائفل بھی واپس پھینک گئے تھے۔

چاچا ابراہیم کا یہ گھر اور احاطہ (فارم) چونکہ باقی بستی سے تھوڑا سا ہٹ کر تھا، اس لئے یہاں ہونے والے ہنگامے کی خبر اردگرد کے لوگوں کو نہیں ہو پائی تھی۔ شریف کے دونوں بیٹے جو احاطے میں سوتے تھے وہ بھی اس گڑبڑ سے بے خبر ہی رہے تھے۔ شانی نے اجمل کے بہت منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی کی۔ مرہم پٹی کے دوران میں وہ مسلسل باتیں بھی کر رہے تھے۔

اجمل خان نے کہا۔ "شانی بہن! اگر آپ کا اجازت ہو تو ام کل صبح ہی اس خبیث ناگی کو ڈھونڈ کر اس کا طبیعت صاف کر دیتا ہے۔ یہ پکا پکا بات ہے کہ وہ ان لوگوں سے ملا ہوا ہے جنہوں نے آج امارے گھر کا کباڑا کیا ہے۔ اسے اس سارے معاملے کا ایک ایک خبر ہوگا۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید اب یہ لوگ یا ناگی دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

"وہ ناگی تو ضرور آئے گا۔ ام نے اس کی آنکھ میں سور کا بال دیکھا ہے۔ ویسے شانی بہن! امارے ذہن میں ایک اور بات بھی آ رہا ہے۔" خان نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ شانی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "میم صیب کا شوہر یہاں کسی کام میں مصروف ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ کسی پودے کی تلاش میں ہے اور اس کے بارے میں کھوج کر رہا ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس پودے کی کھوج لگانے والے ایک پاکستانی اور اس کے بیٹے کو کسی نے انگلینڈ میں بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی لوگ اب یہاں پر بھی میم جی کے شوہر اور میم جی کا دشمن بنا ہوا ہو۔"

اجمل خان کی سوچ عموماً دور کی کوڑی لاتی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہی بات شانی کے ذہن میں تھی۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا اور گہری سوچ میں گم دکھائی دینے لگی۔ اجمل خان دلیر اور معاملہ فہم شخص تھا مگر ناصر اور رستم کی غیر موجودگی میں شانی خود کو فکرمند محسوس کر رہی تھی۔ خاص طور سے رستم کی غیر موجودگی تو اپنے پیچھے ایک بڑا خلا چھوڑ گئی تھی۔ یہ خلا اردگرد کے حالات میں تو محسوس ہوتا ہی تھا، شانی کو اپنی روح کے اندر بھی نظر آتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ رستم کی کمی اتنی شدت سے محسوس کر سکتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں

پکار اٹھی۔۔۔ رستم کہاں ہو تم؟ جلدی واپس آ جاؤ۔ کہیں وقت ہمیں پھر ایک دوسرے سے دور نہ کر دے۔

☆======☆======☆

رستم اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا، ناصر اور شریف بھی اس کے ساتھ تھے۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ایک مسلح پہرے دار ہر وقت گرل والی کھڑکی کے سامنے موجود رہتا تھا۔ انہیں کھانا پہنچانے کے لئے مقفل دروازہ تھوڑی دیر کے لئے کھولا جاتا تھا لیکن پورا نہیں کھولا جاتا تھا۔ دروازے کے دونوں پٹ ایک زنجیر سے منسلک تھے اور بس اتنے ہی کھلتے تھے کہ پانی کا گلاس اور سالن کی پلیٹ وغیرہ اندر آ سکے۔

کل رات انہیں کسی قریبی کمرے سے گریس کے رونے چلانے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔۔۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس کا مشتعل شوہر اس پر تشدد کر رہا ہے۔ پہلے تو گریس کی آواز میں صرف کرب تھا، پھر غیظ و غضب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ غصے کے عالم میں اسٹیفن پر چلا رہی تھی۔ اس کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ وہ اسے چمڑے کی بیلٹ سے پیٹ رہا تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ نیم برہنہ حالت میں تھی۔

آج سارا دن عمارت میں خاموشی طاری تھی۔ اپنی ٹانگ کے آپریشن کے بارے میں رستم اور ناصر میں طویل بحث ہوئی تھی۔ رستم اس بات پر مصر تھا کہ وہ اپنی ٹانگ کے حوالے سے رسک لے گا اور آپریشن کروائے گا۔ بالآخر وہ ناصر کو کسی حد تک قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود ناصر ایک بات بار بار کہہ رہا تھا۔ "بھائی! آپ پھر سوچ لیں۔ یہ معمولی رسک نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا رسک ہے۔"

"یار! تمہارے منہ سے یہ لفظ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔" رستم نے کان کھجائے۔

ناصر کچھ دیر تک خاموش رہا پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔ "اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں شانی بھابی کو کیا منہ دکھاؤں گا جا کر۔"

"گھبراؤ مت۔ میری وفات کے بعد یہ لوگ تمہیں اتنی آسانی سے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔" رستم مسکرایا۔ "بس دعا کرو تجربہ کامیاب ہو جائے۔"

ناصر کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ "بھائی! اگر ہم بے خبر ہوتے تو اور بات تھی، اب ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ان لوگوں نے جس طرح بابے بوٹے کا مدعا غائب کیا ہے اور اب جس طرح ہم سب کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا ہے، اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ یہ خطرناک جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ان سے بُری سے بُری توقع رکھی جاسکتی ہے۔"

"لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا ہے یہ ہماری مجبوری ہے۔ تم خود مان رہے ہو کہ یہ خطرناک لوگ ہیں۔ کیا یہ ہمیں آسانی سے نکل جانے دیں گے؟"

ناصر خاموش ہوگیا رستم کی اس بات میں وزن تھا اور وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسی دوران میں قدموں کی آوازیں ابھریں۔ ڈاکٹر یوسف اور اسٹیفن آتے دکھائی دیئے۔ اسٹیفن کا چہرہ شراب کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ رستم کو اس کی گردن اور چہرے پر چند خراشیں بھی نظر آئیں۔ یقیناً یہ خراشیں اس دھینگا مشتی کا نتیجہ رہی ہوں گی جو کل رات اس نے اپنی بیوی گریس سے کی تھی۔ رستم کو گریس کے لئے فکر مندی پیدا ہونے لگی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھی۔

جارج نامی گارڈ نے کمرے کے دروازے کو بند رہنے دیا اور ناصر کو اشارہ کیا کہ وہ کھڑکی کے پٹ کھولے۔ جالی دار کھڑکی کی دوسری جانب سے ڈاکٹر یوسف نے رستم کے ساتھ بات چیت کی۔ رستم نے بات چیت شروع ہوتے ہی ڈاکٹر یوسف کو بتایا کہ وہ اپنی رضامندی سے اس آپریشن کے لئے تیار ہے۔

اس بات پر یوسف یا اسٹیفن نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا، جیسے وہ رستم کو جتانا چاہ رہے ہوں کہ اس کی رضامندی یا انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کام تو ہر صورت میں ہونا ہی ہے۔ تاہم ڈاکٹر یوسف کا لہجہ قدرے نرم ضرور ہوگیا...... وہ رستم سے مخاطب ہوکر بولا۔

"تمہارا آپریشن کل دوپہر کو ہوگا۔ تم ناشتہ نہیں کرو گے۔ دو تین گولیاں تمہیں رات کو دے دی جائیں گی، وہ کھا لینا۔ ایک دو روٹین کے ٹیسٹوں کے لئے تمہیں آج شام دوسرے کمرے میں لے جایا جائے گا۔ ہمیں دو تین بوتل خون کا انتظام بھی کرنا ہے، اس کے لئے تمہارے دونوں دوستوں کا خون بھی ٹیسٹ کرلیں گے۔"

"ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

شام سے کچھ دیر پہلے رستم کو کمرے سے باہر لے جایا گیا۔ اس کے سینے کا ایکسرے ہوا۔ بلڈ شوگر اور خون کے دیگر ٹیسٹ ہوئے۔ ناصر کا بلڈ گروپ رستم سے مل گیا۔ اس نے خون کا بیگ دیا۔ رات تک آپریشن کی ساری تیاری مکمل ہوگئی۔ ڈاکٹر یوسف اور اسٹیفن نے رستم سے دو تین کاغذات پر دستخط بھی کرائے۔ رستم نے آنکھیں بند کر کے یہ دستخط ٹھونک دیئے۔

اگلے روز دوپہر سے کچھ پہلے ہی رستم کو نہلایا گیا۔ اس کی پنڈلی کے سارے بال مونڈ دیئے گئے اور اسے جراثیم سے بالکل پاک لباس پہنا دیا گیا۔ آپریشن تھیٹر کی طرف

جاتے ہوئے اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا جب کہ ڈاکٹر ناصر کے چہرے پر بلا کی بے قراری تھی۔ شریف کا لمبوترا چہرہ بھی بارہ بجا رہا تھا۔ رستم نے اپنی انگوٹھی، گھڑی اور گلے کی چین ناصر کو سونپتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوگا پیارے۔ لیکن...... اگر...... کچھ ہوگیا تو تمہیں پتا ہی ہے، یہ چیزیں کس کو پہنچانی ہیں۔" فقرہ مکمل کرتے ہوئے وہ مسکرایا۔

ناصر کی آنکھوں میں ناراضگی بھرے آنسو تھے۔

آپریشن تھیٹر میں بہت تناؤ کی کیفیت تھی۔ یہاں کم و بیش چار ڈاکٹرز اور تین نرسیں موجود تھیں۔ ڈاکٹروں میں ایک لیڈی ڈاکٹر تھی اور یہ یقیناً مالینا ہی تھی۔ سب ڈاکٹرز کے چہرے ماسک میں چھپے ہوئے تھے۔

"یہ دیکھو تمہاری بقایا ٹانگ۔" ڈاکٹر یوسف نے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ شیشے کے ایک شفاف کیس میں کسی زردی مائل محلول کے اندر اس کی ٹانگ کا وہ حصہ ڈوبا ہوا تھا جسے وہ کئی ماہ پہلے ناپید سمجھ چکا تھا۔ وہ اس کا پاؤں تھا، وہ اسے کیوں نہ پہچانتا۔ وہ اس کی پنڈلی تھی۔ وہ اس کے لئے اجنبی کیوں ہوتی؟ پنڈلی کے سیاہ بال اور ٹخنے پر پرانی چوٹ کا چھوٹا سا نشان، سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔

جن قیامت کی گھڑیوں میں یہ ٹانگ اس کے جسم سے جدا ہوئی تھی، وہ گھڑیاں پوری حشر سامانی کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ رستم کے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد ریاض ہٹلر نے اس ٹانگ پر تھوکا تھا۔ اس لئے تھوکا تھا کہ یہ ٹانگ اس کے سینے پر ماری گئی تھی۔ اس وقت ریاض کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جنگل میں پھینک دی جانے والی یہ ٹانگ کئی ماہ بعد پھر سے رستم کے جسم سے جوڑنے جانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس رات کے سارے ہولناک مناظر رستم کی نگاہوں میں گھومے اور اس کے ساتھ ساتھ مقصود عرف لڈو کا چہرہ بھی۔ مقصود وہ شخص تھا جو رستم کی ٹانگ کاٹے جانے سے تھوڑی دیر پہلے طیش سے دیوانہ ہوکر ریاض ہٹلر پر جھپٹا تھا۔ اس نے نابینا ہونے کے باوجود ایک چھری سے ریاض پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور نتیجے میں ریاض نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اسے مار ڈالا تھا۔ کچھ دوسری اموات کی طرح اس شخص کی موت بھی رستم کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ مقصود نامی یہ شخص مرتے مرتے اس کے کندھوں پر ایک بہت بڑا قرض چھوڑ گیا ہے۔ ایسا قرض جسے اُتارے بغیر مرنا بھی محال ہے۔

"اب ہم تمہیں انستھیسیا یعنی بے ہوشی کی دوا دیں گے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟" ڈاکٹر یوسف نے کہا۔

''اگر میں کہوں کہ تیار نہیں ہوں تو کیا تم مجھے گھر واپس جانے دو گے؟'' رستم نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

ماسک کے پیچھے ڈاکٹر کے ہونٹ مسکرائے۔ ''تم دلچسپ بندے ہو۔''

اسے انجکشن لگا دیا گیا۔ اس کا ذہن ایکا ایکی تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے لگا کہ وہ سرخ رنگ کی ایک طویل سرنگ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سرنگ گہرائی میں اتر رہی ہے۔ اس سرنگ کے آخری سرے پر کوئی اسے پکار رہا ہے۔ شاید یہ بی بی ہے پھر سب کچھ گھپ تاریکی میں ڈوب گیا۔

رستم کے حواس نہ جانے کتنی دیر بعد بحال ہوئے تھے۔ اسے لگا کہ اسے اسٹریچر پر کسی اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کا گلا بالکل خشک تھا اور ٹانگ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے نیم بے ہوش ذہن نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مر چکا ہو اور اسے بھی بابے بوٹے کے پہلو میں دفن کرنے کے لئے پچھواڑے کے درختوں میں لے جایا جا رہا ہو۔ اس نے اپنی سلامت ٹانگ کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ ٹانگ نے حرکت کی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔

اگلے آٹھ دس گھنٹے تک وہ انستھیسیا کے ناگوار اثر میں رہا۔ اسے متلی ہو رہی تھی۔ اسے خون کی بوتل کے علاوہ گلوکوز کی ڈرپ بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک نرم ہاتھوں والی لڑکی اسے گاہے بگاہے انجکشن بھی لگا دیتی تھی۔ یہ ایک نیلی چھت والا کمرہ تھا اور ڈھلوان چھتوں پر برسنے والی موسلا دھار بارش کی آواز یہاں تک تب ہی پہنچتی تھی جب کوئی دروازہ کھولتا تھا۔ آہستہ آہستہ رستم کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی۔ اسے نرم ہاتھوں والی لڑکی نے چمچ کے ذریعے جوس وغیرہ پلایا۔ اس کی زخمی ٹانگ نادیدہ شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

یہ اگلی رات قریباً ڈھائی تین بجے کا وقت تھا جب اسے اپنے اردگرد ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔ دروازے تیزی سے بند ہوئے اور کھلے۔ ایک دو چلاتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ پھر عمارت کے کمپاؤنڈ کی طرف جیپوں کے سٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں۔ وہ نیم بے ہوشی و نیم غنودگی کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ نرم ہاتھوں والی نرس، ایک دوسری نرس کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ دونوں رستم کے سرہانے کی طرف کھڑی تھیں۔

نرم ہاتھوں والی نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ دو تین گھنٹے پہلے ہی بھاگ گئی تھی۔ ان دونوں کو پتا اب چلا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو وہ پھر کہاں پکڑی جائے گی۔ ویسے اچھا ہی ہے نکل جائے۔ پچھلے دو دن میں بڑی مار کھائی ہے بے چاری نے۔ موٹی بیلٹ سے مار مار کر جسم نیلا کر دیا تھا اسٹیفن صاحب نے۔ یہ مرد جب اپنی بہادری دکھانے پر آتے ہیں تو بالکل چنگیز خان بن جاتے ہیں۔''

''کیا وہ پولیس کے پاس جائے گی؟'' دوسری نرس نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا لیکن اب کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔'' پہلی نرس نے سرگوشی کی۔

رستم پر انکشاف ہوا کہ یہ گفتگو گریس کے بارے میں ہو رہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ گریس کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ بہرحال اتنی عقل تو وہ بھی رکھتی تھی کہ وہ پولیس کے پاس نہیں جا سکتی۔ ویسے بھی بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان ان خاموش وادیوں میں پولیس تک پہنچنا کون سا آسان کام تھا۔ یہ ممکن تھا کہ گریس کسی طرح بچ بچاتی چاچا ابراہیم اور اجمل خان تک جا پہنچتی۔ ایسے میں اس نے اجمل خان کو بتانا تھا کہ رستم سخت خطرے میں ہے۔ اس کا شوہر جھوٹا ثابت ہوا ہے اور وہ رستم کو ایک نہایت خطرناک آزمائش سے گزار رہا ہے۔ ایسے میں اجمل خان سے کوئی بے وقوفی بھی سرزد ہو سکتی تھی۔ اگر وہ جوش کے عالم میں اس عمارت پر چڑھ دوڑتا تو بہت نقصان اٹھا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ صورتِ حال خود رستم کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی۔

دونوں نرسیں مسلسل سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک نے کہا۔ ''گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اسٹیفن نے بہت شور مچایا تھا۔ بعد میں چھوٹا روی کتا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ میڈم اسی وقت یہاں سے نکلی ہیں۔''

دوسری بولی۔ ''میں خود دیکھ کر آئی ہوں۔ باتھ روم کی چھوٹی کھڑکی کی جالی کاٹ کر راستہ بنایا گیا ہے۔ اس تنگ جگہ سے نکلنا کسی عام عورت کے بس کی بات نہیں۔ میڈم ایک دم سمارٹ اور پھرتیلی ہے۔ اس نے پہلے اپنا اوپر کا دھڑ کھڑکی میں سے گزارا اور پھر دوہری ہو کر لٹک گئی اور باہر نکل آئی۔''

''بڑی جلدی تعلقات خراب ہوئے ہیں میاں بیوی کے۔ چار پانچ دن پہلے جب میڈم یہاں آئی تھی تو دونوں سب کے سامنے kiss وغیرہ کرتے رہے تھے۔''

اسی دوران میں ڈاکٹر رابرٹ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا اور دونوں نرسیں خاموش ہو گئیں۔ رستم نیم وا آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر رابرٹ نے سب سے پہلے رستم کے وائٹل سائنز چیک کئے پھر ٹانگ کا معائنہ کیا۔ نرسوں نے ٹانگ کے دو تازہ ایکسرے بھی اسے

دکھائے۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ نرسوں کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

رستم جانتا تھا، آپریشن کے بعد اس کا ہوش میں آ جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل مرحلہ تو آپریشن کے بعد کا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا جسم کٹی ہوئی ٹانگ کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر ناصر اور گریس نے زہر پھیلنے کی بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ خاص قسم کا زہر لا علاج ہے۔

عمارت کے طول و عرض میں اب بھی افراتفری محسوس کی جا سکتی تھی۔ رستم نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ گریس کے یہاں سے نکل بھاگنے کے بعد یہ لوگ جگہ بدلنے کی کوشش کریں۔ یعنی اپنی اس ''تجربہ گاہ'' کو اٹھا کر کہیں اور لے جائیں۔ رستم کا خیال تھا کہ اگر ایسی کوئی صورتِ حال سامنے آنی ہوگی تو ابھی ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی۔

رستم نے سر تکیے سے اوپر اٹھایا اور اپنی ٹانگ پر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ٹانگ مکمل نظر آ رہی تھی تاہم مختلف قسم کے شکنجوں اور خاص قسم کی دھاری دار پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کو محسوس کرنے اور حرکت دینے کی کوشش کی مگر وقتی طور پر ناکام رہا۔ ہاں یہ احساس اسے ضرور ہوا کہ اس کے جسم کا گمشدہ حصہ ایک بار پھر اس کے جسم کے ساتھ ہے۔

پانچ چھ گھنٹے مزید گزر گئے۔ کوئی نئی اطلاع رستم کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ وہ ناصر اور شریف کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا۔ اس نے ایک دو بار نرس سے ان کے بارے میں پوچھا بھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غالباً نرسوں کو سختی کے ساتھ کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اس سے بات نہیں کریں گی۔ فیصل آباد کا بھکاری بابا بوٹا تو اپنے جیون سے ہاتھ دھو چکا تھا، ہاں اس کے دونوں ساتھی ابھی حیات تھے۔ ایک دن کی ابتر حالت کے بعد اب وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے رستم نے فربہ اندام بوڑھے اے بی تراب کو اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ کھڑکی کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ جواں سال لڑکی نے انتہائی ہیجان خیز لباس پہن رکھا تھا بلکہ اسے لباس کہنا بھی غلط تھا۔ وہ اسی حالت میں خمیری روٹی جیسے پھولے پھولے بے ڈول بابے کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور بابا جی بھی جوان نظر آنے کی کوشش میں اس پر لدے ہوئے تھے۔ اب اندرونی کمرے سے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ پیانو بجانے والا یقیناً وہی پیرِ فرتوت تھا جس کا نام بابے بوٹے نے نذیر احمد بتایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ نذیر احمد برسوں برس قوالوں کے ساتھ ہارمونیم بجاتا رہا ہے۔ اب یہاں پہاڑ کی چوٹی پر اس قدیم

عمارت میں یہ عمر رسیدہ شخص خود تنے نویلے ہارمونیم کی طرح بج رہا تھا اور اس میں سے شوخ چنچل سُر نکل رہے تھے لیکن یہ سب کچھ فطری نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کیمسٹری تھی اور سپ گندل نامی حیرت انگیز پودے کے اثرات تھے۔ یہ دونوں معمر افراد اس حقیقت سے یکسر بے خبر تھے کہ ان کا تیسرا دوست کہاں ہے۔ ان کے علم کے مطابق وہ واپس جا چکا تھا لیکن وہ ان کے بالکل قریب موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کی طرح زمین کے اوپر نہیں تھا۔

اس روز رات کو رستم کے پُر زور اصرار پر ڈاکٹر یوسف نے چند منٹ کے لئے ناصر اور شریف کو باری باری رستم سے ملنے دیا۔ اس مختصر ملاقات کے دوران میں بھی گرانڈیل گارڈ جیکب آسیب کی طرح ان کے قریب موجود رہا۔ ناصر اور شریف نے اپنے اپنے انداز میں رستم کو تسلی دی اور یہ ظاہر کی کہ وہ جلد ہی ٹھیک ہو کر ان کے پاس موجود ہوگا۔ رستم ناصر سے گریس کے فرار اور باہر کے حالات کے متعلق دریافت کرنا چاہتا تھا مگر جیکب کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ بے حد بد دماغ اور بد اخلاق شخص تھا، ذرا ذرا سی بات پر جنگلی جانور کی طرح پھنکارنے لگتا تھا۔

رات آخری پہر رستم کی آنکھ کھلی تو اسے اندازہ ہوا کہ اسے بخار ہے۔ اس کا سارا جسم تپ رہا ہے اور گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس نے پانی مانگا۔ نرس کچی نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی اور رستم کو پانی پلایا۔ رستم کو لگا کہ اس کی ٹانگ بھی بوجھل ہے اور اس میں ہلکا درد ہو رہا ہے۔ ایکا ایکی اس کا دل سینے میں زور سے دھڑک کر رہ گیا۔ کہیں معاملات خرابی کی طرف جانا تو شروع نہیں ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر یوسف نے اسے تاکید سے کہا تھا کہ وہ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت کے بارے میں فوراً آگاہ کرے۔

اس نے نرس سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ بخار ہو گیا ہے۔''

اس نے فوراً تھرمامیٹر اس کی بغل کے نیچے دے دیا اور بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔

''ٹانگ کا کیا حال ہے؟'' نرس نے پوچھا۔

''ٹانگ ٹھیک ہے لیکن ذرا بوجھ محسوس ہو رہا ہے۔''

ٹمپریچر چیک کرنے کے بعد نرس فوراً اپنی اونچی ایڑیوں پر ٹھک ٹھک کرتی باہر چلی گئی۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی تو ڈاکٹر یوسف بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا، بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے کمرے کی ساری روشنیاں جلا دیں۔ فائل دیکھنے کے بعد وہ سب سے پہلے رستم کی ٹانگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ پٹیاں ہٹائیں۔ ٹانگ کو چھوا۔ اُسے کسی خاص جگہ سے دبا دبا کر دیکھا۔ اس کے بعد پٹیاں دوبارہ

لپیٹ دیں۔

''پریشانی کی بات نہیں ہے، ٹانگ فی الحال ٹھیک نظر آ رہی ہے۔ میں بخار اور درد کی دوا دے دیتا ہوں۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس مرحلے میں یقین سے وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید صبح ڈاکٹر رابرٹ کے ساتھ ٹانگ کے تفصیلی معائنے کے بعد ہی وہ کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا۔

رستم کے ذہن میں وہ فقرات گونجنے لگے جو اس کے آپریشن کے حوالے سے ادا کئے گئے تھے۔ زندگی کا امکان چالیس فیصد، موت کا امکان ساٹھ فیصد۔

ڈاکٹر یوسف نے اپنے ہاتھوں سے ایک انجکشن تیار کر کے رستم کو لگایا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

ابھی آخری لفظ اس کے منہ میں ہی تھا کہ ایک دم بھونچال سا آ گیا۔ اندرونی کھڑکی کا جہازی سائز شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹا اور دو سائے تڑپ کر اندر داخل ہو گئے۔ نرس دہشت سے چلائی اور دواؤں والی ٹرے اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اسی دوران میں کمرے کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔ ایک شخص توپ کے گولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں رستم کو اس کی ایک جھلک ہی نظر آ سکی۔ اس کے سر کے بال منڈھے ہوئے تھے۔ داڑھی جھاڑ جھنکاڑ اور گرد آلود تھی۔ وہ ایک لمبا چوغہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی چمک دار کلہاڑی بھی رستم کو دکھائی دی۔

رستم نیم دراز تھا۔ مڑ کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شیشہ توڑ کر اندر گھس آنے والے افراد نے ڈاکٹر یوسف کو فرش پر گرا لیا ہے اور بے دریغ مار رہے ہیں۔ نرس دہشت سے چلاتی ہوئی بھاگی۔ ''رک جا...... رک جا۔'' کوئی رستم کے سرہانے کی طرف سے گرجا پھر رستم نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اُڑتی ہوئی سی نوجوان نرس کے تعاقب میں گئی اور اس کے دونوں کندھوں کے عین درمیان یوں پیوست ہو گئی جیسے خشک لکڑی میں پیوست ہوئی ہو۔ نرس کرب سے چیخ مار کر اوندھے منہ چکنے فرش پر گری اور دور تک پھسل گئی۔ رستم نے اس کی رسٹ واچ کو ٹوٹ کر ایک آبنوسی تپائی کے نیچے گھستے دیکھا۔ خون کے فوارے نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی سفید قمیص کو پشت سے سرخ کر دیا۔

یہ قیامت خیز ہنگامہ کوئی اس کمرے تک ہی محدود نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس پوری عمارت میں قیامت صغریٰ برپا ہو گئی تھی۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے، دروازے دھماکوں سے کھل رہے تھے۔ خوفناک للکاروں سے در و دیوار لرزنے لگے تھے۔ حملہ آوروں میں سے اکثر کے

سر صفا چٹ تھے اور چہروں پر خود رَو داڑھیاں تھیں۔ وہ کلہاڑیوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ ان کے حملے میں ایسی تیزی اور وحشت تھی کہ گارڈز وغیرہ کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

رستم نے بہت کوشش کی اور اپنے اسپرنگ دار بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن ٹانگ سے اٹھنے والی ٹیسیں اسے اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دے رہی تھیں کہ وہ بستر سے اترتا۔ کمرے کے دروازے کے عین سامنے اس نے ایک وردی پوش گارڈ کو دیکھا۔ وہ نیند سے جاگ کر بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس نے اپنا ماؤزر ایک کلہاڑی بردار کی طرف سیدھا کرنا چاہا تاہم اس سے پہلے ہی دائیں جانب سے ایک کلہاڑی بردار جھپٹا۔ اس نے پنجوں کے بل اٹھ کر کلہاڑی کا ایسا زوردار وار گارڈ کے سر پر کیا کہ پھل کئی انچ تک بدقسمت گارڈ کی کھوپڑی میں گھس گیا۔ پہلے اس کی رائفل گری پھر وہ خود گرا۔ حملہ آور نے پاؤں گارڈ کی گردن پر رکھا اور ایک جھٹکے سے پھل اس کے سر میں سے نکال لیا۔ گارڈ جان کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ پھر اوپر تلے دو دھماکے ہوئے۔ یہ لحیم شحیم اسٹیفن تھا جس نے گارڈ کو ہلاک کرنے والے کلہاڑی بردار کو نشانہ بنایا تھا۔ اسٹیفن کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

ایک دوسرے کلہاڑی بردار نے سیڑھیوں پر سے جست لگا کر اسٹیفن پر حملہ کیا۔ اسٹیفن نے دلیری سے کلہاڑی کا وار اپنی رائفل پر روکا۔ دوسرے کلہاڑی بردار کا وار اس نے جھک کر بچایا اور اس کے پیٹ میں زوردار ٹانگ رسید کی۔ پہلے حملہ آور نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ اسٹیفن سے لپٹنا چاہا۔ اسٹیفن پھرتی کا مظاہرہ کر کے نیچے جھک گیا اور حملہ آور کو اپنے اوپر سے گزار کر دیوار پر پٹخ دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی انگلش رائفل سیدھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، حملہ آوروں کی طرف سے کسی فرد نے گولی چلائی اور اسٹیفن اپنی ٹانگ پکڑتا ہوا لکڑی کے فرش پر گر گیا۔

''پکڑو پکڑو...... ان کتوں کو۔'' ایک جانب سے للکار سنائی دی۔

رستم نے پلٹ کر دیکھا۔ موٹے بھدے جسم والا اے بی تراب اب بالکل عریاں حالت میں مضحکہ خیز انداز میں بھاگتا ہوا برآمدے کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے چند قدم آگے اس کی ساتھی لڑکی تھی۔ وہ بھی مادر زاد برہنہ تھی۔ جنونی حملہ آور کلہاڑیاں لہراتے اور چنگھاڑتے ہوئے ان دونوں کے پیچھے لپکے...... آگے پیچھے دوڑتے وہ چند لمحوں میں رستم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اسٹیفن کو بھی حملہ آوروں نے دبوچ لیا اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ اس کی زخمی ٹانگ اس کے پیچھے خون کی لکیر بناتی جا رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد رستم نے محسوس کیا کہ وحشی حملہ آور آپریشن تھیٹر میں خوفناک توڑ پھوڑ مچا

رہے ہیں۔ ان کی کلہاڑیوں کی بے دریغ ضربیں ہر شے کو چکنا چُور کر رہی تھیں۔ اس توڑ پھوڑ کے دوران میں ڈاکٹر رابرٹ کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”اسٹاپ اِٹ...... فار گاڈ سیک اسٹاپ اِٹ۔“

چند سیکنڈ بعد رابرٹ کی آواز بھی بند ہو گئی۔ پتا نہیں کہ اسے کلہاڑی سے خاموش کرایا تھا یا ویسے ہی اس کا منہ دبا لیا گیا تھا۔

بڑھی ہوئی شیو اور لمبے بازوؤں والا ایک قومی ہیکل شخص رائفل سونت کر رستم کے سامنے آیا۔ چند سیکنڈ کے لئے محسوس ہوا کہ وہ رستم کو اُڑا ڈالے گا مگر پھر اس کی جنونی نگاہ رستم کی شکنجوں میں جکڑی ہوئی ٹانگ پر پڑی۔ اس نے ارادہ بدل دیا اور عمارت میں توڑ پھوڑ مچانے کے لئے اپنے ساتھیوں کے پیچھے لپک گیا۔

یہ کون لوگ تھے؟ کیا چاہ رہے تھے؟ رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے اپنے دونوں ساتھیوں کی فکر بھی تھی۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھے۔

اچانک ایک دہاڑتی ہوئی آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ ”لاؤ اس حرامی کو یہاں...... کمرے کے درمیان میں لے آؤ۔“ لب و لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ اس قسم کے لہجے وادی سون اور سون کے ارد گرد پائے جاتے تھے۔

رستم نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ چند افراد ڈاکٹر رابرٹ کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے کامن روم کے وسط میں لے آئے۔ ڈاکٹر رابرٹ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ تاہم یہ دھاری دار سوٹ اب فقط دھجیوں کی صورت میں اس کے جسم پر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کے پاؤں ایک ازار بند سے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی باندھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ پوری جدوجہد کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ نہ باندھے جا سکیں۔

تین چار افراد نے اس کے ہاتھ باندھے بغیر ہی اسے الٹا کر کے بے دردی سے فرش پر پٹخ دیا اور پوری طرح اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔ یہ عین یہی محسوس ہوا کہ وہ کوئی جانور ہے جسے گلا کاٹ کر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ رابرٹ دھمکی آمیز زبان بول رہا تھا...... پھر اچانک اس نے منت سماجت والا لہجہ اختیار کر لیا۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی تھی۔ پتا نہیں وہ انگریزی میں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی نفیس عینک کھسک کر اس کی تھوڑی پر آ گئی تھی۔ ایک کلہاڑی بردار نے اس کی عینک اُتاری اور نفرت سے دور پھینک دی۔ رابرٹ کے چہرے پر دہشت کے ساتھ ساتھ بے پناہ حیرت بھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بپھرے ہوئے افراد اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ بہر حال یہ بات تو طے تھی کہ وہ جو کچھ بھی کریں گے المناک

ہوگا۔ وہ گھگھیاتی ہوئی آواز میں بول رہا تھا، کبھی فرطِ دہشت سے چلانے لگتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا اچانک اور ناقابلِ یقین تھا کہ رستم جیسا شخص بھی سناٹے میں رہ گیا۔ جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی جو پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک چلی گئی۔ صفاچٹ والا ایک کیم شحیم شخص آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بالکل چھوٹے دستے والی ایک کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا پھل بھی مختلف شکل کا تھا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبا پھل، دھار کی طرف سے نیم گول تھا۔ کلہاڑی بردار شخص کے پیچھے ایک اور شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں بالکل سفید لٹھے کا ایک دو گز لمبا ٹکڑا تھا۔ کلہاڑی بردار نے ڈاکٹر رابرٹ کی ٹھوڑی اپنے بائیں ہاتھ میں جکڑی اور دائیں ہاتھ سے کلہاڑی کے پھل کو چھری کی طرح رابرٹ کی گردن پر چلایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا تھا۔ یہ سب کچھ جیسے آسمانی بجلی کی چمک سے مشابہ تھا۔ رابرٹ کی گردن ہڈی تک کٹ گئی اور شہ رگ سے خون کا فوارہ نکل پڑا۔ خون نکلتے دیکھ کر ارد گرد موجود افراد نے بھی زوردار نعرہ لگایا۔

رستم سناٹے میں تھا۔ رابرٹ اس کے عین سامنے...... قریباً پانچ میٹر کے فاصلے پر اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ ایک قابل ترین سرجن تھا جس سے اپوائنٹ منٹ لینے کے لئے کروڑ پتی افراد کو بھی دنوں انتظار کرنا پڑتا ہوگا۔ اس کے نشتر کی ایک حرکت سے زندگی اور موت کے راستے کھلتے ہوں گے۔ وہ ہوس زر کی ڈور سے بندھ کر یہاں اتنی دور اس ملک میں اور پھر ان بلند پہاڑوں میں پہنچا تھا اور آج اس ابر آلود رات میں اس ٹھنڈے فرش کے اوپر اس کا پھڑکتا جسم خون سے خالی ہو رہا تھا۔

”نقش لو اس کا۔“ ایک بڑے سر والا شخص تحکم سے بولا۔

سفید لٹھے والا آگے بڑھا اور کپڑا مقتول کے قریب فرش پر بچھا دیا۔ بڑے سر والے نے مقتول کا دایاں ہاتھ اسی کے خون سے تر کیا اور ہتھیلی کی چھاپ سفید کپڑے پر بنا دی۔ ارد گرد موجود لوگوں نے ایک بار پھر نعرہ بلند کیا۔

کچھ دیر پھڑکنے کے بعد رابرٹ کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کی دہشت زدہ بے نور نیلی آنکھیں حیرت سے خلا میں گھور رہی تھیں۔ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا اور کمرے کے ایک کونے میں اس مُردہ نرس کے قریب ڈال دیا گیا جس کی کمر میں کندھوں کے درمیان ابھی تک چھوٹے دستے کی کلہاڑی پیوست تھی۔

”لاؤ دوسرے حرامی کو بھی۔ اسانوں (ہمیں) اس کا نقش بھی چاہیے۔“

اس دفعہ لمبے چوغوں والے حملہ آور جس شخص کو گھسیٹتے ہوئے کمرے کے وسط میں لائے

وہ کوئی اور نہیں اس عمارت کا ہیڈ گارڈ جیکب تھا۔ زیادہ تر یہی سفید فام جیکب اپنے ری پیٹر کے ساتھ رستم، ناصر وغیرہ کے پہرے پر رہتا تھا۔ وہ اندھا دھند وہسکی پیتا تھا اور عورت بازی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ عمارت کی ایک جواں ملازمہ کو آتے جاتے چٹکیاں کاٹنا اور جنسی طور پر ہراساں کرنا جیکب کا دل پسند مشغلہ تھا۔ آج وہ خود ایک ''مشغلے'' کی زد میں تھا۔ یہ خونی مشغلہ تھوڑی ہی دیر میں جیکب کی جان لینے والا تھا۔

یہاں تک پہنچنے سے پہلے جیکب اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ وہ غالباً حملہ آوروں کو یہ بتا رہا تھا کہ وہ تو صرف ایک تنخواہ دار ملازم ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ یہاں کیا ہوتا ہے اور کون کرتا ہے۔ وہ بالکل بے قصور ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب یہاں پہنچنے کے بعد اس نے ڈاکٹر رابرٹ اور نرس کی لاشیں دیکھیں اور خون سے سرخ فرش پر اس کی نگاہ پڑی تو اس کا خوف اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلانے لگا اور حملہ آوروں کی ناقابلِ شکست گرفت میں پھڑکنے لگا۔ اس کی تڑپ دیدنی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لوگ اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ رابرٹ کی کٹی ہوئی گردن اسے سب کچھ سمجھا رہی تھی۔

حملہ آوروں نے اسے بھی قربانی کے جانور کی طرح فرش پر پٹخ دیا۔ تین اطراف سے دبوچ کر بالکل بے بس کر دیا۔ وہ ناقابلِ شناخت آوازوں میں چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ انسانی آواز ہی نہیں ہے۔ ہٹے کٹے شخص نے نیم گول پھل والی کلہاڑی کی دھار دیکھی اور اطمینان سے جیکب کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رستم نے اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر خواہ مخواہ اپنے لئے تکلیف کا سامان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وحشی نعرے اور بکرے کی طرح چلانے کی آواز ایک ساتھ بلند ہوئی۔ رستم سمجھ گیا کہ جیکب بھی ڈاکٹر رابرٹ کے پاس پہنچ چکا ہے۔ نعرے کے جواب میں باقی افراد نے بھی ہم آہنگ ہو کر کوئی آواز بلند کی۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ جیکب کا جسم آہنی ہاتھوں کی گرفت میں لرز رہا تھا۔ اس کی شہ رگ سے ابھی تک خون کی ہلکی ہلکی پچکاریاں نکل رہی تھیں۔ بڑے سر والے شخص نے مقتول کی ہتھیلی کو اسی کے خون سے سرخ کیا اور لٹھے کے کپڑے پر چھاپ دیا۔

رستم نے جنگ و جدل کے بہت سے منظر دیکھے تھے، اس کے اپنے ہاتھوں سے بھی بہت سے لوگ قتل ہوئے تھے لیکن یہ عجیب و غریب مناظر سب سے جدا تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی ڈراؤنی فلم کے مناظر دیکھ رہا ہے۔

وہ بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سوچا اگر خدانخواستہ

اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ بھی کوئی ظالمانہ سلوک کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کیا کرے گا؟ کیا تب بھی وہ تماشائی بنا رہے گا؟

پھر اس کے دل کے اندر سے ہی آواز آئی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں کہا تو اس کے ساتھیوں کو بھی نہیں کہیں گے۔ ان کا سارا غیظ و غضب غالباً سفید فاموں کے لئے تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی دشمنی چکا رہے تھے۔ یہ کیا دشمنی تھی؟ کیا اس کا تعلق نایاب پودے سپ گندل سے تھا، یا یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ قریبی کمروں سے ابھرنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں معمر افراد اور ان کی ساتھی لڑکیاں بھی پکڑی گئی ہیں۔ اب یہ لوگ حملہ آوروں کی تحویل میں تھے۔

حملہ آوروں کا تیسرا شکار نیکر پوش ڈاکٹر مالینا تھی جو ہمہ وقت عمارت میں اپنے ہوش رُبا جسم کی نمائش کرتی پھرتی تھی۔ ناصر کی اطلاع کے مطابق وہ ماہر جنسیات تھی۔ یعنی وہ خود ہی ڈاکٹر تھی اور خود ہی بیماری بھی تھی۔ اب یہ ڈاکٹر یا ''بیماری'' حملہ آوروں کی بے پناہ گرفت میں تھی اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے قتل گاہ کی طرف لا رہے تھے۔ ان کے لئے وہ عورت نہیں تھی، نہ ہی جوان خوب صورت عورت تھی۔ ان کے لئے وہ صرف ایک مجرم تھی اور وہ اسے اپنے مروجہ قاعدے کے تحت موت کے گھاٹ اُتارنے جا رہے تھے۔ فضا میں سفاکی کا راج تھا اور ہوا میں لہو کی بُو تھی۔ مالینا کا رنگ اس لٹھے ہی کی طرح سفید تھا جس پر مقتولوں کے ہاتھ کی چھاپ لگائی جا رہی تھی۔ کھینچا تانی میں مالینا کی سرخ شرٹ پھٹ گئی تھی۔ وہ ایک طرف سے برہنہ ہو رہی تھی مگر اس کو اپنی برہنگی کی پرواہ نہیں تھی۔ شاید وہ مکمل برہنہ ہوتی تو بھی اسے احساس تک نہ ہوتا۔ ان لمحوں میں اسے صرف اپنی زندگی کی پرواہ تھی۔ زندگی جو شہد سے میٹھی، پھولوں سے بڑھ کر خوشبودار اور چاند تاروں سے زیادہ چمکیلی تھی۔

دو توانا افراد نے مالینا کو گڑیا کی طرح اٹھایا اور فرش پر پٹخ دیا۔ وہ درد سے چیخی۔ اسے دبوچ لیا گیا۔

وہ بس پکارتی جا رہی تھی۔ ''فار گاڈ سیک......فار گاڈ سیک۔''

ان لمحوں میں اگر اسے کہا جاتا کہ وہ ان بدبُودار گنوار حملہ آوروں کے قدموں میں سر رکھ دے، یا اپنی زبان سے ان کے خارش زدہ پاؤں چاٹے تو وہ اپنی زندگی بچانے کے لئے شاید ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کرتی۔ اس کی بے پناہ عقل، دولت، مرتبہ اور علم سب کچھ ان لمحوں میں بے کار تھا۔ وہ عقابوں کے پنجے میں آئی ہوئی چڑیا کی طرح بے بس تھی۔

رستم کے لئے یہ سب کچھ دیکھنا محال ہو رہا تھا۔ بے شک وہ دشمن تھی۔ اس نے اور اس

کے ساتھیوں نے رستم و ناصر کو یہاں دھوکے سے بلایا تھا اور یہاں حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ وہ اس عمارت میں جو کچھ کر رہے تھے، وہ بھی سب ناجائز تھا لیکن جو کچھ اب یہاں ہو رہا تھا اسے بھی جائز کہاں کہا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر مالینا کی یہ تذلیل رستم سے برداشت نہیں ہوئی۔

''سنو۔'' وہ اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے پکارا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ اسے کیوں مار رہے ہو؟''

بڑے سر والے نے رستم کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف آیا۔ ''چپ کر کے بیٹھ۔ نہیں تے تیڈا بھی گھاٹا اُتر جائے گا۔'' اس نے خون آلود کلہاڑی کا نیم گول پھل رستم کی گردن پر رکھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم نے مردوں کو مار دیا ہے۔ پر یہ ایک عورت ہے...... ایک کمزور عورت ہے۔''

''یہ کمزور عورت تیڈی ماں لگتی ہے۔'' بڑے سر والے نے کلہاڑی کا دباؤ رستم کی گردن پر بڑھایا۔

خود رَو داڑھی والا ایک رائفل بردار رائفل تان کر رستم کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ بڑے سر والا دوبارہ مالینا کی طرف بڑھا۔ مالینا پہلو کے بل لیٹی تھی اور بے بس تھی۔ بڑے سر والا بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے مالینا کی سرخ شرٹ پھاڑ دی۔ مالینا کی پسلیوں پر تازہ چوٹ کا نشان تھا اور خون رِس رہا تھا۔ اس کے باقی جسم پر بھی کھینچا تانی کی خراشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ کسی وقت اس کا جوان جسم رات کے ریشم میں نگینے کی طرح دمکتا ہوگا اور بڑوں بڑوں کی بتی گل کرتا ہوگا لیکن اب موت کے خوف سے زرد ہو کر سکڑ سمٹ گیا تھا۔

کچھ دیر تک مالینا کو گھورنے کے بعد بڑے سر والے نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ روتی چلاتی مالینا کو اٹھا کر چند قدم پیچھے لے گئے۔ یہاں انہوں نے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر اس کے بالائی جسم کو ایک چادر سے ڈھانپنے کے بعد موقع سے ہٹا لیا گیا۔

رستم نے اندازہ لگایا کہ موت سے فقط چند سیکنڈ پہلے ڈاکٹر مالینا کی جان بخشی ہو گئی ہے۔ اس جان بخشی کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ سوچا جا سکتا تھا کہ بڑے سر والے سرغنہ نے مالینا کی جوانی اور اس کے دلکش جسم کو دیکھنے کے بعد اپنا ارادہ بدل ڈالا ہے۔ جنگ و جدل میں غالب آنے والے لوگ دشمن کی جوان خوب صورت عورتوں کو ہمیشہ موت کی تلوار سے پناہ دیتے ہیں لیکن یہ پناہ کسی رحم دلی یا خدا ترسی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل دوسرے طریقے سے سفاکی اور

وحشت کا ہی تسلسل ہوتی ہے۔ دشمن کی روتی پیٹتی عورتوں کو کھلونا بنا کر اپنی فتح کا نشہ پختہ کیا جاتا ہے۔ کیا یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا؟

ممکن تھا کہ ایسا ہی ہوا ہو لیکن رستم کو لگ رہا تھا کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ مالینا کی سرخ شرٹ پھاڑنے کے بعد بڑے سر والے نے کسی خاص چیز کا مشاہدہ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا تھا۔

عمارت میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ پورچ میں کھڑی نہایت قیمتی جیپوں کو بھی چکنا چور کیا جا رہا ہے۔ دائیں جانب کسی کمرے سے کسی دوسری عورت کے رونے بلکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ ابھی یہاں مزید خون بہایا جانا ہے۔

''اگلے حرامی کو لاؤ۔'' اگلے ''حرامی'' کو لایا گیا لیکن یہ میل نہیں فی میل تھی، سفید فام فی میل۔

یہ اس تیسرے بوڑھے کی ساتھی تھی جو کمرے میں پڑا میوزک سنتا رہتا تھا یا ٹی وی دیکھتا تھا یعنی اے بی تراب۔ جو ابھی تھوڑی دیر قبل فطری لباس میں بھاگتا ہوا نظر آیا تھا۔ اپنے بوڑھے ''ہیرو'' کی طرح یہ لڑکی بھی قدرے فربہ اندام تھی مگر یہ فربہ اندامی زیادہ بھدی نہیں تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے یہ لڑکی بھی ٹھیک تھی۔ رستم کے اندازے کے مطابق اسے لڑکی کے بجائے جواں سال عورت کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ مرنے کے لئے یہ عمر کافی تھوڑی محسوس ہوتی تھی لیکن اسے مرنا تھا اور ابھی سب کے سامنے مرنا تھا۔

وہ بھی اپنا انجام سامنے دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا تھا یہاں اس کمرے میں ڈاکٹر رابرٹ اور گارڈ جیکب کو کس طرح جانوروں کی طرح ذبح کیا جا چکا ہے۔ اب اس کی باری تھی۔ وہ کسی بدکی ہوئی گائے کی طرح حملہ آوروں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس کے دہشت زدہ چہرے پر نگاہ جمانا ایک مشکل کام تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلاتے چلاتے ایک دم خاموش ہو گئی۔ رستم نے چونک کر دیکھا، وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کا بھاری جسم حملہ آوروں کے ہاتھوں میں لٹک کر رہ گیا۔ اس کی بے ہوشی کے باوجود وہی کچھ ہوا جو طے تھا۔ اسے لٹا کر نیم گول پھل والی کلہاڑی سے ذبح کر دیا گیا۔ ایک موٹی ناک والے گہرے سانولے شخص نے دم توڑتی عورت کے کانوں سے اس کے آویزے بے دردی سے کھینچ لئے۔ دوسرے نے اس کے خون آلود گلے سے سونے کی زنجیر توڑ کر اتار لی۔

اسی دوران میں بالائی منزل پر اوپر تلے تین فائر ہوئے اور کرب ناک چیخیں گونجیں۔

شاید جنونی حملہ آوروں نے عمارت کے ایک دو ملازموں کو شوٹ کیا تھا۔ رستم کی حیثیت خاموش تماشائی کی سی تھی لیکن وہ زیادہ دیر خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ اس کی ٹانگ سٹیل کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ جسم بھی تیز بخار میں پھنک رہا تھا پھر بھی اس کی نگاہ ایک چاقو پر تھی۔ بٹن دبانے سے کھلنے والا یہ چاقو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک حملہ آور کے چوغے میں سے گرا تھا۔ دبیز قالین پر گرنے کی وجہ سے آواز پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی کا دھیان اس کی طرف گیا تھا۔ رستم بستر سے اُتر آتا تو یہ چاقو اٹھا کر اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ اس نے اپنی سلامت ٹانگ بستر سے نیچے اُتاری اور چاقو کی طرف بڑھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اچانک رستم کو ڈیزل کی تیز بُو محسوس ہوئی۔ جنریٹر عمارت سے کافی دور تھا۔ یہ بُو وہاں سے نہیں آسکتی تھی۔ تو پھر یہ کہاں سے آرہی تھی؟ بُو پھیلتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رستم کی نگاہ کھڑکی سے باہر ایک شخص پر پڑی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یہ حملہ آوروں کا ہی ساتھی تھا۔ ایک ٹرپل ٹو رائفل اس کے دائیں کندھے سے جھول رہی تھی اور گولیوں والا تھیلا بائیں کندھے پر تھا۔ وہ ایک کین کے ذریعے عمارت کی دیواروں پر ڈیزل تیل چھڑک رہا تھا۔ رستم سمجھ گیا کہ عنقریب اس قدیم عمارت کو آگ لگائی جانے والی ہے۔ یہ بڑی ڈرامائی رات تھی اور عام راتوں سے مختلف بھی تھی۔ بادل مسلسل گرج رہے تھے لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

رات تاریک تھی۔ بادل مسلسل گرج رہے لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آتا تھا۔ کبھی بدلیاں چاند کو ڈھانپ لیتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں شانی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں لیٹے مُنے اور ڈیوس کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور لالٹین کی لَو تھوڑی اونچی کر دی۔ ساتھ والے کمرے میں چاچا ابراہیم اور بے جی سو رہے تھے۔ اجمل خان برآمدے میں تھا۔ شانی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ گریس یا رستم کا ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں رستم کے لئے اس کے دل میں عجیب و غریب اندیشے جاگنے لگے...... وہ کہاں تھا؟ کیوں اس کے بارے میں خبر نہیں مل رہی تھی .. کیوں نہیں؟

دفعتاً وہ چونک گئی۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی تھی۔ رات کے اس پہر دستک؟ وہ حیران ہوئی۔ چاچا ابراہیم پہلے ہی کھانس رہے تھے۔ دستک کی آواز سے فوراً جاگ گئے۔ انہوں نے لالٹین اور لاٹھی سنبھالی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ ''کون ہے بھئی؟'' انہوں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں نور عباسی۔'' باہر سے چاچا نورے کی دبی دبی آواز ابھری۔

چاچا ابراہیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ چاچا نوری لرزتا کانپتا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین بھی کانپ رہی تھی اور چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

''کیا ہوا ہے نوری؟'' چاچا ابراہیم نے ہیجانی انداز میں پوچھا۔

''ایک بُری خبر ہے۔'' نوری بولا۔

''چاچا! رستم تو خیریت سے ہے ناں؟'' شانی تقریباً چلا اٹھی۔

نوری سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے میم جی میرے گھر پہنچی ہے۔ اس کے پاؤں لہولہان ہیں اور کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں جنگل ہوتی

ہوئی آئی ہے۔ شکر ہے کہ رستے میں اسے ایک خداترس بندہ مل گیا جو اسے یہاں روکیٹ تک لے آیا۔" میم جی سے اس کی مراد گریس تھی۔

"اور ناصر اور شریف کہاں ہیں...... اور رستم؟" چاچا ابراہیم نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

"وہ تینوں...... مصیبت میں ہیں۔" نوری نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

"مصیبت...... کیسی مصیبت...... کیا ہوا ہے...... کیا پولیس نے کچھ کیا ہے؟" شانی تڑپ گئی۔

"نہیں، یہ پولیس کا معاملہ نہیں ہے۔" نوری نے اپنا کھچڑی سر نفی میں ہلایا۔ "مجھے تو یہ اس سے بھی زیادہ پریشانی والا معاملہ لگتا ہے۔ میم جی مسلسل رو رہی ہے۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی ہے۔ رستم کو بچالو...... وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے...... وہ زندہ نہیں بچے گا"

شانی سکتے کی سی کیفیت میں چاچا نوری کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ نوری کہہ رہا تھا۔ "لگتا ہے کہ میم جی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے۔ اس کے پنڈے پر مار پیٹ کے نشان بھی ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی اسے چپٹی لکڑی یا پتلون کی بیلٹ سے مارتا رہا ہے۔ وہ ایک ہی بات کہہ رہی ہے...... جو بھی کرنا ہے جلدی کرو، نہیں تو رستم کی جان چلی جائے گی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں یہاں آنے لگا تو اس نے یہ بھی کہا کہ ناصر اور شریف کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟ وہ کیا بتاتی ہے؟" شانی کی آواز کرب سے کانپ رہی تھی۔

"وہ پہلے کچھ نہیں بتاتی تھی لیکن اب اس نے اپنے شوہر اور اس کے ساتھیوں کا نام لیا ہے۔ وہ کہتی ہے انہوں نے اس سے دھوکا کیا ہے۔ وہ علاج کے نام پر رستم کی جان لینے والے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا کام بھی کر چکے ہوں۔ اگر آج رات ہی کچھ نہ کیا گیا تو شاید بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔ اسے خطرہ ہے کہ وہ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے پیچھے آئیں گے۔ وہ یہاں شانی بیٹی کے پاس بھی اسی لئے نہیں پہنچی ہے۔"

شانی کی رگوں میں خون سنسنانے لگا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وقت نے اسے ایک اور کڑی آزمائش میں ڈالا ہے۔ اسے لگا کہ اس کی کلائیوں میں سہاگ کی رنگین چوڑیاں لرزنے لگی ہیں۔

چاچا ابراہیم نے شانی کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ "میری دھی! تُو پریشان نہ ہو۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں، کیا معاملہ ہے۔ اللہ خیر کرے گا...... اللہ خیر کرے گا۔"

"چاچا! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" شانی بے تاب ہو کر بولی۔

"نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی مجھے اکیلا جانے دے۔"

"تو پھر اجمل خان کو لے لو۔"

"نہیں، اجمل خان کو یہیں اپنے پاس رہنے دو۔" نور عباسی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "بلکہ میں کوشش کرتا ہوں کہ دو چار اور بندے بھی یہاں گھر کے آگے دوالے کھڑے کر دوں۔"

چاچا ابراہیم اور نور عباسی تیزی سے باہر نکل گئے۔ اجمل خان بھی اب جاگ چکا تھا اور اس نے ساری بات سن لی تھی۔ اس نے رائفل لوڈ کر کے ہاتھ میں لے لی اور بالکل چوکس ہو گیا۔

اگلا آدھا گھنٹہ شانی، اجمل، ڈولے اور بے جی نے سخت بے چینی میں گزارا۔ شانی کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے اور دل میں انجانے وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ جب ناصر اور گریس، رستم کو یہاں سے لے کر گئے تھے تو انہوں نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ تاہم اجمل نے اپنے طور پر اندازہ لگایا تھا کہ شاید یہاں علاقے میں کوئی قابل سنیاسی یا معالج وغیرہ پایا جاتا ہے اور رستم کو علاج کے لئے وہاں لے جایا گیا ہے لیکن یہ بات شانی یا اجمل خان کے گمان میں بھی نہیں تھی کہ رستم کو گریس کے شوہر اسٹیفن اور اس کے ساتھیوں کے پاس لے جایا گیا ہے۔ وہ لوگ نایاب پودے پر ریسرچ کر رہے تھے۔ اس گروپ میں ایک دو ماہر ڈاکٹر بھی شامل تھے...... تو کیا گریس، رستم کو ان ڈاکٹروں کے پاس لے کر گئی تھی؟ وہ ڈاکٹر اس علاقے میں کیسے آموجود ہوئے تھے؟ اور رستم کا علاج کس طور کیا جانا تھا؟ کہیں اس نایاب پودے سپ گندل کے سلسلے میں ہی کوئی تجربہ تو نہیں کیا جانا تھا؟

اس کا ذہن رسا بڑی تیزی سے اہم سوالات تک پہنچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سب بری طرح چونک گئے۔ اجمل خان نے باہر سے چاچا ابراہیم کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ چاچا ابراہیم چادر میں لپٹی ہوئی گریس کو لے کر تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ نور عباسی بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی گھر سے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونجنے لگیں۔ یہ نور عباسی ہی کے آدمی تھے۔ انہوں نے مکان کو اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا تھا۔

کمرے کے اندر پہنچ کر گریس نے اپنی چادر ہٹائی۔ لالٹین کی روشنی میں گریس کا سراپا دیکھ کر شانی کو دھچکا لگا۔ وہ ایک ریشمی نائٹی میں تھی۔ نائٹی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ بازوؤں

اور چہرے پر گہری خراشیں اور چوٹیں تھیں۔ نور عباسی کے گھر میں اس نے منہ ہاتھ دھویا تھا اور چپل بھی پہن لی تھی، اس کے باوجود اس کا حلیہ ابتر تھا۔ سب سے بُری حالت پاؤں کی تھی۔ انگلیوں کے درمیان سے خون رِس رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''یہ کیا ہوا ہے گریس......؟ تم تو بہت زخمی ہو۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''ذرا میرا بیگ الماری پر سے اتار دو۔ میں کپڑے بدلنا چاہتی ہوں۔ مجھے ابھی جانا ہے انکل نوری کے ساتھ۔''

''کک......کہاں؟''

''جہاں رستم اور ناصر ہیں۔ ہمارا جلدی پہنچنا ضروری ہے۔ میں آ کر تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گی میری بہن۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ بس ذرا میرا اٹیچی اوپر سے اُتار دو۔''

شانی نے محسوس کیا کہ اس کی کمر پر بھی چوٹ ہے اور وہ سیدھا کھڑا ہونے میں دشواری محسوس کر رہی ہے۔

''میں اٹیچی اُتار دیتی ہوں لیکن اس حالت میں کہاں جاؤ گی، مجھے کچھ بتاؤ گریس! پلیز ایسا مت کرو۔ مجھے بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ میں سب کچھ سن لوں گی۔ سب کچھ سہہ لوں گی۔'' شانی کراہی۔

''ابھی مجھے بھی وہی کچھ معلوم ہے جو تمہیں انکل نوری نے بتایا ہے۔ پلیز شانی! وقت ضائع مت کرو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے گریس کچھ جھلا گئی۔

شانی نے الماری پر سے گریس کا اٹیچی اُتار دیا۔ وہ کپڑے بدلنے لگی۔ شانی کمرے سے باہر آ گئی۔ نور عباسی اور اجمل خان دونوں کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتے تھے اور وہ اکیلے نہیں تھے، گھر سے باہر کم و بیش دو درجن مسلح گھڑ سوار بھی تیار تھے۔ ''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں چاچا نوری؟'' شانی نے پوچھا۔

''رستم اور ناصر کی مدد کے لئے۔ انہیں ہماری ضرورت ہے۔ ہم جتنی جلدی نکلیں گے اتنا ہی ان لوگوں کے لئے اچھا ہوگا۔''

''گریس بھی جائے گی؟''

''ہاں، اسی کو رستے کا پتا ہے اور اس جگہ کا بھی۔''

''لیکن چاچا! وہ زخمی ہے۔ ٹھیک سے سیدھی کھڑی بھی نہیں ہو سکتی۔ تم اسے گھوڑے پر

بٹھاؤ گے اور اتنا لمبا سفر کرو گے؟''

چاچا ابراہیم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ انہیں شانی کی بات میں وزن محسوس ہوا ہے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے چاچے نوری کو دیکھا پھر شانی کی طرف دیکھا۔

''وہ اس حالت میں سفر نہیں کر سکے گی چاچا۔'' شانی نے دہرایا۔

''لیکن اس کا جانا بھی ضروری ہے۔'' چاچا ابراہیم نے کہا۔

نور عباسی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہ ڈولی کا انتظام کر لیا جائے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' ابراہیم نے فوراً تائید کی۔

چاچا نوری کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

گھر کی چار دیواری سے باہر گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور رائفلوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ شانی اندر پہنچی۔ گریس کپڑے بدل چکی تھی۔ اب وہ مقامی طرز کی شلوار قمیص اور موٹی اوڑھنی میں تھی۔ اس نے اپنے بائیں پاؤں کی پشت پر خود ہی کپڑے کی ایک پٹی پھاڑ کر باندھ لی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے لیکن بڑی ہمت کے ساتھ وہ اس تکلیف کو خود پر حاوی ہونے نہیں دے رہی تھی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا!'' وہ ہیجانی انداز میں بولی۔ ''میرے جیتے جی کچھ نہیں ہوگا رستم کو۔'' پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ''ڈیوس کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ سو رہا ہے......آؤ دیکھ لو اسے۔'' شانی نے کہا۔

وہ شانی کے ساتھ اندرونی کمرے میں پہنچی۔ شانی کے بستر پر ڈیوس اور مُنا سو رہے تھے۔ گریس نے سوئے پڑے ڈیوس کا ماتھا چوما، اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر مُنے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شانی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔

''گھبرانا نہیں میری بہن۔'' وہ یقین سے بولی۔ ''خدا نے چاہا تو ہم کل رات نو بجے تک واپس لوٹ آئیں گے......سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''گریس! میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی؟'' شانی نے کہا۔

''یہاں گھر میں بچوں کے پاس بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔''

''بچے، بے جی اور چاچا ابراہیم کے پاس رہیں گے۔ بے جی سنبھال لیں گی انہیں۔'' شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''میرا دم گھٹ جائے گا گریس۔ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے ساتھ جانے دو اور دیکھنے دو کہ میں وہاں رستم کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔''

ڈولی صحن میں آگئی۔ اس میں اتنی گنجائش تھی کہ دو خواتین بہ آسانی بیٹھ سکتی تھیں۔ (ایسی ہی ایک ڈولی میں شانی کچھ عرصہ پہلے وڈے ڈیرے کی طرف گئی تھی تب اس نے رستم کے چنگل سے تاؤ حشام اور راجو کو چھڑایا تھا) چاچا ابراہیم نے بھی نوٹ کرلیا تھا کہ شانی ہر صورت ساتھ جانا چاہتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اگر یہیں رہی تو اسے کچھ ہو جائے گا۔

چاچا ابراہیم نے کہا۔ ”ٹھیک ہے دھی رانی! اگر تم سہیلی کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ ہم بچوں کو سنبھال لیں گے۔ ویسے بھی نوری کی ساری برادری رائفلیں پکڑ کر یہاں آگئی ہے۔ یہاں ہم کو ان شاء اللہ کسی طرح کا ڈر خطرہ نہیں ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد شب کی گہری تاریکی میں وہ لوگ بڑی خاموشی کے ساتھ روکیٹ سے روانہ ہو رہے تھے۔ قریباً تین درجن دیہاتی ان کے ساتھ تھے۔ ان میں سے نصف کے پاس آتشیں اسلحہ جبکہ باقی کلہاڑیوں اور تیز دھار آلات سے مسلح تھے۔ شانی اور گریس ڈولی میں تھے۔ اسے چار صحت مند کوہستانیوں نے اٹھا رکھا تھا اور اونچے نیچے راستوں پر بڑی مہارت سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ روشنی کے لئے چند لالٹینیں اور ٹارچیں قافلے کے ہمراہ تھیں۔ راستے میں شانی کو معلوم ہوا کہ ڈولا بھی قافلے کے ساتھ ہے۔

”تمہارا کیا خیال ہے گریس! کیا اتنے لوگ وہاں جانے کے لئے کافی ہوں گے؟“ شانی نے پوچھا۔

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی شونی۔“ گریس نے جواب دیا۔ ”ویسے میرا اندازہ ہے کہ راستے میں کسی گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔ انکل نوری کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔“

”وہاں موجود لوگوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کے پاس ہتھیار کیسے ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

گریس اسے اس بارے تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔ وہ شانی سے کچھ بھی چھپا نہیں رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شانی کے ذریعے نور عباسی اور اجمل خان وغیرہ کو ساری صورتِ حال کا علم ہو جائے۔ اس نے رستم کو درپیش خطرے کے بارے میں بھی شانی کو سب کچھ وضاحت سے بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کو اسٹیفن سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔ اسٹیفن اور اس کے ساتھیوں نے صریحاً دھوکا کیا ہے۔ وہ رستم کو جس آپریشن سے گزارنا چاہتے ہیں وہ بے حد خطرناک ہے اور سراسر تجرباتی ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں گریس کی آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ اس نے اپنے شوہر کی حراست سے نکلنے کی تفصیل بھی شانی کو بتائی۔

ان کا سفر بادلوں اور چاند کی آنکھ مچولی کے ساتھ جاری رہا۔ کہیں کہیں انہیں ہلکی بارش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ گریس کا قیافہ درست تھا۔ راستے میں بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک الگ تھلگ بستی میں سے کم و بیش بیس افراد ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ ان میں سے کئی کے پاس پکی رائفلیں تھیں۔ اب اس قافلے کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ گریس ڈولی کے اندر سے گاہے بگاہے قافلے کی رہنمائی کر رہی تھی۔ ایک دو جگہوں پر اسے کچھ الجھن بھی ہوئی لیکن اپنی تیز یادداشت کے سبب وہ اس الجھن سے نکل گئی۔

صبح دس بجے کے قریب وہ اپنی منزل سے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ گریس کو اپنی دائیں جانب چیڑ کے جنگل سے ڈھکا ہوا وہ مخروطی پہاڑ نظر آ رہا تھا جس کی دوسری طرف بالائی ڈھلوان پر وہ قدیم عمارت واقع تھی۔ اس عمارت کے آثار نظر آنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ اس علاقے میں کہیں کہیں فاصلے پر پختہ اور نیم پختہ گھر موجود تھے۔ ان گھروں کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا اور آدم زاد کی صورت بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھی۔ قافلے کا سامنا تین خچر برداروں سے ہوا، وہ گندم کے توڑے لے کر نشیبی آبادی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک خچر پر کچھ کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ ایک جلی ہوئی بائیسکل اور ایک ”کراس کنٹر“ کا ڈھانچا تھا۔ اسی طرح لوہے کے کچھ ناقابلِ شناخت ٹکڑے تھے۔

نور عباسی نے ان خچر سواروں سے بات چیت کی۔ اس بات چیت کے الفاظ تو شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے تھے تاہم اسے نور عباسی کے چہرے پر ہلچل کے آثار ضرور نظر آنے لگے تھے۔ وہ بار بار مخروطی پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چار پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد نور عباسی اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ڈولی کی طرف پلٹا۔ شانی نے پردہ تھوڑا سا سرکایا اور پوچھا۔ ”چاچا نوری! کیا بات ہے؟“

چاچے نوری نے شانی سے کہا۔ ”دھی رانی! میم جی سے پوچھو وہ گھر کتنی دور ہے جہاں رستم اور ناصر کو رکھا گیا ہے؟“

شانی نے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے گریس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے فاصلہ چار پانچ میل سے زیادہ نہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہی وہ عمارت نظر آ جائے گی۔

چاچے نوری نے پوچھا۔ ”اس کی چھتوں پر سبز رنگ ہے اور اس کے پھاٹک پر پتھر کے دو چھوٹے شیر بنے ہوئے ہیں؟“

گریس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اس کوٹھی کو یہاں کے لوگ گورے کا بنگلہ کہتے ہیں۔“ چاچا نوری بولا۔ پھر چاچے نے

ذرا توقف کیا اور خچر برداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ گورے کے بنگلے کے بارے میں ایک بڑی بُری خبر سنا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شانی تڑپ اٹھی۔

''یہ کہتے ہیں کہ آج رات پچھلے پہر بنگلے میں آگ لگ گئی تھی۔ آگ اتنی زوردار تھی کہ اس نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا ہے۔'' چاچے ابراہیم نے دائیں طرف انگلی اٹھائی۔ ''وہ دیکھو ناں تم بھی۔ چوٹی کے پیچھے سے اب بھی دھواں اٹھ رہا ہے۔''

شانی نے غور سے دیکھا۔ دھویں کے ان مٹیالے مرغولوں کو وہ پہلے بادل سمجھی تھی لیکن اب غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ بادل نہیں ہیں۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ گلا ایک دم خشک ہو گیا۔ گریس کے چہرے پر بھی ہراس نظر آنے لگا۔ اس نے انگلش میں شانی سے تفصیل پوچھی۔ شانی نے اسے بتایا کہ چاچا نوری کیا کہہ رہا ہے۔

جس دوران میں وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے خچر سوار کھسک کر نشیب میں اُترتے چلے گئے۔ اچانک شانی پر انکشاف ہوا کہ ایک خچر پر لدا ہوا کاٹھ کباڑ آتش زدگی کا شکار ہونے والی عمارت سے نکالا گیا ہے۔

اس انتہائی تشویشناک خبر کے ملتے ہی قافلے کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ ان سب کے ذہنوں میں انجانے خدشے کھلبلی مچانے لگے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے دھویں کے آثار واضح ہوتے گئے۔ انہیں راستے میں دو خچر سوار اور ملے۔ وہ خاصے فاصلے سے گزرے تاہم انہیں دیکھ کر یہی اندازہ ہوا کہ ان کے خچروں پر بھی کسی برباد عمارت سے نکلنے والا کاٹھ کباڑ لدا ہے۔

گریس کے کہنے پر ایک جگہ قافلہ رک گیا۔ چاچا نوری اپنے ہانپتے ہوئے گھوڑے پر سوار ڈولی کے قریب آیا۔ شانی کی طرح گریس کا چہرہ بھی اس کے شدید اندرونی اضطراب کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے شانی کے ذریعے چاچا نوری سے کہا۔ ''انکل! اگر واقعی وہاں گورے کے بنگلے میں کچھ ہو گیا ہے تو ہمیں سوچ لینا چاہیے۔ کیا وہاں پولیس وغیرہ تو نہیں پہنچی ہو گی۔''

''نہیں میم جی!'' چاچے نے شانی کی وساطت سے کہا۔ ''اگر پولیس نے یہاں پہنچنا بھی ہے تو اسے کم از کم تین چار گھنٹے لگیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے جلدی چلو۔'' شانی رو دینے والے انداز میں بولی۔

قافلہ ایک بار پھر چوٹی کی طرف بڑھا۔ اب انہیں ہوا میں دھوئیں کی گھٹن اور جلے ہوئے گوشت کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے سب کچھ

ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ شانی کی نگاہیں دھندلانے لگیں۔ ان کے سامنے ایک کوئلہ بنی عمارت کی باقیات تھیں۔ ان باقیات میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا اور کہیں کہیں آگ سلگ رہی تھی۔ عمارت کے گرد و پیش دو سو مقامی افراد جمع تھے۔ یقیناً یہ لوگ کافی فاصلے سے آئے تھے کیونکہ ارد گرد تو اکا دکا مکان ہی دکھائی دیتے تھے۔ عمارت کے کوئلہ بنے کمپاؤنڈ میں تین بڑی گاڑیوں کے سلگتے ہوئے ڈھانچے بھی موجود تھے۔ یقیناً یہ جیپیں ہی تھیں۔

گھڑ سوار قافلے کو دیکھ کر ہجوم میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ مقامی لوگوں میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نور عباسی کی طرف آیا۔ دونوں کے درمیان مقامی انداز میں سلام دعا ہوئی۔ ادھیڑ عمر شخص نے نور عباسی سے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔

نور عباسی نے کہا۔ ''ہم گھوڑا گلی کی طرف سے آئے ہیں۔ اپے گراں جا رہے ہیں۔ یہاں دھواں دیکھ کر رک گئے ہیں۔'' پھر اس نے سلگتے ملبے پر نظر ڈالی اور ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے بھائیا جی؟''

ادھیڑ عمر شخص لرزاں آواز میں بولا۔ ''ہمیں تو خود کچھ پتا نہیں ہے جی۔ کل رات تک یہاں دس پندرہ بابو لوگ موجود تھے۔ ان کے نوکر بھی تھے۔ رات کو اس طرف سے گولیاں چلنے کی آواج آئی تھی۔ میں نے بھی سنی تھی۔ یہاں عام طور پر جنگلی جناور آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بڑا جنگلی بلا اور چیتا بھی دکھائی پڑتا ہے۔ میں نے سمجھا شاید کسی جناور کو دیکھ کر فیر نکالے گئے ہیں۔ صبح سویرے یہاں سب سے پہلے میں ہی نماج کے لئے اٹھتا ہوں۔ میرا گھر وہ سامنے چشمے کے کنارے پر ہے، لمبی چھت والا۔ میں اٹھا تو لال لال روشنی نجر آئی۔ میں جلدی سے باہر آیا۔ گورے کا بنگلہ جل رہا تھا۔ سارا آسمان لال ہو رہا تھا۔ اتنے میں میرا ہمسایہ لالہ فیاج بھی جاگ گیا۔ اس نے آگ دیکھ کر رولا مچایا۔ کئی اور لوگ بھی گھروں سے نکل آئے۔ ہم دوڑتے ہوئے یہاں پہنچے...... پر ہمارے کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ پورا بنگلہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اندر کوئی ہل جل کی کوئی آواج نہیں تھی۔''

''کسی نے نہیں دیکھا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟'' اجمل خان نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں۔'' ادھیڑ عمر نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ''یہاں بہت تھوڑی آبادی ہے۔ ویسے بھی ہم لوگ جلدی سو جانے کے عادی ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ رات کو یہاں کون آیا گیا ہے۔ اب تو پولیس ہی آئے گی اور وہی کوئی کھوج کھرا ڈھونڈے گی۔''

''خو پولیس کب آئے گی؟'' اجمل خان نے پوچھا۔

''ہم نے ایک بندے کو اطلاع دے کر بھیجا ہے لیکن بارشوں کی وجہ سے رستے خراب ہیں۔ ایک دو جگہ تو رستہ بالکل بند ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ پولیس رات سے پہلے یہاں پہنچ سکے گی۔''

اتنے میں وہ شخص بھی آگے بڑھ آیا جس کا نام ادھیڑ عمر شخص نے لالہ فیاج یعنی فیاض بتایا تھا۔ اس کی عمر بھی پینتالیس پچاس سے کم نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ ملبے میں سے کام کی اشیاء ڈھونڈتا رہا ہے۔

اس نے کہا۔ ''یہاں بنگلے میں پتا نہیں کیا کچھ ہو رہا تھا۔ بُرے کاموں کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ یہاں انگریز شراب پیتے تھے اور ڈانس کرتے تھے۔ ایک دو بڈھے کھوسٹ بندے بھی یہاں جوان لڑکیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے نجر آتے تھے۔ ہم گریب لوگ ہیں، ان کو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ رات کو میری آنکھ ڈھائی تین بجے کھلی تھی۔ اس وقت بنگلے کے کُتے بہت شور مچا رہے تھے۔ آلے دوالے کے دو تین گھروں میں بھی رکھوالے کتوں کا شور تھا۔ اس کے بعد کچھ فیر بھی ہوئے تھے لیکن تب تک آگ نہیں لگی تھی، نہیں تو آگ کی روشنی ہم کو نجر آ جاتی۔''

اجمل خان نے کہا۔ ''لالہ جی! آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ آگ کیسے لگا ہے؟ اور بنگلے والوں میں سے کوئی زندہ بھی بچا ہے یا نہیں؟''

''ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا جی...... پر لگتا ہے کہ کچھ بندے جرور جندہ بچے ہیں۔ وہاں ان پتھروں کے پاس کھون کے دھبے ہیں جو اترائی کی طرف چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں پیروں کے نشان بھی ملتے ہیں۔ پر بارش اور گیلی مٹی کی وجہ سے یہ نشان صاف نہیں ہیں اور آگے جا کر بالکل کھتم ہو گئے ہیں۔ میرے انداجے کے مطابق بس دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں جی...... یا تو کچھ بندے باہر سے آئے ہیں اور انہوں نے بنگلے کو آگ لگائی ہے یا پھر بنگلے کے اندر ہی کوئی مالمہ ہوا ہے۔'' لالے فیاض نے کہا۔

''بنگلے کے پچھواڑے جنریٹر کے لئے ڈیجل (ڈیزل) کے کین وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ کیا پتا ان میں کسی نے ماچس کی تیلی پھینک دی ہو۔'' ادھیڑ عمر شخص کی آواز واقعے کی شدت سے لرز رہی تھی۔

شانی نے دھندلائی ہوئی نظروں سے گریس کی طرف دیکھا۔ وہ سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ تقریباً 36 گھنٹے پہلے وہ جن لوگوں کو زندہ سلامت چھوڑ کر گئی تھی، وہ اب زندہ سلامت نہیں تھے۔ ان میں سے نہ جانے کتنے اس بھوت

بنگلے کے اندر ہی جل کر راکھ ہو گئے تھے اور یہ بنگلہ بھی اب راکھ کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔

اردگرد کے مفلس لوگ اب حیرت اور صدمے کے مرحلے سے گزر چکے تھے۔ وہ اب ملبے کے اندر گھوم رہے تھے اور اپنے کام کی چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ چند معمر افراد انہیں منع کرنے کی ادھوری سی کوششیں کر رہے تھے۔ اجمل خان، چاچا نوری اور چند دیگر افراد بھی بے قرار قدموں سے چلتے ہوئے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئے۔

''وہ دیکھو شونی۔'' گریس نے گلوگیر آواز میں ایک سمت اشارہ کیا۔

شانی نے ڈولی کے پردے کو سرکا کر دیکھا اور لرز گئی۔ کمپاؤنڈ میں ایک جلی ہوئی جیپ کے پاس ایک شخص کی کوئلہ لاش پڑی تھی۔ اس کا آدھا دھڑ جیپ میں اور آدھا جیپ سے باہر تھا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کون ہے۔ شاید یہ بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اس کے مقامی یا غیر مقامی ہونے کا تعین تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

''آہ...... رستم کہاں ہوگا؟'' شانی کے سینے یہ سوال ایک دردناک چیخ کی طرح ابھرا۔

شانی کو لگا جیسے وہ ایک بار پھر وڑے ذیرے پر اندوہناک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ چادروں سے ڈھکی ہوئی لاشوں کی قطار کو دیکھ رہی ہے اور دہشت زدہ ہو کر سوچ رہی ہے کہ خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے ان میں سے کوئی لاش رستم کی ہو۔ مقامی لوگ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ ثبوت ضائع ہوں گے، آزادانہ ملبے میں گھوم پھر رہے تھے۔ ایک بچے کے ہاتھ میں ایک ادھ جلی ویڈیو کیسٹ تھی۔ کیسٹ پر ہیجان خیز تصویریں تھیں۔ بنگلے کے گیٹ پر نصب دونوں پتھر کے شیر بھی دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے۔

اجمل خان اور چاچا نوری وغیرہ کو اندر گئے دیر ہوئی تو شانی سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ منہ سر چادر میں لپیٹ کر ڈولی سے باہر نکل آئی۔ گریس نے بھی چہرہ چھپایا اور اس کی تقلید کی۔ ڈولا بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان کے پیچھے ہولیا۔ وہ ہر چیز کو بڑی گہری اور ٹھہری ہوئی نظر سے دیکھتا تھا۔ شانی اور گریس تباہ حال عمارت کے اندر داخل ہو گئیں۔ ایک گھنٹہ پہلے ہونے والی بارش کے سبب ملبہ تیزی سے ٹھنڈا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شانی نے اپنا دل کڑا کر لیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں دردناک مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ اس کے دل کی گہرائی سے رستم کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ناصر اور شریف کے لئے بھی۔

''خدا سے دعا کرو گریس! وہ تینوں یہاں سے نکل جانے والوں میں شامل ہوں۔'' شانی روہانسی سرگوشی میں بولی۔

"تم بھی دعا کرو۔" گریس نے کہا۔

وہ ملبے کے درمیان گھومنے لگیں۔ ایک بڑے کمرے میں ورزش کی مشینوں کے پاس تین جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ سوختہ گوشت کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ان لاشوں کے گرد کئی افراد جمع تھے۔ ان تین لاشوں میں سے ایک لاش کے بازو اور آستین کا کچھ حصہ اتفاقیہ طور پر سلامت رہ گیا تھا۔ اس حصے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک صحت مند سفید فام عورت کی لاش ہے..... اس کے سوا کچھ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔

شانی نے بے ساختہ باقی دونوں کوئلہ بنی ہوئی لاشوں کی ٹانگیں دیکھیں۔ یہ دونوں افراد سلامت ٹانگوں والے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ خدانخواستہ ان میں کوئی رستم نہیں۔

ادھیڑ عمر مقامی شخص کا نام افضال خان تھا۔ دو نوجوانوں نے جلی ہوئی دستی گھڑیاں، ایک تباہ حال پسٹل اور طلائی چوڑیوں کی ایک جوڑی افضال خان کے سپرد کی۔ یقیناً یہ چیزیں نوجوانوں کو ملبے سے ملی تھیں اور وہ انہیں امانتاً افضال خان کے سپرد کر رہے تھے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں شانی اور گریس دل کڑا کر کے اس عمارت کے تقریباً ہر حصے میں گھوم گئیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں لکڑی کثرت سے استعمال کی گئی تھی۔ یہاں لگنے والی آگ بھی شدید ترین تھی۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ یہ سب کچھ ناقابلِ شناخت ہو کر رہ گیا تھا۔ عمارت میں کم و بیش سات لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ سب لوگ جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ فقط ایک لاش کے سوا یہ اندازہ لگانا بھی دشوار تھا کہ ان میں مرد کتنے ہیں اور عورتیں کتنی۔ شانی بے حد دہشت زدہ نظروں سے ان لاشوں کو تکتی رہی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ان میں خدانخواستہ وہ شخص موجود نہیں جس کی دید اس کی دنیا کو اندھیر کر سکتی ہے۔ رستم کی ٹانگ کی معذوری ایک اہم شہادت بن گئی تھی۔ ان لاشوں میں کوئی معذور لاش نہیں تھی، لیکن ناصر اور شریف کی طرف سے وہ اب بھی اسی طرح پریشان تھی۔

"گریس! مجھے لگتا ہے، یہاں کچھ لوگ زبردستی گھسے ہیں۔ انہوں نے توڑ پھوڑ کی ہے۔ یہ سامنے کھڑکیوں کو دیکھو۔ ان کے شیشے کس طرح ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

"اور یہ دائیں طرف دیکھو۔" گریس نے کہا۔ "یہ جگہ آپریشن تھیٹر کی طرح تھی۔ یہیں رستم کا آپریشن ہونا تھا۔ سب کچھ جل گیا ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ جلنے سے پہلے یہ ٹوٹا پھوٹا بھی ہے۔"

اچانک شانی کو راکھ میں کوئی شے دکھائی دی اور وہ چونک گئی۔ اس نے جوتے کی مدد سے نیم گرم راکھ کو ہٹایا۔ راکھ کے اندر سے لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا ملا۔ مگر یہ ٹکڑا نہیں تھا بلکہ یہ

کسی کلہاڑی کا پھل تھا۔

شانی کے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا دھیان فوراً پانچ چھ دن پہلے کے سنسنی خیز واقعے کی طرف چلا گیا جب کچھ جنونی لوگ روکیٹ میں چاچا ابراہیم کے گھر گھس آئے تھے۔ کیا یہاں بھی کچھ ایسے ہی جنونی لوگوں نے تباہی مچائی ہے؟ یہ سوال ایک میخ کی طرح شانی کے ذہن میں گڑ گیا۔

چاچا نوری شانی کے قریب آیا اور بولا۔ "دھیئے! ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔ چلو اب چلیں یہاں سے۔"

"لیکن چاچا! ام کیا منہ لے کر واپس جائے گا۔" اجمل خان کرب سے کہنے لگا۔ "ام کو رستم بھائی اور ناصر بھائی کا تھوڑا بہت کھوج کھرا تو ملنا چاہیے۔"

چاچا نوری بولا۔ "مجھے پکا پکا یقین ہے کہ بہت سے لوگ اس بنگلے سے نکل کر گئے ہیں۔ ان شاء اللہ رستم، ناصر اور شریف بھی ان میں شامل ہوں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہاں مرنے والے زیادہ تر انگریز ہی ہیں۔"

"لالہ فیاض نام کا یہ بندہ کسی کھرے کی بات بھی تو کر رہا ہے چاچا۔" شانی نے کہا۔

"یہ بتا رہا تھا کہ خون کے دھبے اور پاؤں کے نشان ہیں جو ترائی کی طرف گئے ہیں۔"

"چلو آؤ، ہم دیکھتے ہیں وہ کیسے نشان ہیں۔" نوری نے کہا۔

تیز بو میں اپنے چہرے ڈھانپے ہوئے وہ دونوں باہر نکل آئیں۔ اجمل خان نے ان سے کہا۔ "شانی بہن! سب لوگ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ڈولی میں بیٹھیں۔ ام جا کر دیکھتا ہے کہ وہ خون کا دھبا کیسا ہے اور کس طرف کو جاتا ہے۔"

شانی اور گریس نے اجمل خان کی بات مان لی اور دوبارہ ڈولی میں جا بیٹھیں۔ اجمل خان، نوری، ڈولا اور دیگر افراد درختوں کی طرف نکل گئے۔

اردگرد موجود ہر شخص کا چہرہ ایک سوالیہ نشان تھا۔ کسی حد تک پولیس کی آمد اور پوچھ گچھ کا خوف بھی چہروں پر جھلک رہا تھا۔ ایک اندوہناک واقعہ ہوا تھا اور ابھی تک اس کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے گریس! مجھے کچھ بتاؤ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"میری کیفیت بھی تم سے مختلف نہیں ہے شونی۔"

"کہیں ایسا تو نہیں ہے گریس کہ تمہارے یہاں سے نکل جانے کے بعد تمہارے شوہر اور اس کے ساتھیوں نے جان بوجھ کر یہ آگ لگا دی ہو تاکہ ثبوت وغیرہ مٹ جائیں۔ اس

کے بعد وہ سب یہاں سے نکل گئے ہوں۔"

"اس امکان کو رد تو نہیں کیا جا سکتا شونی! لیکن یہاں جو لاشیں پڑی ہوئی ہیں یہ کس خانے میں فٹ ہوں گی۔ یہ کن لوگوں کو مارا گیا یا جلایا گیا ہے۔"

"کہیں یہاں موجود لوگ کسی وجہ سے آپس میں تو نہیں لڑے ہیں؟"

"میں اس طرح نہیں سوچ سکتی۔" گریس نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جس کے سبب ایسا خون خرابہ ہوتا۔"

"یا پھر کچھ لوگوں نے بنگلے والوں کی غلط حرکتوں کی وجہ سے ایسی کارروائی کر ڈالی ہو۔"

گریس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں سمجھتی کہ ارد گرد موجود لوگوں میں سے کوئی اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔"

شانی اور گریس نے پندرہ بیس منٹ تک پُر اندیش گفتگو کی۔ اس دوران میں نور عباسی اور اجمل خان وغیرہ واپس آ گئے۔

اجمل خان نے کہا۔ "خون کا بہت سا دھبہ درختوں میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ قدموں کا نشان بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ دو تین درجن کے قریب لوگ تھے۔ یہ دو تین ٹولیوں کی شکل میں یہاں سے نکلے ہیں۔ تھوڑا آگے جا کر بہت زیادہ گھاس والا علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ وہاں پر نشان بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ خو امارا خیال ہے کہ اگر مزید بارش نہ ہو تو ان نشانوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کیا جا سکتا ہے۔" اجمل کے لہجے میں ایک تجربہ کار حوالدار بول رہا تھا۔

ڈولا بڑے دھیان سے ارد گرد کی گھاس کو دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے ڈولے؟" شانی نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر بولا۔ "باجی جی! یہاں آپ کو کچھ نشان نظر آ رہے ہیں؟ یہ دیکھیں ... یہ گھاس پر پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ کافی لمبا اور پتلا پاؤں ہے۔"

شانی اور گریس نے دھیان سے دیکھا، انہیں کوئی واضح نشان دکھائی نہیں دیا۔ بس دو چار جگہ سے گھاس دبی دبی لگتی تھی۔

ڈولے نے اجمل خان کو اپنے ساتھ نیچے بٹھایا اور خاص زاویے سے نشان دکھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد اجمل خان کے چہرے پر تائیدی تاثرات ابھرے۔ اس نے تعریفی نظروں سے کوتاہ قد ڈولے کی طرف دیکھا۔ "ہاں ... ایک لمبے پاؤں کا نشان ہے۔"

"ایسے ہی نشان میں نے نیچے ڈھلوان پر بھی دو چار جگہ دیکھے ہیں۔ پاؤں کا نشان عام

پاؤں سے کافی لمبا ہے۔" ڈولے نے کہا۔ اس کا انداز سراغ رسانوں جیسا تھا۔

نور عباسی، ڈولا اور اجمل خان ایک بار پھر اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد انہوں نے جو نتیجہ نکالا، وہ یہ تھا کہ آگ لگنے کے بعد جو لوگ اس بنگلے سے نکل کر گئے ان میں ایک کافی لمبے قد والا دبلا پتلا شخص بھی تھا۔ اس نے عام شہری طرز کی جوتی پہن رکھی تھی۔ نور عباسی اور اجمل نے اس حوالے سے افضال اور فیاض وغیرہ سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہیں بتا سکے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ وہاں سے واپس روانہ ہو گئے۔ وہ سب بہت دل گرفتہ تھے۔ شانی اور نور عباسی کے بہت اصرار کے باوجود اجمل خان واپس نہیں گیا تھا۔ وہ وہیں جائے حادثہ کے ارد گرد موجود رہنا چاہتا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اسے یہاں کوئی مفرور حوالدار کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا۔ وہ اس اندوہناک واقعے کے حوالے سے ہونے والی تفتیش سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے طور پر بھی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ رستم کے ساتھ اجمل خان کی ایسوسی ایشن بالکل واضح تھی۔ وہ اس کی سانس کے ساتھ سانس لیتا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف اور صرف رستم کے لئے یہاں موجود تھا۔ اس لیے رستم کو یہاں لاپتا چھوڑ کر واپس روکیٹ جانا اسے بے معنی محسوس ہو رہا تھا۔

جب شانی نے دیکھا تھا کہ وہ کسی صورت واپس نہیں جائے گا تو اس نے اسے بے حد محتاط رہنے کی تاکید کی تھی اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ضروری ہدایات بھی دی تھیں۔

☆======☆======☆

شانی روکیٹ واپس پہنچ گئی تھی مگر اسے لگتا تھا کہ وہ اپنا آپ وہیں جلی ہوئی عمارت کے کھنڈر میں چھوڑ آئی ہے۔ بے شک اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ رستم ان بدنصیبوں میں نہیں جنہوں نے وہاں جان ہاری لیکن وہ کہاں تھا؟ ناصر اور شریف کہاں تھے؟ کیا اسٹیفن وغیرہ نے ہی انہیں کسی اور جگہ منتقل کیا تھا یا پھر یہ اسی جنونی گروہ کا کیا دھرا تھا جو یہاں چاچا ابراہیم کے گھر میں بھی تباہی مچا چکا تھا۔ اگر یہ لوگ وہی تھے تو پھر کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ گریس، اسٹیفن اور دوسرے سفید فاموں سے ان کی کیا دشمنی تھی۔ پھر شانی کا دھیان حوالدار ناگی کی طرف چلا گیا۔ کوئی اور ان جنونیوں کے بارے میں جانتا ہو یا نہیں لیکن ناگی ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ یہ ناگی ہی تھا جس نے چاچا ابراہیم کے گھر میں کلہاڑی برداروں کی آمد سے چند گھنٹے پہلے گریس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ ایک سفید فام لڑکی کا کھوج لگاتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور شانی اور اجمل خان پر رعب گانٹھتا رہا تھا۔

شانی کو اندازہ ہوا کہ حوالدار ناگی اس معاملے میں ایک اہم سراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ناگی سے ملا جاتا اور طریقے سے پوچھا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ وہ حملہ آوروں کے بارے میں اہم سراغ دے سکتا تھا۔ بہرحال فی الوقت تو وہ اجمل خان کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ چاچا نوری نے شانی اور گریس کو ہر طرح تسلی دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے طور پر بھی حالات سے باخبر رہے گا اور ممکن ہے کہ ایک دو دن میں وہاں کا ایک چکر مزید لگائے۔

روکیٹ بستی کے اس ہنستے بستے گھر میں ایک دم دکھ کی یلغار ہوگئی تھی۔ تمام مسکراہٹیں اندیشوں کے تاریک بادلوں کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ چاچا ابراہیم اور بے جی کے لئے ناصر اور رستم کی گمشدگی کا دکھ ناقابلِ بیان تھا۔ کچھ یہی کیفیت شانی کی بھی تھی۔ بے جی پہلے بھی ''انگریزنی'' یعنی گریس کی طرف سے بدگمان تھیں، اب یہ بدگمانی مزید بڑھ گئی تھی۔ گریس بھی ناصر، رستم اور شریف کے لئے ازحد پریشان تھی، اس کے علاوہ اسے اپنے شوہر کی دھوکا دہی کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔ وہ بار بار یہی فقرہ دہراتی تھی۔ ''یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ کاش میں رستم کو لے کر اسٹیفن کے پاس نہ جاتی۔''

اسٹیفی یعنی اسٹیفن کے لئے اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ان دونوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے کئی برس اکٹھے گزارے تھے مگر پچھلے دو چار دن میں گریس نے شوہر کا جو روپ دیکھا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ آپریشن کے حوالے سے شدید تلخ کلامی کے بعد اسٹیفن نے اسے گھسیٹ کر بیڈروم میں بند کر دیا تھا۔ بعدازاں اس کے کپڑے پھاڑے تھے اور اسے بُری طرح پیٹا تھا۔ یہ کشیدگی اور نفرت پتا نہیں کب سے چپکے چپکے میاں بیوی کے درمیان پل رہی تھی۔ ایک واقعے کے سبب یہ ایک دم چنگاری سے شعلہ بنی تھی اور ان دونوں کے ازدواجی تعلق کو جلا کر راکھ کر گئی تھی۔ اب گریس کو اپنے شوہر کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی رستم اور ناصر کی تھی۔ وہ خود کو اس ناگہانی مصیبت کا ذمے دار سمجھ رہی تھی۔ اسے پچھتاوا بھی تھا کہ وہ رستم کے آپریشن کے حوالے سے اپنے باس فلپ اور شوہر اسٹیفن کی باتوں میں آئی اور اصرار کر کے رستم کو یہاں سے لے گئی۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اجمل خان واپس آیا اور نہ بستی کے باہر کے حالات کے بارے میں کچھ علم ہوا۔ صرف چاچا نوری سے اتنا پتا چل سکا کہ گورے کے بنگلے میں لگنے والی آگ کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی ہے۔ وہاں ہونے والی اموات کے چرچے بھی عام ہیں۔ کئی لوگ اس واقعے کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ وہ مرنے والوں کی

تعداد تیس چالیس بتا رہے تھے۔ کچھ بتا رہے تھے کہ بنگلے پر ڈاکوؤں کے ایک بڑے گروہ نے باقاعدہ حملہ کیا تھا اور انگریزوں کو قتل کرنے کے علاوہ ان کی ساتھی عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ کچھ کمزور عقیدے کے لوگ اس اندوہناک واقعے کا ناتا ہوائی چیزوں سے بھی جوڑ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ یہ ساری باتیں سینہ گزٹ کے سوا کچھ نہیں تھیں۔

ایک رات شانی اور گریس نے دیر تک مشورہ کیا۔ گریس نے کہا۔ ''اگر کسی طرح اس حوالدار ناگی سے رابطہ ہوسکے تو معاملے کا سرا ہاتھ آسکتا ہے۔''

''لیکن رابطہ ہو کیسے؟ ہم دونوں تو اسے ڈھونڈنے سے رہیں۔ اجمل خان یہاں نہیں ہے۔ نہ ہی ڈولا یہ کام کرسکتا ہے۔'' شانی نے کہا۔ ''ویسے بھی وہ شخص مہینے میں بس ایک دو بار ہی بستی کا چکر لگاتا ہے۔ اب تو وہ واپس چوکی جاچکا ہوگا اور ناصر نے بتایا بھی تھا کہ چوکی یہاں سے 25 میل کے فاصلے پر ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ بنگلے میں آگ والے واقعے کے بعد ناگی پھر بستی کا چکر لگائے۔'' گریس نے کہا۔

''اگر وہ آتا بھی ہے تو ہمیں اس سے بہت محتاط رہ کر بات چیت کرنی ہوگی۔ اگر اسے کسی طرح کا شک ہوا تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

وہ دونوں ناگی کے بارے میں بات کر رہی تھیں اور انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ چاچا ابراہیم گھر میں نہیں تھے۔ شانی نے ڈولے کو آواز دی کہ وہ دروازے پر دیکھے۔ ڈولا اندر سے آیا اور شانی کے قریب پہنچ کر سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے باجی جی! یہ وہی اس دن والا بندہ ہے...... وہی حوالدار۔''

''تمہیں کیسے پتا؟'' شانی نے چونک کر کہا۔

''بس مجھے اس کے پنڈے کی ہواڑ (جسم کی بو) آ رہی ہے۔'' ڈولا کبھی کبھی ایسی ہی چونکا دینے والی بات کرتا تھا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ دروازہ کھولوں یا نہیں۔

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا دروازے کی طرف گیا اور چند سیکنڈ بعد واپس آ گیا۔ ''وہی پولیس والا ہے جی۔'' اس نے کہا۔ ''چاچے ابراہیم کا پوچھ رہا ہے۔ میں نے کہا وہ نہیں ہیں۔ کہہ رہا ہے کہ میں نے ان سے بات کرنی ہے۔ انہیں فوراً

بلاؤ۔"

شانی نے گریس کو صورتِ حال بتائی۔ "پھر کیا کرنا چاہیے؟" گریس نے پوچھا۔

"تم ڈیوس کو لے کر پچھلے کمرے میں چلی جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

"احتیاط سے۔" گریس نے کہا اور ڈیوس کو لے کر عقبی دروازے میں اوجھل ہوگئی۔

شانی نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا کہ گریس یا ڈیوس کی کوئی نشانی نہ پڑی رہ گئی ہو۔ شانی کی دھڑکن ذرا بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انور ناگی جتنا شیخی خور ہے اتنا ہی ٹیڑھا بھی ہے۔ چند روز پہلے وہ کہہ کر گیا تھا کہ یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا، وہ دوبارہ آئے گا اور آج وہ تشریف لے آیا تھا۔

شانی اوڑھنی لیتی ہوئی بیٹھک میں چلی گئی اور ڈولے سے کہا کہ وہ بیٹھک کا دروازہ کھول کر حوالدار کو اندر بلا لے۔ ڈولے نے شانی کی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد موٹی توند اور سانولی رنگت والا اخرانٹ صورت ناگی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ حسبِ سابق ایک بوگس فائل اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ شانی نے اس کی آمد سے پہلے ہی لمبا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ حوالدار نے کلف لگی وردی پہنی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ تھا۔ آج اس نے اپنے ہولسٹر میں باقاعدہ ریوالور لگایا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ دیسی ریوالور ہو اور ناگی نے کسی سے مانگ تانگ کر اپنی توند کے ساتھ آویزاں کرلیا ہو۔

ناگی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے؟"

"کس بارے میں جی؟" شانی دھیمی آواز میں بولی۔ پچھلی ملاقات کی طرح اس نے اپنا لب ولہجہ خالص دیہاتی رکھا تھا۔

"انگریز عورت کے بارے میں۔" ناگی نے غصے سے کہا۔ "میرے پاس عورت کے بارے میں جو انکوائری ہے وہ ایک دم پکی ہے۔ اس عورت کو اس چار دیواری کے اندر دیکھا گیا ہے، اب تم لوگ اس سے انکاری ہو رہے ہو۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے اب تک تمہارے گھر کے مردوں کو تھانے میں نہیں بلایا۔ پر اب مجھے لگ رہا ہے خیر نال۔ کہ تمہارے دیور اور سسر کو لے جائے بغیر گزارا نہیں ہوگا۔" وہ اجمل خان کے لئے "دیور" کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ "ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں جی کہ ہم پر کسی نے جھوٹا الزام لگایا

ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے بی بی! الزام تو لگا ہے نا خیر نال اور الزام کی صفائی کورٹ میں پیش کرنی پڑتی ہے۔" پھر اس نے اپنی تنومند گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔ "ویسے وہ تمہارا دیوار خیر نال ہے کہاں؟"

"وہ دو چار دن کے لئے اپنے بھائی کے گاؤں گیا ہوا ہے۔"

"اس کی گردن میں بڑا سخت سریا ہے۔ بات کرنے کی تمیز بھی اسے کسی نے نہیں سکھائی۔ پچھلی دفعہ میرا دماغ آؤٹ ہو جاتا تو اس نے تھانے میں الٹا لٹک جانا تھا۔ اب بھی وقت ہے، اسے اچھی طرح سمجھا لو ورنہ کارِ سرکار میں ٹانگ اڑانے کی وجہ سے بہت بُرا پھنسے گا۔" ناگی نے دھمکی دی پھر اس نے اپنی تیل سے چپڑی کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اور وہ تیرا شوہر......وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی ابھی نہیں آیا۔"

ناگی نے ایک بار پھر دھونس جمانے والا لہجہ اختیار کیا۔ "دیکھ بی بی! یہ انگریز لڑکی کے لاپتہ ہونے کا کیس ہے اور وہ لڑکی یہاں دیکھی گئی ہے۔ دفعہ 363 دفعہ 362 اور 365 کے تحت یہ بڑا سنگین جرم ہے۔ یہ ابراہیم کا گھر ہے۔ مالک مکان اور گھر کا سربراہ ہونے کی وجہ سے سب سے سخت کیس اسی پر بنتا ہے خیر نال۔ پر تیرا بندہ اور وہ پٹھان بھی اسی لپیٹے میں آرہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بوگس فائل کھولی اور بڑے دھیان سے چند کاغذات دیکھے اور قلم سے ان پر چند نشان وغیرہ لگائے۔ شانی کو صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بھونڈی اداکاری میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ دور دراز دیہاتی علاقوں میں نچلے درجے کے سرکاری اہلکار سادہ لوح لوگوں کو کس طرح دہشت زدہ کرتے ہیں۔

پھر شانی نے ایک اور چھوٹا سا تماشا دیکھا۔ ناگی نے اپنی جیب میں سے ایک کھٹارا موبائل فون نکالا۔ اس سے ذرا چھیڑ چھاڑ کی۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ناگی نے ظاہر کیا کہ اسے کہیں سے کال آئی ہے۔ حالانکہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں سگنلز بہت کمزور تھے۔ ناگی اپنے کسی تصوراتی مخاطب سے باتیں کرنے لگا۔

"ہاں ہاں......میں تھانیدار بول رہا ہوں۔ انور ناگی۔ ہاں ہاں کیا کہتا ہے وہ؟ نہیں نہیں......پکڑ کے لاؤ اسے۔ شام تک چمڑی ادھیڑ دو حرام زادے کی۔ میں دیکھ لوں گا اس

سیکڑی شیکڑی کو جو اس کے پیچھے آئے گا خیر نال......''

تھوڑی دیر تک وہ ظاہر کرتا رہا کہ دوسری طرف سے ہونے والی بات سن رہا ہو پھر پھنکار کر بولا۔ ''کوئی مخول نہیں ہے۔ خیر نال پلس مقابلہ کیا ہے اس نے۔ لگاؤ اس پر دفعہ 332 اور 333۔''

اس کے بعد ناگی نے فون بند کر کے جیب میں ٹھونسا اور بڑبڑانے لگا۔ اپنے طور پر اس نے شانی کو متاثر کرنا چاہا تھا۔ یہ بے حد بھونڈی اور سطحی قسم کی کوشش تھی لیکن شانی جانتی تھی، اس بستی میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جن کے لئے ایسی کوشش بھی مکمل طور پر کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

''تیرے بندے کا نام کیا ہے؟'' ناگی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

''اسلم۔''

''اس کو ایک دو دن میں پیش ہونا پڑے گا۔ بڑے صاحب کا حکم ہے خیر نال۔''

شانی نے اپنی خاموشی سے ظاہر کیا کہ وہ بُری طرح گھبرا رہی ہے۔

''تیرا اپنا نام کیا ہے؟'' ناگی نے دوسرا سوال کیا۔

''مختاراں۔'' شانی نے پہلے سے سوچا ہوا نام بتایا۔

ناگی نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ مختاراں! تُو چنگی بھلی سوہنی ہے۔ تجھے اچھے سے اچھا بَر مل سکتا تھا بلکہ اب بھی مل سکتا ہے پھر تُو نے ایک نکھٹو اپاہج سے بیاہ کر لیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی خیر نال۔''

''بس جی...... جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔''

''وہ پرانی بات تھی مختاراں بی بی! اب تو جوڑے موبائل فون پر بنتے ہیں اور دوسرے فون پر بنتے ہیں اور شادی ہالوں میں بنتے ہیں جہاں سب کڑیاں منڈے لشک پشک کر آتے ہیں۔ ویسے میں تجھے ایک بات بتا دوں، اگر ابراہیم نے تیرے جیسی کُڑی کا ویاہ اسلم جیسے بندے سے کرایا ہے تو اس نے ضرور کوئی فائدہ لیا ہوگا۔ میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ کیا پتا ابراہیم نے اس لنگڑے سے، مم...... میرا مطلب ہے تمہارے معذور بندے سے کوئی رقم شقم لی ہو۔ اس دنیا میں سب کچھ چلتا ہے خیر نال۔ تیرے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ تیرے جیسی لاوارث کڑیاں لوگوں کے لئے حلوہ ہوتی ہیں۔ لوگ ایسا حلوہ خود کھا لیتے ہیں اور جو شوگر کی وجہ سے خود نہیں کھا سکتے، رقم لے کر دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔''

شانی بس ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

ناگی کی تھوڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ شانی کی طرف جھکتے ہوئے وہ بولا۔ ''میرا دل کہتا ہے تیرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تجھے شام لاٹ زمین سمجھ کر تجھ پر قبضہ جمایا گیا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں تیرے جیسی کُڑی کو اچھے سے اچھا بَر مل سکتا تھا بلکہ اب بھی مل سکتا ہے...... بالکل مل سکتا ہے۔''

شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا ہے کہ میں بڑی سوہنی کُڑی ہوں...... تو کیا آپ نے مجھ کو دیکھا ہے؟''

''ہاں...... نن...... نہیں...... میرا مطلب ہے...... کہ...... دراصل'' وہ گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سگریٹ کا کش لیا اور ذرا سنبھل کر بولا۔ ''اگر سچ پوچھتی ہو مختاراں تو میں نے تم کو دیکھا ہے خیر نال۔''

''کب؟''

''کچھ دن پہلے، جب تم کوٹھے پر کپڑے سوکھنے کے لئے ڈال رہی تھیں، وہ تیرا کاکا بھی تیرے ساتھ تھا۔ دراصل میں اس وقت حاجی صادق خان کے گھر پر تھا۔ اس کے ڈیرے کی چھت سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ حاجی صادق نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تُو ابراہیم کے گھر میں رہ رہی ہے اور ابراہیم کے بھتیجے کے یار سے تیری شادی ہوئی ہے۔''

شانی محسوس کر رہی تھی کہ ناگی کے لہجے میں لگاوٹ آتی جا رہی ہے۔ وہ تفتیش کے موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں کا لب لباب یہ کہ تھا اس کا (ناگی کا) شمار محکمہ پولیس کے گنے چنے افسروں میں ہوتا ہے۔ وہ دشمن کا دشمن اور یاروں کا یار ہے۔ اس کی پہلی بیوی دو بچوں کے ساتھ میکے میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ عنقریب اسے طلاق دینے والا ہے۔ اس کا اپنا مکان ہے۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں بلکہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اپنی ''حق حلال'' کی کمائی کو کہاں اور کیسے خرچ کرے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں پھیلاتا ورنہ اگر وہ چاہے تو اسلام آباد جا کر وزیراعظم ہاؤس تک خرید سکتا ہے۔

اس کے بعد وہ براہ راست شانی کی تعریفیں کرنے لگا اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ چاچے ابراہیم نے جو نکھٹو، بے کار شوہر اس کے پلے باندھا ہے وہ کسی طور اس کے قابل نہیں ہے۔ ایسے بندے کو تو اس کا نوکر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ آخر وہ ریشہ خطمی انداز میں بولا۔ ''میں سچ کہتا ہوں مختاراں! اس لنگڑے اور اس بڈھے ابراہیم کے چکر میں پڑ کر اپنی زندگی برباد نہ کرنا۔ تجھے چنگے سے چنگا مال دار اور حیثیت والا خاوند مل سکتا ہے۔''

''بس جی جو ہو گیا ٹھیک ہے۔'' شانی گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔

''بس یہی کم ہمتی ہے تیرے جیسی عورتوں کی۔ بیوقوفے! تھوڑی سی ہمت کر۔ اپنے آسے پاسے دیکھ۔ ہوسکتا ہے کہ تیرے آسے پاسے ہی کوئی کھاتا پیتا بندہ تیرا ہتھ پکڑنے کو تیار ہو خیر نال۔'' ناگی نے رازداری سے کہا۔ اس کا لہجہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''اگر تجھے کسی کا ڈر ہے تو یہ ڈر اپنے دل سے نکال دے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ ابراہیم اور نوری جیسے بندے میرے کھبے ہتھ کی مار ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ تُو بڑے گھاٹے میں جا رہی ہے تیرے والی وارث ہوتے خیر نال تو تجھے کبھی اسلم جیسے بندے کے پلے نہ بندھنے دیتے۔ اگر میرے دل کی بات پوچھتی ہے تو تُو رج کے سوہنی ہے۔ تیرے اندر ایک خاص طرح کی کشش ہے۔ تُو کسی کو بھی لوٹ پوٹ کر سکتی ہے۔'' وہ جیسے روانی میں بولتا چلا گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر کہنے لگا۔ ''خیر باتوں باتوں میں بات دور نکل گئی ہے۔ میں ابراہیم اور تیرے دیور وغیرہ سے انگریز کُڑی کی بات کرنے آیا تھا۔ یہ فوجداری معاملہ دن بدن بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ وڈے تھانیدار صاحب ایک دم غصے میں ہیں۔ وہ تیرے دیور اور بندے کو تھانے بلانا چاہتے ہیں اور شاید تیرے سورے (سسر) کو بھی۔ اگر درمیان میں مَیں نہ ہوتا تو وہ کب کے ایسا کر بھی چکے ہوتے۔ کیا کروں...... یہ میرا پنڈ ہے خیر نال۔ میں اپنے پنڈ والوں کی سائیڈ نہ لوں تو اور کون لے گا۔'' وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

شانی نے کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھانیدار جی کہ ہمارے اوپر انگریز کُڑی والا جھوٹا الزام لگایا کس نے ہے؟''

''اس بات کا تو تم کو پتا ہونا چاہیے خیر نال۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تم لوگوں کا کوئی ویری ہو۔ میں نے تو اس کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھ کو ساتھ والے گاؤں دوسہرہ میں ملا تھا۔''

''حلیہ کیا تھا؟''

''حلیہ کیا ہونا تھا، بس لمڈھینگ کا لمڈھینگ تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ سات فٹ سے کچھ ہی کم قد ہوگا اور بالکل دبلا پتلا، کانے کی طرح۔''

''کون ہوسکتا ہے جی! ہم تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتے۔'' شانی نے گھونگھٹ کے پیچھے سے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اس کی باتوں سے کیا پتا چلتا تھا۔ اسی علاقے کا تھا یا کسی اور جگہ کا اور وہ کہتا کیا تھا آپ سے؟''

''باتوں سے تو تھوڑا بہت پڑھا لکھا لگتا تھا۔ شلوار قمیص میں تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ بائیس چوبیس سال رہی ہوگی خیر نال۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ گلگت اور اسکردو وغیرہ کی طرف کا

رہنے والا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ دو تین ہفتے پہلے کاغان سائیڈ سے ایک ٹورسٹ جوڑا غائب ہوا ہے۔ ان کا کوئی کھوج کھرا نہیں مل رہا ہے۔ سارے علاقے میں ان کو ڈھونڈا جا رہا ہے۔ یہ لمڈھینگ بھی ان ڈھونڈنے والوں میں شامل تھا۔ اس سے زیادہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''اس نے ہم پر شک کیوں کیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس بارے میں بھی اس نے زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ اس نے کہا کہ اسے کہیں سے اطلاع ملی ہے۔''

''کیسی اطلاع؟''

''یہی کہ روکیٹ کے رہائشی میاں ابراہیم کے گھر میں کوئی انگریز کُڑی دیکھی گئی ہے۔ اس نے میری منت کی کہ میں اس بارے میں پتا کر کے بتاؤں۔''

ناگی منت کی بات کر رہا تھا لیکن شانی کو پورا یقین تھا کہ ناگی نے اس نامعلوم شخص سے رشوت وصول کی ہوگی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو لالچ کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتے۔

''اس بندے سے دوبارہ ملاقات ہوئی ہے؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''ہاں...... ہاں۔'' ناگی نے اپنا گھڑا سا سر ہلایا۔ اس کے انداز سے شانی نے فوراً محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور شانی کو بتانا چاہ رہا ہے کہ مدعی اپنی جگہ موجود ہے اور اس نے معاملے کو اٹھا کر رکھا ہوا ہے۔

چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی۔ شانی جانتی تھی کہ گریس آس پاس ہی موجود ہے اور اندر کی صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہے۔ ناگی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بے تکلف انداز میں بولا۔ ''چل چھڈ ان باتوں کو مختاراں! میں سنبھال لوں گا سب کچھ...... تُو مجھے چنگی کُڑی لگی ہے۔ تجھے کسی طرح کا کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے بتا۔ ویسے میں آتا جاتا رہوں گا۔ قانونی کارروائی تو پوری کرنی ہے ناں۔ تیرے اس منہ پھٹ دیور اور بندے سے بھی ملاقات کرنی پڑے گی خیر نال۔ ان کے بیان شیان قلم بند ہونے ہیں۔'' پھر اس نے ذرا توقف کیا اور شانی کی طرف جھکتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ''ویسے میرا تو تجھے مشورہ ہے کہ اپنے نکھٹو بندے سے پیچھا چھڑا لے۔ خواہ مخواہ اپنی جوانی برباد نہ کر۔ یہ جو مرغی خانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ناں تیرا بندہ اور دیور...... تو اس میں ان کو کچھ ہتھ آنے والا نہیں ہے۔ تجھے بھوکا مار دیں گے یہ لوگ۔'' ناگی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

شانی گھونگھٹ کے پیچھے خاموش رہی۔ وہ ناگی پر یہی ظاہر کر رہی تھی کہ اس کی باتیں توجہ اور سنجیدگی سے سن رہی ہے۔

ناگی نے اپنی افسری کا ماحول برقرار رکھنے کے لئے ایک بار پھر خود ہی بٹن دبا کر اپنے کھٹارا موبائل فون کی رنگ ٹون چلائی۔ حاکمانہ انداز میں سکرین پر نگاہ دوڑائی اور بڑبڑا کر فون بند کر دیا۔ ''ایک تو یہ سائل چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور یہ کونسلر...... پتا نہیں ان میں کیسے کیسے چھابڑی فروش بھی کونسلر بن گئے ہیں۔''

چند سیکنڈ کے بعد اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر اپنا موڈ درست کیا۔ اس کی رال ٹپکاتی نظریں شانی کے سراپے پر لگی تھیں۔ اپنے بوگس کاغذات کو بوگس فائل میں واپس رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا میں تین چار دن تک پھر آؤں گا۔ تیرے سسر سے بھی ایک دو باتیں پوچھنی ہیں۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنی ٹوپی سر پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ تاہم دروازہ کھولنے سے پہلے وہ ایک بار پھر شانی کی طرف مڑا اور اس کے پاس آکر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''تجھے زیور گہنے کا شوق ہے؟''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، عورت کو گہنے کا شوق نہ ہو۔ تیری خالی کلائیاں دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ ایسی کلائیوں میں تو سونے کی جگہ ہیرے کے کنگن ہونے چاہئیں۔ میرے پاس چار کنگن پڑے ہوئے ہیں۔ اگلی دفعہ میں لے کر آؤں گا تیرے لئے۔ میرے خیال میں تجھے پورے آئیں گے۔ ذرا دکھانا اپنا ہاتھ۔'' شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے شانی کی کلائی اپنے سانولے بھدے ہاتھ میں پکڑ لی۔ آواز کی طرح اس کا ہاتھ بھی جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔

کلائی دیکھنے کے فوراً بعد اس نے خیر چھوڑ دی اور منکے جیسا سر ہلا کر بولا۔ ''سائز ٹھیک ہے خیر نال ...''

''لیکن......''

''لیکن شیکن کچھ نہیں۔'' وہ تیزی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

شانی نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد گریس بھی اندر آگئی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دروازے کی دوسری جانب سے ساری باتیں سنتی رہی ہے۔ تھوڑی بہت اردو تو اسے سمجھ میں آہی جاتی تھی۔ ''یہ بڑا کم ظرف بندہ لگتا ہے۔'' وہ شانی سے بولی۔

''ہاں، بالکل تھرڈ کلاس اور ایک دم شیخی خورہ۔''

''لیکن تم بھی تو کسی کو معاف نہیں کرتی ہو۔'' گریس پھیکے انداز میں مسکرائی۔ شانی نے کہا کہ وہ سمجھی نہیں۔ گریس جواب میں بولی۔ ''میں نے بہت دفعہ نوٹ کیا ہے شونی! تم سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہو۔ خاص طور سے صنفِ مخالف کو۔ میں جانتی ہوں اس میں تمہارا ذرا بھر قصور نہیں لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے۔''

''پلیز گریس! یہ موضوع پھر سہی۔'' گریس نے ایک بار پھر مسکرا کر موضوع بدل دیا اور شانی سے پوچھا۔

''کوئی کام کی بات معلوم ہوئی اس سے؟''

شانی کے چہرے پر سوچ کے تاثرات ابھرے۔ ''ایک بات میرے دماغ میں آرہی ہے۔''

''کیسی بات شونی؟''

''یہ انور ناگی بتا رہا تھا کہ اس کے پاس ایک بندہ آیا تھا، اسی نے بتایا تھا کہ یہاں ابراہیم کے گھر میں ایک انگریز لڑکی ہے۔ وہ لمبا اور دبلا پتلا سا شخص تھا۔''

''اس سے کیا ثابت ہوا؟''

''ثابت تو کچھ نہیں ہوا مگر مجھے قدموں کے وہ نشان یاد آئے ہیں جو ڈولے نے گورے کے بنگلے کے پاس دیکھے تھے۔ وہ بھی ایک دبلا پتلا اور بہت لمبا پاؤں تھا۔''

گریس پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''تمہارا مطلب ہے شونی! کہ یہ وہی بندہ تھا جس نے انور ناگی سے رابطہ کیا؟''

''ہاں اور انور ناگی کو رشوت دے کر تیار کیا کہ وہ یہاں آکر تمہارا کھوج لگائے۔ ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن کم از کم ایک امکان تو پیدا ہو گیا ہے۔''

''یعنی اس بندے کا پتا لگ جائے تو اور بھی کئی باتیں سامنے آسکتی ہیں۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پتا نہیں کیوں، میرا دل گواہی دے رہا ہے۔''

تین چار دن مزید اسی طرح گزر گئے۔ گھر میں خاموشی تھی۔ بے جی اور چاچا ابراہیم بھی رستم اور ناصر کی وجہ سے گم صم تھے۔ بے جی تو اپنا اکثر وقت مصلے پر ہی گزار رہی تھیں۔ شریف کے دونوں بیٹے اس کے لئے ازحد پریشان تھے۔ سب سے پتلی حالت شانی کی تھی۔ وہ گھر کا کام کاج کرتے ہوئے گاہے بگاہے بے ساختہ بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی، جیسے اسے توقع ہو کہ رستم کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دے گی۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آجائے

گا اور اپنے مخصوص مہربان لہجے میں کہے گا۔ ''شانی بی بی! معافی چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا۔''

رستم کے ساتھ ساتھ شانی کو اجمل خان کا بھی شدت سے انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی اجمل خان ایک باہمت اور باتدبیر شخص ہے۔ وہ جب آئے گا اس کے پاس یقیناً کوئی مثبت خبر ہوگی۔ بستی کا مکھیا نور عباسی بنگلے کا ایک چکر مزید لگانا چاہتا تھا مگر چاچا ابراہیم نے اسے روک دیا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ بنگلے میں چند بڑے پولیس افسروں نے مستقل ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور وہاں تفتیش کا دائرہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ پولیس اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے راہ چلتے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر تفتیش میں بٹھا رہی ہے۔ لوگ پوچھ گچھ سے ڈرے ہوئے ہیں اور کچھ گھرانے وہاں سے عارضی نقل مکانی کر کے گلیات کی طرف چلے گئے ہیں۔ نور عباسی نے بتایا کہ ایسے ہی ایک گھرانے کے ساتھ تکلیف دہ واقعہ پیش آیا ہے۔ پولیس کے بھیس میں کچھ نوسربازوں نے ایک فیملی کو گھیر لیا اور ایک ویران پولٹری فارم میں لے گئے۔ ان سے خچر چھین لئے گئے اور ان کی جوان لڑکی کو دو روز تک زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ یعنی ایک خطرے سے بچنے والے دوسرے خطرے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ایک دن شام کو ڈولا بیٹھے بیٹھے مضطرب ہو گیا۔ ''کیا بات ہے ڈولے! کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' شانی نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے باجی جی! اجمل خان صاحب ہمارے آس پاس ہی کہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بس مجھے لگ رہا ہے۔'' وہ پھر وہ اٹھ کر جلدی سے دروازے کی طرف گیا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر دستک ہوگئی۔ ڈولے نے بڑے اشتیاق کے عالم میں دروازہ کھولا۔ اجمل خان ''السلام علیکم چھوٹو بھائی'' کہتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس بکل میں اس کی چھوٹی نال والی سیون ایم ایم بڑے اچھے طریقے سے چھپ گئی تھی۔

اجمل خان کو دیکھ کر شانی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے خوشگوار انداز میں ڈولے کو السلام علیکم کہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس خدانخواستہ کوئی بُری خبر نہیں تھی۔ تو کیا وہ اچھی خبر کے ساتھ آیا تھا؟ کیا وہ رستم اور ناصر وغیرہ کا اتا پتا دریافت کرنے میں کامیاب رہا تھا؟ پھر شانی کی نگاہیں اجمل کی نگاہوں سے ملیں اور ایک دم اس کا دل بجھ گیا۔ اجمل کے پاس اگر کوئی بُری خبر نہیں تھی تو اچھی بھی نہیں تھی۔

اجمل خان نے ذرا دم لینے کے بعد اسے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا..... گورے کے بنگلے میں ہونے والی آتش زدگی اور اموات کی خبر نے کافی شہرت پائی تھی۔ پولیس کے محتاط اندازے کے مطابق اس اندوہناک واقعے میں کُل نو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں سے سات غیر ملکی تھے۔ ہلاک ہونے والے دو مقامی افراد کی شناخت بھی ہوگئی تھی۔ یہ دونوں افراد اس عمارت میں گارڈز کی حیثیت سے متعین تھے۔ عمارت کے کمپاؤنڈ میں بندھے ہوئے رکھوالی کے دو کُتے بھی اس آتش زدگی میں بھسم ہو گئے تھے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق عمارت میں ڈیزل چھڑکنے کے بعد آگ لگائی گئی۔ آگ اتنی شدید تھی کہ اس میں واقعے کے تمام تر ثبوت ناپید ہو گئے۔ بظاہر لگتا تھا کہ عمارت میں غیر ملکیوں کو قتل کرنے اور عمارت میں آگ لگانے والے لوگ بعد ازاں باقی بچے ہوئے افراد کے ساتھ موقع سے نکل گئے۔ نکلنے کے بعد وہ کہاں گئے اور کیسے روپوش ہوئے اس کے بارے میں ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اردگرد کے علاقے میں کچھ زمینی شہادتیں موجود تھیں لیکن بادوباراں کی وجہ سے یہ ضائع ہو گئی تھیں یا اتنی غیر واضح تھیں کہ کھوج کو آگے نہیں بڑھاتی تھیں۔ ویسے بھی یہ ساری زمین پتھریلی تھی یا سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ایسے گردوپیش میں عموماً شواہد ملنے مشکل ہو جاتے ہیں۔

اجمل خان نے کہا۔ ''شانی بہن! یہ صرف قتل کا معاملہ نہیں، غیر ملکیوں کے قتل کا معاملہ ہے۔ امارا پولیس کا لوگ خاصا بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ بہت سے بے گناہوں کو پکڑا بھی گیا ہے لیکن ابھی تک معاملے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ واردات آدھی رات کے بعد ہوا ہے۔ حملہ آوروں کو کسی نے آتے جاتے اور واردات کرتے نہیں دیکھا ہے۔''

''یہ گورے کا بنگلہ ہے کیا چیز اور یہ کس کا ہے؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''شانی بہن! ام کو اردگرد کے لوگوں سے جو کچھ پتا چلا ہے اس کے مطابق یہ انگریزوں کے دور کا بلڈنگ ہے۔ اب سیالکوٹ کا ایک سیٹھ مجید اس کا مالک ہے۔ یہ شخص ایک ٹریولنگ ایجنسی بھی چلاتا ہے۔ یہ عام طور پر غیر ملکیوں کو اپنا بنگلہ کرائے پر دیتا ہے۔ پچھلے دنوں یہ بلڈنگ ایک سرکاری اپسر (افسر) کے ذریعے ایک فلپ نام کے بندے نے حاصل کیا تھا۔ اس بلڈنگ کا کرایہ دو مہینے کے لئے ایڈوانس ادا کیا گیا تھا۔ ان انگریز لوگوں کو یہاں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہی ہوا تھا۔ اب سیٹھ مجید بہت پریشان ہے۔ اس کا کروڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ پولیس کا لوگ اسے کو علیحدہ کھینچتا پھر رہا ہے۔''

''یہ فلپ وہی ہے ناں، جو گریس اور اسٹیفن کا باس ہے؟''

''بالکل جی! یہ وہی بندہ ہے۔ یہ لندن میں دوائیں بنانے کا کام کرتا ہے اور بہت امیر کبیر شخص ہے۔''

''اور کیا معلوم ہوا وہاں سے؟'' شانی نے دریافت کیا۔

''اور یہ پتا چلا ہے کہ وہاں لاہور میں مُنا کے بارے میں اخبارات کے اندر مسلسل خبریں آرہا ہے۔ پولیس تو اس سلسلے میں بھاگ دوڑ کر ہی رہا ہے چوہدری بشیر کا اپنا لوگ بھی ہر طرف شکاری کتوں کی طرح بُو سونگھتا پھر رہا ہے۔ اس بارے میں آپ پر بھی الزام لگایا جارہا ہے۔ چوہدری بشیر کا کارندہ لوگ یہ ظاہر کررہا ہے کہ مُنے کو اغوا کرنے میں آپ کا ہاتھ ہوگا۔ سنا ہے کہ چوہدری بشیر تو غصے سے بالکل دیوانہ ہورہا ہے۔''

''اجمل بھائی! اسی لئے تو تمہیں کہتی ہوں کہ زیادہ اِدھر اُدھر مت گھومو۔ یہ تمہارے لئے خطرناک ہے اور ہم سب کے لئے بھی۔''

''لیکن ام کیا کرے شانی بہن! جب تک رستم بھائی کا کھوج نہیں ملتا امارے لئے چین سے بیٹھنا بہت مشکل ہے۔ ام تو کھانا بھی کھاتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ زہر کھا رہا ہے اور خون کے گھونٹ پی رہا ہے۔ آپ کا پریشانی ام سے دیکھا نہیں جاتا۔''

''میں کہاں پریشان ہوں۔'' شانی نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

''ام سب جانتا ہے۔ آپ ام کو کچھ نہ بتائیں۔ ام کو معلوم ہے آپ رستم بھائی سے کتنا محبت کرتا ہے۔ ام سب جانتا ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''شانی بہن! یہ بات تو اب طے ہے کہ گورے کے بنگلے پر حملہ کرنے والا حرامی لوگ بھی وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے یہاں اس گھر میں توڑ پھوڑ مچایا تھا۔ ام ان میں سے بہت سے لوگوں کو شکل سے پہچان سکتا ہے۔ ان کا حلیہ بھی ام نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک دو بندہ پوٹھوہاری زبان بولتا تھا اور شکل سے بھی پوٹھوہاری لگتا تھا لیکن زیادہ لوگ ام کو گلگت اور اسکردو وغیرہ کی سائیڈ کا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور خاص بات بھی ہے۔ وہ اُلو کا دم فاختہ...... کیا نام ہے اس کا...... حوالدار ناگی؟'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''یقینی بات ہے کہ حوالدار ناگی بھی ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ امارا دل چاہتا ہے کہ شام کے بعد منہ پر ڈھاٹا باندھ کر جائے اور بسم اللہ پڑھ کر ناگی کا گردن پکڑ لے اور تب تک نہ چھوڑے جب تک ام کو وہ کوئی کام کی بات نہ بتا دے۔''

''حوالدار ناگی یہاں آیا تھا اور میری اس سے بات بھی ہوئی ہے۔'' شانی نے پھر ناگی

سے ہونے والی بات چیت کی ساری تفصیل اجمل خان کو بتائی۔ آخر میں اس نے کہا۔

''اجمل! پتا نہیں کیوں یہ بات بار بار میرے دل میں آرہی ہے کہ ناگی کے پاس آنے والا دبلا اور لمبوترا شخص وہی ہے جس کے پاؤں کے نشان ڈولے نے بنگلے کے آس پاس دیکھے تھے۔ ڈولے کی باتیں بظاہر عجیب لگتی ہیں لیکن اکثر وہ بعد میں درست ثابت ہوتی ہیں۔ اب اگر ہم اس بات کو سچ مان بھی لیں کہ ناگی کے پاس آنے والا بندہ وہی تھا جو بعد میں بنگلے پر بھی گیا تھا تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ بنگلے پر حملہ کرنے والے جنونی وہی تھے جنہوں نے یہاں پر ہلہ بولا۔ بنگلے کے ملبے میں سے مجھے جو کلہاڑی کا پھل ملا وہ بھی اس چیز کا ایک اور ثبوت ہے۔''

''آپ کا بات امارا کھوپڑی میں آرہا ہے۔'' اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اب سوال یہی ہے کہ وہ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے؟'' پھر وہ ذرا وقفے سے بولی۔ ''مجھے تو اس سارے معاملے کا تعلق سپ گندل سے ہی لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مسٹر فلپ اور اسٹیفن وغیرہ پر حملہ کرنے والے لوگ وہی ہوں جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے لندن میں باپ بیٹے کو جان سے مارا۔ اس باپ بیٹے کا قصور بھی یہی تھا کہ وہ پودے کو اپنے طور پر کاشت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔''

''کیا لندن میں قتل ہونے والوں کا کوئی کھوج ملا تھا؟'' اجمل نے پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں معلوم نہیں لیکن اگر ان لوگوں کا کوئی اتا پتا ملا تھا تو وہ یہاں کی پولیس کے بہت کام آسکتا ہے۔''

☆======☆======☆

گزرنے والا ہر دن ایک پہاڑ کی طرح تھا، اپنی جگہ سے سرک ہی نہیں رہا تھا۔ ہر صبح شانی کی امید بندھتی تھی اور ہر شام ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ سارا دن تو کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی لیکن جب رات ہوتی اور وہ چاچا ابراہیم کو دوا کھلا کر اور بے جی کے پاؤں دبا کر بستر پر لیٹتی تو رستم کا خیال بے پناہ شدت سے اس پر حملہ آور ہوجاتا۔ اس خیال میں اتنی توانائی ہوتی تھی کہ شانی کو اپنے دل کی نازک رگیں ٹوٹتی اور کٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ رستم کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز اسے یاد آتے، ان شب و روز کا ایک ایک پل اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا۔ کتنے تھوڑے عرصے میں وہ کتنا قریب آگیا تھا۔ جسم میں روح کی طرح سما گیا تھا۔ اب تو اس سے لمبی جدائی کا تصور بھی محال تھا۔ اس سے بچھڑے ہوئے یہ مشکل بیس پچیس روز گزر رہے تھے مگر شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے برسوں بیت گئے

ہیں۔ یہ کیسا تعلق تھا؟ رستم کو پانے اور پرکھنے کے بعد اس کی طلب کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

رستم کے حوالے سے شانی کی پریشانی اور تڑپ شاید اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اسے رستم کے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ اگر وہ کہیں گیا ہوتا، بے شک بہت دور ہوتا، بے شک مشکل میں ہوتا لیکن معلوم تو ہوتا کہ وہ کہاں ہے؟ اب تو نگاہوں کے سامنے بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ تو شانی کو بھی معلوم تھا کہ ان دونوں کی ازدواجی خوشیاں آندھی میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہیں۔ کسی بھی وقت ان خوشیوں کو حالات کی نظر لگ سکتی ہے لیکن اتنی جلدی...... اتنے تھوڑے وقت میں روز و شب کے تیور بدلنے لگیں گے، یہ شانی نے ہرگز نہ سوچا تھا...... دکھوں اور تکلیفوں سے بھری ہوئی اس زندگی میں صرف چند اچھے دن..

چند مہربان راتیں!

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا...... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ جدائی عارضی ہے۔ بہت جلد اس کا شریکِ حیات پھر اس چار دیواری میں ہوگا۔ اس کی بھرپور مسکراہٹیں، اس کی گرم مہربان بانہیں، اس کی حیات بخش سرگوشیاں، یہ سب کچھ پھر سے اس کے اردگرد ہوگا۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکی۔ اس کے لئے۔ ابھی تو اس کے جسم سے بہت سے کانٹے چننے ہیں اسے...

ابھی تو اس کے کئی زخموں کے منہ سینے ہیں...... ابھی تو اس کے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جمی ہیں۔ نہیں...... ابھی نہیں۔

ایک شام بے جی نے اسے جھاڑ پلائی۔ وہ جھرنے کے پاس کھلنے والی کھڑکی کے سامنے اداس بیٹھی تھی۔ بے جی نے کہا۔ ''شانی! یہ کیا حال بنالیا ہے تُو نے؟ نہ کپڑے بدلنے کی فکر ہے، نہ نہانے دھونے کی۔ بال کس طرح خشک ہو رہے ہیں۔ ذرا شیشے میں منہ دیکھ...... لگتا ہے ہفتوں سے بیمار پڑی ہے۔ نئی سہاگنیں اس طرح اُجڑی بجڑی نہیں پھرا کرتیں۔ چل اٹھ کپڑے بدل۔''

''اچھا بے جی۔''

''ہر بات پر اچھا بے جی۔ کھانا کھالو...... اچھا بے جی، دودھ پی لو...... اچھا بے جی، کپڑے بدل لو...... اچھا بے جی اور کرنا کرانا کچھ بھی نہیں۔ چل اٹھ، ابھی میرے سامنے اٹھ۔''

بے جی نے ممتا بھرے غصے سے کہا۔

شانی اپنے بکھرے بالوں کو سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے لکڑی کی الماری کھولی اور تہہ کئے ہوئے کپڑوں میں سے ایک جوڑا نکالا۔ ایک خشک پھول کپڑوں کے اندر

سے نیچے گر گیا۔ شانی نے جھک کر پھول اٹھایا اور اس کی آنکھیں پھر نم ہوگئیں۔ سفید گلاب کا یہ پھول اس دن کی نشانی تھا جب شانی نے احاطے میں جا کر بھینس کا دودھ دھویا تھا۔ واپسی پر یہ پھول شانی کی اوڑھنی سے اٹک کر یہاں چلا آیا تھا۔ بعد ازاں رستم نے یہ پھول شانی کے بالوں میں لگایا تھا۔

وہ خشک پھول چٹکی میں دبا کر محویت سے دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر پھول دوبارہ کپڑوں کی تہہ میں رکھ دیا اور لباس بدلنے میں مصروف ہوگئی۔ یہی وقت تھا جب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد کمرے کے دروازے پر ایک بے چین دستک ہوئی۔ دوسری طرف اجمل خان تھا اور کافی گھبرایا ہوا تھا۔ شانی نے قمیص بدلنے کا ارادہ ترک کر کے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اجمل خان کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی سیون ایم ایم رائفل تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور طیش ایک ساتھ جمع ہو رہے تھے۔

''کیا بات ہے خان بھائی؟'' شانی نے پوچھا۔

''ام کو لگتا ہے کہ کوئی سخت قسم کا گڑبڑی ہوگیا ہے۔ شاید پولیس کو امارے بارے میں پتا چل گیا ہے۔'' خان نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا پھر رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ ''باہر دو آدمی آیا ہے، ان میں سے ایک بندے پر ام کو شک ہے کہ وہ سرحد پولیس کا ایک انسپکٹر ہے۔ ام اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اگر یہ واقعی وہی ہے تو پھر...... اب یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''وہ سادہ کپڑوں میں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں دونوں نے پہاڑی لباس پہن رکھا ہے۔ سر پر پگڑ رکھے ہوئے ہیں لیکن امارا نظر دھوکا نہیں کھا سکتا۔ وہ پولیس والا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ امارے لئے یہاں آیا ہو یا ام سب کے لئے آیا ہو۔ کچھ بھی ہے بہن جی...... اگر ان لوگوں نے کسی طرح کا زبردستی کیا تو پھر امارے ہاتھوں سے ان کا موت لکھا جائے گا۔'' اجمل خان کی گھبراہٹ بتدریج پُرجوش غصے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔

اتنے میں چاچا ابراہیم اپنی گڑگڑی تھامے اندر آگئے۔ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''دھی رانی! باہر دو بندے آئے ہیں۔ تمہارا نام لے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنا نام حاجی حیات بتا رہا ہے۔''

شانی کا جسم سنسنا اٹھا۔ ''حاجی حیات؟'' ابراہیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

شانی کی دھڑکنیں تیز تر ہوگئیں۔ اسے لگا کہ اس ویرانی اور بے سروسامانی میں اسے

جس مدد کی ضرورت تھی وہ اس کے پاس پہنچ گئی ہے۔ حاجی حیات، رستم کا وہ دوست تھا جس نے پس پردہ رہتے ہوئے بھی ہر ہر قدم پر اس سے تعاون کیا تھا۔ وہ ایک بااختیار پولیس افسر تھا اور اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس کے لمبے اور متحرک ہاتھوں کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ رستم شدید زخمی حالت میں وادی سون سے تحصیل مری کے اس گاؤں تک پہنچ گیا تھا لیکن کیا آج شام اس گھر کے دروازے تک پہنچنے والا واقعی ایس ایس پی حاجی حیات خان تھا۔

شانی نے اوڑھنی لی اور جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ ابراہیم اور اجمل خان حیران کھڑے تھے۔ شانی نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ شام کے لمبے ہوتے ہوئے سایوں میں چیڑ کے ایک نوعمر پودے کے پاس حاجی حیات خان پھٹے پرانے مقامی لباس میں موجود تھا۔ شانی جلدی سے واپس پلٹی اور چاچا ابراہیم سے کہا کہ وہ آنے والوں کو بیٹھک میں بٹھائے۔ حاضر ڈیوٹی حاجی حیات خان ایک دشوار سفر طے کر کے از خود یہاں پہنچا تھا۔ یہ اس بات کا بین ثبوت تھا کہ وہ رستم کے لئے اپنے اندر بے حد تڑپ رکھتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد شانی بیٹھک میں حاجی حیات کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے گھونگھٹ نہیں نکال رکھا تھا، ہاں سر پر اوڑھنی موجود تھی۔ حاجی حیات کے ساتھ آنے والا شخص واقعی ایک انسپکٹر تھا اور اس کا تعلق سرحد پولیس سے تھا۔ اس کی حیثیت حاجی کے ذاتی دوست کی تھی۔ اس لحاظ سے اجمل خان کا یہ بیان درست ثابت ہوا تھا کہ سرحد پولیس کا ایک انسپکٹر باہر دروازے پر موجود ہے۔

سلام دعا اور حال احوال پوچھنے کے بعد حاجی حیات اور شانی میں چند رسمی باتیں ہوئیں پھر حاجی حیات کے ساتھ آنے والا انسپکٹر از خود ہی اٹھ کر باہر چلا گیا۔ شانی نے باہر آ کر اجمل خان کو ساری صورتِ حال بتا دی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان انسپکٹر صاحب سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں۔ اجمل خان اور انسپکٹر دونوں باہر نکل گئے۔ اب حاجی حیات اور شانی آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ کئی ماہ پہلے مہتم بستی میں ہونے والی ملاقات کے بعد حاجی حیات سے شانی کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ پہلی بالمشافہ گفتگو تھی۔ حاجی حیات نے شانی سے پہلا سوال وہی کیا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ حاجی حیات نے شانی سے پوچھا کہ کیا وہ گوجرانوالہ سے وڈے ڈیرے پر خود گئی تھی یا ریاض ہٹلر اسے زبردستی لے کر گیا تھا۔

شانی نے تسلیم کیا کہ ریاض اسے زبردستی لے کر گیا تھا۔

حاجی حیات نے کہا۔ ''شانی بی بی! میرے خیال میں تمہارا یہ بیان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تمہارے تایا معصوم لاپتا نہیں ہوئے بلکہ وہ ریاض ہٹلر کی حبس بے جا میں ہیں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' شانی نے حاجی کی طرف سے نگاہیں پھیرتے ہوئے کہا۔

''شانی بی بی! تم کچھ جانتی نہیں ہو یا بتانا نہیں چاہتی ہو؟''

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

پانچ دس سیکنڈ کی خاموشی کے بعد حاجی حیات نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ فی الحال میں تمہاری پریشانیاں بڑھانا نہیں کم کرنا چاہ رہا ہوں۔ سب سے پہلے میں تمہیں شادی کی مبارک باد دینا چاہتا تھا لیکن ان حالات میں مبارک کا لفظ مجھے کچھ عجیب لگ رہا ہے۔ میں تمہیں شادی کی مبارک باد دوں گا لیکن ابھی نہیں...... رستم کے مل جانے کے بعد۔'' (شانی کا یہ خیال درست نکلا کہ حاجی حیات رستم کی گمشدگی سے آگاہ ہو چکا ہے)

شانی نے امید بھری نظروں سے حاجی حیات کی طرف دیکھا۔ وہ ظاہری طور پر بھی ایک نہایت مضبوط اور کارگر شخص نظر آتا تھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، رستم اور ناصر مل جائیں گے؟'' شانی نے پوچھا۔

''بے فکر رہو شانی بی بی! ہم انہیں تلاش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔'' حاجی حیات نے عزم سے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''مجھے اب تک جو انٹیلی جنس رپورٹس ملی ہیں ان کے مطابق یہ اسی نایاب جڑی بوٹی کا چکر ہے جسے مقامی طور پر سپ گندل کا نام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی خودرو پیداوار آہستہ آہستہ ختم ہو چکی ہے یا پھر بہت خاص علاقوں میں اور بہت تھوڑی مقدار میں موجود ہے۔ درحقیقت یہ جڑی بوٹی ہمارے علاقے کی ہے ہی نہیں۔ یہ بہت سرد علاقے کی نباتات ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے یہاں مصنوعی طریقے سے کاشت کرنے کی کوشش کی اور چند افراد اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان میں نارپور کا بڑا چوہدری مہر جی بھی شامل تھا۔ سپ گندل کی مصنوعی کاشت کا طریقہ بڑا عجیب بلکہ ڈرامائی طرز کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پودے کی خوراک میں خاص قسم کے سانپ کا فضلہ اور جانوروں کا خون وغیرہ شامل ہوتا ہے۔ چوہدری مہر مرحوم کی حویلی میں کام کرنے والے کچھ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن کیاریوں میں یہ پودا کاشت کیا گیا تھا وہاں پالتو سانپوں کا ایک جوڑا مستقل رہائش رکھتا تھا۔ کیا تم نے بھی حویلی میں رہتے ہوئے کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سانپوں کے جوڑے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن ایک سیاہ

کوبراسانپ میں نے ضرور دیکھا تھا۔اس کے جسم میں سوراخ کر کے اس میں ڈوری پروئی گئی تھی تاکہ وہ پھلواری کے اندر ہی گھومتا رہے۔ پودے کے پتے سنہری اور پھول سرخ تھے۔ ان پتوں کو غور سے دیکھا جائے تو ان کی شکل بھی سانپ کے پھن جیسی لگتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ مہر کو پھلواری میں کھاد کی جگہ گوشت کے باریک ٹکڑے بھی ڈالتے دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کیا کرتا رہتا تھا ان پودوں کے ساتھ۔''

حاجی حیات نے مقامی طرز کی بھاری پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور بولا۔''میں اب تک جو جان سکا ہوں اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نایاب پودے کی اصل جگہ یا اس کا اصل وطن شمالی طرف کے سرد علاقے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس پودے کو مقدس سمجھتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق اس کے کسی بھی جائز یا ناجائز استعمال کے سخت خلاف ہیں...... تمہیں شاید معلوم ہی ہو، کچھ عرصہ پہلے لندن میں وارا نام کا ایک شخص اور اس کا بیٹا بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان باپ بیٹے کے قتل کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اس پودے کو انگلینڈ میں مصنوعی طریقوں سے اُگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دہرے قتل کا معاملہ آج تک معمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ جیسے علاقے کی پولیس بھی ابھی تک اس گتھی کو سلجھا نہیں سکی ہے۔''

حاجی حیات کی باتوں سے شانی کو یوں لگا جیسے واقعات کی کڑیاں مل رہی ہیں۔ حاجی حیات شمال کے سرد علاقوں کی بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف جن جنونی افراد نے پہلے یہاں اور پھر گورے کے بنگلے پر حملہ کیا وہ بھی غیر مقامی لگتے تھے۔ اس حوالے سے شانی کو جو تفصیل بھی معلوم تھی وہ اس نے حاجی حیات کے گوش گزار کر دی۔ حاجی حیات بہت دھیان سے سنتا رہا۔ دو چار باتیں اس نے اپنی جیبی ڈائری میں بھی نوٹ کیں۔

اس کے بعد حاجی حیات نے گریس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گریس اور حاجی حیات میں بھی تفصیل سے بات ہوئی۔ گریس نے حاجی حیات کو اپنے کروڑ پتی باس مسٹر فلپ اور اپنے شوہر اسٹیفن کے بارے میں بھی چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔ اس کے بعد گورے کے بنگلے میں ہونے والے سارے واقعات سے بھی حاجی حیات کو آگاہ کیا۔ جب اس نے حاجی حیات کو رستم کی ٹانگ کے نہایت ''رسکی'' آپریشن کے بارے میں بتایا تو حاجی حیات پہلے سے زیادہ متفکر نظر آنے لگا۔

آخر میں گریس نے کہا۔''مسٹر فلپ نے اپنے خرچے پر تین نہایت مہنگے ڈاکٹروں کو یہاں بلا رکھا تھا۔ ان میں ایک آسٹریا کا ڈاکٹر رابرٹ، دوسرا انڈیا کا ڈاکٹر یوسف اور تیسری

ایک سیکسالوجسٹ ڈاکٹر مالینا ہے۔ میں آپ کو غیر جانبداری سے وہی کچھ بتا رہی ہوں جو میں نے دیکھا ہے۔ مسٹر فلپ اور اس کے ساتھی بڑی بے رحمی سے یہاں کچھ تجربات کرنے میں مصروف تھے...... میں اس پر بہت شرمندہ اور دکھی ہوں۔''

''تجربات سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' حاجی حیات نے پوچھا۔''کیا آپ کا مطلب ہے کہ رستم کی ٹانگ جوڑنے جیسے تجربات؟''

''جی ہاں...... اور اس کے علاوہ بھی۔'' گریس نے کہا پھر ذرا جھجک کر اس نے شانی کی طرف دیکھا اور بولی۔''مسٹر فلپ نے یہاں کچھ بوڑھے حضرات جمع کر رکھے تھے۔ ان پر بڑی بے پروائی سے اس جڑی بوٹی کے تجربات کیے جا رہے تھے اور شاید اب بھی کیے جا رہے ہوں۔''

گریس سے حاجی حیات کی گفتگو آدھ پون گھنٹہ رہی پھر وہ ڈیوس اور مُنے کے پاس چلی گئی۔ حاجی حیات نے شانی سے کہا۔''میرے یہاں آنے کا ایک مقصد تمہیں سمجھانا بھی ہے شانی بی بی! مجھے تمہاری طرف سے خطرہ ہے کہ کسی وقت تم کہیں اپنے طور پر رستم کو ڈھونڈنے نہ چل پڑو۔ اگر کوئی ایسی بات تمہارے دماغ میں ہے تو اسے بالکل کھرچ کر نکال دو۔ میرے خیال میں تمہارے اور مُنے کے لئے یہ ٹھکانہ فی الوقت محفوظ ترین ہے۔ تمہیں شاید ٹھیک سے اندازہ نہ ہو کہ اس چاردیواری سے باہر تمہارے لئے کتنے خطرے ہیں۔ اگر میں تمہیں گن کر بتاؤں تو اس وقت تین بڑے خطرے ہیں۔''

اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''پہلا خطرہ چوہدری بشیر کی طرف سے ہے۔ بچے کی گمشدگی کے بعد وہ بالکل جنونی ہو رہا ہے۔ وہ اب صاف لفظوں میں تم پر الزام لگا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تم نے اپنے کسی مددگار کے ذریعے بچے کو لاہور سے اٹھوایا ہے۔ اس کے بندے دور دور تک تمہیں اور مُنے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ چوہدری بشیر کے خوف سے وہ لڑکا لڑکی بھی غائب ہو گئے ہیں جن کی تم نے شادی کروائی تھی اور لڑکی کا باپ بھی اپنی فیملی کے ساتھ روپوش ہے۔ دوسرے نمبر پر پیر قدرت اللہ زخمی سانپ کی طرح پھنکاریں مار رہا ہے۔ ملتان میں رستم کے ہاتھوں اس کی لاڈلی بیوی قتل ہوئی اور دیگر بندے مارے گئے۔ وہ اس واقعے میں تمہیں بھی برابر کا ذمے دار سمجھتا ہے...... میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت اللہ کے کئی سرپھرے چیلے ایسے ہیں جنہوں نے قدرت اللہ کی بیوی کے بدلے میں تمہاری جان لینے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ وہاں لاہور میں چوہدری بشیر کی کوٹھی پر تم پر جو قاتلانہ حملہ ہوا وہ اسی سلسلے میں تھا۔ اپنے تیسرے بڑے دشمن کے بارے

میں تو تم اور رستم اچھی طرح جانتے ہی ہو۔ وہ ریاض ہٹلر ہے۔ وہ بہت خرانٹ شخص ہے۔ میرے خیال میں اب بھی اس کے دماغ میں بیس تیس فیصد تک یہ شک موجود ہوگا کہ رستم وڈے ڈیرے کے قتلِ عام میں بچ کر نکل گیا ہے اور تمہارے بارے میں تو اسے یقین ہے کہ تم اپنی مرضی سے روپوش ہو۔ وہ پیچھا چھوڑنے والا شخص نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے تمہاری اور گریس کی تلاش مسلسل جاری رکھی ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے لاہور میں گریس کے شوہر اسٹیفن سے بھی لمبی چوڑی پوچھ گچھ کی تھی اور اس سے پوچھا تھا کہ اس کی بیوی اور بچہ کہاں ہیں۔ دوسری طرف وہ سینئر اخبار نویس ضمیر احمد صاحب پر بھی مختلف طریقوں سے پریشر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں اس چار دیواری سے نکلنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ یہاں سے جاتے ہی میں بڑے بھرپور طریقے سے رستم اور ناصر کی تلاش شروع کر رہا ہوں۔ ایک دو کلیو ہیں میرے پاس اور مجھے پوری امید ہے کہ میں چند دنوں کے اندر ہی تمہیں کوئی اچھی خبر سنا سکوں گا.....''

شانی نے کہا۔ ''جن لوگوں نے گورے کے بنگلے پر حملہ کیا وہ انگریزوں کے دشمن تھے.....ممکن ہے کہ وہ زندہ بچ جانے والے غیر ملکیوں کو پکڑ کر ساتھ ہی لے گئے ہوں لیکن رستم، ناصر اور وہاں موجود بوڑھے لوگوں سے حملہ آوروں کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ وہ ان کو بھی اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟''

''ابھی سب کچھ الجھا ہوا ہے شانی بی بی! کوئی بات واضح نہیں لیکن جس طرح ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بہت سرپھرے اور دیوانے قسم کے لوگ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے بنگلے میں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہو۔''

''کیا وہ انہیں اپنے ساتھ آگے پہاڑوں میں لے گئے ہوں گے؟''

''بظاہر تو یہ کام آسان نہیں لگتا۔ لوکل پولیس نے علاقے میں کافی چھان بین کی ہے۔ اتنے زیادہ لوگوں نے اگر اکٹھے اس علاقے میں سفر کیا ہو تو کہیں نہ کہیں سے تو کوئی شہادت مل جائے۔ ابھی تک ایسی کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملی۔''

''تو پھر حاجی صاحب..... یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں چھپے ہوں۔''

اسی دوران میں بے جی نے ادھ کھلے دروازے پر دستک دی اور شانی کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ ''کیا بات ہے بے جی؟'' شانی نے سرگوشی کی۔

بے جی نے ڈرتے ہوئے انداز میں برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں مٹکے کی سی توند والا سانولا سلونا انور ناگی بڑے غصے سے کھڑا تھا۔ وہ حسبِ معمول وردی میں تھا اور

بوگس فائل ایک سپاہی نے اٹھا رکھی تھی۔ شانی نے تیز سرگوشی میں بے جی سے پوچھا۔

''بے جی! اس پولیس والے نے گریس کو تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں دھی رانی! میں اتنی جھلی نہیں ہوں۔ میں نے انگریزنی اور اس کے بچے کو پچھلے کمرے میں بھیجنے کے بعد دروازہ کھولا تھا۔''

شانی دھیمے قدموں سے حوالدار ناگی کے پاس چلی گئی۔ ''جی تھانیدار جی؟''

''تیرا بندہ آیا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں جی۔''

''اور دیور بھی نہیں آیا ہوگا؟''

''وہ تو آیا ہے لیکن ابھی گھر میں نہیں ہے۔''

ناگی کی آنکھیں چمکیں۔ وہ توند پر ہاتھ پھیر کر بولا ''تجھ سے ایک دو باتیں پوچھنی ہیں مختاراں۔ ذرا دو منٹ کے لئے بیٹھک میں چلو۔''

''وہ میرے رشتے کا ایک بھائی آیا ہوا ہے۔''

''اوہ، تو میں چلتا ہوں.....پھر آجاؤں گا۔'' ناگی ذرا بدمزہ ہوکر اور ذرا اڑ کر بولا۔

شانی نے تیزی سے سوچا اور بولی۔ ''کوئی بات نہیں۔ آپ آجائیں، میں اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیتی ہوں۔''

شانی کی اس ہمت افزا بات نے ناگی کے سانولے چہرے کی رونق بحال کردی۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور حاجی حیات سے بولی۔ ''آپ نے دیکھا ہے؟ برآمدے میں وہی حوالدار ناگی کھڑا ہے۔ اس سے کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں اسے اندر بلا کر اس سے بات کرتی ہوں۔ آپ ساتھ والے کمرے میں کھڑے ہوکر یہ باتیں سن سکتے ہیں۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔''

شانی نے حاجی حیات کو بیٹھک سے باہر نکال دیا۔ وہ مکمل دیہاتی لباس میں تھے اور لباس بھی کھیت مزدوروں جیسا تھا۔ اپنی پھٹی ہوئی چپل کو گھسیٹتے ہوئے اور مسکین انداز میں سر جھکائے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ حوالدار ناگی نے اپنے مریل سے سپاہی کو باہر برآمدے میں بیٹھا رہنے دیا اور خود شانی کے ساتھ اندر بیٹھک میں آگیا۔ غالباً اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ چاچے ابراہیم کے گھر میں اس کی دال گلنا شروع ہوگئی ہے۔ بے جی نے ملائی والے دودھ سے بھرے ہوئے دو لمبے گلاس اسٹیل کی ٹرے میں رکھے اور رسوئی سے باہر لے

آ نیں۔ انہوں نے یہ بڑے ڈولے کو تھما دی۔ ڈولا اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا برآمدے میں پہنچا اور ایک گلاس سپاہی کو پیش کرنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔

دودھ کو دیکھ کر ناگی نے ذرا منہ بنایا اور بولا۔ ''میں اس وقت دودھ نہیں پیتا...... لیکن چلو آج پی لیتا ہوں تم لوگوں کی خاطر۔''

''آپ جو کہیں وہ بنوا لیتے ہیں جی۔'' شانی جلدی سے بولی۔ ''چائے اور بسکٹ ٹھیک رہیں گے؟''

''نہیں چائے بسکٹ کا کیا کرنا ہے۔ یہ بھی کوئی کھانے پینے والی شے ہے۔''

''تو پھر؟''

''کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی...... پھر کبھی تمہارے ہاتھوں سے مرغی کو تڑکا لگوائیں گے۔ ویسے بھی آج تو تمہارا بھائی آیا ہوا ہے خیر نال۔'' حوالدار کی باتیں معنی خیز تھیں۔ شانی خاموش رہی۔ ڈولا واپس جا رہا تھا۔ ناگی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ گٹھا کون ہے؟ بڑی چالاکی اور ہوشیاری نظر آتی ہے اس کی آنکھوں میں۔''

''یہ میرے دیور کا بیلی ہے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہو گا ورنہ سیدھا سادہ ہے۔''

انور ناگی نے رانو نامی اصیل بھینس کا خالص دودھ پی کر لمبی ڈکار لی اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''بڑے تھانیدار صاحب پرسوں بھی کہہ رہے تھے کہ ابراہیم، اس کے بھتیجے اور بھتیجے کے یارتیوں کو چوکی میں پیش کرو۔ وہ کچی رپورٹ کو پکا کرنے کا بھی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہہ سن کر بات ٹال دی ہے۔ اگلے ہفتے وہ ڈیڑھ مہینے کی چھٹی پر جا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ مدعی بھی دوبارہ نہ آئے اور بات آئی گئی ہو جائے۔ ویسے تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 363 اور...... اور 365 کوئی ایویں شیویں نہیں ہوتی ہیں۔ ان میں راضی نامہ ہوتا ہے نہ ضمانت ضمانت ہوتی ہے۔ سات سال تک قید ہو سکتی ہے اور جرمانے اس کے علاوہ ہوتے ہیں خیر نال۔''

دو تین منٹ تک اپنی بے پناہ قانون دانی اور لامتناہی اختیارات کا رعب گانٹھنے کے بعد ناگی نے سگریٹ سلگائی اور بے کار میں اپنے بوسیدہ موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ وہ اول نمبر کا ڈرامے باز تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ ساتھ والے کمرے میں واقعی ایک بہت بڑا افسر موجود ہے اور اس کی ساری شیخیاں اور دھونس دھاندلیاں ملاحظہ کر رہا ہے۔

موبائل کو اپنی جیب میں رکھنے کے بعد ناگی نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر طلائی چوڑیاں نکال لیں۔ ان درمیانے وزن کی چوڑیوں کی تعداد چار

تھی۔ یہ چوڑیاں ناگی نے سبز رنگ کے بوسیدہ سے گڈی کاغذ میں لپیٹ رکھی تھیں۔ ''لے یہ اپنے پاس رکھ لے۔ بڑی مہنگی شے ہے خیر نال۔ کسی کو بتانا نہیں۔''

''میں یہ نہیں رکھ سکتی۔'' شانی نے کہا۔

''پھر وہی بات۔ میں نے کل تجھ سے کہا تھا۔ انکار نہیں کرنا ہے۔ محبت سے دے رہا ہوں تجھے۔''

شانی نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس نے چوڑیاں شانی کے پاس اس کی اوڑھنی کے نیچے رکھ دیں اور چوکسی سے دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ''اور بھی زیور ہے میرے پاس۔ جی چاہتا ہے تجھے پیلا کر ڈالوں...... پر کسی کو بتانا نہیں ہے تُو نے۔ یہ گٹھا مجھے بڑا ہوشیار لگتا ہے اور یہ ابراہیم کی بڈھی بھی...... ان سے ہوشیار رہنا۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''تیرا بندہ ابھی تک نہیں آیا خیر نال، تجھے روپوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

شانی نے انکار میں سر ہلایا۔

طرفہ تماشا تھا۔ رشوت لینے والا، رشوت دینے کے چکر میں تھا۔

''میرے دماغ میں تو آج کل بس ایک ہی بات گھسی ہوئی ہے۔'' شانی نے کہا۔ ''وہ بندہ کون ہے جو یہاں انگریزی گڈی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ میرے گھر والوں کے ساتھ اس کی کیا دشمنی تھی۔ وہ پھر نظر نہیں آیا ہے؟''

''وہ نظر نہ ہی آئے تو چنگا ہے مختاراں۔ تُو بات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ قانونی معاملہ ہے۔ اگر مدعی سُست پڑ جائے تو سارا معاملہ سُست پڑ جاتا ہے بلکہ ختم ہو جاتا ہے۔ تُو دفع کر اس کو۔''

''میں کیا کروں۔ میرے دماغ سے یہ بات نکلتی ہی نہیں ہے تھانیدار جی۔''

''یہ بات دماغ سے نکال دے۔ یہ بڑی منحوس بات ہے۔ تجھے اصل بات کا پتا نہیں ہے ناں...... یہ بڑا خطرناک قسم کا چکر ہے۔ اگر کہیں تم لوگ اس رگڑے میں آ گئے ناں تو پھر شاید میں بھی کچھ نہ کر سکوں گا خیر نال۔''

''آپ کس رگڑے کی بات کرتے ہیں؟''

ناگی شانی کی سمت کچھ اور جھک گیا۔ لالٹین کی روشنی اس کے چہرے کو ایک طرف سے زیادہ روشن کر رہی تھی۔ اس نے سرکاری ٹوپی اتار کر گود میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کی تیل میں چپڑی ہوئی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ وہ رازداری سے بولا۔ ''میری تفتیش یہ کہہ رہی ہے کہ بنگلے والی واردات بھی اسی معاملے کے ساتھ نتھی ہے۔ بنگلے والی بات جانتی ہو ناں تم بھی جس

میں نو دس بندے قتل ہوئے اور پورا بنگلہ جل گیا۔"

شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔ "ہاں، بستی میں سب اس کی باتیں تو کرتے ہیں۔"

"میرے بندے اس سارے معاملے کی انکوائری کر رہے ہیں۔ تم کو شاید پتا ہو یا نہ ہو، اس واردات میں قتل ہونے والے زیادہ لوگ خیر نال انگریز تھے۔ یہاں بھی وہ لمڈھینگ بندہ کسی انگریز کُڑی کی ٹوہ لگاتا پھر رہا تھا۔ اب پتا نہیں اس بندے کو کیسے شک ہوا کہ وہ انگریز کُڑی اس چار دیواری میں ہے۔ ابھی تک تو یہ پتا بھی نہیں کہ وہ شک خیر نال درست تھا یا غلط؟ اگر غلط بھی تھا تو بھی اس شک کی وجہ سے چاچا ابراہیم، تیرا بندہ اور دیور سب مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔ یہ کیس سولہ آنے قابلِ دست درازی پولیس ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو بہت بعد میں عدالت کے اندر ہونا ہے کہ ملزم نے جرم کیا ہے یا نہیں، اس سے بہت پہلے ہی تھانے کچہری میں ملزم کی مٹی پلید ہو جاتی ہے...... ایسے کیس کا تو ریمانڈ بھی دس دن سے کم کا نہیں ہوتا...... زیرِ دفعہ......" ناگی اپنی حوالدارانہ سمجھ بوجھ کے مطابق شانی کو ڈرانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اس کی کوشش نے طول کھینچا تو شانی بولی۔ "آپ کے ہوتے ہمیں ڈرنے کی کیا لوڑ ہے جی۔"

اس بات پر ناگی ایک دم خوش ہو گیا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور للچائے ہوئے انداز میں بولا۔ "مختاراں! ذرا یہ کپڑے پہن کر تو دکھا دے۔"

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔"

"تو پھر کب؟" ناگی نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"پھر کبھی۔"

اس بات نے ناگی کو ایک دم نہال کر دیا۔ شاید اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شانی کے قدموں میں لیٹ کر کُتے کی طرح دُم ہلانے لگتا۔ وہ ذرا سا مزید بے تکلف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ مٹھی میں دبا کر لمبا کش لیا۔ سیاہ مونچھوں کے اوپر سے دھوئیں کی دو لکیریں چھوڑ کر وہ بولا۔ "تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہوں مختاراں...... میری پرموشن ہونے والی ہے خیر نال۔"

"یہ کیا ہوتی ہے؟"

"ترقی...... سمجھ لے میں زیادہ وڈا افسر بننے والا ہوں۔ گڈی شڈی بھی ملنے والی ہے۔

ایک نوکر بھی ملے گا گھر کا سارا کام کرنے والا۔"

"ترقی؟ کس طرح؟"

"دیکھ مختاراں، یہ بات میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتائی۔ بس تجھ کو بتا رہا ہوں اور تجھے اس لئے کہ تُو مجھے بڑی اپنی اپنی سی لگ رہی ہے۔ دراصل بنگلے میں لگنے والی آگ کی واردات بڑی گھمسن گھیری والی ہے۔ میری طرح دو تین اور افسر بھی اس کی انکوائری کر رہے ہیں۔ جس نے بھی اس واردات کا کھوج لگا لیا ناں، اس کی ترقی اور ایک دو میڈل پکے ہیں۔ میڈل سمجھتی ہے ناں تُو...... تمغے...... یعنی سونے کے بلے وغیرہ۔" شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل اس واردات میں وہ لمڈھینگ بندہ اسی طرح ہے جس طرح...... جس طرح تالے میں چابی ہوتی ہے۔ اگر وہ بندہ مجھے دوبارہ مل جائے ناں تو اس سے بڑا کچھ پتا چل سکتا ہے۔"

"تو آپ اس کو ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"رات دن مختاراں۔ اسی لئے تو پچھلے تین چار دن سے تمہارے پاس نہیں آسکا۔ ویسے تجھے یاد کرتا رہتا ہوں۔ میں تجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ یہیں ساتھ والے گراں بھورے وال میں میرا ایک پرانا یار ہے عابد۔ ریلوے پولیس میں افسر ہے۔ میں اسی کے گھر میں تھا بلکہ آج کل میں زیادہ ٹائم اسی کے پاس گزار رہا ہوں۔ سمجھو، ہم دونوں مل کر ڈھونڈ رہے ہیں اس لمڈھینگ کو۔"

"کوئی کھوج کھرا ملا؟"

"ملا ہے...... ملا ہے۔" ناگی دبے دبے جوش سے بولا۔ "اگلی ملاقات میں بتاؤں گا وعدہ رہا اور تُو بھی وعدہ کر کہ اگلی ملاقات میں مجھے یہ کپڑے پہن کر دکھائے گی اور اس گھونگھٹ کو بھی آگ لگائے گی۔" شانی خاموش رہی۔ ناگی کے لئے یہ خاموشی بھی حوصلہ افزا تھی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔ پیڑھی سے اُترتے ہوئے وہ بولا۔ "مختاراں! اپنی کوئی فوٹو ہی دے دے۔ فوٹو ہو گی تیرے پاس؟"

شانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تھوڑے دن پہلے تیری شادی ہوئی ہے۔ شادی کی تصویریں تو ہوں گی۔"

"اُن کے پاس ہیں۔" شانی نے کہا پھر موضوع بدل کر بولی۔ "آپ کے وڈے افسروں کو پتا ہے کہ آپ اس لمبے قد والے کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں؟"

"تو بھی جھلی ہے۔ یہ بڑے نازک کام ہوتے ہیں۔ چھوٹے افسر اپنی جان کھپا کر ملزم تک پہنچتے ہیں اور بڑے افسر ساری شاباشی اور ساری ترقیاں شرقیاں اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں۔ میں وڈے افسروں کو بتاؤں گا، پر وقت آنے پر...... ابھی نہیں۔"

"جب اس کا پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا تھانیدار صاحب۔ یہ بات تو سامنے آئے کہ ہم پر بہتان لگانے والا ہے کون؟"

"بتاؤں گا مختاراں...... بتاؤں گا۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "چل اپنے مہندی والے ہتھوں سے تھوڑا سا شربت ہی بنا کر پلا دے۔"

شربت کی بوتل اور گلاس وغیرہ سامنے ہی رکھے تھے۔ مُنا دودھ ملے شربت کا بہت شوقین تھا۔ شانی نے ڈولے کو آواز دی۔ وہ گلاس میں ٹھنڈا پانی اور چمچ لے آیا۔ شانی نے ایک گلاس شربت بنا کر حوالدار ناگی کی طرف بڑھایا۔ شانی سے گلاس لیتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے شانی کے ہاتھ کی پشت کو معنی خیز انداز میں چھوا۔ پھر شانی کی جانب دیکھتے ہوئے پورا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔ وہ جیسے شربت نہیں شانی کو پی گیا تھا۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں شانی غصے سے تپ رہی تھی...... لیکن وقت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنا روپ برقرار رکھے۔ مونچھیں صاف کر کے وہ بازاری انداز میں بولا۔ "ایسا میٹھا شربت پہلے کبھی نہیں پیا...... اس میں کیا گھولا ہے بھئی؟"

گلاس شانی کو واپس تھماتے ہوئے اس نے پھر پہلے والی حرکت دہرائی اور اپنے تئیں بہت خوش نظر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "اچھا مختاراں! ایک دو دن میں پھر آؤں گا۔ تجھے اس لمڈھینگ کے بارے میں کوئی خبر سناؤں گا خیر نال۔"

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جانے کے لئے واپس مڑا اور حسبِ عادت جاتے جاتے پھر رک گیا۔ شانی کی طرف دو قدم چلنے کے بعد سرگوشی کے انداز میں وہ بولا۔ "ویسے میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تیرے بندے اور دیور کے لئے کہ ابھی وہ ہفتہ دو ہفتے دائیں بائیں رہیں تو اچھا ہے۔ گھر آئیں گے تو پھر ان سے پوچھ گچھ بھی ضرور ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ وڈے تھانیدار صاحب ان کو چوکی ہی بلا لیں۔ میری بات سمجھ رہی ہے ناں۔"

"سمجھ رہی ہوں۔" شانی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ایک دو دن میں آؤں گا۔ موقع ہوا تو تیرے ہتھ کی بھنی ہوئی مرغی بھی کھاؤں گا۔" وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ برآمدے میں سپاہی بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شانی اور حاجی حیات ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے

تھے۔ "ایسے لوگ ہی اس محکمے کو بدنام کر رہے ہیں۔" حاجی حیات نے تاسف سے کہا۔

"لیکن آپ جیسے اور انسپکٹر شاد جیسے لوگ بھی تو اس محکمے میں ہیں۔"

حاجی حیات خاموش رہا۔ اس نے ٹچی خورے کرپٹ ناگی کی ساری باتیں سنی تھیں۔ اب اس کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں حاجی صاحب؟"

"شانی بی بی! یہ حوالدار اس وقت واقعی ہمارے کام کا بندہ ہے۔ اس سے کچھ معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جس طرح چل رہا ہے اسے چلنے دیا جائے اور اس پر نظر رکھی جائے۔ دوسرا یہ کہ اسے گردن سے پکڑ کر سامنے بٹھا لیا جائے اور ڈنڈے کے زور پر اس سے کام لیا جائے۔"

"آپ کیا مناسب سمجھتے ہیں؟"

"ڈنڈے کے زور پر کام لیا گیا تو پھر ایک دو مسئلے پیدا ہوں گے۔ یہ چار دیواری جو تمہاری پناہ گاہ بنی ہوئی ہے یہ بھی ڈسکشن میں آجائے گی۔ مقامی پولیس کو اس گھر کا رستہ مل جائے گا۔"

"یہی بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔"

"تو پھر بہتر یہ ہے کہ پہلے طریقے پر عمل کیا جائے۔ میں انسپکٹر حفیظ خان کو کسی طریقے سے یہیں چھوڑ جاتا ہوں۔ یہ اپنے کام کا بہت ماہر بندہ ہے۔ بھیس بدل کر اس نے کئی نامی گرامی بندے پکڑے ہیں۔ ناگی نے اسے دیکھا نہیں یہ بھی اچھا ہی ہوا ہے۔ میں اسے ناگی کی نگرانی پر لگا دیتا ہوں۔ یہ اس کے آس پاس رہے گا۔ اگر خدانخواستہ ناگی نے تمہارے لئے کسی طرح کا مسئلہ بنانے کی کوشش کی تو یہ اس سے اچھی طرح نمٹ لے گا۔"

"میرا نہیں خیال کہ ناگی میرے لئے کوئی مسئلہ بنا سکتا ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو اجمل خان یہاں موجود ہے۔ وہ بڑا چوکس اور نڈر شخص ہے بلکہ میری رائے میں تو...... اگر آپ مناسب سمجھیں تو ناگی پر نظر رکھنے کے لئے بھی...... لیکن نہیں۔ اجمل کو تو وہ اچھی طرح جانتا ہے۔" شانی نے اپنی رائے خود ہی رَد کر دی۔

حاجی حیات نے طلائی کڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں اس خبیث نے یہ کس کے ہاتھوں سے کون سا ڈراوا دے کر اُتروائے ہوں گے۔ ان کو سنبھال کر رکھنا۔ یہ اس کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"اور شانی بی بی! تم بالکل ٹھیک لائن پر جارہی ہو۔ کسی بڑے مقصد کے لئے کسی وقت تھوڑی سی پریشانی یا شرمندگی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ حوالدار سے اپنا رویہ اسی طرح نرم رکھو۔ امید ہے کہ اگلی ملاقات میں وہ کافی کچھ بک دے گا۔"

حاجی حیات تقریباً تین گھنٹے تک ابراہیم کے گھر میں رہا۔ اجمل خان اور انسپکٹر حفیظ بھی احاطے یعنی فارم کی سیر کر کے واپس آگئے تھے۔ انسپکٹر حفیظ خان ایک خوش خلق اور خوش گفتار شخص تھا۔ حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں شانی کو انسپکٹر شاد یاد آگیا۔ وڈے ڈیرے کی خون ریز لڑائی میں انسپکٹر شاد نے جس طرح اپنی نوکری اور جان خطرے میں ڈال کر ان کی مدد کی تھی اور انہیں موت کے گھیرے سے نکالا تھا، وہ یادگار تھا۔ یہ لوگ پولیس ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی حیات کے وفادار دوستوں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

اجمل خان نے Cooking میں اپنی مہارت کا بڑا اچھا ثبوت دیا اور مہمانوں کو ایسی دیسی مرغی بنا کر کھلائی جس میں تلے ہوئے آلو بھرے تھے۔ سب نے شوق سے کھانا شروع کیا لیکن کھانے کے دوران میں پتا نہیں کس طرح رستم اور ناصر کا تذکرہ شروع ہوگیا۔ سب کا موڈ بدل گیا۔ حاجی حیات نے بے دلی سے چند نوالے مزید لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ رستم سے شروع ہونے والی بات اس کی کٹی ہوئی ٹانگ اور پھر وڈے ڈیرے کی خون ریزی تک پہنچ گئی۔ ان واقعات کا دکھ حاجی حیات کے چہرے پر بڑے نمایاں رنگوں میں دکھائی دینے لگا۔

شانی نے آہ بھر کر کہا۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر وہ قتل عام رک جاتا۔"

"ہاں، وہ رک سکتا تھا" حاجی حیات نے کہا۔ "انتظامیہ ڈاکوؤں سے بات چیت کر رہی تھی۔ بارودی سرنگوں کی وجہ سے انتظامیہ دباؤ میں تھی۔ عام معافی کا آپشن بھی زیر غور تھا۔ یوں لگتا تھا کہ لالہ فرید اور اس کے ساتھی بھی چاہتے تھے کہ مسئلہ بات چیت سے حل ہوجائے لیکن ایک شخص نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا اور اس کو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ مقامی سرداروں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بے گناہ لوگوں کو انسانی ڈھال بنانے کا منصوبہ بنایا اور اپنے طور پر بارودی سرنگوں کا حل تلاش کرلیا۔"

"ام جانتا ہے، آپ ریاض ہٹلر کی بات کر رہے ہیں۔ اس کا انجام بہت بُرا ہونا ہے ایس ایس پی صاحب اور اگر یہ انجام امارے ہاتھوں سے ہو تو ام یہ سمجھے گا کہ امارا زندگی کامیاب ہوگیا۔"

ابراہیم، شانی اور گریس کو تسلی تشفی دینے کے بعد حاجی حیات واپس لوٹ گیا۔ اس نے عزم ظاہر کیا تھا کہ ایک دو ہفتے کے اندر رستم کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔

حاجی حیات کے جانے کے بعد شانی کا انتظار ایک بار پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلا۔ وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد کھڑکی میں آبیٹھتی تھی اور ان پگڈنڈیوں کو دیکھتی رہتی تھی جو سرسبز پہاڑوں پر ہاتھ کی رگوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا انتظار کربناک ہوتا جارہا تھا۔ کل بے جی کے ڈانٹنے پر اس نے خود کو سنوار تو لیا تھا مگر اندر سے دل ویسے ہی اُجڑا ہوا تھا۔ بلکہ باہر کے سنگھار نے اندر کی ویرانی کو اور بڑھا دیا تھا۔

مُنا عقب سے آیا اور اس نے شانی کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس پر جھولنا شروع کر دیا۔ "تائی! تم کھلکی (کھڑکی) میں کس کا رستہ دیکھتی لہتی ہو؟"

"تمہارے انکل کا۔"

"وہ کیوں نہیں آتے؟ میں بھی ان کے بغیل اداس ہوگیا ہوں۔"

"وہ تم کو اچھے لگتے ہیں ناں؟"

"بہت زیادہ تائی اور وہ تم کو بھی اچھے لگتے ہیں ناں؟ تم نے ان سے شادی کل لی ہے ناں تائی؟"

شانی کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرایا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن تائی! تم نے تو کہا تھا کہ تم میلے ابو سے شادی کرو گی۔"

"میں نے نہیں کہا تھا...... تمہارے ابو کہتے تھے۔"

"تو کیا تم اب میلے ابو سے بھی شادی کل لو گی؟"

"نہیں منا۔ شادی بس ایک سے ہوتی ہے اور ایک ہی بار ہوتی ہے۔ دل میں جو پھول ہوتا ہے وہ ایک ہی بار کھلتا ہے۔" وہ روانی میں کہہ گئی۔

"دل میں پھول ہوتا ہے؟" اس نے نئی بحث چھیڑ دی۔

"ہاں ہوتا ہے۔" وہ مسکرائی۔ "اس میں سے خوشبو آتی ہے۔ بتاؤ آتی ہے ناں؟" اس نے مُنے کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں آتی ہے تائی۔ امی کے اندر سے بھی آتی تھی۔"

"میں بھی تو تیری امی ہی ہوں۔ میرے دل میں جو پھول ہے اس میں آدھی پتیوں پر تیرا نام لکھا ہوا ہے۔"

"اول آدھی پتیوں پل؟"

وہ مسکرائی۔ ''آدھی پتیوں پر تیرے انکل کا۔''

اسی طرح تین چار دن مزید گزر گئے۔ کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں آرہی تھی۔ اجمل خان کسی موہوم امید کے سہارے ایک بار پھر گورے کے بنگلے کی طرف چلا گیا تھا۔ شانی کا دل غم سے چُور تھا لیکن وہ اپنا غم بھلا کر بے جی اور چاچا ابراہیم کی دلجوئی میں مصروف رہتی تھی۔ دوسری طرف گریس بھی اپنا دکھ بھلا کر شانی اور بے جی کا دکھ بانٹتی رہتی تھی۔ دل بہت گھبراتا تو شام کے وقت شانی احاطے میں چلی جاتی۔ وہ پھولوں، پرندوں اور جانوروں کے درمیان خوش ہوتی اور اسے لگتا کہ پرندے اور جانور بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ بطخوں کو مکئی ڈالتی، بکریوں کو اپنے ہاتھ سے چوکر کھلاتی اور رانو کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہتی، لیکن یہاں بھی زیادہ دیر تک اس کا دل نہ بہلتا۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی یا کوئی ایسی شے نظر آجاتی جس سے رستم کی یاد زیادہ شدت سے دل کو مسلنے لگتی۔

بہار کا موسم بتدریج گرمی میں ڈھل رہا تھا۔ دن کے وقت ہلکی سی تپش محسوس ہوتی تھی۔ انور ناگی کا بھی کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ صرف ایک دن ناگی کا چھوٹا افسر یعنی دبلا پتلا سپاہی ایک ٹیڈی بکری کے ساتھ تشریف لایا تھا۔ اس نے یہ بکری دو چھوٹے بچوں سمیت چاچا ابراہیم کو واپس کر دی تھی اور کہا تھا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہے۔ درحقیقت ناگی یہ بکری بھتے کے طور پر لے کر گیا تھا، اب ''بدلے ہوئے حالات'' کے سبب وہ چاچے ابراہیم سے تعلقات بہتر رکھنا چاہتا تھا۔ یہ ''خیر سگالی'' کا ویسا ہی اظہار تھا جیسا اس نے طلائی چوڑیوں کے ذریعے کیا تھا۔

روکیٹ کی زندگی بہت سُست رو اور سنسان تھی۔ گھر کے عقب میں جھرنے کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔ صبح دم مویشیوں کی گھنٹیاں اور پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازیں بھی اپنے اندر ایک طرح کی اداسی لئے ہوتیں۔ بستی کی دوپہریں کچھ اور بھی خالی خالی ہو جاتیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر کاشت کار خاموشی سے کام کرتے۔ گلیوں میں چھوٹے بچے اخروٹ یا گولیاں کھیلتے۔ ان کی نانیاں دادیاں کواڑوں کے پیچھے سے انہیں جھانکتی رہتیں۔ تنہا راستے پر کبھی کوئی شخص خچر ہانکتا گزر جاتا یا کوئی عورت سر پر لکڑیوں کا گٹھڑ رکھے دکھائی دیتی۔ شانی ان ایک جیسے مناظر کو دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھی۔ اس کی اندرونی بے قراری روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔

وہ جانتی تھی، رستم ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرسکتا ہے لیکن اب وہ پہلے جیسا رستم رہا ہی کہاں تھا۔ ریاض ہٹلر کی سفاکی نے اسے عضو معطل بنا دیا تھا۔ اب یہ عضو معطل کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک دن شام کے بعد جب اندھیرا پھیل چکا تھا،

دروازے پر دستک ہوئی۔ چاچا ابراہیم نے دروازہ کھولا اور انسپکٹر حفیظ اندر آگیا۔ وہ ابھی تک اسی دیہاتی لباس میں تھا جس میں چار پانچ دن پہلے حاجی حیات کے ساتھ دکھائی دیا تھا۔ یہ لباس اب کافی میلا ہو چکا تھا۔ حفیظ کافی جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے چاچا ابراہیم سے کہا۔ ''میاں جی! مجھے ایک جوڑا کپڑوں کا چاہیے اور اگر سواری کے لئے ایک گھوڑا مل سکے تو اچھا ہے۔''

حاجی حیات جاتے جاتے شانی کو ہدایت کر گیا تھا کہ حفیظ کو جس چیز کی ضرورت وہ اسے دی جائے۔ چاچا ابراہیم کہیں سے شریف کا ایک جوڑا لے آئے۔ یہ شلوار قمیص اور چادر پر مشتمل تھا۔ حفیظ نے کہا۔ ''میاں جی! یہ سفید ہے۔ اگر کسی دوسرے رنگ میں ہو تو اچھا ہے۔''

چاچے ابراہیم نے کہا۔ ''بیٹا! فی الحال تو یہ ہی مل سکا ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک براؤن شلوار قمیص لے آئے۔ حفیظ مطمئن ہو گیا۔ چاچا ابراہیم نے اس کے لئے ایک گھوڑی کا انتظام بھی کر دیا۔ حفیظ صورت سے ہی بھوکا دکھائی دے رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے اچھے کھانے اور بھرپور آرام کی ضرورت ہے۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔ شانی روٹی پکا رہی تھی۔ اس نے چاچے ابراہیم سے کہلوایا کہ وہ کھانا کھا کر جائے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو نے جیسے چند لمحوں کے لئے اس کے پاؤں جکڑے لیکن پھر ڈیوٹی کا خیال غالب آگیا۔ ''نہیں میاں جی! مجھے جلدی جانا ہے۔'' وہ بولا۔

شانی نے دروازے کی اوٹ سے پوچھا۔ ''حوالدار ناگی کہاں ہے انسپکٹر؟''

''وہ ساتھ والے گاؤں بھورے وال میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد اسے اپنے یار عابد کے ساتھ اوپر اُچے گراں کی طرف جانا ہے۔ میں نے ان کے پیچھے جانا ہے، یہ بڑا ضروری ہے بی بی۔ اگر کل واپسی ہوگئی تو میں شام کے بعد آؤں گا اور آپ کو تفصیل بتاؤں گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اسی لمبے قد والے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے؟''

''وہ کسی کو ڈھونڈ تو رہا ہے بی بی، پر ابھی میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پرسوں بھی ایک جگہ گیا تھا اور ایک مسجد کے امام صاحب کے علاوہ دو اور بندوں سے بھی ملا تھا۔''

انسپکٹر کی عجلت دیکھ کر شانی نے کہا۔ ''بہتر تو یہ تھا کہ تم کھانا کھا کر جاتے لیکن اگر تمہیں جلدی ہے تو پھر میں تمہیں ٹفن میں دے دیتی ہوں۔''

انسپکٹر حفیظ انکار ہی کرتا رہ گیا۔ شانی نے جلدی جلدی اس کے لئے روٹی سالن اور چاول ٹفن میں پیک کر دیئے۔

یہ شخص انسپکٹر شادی ہی کی طرح شانی کو عام پولیس والوں سے کافی مختلف لگا تھا۔ یہ پڑھا لکھا اور خوش گفتار تھا۔ جسم چست تھا اور اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کاہلی اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔

گریس کو دو تین دن سے بخار تھا۔ دونوں بچوں کی ذمے داری مکمل طور پر شانی نے سنبھال رکھی تھی۔ بچوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر شانی اس کمرے میں پہنچی جہاں انسپکٹر حفیظ نے لباس بدلا تھا۔ لباس بہت زیادہ میلا نہیں تھا۔ حفیظ نے غالباً اس لئے بدلا تھا کہ ناکے کی نگرانی کرتے ہوئے وہ مسلسل ایک ہی لباس میں نظر آنا نہیں چاہتا تھا۔ انسپکٹر حفیظ کے کپڑے اٹھا کر شانی نے دھونے والے کپڑوں میں رکھ دیئے۔ ایسے کرتے ہوئے شانی کو شلوار کے نیفے میں کسی سخت چیز کا احساس ہوا۔ اس نے ازار بند کھینچا تو یہ سخت چیز بھی ساتھ ہی باہر نکل آئی۔ یہ سو سو کے دو کرنسی نوٹ تھے، ایک رسید تھی اور ایک خط تھا۔ انسپکٹر حفیظ جلدی کے سبب یہ اشیاء اپنے کپڑوں میں بھول گیا تھا۔ انسان خطا کا پتلا ہے چاہے وہ پولیس والا ہی کیوں نہ ہو۔ شانی نے خط پر نگاہ دوڑائی۔ پھر اسے پڑھے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ انسپکٹر حفیظ کی نو بیاہتا بیوی کی طرف سے تھا۔ بڑے خوب صورت الفاظ تھے۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور شاعرانہ مزاج کی بھی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"جانی! کہاں ہو تم؟ تمہارے بغیر وقت بڑی مشکل سے کٹتا ہے بلکہ کٹتا ہی نہیں۔ جی چاہتا ہے اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں یا پھر میرے پاس سلیمانی ٹوپی ہو، کسی کو نظر نہ آؤں اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں۔ تمہارے دفتر میں تمہاری میز پر چڑھ کر بیٹھی رہوں۔ تمہاری گاڑی کے اندر تمہارے پہلو سے لگ کر اور رات کو سرکاری کوارٹر میں تمہارے...... تمہارے...... سمجھ گئے ناں جانی۔

ویسے تم بڑے بے ایمان ہو۔ میں امی کے گھر میں دو دن زیادہ رہ آئی اور تم نے مجھ سے جرمانہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اب تم وعدہ کر کے بھی آنے میں دیر لگا رہے ہو۔ تمہاری سزا کیا ہونی چاہیے۔ آؤ گے تو تم سے ایک ایک زیادتی کا حساب لوں گی اور جانی! تم نے لکھا ہے کہ کل چودھویں کا چاند تھا۔ یہاں ہمارے گھر میں بھی چودھویں کا چاند تھا بلکہ یہاں تو دو چاند تھے۔ ایک کھڑکی میں تھا اور ایک میرے سرہانے تصویر کی صورت میں۔ تصویر والا چاند زیادہ خوب صورت

ہے اور کچھ کچھ شریر بھی ہے۔ مجھے بڑی بے ایمانی سے دیکھتا رہتا ہے۔ یہ اتنا بے ایمان کیوں ہے حفیظ جی! چلو بے ایمان ہی سہی لیکن دور بھی رہتا ہے۔ مجھے اپنی عادت ڈال کر اب اپنی نوکری کے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی......"

یہ خط ایسی ہی شوخ، محبت بھری باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شانی نہ چاہنے کے باوجود اسے آخر تک پڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی کا خط نہیں پڑھنا چاہیے لیکن پتا نہیں کہ وہ کس کیفیت میں تھی کہ اپنی نگاہ نہ ہٹا سکی۔ بعد میں اسے کچھ ندامت بھی ہوئی۔ بہر حال خط اور نقدی وغیرہ اس نے دوبارہ وہیں اڑس دیں جہاں سے نکالی تھیں۔ کپڑوں کو دھوئے بغیر ہی اس نے الماری میں رکھ دیا۔

ازدواجی محبت اور تعلق کا کتنا خوب صورت اظہار تھا ان الفاظ میں۔ شانی دیر تک اس سادہ تحریر کے تاثر میں کھوئی رہی۔ جن دنوں وہ نارپور کی حویلی میں تھی اور فاخر کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو رہی تھی، اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہونے لگی تھی لیکن اب.... سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔ اسے مرد و زن کے تعلق کی اصل رعنائیوں کا علم ہو رہا تھا اور اپنے شریکِ حیات کے لئے اس کی محبت بے کنار ہوتی جا رہی تھی۔

اس کا دل چاہا، وہ بھی اپنے محبوب شوہر کی یاد میں کاغذ قلم لے کر کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ جائے اور اسے ایک طویل خط لکھے جس میں محبت ہو، تھوڑی سی شوخی ہو اور انتظار کی بے پناہ شدت ہو۔ وہ اپنے دل کا حال کھول کر اس شخص پر بیان کرے جس کے لئے وہ ایک ایک پل گن کر گزار رہی ہے لیکن وہ جانتی تھی وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، اس کا وقار اور فطری حیا اس کے آڑے آتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سوچ کر لرز جاتی تھی کہ کسی وجہ سے وہ رستم کو ناراض نہ کر دے۔ وہ اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرتی کہ شوہر کی دلجوئی میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ رہے پھر بھی کمی کا احساس اس کے ذہن پر سوار رہتا تھا۔ رستم کے جانے کے بعد یہ احساس مزید شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز سوچنے لگی کہ رستم کی واپسی ہو گی تو وہ خود کو اور زیادہ تبدیل کرنے کی کوشش کرے گی۔ خود کو اور زیادہ اس کی خوشی کے قالب میں ڈھالے گی۔ وہ رستم کو ایک رومان بھرا شوخ خط نہیں لکھ سکتی لیکن کسی اور طور اس کا مداوا تو کر سکتی ہے لیکن وہ کب آئے گا؟ اسے کب آنا ہے؟ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ ایک بار پھر بے ساختہ کھڑکی سے باہر دور تک نظر آنے والی خالی راہوں کو دیکھنے لگی۔ براؤن پالتو بلا اس کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا۔

اچانک وہ چونکی......کوئی آرہا تھا......کوئی آرہا تھا۔ وہ جھرنے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس کا رخ سیدھا چاچے ابراہیم کے گھر کی طرف ہی تھا۔ تاریکی میں جب وہ قریب پہنچا تو شانی نے اسے پہچان لیا۔ وہ اجمل خان تھا۔ اس کی واپسی پانچ چھ دن بعد ہوئی تھی۔ شانی کا دل دھڑکنے لگا۔ ''یا اللہ وہ کسی اچھی خبر کے ساتھ آیا ہو۔'' وہ بلی کو احتیاط سے پاؤں سے ہٹاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کچھ ہی دیر بعد اجمل خان گھر میں تھا۔ شانی کا خیال تھا کہ وہ اس کے پاس کمرے میں آئے گا لیکن وہ صحن میں چاچا ابراہیم سے ملنے کے بعد اس دوسرے پورشن میں چلا گیا جہاں اس کی رہائش تھی۔ شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اجمل خان کے اس طرح اپنے کمرے میں چلے جانے سے ایک بات تو واضح ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ تو کیا... کوئی بُری خبر تھی؟ چند ہی سیکنڈ میں شانی کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔

کچھ دیر بعد گریس کو بھی اجمل کی آمد کا پتا چل گیا۔ وہ دونوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ اجمل کے پاس اس کے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ ''اجمل خیریت تو ہے، تم سیدھے یہاں چلے آئے؟''

''خیریت ہے شانی بہن! آپ پریشان نہ ہوں۔ ام آپ ہی کے پاس آرہا تھا۔''

اجمل نے بجھے بجھے انداز میں کہا۔

شانی گہری سانس لے کر بولی۔ ''لگتا ہے کہ اتنے دن باہر رہ کر بھی تمہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی؟''

''شاید آپ ٹھیک کہتا ہے۔ چند باتیں معلوم ہوا لیکن جو امید تھا وہ پورا نہیں ہوا۔''

اس کے بعد اجمل، شانی اور گریس کے پاس بیٹھ کر انہیں پچھلے پانچ چھ دن کی کارگزاری سنانے لگا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پولیس نے اپنی تفتیش کا دائرہ دور تک پھیلایا ہوا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ کچھ پولیس اہلکار پوچھ گچھ کے لئے روکیٹ اور اردگرد کی چھوٹی بستیوں تک بھی آئیں۔ اجمل خان کے مطابق شبے میں کئی مقامی افراد کو پکڑا گیا ہے۔ ان لوگوں کی بھی پکڑ دھکڑ ہوئی تھی جنہوں نے بنگلے کے ملبے میں سے مختلف اشیاء اٹھائی تھیں۔ اس کے علاوہ بنگلے کے مالک سے بھی پولیس مسلسل پوچھ گچھ کر رہی تھی۔''

اجمل خان نے ایک اور اہم بات بتاتے ہوئے کہا۔ ''بنگلے کے پچھواڑے درختوں میں سے ایک اور لاش بھی نکلا ہے۔ یہ لاش زمین کھود کر دفن کیا گیا تھا۔ پولیس والوں کو شک ہوا کہ یہاں سے زمین کھودا گیا ہے۔ انہوں نے مٹی اور پتھر ہٹایا تو اندر سے ایک بوڑھے آدمی کا

تازہ لاش برآمد ہوا۔ اس کے سامان کا تھیلا بھی اس کے ساتھ ہی دفن تھا۔ اب تفتیش سے پتا چلا ہے کہ یہ بوڑھا فیصل آباد کا ایک بھک منگا تھا۔ گھنٹہ گھر کے سامنے اس کا اڈا تھا۔ پچھلے دو تین ماہ سے وہ اپنے اڈے سے غائب تھا۔ بوڑھے کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا ہے کہ اس کا موت ہارٹ اٹیک سے ہوا۔ جس وقت اس کا موت ہوا اس نے مہنگا سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ پولیس اس نئے معاملے کی تفتیش بھی زور وشور سے کر رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بنگلے میں کچھ اور بڈھا لوگ بھی موجود تھا اور ان کو بھی اسی طرح پکڑ دھکڑ کر یہاں لایا گیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ پولیس لاہور میں چوہدری بشیر تک بھی پہنچا ہے اور اس سے بھی اسٹیپن صیب اور پلپ صیب کے بارے میں پوچھ گچھ کیا ہے۔ پولیس کا لوگ اب اس نتیجے پر پہنچ گیا ہے کہ اس بنگلے میں غیر قانونی کام ہو رہا تھا اور غیر ملکی ڈاکٹر مقامی لوگوں پر الٹا سیدھا تجربات کر رہا تھا۔''

اجمل خان، شانی اور گریس تادیر بات چیت میں مصروف رہے۔ ہر ایک بات کی تان اس بات پر ٹوٹ رہی تھی کہ آخر وہ گروہ کون ہے جس نے پہلے یہاں اور پھر بنگلے پر حملہ کیا؟ اور بنگلے پر خون ریز حملہ کرنے کے بعد وہ لوگ ہوا کی طرح کہاں غائب ہوگئے؟ پولیس کے لئے بھی یہی سوال معمہ بنا ہوا تھا۔

اجمل خان نے پوچھا۔ ''اس چھچھورے حوالدار کی طرپ سے کوئی اطلاع مطلاع آیا ہے؟''

''نہیں خان! ابھی تو اُدھر بھی خاموشی ہے۔ بس تین دن پہلے انسپکٹر حفیظ آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ حوالدار کے اردگرد موجود ہے اور جیسے ہی کوئی کامیابی ملتی ہے وہ اطلاع دے گا۔''

باہر تاریک پہاڑوں کے درمیان پانی سے بوجھل ہوا چل رہی تھی۔ لالٹین کی ہولے ہولے لرزتی لَو کے درمیان وہ تینوں تادیر بات چیت میں مصروف رہے۔ پھر چاچا ابراہیم اپنی گڑگڑی اور بے جی چائے کی پیالیاں لے کر آگئیں اور وہ بھی اس افسردہ گفتگو میں شریک ہوگئے۔

☆======☆======☆

اجمل خان دو دن آرام کرنے کے بعد پھر کسی طرف نکلنا چاہ رہا تھا لیکن شانی نے اسے منع کر دیا۔ اس نے اسے سمجھایا کہ یہاں بھی خطرات ہیں اور یہاں اس کی ضرورت ہے۔

ایک رات پچھلے پہر شانی کی آنکھ کھلی۔ اسے لگا جیسے رستم اس کے ارد گرد کہیں موجود ہے۔ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تڑپ کر چارپائی سے نیچے اُتر آئی۔ ''کہاں ہو، رستم کہاں ہو؟'' اس نے خالی گھر کے در و دیوار سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں اس کے کانوں میں ایک بھولی بسری آواز گونجنے لگی۔

میریاں گلاں یاد کریں گی
رو رو کے فریاد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آنواں گا

وہ اسے یاد آ رہا تھا...... بری طرح یاد آ رہا تھا۔ اس نے الماری کھولی۔ رستم کی وہ قمیص نکالی جو اس نے بے جی کے بار بار کہنے کے باوجود نہیں دھوئی تھی۔ وہ اس قمیص میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر رو کر طبیعت کچھ ہلکی ہوئی تو ایک عزم سا اس کے اندر انگڑائی لینے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ خود ناگی کا پتا کرے گی۔ ناگی کو آخری بار یہاں آئے ہوئے دس بارہ روز ہو چلے تھے۔ انسپکٹر حفیظ نے بھی کئی روز سے صورت نہیں دکھائی تھی۔ شانی کو یہ ساری صورتِ حال عجیب سی لگ رہی تھی۔ اگر حاجی حیات کی طرف سے ہی کوئی اچھی اطلاع مل جاتی تو شاید شانی کے اندر وہ گھٹن پیدا نہ ہوتی جو وہ اب محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر راستہ ایک جگہ جا کر رک جاتا ہے۔

شانی نے چاچا ابراہیم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ سحری کے وقت ہی اپنی گڑگڑی لے کر احاطے کی طرف نکل جاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد

وہ نکل گئے اور بے جی دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کے بعد دوبارہ سو گئیں تو شانی نے گریس کو جگایا اور اسے اپنے سارے پروگرام سے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بعد شانی ڈولے کے ہمراہ گھر سے نکل رہی تھی۔ بستی کے مرغ اذانیں دے رہے تھے۔ اب کچھ ہی دیر بعد سپیدہ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ شانی کے باہر نکلنے کے بعد گریس نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے قریباً ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ موسم گرما کے باوجود صبح کے وقت کپکپی طاری کرنے والی ٹھنڈ ہوتی تھی۔ اب بھی یہی عالم تھا۔ شانی اور ڈولا چادروں کے بکل مارے پہاڑی پگڈنڈی پر آگے بڑھنے لگے۔ شانی نے گریس کو بتا دیا تھا کہ بے جی اٹھیں تو وہ انہیں یہی بتائے کہ وہ اور ڈولا ابھی گھر سے نکلے ہیں اور بے جی کو ایک گھنٹے سے پہلے نہیں اٹھنا تھا اور اجمل کی صبح تو دن گیارہ بجے سے پہلے ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ حفاظت کی غرض سے رات کو دیر تک جاگتا تھا۔

پہلے شانی نے سوچا تھا کہ وہ اجمل خان کو ناگی کی طرف بھیجے گی لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ ناگی اور اجمل خان میں فوراً ٹھن جائے گی۔ دونوں پولیس حوالدار تھے لیکن بہت الگ الگ مزاج کے مالک تھے۔

بھورے وال نامی بستی یہاں سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر تھی۔ شانی کو امید تھی کہ وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے وہاں تک پہنچ جائے گی۔ ناگی نے کہا تھا کہ وہاں اس کا عابد نامی دوست رہتا ہے جو ریلوے سب انسپکٹر ہے اور آج کل وہ اکثر اس کے گھر میں ہوتا ہے۔ شانی اس امید کے سہارے وہاں جا رہی تھی کہ شاید ناگی سے ملاقات ہو جائے۔ اگر ملاقات نہ ہوتی تو بھی کم از کم ناگی کا کچھ اتا پتا تو معلوم ہو سکتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ اگر ناگی اس مکان میں ہوا تو اسے بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔ ناگی عورت پرست شخص ثابت ہوا تھا۔ شانی کی موجودگی سے اس کی ذہنی رَو بھٹک سکتی تھی۔ ڈولے کو وہ اسی لئے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ورنہ چاہتی تو اکیلی بھی نکل سکتی تھی۔

ڈولا شانی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے لئے اسے بہت تیزی سے قدم اٹھانے پڑ رہے تھے۔ شلوار قمیص اور گرم چادر میں لپٹا ہوا وہ چھوٹا سا بچہ ہی لگ رہا تھا۔ ''باجی جی! گھر میں آپ نے کیا بتایا ہے؟'' ڈولے نے پوچھا۔

''گریس کو بتا دیا ہے وہ سنبھال لے گی۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ بے جی سے مزار کا کہہ دے۔''

''یعنی ہم مزار پر سلام کرنے گئے ہیں؟'' ڈولے نے کہا۔

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ روکیٹ اور بھورے وال کے درمیان کی چوٹی پر کسی بھورے سائیں کا مزار تھا۔ روکیٹ والے اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔

وہ جب مزار کے قریب سے گزرے تو رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ ہلکی ہلکی دُھند میں چیڑ اور دیودار کے بلند قامت درختوں کے نیچے ایک بڑی چٹائی پر ایک سفید ریش شخص گلے میں بہت سی مالائیں پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد چند اور افراد تھے۔ وہ غالباً کسی طرح کے وظیفے میں مشغول تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ دونوں بھورے وال کی طرف بڑھتے رہے۔

بھورے وال ساٹھ ستر گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ صبح کی اولین گھڑیوں میں یہ بستی کہرے میں لپٹی ہوئی تھی اور اونگھتی محسوس ہوتی تھی۔ چہار سُو گہری خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو بس کبھی کبھار کسی پہاڑی کوے کی آواز مجروح کرتی تھی...... ریلوے پولیس کے سب انسپکٹر عابد عباسی کا گھر ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ناگی نے گھر کی نشانی بتائی تھی۔ ویسے بھی پوری بستی میں صرف دو گھر ہی پختہ چھت والے تھے اور ان کی دیواریں بھی پختہ تھیں۔

دروازے پر "سب انسپکٹر ریلوے عابد عباسی" کی پلیٹ کے سامنے وہ دونوں رک گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے فی الوقت اس پوری بستی میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جاگ رہا۔ شانی کے کہنے پر ڈولے نے لوہے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر خاموشی رہی۔ شانی کی نگاہ ڈولے کے چہرے پر پڑی۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دے رہا تھا، کسی وقت اس کی کیفیت عجیب ہو جاتی تھی۔ وہ کسی "تیز حسیات والے جانور" ہی کی طرح بے قرار دکھائی دینے لگتا تھا۔

"کیا بات ہے ڈولے؟" شانی نے پوچھا۔

"کک...... کچھ نہیں جی۔"

"کچھ محسوس ہو رہا ہے تمہیں؟"

"مجھے لگ رہا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ رک رک کر بولا۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھولے ہوئے تھے۔

"کیا لگ رہا ہے تمہیں؟"

ڈولے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "مجھے اندر سے بو آ رہی ہے۔ کوئی شے مری ہوئی ہے شاید۔"

اس نے ایک بار پھر لوہے کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ اندر گہرا سکوت طاری

رہا۔ ڈولے نے اپنا کان گیٹ سے لگایا، جیسے اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا اضطراب بڑھ گیا۔

"باجی جی! مجھے نہیں لگتا کہ کوئی دروازہ کھولے گا۔ اگر آپ کہیں تو میں دیوار کے اوپر سے اندر جاؤں؟"

"کیسے جاؤ گے؟"

ڈولا جواب دینے کے بجائے کسی بچے کی سی پھرتی سے چیڑ کے ایک قریبی پیڑ پر چڑھ گیا۔ اس پیڑ کی کچھ شاخیں دیوار تک پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار تک پہنچا اور آسانی سے اندر کود گیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے دروازہ اندر سے کھول دیا۔ شانی نے دائیں بائیں دیکھا۔ کہرے کی سپید چادر نے سب کچھ ڈھانپ رکھا تھا۔ دور ایک مقامی بوڑھا اپنی گائے کو ہانکتا ہوا نشیب کی طرف جا رہا تھا اور پرچھائیں جیسا لگتا تھا۔ شانی جلدی سے اندر چلی گئی۔ چھوٹے سے صحن سے گزر کر وہ برآمدے میں پہنچی اور اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ واقعی کوئی سنگین قسم کی گڑبڑ ہے۔ اب اس کے نتھنوں سے بھی مردار کی بو ٹکرائی تھی۔ یہ بو دائیں طرف والے ایک کمرے سے آ رہی تھی۔

شانی اور ڈولا احتیاط سے کمرے کی طرف بڑھے۔ دائیں طرف طاق میں رکھی ہوئی ایک مُوم بتی شاید تین چار دن پہلے خود ہی جل جل کر بجھ گئی تھی اور اس نے لکڑی کے طاق کے ایک حصے کو بھی جلا دیا تھا۔ دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ شانی نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں دھینگا مشتی کے آثار نظر آئے۔ ایک ٹرانزسٹر ریڈیو فرش پر ٹوٹا پڑا تھا۔ دو جوتے الٹے سیدھے پڑے تھے اور ان کے اردگرد ایک ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے بکھرے ہوئے تھے۔

"اوہ میرے خدا یہاں کچھ ہو گیا ہے۔" شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"واپس چلیں؟" ڈولے نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" شانی نے نفی میں سر ہلایا اور ایک بڑی جستی پیٹی کی طرف بڑھی۔ یہ پیٹی کمرے کے گوشے میں رکھی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ بو پیٹی کے اندر سے آ رہی ہے۔ شانی نے اپنا دل کڑا کیا اور اوڑھنی کے پلو سے اپنا ہاتھ ڈھانپ کر پیٹی کے دونوں بند کنڈے کھول دیئے۔ ایک لمحے کے لئے وہ سکتے میں رہ گئی۔ پیٹی کے اندر لحاف میں لپٹی ہوئی ایک لاش تھی، بلکہ یہ لاشیں تھیں جو ساتھ ساتھ پڑی تھیں۔ بُو کے تیز بھبکوں سے شانی کو اپنا دماغ پھٹتا ہوا

محسوس ہوا۔ اس نے اوڑھنی کے پلو سے چہرے کا زیریں حصہ ڈھانپ لیا۔ ڈولے نے بھی ایسا ہی کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شانی نے دل مضبوط کر کے ایک لاش کے چہرے سے لحاف ہٹایا۔ یہ لاش حوالدار انور ناگی کی تھی۔ اس کی گردن پر چاقو یا خنجر وغیرہ سے وار کیا گیا تھا۔ گردن پر گہرا گھاؤ تھا اور بہنے والا خون لحاف میں جذب ہو کر سوکھ چکا تھا۔ ہاں... چند دن پہلے تک طوفان میل کی رفتار سے بولنے والا آج زیر دفعہ 302 یکسر مُردہ پڑا تھا۔ دوسری لاش بھی ایک درمیانی عمر کے شخص کی تھی۔ اس کے غالباً سینے پر وار کیے گئے تھے۔ اس کی قمیص خون سے داغ دار تھی۔ دونوں لاشیں پھول چکی تھیں اور ان سے سخت تعفن اٹھ رہا تھا۔

شانی نے جستی پیٹی کا ڈھکنا پھر سے بند کر دیا لیکن جو تعفن باہر نکل چکا تھا وہ سارے گھر میں چکرانے لگا تھا۔ شانی نے بہ مشکل اپنی ابکائیاں روکیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ جس ناگی کو چند روز پہلے اس نے زندہ سلامت دیکھا تھا اور وہ اسے زبردستی طلائی چوڑیاں دے کر گیا تھا آج ایک مسخ لاش کی صورت میں جستی پیٹی میں پڑا ہے۔

''چلو ڈولے چلیں۔'' شانی تیزی سے بولی لیکن پھر ڈولے کے تاثرات دیکھ کر وہ چونک گئی۔ وہ پھر سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کان کسی شکاری جانور کی طرح متحرک دکھائی دیتے تھے۔

''یہاں کچھ اور بھی ہے باجی جی اور وہ حرکت کر رہا ہے..... سانس لے رہا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

شانی نے دھیان سے دائیں بائیں دیکھا۔ اسے کچھ محسوس تو نہیں ہوا لیکن اس کی چھٹی حِس نے بھی جیسے اعلان کیا کہ اس چاردیواری میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ڈولا بڑے دھیان سے کچھ محسوس کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ شانی بھی اس کے عقب میں گئی۔ وہ مکان کی اوپری منزل پر آ گیا۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں چند چارپائیوں پر بہت سے لحاف اوپر نیچے پڑے تھے۔ کمرہ خالی تھا۔ ڈولے نے دوسرا دروازہ کھولا۔ بظاہر یہ کمرہ بھی خالی دکھائی دے رہا تھا لیکن ڈولے کے تاثرات مختلف تھے۔ اس کمرے میں بھی نسبتاً چھوٹے سائز کی ایک پیٹی موجود تھی۔

''کوئی اس کے اندر ہے باجی جی۔'' ڈولے نے سرسراتی آواز میں کہا۔

شانی نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ پر اوڑھنی لپیٹی اور جستی ٹرنک کھولا۔ یہاں بھی لحاف میں لپٹا ہوا ایک بے حِس و حرکت جسم موجود تھا..... یہ حاجی حیات کا انسپکٹر حفیظ تھا۔ لحاف کھسک کر اس کے سینے تک آ گیا تھا۔ اس کی پشت کے نیچے بہت سے تکیے کمبل اور گدیلے

وغیرہ پڑے تھے۔ انسپکٹر حفیظ مُردہ نہیں تھا مگر اسے زندہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر کسی کند آلے کی بڑی کاری ضرب لگی تھی۔ اس کے ناک منہ اور کانوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اب یہ خون ایرانی کمبلوں کے اوپر خشک ہو کر سیاہ ہو چکا تھا۔ انسپکٹر حفیظ بے ہوش تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں اس کے سینے سے عجیب گونج دار سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

شانی نے بے تابی سے اسے ہلایا۔ ''حفیظ آنکھیں کھولو... حفیظ!''

اس کی بے ہوشی گہری تھی اور یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ طویل عرصے سے اسی حالت میں ہے۔ اس کا چہرہ مدقوق اور زرد تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔

''یہ دیکھیں باجی! ان کے ہاتھ پیچھے سے زخمی ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ مارنے والے ان کو مُردہ سمجھ کر چلے گئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ اس ٹرنک میں سے نکلنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور ٹرنک کو بجاتے بھی رہے ہیں کہ کوئی آواز سن کر اس طرف آ جائے۔''

''کہیں سے پانی لاؤ ڈولے۔''

ڈولا گیا اور ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ شانی نے یہ پانی انسپکٹر کے سیاہ ہونٹوں پر ٹپکایا۔ اس کے چہرے پر چھینٹے مارے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

اچانک شانی کو اندازہ ہوا کہ نیچے گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ ڈولے نے بھی یہ دستک سن لی تھی۔ شانی نے گھر میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ ڈولے نے بالائی منزل کی ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے نیچے جھانکا اور اس کے چہرے پر کھلبلی کے آثار نظر آئے۔ ''باجی جی! تین چار بندے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ لاشوں کی بدبو ہمسایوں تک پہنچ گئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شانی نے کہا اور جستی پیٹی کو کھلا چھوڑ کر واپس مڑی۔ اس نے ڈولے کا بازو پکڑا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر صحن میں آ گئی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شانی نے گھر کا چھوٹا سا عقبی دروازہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈولے کو ساتھ لیا اور عقبی دروازہ کھول کر ایک چھوٹے سے باغیچے میں آ گئی۔ قرب و جوار کی طرح یہ باغیچہ بھی صبح دم اُمڈنے والی گہری دھند میں چھپا ہوا تھا۔ (یہاں شانی کو ایک گھوڑی بھی اِدھر اُدھر گھومتی دکھائی دی۔ ڈولے نے شانی کو بتایا کہ یہ وہی گھوڑی ہے جو چاچے ابراہیم نے حفیظ کو سواری کے لئے دی تھی)

شانی اور ڈولے نے دیکھا کہ اردگرد کے مکانوں سے نکل نکل کر کچھ اور لوگ بھی ریلوے سب انسپکٹر عابد عباسی کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر آوازوں سے اندازہ ہوا

کہ دروازے کی کنڈی توڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کچھ دیر بعد کنڈی ٹوٹ گئی اور بہت سے افراد اندر گھس گئے۔ یقینی بات تھی کہ اب انسپکٹر حفیظ تک بھی مدد پہنچ جائے گی۔ یہاں رکنا اب بہت خطرناک تھا۔ شانی نے ڈولے کے ساتھ باغیچے کا چکر کاٹا اور نشیب میں اُترتی چلی گئی۔ وہ اب واپس جارہی تھی۔

دوپہر تک یہ خبر دور ونزدیک تک پھیل چکی تھی۔ سب سے پہلے چاچا ابراہیم نے ہی شانی کو اطلاع دی۔ ''دھی رانی! کچھ پتا چلا ہے، ساتھ والے گراں میں کیا ہوا ہے؟''

شانی سوالیہ نظروں سے چاچے ابراہیم کا دھواں دھواں چہرہ دیکھتی رہی۔

چاچے نے کہا۔ ''ناگی قتل ہوگیا ہے اور ساتھ میں اس کا یار ریلوے والا عابد بھی۔ دونوں کی لاشیں عابد کے گھر سے ایک بڑے صندوق میں سے نکلی ہیں۔ انہیں قتل ہوئے تین چار دن ہوگئے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک بے ہوش بندہ بھی مکان کے اندر سے ملا ہے...... مارنے والے اسے بھی مُردہ سمجھ کر ایک پیٹی میں بند کر گئے تھے۔''

شانی نے چاچے ابراہیم کو نہیں بتایا کہ وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہے بلکہ سب سے پہلے ان لاشوں تک پہنچنے والی وہی ہے۔ ہاں شانی نے گریس اور اجمل خان کو ساری صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔

چاچا ابراہیم مکمل خبر سنا چکا تھا شانی نے پوچھا۔ ''اس بے ہوش بندے کا کیا ہوا؟''

''اسے بھورے سائیں کے مزار پر لے گئے ہیں۔ وہاں چھوٹے پیر ہیں۔ انہوں نے اس کا دوا دارو کیا ہے۔ سنا ہے اب وہ ہوش میں ہے۔''

چاچا ابراہیم کی باتوں سے عیاں تھا کہ انہوں نے اس ''بے ہوش آدمی'' کو نہیں دیکھا ورنہ پہچان جاتے کہ یہ وہی شخص ہے جو حاجی حیات کے ساتھ ایک دن ان کے گھر آیا تھا۔ (دوسری بار جب وہ کپڑے بدلنے آیا تھا تو چاچا ابراہیم نے ہی اسے جوڑا لاکر دیا تھا)

شانی، گریس اور اجمل اس تازہ واقعے کے حوالے سے تادیر بات کرتے رہے۔ ناگی کی موت بالکل غیر متوقع اور ناگہانی تھی۔ جب وہ آخری بار شانی کے پاس آیا تو اس نے شانی کو بتایا تھا کہ وہ اپنے طور پر اس لمبے بندے کی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ اس کھوج میں اسے اپنی ترقی اور شاباشی نظر آرہی تھی۔ اس نے شانی سے کہا تھا کہ وہ عنقریب آکر اسے تفصیل بتائے گا۔

اب وہ ''عنقریب'' لامتناہی مدت میں بدل گیا تھا اور ناگی اپنے دوست سمیت موت کی وادی میں اُتر گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوجاتا تھا

لیکن ایک امید ابھی باقی تھی۔ انسپکٹر حفیظ زندہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس دہرے قتل کے بارے میں کچھ بتا سکتا۔

گریس نے کہا۔ ''شونی! یہ حوالدار ناگی اس دراز قد بندے کا سراغ لگا رہا تھا۔ یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ اس کی موت کی وجہ بھی یہی ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ انسپکٹر حفیظ ہمیں جلد از جلد کچھ بتانے کے قابل ہوجائے۔ پتا نہیں اس کی حالت اب کیسی ہے۔''

''اس کا پتاام کرکے آتا ہے۔'' اجمل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر اس کی حالت بہتر نہیں تو اسے فوراً شہر لے جانا چاہیے۔'' شانی نے کہا۔ اجمل خان لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابراہیم نے گڑگڑی کا ایک طویل کش لے کر کہا۔ ''حالات بڑے خراب ہوگئے ہیں۔ ناگی اور اس کے یار کا قتل معمولی بات نہیں ہے۔ اب علاقے کی پولیس روکیٹ اور بھورے وال پر چڑھ دوڑے گی۔ لوگوں کی بڑی مٹی پلید ہوگی۔ پولیس والے لوگوں کو سارا سارا دن قطاروں میں بٹھائیں گے اور ڈرائیں دھمکائیں گے۔ اللہ خیر کرے۔''

بے جی نے دیہاتی انداز میں کہا۔ ''ہائے ربا! اتنے وڈے افسر کو کس نے مارا اور کیسے مارا۔ کیا گولی شولی لگی ہے اس کو؟''

''نہیں بھلیے لوکے! چاقو سے مارا ہے۔ اس کے گلے اور پیٹ پر سات آٹھ زخم لگے ہیں۔ ایسے لوگوں کی جان آسانی سے تھوڑی نکلتی ہے۔''

''جو بندہ زندہ ملا ہے وہ کون ہے؟''

''ہوگا کوئی ان کا یار بیلی۔'' ابراہیم نے خیال ظاہر کیا۔

''یا اللہ سب کا بھلا...... سب کی خیر۔'' بے جی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''پتا نہیں کیا ہوگیا ہے اس علاقے کے سکون کو..... پہلے وہ انگریز مرے اب یہ ناگی اور.....''

ابراہیم نے کہا۔ ''پچھلے دنوں میں ناگی دو تین بار ہمارے گھر بھی آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پولیس والے یہاں بھی پوچھ تاچھ کرنے ضرور آئیں گے ان سے ہم نے یہی کہنا ہے کہ وہ نور عباسی کے ساتھ آیا تھا چائے شائے پینے کے لئے۔ اسے ایک دودھ والی بکری اور اس کے بچے چاہیے تھے۔ وہ لے کر گیا تھا اور پھر واپس لے آیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں بتانا ہے۔ نہ یہ بات کہ وہ انگریز کُڑی کے بارے میں پوچھتا تھا اور نہ یہ بات کہ کچھ لوگوں نے گھر میں

گھس کر توڑ پھوڑ کی۔''

بے جی نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی ذرا گرم نظروں سے گریس کی طرف دیکھا، جیسے ساری مصیبتوں کا ذمے دار اسے ہی سمجھ رہی ہوں۔

کچھ دیر تک اس پریشان کن صورتِ حال کے بارے میں بات چیت کرنے کے بعد ابراہیم بھی صورتِ حال جاننے کے لئے بھورے سائیں کے مزار کی طرف چلا گیا۔

پوری بستی میں سنسنی کی کیفیت تھی اور لوگ یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

قریباً ڈھائی تین بجے کا وقت تھا جب ڈولا، مُنے اور ڈیوں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ایک دم بے چین نظر آنے لگا۔ وہ پہلے صحن میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر اچانک باہر نکل گیا۔ شانی اسے آواز دیتے دیتے رہ گئی۔

ڈولے کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا تیزی سے اندر آیا تھا۔ ''کیا ہوا ڈولے؟'' شانی نے اس کا متغیر چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''باجی جی! وہاں مزار پر لڑائی ہوگئی ہے۔ بڑا ہنگامہ ہوا ہے جی۔ خان جی کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔''

شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کس کی لڑائی کس سے ہوئی ہے؟''

''خان بھائی اور دو چار دوسرے بندے تھے، وہ سائیں کے بندوں سے لڑے ہیں۔ بعد میں دوسرے لوگ بھی آگئے ہیں اور انہوں نے خان بھائی اور ان کے ساتھیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ بعد میں خان بھائی نے بھی تین چار بندوں کے سر پھاڑ دیئے ہیں۔ بیچ بچاؤ کراتے ہوئے چاچا ابراہیم کو بھی چھوٹی موٹی چوٹیں آئی ہیں۔''

''اوہ میرے خدا...... اب کہاں ہے اجمل خان؟'' شانی نے کہا۔ گریس نے بے چین نظر آنے لگی۔

''وہ آرہے ہیں...... بس تھوڑی دور ہیں۔'' ڈولے نے کہا۔

قریباً دو منٹ بعد بیرونی دروازے سے باہر کئی افراد کے ایک ساتھ بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر اجمل خان، چاچا ابراہیم اور نور عباسی وغیرہ اندر آگئے۔ اجمل خان کا سر پھٹ گیا تھا اور براؤن قمیص پر خون کے چھینٹے تھے۔ وہ ذرا لنگڑا کر بھی چل رہا تھا۔ چاچا ابراہیم کے سرخ و سپید چہرے پر بھی ایک دو نیل تھے اور آستین پھٹی ہوئی تھی۔ اجمل خان طیش کے عالم میں بولتا ہوا آرہا تھا۔ ''یہ لوگ کبھی بخشا نہیں جائے گا...... دوزخ کا ایندھن بنے گا یہ لوگ۔

ان کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کا جان جاتا ہے۔ بے شمار گھر برباد ہوتے ہیں۔ امارا بس چلے تو ایک ایک کا گلا کاٹ ڈالے۔''

''کیا ہوا ہے اجمل خان...... کیا کیا ہے تم نے؟'' شانی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''ام نے کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ چاچا نوری بھی وہاں موجود تھا۔ بتاؤ چاچا ام نے کیا کہا تھا۔ یہی کہا تھا ناں کہ یہ جھاڑ پھونک کا کام نہیں۔ اس بندے کا دوا دارو ہونا چاہیے۔''

''تم نے ٹھیک کہا تھا پُتر...... پر یہ لوگ سمجھنے والے نہیں ہیں۔ یہ بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔ جب میری بیٹی والا معاملہ ہوا تھا، تب بھی بہت شور مچایا تھا ان لوگوں نے۔ کہتے تھے کہ بھورے سائیں کی طرف سے منہ موڑ کر شہر کے ڈاکٹروں کی طرف بھاگ رہے ہو۔ بہت بڑا گناہ کر رہے ہو بلکہ یہ کفر کے برابر ہے۔ پورا گراں ایک طرف ہو گیا تھا۔ وہ تو اس شہدی کی زندگی تھی جو میں ابراہیم کے کہنے پر لگ گیا اور رشیدہ کو شہر لے گیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آج تک اسی وجہ سے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے ہیں۔ ان کو تو بس اوپر والا ہی ہدایت دے سکتا ہے۔''

''لیکن بھائیا جی! وہاں مزار پر ہوا کیا ہے؟'' بے جی نے چاچے نور عباسی سے پوچھا۔

چاچے نوری اور ابراہیم وغیرہ نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ عابد کے گھر سے زندہ نکل آنے والے زخمی شخص کو بھورے سائیں کے مزار کے پاس ایک گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ چھوٹے سائیں کے ایک مرید کا گھر ہے۔ زخمی شخص ہوش میں تو آگیا ہے لیکن اس کی حالت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں اور آنکھیں الٹ جاتی ہیں۔ چھوٹے سائیں نے مزار کے احاطے میں زخمی کا اپنے طریقے سے علاج کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ کل شام تک بھلا چنگا ہو جائے گا لیکن اس کی حالت دیکھ کر لگتا نہیں کہ ایسا ہوگا۔ مزار کے احاطے میں اجمل خان نے کہہ دیا کہ یہ جھاڑ پھونک کا کام نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ مریض کو کسی طرح مری یا پھر پنڈی پہنچایا جائے۔ بھورے سائیں کے گدی نشین چھوٹے سائیں کے مریدوں نے اجمل خان کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ چھوٹے سائیں کے ایک مرید نے اجمل خان کو شیطان کہا۔ اجمل خان دہاڑ کر... شیطان وہ ہے جو سفید داڑھی کے ساتھ سامنے چوکی پر بیٹھا ہے اور تم دس بارہ بندے شیطان کے چیلے ہو۔ (اجمل خان بھی ایک ایسے ہی فراڈیئے پیر کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ پیر علاج کے نام پر سیدھی سادی عورتوں کے جسم چھوتا تھا اور دیگر خرافات کا علم بردار بنا ہوا تھا لیکن اسے ماننے والے اس پر ایسا اندھا عقیدہ رکھتے تھے کہ انہوں نے اس لوفر عالم کو گھ

بجائے اجمل خان اور اس کے گھرانے کو علاقہ بدر کر دیا تھا) جب اجمل نے مریدوں کو شیطان کے چیلے کہہ دیا تو معاملہ کنٹرول سے باہر ہو گیا۔ مریدوں نے اجمل کو دھکے دیئے۔ چند افراد اجمل کی حمایت میں بھی بولے لیکن مخالفت میں بولنے والے بہت زیادہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اجمل کو پیٹنا شروع کر دیا۔ چند لاتیں گھونسے کھانے کے بعد اجمل بھی بھڑ گیا۔ اس نے بھنگ گھوٹنے والا لمبا ڈنڈا اٹھا لیا اور اتنی وحشت سے گھمایا کہ کئی مریدوں کے سر پھٹ گئے۔ اجمل کی دلیری دیکھ کر اس کے چند حمایتیوں نے بھی اجمل کا ہاتھ بٹایا۔ دونوں طرف سے آٹھ دس افراد کو چوٹیں آئیں۔ بستی کے چند بڑے بوڑھوں نے درمیان میں کود کر بڑی مشکل سے یہ لڑائی رکوائی۔ ابراہیم اور نور عباسی بھی ان بڑے بوڑھوں میں شامل تھے۔ بہر حال چھوٹے سائیں کے مرید ابھی تک بھڑکے ہوئے تھے اور انہوں نے ابراہیم سے فوری مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے مہمان کو گھر سے چلتا کرے۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دو عمر رسیدہ افراد السلام علیکم کہتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کی لمبی نکیلی داڑھی بالکل سفید تھی اور کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ تاہم اس کا سرخ و سپید چہرہ تمتما رہا تھا اور یہ تمتماہٹ غصے کی تھی۔ وہ بھڑکیلے انداز میں ابراہیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ابراہیم! یہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔ تیرے اس بدبخت مہمان نے اللہ معاف کرے...... اللہ معاف کرے چھوٹے سائیں کو شیطان کہا ہے۔''

''تو کیا ام ایسے کام کرنے والے کو فرشتہ کہے گا۔'' اجمل خان نے بھی سینہ پھلایا۔ وہ اپنی بات پر ذرا شرمندہ نظر نہیں آتا تھا۔

ابھی اجمل کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ابراہیم نے اسے زور سے دھکا دیا۔ ''تو اندر چل...... اندر چل...... یہ تجھ سے نہیں مجھ سے بات کرنے آئے ہیں۔''

اجمل خان نے غضب ناک انداز میں کچھ کہنا چاہا مگر چاچا ابراہیم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ پھر بھی اجمل کی اتنی سی بات سب کے کانوں تک پہنچی۔ ''ام چیر کے رکھ دے گا...... ''

ابراہیم نے اسے زور سے اندر دھکا دیا۔ نور عباسی نے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ یہ اندرونی کمرہ تھا۔ اس سے آگے ایک کمرہ اور بھی تھا۔ نور عباسی نے اس کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ اندر سے کچھ دیر تک اجمل خان کے بولنے کی مدھم آواز آتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ خمیدہ کمر والے بوڑھے نے نہایت غصیلے انداز میں ابراہیم کو مخاطب کیا۔ ''یا تو یہ بندہ ابھی چھوٹے سائیں سے معافی مانگے یا پھر اسے چھتر مار مار کر گاؤں سے نکال دو۔''

نور عباسی نے بیچ میں پڑتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی! جو کچھ ہوا ہے غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں بھی وہاں مزار پر ہی تھا۔ اصل میں چھوٹے سائیں کے مرید ابرار نے سارا کام خراب کیا ہے۔ اجمل نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ بندے کی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے ڈاکٹر کو بھی دکھا لینا چاہیے۔ ابرار نے بات کا جواب گالی سے دیا اور ساتھ ہی دھکے دینا شروع کر دیئے۔ یہ بات سب مانتے ہیں کہ غصہ حرام ہوتا ہے۔ اجمل خان کو بھی طیش آ گیا۔ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی۔ ویسے میں چنگی طرح جانتا ہوں کہ وہ بے ادب بندہ نہیں ہے۔ ذرا اپنے آپ میں آئے گا تو خود بھی اپنی غلطی کو مانے گا اور پھر معافی بھی مانگ لے گا۔ بس تھوڑا سا وقت دے دیں اسے۔'' نور عباسی نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اوئے وقت کیا دیں گے اس کنجر کے تخم کو...... یہ تو اب بھی بک بک کر رہا ہے۔ ایسے بے ادبے بے غیرتے کی تو زبان کاٹ کر تلی پر رکھ دینی چاہیے۔'' خمیدہ کمر والے کے ساتھ آئے ہوئے شخص نے بلند آواز سے کہا۔

''بس ایسی ہی باتوں سے بات بڑھتی ہے بھائیا۔'' ابراہیم بھنا کر بولا۔

''بات اب کیا بڑھنی ہے۔ بات بڑھ چکی ہے۔'' مخاطب کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔

خمیدہ کمر والے بوڑھے نے بات کو سنبھالا اور ذرا کم تلخ لہجے میں بولا۔ ''دیکھو ابراہیم! اس سے پہلے تم نے نوری کی بیٹی والے معاملے میں بھی یہی کچھ کیا تھا۔ تم نے نوری کو پٹی پڑھائی کہ یہ بیٹی کو شہر لے جائے۔ چھوٹے سائیں کے منع کرنے کے باوجود یہ اسے شہر لے گیا تھا۔ اب اس کا وبال پڑ رہا ہے ناں پورے گھر پر۔''

''کیا وبال ہے؟'' ابراہیم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''یہی وبال کیا کم ہے کہ اس کا داماد ایک ساتھ تین بیٹیوں کا باپ بنا۔ صرف چھ مہینے بعد اس کی بیٹی کا دیور گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ جوان لڑکے کے مرنے کے ایک ہی مہینے بعد ان کی بکریوں میں بیماری پھیلی اور دس بکریاں ایک رات میں مر گئیں۔ مری تھی یا نہیں؟ اور پھر اس کی بیٹی کی ساس پورے ایک سال سے بیمار پڑی ہے۔ مرتی ہے نہ جیتی ہے۔ یہ ہوتا ہے وبال۔''

ابراہیم نے تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ ''ایسی تکلیفیں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں، ہر ایک پر آتی ہیں۔ اللہ کے بڑے بڑے پیارے بندوں پر تکلیفیں آئی ہیں۔ اگر آپ کو یاد نہ ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔ چھوٹے سائیں کے مرید ابرار نے ہی سب سے پہلے کہا تھا کہ مریضہ کے پیٹ میں تین رسولیاں ہیں...... حالانکہ وہ۔''

''چپ کر جا ابراہیم۔ چپ کر جا۔'' خمیدہ کمرے والے نے طیش سے ابراہیم کی بات کاٹی۔ ''اپنے منہ سے ایسی بات نہ نکال جس کا عذاب تجھے بھگتنا پڑے اور ساتھ میں تیرے بال بچے کو بھی۔ اللہ والے جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری آنکھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں ہے۔ ابھی تک تو لوگ تیرے مہمان کے بارے میں ہی باتیں کر رہے ہیں، ایسی بے ادبی کی باتیں کرے گا تو لوگ تیرے خلاف بھی ہو جائیں گے..... ان کے پرانے زخم تازہ ہو گئے تو تیرے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

''میں نے کسی کو کوئی زخم نہیں لگایا، ہمیشہ حق سچ کی بات کی ہے۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''اللہ پر ہے تو پھر اللہ کے بندوں پر کیوں نہیں؟ کیوں لوگوں کو بھٹکاتا ہے تُو.....''

اس سے پہلے کہ ابراہیم بھی زیادہ کڑے لہجے میں بات کرتا، نور عباسی نے درمیان میں آکر اسے خاموش کر دیا۔ ''نہیں ابراہیم! شاہ جی کو جواب نہیں دینا۔ بس انہوں نے جو کہہ دیا، ٹھیک ہے۔ یہ ہمارے بزرگ ہیں۔'' پھر وہ خمیدہ کمر والے کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''شاہ جی! ابراہیم کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ باقی آپ تسلی رکھیں۔ وہی ہوگا جو آپ کہتے ہیں۔ اجمل خان خود مزار پر جا کر چھوٹے سائیں سے معافی مانگے گا۔ بس ایک دو دن میں مَیں خود لے کر آؤں گا اسے۔ آپ بے فکر رہیں۔''

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد نور عباسی دونوں مقامی بوڑھوں کو سمجھا بجھا کر بیرونی دروازے کی طرف لے گیا۔ ان کے جانے کے بعد ابراہیم نے اپنی پگڑی کھول کر گود میں رکھی اور بے دم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''پتا نہیں ہمارے لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ ان کی عقلوں سے پتھر کب ہٹیں گے۔'' چاچے ابراہیم نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا اور اپنے چہرے کی چوٹوں کو سہلانے لگا۔ شانی ان کے لئے جلدی سے روئی اور ہائیڈروجن وغیرہ لے آئی۔

گریس نے کہا۔ ''شانی! خان کو تو کمرے سے نکالو۔''

آج کل اسے خان کی بہت فکر رہتی تھی۔

ابراہیم اور نور عباسی نے اجمل خان کو کمرے سے نکالا۔ وہ بدستور طیش میں تھا۔ اسے روکیٹ سے نکالنے کی بات کی جا رہی تھی۔ دیکھا جاتا تو یہ دوبارہ ہو رہا تھا، اسے کسی بستی سے نکالنے کی بات ہو رہی تھی۔ اجمل خان نے اپنی جو روداد سنائی تھی اس کے مطابق وہ کوہاٹ کے نواحی گاؤں روگڑی کا رہائشی تھا اور پیر قدرت اللہ کے چیلے شاہی کی وجہ سے اسے بستی بدر کیا گیا تھا۔ اجمل خان کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی۔ اس کے پاؤں پر کسی کا پھینکا ہوا پتھر لگا تھا

اور پاؤں سوج گیا تھا۔ شانی اجمل کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ گریس بھی ہمدردی سے اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

☆======☆======☆

شانی اور ڈولا ایک بار پھر بڑی خاموشی سے بھورے وال کی طرف جا رہے تھے۔ شانی کے پہلو میں چلتا ہوا ڈولا بالکل بچہ ہی لگتا تھا۔ اس کی معصوم صورت عام بونوں سے کافی مختلف تھی۔ جب تک اسے غور سے نہ دیکھا جاتا پتا نہیں چلتا تھا۔ شانی نے بھی اپنا منہ سر اچھی طرح اوڑھنی میں لپیٹا ہوا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کرتی بلند پہاڑی درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی اور شام کے سائے طویل ہونے کے بعد اب تاریکی میں ڈھلنے لگے تھے۔

شانی کے اندر بے پناہ بے قراری تھی۔ وہ زخمی انسپکٹر حفیظ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ شانی کے نزدیک حفیظ کی زندگی ہر لحاظ سے قیمتی تھی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو کبھی پتا نہ چلتا کہ حوالدار ناگی اور اس کے دوست کے ساتھ کیا ہوا۔ نہ ہی اس طویل قامت شخص کے بارے میں کوئی کھوج لگ سکتا جس کی تلاش میں غالباً ناگی نے جان ہاری تھی۔ وہ طویل قامت شخص اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا بن گیا تھا جس میں رستم اور ناصر وغیرہ کی گمشدگی کا معاملہ بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔

شانی اپنے ساتھ اجمل خان کو لانا چاہتی تھی مگر دو دن پہلے وہ چونکہ ایک جھگڑے میں ملوث ہو چکا تھا اور اسے ساتھ لانا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے اس کا پاؤں بھی زخمی تھا۔ شانی خطرہ مول لے رہی تھی تاہم وہ جانتی تھی کہ اب خطرات مول لئے بغیر چارہ نہیں۔

ڈولے نے چلتے چلتے کہا۔ ''باجی! آپ نے بتایا ہے کہ زخمی انسپکٹر صاحب چھوٹے پیر کے ایک مرید کے گھر میں ہیں۔ تو کیا وہ مرید ہمیں گھر میں گھسنے دے گا؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ ابھی تک حفیظ کی شناخت نہیں ہو سکی۔ علاقے کے لوگ اسے راہ گیر سمجھ رہے ہیں یا ان کا خیال ہے کہ وہ کسی قریبی بستی کا رہنے والا ہے۔ اس کی شناخت کے لئے کل سے بہت سے لوگ بھورے وال آئے ہیں۔ سمجھو ہم بھی ان میں سے ایک ہیں۔''

''ہم کیا کہیں گے، وہاں جا کر؟''

''میں کہوں گی میرا بھائی کئی مہینے سے شہر گیا ہوا ہے اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا.....'' تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔

شام کافی گہری ہو گئی تھی جب وہ مزار کے نواح میں پہنچ گئے۔ مزار قد... بلندی

تھا۔ نشیب میں روکیٹ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور بلندی پر قریباً ایک میل آگے بھور والی کے چراغ جھلک دکھا رہے تھے۔ مزار کے وسیع احاطے میں اس وقت خاموشی تھی۔ احاطے سے صرف چالیس پچاس میٹر آگے چند ایک چھوٹے گھر تھے۔ شانی کی معلومات کے مطابق ان گھروں میں مزار کے خدمت گار اور چھوٹے سائیں کے قریبی مرید رہائش پذیر تھے۔ اس کے ساتھ ہی لنگر خانہ تھا اور جھنڈے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔

شانی اور ڈوڈے کو مرید ابرار کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ مکان نسبتاً بڑا تھا، تین چار کمرے تو ہوں گے۔ گھر پر سرخ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گھر کے عین سامنے ایک درخت پر منتوں کی بہت سی رنگ برنگی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شانی نے ڈوڈے کو کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیا اور سمجھا دیا کہ وہ وہیں پر اس کا انتظار کرے۔

اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ابرار کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری تیسری دستک پر درمیانے قد کے ایک بیس بائیس سالہ نوجوان نے دروازہ کھولا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ شکل وصورت سے وہ ٹھیٹ پنجابی لگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پنجابی لہجے میں پوچھا۔

''میں نے چھوٹے سائیں کے متولی جی سے ملنا ہے۔''

''متولی جی اس ویلے نہیں مل سکتے۔'' خشک لہجے میں جواب ملا۔

اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو جاتا، شانی نے اپنا ہاتھ دروازے پر رکھ دیا۔ ''میں بڑی مجبور ہوں اور دور سے آئی ہوں۔ میرا ملنا ضروری ہے۔'' شانی نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

''کہا ہے ناں کہ نہیں مل سکتے.... جاؤ کام کرو۔'' ایک بار پھر تیز لہجے میں کہا گیا۔

اندر سے ایک بھاری اور بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔ ''اوئے کون ہے شہابے؟''

''اک کڑی ہے جی۔ اندر وڑتی (گھستی) آ رہی ہے۔''

چند لمحے کے توقف کے بعد کہا گیا۔ ''کیا کہتی ہے؟ بلاؤ اسے۔''

گول ٹوپی والے نے بڑبڑا کر دروازہ کھول دیا۔ شانی چادر میں لپٹی لپٹائی اندر چلی گئی۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک صحن میں سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچی۔ یہاں لالٹین کی روشنی تھی۔ ایک بڑی چارپائی پر ایک صحت مند بندہ پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ سر صفاچٹ تھا، بالکل چھوٹی داڑھی تھی۔ لگتا تھا کہ شیو بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بنیان اور دھاری دار ریشمی دھوتی میں تھا۔ ایک جواں سال پہاڑن اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ پہاڑن لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی تھی اور چوڑیاں

چھن چھن کر رہی تھیں۔

شانی نے دیکھا متولی ابرار کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ یقیناً یہ کسی نشے کا اثر تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے دو دن پہلے اجمل خان سے جھگڑے کی شروعات کی تھی۔ ''کیا بات ہے کاکی؟'' اس نے لیٹے لیٹے شانی سے سوال کیا۔ لہجہ سپاٹ تھا۔ اس کے منہ سے کاکی کا لفظ شانی کو عجیب لگا۔ شانی چادر میں پوشیدہ تھی اس کے باوجود اس نے جان لیا تھا کہ وہ جواں سال ہے۔ اس نے شانی کے لئے کاکی کا لفظ استعمال کر کے اپنے رتبے کو بلند رکھنے کی کوشش کی تھی۔

شانی نے کہا۔ ''میرا بھائی گم ہے جی..... پچھلے تین مہینے سے۔ میں روکیٹ میں آئی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس کوئی زخمی بندہ علاج کے لئے آیا ہے.....''

شانی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ابرار نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ایک بے زاری جمائی لے کر اپنے پاؤں دباتی لڑکی سے بولا۔ ''اچھا گلزاراں تُو جا، اب سو جا...... جا کر۔''

گلزاراں نامی وہ لڑکی اپنی اوڑھنی سر پر درست کرتے ہوئے اٹھی۔ وہ بھرپور جسم کی مالک تھی۔ شانی نے حیرت سے دیکھا، لڑکی نے ابرار کے دونوں پاؤں اکٹھے کر کے انہیں چوما پھر ان پر اپنا ماتھا ٹیکا اور الٹے پاؤں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ مزار کی طرف چلی گئی تھی۔

متولی ابرار نے اپنی لکڑی کی کھڑاویں پہنیں اور شانی کو ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے گلے میں لکڑی کے موٹے دانوں والی مالا لڑکھڑا رہی تھی۔ اس دوسرے کمرے میں شانی نے حفیظ کو دیکھا۔ وہ ایک نواڑی پلنگ پر دراز تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں نیلگوں ہو کر سوج گئی تھیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی شانی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں.... بلکہ بہت خراب ہے۔ وہ اٹک اٹک کر سانس لیتا تھا اور ہر سانس کے ساتھ گردن کے نچلے حصے پر سامنے کی طرف چھوٹا سا گڑھا نمودار ہو جاتا تھا۔ اس کے سر پر کسی چادر سے پھاڑی جانے والی بڑی سی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اس کی دونوں کلائیوں اور دونوں ٹخنوں پر قریباً ایک درجن تعویذ بندھے ہوئے تھے۔

شانی کے دل نے ایک لمحے کے لئے گواہی دے دی کہ حفیظ کی زندگی خطرے میں ہے اور اسے فوری طور پر کسی اچھے معالج کے پاس پہنچایا جانا چاہیے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ حفیظ کے ذریعے رستم کی گمشدگی کا کھوج لگ سکتا تھا بلکہ بات یہ بھی تھی کہ وہ ایک جیتا

جاگتا انسان تھا اور تعویذ گنڈے کی بھینٹ چڑھ کر مر رہا تھا۔ شانی کو لگا کہ وہ واقعی اس کا بھائی ہے۔ اسے اس کی ضرورت ہے۔ وہ پوری جان سے تڑپ گئی۔ اس کے اندر وہی جبلت جاگ اٹھی جو اسے غیروں کے دکھ جھیلنے پر مجبور کرتی تھی، وہ سب کچھ بھول کر دوسروں کے خطرناک ترین مصائب کو اپنے گلے لگا لیتی تھی۔

وہ مر رہا تھا اور اسے زندگی کی ضرورت تھی۔

وہ مر رہا تھا اور بڑی تیزی سے مر رہا تھا۔

وہ مر رہا تھا اور اس کے ان دھلے کپڑوں میں ایک پُرامنگ خط تھا۔ وہ خط جس میں کسی کا پُرشوق انتظار تھا۔ جس میں چودھویں کے چاند کا ذکر تھا اور محبت کے جگنوؤں سے سجی ہوئی حسین شاموں کا ذکر تھا۔

شانی کا لگا واقعی اس کا بھائی مر رہا ہے۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''میرے اللہ! یہی میرا بھائی ہے۔ یہی ہے میرا بھائی۔''

اس نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما اور اس کے زرد گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ بے تاب ہو کر بولی۔ ''متولی صاحب! اسے کیا ہو رہا ہے۔ یہ کھینچ کر سانس لے رہا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے ہیں۔''

متولی ابرار کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی نظر آئی۔ اس نے حفیظ کی پیشانی چھو کر دیکھی پھر طفل تسلی کے انداز میں بولا۔ ''کچھ نہیں۔ بس ذرا بخار ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا......''

تب اس نے غور سے شانی کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے بعد حفیظ کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ شانی کی طرف دیکھا۔ ''تو...... یہ تیرا...... بھائی ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''جی .. متولی جی...... یہ بھائی ہے میرا۔ مم...... میں اسے لے جانا چاہتی ہوں یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں۔''

''کہاں لے جانا چاہتی ہے؟'' ابرار کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ''تیرے گھر والے کہاں ہیں؟''

اگلے دو تین منٹ میں متولی ابرار اور شانی میں زوردار بحث ہوئی۔ حفیظ کی مخدوش حالت دیکھ کر شانی ہر خطرے، اندیشے سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ ایک ایسی توانائی اس کے اندر بیدار ہو گئی تھی جو اکثر سامنے والے کو مرعوب کر دیتی تھی۔ وہ متولی ابرار کا بازو اپنی انگلیوں میں جکڑ کر بولی۔ ''تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ بڑی اچھی طرح دیکھ رہے ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ میں تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دوں گی۔ ختم کر دو

یہ تماشا...... خدا کے لئے ختم کر دو۔'' وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح آگے بڑھی اور اس نے حفیظ کے ٹخنوں سے بندھے ہوئے سیاہ تعویذ توڑ توڑ کر پھینک دیئے۔

اس کی یہ حرکت متولی ابرار کو بالکل آگ بگولہ کر گئی۔ اس نے شانی کو دھکا دیا۔ وہ دیوار سے جا لگی۔ ''تم ہو کون...... کون ہو تم؟'' (طیش کے عالم میں شانی اپنا خالص دیہاتی لب و لہجہ برقرار نہیں رکھ سکی تھی)

ابرار نے جھپٹا مار کر شانی کو بے پردہ کر دیا پھر وہ چلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا یہ تمہارا بھائی ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کون ہو تم...... کس کے کہنے پر آئی ہو؟''

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی...... لیکن بعد میں۔ ابھی اس کا کچھ کرو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔'' شانی کے لہجے میں حیران کن وزن اور دبدبہ تھا۔

''اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے یہیں ہونا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' شانی ایک بار پھر حفیظ کی طرف جھپٹی۔ اس نے حفیظ کی کلائی پر بندھے تعویذ بھی توڑ کر پھینک دیئے۔

ابرار نے بدحواسی کے عالم میں شانی کو واپس کھینچنے کی کوشش کی۔ شانی نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ ابرار کے منہ پر مارا۔ اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئیں۔ اس سے پہلے کہ مشتعل اور حواس باختہ متولی ابرار جواب میں کچھ کہتا یا کرتا ایک غیر متوقع واقعہ ہوا۔ ایک جانب سے گول ٹوپی والا نوجوان برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی عصا نما شے تھی۔ شاید یہ متولی ابرار کا ہی عصا تھا۔ نوجوان نے شیشم کی یہ بھاری لکڑی بڑی طاقت سے ابرار کے سر کے پچھلے حصے پر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کی مالا چارپائی کے پائے سے الجھ کر ٹوٹ گئی اور منکے فرش پر بکھر گئے۔ نوجوان نے گرے ہوئے ابرار کے سر پر ایک اور بھرپور ضرب لگائی۔ وہ اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ بے ہوش ہوا ہے یا......

شانی کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگی۔ نوجوان کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر زلزلے کی کیفیت۔ وہ عصا پھینک کر تیزی سے شانی کی طرف آیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پاؤں کو چھو لیا۔ ''کیا کرتے ہو؟'' شانی تیزی سے پیچھے ہٹی۔

''میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ وڈی آپا کی بیٹی ہیں۔ آپ .نگ والی کی چھوٹی بی بی ہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے۔'' وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔

''کک...... کون ہو تم؟''

''آپ نے مکھن وال کا نام ضرور سنا ہوگا۔ یہ رنگ والی کے پاس کا ایک پنڈ ہے۔ میں وہاں کا رہنے والا ہوں جی۔ میرے ماں پیو بھٹہ مزدور تھے۔ بھٹہ مالک نے ان کو گروی رکھا ہوا تھا۔ ہم کو وڈی آپا نے چھڑایا تھا۔ میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا جی۔ ....سب کچھ بتاؤں گا۔ ابھی آپ مجھے یہ بتائیں مجھے کیا کرنا ہے؟ آپ جو کہیں گی میں کروں گا۔ اپنی جان لڑا دوں گا۔ آپ بس حکم کریں جی۔'' نوجوان کے لب و لہجے میں شانی کو اپنے ہی علاقے کی جھلک نظر آئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاید اسی کو غیبی امداد کہتے ہیں۔ یہاں وہ کام ہوا تھا جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ شانی نے ہمت کی تھی۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر ابرار سے جھگڑا مول لیا تھا۔ اس جھگڑے کے سبب اس کے چہرے سے نقاب اُترا تھا اور نقاب اُترنے کی وجہ سے ایک خیر خواہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ ایک اجنبی خیر خواہ نے۔ شانی نے ایک تیز نظر بے سُدھ پڑے متولی ابرار پر ڈالی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں نہیں تھا۔ یہ گہری بے ہوشی تھی۔ چوٹیں زوردار لگی تھیں۔ شانی نے حفیظ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ اس کو کسی طرح شہر پہنچانا ہوگا۔ کیا یہاں کوئی گاڑی ہے؟''

''ہاں جی ایک ڈالہ ہے۔ اس پر ہم گھوڑا گلی سے سامان وغیرہ لے کر آتے ہیں۔''

''تم اسے چلا لوگے؟''

''راستہ بڑا مشکل ہے۔ پر اللہ کی مدد سے چلا لوں گا جی۔''

''اس گھر میں اور کون ہے؟''

''اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں ہے جی۔ یہ سارے لوگ کل رات کے جاگے ہوئے ہیں اس لئے آج جلدی سو گئے ہیں۔ ڈالہ مکان کے پچھواڑے کھڑا ہے۔ چابی متولی ابرار کی الماری میں ہوگی۔''

''تم ڈالہ سٹارٹ کرو گے تو کسی کو پتا تو نہیں چل جائے گا؟''

وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا پھر فوراً بولا۔ ''اسے ابھی اسٹارٹ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ کافی دور تک ڈھلوان پر جانا ہے۔ ہینڈ بریک کھولیں گے تو چلنا شروع ہو جائے گا۔ بس ڈیزل کے دو گیلن رکھنے پڑیں گے، وہ میں ابھی رکھ لیتا ہوں۔ آگے جا کر ڈیزل ڈال لیں گے۔ پکی سڑک تک پہنچ گئے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ گھوڑا گلی تک مشکل سے ایک گھنٹہ کا رستہ ہوگا۔''

شانی نے کہا۔ ''لیکن اس کو ڈالے تک پہنچاؤ گے کیسے؟'' اس کا اشارہ حفیظ کی طرف

تھا۔

''گھر کے پچھواڑے ایک چھوٹا دروازہ ہے جو ابرار نے تختے لگا کر بند کیا ہوا ہے۔ میں ابھی دو منٹ میں تختے اکھاڑ دیتا ہوں۔''

''میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ تم تختے اکھاڑو میں اسے لے کر آتی ہوں۔'' شانی نے کہا اور تیزی سے ڈولے کی طرف چلی گئی۔

سب کچھ بڑی خوش اسلوبی اور تیزی سے ہوا۔ مزار کے اردگرد موجود گھروں میں سے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور اب شانی زخمی حفیظ کو لے کر تیزی سے گھوڑا گلی کے رخ پر جا رہی تھی۔ ان کی منزل گھوڑا گلی سے آگے مری کا تحصیل ہسپتال تھا۔ ڈالے کو گول ٹوپی والا وہی اجنبی خیر خواہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کا نام شہاب الدین تھا۔ ڈولا اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈالے کے فرش پر موٹا گدیلا ڈال کر حفیظ کو لٹا دیا گیا تھا اور اوپر کمبل دے دیا گیا تھا۔ شانی حفیظ کے سرہانے بیٹھی تھی اور مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

شروع میں راستہ بے حد دشوار تھا۔ کئی جگہ تو یوں لگا تھا کہ شاید ڈالہ آگے ہی نہیں بڑھ سکے گا۔ درحقیقت یہ پیدل یا گھوڑے خچر وغیرہ کا راستہ تھا۔ انہوں نے ایک گھنٹے میں یہ مشکل چار پانچ میل سفر طے کیا ہوگا لیکن اب وہ نسبتاً بہتر رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ کیبن اور عقبی حصے کا درمیانی شیشہ موجود نہیں تھا۔ شہاب اور ڈولا بہ آسانی شانی سے بات چیت کر رہے تھے۔

شہاب ایک بالکل سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ شروع میں تو شانی کو یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ یہ لوڈر ڈرائیو کر لے گا لیکن یہ کام تو وہ بہرحال کر ہی رہا تھا۔ اس نے اب تک جو باتیں کی تھیں ان سے معلوم ہوا کہ اس نے شانی کے چہرے سے چادر کا نقاب اُترتے ہی اسے پہچان لیا تھا کیونکہ وہ اپنی ماں وڈی آپا کی زندہ تصویر تھی۔ شہاب اور اس کا پورا گھرانہ ہزاروں دوسرے لوگوں کی طرح وڈی آپا اور چوہدری ارشاد کا پرستار تھا۔ وڈی آپا کے ان پر بہت زیادہ احسانات تھے۔

شہاب کی گفتگو سے پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر پہلے متولی ابرار کے گھر میں جو جوان پہاڑن ابرار کے پاؤں دبا رہی تھی وہ مقامی رواج کے مطابق مزار کی ''چاکری'' میں تھی۔ شانی نے ''چاکری'' کے بارے میں پوچھا تو شہاب نے بتایا کہ مقامی رواج کے مطابق جو لوگ کسی مصیبت میں ہوتے ہیں وہ رَدِ بلا کے لئے اپنے اہلِ خانہ میں سے کسی ایک فرد کو کچھ عرصے کے لئے بھورے سائیں یا ایک دوسرے مزار کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ بگڑتے

بگڑتے اس رواج کی شکل یہ ہوگئی ہے کہ کچھ جاہل اپنی عورتوں تک کو بھیج دیتے ہیں۔ شہاب نے بتایا کہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے مزار کی چاکری میں آئی ہوئی ہے۔ اس کا ایک بھائی جیل میں ہے اور اسے سزائے موت ہوئی ہے۔ اس منت کے ساتھ کہ جوان بھائی کی پھانسی ٹل جائے، اس لڑکی نے خود کو چاکری میں دے رکھا ہے۔ چاکری کی مزید تفصیل بتانے سے شہاب نے اجتناب کیا لیکن اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ اکثر اوقات چاکری کی آڑ میں مزار کے ''کارِمختار لوگ'' گناہ کا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہیں۔ بعض اوقات سادہ لوح لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے چھوٹا سائیں اپنے کسی مرید اور چاکر عورت کے درمیان نکاح کا ڈرامہ بھی رچا دیتا ہے۔ اردگرد کے لوگ بہت کچھ جانتے ہیں اور بہت سے اس کے خلاف بھی ہیں لیکن مختلف قسم کے ڈر اور وہم انہیں چپ رہنے پر مجبور رکھتے ہیں۔

اس گفتگو کے ساتھ ساتھ شانی مسلسل حفیظ کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھی۔ نہایت ناہموار راستے کی وجہ سے اسے گاہے بگاہے نیم بے ہوش حفیظ کو تھام کر رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بار بار ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ بھی دیکھ لیتی تھی اور سانس کی روانی کا جائزہ بھی لے لیتی تھی۔ جب شہاب نے ایک ہموار جگہ پر لوڈر روک کر اس میں ڈولے کی مدد سے ڈیزل بھرنا شروع کیا، اچانک حفیظ پر تشنج کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے اور آنکھوں کی پتلیاں اوپر کی طرف چلی گئیں۔ شانی نے اسے پانی پلایا۔ ڈولے اور شانی نے اس کی ہتھیلیوں اور تلووں کی مالش کی۔ کچھ دیر بعد اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی۔

فی الوقت شانی کے ذہن میں فقط ایک ہی بات تھی، حفیظ کو جلد از جلد کسی ہسپتال تک پہنچایا جائے۔ وہ اس شخص کے لئے وہی تڑپ محسوس کر رہی تھی جو کوئی اپنے کسی خونی رشتے کے لئے کر سکتا ہے۔ وہ باقی ساری باتیں بھولی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی ان پہاڑوں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنا اس کے لئے بے حد خطرناک ہے۔ وہاں اس کے لئے اَن گنت اندیشے موجود تھے۔ ان میں تین بڑے اندیشے ریاض ہٹلر، پیر قدرت اللہ اور چوہدری بشیر تھے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ حفیظ کی زندگی چلچلاتی دھوپ میں رکھی برف کی طرح ختم ہو رہی ہے۔ وہ اب سوچ سکتی تھی، نہ کہیں رک سکتی تھی، نہ متبادل راستہ ڈھونڈ سکتی تھی۔

''جلدی کرو شہاب۔'' وہ فریادی آواز میں بولی۔

''بس کام ختم ہوگیا چھوٹی بی بی۔'' شہاب نے ادب سے کہا اور خالی کین کیبن کی چھت پر رکھ دیئے۔ چند ہی لمحے بعد لوڈر پھر سے اونچے نیچے راستے پر رواں تھا۔

ڈولے نے کہا۔ ''باجی! کہیں وہ بندہ مر تو نہیں جائے گا؟'' اس کا اشارہ متولی ابرار کی

طرف تھا۔

''لگتا تو نہیں۔ جب ہم وہاں سے چلے تو اس نے ہلنا جلنا شروع کر دیا تھا۔'' شانی نے کہا۔

''مر بھی گیا تو لوگ یہی سمجھیں گے، اسے جنوں نے مار دیا ہے۔'' شہاب نے ڈرائیو کرتے کرتے کہا۔

''کیا مطلب؟'' شانی نے پوچھا۔

''چھوٹے سائیں نے دعویٰ کیا ہے کہ ریلوے ملازم عابد کے گھر میں ہونے والی خونی واردات میں ہوائی چیزوں کا عمل دخل ہے۔ وہ کہتا ہے زخمی حفیظ صاحب میں بھی ایک سکھ جن گھسا ہوا ہے۔ اکثر لوگ تو شاید یہی سمجھیں گے کہ زخمی حفیظ صاحب نے اپنے سکھ جن کی طاقت سے متولی ابرار کی کھوپڑی توڑی اور پھر ڈالہ لے کر کہیں نکل گئے۔''

''اور تمہارے بارے میں کیا سمجھا جائے گا؟'' ڈولے نے پوچھا۔

''شاید یہ سمجھا جائے کہ میں اس واقعے کی دہشت سے کہیں غائب ہوگیا ہوں۔''

''مجھے یہ فکر ہے کہ کہیں اس واقعے کا الزام اجمل خان پر نہ آجائے۔'' شانی نے کہا۔

''دیکھیں چھوٹی بی بی! متولی ابرار کو پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں پھر وہ آپ کی وجہ سے روکیٹ اور آپ کے کسی ساتھی کی طرف توجہ کیوں کرے گا...... وہ تو......''

اچانک شہاب خاموش ہوگیا۔ ڈولے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ڈولے کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کوئی...... ہمارے...... پیچھے ہے۔'' آخر اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' شانی نے اپنی پھڑپھڑاتی اوڑھنی کو مضبوطی سے تھام کر پوچھا۔

''مجھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آرہی ہے... کافی دیر سے۔''

لوڈر ڈھلوان پر جا رہا تھا۔ شانی کے کہنے پر شہاب نے انجن بند کر دیا اور ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ شانی نے پوری توجہ سے سننے کی کوشش کی۔ پہلے تو اسے یہ ڈولے کا وہم لگا پر اس کا دل بھی دھک دھک کرنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپ جیسی نامانوس آواز ہوا کے دوش پر اس نے بھی سنی تھی۔

ان کا پیچھا کیا جا رہا تھا...... اس تاریک رات میں، ان ویران سرد پہاڑوں کے درمیان

اس جاں بلب مریض کے ساتھ، اس بے سروسامانی کے عالم میں......وہ شاید گھیرے میں لئے جارہے تھے۔

شانی نے شہاب سے کہا۔ ''انجن سٹارٹ کردو اور چلتے رہو۔''

لوڈر پھر سٹارٹ ہو کر اونچے نیچے راستوں پر اچھل کود کرنے لگا۔ یہ بے حد دشوار سفر تھا۔ پتھریلے راستے پر بڑے بڑے گڑھے تھے۔ ایک طرف جنگل سے ڈھکا ہوا پہاڑ اور دوسری جانب گہری کھائی تھی۔ ہیڈ لائٹس بجھا دی جاتیں تو چند لحوں میں وہ تحت الثریٰ تک جا پہنچتے۔ شہاب عرف شہابا بے شک ڈرائیونگ بہت اچھی نہیں کرسکتا تھا لیکن وہ ان راستوں کا بہت اچھی طرح شناور تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ڈالے یعنی لوڈر کو آگے بڑھاتا چلا جارہا تھا۔

شانی اور شہاب کو اب آواز نہیں آرہی تھی تاہم ڈولے کے کان بدستور کھڑے تھے۔

انہوں نے تقریباً پانچ چھ میل کا فاصلہ اسی طرح طے کیا۔ پھر ڈولا زیادہ مضطرب دکھائی دینے لگا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تین کے قریب گھڑسوار ہیں یا شاید چار ہیں۔ ان میں سے دو یا تین اکٹھے ہیں، ایک علیحدہ ہے۔''

شانی نے اپنی سماعت پر زور دیا۔ ایک بار پھر اسے گھوڑے کے سموں کی مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس دفعہ یہ آواز قریب تھی اور دائیں طرف سے آرہی تھی۔ ''وہ دیکھیں جی۔'' ڈولے نے چلا کر دائیں طرف اشارہ کیا۔

شانی نے ڈولے کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ ایک پرچھائی سی درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتی نظر آئی۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بہ مشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ دو گھڑسوار آناً فاناً لوڈر کے سامنے آگئے۔ وہ پولیس اہلکار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی خودکار رائفلیں تھیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے لوڈر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ شہاب نے لوڈر روک دیا۔

اسی دوران میں ایک تیسرا گھڑسوار بھی سامنے آگیا۔ اس کی کمر سے پسٹل لگا ہوا تھا۔ یہ ایک باوردی سب انسپکٹر تھا۔ ''گاڑی بند کرو۔'' اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تحکم سے کہا۔ شہاب نے شانی کی طرف دیکھا اور انجن بند کردیا۔ ''نیچے اترو۔'' اس نے شہاب اور شانی کو ایک ساتھ گھورتے ہوئے حکم جاری کیا۔

''سرجی! ہمارے ساتھ مریض ہے۔ اس کی حالت چنگی نہیں ہے۔ اس کو فوراً ہسپتال پہنچانا ہے۔'' شہاب نے کہا۔

''کرلیتے ہیں تمہارے مریض کو بھی چیک......ذرا نیچے تو اترو۔'' روایتی انداز میں کہا

گیا۔ شانی نے مریض کی حالت دکھاتے ہوئے احتجاج کرنا چاہا لیکن اسی دوران میں ایک ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ بڑھا کر لوڈر کی چابی اگنیشن میں سے نکال لی اور شہاب کو کھینچ کر باہر لے آیا......چاروناچار شانی کو بھی نیچے اُترنا پڑا۔ وہ سب انسپکٹر کے سامنے پہنچ کر گڑگڑائی۔

''کچھ خدا کا خوف کرو۔ یہ بندہ مر رہا ہے۔ ہمارے لئے ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔''

''کون ہے یہ؟ کیا ہوا ہے اسے؟ کہاں سے آرہے ہو؟'' سب انسپکٹر نے ٹارچ کا روشن دائرہ حفیظ پر اوپر سے نیچے تک دوڑاتے ہوئے اوپر تلے کئی سوالات کرڈالے۔

''تم مہربانی کر کے گاڑی کی چابی دو۔ اگر اس بندے کو کچھ ہوگیا تو تمہارا ابھی ستیاناس ہوجائے گا۔'' شانی بلند آواز میں بولی۔

سب انسپکٹر نے اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر دونوں ٹانگوں پر وزن برابر کیا اور طیش آمیز انداز میں گردن ٹیڑھی کر کے شانی کو سرتاپا دیکھا۔ ''اوہو......ہو......ہو۔ دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ تیرے جیسی کُڑی کو دھمکیاں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بس آنکھ کا اشارہ کرو اور جس کو چاہو قتل کر کے اپنے قدموں میں ڈال لو۔ نہ کوئی چارج، نہ کوئی دفعہ، نہ پرچا شرچا۔'' اس نے بڑی بے باکی سے شانی کو بازو سے تھام لیا۔

شانی نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت مضبوط تھی۔ شہاب سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ وہ تڑخ کر بولا۔ ''تھانیدار صاحب! اپنے آپ میں رہو۔ ہم کوئی چور ڈاکو نہیں اور نہ ہی لاوارث ہیں۔ چھوڑ دو چھوٹی بی بی کا ہاتھ۔''

''اوئے تیری تو......'' لمبے تڑنگے ہیڈ کانسٹیبل نے دانت پیسے اور وحشیوں کی طرح شہاب پر پل پڑا۔ شہاب درمیانے قد کاٹھ کا تھا لیکن اس کے اندر دہقانی دلیری موجود تھی۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کے پیٹ میں زوردار گھونسے رسید کئے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس حرکت پر دوسرا اہلکار بھی اس پر ٹوٹ پڑا اور رائفل کے بٹ بے دریغ مارنے لگا۔ دوسری طرف سب انسپکٹر نے شانی کو گھما کر لوڈر کی سائیڈ سے دے مارا اور تلاشی لینے والے انداز میں اس کے جسم پر ہاتھ دوڑانے کی کوشش کی۔ شانی نے الٹے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر گالیاں بکتے ہوئے پسٹل شانی پر تان لیا۔ ''خبردار۔ گولی مار دوں گا۔'' وہ دہاڑا اور اپنی گری ہوئی ٹوپی جھاڑ کر سر پر رکھ لی۔

اسی دوران میں دونوں کانسٹیبل شہاب کو رائفل کے کندے سے کاری ضربیں لگانے کے بعد نیم جان کر چکے تھے۔ وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا اور لمبے تڑنگے کانسٹیبل نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل نے حیران کن دیدہ دلیری سے شانی کو عقب

سے دبوچ لیا۔ شانی مزاحمت کرسکتی تھی تاہم وہ جانتی تھی کہ اس ویرانے میں یہی اہلکار پولیس عدالت اور جلاد کے جملہ امور انجام دے سکتے ہیں اور بات صرف اس کی اپنی جان کی نہیں تھی۔ جاں بلب حفیظ اس کے ساتھ لوڈر میں تھا اور اب شہاب بھی زخمی ہو کر پتھریلی زمین پر پڑا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے پھرتی سے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی تھی۔

شانی نے اپنے طیش پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، تم لوگ زیادتی کر رہے ہو۔ آخر چاہتے کیا ہو تم؟''

''زیادتی کی نہیں تھی لیکن اب تھوڑی بہت کرنی پڑے گی۔'' فربہ اندام سب انسپکٹر نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

شانی کے دل میں آئی کہ ان پولیس والوں کو بتا دے کہ لوڈر میں پولیس کا ہی ایک انسپکٹر ہے لیکن وہ فوری طور پر بتانے یا نہ بتانے کا فیصلہ نہیں کرسکی۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ بتانے کے نتائج سنگین ہوں گے۔

یہ رات کے قریباً دس بجے کا عمل تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ تینوں اہلکار شہاب اور شانی کو دھکیلتے ہوئے ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں لے آئے۔ یہاں ہوا کا دباؤ کم تھا۔ اچانک شانی کو احساس ہوا کہ ڈولا موجود نہیں ہے۔ وہ کدھر گیا تھا؟ غالباً وہ گھڑسواروں کی آمد سے چند سیکنڈ پہلے کھسک گیا تھا۔ شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بزدل نہیں ہے۔ وہ جان بوجھ کر اوجھل ہوا تھا۔ پولیس والوں میں سے ابھی تک کسی نے ڈولے کے ہونے یا نہ ہونے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں معلوم نہیں کہ لوڈر پر کتنے افراد سوار تھے۔

سب انسپکٹر نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ اچھی طرح شہاب کی جامہ تلاشی لے۔ اس نے خود بڑے غیر اخلاقی انداز میں شانی کی جامہ تلاشی لی۔ وہ خود پر بے پناہ ضبط کیے خاموش کھڑی رہی۔ وہ ابھی تک کوشش کر رہی تھی کہ معاملہ مزید نہ بگڑنے پائے لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوگی۔ اسے سب انسپکٹر کے منہ سے الکحل کی منحوس بو بھی آرہی تھی۔

اگلے تین چار منٹ میں اہلکاروں نے شہاب کی گھڑی، انگوٹھی، سونے کا ایک تعویذ اور چھ سات سو روپے نقدی اپنے قبضے میں کر لی۔ شانی کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار لی گئیں۔ وہ چھوٹی سی خوب صورت انگوٹھی بھی ان کے قبضے میں چلی گئی جو رستم نے اسے منہ دکھائی کے طور پر دی تھی۔ شانی نے دو تین بار بولنے کی کوشش کی مگر سب انسپکٹر نے ہر بار

ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔ ساری اشیاء اپنے قبضے میں لینے کے بعد اہلکاروں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد سب انسپکٹر تھانیداری لہجے میں بولا۔ ''اوئے رمضانے! ان دونوں کے بیان لینے ہیں، پر علیحدہ علیحدہ۔ چل تُو اس حرامی کو لے کر ان درختوں میں چلا جا۔ میں پہلے اس بی بی سے سوال جواب کر لوں۔''

کانسٹیبل نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور شہاب کو ہتھکڑی سے گھسیٹتا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا۔ سب انسپکٹر نے دوسرے کانسٹیبل یعنی ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ ''چل تُو لوڈر میں چلا جا، اس مردار کے پاس۔ اس کا دھیان رکھ کہیں پار ہی نہ ہو جائے۔''

ہیڈ کانسٹیبل بھی چلا گیا۔ سب انسپکٹر گھوڑے کی زین پتھریلی زمین پر رکھ کر بیٹھا تھا اور چٹان سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ شانی ابھی تک کھڑی تھی۔ اس نے شانی کو سرتاپا گھورا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ شانی کے جسم پر اوپر سے نیچے تک سرکایا۔ ''ہاں اب بتا۔ کہاں سے آئی ہے؟ یہ بندہ کون ہے تیرا اور یہ گھائل کیسے ہوا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ بتانے سے پہلے بیٹھ جا، ادھر میرے سامنے۔''

شانی اسی طرح ساکت کھڑی رہی۔ وہ تحکم سے بولا۔ ''سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ادھر بیٹھ جا میرے سامنے۔''

اچانک شانی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے چند دن پہلے کا واقعہ یاد آیا جو نور عباس نے سنایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ گورے کے بنگلے والی واردات کے بعد ارد گرد کے کچھ گھرانے عارضی طور پر گلیات وغیرہ کی طرف چلے گئے تھے۔ ایسی ہی ایک فیملی پر جعلی پولیس والوں نے دھاوا بولا اور اسے گھیر کر ایک ویران مرغی خانے میں لے گئے۔ یہاں ایک جوان لڑکی کو زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ کہیں...... پولیس کی وردیوں میں یہ وہی شیطان صفت لوگ تو نہیں تھے؟ اس نے دھیان سے موٹے بھدے شخص کو دیکھا جس نے سب انسپکٹر کی وردی پہن رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں اس شخص کا لب ولہجہ اور طور اطوار شانی کو پہلے سے شبے میں مبتلا کر رہے تھے۔ اب نئے خیال کے تحت اس نے مزید غور کیا تو اس کے دل نے گواہی دی کہ اس کا قیاس درست ہے۔

''بیٹھتی کیوں نہیں؟'' سب انسپکٹر کی وردی والا گرجا۔

شانی ساکت کھڑی رہی۔ ''بہتر ہے کہ تم ہمیں جانے دو۔ زخمی کی جان خطرے میں ہے۔''

''میں کہتا ہوں بیٹھ جا ادھر۔'' وہ دانت پیس کر پھنکارا۔

''مجھے نہیں بیٹھنا۔''

''تجھے نہیں بیٹھنا۔'' وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''اور اگر میں تجھے گود میں بٹھا کر دکھا دوں تو پھر؟''

شانی کی نگاہ بڑی دیر سے مشکوک سب انسپکٹر کے پسٹل پر تھی۔ یہ پسٹل اس نے بے پروائی سے اپنے قریب ہی گھاس پر رکھ چھوڑا تھا۔ پسٹل شانی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جعلی سب انسپکٹر کے نادر شاہی حکم کے مطابق ایک قدم آگے بڑھ کر نیچے بیٹھ جاتی تو باآسانی اپنا ہاتھ پسٹل تک پہنچا سکتی تھی۔ اس کے لئے بس تھوڑی سی پھرتی کی ضرورت تھی اور اس امر کی ضرورت تھی کہ اس کا ہاتھ سیدھا پسٹل پر ہی پڑے۔ اس کے بعد وہ دو چار قدم پیچھے ہٹ کر پسٹل بہروپیئے اہلکار پر تان لیتی۔ اسلحے کا استعمال شانی کے لئے انوکھی بات نہیں تھی۔ رنگ والی کی حویلی میں اس کے اباجی اکثر اسے رائفل تھامنا، لوڈ کرنا اور چلانا سکھاتے تھے۔ اس نے صرف ایک دو سیکنڈ کے اندر اس سارے معاملے کو اور اس کی ٹائمنگ کو بھانپا۔ ایک دفعہ پسٹل اس کے ہاتھ میں آجاتا تو وہ اس بہروپیئے کو اپنا حکم ماننے پر مجبور کر سکتی تھی اور اگر وہ نہ مانتا یا اس پر جھپٹنے کی کوشش کرتا تو وہ اس کے پاؤں یا ٹانگ پر گولی بھی مار سکتی تھی لیکن اس سے زیادہ وہ شاید نہ کر سکتی۔ اپنے بدترین دشمن کی جان لینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ پسٹل تک پہنچنے کے لئے اپنے جسم کو حرکت دے ہی رہی تھی کہ اچانک بہروپیئے سب انسپکٹر کے عقب میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ وہ بجلی کی طرح تڑپا اور اپنا پسٹل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ ''کون ہے؟'' وہ عجیب پھٹے پھٹے لہجے میں بولا۔

اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور وہ شکاری جانور کی طرح دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس افراتفری میں شانی کی طرف اس کی پشت ہو گئی تھی۔ درحقیقت ان لمحوں میں وہ شانی کی طرف سے یکسر غافل تھا۔

شانی نے بھی تاریک پودوں میں آہٹ محسوس کی تھی۔ اس کے لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں تھا کہ یہ ڈولا ہے۔ رات کے اس پہر اس تاریک ویرانے میں یہاں اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر تیزی سے جھپٹی اور اس نے بہروپیئے سب انسپکٹر کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلائی۔ ''ڈولے.. ڈولے۔''

لیکن جھاڑیوں میں سے جو شخص نکل کر بہروپیئے پر جھپٹا وہ ڈولا ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے رائفل کا بٹ بڑے زور سے بہروپیئے کے منہ پر مارا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔

شانی نے تاریکی میں پسٹل ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ چلایا لیکن پتا نہیں وہ کہاں پھسل گیا تھا۔ اس نے دائیں طرف نشیب میں دیکھا۔ بہروپیا [illegible] اور حملہ آور ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ''اوئے کتے کا بچہ .... اوئے خنزیر .... وہ امارا دشمن ہے۔ ام تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

حملہ آور کی وحشی آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس ٹھٹھرتے ہوئے تاریک ویرانے میں اچانک دوپہر کا سورج چمکنے لگتا تو بھی شانی کو شاید اتنی حیرت نہ ہوتی۔ یہ اجمل خان کی آواز تھی اور وہ اجمل کو زخمی حالت میں چاچا ابراہیم کے گھر میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ یہاں کیونکر اور کیسے پہنچا؟ یہ بڑا اہم سوال تھا، مگر اس کا جواب ڈھونڈنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ بہروپیا، اجمل سے برسرِ پیکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ گلا پھاڑ کر چلا بھی رہا تھا۔ شانی نے بائیں طرف دیکھا اور اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ رمضان نامی وہ شخص جو شہاب کو ہتھکڑی لگا کر قریبی درختوں میں لے گیا تھا، آندھی کی رفتار سے اُڑا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کا انداز خطرناک تھا۔ شانی نے محسوس کیا کہ وہ اجمل خان پر عقب سے گولی چلا دے گا۔ درد کی ایک ناقابلِ برداشت لہر اس کے سینے میں پھیل گئی پھر اس کی آنکھوں نے ایک اور تعجب خیز منظر دیکھا۔ شاید آج کی رات ایسے ہی مناظر کے لئے وقف ہو گئی تھی۔ ایک طرف سے کوتاہ قد ڈولا بھاگتا ہوا آیا اور جمپ لگا کر رمضان کی رائفل سے چمٹ گیا۔ رمضان نے بدحواسی میں ٹرائیگر دبایا۔ دھماکوں کے ساتھ تین چار شعلے نکلے اور تاریکی میں گم ہو گئے۔ رمضان نے رائفل نہیں چھوڑی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈولے اور رائفل کے اوپر ہی اوندھے منہ گرا۔ شانی نے عقب سے اس کے بال پکڑ لئے اور کھینچ کر اسے پشت کے بل گرانے کی کوشش کرنے لگی۔

تب تیسرے سائے کی جھلک دکھائی دی۔ یہ وہ جعلی کانسٹیبل تھا جو جعلی سب انسپکٹر کو تخلیہ فراہم کرنے کے لئے لوڈر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ وہ دھاڑتا ہوا آ رہا تھا۔ ''جان سے مار دوں گا۔ خبردار..... خبردار۔'' پھر اس نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل سب انسپکٹر سے گتھم گتھا اجمل پر تان لی۔ وہ ایک دوسرے سے بُری طرح الجھے ہوئے تھے۔ کانسٹیبل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوراً گولی چلائے یا نہیں۔ اس کی چلائی ہوئی گولی اس کے ساتھی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اس کی یہ لمحاتی تاخیر اس کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اجمل نے نیچے لیٹے لیٹے، اپنے مدِمقابل کو اپنی ٹانگوں پر بڑی طاقت سے اچھالا۔ وہ توپ کے گولے کی طرح اپنے ساتھی سے ٹکرایا۔ دونوں ڈھلوان پر لڑھک گئے۔ لڑھکنے کے باوجود جعلی کانسٹیبل

نے اپنے ہاتھ سے رائفل نہیں نکلنے دی۔ اس نے پشت کے بل گرتے گرتے فائر کیا۔ اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی اجمل خود کو اوندھے منہ زمین پر گرا چکا تھا۔ نشانہ خطا گیا۔ اجمل نے جوابی فائر کیا۔ یہ کسی عام شخص کی چلائی ہوئی گولی نہیں تھی۔ یہ پروفیشنل نشانے باز تھا۔ گولی سیدھے مدِمقابل کے ماتھے پر لگی۔ وہ جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، جھٹکے سے پھر پشت کے بل گر گیا۔ شانی کا خیال تھا کہ اجمل خان دوسرا فائر ''سرغنہ'' پر کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ اس نے تین چار قدم بھاگ کر پھر جست لگائی اور اسے چھاپ لیا۔

شانی نے مڑ کر دیکھا۔ ڈولے اور لمبے تڑنگے شخص میں کشمکش بدستور جاری تھی۔ ڈولا مختصر الوجود ہونے کے باوجود مدِمقابل کی رائفل سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ رائفل کے ساتھ لٹک چکا تھا۔ لمبا تڑنگا شخص رائفل چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا لیکن ڈولے نے رائفل کی نال بدستور زمین کی طرف جھکا رکھی تھی اور رائفل بردار کی کوئی پیش چلنے نہیں دے رہا تھا۔

رائفل بردار گالیاں بکنے کے ساتھ ساتھ ڈولے کو ٹانگیں رسید کر رہا تھا...... ڈولے کو ڈرانے کے لئے اس نے دو تین فائر بھی کیے تھے مگر یہ سب لاحاصل تھا۔ کم از کم ابھی تک لاحاصل تھا۔ اجمل خان اور جعلی سب انسپکٹر کو گتھم گتھا چھوڑ کر شانی ڈولے کے مدِمقابل کی طرف لپکی۔ ایک نکیلا پتھر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ دل کڑا کر کے اس نے اس شخص کی گدی سے ذرا اوپر چند زوردار ضربیں لگائیں۔ کھوپڑی کے پچھلے حصے پر لگنے والی آخری ضرب خاصی شدید تھی۔ وہ شخص لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ یہ دو طرفہ لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اسے کمزور پڑتا دیکھ کر ڈولے نے دو تین شدید جھٹکے دیئے اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکال لی۔ رائفل نکلی تو وہ شانی کی طرف پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ شانی کو دبوچتا شانی نے پتھر کی ایک اور چوٹ اس کے چوڑے جبڑے پر لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر نشیب میں لڑھک گیا۔ آٹھ دس میٹر نیچے جا کر وہ اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے رکا پھر لنگڑا کر بھاگتا ہوا تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔ رائفل ڈولے کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ گولی چلانے جیسا بڑا فیصلہ فوری طور پر نہیں کر سکا۔

وہ دونوں واپس مڑے تو اجمل خان موٹی توند والے شخص پر قابو پا چکا تھا۔ وہ اس کی چھاتی پر چڑھا بیٹھا تھا اور گھونسے مار مار کر اسے نڈھال کر چکا تھا۔ پھر وہ اسے پرانے کپڑے کی طرح گھسیٹ کر اس چٹان کے پاس لے آیا جہاں اس نے سب انسپکٹر کے روپ میں شانی

سے ''تفتیش'' کا آغاز کیا تھا۔ یہاں ایک طرف پڑی ہوئی ٹارچ ابھی تک روشن تھی

''وہ تیرا الیاس گیا شانی بھائی؟'' اجمل خان نے رائفل سنبھالتے ہوئے کہا

''وہ بھاگ گیا ہے۔''

''خو، مار دینا تھا اس حرام زادے کو۔'' اجمل پھنکارا۔

ڈولے نے جعلی اہلکاروں کی بکھری ہوئی ٹوپیاں اکٹھی کر لی تھیں اور وہ پسٹل بھی ڈھونڈ لیا تھا جو سرغنہ کے ہاتھوں سے گرا تھا۔

ڈولے نے ٹارچ کی روشنی اس شخص کے چہرے پر ڈالی جس کے ماتھے پر دائیں طرف پگھلے ہوئے سیسے کا سوراخ تھا۔ سیاہی مائل خون اس کے چہرے پر پھیل چکا تھا اور سیاہ مونچھوں کے نیچے سے دانت دکھائی دے رہے تھے۔ رائفل اس کے پہلو میں پڑی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''اجمل! مجھے لگتا ہے، یہ وہی نوسرباز ہیں۔''

''آپ کن کا بات کر رہا ہے جی؟''

''نور عباسی نے جعلی پولیس والوں کے بارے میں بتایا تھا نا، جنہوں نے کچھ لوگوں کو یرغمال بنایا اور ایک لڑکی سے بدسلوکی بھی کی۔''

اجمل خان کے چہرے پر حیرت آمیز تاثرات اُبھرے۔ اس نے گردن گھما کر ذرا غور سے سرغنہ کی طرف دیکھا۔ پھر تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔ ''شاید آپ ٹھیک پرما (فرما) رہا ہے۔''

وہ عقاب کی طرح سرغنہ پر جھپٹا اور رائفل کی نال اس کی زخمی گردن پر رکھ دی۔

''اوئے! کون ہو تم!...... بتاؤ ام کو، کون ہو؟''

تب رائفل ایک جانب رکھ کر وہ ایک بار پھر طوفانی رفتار سے سرغنہ پر پل پڑا اس مرتبہ اجمل نے اسے بڑی بے دردی سے مارا۔ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا۔ اچانک اجمل نے قریب رکھی رائفل پھر اٹھا لی۔ اس نے رائفل سرغنہ کی طرف اٹھائی اور پھنکارا۔

''اوئے کاپر کے ناجائز بچے! ام کو بتا، تم پولیس والا ہے کہ ڈاکو ہے......؟''

سرغنہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اجمل نے اپنا سوال دہرایا۔ مخاطب نے جواب نہیں دیا تو اجمل نے بے دریغ فائر کر دیا۔ بیرل سے نکلنے والا شعلہ فربہ اندام سرغنہ کی ٹانگ میں گھس گیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلایا۔ اجمل نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ ''بتا حرام زادے! کون ہے تُو...... تیرا اور کتنا ساتھی ہے یہاں؟''

سرغنہ پھر خاموش رہا۔ اس مرتبہ بھی اجمل خان نے اپنا سوال دہرایا اور جواب نہ ملنے پر اس کی دوسری پنڈلی میں گولی اتار دی۔ دوسری گولی کھا کر سرغنہ تڑپنے لگا۔ اجمل اسی لہجے میں بولا ”بتا...... نہیں تو تیسری گولی آرہا ہے۔“

اب سرغنہ کا پندار ٹوٹ گیا اور برداشت جواب دے گئی۔ وہ ڈکرایا۔ ”میں بتاتا ہوں ... میں بتاتا ہوں۔ اس کو پیچھے ہٹاؤ۔“ اس کا اشارہ خان کی رائفل کی طرف تھا۔

خان نے رائفل کا رخ بدستور اس کے سینے کی طرف رکھا اور خطرناک لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

جواب میں سرغنہ نے کراہتے ہوئے اور واویلا کرتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے شانی اور اجمل کے خیال کی سو فیصد تصدیق ہوگئی...... یہ فردوس نامی شخص پولیس والا نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بھی وردیوں میں چھپے جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان سب کا تعلق راولپنڈی کے علاقے سے تھا۔ ان کا ایک ساتھی اور تھا جو گردے کے شدید درد کے سبب دو دن پہلے شکار گاہ سے واپس چلا گیا تھا۔ فردوس نامی اس شخص نے اعتراف کیا کہ چند دن پہلے گورے کے بنگلے سے چھ سات میل کے فاصلے پر ایک جوان لڑکی سے زیادتی کرنے والے وہ اور اس کے دونوں ساتھی ہی تھے۔ اس بدنصیب لڑکی کے کانوں سے اُتاری ہوئی سونے کی ایک بالی بھی سرغنہ کی جیب سے برآمد ہوئی۔ دوسری بالی درد گردہ کا شکار ہونے والے شخص کے پاس تھی۔ سرغنہ کی درد سے کراہتی ہوئی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اور اس کے ساتھی اس سے پہلے راہزنی اور ڈکیتی کی کوئی دو درجن وارداتیں کر چکے ہیں۔ اس دوران میں کم و بیش چار خواتین ان کی زیادتی کا شکار بھی ہوئی ہیں۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد اجمل خان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس نے سرغنہ کی مکمل جامہ تلاشی لی اور سب کچھ اس کی جیبوں سے برآمد کرلیا۔ وہ اب منت سماجت پر اُتر آیا تھا۔ کبھی شانی اور کبھی اجمل سے جاں بخشی کی درخواست کر رہا تھا۔ شانی اس کی طرف سے رخ پھیر کر لوڈر کی طرف آگئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اجمل اس سفاک شخص کے ساتھ جو چاہے سلوک کرسکتا ہے۔

اجمل اور سرغنہ کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیر کر شانی اور ڈولے تک پہنچ رہی تھیں۔

اجمل نے اسے اٹھ کر بھاگ جانے کو کہا۔ وہ گھگھیانے لگا۔ ”نہیں...... نہیں۔ تم مجھے گولی مار دوگے۔“

اجمل کے دو تین بار کہنے کے باوجود جب وہ اٹھ کر بھاگا نہیں تو اجمل دہاڑا۔ ”تو تم کیا

سمجھتا ہے حرامی کی اولاد! تم بھاگے گا نہیں تو ام تم کو چھوڑ دے گا۔“ اجمل کی آواز میں کرب کا سمندر تھا۔

سرغنہ شاید اجمل کے پاؤں سے لپٹ گیا تھا۔ وہ جاں بخشی کی التجائیں کر رہا تھا... شاید اسی طرح کی التجائیں وہ عورتیں بھی کرتی رہی ہوں جو اس کی راہزنی اور زیادتی کا شکار ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد زوردار دھماکہ ہوا اور سرغنہ کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

☆======☆======☆

اجمل گھوڑے پر سوار یہاں پہنچا تھا۔ درحقیقت یہی وہ علیحدہ گھڑ سوار تھا جو باقی ٹکڑی سے علیحدہ آرہا تھا اور جس کی نشاندہی ڈولے نے اپنے تیز کانوں کے ذریعے کی تھی۔ اجمل کا یہاں پہنچنا بڑے اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ درحقیقت اجمل روکیٹ بستی سے ہی شانی اور ڈولے کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ زخمی ہونے کے سبب شانی اجمل کو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی لیکن وہ پیچھے رہ جانے والا شخص نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں ہمہ وقت رستم اور شانی کا تعاقب کرتی تھیں اور وہ ان کی حفاظت کے لئے ان کا سایہ بنا رہتا تھا۔ آج رات بھی اس نے شانی اور ڈولے کی نظر میں آئے بغیر دس پندرہ میل کا سفر کیا تھا اور حیرت انگیز طور پر اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ ”تم تو زخمی تھے اجمل؟“

”مرتو نہیں گیا تھا۔ امارے اندر تھوڑا سا جان بھی باقی ہوتا تو ام آپ کے پیچھے نہ آتا۔ ام کو بہت بہت خوشی ہے کہ امارا آپ کے پیچھے آنا کسی کام آگیا ہے۔“

”ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔“ ڈولے نے کہا۔ ”دھماکوں کی آواز پہاڑوں میں دور تک گونجتی ہے۔“

اجمل اور ڈولا زخمی شہاب کو سہارا دے کر لوڈر تک لائے۔ جعلی کانسٹیبل کی جیب سے برآمد ہونے والی چابی سے شہاب کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ وہ مارا ماری کی وجہ سے ستم زدہ نظر آتا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اب وہ ڈالہ یعنی لوڈر ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں ہے۔

شانی کو اپنی چھینی ہوئی اشیاء واپس مل گئی تھیں۔ سب سے پہلے اس نے رستم کی دی ہوئی انگوٹھی اپنی انگلی میں واپس پہنی۔ اسے لگا جیسے وہ کچھ دیر کے لئے ادھوری ہوگئی تھی اب پھر مکمل ہوگئی ہے۔

اجمل، ڈولے اور شانی نے موقع پر سے اپنی موجودگی کی ساری نشانیاں سمیٹ لیں۔ مرنے والے دونوں افراد میں سے ایک کی رائفل اور گولیوں والا بیلٹ اٹھا کر لوڈر میں رکھ لی

گئی۔ ان پہاڑوں میں آوارہ گھومنے والے ان جانور نما انسانوں کی لاشیں کھلے آسمان تلے بے گور وکفن پڑی تھیں۔ ہر دم گہرے ہوتے ہوئے بادلوں کے مرغولے انہیں ڈھانپتے چلے جارہے تھے۔ کیا پتا تھا کہ ان انسان نما جانوروں کی لاشوں کو آج رات جنگلی جانوروں سے ہی واسطہ پڑ جاتا۔ ان خطرناک راہزنوں کے گھوڑے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ غالباً شدید دھماکوں کے سبب وہ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ اجمل کا گھوڑا چونکہ درخت سے بندھا ہوا تھا لہٰذا اپنی جگہ موجود تھا۔

اجمل نے اپنا گھوڑا لوڈر کے عقب میں باندھ دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گدیلے پر لیٹا ہوا انسپکٹر حفیظ اس ساری ہنگامہ آرائی کے دوران میں بالکل ساکت پڑا رہا تھا۔ اس کی حالت بدستور نازک تھی۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ جتنی جلدی کسی ہسپتال تک پہنچ جائے اس کے لئے اتنا ہی بہتر ہے۔

اجمل کی ڈرائیونگ شہاب سے بہتر تھی۔ ان کا سفر نسبتاً تیزی سے طے ہونے لگا۔ کچھ آگے جاکر بادل صاف ہوگئے۔ ایسے بلند پہاڑوں پر اَبر ایسے ہی تیز رفتاری سے آتا جاتا رہتا ہے۔ اب جنوب مشرق کی طرف فاصلے پر مری اور جھیکا گلی وغیرہ کی روشنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ پختہ سڑک زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ بلند دیوداروں اور چناروں کے درمیان گھری ہوئی ایک تنگ پختہ سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ سڑک پختہ ہونے کے باوجود ٹوٹی پھوٹی تھی۔ دور دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر طے شدہ پروگرام کے مطابق شانی نے اجمل سے کہا کہ وہ اب گھوڑے کو لوڈر کے عقب سے کھول لے اور واپس چلا جائے۔ اجمل کچھ دیر تک متذبذب نظر آتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''اب پریشان ہونے کی بات نہیں ہے اجمل۔ یہاں سے آگے شہاب آسانی سے ڈرائیو کرلے گا۔''

''لیکن شانی بہن......''

''اجمل! میں نے بتایا ہے ناں، میری طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں پردے میں رہوں گی۔ میرا دیہاتی لباس تم دیکھ ہی رہے ہو۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو ہسپتال تک پہنچاتے ہی ہم تینوں واپس آجائیں۔''

''امارا تو مشورہ ہے جی کہ آپ اس کی پاکٹ میں ایک پرچی ڈال دیں۔ اس پر اس کا سارا کوئف موائف لکھ دیں۔ ہسپتال والوں کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ یہ پولیس کا بندہ ہے۔

اس کا علاج ملاج اچھی طرح ہونا چاہیے۔''

''چلو دیکھتے ہیں ہمیں کیا کرنا ہے۔ تم بس جلدی سے واپس نکل جاؤ۔''

''اور خان بھائی! یاد رہے کہ راستہ بدل کر جانا ہے۔'' ڈولے نے یاددہانی کرائی۔

''ایسا ہی ہوگا چھوٹو۔'' اجمل نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد اجمل کا گھوڑا اور شہاب کا لوڈر علیحدہ علیحدہ سمت میں روانہ ہورہے تھے۔

دو بجے تھے جب لوڈر جھیکا گلی سے ہوتا ہوا مری پہنچا۔ رات کے اس پہر جگمگاتی ہوئی کوہ مری سنسان نظر آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے مکینوں کی طرح وہ بھی سکون کی نیند سو رہی ہے۔ ہر دم بارونق نظر آنے والی مال روڈ بھی یکسر سنسان پڑی تھی۔ جی پی او کے سامنے سے ہوتے ہوئے وہ تحصیل ہسپتال پہنچ گئے۔ راستے میں ان تینوں نے کافی سوچا تھا تاہم شانی کو اجمل کی یہ تجویز مناسب نہیں لگی تھی کہ زخمی حفیظ کی جیب میں پرچی رکھ دی جائے یا زبانی کسی کو بتا دیا جائے کہ وہ پولیس انسپکٹر ہے (تاکہ اس کا بہتر علاج ہوسکے) ایسا کرنے میں کئی طرح کے اندیشے تھے۔ سب سے بڑا اندیشہ تو یہی تھا کہ بہت سی دوسری جگہوں کی طرح ڈپٹی ریاض کے لوگ یہاں بھی موجود ہوں گے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے سراغ کو بھی نظر انداز نہیں کررہے ہوں گے۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ حاجی حیات کا قریبی ساتھی یہاں ہسپتال میں ایک دیہاتی کے طور پر موجود ہے تو وہ اس کی پوری تحقیق کریں گے۔ اگر ڈپٹی ریاض کے لوگ یہاں نہ بھی ہوتے تو بھی عام پولیس چونک سکتی تھی کہ انسپکٹر حفیظ اپنی ڈیوٹی کی جگہ سے اتنی دور کیوں پایا گیا ہے اور کیسے زخمی ہوا ہے۔ دوسری طرف حفیظ کو فوری طبی امداد کی ضرورت بھی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ شانی حفیظ کی شناخت بتائے بغیر اس کا ایمرجنسی علاج شروع کراتی اور پھر کسی طرح حاجی حیات یا اس کے کسی قریبی ماتحت تک بذریعہ فون یہ اطلاع پہنچاتی کہ حفیظ ایک واردات کا شکار ہوکر مری کے ہسپتال میں ہے اور اسے فوری مدد کی ضرورت ہے۔

شہاب جو خود بھی زخمی تھا، اپنے زخم بھلا کر دوڑا ہوا گیا اور اسٹریچر لے آیا۔ کچھ ہی دیر بعد شانی اور شہاب ایمرجنسی وارڈ میں تھے۔ شانی نے ڈولے کو لوڈر کے اندر ہی رہنے دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں آنے سے بچا رہے۔

رات کے اس پہر کسی سینئر ڈاکٹر کا ملنا محال تھا۔ ڈیوٹی پر موجود دو ڈاکٹرز نے حفیظ کو ابتدائی طبی امداد دی۔ اس کا بلڈ پریشر مسلسل لو ہو رہا تھا۔ اسے ڈرپ میں انجکشن دیئے گئے اور آکسیجن بھی لگادی گئی۔ شانی نے حفیظ کا نام حفیظ ہی لکھوایا تاہم بتایا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔ وہ

لوگ اُچے گراں سے آئے ہیں۔ چند دن پہلے حفیظ کے باغ میں نامعلوم چور گھس آئے اور وہ ان کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوا ہے۔

حفیظ کے سر کے ایکسرے کرائے گئے۔ ایک دو بلڈ ٹیسٹ بھی ہوئے۔ زخم کی مرہم پٹی ہوئی تاہم صاف نظر آتا تھا کہ یہ سب عارضی ٹریٹ منٹ ہے۔ اصل علاج تب شروع ہوگا جب سینئر ڈاکٹرز اور نیورو فزیشن وغیرہ پہنچیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تب حفیظ کو راولپنڈی یا اسلام آباد منتقل کرنے کا مشورہ دیا جاتا۔ بہرحال ہسپتال پہنچنے سے اتنا ہوا تھا کہ حفیظ کی دم بدم بگڑتی ہوئی حالت ایک جگہ پر رک گئی تھی۔

صبح تک حفیظ کچھ سنبھلا ہوا نظر آنے لگا تاہم وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ شانی نے دو تین بار اسے بڑبڑاتے ہوئے بھی سنا۔ پہلے اس نے اپنی ماں کو پکارا پھر شکیلہ کا نام لیا۔ یقیناً یہی اس کی نوبیاہتا تھی جو کسی نامعلوم بستی کے نامعلوم مقام پر موجود تھی اور ایک ایسی کھڑکی میں بیٹھ کر اسے خط لکھتی تھی جس میں چودھویں کا چاند اپنی کرنیں بکھیرتا تھا۔

رات کو سنسان پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے خطرناک راہزانوں فردوس وغیرہ سے جو مارا ماری ہوئی تھی اس میں شہاب کو بھی ایک دو زوردار چوٹیں لگی تھیں۔ حفیظ کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی تو شانی نے شہاب سے کہا کہ وہ بھی اپنی پرچی بنوائے اور پٹی وغیرہ کروالے۔ شانی کے مجبور کرنے پر شہاب پرچی بنوانے اور ڈریسنگ وغیرہ کروانے کے لئے چلا گیا۔ اسے گئے ہوئے بیس پچیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ حفیظ کی حالت پھر کچھ خراب نظر آنے لگی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں تشنج نمودار ہوا اور سانس کی روانی بھی متاثر ہوگئی۔ ہونٹ جو پہلے سرخی مائل نظر آنے لگے تھے پھر ہلکے نیلے ہوگئے۔ شانی بھاگی ہوئی گئی اور ڈیوٹی ڈاکٹر کو لے کر آئی۔

ڈاکٹر نے سب سے پہلے بلڈ پریشر چیک کیا۔ پھر شانی کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں بی بی! تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔'' پھر اس نے ایک پرچی پر لکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ انجکشن جلدی سے منگوالو۔''

شانی نے کانپتے ہاتھوں سے پرچی لی اور وارڈ سے باہر آگئی۔ اب دھوپ نکل آئی تھی۔ ہسپتال کے وسیع احاطے میں چہل پہل نظر آرہی تھی۔ ڈولا یقیناً لوڈر کے اندر ہی سویا ہوا تھا۔ شانی خود کو اوڑھنی میں چھپائے فارمیسی میں آئی۔ یہاں سے یہ انجکشن نہیں ملا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ باہر سے ملے گا شاید مال روڈ سے۔ مال روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پرچی تھامے پیدل ہی چل پڑی۔ چادر کے نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ اسے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ پہچانی جاسکتی ہے...... پھر بھی کہیں دل کی گہرائی میں یہ خیال

موجود تھا کہ اس نے روکیٹ کے ان بے آباد پہاڑوں میں سے یہاں آکر رسک لیا ہے۔ اسے زیادہ خطرہ ڈپٹی ریاض اور اس کے ہرکاروں کی طرف سے ہی تھا۔

وہ مال روڈ پر پہنچی۔ یہ گرمیوں کا آغاز تھا۔ مری کے سیزن کا آغاز ہو چکا تھا۔ بھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر جی پی او کے اردگرد چہل پہل نظر آرہی تھی۔ شانی نے بہت دنوں بعد کسی شہر کی گہما گہمی دیکھی تھی۔ اسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے ایک میڈیکل سٹور والے کو پرچی دکھائی۔ اس نے بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ ''بی بی! یہ ٹیکہ نہیں ہے لیکن اس جیسا دوسرا مل جاسی۔ تم کہاں سے آئی ہو؟''

''ہسپتال سے...... میرا بھائی داخل ہے۔'' وہ دیہاتی لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا ہے اسے؟''

''سر پر چوٹیں آئی ہیں۔''

''میں تمہیں دوسرا ٹیکہ دے دیتا ہوں۔ تم ڈاکٹر کو دکھالو اگر ڈاکٹر انکار کرے تو پھر مجھ کو واپس کر جانا۔''

''لیکن ڈاکٹر......''

''بی بی! مجھے یقین ہے یہ ٹیکہ تمہیں مری سے نہیں ملے گا۔ اگر ٹرائی کرنی ہے تو کر لو۔''

شانی نے مناسب سمجھا کہ یہی ٹیکہ لے لے۔ اس نے ادائیگی کر دی۔ ادائیگی کرنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ اس کی دائیں جانب کھڑا ایک شخص دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور گھنی مونچھیں تھیں۔ شانی اس پر مزید دھیان دیئے بغیر باہر نکل آئی۔ اس کے قدموں میں بے تاب تیزی تھی۔ وہ جلد از جلد حفیظ تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ دوڑنا شروع کر دیتی۔ حفیظ کے سوا اسے سب کچھ بھولا ہوا تھا۔

اچانک اس کی رگوں میں لہو جم سا گیا۔ اس نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی والا وہی شخص اس کے پیچھے آرہا ہے۔ شانی ایک دم بغلی گلی میں گھس گئی۔ یہاں دونوں طرف ریسٹورنٹ تھے اور پوریاں تلی جارہی تھیں۔ شانی کا بدترین اندیشہ درست ثابت ہوگیا۔ وہ شخص واقعی اس کے پیچھے تھا۔ شانی کو یہ اندیشہ تو تھا کہ اگر اسے مری میں ایک دو دن رکنا پڑا تو کہیں کوئی بدخواہ اسے پہچان نہ لے لیکن یہ توقع اسے ہرگز نہیں تھی کہ مری پہنچنے کے چھ سات گھنٹے بعد ہی ایک مشکوک شخص اس کے پیچھے لگ جائے گا۔

''کون ہے یہ...... کون ہے؟'' یہ سوال ایک شعلے کی طرح شانی کے ذہن میں چکرایا۔

کہیں یہ پیر قدرت اللہ کا کوئی خطرناک چیلہ تو نہیں؟ لاہور کی کوٹھی میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ برقی کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپک گیا۔ پیر قدرت اللہ کی چہیتی بیوی کی موت کا بدلہ لینے کے لئے اس کے ایک جنونی چیلے نے اس گھر میں گھس کر شانی پر حملہ کیا تھا۔ اگر ریس آڑے نہ آتی تو شاید وہ مخبوط الحواس اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جاتا۔ شانی کے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ شاید یہاں آ کر اس نے سنگین غلطی کی ہے۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ تو کیا پھر وہ حفیظ کو وہیں چھوٹے سائیں کی جاہلیت کے ہاتھوں مر جانے دیتی؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ پورا وزن رکھتا تھا۔

ہسپتال میں داخل ہوتے ہی شانی نے ارد گرد دیکھا۔ تعاقب کرنے والا اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اسے تھوڑا سا سکون محسوس ہوا۔ اس نے انجکشن متعلقہ ڈاکٹر تک پہنچایا جو ڈاکٹر نے لے لیا۔ انجکشن لگنے کے بعد حفیظ کی حالت بتدریج سنبھل گئی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹرز کا راؤنڈ ہوا۔ حفیظ کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ ٹیسٹ کی رپورٹس وغیرہ دیکھی گئیں۔ شانی سے مختلف سوالات پوچھے گئے۔ بعد ازاں شانی کو بتایا گیا کہ ابھی اس کے مریض کو یہیں پر رکھا گیا ہے۔ آج شام تک کچھ مزید رپورٹیں آ جائیں گی تب بتایا جائے گا کہ اسے راولپنڈی لے جانا ہے یا یہیں پر علاج ہو جائے گا۔

شانی کے پاس حاجی حیات کے دست راست سب انسپکٹر اختر کا فون نمبر موجود تھا۔ اس نے ہسپتال کے پی سی او سے متعدد کوششیں کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے پہلوان کے موبائل نمبر پر بھی کئی بار ٹرائی کی۔ دو تین بار شہاب بھی کوشش کر کے آیا مگر سب کچھ لاحاصل رہا۔ میڈیکل سٹور پر مشکوک شخص کو دیکھنے کے بعد شانی چاہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد ڈولے اور شہاب کے ساتھ یہاں سے واپس چلی جائے۔ حفیظ کسی حد تک محفوظ ہاتھوں میں تھا۔

آج سارا دن رہ رہ کر اسے محسوس ہوتا رہا تھا کہ اس نے داڑھی مونچھوں والے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ شام کے وقت شہاب کے سرہانے بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ منحوس صورت کس کی ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یہ ناصر تھا (ڈاکٹر ناصر نہیں، چوہدری بشیر کی رکھیل شہ نمہ کا بے غیرت خاوند ناصر اعجاز) شانی نے اسے آخری بار مرید کے میں ہی دیکھا تھا۔ چوہدری بشیر اس کے گھر میں مہمان ٹھہرا ہوا تھا اور یہ شخص چوہدری بشیر کو اپنی بیوی کے ساتھ خلوت فراہم کرنے کے لئے کسی بہانے سے لاہور چلا جاتا تھا اور پھر اس کے گھر پر تاؤ حشام کے مشتعل کارندوں نے حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں ناصر کی ٹانگ پر بھی گولی لگی تھی اور لڑائی میں اس کا ایک کان تقریباً کٹ گیا تھا۔ شانی اس لڑائی سے بچ کر ڈولے کے ہمراہ بھاگ نکلی تھی اور آج ایک عرصے بعد یہ منحوس شخص شانی کو پھر یہاں مری کے میڈیکل سٹور میں نظر آیا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ اس شخص نے میڈیکل سٹور پر شانی کی آواز سنی اور اس کے حوالے سے شبے میں مبتلا ہوا۔ حوصلہ افزا بات صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ جب شانی ہسپتال میں داخل ہوئی تو وہ عقب میں دکھائی نہیں دیا تھا مگر غور کیا جاتا تو یہ بات کچھ ایسی حوصلہ افزا بھی نہیں تھی۔ ناصر نے جان لیا ہوگا کہ وہ اپنے کسی ایسے مریض کے لئے دوا لے کر جا رہی ہے جو ہسپتال میں داخل ہے۔ مری کا بڑا ہسپتال یہی تھا لیکن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ یہاں کسی کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔

ایک بات سوچ کر شانی کا دماغ سن ہو رہا تھا، اگر وہ واقعی ناصر کی نگاہوں میں آ چکی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ چوہدری بشیر کی نگاہوں میں آ چکی ہے اور موجودہ حالات میں چوہدری بشیر اس کے لئے جتنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، وہی جانتی تھی۔

شام کے فوراً بعد شانی نے شہاب سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ تم یہ پیسے لے جاؤ اور سی بینک کی طرف سے لوڈر میں ڈیزل ڈلوا لاؤ۔“

”جیسے آپ کی مرضی جی۔ میں بس گیا تے آیا۔ آپ کے لئے کھانا شانا بھی لے آتا ہوں۔ آپ نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا لیکن یہ پیسے میں نے آپ سے بالکل نہیں لینے ہیں چھوٹی بی بی۔“ اس نے پانچ سو کا نوٹ واپس میز پر رکھ دیا۔

”نہیں شہاب! میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

شانی نے بہت اصرار کیا لیکن شہاب نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر شانی نے محسوس کیا کہ وہ رو پڑے گا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے...... لیکن میری دوسری بات تمہیں ماننا پڑے گی۔ تم مجھے اور ڈولے کو آخر تک لے کر نہیں جاؤ گے۔ بھورے وال سے سات آٹھ میل پہلے ہی اُتار دو گے۔ اس سے آگے ہم پیدل جائیں گے۔ تم لوڈر وہیں چھوڑ کر پیدل واپس مری آ جاؤ گے یا جہاں بھی جانا چاہو چلے جاؤ گے۔ ہم وہاں بھورے وال میں متوالی ابرار کو بے ہوش چھوڑ آئے تھے۔ ایسی حالت میں تمہارا واپس بھورے وال جانا مناسب نہیں۔“

اس بات پر بھی شہاب اور شانی میں تکرار ہوئی۔ شہاب چھوٹی بی بی کو راستے میں چھوڑ کر واپس آنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال شانی کی یہ بات تو اسے ماننا ہی پڑی۔ شہاب، ڈولے کے ساتھ لوڈر میں ڈیزل بھروانے اور کھانا لینے چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد

ہی اچانک ہسپتال کی بجلی چلی گئی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ لوگ موم بتیاں اور ماچس وغیرہ ڈھونڈنے لگے۔

شانی بھی نیچے جھک کر سائیڈ ٹیبل میں ہاتھ چلانے لگی۔ یہاں اس نے موم بتی دیکھی تھی۔ بیڈ کی دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز آئی۔ ''مجھے ماچس مل گئی ہے۔ کسی کے پاس موم بتی ہے؟''

شانی کا ہاتھ موم بتی سے چھوا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں خالہ جی! موم بتی میرے پاس ہے۔''

اس سے پہلے کہ موم بتی اور ماچس کا ملاپ ہوتا، ایک اور ملاپ ہوا۔ یہ ملاپ شانی کے ہونٹوں اور ایک آہنی ہاتھ کا تھا۔ یہ ہاتھ ایک جھٹکے سے شانی کے منہ پر آیا تھا۔ دوسرے ہاتھ نے شانی کی پتلی کمر کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ شانی کو بعینہٖ یہی محسوس ہوا کہ اس کی کمر کسی بازو میں نہیں کسی شکنجے میں جکڑی گئی ہے۔ شانی پر حملہ کرنے والے نے کسی گڑیا ہی کی طرح اسے اٹھالیا۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں فضا میں بلند ہیں اور اس کی ایک چپل نکل کر گر گئی ہے۔

اس نے چلانے کی اور خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن دونوں ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ حملہ آور آٹھ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ تاریکی میں شانی کا دایاں ہاتھ ایک بیڈ پر پڑ گیا۔ شانی نے پوری قوت سے بیڈ کے سرہانے والا لوہا تھام لیا۔ بیڈ پر کوئی مریض نہیں تھا۔ شانی نے اس کے سرہانے والے فریم کو اتنی طاقت سے پکڑا تھا کہ بیڈ ساتھ ساتھ گھسٹنے لگا۔ عجیب شور پیدا ہوا۔ گہری تاریکی کے باوجود اردگرد موجود مریضوں اور ان کے لواحقین کو اندازہ ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہورہی ہے۔

کسی شخص نے چلا کر کہا۔ ''کون ہے...... کیا ہورہا ہے؟''

پھر کسی نے ٹارچ روشن کی لیکن اس سے پہلے ہی بیڈ کا سرا شانی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک دم سرا چھوٹنے کے سبب حملہ آور اور شانی ایک برآمدے میں گرے۔ شانی کے ہونٹوں سے آہنی ہاتھ ہٹ گیا۔ وہ چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے تڑپ کر خود کو حملہ آور کی گرفت سے آزاد کرلیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ اٹھ کر بھاگی۔ تاریکی میں ایک نہیں دو سائے اس کے پیچھے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کے پاس کوئی خطرناک ہتھیار بھی ہو۔ شانی جلدی سے ایک کوریڈور میں مڑ گئی۔ وہ ایک ایکسرے روم میں گھسی۔ کسی اسٹریچر سے ٹکرائی اور پھر ایکسرے روم کے دوسرے دروازے سے نکل کر ایک برآمدے میں آگئی۔

ابھی تک جنریٹر وغیرہ نہیں چلے تھے۔ ہسپتال مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شانی صاف

محسوس کررہی تھی کہ حملہ آور اس کے پیچھے ہیں۔ ان کی تعداد شاید دو سے بھی زیادہ تھی۔ ان کی خطرناک آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ''ادھر گئی ہے...... نہیں نہیں ادھر گئی ہے۔ وہ دیکھو...... وہ ہے سامنے...... پکڑو سالی کو۔'' شانی کسی سٹول سے ٹکراتی ہوئی پھونے سے گراسی لان میں گری۔ یہ ہسپتال کا ایک بغلی گیٹ تھا۔ سامنے ہی پنجرے نے ایک بڑے ڈرم کے اردگرد بلیاں منڈلا رہی تھیں۔ وہ بلیوں کے درمیان سے گزر کر چھوٹے گیٹ سے نکلتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ اسے اپنے رخ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ ہسپتال کی کس سمت میں ہے۔ اس نے دیکھا حملہ آور سائے برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے گراسی لان میں آگئے تھے۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ وہ باہر نکلی ہے یا ہسپتال کے اندر ہی ہے۔ یقیناً ان کے لئے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ وہ گیٹ سے نکل گئی ہے۔

شانی کو ایک سوزوکی ''ہائی روف'' نظر آئی۔ وہ دھیمی رفتار سے گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ شانی نے اسے ہاتھ دے کر رکنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح رکتی، شانی نے اس کی سائیڈ کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا اور سوار ہوگئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''پلیز مجھے لے چلیں...... پلیز گاڑی آگے بڑھائیں۔'' شانی نے التجا کی۔

ادھیڑ عمر شخص نے سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ شانی کانپ رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سائے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے شانی کو سوزوکی ڈبے میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ شانی نے وحشت زدہ آواز میں کہا۔ ''پلیز جلدی کریں، وہ آرہے ہیں...... وہ آرہے ہیں۔''

گاڑی کی رفتار تیز نہیں ہوئی۔ وہ بس بائیسکل کی رفتار سے جارہی تھی۔ شانی پھر چلائی۔

''آپ کیا کررہے ہیں؟ گاڑی تیز کریں۔ وہ مجھے پکڑ لیں گے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔''

گاڑی والے نے مڑ کر عقب میں دیکھا مگر وہ رفتار بڑھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ شاید وہ ایسا چاہ ہی نہیں رہا تھا۔ پیچھا کرنے والے قریب آتے جارہے تھے۔ ''یہ کیا کررہے ہو تم؟'' شانی پھر چیخ کر ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔

''وہی کررہا ہوں جو کرسکتا ہوں۔'' گاڑی والے نے گھمبیر آواز میں کہا اور بریک لگا دی۔

گاڑی رک گئی۔ پیچھے آنے والے تند بگولوں کی طرح اندر گھس آئے۔ ایک نے شانی کو

اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ دوسرے نے گاڑی کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ گاڑی والا اب بھی سکون سے بیٹھا تھا۔ اس نے مسکرا کر شانی کی طرف دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''ڈبل کرو استاد جی۔'' حملہ آوروں میں سے ایک نے ڈرائیور سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کو آناً فاناً تیس چالیس کی سپیڈ پر پہنچا دیا۔ شانی پر انکشاف ہوا کہ اس کی بدقسمتی اسے غلط گاڑی میں لے آئی ہے۔ وہ بھاگ کر ایک ایسے شخص کے پاس پہنچی ہے جس کے ساتھی اسے بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اب وہ شخص بڑی سفاکی سے ہنس رہا تھا۔

اس نے خود کو جکڑنے والے کے چہرے پر کئی طمانچے مارے لیکن پھر دو تین مزید ہاتھوں نے اسے دبا لیا، وہ بے بس ہو گئی۔ سڑک کے دونوں طرف مخروطی چھتوں والے گھر روشن تھے۔ لائٹ صرف ہسپتال کی گئی تھی یا شاید پروگرام کے تحت بند کی گئی تھی۔

''انسانوں کی طرح بیٹھی رہو چھوٹی چوہدرانی! ورنہ ہم بدتمیزی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' ایک زہریلی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے پیچھے آنے والوں میں سے ایک ناصر اعجاز تھا۔ گھنی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کے باوجود وہ اسے پہچان سکتی تھی۔ شانی نے دیکھا اس کے ہاتھ میں رومال میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ یہ پستول تھا۔ ہوا سے اس کے بال منتشر ہوئے تو شانی نے دیکھا، بالوں کے نیچے اس کے کان کی جگہ ایک چھوٹا سا ٹنڈ تھا۔

☆======☆======☆

شانی کو ملکہ کہسار مری سے راولپنڈی لے جایا گیا۔ یہ کام صبح کا اجالا پھیلنے سے بہت پہلے پہلے مکمل ہو گیا۔ شانی کو ایک نامعلوم رہائشی آبادی کی کوٹھی میں پہنچایا گیا۔ لان اور پورچ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کینال ڈیڑھ کینال کی کوٹھی ہے۔ یہاں شانی کو ایک رائفل بردار گارڈ اور ایک ڈاگ کا نیچ بھی نظر آیا۔ گاڑی اندرونی دروازے کے عین سامنے روکی گئی اور تین چار افراد نے شانی کو دبوچ کر تیزی سے اندر پہنچا دیا۔

کوٹھی کے وسط میں ایک کمرہ غالباً شانی کے لئے پہلے سے تیار کر دیا گیا تھا۔ یہاں ایک بیڈ اور سٹیل کی ایک کرسی کے سوا کوئی شے موجود نہیں تھی۔ کھڑکی اور روشن دانوں پر لوہے کی گرل تھی۔ شانی کو کمرے میں دھکیل کر لکڑی کا موٹا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ شانی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہاں رونے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنے والے لوگ ایسے نہیں تھے کہ کچا ہاتھ ڈالتے۔

وہ بیڈ پر بیٹھنے کی بجائے کھڑی رہی۔ اس نے بند دروازے سے ماتھا ٹکا اور سسکیوں سے رونے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے اور اتنی جلدی ہوا ہے۔ بے شک اس کے ذہن میں اندیشے موجود تھے اور یہ اندیشے زیادہ تر ڈپٹی ریاض کی طرف سے تھے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ ریاض سے بھی خطرناک شخص کے ہتھے چڑھ جائے گی اور وہ بھی اتنی سرعت کے ساتھ!

اسے وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو وقتاً فوقتاً اس سے کہی گئی تھیں اور جن کا لب لباب یہ تھا کہ تحصیل مری کے ان پہاڑوں سے باہر اس کے لئے خطرات ہی خطرات ہیں۔ یہ باتیں کہنے والے یقیناً اس کے بہی خواہ تھے۔ ان میں حاجی حیات تھا، پہلوان تھا، اجمل خان اور چاچا ابراہیم تھے۔ تو وہ کیوں ان کی باتوں کو رد کر کے یہاں چلی آئی؟ اس نے خود کو ملامت کی۔

لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے ایک قیمتی جان بچانے کے لئے ایسا کیا تھا۔ ایک ایسی جان جس کی سلامتی کے طفیل رستم کی تلاش کامیاب ہو سکتی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ حفیظ اب محفوظ ہاتھوں میں تھا۔

''یارب! میری مدد کر۔'' وہ دروازے سے لگی لگی سسک اٹھی۔

کمرے میں بلندی پر لگا ہوا وال کلاک اب دن سات بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ تاہم اس کمرے میں دن کی روشنی کی پہنچ نہیں تھی۔ وہ نڈھال سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی کھینچا تانی میں اس کی ایک آستین پھٹ گئی تھی اور چپل بھی کہیں نکل گئی تھی۔ جہاں جہاں اسے سختی سے پکڑا گیا تھا وہاں وہاں جلن تھی اور خراشیں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ ڈولے اور شہاب کے بارے میں سوچنے لگی۔ نہ جانے ان پر کیا بیتی تھی۔ ڈولے کے بارے میں تو کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے تاہم شہاب کی طرف سے شانی کو خدشہ محسوس ہو رہا تھا۔ پھر شانی کا دھیان منے کی طرف چلا گیا۔ وہ پرسوں سہ پہر اسے چاچا ابراہیم کے گھر میں سوتا چھوڑ کر آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے میں منے کے پاس واپس پہنچ جائے گی۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ شام کے بعد آٹھ بجے کے قریب جاگا ہو گا۔ اس نے شانی کو کمروں میں ڈھونڈا ہو گا پھر گریس اور بے جی نے اسے تسلی دی ہو گی۔ اس نے رات تو جیسے تیسے کاٹ لی ہو گی لیکن اب اس کی نگاہیں مسلسل گھر کے بیرونی دروازے پر لگی ہوں گی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں انتظار کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔

کمرے کے باہر سے مدھم آوازیں شانی کی سماعت میں پہنچ رہی تھیں۔ کہیں کہیں ...

موبائل فون پر بات کر رہا تھا۔ ”جی جی.... سب ٹھیک ہوگیا ہے جی۔ بڑی عزت سے لے کر آئے ہیں چوہدرانی صاحبہ کو۔ نہیں جی.... کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔“

وہ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا اور ہنکارا بھرتا ہوا پھر بولا۔ ”آپ کہاں پہنچے ہیں جی.... ٹھیک ہے جی.... بس ایک ڈیڑھ گھنٹے کا رستہ ہوگا۔“

آخر میں اس نے کہا۔ ”او کے.... او کے، آپ بالکل بے فکر رہیں۔“ اور فون بند کر دیا۔

شانی کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ ناصر یقیناً چوہدری بشیر سے بات کر رہا تھا۔ غالباً چوہدری بشیر کو اس بات کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی کہ شانی یہاں مری کے ہسپتال میں موجود ہے۔ اب وہ ایک آتش فشاں کی طرح ابلتا ہوا اور تیز رفتار لاوے کی طرح بہتا ہوا لاہور سے راولپنڈی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کا تصور کر کے شانی سرتاپا کانپ گئی۔ چند منٹ بعد ناصر اعجاز کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ اب پھر وہ بشیر سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس مرتبہ کسی جھگڑے کی بات تھی۔ ناصر نے کسی پٹواری اور قانون گو کو لعن طعن کی اور کہا کہ ان دونوں کی وجہ سے سارا کام خراب ہو رہا ہے۔ دو چار منٹ بعد یہ بات بھی اختتام پذیر ہوگئی۔

کچھ دیر بعد ایک شخص نے کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ایک ٹرے دروازے کے پاس ہی تپائی پر رکھ دی۔ ٹرے میں ناشتہ تھا۔ دروازہ فوراً ہی دوبارہ بند کر دیا گیا۔ مسلح گارڈ کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ شانی نے ناشتے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ اس نے چوہدری بشیر کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ سب سے پہلے مُنے کے بارے میں سوال کرے گا اور جاننا چاہے گا کہ مُنا کس کے پاس ہے اور کہاں ہے؟ پھر یقیناً اس نے یہ پوچھنا تھا کہ وہ لاہور سے واپس جوہر آباد جاتے جاتے رستم کے پاس وڈے ڈیرے پر کیسے پہنچ گئی اور کیوں؟

وہ ان سوالوں کے جواب اور جوابات سے پیدا ہونے والے سوالوں کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہوتا رہا۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں موجود تین چار افراد سے داد فریاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہونا تھا اب چوہدری بشیر کے آنے کے بعد ہی ہونا تھا۔

فاخر کے مرنے کے بعد شانی کو چوہدری بشیر ایک مختلف شخص نظر آیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ چوہدری بشیر چوہدراہٹ کا ایک ماڈرن اور سلجھا ہوا روپ ہے لیکن دھیرے دھیرے اور بتدریج چوہدری بشیر بھی وہی بن گیا جو چوہدری فاخر تھا۔ بلکہ آج تو اسے چوہدری فاخر سے

کہیں بڑھ کر چوہدری بشیر سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی، کیا کسی طرح وقت کی رفتار رک نہیں سکتی؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ وال کلاک اپنی ٹک ٹک ختم کر کے ساکت ہو جائے اور چوہدری بشیر بھی یہاں نہ پہنچ سکے؟ لیکن وقت کسی کی خواہش کے مطابق اپنی رفتار سست یا تیز نہیں کرتا! یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ وقت آ گیا جب کوٹھی کے گیٹ پر چوہدری بشیر کی پجارو کا ہارن سنائی دیا اور ارد گرد ہلچل نظر آنے لگی۔

قریباً دس منٹ بعد وہ چوہدری بشیر کو اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ سفید کلف لگی شلوار قمیص میں تھا۔ عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں شرربار نظر آ رہی تھیں۔ گھنی مونچھوں تلے اس نے اپنے سانولے ہونٹ بڑی مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر خوں خوار نظروں سے شانی کو گھورتا رہا پھر سانپ جیسی زہریلی پھنکار کے ساتھ بولا۔ ”اپنے یار کا دل خوش کر دیا یا نہیں؟“

”کک.... کیا مطلب؟“

”مطلب کا تمہیں بڑی اچھی طرح پتا ہے۔“ وہ کسی شکی مزاج شوہر کی طرح بہت خطرناک لہجے میں بولا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”یہ بات بس تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی، باقی ساری دنیا کی سمجھ میں آ رہی ہے۔“ وہ پھنکارا۔ ”پاکستان کا بچہ بچہ شاید جانتا ہے کہ تیری اس حرام زادے ڈکیت کے ساتھ یاری تھی۔ تُو اس کے بغیر تڑپتی تھی اور وہ تیرے بغیر تڑپتا تھا۔ اس کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے تیرا دل لمبی لمبی چھلانگیں مارتا تھا۔ ایسی ہی ایک لمبی چھال مار کر تُو نان سٹاپ لاہور سے وڈے ڈیرے پہنچ گئی.... پہنچ گئی یا نہیں؟“

شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”آپ کچھ نہیں جانتے۔“

”نہیں نہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ ”ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں کچھ باتیں نہیں جانتا.... جیسے میں یہ تو جانتا ہوں کہ تم اپنے یار کے ساتھ سونے کے لئے وڈے ڈیرے پر گئی تھیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ تم اس کے ساتھ کتنی بار سوئی ہو۔ جیسے میں یہ تو جانتا ہوں کہ اس کے پلید ہاتھوں نے بار بار تمہارے پنڈے کو چھوا ہوگا لیکن کہاں سے زیادہ چھوا ہے اور کہاں سے کم، یہ نہیں جانتا۔ جیسے میں یہ تو جانتا ہوں کہ “

”خدا کے لئے.... خدا کے لئے بشیر چپ ہو جاؤ تم۔“ وہ کراہی۔

”چپ ہو جاؤ تم۔“ بشیر نے دہرایا۔ ”یعنی جو تھوڑا بہت ادب لحاظ تھا اب وہ بھی گیا۔

میں آپ سے تم ہو گیا۔ ہوتا ہے ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے سر اوپر نیچے ہلایا اور جیب سے امپورٹڈ سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

وہ پہلے ہی نشے میں لگ رہا تھا اس نشے کو مزید گہرا کرنے کے لئے اس نے بیل دے کر وہسکی منگوا لی۔ وہسکی کے چند گھونٹ لینے کے بعد اس کی آنکھیں کچھ اور بھی خوں رنگ ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی سفاک بے باکی سے شانی کی نازک کلائی اپنے آہنی ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ لی اور پھنکارا۔ "دیکھو میں کچھ بھی بھولا نہیں ہوں، مجھے اک اک بات یاد ہے۔ تم ملتان میں نو دس گھنٹے تک رستم کے ساتھ تنہائی میں رہی تھیں اور پھر تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ ان نو دس گھنٹوں میں کچھ نہیں ہوا اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد تم کبھی رستم کی صورت نہیں دیکھو گی۔ بتاؤ تم نے کہا تھا یا نہیں؟"

شانی خاموشی سے آنسو پونچھتی رہی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اب بات نو دس گھنٹے کی نہیں، کئی دنوں کی ہے جو تم نے وڈے ڈیرے پر گزارے ہیں۔ اب اگر وہ حرامی مر بھی گیا ہے تو بھی تم کئی دن تک اس کے پاس موجود رہی ہو۔ اب میں کیسے مان لوں کہ تم نے پانی میں غوطے بھی لگائے ہوں اور بھیگے بغیر باہر بھی نکل آئی ہو۔ ایسا نہیں ہوا شانی بیگم اور نہ ہو سکتا ہے۔ اب تم جو بھی کہو گی جھوٹ کہو گی، لیکن پھر بھی میں اتنا ضرور جاننا چاہوں گا تمہاری زبان سے کہ تم گوجرانوالہ میں بریکیں لگانے کے بعد پوٹھوہار میں اور پھر سون میں کیسے پہنچیں اور وہاں تمہاری ضروری مصروفیات کیا رہیں اور ان مصروفیات کے بعد تم کئی ماہ تک کہاں غائب رہی ہو؟"

شانی حیران ہو رہی تھی وہ سب کچھ پوچھ رہا تھا لیکن مُنے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا۔ حالانکہ بقول اجمل خان چوہدری کو پختہ شک تھا کہ مُنا شانی کے پاس ہی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے بچے کی چوہدری بشیر کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اگر اس بچے کی کوئی اہمیت تھی تو صرف اتنی کہ وہ اس معصوم کے ذریعے شانی کو اپنے شکنجے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ خود ہی اس کے شکنجے میں آ گئی تھی لہٰذا مُنا غیر اہم ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دیوی

6

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

باراول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز۔لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔لاہور
قیمت ——— ۲۵۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

شانی جانتی تھی کہ چپ رہنے سے گزارہ نہیں ہوگا۔ اسے بپھرے ہوئے چوہدری کو کچھ نہ کچھ بتانا پڑے گا۔ اس نے تایا معصوم کو یرغمال بنائے جانے کا ذکر نکال کر بشیر کو قریباً سبھی کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ ڈپٹی ریاض اسے زبردستی جیپ میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہاں اس کی مدد سے ریاض نے رستم کو وڈے ڈیرے سے نکلنے پر مجبور کیا۔ پولیس کے کیمپ میں رستم سے بس اس کی ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہاں بھی ریاض کے ماتحت خیمے میں موجود تھے۔ بعدازاں وڈے ڈیرے کے مکینوں نے ڈیرے سے نکل کر پولیس پر حملہ کیا۔ اس لڑائی میں رستم سمیت زیادہ تر لوگ کام آگئے اور وہ خود پولیس اور خصوصاً ڈپٹی ریاض کے خوف سے مری کی ایک قریبی بستی میں روپوش ہوگئی۔ گریس بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

بشیر نے شانی سے بستی کا اتا پتا دریافت کیا۔ شانی نے کہا۔ ''میں نہیں بتا سکتی۔ میں نے کچھ لوگوں سے وعدہ کیا ہوا ہے۔''

''اور وعدے کی تم بہت زیادہ پابند ہو۔'' بشیر سخت کٹیلے لہجے میں بولا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ کچھ اور بپھر گیا۔ ''میں نے کہا تھا ناں، تم جو بکو گی جھوٹ بکو گی..... سفید جھوٹ!'' شانی کی نازک کلائی پر اس کی گرفت بے حد سخت ہوگئی۔ وہ کراہ اٹھی۔ اسے تکلیف میں دیکھ کر بشیر نے گرفت کچھ اور سخت کر دی۔ ''جی تو چاہتا ہے کہ تیرے ٹکڑے کر کے گٹر میں بہا دوں لیکن اپنے اس خبیث دل سے مجبور ہوں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارا اور شراب کا نصف گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔

اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہوتی جا رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکی اور اکلوتا دروازہ بند تھا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کے سوا عمارت میں کوئی اور موجود ہی نہیں، لیکن حقیقت مختلف تھی۔ یہاں تقریباً چار افراد موجود تھے اور ان میں سے ایک شائلہ کا

بے غیرت خاوند کن کتا ناصر تھا۔ اس کے علاوہ رکھوالی کا ایک دیوہیکل کتا تھا جو کمپاؤنڈ میں گاہے بگاہے شور مچانے لگتا تھا۔

چوہدری بشیر نے اپنی نگاہیں شانی کے چہرے پر گاڑے گاڑے کہا۔ ''تم کہتی ہو، تم اپنے یار کے پاس نہیں گئی ہو لیکن میں تمہارے اس چہرے پر اس کے منحوس ہونٹوں کے نشان دیکھ رہا ہوں...... سارے چہرے پر!'' اس نے آخری الفاظ کافی بلند آواز میں کہے اور اس کے ساتھ ہی گلاس میں بچی کھچی شراب شانی کے چہرے پر پھینک دی۔ تیز بُو کے ساتھ شانی کو آنکھوں میں جلن اور چبھن کا احساس ہوا۔ وہ دہاڑا۔ ''تو گندی عورت ہے۔ دغاباز، احسان فراموش۔ میں نے کیا نہیں کیا تیرے لئے...؟ اپنوں، غیروں سے دشمنی لی۔ اپنا کاروبار تباہ کیا، پولیس کی نظروں میں مشکوک بنا...... کیا کیا نہیں کیا میں نے تیرے لئے۔ کاش میں اپنے ہاتھوں سے تیرے جیسی غدار کی جان لے سکتا۔'' فرطِ غضب میں بشیر کے منہ سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے شانی کی کلائی کو ایک اور جھٹکا دیا۔ وہ پھر کراہ اٹھی۔

شانی کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب تک چوہدری بشیر کے سامنے دبی ہی رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ وہ جب بھی اس کے سامنے آتا تھا، وہ اس کے ٹرانس میں آ جاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مُنے کا باپ تھا۔ شانی نے جب جب بھی چوہدری کی مزاحمت کا سوچا تھا اسے یہی لگا تھا کہ اس مزاحمت کے سبب مُنے کی مصیبت بڑھ جائے گی لیکن آج تو مُنا یہاں نہیں تھا۔ وہ یہاں سے بہت دور ایک محفوظ چار دیواری میں تھا۔ لہٰذا شانی دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ آج اگر چوہدری بشیر نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو وہ خاموش نہیں رہے گی۔

چوہدری نے اس کے چہرے پر جو شراب پھینکی تھی وہ اس کی گردن کو بھگو کر گریبان میں داخل ہو رہی تھی۔ کراہیت سے شانی کا دل بھر گیا۔ چوہدری نے اس کی کلائی چھوڑی تو وہ منہ دھونے کے لئے واش روم میں گھس گئی۔ یہ بڑا لگژری باتھ روم تھا۔ پوری کوٹھی ہی لگژری تھی۔ شانی صابن سے چہرہ اور گردن دھو رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ چوہدری واش روم کے دروازے میں کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

وہ ڈگمگاتا ہوا اندر آیا، اس نے باتھنگ برش پکڑا اور شانی کے بال پکڑ کر برش کو جنونی انداز میں اس کے چہرے پر رگڑنے لگا۔ ''وسکی تو صاف کر رہی ہے.... ان نشانوں کو بھی صاف کر جو تیرے حرامی یار کے گندے ہونٹوں نے یہاں ڈالے ہیں۔ صاف کر ان

کو... صاف کر۔'' وہ جیسے دیوانگی کے عالم میں باتھنگ برش کو شانی کے چہرے اور گردن پر رگڑنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو..... چھوڑو مجھے۔'' شانی نے بہ مشکل خود کو اس کی بے رحم گرفت سے چھڑایا۔

وہ ہانپتا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی دیوار سے سر ٹکا کر رونے لگی۔ برش کی کرخت رگڑ سے اس کے ریشمی رخسار جلنے لگے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ جلن اسے اپنی کلائی پر محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے بشیر کی انگلیاں گوشت میں جیسے دھنس گئی تھیں۔ وہ بشیر کی اس بے رحم گرفت کا شکار ایک مرتبہ پہلے بھی ہو چکی تھی۔

وہ باہر نکلی تو چوہدری بشیر تند بگولے کی طرح کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ دروازہ ایک بار پھر مقفل تھا۔ شانی نڈھال ہو کر بستر پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اس کی تقدیر اب آگے اسے کیا دکھانے والی ہے۔ اسے لگا کہ وہ غلطی پر غلطی کرتی رہی ہے۔ پہلے اس نے روکیٹ بستی سے نکلنے کی غلطی کی، پھر اجمل خان کو مری کے نواح سے واپس بھیج دینے والی غلطی، اس کے بعد از خود ہسپتال سے نکل کر میڈیکل سٹور جانے والی غلطی۔ اگر وہ اجمل کو ہی اپنے ساتھ رکھتی تو شاید یہ سنگین ترین صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

وہ شام تک یکسر بھوکی پیاسی کمرے میں بند رہی۔ کمرے میں اے سی موجود تھا مگر چل نہیں رہا تھا۔ چھت کا پنکھا گرمی کی شدت کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ شانی کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اس نے گارڈ سے سادہ پانی مانگا۔ اس نے پانی دیا۔ وہ بدمزہ سا تھا لیکن وہ پی گئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ سو گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر دنیا و مافیہا سے بے خبر رہی تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی ''بے خبری'' کافی گہری اور طویل تھی۔ شاید پانچ چھ گھنٹے کی۔ اس نے وال کلاک دیکھا۔ وہ ساڑھے بارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ یعنی شام کے بعد قریباً ساڑھے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ کمرے میں ٹھنڈک تھی، شاید اے سی اب آن کر دیا گیا تھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں شانی کی نگاہ ایک شے پر پڑی اور وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے سامنے ایک ہینگر پر اپنا لباس نظر آیا تھا، وہی لباس جو اس نے یہاں آتے ہوئے پہن رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے موجودہ لباس کی طرف دیکھا اور اسے دوسرا شدید ترین جھٹکا لگا۔ اس کے جسم پر ایک سرخ عروسی لباس تھا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ شاید وہ ابھی تک جاگی ہی نہیں تھی۔ اس نے پھر

تڑپ کر سامنے ہینگر کی طرف دیکھا۔ یہ ہینگر کمرے سے باہر ایک دوسرے کمرے میں تھا۔ ہاں، یہ اسی کا پہاڑی لباس تھا۔ چنٹوں والا موٹا پھول دار کرتہ اور شلوار۔ کُرتے کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی۔

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ کس نے بدلا تھا اس کا لباس؟ کون تھا وہ؟ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ کئی سوالات اس کے ذہن میں چنگھاڑے۔ اسے لگا کہ اس کا سر گھوم رہا ہے۔ ہر شے ڈولتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اسے یاد آیا، اس نے پیاس سے مجبور ہو کر بدمزہ پانی پیا تھا......تو کیا پانی میں ہی کوئی نشہ آور دوا تھی؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ پر بہت بھاری بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے حد وزنی ہو گئے تھے۔

وہ بے حد پریشانی کے عالم میں اٹھ بیٹھی۔ تب اس کی نگاہ ایک عورت پر پڑی اور وہ سکتہ زدہ کھڑی رہ گئی۔ یہ لڑکی نما عورت واش روم سے برآمد ہوئی تھی اور ایک چھوٹے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ شانی کے لئے یہ تیسرا جھٹکا تھا۔ یہ لڑکی نما عورت اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی بلکہ کن کٹے ناصر اعجاز کو دیکھنے کے بعد اسے توقع پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہ اس عورت کو بھی اپنے آس پاس دیکھے گی۔ یہ ناصر کی بیوی اور بشیر کی رکھیل شمائلہ تھی۔ پچھلے قریباً ایک سال میں وہ پہلے سے فربہ ہو گئی تھی۔ چہرے کی دلکشی بھی گناہوں کی سیاہی میں ماند پڑ گئی تھی مگر اس کا لباس ویسا ہی ہیجان خیز تھا۔ اس کے چھینٹتے چنگھاڑتے جسم پر یہ لباس بالکل ناکافی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے گھونگریالے بالوں کے نیچے پیشانی پر چوٹ کا ہلکا سا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ ناصر یا چوہدری کے ساتھ ہونے والی کسی مار پیٹ کا نتیجہ تھا۔

شمائلہ حسب عادت لہراتی ہوئی اس کی طرف آئی اور بے باکی سے بولی۔ ''زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چھوٹی چوہدرانی! آپ کے یہ کپڑے کسی اور نے نہیں، میں نے اُتارے ہیں اور بالکل بند کمرے میں۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟'' شانی روہانسی آواز میں بولی۔

''میں نے کیا کرنا ہے چھوٹی چوہدرانی! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔''

''چوہدری کدھر ہے؟ اس کو بلاؤ اور میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گی، مجھے میرے کپڑے دو'' وہ چلائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سرخ اوڑھنی اپنے کندھوں سے اتار کر دور پھینک دی۔

''کیا کرتی ہیں چھوٹی چوہدرانی!'' شمائلہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔ ''یہ مرد لوگ ایسے لال پیلے کپڑے اتارنے کے لئے ہی پہناتے ہیں۔ پر آپ خود تو نہ اتاریں۔ یہ اتار دیں گی تو پھر پہنیں گی کیا؟ کھڑکی میں سے کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''میرے کپڑے مجھے لا کر دو۔'' شانی گرج کر بولی۔

''وہ میں کیسے لاؤں وہ تو کمرے سے باہر ہیں جی۔'' شمائلہ نے پنجابی لہجے میں اردو بولی۔

شانی نے اپنی طرف دیکھا۔ اس کے گلے میں سونے کا جڑاؤ ہار تھا۔ کانوں میں آویزے اور کلائیوں میں طلائی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ اس نے ہار توڑ کر پھینک دیا۔ سفید موتی پورے قالین پر بکھر گئے۔ اس نے آویزے اتار دیئے لیکن چوڑیاں وہ کوشش کے باوجود نہیں اتار سکی۔ اسے اپنے ہاتھوں پر صابن کی ہلکی سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ شانی کی مدہوشی کے عالم میں یہ چوڑیاں شمائلہ نے اسے پہنائی تھیں اور پہنانے کے لئے ہاتھوں پر صابن لگایا تھا۔

شانی نے بے تاب ہو کر کمرے کا بند دروازہ زور زور سے بجایا۔ آواز پوری کوٹھی میں گونجنے لگی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

''چھوٹی چوہدرانی! کیا کرتی ہو؟'' شمائلہ طنز سے بولی۔ ''رونا پیٹنا تو مجھے چاہیے جسے چوہدری ورت کر (استعمال کر کے) چھوڑ گیا ہے۔ تیرے تو دل کی مرادیں آج پوری ہو رہی ہیں۔ شگنوں والی رات آ گئی ہے۔ آج تُو سچ مچ چوہدرانی بننے والی ہے اور مجھے لگتا ہے باقی سب پیچھے رہ جائیں گے۔ اب چوہدری تیرے ہاتھ کی پکی ہوئی ہی کھائے گا۔ جو سواد اسے تُو دے سکتی ہے اور کس نے دینا ہے۔ وہ اب تک تیرے ہی انتظار میں روکھی سوکھی کھاتا رہا ہے۔''

''بکواس بند کر تُو۔'' شانی نے اسے دھکا دیا۔ ''چوہدری کو بلا کہاں ہے وہ؟'' نشہ آور دوا کے اثر سے شانی کا گلا سوکھ رہا تھا اور نظر دھندلا رہی تھی۔

''اتنی بے چین کیوں ہوتی ہو چھوٹی چوہدرانی! ابھی آ جاتا ہے اور پھر سویرے سے پہلے نہیں جائے گا۔ تیرے سارے ارمان پورے کرے گا۔'' وہ کسی نائیکہ کے سے انداز میں بولی۔

شانی نے اسے طمانچہ دے مارا۔ اس نے بالکل بُرا نہیں منایا۔ بس اسے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ شانی چلائی۔ ''دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتی ہے۔ بے غیرت، بے حیا۔ گاڑی اور

بنگلے کے لئے چوہدری کے اشاروں پر ناچتی رہی ہے اور وہ تیرا بے شرم شوہر بھی.....'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکی۔

''بہت اکڑ ہے چھوٹی چوہدرانی! سویرے مجھ سے نظر ملا کر بات کرنا پھر مانوں گی۔'' وہ عجیب انداز میں بولی۔

اتنے میں بھاری قدموں کی آواز آئی۔ شانی نے مڑ کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ چوہدری بشیر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ناصر تھا اور ایک مولوی صاحب تھے۔ لمبا تڑنگا گارڈ ٹرپل ٹو رائفل ہاتھ میں تھامے عقب میں تھا۔ چوہدری بشیر نے کلف لگا نیا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ دروازے کا لاک کھولا گیا اور یہ لوگ دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔

مولوی صاحب قدرے پریشان نظر آ رہے تھے۔ غالباً انہیں ماحول کی شدید سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ''دو...... دلہن کہاں ہے؟'' مولوی صاحب ہکلائے۔

''یہ تجھے کیا نظر آ رہا ہے؟'' ناصر نے بدتمیزی سے کہا۔

''چھوڑ دو مجھے...... جانے دو۔'' شانی چلائی اور اس نے چوہدری اور ناصر کے درمیان سے راستہ بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ چوہدری بشیر نے اسے بازو سے پکڑ کر اتنی زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا کہ وہ بستر پر جا گری اور اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرایا۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ شانی جو پہلے ہی بری طرح چکرائی ہوئی تھی، نیم بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ شمائلہ نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ناصر اعجاز نے اس کی مدد کی۔

شانی نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، مولوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ان کی دھیمی آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ''میں آپ سے شرمندہ ہوں جی۔ میں یہ نکاح نہیں پڑھا سکتا۔''

''کیوں نہیں پڑھا سکتے؟'' چوہدری کی آواز شانی کی سماعت سے ٹکرائی۔

''آپ کسی اور کا انتظام کر لیں جی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نکاح کے لئے لڑکی کی پوری رضامندی ضروری ہے۔ اس طرح کا نکاح نکاح نہیں ہوگا۔''

چوہدری اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے رہے۔ شانی کے دل میں ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ننھی سی کرن پیدا ہوئی۔

درمیانی عمر کے مولوی صاحب نے کسی کو خاطر میں لائے بغیر دروازہ کھولا اور واپس چل دیئے۔ چوہدری اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے تھے۔ شانی کو تھوڑا سا تعجب ہوا لیکن جلد ہی یہ تعجب دور ہو گیا۔ مولوی صاحب ابھی راہداری میں چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ کن

کٹے ناصر نے اپنے لمبی قمیص کے نیچے سے سیاہ رنگ کا پستول نکال لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ مولوی صاحب کو للکارتا اور رکنے کا حکم صادر کرتا، چوہدری بشیر نے اسے ایک جھلائے ہوئے اشارے کے ساتھ منع کر دیا۔ پستول پھر ناصر کی قمیص کے نیچے چلا گیا۔ چوہدری خود آگے بڑھا اور مولوی صاحب کو روکا۔ پھر وہ کمرے سے باہر جا کر مولوی صاحب سے بات کرنے لگا۔ چوہدری کی ناک کے اوپر وہی موٹی سی سلوٹ نظر آ رہی تھی جو اس کے اندر کے شدید تناؤ اور غصے کو ظاہر کرتی تھی...... تاہم فی الوقت اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا ہوا تھا۔

شانی کو جو دوا دی گئی تھی اس میں شاید اعصاب شل کرنے والے اثرات تھے۔ وہ شمائلہ اور ناصر کی گرفت میں مزاحمت تو کر رہی تھی مگر اس مزاحمت کی ناتوانی خود اسے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بار بار یہی فقرہ دہرا رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو۔''

تب اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ چوہدری بشیر نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور سو سو کے چند نوٹ نکال کر مولوی صاحب کو تھمائے۔ وہ مسلسل انکار میں سر ہلاتے رہے اور باہر جانے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے۔ چوہدری نے بٹوے سے چند اور نوٹ نکالے...... پھر چند اور نکاح خواں کے چہرے پر نرمی کے آثار دکھائی دینے لگے لیکن وہ ابھی تک پوری طرح آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی دوران میں لمبا تڑنگا باوردی گارڈ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دیوہیکل کتے کی زنجیر تھی۔ معلوم نہیں وہ خود آیا تھا یا چوہدری نے اسے اشارے سے بلایا تھا۔ کتے کی سرخ زبان اور سفید نکیلے دانت چمک رہے تھے۔ اندر آتے ہی اس نے اپنے سینے سے لرزہ خیز دھیمی آواز نکالی اور رشوت خور نکاح خواں کی طرف بڑھا۔ نکاح خواں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ چوہدری نے کتے کو بری طرح ڈانٹا۔ اس کے بعد گارڈ کو لتاڑا کہ وہ اسے باہر لے کر جائے۔ گارڈ مشتعل کتے پر قابو پاتا ہوا اسے باہر لے گیا۔ کتے کی گونج دار آواز در و دیوار میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

چوہدری نے لرزاں نکاح خواں کا شانہ تھپکا اور اپنے بٹوے کا تھوڑا سا مزید وزن نکاح خواں کی جیب میں منتقل کر دیا۔ اس نے رسمی انکار کیا اور پھر نکاح پڑھانے کے لئے واپس کمرے میں آ گیا۔ یہ ذہنوں کو آمادہ کرنے کے لئے لالچ اور ڈراوے کا وہی دوطرفہ کھیل تھا جو معاشرے میں نیچے کی سطح سے بلند ترین سطح تک کھیلا جاتا ہے اور کھیلنے والا اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے ایک معمولی اہلکار سے لے کر کسی ملک کی حکومت تک کو اس طریقے سے تابع فرمان کر لیا جاتا ہے۔ اس نکاح خواں کو پہلے رشوت کے ذریعے توڑا گیا پھر جو تھوڑی

بہت کسر رہ گئی اسے دھونس سے پورا کرلیا گیا۔ ہر طبقے اور ہر شعبے میں اس نکاح خواں جیسے بظاہر اصول پسند اور دراصل کمزور لوگ موجود ہوتے ہیں۔

اپنے تھیلے میں سے نکاح کا فارم نکال کر نکاح خواں نے خانہ پُری شروع کردی۔ شانی کا سارا احتجاج بے سود ثابت ہو رہا تھا۔ جب نکاح خواں نے باقاعدہ نکاح پڑھانا شروع کیا تو وہ اپنے مختل حواس کو جمع کرکے چلائی۔ ''یہ نکاح نہیں ہوسکتا...... میں شادی شدہ ہوں......''

چوہدری نے ایک لمحے کے لئے چونک کر شانی کی طرف دیکھا پھر نکاح خواں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اپنے تاثرات سے ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی دلہن کے حواس درست کام نہیں کر رہے اور وہ واہی تباہی بول رہی ہے...... نکاح جاری رہا...... پھر چوہدری بشیر اور شائلہ نے نیم جان شانی کا دایاں ہاتھ پکڑا اور زبردستی اس کا انگوٹھا نکاح فارم پر لگایا۔

''مبارک مبارک۔'' کی مدھم آوازیں شانی کے کانوں سے ٹکرائیں۔ تب شانی نے دیکھا کہ کن کٹا ناصر مٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب کا منہ میٹھا کروا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک چھوٹا ڈبہ نکاح خواں کو دیا گیا۔ چوہدری بشیر نکاح خواں کو ضروری ہدایات دیتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ گارڈ سمیت باقی دو افراد بھی باہر چلے گئے۔

چند سیکنڈ بعد چوہدری بشیر دندناتا ہوا کمرے میں واپس آگیا۔ اس نے شائلہ اور ناصر کو بھی باہر جانے کو کہا۔ وہ دونوں باہر چلے گئے۔ چوہدری نے دروازہ مقفل کیا اور اکلوتی کھڑکی کا پردہ برابر کردیا۔

''دیکھو چوہدری! میں جان دے دوں گی لیکن تمہاری مرضی پوری نہیں ہونے دوں گی۔''

''تو دے دینا جان...... لیکن ابھی تو میں تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گا۔'' چوہدری کے لہجے میں شراب پھنکار رہی تھی۔ ''بہت صبر کیا ہے میں نے...... بہت ڈھیل دی ہے تجھے...... لیکن تُو عورت ہے...... مرد کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ تجھے سیدھا کرنے کے لئے اب دل کو تھوڑا سا سخت کرنا ہی پڑے گا۔''

''میں...... شادی شدہ ہوں...... نکاح پر نکاح نہیں ہوسکتا۔''

''کس سے ہوئی ہے تیری شادی؟''

''رستم سے۔''

چوہدری کے سنگلاخ چہرے پر دنیا جہان کی سفاکی سمٹ آئی۔ ''کب ہوئی تھی یہ شادی؟'' اس نے پوچھا۔

''وڈے ڈیرے کی لڑائی سے پہلے۔''

''بہت خوب...... اب کہاں ہے رستم؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اگر تجھے واقعی نہیں معلوم اور کسی اور کو بھی نہیں معلوم تو پھر وہ حرام زادہ ڈیرے پر کُتے کی موت مرچکا ہے۔ تیری عدت شدت بھی پوری ہوچکی ہے۔ اب تُو میری منکوحہ بیوی ہے اور میرا پورا حق ہے کہ تجھ سے ازدواجی تعلق قائم کروں اور تُو بھی پابند ہے کہ میری مرضی کے مطابق چلے۔''

شانی کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک اس نے چوہدری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''مجھے معاف کردو چوہدری! مجھ سے تمہیں کچھ نہیں مل سکے گا۔ ایک مٹی کے بت سے تم کیا حاصل کروگے۔ میں اب بھی مانتی ہوں کہ تم دوسرے چوہدریوں سے مختلف ہو ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت بھی ہو اور محبت کسی کو پالینے کا نام ہی نہیں ہے۔ محبت تو اپنا صلہ آپ ہوتی ہے۔''

چوہدری پھنکارا۔ ''یہ بات تُو نے اپنے اس حرامی یار سے کیوں نہ کہی؟ اس سے تو تو نے شادی رچائی اور خود کو پورے کا پورا اس کی گود میں پھینک دیا۔ اس کُتے سے بھی کہنا تھا کہ محبت کسی کو پالینے کا نام نہیں ہے۔'' اس نے گلاس سے سنہری محلول کا ایک طویل تلخ گھونٹ لیا اور بولا۔ ''یہ کہانیوں کتابوں کی باتیں اپنے پاس رکھو شانی بیگم...... میں بہت بے وقوف بن چکا ہوں، اب اور بے وقوف نہیں بننا ہے۔ آج وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ اس میں اپنی مرضی شامل کرلو گی تو تمہارے حق میں اچھا ہے، ورنہ میاں بیوی تو آج ہم کو بننا ہی ہے۔ باقی ساری چیزیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔''

شانی کو لگا کہ نارپور کی حویلی کا چوہدری فاخر جو پچھلے ڈیڑھ برس میں تھوڑا تھوڑا چوہدری میں زندہ ہوتا رہا تھا، آج پوری طرح انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا ہے۔ وہی چوہدری فاخر جس نے نارپور کی حویلی میں ازدواجی رشتے کی خوب صورتی کو گالی بنا کر رکھ دیا تھا۔

چوہدری بشیر نے نیا سگریٹ سلگایا اور دھواں اپنی گھنی سیاہ مونچھوں کے نیچے سے چھوڑا۔ ''ہاں شانی بیگم! تُو نے ابھی میرے مُنّے کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' شانی نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں سب کچھ معلوم ہے لیکن بتاتیں کچھ نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں.... آہستہ آہستہ

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ تمہارے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ میں مہیا کر سکتا ہوں اور مُنے کے لئے بھی اس کے باپ سے بڑھ کر کسی کا سایہ نہیں ہے۔ ویسے اگر تم مجھے بتا دیتیں کہ میرا بیٹا کہاں ہے تو مجھے تھوڑی سی تسلی ہو جاتی۔''

چوہدری کے مخمور چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ شانی جانتی تھی کہ یہ بے حس باپ اپنے بیٹے کا کیوں پوچھ رہا ہے۔ وہ شانی کی مزاحمت دیکھ رہا تھا اور غالباً سوچ رہا تھا کہ اس مزاحمت کو اچھے طریقے سے اور مستقل طور پر توڑنے کے لئے بچے کا یہاں ہونا ضروری ہے۔

ایک دم شانی بے تاب ہو کر اٹھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ چابی دروازے کے اندر ہی لگی ہے۔ اس نے لپک کر دروازے تک پہنچنا چاہا...... اس کا سر بُری طرح گھوم رہا تھا۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ بُری طرح لڑکھڑائی۔ وہ دیوار سے ٹکراتی مگر چوہدری نے اسے پکڑ لیا۔ چوہدری کی مضبوط بانہوں کا شکنجہ اس نے اپنی نازک کمر کے گرد محسوس کیا۔ وہ بظاہر اسے آرام سے لیکن حقیقت میں نہایت سختی سے کھینچ کر واپس بیڈ پر لے آیا۔

''نہیں شانی بیگم نہیں...... اب اس طرح نہیں چلے گا۔ ویسے بھی اپنی جان پر اتنا ظلم ٹھیک نہیں ہوتا۔'' اس کی سخت گیر ناک پر نظر آنے والی سلوٹ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ الکحل کے بھبکے شانی کے نتھنوں سے ٹکرا کر نارپور حویلی کی ساری تلخ یادیں تازہ کر رہے تھے۔

اس نے بہکے ہوئے انداز میں اپنا ہاتھ شانی کے بھیگے رخسار پر پھیرا۔ ''شاید فاخر نے تمہارے ساتھ ٹھیک ہی کیا تھا۔ تم دشمن کی بیٹی ہو اور دشمن کی بیٹی ہی رہو گی۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

شانی نے خود کو دنیا کے مکروہ ترین بوجھ تلے محسوس کیا۔ ہاں یہ مکروہ ترین بوجھ تھا۔ یہ اس مشتعل مرد کا بوجھ تھا جو ایک کمزور عورت کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرتا ہے...... یا کہنا چاہیے کہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شانی نے بے پناہ نفرت سے بشیر کو پیچھے دھکیلا اور ایک بار پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ بشیر کے ہاتھ میں اس کی قمیص آئی اور اس نے پورے زور سے کھینچا۔ شانی لہرا کر قالین پر گر گئی۔ بشیر پھر اپنے غلیظ بدبودار بوجھ کے ساتھ اس کی طرف آیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے شانی کی سرخ کام دار قمیص پھاڑ دی اور اس کے دونوں ہاتھ اطراف میں دبوچ لئے۔ وہ ہانپتی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولا۔ ''تجھے پھولوں کی سیج پر بٹھانا چاہتا تھا لیکن حرام زادی تیری قسمت میں یہی تھا۔''

باہر سے کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی شے گری ہے۔ بشیر ذرا چونک کر

دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شانی بدستور اس کے پنجوں میں رہی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو دبوچ لینے کے بعد اطراف کی آہٹوں کا جائزہ لیتا ہے۔

مزید کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور بشیر پھر شانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنی کلائیاں بشیر کی گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر یہ ایک بپھرے ہوئے شرابی مرد کی گرفت تھی۔ اسے ختم کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ شانی کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو چکا تھا۔ شانی نے خود کو بالکل بے بس محسوس کیا تو اپنی بے پناہ نفرت کے اظہار کے لئے چوہدری بشیر کے منہ پر تھوک دیا۔

یہ تھوک چوہدری کے منہ پر توپ کے گولے کی طرح لگا۔ چند لمحے کے لئے وہ پتھرا سا گیا۔ پھر اس کی وحشت کئی گنا فزوں ہو کر شانی کی طرف پلٹ آئی۔ اس نے کُتے کی طرح شانی کو بھنبھوڑنے کی کوشش کی۔ نامعلوم آہٹ ایک مرتبہ پھر ابھری۔ اس دفعہ یہ آہٹ دروازے کے پاس سے ابھری تھی۔ عالم وحشت و مدہوشی میں بشیر ایک بار پھر ذرا سا چونکا۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر ایک زوردار دھما کا سا ہوا...... یوں لگا جیسے کوئی باہر سے پوری قوت کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا ہے پھر دوسرا دھما کا ہوا۔ اس دفعہ بعینہ یہی محسوس ہوا کہ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔

چوہدری سکتے میں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ شانی کو چھوڑ کر اپنے پستول کی طرف بڑھے، جو بستر پر پڑا تھا یا انتظار کرے کہ اس کے ساتھی دروازے پر حملہ کرنے والے کو دبوچیں۔ اسے یہ تذبذب مہنگا پڑا۔ اگلی ٹکر میں دروازے کا کھٹکا اکھڑ گیا۔ اندر آنے والے نے چوہدری بشیر پر گولی چلائی جو سیدھی اس کے سینے میں لگی اور یہ گولی نشانے پر کیوں نہ لگتی۔ گولی چلانے والا حسن ابدال کا ماہر ترین نشانہ باز اجمل خان تھا۔ شانی کو لگ رہا تھا، وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اجمل خان اور یہاں؟ شاید وہ بصری واہمے کا شکار ہو رہی تھی لیکن نہیں...... یہ اجمل خان ہی تھا۔ پٹھان نسل کی ساری غیرت...... سنگلاخ پہاڑوں کی ساری سختی اور آگ و بارود کی ساری تپش اس کے چہرے پر تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ شاید اس وقت بیسیوں افراد کو بھی قتل کر سکتا ہے۔

شانی خود کو ڈھانپتی ہوئی ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ اجمل کے پسٹل پر وہی سائیلنسر لگا تھا جو وڈے ڈیرے پر رستم کے زیر استعمال تھا۔ اجمل نے دوسرا فائر چوہدری بشیر کے چہرے پر فقط چار پانچ فٹ کی دوری سے کیا۔ سر نے جھٹکا کھایا۔ پیشانی پر بائیں طرف خوفناک سیاہ سوراخ نظر آیا۔ چوہدری بشیر کی آنکھیں حیرت اور خوف کے عالم میں پھٹی ہوئی تھیں۔ یہ

اس کی زندگی کی آخری سانسیں تھیں مگر وہ پھر بھی شانی ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کتے! یہ امارا بہن ہے...... کتے یہ امارا بہن ہے۔'' اجمل سینے کی پوری قوت سے دہاڑا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ پھر شانی نے دیکھا اس نے پستول سیدھا کر کے کم از کم تین مزید گولیاں بشیر کے سر میں اتار دیں۔ اس کی پیشانی کے پرخچے اُڑ گئے اور لہو اس کے بھاری بھرکم چہرے کو بھگونے لگا۔ شانی کو لگا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ وہ دیوار کے ساتھ پھسل کر نیچے بیٹھ گئی۔ اجمل نے اپنے نیفے میں سے نیا میگزین نکال کر پستول سے اٹیچ کر لیا پھر اس نے بستر کی چادر شانی کو لپیٹنے کے لئے دی۔ وہ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ شانی کا پھٹا ہوا پہاڑی لباس بھی ہینگر سے اتار کر اس نے گول مول کیا اور شانی کو تھما دیا۔ پھر اس نے شانی کا بازو پکڑا اور تیزی سے باہر آیا۔ وہ راہداری سے گزر کر سیڑھیوں کے پاس سے گزرے۔ یہاں کے مناظر شانی کے لئے دل دہلا دینے والے تھے۔ اس نے سیڑھیوں پر دو لاشیں دیکھیں۔ ایک لمبے تڑنگے گارڈ کی تھی۔ سائیلنسر لگے پسٹل کی گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی۔ دوسری لاش ناصر اعجاز کی تھی۔ وہ سیڑھیوں پر پشت کے بل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ شانی سکتہ زدہ رہ گئی۔ ناصر کی چھاتی پر اور پیٹ پر چاقو کے کم از کم چھ وار کئے گئے تھے۔ خون اس کے پورے لباس کو بھگو چکا تھا۔ شمائلہ کے دلال نما شوہر کی کہانی اپنی تمام ''ناپاک لالچ'' سمیت آج ان سیڑھیوں پر ختم ہو گئی تھی۔

سیڑھیوں کے اوپر سے بھی تھوڑا تھوڑا خون ٹپک رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ایک آدھ لاش اوپر بھی موجود ہے جو نظر نہیں آ رہی۔ یوں لگتا تھا کہ جو بھی اجمل کے سامنے آتا رہا ہے، آناً فاناً اس کی وحشت کا شکار ہوتا رہا ہے۔ اسے پسٹل کی گولی لگی ہے یا تیز دھار آلے نے اس کا سینہ چیر دیا ہے... یہاں شانی کو ایک چپل ملی جو اس نے پہن لی۔

''مجھے کہاں لے جا رہے ہو اجمل؟'' شانی پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

''آپ بے فکر رہو امارا بہن۔ ام آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔''

وہ ایک کمرے کے سامنے سے گزری اور شانی کو ایک اور جھٹکا لگا۔ کمرے کے فرش پر نکاح خواں مُردہ پڑا تھا۔ اس کی بالائی جیب میں سے سرخ اور نیلے نوٹ اپنی جھلک دکھا رہے تھے جیسے وہ نیچے گرنے کے لئے بے تاب ہوں۔ قریب ہی میز پر روسٹ مرغ کی ہڈیاں اور روغنی نان کے بچے ہوئے ٹکڑے تھے۔ درمیانی رات کا یہ کھانا نکاح خواں کو بہت مہنگا پڑا تھا۔ گیہوں کے ساتھ وہ بھی گھن کی طرح پس گیا تھا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے میں لگی تھی اور کان کی طرف سے نکل گئی تھی۔

کہیں سے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کوئی نسوانی آواز میں واویلا بھی کر رہا تھا۔ آوازیں مدھم تھیں لیکن غور کر کے سنی جا سکتی تھیں۔

''یہ کون ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ان ہی کی کوئی ساتھی ہے۔ ام نے عورت سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ ایک غسل خانے میں بند کیا ہے۔ امارا تو خیال ہے اسے بھی پار کر دیا جائے۔''

''نیلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس نے؟'' شانی نے پوچھا۔ اجمل خان نے اثبات میں جواب دیا۔ شانی سمجھ گئی کہ وہ شمائلہ ہے۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ بدترین دشمن تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ کسی جابر نائیکہ کا سا کردار ادا کر رہی تھی لیکن شانی اس کے لئے بھی موت نہیں چاہتی تھی۔

''نہیں اجمل۔'' وہ کراہی۔ ''وہ عورت ذات ہے، رہنے دو اسے۔''

اجمل ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر شانی کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کی عقبی سمت میں آ گیا۔ یہاں درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا۔ اجمل خان نے اپنی جیب میں سے چابیوں کا ایک چھوٹا گچھا نکالا اور لوہے کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ یقینی بات تھی کہ اجمل نے یہ گچھا کسی مقتول کی جیب سے ہی نکالا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک چھوٹی سڑک کے ساتھ ساتھ قریباً تیس فٹ چوڑی گرین بیلٹ دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک ٹیکسی کار اس طرح کھڑی تھی جیسے خراب ہو۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔

شانی نے اندازہ لگایا کہ اجمل خان اسی ٹیکسی پر یہاں پہنچا ہو گا۔ فی الحال اس کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہاں کیونکر پہنچ سکا۔ ایک بار پھر احتیاط سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اجمل نے شانی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر ٹیکسی کار تک آ گیا۔ اس نے شانی کو پچھلی نشست پر بٹھایا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ رات کے اس پہر سڑک پر اور اطراف میں مکمل خاموشی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس اور گھروں کی اکا دکا روشنیاں کہر آلود تاریکی میں اونگھتی محسوس ہوتی تھیں۔ دور کہیں کسی لین میں چوکیدار کی سیٹی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

شانی نے مڑ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ بظاہر اس پُرسکون کوٹھی کے اندر تھوڑی ہی دیر پہلے پانچ چھ قتل ہو چکے ہیں اور یہ قتل کسی گینگ یا قاتل ٹولے نے نہیں کئے، صرف ایک شخص نے کئے ہیں اور وہ شعلہ صفت شخص اس وقت شانی کے ساتھ اس ٹیکسی میں

موجود ہے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا مگر پتا نہیں کیوں تذبذب میں نظر آ رہا تھا، جیسے سوچ رہا ہو کہ گاڑی آگے بڑھائے یا نہیں۔ تب ایک دم وہ باہر نکل آیا۔ عقبی کھڑکی میں جھک کر شانی سے بولا۔ "شانی بہن! آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں۔ ام ایک سیکنڈ میں آیا۔"

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہہ پاتی، وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پھر کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اندر جانے کے لئے اس نے وہی لوہے کا دروازہ استعمال کیا تھا۔

اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوگئی۔ دروازہ بھیڑ کر اس نے تیزی سے گرین بیلٹ پار کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ٹیکسی تیزی سے ویران سڑک پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت ایک سیاہ ہونڈا سوک کار تیزی سے ٹرن لے کر کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف مڑی۔ کار کے دبے ہوئے شاکس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں کم از کم تین چار افراد موجود ہیں۔

"کہاں گئے تھے اجمل؟" شانی نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"وہ ایک چیز وہاں رہ گیا تھا۔"

"مجھ سے جھوٹ مت بولو اجمل۔"

"ام......ام.... سمجھا نہیں۔"

شانی نے ذرا توقف کیا پھر گھمبیر لہجے میں بولی۔ "اس لڑکی کو بھی قتل کر آئے ہو ناں؟"

اجمل کو جھٹکا سا لگا لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیرنگ وہیل پر جمے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز ابھری۔ "آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"میری بات کا جواب دو۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے ام مافی چاہتا ہے شانی بہن! لیکن ام کو یہی مناسب لگا۔ جو مارا ماری بھی یہاں ہوا ہے، یہ عورت اس کا چشم دید گواہ تھا۔ یہ امارے اور آپ کے لئے مصیبت بن سکتا تھا اور ام سمجھتا ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ اگر امارے بس میں ہوتا، ام ان لوگوں کو بار بار زندہ کر کے مارتا۔" اجمل کے لہجے میں آتش فشاں دہک رہے تھے۔ اجمل کا یہ روپ شانی کے لئے حیران کن تھا۔ عام شخص شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ہنستے کھیلتے خوش باش شخص کے پیچھے ایسا گھمبیر و شعلہ صفت بندہ چھپا ہوا ہے۔

"کیسے مارا اسے؟" شانی نے دل گرفتہ آواز میں پوچھا۔

"زیادہ تکلیف نہیں دیا۔ بس ایک گولی کنپٹی میں اتار دیا۔"

شانی کی آنکھوں میں شائلہ کی شکل گھومی۔ وہ چھبیس ستائیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی، لیکن وہ اور اس کا شوہر بغیر کسی محنت کے بہت جلد بہت کچھ حاصل کر لینا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے چوہدری بشیر کی عیش پرستی کو سیڑھی بنا رکھا تھا۔ آج وہ آناً فاناً چوہدری بشیر کے ساتھ ہی خاک و خون میں لوٹ کرنا پید ہو گئے تھے۔

شانی وقت کی تیز رفتاری پر ششدر تھی۔ اب سے صرف ڈھائی دن پہلے وہ تحصیل مری کے دور افتادہ خاموش پہاڑوں میں تھی۔ ان ڈھائی دنوں کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ وہ راولپنڈی پہنچی تھی بلکہ چوہدری بشیر اور اس کی شعلہ نشانی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اب چوہدری بشیر اپنی تمام تر وحشت اور بے قراریوں سمیت راہی عدم بھی ہو چکا تھا۔ اسے ابھی تک یہ یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ بشیر مر چکا ہے۔

شانی نے لرزاں آواز میں اجمل سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں روکیٹ واپس جانے کا کہہ دیا تھا...... تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ام آپ کو سب کچھ بتاتا ہے۔ ذرا ام پہلے کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائے شانی بہن۔" اجمل نے ونڈ سکرین پر نگاہیں جمائے جمائے کہا۔ وہ تیزی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہو گیا اجمل...... میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی۔"

"ام خود بھی ان سب کو مارنا نہیں چاہتا تھا مگر سچویشن ہی ایسا ہو گیا تھا۔ ام ان کو نہ مارتا تو وہ ام کو مارتا اور آپ کے لئے تو ام اس سے دگنا بندے بھی مار سکتا تھا۔" اجمل کی آواز بھی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ٹیکسی کار ایک متوسط درجے کی رہائشی آبادی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی رک گئی۔ اب رات کے تین بجنے والے تھے۔ چہار سُو خاموشی تھی۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی آوازوں کے سوا سناٹا تھا۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ یہاں ایک اور ٹیکسی بھی اوس میں بھیگی ہوئی کھڑی تھی۔ اجمل خان نے اُتر کر لوہے کے چھوٹے سے گیٹ پر بیل دی۔ دبلے چہرے والا ایک شخص باہر آیا۔ ایسا لگتا تھا وہ جیسے پہلے سے ہی اجمل کا انتظار کر رہا تھا۔ اجمل شانی کو لے کر فوراً گھر کے اندر آ گیا۔ اب پہلی بار شانی نے اجمل کے پاؤں کی لنگڑاہٹ محسوس کی۔ اس کا یہ پاؤں بھورے سائیں کے مزار پر مجاوروں کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوا تھا، یہ اجمل کی ہمت تھی کہ وہ اس چوٹ کو خاطر میں لائے بغیر نقل و حرکت کر رہا تھا۔ یہاں صحن میں شانی کو وہ ڈالہ یعنی لوڈر بھی کھڑا نظر آیا

جس نے انہیں بھورے وال سے مری پہنچایا تھا۔ شانی نے اس چار دیواری میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے ادھورے لباس سے نجات حاصل کی تھی اور ایک زنانہ جوڑا پہنا۔ بستر کی چادر کی جگہ اسے ایک شال مہیا کر دی گئی۔

شانی کو نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بلب روشن تھا۔ پرانی طرز کے پھول دار فرش پر پرانی طرز کا ڈیزائن دار پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ شانی یہاں ڈولے اور شہاب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''اجمل! یہ دونوں یہاں کیسے؟'' شانی نے تعجب سے پوچھا۔

''یہ بھی کل رات ہی یہاں پہنچا تھا۔ ان کو امارا یہ پنڈی وال دوست شیر محمد یہاں لے کر آیا ہے۔'' اجمل نے دبلے چہرے والے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے گیٹ کھولا تھا۔

شیر محمد نے مقامی لب و لہجے میں اجمل خان سے پوچھا۔ ''کھانا کھاسو...... یا چائے پیسو؟''

اجمل نے سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔

شیر محمد بولا۔ ''چلو جی! میں جولتا ہوں (جاتا ہوں) اگر تساں کو کسی بھی شے کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔''

شیر محمد کے جانے کے بعد شانی نے روہانسی آواز میں اجمل سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہوا ہے۔ تم لوگ کیسے پہنچے ہو یہاں؟''

اجمل نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ام کو امید ہے، رستم بھائی کی طرح آپ بھی ام کو معاپ کر دے گا۔ آپ کے منع کرنے کے باوجود ام آپ دونوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ شاید امارے بس میں ہی نہیں ہے۔''

''تو تم روکیٹ واپس گئے ہی نہیں؟'' شانی اپنی گردن کی خراشوں کو شال سے ڈھانپتے ہوئے بولی۔

''نہیں شانی بہن! امارے پاس آپ کا ناپرمانی کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ام آپ کے پیچھے پیچھے گھوڑے پر ہی مری پہنچا تھا۔ وہاں مری میں لوگ گھوڑوں پر گھومتا رہتا ہے۔ ام پر بھی کسی نے زیادہ توجہ نہیں دیا۔ ام نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے گھوڑا چھوڑ دیا۔ اُدھر ہسپتال میں ام کو وہ ڈالہ نظر آ گیا جس پر ام انسپکٹر حفیظ کو لے کر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ام کو یہ بھی پتا چل گیا کہ چھوٹو (ڈولا) ڈالے کے اندر ہی سویا پڑا ہے۔ ام اگلے روز بھی آپ کے آس پاس ہی رہا تھا۔

جب آپ میڈیکل سٹور سے دوائی لینے گیا تب بھی ام آپ کے آس پاس تھا۔ وہاں ام کو شک پڑا کہ ایک بندے نے آپ کو پہچانا ہے اور کچھ دور تک آپ کا پیچھا بھی کیا ہے۔ ام اور بھی چوکس ہو گیا۔ اسی دوران میں اللہ تعالیٰ نے امارا مدد پرمایا۔ ام کو اپنا یہ پرانا پنڈی وال دوست شیر محمد مل گیا۔ یہ وہاں مری میں ڈرائی پروٹ کا کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تین ٹیکسی بھی پنڈی اور مری کے درمیان چلتا ہے۔ ام نے اس کو بتایا کہ ام کو اس کا ایک ٹیکسی کا ضرورت پڑ سکتا ہے۔ اس نے ٹیکسی پورا امارے حوالے کر دیا۔''

اجمل خان نے ذرا توقف کر کے گہری سانس لی اور خاموش بیٹھے ڈولے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''چھوٹو بھائی کا نظر واقعی بہت تیز ہے...... اور کان وغیرہ نظر سے بھی زیادہ تیز ہے۔ ام اس سے بچنا چاہتا تھا لیکن اس کو پتا چل گیا کہ ام ہسپتال کے احاطے میں موجود ہے۔ اس نے ام کو دیکھ لیا۔ ام نے اس سے درخواست کیا کہ یہ فی الحال آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ شام کے بعد جب اچانک ہسپتال کا لائٹ گیا تو ام، ڈولا اور شیر محمد پاس پاس ہی کھڑا تھا۔ ڈولے نے آپ کو بھاگ کر پچھلے گیٹ کی طرپ جاتے اور ایک سوزوکی ڈبے میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا۔ ام پورا ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی کو ڈبے کے پیچھے لگا دیا۔ شیر محمد بھی امارے ساتھ تھا۔ جانے سے پہلے ام نے چھوٹو بھائی کو شیر محمد کا موبائل نمبر دے دیا تھا۔ ام نے پنڈی تک بڑی احتیاط سے سوزوکی ڈبے کا پیچھا کیا اور وہ منحوس کوٹھی دیکھ لیا جس میں آپ کو لے جایا گیا تھا۔ اب آپ امارا بات بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوگا۔''

''ڈولا اور شہاب یہاں کیسے پہنچے؟'' شانی نے پوچھا۔

''کل رات نو بجے شیر محمد کے موبائل پر چھوٹو کا کال آیا۔ اس نے ام کو بتایا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور بہت پریشان ہے۔ چھوٹو آپ کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔ ام نے اس کو تسلی دیا کہ آپ کا پتا چل گیا ہے۔ پھر ام نے اس سے کہا کہ ابھی شیر محمد کا دوسرا ٹیکسی ہسپتال پہنچ جائے گا۔ وہ اور شہاب خاموشی سے اس میں بیٹھ کر پنڈی پہنچ جائے۔''

''ہسپتال میں کسی کو پتا چلا کہ کیا ہوا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''جی ہاں..... لوگوں کو گڑبڑی کا شک ہو گیا تھا۔ ایک عورت نے دو بندوں کو آپ سے کھینچا تانی کرتے دیکھ لیا تھا۔ بعد میں سب لوگ شہاب سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا مالمہ ہے۔ شہاب نے عقل مندی کیا کہ خاموشی سے ڈولے کے پاس آیا اور دونوں ہسپتال سے نکل کر مال روڈ کی طرف چلا گیا۔ بعد میں ڈولے... امارا مطلب ہے چھوٹو نے وہیں سے شیر محمد کے موبائل پر فون کیا تھا۔''

شانی کے چہرے پر ابھی تک ہیجانی تاثرات تھے۔اس نے اپنا سر گھٹنوں میں جھکا دیا اور منمنائی۔ ''یہ بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے، اجمل! بہت بڑا۔''

''کیا آپ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہیں باجی جی؟'' ڈولے نے پوچھا۔

''ہاں ڈولے! میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' شانی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

ڈولا اور شہاب فوراً باہر چلے گئے۔شانی نے کہا۔''اب کیا ہوگا اجمل؟ چوہدری بشیر کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بڑی ہلچل مچے گی۔ پتا نہیں کس کس کی مصیبت آئے گی؟''

''تسلی کی بات صرف ایک ہے۔جس جس نے بھی اس کوٹھی میں آپ کو دیکھا اور پہچانا ہے وہ زندہ نہیں ہے۔ مری کے ہسپتال میں بھی آپ کو کسی نے نہیں پہچانا۔ نہ ہی یہاں راولپنڈی میں کسی نے دیکھا ہے۔آپ مہینوں سے لاپتا ہیں۔ ہمارے منہ میں خاک ... رستم بھائی کو مُردہ سمجھ لیا گیا ہے۔امید نہیں ہے کہ ان قتلوں کے لئے کسی کا دھیان جلدی آپ کی طرف جائے گا۔''

''لیکن ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا اجمل۔ کیا پتا چوہدری بشیر نے لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے ہی کسی کو میرے بارے میں بتا دیا ہو۔''

''چلیں جو بھی ہے، اگلے دس بارہ گھنٹے میں سامنے آجائے گا۔''

پھر اجمل شانی کو بتانے لگا کہ وہ کیسے اور کیونکر کوٹھی میں داخل ہوا اور داخل ہونے کے بعد کیا ہوا۔اس کی گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ اجمل خان کو کل رات ہی کوٹھی میں گھسنے کا موقع مل گیا تھا۔اس نے کوٹھی کے پچھواڑے ٹیکسی کار کھڑی کی اور اس کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ وہ خراب نظر آئے۔ یہ ایک سازگار اتفاق تھا کہ کوٹھی میں گھسنے کے بعد اجمل خان کسی کو نظر نہیں آیا۔ رکھوالی کے کتے نے تھوڑی دیر شور مچایا پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ جس وقت اجمل کوٹھی میں گھسا، شانی کمرے میں بندھی اور گن کٹے ناصر پر چلا رہی تھی۔ اجمل اس کی آواز ٹریس کرتا ہوا اس کمرے تک پہنچ گیا اور ساتھ والے کمرے میں چھپ گیا...... یہ ایک سٹور روم تھا اور سامان پر پڑی ہوئی گرد دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے شاذونادر ہی کھولا جاتا ہے۔ اجمل کے چھپنے کے لئے یہ جگہ بڑی مناسب تھی۔ اس سٹور روم کا ایک چھوٹا دروازہ اس کمرے میں بھی کھلتا تھا جہاں شانی کو رکھا گیا تھا تاہم یہ دروازہ مقفل تھا۔ اس دروازے کی موجودگی سے یہ فائدہ ہوا کہ اجمل تک وہ ساری آوازیں پہنچتی رہیں جو شانی والے کمرے سے ابھرتی تھیں۔ اجمل نے وہ سنگین گفتگو بھی کان لگا کر سنی جو شانی اور چوہدری بشیر کے درمیان ہوئی

تھی۔اس گفتگو کا کافی حصہ اجمل کے کانوں تک بھی پہنچا۔

جب شانی نشہ آور دوا کے زیر اثر گہری غنودگی میں چلی گئی تو اجمل نے سٹور روم اور کمرے کے درمیانی دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

بعدازاں کمرے میں نکاح خواں مولوی داخل ہو گیا اور اجمل پر صورت حال کی سنگینی مزید واضح ہوگئی۔ جب کمرے میں زبردستی شانی کا نکاح پڑھانے کی کوشش کی جارہی تھی، اسی وقت سٹور روم کا دروازہ اچانک کھلا اور کسی نے سٹور روم کی لائٹ جلانا چاہی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اجمل نے سٹور کا بلب اتار رکھا تھا تاہم آنے والے کے پاس ٹارچ بھی تھی۔ اس نے دفعتاً ٹارچ جلالی۔ اجمل خان جو پچھلے تقریباً بائیس گھنٹوں سے اس سٹور روم میں چھپا ہوا تھا مزید چھپا نہ رہ سکا۔ اس سے پہلے کہ اندر آنے والا اجمل کو دیکھ کر شور مچاتا، اجمل نے اس کے دل پر خنجر کا وار کیا اور اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ باہر کھڑے دو افراد نے سٹور روم میں ہونے والی گڑبڑ کو محسوس کر لیا اور مقتول کو پکارنے لگے۔ اجمل خان سمجھ گیا کہ اب چھپنا اور خاموش رہنا بے کار ہے۔ اس نے اپنا سائیلنسر لگا پسٹل نکال لیا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ یہاں اس نے گارڈ کو پسٹل سے اور ناصر کو خنجر کے پے در پے وار سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب چوہدری بشیر کمرے میں شانی سے دست درازی کر رہا تھا، کسی کے زمین بوس ہونے کی آوازیں سنائی دی تھیں اور ذرا دیر کے لئے وہ ٹھٹک گیا تھا۔ یہ گارڈ یا ناصر اعجاز کے گرنے کی آوازیں ہی تھیں یا پھر دونوں کے یکے بعد دیگرے گرنے کی آوازیں ہوں گی۔ نکاح خواں کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے قتل ہوا۔ اس نے نہ صرف شور مچانے کی کوشش کی بلکہ کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کرنا چاہا تھا۔ کمرے میں فون سیٹ موجود تھا شاید وہ دروازہ بند کر کے فون استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اجمل نے اسے اتنی مہلت نہیں دی تھی۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے لیکن نہایت خاموشی سے ہوا تھا۔ اندرونی کمرے سے شانی سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے بدمست بشیر کو اس آفت کا پتا تبھی چلا تھا جب اجمل نے کمرے کے دروازے پر ہلا بولا تھا۔

اجمل کی پوری رُوداد سننے کے بعد شانی کو اجمل کی بے پناہ دلیری اور خداداد ذہانت کا احساس ہوا۔ اس نے کوٹھی کے سٹور روم میں قریباً ایک دن تک بڑے صبر سے مناسب موقع کا انتظار کیا تھا اور جب موقع آیا تھا تو وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اپنے حریفوں کو خاکستر کر گیا تھا۔ اس کا یہ روپ اس کے ظاہری روپ سے بہت مختلف تھا۔

اگلے روز اجمل خان کا دوست شیر محمد کہیں سے دوپہر کا ایک اخبار ڈھونڈ لایا۔ اس اخبار

میں کل رات زینت کالونی کی ایک کوٹھی میں ہونے والی لرزہ خیز واردات کا احوال شہ سُرخیوں کے ساتھ درج تھا۔ کچھ لاشوں کی خون آلود تصاویر بھی چھاپی گئی تھیں۔ شہ سرخی تھی۔

''لاہور کے مشہور صنعت کار سمیت سات افراد کا بہیمانہ قتل۔''

لیکن اس شہ سرخی کے نیچے جو ذیلی سُرخیاں اور تصویریں تھیں انہوں نے شانی اور اجمل وغیرہ کو بری طرح چونکا دیا۔ لکھا تھا۔ ''کمرشل پلاٹ کی ملکیت کا شاخسانہ...... وحدت گروپ کے لوگوں نے پرسوں ہونے والے قتل کا بدلہ چکا دیا۔ خونی واردات میں چوہدری بشیر، اس کا سیکرٹری ناصر اعجاز اور اس کی بیوی شائلہ بیگم بھی شامل ہیں۔ تمام افراد کو بے دردی سے مارا گیا۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تیز دھار آلے سے بھی وار کیے گئے۔''

ان ذیلی سُرخیوں کے نیچے مکمل خبر کا متن اس طرح تھا۔ ''صدر کے علاقے میں کمرشل پلاٹ کی ملکیت سے جنم لینے والا تنازعہ کل رات ایک خونی واردات کا سبب بن گیا۔ وحدت گروپ کے لوگوں نے زینت کالونی کی ایک کوٹھی پر دھاوا بول کر صنعت کار چوہدری بشیر اور اس کے سیکرٹری و گارڈ سمیت سات افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یاد رہے کہ دو کینال کا یہ پلاٹ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان پچھلے کئی ہفتوں سے وجہ تنازعہ بنا ہوا تھا۔ یہ پلاٹ چوہدری بشیر کی گارمنٹس فیکٹری سے ملحق ہے اور چوہدری کو اس کی ملکیت کا دعویٰ تھا۔ صرف دو دن پہلے مری روڈ کے علاقے میں وحدت گروپ کے ایک نواز راجا نامی شخص کو موٹر سائیکل سواروں نے برسٹ مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ باخبر حلقوں کا کہنا تھا کہ یہ کارروائی چوہدری بشیر کے کارندوں نے کی ہے اور وحدت گروپ کے لوگ جلد ہی اس کا بدلہ لیں گے۔''

شانی نے یہ طویل سنسنی خیز خبر آخر تک پڑھی اور سناٹے میں رہ گئی۔ اسے فوراً ہی وہ سیاہ ہنڈا کار یاد آگئی تھی جو اس نے اجمل کے ساتھ کوٹھی چھوڑتے وقت کوٹھی کی طرف مڑتے دیکھی تھی۔

پھر شانی کی نگاہ اسی خونی واردات کے حوالے سے ایک اور چھوٹی خبر پر پڑی۔ اس خبر میں لکھا تھا۔ ''حملہ آوروں کی سیاہ ہنڈا موقع واردات سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر حادثے کا شکار ہوگئی۔ کار ایک اسٹیشن ویگن سے ٹکرا کر گرین بیلٹ میں گھس گئی۔ اسی دوران میں پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی اور سب انسپکٹر نے وحدت گروپ کے تین افراد کو پہچان لیا۔ ان لوگوں سے واردات کے دوران استعمال ہونے والے ہتھیار بھی برآمد ہوئے ہیں۔ وحدت گروپ کے کم از کم تین افراد بھاگنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں

چھاپے مار رہی ہے۔ وحدت گروپ کی طرف سے اس واردات سے لاتعلقی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ وحدت گروپ کا سرغنہ راجا وحدت روپوش ہو گیا ہے۔''

یہ خبریں بڑی تعجب خیز تھیں اور بہت غیر متوقع بھی۔ شانی کو یاد تھا کہ جب وہ مری سے زینت کالونی کی کوٹھی میں پہنچائی گئی تھی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ناصر نے فون پر چوہدری بشیر کے موبائل پر بات کی تھی۔ اس نے شانی کی بحفاظت آمد کے علاوہ کسی جھگڑے کی بات بھی کی تھی۔ اس نے سنگین لہجے میں کسی پٹواری اور قانون گو وغیرہ کا ذکر کیا تھا۔ غالباً یہ اسی جھگڑے کے نتائج تھے جو آج اخباروں کی سُرخیوں میں نظر آئے تھے۔

اتفاق یہ ہوا تھا کہ اس کوٹھی میں کوئی گواہ زندہ نہیں رہا تھا۔ شانی اور اجمل وہاں کوئی ایسی شہادت بھی چھوڑ کر نہیں آئے تھے جو شانی کی طرف اشارہ کر سکتی۔ یہاں تک کہ شانی کا پہاڑی لباس بھی اجمل ہینگر سے اتار کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس واردات کی تفتیش کوئی دوسرا رخ اختیار کر جاتی۔

شیر محمد کے گھر میں فون موجود تھا۔ یہاں سے شانی نے ایک بار پھر حاجی حیات اور اس کے خاص ماتحت سب انسپکٹر اختر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد کامیابی ہوئی۔ اس کا رابطہ سب انسپکٹر اختر کے موبائل سے ہو گیا۔ اختر اسلام آباد میں تھا۔ شانی نے اسے بتایا۔ ''تین دن سے تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اختر! حاجی حیات سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا...... کیا کر رہے ہو تم لوگ؟''

''شانی بی بی! میں تو ایک تاریخ پر اسلام آباد آیا ہوا ہوں۔ حاجی حیات صاحب اسی معاملے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' اختر کا اشارہ رستم اور ناصر وغیرہ کی گمشدگی والے معاملے کی طرف تھا۔

شانی کا دل دھڑک اٹھا۔ ''کوئی خبر ہے؟''

''نہیں، میرے پاس تو نہیں ہے بی بی۔ شاید حاجی صاحب کے پاس ہو۔''

شانی نے کہا۔ ''اس وقت تمہیں ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔ حفیظ زخمی ہوا ہے اور مری کے ہسپتال میں ہے۔ اسے فوری نگہداشت اور توجہ کی ضرورت ہے۔''

شانی نے اس بارے میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اختر کو بتایا۔ وہ فون پر وضاحت سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اختر نے کہا۔ ''اب آپ اس کے بارے میں بے فکر ہو جائیں۔ میں حاجی صاحب سے مشورے کے بعد ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

''حاجی صاحب کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

"وہ تو راولپنڈی میں ہی ہیں۔کیا آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں؟"

شانی نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ وہ جتنی جلدی مل سکیں اتنا ہی بہتر ہے..... لیکن مناسب یہی ہے کہ وہ پہلے کی طرح سادہ لباس میں آئیں۔

اختر نے شانی سے اس کا موجودہ ایڈریس پوچھا جو شانی نے بتا دیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد حاجی حیات گھر کے دروازے پر موجود تھے۔شانی کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔حاجی حیات اسے رستم کے بارے میں کوئی اچھی خبر دے سکتے تھے اور رستم کے حوالے سے کسی اچھی خبر کے لئے وہ اسی طرح ترسی ہوئی تھی جیسے کئی دن صحرا میں پیاسا بھٹکنے والا پانی کے لئے ترستا ہے۔

حاجی حیات ایک خستہ حال مزدا کار میں یہاں پہنچے تھے۔وہ شلوار قمیص میں تھے اور ایک سوتی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔کوئی قریبی شخص ہی انہیں اس حلیے میں پہچان سکتا تھا۔ان کی نگاہیں شانی کی نگاہوں سے ملیں۔شانی کی نگاہوں میں امید کے ستارے چمکے لیکن فوراً ہی بجھ گئے۔حاجی حیات کے چہرے پر اسے کوئی حوصلہ افزا تاثر نظر نہیں آیا۔شانی کو لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔اس نے خود کو بہ مشکل سنبھالا۔گھر کی بیٹھک میں حاجی حیات سے اجمل اور شانی کی طویل بات چیت ہوئی۔سب سے پہلے تو حاجی حیات نے شانی کو تسلی تشفی دی اور اسے یقین دلایا کہ رستم کا کھوج ملنے تک وہ چین سے بیٹھیں گے اور نہ تلاش کی رفتار سست ہونے دیں گے۔حاجی حیات نے تفتیش کی تفصیل سے شانی کو آگاہ کیا۔اس کے بعد حاجی حیات نے شانی سے دریافت کیا کہ وہ یہاں کیونکر اور کیسے پہنچی اور حفیظ کے زخمی ہونے کا کیا ماجرا ہے۔

جواب میں شانی نے تقریباً سبھی کچھ حاجی حیات کو تفصیل سے بتا دیا۔حوالدار ناگی کی وہ تلاش جو اس نے دراز قد شخص کے حوالے سے شروع کی تھی.. پھر ناگی کی ناگہانی موت اور حفیظ کا زخمی ہونا۔اس کے بعد شانی اور اجمل کا حفیظ کو مری لانا اور بعدازاں مری میں بالکل غیر متوقع طور پر شانی کا ناصر اعجاز کے ہتھے چڑھ کر چوہدری بشیر کی دسترس میں چلے جانا۔شانی نے زینت کالونی میں پیش آنے والے سارے واقعات الف سے یے تک حاجی حیات کے گوش گزار کر دیئے۔

حاجی حیات بڑے تحمل اور بڑی توجہ سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔درمیان میں اس نے شانی اور اجمل سے دو چار سوال بھی کئے۔آخر میں حاجی حیات نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔"چوہدری بشیر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی خبر مجھے واردات کے ایک گھنٹے بعد ہی مل

گئی تھی۔تب تک مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ تم دونوں روکیٹ کے بجائے یہاں راولپنڈی میں ہی موجود ہو۔اس کے باوجود پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ واردات اس طرح نہیں ہوئی جس طرح میڈیا میں آ رہی ہے۔اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔اب جو کچھ تم نے یعنی تم دونوں نے مجھے بتایا ہے...... یہ میرے لئے بڑا حیران کن اور سنسنی خیز ہے۔اگر تم لوگ خود نہ بتاتے تو شاید میں کبھی اس پر یقین نہ کر سکتا۔"

چوہدری بشیر کے قتل اور اس کے اثرات کے حوالے سے شانی، اجمل اور حاجی حیات میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔اس کے بعد حاجی حیات نے شانی کو دو بہت اہم باتیں بتائیں۔پہلی بات کا تعلق روکیٹ سے تھا۔حاجی نے کہا۔"میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہاں جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد چھوٹے سائیں کے چیلوں نے اجمل کو نشانہ ضرور بنانا ہے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ متولی ابرار کے زخمی ہونے کا الزام اجمل پر نہ لگائیں۔یہ تو اچھا ہوا کہ اجمل تم لوگوں کے پیچھے ہی پیچھے مری چلا آیا۔اگر یہ واپس روکیٹ جاتا تو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہو جانا تھا۔میں ایسے مجاوروں کی خطرناک دشمنی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔اب بہتر یہ ہے کہ مُنے، گریس اور اس کے بچے کو بھی جلد از جلد روکیٹ سے نکال لیا جائے۔میں اس سلسلے میں ابھی انتظام کرتا ہوں اور اس بارے میں مجھے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔"

حاجی حیات نے جو دوسری بات بتائی وہ رنگ والی کے آگے جوہر آباد گاؤں کی تھی۔وہی جوہر آباد جہاں تاؤ حشام کی قید سے چھوٹنے والے ڈاکٹر زیب النساء اور ڈاکٹر بہروز ایک نئے عزم سے ہسپتال کا آغاز کرنے والے تھے۔جب شانی جوہر آباد سے نکلی تھی تو ایک طرف ہسپتال کھولے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف قدرت اللہ کے چیلے اس کوشش کو سبوتاژ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

حاجی حیات نے بتایا۔"پچھلے تین چار مہینے میں جوہر آباد میں بڑی نمایاں اور تیز رفتار تبدیلیاں آئی ہیں۔ڈاکٹر بہروز، ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ ہسپتال میں ہے اور اس نے ہسپتال کو بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ڈاکٹر زیب النساء بھی اس کے ساتھ ہے۔اکثر لوگوں کو پتا ہے کہ ڈاکٹر زیب النساء کا شوہر ڈاکٹر محسن نارپوریوں کی قید میں قتل ہو گیا تھا اور اس قید میں زیب النساء سے بدسلوکی بھی ہوتی رہی ہے۔اب لوگوں کی ساری ہمدردیاں ڈاکٹر زیب النساء کے ساتھ ہیں اور اس نے بھی خود کو ہسپتال کے لئے وقف کر رکھا ہے۔اردگرد کے علاقوں کے لوگ بڑی تیزی سے ہسپتال کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔تمہیں پتا ہے، ہسپتال کا نام کیا رکھا گیا ہے؟"

شانی نے سوالیہ نظروں سے حاجی حیات کو دیکھا۔

''شانی بی بی ہسپتال۔'' حاجی حیات نے کہا۔''لوگ تم سے بہت پیار کرتے ہیں شانی! اس پیار میں وہ سارا پیار بھی شامل ہوگیا ہے جو تمہاری والدہ وڈی آپا سے کیا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تم نے ڈاکٹر بہروز اور زیب النساء وغیرہ کو نار پوریوں سے چھڑا کر اور کمبوہوں اور نار پوریوں میں لڑائی ختم کرا کے بہت بڑے کام کئے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ تمہاری وجہ سے اس علاقے میں اور بھی بہت سی اچھی تبدیلیاں آئیں گی۔ میں سمجھتا ہوں شانی بی بی! تم خوش قسمت ہو کہ اس چھوٹی سی عمر میں تمہیں اتنی عزت اور محبت مل رہی ہے۔''

''پیر قدرت اللہ کا رویہ کیسا ہے؟''

''اب میں اسی بات کی طرف آ رہا تھا۔ قدرت اللہ اور اس کے ہزاروں عقیدت مند اس صورتِ حال کی وجہ سے سخت غصے میں ہیں۔ وہ بھی اپنے پاؤں جمائے رکھنے کے لئے پورا زور لگا رہے ہیں۔ پیر قدرت اللہ نے خود علاقے کے دورے کئے ہیں اور کئی کئی دن وہاں رہا ہے۔ اس نے اپنے سینئر چیلوں کی وہاں ڈیوٹیاں لگادی ہیں اور ان کی پوری پوری خبر رکھ رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی موت کو بھی کیش کرانے کی کوشش میں ہے۔ اس کے چیلے تمہارے اور رستم کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی سے بی بی کو پرانی خارش تھی اور رستم نے بی بی کے کہنے پر اسے قتل کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ''خارش والا معاملہ'' بھی دن رات اچھالا جا رہا ہے۔''

''جلدی بیماری والی بات؟'' شانی نے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔ قدرت اللہ کے عقیدت منداسے معجزہ قرار دیتے ہیں اور اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔'' حاجی حیات نے ذرا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''ویسے یہ عجیب اتفاق ہوا ہے۔ اس جلدی بیماری والے واقعے نے خاصی شہرت پائی ہے۔ حیران کن طور پر وہی لوگ بیمار ہوئے جنہوں نے چوہدری بشیر کی لاہور والی کوٹھی میں پیر قدرت اللہ اور اس کے حامیوں پر ہاتھ اٹھایا اور کھینچا تانی کی۔ نہ صرف وہ لوگ خود بیمار ہوئے بلکہ ان کے گھر والے اور قریبی عزیز بھی اس بیماری کا شکار ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے قدرت اللہ کی شہرت کو بڑا بڑھاوا ملا ہے۔''

''یہ بات ماننے والی نہیں کہ صرف وہی لوگ بیمار ہوئے جنہوں نے قدرت اللہ سے جھگڑا وغیرہ کیا۔'' شانی نے کہا۔''میرے خیال میں یہ ایک چھوت کی تکلیف تھی جس میں بہت سے لوگ بیمار ہوئے۔ قدرت اللہ اور اس کے ماننے والوں نے اس معاملے کا بس ایک

رخ پیش کیا۔''

''کچھ بھی ہے۔ اس معاملے نے قدرت اللہ کو بہت فائدہ دیا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ان لوگوں نے دو تین کتابچے بھی چھاپے ہیں۔ ایک کا نام ''کرامت'' ہے، دوسرے کا نام ''کرشمہ'' تیسرے کا نام بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ان کتابوں میں درجنوں لوگوں کی تصویریں اور ان کے بیان وغیرہ چھاپے گئے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو بیمار ہوئے اور بعد ازاں توبہ کرنے اور قدرت اللہ سے معافی مانگنے کے بعد صحت یاب ہوئے۔ یہاں تک کہ ان بیانوں میں چوہدری بشیر کا بیان بھی شامل ہے اور اسے نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ چوہدری بشیر نے مریدکے میں ناصر اعجاز کے گھر اپنے بیمار ہونے کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کس طرح اس کے جسم پر چھپاکی جیسے بڑے بڑے داغ نمودار ہوئے تھے اور کس طرح وہ پگھلی ہوئی برف اپنے جسم پر ڈال کر بھی جلن سے تڑپتا رہتا تھا۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی صحت یابی صرف قدرت اللہ کی مرہونِ منت ہے۔''

''عام لوگ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''عام لوگ اس بارے میں کھل کر بات نہیں کرتے۔ وہ لوگ بھی قدرت اللہ کی شعبدہ بازیوں سے خوف زدہ رہتے ہیں جو اسے دل سے بُرا سمجھتے ہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ قدرت اللہ کے علاج کے کچھ طریقے بڑے غلط ہیں۔ وہ جانوروں اور پرندوں کو بے دردی سے مارتا ہے اور ان کے خون سے عملیات کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نر اور مادہ جانور کی Meeting کے دوران میں نر کی جان لیتا ہے اور اس کے خون سے تعویذ لکھتا ہے...... لیکن اس طرح کے کاموں کے خلاف بھی کوئی آواز نہیں اٹھاتا ہے... ویسے جانوروں اور پرندوں کو بے وجہ مارنے والا معاملہ قانون کی زد میں تو آتا ہے مگر اس کے لئے کسی کو کوئی بڑی سزا نہیں ہو سکتی۔''

''لیکن حاجی صاحب، اگر کوشش کی جائے تو ان لوگوں کے خلاف اور کئی معاملوں میں [illegible] قسم کے ثبوت مل سکتے ہیں۔ کسی انسان کی جان لینے سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہوگا اور اس قدرت اللہ نے میری آنکھوں کے سامنے میری بھابو کو اپنے جادو ٹونے کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ وہ لاہور والی کوٹھی میں سسک سسک کر مرگئی لیکن اس نے اور اس کی بیوی نے اسے [illegible] نہیں جانے دیا۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔ یہی سب کچھ میرے سامنے ہوا تھا۔ آپ کہیں گے میں گواہی دوں گی اور مجھے یقین ہے کہ ایسے بہت سے مرنے والوں کے لئے چشم دید گواہ آسانی سے آپ کو مل جائیں گی۔''

حاجی حیات نے ایک گہری سانس لی۔ ”فی الحال تو یہی لوگ ہر جگہ اپنی گواہیاں پیش کر رہے ہیں۔ چند روز پہلے قدرت اللہ کے کسی عقیدت مند پبلشر نے ایک رنگ دار پمفلٹ روغنی کاغذ پر چھاپ کر اسے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں ایسے لوگوں کی مکمل تفصیل ہے جو کسی نہ کسی طور پیر قدرت اللہ کے عتاب کا شکار ہوئے اور اب گوناگوں مشکلوں اور آفتوں کا شکار ہیں۔ ان میں دو چار لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اب تک جلدی بیماری سے نجات حاصل نہیں مل سکی اور وہ موت کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔“

حاجی حیات اور شانی کے درمیان بات چیت قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ آخر میں رستم کا ذکر آیا۔ شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ حاجی حیات نے شانی کو بھرپور تسلی دی اور یقین دلایا کہ وہ جلد کسی اچھی خبر کے ساتھ یہاں آنے والا ہے۔ جاتے وقت حاجی حیات نے شانی کو بتایا کہ وہ منے، گریس اور اس کے بچے کو جلد از جلد یہاں راولپنڈی میں لا رہا ہے۔ جونہی وہ آ گئے، وہ انہیں اس بارے میں اطلاع دے گا۔

☆======☆======☆

حاجی حیات کی طرف سے اطلاع قریباً تین روز بعد آئی۔ شیر محمد کے گھر ٹیلی فون پر حاجی حیات نے شانی کو بتایا کہ مُنا، گریس اور اس کا بچہ بحفاظت روکیٹ سے راولپنڈی پہنچ گئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان کے اندازے کے عین مطابق روکیٹ میں حالات خراب ہیں۔ روکیٹ کی قریباً نصف آبادی چاچا ابراہیم پر دن رات زور دے رہی تھی کہ وہ اپنے مہمانوں کو یہاں سے چلتا کرے ورنہ مجاوروں اور روکیٹ کے مکینوں میں باقاعدہ جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ حاجی حیات کی ہدایت پر پہلوان، جیرا اور اس کے ایک درجن ساتھیوں نے بڑی حکمت کے ساتھ دونوں بچوں اور گریس کو وہاں سے نکالا تھا۔ اب وہ تینوں راولپنڈی کے ایک پوش علاقے کی وسیع کوٹھی میں حاجی حیات کی تحویل میں تھے۔

حاجی حیات نے فون پر شانی سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اب تم تینوں بھی اس مکان کو چھوڑ کر یہاں پہنچ جاؤ۔ یہ جگہ زیادہ بہتر اور محفوظ ہے۔ گنجان آبادیوں میں لوگ ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ یہ پُرسکون کوٹھی ہر لحاظ سے ٹھیک رہے گی۔“

حاجی حیات کی بات میں وزن تھا۔ شانی اور اجمل نے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ حاجی حیات کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ شانی، مُنے اور گریس سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔

اسی شام سات بجے کے لگ بھگ حاجی حیات نے ایک اسٹیشن ویگن بھجوا دی۔ رنگ

دار شیشوں والی یہ پرائیویٹ وین ان کے سفر کے لئے بالکل محفوظ تھی۔ یہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی وین تھی اور اس پر لوگو وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ اپنے میزبان شیر محمد کا بہت بہت شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ لوگ وین میں آ بیٹھے۔

اجمل خان کی لنگڑاہٹ اب کافی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شہاب کی چوٹیں بھی بہتر تھیں۔ شہاب اپنے گاؤں مکھن وال جانا چاہتا تھا لیکن اس میں خطرات تھے۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ وہ شانی کی ہر بات پر بڑی عقیدت مندی سے بلا چوں چرا عمل کر رہا تھا۔ روانہ ہوتے وقت شانی بالکل گم صم تھی۔ درحقیقت وہ ابھی تک ان خونی مناظر کے اثر سے نہیں نکل پائی تھی جو اس نے زینت کالونی کی کوٹھی میں دیکھے تھے۔ سیڑھیوں پر الٹی سیدھی لاشیں، نکاح خواں کا خونچکاں جسم، بند کمرے میں شمائلہ کا رونا چلانا اور ان سارے مناظر میں سے دردناک ترین منظر چوہدری بشیر کی پیشانی کا غائب ہو جانے والا ٹکڑا۔ اس کی عینک کا ایک شیشہ لہو رنگ تھا اور شکل مسخ ہو گئی تھی۔

شانی ان مناظر کو ذہن سے نکالنے کی بہت کوشش کرتی تھی مگر کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اسٹیشن وین میں بیٹھی تو سامنے ہی شام کا اخبار نظر آ گیا۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اخبار پر نگاہ دوڑانے لگی۔ زینت کالونی والے واقعے میں چوہدری بشیر کو قتل ہوئے چار دن گزر چکے تھے تاہم اخبار میں اس کی بازگشت موجود تھی۔ وحدت گروپ کے کم از کم دس افراد گرفتار ہو چکے تھے اور باقی نامزدگان کے لئے چھاپے مارے جا رہے تھے۔ سرغنہ راجا وحدت ابھی تک روپوش تھا۔ کسی نامعلوم مقام سے اس نے پولیس حکام کو مطلع کیا تھا کہ وہ عنقریب کسی اعلیٰ حکومتی عہدے دار کے ذریعے خود کو پیش کر دے گا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا یہ بیان دہرایا تھا کہ چوہدری بشیر اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت میں اس کے ساتھیوں کا ہاتھ نہیں اور نہ وہ خود اس واقعے میں ملوث ہے۔ بہرحال پولیس تفتیش کا نوے فیصد زور وحدت گروپ کی طرف تھا۔

اسٹیشن وین اس گنجان آبادی سے روانہ ہوئی اور صدر کے علاقے کی طرف چل پڑی۔ راولپنڈی کی سڑکیں جگمگا رہی تھیں۔ زندگی حرکت میں تھی۔ گاڑیوں کا شور، ہارنوں کی آوازیں، جلتے بجھتے ٹریفک سگنلز، بس سٹاپوں پر منتظر چہروں کا ہجوم، فلموں کے بڑے بڑے ... دکانوں اور شاپنگ پلازا کے دل آویز نیون سائنز اور رستم کہاں تھا؟ کتنی دور، کسی ...نے میں؟ کسی تاریک بستی یا کسی پہاڑ کی کسی اندھی کھوہ میں۔ اس کا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ جدائی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ رستم کے وقت رخصت شانی نے ہرگز نہیں سوچا تھا کہ یہ جدائی

ایسا رخ اختیار کرے گی۔

وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔ ڈرائیور پولیس کا ہی ایک ریٹائرڈ ملازم تھا اور حسن ابدال ہی کے علاقے کا تھا۔ وہ اجمل خان سے کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ اجمل خان بھی جب باتیں کرنے پر آتا تھا تو رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اندر سے کتنا گہرا اور گھمبیر ہے۔ اجمل خان ڈرائیور سے ہنس ہنس کر اپنے لڑکپن کی باتیں سنا رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ وہ بچپن میں بہت پیٹو تھا۔ اسی پیٹو پن کی وجہ سے اسے کھانا پکانے کا شوق پیدا ہوا۔ اب وہ پارٹ ٹائم بہترین کک ہے۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ ''پارٹ ٹائم کک ہو اور فل ٹائم کیا کرتے ہو؟''

اجمل اطمینان سے بولا۔ ''فل ٹائم میں قتل شغل کر لیتا ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے لیکن ہفتے میں دو تین قتل بھی ہو جائیں تو گزارے لائق پیسے مل جاتے ہیں۔''

اجمل کی اس بات پر ڈرائیور نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''آپ دلچسپ آدمی ہو۔'' شہاب کے ہونٹ بھی مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ ڈولا خاموش بیٹھا رہا۔ اسٹیشن ویگن ایک کشادہ سڑک پر فراٹے بھرتی پنڈی کے پوش علاقے کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک روشن سڑک کے خوبصورت فلنگ سٹیشن پر وہ فیول لینے کے لئے رکے...... اچانک رنگ دار شیشوں کی دوسری جانب شانی کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی۔ بالکل گول آنکھوں اور بالکل گول چہرے والا یہ سانولا سا شخص ویگن کے بالکل پاس سے گزرتا ہوا سڑک پار کر گیا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھے۔ ایک شاپر میں دودھ اور جوس کے ٹیٹرا پیک تھے، دوسرے میں کیلے وغیرہ تھے۔ گول مٹول چہرے والا سانولا شخص سڑک پار کر کے سامنے کی وسیع بلڈنگ میں چلا گیا۔ یہ ایک شاندار پرائیویٹ ہسپتال کی بلڈنگ تھی۔ صاف ستھرے پارکنگ لاٹ میں پانچ چھ شاندار گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

شلوار قمیص والے اس شخص کو دیکھ کر شانی کے دماغ میں گھڑ دوڑ سی شروع ہو گئی۔ کہاں دیکھا تھا اس نے یہ چہرہ؟ کہاں دیکھا تھا؟ شاید اسے کوئی وہم ہو رہا تھا...... لیکن نہیں، یہ وہم نہیں تھا پھر اسے یاد آ گیا۔ یہ چہرہ تو اس نے کئی ماہ پہلے مہتم بستی میں دیکھا تھا۔ رنگ والی کے اردگرد سارے علاقے میں دور دور تک قدرت اللہ کے چیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نامور چیلا جالب بھی تھا۔ جس طرح شاہی جوہر آباد میں دندناتا تھا، جالب مہتم بستی کا کرتا دھرتا بنا ہوا تھا۔ مہتم بستی میں شانی اور رستم جب سردار دراج کے مہمان تھے تو شانی نے کئی بار جالب اور اس کے عقیدت مندوں کو دیکھا تھا۔

یہ گول مٹول شخص جو ابھی نظر آیا تھا، جالب کا خدمت گار تھا۔ شانی نے مہتم بستی میں بھی دیکھا تھا۔ یہ شخص ہمہ وقت ناف پر ہاتھ باندھے جالب کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔ یہ یہاں ہسپتال میں کیا کر رہا تھا؟ یہ بہت مہنگا ہسپتال تھا... تو کیا جالب بھی اس شخص کے ساتھ یہاں موجود تھا؟ اگر جالب یہاں موجود تھا تو یہ بڑی انکشاف انگیز بات تھی۔ قدرت اللہ اور اس کے نامی گرامی چیلے تو خود عظیم معالج تھے۔ ان کو مستند ڈاکٹروں اور معالجوں کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟

شانی کے دماغ میں تجسس جاگنا فطری عمل تھا لیکن اس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ اس دور دراز علاقے میں رہنے والا شعبدہ باز جالب واقعی یہاں راولپنڈی میں موجود ہوگا۔ اسی دوران میں شانی کی نگاہ ڈولے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو گہرے مراقبے سے ملتی جلتی تھی۔ وہ جیسے بہت غور سے کچھ سوچنے یا جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ''کیا بات ہے ڈولے؟'' شانی نے اس کا اضطراب بھانپتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں باجی جی۔'' اس نے اپنا چھوٹا سا سر نفی میں ہلایا۔

شانی نے اسے گھورا۔ ''ڈولے! تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہو بتایا کرو۔''

ڈولے کے چہرے پر الجھن بڑھ گئی۔ وہ کھسیانا سا دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر تک مزید تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''باجی جی! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہاں آس پاس قدرت اللہ یا اس کا کوئی قریبی عزیز موجود ہے...... ہو سکتا ہے یہ صرف میرا وہم ہو اور ہو سکتا ہے......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا اور کسی حساس جانور کی طرح سڑک کے پار دیکھنے لگا۔

''کیا تمہیں کوئی آواز آ رہی ہے؟'' شانی نے سرگوشی میں پوچھا۔

''نہیں جی۔''

''کیا کچھ دیکھا ہے؟''

''نہیں جی۔'' ڈولے نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ ''بس...... بس مجھے لگ رہا ہے۔''

شانی نے دیکھا۔ ڈولے کے چھوٹے چھوٹے حساس نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ اس ...نی دور میں یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ یہ دلیل کا زمانہ ہے، یہ ٹھوس حقیقتوں کی دنیا ہے لیکن انہونیوں کے وجود سے یکسر انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چھوٹا سا بے حقیقت بونا اپنے

اندر کچھ ایسی توانائیاں رکھتا تھا جو حیران کن تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ان صلاحیتوں کے اظہار سے کنی کتراتا تھا اور شرمندہ رہتا تھا۔ یہ شانی ہی تھی جس کے ساتھ کبھی کبھی ڈوولے نے بات کرنا شروع کی تھی اور وہ بھی رازداری کے ساتھ۔ اس وقت بھی وہ سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اجمل یا شہاب نے یہ باتیں سنیں تو اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیں گے یا پھر اس طرح کی باتوں سے یہ ہوگا کہ وہ اس سے دور ہوتے جائیں گے۔

اگر کسی اور موقع پر شانی نے ڈوولے سے یہ بات سنی ہوتی تو شاید وہ اسے سنجیدگی سے لینے میں کچھ دیر لگاتی لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے گول مٹول مہتمم کی صورت جو کچھ دیکھا تھا، اس کے بعد زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ یہاں واقعی کچھ ہے۔ اجمل خان اگلی نشست پر بیٹھا شہاب سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈرائیور باہر کھڑا ایندھن بھروا رہا تھا۔ شانی نے اجمل کو اپنے پاس پچھلی نشست پر بلایا اور اس سے کہا۔

''اجمل! وہ دیکھو سامنے...... وہ کیا ہے؟''

''ہسپتال ہے جی...... فضل الٰہی ہسپتال۔''

''مجھے لگتا ہے اجمل! یہاں کچھ ہے۔ میں نے ابھی یہاں سے ایک بندے کو گزرتے دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب جی؟'' اجمل نے پوچھا۔

شانی نے اسے ساری تفصیل بتا دی، صرف ڈوولے کی بات کو حذف کر دیا۔ اجمل غور سے سنتا رہا پھر ایک دم وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ام ابھی گیا اور ابھی آیا۔ ام کو پیشاب کی حاجت ہو رہا ہے۔ یہ ہسپتال والا اتنا کٹھور دل نہیں ہوگا کہ ام کو اندر نہ گھسنے دے۔''

شانی سمجھ گئی کہ وہ ہسپتال کے اندر جا کر تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ وہاں جالب یا قدرت اللہ کا کوئی اور ساتھی تو موجود نہیں۔ قدرت اللہ کے ساتھی شاہی کو تو وہ ذاتی طور پر بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جالب اور شاہی وغیرہ کی شکلیں بھی دیکھی ہوئی تھیں۔ ان سب لوگوں سے اجمل کا بیر جتنا پرانا تھا اتنا ہی گہرا بھی تھا۔

شانی اسے روکتی ہی رہ گئی اور وہ باہر چلا گیا۔ آخر شانی نے کہا۔ ''اجمل! احتیاط سے...... اب میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی ہوں۔ نہ ہی کسی کو کوئی نقصان پہنچے...... میری بات سن رہے ہو ناں؟''

''امارا بہن بالکل بے فکر ہو جائے۔'' اجمل نے مخصوص لہجے میں کہا اور دو جستیں لگا کر سڑک کے پار یوکلپٹس کے پیڑوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

ایسے موقعوں پر اجمل کی تمام حسیات پوری طرح بیدار ہو جاتی تھیں۔ اس نے اپنی قمیص کے اوپر سے ٹٹول کر پستول کی موجودگی کو یقینی بنایا اور مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار بھی پٹھان ہی تھا، وہ اجمل کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔ اجمل نے دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ وہ پارہ چنار کی سائیڈ کا ہے۔ اجمل نے اس سے اسی لہجے میں پشتو بولی اور اسے بتایا کہ اس کا ماموں یہاں زیر علاج ہے۔ چوکیدار نے کمرہ نمبر پوچھا۔ اجمل نے تکے سے سات نمبر بتایا۔ یہ تکا چل گیا اور اجمل خان اس شاندار ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ اسے ہسپتال کے بجائے پرائیویٹ کلینک کہنا زیادہ مناسب تھا۔ عمارت بہت بڑی نہیں تھی۔ اجمل خان نے دس پندرہ منٹ اِدھر اُدھر گھومتے گزارے۔ وہ چھ چھ بیڈز والے چار پانچ وارڈز میں گیا۔ پرائیویٹ کمروں کے اندر بھی ''غلطی'' سے جھانکا لیکن کہیں کوئی شناسا یا مشکوک صورت دکھائی نہیں دی۔ جلد ہی اجمل خان کو اندازہ ہو گیا کہ کلینک کا ایک زیادہ ''پرائیویٹ پورشن'' بھی ہے۔ یہ قریباً پانچ عدد وی آئی پی رومز تھے۔ اُدھر سکیورٹی کا انتظام بھی تھا۔ پوری شناخت اور انکوائری کے بغیر کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا۔

اجمل خان کی چھٹی حس نے کہا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہے تو یہاں ہے۔ یہاں سکیورٹی پر مامور لوگوں میں اجمل کو ایک دو مشکوک افراد بھی نظر آئے جیسے یہ لوگ کلینک کے نہیں تھے، آؤٹ سائیڈر تھے۔ اجمل سمجھ گیا کہ یہاں سے آگے جانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ ایک قالین پوش راہداری سے گزر کر ایک بغلی دروازے سے عمارت کے پہلو کی طرف چلا گیا۔ یہاں بلڈنگ ڈبل سٹوری تھی۔ اجمل نے اندازہ لگایا کہ شاید دوسری منزل کی کوئی کھڑکی کھلی مل جائے اور وہ وی آئی پی رومز تک جانے میں کامیاب ہو جائے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے ورزشی جسم کو پنجوں پر تھوڑا سا اچھال کر ایک چھجے سے لٹکایا اور چند ہی سیکنڈ میں بالائی منزل کی بیرونی کارنس پر پہنچ گیا۔ اس تنگ کارنس پر پاؤں جما کر چلنا خاصا دشوار تھا۔ اجمل نے یہ خطرہ مول لیا اور دیوار سے چپٹ کر کارنس پر چلتا ہوا مختلف کھڑکیوں پر قسمت آزمائی کرنے لگا۔ چوتھی یا پانچویں کھڑکی میں سے ایک پٹ اسے کھلا مل گیا۔ کمرے کی سن گن لینے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔

یہ شاندار لگژری کمرہ خالی تھا۔ مریض اور تیماردار دونوں کے بیڈ خالی تھے۔ میڈیکل آلات نہایت جدید تھے۔ ایک مہنگی نفاست ہر طرف جلوہ گر تھی۔ اجمل خان اس کمرے سے

گزر کر خاموش کوریڈور میں آ گیا۔ فرش پر فرانسیسی ٹائلز دیواروں پر امپورٹڈ رنگ، امریکن دروازے اور اٹلی کے طلائی ہینڈل۔ یہ جیسے ہسپتال نہیں کسی یورپین پرنس یا ڈیوک کا محل تھا۔ عزرائیل کو ایسی چیزوں سے کہاں مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ اجمل خان نے دل میں سوچا۔

اچانک اسے اپنے سامنے والے کمرے میں کسی آہٹ کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی شوخ نسوانی ہنسی سنائی دی۔ کمرے کے دروازے پر 2 نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجمل نے ہمت کر کے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اسے کمرے کا وسطی حصہ نظر آنے لگا۔ اندر نیلگوں نائٹ بلب روشن تھا۔ اجمل سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے پیر قدرت اللہ کے دیہاتی چیلے جالب کو دیکھا۔ بے شک وہ جالب ہی تھا۔ کتھولی گاؤں سے آگے مہتم بستی میں یہی جالب، پیر قدرت اللہ کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ قدرت اللہ کے دوسرے نامور چیلے شاہی کا ہم منصب تھا۔ وہ کبھی کبھار شاہی کے ہمراہ اجمل خان کے گاؤں میں بھی آیا کرتا تھا۔ اس سانولے بھدے شخص کو اجمل بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کی قمیص آگے سے پتلون کے اندر تھی اور پیچھے سے نکلی ہوئی تھی۔ ٹائی کی ناٹ بھی ڈھیلی ہو کر سینے کے وسط تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس نہایت نفیس کمرے میں اجڈ جالب ایسے ہی لگتا تھا جیسے خوب صورت کراکری کی دکان میں بیل گھسا بیٹھا ہو۔ قریب ہی میز پر دو شاپر پڑے تھے۔ ایک میں جوس اور دودھ کے ڈبے تھے...... دوسرے میں فروٹ۔

ایک قبول صورت نوجوان نرس ہاتھ میں غالباً نیوروبیان کا سرخ انجکشن لئے کھڑی تھی۔ جالب نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔ ''پر میری شہزادی ہر ٹیکے کی گولی بھی تو بنی ہوتی ہے۔ گولی کھلا دیا کر۔''

''گولی سے معدہ خراب ہوتا ہے مختار صاحب۔ ویسے آج درد نہیں ہوگا۔ بڑے پولے ہاتھ سے لگاؤں گی۔'' نرس نمائشی مسکرائی۔

''چلو دیکھ لیتے ہیں آج پھر۔'' جالب نے کہا جو یہاں ''مختار صاحب'' کے نام سے موجود تھا۔

وہ اوندھا لیٹ گیا اور پتلون نیچے کھسکا دی۔ اس کا کالا کلوٹا کولہا نمایاں ہو گیا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے لیکن بڑی احتیاط سے نیڈل جالب کے چربی دار گوشت میں اتاری۔ وہ پنجابی میں تقریباً چلا اٹھا۔ ''اوئے مار دتا ای ظالمے۔''

اس نے ٹانگ اکڑا لی اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ شکل دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اسے سوئی نہیں

خنجر گھونپا گیا ہے۔ اس کی کم دلی پر لڑکی کی مسکراہٹ ذرا گہری ہو گئی۔

انجکشن لگ چکا تو جالب نے گھور کر لڑکی کو دیکھا۔

''آپ بھی بس ایویں ہیں مختار جی۔'' وہ قدرے شوخی سے بولی۔ لگتا تھا کہ ان کے درمیان خاص قسم کی بے تکلفی موجود ہے۔

''اچھا، میں ایویں ہوں۔'' وہ تڑخ کر بولا پھر اس نے پتلون برابر کی اور لڑکی پر پل پڑا۔ اسے دبوچ کر اس نے بیڈ پر پھینکا اور اسے ڈھانپ لیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی اور ساتھ ساتھ دبی آواز میں ہنسنے لگی۔ جالب کے ہاتھ شیطانی انداز میں چلنے لگے اور لڑکی اپنے لباس سے محروم ہونے لگی۔ اجمل نے سرخ چہرے کے ساتھ اپنی نگاہ کی ہول میں سے ہٹا لی۔

یہ ہٹا کٹا جالب بیمار تو ہرگز نظر نہیں آتا تھا۔ جو انجکشن اس نے لگوایا تھا وہ بھی طاقت کا تھا...... جو بعض لوگ شوقیہ بھی لگوانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شخص یقیناً یہاں کسی چکر میں موجود تھا۔ اچانک راہداری کے سامنے والے دروازے کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا بلکہ شاید یہ دو افراد تھے۔ اجمل پھرتی سے واپس اس کمرے میں چلا گیا جہاں سے نکلا تھا۔ کمرہ ابھی تک بالکل خالی تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا تاکہ اگر کوئی اس کمرے میں آئے اور دروازہ کھولے تو اسے فوری طور پر نہ دیکھا جا سکے۔

خیریت ہی گزری۔ اندر آنے والے دونوں افراد باتیں کرتے ہوئے کمرے کے سامنے سے گزر گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر تھا اور دوسرا جو ہری ٹوپی والا وہ انستھیسیا ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈاکٹر دوسرے شخص کو بتا رہا تھا۔

''کسی مختار صاحب کے نام بکنگ ہے۔ اس وقت یہ پورا بلاک ہی ان کے استعمال میں ہے۔ وی آئی پی لوگ ہیں۔ مریض تو صرف دو ہیں باقی کمرے ملازمین کے استعمال میں ہیں۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اجمل نے ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا شیشے کے ایک سلائیڈنگ دروازے کے سامنے ایک سکیورٹی گارڈ ڈاکٹر کے ساتھی کا شناختی کارڈ چیک کر رہا تھا۔ اس جانچ پڑتال سے سکیورٹی کی سختی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اور انستھیسیا والا اندر چلے گئے۔ گارڈ پھر چوکس کھڑا ہو گیا۔

اب اجمل کا دل اندر جانے کو مچلنے لگا تھا۔ اس نے دو مریضوں والی بات سن لی تھی اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مریض انہی اندرونی کمروں میں ہیں جہاں یہ دونوں حضرات

گئے ہیں۔ اجمل اندر ہی رک کر سوچتا رہا اور بہتر موقع کا انتظار کرتا رہا۔ نرس نما لڑکی ابھی تک اندر ہی تھی اور یقیناً بہروپیئے جالب کے ساتھ ''مصروف'' تھی۔ چار پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر اچانک اجمل خان کو ایک موقع ملا۔ دروازے کے سامنے موجود گارڈ دائیں جانب گیا۔ دراصل ٹیلی فون کی مدھم گھنٹی سنائی دی تھی اور وہ شاید فون سننے ہی گیا تھا۔ اجمل نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور دس پندرہ قدم کا فاصلہ طے کر کے شیشے کے سلائیڈنگ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ اس پرائیویٹ کلینک کا خاص الخاص حصہ تھا۔ یہاں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ گردوپیش نہایت صاف ستھرے تھے۔ اجمل خان ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھا۔ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کا ہاتھ اپنے پسٹل تک پہنچ سکتا تھا اور وہ صورتِ حال کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتا تھا۔

☆======☆======☆

وہ ایک دیوار گیر کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اس میں موٹا شیشہ فکس تھا اور اندر کی طرف نہایت قیمتی کرٹن نظر آ رہا تھا۔ اجمل خان نے اندر جھانکا اور دنگ رہ گیا۔ یہ ایک خاصا وسیع کمرہ تھا۔ میڈیکل ایڈ کے جدید ترین آلات یہاں موجود تھے۔ بیڈ پر ایک عورت لیٹی تھی۔ ایک نرس ہاتھوں میں دستانے چڑھائے عورت کے ہاتھوں پر کوئی دوا لگا رہی تھی۔ عورت کو دیکھ کر اجمل خان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ اس پینتیس چالیس سالہ عورت کو جانتا تھا۔ یہ پیر قدرت اللہ کی پہلی بیوی تھی اور اس کا چہرہ خارش زدہ تھا۔ چھپاکی کی طرح کے سرخ ابھرے ہوئے نشان اس کے پورے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر موجود تھے۔ اجمل خان کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وہی جلدی بیماری تھی ..... ہاں، وہی جلدی بیماری تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے چوہدری بشیر اور اس کے سنگی ساتھیوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ اس بیماری کے کچھ مریض ابھی تک کہیں کہیں موجود تھے۔

اجمل نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ بے شک یہ پیر قدرت اللہ کی بڑی بیوی ہی تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بیویاں تو سخت پردے میں رہتی تھیں لیکن یہ عورت بہت زیادہ پابند نہیں تھی۔ ایک مرتبہ جب اجمل خان کے گاؤں میں پیر قدرت اللہ اپنے چیلے شاہی کے پاس آیا تھا تو یہ بی بی بھی قدرت اللہ کے ساتھ تھی۔ اجمل سناٹے میں رہ گیا۔ وہ کلینک کے اس حصے کی سکیورٹی دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اب اسے اس سکیورٹی کی وجوہات بھی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ قدرت اللہ کے ہزاروں ماننے والے اس جلدی تکلیف کو قدرت اللہ کے کرشمے کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ وہ اس تکلیف کو قدرت اللہ کے گستاخوں پر قہرِ الٰہی قرار دے

رہے تھے اور اب یہ قہرِ الٰہی قدرت اللہ کے اپنے گھر میں بھی داخل ہو گیا تھا۔

اچانک اجمل کو وہ فقرہ یاد آیا جو تھوڑی دیر پہلے اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ''یہاں دو مریض ایڈمٹ ہیں۔''

''یہ دوسرا مریض کون تھا؟''

اجمل خان دائیں طرف کے کوریڈور میں داخل ہوا۔ سامنے سے ایک خوش لباس وارڈ بوائے ایک نفیس ٹرالی دھکیلتا ہوا برآمد ہوا۔ اجمل خان کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ اجمل سفید شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ وارڈ بوائے اجمل کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے چلا گیا تاہم اس نے اجمل سے کچھ پوچھا نہیں۔

چند قدم آگے اجمل نے ایک دوسری کھڑکی میں جھانکا اور ایک بار پھر چونکا۔ یہاں بھی ایک عورت سفید اجلے بستر پر موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بھی بیماری کے آثار ذرا کم شدت سے موجود تھے۔ ایک خدمت گار لڑکی اس کے قریب بیٹھی کوئی انگلش میگزین دیکھ رہی تھی۔ اجمل اس عورت کو صورت سے نہیں جانتا تھا لیکن اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ پیر قدرت اللہ کی دوسری زوجہ ہو گی۔ اجمل کی معلومات کے مطابق قدرت اللہ کی اس منجھلی بیوی کا نام عریسہ تھا ..... عریسہ فراقی۔

اجمل خان کا خون کھولنے لگا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اسے گاؤں بدر کیا تھا ..... جن کی وجہ سے اسے اپنے بچپن کی گلیاں چھوڑنا پڑیں، اپنے قریبی رشتے داروں سے دور جانا پڑا اور اپنی منگیتر چھوڑنا پڑی۔ یہ بہروپیئے، یہ دھوکے باز ہوس کار اس کے مجرم تھے۔ رستم بھی اجمل کا بہروپ اسی لئے بنا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ اجمل کے جی میں آئی کہ وہ اپنے کرتے کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکالے ..... اس پر سائیلنسر چڑھائے اور پستول کی دو دو گولیاں ان دونوں عورتوں کی کھوپڑیوں میں ڈال دے پھر یہاں سے نکلے اور باقی دو گولیاں دو نمبر کمرے میں دو نمبر کام کرتے ہوئے جالب کے بھیجے میں پیوست کر دے۔ لیکن یہاں آنے سے پہلے بی بی نے اسے کسی لڑائی جھگڑے اور خون خرابے سے یکسر منع کر دیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ خون خرابے کا موقع بھی نہیں تھا۔ یہ تو ٹھنڈے دل سے اپنی حکمت عملی سوچنے کا وقت تھا۔ قدرت نے پیر قدرت اللہ پر بڑا کاری وار کیا تھا قدرت اللہ کی ساری چال بازی آپوں آپ اس کے اپنے اوپر الٹ رہی تھی۔ اجمل نے آج جو کچھ یہاں دیکھا تھا، یہ قدرت اللہ کے لئے بہت بڑا جھٹکا ثابت ہو سکتا تھا۔

اجمل زیادہ دیر یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شیشے والے بڑے دروازے کی طرف

آ گیا۔ یہاں چوکس گارڈ موجود تھا۔ اجمل نے اس پر دھیان دیئے بغیر تیزی کے ساتھ دروازے سے نکلنا چاہا۔ گارڈ کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے اجمل کو روکنے کا ارادہ کیا۔

''آپ کہاں سے آئے ہو بھائی صاحب؟'' گارڈ نے تعجب سے کہا۔

اجمل نے اپنا منہ پہلے ہی دائیں ہاتھ میں دبا لیا تھا..... وہ ظاہر کر رہا تھا اس نے منہ میں کوئی دوا وغیرہ لگا رکھی ہے یا جیسے منہ میں خون وغیرہ جمع ہے اور وہ بات نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ گارڈ اپنی الجھن سے نکلتا، اجمل لمبے ڈگ بھرتا ہوا دو نمبر کمرے کے پاس سے گزرا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔

اگلے دروازے پر موجود دو گارڈز نے بھی اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔ تاہم اسے کسی نے روکا نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ باہر نکل رہا تھا، اندر نہیں گھس رہا تھا۔ اس نے تیزی سے احاطہ پار کیا۔ جب وہ بیرونی گیٹ کے قریب تھا، عقب سے ایک گارڈ نے اسے آواز دی لیکن تب تک اجمل ان کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔ اس نے باہر والے پٹھان گارڈ سے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور بھاگ کر سڑک پار کر گیا۔ اس نے اپنی اسٹیشن دین کے ڈرائیور کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔ جونہی وہ وین میں چڑھا وین تیزی سے روانہ ہو گئی۔

''کیا بات ہے اجمل؟'' شانی نے پوچھا۔

''بہت بڑا بات ہے شانی بہن۔ ایک دم تہلکہ مچا دینے والا..... ایٹم بم کی طرح۔'' اس کا چہرہ جوش سے سرخ تھا۔

''کچھ بتاؤ بھی..... کون ہے وہاں؟''

''قدرت اللہ کا دو عدد بیویاں۔'' اجمل نے سرگوشی کی۔

''وہ وہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھ رہی ہیں اور دوسروں کو بھی دکھا رہی ہیں۔'' اجمل نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ام آپ کو کیا بتائے..... کہتے ہیں کہ کسی کی تکلیف پہ خوش نہیں ہونا چاہیے..... پر ام ایک دم خوش ہے۔ بات ہی خوشی کا ہے۔''

''کچھ بتاؤ بھی۔'' شانی نے اجمل کا سرخ چہرہ دیکھ کر کہا۔

اجمل نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ''ام اس کلینک میں قدرت اللہ کی دو بیویوں کو دیکھ کر آیا ہے۔ وہ دونوں بیمار ہیں اور آپ کو پتا ہے ان کو کون سا بیماری ہے؟ وہی بیماری جس کا نام لے لے کر قدرت اللہ اور اس کا حرامی چیلا لوگوں کو ڈراتا تھا۔ وہ دونوں

عورتیں خارش کا تکلیف لے کر اس کلینک میں پڑا ہوا ہے۔ وہ حرامی جالب بھی یہاں مختار کے نام سے موجود ہے۔ ام کو پکا یقین ہے یہ دونوں بیویاں بھی پرضی (فرضی) نام سے یہاں داخل ہوا ہوگا۔ ام سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔''

شانی کو اپنے جسم میں عجیب سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اجمل کی اطلاع واقعی حیران کن اور سنسنی خیز تھی۔

اجمل بتا رہا تھا۔ ''کلینک کے اندر ایک پورا بلاک ان لوگوں نے بک کرا رکھا ہے۔ وہاں کسی کو آنے جانے نہیں دیا جاتا۔ ام بڑی مشکل سے اندر گھسا ہے۔''

پھر اجمل خان مختصر الفاظ میں شانی کو بتانے لگا کہ وہ اندر کیسے گیا اور اس نے وہاں کیا دیکھا۔

اسٹیشن وین برق رفتاری سے اُڑی جا رہی تھی۔ شانی نے خاموش بیٹھے ڈولے کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت نے ایک بار پھر اپنا آپ منوایا تھا۔ اگر ڈولے کی تائید شامل نہ ہوتی تو شاید شانی اس بارے میں اتنی جستجو نہ کرتی۔

ان کی منزل دو کینال کی ایک پُرسکون کوٹھی تھی۔ کوٹھی کو چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں مُنا، گریس اور ڈیوس پہلے سے موجود تھے۔ مُنا بھاگ کر شانی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا پھر گریس، شانی سے گلے ملی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے حال احوال سے آگاہ کیا۔ رات کا کھانا بالکل تیار تھا۔ کھانا خاموشی میں کھایا گیا مگر شانی کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اجمل کی اطلاع معمولی نہیں تھی۔

☆======☆======☆

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔ عارف کمبوہ راولپنڈی کی اس کوٹھی میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ رستم وڈے ڈیرے کی خون ریز لڑائی میں جان سے ہاتھ دھو چکا ہے۔ (شانی نے اس بات کی تصدیق کی تھی نہ تردید)

حاجی حیات سے مشورہ کرنے کے بعد شانی نے عارف کمبوہ کو خود ہی جوہر آباد سے بلوایا تھا۔ چند ماہ پہلے گوجرانوالہ کے بائی پاس سے شانی اور عارف کے راستے جدا ہو گئے تھے۔ عارف گوجرانوالہ کے بازار سے کھانے کا سامان لینے گیا تھا اور شانی کو ریاض ہٹلر کی کال پر اس کے پاس جانا پڑ گیا تھا۔

دونوں دیر تک ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ قریباً ایک گھنٹے کی

گفتگو کے بعد جوہرآباد کا ذکر چھڑ گیا۔ عارف نے بھی وہی کچھ بتایا جو حاجی حیات بتا چکا تھا۔ جوہرآباد اور اور اردگرد کے علاقے میں ڈاکٹر بہروز اور قدرت اللہ کے درمیان جنگ جاری تھی۔ ڈاکٹر بہروز اور اس کے ساتھی اس کوشش میں تھے کہ جوہرآباد کا ہسپتال نہ صرف موجود رہے بلکہ تیز رفتار ترقی کرے۔ دوسری طرف چوہدراہٹ اور وڈیرہ شاہی کے نمائندے قدرت اللہ کے ساتھ مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ ہسپتال اور اس سے ملحق سکول ختم ہو جائے اور ڈاکٹر و اساتذہ وغیرہ خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں یا اپنے کام سے توبہ کر لیں۔ وقتی طور پر ان لوگوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔

عارف نے کہا۔ ''شانی بی بی! جوہرآباد میں آپ کی جتنی ضرورت اب ہے شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کے لئے بہت جگہ ہے۔ آپ وڈی آپا کی بیٹی ہیں۔ لوگ آپ کے گرد پروانوں کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے اور آپ کی بات مانیں گے۔'' پھر عارف نے شانی کو بتایا کہ علاقے کے لوگوں نے وڈی آپا کی بیٹی سے محبت کی وجہ سے ہسپتال کا نام ''شانی بی بی ہسپتال'' رکھ دیا ہے۔

''تمہیں پتا ہے عارف! ڈپٹی ریاض مجھے ہر جگہ کھوجتا پھر رہا ہے۔''

''مجھے پتا ہے، حاجی حیات صاحب اسے سنبھال لیں گے۔ ویسے بھی ڈپٹی کی اصل دشمنی تو رستم بھائی کے ساتھ تھی۔ اب وہ ہی نہیں رہے ''آخری الفاظ کہتے کہتے عارف کا گلا رندھ گیا۔

شانی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''عارف! قدرت نے ہمیں قدرت اللہ کا زور توڑنے اور اسے جھوٹا ثابت کرنے کا ایک بہترین موقع دیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں شانی بہن!''

شانی نے عارف کو تفصیل سے وہ سب کچھ بتا دیا جو اجمل خان کے ذریعے اس کے علم میں آیا تھا۔ عارف حیرانی سے سنتا رہا۔ جب شانی گفتگو کے آخری مرحلے میں پہنچی تو عارف کی آنکھیں اندرونی جوش اور حرارت سے چمک رہی تھیں۔ اس نے چند سوالات کر کے شانی سے پوری تفصیل جانی اور پھر پرعزم لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ سب کچھ ہو چکا ہے شانی بی بی، تو پھر میں قدرت اللہ کو دن میں تارے دکھا دوں گا۔ یہ بہت بڑی خبر ہے اور سچ کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔''

''تم کیا کرو گے؟'' شانی نے پوچھا۔

''آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''نہیں تم بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا آ رہا ہے؟''

''ایسی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ بس دو چار لوگوں کو بتانے کی ضرورت ہے پھر خود ہی یہ اطلاع چل نکلے گی۔ اس کے ساتھ ہی پریس والوں کو بھی بتا دیتے ہیں۔''

''یہ لوگ کوئی جوابی چالاکی دکھا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی طرح چکما دے کر اس کلینک سے نکلنے کی کوشش کریں۔ بعد میں شور ڈالیں کہ یہ سب کچھ انہیں بدنام کرنے اور کیچڑ اچھالنے کے لئے تھا۔'' شانی نے کہا۔

''پھر ایک اور کام ہو سکتا ہے۔'' عارف کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ ''راولپنڈی کے علاقے میں بھی قدرت اللہ کے ماننے والوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ یہاں بھی یہ خبر بڑی جلدی پھیل جائے گی کہ فلاں ہسپتال میں قدرت اللہ کی بیویاں داخل ہیں۔ ایک دو گھنٹے میں بہت سے لوگ ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی پریس والوں کو بھی وہاں لے جاتے ہیں۔ لوگوں کے پہنچنے تک پریس والے ہسپتال سے دور رہیں گے۔ پریس کے لئے یہ اہم خبر ہو گی کہ پیر قدرت اللہ کی بیویاں ہسپتال میں ہیں اور وہ منحوس بیماری جس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا ہے خود قدرت اللہ کے گھر میں داخل ہوئی ہے۔''

''امارے ذہن میں بھی ایک کام کا بات آ رہا ہے۔'' اجمل خان نے کہا۔ ''ادھر پنڈی میں امارا ایک جاننے والا نیوز رپورٹر موجود ہے۔ ایک دم سر پھرا ہے اماری طرح۔ ام اس کو اطلاع کر دیتا ہے یا پھر اس وقت اطلاع کر دے گا جب اخبار والوں نے ہسپتال کے اندر جانا ہو گا۔ وہ کسی سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ لڑ جھگڑ کر بھی وی آئی پی کمروں میں گھس جائے گا۔''

''ظاہر ہے خان بھائی! آپ کا دوست بھی آپ کی طرح کڑک ہو گا۔'' ڈولے نے کہا۔

اجمل خان نے ڈولے کو اٹھا کر اس کا منہ چوما۔ ''چھوٹو! تم جب بھی بولتا ہے اچھا ستھرا بات بولتا ہے۔''

شانی نے عارف سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو عارف! تم اس معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ اپنی سمجھ کے مطابق جو بھی کر لو ٹھیک ہے لیکن قدرت اللہ کے جھوٹ کا پول کھولنے کا یہ موقع ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔''

"بالکل پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عارف نے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ یہ نیا جھٹکا قدرت اللہ کے لئے بڑا کارگر ثابت ہوگا۔ ملتان والا جھٹکا بھی ابھی لوگوں کو بھولا نہیں ہے۔ اپنے درجنوں پرستاروں کے سامنے وہ اپنی زخمی بیوی کو اپنے جادو ٹونے سے بچا نہیں سکا تھا۔ اس واقعے کے چرچے ابھی تک ہوتے ہیں۔"

صلاح مشورے کے بعد عارف چلا گیا۔ اجمل خان بھی اصرار کر کے اس کے ساتھ ہی گیا۔ شانی کو عارف کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ وہ کمبوہ برادری میں پڑھا لکھا شخص تھا۔ ایک جوشیلے لیڈر والی ساری خصوصیات اس میں موجود تھیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت شانی کو اجمل خان کا فون موصول ہوا۔ "کہاں ہو اجمل؟" شانی نے پوچھا۔

"فضل الٰہی کلینک کے سامنے۔" اجمل خان نے جواب دیا پھر بولا۔ "شانی بہن! عارپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ ایک دم کڑک بندہ ہے یہ......"

"کیا ہوا؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے دو بسوں میں بہت سا دیہاتی لوگ یہاں پہنچا ہے۔ یہ سب کا سب ہسپتال کے اگلے اور پچھلے گیٹ کے سامنے جمع ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اندر ہمارے پیر صاحب کا بیگمات ہے۔ وہ بیمار ہے۔ ہم فکرمند ہو کر یہاں آیا ہے۔ ان میں بہت سا عورتیں بھی … ہے جو قدرت اللہ کی بیویوں کا شکل دیکھنا چاہتا ہے۔ اصل میں یہ سب کا سب عارپ (عارف) صاحب کا اپنا آدمی ہے۔ اندر جو قدرت اللہ کا ساتھی لوگ ہے وہ ایک دم … ہے۔ وہ اس بات سے انکار کر رہا ہے کہ یہاں حضرت قدرت اللہ کا کوئی … ہے۔ بڑا دلچسپ صورت حال پیدا ہو گیا ہے۔"

"کوئی میڈیا والا بھی آیا ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"چار پانچ اخبار والا پہنچ چکا ہے۔ ایک ٹی وی چینل کا چھوٹا سا ٹیم بھی ہے۔ ان … ہسپتال کا انتظامیہ جھگڑا کر رہا ہے۔ ان کو اندر جانے نہیں دے رہا۔ ابھی تھوڑا … پہلے ہسپتال والوں نے پریس کو دور رکھنے کے لئے پولیس بلانے کی دھمکی بھی دیا ہے … تھوڑی دیر پہلے ایک اخبار والا بہت چلا چلا کر بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ دو نمبر … ہے۔ یہاں پنڈی کے امیرزادے جھوٹ موٹ کے بیمار بن کر آتے ہیں اور عیاشی … ہیں۔ یہاں بہت رولا پڑا ہوا ہے جی۔"

"کسی کو پتا چلا ہے کہ قدرت اللہ کی بیویاں یہاں کیوں داخل ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"بالکل جی! عارپ صاحب نے اخبار والوں کو اپنا نام بتائے بغیر ٹیلی فون کئے ہیں۔ ہر طرف یہی بات گھوم رہا ہے کہ خارش والا بیماری پیر قدرت اللہ کے اپنے گھر میں بھی آ گیا ہے۔"

بات کرتے کرتے اجمل ایک دم چونکا۔ پھر اس کی آواز تھوڑے وقفے کے بعد ریسیور پر ابھری۔ "یہاں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو رہا ہے شانی بہن! ابھی ایک ٹریکٹر ٹرالی پر کوئی تین درجن مرد عورتیں یہاں پہنچا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ پنڈی کے آس پاس کے علاقے کا لوگ ہی ہے۔ شاید یہ قدرت اللہ کا اصلی عقیدت مند ہے۔ ہسپتال کے آس پاس لوگوں کا رش بڑھتا جا رہا ہے۔ سامنے گیٹ پر قدرت اللہ کا ملازم لوگ نظر آ رہا ہے۔ وہ حرامی جالب بھی ہے۔ یہ سب لوگ سخت سٹپٹایا ہوا ہے۔"

اجمل خان فون پر جیسے رواں تبصرہ نشر کر رہا تھا۔

ہسپتال کے ارد گرد رات تک کشمکش جاری رہی۔ پنڈی کے نواحی علاقوں سے بہت سے لوگ یہاں آ موجود ہوئے تھے۔ عارف کمبوہ نے جن لوگوں کو جوہر آباد سے بلوایا تھا وہ بھی کلینک نما ہسپتال کے گرد پکا ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ مختلف افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف ہسپتال کی انتظامیہ اور قدرت اللہ کے ساتھی اس امر سے صاف انکاری تھے کہ حضرت قدرت اللہ کی فیملی میں سے کوئی شخص یہاں موجود ہے۔ اخبار والے اپنے طور پر ٹوہ لگانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور وہ اپنے ذرائع سے اس حد تک تصدیق کر چکے تھے کہ دو عورتیں ہسپتال کے وی آئی پی بلاک میں ایڈمٹ ہیں اور غالب امکان یہی ہے کہ وہ پیر قدرت اللہ کی بیویاں ہیں۔

رات ہونے کے بعد کچھ لوگ ہسپتال کے گیٹس کے سامنے سے واپس جانے لگے۔ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پنڈی اور ارد گرد سے آئے تھے۔ اکثریت ہسپتال کے ارد گرد موجود رہی۔ کچھ لوگوں نے ہسپتال کے ساتھ ساتھ گرین بیلٹ پر قبضہ جما لیا۔ کچھ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے رہے۔ کچھ صبح پھر واپس آنے کے لئے اندرون شہر کی طرف جانے کا سوچنے لگے۔ اجمل خان ایک ایف ایکس سوزوکی کار میں موجود تھا۔ کار میں اس کا پرانا دوست نیوز رپورٹر لقاف خان تھا۔ وہ نہایت گورا چٹا خوبرو نوجوان تھا۔ لقاف خان کو یار دوست پیار سے لکی خان بھی بولتے تھے۔ وہ ایک دلیر اور نڈر صحافی تھا اور ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتا تھا مگر پشتو وغیرہ نہیں جانتا تھا۔

آج دن کے وقت لکی خان نے دو تین بار کوشش کی تھی مگر فضل الٰہی کلینک کے اندر داخل

نہیں ہو سکا تھا۔ ایک مرتبہ تو گارڈز کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی اور اس کا چھوٹا کیمرا ٹوٹتے ٹوٹتے بچا تھا۔ گارڈ نے اسے گھونسا مارا تھا۔ جواب میں لکی خان نے بھی اس کے اگلے دانت ہلا دیئے تھے۔ یہ پرانے ماڈل کی چھوٹی گاڑی لکی خان کے استعمال میں رہتی تھی۔ سارے دن کا تھکا ہارا لکی خان نشست کو اسٹریچ کر کے اونگھ رہا تھا۔ اجمل خان نے نسوار کی چھوٹی سی چٹکی لی اور اپنے زخمی پاؤں کو اٹھا کو دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر رکھ لیا۔ شانی سے بچ کر چوری چھپے وہ بھی کبھی تھوڑی سی نسوار لے لیتا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل قدرت اللہ اور اس کی بیویوں میں الجھا ہوا تھا۔ کلینک کی انتظامیہ صاف انکار کر رہی تھی کہ یہاں قدرت اللہ کی کوئی عزیزہ موجود ہے۔ اگر اجمل نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح شاید اس کا یقین بھی ڈانواں ڈول ہونے لگتا۔

رات کا قریباً ایک بج چکا تھا۔ اچانک اجمل کی نگاہ ایک گاڑی پر پڑی۔ یہ گاڑی ہیڈ لائٹس آن کئے بغیر ہسپتال نما کلینک کے دائیں پہلو کی طرف جا رہی تھی۔ اجمل کی تیز چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اس نے لکی خان کا بازو ہلا کر اسے جگایا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے یارا۔ ام نے ابھی اس طرف ایک ٹویوٹا کار دیکھا ہے۔'' اجمل نے انگلی سے تاریک سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

لکی خان بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنی سوزوکی کار ایسی جگہ پارک کر رکھی تھی جہاں سے وہ کلینک کے دونوں گیٹس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ خاص طور پر پچھلے گیٹ پر کیونکہ اگلے گیٹ کی طرف تو گرین بیلٹ کے ساتھ ساتھ کافی لوگ موجود تھے اور چار پانچ اخبار والے بھی تا حال جمے ہوئے تھے۔

اجمل خان اور لکی خان نے ایک ساتھ گاڑی چھوڑی اور کلینک کے پہلو کی طرف گئے۔ وہ گھاس پر اونگھتے ہوئے ایک اخبار نویس کے قریب سے گزر کر کلینک کی عقبی سڑک پر پہنچے اور پھر دائیں پہلو کی طرف آ گئے۔ یہاں مکمل سکوت تھا۔ باؤنڈری وال خاصی اونچی تھی اور اس پر نوک دار آہنی گرل بھی لگی ہوئی تھی۔ یہاں ایک چیز پر اس سے پہلے کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی چوکور کھڑکی تھی جس میں آہنی پٹ لگا ہوا تھا۔ دراصل اس طرف رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں دو چھوٹے چھوٹے میڈیکل سٹور تھے۔ غالباً ایمرجنسی میں یہاں سے دوائیں وغیرہ حاصل کی جاتی تھیں۔ رات کے اس پہر یہ دونوں سٹور بند تھے۔

اجمل خان نے دیکھا، نیلے رنگ کی ٹویوٹا کار اس کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چاروں دروازے کھلے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھڑکی میں سے ایک سایہ رکوع کے انداز

میں جھک کر باہر آیا۔ یہ ایک چادر پوش عورت تھی۔ اس کے پیچھے دوسری عورت نکلی۔ وہ بھی سرتاپا چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ ان دونوں عورتوں سے پہلے ایک مرد باہر آ چکا تھا اور وہ کار کے باہر کھڑا تھا۔ اجمل خان کے لئے اب یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ، سر ایک صافے میں لپیٹا اور دوڑتا ہوا نیلی کار کی طرف آیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے..... کون ہو تم لوگ؟'' وہ قریب پہنچ کر دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے کار کے قریب کھڑے شخص کو دھکا دیا۔ لکی خان بھی شور مچاتا اجمل خان سے آملا۔ ایک دم ہلچل پیدا ہو گئی۔ سامنے والے گیٹ پر موجود افراد چونک گئے۔ ان میں سے کچھ دوڑتے ہوئے موقع کی طرف آئے۔ لکی خان کے جدید کیمرے کی فلیش گن دو تین بار چمکی اور سنسنی مزید بڑھ گئی۔

کار کے قریب موجود افراد نے اجمل کو جوابی دھکے دیئے اور دونوں عورتوں کو کار میں پہنچانے کی کوشش کی۔ اجمل خان نے پھرتی سے ہاتھ چلا کر ایک عورت کی چادر اس کے چہرے سے کھینچ دی۔ اس کے ساتھ ہی لکی خان کی فلیش گن نے اپنا کام کیا۔ عورت کا چہرہ چند لمحے کے لئے روشنی میں نہا گیا۔ یہ پیر قدرت اللہ کی منجھلی بیوی عریسہ فراقی تھی۔ اس کا چہرہ بیماری کے اثرات سے داغ دار تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ جدید کیمرے نے تین چار سیکنڈ کے اندر خودکار طریقے سے اس منظر کی کئی تصاویر اتار لیں۔ اجمل نے دوسری عورت کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی جو جزوی طور پر کامیاب رہی۔

پیر قدرت اللہ کا سانولا چیلا جالب چنگھاڑتا ہوا لکی خان پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی اجمل خان کی ٹانگ کام کر گئی۔ وہ اپنی پسلیوں پر ضرب کھا کر لڑکھڑاتا ہوا کار کی سائیڈ سے جا ٹکرایا۔ اب درجنوں لوگ موقع پر پہنچ گئے تھے اور حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ پیر قدرت اللہ کے ایک مرید نے زمین پر گری ہوئی چادر اٹھا کر پھر سے عریسہ فراقی کو ڈھانپا اور کار میں دھکیل دیا۔

دو اور افراد رپورٹر لکی خان پر جھپٹے۔ ایک کی ناک پر لکی خان نے سر کی ٹکر رسید کی۔ وہ کراہتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ دوسرے کو اجمل نے اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر اسٹریٹ لائٹ کے پول سے دے مارا۔ ''بھاگو لکی۔'' اجمل خان چلایا۔

دونوں آگے پیچھے سوزوکی کار کی طرف دوڑے۔ یہی وقت تھا جب نیلی کار کے عقب سے پسٹل کا پہلا فائر ہوا۔ دھماکے سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ دوسرا فائر بھاگتے ہوئے لکی

خان کے چہرے پر لگا۔ اجمل نے اسے منہ پکڑ کر دہرا ہوتے دیکھا لیکن وہ زخمی ہونے کے بعد بھی رکا نہیں۔

اجمل نے دوڑتے دوڑتے اپنا سائیلنسر لگا پسٹل قمیص کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ اس نے نیلی کار کی طرف دو فائر کیے۔ کار کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ رائفل کی دو گولیاں اجمل کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ اس نے پلٹ کر پھر دو فائر کیے۔ اس کے بے مثال نشانے نے رائفل بردار گارڈ کو زخمی کیا اور وہ گر گیا۔ دونوں جھک کر دوڑتے ہوئے سوزوکی کار تک پہنچے۔ اندر گھستے ہی لکی خان عقبی سیٹ پر ڈھے گیا۔ وہ سخت زخمی ہوا تھا۔ اجمل جانتا تھا کہ چابی اگنیشن میں ہی ہے۔ اس نے کار کی اوٹ لی اور پیچھے آنے والوں پر مسلسل فائر کیے۔ جب دوسرے میگزین میں صرف تین گولیاں رہ گئیں تو اجمل جھپٹ کر کار میں سوار ہوا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔

گاڑی چلاتے چلاتے اس نے مڑ کر لکی خان کی طرف دیکھا۔ کیمرا اس کے گلے میں تھا۔ وہ سیٹ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خون بہہ بہہ کر سیٹ کو بھگو رہا تھا۔

''یارا کہاں لگا گولی؟'' اجمل نے تڑپ کر پوچھا۔

''آ.....او.....غوں.....غاں۔'' لکی نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ منہ کے اندر ہی گڈمڈ ہو گئے۔

اجمل نے ڈرائیونگ کرتے کرتے گاڑی کی اندرونی لائٹ آن کی اور لکی خان کا خوبرو چہرہ دیکھ کر کانپ گیا۔ گولی اس کے ایک رخسار میں گھسی تھی اور غالباً دانت توڑتے ہوئے دوسرے رخسار سے نکل گئی تھی۔ گولی کے لگنے کا بھلا کیا طریقہ ہوگا۔ یہ پگھلا ہوا سیسہ کہیں سے گھس کر کہیں سے بھی نکل سکتا ہے یا جسم کے اندر ہی پھسل کر کہیں گم ہو سکتا ہے۔ اچھی چیزوں کی ترتیب ہوتی ہے، بُری چیزوں کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ خون کی، جان توڑ اذیت کی اور موت کی بھلا کیا ترتیب ہوگی۔ چند منٹ پہلے آرام سے اپنی نشست پر اونگھنے والا دلکش لکی خان اب خونچکاں تھا۔ اس ساری مصیبت کے باوجود بھی لکی خان شاید لکی ہی ثابت ہوا تھا۔ گولی صرف ڈیڑھ انچ اوپر لگتی تو اس کی کنپٹی میں گھس جاتی اور وہ اب تک ٹھنڈا بھی ہو چکا ہوتا۔

اچانک اجمل کو اپنے عقب میں ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ ہیڈ لائٹس طوفانی رفتار سے کلینک کے عقب سے برآمد ہوئی تھیں اور سوزوکی کار کی طرف جھپٹ پڑی تھیں۔ یقیناً یہ قدرت اللہ کے چیلے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کیمرا اور کیمرا مین ان کے ہاتھ سے نکل

جائے۔ وہ اندھا دھند تعاقب میں آرہے تھے۔ یہ کم از کم دو گاڑیاں تھیں۔ اجمل کے پسٹل میں اب صرف تین گولیاں تھیں۔ ان تین گولیوں سے وہ تادیر قدرت اللہ کے ساتھیوں کو خود سے دور نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیا موقع پر موجود لوگوں میں سے کچھ لوگ مدد کے لئے ان کے پیچھے آئیں گے؟ اس نے فکرمندی سے سوچا۔

اس کا امکان بہت کم تھا۔ جو کچھ ہوا تھا بہت آناً فاناً ہوا تھا اور تینوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی کئی موڑ مڑ چکی تھیں۔

عقبی نشست سے زخمی لکی خان نے ناقابلِ فہم آواز میں کچھ پوچھا۔ اجمل سمجھ گیا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔

اجمل نے کہا۔ ''یارا تم کو ڈاکٹر کا ضرورت ہے۔ ام تم کو سب سے پہلے ہسپتال پہنچانا چاہتا ہے۔''

لکی خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ایک دو الفاظ بولے اور کیمرے پر ہاتھ مار کر اشارہ دیا کہ وہ گاڑی کا رخ اخبار کے دفتر کی طرف موڑے تاکہ کیمرا محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

''لیکن برادر! ام دفتر تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اِدھر راستہ تنگ ہے۔ ام پکڑا جائے گا۔''

لکی خان نے ایک بار پھر بے قراری سے سر ہلایا۔ اس نے سر اٹھا کر عقب میں دیکھا..... متعاقب گاڑیاں اب بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔

لکی خان نے بیٹھ کر اپنی سائیڈ والی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار لیا۔ اجمل خان نہیں سمجھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ ہسپتال کا راستہ پکڑنے کے لئے اجمل نے گاڑی کو جونہی ایک بغلی سڑک پر ٹرن دیا، گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ لکی خان نے اپنا چھوٹا سا کیمرا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ یہ ایک فلتھ ڈپو تھا۔ بہت سا کوڑا کرکٹ کارپوریشن کے جہازی سائز ڈبے (کنٹینر) میں تھا اور بہت سا ارد گرد بکھرا ہوا تھا۔ کیمرا کوڑے میں گرا اور اوجھل ہو گیا۔

اجمل اور لکی خان بہ مشکل سو میٹر آگے گئے ہوں گے کہ عقب سے رائفل کا فائر ہوا۔ گولی عقبی سکرین کو توڑ کر چھت میں گھس گئی۔ اجمل نے چلتی گاڑی سے ہاتھ نکال کر عقب میں پسٹل کا فائر کیا۔ پہلی گولی نے ہی عقب میں آنے والی کار کا ٹائر برسٹ کر دیا اور وہ ڈگمگا کر فٹ پاتھ پر چڑھی پھر ایک بند دکان کے شٹر سے جا ٹکرائی۔ یہ شہر کا قدرے بارونق علاقہ تھا لیکن ساری دکانیں وغیرہ بند نظر آرہی تھیں۔ تعاقب میں آنے والی دوسری کار طوفانی رفتار

سے آگے بڑھی۔ یہ پرانے ماڈل کی لیکن بہت مضبوط ٹویوٹا مارک ٹو تھی۔ گاڑی نے وحشیانہ انداز میں ہلکی پھلکی ایف ایکس کو سائیڈ ماری اور اپنے زور سے رگیدتی ہوئی ایک دکان کے تھڑے سے جا ٹکرائی ... ایف ایکس کی ونڈ سکرین چکنا چور ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ مارک ٹو میں سے قدرت اللہ کے چمچے کڑچھے بھڑکیں مارتے ہوئے نکلتے اور اجمل خان پر پل پڑتے، ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک اور کار پیچھے سے آئی۔ اس کار میں سے مارک ٹو پر براہِ راست گولیاں چلائی گئیں۔ مارک ٹو میں سے ایک بندہ فوری طور پر زخمی ہوکر گر گیا۔ باقی نے اپنی گاڑی کی آڑ لی۔ پانچ دس سیکنڈ کے لئے دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ یہ پسٹل اور ماؤزر کے فائر تھے۔ دو تین بار ٹریل ٹو کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ اجمل نے اپنی گاڑی میں دبکے دبکے دیکھا۔ اس کی مدد کرنے والے تین افراد میں سے ایک عارف کمبوہ تھا۔ وہ خود بھی گاڑی کے دروازے کی اوٹ سے ماؤزر کا فائر کر رہا تھا۔ اجمل خان کا دل خوش ہوگیا اور جوش سے بھر گیا۔

اسی دوران میں عقب سے پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ یہ شاید دو گاڑیاں تھیں۔ جونہی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیئے مارک ٹو کے عقب میں چھپے ہوئے افراد صورتِ حال سے بددل ہوکر بھاگ نکلے۔ اجمل نے انہیں ایک بغلی گلی کی تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عارف کمبوہ بھاگتا ہوا ایف ایکس تک پہنچا۔ اس نے پہلے خون آلود لکی خان کو دیکھا پھر اجمل خان کو پہچانا اور بولا۔ ”اجمل خان! پولیس آگئی ہے۔ بہتر ہے کہ تم نکل جاؤ۔ میں یہاں سنبھالتا ہوں۔“

عارف ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اجمل خان نے زخمی لکی خان کا شانہ تھپکا اور بولا۔ ”پریشان نہیں ہونا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا اور ام تمہارا کیمرا بھی ڈھونڈتا ہے ابھی۔“

پولیس کی گاڑیاں نزدیک آگئی تھیں۔ اجمل نے جست لی اور ایک بل کھاتی تاریک گلی میں گھس گیا۔

☆======☆======☆

شانی اداس بیٹھی تھی۔ صبح اسے ہمیشہ سے اچھی لگا کرتی تھی۔ رنگ والی حویلی میں وہ اپنے ابا جی کے ساتھ ننگے پاؤں شبنم آلود گھاس پر ٹہلتی تھی۔ پرندوں کا چہچہانا، پھولوں کا مسکرانا اور سنہری کرنوں کا نمودار ہونا ... سب کچھ اسے اچھا لگتا تھا۔ اب بھی اس کے اردگرد وہی منظر تھے ... مگر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کوئی شے تھی جو اس کے اندر ٹوٹ گئی تھی اور کرچی کرچی ہوکر رگ و پے میں پیوست ہوگئی تھی۔ ان کرچیوں میں سے ہر کرچی پر ایک ہی تصویر

نظر آتی تھی اور اس کی جان کو ہلکان کرتی تھی۔

اجمل خان رات کو فضل الٰہی کلینک چلا گیا تھا اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے مُنا تازہ اخبار پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ شانی نے پہلے صفحے پر ایک خبر دیکھی اور بُری طرح چونک گئی۔ لکھا تھا۔ ”رات گئے فضل الٰہی کلینک کے سامنے ہنگامہ ... پیر قدرت اللہ کی بیویوں کو چوری چھپے کلینک سے نکال لیا گیا ... اخباری رپورٹروں سے ہاتھا پائی ... کیمرے چھیننے کی کوشش ... ایک رپورٹر شدید زخمی۔“

نیچے تفصیل درج تھی کہ نصف شب کے بعد فضل الٰہی کلینک کے سامنے کیا اور کیسے ہوا۔ یہ سب کچھ سنسنی خیز تھا۔ تاہم یہ مکمل تفصیل نہیں تھی۔ یہ انگریزی اخبار تھا۔ اس میں واقعے کی بس ایک ہی دو کالمی خبر لگی تھی۔

قریب ہی مارکیٹ تھی۔ وہاں سے اردو اخبارات مل سکتے تھے۔ حاجی حیات کا ایک ملازم چھٹی پر تھا۔ دوسرا ناشتہ وغیرہ بنانے میں لگا ہوا تھا۔ شانی خود ہی مارکیٹ کی طرف چل دی۔ کوٹھی سے نکلتے ہوئے وہ مکمل پردہ کرلیتی تھی۔ وہ مارکیٹ میں پہنچی۔ بس سٹاپ کے ساتھ اخبارات اور رسائل وغیرہ کا سٹال تھا۔ اردو اخبارات میں اس واقعے کی خاصی تفصیل آئی تھی ... ابھی شانی دیکھ ہی رہی تھی کہ اس کی نگاہ بس سٹاپ کی طرف گئی اور اس کی ساری حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ حقیقت میں نہیں اپنے تصور میں کوئی منظر دیکھ رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے وہ پتھر کا بت بن گئی۔ اس نے رستم کو دیکھا۔ وہ ایک بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا ایک لوکل بس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شانی نے اسے عقب سے دیکھا ... اس کے لمبے بال اس کے ہموار کندھوں پر جھول رہے تھے۔ وہ ایک میلی سی شلوار قمیص میں تھا۔ شلوار کا ایک پائنچہ بے بسی سے ہوا میں جھول رہا تھا۔ پھر شانی کا سکتہ ٹوٹا ... وہ اخبار پھینک کر رستم کے پیچھے لپکی۔ ”رستم ... رستم۔“ اس نے دور ہی سے آواز دی۔ اس کی آواز میں کرب کا جہان سمٹا ہوا تھا۔

رستم تب تک بس کے پچھلے دروازے میں سوار ہو چکا تھا۔ شانی کے پہنچتے پہنچتے بس چل پڑی۔ شانی بس کے پیچھے بھاگی۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی۔ ”رکو ... خدا کے لئے رکو ...“

یہاں بچوں کا سکول تھا۔ بس رفتار نہیں پکڑ رہی تھی لیکن رک بھی نہیں رہی تھی۔ شانی اس کے پیچھے دوڑتی رہی۔ ”رک جاؤ ... خدا کے لئے رک جاؤ۔“ اس کی ایک سینڈل اُتر گئی تھی۔ وہ ایک ہی سینڈل کے ساتھ ڈگمگاتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ پھر شاید بس کی سواریوں میں سے

کسی کو ترس آیا اور تھوڑا آگے جا کر بس رک گئی۔ شانی بھاگ کر لیڈیز دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ بُری طرح ہانپی ہانپی ہوئی تھی۔ ''کیا بات ہے مس؟'' کنڈیکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

''کک...... کچھ نہیں...... میں اپنے ایک عزیز کو ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''کہاں ہے؟''

''پیچھے سوار ہوا ہے۔'' شانی نے کہا اور مردانے حصے کی طرف بڑھی جہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لوگوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

شانی مسافروں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی۔ اس کے انداز میں انتہا درجے کی بے تابی تھی۔ مسافر حتیٰ الامکان حد تک سمٹ کر اسے راستہ دینے کی کوشش کر رہے تھے پھر بھی اس کا آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ بس رکی ہوئی تھی۔ جلد ہی شانی عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ اسے بیساکھی نظر آئی۔ پھر بیساکھی والے کے لمبے بال نظر آئے...... پھر وہ خود نظر آیا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے چھوٹے چھوٹے داغ تھے۔ ناک قدرے پھولی ہوئی تھی۔ وہ رستم نہیں تھا۔

شانی کے دل میں جیسے ایک زوردار گھونسا لگا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ تماشا دیکھنے کے لئے کئی ایک سواریاں اپنی نشستوں سے کھڑی ہو گئی تھیں۔ شانی بے دم سی ہو کر ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی۔ دکھ...... شرمندگی...... پریشانی...... وہ جیسے اپنے ہی پسینے میں ڈوب گئی۔ کچھ لوگ ہمدردی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جیسے اس کی ذہنی حالت پر افسوس کر رہے ہوں۔ شانی اپنے دل ہی دل میں پکار کر بولی۔ ''دیکھو رستم! میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ کہاں کھو گئے ہو؟ کہاں؟'' وہ سسک اٹھی۔

ٹانگ سے معذور شخص بھی حیرت سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا پھر ایک اور شخص آگے بڑھا۔ اس نے بڑی نرمی سے شانی کے کندھے کو چھوا اور بولا۔ ''شاید آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... کیا اب آپ نیچے اُترنا چاہتی ہیں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شانی کے لئے راستہ بناتا ہوا اسے بس سے نیچے لے آیا۔ ''میں نے بھی بس یہاں پاس ہی اُترنا تھا۔'' وہ شائستہ انداز میں بولا۔

شانی کو ایک سینڈل کے ساتھ چلتے دیکھ کر شاید اسے کوفت ہو رہی تھی۔ وہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ایک خاصے لمبے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ وہ شانی کو صورت سے بھلا مانس نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنی چرمی چپل اُتاری اور کہنے لگا۔ ''آپ کچھ دیر کے لئے یہ پہن

لیں۔''

اس کے اصرار پر شانی نے چپل پہن لی۔ ایک دم ایک نیا خیال شانی کے ذہن سے ٹکرایا اور وہ بڑے دھیان سے اس شخص کو دیکھنے لگی۔

وہ لمبوترے چہرے والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ شانی نے ایک بار پھر دھیان سے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ ڈولے کی تیز نگاہوں نے گورے کے بنگلے کے پاس کسی ایسے ہی پاؤں کی نشاندہی کی تھی لیکن ایسا پاؤں کسی ایک شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی شہر راولپنڈی میں یقیناً درجنوں افراد اسی قسم کا غیر معمولی قد اور غیر معمولی پاؤں رکھتے ہوں گے۔

اس شخص کا حلیہ کھلاڑیوں جیسا تھا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کرکٹ کا کھلاڑی ہے۔ اس کے جوتے بھی کھلاڑیوں جیسے تھے جن کے نیچے چھوٹے چھوٹے کیل ہوتے ہیں۔

''لگتا ہے کہ آپ کو بڑی شدت سے کسی کی تلاش ہے۔'' اس شخص نے بڑی ملائمت سے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ شخص آپ کا بہت قریبی ہے۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟'' شانی نے سوال کیا۔

''میرا نام زبیر ہے۔ یہاں پنڈی میں میری کھیلوں کے سامان کی شاپ ہے۔ زبیر سپورٹس کے نام سے۔''

''کس جگہ؟''

''صدر میں۔'' اس لمڈھینگ نے کہا۔ پھر شانی کو سرتاپا دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ''آپ خود کو سنبھالیں۔ اس طرح سڑکوں پر کسی کے پیچھے بھاگنا آپ کے لئے مناسب نہیں۔ آپ شکل سے بہت سمجھدار لگتی ہیں۔''

شانی اسے کیا بتاتی کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے اور اس کی ساری سمجھ بوجھ جذبات کے کس طوفانی ریلے کی زد میں ہے۔ دن بدن اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ کسی کی جاں گسل جدائی اتنی شدت سے اثر انداز ہو رہی تھی کہ اس کے سارے اصول، ضابطے تتر بتر تھے۔ وہ قریب آیا تھا...... بہت قریب آیا تھا اور پھر بالکل اچانک غیر متوقع طور پر اس سے دور چلا گیا تھا۔ یہ عجیب جدائی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے اور اسے کب واپس آنا ہے؟ ڈھونڈنے والے شانی کو بس طفل تسلیاں ہی دے رہے تھے۔ حاجی

حیات، سب انسپکٹر اختر، اجمل خان اور عارف کمبوہ سب اپنے اپنے طور پر کوشش کر رہے تھے مگر کامیابی کسی کو نہیں ملتی تھی۔

کچھ دیر بعد شانی نے اس شخص کو خدا حافظ کہا۔ اخبار کے سٹال سے اردو اخبار لیا اور واپس گھر آ گئی۔ تب تک اجمل خان واپس پہنچ چکا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھ پر چند ایک خراشیں تھیں۔ یہ خراشیں اس دھینگا مشتی کا نتیجہ تھیں جو رات کو اجمل خان، لکی خان اور قدرت اللہ کے چیلوں میں ہوئی تھی۔ اجمل خان کچھ پریشان نظر آ رہا تھا...... شانی کے ہاتھ میں اخبار دیکھ کر وہ چیل کی طرح اخبار پر جھپٹا۔ اخبار میں قدرت اللہ اور اس کی بیویوں کے بارے میں دھواں دھار خبریں دیکھنے کے بعد وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

نامہ نگاروں نے رات والے واقعے کو خوب مرچ مسالے کے ساتھ بیان کیا تھا۔ ایک بڑی سرخی کچھ اس طرح تھی۔ ''جھوٹ کا پول کھل گیا۔ ہسپتال میں قدرت اللہ کی بیویاں ہی داخل تھیں۔''

''نیوز فوٹوگرافر سے کیمرے چھیننے کی کوشش۔ رپورٹروں سے ہاتھا پائی اور فائرنگ۔ اندھی گولیاں لگنے سے ایک شخص ہلاک تین افراد زخمی۔''

''زخمی فوٹوگرافر لکی خان کی ایف ایکس گاڑی کا چار کلومیٹر تک تعاقب کیا گیا۔ لکی خان کا کیمرا غائب۔''

خبر کے متن میں تفصیل سے درج تھا کہ پیر قدرت اللہ کی دونوں بیویاں پُراسرار جلدی بیماری کا شکار ہیں۔ اس سے پہلے پیر قدرت اللہ اور ان کے عقیدت مندوں کا دعویٰ تھا کہ یہ Skin Disease صرف انہی لوگوں کو لاحق ہوئی ہے جو ایک موقع پر پیر صاحب کے ساتھ گستاخی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس بیماری کو خاص طریقے سے اسکینڈلائز کیا جاتا رہا ہے تاکہ پیر صاحب کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔

اخبار میں ایک جگہ رات والے واقعے کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ تصویر بہت بھاگ دوڑ میں اُتاری گئی ہے۔ اس تصویر میں ایک چادر پوش عورت کی پشت دکھائی دیتی تھی اور وہ گاڑی نظر آتی تھی جس میں اسے سوار کرایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ قدرت اللہ کے ایک مشتعل مرید کا چہرہ تھا۔ وہ کیمرے کے سامنے ہاتھ کی ڈھال بنا کر فوٹوگرافر کو تصویر بنانے سے منع کر رہا تھا۔ اس تصویر میں دو اہم چیزیں ناپید تھیں۔ یعنی گاڑی کا نمبر اور چادر پوش عورت کا چہرہ۔

اخبار نے توازن قائم رکھتے ہوئے دوسرے فریق کا نکتہ نظر بھی وضاحت سے بیان کیا

تھا۔ پیر قدرت اللہ کے ایک بیان کو سرخی کی شکل دی گئی تھی۔ سرخی یوں تھی۔ ''اللہ میرے مخالفین کو ہدایت دے۔ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔''

نیچے لکھا تھا۔ ''بے بنیاد الزامات لگانے والوں کی آوازیں بہت جلد دم توڑ جائیں گی۔ یہ لوگ قابلِ رحم ہیں۔''

متن میں درج تھا۔ ''پیر قدرت اللہ نے رات والے واقعے کو سراسر ڈرامہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں۔ جو بے پَر کی اُڑا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اکثر لوگ جانتے ہیں کہ ان کی پشت پناہی کون لوگ کر رہے ہیں اور ان کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔ ڈکیتوں اور نامی گرامی قاتلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اس نورانی تحریک کو کیسے دبا سکتے ہیں جو سورج کی روشنی کی طرح پھیل رہی ہے۔'' کل رات فضل الٰہی کلینک کے پچھواڑے پیش آنے والے واقعے کا دفاع کرتے ہوئے پیر صاحب نے کہا۔ ''یہ واقعہ اس قابل نہیں کہ اس پر تبصرہ کیا جائے۔ میری اہلیہ کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف تھی اور وہ علاج کے لئے چند روز سے مذکورہ کلینک میں موجود تھی۔ دوسری اہلیہ اس کی دیکھ بھال کے لئے وہاں موجود تھی۔ اس بیان میں قطعی صداقت نہیں ہے کہ میری اہلیہ خدانخواستہ کسی خاص جلدی بیماری کا شکار ہے۔ ہسپتال میں اس کی میڈیکل فائل موجود ہے اور یہ فائل اس جھوٹ کے خلاف ایک کھلا ثبوت ہے۔''

ایک سوال کے جواب میں پیر صاحب نے کہا۔ ''بیمار اہلیہ کو رات کے وقت کلینک کے عقبی دروازے سے نکالنے کی کوشش اس لئے کی گئی کہ کلینک کے گرد شر پسند لوگوں کا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ وہ مختلف افواہیں پھیلا رہے تھے۔ نقصِ امن کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کلینک انتظامیہ بھی پریشان تھی۔ انتظامیہ کی خواہش تھی کہ صبح کے بجائے رات کے وقت ہی ڈسچارج شدہ مریضہ کو کلینک سے نکال لیا جائے۔ درحقیقت اہلیہ کو بہتر حالت کے پیشِ نظر شام کو ہی کلینک سے فارغ کر دیا گیا تھا۔''

اس خبر کے علاوہ پیر قدرت اللہ کے حق میں ایک چھوٹی سی نیوز موجود تھی۔ ایک مشہور سیاسی و سماجی شخصیت نے بیان دیا تھا کہ کچھ لوگ خواہ مخواہ پیر صاحب کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس شخص نے بیان دیا تھا۔ ''اس اطلاع میں کوئی صداقت نہیں کہ خدانخواستہ پیر صاحب کی دونوں بیویاں جلدی بیماری کا شکار تھیں اور خفیہ طریقے سے پنڈی کے پرائیویٹ کلینک میں داخل تھیں۔'' اس سوال کے جواب میں کہ کلینک میں دونوں خواتین کی موجودگی کو چھپانے کے لئے پہلے جھوٹ کیوں بولا گیا۔ اس سیاسی شخصیت نے کہا

کہ ایسا سکیورٹی کے نقطہ نظر سے کیا گیا۔

یہ متضاد خبریں پڑھنے کے بعد اجمل خان کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا تھا۔ ''یہ ایک دم ڈھیٹ اور بے غیرت لوگ ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں مرچیں ڈال رہا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

شانی نے اس سے پوچھا۔ ''نیوز فوٹو گرافر لکی خان کا ذکر اخباروں میں خاص طور سے آیا ہے۔ وہ کیسے زخمی ہوا؟''

''ام اس سارے واقعے کا چشم دید گواہ ہے۔ شانی بہن۔'' اجمل خان نے وثوق سے کہا۔ پھر یہ سارا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ لکی خان نے کس طرح اپنا کیمرا چلتی گاڑی سے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔

''پھر کیا بنا اس کیمرے کا؟'' شانی نے بے قراری سے پوچھا۔

''خو، یہی تو گڑ بڑی ہوئی ہے شانی بہن! کیمرا ابھی ملا نہیں۔'' اجمل خان نے منہ لٹکا کر کہا۔

''تم خود ڈھونڈنے گئے تھے؟'' شانی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ام رات کو فائرنگ والے واقعے کے کچھ ہی دیر بعد واپس اس کوڑا ڈرم (فلتھ ڈپو) تک پہنچا تھا۔ لیکن امارا بدقسمتی کہ ام کوڑے کے ڈھیر تک نہ پہنچ سکا۔ وہاں پولیس نے ناکہ لگا لیا تھا۔ دس پندرہ بندے کی نفری تھی۔ یہ لوگ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہر آتی جاتی گاڑی کو چیک کر رہا تھا۔ ام نے کافی دیر انتظار کیا لیکن آگے جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ فجر کی اذان سے تھوڑی دیر بعد پولیس ناکہ ختم ہوا اور ام کوڑے کے ڈھیر تک پہنچا مگر بہت اچھی طرح دیکھنے کے بعد بھی کیمرا ام کو نہیں ملا۔ ام کو لگتا ہے کہ صبح سویرے کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے والا کوئی لڑکا کیمرا اپنے جھولے میں ڈال کر لے گیا ہے۔''

''پھر اب کیا کرو گے؟''

''ہمارے لئے وہ کیمرا بہت قیمتی ہو گیا ہے جی! ام کو پورا یقین ہے کہ اس میں چار پانچ پوٹو ضرور ایسا ہے جو قدرت اللہ کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوڑ سکتا ہے۔ ان تصویروں میں قدرت اللہ کی دونوں بیبیوں کا شکل بہت صاف طور پر آیا ہوگا۔ انہی تصویروں کی وجہ سے وہ قدرت اللہ کا حرامی چیلا ام دونوں کے پیچھے لگا تھا۔''

''تمہارے خیال میں اب وہ کیمرا کس کے پاس ہو سکتا ہے؟''

''ام نے پچھلے تین چار گھنٹے میں تھوڑا بہت ریسرچ کیا ہے جی۔ ام ان لڑکوں سے ملا ہے جو صبح سویرے علاقے سے کوڑا اکٹھا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک عیسائی لڑکا شفیع بھی

ہے۔ آج صبح سویرے وہی سائیکل لے کر نکلا تھا۔ وہ مرغیوں کے پر وغیرہ جمع کر کے مارکیٹ میں بیچتا ہے اور اس کے علاوہ ویگن کنڈیکٹری بھی کرتا ہے۔ ام کچی آبادی میں اس کا گھر بھی دیکھ آیا ہے لیکن اس سے ملاقات نہیں ہو سکا۔ ابھی تھوڑی دیر میں ام پھر جائے گا۔ ام کو پکا امید ہے کہ کیمرا اسی لڑکے کو ملا ہے اگر وہ اس کے پاس ہے تو دو چار سو روپے لے کر وہ ام کو واپس کر دے گا۔''

''لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ملا ہی نہ ہو۔ تم بتا رہے تھے کہ وہاں پولیس والوں نے ناکہ لگا رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر پڑ گئی ہو۔''

''نہیں جی! امارا دل گواہی دے رہا ہے کہ کیمرا لڑکے کو ہی ملا ہے۔ لڑکے کی والدہ سے امارا ملاقات ہوا ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ شفیع آج صبح بہت جلدی کام سے واپس آ گیا تھا اور پھر کمرے میں جا کر اپنے چھوٹے بھائی سے بہت دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا تھا۔ ناشتے کے بعد دونوں بھائی کام پر چلا گیا تھا۔ وہ دونوں کنڈیکٹری کا کام کرتا ہے۔''

''یہ کام بہت جلدی کرنے والا ہے اجمل۔ بہتر ہے کہ تم اس کی ماں سے دوبارہ ملو اور پوچھ لو کہ وہ کہاں مل سکتا ہے؟''

''اس کی ماں نے کہا ہے کہ اسے شفیع کی ویگن کا پتا نہیں کہ وہ کس روٹ پر چلتا ہے لیکن وہ کہیں بھی ہو وہ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے گھر ضرور آئے گا۔''

☆======☆======☆

ناشتہ کرنے کے فوراً بعد اجمل خان ایک بار پھر کچی آبادی کی طرف نکل گیا۔ اس نے شانی کے چہرے پر نظر آنے والی بے قراری پڑھ لی تھی اور یہ بے قراری بلا وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اجمل بھی بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ جن تصویروں کے لئے اس کے چہیتے دوست لکی خان نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے، وہ کتنی قیمتی ہیں۔ خاص طور سے موجودہ صورتِ حال میں ان کی قدر و قیمت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

یہ آبادی نالہ لئی کے پار واقع تھی۔ یہاں نیچی چھتوں والے کچے پکے مکانوں کی طویل قطاریں تھیں اور گلیوں میں نیم عریاں بچے کھیل رہے تھے۔ اجمل خان شفیع کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی ماں گہرے سانولے رنگ کی تھی اور تھوڑی دور واقع ایک متوسط رہائشی آبادی میں لوگوں کا کام کاج کرتی تھی۔ اس کا نام نذیراں تھا۔ آج اتوار کے سبب نذیراں کی چھٹی تھی۔ وہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ اجمل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر چونک گئی۔

اجمل نے پوچھا۔

''ہاں ماسی! کچھ پتا چلا لڑکے کا؟''

''میں نے کہا تھا نا خان جی! وہ دوپہر سے پہلے نہیں آئے گا۔''

اجمل نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بڑے دھیان سے نذیراں کو دیکھا۔ وہ نگاہ چرانے لگی۔ اجمل نے اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''ماسی! مجھے لگتا ہے کہ تُو کچھ چھپا رہی ہے۔ دیکھ، ام کو سختی پر مجبور نہ کر۔ اگر کیمرا گھر میں پڑا ہے تو ام کو بتا دے۔ اگر پولیس یہاں آگئی اور اس نے خود کیمرا ڈھونڈا تو تم لوگوں پر بڑی مصیبت آجائے گی۔ تمہارا انعام اکرام تو مارا جائے گا ہی دو چار ہزار روپے پلے سے دے کر بھی جان نہیں چھوٹے گی۔''

نذیراں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ہکلائی۔''خان جی! میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی......کک......کیمرا......مم......میرا مطلب ہے......کہ۔'' وہ بُری طرح گڑبڑا گئی۔

اجمل نے اپنے تاثرات نرم کئے اور محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''دیکھ نذیراں! ام تم کو برادرانہ مشورہ دے رہا ہے۔ تم یا تمہارا بیٹا کیمرا باہر بیچ کر ہزار بارہ سو روپے سے زیادہ حاصل نہیں کرسکو گے۔ ام تم کو اس سے کہیں زیادہ انعام دے گا...... اور ایک دم نقد......لیکن اگر کیمرا کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا تو تم پر مصیبت بھی بڑا سخت آئے گا۔''

نذیراں کے تاثرات بدل گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔''خان جی! سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ شفیع کو کوڑے سے کالے رنگ کا ایک چھوٹا سا کیمرا ملا ہے۔ اس کے ایک دوست بالے نے مجھے بتایا ہے۔ بالے نے ایک چھوٹی ٹیپ دے کر اس سے کیمرا لینا چاہا تھا پر شفیع نے کہا کہ وہ ہزار روپے سے کم میں نہیں بیچے گا۔''

اجمل کو غصہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری بات نذیراں کو سویرے سے ہی معلوم تھی۔ اگر وہ سویرے یہ سب کچھ بتا دیتی تو شاید اجمل اب تک شفیع کو ڈھونڈ بھی چکا ہوتا۔ اب اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ شفیع وہ کیمرا ہزار بارہ سو روپے میں کسی انجان شخص کو بیچ دے اور وہ منہ دیکھتے رہ جائیں۔

اگلے دو چار منٹ میں اجمل نے نذیراں نامی اس کالی بھجنگ عورت کو اچھی طرح دھمکایا اور اچھی طرح لالچ بھی دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اجمل کے ہمراہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ انہوں نے بالے نامی اس لڑکے کو بھی ساتھ لیا جس نے صبح سویرے شفیع سے کیمرے کا معاملہ پٹانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تینوں ٹیکسی پر روانہ ہوئے۔ ان کی منزل اندرون شہر کا ایک ویگن اڈا تھی۔ وہ اڈے پر پہنچے تو دس بجے کا وقت تھا۔ ویگنیں ایک طویل قطار میں

کھڑی تھیں۔ آگے والی ویگنوں میں سواریاں ٹھونسی جارہی تھیں۔ نذیراں اجمل کو لے کر ایک بوڑھے چپلے شخص کے پاس پہنچی جس کے اردگرد چرس کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس کے پاس شفیع کنڈیکٹری کرتا تھا۔ اس شخص کی تین چار ویگنیں اس روٹ پر چلتی تھیں۔

نذیراں نے اس شخص سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو وہ روانی سے شفیع کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگا اور اس نے بتایا کہ وہ آج کام پر نہیں پہنچا۔

نذیراں کان لپیٹ کر واپس ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ اس نے اجمل کو بتایا کہ آج شفیع نے ویگن سے چھٹی کی ہے۔ وہ یقیناً گیند پکڑنے گیا ہوگا۔

''گیند پکڑنے؟'' اجمل نے حیرانی سے پوچھا۔''یہ کیا کام ہے؟''

''یہاں کلب میں لوگ گیند کھیلنے آتے ہیں۔ کبھی کبھی اتوار کے روز شفیع وہاں چلا جاتا ہے گیند پکڑنے کے لئے۔''

اجمل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ شاید وہ ٹینس وغیرہ کا ذکر کر رہی تھی۔''کلب کہاں ہے؟'' اجمل نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

نذیراں نے اسے ایڈریس بتایا۔ وہ تینوں ایک بار پھر ٹیکسی پر کلب کی طرف روانہ ہوئے۔

ایک پوش علاقے میں بڑی سڑک کے کنارے یہ ایک سرسبز گراؤنڈ تھا۔ یہاں ان ڈور گیمز کے ساتھ ساتھ ٹینس کھیلنے کا انتظام بھی تھا۔ تین چار شاندار گاڑیاں پارکنگ میں موجود تھیں۔ دو لیڈیز اپنے کوچ کے ساتھ کھیل کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ دور چلے جانے والی گیند کو پکڑنے کے لئے یہاں ایک دو غریب صورت لڑکے موجود تھے۔ نذیراں کو اپنا لڑکا شفیع کہیں نظر نہیں آیا۔ اس نے بےقراری سے دائیں بائیں دیکھا پھر اس نے اسے ڈھونڈ لیا.. وہ ایک کینٹین کے پاس کرسی پر بیٹھا بڑی شان سے کولڈ ڈرنک اور چپس انجوائے کر رہا تھا۔

وہ اٹھارہ انیس سال کا سانولا لڑکا تھا۔ بال گھونگھریالے اور لباس معمولی تھا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر وہ حیران ہوا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوئے شفیع! کیمرا کدھر ہے؟'' نذیراں نے اس کے پاس پہنچتے ہی تیز سرگوشی کی۔

شفیع کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں بارعب اجمل خان کو دیکھا اور ہکلایا۔''کک......کون سا کیمرا اماں؟''

نذیراں نے دانت پیسے۔''بکواس نہ کر۔ کیمرے کا بتا کدھر ہے؟''

''وہ تو میں نے دے دیا چھوٹے صاحب کو۔''

"کون چھوٹے صاحب؟" نذیراں نے پھر تیز سرگوشی کی۔

"وہی شاہ نواز صاحب جو یہاں کھیلنے آتے ہیں۔ ملکانی بیگم کے بیٹے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں دیکھا۔ ان کو اچھا لگا۔ انہوں نے مانگ لیا۔ میں نے دے دیا۔ میں نے سوچا میرے کس کام کا ہے۔"

"دے دیا یا بیچ دیا؟" اجمل نے تڑخ کر پوچھا۔

"نہیں جی... بیچا نہیں ہے۔" شفیع کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

نذیراں اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور کچھ دیر تک غصیلے انداز میں کھسر پھسر کرتی رہی۔ پھر وہ اجمل کے پاس آئی اور کھسیانے لہجے میں بولی۔ "خان جی! ہم نے آنے میں تھوڑی سی دیر کر دی ہے۔ شاہ نواز نام کے اس بابو جی نے شفیع سے وہ کیمرا لے لیا ہے۔ یہ ایک ہزار روپیہ دیا ہے شفیع کو۔ اس میں سے پچاس ساٹھ روپے اس نے خرچ کر دیئے ہیں۔" نذیراں نے چند مڑے تڑے نوٹ کانپتے ہاتھوں سے اجمل کی طرف بڑھائے۔

اجمل چیخ کر رہ گیا۔ شاید آج کا دن ہی اچھا نہیں تھا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ کیمرا کسی انجان خریدار کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ وہ نوٹوں کی طرف توجہ دیئے بغیر پھنکارا۔ "اب خیر سے وہ چھوٹا صاحب کہاں ملے گا ام کو؟"

نذیراں ایک بار پھر شفیع کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ اب خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اجمل کو وہ زیادہ چالاک لڑکا دکھائی نہیں دیا۔ اس جدید کیمرے کی قیمت بازار میں چودہ پندرہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو اس کے بدلے پانچ چھ ہزار حاصل کر سکتا تھا۔

ماں بیٹا تین چار منٹ تک ڈرے ڈرے انداز میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر نذیراں اجمل کے پاس آئی۔ "خان جی! شفیع کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے جی۔ اگر ہم تھوڑی دیر پہلے یہاں آجاتے تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کیمرا آپ کو دے دینا تھا جی...... اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ ملکانی بیگم کی کوٹھی پر لے جاتا ہے...... اگر چھوٹا صاحب ابھی گھر پر ہی ہوا تو ہو سکتا ہے کہ کیمرا ابھی آپ کو مل جائے۔ نہیں تو شام کو تو ضرور مل جائے گا۔"

"نہیں، وہ ابھی ملنا چاہیے۔" اجمل نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "بیٹے کو ساتھ لو اور ابھی چلو امارے ساتھ۔"

سانولے رنگ کے دبلے پتلے اور کسی حد تک بدبودار شفیع کے ساتھ وہ پھر ٹیکسی کار میں آبیٹھے۔ شفیع کی نگاہیں ایک مجرم کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ چند بھری پُری سڑکوں سے گزر کر وہ

نسبتاً کشادہ علاقے میں داخل ہوئے اور پھر ایک شاندار رہائشی آبادی میں آگئے۔ راستے میں شفیع نے اجمل خان کو بتایا کہ چھوٹے صاحب نے آج کہیں پکنک پر جانا تھا اس لئے وہ ٹینس کھیل کر جلدی واپس چلا گیا ہے۔ دو تین کینال کی شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی رکی۔ شفیع نے ٹیکسی کو مین گیٹ سے کچھ فاصلے پر ہی رکوایا تھا۔ وہ کچھ ڈرا ڈرا نظر آنے لگا، جیسے اجمل خان کو یہاں چھوٹے صاحب کی رہائش گاہ پر لا کر اس نے کوئی غلط کام کیا ہو۔

اجمل خان از خود ٹیکسی سے اُترا اور کوٹھی کے وسیع و عریض گیٹ کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک شاندار جیگوار کار لشکارے مارتی مین گیٹ پر پہنچی۔ اس کار کو گندمی رنگت والی ایک ہٹی کٹی بارعب عورت چلا رہی تھی۔ اس کے بال زیادہ بڑے نہیں تھے اور اس نے دوپٹا کسی مفلر کی طرح گلے میں ڈال رکھا تھا۔ عورت کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔

گاڑی کے اندر سے شفیع نے دبی آواز میں کہا۔ "یہی ملکانی جی ہیں۔"

گیٹ پر موجود دو پہرے دار بالکل اٹین شین نظر آنے لگے تھے۔ دونوں نے جلدی سے گیٹ کھولا۔ شاندار گاڑی جیسے سڑک پر تیرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ڈرائیو وے پر دس پندرہ میٹر آگے جا کر گاڑی رک گئی۔ یہاں ایک نوجوان لڑکی موجود تھی۔ وہ قبول صورت تھی اور شکل سے خادمہ ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ہٹی کٹی دراز قد ملکانی بیگم باہر آئی۔ اس نے ترش لہجے میں لڑکی سے کچھ کہا جسے اس نے سر جھکا کر سنا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی۔ اس نے گاڑی کو ڈرائیو کر کے قریبی گیراجوں میں سے ایک گیراج میں پہنچا دیا اور ملکانی بیگم کے پیچھے کوٹھی میں چلی گئی۔

اجمل خان کو دیکھ کر ایک مسلح پہرے دار اس کے نزدیک آیا۔ "جی خان جی! کس سے ملنا ہے؟"

"چھوٹے صاحب شاہ نواز سے۔"

"پر وہ تو کہیں جا رہے ہیں۔ ان سے ٹائم لیا تھا آپ نے؟"

"ٹائم تو نہیں لیا لیکن ملنا ضروری ہے۔"

"کام کیا ہے؟" اس مرتبہ ذرا تلخ لہجے میں پوچھا گیا۔

"کام ام ان کو ہی بتائے گا۔"

اس سے پہلے کہ گارڈ زیادہ سخت لہجے میں اجمل سے بات کرتا، دو تین گاڑیاں کوٹھی کے اندر سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھیں۔ ان میں ایک کھلی چھت کی سپورٹ کار تھی۔ ایک اسٹیشن وین اور ایک جیپ تھی۔ تینوں گاڑیوں میں خوش باش لڑکے لڑکیاں بھرے ہوئے تھے۔

اسپورٹ کار میں بلند آواز سے میوزک بج رہا تھا۔ اطلاع درست تھی۔ چھوٹا صاحب اور اس کے کزن وغیرہ شاید پکنک پر جا رہے تھے۔

گارڈ نے اجمل کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور جلدی سے مین گیٹ کھول دیا۔ سپورٹ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر اٹھارہ انیس سال کا ایک گورا چٹا لڑکا موجود تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی موٹی زنجیر اور آنکھوں پر دھوپ کا قیمتی چشمہ تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ گیٹ کھولنے سے پہلے گارڈ نے اجمل کو دھکیلا ہے۔ اس نے کڑے تیوروں سے اجمل کی طرف دیکھا اور گارڈ سے کچھ پوچھا۔

جب گارڈ لڑکے سے بات کر رہا تھا، اجمل ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سرخ سپورٹ کار میں موجود یہی لڑکا شاہ نواز ہے۔

''کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟'' لڑکے نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اجمل سے پوچھا۔ اس کے ساتھ گاڑی میں موجود ایک لڑکی اور دو لڑکے بھی تعجب سے اجمل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اجمل نے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! ام آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہے اگر آپ ام کو صرف دو منٹ کا وقت دیں تو آپ کا بہت مہربانی ہوگا۔''

''جو کہنا ہے کہہ دو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' جھلائے ہوئے انداز میں کہا گیا۔

اجمل نے پھر درخواست کی تو لڑکا بہت احسان کرتے ہوئے گاڑی سے باہر آ گیا۔

''ہاں کہو، کیا کہنا ہے؟''

''دراصل ام آپ سے اس کیمرے کی بات کرنا چاہتا ہے جو آج سویرے گیند پکڑنے والے لڑکے شفیع نے آپ کو دیا ہے۔''

''کیا مطلب . کون سا کیمرا؟'' شاہ نواز ذرا گڑبڑا گیا۔

اجمل نے کہا۔ ''آپ بڑا لوگ ہے صاحب! آپ کے لئے وہ معمولی چیز ہے لیکن امارے لئے نہیں۔ وہ امارے بھائی نے چند دن پہلے امارے لئے انگلینڈ سے بھجوایا تھا۔ کل رات موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے وہ ام سے گر گیا۔ اس عیسائی لڑکے کے ہاتھ لگا اور اس نے آپ تک پہنچا دیا۔''

''دیکھو خان! میں نہ تم کو جانتا ہوں اور نہ کسی عیسائی لڑکے کو۔ اپنا وقت ضائع نہ کرو اور نہ میرا۔''

شاہ نواز کے لہجے میں خودسری اور بددیانتی کی بُو آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس

مڑتا اجمل نے تیزی سے کہا۔ ''وہ لڑکا امارے ساتھ ہی آیا ہے چھوٹے صاحب۔ وہ آپ سے ڈر رہا تھا اس لئے وہاں ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ اس نے ام کو وہی بتایا ہے جو ام آپ سے بول رہا ہے۔''

شاہ نواز نے ذرا دھیان سے دور کھڑی ٹیکسی کی طرف دیکھا اور اس میں دبک کر بیٹھے ہوئے سانولے شفیع کو پہچان لیا۔ شفیع کو پہچاننے کے بعد تھوڑی دیر تک اس کے چہرے پر تذبذب اور جھلاہٹ کے آثار نظر آئے پھر وہ ایک گہری سانس لے کر اور دونوں ہاتھ اپنی پشت پر جما کر بولا۔ ''اچھا چلو......وہ کیمرا میں نے خریدا ہے اس لڑکے سے۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟'' اس کے لہجے میں تپش تھی۔

''وہ امارا کیمرا ہے۔ اگر تم کہو تو ام تم کو رسید دکھا سکتا ہے۔ تم نے جتنا روپیہ اس لڑکے شفیع کو دیا ہے وہ ام واپس کرا دیتا ہے۔ آپ کا مہربانی ہوگا کہ وہ کیمرا ام کو واپس کر دیں۔''

''دیکھو خان! بات یہ ہے کہ وہ کیمرا میں نے پیسے دے کر لیا ہے اور اب وہ میرا ہے۔ میں اس کو بیچنا چاہوں یا نہ بیچنا چاہوں یا کتنے میں بیچنا چاہوں یہ میری مرضی ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کیمرا عیسائی لڑکے نے مجھے ہی دیا ہے؟''

شعلہ مزاج امیر زادے کے لہجے میں پھڈے بازی کا رنگ ڈھنگ موجود تھا۔ اس کے دوست اور کزن وغیرہ کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ گو ان تک آواز نہیں پہنچ رہی تھی لیکن وہ بڑی توجہ سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب بھی شاہ نواز کی طرح اس بات پر جھلائے ہوئے تھے کہ خان نے انہیں روک کر ان کا راستہ کھوٹا کیا ہے۔

اجمل خان نے کہا۔ ''چھوٹے بھائی! ام تم سے لڑائی جھگڑا نہیں کر رہا۔ تم بڑا لوگ ہے، تمہارے امارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم بس ام پر مہربانی کر کے کیمرا دے دو اور اگر کوئی جرمانہ ورمانہ لینا چاہو تو وہ کر لو۔''

''چلو......دو پھر جرمانہ۔'' شاہ نواز نے خشک لہجے میں کہا۔

''ہاں جی......بتا دو۔'' اجمل ذرا توقف سے بولا۔

''بیس ہزار میں دوں گا۔''

''بیس ہزار......؟ اتنی قیمت تو بازار میں بھی نہیں ہے اس کی۔'' اجمل نے حیرت سے

''میں نے کہا ہے نا......میری چیز ہے، جتنے میں چاہوں گا بیچوں گا۔'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

''دیکھو بھائی! بات یہ ہے کہ تم نے......''

''میں تمہارا بھائی وائی نہیں ہوں۔'' لڑکے نے درشتی سے اجمل کی بات کاٹی۔ ''اور زیادہ بحث کرو گے تو قیمت بڑھا دوں گا۔''

اجمل سٹپٹا گیا تاہم اس نے خود پر قابو رکھا اور بولا۔ ''چلو ایسا کرو ام.....''

خودسر امیرزادے نے ایک بار پھر تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''اب تیس ہزار میں دوں گا۔''

اجمل گڑبڑا کر رہ گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''یار تم خواہ مخواہ جھگڑا پیدا کر رہا ہے۔''

''اب پچاس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔'' شاہ نواز بھڑکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''کس بات کا پچاس ہزار؟'' اجمل بھی تنک کر بولا۔

''اب ایک لاکھ اور مزید بکواس کرو گے تو ایک کا دو لاکھ ہو جائے گا۔'' شاہ نواز کا لہجہ اٹل اور خطرناک تھا۔ اس کے کزن اور دوست قریب آ کر دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگے تھے۔

اجمل کے اعصاب تن گئے۔ وہ کافی برداشت کر چکا تھا۔ اس کے اندر کا جنگجو پٹھان اپنی تمام خطرناکی سمیت انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ ''ام پوچھتا ہے، تم نے سیدھے ہاتھوں سے کیمرا دینا ہے یا نہیں؟'' وہ گرجا۔

شاہ نواز کا چہرہ انگارے کی طرح ہو گیا۔ اس نے اپنا چشمہ اُتارا اور خطرناک لہجے میں بولا۔ ''اوئے تُو بولتا کس طرح ہے سودخور کی اولاد۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اجمل کو زور سے دھکا دیا۔ اجمل لڑکھڑا کر ایک دو قدم پیچھے گیا۔ شاہ نواز کے دو کزن اس پر ٹوٹ پڑے۔ اجمل نے ایک کا گھونسا جھک کر بچایا اور اس کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ قریبی درخت سے ٹکرایا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو اجمل نے بڑی شدت سے گھما کر شاہ نواز پر دے مارا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے اسٹیشن وین کی سائیڈ سے لگے۔ اس تصادم میں زوردار دھماکا ہوا۔ اسٹیشن وین میں موجود لڑکیاں چلاتی ہوئی ویگن سے نکلیں اور مین گیٹ کی طرف دوڑ پڑیں۔

اتفاقاً کوٹھی کے دونوں پہرے دار غیر مسلح تھے۔ ان میں سے ایک تومند گارڈ نے اجمل کو عقب سے دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ تو چند سیکنڈ میں ہی شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس نے یہ کوشش ناکام بنائی اور سامنے سے حملہ کرنے والے دو لڑکوں پر تابڑتوڑ مکے برسا کر انہیں دن میں تارے دکھا دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''جان سے مار دے گا ام۔''

اچانک پچھلی گاڑی میں سے برآمد ہونے والے تین چار لڑکوں نے گارڈ کے ساتھ مل کر

اجمل کو دبوچ لیا۔ جس ٹیکسی میں شفیع اور اس کی والدہ وغیرہ سوار تھے، وہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر رفوچکر ہو گئے تھے۔ جب اجمل نے خود کو گھرا ہوا محسوس کیا تو اچانک قمیص کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ پستول والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اس نے اوپر تلے تین فائر کئے۔ دھماکوں سے فضا لرز گئی۔ فیشن ایبل لڑکے حواس باختہ ہو کر چاروں طرف بھاگے۔ چھوٹے صاحب یعنی شاہ نواز بھی ان میں شامل تھا۔ وہ سب خوف زدہ ہو کر بھاگے تھے..... تاہم انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ بھی کوئی ہتھیار وغیرہ لینے کے لئے دوڑے ہوں۔

اسی اثناء میں اجمل کی نگاہ کوٹھی کے احاطے کی طرف گئی۔ پہلے والا گارڈ اندرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ یقیناً وہ اپنی رائفل لینے کے لئے لپکا تھا۔ اجمل نے چند سیکنڈ کے لئے سوچا۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اب صورتِ حال سنگین تر ہو جائے گی۔ قریب سے ایک ہنڈا گاڑی گزر رہی تھی۔ اجمل اس کے آگے کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کے پہیئے چرچرائے اور وہ رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ماڈرن لڑکی نے آنکھیں نکال کر اجمل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا غصیلا اشارہ کرتی اجمل نے پھرتی سے عقبی دروازہ کھولا اور گاڑی میں گھس گیا۔ اجمل کے تاثرات اور اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر لڑکی کی سٹی گم ہو گئی۔ اجمل نے بلاتوقف پستول اس کی طرف سیدھا کر لیا۔ ''خبردار...... میڈم رانی! گاڑی آگے بڑھاؤ ورنہ گولی تمہاری گوری گوری گردن میں گھس جائے گی اور سیانے کہتے ہیں جب گولی اندر گھستا ہے تو بہت تکلیف ہوتا ہے۔''

لڑکی کا چہرہ چند سیکنڈ میں ہلدی ہو گیا۔ اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن وہ بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ دو تین سڑکیں کراس کرنے کے بعد ہی اجمل کو اندازہ ہو گیا کہ وہ گاڑی کہیں ٹھونک دے گی۔ وہ جلد از جلد ملکانی بیگم کی کوٹھی سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نے لڑکی کو حکم دیا کہ وہ گاڑی ایک طرف سڑک کے کنارے روک دے۔ لڑکی نے مشینی انداز میں عمل کیا اور گاڑی روک دی۔ وہ تھرتھر کانپ رہی تھی اور اجمل کو پیشکش کر رہی تھی کہ اس کے پرس میں جتنے روپے ہیں وہ رکھ لے..... گاڑی بھی رکھ لے اور اسے جانے دے۔

اجمل نے کہا۔ ''اس بات پر ام بعد میں غور کرے گا۔ ابھی تم اپنا سیٹ چھوڑ کر ساتھ والی سیٹ پر آ جاؤ۔ گاڑی ام خود ڈرائیو کرے گا۔'' لڑکی کسمسائی۔ ''چلو، شاباش.. جلدی۔'' اجمل نے پستول کو حرکت دی۔

گاڑی کے اندر ہی اندر سیٹ کو تبدیل کرنا لڑکی کے لئے کافی مشکل ثابت ہوا۔ اس

نے بہت چست پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے منہ سے کئی بار بے ساختہ ''اوئی اللہ'' کے نسوانی کلمات نکلے۔ جب وہ سیٹ تبدیل کر چکی تو اجمل خان نے بھی پھرتی سے سیٹ تبدیل کی اور لڑکی کے برابر آبیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ بڑی تیزی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''تم..... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔

''آئس کریم کھلانے..... اس کے بعد ام تم کو پورا چھوڑ دے گا۔''

''مم..... میں..... آئس کریم نہیں کھاتی۔'' وہ گڑبڑائی۔

''تمہارا تو باپ بھی کھائے گا اور پورا ایک لیٹر ایک ہی ٹائم میں کھائے گا۔'' اجمل ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا تھا۔

لڑکی تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی، جیسے کچھ بھی سمجھ نہ پا رہی ہو۔ اجمل نے ایک ہاتھ کو حرکت دے کر جیب میں سے نسوار کی خوب صورت ڈبیا نکالی اور بولا۔ ''ام نے کسی سے وعدہ کر رکھا ہے کہ نسوار کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس لئے تم اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا نسوار لے کر امارے منہ میں رکھو۔''

''مم..... میں رکھوں۔''

''چلو، جلدی کرو۔'' وہ دہاڑا اور ڈھکن کھول دیا۔

لڑکی نے لرز کر ایک چٹکی لی اور کانپتے ہاتھ سے یوں اجمل کے منہ میں رکھی جیسے شیر کے منہ میں گوشت کا ٹکڑا رکھ رہی ہو۔

''شاباش..... اب تمہیں وہی کرنا ہوگا جو ام کہہ رہا ہے۔''

''کک..... کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلے وعدہ کرو..... وہی کرو گی جو ام تم سے کہے گا۔'' اجمل پھنکارا۔

''تت..... تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''میں کیا بکواس کر رہا ہوں؟'' اجمل دہاڑا۔ ''وعدہ کرو کہ وہی کرو گی جو ام کہے گا۔''

لڑکی خاموش رہی۔ اس کا رنگ ہلدی تھا اور پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اجمل نے گاڑی ایک سنسان سڑک پر روک دی۔ ''یعنی ام تمہاری خاموشی کو رضامندی سمجھے۔'' وہ بولا اور اطمینان سے پستول جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے گاڑی کے اگنیشن میں سے چابی نکال کر لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ ''خو، اب جاؤ..... تم آزاد ہو۔'' وہ ملائم لہجے میں بولا۔

وہ خوشی آمیز حیرت سے اجمل کو دیکھنے لگی۔ اجمل گاڑی سے نکل آیا۔ لڑکی نے اپنی بچی کھچی ہمت جمع کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اجمل نے کھڑکی میں سے جھک کر کہا۔

''کسی سے ذکر کیا تو مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں۔''

''اور وہ وعدہ کہ، جو کہوں گا وہی کرنا ہے۔'' اجمل نے کہا۔

''کک..... کیا کرنا ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''ایسی تنگ پتلون پھر نہیں پہننی۔'' وہ زیر لب مسکرایا اور تیزی سے گھوم کر ایک باغیچے میں گھس گیا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ موقع واردات سے محفوظ دوری پر آ چکا ہے۔ اس لیے وہ جلد از جلد شانی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگلے ایک دو گھنٹے میں ملکانی بیگم اور اس کے لوفر لونڈے سے اس کا زوردار ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ یقیناً عارف کمبوہ وغیرہ نے بھی اس ٹکراؤ میں حصہ لینا تھا۔

جس وقت اجمل خان ایک ٹیکسی میں سوار حاجی حیات کی کوٹھی پر پہنچا، دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ کوٹھی میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ حاجی حیات کی ذاتی کار بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غالباً وہ ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔ اتفاقاً کوٹھی کے پورچ میں ہی اجمل خان کی ملاقات عارف کمبوہ سے ہو گئی۔

وہ پتلون قمیص میں تھا۔ اس کی پتلون کی ایک جیب خاصی پھولی ہوئی تھی۔ یقیناً اس میں پستول وغیرہ موجود تھا۔ اجمل خان کو عارف کا خاص دیہاتی بانکپن اور جی داری پسند آئی تھی۔ پچھلے چند دن میں دو تین موقعوں پر اس نے خطرناک صورتِ حال میں بڑی جرأت مندانہ دخل اندازی کی تھی۔ خاص طور سے کل رات جب لکی خان زخمی حالت میں سوزوکی کار کے اندر موجود تھا اور قدرت اللہ کے مسلح چیلوں نے داداگیروں کی طرح کار کو گھیر لیا تھا۔ وہاں دو تین سنٹ تک خاصی زوردار دو طرفہ فائرنگ ہوئی تھی۔ دو افراد زخمی ہوئے تھے اور ایک شخص ہلاک اور تین زخمی ہو گئے تھے۔ اس واقعے کی تفصیل بھی آج کے اخبارات میں موجود تھی۔

عارف کے ہاتھ کی پشت پر تھوڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ غالباً یہ کل رات کی ہنگامہ آرائی کا ہی نتیجہ تھی۔

''شانی بہن کہاں ہے؟'' اجمل نے چھوٹتے ہی عارف سے پوچھا۔

''فون پر کسی سے بات کر رہی ہے۔ تم بتاؤ کیمرے کا کچھ پتا چلا؟''

اجمل نے تفصیل کے ساتھ سب کچھ عارف کے گوش گزار کر دیا۔ اس رُوداد کے آخر میں ملکانی بیگم کا ذکر آیا۔ ملکانی بیگم کے نام پر عارف چونک گیا۔ ''یہ بڑی دھانسو ٹائپ عورت

ہے۔ وہاں گوجرانوالہ میں بھی اس کی ایک بڑی کوٹھی ہے۔ اس کا ایک بھائی سیاست میں پاؤں رکھتا ہے، ایک بھائی پولیس افسر ہے۔" عارف نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے لیکن اب ام پیچھے نہیں ہٹ سکتا ہے عارپ بھائی۔ وہ کیمرا تو ام کو واپس لینا ہی ہے، چاہے جیسے بھی لیں۔"

عارف کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور پورچ میں ہی چار پانچ قدم ٹہل کر رہ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ حاجی صاحب بھی اس سلسلے میں کچھ خاص مدد نہیں کر سکیں گے۔ ملکانی کا بڑا بھائی سینئر پولیس آفیسر ہے اور خاصا اثر رسوخ والا ہے۔ شاید ایس ایس پی ہے یا اس سے بھی اوپر ہے۔"

"تم ٹھیک کہتا ہے عارپ بھائی! ویسے بھی ہر معاملے میں حاجی حیات صاحب کو گھسیٹنا ٹھیک نہیں۔ وہ پہلے ہی امارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔"

عارف کے روشن چہرے پر چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ وہیں لان میں ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عارف نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک میں جانتا ہوں یہ بڑے ڈھیٹ اور ضدی قسم کے لوگ ہیں۔ خاص طور سے اس ملکانی بیگم کے ضدی پن کے بارے میں تو بہت کچھ سنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا لڑکا بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"ملکانی بیگم کے بارے میں کیا سنا ہے؟" اجمل نے پوچھا۔

"پرلے درجے کی ضدی اور پھڈے باز عورت ہے۔ اس کا ایک واقعہ تو گوجرانوالہ میں بڑا مشہور ہوا تھا۔ گوجرانوالہ کی ایک خوب صورت سکول ٹیچر کی شادی اس عورت نے زبردستی اپنے ایک اجڈ نوکر سے کروا دی تھی۔ یہ پچھلے سال کا ہی واقعہ ہے۔ معمولی سی بات تھی..... صرف کار پارکنگ کرنے پر جھگڑا ہوا تھا۔"

"ام سمجھا نہیں۔" اجمل نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکی اچھے بھلے شریف خاندان سے تھی۔ ایک بھائی ڈاکٹر تھا، دوسرا لیکچرار۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ بس ایویں پھڈا ہو گیا۔ ملکانی بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ ایک ہوٹل میں آئی۔ اس وقت وہ سکول ٹیچر بھی اپنے بھائی کی گاڑی چلاتی ہوئی دو سہیلیوں کے ساتھ وہاں پہنچی۔ وہ خالی جگہ پر اپنی گاڑی کھڑی کرنے لگی تو ملکانی کے ڈرائیور نے بھی گاڑی وہاں گھسیڑ دی۔ بس گاڑی کھڑی کرنے پر بات بڑھ گئی۔ لڑکی نے کوئی سخت بات کہی تو ملکانی نے اسے تھپڑ جڑ دیا۔ لڑکی کو پتا نہیں تھا کہ یہ کون بلا ہے۔ اس نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ لوگوں

نے تو بیچ بچاؤ کرا دیا لیکن یہ معاملہ بعد میں اتنا گرم ہوا کہ لڑکی کی فیملی کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ ہٹ کی پکی ملکانی پنجے جھاڑ کر ان لوگوں کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ لڑکی کو کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ آٹھ دس مہینے کے اندر اندر ملکانی نے ان دونوں بھائیوں اور ان کے بچوں کو فٹ پاتھ پر لا پھینکا۔ ایک بھائی پر ہسپتال کے فنڈ میں غبن کا الزام لگا اور وہ جیل پہنچ گیا۔ دوسرے بھائی کی نوکری چھن گئی اور مکان کی قرقی کے نوٹس ایشو ہو گئے۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ ملکانی کے بال کھینچنے والی لڑکی کو ملکانی کے پاؤں میں گر کر معافی مانگنی پڑی۔ لیکن ملکانی جیسی ضدی عورت سے معافی لینا کون سا آسان کام تھا۔ اس معافی کی عملی شکل یہ سامنے آئی کہ صلح کے نام پر سکول ٹیچر کو ملکانی کے منہ بولے بیٹے سے شادی کرنا پڑی۔ منہ بولا بیٹا بھی بس نام کا ہی تھا۔ حقیقت میں وہ ملکانی کا دیہاتی نوکر تھا۔ میں نے ایک بار گوجرانوالہ میں دیکھا تھا اسے..... موٹا سا بھدا سا..... قد بھی درمیانہ ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں حور کے پہلو میں لنگور..... جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ طاقت طاقت ہی ہوتی ہے۔ وہ لڑکی اب بھی ملکانی کے منہ بولے بیٹے کے پاس ہے اور ملکانی کی کوٹھی میں ہی رہتی ہے۔ اس عورت کی ضد اور اکڑ دیکھو، میں نے سنا ہے وہ اس لڑکی سے اپنی گاڑی تک دھلواتی ہے، یعنی اسے جتاتی ہے کہ جس گاڑی کو پارک کرنے کے لئے تم نے جگہ نہیں دی تھی اب اپنے ہاتھوں سے اسے صاف کرو۔ ایسے لوگوں کی ضد ایک بیماری کی طرح ہوتی ہے۔"

اجمل خان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس نے ملکانی کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔ ایک جواں سال لڑکی نے ملکانی کی گاڑی خود ڈرائیو کر کے گیراج میں کھڑی کی تھی۔ شاید یہ وہی سکول ٹیچر تھی جس کا ذکر عارف کر رہا تھا۔

"پھر اب تمہارا کیا مشورہ ہے عارپ بھائی! اس مالے کو کیسے حل کیا جائے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" عارف نے الٹا سوال کیا۔

اجمل خان کے گلے کی رگیں طیش سے ابھر آئیں۔ "ام کو تو لگتا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اس خبیث لڑکے کا صورت اماری نگاہوں میں گھوم رہا ہے اور امارے اندر آگ بھڑکا رہا ہے۔ باقی آپ ام سے زیادہ سمجھ دار ہے اور شانی بہن سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔"

"ان لوگوں کی گردن میں بڑا سخت سریا ہے۔" عارف نے کہا۔ اس کا اشارہ ملکانی بیگم وغیرہ کی طرف تھا۔

"تو تم کہنا چاہتا ہے کہ ام بات کو زیادہ نہ بڑھائے؟" اجمل نے ذرا مایوسی سے کہا۔

''نہیں...... میں کہنا چاہتا ہوں کہ اکڑی ہوئی گردن کو جھکانے اور توڑنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔'' عارف کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

اجمل خان کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ گئی۔ ''تم نے امارے دل کا بات کیا ہے عارپ بھائی۔ اگر ان اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکانے کا بات ہے تو پھر ام کو آگے کرو۔ امارے ہاتھوں سے پہلے ہی ٹھیک ٹھاک قانون شکنی ہو چکا ہے۔ اب پھانسی سے زیادہ سزا ام کو کیا ہوسکتا ہے۔ ام ان گردنوں کا ایک دم بہترین علاج کر دے گا۔''

''نہیں...... یہ پھڈا اتنا آسان نہیں ہوگا، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ملکانی بیگم کی کوٹھی میں زیادہ نہیں تو سات آٹھ مسلح بندے ضرور ہوں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لڑائی کا خطرہ دیکھ کر اس نے مزید تیچے بلا لیے ہوں۔ ایسے لوگ آسانی سے ہار کہاں مانتے ہیں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''اگر واقعی ان لوگوں سے ٹکر لینی ہے تو پھر کم از کم ایک درجن بندے ہمارے ساتھ بھی ہونے چاہئیں۔ دو تین بندے آگے لگا کر ان سے بات کریں، باقی بالکل تیار حالت میں پیچھے رہیں۔ اگر کام خراب ہوتا نظر آئے تو پھر موبائل پر ان کو کال دے دی جائے۔''

''جیسے تمہارا مرضی۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے۔ وہ لڑکا اور اس کے ساتھی وغیرہ اب کہاں ہوں گے؟''

''وہ سب حرامی پکنک پر جا رہا تھا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ کوٹھی پر ہونے والے پھڈے کے بعد پروگرام کینسل ہو گیا اور امارا خیال ہے کہ ضرور کینسل ہو گیا ہوگا۔ میرے ہاتھ سے دو تین چھوکروں کو ٹھیک ٹھاک چوٹیں بھی لگا ہے۔''

عارف نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ ''اگر یہ کام کرنا ہے تو پھر اس میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیمرا ابھی تو لڑکے کے گھر میں ہوگا پھر ہوسکتا ہے کہ کہیں اور چلا جائے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اگر اس پھولن دیوی کا نمبر مل جائے تو پہلے اس سے فون پر بات کی جائے۔''

''لو جی... شانی بہن بھی آ گیا۔'' اجمل نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی کے ساتھ مُنا بھی چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنے بال جُوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہوئی لان میں ان دونوں کے پاس آ بیٹھی۔ ''کیا بات ہے؟ تم دونوں پُر جوش نظر آ رہے ہو۔'' شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''کیمرے کا کچھ پتا چلا؟''

جواب میں اجمل اور عارف نے سب کچھ شانی کے گوش گزار کر دیا۔

شانی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ اجمل سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میری بات کا بُرا نہ ماننا اجمل، میرا خیال ہے کہ تمہاری جلد بازی سے کام خراب ہوا ہے۔ یہ کوئی ایسا الجھا ہوا مسئلہ نہیں تھا لیکن الجھ گیا ہے۔ اب تم دونوں اسے مزید بگاڑنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بات سوچنے کی ہے عارف! آخر ہم ہر مسئلے کا حل طاقت کے استعمال میں ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے اردگرد پہلے ہی خون خرابہ ہو رہا ہے۔ اب تم اس ملکانی بیگم سے ٹکر لینے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ میرے خیال میں تو یہ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے بلکہ بچکانہ سی ضد ہے۔ اس معاملے کو آسانی سے بات چیت کے ذریعے حل ہو جانا چاہیے۔''

''آپ کا بات ٹھیک ہے شانی بہن! لیکن کچھ لوگ لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں، وہ باتوں سے کسی صورت نہیں مانتے۔''

''اب اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ لاتوں کے بھوت کون ہے اور باتوں کا کون؟'' شانی کا لہجہ خشک تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، عارف نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا خیال ہے کہ ملکانی بیگم سے بات کرنی چاہیے۔ ہم بھی اس سے ''بات'' کرنے کا پروگرام ہی بنا رہے ہیں لیکن احتیاط کے طور پر......''

''احتیاط کے طور پر تم اپنے ساتھ دو درجن گن مین لے جاؤ گے؟'' شانی نے بات کاٹی۔ ''جب لڑائی کی اتنی تیاری کر لی گئی ہو تو صلح صفائی کے ساتھ بات چیت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔'' شانی کا لہجہ تند و تیز تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم ملکانی کے ساتھ بات کرنا چاہتے ہو تو پھر یہ بات میں خود کروں گی۔''

عارف نے تعجب سے شانی کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ ''وہ بہت الٹی عورت ہے شانی...... خواہ مخواہ بندے کو بے عزت کر دیتی ہے۔''

''جب تک کسی شخص سے خود مل نہ لیا جائے اور اس سے بات چیت نہ کر لی جائے اس کے اچھے بُرے ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے زیادہ مسئلے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم کسی شخص سے ملے بغیر اس کے بارے میں بُری رائے بنا لیتے ہیں۔ یہ رائے سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے یا ویسے ہی ہمارے اندر کا ڈر ہمارے ذہن میں غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے۔ بعد میں کسی چھوٹی سی بات کی وجہ سے یہ غلط فہمی ایک دم بہت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے بے شمار دفعہ دیکھا ہے کہ ایک دوسرے سے ڈرتے رہنے والے اور ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے والے دو

بندے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور کچھ وقت اکٹھے گزارتے ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ ان کے درمیان تو کسی طرح کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

''لیکن ہر جگہ تو ایسا نہیں ہوتا نا... بلکہ بہت جگہ ایسا نہیں رہتا۔ آخر اس دنیا میں قدرت اللہ، تاؤ حشام اور ڈپٹی ریاض جیسے لوگ موجود ہیں جب ہی خون خرابا ہوتا ہے۔''

''میں اس بات سے انکار نہیں کر رہی عارف...... یہ کہہ رہی ہوں کہ ہمیں کسی کو جانے بغیر ہر شخص کو قدرت اللہ یا ڈپٹی ریاض نہیں سمجھ لینا چاہیے اور اگر کوئی قدرت اللہ یا ڈپٹی ریاض ہیں بھی تو آخر تک کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس کو چوہدری بابر اور تاؤ حشام اور راجو کی طرح بدلنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''اور اگر کوئی راستہ نہ رہے تو...... یا ویسے ہی اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو جائے؟'' عارف نے کہا۔

''تو پھر دوسرا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی طاقت کا اندھا دھند استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی دل میں نفرت اور انتقام کا جذبہ ہو...... بلکہ یہ سوچ ہو کہ ہم نے بُرے کو نہیں مارنا، برائی کو مارنا ہے اور ہماری لڑائی برائی سے ہے۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے شانی بہن کہ آپ اس ٹیڑھی گردن والے لڑکے اور اس کی خبیث ماں کو بات چیت سے راضی کرلے گا؟'' اجمل نے کہا۔

شانی نے اسے گھورا۔ ''اجمل! یہی زبان ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر معاملے بگڑتے ہیں۔'' اجمل نے ذرا شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ شانی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''جہاں جوش کی ضرورت ہو گی وہاں میں تمہارے جوش کی قدر کروں گی اجمل لیکن جہاں ہوش کی ضرورت ہو وہاں ہوش ہی اچھا لگتا ہے۔''

عارف نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ وہاں اکیلی جا کر بات کرنا چاہتی ہیں؟'' جب سے شانی رستم کی بیوی بنی تھی، عارف نے اسے زیادہ عزت کے ساتھ ''آپ'' کہنا شروع کر دیا تھا۔

عارف کی آنکھوں میں نارضامندی دیکھ کر شانی نے کہا۔ ''اگر تم سمجھتے ہو کہ احتیاطاً چھ سات بندوں کا جانا ضروری ہے تو میں تمہیں منع نہیں کروں گی لیکن یہ بندے جذباتی اور جوشیلے نہ ہوں۔ وہ موقع سے دور رہیں اور کچھ بھی ہو میری اجازت کے بغیر کوئی حرکت نہ کریں۔''

''اور یہی ہدایت ہمارے لئے بھی ہے؟'' عارف نے کہا۔

''بالکل...... یہ اتنا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اسے ہینڈل کر لوں گی۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اس وسیع و عریض کوٹھی کے گیٹ پر موجود تھی جسے ملکانی بیگم کی کوٹھی کہا جاتا تھا۔ شانی اجمل کو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ ہاں عارف کمبوہ اس کے ہمراہ تھا۔ عارف کمبوہ کے قریباً چھ عدد مسلح ساتھی کوٹھی سے تھوڑے ہی فاصلے پر رک گئے تھے۔ وہ ایک اسٹیشن وین میں سوار تھے۔ عارف سے ان کا موبائل کے ذریعے رابطہ تھا۔ شانی اور عارف میں طے ہوا تھا کہ بدترین صورتِ حال میں ہی ان لوگوں کو کال کیا جائے گا۔

گیٹ کے اردگرد شانی کو تناؤ کی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت اس ہنگامے کی طرف اشارہ کرتی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اجمل خان اور ملکانی کے لوگوں میں ہوا تھا۔ ایک جیپ گیٹ کے پاس موجود تھی۔ اس میں دو تین خطرناک صورتوں والے افراد بیٹھے تھے۔ گیٹ پر گارڈز بھی بالکل چوکس تھے۔ جونہی شانی اور عارف کی سوزوکی کار گیٹ پر پہنچی دو افراد تیزی سے پاس آئے۔ ''کس سے ملنا ہے؟'' ایک گارڈ نما شخص نے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

عارف نے اپنا تعارف گلزار احمد کے نام سے کرایا اور بتایا کہ وہ ملکانی جی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ گارڈز نے کافی چھان پھٹک کی اور آخر ملکانی سے فون پر رابطہ کرنے کے بعد ان دونوں کو ملکانی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ چند منٹ بعد اونچی لمبی ملکانی بگولے کی طرح ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ شلوار قمیص میں ہونے کے باوجود دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ ایک قیمتی شال اس کے دائیں کندھے پر پڑی تھی۔

اس نے شانی اور عارف کو سرتاپا گھورا اور انہیں ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''گارڈز نے بتایا ہے کہ تم کچھ دیر پہلے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟''

''جی، ایسا ہی ہے۔'' شانی نے کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ وہ پٹھان تمہارا لگتا کیا ہے؟'' ملکانی کا لہجہ کچھ مزید درشت ہو گیا۔

''وہ ہمارا ساتھی ہے۔ ذرا سا جذباتی ہے۔ ہم اسی کی غلطی پر معذرت کرنے کے لئے آئے ہیں۔'' شانی نے کہا۔

''میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کہاں؟'' ملکانی دھاڑی۔

''میں اسے اسی لئے اپنے ساتھ نہیں لائی۔ اسے دیکھ کر آپ کو مزید غصہ آتا۔ اس کی طرف سے ہم دونوں آپ سے معافی مانگنے کے لئے یہاں موجود ہیں۔''

''میں نہیں دیتی کسی کتے بلے کو معافی...... میں سزا دوں گی۔ میں اس حرامی کی چمڑی

اپنے ہاتھوں سے ادھیڑ دوں گی اور پھر پولیس کے حوالے کروں گی۔ اس نے ملکانی کے بیٹے پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ ۔۔۔'' وہ مردوں کی طرح گندی گالیاں دینے لگی۔

شانی کمال تحمل سے سنتی رہی۔ عارف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک موقع پر شانی کو لگا کہ وہ ایک دم بھڑک اٹھے گا۔ شانی نے اسے ہلکے سے ٹہوکا دے کر مشتعل ہونے سے باز رکھا۔

گالیاں بکنے کے بعد ملکانی کا پارہ تھوڑا سا نیچے آیا تو وہ شانی کو ٹھوڑی سے پکڑ کر بولی۔ ''تو اس کُتے کی جورو لگتی ہے یا بہن؟''

''آپ بہن ہی سمجھ لیں۔ جو سزا آپ اسے دینا چاہتی ہیں، وہ مجھے دے لیں۔ میں اس کی غلطی مانتی ہوں۔ اتنی چھوٹی سی بات پر اسے یہ جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے بیٹے نے وہ کیمرا کسی سے لیا ہے اور پیسے دے کر لیا ہے۔ اگر اسے جھگڑنا ہی تھا تو اس سے جھگڑتا جس نے کیمرا بیچا ہے۔''

یہ وہی بات تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ملکانی نے اپنے انداز میں کہی تھی۔ اب شانی یہ بات خود ہی کہہ رہی تھی۔ یوں وہ ملکانی کی زبان کی دھار کو کند کرتی جا رہی تھی۔

ملکانی چند سیکنڈ کے لئے چپ رہی پھر دوبارہ گرجی۔ ''تو زیادہ ہوشیار چالاک نہ بن۔ تیری جیسی بڑی دیکھی ہیں میں نے میٹھی چھریاں۔ ۔۔۔ چل نکل یہاں سے۔۔۔۔ چل۔'' اس نے شانی کو باقاعدہ دھکا دیا۔ شانی لڑکھڑا کر صوفے سے جا ٹکرائی۔ عارف کے لئے اب اپنے غصے کو سنبھالنا مشکل تھا۔ اس نے شانی کو سہارا دیا اور پھر تڑخ کر ملکانی سے بولا۔ ''دیکھو ملکانی بیگم! ہم یہاں لڑنے کے لئے نہیں۔۔۔۔۔ صلح کرنے کے لئے آئے ہیں۔''

اسی دوران میں ملکانی کا بیٹا شاہ نواز دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ ''تو لڑنے کے لئے آجاؤ۔۔۔ بلکہ ابھی لڑ لو ۔۔۔ ابھی کر لو فیصلہ۔'' وہ سینہ چوڑا کر کے پھنکارا اور اس کے ساتھ ہی عارف کو ہیجڑے کا خطاب دیا۔

عارف جو پہلے ہی بپھرا ہوا تھا مزید بپھرا۔ چند لمحے کے لئے لگا کہ شاہ نواز کی بدتمیزی کا نتیجہ لڑائی کی صورت میں نکلے گا تاہم شانی نے کمال صبر اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بار پھر عارف کو سنبھال لیا۔ وہ اسے دھکیل کر کمرے کے دروازے تک لے گئی اور اسے کہا کہ وہ تھوڑی دیر باہر جا کر بیٹھے لیکن عارف نے باہر جانے سے انکار کر دیا اور وہیں کشادہ ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

شانی نے ایک بار پھر ملکانی بیگم کو نرم کرنے کی کوشش کی۔ اجمل کی حرکت پر اس سے غیر مشروط معافی مانگی اور اسے کہا کہ اس کا غصہ بالکل بجا ہے۔

ملکانی کافی ٹیڑھی عورت تھی لیکن شانی نے اس کی کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ جب ملکانی اور اس کے بیٹے نے دیکھا کہ شانی کسی طور مشتعل نہیں ہو رہی تو وہ بھی ذرا ٹھنڈے پڑ گئے۔ ویسے بھی ملکانی کا کافی غصہ زبان کے رستے نکل چکا تھا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' آخر وہ فرعونی لہجے میں بولی۔

''وہ کیمرا ہمارے لئے ضروری ہے کیونکہ اس میں چند اہم تصویریں ہیں۔''

''کیسی تصویریں؟'' شاہ نواز نے تنک کر کہا۔

''اخباری تصویریں ہیں بھائی! آپ کے کسی کام کی نہیں ہیں لیکن ہمارے لئے اہم ہیں۔ آپ کیمرا آن کر کے دیکھ سکتے ہیں۔''

شاہ نواز نے چند لمحے سوچا پھر اجڈ لہجے میں بولا۔ ''ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔ بس میں نے جو کہہ دیا تھا، وہ کہہ دیا۔ میں کیمرا نہیں دوں گا۔ اگر دوں گا تو ایک لاکھ میں دوں گا۔''

شانی نے سوالیہ نظروں سے ملکانی کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بھی سخت ہو گئے۔ ''بس۔۔۔۔۔ میرے بیٹے نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ اگر یہ دس لاکھ بھی کہہ دیتا تو دینا پڑتا۔ اب اگر کیمرا لینا ہے تو ایک لاکھ روپے نقد نکال کر یہاں رکھ دو۔ ابھی اسی وقت ۔۔۔ بعد کی ضمانت میں نہیں دے سکتی۔''

عارف نے شانی کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ اپنے طیش کو بڑی مشکل سے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ وہ سرگوشی میں شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ سراسر زیادتی ہے۔ یہ لوگ ہمیں ذلیل کر رہے ہیں اور بلیک میلر بھی بنے ہوئے ہیں۔ ایک لاکھ بہت زیادہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ مجھے کال کرنے دیں۔ دو منٹ میں تیر کی طرح سیدھے ہو جائیں گے یہ سب۔''

''نہیں عارف! میں نے تمہیں کہا تھا نا۔۔۔۔۔ ہمیں لڑنا نہیں ہے۔''

عارف کسمسا کر رہ گیا۔ دوسری تجویز پیش کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''یا ایسا کریں اس سے کہیے ہمیں تصویریں نکال لینے دے۔ کیمرا یہ خود رکھ لے۔''

''وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ اصل قیمت تصویروں کی ہے۔'' شانی نے سرگوشی کی۔ ''معاملے کو خواہ مخواہ بگاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرت اللہ کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے ایک لاکھ روپے زیادہ قیمت نہیں ہے۔'' شانی کے لہجے میں استحکام تھا۔

وہ واپس مڑی اور ملکانی بیگم کے پاس پہنچ گئی۔ ''مجھے منظور ہے ملکانی صاحبہ۔'' اس نے کہا اور شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر رقم نکال لی۔ وہ پہلے ہی ایک لاکھ کے بڑے نوٹ گن کر لائی تھی۔ نوٹ ملکانی کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اس کے ساتھ ساتھ میں ایک

بار پھر آپ سے معذرت کرتی ہوں۔ اپنے ساتھی کی طرف سے بھی میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔''

ملکانی نے نوٹ لے کر اپنے بیٹے شاہ نواز کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے گردن اکڑا کر فخریہ انداز میں شانی کی طرف دیکھا اور ماں کے سامنے ہی سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

''کیمرا کہاں ہے شاہ نواز؟'' ملکانی نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے راکی کے پاس بھیج دیا تھا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''تو منگوا لو۔'' ملکانی نے کہا۔

شاہ نواز نے پتلون کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اس پر رابطہ کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

عارف دور صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے اشارے اشارے میں شانی سے کہا۔ ''یہ سب ڈرامہ لگتا ہے۔ لڑکا کیمرا نہیں لوٹائے گا۔''

شانی کے اپنے دل میں بھی شبہ موجود تھا کہ کہیں شاہ نواز کی طرف سے مزید بلیک میلنگ شروع نہ ہو جائے لیکن ملکانی کی خصلت میں اسے زبان کی تھوڑی بہت پاسداری نظر آئی تھی۔

شاہ نواز کے جانے کے بعد ملکانی نے پہلی بار شانی کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ شانی شکریہ ادا کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اپنی بات منوانے کے بعد ملکانی کے چہرے پر اب قدرے نرمی آ رہی تھی۔ وہ شانی سے بات چیت کرنے لگی۔ اس نے شانی سے تصویروں کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ شانی نے اسے بتایا کہ ان تصویروں کا تعلق تعویذ گنڈے کرنے والے ایک جھوٹے پیر سے ہے۔ اس پیر کے خلاف اخبار میں خبر لگانے کے لئے یہ تصویریں ضروری ہیں۔

شانی کا خیال تھا کہ شاید ملکانی پیر قدرت اللہ کے حوالے سے کچھ جانتی ہو گی یا شاید اخبار میں چھپنے والی خبروں پر اس کی نظر پڑی ہو گی لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ملکانی عمومی انداز میں بات کرتی رہی۔ ذہنی طور پر وہ بھی پیر پرستی کے خلاف تھی اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے عاملوں کو برا سمجھتی تھی۔ اس نے شانی کو ایک دو ایسے واقعات بھی سنائے جن کا تعلق عاملوں کی شعبدہ بازی سے تھا۔ عارف بدستور دروازے کے پاس صوفے پر تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی صرف ایک مختصر کال پر ملکانی کی کوٹھی میں تہلکہ خیز ہنگامہ شروع ہو سکتا تھا۔ اس ہنگامے کو شانی کی فراست نے روکا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس تحمل کا مثبت

نتیجہ نکلے گا۔

اور پھر یہی ہوا۔ شاہ نواز کیمرا لے آیا۔ اس نے کیمرا دور ہی سے بے پروائی کے ساتھ صوفے پر اچھال دیا۔ ملکانی نے اٹھا کر کیمرا شانی کو تھما دیا۔

''شکریہ۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔'' شانی نے کہا۔

''نہیں تم کھانے کے وقت پر آئے ہو۔ ہم لوگ کھانے کے وقت کسی کو اپنے ڈرائنگ روم سے کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیتے۔'' ملکانی عجیب رعونت سے بولی۔

شانی دل ہی دل میں مسکرائی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہ ٹیڑھی عورت مرنے مارنے پر آمادہ تھی..... شانی نے کھانے سے انکار کیا لیکن ملکانی کا تحکمانہ اصرار دیکھ کر چپ رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد شانی اور عارف ملکانی کے ساتھ کھانے کی میز پر تھے اور پُرتکلف لنچ کر رہے تھے۔ کھانے کے دوران میں شانی کو ملکانی کے منہ بولے بیٹے کی بیوی بھی نظر آئی۔ وہ خوش شکل لڑکی تھی تاہم اس کے بشرے سے مظلومیت ٹپک رہی تھی۔ اس مظلومیت کی وجہ بھی شانی کو جلد ہی نظر آ گئی۔ یہ اس کا خاوند تھا۔ عارف نے شانی کو بتایا تھا کہ یہ ملکانی کا منہ بولا بیٹا ہے۔ تاہم وہ جس طرح ملکانی کے ارد گرد گھوم رہا تھا اس سے وہ منہ بولا بیٹا کم اور چہیتا نوکر زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی شکل و شباہت بھی ملازم پیشہ افراد کی طرح تھی۔ قد درمیانہ بلکہ درمیانے سے بھی کم تھا۔ مشکل سے اپنی خوبرو بیوی کے برابر ہو گا۔ رنگ پختہ اور نقوش بھدے تھے۔ بہر حال، کچھ بھی تھا، وہ لڑکی کا منکوحہ شوہر تھا۔ شانی اور عارف کے سامنے ہی اس نے کسی بات پر لڑکی کو بری طرح جھڑکا اور وہ کان لپیٹ کر اندر چلی گئی..... شانی نے سوچا ایک ذرا سی بات سے بگڑ جانے والا معاملہ بالآخر کہاں تک پہنچا ہے۔

کھانے کے بعد ملکانی کے باوردی ملازم نے چائے پیش کی۔ ملکانی بھی اب نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ چائے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لئے تیار ہوئے تو ملکانی اندر گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔ نوٹ اس نے زبردستی شانی کو تھما دیئے۔

''یہ کیا ہے جی؟'' شانی نے حیرت سے کہا۔

''تمہارے روپے..... وہ میرے بچے کی ضد تھی جو تم نے پوری کر دی۔ یہ میرا اخلاقی فرض ہے۔ تم لوگ مجھے اچھے لگے ہو۔ میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ تاہم تم لوگوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ اس کے لئے میں بھی شرمندہ ہوں۔''

''نہیں ملکانی جی! ایسی بات نہ کریں۔ غلطی تو میرے بھائی کی تھی۔ اس نے چھوٹی سی

بات پر آپ کے بچوں سے مار پیٹ کی۔ وہ بڑا تھا اس کی ذمے داری زیادہ تھی۔ مجھے دلی طور پر اس کے رویے کا بڑا افسوس ہوا ہے۔"

"میں جانتی ہوں، میرا شاہ نواز بھی چھوٹی سی بات پر بگڑ جاتا ہے۔ اس کا ایک دوست کمال ہے۔ اسی نے اسے زیادہ زہری بنا دیا ہے۔ میں اسے درست کروں گی......"

"کچھ بھی ہے ملکانی جی...... لیکن یہ روپے۔"

"بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔" ملکانی نے محبت آمیز غصے سے اسے ڈانٹا۔ "یہ تمہارے روپے ہیں تمہارے پاس رہیں گے۔ تم خود اخبار والی ہو پھر بھی اس شہر میں کسی طرح کا کوئی کام آ پڑے تو مجھے بتاؤ...... تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔"

"آپ کا بہت شکریہ۔" شانی نے کہا۔

عارف حیرت سے اس نہایت کرخت عورت کی کایا پلٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انہیں باہر تک چھوڑنے آئی۔ اس دوران میں اتفاقاً شانی کی نگاہ ملکانی کی کوٹھی کی چھت پر گئی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ کوٹھی کی چھت پر بھی کئی مسلح افراد موجود تھے۔ یعنی اگر یہاں لڑائی ہوتی تو کافی سنگین ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ اس لڑائی میں کامیاب ہونے کے باوجود بھی عارف اور اجمل وغیرہ کیمرے تک نہ پہنچ سکتے۔ کیونکہ بقول شاہ نواز کیمرا یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

حاجی حیات کی رہائش گاہ پر واپس پہنچتے ہی شانی نے سب سے پہلے اجمل خان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ملکانی بیگم سے بات چیت کے دوران میں وہ دیگر مسلح افراد کے ساتھ کوٹھی سے باہر موجود رہا تھا۔ اجمل خان اس صورتِ حال پر جہاں حیرت زدہ تھا وہاں خوش بھی تھا۔ اجمل خان نے فوری طور پر ہسپتال میں کیمرے کے اصلی مالک یعنی لکی خان سے رابطہ کیا۔ لکی خان کی حالت اب بہتر تھی۔ اجمل نے اسے فون پر ہی خوش خبری سنائی کہ کیمرا اور تصویریں مل گئی ہیں۔ لکی خان نے کہا کہ کیمرا فوراً اخبار کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ اس نے اپنے اس اہم کارکن کا نام بھی بتایا جس کے حوالے کیمرا کیا جانا تھا۔

اگلے روز کے اخباروں میں قدرت اللہ کی بیویوں کی تہلکہ خیز تصویریں موجود تھیں۔ ان میں سے دو تین تصویریں تو اتنی واضح تھیں کہ ان سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ فلیش لائٹ نے نہ صرف چہروں کے خدوخال نمایاں کیے تھے بلکہ چہروں اور جسم کے عارضے کو بھی آشکار کیا تھا۔ جلدی بیماری کے آثار جسم کی جلد پر واضح تر تھے۔ ان میں ایک تصویر دھینگا مشتی کی بھی تھی۔ قدرت اللہ کا چیلا جالب نیوز فوٹو گرافر سے نپٹنے کے لئے لکی خان کو گھونسا رسید کر رہا تھا۔

ان تصویروں کے ساتھ نیوز رپورٹر لکی خان کے زخمی ہونے کی خبر بھی دوبارہ نتھی کی گئی تھی اور تصویروں کے زوردار کیپشن لگائے گئے تھے۔

ان تصویروں نے پیر قدرت اللہ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کی طرف سے جوابی طور پر کوئی بیان جاری نہیں ہوا۔ شاید اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اور اس کے نہایت سخت سناٹے میں تھے۔ شانی اور عارف وغیرہ کے لئے بھی اجمل خان کے ہاتھوں چوہدری بشیر کی سنسنی خیز موت کے بعد یہ دوسری بڑی خبر تھی۔

اگلے روز کے اخباروں میں پھر قدرت اللہ کے خلاف خبروں کی بھرمار تھی...... قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے اڈے کئی شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں استانے یعنی آستانے کہا جاتا تھا۔ مختلف شہروں میں کم از کم چار استانوں کے سامنے شدید ہنگامے ہوئے اور وہاں توڑ پھوڑ مچائی گئی۔ ان میں سے ایک استانے کو آگ بھی لگا دی گئی۔ وہ لوگ جو قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کی شعبدہ بازیوں کا شکار ہوئے تھے اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہے تھے۔ ایسے ہی کسی دل جلے نے بے رحمی حیوانات ایکٹ کے تحت قدرت اللہ پر کیس کرنے کا اعلان کیا۔

تیسرے روز کے اخبارات میں پیر قدرت اللہ سے منسوب ایک چھوٹا سا بیان شائع ہوا جس میں اس نے ان تصویروں کو جعلی قرار دیا۔ یہ آواز اور یہ دلیل بڑی کمزور تھی۔ درحقیقت پیر قدرت اللہ اور اس کی شعبدہ بازی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا تھا اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ مزید نقصان ہو رہا تھا۔ قدرت اللہ کو بے حد کاری ضرب لگی تھی اور اس کارنامے کے اصل ہیرو اجمل خان، عارف اور لکی خان تھے۔

جس روز رنگ والی کے قریب جوہر آباد سے قدرت اللہ کا خاص چیلا شاہی خاموشی کے ساتھ اپنا بستر بوریا سمیٹ کر غائب ہوا، اسی روز جوہر آباد کی 80 فیصد آبادی نے باقاعدہ جشن منایا اور جوہر آباد کے ہسپتال کی عمارت پر چراغاں کیا گیا۔ راولپنڈی میں شانی، اجمل خان اور عارف کسبوہ کے لئے بھی یہ جشن کا وقت تھا۔ اس روز اجمل خان نے شانی سے باقاعدہ اجازت لے کر مسالے دار نسوار کے دو بڑے چنکے منہ میں رکھے اور ایک کف گیر (چمچے) کو تلوار بنا کر خٹک رقص پیش کیا۔ شانی کے لئے بھی یہ خوشی کا وقت تھا۔ وہ ظاہری طور پر خوش بھی نظر آئی لیکن دل کی گہرائی میں تو خوشی کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہاں صرف کسی کا انتظار تھا...... کسی کا عشق تھا...... کسی کا غم تھا۔ وہ سراپا آنکھ تھی اور یہ آنکھ کسی کی راہ پر تھی وہ دیکھتی رہی اور بس دیکھتی رہی۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا وہ سرکتا رہا۔ سورج ڈوبتا رہا اور پھر ابھرتا رہا۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ دن ہفتوں میں

اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ وہ نہیں ملا...... وہ نہیں آیا۔ وہ پہاڑ جیسے حوصلے والی، وہ چٹان جیسے صبر والی، اندر ہی اندر موم کی طرح پگھلتی رہی۔

☆======☆======☆

یہ نومبر دسمبر کے دن تھے اور بلا کی سردی تھی۔ یہ دشوار پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک برف زار تھا۔ جہاں تک انسانی نگاہ جاتی تھی۔ سفید برفیلی چادر نے نشیب و فراز کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ رُوئے زمین پر اس سفید برف اور اس نیلے آسمان کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن نہیں..... یہاں لوگ موجود تھے اور ایک وسیع رقبے پر پھیلی بستی آباد تھی۔ اس وسیع و عریض بستی کے مکینوں نے کھال اور اون کے بھاری بھرکم لباس پہن رکھے تھے۔ ان میں سے بیشتر مردوں کے چہرے صفا چٹ تھے اور خود رَو داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ان کے کرخت چہروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بڑے دائرے کی شکل میں جمع تھے۔ کچھ لوگ ایک کھوہ کے دہانے سے نکل نکل کر دائرے میں شامل ہو رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں تھیں۔

دائرے کے درمیان لوہے کا ایک بڑا چوکور پنجرہ تھا۔ اس پنجرے کی لمبائی چوڑائی ایک بڑے کمرے جتنی تھی۔ پنجرے کی چھت میں ایک گول سوراخ تھا جس میں سے ایک موٹی رسی نیچے لٹک رہی تھی۔ پنجرے کے اندر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ یہاں ایک جسیم سفید ریچھ اور ایک تنومند شخص نبرد آزما تھے۔ ریچھ کی طرح تنومند شخص بھی خالی ہاتھ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ریچھ کو پچھاڑنے کی کوشش میں ہے۔ تاہم بپھرے ہوئے ریچھ کا پلہ واضح طور پر بھاری دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ایک تھپڑ نے تنومند شخص کو اچھال کر پنجرے کے زنگ آلود جنگلے سے دے مارا۔ اس شخص نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ پوری طرح اٹھا نہیں تھا کہ غصیلا ریچھ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس مرتبہ ریچھ نے عقب سے اپنے مدِمقابل پر وار کیا اور چمڑے کے لباس کے ساتھ ساتھ اس کی کھال بھی کمر سے ادھیڑ کر رکھ دی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور پھر گرے گرے چت کر ایک لات ریچھ کی تھوتھنی پر رسید کی۔ یہ بھاری بھرکم بوٹ کی ضرب تھی مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ زورآور جانور کو متاثر کر سکتی۔ وہ پھنکارتا ہوا اپنے مدِمقابل پر آیا اور اسے چھاپ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے تیز ناخنوں اور دانتوں سے اسے ادھیڑ ڈالتا، پنجرے کا ایک سائیڈ کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ دو رائفل بردار تیزی سے اندر آئے...... انہوں نے ایک ساتھ دو ہوائی فائر کئے۔ ریچھ نے بدک کر اپنے مدِمقابل کو چھوڑ دیا اور ایک کونے میں سمٹ گیا جیسے وہ ایک باکسر ہو اور اپنے مدِمقابل کو زمین بوس کرنے کے بعد ریفری کے

اشارے پر اپنے سٹول پر جا بیٹھا ہو۔ یقیناً یہ تربیت یافتہ جانور تھا۔ ریچھ کی کامیابی پر کچھ لوگوں نے پُرجوش نعرے لگائے تاہم زیادہ تر نے مایوسی کا اظہار کیا۔ دو افراد زخمی شخص کو سہارا دے کر پنجرے سے باہر لے گئے۔

چند منٹ بعد ایک اور مدِمقابل ریچھ کے سامنے آ گیا۔ یہ بھی موٹے چرمی لباس میں ملبوس ایک مقامی شخص تھا۔ وہ سر سے گنجا اور داڑھی بکھری بکھری تھی۔ نعروں کی گونج میں ایک بار پھر انسان اور جانور کا مقابلہ شروع ہوا۔ گنجے شخص نے شروع میں ریچھ کے منہ پر چند زوردار گھونسے مارے اور اسے چاروں شانے چت کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی ریچھ ایک بار پھر حاوی ہو گیا۔ گنجا شخص بڑی جلدی ہانپ گیا۔ وہ کچھ دیر پنجرے کے اندر ہی ادھر اُدھر بھاگ کر خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے جمپ لے کر چھت سے جھولتے ہوئے رسے کو پکڑ لیا۔ باہر کھڑے افراد نے پھرتی کے ساتھ ایک چرخی کے ذریعے رسے کو اوپر کھینچ لیا۔ یوں یہ شخص ریچھ کی مشتعل لپیٹ سے نکل آیا اور پنجرے کی چھت پر پہنچ کر باہر کود گیا۔

اس کے چند منٹ بعد ایک اور مقامی نوجوان کو قریباً ایسے ہی مراحل سے گزرنا پڑا۔ ریچھ کو زیر کرنے کی کوشش میں اس کی ٹانگ پر ایک دو زخم بھی آئے...... مگر اس سے پہلے کہ ریچھ اسے سنگین طور پر زخمی کرتا وہ رسے سے لٹک گیا اور رسا اوپر کھینچ لیا گیا۔ ریچھ کی سستی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دانت نکوس رہا تھا اور منہ سے غصیلی آوازیں نکال رہا تھا۔ غالباً اسے بھوکا رکھا گیا تھا۔ پھر ایک اور شخص پنجرے میں داخل ہوا۔ اس کے داخل ہوتے ہی ہجوم نے پُرجوش نعرے لگائے اور ہوا میں اسلحہ لہرا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص نہ صرف پہلے بھی ایسے مقابلوں میں حصہ لے چکا ہے بلکہ کامیاب بھی ہو چکا ہے۔ نووارد کا اعتماد اور اطمینان دیدنی تھا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں مشتعل ریچھ کے سامنے آیا اور بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد انسان اور جانور بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ نووارد کی ایک زوردار ٹکر ریچھ کے سینے پر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زنگ آلود آہنی جنگلے سے جا ٹکرایا۔ ٹکر سے پورا پنجرہ جیسے تھرا کر رہ گیا۔ تماشائیوں نے اس شخص کی کارکردگی پر نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔

پنجرے کے باہر سے ایک شخص چلایا۔ ”شاباش رستم بھائی...... شاباش۔“

باہر سے چلانے والا شخص ڈاکٹر ناصر اور اندر خونخوار جانور سے برسرِ پیکار رستم سیال تھا۔

رستم سیال جو پانچ چھ ماہ پہلے تحصیل مری کی پہاڑیوں میں گورے کے بنگلے کے اندر ایک انوکھے تجربے سے گزرا تھا۔ ایک عجیب آپریشن کے ذریعے اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کو دوبارہ

سے اس کے جسم کا حصہ بنایا گیا تھا۔ اس تجرباتی آپریشن میں اس کی زندگی کا امکان چالیس فیصد اور موت کا امکان ساٹھ فیصد بتایا جا رہا تھا۔ آج وہی رستم ایک تنومند شخص تھا۔ نہ صرف تنومند بلکہ ایک کٹھن کام بھی کر رہا تھا۔ ریچھ کے ایک طوفانی پنجے سے بچنے کے لئے وہ تیزی سے پیچھے ہٹا پھر ریچھ کی مہلک تھوتھنی سے بچنے کے لئے دائیں طرف ہٹتا چلا گیا۔ اس کے پاؤں میں ہلکی سی لنگڑاہٹ کے سوا کوئی نقص نظر نہیں آ رہا تھا۔

سفید برفانی ریچھ اپنے پچھلے دو پاؤں پر انسانوں کی طرح کھڑا تھا اور لپک لپک کر رستم کو دبوچنے کی کوشش میں تھا۔ رستم نے اپنے وزنی بوٹ کی ضرب ریچھ کی دونوں پچھلی ٹانگوں کے درمیان لگائی۔ وہ تکلیف سے تلملایا اور عجیب آواز میں پھنکارا۔ چوٹ کھانے کے بعد ریچھ کی نگاہ چند سیکنڈ کے لئے رستم پر سے ہٹ گئی۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور بھاگ کر کندھے کی شدید دھکیل سے ریچھ کو پیچھے کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے پاؤں سے ریچھ کو اڑنگا لگایا۔ قوی الجثہ جانور ایک دھماکے سے پشت کے بل گرا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ پنجرے کے باہر سے جوشیلے نعرے بلند ہوئے اور تماشائیوں کے ردعمل سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے اس خونی کھیل کے قواعد کے مطابق رستم کو فاتح قرار دے دیا ہے۔

رستم تیزی سے اٹھا اور رسے سے لٹک کر پنجرے سے باہر آ گیا۔ اس کی پوستین شانے پر سے ادھڑ گئی تھی اور ایک ہاتھ پر بھی خونی خراشیں آئی تھیں۔ تاہم اس کے سوا وہ بالکل محفوظ رہا تھا۔ جونہی وہ نیچے اترا ڈاکٹر ناصر اور شریف اس کی طرف بڑھے۔ وہ دونوں بھی مقامی طرز کے بھاری بھرکم لباس میں تھے۔ ان کی داڑھیاں بڑھ چکی تھیں اور کئی ماہ سے حجامتیں نہیں ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے پاؤں میں آہنی بیڑیاں تھیں۔ ان بیڑیوں کے سبب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے رستم تک پہنچے اور اس کی پیٹھ تھپکی۔ ڈاکٹر ناصر نے رستم کی خراشوں کا معائنہ کیا۔ ''معمولی خراشیں ہیں۔ میرے پاس اسپرٹ ہے میں لگا دوں گا۔'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

''اس دفعہ تو کمال کیا جی آپ نے۔ دو منٹ میں پٹڑا کر دیا۔'' شریف نے بھی تعریف کی۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اس لڑائی پر شرطیں وغیرہ بھی لگائی گئی ہیں۔ جو لوگ شرطیں جیت گئے تھے وہ دوسروں سے نوٹ وصول کر رہے تھے۔ سامنے دو مقامی طرز کی نشستوں پر دو تنومند نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ خاصی حد تک ہم شکل تھے۔ دونوں کے چہرے گول اور سرخ و سپید

تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی داڑھیاں اور چھوٹی چھوٹی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں تھیں۔ رستم کی جیت پر وہ بھی خوش نظر آتے تھے۔ تاہم یہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے اپنے کسی پالتو جانور کی جیت پر ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک نے اپنے قریب کھڑے مؤدب خادم سے کچھ کھسر پھسر کی اور ساتھ ہی رستم کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکٹر ناصر نے رستم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''رستم بھائی! لگتا ہے آپ کے بارے میں ہی بات ہو رہی ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کے کھانے میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ بکرے کا گوشت بڑھا دیا گیا ہو۔'' شریف نے خیال آرائی کی۔

چند سیکنڈ بعد کھسر پھسر سننے والا شخص رستم کے قریب آیا۔ اس شخص کا نام واس تھا اور یہ یہاں مترجم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس نے رستم کو اردو میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''رستم! تمہارے دوپہر کے کھانے میں ایک پاؤ گوشت بڑھا دیا گیا ہے۔ رات کو تمہیں ایک پیالہ دودھ بھی ملا کرے گا۔ ارفا خان اور سامی خان تمہاری پھرتی پر خوش ہوئے ہیں۔''

رستم نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کی سانس ابھی تک پھولی ہوئی تھی۔ ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے ویسی ہی ایک بیڑی رستم کے پاؤں میں پہنا دی جیسی ناصر اور شریف کے پاؤں میں تھی۔ رستم نے بیڑی پہننے میں کوئی پس و پیش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس کا عادی ہو چکا ہے اور اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ یہاں مزاحمت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اردگرد موجود لوگ رستم کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم اس تحسین میں عزت و احترام کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ لوگ رستم کو اور کھیل میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کو بس تماشے کی چیز سمجھتے ہیں۔ اس کھیل میں تین چار افراد زخمی ہوئے تھے۔ خاص طور سے کمر پر پنجہ لگنے والے شخص کا زخم سنگین تھا۔ یہ چاروں افراد ایک کشادہ کھوہ کے اندر ایک اونی گدیلے پر پڑے تھے اور ان کے قریب دیودار کی لکڑی کی آگ جل رہی تھی۔ ایک مقامی معالج مقامی دواؤں کے ذریعے ان کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ لوگ ایک اندرونی غار میں چلے گئے۔ اس اندرونی غار کا دہانہ ایک زنگ آلود آہنی جنگلے کے ذریعے بند کیا گیا تھا اور اس دروازے میں باقاعدہ قفل لگا ہوا تھا۔ ایک قفل بردار شخص نے قفل کھول کر رستم، ناصر اور شریف کو اندر جانے کا راستہ دیا۔

اس نہایت سرد پتھریلے غار کے اندر چربی کے چراغ روشن تھے اور دن میں بھی مکمل رات کا سماں تھا۔ قریباً ایک درجن مزید افراد یہاں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر کوہستانی

تھے۔ ایک دو پوٹھوہاری بھی نظر آتے تھے۔ یہ سب کے سب بھاری بھرکم اونی اور چرمی لباسوں میں تھے۔ ان میں ایک شے مشترک تھی۔ سب کے پاؤں نہایت مضبوط اور وزنی آہنی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر بیڑیوں کے نشان اَن مٹ مہروں کی طرح نقش ہو چکے تھے۔ یہ نشان اس بات کے گواہ تھے کہ یہ آزاد انسان نہیں ہیں۔ اس برف زار میں ان نامعلوم لوگوں کے درمیان ان لوگوں کی حیثیت محض غلاموں کی سی ہے۔

غار میں آنے کے بعد ڈاکٹر ناصر نے ایک چھوٹے پتھر کی اوٹ سے ایک لیڈیز شولڈر بیگ نکالا۔ اس نفیس بیگ کی حالت پچھلے چند ماہ میں بہت بُری ہو چکی تھی۔ ناصر نے بیگ میں سے اسپرٹ کی ایک چھوٹی بوتل اور تھوڑی سی روئی نکالی۔ اس روئی کی مدد سے اس نے رستم کے دائیں ہاتھ کی تازہ خراشوں پر اسپرٹ لگائی۔ ''یہ تھوڑی سی تکلیف تو دیتی ہے لیکن اچھی جراثیم کش ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''اور ڈاکٹر مالینا کی یاد بھی دلاتی ہے۔'' شریف نے کہا۔

یہ شولڈر بیگ اور یہ چند ایک دوائیاں دراصل خوبرو لیڈی ڈاکٹر مالینا سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر مالینا دیگر افراد کے ساتھ ان جنونی کلہاڑی برداروں کے ہتھے چڑھ کر چیلاس اور اسکردو سے آگے اس برف زار میں پہنچی تھی۔

رستم سنگی دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے لمبے بال اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی جیسے ایک برف زار تھا۔ ایک خاموش اور سنسان برف زار۔ اس برف زار کی تہہ میں کیا ہے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کسی سوچ میں گم رہا۔ ڈاکٹر مالینا کی موت کے مناظر اس کی نگاہوں میں تازہ ہونے لگے۔ اسے مری کے نواح میں گورے کے بنگلے کے واقعات یاد آئے...... کلہاڑی برداروں کا وحشیانہ حملہ، اس حملے میں سفید فاموں کا قتل عام...... نیم گول دھار والی کلہاڑیوں سے مقتولوں کا ذبح کیا جانا۔ قاتلوں کے خوفناک للکارے اور پھر نیکر پوش ڈاکٹر مالینا کی خوش قسمتی۔ عین قربان گاہ پر اس کی موت کا ٹلنا...... ان خون ریز واقعات کے بعد گورے کے بنگلے میں زبردست آتشزدگی ہوئی تھی اور کلہاڑی برداروں کے گروہ نے انہیں آہنی زنجیروں میں باندھ کر وہاں سے نکال لیا تھا۔ نہایت دشوار گزار پہاڑی راستوں پر راتوں کے اندھیروں میں سفر کرتے ہوئے وہ کیسے سکردو تک پہنچے اور پھر کیسے اس ویران برف زار تک آئے، یہ ایک لمبی کہانی تھی۔ اب وہ کئی ماہ سے اس لق و دق برف زار کے اسیر تھے۔ یہاں دور...... بہت

دور شمال مشرق کی طرف جو سفید چوٹیاں نظر آتی تھیں ان کے بارے میں مترجم داس کا کہنا تھا کہ یہ کے ٹو اور اس کے اردگرد کے پہاڑ ہیں۔ یہاں رستم، ناصر اور شریف کی طرح کئی درجن افراد محبوس تھے۔ ان سب کی حیثیت زرخرید غلاموں کی سی تھی۔ رستم کی معلومات کے مطابق انڈین ڈاکٹر یوسف اور گریس کا خاوند اسٹیفن بھی ان کوہستانیوں کی قید میں تھے۔ ان جنونی لوگوں نے سب سفید فاموں کو مار ڈالا تھا تاہم اسٹیفن ابھی تک زندہ تھا۔ اس کی جان بخشی کی وجہ ابھی تک رستم اور ناصر وغیرہ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس کوہستانی قبیلے کا کرتا دھرتا شوتم خان نامی شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سرخ و سپید چہروں کے ساتھ جو دو ہم شکل نوجوان ریچھ کی لڑائی دیکھ رہے تھے وہ شوتم خان کے بیٹے ارفا خان اور سامی خان تھے۔ اب تک رستم کو جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کے مطابق یہ پاؤندہ قبیلہ تھا۔ داس نے بتایا کہ پاؤندہ نہایت سخت جان قسم کے پہاڑی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عموماً بھیڑ بکریاں پالتے ہیں، شکار کرتے ہیں اور موسم تبدیل ہونے پر اپنے علاقے سے نقل مکانی بھی کر جاتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے پاؤندہ بھی ہوتے ہیں جو کسی علاقے میں پکا ٹھکانہ بنا لیتے ہیں۔ یہ گارے، پتھر اور لکڑی کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ بڑے بالوں والے کتے پالنا ان کا پسندیدہ مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس برف زار میں رہنے والے لوگ بھی گئے وقت میں افغان علاقے سے نقل مکانی کر کے یہاں پہنچے تھے اور اب یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے۔

یہ کوہستانی قبیلہ غیر مسلم تھا اور ایک خاص قسم کے قدیم درخت کی پوجا کرتا تھا۔ یہ نامانوس پہاڑی درخت رستم نے یہاں کئی جگہ دیکھا تھا۔ اس کی شکل و شباہت بہت حد تک دیودار سے ملتی تھی تاہم یہ دیودار نہیں تھا۔ اس درخت کو مقامی زبان میں آبوک کہا جاتا تھا۔

آبوک نامی اس درخت کے علاوہ یہ لوگ ایک اور چیز کو بھی بے حد قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آبوک کی طرح اس چیز کی بھی پوجا کی جاتی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اس دوسری چیز کا تعلق بھی نباتات سے تھا اور یہ تھا نایاب پودا سپ گندل۔ سخت سردی میں جہاں ہر طرح کی حیات ختم ہو جاتی ہے، کچھ نہایت سخت جان جانور اور پودے زندہ رہتے تھے۔ یہ سپ گندل بھی غالباً اسی مزاج کا پودا تھا۔ کچھ علاقوں میں لوگ اس کے ایک ایک پتے کو ترستے تھے لیکن رستم نے یہاں اسے کئی جگہوں پر گھاس کی طرح اُگتے ہوئے پایا تھا۔

رستم نے ایک طویل سانس لے کر کروٹ بدل لی۔ ڈاکٹر مالینا کے خیال سے پیدا ہونے والی لہر اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر مالینا کی موت کے بارے میں

سوچنے لگا۔اس بستی کا نام کوہ مارگا تھا۔شوتم خان یہاں کے سیاہ سفید کا مالک تھا۔اس بستی کے اصول اور ضابطے بے حد سخت اور عجیب تھے۔خاص طور سے شوتم اور اس کے خاندان نے اپنے اوپر بہت سی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔یہ لوگ پرندوں کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔اپنے سر کے بال لازماً منڈوا کر رکھتے تھے۔ریشمی کپڑا نہیں پہنتے تھے اور فقط اپنے سے بڑی عمر کی عورت کے ساتھ شادی کرتے تھے۔یہ آخری شرط کافی دلچسپ اور توجہ طلب تھی۔شوتم کے خاندان کا کوئی مرد بھی نوجوان عورت سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔اس کی بیوی کے لئے ضروری تھا کہ اس نے اپنی عمر کی کم ازکم بتیس بہاریں دیکھ لی ہوں۔رستم نے شوتم خان کے نوجوان بیٹوں اور بھتیجوں وغیرہ کی بیویاں دیکھی تھیں۔وہ چالیس چالیس برس کی تھکی ماندی خواتین تھیں۔سخت موسم کے سبب ان کے چہروں پر سلوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔عموماً وہ اپنے چہرے بھاری چادروں کی اوٹ میں چھپائے رکھتی تھیں۔شوتم خاندان کے اکثر مرد درمیانی عمر میں ہی رنڈوے ہو جاتے تھے۔خود شوتم کی بیوی بھی قریباً پچیس سال پہلے مرچکی تھی۔رستم نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ نفس کشی کے لئے عورت سے دور رہنا چاہتے ہیں۔مگر چونکہ نسل کو آگے چلانا بھی ضروری ہے اس لئے بڑی عمر کی بے کشش عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔یہ عجیب نکتہ نظر تھا۔جب ڈاکٹر مالینا ایک اسیر کی حیثیت سے یہاں آئی تھی تو اس کے ہمراہ ایک ڈچ نرس بھی تھی۔شروع میں شوتم خان نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ دونوں اسیر عورتیں خادماؤں کی حیثیت سے اس کے بھائی اور بیٹے کے گھر میں رہیں گی لیکن دو چار دن بعد ہی شوتم نے فیصلہ بدل دیا تھا اور دونوں عورتوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔غالباً اس حکم کے پیچھے یہی خیال کارفرما تھا کہ یہ خوب صورت لڑکیاں یہاں مردوں کے دلوں میں فتور پیدا کریں گی۔شوتم کے چھوٹے بیٹے کا بھی یہی خیال تھا۔

رستم کو وہ منظر اب بھی یاد تھا جب شوتم خان کے حکم پر ڈاکٹر مالینا اور ڈچ نرس کو جانوروں کی طرح گھسیٹ کر کھوہ سے باہر لے جایا گیا تھا۔ان دونوں کے رنگ برف کی طرح سفید ہو رہے تھے اور خوب صورت ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ڈاکٹر مالینا نے رحم طلب نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا لیکن رحم کہیں نہیں تھا اور نہ کہیں کوئی مددگار تھا۔رستم، ناصر اور اسٹیفن وغیرہ بیڑیوں میں جکڑے، بے بسی کی حالت میں اپنے زنداں کے اندر تھے۔پھر باہر برفیلے میدان میں اوپر تلے دو فائر ہوئے تھے اور دونوں عورتیں اپنی تمام تر خوبصورتی، ذہانت اور تعلیم سمیت ان کوہستانیوں کے ہاتھوں ماری گئی تھیں اور آج کئی ماہ بعد ڈاکٹر مالینا کے شولڈر بیگ میں سے برآمد ہونے والی اسپرٹ نے رستم کی خونی خراشوں کو دھویا تھا۔

’’کس سوچ میں کھو گئے ہو؟‘‘ ناصر کی آواز نے اسے چونکایا۔

’’نہیں......کچھ بھی نہیں۔‘‘ رستم بولا۔

’’میں جانتا ہوں...... بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔شانی بھابی کی یاد آرہی ہے۔‘‘

’’نہیں......اب تو یوں لگتا ہے کہ دل آہستہ آہستہ مُردہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔کچھ بھی یاد نہیں آتا۔‘‘

’’لیکن آپ کا چہرہ بتاتا ہے...... آپ کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ آپ بھابی کو کسی پل نہیں بھولتے۔‘‘

’’نہیں،اس وقت تو میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’کیا ہم کبھی اس ٹھنڈے دوزخ سے نکل سکیں گے۔کیا کبھی پھر آباد دنیا کو دیکھ سکیں گے؟‘‘

’’امید پر دنیا قائم ہے بھائی اور ہمارے دلوں میں امید باقی ہے۔ہم ایک دن ضرور اس حصار کو توڑیں گے۔‘‘

’’لیکن وہ دن کب آئے گا۔شاید دس سال بعد......شاید بیس سال بعد۔تم نے دیکھا ہے یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بیس سال سے یہاں بند ہیں۔وہ سرتوڑ کوشش کے باوجود یہاں سے نکل نہیں سکے۔مجھے تو یہ جگہ کالا پانی لگتی ہے جہاں بند رہنے والے بس خیالوں میں باہر جاتے ہیں یا پھر مرنے کے بعد ان کی روحیں ان کے جسموں سے نکل کر باہر جاتی ہوں گی۔‘‘

’’ہر بندے کی قسمت علیحدہ ہوتی ہے بھائی!ضروری نہیں کہ ہمارا مقدر بھی ان لوگوں جیسا ہو جو یہاں سے نکل نہیں سکے۔ٹھیک ہے کہ ہماری دو کوششیں ناکام ہوئی ہیں لیکن یہ ہماری آخری کوششیں نہیں ہیں۔‘‘

’’ایسی عجیب وغریب جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی اور نہ کسی سے سنا ہے۔‘‘ رستم نے کھوہ کے دہانے سے باہر سفید براق برف کو دیکھتے ہوئے کہا اور ٹھنڈی سانس لی۔

’’پتا نہیں رستم بھائی!آج آپ اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟‘‘

’’اچھا یار!نہیں کرتا مایوسی کی باتیں۔‘‘ رستم نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

شریف بڑی محبت سے رستم کے پاؤں دبانے لگا۔رستم نے اسے دو تین بار منع کیا لیکن جب وہ نہیں مانا تو وہ خاموش ہو گیا۔

ہفتے میں دو بار انہیں طویل کھوہ سے باہر گھومنے پھرنے کی اجازت دی جاتی تھی لیکن اس اجازت کے دوران بھی ناقابلِ شکست بیڑیاں ان کے پاؤں میں ہی رہتی تھیں۔ وہ اس برف زار پر کئی کئی فرلانگ تک آزادی سے گھومتے پھرتے رہتے تھے لیکن اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس حیرت انگیز گلیشیر نما مقام سے نکل نہیں سکتے۔ اس کے چاروں طرف عمودی کھائیاں تھیں جنہیں پاٹنے یا جن میں اترنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس روز بھی ہفتے کا تیسرا دن تھا۔ کھوہ میں محبوس افراد آج خود کو نسبتاً آزاد محسوس کر رہے تھے۔ ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ رستم لنگڑا کر چلتا ہوا برفانی کھوہ سے کافی دور نکل آیا۔ برف میں سے کہیں کہیں چٹانیں ابھری ہوئی تھیں اور پہاڑی درخت دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک ایسے ہی مخروطی درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اداس نظروں سے جنوب کی طرف دیکھنے لگا.. جنوب جہاں دنیا آباد تھی، جہاں من موہنے شہر تھے اور جہاں کسی چار دیواری میں اس کی شانی بھی تھی۔

اچانک وہ چونک گیا۔ اسے درختوں میں کوئی شخص متحرک نظر آیا۔ رستم نے اسے پہچان لیا۔ وہ شوتم خان کا چھوٹا بیٹا سامی خان تھا۔ رستم نے سامی خان کو اس کی سموری صدری سے پہچانا۔ یہ دھاری دار صدری اکثر سامی خان کے جسم پر نظر آتی تھی۔ سامی خان بڑی خاموشی سے مغربی کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ رستم چونکا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی سامی خان کو اس طرح رازداری سے مغربی کنارے کی طرف جاتے دیکھا تھا...... پتا نہیں رستم کے دل میں کیا آئی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور احتیاط سے سامی خان کے پیچھے چل دیا۔ موسم نے بھی رستم کی مدد کی۔ دھوپ بتدریج غائب ہو گئی اور قرب و جوار میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اپنی بیڑی کے سبب رستم زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا پھر بھی اس نے کوشش کر کے سامی خان کا تعاقب جاری رکھا۔ اسے کوئی اندیشہ نہیں تھا اگر سامی خان اسے دیکھ بھی لیتا تو رستم اپنی موجودگی کے لئے کوئی مناسب بہانہ بنا سکتا تھا۔

سامی خان کے انداز میں چوکنا پن محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ایک دو بار مڑ کر اپنے عقب میں بھی دیکھا۔ رستم کو سامی کے ہاتھ میں ایک تھیلا سا بھی نظر آیا۔ سامی اور ارفا کافی حد تک ہم شکل تھے اور جڑواں نظر آتے تھے تاہم وہ جڑواں نہیں تھے۔ دونوں کی عمروں میں ایک برس کا فرق تھا۔ دونوں اپنے باپ کے بے حد اطاعت گزار تھے اور اس کے حکم کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے تھے اور یہ کیفیت فقط ان دو بھائیوں ہی کی نہیں تھی، شوتم خان کے عزیز و اقارب اور مارگا بستی کے بیشتر مکین شوتم کے احکامات پر بلا چون و چرا عمل کرتے تھے۔ ہر کوئی یہاں کے مذہبی عقیدے کے مطابق یہاں کے اصولوں، ضابطوں کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

کوشش کے باوجود رستم اپنا اور سامی خان کا درمیانی فاصلہ برقرار نہیں رکھ سکا۔ ڈھیرے ڈھیرے یہ فاصلہ بڑھ گیا۔ بہرطور رستم نے برف پر قدموں کے نشانات سے تعاقب جاری رکھا۔ جلد ہی رستم نے محسوس کیا کہ سامی خان ایک ڈھلوان پر اُتر گیا ہے۔

یہ شخص کہاں جا رہا ہے؟

کیا یہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جسے دوسروں سے چھپانے کی ضرورت ہے؟

کیا یہ کوئی ایسا کام ہے جس میں شوتم خان کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہے؟

ایسے کئی سوال رستم کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ کچھ آگے جانے کے بعد رستم نے محسوس کیا کہ سامی خان اچانک کہیں غائب ہو گیا ہے۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ درختوں کے درمیان کوئی ایسی جگہ بھی نظر نہیں آتی تھی جہاں وہ چھپ سکتا۔ رستم نے قدموں کے نشانات پر غور کیا۔ اسے یہ نہایت مدھم نشانات ایک نشیب میں اترتے دکھائی دیئے۔ رستم بڑی احتیاط سے بے آواز چلتا ہوا ان نشانات کے پیچھے اُتر گیا۔ اس نے دیکھا کچھ فاصلے پر لکڑی کے بالوں اور خاردار تار کے ذریعے ایک باڑ سی بنائی گئی تھی۔ اس باڑ نے قریباً ایک ایکڑ جگہ گھیر رکھی تھی۔ یہاں کٹی ہوئی لکڑی کی بھاری بھرکم گیلیاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لکڑی طویل عرصے سے یہاں پڑی ہے۔ ان پر کائی جمی ہوئی تھی اور گیلیوں کے کچھ حصے برف میں دبے ہوئے تھے۔ قدموں کے نشان باڑ کے چھوٹے سے پھاٹک تک جا کر اوجھل ہو گئے تھے۔

رستم نے تناور درختوں کی اوٹ سے دھیان کے ساتھ دیکھا۔ اسے باڑ کے اندر سامی خان کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ان تناور گیلیوں میں ہی کہیں اوجھل ہوا تھا۔ رستم وہیں رک کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ سردی میں اضافہ تو ہوا لیکن رستم کو یہ اطمینان بھی ہوا کہ برف پر قدموں کے نشان مزید مدھم ہو جائیں گے اور سامی خان کو نظر نہیں آئیں گے۔ اگر وہ ان نشانات کو نہ دیکھ سکتا تو اس شک میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا کہ کسی نے اس کا تعاقب کیا ہے۔

سامی کی واپسی کے لئے رستم کو صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ وہ قریباً ایک گھنٹے بعد دوبارہ نظر آیا۔ وہ لکڑی کی گیلیوں کے اندر سے ہی کہیں سے برآمد ہوا تھا۔ بوندا باندی سے بچنے کے لئے اس نے اپنے اوپر ایک برساتی نما لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جاتے وقت جو تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا وہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ خاردار باڑ سے باہر نکل کر اس نے لکڑی کے پھاٹک کو باقاعدہ تالا لگایا اور واپس روانہ ہو گیا۔

اس کی واپسی کے قریباً پندرہ منٹ بعد رستم درخت کی اوٹ سے نکلا اور پھاٹک تک پہنچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک پُرخطر کام کرنے جا رہا ہے اور اگر پکڑا گیا تو اس پر ٹھیک ٹھاک مصیبت آئے گی۔ اس کے باوجود وہ اپنے اندر کے تجسس کو دبا نہیں پا رہا تھا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی اور کسی ذی نفس کی موجودگی کا اشارہ نہیں ملتا تھا۔ رستم کو قریب سے ایک مڑا تڑا آہنی تار مل گیا۔ اس تار کی مدد سے اس نے کوشش کی اور پھاٹک کا تالا کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ بادل ایک دم گہرے ہوگئے تھے اور دن میں بھی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ رستم بڑی احتیاط سے گیلیوں کے درمیان گھومنے لگا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی خاص چیز یا کوئی راستہ نظر نہیں آیا لیکن کچھ نہ کچھ تو تھا یہاں۔ لکڑی کے ایک پچاس ساٹھ فٹ لمبے بھاری بھرکم تنے کے پاس رستم کو پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ اس تنے کو اس جگہ سے ہلانا ایک درجن افراد کے بس کی بات بھی نہیں تھی...... لیکن رستم نے تھوڑا سا زور لگایا تو وہ ایک طرف سے اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ دراصل یہ بھاری بھرکم تنا ایک چھوٹی گیلی پر لیور کی صورت میں پڑا تھا۔ ذرا سی سپورٹ ملنے پر وہ اپنے ہی زور سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ رستم نے اس کے نیچے ایک لٹھ نما لکڑی ٹکا دی۔ اس تنے کے نیچے برف میں ایک بہت تنگ راستہ نیچے کی طرف جاتا تھا۔ ایک آدمی بہ مشکل یہاں سے گزر سکتا تھا۔ یہاں برف ہی کی سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ رستم چند لمحے تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ بیڑی کے ساتھ سیڑھی نما جگہ سے اُترنا اس کے لئے مشکل کام تھا۔ وہ سلائیڈ کر کے نیچے جا سکتا تھا۔ ابھی وہ ایک دو زینے ہی نیچے گیا تھا کہ اچانک بجلی سی چمک گئی۔ ایک لڑکی تیزی سے اس کے سامنے آئی۔ ''کون؟'' وہ زور سے بولی۔

وہ مقامی لباس میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی پشت پر تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ اس نے کوئی اوزار چھپا رکھا ہے۔ رستم نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ لڑکی کا لباس بے شک مقامی تھا لیکن وہ خود مقامی نہیں تھی۔ رستم اسے پہچانتا تھا۔ وہ ڈاکٹر مالینا تھی۔ وہی نیکر پوش خوبرو ڈاکٹر جو چھوٹی سی عمر میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی اور گورنمنٹ کے بنگلے میں ڈاکٹروں کی ٹیم کا حصہ تھی۔ رستم کی نگاہ میں وہ مر چکی تھی اور اسے مرے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ابھی کل ہی رستم نے اس کا شولڈر بیگ دیکھا تھا اور اس کے بارے میں دیر تک سوچا تھا۔ آج رستم اسے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

غالباً مالینا نے بھی رستم کو پہچان لیا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھیں حیرت سے وا ہوگئیں۔

رستم نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''مالینا... تم... یہاں؟''

مالینا جیسے ایک دم چونکی۔ اس نے اپنے سرخ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ''شی...'' کی آواز نکالی اور ڈرے ہوئے انداز میں دائیں طرف دیکھنے لگی۔

دونوں چند سیکنڈ تک خاموش کھڑے رہے۔ دونوں کے چہرے حیرت کی آماجگاہ تھے۔ مالینا نے اپنے پیچھے چھوٹے دستے کی کلہاڑی چھپا رکھی تھی۔ یہ کلہاڑی بہت ہولے سے اس نے ایک پتھر پر رکھی۔ کچھ دیر سن گن لینے کے بعد مالینا نے رستم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں دبے پاؤں آگے بڑھے۔ یہ ایک پہاڑی دراڑ تھی جو اندر سے کشادہ ہو کر غار کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس غار کے دو تین چھوٹے چھوٹے چیمبر تھے اور اندرونی دیواریں مسلسل استعمال کے سبب خوب ملائم ہو چکی تھیں۔ فرش پر نمدے بچھے تھے۔ ایک طرف لالٹین روشن تھی۔ ضروریاتِ زندگی کا بیشتر سامان یہاں نظر آ رہا تھا۔ انڈے اور پیاز کی ہلکی ہلکی خوشبو درمیانی چیمبر میں چکرا رہی تھی۔

''کیا یہاں کوئی اور بھی ہے؟'' رستم نے سرگوشی کی۔

''یس۔ ایک اولڈ عورت ہائیں۔ وہ ساتھ والے روم میں سوتا۔'' ڈاکٹر مالینا نے گلابی اردو میں جواب دیا۔ وہ بھی سرگوشی میں بولی تھی۔

وہ رستم کو لے کر ایک اونی گدیلے پر بیٹھ گئی۔ دیکھنے میں یہ ایک آرام دہ بستر نظر آتا تھا۔ یہاں قریب ہی رستم کو ایک تھیلا بھی نظر آیا۔ اس نے قیافہ لگایا کہ یہ وہی تھیلا ہے جو کچھ دیر پہلے سامی خان کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا تھا۔ تھیلے میں پھل اور خشک گوشت وغیرہ تھا۔

ڈاکٹر مالینا نے ایک، چھوٹے سے روزن میں سے ایک چوکور پتھر ہٹایا اور ساتھ والے خلا (چیمبر) میں جھانکا۔ یہاں سے مدھم خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ مالینا قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ اس نے پتھر دوبارہ چوکور روزن میں فٹ کر دیا اور رستم کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''مالینا! تم زندہ ہو......؟'' وہ بے حد حیرت سے بولا۔

مالینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا۔ ''ہاں زندہ بھی اور نا ئیں بھی۔''

''میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ تمہیں دوبارہ جیتا جاگتا دیکھوں گا۔ وہ لوگ تو تمہیں اور ان لوگوں کو گولی مارنے کے لئے لے گئے تھے؟'' رستم نے سرگوشی کی۔

مالینا کی سمجھ میں رستم کا یہ طویل فقرہ نہیں آیا۔ ''ہام تم کو یہاں دیکھ کر بہت سرپرائزڈ۔ لیکن یہ بہت ڈینجر...... اگر سامی کو پتا چل گیا تو ہی وِل کل یو۔''

''مجھے کسی کا ڈر نہیں لیکن مجھے بتاؤ کہ سامی تم کو یہاں کیسے لایا؟''

مالینا رستم کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اس کی ٹانگ دیکھنے لگی۔ اس کی خوب صورت نیلگوں آنکھوں میں ابھی تک آنسو جھلملا رہے تھے۔ رستم کی ٹانگ کو ٹٹولنے کے بعد اس نے جذباتی سرگوشی کی۔ ''تم کا ٹانگ اب ٹھیک..... لگتا ہے کہ ہام کا آپریشن سکسیس فل رہا۔ اِٹ از گریٹ اٹ از گریٹ۔''

وہ اس کی ٹانگ کو ٹخنے سے گھٹنے تک بار بار چھونے لگی۔ وہ ایک موٹے اونی لبادے میں تھی۔ سر پر بھاری اوڑھنی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اپنی گلابی اردو میں ٹانگ کے متعلق بات کرتی رہی۔ رستم نے اسے بتایا کہ وہ سو فیصد ٹھیک نہیں ہے۔ چلتے ہوئے وہ واضح طور پر لنگڑاتا ہے۔ مالینا نے اس اطلاع کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس نے کہا کہ یہ جہت بڑی امپرزومنٹ ہے، ابھی اس میں مزید بہتری آئے گی۔

رستم نے کہا۔ ''ڈاکٹر مالینا! سامی خان تمہیں اور نرس کو قتل کرنے کے لئے لے گیا تھا۔ بعد میں ہم نے کھوہ سے باہر دو فائر بھی سنے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ فائر تم دونوں پر ہی کئے گئے ہیں۔ تم دونوں کا مرڈر کر دیا گیا ہے۔''

''نا ئیں۔'' اس نے عجیب انداز میں سر ہلایا۔ ''ایک فائر نرس پر..... لیکن ایک فائر ہوا میں۔ ہام کا مرڈر نا ئیں ہوا..... ہم کو لائف اور ڈیتھ کے درمیان ہینگ کیا گیا..... سامی خان لیومی۔ ہی براٹ می ہیئر..... ان دِس ڈارک کیو۔''

بات رستم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ سامی خان نے نوجوان مالینا کو زندہ رکھ کر اپنے لئے مخصوص کیا تھا۔

رستم نے مالینا سے اس سارے واقعے کی تفصیل چاہی۔ مالینا نے ٹوٹی پھوٹی اردو اور انگلش میں رُک رُک کر جو کچھ بتایا اس کا لُب لباب کچھ یوں تھا..... شوتم خان کی طرف سے مالینا اور نرس سوزی کی موت کا حکم صادر ہونے کے بعد سامی خان ان دونوں پر جلاد مقرر ہوا تھا۔ وہ دونوں عورتوں کو دور برف زار کے درختوں میں لے گیا۔ اس نے نرس کو تو گولی مار دی لیکن مالینا کے حصے کی گولی ہوا میں چلا دی۔ اس نے مالینا کو بتایا کہ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا۔ وہ اسے اپنے پاس رکھے گا لیکن یہ کام اسے بے حد احتیاط سے کرنا ہوگا کیونکہ یہاں کے اصول ضابطے بڑے سخت ہیں اور وہ اپنے والد محترم کا بہت زیادہ احترام بھی کرتا ہے۔

وہ مالینا کو بڑی رازداری کے ساتھ یہاں اس پہاڑی دراڑ میں لے آیا..... یہاں اس نے مالینا کو زندگی کی ہر وہ ضرورت اور سہولت مہیا کی جو بستی میں موجود تھی۔ مالینا اس کھوہ میں

...س آگ نہیں جلا سکتی تھی، باقی ہر قسم کی آسانی اسے مہیا تھی۔ سامی خان نے یہاں نمدوں اور اونی ...لوں وغیرہ کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ سامی خان کی بیوی بستی کے رواج کے مطابق اس سے ...با اٹھارہ برس بڑی تھی۔ سامی خان کے اندر نوجوان خوبرو عورت کی بھوک تھی۔ اس بھوک ...انے کے لئے اسے مالینا میسر آ گئی۔ مالینا کو یہ فائدہ ہوا کہ اس کی زندگی بچ گئی۔ یہ ایک انوکھا سمجھوتہ تھا۔ نہایت تعلیم یافتہ و خوش شکل ڈاکٹر مالینا نے ایک اجڈ کوہستانی کو اپنے مرد کے طور پر قبول کیا اور زندہ رہی۔ دوسری طرف سامی خان جیسے اطاعت گزار بیٹے نے فطری ...وں کی خاطر اپنے باپ اور اپنے قبیلے کے سخت اصولوں سے انحراف کیا اور نتیجے میں مالینا ...بت حاصل کی۔ شاید زندگی نام ہی ایسے ناہموار سمجھوتوں کا ہے۔

ڈاکٹر مالینا کی بات ختم ہوئی تو رستم نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کبھی یہاں سے نکلنے کا نہیں سوچا؟''

''سوچا..... ہام نے سوچا۔ لیکن ہام کو مالوم..... آؤٹ سائیڈ ہام کے لئے بہت زیادہ ... ویسے بھی ہام جانتا کہ اس سنو (برف) سے نکلنا ہام کے لئے بہت مشکل۔ ہام کو سورا ... کچھ بتایا۔''

''سورا کون؟'' رستم نے پوچھا۔

مالینا نے روزن کی طرف اشارہ کیا اور گلابی اردو میں بتایا کہ سورا اس بوڑھی عورت کا ... ہے جو اس کے ساتھ یہاں رہتی ہے۔ یوں تو وہ بھی پاؤندہ ہے لیکن تھوڑی بہت اردو بول ... ہے۔ وہ اس کی نگران ہے لیکن اچھی عورت ہے اور مہربان بھی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتی ...یہ راتوں کی تنہائی میں دم گھٹنے کے باعث وہ مرجاتی۔

مالینا نے رستم سے باہر کے حالات کا پوچھا اور ڈاکٹر یوسف اور اسٹیفن وغیرہ کی خیریت ...ت کی۔ رستم جو کچھ جانتا تھا اسے بتا دیا۔

رستم کے ذہن میں یہ سوال اب تک کلبلا رہا تھا کہ گورے کے بنگلے میں جب ان جنونی ...تانیوں نے قتلِ عام کیا تو مالینا کو فرش پر لٹانے کے باوجود ذبح کئے بغیر کیوں چھوڑ دیا۔ ...نے یہ سوال مالینا سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ لوگ سپ گنڈل پودے کو پجاریوں کی ...ح پوجتے ہیں۔ کیونکہ وہاں ہسپتال میں پودے کی ''توہین'' ہو رہی تھی لہٰذا یہ پاؤندہ سخت ...ش میں تھے۔ انہوں نے تلافی کے طور پر لوگوں کو بے دریغ قتل کیا اور ان کے خون آلود انگوٹھوں کے نقش سفید کپڑے پر لئے۔ یہ ایک طرح کی مذہبی قربانی تھی۔ تاہم اس کے لئے شرط یہ تھی کہ قربان ہونے والا جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ہو مالینا نے اپنی انگلش آمیز اردو

میں بتایا۔ ''ہام کا لائف اس لئے بچا کہ کھینچا تانی میں ہام کی باڈی پر چوٹ آ گیا تھا۔ چوٹ سے بہت بلیڈنگ ہوتا۔ مرڈرز کا لیڈر ہام کو چھوڑنا مانگتا کیونکہ ہام قربانی کے لائق نائیں تھا۔ آفٹر ڈیتھ یہاں آ کر ہام کو فائر سے مرڈر کرنے کا فیصلہ ہوا۔''

اب بات رستم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسٹیفن کی جان بھی شاید اسی لئے بچی تھی کہ ہنگامے کے دوران میں اس کی ٹانگ پر گولی لگ گئی تھی۔

ساتھ والے چیمبر سے عورت کے کراہنے اور نیند میں بڑبڑانے کی آواز آئی۔ مالینا نے سرگوشی میں رستم کو بتایا کہ سوراذرا بیمار ہے۔ نشہ آور دوا کھا کر سوئی ہوئی ہے لیکن اب لگتا ہے کہ جاگ رہی ہے۔ اس لئے رستم کا جانا بہتر ہے۔

رستم نے مالینا سے پھر آنے کا وعدہ کیا اور اپنی موجودگی کے نقوش مٹاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر بادل بدستور ٹھہرے ہوئے تھے۔ دن میں شام کا گمان ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش پھر شروع ہو سکتی ہے۔ رستم نے گیلی برابر کی۔ پھاٹک کو پھر سے تالا لگایا اور نسبتاً سخت برف پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا واپس روانہ ہو گیا۔

%======☆======☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رستم اور ناصر اپنے زنداں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے لالٹین کی لو بہت نیچی کر رکھی تھی اور موٹے کمبل اپنے جسموں کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔ اس زنداں کے باقی مکین شریف سمیت سکون کی نیند سو رہے تھے۔ کھوہ سے باہر برف زار پر کبھی کبھی کسی جنگلی جانور یا برفانی کتے کے چلانے کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''رستم بھائی! آپ کو یاد ہے جب ہم یہاں پہنچے تھے تو شوتم خان کے بڑے بیٹے نے مالینا کو ملازمہ کی حیثیت سے اپنے گھر میں رکھنا چاہا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔ اس وقت ارفا خان نے یہی کہا تھا۔''

''اور تب سامی خان نے دبے لفظوں میں اس کی مخالفت کی تھی۔''

رستم نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''اب یہی سامی خان مالینا کو اپنی عورت بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔''

رستم کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں نظر آنے لگیں۔ ناصر بھی کچھ دیر تک سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ ''رستم بھائی! ہم نے اب تک جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہی ہے کہ مارگا (پاؤندہ بستی) والوں کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے شوتم خان کے

ہر حکم پر عمل کرتے ہیں۔ شوتم خان کے اپنے خاندان میں بھی زبردست قسم کا اتحاد پایا جاتا ہے۔ اگر کسی طرح اس ایکے کو کم کیا جا سکے تو شاید ان لوگوں کا زور کچھ ٹوٹے اور ہمارے لئے بھی کسی طرح کی آسانی پیدا ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ ارفا اور سامی میں کسی طرح کا اختلاف پیدا کیا جائے؟''

''ہمیں پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اختلاف تو موجود ہے، بس اس کو سامنے لانا ہے۔''

''کھل کر بات کرو۔''

''اگر ارفا خان تک یہ بات پہنچے کہ اس کے چھوٹے بھائی نے مالینا کو اب تک زندہ رکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ شوہر کی طرح رہ رہا ہے تو یقیناً اسے بہت تکلیف پہنچے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی پرانی چوٹ بھی تازہ ہو جائے۔ بے شک یہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں زبان نہیں کھولتے لیکن رقابت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

رستم نے اپنے متاثرہ پاؤں کو بے خیالی میں سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بات تو تمہاری کسی حد تک ٹھیک ہے۔''

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے پھر ناصر بولا۔ ''لیکن اس میں ایک مسئلہ بھی ہے۔ مالینا کا کیا ہو گا۔ اس کی جان پھر خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''نہیں...... میرے خیال میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔'' رستم نے گہری سانس لی۔ ''مالینا کو پتہ نہیں ہو گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر کسی بھی مقامی یا غیر مقامی عورت کے ساتھ سردار خاندان کا کوئی مرد ازدواجی رشتہ قائم کر لیتا ہے تو اس عورت کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی کسی طرح کی اور سزا دی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔ داس (مترجم) نے مجھے اس بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ ان پاؤندوں کی مقامی رسمیں جتنی عجیب ہیں اتنی ہی پرانی بھی ہیں۔ یہ بڑی سختی سے ان کو نبھاتے ہیں۔''

''لیکن اگر وہ حرامی سامی خان مانا ہی نہیں کہ اس نے مالینا کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔''

''اس بارے میں عورت کی گواہی ایک دم تسلیم کی جاتی ہے پھر ان کے پاس بہت تجربہ کار مقامی عورتیں ہوتی ہیں جن کو ''مجاریاں'' کہا جاتا ہے۔ وہ اس قسم کے معاملوں کو دیکھتی ہیں۔''

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ خطرہ تو ہو سکتا ہے۔" رستم نے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا راز فاش ہونے کے خوف سے سامی خان مالینا کو فوری طور پر ختم کرنے کی کوشش کرے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ وہ اس کا مدعا غائب کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔"

"لیکن اس کا حل بھی ہے۔ ارفا خان کو ہی یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ سامی خان کو مدعا غائب کرنے کا موقع نہ دے لیکن یہ ڈر پھر بھی اپنی جگہ موجود رہے گا کہیں دونوں بھائی مل بھگت کر کے مالینا کو ٹھکانے نہ لگا دیں۔"

"میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔" ناصر نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "قبیلے کے قانون کے مطابق سامی نے ایک بڑا گناہ کیا ہے۔ ارفا اس گناہ میں شریک نہیں ہوگا۔... ویسے بھی یہ رقابت کا معاملہ بنے گا۔ دوسرے ہمارے مترجم واس بھی تو اس ساری صورت حال کا گواہ ہوگا۔"

رستم اور ناصر نے دیر تک اس صورت حال پر تبصرہ کیا اور آخر فیصلے پر عمل کرنے کا ارادہ کیا۔ آخری فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ارفا خان یا کسی دوسرے کو اطلاع دینے کے بجائے، رستم خود دوبارہ اس ٹھکانے تک پہنچے۔ مالینا کو اس ٹھکانے سے باہر آنے کے لئے تیار کرے۔ مالینا ایک مقامی طرز کی بڑی چادر میں اپنا آپ چھپائے اور بستی آکر سیدھی شوتم خان کے پاس پہنچ جائے۔

ایک روز بعد سارا کام پروگرام کے عین مطابق ہوگیا۔ بوڑھی عورت سورا اس صورت حال سے بے خبر رہی اور مالینا خود کو ایک بھاری بھرکم چادر میں چھپا کر اور قریباً تین کلومیٹر فاصلہ طے کر کے بستی آن پہنچی۔

یہ اس پاؤندہ بستی میں بڑے ہنگامے کا دن تھا۔ ہر طرف سنسنی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شوتم خان کے مسلح محافظ اور دیگر ساتھی چاروں طرف بھاگتے دوڑتے نظر آئے۔ پھر سب سے پہلے مترجم واس نے ہی رستم اور ناصر وغیرہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ مترجم واس چالیس پینتالیس سال کا ایک دبلا پتلا شخص تھا اور کئی علاقائی زبانوں میں روانی سے بات کر سکتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح شوتم خان کا زبردست وفادار ہونے کے باوجود یہاں کے اسیروں سے اس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔

واس نے اپنی طرف سے زوردار انکشاف کرتے ہوئے رستم اور ناصر کو بتایا۔ "ڈاکٹر مالینا جس کے بارے میں ہم سمجھتے تھے کہ اسے نرس کے ساتھ ہی گولی ماردی گئی تھی ابھی زندہ

ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد وہ ملک (شوتم خان) سے ملی ہے۔"

رستم اور ناصر کو اس خبر پر "زبردست حیرت" کا اظہار کرنا پڑا۔

واس نے مزید اطلاع دی۔ "اس لیڈی ڈاکٹر نے الزام لگایا ہے کہ وہ اب تک سامی خان کے پاس تھی اور سامی خان اس کے ساتھ شوہر کی طرح رہ رہا تھا بلکہ ایک نہایت کرخت مزاج اور بے پرواہ شوہر کی طرح۔ وہ اس زمین دوز جگہ پر کئی کئی دن فاقے سے بھی گزارتی تھی۔ اسے اپنی زندگی موت سے بدتر لگنے لگی تھی۔ لہٰذا وہ سارے اندیشوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں چلی آئی ہے۔"

رستم اور ناصر نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا۔ رستم نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، یہ الزام درست ہوگا؟"

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن دال میں کالا ضرور ہے۔ اس خبر کے پھیلنے کے بعد سے سامی خان کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ سب اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔" یہاں تک بتا کر واس نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ "شاید ملک کو ڈر ہے کہ سامی خان یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ ملک نے ارفا خان کو دو درجن مسلح بندے دے کر سامی خان کے پیچھے بھیجا ہے۔"

دوپہر کے بعد پاؤندہ بستی کے طول و عرض میں زبردست ہلچل نظر آئی۔ رستم، ناصر اور شریف بھی اس وقت کھوہ سے باہر کھلے آسمان کے نیچے تھے۔ مقدس درخت کے ایک سوکھے ہوئے تنے کے قریب شوتم خان کی عدالت لگی تھی۔ وہ لکڑی کے ایک بڑے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد لکڑی اور بان کی بنی ہوئی نشستوں پر شوتم خان کے مصاحب اور بستی کے اہم لوگ براجمان تھے۔ سامی خان فرار ہونے کی کوشش میں پکڑا گیا تھا۔ اسے پکڑنے والا اس کا بڑا بھائی ارفا خان ہی تھا۔ گرفتاری کے وقت سامی خان نے باقاعدہ مزاحمت کی تھی۔ اس مزاحمت کی نشانیاں اس کے گول چہرے اور گردن پر تازہ چوٹوں اور خراشوں کی صورت میں موجود تھیں۔ سامی خان کے پاؤں میں باقاعدہ بیڑی پہنائی گئی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر ن کی رسی سے بندھے ہوئے تھے...... وہ مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے باپ اور بڑے بھائی کی تیز گرم نگاہیں گاہے بگاہے اس کے چہرے کا طواف کرنے لگتی تھیں۔

رستم، ناصر اور شریف عدالت کی جگہ سے کافی دور تھے۔ قریب بھی ہوتے تو انہیں کون سی کارروائی سمجھ میں آنا تھی۔ بہرحال جب کارروائی شروع ہوتی تو انہیں اندازہ ہوا کہ سامی خان اپنے جرم سے انکار کر رہا ہے اور صفائی میں مختلف دلیلیں دے رہا ہے لیکن اس کا کیس

بہت کمزور تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس کا کیس کمزور ہے۔ وہ صرف سزا کے خوف سے الٹی سیدھی ہانکنے لگا تھا۔

اسی دوران میں رستم، ناصر، شریف اور دیگر قیدیوں کو کھلی جگہ سے ہٹا کر کھوہ کے اندر پہنچا دیا گیا اور وہ پنچایتی کارروائی کے آنکھوں دیکھے حال سے محروم ہو گئے۔

اگلے روز مترجم واس کی زبانی رستم اور ناصر کو مزید خبریں ملیں۔ واس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سچ کہتے ہیں عورت اور دولت فساد کی جڑ ہوتی ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ سامی جیسا نوجوان اپنے باپ کے حکم کے خلاف چلے گا اور یہ نہ سوچا تھا کہ ارفا اور سامی جیسے بھائی ایک دوسرے کے خلاف زبان کھولیں گے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''کل جرگے میں بہت تکرار ہوئی ہے۔ ارفا خان نے اپنے باپ سے بہت کھل کر بات کی ہے اور کہا ہے کہ سامی کو وہی سزا ملنی چاہیے جو اس جرم کے لئے مقرر ہے۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی رُو رعایت نہیں ہونی چاہیے ورنہ ایک بُری مثال قائم ہوگی۔ دوسری طرف ارفا اور سامی کے درمیان بھی تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا ہے۔ فیصلہ کل شام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر سامی کو سزا دینے کا فیصلہ ہوا تو ہو سکتا ہے کہ یہ سزا سرِعام دی جائے۔'' واس نے خشک خوبانی، کشمش اور بادام رستم اور ناصر کو پیش کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اگر عورت کے ساتھ زبردستی کی جائے تو اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے لیکن اس معاملے میں بہت حد تک زبردستی نظر نہیں آتی۔ عورت کی اپنی بھی خواہش تھی کہ وہ زندہ رہے اور زندہ رہنے کے لئے اس نے سامی خان کی بات مان لی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس جرم میں اگر سامی خان کو سزا دی گئی تو وہ بایاں بازو کاٹنے کی سزا ہوگی۔ یہ بازو تیز کلہاڑی کے ذریعے کندھے سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ''بہار'' کے کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ موسموں کے لئے سامی کو قید کی سزا بھی ہوگی۔''

''اوہ... یہ تو کافی سخت سزائیں ہیں۔'' ناصر نے ہونٹ سکیڑے۔

''تم دونوں نے یہ نہیں پوچھا کہ بایاں بازو ہی کیوں کاٹا جاتا ہے؟''

''فرماؤ... کیوں کاٹا جاتا ہے؟'' ناصر بے تکلفی سے بولا۔

''بایاں بازو دل کی طرف ہوتا ہے اور یہ دل ہی ہے جو سب سے پہلے عورت کی طرف کھنچتا ہے اور مرد کو خوار کرتا ہے۔''

''میر... تو سب سے پہلے آنکھوں میں گرم سلائی پھیرنی چاہیے کیونکہ آنکھیں ہی عورت کی طرف دیکھتی ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

''یہاں کے لوگ نظر سے زیادہ دل کی غلطی مانتے ہیں کیونکہ نظر تو اپنی ماں اور بہن وغیرہ کو بھی دیکھتی ہے۔'' واس نے دلیل دی۔

''اچھا..... ڈاکٹر بالینا اب کہاں ہے؟'' رستم نے موضوع بدلا۔

''وہ شوتم خان کی حفاظت میں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اب اسے کسی طرح کا خطرہ نہیں۔ یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ سامی خان اس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ اسی طرح رہ رہا تھا، جس طرح ایک مرد اپنی عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ کسی بھی طرح شوتم خان کی بہو تو شمار نہیں ہو سکتی لیکن اس کا ناتا ضرور سردار خاندان کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ اب اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کا بچہ ہوتا ہے تو اس کو زندہ رکھنے یا مار دینے کا فیصلہ بھی ایک خاص طریقے سے ہوگا۔''

دوسری سہ پہر وہ کچھ ہوا جس کے بارے میں مترجم واس نے قیافہ لگایا تھا۔ شوتم خان نے مقامی قانون کے مطابق اپنے بیٹے کو سزا سنا دی۔ یہ بازو کاٹنے کے علاوہ پورے چار سال تک قید میں رکھے جانے کی سزا تھی۔ یہ سزا ایک بڑے ہجوم کی موجودگی میں سنائی گئی۔ اس ہجوم میں زیادہ تر مرد ہی تھے۔ کچھ عورتیں بھی تھیں لیکن بچہ کوئی نہیں تھا۔ کئی سو افراد نیم دائرے کی شکل میں ہموار برف پر کھڑے تھے۔ متبرک درخت کے نیچے شوتم خان اور جرگے کے دیگر افراد موجود تھے..... شوتم کا بیٹا سامی خان زنجیروں میں جکڑا وہاں موجود تھا۔ اس کا چہرہ پہلے ہی پھیکا پڑ رہا تھا۔ باپ کے منہ سے اپنے لئے کڑی سزا کا اعلان سن کر وہ بالکل ہی سفید پڑ گیا۔

سزا سنانے کے بعد شوتم خان فوراً ہی اٹھ کر چلا گیا۔ ہجوم میں سرگوشیاں ابھریں۔ شاید کچھ لوگ سامی خان کی سزا میں کمی کے حامی تھے لیکن نظرثانی کا وقت اب گزر چکا تھا۔ سفید داڑھیوں والے دو افراد کچھ صاف کپڑا، شیشے کی بوتلیں اور روئی وغیرہ لے کر موقع پر پہنچ گئے۔

''یہ کون ہیں؟'' رستم نے مترجم واس سے پوچھا۔

''سمجھو، یہ یہاں کے ڈاکٹر ہیں۔ سامی خان کا بازو کٹنے کے بعد یہ اس کے جسم سے خون کا اخراج روکیں گے اور مرہم پٹی کریں گے۔'' واس کے لہجے میں ہلکا سا تاسف تھا۔

''کیا بازو سرِعام کاٹا جائے گا؟''

''یہاں اکثر سزائیں سرِعام ہی دی جاتی ہیں۔''

لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ لا کر ہموار برف پر رکھ دیا گیا۔ اس پر لوہے کے چھوٹے

چھوٹے شکنجے سے تھے۔ مسلح افراد سامی خان کو تختے کی طرف لانے لگے تو سامی خان نے آخری کوشش کے طور پر جرگے کے ارکان سے کچھ کہا مگر اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

سامی خان کو تختے پر لٹا دیا گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں شکنجوں میں کس دیئے گئے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے واضح آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار خشک لبوں پر زبان پھیرتا تھا۔ اس کا بایاں بازو افقی رخ پر پھیلا دیا گیا اور اس کے نیچے کندھے کے قریب ایک وزنی لکڑی رکھ دی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد سزا پر عمل درآمد ہو گیا۔ ایک تنومند پاؤندے نے چوڑے پھل کے کلہاڑے کے ایک ہی بچے تلے وار سے سامی خان کا جوان بازو کندھے سے کاٹ کر رکھ دیا۔

زیادہ تر تماشائیوں نے دم بخود ہو کر یہ تماشا دیکھا۔ تاہم چند ایک نعرے بھی سنائی دیئے۔ سفید داڑھیوں والے معالج بھاگ کر مضروب سامی خان کے پاس پہنچ گئے اور چابک دستی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ سامی خان صدمے سے نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کچھ فاصلے پر اکڑوں بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کے رونے میں بَین کا سا انداز تھا۔ اس کے چہرے پر چادر تھی۔

"یہ کون ہے؟" رستم نے واس سے پوچھا۔

"سامی خان کی ادھیڑ عمر بیوی۔ کل اس نے اپنے شوہر کو سزا سے بچانے کے لئے اپنے سسر کی بڑی منتیں کیں لیکن یہ سب کچھ بے سود رہا۔" واس نے کہا۔

کٹے ہوئے بازو کو ڈھانپ کر موقع سے ہٹا لیا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر رستم کو اپنی ٹانگ کے کاٹے جانے کا منظر یاد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک منحوس چہرہ بھی یاد آیا اور اس چہرے کے ساتھ اور بہت کچھ یاد آیا۔

ہجوم اب آہستہ آہستہ منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مسلح محافظوں نے محبوس افراد کو بھی کھوہ میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اچانک ایک جانب سے شور اٹھا۔ یوں لگا کہ بہت سے لوگ گتھم گتھا ہو گئے ہیں۔ بلند آواز سے بولنے اور چلانے کی آوازیں بھی ابھریں۔

واس صورتِ حال جاننے کے لئے تیزی سے اس جانب بڑھ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہنگامے کی جگہ پر باقاعدہ کلہاڑی چل رہی ہے۔ بہت سے افراد اس لڑائی کو رکوانے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔ دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ تھم گیا اور شوتم کے مسلح محافظوں نے لڑائی جھگڑے کے الزام میں کئی افراد کو پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد واس بھی واپس آ گیا۔

اس نے حسبِ عادت ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "عورت واقعی فساد کی بنیاد ہوتی ہے

اور اگر وہ خوب صورت بھی ہو تو کام زیادہ خراب ہوتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" ناصر نے پوچھا۔

"لگتا ہے کہ اس لیڈی ڈاکٹر کی وجہ سے یہاں نفاق کا بیج پڑ گیا ہے۔ پہلے دونوں بھائیوں میں اَن بن ہوئی۔ اب ان کے حمایتیوں میں ٹھن گئی ہے۔ جو لوگ سامی خان کے قریب ہیں انہیں اس کڑی سزا پر صدمہ ہوا ہے۔ جو بندہ پہلے ہی صدمے میں ہو اس کے سامنے کوئی مخالفت کی بات کی جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے۔"

"کس نے کی مخالفت کی بات؟" رستم نے پوچھا۔

"ارفا خان کے کسی حمایتی نے کہا کہ جو ہوا بہت اچھا ہوا۔ اس پر سامی خان کے ایک حمایتی کو طیش آ گیا۔ بس اسی سے بات بڑھ گئی۔ ایک شخص نے گالی دے دی۔ دوسرے نے کلہاڑی چلا دی۔ اس کے بعد کئی کلہاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ دس بارہ بندے زخمی ہوئے ہیں۔ دو تین تو شدید زخمی ہیں۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" ناصر نے سر ہلایا۔

"یہاں لوگوں کا اتفاق مثالی ہے۔ برسوں گزر جاتے ہیں اور کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے حیران کن ہے۔ خاص طور سے لوگ اس بات پر حیران ہیں کہ سامی خان جیسے بیٹے نے شوتم خان کی حکم عدولی کی ہمت کیونکر کی؟"

ناصر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "دیکھو چاچا واس! بندہ جب فطرت کے خلاف چلتا ہے نا تو باہر سے چاہے کتنا بھی اصول پسند اور پرہیزگار ہو اندر سے کھوچل ہی رہتا ہے۔ کھوچل سمجھتے ہو نا؟ کمینہ اور بھوکا۔ ایسے پرہیزگاروں کو جب کبھی اپنی بھوک مٹانے کا آسان موقع ملتا ہے تو وہ اپنے بنائے ہوئے سارے قانون اور قاعدے بھول جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ یہ نرالا رواج کم از کم ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ سامی خان اور ارفا خان جیسے نوجوانوں کو جب پکی عمر کی عورتوں سے بیاہا جائے گا تو ان کے اندر ضرور ہم عمر عورت کی چاہ پیدا ہو گی۔ سامی نے جو کیا اسی دبی ہوئی چاہ اور خواہش کا نتیجہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں پردے چھپے ایسے اور واقعات بھی ہوتے ہوں گے۔ کچھ سامنے آ جاتے ہوں گے کچھ راز میں رہتے ہوں گے۔"

جہاں دیدہ واس خاموش رہا۔ اس کے مدقوق چہرے سے عیاں تھا کہ وہ ناصر کی باتوں سے نیم متفق ہے۔ ایک جگہ رستم ٹھٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی رہائشی کھوہ میں داخل ہوتے ایک جگہ لوگوں کا مجمع نظر آیا۔ چند افراد نے سفید رنگ کا ایک بڑا سا کپڑا ہموار پتھر پر

بچھا رکھا تھا۔ اس کپڑے پر خون آلود ہاتھوں کی چھاپ تھی۔ چھاپ پرانی ہونے کی وجہ سے خون کا رنگ سیاہی مائل دکھائی دیتا تھا پھر ایک شخص کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک خون آلود شے لے کر آیا۔ بے شک یہ سامی خان کے جسم سے علیحدہ کئے جانے والا بازو تھا۔ کٹے ہوئے بازو کا ہاتھ ''خون آلود'' تھا یا اسے خون آلود کر دیا گیا تھا۔ اس ہاتھ کی تازہ چھاپ بھی کپڑے پر ثبت کر دی گئی۔

''یہ کیا ہے؟ کہیں یہ وہی کپڑا تو نہیں رستم بھائی جو آپ نے گورے کے بنگلے میں دیکھا تھا؟'' ناصر نے پوچھا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرے خیال میں یہ وہی کپڑا ہے اس پر ان لوگوں کی ہاتھوں کی چھاپ ہے جنہیں وہاں ذبح کیا گیا۔ ڈاکٹر رابرٹ، گارڈ جیکب اور وہ اے بی تراب کی مدھو بالا۔ سب کے ہاتھوں کے نقش اس کپڑے پر ہیں۔ میں پہچان سکتا ہوں۔''

''اس کپڑے کو مقامی زبان میں ''سزا کا آئینہ'' کہتے ہیں۔'' واس نے کہا۔ ''اس کپڑے کو مقدس درخت آبوک کے تنے سے باندھا جاتا ہے اور بہ وقتِ ضرورت وہاں سے اُتارا جاتا ہے۔''

اچانک عقب سے ایک جواں سال لڑکی تیزی سے آئی اور بڑی بے تکلفی سے رستم کی پشت سے لپٹ گئی۔ یہاں عورتیں بھاری بھرکم پردے میں نظر آتی تھیں لیکن یہ لڑکی اور اس طرح کی تین چار اور لڑکیاں پردے کے بغیر بھی نظر آتی تھیں۔ یہ لڑکیاں کھلے اور موٹے لبادے پہنتی تھیں۔ سروں پر کبھی اوڑھنی نظر آتی تھی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ہر جگہ آزادانہ پھرتی تھیں۔ ان کی کسی بات کا کوئی بُرا نہیں مانتا تھا اور نہ کوئی روک ٹوک کرتا۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔ یہ بُری بھلی اردو بھی بول لیتی تھی اور اپنے لئے بڑے بھولپن سے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔ وہ رستم کو جھنجھوڑ کر بولی۔ ''تم بہت آچھا۔ بہت زیادہ آچھا... تم بہت زوروالا... تم جس طرح ریچھ سے لڑتا اور اس کو گراتا......کوئی اور نہیں گرا سکتا۔ میں تم کو بہت پسند کرتا۔''

''بہت مہربانی..... بہت شکریہ۔'' ناصر نے چنچل لڑکی کو رستم کی پشت سے ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ اور چمٹ گئی۔ ''لڑائی میں تمہارے ہاتھ پر بہت چوٹ آیا تھا... اگر تمہیں آرام نہیں آیا تو مجھ کو بتاؤ۔ میں تم کو دوائی لگاؤں گا۔''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' رستم نے کہا۔

لڑکی نے شرارت سے رستم کا کان زور سے کھینچا اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

مترجم واس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے لیکن وہ پی گیا۔ پھر حسبِ معمول وہ کچھ اداس نظر آنے لگا۔ وہ جب بھی اس لڑکی کو دیکھتا تھا اداس ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں رستم اور ناصر کو کئی بار محسوس ہوا تھا کہ اس لڑکی سے مترجم واس کا کوئی نزدیکی رشتہ ہے۔ بہرحال واس نے کبھی اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ ناصر، رستم اور واس اندر کھوہ میں چلے گئے۔ واس ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں رستم کا دل چاہا کہ آج واس سے اس لڑکی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ پوچھے۔

کھوہ کے اندر گرم قہوے کا دور چل رہا تھا۔ ابھی قیدیوں کو ان کے مخصوص چیمبر میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ رستم اور ناصر پیالیاں پکڑ کر واس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

رستم نے کہا۔ ''واس! تم نے ایک دن بتایا تھا کہ یہ لڑکیاں کسی مذہبی رسم کو ادا کرنے کے لئے پالی پوسی جاتی ہیں لیکن تم نے رسم کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''چھوڑو واس ذکر کو۔'' واس کچھ اور اداس ہو گیا۔

''کیا کوئی تکلیف دہ رسم ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

واس نے گہری سانس لی۔ ''موت سے بڑھ کر تکلیف دہ کیا ہو گا؟''

ناصر اور رستم دونوں چونک گئے۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو واس؟'' ناصر نے اسے کریدا۔

واس نے اپنی آواز پست کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں ضرور مجھے کسی چکر میں پھنساؤ گے۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کے ضابطے سخت ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''اور تم بھی یہ جانتے ہو کہ ہم دونوں مکمل طور پر قابلِ بھروسا ہیں۔'' رستم نے آہستہ سے واس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

واس کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس کی نگاہیں سیاہی مائل قہوے پر تھیں جس میں سے الائچی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کھوہ کی چھت سے لٹکی ہوئی لالٹینیں آہستہ آہستہ جھول رہی تھیں۔ واس نے اچانک کہنا شروع کیا۔ ''ان لڑکیوں کو آبوک درخت کی بھینٹ چڑھانے کے لئے پالا جاتا ہے اور پال پوس کر جوان کیا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ مقدس لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہر ایک کے لئے قابلِ عزت ہوتی ہیں۔ کوئی ان کی طرف غلط نگاہ اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ تو دور کی بات ہے کسی کے دل میں بھی ان کے بارے میں کسی طرح کا غلط خیال نہیں آتا۔ یہ جہاں چاہے جاتی ہیں۔ جو چاہے کھاتی پیتی ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ نہیں روکتا۔ نہ ان

پر کسی طرح کی کوئی ذمے داری ڈالی جاتی ہے لیکن ان کی عمر طویل نہیں ہوتی۔ عین جوانی کے عالم میں گارنیوں کو دنیا چھوڑنی پڑتی ہے ... شاید میں تمہیں بتانا بھول گیا، ان لڑکیوں کو مقامی زبان میں گارنیاں کہا جاتا ہے۔ ایک خاص موقع پر ان لڑکیوں کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ لڑکی زری بھی ایک گارنی ہے۔"

"کیا اسے معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟" رستم نے دریافت کیا۔

واس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ان لڑکیوں کو معلوم ہے۔ بچپن سے ہی ان کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کے ذہن اس بات کو قبول کر لیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ وہ آبوک کی چاکر ہیں اور ایک دن اس کے قدموں میں قربان ہو جائیں گی۔ قربان ہونے کے بعد وہ ابدی زندگی پائیں گی اور ایک ایسی دنیا میں پہنچیں گی جہاں عیش و آرام کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ جہاں ان کی ہر چھوٹی بڑی خواہش بہترین طریقے سے پوری ہوگی اور کسی بھی طرح کی محرومی ان کے قریب نہیں آئے گی۔" بولتے بولتے واس کی آواز بھرا سی گئی۔

"کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتے ہو؟" ناصر نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میرے یقین رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں کئی سو برس سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ان علاقوں میں کئی چھوٹے بڑے غیر مسلم قبیلے آباد ہیں۔ ان کے عقیدے اسی طرح کے ہیں۔"

رستم نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک بتایا نہیں واس..... لیکن ہمیں لگتا ہے کہ اس لڑکی زری سے تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ تمہاری طرح یہ بھی اردو اور پشتو وغیرہ سمجھ لیتی ہے۔ تم دونوں کسی ایک ہی علاقے کے لگتے ہو۔"

واس ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آج تم دونوں مجھ سے بہت کچھ پوچھ کر چھوڑو گے۔"

"اس بات پر یقین رکھو واس! ہمیں بتانے سے تھوڑا فائدہ تو ہو سکتا ہے، نقصان نہیں۔" رستم نے اسے حوصلہ دیا۔

دبلے پتلے واس نے اپنی کھچڑی داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کہا۔ "زری میری بھتیجی ہے۔ آج سے تقریباً بارہ سال پہلے وہ میرے اور میری بیوی کے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ زری کی ماں بھی ہمارے ساتھ تھی۔ پھر وہ تو بیمار ہو کر مر گئی اور ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے۔"

واس کچھ دیر خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا تعلق راولپنڈی کی ایک پڑھی لکھی فیملی سے ہے۔ میرا اصل نام وسیم خان ہے۔ میرے بڑے بھائی انیس خان تھے۔ وہ محکمہ سیاحت میں ملازم تھے۔ انہیں ٹریکنگ اور ہائیکنگ وغیرہ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ فرصت ملتے ہی کوہ پیمائی کے ساز و سامان اور اپنی فیملی کے ساتھ دور دراز کے ٹریکس پر نکل جاتے تھے۔ گرمیوں کے ایک موسم میں ہم لوگ کیمپنگ کا سامان لے کر اسکردو کی طرف گئے۔ اس بلتستانی علاقے کے بارے میں ہم نے کافی پڑھا تھا اور ہمیں اس میں دلچسپی تھی۔ اس سفر میں کے ٹو کے نظارے ہمارے ساتھ تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمارا یہ سفر دس بارہ دن کا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک ابر آلود دن میں ہم راستہ بھول گئے۔ ہمارا کمپاس ٹھیک سمت نہیں بتا رہا تھا۔ ہم بھٹک کر ایسے علاقے میں چلے گئے جو ٹریک سے بہت ہٹ کر تھا۔ ہم جوں جوں آگے بڑھتے گئے اصل رخ سے دور ہوتے گئے۔ ہم کل پانچ افراد تھے۔ میں اور میری بیوی..... بڑے بھائی اور ان کی بیوی اور بڑے بھائی کی یہ بیٹی زری۔ بڑے بھائی صاحب کو اس سے بہت پیار تھا۔ وہ اسے بھی اپنی طرح مہم جو بنانا چاہتے تھے اور چھوٹی عمر میں ہی اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک رات ہم اپنے سفری خیموں میں تھے کہ کچھ افراد نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کی چمکیلی کلہاڑیوں نے ہمارا گھیراؤ کر لیا۔ وہ ہماری کوئی بھی بات سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ انہوں نے ہمارے خیمے اکھاڑ دیئے اور ہمیں کئی کلومیٹر تک پیدل چلانے کے بعد اس مقام پر لے آئے۔ ان دنوں یہاں ایک شخص بُری بھلی پشتو بول لیتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب بھی پشتو جانتے تھے۔ پشتو میں ہماری بات چیت ان لوگوں سے ہوئی اور ہم نے انہیں بتایا کہ ہم بالکل بے ضرر لوگ ہیں اور بھٹک کر اس علاقے میں آ نکلے ہیں لیکن وہ ہم پر مسلسل شک کر رہے تھے۔ پھر ایک سنگین اتفاق یہ ہوا کہ بڑے بھائی صاحب کے رک سیک (تھیلے) میں سے اس مقامی پودے کے کچھ مرجھائے ہوئے پتے نکل آئے جسے یہاں بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے سپ گندل کے پتے؟" رستم نے پوچھا۔

"ہاں ... یہاں اس کی باقاعدہ عبادت کی جاتی ہے۔ آبوک درخت کے بعد یہی جڑی یہاں سب سے زیادہ متبرک ہے۔ مقامی زبان میں اسے سوئی کہا جاتا ہے۔ اسے توڑنا یا اسے کسی بھی طرح کے استعمال میں لانا یہاں سخت گناہ ہے۔ اس نایاب جڑی بوٹی کی تلاش میں کبھی کبھار کوئی سیلانی یا سنیاسی یہاں آ پھنستا ہے پھر یہ لوگ اسے یہاں سے جانے نہیں دیتے ... تمہیں اب تک اندازہ ہو گیا ہوگا تمہارے ساتھ جو لوگ یہاں بند ہیں ان میں سے

زیادہ تر کا جرم یہی ہے کہ وہ اس علاقے کی حدوں میں پائے گئے ہیں۔''

''کیا یہاں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں؟''

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ دور دراز علاقے ایسے ہیں کہ سال میں آٹھ مہینے تو یہاں پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔ ان بلند پہاڑوں پر کئی جگہیں ایسی ہیں جہاں سے نہ کبھی کوئی باہر نہیں جاتا اور نہ کوئی باہر سے آتا ہے۔ لوگ یہیں پر پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔''

''تم اپنے بھائی اور بھاوج کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' رستم نے واس کو پھر موضوع کی طرف کھینچا۔

''ہاں...... تو میں بتا رہا تھا کہ بھائی صاحب نے یونہی سوی کے عجیب و غریب پتے اپنے سامان میں رکھ لئے تھے۔ انہیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس کا انہیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مرجھائے ہوئے پتے برآمد ہونے کے بعد یہ پاؤندے سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے ہم سب کو اپنی نیچی چھت والے کمروں میں بند کرنا چاہا۔ جب ہماری عورتوں کو ہم سے علیحدہ کیا گیا تو ہم نے زبردست مزاحمت کی۔ بھائی صاحب کی جیکٹ میں ابھی تک ایک ریوالور موجود تھا۔ انہوں نے پاؤندوں کو ڈرانے کے لئے ہوائی فائر کئے۔ اسی دوران میں عقب سے ایک شخص نے کلہاڑی کا زوردار وار کیا اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔ میرے کندھے اور میری بیوی کی ٹانگ پر بھی گہرا زخم آیا۔''

واس نے دائیں بائیں دیکھا اور احتیاط سے اپنے کندھے پر سے اونی جیکٹ کھسکا کر دس بارہ سال پرانا کلہاڑی کا زخم دکھایا۔

''تمہارے بھائی صاحب موقع پر ہی ختم ہو گئے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ دو دن بعد زخم کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ ہمیں بیڑیاں پہنا کر یہاں کے قیدیوں میں شامل کر دیا گیا۔ میری بیوی، بھاوج اور زری عورتوں کے ساتھ تھیں اور میں مردوں کے ساتھ۔ زری کی عمر اس وقت مشکل سے آٹھ نو سال ہو گی اس کے بعد ہماری طویل قید کا دور شروع ہوا۔ میری بیوی اور بھاوج شوتم خاندان کے دو گھروں میں کام کاج کرتی تھیں۔ مجھ سے بھی تھوڑی بہت بیگار لی جاتی تھی۔ میرا کام بھیڑ بکریوں کے چمڑے کو صاف کر کے اسے استعمال کے قابل بنانا تھا۔ زری کی ماں شوہر کی موت اور اپنی قید کا صدمہ نہ جھیل سکی اور دو سال بعد بیمار رہ کر مر گئی۔ میری بیوی کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے کافی تکلیف جھیلی لیکن پھر صحت یاب ہوئی۔ زری ایک دوسرے گھر میں تھی۔ اس کی مالکن بھی

اچھی عورت تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بارہ سال کی عمر میں ایک تہوار میں زری کو چھ دوسری ..لیوں کے ساتھ گارنی کے طور پر چن لیا گیا۔ یہ آبوک کے درخت کے نیچے ایک طرح ... اندازی کی جاتی ہے جس میں درجنوں لڑکیوں میں سے چھ یا سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔''

زری کے گارنی بننے کا ذکر کرتے کرتے واس ایک بار پھر اداس ہو گیا۔

''تم قیدی سے مترجم کیسے بنے؟'' رستم نے سوال کیا۔

''سات آٹھ سال پہلے، یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ دو انگریز باشندے پکڑ کر یہاں ..نے گئے۔ یہ میاں بیوی تھے۔ یہ بھٹک کر نہیں آئے تھے۔ یہ واقعی مقدس جڑی بوٹی سپ ..ندل یا سوی کی تلاش میں تھے۔ میں نے ایک مترجم کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی اور ان سے کافی کچھ اگلوایا۔ شوتم خان میری کارکردگی سے بہت خوش ہوا۔ میری سب سے بڑی قابلیت یہ تھی کہ میں نے چار پانچ سال کے اندر مقامی زبان بڑی اچھی طرح بولنا شروع ..دی تھی۔ شوتم خان نے مجھے اور میری بیوی کو اکٹھے رہنے کی اجازت دے دی اور پھر کچھ ..صے بعد ہماری قیدی کی حیثیت بھی ختم کر دی گئی۔''

''کیا تم نے کبھی اس جگہ سے نکلنے کا اور اپنے پیاروں میں جانے کا نہیں سوچا؟'' ..ال ناصر کی طرف سے کیا گیا۔

''پہلے پہل بہت سوچا تھا بلکہ شاید چھ سات سال پہلے تک بھی سوچا کرتا تھا لیکن اب ..ستہ آہستہ یہ بے چینی ختم ہو گئی بلکہ کبھی کبھی تو ہم میاں بیوی سوچتے ہیں کہ شاید یہی ہمارا گھر ..ہے۔''

''کیا کبھی یہاں سے نکلنے کی کوشش بھی کی؟'' رستم نے پوچھا۔

''سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میری ..ی کی ایک ٹانگ تقریباً معذور ہے۔ وہ میرے ساتھ کسی ایسی کوشش میں شریک نہیں ہو سکتی ..ور ..س کے بغیر میں یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسری وجہ اس جگہ کا حدود ..بعہ ہے۔ تم تینوں بھی یہاں سے نکلنے کی دو کوششیں کر چکے ہو۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ اس ..ناپو نما جگہ سے نکلنا کتنا دشوار ہے۔ یہ درحقیقت برف کا ایک قدرتی جزیرہ ہے جس کے ..ں طرف گہری کھائیاں ہیں۔ نکلنے کا راستہ ایک ہے اور وہ بھی بڑی محنت سے خود بنایا گیا ..۔ پہلی مرتبہ تو تم اس راستے تک نہیں پہنچ سکے تھے لیکن دوسری مرتبہ تم لوگوں نے دیکھا ہی ..ہ وہاں کتنی سخت نگرانی ہے۔''

''یہ نگرانی اور پہرے در ہمارا راستہ نہیں روک سکتے واس! ایک دن ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' ناصر نے عجیب لہجے میں کہا۔

واس نے کھوئی کھوئی نظروں سے رستم اور ناصر کی طرف دیکھا۔ ''اگر یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو میں اسے بے وقوفی کہتا لیکن پتا نہیں کیوں تم مجھے یہاں کے دوسرے اسیروں سے جدا لگتے ہو۔ کوئی بات ہے تمہارے اندر کوئی بات ہے لیکن پھر بھی تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہوگا کہ اب اس قسم کا خطرہ مول نہ لینا۔ شوتم خان نے پہلی دفعہ تو تمہیں معاف کر دیا تھا۔ دوسری مرتبہ بہت ہلکی سزا دی گئی تھی۔ راشن کا آدھا ہونا اور ایک ماہ کے لئے کال کوٹھڑی میں بند کئے جانا کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اسے تو ایک طرح کی وارننگ کہنا چاہیے۔ اگلی مرتبہ تمہاری کم از کم سزا یہ ہوگی کہ تمہارے ایک گھٹنے سے ٹکیہ نکال دی جائے گی۔ پھر اسی ایک مفلوج ٹانگ کے ساتھ تمہیں اپنی آہنی بیڑیوں کو بھی گھسیٹنا ہوگا۔''

واس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ رستم نے یہاں کم از کم دو ایسے قیدی دیکھے تھے جن کی ٹانگ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا تھا۔ انہیں اپنی بیڑیوں کو گھسیٹ کر چلتے ہوئے دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔

اس سے پہلے کہ ان کی گفتگو مزید آگے بڑھتی، شوتم خان کے مقرر کردہ مسلح محافظ آ گئے اور انہوں نے سب کو وہاں سے اٹھ کر غار میں چلے جانے کا حکم دیا۔ آج محافظوں کے چہروں پر کافی تناؤ نظر آتا تھا۔ اس تناؤ کی وجہ غالباً وہ لڑائی تھی جس نے آج پاؤندہ بستی مارگا کا سکون تہہ و بالا کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

یہ چھ سات روز بعد کی بات ہے۔ کھوہ کے اندر مشقت ختم کرنے کے بعد ناصر اور شریف ذرا آرام کرنے کے لئے چلے گئے اور رستم باہر برف پر نکل آیا۔ یہاں پر قیدی کی حیثیت سے ان کی مشقت اکثر بدلتی رہتی تھی۔ آج کل کھوہ کے اندر شمال کی جانب نشیب میں اترنے کے لئے پتھروں میں سیڑھیاں کھودی جا رہی تھیں۔ وہ قریباً سات گھنٹے وہاں کام کرتے تھے۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ طویل ہو رہے تھے۔ سورج مغربی ٹیلوں کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ کھوہ سے باہر بستی کے گھروں کے سامنے اور ٹیلوں میں بچے کھیل کود رہے تھے۔ رستم لنگڑا کر چلتا ہوا ذرا دور نکل گیا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہوگی؟'' وہی سوال اس کے ذہن میں کلبلانے لگا جو چمکیلی صبحوں، تاریک راتوں اور شفق رنگ شاموں میں اس کے ذہن میں

کلبلاتے تھے۔ شادی کے بعد تو شانی کے لئے چند گھنٹے بھی اس سے دور رہنا محال تھا۔ اس نے اتنی طویل جدائی کیسے کاٹی ہوگی اور جدائی بھی ایسی جس کی مدت کا کچھ علم نہیں تھا۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ عارضی جدائی ہے یا ہمیشہ کی۔ شادی کے وقت یہ بات تو رستم کو بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کی زندگی تیز ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہے۔ ڈپٹی ریاض اور اس جیسے کئی پولیس افسر اپنی جیب میں اسے ہلاک کرنے کا اجازت نامہ لئے پھر رہے ہیں اور وہ ان سارے حالات کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن یہاں جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے اندیشوں کے بالکل برعکس تھا۔ وہ جرم بے گناہی کی زد میں آیا تھا اور گندم کے ساتھ گھن کی طرح پس کر اس برف زار میں پہنچ گیا تھا۔ شروع میں اسے اور ناصر کو علم نہیں تھا کہ یہاں سے نکلنا اتنا دشوار ہوگا لیکن اب دھیرے دھیرے انہیں حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے جنونی لوگوں کے نرغے میں تھے جو اپنے عقیدے اور اصولوں کے لحاظ سے بے حد کٹر تھے اور جو اس برف زار میں پہنچنے والے کسی بھی شخص کو زندہ حالت میں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ وہ نہ کچھ سمجھتے تھے، نہ مانتے تھے، نہ ان سے کسی طرح کا کوئی سمجھوتا کیا جا سکتا تھا۔ وہ پتھر پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے سینے پر رینگتا رہا جہاں B کا حرف کندہ تھا۔ شانی کی مسکراہٹ اس کی نگاہوں میں چمکتی رہی۔ اس کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اس کی محبت، اس کی بے مثال قربت رستم کو یاد آتی رہی۔ وہ عورت تھی... یا کوئی خوش رنگ منظر تھی؟ یا آسمانی تحفہ تھی؟ وہ کیا تھی؟ جو کوئی اسے دیکھتا تھا خود کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا اور وہ تو اس کا شوہر تھا۔ اس نے اس کے باوقار حسن کو قریب سے دیکھا تھا اور جھیلا تھا...... ہاں وہ بے پناہ تھی...... وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا جو محبت ملاپ سے کم ہو جائے وہ سچی محبت نہیں ہوتی۔

اچانک کسی عورت کے چلانے کی زوردار آواز نے رستم کو خیالوں سے چونکا دیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اوپر ڈھلوان پر ایک لڑکی ایک تنومند مرد سے گتھم گتھا تھی۔ پھر وہ دونوں برف پر لڑھکتے ہوئے رستم کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ رستم دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تنومند شخص سے لپٹی ہوئی لڑکی زری تھی۔ اس نے بڑی دلیری سے اپنے دونوں ہاتھوں سے مدمقابل کی دائیں کلائی پکڑی ہوئی تھی۔

وہ چلائی۔ ''رستم...... رستم بھاگ جاؤ یہ تمہیں مار دے گا۔''

رستم کے پاؤں میں بیڑی تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس نہتی لڑکی کو اس بپھرے ہوئے شخص کے مقابل چھوڑ کر اپنی جان بچاتا۔ زری کھلے ہاتھ پیر کی جوان صحت مند لڑکی تھی

لیکن اس شخص سے مزاحمت کرنے کے لئے بالکل ناکافی نظر آتی تھی۔ اس نے مدِمقابل کا جو ہاتھ اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا اس میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔

رستم کے دیکھتے ہی دیکھتے تومند شخص نے زری کے لمبے بالوں کو اپنی بائیں مٹھی میں جکڑا اور دو ایسے زوردار جھٹکے دیئے کہ وہ اس سے علیحدہ ہو کر دور برف پر جا گری۔ یہ کون شخص تھا۔ اس نے اپنا منہ، سر ایک مقامی طرز کی اونی ٹوپی میں چھپا رکھا تھا۔ اس ٹوپی میں سے صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بڑے غضب ناک انداز میں زری کی طرف بڑھا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے رستم کی طرف آیا۔

رستم اب اس کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس شخص نے بے دریغ رستم کے چہرے پر کلہاڑی کا وار کیا۔ رستم نے نہ صرف جھک کر وار بچایا بلکہ بڑی مہارت سے حملہ آور کو اپنے سر کے اوپر سے گزار دیا۔ بھاری بھرکم شخص کے قلابازی کھانے کا منظر دیدنی تھا۔ وہ پشت کے بل گرا لیکن فوراً ہی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

زری چلائی۔ ''یہ تم کو مار دے گا۔''

حملہ آور نے ایک بار پھر رستم پر کلہاڑی چلائی۔ رستم نے اطمینان سے جھک کر یہ وار بچایا۔ وہ اس پر جوابی حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن پاؤں کی بیڑی آڑے آئی۔ وہ بروقت حرکت نہ کر سکا۔ حملہ آور نے ٹانگ چلائی اور رستم گر کر دور تک پھسل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے اٹھنے میں دیر لگے گی۔ اس دوران میں حملہ آور کی کلہاڑی اپنا کام کر سکتی تھی۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔ زری اس موقع پر آڑے آئی۔ وہ ایک بار پھر تڑپ کر آگے بڑھی اور حملہ آور سے چمٹ گئی۔ حملہ آور نے اسے بے دردی سے جھٹکے دیئے اور پھر تھپڑ مار کر دور گرا دیا۔ اس دوران میں رستم کو اٹھنے اور حریف کے مقابل آنے کا موقع مل گیا۔

آہنی بیڑی کے سبب رستم کی کارکردگی نصف تھی۔ اس کے باوجود رستم اپنے حریف کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ زری بھی گاہے بگاہے اس کی مدد کر رہی تھی لیکن وہ ہر بار اسے دھکا دے کر دور پھینک دیتا تھا۔ وہ زری پر کلہاڑی سے وار کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

زری مزاحمت کے ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی۔ وہ مقامی زبان میں لوگوں کو مدد کے لئے بلا رہی تھی لیکن اردگرد کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ اس دوران میں حملہ آور کا ایک وحشیانہ وار رستم کے دائیں کندھے پر لگا اور اونی صدری کو چیرتا ہوا گوشت کو زخمی کر گیا۔ رستم نے تلملا کر مدمقابل کے سینے پر سر کی ٹکر رسید کی۔ وہ ذرا سا جھکا تو رستم نے پھرتی سے اس کی اونی ٹوپی

کھینچ لی۔

زری حیرت آمیز خوف سے چلا اٹھی۔ رستم بھی حیران رہ گیا۔

حملہ آور پاؤندہ بستی کا خطرناک ترین لڑاکا ''نے مان'' تھا۔ یہ خود کو بنگش نسل سے بتاتا تھا۔ رستم سے پہلے یہی شخص ریچھ سے لڑائی میں سب سے آگے تھا۔ مقامی زبان میں اسے چمپئن کہا جاتا تھا۔ بعدازاں اس کھیل میں ...... یا کہنا چاہیے کہ اس خونی کھیل میں رستم کا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ ناصر اور رستم وغیرہ جانتے تھے کہ ''نے مان'' ان سے شدید رقابت محسوس کرتا ہے لیکن انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا سنگین قدم اٹھائے گا۔ وہ اپنی شناخت چھپا کر یہاں تنہا بیٹھے رستم پر حملہ آور ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اسے ہلاک کرنا چاہتا ہو یا پھر زخمی کر کے کھیل کے لئے ناکارہ بنا دینا چاہتا ہو۔ اسے رستم کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس برف زار میں چوکڑیاں بھرنے والی زری یہاں موجود تھی اور اس نے رستم کو عالمِ بے خبری میں مرنے یا زخمی ہونے سے بچا لیا تھا۔

اب دو خطرناک لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ آج ان کے سامنے ریچھ نہیں تھا۔ وہ خود ہی ایک دوسرے کے لئے خونی جانور بنے ہوئے تھے۔ ''نے مان'' کلہاڑی سونت کر ایک چنگھاڑ کے ساتھ رستم کی طرف آیا۔ رستم نے اپنا ردِعمل پہلے سے سوچ لیا تھا۔ اس نے چیڑ کی ایک شاخ سے لٹک کر اپنے بندھے پاؤں کی طوفانی ضرب ''نے مان'' کے چہرے پر لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا کئی فٹ تک نشیب میں لڑھک گیا۔ درحقیقت یہ پہلی شایانِ شان ضرب تھی جو رستم اپنے حریف کو لگا سکا تھا۔

زری ایک اونچے پتھر پر چڑھ گئی اور مقامی زبان میں چلانے لگی۔ ''بچاؤ... بچاؤ... ادھر آؤ۔''

شاید اس نے کسی کو دیکھ لیا تھا۔ رستم کا یہ اندازہ درست نکلا۔ اس کے کانوں میں ایک سے زیادہ افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس وقت رستم اور ''نے مان'' ایک دوجے سے گتھم گتھا تھے اور خود کو اوپر رکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ تیز دھار کلہاڑی بدستور ''نے مان'' کے ہاتھ میں تھی۔

''رک جاؤ۔'' کسی نے گرج دار آواز میں کہا۔ (مقامی زبان کے چیدہ چیدہ الفاظ رستم اور ناصر کی سمجھ میں آ جاتے تھے)

یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی ''نے مان'' کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ موقع پر پہنچنے والا شوتم خان کا بڑا بیٹا ارفا خان تھا۔ اس کے ساتھ کم و بیش ایک درجن دیگر افراد

بھی تھے۔ان میں سے اکثر مسلح تھے۔

ارفا خان نے ایک بار پھر گرج کر کہا۔"رک جاؤ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

رستم نے بھی "نے مان" پر سے اپنی گرفت ختم کردی۔ رستم کے زخمی کندھے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ بیڑی کی بے رحم رگڑ سے اس کے دونوں ٹخنے بھی چھل گئے تھے۔ رستم اور "نے مان" دونوں کھڑے ہوگئے۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ زری بھاگ کر ارفا خان کے سامنے پہنچی اور مقامی زبان میں واویلا کرنے لگی۔اس نے ارفا کو اپنا سرخ انگارہ گال دکھایا جس پر "نے مان" نے لڑائی کے دوران طوفانی تھپڑ رسید کیا تھا۔ اپنی گردن اور ہاتھوں پر آنے والی دیگر خراشیں بھی اس نے ارفا خان کو دکھائیں۔

ارفا خان کے چہرے پر "نے مان" کے لئے شدید ناپسندیدگی کے آثار ابھرے۔ اس نے زری کے سر پر شفقت کے انداز میں ہاتھ پھیرا اور "نے مان" کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ارفا خان نے "نے مان" کے ساتھ تلخ ترش لہجے میں بات کی۔ جواب میں "نے مان" نے بھی تجل انداز میں ایک دو فقرے کہے۔ وہ واضح طور پر گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں برف کی سطح سے اٹھ نہیں رہی تھیں۔ تاہم وہ رستم کی طرف جب بھی دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں بجلی لپکنے لگتی تھی۔

بہت سے دیگر افراد بھی اب موقع پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور حیرت سے صورت حال کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ رستم کو ان لوگوں میں مترجم واس کی صورت بھی نظر آئی۔

تھوڑی دیر بعد واس رستم کے قریب آیا اور چھوٹے ملک ارفا خان کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔"رستم! گارنی زری کی گواہی کے بعد "نے مان" کا قصور ثابت ہو رہا ہے۔ اس نے جرم کیا ہے۔وہ تمہیں نقصان پہنچا کر ریچھ کے کھیل کے لئے ناکارہ کردینا چاہتا تھا۔ اسے سزا ملے گی لیکن چھوٹے ملک کا کہنا ہے کہ اگر تم خود "نے مان" سے دو دو ہاتھ کرنا چاہو تو انہیں منظور ہے۔"

رستم نے تنومند "نے مان" کی جانب دیکھا اور جرأت مندی سے بولا۔"میری بیڑی کھول دی جائے گی؟"

"بالکل کھول دی جائے گی اور اگر تم چاہو تو یہ مقابلہ کسی اور دن کے لئے بھی اٹھا رکھا جاسکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں، میں ابھی اس سے حساب برابر کرنا چاہوں گا۔"

"لیکن تمہارے کندھے سے خون بہہ رہا ہے۔" واس نے دبی آواز میں کہا۔

"نہیں، یہ معمولی زخم ہے۔" رستم نے گہرے کٹ کو معمولی قرار دیا۔

"یعنی تم اس سے لڑنا چاہتے ہو؟"

"بالکل اور چھوٹے ملک کی خواہش کی مطابق میں اسے زمین بھی چٹواؤں گا۔"

واس واپس چھوٹے ملک ارفا خان کے پاس گیا اور اسے رستم سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں برف زار کا وہ ویران حصہ تماشا گاہ کی شکل اختیار کر گیا۔ بیسیوں افراد ایک بڑے دائرے کی شکل میں جمع ہو گئے۔ رواج کے برعکس ارفا خان اور اس کے قریبی ساتھیوں نے بھی کھڑے ہو کر مقابلہ دیکھنا پسند کیا۔ زور آزمائی کے مقابلوں اور جواں مردی کے مختلف کھیلوں میں ان لوگوں کی خاص دلچسپی رہتی تھی۔

رستم کی بیڑی کھول دی گئی۔ وہ خم ٹھونک کر میدان میں آ گیا۔ اسے بھی "نے مان" کی طرح چھوٹے دستے کی ایک کلہاڑی فراہم کردی گئی۔ لڑائی میں سر کو مہلک ضرب سے بچانے کے لئے یہ لوگ لوہے کی خود نما ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ ایسی دو ٹوپیاں "نے مان" اور رستم کو پہنا دی گئیں۔ سورج کی الوداعی کرنوں میں دونوں لڑاکے ایک دوسرے کے سامنے آئے اور زوردار مقابلہ شروع ہوگیا۔ رستم اپنی وزنی بیڑی سمیت "نے مان" سے لڑتا رہا تھا۔ اب بیڑی کھلتے ہی اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہوا میں اُڑ رہا ہو۔ اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر اس نے "نے مان" کو چند زوردار ضربیں لگائیں۔ کلہاڑی کا ایک طوفانی وار رستم کے اپنے سینے پر بھی لگا تاہم موٹے اونی کپڑوں کے سبب کوئی نقصان نہیں ہوا۔

"نے مان" کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے روبرو ہے جس کی زندگی ہی ایسے معرکے سر کرتے گزری ہے۔ اس کا سابقہ ایک نیچرل فائٹر سے پڑا ہے تھا۔ جب یہ فائٹر اپنی پوری فارم میں آیا تو پاؤندوں کے اس جنگجو کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اسے جیسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرف سے وار کرے اور کس جانب سے اپنے جسم کو غیر محفوظ چھوڑے۔ ہجوم کی ہمدردیاں بٹی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ رستم کے حق میں آوازیں بلند کررہے تھے مگر زیادہ تر مقامی سورما "نے مان" کے طرف دار تھے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اچانک ہی ہوا۔ رستم کے ایک وار کو جھیلتے ہوئے "نے مان" کی کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ رستم کے اگلے طوفانی وار نے "نے مان" کا آہنی ٹوپ ایک طرف سے پچکا دیا اور وہ تیورا کر زمین بوس ہوگیا۔ رستم نے اس کے سینے پر ٹانگ رکھی اور اپنے زخم کا بدلہ لیتے ہوئے کلہاڑی

کا ایک بھرپور تلا وار اس کے کندھے پر کیا۔ وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح چلایا۔

اگر رستم اس وقت "نے مان" کو قتل بھی کر دیتا تو شاید یہ اس کا حق تھا۔ تاہم اسے زخمی کرنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ارفا خان کی طرف دیکھا۔ ارفا نے ہاتھ کے اشارے سے لڑائی ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ واس بھاگ کر رستم کے پاس آیا۔ "شاباش رستم! تم ہمیشہ کی طرح جیتے ہو ... بہت خوب۔"

مسلح محافظوں نے لوہے کا ٹوپ کھینچ کر "نے مان" کے سر سے اُتارا اور اسے زخمی حالت میں اٹھا کر میدان سے باہر لے گئے۔ زری بھاگ کر آئی اور بے تکلفی سے رستم سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ... جیسے جنگلی گلاب پر شبنم ٹکی ہو۔ وہ عجیب معصومیت سے بولی۔ "میں جانتا تھا تم ضرور جیتو گے ..... یہ بڑا کمینہ ..... تم آچھا کرتا، اس کو مار دیتا۔"

رستم نے زری کو خود سے علیحدہ کیا۔ زری کی نگاہ رستم کے کندھے پر پڑی۔ لڑائی کے دوران میں زخم کچھ اور کھل گیا تھا اور صدری خون سے تر تھی۔ "ہائے اللہ۔ تم کا بہت خون بہتا۔" وہ کراہی اور غم زدہ نظروں سے واس کی طرف دیکھنے لگی۔

واس نے بھی آگے بڑھ کر رستم کا زخم دیکھا پھر وہ چھوٹے ملک ارفا خان کی طرف گیا اور اس سے کچھ بات کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دبی دبی خوشی کے ساتھ بولا۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" رستم نے پوچھا۔

"میرے گھر ... میں نے چھوٹے ملک سے اجازت لی ہے۔ تم زخمی ہو۔ وہاں کھوہ میں تمہیں آرام نہیں مل سکے گا۔ تم چند دن میرے گھر میں رہو گے۔"

"لیکن ناصر اور ..."

"ان کی فکر کیوں کرتے ہو۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری ملاقات بھی کرا دوں۔"

زری بھی خوش نظر آ رہی تھی۔ رستم نے واس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو ٹھیک ہے، چلو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے قدم بڑھا دیئے۔ واس نے اسے کندھے سے تھاما۔ "اتنا بھی خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیڑی تمہارے ساتھ رہے گی۔" اس نے برف پر پڑی منحوس بیڑی کی طرف اشارہ کیا۔

ایک محافظ آگے بڑھا اور اس نے بیڑی کو پھر سے رستم کے جسم کا حصہ بنا دیا۔

تم ... تیز عمر واس کے گھر پہنچ گیا۔ بستی کی صرف ایک تہائی آبادی کھوہ کے اندر تھی، باقی

رہائشی کھوہ کے باہر پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ واس کی رہائش گاہ بھی کھوہ سے باہر تھی۔ یہ ویسا ہی گھر تھا جیسے گھر پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے دیہی علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ گھر اندر سے گرم اور آرام دہ تھا .. اس کی چھت نیچی تھی اور گھر کے وسط میں ایک انگیٹھی کے اندر آگ بھی موجود تھی۔ واس کی بیوی بھی واس ہی کی طرح دبلی پتلی اور درمیانے قد کی تھی۔ وہ شکل سے ہی ایک مہربان خاتون نظر آتی تھی۔ وہ کبھی بہت خوش شکل رہی ہو گی لیکن اب چہرے پر عمر کے اثرات تھے اور وہ بیساکھی کے سہارے چلتی تھی۔ یہ جوڑا بے اولاد تھا۔

واس کے ذریعے اس کی بیوی کو رستم اور ناصر وغیرہ کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ رستم کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئی۔ اسے اچھا کھانا اور اچھا بستر فراہم کیا۔ واس نے رستم کے کندھے کی مرہم پٹی کروائی۔ رستم کو یہاں واقعی بے حد آرام محسوس ہوا۔

دوسرے روز جب صبح سویرے سب سو رہے تھے اور رستم بھی اپنے بستر پر تھا کسی نے زور سے اس کا کان کھینچا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ زری اس کے بستر پر چڑھی بیٹھی تھی۔ وہ صحت مند اور ہوش رُبا جسم کی مالک تھی۔ کھلے اونی لباس میں اس کی نسوانیت مچلتی تھی۔ وہ کسی جنگلی پھول ہی کی طرح اپنی دلکشی و رعنائی سے بے خبر تھی اور وہی بے خبر نہیں بستی کے لوگ بھی بے خبر تھے ..... یا شاید وہ بے خبر نہیں تھے، صرف بے خبر بنے رہتے تھے۔ وہ مقدس لڑکی تھی۔ وہ گارنی تھی اور وہ گارنی کی طرف بے باک نظروں سے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "میں بھاگتا ہوا آیا۔ اپنا ہاتھ یہاں رکھو.... رکھو۔" اس نے بے تکلفی سے رستم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دھک دھک کرتے سینے پر رکھ لیا۔

رستم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تم کا کان کھینچنے۔" وہ کھلکھلائی اور رستم پر لد سی گئی۔ وہ اپنے سراپا کی تباہ کاری سے یکسر بے خبر تھی۔ اس کے آوارہ بال رستم کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔

رستم نیم دراز تھا، اب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "دیکھو..... میں تم کے لئے کیا لایا؟"

زری نے کہا اور ایک رومال نما کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے رستم کی طرف بڑھائی۔ یہ اسٹابری کی طرح کا ایک مقامی پھل تھا اور بہت کم نظر آتا تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں سے لے آئی تھی یا کسی کی جھاڑی سے اٹھا لائی تھی۔ یہاں کوئی بھی کسی گارنی کو روکتا نہیں تھا۔

"کیوں لائی ہو؟"

"تم مجھ کو آچھا لگتا۔ میں تم کو دیکھنا چاہتا۔ تم جب ریچھ کو مارتا مجھ کو بڑا آچھا لگتا۔ تم بڑا

زور والا۔'' اس نے رستم کے بازو کے مسل تھپتھپائے۔

یہ وہی بازو تھا جس کا کندھا زخمی تھا۔ رستم تڑپ گیا۔ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ ''ہائے اللہ۔۔۔ ہائے اللہ۔'' وہ پکار اٹھی۔ پھر اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ رستم کے کندھے کی پٹی پر رکھے اور دو تین بار آہستہ سے اسے چوما۔ اس کا انداز بچکانہ تھا۔

اسی دوران میں واس بھی آنکھیں ملتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ ''یہ آفت یہاں کیا کر رہی ہے؟'' اس نے کہا۔

زری ابھی تک رستم کا زخم دُکھنے پر پریشان تھی۔ اس نے مقامی انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو کراس کر کے اپنے کانوں کو لگایا۔ یعنی دایاں ہاتھ بائیں کان کو اور بایاں دائیں کان کو۔ ''مجھ سے غلطی ہوا۔ میں تم سے مافی مانگتا۔'' وہ عاجزی سے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔'' رستم نے اسے تسلی دی۔

''میں ساچی (سچی) کہتا ہوں۔ پھر ایسا نہیں کروں گا۔''

رستم مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب تو تمہارا چاچا بھی گواہ ہے۔''

رستم کے مسکرانے سے وہ بھی کھل گئی۔ رستم کو واس نے اشارے سے بتایا کہ یہ بہت معصوم ہے۔ اس کی کسی بات کا بُرا نہ ماننا۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے واس کی بیوی اسے آوازیں دینے لگی۔ واس باہر چلا گیا۔

زری ایک بار پھر رستم کے بستر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ رستم نے اس سے پوچھا کہ کل شام جب ''نے مان'' نے کلہاڑی سے اس پر حملہ کرنا چاہا تو وہ اچانک وہاں کیسے پہنچ گئی۔ زری کے چہرے پر شرم کا سرخ رنگ لہرا گیا۔ وہ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم بولی۔ ''میں وہاں پہلے سے تھا۔۔۔ تم کو دیکھتا۔۔۔ تم وہاں بیٹھا۔۔۔ آچھا لگتا۔''

اب بات رستم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سرپھری لڑکی رستم کے پیچھے ہی پیچھے وہاں آئی تھی اور کسی درخت کی اوٹ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے ''نے مان'' کو دیکھا جو کلہاڑی سونت کر عقب سے رستم کی طرف بڑھا تھا۔ زری نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور بھاگ کر اس سے چمٹ گئی۔ یہ بڑا ڈرامائی واقعہ تھا۔

''تم کیسی لڑکی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''میں بہت آچھا ہوں۔ تم بھی بہت آچھا۔ تمہارا لمبا بال۔۔۔ بھی کتنا شناری۔''

''شناری؟ کیا مطلب؟''

''شناری۔۔۔ شناری۔۔۔ مطلب آچھا۔'' اس نے رستم کو سمجھانا چاہا اور بے تکلفی سے

رستم کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

اسی دوران میں واس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رستم نے زری کا ہاتھ جلدی سے کھینچ ہٹا دیا۔ واس اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں گرم گرم قہوے کی پیالی تھی۔ وہ زری سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اچھا اب تم جاؤ۔ ہمیں بات کرنی ہے۔''

وہ متذبذب نظر آئی جیسے جانا نہ چاہ رہی ہو۔ واس نے دوبارہ کہا تو اسے اٹھ کر جانا پڑا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد وہ پھر سے بھاگی ہوئی آئی اور اٹک اٹک کر بولی۔ ''یہ تم کے لئے۔۔۔ میں بھول گیا۔''

اس نے کپڑے میں لپٹے ہوئے پھل رستم کے سامنے رکھ دیئے اور شرمائے ہوئے انداز میں باہر چلی گئی۔ واس بڑے غور سے اپنی بھتیجی کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ہمیشہ سے زیادہ اداس نظر آنے لگا۔ رستم کو مخاطب کرکے بولا۔ ''تم نے زری کے سامنے مجھے اس کا چاچا کہا۔ آئندہ نہیں کہنا۔ دراصل زری شروع سے ہی بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ یہاں آ کر یہ چار پانچ سال ہم سے دور رہی۔ اس دوری سے یہ اور بھی بدل گئی۔ اب یہ گارنی بن گئی ہے اور گارنی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف آبوک کی امانت ہوتی ہے۔ زری بھی قریباً بھول ہی چکی ہے کہ وہ ہماری بھتیجی ہے۔ وہ ہمیں چاچا جی کہتی ہے لیکن ایسے ہی جیسے اور بہت سے لوگوں کو کہتی ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ اس کا انس کم سے کم ہو۔۔۔ اسے بہت دیر زندہ نہیں رہنا ہے۔۔۔ شاید ایک یا دو سال۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے واس کی آواز بھرا گئی۔

رستم نے کہا۔ ''کیا اسے بھی یہ سب کچھ معلوم ہے؟''

واس نے اثبات نے سر ہلایا۔ ''بچپن سے ہی گارنیوں کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر بھینٹ چڑھائے جانے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ تمہیں میں نے ان مذہبی عورتوں کے بارے میں بتایا تھا جو مجاریاں کہلاتی ہیں اور عورتوں کا علاج معالجہ کرتی ہیں۔ یہ زچگی میں بھی عورتوں کی مدد کرتی ہیں۔ یہ مجاری عورتیں بڑے پکے عقیدے کی مالک ہوتی ہیں اور ان کا فارغ وقت پوجا پاٹ میں گزرتا ہے۔ یہی عورتیں گارنی لڑکیوں کی پرورش بھی کرتی ہیں۔ وہ شروع سے ہی ان کے دماغ میں بٹھا دیتی ہیں کہ آبوک پر قربان ہونے کے بعد وہ دوسری دنیا میں بہت سی خوشیاں پائیں گی اور ان کی زندگی رشک کے قابل ہوگی۔ وہاں ہر گارنی کی شادی ایک ایسے خوش شکل نوجوان سے ہوگی جس کے سر پر سورج کی کرنوں کا تاج ہوگا اور جو ایک چھوٹی سی سلطنت کا راجا ہوگا۔ وہ انہیں اتنی خوشیاں دے گا کہ اگر وہ

خوشیاں برف۔ کی طرح پہاڑوں پر بچھادی جائیں تو ساری دنیا کے پہاڑ چھپ جائیں۔'' واس کا لہجہ یاس انگیز تھا۔

''کیا زری بھی ایسا ہی سوچتی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''وہ شاید کچھ سوچتی ہی نہیں ہے۔ اس کا دماغ ایک سادہ تختی کی طرح ہوگیا ہے۔ بوڑھی مجاریوں کی ہر ہدایت پر ایک چھوٹی بچی کی طرح عمل کرتی ہے۔ اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دوسری گارنیوں کی طرح سارا دن گلی کوچوں میں چوکڑیاں بھرے اور رات کو عبادت گاہ میں جا کر مجاریوں کے ساتھ سو جائے۔''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''واس! کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہاری اس پیاری سی معصوم بھتیجی کی جان بچ جائے۔ یہ یہاں سے نکل سکے۔ اس کی واقعی شادی ہو...... بچے ہوں۔ یہ اپنی زندگی جی سکے؟''

''کیوں نہیں چاہتا لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں تھکن اور شکست تھی۔

''تم دل سے چاہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تم قیدی نہیں ہو۔ یہاں کے آزاد باشندے ہو۔ تم کوشش کرو تو تمہارے لئے کوئی نہ کوئی راہ کھل سکتی ہے۔ کہیں نہ کہیں راستہ مل سکتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے۔''

واس نے دیوار سے ٹیک لگا کر گہری نظروں سے رستم کو دیکھا۔ کمرے میں داخل ہونے والی صبح کی روشنی رستم کے دائیں رخسار کو روشن کر رہی تھی۔ برف زار پر نمودار ہونے والے سورج کی سنہری کرنیں اس کے لمبے بالوں اور چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی میں سرسرا رہی تھیں۔ آنکھوں میں ایک نامعلوم لپک تھی۔ واس نے کہا۔ ''تمہاری باتوں میں حوصلہ ہے اور امید ہے۔ ایسی باتیں میں نے یہاں پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنیں۔ مجھے لگتا ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''کیا لگتا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارا کوئی بہت پیارا اس برف کے پار موجود ہے۔ اس کی کشش تمہیں ہر وقت بے چین رکھتی ہے، اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شاید یہ کشش تمہیں کسی وقت یہاں سے نکال ہی لے جائے۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو دو چار سال بعد یا پھر پانچ دس سال بعد۔''

''نہیں...... اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔'' رستم نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔

''تم نے ابھی تک اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ناصر اور شریف نے

بتایا ہے۔'' واس نے گلہ کیا۔

''اس سے تمہیں یا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا واس۔ کیوں نہ ہم وہ باتیں کریں جن سے ہم دونوں کو کچھ فائدہ ہو۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ یہاں سے نکلنے کا کیا حیلہ ہوسکتا ہے۔ ہماری پہلی دو کوششوں میں کیا خامی تھی جس کی وجہ سے ہم ناکام ہوئے۔ آئندہ کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ آخر تمہیں یہاں رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے واس۔ تم یہاں کے اندرونی معاملوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر تم کوشش کرو تو مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ نہ صرف خود بلکہ تمہیں اور زری کو بھی نکال سکتے ہیں۔''

''نہیں بھئی! مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں۔'' واس نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اپنے اور اپنی بیوی کے لئے اب کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ نہ ہی میں تمہیں اس طرح کا مشورہ دوں گا۔ تیسری بار شوتم خان تمہیں معاف نہیں کرے گا۔''

''شوتم خان خدا نہیں ہے واس! اور نہ ہی یہ جگہ کالا پانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم شوتم خان سے زیادہ سمجھ دار اور باتدبیر شخص ہو۔ تمہارے پاس علم کی روشنی ہے۔ ان لوگوں کے پاس بس اندھے عقیدے ہیں اور وہم کی پوجا پاٹ ہے۔''

رستم دیر تک واس سے محوِ گفتگو رہا۔ اس نے واس کی ہر بات کا جواب دلیل سے دیا۔ رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ واس بھی دل سے یہ بات مانتا ہے کہ اگر ایک منظم کوشش کی جائے تو اس سے علاقے سے نکلنا ناممکن نہیں ہے۔ دوسری بات رستم نے یہ محسوس کی کہ وہ زری کو اس کے دردناک انجام سے بچانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زری نوعمری کی موت سے بچے اور آزاد دنیا میں سانس لے۔''

شام کو زری پھر آگئی۔ وہ اس کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتی رہی۔ رستم کی ذرا سی شہ پا کر وہ اس کے بستر میں گھس آئی۔ اس نے بڑی سادگی سے اعلان کیا۔ ''میں آج...... تمہارے پاس...... سوؤں گا۔''

اس کی چاچی نے اسے ڈانٹا کہ لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ چاچی نے اسے رستم کے بستر سے نکلنے کا حکم دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم آنسو چمک گئے۔

رستم نے اسے پچکارا۔ ''چلو چلو...... بیٹھی رہو۔''

اس کے آنسو مسکرانے لگے۔ وہ جتنی جلدی غمگین ہوتی تھی اتنی ہی جلدی خوش بھی

ہو جاتی تھی۔ اسے ریچھ کی لڑائی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ رستم سے ریچھ کی لڑائی کے بارے میں باتیں کرنے لگی اور پوچھنے لگی کہ وہ اتنے زور والے جانور کو کس طرح پچھاڑ لیتا ہے۔ رستم نے اسے مناسب جواب دیئے۔ پھر اس کی ذہنی رَو دوسری طرف چلی گئی۔ وہ بچے کی طرح مچلنے لگی کہ رستم اپنی صدری (جیکٹ) ہٹا کر اسے اپنا جسم دکھائے۔ چاچی دوسرے کمرے میں تھی۔

''نہیں..... یہ اچھی بات نہیں۔'' رستم نے اسے ٹوکا۔

''نہیں..... یہ آچھا بات..... یہ عورتوں کے لئے آچھا بات نہیں..... تم کے لئے آچھا بات۔'' وہ اسے گدگدانے لگی اور صدری ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بار پھر وہی ہوا جو صبح ہوا تھا۔ رستم کے کندھے کا زخم دُکھ گیا۔

رستم کے تاثرات دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ صبح کی طرح اس نے بے ساختہ دو تین بار رستم کا کندھا چوما اور اپنے ہاتھوں کو کراس کر کے کانوں کو لگایا۔ ''میں مافی مانگتا..... میں غلطی..... کرتا۔''

''پھر معافی مانگتا..... پھر غلطی کرتا۔'' رستم نے کراہتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔ اتنے میں واس تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی زری گلہری کی طرح پھدک کر باہر نکل گئی۔

واس کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ وہ بولا۔ ''عورت واقعی فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہاں پاؤندہ بستی میں کبھی ایسا ہوگا۔''

''کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''آج پھر ارفا خان اور سامی خان کے حمایتیوں میں کلہاڑی چلی ہے۔ ایک بندہ جان سے گیا ہے۔ ایک کا بازو کٹ گیا ہے۔ وہ سخت زخمی ہے۔''

واس انگیٹھی کے قریب بیٹھ کر رستم کو اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ لوگوں کو شک ہے کہ سامی خان پر آنے والی آفت کی اصل وجہ ارفا خان ہی ہے۔ ارفا نے ہی خفیہ جگہ پر لیڈی ڈاکٹر کا کھوج لگایا اور بعد میں اسے جان کی امان دے کر اور سامی کے خلاف پٹی پڑھا کر شوتم خان کے پاس بھیجا۔''

رستم خاموشی سے واس کی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں رستم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''واس مجھے بتاؤ، کیا اس صورتِ حال میں ہمارے لئے بہتری کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟''

واس نے چونکی ہوئی نگاہوں سے رستم کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر خاموشی سے کچھ سوچنے

لگا۔ رستم بڑے صبر سے انتظار کرتا رہا۔ انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ خوش نما معلوم ہوتی تھی۔ باہر برفانی ہوا چل رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں واس کی بیوی بیساکھی کے سہارے ٹھک ٹھک چل رہی تھی اور مقامی لوگوں کی مرغوب غذا گوشت پلاؤ پکا رہی تھی..... اس مزیدار پلاؤ میں عموماً IBEX یعنی برفانی بکرے یا SNOW COCK یعنی برفانی مرغ کا گوشت استعمال ہوتا تھا۔

کافی دیر بعد ادھیڑ عمر واس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولا۔ ''یہاں پاؤندوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل نیا اور اَن دیکھا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی اصل طاقت ہی ان کا باہمی اتفاق ہے..... جو ارفا اور سامی کی لڑائی کے بعد ٹوٹتا پھوٹتا نظر آ رہا ہے۔''

''میرے خیال میں اسے اتفاق کے بجائے گٹھ جوڑ کہنا چاہیے کیونکہ یہ بُرے لوگوں کا ایکا ہے اور غلط کاموں کے لئے ہے۔''

واس نے اثبات میں سر ہلایا اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کے لوگ شوتم خاندان کے افراد کو بہت پارسا اور نیکوکار سمجھتے رہے ہیں لیکن کچھ لوگوں کے دلوں میں تھوڑے بہت شکوک و شبہات بھی موجود تھے۔ اب سامی خان اور ارفا کی وجہ سے یہ شکوک بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور میرے خیال میں یہ شوتم خان کے لئے بہت بڑا دھچکا ہے۔ اگر اس موقع پر یہ عیش پسندی والا معاملہ تھوڑا سا اور اچھل گیا تو شوتم خان کے لئے یہاں کے امن سکون کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔''

''میرے خیال میں اپنے دشمن کو کمزور کرنا، ہر لڑنے والے کا حق ہوتا ہے۔''

واس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور رستم کی بات کی گہرائی میں جھانکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہا ہوں، یہ تمہیں عجیب لگے گی۔ شاید تم سمجھو کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں یا مبالغے سے کام لے رہا ہوں لیکن یہ سو فیصد حقیقت ہے۔ ہاں تم اسے حیران کرنے والی حقیقت کہہ سکتے ہو۔''

رستم سوالیہ نظروں سے واس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ آگ کی روشنی واس کی پیشانی پر منعکس ہو رہی تھی اور اس کے نیم سفید بالوں کا رنگ تبدیل کر رہی تھی۔

''شوتم یہاں کا ملک ہے۔ اس کی پارسائی اور نیکوکاری پر کسی کو شبہ نہیں۔'' واس نے کہنا شروع کیا۔ ''شوتم کی بیوی اس وقت مری تھی جب شوتم کی عمر صرف تیس پینتیس سال تھی۔ لوگ جانتے ہیں کہ اس کے بعد سے عورت شوتم کی زندگی سے نکل گئی ہے۔ وہ کسی عورت کی

طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور نہ کسی طرح کی دلچسپی ظاہر کرتا ہے.... لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' رستم نے پوچھا۔

''شوتم کے اندر عورت کے لئے جتنی تڑپ ہے وہ بہت کم لوگوں میں ہوگی۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں اسے بتاؤں کہ آدم کا یہ ساٹھ سالہ بیٹا حوا کی بیٹی کے لئے کتنا ترستا ہے۔''

رستم غیر یقینی نظروں سے واس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ واس کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ دور مشرقی ٹیلوں کے عقب سے پوری رات کا چاند آہستہ آہستہ کسی سنہری غبارے کی طرح فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ واس نے کہا۔ ''شوتم خان کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہو اور جو بات میں تمہیں اب بتانے لگا ہوں وہ تمہیں اور بھی عجیب لگے گی۔'' واس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''شوتم خان.... تقریباً ہر مہینے چند دنوں کے لئے ایک خاص قسم کی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی ہیجانی حالت ہوتی ہے۔ ان دنوں میں شوتم خان خود کو عام لوگوں سے بالکل الگ کر لیتا ہے۔ ان دنوں میں وہ عورت سے ملنا تو کجا اس کو دیکھنے یا اس کی آواز سننے سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں پتھر ہے، لیکن میں جانتا ہوں ان دنوں میں وہ ایک شیشہ ہوتا ہے جو جوان عورت کے سانسوں کی ٹھوکر سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔'' واس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر چمکتے چاند کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میرے خیال میں شوتم خان کی خاص کیفیت کے وہ خاص دن شروع ہونے والے ہیں۔'' واس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

شوتم کی خاص کیفیت والی بات رستم کی سمجھ میں پوری طرح تو نہیں آئی لیکن وہ کچھ نہ کچھ سمجھ گیا۔ مترجم واس نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھار ناغہ بھی ہو جاتا ہوگا لیکن عام طور پر مہینے میں کم از کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا ہے۔ عام طور پر جب چاند جوبن پر آنے کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے تو شوتم کے اندر یہ تبدیلی بتدریج پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دو روز کے اندر ہی وہ چار پانچ دن کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔''

''کہاں غائب ہو جاتا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اگیارے میں۔ مقامی زبان میں اگیارہ چلہ کاٹنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ شوتم خان کے گھر کے پچھواڑے تم نے سفید پتھروں کی وہ چار دیواری دیکھی ہوگی جس کے اندر پتھر کی دیواروں میں دو بڑے بڑے جھونپڑے ہیں۔ یہاں آبوک کا ایک پرانا درخت بھی ہے۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہی اگیارہ ہے۔'' واس نے کہا۔ ''اس چار دیواری کا دروازہ بھی بہت پرانا ہے۔

یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ دروازہ تین ہزار سال پہلے آبوک کی لکڑی سے بنا ہے جن دنوں شوتم خان اگیارے تک محدود رہتا ہے، یہ دروازہ بھی اندر سے بند رہتا ہے۔ کوئی اگیارے میں آ جا نہیں سکتا۔''

''شوتم کو کھانا وغیرہ کیسے پہنچتا ہے؟''

''کھانے کی چیزیں چار دیواری کے اندر ہی موجود ہوتی ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں شوتم خان بہت ہلکا پھلکا کھانا کھاتا ہے۔ عام طور پر یہ خشک راشن ہی ہوتا ہے۔ مثلاً بھنے ہوئے چاول، مکئی یا ستو وغیرہ۔''

''واقعی یہ حیران کن سی بات ہے۔ کیا شوتم خاندان کے کسی اور فرد کے ساتھ بھی یہ مسئلہ ہے؟''

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کم از کم میرے علم کے مطابق تو ایسا نہیں۔ شوتم خاندان کے اکثر مرد بڑے پرہیزگار اور قناعت پسند سمجھے جاتے ہیں اور شوتم کے اس مسئلے کے بارے میں بھی صرف اور صرف چند قریبی لوگ جانتے ہیں یہ مسئلہ ایک بیماری کی طرح پچھلے پندرہ بیس سالوں سے شوتم خان کے ساتھ موجود ہے۔''

''جب چار پانچ دن کے بعد شوتم اپنی پناہ گاہ سے باہر آتا ہے تو اس کے کیا طور اطوار ہوتے ہیں؟''

''وہ بالکل عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے۔ بے حد پُر سکون... بہت گہرا اور اسٹیل کی طرح سخت۔''

''اسٹیل کی طرح سخت.....! کیا مطلب؟'' رستم نے پوچھا۔

''تم نے دیکھا ہی ہے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے قانون قاعدوں کا کتنا پابند ہے۔ اپنے قبیلے کی پرانی روایتوں کے مطابق جو لکیریں اس نے کھینچی ہوئی ہیں ان میں سے ایک ان کو پار کرنے کا مطلب بھی اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ تم نے دیکھا، اس نے اپنے سگے بیٹے کو بھی نہیں بخشا۔ اس کا بازو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیا اور ایسا کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ایسے ہی جرم پر بلکہ اس سے ہلکے جرم پر بھی کئی لوگوں کے بازو کاٹ چکا ہے۔ ابھی پچھلے سال انہی دنوں میں اٹھارہ انیس سال کے ایک لڑکے نے اپنی جان ہاری ہے۔ وہ شوتم گھرانے کی ایک لڑکی سے پیار کرنے لگا تھا۔ نوعمری کا پیار تھا اور منہ زور۔ لڑکے کا باپ بستی کا کھاتا پیتا شخص تھا۔ اس کے پاس بکریوں کے تین بڑے ریوڑ تھے اور بہت سی قیمتی کھالیں۔ اس نے لڑکے کی دیوانگی دیکھی تو سمجھ گیا کہ اس کی جان چلی

جائے گی۔ اس نے لڑکے کو پہلے تو دو ماہ تک ایک کمرے میں بند رکھا پھر مقامی رواج کے مطابق اس کی شادی ایک پختہ عمر کی عورت سے کردی۔ لڑکے کی بدقسمتی کہ اپنی شادی کی رات وہ اپنی بیوی کے پاس جانے کے بجائے اس لڑکی کے پاس جا پہنچا۔ رکھوالی کے کتوں نے اسے بھنبھوڑ دیا اور وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ مقامی دستور کے مطابق اس کی سزا موت تھی۔ لڑکے کے باپ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح بچے کی جان بچ جائے۔ اس نے اپنے سارے مال، مویشی ہرجانے کے طور پر دینے کی پیشکش بھی کردی لیکن شوتم خان کا فیصلہ اٹل رہا۔ کلہاڑے سے لڑکے کی گردن اُڑا دی گئی۔''

''اور وہ لڑکی؟''

''لڑکی اس واقعے کے بعد صرف آٹھ دس دن ہی زندہ رہی۔ جس دن لڑکے کی موت کے لئے اس کے گھر میں ''تیسری عبادت'' ہو رہی تھی لڑکی نے کانچ کی بہت سی چوڑیاں پیس کر نگل لیں اور وہ بھی ..... برف کے نیچے چلی گئی۔''

رستم نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟''

''یہ ظلم دوسروں پر تو ہے ہی..... اپنے آپ پر بھی ہے۔ جب بندہ قدرت کے قانون توڑ کر اپنے قانون بناتا ہے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ بڑی عمر کی دلہنوں سے شادی کرنے کا رواج اس قبیلے میں بہت پرانا ہے۔ اصل میں یہ پابندی صرف سردار خاندان کے لئے ہوتی ہے لیکن سردار خاندان کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی جو زیادہ پرہیزگار بننا چاہتے ہیں، یہ رسم اپنا لیتے ہیں۔ ایسی شادیوں کا انجام عموماً یہ ہوتا ہے کہ مرد جواں سالی میں ہی رنڈوا ہو جاتا ہے۔ یہاں جو لوگ زیادہ مذہبی بنتے ہیں وہ دوسری شادی کو بھی عیاشی گردانتے ہیں۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ مرد کی نرینہ اولاد موجود ہو یہ سب کچھ فطرت کے خلاف جاتا ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب سردار شوتم خان کو ہی دیکھا جائے، وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی اچھا خاصا صحت مند ہے۔ خوب ڈٹ کر کھاتا پیتا بھی ہے۔ آرام چین کی زندگی گزارتا ہے۔ پھر ساری نفس کشی اور درویشی صرف عورت کے سلسلے میں ہی رہ گئی ہے؟''

''بس جو رسم و رواج صدیوں پرانے ہوتے ہیں انہیں کوئی ختم کرنا نہیں چاہتا اور اگر چاہے بھی تو اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔''

''کیا شوتم جیسے لوگوں کا برہمچار توڑنے کی کوشش بھی یہاں کی جاتی ہے؟'' رستم نے

دریافت کیا۔

''جہاں رہن سہن ہوگا وہاں اس طرح کی کوششیں تو ہوتی ہی ہیں لیکن ایسے لوگ اپنے ارادوں میں بڑے کٹر ہوتے ہیں اور میرے خیال میں سب سے بڑا کٹر یہ شوتم خان خود ہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے جب شوتم خان زیادہ صحت مند اور خوبرو تھا اس پر کئی ''زنانہ حملے'' ہوئے تھے۔ شوتم گھرانے کی ہی ایک جواں سال عورت دل و جان سے شوتم پر فدا ہوئی تھی اور اس نے نیلا تھوتھا کھا کر اپنی جان تک لینے کی کوشش کی تھی مگر یہ پتھر ٹس سے مس نہیں ہوا۔ پھر شوتم خان کی آنجہانی بیوی کی چھوٹی بہن جو کافی خوب صورت تھی، دو تین برس اس چکر میں رہی کہ شوتم خان سے شادی کر کے سردارنی بن جائے۔ سنا ہے کہ شوتم خان بھی تھوڑا بہت اس کی طرف متوجہ ہوا تھا لیکن شوتم کے کٹرپن کی وجہ سے یہ بیل بھی منڈھے نہیں چڑھی۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کئی عورتیں اس ''قلعے'' پر کمند پھینکتی رہیں لیکن کامیاب کوئی نہیں ہوئی اور اب کچھ برسوں سے تو شوتم اس معاملے میں بے حد سخت ہو چکا ہے۔ کوئی عورت اس کی طرف مائل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''اس لحاظ سے تو تمہاری یہ ''خاص کیفیت'' والی معلومات بڑی فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا تم واقعی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ ان خاص دنوں میں عورت، شوتم خان کو زیر کر سکتی ؟''

''اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو اور اس انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ گرم ہے۔'' واس نے افغانی قہوے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دو تین سال میں، میں شوتم کو بہت قریب سے جاننے لگا ہوں۔ وہ اندر سے بہت گہرا اور بے حد مضبوط شخص ہے لیکن کہتے ہیں ناں کہ مضبوط سے مضبوط گرہ کے اندر بھی کوئی ایک بل ایسا ہوتا ہے جو نکل جائے تو ساری گرہ کمزور ہو کر کھل جاتی ہے۔ شوتم کی نہایت مضبوط اور سخت گرہ کا کمزور بل وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ اگر کوئی کسی طرح وہ بل کھول دے تو شوتم کے لئے خود کو سمیٹنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

رستم نے گہری نظروں سے واس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن دنوں شوتم نے خود کو دوسروں سے علیحدہ کر کے اگیارے کی چار دیواری تک محدود کر رکھا ہو اس تک کوئی عورت پہنچا دی جائے۔''

''اور یہ آسان کام نہیں ہے۔'' واس نے خالی خالی نظروں سے لالٹین کو گھورا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو چاچا؟''

''سب سے پہلے تو اس جواں سال خوش شکل عورت کا ملنا ہے جو یہ رسک لینے کے لئے تیار ہو۔ پھر ایک اہم سوال یہ کہ اس عورت کو چار دیواری کے اندر کیسے پہنچایا جائے؟''

رستم نے ساوار سے قہوہ منقش پیالی میں انڈیلا اور کھڑکی سے باہر برفانی ہوا کے بہاؤ پر ایک نگاہ ڈال کر بولا۔ ''فرض کرو واس، ہم یہ دونوں کام کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ ضروری ہے کہ سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا ہم نے سوچا ہے...... میرا مطلب ہے کہ کیا شوتم خان سچ مچ اپنا برہمچار توڑ کر اس عورت کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر ہو جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو ہمارے دماغوں میں آ رہا ہے؟''

''تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ سارا کام میری مرضی کے مطابق ہوا تو اس بات کا پانچ فیصد امکان بھی نہیں کہ شوتم خان کا سارا دفاع درہم برہم نہ ہو اور وہ اپنے برہمچار پر قائم رہ سکے۔ جہاں تک اس سے آگے کے معاملے کا سوال ہے تو میرے خیال میں تم بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ قبیلے کے لوگ شوتم خاندان کے افراد کو اپنے دل و دماغ میں بہت اونچا رتبہ دیتے ہیں۔ رتبے کے اس ''صاف شفاف شیشے'' میں ایک تڑیر تو صاحب زادہ سامی خان کی حرکت کی وجہ سے پڑی ہے، اگر دوسری تڑیر خود شوتم خان کی وجہ سے پڑ گئی تو بہت کچھ چکنا چور ہو جائے گا۔''

''سامی خان اب کس حال میں ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''وہ بندی خانے میں ہے۔ اسے اب طویل سزا کاٹنا پڑے گی۔ مجھے پتا ہے اس سزا میں ایک دن کی رعایت بھی نہیں ہوگی۔ پورے چار سال اسے تالے کے پیچھے رہنا ہوگا۔ اس کا زخم بھی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے روزانہ مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ سامی خان جیسے شخص کا پھسلنا آسان نہیں تھا لیکن اس کے اندر دبی ہوئی منہ زور خواہشوں نے اسے پھسلا دیا۔''

''ڈاکٹر مالینا کس حال میں ہے؟''

''سردار زادے نے اس کے ساتھ تعلق قائم کر لیا تھا اس لئے اب اسے قتل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔ وہ سردار خاندان کے ایک فرد کی طرح علیحدہ گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ اگر اس سے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ بھی آبوک (دیوتا) کی منشا سے ہوگا۔ قدیم روایت کے مطابق نومولود بچے کو پن چکی کے گول پتھر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اس بچے کو گرم کپڑوں میں لپیٹ کر پن چکی کے پتھر سمیت ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اگر بچہ رات بھر سردی اور جنگلی جانوروں کے

پنجوں سے بچا رہا تو سمجھا جاتا ہے کہ آبوک نے اسے واپس لوٹا دیا ہے۔ دوسری صورت میں جانا جاتا ہے کہ آبوک نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ صبح بچے کی ماں جاتی ہے اور خشک آبوک کے تنے کے پاس سے بچے کو زندہ یا مُردہ حالت میں اٹھا لاتی ہے۔''

''بڑا بے رحم طریقہ ہے۔'' رستم نے تاسف ظاہر کیا۔

''لیکن یہ تو تب ہوگا جب ڈاکٹر امید سے ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہے اگر ہوتا تو مجاریاں اسے آزادی سے گھومنے پھرنے نہ دیتیں۔''

''کیا وہ آزادی سے گھوم پھر سکتی ہے؟''

''مکمل آزادی تو اسے نہیں ہے لیکن بستی کے اندر دن کے وقت وہ چل پھر لیتی ہے۔ دو تین دفعہ تو یہاں میرے گھر تک بھی آ چکی ہے۔ وہ جس جگہ رہ رہی ہے وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں، صرف دو تین منٹ کا راستہ ہے...... بلکہ اس سے بھی کم اور شاید میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ پانچ چھ دن پہلے تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ شام کے بعد چھوٹی جھیل کی طرف چلی گئی۔ تمہیں پتا ہی ہے یہ جگہ بستی کے بالکل جنوبی کنارے پر ہے۔ وہ اپنے گھر سے قریباً آدھ کلومیٹر آگے نکل آئی تھی۔ محافظوں نے اسے پکڑ لیا اور واپس گھر لے آئے۔ اس نے کہا کہ اسے کچھ پتا نہیں، وہ کیسے جھیل تک پہنچی ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ اب معلوم نہیں اس نے اپنی جان چھڑانے کے لئے بہانہ بنایا یا اسے واقعی نیند میں چلنے کی بیماری ہے۔''

واس نے سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھا جیسے اس سے تصدیق چاہ رہا ہو۔ رستم نے کہا۔ ''مجھے اس بارے میں زیادہ پتا نہیں لیکن ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ یورپین لوگ شراب وغیرہ پیتے ہیں اور نشے میں دھت ہو کر سوتے ہیں۔ نیند میں بھی ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں۔''

واس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر مالینا واقعی نیند میں چلتی ہے یا پھر اس نے اپنے کسی ''پروگرام'' کو چھپانے کے لئے بہانہ بنایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے ناسمجھ قیدیوں کی طرح اس برفیلے ٹاپو سے نکلنے کے لئے کسی راستے کا جائزہ لے رہی ہو۔ ویسے یہ بات ماننا پڑے گی کہ وہ ایک ہوشیار لڑکی ہے...... اگر ہوشیار نہ ہوتی تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتی۔''

کھانا تیار ہو چکا تھا۔ چار دیواری میں پلاؤ اور اخروٹ کے حلوے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ واس کی بیوی انہیں کئی دفعہ پکار چکی تھی۔ آخر انہیں دوسرے کمرے میں جا کر

کھانا کھانے کے لئے اٹھنا پڑا۔

اگلے روز صبح سویرے سے ہی زری نے واس کے گھر کے گرد منڈلانا شروع کر دیا۔ واس مسلسل گھر میں تھا اس لئے زری، رستم کے قریب نہیں آ سکی۔ بستی میں بدستور تناؤ کی کیفیت تھی۔ کل ہونے والے ہنگامے کے بعد پُر اندیش خاموشی نے بستی کے گلی کوچوں اور کوہ کے طول و عرض میں پڑاؤ کر رکھا تھا۔ ویسے بھی سردی معمول سے زیادہ تھی۔ برف زار میں برفانی ہوائیں سنسناتی تھیں اور دور کہیں سے گاہے بہ گاہے ایک پُر ہول آواز سنائی دیتی تھی۔ واس نے بتایا کہ یہ برفانی تودے ہیں جو ایک ڈھلوان سے پھسل پھسل کر ایک آبی گزرگاہ میں گرتے ہیں اور آواز پیدا کرتے ہیں۔''

ناشتے کے بعد واس اور رستم ایک بار پھر غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ واس نے گڑگڑی کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے رستم! کیا ہم اس معاملے میں مالینا کو استعمال نہیں کر سکتے؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ اگیارے میں شوتم کی آزمائش کے لئے مالینا کو بھیجا جائے؟''

''میں صرف مشورے کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہوں۔'' واس جلدی سے بولا۔ ''ویسے میں بھی یہ جانتا ہوں کہ اس کام میں بہت رسک ہے لیکن یہ بات ہے کہ مالینا ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اس کی خوب صورتی کسی بھی مرد کے لئے امتحان ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے رات کو بہت دیر تک سوچ بچار کی ہے..... میرے اندازے کے مطابق میں ایک ایسی راہ نکال سکتا ہوں کہ مالینا یا کوئی بھی دوسری عورت رازداری سے اگیارے میں پہنچ جائے۔''

''کیا کرو گے تم؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ شوتم خان اگیارے میں جانے کے بعد اس کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دیتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس تین ہزار سال پرانے دروازے کی کنڈی کو باہر سے کیسے گرایا جا سکتا ہے۔ دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان جو درز ہے میں وہاں سے یہ کام کر سکتا ہوں۔''

''چلو، یہ تو ایک علیحدہ مسئلہ ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ مالینا یہ رسک کیسے لے سکتی ہے۔ ابھی تو سامی خان والا معاملہ بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے۔''

''مگر اس معاملے میں بھی مالینا کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔'' واس نے کہا۔ ''سب جانتے ہیں کہ جو کیا سامی خان نے کیا۔ وہ مالینا کو گولی مار دیتا تو مالینا نے کیا کر لینا تھا۔ سامی نے اس خوب صورت عورت کی جان بخشی کی اور اس کے بدلے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ خوب صورت

عورت کا قصور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ خوب صورت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس پر ایک مرد ہی مرے، کئی مرد اس پر فریفتہ ہو سکتے ہیں۔''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے پہلو بدلا۔ ''چلو فرض کر لیتے ہیں کہ مالینا کسی طرح اگیارے میں شوتم خان کے پاس پہنچ گئی اور تمہاری ریسرچ کے مطابق شوتم خان نے وہی کچھ کیا جس کا تم نے قیافہ لگایا ہے..... اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''اس کے بعد مالینا شور مچا دے گی۔ ہم دو چار ایسے گواہ تیار رکھیں گے جو شوتم خان کو مالینا کے ساتھ غیر حالت میں دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طوفان خود بخود اپنی راہ بنا لے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے واس کی آواز مزید دھیمی اور معنی خیز ہو گئی۔

''اس کے بعد کیا ہو گا؟ شوتم خان پکڑا جائے گا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ کیا ہوا؟ شوتم خان کہے گا کہ یہ لڑکی زبردستی میری تنہائی میں گھسی ہے اور مجھے ''

''کچھ نہیں ہو گا۔'' واس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہاں کے لوگوں کو بہت قریب سے جاننے لگا ہوں۔ اس واقعے کے بعد شوتم کچھ بھی کہے گا، اس کی ایک نہیں سنی جائے گی۔ وہ سردار ہونے کے باوجود سیدھا ملزموں کے کٹہرے میں پہنچے گا۔ سامی خان کے ماتحت اور خاص طور سے سامی خان کے سسرالی پہلے ہی بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ وہ ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔'' چند لمحے توقف کر کے واس نے گڑگڑی کے چند کش لئے اور بولا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہ ہو، سامی خان کے سسر برق جان کا بایاں بازو بھی کندھے سے کٹا ہوا ہے۔ یہ بازو بارہ تیرہ سال پہلے شوتم کے حکم پر اس وقت کاٹا گیا جب برق جان پر ایک لداخی دیہاتی سے دست درازی کا الزام لگا تھا۔''

''پھر بھی واس، اس کام میں مالینا کے لئے خطرے تو موجود ہیں۔ شوتم تو مالینا کے پاس نہیں آئے گا۔ مالینا ہی چل کر شوتم کے پاس پہنچے گی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ اگیارے میں کیوں گئی..... اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا؟''

''ایسے موقعوں پر عورت کی ہر دلیل سچ مانی جاتی ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ شوتم خان نے اسے رات کے اندھیرے میں وہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ اگیارے کا اندر سے کھلا دروازہ اس کی تصدیق کرے گا۔''

رستم کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ اس کے لمبے بال ہولے ہولے اس کی پیشانی اور ٹھوڑی پر جھول رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے زخمی کندھے کو ہولے

ہولے سہلاتا رہا، پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”کچھ بھی ہے واس! مجھے لڑائی کا یہ طریقہ پسند نہیں۔ میں نے کبھی کسی سے دشمنی چکانے کے لئے عورت کو استعمال نہیں کیا..... نہ ہی میں یہ چاہوں گا کہ اس جگہ سے نکلنے کے لئے ایک عورت کا سہارا لوں۔“

”رستم! میں جانتا ہوں کہ تم ایک بہادر شخص ہو۔ تم شوتم کا زور توڑنے کے لئے جو سوچ بچار کر رہے ہو اس کی وجہ بزدلی نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یہ مقولہ تو تم نے بہت دفعہ سنا ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ شاید یہ مقولہ کسی ایسی ہی صورتِ حال کے لئے بنایا گیا ہوگا۔“

”لیکن اگر اس معاملے میں مالینا کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ اس کا مطلب تو پھر یہی لیا جائے گا کہ ہم نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک ایسی لڑکی کو چارے کے طور پر استعمال کیا جو یہاں پہلے ہی کافی مصیبتیں جھیل چکی ہے۔“

”مگر رستم! یہ صرف تمہاری اپنی آزادی کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ مالینا کی آزادی اور رہائی کا معاملہ بھی ہے اور وہ عورت ذات ہے۔ اس پائندہ بستی سے اس کی رہائی تم تینوں کی رہائی سے بھی زیادہ اہم ہے۔“

”کچھ بھی ہے واس۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔“

ابھی رستم کا یہ فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر آ گیا۔ رستم اور واس نے چونک کر دیکھا اور حیران رہ گئے۔ یہ مالینا تھی۔ وہ مقامی لباس میں تھی۔ مقامی انداز میں ہی اس نے اپنے سنہری بالوں کی لمبی لمبی مینڈیاں بھی بنا رکھی تھیں۔ ..اس کے سرخ و سپید چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔

”ڈاکٹر! تم یہاں؟“ واس نے بے حد تعجب سے کہا۔

وہ بغیر آفر کے ہی ایک نشست پر بیٹھ گئی اور اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ”ٹم ہام کو ماف کرنا۔ ہام ٹم کو سوری بولتا۔ ہام نے ٹم کا سارا باتیں سنا۔ ہام ڈور کے پیچھے ہوتا۔“ رستم اور واس نے ہونٹ سکوڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مالینا کی نیلگوں آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہام نے سب سنا...... ہام ایگری کرتا...... ہام یہ کام کرنا مانگتا یس، آئی وِل ڈو دِس جاب۔“

”تم ... نے کیا سنا ہے مالینا؟“ رستم نے پوچھا۔

جواب میں مالینا نے اپنی لنگڑی اردو اور انگریزی میں اٹک اٹک کر وہ سب کچھ بتا دیا جو یہاں کہا گیا تھا۔ دراصل واس کی بیوی انہیں ناشتہ کھلانے کے بعد پھر سو گئی تھی۔ اس دوران

میں مالینا ان میاں بیوی سے ملنے آئی۔ اس گھر کی اندرونی دیواریں چیڑ اور دیودار کے تختوں کی تھیں۔ دھیمی آواز بھی ان دیواروں سے کراس ہو جاتی تھی۔ مالینا نے رستم اور واس کو بولتے سنا اور دروازے سے لگ کر سننے لگی۔ وہ اس پلاننگ کے بارے میں بہت کچھ سمجھ چکی تھی اور اس کی پُر جوش رائے تھی کہ اس پر عمل کیا جائے۔

صورتِ حال ایک دم ہی ڈرامائی رخ اختیار کر گئی۔ رستم نے مالینا کے سامنے اپنے اندیشوں کا کھل کر اظہار کیا۔ وہ کسی اندیشے کو خاطر میں نہیں لائی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رستم پر اندھا دھند اعتماد کرنے لگی ہے اور سمجھتی ہے کہ جس پلاننگ کو رستم قابلِ عمل جان رہا ہے وہ ضرور قابلِ عمل ہوگی اور کامیاب بھی ہوگی۔

☆======☆======☆

یہ چوتھی رات کا ذکر ہے۔ مالینا پروگرام پر عمل کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ اس نے وقت کی ''ڈیمانڈ'' کے مطابق خود کو تھوڑا سا سنوار لیا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بڑے جھمکے، گلے میں چاندی کا ہار جس میں سرخ پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اپنی نگران عورت کے سامان میں سے اسے رنگین پتھر کی چند چوڑیاں بھی مل گئی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر تھوڑی سی لالی لگائی اور مقامی انداز میں گندھے ہوئے سنہری بالوں کو سنوار لیا۔ اس نے لکڑی کے خستہ حال اسٹینڈ پر لگا ہوا بیضوی آئینہ دیکھا اور اپنی ہیئت کذائی پر خود ہی حیران ہوئی۔ اس نے سوچا کیا وہ واقعی ڈاکٹر مالینا ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر، ایک کامیاب ماہر جنسیات، جو گلے میں اسٹیتھ اسکوپ لگائے برمنگھم کے اعلیٰ ترین ہسپتال میں بگولے کی طرح چکراتی تھی۔ آج کی اس مقامی حلیے کی عورت اور اس ڈاکٹر مالینا میں کتنا فرق تھا۔ آنکھوں کو بھروسا ہی نہیں ہوتا تھا۔

پھر اس نے خود سے سوال کیا۔ ''مالینا! کیا تم کبھی واپس اپنے ملک پہنچ سکو گی؟ کیا تم پھر سے اپنی ماں اور بڑی بہن کا چہرہ دیکھ سکو گی اور کیا پھر کبھی تمہارے بوائے فرینڈ آرتھر کی حساس انگلیاں تمہارے سنہری بالوں میں چلیں گی اور تم اس کے سینے کی گرمی محسوس کر سکو گی؟''

اسے آرتھر کی انگلیاں شدت سے یاد آئیں۔ وہ انگلیاں جو گٹار پر چلتی تھیں اور ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیتی تھیں۔ وہ ایک پروفیشنل گٹارسٹ تھا۔ وہ سوچنے لگی کیا وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا یا پھر کسی اور لڑکی کی زلفوں میں انگلیاں چلانے لگا ہوگا۔ وہ جس معاشرے میں رہتی تھی وہاں زیادہ دیر کسی کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو تین چار راتوں کی دوری ہی کافی ہوتی تھی۔ یہاں تو تقریباً نو ماہ گزر چکے تھے۔ اس نے ان خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں کسی سے وفا کی امید رکھنا ہی عبث تھا۔ اس نے ایک بار

پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور آنے والے حالات کے لئے تیار ہوگئی۔

کھڑکی میں سے ٹھٹھرتے ہوئے تارے آج نظر نہیں آ رہے تھے۔ مطلع صاف نہیں تھا۔ یہ اندھیرا اس کے لئے اچھا تھا۔ کھڑکی پر ایک سایہ سا لہرایا اور پھر واس کی مدھم آواز آئی۔

''ٹھیک ہے، آجاؤ۔'' اس نے یہ فقرہ انگریزی میں کہا تھا۔

مالینا نے ایک نگاہ اپنی سوئی پڑی نگران پر ڈالی اور شال لپیٹ کر باہر نکل آئی۔ رات اپنے نصف کے قریب پہنچ چکی تھی۔ گلیاں سنسنان تھیں اور برفانی ہوا نے جیسے ہر شے کو منجمد کر رکھا تھا۔ ''روستم کہاں ہے؟'' مالینا نے واس کے عقب میں چلتے چلتے سرگوشی میں کہا۔ وہ واس سے انگریزی میں بات کرتی تھی۔

''وہ میرے گھر میں ہی ہے اور تمہاری کامیابی کا ہم سب بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔'' واس نے ذرا توقف کیا پھر مالینا کی طرف جھکتے ہوئے مزید مدھم آواز میں بولا۔ ''رستم نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے اور یہ بات تمہارے ایک اہم سوال کا جواب بھی ہے۔''

''کون سا سوال؟''

''یہی کہ اگر فرض محال وہ سب کچھ نہ ہوا، جس کی ہم توقع کر رہے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ یعنی اگر فرض محال شوتم خان تمہاری طرف متوجہ نہ ہوا اور اپنے برہمچار پر قائم رہا۔''

''روستم نے کیا کہا ہے؟''

''رستم نے کہا ہے کہ اس صورت میں تم ایک بڑے معقول بہانے کی آڑ لے سکتی ہو۔ وہی بہانہ جو تم نے کچھ عرصہ پہلے جھیل پر سے پکڑے جانے کے بعد بنایا تھا...... تم نیند میں چلنے کا عذر کر سکتی ہو۔ ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ تم رات کے وقت نیند میں چلتی اگیارے تک پہنچیں۔ کسی اتفاق کے تحت اگیارے کا بیرونی دروازہ کھلا رہ گیا تھا، تم اندر چلی گئیں۔''

''زبردست...... یہ اچھی تجویز ہے اور اس پر عمل ہو سکتا ہے۔'' مالینا نے کہا۔ پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''روستم ایک باتدبیر شخص ہے اور اعتماد سے بھرا ہوا بھی۔ اگر وہ مجھے ...'' مالینا کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ رستم نے واس وغیرہ کو اصل حقیقت بتا رکھی ہے یا نہیں۔ بستی میں تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ مالینا سائی خان کے زمین دوز ٹھکانے سے ازخود نکلی ہے اور شوتم خان تک پہنچی تھی۔

''تم کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو؟'' واس نے سرگوشی کی۔

''کچھ نہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ روستم اور اس کے دوست بلند ہمت ہیں۔ اگر انہیں

سازگار حالات مل گئے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر گزریں گے۔ خاص طور سے روستم کی شخصیت میں الگ بات ہے۔ ہم اس سے اچھی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔"

دو تین بالکل سنسان اور تاریک گلیوں سے گزر کر وہ اگیارے کے سامنے پہنچ گئے......

یہاں دو تین جھنڈے لہرا رہے تھے۔ چار دیواری کے اندر مخروطی جھونپڑوں کی ساخت پگوڈوں سے ملتی جلتی تھی لیکن یہ پگوڈے نہیں تھے۔ سامنے ہی آبوک کی لکڑی کا وہ قدیم دروازہ تھا جسے کھول کر مالینا کو اندر جانا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ سخت سردی کے باوجود اسے اپنی ہتھیلیاں نم محسوس ہوئیں۔

"ساری باتیں تمہیں یاد ہیں ناں؟" واس نے انگریزی میں پوچھا۔ مالینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ واس بولا۔ "یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ اب تم جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ اوپر والا تمہاری مدد کرے گا۔"

واس چند قدم پیچھے ہٹ کر تاریکی میں رُوپوش ہو گیا۔ مالینا کچھ دیر تک گلی کے وسط میں تیز برفانی ہوا کے سامنے بے حرکت کھڑی رہی۔ پھر اس نے مستحکم انداز میں قدم بڑھائے اور اپنا ہاتھ لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے پر رکھ دیا۔ اس نے دباؤ ڈالا تو ایک مہین آواز کے ساتھ دروازے کا پٹ وا گیا۔ مالینا اندر داخل ہوئی اور اپنے عقب میں دروازہ بھیڑ دیا۔ اندر پگوڈا نما جھونپڑوں میں سے ایک جھونپڑے کے اندر اسے لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ یہ گول جھونپڑا دیگر دو چھوٹے جھونپڑوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس میں سے ہلکا دھواں بھی اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ غالباً انگیٹھی وغیرہ دہک رہی تھی۔ مالینا برف کی پتلی تہہ پر قدم رکھتی ہوئی اسی بڑے جھونپڑے کی طرف بڑھی۔ اس کے ٹخنوں میں بندھی ہوئی چاندی کی پائلوں نے مدھم آواز پیدا کی۔ جھونپڑی کا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ مالینا نے دل کڑا کر کے دروازے کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ اندر لالٹین کی روشنی میں حرکت پیدا ہوئی۔ اندر جو کوئی بھی تھا وہ جاگ رہا تھا۔ مالینا الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر چھوٹے جھونپڑے کی اوٹ میں ہو گئی۔

چند سیکنڈ بعد بڑے جھونپڑے کا دروازہ کھلا۔ مالینا نے جھرجھری لے کر دیکھا۔ وہ شوتم خان تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور لالٹین کی سرخ روشنی شوتم کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور گھنی بھنوؤں پر منعکس ہو رہی تھی۔

اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً پوچھا تھا کہ کون ہے۔

مالینا نے جھونپڑے کی اوٹ سے اسے اپنی جھلک دکھائی۔ اوڑھنی اس نے سر پر سے ڈھلکا دی تھی۔ اس کے ماتھے پر اور سرخ و سپید کانوں میں چاندی کا زیور دمک رہا تھا۔ شوتم

خان نے اسے دیکھا اور ہکا بکا ہو کر جلدی سے باہر آ گیا۔ اس نے عجیب حیرت آمیز آواز میں پچھ کہا بھی تھا۔ مالینا اسے جھلک دکھا کر دوسرے جھونپڑے کی اوٹ میں چلی گئی۔ نیم تاریکی میں اس کی پائل اور چوڑیاں چھن چھن بج اٹھی تھیں۔ لمبا تڑنگا شوتم خان لڑکھڑاتا ہوا پہلے جھونپڑے کے عقب میں پہنچا تو مالینا دوسرے جھونپڑے کی اوٹ میں تھی۔ اس نے دوبارہ جھلک دکھائی۔

شوتم خان نے ایک بار پھر بھاری بھرکم آواز میں کچھ کہا اور تیزی سے مالینا کی طرف آیا۔ مالینا جھونپڑے میں گھسی اور اس کے دوسرے دروازے میں سے نکل کر سب سے بڑے جھونپڑے کی طرف آ گئی۔ چند سیکنڈ تک شوتم سے مزید آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد مالینا بڑے جھونپڑے کے اندر داخل ہو گئی۔ یہاں فرش پر دبیز غالیچے تھے جن کو مزید آرام دہ بنانے کے لئے ان پر جانوروں کی کھالیں بچھائی گئی تھیں۔ یہاں خوش گوار حرارت محسوس ہوئی کیونکہ انگیٹھی میں آگ موجود تھی۔ ایک طرف عبادت کے لئے چبوترا سا نظر آیا۔ یہاں ایک سفید تختے پر مقدس درخت آبوک کی شبیہ بنی ہوئی تھی اور آبوک کے پھولوں سے ہار پرو کر جھونپڑے کی چھت سے لٹکائے گئے تھے۔ یہاں مالینا کو اس جادوئی پودے سپ گندل کی خوشبو بھی محسوس ہوئی جس کی کشش سینکڑوں لوگوں کو اور خود مالینا کو کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ وہ اس پودے پر ہونے والے تجربات کے سلسلے میں ہی تو لندن سے پاکستان اور پھر ان دور دراز پہاڑوں میں پہنچی تھی۔

یہ سارے خیالات شاید دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں مالینا کے دماغ سے گزر گئے۔ ایک لالٹین جھونپڑے کے اندر بھی جھول رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر رعنائی اور اپنی خوب صورتی کے بخشے ہوئے سارے اعتماد کے ساتھ اس لالٹین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دلکش نظر آ رہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ہانپتے ہوئے شوتم کو اپنے رُوبرو پایا۔ وہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آخری حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ بکھری ہوئی خودرو داڑھی کے اندر ہونٹ لرز رہے تھے۔

"تم..... یہاں..... کیسے؟" وہ بے پناہ حیرت سے بولا۔

پچھلے چند ماہ میں مقامی زبان کے گنے چنے الفاظ مالینا کی سمجھ میں آنے لگے تھے۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ زبان پشتو، ہندستانی، کشمیری وغیرہ کا مرکب ہے۔

وہ مسکرائی اور مسکراتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ شوتم کی حالت دیکھ کر اس کے اندر اعتماد پیدا ہو رہا ہے۔ اس نے جواب میں جو الفاظ کہنے تھے، وہ اس نے پہلے ہی چن لئے تھے

وہ بولی۔ ''میں بے خبر...... نیند میں چل کر... یہاں ہوں۔''

جواب میں شوتم خان نے بہت کچھ کہا لیکن مالینا کی سمجھ میں بس ایک دو لفظ ہی آئے۔ شوتم کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنی نگاہ مالینا کے سراپے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بتدریج ایک اذیت میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ مالینا ساکت کھڑی رہی۔ اب وہ اوڑھنی سے بے نیاز تھی۔ انگیٹھی کی سرخ روشنی مالینا کی گردن اور اس کے چہرے کو جگمگاتی رہی۔

شوتم نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔ وہ غصے میں نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے بس چند ایک بے ربط الفاظ ہی مالینا کی سمجھ میں آ سکے۔ ''تم شرم...... مقدس...... گناہ۔''

کچھ دیر بعد شوتم خان نے مالینا کو انگلی سے اشارے کرنے شروع کئے۔ وہ اسے باہر نکل جانے کا حکم دے رہا تھا۔

یہ صورتِ حال اس صورتِ حال سے بالکل مختلف تھی جس کی مالینا توقع کر رہی تھی۔ شوتم تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ضرور نظر آیا تھا لیکن اب وہ ایک دم سنبھلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ کیا واس کے لگائے ہوئے اندازے غلط تھے؟ کیا شوتم اتنا کمزور نہیں تھا جتنا واس نے سمجھا تھا؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اب کیا ہوگا؟ کیا وہ اسے یہاں سے نکال باہر کرے گا یا پھر اپنے محافظوں کے حوالے کر دے گا...... کہیں وہ اس کے ساتھ مار پیٹ ہی شروع نہ کر دے۔ کچھ بھی تھا آخر وہ یہاں کا سردار تھا۔ ایک ہی سیکنڈ میں یہ سارے خیالات مالینا کے ذہن سے گزر گئے۔

اچانک وہ بُری طرح چونک گئی۔ جس جگہ وہ گداز غالیچے پر کھڑی تھی وہاں سے فقط تین قدم کی دوری پر ایک سرخ غالیچے میں حرکت پیدا ہوئی۔ یہ غالیچہ تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ پانچ چھ انچ کے خلا میں سے مالینا کو ایک جوان بلتستانی لڑکی کی آنکھیں دکھائی دیں۔ پھر ایک دم خلا بند ہو گیا اور غالیچہ فرش پر برابر ہو گیا۔

مالینا سکتے کی سی حالت میں کھڑی رہ گئی۔ شوتم تڑپ کر آگے بڑھا۔ اس نے حرکت کرنے والے غالیچے کو ٹھیک سے کھینچ کر اس کی جگہ پر بٹھایا۔ مالینا سناٹے میں تھی...... درحقیقت یہاں فرش میں ایک راستہ تھا جس پر لکڑی کا چوکور ڈھکنا تھا۔ غالیچہ اس چوکور ڈھکنے پر بچھا ہوا تھا اور یہاں ایک لڑکی تھی۔

غالیچہ برابر کرنے کے بعد شوتم لپک کر دروازے کی طرف گیا اور اس سے پہلے کہ مالینا

بھاگ کر دروازے تک پہنچتی شوتم نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی اور مالینا کو بازو سے پکڑ کر واپس اونی گدیلوں میں پھینک دیا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں اشتعال تھا لیکن اس اشتعال کا تعلق ''جنس'' سے نظر نہیں آتا تھا۔ مالینا خود ماہر جنسیات تھی۔ اس سے بہتر ایسا تجزیہ اور کون کر سکتا تھا۔ پھر ایک دم مالینا کی آنکھوں کے سامنے جھماکا سا ہوا۔ اس نے دیکھا شوتم نے لپک کر ایک طرف پڑی کلہاڑی اٹھا لی ہے۔ چھوٹے دستے کی اس کلہاڑی کا پھل لالٹینوں کی روشنی میں خوفناک چمک دے رہا تھا۔

''خدا کے لئے...... نہیں۔'' وہ بے ساختہ چلائی۔

پھر اس کے ذہن میں آیا کہ یہاں منت سماجت سے کام چلنے والا نہیں۔ وہ شوتم کے ایک اہم ترین راز سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اب شوتم اسے زندہ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ وہ یہی چاہے گا کہ اسے جھونپڑے کے اندر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے۔ بعدازاں وہ اس پر کوئی بھی الزام عائد کر سکتا تھا۔ وہ مارگہ نامی اس پاؤندہ بستی کا قابلِ احترام سردار تھا۔ اس کی کسی بھی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جا سکتا تھا۔

اپنی زندگی بچانے کی فطری خواہش کے تحت مالینا کے جسم میں برق سی کوند گئی۔ دوسری طرف شوتم بے پناہ وحشت کے ساتھ مالینا پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کلہاڑی کا وار کیا۔ یہ وار یقیناً مالینا کو قتل کرنے کے لئے تھا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ نہ چھوڑتی تو اس کا سر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔

وار بے حد درندگی سے کیا گیا تھا۔ لہٰذا جب وار خالی گیا تو شوتم اپنے زور میں لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ مالینا تڑپ کر دروازے تک پہنچی اور کنڈی گرا کر باہر نکل آئی۔ وہ جانتی تھی کہ شوتم خان طوفان کی طرح اس کے پیچھے ہے۔ وہ پورے زور سے چلائی۔

''بچاؤ...... خدا کے لئے بچاؤ۔''

آبوک کی لکڑی کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو سائے اندر داخل ہوئے۔ یہ وہ تھے جنہیں واس نے پروگرام کے تحت بطور گواہ اگیارے کے قریب موجود رکھا ہوا تھا۔ واس ان کے پیچھے تھا۔ مگر اندر کی صورتِ حال کا واس کو پتا نہ تھا اور نہ باقی گواہوں کو۔ واس تو یقیناً یہ سمجھتا ہوگا کہ شوتم خان نیم برہنہ حالت میں یا برہنہ مالینا سے گتھم گتھا ہوگا اور جب وہ مالینا کی پکار پر بھاگتے ہوئے اندر پہنچیں گے تو وہ سکتہ زدہ کھڑا رہ جائے گا مگر یہاں تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔ شوتم خان غضب ناک حالت میں مالینا کے پیچھے تھا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ دہاڑ رہا تھا۔ ایک سایہ شوتم کے کندھے سے ٹکرانے کے بعد دور جا گرا۔ دوسرا خود ہی ڈر

کر ایک طرف ہو گیا۔ شوتم کلہاڑی سونت کر مالینا کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ اس کے قدموں کی مہلک آواز مالینا اپنے پیچھے صرف پندرہ بیس فٹ کی دوری پر سن رہی تھی اور یہ فاصلہ مزید کم ہو رہا تھا۔ مالینا جانتی تھی کہ کسی لمحے بھی کلہاڑی کا تیز دھار فولادی پھل اس کے سر سے ٹکرا سکتا ہے۔ وہ نیچی چھت والے تاریک گھروں کے درمیان یخ بستہ گلی میں بھاگ رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بالآخر اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ کہاں جائے..... کس طرف جائے؟ اس نے دھندلائے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ''روستم'' کا چہرہ ابھرا۔ فراخ پیشانی پر جھومتے ہوئے بال ... بڑی بڑی آنکھیں جن میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اسے زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا ..... مصیبت میں جن پر خواہ مخواہ بھروسا کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اور وہ ''روستم'' آج کل مترجم واس کے گھر میں تھا۔ مالینا وہاں اس سے مل چکی تھی۔ بھاگتے بھاگتے مالینا کے قدم بے ساختہ واس کے گھر کی طرف مڑ گئے۔

☆======☆======☆

رستم واس کے گھر میں انگیٹھی کے قریب بیٹھا تھا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا مگر وہ جاگ رہا تھا۔ واس کی بیوی بھی جاگ رہی تھی۔ یہ سونے کی نہیں جاگنے کی رات تھی۔ آج اس پاؤندہ بستی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ واس کی بیوی نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے بیٹا! سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا تم نے سوچا ہے؟''

''امید تو یہی ہے۔'' رستم نے سر ہلایا۔

''تم دونوں کے علاوہ اور کسی کو اس معاملے کو پتا ہے؟''

''کسی کو بھی نہیں۔'' رستم نے جواب دیا۔

''اور وہ دو تین گواہ جو اگیارے میں جائیں گے؟''

''واس نے ان کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ بس انہیں کسی بہانے سے اگیارے کے قریب لے گیا ہے۔''

''لیکن اگر .....'' ابھی واس کی بیوی نے اتنا ہی کہا تھا کہ دور سے ایک چلاتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

''اوہ خدا! یہ کیا ہے؟'' واس کی بیوی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

رستم تیزی سے اٹھا اور اپنی وزنی بیڑی گھسیٹتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اسے دور گلی میں ایک سایہ نظر آیا۔ وہ اندھا دھند بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور لمبا تڑنگا سایہ

تھا۔

''بچاؤ.... بچاؤ۔'' ایک تیز آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی آئی۔ یقیناً یہ مالینا تھی۔ اس نے ''بچاؤ بچاؤ'' کے الفاظ انگریزی میں ادا کیے تھے۔

''مجھے کلہاڑی دو۔'' رستم نے ہیجانی لہجے میں واس کی بیوی سے کہا۔

اس نے لپک کر کلہاڑی رستم کی طرف بڑھائی۔ رستم کلہاڑی تھام کر باہر گلی میں نکلا۔ اس وقت تک مالینا بھاگتی ہوئی رستم تک پہنچ چکی تھی۔ رستم بس اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ وہ سر اور پاؤں سے ننگی ہے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے آویزے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً مالینا نے بھی رستم کو پہچان لیا تھا۔ وہ تیر کی طرح سیدھی آئی اور پھر رستم کی اوٹ میں ہو گئی۔ مالینا کے پیچھے جو سایہ دہاڑتا ہوا آ رہا تھا وہ شوتم خان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کلہاڑی اس نے سر سے بلند کر رکھی تھی، اس کا انداز بے حد خطرناک تھا۔

''رکو۔'' رستم چلا کر شوتم کے رستے میں آیا۔

شوتم کا زوردار دھکا لگنے کے بعد رستم لڑکھڑایا ضرور لیکن گرا نہیں۔ شوتم بھی ذرا سا لڑکھڑایا اور پھر سنبھل گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ان لمحوں میں اسے مالینا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ وہ کلہاڑی سونت کر دوبارہ مالینا پر جھپٹا تو رستم پھر اس کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ رستم نے شوتم خان کو اپنے کندھے کی زوردار ضرب سے پیچھے ہٹایا۔ شوتم خان نے بھی زخمی درندے کی طرح پھنکار کر رستم پر حملہ کیا۔ رستم نے کلہاڑی کا وار کلہاڑی پر روکا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا تو فضا میں چنگاریاں سی چھوٹیں۔

اس دوران میں کئی اور سائے بھی موقع پر پہنچ گئے لیکن ابھی شوتم خان کے سامنے آنے اور اس کا ہاتھ روکنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ شوتم نے کسی مشتعل ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے رستم پر کلہاڑی کے کئی وار کیے۔ یہ سارے وار رستم نے جیسے تیسے اپنی کلہاڑی پر لیے اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے پیچھے ہٹتا گیا۔ اسے صورتِ حال کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی اسے یہ پتا تھا کہ اسے شوتم خان پر جوابی وار کرنا چاہیے یا نہیں۔ ان لمحوں میں اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ مالینا، شوتم کی وحشیانہ یلغار سے بچ جائے اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مالینا اب اس کے عقب میں نہیں۔

شوتم کے سارے غیظ و غضب کا نشانہ اب رستم تھا اور وہ بڑی دلیری و کامیابی سے اس کے غیظ و غضب کو جھیل رہا تھا۔ اسی دوران میں واس نے عقب سے سردار شوتم کو سنبھالنے کی

کوشش کی۔ پہلی کوشش میں تو وہ دور جا گرا تاہم دوسری کوشش میں چند اور افراد اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے بڑی بے باکی سے شوتم خان کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان ہی نو وارد افراد میں سے کچھ لوگ رستم کے دفاع کے لئے اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اردگرد کے دروازے دھڑا دھڑ کھل گئے تھے اور درجنوں لالٹینیں اور لیمپ گردش کرنے لگے تھے۔

شوتم کی ہیجانی آواز گونج رہی تھی۔ وہ مقامی زبان میں چنگھاڑ رہا تھا۔ ''پکڑو اسے ..... کہاں گئی ..... پکڑو ..... جان سے مار دو۔''

شوتم کو سنبھالنے کی کوشش میں واس کی ایک کلائی زخمی ہو گئی تھی اور وہاں سے خون ٹپک ٹپک کر گلی کی برف میں گلکاریاں کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چند مشعل بردار گھڑ سوار بھی موقع پر پہنچ گئے۔ یہ سب مقامی ہی تھے۔ ان میں سے ایک فرد کو دیکھ کر رستم چونکا۔ یہ چوڑے شانوں والا ایک دراز قد شخص تھا۔ گھوڑے پر بیٹھا، وہ سب سے اونچا لگ رہا تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے سے کٹا ہوا تھا اور خالی آستین ہوا میں جھول رہی تھی۔ وہ موقع پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر بڑے طیش کے عالم میں کچھ کہہ رہا تھا۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ یہی شخص سامی خان کا سسر برق جان ہے۔

چارسُو ایک طوفان سا برپا ہو گیا تھا۔ ہر شخص چلا رہا تھا، منہ سے جھاگ اُڑا رہا تھا۔ سب سے بلند دھاڑ برق جان کی تھی اور شاید اس سے بھی بلند شوتم خان کی۔ اس کا شور ''چوری اور سینہ زوری'' کے مصداق تھا۔ کچھ ہی دیر میں برق جان کے مزید ساتھی آ گئے اور اس کے ساتھ ہی شوتم خان کے کم و بیش دو درجن محافظ موقع پر پہنچ گئے۔ ہر طرف کلہاڑیاں اور رائفلیں، لالٹینوں کی روشنی میں چمکنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے صورتِ حال نہایت سنگین ہو گئی تھی۔

بیس تیس سیکنڈ گزرے تھے کہ دو پگڑی پوش افراد تیزی سے گھوڑے دوڑاتے موقع پر پہنچے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ اس نے قریب آتے ہی بڑے طیش سے شوتم خان کی طرف اشارہ کیا اور بلند آواز میں کچھ کہا۔

اس کے بولنے کی دیر تھی کہ ایک دم جیسے کسی نے بھڑکتے شعلوں پر تیل پھینک دیا...... دو گھڑ سوار کلہاڑیاں سونت کر تیر کی طرح کلاشنکوف بردار کی طرف لپکے لیکن ابھی وہ راستے میں تھے کہ ایک چھوٹی سی کلہاڑی تیرتی ہوئی آئی اور ایک حملہ آور کی گردن میں لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بارہ بور کی رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور دوسرے حملہ آور کا گھوڑا لڑکھڑا کر اوندھے منہ برف پر گرا۔ ایک دم ہی درجنوں افراد للکارے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑے ..... دھماکوں سے رات کا سناٹا چکنا چور ہونے لگا۔ دائیں طرف سے ..... واس کی پکارتی

ہوئی آواز ابھری۔ ''رستم، میری طرف آؤ۔''

رستم کے قدموں میں لوہا تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ وہ جھک کر حتیٰ الامکان تیزی سے چلتا ہوا واس کی طرف گیا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ گلی کے موڑ پر پہنچتے پہنچتے رستم اور واس کو اوندھے منہ برف پر گرنا پڑا ورنہ عین ممکن تھا کہ کوئی اندھی گولی انہیں چاٹ جاتی۔ وہ تقریباً فوجی انداز میں کرالنگ کرتے ہوئے ہنگامے کی مخالف سمت میں بڑھے۔ ایک خنجر بردار پاوندہ للکارتا ہوا واس کی طرف بڑھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ واس کو پہچان کر اس کی طرف لپکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ برف پر اوندھے پڑے واس کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا، رستم نے لیٹے لیٹے اس کی ٹانگ پر کلہاڑی چلائی۔ اس کا گوشت کٹنے اور ہڈی ٹوٹنے کی واضح آواز سنائی دی۔ وہ کرب سے چیخ کر پہلو کے بل گرا۔ رستم نے لیٹے لیٹے اس پر جست کی اور بے دریغ اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس بپھرے ہوئے حملہ آور کو ایک موقع بھی مل گیا تو وہ اپنا ایک فٹ لمبا خنجر واس کے دبلے پتلے جسم میں اُتار دے گا۔ گردن پر کاری ضرب کھانے کے بعد حملہ آور بے سدھ ہو گیا۔

''رستم جلدی کرو۔'' واس نے رستم کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''کدھر جانا ہے؟''

''بس میرے پیچھے آؤ۔''

دونوں ایک برفیلی ڈھلوان پر تقریباً لڑھکتے ہوئے پندرہ بیس میٹر نیچے چلے گئے پھر واس بھاگ کر ایک تنگ گلی میں داخل ہوا اور ایک مکان میں گھس گیا۔ رستم بھی اس کے پیچھے تھا۔ مکان میں دو حیران پریشان عورتیں موجود تھیں۔ چند سیکنڈ بعد رستم کو ایک تیسری عورت نظر آئی ..... یہ مالینا تھی۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ شال تھی اور وہ سہمی ہوئی ایک تاریک گوشے میں سمٹی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نا مالینا؟'' رستم نے اسے سرتاپا دیکھا۔

''یس...... ہام ٹھیک اور تُم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں...... لیکن واس کو زخم آیا ہے۔''

رستم کے بتانے سے پہلے ہی دونوں مقامی عورتیں واس کی زخمی کلائی کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ اسے کلہاڑی کا گہرا کٹ لگا تھا۔ ایک عورت نے واس کا خون روکنے کے لئے اس کے زخم پر انگیٹھی کی ٹھنڈی راکھ لگائی اور اپنی اوڑھنی کی پٹی پھاڑ کر باندھ دی۔ باہر

قیامت کا شور تھا۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی اور للکارے گونج رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے واس؟" رستم نے پوچھا۔ خون آلود کلہاڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

"وہی ہو رہا تھا جو ہونا تھا۔ شوتم کے حمایتی اور مخالف آپس میں بھڑ گئے ہیں۔ یہ لاوا کئی دنوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، آج پھٹ پڑا ہے۔ اب یہاں وہ سب کچھ ہوگا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت خون بہے گا۔ یہ قبائلی لڑائیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"لڑ کون کون رہا ہے؟"

"یہ صاف طور پر دو دھڑے بن گئے ہیں۔ کچھ لوگ شوتم اور اس کے بڑے بیٹے ارفا خان کے حامی ہیں۔ کچھ سامی خان اور اس کے سسرالیوں کی حمایت میں نکل آئے ہیں۔"

دھماکوں سے در و دیوار لرز رہے تھے۔ گاہے بگاہے خودکار رائفلوں کے طویل برسٹ بھی چلتے تھے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور چلاتی ہوئی انسانی آوازیں اس شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ چند بدکے ہوئے کتے اندھا دھند بھاگتے اور شور مچاتے مکان کے دروازے کے عین سامنے سے گزرے۔

ایک عورت اندر سے ایک ریوالور اور ایک آٹھ ایم ایم رائفل لے آئی۔ واس نے ریوالور خود رکھ لیا اور رائفل رستم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لوڈ ہے۔ امید ہے ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی لیکن احتیاطاً کچھ نہ کچھ ہمارے پاس ہونا چاہیے۔"

یوں محسوس ہوتا تھا کہ لڑائی کا دائرہ پھیلتا ہوا کھوہ کے دہانے تک پہنچ گیا ہے۔ رستم کو اپنے ساتھیوں ڈاکٹر ناصر اور شریف کی فکر ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں کھوہ میں تھے اور اس کی طرح ہی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

واس نے جیسے رستم کے تاثرات سے اس کے دل کا حال پڑھ لیا۔ وہ کہنے لگا۔ "ناصر اور شریف کے لئے پریشان ہو؟"

"کیوں؟ پریشان نہیں ہونا چاہیے؟" رستم نے پوچھا۔

"افسوس ..... میں اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔" واس نے سرد آہ بھری۔ "بس اس موقع پر ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اگر شوتم خان کے حمایتیوں کا پلڑا بھاری ہو گیا تو ناصر اور شریف وغیرہ پر مصیبت آ سکتی ہے۔ بے شک تم نے شوتم خان پر حملہ نہیں کیا لیکن اس کا ہاتھ تو روکا ہے اور اس قبیلے کے قانون کی منحوس کتاب میں یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔"

"اور واس! تمہاری بیوی؟" رستم نے پوچھا۔

"اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہماری طرح محفوظ جگہ پر ہے۔" واس نے کہا۔

ایک دم مالینا اپنی جگہ سے اٹھی اور رستم کا بازو تھام کر گلوگیر آواز میں بولی۔ "تھینک یو رستم۔"

یقیناً اس کا "تھینک یو" ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کے حوالے سے تھا۔ رستم آہنی بیڑی میں ہونے کے باوجود شوتم اور مالینا کے درمیان دیوار بنا تھا۔

رستم نے مالینا کا شانہ تھپکا۔ "تھینک یو کس بات کا؟ تم نے جو کچھ کیا ہم سب کے لئے تھا اور ہم بھی جو کچھ کر رہے ہیں سب کے لئے ہے۔"

واس نے رستم کے اس فقرے کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مالینا کو سنایا۔ وہ تشکر کے انداز میں نفی میں سر ہلانے لگی اور ایک پُرخلوص دوست کی طرح رستم کا بازو سہلاتی ہوئی چلی گئی۔

فائرنگ کی شدت نہ صرف برقرار تھی بلکہ اس کا دائرہ بھی پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہوا میں بارود کی بُو صاف سونگھی جا سکتی تھی۔ دونوں مقامی عورتیں گھٹنوں کے بل مقدس آبوک کی ایک مستطیل لکڑی کے سامنے عبادت کے انداز میں کھڑی تھیں اور آنکھیں بند کر کے مسلسل بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ یہاں بھی رستم کو نایاب پودے سپ گندل کی بُو باس محسوس ہوئی۔ اسے چند دن پہلے معلوم ہوا تھا کہ اس برف زار میں سپ گندل کو کسی بھی طرح استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ بلکہ سپ گندل سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانے کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اس کا صرف ایک استعمال تھا اور وہ یہ کہ پوجا پاٹ کے وقت سپ گندل کے خشک پتوں سے بنائے گئے سفوف کو تانبے کے ایک تھال میں رکھ کر اپنے قریب رکھا جاتا تھا۔ یہ تھال ایک عام پلیٹ کے سائز سے لے کر چار پانچ فٹ کے قطر تک ہو سکتا تھا۔ بعض اوقات اس تھال کے اندر موم بتی روشن کی جاتی تھی۔

اچانک گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ رستم سمیت سب اچھل پڑے۔ رستم نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور واس کے ساتھ ایک عقبی کمرے میں چلا گیا۔ مالینا بھی ان کے پیچھے اس تاریک کمرے میں پہنچ گئی۔ رستم ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ اگر بیرونی دروازے پر کسی طرح کی گڑبڑ ہو تو اسے نظر آ سکے۔

رستم کی خون آلود کلہاڑی ابھی تک بیرونی دروازے کی دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔ بڑی عمر کی عورت نے اس کلہاڑی کو ایک چٹائی کے نیچے چھپایا اور بیرونی دروازے کے قریب پہنچ

گئی۔ دروازے کے دوسری طرف سے جو آواز آئی اسے سن کر عورت کا خوف ایک دم کم ہوگیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے واس کی طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ جواں سال زری جلدی سے اندر آ گئی۔ وہ اپنے موٹے اونی لبادے میں تھی۔ پاؤں میں صرف ایک چرمی جوتا تھا، سر حسبِ معمول ننگا تھا۔ وہ ہانپی ہوئی تھی اور برف کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ مقامی عورت نے دروازہ پھر بند کر دیا۔

''خیریت سے ہو ناں؟'' واس نے اسے ٹٹول کر پوچھا۔

''باہر بہت خون نکل رہا ہے...... لوگ مر رہے ہیں۔ میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔'' زری نے بھی اردو میں جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''لڑائی کس طرف ہو رہی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''کھوہ کی طرف...... بہت لڑائی...... بہت گولی اور آگ بھی...... چھوٹے ملک کو بھی گولی لگتا۔ یہاں بانگو (بازو) ہیں۔''

''ارفا خان کو؟'' واس نے تصدیق چاہی۔

زری نے خوف زدہ چہرہ اثبات میں ہلایا۔ اس کے لمبے ریشمی بال پھسل کر رخساروں پر آ گئے۔ وہ بولی۔ ''چھوٹا ملک گر گیا۔ پھر اس کا ساتھی پیچھے ہٹ گیا...... برق چاچا نے بہت گولی چلایا...... میں بھی مشکل سے بچا۔''

پھر وہ سیدھی رستم کی طرف آئی۔ ''تم ٹھیک ہے ناں؟ تم کو کچھ نہیں ہوا؟''

''ہاں اسے کچھ نہیں ہوا۔ تم وہاں جا کر بیٹھو۔'' واس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

زری کو یہ حکم ناگوار گزرا۔ تاہم ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ رستم کو عجیب نظروں سے دیکھتی اور الٹے قدموں چلتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

رستم نے واس سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ اس لڑائی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ لڑائی کھوہ کی طرف بلکہ اس سے آگے چلی گئی ہے۔ شاید برق جان اور اس کے ساتھیوں کا پلڑا بھاری ہے۔''

''لڑائی ایک دم شروع کیسے ہوگئی؟ وہ کلاشنکوف والا بندہ بھاگتا ہوا آیا تھا، کیا اس نے کچھ کہا تھا؟''

''اس کا نام دادا خان ہے۔ وہ ان گواہوں میں سے ہے جن کو میں نے اگیارے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ جب شوتم خان کلہاڑی لے کر مالینا کے پیچھے بھاگ گیا تو دادا خان اور اس

کا ایک ساتھی اگیارے میں چلے گئے۔ انہوں نے بڑے جھونپڑے میں کچھ ایسی چیزیں دیکھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ کوئی عورت یہاں شوتم کے ساتھ موجود رہی ہے۔''

''کیسی چیزیں؟'' رستم نے پوچھا۔

واس آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک جوان عورت کے کپڑے، اس کے جھمکے اور پھولوں کے گجرے وغیرہ...... یہ سب کچھ ناقابلِ یقین ہے۔''

بات ختم کر کے واس اور رستم سوالیہ نظروں سے مالینا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ فائرنگ اور للکاروں کی آوازیں بھی اب کافی دور مشرق کی طرف چلی گئی تھیں۔ گاہے بگاہے فائرنگ میں وقفہ بھی آ رہا تھا۔ مالینا نے جھرجھری لے کر کہنا شروع کیا۔ ''ہاں...... ہام نے سب کچھ دیکھا...... آنکھوں سے دیکھا...... ویئر واز اے گرل...... ایک لڑکی...... شی واز ان اے بیسمنٹ...... یس...... وہاں ایک بیسمنٹ۔''

''اوہ خدایا۔'' واس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''ان باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے۔''

مالینا نے لرزاں آواز میں بات جاری رکھی۔ ''ہام نے لڑکی کو بائی چانس دیکھا۔ اس نے بیسمنٹ کا ڈور اوپر اٹھایا...... پھر کلوز کیا۔ شوتم ایک دم بہت اینگری ہوا۔ اس نے ہام پر اٹیک کیا۔ آئی رین...... ہام اپنا لائف کے لئے بھاگا......''

مالینا کے بیان سے صورتِ حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ شوتم خان کی زندگی کا ایک بالکل نیا اور غیر متوقع رخ سامنے آیا تھا۔ مالینا وہاں جس کام سے گئی تھی وہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کے جانے سے جو انکشافات ہوئے تھے وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھے۔ ان انکشافات نے وہی نتیجے برآمد کئے تھے جن کی رستم اور واس وغیرہ کو ضرورت تھی۔

رستم نے واس سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھا جن کے گھر میں انہوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ واس نے بتایا۔ ''یہ دونوں سگی بہنیں بیوہ ہیں۔ ان کے شوہر کچھ عرصہ پہلے شاہ گوری کے دامن میں ہلاک ہو گئے تھے۔''

''شاہ گوری! یہ کیا ہے؟''

''تمہیں نہیں پتا؟ شاہ گوری 'کے ٹو' ہی کا دوسرا نام ہے۔''

''اچھا...... تو ان کے شوہر کیسے ہلاک ہوئے؟''

''بس وہی یہاں کی کہنہ رسمیں اور...... شوتم خان کی ہٹ دھرمی۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ تمہارے مطلب کی نہیں۔ بہرحال یہ دونوں بیبیاں ہر طرح سے قابلِ اعتماد ہیں۔''

پھر واس نے ان میں سے بڑی عمر کی عورت کو خانی کہہ کر آواز دی اور مقامی زبان میں

جو بستانی کی ہی ایک قسم تھی، عورت سے کچھ کہا۔

وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے سنتی رہی اور اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

قرب و جوار میں فائرنگ کی آواز اب قریباً تھم گئی تھی لیکن پُرجوش لوگوں کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔ گاہے بگاہے گلیوں میں گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں آتی تھیں۔ گھوڑوں کے سم برف پر عجیب طرح کی آواز پیدا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عورت باہر جانے کے لئے تیار ہوگئی جس سے واس نے بات کی تھی۔

''کیا اسے تم کہیں بھیج رہے ہو؟'' رستم نے واس سے دریافت کیا۔

''ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ باہر کی خبر لائے۔''

عورت دروازہ کھول کر باہر کی تاریک سردی میں روپوش ہوگئی۔ زری انگیٹھی کے بالکل پاس آرام سے بیٹھی تھی۔ اب اس کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی تھی۔ انگیٹھی کی سرخ روشنی اس کے چہرے کو کسی خوب صورت پینٹنگ کی طرح دکھا رہی تھی۔ وہ اردگرد سے بالکل بے خبر بڑی ستائشی نظروں سے رستم کو تک رہی تھی۔ اسے چچا واس کا ڈر نہ ہوتا تو شاید بے تکلفی سے رستم کے پہلو سے لگ کر بیٹھ جاتی اور اس کا کان کھینچ کر کھلکھلانے لگتی۔

''اپنے بال کلپ میں باندھو۔'' واس نے اسے ہلکی سی سرزنش کی۔

جواب میں وہ زور سے ہنسی اور اپنے بال سنبھالنے کے بجائے انہیں کچھ اور بھی بکھیر دیا۔ اس کے لمبے بال جنگلی حیات ہی کی طرح خودرَو اور سرکش تھے۔ تاہم اس سرکشی میں بڑی معصومانہ سی پاکیزگی بھی تھی۔

واس نے بے بسی سے سر ہلایا اور زری کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ واس کو پسپا کرنے کے بعد زری نے اس کی بات مان لی اور اپنے وحشی بالوں کو ایک عجیب وضع کے کلپ میں سمیٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے رستم کی طرف دیکھ کر شرارت سے ناک چڑھائی اور پھر خود ہی شرما کر گھٹنوں پر چہرہ چھپا لیا۔ وہ اردگرد کے سنگین حالات سے اب یکسر بے پروا نظر آرہی تھی۔ وہ اس چار دیواری سے باہر خون خرابا دیکھ کر آئی تھی۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں وہ اس خون خرابے کو فراموش کر چکی تھی یا پھر شاید رستم کو سامنے دیکھ کر اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے واس اور مالینا کی نظر بچا کر اپنی زبان نکال کر رستم کو چڑایا اور پھر گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر پھس پھس ہنسنے لگی۔

اسی دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ وہی مقامی عورت تھی جسے واس نے خانمی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ گھونگھٹ نکالے ہوئے اندر آگئی۔ اس کا گھونگھٹ لرز رہا تھا

اور یقیناً جسم بھی لرز رہا تھا۔ وہ گھر کے ایک گوشے میں چلی گئی۔ واس بھی اس کے پیچھے گیا۔ وہاں لالٹین کے پاس بیٹھ کر دونوں دس پندرہ منٹ تک کھسر پھسر کرتے رہے۔

کھسر پھسر مکمل ہوئی تو واس، رستم اور مالینا کے پاس آیا۔ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''اندازہ ہو رہا ہے کہ برق جان اور اس کے ساتھیوں کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے۔ شوتم خان کے کافی بندے مارے گئے ہیں اور زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس کا چہیتا ارفا خان بھی زخمی ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔ شوتم اور اس کے ساتھی بستی کے مشرقی کنارے کی طرف پسپا ہو گئے ہیں۔ لڑائی فی الحال رکی ہوئی ہے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے بستی کا کنٹرول کس کے پاس ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک میں خود باہر نہ جاؤں، ہم صرف قیافے لگا سکتے ہیں۔''

''تم نے بتایا تھا واس کہ شوتم کے پاس کم از کم چار سو مسلح محافظ ہیں۔ اتنے وفادار محافظوں کے ہوتے ہوئے وہ آسانی سے ہار تو نہیں مانے گا۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن ان محافظوں کو بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کہاں تک شوتم کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ جو کچھ سامنے آرہا ہے وہ شوتم کے لئے تباہ کن ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

واس نے رستم کے قریب کھسک کر آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ''خانمی باہر سے اہم خبریں لائی ہے۔ ڈاکٹر مالینا نے اگیارے کے اندر جس جگہ کو تہہ خانہ بتایا ہے، وہ تہہ خانہ نہیں ہے۔ وہ ایک راستہ ہے۔''

''راستہ؟''

''ہاں...... ایک بہت پرانا راستہ جس کی خبر صرف شوتم کو تھی یا شاید شوتم سے پہلے اس کے آنجہانی بڑے بھائی کو ہوگی...... یہ پرانے پتھروں سے بنا ہوا زمین دوز راستہ قریباً سو میٹر لمبا ہے اور یہ راستہ پتا ہے کہاں کھلتا ہے؟''

رستم سوالیہ نظروں سے واس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ واس نے کہا۔ ''یہ راستہ مقدس آبوک کے جھکے ہوئے درخت کے پاس ایک رہائشی مکان میں کھلتا ہے جہاں چند برس پہلے عورتوں کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی لیکن اب شوتم نے یہ مکان ایک بیوہ عورت اور اس کی جوان بھانجی کو دے رکھا ہے۔ عورت کا تیرہ چودہ سالہ بھانجا بھی ساتھ رہتا ہے لیکن اس بے چارے کو کیا پتا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے ''

''ہاں... یہ بیوہ عورت شوتم کے قریب تصور کی جاتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کو جلد ہی دانا عورتوں (مجاریوں) کی جماعت میں شامل کرلیا جائے گا۔ بلکہ کچھ کا تو اندازہ تھا کہ یہ مجاریوں کی نگران یعنی ہیڈ بنے گی۔ کسی کو گمان تک نہیں تھا کہ یہ پاک باز عورت نیکوکار ملک شوتم کے ساتھ مل کر کیا گندگی پھیلا رہی ہے۔ جو کچھ سامنے آرہا ہے وہ بہت حیران کن ہے۔''

''وہ خالہ بھانجی اب کہاں ہیں؟''

''گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہیں لیکن گھر سے ملنے والے ثبوت حیران کن ہیں۔ اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ خالہ اور اس کی مبینہ بھانجی دونوں شوتم کے ساتھ ملوث تھیں... جن دنوں سردار شوتم اگیارے میں گوشہ نشین ہوتا وہ زمین دوز راستے کے ذریعے اس تک پہنچتی تھیں اور اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ کام اتنی رازداری اور صفائی سے ہورہا تھا کہ ڈیڑھ دو سال گزرنے کے باوجود کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور پتا نہیں کہ آئندہ بھی کتنے عرصے تک نہیں ہونا تھی۔ ابھی اس گندے کام کی مزید تفصیل بھی سامنے آرہی ہے۔ عام لوگوں میں غم و غصہ پایا جارہا ہے۔ وہ سخت الجھن کا شکار بھی ہیں۔''

رستم خاموش رہا۔ واس بھی گہری سوچ میں غرق اپنی کلائی کے زخم کو سہلاتا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''انسان نے کسی غلط عقیدے کے چکر میں جب بھی فطرت سے ٹکر لی ہے، منہ کی کھائی ہے۔ فطرت بہتے پانی کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ جب اس بہتے پانی پر احمقانہ رسموں اور عقیدوں کے بند باندھے جاتے ہیں تو یہ پانی سڑ کر بدبو دینے لگتا ہے اور پھر اس میں سے جسمانی اور روحانی بیماریوں کے عفریت برآمد ہوتے ہیں۔ انسان کے لئے وہی راستہ بہتر ہے جو اس کے خالق نے اس کے لئے متعین کیا ہے۔ اسی راستے پر چلنے میں اس کی عافیت ہے۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولتا چلا گیا۔

رستم کو لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ جاہلیت میں لپٹی ہوئی اندھی عقیدتیں ہی تھیں جو مختلف جگہوں پر مختلف شکلوں میں نظر آتی تھیں۔ پیر قدرت اللہ کا نام بھی اسی سلسلے میں آتا تھا۔ اس نے اپنی شعبدہ بازیوں سے ایک خلقت کو بے وقوف بنا رکھا تھا اور اس کی عقیدت کا دائرہ مسلسل پھیل رہا تھا۔ رستم نے کئی بار سوچا تھا، کاش ملتان کے آستانے میں بی بی نے اس کا ہاتھ نہ روکا ہوتا اور اس قاتل بہروپیے کو وہیں جہنم واصل کر دیتا۔ اب وہ شخص اس کے ساتھ ساتھ بی بی کے خون کا پیاسا بھی تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی چہیتی بیوی کے مارے

جانے میں بی بی کا ہاتھ بھی ہے۔ بی بی کی سلامتی اور زندگی کے بارے میں ان گنت اندیشے رستم کے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ وہ سارے بندھن توڑ کر ساری رکاوٹیں پھاند کر اس برف زار سے نکل جائے اور مہلک ترین خطروں میں گھری ہوئی اپنی بی بی کی طرف بھاگتا چلا جائے لیکن کیسے؟ یہ سرد دوزخ کسی طرف سے راستہ نہیں دیتی تھی۔ یہ ناقابلِ شکست ہوکر رہ گئی تھی۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' واس کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

رستم نے لکڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے لمبی ریشمی بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

''کیا یہاں جو کچھ ہورہا ہے اس کا فائدہ ہمیں پہنچ سکے گا؟ میرا مطلب ہے کہ ہم اس ٹاپو سے نکل سکیں گے؟''

''ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اب کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔''

وہ سارا دن بھی تذبذب اور کشمکش میں گزر گیا۔ واس باہر نہیں جاسکا تھا۔ اس کے باہر جانے کے بعد ہی رستم کو ناصر اور شریف کی خیریت کا علم ہوسکتا تھا۔ اس پاؤندہ بستی میں لڑائی رکی ہوئی تھی لیکن حالات سخت کشیدہ لگتے تھے۔ رات سخت سرد تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں بھی ختم ہوچکی تھیں۔ رات آخری پہر کوئی بلی کی طرح چپکے سے رستم کے بستر میں گھس آیا۔ رستم سناٹے میں رہ گیا۔ یہ زری تھی۔ وہ ایک بے باک معصومیت کے ساتھ رستم کے کندھے سے لگ کر لیٹ گئی جیسے وہ جوان لڑکی نہ ہو ایک کم عمر بچی ہو۔ رستم بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کمرے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ واس کا بستر چند فٹ کی دوری پر تھا۔ وہ زری کو ڈانٹتا تو اس کا بھانڈا پھوٹتا۔

یکلخت وہ گھبرا گیا۔ واس کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ وہ رستم کی طرف ہی آرہا تھا۔ رستم نے گھٹنے تھوڑے سے اوپر اٹھائے تاکہ لحاف کا شامیانہ سا بن جائے اور معلوم نہ ہو کہ وہ بستر میں تنہا نہیں ہے۔

''رستم جاگ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' رستم نے بھاری آواز میں کہا۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں واس اس کا کندھا ہلانے نہ لگ جائے۔

''میں باہر جارہا ہوں۔''

''کب تک آؤ گے؟'' رستم نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ کچھ دیر ہوجائے، تم لوگ پریشان نہیں ہونا۔''

''ناصر اور شریف کے بارے میں ضرور جاننا۔''

''بے فکر رہو......'' واس نے کہا اور بھاری کمبل اوڑھتا ہوا باہر نکل گیا۔

لیکن مطلع اب بھی صاف نہیں تھا۔ ادھیڑ عمر عورت خانمی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ زری نے رستم کا کان کھینچا اور اس میں گرم گرم سرگوشی کی۔ ''تم بہت آچھا۔''

وہ بچکانہ انداز میں اپنی انگلیوں سے رستم کو گدگدانے لگی۔ رستم نہیں ہنسا تو وہ خود ہی لحاف کے اندر کھی کھی کرنے لگی۔ رستم بہت سٹپٹا رہا تھا۔ جونہی خانمی چکی پر گندم پیسنے کے لئے دوسرے کمرے میں گئی، رستم نے لحاف ہٹایا اور اسے دھکیل کر چارپائی سے نیچے چٹائی پر گرا دیا۔

وہ بے مزہ ہوئے بغیر بے آواز ہنستی رہی۔ رستم غصے میں تھا۔ اس نے حسبِ عادت اپنے دونوں ہاتھ کراس کر کے کانوں کو چھوا اور سائے کی طرح کمرے سے کھسک گئی۔

☆======☆======☆

کے ٹو کے نواحی برف زاروں میں آباد اس کوہستانی بستی کے حالات تہلکہ خیز تھے۔ یہ وسیع و عریض بستی واضح طور پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ بستی کے مغربی حصے اور کھوہ پر برق جان اور اس کے حمایتیوں کو اختیار حاصل ہو گیا تھا جب کہ مشرقی حصہ جو منجمد جھیل کے اردگرد کا ایریا تھا، بدستور شوتم خان اور اس کے بیٹے ارفا کی تحویل میں تھا۔ یہ قبائلی لڑائیوں کا وہی جانا پہچانا انداز تھا جس کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ رستم اور ناصر تک یہ معلومات بھی پہنچیں کہ برق جان کا داماد سامی خان ابھی تک شوتم کی تحویل میں ہی ہے۔

دو دن سے لڑائی رکی ہوئی تھی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ دیر نہیں رکے گی۔ دونوں متحارب گروہ مورچہ بندی میں مصروف تھے۔ ناصر اور شریف وغیرہ بالکل خیریت سے تھے۔ باقی بردوں یعنی قیدیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ صرف دو تین افراد دستی بموں کے ٹکڑوں سے معمولی زخمی ہوئے تھے۔ واس کے اندازے کے مطابق لڑائی میں دونوں طرف کے کم و بیش ساٹھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ شوتم خان کے ساتھیوں کی ہلاکتیں زیادہ تھیں۔ درجنوں افراد اس لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔

برق جان اور اس کے ساتھیوں کا رویہ رستم، ناصر اور دیگر بردوں سے بہتر تھا۔ خاص طور سے رستم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ خصوصی سلوک کیا گیا۔ اب رستم کے ساتھ ساتھ ناصر اور شریف کو بھی کھوہ کے اندرونی غار سے نکال کر واس کے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ تاہم ان تینوں کے پاؤں میں اس پائندہ بستی کا ٹریڈ مارک یعنی آہنی بیڑی بدستور موجود تھی۔ مالینا

نے برق جان وغیرہ کے سامنے اپنا یہ موٗقف برقرار رکھا ہوا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اگیارے کی طرف نہیں گئی تھی۔ وہ نیند کی حالت میں چلتی ہوئی اتفاقاً وہاں پہنچ گئی تھی۔ مالینا کو دوبارہ اس کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کی حفاظت و نگرانی کے لئے برق جان نے دو مسلح محافظ بھی مقرر کیے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا مگر یوں لگتا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔ اس ٹاپو کی زندگی انگیٹھیوں اور آتش دانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ واس کی بیوی، رستم، ناصر اور شریف کے سامنے کھانا پروس رہی تھی جب واس تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا جوش تھا۔ وہ بولا۔ ''رستم! تمہیں برق جان نے بلایا ہے... ابھی اسی وقت۔''

''کھانا تو کھا لینے دو۔'' واس کی بیوی بولی۔

''یہ بلاوا کھانے سے زیادہ ضروری ہے۔'' واس نے جھلا کر کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں ایک فٹ گہری برف میں چلتے ہوئے برق جان کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں نے یاک کی کھال کی بنی ہوئی برساتیاں اوڑھ رکھی تھیں۔ ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی کیونکہ رستم کو بیڑی کی وجہ سے چلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ راستے میں رستم کو جگہ جگہ تین دن پہلے ہونے والی لڑائی کے شواہد نظر آئے۔ گھروں کی بیرونی دیواروں پر گولیوں کے نشانات تھے۔ دو مُردہ گھوڑوں کی لاشیں ابھی تک برف میں دبی پڑی تھیں...... ایک جگہ ایک جوان کوہستانی کی لاش درخت سے جھولتی نظر آئی۔ اسے پھانسی دے دی گئی۔

برق جان کا گھر کافی وسیع اور اندر سے آرام دہ تھا۔ ایک بڑے قالین کے گرد گاؤ تکیے لگے تھے اور قہوے کی خالی پیالیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ شاید کچھ دیر پہلے تک یہاں اس نشست گاہ میں کافی لوگ موجود تھے۔ اب برق جان کے علاوہ صرف دو افراد مزید نظر آتے تھے۔ برق جان نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے لوہے کی ایک الماری کھولی اور اس میں سے رائفل کی گولیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں نکال کر دونوں افراد کو دیں۔ دونوں نے سپاہیانہ انداز میں برق جان کو سلام کیا اور باہر نکل گئے۔

برق جان کے عقب میں ایک مسلح لداخی موجود تھا۔ اس کی گول ٹوپی پر سرخ پھول سجا تھا۔ برق جان نے اسے بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم واس کے ذریعے برق جان اور رستم میں جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی۔

برق جان نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا۔ ''تم نے جس طرح

اس بڈھے شیطان کا راستہ روکا اور اس کی ظالم کلہاڑی سے ڈاکٹر مالینا کی جان بچائی، وہ قابلِ تعریف ہے۔"

"آپ کی تعریف کا شکریہ۔" رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم ایک بہادر شخص ہو اور اس رات تمہاری بہادری میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ شاید تم ریچھ کی لڑائی میں ہی اپنا جوہر دکھا سکتے ہو۔ لڑائی بھڑائی میں مہارت کے علاوہ تم اسلحہ شناس بھی لگتے ہو۔"

"مجھے کوئی دعویٰ نہیں لیکن اس معاملے میں، مَیں بہت سے لوگوں سے بہتر ہوں۔"

برق جان نے گڑگڑی کی نے منہ میں دبا کر چند کش لئے اور بولا۔"میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم ہماری طرف سے اس بڈھے خبیث کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا پسند کرو گے؟"

"آپ کا مطلب ہے یہاں لڑائی ہونے والی ہے؟"

"بالکل ..... بس یہ برف باری رکنے کی دیر ہے۔ وہ ہم پر حملہ کریں گے یا پھر ہم ان پر کردیں گے۔" برق جان نے ذرا توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"میں نے سنا ہے کہ تمہارا دوست ناصر بھی ایک اچھا لڑاکا ہے اور خاصی مار دھاڑ کی زندگی گزار چکا ہے۔"

"بے شک آپ اسے بھی کسی سے کم نہیں پائیں گے۔" رستم نے وثوق سے کہا۔

"ہاں تو پھر بتاؤ۔ کیا تم اس بستی کو اس بڈھے شیطان سے پاک کرنے کے لئے لڑائی میں حصہ لینا پسند کرو گے؟"

رستم نے برق جان کی بھوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"ہمیں بدلے میں کیا ملے گا..... میرا مطلب ہے کہ اگر ہم بچ گئے تو؟"

"تمہیں بہت سی سہولتیں مل جائیں گی۔ رہائش کے لئے مکان مل جائے گا۔ بہتر کھانا، بہتر لباس ہو سکتا ہے اور کچھ عرصے بعد تمہاری قیدی کی حیثیت بھی ختم کردی جائے گی۔ اس کے بعد تم اس ٹاپو پر آزاد شخص کی طرح رہ سکو گے۔ ممکن ہے کہ شادی بھی کرسکو۔ واس کی مثال تمہارے سامنے ہے۔"

رستم کا دل چاہا کہ برق جان سے پوچھے..... اگر ہم واپس اپنے پیاروں میں جانا چاہیں تو پھر؟ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا جواب صرف اور صرف نفی میں ہوگا۔ اس معاملے میں یہ لوگ بالکل بے حس تھے۔ رستم نے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔

"کس سوچ میں کھو گئے؟" برق جان نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔

واس نے رستم کو ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ رستم طویل سانس لے کر بولا۔"میرے لئے عزت کی بات ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا ہے۔ میں اور میرے ساتھی اس لڑائی میں آپ کی طرف سے حصہ لیں گے۔ خاص طور سے ناصر اور میں اگلی صف میں رہنا پسند کریں گے۔ آپ ہمیں اچھا اسلحہ دیں، ہم اس اسلحے کا حق ادا کردیں گے۔"

برق جان کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔ وہ بولا۔"میں بھی تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے جنگجو ساتھیوں کی ضرورت ہے اور میں ان کی قدر کرنا بھی جانتا ہوں۔"

اس موقع پر رستم نے اپنے ساتھ قید رہنے والے دیگر افراد کی حالتِ زار کا بھی ذکر کیا۔ برق جان نے اپنے ایک ذمے دار ساتھی کو فوراً بلایا اور اسے حکم دیا کہ خوراک میں فی بردہ ایک پاؤ دودھ کا اضافہ کیا جائے اور گوشت کی مقدار بھی بڑھائی جائے...... اس کے علاوہ جب تک سردی زیادہ ہے، بردوں سے کھوہ کے اندر ہی کام لیا جائے۔ اس طویل گفتگو میں طے ہوا کہ رستم اور اس کے دونوں ساتھیوں کی بیڑیاں آج شام تک کھول دی جائیں گی۔ رات تک انہیں اسلحہ بھی فراہم کردیا جائے گا۔

شام تک رستم، ناصر اور شریف کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔ کھوہ کے خصوصی بنگش محافظ آئے اور انہوں نے خاص قسم کی ایک بالشت لمبی چابیوں کی مدد سے یہ منحوس بیڑیاں کھولیں۔ ان بیڑیوں نے رستم، ناصر اور شریف کے ٹخنوں پر اَن مٹ نشان چھوڑے تھے۔ بہترین فولاد سے بنائی گئی یہ بیڑیاں اتنی مضبوط تھیں کہ کوئی اسیر انہیں توڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا۔ ان بیڑیوں کے لیے مقامی زبان میں جو الفاظ استعمال کیا جاتا تھا اس کا مطلب واس نے "قراقرم جیسا مضبوط" بتایا تھا۔ یہ بیڑیاں اور کلہاڑیوں کے پھل تیار کرنے والا ایک ہی گھرانہ اس قبیلے میں تھا اور وہ کئی پشتوں سے یہ کام کررہا تھا۔

بیڑیاں کھلنے کے فوراً بعد واس نے ان تینوں کو رائفلیں بھی فراہم کردیں۔ یہ بہترین روسی رائفلیں تھیں اور ان کے ساتھ تسلی بخش مقدار میں ایمونیشن تھا۔ رستم نے کہا۔"واس! برق جان نے تو کہا تھا کہ رائفلیں بعد میں ملیں گی؟"

"لگتا ہے کہ لڑائی اب زیادہ دیر تک نہیں رکے گی۔ شاید آج رات ہی شروع ہوجائے۔"

"برف باری تو نہیں رکی۔" ناصر نے کہا۔

"لیکن آثار کچھ ایسے ہی لگ رہے ہیں۔" واس بولا۔

لڑائی کے خیال نے واس کی بیوی کو خاصا فکرمند کردیا تھا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی گھر میں پھر

رہی تھی اور ساتھ ہی منہ میں دعائیں بھی پڑھ رہی تھی۔ بارہ تیرہ برس گزر چکے تھے مگر واس اور اس کی بیوی نے اس بے راہ بستی میں اپنے دین سے ناتا جوڑ رکھا تھا۔ رستم نے واس کی بیوی کو کئی بار نماز پڑھتے بھی دیکھا تھا۔

بستی کی گلیوں میں شام کے فوراً بعد ہلچل کے آثار محسوس ہونے لگے۔ مسلح جتھے شوتم خان کے خلاف نعرے بازی کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر حرکت کرنے لگے۔ گاہے بگاہے گھوڑوں کی گونج دار ٹاپیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے آتشیں ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے لئے ہوائی فائر کر رہے تھے۔

رائفل رستم کی گود میں تھی۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ آج اسے بی بی ہمیشہ سے زیادہ یاد آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس کے آس پاس موجود ہے۔ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ ''کہاں چلے گئے تم؟ رستم تم اتنے بے حس تو نہیں تھے۔ دیکھو میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ دیکھ کر پتھرا گئی ہیں۔ اب آجاؤ ناں...... اس سے پہلے کہ میری جان چلی جائے۔ میں تمہیں دیکھنے کی خواہش دل میں لئے مٹی کے نیچے چلی جاؤں...... ایک بار مجھے گلے لگا لو۔''

وہ ان غیر مرئی سرگوشیوں کو سنتا رہا اور اس کا ہاتھ لحاف کے اندر ایک تہہ شدہ سفید کاغذ پر حرکت کرتا رہا۔ یہ کھردرا کاغذ رستم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واس کی الماری کے ایک خانے سے نکالا تھا۔ چند دن پہلے واس نے اس کاغذ پر ایک خاکہ سا بنایا تھا اور رستم کو کچھ سمجھایا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ناصر اور شریف نے چری برساتیاں اوڑھیں اور گلی کوچوں کا جائزہ لینے چلے گئے۔ رستم انگیٹھی کے قریب بیٹھا رہا۔ اس کا زخمی کندھا اب کافی بہتر تھا۔ واس چائے کی پیالی تھامے رستم کے قریب آن بیٹھا تھا۔ ''رستم! تمہیں یہ سنہری موقع ملا ہے۔ اگر تم اس لڑائی میں کارکردگی دکھا سکے تو برق جان کی نگاہوں میں تمہیں اور تمہارے دوستوں کو خاص اہمیت حاصل ہو جائے گی اور اگر برق جان یہاں کا سردار بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر تمہیں واقعی بہت فائدہ ہوگا۔ درحقیقت جس رات سے تمہاری کلباڑی شوتم خان کی کلباڑی سے ٹکرائی ہے تمہیں بستی میں بڑا نام مل گیا ہے۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو واس؟''

''میں جانتا ہوں کہ تم اور ناصر بہت اچھا لڑ سکتے ہو۔ آج رات لڑائی تقریباً یقینی ہو چکی ہے۔ تم دونوں برق جان کے قریب رہنے کی کوشش کرنا۔ تم خاص خاص لوگوں کی نظر میں آجاؤ

گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ شریف کے حصے کا ایمونیشن بھی تم اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس سے فائدہ ہوگا۔''

رستم کا ہاتھ بدستور لحاف کے اندر تھا۔ برفانی ہوا دیواروں سے سر پٹخ رہی تھی۔ رستم نے لالٹین کی پھڑپھڑاتی روشنی میں یکسوئی سے واس کا چہرہ دیکھا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں آج رات نہیں لڑ رہا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں آج رات...... یہاں سے جا رہا ہوں اور ناصر اور شریف بھی...''

واس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''واس، تم نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ ہمارے لئے سنہری موقع ہے لیکن لڑنے کے لئے نہیں یہاں سے نکلنے کے لئے۔ ہمیں یہاں کے لڑائی جھگڑے سے کچھ نہیں لینا۔ یہ سب کُتے کے تخم ایک ہی جیسے ہیں۔'' واس پریشانی کے عالم میں رستم کو تکتا رہا۔

رستم کے اندر ایک آگ سی روشن تھی۔ اس نے لحاف میں سے ہاتھ نکالا اور تہہ کیا ہوا کھردرا کاغذ واس کے سامنے پھیلا دیا۔ اس پر سیاہ بال پوائنٹ سے ایک نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ اس بلند برفیلے ٹاپو کا نقشہ تھا جو مشرق اور مغرب کی طرف قریباً چھ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ شمالاً جنوباً اس کی چوڑائی بھی چار پانچ میل سے کم نہیں تھی۔ اس کے چاروں طرف عمودی دیواریں اور قدرتی کھائیاں تھیں جو ہزاروں فٹ گہری تھیں۔ اس بلند برفیلے گلیشیر نما ٹاپو کے اوپر چڑھنے کا راستہ مشرق کی طرف تھا۔ اس طرف بھی ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی۔ تاہم یہاں ٹاپو کی قدرتی دیوار بالکل عمودی نہیں تھی۔ اس میں معمولی سی ڈھلوان موجود تھی۔

رستم نے اسی دھلوان پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''واس! تمہارا کہنا ہے کہ یہاں پاؤندہ بستی میں آنے کا راستہ اس جانب ہے۔ کیا یہ راستہ قدرتی ہے یا بنایا گیا ہے؟''

واس کے چہرے پر بے چینی کی یلغار تھی۔ ''رستم! تم یہ کیا کر رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ...''

''واس!'' رستم نے پھنکارتے ہوئے واس کی بات کاٹی۔ ''میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ آخری ہے۔ تم دس راتوں تک بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہو گے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہم نے آج رات یہاں سے نکلنا ہے اور ہر صورت نکلنا ہے۔''

واس خاموشی سے رستم کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ جیسے وہ سمجھ گیا کہ رستم وہی کرے گا جو

کہہ رہا ہے۔ اس نے گڑگڑی کی نئے ہونٹوں میں دبا کر دو طویل کش لئے اور الائچی کی خوشبو والا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''کیا تمہارے دونوں ساتھیوں کا بھی یہی فیصلہ ہے؟''

''وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم چاروں جانے کے لئے تیار ہیں۔''

''چوتھا کون؟''

''ڈاکٹر مالینا۔''

''ناصر اور شریف ابھی ڈاکٹر مالینا کی طرف گئے ہیں؟'' واس نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ کسی اور کام سے گئے ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں۔''

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ساتھ ہی شیفرڈ کتوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ واس نے جا کر دروازہ کھولا۔ برق جان کے دو قریبی ساتھی دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے چہرے تمتمار ہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی نشہ آور مشروب کے زیر اثر ہیں۔ انہوں نے مقامی زبان میں بات کی اور واس کی وساطت سے رستم کو بتایا کہ دو چار گھنٹے کے اندر لڑائی شروع ہو سکتی ہے۔ جیسے ہی ''کام'' سٹارٹ ہوا ان تینوں کو اطلاع دے دی جائے گی۔

ان کے جانے کے بعد واس اور رستم پھر انگیٹھی کے سامنے آن بیٹھے۔ باہر برف باری مسلسل ہو رہی تھی۔ واس یکسر خاموش تھا۔ رستم نے کہا۔ ''ہمارے جانے سے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم نے کسی سے ہماری سفارش نہیں کی ہے۔ ہمیں برق جان نے جو رعایتیں دی ہیں اپنی مرضی سے دی ہیں۔'' واس نے اثبات میں سر ہلایا تاہم منہ سے کچھ بولا نہیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد رستم نے کہا۔ ''واس! اگر تم بھی یہاں سے نکلنا چاہو تو ہمارا ساتھ دے سکتے ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہم اسے کر سکتے ہیں۔ ہم کر دکھائیں گے۔ یہاں پر شدید افراتفری کے حالات ہیں، یہ حالات بھی ہماری مدد کریں گے۔''

واس خالی خالی نظروں سے ادھ بجھے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ شاید وہ خود بھی ان انگاروں کی طرح اپنی حرارت کھو چکا تھا یا شاید راکھ ہی ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے لب ہلائے۔ ''نہیں میرے دوست! جہاں اتنی گزر گئی ہے باقی کی بھی گزر جائے گی۔ نہیں ..... اب نہیں ..... اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ لیکن '' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' رستم نے اسے اکسایا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''کیا تم زری کو یہاں سے نکالنے کی کوشش

کر سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں ..... اگر وہ چاہے تو۔''

''اس کے چاہنے یا نہ چاہنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ایک بچے کی طرح سادہ اور کم فہم ہے۔ ہم اسے جو کہیں گے کرے گی۔ خاص طور سے تمہارے ساتھ جانے سے تو اسے کوئی انکار نہیں ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اسے تمہارے ساتھ بہت لگاؤ ہو گیا ہے۔ ہر وقت تمہارے آس پاس رہنا چاہتی ہے۔ وہ بالکل اول جلول ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تم اسے جس طرح چاہو چلا سکتے ہو۔''

رستم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں واس ..... لیکن یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں سے نکلنے میں خطرات ہیں۔''

''نکلنے میں تو خطرات ہیں ..... یہاں رہنے میں یقینی موت ہے۔ اس کی عمر بیس سال ہو چکی ہے۔ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے تہوار میں اسے ایک یا دو گارینوں کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیا جائے۔'' بھینٹ کی حیران کن تفصیل رستم جان چکا تھا۔

اس موضوع پر کچھ دیر بات ہوئی پھر یہ طے ہو گیا کہ اگر آج رات لڑائی ہوتی ہے اور اس لڑائی کے دوران رستم اور اس کے ساتھی ٹاپو سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو زری بھی ان کے ساتھ ہو گی۔

اس گفتگو کے بعد رستم اور واس ایک بار پھر کاغذ پر بنے دستی نقشے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رستم نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''واس! کیا یہ جگہ واقعی اسی طرح ہے جس طرح تم نے اس اسکیچ میں دکھائی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے اردگرد کے علاقے سے ہزاروں فٹ اوپر ابھری ہوئی ایک ہموار سطح جس کے چاروں طرف قدرتی طور پر عمودی دیواریں ہیں؟''

''بالکل۔ یہ ایسے ہی ہے۔ اس کو تم ہموار سطح والا ایک مکعب پہاڑ بھی کہہ سکتے ہو۔ دنیا کے مختلف کوہستانی علاقوں میں اس طرح کے رقبے پائے جاتے ہیں۔ یہ برفانی اور غیر برفانی دونوں طرح کے پہاڑوں میں ہوتے ہیں۔ سری لنکا میں ایسے ہی ایک مکعب پہاڑ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دینے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ زیر زمین عظیم الشان پلیٹوں کی حرکت سے پہاڑی سلسلوں میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اس میں ایسے رقبے نمودار ہوتے ہیں۔ ہماری اس زمین پر لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے یہ کوہستانی سلسلے قدرت کی صناعی کا حیران کن

نمونہ ہیں۔ نانگا پربت کے ''جنوبی چہرے'' کو تم جانتے ہو؟''

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

''نانگا پربت کے اس رخ کو ''روپل فیس'' کہا جاتا ہے۔ سمجھو کہ یہ ایک ساڑھے چار ہزار میٹر اونچی عمودی چٹان ہے جو دیکھنے والے کو ششدر کر دیتی ہے۔ ذرا غور کرو، ساڑھے چار ہزار میٹر یعنی تقریباً 14700 فٹ اونچی ایک چٹان...... ان پہاڑوں کے زاویے اور رخ ایسے ہی ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔''

رستم کی نگاہیں اسکیچ پر جمی تھیں۔ وہ اس برفانی ٹاپو کے ایک جنوبی کنارے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اسی کنارے کے بارے میں بتایا تھا ناں، جہاں سے رسیوں کے ذریعے اترنے کی کوشش کی جا سکتی ہے؟''

واس نے تعجب سے رستم کو دیکھا۔ ''تم ٹھیک تو ہو...... تمہارا مطلب ہے کہ تم اس برفانی رات میں ان عورتوں کے ساتھ اس جگہ سے اترنے کی کوشش کرو گے؟ اور وہ بھی رسیوں کے ذریعے؟''

''رسیوں کے ذریعے نہیں...... کوہ پیائی کے مکمل سامان کے ذریعے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہمارے پاس پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کا سامان موجود ہے۔''

واس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کہاں سے آیا سامان؟''

رستم نے اپنے بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور واس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ان انگریز میاں بیوی کا ذکر کیا تھا ناں جو سات آٹھ سال پہلے سپ گندل کی کھوج میں یہاں آئے تھے اور پکڑے گئے تھے۔'' واس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''عورت تو چار پانچ سال پہلے نمونیہ سے مر گئی تھی لیکن وہ انگریز شخص ابھی زندہ ہے۔''

''اس کا نام جانسن ہے۔ تم اسی کی بات کر رہے ہو ناں؟''

''ہاں اسی کی...... شاید تمہیں یاد نہ ہو، ان میاں بیوی کے سامان میں کوہ پیائی کا سامان بھی تھا۔ یہ سامان دیگر اشیاء کے ساتھ شوتم کے محافظوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔''

واس نے الجھے ہوئے انداز میں اقرار میں سر ہلایا۔ غالباً اسے یاد آ رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''وہ سامان اب کافی عرصے سے جانسن کے پاس ہے۔''

''وہ کیسے؟'' واس کی حیرت بڑھ گئی۔

''بس، جانسن نے دو تین سال پہلے اسے کسی طرح حاصل کر لیا تھا۔ سامان کا تھیلا دوسری بہت سی بیکار چیزوں کے ساتھ گودام میں پڑا تھا۔ جانسن نے گودام کے ایک نگران کو اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی لکڑی کی تین کرسیاں دیں اور بدلے میں تھیلا لے لیا۔ وہ تھیلا اب تک جانسن کے گھر میں صحن میں دبا رہا ہے۔''

واس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

''تو...... وہ جان (جانسن) بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ناصر اور شریف اسی کی طرف گئے ہیں...... پروگرام کو آخری شکل دینے۔''

''تم رستم ہی نہیں...... چھپے رستم بھی ہو۔ چپکے چپکے لگے رہے اور مجھ سے چھپاتے بھی رہے۔''

''میں تمہیں کسی بھی منصوبہ بندی میں شریک کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ویسے بھی جانسن سے رابطے اور پروگرام بنانے کا سارا کام ناصر نے انجام دیا ہے۔''

واس نے گڑگڑی کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ ''رستم! جو کچھ تم کرنا چاہ رہے ہو یہ ناممکن تو شاید نہ ہو لیکن بہت مشکل ضرور ہے۔ خاص طور سے رات کے وقت رسوں کے ذریعے نیچے اترنا۔''

''جو لوگ کوہ پیائی کو پوری طرح سمجھتے ہیں واس، وہ کہتے ہیں کہ اگر سامان پورا ہو تو یہ کام اتنا مشکل نہیں جتنا نظر آتا ہے۔''

''لیکن بات صرف نیچے اترنے ہی کی تو نہیں ہے۔ تمہیں وہاں پر موجود پہرے داروں سے بھی تو نمٹنا ہوگا۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو واس...... اصل مسئلہ نیچے اترنے کا ہی ہے۔ پہرے دار وہاں دو چار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد ناصر اور شریف بھی آ گئے۔ ان کی برساتیوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ چہروں پر دبا دبا جوش تھا۔ بیڑیاں کھلنے کے بعد وہ خود کو پرندوں کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے اور پیدل چلنا ان کے لئے ایک تفریح جیسا ہو گیا تھا۔

رستم نے ان دونوں کو بھی گفتگو میں شریک کرلیا۔ ناصر نے اس فیصلے کو سراہا کہ زری بھی ان کے ساتھ جائے گی۔ درحقیقت زری کے لئے اس کام میں کسی طرح کا کوئی رسک نہیں تھا۔ بالفرض وہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہتے اور پکڑے بھی جاتے تو زری سے کسی طرح کی بازپُرس نہیں ہونی تھی۔ موت سے بڑی سزا بھلا اور کیا ہوسکتی تھی اور یہ سزا تو اس بے چاری کو بغیر کسی جرم کے بھی ملنے والی تھی۔ وہ گارنی تھی اور گارنی کا مقدر ہی ''جوانی کی موت'' تھا۔

ناصر نے رستم کو بتایا۔ ''رستم بھائی! جانسن پوری طرح تیار ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ یہاں بڑھئی کا کام کررہا ہے۔ اس کے پاس بہت سی اسکریپ لکڑی موجود ہے۔ یہ لکڑی اس نے اپنے خچر پر لادلی ہے۔ کوہ پیمائی کا سامان اس لکڑی کے نیچے موجود ہے۔ جونہی لڑائی شروع ہوئی وہ اپنا خچر لے کر گھر سے باہر نکل آئے گا اور ہمارا انتظار کرے گا۔''

''زری کہاں ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''وہ یہاں آس پاس ہی گھوم رہی ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور جانے کے لئے کہتا ہوں۔'' واس نے کہا۔ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں تھوڑی سی اداسی آگئی۔

واس اپنی گرم ٹوپی درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ رستم، ناصر اور شریف اپنے منصوبے کی تفصیلات پر غور کرنے لگے۔ سب سے اہم فیصلہ تو انہیں یہ کرنا تھا کہ لڑائی کے دوران میں وہ کب اور کس مرحلے سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھیں گے۔ شریف تھوڑا سا نروس دکھائی دیتا تھا مگر جب ناصر نے اسے بتایا کہ پہاڑ سے اترنے کے لئے رسے سے جھولنا نہیں پڑتا بلکہ یہ ایک طرح کا جھولا سا بن جاتا ہے جس میں بیٹھ کر اور تھوڑا تھوڑا کھسک کر نیچے آنا ہوتا ہے تو وہ قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔''

چند منٹ بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ یہ جان کر رستم کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں کہ باہر برق جان کے محافظ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ طبل جنگ بجنے والا ہے۔ روسی رائفل پر رستم اور ناصر کے ہاتھوں کی پُرجوش گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

دروازہ کھلنے پر محافظ اندر آئے۔ انہوں نے جو اطلاع دی وہ ان کی توقعات کے برعکس تھی۔ انہوں نے اپنی اطلاع سے واس کو آگاہ کیا۔ واس نے رستم اور ناصر کو بتایا۔ ''برف باری مسلسل ہورہی ہے۔ لگتا ہے کہ آج رات کے لئے لڑائی ٹل گئی ہے۔ شوتم کے قریباً دو سو مسلح محافظ جو جھیل کے مغربی کنارے پر آگئے تھے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے گئے ہیں۔''

''کیا ہم آرام سے سوسکتے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں کہ سوسکتے ہیں۔'' واس نے جواب دیا۔

تناؤ نکتہ عروج پر پہنچ کر ایک دم ختم ہوگیا تھا۔ سب ایک ایک کر کے سونے لگے۔ بستی کے گلی کوچوں میں ہونکتی ہوئی سنسنی بھی بتدریج معدوم ہوگئی۔ رات کے یخ بستہ سناٹے میں گاہے بگاہے ایک گونج سی پیدا ہوتی تھی۔ یہ ان برفانی تودوں کی آواز تھی جو ایک ڈھلوان پر پھسل پھسل کر نیم منجمد آبی گزرگاہ میں گرتے تھے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم رستم کا دل چاہا کہ اس سیاہ رات کے بجائے ایک چمکیلی صبح ہوتی۔ اس تنہائی کے بجائے کوئی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس آبی گزرگاہ کے کنارے کھڑے ہوتے اور تودوں کے گرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

وہ کیوں اتنی شدت سے یاد آتا تھا؟ کیوں.....کیوں؟ اسے اپنی سانسوں میں اس بچھڑے ساتھی کے جسم کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ اس کو دیکھنے اور چھونے کی طلب اس کے اندر اتنی شدت سے جاگتی تھی کہ اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہونے لگتی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس کے اردگرد سب سوگئے لیکن وہ جاگتا رہا۔ اس کے اردگرد لالٹین کی مدھم روشنی اور انگیٹھی میں بجھتے ہوئے انگاروں کی ناتواں حرارت تھی۔

اس کے ذہن کے ایک حصے نے جواب دیا۔ ''بی بی.....بی بی... اس سے پہلے بھی کچھ نہیں اس سے آگے بھی کچھ نہیں۔''

ذہن کے کسی اور گوشے سے پکار ابھری۔ ''لیکن ان سینکڑوں درد بھری چیخوں سے کیسے پیچھا چھڑاؤ گے جو وڈے ڈیرے کے ڈھلوانوں پر ابھری تھیں اور گولیوں کی بارش میں آہستہ آہستہ دم توڑ گئی تھیں۔ اپنے ان بدقسمت ساتھیوں کو کیسے فراموش کرو گے جنہوں نے بے بس ہوجانے کے بعد جان بچانے کے لئے ڈپٹی ریاض ہٹلر کے سامنے ہاتھ کھڑے کئے تھے لیکن انہیں بھون ڈالا گیا تھا اور تم اس نابینا مقصود عرف لڈو کا خون کیسے بھلاؤ گے جس نے تمہارے سامنے ڈپٹی ریاض کے پاؤں کے نیچے دم توڑا تھا۔ تم ان لوگوں کی موت قیامت تک نہیں بھلا سکتے۔ پوٹھوہار کی گھاٹیوں میں بہہ جانے والا ہر خونی قطرہ، ڈوب جانے والی ہر نبض اور بلند ہونے والی ہر فریاد تمہارا پیچھا کرے گی۔''

''تو پھر... پھر میری جدوجہد کا کیا فائدہ؟ میں اس ٹھنڈی دوزخ سے نکل بھی گیا اور اپنی بی بی تک پہنچ بھی گیا تو... جدائی تو پھر بھی ساتھ رہے گی۔ بی بی کے ساتھ زندگی گزارنا تو پھر بھی نصیب نہیں ہوگا۔ یہ تو دہری جدائی ہوگی۔''

وہ بہت دیر تک اپنے آپ سے دست و گریباں رہا۔ خود ہی دلائل دیتا رہا، خود ہی انہیں

حرف غلط کی طرح مٹاتا رہا۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کا چڑھایا ہوا قرض بھلا کر بی بی کے ساتھ کسی پُرسکون گوشے کی طرف ہجرت نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف بی بی سے اجازت لئے بغیر شاید مرنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس کے جذبے انوکھے تھے، اس کا عشق عجیب تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ میں کسی کو مجازی خدا کا درجہ دیا تھا اور یہ ایک عورت تھی۔ وہ سوچتا تھا، کیا کسی عورت کو مجازی خدا کہا جا سکتا ہے یا پھر اس کے لئے کوئی اور لفظ استعمال ہونا چاہیے۔ اس چار دیواری سے باہر اس بستی سے آگے تاریک پہاڑوں پر، پہاڑی نالوں پر، گلیشیرز پر اور ان سے آگے دور کے ٹو کی عظیم ڈھلوانوں پر برف گرتی رہی اور وہ سوچتا رہا...... خیالات کی دُھند میں بس ایک موہوم سا راستہ اسے نظر آ رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ...... چند دن...... یا چند ہفتے...... یا پھر چند مہینے بی بی کے ساتھ اور جب بی بی اکیلی نہ رہیں...... انہیں ایک ''معصوم آسرا'' مل جائے تو پھر خدا حافظ...... ہمیشہ کے لئے۔ کیونکہ یہی اس کا طے شدہ مقدر تھا۔

سوچتے سوچتے وہ دل میں ہنس دیا۔ اس کے خیالات اسے کیسے کیسے سراب دکھا رہے تھے۔ وہ بی بی سے دوبارہ ملنے کی باتیں یوں سوچ رہا تھا جیسے وہ راولپنڈی کے پیر ودھائی اڈے سے بس میں بیٹھے گا اور روکیٹ بستی جا پہنچے گا۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا...... یہ اس سے کئی ہزار گنا زیادہ مشکل تھا۔ وہ ایک ٹھنڈے جہنم کے قیدی تھے اور یہ جہنم گہرا نہیں تھا...... بلند تھا...... کئی ہزار فٹ بلند...... ایک ناقابلِ بیان درد کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ کر رہ گئی۔

اچانک وہ چونک گیا۔ اس نے رخ پھیر کر دیکھا۔ ''بلی'' اس کی چارپائی کے بالکل پاس چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ''بلی'' پچھلی دفعہ بڑی خاموشی سے اس کے بستر میں ہی گھس گئی تھی۔ اس مرتبہ اس نے رعایت کی تھی اور سرہانے کی طرف پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رستم نے اس ''دو پاؤں والی بلی'' کو گھورتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ اپنی چاچی کے پاس۔''

''چاچا نے کہا ہے۔''

''کیا کہا ہے؟''

''کہ میں تم کے ساتھ جاؤں گا۔''

رستم سٹپٹا گیا۔ ''وہ تو جب جاؤں گا تب جاؤ گے ناں۔ اب یہاں ڈیرہ کیوں ڈالا ہوا

''ڈیرہ...... کیا ہوتا؟''

''میرا سر ہوتا۔ اب جاؤ یہاں سے۔ چاچا تمہارے سر پر ایک بال نہیں چھوڑے گا۔'' رستم نے غصیلی سرگوشی کی۔

''میں نہیں جاتا...... تم مجھ کو چھوڑ جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں جگاتا ہوں تمہارے چاچا کو۔'' رستم نے سرگوشی کی۔

وہ ایک دم جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے...... مم...... میں جاتا...... لیکن تم بہت آچھا...... تم مجھ کو بتاؤ...... ہم کہاں جاتا؟''

رستم کے جی میں آئی کہ اس کے کولہے پر لات جما کر اسے کمرے سے باہر پھینک دے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے ضبط کیا اور کہا۔ ''تم کو بہت اچھی جگہ لے کر جاؤں گا۔ تم ایک دم خوش ہو جاؤ گی۔''

وہ سن کر ہی خوش ہو گئی۔ اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔ وہ چند لمحے تعریفی نظروں سے رستم کو تکتی رہی۔ تب اس نے اچانک رستم کے رخسار پر زور سے چٹکی لی اور کھی کھی کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

سارا دن برف باری رکی رہی مگر شام ہوتے ہی ایک بار پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ لگتا تھا کہ آج بھی دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر مورچہ بند رہیں گے لیکن جو کچھ ہوا یکایک ہوا۔ پہلے کھوہ سے کچھ فاصلے پر دستی بموں کے تین چار زوردار دھماکے ہوئے پھر دفعتاً اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ بستی کی گلیوں میں ہلچل مچ گئی۔ گھوڑے دوڑنے لگے اور للکارے یخ بستہ فضا کو گرمانے لگے۔

واس دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے سفید چہرے کے ساتھ بتایا کہ لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ زری کو گلے لگا کر رونے لگا۔ واس کی بیوی بھی آبدیدہ تھی۔ رستم نے زری کا بازو پکڑا اور اسے باہر تاریکی میں لے آیا۔ ناصر، شریف اور مالینا اس کے عقب میں تھے۔ وہ دشمنوں سے اس صورتِ حال کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ واس اور واس کی بیوی سے رخصت ہو کر وہ دوڑتے ہوئے بستی کے مشرقی کنارے کی طرف بڑھے۔ گلیوں میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔

دو تین برفیلی گلیوں میں سے گزرنے کے بعد ان کا چھٹا ساتھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ جانسن تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر صحت بہت اچھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور وہ مقامی لباس میں مقامی ہی نظر آتا تھا۔ لکڑیوں سے لدے ہوئے خچر کی رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔

''کوئی پوچھے گا نہیں کہ اس وقت لکڑیاں کہاں لے کر جا رہے ہو؟'' ناصر نے جانسن سے انگریزی میں پوچھا۔

''اس وقت کسی کو کچھ پوچھنے کا ہوش نہیں ہے۔'' جانسن نے کہا۔ ''اگر کوئی پوچھے گا تو بھی اس کا معقول جواب موجود ہے۔''

''وہ کیا؟''

''آگے لشکری مورچوں میں موجود ہیں۔ وہاں آگ جلانے کے لئے ایندھن بستی سے ہی جاتا ہے۔''

اچانک فائرنگ میں تیزی آ گئی۔ مشرقی کنارے پر تاریکی میں ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹتی نظر آئیں۔ ایک زخمی کو ہاتھوں پر اٹھائے تین افراد تیزی سے بستی کی طرف آ رہے تھے۔ اس شخص کے سر پر کلہاڑی لگی تھی۔ اس کے اونی کپڑے لہولہان ہو رہے تھے۔

بستی سے باہر نکلتے ہی برق جان کے چند مسلح ساتھیوں نے رستم اور ناصر کو دیکھ لیا..... انہوں نے ان دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھما دی اور اشاروں سے بتایا کہ ابھی تو فائرنگ ہو رہی ہے لیکن دست بہ دست لڑائی کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ اس لڑائی میں یہ کلہاڑی کام آئے گی۔

رستم نے ناصر سے کہا۔ ''ہم دونوں پر برق کے آدمیوں کی خاص نظر ہے۔ ہم نے ابھی اپنا رخ تبدیل کر لیا تو ان کو شبہ ہوگا۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''بہتر ہے کہ ہم دونوں کچھ دیر کے لئے لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ باقی سب اپنے رخ پر بڑھتے جائیں۔ موقع ملتے ہی ہم بھی ان کے پیچھے چلے جائیں گے۔''

ناصر نے انگریزی میں یہ بات جانسن کو سمجھا دی۔ اب مسئلہ زری کا تھا۔ رستم نے اسے اور مالینا کو جانسن کے ساتھ جانے کا کہا تو زری اٹک گئی۔ ''میں نہیں جاؤں گا..... تم کے ساتھ جاؤں گا۔ تم بہت آچھا۔''

''یہ سب بھی بہت آچھا۔'' رستم نے دانت پیس کر کہا۔ ''چلو جاؤ ان کے ساتھ۔''

رستم کی گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ ذرا سا گھبرائی لیکن وہیں کھڑی رہی۔ اسے سمجھانے میں رستم کو دو تین منٹ لگ گئے۔

گہری تاریکی اور برف باری میں وہ لوگ مختلف اطراف میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ چھ کے چھ پہلے ایک ساتھ ایک ہی رخ پر چلتے رہے پھر رستم اور ناصر کا رخ تو لڑائی کے

میدان کی طرف رہا مگر باقیوں نے غیر محسوس طور پر اپنا رخ تبدیل کر لیا.... قریباً ایک سو میٹر آگے برق جان کے جان نثاروں نے ایک بلندی پر پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں اور اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ برچ کے ایک سفید درخت کے پاس برق جان خود موجود تھا اور اپنا اکلوتا ہاتھ لہرا لہرا کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ رستم اور ناصر نے بھی ایک اوٹ کے پیچھے لیٹ کر روسی رائفلوں کے کندے اپنے کندھوں سے لگا لئے اور فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف سمت سے آنے والی گولیاں جب برسٹ کی شکل میں برف سے ٹکراتی تھیں تو برف پانی کی بوچھاڑ کی طرح ہوا میں اچھلتی تھی اور رائفل برداروں پر گرتی تھی۔

رستم اور ناصر کو فائرنگ کرتے بہ مشکل دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ برق جان کے قریباً ایک سو ساتھیوں نے اچانک ایک پُر جوش نعرہ بلند کیا اور پوزیشنیں چھوڑ کر آگے کی طرف دوڑے ..... وہ دشمن پر چارج کر رہے تھے۔ رستم اور ناصر کے دیکھتے ہی دیکھتے چارج کرنے والے کئی افراد فائرنگ سے زخمی ہو ہو کر گرے تاہم باقی سب افراد اپنے مخالفوں کی پوزیشنوں تک جا پہنچے۔ وہاں سے کچھ افراد تو بھاگ کر اپنی پچھلی پوزیشنوں پر چلے گئے...... جو ڈٹے رہے ان کے ساتھ برق جان کے ساتھیوں کی دست بہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں دستی بموں کے چند خوفناک دھماکے بھی ہوئے۔ رخ تبدیل کرنے کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ رستم اور ناصر اپنی جگہوں سے اٹھے اور تازہ گری ہوئی برف میں راستہ بناتے جنوب کی سمت ہٹنے لگے۔ سخت سردی کے سبب رستم کی متاثرہ ٹانگ میں اینٹھن تھی اور وہ لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

قریباً پانچ منٹ میں وہ فائرنگ اور وحشیانہ للکاروں کی آوازوں سے کافی دور نکل آئے۔ انہیں رستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ .....کہیں کوئی محافظ بھی دکھائی نہیں دیا۔ جلد ہی انہیں برف پر اپنے ساتھیوں کے قدموں کے گہرے نشانات مل گئے۔ خچر کے پاؤں کے نشانات نے تصدیق کی کہ یہ ان کے ہمراہیوں کے نقوشِ پا ہی ہیں۔ کچھ فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد وہ پھر اکٹھے ہو گئے۔ جانسن، شریف، زری اور مالینا برف کے ایک قدرتی سائبان کے نیچے رکے ہوئے تھے۔

رستم کو دیکھتے ہی زری لپک کر آئی اور اس کے بازو سے لگ کر کھڑی ہو گئی، جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو اور اسے راستہ بھولنے کا ڈر ہو۔ رستم نے شریف سے پوچھا۔ ''تم لوگ یہاں کیوں رک گئے ہو؟''

''ان گورے صاحب سے پوچھو بھرا جی یہ رک گئے تو ہم بھی رک گئے۔''

رستم نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر جانسن ایک درخت کے سوکھے تنے سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے حلیے اور لباس کے اعتبار سے بالکل مقامی ہی دکھائی دینے لگا تھا۔ ماحول اور رہن سہن انسان کی زندگی پر بڑی تیز رفتاری سے اثر کرتے ہیں۔

رستم نے سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر جانسن کے پاس پہنچا اور اس سے رکنے کی وجہ دریافت کی۔ دونوں کچھ دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ تب ناصر دھیمے قدموں سے رستم کی طرف آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کسی پرندے کا مُردہ جسم تھا۔ رستم نے غور سے دیکھا۔ یہ برفانی علاقوں میں نظر آنے والا مرغ زریں تھا۔ غالباً اسے کوئی آوارہ گولی زخمی کرتے ہوئے گزری تھی اور وہ تڑپتا پھڑکتا ہوا یہاں آ گرا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''جان صاحب کے رکنے کی وجہ۔''

''مطلب؟''

''نمک کی کان میں ہر شے نمک ہوتی ہے۔ یہ روشن خیال انگریز ہے لیکن سات آٹھ سال یہاں گزارنے کے بعد اس پر بھی ''توہم'' کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر مسافر کو رستے میں مرغ زریں کے پر پڑے ہوئے مل جائیں تو یہ سخت بدشگونی سمجھی جاتی ہے۔ سفر کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے یا راستہ بدل لینا چاہیے۔ یہاں تو پروں کے بجائے پورا پرندہ ملا ہے۔''

''یار سمجھاؤ اس باندر کو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' رستم نے جھلا کر کہا۔

ناصر پھر جانسن کے پاس چلا گیا۔ دونوں میں دو تین منٹ بات ہوئی۔ پھر ناصر اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ پرندے کو برف میں دبا کر انہوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔ وہ مسلسل ٹاپو کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لڑائی کا ہنگامہ دم بہ دم ان سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے خچر کو چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ خچر کو روک کر اس میں لدے ایندھن میں سے اپنا مطلوبہ سامان نکال لیا اور اسے آزاد کر دیا۔ مطلوبہ سامان ایک رک سیک (تھیلے) کی شکل میں تھا جس میں کوہ پیمائی کے لوازمات موجود تھے۔ یہ رک سیک ناصر نے اپنی پشت پر فکس کر لیا۔ خچر سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے باقی ماندہ فاصلہ نسبتاً تیزی سے طے کیا اور قریباً آدھ گھنٹے میں اس مقام تک پہنچ گئے جہاں اس مکعب پہاڑ کی ہموار سطح یک دم ختم ہو جاتی تھی اور آگے سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔ اس کھائی میں اترنے کا مطلب اس مکعب پہاڑ پر سے اُترنا تھا۔

کنارے کے قریب پہنچ کر وہ محتاط ہو گئے۔ ناصر نے شریف اور جانسن کو سمجھایا۔ ''تم چاروں یہاں رہو گے۔ ہم دونوں آگے جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ تم بھی اپنی گن تیار رکھو اور اگر کوئی خطرہ نظر آئے تو فائر کر کے ہمیں اطلاع دو۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جی۔'' شریف نے پنجابی میں تسلی دی۔ وہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک وہ دلیر اور چوکس شخص تھا مگر اس قسم کے حالات سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

رستم اور ناصر احتیاط سے آگے بڑھے۔ یہاں ہوا چل رہی تھی اور سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ جلد ہی ان دونوں کو لکڑی کا وہ مضبوط کیبن نظر آ گیا جو برف باری سے یکسر سفید ہو رہا تھا۔ رستم اور ناصر کی معلومات کے مطابق اس طرح کے کیبن اس ٹاپو کے کنارے اہم جگہوں پر بنائے گئے تھے۔ ان کا مقصد آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنا تھا۔ لکڑی کا کیبن گہری تاریکی میں ڈوبا برف کی موٹی چادر اوڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کیبن کسی کے استعمال میں نہیں اور اگر کوئی یہاں رہتا بھی ہے تو فی الحال اس پوسٹ کو خالی چھوڑ کر بستی کے ہنگامے میں شریک ہو چکا ہے۔

''مطلع صاف لگ رہا ہے۔'' ناصر نے سرگوشی کی۔

''لگتا تو ایسے ہی ہے مگر.....'' رستم کو فقرہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ ''یہ آواز سن رہے ہو تم؟'' رستم نے کہا۔ ناصر کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔

''اوہ گاڈ۔ یہ کتوں کی آوازیں ہیں۔'' ناصر نے تصدیق کی۔

''ہماری ہی طرف آ رہے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

دونوں تیار ہو گئے.....صرف ایک منٹ بعد انہوں نے دو سینٹ برنارڈ نسل کے کتوں اور دو محافظوں کو اپنے سامنے پایا۔ محافظوں کے سر اور چہرے چرمی برساتیوں کی ٹوپیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ چھوٹی نال کی روسی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ رستم اور ناصر کو دیکھتے ہی انہوں نے زور سے للکارا مارا۔ غالباً اپنی زبان میں وہ انہیں دھمکا رہے تھے اور ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دے رہے تھے۔

رستم اور ناصر کے پاس مکالمے کی فرصت نہیں تھی اور نہ وہ ایسا کرنا چاہتے تھے۔ رستم اور ناصر نے سب سے پہلے اپنی طرف لپکنے والے کتوں کو نشانہ بنایا۔ ایک ایک گولی سے وہ دونوں لڑھک کر برف پر گرے اور ڈھلوان پر پھسل گئے۔ اس کے بعد محافظوں کی باری آئی۔ رستم کی چلائی ہوئی گولی محافظ کے عین سر پر لگی اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح چھپاک سے تازہ پکی

برف پر گرا۔ دوسرا محافظ زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے خود کو اوندھے منہ برف پر گرایا اور ناصر کے فائر سے بچ نکلا۔

''خبردار۔'' ناصر گرجا۔

لفظ تو محافظ کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا مگر یہ بات ضرور سمجھ میں آ گئی کہ وہ نشانے پر ہے۔ اس نے اپنی رائفل خود سے دور پھینک کر اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ رستم اور ناصر بھاگ کر اس کے قریب گئے۔ وہ درد سے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ دراصل ناصر کا فائر یکسر خالی نہیں گیا تھا۔ گولی محافظ کی پنڈلی میں کہیں جا لگی تھی۔ ناصر نے ایک نظر رستم کی طرف دیکھا پھر رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور الٹی کلہاڑی سے ایک بھرپور وار محافظ کی کنپٹی پر کیا۔ پہلی ضرب ہی کافی شافی ثابت ہوئی۔ وہ بے سدھ ہوگیا۔ رستم نے اسے گھسیٹ کر ایک درخت کے نیچے کردیا۔ اب اگر اس کی قسمت ہوتی تو بچ جاتا۔ رستم اور ناصر نے اس کے لئے زندگی کا تھوڑا سا مارجن چھوڑ دیا تھا۔

دونوں کتوں میں سے ایک تو فوراً ٹھنڈا ہوگیا تھا، دوسرا جان کنی کی حالت میں لوٹ پوٹ لگا رہا تھا۔ ناصر کی رائفل سے نکلنے والی تیسری گولی نے اسے اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دیا۔ جانسن، شریف اور دونوں لڑکیاں بھاگتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ چاروں حیرت زدہ اور ڈرے ہوئے تھے۔ زری نے آتے ساتھ ہی رستم کے بازو سے لپٹنا پسند کیا۔

''کوئی اور تو نہیں ہے یہاں؟'' شریف نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

''بندہ بشر تو نظر نہیں آتا۔ کوئی بدروح نہ ہو۔'' ناصر نے پُرسکون نظر آنے کی کوشش کی۔

شریف نے ایک لہولہان مُردہ کتے کو اپنے پاؤں سے ہلکا سا ٹھوکا دیا اور ناصر سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''بھرا جی! ان مُردہ جانوروں کو دیکھ کر مجھے روکیٹ کا ایک سین یاد آ گیا ہے۔ پچھلے سال پتا نہیں کہاں سے کچھ جنگلی سؤر ہمارے علاقے میں آ نکلے تھے۔ ایک رات انہوں نے احاطے میں گھس کر بھینس کے ایک چھوٹے بچے پر حملہ کردیا۔ میرے وڈے پُتر نے فائر مار کر تین سؤر گرا دیئے تھے۔''

''تمہیں سؤر یاد آ رہے ہیں یا وڈا پُتر؟'' ناصر نے پوچھا۔

''دونوں ہی۔'' شریف نے ناصر کا ''مزاح'' سمجھے بغیر کہا۔

رستم نے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

مالینا، زری اور جانسن ڈری ڈری نظروں سے برف پر اوندھی پڑی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ نیم تاریکی میں یہ لاش کسی سیاہ دھبے کی طرح نظر آتی تھی۔ رائفل کی صورت میں ایک

اور چھوٹا سا دھبہ لاش کے پہلو میں موجود تھا۔

رستم نے پھر کہا۔ ''دیکھو ناصر! اس بات کا خطرہ ہے کہ فائرنگ کی آواز کچھ اور محافظوں کو کتوں سمیت یہاں کھینچ لائے۔ جانسن سے کہو، وہ اپنا کام جلدی شروع کرے۔''

''جانسن کچھ سُست سا نظر آ رہا ہے۔ شاید وہی پرندے والا وہم ہے۔''

''اس وہم کو لے کر بیٹھا رہے گا تو پھر وہ سچ ثابت ہو جائے گا۔''

مالینا نے بھی تائید کی۔ ''ہم کو ٹائم ویسٹ نائیں کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، میں اسے اٹھاتا ہوں۔ اب کافی دم لے لیا ہے اس نے۔'' ناصر نے کہا اور جانسن کی طرف بڑھ گیا۔

جانسن ایک ماہر کوہ پیما کی طرح حرکت میں آ گیا۔ وہ اس ہموار سطح کے کنارے پر پہنچا۔ گہرائی ہولناک اور ہوا تیز تھی۔ گہرائی کی ہولناکی اندھیرے کی وجہ سے زیادہ دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ ناصر نے ایک پتھر کنارے سے لڑھکایا۔ وہ بغیر رکے بہت دیر تک لڑھکتا چلا گیا۔ جانسن نے اپنا رک سیک کھولا اور کام میں مصروف ہوگیا۔ آہنی میخیں، برف میں گھسنے والے اسکریو، ہتھوڑیاں...... دراڑوں میں پھنسائے جانے والے اسپرنگ، بہت کچھ تھا اس رک سیک (تھیلے) میں۔ جانسن نے ٹارچ کی مدد سے کنارے کے پتھروں میں ایک مضبوط جگہ تلاش کی اور ہتھوڑے کی مدد سے وہاں آہنی کیل ٹھونکنے لگا۔ اس کام میں ناصر اس کی مدد کرنے لگا۔ رستم تھوڑی دیر کے بعد برچ کے ایک خشک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ٹانگ سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی ریچھ والے کھیل میں حصہ لیا ہے۔ اس کھیل کے بعد بھی اس کی ٹانگ ایسے ہی رات بھر اسے بے چین رکھا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ صورتِ حال بہتر ہو رہی تھی مگر ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ برف کے ''آئس اسکریو'' فٹ کرنے اور آہنی میخیں وغیرہ ٹھونکنے کے بعد جانسن نے رسے نکالے۔ دستانے، جوتے، ہتھوڑیاں، کنڈیاں اور دیگر سامان نکالنے کے بعد اس نے ناصر کو اترنے کے طریقہ کار سے آگاہ کیا۔ اس نے تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ غیر معمولی طور پر لمبا رسہ قریباً 120 میٹر لمبا ہے۔ ہم اسے ان کنڈیوں (اینگر) میں سے گزار کر دوہرا کردیں گے۔ یعنی یہ قریباً 60 فٹ کی گہرائی تک جاسکے گا۔''

''دوہرا کیوں کریں گے؟'' مالینا نے پوچھا۔

''رسے کو دوہرا نہ کیا جائے تو پھر اسے گرہ دے کر لٹکانا پڑتا ہے۔ یعنی جب آخری بندہ بھی نیچے اُتر جائے گا تو اوپر گرہ لگی رہ جائے گی اور رسہ یہاں چھوڑنا پڑے گا۔ دوہرا ہونے کی

صورت میں نیچے سے رسے کا ایک سرا کھینچ کر اسے کنڈوں سے نکالا جاسکتا ہے۔'' جانسن نے ٹیکنیکل وجہ بتائی۔

دور شمال مشرق کی طرف سے گولیاں چلنے اور دستی بم پھٹنے کی آوازیں وقفے وقفے سے آرہی تھیں۔ دو تین بار کچھ ایسی آوازیں سنائی دی تھیں جن سے رستم اور ناصر کو اندازہ ہوا کہ شاید راکٹ لانچر چلایا گیا ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مسلح فائرنگ سے کہیں آگ لگ گئی ہے۔ یہ سب کچھ بہت ڈرامائی تھا اور اس سے بھی ڈرامائی بات یہ تھی کہ وہ مارگہ بستی کی موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی تیسری کوشش کر رہے تھے۔ رستم اور ناصر کو یقین تھا کہ اگر مارگہ یعنی پاؤندہ بستی میں جنگ کی حالت نہ ہوتی تو وہ اتنی آسانی سے اس کنارے پر اپنی کارروائی نہ کر سکتے تھے۔

اب آہنی میخیں مضبوطی سے گڑی ہوئی تھیں اور رسے تاریک گہرائی میں جھول رہے تھے۔ یہاں ہوا کی شدید کاٹ کے سبب ہاتھ پاؤں منجمد ہو رہے تھے۔

رستم نے جانسن سے پوچھا۔ ''ان رسوں کے ذریعے کتنی گہرائی تک اُترنا ہے؟''

رستم کا یہ سوال ناصر نے ترجمہ کر کے جانسن تک پہنچایا۔ جانسن نے ناصر کے ذریعے جواب دیا۔ ''ہم قریباً پچاس میٹر نیچے جائیں گے۔ یہاں ہمیں پہلا اسٹاپ مل جائے گا۔''

''پہلے اسٹاپ سے کیا مراد ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

ناصر نے بتایا۔ ''مسٹر جانسن دن کی روشنی میں اس جگہ کا مکمل سروے کر چکا ہے۔ جانسن کے اندازے کے مطابق قریباً ڈیڑھ سو میٹر نیچے ایسی ابھری ہوئی چٹانیں موجود ہیں جن پر ہم پاؤں جما سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ رک سکتے ہیں۔ اس کے بعد جانسن پھر میخیں وغیرہ گاڑے گا اور مزید نیچے جانے کے لئے انتظام کیا جائے گا۔''

''دوسری مرتبہ کتنا نیچے جانا ہوگا؟'' رستم نے پوچھا۔

جانسن نے ناصر کی وساطت سے بتایا۔ ''قریباً 60 میٹر یعنی 200 فٹ اور درحقیقت یہی ہمارے اس سفر کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ یہ بالکل عمودی چڑھائی ہے بلکہ ایک دو جگہ عمودی سے بھی زیادہ ہے۔ اسے اوور ہینگنگ کہا جاتا ہے۔ میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ہمیں کتنا نیچے جانا ہوگا لیکن اندازہ وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد ہمیں پھر اسٹاپ ملے گا اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ بعد میں اترائی نسبتاً آسان ہو جائے گی۔ یہ مکمل Vertical پوزیشن میں نہیں ہوگی ہم اپنے پاؤں کا استعمال

کر سکیں گے۔''

''پہلے نیچے کون اُترے گا؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''میں نے جانسن سے طے کر لیا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''سب سے پہلے میں اتروں گا اور نیچے جا کر صورت حال کو سنبھال لوں گا۔ اس کے بعد باری باری سب اتریں گے۔ یہاں پر جانسن کنٹرول کرے گا۔ آپ یا جانسن آخر میں اتریں گے۔''

جانسن نے جلدی جلدی ناصر کو وہ جانگیہ نما چیز پہنائی جسے وہ ''سٹ ہارنس'' کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد دستانے اور ہیلمٹ وغیرہ بھی پہنا دیئے۔ اس نے رستے کو مختلف ''کیرابینرز'' میں سے گزارنے کے بعد ناصر کو بتایا کہ اس نے کس طرح رسے کو آہستہ آہستہ ہاتھ سے چھوڑنا ہے اور نیچے کو پھسلنا ہے۔ ناصر نے یہ سب کچھ بڑی آسانی سے سمجھ لیا۔ رسے سے جھولنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد تاریکی کا حصہ بن گیا۔ وہ سب بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ آخر ناصر نے نیچے پہنچ کر رسے کو خاص انداز میں ہلایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ لوگ رسے کو اوپر کھینچ لیں۔

''اب یہ رسے کو واپس کیوں کھینچ رہے ہیں؟'' شریف نے رستم سے پوچھا۔

''اس معاملے میں، میں بھی تمہاری ہی طرح ہوں۔ بس ایک اندازہ سا ہے کہ جو سامان ناصر کے ساتھ نیچے گیا ہے وہ اوپر آئے گا۔''

رستم کا اندازہ درست تھا۔ جب جانسن اور رستم نے مل کر رسے کا ایک سرا اوپر کھینچا تو اس کے ساتھ دستانے، ہیلمٹ اور نائیلون کی وہ جانگیہ نما پٹیاں تھیں جنہیں جانسن ''سٹ ہارنس'' کہتا تھا۔ دراصل کوہ پیمائی کا یہ سامان صرف ایک شخص کے لئے تھا۔ ناصر یہ چیزیں پہن کر نیچے گیا تھا اور اب اس نے اوپر بھیج دی تھیں۔ جانسن کی ہدایت پر رستم نے رسا پھر نیچے گہرائی میں پھینک دیا۔

دوسری باری مالینا کی تھی۔ وہ بھی کامیابی سے نیچے اُتر گئی۔ سامان پھر اوپر واپس آ گیا۔ شریف ہچکچا رہا تھا۔ وہ بار بار خشک لبوں پر زبان پھیرتا تھا اور نیچے تاریک گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کرتا تھا۔ رستم کو اسے نیچے بھیجنے میں محنت کرنا پڑی۔ اب زری کی باری تھی۔ وہ مسلسل رستم کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گا...'' وہ بار بار کہتی تھی۔ اس کے بعد مقامی زبان کے دو چار ناقابل فہم لفظ بولتی تھی اور کہتی تھی۔ ''میں تم کے ساتھ جاؤں گا۔''

جانسن مقامی زبان میں شد بد رکھتا تھا۔ اس نے پچھلے ایک گھنٹے میں زری کو نیچے

اترنے کے حوالے سے کافی کچھ سمجھایا تھا۔ رستم نے بھی کافی کوشش کی اور اسے بتایا کہ وہ دیر کرے گی تو سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔ انہوں نے زری کو اچھی طرح سٹ بارنس میں بٹھایا اور کسی نہ کسی طرح نیچے اُتار دیا۔

رستم کا خیال تھا کہ جانسن سب سے آخر میں [illegible] ناپسند کرے گا لیکن وہ کچھ خوف زدہ نظر آتا تھا۔ بار بار بستی کے رخ پر دیکھنے لگتا تھا۔ رستم کے مشورے کے بغیر ہی وہ اپنے رک سیک کے ساتھ نیچے اُتر گیا۔ اب رستم اس ٹاپو کے کنارے یعنی رائفل اور خوراک کے چھوٹے سے تھیلے کے ساتھ تنہا تھا۔ یہ تھیلا وقتِ رخصت واس کی بیوی نے بھیگی آنکھوں اور دعاؤں کے ساتھ اسے تھمایا تھا۔ قریباً بیس منٹ رستم نے اس کنارے پر تنہا گزارے۔ اس سے چند میٹر دور ایک انسانی اور دو حیوانی لاشیں پڑی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ اور لوگ اسے لاش بنانے یا خود لاشیں بننے کے لئے اس کنارے پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر رستم کی باری آئی اور وہ بھی یخ بستہ تاریکی میں جھولتے ہوئے طویل رسے کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ اس کے پاؤں جس جگہ برف پر ٹکے وہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ یہ مشکل بارہ ضرب پانچ فٹ کی ایک چٹان سی تھی جو عمودی دیوار سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ جیسے خوفناک بلندی پر واقع ایک بالکونی بغیر حفاظتی جنگلے کے۔ وہ سب سکڑ سمٹ کر وہاں بیٹھے تھے اور ہوا کی طوفانی کاٹ کا مقابلہ کر رہے تھے۔

''اوپر خیریت رہی ہے ناں؟'' ناصر نے رستم سے پوچھا۔

''ہاں......اور یہاں؟''

''صرف شریف کو تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔ وہ سٹ بارنس سے نکلتے ہوئے پھسل کر گر گیا تھا۔ سر پر چوٹ لگی ہے۔''

رستم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ شریف کی ایک آنکھ سوج کر کپا ہو گئی تھی۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو یقیناً ناصر نے ہی باندھی تھی۔ رستم نے اسے تسلی دی اور اپنے تھیلے میں موجود فلتو مفلر اسے تھما دیا۔ جانسن نے مہارت کے ساتھ رسا نیچے کھینچ لیا تھا۔ اب وہ پھر سے آئس اسکریو لگانے کے لئے مناسب پختہ برف ڈھونڈ رہا تھا۔ ناصر بھی اس حوالے سے اس کی مدد کرنے لگا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ مختلف جگہوں کو دیکھتے اور مشورہ کرتے رہے۔ آخر ایک جگہ انہوں نے منتخب کر لی۔ یہاں وہ آئس اسکریوز کے ذریعے اینکر یعنی وہ مضبوط ٹھکانہ بنا سکتے تھے جو وزن سہار سکتا۔ رستم کے ہاتھ میں [illegible] تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار ڈیڑھ سو فٹ اوپر کھائی کے کنارے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ [illegible] جان لینے کو تیار تھا۔ رسہ لٹکانے کے لئے ایک مضبوط اینکر بناتے بناتے انہیں قریباً ایک گھنٹہ مزید

لگ گیا۔ اس دوران میں رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ برف باری ہلکی ہو گئی تھی لیکن تھمی نہیں تھی۔ انہیں بار بار اپنے کندھوں اور ٹوپیوں سے برف جھاڑنا پڑ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات کے گہرے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ جانسن بار بار نیچے جھانک رہا تھا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رسے کے دونوں نچلے سرے اس مقام تک پہنچے ہیں یا نہیں جہاں انہیں لینڈ کرنا ہے۔ ضروری تھا کہ اجالا بڑھ جائے تاکہ وہ ٹھیک سے دیکھ سکے۔ دوسری طرف یہی اجالا ان کے لئے خطرناک بھی تھا بے شک برف باری جاری تھی مگر انہیں اوپر سے دیکھا جا سکتا تھا۔

''کیا بات ہے شریف، تم بالکل چپ ہو گئے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی......بس ذرا سر گھوم رہا ہے۔''

''لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کچھ بات ہے۔'' ناصر نے اسے کریدا۔

''نہیں......میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بولا۔

رستم اور ناصر نے معنی خیز نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ درحقیقت جوں جوں اندھیرا چھٹ رہا تھا ایک نہایت خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے عیاں ہو رہا تھا۔ وہ اس گہرائی کا منظر تھا جس میں وہ اُترے تھے اور ابھی انہیں مزید اُترنا تھا۔ رستم نے سوچا یہ سب کچھ اندھیرے میں ہی لپٹا رہتا تو اچھا تھا۔ جس مختصر چھجے پر وہ بیٹھے تھے اس سے نیچے دیکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور انہیں صرف دیکھنا ہی نہیں تھا نیچے اُترنا بھی تھا۔

''حوصلہ رکھو شریف پہلے ہم اتریں گے۔ تم بے شک سب سے آخر میں اُتر جانا۔'' ناصر نے اسے تسلی دی۔

وہ چپ رہا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ کچھ لوگ غیر معمولی بلندی سے خوف کھاتے ہیں، خاص طور سے ایسی بلندی جہاں کوئی حفاظتی انتظامات نہ ہوں۔ شاید شریف بھی کسی ایسے فوبیا کا شکار تھا اور حقیقت یہ تھی کہ وہ سب ہی اس خوفناک بلندی کو اجالے میں دیکھ کر اندر سے لرز گئے تھے۔ جانسن کا اندازہ تھا کہ مزید ڈیڑھ دو سو فٹ نیچے جانے کے بعد اُترنا قدرے آسان ہو جائے گا مگر ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نیچے کی صورتِ حال مشکوک ہی لگتی تھی۔

ناصر کو ایک مرتبہ پھر سب سے پہلے اُترنا تھا۔ اس نے سٹ ہارنس پہنا اور دیگر لوازمات پورے کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جانسن اس کی مدد کر رہا تھا۔ رستم نے آئس اسکریوز یعنی برف میں لگنے والی چار عدد میخوں کو بار بار احتیاط سے چیک کیا تھا۔ ان میخوں

کے علاوہ کچھ مخصوص اسپرنگ اور ہک بھی ایک پتھریلی دراڑ میں پھنسائے گئے تھے۔ ناصر کے اترنے سے پہلے وہ سب کے سب تناؤ کی کیفیت میں تھے۔

اچانک مالینا چلائی۔ ''دیکھو......دیکھو......واٹ از گوئنگ آن۔''

رستم اور ناصر نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا اور بُری طرح چونک گئے۔ شریف دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور ایک طرف کو جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ''شریف......شریف۔'' رستم نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑا۔

شریف کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چلی گئیں اور وہ رستم کے ہاتھوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا۔

ناصر بھی لپک کر قریب آیا۔ شریف کا منہ کھل گیا تھا اور سانس ایک آواز کے ساتھ آ جا رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ناصر اس کیفیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ ''اسے کیا ہوا ناصر؟'' رستم نے چلا کر پوچھا۔

''کوئی اٹیک سا ہے۔ شاید ہارٹ اٹیک۔''

ناصر نے جھٹکے سے اس کی جیکٹ کی زپ کھول دی۔ مفلر چہرے سے ہٹا دیا۔ ''شریف......شریف۔'' اس نے پکارا پھر اس کی نبضیں دیکھنے کے بعد اپنے ہاتھوں کے دباؤ سے اس کے دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ شریف کی سانس رکنے لگی، ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ یہی وقت تھا جب ان پر ایک اور آفت ٹوٹی۔ اوپر ٹاپو کے برفیلے کنارے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی شور تھا جس کا اندیشہ کئی گھنٹوں سے انہیں ڈرا رہا تھا۔ یہ زیادہ تھے۔ یقیناً ان کے ساتھ زیادہ محافظ بھی تھے۔ یقیناً اوپر موجود لوگوں کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ محافظ اور کتوں کی لاشیں دیکھ لی گئی ہوں یا پھر ویسے ہی بستی میں ان کی غیر موجودگی کا پتا چل گیا ہو۔

''دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔'' رستم نے پکار کر کہا۔

وہ سب دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ اس طرح ممکن ہو گیا کہ وہ اوپر سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد سے وقتی طور پر بچ جائیں۔ یہ ایک قدرتی سائبان سا تھا مگر اس کی چوڑائی دو ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اوپر سے زوردار آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ غالباً وہ لوگ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ فرار ہونے والے کس طرف سے اُترے ہیں۔ ناصر نے سرگوشی کی۔ ''انہیں پتا چلانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اوپر لگا ہوا آنکڑا بڑی جلدی مل جائے گا۔''

''اب کیا کریں؟'' رستم نے کہا۔

''ابھی پوری طرح روشنی نہیں ہوئی۔ برف باری کی وجہ سے بھی دیکھنے کی حد کم ہے۔ ہم جتنی جلدی نیچے کی طرف چلے جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

چند سیکنڈ بعد یہی بات جانسن نے بھی انگریزی میں دہرائی۔ کتوں کا شور سننے کے بعد اس کا چہرہ برف کی طرح سفید نظر آنے لگا تھا۔

ناصر نے ایک بار پھر تشویش ناک نظروں سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس کی سانس خرخراہٹ کے ساتھ چل رہی تھی۔ گردن پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ بے ہوش تھا۔ رستم اور ناصر وغیرہ نے اپنی اپنی جیکٹیں اُتار کر اس پر ڈال دی تھیں۔ ڈاکٹر مالینا کے پاس نہ جانے کب سے دوائیوں کا ایک چھوٹا سا پیکٹ موجود تھا۔ اس میں زبان کے نیچے رکھنے والی گولی بھی موجود تھی۔ یہ گولی اس نے شریف کی زبان تلے رکھ دی۔ ناصر اور مالینا کی کوششوں سے شریف کی سانس قدرے بحال ہو گئی۔ ڈوبی ہوئی نبضیں بھی ابھر آئیں لیکن وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ ''اب اس کا کیا کیا جائے؟'' ناصر نے پریشانی سے کہا۔

''نو مین......اس کو تم نیچے نائیں لے جا سکتا۔'' مالینا نے مایوسی سے کہا۔

''لیکن اس کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔'' رستم نے کہا۔

''تو پھر سب اِدھر ہی مرو۔'' جانسن یک دم بھڑک کر بولا۔

ناصر نے ہاتھوں کے اشاروں سے جانسن سے کہا کہ وہ ذرا تحمل سے کام لے۔ جانسن بڑبڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

رستم نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سے کوئی شریف کو اٹھا کر نیچے اُتر جائے؟''

''کیسے کریں گے بھائی یہ نہیں ہو سکے گا۔'' ناصر نے کہا۔

رستم اور ناصر ایک بار پھر شریف کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کسی عورت کا نام لے رہا تھا۔

''آمنہ کون ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اس کی بیوی۔ دونوں میں جھگڑا ہے۔ وہ کسی اور گاؤں میں رہتی ہے۔''

چند سیکنڈ بعد شریف کی سانس پھر بھاری ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن طبی امداد یہاں دور دور تک نہیں تھی ... چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ زندگی سے عاری برف اور قاتل دشمن سر پر پہنچ چکا تھا۔ رستم مسلسل یہ اندازہ لگانے کی

کوشش کر رہا تھا کہ یہاں پہنچنے والے لوگ کون ہوں گے۔ شوتم کے ہرکارے یا برق جان کے کاندے؟ اس سوال کا جواب اس بات سے بھی مشروط تھا کہ اوپر بستی میں ہونے والی لڑائی میں کس کا پلڑا بھاری رہا ہے۔

یکایک اوپر سے چند للکارے سنائی دیئے۔ پھر تڑ تڑ کی لرزہ خیزہ آواز نے ان کے دل دہلا دیئے۔ یہ کلاشنکوف کی فائرنگ تھی۔ بالکونی کے باہری کنارے سے بہت سی تازہ برف اچھل کر گہرائی میں گر گئی۔ تب دوسرا برسٹ چلا۔ یہ برسٹ تھوڑا دائیں جانب تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر موجود لوگوں کو ابھی ان کی صحیح پوزیشن کا پتا نہیں چلا۔ وہ صرف قیافے سے گولی چلا رہے تھے۔ وہ بلند آوازوں میں چلا بھی رہے تھے۔ اپنی زبان میں غالباً وہی الفاظ دہرا رہے تھے جو صدیوں سے ہر آقا اپنے بھاگنے والے غلام یا قیدی کے لئے پکارتا ہے۔ ''رک جاؤ......رک جاؤ......میں تم سے زیادہ طاقت ور اور بااختیار ہوں۔ لہٰذا مجھے حق ہے کہ تمہیں غلام رکھوں۔ رک جاؤ......ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

ہر زمانے میں ان فقروں کے الفاظ اور انداز مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم یہی رہتا ہے۔ جانسن جھلا کر بولا۔ اس کی پھنکارتی ہوئی انگریزی میں سے بس چند الفاظ ہی رستم کی سمجھ میں آ سکے۔ غالباً وہ ناصر سے کہہ رہا تھا کہ تم مشرقی لوگ پرلے درجے کے بے وقوف ہوتے ہو۔ ایک مرتے ہوئے شخص کے ساتھ سارے مر جاتے ہو۔

رستم کا دل چاہا کہ اس سے کہہ دے......اگر اپنے بے بس ساتھی کو بے رحم دشمن کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ جانا بے وقوفی ہے تو اس پر ہم ہزاروں عقل مندیاں قربان کر سکتے ہیں۔

جانسن اب ڈاکٹر مالینا سے محوِ گفتگو تھا۔ وہ بپھرے ہوئے انداز میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مالینا الجھن میں نظر آتی تھی۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' رستم نے ناصر نے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے میں نیچے جا رہا ہوں۔ تم بھی آنا چاہو تو آ جاؤ۔ جو بھی آنا چاہے آ جائے۔ ہمارے پاس اب دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔''

اس دوران میں دو برسٹ اور چلے۔ گولیوں کی گونج دیر تک گہرائی میں گونجتی رہی۔ یخ بستہ گہرائی جو کسی عفریت کی طرح منہ کھولے ان کے سامنے موجود تھی۔

گونج ختم ہوئی تو اوپر سے ایک جانی پہچانی آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ بے شک ان کے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ یہ مترجم واس ہی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رستم! تم لوگ جہاں بھی ہو وہیں رک جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔ تمہارے بچنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔''

اس نے کچھ اور بھی کہا لیکن الفاظ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ سکے۔

جانسن نے خلا میں جھولتا ہوا رسہ اپنے سٹ ہارنس کے ساتھ منسلک کر لیا تھا اور اب نیچے اترنے کے لئے یکسر تیار تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی مہارت کے ساتھ رسے سے جھول کر نیچے اترنے لگا۔ وہ ہلکی براؤن شلوار قمیص اور سفید جیکٹ میں تھا۔ ہیلمٹ بھی آف وہائٹ تھا۔ یہ لباس برف میں ڈھک کر برف کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔

مالینا نیچے جانے کے لئے نیم رضامند نظر آتی تھی جب کہ ناصر بھی بار بار سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھتا تھا۔ ان کے سامنے اہم ترین سوال یہ تھا کہ کیا وہ اپنے ساتھی کو یہاں چھوڑ کر اپنی جان بچا سکتے ہیں یا بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بے حد مشکل تھا۔ شریف کا سر رستم کی گود میں تھا اور اس نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہی رستم کی کلائی تھام لی تھی جیسے اس برفیلے جہنم اور ان سفاک دشمنوں کے درمیان یہ کلائی اس کا آخری سہارا ہو۔

''تم اسے کسی طرح میری پشت پر باندھ دو۔ میں اسے نیچے لے جاؤں گا۔'' رستم نے ایک عزم سے کہا۔

''یہی بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میں نیچے اترنے میں آپ سے زیادہ آسانی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں شریف کو آرام سے لے جاؤں گا۔ یہاں فالتو رسیاں اور بیلٹس موجود ہیں۔ آپ اور مالینا مل کر اسے میرے ساتھ باندھ دیجئے اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔''

ڈاکٹر مالینا نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس تجویز سے اتفاق کر رہی تھی۔ رستم نے اپنی سی کوشش کی مگر ناصر نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔

مالینا اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''ویسے ہام کو نائیں لگتا کہ ون آور (ایک گھنٹے) سے پہلے برق جان کا گارڈز نیچے اُتر سکیں گا۔ ''ماؤنٹ ننگ'' کے سامان کے بغیر یہ ایک ڈیفی کلٹ ٹاسک (مشکل کام) ہائیں۔''

شریف اب ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا اور ایک آنکھ سوج کر بالکل بند ہو گئی تھی۔ مالینا کا مشورہ تھا کہ شریف کو ناصر کی پشت پر باندھنے کے بجائے سامنے کی طرف اٹیچ کیا جائے۔ یہ زیادہ آسان اور قابلِ عمل ہوگا۔ وہ رستم کے ساتھ مل کر رسیوں کو سلجھانے لگی۔ زری حسبِ معمول رستم سے جڑ کر کھڑی تھی۔

گہرائی میں لٹکے ہوئے رسے کے تناؤ اور حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ جانسن ابھی اُتر رہا ہے۔ برف باری کچھ دیر تک دھیمی رہنے کے بعد پھر تیز ہو گئی تھی۔ یکایک رستم کی آنکھوں

کے سامنے برق سی لہرائی۔ ایک ساعت شکن دھماکے نے اسے سن کر دیا۔ جس برفیلی چٹان پر انہوں نے پناہ لے رکھی تھی اس کے کنارے کی بہت سی برف اچھل کر اتھاہ گہرائیوں میں بکھر گئی۔ اس کے ساتھ ہی رستم نے اس آنکڑے کو بھی فضا میں اچھلتے اور اوجھل ہوتے دیکھا جس کے سہارے جانسن کھائی میں اُتر رہا تھا۔

یہ بڑے سائز کے دستی بم کا دھماکہ تھا۔ ایک پرخچہ رستم کے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ دوسرا مالینا کے پاؤں میں کہیں لگا۔ وہ درد سے چیخ کر وہیں دوہری ہوگئی۔ رستم اور ناصر پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی بالکونی کے اس کنارے کو دیکھ رہے تھے جہاں جانسن نے میخیں وغیرہ لگا اینکر تیار کیا تھا۔ اب وہاں ایک گڑھے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جانسن یقینی طور پر برفیلی کھائی کی اتھاہ گہرائی میں گر چکا تھا۔ شاید پرندے والی بدشگونی نے اسے کھالیا تھا یا پھر اس کے اپنے وہم نے اسے نگل لیا تھا۔ غالباً دوسری بات ہی درست تھی۔ پرندے، پھول اور دریا تو خوب صورتی کا استعارہ ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بدشگونیاں انسان خود وابستہ کرتا ہے۔ انسان کی تقدیر ان شگونوں میں نہیں اپنے ارادوں میں پوشیدہ ہوتی ہے اور جب وہم ان ارادوں کو چاٹتا ہے تو شگون خود بخود سچ ثابت ہوجاتے ہیں۔

ناصر مالینا کی طرف لپکا اور اس کے پاؤں کے زخم کو دیکھنے لگا۔ ایک آہنی ٹکڑا اس کی نازک پنڈلی کو زخمی کرتا گزر گیا تھا۔ ''ہڈی بچ گئی ہے۔'' ناصر نے لرزاں آواز میں کہا۔

اسی دوران میں اوپر سے واس کی پکارتی ہوئی آواز پھر ان کے کانوں تک پہنچی۔

''سامنے آکر ہتھیار پھینک دو، ورنہ وہیں ختم ہوجاؤ گے۔''

یہ زبان تو واس کی تھی لیکن الفاظ برق جان وغیرہ کے تھے اور یہ لوگ اپنی سفاکی میں یکتا تھے۔ اس سفاکی کا ایک ثبوت انہوں نے ابھی چند سیکنڈ پہلے دستی بم پھینک کر فراہم کیا تھا۔ ایسے ہی مزید ثبوت وہ آنے والے منٹوں میں فراہم کرسکتے تھے۔ یہ مختصری چٹان انہیں زیادہ دیر بچا نہیں سکتی تھی۔ دو ڈھائی فٹ چوڑے قدرتی چھجے نے انہیں فائرنگ کی براہِ راست زد سے تو محفوظ کردیا تھا لیکن یہاں گرنے والے دستی بم کی مار سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔

اوپر کنارے پر واس مسلسل پکار رہا تھا اور برق جان وغیرہ کی دھمکیاں ٹرانسفر کررہا تھا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ بات رستم اور ناصر اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر وہ پکڑے گئے تو ان کی سزا موت سے کم نہیں ہوگی۔ ان کے ہاتھوں کم از کم ایک بندہ تو قتل ہو ہی چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ دوسرا بھی چل بسا ہو۔

''یہاں ایک دراڑ ہے لیکن اس کے سامنے یہ پتھر پڑا ہے۔ اگر ہم اسے کسی طرح سرکا

سکیں تو عارضی پناہ مل سکتی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''لیکن اسے ہلانے کے لئے تو آٹھ دس بندے بھی کافی نہیں ہوں گے۔'' رستم نے کہا۔

ابھی رستم کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ایک اور ساعت شکن دھماکہ ہوا۔ کنارے پر بہت سی برف اچھلی اور بارود کی تیز بُو پھیل گئی۔ یہ دستی بم عین نشانے پر گرا تھا۔ چند ٹکڑے سامنے والی دیوار سے ٹکرائے اور بہت سے سنگریزے چاروں طرف بکھر گئے۔ رستم نے جلدی سے شریف کو دیکھا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ زری گوشے میں دبکی ہوئی تھی۔ ناصر نے اسے اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ مالینا شاید دھماکے کے زور سے گر گئی تھی۔ رستم نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا... وہ مرچکی تھی۔ بم کے ایک ٹکڑے نے اس کے سینے کو یوں ادھیڑا تھا کہ پھٹی ہوئی جیکٹ میں سے کٹی ہوئی پسلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

گرم خون برف پر راستہ بناتا تیزی سے گہرائی کی طرف جارہا تھا۔ رستم کا چہرہ چٹان کی طرح سخت نظر آنے لگا۔ رائفل پر اس کی گرفت مضبوط تر ہوگئی۔ اگر مالینا کو مارنے والے اس کی زد میں ہوتے تو وہ یقیناً اس وقت آٹھ دس بندوں کو ڈھیر کردیتا لیکن وہ تو اسے دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ مالینا کی لاش دیکھ کر ناصر بھی سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ زری کی نگاہ زخم پر نہیں پڑی تھی تاہم بہتے خون کو دیکھ کر وہ بھی زور زور سے چلانے لگی۔

یہ جگہ ان کے لئے چوہے دان ثابت ہورہی تھی۔ وہ بالکل بے بس ہوگئے تھے۔ اگر شریف کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو رستم اور ناصر پھر بھی کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ گرنے والا اگلا دستی بم ان چاروں کے پرخچے اُڑا سکتا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک اور دستی بم ہوا میں تیرتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور نیچے کہیں ٹکرا کر پھٹ گیا۔ وہ مزید رسک نہیں لے سکتے تھے۔ یہ بہادری نہیں حماقت تھی۔ وہ یہ لڑائی ہار گئے تھے۔ رستم نے زری کا سفید اونی اسکارف بندوق کے سرے پر باندھ کر ہوا میں لہرا دیا۔ یہ ایک طرح سے ہتھیار پھینکنے کا اشارہ تھا۔

کچھ دیر بعد اوپر سے واس کی پکارتی ہوئی آواز سنائی آئی۔ ''ہم نے سفید کپڑا دیکھ لیا ہے۔ تم اپنے ہتھیاروں سمیت سامنے آجاؤ۔''

رستم اور ناصر رائفلوں سمیت سامنے آگئے۔

برف باری رکی ہوئی تھی۔ اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ اوپر سے سن کا ایک لمبا رسا چٹان کی خون آلود بالکونی تک پہنچ گیا۔ اوپر کنارے پر درجنوں رائفل بردار نظر آرہے تھے۔

کلہاڑیوں کے پھل بھی صبح کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ واس اور اس کی زخمی کلائی پر بندھی ہوئی سفید پٹی تک رستم کو دکھائی دی۔

واس نے پکار کر کہا۔ ''اپنی رائفلیں اور کلہاڑیاں اس رسے کے ساتھ باندھ دو اور خبردار اب مزید ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔'' پھر وہ ذرا وقفہ دے کر بولا۔ ''کیا تم یہاں سے اور نیچے جاسکتے ہو؟''

رستم اور ناصر چونک گئے۔ یہ آخری فقرہ واس نے مترجم کی حیثیت سے نہیں ان کے دوست اور خیر خواہ کی حیثیت سے بولا تھا۔

''نہیں......ہم نیچے نہیں جاسکتے۔'' ناصر نے پکار کر کہا۔

''تم نے اپنے لئے بہت مشکل پیدا کرلی ہے.....چلو اب کیا ہوسکتا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کرنا پڑے گا۔'' واس کی آواز لرز رہی تھی۔ رستم اور ناصر نے اپنی رائفلیں اور دونوں کلہاڑیاں رسے کے ساتھ باندھ دیں۔ رسا فوراً اوپر کھینچ لیا گیا۔

ناصر نے جواں سال ڈاکٹر مالینا کی لاش ایک کپڑے سے ڈھانپ دی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی جیسے کبھی زندہ تھی ہی نہیں۔ وہ جب چند ماہ پہلے راولپنڈی سے ہوتی ہوئی گورے کے بنگلے میں پہنچی ہوگی تو اسے کیا پتا تھا کہ اب وہ کبھی ان پہاڑوں سے واپس نہ جاسکے گی۔ وہ پہلے اسکردو سے آگے اس برف زار میں پہنچی تھی اور پھر کئی دشوار مراحل سے گزر کر آج اس برفانی چھجے پر جان ہار گئی تھی۔ رستم کے کانوں میں مالینا کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو چار دن پہلے اس نے عجیب جذباتی انداز میں کہے تھے۔ اس نے رستم کا بازو تھام کر کہا تھا۔

''تھینک یو رستم۔''

یہ تھینک یو اس کوشش کے لئے تھا جو رستم نے مالینا کی جان بچانے کے لئے کی تھی۔ وہ کلہاڑی سونت کر دیوانہ وار شوتم خان کے سامنے آگیا تھا۔

لیکن اس کوشش کے طفیل مالینا کی زندگی میں بس چار پانچ دن کا اضافہ ہی ہوسکا۔ آج اس کے سانس پورے ہوگئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مزید رسے کنارے سے اس چٹان تک جھولنے لگے۔ کچھ ماہر پاؤندے ان رسوں کے ذریعے نیچے اُتر رہے تھے۔

قریباً دو گھنٹے بعد وہ چاروں اوپر کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ رستم کنارے پر آنے والا آخری شخص تھا۔ جس رسے کے ذریعے اسے اوپر کھینچا گیا تھا وہ ابھی تک اس کے کندھوں اور کمر سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد درجنوں کرخت چہرے والے رائفل بردار

تھے۔ رستم نے مڑ کر دور نشیب میں دیکھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ نیچے دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ برف کی سفید چادر میں اسے دائیں جانب جو سیاہی مائل دھبا نظر آرہا تھا وہ جانسن کی لاش تھی۔ آنکڑا نکلنے کے بعد وہ قریباً ڈیڑھ دو ہزار فٹ نیچے گرا تھا اور اس کے اعضا شاید مرغ زریں کے پروں کی طرح ہی بکھر گئے تھے۔ یہاں پاس ہی ایک اور سیاہ دھبہ بھی موجود تھا۔ وہ بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ ڈاکٹر مالینا کی لاش تھی۔ رستم وغیرہ کو اوپر لانے سے پہلے پاؤندوں نے مالینا کی لاش کو بے دردی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔

رستم نے ایک آہ بھر کر رخ پھیر لیا۔ سامنے ہی ایک اسٹریچر نما تختے پر شریف کا نیم بے ہوش جسم پڑا تھا۔ اس کے جسم کے گرد رسیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سردی سے وہ سفید پڑ رہا تھا۔

جونہی رستم اوپر پہنچا قہر آلود نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ تاہم برق جوان اسے اردگرد نظر نہیں آیا۔ رستم نے واس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے اس ساتھی کی حالت ٹھیک نہیں، اسے علاج کی ضرورت ہے۔ تم نے اسے یہاں لاکر سردی میں پھینک دیا ہے۔''

واس نے رستم کے فقروں کا ترجمہ کرکے برق کے ایک دراز قد ساتھی تک پہنچایا۔ جواب میں خاصا سخت ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ دراز قد شخص نے آتش فشاں لہجہ اختیار کیا......غالباً رستم اور اس کے ساتھیوں کو گالیاں وغیرہ دی گئی تھیں۔

ناصر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ واس سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''ہمیں اس ساتھی کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو تم اتنی آسانی سے ہمارے ہتھیار نہ رکھوا سکتے۔ اب اس کی سلامتی کی ذمے داری تم پر ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

ناصر نے اپنی آہنی بیڑی کو گھسیٹتے ہوئے شریف کی طرف بڑھنا چاہا تو ایک ہٹے کٹے شخص نے اسے زور سے دھکا دیا۔ ناصر گر گیا۔ پھر وہ شخص پھنکارتا ہوا نیم بے ہوش شریف کی طرف بڑھا۔ اس کی پسلیوں پر بے رحمانہ ٹھوکر لگائی اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ یہ تنومند شخص وہی ''نے مان'' تھا جس کو ریچھ کے کھیل کی وجہ سے رستم کے ساتھ رقابت تھی۔

یہ سارا منظر رستم کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ یکایک وہ سب کچھ بھول گیا۔ اردگرد موجود لوگوں اور ان کے مہلک اسلحے کی پرواہ کئے بغیر وہ عقاب کی طرح ''نے مان'' پر جا پڑا۔ اس کے سر کی طوفانی ضرب نے ''نے مان'' کا جبڑا اچیخ دیا اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ چند سیکنڈ کے اندر رستم نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور پھر نہایت نفرت سے دو مرتبہ اس کے منہ پر تھوکا۔ ''نے مان'' کی گردن رستم کے ہاتھ کے شکنجے میں تھی۔

دفعتاً بہت سے افراد رستم پر پل پڑے لیکن وہ تو شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ وہ برق کی طرح

تڑپ کر حریفوں کے نرغے سے نکلا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس صورتِ حال کو سمجھتا یا کچھ کرسکتا، رستم نے ایک قریب کھڑے عمر رسیدہ پاؤندے کی کمر سے چھوٹے دستے کی مخصوص کلہاڑی کھینچ لی۔ اگلے دو تین منٹ میں گھمسان کا رن پڑا۔ ناصر تو پاؤں میں بیڑی ہونے کے سبب بے بس ہوگیا تھا، رستم بے بس نہیں تھا۔ اس نے مزاحمت کا حق ادا کردیا۔ پانچ پاؤندے اس کے مقابل تھے۔ باقی سب ایک وسیع دائرے کی شکل اختیار کرگئے تھے۔ وہ سب ششدر تھے۔ وہ سب کے سب پیدائشی جنگجو اور لڑاکے تھے لیکن وہ جس کو برسرِ پیکار دیکھ رہے تھے وہ سب سے جدا تھا۔ وہ آسمانی برق کی طرح اپنے حریفوں کے درمیان چمکا اور لپکا۔ اس نے تین افراد کو زخمی کر کے گرا دیا۔ ان میں سے ایک "نے مان" بھی تھا... اس کی کلہاڑی اور کلائی دونوں ٹوٹ گئی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ سات آٹھ افراد مزید لڑائی میں شریک ہوگئے اور انہوں نے رستم کو چھاپ لیا۔ رستم برف پر گر گیا اور کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ "نے مان" درد اور غضب سے چنگھاڑتا ہوا رستم پر پل پڑا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے رستم کے جبڑے پر طوفانی مکے رسید کئے اور اس کی داڑھی لہولہان کردی۔ رستم کے لمبے بال کم از کم چار ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ "نے مان" نے گلے سے "آخ" کی آواز نکال کر رستم کے چہرے پر تھوکنے کے لئے لعاب جمع کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ تھوک سکتا ایک ٹھوکر اس کے کندھے پر پڑی۔ وہ رستم کی چھاتی سے لڑھک کر دور جا گرا۔

"نے مان" کو ٹھوکر رسید کرنے والا برق جان ہی تھا۔ اس کی ایک آستین ہوا میں جھول رہی تھی۔ اس نے گرج کر "نے مان" سے کچھ کہا۔

رستم کی سمجھ میں ایک دو لفظ ہی آسکے۔ غالبًا اس نے "نے مان" سے کہا تھا کہ وہ شرم کرے۔ اس نے کئی افراد کے ساتھ مل کر رستم کو پچھاڑا ہے۔ اسے رستم کے منہ پر تھوکنے کا حق تب تھا جب وہ اسے اکیلا گراتا۔

رستم کو جکڑنے والے افراد نے اس کے پاؤں میں وہی مخصوص بیڑی پہنادی جس کے شکنجے سے نکلنا قریباً ناممکن تھا۔ مترجم داس کے ذریعے برق جان اور رستم میں جو مکالمہ ہوا وہ اس طرح تھا۔

برق جان نے رستم کو قہر آلود لہجے میں مخاطب کیا۔ "تم نے ہم کو دھوکا دیا۔ ہم نے تمہیں لڑائی کے لئے آزاد کیا تھا۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی۔"

"میری یہاں کسی سے لڑائی نہیں ہے۔ ہمیں یہاں چھ مہینے سے جس بے جا میں رکھا ہوا

ہے...... جب کہ ہمارا کوئی جرم بھی نہیں ہے۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہمارا حق ہے۔"

"اور بھاگنے والوں کو سزا دینا ہمارا حق ہے۔ تم لوگوں کو دو دفعہ معاف کیا جاچکا ہے، اب نہیں کیا جائے گا اور اب گنجائش بھی نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھوں ایک پہرے دار ہلاک اور دوسرا شدید زخمی ہوچکا ہے۔ تمہیں پوری پوری سزا ملے گی۔" برق جان کا لہجہ آتشیں تھا۔

"پہرے دار کو مارنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم نے صرف اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ ہمارا نشانہ گُتے تھے لیکن گولی اتفاقاً اسے لگ گئی۔ جہاں تک بھاگنے کی بات ہے، بھاگنے کی کوشش کرنا ہمارا حق ہے۔ ہم یہ حق اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک ہمارے جسموں میں جان ہے۔"

رستم کا آہنی لہجہ اور کھری کھری باتیں سن کر برق جان خاموش ہوگیا۔ وہ گہری نظروں سے رستم کے سراپا کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اس خطرناک لیکن بہادر دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس کی آنکھوں سے بھی شعلے نکلتے محسوس ہوتے تھے، کبھی یہ آنکھیں تفکر میں کھو جاتی تھیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟" برق جان نے پوچھا۔

"سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جو چاہو کرسکتے ہو لیکن ہمارا یہ ساتھی بیمار ہے۔ اس کے ساتھ کم از کم وہ سلوک تو ضرور ہونا چاہیے جو زخمی اور بیمار دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

برق جان چند قدم چل کر آگے آیا اور تختے پر پڑے شریف کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات جاری کیں۔ وہ لوگ شریف کو اٹھا کر روانہ ہوگئے .... ناصر کو بھی ساتھ بھیج دیا گیا۔

رستم نے زری کو دیکھا۔ وہ دو تنومند مجازی عورتوں کی گرفت میں تھی اور بُری طرح کسمسا رہی تھی۔ اس کی نگاہ کا مرکز صرف اور صرف رستم تھا۔ وہ اس کی طرف آنا چاہ رہی تھی لیکن مجبور تھی۔ عورتیں اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئیں۔ رستم کو پابجولاں بستی کی اکلوتی کھوہ کی طرف روانہ کردیا گیا۔ اسے لے جانے والوں کا رویہ سخت معاندانہ تھا۔

رستم کو کھوہ کے اندر قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ یہ کھوہ کے اندر پتھر کی بنی ہوئی ایک نہایت تنگ اور تاریک کوٹھڑی تھی ...... بہ مشکل چھ ضرب چھ فٹ کی۔ پانی کا ایک مٹکا، ایک چٹائی اور ایک پھٹا پرانا کمبل۔ یہ اس کوٹھڑی کا کل اسباب تھا۔ کوٹھڑی کے اندر ہی گہرائی میں جاتی ہوئی ایک دراڑ سی تھی۔ اس دراڑ کو ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کوٹھڑی کی سب سے بڑی سزا یہاں کی سردی تھی۔ رات کے وقت تو یہ جگہ یکسر برف خانہ بن جاتی تھی۔

درحقیقت یہاں رات اور دن میں تمیز، سردی میں اضافے اور کمی سے ہی کی جاسکتی تھی۔ رستم ایک دفعہ پہلے بھی پورے ایک ماہ تک اس کوٹھڑی کی ''سہولتوں'' سے فیض یاب ہو چکا تھا لیکن وہ یہ کوٹھڑی نہیں تھی۔ اس طرح کی ایک اور کوٹھڑی تھی۔ رستم کے اندازے کے مطابق ایسی تین چار ''وی آئی پی'' کوٹھڑیاں یہاں موجود تھیں۔

رستم کے کندھے کا زخم پھر ہرا ہو گیا...... اوپر سے سردی کی مار۔ کوٹھڑی میں نمی موجود تھی جس کے سبب چٹائی اور کمبل بھی نم رہتے تھے۔ اس نمی کے ساتھ رات گزارنا، پل صراط پر سے گزرنا تھا اور رستم کو ہر رات یہ پل صراط پار کرنا پڑ رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ علم نہ تھا اور نہ باہر کے حالات کے بارے میں۔ بھوک، سردی اور درد کے آکٹوپس اپنے درجنوں بازوؤں میں اسے جکڑے ہوئے تھے۔ یہ اذیت کی انتہا تھی۔ اگر وہ اس اذیت کو جھیل رہا تھا تو اس کی وجہ تھی...... اس کے پیچھے کوئی توانائی تھی...... کوئی چہرہ تھا...... ایک امید جو اپنے گرم بازوؤں میں اسے سہارا دیتی تھی اور کہتی تھی...... تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں سے نکلنا ہے رستم...... کیونکہ کوئی تمہارا انتظار کرتا ہے...... سرمئی شاموں...... چاندنی راتوں اور چمکیلی صبحوں میں تمہیں ڈھونڈتا ہے...... تمہیں اس سے ملنا ہے۔ کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا ہے۔ جی بھر کر دیکھنا ہے اور پھر...... پھر...... آگے جانے کی اجازت لینی ہے شاید......

پورے چار دن تک ایک دانہ اُڑ کر رستم کے منہ میں نہیں گیا۔ چوتھے دن جب غالباً شام کا وقت تھا، کوٹھڑی کا آہنی زنگ آلود دروازہ کھلا اور واس اندر آ گیا۔ آج وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ اندر آ کر واس نے دروازہ بند کر دیا۔

''شریف کا کیا حال ہے؟'' رستم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''اس کی جان بچ گئی ہے لیکن ابھی بستر پر ہی ہے۔'' واس نے مدھم آواز میں جواب دیا، جیسے اسے خطرہ ہو کہ آس پاس کوئی سن نہ لے۔ واس اپنے ساتھ ایک چھوٹی لالٹین بھی لایا تھا۔

''اور ناصر؟''

''ناصر نے شریف کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ یہاں برق جان کے پاس کچھ ایلو پیتھک دوائیں موجود تھیں۔ کچھ دوائیں ڈاکٹر مالینا کے شولڈر بیگ میں تھیں۔ ناصر انہی دواؤں کی مدد سے کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی مقامی نباتاتی دوائیں بھی استعمال ہوتی رہی ہیں۔''

''ناصر اب شریف کے ساتھ ہی ہے؟''

''نہیں۔'' واس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''کل اسے بھی تمہاری طرح کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا ہے۔''

''باہر کے حالات کیا ہیں؟'' رستم نے پوچھا۔

''تم اندر کے حالات کی بات کیوں نہیں کرتے؟'' واس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں ٹھیک ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ لوگ یہاں کتنے ٹھیک رہتے ہیں۔ کچھ کی تو دو تین ہفتے بعد لاش باہر آ جاتی ہے۔'' واس نے کہا اور گم صم ہو کر بیٹھ گیا۔ سردی اس کی کمزور ہڈیوں میں اُتر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے اپنی جیکٹ اُتار کر تمہارے کندھوں پر ڈال دوں...... کچھ دیر کے لئے تو تمہیں آرام ہو لیکن ڈر ہے کہ کسی کو پتا چل جائے گا۔''

''ہم پہلے بھی بچ کر نکل آئے تھے۔ اب بھی نکل آئیں گے۔ تم ان باتوں کو چھوڑو واس، مجھے بتاؤ کہ باہر کیا صورتِ حال رہی ہے؟''

واس نے الٹے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''برق جان کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ شوتم خان اور ارفا خان کو مزید پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ درحقیقت وہ اب مارگہ کے صرف ایک چوتھائی حصے پر رہ گئے ہیں۔ وہاں بھی ان کے پاؤں ٹکتے نظر نہیں آتے۔ برق جان نے اپنے داماد سامی خان کو بھی اس کے باپ کی قید سے چھڑا لیا ہے۔ وہ سخت زخمی حالت میں ملا ہے تاہم جان بچ گئی ہے۔''

''عام لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

''شوتم خان کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹا ہے۔ بیوہ عورت اور اس کی بھانجی نے وعدہ معاف گواہ بن کر سب کچھ صاف صاف بول دیا ہے۔ شوتم خان نے دونوں عورتوں سے ناجائز تعلق قائم رکھا ہے۔ پہلے اس کا تعلق عورت سے تھا۔ جن دنوں وہ اپنی خاص کیفیت میں ہوتا تھا گیارے میں جاتا تھا اور اس عورت کو بلا لیتا تھا۔ بعد میں وہ اور بھی بے باک ہو گیا۔ اس نے لڑکی سے بھی تعلق قائم کر لیا۔ اب سارے ثبوت مل گئے ہیں۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ شوتم اور ارفا کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ بھی الجھن میں ہوں گے۔''

''ہمارے بارے میں کیا سوچا گیا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

واس خاموشی سے سامنے سپاٹ پتھریلی دیوار کو گھورتا رہا۔ اس کے چہرے پر درد کی چند نئی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

"کیا کوئی بُری خبر ہے؟" رستم نے استفسار کیا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے، یہ لوگ اپنے ضابطوں کے بڑے سخت سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ میں نے اس سے پہلے یہاں کبھی بدامنی نہیں دیکھی۔ اگر یہ بالینا والا واقعہ نہ ہوتا تو شاید امن و امان اور انصاف کا یہ بھرم اور کئی برسوں تک برقرار رہتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ برق جان تمہارے فرار اور ایک محافظ کے قتل ہونے والے واقعے کو کسی صورت نظرانداز کرسکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اسے اپنے قریبی ساتھیوں کو جواب دینا پڑے گا...... تم لوگوں کو سزا ہرصورت ملنی ہے۔ کم از کم جس کے ہاتھوں سے محافظ کو گولی لگی تھی اسے تو ضرور مرنا پڑے گا۔"

"اور گولی میرے ہاتھوں لگی تھی۔" رستم نے اطمینان سے کہا۔

"کہیں تم ناصر یا شریف کو بچانے کے لئے تو ایسا نہیں کہہ رہے ہو؟"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ ہاں اگر ان دونوں میں سے کوئی یہ الزام اپنے سر لے گا تو یہ جھوٹ ہوگا۔"

"اس حوالے سے امید کی صرف ایک کرن ہے اور یہ کرن بھی تب باقی رہے گی جب تم تینوں میں سے کوئی بیوقوفی کر کے یہ الزام اپنے سر نہ لے لے۔ میرا مطلب آنجہانی جانسن سے ہے۔ اگر دونوں کتوں اور محافظ کی موت کا ذمے دار جانسن کو قرار دے دیا جائے تو تم تینوں کے لئے بچاؤ کی کوئی راہ نکل سکتی ہے مگر اس کا امکان بھی دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے اس کے بعد قانون قاعدے اور سخت ہوگئے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو، پانچ دن پہلے ہونے والی لڑائی میں 300 کے قریب لوگ مارے گئے ہیں۔ جن 30 کے قریب لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے واس! برق جان کی ذاتی رائے ہمارے بارے میں کیسی ہے؟"

"تم تینوں ابھی تک زندہ ہو۔ تم میں سے کسی کو ٹکیہ (گھٹنے کی ٹکیہ) نکالنے کی سزا بھی نہیں دی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ برق جان کی ذاتی رائے تم تینوں کے بارے میں بُری نہیں ہے۔ خاص طور سے تمہارے بارے میں اس کی سوچ مختلف تھی۔ تم جی داری سے ریچھ کے کھیل میں حصہ لیتے رہے ہو۔ پھر تم نے جس طرح ہر خطرے کو نظرانداز کر کے شوتم کا راستہ روکا تھا، وہ اس کے دل پر نقش ہے لیکن تمہارے فرار اور محافظ کے قتل نے سب کچھ الٹ پلٹ کردیا ہے۔ اب یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔"

رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "زری تو خیریت سے ہے؟"

زری کے ذکر پر واس کے دل پر جیسے تیر سا لگا۔ ایک سیکنڈ میں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "وہ اب نہیں بچے گی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کل جرگے میں تین گارنیوں کو بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ ان میں ایک زری بھی ہے۔ بستی کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ بستی پر نحوست کے سائے ہیں۔ بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے کا خون بہایا جارہا ہے۔ اس آفت کو ٹالنے کے لئے خصوصی عبادتوں اور مذہبی رسموں کی ضرورت ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ روشنی کا سالانہ تہوار بھی قریب آرہا ہے۔ اس تہوار میں عموماً ایک یا دو گارنیوں کو بھینٹ کیا جاتا ہے لیکن اس مرتبہ تین لڑکیاں جان ہاریں گی۔ زری شاید اس تہوار پر بچ جاتی لیکن پانچ دن پہلے جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد اس کا بچنا محال نظر آتا ہے۔ اسے بھینٹ میں شامل کرلیا گیا ہے۔"

یہ ساری باتیں رستم کو عجیب سی لگ رہی تھیں جیسے وہ کوئی کہانی سن رہا ہے یا فلم دیکھ رہا ہے۔ جو کچھ بھی تھا، یہ ویرانہ ملک کا حصہ تھا۔ یہاں جو کچھ ایک قبائلی رسم کے نام پر ہورہا تھا وہ حیران کن حد تک بے رحمانہ تھا۔ کیا یہاں کبھی کوئی صحافی نہیں پہنچا؟ کوئی تحقیق کار، کوئی پڑھا لکھا شخص جو یہاں کی خرافات کو باہر کی دنیا پر آشکارا کرسکے۔ جو لوگوں کو ان پاؤندوں کے عجیب و غریب رہن سہن سے آگاہ کرسکے۔ رستم کو یوں لگا جیسے یہ بھی پیر قدرت اللہ والی جاہلیت کا ہی ایک روپ ہے۔ یہ جاہلیت اور توہم پرستی ایک ہزار شاخہ درخت کی طرح ہے جس نے ہر خطے اور ہر مزاج کے لوگوں پر اپنا زہریلا سایہ پھیلا رکھا ہے۔

"کس سوچ میں کھوگئے؟" واس نے دل فگار آواز میں پوچھا۔

"کب ہے یہ تہوار؟" رستم نے پوچھا۔

"تین مہینے بعد...... لیکن دس پندرہ دن بعد اس تہوار کی تیاری شروع ہوجائے گی۔ مقامی لوگ اس تہوار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی تیاریوں کا آغاز ایک بڑے جلوس کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ حالات خراب ہیں۔ ممکن ہے کہ جلوس نہ نکالا جائے مگر دس باگنیں گرم پانی کے چشمے میں نہا کر مقدس آبوک پر الپائن کے پھول نچھاور کریں گی۔ یہ بھی یہاں کی ایک رسم ہے۔"

"لعنت ہے یہاں کی رسموں پر۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا واس! کیا واقعی ان جیتی جاگتی لڑکیوں کو مذہب کے نام پر ذبح کردیا جاتا ہے؟"

"تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا؟ کیا تم نے مری کے پہاڑوں میں گورے کے بنگلے کے

اندر لوگوں کو ذبح ہوتے نہیں دیکھا تھا؟''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' رستم نے تاسف سے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔'' کیا ان بدقسمت لڑکیوں کو ... میرا مطلب ہے کہ انہیں گولی ماری جاتی ہے یا ذبح کیا جاتا ہے؟''

''ان کی گردنوں پر مقدس کلہاڑی کا نیم گول پھل چھری کے انداز میں چلایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں یہ سب کچھ سرِعام ہوتا تھا مگر اب تیس چالیس برسوں سے یہ سب کچھ رازداری سے چار دیواری کے اندر ہوتا ہے۔ گارنیوں کی جان لینے سے پہلے ان کو ایک نشہ آور مشروب پلا دیا جاتا ہے۔ وہ نیم بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ بعدازاں ان کے خون آلود کپڑوں کی نمائش کی جاتی ہے...... لیکن تم مجھ سے یہ سب پوچھ کر میری اذیت میں اضافہ کیوں کر رہے ہو؟''

''میں معافی چاہتا ہوں واس۔ مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن میں تمہاری بھتیجی کے لئے فکرمند ہوں۔ میں اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس کی...... جان بچنے کا کوئی راستہ ہے؟''

''کوئی نہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' واس نے تاسف سے کہا۔ ''اور رستم! تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ تم تو اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم بُری طرح پھنس گئے ہو۔ شاید تم نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ ذرا تحمل رکھو۔ اگر تم لوگ برق جان کی طرف سے لڑائی میں حصہ لیتے اور اچھی کارکردگی دکھاتے تو تمہارے لئے حالات مزید سازگار ہو سکتے تھے۔ تمہیں بہت سی چھوٹیں مل سکتی تھیں۔ پھر تم ان چھوٹوں کا فائدہ اٹھا کر کسی اور مناسب موقع پر کوشش کر سکتے تھے۔ اب دیکھو، مالینا بھی گئی، جانسن بھی مارا گیا۔ میں بھی اس زد میں آنے سے بال بال بچا ہوں اور تم اس چوہے دان میں آ پھنسے ہو۔ اب تم اس بے چاری کی کیا مدد کرو گے؟''

رستم نے سرد دیوار سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی اور اپنی کوٹھڑی کو دیکھ کر عجیب لہجے میں بولا۔'' یہ چوہے دان زیادہ دیر ہمارا راستہ نہیں روک سکتا واس۔ یہ پاؤندے اپنی زنجیریں جتنی بھی موٹی کر لیں، ایک دن ہم نے انہیں توڑ جانا ہے۔ ہماری کوشش ابھی ختم نہیں ہوئی... یہ لڑائی ابھی جاری ہے۔ تم ہماری فکر بالکل نہ کرو۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی صورت ہے جس میں زری کی جان بچ سکے؟''

''نہیں۔''

''نہیں، تم بھول رہے ہو واس۔ تم نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ایک لداخی گارنی کی جان

بخشی بھینٹ سے چند دن پہلے ہو گئی تھی۔ وہ کیسے ہوا تھا؟''

واس چونک کر رستم کی طرف دیکھنے لگا پھر بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔'' وہ امید سے ہو گئی تھی۔ بھینٹ چڑھائے جانے کے لئے گارنی کا کنوارہ ہونا ضروری ہے۔ گارنی کو چھونا ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ اس گناہ کی پاداش میں نوجوان پاؤندے کو ہی نہیں اس کے پورے گھر کو موت کا مزہ... چکھنا پڑا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو مکان کے اندر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ سات افراد موت کے گھاٹ اُترے تھے۔ یہاں کسی گارنی کی طرف نظرِ بد سے دیکھنا ایسا بھیانک جرم ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

رستم کچھ دیر عجیب نظروں سے واس کو دیکھتا رہا پھر بولا۔''واس! اگر ہم میں سے کوئی زری کے ساتھ شادی کر لے تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں، ناصر یا شریف؟''

واس نے پھٹی پھٹی نظروں سے رستم کو دیکھا۔ اس کا جسم لرزنے لگا تھا۔'' یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔''

''میں اپنے حواس میں ہوں واس۔''

واس بدک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے دروازے کو دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس آہنی تختے کے ساتھ لگا کھڑا ہو گا۔ پھر وہ رستم کی طرف مڑا اور بولا۔'' مجھے تمہاری باتوں میں دیوانہ پن نظر آ رہا ہے۔ شاید اس کوٹھڑی کا اندھیرا تمہارے ذہن پر اثر کر رہا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے واس! تم میری بات پر غور کرنا اور اگر اس کے علاوہ کوئی بہتر راستہ تمہارے ذہن میں ہو تو وہ بھی مجھے بتانا۔ زری کو مرنا نہیں چاہیے۔''

''تم کس دنیا میں بس رہے ہو رستم! تمہارا کیا خیال ہے کہ برق جان تمہیں صحیح سلامت چھوڑ دے گا؟''

رستم نے عجیب آہنگ میں کہا۔ ''میں نے بھی دنیا دیکھی ہے واس۔ برق جان ہمیں زندہ رکھے گا اور صحیح سلامت بھی رکھے گا۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے ایک دو سخت شرطیں رکھے اور مجھے امید ہے کہ چار چھ ہفتے کے اندر وہ ہمیں یہاں سے نکال کر تمہاری موجودگی میں ہم سے بات چیت کرے گا۔ مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ ایسا ہو گا۔''

رستم کے اعتماد نے واس کو ذرا سا مرعوب کیا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے رستم کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

رستم بڑے ایزی موڈ میں آ گیا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ بولا۔'' اب تمہیں

بتاؤں، تم یہاں کس مقصد کے لئے آئے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے آنے کا اصل مقصد؟''

''کیا مقصد ہے؟''

''تمہارے اس لمبو دادا برق جان کو اندیشہ ہے کہ جانسن کی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو یہاں سے چپکے چپکے فرار ہونے کے طریقے سوچ رہے ہوں گے۔ اس نے تمہیں یہ ذمے داری دے کر میرے پاس بھیجا ہے کہ تم مجھ سے کچھ اگلواؤ...... اگر میں کچھ چھپانے کی کوشش کروں تو پھر مجھے دھمکاؤ... ناصر اور شریف کی زندگی کا حوالہ دے کر مجھے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

واس نے قدرے حیرت سے رستم کو دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

''تمہارا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔ اب بتاؤ، میں جا کر اسے کیا جواب دوں؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔ میری جان بھی لے لو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں اس بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔'' رستم نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور تب ہولے سے مسکرا دیا۔

واس کے چہرے پر ابھی تک حیرت جمی ہوئی تھی۔ ''تم اور ناصر کیا چیز ہو رستم! مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔

ان دونوں کے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ واس کو رستم کی حالتِ زار پر بہت تشویش ہو رہی تھی۔ خاص طور سے یہاں کی سردی نے اسے دہلا دیا تھا۔ جاتے جاتے واس نے رستم سے کہا۔ ''تمہارا کھانا آج بحال کر دیا جائے گا، بلکہ ابھی تھوڑی دیر میں کھانا آ جائے گا۔ میں تمہیں ایک اچھا کمبل بھجوانے کی بھی پوری کوشش کروں گا۔''

''میرے حصے کا کمبل ناصر کو بھجوا دینا۔''

''نہیں... ابھی اس کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے پتا ہے کہ چار پانچ دن تک اسے کوئی رعایت نہیں ملے گی۔ اس کے لئے۔ ما ہو سکتی ہے کہ اوپر والا اسے ہمت دے۔''

اور پھر واس اپنی لالٹین کی خوش نما روشنی سمیت چلا گیا۔ رستم اس تاریکی، سیلن اور جان لیوا ٹھنڈک میں تنہا رہ گیا۔ اس کی دال روٹی بحال ہو گئی تھی اور ایک بُرا بھلا کمبل بھی مل گیا لیکن آزادی نہیں تھی...... آزادی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

کہتے ہیں کہ قیدِ تنہائی انسان کے اعصاب کو توڑ دیتی ہے۔ اس کے حواس بکھرنے لگتے ہیں۔ شاید رستم سیال کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا لیکن وہ کوٹھڑی میں اکیلا نہیں تھا۔ رنگ والی کی رنگ رنگیلی شانی بی بی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ایک پُر حرارت خوشبو کی طرح ہر وقت اس کے ارد گرد رہتی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی تھی۔ اس کے سر کے لئے اپنے زانو کا تکیہ

بناتی تھی، اس کے لمبے بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔ ''میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ سے عشق کرتی ہوں۔ آپ بھی مجھ سے کرتے ہیں ناں؟''

''ہاں، میں بھی آپ سے عشق کرتا ہوں۔'' وہ کہتا تھا اور اس کی آنکھوں کی نمی اس کی تصدیق کر دیتی تھی۔ وہ اس کی نم آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اس کے ٹھٹھرتے ہوئے چہرے کو اپنے مہربان جسم کے خم میں چھپا لیتی تھی۔

رات ہوتی تھی اور اس کی سرد کوٹھڑی سرد تر ہو جاتی۔ پھر دن چڑھتا اور تھوڑی سی حرارت لوٹ آتی۔ حرارت اور ٹھنڈک ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتا رہا۔ باہر کیا ہو رہا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کا تعلق بس ایک ہاتھ کے ذریعے تھا۔ یہ ہاتھ اسے دن میں دو بار کھانا پہنچاتا تھا اور دو بار خالی برتن واپس لے جاتا تھا۔ صرف ایک دن کھانا لانے والے سے اس کی تھوڑی سی بات ہو پائی تھی۔ وہ اچھا کھانا لایا تھا۔ رستم کے پوچھنے پر اس نے دو تین فقرے بولے۔ ان فقروں میں سے بس دو تین الفاظ ہی رستم کی سمجھ میں آ سکے۔ اسے اندازہ ہوا کہ بستی میں روشنی کا تہوار قریب آ رہا ہے اور مختلف تقریبات ہو رہی ہیں۔

کبھی کبھی وہ تنہا بیٹھا بیٹھا بے قرار بھی ہو جاتا۔ اس کی بے پناہ برداشت میں دراڑیں پیدا ہو جاتیں۔ وہ اپنے قفس میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان سنگلاخ دیواروں کو پاش پاش کرے یہاں سے نکلے اور اپنی بی بی کے پاس پہنچ جائے۔ وہ بے چین ہو کر اپنی مختصر ترین کوٹھڑی میں ٹہلنے لگتا۔ تین قدم دائیں...... تین قدم بائیں... پھر تین قدم دائیں...... پھر بائیں۔

☆======☆======☆

سردی میں گرمی کی جوت جگنے لگی تھی۔ کھیتوں میں سرسوں کھلی ہوئی تھی۔ گندم کے ہرے خوشے آہستہ آہستہ رنگ بدلنے لگے تھے۔ شانی اب رنگ والی کی حویلی میں تھی۔ چھوٹی چوہدرانی بالآخر اپنے گاؤں میں واپس آ گئی تھی۔ اسے گاؤں میں واپس لانے اور یہاں اس کے قدم جمانے میں حاجی حیات کا کردار بہت اہم تھا۔ حاجی حیات نے رستم سے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا اور کسی بھی موقع پر کسی بھی مشکل مرحلے میں شانی کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ حاجی حیات کھل کر تو سامنے نہیں آیا تھا مگر پس پردہ شانی کو درجنوں آنکھوں سے دیکھ کر بیسیوں ہاتھوں سے اس کی مدد کرتا رہا تھا۔ حاجی حیات کے علاوہ عارف کمبوہ اور اجمل خان نے بھی اپنا اپنا کردار جاں فشانی سے ادا کیا تھا۔

چوہدری بشیر سے شانی کی جان اس طرح چھوٹی تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چوہدری بشیر، اجمل خان کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس وقت کوٹھی میں موجود اس کے تمام ساتھی بھی قتل ہوئے۔ ایک شائلہ رہ گئی تھی۔ اجمل نے دوبارہ جا کر اس کا کام بھی تمام کر دیا اور ہر ثبوت وہاں سے مٹا دیئے۔ چوہدری کے قتل کے خونی مناظر اب بھی شانی کو جاگتی آنکھوں کا خواب لگتے تھے۔ جس طرح کبھی کبھی ناکردہ جرم کی سزا مل جاتی ہے، اسی طرح کبھی کبھی کیا ہوا جرم بھی آپوں آپ پس پردہ جا سکتا ہے۔ چوہدری بشیر والے کیس میں بھی یہی ہوا تھا۔ سارا الزام چوہدری کی حریف پارٹی وحدت گروپ پر آیا تھا۔ وحدت گروپ نے یہ قتل نہیں کئے تھے لیکن سارے ثبوت اور اشارے حیران کن طور پر ان کے خلاف گئے اور وہ دھر لئے گئے۔ شاید ان کے کسی اور بھیانک جرم کی سزا نے انہیں پکارا تھا۔ قدرت کا نظام کبھی کبھی ایسے بھی انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

پیر قدرت اللہ زوال کی زد میں تھا۔ بیہودہ تصویروں والے معاملے کو اب پانچ ماہ

ہونے کو آئے تھے۔ ان پانچ مہینوں میں قدرت اللہ کی ساکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کے عملیات اور جانوروں کے ساتھ سفاکانہ سلوک کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے گئے تھے اور ان میں سے بیشتر سوالوں کا بہروپیئے پیر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نہ صرف دیہی اور شہری علاقوں میں قدرت اللہ کی پیش قدمی رک گئی تھی بلکہ اس کے کئی ''آستانے'' بند بھی ہو گئے تھے۔ کچھ جگہوں پر لوگوں نے قدرت اللہ کے شائع کئے ہوئے کتابچے اجتماعی طور پر نذرِ آتش کئے تھے۔

گریس اپنے بچے ڈیوس کے ساتھ انگلینڈ واپس جا چکی تھی۔ تاہم بذریعہ خط شانی سے اس کا رابطہ تھا۔ انسپکٹر حفیظ اپنے زخموں سے صحت یاب ہونے کے بعد ڈیوٹی جوائن کر چکا تھا۔ اجمل خان پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اپنے آبائی علاقے حسن ابدال میں تھا۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی شانی کو بُری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا تھا۔ ریشم کی طرح نرم، فولاد کی طرح سخت۔

شانی رنگ والی کی حویلی میں تھی۔ اسے اپنے کھیت، اپنے گلی کوچے، اپنے کنوئیں اور اپنی سہیلیاں واپس مل گئی تھیں، لیکن جو لوگ ہمیشہ کے لئے کھو گئے تھے انہیں کون واپس لا سکتا تھا۔ شانی کا بھائی، والد، والدہ اور بے وفا چچا رئیس بھی۔ تایا معصوم واپس آ چکے تھے۔ یہ سب کچھ ایک آف دی ریکارڈ معاہدے یا راضی نامے کے تحت ہوا تھا۔ یہ معاہدہ غالباً حاجی حیات اور ڈپٹی ریاض ہٹلر کے درمیان ہی ہوا اور اس کی زیادہ تفصیل شانی کو معلوم نہیں تھی۔ اس معاہدے کے تحت تایا معصوم (اور شانی) کو ڈپٹی ریاض اور اس کے ہم کاروں کے خلاف زبان بند رکھنا تھی...... یعنی مکمل زبان بندی۔

شانی نے رنگ والی کی حویلی پر سے ویرانی کی گرد جھاڑی تھی۔ اس کا عزم تھا کہ وہ اس حویلی کو اب مزید بے آباد نہیں رہنے دے گی۔ اس کی رونقیں واپس لائے گی، لیکن کیسے؟ وہ حویلی کو آباد تو تب کر سکتی تھی جب اس کا اپنا دل آباد ہوتا۔ اپنا دل تو جیسے ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ اس میں یادوں کے آسیب چکراتے تھے۔ رستم اور اس کے ساتھیوں کو اوجھل ہوئے اب پون سال ہونے کو آیا تھا۔ ان نو مہینوں میں کون سا پل کون سی ساعت ایسی تھی جس میں اس نے بچھڑنے والے کو یاد نہ کیا ہو۔ اب بھی وہ اپنی عزیز ترین سہیلی سکینہ کے ساتھ پچھلے صحن میں آم کے پیڑ تلے رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ حسن و وقار کا پیکر معلوم ہوتی تھی۔ علاقے کے درجنوں لوگوں سے مل کر اور ان کی چھوٹی موٹی شکایات سن کر وہ ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔ یہ لوگ دو تین ماہ میں ہی شانی کو اس کی والدہ وڈی آپا کا سا درجہ دینے لگے تھے۔ شانی خود کو

اس عزت افزائی کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اتنے میں حویلی کے پرانے ملازم خادم حسین نے اندر آکر سلام کیا اور ادب سے بولا۔ ''چھوٹی بی بی! آپ کا فون ہے جی لاہور سے۔ رانا امتیاز صاحب ہیں۔''

''اب کیا کہتے ہیں وہ؟'' شانی روہانسی ہو کر بولی۔

''وہی گل کرنی ہوگی جی...... ان کے دماغ میں وڑا (گھسا) ہوا ہے کہ آپ کو الیکشن میں کھڑا کر کے چھوڑنا ہے۔'' شانی نے خادم حسین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اسے کہا کہ وہ انہیں ٹال دے۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ ذرا تنہائی ملی تو شانی ایک دم رونے لگی۔ سکینہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آخر وہ بولی۔ ''کیوں رو رو کر اپنا سر خالی کرتی ہے شانی؟''

وہ جیسے پھوٹ پڑی۔ ''سکینہ! وہ سب کہاں چلے گئے؟ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان...... کوئی بھلا ایسے بھی جاتا ہے سکینہ؟ ایسے بھی رُلاتا ہے؟ سکینہ کہیں...... وہ پھر پہاڑوں میں تو نہیں چلے گئے۔ وڈے ڈیرے کی جگہ کوئی اور ڈیرہ بنالیا ہو انہوں نے...... کوئی اور گروہ بن گیا ہو۔ کہیں رستم نے اپنے لئے کوئی نئی دنیا تو نہیں وسا لی سکینہ؟ مجھے بھلا تو نہیں دیا کہیں؟ ڈھونڈنے والے کو تو رب بھی ملتا ہے پھر وہ مجھ کو کیوں نہیں ملتا؟ کہیں اس نے مجھ سے اپنا رستہ جان بوجھ کر تو وکھرا نہیں کر لیا؟''

سکینہ نے آہ بھری۔ ''میں تجھے کیا تسلی دوں شانی! میں رستم کے بارے میں بہت تھوڑا جانتی ہوں اور سچی بات تو یہ ہے شانی...... کہ یہ مرد......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

اتنے میں برآمدے کی طرف سے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز آئی اور کوتاہ قد ڈولا تیزی سے اندر داخل ہوا۔ شانی کو بے تکلفی سے مخاطب کر کے بولا۔ ''باجی جی! خان بھائی آگئے ہیں۔ اپنے ساتھ بہت سے بادام اور کشمش وغیرہ لائے ہیں۔ بڑے جوش میں نظر آتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ان کے پاس آپ کے لئے کوئی خاص خبر ہے۔ آپ کو پورا بلا رہے ہیں۔'' ڈولے نے ''فوراً'' اجمل خان کے انداز میں ادا کیا۔

شانی اٹھی اور حویلی کی بیٹھک کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

اجمل خان نشست گاہ میں موجود تھا۔ شانی دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔ اجمل خان تپاک سے ملا۔ اس کا چہرہ سرخی مائل ہو رہا تھا۔

''اجمل! اتنے دن کہاں رہے تم؟ فون پر بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں تمہارے لئے بہت پریشان تھی۔''

''ام نے بے کار میں وقت ضائع نہیں کیا ہے جی۔ اگر ام دیر سے آیا ہے تو اس کا کوئی وجہ تھا۔ ام بھی آپ سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن سگنل ٹھیک نہیں آتا تھا۔'' چند لمحے توقف کر کے اجمل نے اپنے سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں کشمش اور بادام ہے جی۔ کچھ اخروٹ بھی ہے۔ اخروٹ کے لئے مُنا نے ام سے خاص پر مائش کیا تھا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اتنی دیر کہاں رہے تم؟'' اپنے سوال میں شانی نے رستم کا نام نہیں لیا مگر اس سوال کے ہر لفظ میں رستم ہی کی جستجو تھی۔

اجمل خان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ایک کھوج تو لگا ہے شانی بہن...... اور ام کو امید بھی ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے گا۔''

''پلیز اجمل...... پہیلیاں نہ بجھواؤ۔''

اجمل نے کہا۔ ''امارا خیال ہے جی کہ ام اس بندے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا ہے جس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پچھلے نو دس مہینے میں امارا کھوپڑی پلپلا ہوگیا ہے۔ امارا مطلب اس لمبو سے ہے جس کے پاؤں کا نشان ڈولے نے مری میں ڈھونڈا تھا۔''

یہ خبر شانی کے لئے چونکا دینے والی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے اجمل خان سے کئی سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے جواب میں اجمل خان نے انکشاف کیا کہ وہ بندہ اس وقت گوجرانوالہ میں ہے اور اجمل کے قبضے میں ہے۔ اجمل اسے وہاں ایک کرائے کے مکان میں اپنے ہمراز دوست کے پاس چھوڑ کر آیا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ شخص رستم اور ناصر وغیرہ کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ بتائے گا۔''

''تمہیں کیسے یقین ہے اجمل کہ یہ وہی ہے جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''ام نے اسے مری سے پکڑا ہے جی...... اور اسی علاقے سے جہاں ہم اسے سب سے زیادہ ڈھونڈتے رہے ہیں اور اب تو اس خبیث نے خود بھی سب کچھ مان لیا ہے لیکن اماری سخت کوشش کے باوجود یہ بندہ امارے مطلب کا بات بتانے کو تیار نہیں ہے۔''

''یعنی رستم اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں؟''

''جی ہاں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ تینوں کہاں گیا لیکن ام جانتا ہے کہ وہ بکتا ہے۔ وہ چھپا رہا ہے اور سخت ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ام کو تو وہ نیم دیوانہ لگتا ہے۔ اس کا سوچ بھی بہت کٹر قسم کا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ اگر ام کو زیادہ غصہ آگیا تو وہ امارے ہاتھوں سے پوت (فوت) ہو جائے گا۔''

"اب تم کیا چاہتے ہو اجمل۔ اگر یہ بندہ واقعی وہی ہے جو حوالدار ناگی سے ملا تھا اور جس نے ناگی کو ہمارے پیچھے لگایا تھا تو پھر یہ بندہ بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔"

"اسی لئے تو ہم آپ کے پاس پہنچا ہے شانی بہن۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ خود امارے ساتھ گوجرانوالہ جائے اور اس ڈھیٹ کے ساتھ تھوڑا سا بات چیت کرے۔ ام کو لگتا ہے جو کام ام درجنوں گولیاں چلا کر نہیں کرسکتا وہ آپ دو چار باتوں سے کرسکتا ہے۔ ام کو یاد ہے آپ نے لکی خان کے کیمرے والا ماملہ کتنے اچھے طریقے سے نمٹایا تھا۔"

"وہ کیا کہتا ہے؟"

"اس نے اپنا نام راکب خان بتایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ اسکردو اور چیلاس کی طرف کا رہنے والا ہے۔ وہ یہ بات بھی مانتا ہے کہ وہ ان غیر ملکی لوگوں کی تلاش میں تھا جو یہاں ان پہاڑوں میں...... خاص پودے سپ گندل پر تجربات کرتے پھر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان میں سپ گندل کا نام کچھ اور لیتا ہے۔ اس کو سوی کہتا ہے۔ خو...... ام آپ کو بتانا بھول گیا، وہ پشتو تو بولتا ہے مگر بہت رک رک کر۔ اس کا زبان اور لہجہ اور طرح کا ہے۔ اس کا اصل زبان کچھ اور ہے۔ تھوڑا بہت اردو بھی جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوی کی کاشت کرنا، اس کو استعمال کرنا اور اس کو ضائع کرنا، سب کچھ جرم ہے اور امارے بزرگوں کے نزدیک اس کا سزا موت سے کم نہیں ہے۔ ایسا کام جو بھی کرے گا اور جہاں بھی کرے گا، امارے لوگ اس کو سزا دیں گے۔"

"چلو...... جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ان کو سزا مل گئی۔ گورے کے بنگلے میں ان میں سے بہت سوں کو ذبح کر دیا گیا لیکن جو باقی تھے ان کو کس جرم میں پکڑا گیا اور وہ اب کہاں اور کس حال میں ہیں؟"

"بس جی...... وہ اس سے آگے کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔ ام نے اسے دو تین دن بھوکا بھی رکھا ہے، تھوڑا سا مار پیٹ بھی کیا ہے۔ ڈرایا دھمکایا بھی ہے۔ وہ حرامی ابھی تک ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ایسا لوگ بہت جنونی قسم کا ہوتا ہے شانی بہن! وہ کہتا ہے کہ ام تمہارے ہاتھوں مر جائے گا تو کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری دنیا میں ام کو بہت اونچا مقام ملے گا۔ ام نے اس سے کہا تم پہلے ہی سات فٹ اونچے ہو اب اس سے اور اونچا مقام کیا لو گے۔ ویسے اس خبیث کی باتوں سے ام کو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ ام کو یقین ہے اگر آپ گوجرانوالہ چلی جائیں تو اس سے زیادہ اچھی طرح بات کرسکے گا۔"

شانی سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اجمل جو اطلاع لایا تھا وہ معمولی نہیں تھی۔ یہ لمڈھینگ شخص رستم، ناصر اور شریف کی پُراسرار گمشدگی کی گتھی سلجھا سکتا تھا۔ اگر اجمل نے واقعی مطلوبہ شخص کو

ڈھونڈا تھا تو پھر چوہدری بشیر کے قتل کے بعد یہ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ تھا۔ ایک عجیب سی لہر شانی کے سراپا میں دوڑنے لگی تاہم اس کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں کئی اندیشے بھی تھے۔ اجمل اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہہ رہا تھا۔ اس کے لئے اسے رنگ والی سے نکلنا پڑتا اور عارف کمبوہ نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

شانی کو سوچ میں دیکھ کر اجمل خان بولا۔ "ام جانتا ہے آپ کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔ رنگ والی سے نکل کر گوجرانوالہ جانے میں آپ کے لئے کافی خطرہ ہے۔ آپ کے ساتھ گارڈز کا ہونا ضروری ہے۔"

شانی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "عارف پرسوں بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت اللہ کے چیلے علاقے میں موجود ہیں۔ ایک ملنگ قادر پور کے پاس سے پکڑا گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ قدرت اللہ کا چیلا ہے۔ تھانے میں اس نے بتایا کہ وہ قدرت اللہ کی ہدایت پر یہاں آیا تھا اور رنگ والی کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے اور لوگ بھی آس پاس موجود ہوں۔"

"پھر کیا کیا جائے شانی بہن...... کیا ام کسی طرح اس لمبو حرامی کو یہاں لانے کی کوشش کرے؟"

"نہیں یہ بھی ٹھیک نہیں۔" شانی نے کہا پھر توقف سے بولی۔ "اچھا، میں ہی کچھ سوچتی ہوں۔"

شانی نے عارف کمبوہ سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد اس نے پھوپھو آمنہ کے کپڑے پہنے۔ سر پر موٹی اوڑھنی لی اور لمبا گھونگھٹ نکال کر اس 86 ماڈل ٹویوٹا کار میں آبیٹھی جس پر عموماً پھوپھو آمنہ سفر کیا کرتی تھیں۔ ڈولا اور اجمل خان شانی کے ہمراہ تھے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ رنگ والی کی حویلی کے مین پھاٹک سے باہر اب بھی درجنوں افراد اپنی بی بی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ ان میں مرد و زن اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ سب اپنی بی بی سے محبت کرتے تھے۔ اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں اس کی تصویر تھی بالکل اسی طرح جس طرح کچھ عرصہ پہلے شانی کی ماں کی تصویر تھی۔

شانی بھاری گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے ان پرستاروں کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتی رہی اور گاڑی نیم پختہ راستے پر دوڑتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ شانی کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں اٹھ رہا تھا...... کیا وہ راکب خان نامی اس شخص سے کچھ پوچھ پائے گی؟ کیا وہ اس کے لئے اپنی چپ توڑنے پر راضی ہو جائے گا؟

اوراس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا یہ شخص رستم اور ناصر کہاں ہیں، ان کے متعلق جانتا ہے؟

رنگ والی سے گوجرانوالہ تک کے راستے میں راکب خان نامی دراز قد شخص کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ قریباً دس دن پہلے اجمل خان اپنے شہر حسن ابدال سے گلیات میں آیا تھا۔ یہاں اسے اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کرنا تھی۔ دوسہرہ گاؤں کے پاس یہ دراز قد شخص اسے بالکل اتفاقاً ہی نظر آ گیا تھا۔ اجمل خان نے اسے ایک دکان کے ادھ کھلے شٹر کے نیچے سے دیکھا تھا۔ یہاں وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ بس اجمل خان شادی کی تقریب کو بھول بھال کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ جیسے ہی اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ مطلوبہ شخص ہے جو چند ماہ پہلے حوالدار ناگی سے ملا تھا اور ناگی کو غیر ملکیوں کا پتہ لگانے کے لئے رشوت کی پیشکش کی تھی...... اجمل خان نے اسے گن پوائنٹ پر اٹھا لیا...... اور پھر اسے مری سے گوجرانوالہ لے آیا۔ شاید وہ اسے رنگ والی ہی لے آتا لیکن مختلف اندیشوں کے تحت رک گیا۔

شانی، اجمل خان اور ڈولا جب گوجرانوالہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ اجمل کی رہنمائی میں حویلی کا ڈرائیور عباس انہیں ایک مضافاتی رہائشی علاقے تک لے گیا۔ یہ ایک زیر تعمیر علاقہ تھا۔ جس چھوٹی سی مکان نما کوٹھی کے سامنے گاڑی رکی اس کے اردگرد دو تین پلاٹ خالی پڑے تھے۔ اجمل نے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر چلی گئی۔ اجمل کے دوست شیر محمد نے ان کا استقبال کیا۔ یہ شانی کے لئے جانا پہچانا شخص تھا۔ شیر محمد کی دو ٹیکسی کاریں راولپنڈی اور مری کے درمیان چلتی تھیں۔ یہ شیر محمد ہی تھا جس نے چوہدری بشیر کے قتل کے بعد اجمل خان کو دلیرانہ پناہ دی تھی۔ تب اجمل کے ساتھ شانی کے علاوہ گریس، منا، ڈیوس اور ڈولا وغیرہ بھی تھے۔ شیر محمد ایک مضبوط اور پُرسکون شخص تھا لیکن آج وہ شانی کو کچھ ہراساں نظر آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد اجمل نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے برادر؟“

شیر محمد، اجمل کو ایک جانب لے گیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ شانی کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ڈولا بھی کچھ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”باجی جی! مجھے لگتا ہے کہ اندر کوئی بندہ زخمی ہے۔ اس کا خون بہہ رہا ہے۔“

اجمل اور شیر محمد تیزی سے اندر چلے گئے تھے۔ ان کے پیچھے شانی اور ڈولا بھی چلے گئے۔ ٹی وی لاؤنج میں ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ شیر محمد ایک دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ شیر محمد اور اجمل کے پیچھے وہ بھی اندر چلے گئے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ ٹیوب

لائٹ میں اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ ایک دبلا پتلا نوجوان کروٹ کے بل کمرے کے فرش پر لیٹا تھا۔ اس کے نیچے دری خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ نوجوان کا سویٹر اور شلوار قمیص بھی بُری طرح خون آلود تھی۔ خون اتنا زیادہ بہا تھا کہ اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد دکھائی دے رہا تھا۔ نوجوان کے دونوں ہاتھ پشت پر نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔

”یہ کیا ہوا اجمل؟“ شانی نے پوچھا۔

”اس نے اپنا کلائیاں شیشے سے کاٹ لیا ہے۔ یہ دیکھئے جی۔ اس نے یہ شیشے کا جگ توڑا ہے اور اس کے ٹکڑے سے اپنا دونوں کلائیاں زخمی کیا ہے۔“

شانی نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک نہیں دونوں کلائیاں بُری طرح کٹی ہوئی تھیں اور مضروب نیم بے ہوش تھا۔ بلاشبہ یہی وہ راکب خان تھا جس کی تلاش نے انہیں مہینوں سرگرداں رکھا تھا۔ آج وہ شانی کو نظر بھی آیا تھا تو کس حال میں۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا اور اپنے ہی خون میں لت پت تھا۔ شانی گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بڑے اضطراب کے عالم میں اس نے نیم جان شخص کا شانہ جھنجھوڑا۔ ”راکب خان...... راکب خان۔“ اس نے پکارا۔

اجمل بھی بیٹھ گیا۔ اس نے بھی راکب خان کے رخسار تھپتھپائے اور اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

راکب خان نے اپنی سفیدی مائل آنکھیں کھولیں اور عجیب نظروں سے شانی اور اجمل خان کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں فتح مندی کی جھلک تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو، دیکھو...... میں نے تمہاری نہیں چلنے دی اور اپنی چلالی۔ اب کیا پوچھ لو گے مجھ سے؟ کیسے پوچھو گے؟

شانی تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے بے چینی سے اجمل خان کی طرف دیکھا۔ ”اجمل کچھ کرو، یہ مر رہا ہے۔“

راکب خان نے نفی میں سر ہلایا اور ہونٹوں کو حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اب کچھ حاصل نہیں۔

شانی نے بے تاب ہو کر اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ وہ کراہی۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا؟ اپنی جان ہی ختم کر لی۔ ہم ایسا کب چاہتے تھے؟“

شیر محمد نے اسے پانی پلایا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھوں کی بندش کھولنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے شیر محمد کے ہاتھ خون سے بھر گئے تھے۔ اجمل خان باہر بھاگا تا کہ ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی دروازے کے عین سامنے لے آئے۔ غالباً اسے امید تھی کہ راکب کو کسی ہسپتال یا کسی پرائیویٹ کلینک تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ ڈولا بھی اجمل کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ شانی

کو ایسی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے راکب کو ہولے سے ہلایا اور روہانسی آواز میں پوچھا۔ ''راکب! وہ سب کہاں گئے؟ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ کچھ تو بتا دو راکب۔''

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شانی نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ شاید اس کے عقیدے کے مطابق یہ کوئی مناجات تھی۔ اپنے چہرے پر ہیجانی کیفیت لئے وہ بڑبڑاتا رہا اور کھینچ کھینچ کر سانس لیتا رہا۔

شانی نے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ''تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ...... کچھ بتا دو۔''

اس کے ساتھ ہی شانی کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک کر نوجوان کی لبوتری ٹھوڑی پر گر گئے۔ اس نے اپنی بند آنکھوں میں درز پیدا کی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لہر تھی...... ایک عجیب جنونی کیفیت تھی۔ اس نے چند لمحوں تک شانی کو دیکھا پھر کچھ بولا۔ شانی نے اپنا کان اس کے سرد ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے جو الفاظ کہے وہ شانی کی سمجھ میں آئے۔ یہ بڑے بے رحم الفاظ تھے۔ اس نے کہا۔ ''......ان کو بھول جاؤ...... وہ سب ختم ہوگیا...... خو، برف کے اندر چلا گیا......''

''نہیں... نہیں یہ غلط ہے۔ ایسا مت کہو۔ مجھے سچ بتاؤ......'' شانی نے ہذیانی انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بار بار جھنجھوڑا۔

وہ پھر آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ شانی اسے ہلاتی رہی اور پکارتی رہی۔ ''خدا کے لئے زبان کھولو...... ہمارے ساتھ ایسا مت کرو۔''

پھر ٹویوٹا کار عین دروازے کے سامنے آکر رک گئی تھی لیکن جسے کار میں ڈال کر ہسپتال لے جایا جانا تھا، وہ مر چکا تھا۔

اجمل خان اور ڈرائیور عباس دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ شانی دراز قد راکب کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ''کیا ہوا شانی بہن؟'' اجمل کراہا۔

''یہ مر گیا۔'' شیر محمد نے راکب کی کھلی آنکھوں کو بند کرتے ہوئے کہا۔

ڈولا شانی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس نے شانی کو پانی پلایا۔ شانی کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ابھی راکب نے جو الفاظ کہے تھے، وہ بے حد اندوہناک تھے۔ یہ الفاظ دہکتے انگاروں کی طرح شانی کی سماعت میں اُترے تھے اور پورے جسم میں پھیل گئے تھے۔ اب یہ الفاظ اسے اندر سے خاکستر کر رہے تھے۔ اچانک شانی کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔

اس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپایا اور بلند آواز سے رونے لگی۔ ڈولا، اجمل اور شیر محمد سخت گھبرا گئے۔ اجمل نے تڑپ کر کہا۔ ''کیا ہوا شانی بہن؟''

ڈولا روہانسی آواز میں بولا۔ ''باجی جی! کیا ہوا؟ حوصلہ رکھیں۔''

شانی ہچکیوں سے روتی رہی۔ شیر محمد نے دھیمی آواز میں اجمل سے کہا۔ ''اس پاؤندے نے بی بی سے کوئی بات کہی ہے۔''

''کیا کہا ہے؟''

''میں سن نہیں سکا لیکن اس نے کچھ کہا ہے۔''

اجمل، ڈولا، عباس اور شیر محمد دم سادھے ساکت کھڑے رہے۔ شانی صوفے کی پشت پر سر ٹکائے روتی رہی۔ ساتھ والے کمرے میں قریباً سات فٹ لمبے راکب خان کی خون آلود لاش ایک سربستہ راز کی طرح پڑی رہی۔

''خو، شانی بہن! اس نے آپ سے کیا کہا ہے؟ آپ ام کو بتائیں، شاید ام آپ کو اس کا کوئی جواب دے سکے۔''

شانی بس نفی میں سر ہلاتی رہی۔ اجمل خان اور عباس وغیرہ راکب کی لاش کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس کے اردگرد بہت سی جگہ خون سے لت پت تھی اور خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ شانی نے کراہتے ہوئے اجمل خان کو مخاطب کیا۔ ''اجمل! تم سے یہ اچھا کام نہیں ہوا۔ تم نے اس پر اتنی سختی کیوں کی کہ یہ خودکشی پر مجبور ہوا۔ اس کی جان تمہاری غفلت اور تمہاری سختی سے گئی ہے۔''

''نہیں شانی بہن! ام آپ کے سر کا قسم کھاتا ہے، ام نے اس پر زیادہ سختی نہیں کیا۔ آپ اس کا جسم دیکھ لیں۔ کہیں چوٹ کا نشان نہیں ملے گا۔ ام اس کو دھمکاتا ضرور رہا ہے لیکن زیادہ مار پیٹ اس سے نہیں کیا ہے۔''

شیر محمد نے اجمل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی گواہ ہوں بی بی جی۔ اجمل غلط نہیں کہہ رہا۔ پولیس والے حوالاتیوں پر جو تشدد کرتے ہیں یہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں تھا۔ پہلے تین دن کے سوا ہم نے اس کے کھانے اور آرام کا بھی پورا خیال رکھا ہے...... یہ ویسے ہی جنونی تھا۔ اس کی جیب سے اس کی ایک تصویر بھی ملی ہے۔ اس تصویر میں اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی ہے اور صفاچٹ سر ہے...... اور میرے خیال میں یہی اس کا اصل حلیہ ہے۔ یہ شہریوں والا حلیہ تو اس نے یہاں گھومنے پھرنے کے لئے بنا رکھا تھا۔''

اجمل نے راکب خان کے گلے سے ایک تعویذ اُتار کر شانی کی طرف بڑھایا۔ یہ

دراصل تانبے کی ایک چھوٹی سی تختی تھی۔ اس پر سامنے کی طرف ایک درخت کی شبیہ کندہ تھی۔ تختی کی الٹی سمت پر دو پتے سے بنے ہوئے تھے۔ ان پتوں کی شکل سانپ کے پھن سے ملتی جلتی تھی۔ شانی دیکھتے ہی پہچان گئی۔ ان پتوں اور سپ گندل کے پتوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اجمل نے راکب کی جیکٹ کی جیبوں سے برآمد ہونے والی کچھ اور اشیاء بھی شانی کو دکھائیں۔ کچھ پاکستانی اور چائنیز کرنسی . . نامعلوم زبان میں لکھا ہوا ایک خط...... ایک چاقو اور دو چار خوبصورت پتھر جو شاید برکت کے لئے جیب میں رکھے گئے تھے۔

شانی کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے غش آ جائے گا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈولے نے کہا۔ ”باجی جی! آپ تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جائیں۔“

شانی وہیں بیٹھی رہی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسکیاں بھرتی رہی۔ مرنے والے کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”ان کو بھول جاؤ...... وہ سب ختم ہو گیا. . . خو، برف کے اندر چلا گیا۔“

یہ کیسے سفاک الفاظ تھے .... کیا یہ الفاظ سچ تھے.. . اور کیا ان کا مطلب وہی تھا جو سمجھ میں آ رہا تھا؟ ختم ہونے سے کیا مراد ہے؟ ختم ہونے سے یہ مراد تو نہیں تھی کہ وہ ہم سب کے لئے ختم ہو گئے لیکن زندہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دلاسے دینے لگی لیکن کوئی دلاسا بھی اتنا مؤثر نہیں تھا کہ اس کے دل کی ٹوٹی ہوئی رگوں کو ٹوٹنے سے بچا سکتا۔

نہیں، وہ نہیں مر سکتا...... وہ دل ہی دل میں کراہی...... وہ اس طرح مجھ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ وقت کتنا بے رحم ہو مگر اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا۔

اجمل، شیر محمد اور عباس لاش کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ برآمدے میں سے کچھ اینٹیں اُکھاڑ لی تھیں۔ اب وہاں گڑھا کھودنے میں مصروف تھے۔ اس کام میں انہیں کم از کم ایک گھنٹہ لگنا تھا۔ بیلچے سے کھدائی کرتے ہوئے وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے تاکہ اردگرد کے کسی گھر تک کھدائی کی آواز نہ پہنچے۔

شانی نڈھال سی ہو کر ساتھ والے کمرے میں آن لیٹی۔ یہ بات تو اسے اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ گورے کے بنگلے پر حملہ کرنے والے لوگ گلگت یا چیلاس وغیرہ کی سائیڈ سے آئے تھے۔ اگر وہ رستم اور ناصر وغیرہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے تو پھر انہیں...... ان ہی شمالی علاقہ جات میں ڈھونڈا جانا چاہیے تھا۔ اجمل خان اور حاجی حیات کے اہلکاروں نے ان علاقوں میں بہت خاک، یا کہنا چاہیے کہ برف چھانی تھی۔ دور دراز کی بستیوں تک پہنچے تھے۔ علاقے کے لوگوں سے سن گن لی تھی۔ سپ گندل کے حوالے سے بھی بہت ٹوہ لگانے کی

کوشش کی تھی کہ شاید کسی ایسے کوہستانی قبیلے کا پتا چل جائے جو اس پودے کو خاص اہمیت دیتا ہو...... یا کوئی ایسی جگہ جہاں یہ پودا قدرتی طور پر پایا جاتا ہو.. لیکن ابھی تک کوئی بھی ٹھوس بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ کم از کم کوئی ایسا ”سراغ“ نہیں مل سکا تھا جس کی مدد سے حاجی حیات یا اجمل خان پیش رفت کر سکتے...... اور پھر موسم سرما شروع ہو گیا تھا۔ اب بلند پہاڑوں پر شدید برف باری کے سبب اہم راستے بند پڑے تھے۔

شانی اپنی اوڑھنی میں چہرہ چھپا کر لیٹی رہی اور سسکتی رہی۔ ڈولا بے بسی سے اس کے قریب بیٹھا رہا۔ آج دوپہر جب اجمل خان نے رنگ والی کی حویلی میں آ کر شانی کو طویل قامت راکب خان کے بارے میں اطلاع دی تھی تو شانی کا دل جوش اور امید سے بھر گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اُڑ کر گوجرانوالہ پہنچ جائے اور اس شخص سے ملے...... اور وہ پہنچ بھی گئی تھی لیکن یہاں پہنچ کر جو کچھ سامنے آیا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

راکب کی لاش کو دبانے کے بعد عباس اور شیر محمد اینٹوں کا فرش پھر سے درست کرنے لگے۔ وہ اینٹوں کو اس طریقے سے لگا رہے تھے کہ ان کی اُکھاڑ پچھاڑ کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ اجمل ہاتھ منہ دھو کر شانی کے پاس آن بیٹھا۔ وہ افسردہ تھا۔ شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا اجمل۔ مجھے یقین ہے، اگر مجھے ایک دو گھنٹے مل جاتے تو میں اس سے کچھ نہ کچھ ضرور پوچھ لیتی۔“

”خو، آپ ٹھیک کہتا ہے شانی بہن...... ام آپ کو یہاں لایا بھی تو اسی لئے تھا۔ امارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھ کہ یہ شخص اس طرح کا حرکت کر ڈالے گا۔ ام خود سے اور آپ سے بہت شرمندہ ہے۔ یہ بندہ امارے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا کاش ام اس کی حفاظت کر سکتا۔ امارا دل غم سے ایک دم چُورا چُورا ہو گیا ہے۔“

شانی خاموش رہی۔ کمرے میں بوجھل سا سناٹا چھایا رہا۔ اس سناٹے کو توڑنے کے لئے شیر محمد نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میرا قصور سب سے زیادہ ہے لیکن آپ کی طرح مجھے بھی یہ شک نہیں تھا کہ یہ بندہ اپنی جان لینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ سونے سے پہلے میں اس کے پاس گیا اور پوچھا، لالہ چائے پیو گے؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ تب تک یہ بالکل صحیح تھا۔ دوپہر کو بھی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے چاول کھلائے تھے۔“

اجمل رندھے ہوئے گلے سے بولا۔ ”شانی بہن! کیا راکب نے رستم بھائی کے بارے میں کچھ بُرا بات بولا تھا؟“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور آنسو چھپانے کے لئے چہرہ پھر بازوؤں کی اوٹ میں کرلیا۔

"نہیں شانی بہن! آپ نے جو سنا ایک دم غلط ہے۔" اجمل جذباتی ہو کر بولا "امارے رستم بھائی کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ جہاں ہوگا بالکل صحیح سالم ہوگا۔ آپ بالکل بے فکر رہو بالکل بے فکر رہو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی اپنی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

راکب کی ذاتی اشیاء میں سے ملنے والا خط ڈولے کے ہاتھ میں تھا۔ نہ جانے یہ کون سی جناتی زبان تھی۔ ایک لفظ پلے نہیں پڑتا تھا۔ ڈولا خط کو بغور دیکھ رہا تھا پھر اس نے یہ خط تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اب ام کو واپس چلنا چاہیے شانی بہن۔" اجمل خان نے کہا۔

شانی کو اپنا جسم مٹی کا ڈھیر محسوس ہو رہا تھا، نقاہت ہی نقاہت تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا، سب لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ وہ کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائے اور بستر پر گرنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن فی الوقت یہ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ کچھ لمحے ایسے ہی جاں گسل ہوتے ہیں۔ چٹان جیسے سخت لوگوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں...... راکب کے کہے ہوئے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح شانی کے کانوں میں تھے اور یہ سیسہ اس کے پورے جسم کو داغ رہا تھا۔

اچانک گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اجمل خان اور شیر محمد یوں اچھلے یوں پاؤں کے قریب سے کوئی سانپ نمودار ہوگیا ہو۔ اجمل خان کے بقول شیر محمد نے یہ مکان دو تین ماہ سے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ غالباً شیر محمد کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ رات کے اس پہر گھر کے بیرونی دروازے پر کوئی دستک دے گا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیر محمد نے اجمل سے مل کر گھر کے برآمدے میں ایک لاش، ایک خون آلود دری اور چند دیگر اشیاء دبائی تھیں...... اب دروازے پر بے وقت کی دستک ہوگئی تھی۔

"تمہارے کسی ہمسائے کو تو شک نہیں ہوا؟" اجمل نے سرگوشی میں شیر محمد سے پوچھا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" شیر محمد نے کہا اور اپنی قمیص کے نیچے لکڑی کے دستے والا ریوالور لگاتا ہوا باہر صحن میں چلا گیا۔ اندر اجمل خان بھی چوکس نظر آنے لگا تھا۔ عباس نے ایک باریائی لاکر برآمدے میں فرش کے اس حصے پر بچھا دی جسے اکھاڑا گیا تھا۔ برآمدے میں سے چھوٹی موٹی مشکوک اشیاء بھی ہٹادی گئیں۔ شانی نے اندرونی کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، شیر محمد باہر چلا گیا تھا۔ شاید آنے والا اس کا واقف کار تھا۔ شیر محمد کے باہر جانے کے بعد

بیرونی دروازہ پھر بند ہوگیا تھا۔ گوجرانوالہ کی اس مضافاتی آبادی میں رات کا سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ جوں جوں رات بھیگ رہی تھی ایک ٹھٹھری ہوئی دھند نشیب و فراز کو ڈھانپتی چلی جا رہی تھی۔

ڈولے کے کان کسی شکاری جانور کی طرح کھڑے تھے۔ شانی نے اس سے پوچھا۔

"کون ہے باہر؟"

وہ اعتماد سے بولا "ایک آدمی ہے..... کسی بزرگ کا پیغام لے کر آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ پیغام آپ کے لئے ہے۔ ایک رقعہ دے رہا ہے یہ شخص شیر محمد صاحب کو۔"

شانی، اجمل اور عارف وغیرہ نے اب ڈولے کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا تھا اور اپنا انوکھا پن اس نے بہت دفعہ ثابت کیا تھا۔

شانی نے خود کو سنبھالا، اٹھ کر اوڑھنی درست کی اور جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ دروازے پر کون ہے۔ ابھی وہ صحن میں ہی تھی کہ شیر محمد واپس آتا نظر آیا۔ شانی اسے نظر انداز کرتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور باہر گلی کی یخ بستہ تاریکی میں جھانکا۔ اسے ایک سائیکل سوار نظر آیا جو تیزی سے گلی کے موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا۔ "کون تھا یہ؟" شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

شیر محمد نے اپنی چادر کی بغل میں سے ایک سفید رنگ کا پرچہ نکالا اور شانی کی طرف بڑھا دیا۔ "نور الحسن راجا نام کا ایک بندہ تھا۔ آپ کے لئے دے گیا ہے۔"

ڈولے کی صلاحیت ایک بار پھر ثابت ہوئی تھی۔

"کیا کہتا تھا؟" شانی نے آنسو پونچھتے ہوئے دریافت کیا۔

"کہتا تھا مجھے پیر بابا نے بھیجا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ بی بی یہاں ہیں۔ میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا کہ وہ کون ہے لیکن وہ آناً فاناً نکل گیا۔"

بیرونی دروازے کو کنڈی چڑھا کر شانی اندر برآمدے میں آئی اور بلب کی روشنی میں پرچہ دیکھنا شروع کیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ایک بھولے بسرے شخص کے نورانی خدوخال اس کی نظروں کے سامنے نمایاں ہونے لگے۔ وہ اس شخص کو کیسے بھول سکتی تھی جس نے نارپور سے آگے ایک تاریک ویرانے میں شانی کو چوہدری بشیر کے کزن بابر کی درندگی سے بچایا تھا۔ اس واقعے کا ایک ایک لمحہ شانی کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا..... اور ساتھ ہی اس مہربان بزرگ کی صورت بھی جسے اس کے ساتھی پیر بادشاہ یا پیر بابا کہتے تھے۔ ہاں، وہ واقعہ شانی کے ذہن پر کندہ تھا۔ بارش سے بھیگے ہوئے، تاریک درختوں میں بھاگتے ہوئے اس کی ٹانگ ایک

دوشاخہ جڑ میں پھنس گئی تھی۔ بابر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے شانی کی ٹانگ چھڑانے کی بجائے اسی حالت میں اس پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہا تھا۔ تب مہربان بزرگ پیر بابا ایک فرشتے کی طرح نمودار ہوا تھا اور شانی کی حفاظت کی تھی۔

یہ اسی پیر بابا کا خط تھا۔ شانی ان کی تحریر نہیں پہچانتی تھی مگر اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ ان کے لکھے ہوئے الفاظ ہیں۔ پیر بابا نے شانی کے لئے اپنا مخصوص لفظ ''میرا بچہ'' استعمال کیا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

''میرا بچہ! آج بہت عرصے بعد تمہیں مخاطب کر رہا ہوں لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ میں تم سے یکسر بے خبر رہتا ہوں۔ تمہارے حالات کی کچھ نہ کچھ آگاہی مجھ کو رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں میرا بچہ اس وقت تم بہت دکھی ہو۔ تمہاری آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس رہی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی دکھ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور نہ ہی خوشی کے بغیر مکمل ہوتی ہے۔ خوشی میں سے دکھ اور دکھ میں سے خوشی کی کونپلیں نکلتی ہیں۔ قدرت ہمارے دکھوں کا مداوا ضرور کرتی ہے...... کوئی ایک خوشی ہمیں نہ مل سکے تو اس کے بدلے میں دوسری خوشی دوسرے طریقے سے مل جاتی ہے...... تو میرا بچہ ہمت نہیں ہارنی۔ سفر جاری رکھنا ہے۔ رات کتنی بھی لمبی ہو، کتنی بھی کالی ہو، صبح کا راستہ تو نہیں روک سکتی ناں۔ ہمت کرو میرا بچہ، ہمت کرو۔ اس وقت کچھ لوگوں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔ یہاں سے تیس چالیس میل دور گجرات بائی پاس سے ذرا آگے نور فیکٹری کے پیچھے ایک گاؤں کاچھی وال ہے۔ کاچھی وال کے تھانیدار کا نام عاقل گوندل ہے۔ عاقل کی حوالات میں ایک میاں بیوی ہیں۔ ان میاں بیوی کو چھڑانا بہت ضروری ہے اور تم انہیں چھڑا سکتی ہو۔ عاقل نے ابھی تک ان پر کوئی ٹھوس الزام نہیں لگایا ہے بس شبے میں پکڑ رکھا ہے۔ تم ان کی ضمانت دے دو گی تو تھانیدار انہیں چھوڑ دے گا۔ ہو سکے تو ان دونوں کو اپنے ساتھ رنگ والی لے جانا۔ بعد میں میں تمہیں بتا دوں گا کہ ان دونوں کا چھڑایا جانا کیوں ضروری تھا...... اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں خود ہی پتہ چل جائے۔ اس موقع پر میں تمہیں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر تمہیں کوئی مجبوری نہیں تو ابھی یہاں سے گجرات روانہ ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کئی سوال کلبلانے لگے ہوں گے۔ ان سوالوں کے جواب میں میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ان میاں بیوی کا تعلق رستم سیال سے ہے......''

اس تحریر نے شانی کو سکتہ زدہ کر دیا۔ شیر محمد نے پیغام پہنچانے والے کا نام راجا بتایا تھا۔ جب وہ سائیکل پر سوار گلی کے موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا تو شانی نے اسٹریٹ لائٹ میں اس کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی۔ وہ یقیناً راجا ہی تھا۔ پیر بابا کے اس مرید کو بھی شانی کسی نہ کسی حد تک جانتی تھی۔ رقعہ شانی کے ہاتھ میں لرز رہا تھا...... اور محترم بزرگ کا چہرہ شانی کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ محترم بزرگ کا اصل نام آصف وارثی تھا۔ وہ ماضی میں فلموں کے ایک معروف اداکار رہے تھے لیکن اب یہ خوبرو اداکار ایک نفس کش فقیر کا روپ دھار چکا تھا۔ ان کی کسی ''وڈیو آرٹسٹ جیسی آواز'' شانی کو اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی.... وقتِ رخصت انہوں نے شانی سے کہا تھا: ''میرا بچہ! میں جانتا ہوں تُو مصیبتوں کے گھیرے میں ہے لیکن جس مالک نے تجھے مشکلیں دی ہیں اس نے تجھے حوصلے بھی دیا ہے۔ بس اس حوصلے کو ٹوٹنے نہ دینا۔''

شانی کا دھیان ایک بار پھر رقعے کے مندرجات کی طرف چلا گیا۔ پیر بابا نے جس مرد اور عورت کا ذکر کیا تھا وہ کون تھے؟ رستم سے ان دونوں کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ کہیں وہ بے جی اور چاچا ابراہیم تو نہیں تھے؟ کئی سوال شانی کے ذہن میں اودھم مچانے لگے۔ اچانک وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے لگا کہ اس کے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئی ہیں۔ کہیں یہ میاں بیوی رستم کی بہن اور بہنوئی تو نہیں تھے۔ شانی کو یہ بات معلوم تھی کہ رستم کی ایک بڑی بہن آپو زاہدہ ہیں جنہیں وہ بہت زیادہ چاہتا ہے۔ اپنی بہن اور بہنوئی کو دشمنی کی آگ اور پولیس کی دستبرد سے بچانے کے لئے رستم نے انہیں کسی محفوظ مقام پر رکھا ہوا تھا۔ رستم کے دوست زوار اور اس کی بیوی شیری کے سوا اس مقام کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اب یہ مقام سربستہ راز نہ رہا ہو اور وہ میاں بیوی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہوں۔ چند لمحوں میں شانی کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈپٹی ریاض کی منحوس صورت گھومنے لگی۔ وہ بڑے عرصے سے ان میاں بیوی کی تلاش میں تھا اور انہیں ہر صورت اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ تو کیا ڈپٹی ریاض کی یہ خواہش پوری ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے؟

اجمل خان بغور شانی کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ رہا تھا۔ ''شانی بہن! ام کو بتائیں کیا لکھا ہے اس خط میں؟'' اس نے پوچھا۔

شانی نے ایک گہری سانس لی۔ خط پر ایک نگاہ مزید دوڑائی اور بولی۔ ''اجمل خان! اگر ہم نے یہاں سے گجرات جانا ہو تو کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگے گا جی، لیکن وہاں خیریت تو ہے ناں؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمیں گجرات سے تھوڑا آگے کاچھی وال گاؤں پہنچنا ہے۔ تم نے

نام سنا ہوا ہے گاؤں کا؟"

اجمل کے بجائے ڈرائیور عباس نے جواب دیا۔"بالکل بی بی جی! سنا ہوا ہے۔ وہاں کسی سے ملنا ہے آپ کو؟"

"تھانیدار سے...... وہاں تھانہ ہے ناں؟"

"ہاں جی! ابھی ایک سال پہلے ہی بنا ہے۔" ڈرائیور عباس نے جواب دیا پھر ذرا پریشان لہجے میں بولا۔"خیریت ہے بی بی جی؟"

اجمل نے زچ ہو کر کہا۔"اوئے اللہ کے بندے! کبھی تھانے میں بھی خیریت ہوتا ہے؟" پھر اس نے اپنا رخ شانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔"آپ بے فکر رہو جی۔ ام خود گاڑی چلائے گا۔ ان شاء اللہ آپ کو ایک گھنٹے سے پہلے گجرات پہنچائے گا۔ آپ آ جائیں پورا۔"

شانی نے چند لمحے کے لئے سوچا پھر اوڑھنی لے کر شولڈر بیگ کندھے سے لٹکایا اور جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس طرح صرف ایک تحریر پڑھنے کے بعد گجرات کے لئے روانہ ہو جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا مگر نہ جانے کیوں شانی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ تحریر انہی محترم بزرگ کی ہے جنہیں وہ اٹھتے بیٹھتے یاد کرتی ہے...... اور اس تحریر پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اجمل خان نے شیر محمد کو ایک طرف لے جا کر اسے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان ہدایات کا تعلق یقیناً اس کرائے کے گھر سے ہی تھا۔ اب گھر کے فرش میں ایک لاش دفن ہو چکی تھی اور ان درودیوار کو جتنی جلدی چھوڑ دیا جاتا، اتنا ہی بہتر تھا۔

کچھ ہی دیر بعد 86 ماڈل کی ٹویوٹا کار تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی جی ٹی روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ ان کا رخ گجرات شہر کی طرف تھا۔ کار میں شانی اور اجمل خان کے علاوہ ڈولا اور ڈرائیور عباس بھی موجود تھے۔ شانی ڈولے کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔

اجمل خان کی پھولی ہوئی چرمی جیکٹ میں ماؤزر موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا پسٹل بھی تھا۔ ان دونوں ہتھیاروں کے علاوہ فالتو راؤنڈ بھی اجمل کی جیکٹ میں موجود تھے۔ اجمل اپنے حلئے اور بول چال کے لحاظ سے ایک عام بندہ نظر آتا تھا۔ ایک خوش خوراک اور بے فکرا سا پٹھان۔ لیکن شانی جانتی تھی کہ اس کے اندر کتنا مضبوط اور دبنگ انسان چھپا ہوا ہے۔ وڈے ڈیرے کی لڑائی میں خان کی شجاعت ابھر کر سامنے آئی تھی اور کئی موقعوں پر اس نے رستم کو بھی دنگ کر دیا تھا۔ اس کے بعد پنڈی کی رہائشی کوٹھی میں اجمل کے ہاتھوں

چوہدری بشیر کا قتل بھی ایک ناقابلِ فراموش واقعہ تھا۔ شانی اس خون ریزی کو یاد کر کے کانپ گئی۔ اجمل نے بشیر اور اس کے ہرکاروں کو مکھیوں کی طرح مار ڈالا تھا۔

بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اجمل نے کہا۔"شانی بہن! ام کو تھوڑا سا آئیڈیا دے دو...... تاکہ ام ذرا تیار ہو جائے۔ کیا وہاں کوئی لڑائی مڑائی کا مالمہ ہے یا بس بات چیت کرنا ہے۔"

"تھانیدار نے دو بندوں کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ ان کی ضمانت کرانی ہے۔"

"اوہو۔" اجمل خان نے لمبی سانس لی۔ اس سانس میں گہری مایوسی بھی شامل تھی۔ غالباً وہ کسی ہنگامے کی توقع کر رہا تھا۔

شانی نے کہا۔"لیکن معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تھانیدار کسی طرح کی تکرار کرے لیکن تم نے بھڑکنا نہیں ہے۔ جوش کو دبا کر رکھنا ہے۔"

اجمل نے اطاعت مندی سے سر ہلایا پھر شاید خفت مٹانے کے لئے اس نے نسوار کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تاہم اسے راستے میں ہی یاد آ گیا کہ نسوار پر پابندی ہے۔ اس کا ہاتھ چیسٹ پاکٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے پاکٹ میں لے جانے کے بجائے چہرے کی طرف لے گیا اور بے وجہ داڑھی کھجانے لگا۔

ڈولا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس موقع پر کوئی مسکرانے والی بات کرتا مگر کچھ دیر پہلے والے واقعے نے ان سب کو گہری سنجیدگی میں ڈبو رکھا تھا۔ راکب خان نے جس طرح اپنی رگیں کاٹ کر اپنی جان لی تھی اور خون میں لت پت ہو کر زمین برد ہوا تھا، وہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔ راکب کی ساری ذاتی اشیاء ڈولے نے ایک چھوٹے بیگ میں ڈال کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ یہ بیگ اب ڈولے اور شانی کے درمیان گاڑی کی نشست پر پڑا تھا۔ شانی کی ہدایت پر ڈولے نے بیگ اگلی نشست کے نیچے گھسا دیا۔

وہ جس وقت کاچھی وال گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف ہلکے کہرے میں لپٹے ہوئے کھیت تھے اور سردی معمول سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی...... شانی جب بھی دریائے چناب کے پاس سے گزرتی تھی، اسے اپنے اور رستم کے حوالے سے بہت کچھ یاد آتا تھا۔ آج بھی یاد آیا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ آج وہ اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل پیر بابا کی تحریر میں الجھا ہوا تھا۔ پیر بابا کہاں تھے؟ انہیں کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت میں گوجرانوالہ کے ایک خاص مکان میں پائی جاتی ہے؟ اور اگر انہیں یہ سب معلوم تھا تو پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ گوجرانوالہ کے اس

مکان میں آج ایک لاش برآمدے کے فرش میں دبائی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد شانی کا دھیان ایک بار پھر رستم کی بہن اور بہنوئی کی طرف چلا گیا۔ اسے اپنے سارے جسم میں سنسناہٹ کی بلند لہریں محسوس ہوئیں۔ دل زیادہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ کیا وہ واقعی رستم کی بہن آپو زاہدہ اور بہنوئی اکرام سے ملنے جارہی تھی؟ کیا واقعی ایسا ہورہا تھا؟ اس نے رستم کی زبان سے آپو زاہدہ کے بارے میں کئی بار سنا تھا۔ خاص طور سے شادی کے بعد روکیٹ بستی میں رہتے ہوئے رستم اکثر اپنی آپو زاہدہ کا ذکر کرتا تھا۔ اپنی آپو کا نام لیتے ہی رستم کی آنکھوں میں ایک محبت بھری نمی آجاتی تھی۔ اس نمی میں بے شمار سہانی رُتوں کی اَن گنت سنہری یادیں لہریں لیتی تھیں۔ رستم کی زبان سے آپو زاہدہ کے بارے میں سن سن کر شانی کے دل میں ان کے لئے بہت تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بڑی حیرت کے ساتھ سوچا، کیا اس کہر آلود رات میں اس نیم پختہ گاؤں کے پولیس اسٹیشن کے اندر وہ رستم کی بہن سے ملنے جارہی ہے؟ ذرا دیر کے لئے اس نے سوچا، کاش ایسا ہو مگر پھر فوراً ہی سوچا کاش ایسا نہ ہو۔

گاؤں کو جانے والے کچے پکے راستے پر انہیں ایک موٹر سائیکل سوار حوالدار نظر آیا۔ انہوں نے گاڑی اس کے قریب روکی اور تھانے کا راستہ پوچھا۔ نیچے کو لٹکتی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں والے حوالدار نے انہیں راستہ بتایا۔ اس کی موٹر سائیکل کے ہینڈل سے دو بڑے شاپر لٹک رہے تھے۔ ایک میں شاید مچھلی کا کچا گوشت تھا...... دوسرے میں کاغذی بادام تھے۔ تھانوں میں مصیبت زدہ لوگ ایسی سوغاتیں پہنچاتے ہی رہتے ہیں۔

''تھانیدار صاحب ہوں گے؟'' شانی نے پوچھا۔

''آہو جی! تھانیدار صاحب سوتے ہی تھانے میں ہیں لیکن اس ویلے آپ ان کو تنگ نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ سویرے آٹھ نو بجے کے بعد آجائیں۔''

''نہیں، ضروری کام ہے۔'' شانی نے کہا اور عباس کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

حوالدار بھی غالباً چھٹی کر کے گھر جارہا تھا، آگے بڑھ گیا۔ اس کی موٹر سائیکل کی آواز بھی اس کی اپنی آواز کی طرح پھٹی ہوئی تھی۔

شانی کو امید نہیں تھی کہ رات کے اس پہر کاچھی وال کا تھانیدار بہ نفس نفیس تھانے میں موجود ہوگا اور جاگ رہا ہوگا۔ یہ فربہ جسم اور گہرے گندمی رنگ والا اے ایس آئی عاقل گوندل تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک پرانی چوٹ کا نشان اس کے چہرے کو ایک کرخت وضع دے رہا تھا۔ وہ تھانے ہی کے ایک کمرے میں بڑی سی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا اور حقہ پی رہا

تھا۔ فرش پر مونگ پھلی اور گنڈیریوں کے چھلکے تھے۔ مٹی کی انگیٹھی دہک رہی تھی اور تین افراد تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ کمرے کے عین سامنے برآمدے میں ایک پچاس سی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ ایسی موٹر سائیکلیں بغیر کلچ کے ہوتی ہیں۔

شانی اور اجمل وغیرہ کی بے وقت آمد نے سب انسپکٹر کو بدمزہ کیا۔ اس نے انہیں بیٹھنے کا بھی نہیں کہا اور کھڑے کھڑے سوال جواب کرتا رہا۔ بہرحال جب شانی نے اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ بُری طرح چونک گیا۔ نہ صرف چونکا بلکہ کھڑا بھی ہوگیا۔ ''اوہو...... تو آپ رنگ والی کی چھوٹی بی بی ہیں۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا جی۔''

اجملو بولا۔ ''خو، تم نے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تم چپ کرتا تو بی بی صاحبہ کچھ عرض کرتی ناں۔''

''اوہو ہو...... میں شرمندہ ہوں جی۔ چلیں آئیں دفتر میں بیٹھتے ہیں۔'' اس نے ٹوپی اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا پھر اپنے ماتحت کو جھاڑ کر بولا۔ ''چل اوئے رفاقت! کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ چل بی بی ہوراں کو بٹھا دفتر میں اور چائے شائے بنوا۔''

کچھ ہی دیر بعد شانی، اجمل اور سب انسپکٹر عاقل تھانے کے چھوٹے سے آفس میں بیٹھے تھے۔ عاقل کافی مرعوب نظر آرہا تھا۔ اس گاؤں سے رنگ والی کا فاصلہ چالیس پچاس میل سے کم نہیں تھا لیکن رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کی حیثیت سے شانی کی شہرت یہاں موجود تھی۔ شانی نے کہا۔ ''عاقل صاحب! میں آپ سے ان میاں بیوی کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں جنہیں آپ نے آج صبح سویرے پکڑا ہے۔''

''نہیں چھوٹی چوہدرانی! ہم نے صرف بندے کو پکڑا تھا۔ اس کے پاس سے چوری کی موٹر سائیکل برآمد ہوئی ہے۔ بعد میں اس کی عورت بھی یہاں آگئی۔ اس نے بہت شور مچایا اور دھمکیاں دیں...... مجبوراً اسے بھی بند کرنا پڑا ہے۔''

''بندہ کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

عاقل نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''اوئے رفاقت علی! لے کر آ اس شریفے کو یہاں اور ہتھکڑی نہیں کھولنی، خطرناک بندہ ہے۔''

ہیڈ کانسٹیبل رفاقت علی ایک کانسٹیبل کے ساتھ لاک اَپ کی طرف چلا گیا۔ عاقل نے بغیر کلچ والی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ موٹر سائیکل برآمد ہوئی ہے جی اس سے...... اس کا چیسی نمبر اور کاغذات شاغذات سب جعلی ہیں۔ دو مہینے پہلے اس کی چوری کی رپٹ بھی درج ہوئی ہے۔''

اسی دوران میں دو کانسٹیبل ایک دراز قد شخص کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور چہرے پر تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ رستم نے شانی کو بتایا تھا کہ اس کے بہنوئی اکرام کا ایک بازو دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اس نے مخالف پارٹی کی ایک بدتمیز عورت کو تھپڑ جڑ دیا تھا۔ بدلے میں اس کا ہاتھ ہی کاٹ ڈالا گیا تھا۔ شانی نے اندر آنے والے حوالاتی کے بازو دیکھے...... اس کی رگوں میں خون سنسنا گیا۔ یہی رستم کا بہنوئی اور آپو زاہدہ کا شوہر تھا۔ اس کا دوسرا بازو ندارد تھا۔ وہ سینہ تانے کھڑا تھا اور جلتی نظروں سے تھانیدار کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے خود پر بے پناہ ضبط کر رکھا ہے۔ اگر وہ اپنے اندرونی غضب کو آزاد کر دیتا تو شاید یہاں خون ریز ہنگامہ شروع ہو جاتا۔

''اوئے نظریں نیچی کر۔'' تھانیدار عاقل گرجا۔

''میں نے کسی کی بہن کو اغوا نہیں کیا ہے۔'' حوالاتی بھی جواب میں دہاڑا۔

''اوئے تیری تو......'' تھانیدار پھنکارا اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

شانی دونوں کے درمیان آ گئی۔ ''نہیں عاقل صاحب! آپ حوصلے سے کام لیں۔'' وہ پوری طرح ڈٹ کر بولی۔

عاقل ذرا ڈھیلا پڑا تو شانی نے حوالاتی کو ڈانٹا۔ ''میں یہاں آپ لوگوں کی مدد کرنے آئی ہوں۔ آپ معاملے کو اور بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ذرا ہوش سے کام لیں......''

صورت حال میں تھوڑی سی بہتری آئی تو شانی نے درخواست کر کے حوالاتی کو لاک اَپ میں واپس بھجوا دیا۔ اسے پچانوے فیصد یقین ہو چکا تھا کہ یہی حوالاتی رستم کا بہنوئی ہے۔

''میں اس کی بیوی سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''

''تھانے کے پچھواڑے ہے۔ لیڈیز اہلکاروں کے پاس۔'' عاقل نے جواب دیا۔

شانی نے کہا۔ ''میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

تھانیدار عاقل نے پہلے تو پس و پیش کیا مگر پھر اجازت دے دی۔ شانی اور اجمل تھانے کے پچھواڑے واقع کوارٹر نما کمروں میں پہنچے۔ ساتھ میں ہیڈ کانسٹیبل رفاقت بھی تھا۔ پھر رفاقت اور اجمل خان تو باہر کھڑے رہے اور شانی ایک لیڈیز کانسٹیبل کے ساتھ کوارٹر میں چلی گئی۔ یہاں موجود دوسری لیڈی کانسٹیبل دیہاتی لباس میں لوہے کی چارپائی پر پھیل کر سو رہی تھی۔ اس دوسری کانسٹیبل نے جاگنے کے بعد شانی کو فوراً پہچان لیا اور قدرے مؤدب نظر آنے لگی۔

''حوالاتی کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''آؤ جی میرے ساتھ۔'' اس نے چابیوں کا گچھا پکڑا اور اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی شانی کے آگے آگے چل دی۔

اس نے بند کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے چٹائی پر تین عورتیں لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک بکھرے بالوں والی کوئی نشئی عورت تھی۔ دوسری ایک تیس پینتیس سالہ ہشتن دکھائی دیتی تھی۔ تیسری عورت پر شانی کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ پینتیس چھتیس سال کی ایک دراز قد قبول صورت خاتون تھی۔ شانی نے اس سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن ایک ہی لمحے میں وہ اسے پہچان گئی۔ یہی رستم کی بہن آپو زاہدہ تھی۔ بہن کی شکل میں اپنے بھائی کی کئی مشابہتیں پائی جاتی تھیں۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور اپنی نند سے لپٹ جائے۔ ان کے گلے سے لگ کر اتنا روئے کہ دل کا سارا بوجھ آنکھوں کے راستے بہہ جائے لیکن وقت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور دھیان سے آپو زاہدہ کا جائزہ لینے لگی۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھیں۔ سر پر گرم اوڑھنی تھی۔ ان کی پیشانی پر بھی ایک نیل پڑا ہوا تھا۔ غالباً گرفتاری کے وقت انہوں نے بھی مزاحمت کی تھی۔

شانی نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''میں ان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

لیڈی کانسٹیبل نے اثبات میں سر ہلایا اور باقی دونوں عورتوں کو یوں ہانک کر باہر لے گئی جیسے وہ بھیڑ بکریاں ہوں۔

شانی بے تکلفی سے چٹائی پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار آپو زاہدہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سینے میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو اس نے بڑی مشکل سے روک رکھا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو بہن؟'' آپو زاہدہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ آپ کی صورت بہت جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ جیسے پہلے بھی آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟''

''نسرین۔'' آپو زاہدہ نے ذرا ہکلا کر کہا۔ شانی کو یاد آیا کہ رستم نے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپو زاہدہ اور بھائی اکرام فرضی ناموں سے رہ رہے ہیں۔ شانی نے رستم سے بہت پوچھا تھا لیکن اس نے ان دونوں کا اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ مگر آج اس یخ بستہ شب میں ایک حیران کن اتفاق کے سبب آپو زاہدہ اور بھائی اکرام دونوں شانی کے روبرو تھے۔

چند سیکنڈ بعد زاہدہ نے شانی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم کون ہو......اور اتنی حلیمی سے

کیوں بول رہی ہو۔ یہاں تو جو بھی آتی ہے سؤرنی کی طرح چلاتی ہے۔ حرامزادیاں..... وردی پہن کر خود کو آسمانی شے سمجھنے لگتی ہیں۔"

"میں آپ کی مدد کرنے کے لئے آئی ہوں۔ جوہر آباد کی طرف ہماری زمینیں ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ لوگ بات مانتے ہیں اور تھوڑا بہت احترام کرتے ہیں۔ خاص طور سے عورتوں کے مسئلے مسائل حل کر کے مجھے بہت اطمینان ہوتا ہے۔ مجھے شام کو پتا چلا تھا کہ تھانیدار عاقل نے آپ کو اور آپ کے شوہر کو حوالات میں ڈالا ہوا ہے۔ قانون کے مطابق کسی بھی عورت کو شام کے بعد عام تھانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے جیل بھیجنا پڑتا ہے یا پھر شخصی ضمانت پر گھر بھیجنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کے شوہر کو بھی کل تک مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا تو اس کو یہاں رکھنا غیر قانونی ہوگا۔"

"تم وکیل ہو؟"

"نہیں جی! پر ان لوگوں سے نمٹنے کے لئے تھوڑا بہت قانون تو معلوم ہونا چاہیے ناں۔"

آپو زاہدہ کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ "ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ہم گوجر خان کے قریب "پہارو" گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ تھوڑی سی کھیتی باڑی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا عاشی کے ابو ایک ہتھ سے معذور ہیں۔ مشکل سے بال بچوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ بچوں کو اسکول لے جانے اور لانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ ایسی موٹر سائیکل ڈھونڈ رہے تھے جو ایک ہتھ سے چل سکے۔ ان کے ایک جاننے والے نے بتایا کہ یہاں گجرات میں ایک بندے کے پاس ایسی موٹر سائیکل ہے اور سستی مل رہی ہے۔ عاشی کے ابو پرسوں سویرے یہاں آئے اور موٹر سائیکل کی بات کی۔ سودا ہو گیا۔ آج صبح سویرے وہ موٹر سائیکل لے کر واپس گاؤں آ رہے تھے کہ یہاں ایک ناکے پر پولیس والوں نے انہیں روک لیا...... اور پکڑ کر تھانے میں بند کر دیا۔ مجھے نو دس بجے یہ اطلاع ملی۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے بہن جو مشکل وقت میں ساتھ دے۔ میں کر ماں ماری اکیلی ہی گوجر خان سے بس میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گئی۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ پولیس والوں نے عاشی کے ابو کو موٹر سائیکل سمیت تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ اب یہ عاشی کے ابو سے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے اور بھی ساتھی ہیں اور تم گاڑیاں چھینتے ہو۔"

آپو زاہدہ سسکنے لگی۔ "اللہ کی مار ہو ان پر۔ ایک ایسے بندے پر جھوٹے الزام لگا رہے ہیں جو حق حلال کی روزی کے لئے صبح سے شام تک کھیت میں پانی کی طرح پسینہ گراتا ہے۔

انہوں نے عاشی کے ابو سے مار پیٹ بھی کی ہے۔ عاشی کے ابو کو دیکھ کر اور تھانیدار کی باتیں سن کر مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اسے بُرا بھلا کہا تو اس نے مجھے بھی حوالات میں بند کرا دیا۔ اب ہمارے بچے گھر میں اکیلے ہماری اڈیک میں رو رہے ہوں گے۔ یہ لوگ فرعون بنے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ موٹی سپاہن مجھ سے کہہ رہی تھی۔ جان چھڑانی ہے تو کسی طرح تیس چالیس ہزار روپے کا انتظام کر لو۔ بات عدالت میں چلی گئی تو لمبا وختا پڑ جائے گا۔ اب میں غریبنی اتنے پیسے کہاں سے لاؤں۔ مشکل سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ میں نے تو اس موٹی سے کہا تھا، یہ اٹھارہ وی ہزار کی موٹر سائیکل رکھ لو اور ہماری جان چھوڑ دو۔ کہہ رہی تھی کہ اس موٹر سائیکل کو تو اب کسی گنتی میں نہ لاؤ۔ یہ تو پولیس کے قبضے میں آ گئی ہے۔ پنڈا چھڑانا ہے تو نقد رقم کا بندوبست کرو۔"

شانی نے بڑی محبت سے اپنی اشک بار نند کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ "آپ پریشان نہ ہوں آپا جی۔ میں سب ٹھیک کر لیتی ہوں۔ آپ نے ان لوگوں کو کچھ دیا تو نہیں ہے؟"

"دیا تو نہیں...... پر میرے سونے کے جھمکے انہوں نے اتروا لئے ہیں۔ عاشی کے ابو کی گھڑی اور پیسے وغیرہ بھی ان کے پاس ہیں۔"

"میں سب واپس لے لوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔" شانی نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد شانی سب انسپکٹر عاقل سے مصروف گفتگو تھی۔ وہ پولیس والوں کے روایتی انداز میں شانی پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ "بی بی جی! آپ کا کہا سر آنکھوں پر لیکن ہم نے بھی تو کسی کو جواب دینا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ دونوں میاں بیوی کچھ مشکوک سے لگ رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں لگتا ہے کہ یہ جو اس عورت کا خاوند شریف محمد ہے یہ کسی اور معاملے میں بھی ملوث رہا ہے۔ اب کچھ دماغ میں نہیں آ رہا... پر کوئی چکر ہے ضرور۔"

شانی اندر سے کانپ گئی مگر اس نے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ خود کو سنبھال کر اس نے عاقل گوندل کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ "کیا پھر... حاجی حیات صاحب سے ہی فون کرانا پڑے گا؟"

شانی کو یقین تھا کہ حاجی حیات کا نام سن کر عاقل ذرا نرم پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ قدرے ڈھیلے لہجے میں بولا۔ "یہ بات نہیں بی بی... لیکن دیکھیں ناں ہم کو بھی تو اپنا آپ بچانا ہوتا ہے۔ گاڑی چھیننے کی وارداتیں علاقے میں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ناک میں دم آیا ہوا ہے۔ اب یہ جو موٹر سائیکل ہے اس کا چیسی نمبر پڑھا ہی نہیں جا رہا۔ انجن نمبر میں بھی گڑبڑ کی

کوشش کی گئی ہے۔ یہ مشکوک گڈی ہے۔"

"لیکن شریف محمد تو کہتا ہے کہ اس نے دفتر سے ریکارڈ چیک کروایا ہے۔ انہوں نے کلیئر کیا ہے۔"

"انہوں نے تو رجسٹریشن سے کلیئر کیا ہے ناں۔ گاڑی سے تو کلیئر نہیں کیا۔ مسئلہ گاڑی کے نمبروں کا ہے۔"

پندرہ بیس منٹ تک شانی اور گوندل میں بحث ہوئی۔ شانی کو اندازہ ہو گیا کہ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ موٹر سائیکل کا چیسی نمبر ٹھیک سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کو بنیاد بنا کر عاقل نے مسئلہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ شانی نے بڑی فراست سے عاقل گوندل کو باور کرا دیا کہ اس معاملے سے اسے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ اگر بات حاجی حیات تک پہنچ گئی تو الٹا اسے مصیبت پڑ سکتی ہے۔ عاقل گوندل ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آپو زاہدہ اور اکرام کو شانی کی شخصی ضمانت پر رہا کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سونے کے جھمکوں کے سلسلے میں اٹکنے کی کوشش کی اور شانی کو بتایا کہ جھمکے حوالدار نے دراز میں رکھے تھے۔ وہ چھٹی کے بعد چابی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ سامان ابھی تھانے میں رہ گیا تو پھر دستیاب نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو لمبی چوڑی کٹوتی کے بعد ہوگا۔ اس نے اصرار کیا تو دراز کی چابی بھی تھانے کے اندر سے ہی مل گئی۔

شانی با اعتماد نظر آ رہی تھی مگر اندر سے کانپ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس والے آپو زاہدہ اور بھائی اکرام کی اصلیت سے آگاہ نہیں۔ اگر آگاہ ہو جائیں تو کاچھی وال سے گجرات تک اور گجرات سے لاہور تک تہلکہ مچ جائے۔ یہ کام جتنی جلدی نمٹ جاتا اتنا ہی بہتر تھا۔ آپو زاہدہ رستم کی بہن تھی اور رستم کی بہن اور بہنوئی کے لئے ڈپٹی ریاض جیسے خطرناک آفیسر کئی برس سے خون آشامی کرتے پھر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کسی موقع پر کہیں نہ کہیں عاقل گوندل کی نظروں سے بھی رستم کے بہنوئی اکرام کی تصویر وغیرہ گزری ہو۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد جب تھانے میں وال کلاک کی سوئیاں رات کے ایک بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ شانی، اکرام اور آپو زاہدہ کو لے کر کاچھی وال سے روانہ ہو رہی تھی۔ عاقل گوندل کا شکریہ ادا کر کے وہ لوگ ٹویوٹا کار میں آ بیٹھے۔ شانی نے دیکھا کہ بھائی اکرام اور آپو زاہدہ دونوں حیران نظر آ رہے تھے۔ خاص طور سے بھائی اکرام حیران تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ صرف ٹھیک ہو جائے گا بلکہ وہ تھانے کی چار دیواری سے بھی چھوٹ جائیں گے۔ بھائی اکرام کی نگاہوں میں شانی کو ہلکا سا اضطراب بھی

نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ شانی اور اجمل وغیرہ کی طرف سے ابھی تک پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ انہیں بجا طور پر یہ خدشہ لاحق ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ پولیس سے چھوٹ کر کچھ اور لوگوں کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔ شانی نے محسوس کیا کہ ایک عورت دوسری عورت کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ رہی ہے...... یعنی آپو زاہدہ موجودہ صورت حال سے مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

"اب ہم کہاں جائیں گے؟" آپو زاہدہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آپا جی! میری تو یہ خواہش ہوتی کہ آپ پہلے میرے ساتھ چلیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کے بچے آپ کے لئے پریشان ہوں گے۔ اس لئے آپ کی میزبانی کی خواہش پھر کبھی پوری کر لوں گی۔ فی الوقت ہم آپ کو آپ کے گاؤں لے جا رہے ہیں۔"

اکرام نے کہا۔ "بہتر تو یہ تھا کہ آپ ہمیں پکی سڑک پر پہنچا دیتے، وہاں سے ہم بس کے ذریعے چلے جاتے۔"

"نہیں یہ ٹھیک نہیں بھائی صاحب۔" شانی نے کہا۔ "رات کے اس پہر آپ کے لئے پھر کوئی مصیبت بن سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی موٹر سائیکل بھی آپ کے گاؤں پہنچانی ہے۔"

"موٹر سائیکل کیسے جائے گی؟" اکرام نے پوچھا۔

"میرا ڈرائیور اسے کار کے پیچھے پیچھے چلا کر لے جائے گا۔ پٹرول وغیرہ ہے ناں اس میں؟"

اکرام نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک الجھن میں نظر آتا تھا۔ اجمل خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عباس موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ شانی، زاہدہ پچھلی نشست پر اور ڈولا اجمل خان کے ساتھ براجمان ہو گیا۔

کار تھانے سے باہر نکلی تو شانی نے سکھ کا سانس لیا۔ "آپ نے کسی طرح کی فکر نہیں کرنی۔" شانی نے انہیں پھر تسلی دی۔ "کوئی پولیس والا آپ کے پاس نہیں آئے گا اگر آیا تو بھی آپ نے اسے ایک ٹیڈی پیسہ نہیں دینا اور نہ کوئی رعب برداشت کرنا ہے۔ میں آپ کو ایک فون نمبر دے دوں گی۔ کوئی بات ہوئی تو مجھے اس پر اطلاع کریں۔"

"تم تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہو۔" آپو زاہدہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ورنہ ایسی رات میں کون کسی کے لئے نکلتا ہے اور بھاگ دوڑ کرتا ہے۔"

"لیکن آپ کو ہمارے بارے میں اطلاع کس نے دی؟" اکرام نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی اس بات کا کوئی جواب دیتی ایک موٹر سائیکل کی روشنی دکھائی

دی۔ یہ موٹر سائیکل مخالف سمت سے گاؤں کی طرف آرہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ موٹر سائیکل عین کار کے سامنے آن کر رک گئی۔ موٹر سائیکل کی پھٹی ہوئی آواز سے ہی پتا چل گیا کہ اس پر کون سوار ہے۔ یہ نیچے کو لٹکی ہوئی مونچھوں والا وہی حوالدار تھا جس سے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے اجمل خان نے تھانے کا راستہ پوچھا تھا۔ اب یہ حوالدار گاڑی کے سامنے کھڑا تھا۔ ہیڈ لائٹس میں اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔

''خو، کیا بات ہے حوالدار صیب؟'' اجمل نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

حوالدار نے شک بھرے انداز میں موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کردی اور کار کے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''تساں دے ساتھ کون ہے جی؟''

''کیوں، کیا بات ہے؟'' اجمل نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

اسی دوران میں مونچھوں والے حوالدار کی نگاہ گاڑی کے اندر بیٹھے اکرام پر پڑ گئی۔ اکرام کو پہچانتے ہی حوالدار کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''تساں اس حوالاتی کو کتھے لے کے جا رہے ہو؟''

''یہ اب حوالاتی نہیں ہے۔ یہ امارے ساتھ جا رہا ہے۔ تم اپنا یہ پھٹ پھٹی سامنے سے ہٹاؤ۔'' اجمل نے پھنکار کر کہا۔

اچانک حوالدار نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ کا پستول باہر نکال لیا۔ وہ بے حد دلیری سے بولا۔ ''خبردار..... باہر نکلو۔ ورنہ گولی چلا دوں گا۔''

''بات کیا ہے حوالدار؟'' شانی نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر پوچھا۔

''بات بھی ساری سمجھا دیتا ہوں۔ یہ حوالاتی اتنی آسانی سے نہیں چھوٹ سکتا۔ میں نے پہچان لیا ہے اسے..... اور اس کی بیوی کو.....'' حوالدار کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

شانی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ تسلی کی صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ کار اب تھانے سے کافی دور آچکی تھی۔ قریباً تین فرلانگ کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ شانی نے گاڑی کے اندر اجمل کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اجمل! اسے پکڑ لو۔''

ان چار الفاظ نے اجمل پر وہی کام کیا جو بارود کے ڈھیر پر چنگاریاں کرتی ہیں۔ وہ جیسے پہلے ہی پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اپنا دایاں ہاتھ حوالدار کے دیسی ساخت کے پستول پر ڈالا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے حوالدار کو اتنی زور سے اپنی

طرف کھینچا کہ حوالدار کا سر دھماکے سے کار کی کھڑکی سے ٹکرایا۔

حوالدار کی انگلی پستول کے ٹرائیگر پر دب گئی۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا لیکن گولی زمین میں لگی۔ دوسرے فائر سے پہلے ہی اجمل نے پستول حوالدار کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے سر کی زوردار ٹکر حوالدار کی پیشانی پر ماری۔ حاضر سروس حوالدار ''سابقہ'' حوالدار کی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا اور پشت کے بل اپنی کھٹارا موٹر سائیکل پر گرا۔ دونوں اوپر نیچے ڈھیر ہوئے..... موٹر سائیکل نیچے حوالدار اوپر تھا۔

''اسے گاڑی میں لے آؤ۔'' شانی تیزی سے بولی۔

اجمل خان نے ہدایت پر عمل کیا اور نیم بے ہوش حوالدار کو گھسیٹ کر گاڑی کی پچھلی نشست پر لے آیا۔

''اس کی موٹر سائیکل کا کیا کرنا ہے؟'' ڈولے نے پوچھا۔

''موٹر سائیکل کو آگے لے جا کر کسی کھیت میں چھپا دو۔'' شانی نے کہا۔

''ساتھ ہی نالہ ہے۔ اس میں کیوں نہ پھینک دیں۔'' ڈولا بولا۔

''کہاں ہے نالہ؟'' اجمل نے دریافت کیا۔

''یہاں کہیں پاس ہی ہے مم..... مجھے پانی کی آواز آرہی ہے۔'' ڈولے نے جواب دیا۔

ڈولے کی حسیات سے انکار کرنا مشکل تھا۔ اجمل نے کہا۔ ''تو چلو پھر نکلو باہر اور پھینکو اس پھٹ پھٹی کو نالے میں۔''

ڈولا جلدی سے باہر نکل آیا اور حوالدار کی گری ہوئی موٹر سائیکل کو سیدھا کر لیا۔ موقعے سے نشانات ملنے کا اندیشہ کم ہی تھا کیونکہ راستہ اینٹوں سے پختہ کیا گیا تھا۔ شانی اگلی سیٹ پر چلی آئی۔ اکرام نے کسمساتے ہوئے حوالدار کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کام میں زاہدہ نے بھی اس کی مدد کی۔ کار کے شیشے بند تھے اس لئے حوالدار کی گھٹی گھٹی آوازیں بس گاڑی کے اندر ہی گونج رہی تھیں۔

گاڑی چل پڑی۔ حوالدار کی کھٹارہ موٹر سائیکل کو ڈولا دھکیلتا ہوا اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ قریباً نصف فرلانگ آگے کھیتوں کے درمیان واقعی ایک ''سوا'' (چھوٹی نہر) موجود تھا۔ ڈولے نے حوالدار کی موٹر سائیکل دھکیل کر اس کے اندر پھینک دی..... اور ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس کار میں آبیٹھا۔ کار ایک بار پھر روانہ ہوگئی۔ تاہم اب اس کی رفتار پہلے سے بہت تیز تھی۔ اجمل خان جانتا تھا کہ حوالدار کے ہاتھ سے چلنے والی گولی کی آواز دور دور تک گئی

ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ کچھ لوگ اس آواز سے چونک گئے ہوں۔

مضروب حوالدار پشت کے بل پچھلی نشست پر پڑا تھا۔ اسے بے حرکت رکھنے کے لئے اکرام نے اپنی دائیں ران اس کے سینے پر رکھی ہوئی تھی۔ حوالدار کی نیچے کو لٹکی ہوئی مونچھیں کچھ اور بھی لٹک گئی تھیں۔ وہ کراہ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ ”مینڈی بات یاد رکھو...... تساں بُری طرح پھنسو گے۔ اب بھی وقت ہے مجھے چھوڑ دو۔ یہ بڑا سیریس کیس ہے۔“

اجمل خوش دلی سے بولا۔ ”خو، ام کو بھی سیریس کیس پسند ہے۔ چھوٹے موٹے کیس سے امارا ارانجھا راضی نہیں ہوتا ہے۔“

”تم ایک حاضر ڈیوٹی پولیس والے کو اغوا کرنے کا جرم کر رہے ہو۔“ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں اطلاع دی۔

”مگر ام پوچھتا ہے کہ یہ پولیس والا اغوا ہونے کے لئے گھر سے واپس کیوں آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم چھٹی کر کے گھر گیا تھا۔“

”شاید اسی کو بدقسمتی کہتے ہیں۔“ ڈولا بولا۔

”نہیں...... ام سمجھ گیا ہے۔ سارا کام اس کی اچھی یادداشت کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ اس کو خواہ مخواہ ایسی باتیں یاد آ گیا جو اس کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی تم نے سنا تو ہے کہ یہ کیا بک رہا ہے۔ اس نے شاید بھائی شریف محمد (اکرام) کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی الٹے سیدھے بوگس کیس میں ان کو پہلے بھی پکڑا گیا ہو۔ بھلے مانس لوگوں کے پیچھے تو پولیس ہاتھ دھو کر پڑ جاتا ہے۔“

اکرام خاموش رہا۔ شانی اور زاہدہ بھی خاموش رہیں۔ شانی کے سوا ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اکرام اور زاہدہ اصل میں کون ہیں۔

حوالدار نے ایک دم زور مارا اور اکرام کے اکلوتے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کی۔ اکرام کی گرفت معمولی نہیں تھی۔ وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ شانی کو رستم نے بتایا تھا کہ جوانی میں اکرام ڈھائی من کی بوری بہ آسانی سر سے اوپر اٹھا لیتا تھا اور خالی ہاتھ تین تین بندوں کی ٹھکائی کر لیتا تھا...... اب بھی وہ ایک دو بندوں سے زیر ہونے والا نہیں تھا۔ حوالدار نے جونہی اٹھ کر اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھانے کی کوشش کی اکرام نے اسے واپس کھینچا اور ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔ ”خبردار! منکا توڑ دوں گا۔“ اکرام پھنکارا۔

”ہائے...... اوئے میں مر گیا۔“ حوالدار نے خون تھوکتے ہوئے دہائی دی۔

”خو اور بادام کھاؤ...... اپنا یادداشت اور تیز کرو۔“ اجمل خان نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مصیبت زدہ حوالدار کو مشورہ دیا۔ ”ایک تو بادام کھاتے ہو اوپر سے رشوت کا بادام۔ ایسے باداموں سے جو یادداشت بنے گا وہ تمہیں ایسے ہی ذلیل و خوار کرائے گا۔“

”دیکھو...... مینڈی گل سنو۔“ حوالدار نے اپنا لہجہ بدلا۔ ”یہ تساں کے لئے بہت وڈی مصیبت کھڑی ہوگی۔ تم مجھ کو چھڈ دیو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہاری...... تمہاری کوئی رپورٹ نہیں کروں گا۔“

”ام سب جانتا ہے موچھل صیب! تم لوگ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے ہو۔“

”نہیں...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ میں بھول جاؤں گا سب کچھ......“

”خو، تم نے جتنا بادام اخروٹ وغیرہ کھایا ہے اس کے بعد تمہارے لئے کوئی بات بھولنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ام تمہاری یادداشت کمزور کرنے کا انتظام کرے گا۔ تمہیں تھوڑا تھوڑا نسوار کھلائے گا...... ایک دم کڑک، مسالے دار نسوار...... اور حوالدار صیب! نسوار میں جو مستی ہوتا ہے اس سے بندہ بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ ایک مرتبہ تو امارا بڑا برادر سائیکل چلاتے ہوئے یہ بھول گیا کہ وہ سائیکل چلا رہا ہے۔ اسے لگا کہ وہ کسی اور کے پیچھے سائیکل پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ سو گیا...... بعد میں اسے ماتھے پر چودہ ٹانکے لگا تھا۔ تم بھی بالکل بے فکر رہو۔ ام تم کو اصلی ہاٹ والا نسوار کھلائے گا۔ ان شاء اللہ چند دن میں ہی تمہارا یادداشت نارمل ہونے لگے گا۔ اس کے بعد تم چھوڑے جانے کے لئے پٹ (فٹ) ہو جائے گا۔“

”اجمل، ڈرائیونگ کی طرف دھیان رکھو۔“ شانی نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے...... اور اب پل پر سے بائیں طرف نہیں مڑنا، دائیں طرف نکلنا ہے...... وزیر آباد کی طرف۔“

اکرام نے کہا۔ ”کیا اب ہم گوجر خان نہیں جا رہے؟“

”نہیں بھائی صاحب! اب یہ بہت خطرناک ہوگا۔ جس طرح اس حوالدار کی یادداشت کام کر گئی ہے، کیا پتا تھانے میں بھی کسی کی کر جائے۔ آپ کے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

”بچوں کا کیا ہوگا؟“ زاہدہ کراہی۔

”آپ بے فکر ہو جائیں آپا...... میں سنبھال لیتی ہوں سب کچھ۔ آپ مجھے گاؤں اور گھر کا مکمل ایڈریس بتائیں۔“ حوالدار کا واویلا روکنے کے لئے ڈولے نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ دوسری طرف تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اکرام نے مکمل ایڈریس بتا دیا۔

''وہاں فون ہے کسی کے پاس؟'' شانی نے پوچھا۔

''نہیں فون تو نہیں ہے..... لیکن اگر آپ بچوں کو وہاں سے لانا چاہتی ہیں..... تو پھر میں آپ کو ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ یہ زاہد نام کا کریانہ فروش ہے۔ میرا بھائی بنا ہوا ہے۔ امید ہے کہ وہ میرا رقعہ دیکھ کر بچوں کو آپ کے حوالے کر دے گا۔ پھر بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''وہاں موبائل کام کرتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''پتا نہیں جی۔ لیکن گوجر خان سے صرف سات آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام کر جائے۔''

''ٹھیک ہے بھائی صاحب! آپ رقعہ بھی لکھ دیں۔ میں ایسے بندے کو وہاں بھیجتی ہوں جس کے پاس موبائل بھی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کریانہ فروش زاہد سے آپ کی فون پر بھی بات ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے میری بہن! جیسے تم مناسب سمجھو۔'' زاہدہ نے کہا۔ وہ بہت دہشت زدہ نظر آتی تھی۔ اس کی دہشت کی وجہ شانی سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ رستم سیال کی بہن تھی اور اس موچھل حوالدار نے اسے اس حیثیت سے پہچان لیا تھا۔

حوالدار کی گردن ایک بار پھر اکرام کی ران کے نیچے تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ مسلسل منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کا اچھی طرح باندھا جانا ضروری تھا۔ شانی نے برانچ روڈ پر ایک سنسان جگہ درختوں کے نیچے کار رکوا دی..... ڈرائیور عباس نے بھی کار کے پیچھے موٹر سائیکل روک دی۔ اس نے شانی کو بتایا کہ کار کی ڈکی میں رسا موجود ہے۔ شانی نے اسے ہدایت کی کہ وہ حوالدار کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دے۔

اجمل اور شانی گاڑی سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ اجمل کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ یہ بات تو وہ بہرحال جان گیا تھا کہ یہ میاں بیوی بہت اہم افراد ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے شانی بڑے سے بڑا رسک لینے کو تیار ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ ابھی کچھ دیر پہلے اسے حوالدار پر حملہ کرنے کے لئے نہ کہتی۔ اب نہ صرف باوردی حوالدار پر حملہ ہوا تھا بلکہ وہ اغوا بھی ہو چکا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''اجمل! جانتے ہو یہ میاں بیوی کون ہیں؟''

''نہیں ... لیکن اتنا ام ضرور جان گیا ہے کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہے۔''

شانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ رستم کی سگی بہن اور بہنوئی ہیں۔''

اجمل کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ اس نے ٹھٹک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ شانی نے اسے تنبیہ کی۔ ''نہیں اجمل! ایسے مت دیکھو۔ وہ پریشان ہوں گے۔ انہوں نے ابھی ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ یہ بات حویلی میں جانے کے بعد کھلے تو بہتر ہے۔''

اجمل کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ دبا ہوا جوش بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ رستم کا دیوانہ تھا۔ رستم سے متعلق کوئی بھی شے اسے دل و جان سے عزیز تھی اور یہ تو جیتے جاگتے لوگ تھے..... رستم کی ہمشیرہ اور اس کا شوہر۔ وہ ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو آمادہ ہو سکتا تھا۔

''اوہ خدایا! اب اماری سمجھ میں آیا کہ یہ موچھل حوالدار اتنا واویلا کیوں کر رہا تھا۔ اس نے رستم صیب کی ہمشیرہ اور بہنوئی کو پہچان لیا ہے۔ ام کو پتا ہے کہ پولیس کاپی عرصے سے ان میاں بیوی کو شہر شہر اور گاؤں گاؤں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اوہ خدایا..... یہ تو بہت اچھا ہوا..... کہ ام لوگ وقت پر پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت مدد پرمایا امارا.....اور..... آپ نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ان دونوں کے بارے میں آپ کو اطلاع کس نے دیا۔ امارا مطلب ہے کہ وہ رقعہ کس کا تھا؟''

''تھا وہ بھی کوئی۔'' شانی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کبھی بتاؤں گی تمہیں اس بارے میں۔''

اجمل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''شانی بہن! امارا تو خیال ہے کہ اس موچھل حوالدار کا مشکل آسان کر دیا جائے۔ ام اس کو کہاں چھپاتا پھرے گا۔ ام اس کو وہاں کھیت میں لے جا کر ٹھنڈا کر دیتا ہے یا پھر راستے میں نہر کے اندر پھینک دے گا۔''

''نہیں اجمل! اس کا گناہ اتنا بڑا نہیں کہ موت کی سزا دی جائے۔ اس کو اپنے پاس رکھنا پڑے گا..... پوری حفاظت کے ساتھ۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اس کا انتظام ام کرے گا۔ آپ اس بیماری کو حویلی میں لے کر نہیں جائے گا۔''

شانی نے چند لمحے سوچا۔ ''لیکن اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو.....''

''نہیں شانی بہن! جب آپ سے وعدہ کر لیا تو پھر کر لیا۔ آپ رستم صیب کی ہمشیرہ اور بہنوئی کو پوری عزت کے ساتھ رنگ والی کی حویلی میں لے جائیں۔ ام اس مردود کا بندوبست شیر محمد کے ساتھ مل کر کرتا ہے..... اور اگر رستم صیب کی ہمشیرہ کے بچوں کو گوجر خان سے حویلی

میں پہنچانا ہے تو ام اس کے لئے بھی حاضر ہے۔ آپ ام کو ایڈریس وغیرہ......''

''نہیں نہیں۔'' شانی نے اس کی بات کاٹی۔''اس کے لئے میں عارف کو فون کر رہی ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ تم بس عباس سے مل کر حوالدار کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ لو... اور منہ پر کپڑا بھی ٹھیک سے کس دو۔ یہ آواز نہ نکال سکے۔''

''آپ بے پکر رہو جی۔ یہ تو منہ کھلنے کے بعد بھی آواز نہیں نکال سکے گا۔''

شانی نے اپنے موبائل پر عارف کمبوہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہی...... عارف اپنے کسی کام سے گوجرانوالہ میں ہی موجود تھا۔ شانی نے اسے مختصر الفاظ میں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ رستم کی بہن اور بہنوئی کے بارے میں جان کر عارف بھی ششدر رہ گیا۔ اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔'' کیا آپ کو یقین ہے کہ...... یہ وہی دونوں ہیں......؟''

''ہاں، میں نے انہیں پہچان لیا ہے عارف......اور تھانے سے چھڑا کر بھی لائی ہوں۔ اب ایک کام تم نے کرنا ہے۔''

''ہاں ہاں، بتائیں۔'' عارف نے کہا۔ رات کے اس پہر بھی اس کی آواز ایک دم چوکس ہوگئی تھی۔

''رستم کا ایک نو دس سالہ بھانجا سرمد اور چھ سات سال کی بھانجی عاشی ہے۔ وہ دونوں اس وقت گوجر خان کے قریب پہارو نام کے ایک گاؤں میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ پولیس کو کسی طرح کا شک پڑے تم ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے آؤ اور رنگ والی پہنچا دو۔''

''آپ مجھے مکمل اتا پتہ دیں۔ میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔ وہاں مجھے ملنا کس سے ہوگا؟''

''میں تمہیں ساری تفصیل بتا دیتی ہوں اور اس شخص کے نام رقعہ بھی دیتی ہوں جو دونوں بچوں کو تمہارے حوالے کرے گا۔ تم فوراً وزیر آباد کی طرف آجاؤ۔ میں وزیر آباد اور گجرات کے درمیان برانچ روڈ پر ہوں۔ ہم ٹویوٹا 86 میں بیٹھے ہیں...... آٹھویں میل سے ذرا آگے۔ وزیر آباد پہنچ کر تم دوبارہ رابطہ کرو۔''

''میں بس ایک گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔'' عارف نے کہا۔ رستم کے دو نہایت قریبی عزیزوں کا سن کر عارف کے جسم میں جیسے پارہ بھر گیا تھا۔

☆======☆======☆

رات ڈھائی بجے کے لگ بھگ شانی نے عارف اور اس کے ایک دوست ذکی کو گوجر

خان کی طرف روانہ کیا۔ خود وہ اجمل اور ڈولے کے ساتھ رنگ والی کی سمت روانہ ہوگئی۔ بندھے ہوئے حوالدار کے علاوہ اکرام اور زاہدہ بھی شانی کے ہمراہ تھے۔ ڈرائیور عباس موٹر سائیکل پر پیچھے آرہا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے کے قریب بہ حفاظت رنگ والی پہنچ گئے۔ ابھی منہ اندھیرا تھا۔ کھیت کھلیان...... گھر اور ڈیرے سب کچھ کہر آلود تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ حویلی میں شانی کی پھوپی کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ حویلی سے باہر رہی ہے۔ ٹویوٹا کار سیدھی ایک اندرونی احاطے میں پہنچائی گئی۔ یہاں دو دوسری گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ اجمل خان نے بندھے ہوئے حوالدار کو ایک بند جیپ میں منتقل کر لیا اور اسے لے کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔ شانی اپنے مہمانوں کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچی۔ شانی کو حویلی میں کسی تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا...... پہرے دار وغیرہ تو پہلے بھی چوکس ہوتے تھے لیکن آج کچھ زیادہ چوکس نظر آرہے تھے۔ ان کی تعداد بھی شانی کو معمول سے زیادہ محسوس ہوئی۔ اصل میں قدرت اللہ کے جوشیلے اور جنون زدہ مریدوں کی طرف سے حویلی کی سکیورٹی کو عموماً خطرہ رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی خاص اطلاع کی وجہ سے سکیورٹی سخت کر دی جاتی تھی۔ شانی نے سمجھا شاید آج رات کے لئے بھی کوئی ایسی اطلاع تھی۔

وہ آپو زاہدہ اور اکرام کو نشست گاہ میں بٹھا کر اوپر پہنچی تو پھوپی آمنہ کو جاگتے ہوئے پایا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر شانی کا ماتھا چوما۔

''کیا بات ہے پھوپی...... آپ سب پریشان لگ رہے ہیں؟''

''بس تیری وجہ سے ہی پریشان تھے۔ شکر ہے تُو خیریت سے آگئی ہے۔''

''یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

اس سے پہلے کہ پھوپی آمنہ جواب میں کچھ کہتی چوہدری بابر نظر آیا۔ شانی کے ساتھ اس کی سلام دعا ہوئی۔ چوہدری بشیر کا یہ کزن اب بہت حد تک بدل چکا تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی اور نیکی کے کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ مہینے میں ایک دو بار وہ رنگ والی کی حویلی کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔ شانی نے اس سے پوچھا۔'' بابر! کیا بات ہے۔ کیا میرے بعد یہاں کوئی مسئلہ ہوا ہے؟''

''نہیں۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔'' بابر نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔''قدرت اللہ کا ایک حرامی چیلا پکڑا گیا ہے حویلی کے باہر سے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔''

پھوپی آمنہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔'' یہ ساری تیرے اس بھائی بابر کی مہربانی ہے۔ نہیں تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ بابر اس خبیث کی ٹوہ میں کل شام یہاں پہنچا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ پکڑا

بھی گیا ہے۔ اتنا لمبا خنجر نکلا ہے اس کے پاس سے۔ ڈاکٹر بہروز کو شک ہے کہ خنجر پر زہر بھی لگا ہوا ہے۔ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے بہت واویلا مچایا۔ گالیاں بکیں، نعرے لگائے اور پتا نہیں کیا کچھ کہا۔''

''اس نے مانا ہے کہ وہ قدرت اللہ کا ساتھی ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا۔ وہ تو للکارے مار رہا تھا۔ میں حضرت صاحب کا دیوانہ ہوں...... میں ......'' پھوپی آمنہ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔ شاید یہ بات ان کے دماغ میں آ گئی تھی کہ انہیں چیلے کی دھمکیاں شانی کے سامنے نہیں دہرانی چاہئیں۔

بابر نے شانی کو ایک طرف لے جا کر ساری صورتِ حال سمجھائی۔ بابر کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کل سہ پہر شانی کے یہاں سے جانے کے فوراً بعد بابر یہاں آ گیا تھا۔ اس کے ایک مخبر نے اسے اطلاع دی تھی کہ قدرت اللہ کا ایک دیوانہ جس کا نام رمضانی ہے، خطرناک ارادے سے بی بی کی تلاش میں ہے۔ قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف کی موت کا بدلہ لینے کے لئے وہ رنگ والی کی حویلی میں گھسنا چاہتا ہے۔ اس کا اصل ٹارگٹ بی بی ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد بابر اپنی پجارو پر سوار رنگ والی آ گیا تھا۔ اس نے سکیورٹی کو الرٹ کر دیا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ ایک بھک منگا سویرے سے حویلی کی دیوار سے لگ کر بیٹھا ہوا ہے...... وہ بیمار اور آنکھوں سے معذور ہے۔ جب اس بھک منگے کو چیک کیا گیا تو وہ مشکوک نکلا۔ جب پہرے داروں نے اس کی تلاشی لینے کی کوشش کی تو اس نے اچانک خنجر نکال لیا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ پہرے داروں نے اسے گھیر کر اور اس پر کمبل ڈال کر اسے پکڑا۔ اس کوشش میں یک پہرے دار معمولی زخمی بھی ہوا۔ خنجر چھڑانے کے بعد اس شخص کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے اور بعد میں پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ رنگ والی کے تھانے میں بند ہے۔ اس واقعے کے بعد حویلی کی سکیورٹی سخت کر دی گئی تھی اور ارد گرد کی اچھی طرح تلاشی بھی لی گئی تھی۔

بابر نے کہا۔ ''مجھے پھوپی آمنہ سے بہت دیر سے بتایا کہ آپ حویلی میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد مجھے دوسری طرح کی پریشانی لگ گئی۔ آپ کسی کو بتا کر بھی نہیں گئی تھیں کہ کہاں گئی ہیں اور کس لئے...... بس اتنا پتا چلا کہ اجمل خان آیا تھا اور وہ آپ کو لے گیا۔''

''بس ایک ضروری کام تھا، میں بعد میں بتاؤں گی۔'' شانی نے کہا۔

''یہ عورت اور مرد آپ کے ساتھ ہی آئے ہیں؟''

''ہاں۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔

بابر سمجھ گیا کہ وہ ابھی اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے،

آپ آرام کریں۔ میں تو صبح نارپور واپس چلا جاؤں گا مگر آپ اگلے تین چار دن تک زیادہ احتیاط کریں۔ حویلی سے باہر تو بالکل نہ نکلیں۔''

''نہیں بابر! اب تو کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے۔ بہرحال تم بھی اب آرام کر لو۔ جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا۔''

بابر، جی اچھا کہتا ہوا واپس چلا گیا۔ شانی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ وہ سرتاپا بدل گیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نارپور کا وہی اکھڑ چوہدری زادہ ہے جو چھاتی چوڑی کر کے زمین کو پاؤں سے روندتا ہوا چلتا تھا اور جس نے ایک ابر آلود رات میں ویران درختوں کے اندر شانی کے لئے درندے کا روپ دھار لیا تھا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے...... شانی نے سوچا اور گہری سانس لیتی ہوئی نشست گاہ کی طرف چلی گئی۔ آپو زاہدہ اور اکرام اپنے بچوں کے لئے ازحد پریشان تھے۔ شانی نے انہیں ہر طرح تسلی دی اور ان کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ انہیں چائے وغیرہ پلوانے کے بعد شانی نے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

آپو زاہدہ نے کہا۔ ''بہن، تم ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہو۔ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ ہماری وجہ سے تم کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ۔ میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہوں......''

شانی جانتی تھی کہ وہ کیا بتانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس سے پہلے کہ پکڑا جانے والا حوالدار ساری بات کھول دے، وہ خود ہی شانی کو اپنی اصلیت سے آگاہ کر دیں۔ اسے بتا دیں کہ وہ اشتہاری رستم سیال کی بہن ہیں...... اور پولیس ان کی تلاش میں ہے، وغیرہ وغیرہ......

شانی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپا! آپ ابھی آرام کریں۔ اپنے دل دماغ پر کسی طرح کا بوجھ نہ لائیں۔ آپ جو بھی کہیں گے میں سن لوں گی...... اور آپ یقین رکھیں، میرے رویے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میں نے اپنا ہاتھ آپ دونوں کی مدد کے لئے بڑھایا ہے، اب کسی بھی وجہ سے یہ ہاتھ کھینچوں گی نہیں۔''

آپو زاہدہ کو بولنے کا موقع دیئے بغیر وہ نشست گاہ سے باہر آ گئی۔ فی الوقت اسے سب سے زیادہ انتظار دونوں بچوں کی بخیریت دستیابی کا تھا۔ اس نے موبائل پر عارف سے رابطہ کرنے کی دو تین کوششیں کیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر منا کسی معصوم فرشتے کی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ شانی نے اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اس کے

رخسار پر ممتا بھرا بوسہ دیا۔ وہ سو رہا تھا مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شانی کا انتظار کرتے کرتے سویا ہے اور شاید سونے سے پہلے دو چار آنسو بھی بہائے ہیں۔ شانی نے ایک بار پھر اسے چوما۔ وہ ذرا دیر کے لئے کمر سیدھی کرنا چاہتی تھی۔ وہ ابھی تک پھوپو آمنہ کے کپڑوں میں تھی۔ اپنا سویٹر اُتار کر اس نے بالوں کو کھولا اور دوبارہ اچھی طرح جُوڑے کی شکل میں باندھا پھر مُنّے کے ساتھ ہی لحاف میں پھسل گئی۔ گرم لحاف نے اسے سکون دیا۔ اچانک اسے لگا کہ ڈولا دروازے کے آس پاس موجود ہے۔ وہ کچھ دیر تک سن گن لیتی رہی...... وہ دروازے کے آس پاس ہی موجود تھا۔ یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟ شانی نے سوچا۔

دو تین منٹ مزید گزر گئے تو وہ لحاف سے نکل آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ڈولا برآمدے میں چکر لگا رہا تھا۔ شانی کو دیکھ کر وہ چونکا۔

"کیا بات ہے ڈولے؟"

"کچھ نہیں باجی جی...... بس یونہی...... اب صبح ہونے والی ہے...... میں نے کہا اب سو کر کیا کرنا ہے؟" ڈولے نے کہا۔

"چلو نہ سونا...... تھوڑی دیر ویسے ہی لیٹ جاؤ" شانی نے کہا۔

"جی اچھا" ڈولے نے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا دوسری طرف نکل گیا۔ شانی کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پایا۔

شانی دوبارہ آ کر لحاف میں لیٹ گئی۔ اس کا ذہن مسلسل عارف اور آپو زاہدہ کے دونوں بچوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ پھر سوچتے سوچتے اس کی سوچ کا رخ گوجرانوالہ کے خونی واقعے کی طرف مڑ گیا۔ راکب خان کی موت کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ ٹوٹے ہوئے جگ کے ٹکڑے سے راکب نے اتنی کامیابی سے اپنی کلائیوں کی رگیں کاٹی تھیں کہ تھوڑی ہی دیر میں اس کا سارا خون جسم سے خارج ہو گیا تھا۔ یہ فرسودہ عقیدے اور وہم انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔

اچانک...... بالکل اچانک شانی کو احساس ہوا کہ کمرے میں اس کے اور مُنّے کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ یہ خیال اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ چند سیکنڈ کے لئے سکتے میں رہ گئی پھر اس نے تیزی سے لحاف پھینکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیم تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا مگر یوں لگا کہ قدِ آدم الماری کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ بھرا ہوا پستول شانی کی الماری میں موجود رہتا تھا۔ وہ الماری کی طرف لپکی مگر اس سے پہلے ہی وہ بھیانک خوف مجسم حالت میں سامنے آ گیا جو کمرے میں موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا جو بے پناہ وحشت کے عالم میں الماری کے عقب سے

برآمد ہوا تھا۔ شانی نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکیلی شے تھی۔ اس نے پوری طاقت سے شانی کی گردن پر وار کیا۔ اضطراری عمل کے تحت شانی نے پیچھے ہٹ کر خود کو بچایا۔ خنجر کی دھار جیسے اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔

ایک بھیانک چنگھاڑ کے ساتھ حملہ آور نے دوسرا وار کیا۔ الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کے سبب شانی گر گئی۔ اس کا گرنا اس کی زندگی کے لئے سودمند ثابت ہوا۔ یہ دوسرا وار بھی خالی گیا۔ اس سے پہلے کہ حملہ آور تیسری مرتبہ شانی کو نشانہ بناتا کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور شانی نے کوتاہ قد ڈولے کو دیکھا۔ وہ دلیرانہ انداز میں جست کر کے حملہ آور پر جا پڑا۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ حملہ آور کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شانی نے خنجر کے فرش پر لڑھکنے کی آواز سنی۔ یہ آواز تسلی بخش تھی۔ شانی نے سوچا اگر خنجر بھی زہر میں بجھا ہوا ہے تو پھر اس کا حملہ آور کے ہاتھ سے نکل جانا اچھا شگون ہے۔

ڈولا کم وزن ہونے کے سبب حملہ آور کو اپنے نیچے نہیں دبا سکا۔ حملہ آور نے ڈولے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور بڑی بے دردی سے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر دے مارا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ دروازے کی لکڑی ٹوٹنے کی آواز آئی اور ڈولا لڑھکتا ہوا برآمدے سے باہر جا گرا۔ اس دوران میں شانی کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ الماری تک پہنچے اور دراز میں سے اپنا چھوٹا پستول نکال لے۔ اس نے دراز کے اندر ہی پستول کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور حملہ آور کی طرف گھومی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نشانہ بنا سکتی اس نے پورے زور سے ٹانگ چلائی۔ یہ بڑی طوفانی ضرب تھی۔ شانی کی پسلیوں کے نیچے شدید چوٹ لگی اور وہ جیسے ہوا میں اُڑ کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے دماغ میں لال پیلی چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کے کانوں میں مُنّے کے چلانے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ اس شورِ قیامت سے اٹھ بیٹھا تھا اور اب بلند آواز سے رو رہا تھا۔ شانی کا سر سخت دیوار سے ٹکرایا تھا اور شاید چند ساعتوں کے لئے وہ سن سی ہو گئی تھی۔ تاہم اس حالت میں بھی اس کے ذہن میں یہ احساس موجود رہا کہ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا نہیں اور وہ فرش پر نیم دراز ہے۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے سامنے دیکھا۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ حملہ آور جو ایک درمیانی عمر کا شخص تھا خوفناک نظروں سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ پستول یا ماؤزر وغیرہ نکال رہا ہے۔ یہ بس چند ساعتوں کا کھیل تھا۔ شانی نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں سوچا۔ کیا وہ حملہ آور کے ہتھیار نکالنے تک خود کو سنبھال سکے گی؟ اور اس پر فائر کر سکے گی؟ ابھی جواب اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ اچانک برق سی کوندگی۔

شانی کو لگا کہ ایک پہرے دار حملہ آور پر جاپڑا ہے۔ دونوں شیشے کی میز کو چکنا چور کر کے گرے اور گتھم گتھا ہو گئے۔ زوردار دھماکے سے پہلا فائر ہوا پھر دوسرا...... پھر ایک اور...... حملہ آور چنگھاڑ رہا تھا اور اندھا دھند گولیاں چلا رہا تھا۔ شانی مُنّے کو جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسی دوران میں چار پانچ مسلح پہرے دار کمرے میں گھس گئے۔ حملہ آور کو بے بس کر دیا گیا۔

شانی نے ٹیوب لائٹ میں دیکھا کہ حملہ آور کے ساتھ سب سے پہلے گتھم گتھا ہونے والا چوہدری بابر ہی تھا۔ وہ بروقت اندر داخل نہ ہوتا تو شاید حملہ آور شانی یا مُنّے کو شوٹ کر دیتا۔ بابر کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آرہے تھے۔

شانی مُنّے کو اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے جلدی سے آگے بڑھی۔ ”کیا ہوا بابر..... تم زخمی تو نہیں؟“

”نہیں، بس تھوڑی سی لگی ہے۔“ بابر کراہا۔

شانی نے دیکھا کہ ایک گولی اس کی پنڈلی کو زخم لگاتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم سنگین نہیں تھا مگر خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

حملہ آور کے سر پر کسی پہرے دار نے بندوق کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی تھی۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا تھا اور اسی حالت میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ یہ ایک کلین شیو شخص تھا۔ اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔ ایک کان میں چاندی کی مرکی تھی۔ ایسی صورتیں شانی کو اکثر قدرت اللہ کے اردگرد نظر آیا کرتی تھیں۔

ایک دم ہی ساری حویلی کے لوگ شانی کے کمرے کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ ہر چہرہ سراسیمہ نظر آنے لگا۔ تایا معصوم اور پھوپو آمنہ نے شانی کو بار بار گلے سے لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔ پھوپو تو اسے خود سے جدا ہی نہیں کر رہی تھیں۔ تایا معصوم نے گھر کے سارے افراد کو ہدایت کی کہ وہ شانی کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے پہرے داروں کو ہدایت کی۔ ”پوری حویلی کی بتیاں جلاؤ۔ ایک ایک کونے کی تلاشی لو۔ باہر کے دروازے بند رکھو۔ اگر کوئی اور حرامی بھی یہاں ہے تو باہر نکلنے نہ پائے۔“

پہرے داروں نے فوراً بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ شانی کے خالو اعجاز بھی حویلی میں ہی تھے۔ وہ خود تلاشی کے کام کی نگرانی کرنے لگے۔

حملہ آور نے ڈولے کو بڑے زور سے پھینکا تھا تاہم حیرت انگیز طور پر اسے بہت کم چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بالکل چوکس نظر آرہا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تشکر بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“ شانی نے پوچھا۔

”نہیں باجی جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

شانی کو یاد آیا کہ اس غیر معمولی واقعے سے پہلا ڈولا کمرے سے باہر بے چین سا پھر رہا تھا۔ یقیناً اس کی غیر معمولی حسیات اسے خطرے سے آگاہ کر رہی تھیں۔ شانی نے کہا۔ ”ڈولے! اگر تمہیں کوئی شبہ تھا تو تم نے مجھے بتا دینا تھا۔“

”بس میری سمجھ میں خود بھی ٹھیک سے کچھ نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی مجھے آپ کو بتا دینا چاہیے تھا۔ یہ میری غلطی ہے۔“

شانی نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ڈولے کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

چوہدری بابر کی پنڈلی پر پٹی باندھی جارہی تھی۔ پٹی میں سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا...... تاہم اس نے اپنی تکلیف کو ضبط کر رکھا تھا۔ درحقیقت حملہ آور سے گتھم گتھا ہوتے ہی چوہدری بابر نے اس کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ حملہ آور نے بس ایک گولی اپنی مرضی سے چلائی جو چوہدری بابر کی پنڈلی کو زخمی کرتی ہوئی گزری۔ باقی ساری گولیاں بابر نے چھت کی طرف چلوا دی تھیں۔ چھت کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

شانی کو معلوم تھا کہ اس ہنگامے کے سبب آپو زاہدہ اور بھائی اکرام بڑے خوف زدہ ہوئے ہوں گے۔ وہ سیدھی نشست گاہ میں ان کے پاس پہنچی۔ آپو زاہدہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ ”کیا ہوا تھا میری بہن! کیا کوئی چور ڈاکو تھا؟“

”ہاں آپا! آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ پکڑا گیا ہے۔“

”بہت سی گولیاں چلی ہیں۔ کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟“ اکرام نے پوچھا۔

”نہیں بھائی جی! اللہ نے کرم کیا ہے۔ بڑی بچت ہو گئی ہے۔“

”ب...... بچوں کا کچھ پتا چلا؟“ آپو زاہدہ کی ممتا بے چین ہو رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی، موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ شانی نے دیکھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑک گیا۔ یہ عارف کی کال تھی۔

”ہیلو عارف! کہاں ہو؟“

”میں یہاں پہارو گاؤں میں بچوں کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ عارف کی آواز مدھم تھی اور اٹک اٹک کر آرہی تھی۔

”بچوں کو لانے میں کوئی مشکل تو نہیں؟“

”آپ بس بچوں کی بات ان کی والدہ یا والد سے کرا دیں۔“ عارف نے کہا۔

شانی نے مائیک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپا! آپ کے بچے آپ سے بات کرنا

چاہتے ہیں، پر آپ نے انہیں یہ نہیں بتانا کہ آپ کہاں ہیں۔"

"تو کیا کہوں۔" آپو زاہدہ نے پوچھا۔

"انہیں لاہور کا کہہ دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" آپو زاہدہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ اس لرزش میں ہلکی سی خوشی بھی شامل تھی۔

اگلے تین چار منٹ میں آپو زاہدہ اور اکرام دونوں نے بچوں سے بات کی اور انہیں کہا کہ وہ انکل کے ساتھ گاڑی میں لاہور آجائیں۔ اس کے بعد اکرام نے بچوں کے نگراں کریانہ فروش زاہد سے بھی بات کی۔ اکرام نے زاہد کو گھر میں سنبھالے ہوئے کچھ زیور اور نقدی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ یہ چیزیں بچوں کے ساتھ ہی بھیج دے۔

فون پر بچوں اور زاہد سے بات کرنے کے بعد آپو زاہدہ اور بھائی اکرام بہت حد تک پُرسکون نظر آنے لگے۔ ان کے سکون نے شانی کے دل سے بوجھ بھی قدرے کم کردیا۔

"اب آپ تھوڑا سا ناشتہ کرلیں۔" شانی نے کہا۔

شانی کے بہت اصرار کے باوجود دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

آپو زاہدہ نے ایک بار پھر کہا۔ "چھوٹی بہن، میں تجھ سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ تجھے جیسے ہی ذرا ویل (وقت) ملے میرے پاس آجانا۔"

شانی کو محسوس ہوا کہ جب تک یہ صاف دل عورت اپنے اندر کی بات کہہ نہ دے گی اسے سخت بے چینی محسوس ہوتی رہے گی۔ اسے بے آرام رکھنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔

شانی نے کہا۔ "اچھا، آپ آئیں میرے ساتھ۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیں۔"

شانی آپو زاہدہ کو حویلی کی بالائی منزل پر لے آئی۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ حویلی میں سراسیمگی کی فضا تھی پھر بھی روزمرہ کے معمولات شروع ہوچکے تھے۔ دہی بلویا جارہا تھا۔ ایک بڑے تندور میں روٹیاں پکائی جارہی تھیں۔ کچھ ملازمائیں برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ مال خانے سے آنے والے تازہ دودھ کے برتن ایک قطار میں رکھے تھے۔ زاہدہ نے ان مناظر کو قدرے حیرت سے اور سہم کر دیکھا۔ دونوں ایک کمرے میں بیٹھ گئیں۔ زاہدہ کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔ وہ جو بات کہنے جارہی تھی اس کا بوجھ اسے اتنا زیادہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ ہانپ سی گئی۔ زاہدہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میری چھوٹی بہن: تُو نے ہم پر جو احسان کیا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں پولیس کے اس حوالدار نے تمہیں کیا کچھ بتایا

ہے۔ پر جو کچھ سچ ہے، وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔"

"جی بتائیں۔" شانی نے کہا۔

آپو زاہدہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر انہوں نے بولنا چاہا مگر آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ انہوں نے بہ مشکل کہا۔ "اس حوالدار نے تمہیں کیا بتایا ہے؟"

شانی نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپا...... آپ کو مشکل ہورہی ہے۔ چلیں میں ہی بتا دیتی ہوں۔ آپ اس رستم سیال کی بہن ہیں جسے پنجاب کی پولیس دور دور تک ڈھونڈتی پھر رہی ہے اور جس پر قتل، اغوا اور ڈکیتی کے اَن گنت کیس ہیں۔ رستم سیال نے آپ کو ایک طویل عرصے سے گوجر خان کے گاؤں پہارو میں چھپا کر رکھا ہوا تھا لیکن کل آپ میاں بیوی ایک اتفاق کے سبب پولیس کی حراست میں چلے گئے اور بعد میں اس موچھل حوالدار نے آپ کو پہچان لیا۔ یہی کہنا چاہتی تھیں ناں آپ؟"

آپو زاہدہ ایکا ایکی سسکنے لگیں۔ انہوں نے لگاتار آنسو گراتے ہوئے کہا۔ "یہ ظالم پولیس میرے شیر جیسے بھائی کو کھا گئی۔ پتا نہیں...... وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ بُری زبانوں والے لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ......" وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

شانی کے دل میں بھی ایک گھونسا سا لگا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ضبط کے سارے بندھن توڑ کر آپو زاہدہ کو گلے سے لگا لے اور ان ہی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردے۔ اس کے کانوں میں نہ جانے کیوں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے کل سرشام جاں بلب راکب خان کے ہونٹوں سے سنے تھے۔ کاش اس نے یہ الفاظ نہ سنے ہوتے، وہ آج اپنی اس روتی ہوئی نند کو صدقِ دل سے تسلی دینے کے قابل تو ہوتی۔ وہ الفاظ ابھی تک پگھلے سیسے کی طرح شانی کے کانوں کو مجروح کررہے تھے۔ راکب خان نے پشتو نما لہجے میں کہا تھا۔ "ان کو بھول جاؤ۔ وہ سب ختم ہوگیا۔ خو، برف کے اندر چلا گیا..."

شانی نے بے پناہ کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور اپنی دکھیا نند کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپا! خدا سے ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔ وہ کہتے ہیں ناں جب تک سانس تب تک آس۔ اگر آپ کے بھائی کی زندگی باقی ہے تو کوئی اسے مار نہیں سکتا......"

"میرا بھائی بُرا نہیں تھا۔ اسے زمانے نے بُرا بنایا۔ یہ زمانہ ہی ہے جو، جوان جہانوں کے فرشتوں جیسے بھائیوں کو ڈاکو اور قاتل بناتا ہے۔ میرا بھائی تو لاکھوں میں ایک تھا۔ پورا پنڈ اس کی تعریف کرتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، اللہ ہر ماں کو رستم جیسا پُتر دے۔ پر پھر دشمنی

کی ایسی ھنیری چلی کہ سب کچھ سڑ کر سواہ ہو گیا۔ ویری دشمنوں سے میری جان اور آبرو بچاتے ہوئے میرا چھوٹا ویر دشمنی کے منہ میں چلا گیا اور قاتل ڈاکو بن گیا..... یہ بڑی لمبی کہانی ہے میری بہن .. میں تمہیں کہاں تک سناؤں، تم کہاں تک سنو گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس خطرناک قاتل ڈاکو کے اندر اب بھی میرا چھوٹا سا ویر چھپا ہوا تھا۔ چوڑی چھاتی اور شرمیلی اکھیوں والا سوہنا سجیلا رستم۔ وہ اب بھی اپنی آپو کی خوشی کے لئے اپنی ووہٹی لے کر آنا چاہتا تھا..... اپنی ووہٹی اور آپو کے درمیان بیٹھ کر تصویر کھچوانا چاہتا تھا..... سارے زمانے کے ویری اس کے پیچھے تھے پر اس کے اندر کا رستم پھر بھی زندگی کے خواب دیکھتا تھا۔ ہائے میری بہن، میں تجھے کیا کیا بتاؤں اس کی باتیں.....'' آپو زاہدہ نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور ہچکیاں روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔

شانی کا اپنا دل بھی کناروں سے اچھل جانا چاہتا تھا لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو چھوٹی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے شانی نے موڑھے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آپو زاہدہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ کا بھائی آپ کی خوشی کے لئے ووہٹی لایا تھا؟''

آپو زاہدہ نے آہ کھینچی۔ ''ہماری اتنی قسمت کہاں میری بہن۔ کون کملے لوگ ہوں گے جو اپنی دھی کو ایک جلتی ہوئی آگ میں دھکا دیں گے؟''

''کیا آپ کے بھائی نے کوئی لڑکی پسند کی تھی؟''

آپو زاہدہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ ''کہتا تو تھا کہ اسے ایک لڑکی پسند ہے۔ ایک وار میرے پاس آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہتا تھا اگلی دفعہ آؤں گا تو تیری سب سے بڑی تمنا پوری کر دوں گا۔ ووہٹی ساتھ لاؤں گا اور وہ بھی ایسی کہ اندھیرے پنڈ میں چانن کر دے گی۔ تُو اس کے لئے گہنے کپڑے کا بندوبست کر۔ پر پھر وہ کئی مہینے کے لئے غائب ہو گیا۔ جب اگلی وار آیا تو سخت دکھی تھا۔ ووہٹی اس کے ساتھ کیا ہونی تھی، وہ تو خود بھی اپنے ساتھ نہیں تھا۔ سمجھو کہ اس کا پنڈا اور دل دونوں داغو داغ تھے۔ وہ جیسے ایک دم آیا تھا، ویسے ہی چلا گیا۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ پولیس اس کے پیچھے تھی اور وہ وڈے ڈیرے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں میرا ویرا کہاں کہاں جنگل ہوا ہے اور آخر میں اس نصیباں مارے کے ساتھ کیا ہوا ہے.....''

شانی دیر تک آپو زاہدہ کو تسلی تشفی دیتی رہی۔ شانی نے آخر میں انہیں کہا۔ ''آپ نے یہاں کسی سے یہ باتیں نہیں کہنی جو مجھ سے کہی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ رستم کے حوالے سے

کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ میرے لئے اب بھی اتنی ہی قابلِ عزت ہیں جتنی یہ باتیں معلوم ہونے سے پہلے تھیں.....اور آئندہ بھی رہیں گی، لیکن ملازموں اور ملنے جلنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں.....''

آپو زاہدہ نے کہا۔ ''چھوٹی بہن! میں بھی تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ یہ بات صرف تیرے تک ہی رہے۔''

اسی دوران میں ایک بار پھر عارف کی کال آ گئی۔ اس مرتبہ اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں بچوں کو لے کر پہاڑ گاؤں سے گوجر خان کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ وہاں سے وہ جی ٹی روڈ کے ذریعے وزیر آباد کی طرف آئیں گے۔''

اس اطلاع نے شانی کے ساتھ ساتھ زاہدہ کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑا دی۔

حویلی میں ابھی تک افراتفری موجود تھی۔ ملازمین میں بھی خوف و ہراس تھا۔ حویلی کے چپے چپے کی تلاشی لے لی گئی تھی۔ رنگ والی کے گلی کوچوں سے بھی دو تین مشکوک افراد پکڑے گئے تھے۔ ان افراد کو شانی کے سامنے لایا گیا۔ ان میں سے دو کو تو شانی نے فوراً چھوڑنے کی ہدایت کر دی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ دونوں بے قصور ہیں۔ تیسرے شخص کو اس نے تحویل میں رکھنے کی ہدایت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ اس پر سختی نہ کی جائے۔

رنگ والی تھانے کا انسپکٹر انوار احمد ازخود حویلی پہنچ گیا۔ انوار احمد یہاں کے سابقہ تھانیدار میاں مظفر کا عزیز تھا اور میاں مظفر ہی کی طرح حویلی کے مکینوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ پکڑے گئے حملہ آور کو انوار احمد کے حوالے کر دیا گیا۔ مشکوک شخص کو بھی شانی نے اس شرط پر انوار احمد کو دے دیا کہ اس پر بے جا سختی نہیں کی جائے گی۔ کل رات پکڑا جانے والا شخص بھی انوار احمد کی تحویل میں تھا۔

انوار احمد نے کہا۔ ''بی بی! اس معاملے کو روکنے کے لئے قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہو چکا ہے۔ قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنے میں جتنی دیر ہو گی یہ مسئلہ اتنا ہی بگڑے گا۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو انوار..... قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پکڑے جانے سے یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا پتا یہ اور بگڑے۔''

''کل رات جس بندے کو پکڑا گیا ہے اس کا نام حشمت ہے۔ اس نے اندھے پن کا ڈرامہ رچایا ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ قدرت اللہ کے ملتان والے آستانے سے آیا ہے۔ اسے پستول بھی آستانے میں ہی دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ خنجر کو زہر کی پان لگانے کے لئے زہر دیا گیا تھا اور پورا طریقہ بتایا گیا تھا۔''

"لیکن انسپکٹر...... تمہیں پتا ہی ہے کہ قدرت اللہ کا مؤقف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس نے لاہور میں پکڑے جانے والے حملہ آور سے بھی بالکل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ وہ ظاہری طور پر ان لوگوں کی مذمت بھی کرتا ہے۔ چند دن پہلے بھی اخبار میں اس کا بیان آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی موت کا بدلہ کسی سے لینا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی شخص اس طرح کی بات کرتا ہے تو وہ اس کی ذاتی سوچ ہے۔"

"مگر یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہوں گی بی بی کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور ہیں۔ رستم کی موت کے بعد قدرت اللہ آپ کی جان کا دشمن ہے۔"

شانی کے دل پر گھونسا سا لگا۔ جب بھی کوئی اس انداز میں بات کرتا تھا، وہ اندر سے تڑپ کر رہ جاتی تھی...... لیکن کہہ کچھ نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ رستم کی بیوی ہے اور اس کی زندگی کی آس پر زندہ ہے۔

"کیا بات ہے۔ آپ چپ ہوگئی ہیں؟" انوار احمد نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" شانی نے بات بدلی۔ "میں قدرت اللہ کے ہتھکنڈوں کا جواب اسی کے انداز سے دینا نہیں چاہتی پھر اس میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"لیکن کچھ بھی ہے بی بی! اب قدرت اللہ سے بات کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ میں کل ایک تاریخ پر لاہور جا رہا ہوں۔ قدرت اللہ بھی لاہور میں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

اسی دوران میں شانی کے تایا معصوم بھی اندر آگئے۔ انسپکٹر انوار نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ تایا معصوم بولے۔ "قدرت اللہ کی کیا بات ہو رہی ہے؟"

"چوہدری صاحب! جو نئی شہادتیں ملی ہیں اس کے بعد قدرت اللہ سے بات کرنا ضروری ہوگیا ہے۔"

"تو کرو ناں اس سے بات۔ کب کرو گے؟ جب اس بدذات کی وجہ سے یہاں کسی کا خون ہو جائے گا۔" تایا معصوم غصے سے بولے۔

"میں یہی بات کہہ رہا ہوں، لیکن......"

"لیکن ویکن چھوڑو انوار احمد...... اب ان بدذاتوں کی اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ ہمارے گاؤں میں ہی نہیں ہمارے گھر کے اندر تک گھس آئے ہیں اور ان کا سرغنہ وہی خبیث ہے جو حضرت صاحب بن کر اونچے تختے پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہی ساری ڈور ہلا رہا ہے۔"

"کل پکڑے جانے والے بندے کا نام حشمت ہے اور یہ قدرت اللہ کے خاص

عقیدت مندوں میں سے ہے۔ اس نے اقبال کیا ہے کہ اس کو پستول قدرت اللہ کے آستانے سے فراہم کیا گیا تھا۔ خنجر بھی اسے وہیں سے ملا تھا اور اسے زہر میں بجھانے کا طریقہ بھی سمجھا دیا گیا تھا۔"

تایا معصوم نے کہا۔ "میں قانون کو زیادہ نہیں جانتا پر میرا خیال ہے کہ اس بیان کے بعد قدرت اللہ اور اس کے خاص چیلوں کے خلاف ایف آئی آر کٹ جانی چاہیے۔"

"میں کل لاہور جا رہا ہوں جی۔ میں اس بارے میں قدرت اللہ سے کھل کر بات کرتا ہوں۔" انسپکٹر انوار نے کہا۔

شانی خاموش بیٹھی رہی تاہم اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اس صورت حال کو بہتر نہیں سمجھ رہی۔ اسے اس میں مزید فساد کی بو آ رہی تھی۔

قریباً تین گھنٹے بعد زاہدہ کے دونوں بچے نو دس سالہ سرمد اور چھ سات سالہ عاشی رنگ والی کی حویلی میں پہنچ چکے تھے۔ ماں بچوں کا ملاپ دیدنی تھا۔ سرمد کے ہاتھ میں ایک اسکول بیگ بھی تھا لیکن اس میں کتابوں کی بجائے غالباً نقدی اور زیور وغیرہ تھے۔ یہ چیزیں وہ اپنے والدین کی ہدایت پر ساتھ لے آیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں میاں بیوی موجودہ صورت حال سے کتنے خوف زدہ ہیں۔ وہ فی الحال گوجر خان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

شانی نے دونوں بچوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور ان کے سر چومے۔ وہ اس کے لئے صرف بچے نہیں تھے۔ وہ رستم کے بھانجا اور بھانجی تھے۔ وہ انہیں ایک ممانی کی حیثیت سے بھی مل رہی تھی۔ اسے سرمد کے خدوخال میں رستم کی جھلک نظر آئی اور وہ بے ساختہ اس کا رخسار چومنے پر مجبور ہوگئی۔

☆======☆======☆

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ ملازمہ مجیدہ نے آ کر شانی کو بتایا کہ مہمان خانہ میں بابر اسے بلا رہا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد وہ نارپور واپس جانا چاہتا تھا مگر تایا معصوم اور شانی کے اصرار پر یہیں رک گیا تھا۔ رنگ والی کا ڈاکٹر عرفان حویلی میں ہی آ کر بابر کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ شانی مہمان خانے میں پہنچی تو بابر گاؤ تکیے کے سہارے بستر پر بیٹھا تھا۔ ذولا اس سے ہلکی پھلکی باتیں کر رہا تھا۔ منا شانی کی گود میں تھا۔ شانی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے بابر؟"

[illegible] اگر آپ کو شک ہے تو میں آپ کو چل کر بلکہ [illegible]

چڑھ کر دکھا دیتا ہوں۔"

"نہیں، کم از کم ایک دن اور رہو۔"

"ایک دن اور رہنے سے کیا ہوگا۔ وہاں فصل سنبھالنی ہے۔ بہت سا کام پڑا ہے۔"

"میں جانتی ہوں وہاں فصل سنبھالنے کے لئے بہت سے لوگ ہیں۔ تم بہانے نہ بناؤ۔ چپکے پڑے رہو۔ یہاں جو آرام تمہیں مل رہا ہے وہاں نہیں مل سکتا۔"

"ہاں جی۔ یہ بات تو صحیح ہے۔" بابر نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر شانی بولی۔ "بابر! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"پہلے شادی کر کے کون سا سکھ پایا تھا جی...... اب تو کوئی وکھری ٹائپ کی اور بڑی ہی چنگی لڑکی ملے گی تو سوچوں گا۔"

بابر کی شادی چھ سات سال پہلے ہوئی تھی۔ لڑکی اس سے کافی چھوٹی عمر کی تھی اور بڑی تند مزاج بھی تھی۔ بابر اس سے بڑھ کر تند مزاج تھا۔ لڑکی کو اپنے جہیز میں ملنے والی دس مربع زمین کا غرور تھا، دوسری طرف بابر کو اپنی چوہدراہٹ کا نشہ تھا۔ نتیجہ صرف چھ مہینے بعد طلاق کی صورت میں نکل آیا۔ اس کے بعد سے بابر اغیر شادی شدہ تھا اور اب تو وہ بابر رہا ہی نہیں تھا...... شراب، جواء، عورت بازی سب کچھ چھٹ گیا تھا اس سے۔ کئی لمحے ایسے ہی کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ بابر کی زندگی میں یہ لمحہ تب آیا تھا جب چوہدری بشیر نے غضب سے مغلوب ہو کر بابر کو جان سے مارنا چاہا تھا لیکن شانی "بابر گزیدہ" ہونے کے باوجود اس کی موت کے سامنے دیوار بن گئی تھی۔ اس کے بعد بابر نے نارپور کے چوہدریوں میں رہتے ہوئے بھی درپردہ شانی کی مشکلوں کو آسانیوں میں بدلا تھا۔ شانی کی نگاہ میں بابر کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے تاؤ حشام کی گرفت سے شانی کو چھڑانے کے لئے کردار ادا کیا تھا۔ اب تین دن پہلے جو واقعہ ہوا تھا اس کی اہمیت بھی کم نہیں تھی۔ اپنے مخبر کی اطلاع پر بابر نہ صرف رنگ والی پہنچا بلکہ شانی کو اس دوسرے حملہ آور سے بھی بچایا جو کسی طرح شانی کے کمرے تک پہنچ چکا تھا۔

"آپ کس سوچ میں کھو گئی ہو شانی بی بی؟" بابر کی آواز نے شانی کو چونکایا۔

"سوچتی ہوں، تمہارے لئے کس قسم کی لڑکی اچھی رہے گی۔"

"جو بہت ہنس مکھ ہو...... بہت ملنسار ہو اور پرلے درجے کی فضول خرچ بھی ہو۔"

"لگتا ہے نارپور میں تمہاری زمینوں کی آمدنی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔"

"بڑھ تو گئی ہے لیکن یہ برقرار تب رہے گی جب آپ اور تایا مجھے یہاں سے واپس

جانے دیں گے۔ اس وقت میرا نارپور میں ہونا بہت ضروری ہے۔ بس دو تین دن میں کٹائی شروع ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بھئی اتنا ضروری ہے تو میں نہیں روکوں گی۔"

"اول میں بھی نہیں لوکوں گا۔" منے نے توتلی زبان میں کہا۔

بابر نے اسے اپنی طرف کھینچ کر پیار کیا۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی گدگدی بھی کی۔ منے نے مستی میں آ کر ایسے زور سے ٹانگ چلائی کہ اس کی ایڑی سیدھی بابر کے زخم پر لگی۔ وہ کراہ اٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سفید پٹی پر خون نمودار ہو گیا۔

شانی نے منے کو ڈانٹا اور کھینچ کر بستر سے نیچے اتارا۔ اس نے ڈولے سے کہا کہ وہ اسے لے کر باہر چلا جائے۔ خود وہ بابر کی پٹی کھول کر اس کا زخم دیکھنے لگی۔ خون مسلسل رس رہا تھا۔ شانی اسپرٹ اور اینٹی بائیوٹیک پاؤڈر لے آئی۔ بابر کے منع کرنے کے باوجود وہ دوبارہ پٹی باندھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ منے کی حرکت کے لئے اس سے معذرت بھی کر رہی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جی۔ وہ بچہ ہے...... اور صرف بچہ نہیں، بہت پیارا بچہ ہے۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بہت پیارا بچہ جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"پیاری صورت کے لئے کچھ نہ کچھ رعایت اپنے آپ ہی نکل آتی ہے...... میرا چھوٹا بھتیجا فیاض بھی بالکل ایسا ہی ہے۔" بابر نے جلدی سے کہا۔

شانی نے دیکھا، تایا معصوم دروازے میں آن کھڑے ہوئے تھے اور اسے بابر کی پٹی کرتا دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا بابر پتر کو؟" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کچھ نہیں تایا جی...... زخم ذرا دکھ گیا ہے۔" بابر نے کہا۔

"منے نے ٹانگ چلائی ہے۔" شانی نے تفصیل بتائی۔

"ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔" تایا معصوم بولے پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگے۔ "شانی پتر، فارغ ہو کر ذرا میری بات سننا۔"

"جی ابھی آتی ہوں۔" شانی نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ تایا کے کمرے میں ان کے سامنے رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تایا اپنی سپید داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ کی

انگلیاں تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک شانی کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''دھی رانی! بندے کو زندگی میں بہت سے فیصلے ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اس کی مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتے۔ کبھی یہ فیصلے زمانے کی وجہ سے کرنے پڑتے ہیں اور کبھی اپنے مذہب کی وجہ سے...... اور کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کی ضرورت زمانے اور مذہب دونوں کی وجہ سے پڑتی ہے...... اور یہ فیصلے زیادہ ضروری ہو جاتے ہیں۔'' یہاں تک کہہ کے تایا معصوم نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے شانی پتر...... اور یہ دنیا بڑی بے رحم ہے۔ یہاں اکیلی عورت کے لئے ہر قدم پر آفتیں ہی آفتیں ہیں......''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں تایا جی؟''

''فاخر کی موت کے بعد تم بالکل تنہا زندگی گزار رہی ہو۔ ایسا کب تک رہے گا؟''

''م...... میں تنہا نہیں ہوں تایا جی...... آپ سب میرے اپنے ہیں اور میرے ساتھ ہیں... اور پھر میری بھابو کی نشانی مُنا میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''

تایا معصوم شانی کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولے۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ تُو ہمیشہ اس حویلی میں رہے۔ تُو نے اس برباد حویلی کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ یہ ساری عمارت اور یہاں کے سارے پھول پودے اور یہاں کے رہنے والے لوگ، سب پھر سے جی اٹھے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب تُو کبھی یہاں سے جائے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تُو ساری زندگی ایک بیوہ کی طرح گزار دے۔''

شانی کے سینے پر ایک گھونسا لگا مگر خاموش رہنا اس کی مجبوری تھی۔

تایا معصوم نے کہا۔ ''میں تیرے لئے ہمیشہ ایک درمیانی راستہ ڈھونڈ تا رہا ہوں۔ کوئی ایسا شریف بندہ جو تجھ سے ویاہ کرے اور تجھے یہاں سے لے جائے بھی نہ...... تُو ہمیشہ یہاں رنگ والی میں ہمارے پاس رہے...... اور رہے بھی سہاگن بن کر!''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں تایا جی۔ میں جس حال میں ہوں بالکل خوش ہوں۔ مجھے کوئی کمی نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔''

''نہیں دھی رانی، کمی ہے اور تمہارے بزرگ کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہاری زندگی کی اس کمی کو پورا کرنے کے بارے میں سوچوں...... اور میں نے بڑی حد تک سوچ بھی لیا ہے۔ ایک بندہ میری نظر میں ایسا ہے جو میری اور تمہاری ساری شرطوں پر پورا اُتر سکتا ہے۔''

شانی کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ تایا سے کیا کہے۔

وہ تکیے سے ٹیک لگائے اپنی دُھن میں بولتے چلے گئے۔ انہوں نے آج جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ شانی کے ردِعمل کی پرواہ کئے بغیر سب کچھ اس سے کہہ دینا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''نار پور والوں نے ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ پر سارے کے سارے نار پوری تو ایک جیسے نہیں ہیں۔ وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ اچھوں میں بُرے اور بُروں میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ اب اس بابر کی مثال ہی لو۔ سنا تھا کہ کسی چوٹ کی وجہ سے لوگ بدل جاتے ہیں لیکن جس طرح بابر بدلا ہے، کوئی کہاں بدلا ہوگا...... لگتا ہے کہ یہ وہ بابر ہے ہی نہیں۔ کاروباری طور پر بھی بابر ہمارے ساتھ بہت تعاون کر رہا ہے...... اس نے اپنے تیل کے کارخانے کے لئے سب سے زیادہ مکئی اور سورج مکھی ہمارے پاس سے اٹھایا ہے۔ میں نے پچھلے مہینے تمہیں بتایا تو تھا سب کچھ......''

''لیکن...... ان باتوں کا...... مجھ سے اور میری زندگی سے کیا تعلق ہے تایا جی۔'' شانی نہایت آزردہ لہجے میں بولی۔

''تعلق اسی طرح بنتے ہیں ناں شانی پتر...... میری بوڑھی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ تم نہیں دیکھ رہی ہو۔ مجھے بابر میں جو سب سے خاص چیز نظر آ رہی ہے وہ اس کا اخلاص ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بغیر کسی مفاد اور لالچ کے کر رہا ہے۔ ابھی اس نے کسی کو بتایا نہیں پر میں جانتا ہوں کہ وہ رنگ والی سے باہر ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ کافی زمین خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ صرف خریدے گا نہیں اسے آباد بھی کرے گا۔''

شانی خاموش رہی۔ وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی مگر تایا کے سامنے سے یوں اٹھ جانا بھی اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی تھی۔ کروڑوں کی جائیداد کی اکلوتی مالک......! لیکن اپنے بڑوں کے احترام کی خو اسے نسل در نسل ورثے میں ملی تھی۔ وہ ایک عام لڑکی کی طرح سر جھکائے اپنے بزرگ کے سامنے بیٹھی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد تایا معصوم نے جیسے ہمت کر کے کہا۔ ''شانی پتر! میں تم پر اپنی اور دوسرے بزرگوں کی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا اور نہ ٹھونسنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچو۔ اگر کسی طرح...... بابر جیسا بندہ تمہاری زندگی میں آ جائے تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی آباد ہو سکتی ہے......''

"پلیز تایا جی......" شانی بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کی آواز گلے میں رک گئی اور وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ اس نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "تم کہاں ہو......تم کہاں ہو......تم کیوں مجھے اتنا دکھ دے رہے ہو...... میں لوگوں کو کیا بتاؤں تمہارے بارے میں؟" وہ سسکنے لگی۔

پتا نہیں وہ کب تک اس طرح پڑی رہی۔ آنسو بہہ جانے سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی رگوں میں ایک بار پھر خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کنپٹیاں جیسے جلنے لگی تھیں۔ دوسری طرف ایک منحوس آواز تھی۔ ڈپٹی ریاض ہٹلر کی آواز۔ "ہیلو......میں ڈی ایس پی ریاض بول رہا ہوں۔"

"ہاں کیا بات ہے؟" شانی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نصیب دشمناں زکام لگا ہوا ہے؟ آواز کچھ بھاری بھاری ہے۔"

"بہتر ہے کہ تم کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک ڈاکٹر ہے جو ہیضے کا بہت اچھا علاج کرتا ہے۔ اس کا نام ہیڈ کانسٹیبل جلال ہے لیکن پولیس لائن میں اسے جلال کے بجائے پیار سے جلاد کہتے ہیں اور تمہیں پتا ہی ہوگا کہ نام ایسے ہی نہیں پڑ جاتے۔ ان کے پیچھے کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہ جلال اپنے قبضے میں آئے ہوئے بندے کو نبو کی طرح نچو دیتا ہے۔"

"تت......تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"بات بڑی سیدھی ہے۔ تم تایا بھتیجی کو چوہدراہٹ اور لیڈری کا ہیضہ ہو رہا ہے۔ اس ہیضے کا میں ایسا علاج کرواسکتا ہوں کہ تمہاری اگلی تین نسلوں کو یہ شکایت نہ ہوگی۔"

"کیا کیا ہے ہم نے؟"

وہ ایک لمبی ڈکار لے کر بولا۔ "تمہیں اچھی طرح پتا ہے بی بی جان کہ تم نے کیا کیا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو کہ اب تمہارے ہاتھ پاؤں چنگی طرح پھیل گئے ہیں۔ اب تم قدرت اللہ صاحب سے اگلے پچھلے بدلے لے سکتی ہو......اور تمہارا ماسٹر مائنڈ وہ تمہارا بڈھا تایا......وہ تمہاری بیڑیوں میں بھاری بھاری وٹے ڈال کر قبر میں چلا جائے گا......اور پیچھے رہ جاؤ گی تم اور تمہاری ملوک جنڈڑی۔ اگر یہ جنڈڑی میرے قبضے میں آگئی ناں تو تمہاری ساری لیڈری ناک کے راستے پتلے پانی کی طرح نکلوا دوں گا۔"

"دیکھو ڈپٹی ریاض! زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں تایا کے بارے میں تمہاری گندی زبان سے ایک لفظ سننا نہیں چاہوں گی۔"

"اگر یہ گندی زبان تمہیں کچھ سنانے پر آگئی ناں تو ایسی باتیں سنو گی کہ سر سے پاؤں تک تمہارے اندر مرچیں ہی مرچیں بھر جائیں گی اور تمہیں یہ بھی بتا دوں جس کلّے پر بندھ کر تم دولتیاں جھاڑ رہی ہو ناں، میں وہ بھی اُکھاڑ کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اس لئے اب زیادہ مان نہ کر حاجی شاہ جی کا۔" ڈپٹی ریاض کی آواز میں غضب کے شعلے پھنکار رہے تھے۔

شانی کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ آگیا لیکن اس نے خود کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ وہ بولی۔ "ڈپٹی ریاض! ہمارے درمیان بات ہوئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے رستے میں نہیں آئیں گے۔ اب تم پھر اپنی ٹانگ ہمارے معاملات میں گھسیڑ رہے ہو۔"

"شکر کر بی بی جان! میں صرف ٹانگ گھسیڑ رہا ہوں اور میں تمہیں بتا دوں، میں وہ عزت مآب کھوتا ہوں جس نے کبھی کسی کُتے بلّے کو اپنے اوپر سواری نہیں کرنے دی...... جہاں تک معاہدے کی بات ہے تو وہ میں نہیں توڑ رہا، تم تایا بھتیجی توڑ رہے ہو۔ تم قدرت اللہ پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ رہے ہو......اور اپنی ساری کھڑکیاں کھول کر سن لو، میں تم لوگوں کو قدرت اللہ کے قریب بھی نہیں پھڑکنے دوں گا۔"

شانی نے کمزور آواز میں کہا۔ "وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس سے قانون نمٹے گا۔"

"اور تم میری خلاف ورزی کر رہی ہو۔ تم سے گاہک نمٹیں گے۔ میں تمہیں طوائف بنا کر لاہور کی ہیرا منڈی میں نہ بٹھا دوں تو میرا نام بدل دینا۔" ریاض ہٹلر کی آواز میں آتش فشاں تھے۔

شانی کا گلا خشک ہو گیا۔ "ریاض! تم بات کو بڑھا رہے ہو۔"

"میں بات کو گھٹا رہا ہوں۔ بڑھاؤں گا تو تم تایا بھتیجی کل دوپہر تک تھانے میں نظر آؤ گے اور میں تمہیں پھر بتا دوں میں بہت ...... آدمی ہوں۔" آخری فقرے میں ریاض نے خود کو ایک غلیظ گالی دی۔

شانی نے فون بند کر دیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سامنے تایا معصوم اور مُنا کھڑے تھے۔ تایا معصوم نے پوچھا۔ "کس سے بات کر رہی تھیں دھی رانی؟"

"کک......کوئی نہیں، اجمل خان تھا۔" شانی نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم چھپا رہی ہو۔ تم ریاض کا نام لے رہی تھیں۔''

شانی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گئی۔ اس کے جسم پر ہلکی سی لرزش تھی۔ تایا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈپٹی ریاض تھا ناں؟''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور دو تازہ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا ناں تایا جی...... انسپکٹر انوار کو قدرت اللہ کی طرف نہ بھیجیں۔ یہ لوگ ملے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ڈپٹی ریاض اور قدرت اللہ وغیرہ۔ ڈپٹی ریاض دھمکیاں دے رہا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ کتنا بُرا بندہ ہے۔ انسپکٹر انوار احمد نے قدرت اللہ سے جو پوچھ گچھ کی ہے، اس کی وجہ سے ریاض بھڑک گیا ہے۔''

''تو پھر جان لے لے ہماری۔ مار ڈالے ہم سب کو...... ہم سب خود چل کر قدرت اللہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں تا کہ وہ اپنی بیوی کے بدلے ہم سب کے گلے کاٹ ڈالے۔'' تایا معصوم آزردہ ہو کر بولے۔

انہیں آزردہ دیکھ کر شانی نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تایا جی! سب ٹھیک ہو جائے گا..... مجھے یقین ہے ہو جائے گا۔ بس ہمیں ذرا حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ جو بندہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اپنی موت خود آپ مر رہا ہے، اسے ہم مارنے کے لئے کیوں ہاتھ پاؤں چلائیں۔ آپ بس دعا کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

تایا معصوم نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ''میری دھی، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ریاض اور قدرت اللہ جیسے بے رحم لوگوں والی اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے تجھے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ .. ایسا سہارا جو ہر خطرے کے سامنے دیوار بن جائے۔''

شانی نے سوچا ایک دیوار ہے تو سہی لیکن پتا نہیں وہ کن اندھیروں میں کھوئی ہوئی ہے۔ وہ تایا کا عمر رسیدہ ہاتھ تھام کر بولی۔ ''تایا جی! آپ اپنی بیٹی کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں۔ میں ریاض جیسے لوگوں کا سامنا کر سکتی ہوں اور آپ کو کر کے دکھاؤں گی۔''

تایا معصوم کے سرخ و سپید چہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی بہادر لیکن کم عمر بھتیجی سے متفق نہیں ہیں۔ بے شک انہیں اس کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور علاقے کے لوگ بھی شانی کو پوری محبت کے ساتھ مرحومہ وڈی آپا کی جگہ سمجھنے لگے تھے لیکن کچھ بھی تھا، تایا معصوم کی نگاہ میں وہ ان سارے کاموں کے لئے کم عمر تھی۔

دوپہر سے پہلے شانی سے ملنے کے لئے سینکڑوں لوگ آتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ یہ اجتماع عموماً ایک کھلی کچہری کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ شانی

لوگوں میں گھل مل جاتی ... ان کے مسائل سنتی۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس طرح اس کے اپنے زخموں کو بھی مرہم ملتا تھا۔ اس کا دھیان اپنے دکھوں کی طرف سے بٹ جاتا تھا۔ لیکن اوپر تلے ہونے والے ان واقعات کے بعد تایا معصوم، خالو اعجاز اور دیگر بزرگوں نے شانی کو اس طرح لوگوں میں گھلنے ملنے سے روک دیا۔ شانی کو قلق تو ہوا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لئے ہے۔ شانی نے درمیانی راستہ یہ اختیار کیا کہ تھوڑے لوگوں سے ملتی۔ ان لوگوں کو چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں اور تلاشی لینے کے بعد شانی کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ لوگ شانی کے دیوانے تھے۔ مرد و زن اور بچے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں اور پہروں حویلی سے باہر کھڑے رہتے تھے۔ وڈی آپا کے بعد شانی ان کے لئے علاقے میں ایک ایسی شخصیت بن کر ابھری تھی جو ان کے دکھ درد کی ساتھی تھی اور وہ اس کے ساتھ قلبی تعلق محسوس کرتے تھے۔ ''شانی بی بی ہسپتال'' تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ درحقیقت اس ہسپتال نے قرب و جوار سے قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے پاؤں اُکھاڑ دیئے تھے۔ ہسپتال سے شفایاب ہونے والے مریضوں کا اصل محسن تو باہمت ڈاکٹر بہروز تھا لیکن بہت سے سادہ لوح ایسے بھی تھے جو صحت یاب ہونے کے بعد رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کو سلام کرنے پہنچ جاتے تھے۔ یہ ساری صورتِ حال یقیناً قدرت اللہ اور اس کے حواریوں کے سینوں پر مونگ دل رہی تھی اور اس کا ثبوت شانی پر ہونے والے قاتلانہ حملوں سے بھی ملا تھا۔

دو روز بعد جب چوہدری بابر حویلی سے رخصت ہونے لگا تو تایا معصوم نے شانی کو بتایا۔

''شانی پُتر! بابر جا رہا ہے۔ جا اسے رخصت کر آ۔''

''اچھا تایا جی۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔

اگر دو روز پہلے والی بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید شانی اسے بڑے تپاک سے رخصت کرتی مگر اب وہ اپنے دل پر بھاری بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر نہیں گئی۔ وہ تایا معصوم کو اپنی طرف سے کوئی مثبت اشارہ نہیں دینا چاہتی تھی، لیکن عین اس وقت جب بابر جا رہا تھا شانی خود کو اخلاقی تقاضا پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکی اور اسے رخصت کرنے کے لئے آ گئی ..... بابر کو بھی غالباً تایا معصوم کی زبانی ان دھمکیوں کا علم ہو چکا تھا جو ڈپٹی ریاض نے شانی کو دی تھیں۔ بابر نے ریاض کے بارے میں چند سخت الفاظ کہے اور شانی کو یقین دلایا کہ اگر ریاض نے بیچ میں کودنے میں کوشش کی تو وہ سب مل کر اس سے نمٹیں گے۔

بابر کے جانے کے بعد شانی سیدھی دوسری منزل کے اس کمرے میں پہنچی جہاں آپو زاہدہ اور بھائی اکرام کا قیام تھا۔ دونوں بچے ساتھ والے کمرے میں سوتے تھے۔ وہ چاروں یہاں خاصا تحفظ محسوس کررہے تھے۔ ویسے ان کے گاؤں بہارو میں بھی ابھی تک خیریت ہی گزری تھی۔ شانی کو عارف کے ذریعے جو خبریں ملی تھیں ان کے مطابق ابھی تک کوئی پولیس والا کسی تفتیش کی غرض سے بہارو گاؤں نہیں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کاچھی وال گاؤں کے موچھل حوالدار کے سوا کسی کی یادداشت نے غیر معمولی تیزی سے کام نہیں کیا تھا۔ تھانیدار عاقل گوندل اور اس کا عملہ اس بات سے بے خبر ہی رہا تھا کہ ان کے حوالات میں پورے ایک دن بند رہنے والے میاں بیوی درحقیقت رستم سیال کے بہن بہنوئی تھے اور یہ وہ دو افراد تھے جن کی تلاش میں پولیس طویل عرصے سے ماری ماری پھر رہی تھی۔ ایک حیرت کی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ کئی دن گزرنے کے باوجود موچھل حوالدار کی پُر اسرار گمشدگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ اس کی بلند آواز پھٹ پھٹی نالے میں پوشیدہ تھی۔ حوالدار کے بارے میں تھانے میں یہ سمجھا جارہا تھا کہ وہ اطلاع دیئے بغیر کہیں گیا ہوا ہے۔

شانی، آپو زاہدہ کے کمرے میں پہنچی تو وہ اکیلی بیٹھی تھیں۔ بھائی اکرام نیچے مردانے میں گئے ہوئے تھے۔ دونوں بچے ساتھ والے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ ماں باپ کی خواہش کے مطابق دونوں بچے تعلیم پر بہت توجہ دیتے تھے۔ چند ہی دنوں میں شانی انہیں بہت پسند کرنے لگی تھی۔ شانی، آپو زاہدہ کے پاس بیٹھ گئی۔ آپو زاہدہ نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور پھر الماری کھولی۔ الماری کے ایک خانے میں سے انہوں نے وہی سکول بیگ نکالا جو یہاں پہنچتے ہوئے سرمد کے پاس نظر آیا تھا۔ شانی کے سامنے بیگ کو کھولتے ہوئے آپو زاہدہ آبدیدہ ہوگئیں اور بولیں۔ ''شانی! ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اپنے پاس سنبھال لو۔''

''یہ کیا ہے آپا؟''

''گہنے ہیں۔ کچھ میری شادی کے اور کچھ رستم کی شادی کے، جو پتا نہیں کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔''

آپو زاہدہ نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ سونے کا ایک جڑاؤ ہار، چار کڑے اور دو خوبصورت جھمکے نکال لئے۔ یہ ایک مکمل سیٹ تھا۔ اس سیٹ کے علاوہ دو تین انگوٹھیاں اور تھلی وغیرہ بھی تھیں۔ وہ یہ زیور شانی کو دکھاتے ہوئے بولیں۔ ''یہ میں نے بڑے چاہ سے رستم کی ووہٹی کے لئے بنوائے تھے۔ اس کے علاوہ کئی جوڑے کپڑوں کے بھی تھے۔ میں ان چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی، بار بار دیکھتی تھی۔ مجھے ان بے جان چیزوں میں رستم کی ووہٹی کی

خوشبو آتی تھی۔ وہ ووہٹی جو میں نے ابھی دیکھی بھی نہیں تھی لیکن جس کا رستم نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا تھا۔''

شانی نے خوبصورت زیوروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی تمنا ضرور پوری ہوگی آپا...... ایک نہ ایک دن یہ گہنے آپ کے بھائی کی ووہٹی ضرور پہنے گی۔''

''پتا نہیں وہ ویلا کب آئے گا۔ اب تو سب کچھ اندھیرے میں ڈوبتا جارہا ہے۔ کہتے ہیں وڈے ڈیرے کی لڑائی میں ڈپٹی ریاض نے رستم پر بڑا ظلم کیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی تھی۔ کچھ کہتے ہیں کہ دونوں ٹانگیں اور کچھ کہتے ہیں کہ عین لڑائی کے وقت وہ بندھا ہوا تھا...... اور گولیوں سے چھاننی ہوگیا تھا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے آپو زاہدہ کی آواز بیٹھ گئی۔ آنسو گرنے لگے۔

''یہ سب باتیں ہیں...... ان میں ثبوت کہیں نہیں۔ میں بھی اخباروں میں اس بارے میں پڑھتی رہی ہوں۔''

''لیکن یہ تو سچ ہے ناں کہ ڈیرے کی لڑائی میں بہت سی لاشیں سڑ کر سواہ ہوگئی تھیں۔ کیا پتا کس کس ماں کا پتر اور کس کس بہن کا بھائی مرا تھا۔''

''ہاں۔ یہ تو کچھ پتا نہیں۔'' شانی نے کہا۔

آپو زاہدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے زیور شانی کے حوالے کردیئے اور اسے کہا کہ وہ عارضی طور پر انہیں سنبھال لے۔

شانی کچھ دیر تک آپو زاہدہ کے پاس بیٹھ کر اور زیوروں والا بیگ لے کر اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ وہ بھی رستم کے لئے اتنی ہی دکھی تھی جتنی آپو زاہدہ دکھی تھیں، لیکن آپو زاہدہ کا خیال تھا کہ رستم وڈے ڈیرے کی لڑائی میں گم ہوا ہے جب کہ شانی یہ بات جانتی تھی کہ وڈے ڈیرے کی لڑائی کے بعد بھی کئی ماہ تک رستم جیتا جاگتا تھا...... اس دوران میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی پوری ہوئی۔ اس نے شانی سے شادی کی تھی۔ اس کے ساتھ کئی حسین شامیں، کئی خوبصورت راتیں اور چمکیلی صبحیں گزاری تھیں۔ یہ زندگی کا وہ یادگار حصہ جس پر کئی زندگیاں قربان کی جاسکتی تھیں...... اور پھر ایک صبح وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت صبح کے تارے ہی کی طرح اوجھل ہوگیا تھا...... اس کی گمشدگی اب تک بے نام ونشان تھی۔ بس طویل قامت راکب خان کے پاس سے چند نشانیاں ملی تھیں، وہ بھی فی الوقت بے معنی ہی نظر

[illegible]ے میں بیٹھی رہی۔ اس پر حزن وملال کی عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس

کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اپنا جُوڑا کھول کر منتشر بال سنوارے۔ الماری میں سے ایک سرخ کامدار اوڑھنی نکالی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ زیور پہننے لگی جن کے بارے میں آپوزاہدہ نے بتایا تھا کہ وہ رستم کی دلہن کے ہیں۔ یہ زیور پہنتے ہوئے اسے عجیب سی خوشی اور راحت کا احساس ہوا۔ ایک محبت بھری لہر اس کے رگ وپے میں جاگ اٹھی۔ وہ جیسے اپنے جسم کی خوشبو سے ہی مہک گئی۔ اس نے سرخ اوڑھنی اپنے سر پر درست کی تو اسے لگا کہ وہ دلہن کی طرح رستم کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بستر پر نیم دراز ہو کر اپنے اردگرد رستم کی موجودگی کو محسوس کرنے لگی۔ اس کے چھونے کا مہربان انداز.....اس کی مہکتی ہوئی سانسیں.....اس کی محبت بھری احتیاط جیسے وہ کانچ کا جسم رکھتی ہو اور ذرا سی بے پروائی سے ٹوٹ سکتی ہو۔

اچانک مُنے کی آواز نے شانی کو بھولے بسرے سپنوں کی دنیا سے باہر نکالا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ''آئی منے۔'' اس نے کہا۔ مُنا دروازے پر تھا۔

وہ جلدی جلدی اپنے زیور اتارنے لگی۔ ورنہ مُنا ایسا تھا کہ سوالات پوچھ پوچھ کر اس کا ناک میں دم کر دیتا۔

زیور دوبارہ الماری میں سنبھال کر اور اسے لاک کر کے وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈولا کھڑا تھا۔ اس نے مُنے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بچے نے دوسرے بچے کو اٹھا رکھا ہے۔ ''باجی جی! یہ بہت ضد کرتا ہے۔ مجھے گھوڑا بنا کر میرے اوپر بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ کمرے میں چکر لگاتے جاؤ۔ میرے تو اب گوڈے چھل گئے ہیں۔''

''اوئے، یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' شانی نے مُنے کو ڈانٹا۔

''انکل خود کہتے تھے کہ میں گھولا (گھوڑا) ہوں۔'' مُنے نے وضاحت کی۔

ڈولا ہنسنے لگا۔ ''باجی جی! یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ یہ مجھے گھوڑی کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا میں عورت نہیں مرد ہوں۔ اگر مجھے کہنا ہی ہے تو پھر گھوڑا کہو۔ بس میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ یہ میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔''

''پھر تھوڑا بہت قصور تمہارا بھی ہے۔'' شانی مسکرائی۔

اسی دوران میں ڈولا چونک گیا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانی نے کہا۔ ''کیا بات ہے، تم نے تو کن گھوڑے ہی کی طرح کان

ہلا نے شروع کر دیئے ہیں۔''

ڈولا بولا۔ ''مجھے نسوار کی بُو آ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ خان بھائی تشریف لا رہے ہیں۔''

''واقعی؟'' شانی خوش ہو کر بولی۔

ڈولے نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے حویلی کے بیرونی پھاٹک کی طرف بھاگ گیا۔ چار پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اجمل خان واقعی اس کے ہمراہ تھا۔ ''تم گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح کہاں غائب ہو جاتے ہو؟'' شانی نے کہا۔

''خو، ام نے پرسوں ہی تو فون کیا تھا آپ کو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا ذاتی طور پر یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔''

''بس ام آ گیا ہے۔ اب کہاں جانا ہے ام نے۔''

''اچھا، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے پھر نسوار کھائی ہے؟'' شانی نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''نہیں.....نہیں اب تو ام نسوار اور سگریٹ کے پاس سے بھی نہیں گزرتا۔''

''پاس سے گزرنے کو کون منع کرتا ہے۔ میں تو استعمال سے منع کر رہی ہوں اور ابھی ڈولے نے تمہاری آمد کا اعلان نسوار کی بُو سونگھنے کے بعد کیا ہے.....اور اب تو مجھے بھی ہلکی ہلکی بُو آ رہی ہے۔''

اجمل کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پہلے شاید اس نے صاف مکرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر پھر غالباً یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اس سے شانی کا بیان بھی جھوٹا پڑتا تھا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''ویسے سچا بات یہ ہے کہ ام کو بھی منہ میں تھوڑا تھوڑا نسوار کا ذائقہ معلوم ہو رہا ہے۔ دراصل ام کل لاہور میں تھا اور وہاں اپنے ایک دوست بشیر گل کے پاس اس کے ٹرک اڈے پر سویا تھا۔ دو تین اور دوست بھی موجود تھا۔ ام تو جلدی سو گیا لیکن وہ دیر تک وی سی آر پر فلم دیکھتا رہا۔ ام کو لگا ہے کہ ان میں سے ہی کسی نے فلم دیکھتے ہوئے امارے منہ کے اندر نسوار رکھ دیا۔''

''اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی نے سوتے میں ہی تمہاری جیب کے اندر نسوار کی چھوٹی سی ڈبیا بھی رکھ دی ہو گی؟''

''ڈبیا!'' اجمل نے گڑبڑا کر کہا پھر اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ بغلی جیب میں ڈبیا کی موجودگی صاف محسوس ہوئی۔ اجمل تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا۔ ''شانی بہن، آپ نے تو کمال کا دماغ پایا ہے۔ بالکل کسی نجومی کے ماپق (مافق)۔ مجھے بھی اس طرف سے نسوار کا تھوڑا سا

خوشبو آ رہا تھا۔''

''اجمل، انسان بن جاؤ۔ ورنہ بڑی لڑائی ہوگی میری اور تمہاری۔'' شانی نے اسے تیور دکھائے پھر ذرا سوچ کر بولی۔ ''اور مجھے لگتا ہے کہ ابھی تمہارے دماغ شریف سے نسوار والا خناس نکل نہیں رہا۔ دیکھو، ابھی تم نے نسوار کی بُو کے لئے خوشبو کا لفظ بولا ہے۔ بولا ہے کہ نہیں؟''

''شانی بہن! آپ نے واقعی بہت کمال کا دماغ پایا ہے۔ آپ بات کو ایک دم کیچ کرتا ہے۔ اس دن بھی آپ نے کمال کر دیا تھا جب آپ......''

''اجمل خان ... بات کو گھماؤ پھراؤ مت۔'' شانی نے آنکھیں نکالیں۔ ''مجھے بتاؤ تم نے نسوار کھائی تھی یا نہیں؟''

اجمل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ جب کسی وقت بہت زیادہ طلب ہو تو ایک چٹکی رکھ لیا کرو۔ ام دو تین دن سے بہت پریشان تھا۔ رات کو دیر تک نیند نہیں آتا تھا۔ رستم بھائی کا خیال امارے دماغ سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ آخر وہ ام کو کیوں نہیں ملتا۔ کیوں ام بے بس ہوتا جا رہا ہے۔ کیا آہستہ آہستہ یہ ہوگا کہ ام تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ یہ سمجھ لے گا کہ رستم بھائی اور ناصر بھائی کے ساتھ امارا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا ....'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور لمبی سانس لے کر بولا۔ ''نہیں شانی بہن! ایسا نہیں ہوگا۔ ام خود سے ایک عہد کر کے آیا ہے اور وہ یہ کہ جب تک رستم اور ناصر بھائی کا سراغ نہیں ملتا، ام اپنے گھر والوں کا منہ نہیں دیکھے گا۔ ام اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسکردو اور چیلاس کی طرف نکل جائے گا۔ ان برفوں میں اس وقت تک گھومتا رہے گا جب تک ام مر نہ جائے یا ام کو رستم بھائی کا کھوج نہ مل جائے اور ام کو یقین ہے کہ امارا کوشش ضرور کامیاب ہوگا کیونکہ اب امارے پاس وہ نشانیاں بھی ہیں جو راکب خان سے ملا ہے۔ وہ چیزیں امارا مدد کرے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں خان بھائی۔'' ڈولے نے تائید کی۔ ''وہ چیزیں تلاش میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔''

''وہ چیزیں کہاں ہیں شانی بہن؟'' اجمل نے پوچھا۔

شانی دوبارہ الماری کی طرف گئی اور لاک کھول کر ایک دراز میں سے وہ ساری اشیاء نکالیں جو راکب سے دستیاب ہوئی تھیں۔ راکب خان کے گلے سے اترنے والا تعویذ جو تانبے کی چھوٹی سی تختی کی صورت میں تھا۔ اس میں ایک طرف کسی درخت کی شبیہ کندہ تھی۔ دوسری جانب پتے بنے ہوئے تھے جو صاف طور پر سپ گندل کے پتے تھے۔ اس تعویذ سے

ہی یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ گورے کے بنگلے پر جو کچھ ہوا وہ کسی نہ کسی طور نایاب پودے سپ گندل سے متعلق تھا۔ راکب کی جیکٹ میں سے کچھ پاکستانی اور چائنیز کرنسی ملی تھی۔ یہ چائنیز کرنسی بھی شمالی علاقہ جات کے ایک خاص رخ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ راکب کی جیبوں سے کچھ گھسے ہوئے گول پتھر برآمد ہوئے تھے۔ یہ غالباً برکت اور دافع بلیات کے طور پر رکھے گئے تھے۔

شانی نے کہا۔ ''میرے خیال میں ان سب چیزوں میں سے زیادہ اہم یہ لکھا ہوا کاغذ ہے۔ میں نے ایک دو لوگوں سے پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی درجنوں زبانیں کوہ قراقرم اور چین کی سرحد کے ساتھ کے علاقوں میں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ اگر مقامی زبانوں کے کسی ماہر سے اسے پڑھوایا جا سکے تو امید کی کرن پیدا ہو سکتی ہے۔''

ڈولے نے تانبے کی تختی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے یہ کوئی ایسا درخت ہے جسے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس علاقے میں اس کی پوجا کی جاتی ہو۔ ہمارے دور دراز علاقوں میں کئی ایسے قبیلے ہیں جو غیر مسلم ہیں اور بے جان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔''

''اسی طرح وہاں سپ گندل کو بھی مقدس جڑی بوٹی کا درجہ دیا جاتا ہوگا۔ گورے کے بنگلے میں ان لوگوں کو موت کی سزا دی گئی جو اس جڑی بوٹی کا کاروباری استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔'' شانی نے کہا۔

اجمل نے شانی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ ہمیشہ امارے دیر سے آنے پر شکوہ پرماتا ہے (فرماتا ہے) لیکن امارے دیر سے آنے کا کوئی نہ کوئی وجہ ہوتا ہے۔ اس بار کی ایک وجہ تو وہ موچھل حوالدار تھا۔ اس کا نام شاہ دین ہے۔ ام نے اسے ٹھکانے لگانا تھا ''

''کیا مطلب؟'' شانی نے اسے گھورا۔

''نہیں... نہیں۔ آپ سے ام وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ ٹھکانے لگانے سے امارا مطلب یہ ہے کہ اسے کسی ایسی محفوظ جگہ پر رکھنا تھا جہاں پر دو ڈھائی مہینے آرام سے نسوار لگا کر اور گانجا پی کر اپنا یادداشت کمزور کر سکے۔ یہ کام کرنے کے بعد ام نے ایک اور کام کیا اور آپ کو اس کام پر بھی امارا تعریپ کرنا پڑے گا۔''

''بتاؤ تو تعریف بھی کریں گے۔'' شانی نے کہا۔

''اچھے کام کے بعد تو اس کی تعریپ ہر کوئی کرتا ہے۔ مزہ تو تب ہے جی کہ اچھے کام کا ذکر سننے سے پہلے ہی اس کا تعریپ کر دیا جائے۔ امارے دادا جی ہمیشہ ایسا کیا کرتے تھے۔ اس کا ان کو بہت پائدہ بھی ہوتا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ انگریز بہت خوشامد پسند ہے۔ بس دادا

صیب کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ اپنی اس عادت سے نقصان ہوا۔ جب امارا دادی صیب بہت بیمار تھا، دادا جی کے منہ سے نکل گیا۔۔۔ آپ نے ہر کام بڑے اچھے طریقے سے کیا ہے۔ اب دیکھیں آپ پوت (فوت) بھی کتنے خوبصورت طریقے سے ہو رہا ہے۔ کہیں کوئی شور شرابہ نہیں۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ آپ جیسی عورت کا جان اتنی سہولت سے نکلے گا۔۔۔۔ بس اسی بات پر اماری دادی صاحبہ کو تاؤ آ گیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے دادا صیب کے مرنے تک اپنے پوت ہونے کا سوچا بھی نہیں۔''

شانی دھیان سے اجمل کو دیکھ رہی تھی۔ ''اجمل! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ تم دہری شخصیت کے مالک ہو۔ وہ شخص کوئی اور ہے جو اوٹ پٹانگ ہانکتا ہے اور لطیفے سناتا ہے۔ وہ اور ہے جو رائفل یا پستول اٹھاتا ہے اور بڑی درندگی سے اپنے حریفوں کو قتل کر دیتا ہے۔ پتا نہیں تم نے جان بوجھ کر خود کو ایسے بانٹ رکھا ہے یا تم ہو ہی ایسے۔''

''نہیں جی! ام ہے ہی ایسا۔ امارا والدہ بتاتا ہے، دراصل جب ام پیدا ہونے والا تھا تو انہوں نے بہت سا مونگ پھلی کھا کر اوپر سے گنے کا رس پی لیا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا گنے کا رس بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ امارا والدہ گرم سرد ہو گیا۔ ام بھی گرم سرد ہو گیا۔ آپ کو سن کر بڑا حیرانی ہوگا۔ جب ام پیدا ہوا تو ام نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ امارے منہ میں پورے تین دن تک ایک چیز کے سوا کچھ نہیں گیا۔ پتہ ہے وہ چیز کیا تھا؟''

''نسوار!'' ڈولے نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں، مونگ پھلی کا تیل۔۔۔۔۔ مونگ پھلی کا تیل کا خوشبو ام کو ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ اب بھی ام کہیں اچھی کوالٹی کا مونگ پھلی دیکھتا ہے تو ایک دم قربان ہو جاتا ہے۔ جب ام پیدا ہوا تو ام میں ایک خاص بات تھا۔ ام رات کو بالکل ٹھیک رہتا تھا۔ ہنستا کھیلتا تھا لیکن دن میں بھینگا ہو جاتا تھا اور بہت تنگ کرتا تھا۔ یہ سب اسی گری سردی کی وجہ سے تھا۔ آہستہ آہستہ اماری والدہ نے دن کے وقت سونا اور رات کو جاگنا شروع کر دیا۔ بالکل چوکیداروں کی طرح۔ بہت دن تک ہماری والدہ نے کسی کو پتا ہی نہیں چلنے دیا کہ ام دن کے وقت بھینگا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ پھول کا خوشبو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا، اماری بستی میں بھی لوگوں کو بہت جلد پتا چل گیا کہ ام دن کے وقت بھینگا ہو جاتا ہے۔ امارے نانا کے گاؤں میں ایک بہت پہنچا ہوا ملنگ تھا۔ اس نے میرے والد سے کہا۔۔۔۔۔ یہ بچہ آگے چل کر بہت نام پیدا کرے گا لیکن اس کے لئے اپنے دل کو تھوڑا سا سخت کر کے ایک کام کرنا پڑے گا۔ میرے والد نے پوچھا، کیا کام؟ ملنگ نے کہا۔ اس بچے کو مار کر پہاڑ کی چوٹی پر دفن

کرنا پڑے گا۔ اس کے مزار کا بہت شہرت ہوگا۔ لوگ دور دراز سے منتیں مانگنے اور چڑھاوے کے لئے آئے گا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ڈولے نے مصنوعی تجسس سے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا۔ وہی ٹریجک اسٹوری۔۔۔۔۔ وہی دکھیا کرنے والا اینڈ۔ ام کو زندہ رہنے دیا۔ نہ صرف زندہ رہنے دیا گیا بلکہ بعد میں پولیس میں بھی بھرتی کرا دیا گیا۔''

''ہاں خان بھائی۔ آپ پولیس میں کیسے بھرتی ہو گیا؟'' ڈولے نے پوچھا۔

''دراصل ام بڑا ہونے کے بعد بھی بارہ چودہ سال تک بھینگا ہی رہا لیکن عجیب بات تھا کہ امارا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ام نے جس چیز کو گولی مارنا ہوتا تھا اس سے تین انچ نیچے کا نشانہ لیتا تھا اور امارا نشانہ کبھی نہیں چوکا۔ پھر ایک مرتبہ ام کو ٹائیفائیڈ بخار ہوا۔ جب ام بخار سے صحت یاب ہوا تو امارا بھینگا پن بالکل ٹھیک ہو چکا تھا لیکن نشانہ بالکل خراب۔۔۔۔ ام بہت دکھی ہوا۔ رمضان شریف کی ستائیسویں رات کو ام نے رو رو کر اللہ میاں سے دعا مانگا کہ ام پھر سے بھینگا ہو جائے لیکن امارا نشانہ ٹھیک رہے۔ اماری ماں نے ام کو یہ دعا مانگتے ہوئے سن لیا۔ انہوں نے مصلے پر ہی ام کو کئی جھانپڑ مارے اور کہا۔۔۔۔۔ خدائی خوار۔۔۔۔۔ میں نے مصلے پر رو رو کر تیری آنکھیں ٹھیک کرایا ہے۔ اب تو دعائیں مانگ مانگ کر انہیں پھر سے خراب کرا رہے۔۔۔۔۔ اس دن انہوں نے ایک بڑا یادگار بات کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا خزانہ بے شمار ہے اور بہت بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کھلے دل کے ساتھ مانگتے ہیں۔ مانگتے ہوئے شرطیں نہیں رکھتے۔ پھر جی ام نے دوسرے طریقے سے دعا مانگا۔ تین چار مہینے بعد امارا نشانہ بھی ویسے کا ویسا ہو گیا جیسے پہلے تھا۔ پولیس میں امارا بھرتی کی وجہ بھی امارا نشانہ ہی بنا۔''

شانی نے کہا۔ ''اجمل! بے پر کی نہ اُڑایا کرو۔ جو کچھ تم نے اب تک کہا ہے اس میں سے دس پندرہ فیصد ہی سچ ہوگا۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم صرف کام کی بات کرو۔ ایک کام تو تم نے یہ کیا ہے کہ حوالدار شاہ دین کو کسی محفوظ ٹھکانے پر چھوڑ آئے ہو دوسرا کارنامہ کیا ہے؟''

شانی کا سنجیدہ موڈ دیکھ کر اجمل خان بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''وہاں ایبٹ آباد میں رحیم اللہ نام کا ایک بندہ ہے۔ اس کا عمر ساٹھ ستر سال کے قریب ہے۔ وہ جوانی میں گائیڈ کا کام کیا کرتا تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور انگریزی بھی بول لیتا تھا اسی لئے ناران، جھیل سیف الملوک اور چیلاس وغیرہ کی طرف جانے والا غیر ملکی لوگ رحیم اللہ کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ان علاقوں کے بارے میں رحیم

اللہ کا تجربہ اور معلومات اتنا زیادہ تھا کہ رحیم اللہ کے لئے باقاعدہ ایڈوانس بکنگ ہوتا تھا۔ اب وہ کافی بوڑھا ہے لیکن پھر بھی مزیدار بندہ ہے۔ ام پانچ چھ دن پہلے خاص طور پر اس سے ملنے کے لئے ایبٹ آباد گیا تھا۔ وہ ایک اچھا پوٹوگراپر بھی ہے۔ آج کل اس نے ایبٹ آباد میں پوٹوگراپی کا دکان کھولا ہوا ہے۔ رحیم اللہ سے امارا کافی لمبا چوڑا بات ہوا ہے۔ آپ سننا پسند پرمائے گا۔''

''اس میں سے جو کام کی باتیں ہیں وہ بتادو تو زیادہ اچھا ہے۔'' شانی نے کہا۔

''نایاب پودے سپ گندل کے بارے میں رحیم اللہ بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ یہ پودا سرد ترین پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے..... ٹراؤٹ مچھلی کی طرح اس پودے کو بھی سرد ترین موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ رحیم اللہ کا کہنا ہے کہ اسکردو اور کے ٹو پہاڑ کے درمیانی علاقے میں ہی کہیں وہ جگہ ہے جہاں قدرتی طور پر یہ پودا اُگتا ہے۔ ام یہ کہہ سکتے ہیں کہ چار چھ پہاڑ ہیں جہاں یہ پودا قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ قریباً چھ سات سال پہلے انگلینڈ سے تین لوگ آیا تھا۔ وہ اسی پودے کی تلاش میں تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے وہ دو ایسے افراد کی تلاش میں تھا جو ان سے پہلے اس پودے کی تلاش میں یہاں پہنچے تھے اور لاپتا ہو گئے تھے۔ رحیم اللہ کا کہنا ہے کہ وہ ان تین انگریزوں کا گائیڈ بن کر اسکردو کی طرف گیا تھا۔ یہ جون جولائی کے دن تھے ..... وہ قریباً دو ماہ تک ان برپوں (برفوں) میں آوارہ گردی کرتے رہے تھے۔ انہوں نے شکار بھی کھیلا اور بہت سا یادگار پوٹو بھی اُتارا تھا لیکن ان کا اصل مقصد پورا نہیں ہوا۔ انہیں ایک دو کھوج بھی ملا جن سے انہیں اندازہ ہوا کہ انہیں کے ٹو پہاڑ کے ''بیس کیمپ'' کی طرپ جانا چاہیے لیکن پھر گڑبڑی ہو گیا۔''

''کیا ہوا؟''

''ایک حادثہ۔ ٹیم کے چار لوگوں میں سے دو برپ کے ریلے میں دب گیا۔ آپ شاید جانتا ہوگا، برپ کے ریلے کو ''ایوالانچ'' بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سا برپ پہاڑ کے اوپر سے طوپان کی طرح گرتا ہوا آتا ہے اور بہت کچھ ملیامیٹ کر دیتا ہے۔''

''ٹیم کے لوگ بچ گئے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہاں بچ تو گئے لیکن ان میں سے ایک شخص کا دونوں ٹانگیں ٹوٹ گیا۔ دوسرا بھی زخمی ہوا۔ ان لوگوں کو اپنا مہم ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ام نے آپ کو بتایا ہے ناں یہ کوئی سات سال پہلے کا بات ہے۔ اس سیر کا سارا رُوداد رحیم اللہ نے اپنی ڈائری میں بھی لکھ رکھا ہے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ رحیم اللہ تمہارے ساتھ اسکردو کی طرف جانے کو تیار

ہو جائے گا؟'' شانی نے پوچھا۔

''ضرور ہو جائے گا جی۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود وہ عمر رسیدہ نظر نہیں آتا۔ وہ بڑا سخت جان ہے جی۔ ہاں اس کا مالی حالت زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اگر اس کام میں اس کو تھوڑا سا مالی پائدہ بھی نظر آجائے گا تو اس کا ارادہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ وہ بہت اچھا بندہ ہے شانی بہن۔''

شانی کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اجمل تم بتا رہے ہو کہ ایوالانچ والا حادثہ ہونے سے پہلے ان لوگوں کو تھوڑے بہت کھوج ملے تھے۔ وہ کیا تھے؟''

''ان میں سے ایک کھوج تو یہی ہے جو ام کو راکب خان سے بھی ملا ہے۔'' اجمل نے تانبے کی تختی والا تعویذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اس تختی پر درخت کا تصویر بنا ہوا ہے۔ ام کو یقین ہے یہ وہی درخت ہے جس کا ذکر ام سے ایبٹ آباد میں رحیم اللہ نے بھی کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کے ٹو کی طرپ جانے والے دشوار پہاڑوں میں کہیں کسی جگہ تھوڑی تعداد میں ایسا لوگ بھی رہتا ہے جو درخت کی پوجا کرتا ہے۔ اس درخت کو شاید آبوک کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ بہت کٹر قسم کا مذہبی لوگ ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سپ گندل نام کا بوٹی بھی پایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں اس بوٹی کو کسی اور نام سے پکارا جاتا ہو۔ جیسے راکب خان اس کو سوسی کے نام سے پکارتا تھا۔''

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ راکب خان کی ناگہانی موت کے باوجود ابھی امید کی کرنیں باقی ہیں۔''

''کرنیں نہیں شانی بہن..... پورا سورج باقی ہے۔ امارا دل کہتا ہے کہ ام بہت جلد آپ کو کوئی خوشخبری لا کر دے سکتا ہے۔ ام کو بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے اور ان دعاؤں کے لئے ضروری ہے کہ ام یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے پیر قدرت اللہ کو کسی اچھے سے قبرستان میں پہنچا دے۔''

''قبرستان..... کیا مطلب؟''

''قبرستان کا مطلب قبرستان ہی ہوتا ہے جی جہاں بڑی اچھی اچھی قبریں بنا ہوتا ہے۔ لمبی لمبی قطاروں میں..... اور ان کے اوپر بڑا اچھا اچھا کتبہ بھی لکھا ہوتا ہے۔ ام چاہتا ہے کہ اب قدرت اللہ وہاں آرام پرمائے تاکہ امارا بہن اس کی دشمنی سے محفوظ رہ سکے۔''

''اجمل..... تم نے پھر وہی ہانکنی شروع کر دی۔''

''نہیں جی۔ اب ام بالکل سنجیدہ ہے۔ ام سچ کہتا ہے کہ امارے پستول میں قدرت اللہ کے نام کا گولی بہت بے چین ہے۔ ام ایبٹ آباد میں تھا جب ام کو اخبار کی ایک خبر سے پتا چلا کہ قدرت اللہ کے کسی حرامی چیلے نے آپ کے کمرے میں گھس کر آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کیا ہے۔ یقین کریں امارا خون اوپر تک کھول گیا تھا۔ بالکل ابالے کھانے لگا تھا۔''

''تمہارے اس خون کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہی تو میں تمہارے ساتھ سر مار رہی ہوں اجمل خان... بلاشبہ بہادری ایک بہت بڑی صفت ہے لیکن برداشت اور معاف کر دینے کی صلاحیت اس سے بڑی صفتیں ہیں۔ تم نے سنا نہیں..... اصل پہلوان وہ ہوتا ہے جو اپنے غصے کو پچھاڑ دیتا ہے۔''

''آپ کا یہ باتیں پوری طرح امارا سمجھ میں نہیں آتا، لیکن ام پھر بھی مانتا ہے کیونکہ یہ آپ کا باتیں ہیں مگر..... مگر یہ قدرت اللہ والا مالمہ امارا کھوپڑی سے بالکل باہر ہے۔ اس مالمے کو اپنی کھوپڑی کے اندر کرنے کی کوشش میں امارا کھوپڑی پھٹ جائے گا۔ یہی بات عارب بھائی بھی کہتا ہے۔ خدانخواستہ..... خدانخواستہ رستم بھائی کی غیر موجودگی میں آپ کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو ام رستم بھائی کو کیا منہ دکھائے گا۔''

''ہر معاملے سے نمٹنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے اجمل۔''

''یہ کیا طریقہ ہے شانی بہن۔ آپ قدرت اللہ کے چیلوں کو پکڑ رہا ہے۔ اس بیماری کا اصل جڑ تو قدرت اللہ ہے۔ جب تک یہ جڑ نہیں اکھڑے گا، دو چار چیلوں کو حوالات میں بند کرنے سے کیا ہوگا؟''

''ہم نے قدرت اللہ کو نہیں مارنا اجمل خان، اس جہالت کو مارنا ہے جو پہلے قدرت اللہ پیدا کرتا ہے پھر اس کے چیلے بناتے ہے۔ اصل جڑ قدرت اللہ بھی نہیں ہے اجمل خان۔''

شانی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اجمل خان اور ڈولے کو بہت بارعب نظر آئی واقعی قدیم زمانے کی کسی دیوی کی طرح۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر شانی نے اجمل سے پوچھا۔ ''راکب خان کے بارے میں کسی کو کسی طرح کا شبہ تو نہیں ہوا؟''

''نہیں جی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا۔ وہ کرائے کا مکان تھا۔ شیر محمد نے اسے تالا لگا دیا ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے تک تالا ہی لگا رہے گا۔ پھر شیر محمد مکان چھوڑ دے گا۔''

''راکب کی موت کا مجھے بہت افسوس ہے اجمل۔''

''جی ہاں۔ وہ امارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ ام کو یقین ہے ایک بار اس

سے آپ کا ملاقات ہو جاتا تو آپ نے اس پر اپنی باتوں کا زور چلا دینا تھا۔''

''ہاں، یہ افسوس بھی ہے کہ ہم اس سے کوئی کھوج حاصل نہ کر سکے، لیکن اس کی موت کا افسوس بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ میں سوچ کر حیران ہوتی ہوں، یہ اندھے عقیدے کس طرح ہر عمر کے لوگوں کا خون پیتے ہیں..... اور خاص طور سے نوجوانوں کا۔''

اچانک اجمل خان کا دھیان رستم کی بہن اور بہنوئی کی طرف چلا گیا۔ وہ ان سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ وہ ان دونوں کے لئے کچھ تحفے بھی لے کر آیا تھا مگر شانی نے اسے سمجھایا کہ فی الحال وہ ان کو اس حوالے سے ڈسٹرب نہ کرے۔

ابھی شانی اور اجمل وغیرہ کے درمیان بات ہو ہی رہی تھی کہ ملازمہ مجیدہ آ گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ جیسے کوئی اہم اطلاع لے کر آئی تھی۔ شانی سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

مجیدہ نے کہا۔ ''چھوٹی بی بی! آپ کو بڑے چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔''

بڑے چوہدری صاحب سے مجیدہ کی مراد تایا معصوم تھے۔ ''یا اللہ خیر۔'' شانی نے دل ہی دل میں کہا اور اٹھ کر نشست گاہ کی طرف چل دی۔ زنان خانے کے بڑے کمرے میں ملازمائیں بیٹھی سبزی وغیرہ بنا رہی تھیں۔ ان کے پاؤں میں درانتیاں دبی ہوئی تھیں اور وہ ساگ کتر رہی تھیں۔ کچھ پیاز اور لہسن وغیرہ سے برسرِ پیکار تھیں۔ شانی کو دیکھ کر چند ملازماؤں نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اس کے لئے جگہ بنائی۔ شاید انہوں نے سوچا تھا کہ چھوٹی بی بی حسبِ عادت ان کا ہاتھ بٹانے آئی ہے۔ وہ ان کے درمیان بالکل گھل مل جاتی تھی اور وہ اس کی موجودگی سے بہت لطف اٹھاتی تھیں۔ شانی جب اپنی سوچ میں گم ان کے پاس سے گزر گئی تو انہیں قدرے مایوسی ہوئی۔ وہ برآمدے میں پہنچی تو دو سفید میمنے بھاگتے ہوئے آئے اور اس کی ٹانگوں سے لپٹنے لگے۔ شانی نے بے خیالی میں ان کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ گئی۔ صحن میں مویشیوں کے لئے بڑی تیزی سے سبز چارہ کترا جا رہا تھا۔ خادم حسین گنا چوس رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کام کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ حویلی کے پھر آباد ہونے سے ہر کوئی خوش دکھائی دیتا تھا۔ شانی کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور ٹھٹک گئی۔ نشست گاہ میں تایا معصوم اور خالو اعجاز کے علاوہ بھی چھ سات بزرگ موجود تھے۔ یہ سب برادری کے لوگ تھے۔ کوئی رشتے میں شانی کا تایا تھا، کوئی چاچا۔ ایک سگے ماموں یعقوب بھی ان میں شامل تھے۔ ان کی بلند پگڑیاں اور کلف لگے ہوئے کپڑے ماحول

کو کچھ اور بھی سنجیدہ بلکہ سنگین بنا رہے تھے۔

''بیٹھ جاؤ دھی رانی۔'' تایا معصوم نے بھاری آواز میں کہا۔

شانی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بزرگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر شانی کے ماموں عمر رسیدہ چوہدری یعقوب نے کہنا شروع کیا۔ ''شانی پتر! بھائی ارشاد اور وڈی آپا کے بعد ہم سب پر تیری ذمے داری آتی ہے۔ ویسے تو تُو خود بہت سمجھ دار ہے اور اپنا اچھا بُرا سمجھتی ہے لیکن کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جو بزرگوں کو ہی طے کرنے پڑتے ہیں......''

تمہید نے شانی کو سمجھا دیا کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔ اس کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ اس کی چھٹی حس اسے کئی دنوں سے آگاہ کر رہی تھی کہ خاندان کی طرف سے اس پر بہت زیادہ دباؤ پڑنے والا ہے۔ یہ دباؤ اس کی شادی کی طرف سے تھا۔ ماموں یعقوب جب ایک لمبی تمہید باندھ چکے تو خالو اعجاز نے کہا۔ ''میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کروں گا۔ بس یہی کہوں گا شانی بیٹی، عادل اور سجاول کے بعد تُو اس حویلی کی اکیلی وارث ہے۔ تیرے کاندھوں پر بڑی بھاری ذمے داریاں آن پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک ذمے داری ہماری عزت کی حفاظت بھی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

تایا معصوم نے ساگوان کا بنا ہوا ایک پرانا خاندانی بکس کھولا اور اس میں سے سونے کا ایک بڑا ہار نکالا۔ اس میں کئی لڑیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سبز ہیروں کے علاوہ اس میں سونے کے بہت سے چھوٹے چھوٹے سکے بھی جڑے ہوئے تھے جو غالباً افغانی تھے۔ تایا معصوم نے کہا۔ ''خاندان کی پرانی روایت کے مطابق یہ ہار گھرانے کی وڈی نوہ (بڑی بہو) کو دیا جاتا ہے۔ اب وڈی یا چھوٹی کوئی نوہ موجود نہیں ہے اس لئے یہ ہار تیری طرف آئے گا اور اسے تُو پہنے گی۔ اس کا یوں اس ڈبے میں پڑا رہنا ایک بہت بُرا شگون ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ شگون ختم ہو جائے۔''

تایا معصوم نے ہار شانی کی طرف بڑھایا اور اس نے پکڑ لیا۔ ماموں یعقوب نے منقش حقے کی طویل نے کو منہ کو دباتے ہوئے کہا۔ ''اور شانی پتر، تُو اچھی طرح جانتی ہو گی کہ اس ہار کو پہننے کے لئے سہاگن ہونا بہت ضروری ہے۔''

شانی کو یوں لگا کہ یہ وزنی ہار ایک دم بہت ہی زیادہ وزنی ہو گیا ہے۔ اتنا وزنی کہ اسے سنبھالتے ہوئے اس کا پورا جسم کانپنے لگا ہے۔

ماموں یعقوب بولے۔ ''تُو بڑی سیانی دھی رانی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تجھے زیادہ سمجھانے بجھانے کی لوڑ نہیں ..... نہ ہی ہم نے ابھی کوئی رشتہ ڈھونڈا ہے.... نہ ہی ہم تجھے کسی

خاص جگہ پر شادی کے لئے مجبور کریں گے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ تیری شادی ہو جائے......اور یہ شادی ایسی ہو کہ تجھے حویلی سے جانا نہ پڑے۔''

شانی کا گلا خشک ہو گیا۔ برادری کے سب سے معزز افراد اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ہر کوئی اس کے لئے قابلِ صد احترام تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، بہت حد تک صحیح ہے...... لیکن......

اس ''لیکن'' سے آگے کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ روکیٹ بستی کے اس پھولوں سے لدے ہوئے خوبصورت مکان کا احوال یہاں اجمل، عارف، حاجی حیات اور ڈولے کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف یہی افراد جانتے تھے کہ شانی ایک سال پہلے رستم کی دلہن بن چکی ہے۔ ہار بدستور شانی کے ہاتھ میں تھا۔ اپنی اضطراری کیفیت میں شانی نے ہار کو زور سے بھینچا تو ایک نوک انگلی کی پور میں گھس گئی۔ خون کے قطرے ہتھیلی پر رینگنے لگے......

اس کے دل نے تڑپ کر کہا۔ ''کہاں ہو تم؟ دیکھو مجھے کس طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اب بھی نہ آؤ گے تو پھر کب آؤ گے؟ کہاں ہو تم؟......'' پھر جاں بلب راکب خان کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس بازگشت نے اسے سر تا پا پسینے میں نہلا دیا۔

☆======☆======☆

وہ اس جاں لیوا برف زار میں تھا۔ اس کی کوٹھڑی بہت ہی مختصر تھی۔ بس مشکل سے چھ ضرب چھ فٹ کی۔ وہ اس مختصر خلا میں ٹہل رہا تھا۔ تین قدم دائیں تین قدم بائیں...... پھر تین قدم دائیں...... پھر بائیں۔ اس کے اندر وہی اضطراب تھا جو قفس میں پھڑ پھڑانے والے شہباز کے اندر ہوتا ہے۔ وہ ان دیواروں کو توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر دینا چاہتا تھا مگر ارادہ بہت مضبوط ہونے کے باوجود عمل کی حد سے بہت دور تھا۔ یہ آہنی پنجرہ اسے کوئی راستہ نہیں دے رہا تھا۔

اس شام سردی معمول سے کچھ کم تھی۔ مختصر کوٹھڑی میں ٹہلتے ٹہلتے نہ جانے کیوں رستم کو بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آنے لگی۔ یہ شاید محمود بادشاہ اور مکڑے کی کہانی تھی۔ مکڑا ایک اندھے کنویں سے نکلنے کے لئے بار بار کوشش کرتا تھا اور کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی واپس تہہ میں گر جاتا تھا۔ مگر اس مکڑے نے ہمت نہ ہار کر بادشاہ کو ایک یادگار سبق دیا تھا۔

اچانک اس آہنی تختے پر ایک آہٹ ہوئی۔ یہ آہٹ خلاف توقع تھی۔ اس سے پہلے تو بس ایک چوکور خلا میں سے ایک ہاتھ اندر آتا تھا اور اسے کھانا پہنچا کر اوجھل ہو جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور لالٹین کی روشنی اس تاریک خلا میں داخل ہوئی۔ دو افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک مترجم واس تھا اور دوسرا گنجے سر والا ایک ادھیڑ عمر باؤنڈہ۔

مترجم واس نے رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد رستم کو بتایا۔ ”ان کا نام روات ہے۔ یہ ملک برق جان کے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تم سے چند سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔“ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔

روات نامی شخص نے رستم سے پوچھا۔ ”ہلاک ہونے والے محافظ پر گولی کس نے چلائی تھی اور زخمی ہونے والے کے سر پر الٹی کلہاڑی کی چوٹ لگانے والا کون تھا؟“

رستم کو فوراً واس کی ہدایت یاد آ گئی۔ پچھلی ملاقات میں واس نے اس کو بتایا تھا کہ ان تینوں کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ گولی چلانے کے سلسلے میں آنجہانی جانسن کا نام لے دیں۔

رستم نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”گولی جانسن نے چلائی تھی۔ دوسرے شخص پر میں نے گولی چلائی تھی لیکن وہ صرف زخمی ہوا۔“

”اور چوٹ کس نے لگائی تھی؟“ روات نے پوچھا۔

رستم کے بولنے سے پہلے ہی واس نے اسے آنکھوں سے اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں دوبارہ جانسن کا نام لے۔ رستم نے اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔

”جانسن سے تم تینوں کا رابطہ کیسے ہوا اور اس کارروائی کے لئے تم نے ہتھیار کہاں سے لئے؟“ روات نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

اس کا جواب رستم نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم نے جانسن سے نہیں، جانسن نے ہم سے رابطہ کیا تھا اور ہتھیاروں کے بارے میں شاید آپ بھول رہے ہیں۔ یہ ہمیں برق جان نے ہی دیئے تھے۔“

رستم کے اس جواب پر روات کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ”ملک برق جان نے یہ ہتھیار تمہیں فرار ہونے کے لئے نہیں دیئے تھے۔ اس لئے دیئے تھے کہ تم ہمارے شانے سے شانہ ملا کر شوتم خان کے ساتھیوں سے لڑو۔ تم نے عین وقت پر غداری کی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔“

رستم نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہماری یہاں کسی سے کوئی لڑائی نہیں۔ ہماری لڑائی صرف اپنی ”قید“ سے ہے۔ ہم یہاں بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہم اپنے بال بچوں میں واپس جانا چاہتے ہیں۔“

رستم کا جواب کافی سخت تھا۔ معلوم نہیں کہ مترجم واس نے اس میں کسی طرح کا ردوبدل کیا یا نہیں۔ بہرحال روات کے رویے میں کوئی منفی فرق نظر نہیں آیا۔

”کتوں کو گولی کس نے ماری؟“ روات نے واس کی وساطت سے پوچھا۔

”ایک کو جانسن نے، دوسرے کو ایک گولی جانسن کی اور دوسری میری لگی تھی۔“

”گارنی زری تمہارے ساتھ کیسے چل پڑی تھی۔ کیا تمہارا اسے ساتھ لے جانے کا منصوبہ پہلے سے تھا؟“ روات نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ آپ خود جانتے ہیں۔ وہ بالکل سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اسے بھلا کسی

منصوبے میں کیسے شریک کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم یہاں سے نکلے تو وہ ازخود ہمارے ساتھ چل پڑی اور چمٹ کر رہ گئی۔''

''تم کہتے ہو کہ وہ منصوبے کے بغیر تمہارے ساتھ تھی مگر اس کے پاس سے اس کا سامان برآمد ہوا ہے۔ کپڑے ہیں، اس کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ یہ انتظام کس نے کیا تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' رستم نے کہا۔

روات نے کن انکھیوں سے واس پر ایک نگاہ ڈالی۔ جیسے اس حوالے سے وہ اسے بھی مشکوک سمجھتا ہو۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں روات خان نے رستم سے کرید کرید کر سوالات کیے۔ رستم مناسب جواب دیتا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ شاید ناصر سے بھی سوال جواب ہو چکے ہوں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ناصر نے کن سوالوں کے کیا جواب دیئے ہیں۔ بہرحال گفتگو کے دوران میں ہی واس نے ہوشیاری سے رستم کی تسلی کر دی۔ روات کے ایک سوال کے دوران میں واس نے اپنی طرف سے بھی چند الفاظ فقرے میں جوڑ دیئے۔ اس نے رستم کو بتایا کہ ابھی ناصر سے پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ امید ہے کہ وہ اس پوچھ گچھ سے پہلے ہی ناصر سے مل لے گا اور اسے جوابات کے لئے تیار کر لے گا۔

روات خان اور واس کے جانے کے بعد رستم کو امید پیدا ہو گئی کہ شاید ایک دو دن میں اسے کوٹھڑی سے نکال لیا جائے گا۔ تاہم رستم کی رہائی اس کی توقع سے کہیں پہلے عمل میں آ گئی۔ یہ سب کچھ بڑے ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ رستم کے اندازے کے مطابق رات کے آٹھ نو ہی بجے ہوں گے۔ یکایک آہنی دروازے سے باہر بھاگتے قدموں کی آواز آئی پھر بڑی عجلت میں دروازہ کھولا گیا۔ واس کی گھبرائی ہوئی صورت دکھائی دی۔ اس کے عقب میں دو مسلح افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں روغن سے جلنے والی مشعل تھی۔

واس نے کہا۔'' رستم! تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''ابھی سب کچھ بتاتے ہیں۔'' واس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر ایک رائفل بردار سے مخاطب ہو کر ہدایت جاری کی۔ رائفل بردار تیزی سے رستم کے قریب آیا اور عجیب وضع کی لمبوتری چابی کی مدد سے رستم کی بیڑی کھول دی۔

رستم کو باہر لایا گیا۔ طویل گپھا سے نکلنے کے بعد وہ باہر کھلے آسمان کے نیچے آئے۔ آج

کئی ہفتے کے بعد رستم نے تاروں اور چاند کی روشنی دیکھی تھی اور اپنے اردگرد آزاد فضا کا بہاؤ محسوس کیا تھا۔ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی تھی مگر ہر شے انوکھی اور نئی لگ رہی تھی۔ موسم بہت سرد نہیں تھا اور ہوا بھی تھمی ہوئی تھی تاہم بستی کے طول و عرض میں ایک طرح کی ہلچل صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ تین چار گھڑ سوار پاؤنڈے بھاگتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر گئے۔ رستم نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے بچے اٹھائے افراتفری میں ایک جھونپڑے سے دوسرے میں منتقل ہو رہی تھیں۔ ''کہیں پھر تو لڑائی شروع نہیں ہو رہی؟'' رستم نے واس سے پوچھا۔

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، یہ اور طرح کی گڑبڑ ہے۔ تہوار کے موقع پر ریچھ کا کھیل بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک بڑا ریچھ منگوایا گیا تھا۔ یہ ریچھ ابھی تھوڑی دیر پہلے زنجیر تڑا کر بھاگ گیا ہے۔''

''کہاں گیا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہی سوال زیادہ اہم ہے۔'' واس نے جواب دیا۔'' وہ بدبخت سیدھا اس گودام میں گھسا ہے جہاں ہمارا ایمونیشن پڑا ہے۔ ڈائنامیٹ، گولیاں، دستی بم اور راکٹ لانچر بہت کچھ ہے۔ اب وہاں گولی بھی نہیں چلائی جاسکتی۔ کسی نہ کسی کو گودام کے اندر گھس کر ہی اسے پکڑنا یا مارنا ہوگا۔''

''اور اس ''مزیدار'' کام کے لئے تم لوگوں کو میں نظر آیا ہوں۔'' رستم نے طنز کیا۔

''تم یہ کام کر سکتے ہو رستم! اگر اگلے پندرہ بیس منٹ میں یہ کام نہ ہو سکا تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ ریچھ اندر دندناتا پھر رہا ہے۔ اس نے ایمونیشن والی کوئی پیٹی الٹا دی یا ڈائنامیٹ کی اسٹک کو چبا لیا تو پورا گودام دھماکے سے اڑ جائے گا اور ساتھ ہی آدھی سے زیادہ بستی بھی اڑ جائے گی۔ رستم تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہیں اس کا خاص تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر یہ مصیبت تم نے ٹال دی تو یقیناً ان کرو برق جان کے ساتھ تمہارے تعلقات بہت بہتر ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی سزا بھی معاف ہو جائے۔ یہ ایک سنہری موقع ملا ہے تمہیں۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ رستم۔''

''فائدہ تو تب اٹھاؤں گا جب وہاں سے زندہ بچنے کا کوئی امکان ہوگا۔'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ چلتے بھی جا رہے تھے۔ بستی میں تہوار کی آمد کے آثار واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے تھے۔ جھونپڑوں اور گھروندوں پر رنگوں سے نقش و نگار بنائے

گئے تھے۔ جا بجا رنگ برنگے جھنڈے اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ کہیں کہیں مقدس درخت آبوک کے خشک تنوں کو برف میں گاڑا گیا تھا اور درخت کی شاخوں پر لالٹینیں آویزاں کی گئی تھیں۔ ان لالٹینوں کی چمنیوں کو رنگ برنگ کاغذوں سے ڈھانپ کر روشنیوں کو دیدہ زیب بنایا گیا تھا۔ ایک جگہ رستم کو الپائن کے پھول نظر آئے اور اس کے ساتھ ہی اسے واس کی یہ بات بھی یاد آئی کہ تہوار کے موقع پر دس خوبصورت سہاگنیں، گرم پانی کے چشمے میں نہائیں گی اور مقدس آبوک پر الپائن کے پھول نچھاور کریں گی۔ یہ خوشی کے مناظر تھے مگر ان میں ایک منظر رستم کو بالکل جدا نظر آیا۔ اسے ایک گلی کے عین درمیان چند پاؤندہ عورتیں بین کرتی اور اپنا سینہ کوٹتی نظر آئیں۔ برف پر پڑی ہوئی ایک نوجوان کی لاش کو چارپائی پر ڈالا جا رہا تھا۔ اردگرد کی برف لہو رنگ ہو رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''مم... میرا خیال ہے کہ اسے بھی ریچھ نے... زخمی کیا ہے۔'' واس نے کہا۔

''زخمی کیا ہے؟ وہ تو مر چکا ہے۔ انتڑیاں باہر لٹک رہی ہیں۔'' رستم نے وضاحت کی۔

''شاید۔'' واس گڑبڑا کر رہ گیا۔

وہ لوگ گودام کے سامنے پہنچے۔ یہ تین چار بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ایک تکونی عمارت تھی۔ پتھریلی دیواروں پر آہنی سلاخوں والی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ گودام کا مین گیٹ بڑی بھاری بھر کم لکڑی کا تھا۔ گودام کے اردگرد بہت سے افراد جمع تھے۔ اکثر کے ہاتھوں میں لالٹینیں یا مشعلیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک بات ظاہر تھی۔ یہ لوگ گودام کے قریب جانے کا رسک نہیں لے رہے تھے۔ برق جان کے مسلح محافظ بھی... پی رائفلوں اور کلہاڑیوں کے ساتھ گودام کے گرد چکراتے پھر رہے تھے...... ان کے چکرانے میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔ گودام کے اندر بھی روشنی موجود تھی۔ یقیناً یہ لالٹینوں کی روشنی ہوگی۔ یہ بھی ایک خطرناک علامت تھی۔ اگر واس کے بقول جانور واقعی بپھرا ہوا تھا تو وہ کسی لالٹین کو نوچ کر بارود کے ڈھیر پر پھینک سکتا تھا اور تہوار سے پہلے ہی آتش بازی کے شاندار مظاہرے کا اہتمام کر سکتا تھا۔

اچانک ایک ہاتھ رستم کے کندھے پر آیا۔ رستم نے مڑ کر دیکھا۔ یہ برق جان تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور کچھ کہا۔ واس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ملک کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے لیکن اگر تم چاہو تو ہماری مدد کر سکتے ہو۔ ہم بستی کے گھروں کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس گولہ بارود کو بھی۔ فی الحال ہمیں اس

ایمونیشن کی سخت ضرورت ہے۔ یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو شوتم خان ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں یہ کام کروں گا۔'' رستم نے کہا۔ ''مجھے ہتھیار دے دیئے جائیں۔''

''آتشیں ہتھیار کا استعمال تو گودام کے اندر ہو ہی نہیں سکتا۔ تمہیں کلہاڑی وغیرہ دے دیتے ہیں۔'' واس نے کہا۔ ''تمہیں اس جانور سے نمٹنے کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ تم تو خالی ہاتھ بھی اسے زیر کرتے رہے ہو۔''

''کلہاڑی...... اور ایک چھرا... ذرا لمبے پھل والا۔'' رستم نے واس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

دو منٹ کے اندر اسے یہ دونوں چیزیں فراہم کر دی گئیں۔ برق جان نے ایک موٹی چرمی جیکٹ بھی رستم کو پہنا دی۔ ''جانور ہے کس جگہ؟'' رستم نے پوچھا۔

''میرے اندازے کے مطابق وہ پچھلے ہال نما کمرے میں چلا گیا ہے۔ دراصل محافظوں نے اسے ڈرانے کے لئے ہوائی فائرنگ کی۔ وہ باہر آنے کے بجائے مزید اندر گھس گیا۔ وہ خاصا بپھرا ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اندر سے ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔''

رستم نے چھوٹے دستے کی کلہاڑی ہاتھ میں لی۔ خنجر اپنی جیکٹ کے نیچے لگایا اور گودام میں گھسنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے احتیاطاً ایک پسٹل بھی فراہم کر دیا جاتا مگر برق جان وغیرہ اس کے لئے رضامند نہیں تھے۔

رستم ذرا لنگڑا کر چلتا ہوا گودام کے مین دروازے کی طرف بڑھا۔ فاصلے پر موجود لوگ دم بخود ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رستم نے اب تک زندگی میں بہت سے خطرات کا مقابلہ کیا تھا مگر ان خطرات کا تعلق عموماً انسانوں سے ہوتا تھا۔ لاہور اور پنڈی کے داداگیر، کراچی کے گینگسٹر، پنجاب اور سرحد کے مختلف علاقوں کے خونخوار پولیس آفیسر...... لیکن اب صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے انسانوں اور حیوانوں سے واسطہ پڑے گا۔ گودام کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد رستم کو صورتِ حال کی اصل سنگینی کا احساس ہوا۔ دہلیز پر ہی ایک محافظ کی خون آلود لاش نظر آئی۔ اس کے قریب ہی اس کی کلہاڑی اور ٹوٹی ہوئی ٹارچ موجود تھی۔ خونی جانور نے محافظ کی شہ رگ پر پنجہ مارا تھا اور گردن ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔

رستم گودام کے اندرونی حصے میں پہنچا تو ہر طرف اسلحہ نظر آیا۔ یہاں لکڑی کی بے شمار

چھوٹی بڑی پیٹیاں تھیں۔ گولیوں والی بیلٹس تھیں اور بھرے ہوئے رائفل میگزین، لکڑی کی شیلفوں پر ترتیب سے رکھے تھے۔ رستم محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ یہاں جانور کے چھپنے کے لئے بہت سی جگہیں ہوسکتی تھیں اور یہ پالتو جانور نہیں تھا۔ جنگلی تھا اور بہت خونخوار بھی۔ رستم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کھیل تماشوں میں استعمال ہونے والے جانوروں کو یہاں تاڑی کی طرح کا ایک نشہ پلایا جاتا ہے جس سے وہ بہت چوکس اور جارح ہوجاتے ہیں۔ شاید یہ جانور بھی کسی ایسے نشے کی ترنگ میں تھا۔

رستم محتاط قدموں سے تینوں کمروں میں گھوم گیا۔ مگر جانور دکھائی نہ دیا نہ کہیں اس کی آہٹ سنائی دی۔ تیسرا کمرہ بالکل تاریک تھا۔ یہاں رستم نے جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکال لی۔ وہ ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں گھمانے لگا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو اسے یہی محسوس ہوا کہ شاید اس گودام میں آنے جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے اور جانور وہاں سے نکل گیا ہے مگر پھر اچانک اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز لہر محسوس ہوئی۔ کوئی عقب میں تھا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ رستم تڑپ کر مڑا۔ خدا کی پناہ...... وہ ایک نہایت جسیم اور پھرتیلا جانور تھا۔ وہ کسی انسان کی طرح اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر رستم پر جھپٹا۔ رستم نے بائیں طرف حرکت کر کے خود کو نکیلے پنجوں سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی کلہاڑی کا وار کیا۔

کلہاڑی جسیم ریچھ کے کندھے پر لگی اور بالکل بے اثر رہی۔ یقیناً وہ موٹی کھال کا حیوان تھا۔ اس وار کے جواب میں ریچھ نے اتنی تیزی سے پنجہ گھمایا کہ رستم اپنی کلہاڑی نہ بچا سکا۔ پنجے میں اتنی طاقت تھی کہ چھوٹے دستے کی کلہاڑی رستم کے ہاتھ سے نکلی اور ہلکی پھلکی شے کی طرح اُڑتی ہوئی ایک دیوار سے جاٹکرائی۔ ریچھ کے کھیل میں رستم کو اب تک جو تجربہ ہوا تھا اس کا نچوڑ یہی تھا کہ جانور کی تھوتھنی سے اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اس کے اگلے دو پنجوں سے ہوتا ہے... درحقیقت یہی پنجے ریچھ کا سب سے کارگر ہتھیار ہوتے ہیں۔ رستم نے بڑی مہارت سے خود کو نصف منٹ تک ان پنجوں کی زد سے بچایا۔ اسی دوران میں وہ جیکٹ کے نیچے سے نو دس انچ کے پھل والا چھرا نکال چکا تھا۔ جانور اس ''موذی تبدیلی'' سے یکسر بے خبر تھا۔ وہ پھنکار رہا تھا اور رستم کو اپنے مہلک جپھے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ الٹے پاؤں پیچھے ہٹتے ہٹتے رستم نے اچانک خود کو روکا اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر چھرے کا طوفانی وار کیا۔ چھرا دستے تک ریچھ کے نرم پیٹ میں گھس گیا۔ پیٹ میں سے نکلنے والے گرم خون کی پہلی پچکاری رستم کو اپنے بازو اور کلائی پر محسوس ہوئی۔ ریچھ آگے کو جھکا اور اس کے جسم کی بے پناہ حیوانی بُو

رستم کے نتھنوں میں گھسی۔ یوں لگا کہ وہ اپنے بے شمار وزن کے ساتھ اس کے اوپر ہی آن گرے گا۔ رستم نے خود کو اس کی زد سے بچاتے ہوئے اپنے چھرے کو جانور کے پیٹ کے اندر ہی افقی حرکت دی اور اس کا شکم پھاڑ کر رکھ دیا۔ جانور منہ کے بل گرا اور ہولناک انداز میں تڑپنے پھڑکنے لگا۔ رستم نے پلٹ کر پے در پے کئی وار اس کے پہلو اور سینے پر کیے اور اس کے لہراتے پنجوں سے بچنے کے لئے تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ خونخوار جانور کے جسم سے خون کی کئی فوارے نکل پڑے تھے اور لکڑی کی پیٹیوں کو رنگین کر رہے تھے۔

رستم پانچ چھ قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ اس کے دل میں یہ ڈر بھی موجود تھا کہ کہیں جان بلب ریچھ کے تڑپنے پھڑکنے سے بارودی پیٹیاں فرش پر نہ آن گریں۔ خون آلود چھرا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ کارروائی نے زیادہ طول نہیں کھینچا تھا۔ اس کے باوجود رستم نے خود کو تھکا ہوا محسوس کیا۔ شاید کئی ہفتوں تک جاری رہنے والی قید تنہائی کی صعوبتوں نے اسے جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا۔

گودام کے باہر سے آنے والی آوازیں رستم کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ کچھ مسلح افراد سلاخ دار کھڑکیوں کے پاس بھی آگئے ہوں اور اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جسیم سفید ریچھ ٹھنڈا ہوگیا تھا...... اچانک...... رستم کو محسوس ہوا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ ابھی کچھ باقی ہے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے اردگرد کوئی اور جانور بھی موجود ہے۔

اسی دوران میں دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی اندر آرہا تھا۔ پھر رستم حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے زری کی آواز سنی۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آرہی تھی۔ ''تم کہاں ہو؟''

رستم نے ٹارچ کی روشنی اس کی طرف پھینکی۔ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے اونی لبادے میں تھی۔ اس کے لمبے بال دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ جیسے یہ کسی ریشمی جسیم والے جانور کے بال ہوں۔ وہ بھاگتی ہوئی رستم کی طرف آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

''تم نے کتنا ریچھ مارا؟'' اس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب؟ یہاں ایک ہی ریچھ تھا۔''

''نہیں نہیں۔ میں تم کو بتانے کے لئے آیا۔ یہاں ایک ریچھ نہیں یہاں دو تین ریچھ ہیں۔ یہ لوگ جھوٹ کہتا......''

یکایک رستم کو اندازہ ہوگیا کہ زری ٹھیک کہتی ہے۔ یہاں صرف ایک ریچھ نہیں تھا...... رستم کو اپنے بالکل سامنے تاریکی میں دو چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ بڑی قاتل آنکھیں تھیں۔ یہاں رستم کو آتشیں ہتھیار کی ضرورت تھی مگر آتشیں ہتھیار اس کے پاس

نہیں تھا۔اس نے زری کو دھکا دے کر خود سے دور پھینک دیا۔اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اس دوسرے Snow Bear کے سامنے آجائے۔رستم کا دھکا کھا کر زری جہاں گری تھی وہیں وہ کلہاڑی بھی موجود تھی جو تھوڑی دیر پہلے رستم کے ہاتھ سے نکلی تھی۔زری نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور پھر دلیرانہ انداز میں کلہاڑی تھام لی۔

''زری تم بھاگ جاؤ۔'' رستم زور سے چلایا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ''تم نے سنا نہیں۔کلہاڑی میری طرف پھینک دو اور نکل جاؤ یہاں سے۔میں اسے اکیلا سنبھال سکتا ہوں۔''

''میں نہیں جاتا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔اس کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔

سامنے تاریکی میں موجود جنگلی ریچھ نے گلے سے ایک غصیلی آواز نکالی اور رستم پر جھپٹا۔ اسے دیکھتے ہی رستم کو اندازہ ہو گیا کہ یہ نر ہے۔اس سے پہلے رستم کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی مادہ تھی۔نر زیادہ بھاری اور قد آور تھا۔وہ صاف طور پر نشے میں تھا۔وہ اپنے جسم کو تھل تھل حرکت دیتا ہوا تیر کی طرح رستم کی طرف آیا۔رستم نے خود کو اس کے اگلے پنجوں سے بچاتے ہوئے نیچے جھکایا اور پہلے والے انداز میں چھرے کا بھرپور وار کیا......اس مرتبہ یہ وار تھوڑا سا اوچھا پڑا۔ریچھ کے پیٹ کی نسبتاً نرم جلد میں لگنے کے بجائے یہ اس کے پہلو میں لگا۔چھرا چھ سات انچ تک جانور کے جسم میں اترنے کے بعد اس کے کولہے کی ہڈی میں کہیں پیوست ہو گیا۔جب زخم کھا کر جانور تڑپا تو چھرے کا دستہ رستم کے ہاتھ سے نکل گیا۔

یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔ریچھ زخمی ہو کر مزید مشتعل ہو گیا تھا اور رستم خالی ہاتھ تھا۔ریچھ نے رستم کو دبوچنے کی بھرپور کوشش کی۔رستم جانتا تھا کہ اس موقع پر وہ اس مشتعل جانور کے ہاتھ آ گیا تو وہ شاید اسے ململ کے کپڑے کی طرح پھاڑ کر رکھ دے۔یہی وقت تھا جب زری ایک چنگھاڑ کے ساتھ ریچھ پر حملہ آور ہوئی۔اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلہاڑی سے ریچھ کے منہ پر حملہ کیا۔ریچھ اس وقت تک رستم کو تقریباً دبوچ چکا تھا۔اپنی تھوتھنی پر دو چوٹیں کھانے کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور رستم کی موٹی چرمی جیکٹ کا سامنے والا حصہ ادھیڑتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

رستم نے نیچے جھکے جھکے جست کی اور ایک بار پھر ریچھ کے پہلو میں پھنسا ہوا چھرا اس کے جسم سے کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔چھرے کا پھل بُری طرح ہڈی میں دھنسا ہوا تھا۔رستم نے اپنے پاؤں سے ریچھ کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی اور اسے تھوڑا سا مزید پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

یہی وقت تھا جب اس گودام میں موجود تیسرے ریچھ نے عقب سے حملہ کیا۔وہ ایک دروازے کو توڑتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔زری ان لمحوں میں بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔وہ پلٹی اور اس نئے حملہ آور کا راستہ روک لیا۔وہ کلہاڑی سے دیوانہ وار اس پر پل پڑی۔سامنے والا ریچھ ایک بار پھر پھنکارتا ہوا رستم پر آیا۔کمرے کے اس حصے میں ایمونیشن کی بہت سی پیٹیاں پڑی تھیں۔رستم اس جگہ کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا گیا اور زینوں کی طرف آ گیا۔سفید ریچھ بگولے کی طرح اس کے پیچھے تھا... یا جیسے وہ کوئی برف کا تودہ ہو اور اپنی ساری ہلاکت آفرینی کے ساتھ اس کے پیچھے لڑھکتا چلا آ رہا ہو۔رستم الٹے قدموں زینے چڑھا تو ریچھ بھی وحشت سے خرخراتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔چھرا اس کے پہلو میں پیوست تھا اور اس کی ایک ٹانگ لہولہان نظر آ رہی تھی۔زینوں کی بلندی سے رستم نے زری کو دیکھا۔اس کے مقابل ایک چھوٹا ریچھ تھا۔وہ اپنی جسامت سے ریچھ کا نوجوان بچہ نظر آتا تھا۔زری کا اونی لبادہ پھٹ چکا تھا اور وہ بالکل عریاں تھی۔صرف اس کے گلے میں لبادے کی چند دھجیاں لٹکی رہ گئی تھیں جو اس کے پیٹ تک جھول رہی تھیں۔وہ کلہاڑی سے پے در پے ریچھ کو ضربیں لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی۔اس کے لمبے ریشمی بال ہیجانی انداز میں لہرا رہے تھے۔ریچھ پیچھے ہٹ رہا تھا۔رستم کو لگا جیسے قدیم زمانے کی کوئی جنگلی کی ہے جو اپنے غار سے باہر ایک درندے سے برسرِ پیکار ہے۔یہ سارا منظر شاید سیکنڈ کے پانچویں حصے میں رستم کی نگاہوں کے سامنے آیا اور اوجھل ہو گیا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے رستم کی نگاہ دیوار سے لٹکی ہوئی چند رائفلوں پر پڑی۔

''کیا وہ رائفل استعمال کر سکتا ہے؟'' اس نے سوچا۔

خونخوار جانور کے ہاتھوں بے موت مرنے سے بہتر تھا کہ رائفل استعمال کر لی جائے۔ضروری تو نہیں تھا کہ ایک گولی چلتے ہی یہ سارا گودام دھماکوں سے اُڑ جائے۔اگر یہ زخمی جانور نہ مارا جاتا تو بھی یہ گودام شدید خطرے میں تھا۔پھر رستم کی نگاہ میں ایک اور شے آئی۔رائفلوں میں سے ایک رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔رستم نے ہاتھ بڑھا کر یہ رائفل کھینچ لی۔ریچھ بہت قریب آ گیا تھا۔اس کی سرخ قاتل آنکھیں کسی عفریت کی آنکھیں تھیں۔اس کے جسم سے دو طرح کی بُو اٹھ رہی تھی۔ایک تو اس کی اپنی حیوانی بُو تھی، دوسری بُو اس تاڑی جیسے نشے کی تھی جو یہاں علاج معالجے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ریچھ نے رستم پر حملہ کرنے کے لئے اپنا منہ کھولا۔اس کا سرخ تالو اور اس کے مہلک دانت رستم کی آنکھوں سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر تھے۔جانور کے منہ کے اندر لیس دار مادے کے تار تک رستم کو صاف نظر آ رہے

تھے۔ اس نے سنگین کا بھرپور وار کیا۔ سنگین جانور کے دانتوں سے ٹکراتی ہوئی اس کے تالو میں لگی اور کھوپڑی کے اندر تک گھس گئی۔ وہ بے پناہ کرب سے چیخا اور پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے پیچھے قریباً ایک درجن سیڑھیاں تھیں۔ وہ لڑھکتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

رستم سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا اور تڑپتے ہوئے ریچھ کے اوپر سے جست کر کے زری کی مدد کے لئے لپکا۔ لیکن اس وقت تک ...... زری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مدِمقابل ریچھ کو بھاگنے پر مجبور کر چکی تھی۔ رستم نے اس چھوٹے ریچھ کی صرف پشت دیکھی۔ وہ گودام کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ زری چند قدم اس کے پیچھے گئی اور پھر رک گئی۔

چند سیکنڈ بعد باہر سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔ یقیناً انہوں نے لہولہان تھوتھنی والے ریچھ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ذرا دیر بعد اوپر تلے تین فائر سنائی دیئے۔ یقینی بات تھی کہ یہ فائر ریچھ کو مارنے کے لئے ہی کئے گئے تھے۔

زری بھاگ کر آئی اور رستم سے لپٹ گئی۔ وہ عجیب انداز سے بار بار اس کا سینہ چومنے لگی۔ اس انداز میں معصومیت نمایاں تھی۔ چند لمحوں بعد وہ پیچھے ہٹی...... اور یہی وقت تھا جب اسے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اس کے سپید گالوں پر شفق کا رنگ پھیل گیا۔ ایک لمحے کے لئے جیسے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ کیا کرے۔ پھر اس نے آسان ترین راستہ اختیار کیا۔ وہ دوبارہ رستم سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ بھی رستم کی پھٹی ہوئی جیکٹ میں گھسا لیا تھا۔

''کیا کر رہی ہو زری پیچھے ہٹو۔''

وہ خاموش رہی۔ رستم نے پھر اسے ٹہوکا دیا۔ ''زری پیچھے ہٹو۔''

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں...... میرے اوپر کپڑے نہیں۔''

''تو اس طرح تم کو کپڑے مل جائیں گے؟'' رستم کے لہجے میں شپٹاہٹ تھی۔

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ اور بھی رستم کے اندر گھس گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی لیکن ایسا کسی رومانی کیفیت کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ ریچھ سے پنجہ آزمائی کا نتیجہ تھا۔ رستم خود بھی ہانپ رہا تھا۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر سب سے پہلے ہلاک ہونے والے ریچھ کی لاش پڑی تھی۔

''زری! چلو چھوڑو مجھے۔ میں تمہیں کوئی کپڑا دیتا ہوں۔'' رستم نے اسے پچکارا۔

ایک لمحے کے لئے اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی لیکن پھر سخت ہو گئی ...... جیسے وہ رستم کے جسم کا پردہ کھونا نہ چاہتی ہو۔

رستم سمجھ گیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔ وہ اسے اسی طرح اپنے ساتھ لیتا ہوا دائیں طرف

بڑھا۔ یہاں فرش پر زری کا پھٹا ہوا اونی لبادہ پڑا تھا۔ رستم نے اپنے پاؤں سے یہ لبادہ اٹھایا اور زری کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ رستم سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کے گال اب بھی سیب کی طرح سرخ تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

''مدد کرنے کا بہت شکریہ زری۔'' رستم نے کہا۔

''تم بہت آچھا۔'' اس نے اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا۔

''تم اندر کیسے آئیں؟''

''بس میں آ گیا۔ مجھ کو کھڑکی نظر آیا۔''

اسی دوران باہر سے لوگوں کا شور سنائی دینے لگا۔ لوگ گودام کے مین گیٹ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پھر واس کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''رستم! تم ٹھیک ہوناں؟''

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا اور زری کے ہمراہ باہر آ گیا۔ اس کی جیکٹ اس کے جسم پر چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہی تھی۔ پشت پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ ریچھوں سے نبرد آزمائی کے دوران میں اس کی پیشانی اور رخسار سے کھال چھل گئی تھی۔ پتا نہیں یہاں کیا لگا تھا۔ شاید اس کا چہرہ کھردری دیوار سے جا ٹکرایا تھا...... وہ باہر نکلا تو بہت سے لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں برق جان بھی پیش پیش تھا۔ واس نے رستم نے پوچھا۔

''کیا اندر کوئی اور ریچھ بھی تھا؟''

''انجان مت بنو واس! تم سب جانتے ہو۔ اندر تین جانور تھے اور تم لوگوں نے مجھے صرف ایک کا بتایا۔ مجھے اندر بھیج کر تم لوگ تماشا دیکھتے رہے۔ اگر یہ لڑکی اندر گھس کر مدد نہ کرتی تو شاید میں زندہ باہر نہیں آتا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو رستم؟ اندر صرف ایک جانور تھا جسے ابھی لوگوں نے مار دیا ہے۔'' واس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اور اندر جو دو بڑے ریچھوں کی لاشیں پڑی ہیں، وہ شاید جن بھوت ہوں گے۔'' رستم کے لہجے میں شدید طنز تھا۔

واس نے تعجب سے برق جان کی طرف دیکھا اور مقامی زبان میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ برق جان کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔ برق جان نے گودام کی طرف قدم بڑھائے۔ کچھ اور لوگ بھی برق جان کے ہم قدم ہو گئے۔ یہ سب مسلح تھے۔ واس اور رستم بھی ہمراہ تھے۔ اندر پہنچ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ گودام سے باہر مارا جانے والا ریچھ چھوٹا تھا۔ اندر دو جسیم ریچھوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس جگہ کا نقشہ گواہی دے رہا تھا کہ

یہاں رستم نے شدید جدوجہد کی ہے۔ اس نے نہ صرف بدمست جانوروں سے خونی لڑائی لڑی تھی بلکہ انہیں ایسی جگہوں سے بھی دور رکھا تھا جہاں بارود کے پھٹنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔

برق جان کے حکم پر ایک بڑے چہرے والے لحیم شحیم شخص کو موقع پر لایا گیا۔ اس کا ایک بازو تازہ تازہ زخمی ہوا تھا اور اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ برق جان کے سامنے پہنچ کر یہ شخص کچھ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ رستم اس شخص کو جانتا تھا۔ اس کا نام بیش خان تھا۔ بیش خان کو بیشو بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ان جانوروں کا رکھوالا تھا جنہیں یہاں کھیل تماشوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے سفید ریچھوں کی نگہبانی اس کے ذمے تھی۔ برق جان اور بیشو کے درمیان مکالمہ ہوا۔

اس مکالمے کے بعد برق جان کافی تپا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے بیشو کو بُری طرح جھڑکا اور وہاں سے دفع ہو جانے کا کہا۔ اس کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور رستم کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے اکلوتے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپکا اور چند الفاظ کہے۔

واس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ملک تمہارا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ تمہاری دلیری و مہارت سے متاثر ہیں۔'' رستم اب خود بھی مقامی زبان کے کافی الفاظ سمجھنے لگا تھا۔ اس کی یہ صلاحیت ناصر سے بھی بہتر تھی۔

برق جان اپنے چار پانچ مسلح محافظوں کے ساتھ گودام کے مختلف حصوں میں چکرانے لگا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی اور جانور الگ تھلگ حصے میں تو موجود نہیں۔ رستم نے واس سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا تماشا تھا۔ یہ جانور یہاں کیسے آئے اور جھوٹ کیوں بولا گیا؟''

واس نے کہا۔ ''پہلی غلطی تو بیشو کی ہے۔ کل کے ایک کھیل کے لئے پانچ ریچھ علیحدہ سے بند کئے گئے تھے۔ انہیں مسلسل بھوکا رکھا گیا تھا۔ ان کی کارکردگی دیکھنے کے لئے بیشو نے شام سے ذرا پہلے انہیں نشہ بھی پلایا تھا۔ ایسی حالت میں اسے جانوروں کا زیادہ دھیان رکھنا چاہیے تھا مگر وہ سو گیا۔ بدمست جانوروں نے باڑے کا دروازہ ہلا ہلا کر اس کا آہنی کھٹکا ٹیڑھا کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ آہٹیں سن کر بیشو جاگ گیا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ اس کے دروازہ بند کرتے کرتے تین جانور باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں روکنے کی کوشش میں بیشو خان کا بازو بھی زخمی ہوا ہے۔ جانور بھاگ کر سیدھے اس گودام میں گھس گئے۔ یہاں گودام کا نگران بھی مارا گیا ہے۔''

''لیکن بیشو خان نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''جھوٹ بیشو نے نہیں، کسی اور نے بولا۔''

''کس نے؟''

''تمہارے رقیب نے ''نے مان'' نے۔'' واس نے ذرا ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ''ریچھ جب باڑے سے نکل کر پچاس ساٹھ گز دور گودام میں گھس گئے تو بیشو خان بھاگا ہوا ''نے مان'' کے پاس پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ ''نے مان'' خالی ہاتھ بدمست ریچھوں سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس نے ''نے مان'' کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو ''نے مان'' کی دلیری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے وہی کیا جو اس جیسے دشمن کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی جگہ تمہیں پھنسایا اور اس کے لئے اپنے دوست بیشو کو استعمال کیا۔ وہ خود تو موقع سے کھسک گیا اور بیشو کو برق جان کی طرف بھیج دیا۔ بیشو نے برق جان کو باقی تو سب کچھ بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ گودام میں ریچھوں کی تعداد کتنی ہے۔ بیشو ابھی مان تو نہیں رہا لیکن یقینی بات ہے کہ ایسا اس نے ''نے مان'' کے کہنے پر ہی کیا ہے۔''

''بیشو کیا کہہ رہا ہے؟ کیا اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ باڑے سے کتنے جانور بھاگے تھے؟''

''وہ کہتا ہے کہ بھاگے تو تین ہی تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ گودام میں صرف ایک گھسا ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے ''نے مان'' کے کہنے پر ایسا کیا ہے۔ ملک برق جان نے اسے آٹھ پہر کی مہلت دی ہے کہ اس دوران وہ سچ بول دے ورنہ اس سے سچ اگلوایا جائے گا۔''

اسی دوران میں برق جان کے مسلح محافظ آہنی بیڑی کے ساتھ آن موجود ہوئے۔ اس معاملے میں یہ لوگ بہت سخت تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے برق جان نے رستم کو شاباش دی تھی اور اس نے کام بھی یقیناً ایسا ہی کیا تھا جو تعریف و تحسین کے لائق تھا لیکن آہنی بیڑی ایک اٹل حقیقت کی طرح اپنی جگہ موجود رہی تھی۔

رستم کی پھنسی ہوئی جیکٹ اُتار کر اسے دوسری صدری پہنا دی گئی۔ گودام کے دروازے پر ہلاک ہونے والے چوکیدار کی لاش موقع سے ہٹا لی گئی تھی تاہم وہاں ابھی تک خون کے نمایاں دھبے موجود تھے۔ دو پاؤندے پانی لے کر آئے اور ان دھبوں کو دھونے میں مصروف ہو گئے۔ تماشائی رستم کو دیکھنے کے لئے اُمڈے پڑ رہے تھے۔ درحقیقت رستم اور کسی حد تک زری کی دلیری نے بستی کو ایک بڑی تباہی سے بچا لیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیکھنے والے اسے احسان مندی کی نگاہ سے دیکھتے مگر ان کی نگاہوں میں فقط تماشائیوں والی دلچسپی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ ان کا یہ انداز رستم کو سخت ناگوار محسوس ہوتا تھا۔

''زری کہاں ہے؟'' رستم نے واس سے پوچھا۔

''اسے مجاریوں کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔اب شاید......''

''رک کیوں گئے؟'' رستم نے استفسار کیا۔

''اب شاید تم اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے۔اسے سخت نگرانی میں رکھا جائے گا۔ ویسے بھی اب تہوار میں تین چار دن ہی رہ گئے ہیں۔'' داس کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے ....''

''ہاں۔ یہاں کے طور طریقوں کے مطابق زری نے حد سے تجاوز کیا ہے.... اور یہ دوسری مرتبہ ہوا ہے۔ پہلے وہ تم لوگوں کے ساتھ اس وقت پکڑی گئی جب تم فرار کی کوشش میں تھے۔ دوسری مرتبہ وہ اب تمہارے پیچھے گودام میں داخل ہوگئی اور اپنے لئے سخت خطرہ مول لیا۔ مجھے یقین ہے، اب وہ خاص نگرانی میں رہے گی اور بھینٹ چڑھنے تک اسے بند رکھا جائے گا۔''

☆======☆======☆

کچھ دیر بعد رستم کو دوبارہ اس کے پہلے والے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔رستم کے دل میں اندیشہ تھا کہ شاید اسے پھر سے سرنگ والے بندی خانے میں پہنچا دیا جائے گا جہاں وہ اس سے پہلے دس پندرہ دیگر بردوں (قیدیوں) کے ساتھ رہتا تھا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ رستم کو واپس داس کے گھر ہی پہنچایا گیا۔اس سے پہلے رستم، ناصر اور شریف وغیرہ داس کے گھر سے ہی فرار ہوئے تھے تاہم اس حوالے سے داس پر کسی طرح کا الزام نہیں آیا تھا۔اس وقت جنگ کی حالت تھی، کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔داس نے مؤقف اختیار کی تھا کہ اسے علم ہی نہیں، وہ لوگ کب لڑائی کے میدان سے کھسکے اور ٹاپو کے کنارے پر پہنچے تھے۔تب جنگ کی وجہ سے ان تینوں کی بیڑیاں خود برق جان کے خاص کارندوں نے کھولی تھیں اور انہیں ہتھیار بھی فراہم کئے تھے۔

داس کے گھر میں داس کی بیوی رستم سے ملی اور اس کا شانہ تھپکا۔اس کی آنکھوں میں حزن و ملال کی کیفیت تھی۔ نہ جانے اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ رستم اور اس کے ساتھی اس برفیلے جہنم سے نکلنے میں کامیاب رہیں مگر ابھی شاید دعاؤں کی قبولیت کا وقت نہیں تھا۔ رستم پھر اس چار دیواری میں تھا۔ ناصر قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا تھا اور شریف تا حال صاحبِ فراش تھا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' داس کی بیوی خانم نے رستم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تاسف سے کہا۔'' مجھے اس انگریز لڑکی کی موت کا بھی بہت دکھ ہے۔'' انگریز لڑکی سے خانم کی

مراد مالینا تھی۔

داس کی بیوی نے رستم سے ان واقعات کی تفصیل پوچھی۔ رستم نے مختصر الفاظ میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ واقعات بیان کرتے ہوئے وہ خود بھی آزاد ہوگیا۔ اب تو کبھی کبھی رستم کو لگتا تھا کہ شاید وہ یہاں سے کبھی نکل نہیں پائیں گے۔ ان بے رحم برفوں میں ہی چکرا چکرا کر ختم ہو جائیں گے۔

اگلی شام کو کھانے کے بعد رستم اور داس نے افغانی قہوے کی پیالیاں سامنے رکھیں اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔ رستم کے چہرے کی رستی ہوئی خراشوں پر خانم نے اپنے ہاتھ سے پٹی باندھ دی تھی۔ اس کے باوجود خون کا رساؤ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے باہر تہوار کی آمد کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا. گلیوں میں بچوں کی چہکاریں تھیں۔ رنگ برنگی لالٹینیں چکراتی پھرتی تھیں۔ گاہے بہ گاہے مقامی موسیقی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

رستم کا سارا دھیان زری کی طرف تھا۔ اس کو دو دوسری گارنیوں کے ساتھ صرف چار روز بعد بھینٹ چڑھا دیا جانا تھا۔ کیا وہ کسی طرح اسے بچا سکتا ہے؟ رستم نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' داس نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

''تمہاری بھتیجی زری کے بارے میں...... کیا اس کے لئے کچھ کیا نہیں جا سکتا؟''

''جو کچھ کر سکتے تھے وہ تو کیا ہے...... تم ا[illegible] نے اسے اپنے ساتھ یہاں سے نکالنے کی کوشش کی مگر قدرت کو منظور نہیں تھا۔''

رستم نے پُر سوچ انداز میں کہا۔'' میں نے ایک دن تم سے پوچھا تھا کہ وہاں گورے کے بنگلے میں جہاں درجن بھر دوسرے افراد کو آبوک کے نام پر ذبح کر دیا گیا، وہاں مالینا کو زمین پر گرانے اور اس کی گردن پر کلہاڑی رکھنے کے باوجود اسے معاف کیوں کر دیا گیا۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ کھینچا تانی میں زخمی ہوگئی تھی اور زخمی کو بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' داس نے پوچھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ زری کسی وجہ سے زخمی ہو جائے اور وہ بھینٹ چڑھنے سے بچ جائے۔''

داس اداسی سے مسکرایا۔'' کل گودام میں تمہاری مدد کرتے ہوئے وہ تھوڑی بہت زخمی تو ہوئی تھی لیکن اس کی جان بخشی کا کوئی سوال پید[illegible]۔ دراصل یہ معاملہ اتنا آسان نہیں

جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ایک گناہ گار کو بھینٹ چڑھائے جانے کا اور طریقہ ہے۔ ایک گارنی کو قربان کرنے کا اور قانون قاعدہ ہے۔"

"اس میں کیا نئی سائنس رکھی گئی ہے؟" رستم کا لہجہ سخت طنزیہ تھا۔

"گارنی کو تہوار کے موقع پر طے شدہ وقت کے مطابق ہر صورت بھینٹ چڑھنا ہوتا ہے۔ زخمی ہو کر، بیمار ہو کر یا قریب المرگ ہو کر بھی وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ صرف اور صرف ایک صورت میں گارنی بھینٹ چڑھنے سے بچ سکتی ہے۔ اور وہ صورت یہ ہے کہ وہ باکرہ نہ ہو۔ گارنی کا کنوارہ پن اس کے بھینٹ چڑھائے جانے کی لازمی ترین شرط سمجھا جاتا ہے۔ اس پاؤندہ قبیلے میں بیس پچیس صدیوں سے یہ اصول چلا آ رہا ہے۔ بھینٹ کے کئی اصولوں میں تھوڑا بہت ردوبدل ہوا ہے مگر یہ اصول اٹل رہا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ اب گارنی لڑکیوں کو سرِعام بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔ قدیم دور کی طرح انہیں قتل کرنے سے پہلے بے لباس بھی نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ انہیں قتل کرنے سے پہلے نشہ آور مشروب پلا دیا جاتا ہے۔ یہ مشروب آبوک کی جڑوں سے تیار ہوتا ہے۔ بھینٹ چڑھنے والی لڑکیاں اس مشروب کے زیر اثر نیم بے ہوشی کے عالم میں ذبح ہو جاتی ہیں۔"

رستم کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ لالٹین کی روشنی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ "تم کہتے ہو واس کہ اگر گارنی کی زندگی میں کوئی مرد داخل ہو جائے تو وہ بھینٹ چڑھنے سے بچ جاتی ہے۔ اس بات کا پتا کیونکر چلتا ہے کہ اس کی زندگی میں واقعی کوئی مرد آیا ہے...... اور اب وہ دوشیزہ نہیں ہے۔"

"اول تو یہاں ایسا ہوتا ہی نہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ گارنی لڑکیاں یہاں کھلے بندوں پھرتی ہیں اور لوگوں کے گھروں تک میں آزادانہ گھس جاتی ہیں۔ قبیلے کے مردان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کچھ مذہبی عقیدت کی وجہ سے بھی ان لڑکیوں سے دور رہتے ہوں گے مگر زیادہ تر لوگوں کو ان نہایت کڑی سزاؤں کا خوف رہتا ہے جو اس جرم کی پاداش میں رکھی گئی ہیں...... بہرحال گزرے برسوں میں ایسے اِکا دُکا واقعات ہوئے بھی ہیں۔ ایسی صورت میں عموماً گارنی خود ہی مجاریوں کو بتا دیتی ہے کہ اس کے ساتھ ایسا واقعہ ہو گیا ہے اور وہ نہ بھی بتائے تو مجاریوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے بڑی مجاری جسے مجاریوں کی سردار بھی کہا جاتا ہے، بہت خاص نگاہ رکھتی ہے۔ مقامی لوگوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ بڑی ماں یعنی بڑی مجاری صرف لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر بتا سکتی ہے کہ وہ بیاہتا ہے، حاملہ ہے، یا کنواری ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ان معاملات میں یہ مجاری عورتیں حیران کن صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کئی معاملوں میں ان عورتوں کا تجربہ اعلیٰ درجے کی گائنا کالوجسٹ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ یہ عورتیں زچگی کے ایسے ایسے کیسوں سے بخوبی نمٹ لیتی ہیں جن کے بارے میں سوچ کر دل کانپ جاتا ہے۔ یہ سینکڑوں سال سے نسل در نسل چلنے والی مہارت ہے جو جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ تم خود سوچو، صرف چہرہ دیکھ کر کسی عورت کے بیاہتا یا نابیاہتا ہونے کا اندازہ لگا لینا کوئی معمولی بات ہے؟"

رستم کی متاثرہ ٹانگ میں درد کی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ٹانگ کو سردی سے بچانے کے لئے اسے ایک لحاف میں لپیٹا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جو گارنی بھینٹ چڑھنے سے پہلے اپنی دوشیزگی کھو دیتی ہے، اس کا کیا بنتا ہے؟"

"عام طور پر اسے بے قصور ہی سمجھا جاتا ہے۔ سارا نزلہ اس مرد پر گرتا ہے جو اس کے ساتھ ملوث پایا جاتا ہے۔ اس شخص یا اشخاص کی کم از کم سزا زندہ جلایا جانا ہے۔"

"یعنی گارنی زندہ رہتی ہے؟"

"ہاں...... زندہ رہتی ہے مگر اس کے ساتھ ایک طرح کی نحوست ضرور وابستہ کر دی جاتی ہے۔ اس کے سر کے بال اور بھنویں مونڈ دی جاتی ہیں۔ اس کے گلے میں لوہے کا ایک کڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ تنہا زندگی بسر کرتی ہے۔ روکھا سوکھا کھاتی ہے۔ عام طور پر اس سے کوئی نیچ کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً کتوں کی رکھوالی، اصطبل کی صفائی وغیرہ۔ ایک ایسی عمر رسیدہ گارنی اب بھی بستی میں موجود ہے۔ وہ قبرستان میں رہتی ہے اور قبروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ واس کی بیوی نے جا کر دروازہ کھولا۔ رستم چونک گیا۔ برق جان کے دو ذاتی محافظ اندر داخل ہوئے۔ وہ سمور کی صدریوں میں تھے۔ رواج کے مطابق کمر سے چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک محافظ کے ہاتھ میں تانبے کا ایک مستطیل طشت تھا۔ اس کو ایک سنہری خوان پوش سے ڈھانپا گیا تھا۔

محافظ نے اپنی زبان میں رسمی کلمات ادا کئے اور طشت رستم کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ واس سے چند فقروں کا تبادلہ کر کے محافظ واپس چلے گئے۔ واس نے خوان پوش ہٹایا۔ طشت میں کسی دھات کا بنا ہوا ایک نہایت خوبصورت جام تھا اور اس میں ہلکے سرخ رنگ کا ایک مشروب ہلکورے لے رہا تھا۔ جام کی بیرونی سطح پر جڑے ہوئے قیمتی پتھر لالٹین کی روشنی میں جگمگانے لگے۔

''یہ کیا ہے؟'' رستم نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری صحت کا جام! برق جان نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔''

''کس خوشی میں؟''

''تہوار کی خوشی میں۔ شاید تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا، اس قبیلے میں جہاں بہت سی برائیاں اور خرافات ہیں، وہاں کچھ اچھی باتیں بھی ہیں۔ اس بستی میں ہر قسم کا نشہ ممنوع ہے...... اور نشہ کرنے والے کے لئے باقاعدہ سزا بھی ہے لیکن سال میں صرف ایک بار ''روشنیوں کے تہوار'' کے موقع پر یہ نشہ آور مشروب محدود مقدار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے مذہبی رسم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مشروب تہوار سے دو دن پہلے بس آج اور کل پیا جائے گا۔''

''کہیں یہ وہی مشروب تو نہیں جو آبوک کی جڑوں سے بنتا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''ہاں۔ درخت کی جڑوں کو پانی میں بھگو کر اور اس میں شکر ڈال کر خمیر اٹھایا جاتا ہے۔ اس کا نشہ بہت تیز تو نہیں ہوتا...... مگر ہوتا ہے۔''

''یہ وہی مشروب تو نہیں ہوگا جو گارنیوں کو بھینٹ چڑھانے سے پہلے پلایا جاتا ہے؟''

''ہاں، یہ وہی ہے۔''

''کہیں مجھے بھی اگلے جہان میں پہنچانے کا ارادہ تو نہیں بن گیا؟'' رستم نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''نہیں، نہیں...... کیسی بات کر رہے ہو۔'' واس مسکرایا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ برق جان تمہیں کسی بھی موقع پر اور کسی بھی وجہ سے قتل کرنا چاہے گا۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ بہت حوصلہ افزاء ہے۔ میرا اندازہ ہے...... اور پختہ اندازہ ہے کہ برق جان اور اس کے قریبی ساتھی تمہیں ہر قیمت پر زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ......'' واس کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''کیا لگتا ہے؟''

''لگتا ہے کہ برق جان تم سے کوئی بہت خاص کام لینا چاہتا ہے۔ میں اس کام کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر یہ بات طے ہے رستم! اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہاری زندگی کے لئے کسی بھی صورت میں خطرہ نہیں بنے گا۔''

''مجھے تمہارے یقین پر حیرانی ہو رہی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''لیکن مجھے کوئی حیرانی نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں برق جان کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' واس نے چند لمحے توقف کر کے اپنی گڑگڑی سے کش کھینچا اور جگمگاتے جام کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری بات کا ایک ثبوت یہ جام بھی ہے جس میں تمہیں مشروب بھیجا گیا ہے۔ قبیلے کا ملک اس جام میں اپنے خاص الخاص مہمان یا دوست کو ہی مشروب یا دودھ وغیرہ بھیجتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے فرار کی ناکام کوشش کر کے برق جان کی نظروں میں جو مقام کھویا تھا، وہ پھر حاصل کر لیا ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نقصان کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

رستم نے جام کو سونگھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ ''کیا بات ہے...... تم اسے پیو گے نہیں؟'' واس نے پوچھا۔

''نہیں...... یہ شراب ہے۔''

''تم شراب نہیں پیتے؟'' واس کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رستم اور ناصر ایک بہت بڑے ''ڈکیت گروہ'' میں شامل تھے اور ہر قسم کے جرائم کی دلدل میں دھنسے رہے ہیں۔

رستم نے ایک طویل سانس لے کر اپنے لمبے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینکا۔ ''بہت پیتا تھا بلکہ رات دن اس میں غرق رہتا تھا۔ شراب اور عورت کا میری زندگی میں بہت عمل دخل تھا مگر اب کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں...... کسی نے مجھے سر سے پاؤں تک بدل دیا ہے۔''

''وہ کون ہے رستم؟'' واس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''میں ہر وقت تمہارے اردگرد اس کی پرچھائیاں محسوس کرتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے لگتا ہے کہ بہت زور آور ہے۔ تمہیں بے پناہ کشش سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تم جس طرح بار بار یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہو، یہ حیران کن ہے۔''

''کسی وقت بتاؤں گا تمہیں۔ اب سو جاؤ۔'' رستم نے کہا اور سنہری جام کا سرخی مائل محلول انگیٹھی کی راکھ میں انڈیل دیا۔

کھڑکی سے باہر ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ خوش باشوں کی ٹولیاں گلیوں میں گھوم رہی تھیں۔ کچھ لوگ مستی کے عالم میں تھے اور کورس کی شکل میں کوئی قدیم گیت گا رہے تھے۔ گاہے بگاہے ہوائی فائر بھی سنائی دے جاتا تھا۔ رستم کے سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ آنکھوں میں بے چینی تھی۔ جبر اور ناانصافی کے خلاف لڑتے لڑتے وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اب جبر ہوتے دیکھنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسی لہر چلنے لگی تھی جو کسی مصلحت کو خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔

موسم اب کافی تبدیل ہوگیا تھا۔ ہوا میں سردی کی وہ بے پناہ کاٹ باقی نہیں رہی تھی۔ رات کو دیر تک رستم روشنیوں کے تہوار اور زری کی اندوہناک موت کے بارے میں سوچتا رہا پھر سوگیا۔

صبح ایک اچھی خبر اس کی منتظر تھی۔ ناصر بھی رہا ہو کر واس کے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے اور دیر تک بغل گیر رہے۔ ناصر کے پاؤں میں بھی منحوس بیڑی کھڑکھڑا رہی تھی۔ وہی بیڑی جو قیدی کے عضو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔ ''یہ آپ کے چہرے کو کیا ہوا؟'' ناصر نے میلی کچیلی پٹی دیکھتے ہوئے کہا۔

رستم نے اسے گودام والے واقعے کی تفصیل بتائی۔ ریچھوں کی تعداد کے حوالے سے ''نے مان'' کے خباثت بھرے جھوٹ نے ناصر کو بہت مشتعل کیا۔ وہ بولا۔ ''رستم بھائی! عنقریب یہ شخص میرے ہاتھ قتل ہونے جا رہا ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ بس میرے اور اس کے آمنے سامنے آنے کی دیر ہے۔ اب وہ حرام زادہ ہے کہاں؟''

''برق جان نے اس سے ہتھیار وغیرہ لے لئے ہیں کیونکہ ریچھوں کے رکھوالے بیشو خان نے اس کے خلاف بیان دے دیا ہے۔ اب وہ اپنے گھر میں ہی نظر بند ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے خلاف کوئی مناسب ہی کارروائی ہوگی۔'' واس نے کہا۔

''برق جان نے کارروائی کرنی ہوتی تو اسی وقت کرتا جب اس کتے نے رستم بھائی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔'' ناصر کے لہجے میں آگ تھی۔

''تم بھول رہے ہو۔ اس وقت یہاں کا ملک شوتم خان تھا اور سزا دینے کا اختیار بھی اس کے پاس تھا۔'' واس نے وضاحت کی۔

رستم کے چہرے پر بندھی ہوئی پٹی بار بار ناصر کی نگاہوں میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے یہ پٹی کھولی اور رستم کی خراشوں کا معائنہ کیا۔ جلد کئی جگہ سے چھل گئی تھی اور زخم خراب ہونے کا اندیشہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ناصر اس معاملے کو بہتر طریقے سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت آنجہانی مالینا کا شولڈر بیگ منگوایا۔ اس میں چند ضروری دوائیں ابھی تک موجود تھیں۔ ناصر نے ان دواؤں کی مدد سے رستم کے چہرے کی مرہم پٹی کی۔ ایک اچھی اینٹی بائیوٹک بھی موجود تھی جو انفیکشن کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوسکتی تھی۔

ریچھوں والے واقعے کی وجہ سے بستی میں دو افراد کی موت ہوئی تھی۔ ان اموات کے سبب بستی میں افسردگی تو موجود تھی لیکن ساتھ ساتھ تہوار کی گہما گہمی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بازار بھی لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ رات کو منجمد جھیل میں سے لالٹینوں کے ذریعے

مچھلی پکڑنے کا مقابلہ بھی ہو رہا تھا۔

واس نے بتایا۔ ''یہ بڑا دلچسپ مقابلہ ہوتا ہے۔ جھیل کی جمی ہوئی سطح پر سوراخ کئے جاتے ہیں۔ نیچے پانی میں مچھلی ہوتی ہے۔ سوراخ کے قریب روشن لالٹینیں رکھی جاتی ہیں۔ مچھلی ان لالٹینوں کی روشنی دیکھ کر سوراخ کے پاس آتی ہے۔ اسے دبوچ لیا جاتا ہے۔ ایک مقررہ وقت میں زیادہ مچھلیاں پکڑنے والے کو دو گھوڑوں یا اس کے مساوی قیمت کی بھیڑوں کا انعام دیا جاتا ہے۔''

رستم اور ناصر اپنے ساتھی شریف کا حال احوال دریافت کرنے کے لئے اس کے پاس جانا چاہتے تھے مگر واس نے بتایا کہ اس کے لئے برق جان سے باقاعدہ اجازت لینا پڑے گی۔ رستم کو برق جان کے داماد سامی خان کی طرف سے بھی اندیشہ تھا۔ سامی خان ڈاکٹر مالینا کی وجہ سے اپنے بازو سے محروم ہوا تھا...... اور ڈاکٹر مالینا کا تعلق رستم اور ناصر وغیرہ کے ساتھ ثابت ہوا تھا۔ اب رستم اور ناصر ایک طرح سے برق جان اور سامی خان کی تحویل میں تھے۔ سامی ان سے بازپُرس کرسکتا تھا۔ تاہم اس حوالے سے اطمینان کی بات یہ تھی کہ سامی خان ابھی تک زخمی اور بیمار تھا۔ اس کی سرگرمیاں بالکل محدود تھیں۔ رات کو موسم ابر آلود ہوگیا۔ ہلکی ہوا بھی چلنے لگی۔ واس کو ہلکا بخار تھا۔ مسلسل کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ وہ دوا کھا کر جلدی سوگیا۔ واس کی بیوی بھی عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد سوجاتی تھی۔ رستم اور ناصر جاگتے رہے۔ اپنے حالات پر غور کرتے رہے اور سوچتے رہے کہ انہیں آئندہ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ تیسری مرتبہ فرار ہوتے پکڑے گئے تھے، برق جان ان پر مہربان نظر آتا تھا۔ مہربان نہ ہوتا تو وہ اس وقت اکٹھے واس کے گھر میں موجود نہ ہوتے۔ درحقیقت ابھی برق جان کے لئے شوتم خان والا خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ شوتم اپنے تقریباً تین سو جاں نثار محافظوں کے ساتھ بستی کے مشرقی کنارے پر موجود تھا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت فیصلہ کن لڑائی ہوسکتی تھی۔ اس لڑائی کے لئے برق جان کو زیادہ سے زیادہ لڑاکوں کی ضرورت تھی اور ممکن تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہو۔

رات کے دس بجے کا عمل ہوگا جب وہ دونوں باتیں کرتے کرتے سوگئے۔ ساتھ والے کمرے سے واس کے خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابھی رستم کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک وہ جاگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ معلوم بھی ہوا کہ وہ بستر میں اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اس کے ساتھ موجود تھا۔ وہی ریشمی بلی کے لمس جیسا احساس! اس نے ایک دم لحاف اپنے اوپر سے ہٹایا اور نیم تاریکی میں غور سے دیکھا۔ وہ سناٹے میں رہ گیا۔ اس کے

ساتھ زری لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کمال بے تکلفی سے اپنا سر رستم کے کندھے سے ٹکایا ہوا تھا اور اپنا ایک بازو رستم کے سینے پر دھرا ہوا تھا۔

"یا خدا! یہ بلا کہاں سے ٹپک پڑی؟" رستم نے دل میں سوچا۔

ابھی صبح ہی واس نے بتایا تھا کہ زری کی صورت اب ہم شاید دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ اور باقی دونوں گارنیاں سخت پہرے میں ہیں اور اب انہیں بھینٹ کے وقت ہی ان کی چار دیواری سے نکالا جائے گا۔ زری کا غم ہی تھا جس نے واس کو بیمار کر رکھا تھا اور وہ پورے دن میں دو چار نوالے سے زیادہ کھانا نہیں کھاتا تھا اور اب یہی زری نہ جانے کس طرح ساری دیواریں پھاند کر اور نگرانوں کو چکمہ دے کر یہاں اس کے پاس موجود تھی۔ یہ ناقابلِ فہم لڑکی تھی اور آج اس نے جو کچھ کیا تھا وہ بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا۔

رستم نے اسے زور کے ساتھ دونوں شانوں سے پکڑا اور اس کے گوشت میں انگلیاں گاڑتے ہوئے سرگوشی کی۔ "کیسے آئی ہو تم یہاں؟ کوئی تمہارے پیچھے تو نہیں آ جائے گا؟"

وہ بے پروائی سے مسکرائی۔ "کسی کو کچھ نہیں پتا۔ میں بڑی چالاکی سے آیا۔"

"تیری چالاکی سب کا بیڑا غرق کر دے گی....." رستم نے دانت پیسے۔ "اور تو یہاں میرے بستر میں کیوں گھسی ہے؟"

اس نے حسبِ عادت بے تکلفی سے رستم کا کان کھینچا اور سرگوشی کی۔ "تم بہت آچھا....."

"تیرے اندر کوئی شرم حیا ہے یا نہیں؟ تیرے چچا کو پتا چل گیا تو پھر؟"

"یہ شرم کیا ہوتا۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔" وہ رستم کے ساتھ کچھ اور چپک گئی۔ وہ واقعی ایک معمہ تھی۔ کسی پہاڑی ندی کی طرح صاف شفاف..... لیکن اپنی فطرت میں پُرجوش اور اپنے ہی بہاؤ سے پریشان! اس کا دل آئینے کی طرح تھا مگر اس کے معصوم جسمانی تقاضے اسے کسی الجھن کے گھیرے میں رکھتے تھے۔

یکایک رستم کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ یہ کیسی رات تھی یہ رات کی کیسی کروٹ تھی..... یہ کیسا خیال تھا؟ اس نے کسی بچی کی طرح اپنے پہلو سے چمٹی ہوئی اس انوکھی لڑکی کو دیکھا..... اور سوچا۔ اس کا زندگی کی حرارت سے بھرپور جسم فقط دو دن بعد موت کی سرد چادر اوڑھنے والا ہے۔ اس تڑپتی مچلتی لڑکی کو کسی بھیڑ بکری کی طرح قربان گاہ کے فرش پر پٹخا جائے گا۔ اسے گھٹنوں کے نیچے دبایا جائے گا اور پھر اس کی صراحی جیسی خوبصورت گردن پر اجل کی چھری چلا دی جائے گی..... یہ ایک ہولناک ظلم

تھا اور اس ظلم سے اس اول جلول لڑکی کو بس ایک ہی طریقے سے بچایا جا سکتا تھا۔ اور اس ظلم کی طرح یہ طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ عام حالات میں شاید رستم کو کسی ایسی بات کے بارے میں سوچنا بھی ناگوار محسوس ہوتا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا اس کے دل میں کراہت سی جاگ رہی تھی، اس کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کیا ایک بہت بڑی برائی سے بچنے کے لئے ایک چھوٹی برائی کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے؟ کیا اس لڑکی کے لئے ایسا کچھ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آبوک کی منحوس قربان گاہ پر لیٹنے کے قابل نہ رہے؟

"تم کیا سوچتا؟" زری نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کچھ نہیں۔" رستم کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"میں جانتا ہوں، تم مجھ سے ناراض..... بہت سارا ناراض۔"

رستم خاموش رہا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کراس کئے۔ دائیں ہاتھ سے بائیں کان کو اور بائیں سے دائیں کان کو چھوا اور بولی۔ "مجھ سے غلطی ہوتا اور بار بار ہوتا۔ پر اب نہیں ہوگا..... بڑی ماں (بڑی مجاوری) نے کہا کہ میں دو دن بعد سفر پر جاؤں گا۔ بہت دور..... وہاں میرا نیا زندگی شروع ہوگا۔ میرا شادی ہوگا..... اسی شہزادے کے ساتھ جس کے سر پر کرنوں کا تاج ہوگا۔ لیکن..... لیکن..... میں وہاں جا کر بھی تم کو بہت یاد کروں گا۔ تم بہت آچھا۔"

رستم کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ "تمہیں پتا ہے زری! تمہیں اس سفر پر کیسے بھیجا جائے گا؟"

"ہاں..... میرا گلا کاٹ کر..... لیکن بڑی ماں کہتی ہے..... سب کہتے ہیں..... گلا کاٹنے سے درد نہیں ہوتا..... بالکل نہیں ہوتا..... پتا بھی نہیں چلتا۔" وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے رستم کے جواب کا انتظار کر رہی ہو۔ پھر اس نے خود ہی پوچھا۔ "کیا سچ مچ گلا کاٹنے سے درد نہیں ہوتا..... کیا وہ..... جھوٹ تو نہیں بولتے؟" زری کے لہجے میں اندیشوں کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ موت کا خوف..... جو انسان کی فطرت میں شامل ہے، سادہ لوح زری کی رگوں میں بھی موجود تھا..... اسے ڈرا رہا تھا..... اندر سے دکھی کر رہا تھا۔

ان لمحوں میں رستم کو اس کی سادگی و نادانی پر بہت ترس آیا..... وہ مر رہی تھی اور اس کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا..... اور جو کیا جا سکتا تھا، وہ رستم کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سکتہ زدہ لیٹا رہا۔ وہ اس کے پہلو سے چمٹی رہی۔ اپنی تمام حشر سامانیوں سے بے خبر، اس کا جسم رستم کے جسم سے ہم کلام رہا۔ نصف شب کی سردی لکڑی کی دیواروں میں سرایت کرنے کے بعد

دھیرے دھیرے کمرے میں اُتر رہی تھی اور موٹے لحاف کی بیرونی سطح کو ٹھنڈا کر رہی تھی اور وہ پوچھ رہی تھی۔ ''کیا یہ ساچا (سچا) بات ہے کہ بھینٹ چڑھنے والے کو درد نہیں ہوتا؟ مجھ کو بتاؤ ناں...... تم بہت آچھا...... تم ساچا بولتا۔''

رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ رات بہت خاموش، سرد اور زہر بھری تھی۔ ساتھ والے کمرے میں واس اور اس کی بیوی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہے تھے۔ دس بارہ فٹ دور ناصر بھی چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے نیچے لالٹین رکھی تھی جس کی لو اتنی مدھم کر دی گئی تھی کہ بس ایک نارنجی لکیر کی طرح ہی نظر آتی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی اور اس تاریکی میں زری کی گرم سانسیں رستم کے کانوں کے بالکل قریب گونج رہی تھیں۔

عورت رستم کے لئے کوئی انوکھی شے نہیں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کی زندگی میں شانی بی بی کے آنے سے پہلے کئی عورتیں آئی تھیں...... لیکن شانی بی بی کے آنے کے بعد کچھ نہیں تھا...... کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ورق اس کی زندگی کی کتاب سے ہمیشہ کے لئے پھٹ گیا تھا۔ وہ شانی بی بی سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا عشق اسے ایسے مقام پر لے آیا تھا جہاں اس کی ساری کائنات کا محور بس بی بی کی ذات ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ وڈے ڈیرے پر بھی ایک امتحان سے گزرا تھا۔ پری پیکر فلمی اداکارہ نادیہ نے اپنے بے پناہ حسن کے گھمنڈ میں رستم کو اپنی راہ پر لانا چاہا تھا۔ آزمائش کی وہ رات رستم کو ابھی بھولی نہیں تھی۔ نادیہ نے اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ رستم کے پندار پر شب خون مارا تھا لیکن وہ رستم کی گرد کو بھی چھو نہیں سکی تھی۔ اسے بہکانا تو دور کی بات ہے، وہ اس کے پایۂ استقلال میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا نہیں کر پائی تھی۔ بی بی کے خیال میں جو طاقت تھی، اس کے بارے میں رستم ہی جانتا تھا۔ یہ طاقت اسے بڑے سے بڑے طوفان کے سامنے ایک پہاڑ کی طرح کھڑا کر سکتی تھی۔

لیکن یہاں صورت حال کچھ مختلف تھی۔ یہاں کوئی اور بات تھی۔ حالات کے پھیر نے یہاں کچھ اور ہی نقشہ ترتیب دے رکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکی کے لئے رستم کے دل میں کسی طرح کی کوئی رغبت نہیں تھی۔ بے شک اس کی موجودگی ایک طوفانی لہر کی طرح اس کے پہلو میں ہاچل مچا رہی تھی، لیکن اس ہلچل کا رستم کے دل و دماغ سے کوئی ناتا نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو بس ایک سوچ تھی۔ کیا وہ کسی طرح اس لڑکی کو بھینٹ چڑھنے کی بدقسمتی سے بچا سکتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے؟ اپنے دل و دماغ اور اپنے جسم پر جبر کرے...... اس لڑکی سے جسمانی تعلق بنائے اور اسے ظالمانہ رسم کے ناقابل بنا دے...... کیا

ایسا ہو سکتا ہے؟

یہ بے حد سنگین سوال تھا اور اس زہر بھری رات میں رستم اس جان لیوا سوال کے دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک گارنی سے تعلق جوڑنے والے کے لئے یہاں بڑی بھیانک [illegible] گئی ہے۔ یہ زندہ جلائے جانے کی سزا تھی۔ اور ایسی ہی ایک کڑی سزا خود رستم کی اپنی سوچ بھی اسے دے سکتی تھی۔ یہ سزا تھی، شانی بی بی سے بے وفائی کا احساس...... وہ سوچنے لگا کیا وہ اس احساس کو جھیل سکے گا؟ وہ لرز گیا۔ بے شک جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، اس میں اس کی اپنی چاہت کا دور دور تک دخل نہیں تھا...... پھر بھی ایک تعلق تو تھا...... اَن چاہا سہی لیکن ایک ملاپ تو تھا۔

وہ جو بڑے بڑے حوادث کے سامنے بھی اپنے دل کی رفتار کو معمول کے مطابق پاتا تھا، آج اس دوراہے پر اپنے سینے میں دھڑکنوں کو زیر و زبر محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی ہلکی سی نمی محسوس ہوئی۔

زری کی سرگوشی نے اسے چونکایا۔ ''یہ تمہارے چہرے پر پٹی کیوں ہے؟ تم کو گودام میں چوٹ لگا؟'' وہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' رستم نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے بے ساختہ رستم کی پٹی کو دو تین بار چوما جیسے وہ اس طرح رستم کی تکلیف کو سکون دینا چاہ رہی ہو۔ اس سے پہلے وہ رستم کے زخمی کندھے کو بھی اسی طرح چومتی تھی۔ اونی لبادے کے اندر اس کے پارہ صفت بدن کے خدوخال بڑی بے باکی کے ساتھ رستم کے پہلو سے ہم کلام تھے۔ ایک حیوانی سی خودسپردگی تھی اس کے انداز میں...... وہ جیسے کچھ چاہتی تھی لیکن خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا چاہتی ہے۔ اس کی جبلت، بے ساختہ انداز میں اسے رستم سے پیوست ہونے پر مائل کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے یہ قربت اسے اچھی لگ رہی ہے اور وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جانتی کہ کیوں اچھی لگ رہی ہے۔

وہ بڑے کٹھن لمحے تھے۔ کچھ ہی دیر میں رستم صدیوں کے جاں گسل تذبذب میں سے گزر گیا۔ یہ سب غلط تھا مگر پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا یہ غلط نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی مرتے ہوئے شخص کو اجل کے جبڑوں میں سے کھینچا جائے۔

اس نے دل کو پتھر کیا...... اپنی آنکھیں بند کیں اور زری پر جھک گیا۔ اس کے ہونٹ زری کے ریشمی چہرے سے ٹکرائے۔ وہ تو جیسے مجسم شعلہ تھی اور ذرا سی ہوا کی منتظر تھی۔ وہ چند ہی لمحوں میں رستم سے قریب تر ہو گئی۔ گہری تاریکی میں اس کے بازو رستم کے گرد حمائل ہو گئے۔ اس

کے ہونٹ بے تابانہ رستم کے چہرے کو ٹٹولنے لگے۔ رستم نے خود پر بے پناہ جبر کرتے ہوئے اسے اپنی طرف بڑھنے دیا اور وہ بلندی سے گرنے والے طوفانی ریلے کی طرح بڑھتی آئی۔ لیکن ... پھر اچانک کچھ بھی رستم کے بس میں نہیں رہا...... وہ یکا یک لاچار ہو گیا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا حالات کا بڑے سے بڑا جواز...... وقت کی سخت سے سخت مجبوری.. زندگی کی سنگین سے سنگین ضرورت...... کچھ بھی اسے یہ حق نہیں دیتا کہ وہ بی بی سے بے وفائی کرے۔ یہ اس کی موت ہوگی۔ یہ اس کی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہوگا...... اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی اسے بی بی سے ملنا تھا۔ کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا تھا۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر اپنے سینے میں سمونا تھا اور اس کے کان میں دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی لافانی سرگوشی کرنی تھی۔ ''میں آپ سے عشق کرتا ہوں۔''

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ زری کی گرفت ختم ہوگئی۔ بس اس کا ایک ہاتھ رستم کے شانے پر ٹکا رہا۔

''تم کو کیا ہوا؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''کچھ نہیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔ ''تم یہاں لیٹو۔''

وہ اطاعت مندی سے لیٹ گئی۔ رستم نے آہستگی سے چارپائی چھوڑ دی...... وہ بہت احتیاط کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں کی آہنی بیڑی آواز پیدا نہ کرے۔ گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وسیع کمرے کے دوسرے گوشے میں ناصر سو رہا تھا۔

''تم کتنی دیر میں آئے گا؟'' تاریکی میں سے زری کی سرگوشی ابھری۔

''ابھی کچھ دیر میں...... تم لیٹی رہو۔'' رستم کے لہجے میں ہلکی سی جھنجھلاہٹ تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اسے کھولا اور باہر برآمدے میں نکل آیا۔ یہ برآمدہ ایک طرح سے صحن کا حصہ ہی تھا۔ بس سائے کے لئے لکڑی کی ڈھلوان چھت بنادی گئی تھی۔ رستم کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے اسے کچھ سکون دیا۔ ایک طرف پتھر کی چھوٹی سی منڈیر تھی۔ وہ اس منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائیں اور اپنے لمبے بالوں کو انگلیوں میں جکڑ لیا۔ اس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹے سے ڈربا نما کمرے میں واس کی تین چار بکریاں خاموش بیٹھی تھیں اور اس تاریک سرد رات کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھیں۔ باہر گلی میں کوئی نوخیز کتا کسی نیم گرم کونے میں دبکا ہوا چوں چوں کی باریک آواز نکال رہا تھا۔ رستم اپنے بالوں کو انگلیوں میں جکڑے بیٹھا رہا

اور سوچتا رہا۔ وہ کیا کر سکتا ہے...... وہ اس لڑکی کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ رستم کو وہ لمحے اچھی طرح یاد تھے جب زری اپنے نامعلوم احساسات سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار رستم کی مدد کے لئے آئی تھی اور ایسا دو مرتبہ ہوا تھا۔ پہلی بار جب بستی سے باہر ڈھلوان پر ''نے مان'' نے عقب سے اچانک رستم پر حملہ کیا تھا اور زری اس کے آڑے آگئی تھی۔ دوسری مرتبہ دو دن پہلے جب وہ گودام میں پہلے ریچھ کا خاتمہ کر کے مطمئن بیٹھا تھا اور زری بھاگتی ہوئی اس کی مدد کو پہنچی تھی۔ رستم اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے خاص قسم کا جذبہ رکھتی ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو بہت ہی سادہ اور فطری تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کا اپنے من پسند مرد کی طرف جھکاؤ...... یہ کوئی عشق قسم کی چیز نہیں تھی، نہ ہی اسے اعلیٰ درجے کی محبت کہا جا سکتا تھا...... یہ بس ایک سادہ لوح لڑکی کی خود رَو محبت تھی جس میں جنسی کشش کو بھی عمل دخل تھا۔ رستم کو ان چیزوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو بس چاہتا تھا کہ کسی طرح اس لڑکی کی جان بچ جائے...... وہ بالکل موت کے دہانے پر تھی...... اور آج رات ایک عجیب اتفاق اسے مقتل سے نکال کر رستم کے پہلو میں لے آیا تھا۔

اچانک وہ چونک گیا۔ اسے اپنے پہلو میں بیڑی کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ناصر تھا۔ وہ مخصوص انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب آن بیٹھا......

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''تم جاگ رہے تھے؟'' رستم نے اس سے الٹا سوال کیا۔

''نہیں، جب آپ نے دروازہ کھولا تو میری آنکھ کھل گئی۔ خیریت تو ہے؟ آپ اس وقت یہاں بیٹھے ہیں؟'' ناصر کے لہجے میں تھوڑی حیرت تھی۔

''تم نے میرے بستر کو دھیان سے نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی موجود ہے یار!''

''کیا؟'' ناصر اچھل پڑا۔

''ہاں...... وہاں لحاف کے نیچے زری ہے۔''

ناصر نے پہلے تو غیر یقینی نظروں سے رستم کو دیکھا پھر اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ ''او گاڈ...... یہ کیسے ہوا؟''

''میں خود حیران ہوں۔'' رستم نے سرگوشی کی۔ ''پتا نہیں یہ مجاریوں کے پاس سے کیسے نکلی ہے اور یہاں کیسے پہنچی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے دیوار وغیرہ پھاندی ہے۔ ایسے کام یہ آسانی سے کر لیتی ہے۔ ویسے بھی واس مجھے بتا رہا تھا کہ یہ مقدس مشروب کی رات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آج مجاری خانے کے پہرے دار بھی نشے میں ہوں گے اس لئے شاید اسے بھاگنے

کا موقع ملا ہے۔''

''کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تو نہیں پہنچ جائے گا؟'' ناصر کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس وقت تو مجاریاں سو رہی ہوں گی لیکن جب بھی کوئی جاگے گی اور زری کو غائب پائے گی، اس کا دھیان سیدھا اس کے گھر کی طرف ہی جائے گا۔ وہ لوگ سرپٹ بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''پھر اب کیا کرنا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں ناصر! کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ رو دان بعد زری کی جان بچ سکے؟''

''کیا ایک بار پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے؟'' ناصر ہولے سے مسکرایا۔

''ان منحوس بیڑیوں کے ہوتے ہوئے یہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔''

''یہاں رہتے ہوئے کیا ہو سکتا ہے؟'' ناصر نے کہا...... پھر اچانک وہ چونک گیا اور غور سے رستم کی طرف دیکھنے لگا۔ رستم نے سر تھوڑا سا جھکایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھا اور لمبے بال جھول رہے تھے۔ ناصر کچھ دیر خاموش بیٹھا رستم کو دیکھتا رہا پھر بات آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔

رستم نے کھوئے کھوئے انداز میں سرگوشی کی۔ ''کہتے ہیں کہ جان بچانے کے لئے ''مردار'' تک کھانا جائز ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کی بہت قیمت ہوتی ہے۔''

''آ...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن......''

''گناہ اور ثواب کی بات ذہن میں آتی ہے۔ ہم دونوں کا علم اس معاملے میں بہت کم ہے اور میرا تو تم سے بھی کم ہے لیکن میرے دل سے ایک آواز ضرور آتی ہے ناصر! انسان کی ''نیت'' بہت...... بہت اہم ہوتی ہے اور ہماری نیت بد نہیں ہے۔''

ناصر نے ایک گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم جس قسم کے لوگوں اور ان کے جس طرح کے عقیدوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ہم عام انداز سے نہیں سوچ سکتے اور نہ ہی کسی مسئلے کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

''زری کی جان بچانے کا راستہ وہی ہے ناصر جو اس نے بتایا تھا۔ زری کی دوشیزگی ہی اس کی موت ہے۔ اس کو موت سے دور کرنے کے لئے اسے دوشیزگی سے دور کرنا ہوگا۔ یا مرد کو اس کی زندگی میں آنا ہوگا......''

''لیکن اس کی زندگی میں آنے والے کے ساتھ یہاں کا قانون کیا سلوک کرے گا؟''

''ظاہر ہے کہ یہ بدترین سلوک ہوگا، لیکن یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا اور میں یہ خطرہ مول لینا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین ہے ناصر...... برق جان مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے...... کل یہی بات مجھے داس نے بھی بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برق جان کو کسی وجہ سے میری ضرورت ہے اور میں ہر حال میں اسے زندہ درکار ہوں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو شاید اب تک فرار ہونے کے جرم میں ہمارے گھٹنے توڑ دیئے گئے ہوتے اور محافظ کی موت کے بدلے، ہم میں سے کم از کم ایک شخص کو سزائے موت بھی دی جا چکی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ برق جان نے ہمارے لئے رعایتیں ڈھونڈی ہیں، خاص طور پر میرے لئے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی ڈھونڈے گا۔''

''لیکن کچھ بھی ہے رستم بھائی! برق جان سیاہ و سفید کا مالک تو نہیں۔ ان لوگوں کا پورا ایک جرگہ ہے اور پھر یہ جو مجاریاں ہیں ان کی اپنی طاقت بھی ہے۔ اگر اتنا بڑا جرم ہوا تو یہ مجاریاں چپ نہیں رہیں گی۔ وہ مجرم کو سزا دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔''

''پھر بھی ہوگا وہی جو برق جان چاہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوتم خان کی شکست کے بعد وہ بہت زیادہ اختیار اپنے پاس سمیٹ چکا ہے۔''

''تو آپ چاہتے ہیں کہ......'' ناصر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد رستم نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہاں ناصر! میں یہ چاہتا ہوں...... لیکن میں کر نہیں سکتا...... میرے بس میں کچھ نہیں۔''

''میں سمجھا نہیں رستم بھائی۔''

''میں شاید تمہیں سمجھا نہیں سکتا......'' رستم کے لہجے سے عجیب لاچاری ٹپک رہی تھی۔

وہ خاموش ہو گیا۔ ناصر بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ برفیلی ہوا مختصر صحن میں چکرا رہی تھی اور ان کے چہروں کو چھو رہی تھی۔ چاند آج گہرے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ یہ بڑے گمبھیر لمحے تھے۔ آخر رستم نے مدھم سرگوشی کی۔ ''بی بی میرے سامنے آ جاتی ہے ناصر۔ میں خود پر تو ہر جبر کر سکتا ہوں مگر بی بی کے خیال پر نہیں۔''

''تو پھر؟''

''میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے ناصر۔''

''وہ کیا؟''

''یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے، بس ایک کام ہو سکتا ہے۔'' رستم نے کہا

''آپ کی بات اب بھی ادھوری ہے۔''

''جو میں کہوں گا وہ کرو گے؟'' اس بار رستم کا لہجہ عجیب تھا۔

''آپ کے کہنے پر اپنی جان اسی وقت آپ کے حوالے کر سکتا ہوں۔'' ناصر کے لہجے میں غیر مشروط وفا تھی۔

رستم کی آنکھوں میں مدھم چمک ابھری۔ وہ بولا۔ ''میں نے تمہیں ایک دن ڈھوک شاہاں والا واقعہ بتایا تھا ناں۔ ہیڈ کانسٹیبل جبرو والا۔''

''جس کے منہ پر آپ کے پھینکے ہوئے دستی بم کے ذرے لگے تھے اور اس نے منہ پر پٹیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔''

''ہاں۔ جبرو کو مارنے کے بعد وہ پٹیاں میں نے اپنے چہرے پر لپیٹ لی تھیں اور جبرو کے کپڑے پہن کر آسانی سے پولیس کیمپ میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی نے پہچانا نہیں تھا مجھے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''میں ایک بار پھر وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت جبرو کی پٹیاں میں نے اپنے چہرے پر لپیٹی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تم میری پٹیوں سے اپنا چہرہ چھپاؤ۔'' رستم کی آواز میں ڈرامائی کیفیت تھی اور ہلکی سی لرزش بھی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے ناصر! اس اندھیری رات میں ..... زری تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔''

ناصر پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اب پوری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی...... اور اس بات کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ رستم مسلسل ناصر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان تہلکہ خیز خاموشی سنسنا رہی تھی...... پھر ناصر کا چہرہ آپوں آپ غیر محسوس طور پر جھک گیا۔ رستم اپنی پیشانی اور اپنے بائیں رخسار کو ڈھانپنے والی طویل پٹی کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ کچھ پٹی کھول چکا تھا جب ناصر نے اسے ہاتھ سے اشارے سے روک دیا۔

''نہیں .... آپ رہنے دیں۔ میں دوسری پٹی باندھ لیتا ہوں۔''

اگلے قریباً ایک گھنٹے میں جو کچھ ہوا وہ رستم کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ یہ ساری صورتِ حال بڑی ڈرامائی تھی۔ ناصر . . رستم کے بھ... اندر گیا تھا۔ اس کے جسم پر تقریباً وہی لباس تھا جو رستم کے جسم پر تھا۔ اپنے سر، پیشانی اور چہرے کے کچھ حصے کو ناصر نے سفید

پٹی میں لپیٹ لیا تھا۔ رستم نے اسے حتی الامکان خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی۔ رستم خود باہر تھا۔ وہ برآمدے کے ایک گوشے میں کمبل لئے خاموش بیٹھا رہا اور اس تاریک سرد رات کے انوکھے پن پر غور کرتا رہا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ صحیح ہے یا غلط .... لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک انسانی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس جان کے بچنے کی کوئی اور صورت موجود نہیں تھی۔

کئی اندیشے بھی اس کے ذہن میں پل رہے تھے۔ ان میں اہم ترین اندیشہ یہی تھا کہ کہیں زری، ناصر کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسرا اندیشہ واس یا خانم میں سے کسی کے جاگ جانے کا تھا۔ تیسرا اندیشہ کسی بیرونی مداخلت کا تھا اور یہ اندیشہ بھی خاصا اہم تھا۔ ان اندیشوں سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ رستم آنے والے لمحوں کی پلاننگ بھی کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ناصر کے باہر آتے ہی وہ اندر جائے گا اور زری سے کہے گا کہ وہ اب واپس مجاریوں کے پاس پہنچ جائے......

آخر اسے آہنی بیڑی کی مدھم آہٹ سنائی دی۔ تاریکی میں ناصر کا ہیولا نظر آیا۔ اندر جانے سے پہلے ناصر کی اونی صدری رستم نے پہن لی تھی اور اپنی صدری ناصر کو پہنا دی تھی۔ اب انہوں نے ایک بار پھر اپنی صدریاں تبدیل کر لیں۔ گہری تاریکی میں دونوں ایک دوسرے کے چہرے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتے تھے اور ایک طرح سے یہ ان کے لئے اچھا ہی تھا۔ کوئی بھی بات کئے بغیر رستم کمرے کی گہری تاریکی کی طرف بڑھا اور ناصر برآمدے میں موجود رہا۔

یہ بڑی عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ زری پچھلے ایک گھنٹے میں ایک ایسے شخص کے ساتھ یہاں موجود رہی تھی جو اس کمرے میں تھا ہی نہیں اور جو اس کمرے میں تھا، اس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس بستی کے جنونیوں کے ساتھ تو دھوکا ہوا ہی تھا، خود زری کے ساتھ بھی دھوکا ہوا تھا۔ لیکن اس دھوکے میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ زری کی جان بچنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

رستم بہت آہستہ آہستہ چلتا ہوا چارپائی تک پہنچا اور اندھیرے میں چارپائی کا بازو ٹٹولنے کے بعد زری کے پہلو میں لیٹ گیا۔ کئی منٹ تک وہ خاموش لیٹا رہا۔ وہ بھی چپ تھی۔ دوسری چارپائی کے نیچے لالٹین کی چمنی میں نارنجی لکیر بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس مدھم لَو کو ناصر نے بجھا دیا تھا.... یا پھر لَو نے خود ہی اس شب کے حیرت کدے میں گل ہو جانا مناسب سمجھا تھا۔ خاموشی طویل ہوتی گئی۔

تاریکی میں زری کی سرگوشی ابھری۔ ''تم کہاں گیا تھا؟''

''مجھے شک ہوا تھا کہ باہر کے دروازے پر کوئی ہے۔ شاید ہوا کی وجہ سے آواز آئی تھی۔''

''تمہارا دوست سویا ہوا ہے؟''

''ہاں..... بالکل بے خبر پڑا ہے۔''

وہ بڑی نرمی کے ساتھ اس کے بازو سے لگ گئی اور خاموش پڑی رہی۔ اس کے ہونٹ رستم کے کندھے پر تھے۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے پھر رستم نے کہا۔ ''زری! رات آدھی سے زیادہ گزر گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب تم واپس جاؤ۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔ تم بہت آچھا۔'' وہ اپنی ناک رستم کے بازو میں گھسیڑتے ہوئے بولی۔ اس کے جسم سے پسینے کی مہک اٹھ رہی تھی۔

رستم نے بڑی سختی سے اس کا کندھا پکڑا اور سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ''دیکھو زری! اب میں جو کہوں گا تمہیں وہی کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم سب کا نقصان ہوگا اور تمہارا بھی۔ میری بات پورے دھیان سے سنو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔''

رستم کے لہجے نے اسے جیسے لرزا دیا۔ رستم کے بازو پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رستم نے کہا۔ ''تم اب واپس اپنے ٹھکانے پر جاؤ گی۔ ہوسکتا ہے کہ مجاریاں جاگ گئی ہوں اور تمہیں ہی ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو تم بڑی ماں (بڑی مجاری) کو جگاؤ گی اور اسے بے خوف سب کچھ بتادو۔''

''کک..... کیا بتاؤ۔''

''وہی..... جو سب کچھ ہوا ہے۔ اسے کہنا کہ تمہارا دل اپنے چاچا اور چاچی کو دیکھنے کو چاہ رہا تھا یا کوئی بھی اور بات کہہ دو۔ یہ کہہ دو کہ تم مجھ سے ملنے یہاں آئی تھیں لیکن جب تم یہاں آئیں تو میں نے تمہیں اپنے ساتھ لٹا لیا..... اور وہ سب کچھ ہوگیا جو تم نے سوچا بھی نہ تھا۔''

''نہیں نہیں..... میں یہ نہیں کہوں گا۔ وہ تم کو بہت ماریں گے۔ وہ تم کو ماردیں گے۔ میں یہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''زری!'' رستم نے دانت پیسے۔ ''بکواس کروگی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' اس نے اتنی زور سے اس کا کندھا بھینچا کہ وہ سسک اٹھی۔ یقیناً اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

رستم کو اپنے رویے کی غیر معمولی سختی کا احساس ہوا۔ اس نے زری کا کندھا چھوڑا اور خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے نسبتاً نرم آواز میں سرگوشی کی۔ ''زری! تم میری فکر بالکل نہ کرو۔ میں جو کچھ کررہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر کررہا ہوں۔ برق جان اور اس کے ساتھی مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں یہ بات بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہاری جان بچنے کی بھی اب پوری امید پیدا ہوگئی ہے لیکن شرط یہی ہے کہ تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ مجاریوں کے پاس جاؤ اور سب کچھ بے خوف ہوکر بتادو۔''

وہ سسکی لے کر بولی۔ ''تم جو کہو گے..... میں وہی..... کروں گا..... لیکن مجھ کو یہ سب کچھ بہت خراب لگتا..... بڑی ماں کو سخت غصہ آئے گا۔ سب کو بہت زیادہ غصہ آئے گا۔ بڑی ماں مجھ کو بہت سارے تھپڑ مارے گی.....''

''بیوقوف ہے تُو..... تھپڑ کھانا مشکل ہے کہ گلا کٹوانا؟ اب تیرا گلا نہیں کٹے گا۔'' رستم نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اور یہ سارے خبیث تجھ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ گلا کٹنے کی بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی زیادہ کہ تُو سوچ بھی نہیں سکتی اور نہ ہی اگلی دنیا میں کسی اُلو کے پٹھے سے تیری شادی ہونے والی ہے۔ یہ سب بکواس ہے۔ یہ ساری باتیں گارنیوں کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لئے گھڑی جاتی ہیں۔''

وہ سہم گئی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر کمزور آواز میں بولی۔ ''تم سچ کہتا؟''

''بالکل سچ..... چلو اب نکلنے کی تیاری کرو۔ جیسے خاموشی سے آئی ہو، ایسے ہی بالکل خاموشی سے نکل جاؤ۔''

''لیکن اب مجھ کو بہت ڈر لگتا۔ بڑی ماں مجھ کو بہت زور زور سے بہت زیادہ تھپڑ مارے گی۔''

رستم کو اس اول جلول لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہ یہاں سے تو چلی جائے لیکن بدک کر کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ وہ سوچنے لگا..... کیا اسے یہیں رہنے دیا جائے اور پھر انتظار کیا جائے کہ صبح ہوجائے اور لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔ ابھی وہ اسی ادھیڑبُن میں تھا کہ باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ زری کا پورا جسم لرز گیا۔ وہ جلدی جلدی اپنے بالوں کو جُوڑے کی شکل میں سمیٹنے لگی۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ دستک کا انداز ہی خطرے کی نشاندہی کررہا تھا۔ دوسری دستک پہلی سے بھی شدید تھی۔ یوں لگا کہ بیرونی دروازہ اکھڑ کر اس کے صحن میں آگرے گا۔ دوسرے کمرے

میں واس اور اس کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''یہ کون ہے اس وقت؟'' خانم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''دیکھتا ہوں۔'' واس نے کہا۔ پھر لالٹین کی لَو اونچی ہوئی اور واس لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''شاید بڑی ماں آگئی۔ وہ بالکل اچھی نہیں۔'' زری کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

دروازے کی جانب سے مختلف آوازیں ابھریں۔ یہ مردانہ آوازیں تھیں۔ محافظ مقامی زبان میں واس سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ ان کے لہجے تند تھے۔ واس حیرت کا اظہار کررہا تھا۔ پھر بھاری قدموں کی چاپ گھر کے اندر سنائی دینے لگی۔ چند ہی لمحے بعد کمرے کے دروازے پر تین ہٹے کٹے مسلح محافظ نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ ان کے عقب میں رستم کو چالیس پچاس سال کی ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے سر پر موٹی اوڑھنی تھی اور گلے میں بہت سی مالائیں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ رستم سمجھ گیا کہ یہی بڑی مجاری ہے۔ اسے دیکھتے ہی زری کا رنگ ہلدی ہوگیا تھا۔

زری کو کمرے کے گوشے میں دیکھتے ہی بڑی مجاری محافظوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مجاری کے ماتھے پر نیلے رنگ سے چند ستارے سے بنے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ جھریوں بھرا تھا۔ اس نے محافظ کے ہاتھ سے لالٹین کو اٹھا کر زری کے چہرے کے عین سامنے کیا اور دھیان سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کمرے میں موجود محافظ بالکل الرٹ نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفلیں تھیں اور آنکھوں کی سرخی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خمار آلود شراب کے زیر اثر ہیں۔ تیسرا محافظ برآمدے کی طرف نکل گیا تھا۔

زری کو کمرے میں دیکھ کر بوڑھا واس بھی حیران دکھائی دینے لگا۔ وہ کبھی زری اور کبھی رستم کو دیکھ رہا تھا۔ مجاری کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور اس کے چہرے کی ہیجانی کیفیت بڑھتی جارہی تھی۔ رستم نے سنا تھا کہ بڑی مجاری کی تجربہ کار نگاہیں صرف عورت کا چہرہ دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیتی ہے۔ بڑی مجاری کے علاوہ بھی دو تین تجربہ کار مجاریاں ایسی ہی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر یہاں تو ''معاملات'' ویسے ہی واضح نظر آرہے تھے۔ زری کی یہاں موجودگی اور اس کا حلیہ ہی چلا چلا کر ساری صورتِ حال کی وضاحت کررہا تھا۔

اچانک مجاری قہرناک انداز میں چلائی...... اس نے لالٹین نیچے رکھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگی۔ وہ مقامی زبان میں خوفناک واویلا بھی کررہی تھی۔ اس کے پورے جسم پر عجیب لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ دونوں محافظ عقابوں کی طرح رستم پر جھپٹے اور انہوں نے رستم کو نیچے گرا لیا۔ رستم نے حتی المقدور مزاحمت کی مگر اس کے دونوں پاؤں بیڑی کی منحوس گرفت میں تھے۔ اس نے ایک حملہ آور کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ مگر دوسرے محافظ کی رائفل کا وزنی دستہ اس کی کنپٹی پر لگا اور اس کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اسی دوران میں بڑی مجاری خود بھی وحشیانہ انداز میں رستم پر جھپٹ پڑی۔ اس نے رستم کے چہرے پر دو تھپڑ مارے پھر ناخنوں سے اس کی آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ رستم نے کہنی سے اس کی گردن پر ضرب لگائی اور وہ کسی زخمی جانور کی طرح چلاتی ہوئی کمرے کے وسط میں جا گری۔

پہلے محافظ کی رائفل پر ایک فٹ لمبی سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی رائفل کو بھالے کی طرح پکڑا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ سنگین کو رستم کے سینے سے پار کردینا چاہتا ہے۔ زمین پر گرا ہوا رستم اس کے لئے ایک بہترین ہدف ثابت ہوسکتا تھا...... یکایک واس اس کے سامنے آگیا اور محافظ کی اوپر اٹھی ہوئی رائفل تھام لی۔ محافظ نے بہت کوشش کی مگر واس نے رائفل نہیں چھوڑی۔ کمرے میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ رستم نے دیکھا، زری صدمے سے بے ہوش ہوکر ایک کونے میں گری ہوئی تھی۔ اس کا اونی لبادہ سمٹ کر اس کی پنڈلیوں اور گھٹنوں کو عریاں کررہا تھا۔ کمرے کی دہلیز پر تیسرے محافظ نے رائفل ناصر کے سر سے لگا رکھی تھی اور اسے گھٹنوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔ بیڑی کی وجہ سے ناصر بھی بے بس تھا۔

واس بلند آواز میں سنگین بردار محافظ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جو چند الفاظ رستم کی سمجھ میں آرہے تھے، ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ محافظ کو رستم پر ایسا وار کرنے سے روک رہا ہے۔ جس سے رستم کی موت واقع ہوجائے..... کیونکہ رستم کی سزا صرف موت نہیں تھی۔ اگر وہ واقعی گارنی کے ساتھ جسمانی تعلق بنا چکا تھا تو پھر وہ عبرت ناک موت کا حق دار تھا۔ شاید یہ بات مشتعل محافظ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار ٹھوکر رستم کی پسلیوں میں لگائی اور گالیاں بکتے ہوئے رائفل کی نال رستم کے سینے پر رکھ دی تاکہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکے۔ رستم کے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا اور کندھے کا زخم بھی تازہ محسوس ہونے لگا تھا۔ بڑی مجاری مسلسل خوفناک واویلا مچا رہی تھی۔ کبھی وہ اپنے گال پیٹتی، کبھی دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتی اور نوحہ کرتی۔ واس نے ایک محافظ کے ساتھ مل

کر بے ہوش زری کو اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ واس اور اس کی بیوی خانم زری کو ہوش میں لانے کی کوششیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد واس کی آواز رستم کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ خانم سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ اس کے منہ پر چھینٹے دیتی رہو۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' خانم کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''برق جان کو لینے۔ بس دو منٹ میں آ رہا ہوں۔ یہاں سے کوئی باہر نہ جائے۔'' پھر اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ غالباً محافظوں کو مخاطب کر کے اپنے فقرے کے آخری الفاظ دہرائے تھے۔ اس کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔

دونوں محافظوں نے رستم اور ناصر کو بدستور گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا اور مسلسل آتشیں نظروں سے گھور رہے تھے۔ گاہے بگاہے وہ آپس میں بپھرے ہوئے جملوں کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔ مجاری کی آہ و بکا مسلسل جاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ساتھ والے کمرے سے زری کے کراہنے کی مدھم آواز آنے لگی۔ اس کی بے ہوشی ٹوٹ رہی تھی۔ رستم دل ہی دل میں خود کو آنے والے حالات کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر زوردار آہٹیں ہوئیں۔ واس، برق جان کو لے آیا تھا۔ برق جان تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کی خالی آستین ہوا میں جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ نیند سے بیدار ہوا ہے۔ مجاری سامنے آئی اور چلا چلا کر برق جان کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ اس کی مشتعل انگلی بار بار رستم کی طرف اٹھ رہی تھی۔

برق جان کا چہرہ سرخ انگارہ ہوتا چلا گیا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں شعلہ فشاں نظر آتی تھیں۔ مجاری کا واویلا ختم ہوا تو برق جان کھا جانے والی نظروں سے رستم کو گھورتا رہا۔ اس نے تند لہجے میں رستم سے کچھ پوچھا۔

واس نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا۔ ''ملک پوچھ رہے ہیں، کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے گارنی زری کو اپنے ساتھ سونے پر مجبور کیا ہے؟'' رستم خاموش رہا۔ واس نے اپنا سوال مزید سخت لہجے میں دہرایا۔

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔'' رستم کے لہجے میں خودسری تھی۔

برق جان نے واس کی وساطت سے کہا۔ ''میں یہاں کھڑے کھڑے تمہاری چمڑی اتروا کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا سکتا ہوں۔ جو تم سے پوچھا جا رہا ہے وہ بتاؤ۔ کیا تم سے یہ گھناؤنی حرکت ہو چکی ہے؟''

رستم نے کہنیوں کے بل اٹھ کر پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائی اور طویل سانس لے کر بولا۔ ''میں نے کچھ بھی ارادے سے نہیں کیا۔ وہ یہاں آئی...... میں نے اسے دیکھا اور خود کو اس سے دور نہ رکھ سکا۔'' رستم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''اور تم جانتے تھے کہ وہ گارنی ہے...... وہ گارنی ہے۔'' برق جان اتنے زور سے دہاڑا کہ کمرے کی دیواریں ہلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

مغلوب الغضب ہو کر وہ رستم کی طرف بڑھا اور اس کے جسم پر کئی ٹھوکریں برسائیں۔ ساتھ ساتھ وہ مقامی زبان میں گرج بھی رہا تھا۔ اس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اُڑ رہے تھے۔ پھر وہ ہانپ کر کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور سخت پریشانی کے عالم میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے اپنی پیشانی تھام لی۔ واس پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ رستم کی نگاہ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کی طرف اٹھی۔ بظاہر واس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں رستم کو اپنے لئے تاسف اور ہمدردی کا سمندر نظر آیا۔

بڑی مجاری نے مٹھی بھر خاک اپنے سر میں ڈال لی تھی اور آگے پیچھے جھولتی ہوئی مناجات پڑھ رہی تھی۔ اس کے جھولنے سے اس کے گلے میں آویزاں درجنوں مالائیں کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد برق جان کسی نتیجے پر پہنچ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ مجاری کو بھی اٹھنے کا کہا۔ اس نے صرف ایک رائفل بردار محافظ کو رستم اور ناصر کی نگرانی پر رہنے دیا اور باقی دونوں محافظوں کو بھی اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ وہ ان تینوں کو لے کر گھر کے پہلو والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ واس اور اس کی بیوی بھی اسی کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔

اندر سے برق جان کے بولنے کی مدھم آواز سنائی دیتی رہی۔ گاہے بگاہے مجاری کی ہیجانی آواز بھی ابھرتی رہی۔ ناصر نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے...... برق چاہتا ہے کہ یہ بات بس بڑی مجاری اور ان تین محافظوں تک ہی رہے۔ باہر نہ نکلنے پائے۔''

''لگتا تو مجھے بھی یہی ہے مگر مجاری پر کنٹرول کرنا اس کے لئے کافی مشکل ہوگا۔'' رستم نے کہا۔

اچانک رائفل بردار محافظ نے رائفل سیدھی کی۔ وہ رستم اور ناصر پر ایک ساتھ پھنکارنے لگا۔ یقیناً وہ اپنی زبان میں انہیں گفتگو بند کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھ کر رستم نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔

بند کمرے میں ہونے والی میٹنگ تقریباً پندرہ منٹ جاری رہی۔ اندر سے ابھرنے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ برق جان دیگر افراد کو اپنی بات سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ دروازہ کھلا۔ بھاری بھرکم اوڑھنی اب ایک بار پھر مجاری کے سر پر نظر آ رہی تھی۔ وہ ہانپی ہانپی دو محافظوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ ایک محافظ گھر میں ہی موجود رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی واپس چلا گیا۔ برق جان نے داس کو ساتھ لیا اور دوبارہ رستم اور ناصر کے پاس آ گیا۔ اس نے درمیان دروازہ بند کر دیا تاکہ یہاں ہونے والی گفتگو وضاحت سے خانم اور زری کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ برق جان بدستور غضب ناک دکھائی دیتا تھا۔ رستم اور برق جان کے درمیان مترجم داس کے ذریعے جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی۔

برق جان دانت پیس کر پھنکارا۔ ”میں تجھے ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر تیرے اندر عورت کی اتنی ہی ہوس تھی تو مجھے بتاتا۔ اچھی سے اچھی لڑکی کو تیرے ساتھ سلا دیتا دو چار ہفتوں کے لئے...... پر تیری گندی نظر پڑی بھی ہے تو کس پر۔ ایک گارنی پر...... تُو نے صرف ایک گارنی کی عزت ہی خراب نہیں کی، ہم سب کے منہ پر جوتا بھی مارا ہے۔ سزا تو تیری یہ ہونی چاہیے کہ تجھے بے لباس کر کے بستی میں گھمایا جائے اور درخت سے الٹا لٹکا کر کوئلوں پر بھون دیا جائے۔ تیری چربی جل جل کر کوئلوں پر گرے اور لوگوں کا دل ٹھنڈا ہو۔“ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے اپنا پسٹل نکالا اور جھپٹ کر رستم کی طرف آیا۔ رستم سے صرف پانچ فٹ کی دوری پر رک کر اس نے پسٹل کی نال رستم کے سر کی طرف کر دی۔ ایک لمحے کے لئے یہی لگا کہ وہ اسے شوٹ کر دے گا مگر پتا نہیں کیوں رستم جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن بیٹھا رہا۔ برق جان نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تیری یہ ہمت کیسے ہوئی...... تجھے سب کچھ پتا تھا پھر بھی تُو نے یہ شرمناک حرکت کی۔ کیا تُو نے جان بوجھ کر ہماری اس رسم کا مذاق اُڑایا ہے یا ویسے ہی تیری لعنتی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے؟“

”میں نے کہا ہے ناں، میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا وہ اپنے آپ ہو گیا۔“

”اب بھی جو کچھ ہو گا وہ اپنے آپ ہو گا۔“ برق کا لہجہ زہرناک تھا۔ ”بغیر کسی ارادے کے بستی کے لوگ تم دونوں کو گھسیٹتے ہوئے چوراہے میں لے جائیں گے اور تمہیں آگ میں ڈال کر تمہارا ناچ دیکھیں گے۔“

برق جان کا لہجہ بہت غضب ناک ہونے کے باوجود اس میں ہمدردی کی ہلکی سی لہر محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ہمدردی بے غرض نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کوئی وجہ ہو سکتی تھی...... یا پھر کوئی منصوبہ!

”برق جان، جو کچھ ہوا ہے مجھ سے ہوا ہے اور اس کی سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے اس میں میرے کسی ساتھی کا نام مت لو۔“

”ساتھی کا نام میں نہیں لوں گا۔ بستی کے ہزاروں لوگ لیں گے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں داس اور اس کی بیوی بھی اس لپیٹ میں نہ آ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ تم تینوں کے ساتھ ان دونوں کو بھی زندہ آگ میں پھینکا جا سکتا ہے۔“

ناصر نے کہا۔ ”ملک برق جان! اس معاملے کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھو۔ بڑی مجاری اور دوسری مجاریاں اور محافظ جواب بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں، زری کی نگرانی کیوں نہ کر سکے۔ وہ تو ایک دم کم عقل ہے، لیکن یہ لوگ تو ذمے دار تھے۔ وہ رات کے اس پہر اس کمرے تک کیسے پہنچی۔ کیا اسے سنبھالنا ان سب لوگوں کی ذمے داری نہیں تھی؟“

”اور تمہاری ذمے داری کیا تھی...... ایک سادہ لوح لڑکی جو اپنے آپ سے بھی بے خبر رہتی ہے، کسی وجہ سے تمہارے پاس پہنچ گئی اور تم نے اسے لوٹ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بستی والوں کے لئے کیا حیثیت رکھتی ہے؟“ برق کی آواز میں واقعی برق کوند رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اضطراری حالت میں پستول کو حرکت دیتا تھا جیسے گولی داغ دینا چاہتا ہو۔

پھر وہ رستم کی طرف مڑا اور گرجا۔ ”کاش یہ حرکت تم نے نہ کی ہوتی۔ اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر لیا ہے تم نے۔ ساری عزت خاک میں ملالی ہے۔ بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے تُو نے۔ تیری عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔“

وہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ داس بھی اس کے پیچھے گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

رستم اور ناصر اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ یہ بات تو ظاہر ہو گئی تھی کہ رستم کا تجزیہ درست نکلا ہے۔ سخت غم و غصے کے باوجود برق جان رستم کے بچاؤ کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔ رستم کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ برق جان اس پاؤندہ قبیلے کا فرد ہونے کے باوجود تھوڑا سا روشن خیال بھی ہے۔ وہ یہاں کی فرسودہ ظالمانہ رسموں پر ویسا اندھا عقیدہ نہیں رکھتا تھا جیسا عام لوگ رکھتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے رستم کے بارے میں کچھ سوچا ہوا تھا۔ اب دیکھنے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں اور خاص طور سے مجاریوں کو اس حوالے سے کیسے مطمئن کر پاتا ہے۔

ناصر اٹھ کر رستم کے قریب آ بیٹھا۔ ”میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے رستم بھائی۔ آپ کی توہین برداشت نہیں ہو رہی۔ یہ نہ ہو میں کچھ کر بیٹھوں...... مار ڈالوں کسی حرامی کو۔“

"میں تم کو اتنا کم ہمت نہیں سمجھتا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ زری کی جان بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا؟"

"اگر ہوتا تو تمہاری سمجھ میں شاید مجھ سے پہلے آ جاتا۔ پھر تم مجھے یہ سب کچھ نہ کرنے دیتے۔" رستم نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ کی یہ توہین مجھے زری کی موت سے بدتر لگ رہی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی توہین شوہین نہیں۔ بندہ اندر سے مطمئن ہو تو باہر کے حالات اس کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ بس دعا کرو کہ برق جان مجاریوں کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے۔ بڑی خبیث عورتیں ہیں یہ۔ بستی میں ان کا اپنا علیحدہ اثر ورسوخ ہے۔"

صبح ہونے سے پہلے پہلے رستم اور ناصر کو اس کے گھر سے ایک دوسری چاردیواری میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ گھر نیچی چھت والے دو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ ذرا بلندی پر واقع تھا۔ برق جان کی نیلے جھنڈے والی رہائش گاہ اس گھر کے ساتھ ہی واقع تھی۔ یہاں تین مسلح محافظ موجود تھے۔ دو دروازے پر اور تیسرا گھر کے اندر۔ یہ تینوں کرخت صورتوں اور بھاری آوازوں والے پاؤندے تھے...... اگلے روز صبح سویرے ایک اور تبدیلی آئی۔ شریف کو بھی اس چاردیواری میں منتقل کر دیا گیا۔ پچھلے چند ہفتوں میں شریف کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ رستم اور ناصر نے ایک اور بات محسوس کی۔ وہ ذرا سی آہٹ پر بدک جاتا تھا۔

"یار کیا بات ہے...... مرد بنو۔ ویسے بھی اب تم بالکل ٹھیک ہو۔" رستم نے کہا۔

شریف نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنسو اس کی پلکوں کے نیچے سے نکل کر زردی مائل رخساروں پر پھیل گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اثبات میں سر ہلا کر رستم کی بات کی تائید کی۔

ناصر نے اشارے سے رستم کو باہر بلا لیا...... دروازہ بند کر کے ہولے سے بولا۔ "اس میں شریف کا کوئی قصور نہیں۔ اسے بزدلی نہیں کہا جا سکتا، بس یہ ایک طرح کی بیماری ہے۔ شریف بلندی سے خوف کھاتا ہے۔ اسے ڈاکٹری زبان میں بلندی کا فوبیا کہہ سکتے ہیں۔ ایسا شخص بعض اوقات تین چار منزلہ مکان سے نیچے دیکھ کر خوف سے پیلا ہو جاتا ہے۔ شریف کو تو ہزاروں فٹ گہری کھائی میں رسے سے لٹک کر اترنا پڑا۔"

"لیکن پہلے تو یہ اتر گیا تھا۔"

"پہلے اندھیرا تھا۔ اسے اپنے اردگرد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر جب صبح کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو اس کے لئے یہ سب کچھ کرنا ناممکن ہو گیا۔ ذہن پر بے پناہ دباؤ پڑنے کے سبب اس کی حالت غیر ہوئی اور اسے دل کا دورہ پڑا۔"

"مگر اب تو ان باتوں کو کئی مہینے گزر چکے ہیں۔" رستم نے کہا۔

"جو شدید دھچکا اسے لگا ہے، اس کا اثر دور ہوتے ہوتے کچھ وقت لگے گا۔" ناصر نے کہا۔ "بہتر ہے کہ ہم اس کے سامنے اس واقعے کا ذکر بھی نہ کریں۔"

شریف کو دوبارہ اپنے درمیان پا کر وہ دونوں خوش تھے۔ تاہم زری کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہے۔ ناصر اس کی طرف سے خاص طور سے پریشان تھا۔ وہ رستم سے پوچھنے لگا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اسے واپس مجاریوں کے پاس بھیج دیا جائے گا؟"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہوگا۔ برق جان اس سارے واقعے کو چھپانا چاہتا ہے۔ تین محافظوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اس واقعے کو راز میں رکھنے کے لئے برق جان انہیں کہیں بند بھی کر سکتا ہے مگر بڑی مجاری کو اپنے بس میں رکھنے کے لئے اسے محنت کرنا پڑے گی۔ بڑی مجاری ہر صورت یہ چاہے گی کہ گارنی کو خراب کرنے والے کو عبرت ناک سزا ملے۔"

"کہیں ان لوگوں کے درمیان کوئی پھوٹ نہ پڑ جائے۔ ایسا ہوا تو شوتم خان کو وار کرنے کا موقع مل جائے گا۔" ناصر نے خیال ظاہر کیا۔

"برق جان میں ہوشیاری تو نظر آتی ہے۔ وہ یقیناً کوئی حل ڈھونڈ لے گا۔"

"میں زری کی طرف سے پریشان ہوں۔" ناصر نے بے ساختہ کہا تو رستم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پرسوں رات جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد ناصر کا زری کے بارے میں فکرمند ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ زری جو کل تک ناصر کے لئے کچھ بھی نہیں تھی، آج بہت کچھ ہو گئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والا پہلا مرد بن گیا تھا اور یہ سب کچھ اتنے عجیب انداز میں ہوا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھا۔

رستم نے کہا۔ "اس کے بارے میں اطمینان رکھو۔ وہ زندہ رہے گی، کوئی سختی بھی نہیں ہوگی اس پر۔"

"لیکن میں اس بارے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔" ناصر کا لہجہ گھمبیر تھا۔

ناصر کی آنکھوں میں دیکھ کر اچانک رستم کو اندازہ ہوا کہ ناصر زری کے ساتھ کسی اَن دیکھی ڈور سے بندھ چکا ہے۔ ایک ریشمی تاریکی میں یکایک پروان چڑھنے والا ناتا جو ناصر کے اندر گہرائی تک سرایت کر گیا تھا۔

رستم نے ناصر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ناصر! پرسوں رات جو کچھ ہوا اسے زیادہ سنجیدگی سے نہ لینا۔ وہ ایک ضرورت تھی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں تم سے بھی شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم اس معاملے میں گھسیٹے گئے۔''

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کی آنکھوں میں فکر کی گہری پرچھائیاں بدستور موجود رہیں۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں تھا۔ میں بھی تو واس کی بھتیجی کو مرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے بچانے کے لئے ہمیں اس کے ساتھ ایسا کچھ کرنا پڑے گا۔ وہ بہت سیدھی سادی ہے رستم بھائی! بہت معصوم۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے مگر اس کی موت ہمیں کہیں زیادہ دکھی کرتی۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کیا ہم واقعی اسے بچا پائے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رستم نے کہا۔

''لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کل رات واس کے گھر میں پہنچی کیسے۔ کیا وہ دیوار پھاند کر آئی تھی؟''

''ایک نہیں دو دیواریں۔'' رستم نے جواب دیا۔ ''پہلے اس نے مجار خانے کی دیوار پھاندی جو کافی اونچی ہے۔ اس کے بعد واس کے گھر کی دیوار پھاندنا اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہے، وہ خطرناک ڈھلوانوں پر بھاگتی پھرتی ہے اور بلی کی طرح درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ مجار خانے کے چوکیدار بھی نشے کے خمار میں تھے۔ اس وجہ سے بھی اسے آسانی ہوئی۔''

مکان چونکہ اونچائی پر تھا اس لئے سلاخ دار کھڑکی سے اردگرد کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ تہوار کی تقریبات شروع ہو چکی تھیں۔ برق جان کی رہائش گاہ کے عین سامنے ایک کھلے میدان میں بھاری بھر کم لبادوں اور موٹی اوڑھنیوں والی پاؤندہ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ انہوں نے وزنی گہنے پہن رکھے تھے اور نفیریوں کی دلکش آواز میں ان کے قدم ایک ترتیب سے اٹھ رہے تھے۔ دوسری طرف نیزے کے ذریعے برف میں سے چوب اُکھاڑنے کا مقابلہ ہونے والا تھا۔ چوبیں گاڑی جا رہی تھیں اور گھڑ سوار چمکتے نیزوں کے ساتھ خود کو ''وارم اَپ'' کر رہے تھے۔ میدان کے پس منظر میں برفیلی ڈھلوانیں تھیں اور دور شمال مشرق کی

طرف کے ٹو کی عظیم الشان سفید چوٹی نیلگوں آسمان کو چھوتی نظر آتی تھی۔ یہ بڑے دلکش مناظر تھے اور دیکھنے والی کی آنکھ کو مبہوت کر دیتے تھے۔

رستم واس سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ اس سے ملے بغیر اسے اردگرد کے حالات کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ برق جان نے واس کو جان بوجھ کر اس سے دور رکھا ہوا ہے۔ سارا دن کھلے میدان میں کھیل تماشے ہوتے رہے اور رستم، ناصر اور شریف بند کمرے سے یہ مناظر دیکھتے رہے۔ سہ پہر کے فوراً بعد گارنیوں کے خون آلود کپڑوں کی نمائش کی گئی۔ یہ خاکستری رنگ کے دو اونی لبادے تھے جو لمبے لمبے بانسوں پر لہرائے جا رہے تھے۔ سینکڑوں لوگ رکوع کے انداز میں جھک گئے اور مناجات پڑھیں۔ دو بے گناہ نوجوان لڑکیاں ایک قبیح رسم کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ بہرطور رستم اور ناصر کے لئے یہ اطمینان کی بات تھی کہ یہ دو تھیں۔ زری ان میں شامل نہیں تھی۔ رات کو مشعلوں کی روشنی میں بھی تہوار کی گہما گہمی موجود رہی۔ رستم اور ناصر کا خیال تھا کہ اس گہما گہمی میں برق جان بھی کہیں نظر آئے گا مگر وہ نہیں آیا۔ نہ ہی وہ ان تینوں سے ملنے اس چار دیواری میں داخل ہوا۔ بعد ازاں ناصر کو ایک محافظ سے پتہ چلا کہ برق جان کو بخار ہے۔ اس گھر میں موجود تینوں محافظ وہی تھے جو کل رات واس کے گھر میں بھی موجود رہے تھے۔ وہ رات کی ساری صورتِ حال جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے بڑی نفرت انگیز نظروں سے رستم کو دیکھ لیتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک گارنی کو داغ دار کرنے والا قابلِ نفرت شخص تھا۔ اس کی ساری دلیرانہ شہرت بھی اس عمل کی وجہ سے گہنا گئی تھی۔

اگلے روز تہوار کی تقریبات جوش و خروش سے جاری رہیں۔ بستی میں موجود ڈھائی تین ہزار پاؤندے ان رسوم میں حصہ لے رہے تھے۔ لوہے کے بڑے پنجرے میں ریچھوں کے ساتھ ماہر کھلاڑیوں کی کشتیاں بھی ہوئیں۔ تاہم یہ مقابلے اس لحاظ سے پھیکے رہے کہ ان میں دو چوٹی کے کھلاڑی شامل نہیں تھے۔ رستم اس چار دیواری میں بند تھا... اور ''نے مان'' اپنی حرکتوں کی وجہ سے اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بہترین ریچھ بھی گودام والے واقعے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ بہرحال اس کی کسر کلہاڑی بازی اور نشانہ بازی کے مقابلوں میں پوری کر لی گئی۔ سہ پہر کے وقت نشانہ بازی کا مقبول مقابلہ شروع ہوا۔ لکڑی کے تین پولوں پر رکھے ہوئے تین سیبوں کو کم سے کم گولیوں سے اُڑانا تھا۔ آخری یعنی فائنل مقابلہ دو پاؤندہ نوجوانوں میں تھا۔ سینکڑوں تماشائی سانس روک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ رستم اور ناصر بھی اپنے کمرے کے اندر سے یہ نشانہ بازی دیکھ سکتے تھے۔ دونوں نشانہ بازوں کے قریب لکڑی

کے چبوترے پر ایک بنی سنوری پاؤندہ لڑکی کھڑی تھی۔ وہ زیوروں سے لدی ہوئی تھی اور اس کے اپنے رخسار سیبوں کی طرح چمک رہے تھے۔

''یہ لڑکی یہاں ریفری کا کام کر رہی ہے؟'' ناصر نے رستم سے پوچھا۔

''نہیں۔ میرے خیال میں یہ ٹرافی کا کام کر رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ناصر نے پوچھا۔

''واس نے بتایا تھا، نشانہ بازی کا آخری مقابلہ جیتنے والے کی شادی ایک خوبصورت مقامی لڑکی سے کی جاتی ہے۔ لڑکی کے جسم پر زیور کی صورت میں جو روپیہ ہوتا ہے وہ بھی نشانہ باز کے حصے میں آتا ہے۔ قبیلے کی چار شاخیں ہیں اور ہر شاخ کا چھوٹا ملک اپنے حصے کا زیور لڑکی کو پہناتا ہے۔''

ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا اجمل خان یہاں ہوتا تو یہ لڑکی اس کے سوا کسی کے پاس جا ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ونڈر فل آدمی ہے رستم بھائی۔ میں نے بہت کم نشانہ باز ایسے دیکھے ہیں۔''

''پتا نہیں کہاں ہوگا وہ...... اور باقی لوگ کہاں ہوں گے؟'' رستم نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میرا دل کہتا ہے، جہاں شانی اور گریس ہوں گے، وہ بھی وہیں ہوگا۔ وہ دل کی گہرائی سے شانی کو بہن کہتا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں شانی کو چھوڑ کر گیا ہوگا......''

''مجھے قدرت اللہ سے بھی زیادہ خطرہ ڈپٹی ریاض اور چوہدری بشیر کی طرف سے رہتا ہے۔ یہ دونوں یقیناً ہر جگہ بی بی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ حاجی حیات نے بی بی اور گریس کو چھپائے رکھنے کی اپنی سی کوشش تو کی ہوگی مگر پتا نہیں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔''

شاید ان دونوں کی گفتگو مزید چلتی مگر اسی دوران میں نشانہ بازی کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ پہلے نوجوان نے تین سیب پانچ فائر میں نشانہ بنائے۔ ہر بار جب گولی ٹارگٹ پر لگتی، نوجوان کے سینکڑوں حامی پُرجوش نعرے لگاتے اور اچھل کود کرتے۔ نفیریوں اور ڈھولوں کے ذریعے نشانے باز کو والہانہ داد دی جاتی۔ اب دوسرے نشانہ باز کی باری تھی...... اس نشانہ باز کے پہلے دو فائر ہی خالی چلے گئے۔ اس کے حامیوں میں مایوسی پھیل گئی۔ مخالف تماشائی مسرور ہوگئے۔ اب یہ نوجوان اگر اگلے تین فائر میں تینوں سیب اُڑا دیتا تو مقابلہ برابر کرسکتا تھا۔ یعنی زیورات سے لدی ہوئی لڑکی کے لئے اس کی امید باقی رہ سکتی تھی۔ اس نے نشانے لگانے

شروع کئے اور کامیابی سے اگلے دونوں سیب دو فائر میں اُڑا دیئے۔ اب آخری فائر تھا۔ اس فائر میں اگر وہ سیب اُڑا دیتا تو مقابلہ برابر ہوجاتا اور ایک بار پھر ان دونوں کو ایک ایک سیب اُڑانے کا موقع دیا جاتا۔

نوجوان نے بندوق کندھے سے لگائی۔ سانس روک کر نشانہ باندھا۔ سینکڑوں تماشائی سکتے کی کیفیت میں تھے۔ اس مقابلے میں لوگوں کی بے پناہ دلچسپی واقعی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ نوجوان نے فائر کیا۔ سیب اپنی جگہ موجود رہا۔ فائر خالی گیا لیکن رستم کو یوں لگا جیسے ایک ساتھ دو فائر ہوئے ہیں۔ دوسرا فائر کسی سائیلنسر لگی رائفل کا تھا اور اس رائفل نے ٹھک کی آواز پیدا کی تھی۔ اس آواز کی طرف شاید زیادہ لوگوں کا دھیان نہیں گیا۔ لوگوں کا دھیان بس مقابلے کے نتیجے کی طرف تھا۔ پہلے نوجوان کے حامیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور دیوانہ وار ناچنے لگے۔ ڈھولوں کی دھما دھم سے قرب و جوار لرز گئے۔ جیتنے والے خوش نصیب نے جوش میں آکر اپنی ''زندہ ٹرافی'' یعنی بجی سنوری لڑکی کندھے پر اٹھا لی اور ناچنے کی کوشش کی......مگر......وہ لڑکھڑا کر گرا۔ ایک بار پھر ٹھک کی خطرناک آواز آئی۔ نوجوان کے گرنے اور اس آواز میں تعلق تھا۔ تب رستم کی نگاہ مقابلہ ہارنے والے نوجوان پر پڑی۔ وہ اپنی ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' رستم نے حیرت کے عالم میں کہا۔

اس سے پہلے کہ ناصر جواب میں کچھ کہتا، سائیلنسر والی اور بغیر سائیلنسر والی رائفلوں کے کئی دھماکے ہوئے۔ ہر طرف کہرام سا مچ گیا۔ رستم نے دیکھا، زیوروں سے لدی ہوئی پاؤندہ لڑکی برف پر گری تڑپ رہی تھی اور یہ حالت اس اکیلی لڑکی کی نہیں تھی۔ رستم نے کئی افراد کو برف پر گرتے اور لہولہان ہوتے دیکھا۔

''لیں جی......وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔'' ناصر بولا۔ ''لگتا ہے شوتم خان نے حملہ کردیا ہے۔''

ابھی ناصر کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ خودکار رائفل کا پورا برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے آس پاس کہیں لگا۔ پتھریلی دیواریں جھنجھنا اٹھیں۔ میدان میں اور میدان کے اردگرد ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لوگوں کی محویت سے فائدہ اٹھا کر شوتم خان اور اس کے ساتھیوں نے کوئی خاص راستہ استعمال کیا ہے اور اچانک سینکڑوں نہتے لوگوں کے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ لوگ تین اطراف سے حملہ کر رہے تھے اور بے دریغ لوگوں کو بھونتے چلے جا رہے تھے۔ ان حملہ آوروں نے بڑی خاموشی کے ساتھ بڑی اچھی جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لی

تھیں اور اب ہر کس و ناکس پر موت برسا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ برق جان کے ساتھی سنبھلتے اور پوزیشن سنبھالتے ،بیسیوں افراد گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے، مرد سب ہی شامل تھے۔ رستم اور ناصر کو ہر طرف زخمی تڑپتے نظر آئے۔ یہ دلدوز مناظر تھے۔ یوں لگتا تھا کہ گولیاں چاروں طرف سے آرہی ہیں۔ درجنوں افراد اپنے ہی ساتھیوں کے پاؤں تلے کچلے جارہے تھے۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' ناصر نے کانپتی آواز میں کہا۔

''بس دیکھ سکتے ہیں۔'' رستم کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

بستر پر لیٹے لیٹے شریف کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ قریباً تین چار منٹ بعد دونوں اطراف سے باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ دونوں طرف کے جنگجوؤں نے باقاعدہ پوزیشنیں لے لیں اور گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ اس گھر میں موجود تینوں محافظ بھی مسلح تھے۔ وہ صاف طور پر تذبذب میں نظر آتے تھے کہ لڑائی میں شریک ہوں یا نہیں۔ مینہ کی طرح برستی ہوئی گولیوں کے سبب رستم اور ناصر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے اور چوبی پٹ بند کر دیئے۔ اب وہ دو چھوٹے چھوٹے مستطیل روزنوں سے ہی میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ سکتے تھے اور یہ نقشہ بہت تہلکہ خیز تھا۔ تماشا گاہ میں ہر طرف تماشائیوں کی لاشیں نظر آرہی تھیں۔ زخمی محفوظ مقامات کی طرف رینگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر دستی بموں کے دھماکے شروع ہو گئے۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی بُو پھیلنے لگی۔

آدھ گھنٹے کے اندر صورتِ حال واضح ہو گئی۔ تہوار کی گہما گہمی کا فائدہ اٹھا کر شوتم خان نے جو اچانک حملہ کیا تھا، اس میں اسے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف برق جان کے سو کے قریب حمایتیوں کو ہلاک کرنے میں کامیاب رہا تھا بلکہ بستی کے مشرقی حصے پر انہوں نے دوبارہ قبضہ بھی کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر کنٹرول حاصل نہیں کر سکے تھے پھر بھی کچھ نہ کچھ حوصلہ افزائی تو ان کی ہوئی تھی۔ لڑائی مسلسل جاری تھی۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی تھی۔ فائرنگ کے درمیان وقفوں میں دونوں طرف کے جنگجو بھاگ بھاگ کر پوزیشنیں بدلتے نظر آتے تھے۔ سامنے کچھ فاصلے سے گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔

اچانک داس بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ خون آلود تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''ملک برق جان آرہے ہیں۔ ان کے گھر میں فائرنگ سے آگ لگ گئی ہے۔''

''یہ دھواں برق جان کے گھر سے اٹھ رہا ہے؟'' ناصر نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

داس نے اثبات میں جواب دیا اور بولا۔ ''برق جان کا داماد سامی خان بھی زخمی ہوا ہے۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ یہاں لا رہے ہیں۔''

اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ برق جان اور اس کے پانچ چھ مسلح محافظ اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک محافظ کے سر کے بال جھلسے ہوئے تھے اور صدری بھی جلی ہوئی نظر آتی تھی۔ دو تنومند محافظوں نے اپنے ہاتھوں کی کرسی بنا کر اس میں سامی خان کو بٹھایا ہوا تھا۔

گول چہرے والے سامی خان کو رستم نے آخری مرتبہ تب دیکھا تھا جب اسے سرِعام بازو کاٹنے کی سزا دی گئی تھی۔ تب وہ خاصا صحت مند تھا مگر اب کمزور دکھائی دیا۔ گولی اس کے ٹخنے میں لگی تھی اور پورا پاؤں لہولہان ہو رہا تھا۔ شریف کو اس کے لئے چارپائی خالی کرنا پڑی۔ شریف والی چارپائی پر گاؤ تکیہ لگا کر سامی خان کو لٹا دیا گیا۔ سامی خان کی صدری (جیکٹ) کی بائیں آستین بازو سے خالی تھی اور کچھ اسی قسم کی صورتِ حال سامی کے سسر برق جان کی بھی تھی۔ یعنی داماد اور سسر دونوں اپنے بائیں بازو سے محروم تھے اور یہ سب کچھ اس شوتم خان کے حکم پر ہوا تھا جو خود بھی اسی نوعیت کے جرم میں ملوث پایا گیا تھا۔ وہ پارسائی کا علم بردار بنتا تھا مگر ایک ساتھ دو عورتوں کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ثابت ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ پاؤندہ بستی بظاہر جتنی پارسا اور راست باز نظر آتی ہے، حقیقت میں اتنی نہیں ہے...... اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یہاں انصاف کا معیار وہ نہیں تھا جو سمجھا جا رہا تھا۔ اگر معیار وہی ہوتا تو پھر آج شوتم خان کا ایک بازو بھی اس کے جسم کے ساتھ موجود نہ ہوتا۔

برق جان کے ساتھ ایک بوڑھا مقامی معالج بھی تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی سامی خان کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ گولی سامی کے پاؤں کے اندر تھی اور خون مسلسل بہتا جا رہا تھا۔

اسی دوران میں لڑائی کچھ دیر کے لئے تھم گئی۔ دونوں طرف سے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائی جانے لگیں۔ لاشیں ابھی تک برف کے میدان میں پڑی تھیں۔ برق جان کے ساتھیوں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ انہیں آگے بڑھ کر اٹھاتا۔ بستی میں کئی جگہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور شعلے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اچانک رستم نے دیکھا کہ شوتم خان کی سائیڈ سے ایک پرچم بردار شخص آگے بڑھا۔ اس نے ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر زور زور سے کچھ کہا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' رستم نے داس سے پوچھا۔

''مقابلے کی دعوت دے رہا ہے، شوتم خان کی طرف سے۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''شوتم خان اپنے ہم منصب برق جان کو مقابلے کی دعوت دے رہا ہے۔ شوتم خان نے

برق جان سے کہا ہے کہ اگر وہ دوبدو مقابلہ کر کے اس لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو میدان میں آ جائے۔''

رستم نے برق جان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یہ چیلنج سن چکا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ الجھن بھی تھی۔

''کیا خیال ہے، برق جان مقابلے کے لئے نکلے گا؟'' ناصر نے واس سے پوچھا۔

''بہت مشکل ہے۔۔۔ یہ بات شوتم بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ برق جان کا صرف ایک ہاتھ ہے اور شوتم ماہر ترین کلہاڑی باز ہے۔ اس عمر میں بھی وہ بہ آسانی دو تین بندوں کو گرا سکتا ہے۔ ویسے شوتم نے یہ بھی کہا ہے کہ برق جان کے علاوہ کوئی بھی کلہاڑی باز اس کے سامنے میدان میں آ سکتا ہے۔''

رستم نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہم میں سے کوئی جا سکتا ہے؟''

''اس کی اجازت تو برق جان ہی دے سکتے ہیں۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ اجازت دیں گے۔ خاص طور پر وہ تمہارے لئے کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور ویسے بھی تم پوری طرح لڑائی کے قابل نہیں ہو۔ تمہارے کندھے کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا ہے۔''

ناصر نے بھی اس بات کی پُرزور تائید کی۔ دوسری طرف برق جان اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کر رہا تھا۔ سب کے چہروں پر تشویش دکھائی دیتی تھی۔ رستم کو واس سے معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑائی کے دوران برق جان کے گھر کے سامنے تین دستی بم پھٹے ہیں۔ اس واقعے میں برق جان کے کم از کم دس قریبی ساتھی ہلاک اور کئی درجن زخمی ہوئے ہیں۔ یہی لوگ برق کے دست بازو تھے۔

چند منٹ کے مشورے کے بعد برق جان نے تین افراد کو باقیوں سے علیحدہ کیا۔ ان میں سے دو برق کے قریبی رشتے دار تھے۔ اب ان میں سے ایک کا انتخاب ہونا تھا اور اس شخص کو شوتم سے مقابلے کے لئے جانا تھا۔ برق جان ان افراد کو لے کر علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔۔ کچھ دیر بعد اچانک رستم کو اندازہ ہوا کہ ناصر ارد گرد موجود نہیں۔ واس کو بھی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ واس نے برق جان کے محافظوں سے پوچھا۔ ان میں سے ایک نے انکشاف کیا کہ وہ تو تین افراد کے ساتھ ہی کمرے میں چلا گیا ہے اور اب برق جان کے ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس نے بھی خود کو مقابلے کے لئے پیش کر دیا تھا۔ رستم کے لئے یہ اطلاع تکلیف دہ تھی۔

اندر ہونے والا مشورہ طویل ہوتا گیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ شخص تیزی سے باہر نکلا اور گلی

سے باہر چلا گیا۔ ''یہ کہاں گیا ہے؟'' رستم نے واس سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ بڑی مجاری کی طرف۔ ایسے معاملوں میں اس سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ وہی کرے کہ تین چار منتخب افراد میں سے شوتم کے مقابلے پر کون جائے گا۔''

''یہ ایک سے ایک کے مقابلے والی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''مگر یہ یہاں کی روایت ہے۔ قبائلی جھگڑوں میں ایسا ہوا کرتا ہے۔''

باہر جانے والے عمر رسیدہ شخص کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگوں کی ڈوریوں کے چار ٹکڑے تھے۔ کچھ دیر بعد برق جان نے واس کو بھی اندر بلا لیا۔ واس جلد ہی واپس آ گیا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے واس؟'' رستم نے برہم لہجے میں دریافت کیا۔

''بڑی مجاری نے کہا ہے کہ شگون اچھے نہیں۔ یہ مقابلہ نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ گارنی کے بھینٹ نہ چڑھنے سے پوری بستی پر بوجھ آ گیا ہے۔''

''تو پھر مقابلہ نہیں ہو گا؟''

''مجاری تو یہی کہتی ہے۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ اگر مقابلہ ضروری ہے تو پھر سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہو۔''

''ڈوریوں کا کیا چکر ہے؟''

''یہ ایک طرح کی قرعہ اندازی ہے۔ برق جان اپنے ہاتھوں سے چار ''لڑاکوں'' کو چار ڈوریاں دے گا۔ ڈوری کا رنگ فیصلہ کرے گا کہ کون بندہ شوتم سے مقابلے پر جائے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور سب افراد باہر آ گئے۔ رستم یہ دیکھ کر چونکا کہ ان میں ناصر موجود نہیں۔ ''ناصر کہاں ہے؟'' رستم نے بلند آواز میں واس سے دریافت کیا۔

واس کے چہرے پر ہلچل تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ناصر کا چناؤ ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''قرعہ اندازی میں اس کا نام نکل آیا ہے۔ وہ شوتم سے مقابلہ کرے گا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' رستم نے سر پکڑ لیا۔ پھر وہ جھپٹ کر برق جان کی طرف گیا۔ ''مجھ سے مشورے کئے بغیر تم نے کیوں بھیجا اسے۔۔۔۔۔ کیوں ایسا کیا؟''

واس نے رستم کے الفاظ کا ترجمہ کیا۔ برق جان نے جواب دیا۔ ''یہ میرا نہیں تمہارا

اور اس کا معاملہ ہے۔ اس نے تم سے مشورہ ضروری نہیں سمجھا ہوگا یا اسے ڈر ہوگا کہ تم اسے جانے نہیں دو گے۔ بہرحال اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس نے خود کو پیش کیا اور اس کا نام قرعہ میں نکلا۔“

رستم سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس کے پاؤں میں بیڑی تھی ورنہ وہ ناصر کے پیچھے جانے کی کوشش کرتا۔ یہ بات درست تھی۔ ناصر کو بجا طور پر اندیشہ تھا کہ رستم اسے مہم جوئی سے روکنے کی کوشش کرے گا۔

کچھ ہی دیر بعد رستم اور واس نے ناصر کو نشیب میں برق جان کے گھر کے پہلو میں دیکھا۔ اس کے اردگرد برق جان کے کئی ساتھی موجود تھے۔ ایک شخص لمبی چابی کے ذریعے ناصر کے پاؤں کی بیڑی کھولنے میں مصروف تھا۔ دوسرا اس کے سر پر وہ آہنی ٹوپ چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا جو لڑائی بھڑائی کے موقعوں پر استعمال کیا جاتا تھا۔ تین چار ٹوپ بدلنے کے بعد ایک ناصر کے سر پر پورا آ گیا۔ دست بہ دست لڑائی میں یہ لوگ عام طور سے بائیں بازو پر ہاتھ اور کہنی کے درمیان ایک آہنی خول بھی چڑھاتے تھے۔ یہ خول ڈھال کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ ناصر کو بھی یہ خول لگا دیا گیا۔

رستم تپ کر برق جان کی طرف متوجہ ہوا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”تم نے درجنوں کے حساب سے ڈشکرے پال رکھے ہیں۔ کیا اس مشکل وقت میں تمہیں میرے ساتھی کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا؟“

واس نے رستم کے ان سخت الفاظ کو کافی حد تک نرم کر کے برق جان تک پہنچایا۔ برق جان نے جواب میں کہا۔ ”وہ خود اصرار کر کے قرعہ اندازی میں شامل ہوا تھا......اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ کامیاب رہے گا۔“

”تمہارا دل اتنی ہی سچی پیش گوئیاں کرتا ہے تو تہوار کی مستی میں تم بستی کی حفاظت سے کیوں غافل ہو گئے؟“

واس نے رستم کے اس تلخ جملے کا ترجمہ کر کے برق جان تک نہیں پہنچایا۔ وہ رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسی لڑائیوں میں سب سے اہم چیز لڑنے والے کا اعتماد ہوتی ہے اور مجھے تمہارے ساتھی میں بے حد اعتماد نظر آیا ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ تم دیکھتے رہنا۔“

”دیکھنے کے سوا اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

دونوں طرف سفید جھنڈے لہرا دیئے گئے۔ مطلب یہ تھا کہ لڑائی عارضی طور پر رکی ہوئی

ہے۔ سفید برفیلے میدان میں لاشیں ابھی تک بکھری ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کو اٹھانے کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ ریچھ کے کھیل والے آہنی پنجرے کے اندر ایک ریچھنی مُردہ پڑی تھی۔ اس کے سینے پر رستم کی آنکھوں کے سامنے رائفل کا پورا برسٹ لگا تھا۔ اسی طرح ڈھول پیٹنے والے دو ڈھولچی بھی اپنے ڈھولوں کے قریب مُردہ پڑے تھے۔ رقص کرنے والی دو خوش رنگ پائندہ لڑکیاں بھگدڑ میں کچلی گئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے سر جوڑے یوں برف پر لیٹی تھیں جیسے جوانی کی کوئی رنگین سرگوشی کر رہی ہوں۔ لیکن اب جوانی نہیں تھی ... نہ ہی سرگوشی تھی۔ سب کچھ اس خونچکاں قبائلی لڑائی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

”ناصر نے ایسا کیوں کیا؟“ رستم نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

واس نے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے بولا۔ ”اس نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہارا سچا دوست ہے۔ اب تک تم ہی ہر جگہ قربانی دیتے رہے ہو۔ اس نے ضروری سمجھا ہوگا کہ کہیں وہ بھی اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالے۔“

”لیکن اسے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔“

”مشورہ کرتا تو تم اسے کبھی نہ جانے دیتے۔ اسے تو یہ ڈر تھا کہ تم مشورے کے بغیر بھی اسے جانے نہیں دو گے۔ اسی لئے وہ چپکے سے کمرے میں چلا گیا۔“

”یہ لڑائی کس قسم کی ہوگی؟ کیا ان میں سے ایک قتل ہو جائے گا؟“

واس چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”عام طور پر ایسی لڑائیاں ایک شخص کے شدید زخمی یا قتل ہونے کے بعد ہی ختم ہوتی ہیں۔ لڑائی کے اصول کے مطابق ہار ماننے والے کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر ہار ماننا کوئی پسند نہیں کرتا۔“

فائرنگ رک جانے کے بعد سلاخ دار کھڑکی کھول دی گئی تھی۔ اس کھڑکی کی بلندی سے اردگرد کے مناظر دور تک واضح نظر آتے تھے۔ دونوں طرف کی مورچہ بندی کے درمیان ایک ”نومین لینڈ“ تھا۔ اس میدان پر کسی کا تسلط نہیں تھا۔ یہیں پر دونوں حریفوں میں مقابلہ ہونا تھا۔ ایک طرف سے ناصر برآمد ہوا اور دوسری طرف سے شوتم خان۔ ان کے ساتھ تین تین افراد مزید بھی تھے۔ میدان کے وسط میں ان تمام افراد کے درمیان چار پانچ منٹ تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر بھاری بھرکم شوتم خان کلہاڑی لہراتا اور بھنّاتا ہوا واپس چلا گیا۔ ناصر وہیں موقع پر موجود رہا۔

برق جان کا ایک ساتھی گھوڑا دوڑاتا ہوا برق جان تک پہنچا اور سلاخ دار کھڑکی کے نیچے سے پکار کر بولا۔ ”ملک برق جان! شوتم خان پیٹھ دکھا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس

نوجوان کا مقابلہ میں نہیں کروں گا۔ یہ میرا جوڑ نہیں ہے۔ میرے مقابلے میں برق جان خود آئے یا اپنے کسی ہم مرتبہ ساتھی کو بھیجے۔''

''لعنت بھیجو اس زانی ریچھ پر۔ اپنے بندے کو واپس لے آؤ۔'' برق جان چنگھاڑا۔

''جیسے آپ کا حکم ملک! لیکن وہ کہتا ہے کہ اگر اس نوجوان سے مقابلہ کرنا ہے تو پھر میں بھی اپنی طرف سے ایک بندہ اپنی مرضی کا بھیجتا ہوں لیکن اس ہار جیت کی وجہ سے لڑائی بند نہیں ہوگی۔ فقط یہ ہوگا کہ اگر میرا بندہ ہار گیا تو ہم اپنی صبح والی پوزیشن پر واپس چلے جائیں گے۔ اگر تمہارا بندہ ہار گیا تو تم اس جگہ پر واپس چلے جاؤ گے جہاں پچھلی لڑائی سے پہلے تھے۔''

''بکواس کرتا ہے حرامی۔ اس میں اس کی کوئی چال ہوگی۔'' برق جان نے دانت پیسے۔

اسی دوران میں برق جان کے چند مزید سرکردہ ساتھی آ گئے۔ ان میں دو تین افراد دستی بموں کے حملے میں زخمی ہوئے تھے۔ برق جان اور اس کے ساتھی کئی منٹ تک سر جوڑ کر مشورہ کرتے رہے۔ پھر وہ برق جان سمیت نیچے چلے گئے۔ ناصر کو میدان سے واپس بلایا گیا۔ اس سے بھی مشورہ کیا گیا۔ بالآخر فیصلہ، مقابلے کے حق میں ہوا۔ وہی باتیں طے ہوئیں جو ابھی شوتم خان نے کہی تھیں۔ اس لڑائی کے نتیجے میں مکمل ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہونا تھا۔ صرف پوزیشنیں تبدیل ہونا تھیں۔ ایک بار پھر ڈھول اور نفیریاں بجنے لگیں۔ ناصر سینہ تان کر اور کلہاڑی سونت کر میدان کے وسط میں پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے ایک لمبا تڑنگا کسرتی جسم شخص برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر واس نے بے ساختہ ''واہ'' کہا۔

''کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔ ''تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں، خطرناک شخص ہے۔ کافی خطرناک ہے۔ اپنے حریف کو اپنے غصے سے ہپناٹائز کر دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بہت زور زور سے للکارے مارتا ہے۔ گندی گالیاں دیتا ہے۔ نیم دیوانہ سا ہے۔''

رستم کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑ کر ناصر کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے سامنے اپنے سینے کی دیوار کھڑی کر دے۔ وہ جانتا تھا کہ ناصر ایک اچھا لڑاکا ہے لیکن اتنا نہیں، جتنے اس کے باقی ساتھی تھے۔ وڈے ڈیرے کا مکین لالہ فرید، حسنا گجراتی اور گوہرا وغیرہ چٹانوں کی طرح مضبوط تھے لیکن وہ سب کے سب ڈپٹی ریاض کی سفاکیوں کا شکار ہو کر پوٹھوہار کی تاریکیوں میں گم

ہو چکے تھے۔..... ناصر پیشے کے اعتبار سے ڈاکو نہیں..... ڈاکٹر تھا۔ وقت کی ستم ظریفی نے اس کے ہاتھوں سے کتابیں چھڑا کر اسلحہ تھمایا تھا اور اس نے کتابوں کی طرح اسلحے کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔ اس کی جی داری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے پوٹھوہار سے لے کر اس برف زار تک کے خطرناک راستوں میں قدم قدم پر رستم کا ساتھ دیا تھا اور آج وہ رستم کو ایک خطرناک صورتِ حال سے دور رکھنے کے لئے خود سینہ تان کر میدان میں پہنچ گیا تھا۔ غالباً اس کے دل میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ قرعہ اندازی میں شامل نہ ہوا تو رستم ہو جائے گا۔

پتا نہیں کیوں، رستم کو دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ ایک بے نام سا اندیشہ اس کی رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ کیا ناصر زندہ واپس آ سکے گا؟ نہ جانے کیوں رستم کے ذہن میں بار بار پرسوں رات کے واقعات آ رہے تھے۔ اس نے ناصر کو ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جسمانی ملاپ کا مشورہ دیا تھا جو گارنی تھی۔ گارنی کو یہاں بے حد مقدس خیال کیا جاتا تھا۔ اسے چھونا تو کجا، بُری نظر سے دیکھنا بھی گناہ تھا۔ کہیں..... زری والے واقعے کی وجہ سے کسی طرح کا وبال تو ناصر پر نہیں آ جائے گا۔ وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا مگر پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں ایک وہم اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ پرسوں رات ناصر، زری کے ساتھ تھا اور آج یکایک ہی اس نے ایک خطرناک مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نہ صرف فیصلہ کر لیا تھا بلکہ منتخب بھی ہو گیا تھا۔

رستم کو لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینہ رینگنے لگا ہے۔ ناصر کے حوالے سے اس کا اندیشہ بتدریج خوف میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے اس کا دل جیسے مٹھی میں لے لیا۔ مگر پھر ایکا ایکی اس نے ساری منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ اگر تم بھی اسی انداز میں سوچو گے تو پھر تم میں اور ان درخت پرست لوگوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ وہ لڑکی مقدس نہیں تھی۔ اسے ایک بیہودہ رسم کی بھینٹ چڑھانے کے لئے مقدس بنایا گیا تھا۔ تم نے ایک جھوٹے خوف کا بت توڑا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کیا تم نے اور ناصر نے۔

وہ بار بار یہ الفاظ اپنے دل میں دہرانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ اس کا دل نادیدہ مٹھی سے آزاد ہو گیا۔ پیشانی کا پسینہ سوکھنے لگا۔ ''کس خیال میں ہو رستم؟'' واس نے اسے ٹہوکا دیا۔

رستم چونک گیا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ ماحول کا اثر بندے پر کتنی تیزی سے ہوتا ہے اور بے بنیاد خوف انسان کو کتنی جلدی شکنجے میں جکڑتے ہیں۔''

واس کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں رستم کی طرف دیکھتا رہا۔ اُدھر میدان میں ڈنکے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقابلہ شروع ہو گیا۔ سینکڑوں لوگ دم بخود ہو کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ واس نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ ناصر کا مدِمقابل بہت گرانڈیل ہونے کے علاوہ از حد غصیلا بھی تھا..... اس نے بڑے گھیر کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور دھوپ میں تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ اپنی کلہاڑی بار بار خود ہی اپنے سینے پر مارتا تھا اور غضب ناک انداز میں چنگھاڑنے لگتا تھا۔ اس کے سر پر بھی آہنی ٹوپ موجود تھا۔ کلہاڑی، کلہاڑی سے ٹکرانے لگی۔ مقابلے کے پہلے دو منٹ میں ہی ناصر کی کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ مخالفین نے فلک شگاف نعرے بلند کئے۔ اس کے بعد ناصر اپنے مدِمقابل کے خوفناک للکاروں، چنگھاڑوں اور غصیلے نعروں کے سامنے بے دست و پا رہ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور صرف اپنی پھرتی اور اعتماد کے سہارے خود کو بچانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ شروع میں رستم کا خیال تھا کہ شاید اس کا مدِمقابل جرأت کا ثبوت دے گا اور اسے دوبارہ کلہاڑی اٹھانے کا موقع دے گا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ وہ کوئی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

کچھ بھی تھا، رستم ابھی تک پُرامید تھا۔ برق جان اور واس وغیرہ بھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ناصر اتنی جلدی ہار نہیں مانے گا مگر جب کافی کوشش کے باوجود ناصر دوبارہ اپنی کلہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا اور مدِمقابل کے حملوں میں مسلسل تیزی آتی گئی..... تو ایک بار پھر نہ جانے کیوں پرسوں رات کے مناظر آپوں آپ رستم کے پردۂ تصور پر نمودار ہونے لگے... تاریک برآمدے میں بیٹھ کر رستم نے ناصر کو کارنی زری کے پاس جانے پر آمادہ کیا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔ وہی زری جس کی طرف غلط نگاہ سے دیکھنا بھی مقامی عقیدے کے مطابق تباہ کن تھا۔ ناصر نے اس سے جسمانی تعلق قائم کیا تھا..... کیا واقعی اس کارروائی کی پاداش میں ناصر کے ساتھ کچھ ہونے والا تھا؟ کہتے ہیں کہ کچھ کرم ایسے ہوتے ہیں جن کا وبال ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسا کرم تھا جس کے ساتھ وبال منسلک تھا۔ ایک بار پھر رستم کا دل مٹھی میں جکڑا جانے لگا۔

اگلے تین چار منٹ کی لڑائی میں ناصر نے مدِمقابل کی ٹانگوں کے درمیان ایک زوردار ٹھوکر لگائی جس کے سبب وہ مچھلی کی طرح تلملایا۔ مدِمقابل کی طرف سے بھی ناصر کو تین چار شدید چوٹیں لگیں۔ دو چوٹوں کو تو سر کے آہنی ٹوپ نے جھیلا۔ ایک چوٹ اس کی کلائی کو زخمی کر گئی اور ناصر کی آستین سرخ نظر آنے لگی۔ پھر اچانک لڑائی رک گئی۔ کئی افراد دونوں حریفوں کے درمیان آ گئے۔

"یہ کیا ہوا؟" رستم نے پوچھا۔

"لڑائی کا درمیانی وقفہ۔ قریباً ہر چھ منٹ بعد یہ وقفہ ہوتا ہے مگر عام طور پر کلہاڑی کی ایسی لڑائیاں ایک وقفے سے زیادہ نہیں چلتیں۔ یعنی دس بارہ منٹ کے اندر اندر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس وقفے سے ناصر کو ایک خاص فائدہ بھی ہوا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ اپنی گری ہوئی کلہاڑی پھر سے اٹھا سکتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، وقفے سے پہلے وہ ناصر پر کس طرح بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ وقفے سے پہلے مقابلہ ختم ہو جائے۔"

"چلو یہ تو ایک اچھی خبر ہے۔"

ناصر کے ساتھ مقابلے میں حصہ لینے والے نہایت مشتعل پاؤندے کا نام فیروزا تھا۔ وہ "ریچھ کا کھیل" کھیلنے والے نام نہاد بنگش "نے مان" کا قریبی دوست بتایا جاتا تھا۔ اس کے لئے برف پر ہی ایک کالی چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ اس کے تین چار مسلح ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ دوسری طرف ناصر کے لئے بھی ایک سیاہ چٹائی بچھا دی گئی۔ برق جان کے ساتھیوں نے بھی اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس کی کلائی کے زخم پر پٹی باندھی جانے لگی۔ اس کی گری ہوئی کلہاڑی برف سے اٹھا کر اسے واپس دے دی گئی تھی۔

برق جان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اب ایک بار پھر ناصر کی طرف سے پوری طرح پُرامید نظر آتا تھا۔ اس نے ایک شخص کو تیز تیز لہجے میں کچھ ہدایات جاری کیں۔ ایک دوسرے شخص نے ہدایات سننے والے کو کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دی۔ ہدایات سننے والا نیچے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ناصر کے پاس میدان کے وسط میں پہنچ گیا۔

"یہ ناصر کو کیا بھیجا گیا ہے؟ کوئی مرہم وغیرہ ہے؟" رستم نے واس سے پوچھا۔

"نہیں۔ ایک عجیب شے ہے۔ تمہیں سن کر حیرانی ہو گی۔ یہ گوندھی ہوئی چکنی مٹی ہے۔ اس میں تھوڑا سا تیل ملایا جاتا ہے۔ یہ کانوں میں ٹھونسنے کے لئے ہے۔"

"کس کے کانوں میں؟"

"ناصر کے کانوں میں۔ جب یہاں کے لوگ شور سے یا کسی خاص قسم کی آواز سے بچنا چاہتے ہیں تو اسی طرح تیل ملی مٹی کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ بعد میں یہ آسانی سے نکل بھی آتی ہے۔ فیروزا کی خوفناک چنگھاڑوں سے ناصر کو بچانے کے لئے یہ مٹی بھیجی گئی ہے۔"

"برق جان نے مزید کیا کہا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

''ناصر کو حوصلہ دیا ہے۔ ...اور اسے فیروزا کے سب سے خطرناک داؤ سے آگاہ کیا ہے۔ یہ بدبخت دائیں ہاتھ سے سر پر الٹا وار کرتا ہے اور اکثر جب مدِمقابل بچنے کے لئے نیچے جھکتا ہے تو اس کی گردن اپنے بازو کے نیچے دبا لیتا ہے۔ اس کا یہ شکنجہ بڑا سخت ہے کلہاڑی سے بھی مہلک۔ بغل کے نیچے دبی ہوئی گردن ٹوٹ تو سکتی ہے، آزاد نہیں ہوسکتی۔''

قریباً دس منٹ بعد مقابلہ دوبارہ شروع ہوا۔ دونوں حریف پھر سے تازہ دم نظر آتے تھے۔ کلہاڑی اب پھر سے ناصر کے ہاتھ میں تھی۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا اور فضا نعروں اور للکاروں سے گونجنے لگی۔ نقارے کی دھما دھم دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر رہی تھی۔ یہ کوئی عام مقابلہ نہیں تھا...... اس میں زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہوگا۔ پھر اس مقابلے کے ساتھ ایک بھاری بھرکم شرط بھی نتھی تھی۔ تماشائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ فیروزا کی وحشیانہ چنگھاڑوں سے گاہے بگاہے فضا گونج اٹھتی تھی۔ ناصر بڑی استقامت سے دفاع کر رہا تھا۔ کسی وقت موقع دیکھ کر جوابی وار بھی کرتا تھا۔ اب ناصر کی کامیابی اس صورت میں تھی کہ کلہاڑی دوبارہ اس کے ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ مگر اس مرتبہ جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مدِمقابل کا ایک وار روکتے ہوئے ناصر کی کلہاڑی کا دستہ درمیان سے ٹوٹ گیا۔ باقی دستہ پھل سمیت اچھل کر دور جا گرا۔ شوتم خان کے سینکڑوں ساتھیوں نے زبردست شور وغل مچایا اور رائفلیں اوپر اٹھا کر ہوائی فائرنگ کی۔

رستم کی پیشانی پر پھر پسینہ چمکنے لگا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا بالکل غیر متوقع تھا۔ ناصر ایک بار پھر اپنے مشتعل حریف کے سامنے نہتا رہ گیا تھا ...کیا واقعی سب کچھ کسی بدشگونی کا نتیجہ تھا؟ اس کے ذہن میں ایک بار پھر وہم کی دھند بھرنے لگی۔ اس دوران میں ناصر ڈٹ کر اپنا دفاع کرتا رہا۔ یکایک اس کا ایک داؤ چل گیا۔ فیروزا کی کلہاڑی والی کلائی ناصر کے دونوں ہاتھوں میں آگئی۔ اس نے کلائی پوری قوت سے دبوچی اور اپنے گھٹنے کی طوفانی ضربیں کلائی پر لگا کر کلہاڑی فیروزا کے ہاتھ سے چھڑا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے دھکیلتا ہوا میدان کے آخری کنارے تک لے گیا۔ اس مرتبہ دوسری طرف کے تماشائیوں نے جوش میں چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

مقابلہ ایک بار پھر برابر نظر آنے لگا۔ لوگ گھروں کی چھتوں پر، چٹانوں پر اور ہر اونچی جگہ پر کھڑے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، تماشائیوں کی ٹولیاں نظر آرہی تھیں۔ برق جان اور اس کے ساتھیوں کے چہرے تمتمانے لگے۔ وہ جہاں تھے، وہیں پر سے نعرے بلند کر رہے

تھے۔ رستم کا دل پھر چاہنے لگا کہ وہ اڑ کر میدان کے وسط میں پہنچ جائے اور ناصر کی حوصلہ افزائی کرے۔ جب دو افراد لڑتے ہیں تو ان میں کسی ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ اس لڑائی میں دونوں حریف بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے لیکن اچانک ...اس لڑائی کی ''ہار'' ناصر کے حصے میں آگئی۔ وہ فیروزا سے گتھم گتھا تھا جب یکایک برق جان اور اس کے ساتھیوں نے سر پیٹ لیا۔ واس کے منہ سے بے ساختہ ''اوہ'' کی طویل آواز نکل گئی اور اس نے سخت مایوسی کے عالم میں میدان کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

پہلے تو رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اچانک اس پر حقیقت حال کا انکشاف ہوا اور اس کے جسم میں بھی سردی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑائی کے زور میں ناصر سے ایک کلیدی غلطی ہوگئی تھی۔ اس کی گردن فیروزا کے بازو کے شکنجے میں چلی گئی تھی۔ اب ناصر گردن چھڑانے کی کوشش کے لئے جتنا زور لگا رہا تھا، اتنا ہی بے بس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی گردن کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی تھی۔ فیروزا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے ناصر کا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ ناصر کا نرخرہ توڑنے کی بہترین پوزیشن میں آگیا تھا۔ ناصر اپنا ہاتھ برف پر پڑی اس کلہاڑی تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے فیروزا کے ہاتھ سے گری تھی۔ کلہاڑی اور ناصر کے ہاتھ میں دو تین فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا...... مگر حقیقت میں یہ فاصلہ بہت ...... بہت طویل تھا۔ فیروزا اپنے ساتھیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ گردن توڑ دوں یا رکوں؟ کیا ناصر ختم ہو رہا ہے؟ رستم نے خود سے پوچھا۔

اسی دوران میں برق جان نے گھر کی کھڑکی میں سے ایک مایوسی بھرا اشارہ کیا۔ برق جان کے دو تین ساتھی دوڑتے ہوئے ناصر اور فیروزا کے پاس پہنچ گئے۔ دوسری طرف سے بھی کئی افراد بھاگتے ہوئے آگئے۔ فیروزا اور ناصر ان لوگوں میں چھپ کر رہ گئے۔ یہ رستم کے لئے بے حد صبر آزما اور اذیت ناک لمحات تھے۔ اتنی دوری سے بالکل پتا نہیں چل رہا تھا کہ ناصر زندہ ہے یا نہیں۔ برق جان اور واس وغیرہ بھی [illegible] سے ہی لگا سکتے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' رستم نے لرزاں آواز میں واس سے پوچھا۔

''ملک برق جان نے شکست ماننے کو کہا ہے لیکن ''

''ناصر کی جان بچی ہے یا نہیں؟''

''ابھی... اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' واس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میدان کے وسط میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ ناصر ابھی تک فیروزا کے جان لیوا شکنجے میں تھا... تاہم اتنی دوری سے واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم کو اپنے پاؤں کی

بڑی جتنی وزنی ان لمحوں میں محسوس ہوئی، پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

آخر دونوں طرف کے مشتعل افراد ایک دوسرے سے پیچھے ہٹے۔ فیروزا بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا مگر ناصر نہیں اٹھا... وہ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سفید برف پر بالکل بے حرکت پڑا تھا۔

کیا ایک اور ساتھی بچھڑ گیا؟

کیا سینے پر ایک اور نہ بھرنے والا گھاؤ لگ گیا؟

کیا بے جی اور چاچا ابراہیم کی نگاہیں کبھی اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکیں گی؟

کئی سوال رستم کے سینے میں آہنی میخوں کی طرح گڑ گئے۔ وہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ پیغام رسانی کرنے والا گھڑسوار گھوڑا دوڑاتا کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اس نے بلند آواز سے برق جان کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر واس نے ہولے سے رستم کا ہاتھ دبایا......اور سرگوشی کی۔

''وہ زندہ ہے......بس بے ہوشی کی حالت میں ہے۔''

رستم کا دل جیسے پھر سے دھڑکنے لگا۔ کچھ افراد ایک تختہ نما اسٹریچر پر ناصر کو میدان سے باہر لے آئے۔ اس کے سر سے آہنی خود اُتار دیا گیا تھا۔ اس کی شکستہ کلہاڑی اس کے پہلو میں رکھی تھی۔ برق جان اور اس کے ساتھی سر جھکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

اگلے دس بارہ گھنٹوں میں اس پائندہ بستی کے اندر کئی تیز رفتار تبدیلیاں آئیں۔ شرط ہارنے کی وجہ سے برق جان، سامی خان اور ان کے ساتھیوں کو اپنی پوزیشنوں سے پیچھے ہٹنا پڑا......اور وہ ساری جگہ شوتم اور اس کے حامیوں کو دینا پڑی جو انہوں نے پچھلے معرکے میں حاصل کی تھی۔ یوں وہ ایک بار پھر جمی ہوئی جھیل اور اس کے قریب کی آبادی میں آن موجود ہوئے۔ بہرحال پہلے معرکے میں ان کے ہاتھ سے نکل جانے والی سرنگ اور اردگرد کا علاقہ اب بھی ان کی پہنچ سے باہر تھا۔

ان تبدیلیوں کی وجہ سے شوتم خان کی گرتی ہوئی ساکھ کو ایک دم سہارا مل گیا۔ اس کے کئی ایک سرکردہ حامی جو اس کا ساتھ چھوڑنے کا سوچ رہے تھے پھر سے اس کے گرد جمع ہوگئے۔ شوتم خان کے اس دلیرانہ فیصلے کو سراہا جا رہا تھا کہ اس نے کھلے میدان میں خود کو دوبدو مقابلے کے لئے پیش کیا۔ اس پیشکش کے نتیجے میں ہی بعدازاں فیروزا اور ناصر کا مقابلہ ہونا طے پایا جس کا نتیجہ شوتم کے لئے کامیابی کی صورت میں نکلا۔

دوسری طرف مایوسی کا دور دورہ تھا۔ ناصر کے دلیرانہ مقابلے اور اس کی مہارت کو تو بے شک سراہا جا رہا تھا مگر آخر میں بالکل اچانک پانسا پلٹ گیا تھا۔ عام لوگ چونکہ توہم پرست

تھے، ان میں ایک اور طرح کا تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ساری نحوست اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہے کہ تہوار کے دوسرے روز تین کے بجائے دو گارنیوں کو بھینٹ چڑھایا گیا اور تیسری گارنی کی حفاظت نہیں کی جا سکی۔

رستم اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ واس آئے اور وہ اس سے باہر کے حالات معلوم کر سکے۔ رستم اور شریف ابھی تک اسی مکان میں تھے جس کی بلندی سے وہ کل جنگ کا نقشہ دیکھتے رہے تھے۔ ناصر کو طبی امداد کے لئے کہیں اور لے جایا گیا تھا۔ وہ ابھی تک ان کے پاس واپس نہیں آیا تھا۔ یعنی ایک ڈاکٹر خود بیمار تھا اور اس کا علاج ایسے لوگ کر رہے تھے جو اس سے کہیں کم ہنرمند تھے۔ کل رات کی اطلاع کے مطابق ناصر کی حالت اطمینان بخش تھی۔ درحقیقت اس کی گردن کئی منٹ تک فیروزا کے شکنجے میں رہی جس کی وجہ سے اس کا دم گھٹا اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کی گردن ورم زدہ تھی اور وہ شدید کھچاؤ محسوس کر رہا تھا۔ لڑائی رکنے کے بعد زخمی سامی خان اور برق جان وغیرہ اپنی اصل رہائش گاہ میں واپس جا چکے تھے۔

شام سے ذرا پہلے واس آیا تو رستم نے اس سے ناصر کا احوال پوچھا۔ واس بولا۔ ''وہ بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل تک یہاں واپس آجائے۔''

''وہ زیادہ افسردہ تو نہیں؟''

''افسردہ ہونے والی کوئی بات ہی نہیں۔ وہ بڑی دلیری اور ہمت سے لڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ لڑائی میں کسی ایک کی تو ہار ہوتی ہے۔ لیکن......بستی کے عام لوگ بہت مایوس ہیں۔ وہ برق جان کو الزام دے رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ گارنی زری کی حفاظت کیوں نہ کی جا سکی۔ ان کا خیال ہے کہ ایک گارنی کے بھینٹ نہ چڑھائے جانے کی وجہ سے ہی یہ مصیبت آئی ہے۔ ورنہ شوتم خان تو گرتی ہوئی دیوار جیسا ہوگیا تھا۔''

''برق جان نے لوگوں کو زری کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ اس کے ساتھ کسی نامعلوم شخص نے زیادتی کی ہے۔ وہ تمہارا نام لے دے تو لوگ تمہارے چیتھڑے اُڑا کر رکھ دیں......اور وہ فی الحال تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔''

''مگر تین محافظوں اور بڑی مجاری کو تو سب کچھ معلوم ہے۔''

''ملک برق جان نے انہیں مکمل زبان بندی کا حکم دیا ہے۔''

''کیا بڑی مجاری بھی مکمل زبان بندی پر عمل کر سکے گی؟'' رستم نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال اہم ہے۔'' واس کا لہجہ متفکر تھا۔

رستم نے اپنے کندھے کے زخم کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''زری اب کہاں ہے؟''

''اس کا سر مونڈ دیا گیا ہے۔ بھنویں بھی مونڈ دی گئی ہیں۔ اس کے گلے میں لوہے کا منحوس کڑا ڈال دیا گیا ہے۔ وہ برق جان کی سخت تحویل میں ہے...... لیکن کچھ بھی ہے، زندہ تو ہے۔''

''کہیں راز کو راز رکھنے کے لئے اس کو مار تو نہیں ڈالا جائے گا؟''

''ڈر تو مجھے بھی ہے۔'' واس نے کہا۔ ''لیکن امید نہیں کہ برق جان اتنی جلدی کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے۔''

واس نے چند لمحے توقف کیا پھر رستم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں تم عورت پرست نہیں ہو۔ نہ ہی مجھے تمہارے کردار میں کوئی ڈھیل نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود تم زری کے قریب گئے۔ اتنا بڑا خطرہ مول لیا...... کیوں؟ کیوں کیا ایسا؟''

''تمہارے خیال میں کیوں کیا؟''

واس نے گڑگڑی کے چھوٹے چھوٹے دو تین کش لئے اور بولا۔ ''میں جانتا ہوں رستم! تم کسی بھی طرح زری کو بچانا چاہتے تھے۔ ایک اتفاق کے تحت وہ تمہارے پاس چلی آئی اور تم نے یہ موقع ضائع نہیں کیا۔ وقتی طور پر تم اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ زری موت کے چنگل میں جانے سے بچ گئی۔ اللہ کرے وہ بچی رہے......'' واس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک گئی۔ اس نے رستم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں نے جو کچھ کیا، اس کے لئے تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''نہیں۔'' واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہاری نیت کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم نے ایک بڑا خطرہ مول لیا۔ بے عزتی برداشت کی۔ برق جان اور محافظوں نے اس رات تم سے جو مار پیٹ کی اس کے لئے مجھے بڑا افسوس ہے۔''

رستم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''لوگ اب کیا کہہ رہے ہیں؟''

''لوگ بہت بدظن ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اگیارے میں خصوصی عبادت ہو رہی تھی اور گناہوں کی معافی مانگی جا رہی تھی۔ لوگ برق جان اور بڑی مجاری سے تفصیل جاننا چاہتے ہیں کہ تیسری گارنی کے ساتھ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ وہ مجرم کی نشاندہی چاہتے ہیں اور اسے عبرت ناک سزا دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کئی سرکردہ افراد نے دھمکی دی ہے کہ اگر گارنی کو خراب کرنے والا درندہ گرفتار نہ ہوا تو وہ برق جان کو چھوڑ دیں گے۔''

''کسی پر شک بھی کیا جا رہا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

واس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ وہ چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''ابھی تک تو نہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ کچھ لوگوں کا دھیان تمہاری اور ناصر کی طرف بھی جائے گا۔ زری اکثر میرے گھر میں آتی رہتی تھی۔ پھر جب تم فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے، تب بھی وہ تم لوگوں کے ساتھ تھی۔ خاص طور سے وہ تمہارے ارد گرد رہتی تھی۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔'' رستم نے تائید کی۔

''بہرحال...... یہاں برق جان نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ اس نے کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی کہ زری اس رات کہاں پائی گئی تھی۔ عام لوگوں کو یہی بتایا گیا ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا، مجار خانے کے اندر گھسا۔ اس نے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر سادہ لوح لڑکی کو بے بس کیا اور بے آبرو کر دیا۔ امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ شاید وہ لداخی پہرے داروں میں سے کوئی تھا۔ مشروب کے نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور وہ کر گزرا جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔''

''کوئی پکڑ دھکڑ بھی ہوئی ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''ہاں۔ تین چار افراد کو پوچھ گچھ کے لئے پکڑا تو گیا ہے مگر عام لوگ اس کارروائی کو بالکل ناکافی سمجھ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ برق جان کو اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔''

بات کرتے کرتے اچانک واس چونک گیا۔ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی تھی۔ رستم نے بھی اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور چونکا۔ یہ بڑی مجاری تھی۔ وہ اپنی موٹی اوڑھنی میں لپٹی لپٹائی کسی تند بگولے کی طرح برق جان کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے عقب میں دو محافظ بھی تھے۔ بڑی مجاری کے قدموں میں ایک طرح کی مشتعل تیزی تھی جو صاف طور پر محسوس ہوتی تھی۔

''یہ کہاں جا رہی ہے؟''

''میں دیکھتا ہوں۔'' واس نے کہا اور اٹھ کر خود بھی برق جان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ حالات ایک خاص رخ اختیار کرتے جا رہے تھے...... خاص طور سے دوبدو مقابلے میں شوتم خان کے بندے کی جیت کے بعد عام لوگ برق جان سے خفا خفا نظر آنے لگے تھے اور اس کی بڑی وجہ زری والا معاملہ ہی تھا۔ اپنے عقیدے کے مطابق وہ اسے بہت بُرا شگون قرار دے رہے تھے۔

بیمار شریف دنیا و مافیہا سے بے خبر سویا پڑا تھا۔ رستم کمرے میں ٹہلنے لگا اور واس کی

واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی سے پہلے بڑی مجاری کی واپسی ہوئی۔ وہ جس طرح بھنائی ہوئی آئی تھی اسی طرح واپس مجار خانے کی طرح چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واس کی صورت بھی دکھائی دی۔ وہ ڈھلوان چڑھ کر اوپر رستم کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر تلاطم کی سی کیفیت تھی۔

"معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" واس نے کہا۔

"کیا بات ہوئی ہے؟" رستم نے دریافت کیا۔

جواب میں واس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق برق جان اور بڑی مجاری کے درمیان کچھ اس طرح مکالمہ ہوا۔ یہ مکالمہ مکمل تنہائی میں ہوا۔

مجاری نے نہایت خفا لہجے میں برق جان سے کہا۔ "یہاں پر آبوک کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں یہ سب کچھ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ گارنی کا بھینٹ کے قابل نہ رہنا ہی بہت بڑا جرم ہے۔ اب دوسرا بڑا جرم یہ ہو رہا ہے کہ مجرم کو سزا نہیں مل رہی۔"

برق جان نے کہا۔ "سزا کیوں نہیں ملے گی۔ ضرور ملے گی۔ سزا میں تاخیر ضرور ہو رہی ہے لیکن معافی کا تو ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میں یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ ہم اتنے خوفناک جرم کے بعد آبوک کے غضب کو آواز کیوں دے رہے ہیں؟ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم پر زیادہ بڑی آفت آئے۔ ہمارے بال بچوں کو ذبح کیا جائے اور ہمارے گھروں کو جلا دیا جائے۔ آخر کیا وجہ ہے اس سزا میں دیر کی؟"

جواب میں برق جان نے کہا۔ "جو بندہ بستی اور قبیلے کا ذمے دار ہوتا ہے اس کی کچھ مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ میں نے تم سے درخواست کی تھی بڑی ماں...... کہ کچھ دیر کے لئے خاموشی اختیار کر لو۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو تم کہو گی......"

"میں تو چند دن اور خاموش رہ سکتی ہوں لیکن لوگ خاموش نہیں ہیں۔ وہ سوال پوچھ رہے ہیں برق جان وہ پوچھ رہے ہیں کہ واقعے کے وقت مجار خانے والے کہاں سوئے ہوئے تھے۔ اتنے محافظوں اور پہرے داروں کے باوجود وہ بندہ کیسے گارنی تک پہنچا اور کیسے اس کی عزت سے کھیلتا رہا اور اب وہ کہاں ہے؟ اسے سامنے کیوں نہیں لایا جا رہا اور میں سچ کہہ رہی ہوں، کچھ لوگوں کو اس بات کا شک بھی ہے کہیں مجرم ان بردوں میں سے تو نہیں جو واس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"دیکھو بڑی ماں! تم زبان بند رکھو گی تو سب ٹھیک رہے گا۔ کچھ بھی برا نہیں ہوگا۔"

"برا تو ہو چکا ہے برق جان...... اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ اب تو توبہ کا وقت ہے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کا وقت ہے۔ تم لوگ سب کچھ دیکھ کر بھی عبرت کیوں نہیں پکڑتے ہو۔ اتنا بڑا جرم ہوا اور تمہیں پھر بھی احساس نہیں۔ میں پوچھتی ہوں اس شخص کو...... اس ملعون شخص کو زندہ آگ میں کیوں نہیں ڈالا جاتا؟ اگر وہ تڑپ تڑپ کر نہ مرا تو ہم سب کو مرنا ہوگا۔ میں آج تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ ہم سب کو مرنا ہوگا۔ وہ شام دور نہیں جب دشمن کی کلہاڑیاں ہوں گی اور ہماری گردنیں ہوں گی۔"

برق جان بولا۔ "بڑی ماں! زیادہ جوش میں آنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تم بات کو سمجھ نہیں پا رہی ہو۔"

"میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ بس ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ آخر تمہارے دل میں ان تین غیر لوگوں کے لئے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ میں اتنی نادان نہیں برق جان کہ سامنے کی چیز کو بھی نہ دیکھ سکوں۔ ان تین بندوں نے تیسری بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھ گارنی زری کو بھی لے جانا چاہتے تھے۔ ان کی اس کوشش کے نتیجے میں ایک وفادار محافظ جان سے گیا۔ وہ پکڑے گئے...... لیکن ان کو سزا نہیں دی گئی۔ ان کے جرم کا سارا بوجھ ایک بوڑھے بندر جانسن پر ڈال دیا گیا جو پہاڑ سے گر کر مرا تھا۔ مجھے بتاؤ کیا ایسا نہیں ہوا برق جان؟"

یہاں تک بات چیت ہوئی تھی جب بڑی مجاری کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اسے پانی وغیرہ پلایا گیا۔ کچھ دیر بعد جب دوبارہ گفتگو شروع ہوئی تو مجاری کا لب و لہجہ کچھ دھیما تھا۔ بہرحال وہ بار بار یہی بات دہرا رہی تھی کہ اگر مجرم کو بہت جلد قرار واقعی سزا نہ ملی تو سب کو آنے والے دو چار دنوں میں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس نے شام کے بعد آسمان پر دیر تک چھائی رہنے والی سرخی کا ذکر بھی کیا اور اپنے علم کے حساب سے برق جان کو بتایا کہ یہ بدشگونی ہے اور اس کا اشارہ واضح طور پرشوتم کی فتح اور ہم سب کے قتل کی طرف ہے۔

واس کی بات ختم ہوئی تو رستم دیوار سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھا۔ بال اس کی پیشانی اور رخساروں پر جھول رہے تھے۔ اس نے انہیں پیچھے ہٹا کر کانوں کے پیچھے اڑسا اور بولا۔

"کیا تمہیں مجاری کی باتوں پر یقین ہے واس؟"

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں رستم ...... لیکن یہاں کے لوگوں کے عقیدے بڑے پکے ہیں۔ کبھی کبھی ان عقیدوں کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ بندہ جو بات پورے یقین کے ساتھ سوچتا ہے، وہ کبھی کبھی انہونی ہونے کے باوجود ہونی ہو جاتی ہے۔''

''بڑی جاہلوں والی سوچیں ہیں ان پاؤنڈوں کی۔ لگتا ہے کہ دو ہزار سال پہلے کے لوگ ہیں یہ۔''

''دو ہزار سال پہلے کے لوگ ہمارے ملک میں اب بھی بے شمار جگہوں پر موجود ہیں۔'' واس مسکرایا۔ ''اس برف زار کا اسیر ہونے سے پہلے میں پاکستان اور انڈیا کے بہت سے علاقوں میں گھوما پھرا ہوں۔ کیا ہمارے دیہاتی علاقوں میں تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کو ماننے والے لوگ ان لوگوں ہی کی طرح وہم پرست نہیں......؟ وہاں بھی تو یہی کچھ ہوتا ہے رستم۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں جبکہ یہ غیر مذہب کے ہیں۔''

رستم کا دھیان قدرت اللہ اور اس کے سفلی عملیات کی طرف چلا گیا۔ اس کے ذہن میں وہ مکروہ مناظر گھوم گئے جب قدرت اللہ جنسی عمل میں مشغول جانوروں اور پرندوں کو ہلاک کرتا تھا اور ان کے تازہ لہو کو اپنے جادو ٹونے میں استعمال کرتا تھا۔ پرندوں کے سروں کے ہار، خون سے بھرے ہوئے پیالے، مُردوں کی ہڈیاں، چتاؤں کی راکھ، پتا نہیں کیا کچھ رستم کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اگلے روز سارا دن بستی میں بے چینی کی سی کیفیت رہی۔ دونوں متحارب گروہ اب ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے تھے۔ شرط ہارنے کے بعد برق جان کو بستی کا قریباً چار مربع میل علاقہ شوتم خان اور اس کے ساتھیوں کو دینا پڑا تھا۔ منجمد جھیل اور آبی گزرگاہ کا علاقہ بھی ان حدود میں آ جاتا تھا۔ ان حدود میں بستی کے بہت سے مکانات بھی شامل تھے۔ یہ مکانات قدرے بلندی پر واقع تھے۔ یہاں شوتم خان کے ساتھیوں نے اپنے جھنڈے لہرا دیے تھے اور مورچہ بندی کر لی تھی۔ وہ ان مکانوں کی چھتوں پر چلتے پھرتے صاف نظر آتے تھے۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے دونوں فریق گاہے بگاہے ہوائی فائرنگ بھی کر رہے تھے۔

یہ بات بھی سنی جا رہی تھی کہ شوتم خان نے اپنے لوگوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگیارے میں چلہ کشی کے دوران اس پر آسیب کے سے اثرات ہو جاتے تھے۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا، وہ کب اور کیسے ان دونوں عورتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا..... پھر بھی اس نے عہد کیا تھا کہ لڑائی ختم ہونے کے فوراً بعد وہ خود پر بھی وہی قانون لاگو

کرے گا جو دوسروں پر لاگو ہے۔ خود کو پاک کرنے کے لئے وہ اپنا بایاں ہاتھ قطع کروا لے گا۔

اس روز شام کو ناصر بھی واپس رستم کے پاس آ گیا۔ اس کی ورم زدہ گردن پر روئی وغیرہ رکھ کر پٹی باندھی گئی تھی۔ کلائی پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں بیڑی بھی موجود تھی۔ تاہم رستم کی توقع کے برعکس وہ صحت مند نظر آتا تھا۔ رستم نے اسے گلے لگایا اور دیر تک اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا۔ وہ اس موقع پر ناصر سے یہ جائز شکایت کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے مشورہ کئے بغیر دوبدو مقابلے میں کیوں شریک ہوا۔ اس نے کہا۔ ''اصل چیز ہار جیت نہیں ہوتی...... وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے اور تمہارا جذبہ سب نے دیکھا ہے۔ کسی ایک شخص کو بھی تم سے شکوہ نہیں ہے شاید۔''

''مجھے دوسروں کی پرواہ نہیں رستم بھائی! لیکن اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں دلیری سے لڑا ہوں تو پھر مجھے تسلی ہے۔ لیکن اس بات کا افسوس تو بہرحال رہے گا کہ میں لوگوں کی توقعات پر پورا نہ اُتر سکا اور میں بالکل آخر میں مقابلہ ہار گیا۔''

''کھلے دل کے ساتھ ہار کو ماننا بھی جیت کے قریب قریب ہوتا ہے۔ بس آخر میں تھوڑی سی غلطی ہو گئی ورنہ سب کچھ برابر برابر جا رہا تھا۔''

''لیکن میں اس بندے سے ایک بار اور لڑوں گا ضرور۔'' ناصر نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ اب تمہیں یہ موقع جلد ہی مل جائے۔'' رستم نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

رستم کی نگاہیں کہیں دور ان دیکھے نقطے پر مرکوز تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ ''سچ بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے ہماری ہمدردی کسی فریق کے ساتھ نہیں تھی۔ ان میں سے کوئی بھی جیتتا یا ہارتا، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا...... لیکن اب پڑتا ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''تم نے دیکھا ہی ہو گا...... برق جان کے ساتھی اور عام لوگ کس طرح بپھرے ہوئے ہیں۔ ان کے غصے کی وجہ زری والا واقعہ ہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شوتم خان کے ساتھ لڑائی میں جو ناکامی ہو رہی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تیسری گارنی کو ذبح نہیں کیا جا سکا۔ وہ بڑی لمبی چوڑی باتیں بنا رہے ہیں۔ اگر اب برق جان کو مزید شکست ہوتی ہے تو یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر اور پکے ہوں گے۔ ان کا یہ معصوم لڑکیوں کی جان لینے والا وہم اور جڑ پکڑے گا

اور میرا دل چاہتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ حالات میں کوئی ایسی تبدیلی آئے کہ ان لوگوں کے منہ بند ہوجائیں ویسے بھی اب ہم برق جان گروپ کے ساتھ انیچ ہو چکے ہیں۔ اب اس گروپ کا جیتنا ہمارے لئے فائدہ مند ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔"

اب ناصر کی آنکھوں میں بھی سوچ کی گہری پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ رستم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تو اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح شوتم خان کو مار پڑے اور وہ اس لڑائی میں ہار مان لے۔"

"خیال تو آپ کا نیک ہے لیکن......اس حوالے سے آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ بھی ہے؟"

"منصوبے کا کیا ہے، وہ بھی بن جائے گا۔ اصل چیز تو ارادہ ہوتی ہے۔"

"اگر آپ نے ارادہ کرلیا ہے تو پھر میں آپ کے ارادے کے ساتھ ہوں۔" ناصر نے پورے عزم سے کہا۔

رستم کچھ دیر تک گہری سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ "میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ لڑائی میں اپنے ملک یعنی سردار کی جان کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ لڑائی میں برق جان کو پیچھے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح شوتم خان بھی اپنے خاص محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ ایسی قبائلی لڑائیوں میں اگر سردار مارا جائے تو اس کو بدترین شکست سمجھا جاتا ہے اور لڑائی ختم ہوجاتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ براہ راست شوتم خان کو نشانہ بنایا جائے؟"

"شوتم خان اور ارفا خان دونوں کو۔ ممکن ہے کہ شوتم کے مرنے کی صورت میں اس کے بیٹے کو فوراً سرداری کا درجہ مل جائے۔ اگر یہ دونوں ختم ہوجائیں تو یہ گروہ کچھ عرصے کے لئے اپنے سردار سے محروم ہوجائے گا۔"

"ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لڑائی کے دوران میں ان دونوں کو خاص طور سے ٹارگٹ بنایا جائے۔" ناصر نے کہا۔

"مجھے تو یہ کام مشکل لگتا ہے۔ لڑائی سے پہلے ہی کوئی کارروائی ہوسکے تو زیادہ بہتر ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے، کمانڈو ایکشن جیسی کوئی کارروائی؟"

"بالکل۔ ایسا ہوسکتا ہے مگر اس سلسلے میں پہلے برق جان سے تفصیلی بات کرنی ہوگی۔"

دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ناصر نے ایک طویل سانس لیتے

ہوئے کہا۔ "رستم بھائی! زری کا کچھ پتہ چلا؟"

"بہت پریشانی ہورہی ہے اس کے بارے میں؟" رستم نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ میں سخت الجھن میں ہوں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ جو کیا، ٹھیک کیا۔ کسی وقت لگتا ہے کہ غلط کیا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس کے جسم کے ساتھ دھوکا کیا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں اسے میرے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں۔ وہ تو بس آپ کو جانتی ہے۔"

"میں نے پرسوں واس سے پوچھا تھا۔ زری خیریت سے ہے۔" رستم نے کہا۔ "برق جان نے ابھی اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔"

"کیا ہم کسی طرح اس سے مل سکتے ہیں؟" ناصر کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ابھی تو یہ بہت مشکل ہے اور ہمیں اس طرح کا کوئی خطرہ مول بھی نہیں لینا چاہیے۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ہم مشکوک ہیں۔"

برق جان سے رستم کی ملاقات اگلی روز صبح سویرے ہوسکی۔ رستم نے واس سے اصرار کرکے برق جان کو تھوڑی دیر کے لئے یہاں بلایا تھا۔ واس بھی اس کے ساتھ تھا۔

برق جان نے واس کے ذریعے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جو بھی کہنا ہے، جلدی کہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ لڑائی کسی بھی وقت پھر شروع ہوسکتی ہے۔ مجھے بہت سے انتظام کرنے ہیں۔"

رستم نے کہا۔ "کیا ایسا ہوسکتا ہے برق جان کہ تم پچھلے واقعے کو بھول کر ایک بار پھر ہماری بیڑیاں کھلوا دو اور ہمیں اس لڑائی میں حصہ لینے کا موقع دو؟ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اس مرتبہ ہم دونوں واقعی تمہارے شانہ بشانہ شوتم خان کے ساتھ لڑیں گے۔"

"میرے لئے اب یہ بہت مشکل ہے۔ میں تو شاید مان بھی جاؤں لیکن میرے ساتھی کسی بھی صورت دوسری مرتبہ دھوکا کھانا نہیں چاہیں گے اور سچی بات یہ ہے رستم کہ تم نے خود کو قابل اعتماد ثابت نہیں کیا......اور ایسا ایک بار نہیں زیادہ بار ہوا ہے۔"

"تم میرے بار بار فرار ہونے کی بات کررہے ہو۔ یہ دھوکا نہیں تھا۔ یہ میرا حق تھا اور اب بھی ہے لیکن تمہیں یاد ہوگا، میں نے آج تک تم سے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا جو اب کررہا ہوں۔"

"کیسا وعدہ؟"

"یہی کہ اس بار کوئی چال نہیں ہے۔ہم تمہارے شانہ بشانہ لڑیں گے۔نہ صرف لڑیں گے بلکہ تمہاری جیت میں پورا کردار ادا کریں گے۔"

برق جان چونک کر رستم کی طرف دیکھنے لگا۔ برق جان جانتا تھا کہ وہ عام لوگ نہیں ہیں۔اس کی مردم شناس نگاہ رستم اور ناصر کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتی تھی۔

رستم کے لب و لہجے کو محسوس کرنے کے بعد برق جان گہری سوچ میں نظر آنے لگا۔وہ قدرے اطمینان سے بیٹھ گیا اور اس بارے میں رستم اور ناصر سے بات کرنے لگا۔

رستم نے برق جان سے بھی وہی بات کہی جو اس نے کل ناصر سے کہی تھی۔اس نے واس کے ذریعے برق جان کو اپنی رائے پیش کی اور کہا کہ اگر شوتم خان اور ارفا خان کو یا کم از کم شوتم خان کو ہی ختم کیا جا سکے تو لڑائی کا پانسا پلٹ سکتا ہے۔

برق جان نے رستم کی بات کو رد نہیں کیا اور کہا۔"تمہاری بات میں وزن ہے۔مگر شوتم تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔اس کے ساتھی بے حد چوکس ہیں۔"

"لیکن کوشش تو کی جا سکتی ہے۔"

"کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟" برق جان نے پوچھا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور فرش پر کوئلے سے لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔"یہاں تک ہمارا قبضہ ہے۔اس سے آگے شوتم خان کے لوگ ہیں۔ اگیارے کی عمارت اس حصے میں ہے جو ہمارے پاس ہے لیکن اس میں سے جو زمین دوز راستہ نکلتا ہے وہ اس علاقے میں نکلتا ہے جو اب شوتم کے پاس ہے۔شوتم کا ٹھکانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔مشکل سے چالیس پچاس قدم کا فاصلہ ہوگا۔"

برق جان کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔"تمہارا مطلب ہے کہ کچھ لوگ وہ راستہ استعمال کر کے شوتم خان کے قریب چلے جائیں؟"

"کچھ لوگ نہیں......صرف دو یا تین بندے۔ مجھے یقین ہے کہ اس افراتفری میں وہ راستہ جس طرح ہمیں بھولا ہوا ہے، اسی طرح شوتم کے لوگوں کو بھی بھولا ہوا ہوگا۔فرضِ محال اگر نہیں بھی بھولا تو وہاں دو تین محافظوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔انہیں ختم کر کے شوتم کے ٹھکانے کی طرف جانا اور اندر گھسنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"یہ کام کہنے اور سننے میں جتنا آسان نظر آ رہا ہے، اتنا ہوگا نہیں۔"

"میں جانتا ہوں یہ مشکل ہوگا لیکن اس کے بعد لڑائی جیتنا زیادہ مشکل نہیں رہ جائے گی۔ جب یہ لوگ شوتم کے صدمے سے دوچار ہوں گے، ہم بھرپور حملہ کر کے انہیں بھیڑ

بکریوں کی طرح گھیر لیں گے۔" رستم کے لہجے میں آگ تھی اور لہو میں ڈوبی ہوئی سنجیدگی تھی۔ وہی کیفیت جو ہر لمحے لڑ مرنے کے لئے تیار رہنے والوں کی فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔

برق جان کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

رستم نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔"سب سے پہلے میں اس کام کے لئے خود کو پیش کرتا ہوں۔اپنے پورے ہوش و حواس اور رضامندی کے ساتھ میں یہ کام اپنے ذمے لینا چاہتا ہوں۔اس سلسلے میں مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔اپنے ایک ساتھی کو بھی میں نے چن لیا ہے۔بس مجھے ایک اور بندے کی ضرورت ہے۔"

"کس ساتھی کو چنا ہے؟" برق جان نے پوچھا۔"اگر تمہاری مراد ناصر سے ہے تو وہ ابھی ٹھیک سے گردن بھی گھما نہیں سکتا۔اس کا بازو بھی زخمی ہے۔"

"نہیں......ناصر میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں کسی اور کی بات کر رہا ہوں۔"

"کس کی؟"

"نے مان" کی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔وہ جیسا بھی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس بستی کے ہوشیار ترین لڑاکوں میں سے ہے۔اس موقع پر ہمیں اپنے اندر کے معاملوں کو بھول کر باہر کی فکر کرنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوتم پر شب خون مارنے کے لئے "نے مان" بہت کارآمد ثابت ہوگا۔"

"لیکن وہ تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔تم اچھی طرح جانتے ہو۔تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم گودام میں ریچھوں کے ہاتھوں ٹکڑے ہونے سے بچ گئے ورنہ "نے مان" نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور اس سے پہلے بھی......"

"میں سب جانتا ہوں ملک برق جان۔ اس کے باوجود میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ میں "نے مان" سے خود بات کروں گا۔یہ میری ذمے داری ہے۔"

"اور تیسرا شخص؟"

"تیسرا شخص تم چنو......لیکن وہ اچھا نشانہ باز ہو اور تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی۔"

اس معاملے پر برق جان اور رستم کے درمیان قریباً آدھ گھنٹہ بات ہوئی۔ ہر پہلو کو تفصیل سے دیکھا گیا اور مشورہ کیا گیا۔اس گفتگو کے اختتام تک صورتِ حال یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ برق جان جو کچھ دیر پہلے بڑی بیزاری کے ساتھ یہاں وارد ہوا تھا، اب ایک دم پُرجوش نظر آ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور رستم کے لیے ستائش بھی۔تاہم ابھی تک اس کی آنکھوں سے شک کی دھندلاہٹ پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔

رستم نے اس کے شک کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''برق جان! اب تمہیں کیا پریشانی رہ گئی ہے۔ شریف کے ساتھ اب ناصر بھی تمہارے پاس ہی رہے گا۔ فی الحال تمہیں صرف میری بیڑی کھولنا ہوگی۔ جب تمہیں شوتم کی موت کا پتا چل جائے اور عام لڑائی شروع ہوجائے تو ناصر کی بیڑی کھلوا دینا۔ شریف پھر بھی تمہارے پاس ہی رہے گا۔''

برق جان تھوڑا سا خجل نظر آیا۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم ''نے مان'' سے کہاں بات کرنا چاہو گے؟''

''اگر وہ یہاں آجائے تو بہتر ہے۔ نہیں تو میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔''

کچھ دیر بعد برق جان اپنے ساتھیوں سمیت تیز قدموں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ رستم، ناصر اور شریف کمرے میں رہ گئے۔

ناصر نے کہا۔ ''آپ نے اچھا بدلہ لیا ہے۔ میں آپ کو یہاں بند کر کے فیروزا سے دو دو ہاتھ کرنے چلا گیا تھا۔ اب آپ مجھے یہاں بند کر کے شوتم سے لڑنے جائیں گے۔''

''بدلہ تو تب ہوتا جب تم اچھے بھلے ہوتے اور میں تمہیں یہاں بند کر کے چلا جاتا۔ اب تو تم اپنی حالت خود ہی دیکھ رہے ہو۔ یہ مجبوری ہے۔ رہی بدلے والی بات تو وہ میں نے ابھی لینا ہے۔'' رستم زیرِ لب مسکرایا۔

شریف نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ گل نہیں آئی رستم بھائی کہ تم ایسے بندے کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو جو اندر سے کھوٹا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور سے رستم بھائی تمہارے بارے میں تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

''پر جو کام ہم کرنے جا رہے ہیں اس میں وہ بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ مجھے پکا یقین ہے۔ باقی رہی نیت کی بات...... تو ہماری نیت ٹھیک ہے، اللہ کرے اس کی بھی ہو جائے۔''

ناصر نے کہا۔ ''گیارے کے انڈر گراؤنڈ راستے کے ذریعے شوتم تک پہنچنے کی تجویز مجھے بھی پسند آئی ہے لیکن اس پر جتنی جلدی عمل ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس سے پہلے ہی شوتم بلہ بول دے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ مگر دن کی روشنی میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ کم از کم آج رات تک تو انتظار کرنا پڑے گا۔''

وہ تینوں ''نے مان'' کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ معاف کرنے کا ہنر رستم نے بی بی سے سیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بی بی اس معاملے میں بہت آگے ہے۔ وہ معاف کرنے اور اپنا نے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی تھی۔ رستم اس کی اس خوبی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ یوں

لگتا تھا کہ دنیا کے بدتر سے بدتر شخص کے لئے بھی بی بی کے دل میں نفرت اور غصہ نہیں ہے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ برائی سے نفرت کرنی چاہیے، بُرے سے نہیں۔ رستم کی فطرت بالکل مختلف تھی۔ وہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آتش فشاں بن جاتا تھا۔ لاوے کی طرح ہر شے کو بہا لے جانے کی خُو تھی اس کے اندر...... اس کی فطرت بی بی کی فطرت کا عکس معکوس تھی۔ اس کے باوجود بی بی کی ذات سے پھوٹنے والی نہایت طاقتور شعاعوں کی کچھ روشنی غیر محسوس طور پر رستم کی ذات میں بھی منتقل ہوئی تھی۔

اس برف زار کے اس پتھریلے گھر میں اپنے رقیب ''نے مان'' کا انتظار کرتے کرتے اس کی سوچوں کے سارے دھارے بی بی کی طرف مڑ گئے۔ اس کے کانوں میں کچھ بول گونجنے لگے۔ یہ بول اس نے کہاں سنے تھے؟ یہ گلی گلی گھومنے والے اور ''اِک تارا'' بجانے والے کسی فقیر کی آواز تھی۔ وہ کہاں گا رہا تھا...... شاید کسی کنویں کی منڈیر پر...... شاید سرسوں کے کسی خوش رنگ کھیت میں...... شاید کسی رنگ رنگیلے میلے میں...... یا شاید وہ رنگ والی گاؤں کی کسی حویلی میں ہی اپنے سُر بکھیر رہا تھا۔ چہرہ بھول گیا تھا، جگہ بھول گئی تھی مگر آواز ہنوز رستم کے حافظے میں نقش تھی......

جیہڑا عشق مجازی دی ڈھائے چڑھدا، بھیت عشق حقیقی دا پالیندا
پتھر نگہ تھیں موم کرسکدا اے، کچے کچ دا لعل بنا لیندا
جھوٹے لیندا اے لکدی دار اُتے ماس اپنا بھن کے کھا لیندا
سینے کئی پہاڑاں دے چیر سکدا، چم جنگلاں وچ سکا لیندا

کسی مہ جبین کے عشق میں گرفتار ہونے والا خدا کی محبت کا راز بھی پالیتا ہے۔ عشق کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے، یہ اپنی نگاہ سے پتھر کو موم کرسکتی ہے اور شیشے کے بے کار ٹکڑے کو ہیرا بنا سکتی ہے۔ عاشق کے لئے پھانسی کا رسا جھولے کے رسے کی طرح دل آویز ہوتا ہے، عاشق بڑی خوشی سے اپنے ہی جسم کا گوشت کاٹ کر بھون سکتا ہے۔ وہ اپنے جذبے کی طاقت سے سنگلاخ پہاڑوں کے سینے چیرتا ہے۔ عاشق کے لیے یہ چنداں مشکل نہیں کہ وہ دنیاوی آسائشوں کو چھوڑ کر سالہا سال جنگلوں میں گھومتا رہے اور سوکھ کر کانٹا ہو جائے۔

''نے مان'' کی آمد قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ مترجم کے طور پر واس بھی اس کے ساتھ تھا۔ ''نے مان'' کا منہ پھولا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غصے اور رقابت کے آثار تھے۔ برق جان نے گودام والے واقعے کے بعد ناراض ہوکر ''نے مان'' کو گھر میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اس کے لئے کوئی مناسب سزا تجویز کی جا رہی تھی مگر آج رستم نے اسے خصوصی اہمیت دے کر اپنے

پاس بلالیا تھا۔

ناصر کی آنکھوں میں بھی ''نے مان'' کے لئے کدورت کی جھلک تھی۔ چند دن پہلے ناصر نے برملا کہا تھا کہ اگر اسے موقع ملے تو وہ اس بدنیت شخص کی جان لے لے گا۔ مگر آج رستم کی خاطر اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ رستم پہلے ''نے مان'' سے خود گلے ملا پھر اسے ناصر کے گلے لگوایا۔ ''نے مان'' کچھ حیران بھی نظر آرہا تھا۔ غالباً اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ رستم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ واس کے ذریعے ان میں گفتگو شروع ہوگئی۔

☆======☆======☆

رات تاریک اور سرد تھی۔ رستم اور ''نے مان'' اگیارے کے اندر کھڑے تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی ایک مقامی شخص لال خان تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر تھی۔ یہ یہاں اسلحہ وغیرہ مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دلیری کی چمک تھی۔

وہ تینوں آتشیں اسلحے سے مسلح تھے۔ ''نے مان'' اور لال خان کے پاس پسٹل تھے۔ رستم کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل تھی۔ یہ رائفل اس کی بھاری بھرکم جیکٹ کے اندر چھپ کر رہ گئی تھی۔ صرف اس کی نال کا اگلا حصہ رستم کی گردن کے پاس، گریبان سے جھانک رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان تینوں کے پاس ایک انوکھی شے بھی تھی۔ یہ موٹے کینوس کا بنا ہوا ایک تھیلا تھا۔ یہ تھیلا ''نے مان'' نے اپنی بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس تھیلے کے اندر کوئی زندہ شے موجود تھی۔ اس شے کا سائز ایک بڑی بلی یا چھوٹے کتے کے برابر تھا۔

وہ تینوں اگیارے کے بڑے کمرے میں موجود تھے۔ تین چار محافظ بھی ان کے ساتھ تھے، تاہم ان محافظوں کو یہیں پر رہ جانا تھا۔ اس سے آگے صرف رستم، ''نے مان'' اور لال خان کو جانا تھا۔ اگیارے کے اس کمرے میں پہنچ کر رستم کو سفید فام ڈاکٹر مالینا کی یاد آگئی۔ مالینا کا شوتم خان سے ٹاکرا اسی کمرے میں ہوا تھا۔ مالینا کو اس کمرے سے نکلنے والے چور راستے کا پتا چل گیا تھا اور شوتم اس کی جان کے درپے ہوگیا تھا۔

اس کمرے میں غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ آبوک کے درخت کی شبیہ تھی اور چلہ کشی کے لوازمات نظر آرہے تھے۔ ایک محافظ نے کمرے کے وسط میں پڑا ہوا غالیچہ اٹھایا۔ نیچے لکڑی کا چوکور تختہ موجود تھا۔ اس مضبوط تختے کو ایک بڑا قفل لگایا گیا تھا۔ محافظ اس تختے سے کان لگا کر کچھ دیر تک گن سن لینے کی کوشش کرتے رہے۔ رستم نے بھی تختے سے کان لگایا...... جس طرح وہ لوگ اس راستے کو استعمال کررہے تھے، یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ شوتم کے ساتھیوں نے بھی

اس راستے کو استعمال کرنے کا سوچا ہو۔ جب کسی طرح کی کوئی آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو رستم نے قفل کھولنے کی ہدایت کی۔

قفل کھول کر تختہ اوپر اٹھایا گیا۔ نیچے پتھر کی گھسی ہوئی ملائم سیڑھیاں موجود تھیں۔ یہ تنگ سا راستہ دور تک تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ بند رہنے والی جگہوں پر جو باس ہوتی ہے، وہ یہاں بھی تھی۔ رستم نے جیکٹ میں سے ٹارچ نکال کر روشن کی اور سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں سے گزر کر وہ دونوں عورتیں شوتم تک پہنچتی تھیں اور نہایت رازداری سے اس کی تنہائی کو گرماتی تھیں۔ یہ خاصا طویل راستہ تھا۔ بالآخر وہ دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ انہیں ایک بار پھر پتھر کی آٹھ دس ملائم سیڑھیاں نظر آئیں۔ سیڑھیوں کے بالائی سرے پر لکڑی کا موٹا تختہ موجود تھا جسے ڈھکنے کی طرح اوپر اٹھایا جاسکتا تھا۔ جب وہ اس تختے کے قریب پہنچے، انہیں کچھ فاصلے سے مدھم آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ شوتم خان کے ساتھیوں کی آوازیں تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں۔ وہ بلند آواز سے باتیں کررہے تھے اور ساتھ ساتھ کچھ کھا پی رہے تھے۔

اب یہاں سے رستم کے تیسرے ساتھی لال خان کا کام شروع ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب برقِ جان نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یہ شخص اسلحہ شناس اور جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیکنیکل ذہن بھی رکھتا تھا۔ اس کے پاس چند اوزار تھے جو اس نے جیکٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ لال خان نے اس چور راستے کے دونوں دروازے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اندر سے ان دروازوں کو کیسے کھولا جاسکتا ہے۔ لال خان نے تاریکی میں ہی ٹٹول ٹٹول کر وہ نٹ دریافت کرلئے جنہوں نے تختے کی بیرونی کنڈی کو تختے سے جوڑ رکھا تھا۔ اگر وہ یہ نٹ کھولنے میں کامیاب ہوجاتا تو پھر باہر لگے ہوئے وزنی قفل کے باوجود تختہ اوپر اٹھ سکتا تھا۔

بڑے سائز کی چابی اور اسکریو گیج کے ذریعے لال خان نے کوشش شروع کی۔ زیادہ آواز پیدا کئے بغیر وہ بڑے انہماک سے آدھ گھنٹے تک لگا رہا اور آخر کار تمام نٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب وہ دونوں یا تینوں مل کر تختے کو جھٹکے سے اوپر اٹھاتے تو وہ اٹھ جاتا۔ خطرناک مرحلہ شروع ہورہا تھا۔ وہ باہر سے ابھرنے والی آوازوں کے مدھم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ الاؤ شاید بجھ گیا تھا۔ آوازیں مدھم ہوئیں اور پھر معدوم ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے ہتھیار تیار کئے اور تختے کو اوپر اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئے...... رستم سب سے آگے تھا۔ اس نے خود کو ایک گھر کے مستطیل کمرے میں پایا۔ سامنے صحن نظر آرہا تھا۔ وہاں ادھ بجھے

انگاروں کی روشنی اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو تھی لیکن الاؤ کے گرد کوئی موجود نہیں تھا۔ رستم باہر نکلتے ہی ایک دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ کھٹکے کی آواز سن کر ایک مسلح شخص تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ رستم نے لپک کر اس کی گردن دبوچی...... دوسرے ہاتھ سے اس کی لالٹین سنبھالی اور اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا...... گردن پر گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکا۔ دوسری بار دیوار سے سر ٹکراتے ہی وہ مُردہ چھپکلی کی طرح رستم کے بازو میں جھول گیا۔ رستم نے اسے ایک تاریک گوشے میں پہنچا دیا۔

یہاں غالباً یہ اکیلا ہی فرد تھا۔ کچھ دیر تک سن گن لینے کے بعد رستم نے تختہ اوپر اٹھایا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی باہر نکال لیا۔ صحن کی دوسری طرف تھوڑے فاصلے پر لکڑی اور پتھروں کا بنا ہوا وہ دو منزلہ گھر نظر آ رہا تھا جو یہاں شوتم کی عارضی قیام گاہ تھا۔ وہاں ایک بڑا جھنڈا ابھی لہرا رہا تھا۔ ''نے مان'' نے تھیلے میں موجود زندہ شے کو تھپتھپایا اور معنی خیز نظروں سے رستم کی طرف دیکھنے لگا۔ ''نے مان'' بے حد سخت جان تھا۔ صرف تین ساڑھے تین مہینے پہلے رستم کی اس سے زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں نہ صرف ''نے مان'' کا جبڑا اچٹخا تھا بلکہ اس کی کلائی کی چھوٹی ہڈی بھی چٹخ گئی تھی مگر بہت تھوڑے عرصے میں وہ پھر سے پوری طرح چاق و چوبند ہوگیا تھا۔ ''نے مان'' نے جو تھیلا پکڑ رکھا تھا اس میں گوہ کی سیاہی مائل نسل کا ایک مضبوط جانور تھا۔ رستم نے کئی بار سنا تھا کہ پرانے نقب زن اور ڈکیت وغیرہ گھروں کی اونچی دیواریں پھاندنے یا چھتوں پر چڑھنے کے لئے سدھائے ہوئے گوہ استعمال کرتے تھے۔ یہ جانور کسی بھی جگہ پر مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے اور وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی کمر سے رسا باندھ کر کمند بنائی جاتی تھی اور اوپر چڑھا جاتا تھا۔ رستم کے لئے یہ بات سنی سنائی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس برفیلے ٹاپو پر موجود ایک پاؤندہ اس کا عملی مظاہرہ کرے گا اور سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

''نے مان'' اس جانور کے حوالے سے بڑا پُراعتماد نظر آتا تھا۔ وہ اس کی کمر سے رسا باندھ کر کمند پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ جانور اور رسا دونوں تھیلے کے اندر تھے۔ لال خان کو وہیں اس چار دیواری میں رہنا تھا اور واپسی کے راستے کی حفاظت کرنا تھی۔ وہ ایک محفوظ جگہ مورچہ زن ہوگیا۔ غور سے دیکھنے پر رستم کو اندازہ ہوا کہ کچھ دن پہلے اس چار دیواری میں آتشزدگی ہو چکی ہے۔ لکڑی کی اشیاء جل چکی تھیں اور دیواریں سیاہی مائل ہو رہی تھیں۔ رستم نے سوالیہ نظروں سے ''نے مان'' کی طرف دیکھا۔ ''نے مان'' نے مقامی زبان میں سرگوشی کی۔ جو کچھ رستم کی سمجھ میں آیا وہ یہ تھا۔ ''لوگ بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے آگ لگائی۔''

درحقیقت ''نے مان'' بتا رہا تھا کہ دونوں عورتوں سے شوتم خان کا ناجائز تعلق ثابت ہونے کے بعد لوگ بہت غصے میں آ گئے تھے، عورتیں تو موقع سے کھسک گئی تھیں مگر لوگوں نے اس گھر کو آگ لگا دی تھی۔

لال خان کو وہیں چھوڑ کر رستم اور ''نے مان'' دبے قدموں شوتم کی قیام گاہ کی طرف بڑھے، یہ قیام گاہ کا عقبی حصہ تھا۔ رستم نے رائفل جیکٹ سے نکال کر ہاتھ میں لے لی تھی۔ اب یہ رائفل کسی بھی وقت شعلہ اگلنے کے لئے تیار تھی۔ ''نے مان'' کا پستول بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رستم نے کچھ دیر پہلے ''نے مان'' کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس ہاتھ کو تھامنے کے بعد نہ صرف ''نے مان'' کا رویہ حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوا تھا بلکہ وہ اب ایک دم چوکس بھی نظر آ رہا تھا۔

مکان کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے کینوس کا تھیلا کھولا۔ منہ سے عجیب سی پھنکار نکال کر گوہ باہر نکل آیا۔ ''نے مان'' نے اسے کھردری دیوار پر چھوڑا۔ وہ تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کی کمر کے ساتھ خاص طریقے سے باندھی گئی رسی کمند کی طرح جھولنے لگی۔ یہ نائیلون کی مضبوط رسی تھی اور اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ ''نے مان'' نے دو تین بار اس کو کھینچ کر گوہ کی ''ثابت قدمی'' کا اندازہ کیا۔ رستم کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ تنومند ''نے مان'' اس جانور کے زور سے اوپر چڑھ جائے گا...... مگر جب وہ ''نے مان'' کا اعتماد دیکھتا تو یقین ہونے لگتا تھا۔ ''نے مان'' نے بڑبڑا کر کوئی مختصر مناجات پڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے رسی کے ذریعے چھت کی منڈیر پر پہنچ گیا۔ صرف ایک موقع پر رسی تھوڑا سا کھسکی اور جانور کی پھنکار سنائی دی لیکن اس کے بعد سب ٹھیک رہا۔ اوپر پہنچ کر ''نے مان'' نے رسی جانور کی پشت سے کھول کر کہیں اور باندھ دی۔ چند ہی لمحے بعد رستم بھی رسی کے ذریعے چھت پر پہنچ گیا۔ ''نے مان'' نے گوہ کو تھپتھپا کر دوبارہ تھیلے میں بند کر دیا۔

وہ دونوں چھت پر بیٹھے اردگرد کا جائزہ لیتے رہے۔ سامنے اور بائیں پہلو کی طرف مشعل بردار پہرے دار موجود تھے۔ گھر کے سامنے کئی گھوڑے بندھے ہوئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ اندر کچھ افراد موجود ہیں۔ باتوں کی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ گاہے بگاہے کوئی بھاری بھرکم قہقہہ گونج جاتا تھا۔ اردگرد سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد رستم اور ''نے مان'' نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ایک پہرے دار کی موت اسے جیسے دھکیلتے ہوئے چھت پر لے آئی۔ پتا نہیں وہ کوئی آہٹ سن کر آیا تھا یا یہ معمول کا گشت تھا۔ رستم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس پر حملہ کیا۔ اس کا ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ پر مضبوطی

سے جم گیا۔ "نے مان" کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس نے یہ خنجر دستے تک پہرے دار کے دل کے مقام پر گھسا دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک رستم کی مضبوط گرفت میں تڑپنے پھڑکنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ رستم نے اپنے خون آلود ہاتھ مقتول کے کمبل سے پونچھے۔ پھر اسے خشک لکڑیوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے لٹا کر اس پر اس کا کمبل ڈال دیا۔ کینوس کا تھیلا بھی اس کے پاس ہی رکھ دیا گیا۔

پتھر کی دس بارہ سیڑھیاں اترتے ہی گھر کے اندر سے سنائی دینے والی آوازیں ایک دم بلند ہو گئیں۔ یہاں لکڑی کا ایک روزن موجود تھا جس میں لکڑی ہی کی جالی لگی ہوئی تھی۔ رستم نے بے ساختہ اس روزن سے آنکھیں لگا ئیں۔ زیریں منزل کے ایک مستطیل کمرے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اپنے شکار کو ڈھونڈ پائے گا۔ وہ شوتم خان کو دیکھ رہا تھا۔ شوتم خان اپنے چھ سات مصاحبوں کے ساتھ دسترخوان پر موجود تھا۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ کشمش اور بادام ملے نمکین چاولوں کے ادھ کھلے تھال اٹھائے جا رہے تھے۔ بڑی بڑی رکابیاں تھیں جن میں بچا کھچا سالن تھا۔ اس سالن میں چھوٹی بوٹیوں کے بجائے بڑے بڑے "بوٹ" نظر آتے تھے۔ برتنوں کے اٹھتے ہی کارندوں نے تیزی سے دسترخوان صاف کیا اور قہوے کی پیالیاں سجا دیں۔

اندر ہونے والی گفتگو کافی سنجیدہ قسم کی تھی۔ قریباً پچاس فیصد الفاظ رستم کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ ان پچاس فیصد سے وہ باقی کا مفہوم بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔

ایک موٹی توند والے مصاحب نے کھڑے ہو کر خوشامدی لہجے میں کہا۔ "ملک! آسیب زدہ شخص کے بارے میں وہ حکم نہیں جو پوری طرح ہوش مند شخص کے بارے میں ہے۔ آپ سے جو کچھ ہوا ہے، وہ بے ساختہ ہے۔"

ایک لمبی سفید داڑھی والا شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی تائیدی انداز میں یہی بات کہی۔ "ملک... ایسے معاملوں میں رعایت موجود ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں موجود ہیں اور مجاریاں اس بارے میں جانتی ہیں۔ جس وقت آپ سے غلط فعل سرزد ہوتا رہا، آپ اپنے حواس میں نہیں تھے... بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے خود کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دیں گے تو یہ سزا آپ سے زیادہ ہم سب کو ملے گی۔ موجودہ حالات میں ہمیں آدھا نہیں پورا سردار چاہیے جو اپنی پوری ہمت اور توانائی سے ہمارا جھنڈا اٹھا سکے۔"

ایک ساتھ کئی افراد تائیدی انداز میں بولنے لگے۔ رستم نے دیکھا کہ شوتم خان کے چہرے پر مصنوعی انکار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے اپنے مصاحبوں کی طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

موٹی توند والا ایک بار پھر کھڑا ہوا اور اعلانیہ انداز میں بولا۔ "ہمارے خیال میں تو یہ سزا کسی طور پر بھی آپ پر لاگو نہیں ہوتی لیکن اگر آپ اپنے دل و دماغ پر کسی طرح کا بوجھ محسوس کرتے ہیں تو پھر کوئی کفارہ ادا کر دیجئے۔"

"کیسا کفارہ؟" شوتم کی بھاری بھرکم آواز پہلی بار سنائی دی۔

"مالی کفارہ۔ خیر خیرات دے دیجئے۔" موٹی توند والے نے کہا۔

عمر رسیدہ شخص بولا۔ "مالی کفارے کے ساتھ ساتھ اگر آپ ایک اور عمل بھی کریں تو بہت اچھا ہوگا۔ آپ کے پہلے غلط عمل کی تلافی ہو جائے گی۔"

شوتم نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر سوالیہ نظروں سے عمر رسیدہ خوشامدی کی طرف دیکھا...... خوشامدی بولا۔ "آپ ان دونوں عورتوں سے شادی کر کے ان کی ناپاکی پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ بے شک ان میں سے ایک کی عمر چھوٹی ہے لیکن میں نے بزرگ مجاری سے خود سنا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ خاص خاص معاملوں میں عمر کی رعایت مل سکتی ہے۔" رستم کی معلومات کے مطابق بزرگ مجاری اس "بڑی ماں" کو کہا جاتا تھا جو اس دار فانی سے گزر چکی ہوتی تھی۔

رعایت ملنے والی بات پر تین چار مصاحبوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ایک یک چشم پاؤندہ کھڑا ہو گیا اور زور و شور سے بولا۔ "میں اپنے ساتھی کی دونوں باتوں کو ٹھیک مانتا ہوں۔ مالی کفارے کے ساتھ ساتھ اگر ملک ان دونوں عورتوں سے شادی کر لیں تو ان پر پردہ پڑ جائے گا اور یہ بڑی نیکی ہوگی۔"

ایک ساتھ کئی آوازیں اس تجویز کے حق میں بلند ہوئیں۔ قہوہ رکھ دیا گیا تھا مگر کسی کا دھیان قہوے کی طرف نہیں تھا۔ عمر رسیدہ شخص ایک بار پھر اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کھڑا ہوا اور بولا۔ "میرے خیال میں اگر ملک سو بھیڑیں اور پانچ درجن کھالیں خیرات کر دیں تو یہ کفارہ ادا ہو جائے گا۔ مزید مشورہ بڑی ماں سے کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی رائے بھی یہی ہوگی۔"

"میرے اندازے کے مطابق یہی تعداد مناسب ہے۔ اس طرح کا ایک کفارہ بائیس سال پہلے ملک مہابت کے وقت میں بھی ادا کیا گیا تھا۔"

تین چار منٹ بحث ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ طے ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ اس معاملے کو اس طرح نمٹانا ہے۔ اس طرح ملک شوتم کی انصاف پسندی کا بھرم بھی رہتا تھا، بازو بھی بچتا تھا اور عورتیں بھی ملتی تھیں۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام!

رستم کے کندھے کے اوپر سے سر نکال کر ''نے مان'' بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا اور آوازیں سن رہا تھا۔ یہاں کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ چند خوشامدی مصاحب نہ صرف اپنے سردار کو جرم وسزا کی دلدل سے نکال رہے تھے بلکہ اس کے لئے مستقل عیاشی کا سامان بھی فراہم کر رہے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ عقل عیار ہوتی ہے، ہر قسم کے حالات میں اپنے لئے عیش، طرب کا حیلہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ بے شک اس برفیلے ٹاپو پر کچھ سخت قاعدے ضابطے موجود تھے۔ شراب، عورت اور موسیقی وغیرہ یہاں عام نہیں تھی پھر بھی جن کے اندر ضرورت شدید تھی انہوں نے کچھ نہ کچھ ایجاد کر لیا تھا۔ رستم اور ''نے مان'' اس نہایت تاریک گوشے میں سمٹ کر بیٹھے رہے اور دیکھتے رہے کہ اندر گرم و نیم روشن کمرے میں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

صرف پانچ دس منٹ کے اندر وہ دونوں عورتیں شوتم خان کے سامنے کھڑی کر دی گئیں جن کے ساتھ وہ اگیارے میں چلہ کشی کے مزے لیتا رہا تھا۔ دونوں عورتیں بھاری بھر کم روایتی لبادوں میں تھیں۔ ان کے سروں پر موٹی چمک دار اوڑھنیاں تھیں۔ ان کے سر، چہرے اور ہاتھ وغیرہ ان اوڑھنیوں کے اندر ہی چھپا دیئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک واضح طور پر چھوٹی عمر کی تھی۔ غالباً بیس سے پچیس سال کے درمیان رہی ہو گی۔ دوسری جو اس کی خالہ کہلاتی تھی وہ بھی بہت زیادہ عمر کی نہیں لگتی تھی۔ وہ بھرے بھرے متوازن جسم کی پینتیس چالیس سالہ عورت تھی۔ وہ خالہ بھتیجی تھیں اور شوتم خان انہیں ایک ساتھ اپنی زوجیت میں لے رہا تھا...... یہ ان پاؤندوں کے نزدیک کوئی معیوب عمل نہیں تھا۔

رستم نے یہاں دیکھا تھا کہ مذہبی معاملات اور مذہبی مسئلوں کی تشریح مردوں کے بجائے عورتوں کے ذمے تھی۔ یہ مجاریاں یہاں مذہبی پیشواؤں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہاں بھی دیکھتے ہی دیکھتے ایک چادر پوش مجاری عورت آن موجود ہوئی۔ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی تاہم اس کی مالاؤں کی کھڑکھڑاہٹ روزن تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ گول تھال کمرے کے وسط میں پہنچا دیا گیا جس میں سپ گندل کو پیس کر رکھا جاتا تھا اور اس میں موم بتیاں بھی روشن کی جاتی تھیں۔ شوتم خان کی بیویاں بننے والی دونوں خواتین بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے تانبے کا گول تھال رکھ دیا گیا۔ تھال کی دوسری طرف بھاری بھر کم شوتم خان بڑی

ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد بیٹھ گیا۔ ایک طرف چادر پوش مجاری اور دوسری طرف سفید ریش مصاحب براجمان ہو گیا۔ دونوں عورتوں کا داہنا ہاتھ شوتم کے داہنے ہاتھ میں تھما دیا گیا اور اوپر ایک ریشمی چادر ڈال دی گئی۔ اس کے بعد مجاری نے مقامی زبان میں دعائیں پڑھنا شروع کیں۔

رستم کو اب مزید انتظار فضول محسوس ہوا۔ بیٹھنے کو تو شاید ابھی وہ مزید دس پندرہ منٹ تک بہ آسانی یہاں بیٹھ کر شوتم کی عجیب وغریب خانہ آبادی کا نظارہ کر سکتے تھے مگر اس میں خطرات بھی تھے۔ رستم کے دل میں اب شوتم کے لئے رحم کی کوئی رمق نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے روسی ساخت کی طاقت ور رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا۔ روزن کی چوبی جالی میں سے شوتم خان کی پیشانی کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ اردگرد کی خاموشی ایک زوردار دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ گولی شوتم کے چہرے پر لگی اور وہ پہلو کے بل تھال کی موم بتیوں کے اوپر گرا۔ دوسری اور تیسری گولی نے اس کے سر اور سینے میں دو سوراخ مزید کر دیئے۔ دونوں دلہنوں نے شادی کی مقدس رسم ادھوری چھوڑی اور ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بھاگیں۔ لڑکی کی بھاری چادر اُتر گئی اور اس کا نوخیز جسم لالٹینوں کی روشنی میں جھلک دکھا کر دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ مجاری بغلی دروازے کی طرف بھاگی تھی۔

اس دوران میں رستم نے رائفل کو برسٹ پر سیٹ کر لیا تھا۔ اس نے شوتم کے خوشامدی مصاحبوں پر دو بھرپور برسٹ چلائے۔ کم از کم پانچ افراد گولیاں کھا کر گرے۔ ان میں سے ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ گولیاں کدھر سے آ رہی ہیں۔

''کافی ہے۔'' ''نے مان'' کی خوشی سے بھرپور آواز رستم کے کان میں پڑی۔

وہ دونوں اٹھ کر چھت کی طرف دوڑے۔ لکڑیوں کے عقب میں پہرے دار کی لاش کے ساتھ ہی کینوس کے تھیلے میں گوہ کلبلا رہا تھا۔ ''نے مان'' نے تھیلا بغل میں دبایا اور نیچے لٹکتی ہوئی کمند کی طرف آیا۔ رستم پہلے اترا، بعدازاں ''نے مان'' تھیلا اپنی پشت پر لٹکا کر اُتر آیا۔ ابھی ''نے مان'' نے کمند چھوڑی نہیں تھی کہ شوتم کے چند پہرے دار دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ رستم ان کے استقبال کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ وہ نیا میگزین رائفل سے انیچ کر چکا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ''میڈیم لینتھ'' کے تین برسٹ چلائے اور کم وبیش چار افراد کو زمین بوس کر دیا۔ باقی آڑ کی تلاش میں دوڑے۔

''بھاگو'' ''نے مان''!'' رستم چلایا۔

دونوں ادھ جلی چار دیواری کی طرف دوڑے۔ عقب سے گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔

رستم نے دوڑتے دوڑتے مڑ کر پھر دو برسٹ چلائے۔ ''نے مان'' نے بھی پستول سے دو تین فائر کئے۔ تاہم زیادہ فائدہ لال خان کی فائرنگ سے ہوا۔ وہ سامنے موجود تھا اور اس کا رخ شوتم کے محافظوں کی طرف تھا۔ اس نے پستول سے پورے چھ فائر کر کے رستم اور ''نے مان'' کو شاندار کور مہیا کیا۔ رستم اور ''نے مان'' دوڑتے ہوئے چار دیواری میں پہنچ گئے اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ رستم کے پاس ایمرجنسی میں استعمال کرنے کے لئے ایک دستی بم موجود تھا۔ اس بم کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہونا چاہیے تھا۔ بم رستم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب ''نے مان'' اور لال خان لکڑی کا تختہ اٹھا کر چور راستے میں داخل ہو گئے تو رستم نے دستی بم کی پن کھینچی اور اسے پوری طاقت سے چار دیواری سے باہر پھینک دیا۔ چمک کے ساتھ زوردار دھماکہ ہوا اور شوتم کے پہرے داروں کی کراہتی ہوئی آوازیں سنائی دیں..... یقیناً اب ان کی پیش قدمی ایک آدھ منٹ کے لئے رک جاتی تھی۔ بھاگنے کے لئے رستم وغیرہ کے لئے یہ وقت کافی تھا۔

چور راستے میں گھستے ہی رستم نے ٹارچ روشن کر لی اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اس کی رائفل بالکل تیار حالت میں تھی۔ اگر سیڑھیوں کی طرف سے کوئی شخص نمودار ہوتا تو رستم اسے چھلنی کر ڈالتا۔ چھلنی ہونے کے لئے کوئی بھی سامنے نہیں آیا۔ رستم، لال خان اور ''نے مان'' دوڑتے ہوئے واپس اگیارے میں پہنچ گئے۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر کئی مسلح افراد کھڑے تھے۔ واس بھی ان میں موجود تھا۔

رستم کو دیکھتے ہی واس نے پوچھا۔ ''شوتم کا کیا بنا؟''

''مارا گیا۔'' رستم نے کہا۔

سیڑھیوں پر کھڑے افراد نے ایک ساتھ زوردار نعرہ بلند کیا اور چند افراد یہ اطلاع باہر موجود لوگوں تک پہنچانے کے لئے تختہ نما دروازے کی طرف بھاگے۔

''تم سب ٹھیک تو ہو ناں؟'' واس نے مقامی زبان میں ''نے مان'' اور لال خان سے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں۔'' ''نے مان'' نے پستول لہرا کر جواب دیا۔

رستم کی نگاہیں ''نے مان'' کی پشت پر جمی تھیں۔ اس کے چہرے پر افسردگی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، سب ٹھیک نہیں ہے۔ ہم میں سے ایک مارا گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' واس نے حیرت سے پوچھا۔

لال خان اور ''نے مان'' کے چہرے پر تعجب نظر آیا۔ پھر انہوں نے رستم کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ان کے چہرے بھی اُتر گئے۔ ''نے مان'' کی کمر سے بندھا ہوا تھیلا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ قطرے ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔ تھیلے کے اندر مطلق حرکت نہیں تھی۔ ''نے مان'' نے جلدی سے تھیلا کمر سے اُتار کر نیچے رکھا اور اسے کھولا۔ فائرنگ کے دوران میں ایک گولی جانور کی گردن میں لگی تھی اور اسے ختم کر گئی تھی۔ یہ پالتو گوہ اپنے مالک کے لئے آخری کام انجام دے کر زندگی سے منہ موڑ گیا تھا ...

اسی دوران میں اگیارے کے اندر اور اردگرد قیامت کا شور برپا ہو گیا۔ ایک ساتھ درجنوں دھماکے ہوئے..... چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ لشکریوں کے فلک شگاف نعروں سے در و دیوار گونج اٹھے۔ پروگرام کے مطابق برق جان کے سینکڑوں ساتھیوں نے مخالفین پر فیصلہ کن حملہ کر دیا تھا۔ رستم، لال خان اور ''نے مان'' وغیرہ بھی دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ یہ قبائلی لڑائی ایک دم ہی نکتہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ رستم کے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ آج واقعی برق جان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ لڑائی میں بھرپور حصہ لینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برق جان کے ساتھی دباؤ کا شکار ہیں اور ان کی وہم پرستی نے ان کی طاقت نصف کر دی ہے۔ ان سب کا متفقہ خیال تھا کہ زری کی بھینٹ نہ چڑھنے سے ان پر نحوست کے سائے ہیں اور وہ یہ لڑائی جیت نہیں سکیں گے۔ رستم کی دلی خواہش تھی کہ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہو۔

وہ اگیارے سے باہر آئے تو ہر طرف شعلے رقصاں نظر آئے۔ واس چلا کر بولا۔ ''برق جان نے بھرپور حملہ کرا دیا ہے۔''

''میرے خیال میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' رستم نے بھی پکار کر کہا۔

پھر وہ بھی لڑائی میں شریک ہو گیا۔ وہ پوزیشن بدلتا ہوا بالکل اگلی صفوں میں چلا گیا۔ یہاں گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ دستی بموں کے دھماکے بھی ہو رہے تھے۔ برق جان کے جاں نثار ساتھیوں نے رائفلوں پر سنگینیں چڑھا کر ایک زوردار ہلہ بولا اور دشمن لشکریوں کو مارتے کاٹتے ہوئے کئی سو قدم پیچھے لے گئے۔ اس معرکے میں کم و بیش تیس افراد مارے گئے۔ دونوں طرف سے زخمی ہونے والوں کی تعداد دوگنا تھی۔ اس عمارت پر بھی دوبارہ قبضہ جما لیا گیا جہاں کچھ دیر پہلے تک شوتم خان اپنے قریبی مصاحبوں کے ساتھ موجود اور بیک وقت دو دلہنوں کا دولہا بننے والا تھا۔ عمارت کے عقب میں ابھی تک نائیلون کی کمند لٹک رہی تھی۔

اس عمارت کے مستطیل کمرے میں تا حال ان افراد کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں جو تھوڑی دیر پہلے رستم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ لالٹینوں کی روشنی میں ان میں سے کئی کے جسم چھلنی دکھائی دیئے۔ موجودہ معرکے کے دوران میں ان میں چند لاشیں مزید شامل ہوگئی تھیں۔ تاہم شوتم کی لاش کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لڑائی مسلسل جاری تھی۔ نعرے گونج رہے تھے۔ پھریرے لہرا رہے تھے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے برفیلی زمین دہل رہی تھی۔

برق جان عقب سے آیا۔ اس نے رستم کو اپنے اکلوتے بازو میں جکڑا اور زور زور سے جھنجھوڑا۔ یہ اس کا شاباش دینے کا انداز تھا۔ اس کے کہے ہوئے فقروں میں سے بس دو تین ہی رستم کی سمجھ میں آئے۔ ''تم نے حق ادا کر دیا...... میں خوش ہوں...... ہم جیتیں گے۔''

رستم نے واس کی وساطت سے کہا۔ ''ملک برق جان! مجھے جیت اتنی آسان نظر نہیں آ رہی۔ شوتم کے ساتھیوں کے پاؤں پھر جم گئے ہیں۔ وہ تین اطراف سے فائرنگ کر رہے ہیں...... فائرنگ میں تیزی بھی آ رہی ہے۔ ہمیں کافی محنت کرنا پڑے گی۔''

رستم کی بات درست ثابت ہوئی۔ صبح تک مقابلہ جاری رہا۔ برق جان کے ساتھی تعداد میں قدرے زیادہ ہونے کے باوجود شوتم کے ساتھیوں کو مزید پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوئے اور نہ گھیرنے میں۔ رستم نے برق جان سے کہا۔ ''ملک برق جان! تم ایسی لڑائیوں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو مگر میرا خیال ہے کہ تم نے شوتم کی موت کے بعد حملہ کرنے میں جلدی کی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' برق جان نے واس کی وساطت سے پوچھا۔

''تھوڑا انتظار کرنا چاہیے تھا تاکہ شوتم کی موت کی خبر پھیل جاتی۔ لگتا ہے کہ شوتم کے قریبی ساتھیوں نے اس کی موت کی خبر چھپالی ہے۔''

رستم کی بات میں وزن تھا۔ برق جان تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا پھر بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اب کیا کرنا چاہیے؟''

''تھوڑی سی سفاکی دکھانا پڑے گی۔'' رستم نے کہا۔

وہ اسی عمارت میں کھڑے تھے جہاں کچھ دیر پہلے رستم اور ''نے مان'' نے حملہ کر کے شوتم کو قتل کیا تھا۔ شوتم کی لاش ایک تاریک ڈیوڑھی سے برآمد ہو چکی تھی اور چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ رستم نے ''نے مان'' کو سمجھایا اور اسے لے کر لاش کے سرہانے پہنچ گیا۔ ''نے مان'' کے ہاتھ میں ایک بڑے پھل والا وزنی کلہاڑا تھا۔ رستم نے لاش پر سے چادر ہٹائی۔ ''نے مان'' نے کلہاڑے کے ایک ہی بھرپور وار سے شوتم خان کا سر اڑا دیا۔ یہ خوفناک منظر تھا اور قدیم دور کی کسی وحشی جنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ رستم نے کوشش کر کے شوتم کے بھاری

بھرکم سر کو ایک لمبی برچھی کے اوپر چڑھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد برچھی میں ٹنگا ہوا یہ سر عمارت کی چھت پر تھا اور سورج کی اولین کرنوں میں چمک کر دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ اس سر کے قریب کھڑے ہو کر برق جان کے درجنوں ساتھیوں نے فلک شگاف نعرے بلند کئے۔ رستم جانتا تھا اور باقی سب بھی جان گئے تھے کہ یہ مخالف فریق پر فیصلہ کن حملے کا وقت ہے

برق جان نے ایک للکارا بلند کیا اور اپنی رائفل لہرا کر حملے کا حکم دیا۔ درجنوں رائفلیں ایک ساتھ چلیں اور تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز سے در و دیوار گونج اٹھے۔ رستم ایک اوٹ میں موجود تھا۔ وہ بھی مسلسل فائرنگ کرنے لگا۔ اس نے لڑائی بھڑائی کے بہت سے مناظر دیکھے تھے مگر اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں کو ایک دوسرے پر گولیاں برساتے، اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اسی دوران میں رستم کو ناصر دکھائی دیا۔ اس کے پاؤں میں بیڑی نہیں تھی اور ہاتھوں میں رائفل موجود تھی۔ اسے اپنی طرح بیڑی سے آزاد دیکھ کر رستم کو تسلی ہوئی۔ ناصر، رستم کے قریب ہی اوندھا لیٹ گیا اور رائفل سونت کر لڑائی میں شریک ہو گیا۔ رستم اور ناصر سے تھوڑے ہی فاصلے پر شوتم خان کا کٹا ہوا سر طویل برچھی پر ٹنگا ہوا تھا...... اور دور سے بھی صاف پہچانا جاتا تھا۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا لیکن اس منظر کے سبب لڑائی جلد ختم ہونے کا امکان بھی تھا۔ شوتم خان کے ساتھیوں کے حوصلے بڑی تیزی سے پست ہوئے تھے۔ ان کی مزاحمت میں پہلے والی شدت نظر نہیں آ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں رستم کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر اس موقع پر باہر نکل کر شوتم کے ساتھیوں پر جھپٹا جائے تو وہ پوزیشنیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اس نے یہی بات واس کے ذریعے برق جان سے بھی کہی۔ برق جان تذبذب میں نظر آ رہا تھا مگر جب رستم، ناصر ان کے دائیں بائیں لڑنے والے چند افراد اچانک اٹھے اور فائرنگ کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے تو بہت سے دیگر افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند سیکنڈ میں ''چارج'' کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ رستم سب سے آگے دوڑنے والے چند افراد میں سے تھا۔ اس کا انداز قابلِ دید تھا۔ لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ رائفل شعلے اگل رہی تھی۔ یہ ایک فطری تربیت! یہ خود رَو شجاعت تھی .. یہ بے ساختہ جھپٹ تھی۔ اس کی رائفل پر چڑھی ہوئی سنگین سورج کی روپہلی کرنوں میں دمک رہی تھی۔ لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ شوتم کے سو ڈیڑھ سو ساتھیوں کا ہراول دستہ اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک بار قدم اکھڑنے کی دیر تھی... پھر کہیں ان کے پاؤں نہ جم سکے۔ اس پسپائی کے دوران

میں کئی افراد مارے گئے اور کئی زخمی ہو کر گرے۔ رستم، نے مان، ناصر اور ان کے درجنوں ساتھیوں نے شوتم کے بہت سے ساتھیوں کو آبی گزرگاہ کے قریب گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سے بہت سوں نے گھبراہٹ میں یخ بستہ پانی کے اندر چھلانگیں لگا دیں۔ اس کے بعد فقط پانچ دس منٹ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ شوتم کے ساتھیوں نے شکست تسلیم کر لی۔ کچھ نے سفید جھنڈے لہرائے، کچھ نے ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر خود کو برق جان کے حوالے کر دیا۔ کچھ کو گھیر کر پکڑ لیا گیا اور ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ مشرقی جانب بس ایک جگہ ایک ٹکڑی نے مزاحمت جاری رکھی پھر وہ بھی دم توڑ گئی۔

وہ پورے کا پورا دن ہنگامہ خیز رہا۔ شوتم کے بڑے بیٹے ارفا خان سمیت اس کے بہت سے قریبی ساتھی پکڑے گئے تھے۔

دوپہر سے ذرا پہلے واس نے آ کر بتایا۔ ''وہ خالہ بھانجی بھی پکڑی گئی ہیں جو شوتم کی دلہنیں بن رہی تھیں۔ انہیں مشرقی کنارے کے ایک گھر کے تہہ خانے سے پکڑا گیا ہے۔''

''وہ کیا کہتی ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اب انہوں نے اپنے سارے بیان بدل لیے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شوتم نے انہیں ڈرا دھمکا کر اپنی راہ پر لگایا ہوا تھا۔ انکار پر وہ انہیں تشدد کا نشانہ بناتا تھا اور جھوٹے الزامات لگاتا تھا۔''

رستم نے پوچھا۔ ''بڑی مجاری کے جذبات اب کیا ہیں؟''

''لڑائی میں کامیابی پر وہ خوش ہے۔ شکریے کی عبادت کے لیے آج مجار خانے اور اگیارے میں بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔'' واس نے بتایا۔

''اب تو وہ گارنی کے ذبح ہونے کی بات نہیں کر رہی؟'' ناصر نے دریافت کیا۔

واس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب وہ اس حوالے سے خاموش ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی زبان بند ہو گئی ہے ورنہ اس نے تو ہر طرف آگ لگا دی تھی۔ وہ اور اس کی ساتھی مجاریاں لوگوں کو بری طرح بھڑکا رہی تھیں۔ اور سچی بات تو یہی ہے کہ لوگوں کو بھڑکانے میں انہیں زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔ صورت حال ہی ایسی بن گئی تھی۔ لوگ زری کے بچ جانے اور لڑائی میں شکست کو ایک ساتھ دیکھنے لگے تھے۔ انہیں پکا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعے کی وجہ بنا ہے۔''

''زری اب کہاں ہے؟ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ناصر نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''وہ اپنی بدلی ہوئی صورت کی وجہ سے بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ اپنے منڈھے ہوئے سر پر ہر وقت کپڑا لپیٹے رہتی ہے۔ دو دن تو وہ بس روتی ہی رہی ہے مگر اب کچھ سنبھل گئی ہے۔ ملک برق جان نے اسے خاص حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو اس سے ملنے نہیں دیا جا رہا۔ میں ایک دو دن میں کوشش کروں گا کہ اس سے ملاقات ہو سکے۔''

واس تو کہہ رہا تھا مگر اسے خود بھی امید نہیں تھی کہ زری سے ملاقات ہو سکے گی۔ تاہم جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ شام کے کچھ ہی دیر بعد واس تیزی سے اندر آیا۔ اس نے گھر کا قفل بھی خود ہی کھولا تھا۔ اردگرد کوئی پہریدار موجود نہیں تھا۔

''آؤ میرے ساتھ...... یہ بڑا اچھا موقع ہے۔'' واس نے کہا۔ ''زری سے مل لو۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''مرنے والوں کو اجتماعی طور پر دفن کیا جا رہا ہے۔ اکثر محافظ اور پہریدار وہاں گئے ہیں۔ برق جان اور اس کے قریبی ساتھی بھی وہیں ہیں۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے۔'' اس نے رستم کا ہاتھ تھام لیا۔

''لیکن...... ناصر بھی جانا چاہتا ہے۔'' رستم نے کہا۔

واس ذرا حیران نظر آیا...... جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ ناصر وہاں جا کر کیا کرے گا؟ معاملہ تو تمہارے اور زری کے بیچ ہے۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ ''معاملہ'' کس کس کے درمیان ہے۔ رستم کے کہنے پر واس نے ناصر کو بھی ساتھ لیا۔ بیڑیوں کی وجہ سے دونوں تیزی سے قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، تاہم فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ برق جان کا گھر چند قدم کی دوری پر ہی تھا۔ اب گھر کی چھت پر ایک کے بجائے تین جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ تین جھنڈے ظاہر کرتے تھے کہ برق جان بستی کا بااختیار ملک بن چکا ہے۔ واس ان دونوں کو ایک چھوٹے سے عقبی دروازے کے ذریعے اندر لے گیا۔ ایک طویل اور تاریک راہداری سے گزر کر وہ بالکل اچانک ایک روشن کمرے میں آ گئے۔ یہاں زری موجود تھی۔ لالٹین کی روشنی میں وہ عجیب و غریب نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص اونی لبادے میں تھی مگر اب اس لبادے کے اوپر ایک اونی اوڑھنی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ یہ اوڑھنی اسے اپنا صفاچٹ سر چھپانے کے لیے دی گئی تھی۔ اس کی بھنویں بھی مونڈی جا چکی تھیں۔ رستم اور واس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے اوڑھنی کھینچ کر اپنا سر پورا ڈھانپا اور چہرہ بھی ڈھانپ لیا۔ پھر وہ ایک ڈری ہوئی بکری کی طرح اپنا سر ایک کونے میں گھسیڑ کر بیٹھ گئی اور سمٹ کر گٹھڑی بن گئی۔

اسے اپنی ہیئت کذائی سے شرم آ رہی تھی۔ واس نے اسے آگے بڑھ کر پچکارا۔ ’’اٹھ جاؤ...... یہ سب جانتے ہیں۔ یہ کوئی غیر نہیں ہیں۔‘‘

’’نہیں...... میں نہیں۔‘‘ اس نے چادر کے اندر ہی اپنا سر نفی میں ہلایا۔

رستم کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ خود آگے بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہولے سے زری کے شانے پر رکھا۔ ’’زری! اب چھپانے سے کیا فائدہ؟ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اور ویسے بھی، تم بری تو نہیں لگ رہی ہو۔ بس شکل ذرا بدل گئی ہے اور کچھ نہیں ہوا۔

وہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ رستم نے کوشش کر کے اسے اٹھایا اور پھر سمجھا بجھا کر چادر بھی اس کے چہرے سے ہٹا دی۔ وہ آنکھیں جھکائے شرمندہ کھڑی تھی۔ رستم نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ’’سچی بات یہ ہے زری کہ تم ایسے بھی بری نہیں لگ رہی ہو۔‘‘

’’آپ نے ٹھیک کہا رستم بھائی۔‘‘ ناصر بولا۔

واس نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔ وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر بھی وہ اپنی اوڑھنی کو سر سے سرکنے نہیں دے رہی تھی۔

واس اردگرد نگاہ رکھنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زری نے پہلی بار بھرپور نظروں سے رستم کو دیکھا۔ وہ واقعی زیادہ بدصورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید یہ اس کے چہرے کی بے پناہ معصومیت کا اعجاز تھا۔

رستم نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ ’’زری! ایک بات بڑی اچھی طرح دماغ میں رکھنا۔ برق جان کو یہ بالکل نہیں بتانا کہ تم اپنی مرضی سے چل کر میرے پاس آئی تھیں اور بعد میں جو کچھ ہوا وہ بھی تمہاری مرضی سے ہوا تھا۔‘‘

رستم نے یہ بات کسی اور لڑکی سے کہی ہوتی تو وہ شرم سے لال گلابی ضرور ہوتی مگر یہ زری تھی۔ اس کا ہر انداز نیارا تھا۔ جنگل میں بہنے والی ندی کی طرح اس کے اپنے ہی طور طریقے اور اپنا ہی بہاؤ تھا۔

’’نہیں۔ میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں وہی بولتا رہا جو تم نے کہا۔‘‘

’’آئندہ بھی وہی کہنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں...... تم مجھے دیکھنے کے لیے واس کے گھر آئی تھیں۔ میں نے تمہیں پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لٹا لیا۔‘‘

’’اور مجھ کو بہت آچھا لگا۔‘‘ وہ پہلی بار ذرا سا شرمائی۔

ات۔‘‘ رستم نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔ ’’یہی بات تو کسی سے کہنی نہیں ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ میں نے تمہیں پکڑ لیا اور تم ڈر گئیں۔‘‘

’’اوہ...... ہم کو پھر غلطی لگا۔‘‘ اس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اس کے گلے میں لوہے کا ایک ملائم کڑا تھا جس پر کچھ کھدا ہوا تھا۔ یہ اس امر کی نشانی تھا کہ یہاں کے دستور کے مطابق زری منحوس ہے۔ وہ گارتی کا درجہ پانے کے باوجود آبوک پر قربان نہیں ہو سکی...... وہ اب اپنا اجڑا اجڑا حلیہ بھول گئی تھی اور بڑی گرم نظروں سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔

ناصر بالکل انجان بن گیا تھا۔ وہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی آبوک درخت کی پتھریلی شبیہہ پر جھکا ہوا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ اسے دیکھنے میں مگن ہے۔

زری بڑی بے باکی سے اپنا چہرہ رستم کے چہرے کے قریب لے آئی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ’’تم بہت آچھا ہو۔ ہمارا دل پھر تمہارے ساتھ سونے کو کرتا۔‘‘

رستم اس بے باکی پر ٹپٹا گیا۔ ’’تمہارا چاچا آس پاس ہی ہے۔‘‘ رستم نے اسے ڈرانے کی ناکام کوشش کی۔

وہ ایک دم بجھ سی گئی۔ اس کا دھیان ایک بار پھر اپنے ابتر حلیے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اپنی اوڑھنی کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ’’میں سمجھ گیا۔ اب میرا شکل خراب ہوتا۔ میں تم کو آچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں زری۔‘‘ رستم نے اس کے ملائم گال کو چھوا اور ذرا چونک گیا۔ اس کا گال غیر معمولی طور پر تپ رہا تھا۔ ’’ناصر! ذرا دیکھنا...... اسے بخار لگ رہا ہے۔‘‘ رستم نے کہا۔

ناصر جلدی سے زری کی طرف آیا۔ اس کی پیشانی کو چھوا اور اس کی کلائی پکڑ کر نبض دیکھی۔

’’ہاں، بخار ہے اسے۔‘‘ وہ بولا۔

’’تمہیں لگ نہیں رہا کہ تمہیں بخار ہے؟‘‘ رستم نے اس سے پوچھا۔

’’مجھ کو بخار نہیں ہے۔‘‘ وہ بہت سادگی سے بولی۔

اچانک واس تیزی سے اندر آیا۔ ’’چلو، یہاں سے نکلیں، پہریدار آ رہے ہیں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ گلی والے دروازے سے آئے ہیں۔‘‘

ناصر نے زری پر محبت بھری الوداعی نظر ڈالی اور رستم کے ساتھ ہی واپسی کے لیے پلٹا۔ ان دونوں کے پاؤں میں کھڑکھڑاتا لوہا تھا جس کے سبب وہ زیادہ تیزی نہیں دکھا سکے۔ یکایک انہیں کہیں پاس ہی بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ پہریدار ان تین پہریداروں میں سے ایک تھا جو زری، رستم اور ناصر وغیرہ کی ساری رُوداد جانتے تھے۔ ان تین

پہریداروں کے علاوہ صرف بڑی مجاری ہی اس واقعے کی راز داں تھی۔ ان کے علاوہ بستی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زری کی دوشیزگی کیونکر ختم ہوئی ہے۔ اور حقیقت میں تو ان افراد کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے رستم کو قصوروار سمجھتے تھے جبکہ زری کا جسمانی تعلق ناصر سے ہوا تھا۔

پہریدار رستم اور ناصر کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رائفل سیدھی کر لی۔ اپنی زبان میں اس نے رستم اور ناصر کو جہاں کا تہاں کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا ساتھی بھی اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ یقیناً وہ چاہتا تھا کہ دیگر پہریدار اس صورتِ حال سے باخبر نہ ہو سکیں۔ رستم نے دیکھا کہ واس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد رستم نے برق جان کو بھی اپنے سامنے پایا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں انگارہ تھیں۔ وہ پہلے واس سے مخاطب ہوا۔ ان کے درمیان مقامی زبان میں مکالمہ ہوا۔ اس مکالمے کی جو باتیں رستم کی سمجھ میں آئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

برق جان نے کہا۔ ''واس! مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ان سارے معاملوں میں تمہارا ہاتھ ہے۔ لڑائی کے موقع پر ان لوگوں کے فرار ہونے میں بھی ضرور تمہاری اور تمہاری بیوی کی مدد شامل تھی۔ اب سب کچھ ثابت ہو رہا ہے۔''

واس کا سر جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ برق جان کے سامنے صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔

برق جان بولا۔ ''اب تو مجھے ایک اور شک بھی ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے..... کہ اپنی بھتیجی کو بھینٹ سے بچانے کے لیے تم نے خود اسے غیر مرد کے حوالے کیا ہے۔''

واس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''خدا کے لیے ایسا مت کہیں ملک! کیا آپ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں.....؟''

''تم نے حرکت تو ایسی ہی کی ہے۔ اپنی بھتیجی کے منہ بولے خاوند کو اس سے ملانے کے لیے یہاں لے آئے ہو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر بھید کھل گیا تو کتنا بڑا طوفان آئے گا۔ لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں۔ اس شخص کا نام جاننا چاہتے ہیں جس نے گارنی کو خراب کیا۔ میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ تو بیوقوف ہے ہی، تم اس سے بڑے بیوقوف نکلے ہو۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر۔''

''میں ان دونوں کو زری سے ملانے نہیں لایا تھا۔ آپ کی رہائش گاہ دکھانے لایا

تھا۔'' واس نے بات بتائی۔

''بکواس بند کرو۔'' برق جان دھاڑا۔ ''مجھے اتنا گاؤدی مت سمجھو۔ جو کچھ میرے ارد گرد ہوتا ہے، میں دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں..... خاموش رہوں تو اور بات ہے۔ کیا یہ بات غلط ہے کہ تم نے ان تینوں کو فرار کرانے کی کوشش کی اور ساتھ میں یہ شرط رکھی کہ یہ تمہاری بھتیجی کو بھی اپنے ساتھ یہاں سے لے جائیں گے؟ بتاؤ..... میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

واس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''مم..... مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں مگر یہ مت بھولیں کہ تب یہاں آپ کی سرداری نہیں تھی..... یہاں شوتم خان کا حکم چل رہا تھا۔ اور شوتم خان کے لیے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت تھی وہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''مگر زری کا بھینٹ چڑھنا شوتم خان کا معاملہ تو نہیں تھا۔ یہ تو مذہبی معاملہ تھا۔''

''مجھے معلوم ہے ملک..... اور آپ بھی بےخبر نہیں ہیں کہ شوتم مذہب کو کس رخ پر لے جا رہا تھا۔ وہ اپنی من مرضی کو ہی مذہب کا درجہ دینے لگا تھا۔''

واس کی اس بات نے برق جان کے ابال کو قدرے کم کیا۔ اس نے دو تین گہری سانسیں لے کر کمرے کے اندر ہی چند قدم چہل قدمی کی اور واس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مجھے ان دونوں کی نادانی پر اتنا افسوس نہیں جتنا تمہاری بے پروائی پر ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں ان دونوں کو، لوگوں کے غصے سے بچانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیل رہا ہوں..... پھر بھی تم نے ان کو یہاں لانے کی جرأت کی ہے۔ بڑی مجاری بارود سے بھرا ہوا بم بنی ہوئی ہے۔ اسے بس چنگاری دکھائے جانے کی ضرورت ہے۔''

''میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔'' واس نے فوراً معذرت کی۔

برق جان کے چہرے پر تناؤ برقرار رہا۔ وہ رستم اور ناصر کی طرف ایک ساتھ دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں اب کچھ باتیں کھل جانی چاہئیں۔ ان دونوں کو بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ میں ان کے لیے کتنا جوکھم اٹھا رہا ہوں اور ان سے کیا چاہتا ہوں۔ میری اس بات کا ترجمہ کر کے انہیں بتاؤ۔''

واس نے فوراً ترجمہ کیا۔

رستم نے جواب دیا۔ ''ملک! ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بے شک تم نے ہم پر احسان کیے ہیں لیکن ہم نے بھی اپنی ہمت کے مطابق تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تمہارا یہ شکوہ دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے پہلے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔''

”میں اس بات سے انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے رستم کہ تم نے بار بار مجھے سخت مایوس بھی کیا ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثال ہے کہ تم اس وقت یہاں موجود ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اگر تمہارے اندر عورت کی اتنی بھوک ہے تو مجھے کھل کر بتاؤ.... میں دو چار لڑکیاں تمہارے لیے پابند کر دیتا ہوں......“

”ٹھیک ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا لیکن کیا میں اطمینان رکھوں کہ زری یہاں بالکل محفوظ ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ تم شرطیں پیش کر رہے ہو۔ حالانکہ شرطیں بتانے کا حق میرا ہے۔“

”چلو تم ہی بتاؤ.....لیکن اچھا! بادشاہ اپنی تین درجن شرطوں کے ساتھ ایک آدھ شرط رعایا کی بھی مان لیتا ہے۔“ رستم کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

برق جان نے پہریداروں سے کہا کہ رستم اور ناصر کو واپس ان کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا جائے۔ اس نے واس کو بھی حکم دیا کہ وہ مترجم کے فرائض انجام دینے کے لیے رستم اور ناصر کے پاس موجود رہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر میں فیصلہ کن گفتگو کے لیے رستم کے پاس آ رہا ہے۔ وہ تینوں رہائش گاہ پر واپس آ گئے۔ برق جان کے آنے سے پہلے ایک بار پھر رستم کے لیے وہی جام آیا جو چند روز پہلے واس کے گھر میں آیا تھا۔ سونے کے اس جڑاؤ جام میں وہی محلول ہلکورے لے رہا تھا جو واس کے بقول برق جان کی طرف سے دوستی اور قربت کا پیغام تھا۔ ایک طرح سے برق جان نے دوبارہ یہ جام بھیج کر دوستی کی تجدید کی تھی۔ رستم نے اس نشہ آور جام کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پہلے کر چکا تھا۔ اس نے پہریداروں کی نظر بچا کر جام ایک طرف انڈیل دیا۔

دس پندرہ منٹ بعد برق جان بھی پہنچ گیا۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں سے گہری سنجیدگی نمایاں تھی۔ قہوے کی پیالیاں پتھر کی تپائی پر چن دی گئیں۔ برق جان نے ناصر کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ بند کمرے میں رستم، واس اور برق جان رہ گئے۔

برق جان نے گھمبیر انداز میں اپنے کٹے ہوئے بازو کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”آج میں تم دونوں سے کچھ اپنے دل کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جو میں نے بہت کم کسی سے کی ہیں۔ یہ باتیں کئی برسوں سے یا شاید لڑکپن سے ہی میرے اندر موجود تھیں مگر میں ان کو زبان پر نہیں لا سکتا تھا شاید اب بھی نہ لاتا۔ مگر اب حالات کچھ بدل گئے ہیں مجھے لگتا ہے کہ یہاں کچھ تبدیلیاں لا سکتا ہوں......اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ لوگ ان تبدیلیوں کو قبول کر سکتے ہیں۔“

چند لمحے توقف کر کے اس نے اپنے خیالات جمع کیے اور بولا۔ ”ہمارا یہ قبیلہ اس علاقے کے قدیم ترین قبیلوں میں سے ہے۔ پتھر کی سلوں پر جو کچھ لکھا ہوا ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ڈھائی ہزار سال پہلے تک بھی ہم لوگ موجود تھے اور اس کے ساتھ ہمارے عقیدے بھی۔ آبوک درخت اور سوی کے پتوں کی پوجا یہاں ہمیشہ سے جاری ہے۔ چند سو سال پہلے تک ہمارے قبیلے کی ایک شاخ ”روئے باش“ بلتستان کے شمالی کنارے پر بھی آباد تھی لیکن اب سب کچھ سمٹ سمٹا کر یہاں جمع ہو چکا ہے۔ ہم چین کی سرحد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“ اس نے چند لمحے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ”میری یہ خواہش رہی ہے کہ غلط رسموں کو یہاں سے ختم کیا جائے۔ خاص طور سے ایسی رسموں کو جو ہمارے مذہب کا حصہ نہیں ہیں......بس خواہ مخواہ مذہب میں شامل کر لی گئی ہیں۔ واس، تم میری بات سے اتفاق کر رہے ہو ناں؟“

”آپ کی سوچ ہمیشہ میری اپنی سوچ رہی ہے۔“ واس نے جواب دیا۔

”اب یہاں پر شادی کے معاملات ہی دیکھو۔ شروع شروع میں ادھیڑ عمر عورتوں سے شادی کرنے کی پابندی صرف ملک (سردار) اور اس کے بیٹوں پر ہوتی تھی۔ اور وہ واقعی اس کی پابندی کرتے بھی تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رواج منہ دکھاوے کے لیے دوسرے لوگوں میں پھیلا۔ ملک کی خوشنودی کو چاہنے والے لوگ جان بوجھ کر جوانی میں ادھیڑ عمر عورتوں سے شادی کرتے ہیں اور جوان لڑکیوں پر رال ٹپکاتے ہیں۔ نتیجے میں جرم پروان چڑھتا ہے۔ اور اب تو اس بات میں کوئی شک شبہ رہ ہی نہیں گیا کہ شوتم خان جو بظاہر برسوں سے رنڈوے کے طور پر زندگی گزار رہا تھا، رنگ رلیاں مناتا ہوا پکڑا گیا۔ جب سردار کی یہ حالت ہے تو دوسروں کے بارے میں کیا قیاس کیا جا سکتا ہے۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ پورے پاؤندہ قبیلے کے لیے شرمناک ہے۔“ واس نے ہنکارا بھرا۔

”اب اس بھینٹ چڑھانے والی رسم کو ہی لے لو۔ ہر سال کم از کم دو جوان لڑکیوں کا خون بے دردی سے بہا دیا جاتا ہے۔ شروع میں یہ رسم صرف اس وقت ادا کی جاتی تھی جب قبیلے پر کوئی بڑی آفت آتی تھی اور اگیارے میں ہونے والی عام عبادتوں سے ٹلتی نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس رسم کو تہوار کا حصہ بنا دیا گیا۔“

”سفید کپڑے پر خون سے رنگے ہاتھوں کی چھاپ لینے کا رواج تو پچھلے چالیس پچاس

سال میں بنا ہے۔" واس نے کہا۔

برق جان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "میں ان چیزوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں کی زندگی کو قدیم دور کے اندھیرے سے باہر کھینچنا چاہتا ہوں۔ مجاریاں سمجھتی ہیں کہ شاید میں یہاں کے مذہب کو چھیڑنا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف ان چیزوں کو نکالنا چاہتا ہوں جو مذہب سے باہر کی ہیں...... اور اس کے لیے...... ہاں، اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے وہ براہ راست رستم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میری مدد کی؟" رستم نے واس کی وساطت سے پوچھا۔

"ہاں، تمہاری مدد کی...... مجھے لگتا ہے کہ جو کام میں چاہتا ہوں وہ تم کر سکتے ہو۔ یقیناً کر سکتے ہو۔"

واس نے برق جان کے فقرے کا ترجمہ کر کے رستم تک پہنچایا۔ رستم نے واس کے ذریعے کہا۔ "ملک برق جان! کیا تم اس کی وضاحت کرو گے؟"

برق جان نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "جب تم باہر سے اس ٹاپو پر لائے گئے تھے تم نے وہ آبی گزرگاہ دیکھی ہوگی جس میں برفانی تودے گرتے رہتے ہیں۔ یہ یہاں کی اکلوتی آبی گزرگاہ ہے۔ کئی جگہوں پر اس کی گہرائی دو سو ہاتھ سے بھی زیادہ ہے۔ اس گزرگاہ کے بارے میں ایک پرانی روایت ہے...... قریباً دو سو سال پرانی! کہتے ہیں کہ یہ گزرگاہ پہلے موجود نہیں تھی اور ایک بڑے زلزلے کے بعد وجود میں آئی۔ اس زلزلے کے سبب زمین دو نیم ہوگئی اور راستہ بن گیا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، اس راستے کے درمیان ابھی بھی کہیں کہیں چٹانیں موجود ہیں۔"

"کہا جاتا ہے کہ ایک ایسی ہی چٹان تک پہنچنے کے لیے پانی کے اوپر پل بھی بنایا گیا ہے۔" رستم نے اپنی معلومات بیان کیں۔

برق جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "درحقیقت میں تم سے اسی پل کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ شاید تم نے اس پل کے بارے میں بس سنا ہے، دیکھا نہیں۔" رستم نے سر ہلا کر اس کی بات کو درست قرار دیا۔ برق جان نے بات جاری رکھی۔ "یہ پل اتنا تنگ نہیں جتنا دور سے نظر آتا ہے مگر اسے پار کرنا لوگوں کو بہت دشوار محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً اس کی وجہ وہ روایتیں ہی ہیں جو اس سے منسوب ہیں۔"

"کیسی روایتیں؟" رستم نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں روایتوں کے بارے میں بتانے سے پہلے اس پل اور چٹان کے بارے میں بتا دوں جہاں تک یہ پل پہنچتا ہے۔ جو کچھ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں، ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ یہ پل زلزلے کے بعد خود بخود بن گیا تھا۔ یہ بہت بلند اور مضبوط درخت کا ایک تنا ہے جسے قدرتی طور پر نیچے سے ایک دو اُبھری ہوئی چٹانوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ یہ پل آبی گزرگاہ کے قریباً وسط تک پہنچتا ہے۔ یہاں ایک چٹان پر ایک مجسمہ ہے۔ مجسمے کی گود میں پتھر کی ایک سِل پڑی ہے۔ اس سِل پر دو سو سال پہلے کی بزرگ مجاریوں نے کچھ باتیں لکھی تھیں۔ اس تحریر کے مطابق تحریر کے مالک سردار کو یہ اختیار حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اس پاؤندہ قبیلے کے رسم و رواج میں کچھ ضروری تبدیلیاں لا سکے۔ مگر اس سے پہلے کہ پتھر پر کندہ کی ہوئی یہ تحریر سردار کے سپرد کی جاتی...... زلزلے والا واقعہ ہو گیا۔ اس میں بہت کچھ درہم برہم ہو گیا۔ پتھر پر لکھی ہوئی تحریر برفانی ندی کے وسط میں چٹان پر پڑی رہ گئی۔ کچھ لوگوں نے یہ گمان بھی کیا کہ دیوتا تبدیلیاں چاہتے ہی نہیں تھے اس لیے ٹاپو پر آفت نازل ہوئی۔ مگر اگلے ایک سو سالوں میں اس خیال کو سوچنے والے لوگ کم رہ گئے۔ بعد میں یہ عقیدہ بن گیا کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا پل پار کر کے مجسمے تک پہنچے گا اور پتھر کی لکھی ہوئی سِل اٹھا لائے گا تو موجودہ سردار کو بھی وہی اختیار مل جائیں گے جو دو سو سال پہلے کے سردار کو ملتے۔ یعنی وہ بھی یہاں کے رسم و رواج میں ضروری تبدیلیاں لا سکے گا۔"

"کیا لوگوں نے سِل لانے کی کوششیں کیں؟" رستم نے پوچھا۔

"اب میں تمہیں اس روایت کے بارے میں بتاتا ہوں جو اس پل کے بارے میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور وہ روایت یہ ہے کہ اس پل کو پاپیادہ پار نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر پل کے آخری پندرہ قدم بہت زیادہ جان لیوا ہیں۔ یہ خیال یا عقیدہ سینہ بہ سینہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اب ٹھوس حقیقت کی طرح ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ پل اتنا تنگ نہیں جتنا دور سے نظر آتا ہے۔ بلکہ تم اسے قریب سے دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے۔ اس پر چل کر اسے پار کیا جا سکتا ہے مگر لوگ پار نہیں کر سکتے۔ میرے بچپن سے اب تک تین چار افراد اس پل پر سے گرے ہیں۔ دو تو ہلاک ہوئے تھے، ایک دو کو بچا لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ سلسلہ چلتا رہا ہے......"

"کیا مطلب...... پل پار کیوں نہیں ہوتا...... کیا چکر وغیرہ آ جاتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ نیچے چلتے ہوئے پانی کو دیکھتے ہوں اور چکرا جاتے ہوں لیکن میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ سب عقیدے اور وہم کا تانا بانا ہے۔ لوگوں کے

ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ شاید آبوک موجودہ صورتِ حال میں تبدیلی کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے لوگ تبدیلی لانے والی اس تحریر تک نہیں پہنچ پاتے۔''

رستم نے عجیب لہجے میں پوچھا۔ ''تو کیا تمہارے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھی ہوئی ہے؟''

برق جان کے چہرے پر رنگ سا لہرایا پھر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو رستم... میں اس بات سے انکار نہیں کرتا۔ میں نئی سوچ رکھتا ہوں، اس کے باوجود میں اپنے قبیلے کی سوچ سے پوری طرح آزاد نہیں ہوں۔ میرے ذہن میں کئی بار آیا ہے کہ میں خود ہی اس حوالے سے کچھ کروں۔ اب تو خیر میرا ایک بازو ہی نہیں ہے مگر نوجوانی کے دنوں میں، میں نے دل کڑا کر کے پل کو پار کرنے کا تہیہ کئی بار کیا۔ ہر بار ایک اَن دیکھی دیوار آنکھوں کے سامنے آئی اور میں بے بس ہوا۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''میں نے اس بارے میں بہت سوچ بچار کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم پاؤندوں میں سے شاید ہی کوئی یہ کام کر سکے۔ ہمارے اندر کا خوف ہمیں کبھی اس حوالے سے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ یہ کام کوئی باہر کا شخص ہی کرے گا۔ اس کا ذہن وہم سے آزاد ہوگا اور اگر وہ باہمت ہوا تو اس کے لیے یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''تم چاہتے ہو، میں یہ کام کروں؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ میری دلی خواہش ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ میں نے جب جب تمہیں دیکھا ہے، میرے دل نے گواہی دی ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ میں منہ پر تعریف کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تمہارے اندر وہ اعتماد نظر آیا ہے جو ایسے کسی کام کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں بات صرف اعتماد کی ہے۔''

رستم، برق جان اور دواس میں بند کمرے کے اندر یہ بات چیت جاری رہی۔ بالآخر رستم نے پوچھا۔ ''فرض کیا، میں یہ سب کچھ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں...... اور زندہ بچ جاتا ہوں تو بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟''

''جو تم چاہو گے۔ میں تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا۔''

''ایڑی چوٹی کے زور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ تم یہاں کے ملک ہو۔ اب یہاں تمہارا حکم چلتا ہے۔''

''بے شک میرا حکم چلتا ہے لیکن میں کلی طور پر مختار نہیں۔ مجھے جرگے کے ارکان اور خاص طور سے بڑی مجاری کے ساتھ مشورہ کرنا پڑتا ہے اور یہ ساری صورتِ حال تم نے خود بھی دیکھی ہے۔ بہرحال میں نے کہا ہے ناں کہ اس کام کا صلہ تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوگا۔''

''کیا مجھے اور میرے ساتھیوں کو آزاد کر دیا جائے گا؟'' رستم نے برق جان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں...... کر دیا جائے گا۔ تم ایک آزاد پاؤندے کی حیثیت سے یہاں اپنا گھر بنا سکو گے۔ کام کر سکو گے...... بلکہ چاہو تو شادی بھی کر سکو گے......''

رستم زہر بھرے انداز میں مسکرایا۔ ''میں اس آزادی کی بات نہیں کر رہا۔ میں تمہارے اس ٹاپو سے آزادی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے گھروں کو واپس بھیج سکتے ہو؟''

برق جان کے چہرے پر طیش کا رنگ سا لہرایا۔ پھر وہ خود کو سنبھال کر بولا۔ ''تم جانتے ہو رستم، ایسا ممکن نہیں ہے...... ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکے گا......''

''یہاں اور بہت کچھ ایسا ہونے جا رہا ہے جو تمہارے بقول پچھلے دو ہزار سال میں نہیں ہوا۔ تو پھر یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''اس میں ہماری بقا کا سوال ہے۔ تم...... تم جو مانگو گے ملے گا لیکن یہ ممکن نہیں ہے......''

''تو وہ بھی ممکن نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تمہارے بقول جو کام پچھلے دو سو سال میں نہیں ہوا اور جسے کرنے کی کوشش میں لوگوں نے جانیں گنوائی ہیں...... اس میں، میں اپنا سر کیوں گھسیڑوں۔''

''اتنی جلدی انکار ٹھیک نہیں رستم! تمہیں شاید ٹھیک سے اندازہ نہیں کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی سلامتی کے لیے میں نے کتنے لوگوں کی مخالفت مول لی ہے۔ اور یقین کرو، بات صرف اس کام کی ہی نہیں ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں مارگہ بستی میں کوئی مرتبہ ملے...... تم میرے آس پاس رہو۔ مجھے تمہارے جیسے توانا بازوؤں کی ضرورت ہے۔''

''لیکن ہمیں اپنے گھر بار کی ضرورت ہے۔ اپنے ان پیاروں کی ضرورت ہے جن کی صورتیں دیکھے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔''

برق جان نے جبڑے بھینچ لیے اور سرنفی میں ہلایا جیسے رستم کو بتانا چاہ رہا ہو کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا۔ تب وہ ایک دم کھڑا ہوا اس نے رستم کو دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جواب دینے میں جلدی نہ کرو۔ ایک دو دن اچھی طرح سوچ لو۔ واس سے بھی مشورہ کرو۔ اور ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ میں جو کچھ کرنا چاہ رہا ہوں اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ میں لوگوں کی وہ مصیبتیں کم کرنا چاہ رہا ہوں جو مذہب کے نام پر یہاں مسلط کر دی گئی ہیں۔''

اس رات رستم، واس اور ناصر میں دیر تک بات چیت ہوئی۔ واس اس مرحلے میں برق جان کی طرفداری کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''برق جان جو کچھ بھی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ اس کا ثبوت تم دونوں دیکھ ہی رہے ہو۔ وہ جو کام نہیں کر سکتا اس کی امید بھی نہیں دلا رہا۔ اس نے صاف الفاظ میں تمہیں بتایا ہے کہ تمہیں یہاں سے آزاد کرنا اس کے اختیار میں نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ مقامی قانون کی سب سے بڑی خلاف ورزی ہوگی۔ لوگ شاید اسے زندہ ہی نہ چھوڑیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہماری قبریں یہیں بنیں گی۔'' ناصر نے غصے سے کہا۔

''میں تمہارے سامنے مایوسی کی بات کرنا نہیں چاہتا اور نہ میں نے کبھی کی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے یہاں کے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے اور جانا ہے وہ یہی ہے کہ اس پاؤندہ بستی میں باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص کبھی یہاں سے واپس نہیں گیا۔ کم از کم پچھلے ڈیڑھ دو سو برسوں میں تو ایسی مثال نہیں ہے۔ اس ٹاپو کی ظالم چڑھائیاں کبھی کسی کو راستہ نہیں دیتیں۔ باہر آنے جانے کا فقط ایک راستہ ہے اور اس راستے سے بلا اجازت گزر جانا ایسا ہی ہے جیسے سوئی کے ناکے سے اونٹ گزرنا۔''

''تو پھر ہم کیا کریں...... یہیں مرجائیں۔'' رستم نے زچ ہو کر پوچھا۔

''نہیں...... یہاں پر زندہ رہیں اور اوپر کی طرف سے کسی انہونی کا انتظار کرتے رہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہاں شادیاں کر لیں...... بچے پیدا کریں اور ملک کی چاکری کرتے رہیں۔ پھر ایک دن تمہاری طرح ہمیں بھی یہ برفیلا جہنم اپنا وطن لگنے لگے۔ ہم قہوہ پئیں، گڑگڑی کے کش لیں...... اور صبح سویرے برفانی مرغ کا شوربا سڑپ کر بھیڑ بکریوں کے پیچھے نکل جائیں......'' رستم نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ ناکام کوششیں کرنے اور جانسن کی

طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ اب کچھ دیر تک برق جان کی مرضی کے مطابق چلو...... یہاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کیا پتا کل کلاں کوئی ایسی تبدیلی بھی آ جائے جس میں تمہارے لیے کوئی امید کی کرن ہو۔''

باہر برفانی ہوائیں چلتی رہیں اور اندر انگیٹھی کی حرارت میں چینی کے پیالوں میں قہوہ پینے کے ساتھ میں یہ تینوں افراد مسلسل بحث کرتے رہے۔ رات کے سناٹے میں دور کہیں برفانی ندی کے اندر برف کے تودے گرنے کی آوازیں ایک گونج پیدا کرتی رہیں۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ یہ ندی اس ٹاپو سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ تاہم راستہ پیچ دار تھا۔ یہ وہی ندی تھی جس کا ذکر برق جان نے کیا تھا۔ اس ندی کے اوپر لکڑی کا قدرتی پل تھا۔ اور اس پل کے ساتھ طویل عرصے سے ایسے واہمے وابستہ ہو چکے تھے کہ یہ عام سا پل...... پل صراط بن گیا تھا۔ خاص طور سے اس کے آخری قدم، موت کے قدم سمجھے جاتے تھے۔ اور پنجاب کے ہرے بھرے کھیتوں سے اٹھ کر اس برفزار میں باہمت رستم سیال دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس پل پر قدم رکھے گا جس طرح زری والا وہم رستم کے ہاتھوں چکناچور ہوا تھا اور زری کے بھینٹ نہ چڑھنے کے باوجود بالآخر شوتم کو شکست ہوئی تھی، اسی طرح یہ پل والا وہم بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونا چاہیے تھا۔

اگلے روز نے مان رستم سے ملنے آیا۔ لڑائی سے پہلے رستم نے نے مان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ نے مان نے اس ہاتھ کو قبول کیا تھا اور بڑی حد تک دوستی کا حق بھی ادا کیا تھا۔ اس لڑائی کا ساٹھ ستر فیصد فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا جب شوتم نے اپنی جان ہاری تھی...... اور شوتم کو قتل کرنے کا کام رستم اور نے مان نے ہی انجام دیا تھا۔ نے مان کو اپنے پالتو جانور کی ہلاکت کا غم تھا مگر اس غم پر فتح کی خوشی حاوی تھی۔ رستم نے باتوں باتوں میں نے مان سے برفانی ندی کے پل اور پتھر پر کندہ کی ہوئی تحریر کا ذکر چھیڑ دیا۔ نے مان نے بھی اس حوالے سے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے رستم کو واس کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ روایات یہی تھیں کہ پتھر کی کندہ کی ہوئی تختی جس سردار کے پاس ہوگی وہ قبیلے کے رسم و رواج میں ضروری تبدیلیاں لا سکے گا۔ نے مان کی معلومات کے مطابق پچھلے ساٹھ ستر برسوں میں کم از کم تین سرداروں نے اس پتھریلے کتبے کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جن افراد کو اس کوشش کا حصہ بنایا گیا ان میں سے دو ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔

اس سلسلے میں انکشاف کرتے ہوئے نے مان نے ایک نئی بات بتائی۔ اس نے کہا۔

''دو سال پہلے شوتم خان پر بھی یہ جنون سوار ہوا تھا۔ اس نے قبیلے میں سے دو افراد کو اس کام پر

آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ان دونوں بندوں کو بھاری انعام واکرام کا لالچ دیا گیا۔مگر پل کا خوف اس لالچ سے بہت زیادہ ہے جو وقتاً فوقتاً لوگوں کو دیا جاتا رہا ہے۔اور میرے خیال میں گزرنے والے وقت کے ساتھ بڑھتا ہی رہا ہے......کم نہیں ہوا۔"

"وہ دو بندے کون تھے؟" رستم نے پوچھا۔

"ان میں سے ایک تو بیشو تھا۔تم اسے جانتے ہو۔وہی جو ریچھوں کی رکھوالی کرتے ہوئے زخمی ہوا تھا۔قریباً تیس سال پہلے بیشو کا دادا اس پل کو پار کرنے کی کوشش میں ندی میں گر گیا تھا اور اپنی دونوں ٹانگیں تڑوا بیٹھا تھا۔شاید تمہیں سن کر حیرانی ہو...... دوسرا بندہ میں تھا۔"

"پھر تم نے انکار کر دیا؟"

"ہاں......ہم دونوں نے انکار کر دیا۔یہ ایسا کام ہے جسے کرنے والا پچھتاتا ہے اور نہ کرنے والا بھی۔کرنے والا اس لیے پچھتاتا ہے کہ وہ مرتا ہے یا گر کر اپاہج ہوتا ہے۔نہ کرنے والا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ کام کیا جا سکتا تھا۔وہ پل بہت تنگ نہیں ہے۔اکثر وہاں ہوا بھی زیادہ تیز نہیں ہوتی۔مگر پل پر پاؤں رکھتے ہی دل و دماغ پر ایک قسم کی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔خاص طور سے پل کا آخری حصہ پار کرنا ناممکن نظر آنے لگتا ہے۔ندی میں گرنے والے زیادہ تر آخری چند قدم میں ہی گرتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں آخری بندہ کب گرا تھا؟"

"قریباً سات آٹھ سال پہلے۔میں نے وہ منظر نہیں دیکھا لیکن بتانے والے بتاتے ہیں کہ وہ بس پانچ چھ قدم دور رہ گیا تھا۔پھر وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو گر گیا۔وہ سر کے بل گرا، چٹان سے ٹکرایا اور وہیں مر گیا۔اس کی لاش نیچے کی طرف بہہ گئی اور مشکل سے نکالی گئی۔اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سرخ ہو چکا تھا اور اس کی طرف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پل کے پار نہ ہو سکنے کی وجہ پُراسرار ہے؟"

"بے شک یہ سمجھا جاتا ہے اور اب سے نہیں، بہت پرانے وقت سے سمجھا جاتا ہے۔آخر یہاں کچھ نہ کچھ تو ایسی بات ہے جو بندے بشر کی عقل میں نہیں آتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ اس وقت پورے پاؤندہ قبیلے کی چاروں شاخوں میں کوئی ایسا بندہ بھی نہیں ہوگا جو بڑے سے بڑے فائدے کے بدلے میں اس پل پر قدم رکھنے کا حوصلہ کرے۔"

"اور قبیلے کے باہر سے؟"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔" رستم نے بات بدلی۔"آخر کبھی نہ کبھی اس کتبے کو وہاں سے اٹھایا ہی جائے گا۔پل کے علاوہ بھی کتبے تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہوگا۔ندی کے ذریعے یا رسّے وغیرہ کے ذریعے؟"

"یہی مسئلہ ہے۔بزرگ مجازیوں کے ذریعے جو بات چلی آرہی ہے... وہ یہی ہے کہ پتھر کی لکھی ہوئی سل تک پہنچنے کے لیے پل کا راستہ ہی استعمال کرنا ہوگا۔اگر کوئی بندہ اس راستے پر چل کر وہ پتھر کی لکھی ہوئی سل اٹھا لائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب آبوک تبدیلیوں پر راضی ہے۔دوسری صورت میں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ابھی تبدیلیوں کا وقت نہیں آیا۔"

"کیا قبیلے والے تبدیلیاں چاہتے ہیں؟" رستم نے پوچھا۔

"اس بارے میں تمہیں واس ہی بہتر بتا سکتا ہے۔مجھے یوں لگتا ہے کہ پرانے لوگ تبدیلیاں نہیں چاہتے لیکن نئے لوگ چاہتے ہیں۔لیکن وہ بھی کھل کر بات نہیں کرتے......کہ کہیں وہ بھی کسی قدرتی سزا کی زد میں نہ آ جائیں۔ہو سکتا ہے کہ جب یہ لوگ بھی بڑی عمر کے ہو جائیں تو تبدیلیوں کے حق میں نہ رہیں۔کہتے ہیں کہ ہر زمانے میں عمر کے ساتھ ساتھ لوگوں کے خیال بدلتے رہتے ہیں۔"

رستم نے تعریفی نظروں سے نے مان کو دیکھا۔"میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف جنگلی جانوروں سے ہی پنجہ لڑاتے ہو۔اب پتہ چلا ہے کہ تم باتیں بھی کر لیتے ہو۔"

"شکریہ......لیکن تم نے بھی مجھے اور دوسروں لوگوں کو حیران کیا ہے۔"

"کس بات پر؟"

"تم نے بڑی تیزی سے مقامی زبان سمجھنا شروع کر دی ہے۔اس کام میں لوگوں کو کئی سال لگ جاتے ہیں۔میرے خیال میں تمہارا ڈاکٹر ساتھی بھی ابھی اتنے لفظ نہیں سمجھ لیتا جتنے تم سمجھ لیتے ہو۔"

"کبھی کبھی اَن پڑھ ہونے کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔" رستم نے کہا۔

"مگر تم بالکل اَن پڑھ بھی نہیں ہو۔مجھے لگتا ہے کہ ہماری دوستی چلے گی۔"

"مجھے بھی لگتا ہے۔" رستم نے کہا۔

رستم کے چہرے کی گہری خراشیں اب مندمل ہو رہی تھیں۔ناصر روزانہ اس کے چہرے پر مرہم لگاتا تھا۔رستم کے کندھے کی چوٹ بھی اب بہتر ہوتی جا رہی تھی۔اس رات ایک غیر

متوقع بات ہوئی۔ رستم اور ناصر وغیرہ کی نگرانی پر مامور پہریدار وہاں سے ہٹا لیے گئے۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ رستم، ناصر اور شریف کو کسی حد تک آزادی کا احساس ہوا۔ شریف نے کہا۔ ''مجھ کو لگدا ہے جی کہ برق جان ہم کو رعائتیں دینا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں ہماری یہ منحوس بیڑیاں بھی کھل جائیں۔''

''نہیں۔ ان بیڑیوں کو تو بھول جاؤ۔ یہ تو شاید ہماری موت کے بعد ہی کھلیں گی۔'' ناصر نے مایوس انداز میں کہا۔

''خیر، اتنا بددل ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔'' رستم بولا۔ ''آہستہ آہستہ بہتری آ رہی ہے۔''

رستم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلی رات ایک بہتری آئی۔ یہ بہتری زری کی شکل میں تھی۔ رستم تو اسے بہتری نہیں سمجھ رہا تھا مگر ناصر کے چہرے پر ضرور رونق آ گئی۔ رات پہلے پہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ رستم نے دروازہ کھولا تو سامنے برق جان کا قریبی ہمراز محافظ کھڑا تھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی زری اس کے ساتھ تھی۔ محافظ نے انہیں بتایا کہ زری یہاں رہے گی۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے وہ اسے واپس لے جائے گا۔ محافظ نے کہا۔ ''یہ جتنی دیر یہاں رہے، اسے پوری رازداری کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''لیکن اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ سوال اسی سے پوچھو تو بہتر ہے۔'' پہریدار معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم نے اسے اپنے ساتھ سُلا کر بیمار کر دیا ہے۔'' پہریدار نے کہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا طنز تھا۔

رستم نے دیکھا، زری کا چہرہ بخار سے تمتما رہا تھا مگر شاید صرف بخار ہی نہیں تھا اندرونی ہیجان بھی تھی۔ زری کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ رستم کے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم آگ ہو رہا تھا...... سر سے پیر تک ایک لرزش سی تھی۔ رستم نے اسے بمشکل پیچھے ہٹایا۔ ''کیا کرتی ہو؟'' رستم نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا دماغ ٹھیک ہونے والا ہے۔''

''تم جو بھی کہو۔ میں یہیں رہوں گا۔'' وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ اس کی سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

رستم نے اس سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ مناسب نہیں سمجھی۔ اسے بٹھایا، پانی وغیرہ پلایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برق جان نے زری کی حالت دیکھتے ہوئے اسے یہاں بھیج دیا ہے۔ برق جان کے اس عمل سے یہ بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ وہ بڑی مجاری کی بشارتوں اور ڈراوؤں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ برق جان نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ زری گارنی ہونے کے باوجود اب ایک عام لڑکی ہے۔ وہ ایک مرد سے اپنا پہلا جسمانی تعلق بنا چکی ہے ... اور اب اس مرد کے لیے زری کی بے چینی ایک فطری عمل ہے۔

زری بڑی ہی سادگی میں رستم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر رستم نے محسوس کیا کہ اس کے گرم آنسو کپڑے میں سے گزر کر اس کی رانوں پر سرسرا رہے ہیں۔ رستم پچکارنے والے انداز میں اس کے منڈھے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اٹھ کر رستم سے لپٹ گئی اور عجب گرم جوشی سے اس کے سر، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دینے لگی۔ وہ رستم کے قرب کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ یہ بارشی جنگلوں میں چلنے والی اس شوریدہ سر ہوا کا سا انداز تھا۔ جو تناور درختوں کو بھی جڑوں کی گہرائیوں تک لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد اچانک کچھ یوں ہوا کہ زری کی گرم جوشی کم ہو گئی۔ رستم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے سر لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ وہ جیسے کوئی چیز Miss کر رہی تھی...... جسم کی خوشبو، لمس یا کچھ اور...... اس کی سادہ سمجھ میں جیسے خود بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کمی محسوس ہو رہی ہے۔

اس کی یہ کیفیت رستم کے لیے تسلی کا باعث تھی۔ وہ رستم کے کندھے سے سر ٹکائے نیم دراز رہی اور اس کے سینے کے بالوں پر اپنی خوبصورت انگلیاں چلاتی رہی۔ انگلیاں چلاتے چلاتے اس نے رستم کے سینے پر کھدے ہوئے اس حرف کو چھوا جو رستم کی زندگی کا حاصل تھا۔ ''بی بی'' کے لفظ سے تعلق رکھنے والا حرف "B"......

''یہ کیا ہوتا؟'' زری نے نیم غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس نشان ہے۔'' رستم نے خشک لہجے میں کہا اور زری کا ہاتھ اس حرف پر سے ہٹا دیا۔

اسے یہ بھی اچھا نہیں لگا تھا کہ زری اس حرف کو چھوتی۔ اسے یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ زری اس جسم اور اس روح کو چھوئے جس کا ناتا صرف اور صرف بی بی سے تھا۔ اس پر بی بی کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ اور یہ رنگ ایسا نہیں تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور رنگ اپنا اثر دکھاتا۔ یہ بڑا گہرا رنگ تھا۔ اس میں ایک نشہ تھا، ایک سرمستی...... ایک جادوئی کیفیت تھی۔ یہ

عشق کا رنگ تھا۔ اور یہ ایسا عشق تھا جس کو جسموں کے ملاپ نے اور بھی لافانی اور لازوال کر دیا تھا۔ زری نے سینے پر کندہ حرف پر انگلی رکھ کر پوچھا تھا، یہ کیا ہے؟ اگر رستم اسے بتا سکتا تو بتاتا یہ زندگی ہے، یہ سانس کی ڈور ہے اور ملن کی آس ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو پنجرے میں اپنے پَر پھڑپھڑاتا ہے اور نیلے آسمان کے نیچے ایک لمبی اُڑان کے سپنے دیکھتا ہے...... تا کہ اپنے بچھڑے ساتھی سے مل سکے۔ یہ وہ حوصلہ ہے جو تنگ و تاریک زندانوں کے اندر قیدیوں کو زندہ رکھتا ہے اور ان کے سینوں میں سالہا سال تک اس آس کو روشن رکھتا ہے کہ ایک دن وہ پھر سے اپنے پیاروں کو مل سکیں گے۔

''مجھ کو لگتا...... تم بدل گیا۔'' زری رستم کے کان میں منمنائی۔

''میں تو نہیں بدلا، شاید کچھ اور بدل گیا ہو۔ تم کو کیا لگتا ہے؟''

وہ لالٹین کی روشنی میں بڑے دھیان سے رستم کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر الجھن سی الجھن تھی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔'' زری نے کہا۔ اس نے اپنا سر دوبارہ رستم کے سینے پر ڈالا اور کسی جنگلی بلی کی طرح اس کو سونگھنے کی کوشش کی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کسی معصوم بچی کی طرح اطمینان کی نیند سو رہی تھی۔ اس کے پھنکتے ہوئے جسم کی تپش بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ سو رہی تھی پھر بھی اس کے چہرے پر مایوسی اور الجھن دکھائی دیتی تھی۔ رستم نے آہستگی سے خود کو اس سے جدا کیا۔ ناصر اور شریف ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ ناصر کی ساری توجہ اس کمرے کی طرف ہو گی۔ وجہ یہ تھی کہ زری یہاں موجود تھی اور زری ایک ہی رات میں...... بلکہ رات کے مختصر سے حصے میں ناصر کے بہت قریب آ چکی تھی۔ زری کے لیے بے پناہ لگاوٹ کے جذبات، رستم نے ناصر کی آنکھوں میں اس رات کی صبح کو ہی دیکھ لیے تھے۔

رستم کمرے سے باہر آیا تو ناصر برآمدہ نما جگہ پر ٹہل رہا تھا۔ ''آپ باہر کیوں آ گئے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ سو گئی ہے۔''

''اس کا بخار کچھ کم ہوا؟'' ناصر نے دریافت کیا۔

''جو بخار تمہاری وجہ سے چڑھا ہے، وہ تمہارے بغیر کیسے اُتر سکتا ہے۔'' رستم زیر لب مسکرایا۔ پھر فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''جو ظاہری بخار تھا، وہ تو کم لگ رہا ہے۔''

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟'' ناصر نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی اچھی کہی۔ تمہیں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ اجازت تو ہمیں لینی چاہیے۔''

ناصر اندر گیا اور زری کو دیکھ کر آیا۔ رستم نے کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے، بہتر ہے کہ تم اب اس کے پاس ہی رہو۔ اگر میرے بارے میں پوچھے تو اسے بتاؤ کہ میں اس گھر سے باہر ہوں۔''

ناصر تو جیسے خود بھی یہی چاہتا تھا۔ رستم دوسرے کمرے میں آ گیا اور کچھ ہی دیر میں سو گیا۔ اس کی آنکھ رات کے تیسرے پہر کھلی۔ ساتھ والے کمرے میں شور ہو رہا تھا۔ زری ہچکیوں سے رو رہی تھی اور ناصر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم جھوٹ بولتا...... رستم ادھر ہی...... میں اس کے پاس جاؤں گا۔'' وہ ایک ضدی بچی لگ رہی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''دیکھو...... میں غلط نہیں کہہ رہا۔ اس کو جانا پڑا ہے۔ اس کی ٹانگ میں بہت تکلیف تھی۔ تمہیں پتا ہے ناں اس کی ٹانگ میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے......''

''نہیں...... وہ بالکل ٹھیک...... وہ ابھی یہاں تھا۔''

رستم نے باہر جا کر دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر لالٹین کی روشنی تھی۔ بستر کا بھاری بھرکم لحاف فرش پر پڑا تھا۔ زری رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ناصر نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما ہوا تھا اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو کچھ کر رہا تھا، بالکل درست تھا۔

زری واویلا کرتی رہی۔ رستم کو اس پر ترس آ رہا تھا مگر وہ خود پر ضبط کیے دوسرے کمرے میں پڑا رہا۔ اسے پھر نیند آ گئی۔ قریباً دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ زری سو رہی تھی اور ناصر ایک تیماردار کی طرح اس کے پاس بیٹھا تھا۔

ناصر کے کردار کا یہ نیا رخ رستم کے سامنے آیا تھا اور یہ بہت مثبت رخ تھا۔ کہنے کو ناصر بھی ایک مفرور ڈاکو تھا۔ اس کے ہاتھوں کئی افراد قتل ہو چکے تھے جن میں یقیناً پولیس والے بھی شامل تھے۔ ایسے لوگوں کی حسیات عموماً ختم ہو جاتی ہیں اور مثبت جذبات دم توڑ جاتے ہیں لیکن یہاں زری کے معاملے میں ناصر کا رویہ ایک ڈاکو کا نہیں تھا بلکہ نازک خیالات رکھنے والے ایک دردمند شخص کا سا تھا۔ شاید یہ اسی ڈاکٹر کا رویہ تھا جو چند برس پہلے ایک ٹریفک آفیسر کی ہٹ دھرمی کے سبب اپنی روشن منزل سے دور ہو کر اندھیروں میں بھٹک گیا تھا۔ چند روز پہلے ایک اتفاق کے تحت اچانک زری ناصر کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تو اس اتفاق کو تھوڑی دیر کا نشاط آور کھیل سمجھ کر بھول سکتا تھا۔ اس کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ زری کچھ زیادہ خوب صورت نہیں تھی، نہ ہی مہذب تھی۔ اس کے باوجود

ناصر کی آنکھوں میں زری کے لیے ایک اٹوٹ تعلق کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ صبح تاریکی چھٹنے سے پہلے برق جان کا خصوصی محافظ ریان بخت، زری کو برق جان کی قریبی رہائش گاہ میں واپس لے گیا۔ زری نے پہلے تو واپس جانے سے انکار کیا مگر جب ریان بخت نے اسے اپنی موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے دیکھا تو وہ ڈر سی گئی اور اپنا منہ اور سر چادر میں لپیٹ کر باہر چلی گئی۔

تاہم اگلی رات ریان کو اسے پھر رستم کے پاس لانا پڑا۔ وہ اسی ہیجانی کیفیت میں تھی۔ رستم اور ناصر طے کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ رستم کو کسی بھی صورت زری کے سامنے نہیں آنا تھا..... آج پھر زری نے بہت ضد کی۔ اس نے رو رو کر آنکھیں متورم کر لیں۔ وہ رستم سے ملنا چاہتی تھی۔ ناصر نے اسے بتایا کہ اس کی ٹانگ میں درد ہے۔ اس درد کا سبب وہ بھاگ دوڑ ہے جو شوتم خان کے ساتھ لڑائی کے دوران میں ہوئی ہے، اب وہ شفا خانے میں ہے۔ زری کسی صورت ماننے میں نہیں آ رہی تھی۔ ناصر اسے سنبھالتا رہا، پچکارتا رہا۔ رستم نے قریباً ایک گھنٹے بعد دوبارہ ناصر اور زری کے کمرے میں جھانکا تو ناصر اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے میں مصروف تھا۔ زری کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے اور اس کے ریشمی رخساروں پر آنسوؤں کی نمکین لکیریں خشک ہو چکی تھیں۔ صورتِ حال بہتر ہو رہی تھی۔ رستم سو گیا۔

دوبارہ رستم کی آنکھ صبح صادق سے کچھ دیر پہلے کھلی۔ سرد ہوا چل رہی تھی..... پاؤندہ بستی اپنی تمام تر برفانی وسعت کے ساتھ نیند کے سناٹے میں ڈوبی تھی۔ رستم اٹھا، ساتھ والے کمرے میں لالٹین بدستور روشن تھی۔ اس نے احتیاط سے کمرے میں جھانکا۔ ناصر نے انگیٹھی روشن کر رکھی تھی۔ اس نے زری کو انگیٹھی کے بالکل پاس بٹھایا ہوا تھا۔ اس طرح زری کا بایاں پہلو انگیٹھی سے قریب تر ہو گیا تھا۔ زری کا اونی لبادہ بائیں کندھے سے نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔ زری کی جلد جنگلی گلاب ہی کی طرح تروتازہ اور پُر شباب تھی۔ اس کے کندھے اور پہلو پر نیلگوں چوٹوں کے ایک دو نشان تھے۔ یہ چوٹیں زیادہ پرانی نہیں تھیں۔ غالباً یہ اس بے قراری کا نتیجہ تھیں جو زری رستم کے پاس آنے کے لیے دکھاتی رہی تھی۔ شاید برق جان یا اس کی کسی خادمہ نے زری کو پیٹا تھا۔

ناصر اس کے کندھے اور پہلو پر اپنے ہاتھ سے کسی آئنٹمنٹ کی مالش کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں ملائمت اور محبت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے زری کو کوئی دوائی بھی کھلائی تھی۔ گولی کا ریپر پاس ہی لکڑی کی تپائی پر پڑا تھا۔

......اگلی دو راتوں میں ایسی دو ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ رستم زری کے سامنے نہیں آیا۔ ناصر ہی اس کے پاس رہا اور اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ رستم کوئی نفسیات دان نہیں تھا، نہ وہ کسی بھی طور دانشوروں کی صف میں آتا تھا..... مگر زمانے اور حالات سے حاصل کی ہوئی دانش اور معاملہ فہمی اس کے پاس ضرور موجود تھی۔ اس نے زری کی صورتِ حال پر خاصا غور کیا تھا۔ بے شک وہ رستم سے گہری وابستگی محسوس کرتی تھی مگر اس میں زیادہ گہرائی نہیں تھی۔ وہ رستم کو اس لیے پسند کرنے لگی تھی کہ وہ نے مان کی طرح خونخوار ریچھوں سے دلیرانہ پنجہ آزمائی کرتا تھا اور کامیاب رہتا تھا۔ رستم کے ساتھ زری کے لگاؤ میں زیادہ عمل دخل ان منہ زور تقاضوں کا تھا جو نوخیز لڑکیوں میں طوفانی شدت سے ابھرتے ہیں۔ ناصر سے جسمانی رابطہ کے بعد زری کے اندر کا یہ خلا مزید شدید ہو گیا تھا۔

تیسری رات کو سونے سے پہلے رستم نے حسبِ معمول ناصر کے کمرے میں جھانکا تو اسے کچھ تسلی ہوئی۔ آج زری کی بے چینی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ناصر بستر پر نیم دراز تھا۔ زری کم سن بچی کی طرح اس کے کندھے سے سر ٹکائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ناصر نے کاجل کے ذریعے اس کی آنکھوں کے اوپر بھنویں بنا دی تھیں۔ ان بھوؤں کی وجہ سے وہ قبول صورت دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا اونی لبادہ اس کی ٹانگوں سے اوپر چڑھا ہوا تھا اور پنڈلیوں کو عریاں کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ناصر کسی کام سے باہر آیا تو رستم نے اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا۔ ”میں نے کہا تھا ناں..... بس دو چار دن کی بات ہے۔ اب دیکھو، وہ نارمل نظر آنے لگی ہے۔“

”مگر اس کے لیے مجھے سخت کوشش کرنا پڑی ہے۔ سمجھیں کہ ہلکان ہو گیا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب وہ اسٹیج آ گئی ہے۔“ رستم نے کہا۔

”کون سی اسٹیج؟“

”اب اسے بتا دینا چاہیے کہ اس رات وہ اس کے گھر میں اس کے ساتھ کون تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اب وہ اسے قبول کر لے گی۔ وہ تمہارے کافی قریب آ گئی ہے۔“

”لیکن مجھے ابھی بھی اندیشہ ہے۔“

”کوئی اندیشہ نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم اسے جو بتاؤ گے وہ اس پر یقین کرے گی۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ عورتوں کی حسیات ایسے معاملوں میں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ مسئلہ صرف رازداری کا ہے۔ پہلے اسے رازداری پر رضامند کر لینا۔“

ناصر کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ مگر ابھی ایک دو روز ٹھہر جائیں۔''

رستم نیم رضامندی کے انداز میں خاموش رہا۔

بستی کے حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ شوتم خان کے چند کٹر حمایتی افراد کو برق جان نے بندی خانے میں ڈال دیا تھا۔ ان میں شوتم کا بڑا بیٹا ارفا خان بھی تھا۔ دو تین افراد کو عورتوں اور بچوں پر ظلم کے جرم میں گولی سے اُڑا دیا گیا تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجاریاں بدستور برق جان سے ناراض ہیں...... خاص طور سے بڑی مجاری۔ اس کے علم کے مطابق زری کو رستم نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا اور وہ ابھی تک سزا سے بچا ہوا تھا۔ بڑی مجاری کے علاوہ جن تین دیگر پہریداروں کو اس رات کی واردات کا علم تھا، ان میں سے دو کو برق جان نے اپنی حفاظتی حراست میں لے لیا تھا صرف تیسرا پہریدار ریان بخت ضروری امور انجام دے رہا تھا۔ پل اور پتھر کی تختی والا معاملہ ہنوز لٹکا ہوا تھا۔

دو راتوں کے وقفے سے زری پھر رستم کے پاس پہنچی۔ درحقیقت وہ ناصر کے پاس ہی پہنچی تھی۔ رستم نے کہا۔

''ناصر! اب مزید دیر نہ کرو۔ اسے بتا دو۔''

''کیا وہ اس کو راز رکھ سکے گی؟''

''ضرور رکھے گی۔ اس کے اندر طلب ہے۔ یہ طلب اسے راستہ دکھائے گی۔''

''کیا ہم واس اور برق جان کو بھی بتا دیں؟''

''نہیں۔ وقت آنے پر واس کو بتا دیں گے مگر برق جان کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں خطرہ ہے۔''

کچھ دیر بعد ناصر کمرے میں زری کے پاس چلا گیا۔ غالباً اب وہ اس تناؤ کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ کام جلد نمٹانے کا خواہش مند تھا۔ وہ جاتے ہی زری کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ آج منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی۔ اس کی مصنوعی بھنویں مٹ چکی تھیں۔ اس نے آئینہ دیکھا اور بھوؤں کے بارے میں بات کی۔

ناصر نے کہا۔ ''اس کا کیا ہے...... پھر بنا لیتے ہیں۔''

اس نے کاجل کی ڈلی لی۔ زری مسکراتی ہوئی چت لیٹ گئی۔ ناصر اس پر جھک گیا اور بڑے پیار سے اس کی بھنویں بنانے لگا۔ ناصر کی قربت سے اس کے چہرے پر ہلکی سی تمتماہٹ

آ گئی تھی۔ اس کی بھنویں بنانے کے بعد ناصر نے اپنی چھنگلی سے اس کی آنکھوں میں کاجل ڈالا۔ زری نے اٹھ کر چھوٹا سا آئینہ دیکھا اور ایک دم خوش نظر آنے لگی۔ وہ ناصر کے کندھے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے اونی لبادے کا گریبان اس کے بالائی جسم کو نمایاں رکھتا تھا لیکن وہ اس صورتِ حال سے یکسر غافل رہتی تھی۔ ناصر فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اس لیے دروازے پر کھڑے رستم کو گفتگو سمجھ آنا بند ہو گئی۔ ناصر نے زری کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے اور اس سے سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد یکایک زری کے چہرے پر شدید حیرت اور بے یقینی کے تاثرات ابھرے۔ ناصر اس سے محوِ گفتگو رہا۔ زری کے شفاف چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ آخری رنگ شرم کا تھا۔ وہ تڑپ کر ناصر سے علیحدہ ہوئی اور ایک دم لحاف اپنے اوپر کھینچ کر لیٹ گئی۔ رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر سے کچھ بول بھی رہی ہے۔ ناصر کے چہرے پر ایک محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ تب اس نے لحاف اٹھا کر زری کی شکل دیکھنا چاہی۔ اس نے لحاف کو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا اور ہرگز چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ ناصر نے کافی کوشش کر کے لحاف اس کے اوپر سے اتارا۔ زری کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ وہ ایک دم ناصر سے لپٹ گئی اور اپنا چہرہ اس کے چوڑے سینے میں چھپا لیا۔ رستم نے اب مزید تاک جھانک مناسب نہیں سمجھی اور واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔

صبح جب رستم اٹھا تو زری حسبِ معمول محافظ ریان بخت کے ساتھ برق جان کی رہائش گاہ پر واپس جا چکی تھی۔ وہ رہائش گاہ کے عقبی دروازے سے آتی تھی اور یہ فاصلہ بیس پچیس قدم سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ناصر والے کمرے میں پہنچا۔ وہ ابھی ابھی جاگا تھا اور پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا خمار اور آنکھوں میں ایک خوبصورت سرشاری تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال اور اس کا شکن شکن بستر بتا رہا تھا کہ گزرنے والی شب محبت اور قربت سے آراستہ رہی ہے۔

رستم نے کہا۔ ''ناصر! بے شک تم مجھے خود سے بڑا سمجھتے ہو مگر ہم بے تکلف دوست بھی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ زری کے بارے میں تمہاری سوچ کیا ہے؟''

''ایک دم عجیب لڑکی ہے رستم بھائی۔ بہت بھولی اور بہت پیار کرنے والی۔ ہماری وجہ سے خُدا نے اسے نئی زندگی دی ہے۔ اب اس زندگی کو رخ بھی ہم نے ہی دینا ہے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''اگر میرے دل کی پوچھتے ہیں تو میں اس سے شادی کرنا چاہوں گا۔ میری خواہش ہو گی کہ میں اس کے ساتھ گھر بساؤں۔ یہ اور بات ہے کہ گھر بسانا ہماری قسمت میں نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں...... اس ٹاپو پر کون ساڈپٹی ریاض تمہیں پکڑنے آئے گا۔ شادی رچاؤ اور سکون سے دو چار بچے پیدا کرو۔''

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ٹاپو پر رہتے ہوئے مجھے زری سے شادی کرنے کون دے گا؟ یہاں کے قانون قاعدے کے مطابق تو وہ منحوس لڑکی ہے جسے آبوک دیوتا نے عین وقت پر بھینٹ کے لیے ٹھکرا دیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس مسئلے کا کوئی حل ہو۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً خفیہ شادی۔ واس کو ساری حقیقتِ حال بتا دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی راستہ نکال لے۔''

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ لوگ اس بندے کو ڈھونڈنا اور کچا چبا جانا چاہتے ہیں جس نے زری سے بدسلوکی کی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ زری سے یہ ملاقاتیں بھی کوئی بڑا نقصان نہ کر دیں۔''

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ رستم اپنی بیڑی کو گھسیٹتا ہوا دروازے تک گیا۔ باہر برق جان بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ اس نے رستم کے ساتھ رسمی کلمات کا تبادلہ کیا۔ آج مترجم واس بھی برق جان کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ برق جان سمجھ گیا تھا کہ تھوڑی سی کوشش کر کے رستم سے براہِ راست بھی بات کی جاسکتی ہے۔ رستم اور برق جان اندر آ گئے۔ یہاں ناصر اور شریف سے بھی رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ برق جان کے چار مسلح محافظ گھر سے باہر ہی کھڑے رہ گئے تھے۔

رستم اور برق جان کے درمیان تنہائی میں بات چیت ہوئی۔ برق جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارا وقت اچھا گزر رہا ہے۔'' برق جان کا اشارہ یقیناً زری کی طرف ہی تھا۔ وہ عموماً رات کے وقت زری کو رستم کی طرف بھیج دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ رستم زری سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمہاری مہربانی ہے۔''

''میں نے پہریداروں کو بھی یہاں سے ہٹا دیا ہے اور سچ پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ یہ بیڑیاں بھی تم تینوں کے پاؤں سے نکل جائیں اور تم تینوں خود کو ہر طرح سے آزاد محسوس کرو۔''

''اگر تم ہم پر اتنا اعتماد کرسکو تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔''

''لیکن ابھی اس میں وقت لگے گا۔'' برق جان جلدی سے بولا۔ ''مجھے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی مطمئن کرنا ہے۔ ہمیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔ ہر قدم پر احتیاط اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ میری رائے ہے کہ اب تم کچھ دنوں کے لیے زری سے بھی دور رہو۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا وقت گزار لیا ہے۔ وہ بھی اب اطمینان میں نظر آتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''اگر ضرورت ہے تو میں تمہارے اور دوستوں کے لیے کچھ اور انتظام کر دیتا ہوں۔ یہاں کے قانون کے مطابق خاص حالات میں اس قسم کی گنجائش موجود ہے۔''

''نہیں، ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہوئی تو کہہ دوں گا۔''

''اور ہاں...... میں نے واس کو ابھی کچھ نہیں بتایا۔ اسے نہیں پتا کہ زری یہاں تمہارے پاس رات گزارنے کے لیے آتی رہی ہے۔ میرے اور محافظ ریان کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھی اس سلسلے میں احتیاط رکھوں گا۔'' رستم نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اپنی بات برق جان تک پہنچائی۔

برق جان نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''پھر جو کام میں نے تم سے کہا تھا اس کے بارے میں سوچا ہے تم نے؟''

''جو گزارش ہم نے کی تھی، اس کے بارے میں کیا سوچا گیا ہے؟''

برق جان نے کہا۔ ''رستم! میں نے تمہیں اپنی مجبوری بتائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تم سے کوئی ایسا وعدہ کروں جسے بعد میں پورا نہ کرسکوں۔ بے شک اگر تم نے یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی تو تم ایک بہت بڑا کام کرو گے۔ اس کام کا صلہ یہ نہیں ہے کہ تم سے دھوکا کیا جائے..... یا تمہیں مایوسی دی جائے۔ اس کا صلہ یہ ہے کہ تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر خوش کیا جائے..... اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں خوش کروں گا بھی۔ لوگ یہاں تمہاری زندگی پر رشک کریں گے۔''

”لیکن میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے یہ زندگی نہیں ہوگی۔ یہ بدترین قید ہوگی۔ تم دنیا کی ہر شے بھی یہاں ہمارے سامنے ڈھیر کر دو، ہمیں اپنے گھر یاد آئیں گے، اپنے پیارے یاد آئیں گے۔“

”تم آنے والے وقت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے ہو رستم۔ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جنہیں اپنے گھر بار سے زیادہ پیار یہاں ملا ہے۔ وہ ہنسی خوشی یہاں رہ رہے ہیں اور واپس جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے رستم۔“

رستم اور برق جان کے درمیان تادیر بات چیت ہوئی مگر کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ نہ جانے کیوں برق جان کو یقین تھا کہ اگر رستم نے پل سے گزرنے کی ہامی بھر لی تو وہ اس کام کو باآسانی کر لے گا۔ اس کام کے بدلے وہ بہت سی رعایتیں دینے کو تیار تھا لیکن آزادی والی بات بقول اس کے اس کے بس میں نہیں تھی۔

جو کچھ بھی تھا...... مگر رستم کو اس کی صاف گوئی پسند آ رہی تھی۔

رستم نے ایک بار پھر برق جان سے وہی بات پوچھی جو اس سے پہلے پوچھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”برق جان! تم بار بار مجھ سے یہی بات کہہ رہے ہو کہ پل کے ذریعے کتبے تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور میں باآسانی یہ کر لوں گا۔ اگر یہ اتنا آسان ہے تو پھر اب تک ہوا کیوں نہیں...... اس کام کے آسان ہونے کا سب سے زیادہ یقین تو تم کو ہی ہے۔ تمہارے بقول تم سینکڑوں بار اس پل کا معائنہ کر چکے ہو۔ تم نے آنکھوں آنکھوں میں اس کی ایک ایک انچ ناپی ہوئی ہے پھر تم...... خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے...... یا تمہارا کوئی قریبی محافظ جو تمہارے اشارے پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو۔“

برق جان کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ”تم نے یہ سوال دوسری بار مجھ سے پوچھا ہے...... اور دوسری بار بھی میرا جواب وہی ہے۔ میں اپنی کمزوری کو مانتا ہوں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے، سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی مجھے معلوم ہے کہ میں یہ پل پار نہیں کر سکوں گا بلکہ ہم میں سے کوئی نہیں کر سکے گا۔ ہمارے اندر گہرائی میں ایک وہم موجود ہے۔ کسی میں کم ہے کسی میں زیادہ۔ لیکن اس وہم کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ تم باہر کے آدمی ہو، دلیر ہو، مضبوط اعصاب کے مالک ہو...... میں نے تمہارے اندر ایک خاص عزم دیکھا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مہم جواب تک سر نہیں ہو سکی تم کر لو گے۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو پھر ان ہٹ دھرم مجاریوں کے منہ بند ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہم یہاں اپنی مرضی سے تبدیلیاں لا سکیں گے۔ یہ بڑی شاندار تبدیلیاں ہوں گی۔ اس کی ایک

چھوٹی سے مثال میں تمہیں دیتا ہوں۔ موجودہ رسم و رواج کے مطابق واس کی بھتیجی زرنی ایک دھتکاری پھٹکاری ہوئی لڑکی ہے۔ وہ یہاں زندہ رہے گی مگر سسک سسک کر بدترین زندگی گزارے گی۔ اگر ہم تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہو گئے تو اسے اور اس جیسی دوسری عورتوں کو عام عورتیں قرار دے سکیں گے۔ زرنی عام زندگی گزار سکے گی۔ شادی کر سکے گی، گھر بنا سکے گی۔ ایسے بہت سے کام ہو سکیں گے جو ابھی نہیں ہو سکتے۔ میں سمجھتا ہوں ایک انقلاب آ جائے گا۔“

”میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“ رستم نے کہا۔

”چلو...... آج کا دن مزید لے لو، لیکن اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ہم جتنی جلدی یہ قدم اٹھا لیں گے اتنا ہی بہتر ہے۔“

...... یہ دو روز بعد کی بات ہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ برف زار حدِ نگاہ تک ایک نیلگوں تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں کے باشندے اپنے چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں اور قدرتی گپھاؤں میں بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ جاگ رہے تھے اور ایک چھوٹے سے سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہ سفر ٹاپو سے نکل کر برفانی ندی تک جانے کا سفر تھا۔ برق جان اور واس کے علاوہ قریباً دس مسلح محافظ بھی رستم کے ساتھ جا رہے تھے۔ رستم کے اصرار پر برق جان، ناصر کو بھی ساتھ لینے پر رضامند ہو گیا تھا۔ تاہم یہ طے ہوا تھا کہ اس سارے سفر کے دوران میں رستم اور ناصر کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے رہیں گے۔ رستم کے ہاتھ بھی اس نازک وقت پر کھولے جانے تھے جب اس نے پل پر قدم رکھنا تھا۔ شریف بدستور ایک یرغمالی کی طرح بستی میں ہی موجود تھا۔ اگر سابقہ تجربے کو دیکھا جاتا تو رستم اور ناصر اپنے ساتھی کو یہاں چھوڑ کر فرار ہو جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود برق جان چھوٹے سے چھوٹا رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

چودہ افراد کا یہ قافلہ رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی کے ساتھ بستی سے روانہ ہوا۔ جب سے رستم اور اس کے ساتھی یہاں آئے تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس ٹاپو سے باہر جا رہے تھے۔ رستم اپنے جسم میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ وہ عنقریب اس راستے سے گزرنے والا تھا جو اس گلیشئر نما ٹاپو پر رہنے والے لوگوں کو یہاں سے باہر نکالتا تھا۔ رستم جانتا تھا کہ اس مرتبہ بھی وہ یہ راستہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کی اور ناصر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ ان کی آمد کے موقع پر بھی یہی کچھ کیا گیا تھا... پھر بھی وہ اس راستے سے گزرتے ہوئے اسے محسوس تو کر سکتے تھے۔ اپنے ذہنوں میں اس کے

خدوخال کا نقشہ تو بنا سکتے تھے۔

سنسناتی ہوئی سردی میں انہوں نے قریباً آدھ گھنٹے تک گھوڑوں پر سفر کیا۔ کے ٹو کی فلک بوس چوٹی اور ملحقہ پہاڑ ان کی دائیں جانب شمال مشرق کی طرف دکھائی دیتے تھے۔ ناصر کا خیال تھا کہ وہ چین کے سرحدی علاقے سے قریب ہیں۔ ایک جگہ گھوڑے روک دیئے گئے۔

''کیا بات ہے؟'' رستم نے برق جان سے پوچھا۔

''ایک ناخوشگوار کام کرنا ہے۔ تمہاری آنکھوں پر پٹیاں باندھنی ہیں۔''

''کیا یہ آخری ناخوشگوار کام ہے؟'' رستم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

برق جان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ قریباً دو فرلانگ مزید چلنے کے بعد وہ سب گھوڑوں سے اُتر گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی۔ ایسی ہی ہوا انہوں نے تب محسوس کی تھی جب وہ فرار ہونے کی کوشش میں ٹاپو کے کنارے پر پہنچے تھے۔ یہاں سے ان کا پیدل سفر شروع ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد رستم کو احساس ہوا کہ وہ ایک تنگ برفیلی کھوہ میں ہیں۔ اس کھوہ میں کم از کم تین جگہ آہنی دروازے تھے جہاں چربی کے تیل کی مشعلیں جل رہی تھیں اور چوکس پہریدار موجود تھے۔ تینوں بار قفل کھلنے اور بھاری بھرکم ''ارل'' کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ اس سرنگ کی اونچائی کئی جگہوں پر بہت کم تھی اور یقیناً یہاں گھوڑوں پر سوار ہو کر نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ قریباً دو فرلانگ تک نیم گرم ڈھلوان سرنگ میں چلنے کے بعد وہ ایک بار پھر کھلی جگہ آ گئے۔ سردی اور ہوا کی کاٹ بے پناہ ہو گئی۔ اب سیڑھیوں کا طویل چکر دار سلسلہ شروع ہوا۔ یہ پتھر کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی ناہموار سیڑھیاں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک طرف گہرا کھڈ ہے۔ ایک ایک پہریدار نے رستم اور ناصر کا بازو تھام رکھا تھا اور انہیں بڑی احتیاط سے اُتار رہے تھے۔

''لگتا ہے کہ یہ سیڑھیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔'' ناصر نے رستم کے پہلو میں چلتے چلتے سرگوشی کی۔

''جو چیز شروع ہوتی ہے، وہ کہیں ختم بھی ہوتی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ٹاپو سے اُتر چکے ہیں اور اب زیر زمین جا رہے ہیں۔''

''زیر زمین ایسی ٹھنڈ اور ہوا تو نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب!'' رستم نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے یہاں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ہم کیسی افسانوی دنیا میں آ گئے ہیں۔ سال ڈیڑھ سال پہلے جب آپ لاہور میں گھوم رہے تھے، لکشمی چوک میں مرغ چنے کھا رہے

تھے اور راوی پل پر گاڑی دوڑا رہے تھے تو آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ چین کی ویران سرحد کے پاس کسی ایسے برف زار میں آ پھنسیں گے۔ اس برف زار میں درخت کو پوجا جاتا ہوگا، لڑکیاں بیچی جاتی ہوں گی..... اور اکھاڑوں کے اندر جنگلی جانوروں سے حضرت انسان کی پنجہ آزمائیاں ہوتی ہوں گی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' رستم نے ہنکارا بھرا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ناصر نے کہا۔ ''رستم بھائی! قیدی کی حیثیت سے ہی سہی مگر ہم ایک بار اس ٹاپو سے نکل تو آئے ہیں۔ کیا کوئی کرشمہ نہیں ہو سکتا؟ کوئی ایسا طریقہ کہ ہم ان لوگوں پر قابو پا لیں..... اور پھر.....''

''پھر شریف کو بھی اور..... تمہاری زری کو بھی بستی سے نکال لیں۔'' رستم نے ناصر کا فقرہ مکمل کیا۔

''بالکل..... یہی کہنا چاہتا ہوں۔ پاؤندہ قبیلے کا اہم ترین فرد یعنی برق جان ہمارے ساتھ ہے۔ اگر ہم کسی طرح پانسا پلٹ سکیں اور برق جان کو گن پوائنٹ پر لے لیں تو اس سے ان دو افراد کی رہائی منوائی جا سکتی ہے۔''

''برق جان کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنے کڑے پہرے کے باوجود ہمارے ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے ہیں۔''

رستم اور ناصر دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے اور کبھی ختم نہ ہونے والی سیڑھیوں پر ہولے ہولے چلتے رہے۔ مسلسل نیچے اترنے کے سبب ان کے جسموں کا تمام تر وزن پاؤں اور پنڈلیوں پر آ رہا تھا۔ ان کے پاؤں پھوڑا بن گئے تھے۔ تیرہ چودہ افراد پر مشتمل اس قافلے نے ایک دو جگہ رک کر سانس بھی لیا، قہوہ پیا، پنیر لگی خمیری روٹی کھائی اور پھر چل پڑے۔

•

شیطان کی آنت جیسا یہ سفر سورج طلوع ہونے سے پہلے ختم نہیں ہوا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ہموار برف پر پہنچے ہیں۔ دو تین کلومیٹر مزید چلنے کے بعد انہیں ایک جگہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ یہاں ان کی آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ بانسوں کے اوپر گھاس پھوس کے چھپر بنائے گئے تھے۔ ان چھپروں کے نیچے چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہاں دو تین درجن تازہ دم گھوڑے اور خچر وغیرہ موجود تھے۔ آگ روشن تھی اور ایک بڑے سے مقامی طرز کے برتن میں چائے بن رہی تھی۔ یہاں انہوں نے گائے اور یاک کے اختلاط سے پیدا ہونے والا ''زوہ'' نامی جانور بھی دیکھا۔

حدِ نگاہ تک برف کی سفید چادر پر روپہلی دھوپ پھیلی نظر آئی۔ یہاں سے عظیم الشان شاہ گوری (کے ٹو) کا نظارہ زیادہ صاف شفاف اور اثر انگیز تھا۔ شاہ گوری کی ہیبت ناک چوٹی نیلگوں فلک کو بوسہ دیتی محسوس ہوتی تھی۔ ''اپنے پیچھے دیکھو ناصر۔'' رستم نے کہا۔

ناصر نے دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ وہ جس عجیب وضع کی چٹانی سطح سے اُترے تھے، وہ ایک بہت بڑے مکعب پہاڑ کی طرح ان کے عقب میں دکھائی دے رہی تھی۔

''کتنا عجیب نظارہ ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہاں زمین دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہم نیچے والے ٹکڑے پر آ گئے ہیں۔''

''وہ برفانی نالہ بھی شاید زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے پانی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔'' رستم نے دور مشرق کی سمت انگلی سے اشارہ کیا۔

دو پہریدار پیالیوں میں بھاپ اُڑاتی چائے لے آئے اور حسبِ سابق انہیں اپنے ہاتھوں سے پلانی شروع کر دی۔ ساتھ میں مقامی طرز پر بنائی گئی مٹھائی اور بادام، کشمش وغیرہ بھی تھی۔ برق جان بھی اپنی پیالی لے کر رستم کے پاس آن بیٹھا۔

''ہم ایک گھنٹے میں پل تک پہنچ جائیں گے ... تمہیں......گھبراہٹ تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''نہیں..... بہت مزہ آ رہا ہے۔'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

برق جان نے ملائمت سے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے یقین ہے رستم... مجھے یقین ہے کہ ہم دوپہر کا کھانا پھر اسی جگہ اکٹھے کھائیں گے۔''

''تم سردار ہی رہو تو بہتر ہے۔ ایسی باتیں تو نجومی کرتے ہیں۔''

''پتا نہیں کیوں، میں تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو خود کو نجومی ہی محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

وہ رستم سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے رستم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور برق جان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ جو بھی ہونا ہے، اب جلدی سے ہو جائے۔ اگر میں گر گیا تو میری لاش واش ڈھونڈنے میں بھی تو کچھ وقت لگنا ہے۔''

برق جان کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ لمبے بالوں والے صحت مند گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ ندی کے کنارے پر تھے۔ یہ بڑا جادوئی سا منظر تھا۔ چاروں طرف سفید برف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ برفیلی چوٹیاں پُرغرور حسیناؤں کی طرح طنطنے سے کھڑی تھیں۔ ان کے پیراہن اور پیکر بے داغ تھے۔ ان کے درمیان سے بہہ کر آنے والا برفاب دھیرے دھیرے آبی گزرگاہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جوں جوں یہ برفاب نیچے آتا تھا، اس کا پاٹ چوڑا ہو جاتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے برف کے تودے اس کے بلند کناروں سے علیحدہ ہوتے اور پُرشور آواز سے پانی میں گرتے تھے۔ یہ اتنا سرد پانی تھا کہ اس میں گرنے والا چند سیکنڈ میں ہی داعی اجل کو لبیک کہہ سکتا تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لگتا تھا جب سے دنیا بنی ہے اس قطعہ زمین پر کسی نے قدم ہی نہیں رکھا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ اس سکوت میں بس اس برفیلے پانی کی آہٹ تھی جو صدیوں سے یہاں بہہ رہا تھا۔

برق جان نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ پل ہے اور وہ سامنے برفیلی چٹان ہے۔ اس چٹان کو ہم مقامی زبان میں ''ہوراشے'' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ''امانت کا پتھر'' ہے۔ یعنی وہ چٹان جس نے دو سو سال سے کتبے کی امانت کو سنبھال رکھا ہے۔''

''وہ دائیں کنارے پر برجیاں کیسی ہیں؟''

برق جان چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں ... جو اپنے بے جا خوف کی وجہ سے...... پل پار نہ کر سکے اور حادثے کا شکار ہوئے۔ یہ ان کی قبریں ہیں۔''

''کافی تعداد میں ہیں۔'' رستم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

فضا میں ایک تناؤ سا تھا۔ یہ اس مہم کا تناؤ تھا جو رستم کو درپیش تھی۔ رستم، برق جان سے طنزیہ لہجے میں بات تو کر رہا تھا مگر کچھ بھی تھا، اس مہم کی ذمے داری اس نے خود قبول کی تھی۔

برق جان نے اس پر کچھ بھی زبردستی نہیں ٹھونسا تھا۔

برق جان کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر یہاں آرام کیا جائے اور چینی قہوے کی ایک ایک پیالی اور پی جائے... مگر رستم ازخود ہی پل کی طرف چل پڑا۔ مجبوراً باقی لوگ بھی حرکت میں آ گئے۔ وہ قریباً سو قدم ڈھلوان پر چڑھنے کے بعد پل کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں ہوا تیز تھی اور کانوں میں سیٹیاں سی بجتی تھیں۔ کوہی ندی کے دونوں کنارے پانی سے قریباً پچاس فٹ بلند تھے۔ دیو قامت درخت کا طویل پل دو سو فٹ سے کم لمبا نہیں تھا۔ استبداد

زمانہ کے سبب یہ ایک دو جگہ سے خم کھا گیا تھا۔ پل کی چوڑائی اور اس کا توازن دیکھ کر رستم کو برق جان کی بات درست لگنے لگی۔ یہ معقول چوڑائی تھی۔ اس پر چلنے والا اگر اپنے حواس بحال رکھتا اور نیچے پانی کی طرف تاک جھانک نہ کرتا تو بظاہر اس کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے تھی۔

رستم کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ برق جان اس کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ اس کی خالی آستین ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں اس تاریخی پانی اور اس تاریخی پل پر جمی تھیں۔ برق جان نے ہولے سے کہا۔ ”میں پھر کہتا ہوں رستم! تم یہ کر سکتے ہو۔ ... جس طرح تم نے گارنی والا بت توڑا ہے تم یہ بت بھی توڑ سکتے ہو۔“

رستم نے جواب نہیں دیا۔

ناصر کی آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ رستم کو توصلہ افزا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہریداروں کی تعداد دس تھی۔ ان میں سے چھ اپنی رائفلوں سمیت بالکل چوکس کھڑے تھے۔ رستم اور ناصر تین مرتبہ ٹاپو سے فرار کی دلیرانہ کوشش کر چکے تھے۔ وہ اس ٹاپو کے خطرناک ترین قیدی تھے اور ان کی طرف سے ایک لحظے کی غفلت بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

رستم کے ہاتھ کھولنے سے پہلے برق جان نے پہریداروں سے کہا کہ وہ ناصر کو اس سے دور لے جائیں۔ ناصر نے رستم کے کندھے پر بوسہ دیا۔ تین مسلح پاؤنڈے اسے رستم سے فاصلے پر لے گئے۔ ”رستم کے ہاتھ کھولو۔“ برق جان نے دوسرا حکم دیا۔

زنگ آلود آہنی زنجیر رستم کے ہاتھوں سے نکال دی گئی۔ کم از کم تین خودکار رائفلیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ مزاحمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رستم نے [illegible] اپنے بھاری بھرکم جوتے اتارنے چاہے تو ایک پہریدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی۔

برق جان نے رستم کو پل اور کتبے کے سلسلے میں آخری ہدایات دیں۔ یہ ہدایات [illegible] نے کافی وقت سے ہی رستم تک پہنچائی تھیں۔ پہریدار اور برق جان سب [illegible] کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسے وہ کسی انسان کے نہیں خونخوار جانور کے گرد موجود ہوں۔ رستم نے [illegible] پل کے نیچے سے بہتے ہوئے شوریدہ سر پانی کو ایک بار نظر بھر کر دیکھا اور پھر پل پر قدم رکھ دیئے۔ شروع کے چند قدم طے کرنے کے بعد اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ شاید برق جان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ بہت آسان راستہ تھا۔ اسے صرف توہمات نے دشوار بنا رکھا تھا۔ پل اتنا چوڑا تھا کہ اس پر دو بندے پہلو بہ پہلو بھی چل

سکتے تھے۔ ہوا دائیں طرف سے اسے دھکیل رہی تھی مگر یہ دھکیل خطرناک نہیں تھی۔ وہ اپنی ٹانگ کے درد کے سبب تھوڑا سا لنگڑا کر چلتا ہوا.... آگے بڑھتا گیا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی طیش آمیز توانائی امڈ آئی تھی۔ اس توانائی کا سرچشمہ یہ ارادہ تھا کہ دو صدیوں سے وہم کے اس لہراتے ہوئے جھنڈے کو اکھاڑ کر پھینکنا ہے جو کام ایک طویل مدت سے نہیں ہو سکا تھا۔ وہ آج اس چمکتی ہوئی صبح میں اس گہرے نیلے آسمان تلے اس کے ہاتھوں سے ہو جاتا تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی۔

اور پھر وہ آخری پندرہ بیس قدم رہ گئے جو مقامی روایت کے مطابق زیادہ خطرناک تھے۔ چند لمحے کے لیے رستم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑا۔ اسے اپنے نیچے پچاس ساٹھ فٹ کی مہلک گہرائی میں برفاب کا مدھم شور سنائی دیا۔ اس پانی نے ایک سرگوشی کی، اسے اپنی طرف بلایا... آ جاؤ... تمہیں آنا ہی پڑے گا۔ یہی یہاں کا دستور ہے... رواج... دستور اور عقیدے اتنی آسانی سے نہیں بدلتے.... آ جاؤ... یہ آخری چند قدم طے کرنا ہمیشہ ناممکن رہا ہے... یہ اب بھی ناممکن ہے۔ تم گر رہے ہو... تمہارا سر چکرا رہا ہے... ہوا بہت تیز ہے۔ پاؤں پھسل رہے ہیں.... نیچے دیکھو... نیچے دیکھو... اپنے پاؤں کی طرف دیکھو۔ غیر مرئی سرگوشیاں وہم کی لہروں پر تیر کر رستم کے کانوں میں گونجتی رہیں لیکن وہ رکا نہیں... ٹھٹکا بھی نہیں...... اس نے توقف بھی نہیں کیا۔ یقین کی ایک توانا لہر کے ساتھ بڑھتا ہوا... وہ دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ دوسرا سرا... ہاں، دوسرا کنارہ... جو دو صدیوں سے پاؤنڈوں کی پہنچ سے دور تھا۔ اور اس لیے دور تھا کہ اس تک پہنچنے کے لیے یقین محکم کی ضرورت تھی۔

یہاں ایک ناہموار چٹان تھی۔ اس کی لمبائی چوڑائی بمشکل بیس ضرب تیس فٹ ہو گی۔ یہاں ایک مجسمہ تھا... بالکل برہنہ عورت کا مجسمہ! وہ اپنی چھاتیوں سے اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ مجسمے کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کئی سو سال پرانا ہے۔ موسم کی سختیوں نے مجسمے کے پتھر میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا دیئے تھے۔ بچے کی ناک غائب تھی۔ عورت کا ایک کولہا نصف رہ گیا تھا۔ شاید کبھی اس مجسمے میں قیمتی پتھر وغیرہ بھی جڑے ہوں لیکن اب وہ جگہیں خالی تھیں اور وہاں چھوٹے چھوٹے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ برق جان کی معلومات کے عین مطابق لکھا ہوا کتبہ عورت کی گود میں موجود تھا۔ یہ پتھر کی ایک پتلی سل تھی اور اسے کتبے کے بجائے سنگی تختی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی بچوں کی عام تختی سے تھوڑی ہی زیادہ تھی۔ اس پر باریک حرفوں سے ایک عبارت کندہ کی گئی تھی۔ یہ ناقابل فہم

عبارت یقیناً مقامی زبان میں ہی تھی۔ یہ تصور کر کے رستم کو عجیب سا احساس ہوا کہ پچھلے تقریباً دو سو سال میں یہاں پہنچنے والا اور اس تختی کو چھونے والا وہ پہلا شخص ہے۔ اس نے تختی اٹھائی اور گھوم کر کنارے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود لوگ جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت آمیز مسرت تھی۔ وہ اچھل رہے تھے اور عجیب آوازیں بلند کر رہے تھے۔ پانی کے شور اور ہوا کے مخالف رخ کی وجہ سے یہ آوازیں وضاحت سے رستم کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ رستم نے تختی کو کسی ٹرافی کی طرح سر سے بلند کر کے کنارے پر موجود لوگوں کو دکھایا۔ ان کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

واپسی رستم کے لیے زیادہ آسان ثابت ہوئی۔ اسے یوں لگا کہ اگر وہ چاہے تو آنکھیں بند کر کے دوڑتا ہوا اس پل کو پار کر سکتا ہے۔ درحقیقت خام عقیدے اور سینہ بہ سینہ چلنے والے وہم کا وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا جس نے ایک مدت سے اس پل کو ناقابلِ عبور بنا رکھا تھا۔

کنارے پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر رستم کے سینے میں ایک امید جاگ اٹھی۔ اگر جوش و خروش کی اس لہر میں بہہ کر برق جان اس کے قریب آ جاتا، اس کے ہاتھ سے تختی لینے کی کوشش کرتا تو پانسا پلٹ سکتا تھا۔ رستم کے ہاتھ اور پاؤں فی الوقت آزاد تھے۔ رستم نے بڑی تیزی کے ساتھ ایک نقشہ ترتیب دیا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گا۔

جونہی رستم نے کنارے پر قدم رکھا، برق جان اور اس کے ساتھیوں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ برق جان لپک کر رستم سے لپٹ جائے گا۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اس کے تجربے نے اسے ایک سنگین ترین غلطی سے بچا لیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے پکار کر کہا۔ ''مبارک ہو رستم بہت بہت مبارک ہو۔''

''تم کو بھی مبارک ہو۔'' رستم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''لگتا ہے کہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔'' برق جان نے گلوگیر آواز میں کہا۔ پھر اس نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر رستم کے ہاتھوں سے تختی لے لے۔ رستم نے چند لمحوں کے لیے خود کو چراغ کی کہانی والے الہ دین کی طرح محسوس کیا۔ وہ بصد مشکل غار کے اندر سے جادو کا چراغ نکال لایا تھا۔ اب چراغ یعنی کتبہ اس کے ہاتھ میں تھا اور برق جان الہ دین کے چچا کی طرح اسے غار سے نکلنے سے پہلے اس سے چراغ وصول کرنا چاہتا تھا۔

رستم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قریب آنے والے محافظ کو دبوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر اس نے محافظ کو پکڑ بھی لیا تو برق جان اسے آناً فاناً محافظ سمیت چھلنی کر دے گا۔ اس نے اپنے اردگرد چوکس مسلح محافظوں کو دیکھا اور تختی، قریب آنے والے محافظ کے سپرد کر دی۔ اس نے مقدس تختی کو لرزاں ہاتھوں سے تھاما، اسے بوسہ دیا اور برق جان کے پاس لے گیا۔ برق جان نے بھی بڑی عقیدت کے ساتھ تختی کو تھاما، اسے بوسے دیئے اور سینے سے لگا لیا۔

محافظوں کے چہروں سے بھی ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد تختی کو دیکھنا اور چھونا چاہتے ہیں مگر فی الحال وہ ایک اہم ڈیوٹی پر تھے۔

برق جان نے ایک دوسرے محافظ کو حکم دیا کہ رستم کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں۔

پہلے محافظ کی طرح اس محافظ نے بھی رستم کی طرف بڑھنے سے پہلے اپنی رائفل برف پر رکھ دی اور آہنی زنجیر لے کر رستم کی طرف بڑھا۔

رستم نے بے بسی سے ناصر کی طرف دیکھا۔ چند لحظے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ان مایوس نگاہوں نے اک دوسرے کو سمجھا دیا کہ مزاحمت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہاں، اگر وہ خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو پھر اور بات ہے۔ محافظ چھوٹا سا چکر کاٹ کر رستم کے عقب میں آیا اور بڑے ادب کے ساتھ اسے ہاتھ پیچھے موڑنے کو کہا۔ رستم نے ایک سوالیہ نظر برق جان پر ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو، کیا اس کے بغیر چارہ نہیں؟

برق جان نے نگاہیں پھیر لیں۔ شاید اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا کہ ہاں، اس کے بغیر چارہ نہیں۔

محافظ نے رستم کے ہاتھ پشت پر زنجیر سے جکڑ دیئے۔ ہاتھوں کے بندھتے ہی فضا میں موجود تناؤ ایک دم کم ہو گیا۔ دو تین پہریداروں کے سوا باقی نے رائفلیں جھکا لیں۔ برق جان لپک کر رستم کے پاس آیا۔ اس کا ماتھا چوما اور گلے سے لگایا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کا رنگ سرخ انار کی طرح ہو گیا تھا۔

''تم نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے...... تم نے...... تم نے تاریخ لکھ دی ہے دوست۔'' اس نے پہلی بار رستم کے لیے دوست کا لفظ استعمال کیا۔ اس کی آواز اندرونی ہیجان سے کانپ رہی تھی۔

رستم ساکت و جامد کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ برق جان نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا اور محبت کے انداز میں اس کے لمبے بالوں کو بکھیرا۔ اس کے بعد وہ اس آگے بڑھا اور اس

نے بھی رستم کو گرم جوشی سے مبارک باد دی۔ ''آج کا دن اس پاؤندہ قبیلے کے لیے ایک یادگار دن ہے۔'' واس نے کہا۔

تختی کو بڑے احترام کے ساتھ ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ محافظ قریب آ کر تختی کو بے حد دلچسپی اور احترام سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے تختی کے قریب آتے، اسے چھوتے، بوسہ دیتے اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ سب لوگ رستم کو بھی بڑی ستائش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ رقص کا دن ہے۔ یہ خوشی کا دن ہے۔'' برق جان نے پکار کر کہا۔

''ہاں، یہ رقص کا دن ہے۔ یہ جشن کا دن ہے۔'' ریان بخت بھی اپنے سردار کی تائید میں بلند آواز میں بولا۔

پاؤندوں نے اپنی چمکیلی رائفلیں اپنے سروں سے اوپر افقی رخ پر اٹھائیں اور رقص کرنے لگے۔ ان کی کمروں سے بندھی ہوئی ان کی چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں سورج کی روشنی میں دمک رہی تھیں۔ واس، ناصر اور رستم کے سوا وہ سب رقصاں تھے۔ ایک شخص لکڑی کے ایک تختے کو تھاپ دینے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ریان بخت دو خنجر ایک دوسرے سے ٹکرا کر موسیقی پیدا کرنے لگا۔ پھر پہلے دو تین ہوائی فائر برق جان نے ہی کیے تھے۔

دھماکوں سے یہ ویران برف زار گونج اٹھا۔ اپنے سردار کو دیکھ کر دوسرے پاؤندے بھی فائر کرنے لگے۔ تین چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑا اور ایک بار پھر تختی کی زیارت شروع ہو گئی۔ رستم اور نصیر کو محبت اور احترام کے ساتھ ایک چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوہی ندی پر اس تاریخی پل کے سامنے ابھی یہ جشن کچھ دیر مزید چلے گا۔

☆======☆======☆

اجمل خان اور ڈولے کو شانی سے رخصت ہوئے اب تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ تین ہفتوں میں انہوں نے بہت سفر کیا تھا۔ اس سفر میں ایبٹ آباد کا رحیم اللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رحیم اللہ ان علاقوں کا ایک نہایت تجربہ کار گائیڈ تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا مگر اس کی کاٹھی اب بھی مضبوط تھی اور جسم میں جوانوں کی سی چستی محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔ رحیم اللہ کے ایک مرحوم دوست کا بیٹا بھی اس سفر میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ اس کا نام فرقان حمید تھا۔

اس گروپ کے پاس ''ہائیکنگ'' کا مکمل سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ اجمل خان

کے پاس چھوٹے بیرل کی اک خود کار رائفل موجود تھی۔ یہ رائفل اس نے اپنے سامان میں اچھی طرح چھپا رکھی تھی۔ تاہم رائفل چھپاتے ہوئے یہ احتیاط کی گئی تھی کہ ہنگامی حالت میں وہ فوری طور پر برآمد کی جا سکے۔ رائفل کا ایمونیشن بھی کھانے کے سربمہر ٹن پیکس میں محفوظ کیا گیا تھا۔ رحیم اللہ کے سامان میں بھی 38 بور کا ایک لائسنس والا پستول موجود تھا۔ یہ لوگ اسکردو سے آگے کے علاقے میں گھومتے گھومتے ان سنسان پہاڑوں کی طرف نکل گئے تھے جو پاکستان اور چین کی سرحد بناتے تھے۔ یہاں حدِ نگاہ تک برف تھی اور کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا...... نباتات اور حیوانات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے ایک برف پوش پہاڑی کے دامن میں کیمپ لگا رکھا تھا۔ یہ دو وائیر ٹائٹ خیمے تھے۔ ایک خیمے میں دو افراد قیام کر سکتے تھے۔ دن کا وقت تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اجمل خان، رحیم اللہ اور فرقان حمید باہر دھوپ میں چٹائی بچھائے بیٹھے تھے۔ رحیم اللہ نے ایک نقشہ اپنے سامنے پھیلا رکھا تھا اور اس میں کھویا ہوا تھا۔ ڈولا اندر خیمے میں ہی تھا۔

فرقان نے کہا۔ ''خان بھائی! کیا بات ہے...... ڈولا کل سے گم صم ہے اور زیادہ بولتا بھی نہیں؟''

''اس پر خاموشی کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔'' اجمل خان نے کہا۔

''کچھ بے چین سا بھی لگتا ہے۔''

''جب خاموش ہوتا ہے تو پھر بے چین بھی ہوتا ہے۔ خواس کا دماغ بالکل اور طرح کا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ اس کا نظر، کان اور ناک وغیرہ کتنا تیز ہے۔ یہ سارا چیز ایک دم تیز گام کی طرح کام کرتا ہے۔ اور دوسرا بات یہ ہے کہ اکثر جب یہ چپ ہوتا ہے تو اس کا دماغ بہت دور کا کوڑی لاتا ہے۔''

''اپنی طرز کا ایک دم انوکھا ہے۔''

رحیم اللہ نے نقشے سے سر اٹھایا اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم اپنے راستے سے کافی آگے نکل گئے ہیں۔'' اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم اس وقت یہاں اس جگہ پر ہیں جبکہ ہمیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ یہ خطرناک جگہ ہے۔ یہاں ڈھلوانیں بہت زیادہ ہیں۔ ایوالانچ (برفانی تودے گرنے) کا خطرہ بھی زیادہ ہوگا اور پھر وہی گہری کھائیاں جو اوپر سے نظر نہیں آتیں......''

فرقان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''انکل! خدا کے لیے اب ان کھائیوں کا ذکر پھر

سے شروع نہ کر دیجیے گا۔ میرا دل ہولنے لگتا ہے...... آج تو دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ موسم کی نسبت سے کچھ اچھی اچھی باتیں کیجیے۔''

''تمہارا مطلب ہے، اب میں بری بری باتیں کر رہا ہوں۔''

''دراصل آپ کی شاعری اتنی اچھی ہے کہ اس کے مقابلے میں آپ کی اچھی سے اچھی نثر بھی بری لگنے لگتی ہے۔''

''تو تمہارا مطلب کہ میں عام باتیں بھی بحر اور قافیے ردیف کی پابندی میں رہ کر کیا کروں؟''

''سچ ہے انکل! اگر ایسا ہو جائے تو میں اپنے میگزین میں آپ کے اس اندازِ گفتگو کی تفصیل چھاپوں اور ساتھ ہی آپ کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے لیے تجویز کر دوں۔ دنیا کا واحد شخص جو باتیں کرتے، ہنستے بولتے اور لڑتے جھگڑتے بھی بحر اور قافیے کا خیال رکھتا ہے۔''

تھوڑی دیر تک انکل اور بھتیجے میں نوک جھونک ہوئی۔ پھر بھتیجے نے انکل کو اپنی تازہ شاعری سنانے پر آمادہ کر لیا۔ رحیم اللہ کے کلام میں واقعی دلکشی اور گہرائی تھی...... اس کی ساری عمر ان برف زاروں، جھیلوں اور جنگلوں میں گھومتے گزری تھی۔ اس لیے اس کی شاعری میں بھی یہی مناظر دکھائی دیتے تھے۔ ایسے برف زار جن میں سینکڑوں میل تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا...... جہاں قدرت ایک مہیب سناٹے کی صورت سفید برفیلی ڈھلوانوں، آئینہ جھیلوں اور سربکف چوٹیوں پر سایہ فگن رہتی تھی۔ جہاں انسان خود کو خدا کے بہت قریب محسوس کرتا تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ ذرا کان لگائے تو غیر مرئی آوازیں سن سکتا ہے۔ اس شاعری میں صرف سفید برف ہی نہیں تھی۔ کہیں کہیں پھولوں کے رنگ، چشموں کی گنگناہٹ اور چناروں کے سائے تلے لچکیلی کمر والی پہاڑنوں کی جھلک بھی تھی۔ رحیم اللہ نے ایسی ہی ایک بھرپور نظم سنا کر ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ اجمل خان کو بھی مزہ آیا۔ اس نے کئی بار ہاتھ اٹھا اٹھا کر رحیم اللہ کو داد دی۔

نظم ختم کر کے رحیم اللہ نے اجمل خان سے کہا۔ ''یار! تمہیں سمجھ بھی آتی ہے یا ویسے ہی دل رکھنے کو واہ واہ کرتے ہو؟''

''خو آپ سمجھنے کی بات کر رہا ہے، ام تو آپ کی صحبت میں رہ کر خود شاعری پر مانے لگا ہے۔ کل رات ام نے بہت اچھے شعر جوڑے ہیں لیکن یہ ذرا مزاحیہ ہیں...... اگر آپ کہیں تو ام آپ کو سنا بھی سکتا ہے۔ بس آپ کو یہ گارنٹی دینا ہوگی کہ آپ ہنسیں گے ضرور۔''

''ایسی کڑی شرط پر ہم نہیں سن سکتے۔'' رحیم اللہ نے کہا۔

''اچھا آپ کے لیے اتنا رعایت کر دیتا ہوں کہ مسکرا دیجیے گا۔'' اجمل نے کہا۔

''بالکل نہیں۔ ہم صرف یہ گارنٹی دے سکتے ہیں کہ اگر تم نے بے کار شعر سنائے اور شاعری کی ٹانگ وغیرہ توڑی تو ہم تمہیں پیٹیں گے نہیں۔''

''ٹانگ تو تھوڑی بہت ٹوٹے گی جی...... کیونکہ ام اپنے شعروں میں ایک آدھ ٹوٹا پشتو یا پنجابی کا بھی لگا دیتا ہے۔''

''اچھا چلو، سناؤ خان بھائی۔'' فرقان نے جیسے ایک بڑے خطرے کے سامنے سینہ تان کر کہا۔

اجمل خان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پوری سنجیدگی سے بولا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کا سایہ پڑا ہوا تھا
وہ سر جھکائے بالکل چپ چاپ کھڑا ہوا تھا
امتحان میں فیل تو اس نے ہونا ہی تھا آخر
پیپر کے دن بھی محبوبہ کے گھر "وڑا" ہوا تھا

''وڑا ہونا'' یعنی گھسا ہونا...... سب کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر گیا۔ فرقان کا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ اس نے سرخ چہرے کے ساتھ مزید فرمائش کی۔ اجمل، شاعروں کے انداز میں بال کھجاتا رہا پھر اس نے بڑی متانت سے ایک اور قطعہ عطا کیا۔

اس بے کار زندگی نے تو ام کو تھکا مارا
ہر موڑ پر جھنجوڑا، ہر روز نیا جھٹکا مارا
ام نے سمجھا وہ پیار سے گردن میں ہاتھ ڈالتی ہے
اس نے ہاتھ ڈالا، کھینچا اور ام کو پٹکا مارا

''پٹکا مارا کا مطلب ہے جی دھڑام مارا۔'' اجمل نے آخر میں وضاحت کی۔ رحیم اللہ نے کھینچ کر برف کا گولا اجمل خان کے سر پر مارا۔ فرقان پیٹ پکڑ کر ہنس رہا تھا...... رحیم اللہ خود بھی مسکرا رہے تھے۔

اچانک ڈولا خیمے میں سے برآمد ہوا۔ وہ اس سارے ماحول سے الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اجمل، فرقان اور رحیم اللہ کی طرف آیا۔ وہ جیسے کسی چیز پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے ڈولے؟'' اجمل نے پوچھا۔

''خان بھائی! کچھ سنا آپ نے؟'' ڈولا بولا۔

وہ تینوں ایک دم خاموش ہو گئے اور سننے کی کوشش کرنے لگے۔ تقریباً نصف منٹ تک یکسر خاموشی رہی۔ ہوا کی سائیں سائیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہی سائیں سائیں جو پچھلے کئی ہفتے سے ان کے ساتھ تھی۔ کبھی کبھار اس آواز میں کسی جنگلی جانور کی آواز شامل ہو جایا کرتی تھی مگر اب تو پچھلے پانچ چھ روز سے کوئی ایسی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں برف کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

کافی دیر غور کرنے کے بعد سب سے پہلے اجمل نے ہی نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر وہ ڈولے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟''

''پتا نہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ.... مدھم آوازیں.... شاید گولی چلنے کی۔'' ڈولے کے اپنے چہرے پر بھی اب الجھن نمودار ہو گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک مزید سن گن لیتے رہے۔ تب ڈولا خیمے میں واپس چلا گیا اور پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ فرقان نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ڈولے کو کبھی کبھی دھوکا بھی ہوتا ہے۔ پچھلے ہفتے بھی اس کی ناک نے غلط اطلاع دی تھی۔ وہ جسے کسی مرے ہوئے جسم کی بو کہہ رہا تھا، وہ ایک گلا سڑا درخت نکلا تھا۔''

''چلو، پھر بھی ہم سے تو یہ بہت بہتر ہے۔ اس کی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں۔'' رحیم اللہ نے کہا۔

دھوپ اب تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف برف تھی پھر بھی ہلکی سی گرمی محسوس ہونے لگی۔ رحیم اللہ نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے ہے کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ہم ڈھلوان کی سیدھ میں ہیں۔ جب ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے تو اوپر سے برف پھسل کر ''ایوالانچ'' بننے کا امکان بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔''

''لیکن ڈولا کہہ رہا تھا کہ ام کو آج کا دن یہاں اور رک جانا چاہیے۔ اس کو یہ جگہ بہت پسند آیا ہے۔''

''پسند کیا آئی ہے، وہ خود تو اندر گھس کر بیٹھا ہوا ہے۔'' رحیم اللہ نے کہا۔

''ام نے پروگرام بنایا تھا کہ آج اس سامنے والی پہاڑی تک جائیں گے۔ لگتا ہے کہ وہاں چھوٹا سا جھیل بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی مچھلی وچھلی مل جائے۔''

''مچھلی پکڑتے پکڑتے خود برف کے نیچے دب گئے تو کیا فائدہ۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔'' فرقان نے کہا۔

''شادی تو انکل رحیم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہوا۔ بلکہ میرا تو کوئی منہ بولا بیوی بھی نہیں ہے۔'' اس بات پر فرقان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''منہ بولی بیوی نہیں...... لیکن منہ بولی بہن تو ہے۔'' رحیم اللہ نے کہا۔

''بالکل ہے جی۔ منہ بولا بہن ہے لیکن بالکل سگی بہن جیسا۔ اس کے لیے اپنا جان بھی قربان ہے۔ ہمارا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ام اس کے لیے کوئی اچھا خبر لے کر جا سکے۔ اور اگر اچھا خبر نہ ہو تو پھر ام بھی یہیں کہیں کسی دراڑ مراڑ میں گر کر مر جائے۔'' اجمل خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ پڑاؤ اٹھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب انہیں آگے جانے کے بجائے بائیں طرف مڑ جانا تھا اور ان پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلنا تھا جو آگے جا کر گلگت ایجنسی کے ساتھ ملتے تھے۔

ڈولا ابھی تک مضطرب تھا۔ جب سامان سفری تھیلوں میں بند ہو چکا اور خیمے وغیرہ سمیٹے جا چکے تو رحیم اللہ نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔ ''بھئی وہ ڈولا مچھلی کدھر ہے؟'' ان کی مراد ڈولا تھا۔

تینوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ ڈولا کچھ فاصلے پر ایک برف پوش پہاڑی کی ڈھلوان پر کھڑا نظر آیا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ پھر وہ چند قدم مزید طے کر کے پہاڑی کی ایک چوٹی کے نزدیک پہنچ گیا۔ عجیب بہکا بہکا سا انداز تھا اس کا۔ ابھی رحیم اللہ اسے آواز دینے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان سب نے ڈولے کو چونکتے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ تیزی سے ان تینوں کی طرف مڑا۔ اس کی پکارتی ہوئی باریک آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔ وہ انہیں پہاڑی کی طرف بلا رہا تھا۔

''شاید اس نے کچھ سنا ہے۔'' اجمل خان نے کہا۔

سب سے پہلے اجمل نے ہی قدم بڑھائے تھے۔ پھر رحیم اللہ اور فرقان بھی اس کے پیچھے آئے۔ وہ نرم برف پر ڈولے کے چھوٹے چھوٹے قدموں کا تعاقب کرتے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر دور پہاڑی پر پہنچ گئے۔ ڈولے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے کچھ دیکھ

نہیں بلکہ سنا ہے۔ وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی باریک آواز میں کہا۔ ''یہاں کچھ ہے جی۔ مجھے فائرنگ کی آواز آئی ہے...... یہ دیکھیں...... یہ دیکھیں پھر...... پھر گولیاں چلی ہیں۔''

اجمل، فرقان اور رحیم اللہ نے بھی ہوا کی لہروں پر کان لگا دیئے۔ انہیں ہوا کی تیز سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دو چار منٹ گزر گئے پھر شاید وہ ڈولے کے واویلے کے باوجود مایوس ہی ہو جاتے...... مگر اچانک ہوا کے بہاؤ میں اجمل کو بھی کچھ سنائی دیا۔ بہت مدھم آواز تھی لیکن شناخت کی جا سکتی تھی۔ یہ فائرنگ کی ہی آواز تھی۔ یعنی اس وسیع و عریض برف زار میں ان کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود تھا۔ نزدیک تھا، دور تھا یا بہت دور تھا...... مگر تھا ضرور!

''ہاں ام کو بھی سنائی دیا ہے۔'' اجمل نے تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ برف کی سفید چادر پر حدِ نگاہ تک کہیں کوئی ایسی نشانی دکھائی نہیں دی جسے کسی جاندار سے تعبیر کیا جا سکے۔

ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ایک بار پھر مدھم آواز ابھری اور اس مرتبہ اس آواز کو فرقان نے بھی سنا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ بات طے تھی کہ یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ اور اگر موجود تھے تو پھر ان سے کچھ نہ کچھ معلوم بھی ہو سکتا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے رحیم اللہ صاحب نے یہی بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''یہاں کسی انسانی آبادی کا ملنا بہت مشکل ہے لیکن اگر آبادی ہوئی تو پھر ہمارے لیے امید کی کرنیں بھی پیدا ہوں گی۔'' تو کیا امید کی کرنیں پیدا ہو رہی تھیں؟

انہوں نے اپنا بھاری سامان وہیں ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔ اجمل خان نے اپنے بیگ میں سے خودکار رائفل نکال لی اور اس کے وافر راؤنڈ بھی نکال کر بھاری بھرکم جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے۔ رحیم اللہ نے بھی اپنا پستول برآمد کر لیا اور اپنی ٹیلی سکوپ و کیمرا وغیرہ بھی لے لیا۔ اس کے بعد وہ اندازے سے آواز کی سمت بڑھے۔ وہ قریباً ایک گھنٹا چلتے رہے راستے میں وہ بڑے دھیان سے قدموں کے نشانات یا اس قسم کی دوسری نشانیاں بھی تلاش کرتے رہے۔ ایک جگہ انہیں پنجوں کے واضح نشانات دکھائی دیئے۔ رحیم اللہ نے خیال ظاہر کیا کہ یہ سنو لیپارڈ کے نشانات ہو سکتے ہیں۔ ان کے جسموں میں سنسنی دوڑ گئی تاہم انہیں دور دور تک کہیں اس خونی جانور کے آثار نظر نہیں آئے۔ لگتا تھا کہ وہ کئی دن پہلے یہاں سے گزرا ہے۔

یکا یک ڈولا ٹھٹک گیا۔ ''سنیں...... جی سنیں۔''

وہ سب کھڑے ہو گئے اور انکے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ دو فائر ہوئے اور اس مرتبہ آواز واضح تھی۔ آواز رحیم اللہ نے بھی سنی۔ ''میرا خیال ہے اس طرف۔'' رحیم اللہ نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

''مجھے بولنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دی ہیں۔ یہ آٹھ دس سے زیادہ بندے ہوں گے۔ شاید وہ کچھ گا رہے ہیں۔''

اجمل اور فرقان نے سننے کی کوشش کی مگر کوئی انسانی آواز سننے میں ناکام رہے۔ بہرحال اب ان کے لیے ڈولے کی بات کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ وہ حتی الامکان تیزی...... اور احتیاط سے ڈولے کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔ اس گرمی کو کبھی کبھی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرام دہ ٹھنڈک میں بدل دیتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید چلنے کے بعد ڈولا ایک جگہ رک گیا۔ اس کی حسیات اپنی پوری رفتار سے کام کر رہی تھیں۔ وہ سن رہا تھا۔ اب باقیوں نے بھی دھیان سے سنا تو انہیں مدھم آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ تاہم وہ کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ ڈولے نے کہا۔ ''ان کے ساتھ گھوڑے بھی ہیں۔ انہوں نے آگ جلا رکھی ہے اور شاید قہوہ وغیرہ بنا رہے ہیں۔ ان کے پاس کافی رائفلیں بھی ہیں......''

''اندازاً کتنی دور ہوں گے ہم سے؟'' اجمل نے پوچھا۔

''وہ اس سامنے والی پہاڑی کے پیچھے ہیں۔ میں...... میں پانی کا شور بھی سن رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی پہاڑی ندی ہے۔ وہ اس کے کنارے بیٹھے ہیں......''

اجمل خان نے اپنی رائفل تیار کر لی۔ وہ چاروں بڑی احتیاط اور آہستہ روی سے پہاڑی کی بلندی کی طرف بڑھے۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ اجمل اور رحیم اللہ نے برفیلے تودوں کے عقب سے نشیب میں جھانکا۔ ڈولے نے جو کچھ کہا تھا، درست تھا۔ ایک چوڑے پاٹ کی برفانی گزرگاہ تھی جس کے اندر آدھ پگھلی برف تیر رہی تھی۔ ڈھلوان کی وجہ سے پانی ہلکا ہلکا شور پیدا کر رہا تھا۔ اس آبی گزرگاہ کے نصف پاٹ کے اوپر ایک قدرتی پھول سا بنا ہوا تھا۔ ایک بہت تناور درخت تھا جو سخت موسموں کی سختیاں جھیلتا جھیلتا نہ جانے کب ندی کے پاٹ میں گرا تھا اور اس کی نصف چوڑائی تک پہنچ گیا تھا۔ اس پل کے عین سامنے سفید براق برف پر تیرہ چودہ افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب بھاری بھرکم لباسوں میں تھے۔ ان کے کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ فاصلہ زیادہ تھا، ان کے چہرے

وضاحت سے تو نہیں دیکھے جاسکتے تھے مگر پتہ چلتا تھا کہ ان میں سے اکثر کے سر اور چہرے کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔

اجمل اور ڈولے نے دیکھا کہ پتھر کی ایک تختی سی ایک بلند پتھر پر رکھی گئی ہے۔ پانچ چھ افراد اس تختی کے گرد جمع تھے اور رقص کا سا انداز اپنائے ہوئے تھے۔ ڈولا کچھ زیادہ ہی پُرجوش دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ''خان بھائی! ان لوگوں نے اپنی کمر سے چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں لٹکا رکھی ہیں۔ ان کے حلیے انہی لوگوں جیسے ہیں، جنہیں ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''دوربین کہاں ہے؟'' اچانک اجمل خان کو خیال آیا۔ رحیم اللہ نے فرقان کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ فرقان نے ٹیلی اسکوپ نکال کر اجمل کے حوالے کی۔ اجمل نے اسے آنکھوں سے لگایا اور جائزہ لینے لگا۔ منظر واضح تر ہوگیا تھا۔ اچانک اجمل خان کو لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون جوش مار کر اس کے سر کی طرف آرہا ہے۔ اس کے پورے جسم میں ہزاروں واٹ کی برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے اپنی محبوب ترین ہستی کو دیکھا...... اس نے رستم سیال کو دیکھا۔ شدید موسموں نے رستم کا رنگ سنولا دے دیا تھا۔ اس کے ریشم کی طرح نظر آنے والے بال الجھے الجھے تھے اور داڑھی بھی ناہموار نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر کسی رسی یا زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ڈاکٹر ناصر بھی موجود تھا۔ اس کا حلیہ بھی بدتر تھا اور ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دراز قد بارعب شخص جس کا ایک بازو کندھے سے کٹا ہوا تھا، رستم اور ناصر کے پاس کھڑا تھا...... اجمل کو شریف نظر نہیں آیا۔

''کیا بات ہے؟'' اجمل کے تاثرات دیکھ کر رحیم اللہ نے بے چینی سے پوچھا۔

اجمل نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹائی۔ اس کا چہرہ جوش اور مسرت کے بے پناہ دباؤ سے آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ ''ام پہنچ گیا جناب! ام چاروں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا اور اس نے ٹیلی اسکوپ رحیم اللہ کی طرف بڑھا دی۔

اگلے دو تین منٹ میں ٹیلی اسکوپ بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے اور تیسرے میں منتقل ہوئی۔ اجمل نے آگے بڑھ کر ڈولے کو گلے سے لگایا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ڈولے...... ورنہ ہم تو پیچھے جارہے تھے۔''

رستم اور ناصر کو پہچان کر ڈولا بھی ایک دم خوش نظر آرہا تھا۔ تاہم اب اسی خوشی کے ساتھ

ساتھ ایک طرح کا تفکر بھی ان سب کے چہروں سے عیاں ہونے لگا۔ یہ بات اب بالکل ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ رستم اور ناصر ایسے لوگوں کی تحویل میں ہیں جو ہرگز ان کے دوست نہیں ہیں۔ ان کے پاس کم از کم گیارہ جدید رائفلیں موجود تھیں اور ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد چوکس اور نڈر لوگ ہیں۔ ان کی ہلاکت آفرینی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مری کے نواح میں گورے کے بنگلے کے اندر انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ اجمل کی آنکھوں کے سامنے وہ خونی مناظر گھوم گئے جن کا تعلق بنگلے میں ہونے والی قتل و غارت سے تھا۔

اچانک رحیم اللہ کی آواز نے اجمل کو چونکا دیا۔ ''اجمل خان! مجھے لگتا ہے، وہ لوگ یہاں سے چلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' ٹیلی اسکوپ رحیم اللہ کی آنکھوں سے لگی تھی۔

اجمل نے ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے لگائی۔ گھوڑوں کی زینیں کسی جارہی تھیں۔ رستم اور ناصر بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کے پاس ایک منحنی سا بوڑھا تھا۔ یہ مقامی نہیں لگتا تھا۔ اجمل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہورہا تھا کہ وہ رستم اور ناصر کو اس لق و دق ویران برف زار میں دیکھ رہا ہے......

رحیم اللہ نے کہا۔ ''یہ دیکھ لو...... یہ لوگ گھوڑوں پر ہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈتے ہی نہ رہ جائیں۔''

''تو پھر کیا کریں...... کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ام ان کے چلنے سے پہلے ہی ان تک پہنچ جائیں۔''

''ہاں، ابھی ان کو چلنے میں دس پندرہ منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔'' رحیم اللہ نے کہا۔

کوہستانیوں کی تعداد نے رحیم اللہ کو بجا طور پر پریشان کر دیا تھا۔ کچھ یہی کیفیت فرقان کی بھی تھی حالانکہ وہ ایک نڈر اور باہمت ''نیوز مین'' تھا۔

اجمل خان کے رگ و پے میں ایک انوکھا جوش بھر گیا تھا۔ وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ یہ اس ہنس مکھ شخص سے بالکل مختلف تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اوٹ پٹانگ شعر سنا رہا تھا۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ تینوں کوئی پکر نہ کرے۔ ام اس معاملے کو خود ہی آسانی سے دیکھ لے گا۔''

''نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' رحیم اللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم جو کچھ کریں گے، مل کر کریں گے اور مشورے سے کریں گے۔''

''یہ دیکھو خان بھائی!'' ڈولے نے کہا۔ وہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اجمل خان نے پوچھا۔

''وہ لوگ چلنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ مگر ان کا رخ دائیں طرف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے قریب سے ہو کر گزریں گے۔''

اجمل نے ٹیلی اسکوپ میں سے منظر دیکھا...... اور تھوڑی دیر بعد تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اگر یہ لوگ دائیں طرف گیا تو پھر ام کو ان کے پاس جانے کا ضرورت نہیں ہے۔ یہ خو امارے پاس سے گزرے گا۔''

انہوں نے باری باری ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے لگائی اور انتظار کرنے لگے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے..... پھر ان کی امیدیں بر آئیں۔ کوہستانیوں کے مختصر قافلے کا رخ دائیں طرف ہی تھا۔ اب انہیں ایک ایسے راستے سے گزرنا تھا جہاں ان پر گھات لگا کر بڑا مؤثر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ گھات لگانے کی جگہ کا انتخاب پہلے ہی کر چکے تھے۔ ''امارا خیال ہے کہ اب ام کو چلنا چاہیے۔'' اجمل نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

رحیم اللہ فرقان حمید اور ڈولے نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ برفیلے تودوں کے پیچھے سفر کرتے ہوئے تیزی سے بائیں رخ سے آگے بڑھنے لگے۔ قریباً بیس منٹ بعد وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے کوہستانیوں کے قافلے کو بہرصورت گزر کر جانا تھا۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوگئی کہ نشیب میں برف پر قدموں کے سابقہ نشان دیکھے جا سکتے تھے۔ یقیناً یہ نشان اسی وقت بنے تھے جب یہ قافلہ کہیں سے چل کر آبی گزرگاہ کے کنارے پہنچا تھا۔ اجمل خان کے اندر کا بے مثال نشانے باز پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے پوزیشن لینے کے لیے بڑی عمدہ جگہ منتخب کی۔ یہاں وہ اوندھا لیٹ کر اور دو پتھروں سے اپنی رائفل کی نال گزار کر بہت عمدہ نشانہ لے سکتا تھا۔ اس کا بے پناہ اعتماد دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی حوصلہ پکڑ لیا تھا پھر بھی پچویشن ایک دم ہی اتنی خطرناک ہوگئی تھی کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

رحیم اللہ نے کہا۔ ''اجمل خان! ہمیں اپنے ذہن میں ایک بات کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہمیں ان پر سیدھی گولی چلانی ہے یا نہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے..... سیدھی گولی چلائے بغیر ام ان کو سنبھالنے میں کامیاب ہو

جائے گا؟''

''مگر یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ اگر ان میں سے کوئی بندہ مر گیا تو پھر معاملہ ایک دم بہت سنگین ہو جائے گا۔ ہم کسی ایک بندے کی نہیں، پورے قبیلے یا برادری کی دشمنی مول لیں گے۔''

''آپ کا کیا رائے ہے؟'' اجمل نے پوچھا۔

رحیم اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ڈولے نے اچانک نشیب کی طرف انگلی اٹھائی اور بولا۔ ''وہ دیکھیں جی...... وہ نظر آ گئے۔''

اجمل اور رحیم اللہ نے بیک وقت نیچے دیکھا۔ برف کی سفید چادر پر قافلے کے دو پہلے گھڑ سوار نمودار ہو گئے تھے۔ یہ لوگ توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں آ پہنچے تھے۔ وہ بالکل کھلی جگہ پر تھے۔ اجمل خان ان کو نشانہ بنانے کی بہترین پوزیشن میں تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے کا پورا قافلہ نمودار ہو گیا۔ اجمل خان نے ٹیلی اسکوپ کے بغیر بھی رستم اور ناصر کو صاف پہچان لیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر باندھے تھے، اس کے باوجود وہ مہارت سے گھوڑوں پر اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ہوئے جا رہے تھے۔ رستم کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ ایک گھڑ سوار نے پتھر کی مستطیل تختی کو بڑے احترام سے اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔

رستم کی بے بس حالت دیکھ کر ایک دم اجمل کی آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ بہت کچھ اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ رستم کو قیدی کی حیثیت سے کہیں لے جایا جا رہا ہے اور اسے لے جانے والے بس چند سیکنڈ میں اس کی زد سے نکل جائیں گے۔ اس نے اپنی رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ کی اور برف پر اوندھا لیٹا لیٹا پکار کر بولا۔ ''خبردار! رک جاؤ...... رک جاؤ۔''

اس کی آواز ویرانے میں دور تک پہنچی۔ یہ الفاظ اس نے پشتو میں ادا کیے تھے۔ قافلہ ٹھٹک کر رک گیا۔ دو تین افراد کے ہاتھ اپنی رائفلوں کی طرف بڑھے۔ اجمل خان پھر دہاڑا۔

''خبردار..... ہاتھ رائفلوں سے دور رکھو۔''

اس کی وارننگ پر کوئی بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ اجمل خان نے بے دریغ دو مرتبہ ٹرائیگر دبایا۔ دو دھماکے ہوئے اور نشیب میں قریباً ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر دو گھڑ سواروں کی پیشانیوں میں ''بندیا'' لگ گئی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیروں کی طرح برف پر گرے۔ اجمل خان پھر دہاڑا۔ ''خبردار..... رائفلیں پھینک دو۔'' اس کی آواز میں خوفناک آگ تھی۔ یہ آواز سننے

والے کے اعصاب پر لرزہ طاری کر سکتی تھی۔

ایک بار پھر اس کی وارننگ پر دھیان نہیں دیا گیا۔ اس مرتبہ اجمل نے بڑی بے رحمی سے دو لمبے برسٹ چلائے اور کم از کم پانچ مزید افراد کو برف اور خون میں لٹا دیا۔ دو گھوڑے بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگے تھے۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا۔

اجمل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ رستم اور ناصر کو کچھ سفاک لوگوں کی گرفت سے نکالنا چاہتا تھا۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو قریباً ایک سال پہلے گورے کے بنگلے میں لرزہ خیز درندگی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔

''وہ دیکھو۔'' ڈولا، اجمل کے پہلو میں چلایا اور ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

اجمل نے دیکھا، رستم اور ناصر دوسرے لوگوں سے کچھ فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ایک شخص ہاتھ میں خنجر لیے رستم اور ناصر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے یا پھر ان میں سے کسی کی گردن پر خنجر رکھ کر یہ اندھی فائرنگ رکوانے کا سوچ رہا ہے۔ دوسرا خیال زیادہ زیادہ قوی تھا۔ کیونکہ اس نے رستم اور ناصر کو مارنا ہوتا تو دور ہی سے گولی چلا دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ رستم یا ناصر کے قریب پہنچتا، اجمل نے ایک اور سنگل شاٹ چلایا۔ گولی حملہ آور کے سر کے پچھلے حصے میں گھسی اور وہ برف پر اوندھے منہ گر کر دور تک پھسل گیا۔

پلک جھپکتے میں سات آٹھ افراد گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ باقی یکسر حواس باختہ کھڑے تھے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جوابی فائر کس طرف کریں۔ یا شاید اب ان میں جوابی فائر کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ اجمل کی گرج ایک بار پھر تہلکہ خیز فضا میں گونجی تو سب سے پہلے ایک ہاتھ والے دراز قد شخص نے ہی اپنی ہلکی پھلکی رائفل برف پر پھینکی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے باقی دو ساتھیوں نے بھی رائفلیں پھینک دیں۔ ان کے دو تین گھوڑوں کو گولیاں لگ چکی تھیں۔ دو تو جان کنی کی حالت میں زمین پر تھے۔ ایک اپنی ٹانگ گھسیٹتا ہوا باقی کے بدکے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ بھاگا پھر رہا تھا۔

☆======☆======☆

کچھ دیر پہلے جب ایک للکارتی ہوئی آواز رستم کے کانوں میں پڑی تو دوسروں کی طرح وہ بھی بری طرح چونکا تھا۔ آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونجی تھی اور کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ کدھر سے آئی ہے۔ الفاظ سمجھ میں آئے تھے اور نہ ہی زبان۔ پھر یکایک دو دھماکے ہوئے تھے۔ رستم

اور ناصر نے دو مسلح پہریداروں کو اچھل کر گھوڑوں سے نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں جان لیوا طور پر زخمی ہوئے تھے پاؤندہ محافظوں نے حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھل کر اپنی رائفلیں کندھوں سے اُتارنا چاہیں تب للکار ایک بار پھر گونجی۔ اور اس کے ساتھ ہی جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ تڑتڑ کی سماعت شکن آواز سنائی دی۔ خودکار رائفل کے دو طویل برسٹ چلائے گئے۔ کم از کم پانچ محافظ برف پر گر کر تڑپنے لگے اور ان کے ساتھ دو گھوڑے بھی جان کنی کا شکار ہو گئے۔

رستم اور ناصر نے گھوڑوں سے چھلانگیں لگا دی تھیں اور کسی محفوظ آڑ تک پہنچنا چاہا تھا مگر آڑ کہیں نہیں تھی۔ وہ بس یہی کر سکے کہ اس مقام سے دور چلے گئے جہاں لاشیں تڑپ رہی تھیں۔ پھر ایک مشتعل پاؤندہ، خنجر بدست بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا مگر ان تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اپنے سر کے عقب میں ایک گولی وصول کی اور مُردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ فرش پر آ گرا۔ اس ہلاکت سے رستم اور ناصر کو کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ گولی کس طرف سے چل رہی ہے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے رستم بھائی؟'' ناصر چلایا۔

''شاید برق جان کے کچھ دشمن ہیں۔'' رستم نے بھی بلند آواز میں کہا۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ کم از کم رائفل تو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ رستم کا خیال تھا کہ شاید اسی وجہ سے انہیں ابھی تک نشانہ بھی نہیں بنایا گیا۔

اسی دوران میں رستم اور ناصر نے دیکھا کہ برق جان اور اس کے بچے ہوئے دو ساتھیوں نے رائفلیں پھینک دیں اور سخت حواس باختہ انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ان کے قریب کھڑے واس نے بھی ایسا ہی کیا۔

''کیا ہم بھاگ سکتے ہیں؟'' رستم نے تیز سرگوشی کی۔

''مشکل ہے۔ یہ بالکل کھلی جگہ ہے......''

اس سے پہلے کہ رستم مزید کچھ کہتا، چند افراد برفیلے تودوں کے عقب سے برآمد ہوئے اور ڈھلوان طے کرتے ہوئے نیچے آنے لگے۔ یہ چار افراد تھے۔ بظاہر یوں لگا کہ ان میں ایک بچہ بھی ہے۔ رستم اور ناصر آنکھیں سکوڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ یکایک رستم کی رگوں میں لہو کی گردش تیز تر ہو گئی۔ اس نے چمکیلی دھوپ میں آنکھیں مزید سکوڑ کر سامنے ڈھلوان کی طرف دیکھا اور پھر دفعتاً اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے ہاں اس نے، اس شخص کو پہچان لیا تھا جو سب سے آگے آ رہا تھا... جس کے ہاتھوں میں خودکار

رائفل تھی۔ جس کا سینہ تنا ہوا تھا اور جس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ رستم اپنے پورے ہوش وحواس کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر بھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے ناصر کو دیکھا۔ ناصر کے چہرے پر بھی زلزلے کی کیفیت تھی۔ اس نے بھی اپنے حسن ابدالی ساتھی اجمل خان کو پہچان لیا۔ ہاں، یہ اجمل خان ہی تھا۔

اجمل خان کسی خونخوار عقاب کی طرح جھپٹتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے پیچھے چند قدم کی دوری پر ایک عمر رسیدہ لیکن چوکس شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ پستول دکھائی دے رہا تھا۔ عمر رسیدہ شخص کے ساتھ جو بچہ دکھائی دے رہا تھا، وہ بھی چند سیکنڈ بعد پہچانا گیا۔ وہ کوتاہ قد ڈولا تھا۔ سب سے آخر میں ایک نوجوان آ رہا تھا جس کی پتلون سفید اور جیکٹ سرخ تھی۔ بوڑھے کی طرح اس کے سر پر بھی پی کیپ دکھائی دے رہی تھی۔

اجمل خان نے برق جان اور اس کے ساتھیوں کو مزید خوفزدہ کرنے کے لیے ان کے پاؤں کے پاس چند فائر اور کیے۔ ان کے پاؤں کے قریب سے برف اچھلی اور وہ ڈر کر چند قدم مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اجمل اور اس کے ساتھیوں نے سب سے پہلے، پاؤنڈوں کا گرا ہوا اسلحہ قبضے میں لیا۔ اجمل خان نے پشتو میں گرج برس کر برق جان اور اس کے تینوں ساتھیوں، بشمول واس کو اوندھے منہ برف پر لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

جب وہ لیٹ گئے تو ڈولا بھاگتا ہوا رستم اور ناصر کی طرف آیا۔ وہ فرطِ مسرت سے موسلا دھار رو رہا تھا۔ وہ باری باری رستم اور ناصر کی ٹانگوں سے لپٹا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اجمل ابھی تک رستم سے دور تھا۔ اس نے بدستور برق جان اور اس کے تینوں ساتھیوں کو کور کر رکھا تھا۔ وہ ان کی طرف سے کوئی رسک لینے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ بس اس نے ایک دو بار دور سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رستم اور ناصر کو دیکھا تھا۔

رستم نے ڈولے کو بتایا کہ ان کی زنجیروں کی چابی کس محافظ کے پاس ہے۔ اس نے چند میٹر دور پڑی ایک لاش کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ''اس کی دائیں جیب میں دیکھو۔''

ڈولے نے زور لگا کر وزنی لاش کو سیدھا کیا اور اس کی جیب ٹٹولی۔ یہاں چابیوں کا ایک چھوٹا گچھا موجود تھا۔ ان میں ان دو چھوٹے چھوٹے چائنیز تالوں کی چابیاں بھی تھیں جن کے ذریعے رستم اور ناصر کے ہاتھوں کو جکڑا گیا تھا۔ ڈولے نے چابکدستی سے تالوں کو زنجیروں سے علیحدہ کر دیا۔ رستم اور ناصر کے ہاتھ کھلتے ہی اجمل خان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ رستم اور ناصر نے ایک ایک رائفل تھام لی۔

پہلے رستم اور اجمل ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ ناصر نے برق اور اس کے ساتھیوں کو کور کیے رکھا۔ پھر رستم نے انہیں کور کیا اور ناصر نے اجمل سے پُر جوش معانقہ کیا۔ یہ عجیب ملاقات تھی۔ ان کے چاروں طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں...... اور بارود کی بُو تھی۔

رستم نے آگے بڑھ کر واس کو برف سے اٹھایا اور پیچھے لے آیا۔ ''یہ دوست ہے۔'' رستم نے اجمل کو بتایا۔

اجمل نے واس سے بھی معانقہ کیا۔ رحیم اللہ اور فرقان حمید کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ دو چار منٹ پہلے تک انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے اردگرد اس طرح انسانوں اور جانوروں کی لاشیں پڑی دیکھیں گے۔ خاص طور سے فرقان تو بالکل زرد تھا۔ جن زنجیروں سے رستم اور ناصر کو باندھا گیا تھا، انہی سے برق جان کے دونوں ساتھیوں کو جکڑ دیا گیا۔ برق جان اب حیرت اور صدمے کے شدید جھٹکوں سے کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔ وہ برف پر اوندھا پڑا پڑا واویلا کرنے لگا۔ ''یہ تم لوگوں نے کیا کر دیا؟ بے گناہوں کو مار دیا۔ یہ بہت برا ہوا...... بہت برا...... اب اس کا انجام کیا ہوگا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

رستم نے اسے برف سے اٹھنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ پر وزن ڈال کر بمشکل اٹھ بیٹھا۔ رستم نے اپنی انگلی سے برق کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''برق جان! میں نے تم سے کہا تھا ناں...... تمہاری یہ اونچی دیواریں ہمیں روک نہیں سکتیں۔ ہم نے ایک دن یہاں سے نکل جانا ہے۔''

برق جان کچھ دیر خاموش رہا پھر زور سے بولا۔ ''یہ مت سمجھو کہ تم یہاں سے نکل گئے ہو۔''

''ہم یہاں سے نکل گئے ہیں برق جان۔'' رستم نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بلکہ اب سے چند گھنٹے بعد ہمارا تیسرا ساتھی بھی یہاں سے نکلنے والا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے نکالنے میں تم ہماری مدد کرو گے۔''

برق جان کو کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ بس الجھی ہوئی نظروں سے کبھی رستم اور کبھی اجمل خان وغیرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ رستم اور ناصر اس ناقابلِ شکست گرفت سے نکل چکے تھے جو ان پاؤنڈوں نے بارہ تیرہ مہینوں سے ان پر قائم کی ہوئی تھی۔ یہ ایک کرشماتی رہائی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ انہیں ابھی تک اپنی رہائی کا

یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال کئی اندیشے ابھی بھی موجود تھے۔ رستم، ناصر اور دواس کو بجا طور پر یہ خطرہ تھا کہ یہاں ہونے والی زبردست فائرنگ کی آواز کہیں کسی ایسی جگہ نہ سنی گئی ہو جہاں سے ٹاپو کے لوگ خبردار ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں گھر جاتے۔ درحقیقت یہ فائرنگ کی آواز ہی تو تھی جو اجمل اور اس کے ساتھیوں کو یہاں کھینچ لائی تھی۔ جب رستم پل پار کر کے پتھر کی دو سو سال پرانی تختی کنارے پر لے آیا تھا تو کنارے پر موجود لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسی خوشی میں انہوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی۔ وقفے وقفے سے کی جانے والی یہی ہوائی فائرنگ تھی جو پہلے ڈولے نے اور پھر اجمل وغیرہ نے سنی۔

اب کھلی جگہ پر سے آٹھ عدد لاشوں کو ہٹایا جا چکا تھا۔ ان لاشوں کو ایک دو میٹر گہری کھائی میں اس طرح ڈال دیا گیا تھا کہ یہ دور سے نظر نہ آسکیں۔ دو گھوڑوں کی لاشوں کو گھسیٹنا اور چھپانا مشکل تھا۔ انہیں چھپانے کے لیے ان پر برف وغیرہ بکھیر دی گئی۔ بدکے ہوئے گھوڑوں کو اکٹھا کر کے ایک جگہ باندھ دیا گیا۔ برق جان کی خواہش کے مطابق پتھر کی مقدس تختی کو ایک اونچی جگہ پر احتیاط سے رکھ دیا گیا۔ اجمل خان، رستم اور ناصر ایک دوسرے کو اپنے اپنے مختصر حالات سے آگاہ کر چکے تھے۔ تفصیلی حالات جاننے کے لیے تو مسلسل کئی دن کی گفتگو بھی تھوڑی تھی۔

رستم نے سب سے پہلے اپنی بی بی کے بارے میں ہی پوچھا تھا۔ ''وہ کیسی ہیں اجمل؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے رستم بھائی۔'' اجمل نے آنکھوں میں نمی لے کر کہا۔ ''وہ آج کل اپنے گاؤں رنگ والی میں ہے۔ اس کی بہت شان ہے رستم بھائی۔ ہزاروں لوگ اپنی چھوٹی چودھرانی کا ایک جھلک دیکھنے کے لیے انتظار میں کھڑا رہتا ہے لیکن...... وہ بھی کسی کا انتظار کرتا ہے...... اور آپ کو پتا ہی ہے وہ کس کا انتظار کرتا ہوگا۔ اس نے آپ کے لیے اتنا آنسو بہایا ہے رستم بھائی...... اتنا آنسو بہایا ہے کہ ام بیان نہیں کر سکتا۔''

''اور حاجی حیات...... اور منا...... گریس وغیرہ؟''

''گریس آج کل اپنے وطن گیا ہوا ہے۔ حاجی حیات نے بھی ہر طرح سے آپ کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ ام آپ کو تفصیل بتائے گا تو گھنٹوں لگ جائیں گے...... منا، بی بی کے پاس ہی ہے۔ وہ اچھا خاصا صحت مند ہو گیا ہے۔ پوری حویلی میں خرگوش کے مافق بھاگتا پھرتا ہے۔''

''اور اس کا باپ...... چودھری بشیر؟''

اجمل کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپکا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر رستم کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''چودھری بشیر اپنے گناہوں اور نیکیوں کا حساب کتاب لے کر اللہ کے پاس حاضر ہو چکا ہے۔ وہ اماری بہن کا زندگی عذاب بنانے کے لیے اب اس دنیا میں موجود نہیں۔''

رستم نے حیرت کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ اس نے اجمل سے تفصیل جاننا چاہی لیکن اجمل شاید اتنے افراد کی موجودگی میں بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو پڑھتے ہوئے رستم نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ اس نے قدرت اللہ، ڈپٹی ریاض ہٹلر اور تایا معصوم وغیرہ کے حوالے سے چند سوالات کیے...... جن کے اجمل نے مختصر جواب دیئے۔

ڈولے اور اجمل نے بھی رستم سے چند سوال کیے جن کے مختصر جواب رستم اور ناصر نے دیئے...... ان میں ایک اہم سوال رستم کی ٹانگ کے بارے میں بھی تھا۔ اجمل اور ڈولا اس امر میں حیرت انگیز مسرت محسوس کر رہے تھے کہ رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ پھر سے اس کے جسم کا زندہ حصہ تھی۔ وہ ایک معمولی لنگڑاہٹ کے سوا وہ رستم میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کر رہے تھے۔

☆======☆======☆

محمد اعظم خاں کے قلم سے ایک دلکش اور خوبصورت ناول۔

پرایا آسماں

قیمت 150 روپے

- رشتوں کے بندھن میں جڑی ایک لازوال تحریر۔
- پیار و محبت سے گندھی ایک منفرد کہانی۔
- ان لمحوں کی داستان جب کوئی ہار کر بھی جیت گیا۔
- کسی کی بے وفائی اور کسی کی وفاؤں کا قصہ۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
20۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

عین۔شین۔قاف

محمد فیاض ماہی

- عشق و محبت کے اس سوداگر کی کہانی۔ جس نے عشق نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ... مگر اس کی ضد اور انا عشق کے پہلے حرف "عین" کی اسیر بن گئی۔
- شرابی اور آوارہ مزاج احمد سبحانی جب عاشق بنا تو "عین" نے اس کو روح کی گہرائی تڑپا دینے والا تاوان دینے پر مجبور کر دیا۔ شیطان ملعون کے کاری دار "عین" کی سرخروئی کی راہ میں دیوار تھے۔
- اس عاشق کا قصہ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کا عشق "شین" سے شک نہیں بلکہ "شین" سے شہادت پر مبنی ہے۔ وہ خاندان سے بغاوت کر کے شہر محمد ﷺ کا مسافر بنا تو طوفان نے اس کا راستہ روک لیا۔ کیا اس نے عشق کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگا کر عشق کا دوسرا حرف "شین" سرخرو کر دیا؟
- سادات گھرانے کی وکالت عشق کے خلاف دلیل بن گئی جبکہ مدعیہ ایک طوائف تھی۔ گندگی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی طوائف نے "قاف" کو اپنا پیرہن بنا لیا۔
- وہ عشق کے قاف کی ایسی اسیر بنی کہ دنیاوی عذابوں نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی۔ اُس نے "قاف" کو کس طرح خراج پیش کیا؟
- محبت و عقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ عشق کی رعنائیوں سے لبریز سطریں عبادت گزار فقرے بہترین اسلوب عشق الٰہی اور محبوبِ الٰہی کے عشق میں جانوں کے نذرانے تحفتاً پیش کرنے والوں کی کہانی۔
- عین۔شین۔قاف کی سچی اور سچی تشریح سہ حرفی "عشق" کی حشر سامانیاں۔
- عشق حقیقی پر اب تک لکھی جانے والی کتب کو فراموش کرا دینے والی شاندار تحریر۔

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
20۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

خواتین کا مقبول ترین ناول

ماہی ماہی کوکدی میں

دو حصے

ہما کوکب بخاری

قیمت فی حصہ 350 روپے

- معاشرے کے سب سے اونچے سنگھاسن پر بیٹھے زورآوروں کی کہانی۔
- ان مقدس دوشیزاؤں کی کہانی جن کا تقدس ان کے لیے عذاب بن گیا تھا۔
- اس باپ کا قصہ جسے اپنی عزت، آن اور زبان اپنی اولاد سے زیادہ عزیز تھی۔
- صدیوں سے غیرت کے نام پر سولی پر لٹکائی جانے والی عورت کی کہانی۔
- عظمت کے ساتویں آسمان پر بیٹھی عورت پاتال کی گہرائی میں کیوں گرتی ہے۔
- اپنی اپنی خواہشوں کے بھنور میں پھنسے لوگوں کی داستان۔
- خاندانی روایات کے باغی ایک بلند ہمت نوجوان کی کہانی۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

پیچ در پیچ سنسنی خیز واقعات میں الجھی ہوئی ہیبت ناک داستان

کالے چراغ

ایم اے راحت

- پاتال جیسی اتھاہ گہرائیوں میں سات بے نور چراغ جنہیں انسانی خون سے روشن کرنا تھا۔
- [illegible] سنسنی خیز واقعات۔
- ایک بد روح نے [illegible] سات خون کرائے۔
- چمپا وتی [illegible] آسیب [illegible] ناچتے تھے۔
- وہ [illegible] پیدا ہونے والوں کا خون مانگتی تھی۔
- وہ خوفناک ناگ طاقتوں کا [illegible] صدیوں جینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ شکتی مان کون تھا؟
- جادو نگری کی پراسرار، دہشتناک کہانی۔

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

علی میاں پبلیکیشنز
20-عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7247414

دیوی

7

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— ۳۰۰ روپے

ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

رستم، ناصر، اجمل اور واس کے درمیان علیحدگی میں بات چیت ہوئی۔ رحیم اللہ اور ڈولا ڈیرہ برق اور اس کے دونوں ساتھیوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ رستم نے ناصر کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں شریف کے علاوہ ہمیں زری کو بھی وہاں سے ہر صورت نکالنا ہوگا۔''

ناصر نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارا کیا ارادہ ہے واس؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' واس..... پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ اس برف زار اور ٹھنڈے موسم میں بھی اس کو پسینے آ رہے تھے۔ یہ شاید اچانک پیش آنے والے اس واقعے کا اثر تھا۔

ناصر نے احترام سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سنہری موقع زندگی میں پھر نہیں ملے گا۔ اسے ضائع نہیں کرنا واس۔ اس برفیلے قبرستان سے نکل کر اپنے گلی کوچوں اور اپنے پیاروں میں واپس پہنچ جاؤ۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''لیکن خانم کو تو اب یہی گلی کوچے اپنا گھر لگتے لگے ہیں۔ شش.....شاید وہ یہاں سے جانے کو تیار نہ ہو۔''

''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اسے اپنا گھر بار، اپنے بچھڑے ہوئے لوگ یاد نہ آتے ہوں۔ وہ صرف خطروں سے ڈرتی ہوگی۔ اسی طرح ڈر ڈر کر اس نے اس پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ پنجرہ ہے واس.... اس کو توڑ دو۔''

انہوں نے واس کو سمجھایا بجھایا۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ واس کے اندر یہاں سے جانے کی تڑپ نہیں ہے اگر وہ جانے کے لیے نیم رضامند نظر آ رہا تھا تو اس کی وجہ

صرف یہ تھی کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آٹھ لاشیں تڑپتی دیکھ چکا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لاشوں کی وجہ سے خود اس پر کتنا بوجھ پڑے گا۔ تین چار منٹ کے مکالمے کے بعد واس نے اس بات پر رضامندی ظاہر کردی کہ جو لوگ یہاں سے شریف اور زری کو لینے جائیں، وہ اس کی بیوی خانم کو بھی لے آئیں۔ جب یہ طے ہوگیا کہ بستی میں سے تین افراد کو یہاں بلوایا جائے گا اور یہ بھی طے ہوگیا کہ کس طرح بلوایا جائے تو برق جان کو بلا لیا گیا اور اس سے بات چیت شروع ہوئی۔

رستم اب مترجم واس کی مدد کے بغیر بھی برق کو اپنی بات سمجھا لیتا تھا۔ اس نے براہ راست برق جان سے بات شروع کی۔ ''برق جان اتم نے ابھی تک میرا صرف ایک روپ دیکھا ہے۔ میں زندگی دینا جانتا ہوں تو زندگی لینا بھی جانتا ہوں۔ بے شک تمہارے دل میں میرے لیے کہیں نہ کہیں ہمدردی موجود تھی۔ میرے دل میں بھی تمہارے لیے کہیں نہ کہیں ہمدردی موجود ہے مگر یہاں اب جو بھی فیصلہ ہونا ہے وہ ایک ہاتھ دو، دوسرے ہاتھ لو کے طریقے سے ہونا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے تمہاری اور تمہارے دونوں ساتھیوں کی ان کے بدلے اپنے تین ساتھیوں کی واپسی چاہیے۔'' رستم کا لہجہ اٹل تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' برق جان بولا۔

''تو پھر تم آج کی شام نہیں دیکھ سکتے۔'' رستم نے رائفل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ ''اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں آسان موت نہیں مرنے دوں گا۔''

رستم کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ برق جان جیسا شخص بھی کانپ کر رہ گیا۔ یہ لہجہ نہیں تھا، یہ آگ تھی جو پورے ایک برس تک رستم کے سینے میں دبی تھی۔ یہ اس درندے کی گرج تھی جس نے ایک مدت تک پنجرے کی سلاخوں میں راستہ بنانے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔

برق جان چونک کر رستم کی طرف دیکھنے لگا...... پھر سنبھل کر بولا۔ ''کیا ہم تینوں کے مر جانے سے تمہارے ساتھی تمہیں واپس مل جائیں گے؟''

''نہیں ملیں گے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی انتہائی قدم نہ اٹھانا پڑے میں چاہتا ہوں کہ۔ میں آخر تک کوشش کروں گا کہ تمہاری جان نہ لوں۔''

''اس کی وجہ؟''

''وجہ میں نے تمہیں ابھی بتائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے زندہ واپس اپنے بیوی بچوں میں پہنچو۔ اپنے لوگوں میں پہنچو...... اور وہ سب کچھ کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ تم یہاں تبدیلیاں لانے کا سوچ رہے ہو اور تمہاری سوچ پوری ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس سوچ کے پورا ہونے سے ہی تمہاری بستی اور تمہارے لوگوں کا بھلا ہے۔''

واس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے رستم کی تائید کی۔ ''ہاں ملک! رستم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ اس بستی کے لیے امید کی کرن ہیں۔ آپ وہاں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو ناسمجھی کے اندھیرے سے نکال سکتے ہیں۔ ہماری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں اور اب بھی ہیں۔''

''لیکن جب میرے لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ نہیں رہیں گی تو میں ایک دم بے کار ہو جاؤں گا۔ تم لوگوں کو چھوڑ کر میں ایک ایسا جرم کروں گا جس کی معافی مجھے میرے لوگ مشکل سے ہی دیں گے۔''

''تم ہمیں چھوڑو گے مگر تمہاری بہادری میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ تم نے چند دن پہلے شوتم جیسے شخص کو چاروں شانے چت کیا ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ میں تمہاری بات مانوں گا تو ایک دم صفر ہو جاؤں گا۔ اپنا جینا حرام کرنے سے بہتر ہے کہ میں تمہارے ہاتھوں موت قبول کرلوں۔''

''موت اتنی آسان نہیں ہے برق جان۔ تم دوسروں کو تو موت اور زندگی کے درمیان لٹکاتے رہے ہو مگر تم نے کبھی خود لٹک کر نہیں دیکھا۔''

ابھی رستم کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ رستم نے پلٹ کر دیکھا۔ منظر بالکل غیر متوقع اور ہلا دینے والا تھا۔ برق جان کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک کسی جنگلی جانور کی طرح رستم پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ رحیم اللہ کو اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اپنے پستول سے اس پر گولی چلا سکتا اور جب کافی تاخیر سے اس نے گولی چلائی تو وہ نشانے پر نہیں لگی۔ گرانڈیل محافظ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح رستم سے ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا دور جا گرا۔ رستم اپنی رائفل سمیت برق جان کے بالکل پاس گرا تھا۔ برق جان نے بڑی پھرتی سے رستم کی رائفل پر ہاتھ ڈالا۔ اگر رستم سے تھوڑی سی کوتاہی ہوتی تو وہ رائفل اس سے چھین چکا ہوتا۔ رستم نے برق جان کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں اور وہ پشت کے بل نیچے گر گیا۔ رستم سے ٹکرانے والے محافظ کے ساتھ ناصر گتھم گتھا ہوگیا تھا۔ محافظ زور آور تھا اور سینے کی پوری طاقت

کے ساتھ واویلا کر رہا تھا۔

"تم نے میرا بھائی مار دیا۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بدلہ لوں گا۔"

اس کے ہاتھ کھلے ہوتے تو بھی شاید وہ ناصر کو زیر نہ کر سکتا۔ ناصر نے چند طوفانی کے اس کے چہرے پر رسید کیے اور اس کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا۔ وہ بے بس ہونے کے باوجود جدوجہد کر رہا تھا اور اپنی زبان میں گالیاں بھی بک رہا تھا۔ یقیناً تھوڑی دیر پہلے گرنے والی آٹھ لاشوں میں اس محافظ کے بھائی کی لاش بھی شامل تھی۔ بھائی کی موت پر اس کا غیظ و غضب اپنی جگہ...... لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بالکل جس طرح کچھ دیر پہلے تک رستم اور ناصر بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری طرف رستم نے برق جان کے ہاتھ سے اپنی رائفل چھڑا لی اور پھر اس رائفل کو دستے کی طرف سے استعمال کرتے ہوئے برق جان کے سینے اور کندھوں پر چند ضربیں لگائیں۔ برق جان مرعوب ہونے کے بجائے دیوانہ وار جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھا۔ برق کے اس انداز نے رستم کو مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے رائفل کے...... کندے سے برق جان کو بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ برق جان کے اکلوتے ہاتھ کی کلائی ٹوٹ گئی اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی دیکھ کر بھی رستم نے اپنا ہاتھ ہلکا نہیں کیا۔ واس تڑپ کر آگے آیا اور برق جان کے اوپر گر گیا۔ "بس کرو رستم۔ خدا کے لیے بس کرو۔" واس چلایا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔" رستم گرجا۔ "میں دیکھتا ہوں، یہ کہاں تک اکڑ سکتا ہے۔"

رستم کی دو تین ضربیں واس کو اپنے جسم پر بھی جھیلنا پڑیں...... بالآخر رستم پیچھے ہٹ گیا۔ رائفل ابھی تک بڑی مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی۔

واس نے برق جان کو اپنی آڑ میں رکھا اور رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "رستم! تم پیچھے چلے جاؤ۔ میں خود بات کرتا ہوں ملک سے۔"

رستم اپنے طیش کو سنبھالتا ہوا دور ہٹ گیا۔ واس نے لہولہان برق جان کو اٹھایا۔ اپنا مفلر اُتار کر اسے پٹی کی طرح برق جان کی مضروب کلائی پر باندھا۔ ایک کپڑے سے برق کا لہولہو چہرہ صاف کیا اور پھر اسے پانی پلایا اور اس سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

"وہ دوسرا احرای کہاں ہے؟" رستم نے ناصر سے پوچھا۔ اس کا اشارہ دوسرے حملہ آور کی طرف تھا۔

"اجمل نے اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے ہیں۔ وہ سامنے پتھر کے پیچھے لٹا دیا ہے ان دونوں کو۔" ناصر نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

رحیم اللہ اور فرقان یہ خون خرابہ اور مار پیٹ دیکھ کر سخت ہراساں تھے۔ فرقان بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ واس اور برق جان میں بات چیت طول پکڑتی جا رہی تھی۔ رستم تک آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم وہ دور ہی سے دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ برق جان اگر ایک بار اثبات میں سر ہلاتا تھا تو تین بار نفی میں ہلا دیتا تھا۔ واس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اس نے ایک دو بار برق جان کے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگائے۔

گزرنے والا ہر لمحہ ان کے لیے قیمتی تھا۔ آخر رستم لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واس اور برق جان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے برق جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سنو برق جان! ہم یہاں کسی چوہے دان میں پھنس کر بے بسی کی موت مرنا نہیں چاہتے۔ تم نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہمارے ساتھیوں کو یہاں بلا رہے ہو یا نہیں؟"

واس نے مداخلت کی۔ "رستم! پلیز تھوڑا سا وقت اور دو...... میں نے......"

"دیکھو واس!" رستم نے واس کی بات کاٹی۔ "جو اصل بات ہے وہ میں بھی جانتا ہوں۔ برق جان کے دل میں اندیشہ ہے کہ اگر ہم یہاں سے نکل گئے تو مار گہ بستی کا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔ لوگ یہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے، یہاں کے حالات جاننا چاہیں گے۔ اس پاؤندہ قبیلے کو اور یہاں کے رہن سہن کو تماشا بنا دیا جائے گا۔ یہی خدشے ہیں ناں اس کے؟"

واس خاموش رہا...... برق جان نے تھوڑے توقف کے ساتھ اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ خدشے غلط نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے ان محافظ پہاڑوں کے اندر خود کو صدیوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ہماری یہ دنیا اچھی ہے یا بری لیکن الگ تھلگ ہے۔ اس کی اپنی خوبصورتیاں ہیں اور اپنے مسئلے مسائل ہیں۔ اگر یہ بستی اب تک اپنی اصل حالت میں آباد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں باہر سے آنے والا کوئی شخص کبھی واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری مرضی سے یا اپنی مرضی سے پھر یہیں کا ہو کر رہا ہے۔ شاید تم لوگوں کے نزدیک یہ ہماری بے رحمی ہو لیکن یہ ہماری مجبوری رہی ہے...... اور اب بھی ہے۔"

رستم گہری سانس لیتے ہوئے زخمی برق جان کے قریب برف پر بیٹھ گیا۔ "اگر ہم تمہاری اس مجبوری کا حل نکال دیں تو پھر؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مرد کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے برق جان...... اگر ہم تم سے وعدہ کریں کہ ہم یہاں سے جا کر کبھی کسی کو یہاں کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے تو پھر؟"

''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' برق جان نے کہا۔

''یہ ہو سکتا ہے برق جان......اور تمہیں پتا ہے یہ کیوں ہو سکتا ہے؟'' رستم نے برق کا شانہ تھام کر عجیب لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے رستم کا چہرہ تکتا رہا۔

رستم نے کہا۔ ''اس لیے کہ اب اس بستی کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ تم اس بستی اور یہاں کے لوگوں کی کایا پلٹو گے اور جب یہاں کی کایا پلٹے گی اور یہاں کے گندے رواج ایک ایک کر کے ختم ہوں گے تو پھر یہ بستی عجوبہ نہیں رہے گی۔ نہ تمہارے لیے......اور نہ ہی باہر سے آنے والے کسی شخص کے لیے۔ ہم اس بستی کے راز کو اپنے سینوں میں دفن کر دیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر یہ تمنا بھی رکھیں گے کہ کسی دن تم لوگ خود ہی اپنے گرد اٹھائی ہوئی دیواروں کو گرا دو گے۔ دس سال نہیں تو بیس سال بعد بیس سال نہیں تو پچاس سال بعد......''

برق جان دھیان سے رستم کی باتیں سن رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ رستم کی باتیں بھی کچھ نہ کچھ برق جان پر اثر کر رہی ہیں۔

ان چاروں کے درمیان طویل مکالمہ ہوا۔ رستم اور ناصر نے دوٹوک لہجے میں برق جان کو بتایا کہ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں اور ان میں سے اسے ایک منتخب کرنا ہوگا۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ برق جان، رستم کے دیئے ہوئے قول پر بھروسہ کرے اور اپنا اختیار استعمال کر کے ان تینوں افراد کو بستی سے یہاں پہنچا دے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں برق جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور وہ واپس چلے جائیں گے

دوسری صورت میں برق جان اور اس کے دونوں ساتھی بطور یرغمال رستم وغیرہ کے ساتھ اسکردو جائیں گے۔ ان سے مکمل پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر مارگہ بستی میں محبوس افراد کو چھڑانے کے لیے باقاعدہ کارروائی کی جانے گی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کارروائی وسیع پیمانے پر ہو اور اس پورے پاؤندہ قبیلے کو حکومتی دائرہ اختیار میں لایا جائے۔ ایسی صورت میں زبردست اکھاڑ پچھاڑ کا ہونا یقینی بات ہے۔

رستم نے برق جان کو دونوں راستے پوری تفصیل اور نیک نیتی کے ساتھ سمجھا دیئے اور اسے سوچنے کے لیے دس پندرہ منٹ کا مزید وقت بھی دیا۔ اب واس مکمل طور پر رستم کی

حمایت میں تھا......اور اپنے طور پر برق جان کو سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد اس ساری گفت و شنید کا نتیجہ مثبت شکل میں نکل آیا۔ برق جان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ سب کچھ لٹا دینے سے بہتر ہے کہ وہ رستم کے دیئے ہوئے قول پر اعتبار کر لے اور مطلوبہ افراد کو رہا کر دے۔ تاہم اس موقع پر برق جان نے ایک نئی بات کی۔ وہ رستم سے بولا۔

''مجھے لگتا ہے واس یہاں سے واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ اور اس کی بیوی یہاں خوش ہیں......تم ان پر نامناسب دباؤ ڈال رہے ہو۔''

''ہم کسی سے کوئی زبردستی کرنا نہیں چاہتے۔''

''میں بھی کسی پر زبردستی نہیں کر رہا ہوں۔'' برق جان نے کہا۔ ''تم واس کو یہاں بلا لو اور اسے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا موقع دو۔''

رستم کو خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ واس شدید تذبذب کا شکار ہے۔ وہ اس کو جتنا سمجھا سکتا تھا، سمجھا چکا تھا، اب آخری فیصلہ تو اس نے ہی کرنا تھا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ رستم نے واس کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ رستم نے وہ بات واس کے سامنے دہرائی جو ابھی برق جان نے اس سے کہی تھی۔

ادھیڑ عمر واس نے رستم سے نگاہ نہیں ملائی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ آخر رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے واس! یہ تمہاری زندگی ہے، اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا تمہیں پورا حق ہے۔''

واس نے رستم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ بولا۔ ''رستم! مجھے یہ موقع آج سے بارہ تیرہ سال پہلے ملا ہوتا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا......لیکن اب......پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ آہستہ آہستہ دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب ہم میاں بیوی کو یہی بستی اپنا گھر لگنے لگی ہے۔ یہاں کا دکھ سکھ اپنا دکھ سکھ محسوس ہونے لگا ہے۔ ویسے بھی اب پیچھے ہمارا کون ہے۔ ایک بھائی ہی تھا جو اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب جو تھوڑی سی زندگی باقی رہ گئی ہے اس کے لیے پھر سے مہاجر بننا بہت بڑا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔''

رستم خاموش رہا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا۔

''مجھے معاف کرنا رستم! میں تمہارے اور ناصر کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن اگر تم لوگ ہمیں یہیں رہنے دو تو یہ ہمارے لیے اچھا ہوگا۔''

رستم اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے کئی بار سنا تھا کہ پنچھی اپنے پنجرے سے، اپنے

گھونسلے ہی کی طرح مانوس ہو جاتے ہیں۔ آج وہ اس کی زندہ مثال دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں سب کچھ طے پا گیا۔ برق جان کے حکم پر واس اور ریان بخت گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس مارگہ بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ واس کے پاس برق جان کا خصوصی پروانہ بھی تھا۔ پروانہ برق جان کی مہر والی انگوٹھی کی شکل میں تھا۔ برق جان کی ہدایت کے مطابق واس نے شریف اور زری کو یہاں لے کر آنا تھا۔

اس کام میں واس اور ریان بخت کو قریباً 10 گھنٹے لگ گئے۔ وہ رات کے بارہ بجے کے لگ بھگ واپس آبی گزرگاہ پہنچ سکے۔ کچھ تاخیر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ شریف ابھی ٹھیک سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ زری سرتاپا ایک کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رستم کو حیرانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اب وہ رستم کی طرف کم ہی توجہ دیتی تھی۔ وہ سیدھی ناصر کی طرف گئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ شریف کو بھی احتیاط کے ساتھ گھوڑے سے اُتار لیا گیا۔ شریف اور زری کے ساتھ واس اور ریان بھی واپس آئے تھے۔ رستم نے محتاط رویہ اپنایا تھا...... جونہی یہ لوگ واپس پہنچے، رستم نے اجمل خان کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر واس اور ریان کی جامہ تلاشی لی۔

رستم اور ناصر جانتے تھے کہ اب ہر ہر لمحہ قیمتی ہے۔ انہیں جلد از جلد اس خطرناک علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔ برق جان، ریان بخت اور اُن کے تیسرے ساتھی کو زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں اور نہ ہی وہاں سے چل کر کہیں جا سکیں۔

رستم نے برق جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے برق جان...... کہ ہم اس طرح جدا ہو رہے ہیں اور تمہیں باندھنا پڑ رہا ہے لیکن تم جانتے ہو یہ مجبوری ہے، جیسے تم ہمیں باندھنے پر مجبور تھے۔“

”نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ برق جان نے کہا۔

”واس کے پاس ان زنجیروں کی چابیاں ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ جب ہم سمجھیں گے کہ محفوظ دوری پر پہنچ گئے ہیں تو واس کو واپس بھیج دیں گے۔ یہ آ کر تمہیں کھول دے گا۔ واس کے ذریعے ہمیں بہتر راستہ ڈھونڈنے میں بھی آسانی رہے گی۔“ رستم نے کہا۔

”واس کب تک واپس آئے گا؟“ برق نے پوچھا۔

”ہم تمہیں اس کھلی جگہ پر زیادہ دیر سردی کے حوالے نہیں رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دوپہر سے پہلے ہی یہ واپس پہنچ جائے۔“

”اگر کسی وجہ سے واس یہاں نہ پہنچ سکا یا راستہ بھول گیا تو ہمارے لیے بہت مشکل ہو

جائے گی۔“ برق جان نے کہا۔

برق جان کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ واس کے علاوہ ریان بخت بھی رستم وغیرہ کے ساتھ جائے گا اور محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد ان دونوں کو آبی گزرگاہ کی طرف واپس روانہ کر دیا جائے گا۔

اجمل خان کسی جاں نثار باڈی گارڈ کی طرح رستم کے اردگرد تھا اور اس نے ساری صورتِ حال پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈولے کو ایک اونچے پتھر پر چڑھا دیا تھا۔ وہ وہیں پر ایک بھاری کمبل کی بکل مارے بیٹھا تھا۔ رستم نے اجمل سے پوچھا۔ ”ڈولے کو یہ سزا کیوں دے رکھی ہے؟“

اجمل نے کہا۔ ”یہ سزا نہیں ہے جی! یہ تو ڈولے کا من پسند ڈیوٹی ہے۔ آپ سچ پوچھتا ہے تو اس بندے کا دماغ ریڈار کی طرح کام کرتا ہے۔ پتا نہیں۔ کہاں کہاں سے بوئیں اور آوازیں لے لیتا ہے یہ شخص۔ خو، یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یہ شخص یہاں بیٹھ کر دور دور تک کا خبر رکھ سکتا ہے۔“

اب جانے کا وقت تھا اس لیے ڈولے کو نیچے بلا لیا گیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو برق جان نے عجیب جذباتی لہجے میں رستم کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”اب یہاں کے حالات بدلیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ سب کچھ بھی نہیں ہو گا جس کے نتیجے میں تمہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ آبوک کے نام پر وہ مار دھاڑ، وہ خون خرابا...... لوگوں کو ذبح کرنا اور مقدس کپڑے پر ان کے ہاتھوں کی چھاپ لینا...... اور اس جیسے دوسرے سارے رواج اب آہستہ آہستہ بدلتے جائیں گے...... آج سے ایک دن پہلے یہ ممکن نہیں تھا مگر اب ممکن ہے۔ اب یہ مقدس تختی میری مدد کرے گی اور......“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا اور کہا۔ ”جب جب یہ تختی میری مدد کرے گی، تم مجھے یاد آؤ گے رستم۔ شاید تمہیں احساس نہیں کہ تم نے کتنا بڑا کام کیا ہے... کاش میرے بس میں ہوتا اور میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے آزاد کر سکتا۔ پھر تمہیں اس طرح نہ جانا پڑتا جس طرح اب جا رہے ہو اور مجھے بھی اس طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے تمہیں الوداع نہ کہنا پڑتا۔“

”یہ ہماری اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔“ رستم نے کہا۔

برق جان نے واس کو اشارہ کیا۔ واس نے کہا۔ ”رستم! یقیناً تم زری میں دلچسپی رکھتے ہو۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ زری تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔ اگر تم زری سے شادی کرنا چاہو تو میری اور ملک برق جان کی طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے۔“

"زری کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" رستم نے پورے وثوق سے کہا۔

برق جان کے مشتعل ساتھی کی طرح اب برق جان کی ٹانگیں بھی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ برق کے اکلوتے ہاتھ کو اس کے ساتھی کے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ملا کر باندھا گیا تھا۔ اسی حالت میں ان سب نے برق جان کو الوداع کہا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر کے ٹو کی مخالف سمت میں چل دیئے۔ واس ان کی رہنمائی کر رہا تھا پھر بھی اجمل خان نے اس پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اجمل خان کا گھوڑا مسلسل ریان کے گھوڑے کے عقب میں تھا۔ لوڈ رائفل اجمل کے ہاتھ میں تھی۔ واس قدرے الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے کئی دن کے بعد اپنی بھتیجی کو دیکھا تھا...... اسے بھتیجی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آج وہ رستم کے بجائے ناصر کا سایہ بنی ہوئی تھی...... اس کا گھوڑا مسلسل ناصر کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بس اسی سے باتیں کر رہی تھی، اسی کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔

"میں اس کے بارے میں بہت حیران ہوں۔" واس نے رستم کے پہلو میں چلتے چلتے سرگوشی کی۔

"کیا یہ پہلا موقع ہے کہ تم اس کی وجہ سے حیران ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جب سے پیدا ہوئی ہے، لوگوں کو حیران کرنے والے کام کر رہی ہے۔"

"یہ تمہارے ارد گرد رہتی تھی، اب یہ ناصر کے پاس نظر آ رہی ہے۔"

"وقت کے ساتھ بندہ کچھ بدل بھی تو جاتا ہے۔" رستم زیر لب مسکرایا۔ "کیا تم اور تمہاری بیوی نہیں بدلے ہو؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

رستم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "واس! سچ بتاؤ...... کیا تمہیں وہ وقت یاد نہیں آتا جو تم نے پاکستان کے بھرے پُرے شہروں میں گزارا ہے۔ ایبٹ آباد اور پنڈی کی سڑکیں، لاہور کی رونقیں، کراچی کی روشنیاں۔ اور وہ سارے لوگ جن کے ساتھ تمہارا اٹھنا بیٹھنا تھا۔"

واس جواب میں خاموش رہا۔ رستم نے ایک وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ "تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا اپنی دنیا میں واپس جانے کا...... لیکن تم نہیں گئے۔ کتنی بڑی تبدیلی آئی ہے تمہارے اندر ایسے ہی دوسرے لوگوں میں بھی تبدیلیاں آسکتی ہیں...... زری میں بھی کتنی ہی تبدیلی آئی ہے۔"

"یہ کیسی تبدیلی ہے؟ وہ تم سے...... پیار کرتی تھی۔ میں جانتا ہوں، وہ کرتی تھی۔ پھر وہ اس رات تمہارے ساتھ...... میرا مطلب ہے تم اس کے ساتھ۔" واس بات مکمل نہ کر سکا تاہم مفہوم رستم کی سمجھ میں آ گیا۔

رستم نے کہا۔ "واس! آج میں تمہاری غلط فہمی بھی دور کر دیتا ہوں۔ اس رات بھی زری میرے ساتھ نہیں ناصر کے ساتھ ہی تھی......"

واس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ "مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔" وہ ہکلایا۔

"کچھ باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو ان پر زیادہ دماغ نہیں کھپانا چاہیے۔" رستم نے واس کے پیچھے پیچھے گھوڑے کو ایک تنگ راستے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں گھوڑے اب آگے پیچھے ہو گئے تھے اس لیے ان کی گفتگو کا سلسلہ تعطل کا شکار ہو گیا۔ واس اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی جسے وہ گاہے روشن کر کے راستے کی "صحت" کا جائزہ لے لیتا تھا۔ جہاں کہیں اسے ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا تھا، گھوڑے سے نیچے اترتا تھا اور اس امر کی تسلی کرتا تھا کہ ان کے نیچے ٹوٹ جانے والی کمزور برف موجود نہ ہو۔ اس سلسلے میں تجربہ کار گائیڈ رحیم اللہ کی رہنمائی بھی انہیں حاصل تھی اور سب سے بڑھ کر عجیب صلاحیتوں والا کوتاہ قد ڈولا! وہ کسی بلی کی طرح اندھیرے میں بھی بڑی آسانی سے دیکھ لیتا تھا...... وہ اجمل خان کے پیچھے ایک ہی گھوڑے پر تھا اور عقب سے کسی بچے کی طرح اجمل خان سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے دو تین جگہوں پر راستے کے بارے میں مشورہ دیا، اجمل خان کا سینہ فخر سے چوڑا ہوا۔ ہر بار اس نے رستم سے ایک ہی سوال پوچھا۔ "رستم بھائی! ام نے ڈولے کو ساتھ لا کر غلط کام تو نہیں کیا؟"

جب اس نے تیسری بار یہی سوال پوچھا تو ناصر نے کہا۔ "لیکن اب تم بار بار یہ سوال پوچھ کر غلط کام ضرور کر رہے ہو۔"

اجمل نے ترت کہا۔ "ناصر بھائی! غلط اور صحیح کا پسلہ (فیصلہ) تم نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ابھی ام کو تمہارا چال چلن بالکل مشکوک نظر آ رہا ہے۔ یہ پسلہ کوئی معزز آدمی کرے تو بہتر ہو گا۔"

"مجھے تو یہاں تمہارے سوا سارے ہی معزز نظر آ رہے ہیں۔" ناصر نے جوابی فقرہ کسا۔

"دیکھو ناصر بھائی! تم عورت ذات کے ساتھ سپر (سفر) کر رہا ہے۔ اس نیک بی بی کی

دجہ سے ام تم کو کوئی ایسا بات کہنا نہیں چاہتا جس سے تمہارا بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ اچھے اچھوں کو بھی اچھا لڑکی آج کل بڑی مشکل سے ملتا ہے...... تمہارا تو کوئی چانس ہی نہیں ہے۔"

"یہ...... خان صیب...... کیا کہتا؟" زری نے ناصر سے پوچھا۔

"یہ جھوٹ بولنے کی پریکٹس کرتا۔" ناصر نے کہا۔ "یہ پاکستان کی طرف سے جھوٹوں کے عالمی مقابلے میں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"میں نہیں جانتا...... یہ پاکستان کیا ہوتا؟" زری معصومیت سے بولی۔

اجمل نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہاں...... آج کل بہت سا لوگ اس سوال کا جواب سوچ رہا ہے۔"

رستم نے کن انکھیوں سے رحیم اللہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ اس کی توجہ اجمل خان کی طرف تھی۔ غالباً اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نسبتاً ہنستا بولتا شخص ہے جو صرف 20 گھنٹے پہلے بڑی بے دردی سے آٹھ افراد کو اپنی فائرنگ سے ہلاک کر چکا تھا۔ پورے آٹھ عدد جیتے جاگتے افراد جن کی لاشیں اس وقت کوہی ندی کے پل کے سامنے برف کی چھ فٹ گہری کھائی میں پڑی تھیں۔ اجمل کے ساتھ ساتھ یقیناً رحیم اللہ کو رستم، ناصر اور ڈولے وغیرہ پر بھی حیرت ہو رہی تھی جن پر اس ہولناک واقعے کا کوئی اثر اب نظر نہیں آ رہا تھا۔

راستہ کشادہ ہوا تو واس اور رستم کے گھوڑے پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ واس ابھی تک زری اور ناصر والی بات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ رستم نے اس کے بوڑھے کمزور شانے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا ناں، جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان پر زیادہ دماغ نہیں کھپانا چاہیے۔ ہاں، جس بات پر تمہیں پریشانی ہو سکتی ہے اس کا بڑا پکا جواب میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ اللہ نے چاہا تو زری کو کوئی دکھ نہیں پہنچے گا۔ وہ بڑی خوش اور عزت والی زندگی گزارے گی اور ان کو صرف لفظ نہ سمجھنا، یہ ایک وعدہ ہے۔"

واس نے سر گھما کر رستم کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان یوں پھیل گیا جیسے کسی برفانی طوفان کے بعد سنہری دھوپ نشیب و فراز کو چمکاتی ہے۔

دونوں خاموشی سے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ یخ بستہ رات بھی سفر میں تھی اور اپنی منزل کے قریب پہنچ رہی تھی۔ رستم اور واس دونوں جانتے تھے کہ یہ ساتھ ختم ہونے کو ہے۔ کئی پُر آشوب واقعات کے ساتھ گزرا ہوا سال اب ماضی کا حصہ بننے والا ہے۔

اب پتا نہیں کہ انہیں پھر کبھی ملنا تھا یا نہیں؟ کچھ لوگ پہلی ملاقات میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ رستم کو بھی واس پہلی نگاہ میں ہی اچھا لگا تھا۔ اس نے شروع سے آخر تک رستم اور ناصر کے لیے اچھے دوست کا کردار ادا کیا تھا۔ اب یہ دوست جدا ہونے والا تھا۔ رستم کا دل بوجھل تھا......

آخر واس نے بھاری آواز میں کہا۔ "رستم! میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ نہ جانے سے تمہیں اور ناصر کو دکھ ہوا ہے۔ بے شک دکھ کی بات ہے لیکن اس میں ایک پہلو امید اور بہتری کا بھی ہے۔ جانتے ہو کیا؟"

رستم نے نیم تاریکی میں سوالیہ نظروں سے واس کو دیکھا۔

واس بولا۔ "تمہیں پتا ہی ہے، میری بیوی بہت مذہبی ہے۔ اس پر یہاں کے رہن سہن کا بالکل اثر نہیں ہوا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہے اور اب میں بھی پڑھنے لگا ہوں۔ وہ یہاں کے حالات پر بہت کڑھتی ہے۔ وہ پاؤندہ عورتوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے تو انہیں مذہب کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ وہ اندر ہی اندر کئی عورتوں کو اسلام کی طرف راغب کر چکی ہے اور ان میں برق جان کی دبنگ بیوی بھی شامل ہے۔ برق جان کی بیوی اس معاملے میں کافی آگے ہے۔ تم برق جان میں جو تبدیلیاں دیکھ رہے ہو، اس کی وجہ بھی اس کی بیوی ہی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات بتائی تم نے۔" رستم نے کہا۔

واس بولا۔ "ہم زیادہ امیدیں تو نہیں لگا سکتے لیکن لوگ پرانے عقیدوں اور رسم و رواج کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ پاتے۔ مگر تھوڑی بہت آس تو لگائی جا سکتی ہے۔ کیا پتا کہ اس برف میں جو چنگاری موجود ہے آہستہ آہستہ آگ میں تبدیل ہو جائے......"

بات رستم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

رات کا سرد اندھیرا اب دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں بدل رہا تھا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ دیو ہیکل کے ٹو اب بھی عقب میں موجود تھا مگر اب وہ قدرے کم اونچا نظر آ رہا تھا۔ اس کا جو رخ چین کی سمت تھا، اس پر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ یہ منظر قابلِ دید تھا لیکن وہ رک کر کسی بھی منظر کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انہیں جلد از جلد آگے بڑھنا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر میں وہ مقام آ گیا جہاں واس اور ریان بخت ان سے جدا ہو گئے۔

رستم اور ناصر نے واس کے ذریعے خاموش طبع خانم اور ریچھوں سے پنجہ آزمائی کرنے والے نے مان کو اپنی نیک تمنائیں بھیجیں۔ انہوں نے ایک دوسرے سے طویل معانقے کیے اور یخ بستہ پانی کے ایک آبشار کے کنارے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

دو مسافر اس ویرانے سے برفیلی دنیا کی طرف واپس چلے گئے اور دو اپنی آباد دنیا کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ابھی وہ خطرناک حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔ ... ابھی منزل بھی بے نشان تھی لیکن ان کے گھوڑوں کے قدم مسلسل اٹھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ کھوئے ہوئے مناظر کی پیاس تھی اور امید کی کرنیں تھیں...... وہ آگے بڑھ رہے تھے

☆======☆======☆

شانی حویلی کی وسیع وعریض نشست گاہ میں گم صم بیٹھی تھی۔ اب تو اس کی آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ کہیں روشنی کی کرن نظر نہیں آتی تھی، کہیں کوئی زندگی بخش خبر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب سب تھک ہار کر بیٹھ چکے ہیں...... حاجی حیات، زوار، عارف کمبوہ اور رستم کے دیگر سنگی ساتھی۔ صرف اجمل خان تھا جو کچھ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ وہ بھی بس تاریکی میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اسے شمالی علاقہ جات کی طرف گئے اب تک مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خط لکھے گا یا کسی طرح ٹیلی فون کرے گا مگر اب تک اس کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ڈولا بھی اجمل خان کے ہمراہ گئے تھے۔ جب دروازے پر آہٹ ہوتی یا فون کی گھنٹی بجتی یا رنگ والی کا ڈاکیا نمودار ہوتا تو شانی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں مگر ہر بار اس کے حصے میں مایوسی ہی آتی تھی۔

تایا معصوم کو آج کل بابر بہت پسند آ رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ادھوری نہ رہے، مکمل ہو جائے اور ان کے نزدیک شانی اسی طرح مکمل ہو سکتی تھی کہ وہ سہاگن ہو جائے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ سہاگن ہے اور ایسی سہاگن ہے جس کے سہاگ کا رنگ مر کر بھی پھیکا نہیں پڑ سکتا۔ شانی نے اس حوالے سے تایا معصوم کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں تو کچھ نہیں کہا تھا تاہم باتوں باتوں میں تایا معصوم اور خاندان کے دیگر لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ شادی کا خیال دور دور تک اس کے ذہن میں نہیں ہے۔ اگر حویلی والے اور علاقے والے اسے اسی طرح چھوٹی چوہدرانی تسلیم کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اس مسند پر بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ یوں کچھ عرصے کے لیے یہ معاملہ سرد پڑ گیا تھا۔ اس معاملے کے سرد پڑتے ہی ایک اور معاملہ گرم ہو گیا تھا۔ اور یہ چھوٹی چوہدرانی کے الیکشن میں حصہ لینے کا معاملہ تھا۔ ایک اہم سیاسی جماعت کے لوگ شانی کو اس علاقے کی ایک بااثر اور ہردلعزیز شخصیت سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اگر وہ آئندہ الیکشن میں ایم این اے کی نشست کے لیے مقابلہ کرے تو اسے کامیابی مل سکتی ہے۔ شانی کو مختلف طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہر

دوسرے تیسرے روز کسی علاقے کے معززین کا کوئی وفد اس سے ملاقات کرنے پہنچ جاتا تھا۔ شانی کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے الیکشن کے اس جنجال کا رخ تایا معصوم اور خالو اعجاز وغیرہ کی طرف موڑنے کی کوشش کی مگر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اب معاملہ احتجاج تک آ پہنچا تھا۔ روزانہ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں لوگ حویلی تک آتے تھے...... اور پُرزور مطالبہ کرتے تھے کہ ان کی چھوٹی چوہدرانی آئندہ الیکشن میں حصہ لے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ بے چارے لوگ خود اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے ان کے پیچھے وہی سرکردہ حضرات ہیں جو لٹھ لے کے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اب پچھلے چھ سات روز سے چند سیاسی کارکنوں نے حویلی کے عین سامنے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ دو تین شامیانوں کے نیچے دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ بھوک ہڑتالیوں میں تین خواتین اور چار پانچ حضرات تھے۔ وہ پانی اور جوس وغیرہ لے رہے تھے پھر بھی ان میں سے دو خواتین کافی کمزور ہو گئی تھیں اور سنا تھا کہ ان میں سے ایک کل شام بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ شانی کے دل و دماغ پر بہت بوجھ ڈال رہا تھا۔ وہ جو پہلے ہی غم کی چکی میں پس رہی تھی اب اور بھی غمزدہ ہو گئی تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی، کسی کا دل نہیں توڑ سکتی تھی لیکن آج کل وہ تکلیف بھی دے رہی تھی اور دانستہ نادانستہ دل بھی توڑ رہی تھی۔

خالو اعجاز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ ”شانی! نئی خبر سنی ہے......؟“

”کیا؟“ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

”آج ایک بڑا جلوس کریم پورہ سے رنگ والی کی طرف آ رہا ہے۔ اس میں بہت سے لوگ گوجرانوالہ سے بھی شامل ہوئے ہیں۔ راستے کے دیہات اور چھوٹی آبادیوں سے بھی لوگ جلوس میں شامل ہو رہے ہیں۔ کئی ہزار کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ تمہاری حمایت میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم سے الیکشن میں آنے کا مطالبہ کرنے کے لیے۔“

”یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے خالو! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ مجھے میری مرضی سے جینے کیوں نہیں دیتے؟ میں خود کو اتنی بڑی ذمے داری کے قابل نہیں سمجھتی۔ یہ کسی دوسرے کو کیوں نہیں چن لیتے؟“

”کسی دوسرے کے لیے ان کے دلوں میں اتنی جگہ نہیں ہے۔ وہ جس طرح تمہاری حمایت میں اکٹھے ہو رہے ہیں، اس سے تو واقعی اندازہ ہوتا ہے کہ تم باآسانی جیت جاؤ گی۔ اس جلوس میں دو ایسے بندے بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے خود اس نشست کے لیے امیدوار تھے۔ مگر اب پارٹی کی ہدایت کے مطابق وہ تمہارے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔“

''اوہ خدایا!'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ کسی کو بتائے بغیر نکل جاؤں۔ میں نہیں اٹھا سکتی یہ بوجھ۔''

اتنے میں ملازم خادم حسین ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے خالو اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری جی تین چار اور تمبو (شامیانے) آگئے ہیں۔ یہ تمبو پہلے تمبوؤں کے ساتھ ہی لگائے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آج بھی بی بی جی نے الیکشن لڑنے والی بات نہیں مانی تو بھوک ہڑتالی کیمپ میں تیس چالیس بندے...... ہاں جی کم از کم تیس چالیس بندے اور شامل ہو جائیں گے۔''

''یہ بندے کہاں ہیں؟'' خالو اعجاز نے پوچھا۔

''جلوس کے ساتھ ہی آ رہے ہیں...... اور سنا ہے جی کہ جلوس چھوٹی نہر تک پہنچ گیا ہے۔ بس دو ڈھائی گھنٹے میں یہاں حویلی کے سامنے ہوگا۔''

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہ جلوس والے کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

خالو اعجاز نے اپنا نیم گنجا سر کھجایا اور زیر لب مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''چاہتے تو یہ لوگ یہی ہیں کہ تم ان کی پُر زور فرمائش پر الیکشن لڑنے کا اعلان کرو...... لیکن اگر ہم فی الحال یہ اعلان نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ تم حویلی کی گیلری میں جاؤ اور وہاں کھڑی ہو کر لوگوں کے سامنے پندرہ بیس منٹ کی تقریر کرو۔''

''تقریر میں کیا کہوں؟''

''وہی جو سارے سیاسی لوگ کرتے ہیں...... وعدے!''

''کیا مطلب خالو؟''

''بھئی وعدے...... یہی کہ وہی ہوگا جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔ بس سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں آپ لوگوں کے خیالات سے پورا اتفاق کرتی ہوں۔ آپ کی محبت دیکھ کر اب میرے لیے ممکن نہیں کہ آپ سے زیادہ دیر دور رہوں۔ مگر مجھے اپنے بزرگوں اور اردگرد کے لوگوں سے مشورہ بھی کرنا ہے...... اس کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دیں...... وغیرہ وغیرہ۔''

''خالو! آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ میں سامنا نہیں کر سکتی اتنے لوگوں کا۔''

''جب سامنا کرو گی تو مشکل نہیں رہے گی۔ جب بندہ چل پڑتا ہے تو راستے خود بخود نکل پڑتے ہیں۔'' خالو اعجاز نے کہا۔ پھر مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''سچی بات یہ ہے

شانی بیٹی کہ ایسے مواقع قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ جس طرح تمہاری محبت اور حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب تمہارے ماں باپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ وڈی آپا نے اپنے پیچھے محبتوں کا جو ورثہ چھوڑا تھا، وہ کئی گنا بڑھ کر تمہاری طرف پلٹ آیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھ رہی ہیں شانی۔''

وہ زچ ہو کر بولی۔ ''خالو! کیا اونچا مقام صرف لیڈری کرنے اور انتخاب لڑنے سے ہی ملتا ہے؟ میرے لیے تو یہی بہت اونچا مقام ہے جہاں پر میں ہوں۔ میرے علاقے کے لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم ان میں گھل مل جاتے ہیں اور ان کا دکھ سکھ بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا یہ بہت نہیں ہے خالو اعجاز؟''

''نہیں، یہ بہت نہیں ہے۔'' خالو نے دانائی سے کہا۔ ''ہمیں اپنی سوچ...... اپنے علاقے اور اپنے چند دیہات سے آگے بڑھانی ہوگی۔ اگر تم اس علاقے سے کامیاب ہو جاتی ہو تو ہم اپنے اردگرد کے بے شمار دیہات کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہاں سڑکیں بن سکتی ہیں، اسکول بن سکتے ہیں۔ جوہر آباد کے شانی بی بی اسپتال جیسے کئی اسپتال کھڑے ہو سکتے ہیں۔ بے شک سیاست ایک گورکھ دھندا ہے مگر جب صاف نیتوں اور اچھے ارادوں والے لوگ اس میدان میں آئیں گے تو پھر اس میں بہتری کے راستے نکلیں گے۔ جب ہی آہستہ آہستہ ڈپٹی ریاض اور قدرت اللہ جیسے ناسوروں کا خاتمہ بھی ہوگا۔''

خالو اعجاز پہلے بھی دو تین بار شانی کو سمجھا چکے تھے، اب بھی انہوں نے سمجھایا لیکن خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح اس پر کوئی فیصلہ تھوپا نہیں۔ اسے خود سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اس حد تک تیار ہوگئی کہ اگر لوگ اصرار کریں گے تو وہ حویلی کی بالکنی سے ان کے سامنے آئے گی اور ان سے بات بھی کرے گی۔ وہ بھوک ہڑتالیوں کو بھوک ہڑتال ختم کرنے کا مشورہ دے گی اور الیکشن میں حصہ لینے کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے دو تین ہفتوں کا وقت مانگے گی۔ وہ خالو اعجاز کے پاس بیٹھی رہی اور دونوں نے مل کر متوقع تقریر کے لئے نوٹس تیار کئے۔ اس میٹنگ کے دوران میں خاندانی وکیل چوہدری نیاز احمد نے بھی شانی کی مدد کی۔

جلوس متوقع وقت سے قریباً ایک گھنٹہ تاخیر کے ساتھ رنگ والی پہنچا۔ جلوس کے پہنچتے

ہی رنگ والی کی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ جلوس میں کوئی درجن گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں اور چھکڑے وغیرہ شامل تھے۔ رنگ والی کی گلیوں میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جھنڈے اور بینرز تھے۔ بینرز پر شانی بی بی سے الیکشن میں حصہ لینے کا پُرزور مطالبہ موجود تھا۔

شانی پہلے تو گھبراتی رہی پھر اس کے اندر کی فطری دلیری نے اسے لوگوں کے سامنے آنے پر آمادہ کرلیا۔ اس نے بڑی سادگی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، بالوں کو کنگھی کر کے سمیٹا اور اوڑھنی لے کر بالکنی میں جانے کو تیار ہوگئی۔ اسے دیکھ کر خالو اعجاز نے کہا۔ ''یہ تم تقریر کرنے جا رہی ہو یا کنویں سے پانی بھرنے؟''

''کیا ہوا خالو؟'' وہ ہکلائی۔

''اوئے جھلی! اب تُو چھوٹی چوہدرانی ہے۔ آنے والے دنوں میں تیرا حکم چلنا ہے۔ وہاں جلوس میں فوٹوگرافر ہیں، ٹی وی کیمرے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے دماغوں میں تیری ایک بڑی رعب والی تصویر بنائی ہے۔ ایک تو تُو ویسے ہی کبوتری سی ہے۔ اوپر سے کپڑے بھی کڑیوں چڑیوں والے پہن لئے ہیں۔ جا کوئی دوسرے اچھے کپڑے پہن...... اور کچھ زیور بھی ہونا چاہیے وڈی آپا والا۔''

شانی نے بہتیرا انکار کیا مگر خالو اعجاز، ایڈووکیٹ نیاز احمد اور چند دیگر افراد نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ انہوں نے پھوپھو آمنہ، فرزانہ اور شانی کی سہیلی سکینہ کی ڈیوٹی لگائی کہ اسے ٹھیک سے تیار کریں۔ شانی کو بروکیڈ کا ایک بھاری کام دار جوڑا پہنایا۔ کندھوں پر سونے کے تاروں والی وہ پوٹھوہاری شال رکھنا پڑی جو چند روز پہلے اسے نارپور کے تین سرکردہ زمینداروں نے بطور تحفہ پیش کی تھی۔ اس نے زیور پہننے سے صاف انکار کردیا تھا پھر بھی روبی کے پتھر والے جھمکے تو اسے پہننا ہی پڑے۔

رنگ والی کا انسپکٹر اور اس کے ماتحت حویلی میں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دو قریبی تھانوں کی نفری بھی بلالی تھی پھر بھی اتنے بڑے جلوس کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ انسپکٹر نے چار مسلح ہیڈ کانسٹیبلوں کو شانی کی سکیورٹی پر مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمہ وقت شانی کے پیچھے رہنا تھا۔ حویلی کے اپنے درجنوں مسلح محافظ بھی سکیورٹی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عارف کمبوہ ان محافظوں کو گائیڈ کر رہا تھا۔ شانی پر ہونے والے دو قاتلانہ حملوں کے بعد عارف وغیرہ بہت محتاط ہوگئے تھے۔

اسی دوران میں بیرونی دروازے کی طرف ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔

ذرا دیر بعد عارف کمبوہ نے آکر اطلاع دی۔ ''دو اخبار والیاں اپنے کیمرہ مین کے ساتھ اندر آگئی ہیں۔ یہ لوگ آپ سے انٹرویو لینا چاہ رہی ہیں۔''

''خدا کے لئے عارف! ان کو باہر بھیج دو۔ میں ان کے الٹے پلٹے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔''

''ٹھیک ہے شانی بہن۔'' عارف نے اطمینان سے کہا۔

خالو اعجاز نے عارف کو روکا۔ ''یہ ٹھیک نہیں عارف اخبار والوں سے بگاڑنی نہیں چاہیے۔ یہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ تم خود بھی تو اچھی خاصی بات کر لیتے ہو۔ شانی کی جگہ تم ان سے بات کرلو۔''

عارف نے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھا۔ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ عارف بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں۔''

شانی جانتی تھی کہ عارف میں ایک پُرجوش لیڈر کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ جب ان لوگوں نے جوہر آباد میں قدرت اللہ کے خلاف مہم چلائی تھی تو شانی نے عارف کو سینکڑوں لوگوں کے سامنے اعتماد سے تقریریں کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔

شانی نے خالو اعجاز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''خالو جی! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کے سامنے بھی میری جگہ عارف ہی دو چار منٹ بول دے؟''

''نہیں بھئی! جو کام اب تم کرسکتی ہو وہ تم ہی کرسکتی ہو۔ ہم سب صرف تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔ چلو شاباش، ہمت کرو اور اب تیار ہو جاؤ۔''

شانی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ شانی کو ہراساں دیکھ کر منّا بھی سہم سا گیا تھا۔ وہ کبھی شانی کو اور کبھی اردگرد موجود لوگوں کو دیکھتا تھا۔ شانی نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کے سرد رخسار چومے۔ باہر لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگوں نے گلاب کی منوں پتیاں حویلی کے مین گیٹ کے سامنے ڈھیر کر دی تھیں۔

اچانک ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ شانی ہر فون کال پر چونک اٹھتی تھی۔ آج بھی چونکی۔ وہ اٹھ کر فون کی طرف جانا چاہتی تھی۔ مگر خالو اعجاز نے اسے روک لیا اور خود فون کی طرف بڑھے۔

''ہیلو کون؟'' انہوں نے پوچھا۔

دوسری طرف سے اجمل خان کی آواز آئی۔ ''آپ...... آپ چوہدری اعجاز صیب بول

رہا ہے؟''

اعجاز صاحب چونک گئے۔''ہاں اعجاز بول رہا ہوں۔ کہاں ہوم:

''ام لاہور پہنچ چکا ہے جی۔'' اجمل کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی نہایت اہم خبر ہے۔

''خیریت تو ہے ناں اجمل خان؟'' اعجاز صاحب نے ہولے سے کہا۔

''بالکل خیریت ہے جی..... سب کچھ ایک دم ٹھیک ٹھاک ہے۔ کیا آپ ذرا دیر کے لئے شانی بہن کو پون پر بلا سکتا ہے؟''

''شش ......شانی ذرا مصروف ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے پیغام دے دو، میں اس تک پہنچا دیتا ہوں۔''

''وہ جی .....دراصل..... ام شانی بہن سے ہی بات کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ زیادہ مصروف ہے..... اور یہ کچھ شور سا بھی سنائی دے رہا ہے۔''

''ہاں کچھ لوگ ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔'' اعجاز صاحب نے مبہم جواب دیا۔

''کیا ام تھوڑی دیر بعد پون کرلے؟'' اجمل نے بدستور جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں..... تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔ وہ فارغ ہو کر خود تمہیں فون کرتی ہے۔'' اعجاز صاحب نے کہا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اجمل خان نے اعجاز صاحب کو ایک موبائل نمبر لکھوا دیا۔ نمبر لکھوانے کے بعد اس نے کہا۔''شانی بہن سے کہیے ذرا جلدی پون کریں۔''

اعجاز صاحب نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

اعجاز صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی حیات، اجمل خان اور عارف وغیرہ ابھی تک رستم کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ موہوم امید موجود ہے کہ شاید وہ اب تک زندہ ہو۔ خالو اعجاز کو شانی کے دل کی کیفیت بھی بڑی حد تک معلوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ رستم اب بھی شانی کے دل و دماغ میں موجود ہے۔ شانی نے رستم کی بہن اور بہنوئی کو بڑی چاہت سے حویلی میں رکھا ہوا ہے..... رستم کو تلاش کرنے والوں میں اجمل پیش پیش تھا..... وہ آئے دن کوئی جھوٹی سچی امید شانی کو دلا دیتا تھا اور اس کے زخم پھر ہرے کر جاتا تھا۔ شاید اسے اب بھی کوئی ایسی ہی اطلاع ملی تھی جس کے بارے میں بتا کر وہ شانی کو مضطرب کرنا چاہتا تھا۔

خالو اعجاز فون بند کر کے پلٹے تو شانی نے پوچھا۔''کون تھا؟''

''کچھ نہیں۔ نارپورٹ یا بڑا فون تھا۔ وہ جلوس کے بارے میں پوچھ رہا تھا'' پھر خالو

اعجاز نے ذرا توقف سے کہا۔''شور سے اندازہ ہو رہا ہے کہ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تمہیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جو باتیں کہنی ہیں، وہ ذہن میں ایک بار دہرا لو اور اٹھ جاؤ۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں لرزش تھی مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی اس کے اندر کی دلیر چھوٹی چوہدرانی بیدار ہوتی گئی۔ اس کا سینہ تن گیا، رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ درجنوں گارڈز اور پولیس اہلکاروں کے جلو میں وہ بڑے اعتماد سے طویل راہداری میں قدم رکھنے لگی۔ اسے لگا، اس کی ماں اسے سہارا دینے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ وہ مسکرا رہی ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے حوصلہ دے رہی ہے۔''گھبراتی کیوں ہے جھلی۔ تُو وڈی آپا کی بیٹی ہے۔ سب لوگ تیرے اپنے ہیں۔ ان کے دلوں میں تیرے لئے بڑی جگہ ہے......''

باہر مائیکروفون پر شانی کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ ہزاروں لوگ پُرجوش نعرے لگا رہے تھے...... وہ بالکنی کی طرف بڑھتی ہوئی بڑی باوقار اور خوبصورت لگ رہی تھی..... کسی آسمانی مخلوق کی طرح!

☆======☆======☆

رستم لاہور میں تھا۔ وہی لاہور جہاں اس کی اَن گنت یادیں وابستہ تھیں۔ اقبال ٹاؤن کے علاقے میں رستم اور ناصر کے لیے اس خفیہ رہائش گاہ کا انتظام حاجی حیات نے ہی کیا تھا۔ حاجی حیات کا خاص آدمی پہلوان، انہیں ایک بند اسٹیشن وین کے ذریعے بڑی رازداری کے ساتھ اقبال ٹاؤن کی اس وسیع کوٹھی میں لے آیا تھا۔ حاجی حیات کو یقین تھا کہ فی الوقت یہ جگہ رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کے لیے محفوظ ترین ہے۔ شریف اور زری بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ عمر رسیدہ گائیڈ رحیم اللہ اور فرقان حمید اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد میں رہ گئے تھے۔

رستم اور ناصر کو ابھی تک اپنے حالات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ تصوراتی محسوس ہوتا تھا۔ صرف پندرہ سولہ روز پہلے وہ چینی علاقے کے قریب ایک نامعلوم برف زار میں تھے۔ برق جان وغیرہ نے انہیں پا بہ زنجیر اس برفاب سے نکالا اور اس آبی گزرگاہ تک پہنچایا جہاں سے انہیں سنگی تختی حاصل کرنا تھی۔ رستم نے ایک مشکل آزمائش سے گزر کر داستانی ہیرو کی طرح وہ سنگی تختی حاصل کی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا ڈرامائی اور تیز رفتار تھا کہ وہ خود بھی چکرا کر رہ گئے اور اب وہ اپنے جانے پہچانے لاہور اور لاہور کی جانی پہچانی فضا میں

تھے۔ وہ لاہور کے گلی کوچے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ حاجی حیات نے انہیں چار دیواری کے اندر رہنے کے لیے بڑی سختی سے پابند کر رکھا تھا..... مگر شہر کی خوشبوئیں اور رنگ جیسے اُڑ اُڑ کر ان تک پہنچ رہے تھے۔

زری حیرت زدہ تھی۔ وہ ایک ایک شے کو بے حد تجسس سے دیکھتی اور پلکیں جھپکاتی تھی۔ وہ جیسے اچانک پتھر کے زمانے سے چل کر جدید دور میں آ گئی تھی۔ ٹی وی، ٹیلی فون، فریج اور اس قسم کی بہت سی اشیاء اس کے لیے عجوبہ تھیں۔ وہ اب پھول دار شلوار قمیص میں تھی مگر اس کی چال ڈھال میں وہی، درختوں پر چڑھنے اور برف پر دوڑنے والا جنگلی پن تھا۔

ناصر، رستم اور اجمل اس کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ اس کی گردن میں سے وہ آہنی کڑا نکال دیا گیا تھا جو پاؤندوں کے نزدیک اس نحوست کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکی..... اب بھی وہ ٹی وی کے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھی تھی اور بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ رستم اور ناصر سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے نہایت ابتر حلیے اب ٹھیک ہو چکے تھے۔ رستم نے سر اور داڑھی کے بال ترشوائے تھے۔ وہ کاٹن کی سفید شلوار قمیص میں دلکش نظر آ رہا تھا۔ ناصر کلین شیو ہو گیا تھا۔ اس نے پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اجمل خان حسب معمول چنٹوں والے کُرتے اور بڑے گھیر کی شلوار میں تھا۔

زری مسلسل چینل بدلتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ آبشار کے نیچے نیم عریاں انڈین ہیروئن، بڑی عمر کے ہیرو سے اپنے تر بہ تر جسم کی پیمائش کرا رہی تھی۔ زری نے اپنے ہونٹوں سے "ہو" کی طویل آواز نکالی اور شرم سے سرخ ہو گئی۔ پھر اس نے چنچل نظروں سے ناصر کو دیکھا اور بے ڈھنگے طریقے سے ہنسنے لگی۔ سین مزید واہیات ہوتا گیا تو اس نے پھر بٹن دبانے شروع کر دیئے۔ ایک جگہ کارٹون آ رہے تھے۔

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ "یہ مجھ کو بہت آچھا لگتا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

جدید دور کی یہ سب چیزیں زری نے بہت بچپن میں دیکھی ہوئی تھیں اور اب ان کی یادیں اس کے ذہن سے تقریباً محو ہو چکی تھیں۔

گاہے بہ گاہے وہ تالی بجاتی اور زور سے ہنسنے لگتی۔

ناصر نے کہا۔ "اتنے زور سے نہیں ہنستے۔"

"کیوں، کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔

اتنے میں لائٹ چلی گئی۔ ٹی وی اسکرین بھی تاریک ہو گئی۔ ناصر نے کہا۔ "اس سے یہ

ہوتا۔ یہاں جب بھی کوئی زیادہ خوش ہوتا ہے، اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے لوگ تھوڑا تھوڑا خوش ہوتے ہیں..... تھوڑا تھوڑا ڈرتے ہیں۔"

اجمل خان نے گیس لیمپ روشن کیے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ وہ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے۔ زری ٹیلی ویژن سے ہٹ کر ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور یونہی نمبر پریس کرنے لگی۔ اجمل خان لپک کر اس کی طرف آیا۔

"او خدائی خوار! یہ تم کیا کرتا..... بار بار اس کو کیوں چھیڑتا؟ ادھر بہت ضروری فون آنا ہے۔" اس نے ریسیور زری کے ہاتھ سے لے کر جھٹکے سے کریڈل پر رکھ دیا۔ دراصل رستم اور اجمل وغیرہ سہ پہر سے شانی کے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت اجمل کی بات شانی کے خالو سے ہوئی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ شانی فارغ ہوتے ہی خود اجمل کو فون کرے گی۔ یہ فون ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اجمل کے انداز سے زری ڈر گئی۔ وہ ٹیلی فون سیٹ سے پیچھے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ناصر نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ہوا زری؟"

"مجھ سے غلطی ہوا۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں معافی مانگتا۔" اس نے بڑی اطاعت مندی سے اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

ناصر نے اسے پچکارا۔ "دراصل ہم کسی کی کال کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے منع کیا ہے۔ کل اس کے ساتھ جو کچھ مرضی کر لینا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ پھر ذرا چونک کر بولی۔ "یہ..... کال کیا ہوتا؟"

اجمل نے کہا۔ "ناصر بھائی! اس کو ذرا دوسرے کمرے میں لے جاؤ اور تفصیل سے بتاؤ کہ کال کیا ہوتا۔ اتنے میں ام ذرا خبریں وغیرہ سن لے۔"

ان باتوں کے دوران لائٹ آ گئی تھی۔ ناصر نے زری کی آنکھ بچا کر اجمل کو مکا دکھایا مگر اس کے ساتھ ساتھ اجمل کی ہدایت پر عمل بھی کیا۔ وہ زری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اجمل نے چینل بدلنے شروع کیے۔ ایک چینل پر علاقائی خبریں آ رہی تھیں۔ ایک نہر کی پٹڑی ٹوٹنے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اس کے فوراً بعد ایک خبر آئی اور اس نے رستم اور اجمل وغیرہ کو بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک بڑے جلسے کی فوٹیج تھی اور دیہاتی علاقہ تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ پھر اس جلسے کا مقرر سامنے آیا۔ یہ ایک عورت تھی اور یہ وہ عورت تھی،

جس کو رستم ہزاروں، لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کے چہرے کی بس ایک جھلک، بلکہ شاید چہرے کا ایک مختصر حصہ بھی دیکھ کر پہچان سکتا تھا...... کہ یہ کون ہے۔ یہ اس کی زندگی تھی اس کی روح تھی۔ یہ بی بی تھی۔ وہ بڑی خوب صورت اور باوقار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کچھ کہہ رہی تھی مگر اس مختصر تصویری جھلکی میں آواز نہیں تھی۔ پھر اسکرین پر دوسری خبریں نظر آنے لگیں۔

وہ تینوں دم بہ خود بیٹھے رہے۔ پھر اجمل خان نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ''اپنا شانی بہن تو بہت مشہور شخصیت بن گیا۔ ٹی وی پر اس کا فوٹو آ رہا ہے۔''

''یہ کیا چکر ہے اجمل؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' رستم نے کہا۔

اجمل نے ہنکارا بھرا اور پُر سوچ انداز میں بولا۔ ''پورا بات تو اماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر جب ام یہاں سے گیا تھا تو کچھ لوگ شانی بہن اور چوہدری اعجاز سے بار بار ملنے کو آ رہا تھا۔ خوان کا پُر زور خواہش تھا کہ شانی بہن آنے والے الیکشن میں حصہ لے۔ شانی بہن ایک دم انکار کر رہا تھا مگر چوہدری اعجاز اور چوہدری بابر وغیرہ کا خیال تھا کہ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

''لیکن...... یہ تو بڑا مشکل راستہ ہے۔'' رستم کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''مشکل آسان کا تو ام کو پتا نہیں رستم بھائی! مگر پچھلے ایک سال میں شانی بہن کا بہت شہرت ہوا ہے۔ دراصل قدرت اللہ والے معاملے نے لوگوں کے ذہنوں کو بہت بدلا ہے۔ بے شمار لوگوں کو جھوٹ اور سچ کا تمیز ہوا ہے۔''

انس خان، رستم کو اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا جس میں قدرت اللہ کے جھوٹ کی ہانڈی بیچ چوراہے میں پھوٹی تھی۔ جس جلدی بیماری (خارش) کے ڈراوے سے قدرت اللہ نے بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا تھا، وہ جلدی بیماری خود اس کے اپنے گھر میں گھس آئی تھی اور اس کی دونوں بیویاں اس کی شکار ہوئی تھیں۔

قدرت اللہ نے اس حقیقت کو چھپانے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔ انس خان کی اُتاری ہوئی تصویروں نے اخباروں میں شائع ہو کر سارا پول کھول دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد قدرت اللہ کی روز افزوں مقبولیت کو نہ صرف بریک لگے تھے بلکہ اس کو کئی جگہوں سے پسپائی بھی اختیار کرنا پڑی تھی۔

اسی دوران میں ناصر بھی آ گیا۔ وہ خبر کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ ان کے لیے خوشی کی بات تھی کہ رنگ والی کی ویران حویلی نہ صرف پھر سے آباد ہو گئی تھی بلکہ لوگوں کی

نگاہوں کا مرکز بھی بنی ہوئی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''شاید اسی مصروفیت کی وجہ سے شانی بھابی کا فون نہیں آیا۔''

اجمل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''امارا خیال ہے کہ ان تک امارا پیغام ہی نہیں پہنچا ہو گا...... ورنہ وہ سب کام چھوڑ کر ام کو فون کرتا۔ ام جانتا ہے کہ جب ام رنگ والی سے آپ کی تلاش میں روانہ ہوا تھا تو شانی بہن کتنا بے تاب تھا۔''

ناصر نے کہا۔ ''لیکن تم بھی تو سرپرائز دینے کے چکر میں پڑ رہے ہو۔ تم نے چوہدری اعجاز کو بتا دینا تھا کہ رستم بھائی تمہارے ساتھ ہیں۔''

''چلو کوئی نہیں اب تو کافی رات ہو گئی ہے۔ امید ہے صبح فون آ جائے گا۔'' رستم نے کہا۔

''ام ایک بار پھر ٹرائی نہ کرے؟'' اجمل نے کہا۔

رستم خاموش رہا۔ ناصر کی خاموشی بھی نیم رضا مندی جیسی تھی۔ اجمل نے کھٹا کھٹ دو تین بار نمبر ملائے مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔

اگلے روز اجمل صبح سویرے اٹھ گیا۔ وہ بے حد بے چین تھا۔ اس کے پاس اتنی بڑی خبر تھی کہ اس کا پیٹ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے شانی کو بہت روتے دیکھا تھا، اب وہ اسے بہت خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ شانی کو یہ خوشی اس کی زبانی ملے۔ اس نے ایک بار پھر رنگ والی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری کوشش کامیاب رہی۔ وہ شانی کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا...... مگر اس کے کانوں میں حویلی کے پرانے ملازم خادم حسین کی آواز پڑی۔

''ام اجمل خان بول رہا ہے چاچا۔ تم نے ام کو پہچانا؟''

''اوئے تم کوئی بھولنے والی چیز ہو خان۔ تم رونقی بندے ہو اور رونقی بندوں کی اس حویلی کو بڑی لوڑ ہے۔''

''چاچا...... شانی بہن کدھر ہے؟''

''رات کو بہت سارے لوگ اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی دیر سے سوئی ''

اتنے میں چوہدری اعجاز کی آواز سنائی دی...... ''کون ہے خادم حسین؟'' جواب میں خادم حسین نے اجمل کے بارے میں بتایا۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری اعجاز لائن پر تھے۔

رسمی کلمات کے بعد چوہدری اعجاز نے معذرت کی کہ رات کو مصروفیت کی وجہ سے وہ شانی کو اجمل کا پیغام نہیں دے سکے۔

''کیا آپ ذرا دیر کے لیے شانی بہن کو جگا سکتا ہے؟ ان کے لیے ایک اچھا خبر ہے اور یہ خبر ام ان کو خود دینا چاہتا ہے۔''

چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''بھئی میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ اس خبر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا شانی کا ہے۔''

''لیکن ام...''

''چلو تم خود ہی اسے بتا دینا لیکن مجھے تو بتا دو، میں اسے نہیں بتاؤں گا۔''

اجمل چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''چوہدری جی! ام پچھلے ڈیڑھ مہینے سے جس کام کے لیے غائب تھا، وہ ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب......تم تو رستم اور ناصر وغیرہ کو ڈھونڈنے نکلے تھے ناں؟''

''جی ہاں......اور......وہ دونوں مل گیا ہے۔'' اجمل کی آواز خوشی کی شدت سے لرز رہی تھی۔

چند لمحے تک لائن پر سناٹا رہا پھر چوہدری اعجاز کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اجمل؟ کیا واقعی رستم......میرا مطلب ہے، کیا واقعی وہ تمہارے ساتھ ہے؟''

''ایک سو دس پی صد جناب! ام جلد از جلد اس کو آپ سے اور شانی بہن سے ملانا چاہتا ہے۔ ام آپ کو بتا نہیں سکتا جناب کہ یہ کام کتنی مشکلوں سے ہوا ہے۔'' اجمل کی آواز میں داد طلب لرزش تھی۔

''تم نے تو حیران کر دیا اجمل خان۔'' چند سیکنڈ بعد چوہدری اعجاز کی آواز لائن پر ابھری۔ ''کیا میں رستم سے بات کر سکتا ہوں؟''

''وہ ابھی سو رہا ہے لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو ام جگا دیتا ہے۔''

''اچھا، چلو رہنے دو۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ......خود تمہارے پاس آتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز نے اچانک کہا۔

''لیکن شانی بہن؟'' اجمل نے پوچھا۔

''شانی سے بات کے لیے تمہیں کم از کم دو گھنٹے تو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے سر میں سخت درد تھا، دوا کھا کر سوئی ہے......تم ایسا کرو کہ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ۔''

ایڈریس کے سلسلے میں حاجی حیات اور پہلوان نے انہیں بہت سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اجمل خان ایک بار پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ ''کیا سوچنے لگے ہو؟'' چوہدری اعجاز نے

تیزی سے کہا۔

''دراصل ام کو خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ام کہاں ہے۔ اگر آپ کہتا ہے تو ام رستم بھائی کو جگاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے جگا لو۔ میں بھی جلد سے جلد اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔''

اجمل خان نے رستم کو جگایا اور اسے بتایا کہ شانی کے خالو جان اس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ رستم اپنے بکھرے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستا ہوا ٹیلی فون تک پہنچ گیا۔ رستم کی آواز فون لائن پر سن کر خالو اعجاز نے بے حد حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

رستم اور شانی کی شادی کے بارے میں ابھی تک خالو اعجاز کو بھی معلوم نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا پتا تھا کہ وڈے ڈیرے کے قتلِ عام میں بچ جانے کے بعد رستم، ناصر، اجمل اور شانی وغیرہ مری کی ایک نواحی آبادی میں قیام پذیر رہے تھے۔ جہاں سے ایک سال پہلے رستم اور ناصر اچانک لاپتا ہو گئے تھے......

چوہدری اعجاز نے رستم سے کہا۔ ''میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں رستم۔''

''ملنا تو میں بھی چاہتا ہوں......آپ سب سے اور شانی بی بی سے بھی۔''

''میں چاہتا ہوں رستم کہ شانی سے ملنے سے پہلے میری اور تمہاری ملاقات ہو جائے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں فون پر یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میرا تم سے ملنا ضروری ہے۔''

رستم نے چند لمحے سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری اعجاز اچھے آدمی ہیں۔ شانی بھی ان پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ جوہر آباد میں جب ڈپٹی ریاض ہٹلر شانی کو بار بار ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ چوہدری اعجاز ہی تھے جنہوں نے ہر جگہ شانی کا ساتھ دیا تھا۔ رستم نے چوہدری اعجاز کو اقبال ٹاؤن کی اس رہائش گاہ والا ایڈریس بتا دیا۔

اگلے تین چار گھنٹے رستم نے خاصی فکرمندی میں گزارے۔ چوہدری اعجاز نہ جانے اس سے کیا بات کہنے والے تھے......انہوں نے ابھی تک شانی کو اجمل کی واپسی کی خبر کیوں نہیں سنائی تھی؟

چوہدری اعجاز بارہ بجے کے لگ بھگ اپنی ہنڈا کار میں سوار مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ وہ خود ہی ڈرائیو کر کے آئے تھے۔ وہ رستم، ناصر، اجمل اور ڈولے کے ساتھ بڑے

تپاک سے ملے۔

انہوں نے رستم کی سلامت ٹانگ دیکھی اور خوشی کا اظہار کیا۔ ''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا رستم۔ تمہیں اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ گیا ہے۔''

رستم نے خالو اعجاز سے ناصر اور زری کا تفصیلی تعارف کرایا۔ وہ اوٹ پٹانگ زری کو تعجب سے دیکھتے رہے اور اس کے بارے میں حیرت سے سنتے رہے۔ رستم اور ناصر کے لاپتا ہونے اور پھر بازیاب ہونے کی رُوداد بہت طویل تھی۔ اجمل اور رستم نے چوہدری اعجاز کو مختصر الفاظ میں اس رُوداد کے خاص خاص واقعات بتائے۔ ان واقعات میں سب سے اہم ذکر سپ گندل کا ہی تھا۔ وہی جادوئی پودا جو پہلے رستم کی ٹانگ کی معذوری ختم کرنے کا سبب بنا اور پھر ان کے لاپتا ہونے کی وجہ بن گیا۔ لاہور میں بیٹھ کر یہ ساری باتیں کرنا بڑا عجیب اور انوکھا لگتا تھا۔

کھانے کے دوران میں یہی باتیں ہوتی رہیں۔ تاہم کھانے کے بعد رستم اور چوہدری اعجاز کے درمیان اکیلے میں بات ہوئی اور یہی وہ خاص گفتگو تھی جس کے لئے چوہدری اعجاز نہایت عجلت میں یہاں پہنچے تھے۔ چوہدری اعجاز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رستم! شانی میری بھانجی ہے لیکن میں اسے بیٹیوں کی طرح چاہتا ہوں اور جس طرح میں اسے چاہتا ہوں اسی طرح اسے سمجھتا بھی ہوں۔ پتا نہیں مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ شانی اور تم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو۔ تم دونوں کے دلوں میں جو جذبہ ہے، اس نے زمانے کا بہت گرم سرد دیکھا ہے۔ اس کے باوجود قائم دائم رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آئندہ بھی رہے گا۔''

رستم نے کہا۔ ''آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں بے جھجک کہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''رستم! میں سمجھتا ہوں کہ سچے جذبے دریا کے بہتے پانی کی طرح ہوتے ہیں، ان کو روکنا نہیں چاہیے۔ پر کبھی کبھی ضرورت کی وجہ سے وقتی طور پر اس پانی کو روکنا پڑ جاتا ہے۔ میں بھی عارضی طور پر تم پر ایک روک لگانا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں چوہدری صاحب۔''

چوہدری اعجاز کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوگئی۔ ''آج میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں رستم ... اور مجھے امید ہے، تم مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گے۔''

''آپ بولیں چوہدری صاحب۔'' رستم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

چوہدری اعجاز نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تم ایک سال بعد لوٹے ہو رستم۔ اس دوران میں رنگ والی اور ارد گرد کے علاقے کی قسمت نے ایک عجیب پلٹا کھایا ہے۔ وہ کچھ ہو رہا ہے جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ رنگ والی کی حویلی کے بھاگ جاگ رہے ہیں۔ ہماری شانی کو ایک بہت اونچا مرتبہ ملنے والا ہے ... شاید تمہیں پتا نہ ہو، وہ علاقے سے ایم این اے کا الیکشن لڑنے والی ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت حیرانی اور بہت خوشی کی بات ہے۔'' رستم نے اپنے اندرونی اضطراب کو کامیابی سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''اسے ایک اہم ترین سیاسی پارٹی کی طرف سے یہ دعوت ملی ہے۔ ابھی اس بات کا فیصلہ تو نہیں ہوا کہ الیکشن سے پہلے اس پارٹی میں شامل ہوگی یا الیکشن جیت کر... مگر یہ بات تقریباً طے ہوگئی ہے کہ اس پارٹی کی پوری سپورٹ شانی کو ملے گی... تم نے سرفراز قزلباش کا نام تو سنا ہوگا؟''

''اس کا نام کس نے نہیں سنا۔ وہ بہت مشہور آدمی ہے۔'' رستم نے کہا۔

چوہدری اعجاز بولے۔ ''وہ آج کل اس سیاسی پارٹی کا سرکردہ لیڈر ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کے کچھ علاقوں میں وہ سیاہ سفید کا مالک ہے۔ ٹکٹوں کی تقسیم کے سارے معاملے شالے بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہمارے علاقے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہم لوگوں کی خوش بختی ہے۔''

''شانی سیاست میں آنے کے لیے تیار ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''وہ نا سمجھ ہے۔ انکار کر رہی تھی۔ ہم سب نے اسے سمجھایا ہے۔ بتایا ہے کہ اللہ کی طرف سے کتنی بڑی کامیابی اسے مل رہی ہے۔ اس میں سب سے بڑی بات یہ ہے ہمارے قدرت اللہ جیسے خبیث دشمن کے دانت بھی اپنے آپ کھٹے ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایم این اے کا، قدرت اللہ کے سر پر ہاتھ رہا ہے اور وہ اسی پارٹی کی طرف سے کامیاب ہوا تھا۔ اب یہ باتیں شانی کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہنی طور پر میدان میں آ گئی ہے۔''

''مجھے بتائیں، میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں ہر طرح حاضر ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے اپنی کلف لگی قمیص کی کریز درست کی اور کچھ دیر تک پُر سوچ انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجانے کے بعد بولے۔ ''رستم! میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوری سچائی سے کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو۔ مجھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ مجھے پتا

ہے کہ تم جرم کی اس گار میں کیسے پھنسے ہو اور کیسے دھنسے ہو۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں لیکن تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ شانی اس وقت ایک بڑے نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ یہاں اگر اس کے مخالفوں کو اس پر الزام تراشی کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آ گیا تو ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہی ہو گے، جب دو سال پہلے شانی، چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو چھڑانے کے لیے وڈے ڈیرے کی طرف گئی تھی تو کیا ہوا تھا؟''

''ہاں، تھوڑا بہت معلوم ہے۔'' رستم نے مدھم آواز میں کہا۔

''ان باتیں بنانے والے لوگوں نے رائی کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ ایسے ایسے الزام گھڑے تھے کہ سن کر کان جل اٹھتے تھے۔ تمہاری ذات کو بھی نشانہ بنایا گیا اور جو بھی دماغ میں آیا بک دیا گیا۔ اگر اب بھی کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی تو بہت نقصان ہو جائے گا رستم۔''

رستم نے اپنے لمبے بھاری بال دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی سے پیچھے ہٹائے۔ ''چوہدری صاحب! اگر اس سے پہلے کبھی میری لاعلمی میں ایسا ہو گیا ہو تو میں اس کے لیے بھی معافی چاہتا ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے جذباتی انداز میں رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ ''رستم! مجھے تمہارے دل کی حالت معلوم ہے لیکن کچھ عرصے کے لیے......بس کچھ عرصے کے لیے تم شانی سے......اور رنگ والی سے دور رہو۔ مجھے امید ہے، بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ کچھ عرصے کے لیے کہہ رہے ہیں......میں تو ہمیشہ کے لیے جانے کے لیے تیار ہوں۔ میرے پیچھے دنیا بھر کی آفتیں لگی ہوئی ہیں۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ میرا خطرناک سایہ شانی بی بی اور آپ لوگوں پر پڑے۔ بس مجھے لاہور میں ایک دو کام نمٹانے ہیں۔ ایک دو ہفتے میں یہ نمٹ جائیں تو شاید آپ کو میرا کھوج کھرا بھی نہیں ملے گا۔'' رستم کا لہجہ بے حد مہیب اور بوجھل تھا۔

''یہ بات تم ناراض ہو کر کہہ رہے ہو رستم؟''

''میں کسی سے ناراض نہیں ہوں چوہدری صاحب! اگر میری کوئی ناراضگی ہے تو اپنے حالات سے......اور اس کے لیے میں خود ذمے دار ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہیں۔ وہی ہو گا جو آپ چاہیں گے۔ آپ سمجھیں کہ میں مری کے گاؤں سے لاپتا ہونے کے بعد واپس آیا ہی نہیں ہوں۔''

''تمہارا دل بہت بڑا ہے رستم۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز نے رستم کا ہاتھ دبایا۔

رستم جواب میں خاموش رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک بے چینی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر خود ہی بولے۔ ''مجھے معلوم ہے رستم کہ ڈپٹی ریاض کے لیے تمہارے دل میں آگ بھڑک رہی ہے۔ تم جلد سے جلد اس سے حساب چکانا چاہو گے لیکن اگر تم مجھے اپنا بڑا سمجھتے ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ ابھی کچھ دیر تک اس آگ میں ہاتھ نہ ڈالنا۔ یہ تمہارے لیے تو بہتر ہو گا ہی، ہمارے لیے بھی بہتر ہو گا۔ بس ذرا یہ الیکشن کا عرصہ گزر جائے پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم مل کر ڈپٹی ریاض کو گھیریں اور ایسا گھیریں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔''

رستم نے ذرا چونک کر چوہدری اعجاز کی جانب دیکھا۔ اسے لگا کہ چوہدری صاحب کو آئندہ الیکشن اور رنگ والی کی خوش حالی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے جوان عزیز جشید کی موت کو بھی بھول گئے ہیں۔ وڈے ڈیرے کے قتلِ عام کو بھول گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان ساری زیادتیوں کو فراموش کر چکے ہیں جو ریاض ہٹلر کی طرف سے وقتاً فوقتاً روا رکھی گئی ہیں لیکن رستم کیسے بھول سکتا تھا؟ رستم جیسے لوگ نہیں بھول سکتے۔ ایسے لوگ ساری مہر و وفا اور ساری چیرہ دستیوں کا حساب اپنے سینوں پر رقم رکھتے ہیں۔ یہ بڑے متبرک حافظوں والے لوگ ہوتے ہیں اور انہی کی مشکل پسندی و جی داری سے حق اور انصاف کے چہرے اجلے رہتے ہیں۔

رستم کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ ایک فلمی سچویشن ہے۔ اس قسم کے مناظر پرانی فلموں میں اکثر نظر آتے تھے۔ ہیروئن کا کوئی قریبی بزرگ خاموشی کے ساتھ اس کے محبوب سے ملتا تھا اور اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ اپنا راستہ الگ کر لے۔ کہانیاں چاہے کس طرح کی بھی ہوں، حقیقی زندگی سے ہی تو پھوٹتی ہیں۔ کہانیوں کو حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آج ایک کہانی ایک نہایت سفاک اور سنگین حقیقت کی صورت رستم کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ جس کو دیکھنے کی چاہت میں ہر پل مر مر کر جیتا رہا تھا......وہ اس کے قریب تو تھی لیکن رستم کو اس سے دور رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے رستم کو لگا کہ یہ دنیا کے ٹوکے اس سرد ترین قید خانے سے بھی زیادہ بے رحم اور تکلیف دہ ہے جہاں وہ لمبی طویل راتوں میں صرف اپنے انتظار کے سہارے زندہ رہا کرتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں چوہدری اعجاز دو منٹ کے لیے واش روم میں گئے تو سفاک کہانی نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ جیسے تپتے صحرا میں اچانک تابڑ توڑ بارش برسنے لگے ... جیسے یخ ... تاریک رات کے وسط میں اچانک دوپہر کا سورج چمکنے لگے... جو کچھ ہوا بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ایک قریبی کمرے سے اجمل خان تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ برآمد

ہوا۔ اس کا سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا اور آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک بہت بھاری بوجھ اس کے سر سے اُتر گیا ہے۔

''کیا بات ہے اجمل؟'' رستم نے پوچھا۔

''ابھی رنگ والی سے شانی بہن کا فون آیا ہے...... یہاں کوٹھی کے نمبر پر۔ ام نے اس کو سب بتا دیا۔ وہ اتنا خوش ہے...... اتنا خوش ہے کہ ام بتا نہیں سکتا۔ کاش ام اس وقت اس کا چہرہ دیکھ سکتا۔''

''اوئے...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' رستم حیرت سے قریباً چلا اٹھا۔

''دراصل آج صبح جب ام نے رنگ والی میں پون کیا تھا تو ادھر سے چاچا خادم حسین نے اٹھایا تھا۔ ام نے اس سے بولا تھا کہ وہ شانی بہن کو بلائے مگر پھر چوہدری صیب سے بات شروع ہو گیا۔ حویلی کے پون پر امارے پون کا نمبر آ گیا تھا۔ جب خادم حسین نے شانی بہن کو اماری کال کے بارے میں بتایا تو انہوں نے پون پر آئے ہوئے نمبر پر کال کر دیا۔ ابھی دو منٹ پہلے ان سے امارا بات ختم ہوا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں پھر کال کرے گا۔''

رستم نے سر پکڑ لیا۔ ''اوئے اجمل کے بچے! یہ کیا کیا تم نے؟ یہ نہیں کرنا تھا۔ یہی کہنے کے لیے تو چوہدری صاحب......'' رستم نے بات ادھوری چھوڑی اور اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگا۔ اسی دوران میں ناصر اور ڈولا بھی آ گئے۔ وہ بھی اس بات پر خوش نظر آ رہے تھے کہ شانی سے بات ہو گئی ہے۔ اصل صورتِ حال کا علم کسی کو نہیں تھا۔

اتنے میں چوہدری اعجاز رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے واش روم سے برآمد ہوئے...... کمرے کی صورتِ حال دیکھ کر وہ ذرا سا چونکے۔ ''کیا بات ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

رستم نے خشک لہجے میں اجمل اور ناصر وغیرہ سے کہا۔ ''تم لوگ ذرا باہر جاؤ۔''

وہ باہر چلے گئے۔ رستم نے چوہدری اعجاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گڑبڑ ہو گئی ہے چوہدری صاحب۔ شانی بی بی کو...... سب پتا چل گیا ہے۔''

''کیسے؟ کب؟'' چوہدری اعجاز کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔

''اجمل خان نے بتایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی شانی بی بی سے فون پر بات ہوئی ہے۔''

''فف...... فون پر......''

''جی ہاں۔ شانی بی بی نے ہی رنگ والی سے فون کیا ہے۔''

''اس نے کیسے فون کر دیا؟ اس کو فون کے بارے میں کس نے بتایا؟''

''دراصل اجمل خان نے صبح حویلی فون کیا تھا۔ آپ کے ساتھ اس کی بات ہوئی تھی۔ مگر آپ سے پہلے اس کی بات خادم حسین سے ہوئی تھی۔ اس نے خادم حسین سے کہا تھا کہ وہ بی بی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بعد میں جب آپ رنگ والی سے لاہور روانہ ہو گئے تو خادم حسین نے بی بی سے اجمل کے فون کا ذکر کر دیا۔ فون پر لاہور کا نمبر آیا ہوا تھا۔ بی بی نے اسی نمبر پر رِنگ کیا ہے۔''

چوہدری اعجاز کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''یہ برا ہوا ہے، بہت برا...... اس اجمل کے بچے کو کیا ضرورت تھی ہم سے پوچھے بغیر بات کرنے کی۔''

''معاف کرنا چوہدری صاحب! کچھ غلطی آپ سے بھی ہوئی ہے۔ آپ کو فون پر اجمل سے پوچھنا چاہیے تھا کہ خادم سے اس کی کیا بات ہوئی ہے اور پھر خادم کو اپنی زبان بند رکھنے کا کہہ دینا چاہیے تھا۔''

چوہدری اعجاز منہ بنا کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں کا رنگ پیلا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور پُرسوچ انداز میں سر تھام لیا۔ اجمل خان کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اور رستم سے اشاروں میں پوچھ رہا تھا کہ کیا بات ہے؟ اس کے چہرے پر پُرمسرت چمک بھی تھی۔

چوہدری اعجاز دو تین منٹ تک بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔'' وہ مایوسی سے بولے۔ ''اب تمہیں اور اجمل وغیرہ کو کم از کم ایک بار تو شانی سے ملنا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ بہت ڈسٹرب رہے گی...... بہت زیادہ!''

''لیکن پھر آپ کا سارا پروگرام ڈسٹرب ہو جائے گا۔'' رستم نے دبا دبا طنز کیا۔

چوہدری اعجاز اپنے خیال میں مگن رہے۔ ''بہتر ہے کہ تم ایک بار اس سے مل لو۔ اس کے بعد کوئی ایسا بہانہ بنا لو کہ تمہیں دوبارہ نہ ملنا پڑے۔ مثلاً تم کہہ سکتے ہو کہ پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے تم کچھ عرصے کے لیے رُوپوش ہو رہے ہو...... یا پھر...... ملک سے باہر جانے کا بھی کہہ سکتے ہو۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں چوہدری اعجاز نے بڑی تفصیل سے رستم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ شانی، رنگ والی اور پورے علاقے کی بہتری کے لیے...... رستم کا کچھ عرصے کے لیے شانی اور حویلی کے دیگر لوگوں سے دور رہنا کیوں ضروری ہے۔

چوہدری اعجاز لاہور سے رنگ والی کے لیے واپس روانہ ہوئے ہی تھے کہ رنگ والی

سے پھر شانی کا فون آ گیا۔فون سننے کے بعد اجمل کا چہرہ خوشی سے تمتمایا اور اس نے ریسیور فوراً رستم کی طرف بڑھا دیا۔کچھ دیر کے لیے جیسے وقت تھم گیا۔اردگرد کی ہر شے ساکت محسوس ہونے لگی۔کان جس آواز کے لیے ایک مدت سے ترس رہے تھے،وہ آواز رستم کے کان میں داخل ہوئی اور سیدھی دل تک سرایت کر گئی۔

''ہیلو رستم! کیسے ہیں آپ؟'' شانی کی آواز لرز رہی تھی۔

''اور آپ؟'' وہ بولا۔

''بڑی دیر بعد یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا آپ کو؟ کہہ کر گئے تھے کہ دو چار دن میں پلٹ آؤں گا۔آپ جانتے ہیں......آپ کے ان دو چار دنوں نے مجھے کند چھری سے ذبح کیا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ایسی ہی چھری میری گردن پر بھی چلی ہے شانی۔میرے بس میں ہوتا تو آپ کو ایک دن کا انتظار بھی نہ کرواتا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔شاید سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی اشک بار آواز ریسیور پر گونجی۔آواز میں شکوے ہی شکوے تھے۔

''اب آپ شکل کب دکھائیں گے؟''

''میرے بس میں ہو تو ابھی آ جاؤں......لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا وہاں آنا ٹھیک نہیں۔''

''تو پھر میں آ جاتی ہوں۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''آپ کا آنا آسان ہوگا؟''

''یہاں آسان مشکل کا سوال نہیں ہے رستم۔آپ کتنے بھی دور ہوں،میرے لیے تو نزدیک ہی ہیں۔مجھے بتائیں......مجھے کہاں آنا ہے اور کب؟''

''منا کیسا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔تایا معصوم،عارف،خالو اعجاز سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔''

رستم نے شانی کو یہ نہیں بتایا کہ خالو اعجاز یہاں آئے تھے۔اسے معلوم نہیں تھا کہ اعجاز صاحب نے شانی کو یہ بات بتانی ہے یا نہیں۔

''آپ کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔کل آپ کو ٹی وی پر بھی دیکھا......''

''میں سب کچھ آپ کو بتاؤں گی۔یہ ساری باتیں فون پر نہیں کی جا سکتیں۔آپ مجھے بتائیں کہ ہمیں کہاں اور کس طرح ملنا ہے۔'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

''میں پہلے حاجی حیات سے بات کر لوں......جب ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

اسی دوران میں کمرے کے اندر بہت سا شور سنائی دینے لگا۔یہ عورتوں کی آوازیں تھیں۔شانی نے چلا کر کسی خادمہ سے کچھ کہا پھر رستم سے مخاطب ہو کر بولی۔''یہ کسی دوسرے گاؤں کی عورتیں ہیں۔مجھ سے ملنے بغیر اجازت اندر چلی آتی ہیں۔آپ ذرا ہولڈ کریں،میں ان کو باہر نکال لوں۔''

''نہیں شانی۔میں آپ کو دوبارہ فون کر لیتا ہوں۔اس سے پہلے حاجی حیات سے بھی بات کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے......کتنے بجے کریں گے؟ میں فون کے آس پاس رہوں گی۔''

''نو بجے کے لگ بھگ۔'' رستم نے کہا۔

''خدا حافظ! اپنا خیال رکھیے گا۔'' شانی نے اتنے دلنشیں انداز میں کہا کہ رستم کو سینے میں اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔رستم نے بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

شام کے وقت رستم کی ٹیلی فون پر حاجی حیات سے گفتگو ہوئی۔حاجی حیت کے ساتھ رستم کی گفتگو بڑی بے تکلف ہوتی تھی۔دونوں ایک دوسرے کو بے تکلف ناموں سے پکارتے تھے اور ایک دوسرے پر فقرے بھی چست کر دیتے تھے۔رستم نے حاجی حیات کو بتایا کہ شانی سے اس کی بات ہو گئی ہے۔

حاجی حیات نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔''چلو بات ہو گئی ہے تو اب بات آگے بھی بڑھے گی۔ہمیں بھتیجا یا بھتیجی کب مہیا کر رہے ہو؟''

''شاید تمہیں یاد نہیں......تم نے شادی کے ساڑھے تین سال بعد رزلٹ دیا تھا۔'' رستم نے سنجیدگی سے کہا پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولا۔''اگر شانی یہاں لاہور آنا چاہیں تو؟''

''جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔'' حاجی حیات بولا۔

''کوئی سکیورٹی کا مسئلہ؟''

''سکیورٹی کا مسئلہ تو تب ہوگا جب کسی کو پتا چلے گا۔اگر شانی پردے میں آتی ہیں اور کسی ایسی گاڑی میں آتی ہیں جس کی شناخت نہ ہو تو کیا ڈر ہے۔ویسے وہ کتنی دیر یہاں رہیں گی؟ میرا مطلب ہے کہ ایک دو دن یا اس سے زیادہ؟'' حاجی حیات نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس کا تو ابھی پتا نہیں ہے۔''

''بہر حال شانی کو رنگ والی سے نکلتے ہوئے بہت رازداری برتنا پڑے گی۔تم جانتے ہی ہو،اس سے پہلے دو تین بار شانی پر فائرنگ ہو چکی ہے۔''

اس سلسلے میں رستم اور حاجی حیات کے درمیان دس پندرہ منٹ بات ہوئی پھر انہوں

نے کچھ تفصیلات طے کر لیں۔

مقررہ ٹائم پر رستم نے شانی کو فون کرنے کے لیے اجمل خان سے کہا۔ اجمل خان نے تین چار بار کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ لائن انگیج جا رہی تھی یا ویسے ہی کوئی خرابی تھی۔ اجمل نے رستم کے کہنے پر نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک بار بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''

کہیں کسی نے ریسیور اٹھا کر ہی تو نیچے نہیں رکھ دیا ہے۔'' اجمل نے خیال آرائی کی۔

ڈولے نے کہا۔ ''شاید ادھر حویلی میں بھی کوئی زری جیسی لڑکی ہے جو فون سیٹ سے چھیڑ خانیاں کرتی رہتی ہے۔''

زری اس وقت ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی شلوار قمیص اس کے جنگلی جسم پر شرمندہ شرمندہ سی نظر آتی تھی۔ اس نے رخ پھیر کر ڈولے اور اجمل وغیرہ کی طرف دیکھا۔ ''تم نے میرا نام لیا؟'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''تو کیا تمہارا نام لینے کے لیے پہلے پرمٹ بنوانا پڑتا ہے۔'' اجمل نے پوچھا۔

''پرمٹ...... یہ پرمٹ کیا ہوتی؟'' زری نے ناک چڑھائی۔

''پرمٹ کا مطلب ہوتا ہے اجازت نامہ۔ جیسے ناصر کے پاس تمہارا اجازت نامہ ہے، وہ جب چاہے تمہارے پاس آسکتا ہے۔ امارا مطلب سمجھتا ہے نا تم؟''

''پاس آسکتا...... کیا مطلب؟ تم سب میرے پاس آسکتا......''

''توبہ...... توبہ...... کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔ ایسا بات نہیں کرتے۔ اس سے گناہ ہوتا ہے۔''

''اس میں گناہ کا کیا بات۔ جب میں اپنی بستی میں تھا، بہت سا لوگ میرے پاس آتا۔ بلکہ جب مجھ کو بھینٹ چڑھنا تھا اس سے پہلے بہت سا لوگ اکٹھا میرے پاس آیا۔ کوئی ایک سو بندہ تھا۔ وہ قطار بناتا...... ایک ایک کر کے میرے پاس آتا...... مجھ کو سلام کرتا...... پھر......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''پھر کیا؟'' اجمل نے آنکھیں پھاڑیں۔

''پھر سب کچھ الٹ پلٹ...... ام کو بھینٹ سے نکال دیا گیا۔ امارا زندگی بچ گیا......''

زری کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ شاید اسے وہ پہلے ملاپ کی شب یاد آ گئی تھی۔ زری کی معصومانہ باتیں دلچسپ تھیں۔ مگر رستم اور اجمل وغیرہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے پا رہے تھے۔ ان کا دھیان مسلسل فون کی طرف لگا ہوا تھا اور فون جوں کا توں تھا۔ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ رات اسی فکر مندی میں گزر گئی۔ اگلے روز بھی اجمل نے صبح سویرے ہی کوشش

شروع کر دی۔ جب رستم قریباً آٹھ بجے کے قریب جاگا، اجمل فون کے سرہانے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ''یار کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو؟'' رستم نے قدرے بیزار لہجے میں کہا۔ ''دیہات کی لائن ہے، کہیں کوئی خرابی ہو گئی ہو گی۔''

اجمل کھسیانا ہو کر فون کے پاس سے اٹھ گیا۔ کچن کی طرف سے حلوہ پوری کی خوشبو آ رہی تھی۔ حاجی حیات کا مہیا کردہ خاص خانساماں ناشتا بنانے میں مصروف تھا۔ اجمل پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ رستم نے منہ ہاتھ دھویا۔ کہنے کو تو اس نے اجمل کو فون سے دور جانے کو کہہ دیا تھا مگر اب اس کی نظریں بھی فون کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر ایک بے تاب انتظار موجود تھا۔ اس نے کچن کی طرف دیکھا کہ کہیں اجمل دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اس نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ ریسیور اٹھاتا اور شانی کا نمبر ڈائل کرتا، گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ٹھٹک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شانی کی زندگی بخش آواز تھی۔ ''ہیلو رستم! میں شانی بات کر رہی ہوں۔''

''لیکن آپ نے تو کل نو بجے بات کرنا تھی؟'' رستم کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ ''ہم یہاں سے بار بار فون کرتے رہے مگر لائن ہی نہیں مل رہی تھی۔''

''سوری رستم...... ویری ویری سوری! دراصل کل یہاں بڑی نہر کی پٹڑی اچانک ٹوٹ گئی۔ ہمارے آٹھ دس دیہات میں پانی آ گیا۔ فون اور بجلی کی لائنیں بھی گڑبڑ ہوئی ہیں۔ کل سہ پہر جو عورتیں اچانک حویلی میں آ گئی تھیں نا...... وہ فلڈ والے علاقے سے ہی آئی تھیں۔ کل رات تک ہم متاثر ہونے والے لوگوں کی مدد میں لگے رہے۔ اب بھی بہت سے لوگ اپنے سامان کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں۔ ان کا انتظام وغیرہ ہو رہا ہے۔''

''اور یہاں میرے دل میں پتا نہیں کیا کیا خیال آتے رہے۔''

''میں نے آج سویرے اٹھتے ہی سب سے پہلے عارف سے کہہ کر فون لائن ٹھیک کروائی ہے۔ مجھے پتا تھا آپ رات کو فون کرتے رہے ہوں گے۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کی حاجی حیات صاحب سے بات ہوئی ہے؟''

''ہاں، وہ تو ہو گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آج شام تک منّے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ رہی ہوں۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

''لیکن آپ کے وہ پناہ گزین اور ان کی مدد کا کام؟''

شانی چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''اس کے لیے لوگ موجود ہیں نا۔ تایا معصوم، عارف، خالو اعجاز اور اب تو سردار وراج بھی آگیا ہے۔ اس کے ساتھ چند سرکردہ مہتم بھی رنگ والی آئے ہوئے ہیں۔''

''لیکن آپ کی موجودگی بھی تو ضروری ہوگی۔''

''میں آپ سے مل کر پھر واپس آجاؤں گی۔''

''کیا بہتر نہیں ہے کہ آپ وہاں اپنا کام نمٹا کر ہی نکلیں؟'' رستم نے کہا۔

شانی پھر چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوگئی۔ آخر اس کی قدرے ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہاں... یہ بات ہے کہ پھر میں اطمینان سے چند دن وہاں رہ سکوں گی۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی شرم کی آمیزش بھی ہوگئی تھی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''آپ کی ٹانگ کے بارے میں اجمل نے جو کچھ بتایا ہے... کیا وہ صحیح ہے؟'' شانی نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

''اس نے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ گورے کے بنگلے میں ماہر انگریز ڈاکٹروں نے آپ کی ٹانگ کو پھر سے آپ کے جسم کا حصہ بنا دیا ہے۔'' شانی کے لہجے میں حیرت موجزن تھی۔

''اس سوال اور اس جیسے دوسرے سارے سوالوں کے جواب آپ کو یہاں آکر ہی مل سکتے ہیں۔'' رستم نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''میں تو ابھی آنا چاہ رہی تھی، پر آپ ہی روک رہے ہیں۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر آپ کے استقبال کی تیاری کر لیتے ہیں۔''

''کیسی تیاری؟'' شانی کی آواز میں ایک نوبیاہتا کی شوخی عود کر آئی۔

''ہر طرح کی تیاری۔'' رستم نے مبہم جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''آپ رنگ والی میں بہت مصروف ہو چکی ہیں۔ وہاں سے نکلنے کے لیے کیا بہانہ کریں گی؟''

''یہ سب میرے سوچنے کا کام ہے۔ آپ سر مت کھپائیں۔'' شانی نے اٹھلا کر کہا۔ ان لمحوں میں یہ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ درجنوں دیہات کی مالک... وہ ہر دلعزیز چوہدرانی ہے جس سے ہزاروں لوگوں کی تقدیر وابستہ ہے۔ اس کے پُر شباب پیکر کے اندر ایک الہڑ دوشیزہ بول رہی تھی۔

''ہماری شادی کا علم کس کس کو ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''صرف انہی لوگوں کو جو روکیٹ گاؤں میں ہمارے ساتھ تھے۔''

''تایا معصوم کو بھی نہیں؟''

''نہیں...... ابھی تک نہیں۔'' شانی نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''اور میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک بہت اچھی خبر بھی ہے۔''

''کیا؟''

''پتا نہیں کہ مجھے یہ خبر آپ کو فون پر سنانی چاہیے یا نہیں...... چلیں میں آپ کو اشارہ دے دیتی ہوں۔ آپ کا کوئی بہت اپنا میرے پاس ہے۔ میرے ساتھ رہ رہا ہے... بلکہ یہ دو ہیں۔''

''آپ پہیلیاں بوجھوا رہی ہیں۔''

''اس پہیلی کا جواب آپ کو خوشی سے نہال کر دے گا لیکن یہ جواب میں آپ کے پاس آکر خود دوں گی۔'' شانی نے کہا۔

''اس کے لیے کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''

''بس ایک یا دو دن اور آپ کو معلوم نہیں کہ یہ دو دن مجھ پر کتنے گراں گزرنے ہیں۔''

فون پر بات ختم کرنے کے بعد رستم دیر تک اس پہیلی کے بارے میں سوچتا رہا جو شانی نے اسے سنائی تھی۔ پھر اسے اچانک خیال آیا کہ اجمل اور ڈولا تو ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک رنگ والی میں ہی تھے۔ شاید انہیں معلوم ہو کہ شانی کے ساتھ وہ کون دو افراد رہ رہے ہیں جو اس کے بہت قریبی ہیں۔ رستم کے بہت قریبی تو بس اس کی بہن اور بہنوئی ہی تھے لیکن وہ ایسی جگہ پر تھے جہاں کوئی ان کی گرد بھی نہیں پا سکتا تھا۔ پھر وہ دونوں رنگ والی کی حویلی میں کیسے ہو سکتے تھے؟

رستم اسی ادھیڑ بُن میں تھا جب اسے اجمل نظر آیا۔ ''اجمل! بات سنو۔'' رستم نے اسے پکارا۔

وہ ٹھٹک گیا... جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ فوراً ہی رستم کو پتا چل گیا کہ وہ کیوں ٹھٹکا ہے۔ اس کے منہ میں اس کی پسندیدہ شے یعنی نسوار تھی۔ ''او نے تم نے پھر نسوار رکھی ہوئی ہے۔'' رستم نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

وہ کھسیانے انداز میں مسکرایا۔ ''دراصل جی! پھر تو شانی بہن نے یہاں آجانا ہے۔ ام نسوار کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا۔ ام نے سوچا، ان کے آنے سے پہلے ذرا پرانی یادیں تازہ کر لے۔''

''پرانی یادیں تو یوں کہہ رہے ہو کہ جیسے نسوار رکھے ہوئے مدتیں گزر گئی ہیں۔ حالانکہ ابھی پانچ دن پہلے ایبٹ آباد میں مَیں نے تمہارے منہ میں نسوار دیکھی تھی۔''

''بس جی۔ من پسند چیز کا تھوڑا سا جدائی بھی بہت زیادہ لگتا ہے۔ ام کو تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر بھی کسی نے نسوار کے لیے ہی کہا ہے۔ تیرے بنایوں گھڑیاں بیتیا، جیسے صدیاں بیت گیا۔''

''تم کو پتا بھی ہے، اس سے بہت بری بری بیماریاں لگتی ہیں۔''

''بیماریاں تو ہوتی ہی بری ہیں جی۔ اب ام اپنے دل کا کیا کرے۔ یہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ پہاڑوں میں رحیم اللہ صیب کے ساتھ رہ رہ کر ام کو بھی تھوڑا سا شاعری لاحق ہو گیا ہے۔ ابھی پرسوں ام نے چھوٹا سا شاعری نکالا ہے۔''

''شاعری نکالا ہے؟ کیا مطلب؟''

''یعنی شاعری کیا ہے۔ لیں آپ بھی سن لیں۔'' اجمل نے کہا اور فوراً ہی دو لنگڑے لولے شعر کہہ ڈالے۔

جب دل میں بہار نہیں، تو کیا بہار ہوگا
ام کہیں بھی ہو گا امارا زندگی دشوار ہوگا
جنت میں جانے سے پہلے ام پوچھے گا فرشتے سے
بتانا جی ذرا، وہاں جنت میں نسوار ہوگا؟

رستم منہ بنا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے ذرا سی شہ دی تو اجمل کی زبان چل پڑے گی اور پھر چلتی جائے گی۔ وہ فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے اجمل کو کریدا کہ وہاں رنگ والی کی حویلی میں شانی بی بی کے ساتھ کون سے دو خاص مہمان رہ رہے ہیں۔

اجمل خان ایک دم چکنا گھڑا بن گیا اور اپنی لاعلمی ظاہر کرنے لگا۔ مگر جب رستم کا اصرار بڑھتا گیا اور اس اصرار میں تھوڑا سا غصہ بھی شامل ہو گیا تو اس نے زبان کھول دی۔

وہ کہنے لگا۔ ''رستم بھائی! ام کو شانی بہن نے بڑی سختی کے ساتھ منع کیا تھا لیکن اب آپ کو ناراض کرنا بھی امارے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے ام شانی بہن سے معافی مانگ لے گا۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ تمہاری طرف سے میں خود ان کے ساتھ بات کرلوں گا۔''

چند لمحے خاموش رہ کر اجمل نے کہا۔ ''دراصل وہاں . . . آپ کا بڑا بہن جی اور آپ کا

بہنوئی صیب موجود ہے۔ وہ پچھلے تقریباً تین مہینے سے حویلی میں رہ رہا ہے۔''

رستم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اجمل؟''

''ام ٹھیک کہہ رہا ہے جی۔ یہ سب کچھ اماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ شانی بہن کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ آپ کا بہن جی اور ان کا شوہر گجرات کے ایک تھانے میں بند ہے۔ شانی بہن آدھی رات کے وقت پورا وہاں پہنچا اور ان دونوں کو اس دیہاتی تھانیدار کے چنگل سے نکال لایا۔ اس وقت ام اور ڈولا بھی شانی بہن کے ساتھ تھے......''

اس کے بعد اجمل نے تفصیل کے ساتھ وہ سارا واقعہ رستم کے گوش گزار کر دیا۔ رستم حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ یہ ساری رُوداد اس کے لیے بہت متاثر کن تھی۔ اس رُوداد میں اس بے پناہ اپنائیت کا اظہار تھا جو شانی، رستم سے اور اس کے خاندان سے رکھتی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے دو روز سب نے شانی کے انتظار میں گزارے۔ رستم تو منتظر تھا ہی کیونکہ وہ اس کی بیوی تھی...... باقی سب بھی ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے تھے۔ ناصر نے کوٹھی کے پہلو میں ایک پُرسکون کمرہ رستم اور شانی کے لیے تیار کرا دیا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خوب صورت برآمدہ تھا جس میں پھول دار بیلیں تھیں اور ماربل کے چمکیلے فرش پر شاندار آرام کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ اسی جانب آگے لان میں نیلے پانی والا چھوٹے سائز کا سوئمنگ پول بھی تھا۔ شانی نے رستم کو فون پر بتایا تھا کہ وہ ایک دن مزید لیٹ ہو جائے گی لیکن کم از کم دس روز یہاں رہے گی۔ اس نے ٹیلی فون پر ہی رستم کو یہ حیران کن اطلاع بھی دی تھی کہ اس نے اپنے ہم راز خالو کو اپنی شادی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ رستم شانی سے اس بات کا ردِعمل پوچھتا ہی رہ گیا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ وہ یہ ردِعمل بھی آ کر ہی بتائے گی۔

اور پھر وہ سہانی شام آ گئی جب اس وسیع کوٹھی کے پورچ میں ایک ٹیکسی کار آ کر رکی۔ کار کی اگلی نشست پر حویلی کا پرانا نمک خوار خادم حسین موجود تھا۔ پچھلی سیٹ پر عام سے کپڑوں میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے ایک موٹی اوڑھنی کا پردہ کر رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی رستم نے جان لیا کہ یہ بی بی ہے۔ بی بی کے ساتھ ڈولا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خادم حسین نے ٹیکسی میں سے ایک اٹیچی کیس نکال لیا۔ اجمل خان نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی واپس چلی گئی۔

شانی نوکرانی کے لباس میں تھی۔ اٹیچی کیس بھی بوسیدہ سا تھا۔ اندر آ کر اس نے اوڑھنی ہٹائی۔ کمرہ اس کے چہرے کی روشنی سے منور ہو گیا۔ رستم اور شانی کی بے تاب نگاہیں

ٹکرائیں۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے اردگرد کی ہر شے سے بے خبر ہو گئے۔ پھر اجمل نے ہی کھنکھار کر اس محویت کو توڑا۔ ''شانی بہن! ام نے پچھلے ایک سال میں آپ کو روتے ہوئے دیکھا ہے، آج ام آپ کو ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اماری طرپ سے آپ سے پُر زور درخواست ہے کہ آپ ایک بار کھل کر ہنس دے۔ امارا پیسا پورا ہو جائے گا۔''

اجمل کی بات پر شانی واقعی مسکرا دی۔ اس کے گہرے گلابی ہونٹوں کے پیچھے، اس کے موتیوں سے دانت چمک اٹھے...... لیکن اس کے ساتھ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی موجود رہی۔ اس دھوپ چھاؤں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا۔ ڈولا بھی مسرور نظر آ رہا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور تھپکی دی۔

اجمل بولا۔ ''شانی بہن! اگر آپ ام سے سچ پوچھتا ہے تو کے ٹو کی طرپ ہمارے سپر (سفر) کا اصل ہیرو یہ امارا ڈولا بھائی ہی ہے۔ رستم اور ناصر بھائی کے مل جانے میں ڈولے کی کوشش میں بہت زیادہ دخل ہے۔ جی ہاں، ام سچ کہتا ہے۔ کیوں ناصر بھائی؟'' اجمل نے ناصر سے تائید چاہی۔

ناصر نے سنجیدگی سے سر ہلا کر اس بات کی تائید کی۔

اجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''امارے سپر کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا تھا جی کہ ام ایک دم مایوس ہو گیا تھا۔ ام سب ایک ٹیلے کے پاس بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ام اس برپستان میں بہت آگے نکل آیا ہے، اب ام کو واپس جانا چاہیے۔ یہی وہ وقت تھا جب ڈولے نے اپنے کانوں کی دوربین سے کچھ ایسا آوازیں سنا جو ام میں سے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔ بعد میں ان آوازوں سے ہی رستم اور ناسر بھائی کا کھوج ملا۔ یہ بہت گریٹ بندہ ہے جی۔''

ڈولا سر جھکا کر شرما رہا تھا اور اجمل اس کی تعریفیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ ناصر نے کہا۔ ''بھائی! یہ تعریفیں کہیں کسی معاہدے کے تحت تو نہیں ہو رہیں۔ یعنی بعد میں ڈولا، اجمل کی تعریفیں کرنا شروع کر دے۔''

اجمل نے کہا۔ ''دیکھیں شانی بہن! پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں یہ ناصر بھائی بالکل نہیں بدلا۔ ایک دم پہلے ہی کی طرح بے لحاظ ہے۔ ام نے اس کے لیے برپوں کے اوپر چل چل کر اپنے پاؤں کا کباڑا کر لیا ہے لیکن یہ اب بھی اماری ہر بات کا مذاق اُڑاتا ہے۔ ام سے ٹھٹھا کرتا ہے۔''

''اوئے اجمل خان! یہ بھی پیار کی ایک قسم یعنی پیار کی اک ورائٹی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''اگر یہ پیار کی ورائٹی ہے تو پھر امارے پاس بھی اس قسم کا بہت سا ورائٹی ہے۔ ام آپ کو پیار کرے گا تو آپ کا رونا نکلے گا۔ ام آپ کو سوتے میں رسے کے ساتھ باندھ دے گا، پھر آپ کے پاس بیٹھے گا اور آپ کو شاعری سنا سنا کر... سنا سنا کر ہلکان کر دے گا۔''

ایک بار پھر سب بے ساختہ مسکرا دیئے۔ ناصر نے کہا۔ ''چھوڑیں جی اس کی باتوں کو۔ آئیں میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاؤں۔''

شانی نے کوٹھی کا وہ پُر آسائش حصہ دیکھا جہاں اس کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں ہر سہولت موجود تھی۔ ایک ملازمہ بھی دست بستہ کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر شانی کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ رستم کو لگا کہ وہ اس تکلف کو پسند نہیں کر رہی۔

اس نے اٹیچی کیس کھولا اور کپڑے الماری میں لٹکا دیئے۔ اس کے روزمرہ استعمال کی مختلف اشیا بھی اٹیچی میں موجود تھیں جو اس نے کمرے میں مناسب جگہوں پر رکھ دیں۔ اس کے بعد ڈریسنگ روم میں جا کر اپنا نوکرانی والا لباس بدلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی تو رستم دیکھتا رہ گیا۔ ہلکے رنگ کی گلابی شلوار قمیص میں وہ ایک دم قیامت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی کمر کے سے نیچے تک لہرا رہی تھی۔ آدھی آستینوں کی قمیص میں سے اس کے ملائم بازو، دو موی شمعوں کی طرح دکھائی دیتے تھے اور ان موی شمعوں کی روشنی آنکھوں کے راستے سیدھی رستم کے دل پر پڑ رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ رنگ والی کی چوہدرانی نہیں تھی، ایک الھڑ لڑکی تھی جس کے لشکارے مارتے جسم کے اندر ایک ندی مچلتی تھی اور یہ ندی اپنے دریا کے محبوب پانیوں سے مل جانا چاہتی تھی۔

''مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ ادا سے بولی۔

وہ جیسے چونک گیا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ آپ حقیقت میں میرے سامنے ہیں یا یہ صرف میرا خیال ہی ہے۔''

''یہ لیں، چھو کر دیکھ لیں۔'' اس نے عجب دل ربائی سے اپنی کلائی رستم کے ہاتھ میں تھما دی۔

ست رنگی چوڑیوں سے سجی ہوئی نرم گرم کلائی، رستم کے ہاتھ میں آئی تو جیسے کائنات کی گردش تھم گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی بی بی کو اس طرح سینے سے لگائے کہ... بس اپنے جسم کا حصہ بنا لے۔ قیامت تک کوئی انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے۔ ناصر کے کھنکھارنے کی آواز نے انہیں چونکایا۔ وہ برآمدے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رستم نے بی بی کی کلائی چھوڑ دی۔

"جی اجازت ہے؟" ناصر نے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پوچھا۔

"آجاؤ ناصر بھائی۔" شانی بولی۔

"خانساماں پوچھ رہا ہے کہ رات کے کھانے میں کیا ہوگا؟"

"رات کے کھانے میں جو کچھ بھی ہوگا مگر خانساماں نہیں ہوگا۔" شانی نے کہا۔

"تمہاری بھابی جان کا کیا مطلب ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ جتنے دن میں یہاں ہوں، میں خود پکاؤں گی......اور آپ سب کو کھلاؤں گی۔ آپ اپنی اپنی فرمائشیں ابھی سے ذہن میں موجود کر لیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہم آپ کو کچن میں گھسانے کے لیے یہاں لائے ہیں؟" ناصر نے احتجاج کیا۔

"صرف کچن ہی نہیں، گھر کی باقی دیکھ بھال بھی میری ذمے داری ہے۔ میں یہ کام ملازمہ اور خانساماں کی مدد سے کروں گی اور پلیز، میرے کام میں دخل مت دیجیے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" رستم نے کہا۔

"آپ تو چپ ہی رہیں جی۔ اگر کچھ بولنا ہی ہے تو مجھے صرف یہ بتائیں کہ رات کو کیا کھانا پسند کریں گے۔" وہ کام کاج کے لیے بالکل تیار نظر آتی تھی۔

رستم اور ناصر تذبذب میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ اپنی لمبی چوٹی کو جُوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ "آپ کچھ نہیں بولیں گے... چلیں، آج کے لیے میرا مینو ہی سہی۔ مجھے فوراً سے پہلے دو مرغیاں اور سلاد وغیرہ منگوا دیں۔ مٹن کا قیمہ فریج میں موجود ہے۔ میں دیکھ آئی ہوں۔ آج میں آپ کو اچار گوشت اور قیمے والے چاول کھلا رہی ہوں۔ مزہ نہ آجائے تو پیسے واپس۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ضروری اشیاء ایک کاغذ پر لکھ دیں اور یہ کاغذ خانساماں تک پہنچانے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔

ناصر نے کہا۔ "لیں جی، آپ نئے کپڑے سلوانے کی تیاری کر لیں۔ اگلے دس پندرہ روز میں آپ کو کافی موٹا ہو جانا ہے۔"

"لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔" رستم ہولے سے مسکرایا۔

"اور... ہاں...... منا کیوں نہیں آیا شانی بھابی کے ساتھ؟"

"تین دن بعد چوہدری اعجاز آئیں گے۔ وہ ان کے ساتھ آئے گا۔ بی بی چھپ چھپا کر آئی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے، وہ نوکرانی کے کپڑوں میں تھیں۔"

"وہ ملازم جو ساتھ آیا ہے، یہیں رہے گا؟" ناصر نے پوچھا۔

"نہیں۔ کل واپس چلا جائے گا۔ اس کا نام خادم حسین ہے۔ وہ حویلی کا پرانا وفادار ہے۔"

"آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس ملازم کو اور چوہدری اعجاز کو تو آپ دونوں کی شادی کا علم ہو ہی چکا ہے۔"

"نہیں...... ملازم کو نہیں...... صرف چوہدری اعجاز کو۔ چوہدری اعجاز کی حیثیت شانی کے رازداں کی سی ہے۔"

شانی گھر میں آتے ہی یوں گھومنے پھرنے لگی تھی جیسے وہ عرصے سے یہاں رہ رہی ہو۔ اس نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ خانساماں اور ملازمہ بڑی خوشی اور محبت سے اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو بہت جلد دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ "بیگم جی ... بیگم جی" کہتے ہوئے ملازمہ کا منہ سوکھ رہا تھا.... رات کا کھانا مزیدار و پُرتکلف تھا۔ ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ناصر اور اجمل میں نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ سب سے دلچسپ کردار زری کا تھا۔ وہ ہر کام کو بچکانا حیرت سے دیکھتی تھی اور ناصر کی ہدایت کے مطابق اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے پہلے ایک سالن والا ڈونگا الٹا پھر اجمل کی پلیٹ کو ڈونگا سمجھ کر اس میں موجود ساری بوٹیاں اپنی پلیٹ میں منتقل کیں۔ اس کے بعد خانساماں کی شلوار کے لٹکتے ہوئے ازار بند کو کھینچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے پانی مانگا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے بغیر لطیفہ بازی کے ہی یہ محفل ہنستی مسکراتی رہی۔

کے ٹو کے سفر کی رُوداد طویل تھی تاہم اس کے چیدہ چیدہ حصے شانی کے گوش گزار کیے گئے۔ یہ ساری باتیں شانی کے لیے ناقابلِ یقین تھیں۔ اگر انہیں بیان کرنے والے رستم اور ناصر نہ ہوتے تو وہ شاید ان واقعات کو ذہن کی تصوراتی بھاگ دوڑ سمجھتی۔ پاوندہ قبیلے کے عجیب و غریب رواج، خون ریز قبائلی لڑائی، خونی تماشے اور گارنیوں کی قربانی ... یہ سارے واقعات حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ رستم اور ناصر خود کو ان قدیم مہم جوؤں کی طرح محسوس کر رہے تھے جو طویل سفر کے بعد اپنے وطن واپس لوٹتے تھے اور پھر سرد راتوں میں آتش دانوں کے سامنے بیٹھ کر انجانی زمینوں کے قصے بیان کرتے تھے۔

☆======☆======☆

رات سہانی اور دلفریب تھی۔ رستم سرتاپا عشق تھا اور اس کا محبوب سرتاپا حسن اور وقار اس

کے سامنے تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ چوڑیوں کی کھن کھن سانسوں کی آہٹ کے ساتھ مل کر بسم کی خوشبو سے سرگوشیاں کررہی تھی۔

''کیوں پیار کرتے ہیں مجھ سے اتنا؟'' شانی نے رستم کے کان میں جذباتی سرگوشی کی۔

''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ آپ اپنے دل سے پوچھیں۔'' رستم نے کہا۔

''میں نے پوچھا ہے۔''

''پھر؟''

''میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں۔'' وہ رستم کی بانہوں میں کچھ اور سماتے ہوئے بولی۔

نیم تاریک کمرے میں سانسوں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ خدا کی پیدا کی ہوئی محبت اپنے حسین اورزورآور ترین روپ میں دوانسانوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔

''مجھے یاد کرتے تھے نا؟'' وہ اَشک بار آواز میں بولی۔

''اس سوال کا جواب بھی خود سے پوچھیں۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ کئی سیکنڈ گزر گئے۔ رستم نے سرگوشی کی۔ ''کیا سوچ رہی ہیں؟''

وہ ہولے سے ہنسی اور بھیگے لہجے میں بولی۔ ''اپنے آپ سے، سوال کا جواب پوچھ رہی تھی۔''

''پھر کیا جواب ملا۔''

''ہاں...... آپ یاد کرتے تھے۔''

''کب کب؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ آپ بتائیں۔''

رستم نے کئی بار اپنی محبوب شریکِ حیات کے ہونٹ چومے اور جذباتی انداز میں بولا۔

''جب جب سورج نکلا، جب جب رات آئی اور تارے چمکے۔ جب جب صبح ہوئی...... اور پتا ہے، اس کے علاوہ کب کب؟''

''بتائیں!''

''جب جب میں نے سانس لی۔ مجھے زیادہ لفظ نہیں آتے شانی! لیکن میں سچ کہتا ہوں، میں نے ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ آپ کو یاد کیا ہے اور آپ سے پھر ملنے کی دعا کی ہے۔ اس عرصے میں کئی ایسے سخت موقعے بھی آئے جب بندے کو زندگی سے بڑھ کر موت اچھی لگنے لگتی ہے لیکن مجھے پھر بھی زندگی ہی اچھی ہی لگتی رہی۔ کیونکہ...... مجھے آپ سے ملنا

تھا۔''

شانی نے بے پناہ محبت کے ساتھ رستم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے اپنی پلکوں سے اس کے جسم کے سارے کانٹوں کو چن لیا۔ وہ ایک تپتے ہوئے صحرا سے...... گھنگھور گھٹا بن کر ملی اور اس کے نشیب وفراز سے دکھوں کی گرد کو بہا کر لے گئی۔ اس کی محبت دہری تاثیر رکھتی تھی۔ اس میں جذبوں کی حدت تو تھی مگر ایک مرہم کی سی ٹھنڈک بھی تھی اور یہ ٹھنڈک رستم کے ہر آتشیں زخم کو ڈھانپتی چلی جارہی تھی۔

کہتے ہیں، غم آنسوؤں کی بنیاد ہوتا ہے یا پھر کبھی کبھی بے پناہ خوشی میں بھی آنکھیں اپنے موتی لٹانے لگتی ہیں...... مگر یہاں آنسو محبت کے عمل سے وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ محبت کررہی تھی اور رورہی تھی۔ اس کی محبت بھی انوکھی اور غیر معمولی تھی۔ ان سحر انگیز طلسماتی لمحوں میں رستم نے سوچا، اگر وہ کسی قدیم زمانے میں پیدا ہوتی تو شاید سچ مچ ایک دیوی ہوتی۔ اس کو نگاہوں سے سجدے کیے جاتے اور دلوں کے معبدوں میں اس کی پرستش کی جاتی اور یہاں اس کمرے کے نیم تاریک ریشم میں یہ دیوی اپنی تمام تر چاہت وخود سپردگی کے ساتھ اس پر مہربان تھی۔ رستم نے اپنی آنکھیں بند کرکے خود کو اس میں گم کردیا۔

صبح ہمیشہ سے زیادہ سہانی اور دل رُبا تھی۔ ہر شے سے خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ رستم دیر تک کوٹھی کی وسیع چھت پر ٹہلتا رہا اور اپنے اردگرد موجود مسرت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے چند دن بڑے سہانے ہیں۔ ایسے چند دنوں پر ایک نہیں کئی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ چھت پر رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک کسی نے عقب سے آکر اس کی آنکھیں بند کردیں۔ خوشبو کے جھونکے نے بتادیا کہ وہ کون ہے۔

''آپ کو بھی نہ پہچانوں گا تو پھر اور کسے پہچانوں گا۔''

''میں نے اپنی شناخت کروانے کے لیے آپ کی آنکھیں بند نہیں کی ہیں۔'' وہ ادا سے بولی۔

''تو کس لیے کی ہیں؟''

''بس میری مرضی۔'' وہ اس کی پشت سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اپنی ٹھوڑی رستم کے سر سے ٹکادی۔

''اب میں کیا کروں؟'' رستم زیرِلب مسکرایا۔

''بس مجھ سے باتیں کریں...... اسی طرح۔'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

"آپ کی پہلی ادائیں ہی میری جان نکالنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ نئی ادا کیوں ڈھونڈ لی ہے۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر رستم کی آنکھیں آزاد کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اب سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر شرم کا رنگ خود بخود چہرے کو ڈھانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں شاید بیتی ہوئی شب کے مناظر تھے۔

"آپ بڑی خوب صورت لگ رہی ہیں۔" رستم نے بے ساختہ کہا۔

اس نے دائیں بائیں دیکھا اور بولی۔ "آپ سے ایک بات کہوں؟"

"اب بھی اجازت کی ضرورت ہے؟"

"یہ بات تو اب ہم سب مان چکے ہیں کہ ڈولے کی حسیں بہت تیز ہیں۔ وہ بہت مدھم آوازیں بھی سن لیتا ہے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ یہ جو آپ دل دھڑکانے والی باتیں کرتے ہیں، کہیں ڈولے کے کانوں تک نہ پہنچ جاتی ہوں۔"

"ایسی باتیں میں بہت مدھم آواز میں کرتا ہوں۔ پھر بھی آپ کو اندیشہ ہے تو ڈاکٹر ناصر سے کہہ کر ڈولے کے کانوں کا آپریشن کروا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈاکٹر ناصر کا بھی مسئلہ ہے۔ اس نے بھی تو زری سے ایسی باتیں کرنا ہوتی ہیں۔"

دونوں ہنس دیئے۔ شانی نے اپنے بالوں کو پیچھے اُڑسا اور قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "رستم! مجھے زری اور ناصر کا اس طرح اکٹھے رہنا اچھا نہیں لگا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"شانی! میں ناصر کو اب بہت اچھی طرح جاننے لگا ہوں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس پر آنکھیں بند کر کے ہر طرح کا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ پاؤندہ بستی میں ہوا وہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں لیکن اب ناصر اور زری کے درمیان کوئی ایسا غلط تعلق نہیں ہے۔ ایک کمرے میں رہنے کے باوجود اس سلسلے میں بے حد احتیاط اور برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

شانی نے پُرسوچ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ "کیا ناصر...... اس کے بارے میں سنجیدہ ہے؟"

"ایک سو دس فیصد ! میں اس کی سوچ سے بڑا متاثر ہوا ہوں شانی! وہ ایک سنگین اتفاق تھا جس کی وجہ سے زری، ناصر کی زندگی میں آئی۔ اس میں ناصر کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس واقعے کو ایک رات کا...... یا دو تین راتوں کا کھیل سمجھ کر بھول سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے ایک کھرا مرد ہونے کا ثبوت دیا ہے شانی! اور اب میں چاہتا ہوں کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے، وہ پورا ہو۔"

"کیا یہ لڑکی مسلمان ہے؟"

"یہ ابھی کچھ بھی نہیں ہے۔ سمجھیں کہ ایک کورے کاغذ کی طرح ہے۔ ہم اس پر جو کچھ لکھ دیں گے...... لکھا جائے گا۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ابھی تو اس کی حرکتیں بھی جنگلیوں جیسی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فریج کا دروازہ کھول کر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تاکہ ٹھنڈک محسوس ہو۔ ناصر اسے آہستہ آہستہ اٹھنا بیٹھنا اور بات کرنا سکھا رہا ہے۔"

"ہاں...... وہ مردوں کی طرح بولتی ہے، میں کھاتا ہوں، میں سوتا ہوں۔"

"اس کی اچھل کود بھی مردوں جیسی ہے۔ وہاں پاؤندہ بستی میں یہ اونچی اونچی دیواروں کو پھاند جاتی تھی اور درختوں پر چڑھ جاتی تھی......"

رستم شانی کو زری کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ کبھی حیران ہوتی رہی، کبھی مسکراتی رہی۔ پھر گفتگو کا رخ رستم کی بہن آپو زاہدہ اور بہنوئی اکرام کی طرف ہو گیا۔ رات کو بھی ان دونوں نے اس بارے میں دیر تک بات کی تھی۔ رستم شانی کا بے حد احسان مند تھا کہ اس نے ایک نہایت مشکل وقت میں نہ صرف آپو زاہدہ کی مدد کی بلکہ انہیں اپنی حویلی میں محفوظ ٹھکانا بھی مہیا کیا۔ رستم نے آپو زاہدہ، بھائی اکرام اور دونوں بچوں کے حالات تفصیل کے ساتھ شانی سے پوچھے۔ آخر میں وہ شانی کے ہاتھ تھام کر بولا۔ "میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟"

"آپ اس بارے میں اپنا پیارا سا منہ بند رکھ کے میرا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔" وہ بھی محبت بھرے لہجے میں بولی۔ پھر تھوڑے سے توقف کے ساتھ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "رستم! آپ ایسی بات کیوں کرتے ہیں؟ اب ہم دو تو نہیں۔ آپو زاہدہ اور بچوں کا مجھ پر بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ پر ہے۔"

سیڑھیوں پر قدموں کی تیز آہٹ سنائی دی۔ رستم نے جلدی سے شانی کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اجمل، ڈولا اور زری اور ناصر وغیرہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ وہ رستم اور شانی کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ پہلے تو شانی کے رات والے کھانے کی تعریف ہوتی رہی پھر اجمل خان نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ ہفتے میں کم از کم دو بار وہ کھانا خود پکائے گا۔ اس نے کہا۔ "آپ سب اچھی طرح جانتا ہے کہ ام بہت اچھا کک ہے۔ یہ امارا ککری کا توہین ہے کہ امارے ہوتے ہوئے صرف شانی بہن ہی کچن میں گھسا رہے۔"

ناصر نے کہا۔ "تمہاری اپنی توہین ہونے سے بہتر ہے کہ تمہاری ککری کی توہین ہو جائے۔ اگر تم نے برا کھانا پکایا یا اس میں سے نسوار کی بُو آئی تو کم از کم مجھ سے تو برداشت نہیں ہوگا۔ میں باقاعدہ تمہیں مار بیٹھوں گا اور مجھے یقین ہے اس کارِ خیر میں دیگر بھی میرا ساتھ دیں

گے۔''

''ناصر! یہ تم زیادتی کر رہے ہو۔'' شانی نے مسکراتے ہوئے ٹوکا۔''اجمل خان کے دادا واقعی بہت اچھے cook تھے اور انگریز صاحبوں کا کھانا پکاتے تھے۔''

''انگریزوں کے برصغیر سے جانے کی وجہ بھی تو یہی تھی۔'' ناصر نے فوراً پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

اجمل نے ناصر کو گھونسا دکھایا۔ اس سے پہلے کہ ان میں تُو تکرار شروع ہوتی، رستم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔''آپ سب نے اچانک چھت پر چڑھائی کیسے کر دی؟ کوئی خاص بات ہے؟''

''ایک سے زیادہ خاص باتیں ہیں۔'' ناصر نے کہا۔''دراصل سب چاہ رہے ہیں کہ کوئی تفریح وغیرہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم اس چار دیواری سے باہر تو نہیں جا سکتے۔ یہیں پر جو کچھ مہیا ہے، اس سے تفریح کے مواقع پیدا کیے جائیں۔''

''مثلاً کیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''کوٹھی کے پچھلے لان میں سیمنٹ کی پچ بنی ہوئی ہے۔ لان کی گھاس وغیرہ کٹوا کر وہاں صفائی کروائی جائے۔ ہم وہاں ٹینس بال سے کرکٹ کھیل سکتے ہیں۔ اجمل خان بہت اچھا باؤلر بھی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ بندوق کے نشانے کی طرح ہر بال کو درمیان والی وکٹ پر مار سکتا ہے۔''

''ام نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں، ام بری بھلی کرکٹ کھیل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ امارا رائے ہے کہ سوئمنگ پول کا پرانا پانی نکال کر اس میں تازہ بھرا جائے۔ اس کا دو دو فائدہ ہوگا۔ ایک تو ام تیر سکے گا، دوسرے ام سے کرکٹ میچ ہارنے کے بعد ناصر بھائی کو خودکشی کرنے کا سہولت رہے گا۔'' ناصر جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا مگر شانی بول پڑی۔

''لیکن مجھے تو کرکٹ کھیلنا نہیں آتی۔'' شانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور زری کو بھی کچھ پتا نہیں۔'' ناصر نے کہا۔

اجمل نے فوراً کہا۔''زری کو آپ ہر الٹا سیدھا کام سکھا رہا ہے ناصر بھائی۔ کرکٹ بھی سکھا لے گا۔ باقی رہے شانی بہن کی بات تو شانی بہن ایمپائر کے پرائض انجام دے سکتا ہے۔''

اس مرتبہ ناصر نے اجمل کو مکا دکھایا۔ شانی نے کہا۔''چلو کرکٹ بھی ٹھیک ہے لیکن کوئی ایسا کھیل ہونا چاہیے جس میں کسی سامان وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے اور اس میں ہر کوئی آسانی

سے حصہ لے سکے۔ خانساماں ظفر اور ملازمہ حمیدن وغیرہ بھی ہیں۔ ہمیں ان کو اپنی تفریح میں شریک کرنا چاہیے۔''

''ایسا کئی کھیل ہو سکتا ہے جی۔ مثلاً...... مثلاً رسا کشی۔'' اجمل نے کہا۔

''اوئے! رسا کشی میں رسا نہیں چاہیے؟'' ناصر نے چہک کر کہا۔''مجھے لگتا ہے اجمل، تیری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔ شانی بی بی کہہ رہی ہیں، کوئی ایسا کھیل جس میں سامان کی ضرورت نہ ہو۔''

''تو پھر درختوں پر چڑھنے کا مقابلہ کر لو۔'' اجمل جل کر بولا۔''وہاں باغ میں جامن کا دو درخت ساتھ ساتھ کھڑا ہے اور ایک جتنا لمبا ہے، ام کو یقین ہے اس مقابلے میں آپ کا یہ ''زری بیگم'' ایک دم پسٹ (فرسٹ) آئے گا۔ پلک جھپکتے میں یہ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھ کر بیٹھ جائے گا اور وہاں سے جامن توڑ کر کچر کچر کھائے گا اور امارا طرف پھینکے گا۔''

''دیکھو اجمل خان!'' ناصر انگلی اٹھا کر دہاڑا۔''تم عورتوں کو درمیان میں مت گھسیٹو۔ یہاں گولیاں چل جائیں گی، لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔''

''تم پہلے اپنا اردو درست کرو ناصر بھائی۔ لاش کبھی نہیں تڑپتا ..... کیونکہ وہ تو لاش ہوتا ہے۔ ہمیشہ زخمی تڑپتا ہے۔''

''بس یہ اپنے اپنے علاقے کا رواج ہے۔'' ناصر نے تیوری چڑھا کر کہا۔''اور اصل بات کی طرف سے میرا دھیان مت ہٹاؤ۔ اصل بات یہ ہے کہ تم دن بدن بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔''

''ہاں بھئی! اس کی تصدیق تو میں بھی کرتا ہوں۔'' رستم نے گفتگو میں حصہ لیا۔''ہم زری کو درختوں وغیرہ سے اُتارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم اسے چڑھانے کی بات کر رہے ہو۔''

''لیکن آپ جانتا ہے رستم بھائی کہ پہلے چھیڑ خانی ناصر بھائی ہی کرتا ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو...... پروگرام بناؤ کیا بنانا ہے۔'' شانی نے کہا۔

سب سنجیدگی سے مشورہ دینے میں مصروف ہو گئے۔ اگلے چند روز کے لیے کھانے، پینے اور تفریح وغیرہ کا ایک اچھا سا شیڈول بن گیا۔ اجمل خان کی یہ بات بھی مان لی گئی کہ ہر دن کے بعد اسے اپنی مرضی کا کھانا بنانے اور کھلانے کا موقع ملے گا۔

اسی دوران میں ملازمہ حمیدن ایک بڑی ٹرے میں تازہ اورنج جوس سے بھرے ہوئے

گلاس لے کر آ گئی۔ وہ سب جوس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گلاسوں میں اسٹرا موجود تھے۔ وہ اسٹراز کی مدد سے پینے لگے۔ زری بھی پینے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ اسٹرا کو منہ سے لگا کر اس نے گلاس کو بھی اوپر اٹھایا۔ جوس گر گیا اور اس کے گریبان سے ہوتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ اجمل اور رستم نے بہ مشکل اپنی ہنسی روکی۔ ناصر سٹپٹایا۔ پہلے اس نے رومال سے اس کی گردن صاف کرنے کی کوشش کی پھر سمجھ گیا کہ یہ کام مشکل ہے۔

''چلو جاؤ کمرے میں..... خود کو صاف کر کے آؤ'' ناصر پیار سے اس کا کان کھینچتے ہوئے بولا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر پھر کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک گئی۔ ''تم بھی آؤ..... مجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''ہاں ہاں جاؤ ناصر بھائی۔'' اجمل کے لہجے میں دبی دبی شرارت تھی۔ ناصر اسے گھورتا ہوا زری کے پیچھے چلا گیا۔

زندگی بڑی انوکھی اور عجیب شے ہے۔ یہ ہر حال میں خوشی اور غم کے موقعے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ بدترین دکھوں کے سمندر میں بھی سکون اور خوشی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ملتے رہتے ہیں۔ سنگین ترین حالات میں بھی لوگ وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے خوشی کشید کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے ماضی اور مستقبل سے کٹ جاتے ہیں اور صرف حال کی خود فراموشی میں زندہ رہتے ہیں۔

رستم، ناصر، شانی اور اجمل وغیرہ کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ خطرات اور آلام چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ قدرت اللہ کے ہرکارے شانی کے خون کی پیاس لے کر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں.....

اس دن شانی نے رستم اور ناصر کی فرمائش پر شملہ مرچ اور قیمہ بنایا۔ یہ ڈش وہ اکثر روکیٹ میں بھی بناتی رہی تھی۔ سب بہت پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بے جی اور چاچا ابراہیم کو بھی یہ پسند تھی۔ شملہ مرچ کی خوشبو جب کچن میں پھیلی تو رستم اور شانی کو وہ دونوں مہربان چہرے بہت یاد آئے۔ بے جی اور چاچا ابراہیم رستم اور شانی کو بھی اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھنے لگے تھے..... ان کے علاوہ نور عباسی، شریف، شریف کے بیٹے، نوبیاہتا جوڑا ساگرا اور چندو، سب محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس دن چھوٹے سے سوئمنگ پول میں تازہ پانی بھرا گیا۔ اجمل اور ناصر نے دیر تک تیراکی کی۔ شام کو ہلکی پھلکی کرکٹ کھیلی گئی۔ اجمل کا نشانہ

واقعی کمال کا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے گیند کے ساتھ درمیانی وکٹ کو ہٹ کر لیتا تھا۔ ''تمہارا نشانہ واقعی اچھا ہے اجمل۔'' ناصر نے تعریف کی۔

''نشانہ تو تمہارا بھی اتنا برا نہیں ناصر بھائی۔'' اجمل نے زری کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

''لیکن نہاتے ہوئے تم ایک نمبر کے گاؤدی لگتے ہو۔ پورا تالاب ہلا دیتے ہو۔ لگتا ہے کہ ایک نہیں سات آٹھ بندے تیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ناصر نے جوابی وار کیا۔

''ایک تو آپ پورا مائنڈ کر لیتا ہے ناصر بھائی۔'' اجمل مسکرایا۔

اسی دوران میں شانی تیزی سے آئی۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی اور کان کے ساتھ موبائل لگا ہوا تھا۔ اس نے اعلان کیا۔ ''لندن سے گریس کا فون ہے۔''

اس موقع پر گریس کے فون نے ان کی خوشی میں اضافہ کیا۔ سب نے گریس کے ساتھ تھوڑی تھوڑی بات کی۔ رستم سے گریس کی بات ذرا طویل تھی۔ گریس کے ساتھ رستم کی آخری ملاقات مری کے نواح میں گورے کے بنگلے میں ہی ہوئی تھی۔ وہ بڑے تشویشناک حالات تھے۔ اسٹیفن وغیرہ رستم کی ٹانگ کا زبردستی آپریشن کرنے والے تھے۔ اس آپریشن میں خطرات بہت زیادہ اور امکانات بہت محدود تھے۔ گریس کو علم ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر اسٹیفن، رستم کے ساتھ کتنا خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا ہے۔ وہ رستم کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی مگر اسٹیفن اس دیوار کو توڑتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

گریس نے اردو آمیز انگلش بولی اور رستم سے اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ خاص طور سے اس کی ٹانگ کے بارے میں سوالات پوچھے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی کہ بالآخر رستم پھر اپنوں کے پاس واپس آ گیا ہے۔ اسے خصوصی مسرت اس بات کی تھی کہ اس وقت بھی رستم اور شانی ایک ساتھ ہیں۔

رستم نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اسے اب اسٹیفن کے مرنے جینے سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ اس کی زندگی سے نکل چکا تھا۔ وہ لندن میں اپنے بیٹے ڈیوس کے ساتھ خوش تھی۔ گریس کے ساتھ بات کر کے رستم نے فون ایک بار پھر شانی کو دے دیا۔ دونوں پھر بات کرنے لگیں۔ رستم نے کن انکھیوں سے شانی کا چہرہ دیکھا۔ گاہے گاہے اس کے چہرے پر شرم کا ہلکا سا عکس ابھر آتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ گریس، رستم کے حوالے سے ہی بات کر رہی ہوگی۔ گریس، شانی کی بے حد مخلص دوست تھی اور دوست ہی نہیں دوپٹا بدل بہن بھی تھی۔ اسی نے شانی کے دل میں پھر سے زندگی کی جوت جگائی تھی اور اسے سمجھایا تھا کہ انسان کے نصیب

میں وہی کچھ ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر حاصل کر لیتا ہے۔ روکیٹ بستی میں شانی اور رستم کی شادی کی جتنی خوشی گریس کو ہوئی تھی، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔

شانی گریس سے باتیں کرتی اور اپنے چہرے کے رنگ چھپاتی کمرے کی طرف چلی گئی۔

......ایک اور رات نے انہیں اپنی نرم گرم بانہوں میں لے لیا۔ وہ دیر تک کھڑکی میں بیٹھے رہے۔ آسمان کو تکتے رہے۔ چاند ننھے منّے تاروں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ اس نے جیسے کوئی طویل دلکش کہانی چھیڑ رکھی تھی جس میں نیلی جھیلوں کا ذکر تھا...... موتیوں سے بنے ہوئے غار تھے اور وادیوں میں ریشم کی طرح بہنے والی ہواؤں کا تذکرہ تھا۔

ایک ایسی کہانی جس میں گرم صحراؤں کے قاتل دن بھی تھے اور برسات کی ایسی راتیں بھی، جن کی رم جھم میں محبت کے لافانی نغمے گونجا کرتے ہیں۔ تارے سن رہے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ رستم اور شانی بھی سنتے رہے، چاند کی کہانی بھی اور ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں بھی۔ پھر انہوں نے کھڑکی بند کر دی اور صرف ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے میں کھو گئے...... گم ہو گئے۔ رستم سوچتا رہا۔ جو کچھ ہو رہا ہے، کیا اس نے کبھی اپنے کسی حسین ترین خیال میں بھی یہ سوچا تھا؟ وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کی زندگی گناہوں میں لتھڑی ہوئی تھی۔ شانی ایک پاکیزہ روح تھی، ایک دیوی تھی...... جس کے پاؤں چھونے کو دل مچلتے تھے اور وہ سرتاپا اس کی بانہوں میں تھی۔

☆======☆======☆

شانی صبح دیر سے اٹھی۔ رستم تب تک سو رہا تھا۔ وہ کروٹ کے بجائے سیدھا لیٹا تھا۔ شانی نے کہیں سن رکھا تھا، پُراعتماد اور مضبوط اعصاب کے مالک لوگ سیدھے سوتے ہیں۔ اس کی چوڑی چھاتی سانسوں کے زیر و بم سے متحرک تھی۔ لمبے بالوں کی کچھ لٹیں اس کی پیشانی پر بکھری تھیں۔ ایک محبت بھری طمانیت اور نرمی تھی اس کے چہرے پر۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی مجرم کا چہرہ ہے۔ وہ بڑی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اسے ڈر لگا کہ کہیں رستم کو اس کی نظر ہی نہ لگ جائے۔ مرحومہ ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ کہا کرتی تھیں، نظر اپنوں کی ہی لگتی ہے۔

اس نے بڑے ہولے سے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس کے پٹ کھول دیئے اور اپنے ریشمی منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل آئی۔ برآمدے میں اس کی نظر سب سے پہلے دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر پڑی۔ اسے یاد آ گیا کہ آج اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پچھلے چار پانچ

روز سے اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج رستم کی تاریخ پیدائش تھی۔ اس تاریخ کا پتا شانی کو رستم کی بڑی بہن آپو زاہدہ سے لگا تھا۔ وہ آج رستم کو چھوٹا سا سرپرائز دینا چاہتی تھی اور اسے خوشی تھی کہ ناصر، اجمل اور ڈولا وغیرہ بھی یہاں موجود ہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق آج کچن میں اجمل خان کا حکم چلنا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ آج وہ خاص افغانی پلاؤ بنائے گا اور اس پلاؤ کو کھانے کے بعد باقی تمام قسم کے پلاؤ ان کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جائیں گے۔ اس کے لیے اجمل کو دنبے کا گوشت درکار تھا۔ اس گوشت کے لیے اس نے کل سے خانساماں کو دوڑایا ہوا تھا۔ خانساماں کے لیے حکم یہ تھا کہ اگر دنبے کا گوشت نہ ملے تو پورا جیتا جاگتا دنبہ لے آئے۔ ناصر نے اس میں اضافہ کیا تھا کہ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم دنبے کی چکی ضرور اُتار کر لے آئے۔ کل کی طرح آج بھی ایک مصروف اور رنگا رنگ دن کی تیاری تھی لیکن شانی اس سے پہلے ایک چکر بازار کا ضرور لگانا چاہتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ رستم کو اس کی سالگرہ پر کوئی بہت اچھا تحفہ دے سکے۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب وہ دوبارہ کمرے میں گئی۔ رستم سکون سے سو رہا تھا۔ اس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ لیا۔ چادر کے نقاب میں چہرے کو مکمل طور پر چھپایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

''اجمل نے پوچھا۔'' خو آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''بس ذرا انارکلی تک۔ ضروری کام تھا۔''

''لیکن آپ اکیلا جائے گا؟''

''کوئی مسئلہ نہیں اجمل۔ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ آج دوپہر کا کھانا ڈھائی تین بجے ہی کھایا جائے گا۔ تب تک واپسی ہو جائے گی۔ اگر تمہارے بھائی پہلے جاگ گئے تو ان سے چائے وغیرہ پوچھ لینا۔''

اجمل نے ٹیکسی گیٹ پر ہی منگوا دی۔ شانی پہلے لبرٹی گئی۔ وہاں سے رستم کے لیے شلوار قمیص کے چند جوڑے خریدے، پھر سالگرہ کے تحفے کے لیے انارکلی چلی گئی۔ یہ ایک خوشگوار دن تھا۔ لاہور کی چہل پہل دل آویز تھی۔ وہ سوچنے لگی، کیا وہ کبھی رستم کے ساتھ آزادانہ ان بارونق بازاروں میں گھوم پھر سکے گی...... جب وہ انارکلی کی ایک معروف دکان میں داخل ہو رہی تھی، اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف خالو اعجاز تھے۔ ان کی آواز میں بہت عجلت تھی۔ ''کہاں ہو شانی بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مم...... میں ذرا بازار میں آئی ہوئی ہوں۔''

"کہاں؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"انار کلی میں۔ خیریت تو ہے ناں خالو جی؟"

"ہاں خیریت ہی ہے۔ میں یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ راوی کا پل پار کر چکا ہوں۔ تمہاری طرف ہی آ رہا ہوں۔ تم ایسا کرو...... تم یہیں پر رہو انار کلی میں...... میں سیدھا تمہارے پاس ہی آتا ہوں انار کلی میں کس جگہ پر ہو تم؟"

"بانو بازار کے بالکل سامنے۔"

"بس ٹھیک ہے، تم ادھر ہی رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔"

"لیکن خالو... بات کیا ہے؟"

"میں آ کر بتاتا ہوں....." اس کے ساتھ ہی لائن میں شور ہوا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شانی پاس ہی ایک چھوٹے سے اسنیک بار میں جا کر بیٹھ گئی۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ خالو اعجاز آدھ پون گھنٹے میں ہی وہاں پہنچ گئے۔ ان کی چوڑی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ انہوں نے شانی کو نہیں پہچانا، وہ خود ہی ان کے پاس چلی گئی۔

"کیا بات ہے خالو جان! آپ گھبرائے ہوئے ہیں۔" شانی نے اپنا نقاب ہٹائے بغیر پوچھا۔

وہ بولے۔ "تمہیں ابھی واپس رنگ والی چلنا ہوگا...... میرے ساتھ۔"

"وہ کیوں؟"

وہ جوش کے ساتھ اس کا بازو دباتے ہوئے بولے۔ "لگتا ہے تیری قسمت بہت زور مار رہی ہے شانی۔ تیرے لیے کامیابی کے دروازے کھل رہے ہیں۔ پتا ہے، آج شام چار بجے رنگ والی میں تم سے ملنے کون آ رہا ہے؟"

"کون آ رہا ہے؟"

"سرفراز قزلباش...... یہ وہ بندہ ہے جس شے کی طرف بھی نظر اٹھاتا ہے، سونا بن جاتی ہے۔ اس سے ملنے کے لیے اہم ترین لوگوں کو بھی ہفتوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جتنا بڑا اس شخص کا نام ہے، اتنا بڑا کردار بھی ہے۔ اپنے پرائے اس کی خدا ترسی اور نیکی کی تعریف کرتے ہیں۔ آج صبح سویرے اس کا فون آیا تھا۔ میں تو فون پر اس کی آواز سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ ہماری حویلی میں سرفراز صاحب کی آواز گونج رہی ہے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ یہاں ہماری حویلی میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر میں کہہ دیتا کہ تم حویلی میں نہیں ہو تو ان کا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ

تم حویلی میں ہی ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ آج شام کی چائے ہمارے ساتھ پئیں گے۔" چوہدری اعجاز کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

"اوہو خالو جی! آپ نے مجھ سے پوچھ تو لینا تھا۔" شانی جز بز ہو کر بولی۔

"اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ ہمیں اب فوراً واپس چلنا ہوگا۔ ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کرنی ہوگی۔ ورنہ ہم سب جھوٹے پڑ جائیں گے۔"

"لیکن خالو....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" انہوں نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ "سرفراز صاحب سے ملنے کے بعد اگر تم واپس لاہور آنا چاہو گی تو میں تمہیں خود چھوڑ جاؤں گا۔ سرفراز صاحب سے ملاقات زیادہ لمبی نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا۔ میرے اندازے کے مطابق رنگ والی میں مشکل سے ایک گھنٹا ٹھہریں گے۔ اس کے بعد انہیں آدھ پون گھنٹا گوجرانوالہ میں رکنا ہے اور پھر لاہور پہنچنا ہے۔"

"مگر خالو! میں نے تو رستم کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ سوئے ہوئے تھے، میں انہیں جگائے بغیر بازار چلی آئی۔"

"اس کی پروا نہ کرو۔ میں نے تم سے بات کرنے کے بعد موبائل پر ہی رستم سے بھی بات کر لی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ ایک ارجنٹ کام کے لیے میں تمہیں واپس رنگ والی لے جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر تفصیل بتا دوں گا۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"پوچھ رہا تھا کہ تم کب واپس آؤ گی۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے کہ شام تک واپسی ہو جائے۔"

"میں ایک بار خود بات کر کے دیکھ لوں۔" شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا موبائل بھی نکال لیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ موبائل کی بیٹری بھی ختم ہے۔

شانی چند لمحے تذبذب میں رہی، پھر اس نے خالو اعجاز سے ان کا موبائل مانگا اور اس کوٹھی کا نمبر ڈائل کرنے لگی جہاں وہ سب رہائش پذیر تھے۔ کئی بار بیل ہوئی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ شانی نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا مگر اس بار بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب مسلسل انگیج کی ٹون آ رہی تھی۔

فون پر ٹرائی کرتے ہوئے وہ خالو اعجاز کے ساتھ ساتھ بھی چل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ خالو اعجاز کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھی تھی۔ کوشش کے باوجود اس کا رابطہ رستم یا اجمل

وغیرہ سے نہیں ہو سکا۔ جو چیزیں اس نے خریدی تھیں وہ پچھلی نشست پر رکھ دیں۔ اس کے دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا، مگر خالو اعجاز کی پریشانی دیکھتے ہوئے وہ کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی۔ اسی دوران میں رنگ والی سے تایا معصوم کا فون بھی آ گیا۔ انہوں نے خالو کے نمبر پر ہی کال کی تھی۔ خالو نے کال ریسیو کر کے فون شانی کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے پوچھا۔ ''شانی بیٹا! کہاں ہو تم؟''

''تایا جی! میں خالو اعجاز کے ساتھ گاڑی میں ہوں اور واپس رنگ والی آ رہی ہوں۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا سی گئی۔

''بہت اچھا کیا تم نے۔ مجھے بھی تم سے یہی کہنا تھا۔ یہ ہم سب کی عزت کا سوال ہے۔ تم لوگ اندازاً کتنی دیر تک پہنچ جاؤ گے؟''

''ابھی تو لاہور سے نکل رہے ہیں تایا جی۔''

''ٹھیک ہے۔ آرام سے آؤ۔ ہائی وے پر جلدی نہیں کرتے۔ پتا چلا ہے مہمان پانچ بجے سے پہلے رنگ والی نہیں پہنچیں گے۔''

''ٹھیک ہے تایا جی۔'' شانی گہری سانس لے کر رہ گئی۔

سب اپنے انداز سے سوچ رہے تھے۔ کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ شانی کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

......قریباً تین گھنٹے بعد خالو اعجاز کی کار دھول اُڑاتی ہوئی رنگ والی میں داخل ہوئی تو کار سے آگے اور پیچھے محافظوں کی ایک ایک جیپ موجود تھی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے پھر بھی اپنے گاؤں کی حدود شروع ہونے سے بہت پہلے شانی نے خود کو اچھی طرح اوڑھنی میں ڈھانپ لیا تھا۔ شانی کو رنگ والی کا نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ گلی کوچوں کی صفائی ہو چکی تھی۔ گلیوں میں دونوں طرف چونے سے لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ جگہ جگہ جھنڈیاں اور آرائشی پنیاں لگائی جا رہی تھی۔ نالیوں کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا... حویلی کے مین دروازے کے سامنے دونوں طرف قناتیں کھڑی کی گئی تھیں اور سرخ دریاں اور قالین وغیرہ بچھائے گئے تھے۔ مہمانوں کی گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے ایک احاطے کو پارکنگ لاٹ کی شکل دے دی گئی تھی۔

علاقے کے لوگ ان تیاریوں میں رضاکارانہ طور پر جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ شانی نے چند نوجوانوں کو دیکھا جو ہائی اسکول کی دیواروں پر رنگ اور برش سے معزز مہمان سرفراز قزلباش کے لیے استقبالیہ نعرے لکھ رہے تھے۔ کچھ سیاسی کارکن جو یقیناً کسی اور

دیہہ سے آئے تھے، سرفراز صاحب کی تصویر والے بڑے بڑے پوسٹر ہموار دیواروں پر چسپاں کرنے میں مصروف تھے۔ اس سے پہلے شانی نے بھی سرفراز قزلباش کی تصویریں اخباروں اور ٹی وی وغیرہ دیکھی تھیں۔ ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ کنپٹیوں سے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر گہری متانت اور سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھی نظر کا چشمہ بھی لگاتے تھے۔ ان کا تعلق ایک مضبوط سیاسی خانوادے سے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ سادہ مزاج ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور باہر کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ عارف کمبوہ سرفراز صاحب کا پُرجوش حامی تھا اور ان کے نظریات کی تائید میں لمبی چوڑی تقریریں کیا کرتا تھا۔

اتنی بڑی شخصیت کی آمد پر رنگ والی کا ہر شخص پُرجوش تھا مگر ان میں سب سے زیادہ پُرجوش یقیناً عارف کمبوہ ہی تھا۔ شانی کی کار رکی اور حویلی میں داخل ہوئی تو عارف دوڑتا ہوا شانی کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بے حد جذباتی آواز میں بولا۔ ''ہم سب بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت اچھا ہوا، آپ ٹھیک وقت پر پہنچ گئی ہیں۔''

چوڑے چکلے سردار دراج نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا اور مہتموں کے مخصوص انداز میں شانی کے لیے نیک خواہشات ظاہر کیں۔ سردار دراج کی خوش مزاج بیوی، ماکھو بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے دہقانی جوش کے ساتھ شانی کا ماتھا چوما اور مقامی رواج کے مطابق شانی کے راستے میں گائے کے کچے دودھ کے چھینٹے دیے۔ سردار دراج اور ماکھو نے اپنے انداز میں شانی کے لیے نکڑی کا لقب استعمال کیا۔ ایک طرف احاطے میں ڈیڑھ دو درجن دیگیں کھڑ کھڑا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے عارف؟'' شانی نے پوچھا۔

''مہمانوں کے استقبال کی تیاری!''

''مہمان آ رہے ہیں یا پوری فوج آ رہی ہے۔ ویسے بھی مہمان کھانے پر تو نہیں آ رہے، چائے پر آ رہے ہیں۔''

''سرفراز صاحب کی جھلک دیکھنے کے لیے علاقے کے بہت سے سرکردہ لوگ یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ بلکہ سو ڈیڑھ سو پہنچ بھی چکے ہیں۔ یہ لوگ سرفراز صاحب کے جانے کے بعد بھی یہاں رکیں گے۔ یہ کھانا ان کے لیے ہے۔'' خالو اعجاز نے وضاحت کی۔

شانی بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے زبردستی ایک کانٹوں بھرے راستے پر گھسیٹا جا رہا ہے...... اور اگر وہ ایک بار اس راستے پر چل پڑی تو واپسی ناممکن

ہو جائے گی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ حویلی کے پرستاروں کا ہجوم، باجے گاجے کا شور، نعروں کی گونج، مسلح محافظوں کے جتھے، اخباری نمائندے، فلیش گنوں کی چمک، ہاں ....

اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چند گھنٹے پہلے کتنی خوش تھی وہ۔ کتنی ہلکی پھلکی، کتنی آزاد، ہر شے سے مسرت پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں دل کو گدگداتی تھیں لیکن ایک دم سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ رنگ والی حویلی کی وارث، وڈی آپا کی بیٹی، چھوٹی چوہدرانی تھی۔ اسے اپنے کندھوں پر منوں وزن محسوس ہوا۔

اسے اب فوری طور پر تیار ہونا تھا۔ نہا کر بھاری بھرکم کپڑے پہننے تھے۔ اپنے جسم پر خاندانی زیور ٹانکنا تھا۔ کندھوں پر ایک زرتار شال لے کر اور کمر کو تختے کی طرح سیدھا رکھ کر چلنا تھا۔ اس کے چاروں طرف خاندان کے بزرگوں کے اونچے اونچے شملے تھے۔

وہ سفر سے تھک گئی تھی۔ ایک کپ چائے پی کر اور چند منٹ لیٹ کر تازہ دم ہونا چاہتی تھی۔ مگر خالو اعجاز بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے اور یوں خاموشی کی زبان میں اسے سمجھا رہے تھے کہ وقت بہت کم ہے۔

شانی کو تیار ہونے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ خالو اعجاز نے دو سفید کاغذوں پر لکھے ہوئے چند نوٹس شانی کو تھما دیئے تھے۔ یہ وہ نکات تھے جن پر شانی کو سرفراز صاحب سے بات کرنا تھی۔ یہ نوٹس حویلی کے خاندانی وکیل اقبال ملک کے تحریر کردہ تھے۔ یقیناً ان کو تیار کرنے میں مزید افراد کی رائے بھی شامل رہی ہو گی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر بھی تھا۔ مثلاً شانی نے سرفراز احمد صاحب کو "سر.... جناب" کہہ کر مخاطب کرنا تھا۔ ان کے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھنا تھا۔ ان کے اٹھنے کے بعد کرسی سے اٹھنا تھا وغیرہ وغیرہ۔

شانی کو یہ ساری ہدایات اور گفتگو کے نکات وغیرہ ناگوار گزر رہے تھے۔ یہ نکات علاقے کے مسائل کے بارے میں تھے۔ شانی ان مسائل کو دوسروں سے بہتر جانتی تھی۔ اس نے کاغذ کو توڑ مروڑ کر ایک دراز میں پھینک دیا۔

چار بجنے میں پانچ دس منٹ ہی باقی تھے جب عارف تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ "کیا بات ہے عارف؟" شانی نے چونک کر پوچھا۔

"سرفراز احمد صاحب نہیں آرہے۔ ان کے پاس وقت کم تھا۔ وہ پچھلے جلسے سے ہی گوجرانوالہ واپس چلے گئے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"بس مجبوری کی بات ہے۔ ان کے سیکرٹری صاحب کا فون آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

سرفراز احمد صاحب رنگ والی ضرور آئیں گے۔ اب وہ نئی تاریخ دیں گے۔ مگر یہ دو تین دن سے زیادہ کی نہیں ہو گی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کل شام ہی دورہ کر لیں۔"

"اوہ گاڈ!" شانی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ باہر ابھی تک باجے اور ڈھول وغیرہ بج رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی، جس شخص نے ابتدا ہی وعدہ خلافی سے کی ہے، اس سے آگے کیا توقع لگائی جا سکتی ہے۔ پتا نہیں کیوں شانی کو پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سرفراز احمد ایک بہت قد آور سیاسی شخصیت ہے، وہ رنگ والی جیسی چھوٹی جگہ پر کیوں آئے گا۔

اسی دوران میں خالو اعجاز کی ستی ہوئی صورت دکھائی دی۔ وہ رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے آرہے تھے، انہوں نے عارف کو کچھ ہدایات دے کر باہر بھیج دیا اور شانی کی طرف بڑھے۔ شانی نے رسٹ واچ دیکھی۔ ابھی چار نہیں بجے تھے۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔ "خالو جی! آپ کے مہمان تو آئے نہیں۔ آپ مجھے لاہور بھجوا دیں۔ وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پھر جب یہاں کا پروگرام پکا ہو جائے آپ مجھے بلوا لیجیے گا۔"

"کیسی بات کر رہی ہو شانی بیٹا! سرفراز صاحب کا پروگرام خدانخواستہ کینسل تو نہیں ہوا ہے۔ بس ذرا وقت تبدیل ہوا ہے۔ ان کے سیکرٹری صاحب کا کہنا ہے کہ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ کل یہاں پہنچیں گے۔"

"مگر یقینی بات تو نہیں ہے نا۔ عارف کہہ رہا تھا کہ دوبارہ پروگرام بننے میں دو تین دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"شانی بیٹا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم سب کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ سرفراز احمد صاحب کا یہاں ہمارے علاقے میں آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان کے استقبال کی پوری تیاری رکھنی چاہیے۔ وہ اس وقت بے حد مصروف ہیں۔ کیا پتا کس وقت اچانک وقت نکال کر یہاں کا دورہ کر جائیں۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہ الیکشن سے پہلے اس علاقے کے ترقیاتی کاموں کے لیے بہت بڑی امداد دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے خالو لیکن ....."

"لیکن کچھ نہیں شانی۔" خالو اعجاز نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ "تم سمجھو کہ تم ہم سب کے لیے اور اس علاقے کے ہزاروں لوگوں کے لیے جو تمہیں چاہتے ہیں، دو تین روز کی قربانی دے رہی ہو۔"

شانی نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بے قراری سے دائیں بائیں ٹہلتی رہی۔ پھر میں

فون کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب ایک دو روز تک واپس نہیں جا سکے گی مگر وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ رستم کو صورتِ حال کی اطلاع دے دیتی۔ اس نے فون اٹھایا اور دل مسوس کر رہ گئی۔ لائن ایک بار پھر خراب تھی۔

موبائل فون اس کے پاس موجود تھا مگر اس کی بیٹری ختم تھی اور چارجر لاہور میں ہی رہ گیا تھا۔ بیٹری ہوتی بھی تو یہاں رنگ والی سے بذریعہ موبائل لاہور یا گوجرانوالہ رابطہ کرنا خاصا دشوار ہوتا تھا۔ پھر بھی ایک موہوم امید کے سہارے وہ خالو اعجاز کے موبائل کے ذریعے ٹرائی کرتی رہی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے رسنے لگے۔ جو چیزیں وہ رستم کے لیے لے کر آئی تھی، وہ یہاں وہاں کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ اس دوران میں آہٹ ہوئی اور آپو زاہدہ ہولے سے اندر آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ انہوں نے پیار سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تو اتنی پریشان کیوں ہے شانی! افسوس تو سب کو ہوا ہے، پر کوئی بات نہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو دن میں یہاں ضرور آئیں گے۔ اصل میں بڑے لوگوں کی پسوڑیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔'' انہوں نے اپنی طرف سے شانی کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں آپا! یہ بات نہیں ہے۔''

آپو زاہدہ دھیان سے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر جہاں دیدہ انداز میں بولیں۔ ''اچھا میں سمجھ گئی..... تجھے لاہور سے ایک دم یہاں واپس آ جانے کا افسوس ہوا ہے۔ وہاں تیری سہیلی کا سارا پروگرام بھی الٹ پلٹ ہو گیا ہوگا۔''

شانی خاموش رہی۔ درحقیقت خالو اعجاز کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ شانی لاہور میں کہاں اور کیا کرنے گئی تھی۔ تایا معصوم اور عارف وغیرہ بھی بے خبر تھے۔ سب کو بس یہی معلوم تھا کہ وہاں لاہور میں شانی کے کالج کے زمانے کی ایک دیرینہ سہیلی بیاہی ہوئی ہے۔ وہ عرصے سے خواہش رکھتی تھی کہ شانی لاہور آئے اور چند روز اس کے پاس ٹھہرے۔ اب اس کے دیور کی شادی بھی تھی۔ شانی نے اس شادی پر آنے کا وعدہ کر رکھا تھا لہٰذا اسے جانا پڑا۔

آپو زاہدہ نے بڑے لاڈ سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر واپس جانا زیادہ ضروری ہے تو چلی جاؤ۔ جب مہمانوں کے آنے کا پروگرام پکا ہو جائے گا تو چوہدری اعجاز صاحب تمہیں پھر واپس لے آئیں گے۔''

''وہ نہیں مانتے۔'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سب کو بس مہمانوں کی ہی پڑی ہوئی ہے۔'' شانی نے نمناک لہجے میں کہا۔

''تو پھر سہیلی کو فون کر لو۔ اس کا دل بھی دکھا ہوگا۔ کیا نام ہے اس کا؟''

شانی نے چونک کر آپا زاہدہ کی طرف دیکھا..... ایک بار تو دل چاہا کہ آپا زاہدہ کو اس سہیلی کا نام بتا ہی دے۔ اس دکھی بہن کو بتا ہی دے کہ اس کا بھائی زندہ ہے۔ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا شوہر بھی ہے..... اور وہ اسی سے مل کر اور اسی کی محبت کی نہایت گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر آ رہی ہے۔ وہ اسے سب کچھ بتا دے اور اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دے۔ اسے وہ راحت دے جو اسے زندگی کی آخری سانسوں تک یاد رہے لیکن..... وہ رستم سے وعدہ کر کے آئی تھی کہ ابھی آپا زاہدہ اور بھائی اکرام کو کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اس وعدے کا پاس کرنا چاہتی تھی۔

اچانک حویلی سے باہر بہت سا شور سنائی دیا۔ شانی نے اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ یہ بہت سے مفلوک الحال لوگ تھے۔ ان میں ویران چہروں والے مرد تھے۔ عورتیں تھیں جنہوں نے اپنی گود میں ننگ دھڑنگ بچے اٹھا رکھے تھے۔ کچھ لوگوں کے سروں پر سامان کی گٹھڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

خادم حسین نے اندر آ کر بتایا۔ ''چھوٹی بی بی! یہ ہڑ (سیلاب) کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ امداد چاہتے ہیں۔''

''ہمیں واقعی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے..... مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''نقد امداد بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ راشن، کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں۔ ان میں سے کچھ لوگ زیادہ دکھی ہیں اور یہ وہ ہیں جن کے گھر کا کوئی فرد مارا گیا ہے یا لاپتا ہے۔''

شانی بے تاب ہو گئی۔ اس کا دل چاہا کہ حویلی میں اس وقت جو کچھ بھی ہے ان لوگوں میں بانٹ دے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کسی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پھر اسے ایک پرانی بات یاد آئی۔ کئی برس پہلے بھی اسی طرح ایک بار برسات میں نہر کی پٹڑی ٹوٹی تھی۔ بیس تیس افراد مارے گئے تھے، سینکڑوں بے گھر ہوئے تھے۔ مال مویشی کا بھی بے شمار نقصان ہوا تھا۔ ان دنوں شانی کی والدہ وڈی آپا زندہ تھیں۔ انہوں نے شانی کے والد اور بڑے وکیل صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد ایک فنڈ بنایا تھا جس میں لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا اور کپڑے کے انبار لگ گئے تھے۔ شانی کی والدہ نے اپنا بہت سا زیور بھی اس فنڈ میں ڈال دیا تھا۔

شانی کے ذہن میں یہ ساری باتیں گردش کرنے لگیں۔ اس کی یہ سوچ بناوٹی نہیں تھی۔

اس کے اندر سے آواز آتی تھی کہ وہ اپنی مرحومہ والدہ کے نقشِ قدم پر چلے۔

اچانک حویلی کے باہر برپا شور میں اضافہ ہوگیا۔شور کا آہنگ بھی بدل گیا۔یوں لگا کہ کچھ لوگ رو پیٹ رہے ہیں۔شانی ایک بار پھر تڑپ کر اٹھی۔اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ سیلاب زدہ لوگوں کے ایک گروہ نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔چارپائی پر ایک انسانی جسم تھا جس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔یہ جسم یقیناً مُردہ تھا۔چارپائی کے اردگرد موجود لوگوں کے چہرے غصے سے تمتما رہے تھے۔ان میں سے کچھ عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔یہ کس کی لاش تھی؟ شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ کسی مہتم کی لاش ہے۔چارپائی کے اردگرد بھی سانولی رنگت والے مہتم ہی نظر آ رہے تھے۔پھر شانی نے عارف کمبوہ کو دیکھا۔ وہ لوگوں کے درمیان چلا گیا اور انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔لوگوں کا غیظ و غضب قدرے ماند پڑتا ہوا محسوس ہوا تاہم وہ بدستور احتجاج کر رہے تھے۔کچھ دیر بعد خالو اعجاز پریشان چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

وہ چھوٹتے ہی بولا۔''اسی لیے کہتا ہوں نا شانی! کہ ہمیں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کا یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔اگر ہم کمزور ہوں گے تو ہمارے دشمن آگے بڑھ بڑھ کر وار کریں گے۔وہ ہر وقت ہمیں چھوٹے بڑے جھٹکے دیتے رہیں گے۔''

''یہ باہر کیا ہوا ہے خالو؟'' شانی نے پوچھا۔

''ڈپٹی ریاض نے اپنی طاقت شو کی ہے۔'' خالو اعجاز گہری افسردگی سے بولے۔

''کیا مطلب خالو؟''

''مہتم برادری کے ایک بندے کو پھڑکا دیا ہے، شاد پور کے سب انسپکٹر طفیل نے اور تمہیں شاید معلوم نہ ہو، طفیل اسی ڈپٹی ریاض کا رشتے دار ہے اور دیکھو مارا بھی کس بندے کو ہے۔یہ سردار دراج کا چھوٹا بھائی بادل ہے۔'' شانی نے کھڑکی سے نیچے نگاہ دوڑائی۔اسے سردار نظر آیا جو چارپائی سے لپٹ کر زار زار رو رہا تھا۔

''لیکن اس بندے نے کیا کیا ہے؟''

''اس پر پولیس نے الزام لگایا ہے کہ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیلاب زدہ علاقے میں لوٹ مار کر رہا تھا۔یہ لوگ گھروں سے قیمتی چیزیں نکال رہے تھے۔پولیس نے للکارا تو انہوں نے جوابی فائرنگ کر دی۔باقی بھاگ گئے۔یہ مارا گیا۔وہی گھڑی گھڑائی کہانی۔''

چوہدری اعجاز کی آواز طیش سے کانپ رہی تھی۔

''یہ تو ظلم ہے۔جمشید بھی اسی طرح جھوٹے پولیس مقابلے میں مار دیا گیا تھا۔'' شانی

کراہی۔

''اصل بات سنو گی تو تمہیں اور زیادہ دکھ ہوگا۔'' چوہدری اعجاز نے کہا۔''سب انسپکٹر طفیل نے جس وقت بادل کو گولی ماری، وہ سادے کپڑوں میں تھا اور آن ڈیوٹی بھی نہیں تھا۔ وہ آج کل کسی وجہ سے معطل ہے۔یہاں اپنے سسرال آیا ہوا ہے۔گولی بھی پرائیویٹ ریوالور سے ماری گئی ہے۔''

شانی کو اس تانے بانے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر اس کا دل غم سے ضرور بھر گیا تھا اور اسے خالو اعجاز کی یہ بات بھی غلط نہیں لگ رہی تھی کہ اس کارروائی کے پیچھے ریاض ہٹلر کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔چند روز پہلے ریاض ہٹلر نے فون پر شانی سے نہایت زہریلی گفتگو کی تھی اس کی گونج ابھی تک شانی کے کانوں میں تھی۔باہر لوگوں کا واویلا بڑھتا جا رہا تھا۔شانی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئی۔اسے اپنے دل و دماغ پر بہت بھاری بوجھ محسوس ہوا۔ان لمحوں میں اسے وہ سب کچھ بھول گیا جو تھوڑی دیر پہلے اسے بے حد اداس کر رہا تھا۔رستم، ناصر، اجمل خان، زری اور ان کے دلچسپ پروگرام سب کچھ وقتی طور پر اس کے ذہن سے نکل گیا۔وہ بڑے مضبوط قدم اٹھاتی ہوئی ان لوگوں کے سامنے پہنچ گئی جو اس سے اپنا دکھ بیان کرنے آئے تھے۔جنہوں نے پتا نہیں کیوں اس سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں۔مرنے والوں کے لواحقین نے شانی کو دیکھا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔سردار دراج اَشک بار آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا۔

☆======☆======☆

رستم بارہ بجے کے قریب جاگا تھا۔ایک چمکیلا دن اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا۔وہ کتنی ہی دیر تک بستر پر لیٹا گزشتہ شب کی نیرنگیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔بی بی اسے کہیں نظر نہیں آئی......وہ شاید کچن میں چلی گئی تھی یا پھر زری کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اتنے میں اسے اجمل خان نظر آیا۔اس کے منہ میں نسوار دیکھ کر رستم ذرا سا چونکا۔شانی کے ہوتے ہوئے اجمل نسوار رکھنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔تو کیا شانی گھر میں موجود نہیں تھی؟

رستم کے پوچھنے سے پہلے ہی اجمل بول پڑا۔''وہ انارکلی تک گئی ہیں۔کہتی ہیں کہ کھانے سے پہلے آجاؤں گی۔خو، آپ نے چائے مائے پینا ہے تو بتا دیں۔''

''انہوں نے بتایا نہیں تھا، کیا کام ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''نہیں۔وہ بہت جلدی میں تھا۔کہتا تھا کہ ام کھانے سے پہلے لوٹ آئے گا۔''

''تم نے کسی کو ساتھ بھیج دینا تھا۔''

”ام نے پوچھا تھا مگر وہ اکیلا جانا چاہتا تھا۔“

رستم سوچنے لگا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ کیا کوئی ایسا کام تھا جو وہ اس کو بھی نہیں بتانا چاہتی تھی؟ قریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اجمل نے فون اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی مدھم سے شکن ابھری۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر رستم سے کہا۔ ”چوہدری اعجاز صیب کا کال ہے۔“

رستم نے کال ریسیو کی۔ چوہدری اعجاز موبائل فون سے بات کر رہے تھے اور غالباً گاڑی میں تھے۔ ”ہیلو رستم! میں اعجاز بول رہا ہوں۔“ انہوں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

”ہاں جی۔ کہیں، خیریت تو ہے؟“

”دراصل رنگ والی میں ایک ایمرجنسی ہے۔ کچھ بہت اہم لوگ آ رہے ہیں۔ شانی کا رنگ والی جانا ضروری ہوگیا ہے۔ ابھی میں اس کو وہیں سے واپس لے جا رہا ہوں لیکن پریشانی کی بات نہیں۔ میں اسے رات تک یا کل صبح تک واپس چھوڑ جاؤں گا۔“ چوہدری اعجاز نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے جی! اگر وہ جانا چاہتی ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن وہ خود فون کر لیتیں تو......“

”چلو اگر میری بات سے تسلی نہیں ہوئی تو وہ بھی کر لے گی۔ بلکہ کہتے ہو تو اسے اجازت دلوانے کے لیے تمہارے پاس لے آتا ہوں۔“ کوشش کے باوجود چوہدری اعجاز کے لہجے میں ہلکی سے تپش داخل ہوگئی۔

”نہیں، میں نے یہ کب کہا ہے۔“

”اچھا خدا حافظ!“ چوہدری اعجاز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رستم کے سینے میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ اسے چوہدری اعجاز کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس سے پہلے بھی چوہدری اعجاز نے جو باتیں کہی تھیں، وہ رستم کے سینے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ خیر اس وقت تک تو چوہدری اعجاز کو شانی اور رستم کی شادی کا علم نہیں تھا۔ اب تو وہ جان چکا تھا کہ شانی اور رستم ازدواجی بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ اسی دوران میں چوہدری اعجاز کا فون پھر آگیا۔ ایک جھنجلاہٹ سی رستم کے رگ و پے میں دوڑی اور اسی جھنجلاہٹ کی وجہ سے اس نے چوہدری اعجاز کا پھر سے آنے والا فون ریسیو نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ بی بی جانے سے پہلے فون پر اس سے رابطہ کریں گی اور جب رابطہ نہیں ہو سکے گا تو وہ یہاں آئیں گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سہ پہر ہوگئی اور پھر شام...... مگر بی بی نہیں آئیں۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ وہ اپنی ایمرجنسی کی وجہ سے اپنے خالو کے ساتھ رنگ والی واپس چلی گئی ہیں۔

کل تک جس چاردیواری میں قہقہے گونج رہے تھے اور نت نئے پروگرام بن رہے تھے، وہ ایک دم اداس ہوگئی تھی۔ سب بجھ سے گئے تھے۔ اجمل خان کو دنبے کا گوشت مہیا ہوگیا تھا مگر اس نے گوشت ریفریجریٹر میں رکھوا دیا۔ آج کسی نے کرکٹ بھی نہیں کھیلی۔ سب سے زیادہ اداس زری تھی۔ وہ ان دنوں میں شانی کے ساتھ بہت مانوس ہوگئی تھی۔

اگلے روز دس بجے تک بھی شانی کا فون نہیں آیا اور نہ کسی اور طرح اس نے رابطہ کیا۔ اجمل آتے جاتے کئی بار فون کا ریسیور اٹھا کر یہ جانچ چکا تھا کہ لائن ٹھیک کام کر رہی ہے یا نہیں۔ زری آلتی پالتی مارے قالین پر بیٹھی تھی اور ٹی وی پر کارٹون دیکھ کر دل بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس نے ٹی وی کی طرف سے رخ پھیرا اور ناصر سے پوچھا۔

”شانا! کب آئے گا؟“

ناصر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”لو جی...... یہ نئی مصیبت پڑ گئی ہے۔“

”نئی مصیبت؟“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”پرانا مصیبت کیا تھا؟“

”پرانی مصیبت یہ تھی کہ تم خود کو مرد سمجھتی ہو اور اپنے بارے میں مردوں کی طرح بولتی ہو۔ میں کھاتا ہوں...... میں جاتا ہوں...... میں سوتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب نئی مصیبت یہ ہے کہ تم نے شانی بی بی کو شانا کہنا شروع کر دیا ہے۔“

ڈولا بولا۔ ”کل یہ شادی کو شادا کہہ رہی تھی اور روٹی کو روٹا کہہ رہی تھی۔“

”دراصل تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے شانی بی بی واپس گئی ہیں۔“ ناصر نے ہولے سے اس کا کان کھینچتے ہوئے کہا۔ ”شانی بی بی چاہتی تھیں کہ تم اپنے بارے میں مردوں کی طرح نہ بولو۔ انہوں نے تم سے کتنا سر کھپایا اس بات پر۔“

”اب میں کب بولتا ہوں...... مم میرا مطلب، بولتی ہوں۔“

”تم بولتی ہو۔ ہاں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا ہے لیکن اس فرق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تم نے روٹی کو روٹا اور سیڑھی کو سیڑھا کہنا شروع کر دیا ہے۔“

”اس کے اندر کوئی ٹیکنیکل پالٹ (فالٹ) ہے ناصر صیب۔“ اجمل نے روانی میں کہا۔

ناصر نے برا سا منہ بنایا۔ ”خیر ٹیکنیکل پالٹ تو تمہارے اندر بھی ہے اجمل خان۔“

اس سے پہلے کہ اجمل کوئی کرارا سا جواب دیتا، بیرونی گیٹ پر کال بیل بولی۔ سب

کے چہرے سے چمک اٹھے۔ زری کی آنکھوں میں روشنی نمودار ہوئی۔ وہ پُر امید لہجے میں بولی۔ ''شانا باجی۔ ...نن نہیں شانی باجا آئی۔''

رستم نے ڈولے کی طرف دیکھا۔ اس کی حسیات شاید کوئی اور اشارہ دے رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر خوشی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اجمل نے خود دوڑ کر دروازہ کھولا۔ غیر متوقع طور پر سامنے حویلی کا ملازم خادم حسین نظر آیا۔ وہ ''السلام علیکم'' کہتا ہوا اندر آ گیا۔

''خیریت سے آئے ہو خادم حسین؟'' رستم نے پوچھا۔

''جی ہاں...... میں چھوٹی بی بی کا سامان لینے آیا ہوں۔''

''سامان لینے؟ کیا مطلب؟'' اجمل نے حیرانی سے کہا۔ ''بی بی کو تو آج واپس آنا ہے۔''

''نہیں، وہ نہیں آ رہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اس کا پتا تو ان کو ہو گا جی۔ اصل میں لاہور سے کچھ بڑے لوگ رنگ والی آنے والے ہیں۔ انہوں نے کل آنا تھا۔ ان کے استقبال کی پوری تیاری بھی ہو چکی تھی۔ مگر وہ کسی وجہ سے آ نہ سکے۔ اب شاید وہ ایک دو روز کے اندر آئیں گے۔ چھوٹی بی بی ان کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''کیا سارا سامان لے جانا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ چوہدری اعجاز صاحب نے یہی کہا ہے۔''

رستم کے سینے میں ایک بار پھر ایک ناگوار سی لہر سی دوڑی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ خادم حسین شانی کا سامان لے کر چلا گیا۔ وہ سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے جو اجمل، ناصر وغیرہ نے اگلے چند روز کے لیے بنائے تھے۔ رستم کو یوں لگا جیسے اردگرد کی ہر شے کو گہری اداسی نے ڈھانپ لیا ہے۔ اتنی طویل اور کٹھن جدائی کے بعد اتنی مختصر ملاقات...... ابھی تو...... وہ جی بھر کر اس چہرے کو دیکھ بھی نہ سکا تھا جس کی جدائی مارگہ بستی کی طویل یخ بستہ راتوں میں اسے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپاتی تھی۔

شام تک وہ سب اسی انتظار میں رہے کہ شاید شانی یا خالو اعجاز کی طرف سے کوئی فون آئے گا مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ناصر نے ایک ٹی وی چینل پر پنجاب کے کچھ دیہاتی علاقوں میں نامور سیاست دان سرفراز احمد قزلباش کی مصروفیات دیکھیں۔ خبروں میں بتایا گیا کہ سرفراز احمد آئندہ الیکشن کے لیے اپنے ووٹروں کو متحرک کرنے کے لیے وسطی علاقوں کا

طوفانی دورہ کر رہے ہیں۔ تصویری جھلکیوں میں ان کی گاڑیوں کے قافلے کے گرد، دھول اُڑاتے لوگوں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا تھا۔ لوگ اپنے محبوب قائد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دیوانہ وار اُمڈ آئے تھے۔

شانی کا یوں اچانک لاہور سے چلے جانا رستم کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر وہ چلی ہی گئی تھی تو اسے کم از کم رابطہ تو ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اگر حویلی کا ٹیلی فون خراب تھا تو شانی کسی اور طریقے سے رابطہ کر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو پرانے ملازم خادم حسین کے ذریعے ہی کوئی پیغام بھیج دیتی۔

رستم نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اجمل بہ دستور اس کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ شانی اور چوہدری اعجاز کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے کے بعد وہ فون سیٹ کے سامنے بیٹھ جاتا اور نمبر پریس کرنے لگ جاتا۔ یہ اگلے روز سہ پہر کی بات ہے، وہ ایک دم بلند آواز میں رستم کو پکارنے لگا۔ ''رستم بھائی...... جلدی آئیں...... فون مل گیا ہے...... بیل جا رہا ہے۔''

رستم نے آگے بڑھ کر ریسیور تھاما۔ بیل جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد مدھم سے شور کے ساتھ چوہدری اعجاز کی آواز سنائی دی۔ یہ چوہدری اعجاز کا ہی موبائل نمبر تھا۔ ''ہیلو! چوہدری اعجاز بول رہا ہوں۔''

''میں لاہور سے رستم بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں رستم، کہو کیا بات ہے؟'' قدرے نرم لہجے میں کہا گیا۔

''میں کافی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ لائن ہی نہیں مل رہی تھی۔ میں شانی سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ چوہدری اعجاز دوبارہ بولے تو ان کی آواز میں تپش تھی۔ وہ کہنے لگے۔

''یار! تمہیں کہا تو تھا کہ وہ مصروف ہے۔ جونہی وقت ملا، وہ تمہیں فون کرے گی۔''

''مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ بس ایک منٹ کے لیے انہیں بلا دیں۔'' رستم نے بھی خشک لہجے میں کہا۔

''کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ اس وقت نہیں آ سکتی۔ تم نے جو بھی ضروری بات کرنی ہے، مجھ سے کہہ دو۔ میں اس تک پہنچا دیتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز کی آواز میں جھنجلاہٹ اور عجلت تھی۔ تاہم وہ دھیمے سُر میں بول رہا تھا۔

اسی دوران میں رستم کو کچھ فاصلے سے شانی کے ہنسنے اور کسی سے بات کرنے کی آواز آئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مہمانوں میں گھری ہوئی ہے۔ وہ چوہدری اعجاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں نے کہا ہے نا صرف شانی سے بات کرنی ہے، آپ اسے بلا دیں۔ میں ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔“ وہ اپنے طیش کو سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

”شانی اس وقت یہاں نہیں ہے۔“

”وہ یہیں ہیں۔ مجھے ان کی آواز آ رہی ہے۔“

”میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”تو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”یار! تم کس نسل کے بندے ہو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ......“

”دیکھیں چوہدری اعجاز! آپ منہ سنبھال کر بات کریں۔ میں کسی غیر سے نہیں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”بیوی ہونے یا نہ ہونے کی باتیں تو بعد کی ہیں۔ فی الحال تم اپنی ٹرٹر بند کرو۔“ چوہدری اعجاز نے جیسے پھٹ کر کہا اور فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

رستم کا جسم جیسے بخار میں پھنکنے لگا۔ چوہدری اعجاز سے چند دن قبل ہونے والی پہلی ملاقات میں ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ صورتِ حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔ چوہدری اعجاز اور رنگ والی کے دیگر چوہدری، شانی کو سونے کی چڑیا سمجھنے لگے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اپنی پُرکشش شخصیت کے سبب وہ تیزی سے شہرت حاصل کر رہی ہے۔ ”شانی بی بی اسپتال“ پورے علاقے میں مشہور ہو رہا ہے اور اس کی نئی نئی شاخیں کھل رہی ہیں۔ انسانوں کا ایک جم غفیر ہے جو شانی سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے...... اور اب سیاست کے میدان میں شانی کے لیے شاندار کامیابی کے راستے کھل گئے تھے۔ یہ بڑے بڑے چوہدری اپنے اندرونی اختلافات بھلا کر اب شانی کے گرد جمع ہو گئے تھے...... اور اسے ایک پل بھی نظروں سے اوجھل رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

چوہدری اعجاز کے لب و لہجے نے رستم کو ہیجانی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ اس سے پہلے وہ شانی کے فون کا انتظار کر رہا تھا مگر اب اس نے خود اجمل سے کہا کہ وہ شانی کے موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اجمل خان نے رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ وقفے وقفے سے تقریباً دو گھنٹے تک نمبر ڈائل کرتا رہا۔ آخر ایک بار قسمت نے یاوری کی اور شانی کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اجمل کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور اس نے ریسیور تیزی سے

رستم کی طرف بڑھا دیا۔ چند سیکنڈ بعد شانی کی مدھم ہیلو سنائی دی۔ پس منظر میں باجے گاجے کا شور تھا۔ پٹاخے چل رہے تھے...... اور نعرے لگ رہے تھے۔

”ہیلو... میں رستم بول رہا ہوں۔“ رستم نے بلند آواز میں کہا۔

”ہیلو رستم! میں اس وقت مصروف ہوں۔ بعد میں فون کروں گی۔“ شانی کی آواز شور میں سے نکل کر بہ مشکل رستم کے کانوں تک پہنچی۔

”ہیلو... ہیلو!“ رستم نے دو تین بار کہا مگر شانی فون بند کر چکی تھی۔

رستم نے گہری مایوسی کے عالم میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

غیر معمولی مسرت کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد غیر معمولی دکھ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اسے لگ رہا تھا کہ جو بدمزگی بھی پیدا ہوئی ہے، وہ چوہدری اعجاز وغیرہ کی وجہ سے ہے، مگر اب محسوس ہونے لگا کہ شاید شانی بھی کچھ کاموں کو زیادہ اہمیت دے رہی ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ خادم حسین بی بی کا سامان یہاں سے لے کر گیا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ مرضی شانی بی بی کی بھی شامل ہوگی۔ سامان واپس منگواتے ہوئے انہوں نے از خود رستم سے بات کرنا ضروری کیوں نہ سمجھا۔

سخت پریشانی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا... کوئی شدید مجبوری ہی ہوگی ورنہ بی بی اس طرح فون بند نہ کرتیں۔ کال کرتے ہوئے پس منظر میں جو سخت شور سنائی دے رہا تھا، وہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا تھا کہ شاید سرفراز احمد اور دیگر معزز مہمان رنگ والی پہنچے ہوئے تھے۔ بہرحال... جو کچھ بھی تھا چوہدری اعجاز کا رویہ رستم کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔

رستم اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے اجمل اور ناصر کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اب ان میں سے کوئی رنگ والی فون نہیں کرے گا۔ جب شانی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی فون کریں گی تو پھر ان کے فون کا انتظار کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ کمرے میں آ کر لیٹا نہیں تھا بلکہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ ذہن مسلسل شانی میں الجھا ہوا تھا۔ شانی سے محبت میں وہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ اس حوالے سے کوئی منفی بات اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ عشق کا وہ درجہ تھا کہ جہاں ایک فریق رات کو دن کہے تو دن ماننا پڑتا ہے۔ یہاں اپنی کوئی مرضی، اپنی کوئی رائے باقی ہی نہیں رہتی۔ سب کچھ اپنے محبوب کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے۔ رستم خود کو ملامت کرنے لگا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر اس کے دل میں شانی کے حوالے سے الجھن کیوں پیدا ہوئی۔ شانی بی بی جو کریں گی ٹھیک کریں گی۔ اگر اپنا سامان واپس لے جاتے

ہوئے انہوں نے اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تو اس میں بھی کوئی مصلحت یا مجبوری ہوگی۔

وہ بستر پر لیٹ گیا اور اپنا دھیان موجودہ حالات کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن بستر پر لیٹ کر تو موجودہ حالات مزید شدت سے یاد آنے لگے۔ بستر اسے ایک ویرانہ محسوس ہوا۔ کمرے کے ہر شے میں بی بی کی جھلک نظر آنے لگی۔ بی بی کی سرگوشیاں، بی بی کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ چوڑیوں کی چھن چھن اسے اپنے کانوں کے بالکل قریب محسوس ہوئی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر باغیچے میں نکل آیا۔ باغیچہ بھی اداس تھا۔ ہر شے جیسے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بس ایک شخص کے چلے جانے سے حدِ نگاہ تک نظر آنے والی ہر چیز اداس ہوگئی تھی۔

وہ باغیچے میں چکراتا رہا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے خود سے سوال کیا۔ ''اتنی سی خوشی......بس اتنی سی؟'' اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ یہ سخت زخمی مسکراہٹ تھی۔

☆======☆======☆

شانی رنگ والی حویلی میں تھی۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ ڈھول تاشے بج رہے تھے، آتش بازی ہو رہی تھی۔ حویلی کی شاندار نشست گاہ میں سرفراز احمد قزلباش اپنے معزز ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ ان کی میزبانی علاقے کی معزز ترین شخصیات کر رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم بی بی تھیں۔

اتنے اہم شخص کو اپنے رُوبرو دیکھ کر شانی پہلے تو مرعوب ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ سنبھل گئی تھی۔ اب وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔

سرفراز احمد نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''ہم آپ کو دیکھ کر حیران ہوئے ہیں۔ ہم نے سمجھا کہ آپ چوہدرانی جی کی بیٹی ہیں مگر آپ تو خود چوہدرانی نکلیں۔''

''جی۔ والدہ اور والد کی وفات کے بعد یہ ذمے داریاں مجھے سنبھالنا پڑیں۔''

''اور ہمارا خیال ہے کہ آپ بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رہی ہیں۔ ہم نے علاقے کے لوگوں میں جو جوش و خروش دیکھا ہے اس سے آپ کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔''

''بس یہ اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو خود کو کسی قابل نہیں سمجھتی۔'' شانی نے سادگی سے کہا۔

''آپ کے بنائے ہوئے اسپتال نے بہت نام پایا اور تھوڑے وقت میں کافی ترقی بھی کی ہے۔ ہم آپ کا اسپتال دیکھنا چاہتے ہیں مگر وقت کم ہے پھر کبھی چکر لگائیں گے۔''

ڈاکٹر بہروز بھی میزبانوں میں موجود تھے۔ شانی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیں ڈاکٹر بہروز۔ دراصل یہی اس اسپتال کو چلا رہے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کو جو بھی بہتری نظر آتی ہے، وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔''

ڈاکٹر بہروز اور سرفراز احمد کے درمیان اسپتال کے حوالے سے کچھ دیر بات ہوئی۔ سرفراز احمد نے یہ عندیہ ظاہر کیا کہ وہ اس اسپتال کے لیے فنڈز کا اہتمام کریں گے اور صحت کے اس منصوبے کو خاطر خواہ وسعت دی جائے گی۔ اس کے بعد علاقے میں مختلف ترقیاتی کاموں کے بارے میں بات ہوئی۔ سرفراز احمد سادگی سے بات کر رہے تھے۔ اتنی اہم شخصیت ہونے کے باوجود ان میں بناوٹی رعب داب نہیں تھا۔

گفتگو کے آخر میں انہوں نے اس بات پر دلی معذرت کی کہ وہ تین دن پہلے پروگرام کے مطابق رنگ والی نہیں پہنچ سکے جس کی وجہ سے میزبانوں کے ساتھ ساتھ دیگر ہزاروں لوگوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ پھر ایک دم جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ انہوں نے شانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں خبر ملی ہے کہ اس دن یہاں آپ کی حویلی کے سامنے کچھ لوگوں نے مظاہرہ بھی کیا۔ شاید کسی بندے کو گولی لگ گئی تھی۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ایک بندے کی موت ہوئی ہے، دوسرا زخمی ہوا ہے۔ اس کو پولیس گردی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''کیا آپ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟'' سرفراز احمد نے پوچھا۔

شانی تو پہلے ہی کسی ایسے سوال کی منتظر تھی۔ دراج کے بھائی کی ہلاکت نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔ اس نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ قصوروار سب انسپکٹر کے خلاف پرچہ درج کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر پرچہ درج نہ ہوا تو وہ عدالت سے آرڈر لے کر پرچہ کٹوائیں گے۔

سرفراز احمد نے یہ ساری بات بڑے دھیان سے سنی۔ ان کی آنکھوں میں معاملہ فہمی کی چمک تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''آپ اس معاملے میں جلدی نہ کریں اور یقین رکھیں کہ مجرم کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ ہم اس سارے معاملے کو خود دیکھتے ہیں اور تین دن کے اندر ہی آپ سے دوبارہ رابطہ کرتے ہیں۔''

''لیکن ایف آئی آر لکھوانے میں جتنی دیر ہوگی، کیس کمزور پڑے گا۔'' شانی نے کہا۔

''اس کی فکر آپ نہ کریں۔ اگر واقعی یہ کیس بن رہا ہے تو پھر ہم اسے کمزور نہیں ہونے دیں گے۔ دراصل ہمیں اس سارے معاملے میں سازش کی بُو آ رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے

کہ اس میں ڈپٹی ریاض کا نام بھی آ گیا ہے۔ ہم اس معاملے کی تحقیق کر لیں پھر آپ کو تفصیل بتائیں گے۔“

شانی چونک کر سرفراز احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دور اندیشی کی بہت گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ ایک بڑے دل و دماغ کا حامل شخص محسوس ہوتا تھا۔

اہم معاملات تو پہلے ہی طے ہو چکے تھے، اس میٹنگ میں یہ رسمی اعلان بھی کر دیا گیا کہ شانی ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے آئندہ الیکشن میں حصہ لے گی۔ تاہم اسے سرفراز احمد کی سیاسی پارٹی کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی اور اس کی انتخابی مہم کو ہر طرح سپورٹ کیا جائے گا۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ معزز مہمان حویلی سے واپس روانہ ہو گئے۔ ایک بار پھر وہی شور قیامت برپا ہوا۔ نعروں کی گونج سے رنگ والی کے در و دیوار لرزنے لگے۔ مہمانوں کی آمد کے موقع پر گلاب کی جو سینکڑوں من پتیاں نچھاور کی گئی تھیں، ان سے رنگ والی کے گلی کوچے ابھی تک سرخ نظر آ رہے تھے۔ اس ہنگامے سے فارغ ہونے کے فوراً بعد شانی کا دھیان اس فون کال کی طرف گیا جو سرفراز احمد کی آمد کے بعد اس کے سیل فون پر آئی تھی۔ یہ رستم کی کال تھی۔ شانی خود بھی رستم سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر یہ کال ایسے موقع پر آئی تھی کہ سرفراز احمد اور دیگر مہمان شانی کے عین سامنے موجود تھے۔ علاقے کے بڑے بڑے زمیندار اور چوہدری حضرات ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ شانی نے بس دو جملے بول کر فون بند کر دیا تھا۔ اس موقع پر وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اب فرصت ملتے ہی اس کا دھیان رستم کی کال کی طرف گیا اور وہ اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ وہ بڑے غلط وقت میں اور بڑے غلط طریقے سے ان سب کو چھوڑ کر آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سب غم زدہ ہوں گے اور سب سے زیادہ رستم۔ اس کے تصور میں رستم کی اداس آنکھیں آئیں اور اسے ان آنکھوں پر بے تحاشا پیار آیا۔

وہ تیز قدموں سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی مگر پھر یکایک اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اسے یاد آیا کہ فون لائن تو کل سے پھر خراب ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ موبائل پر رابطہ بہت مشکل سے ہوتا تھا بلکہ اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے۔ پھر بھی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ وہ موبائل پر رستم کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک اسے خالو اعجاز کی صورت نظر آئی۔ وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے، آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

”کیا بات ہے خالو جان؟“ شانی نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”آج دل بہت دکھا ہے۔“ چوہدری اعجاز نے بھرائے لہجے میں کہا۔

”خیریت تو ہے خالو؟“ شانی نے چوہدری اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہے پھر ایک آہ بھر کر بولے۔ ”رستم جو کچھ بھی ہے مگر اب رکھ رکھاؤ والا نظر آتا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت بدل چکا ہے لیکن آج اس نے جس طرح بات کی ہے میں حیران رہ گیا ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں، میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔“ چوہدری اعجاز کی آواز بھرا گئی۔

”کک…… کیا کہا ہے انہوں نے؟“

”بہت بدتمیزی سے بولا ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ مہمان آ گئے ہیں۔ شانی انہیں ویلکم کہہ رہی ہے۔ وہ جونہی فارغ ہوئی خود فون کرے گی۔ بس اس بات پر وہ بھڑک اٹھا۔ پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا۔ آپ چوہدری ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ میں نے اپنی بیوی سے بات کرنی ہے…… اور مجھے منہ سنبھال کر بات کرنے کے مشورے دے رہا تھا۔ ایک دو بڑی سخت باتیں کہی ہیں اس نے۔ میں اب پچھتا رہا ہوں کہ میں نے فون ریسیو ہی کیوں کیا۔ تمہیں دے دیتا…… تم خود بات کر لیتیں۔“

”لیکن اس وقت میں کیسے بات کر سکتی تھی۔ مہمان سامنے کھڑے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔“

”بہرحال وہ بڑے غصے میں تھا۔ تم بھی ابھی اسے فون مت کرنا۔ ذرا غصہ ٹھنڈا ہو لینے دو۔ پتا نہیں کس موڈ میں ہے وہ…… میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

چوہدری اعجاز چلے گئے اور شانی کا دل بجھ سا گیا۔ ایسا کیوں کیا ہے رستم نے؟ اسے تھوڑی دیر انتظار کر لینا چاہیے تھا۔ وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ منا اس کی نقل اتارتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ٹہلنے لگا۔ شانی کی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے۔

”تاتی! تم ملے شان ہو؟“

”نہیں تو۔“

”جب تم اس طرح چلتی ہو، مجھے پتا چل جاتا ہے کہ تم ملے شان ہو۔“

شانی نے اسے گود میں اٹھا کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر اس کی ناک کھینچ کر بولی۔ ”تم زیادہ نجومی مت بنا کرو۔“

”میں نجومی نہیں۔ میری کوئی والی (داڑھی) ہے۔“ شانی نے اس کے پیٹ میں انگلی

چھوئی۔ رستم کے لیے اس کے ذہن میں جو تھوڑا سا تناؤ پیدا ہوا تھا، وہ اب دور ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی یقیناً کوئی معقول وجہ ہو گی، جس کے سبب رستم نے ترشی سے بات کی ہے۔ شانی نے دیکھا تھا کہ اس کے اندر بے پناہ برداشت تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو وہ بے حد آسانی سے سہہ لیتا تھا۔ محبت نے اسے جینا سکھایا تھا......اور اسی محبت نے شانی کو بھی جینا سکھایا تھا۔ یہ محبت اتنی طاقتور تھی کہ اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔

"تم کیوں پلے شان ہو؟ مجھے بتاؤ نا!" مُنا اپنے مخصوص انداز میں ٹھنک کر بولا۔

"سچ سچ بتاؤں؟" شانی نے لاڈ سے کہا۔ مُنے نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔

"تمہارے انکل مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔"

"کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا تم ان سے پڑھتی ہو؟"

"پڑھتی ہو؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب میں تم کو سبق نہیں سناتا تو تم مجھ سے ناراض ہو جاتی ہو۔ کیا تم نے بھی ان کو سبق نہیں سنایا تھا؟"

شانی مسکرائی۔ "ہاں......یہی سمجھ لو۔ میں ان سے پیار کا سبق پڑھتے پڑھتے اچانک بھاگ آئی ہوں، ان کو بتایا بھی نہیں۔ انہوں نے ناراض تو ہونا ہی تھا۔"

"تو کیا، وہ اب تم کو ماریں گے؟"

"پتا نہیں۔ یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔" وہ مسکرائی۔

"تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ وہ مجھ پہ کبھی غصہ نہیں ہوتے۔ میں تم کو ان سے مانی لے کل دوں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" شانی نے اس کی ناک مروڑی۔ "معافی تو وہی مانگتا ہے جس نے غلطی کی ہو۔"

"مگر میں تمہالے ساتھ رہوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" شانی نے اسے گلے سے لگا کر چوما۔

مُنا چلا گیا تو وہ ایک بار پھر رستم کو فون کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے موبائل فون اٹھایا مگر رکھ دیا۔ خالو اعجاز نے کہا تھا کہ ابھی رستم کا موڈ بہت خراب ہے۔ اس نے سوچا کل کوشش کرے گی اور اگر فون نہ ہو سکا تو پھر خادم حسین سے کہے گی کہ وہ لاہور جا کر اس کا پیغام رستم تک پہنچا دے۔ درحقیقت دراج کے بھائی کے قتل والے واقعے نے اسے یہاں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کل اپنے وکیل، اپنے خالو اور چند دیگر افراد کے ساتھ تھانے جا

کر با قاعدہ ایف آئی آر درج کرانا چاہتی تھی مگر آج سرفراز صاحب نے کچھ اور بات کہہ دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ انہیں اس معاملے میں سازش کی بو آ رہی ہے۔ وہ خود اس معاملے کو دیکھیں گے اور ایک دو دن میں خود ذاتی طور پر شانی کو آگاہ کریں گے۔ شانی جانتی تھی کہ اب اس کا رنگ والی سے فوری طور پر واپس لاہور جانا ممکن نہیں ہو گا۔

اگلے روز بھی رنگ والی حویلی کی لینڈ لائن ٹھیک نہیں ہو سکی۔ شانی موبائل پر کوشش کرتی رہی مگر رابطہ نہیں ہوا۔ سہ پہر کو وہ کمرے میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کا اٹیچی کیس ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی اٹیچی کیس تھا جس میں وہ اپنا سامان لاہور لے کر گئی تھی۔ اس نے ملازمہ مجیداں کو بلایا۔ اس نے بتایا کہ یہ اٹیچی بابا خادم حسین رکھ کر گیا تھا۔

شانی نے فوراً خادم حسین کو طلب کیا اور اپنے سامان کے بارے میں پوچھا۔

خادم حسین نے کہا۔ "چھوٹی بی بی! مجھے چوہدری اعجاز صاحب نے بھیجا تھا۔ انہوں نے ایک دو دوائیاں لاہور سے منگوائی تھیں۔ کہنے لگے کہ آتے ہوئے چھوٹی بی بی کا سامان بھی اقبال ٹاؤن سے لے آؤں۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔"

"اور تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں؟"

"میں نے سمجھا، آپ کو پتا ہو گا۔"

شانی سٹپٹا کر رہ گئی۔ کبھی کبھی خالو اعجاز اتنی عجلت میں کام کرتے تھے کہ پریشانی ہوتی تھی۔ شانی کو کوفت محسوس ہوئی۔ وہ اتنا لمبا چوڑا پروگرام لے کر لاہور گئی تھی اور وہاں سے دو دن میں اس کا سامان اور وہ خود واپس رنگ والی پہنچ گئے تھے اور یہ سب کچھ آناً فاناً بغیر کسی کو بتائے ہوا تھا۔ شانی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔

اس نے خادم حسین کو واپس بھیج دیا۔ وہ خالو اعجاز سے سامان کی واپسی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ زمین پر گئے ہوئے تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رستم سے رابطہ اب اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ فون کام نہیں کر رہے تھے۔ اب واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ خادم حسین کے ہاتھ رستم کو ایک تفصیلی خط بھیج دے...... یا پھر خادم حسین سے کہے کہ جھنڈے شاہ کے مزار سے پانچ میل کا سفر طے کر کے جنرل اسٹور پہنچے اور وہاں سے بذریعہ فون رستم کو یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دے۔ یہ وہی جنرل اسٹور تھا جہاں ایک ٹیلی فون لائن موجود تھی۔ اس ٹیلی فون سے شانی نے ایک مرتبہ اپنے جابر شوہر فاخر کو کال کر کے اپنی رہائی کی اطلاع دی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ غیر مشروط طور پر اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔

سوچ بچار کے بعد اسے فون والی تجویز زیادہ آسان اور قابلِ عمل لگی۔

اس نے ایک بار پھر خادم حسین کو بلایا۔ خادم حسین گھر کے فرد کی طرح ہی تھا۔ خاص طور سے شانی بچپن سے ہی اپنے دل کی ہر بات اس سے کہہ دیتی تھی۔ خادم حسین کو ابھی تک رستم اور شانی کی شادی کا علم نہیں تھا۔ ہاں، یہ بات وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ چھوٹی بی بی اور رستم سیال ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں...... بہت گہری محبت!

شانی کی جھنجلاہٹ اب ذرا کنٹرول میں تھی۔ اس نے خادم حسین سے پوچھا۔ ''جب تم سامان لے کر آنے رستم صاحب نے کچھ کہا؟''

''بس جی یہ پوچھا تھا کہ سامان منگوانے کا کس نے کہا ہے۔ میں نے چوہدری صاحب کا نام لیا۔ وہ چپ ہوگئے۔ کچھ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ پھر پوچھنے لگے، کیا سارا سامان لے جانا ہے؟ میں نے کہا، ہاں۔''

''فون کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا؟''

''میں نے انہیں بتایا تھا کہ حویلی کا فون پھر خراب ہوگیا ہے۔''

شانی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''بابا! بیٹھ جاؤ''

خادم حسین ہمیشہ کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔ شانی نے کہا۔ ''بابا! تم نے میرا ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ میں تمہیں پیسے دیتی ہوں، تم ابھی مزار سے بس میں بیٹھ کر جنرل اسٹور پر چلے جاؤ، پرانے جنرل اسٹور...... لاہور میں رستم کا فون نمبر ہے نا تمہارے پاس؟''

''ہاں جی! میں نے لکھا ہوا ہے۔'' خادم حسین نے جیب سے چٹ نکال کر دکھائی۔

''بس ٹھیک ہے۔ تم نے جنرل اسٹور سے رستم کو فون کرنا ہے۔ کوشش کرنا کہ رستم سے ہی بات ہو۔ رستم کو تم نے بتانا ہے کہ یہاں کیا پوزیشن ہوئی ہے۔ بادل مہتم کے قتل والی ساری بات کھول کر بتا دینا۔ یہ بھی بتا دینا کہ مہتم غصے میں ہیں اور ان کا زور ہے کہ قاتل کے خلاف فوراً پرچہ کٹوایا جائے۔ اس معاملے کی وجہ سے میرا یہاں دو چار دن رکنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ انہیں بتانا کہ میں یہاں سے فون کرنے کی بہت کوشش کرتی رہی ہوں مگر فون نہیں ہوا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ خالو اعجاز نے مجھے بتائے بغیر میرا سامان منگوالیا ہے۔ سامان آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اب لاہور نہیں آؤں گی۔ جیسے ہی یہاں کا معاملہ نمٹ جاتا ہے، میں منّے کے ساتھ پہنچ جاؤں گی۔ میری طرف سے ناصر اور اجمل سے بھی معذرت کرنا کہ میں انہیں بتائے بغیر یہاں چلی آئی۔ جیسے ہی حویلی کا فون ٹھیک ہوتا ہے، میں خود بھی ان سب سے بات کروں گی۔''

شانی نے سب کچھ تفصیل سے خادم حسین کو سمجھا دیا اور کرایہ، کال چارجنگ وغیرہ دے کر فون کے لیے بھیج دیا...... اسے معلوم نہیں تھا کہ خادم حسین جنرل اسٹور نہیں پہنچے گا اور نہ ہی اس کا یہ اہم ترین پیغام رستم تک پہنچ پائے گا۔

خادم حسین شانی سے رخصت ہو کر حویلی کے مردانے میں پہنچا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ چوہدری اعجاز اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے خادم حسین کو روکا اور نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''شانی نے کیا بات کی ہے؟'' انہوں نے رازداری کے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں چوہدری جی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ وہاں کوٹھی میں کون تھا اور کیا بات ہوئی تھی؟''

''دیکھو خادم حسین!'' چوہدری اعجاز نے نہایت گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ کچھ بھی ہے، شانی ابھی بچی ہے۔ ہم نے اس کے مطابق نہیں چلنا بلکہ اسے اپنے مطابق چلانا ہے۔ ہر قدم پر اس کو راستہ دکھانا ہے۔ یہی بات تم سے معصوم بھائی نے بھی کہی تھی، کہی تھی نا؟''

خادم حسین نے گھبرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اور معصوم بھائی نے یہ بھی کہا تھا کہ سامنے بے شک شانی ہے لیکن اس حویلی میں ہر کام میری ہدایت کے مطابق ہوگا۔ کہا تھا نا یہ بھی؟''

خادم حسین نے ایک بار پھر سر ہلا کر اقرار کیا۔

چوہدری اعجاز نے طویل سانس لی اور بولے۔ ''دیکھو خادم حسین! ہم جس کھیل میں داخل ہوگئے ہیں۔ یہ جتنا شان و شوکت والا ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ اس پورے علاقے کی نگاہیں رنگ والی حویلی پر اور ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا ہے۔ تم اس حویلی کے سب سے پرانے اور بااعتماد خدمت گار ہو۔ میں اور بھائی معصوم اور بیگم آمنہ تم سے یہ توقع ہرگز نہیں کر سکتے کہ تم ہم سے کوئی بھی بات چھپا کر رکھو گے۔''

''آ... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں چوہدری جی۔'' خادم حسین کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''میں کہتا ہوں کہ شانی ابھی اتنی جہاں دیدہ نہیں ہوئی کہ اپنے سارے فیصلے خود کر

سکے۔اس کے لیے بہت سے فیصلے ہمیں ہی کرنے ہوں گے اور میں امید رکھتا ہوں کہ تم اس کام میں ہمارا ساتھ دو گے۔''

خادم حسین سر جھکائے کھڑا رہا۔اس کے عمر رسیدہ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ذرا توقف کے بعد چوہدری اعجاز نے اس سے پھر پوچھا کہ شانی بی بی نے اس سے کیا باتیں کی ہیں اور وہ کہاں جا رہا تھا۔اس مرتبہ خادم حسین نے یہ ساری باتیں چوہدری اعجاز کے گوش گزار کر دیں۔چوہدری اعجاز نے یہ سب کچھ تحمل سے سنا اور کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

خادم حسین بات ختم کر چکا تو چوہدری اعجاز نے کہا۔''خادم حسین! تم دیکھ ہی رہے ہو یہ سارا معاملہ کتنا خطرے والا ہے۔تم لاہور ٹیلی فون نہیں کرو گے۔مگر شانی بی بی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ مجھ سے پوچھیں گی۔''

''اگر پوچھیں تو بتا دو کہ فون ہو گیا تھا۔انہوں نے جو کہا، وہ تم نے فون پر رستم سے کہہ دیا۔ٹھیک ہے؟''

''لیکن جب چھوٹی بی بی اور رستم وغیرہ میں فون پر یا کسی اور طریقے سے بات ہو گی تو میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔''

''تم پریشان نہ ہو۔ان میں اب اتنی جلدی بات نہیں ہو گی۔جب ہو گی تب دیکھا جائے گا۔اور تب بھی تمہیں کسی کو جواب نہیں دینا پڑے گا۔تمہاری جگہ بھائی معصوم جواب دیں گے۔''

خادم حسین سر ہلا کر رہ گیا۔اس کی آنکھیں بدستور نم تھیں۔یوں لگتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے دل و دماغ پر بہت بوجھ ڈال رہا ہے۔

پھر وہی ہوا جو چوہدری اعجاز نے خادم حسین کو سمجھایا تھا۔خادم حسین حویلی سے چلا گیا اور قریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا۔اس نے شانی کے پوچھنے پر اسے بتا دیا کہ وہ ان کے حکم پر عمل درآمد کر آیا ہے۔اس نے فون پر رستم تک پیغام پہنچا دیا ہے۔

شانی کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔اب اسے سرفراز احمد قزلباش صاحب کی طرف سے رابطے کا انتظار تھا۔فون لائن تو خراب پڑی تھی۔یہ رابطہ یقیناً براہِ راست ہونا تھا۔اس بات کی توقع تو کسی صورت نہیں کی جا سکتی تھی کہ سرفراز صاحب بہ نفسِ نفیس دوبارہ رنگ والی آئیں گے۔اب ان کے کسی ماتحت یا سیکرٹری وغیرہ کو ہی آنا تھا۔یہ رابطہ جتنی جلدی ہو جاتا اچھا تھا۔

شانی دیکھ رہی تھی کہ علاقے کی مہتم برادری میں غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔وہ قاتل کے خلاف

کارروائی چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ کام فوراً ہو۔سردار دراج نے ان لوگوں کو سنبھال رکھا تھا ورنہ زبردست قسم کا احتجاج شروع ہو سکتا تھا۔

شانی اور چوہدری اعجاز کی توقع کے مطابق اگلے روز دوپہر کو سرفراز احمد صاحب کا ایک نمائندہ تیمور حمدی اپنے دو محافظوں کے ساتھ رنگ والی پہنچا۔تیمور حمدی چھدرے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر خوش پوش شخص تھا۔اس نے شانی، چوہدری اعجاز اور چوہدری معصوم کے ساتھ علیحدہ کمرے میں بات کی۔اس نے سرفراز احمد صاحب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ مہتم برادری کے بندے کا قتل سازش کے تحت کیا گیا ہے اور یہ سازش بالکل واضح ہے۔ہو سکتا ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ بات آ رہی ہو۔''

''نہیں......آپ وضاحت کریں۔''چوہدری معصوم نے کہا۔

تیمور حمدی بولا۔''آپ کو پتا ہی ہو گا کہ ہماری سیاست میں برادری سسٹم کتنا اہم ہے۔مہتم برادری کا سارا ووٹ آپ کی طرف ہے۔اسی طرح گوراہی برادری کا ووٹ بھی آپ کو جانے والا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپ کے جیتنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی ہے۔آپ کے مخالف یہی چاہ رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو اور ان دونوں میں سے کم از کم ایک برادری آپ کی حمایت چھوڑ دے۔''

''بادل کے قتل کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''شانی نے پوچھا۔

''ہمارے خیال میں یہی نکتہ آپ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے۔''تیموری حمدی نے کہا۔

پھر ذرا توقف سے اس نے تایا معصوم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''آپ کو معلوم ہے کہ سب انسپکٹر طفیل کی شادی کن لوگوں میں ہوئی ہے؟''

''نہیں۔مجھے معلوم نہیں۔''

''سب انسپکٹر طفیل گوراہی برادری کا داماد ہے۔طفیل کے دو بڑے بھائی بھی گوراہی برادری میں بیاہے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک پولیس میں ہے، دوسرا آبپاشی کے محکمے میں بڑا افسر ہے۔داماد ہونے کی وجہ سے گوراہی برادری میں ان کا کافی اثر ہے۔اگر اب آپ لوگ اس قتل کی وجہ سے طفیل کے خلاف کارروائی کراتے ہیں تو گوراہی برادری میں بہت سے لوگ آپ کی مخالفت پر اُتر آئیں گے۔اس برادری کا ووٹ اگر ٹوٹ گیا تو الیکشن میں بہت نقصان ہو گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ ان ووٹوں کی خاطر ہم......''

''نہیں نہیں، ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں۔''تیمور حمدی نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔

"آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ جو اندر کی حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ سرفراز احمد صاحب خود بھی ڈپٹی ریاض کے حد سے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر طفیل نے جرم کیا ہے تو اس کی پوری پوری سزا اسے ملے لیکن اس کے لیے وہ مناسب وقت کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں..... سیاست میں اس طرح کی حکمتِ عملی اکثر اختیار کرنا پڑتی ہے۔"

"میں کسی حد تک آپ بات سمجھ رہا ہوں لیکن مدعی پارٹی کا ردِعمل سخت ہے۔" خالو اعجاز نے کہا۔

"اس ردِعمل کو ہم کسی طرح کنٹرول کر لیں گے۔ اس دوران میں ہم خاموشی سے ملزم کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی مہیا کریں گے۔ اس کام کے لیے ہمارے پاس وافر ذریعے موجود ہیں۔ آپ اس سارے معاملے میں بالکل بے فکر رہیں۔ ملزم اگر مجرم ثابت ہو گیا تو اسے آپ کی توقع سے بھی سخت سزا ملنی ہے۔"

"لیکن آپ ایک بات پر غور نہیں کر رہے۔" شانی نے کہا۔ "اگر ہم ملزم کے خلاف پرچہ نہیں کٹواتے اور مقتول کی پارٹی کی مدد نہیں کرتے تو یہ لوگ ہم سے بدظن ہو جائیں گے۔ مہتم برادری بھی تو ایک کافی بڑی برادری ہے۔ یہ لوگ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔"

تیمور حمدی نے بڑی دانائی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں۔ درحقیقت ڈپٹی ریاض اور اس کے پیچھے موجود لوگ یہی چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ دونوں برادریوں میں سے ایک برادری ضرور ہم سے ناراض ہو جائے۔ ہمیں ان کی اسی چال سے بچنا ہے۔ میری معلومات کے مطابق مہتم برادری پر آپ لوگوں کا زیادہ اثر و رسوخ ہے بلکہ سردار دراج تو آپ کے ساتھ بہت عقیدت بھی رکھتا ہے۔ مہتم برادری کو آپ لوگ تھوڑے عرصے کے لیے کسی نہ کسی طور سنبھال لیں گے۔ مگر گوراہیوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ ان کا رویہ ذرا مختلف ہے اور تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ووٹر ہے اس برادری کا۔ جس طرح ہم پر چال چلی گئی ہے۔ ہم بھی اس کا جواب چال سے ہی دیں گے اور اللہ نے چاہا تو جواب بڑا کافی شافی ہو گا۔"

اس موضوع پر تیمور حمدی اور رنگ والی کے نمائندوں میں تقریباً آدھ گھنٹا بات ہوئی۔ تیمور حمدی نے بڑی گہری باتیں کیں۔ ان باتوں میں وزن تھا اور اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ سرفراز احمد صاحب اور ان کے ہمکاروں کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ مسز سرفراز احمد کی طرف سے شانی کے لیے ایک بیش قیمت شال کا تحفہ بھیجا گیا تھا۔ چوہدری اعجاز، تایا معصوم اور شانی

کی پھوپھو آمنہ کے لیے بھی قیمتی تحفے آئے تھے۔

☆======☆======☆

رستم زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر وہ ہر گھڑی شانی کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ آتے جاتے اکثر اس کی نگاہ ٹی وی لاؤنج میں رکھے فون کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ فون خاموش تھا اور اس کی خاموشی اس کے دل پر کچوکے لگاتی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ناصر، اجمل، زری اور ڈولا بھی پریشان تھے۔ سب بجھ سے گئے تھے۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات چیت بھی نہیں ہوتی تھی۔ رستم کو گاہے بہ گاہے آپو زاہدہ اور بھائی اکرام کا خیال بھی شدت سے آ رہا تھا۔

ایک دن اجمل نے اداسی سے پوچھا۔ "کہیں بی بی..... اماری کسی بات پر ناراض تو نہیں ہو گیا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" رستم نے کہا پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "وہ ایسی نہیں ہیں..... وہ ناراض نہیں ہو سکتیں۔ وہ بہت خوش تھیں یہاں۔ یقیناً وہاں کوئی مجبوری ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ رستم کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس کا دل چاہا کہ لپک کر فون کی طرف جائے مگر اس میں اسے ہلکا پن محسوس ہوا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اجمل دوڑ کر فون کی طرف گیا۔

"ہیلو!" اس نے پُرشوق انداز میں کہا۔

دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی اسے سن کر اجمل کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یقیناً یہ شانی کی آواز نہیں تھی۔ "جی وہ ادھر ہی ہیں۔ ام ان کو بلاتا ہے۔" اجمل نے مؤدب لہجے میں کہا۔ پھر رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "حاجی صاحب کا کال ہے جی۔"

رستم نے کال ریسیو کی۔ حاجی حیات نے کہا۔ "ہاں بھئی، کیا ہو رہا ہے رستم زماں!"

"مکھیاں مار رہے ہیں۔" رستم نے جواب دیا۔

"مکھیاں مار رہے ہو..... کس کو؟"

"مذاق چھوڑو..... میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"شادی شدہ سنجیدہ ہی ہوتے ہیں۔ کوئی نئی بات کرو۔ ہماری بھابی پلٹی یا نہیں؟"

"نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اب جلدی پلٹے گی بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

''ادھر رنگ والی میں کچھ گڑبڑ گوٹالا ہو گیا ہے۔ وہ اسے سنبھالنے میں لگ گئی ہوگی۔ کافی سیریس معاملہ ہے۔ شاید تمہیں ابھی تک پتا نہیں چلا۔''

''پتا کیسے چلے گا، تم نے ہمیں مرغیوں کی طرح اس کوٹھی کے ڈربے میں تاڑ رکھا ہے۔''

''یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے بھئی۔ دو ٹانگوں والے بہت سے کتے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''ہاں خبر کیا ہے؟''

''سردار دراج کا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ اسے گولی ماردی گئی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو...... کس نے ماری ہے گولی؟'' رستم کے لہجے میں بے حد حیرت شامل ہو گئی۔

''یہی بات زیادہ پریشانی کی ہے۔ دراج کے بھائی کو قتل کرنے والا ڈپٹی ریاض کا قریبی رشتے دار ہے۔ بھتیجا ہے اس کا۔''

رستم سناٹے میں تھا۔ دراج کے بھائی کا قتل اس کے لیے اندوہناک تھا۔ اس جواں سال شخص کا نام بادل تھا۔ دراج کو اس سے بڑی الفت تھی۔ رستم کو یاد تھا، جب کٹھولی کے میلے سے دراج اور عارف وغیرہ نے اسے سنگین خطرے سے بچایا تھا اور شانی سمیت اسے مہتم بستی میں پہنچایا تھا...... یہاں سردار دراج نے جس طرح رستم اور شانی کی میزبانی کی، وہ یادگار تھی۔ وہ اور اس کے قریبی عزیز ہر خطرے کے سامنے دیوار بن گئے تھے۔ دراج اور اس کے بھائی نے اپنے لوگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی مگر رستم اور شانی پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ آج رستم اور شانی کو پناہ دینے کا صلہ دراج کو اپنے بھائی کی موت کی صورت میں ملا تھا اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس میں ڈپٹی ریاض کا نام آرہا تھا۔ وہی خون آشام شخص جس کی گردن پر وڈے ڈیرے کے اَن گنت باسیوں کا خون تھا۔ رستم کا خون کھول اٹھا اور اسے اپنے جسم کی رگیں تڑختی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''کس خیال میں کھو گئے ہو؟'' حاجی حیات کی آواز نے اسے چونکایا۔

''کیسے ہوا یہ قتل؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''چند دن پہلے بڑی نہر کی پٹڑی ٹوٹ گئی تھی۔ علاقے کے کئی گاؤں میں پانی آگیا تھا۔ گوراہیوں نے الزام لگایا ہے کہ بادل مہتم اور اس کے ساتھی تباہ حال گھروں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ انہیں للکارا گیا، انہوں نے گولی چلا دی۔ جوابی فائرنگ میں سب انسپکٹر طفیل نے بادل کو شوٹ کر دیا۔ باقی افراد بھاگ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سب جھوٹ ہے۔

ان لوگوں نے بادل کو پروگرام کے تحت مارا ہے۔''

''قاتل کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک تو آزاد پھر رہا ہے۔ میں نے کل سنا تھا کہ رنگ والی کے چوہدری اس کے خلاف پرچہ کروانا چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری بیگم اور چوہدری اعجاز وغیرہ خود پولیس اسٹیشن پہنچیں اور ایف آئی آر کے لیے درخواست دیں۔ سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہوگا۔''

''عام مہتم تو بڑے غصے میں ہوں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

بہت زیادہ۔ آخر سردار کا بھائی قتل ہوا ہے۔ برادریوں میں ایسے معاملے بہت زیادہ بھڑکتے ہیں۔ لوگ جنازہ لے کر حویلی کے سامنے پہنچے تھے۔ وہاں شانی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ قاتل سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ مہتم، شانی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کا غم و غصہ کم ہوا اور وہ چارپائی واپس لے گئے لیکن اب میں کچھ اور خبر سن رہا ہوں......''

حاجی حیات نے ذرا الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیسی خبر؟''

''پتا نہیں اب یہ خبر صحیح ہے یا نہیں مگر ایک انفارمر نے بتایا ہے کہ رنگ والی کے چوہدری کچھ ڈانواں ڈول ہو گئے ہیں۔ کہا جارہا ہے قزلباش صاحب نے چوہدریوں کو منع کیا ہے...... انہوں نے کہا ہے کہ سب انسپکٹر طفیل کے خلاف پرچہ نہ کرایا جائے۔ اب اس کے پیچھے کیا وجہ ہے، اس بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر پرچہ درج نہ کرایا گیا تو مہتم برادری کا ری ایکشن کیا ہوگا۔''

حاجی حیات سے دس پندرہ منٹ اس موضوع پر بات ہوئی۔ پھر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون بند کر کے رستم چند سیکنڈ تک خاموش رہا۔ یہ کرخت صورت والا سب انسپکٹر طفیل، رستم کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ رستم اسے ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جن دنوں رستم شانی کی چاہ دل میں لیے رنگ والی اور نارپور کے درمیان بھٹک رہا تھا، طفیل سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

یکایک رستم کے ذہن میں برق سی کوند گئی۔ اسے یاد آیا کہ یہاں لاہور میں طفیل کا ایک بڑا پکا ٹھکانا ہے۔ یہاں کے ایک قریبی پوش علاقے میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ نام کا گیسٹ ہاؤس تھا ورنہ اسے عیاشی کا بدترین اڈا کہا جاسکتا تھا۔ اس گیسٹ ہاؤس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں عموماً درمیانی عمر کے لوگ آتے تھے۔ جس طرح ہر ہوٹل اور ریسٹورنٹ وغیرہ کی کوئی

خاصیت ہوتی ہے، اس عشرت کدے کی بھی ایک خاصیت سنی گئی تھی۔ یہاں ''عورت طلبوں'' کو درمیانی عمر کی فربہ اندام، گداز عورتیں دستیاب ہوتی تھیں۔ عموماً یہاں غیر ملکی عورتیں بھی دیکھی جاتی تھیں۔ اس کی مالکہ پہلے بازارِ حسن کی ایک مشہور نائیکہ داری بیگم تھی، اب وہ یہاں میڈم ڈی کہلاتی تھی۔ رستم کے ہمدم دیرینہ زوار نے اسے بتایا تھا کہ طفیل اور اس کے دو دوست ہفتے کی شام زیادہ تر اس گیسٹ ہاؤس میں ہی گزارتے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہوں، کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ایک ویک اینڈ یہاں گزرے۔ زوار کے مطابق دو تین بار ڈپٹی ریاض بھی یہاں دیکھا گیا تھا۔ طوائفوں کے ساتھ ڈپٹی ریاض کے گہرے مراسم تھے، میڈم ڈی بھی ان میں شامل تھی۔ وہ اکثر مشکل وقت میں ڈپٹی ریاض کو آواز دیتی تھی۔

یہ سارے خیالات بس چند سیکنڈ کے اندر رستم کے ذہن میں سے گزر گئے۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ اسے لگا، اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ایک دم شعلہ جوالا بن گئی ہے۔ ڈپٹی ریاض کے رستم پر بہت سارے قرض تھے۔ اب ان بے شمار قرضوں میں اک اور قرض کا اضافہ ہوا تھا...... بادل ہتم کا قتل اور اس کا قاتل اب سے تین چار گھنٹے بعد رستم کو ایک قریبی عشرت کدے میں مل سکتا تھا۔ صرف چند کلومیٹر کا فاصلہ تھا..... صرف چند کلومیٹر! رستم اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے اندر بھڑکتی آگ پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھی۔

رات قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ رستم باہر گیراج میں آ گیا، وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ وہ بس کبھی کبھار ہی پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ اجمل دیکھ کر حیران ہوا۔ ''خیریت ہے رستم بھائی! آپ کہیں جا رہا ہے؟''

''ہاں، تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔''

''لیکن آپ جانتا ہے کہ حاجی حیات صیب نے ام کو باہر جانے سے بڑی سختی سے منع کیا ہوا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ اجمل چونک کر رہ گیا۔ اسے وڈے ڈیرے کا وہ رستم یاد آ گیا جو خطرات سے دیوانہ وار ٹکراتا تھا اور جس کے اندر ہر گھڑی ایک آتش بھڑکتی رہتی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی خطرناک معاملہ ہے۔ یہ بات تو اسے معلوم ہی ہو چکی تھی کہ چار پانچ دن پہلے سردار دراج کا بھائی قتل ہو گیا ہے اور اسے قتل کرنے والا ڈپٹی ریاض کا ہی کوئی بھتیجا بھانجا ہے۔ اسے شک ہوا کہ شاید رستم کا نکلنا اسی سلسلے میں ہے۔ مگر رستم کا موڈ ایسا تھا کہ وہ کچھ بھی پوچھ نہ سکا۔

گیراج میں رنگین شیشوں والی ایک سوزوکی کار کے علاوہ ایک بڑی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ کالے رنگ کی یہ موٹر سائیکل 175 سی سی تھی۔ رستم جانتا تھا کہ اس کی نمبر پلیٹ فرضی ہے۔ رستم کے ہاتھ میں ہیلمٹ اور موٹر سائیکل کی چابی موجود تھی۔ اس نے ہیلمٹ پہنا اور اس کا ہلکا براؤن شیشہ نیچے گرا لیا۔

اجمل نے کہا۔ ''اگر ناصر بھائی پوچھے تو''

''میں نے اسے بتا دیا ہے۔'' رستم نے کہا اور موٹر سائیکل کا سیلف مار کر انجن اسٹارٹ کر لیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لاہور کی روشن روشن سڑکوں پر جا رہا تھا۔ وہ وحدت روڈ سے ہوتا ہوا، اچھرہ اور پھر نہر کی طرف نکل گیا۔ اس کی پنڈلی کے ساتھ ربڑ بینڈ کے ذریعے 38 بور کا پسٹل بندھا ہوا تھا۔ لاہور کی ہلچل مچاتی زندگی دیکھنے کا اتفاق اسے بہت دنوں بعد ہوا تھا۔ فضا میں کبر اور حبس تھا تاہم موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اسے خوشگوار ہوا لگ رہی تھی۔ خاص طور سے نہر کے کنارے ہوا میں ٹھنڈک موجود تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید رستم اس رائڈ سے لطف اٹھاتا مگر اس وقت تو اس کے اندر سرخ انگارے دہک رہے تھے اور ہر اندر جاتی سانس سینے کو شعلے کی طرح جھلسا رہی تھی۔ ایک طویل...... طویل انتظار کے بعد بالآخر ڈپٹی ریاض سے حساب چکتا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد رستم ایک کشادہ رہائشی آبادی کے ایک نہایت دیدہ زیب گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ وسیع لان میں اور باہر گرین بیلٹ کے ساتھ قریباً دو درجن گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مین گیٹ پر چوکیدار نے رستم کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے اندر چلا گیا کہ میڈم ڈی سے ملنے آیا ہوں۔ چوکیدار تذبذب میں کھڑا رہ گیا۔

رستم نے موٹر سائیکل پارکنگ میں ایک جانب کھڑی کر دی۔ ہیلمٹ بدستور اس کے سر پر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ ہیلمٹ بھی بڑے کمال کی چیز ہے۔ اسے اب اصل پریشانی اس بات کی تھی کہ کیا آج رات وہ واقعی ریاض ہٹلر کے بھتیجے سے ملاقات کر سکے گا ... یہی سوچتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک اس کی نظر سرخ رنگ کی ایک چھوٹی کار پر پڑی۔ اس پر گوجرانوالہ کی نمبر پلیٹ تھی۔ رستم کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ اس نے یہ کار پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ یقیناً اس گاڑی پر طفیل یہاں پہنچا ہوا تھا۔

رستم عمارت کے اندرونی دروازے کے سامنے سے گزرا تو اسے اندازہ ہوا کہ محفل پچھلے لان میں جمی ہوئی ہے۔ وہ سائیڈ کی راہداری سے ہوتا ہوا پچھلے لان میں آ گیا۔ اوپن

ائیر میں کوئی پچیس تیس میزیں لگی ہوئی تھیں۔ بوفے کا اہتمام تھا۔ زیادہ تر میزوں پر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیانی عمر کی کئی گداز بدن عورتیں بھی نظر آئیں۔ وہ سب کی سب خوش شکل اور ناز نخرے سے آراستہ تھیں...... ان کے ساتھی مردوں میں بھی زیادہ تر درمیانی عمر کے تھے۔ تاہم دو چار اسمارٹ جوڑے بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف اسٹیج بنا ہوا تھا۔ یہاں بھرے بھرے جسم والی ایک عورت نما لڑکی، ایک طوائف کے لباس میں باقاعدہ گھنگروؤں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سفید میز پوش اور حسیناؤں کے پیراہن اُڑ رہے تھے۔ چند کرسیاں بوفے کے سیٹ اَپ سے علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ رستم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہیلمٹ کی شیلڈ یعنی شیشہ اوپر اٹھا دیا تھا لیکن...... ہیلمٹ بہ دستور اس کے سر پر ہی تھا۔ اچانک اس کی نظر طفیل پر پڑ گئی۔ وہ خود بھی کافی فربہ اندام تھا۔ پتلون قمیص پہنے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک میز پر موجود تھا...... نیلے اسکرٹ والی ایک گدرائی ہوئی لڑکی اس سے لچک مٹک کر باتیں کر رہی تھی۔ لڑکی کی سفید رنگت سے پتا چلتا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے تاہم رستم فاصلے سے اس کی قومیت کا اندازہ نہیں لگا سکا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز ہو گئی اور پھر شدید آندھی کی شکل اختیار کر گئی۔ اوپن ائیر کی یہ تقریب شدید ہلچل کا شکار ہو گئی۔ میز پوش اُڑنے لگے، برتن الٹ گئے۔ عورتوں کے لباس...... تیز ہوا کے سبب ان کے ہر نشیب و فراز کی چغلی کھانے لگے۔ رستم نے دیکھا، غیر ملکی لڑکی کا اسکرٹ نما لبادہ ایک دم اوپر اٹھ گیا اور چند لمحے کے لیے اس کی ٹانگیں بالکل عریاں نظر آئیں۔ لوگ چلاتے شور مچاتے اندر کی طرف بھاگے۔ رستم کی نگاہ بہ دستور اپنے شکار پر تھی۔ اسی دوران میں اچانک لائٹ بھی چلی گئی۔ وسیع لان میں تیرگی پھیل گئی تاہم رستم کو اپنا شکار اب بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے بھاری جسم کو حرکت دیتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف بھاگا۔ رستم کا ارادہ اسے شوٹ کرنے کا تھا لیکن صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ وہ ایک دراز قد سرو کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ طفیل اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ گرد کے سبب اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے ساتھی نسبتاً سبک بدن ہونے کے سبب اس سے آگے نکل چکے تھے۔ جونہی وہ قریب پہنچا، رستم اس کے سامنے آ گیا۔

''میری بات سنو جی۔'' رستم بلند آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے؟'' طفیل، رستم کو سر تا پا دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

رستم نے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''میانی صاحب قبرستان میں۔'' رستم نے ہیلمٹ کے اندر سے ہی جواب دیا۔

''کیا بکواس ہے؟'' طفیل نے رستم کو راستے سے دھکیلنا چاہا۔

یکایک برق سے لپکی اور رستم نے سرو کی اوٹ میں فربہ اندام طفیل کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا۔ اس کے 38 بور پسٹل کی نال طفیل کی کنپٹی سے آ لگی تھی۔

''ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' رستم پھنکارا۔ ''ایک سیکنڈ میں ٹھنڈا کر دوں گا...... میں رستم سیال ہوں۔'' رستم کے آخری چار الفاظ نے چند لحظے کے لیے طفیل کو جیسے پتھرا دیا۔

رستم اس کے عقب میں تھا اس نے رخ موڑ کر رستم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں تھی، وہ چہرہ پھیر نہیں سکا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ تیرا باپ ہوں۔ چہرہ شہرہ بعد میں دیکھ لینا۔'' رستم پھر پھنکارا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل کا بیرل بڑی بے رحمی سے طفیل کی چربی دار گردن میں گھسیڑا۔ وہ کراہ اٹھا۔

وہ رستم کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا مگر رستم کی آواز اور لہجہ شاید اس نے پہچان لیا تھا۔ ایک ہی لمحے میں اس کی ساری مزاحمت اور مدافعت دم توڑ گئی۔ رستم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اگر زندگی سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو بھلے مانسوں کی طرح میرے آگے چل پڑ۔ اگر چالاکی دکھائے گا تو کم از کم تین گولیاں ضرور تیرے کھوپڑ میں اتاروں گا۔''

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ طفیل پورے جسم سے کانپ گیا۔ رستم اسے چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور گرجا۔ ''چل...... اپنی گاڑی کی طرف چل۔'' طفیل نے بے بسی کی ایک نظر ارد گرد ڈالی۔ لان یکسر خالی ہو چکا تھا۔ آندھی کے تیز جھکڑوں میں برتن لڑھکتے پھر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا اشتہاری بورڈ زمین بوس ہو گیا تھا۔ طفیل کی سرخ کار زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے کار کے قریب پہنچ گئے۔

''دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ۔'' رستم نے حکم جاری کیا۔

اس مرحلے میں ایک سیکنڈ کے لیے رستم کو لگا کہ شاید طفیل کوئی پھرتی دکھانا چاہتا ہے۔ اس نے پسٹل کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ اگر طفیل کے دماغ میں کوئی باغیانہ خیال آیا بھی تھا تو صاف ہو گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے جیب ٹٹول کر گاڑی کی چابی نکالی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رستم نے اس کے عین پیچھے نشست سنبھال لی۔

''چلو...... گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلو۔'' رستم پھنکارا۔ ہیلمٹ بہ دستور اس کے سر پر تھا۔

"مم... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم......؟" طفیل کے منہ سے پہلی بار لرزاں آواز نکلی۔

"زیادہ کچھ نہیں چاہتا......لیکن فی الحال تم بی بے بچوں کی طرح یہاں سے نکلو۔" رستم کے لہجے میں زہریلی کاٹ تھی۔

"کیا تم......رستم ہو؟" طفیل نے خوف کے عالم میں بے معنی سوال کیا۔

"نہیں، اس کی روح ہوں۔ تجھ سے ملنے کے لیے وڈے ڈیرے سے یہاں تک کا سفر کیا ہے۔" رستم نے ترت جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی پستول کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔

چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد طفیل اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ وہ تیز آندھی میں گاڑی چلا کر باہر لایا اور پھر کشادہ سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ بڑے بڑوں کا پتا اس کے نام سے پانی ہوتا تھا لیکن آج وہ رستم سیال کے نشانے پر تھا اور رستم سیال کی دہشت طفیل کی دہشت پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔

رستم جس موٹر سائیکل پر گیسٹ ہاؤس پہنچا تھا، وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی مگر اس کی طرف سے رستم کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس موٹر سائیکل کے ذریعے حاجی حیات یا رستم وغیرہ کا کھوج لگانا کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ بھی جعلی تھی۔ یہ موٹر سائیکل حاجی حیات کے ماتحت انسپکٹر نے کسی خاص مقصد کے لیے رکھی ہوئی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد رستم اور طفیل آندھی کے تیز جھکڑوں میں اقبال ٹاؤن کی مین روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں آکر رستم نے طفیل کو ایک جگہ گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اس نے کنارے پر گاڑی روک دی۔ رستم نے گاڑی صاف کرنے والے کپڑے سے طفیل کی آنکھیں مضبوطی سے باندھ دیں۔ اس نے کوئی چوں و چرا نہیں کی۔ آنکھیں باندھنے کے بعد رستم نے اسے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ بیٹھ گیا تو رستم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے بعد رستم نے طفیل کی نشست کو اس طرح اسٹریچ کر دیا کہ وہ گاڑی میں نیم دراز ہو گیا۔ یوں اس بات کا امکان بالکل ختم ہو گیا کہ طفیل کو باہر سے دیکھا جائے گا۔

تیز آندھی نے لاہور کے در و بام کو گرد آلود کر رکھا تھا۔ اسی گرد میں راستہ بناتے ہوئے مختلف سڑکوں سے گزرا اور پھر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ہارن پر ملازم نے دروازہ کھولا اور رستم کو پہچاننے کے بعد بڑا گیٹ کھول دیا۔ رستم گاڑی کو ڈرائیو وے پر سے گزار کر سیدھا گیراج میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد اجمل خان اور ناصر بھی باہر آگئے۔

ناصر نے چہک کر کہا۔ "رستم بھائی! یہ تو بڑا فائدے والا پھیرا رہا ہے۔ موٹر سائیکل لے

کر گئے تھے، گاڑی لے کر آگئے۔"

"پہلے گاڑی کے اندر تو دیکھ لو کہ کیا ہے؟" رستم نے سنجیدگی سے کہا۔

گاڑی کے اندر دیکھ کر ناصر اور اجمل ششدر رہ گئے۔ طفیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کسی پریشان زچہ کی طرح نشست پر لیٹا تھا۔

"یہ بھینسا کون ہے؟" اجمل نے پوچھا۔

"اسی حرامی نے بادل مہتم کو گولی ماری تھی۔" رستم نے اطمینان سے کہا۔

"اوہ گاڈ!" ناصر ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ "اس کو آپ کہاں سے اٹھا لائے؟"

"یہ اس کا ایک اڈا جہاں یہ باقاعدگی سے اپنا منہ کالا کرنے کے لیے تشریف لاتا ہے۔"

اجمل کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ "آپ نے امارا دل خوش کر دیا رستم بھائی۔ جب آپ ایسا کام کرتا ہے، امارا خون سیروں بڑھ جاتا ہے۔ ام کو امید ہے کہ آپ اس کو ذبح کرنے کا کام ام کو سونپے گا اور اگر زندہ اس کا کھال اُتارنا ہے تو بھی ام حاضر ہے۔"

"چلو، پہلے اس کو اندر تو لے جاؤ۔" رستم نے کہا اور اپنا پسٹل اجمل کو تھما دیا۔

اجمل نے گریبان سے کھینچ کر طفیل کو اٹھایا اور اس کی پسلیوں میں پسٹل چبھونے کے بعد اسے اندر چلنے کی ہدایت کی۔ طفیل کی آنکھوں پر پٹی بدستور موجود تھی۔ زری، ڈولا اور خانساماں وغیرہ بھی طفیل کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ اجمل کے ہاتھ میں موجود پستول نے بھی سب کو ڈرایا۔

ناصر، اجمل اور رستم اس کو سیدھا کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے۔ یہاں رستم اچانک طفیل پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے حملے میں بلا کا غضب تھا۔ صرف تیس چالیس سیکنڈ کے اندر طفیل کا بالائی لباس تار تار ہو گیا۔ رستم کے طوفانی گھونسوں اور ٹھوکروں نے طفیل کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا......اور وہ جو ایک گداز انگریزنی کے ساتھ بوفے ڈنر کھانے کے لیے تیار تھا، قالین پر مچھلی کی طرح تڑپتا اور لوٹتا نظر آیا۔ وہ گاہے بگاہے کراہیہ انداز میں چلاتا تھا اور اپنا چہرہ رستم کی ضربوں سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔

رستم نے اپنے طیش کو بڑی مشکل سے سنبھالا ورنہ شاید اسی جگہ طفیل کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا۔

رستم، اجمل سے مخاطب ہو کر گرجا۔ "آج رات اس کی خوب خاطر مدارت کرو۔ اسے کسی طرح کی شکایت نہ رہے۔"

''بالکل جی۔'' ناصر نے تائید کی۔ ''ڈپٹی ریاض کا بھتیجا ہونے کی وجہ سے اس کی خاطر مدارت کون کرتا ہوگا۔ جس کو کوئی نہ پوچھے اس کو ضرور پوچھنا چاہیے...... اور بڑے اچھے طریقے سے!''

''آپ پھکر ہی نہ کریں جی۔ یہ پولیس والا ہے تو ام بھی پولیس والا ہے۔ سابقہ ہے تو پھر کیا ہوا۔''

''اس حرامی کو بھی سابقہ ہی سمجھو۔ معطل ہوا بیٹھا ہے۔'' رستم نے اس پر آتشیں نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

ناصر اور اجمل نے آگے بڑھ کر طفیل کے ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیئے۔ اس مقصد کے لیے اس کی پینٹ کی بیلٹ استعمال کی گئی۔ اس کے پاؤں باندھنے کے لیے نائیلون کی رسی استعمال کی گئی۔ اس دوران میں فربہ اندام طفیل ہانپتا رہا اور شعلہ بار نظروں سے رستم وغیرہ کو گھورتا رہا۔ شاید اتنی مار کھانے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رستم زندہ سلامت اس کے سامنے موجود ہے۔ وہ تو شاید یہی جانتا تھا کہ رستم کو اس کے جلاد چچا ریاض نے لنگڑا کرنے کے بعد وڈے ڈیرے کی گھاٹیوں میں فنا کر دیا تھا۔

اس نے خون تھوکتے ہوئے رستم کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' غالباً وہ بھانپ گیا تھا کہ اس کے ساتھ مزید مار پیٹ کی تیاری ہو رہی تھی۔

''ہم چاہتے تو بہت کچھ ہیں۔ تم سے بہت سی باتیں بھی پوچھنا ہیں لیکن فی الحال ہم تمہیں مارنا چاہتے ہیں۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' طفیل کا رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔

''اوہ خدائی خوار! تم مار کا مطلب نہیں سمجھتا۔ مار مار کر لوگوں کا چمڑیاں ادھیڑ دیتا ہے اور خود کو مار کا پتا ہی نہیں۔ اس کو کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا...... بلکہ اندھیرا گھپ۔ یہ دیکھو، اس کو کہتے ہیں مار... یہ دیکھو۔'' اجمل نے اس کے سر اور کمر پر ہاتھوں سے کئی زوردار ضربیں لگائیں اور پھر ٹانگ مار کر فرش پر لمبا لٹا دیا۔

طفیل نے طیش میں آ کر ایک دم گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور جنونی انداز میں فرش سے اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اب یہ سب کچھ بے سود ہے۔ اس کی گالیوں کے انداز میں رستم کو ڈپٹی ریاض ہٹلر کی جھلک صاف نظر آئی۔ یوں لگا کہ چھوٹا ڈپٹی ریاض بول رہا ہے۔ رستم نے اجمل کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر طفیل کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں

ہاتھوں سے طفیل کی چربی دار گردن دبائی تو اس کا منہ کھل گیا۔ ناصر نے پھرتی سے جھاڑ پونچھ والا کپڑا طفیل کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اس کی آواز غوں غاں میں بدل گئی... ناصر نے اس کے بند منہ کے اوپر ایک پرانی ٹائی کس کر باندھ دی۔

رستم اور ناصر تو باہر آ گئے تاہم اجمل نے بند کمرے کے اندر طفیل کو آدھ پون گھنٹے تک سخت پھینٹی لگائی۔ وہ اسے چمڑے کی بیلٹ سے مار رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے طفیل کے کراہنے اور چلانے کی آواز آتی تھی۔ رستم فطرتاً اذیت پسند نہیں تھا اور نہ ہی شدید منتقم المزاج تھا۔ مگر آج طفیل کی درد بھری چیخیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

زری بار بار کانوں میں انگلی ٹھونستی تھی۔ آخر اس نے پوچھا۔ ''یہ کیوں چلاتا، کیوں شور مچاتا؟''

ناصر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ یہاں کا رسم ہے۔ جو لوگ باہر سے آتے، ہم ان کو خوب پیٹتے۔''

''یہ کیا بات...... کیا تم...... ام کو بھی پیٹے گا؟''

''کیوں نہیں، بس ذرا شادی ہو جانے دو...... پھر ہم تم کو خوب مارے گا۔''

''کک...... کس چیز سے؟''

''کوئی ایک چیز تھوڑی ہے۔ مختلف موقعوں پر مختلف چیزوں سے مارا کروں گا۔''

زری واقعی ڈری ہوئی نظر آنے لگی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھنے لگی۔ ناصر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور زری کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے بڑی محبت سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''پاگلے! تجھے کیوں ماروں گا۔ تجھے تو پھول کی طرح رکھوں گا۔ یہ تو بہت خبیث بھینسا ہے۔ اس نے ہمارے ایک دوست کو قتل کیا ہے۔ اس کی جان لی ہے۔''

''تو...... تم اس کے ساتھ کیا کرے گا؟''

''جو تمہاری بستی کے لوگ گارنیوں کے ساتھ کرتے تھے بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا... تم دیکھتی رہنا۔''

''میں نہیں دیکھوں گا۔''

''پھر وہی دیکھوں گا۔'' ناصر نے اس کے بال پکڑے۔ ''دیکھوں گی بولو دیکھوں گی۔''

''ہائے...... میرے بال۔'' وہ کراہی۔

''پہلے بولو دیکھوں گی۔''

''وہ سسکی لے کر بولی۔''دیکھوں گی۔''

ناصر نے کہا۔''شاباش!''اور اس کے بال چھوڑ دیئے۔

وہ اٹھ کر دروازے تک چلی گئی۔ پھر ایک دم شرارت سے مسکرائی اور زور سے بولی۔

''دیکھوں گا... دیکھوں گا۔''

''ٹھہر، تیری ایسی کم تیسی۔'' ناصر اس کے پیچھے لپکا۔

وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگالی لیکن ایک کھڑکی کھلی تھی۔ ناصر آرام سے کود کر اندر چلا گیا۔''دیکھوں گی......دیکھوں گی۔'' وہ زور زور سے چلانے لگی۔ پھر اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگیں۔

طفیل سے مار پیٹ ختم ہو چکی تھی۔ اجمل وسطی کمرے میں سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک چمڑے کی بیلٹ تھی۔ چہرہ غضب سے تمتما رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''شاید بے ہوش ہو گیا یا شاید ڈراما کر رہا ہے۔'' اجمل بولا۔

''چلو آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''ڈپٹی ریاض کے کسی ساتھی کو آسان موت نہیں مارنا رستم صیب۔'' اجمل کے لہجے میں عجیب سی گرج تھی۔ اس گرج کے پیچھے ظلم وستم کی ایک طویل داستان تھی۔

''لیکن ہم ڈپٹی ریاض تک پہنچ بھی سکیں گے؟'' رستم نے کہا۔

''کیوں نہیں پہنچیں گے رستم بھائی۔ امارے اندر کا آگ ام کو راستہ دکھائے گا۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ جب بھی گھنٹی بجتی تھی، رستم کے سینے میں ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ اس کا دل پکار پکار کر کہتا تھا کہ یہ اس کی شانی بی بی کا فون ہے۔ اس مرتبہ بھی اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر فون کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر اپنا رکھ رکھاؤ آڑے آیا۔ وہ وہیں بیٹھا فون کی طرف دیکھتا رہا۔ .....اجمل لپک کر فون سیٹ کے پاس پہنچا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ پھر اس کے چہرے پر مسرت کی چمک صبح کے اجالے کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

''ہیلو! ام اجمل خان بول رہا ہے۔'' اجمل نے چہک کر کہا۔

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔ اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔''جی جی! باقی سب امارے ساتھ ہے۔ ام آپ کی کال کا بہت انتظار کر رہا ہے۔ جی ہاں... جی ہاں۔ اب بھی لائن میں شور آرہا ہے۔ آپ شانی بہن ہی بول رہا ہے ناں؟'' اجمل نے ذرا چونک کر پوچھا۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا اسے سن کر اجمل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے مایوس نظروں سے رستم کی طرف دیکھا...... پھر ریسیور رستم کی طرف بڑھا دیا۔

رستم کے دل پر بھی گھونسا سا لگا تھا۔ اس نے ریسیور تھام کر ''ہیلو'' کہا۔ لائن میں ہلکا سا شور تھا۔ دوسری طرف کوئی لڑکی بول رہی تھی۔''آپ رستم ہیں'' لڑکی نے پوچھا۔

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں حاجی حیات صاحب کے لیے کام کرتی ہوں۔ پہلوان اور جیرا کے ساتھ ہوتی ہوں۔ حاجی صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ چند سیکنڈ کے لیے ہولڈ کریں۔'' لڑکی نے شائستہ لہجے میں کہا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد لائن پر حاجی حیات کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ حاجی حیات نے چھوٹتے ہی کہا۔''یار! یہ کیا چکر چل رہا ہے تمہارے سسرال میں؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' رستم نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ بھابی شانی پر دباؤ ہے اور دباؤ کے ساتھ اس سے غلط فیصلے کرائے جا رہے ہیں۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو حاجی؟''

''دیکھو، اب یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے نے مہتم برادری کا بندہ قتل کیا ہے اور بالکل ناجائز کیا ہے۔ دو تین دن پہلے تک یہ پروگرام تھا کہ رنگ والی کے چوہدری مہتم سردار کے ساتھ جا کر قاتل کے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے اور اس کی پوری پیروی بھی کریں گے مگر اب پتا چلا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ اس کے بجائے شانی بھابی اور اس کے تایا وغیرہ سردار دراج کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اس معاملے کو زیادہ نہ اچھالے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سنگی ساتھیوں کو بھی شدید قسم کے احتجاج سے روک کر رکھے۔ پتا نہیں کہ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس طرح یہ ہزاروں مہتموں کو اپنے خلاف کر لیں گے۔''

''میرے خیال میں اگر صورتِ حال ویسی ہی ہے جیسی تم بتا رہے ہو تو پھر اس میں شانی بی بی کا زیادہ عمل دخل نہیں ہوگا۔''

''تمہاری یہ سوچ درست نہیں۔'' حاجی حیات نے اطمینان سے کہا۔''میری اطلاع کے مطابق بھابی شانی اس معاملے میں کافی سرگرم ہے۔ وہ اس مسئلے میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اور اسے لینی بھی چاہیے۔ لوگ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔''

"لیکن ... یہ رپورٹ نہ کرانے والا فیصلہ کیوں ہوا ہے؟"

"شاید... اس میں کچھ کردار سرفراز قزلباش صاحب کا بھی ہے۔ انہوں نے ہی بھابی شانی اور بزرگوں پر زور دیا ہے کہ وہ ابھی سب انسپکٹر طفیل والے کیس کو نہ چھیڑیں۔ بھابی شانی اور رنگ والی کے بزرگ چوہدریوں کو یہ بات ماننا پڑی ہے۔"

"مگر یہ تو ناانصافی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مہتم برداری بھی پریشان ہو جائے گی۔"

"مگر یار جی! سرفراز صاحب جیسے بااثر بندے کی بات کو رَد کرنا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔ یہ شخص اس وقت بہت بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔" بات کرتے کرتے حاجی حیات اچانک خاموش ہو گئے۔ شاید ان کے موبائل کی بیل ہونے لگی تھی۔ "ایک منٹ ہولڈ کرنا۔" انہوں نے رستم سے کہا اور موبائل پر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

قریباً دو منٹ بعد انہوں نے دوبارہ رستم کو مخاطب کیا۔

"ہیلو رستم! یہاں ایک نئی خبر ہے۔"

"کیا ہوا؟" رستم نے پوچھا۔

"سب انسپکٹر طفیل لاپتا ہو گیا ہے۔ اب سے کوئی دو گھنٹے پہلے تک وہ یہاں لاہور کے ایک گیسٹ ہاؤس میں موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں کسی بندے سے تفتیش کرنے آیا ہوا تھا...... ایک دوست بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ جب زور کی آندھی چلی تب بھی وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی تھا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کی کار بھی پارکنگ میں نہیں ہے۔"

رستم نے اطمینان سے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہو۔ اتنی جلدی کیسے سوچ لیا گیا کہ وہ لاپتا ہوا ہے؟"

"موقع سے اس کی گھڑی ملی ہے۔ شاید اس کی کسی کے ساتھ کھینچا تانی ہوئی ہے جس کے سبب اس کی گھڑی کھل کر گری ہے۔"

رستم دانت پیس کر رہ گیا۔ طفیل کے ساتھ اس کی ایسی کوئی کھینچا تانی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی رسٹ واچ گر سکتی۔ اس نے غالباً جان بوجھ کر رسٹ واچ گرائی تھی۔ رستم نے حاجی حیات سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟"

"ابھی تو اطلاع ہی ملی ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس میں کسی تفتیش کے لیے گیا ہوگا۔ وہ ایک بدنام گیسٹ ہاؤس ہے اور میری اطلاع کے مطابق طفیل ایسی تفتیشوں کے لیے وہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا کوئی ویری اسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ اب تو یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ اس

واقعے کا تعلق بادل مہتم کے قتل سے ہی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ اس واقعے کا تعلق بادل مہتم کے واقعے سے ہی ہے۔" رستم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" حاجی حیات چونک کر بولے۔

"تم ادھر آؤ گے تو بتاؤں گا۔ کب آ رہے ہو یہاں؟"

چند سیکنڈ تک لائن پر خاموشی رہی پھر حاجی حیات کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ "رستم! یہ تم کیا اشارہ دے رہے ہو مجھے؟"

"جو کچھ بھی ہے۔ ادھر آؤ گے تو پتا چلے گا۔"

حاجی حیات سنائے میں تھے۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے فون بند کر دیا۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد اپنی پرائیویٹ کار میں کوٹھی پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ رستم نے علیحدہ کمرے میں انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ معطل سب انسپکٹر طفیل اس وقت کوٹھی کے اندرونی کمرے میں پابہ زنجیر موجود ہے۔

حاجی حیات پہلے تو کچھ ناراض نظر آئے مگر جلد ہی انہوں نے اپنا موڈ کسی حد تک بحال کر لیا۔ جب رستم نے انہیں بتایا کہ وہ طفیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے یہاں تک لایا ہے اور اسے راستے کا بالکل اندازہ نہیں ہوسکا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ انہوں نے کہا۔

"رستم! کام تو تم نے بڑے رسک والا کیا ہے۔ چلو اب جو ہو گیا وہ تو ہو گیا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ یہ طفیل بہت خطرناک بندہ ہے۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ تم اسے اٹھا کر یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اب اس کی طرف سے ذرا سی غفلت بھی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ اسے اس کمرے سے منتقل کر دو۔ یہاں ماسٹر بیڈروم کے نیچے ایک تہہ خانہ موجود ہے۔ خانساماں ظفر کو راستے کا پتا ہے اور چابی بھی اس کے پاس ہے۔"

"زبردست...... یہ بہت اچھی بات بتائی ہے۔" رستم نے کہا۔

"اب تم سے دست بستہ درخواست ہے کہ اس طرح کا کوئی اور رسک نہ لینا۔ یہ ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کا اس طرح لاپتا ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک مرتبہ تو خوب ترتھلی مچی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ سرکردہ مہتموں کی شامت بھی نہ آ جائے۔ سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو اپنا انتظام کر لینا چاہیے۔ بلکہ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح عارف کمبوہ کے ذریعے ان تک یہ پیغام پہنچا دوں۔ اگر ہم نے "

اچانک حاجی حیات کو خاموش ہونا پڑا۔ اندرونی کمرے سے طفیل کے واویلا کرنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ حاجی نے کہا۔ ''دیکھو! آواز یہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اس خبیث کو جتنی جلدی تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' پھر ذرا توقف سے حاجی حیات نے پوچھا۔ ''اس نے بادل کے قتل کے بارے میں کچھ بتایا ہے یا نہیں؟''

''ابھی تو نہیں بتایا لیکن بتا دے گا.... اور بتانا بھی اس نے کیا ہے۔ یہ تو کھلی بات ہے کہ اس حرامی نے پروگرام بنا کر بادل کو مارا ہے۔''

''مگر جو کچھ بھی ہے، تم اس سے یہ بیان پوری تفصیل سے لو......اور اس کو ریکارڈ بھی کرو۔ بعد میں یہ کام آئے گا۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ حاجی حیات کے انداز سے نظر آتا تھا کہ وہ پریشان ہیں مگر اپنی پریشانی وہ پوری شدت کے ساتھ رستم پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ رستم کو اندازہ تھا کہ اس نے ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کو اٹھا کر اور اس کوٹھی میں لا کر حاجی حیات کو ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حاجی حیات اس کی آزمائش پر پورا اُتر سکتا ہے۔ بلکہ وقت آنے پر وہ رستم کی خاطر اس سے بھی بڑی آزمائش کو گلے سے لگا سکتا تھا۔

اسی دوران میں حاجی حیات کے موبائل پر کال آگئی۔ حاجی حیات کسی انسپکٹر سے بات کرتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ یہ کال بھی طفیل کی گمشدگی کے حوالے سے ہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد حاجی حیات رستم کو ضروری ہدایات دے کر اپنی پرائیویٹ گاڑی پر تیزی سے واپس جا رہے تھے۔

حاجی حیات کے واپس جانے کے بعد رستم تا دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں حاجی حیات کے یہ الفاظ بار بار گونج رہے تھے کہ بھابی شانی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اور اس نے بزرگوں کے مشورے سے طفیل کے خلاف کارروائی نہ کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

کیا واقعی ایسا ہے......یا یہ صرف حاجی حیات اور دیگر لوگوں کے اندازے ہیں؟ یا پھر اس کے پیچھے کوئی خاص مجبوری یا وجہ ہے؟ مسئلہ تو یہ تھا کہ شانی کے ساتھ رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ کئی روز پہلے شانی نے کہا تھا کہ وہ خود رابطہ کرے گی۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اب تک وعدہ ایفا نہیں کر سکی تھی۔

رستم دیر تک سوچتا رہا۔ اپنی شانی بی بی کے بارے کوئی مخالفانہ بات تو اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی بات ذہن میں آسکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ شانی بی بی کسی نہایت اہم

معاملے میں الجھی ہوئی ہے یا الجھائی گئی ہے۔ جب وہ اس انداز سے سوچتا تھا تو پھر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں بی بی کو اس کی مدد کی ضرورت نہ ہو مگر اس ضرورت کا پتا بھی تو تب ہی چل سکتا تھا جب بی بی سے رابطہ ہوتا۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں پکارا۔

''بی بی! مجھے کب تک انتظار کرنا ہے؟ کب تک؟ آپ کیوں کر رہی ہیں ایسا؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بی بی۔ مجھے شاید بہت جلد آپ سے دور چلے جانا ہے۔ پھر آپ ابھی سے کیوں دور ہو رہی ہیں؟ کچھ دن تو میرے پاس رہتیں۔ بس تھوڑا سا عرصہ ... بس تھوڑا سا!''

اس کا دل جیسے کراہنے لگا۔ وہ جو بڑے بڑے صدموں اور تکلیفوں کو مصری کی طرح گھول کر پی جاتا تھا اور ماتھے پر شکن تک نہ لاتا تھا...... اپنی بی بی کی اچانک دوری سے آزردہ ہو گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے اس کی نگاہ کچن میں گئی۔ کچن میں بی بی کے ہاتھوں سے سجائے ہوئے گلدستے اور برتن وغیرہ جوں کے توں رکھے تھے۔ بی بی کی کک بک، بی بی کا ایپرن، دستانے اور دیگر چیزیں، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ بی بی کہیں نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر افسردہ نظروں سے خاموش ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اندرونی کمرے سے ایک بار پھر طفیل کے چلانے اور شور مچانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اسے فوری طور پر تہہ خانے میں پہنچایا جانا ضروری تھا۔ رستم نے اجمل خان اور خانساماں ظفر احمد کو بلایا اور اس کے ساتھ مل کر طفیل کو تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ ایسا کرنے سے پہلے اس کی آنکھوں پر پھر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ مسلسل واویلا بھی کر رہا تھا۔ کبھی دھمکیاں دینے لگتا تھا۔ کبھی پیشکش کرتا تھا کہ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، وہ انہیں پوری سچائی کے ساتھ بتا دے گا لیکن اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی جائے۔ اس کا چپل دار جسم تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے تھل تھل کر رہا تھا۔

تہہ خانہ درمیانے سائز کا تھا۔ یہاں فرنیچر کے نام پر بس ایک پرانا صوفہ پڑا تھا۔ سونے کے لیے فوم کا ایک گدا بچھا ہوا تھا تاہم اے سی کی سہولت یہاں موجود تھی۔

طفیل کو تہہ خانے میں بند کرنے کے بعد رستم نے اجمل کو اس کا نگران مقرر کر دیا۔ اس نے باہر آ کر اجمل سے کہا۔ ''اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے لیکن اس سے پوچھ گچھ بھی کرنی ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ ام دونوں کام کرے گا اور بہت اچھے طریقے سے کرے گا۔ بس آپ ام کو ایک ٹیپ ریکارڈر دے دیں تاکہ یہ جو بھی بکواس کرے، ام اس کو

ریکارڈ کر لے۔"

"ٹیپ ریکارڈر تمہیں مل جائے گا لیکن پتا ہے کہ اس سے کیا کیا پوچھنا ہے؟"

"ام سب کچھ پوچھ لے گا جی۔ بلکہ وہ بھی پوچھ لے گا جو اس کو پتا ہی نہیں۔"

"نہیں۔ اتنا جوش دکھانے کی ضرورت بھی نہیں اور دیکھو......اس کو کوئی زخم وغیرہ بھی نہیں لگنا چاہیے۔ خاص طور سے اس سے یہ پوچھنا ہے کہ اس نے بادل کو گولی کیوں ماری اور کس کے کہنے پر یہ کیا۔ یہ ساری تفصیل معلوم کرنی ہے۔"

☆======☆=====☆

اجمل کو یہ ذمے داری سونپ کر رستم مطمئن ہو گیا۔ اگلے روز صبح رستم نے ٹی وی لاؤنج میں جھانکا تو ناصر ٹی وی دیکھتا نظر آیا۔ وہ خبریں سن رہا تھا۔ زری صوفے کے عقب میں موجود تھی اور ناصر کو تنگ کر رہی تھی۔ وہ ماچس کی تیلی بار بار ہولے سے ناصر کے کان میں گھماتی۔ ناصر اس کا ہاتھ جھٹک دیتا اور خبروں کی طرف متوجہ رہتا۔ جب زری نے دیکھا کہ وہ کسی طرح اس کی طرف دھیان نہیں دے رہا تو وہ آرام سے دیوار کی طرف گئی اور وہاں سے ٹی وی کی پاور سپلائی کا بٹن آف کر دیا۔ ٹی وی اسکرین تاریک ہو گئی۔ ناصر بھنا کر اس کی طرف گیا تو وہ بیرونی دروازے کی طرف دوڑ گئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی مگر دوڑتی ایسے ہی تھی جیسے جسم پر پتے باندھے جنگل میں دوڑ رہی ہو۔ اس کے جسم میں جنگلی گھوڑی کی سی لچک اور لپک تھی۔

فرش چکنا ہونے کی وجہ سے دروازے کے قریب اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ گر گئی۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر کراہ کر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں سے سینڈل نکل کر دور پھسل گیا تھا۔ ناصر اور رستم جلدی سے اس کے پاس پہنچے۔ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔

ناصر نے اسے سہارے سے چلانے کی کوشش کی مگر اسے درد ہو رہا تھا۔ ناصر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اجمل نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔ "ناصر بھائی! یہ بہو بیٹیوں والا گھر ہے۔ تم یہ دن دیہاڑے کیا کر رہا ہے۔"

"وہ گر گئی ہے۔" ناصر نے برا سا منہ بنا کر وضاحت کی۔

"اگر تم نے اسے گرنے کی وجہ سے اٹھایا ہے تو پھر یہ روز گرا کرے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو۔ کیا تم نہیں پھسل سکتے ہو۔"

"سارا پاکستان جانتا ہے، ام مضبوط کردار کا بندہ ہے۔ یہ پھسلنا اور سنبھلنا اور پھر سے پھسلنا آپ دونوں کا ہی کام ہے۔" پھر وہ رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "رستم بھائی! امارا تو مشورہ ہے کہ ان دونوں کا جلد سے جلد دو بول پڑھوا دیا جائے۔"

ناصر نے اجمل کی طرف دیکھ کر مکا لہرایا۔ مطلب یہ تھا کہ زری کی طرف سے فارغ ہو لوں پھر تمہیں دیکھتا ہوں۔ زری کو صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ رستم نے کہا۔ "تم بھی تو ہر وقت بڑے بڑے ڈنگے مارتی ہو۔ آرام سے چلا کرو۔"

"میں آرام سے چلتا مگر یہ جوتی ایک دم خراب۔ یہ مجھ کو گراتا۔"

"یہ جوتی ٹھیک ہے...... تم ٹھیک نہیں ہو۔" ناصر نے ذرا غصے سے کہا۔

زری نے ناصر کا چہرہ دیکھا پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر گم صم رہی پھر بولی۔ "اگر میں ٹھیک نہیں...... تم مجھ کو واپس چھوڑو۔ میں اپنے گاؤں میں جاتا۔ میں ادھر نہیں رہتا۔"

"ہاں ہاں جاؤ تاکہ وہاں برق جان اور اس کے ساتھی تمہیں کلہاڑی سے دو ٹکڑے کریں اور اگیارے کے سامنے برف میں دفن کر دیں۔" ناصر بہ دستور غصے میں تھا۔

وہ ہچکیوں میں رونے لگی۔ اس کا سینہ دہل رہا تھا۔ اجمل نے دیکھا کہ معاملہ الٹ گیا ہے تو وہ فوراً زری کی حمایت میں سامنے آ گیا۔ اس نے زری کو بڑی محبت سے اپنے ساتھ لگایا اور بولا۔ "تم امارا ہونے والا بھابی کو کیوں تنگ کرتا۔ کیا تم وہاں پائندہ بستی میں برپ پر چلتے ہوئے نہیں پھسل جاتا تھا...... اور ناصر بھائی! اس سے پہلے بھی تم نہ جانے کہاں کہاں پھسلا ہے۔" اجمل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ڈولا بھی آ گیا تھا۔ وہ زری کے متاثرہ پاؤں پر لچک دار پٹی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ زری بہ دستور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ "مجھ سے نہیں چلا جاتا ایسے۔ مجھ سے نہیں کھایا جاتا ایسے۔ میں بالکل بے وقوف ہوتا۔ مجھ کو مافی دے دو۔"

اجمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "زری! ایک تو تم نے ماپی مانگ مانگ کر ڈاکٹر کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہر وقت کانوں کو ہاتھ لگاتا رہتا ہے تم۔ ماپی کو اتنا سستا نہیں کرتے ورنہ اس کا کوئی قدر قیمت نہیں رہتا۔ اب امارے ڈاکٹر صیب کو ہی دیکھو، اس نے کبھی تم سے ماپی مانگا...... جبکہ ام جانتا ہے کہ یہ جس طرح کے کام کرتا ہے اس کو ہر روز دو تین مرتبہ تم سے ماپی مانگنا چاہیے اور ڈاکٹر صیب کو بھی چھوڑو، یہاں کوئی کسی سے ماپی نہیں مانگتا...... لوگ ملک کا سارا خزانہ کھا جاتے ہیں پھر بھی ماپی نہیں مانگتے۔ بلکہ جن کا پیسا کھاتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگائیں۔"

ناصر کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے بے دھیانی میں سخت بات کہہ دی ہے۔ وہ ایک لٹی پٹی بے آسرا لڑکی تھی اور اس وقت کلی طور پر ان کے رحم و کرم پر تھی۔ رستم نے ناصر کو اشارہ

کیا کہ وہ زری کو دلاسا دے۔ ناصر نے بیٹھے بیٹھے زری کو اپنے ساتھ لگایا اور ذرا پچکارا۔ وہ اور زور سے رونے لگی۔ تاہم جلد ہی اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا...... اور اس نے خود کو ناصر کی محبت بھری گرفت میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ناصر اور اجمل، زری کو کمرے میں لٹا آئے۔ واپس آ کر ناصر نے پھر سے ٹی وی آن کیا مگر اب نیوز ختم ہو چکی تھیں۔ ناصر نے رستم کو بتایا کہ طفیل کی گمشدگی نے واقعی ہلچل مچائی ہے۔ اخباروں نے بھی اس خبر کو نمایاں جگہ دی ہے۔ کچھ افراد کو تفتیش میں لیا گیا ہے۔ ان میں مہتم برادری کے دو بندے بھی ہیں۔

خانساماں ناشتا لے آیا۔ ناشتے کے دوران بھی رستم اور ناصر میں گفتگو جاری رہی۔ رستم نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''ناصر! آنے والے دن میرے لیے بڑے اہم ہیں۔''

''ہم آپ کو تنہا کسی خطرے میں نہیں کودنے دیں گے۔'' ناصر نے مصمم ارادے کے ساتھ کہا۔

''ڈپٹی ریاض سے حساب چکائے بغیر تو میرے لیے مرنا بھی آسان نہیں ہو گا۔ تم جانتے ہی ہو اس نے ہم پر کتنے قرض چڑھا رکھے ہیں اور پھر قدرت اللہ ہے جو زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے۔ اپنی بیوی کی موت کے بعد وہ بی بی کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ اپنی زہریلی سوچ کے ساتھ جب تک زندہ ہے، بی بی کے سر پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی۔''

''بے شک جو آپ کی سوچ ہے، وہی میری ہے۔''

''میں اس چار دیواری میں چھپ کر بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں ناصر...... اور یہ کام نمٹانے کے لیے اس چار دیواری سے نکلنا ضروری ہے۔ اس چار دیواری سے نکلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرا حلیہ ہے۔ میرے لمبے بال اور داڑھی میری شناخت تو بہت آسان بنا دیتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان بالوں سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔''

''ہاں، یہ برا خیال نہیں ہے...... لیکن آپ بار بار میں اور مجھے کے لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ اس سفر میں ہم سب شریک ہیں اور ہماری منزل بھی ایک ہے، ان شاء اللہ۔''

''میں اس سے انکار تو نہیں کر رہا ہوں ناصر اور مجھے معلوم ہے کہ جہاں تم لوگوں کی ضرورت ہو گی، تم توقع سے بڑھ کر میرا ساتھ دو گے۔''

ناصر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد رستم نے کہا۔ ''ایک بار پھر حجام کو بلایا

جائے۔'' اس نے یہ بات ازراہِ مذاق کہی تھی۔ حجام کو یہاں بلانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی جب وہ یہاں وارد ہوئے تھے انہوں نے اپنے بال ترشوائے تھے مگر کسی پیشہ ور حجام سے نہیں، ڈولے سے۔ ڈولا ہر فن مولا شخص تھا جب وہ کوکب کی بڑی بہن کے عشق میں گرفتار ہو کر لاہور میں فلم لائن کے دھکے کھا رہا تھا۔ اس نے حجام کا کام بھی سیکھا تھا۔

رستم کے کہنے پر ناصر نے اسے بلایا۔ ڈولے نے ایک گھنٹے کے اندر رستم کے نہ صرف سر کے بال خوب صورتی سے تراش دیئے بلکہ اسے کلین شیو بھی کر دیا۔ اس تبدیلی نے رستم کی مجموعی شخصیت کو کافی حد تک بدل دیا۔ رستم کے بال گہرے سیاہ تھے۔ ناصر نے تجویز پیش کی کہ اگر ''ڈائی'' کے ذریعے اس کے بالوں کی گہری سیاہی کو ذرا کم کر دیا جائے تو مزید بہتری آئے گی۔ مشورے کے بعد رستم نے یہ تجویز بھی مان لی۔

رستم کو ہیلمٹ کا استعمال بھی بہت پسند آیا تھا۔ یہ ایک ایسا نقاب تھا جسے پہن کر وہ بلا خطر پورے شہر کا چکر لگا سکتا تھا۔

رستم کے دل میں عجیب سی عجلت پیدا ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کرنا ہے، جلد سے جلد کر لے۔ اس کے اندر ایک عجیب سا خدشہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ کہیں بی بی کچھ کہہ نہ دیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی بھی وجہ یا مجبوری کے تحت بی بی اس سے کہہ دیتیں کہ فی الحال وہ طفیل یا ڈپٹی ریاض کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے تو اسے پابند ہو جانا تھا۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی بی بی کی منشا کے خلاف چلتا۔ وہ عشق کی اس منزل پر تھا جہاں کسی کے ایک اشارے پر آنکھیں بند کر کے تحت الثریٰ میں چھلانگ لگائی جا سکتی ہے۔

اجمل خان کی آواز نے رستم کو چونکا دیا۔ ''آپ کن خیالوں میں کھو گیا رستم بھائی۔ یہ دیکھیں ام آپ کے لیے کیا لایا ہے۔''

اجمل کے ہاتھ میں ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ رستم کے اشارے پر اجمل نے اس کو آن کیا۔ ریکارڈ شدہ آڈیو کیسٹ میں طفیل کراہ رہا تھا اور فر فر بول رہا تھا۔ طفیل نے اس ریکارڈ شدہ بیان میں اعتراف کیا تھا کہ بادل مہتم اور اس کے ساتھی سیلاب زدہ بستی میں لوٹ مار نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنا ہی سامان نکالنے کے لیے ایک گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان پر گولی چلائی اور اس فائرنگ میں بادل کو ٹارگٹ بنایا۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ بادل کو ٹارگٹ بنانے کی ہدایت اسے اپنے چچا حاضر سروس ڈپٹی

سپرنٹنڈنٹ ریاض کی طرف سے ملی تھی۔اس ٹارگٹ کلنگ کا مقصد مبتم اور گوراہی برادری میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔

اس بیان سے اس واقعے کا ایک نیا رخ سامنے آ رہا تھا۔اس سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ مقامی سیاست میں کھچڑی سی پک رہی ہے۔ بہر حال رستم کو ان معاملوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔اسے اگر فکر تھی تو وہ بی بی کی تھی کہ وہ کہیں ان معاملوں میں زیادہ نہ الجھ جائیں۔اس کی دوسری پریشانی ڈپٹی ریاض تھا۔وہ جلد سے جلد اس کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

رستم اور ناصر نے طفیل کا ریکارڈ شدہ بیان دو تین بار سنا۔طفیل کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اجمل نے اس کی ساری تن فن ختم کر ڈالی ہے اور اب وہ مشکل سوالوں کے جواب بھی آسانی سے دے دے گا۔

رستم اٹھ کھڑا ہوا اور اجمل کے ساتھ تہہ خانے میں آ گیا۔ناصر بھی اس کے ساتھ تھا۔ تہہ خانے میں طفیل صرف ایک انڈر وئیر کے ساتھ موجود تھا۔اجمل نے اسے بڑی مضبوطی سے ایک آہنی کرسی سے باندھ رکھا تھا۔کرسی کو زمین پر لٹا دیا گیا تھا۔یوں طفیل کے پاؤں افقی رخ پر ہو گئے تھے۔اس کے تلوے بری طرح سوجے ہوئے تھے۔اجمل نے اسے بڑے پروفیشنل انداز میں مارا تھا۔اس کے جسم پر کوئی تازہ چوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ چہرے پر بھی بس وہی چوٹیں تھیں جو رستم کی مار پیٹ سے آئی تھیں۔

رستم کے اشارے پر اجمل نے کرسی کو سیدھا کیا۔طفیل بری طرح کراہنے لگا۔اجمل نے کہا۔''دیکھ لیں جناب!ام نے اس کی خاطر مدارات میں کسی طرح کا کوئی کسر نہیں چھوڑا۔ اس کی مہمان نوازی کے لیے امارے پاس تین چار طرح کا ڈشیں موجود تھا مگر یہ ایک ہی ڈش سے شکم سیر ہو گیا ہے۔''

''کیوں بھئی، پیٹ بھر گیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

طفیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس اپنی چربی دار ٹھوڑی اپنی گردن پر ٹکائے کراہتا رہا۔

''ام نے کہا تھا جی، تھوڑا سا سوڈا واٹر پی لو۔ایک دو ڈکار آئے گا، معدے میں مزید گنجائش پیدا ہو جائے گا۔ بعد میں تھوڑا سا سویٹ ڈش لے لیتا لیکن یہ دہائی دینے لگا کہ مجھ کو میٹھے سے پرہیز ہے۔''

''کون سا میٹھا کھلا رہے تھے تم؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ والا۔'' اجمل نے پلاس سے طفیل کی مونچھوں کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

رستم صوفے کو گھسیٹ کر طفیل کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔اس نے بڑی سفاکی سے طفیل کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔''تمہارے چاچا جان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔اب تم یہ بتاؤ گے کہ اس ملاقات کے لیے کون سی جگہ اور کون سا وقت بہترین ہے اور یاد رکھنا، غلط معلومات دو گے تو بہت زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ابھی تک تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ اس درندگی کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو تمہارا چاچا میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔''

طفیل نے اپنے خشک زخمی ہونٹوں پر زبان پھیری اور کراہا۔''م...... مجھے صرف یہ پتا ہے کہ وہ آج کل گوجرانوالہ میں ہیں۔ان کی ٹائمنگ وغیرہ کا مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

ناصر پھنکارا۔''یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ کتا آج کل گوجرانوالہ میں ہے۔وہاں کسی تفتیش کے لیے ٹھہرا ہوا ہے۔اس کے آنے جانے کے ٹائم کیا ہیں؟ سکیورٹی وغیرہ کیا ہے؟ یہ تم بتاؤ گے اور تمہیں یہ سب پتا ہے۔'' ناصر نے آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی ٹانگ پر بے رحمی سے ٹھوکر لگائی۔وہ بری طرح کراہنے لگا۔

''بولتے ہو یا پھر ام سویٹ ڈش پلیٹ میں ڈالے۔'' اجمل نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں سچ کہتا ہوں...... م...... مجھے اس بارے میں زیادہ پتا نہیں...... اور...... اور دیکھو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں...... اگر...... م میرے دل کو کچھ ہو گیا ''

''خو، یہ بہت پرانا ڈائیلاگ ہے۔ جب ام پولیس میں تھا تو ام بھی یہ ڈائیلاگ بہت سنتا تھا۔خاص طور سے جب کوئی موٹا سیٹھ حوالات میں پھنستا ہے تو یہ ڈائیلاگ ضرور مارتا ہے۔''

رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔''لمبا چوڑا بوفے ڈنر کھانے کے بعد...... وو دو عورتوں کے ساتھ اکٹھے سونے کے بعد بھی اگر تمہارا بلڈ پریشر فٹ فاٹ رہتا ہے تو اب بھی ان شاء اللہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

اگلے تین چار منٹ میں اجمل نے طفیل کو تھوڑی سی مزید مار لگائی۔اس کے واویلے سے تہہ خانہ گونجنے لگا۔وہ موٹی کھال کا بندہ تھا اور خاصا ڈھیٹ بھی تھا...... تاہم اس کے اندر وہ کم ہمتی بھی موجود تھی جو سیاہ کار لوگوں کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے۔ جب اس نے اپنی ناک سے مسلسل خون بہتے دیکھا تو اس کا سارا جسم کانپنے لگا اور اس نے ایک دم حوصلہ چھوڑ دیا۔اس نئی خاطر مدارت کے بعد طفیل نے اپنے محترم چچا جان کے حوالے سے جو تازہ صورت حال

بتائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

......اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ ڈپٹی ریاض دو تین دن کے اندر اپنے کسی خاص کام سے آزاد قبائلی علاقے کی طرف یا شاید پڑوسی ملک کی طرف نکل جائے گا۔ اگر کوئی اس سے جلد ملاقات کرنا چاہتا تھا تو پھر اسے ایک دو روز کے اندر ہی کرنی تھی۔ اس ملاقات کے لیے ایک بہت موزوں موقع بھی طفیل کی زبانی ہی معلوم ہو گیا۔ مسلسل سوال جواب کر کے رستم وغیرہ نے جو کچھ طفیل سے معلوم کیا، وہ کچھ اس طرح تھا۔ وزیری گاؤں کے بہت بڑے زمیندار اور سیاسی شخصیت چوہدری شہاب الدین کے بیٹے کی شادی تھی۔ کل اس کی دعوتِ ولیمہ بھی تھی، اس نے کل وزیری گاؤں میں ضرور آنا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہی آتا مگر اس کا آنا یقینی تھا۔

وزیری گاؤں کا فاصلہ لاہور سے صرف چالیس پچاس کلو میٹر تھا۔ گاؤں تک پختہ سڑک بھی پہنچتی تھی۔ گوجرانوالہ آنے کے بعد رستم، ناصر اور اجمل خان نے مشورہ کیا۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ اگر وہ ڈپٹی ریاض سے جلد ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں کل کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

ناصر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں ڈپٹی ریاض سے حساب بے باق کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ وہ اس وقت غفلت میں ہے۔ بس اسی غفلت میں ہی اسے دبوچ لینا چاہیے۔ بس ایک دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں صحیح جگہ پر ڈال کر ہم فارغ ہو سکتے ہیں۔''

''ہم کو تو لگتا ہے جی کہ اس پہ گولی چلانے کا ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب اس نے رستم بھائی کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ لیا تو اس کی آدھی دپات (وفات) تو وہیں ہو جائے گی۔ امارا مطلب ہے کہ نیم بے ہوش ہو جائے گا۔ ایسے میں اس کے سر پر دو چار دو ہتڑ مار اس کو ہلاک کیا جا سکے گا۔''

''خیر اس معاملے کو اتنا آسان بھی مت لو۔'' رستم نے کہا۔ ''وہ غافل ہو کر بھی عام لوگوں سے کہیں زیادہ چوکس ہو گا۔ خاص طور سے اپنے بھتیجے کی گمشدگی کے بعد اسے اپنی طرف سے بھی خطرہ ہو گا۔ وہ آج کل جس علاقے میں ہے، وہاں سے ہم تم زیادہ دور بھی نہیں ہیں۔''

''آپ کے ذہن میں کوئی پروگرام ہے؟'' ناصر نے ٹٹولنے والی نظروں سے رستم کو دیکھا۔

''میرے خیال میں ہمیں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔ جو کام ایک اکیلا بندہ کر سکتا ہے اس کے لیے دو یا تین بندوں کو جانے اور خود کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو یہی ہے نا کہ اس حرامی کو جلد از جلد لاش میں بدل دیا جائے۔''

ناصر اور اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کل رات میں نے جو ہیلمٹ لی اور موٹر سائیکل والا تجربہ کیا ہے، وہ بہت کامیاب رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کیوں نہ کل شام میں موٹر سائیکل پر ہی وزیری گاؤں پہنچ جاؤں۔ مجھے بس ایک بھرے ہوئے پستول اور اس کے تیس چالیس فالتو راؤنڈز کی ضرورت ہو گی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے...... کارروائی کے بعد آپ آسانی سے نکل سکیں گے؟''

''وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ رات کے وقت بستیوں سے باہر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے اور میرے خیال میں موٹر سائیکل پر فرار ہونا، گاڑی یا کسی دوسری سواری پر فرار ہونے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔''

اس موضوع پر ان تینوں میں تقریباً ایک گھنٹے تک بات ہوئی۔ تمام پہلوؤں پر باریک بینی سے غور کیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ رستم اور ناصر دونوں اس مہم پر جائیں گے۔ ان کے اسلحے میں ایک پستول اور ایک ماؤزر شامل ہو گا۔ یہ دونوں ہتھیار موٹر سائیکل کے اندر ہی اس طرح چھپائے جائیں گے کہ آسانی سے نظر نہ آ سکیں۔ اس کے لیے موٹر سائیکل کی نشست کے نیچے فوم کے اندر جگہ بنانے کی تجویز تھی۔

ساری تفصیل طے ہو چکی تو ناصر نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''رستم بھائی! اب آپ کا کیا خیال ہے، حاجی حیات صاحب ہمیں اس مہم جوئی کی اجازت دیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس چار دیواری سے نہ نکلیں۔''

''اس کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔

''تو آپ کا کیا مطلب ہے، ہم یہاں سے تین چار گھنٹے غائب رہیں گے اور ان کو پتا ہی نہیں چلے گا۔''

''پتا چل جائے گا تو زری کی طرح معافی مانگ لیں گے۔'' رستم نے غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مگر رستم بھائی! آپ حاجی صیب کو نہیں بتائے گا تو موٹر سائیکل کا انتظام کیسے ہو گا؟'' اجمل خان نے نکتہ اٹھایا۔

''موٹر سائیکل کا انتظام ہے۔ وہاں سرونٹ کوارٹر میں ایک موٹر سائیکل پڑی ہوئی ہے، بس اس پر ایک فرضی نمبر پلیٹ لگائیں گے اور کام چلائیں گے۔''

''اچھا، وہ پرانا بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل.... مگر اس کا تو بیٹری نہیں ہے۔''

''بیٹری کا انتظام کر لیتے ہیں۔ تھوڑا بہت اور نقص بھی ہوگا تو ہمارے پاس ہر فن مولا ڈولا موجود ہے۔ وہ ٹھیک کر لے گا۔''

اگلے روز شام سے ذرا پہلے رستم اور ناصر پانچ ہارس پاور سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو پر سوار، لاہور کے مضافات سے نکل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی گرد آلود ہوا چل رہی تھی۔ رستم پینٹ شرٹ میں تھا اور موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ناصر شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے چہرے کے گرد کپڑے کا منڈاسہ لپیٹ رکھا تھا۔ دیہاتی علاقے میں موٹر سائیکل والوں کے چہروں پر ایسے منڈاسے اکثر نظر آتے ہیں۔ اندھیرا پھیلنے کے قریباً آدھے گھنٹے بعد انہوں نے مین سڑک چھوڑی اور روزیری گاؤں کی طرف جانے والی ذیلی سڑک پر آ گئے۔

☆======☆=====☆

شانی کا دل تو بالکل بھی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر خالو اعجاز اور تایا معصوم کا اصرار تھا کہ اسے شادی کی اس تقریب میں ضرور جانا چاہیے۔ چوہدری شہاب الدین کا شمار علاقے کے با اثر لوگوں میں ہوتا تھا۔ چوہدری شہاب الدین ذاتی طور پر رنگ والی آئے تھے اور دعوت نامہ دے کر گئے تھے۔ برات میں تو تایا معصوم اور پھوپھو آمنہ نے رنگ والی کی نمائندگی کر دی تھی تاہم اب ان کا اصرار تھا کہ ولیمے میں شانی ضرور شرکت کرے۔

اسے نہ چاہنے کے باوجود ایک بار پھر بھاری بھرکم قیمتی لباس پہننا پڑا۔ ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرنا پڑا۔ ائیر کنڈیشنڈ کار اور گارڈز کی دو جیپیں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں.... مگر شانی کا دل مسلسل رستم میں اٹکا ہوا تھا۔ آج کتنے ہی دن ہو چکے تھے رستم سے رابطہ ہوئے۔ اس نے چند روز پہلے خادم حسین کے ذریعے رستم کو تفصیلی پیغام تو دے دیا تھا مگر براہِ راست بات تو اب تک نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اس امید پر ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی کہ شاید آج لائن ٹھیک ہو گئی ہو۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا...... لائن پر وہی منحوس سناٹا تھا۔ وہ جز بز ہو گئی۔ پتا نہیں کیوں لائن ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی۔ لائن مین ہر دوسرے روز آ کر امید ..ا جاتا تھا مگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل خالو اعجاز سے کہہ کر متعلقہ ایس ڈی او کو بلوائے گی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت خالو اعجاز ہی ہیں جو فون ٹھیک کرانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شانی کی تمام تر توجہ حویلی کے معاملوں پر مرکوز رہے اور لاہور سے اس کا رابطہ کم سے کم ہو۔ وہ اپنے طور پر ایک محتاط اور پُرخلوص بزرگ کا کردار ادا کر رہے تھے اور اپنے انداز سے سوچ رہے تھے جبکہ شانی اپنے انداز سے سوچ رہی تھی۔

بے شک اس کے لیے بھی حویلی اور حویلی کے معاملات بہت اہم تھے لیکن ان سے

کہیں زیادہ اس کے لیے رستم اہم تھا۔ اس نے جھنجھلا کر ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا اور تایا معصوم کی پکار کے جواب ”آئی تایا جی“ کہتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف لپک گئی۔

وہ خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ جب وہ حویلی کے اندرونی حصے سے نکلی تو احاطے میں موجود درجنوں افراد نے اسے سلام کیا اور اپنی نگاہیں جھکالیں۔ عارف کمبوہ بھی حفاظت کی غرض سے ایک جیپ کے ساتھ موجود تھا۔ شانی آرام دہ کار میں آبیٹھی۔ اس کا ذہن مسلسل رستم اور لاہور میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارے جھنجھٹ چھوڑ دے۔ یہ سارے معاملات کوئی اور بھی تو سنبھال سکتا تھا۔ وہ بس مُنّے کو گود میں اٹھائے رستم کا ہاتھ پکڑے، آپا زاہدہ اور بھائی اکرام کو ساتھ لے......اور کہیں بہت دور نکل جائے۔ جہاں دن رات اس کے گرد رستم کی بانہوں کا گھیرا ہو اور وہ خود ہو۔

شانی کے ذہن میں بہت سے خطرات بھی منڈلا رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رستم کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہوگا۔ وہ وڈے ڈیرے کے قتلِ عام کو کسی صورت بھول نہیں سکتا تھا اور اس قتلِ عام کا سب سے بڑا مجرم ڈپٹی ریاض تھا۔ اب ڈپٹی ریاض، رستم کے اردگرد موجود تھا اور رستم یہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ قاتل اس کے آس پاس موجود ہو اور زندہ بھی ہو۔ رستم کسی بھی وقت کوئی خطرناک ترین قدم اٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے قریب موجود ہوتی تو اس کو سمجھا بجھا سکتی تھی لیکن فی الوقت تو اس سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

گاڑیوں کا قافلہ جنوب کی طرف رواں رہا۔ جنوب جہاں لاہور تھا اور جہاں رستم، ناصر، اجمل اور ڈولا وغیرہ تھے مگر شانی کو لاہور نہیں جانا تھا۔ اسے لاہور سے بہت پہلے وزیری گاؤں میں ہی رک جانا تھا اور ایک اَن چاہی تقریب میں شرکت کر کے واپس لوٹ آنا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے میں وہ لوگ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ دیہی علاقوں میں شادی ہال وغیرہ کا رواج نہیں ہے لیکن وزیری گاؤں کے نواح میں غیر متوقع طور پر ایک بڑا شادی ہال موجود تھا۔ جنریٹرز کی مدد سے اس شادی ہال کو بقعۂ نور بنایا گیا تھا۔ وزیری گاؤں کے وسط میں چوہدری شہاب الدین کی حویلی بھی جگمگا رہی تھی۔ حویلی سے شادی ہال تک روشنیوں کی دو طویل قطاروں کے ذریعے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ یہاں گاڑیوں کی قطاریں موجود تھیں۔ بھاری بھاری جسموں اور اونچے اونچے شملوں والے چوہدری شہاب الدین اور اس کے بیٹوں نے رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا پُرتپاک استقبال کیا اور انہیں پنڈال میں اسٹیج کے بالکل نزدیک بٹھایا۔

اسٹیج پر ایک ورائٹی شو چل رہا تھا۔ لاہور سے آئے ہوئے فنکار فنی مذاق کے آئٹم پیش کر رہے تھے۔ ایک گوشے میں سازندے موجود تھے۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے رقص بھی ہو چکا تھا۔ تقریب میں موجود کیمروں کا رخ شانی کی طرف ہو گیا۔ اس کا چہرہ بار بار فلیش لائٹ میں نہانے لگا۔ علاقے کے زمیندار اور چوہدری شانی کے اردگرد بیٹھ کر فخر محسوس کر رہے تھے۔ ان میں چوہدری حشام، چوہدری بابر اور نارپور کے دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ چوہدری حشام نے آگے بڑھ کر شانی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی عاجزی کے ساتھ اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ وہی چوہدری حشام تھا جس نے اپنی حویلی میں شانی پر ظلم و ستم کی انتہا کی تھی۔ وہ اسے زمین پر بٹھاتا تھا۔ اسے جالاں جیسی سفاک نوکرانیوں سے پٹواتا تھا اور بالآخر اس نے شانی کو اپنے نوعمر بیٹے کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ شانی کی بے پناہ برداشت اور اس کے حسنِ سلوک کا اعجاز تھا کہ آج چوہدری حشام اور بابر جیسے دشمن شانی کے قریب بیٹھ کر اور اس سے بات کر کے خوشی محسوس کر رہے تھے۔

”چوہدری جی، راجو آج کل کہاں ہے؟“ شانی نے حشام سے پوچھا۔

”وہ آج کل اپنی ووہٹی کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو گیا ہوا ہے۔ ویسے وہ تم کو ہر ویلے یاد کرتا رہتا ہے۔“

”ہاں......ایک مہینہ پہلے رنگ والی میں ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہتا تھا کہ میں کوکی کو ساتھ لے کر آؤں گا اور چار دن رنگ والی میں رہوں گا۔“

شاید چوہدری حشام اور شانی میں مزید بات ہوتی مگر اسی دوران میں پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اداکاروں کی ایک جوڑی مشہور مزاحیہ اداکار منور ظریف اور ننھو کی آوازوں کی نقل کر رہی تھی۔ یہ نقل اتنی شاندار تھی کہ لوگ بے ساختہ داد دینے لگے۔ درحقیقت یہ دونوں صدا کار آوازوں کی نقل اُتارنے میں ماہر تھے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں انہوں نے کئی مشہور اداکاروں اور سیاست دانوں کی کاپی کر کے لوگوں کو حیران کر دیا۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے اور قہقہے برسا رہے تھے۔ شانی کے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری اعجاز صاحب کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے۔ ان کی نگاہ بار بار اداکاروں کی طرف اُٹھتی تھی اور پلٹ آتی تھی۔ وہ اس بات پر خود بھی حیران تھے کہ آوازوں کی نقل اتنی مکمل طریقے سے بھی کی جا سکتی ہے۔

☆======☆======☆

رستم اور ناصر جب وزیری گاؤں کے نزدیک پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ وزیری

گاؤں کی حویلی انہیں دور ہی سے نظر آ گئی۔ حویلی پر لائٹنگ کی گئی تھی۔ اس لائٹنگ سے اردگرد کا علاقہ بھی روشن ہو رہا تھا۔ پارکنگ میں زمینداروں اور چوہدریوں کی بڑی بڑی جیپیں اور کاریں کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ رستم کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس کی نگاہیں اپنے بدترین دشمن کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

وزیری گاؤں سے دو تین کلومیٹر پہلے ہی انہوں نے اپنی موٹر سائیکل درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑی کی تھی اور اس کی نشست کے نیچے سے اسلحہ نکال لیا تھا۔ اب پستول رستم کے لباس میں تھا اور ماؤزر ناصر کے کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ حویلی کی پارکنگ میں پہنچ کر رستم نے ہیلمٹ اُتار دیا...... نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اسے یہاں پہچانا نہیں جا سکتا۔ درحقیقت پولیس کی فائلوں میں تو وہ مر چکا تھا۔ ایک طویل عرصے سے اسے دیکھا گیا تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع تھی...... اب وہ کافی حد تک بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

"وہ دیکھیں، لگتا ہے کہ وہاں کوئی شور ہو رہا ہے۔" ناصر نے حویلی کے احاطے میں موجود مجمع کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ شاید رنگ والی سے بھی کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔" رستم نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ سرخ نسان گاڑی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے یہ حویلی میں دیکھی ہے۔"

ایک موٹا سا حوالدار وقت گزاری کے لیے درخت کے ایک کٹے ہوئے تنے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کے سگریٹ کا شعلہ نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔ رستم بڑے اعتماد سے اس کے پاس چلا گیا۔ حوالدار نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا۔

"حوالدار جی۔ سنا ہے ڈپٹی ریاض صاحب نے بھی یہاں آنا ہے؟"

حوالدار نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم نے ڈپٹی ریاض صاحب کے ساتھ بانہہ پھڑنی ہے؟" (بازو پکڑنے کا مقابلہ کرنا ہے؟)

"نہیں، ویسے ہی ان کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بڑی مشہوری سنی ہوئی ہے جی ان کی۔"

حوالدار نے گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے آنا تھا...... پر نہیں آئے۔ سنا ہے کہ وہ کسی تفتیش پر پشاور کی طرف گئے ہیں۔"

رستم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اسی دوران میں ایک لمبا تڑنگا ہیڈ کانسٹیبل بھی موقع پر پہنچ

گیا۔ "کیا بات ہو رہی ہے جی؟" اس نے خود کو گفتگو میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈپٹی ریاض صاحب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کا دیدار کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"بھائی جی! وہ کوئی فلمی ایکٹر ہیں جن کا دیدار کرنا ہے؟"

"بڑا نام ہے ان کا کانسٹیبل صاحب۔ سنا ہے انہوں نے بڑے بڑے ڈاکو پھڑکائے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے اپنا گائے جیسا بڑا سا سر ہلایا۔ پھر لکڑی کے تنے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پر وہ تو اس وقت کہیں پشاور کوہاٹ میں پھر رہے ہیں۔ ابھی انسپکٹر اسلم جٹ صاحب وائرلیس پر بات کر رہے تھے۔ وہ کسی دوسرے افسر کو بتا رہے تھے کہ ڈپٹی ریاض صیب یہاں نہیں آئے۔ وہ اپنے دورے پر چلے گئے ہیں۔"

حوالدار کی بات پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی تھی۔ ڈپٹی ریاض یہاں نہیں تھا۔ اس کی قسمت اسے وقتی طور پر موت کے اسٹیج سے دور لے گئی تھی۔

اچانک ناصر نے چپکے سے رستم کا بازو دبایا۔ وہ بڑے دھیان سے پنڈال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رستم نے ناصر کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ شروع میں تو وہ کچھ نہ جان سکا لیکن پھر وہ بھی ایک دم چونک گیا۔ اس کی ساری حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئیں۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بی بی کو دیکھا۔ بی بی شاندار لباس پہنے، کندھوں پر زرتار چادر ڈالے پنڈال سے حویلی کی طرف جا رہی تھیں۔ بی بی کے اردگرد میزبان چوہدری شہاب الدین اور اس کے بیٹے تھے۔ رستم کو چوہدری اعجاز اور چوہدرانی آمنہ کی صورت بھی دکھائی دی۔ ان کے عقب میں رنگ والی کے دو تین مسلح محافظ بھی تھے۔

بی بی کو دیکھ کر رستم ششدر رہ گیا۔ وہ اور ناصر نیم تاریکی میں کھڑے تھے اس لیے بی بی کے ہمراہیوں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ بی بی تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھیں تو محافظ ایک جگہ رک گئے۔ باقی لوگ حویلی کے اندر چلے گئے۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ شانی اور پھوپھو آمنہ دلہن کو دیکھنے کے لیے حویلی کے زنان خانے میں گئی ہیں۔

اپنی بی بی کو خود سے اتنا قریب دیکھ کر رستم بے چین ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کسی طور بی بی سے بات کرے۔ کم از کم ان سے یہ تو پوچھے کہ انہوں نے اسے انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے...... اس سے رابطہ کیوں نہیں کر رہیں؟ لیکن بات کیسے ہو سکتی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ تھے اور بی بی کے اردگرد رنگ والی کے کئی بزرگ تھے۔

"کیا کیا جائے ناصر! کیا بی بی سے بات کرنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟"

"یہاں تو بہت مشکل ہے۔"

"کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ملازمہ کے ہاتھ بی بی کو کوئی چٹ بھیج دی جائے۔"

"ہوتو سکتا ہے......لیکن گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔"

رستم اور ناصر چلتے ہوئے حویلی کے وسیع وعریض لان کے کنارے پہنچ گئے۔ ناصر کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنا منڈاسا اُتار دیا تھا۔ وہ کئی پولیس والوں کے سامنے سے گزرا مگر کسی نے اس پر ذرا سی بھی توجہ نہیں دی۔ اس صورت حال کے سبب رستم کا حوصلہ بھی اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ تو بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔

مگر پھر اچانک ان دونوں کو بری طرح چونکنا ہوناپڑا۔ انہوں نے رنگ والی حویلی کے ایک ملازم برکات علی کو دیکھا۔ گھونگریالے بالوں والا یہ درمیانی عمر کا شخص حویلی کا مستقل ملازم تھا اور ہر طرح کی مشینری بشمول ٹریکٹر، ڈیزل انجن وغیرہ ٹھیک کرتا تھا۔ وہ حویلی کے برآمدے میں کھڑا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر رستم اور ناصر ایک دم پریشان ہو گئے۔ وہ چوہدری اعجاز تھے۔ برکات علی کی نگاہیں تو رستم اور ناصر پر تھیں مگر وہ بات چوہدری اعجاز سے کر رہا تھا۔ ایک ہی لحظے میں رستم اور ناصر سب کچھ بھانپ گئے۔ یہ ان کے لیے مخدوش صورتِ حال تھی۔ حویلی کے خاص ملازم برکات علی نے رستم اور ناصر کو قریب سے دیکھا تھا اور غالباً ان دونوں میں سے رستم کو پہچان لیا تھا۔ اب وہ چوہدری اعجاز کو ان دونوں کی موجودگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کی توقع تھی۔ چوہدری اعجاز تیزی سے رستم اور ناصر کے قریب چلے آئے۔ انہوں نے بڑے دھیان سے رستم کو دیکھا اور اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود اس کو پہچان گئے۔ رستم نے پہل کرتے ہوئے چوہدری اعجاز کو سلام کیا۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے......اور یہاں کیسے پہنچ گئے ہو تم؟" انہوں نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔ ان کا لہجہ دھیما تھا جیسے وہ چاہ رہے ہوں کہ اردگرد موجود کوئی شخص اس گفتگو سے آگاہ نہ ہوسکے۔

"کیا میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے؟" رستم نے نرم لہجے میں کہا۔

"پابندی لگانے والا میں کون ہوتا ہوں لیکن تمہارے یہاں آنے کا کوئی مقصد تو ہوگا؟"

"مقصد تو ایک تھا لیکن وہ پورا نہیں ہوسکا۔ اب میں نے شانی بی بی کو یہاں دیکھ لیا

ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ شانی سے ملنے کے لیے ہی یہاں پہنچے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیوں ہمیں اس طرح ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" چوہدری اعجاز کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"اگر میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں تو اس میں آپ کی ذلت کا مسئلہ کہاں سے نکل آیا؟"

چوہدری کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انہوں نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی ان کی طرف متوجہ تو نہیں ہے پھر پھنکار کر بولے۔ "رستم! بندے کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اگر میں نہ جاؤں تو؟" رستم نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"پھر تمہارے جیسے بدخصلتوں کے لیے اور طریقے بھی ہوتے ہیں۔" چوہدری کا لہجہ آتش فشانی ہوگیا مگر آواز بہ دستور پست تھی۔

"بدخصلت تُو خود ہوگا چوہدری۔" رستم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اس میں تیرا قصور نہیں۔ تیرے اندر کا گندا خون بول رہا ہے۔" چوہدری جیسے پھٹ پڑا۔ اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی......اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے رستم کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ طیش کے عالم میں اس کا دایاں ہاتھ پوری قوت سے گھوما اور چوہدری اعجاز کے رخسار پر پڑا۔ وہ اپنی پگڑی سمیت ڈگمگا کر رہ گیا۔

عین اسی وقت شانی برآمدے میں موجود تھی۔ وہ رستم اور چوہدری اعجاز کی تکرار دور سے دیکھ رہی تھی۔ جب رستم نے چوہدری اعجاز کو تھپڑ مارا تو وہ دوڑتی ہوئی ان دونوں کی طرف آئی۔ یہ سارا واقعہ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ہوا تھا۔ دو تین افراد کے سوا یہ منظر کوئی نہیں دیکھ سکا۔ تھپڑ کھانے کے بعد چوہدری اعجاز تو اپنی جگہ کھڑا رہا مگر ملازم برکات علی جو تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا تیزی سے رستم کی طرف بڑھا۔ تب تک شانی بھی قریب آ چکی تھی۔ چوہدری اعجاز نے شانی کو دکھانے کے لیے برکات علی کو راستے میں ہی روک لیا۔

"نہیں برکات، نہیں! دیوانے کے ساتھ دیوانے نہیں ہو جاتے۔ اس کی عزت نہیں ہوگی مگر ہماری تو ہے۔"

برکات علی نے زور مار کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر چوہدری اعجاز نے اسے نہیں

چھوڑا۔اس دوران میں شانی بھی رستم کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے میں اس کی خوب صورت آنکھوں کے اندر آتشیں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ ''رستم! یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ درد سے بھرپور آواز میں کراہی۔ ایک سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ رستم کا گریبان پکڑ لے گی ۔اور شاید وہ پکڑ بھی لیتی مگر چوہدری اعجاز نے اس کا راستہ بھی روک لیا۔ ''نہیں شانی پُتر.....ہمیں یہاں تماشا نہیں بنانا۔تم اندر چلو.....''

چوہدری اعجاز شانی کے رستے میں پوری طرح حائل ہو گیا..... پھر اسے دھکیلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا۔شانی نے درد سے کراہ کر کہا'' چلے جاؤ یہاں سے..... میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔'' شانی نے یہ بات رستم کے لیے کہی تھی مگر رستم یہ بات سننے سے پہلے ہی واپس جا چکا تھا۔چند ہی سیکنڈ میں یہاں احاطے میں ہونے والے واقعے کی خبر برآمدے تک بھی پہنچ گئی۔ چوہدری اعجاز کے مسلح محافظ دندناتے ہوئے باہر آئے۔ چوہدری کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر ان کی آنکھوں کی طیش آمیز حیرانی مزید بڑھ گئی۔

''کون تھا جی؟''

''کہاں گیا ہے جی؟''

''پکڑو اس حرامی کو۔'' دو تین آوازیں ابھریں۔

''نہیں..... بالکل نہیں.....کوئی کچھ نہیں کرے گا۔'' چوہدری نے مدھم مگر سخت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

محافظ جہاں کے تہاں رک گئے۔ یہی وقت تھا جب کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر یہ آواز تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ رستم سے اسے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ابھی کچھ دن پہلے اسے خالو اعجاز نے بتایا تھا کہ رستم نے ان سے فون پر سخت بدتمیزی کی ہے۔ابھی شانی کے دل میں اس بات کا کانٹا چبھا ہوا تھا کہ آج انتہا ہو گئی تھی۔ یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں تھی۔شانی نے اپنی آنکھوں سے، رستم کو تھپڑ مارتے دیکھا تھا۔شانی کا دماغ ہی نہیں پورا جسم سنسنا رہا تھا۔خالو اعجاز کی آنکھوں کو نم دیکھنا ایک ایسا منظر تھا جو شانی کے دل کو اس کے سینے میں لہو کر رہا تھا۔

یہ واقعہ ایسا نہیں تھا جسے چھپایا جا سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی میں موجود سارے مہمانوں میں یہ خبر پھیل گئی۔ چوہدری شہاب الدین اور اس کا بڑا بیٹا بھناتے ہوئے چوہدری اعجاز کے پاس پہنچ گئے۔ چوہدری شہاب نے پوچھا۔''کون حرام زادہ تھا وہ۔ آپ نام بتاؤ

جی۔ہم اسے زمین کی تہہ سے کھینچ کر لے آتے ہیں۔''

''نہیں چوہدری، میں اس معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا۔وہ جو کوئی بھی تھا اسے اپنی کرنی کا پھل ضرور ملے گا۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے گھر میں آ کر ہمارے مہمان کے ساتھ برا سلوک کرے اور چلا جائے۔ میں اس کے پیچھے بندے دوڑا رہا ہوں۔ پتا چلا ہے کہ وہ دو منڈے تھے اور موٹر سائیکل پر پکی روڈ کی طرف گئے ہیں۔''

چوہدری اعجاز نے بازو تھام کر اسے روک لیا۔'' چوہدری صاحب! میں ایک کملے (دیوانے) کے ساتھ کملا ہونا نہیں چاہتا۔اس کے کملے پن کی وجہ سے میری بے عزتی نہیں ہوئی مگر اس معاملے کو اچھالنے میں میری بے عزتی ہے۔ اگر میں نے اس بندے سے نمٹنا ہوا تو اپنے طور پر نمٹوں گا۔''

چوہدری شہاب نے کہا۔'' آپ کا مطلب ہے کہ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہو اور فی الحال اسے معاف کر رہے ہو؟''

چوہدری زخمی انداز میں مسکرایا اور شانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' معاف کرنے کا ہنر بھی میں نے اپنی دھی رانی سے ہی سیکھا ہے۔لوگ بڑوں سے سیکھتے ہیں ہم اس چھوٹے سے سیکھ رہے ہیں۔''

شانی اپنے آنسو چھپانے کے لیے خالو اعجاز کے گلے لگ گئی۔ کچھ دیر بعد جب چوہدری اعجاز اور شانی کمرے میں اکیلے تھے تو شانی نے پوچھا۔'' خالو جی! کیوں ہوا ایسا؟ آپ نے کیا کہہ دیا تھا رستم کو؟''

'' کچھ بھی نہیں کہا میں نے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے برکات علی نے آ کر مجھے بتایا کہ اسے دو بندوں پر شک ہو رہا ہے۔ وہ احاطے کے پاس کھڑے ہیں، ان میں سے ایک رستم سیال لگتا ہے۔ میں برکات علی کے ساتھ باہر آیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا، وہ رستم ہی تھا۔تم نے دیکھا ہی ہے شانی کہ اس نے بال چھوٹے کرا لیے اور کلین شیو ہو گیا ہے۔ پینٹ شرٹ کی وجہ سے حلیہ اور بھی بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ناصر تھا۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے بڑی نرمی کے ساتھ اس سے بات کی۔ میں نے کہا کہ اسے تم سے ملنے کے لیے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں اتنے زیادہ مہمان ہیں اگر ملنا ضروری ہی تھا تو وہ پہلے فون پر رابطہ کر لیتا۔وہ تو جیسے پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا کہ وہ میری منکوحہ بیوی ہے۔ میں جب چاہوں گا اس سے ملوں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ وہ سیدھا اندر تمہارے پاس

آنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا رستم اس طرح تماشا بنے گا۔ میں نے اسے اندر آنے سے روکنا چاہا۔اس نے ہم سب کو گالیاں دیں .. پھر تھپڑ مار دیا۔''

''اسے کیا ہو گیا ہے خالو جی! وہ ایسا تو نہیں تھا، کہیں وہ .... پھر سے نشہ تو نہیں کرنے لگا۔''

''نہیں، نشے میں تو نہیں لگتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں غصہ بہت ہے۔ وہ کوشش تو کرتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ غصہ اس سے سنبھالا نہیں جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ......''

''لیکن خالو! اس نے اتنی غلط حرکت کر دی ..... اتنی زیادہ غلط۔'' شانی نے تیزی سے چوہدری اعجاز کی بات کاٹی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے چوہدری اعجاز کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔''خالو جی! اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ پتا نہیں یہ سب کیوں ہوا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، میرا دل رو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے..... کہ اس نے آپ پر نہیں ابا جی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔''

خالو اعجاز نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا سر چومتے ہوئے کہا۔''دیکھ میری دھی! تُو اپنے دل پر بوجھ نہ لے..... زندگی میں ایسی اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ جہاں تک رستم کی بات ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ بہتر ہو جائے۔ یہ تو پکی بات ہے کہ وہ تم سے پیار کرتا ہے اور اگر وہ پیار کرتا ہے تو پھر یہ پیار اس کو ضرور بدلے گا۔''

شانی خالو اعجاز کے گلے سے لگی رہی اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ کچھ دن پہلے وہ رستم سے پوچھے بغیر اچانک لاہور سے چلی آئی تھی لیکن یہ اتنی بڑی غلطی تو نہیں تھی جس کے لیے اتنی بڑی سزا دی جاتی۔ چند روز پہلے اس نے ملازم خادم حسین کے ذریعے ساری صورتِ حال رستم کو بتا بھی دی تھی اور رستم، ناصر، اجمل وغیرہ سے معذرت بھی کی تھی۔ وہ رستم کو بہت برداشت والا سمجھتی تھی مگر جو کچھ ہو رہا تھا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رستم اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے کہ وہ کہاں جاتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اسے کیونکر خبر ہوئی کہ وہ آج رات یہاں وزیری گاؤں میں موجود ہو گی۔ اسے خبر تھی اس لیے وہ یہاں چلا آیا۔ شانی جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی اس کا دکھ بڑھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

رنگ والی واپس آ کر بھی وہ غم و غصے میں غلطاں رہی۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی

وزیری گاؤں والے واقعے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی۔ سکینہ، شانی کی ہم راز سہیلی تھی شانی نے کبھی کوئی ذاتی بات سکینہ سے نہیں چھپائی تھی۔ دیہات میں شام سے پہلے چنے مکئی وغیرہ بھٹی پر بھنوانے کا رواج بہت پرانا ہے۔ دن ڈھلتے ہی لوگ اس شغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سکینہ بہت خوشبودار چنے بھٹی سے بھنوا کر لائی تھی۔ یہ چنے اس کی صاف اوڑھنی میں ایک چھوٹی سی پوٹلی کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ وہ پھسکڑا مار کر شانی کے پاس بیٹھ گئی۔''لے چھوٹی چوہدرانی..... چنے کھا۔'' اس نے کہا۔ وہ اکثر شانی کو ہلکے پھلکے انداز میں چھوٹی چوہدرانی کہہ کر بلاتی تھی۔

شانی جوں کی توں بیٹھی رہی تو سکینہ نے ذرا دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کو فوراً پتا چل گیا کہ شانی تادیر روتی رہی ہے۔''کیا ہوا میری بنو!'' اس نے لاڈ سے پوچھا۔''یہ پیاری سی ناک کیوں لال ہو رہی ہے؟''

''کک..... کچھ نہیں۔ زکام سا ہے۔''

''زکام ہے تو پھر یہ بھنے ہوئے چنے کھانا تو اور بھی اچھا ہے..... لیکن....'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا توقف سے بولی۔''لیکن مجھے لگتا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔ شاید رات کو پھر میری بنو رانی تکیے کو اتھروؤں (آنسوؤں) سے بھگوتی رہی ہے۔''

شانی خاموش رہی۔ سکینہ نے چنے ایک طرف چنگیر میں رکھ دیے اور کھوجی نظروں سے شانی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر نجومیوں کے سے انداز میں بولی۔''یا تو پرسوں وزیری پنڈ میں ہونے والے واقعے کا افسوس ہے یا پھر..... وہ یاد آ رہے ہیں بڑے زور کے ساتھ۔''

شانی اسے کیسے بتاتی کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی دکھ بھری رُوداد کا حصہ ہیں۔ شانی کی ہم راز سہیلی ہونے کے باوجود سکینہ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ رستم اور شانی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ رستم کو شانی کا محبوب ہی سمجھتی تھی۔ کہنے لگی۔''اگر رستم کی وجہ سے پریشانی ہے تو اس میں تیرا اپنا قصور ہے۔ تُو نے خود اسے ناراض کیا ہوا ہے۔ وہ لاہور میں بیٹھا تیرے انتظار میں سوکھ رہا ہے اور تُو یہاں اپنے کام دھندوں میں لگی ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے کہ علاقے کے لوگوں کا دکھ درد بانٹنا بھی اچھی چیز ہے مگر جو تیرے نام کی مالا گلے میں پہنے بیٹھا ہے اس کا دکھ بھی تو بانٹنا چاہیے۔''

شانی بس ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

سکینہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''جہاں تک چوہدری اعجاز صاحب والے واقعے کی بات ہے، یہ ہے تو دکھ والا واقعہ..... پر چوہدری صاحب نے جس طرح اس معاملے کو

برداشت کیا ہے، اس سے ان کی عزت بڑھی ہے۔ پنڈ میں یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ بڑے مولوی صاحب دائرے (بیٹھک) میں لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو گرا دے، پہلوان وہ ہے جو اپنے غصے کو دبا لے۔ کوئی شخص بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہو پھر بھی بدلہ نہ لے تو یہ بہت بڑی بہادری ہوتی ہے۔ وہ چوہدری اعجاز کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے دوسروں کے لیے مثال پیدا کی ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' شانی نے نم ناک لہجے میں کہا۔

''مگر شانی! وہ بندہ تھا کون؟ اور چوہدری جی سے کیا دشمنی تھی اس کی؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''تم نے اسے دیکھا تو ہے۔ اپنے علاقے کا لگتا تھا یا باہر کا؟''

''باہر کا ہی لگتا تھا۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔

کچھ دیر بعد سکینہ تندور گرم کرانے کے لیے احاطے کی طرف چلی گئی تو شانی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ملازم برکات علی، رستم کے حوالے سے کسی سے کچھ کہہ نہ دے۔ درحقیقت رستم کے زندہ سلامت ہونے اور لاہور میں ہونے کا علم خالو اعجاز، تایا معصوم، پھوپھی آمنہ اور بابا خادم حسین کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ ان میں سے صرف خالو اعجاز کو یہ معلوم تھا کہ رستم اور شانی کی شادی ہو چکی ہے۔ اب ایک اور شخص اس بات سے آگاہ ہو گیا تھا کہ رستم زندہ ہے اور وہ برکات علی تھا۔ شانی اور خالو اعجاز نے کل برکات علی کو اکیلے میں بلایا تھا اور بڑی سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ یہ راز صرف اپنے تک رکھے گا۔ برکات علی نے حلفاً کہا تھا کہ یہ بات مرتے دم تک اس کے سینے میں رہے گی۔ اب شانی چاہتی تھی کہ مزید تاکید کے طور پر خالو اعجاز اور برکات علی سے ایک اور ملاقات کر لے۔

کمرے میں چکراتے چکراتے شانی کی نگاہ ان اشیاء پر پڑی جو اس نے چند دن پہلے بڑی چاہت سے رستم کی سالگرہ کے لیے خریدی تھیں۔ کپڑے، گھڑی اور پرفیوم وغیرہ۔ وہ سب کچھ یہاں دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ سالگرہ گزر گئی تھی اور وہ سہانا وقت بھی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا تھا جس نے دو تین روز کے لیے ان دونوں کو مسحور کیا تھا۔ خوشیوں کی عمر اتنی تھوڑی کیوں ہوتی ہے؟ شانی نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ اس نے رستم کے لیے خریدی ہوئی قمیص پر ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

رستم کے لیے شدید ترین غصہ اب قدرے کم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ دکھ نے لے لی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے کسی بھی دکھ اور پریشانی کی بنیاد اپنی ذات میں ڈھونڈا

کرتی تھی۔ سوچتی تھی کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ رستم ایسا تو نہیں تھا پھر اس نے ایسی اوچھی حرکت کیوں کی؟ کہیں نہ کہیں ضرور کوئی گڑبڑ تھی۔ اسے ایک بار پھر حویلی کی ٹیلی فون لائن پر شدید غصہ آنے لگا۔ اگر یہ لائن ہی ٹھیک ہوتی تو شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ وہ ویسے ہی چیک کرنے کے لیے فون سیٹ کی طرف گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ لائن پر وہی منحوس خاموشی تھی۔ وہ خالو اعجاز کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔ خالو اعجاز کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

خالو اعجاز عین اس وقت حویلی کے مردانے میں موجود تھے۔ وہ ایک الگ تھلگ کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ دو مہمان موجود تھے۔ یہ وہی فنکار جوڑا تھا جس نے تین روز پہلے چوہدری شہاب الدین کی حویلی میں ورائٹی شو میں پرفارم کیا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ پچھلے دو تین دنوں میں چوہدری اعجاز نے اپنے ذریعے سے ان میاں بیوی کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ ان معلومات کے مطابق اس فنکار جوڑے کو ان دنوں روپے کی شدید ضرورت تھی ..... بلکہ اس ضرورت کو شدید ترین کہنا چاہیے۔ ان کا تین سالہ بچہ دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ اس کے دل میں سوراخ تھا اور علاج کے لیے کم و بیش تین لاکھ روپے کی رقم درکار تھی۔ دوسری طرف فنکار جوڑے کی آمدن بہ مشکل اتنی تھی کہ پانچ افراد پر مشتمل کنبے کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ وہ اپنے جاں بلب بچے کے علاج کے لیے اپنا آپ بیچنے تک کو تیار تھے۔

سامنے تپائی پر ایک اسٹامپ پیپر رکھا تھا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر کے مطابق میاں بیوی تین لاکھ روپے نقد وصول کر رہے تھے اور تین ماہ کے اندر واپس کرنے کے پابند تھے۔ بچے کے باپ اختر قصوری نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مگر چوہدری صاحب! ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

چوہدری اعجاز نے اختر کی جواں سال بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں نہیں..... صرف تمہاری بیوی کو کچھ کرنا ہوگا۔''

اختر قصوری چونک کر چوہدری اعجاز کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس کے ذہن میں وہ کہانیاں گھوم گئی تھیں جن میں پرشکوہ حویلیوں کے اندر رہنے والے عیاش زمینداروں کا ذکر ہوتا ہے...... جو راہ چلتی عورتوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں اپنی خوابگاہوں تک لانے کے لیے دھن اور دھونس کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اختر کی خوش شکل بیوی بھی چند سیکنڈ کے لیے ہراساں نظر آئی۔ چوہدری اعجاز نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔ ''پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خدانخواستہ تم سے کوئی ناجائز کام نہیں کرواؤں گا۔ میں خود بھی بال بچے والا ہوں۔ اس حوالے سے تم بالکل بے فکر رہو۔"

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ اختر قصوری نے ہمت کر کے کہا۔ "آپ ہمارے لیے عزت کے مقام پر ہیں۔ آپ بتائیں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

چوہدری اعجاز بولے۔ "میں پھر وہی بات کہوں گا۔ یہ ایک بالکل معمولی اور بے ضرر کام ہے لیکن پہلے تم دونوں کو اس سلسلے میں مکمل رازداری کا وعدہ کرنا ہوگا۔ درحقیقت میں تمہیں جو قیمت دے رہا ہوں وہ اس کام کی نہیں ہے۔ یہ کام تو آپ جیسا کوئی بھی فنکار ہزار دو ہزار میں یا شاید مفت بھی کر دے گا مگر میری پہلی اور آخر شرط رازداری ہے۔"

اختر کی بیوی نائلہ نے کہا۔ "چوہدری جی! اگر اس کام سے ہمیں یا کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں اور پوری رازداری بھی برتیں گے۔"

"کیا تم بھی یہ وعدہ کرتے ہو قصوری؟"

"جی، میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔" اختر قصوری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

چوہدری اعجاز نے کہا۔ "یہ اسٹامپ پیپر میں صرف اس وعدے کی ضمانت کے طور اپنے پاس رکھوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کبھی بھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی جناب!" اختر قصوری نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔

چوہدری اعجاز گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ "تم لوگ یوں سمجھو کہ میں اپنی ناسمجھ بیٹی کو ایک غلط بندے کے شر سے بچانا چاہتا ہوں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، ہر شخص اپنی دنیا کا دھندا چاہتا ہے، جس طرح تم دونوں چاہ رہے ہو۔" اختر قصوری اور اس کی بیوی نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ چوہدری اعجاز نے کہا۔ "اس کام کے لیے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک چھوٹا سا ڈرامہ کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے امید ہے قصوری کہ اس میں تمہاری وائف میرا ساتھ دے گی۔"

چوہدری اعجاز نے قریبی الماری میں سے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈ نکالا۔ اس میں شانی کی آواز تھی۔ یہ وہی تقریر تھی جو کچھ روز پہلے شانی نے حویلی کی بالکونی میں کھڑے ہو کر ایک بڑے مجمعے کے سامنے کی تھی۔ اس تقریر کے علاوہ اس میں دس پندرہ منٹ کی بات چیت بھی شامل تھی جو شانی، عارف کمبوہ اور میڈیا کے لوگوں کے درمیان ہوئی تھی۔

چوہدری اعجاز نے قصوری کی بیوی نائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کسی بھی آواز کی نقل آسانی سے کر سکتی ہو۔ تم یہ کیسٹ اپنے ساتھ لے جاؤ اور دو تین دن میں اس آواز کی مشق کر لو۔ کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟"

نائلہ ٹیپ ریکارڈر سے ابھرنے والی آواز کو غور سے سن رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "میں یہ آواز بنا لوں گی۔"

"ویری گڈ! میں تم دونوں کو فون کروں گا اور تمہیں یہاں حویلی میں آنا ہوگا۔ یہاں ہم ٹیلی فون پر اس بندے سے بات کریں گے۔ باقی تفصیل میں تمہیں اسی دن بتاؤں گا۔"

چند منٹ کی گفتگو میں سارے معاملے طے ہو گئے۔ چوہدری اعجاز نے اختر قصوری کو دو لاکھ روپے کا چیک دے دیا۔ باقی ایک لاکھ روپے آٹھ دس روز کے اندر دینا طے پایا۔ اسٹامپ پیپر پر سائن اور انگوٹھے ہو گئے۔

☆======☆======☆

جو کچھ ہوا اس کے لیے رستم کے دل میں بہت پچھتاوا تھا۔ چوہدری اعجاز نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی جس کے بعد رستم کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، کب اس کا ہاتھ اٹھا، کب گھوما اور چوہدری اعجاز کے رخسار پر پڑا۔ اس وقت رستم کی عجیب کیفیت تھی۔ اگر وہ شخص شانی کا خالو نہ ہوتا تو شاید رستم کے ہاتھوں اس کی موت واقع ہو جاتی۔

یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے رستم کو شانی بی بی کا ردِعمل بھی یاد آیا۔ بی بی کی آنکھوں نے اس پر شعلے برسائے تھے۔ وہ بڑے غصے سے رستم کی طرف بڑھی تھیں مگر چوہدری نے بڑی برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں روک لیا تھا۔ بی بی کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجے۔ انہوں نے رستم کا نام لیے بغیر کہا تھا۔ "چلے جاؤ یہاں سے...... میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔"

رستم نے سوچا، کاش یہ الفاظ سننے سے پہلے وہ مر گیا ہوتا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ بار بار خود سے یہ سوال پوچھ رہا تھا۔ اجمل خان چائے کے دو کپ پکڑے ہوئے رستم کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے ایک کپ رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے کپ لے کر بے دلی سے تپائی پر رکھ دیا۔ اجمل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "رستم بھائی! چوہدری اعجاز کا نیت اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ وہ آپ کو شانی بہن سے دور رکھنا چاہتا ہے اسی لیے وہ آپ دونوں کے درمیان دراڑیں پیدا کرنے کا کوشش کر رہا ہے۔ امارے دادا کہا کرتے تھے کہ پانی کو لاٹھیاں مار کر دو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ آپ اور شانی بی بی کا تعلق بھی ایسا نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کی کوششوں سے ٹوٹ سکے۔ آپ کسی طرح ایک بار شانی بہن سے براہِ راست بات

کرے۔"

"بات کس طرح ہوسکتی ہے؟"

"آپ کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی ملتا ہے۔"

رستم خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح بی بی سے براہِ راست بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اس کا عشق خام نہیں تھا۔ یہ آزمائشوں کی بھٹی میں جل جل کر کندن ہو چکا تھا۔ یہ وہ عشق تھا جس میں اپنا آپ ختم ہو جاتا ہے، بس محبوب ہی محبوب رہ جاتا ہے۔ رستم ایک سرکش باغی کا نام تھا۔ اس کی گردن کبھی کسی کے سامنے خم نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اپنی بی بی کی خاطر چوہدری اعجاز سے دست بستہ معافی بھی مانگنا پڑی تو وہ مانگ لے گا۔ بی بی اس کے لیے کوئی سزا بھی تجویز کرتیں، وہ اسے بسروچشم قبول تھی۔ یہاں مسئلہ صرف یہی تھا کہ بی بی سے اس کی بات نہیں ہو رہی تھی۔ کسی وقت تو رستم کو یوں لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس سے دور رہنا چاہ رہی ہیں۔ کئی دن پہلے انہوں نے رستم سے کہا تھا کہ وہ انہیں فون نہ کرے، وہ خود ہی اس سے رابطہ کریں گی..... وہ یہ بات کہہ کر جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

"خو آپ کس خیال میں کھو گیا؟" اجمل خان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" رستم نے جواب دیا پھر موضوع بدل کر بولا۔ "تمہارے خوالاتی کا حال کیسا ہے؟"

"ایک دم پسٹ کلاس۔ اس کا تن فن کافی حد تک کم ہو گیا ہے لیکن پھر بھی ڈپٹی ریاض کا سگا بھتیجا ہے۔ کبھی کبھی اپسری (افسری) کا غبار اس کے معدے کو چڑھ جاتا ہے۔ دھمکیاں دینے لگتا ہے۔"

"غبار معدے کو نہیں دماغ کو چڑھتا ہے۔" رستم نے کہا۔

"چھوڑیں جی، ایسے لوگوں کے کھوپڑے میں دماغ کہاں ہوتا ہے۔ بس اکڑ ہی اکڑ ہوتی ہے۔"

اس دوران میں ناصر اپنے ناخن تراشتا ہوا ادھر آ گیا۔ "یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" اس نے کہا۔

"ام تم کو راہ راست پر لانے کی بات کر رہا تھا۔ ام رستم بھائی کو بتا رہا تھا کہ جوان لڑکے کو زیادہ دیر فارغ نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا جلدی سے شادی کر دیں۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے چاچاجی۔" ناصر نے طنز کیا۔

"امارا تو پاؤں قبر میں ہے بھتیجا جی۔"

"لیکن سر تو باہر ہے۔ اس لیے آتی جاتی عورتوں کو گھورتے ہو۔"

"یہ سراسر الزام ہے۔ آپ اچھی طرح جانتا ہے کہ ام کو نسوار کے سوا کسی سے عشق نہیں۔"

اسی دوران میں خانساماں ظفر کا پالا ہوا مرغا مرغی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے صحن میں سے گزر گئے۔ اجمل خان نے فوراً کہا۔ "دیکھیں رستم بھائی! آپ خود دیکھ لیں، سیانا لوگ سچ کہتا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ناصر بھائی اور زری نے جانوروں کا عادتیں بھی خراب کر دیا ہے۔ یہ بھاگنے دوڑنے میں ان دونوں کا نقل کرتا ہے۔"

"یہ تو ہزارہا سال سے ایسے ہی بھاگ دوڑ رہے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"تو پھر آپ دونوں ان کا نقل کر رہا ہوگا۔ دونوں صورت میں کام تو اچھا نہیں ہے نا۔"

"اچھا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں تو اٹھ جاتا ہوں۔" ناصر نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"ارے..... نہیں۔" اجمل نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ "ام اس بارے میں سنجیدگی سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ امارے آنے والے دنوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔ سچ، امارا دل چاہتا ہے کہ جلد سے جلد زری کے ساتھ تمہارا شادی ہو جائے۔ وقت امارے لیے بہت بے رحم ہے۔ اس وقت سے ام جو خوشی بھی چھین سکتا ہے ام کو چھین لینا چاہیے۔ اگر چند دنوں میں آپ دونوں کا شادی ہو جائے تو امارے خیال میں اس سے ایک اور پائدہ بھی ہو سکتا ہے؟"

"کیا..... تمہاری عقل داڑھ نکل سکتی ہے؟" ناصر نے کہا۔

"ام مذاق نہیں کر رہا ناصر بھائی۔ ہوسکتا ہے کہ اس شادی کا سن کر اماری شانی بہن کا دل بھی پسیج جائے۔ شانی بہن اور رستم بھائی میں صلح ہو جائے۔ اور پھر وہ بھی اس شادی میں شریک ہونے کے لیے یہاں پہنچ جائے۔ ایسے موقعوں پر کئی بگڑے ہوئے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"عقل کی بات تم آٹھ دس مہینے میں ایک بار ہی کرتے ہو۔ بڑا مبارک موقع ہے کہ ہم نے یہ شبھ گھڑی دیکھی ہے۔" ناصر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

رستم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "بی بی کا معاملہ تو علیحدہ ہے ناصر! لیکن یہ میں

بھی چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔ ہم وہاں مارگہ بستی میں واس اور خانم سے وعدہ کر کے آئے ہیں کہ زری کو خوشی اور عزت دیں گے، اور واقعی اتنے دکھ برداشت کرنے کے بعد وہ اس خوشی کی حق دار بھی ہے۔"

زری کسی قریبی کمرے میں گنگنا رہی تھی۔ وہ پاؤندہ بستی کی مقامی زبان کا گیت تھا۔ الفاظ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر لہجہ اور آہنگ بھی متاثر کرنے والا تھا۔ اس آہنگ میں بلند و بالا درختوں میں سرسراتی ہوئی یخ بستہ ہواؤں کی آہٹ تھی۔ برفیلے چشموں کی روانی، نیم منجمد آبشاروں کا ترنم، آبی گزرگاہ میں گرنے والے برفانی تودوں کی آواز...... بہت کچھ شامل تھا۔ اس آہنگ میں اور اس کونج کی گداز کوک بھی تھی جو اپنے جھنڈ اور اپنے دیس سے جدا ہو گئی ہو۔ زری کی گنگناہٹ نے رستم کو تھوڑی دیر کے لیے اس برفانی ٹاپو پر پہنچا دیا جہاں اس نے اور ناصر، شریف وغیرہ نے قریباً ایک برس گزارا تھا۔ وہاں پیش آنے والے سارے حیران کن واقعات ایک بار پھر رستم کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے...... مسای کا بازو کاٹے جانے کی اندوہناک سزا، برفانی کھائی میں جانسن اور ڈاکٹر مالینا کی اندوہناک موت، خوفناک سفید ریچھوں سے پنجہ آزمائی، دھواں دھار معرکے میں شوتم خان کا برچھی پر ٹنگا ہوا سر...... بہت کچھ رستم کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر میں وہ داستانی طرز کا واقعہ بھی جب وہ ایک پُل پر سے گزر کر ایک پتھریلی تختی اٹھا کر لایا تھا۔ وہ اب بھی کبھی کبھی سوچتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ اس پُل پر سے گزرنے کو اتنا دشوار کیوں سمجھ لیا گیا تھا۔ اس پل پر سے گزرنا ہرگز مشکل نہیں تھا، بس عقیدوں کی کمزوری نے اس راستے کو پل صراط بنا دیا تھا۔

اجمل، رستم اور ڈولا کچھ دیر تک زری کے بارے میں بات کرتے رہے پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رستم کے سینے میں لہری دوڑ گئی۔ مگر اس بار بھی فون بی بی کا نہیں تھا۔ یہ رستم کے لیے حاجی حیات کی کال تھی۔ رستم، حاجی حیات سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے، رستم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ از خود بی بی سے رابطے کی کوشش کرے گا اور ان سے وزیری گاؤں والے واقعے پر دلی معذرت کرے گا۔ اس حوالے سے وہ جو کچھ بھی کہیں گی وہ قبول کر لے گا۔

اس نے اجمل خان سے کہا۔"اجمل! تم حویلی کے فون پر رابطے کی کوشش کرو۔ جو کوئی بھی فون اٹھائے اسے بی بی کو بلانے کے لیے کہو۔"

"اپنا تعارف کرا دوں؟"

"ہاں ہاں...... لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔"

"اور اگر چوہدری اعجاز نے فون اٹھایا تو پھر؟"

"پھر بند کر دینا۔"

اجمل خان تو جیسے پہلے ہی کسی ایسی ہدایت کا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے حویلی کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ صرف دو تین منٹ بعد ہی اس کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا۔ رابطہ ہو گیا تھا۔"ہیلو...... کون...... سلاماں لیکم...... چاچا...... ام اجمل خان بول رہا ہے...... کیا حال چال ہے...... ہاں جی...... ام بھی ٹھیک ٹھاک ہے...... شانی بی بی کہاں ہیں...... اچھا اچھا...... ٹھیک ہے۔"

اجمل خان نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"چاچا خادم حسین تھا۔ کہتا ہے ام شانی بی بی کو دیکھ کر آتا ہے، اس نے ہولڈ کرایا ہے۔"

دو تین منٹ بعد اجمل نے دوبارہ خادم حسین سے بات کی۔ یہ مختصر بات تھی۔ اجمل اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ آخر میں اس نے دو تین بار"ٹھیک ہے" کہا اور فون بند کر دیا۔ رستم اور ناصر تجسس سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ میکانکی انداز میں منہ کے اندر نسوار رکھتے ہوئے بولا۔"چاچا بتا رہا ہے کہ رات کو حویلی میں کچھ زمینداروں کا دعوت تھا۔ لاہور سے بھی دو چار خاص مہمان آیا ہوا تھا۔ بی بی کو دیر تک جاگنا پڑا ہے۔ اب وہ سو رہا ہے۔ شام چار بجے سے پہلے نہیں اٹھے گا۔ ام پانچ بجے کے قریب فون کر لے۔"

پانچ بجے تک کا وقت رستم نے کافی بے چینی میں گزارا۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اجمل نے دوبارہ رنگ والی کی حویلی میں رابطہ کیا۔ اس مرتبہ بھی جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ پہلے بابا خادم حسین نے بات کی پھر شانی لائن پر آ گئی۔ رستم کی نگاہیں اجمل کے تاثرات پر تھیں۔ اجمل نے خوش دلی سے رسمی کلمات کہے لیکن اس کے فوراً بعد اجمل کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ واضح طور پر پریشان نظر آیا۔ اس نے ایک دو بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر جیسے کراہ کر بولا۔"لیکن شانی بہن! آپ ایک منٹ رستم بھائی سے بات تو کر لیں...... میرا مطلب ہے...... خو آپ نے......" اجمل نے بات ادھوری چھوڑ کر رستم کو ریسیور تھامنے کا اشارہ کیا۔ رستم نے گہری سانس لی اور آگے بڑھ کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف سے شانی اپنی روانی میں کچھ اور کہتی۔ رستم نے کہا۔"میں رستم بول رہا ہوں شانی! پلیز فون بند نہ کرنا۔ میری بات سن لیں......" دوسری طرف کچھ دیر کے لیے سناٹا

چھا گیا۔ رستم نے پھر کہا۔ ''پلیز شانی! فون بند نہ کریں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب کون سی بات باقی رہ گئی ہے جو کرنی ہے۔'' شانی کا لہجہ جیسے دکھ میں لتھڑا ہوا تھا۔

''میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا شانی! مگر اتنا ضرور کہوں گا......''

''تم کچھ بھی مت کہو۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''جب میں نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تو پھر......تم کیا بتاؤ گے مجھ کو۔''

وہ رستم کو ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ رستم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے لہجے میں لجاجت سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''شانی! میں مانتا ہوں جو کچھ ہوا بہت برا ہوا لیکن آپ ایک منٹ کے لیے میری بات تو سن لیں۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا...... مجھے اپنے بزرگوں کی عزت سے کچھ بھی زیادہ عزیز نہیں ہے۔ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر اپنے بڑوں اور اپنے خاندان کی بے عزتی نہیں اور تم نے تو حد کو چھوا ہے۔ کاش میں وہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے اندھی ہو گئی ہوتی......''

''جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں وہ سارا تو سچ نہیں ہوتا بی بی......اگر آپ......'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ بی بی نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

درد کے نہایت شدید احساس کے ساتھ رستم نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کیا ہوا رستم بھائی؟'' ناصر نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

''جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' رستم نے سرد آہ بھری۔ ''وہ بہت خفا ہیں......ہماری توقع سے بہت زیادہ۔'' رستم لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ باہر آیا اور فون کی طرف بڑھا۔ اجمل اور ناصر فون سیٹ کے قریب ہی سوگوار بیٹھے تھے۔

رستم نے اجمل سے کہا۔ ''ذرا دوبارہ نمبر ملانا۔''

اجمل نے مشینی انداز میں عمل کیا مگر اس مرتبہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے دوبارہ اور سہ بارہ ٹرائی کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ رستم اپنی بی بی سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک بار اس کی بات تو سن لیں۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی ریسیور اٹھا نہیں رہا تھا۔ آخر وقفے وقفے سے چھٹی ساتویں بار ڈائل کرنے کے بعد رابطہ ہوا۔ دوسری طرف سے اُبھرنے والی آواز سننے کے بعد اجمل نے ریسیور جلدی سے رستم کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو کون؟'' دوسری طرف بی بی تھیں اور جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''میں رستم ہوں شانی! کیا آپ ذرا دیر کے لیے میری بات نہیں سن سکتیں؟''

''میں نہیں سن سکتی۔ مجھے تمہارے خیال سے وحشت ہو رہی ہے۔''

''میں معافی مانگتا ہوں شانی...... مجھے پتا ہے......''

''معافی تو تم مجھے دے دو۔'' شانی نے طیش کے عالم میں تیزی سے اس کی بات کاٹی......''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے گر سکتے ہو۔''

''پلیز شانی! فون بند نہ کرنا۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔

''میں تمہاری آواز سننا نہیں چاہتی۔ میرا لہو کھولنے لگتا ہے۔ تم نے......جس طرح میرے بڑوں کی توہین کی ہے میں کبھی نہیں بھول سکتی اور میں یہ بھی جان گئی ہوں کہ تم کبھی بدل نہیں سکتے۔ کوئی کتنی بھی کوشش کرے، تمہارے اندر کا گھٹیا پن سامنے آ کر ہی رہے گا۔ تم گھٹیا ہو اور گھٹیا رہو گے......'' وہ غیض کے عالم میں بولتی گئی اور وہ سنتا گیا۔

کوئی اور یہ بات کہہ کر شاید زندہ نہ رہ سکتا لیکن وہ بی بی تھیں اور وہ رستم تھا۔ وہ اس سے دس گنا سخت الفاظ بھی استعمال کرتیں تو اسے سننا پڑتے۔ وہ شوہر نہیں تھا اور نہ وہ بیوی تھیں۔ وہ دیوی تھیں اور وہ عشق میں ڈوبا ہوا پرستار تھا۔ کسی گناہ گار پرستار ہی کی طرح وہ گردن ڈالے، سر جھکائے زرد رو بیٹھا تھا۔ ان لمحوں میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ رستم سیال ہے جو نگاہوں نگاہوں میں زندہ بندے کی جان کھینچ سکتا ہے۔

پھر ایک منحوس کھٹکے کے ساتھ فون سیٹ خاموش ہو گیا۔ وہ بیٹھا رہا۔ پتھر کی طرح ساکت! اس کے سینے میں اس کا بدنصیب دل لہولہو ہو کر اور کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ اپنی بی بی کے الفاظ اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔ ''تم گھٹیا ہو......اور گھٹیا ہی رہو گے......تم گھٹیا ہو اور گھٹیا ہی رہو گے۔''

پھر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات بڑی تاریک اور بے رحم تھی۔ اس رات میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ رستم کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

وہ تقریباً چوبیس گھنٹے تک کمرے سے نکلا ہی نہیں۔ اگلے روز اجمل خان نے دو تین مرتبہ دروازے پر دستک دی مگر رستم نے ہر بار کہا کہ آرام کر رہا ہوں۔ جب اس نے تیسری بار دستک دی تو رستم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اجمل یا ناصر اپنے طور پر بی بی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور اجمل اور ناصر کو اندر آنے دیا۔ رستم کی حالت نے ان دونوں کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ رستم نے اجمل سے پوچھا۔ ''تم نے دوبارہ رنگ والی میں فون تو نہیں کیا؟''

اجمل ذرا گڑبڑایا پھر بولا۔ ''بس جی ..... ایک مرتبہ کیا تھا پر رابطہ نہیں ہو سکا۔''

''تم سے کس نے کہا تھا فون کرنے کو؟'' رستم جیسے پھٹ پڑا۔ ''کیا تم مجھ سے زیادہ میرے خیر خواہ ہو۔ مجھے نہیں ضرورت تمہاری خیر خواہی کی۔ بس معاف کرو مجھے۔'' رستم نے طیش کے عالم میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

رستم نے کبھی ایسے انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اجمل ہکا بکا رہ گیا۔ ''وہ...... وہ جی ام نے تو سوچا تھا کہ......''

''کچھ بھی مت سوچو تم۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔'' رستم نے بہ دستور اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے میرے معاملے میں دخل دینے کی۔''

وہ اٹھا اور واش روم میں چلا گیا۔ واش روم کا دروازہ زوردار آواز سے بند ہوا تھا۔ دو چار منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اجمل اور ناصر دونوں کمرے سے جا چکے تھے۔ خانساماں نے میز پر رات کا کھانا رکھ دیا تھا۔ اس میں رستم کے پسندیدہ سفید چاول اور چنے کا شوربا تھا۔ اس کے علاوہ سلاد اور کسٹرڈ وغیرہ تھا۔ رستم نے بس دو چار لقمے ہی لیے اور دروازہ اندر سے بند کر کے دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

وہ اگلے روز شام تک کمرے میں ہی رہا۔ تاہم اگلے روز شام کو جب وہ کمرے سے نکلا تو اپنی بے پناہ جذباتی کیفیت پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہو رہا تھا کہ اس نے کل اجمل سے بڑے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ اسے ناصر کی زبانی معلوم ہوا کہ کل سے اجمل نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ رستم اجمل کے پاس پہنچا اور اسے بازو سے پکڑ کر کھانے کی میز پر لایا...... راستے میں اجمل کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ رستم سے لپٹ گیا۔ رستم نے بھی اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اجمل ہچکیوں سے رو دیا۔ رستم کی آنکھوں میں خاموش آنسو تھے۔

''مجھے معاف کر دو اجمل۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اجمل نے رستم کے گلے سے لگے لگے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا بات مت کہیں رستم بھائی.. ''

رستم اسے لیے ہوئے کھانے کی میز پر آ گیا۔ خانساماں ظفر نے کھانا چن رکھا تھا۔ ڈولا اور زری بھی ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ رستم کے بیٹھتے ہی وہ سب بھی بیٹھ گئے۔ کھانا خاموشی میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد رستم دیر تک اکیلا ہی باغیچے میں چہل قدمی کرتا رہا۔ برآمدے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ بار بار ایک ادھ کھلے دروازے سے اس

کمرے میں جا رہی تھی جہاں اس نے شانی بی بی کے ساتھ دو دن گزارے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ سنگھار میز، بیڈ، سائیڈ ٹیبلز، بی بی کے ہاتھ کے رکھے ہوئے گلدان، ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی پینٹنگ۔ یہ سب کچھ رستم کو بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے خانساماں ظفر احمد کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کمرے کا سارا سامان ان جگہوں پر واپس رکھوا دے جہاں سے لایا گیا تھا اور کمرے کو تالا لگا دے۔

کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر وہ کیمرہ بھی پڑا تھا جس سے انہوں نے بی بی کی موجودگی میں تصویریں اُتاری تھیں۔ رستم کھوئے کھوئے سے انداز میں کیمرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کیمرے میں سے فلم رول نکال لیا اور اسے کھول کر ضائع کر دیا۔

وہ رات گئے تک ناصر اور اجمل سے باتیں کرتا رہا اور اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا...... کیونکہ سب کچھ ہونے کے باوجود زندگی ابھی باقی تھی۔ تھوڑی تھی یا زیادہ لیکن ابھی موجود تھی، اسے گزارنا تھا۔

رات گئے اجمل سونے کے لیے چلا گیا مگر رستم اور ناصر بیٹھے رہے۔ سگریٹ پھونکتے رہے...... کھڑکیوں سے باہر ہوا چلتی رہی، سفیدے کے درخت ہولے ہولے جھومتے رہے۔

''میں جانتا ہوں آپ کے دل پر بہت بوجھ ہے رستم بھائی۔'' ناصر نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ناصر...... پتا نہیں کیا بات ہے۔ اب میں خود کو پہلے سے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں پتا ہی ہے کہ اس زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اس زندگی کے چلے جانے سے بی بی کو جتنا کم دکھ ہوگا، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''لیکن کوئی بات بھی تو یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ ایک دن آپ نے خود ہی کہا تھا کہ ہماری زندگی اور موت کے چانس ففٹی ففٹی ہیں۔''

''لیکن...... اب دل چاہتا ہے کہ کم از کم میرے چانس تو ففٹی ففٹی نہ رہیں اور ففٹی ففٹی والا بھی تو بس ایک اندازہ ہی ہے ناصر۔ ورنہ جس دلدل میں ہم پھنسے ہوئے ہیں وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ میں ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا اور ان سے بدلہ لینا اور بچ نکلنا بھی بس ایک خیال ہی لگتا ہے۔''

''آپ اس کام کے لیے ''میں'' کا لفظ استعمال نہ کریں۔ میں پہلے بھی کئی بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔ یہ آپ کا نہیں ہم تینوں کا مسئلہ ہے۔ اس حوالے سے ہمارا جینا مرنا ساتھ ہو گا۔'' ناصر کے لہجے میں ہلکی سی خفگی آ گئی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر رستم نے اچانک کہا۔ ''ناصر! تم شادی کر لو۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے۔ اس ویرانے میں تھوڑی سی تو رونق آئے۔''

''لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا چانس بہت کم ہے۔ پھر ایسی شادی کہاں تک ٹھیک ہے؟''

''میں اپنی زندگی کے چانس کی بات کر رہا تھا۔ تمہاری زندگی کا چانس، اللہ نے چاہا تو بہت ہے۔''

''اور میرا خیال اس کے الٹ ہے۔''

باتیں کرتے کرتے دونوں اچانک چونک سے گئے۔ انہیں یوں لگا کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزرا ہے۔ اس وقت کون ہو سکتا تھا؟ دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر پہلے رستم ہی اٹھا تھا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے اپنا پستول تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ احتیاط سے دروازہ کھول کر اس نے باہر دیکھا۔ وسیع لان میں سفیدے کے طویل سائے بھوتوں کی طرح رقصاں تھے۔ چہار سو خاموشی تھی۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ ناصر اور رستم نے گھوم پھر کر دیکھا۔ خانساماں اور ملازمہ حمیدن اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ زری، ڈولا اور اجمل بھی اپنے اپنے کمروں میں سوئے پڑے تھے۔ تاہم ان دونوں کی نگاہ ایک ساتھ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سایہ کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔

☆======☆======☆

اور یہ منظر رنگ والی کی حویلی کا تھا۔ مدھم اور اداس سا چاند گدلے آسمان پر کسی پریشان کن سوال کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ شانی کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہی تھی اور بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ منّا اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ رستم سے شانی کی آخری ملاقات وزیری گاؤں والے اندوہناک واقعے پر ہی ہوئی تھی۔ پچھلے پانچ چھ دن میں وہ منظر سینکڑوں بار شانی کے ذہن پر یلغار کر چکا تھا اور ہر بار شانی کا دل کچھ مزید زخمی ہوا تھا۔

شانی کے دل میں امید کی کرن تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ رستم کسی نہ کسی طور

اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ وہ اس سے معافی مانگے گا ..... خالو اعجاز سے بھی غیر مشروط معافی مانگے گا۔ وہ عذر پیش کرے گا کہ وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا پتا کہ کسی وجہ سے وہ اس وقت نشے میں ہو۔ شانی کے دل و دماغ میں رستم کو رعایت دینے والے اَن گنت خیالات آتے رہے تھے..... مگر اب دھیرے دھیرے سب کچھ مایوسی کے اندھیرے میں غرق ہو رہا تھا۔ حویلی کا فون ٹھیک ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ مگر رستم کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ناصر یا اجمل نے کسی طرح شانی کی ساعت تک کوئی بات پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

شانی نہیں جانتی تھی کہ اس کی طرف سے رستم سے بات ہو بھی چکی ہے..... اور اس انداز سے ہو چکی ہے کہ بہت کچھ ملیامیٹ ہو گیا ہے۔ وہ خالو اعجاز کی منصوبہ بندی سے بے خبر تھی۔ نہ ہی اسے اس ''صداکار'' کی حویلی میں آمد کا علم تھا جو تین دن پہلے بڑی رازداری کے ساتھ لاہور سے بلائی گئی تھی اور حویلی کے ٹیلی فون سے اس کی بات اجمل اور رستم سے کرائی گئی تھی۔ شانی کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس اس کا دل رو رہا تھا اور رستم کے لیے اس کے دل میں موجود نرم گوشہ دھیرے دھیرے اپنی نرمی کھو رہا تھا۔

حویلی کا ٹیلی فون اب ٹھیک تھا مگر شانی کو یہ معلوم نہیں تھا یہ کہ ٹیلی فون اس وقت ٹھیک کیا گیا ہے جب اس پر کسی ناپسندیدہ کال کا خدشہ ہی باقی نہیں رہا۔ مزید احتیاط کے طور پر چوہدری اعجاز فون سیٹ کو اٹھا کر اپنے کمرے کے عین سامنے لے گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہر گزرنے والے دن کے ساتھ شانی کو لگ رہا تھا کہ اس کا دل ایک لاش بنتا جا رہا ہے اور یہ لاش اس کے سینے کی قبر میں دفن ہونے والی ہے۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر منّے کو سینے سے لگا کر سو گئی۔

اگلے روز نو دس بجے کے قریب جب وہ باغیچے میں پودوں کو دیکھ رہی تھی، ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی کہ مہتم سردار دراج کی بیوی ماکھو آئی ہے۔ اس کے ساتھ دو مہتم لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔ شانی فوراً نشست گاہ میں پہنچی۔ تنومند ماکھو اور لڑکیوں نے اٹھ کر شانی کو سلام کیا۔ ماکھو کا ہر دم ہشاش بشاش نظر آنے والا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے۔ یہ دیور کی موت کا غم تھا اور اس موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا غم تھا۔ لڑکیاں سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ تانگے کا طویل سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ان کے چہروں اور لباس پر راستے کی گرد تھی۔

''ماکھو! خیریت تو ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''میری نکڑی بہن! کھیریت نہیں ہے۔اگر ہوتی تو آپاں کو (ہم کو) اس طرح تیرے پاس نہ آنا پڑتا۔'' ماکھو نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

''کیا ہوا ہے ماکھو؟'' شانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ پچھ نکڑی کہ کیا نہیں ہو رہا ہمارے ساتھ۔ بندہ بھی ہمارا مرا ہے، مجرم بھی ہم بنے ہوئے ہیں۔ جندڑی عذاب میں آئی ہوئی ہے ...لے دیکھ، میں تجھ کو دکھاتی ہوں۔'' ماکھو نے کہا پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف گئی اور نشست گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ لڑکیوں کی طرف مڑی اور دونوں کی چادریں کھینچ کر اُتار دیں۔ پھر وہ ان سے مخاطب ہو کر غصے سے بولی۔ ''اپنے کُرتے اُتار کر دکھاؤ چھوٹی چوہدرانی کو۔ ان کو تو کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ان کو بھی پتا چلے کہ آپاں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

گندمی رنگ والی دونوں لڑکیاں تھوڑی دیر تک جھجکتی رہیں۔ پھر انہوں نے اپنے رخ دیوار کی طرف کر کے کُرتے اُتار دیئے۔ان کے بالائی جسم عریاں ہو گئے۔ شانی لرز گئی۔ان کی کمر، پیٹ اور کندھوں پر بے شمار نیل اور چھڑیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ کچھ نشان ایسے بھی تھے جن سے خون رستا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یقیناً ان کے زیریں جسم پر بھی ایسے نشان ہوں گے۔

''یہ کس نے کیا؟'' شانی نے دل گرفتہ آواز میں پوچھا۔

''پلس نے جی......اور کس نے؟ جنانہ پلس (زنانہ پولیس) کی ڈشکریاں تھیں۔ مار مار کر کڑیوں کی کھال ادھیڑ دی۔ تھانے کے ویہڑے میں وچاریوں کی دوڑیں لگوائیں۔ چار چار گھنٹے دھوپ میں کھڑے رکھا۔ دیکھنے والے تماشا دیکھتے رہے۔ان کا کسور کیا تھا؟ صرپ اتنا کہ ان کا چاچا اور بھائی پلس کو نہیں مل رہے تھے اور چاچے اور بھائی کا کسور بھی کیا ہے۔ سرپھد یہ کہ وہ بے کسور ہیں۔ ان کا رشتے دار مرا ہے۔ انہوں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔اگر وہ حرام جادہ طفیل کہیں غیب ہو گیا ہے تو اس کے لیے ہم مہتموں پر آپھت کیوں آئی ہوئی ہے۔ ہمارا جینا کیوں حرام کیا ہوا ہے پلس نے؟''

ماکھو کی سیاہ جنگلی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی سر جھکائے کھڑی تھیں اور سسک رہی تھیں۔

''چلو، کپڑے پہن لو تم۔'' شانی نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ کپڑے پہننے لگیں۔ ماکھو نے رقت آمیز لب و لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ طفیل کے گم ہو جانے کے بعد سے مقامی پولیس نے مہتموں کی تینوں بستیوں کو نشانہ بنایا ہوا

ہے......آئے دن جیپیں گرد اُڑاتی کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جاتی ہیں۔ طفیل کے پیٹی بھرا، لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور دو چار کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ تھانے میں بے گناہوں کو مارا پیٹا جا رہا ہے۔ان دونوں بہنوں کا چچا اور بھائی بھی پولیس کو مطلوب ہیں۔ان پر الزام ہے کہ انہوں نے سیلاب زدہ علاقے میں لوٹ مار کی ہے اور ان کی جھگی سے چوری کی چیزیں، چاندی کی چوڑیاں اور سونے کی دو انگوٹھیاں ملی ہیں۔ ماکھو نے حلفیہ بیان دیا کہ یہ سراسر جھوٹا الزام ہے۔

شانی نے ماکھو کی پوری بات سننے کے بعد اسے تسلی دی۔ لڑکیوں سے بھی دل جوئی کی باتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ وہ اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دے گی۔ ان کے چچا اور بھائی کو بھی پولیس کی تفتیش سے نکلوائے گی۔ اس نے تینوں عورتوں کو شربت وغیرہ پلوایا اور ان کے ساتھ آنے والے دو مردوں کے لیے بھی لسی پانی کا انتظام کروایا۔

ابھی شانی، ماکھو کے ساتھ باتیں کر ہی رہی تھی کہ خالو اعجاز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ تایا معصوم چونکہ بیمار تھے اس لیے حویلی کے زیادہ تر معاملات آج کل خالو اعجاز کے ہاتھ میں ہی تھے۔ شانی سمیت حویلی کے تمام وفادار چوہدری اعجاز پر اعتماد کرتے تھے۔ چوہدری اعجاز نے شانی کے پاس عورتوں کو بیٹھے دیکھا تو دروازے پر ہی رک گئے۔ انہوں نے شانی کو اشارے سے باہر بلایا۔ شانی باہر پہنچی تو چوہدری اعجاز نے پریشان لہجے میں کہا۔

''یہ عورتیں مہتم بستی سے ہی آئی ہیں ناں؟''

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔

چوہدری اعجاز بولے۔ ''مہتم بستی سے ابھی ابھی ایک پریشان کن خبر آئی ہے۔ عارف تک پتا نہیں یہ خبر کیسے پہنچی ہے، اس نے حویلی کے نیلی فون پر اطلاع دی ہے۔ بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے چار سو مہتموں نے بستی کے قریبی تھانے پر حملہ کیا ہے۔ اپنے تین ساتھیوں کو حوالات سے چھڑا لیا ہے۔ تھانے کو آگ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایس ایچ او نذیر گوراہی اور دو کانسٹیبلوں کو اغوا کر کے اپنے ساتھ بستی میں لے گئے ہیں۔''

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔'' شانی نے ہونٹ سکوڑے۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے دراج کی بیوی یہی بات کہہ رہی تھی کہ مہتموں میں بڑی بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔'' شانی نے ذرا توقف کیا اور خالو اعجاز سے پوچھا۔ ''سردار دراج نے لوگوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

خالو اعجاز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو خود لوگوں کے ساتھ شریک تھا۔ اس نے حملے کے دوران میں اپنی کلاشنکوف سے ہوائی فائرنگ بھی کی ہے۔''

"آپ بتا رہے ہیں کہ پکڑا جانے والا ایس ایچ او گوراہی برادری کا تھا؟"

"ہاں... اور یہی بات اس مسئلے کو اور زیادہ سنگین بناتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہی کچھ ہو رہا ہے جو خبیث ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھی چاہتے ہیں۔"

"ڈپٹی ریاض اس وقت قبائلی علاقے میں ہے لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے بھتیجے کی گمشدگی کے بعد مقامی پولیس سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا ہے۔ اسی کی ہدایت پر لگاتار مہتموں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں، یہ عورتیں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ ماکھو بتا رہی تھی کہ ڈپٹی کا ایک چھوٹا تھانے دار وائرلیس پر مسلسل یہاں کے تھانے سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔"

"اب یہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہمیں اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔ میں بھائی معصوم اور بابر وغیرہ سے مشورہ کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں خود موقع پر جانا پڑے۔ مہتم تمہاری بات بہت مانتے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت تم ہی انہیں سمجھا بجھا سکتی ہو۔"

"اگر خون خرابے سے بچنے کے لیے میرا جانا ضروری ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔"

"ان عورتوں کو ابھی کچھ نہ بتانا۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ لوگ ابھی یہیں رہیں۔ خاص طور سے ان لڑکیوں کی تو بری حالت ہے۔ اگر یہ کسی وجہ سے دوبارہ پکڑی گئیں تو شاید زندہ نہ بچیں۔"

"چلو، جیسے مناسب سمجھو۔"

قریباً بیس پچیس منٹ بعد ایک نہایت اہم فون آ گیا۔ لاہور سے سرفراز احمد قزلباش کا سیکرٹری تھا۔ شانی فون پر آئی تو سیکرٹری تیمور نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "میں لاہور سے تیمور حمدی بول رہا ہوں۔ سر آپ سے بات کرنا چاہیں گے۔"

"جی کروا دیجیے بات۔" شانی نے کہا۔

چند سیکنڈ تک میوزک سنائی دیتا رہا پھر سرفراز صاحب کی بھاری رعب دار آواز سنائی دی۔ وہ شاید کسی تقریب میں تھے۔ پس منظر میں کسی مقرر کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

سرفراز احمد نے بلا تمہید کہا۔ "ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ مہتموں نے شاپور کے تھانے پر حملہ کر کے کچھ حوالاتیوں کو چھڑایا اور تھانے کو آگ لگا دی ہے۔"

"جی آگ تو نہیں لگائی گئی بس کوشش کی گئی تھی۔"

"اور وہ لوگ کچھ پولیس والوں کو اغوا کر کے بستی میں بھی لے گئے ہیں۔"

"ہاں جی! یہ اطلاع تو مجھ تک بھی پہنچی ہے۔"

"یہ بڑی سنگین صورت حال ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں کردار ادا کرنا چاہیے۔ مہتموں پر آپ کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ آپ صورت حال کو کنٹرول کر سکتی ہیں۔"

"میں پوری کوشش کرتی ہوں سر! لیکن مقامی پولیس کے لوگ بھی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ میرے پاس مسلسل ان کی شکایتیں پہنچ رہی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ ڈپٹی ریاض کا مقامی پولیس سے رابطہ ہے...... اور وہاں سے لگاتار ہدایتیں آ رہی ہیں۔"

"دراصل سب انسپکٹر کے لاپتا ہونے کے بعد پولیس زیادہ مستعد ہوئی ہے۔"

"مگر سر! مہتم یہ بات حلفیہ کہہ رہے ہیں کہ سب انسپکٹر کی گمشدگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بڑی سے بڑی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں اس بارے میں بڑے افسروں سے ذاتی طور پر بات کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کا مثبت اثر پڑے گا مگر فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مہتموں کو سنبھالا جائے اور پولیس اہلکاروں کو رہائی دلائی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سردار وراج کی طرف سے بڑی بے وقوفی کا کام ہوا ہے۔"

"جی، یہ بات تو میں بھی مانتی ہوں۔ میں خالو جان کے ساتھ ابھی دس پندرہ منٹ میں ...ہ کی طرف روانہ ہو رہی ہوں۔"

"ہاں، اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔" سرفراز احمد نے کہا۔ پس منظر میں سرفراز صاحب کے حق میں فلک شگاف نعرہ بازی ہو رہی تھی۔ ایک دو رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔

شانی نے جیپ میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا سفر کیا اور چالیس کلومیٹر کا کچا پکا راستہ طے کر کے ایک نالے کے کنارے آباد مہتموں کی نئی بستی میں پہنچ گئی۔ خالو اعجاز اور بابر بھی اس کے ساتھ تھے۔ راستے میں عارف کمبوہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ خالو اعجاز نے جیپ کے اندر ایک میگا فون رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ دو دور مار رائفلیں اور ان کا ایمونیشن وغیرہ بھی جیپ میں موجود تھا۔ مہتم بستی نالے کے ساتھ ساتھ قریباً ڈیڑھ کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بستی کچی و نیم پختہ جھونپڑیوں پر مشتمل تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں گرد کے بادل سے اُڑ رہے تھے۔ پولیس کی خاصی نفری یہاں پہنچ چکی تھی تاہم ابھی پولیس بستی کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ پولیس کا عملہ اور گاڑیاں گھوڑے وغیرہ بستی سے چار پانچ سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھے۔ انہوں نے نکاسی کے راستوں پر ناکے لگا رکھے تھے۔ عارف کمبوہ نے بتایا تھا کہ ابھی پولیس کی

مزید نفری موقع پر پہنچنے والی ہے۔ شانی نے دیکھا، بستی پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ بس کسی وقت جھونپڑیوں کی طویل قطاروں کے درمیان گھومتی ہوئی کسی بکری یا بھینس، گدھے وغیرہ کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ یہ تقریباً ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل بستی تھی اور یہ سب لوگ یہیں موجود تھے مگر نظر نہیں آ رہے تھے۔

ایک انسپکٹر اپنی گاڑی کے عقب میں موجود تھا اور ٹیلی اسکوپ لگائے بستی کا جائزہ لے رہا تھا۔ شانی کی گاڑی کو دیکھ کر وہ تیزی سے گاڑی کے پاس آیا۔ ”ہاں انسپکٹر! کیا صورت حال ہے؟“ چوہدری اعجاز نے پوچھا۔

”یہ لوگ مورچہ بند ہو گئے ہیں جی۔ ان کے پاس کافی رائفلیں ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے زبردست ہوائی فائرنگ بھی کی ہے۔“ انسپکٹر نے ٹیلی اسکوپ چوہدری اعجاز کی طرف بڑھا دی۔ چوہدری اعجاز نے بستی کا جائزہ لینے کے بعد ٹیلی اسکوپ شانی کو تھمائی۔ شانی نے بستی کا جائزہ لیا۔ غور سے دیکھنے پر تین چار جگہ جھونپڑیوں کے اندر سے رائفلوں کی سیاہ نالیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ ایک مہتم دکھائی دیا جو رکھوالی کے دو دیوہیکل کتوں اور ایک ننگ دھڑنگ بچے کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ایک جھونپڑے کے اندر گم ہو گیا۔

”سردار دراج سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ شانی نے انسپکٹر سے پوچھا۔

”نہیں بی بی! سردار سمیت سب لوگ بہت مشتعل ہیں۔ ان میں سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔ اس بات کا ڈر ہے کہ تاخیر ہوئی تو انسپکٹر صاحب کو جان سے نہ مار دیا جائے۔ وہ پہلے ہی کافی زخمی ہیں۔“

”میں آگے جا کر سردار دراج سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ شانی نے کہا۔

”میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ آگے جانے میں خطرہ ہو گا۔ آپ کی جان کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔“

”مقتول بادل کی جان کی حفاظت بھی تو آپ لوگوں کی ذمے داری تھی۔ ان باتوں کو چھوڑیں میں اپنی مرضی سے اور اپنی ذمے داری پر آگے جا رہی ہوں۔“

”دیکھیں بی بی! ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی کے دوست نہیں! اگر وہ......“

”اس کے باوجود میں آگے جا کر ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ شانی کا لہجہ فیصلہ کن تھا...... دو تین منٹ تک مشورہ ہوا۔ پھر شانی ایک ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ہو گئی۔ عارف، نبوہ، چوہدری بابر اور حویلی کے تین چار محافظ بھی سوار ہو گئے۔ میگا فون عارف کے ہاتھ میں تھا۔

ٹریکٹر ٹرالی آگے بڑھی۔ شانی اونچی جگہ پر کھڑی تھی اور نمایاں نظر آ رہی تھی۔

اس نے بستی کی طرف بڑھتے ہوئے میگا فون پر کہا۔ ”میں بی بی...... آپ سے بات کر رہی ہوں۔ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔ سردار دراج سے ملنے آئی ہوں۔ ہم بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور جن لوگوں نے بات کرنی ہے، وہ سردار دراج کے ساتھ باہر آ جائیں۔“

اس دوران میں ٹرالی بستی کے اندر پہنچ چکی تھی۔ خطرہ موجود تھا لیکن کہیں سے کوئی فائرنگ نہیں ہوئی۔ شانی کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔ اس نے ایک بار پھر میگا فون کے ذریعے سردار دراج کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ سامنے آئے۔ اسے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

دو چار منٹ مکمل سکوت میں گزرے۔ کتوں کی آواز کے سوا مکمل سکوت تھا۔ پھر شانی نے دیکھا کہ تین تنومند مہتم جھونپڑیوں کی دو طویل قطاروں کے درمیانی راستے پر نمودار ہوئے۔ وہ مسلح تھے۔ ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ ان کے بالائی جسم عریاں تھے اور چلچلاتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ یہ لوگ ٹریکٹر ٹرالی کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ انہوں نے شانی کو جھک کر سلام کیا پھر محتاط نظروں سے ٹرالی کا جائزہ لینے کے بعد مزید قریب آ گئے۔

”سردار دراج کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”وہ آگے جھونپڑے میں ہے۔ اگر آپ نے اس سے بات کرنی ہے تو آپ کو اکیلے آگے جانا ہو گا۔“

”میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ تم اچھی طرح میری تلاشی لے سکتے ہو۔“ خالو اعجاز نے کہا۔

”نہیں جی۔ سردار نے منع کیا ہے۔“ ایک مہتم نے اٹل لہجے میں کہا۔

”کیا عارف بھی نہیں آ سکتا؟“ شانی نے پوچھا۔

مہتم چند لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آئے۔ انہوں نے آپس میں کچھ بات کی پھر ترجمان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے چھوٹی چوہدرانی...... اگر آپ جروری سمجھتی ہیں تو اس کو لے آئیں۔“

بستی کے وسط میں ایک بڑے جھونپڑے کے اندر شانی اور عارف کی ملاقات سردار دراج سے ہوئی۔ وہ حسبِ معمول شلوار قمیص میں تھا۔ کھلے ہوئے گریبان سے اس کا سانولا فولادی جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور کندھے سے کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی اس ہنگامے کی نشاندہی کرتی تھی جو آج صبح

تھانے میں ہوا تھا۔ سردار دراج سرتاپا شعلہ نظر آ رہا تھا۔ سردار دراج کے اردگرد کم از کم آٹھ مسلح مہتم موجود تھے۔ وہ تین حوالاتی بھی اسی جھونپڑے میں تھے جن کو تھانے سے چھڑایا گیا تھا۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ ان کے جسم اور چہرے پر بڑے بڑے نیل تھے۔ ان میں سے ایک اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ عارف نے بتایا کہ اس کے گردوں پر اثر پڑا ہے، اس کا پیشاب رکا ہوا ہے۔

سردار دراج نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ ''نکی چوہدرانی! ہم نے بہت برداشت کیا، اب اور برداشت نہیں ہوتا۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ماریں گے یا مر جائیں گے۔ دہائی کھدا (خدا) کی، بھائی بھی ہمارا مرا ہے اور الٹا بھی ہم کو لٹکایا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاپھ ہے؟''

ایک دوسرا مہتم بولا۔ ''اور جو کچھ یہ ہماری جنانیوں کے ساتھ کر رہے ہیں، وہ بھی بتانے کے قابل نہیں ہے۔ ڈشکری پلس والیوں سے ان کا حشر نشر کرایا گیا ہے اور مردوں نے ان کا تماشا دیکھا ہے۔ ان کو ایسی ایسی دھمکیاں دی ہیں کہ جن کو کان سن نہیں سکتے۔ اس سے اچھا ہے ہم کھد مر جائیں اور ان کو بھی مار دیں۔''

شانی نے کہا۔ ''دیکھو دراج! سارے پولیس والے تو ایک جیسے نہیں ہیں۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ کچھ پولیس والے ہماری مدد بھی تو کر رہے ہیں۔ اگر دو چار نے کوئی ایسا جرم کیا ہے تو ان کو کیسے کی سزا ملے گی۔''

''کب ملے گی سجا؟ کب ملے گی؟'' ایک مہتم پھنکارا۔ ''ابھی تو ہم کو ہی سجا مل رہی ہے، ہماری شرلیعت کی۔ اگر اس ڈپٹی ریاج کا بھتیجا لا پتا ہوا ہے تو اس میں ہمارا کیا کسور ہے۔ اس جیسے حرامی کے درجنوں دشمن ہوتے ہیں اور کیا پتا وہ کھد ہی کہیں گائب ہو گیا ہو۔ اس کمینے کی کھاتر ہمارے اوپر گوراہی برداری کا تھانے دار جیسے کھدا بن کر آ گیا ہے۔ دن رات ہم کو عجاب میں ڈالا ہوا ہے۔ اب ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے۔ بادل بھائی کے بدلے اس کی لاش گوراہیوں کو بھیجیں گے۔''

''ہاں نہیں چھوڑیں گے۔ مار دیں گے۔ ... کھتم کر دیں گے۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

عارف نے ہاتھوں کے اشارے سے ان کو خاموش کرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زیادہ جوش اچھا نہیں ہے۔ اس سے بہت نقصان ہوگا۔ تھانے پر حملہ کرنا اور حوالاتیوں کو چھڑانا ہی کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اب تم لوگ پولیس والوں کو بھی پکڑ کر لے آئے ہو۔ یہ تو کھلے ٹکراؤ والی بات ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پولیس اور انتظامیہ سے ٹکر لے کر کامیاب ہو سکتے

ہو؟''

اسی دوران میں ایک ننگ دھڑنگ مہتم، جس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی، تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں دراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کھیا جی! پلس کی چھ سات گڈیاں اور آ گئی ہیں۔ پلس والوں نے آپاں کی بستی کو تین طرپھ سے گھیر لیا ہے۔''

شانی نے اس مہتم سے تھوڑی سے مزید تفصیل پوچھی اور پھر سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جھونپڑے میں رش کم کرنے کے لیے اس نے پانچ چھ افراد کو بھی باہر جانے کا کہا پھر وہ سردار دراج سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دراج! اس معاملے کو جتنا طول دیں گے اتنا ہی خطرناک ہوگا۔ ہم اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کر لیں گے تو بہتر ہے۔''

ایک مہتم نے تڑاخ سے کہا۔ ''آپاں کو کسی سے کوئی امید نہیں ہے۔ حویلی والوں نے بھی ہمارے لیے کیا کیا ہے۔ ابھی تک ہمارے بندے کے کتل کا پرچہ بھی نہیں ہو سکا۔''

''تم کھاموش ہو جاؤ۔'' سردار دراج نے اپنے ساتھی کو جھاڑا۔ ''نکی چوہدرانی کے کھلاف کوئی بات نہ کرے۔''

وہ شخص کان لپیٹ کر باہر چلا گیا۔ شانی نے کہا۔ ''دراج! تم ہمارے ساتھی ہو۔ ہمارے اپنے ہو۔ ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے بالکل غلط ہوا ہے۔ اب اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے تھانیدار نذیر اور اس کے دو کانسٹیبل ساتھیوں کو چھوڑنا ہوگا۔''

''نہ صرف چھوڑنا ہوگا بلکہ حوالاتی بھی ان کے حوالے کرنے ہوں گے۔'' عارف نے کہا۔

''تاکہ وہ مار مار کر ان کی بچی کھچی جان بھی ان کے پنڈے سے کھینچ لیں؟'' دراج نے کرب ناک آواز میں کہا۔

''نہیں۔ ہم پولیس سے ضمانت لیں گے کہ ان پر کسی طرح کی سختی نہیں ہوگی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان کو تھانے کے بجائے علاج کے لیے اسپتال بھیج دیا جائے۔''

''ایسی جمانتیں ہم کو پہلے بھی ملتی رہی ہیں......'' ایک ادھیڑ عمر مہتم نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ دراج نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں شانی، عارف، سردار دراج اور اس کے دو ساتھیوں میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔ شانی نے بڑی ہمدردی اور سلیقے سے سردار دراج کو قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی۔ سردار دراج اور اس کے ساتھی انسپکٹر اور

کانسٹیبلوں کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے مگر وہ حوالاتیوں کو واپس کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔ ان تین حوالاتیوں میں ایک سردار دراج کی بیوی کا بھائی ساجن بھی تھا۔ مار پیٹ سے اس کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔

شانی اور عارف نے باہر آ کر اس بارے میں پولیس کے افسروں سے بات کی۔ یہ دو مختلف تھانوں کے دو انسپکٹر تھے۔ چونکہ تینوں افراد پر باقاعدہ پرچہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ کسی پرچے میں نامزد تھے لہٰذا ان کے لیے گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔ پولیس والے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ بضد تھے کہ حوالاتیوں کو واپس تھانے میں لے کر جائیں گے۔ ابھی وہ تھانے پر حملہ کرنے والوں کی گرفتاری کی بات نہیں کر رہے تھے مگر شانی اور عارف کو اندازہ تھا کہ یہ بات بھی جلد سامنے آ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ مقامی پولیس سردار دراج کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی بات کرے۔

یہ بات چیت تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ شانی نے پولیس اور سردار دراج کے درمیان دو تین چکر لگائے۔ اس دوران میں سرفراز احمد قزلباش صاحب کا ایک نمائندہ بھی موقع پر پہنچ گیا اور اس نے بھی پولیس والوں سے بات کی۔ اس ساری تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ شانی اور چوہدری اعجاز کی طرف سے پولیس کو گارنٹی دی گئی کہ تینوں حوالاتی کہیں غائب نہیں ہوں گے۔ وہ رنگ والی میں چوہدری اعجاز کی تحویل میں رہیں گے۔ پولیس نے ان سے جو بھی پوچھ گچھ کرنی ہوگی، وہ چوہدری اعجاز یا شانی کی موجودگی میں کر سکتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے بعد ازاں ان کی گرفتاری کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ کام باقاعدہ قانونی طریقے کے مطابق ہو گا۔ ملزموں کو چوبیس گھنٹے کے اندر عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

بہت سے مہتم اس صورتِ حال پر راضی نہیں تھے مگر یہاں بھی شانی کا اثر و رسوخ کام آیا اور یوں فوری طور پر تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔

زخمی انسپکٹر اور دیگر اہلکاروں کو واپس کر دیا گیا۔ تینوں حوالاتی شانی اور چوہدری اعجاز کی سپرداری میں دے دیئے گئے۔ ان کی طرف سے پولیس کو ضمانت دی گئی کہ وہ کہیں نہیں جائیں گے اور پوچھ گچھ کے لیے ہر وقت پولیس کو دستیاب ہوں گے۔

شام تک یہ معاملہ بہ مشکل نمٹ سکا اور شانی، عارف اور چوہدری اعجاز واپس رنگ والی پہنچے۔ تینوں حوالاتی ان کے ساتھ تھے۔ شانی اور عارف تو چاہتے تھے کہ سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہی رنگ والی آ جائے مگر سردار نے کہا کہ اس کا اپنے لوگوں میں رہنا ضروری ہے تا کہ وہ بہ وقتِ ضرورت ان کو سنبھال سکے۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بہرحال شانی اور

عارف کو اندیشہ تھا کہ پولیس کسی بہانے سردار دراج پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کوشش کا نتیجہ سنگین تصادم کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ جو تین حوالاتی رنگ والی لائے گئے، ان میں سے ایک شدید بیمار تھا۔ اسے رنگ والی کے شفا خانے میں ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ چند گھنٹے بعد وہ بھی حویلی میں آ گیا۔ حویلی سے ملحق ایک مہمان خانے میں ان کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔

وہ تینوں پولیس سے کافی خوف زدہ تھے۔ شانی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم جرم دار نہیں ہو تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہو گیا سو گیا لیکن اب ہم پولیس کو تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرنے دیں گے۔''

''ہمیں بہت مارا ہے جی انہوں نے۔ بہت جلیل کیا ہے۔ تھانے دار نجیر نے ہم سے اپنی برادری کے بندے کا بدلہ لیا ہے۔ وہ ہماری عورتوں کو اٹھانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔'' دراج کے سالے ساجن نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا...... تم بالکل فکر نہ کرو۔'' چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''لیکن ہم نے تم پر جو بھروسا کیا ہے تم بھی اس پر پورے اترنا۔ یہ نہ ہو کہ پولیس کے ڈر سے تم یہاں سے دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے چوہدری جی۔'' ساجن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ کی عجت ہماری عجت ہے۔ آپ نے ہمارے سر پر ہتھ رکھا ہے۔ آپ اگر آپاں کو کھو میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو آپاں اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے۔''

''شاباش! ہمیں تم سے یہی امید ہے۔'' چوہدری اعجاز بولے۔

شانی نے کہا۔ ''فکر مند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اگر پولیس پوچھ گچھ کے لیے آئی بھی تو میں تمہارے ساتھ یہاں موجود ہوں گی۔''

''نکی چوہدرانی! آپاں کس جبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔'' ساجن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنا اچھی طرح خیال رکھو۔ مرہم پٹی کراؤ۔ کھانا دھیان سے کھاؤ۔ ڈاکٹر ابھی تھوڑی دیر میں پھر یہاں کا چکر لگائے گا۔''

ساجن کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کا ساتھی بھی آبدیدہ تھا۔ تیسرا ساتھی دوا کے زیر اثر سو رہا تھا۔

شانی زنان خانے میں واپس آئی تو رستم کی بہن آپو زاہدہ بے چینی سے شانی کا انتظار کر

رہی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے شانی کا ماتھا چوما۔ ''میں تو مصلّے پر بیٹھی دعائیں کر رہی تھی ..... کہ اللہ کرے وہاں کوئی جھگڑا اشگوانہ ہو۔''

''نہیں آپا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔''

''سنا ہے کہ تُو حوالاتیوں کو اپنے ساتھ لے آئی ہے؟''

''ہاں جی۔''

''یہ بڑا اچھا کیا تُو نے۔ زور آوروں کا ساتھ تو ہر کوئی دیتا ہے۔ کمزوروں وچاروں کا ساتھ دینا ہی نیکی ہے۔ اللہ سوہنا تجھے اس کا صلہ ضرور دے گا۔''

''ماکھو اور دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟''

''وہ کھانا کھا کر جلدی سو گئی ہیں...... انہیں کچھ پتا نہیں کہ وہاں بستی میں کیا تماشا ہوا ہے۔''

''ان کو بتانا بھی نہیں آپا ..... پریشان ہوں گی۔''

''نہیں بتاؤں گی۔ ویسے ماکھو تم کو بڑی دعائیں دے رہی تھی۔ تمہارا نام لے لے کر اس کا منہ سوکھ رہا تھا۔''

شانی نے آہ بھری۔ سب اس کو دعائیں دیتے تھے مگر پتا نہیں یہ دعائیں اسے لگ کیوں نہیں رہی تھیں؟ اس کی زندگی دن بدن اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ وہ تو بہت حساس تھا پھر اسے اپنے کیے پر ذرا سی بھی ندامت محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی؟

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک دن پولیس رنگ والی آئی اور پولیس کے تفتیشی نے ساجن اور اس کے دونوں ساتھیوں سے پوچھ گچھ کی۔ جونہی شانی کو پولیس کی آمد کی اطلاع ملی، وہ فوراً مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ پولیس والے وہاں پہلے سے بیٹھے تھے اور شربت ملا دودھ پی رہے تھے۔ شانی کو دیکھتے ہی ساجن اور اس کے دونوں ساتھیوں کے چہروں پر رونق آ گئی تھی۔ پولیس والوں نے تقریباً ایک گھنٹا پوچھ گچھ کی۔ اس دوران میں شانی وہیں موجود رہی۔ ساجن اور اس کے ساتھیوں سے پولیس والوں کا رویہ اچھا نہیں تھا، ان کی آنکھوں میں کدورت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

پولیس کے جانے کے بعد شانی خالو اعجاز کو ڈھونڈنے لگی۔ اسے آپا زاہدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ تایا معصوم کے ساتھ زمینوں پر گئے ہیں۔ جس وقت شانی اور زاہدہ بات کر رہی تھیں، چوہدری اعجاز اور تایا معصوم اپنی بارانی زمین کا جائزہ لینے اور مزارعوں کو ضروری

ہدایات دینے کے بعد اپنی لینڈ کروزر میں واپس بیٹھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ حسب سابق چوہدری اعجاز نے سنبھالی اور تایا معصوم ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ تایا معصوم کے چہرے پر بیماری کی نقاہت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ درحقیقت قریباً ڈیڑھ برس پہلے ڈپٹی ریاض کی سفا کی کا سامنا کرنے کے بعد تایا معصوم ٹھیک ہوئے ہی نہیں تھے۔ وہ اب بھی چوہدری اعجاز کے تعاون سے زمینداری کے امور بہ مشکل انجام دیتے تھے۔ تایا معصوم کی اولاد نہیں تھی۔ ان کی ساری زندگی دنیا سے بے رغبتی اور قناعت پسندی کے ساتھ گزری تھی۔ شانی کے والد، والدہ اور بھائی کی وفات کے بعد زمینداری کی اَن چاہی ذمے داریاں چوہدری معصوم علی پر آ گئی تھیں۔ شروع شروع میں تو انہوں نے یہ ذمے داریاں بخوبی نبھائی تھیں مگر اب بیماری کی وجہ سے بہت سے اختیارات غیر محسوس طور پر چوہدری اعجاز اور شانی کے پاس چلے گئے تھے۔ خاص طور سے چوہدری اعجاز پر بہت زیادہ انحصار کیا جانے لگا تھا۔

تارکول کی تنگ لیکن طویل سڑک پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''بھائی جی! یہ حوالاتیوں والا معاملہ ہمیں کسی نہ کسی طرح حل کرنا پڑے گا۔ دھی رانی شانی ماشاء اللہ سیانی ہے لیکن پھر بھی اس کا وہ تجربہ نہیں ہے۔ اگر ہم نے واقعی الیکشن میں حصہ لینا ہے تو پھر ہمیں علاقے کی سیاست کو سمجھنا پڑے گا۔ ہم گوراہی برادری کی مخالفت کا خطرہ کسی طور مول نہیں لے سکتے۔ ان کا ووٹ مہتموں سے بہت زیادہ ہے۔ اثر و رسوخ میں بھی وہ بہت آگے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ مہتموں کو چھوڑ دیا جائے۔''

''نہیں نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا درمیانی رستہ نکل آئے جس سے گوراہی ناراض نہ ہوں۔''

''اگر تم حوالاتیوں کی بات کر رہے ہو تو یہ بات تو میرے دماغ میں بھی آتی ہے۔ اس کا کوئی مناسب حل ہونا چاہیے...... کوئی ایسا حل جس سے شانی کی بات بھی رہ جائے۔''

''چلیں، میں اس بارے میں شانی سے مشورہ کرتا ہوں۔ اگر کوئی درمیانی حل نکل سکتا ہے تو اچھا ہو گا۔ ہمیں پولیس سے خواہ مخواہ کی ٹسل پیدا نہیں کرنی چاہیے۔''

☆======☆======☆

اگلے روز صبح سات آٹھ بجے کے قریب پھوپھی آمنہ نے شانی کو جھنجوڑ کر جگایا۔ ''شانی اٹھ اٹھ۔ دیکھ یہ ادھر کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔''

شانی گھبرا کر اٹھی اور اپنے بال سمیٹے۔ ''کیا ہوا پھوپھی؟''

"وہ دیکھ کر مردانے کی طرف کتنا شور مچا ہوا ہے۔ وہ تینوں بندے مہمان خانے سے بھاگ گئے ہیں، جنہیں تُو یہاں لے کر آئی تھی۔"

"یہ کیسے ہوا؟" شانی تیزی سے کھڑکی کی طرف گئی۔ مردانے کی طرف واقعی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ ایک کھلی جیپ جس میں محافظ سوار تھے، جیپ یوٹرن لے کر تیزی سے سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

شانی، خالو اعجاز کے کمرے کی طرف گئی۔ ان کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ بات ختم کر کے انہوں نے شانی کی طرف دیکھا۔ "یہ بہت برا ہوا ہے شانی...... ہمارے لیے پہلے ہی مسئلے کم نہیں تھے۔"

"آپ خود دیکھ کر آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ تینوں واقعی کمرے میں موجود نہیں ہیں؟"

"تو کیا میں صرف سنی سنائی باتیں کر رہا ہوں۔" خالو اعجاز نے ہلکی سی جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ "ان کو یہاں سے غائب ہوئے کم از کم تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس وقت ابھی چانن (اجالا) بھی نہیں ہوا ہوگا...... اور وہ تین نہیں چار ہیں۔"

"کک...... کیا مطلب؟"

خالو اعجاز نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کل رات نو بجے کے قریب سردار دراج یہاں آیا تھا۔ وہ تینوں مہتموں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ دو گھنٹے ان کے پاس رہا۔ چاروں نے اکٹھے ہی کھانا وغیرہ کھایا اور چائے پی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ سردار کا پروگرام بنا کہ وہ صبح سویرے نکل جائے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سویرے یہ تماشا ہو جائے گا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ باہر پہرا موجود تھا۔ انہوں نے دو پہرے داروں کو نشے والا سگریٹ پلایا، ان کے ہتھیار لیے اور آدھی رات کے وقت یہاں سے نکل گئے۔"

"آ...... آپ کا مطلب ہے...... سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہے؟"

"اس میں شک والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... دراج تو بہت...... سوجھ بوجھ والا شخص ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... مگر تھانے پر حملے میں بھی تو دراج شریک تھا۔" چوہدری اعجاز نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"اگر واقعی ایسا ہو چکا ہے تو بہت برا ہوا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ اب کہاں جائیں گے؟"

"واپس بستی میں تو ہرگز نہیں جا سکتے۔ اب ان کی حیثیت مفروروں کی ہو گئی ہے...... اب سردار کی بیوی اور دونوں لڑکیوں کو بھی کہیں چھپا کر رکھنا ہوگا۔ ورنہ پولیس انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جائے گی۔"

شانی واقعی پریشان نظر آ رہی تھی۔ خالو اعجاز کارندوں کو ہدایات دینے کے لیے نیچے چلے گئے تو شانی سیدھی ماکھو اور دونوں لڑکیوں کے پاس پہنچی۔ ان تینوں کو ابھی تک صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ ہاں...... شانی انہیں یہ بتا چکی تھی کہ چار پانچ روز پہلے بستی میں کیا ہوا ہے۔ تھانے پر حملے اور پھر پولیس کے ساتھ راضی نامے کا سارا واقعہ بھی شانی نے ماکھو کو بتا دیا تھا۔ اب شانی نے تازہ ترین صورتِ حال ماکھو کے گوش گزار کی۔ ماکھو یہ جان کر ششدر رہ گئی کہ اس کا خاوند دراج اور بھائی ساجن و دیگر افراد کے ساتھ فرار ہو گئے ہیں۔ وہ یہ بات کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"نکی چوہدرانی! دراج ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ایسے مشکل ویلے میں اپنے کبیلے کو چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا۔ وہ تو اپنے لوگوں کے درمیان رہنا چاہے گا۔ میری اکل میں یہ بات بالکل نہیں آتی ہے کہ وہ چپ چپاتے نکل گیا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے ماکھو! وہ اس وقت یہاں پنڈ میں موجود نہیں ہے۔ پولیس نے اب بہت سختی کرنی ہے۔ تمہارا سامنے آنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی بہتر ٹھکانا ہے تو وہاں جا سکتی ہو۔ اگر نہیں تو مجھے بتاؤ، میں تمہارا کوئی انتظام کرتی ہوں۔"

پولیس کے خوف سے لڑکیوں کے رنگ اُڑ گئے۔ مضبوط اعصاب کی مالک ماکھو بھی قدرے پریشان نظر آنے لگی۔ وہ بولی۔ "نکڑی! اب تو کھدا کے بعد تیرا ہی آسرا نجر آ رہا ہے۔ جو کرنا ہے تُو نے ہی کرنا ہے۔ تُو جہاں کہے گی آپاں رہ لیں گے۔"

حویلی کا ایک حصہ بہت پرانا تھا۔ اسے پرانے کوٹھے کہا جاتا تھا۔ شانی نے سکینہ کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ ایک ملازمہ کو لے کر پرانے کوٹھے جائے اور ایک کمرے کی اچھی طرح صفائی کرا دے۔

ماکھو اور دونوں لڑکیوں کو تسلی تشفی دینے کے بعد شانی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ حویلی کے کارندے بھاگ دوڑ کر رہے تھے مگر جن لوگوں کو تلاش کیا جا رہا تھا ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دوپہر کو چند پولیس اہلکار حویلی میں آئے۔ وہ تایا معصوم اور خالو اعجاز سے مل کر واپس چلے گئے۔ تایا معصوم بھی اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔

شانی نے ایک ملازمہ سے پوچھا۔ ''منا کہاں ہے؟''

اس نے بتایا کہ وہ چھوٹے کمرے میں ہے۔ شانی اس کمرے میں پہنچی تو ملازمہ جمیلہ کو منے کے ساتھ الجھتے ہوئے پایا۔ وہ اوندھا لیٹا تھا۔ وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہہ رہی تھی۔ ''بس دو تین چمچے کھالو۔ نہیں تو بی بی مجھ کو بڑا ڈانٹیں گی۔''

منا بار بار اس کا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔ قریب ہی کھانے کی ٹرے میں چاول اور قورمہ وغیرہ رکھا تھا۔ ''کیا ہوا ہے جمیلہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''منا جی ناراض ہیں۔ انہوں نے ناشتا بھی چنگی طرح نہیں کیا۔ بار بار آپ کو بلانے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کو بتایا بھی تھا کہ آپ مصروف ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... تم جاؤ۔'' شانی نے کہا۔

ملازمہ جمیلہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ شانی کچھ دیر تک اوندھے پڑے منے کو دیکھتی رہی۔ منے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں اپنی مرحومہ بھابو کی تصویر پھر جاتی تھی اور اس کا سینہ جیسے ممتا کے سیال جذبے سے بھر جاتا تھا۔ وہ پھیکے انداز میں مسکرائی اور منے کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے کان میں سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر اسے اپنے گلے سے لگایا، بھینچا اور دو تین بار اس کا منہ چوما۔ وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ شانی کو محسوس ہوا کہ اپنی زیادہ مصروفیت کی وجہ سے وہ پچھلے تین چار روز سے واقعی منے کو نظرانداز کر رہی ہے۔ وہ کل بھی دیر تک اسے حویلی کی راہداریوں میں ڈھونڈتا رہا تھا..... پھر آپا زاہدہ کے پاس پڑ کر سو گیا تھا۔

شانی نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلانا شروع کیا۔ وہ لاڈ پیار سے تھوڑی ہی دیر میں ٹھیک ہو گیا اور حسبِ عادت چہکنے لگا۔ بچے میں یہی تو خوبی ہوتی ہے کہ وہ رنج کو تادیر اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''جب میں ناراج ہوتا ہوں تو تم مجھ کو پپی کیوں کرتی ہو؟''

''جو ناراض ہو اسے پیار سے پپی کی جاتی ہے تاکہ وہ مان جائے۔''

''تو پھر انکل رستم کو پپی کیوں نہیں کرتی ہو؟'' وہ معصومیت سے بولا۔ ''وہ تم سے ناراج ہیں نا۔ تم ان کے ساتھ لیٹ کر ان کو زور سے پپی کرو گی..... تو وہ مان جائیں گے؟''

منے کے سوال پر شانی کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ منا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''نہیں منے، ان کی ناراضگی ایسی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیسی ہے؟''

''بہت بڑی ہے۔'' شانی نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ اسی دوران میں شانی کی نگاہ دریچے سے گزر کر زنان خانے کے صحن میں گئی۔ خالو اعجاز ڈیوڑھی کے قریب موجود تھے۔ ان کا قریبی ملازم برکات علی بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی اور رازداری کے ساتھ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ڈیوڑھی کی طرف چلے گئے۔

☆======☆======☆

رستم نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح ناصر، زری کے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے مگر وہ نہیں مانا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ زری سے شادی کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت زری کے پیار کی جوت جلتی رہتی تھی۔ دوسری طرف زری بھی پوری طرح اس پر فدا تھی لیکن ناصر کا مؤقف تھا کہ موجودہ سنگین حالات میں وہ خوشی کا یہ شادیانہ بجانا نہیں چاہتا۔ خاص طور سے وہ رستم کے حالات سے پریشان تھا۔ رستم کی کوشش رہتی تھی کہ اس کے اندر کا دکھ اس کے ساتھیوں پر ظاہر نہ ہو مگر اس کے ساتھی اچھی طرح جانتے تھے کہ رستم کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

صبح ناشتے کی میز پر جب رستم اور ناصر اکیلے رہ گئے تو رستم نے کہا۔ ''یار ناصر! میرے دل پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے اب اچھا نہیں لگتا کہ آپا زاہدہ اور بھائی اکرام شانی بی بی کی حویلی میں پناہ گزین رہیں۔ میں ان کو اپنے پاس بلا لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس بارے میں حاجی سے بات کی ہے۔ اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کوٹھی میں کافی گنجائش موجود ہے۔ وہ آسانی سے کسی کونے میں سما سکتے ہیں۔ بس چار افراد تو ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے۔''

''وہ آئیں گے کیسے؟''

''میں نے اس بارے میں کل اجمل سے بات کی تھی۔ اجمل نے رنگ والی کی حویلی میں فون کیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر بی بی بولیں تو فون بند کر دینا۔ دوسری طرف بابا خادم حسین بولا تھا۔ بعد میں بابا خادم حسین نے اجمل کی بات چوہدری اعجاز سے کرا دی۔ اجمل نے چوہدری اعجاز کو بتایا کہ ہم لوگ بھائی اکرام اور ان کے بیوی بچوں کو اپنے پاس لاہور میں بلانا چاہتے ہیں۔ چوہدری اعجاز نے یہ بات تحمل سے سنی اور کہا کہ وہ اس بارے میں سوچ کر کل تک بتائے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے..... وہ کیا کہے گا؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اسے ان کے یہاں آنے کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ تو خود بھی چاہے گا کہ حویلی سے میرا تعلق کم سے کم ہو۔ موجودہ صورتِ حال میں تو لگتا ہے کہ شاید

شانی بھی یہی چاہتی ہوں۔"

ناصر اضطراب کے عالم میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد رستم کی ہدایت پر اجمل خان نے پھر رنگ والی کی حویلی میں رابطہ کیا۔ اس مرتبہ اتفاقاً چوہدری اعجاز سے ہی بات ہوگئی۔ اجمل خان نے دو تین منٹ چوہدری سے بات کی پھر فون بند کر دیا۔

"ہاں، کیا کہتا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"خو وہ کہتا ہے ام کو کوئی اعتراض نہیں۔ بے شک ان کو آج ہی لے جاؤ۔ بلکہ ابھی لے جاؤ۔ اس نے بڑا رکھائی سے بات کیا ہے۔"

"لانے کا طریقہ کیا ہوگا؟" رستم نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ اگر ام انتظام نہیں کر سکتے تو اس کو بتا دیں۔ وہ خود ان کو حفاظت سے لاہور پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔"

"میں اس کا یہ احسان بھی لینا نہیں چاہتا۔ میں حاجی سے بات کرتا ہوں کہ ان کو یہاں لانے کا کوئی انتظام کر سکے۔"

"ہاں! آپ ابھی بات کر لے۔ ام نے چوہدری سے کہا ہے کہ ام مشورہ کر کے دس بیس منٹ میں اسے دوبارہ فون کرتا ہے۔"

رستم نے فون پر حاجی حیات سے رابطہ کیا اور پانچ چھ منٹ تک اس سے بات کی۔ اس بات چیت میں یہ طے ہوگیا کہ حاجی کے خاص آدمی پہلوان اور جیرا...... پرائیویٹ طور پر رنگ والی پہنچیں گے۔ ان کے پاس ٹنڈڈ شیشوں والی اسٹیشن وین ہوگی۔ وہ اس وین کے ذریعے میاں بیوی اور دونوں بچوں کو رنگ والی سے لاہور منتقل کر دیں گے۔ اجمل نے دوبارہ رنگ والی فون کیا اور چوہدری اعجاز کو اس ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب رستم کا جاں گسل انتظار ختم ہوگیا۔ اسٹیشن وین میں آپو زاہدہ، اکرام اور دونوں بچے حفاظت سے کوٹھی پہنچ گئے۔ بھائی بہن کا ملاپ دیدنی تھا۔ آپو زاہدہ نے دیر تک رستم کو گلے سے لگائے رکھا اور روتی رہیں۔ بچے بھی اپنے ماموں سے لپٹ گئے... بھائی اکرام بار بار رستم کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ درحقیقت ان سب نے رستم کو کھو کر دوبارہ پایا تھا۔ ان سب کے آنے سے اس ویران کوٹھی میں پھر سے تھوڑی سی رونق آگئی۔ دونوں بچے سرمد اور عاشی اوٹ پٹانگ زری میں دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ بھی بڑی جلدی ان سے بے تکلف ہوگئی اور انہیں اپنی گلابی اردو سے مسکرانے پر مجبور کرنے لگی۔ اجمل

خان نے ضد کر کے دوبارہ کچن سنبھال لیا اور ان سب کے لیے ایک شاندار ڈنر کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ دنبے کا گوشت اور اس کی چکی کی چربی جو کئی روز سے فریزر میں پڑی تھی پھر سے گفتگو کا موضوع بن گئی۔ رستم...... آپو زاہدہ اور بھائی اکرام کے ساتھ کمرے میں تھا اور انہیں اپنی طویل رُوداد کے ضروری حصے سنا رہا تھا۔ یہ رُوداد اس وقت سے شروع ہوتی تھی جب رستم نادیہ اور زوار بھی پہنچ گئے تھے۔ پھر رستم ایک گاڑی پر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہوگیا تھا اور اس بات سے بے خبر رہا تھا کہ فلمسٹار نادیہ گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔

کوٹھی کے ماحول میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ اگلے چوبیس گھنٹے نسبتاً اچھے ماحول میں گزرے۔ آپو زاہدہ نے بھی رستم کو اپنی کہانی سنائی۔ انہوں نے مسلسل رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کے قصیدے پڑھے۔ وہ نوجوان چوہدرانی جس نے ایک رات خود کو مشکلات میں ڈال کر ان کو اور اکرام کو ایک تھانے دار کی گرفت سے نکالا تھا اور پھر مسلسل کئی ماہ تک اپنی حویلی میں پناہ دی تھی۔ آپو زاہدہ کو علم نہیں تھا کہ اس چھوٹی چوہدرانی سے رستم کا کتنا گہرا تعلق ہے اور اس کا ذکر رستم کو اندر سے کتنا دکھی کر رہا ہے۔

اس رات پھر ایک چونکا دینے والی بات ہوئی۔ رستم اپنے کمرے میں سرمد کو اپنے ساتھ لیے لیٹا ہوا تھا۔ ابھی وہ سویا نہیں تھا، سرمد سو چکا تھا۔ رستم اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک اسے کھڑکی کے سامنے ایک سایہ سا لہراتا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی چوری چھپے اس کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ایسا ہو چکا تھا۔ رستم نے واضح طور پر ایک سایہ دیکھا تھا مگر اس کا کھوج نہیں ملا تھا۔ اس دفعہ رستم کو باقاعدہ ہلکی سی آہٹ بھی سنائی دی تھی۔ رستم اپنی جگہ بے حرکت لیٹا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ کوٹھی میں موجود تقریباً سبھی افراد سو چکے تھے لیکن اگر کوئی جاگتا بھی ہوتا تو اسے اس طرح کمرے کے اردگرد چکرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب کی بار رستم نے ایک اور بات محسوس کی تھی۔ سایہ کسی عورت کا تھا۔ شاید کسی لڑکی کا...... اور یہ زری ہرگز نہیں تھی کیونکہ رستم ابھی کچھ دیر پہلے اسے آپو زاہدہ اور حمیدن کے کمرے میں سوتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔

قریباً دو منٹ بعد سایہ ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے آیا۔ چند سیکنڈ موجود رہا اور پھر بائیں باغ کی طرف چلا گیا۔ اس بار رستم نے اپنی جگہ سے اٹھنے اور دروازے کی طرف لپکنے میں خاطر خواہ تیزی دکھائی۔ اس نے چپل پہننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ خوش قسمتی سے دروازہ بھی لاک نہیں تھا۔ رستم کو بستر سے اٹھنے اور راہداری تک پہنچنے میں بہ مشکل دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اس نے سائے کو برآمدے کے قریب دیکھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے

چونکایا۔ اس نے سائے کو ٹھٹکتے ہوئے دیکھا لیکن اس نے بھاگنے یا اوجھل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی جگہ موجود رہا۔ وہ رستم کو راہداری میں دیکھ چکا تھا کیونکہ رستم روشنی میں تھا۔ رستم سائے کے پیچھے لپکنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے تو رستم نے بھی زیادہ تیزی نہیں دکھائی اور قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دھیان سے دیکھا، یہ ایک نوجوان لڑکی ہی تھی۔ اس کے جسم پر گھریلو ملازماؤں جیسا لباس تھا۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں نظر آ رہی تھیں۔

”کون ہو تم؟“ رستم نے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔

”آپ سے ایک گل کرنی ہے۔“ وہ دیہاتی لہجے میں بولی۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی۔

”کیا بات ہے اور...... تم ...... یہاں آئی کیسے ہو؟“

”میں بتاتی ہوں۔ آپ بس دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آئیں۔“ اس کی آواز میں عجیب سی معصومیت اور سادگی تھی۔ وہ رستم سے رخ موڑ کر اطمینان سے باغ کی طرف چل دی...... جیسے اسے یقین ہو کہ رستم اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔

رستم کو یہ لڑکی عجیب لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے خطرے کا احساس بھی ہوا۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ خانساماں ظفر احمد کی کوئی رشتے دار ہے جو اس کے پاس رہنے کے لیے آئی ہے مگر خانساماں ظفر نے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں ملازموں کو نہایت سختی سے منع بھی کیا گیا تھا کہ اس کوٹھی میں باہر کا کوئی شخص نہیں آئے گا۔ پھر یہ کون تھی؟ وہ باغ کی طرف جا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ وہاں اس کا ساتھی یا زیادہ ساتھی چھپے ہوئے ہوں۔ رستم ننگے پاؤں تھا مگر اس کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ لڑکی کے پیچھے چلتا ہوا پائیں باغ میں پہنچ گیا۔ یہاں امرود، آم اور جامن کے بہت سے درخت تھے۔ یہیں پر تھوڑی سی کھلی جگہ میں بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا ہوا تھا۔ کورٹ سے ذرا آگے ساتھ والی کوٹھی کی دیوار تھی۔ یہاں کوٹھیوں کی درمیانی دیواریں اونچی نہیں تھیں۔ یہ مشکل چار پانچ فٹ اونچائی تھی۔

وہ لڑکی ایک تناور درخت کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ چاند کی روشنی شاخوں سے چھن چھن کر لڑکی کے سراپا پر پڑ رہی تھی۔ رستم کے بولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔ ”آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کو جو بتاؤں گی سچ بتاؤں گی۔ کوئی بات بھی غلط نہیں کہوں گی۔ میں یہاں کوٹھیوں میں کام کرتی ہوں۔“ اس نے پہلو والی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”میں اس کوٹھی میں بھی آتی ہوں۔ اور کبھی کبھی یہاں رات بھی گزار

لیتی ہوں۔ ویسے میرا پکا ٹھکانا ایک دوجی کوٹھی میں ہے۔ وہ یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے۔ وہاں ایک اور لڑکی بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔ .....“

”تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئی کیسے ہو؟“

”میں نے کہا نا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں یہ سامنے والی دیوار ٹپ (پھلانگ) کر آئی ہوں۔“ اس نے دونوں کوٹھیوں کی درمیانی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں کیا تم نے ایسا...... کیا چوری شوری کا ارادہ تھا؟“

اس نے جیسے رستم کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ عجیب انداز سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”جب آپ نئے نئے اس کوٹھی میں آئے تھے، میں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اس وقت آپ کے بال لمبے تھے اور داڑھی بھی تھی۔ میں نے آپ کو اسی حلیے میں پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔“

رستم کے ذہن میں انجانے خدشات جاگ گئے۔ ”کہاں دیکھا ہے؟“

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گے میری بات سے؟“

”تم بے کار باتیں مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہاں دیکھا تھا؟“

وہ چند سیکنڈ تک جھجکتی رہی پھر بولی۔ ”میں نے آپ کو ملتان میں دیکھا تھا۔ پیر قدرت اللہ کے آستانے پر۔ میں اپنے مالکوں کے ساتھ وہاں گئی ہوئی تھی۔ ان کا پتر سخت بیمار تھا......“

وہاں کی مار دھاڑ کا سارا نقشہ رستم کے ذہن میں گھوم گیا۔ اس نے کڑی نظروں سے اس ملازمہ لڑکی کو دیکھا اور پوچھا۔ ”وہاں...... کیا دیکھا تھا تم نے؟“

”وہ سب کچھ جو وہاں ہوا۔ آپ نے وہاں گولیاں چلائیں۔ قدرت اللہ کے کئی بندوں کو گولیاں لگیں۔ قدرت اللہ کی گھر والی گر کر زخمی ہوئی اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر بے ہوشی میں ہی وہ مر بھی گئی۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کون ہیں اور آپ کے ساتھی کون ہیں۔ اس وقت مجھے آپ کی مارا ماری بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ جب آپ آستانے سے چلے گئے تو لوگوں کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ آپ کا نام رستم سیال ہے اور آپ بڑے نامی گرامی ہیں۔ بڑے بڑے بدمعاش ہی نہیں، بڑے بڑے پلس افسر بھی آپ کے نام سے کانپتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں بعد مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ آپ نے ملتان کے آستانے پر جو مارا ماری کی تھی وہ غلط نہیں تھی......“

رستم سناٹے میں تھا۔ وہ اپنے طور پر یہاں چھپ چھپا کر محفوظ بیٹھا ہوا تھا لیکن ساتھ والی کوٹھی سے دیوار پھلانگ کر آنے والی یہ لڑکی نہ صرف اسے پہچان چکی تھی بلکہ اس کے

بارے میں بہت کچھ جانتی بھی تھی۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال تھی۔ اگر یہ لڑکی کسی اور کو بھی اپنی معلومات سے آگاہ کر چکی تھی تو پھر رستم اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔۔

رستم نے لڑکی کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''جو کچھ تم بتا رہی ہو اس کے بارے میں اور کس کس کو معلوم ہے؟''

''کسی کو نہیں۔'' لڑکی نے بے حد سادگی سے کہا۔ ''اور نہ میں نے کسی کو بتانا ہے۔ اگر میں نے بتانا ہوتا تو آج سے ایک مہینہ پہلے بتا چکی ہوتی اور میں کسی کو بتاؤں گی بھی کیوں..... آپ تو میرے لیے امید بن کر آئے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رستم نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت ابھر آئی۔ درختوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی تیز چاندنی میں اس کا چہرہ انوکھا لگ رہا تھا۔ رستم کو اس کی شفاف آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ بولی تو اس کی معصوم آواز میں گھمبیر کرب تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے جی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میرے مالک اور مالکن نے مجھے کس طرح برباد کیا ہے۔ میرے دکھ کو سننے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔''

''کیا تم نے اپنی بپتا سنانے کے لیے دیوار پھاندی ہے اور گھر میں گھسی ہو؟''

''نہیں..... اس وقت تو میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ آپ مجھے تھوڑا سا ٹیم دیں..... بس آدھا پونا گھنٹا۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں اور دکھانا بھی چاہتی ہوں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے کہ لوگوں کی نقلی شکلوں کے پیچھے کیسی کیسی اصلی شکلیں چھپی ہوئی ہیں۔ میں آپ کو سب کچھ ثبوت کے ساتھ دکھاؤں گی اور پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے کہوں گی کہ اگر آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔''

''تمہارا نام کیا ہے..... اور رہتی کہاں ہو؟'' رستم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام ثریا ہے جی..... اسی لائن میں آپ کے ساتھ کی چھ کوٹھیاں چھوڑ کر 99 نمبر کوٹھی ہے۔ مالک تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دو کمرے ہمارے لیے کھولے ہوئے ہیں۔ ایک میں چوکیدار عبدالرحمٰن ہوتا ہے۔ دوسرے میں، میں اور میرے ساتھ والی لڑکی ہوتی ہے۔ چوکیدار بھی بس نام کا چوکیدار ہے۔ آٹھ نو بجے کے بعد آکر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھٹکائیں گے تو میں فٹافٹ کھول دوں گی.....''

لڑکی کی باتیں رستم سن تو رہا تھا مگر اس کا ذہن کسی اور رخ پر سوچ رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں

کر پا رہا تھا کہ اس لڑکی کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں۔ لڑکی تو بے ضرر لگتی تھی لیکن جو کچھ وہ جانتی تھی، وہ بے حد خطرناک تھا۔ رستم کے لیے اس پر قابو پانا اور اس کوٹھی کے اندر ہی اس کو غائب کر دینا چنداں مشکل نہیں تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ لڑکی کی معلومات کیا صرف لڑکی تک ہی محدود ہیں؟

ابھی وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ برآمدے کی طرف آہٹ سنائی دے۔ کسی کے چلنے کی آواز آئی پھر ایک دم برآمدے کی لائٹ روشن ہو گئی۔ رستم کو اجمل خان کا چوڑا چکلا سراپا نظر آیا۔ وہ کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً رستم کو احساس ہوا کہ لڑکی اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ رستم نے گھوم کر دیکھا، وہ واقعی غائب تھی۔ وہ درمیانی دیوار پار کر چکی تھی۔ رستم نے بس اس کی ہلکی سی پرچھائیں دیکھی جو ساتھ والی کوٹھی کے درختوں میں اوجھل ہو رہی تھی۔ کسی قریبی کوٹھی کے کتوں نے تھوڑی دیر شور مچایا پھر خاموش ہو گئے۔

اجمل خان برآمدے میں کھڑا بغور بائیں باغ کے درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس نے وہاں کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس نے پکار کر پوچھا۔

''میں ہوں۔'' رستم نے جواب دیا۔ اجمل تیزی سے چل کر اس کے قریب آ گیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' رستم نے تحکم سے پوچھا۔

''وہ..... دراصل..... چاندنی بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ ام ابھی جاگ رہا تھا اس لیے سوچا کہ چلو ذرا باہر کا نظارہ مظارہ کر لے۔''

ایک قریبی کمرے کی تاریک کھڑکی میں سے ناصر کی آواز آئی۔ ''رستم بھائی! یہ غلط کہہ رہا ہے۔ چاندنی سے اس کا کیا تعلق واسطہ۔ دراصل اس نے کل کا بچا ہوا افغانی پلاؤ آج پھر ٹھوس ٹھوس کر کھایا ہے۔ اب یہ ایک گھنٹا چہل قدمی کرے گا۔ پندرہ بیس ڈکاریں لے گا پھر کہیں بستر پر جانے کے قابل ہو گا۔''

ناصر اور اجمل میں نوک جھونک شروع ہو گئی۔ اس نوک جھونک میں وہ دونوں یہ سوال ہی بھول گئے کہ رستم اس وقت باغ میں کیا کر رہا تھا۔ رستم کے ننگے پاؤں پر بھی اجمل کی نظر نہیں پڑی تھی۔ رستم اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس محفوظ پناہ گاہ میں بھی اس طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ اسے لگا کہ جیسے وہ اپنے ساتھیوں سمیت اچانک بیچ چوراہے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ اور کسی بھی وقت پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی اسے اپنے حصار میں لے سکتی ہیں۔ یہ لڑکی

اچانک ایک پریشان کن معما بن کر اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں بات کر کے اپنے ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے روز رات دس بجے تک کا وقت رستم نے جیسے تیسے گزارا۔ یہ ایک ابر آلود رات تھی۔ گاہے بہ گاہے بجلی چمکتی تھی، ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ رستم جلد از جلد اس ثریا نامی ملازمہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے پستول اپنی قمیص کے نیچے لگایا۔ اس کے فالتو راؤنڈ پتلون کی جیبوں میں ڈالے اور تیار ہو گیا۔ بیرونی گیٹ کی چابی عموماً اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ اسے قریباً آدھ گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ جب سب سو گئے تو وہ ناصر کو بتا کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ ناصر کو اس نے صورتِ حال کے بارے میں مختصر بتا دیا تھا۔ کوٹھی سے نکل کر 99 نمبر کوٹھی تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کوٹھی کی بیرونی حالت اور اس کے پیڑ پودے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اصل مالک کئی ماہ سے یہاں موجود نہیں ہیں۔

کوٹھی کے فقط ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی یا پھر اس کے عقبی احاطے میں ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ بوندا باندی کچھ تیز ہو گئی تھی۔ رستم گیٹ کے سامنے پہنچا۔ حسب ہدایت اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ ہولے سے کھٹکھٹایا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی پہلی ہی دستک پر نسوانی قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔

سامنے قبول صورت ملازمہ ثریا کھڑی تھی۔ "مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔"

رستم کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر بھی گراسی لان اور پودوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کوٹھی کا رنگ و روغن بھی خراب ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر شخص سویا پڑا تھا۔ اس کا حقہ بھی اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ نوجوان ملازمہ رستم کو روشن کمرے میں لے آئی۔ یہاں ایک اور ملازمہ صورت لڑکی بھی موجود تھی۔ اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر رستم کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" رستم نے کہا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کمرہ شاید بچوں کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا لیکن اب یہاں دونوں ملازماؤں کی ضرورت کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ جستی ٹرنک، کپڑے، دو چارپائیاں گیس کا چولہا اور معمولی برتن۔ ثریا نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے ایک کرسی صاف کی اور رستم کو بٹھایا۔

رستم نے اپنے بالوں سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "کل تم اچانک غائب ہو گئیں۔"

"سوری جی۔" اس نے دیہاتی لہجے میں کہا۔ "دراصل...... کوئی آ گیا تھا۔ اس لیے

میں جلدی نال وہاں سے نکل آئی۔"

"یہ لڑکی کون ہے؟" رستم نے دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرے پنڈ کی ہے جی...... بلکہ برادری کی ہے۔ اس کا نام نوری ہے۔ یہ بھی گھروں میں کام کرتی ہے۔ ہم دونوں کی کوئی بات ایک دوجے سے لکی ہوئی نہیں ہے۔"

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تم نے جو کچھ بھی کہنا ہے، جلدی کہو۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

ثریا نے ایک لمبی سانس لی اور سر جھکا کر رستم کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کو بتدریج دکھ کے سایوں نے ڈھانپ لیا۔ رستم پہلے بار اس کے جوان چہرے کو وضاحت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے نقوش کے گرد جیسے دکھ کا ایک نادیدہ ہالہ سا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی اور بوندا باندی جاری تھی۔ اس نے ٹرنک میں سے ایک تصویر نکالی اور رستم کے سامنے کر دی۔ یہ ایک بیس بائیس سالہ دیہاتی نوجوان کی رنگین تصویر تھی۔ وہ قبول صورت لگا۔ اس نے کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں مفلر دکھائی دیتا تھا۔

"کون ہے یہ؟" رستم نے پوچھا۔

"میرا گھر والا جی۔ ہم ایک ہی پنڈ کے ہیں۔ یہ میرے ماے کا پتر بھی ہے۔ ہم اکٹھے ہی اس گھر میں ملازم ہوئے تھے جی...... اس کا نام رشید ہے۔ پیار سے چھیدی کہتے تھے۔ یہ مجھ سے...... بڑا...... پیار کرتا تھا جی۔ مجھے ایک پل کے لیے اکھیوں سے دور نہیں ہونے دیتا تھا۔"

"اب کہاں ہے یہ؟"

"قتل ہو گیا ہے۔" ثریا نے کرب ناک لہجے میں انکشاف کیا۔ "اور...... ایسے قتل ہوا ہے...... جیسے شاید ہی کوئی قتل ہوا ہو۔ اگر میں ثبوت کے بغیر بات کرتی تو شاید آپ مجھ پر یقین ہی نہ کرتے...... اور آپ ہی نہیں کوئی بھی یقین نہ کر سکتا۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے؟"

"بس ہے جی ایک بات ایسی۔" ثریا کی ساتھی لڑکی نوری نے مغموم لہجے میں کہا۔ وہ پہلے بار اس گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔

"قتل کس نے کیا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

ثریا گلوگیر آواز میں بولی۔ "میرے مالکوں نے ایک بندے کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ آپ اس بندے کا نام سن کر بھی حیران رہ جائیں گے۔ وہ انسان کے روپ میں درندہ ہے۔"

رستم کا دھیان فوراً پیر قدرت اللہ کی طرف چلا گیا۔ ثریا نے کل اپنی باتوں میں قدرت اللہ کا ذکر کیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی طور اس شخص کی ڈسی ہوئی ہے۔

''ہر قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''اس قتل کے پیچھے میرے مالکوں کا جوان بیٹا تھا۔ وہ دن رات شراب پیتا تھا اور ہر بری عادت اس کے اندر تھی۔''

''اس نے چھیدی کو کیوں مارا؟''

''اس نے نہیں مارا جی۔ اس کی وجہ سے اسے مالکوں نے مروادیا۔''

''تم شروع سے بتاؤ گی تو میری سمجھ میں کچھ آئے گا۔''

ثریا نے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''اس کوٹھی کے مالکوں کے دو ہی پُتر تھے...... پیسے کی ریل پیل کی وجہ سے دونوں ہی وگڑے تگڑے تھے۔ وڈے کا نام سہیل اور چھوٹے کا وقار ہے، اسے وکی کہتے ہیں۔ وڈا پُتر سہیل کچھ زیادہ ہی چوڑ تھا۔ وہ نشہ کرتا تھا اور ہوٹلوں میں راتیں گزارتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہوگیا۔ وڈے مالک تاج صاحب نے ہر جگہ اس کا علاج کرایا، پر وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ پتا چلا کہ اس کے جگر میں کینسر ہے۔ تاج صاحب کی بیوی باجی دلشاد تعویذ گنڈے پر بڑا یقین رکھتی ہے۔ جب سہیل کی حالت خراب ہوتی گئی اور اس کی جان کو خطرہ ہوگیا تو یہ لوگ اسے لے کر ملتان میں پیر قدرت کے آستانے پر گئے۔ وہاں سہیل کا جھاڑ پھونک والا علاج شروع ہوا۔ وڈا مالک موٹی اسامی ہے۔ لاہور میں دو جگہ اس کے ہوٹل ہیں۔ لاکھوں کی آمدن ہے۔ پیر قدرت نے مالکوں کی ایسی مت ماری کہ وہ پُتر کے علاج کے لیے دن رات اس پر نوٹ لٹانے لگے......اور پھر وہ کام ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اپنے مطلب نے مالکوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی کہ وہ انسان سے جانور بن گئے۔ اپنی اولاد کی جان بچانے کے لیے انہوں نے کسی اور کی اولاد ماردی...... کسی اور کے سر سے سہاگ کی چادر کھینچ لی ......'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

''انہوں نے چھیدی کو مارا؟''

ثریا نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''انہوں نے اس وچارے کو اس طرح قتل کیا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بے رحم سے بے رحم بندہ بھی اس طرح کی حرکت نہیں کرسکتا۔''

''کیا کیا انہوں نے؟''

''آئیں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی سہیلی نوری بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوری کا چہرہ روشنی میں آیا تو رستم اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ اسے نوری کے چہرے پر کوئی جانی پہچانی شے نظر آئی۔ اسے لگا کہ اس نے اس چہرے کو یا چہرے کے کسی ایک نقش کو پہلے بھی بڑی توجہ سے دیکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بات پر مزید غور کرتا، ثریا نے بہت آہستہ سے ایک بغلی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ رستم اور نوری بھی اس کے پیچھے گئے۔ یہ بھی ایک بیڈ روم تھا۔ غالباً یہ کسی نوجوان کا بیڈ روم تھا۔ کمرے میں میوزک کا سامان، بڑے سائز کا ٹی وی اور غیر ملکی ایکٹروں کی پورٹریٹ وغیرہ تھیں۔ ثریا نے کمرے کی ایک لائٹ آن کردی۔ اس کمرے کے اندر بھی گردوغبار کی ہلکی تہہ موجود تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کئی مہینوں سے کھولا نہیں گیا۔ ثریا نے ایک آبنوسی میز گھسیٹ کر کمرے کے ایک کونے میں کی۔ اس کام میں نوری نے بھی اس کی مدد کی۔ اس کے بعد ثریا نے ایک کرسی میز کے اوپر رکھی اور کرسی پر چڑھ گئی۔ اس کا ہاتھ کمرے کی آرائشی چھت تک پہنچ گیا۔ یہاں ہشت پہلو خانے بنے ہوئے تھے۔ ثریا نے ایک خانے پر دباؤ ڈالا تو وہ اوپر کی طرف چلا گیا۔ ثریا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے چابی موجود تھی۔ وہ ہشت پہلو خلا کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ دیر تک مصروف رہی۔ اس نے ایک لاک کھولا تو اس میں چھوٹا سا خانہ نمودار ہوا۔

اس خانے میں سی ڈیز تھیں، ویڈیو کیسٹس اور شراب کی خالی اور ادھ خالی بوتلیں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی اشیاء موجود تھیں۔ ثریا کچھ دیر تک ٹٹولتی رہی پھر اس نے ویڈیو کیسٹس میں سے ایک کیسٹ برآمد کی اور خانہ بند کردیا۔ چھت کا ہشت پہلو ٹکڑا برابر کیا اور احتیاط سے نیچے اُتر آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ویڈیو کیسٹ وی سی آر میں پہنچ چکی تھی۔ نوری نے ٹی وی آن کردیا اور اس کی آواز کافی حد تک کم کردی۔

ثریا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس فلم میں قتل کا سارا ثبوت ہے۔ یہ زیادہ لمبی فلم نہیں ہے۔ دس منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ آپ دیکھیں، میں دوسرے کمرے میں جارہی ہوں۔''

رستم سمجھ گیا کہ وہ خود یہ فلم دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ دروازہ آہستہ سے بند کرکے باہر چلی گئی۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ رستم کو یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا...... عجیب اور پُراسرار۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہورہی تھی۔ اس ویران کوٹھی میں بادلوں کی آواز، گونج پیدا کرتی تھی۔ بظاہر رستم کے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا اس کے باوجود وہ اپنے اطراف

سے پوری طرح چوکس تھا۔ رستم نے ویڈیو کو پلے کیا۔ ٹی وی اسکرین پر ایک خالی کمرے کی تصویر ابھری۔ یہ کمرہ اسی کوٹھی کا کوئی بیڈ روم تھا۔ کمرہ خالی لگتا تھا مگر کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ کوئی موجود ہے لیکن وہ کیمرے کے فریم میں نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک لڑکا لڑکی کیمرے کے سامنے آگئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کیمرے کی موجودگی سے یکسر بے خبر ہیں۔

رستم ذرا سا چونکا۔ کم روشنی کی وجہ سے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی مگر رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ثریا ہی ہے۔ اس کا ساتھی یقیناً اس کا خاوند چھیدی ہی تھا۔ وہ گھریلو ملازموں کے لباس میں تھا۔ اس نے ثریا کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اس کے سر کو چوم رہا تھا۔ ثریا کی مدھم آواز کمرے میں گونجی۔ ''چھیدی! مجھے شرم آ رہی ہے۔''

جواب میں چھیدی نے اس کا گال چومتے ہوئے کچھ کہا جو فلم میں ٹھیک سے ریکارڈ نہیں ہوا۔

ثریا نے پریشان نظروں سے کمرے کو دیکھا جیسے وہ خود کو یہاں اجنبی اور بے آرام محسوس کر رہی ہو۔ ''اچھا، وہ پردہ تو کھڑکی کے آگے کر دو۔'' ثریا نے خود کو چھیدی کی جذباتی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

چھیدی نے آگے جا کر پردہ اچھی طرح برابر کیا اور پھر سے ثریا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اسے اپنی بانہوں میں لیا۔ ثریا نے ہنستے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بستر پر آ گئے اور لیٹ گئے۔ ثریا بدستور اپنے شوہر کی بانہوں میں تھی۔ شوہر چھیدی کے جذبات میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ مرد و زن کا تعلق مرحلہ وار جن صورتوں سے گزرتا ہے، وہ سامنے آ رہی تھیں۔ ثریا کے بدن پر اب نسبتاً مختصر لباس رہ گیا تھا۔ پھر اس نے بڑا سا نیلا کمبل کھینچ کر اپنے اوپر لے لیا۔ چھیدی اور وہ دونوں اس کمبل میں چھپ گئے تھے۔

کیمرہ چلتا رہا۔ متحرک کمبل کی فلم بنتی رہی۔ رستم کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک انجانا خدشہ بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔ اسے پیر قدرت کے سفلی عملیات کے بارے میں بڑی اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ بہتے ہوئے تازہ خون میں سنگین بیماریوں کا علاج ڈھونڈتا تھا۔ رستم چشم دید گواہ تھا۔ اسے علم تھا کہ پیر قدرت کے عملیات کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ جانوروں کو جنسی عمل کے دوران میں ہلاک کرتا ہے۔ پرندوں اور چوپایوں وغیرہ کے ساتھ وہ یہ قبیح حرکت شاید سینکڑوں مرتبہ کر چکا تھا۔ وہ عین میٹنگ کی حالت میں نر کو تیز دھار آلے سے ہلاک کرتا تھا اور پھر اس کا ابلتا ہوا خون ایک

خاص برتن میں جمع کر لیتا تھا...... طوطے، چڑیاں، کبوتر، اُلو اور چوپائے، بلیاں، کُتے اور بکریاں وغیرہ سب اس کی ستم ظریفی کا شکار تھے۔ جن دنوں رستم مری کی نواحی روکیٹ بستی میں تھا، اسے معلوم ہوا تھا کہ قدرت اللہ کے خلاف کچھ سمجھ دار لوگوں کی طرف سے کیس کیا گیا ہے۔ اس کیس میں کہا گیا تھا کہ پیر قدرت اللہ جو کچھ کرتا ہے یہ حیوانات پر بے رحمی کے زُمرے میں آتا ہے اور قانون میں اس کے لیے قرار واقعی سزا موجود ہے لیکن آج جو کچھ رستم دیکھ رہا تھا یہ تو بالکل ناقابلِ گمان تھا۔ کیا کوئی عامل اپنی سفا کی اور جاہلیت میں اس حد تک بھی آگے پہنچ سکتا تھا؟ رستم سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا پھر وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دفعتاً متحرک کمبل کے پہلو میں ایک سفید رنگ کا چھوٹا بغلی دروازہ کھلا۔ غالباً ثریا اور چھیدی نے اس دروازے کو مقفل سمجھ رکھا تھا مگر یہ مقفل نہیں تھا۔

رستم نے پینٹ شرٹ اور ٹائی میں ملبوس قدرت اللہ کو صاف پہچانا...... اس نے اپنی دونوں آستینیں اُڑسی ہوئی تھیں۔ اس کے پہلو میں اس کی منجھلی بیوی عریسہ فراتی تھی۔ حسبِ معمول اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔ اس کے ہاتھ میں نقش و نگار والا ایک بڑا پیالہ تھا۔ پیر قدرت اللہ کے ہاتھ میں رستم کو ایک تیز برچھی نما ہتھیار دکھائی دیا۔ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وہ دونوں نہ صرف اندر داخل ہوئے بلکہ جوڑے کے سر پر بھی پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ جوڑا دروازے کی آواز سن کر کسی نتیجے پر پہنچتا یا کمبل اپنے چہرے سے ہٹا سکتا، قدرت اللہ نے برچھی نما آلہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سر سے بلند کیا اور پوری طاقت سے چھیدی کی کمر میں اُتار دیا۔ کھچ کی خوفناک آواز ابھری۔

یہ وزنی تیز دھار آلہ چھیدی کا بایاں پہلو پھاڑتا ہوا اس کے پیٹ کی طرف سے نکل آیا چھیدی اور ثریا کرب ناک انداز میں چلائے۔ چھیدی کے چلانے کی آواز ذبح ہوتے ہوئے بکرے سے مشابہ تھی۔ یہ سارا منظر ہی نہایت دردناک اور قابلِ ترحم تھا۔ رستم جیسے شخص کی آنکھیں بھی جیسے پتھرا گئیں۔ ایک بند کمرے کے اندر محبت میں مشغول میاں بیوی پر اچانک ایک ایسی قیامت ٹوٹی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمبل ان کے اوپر سے اُتر چکا تھا۔ ان کی آنکھیں دہشت اور تکلیف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ رستم نے دیکھا کہ نہایت تیز دھار آلے کی انی چھیدی کا پیٹ پھاڑ کر نکلی تھی اور ثریا کے پہلو کو بھی زخمی کر گئی تھی۔ وہ اذیت سے چیختی ہوئی دہری ہوئی اور بیڈ سے گر گئی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ'' اس نے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے دہائی دی۔

لیکن وہاں بچانے والا کوئی نہیں تھا...... سب مارنے والے تھے۔ ثریا کے جسم پر لباس نہ

ہونے کے برابر تھا۔ چھیدی کا زیریں جسم بھی بالکل عریاں تھا۔ برچھی اس کے جسم میں ترازو تھی ...... اور وہ جو چند سیکنڈ پہلے زندگی کے پُرمسرت لمحوں سے بغل گیر تھا، اب ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر سب سے تکلیف دہ اس کی سیاہ آنکھیں تھیں، جو کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ چھیدی کے جسم میں برچھی اترتے ہی تین ہٹے کٹے مرید قتل گاہ میں داخل ہو گئے تھے۔

''پکڑو اسے۔'' قدرت اللہ نے مریدوں کو حکم دیا۔

مریدوں نے بڑی مہارت سے تڑپتے پھڑکتے بدنصیب چھیدی کو بازوؤں اور ٹانگوں سے جکڑ لیا۔ قدرت اللہ نے چھیدی کی کمر پر پاؤں رکھ کر ایک جھٹکے سے برچھی کھینچی۔ وہ اپنی تیسری کوشش میں کامیاب ہو سکا۔ برچھی نکلتے ہی چھیدی کے جوان جسم سے خون کا فوارہ نکلا۔ ہٹے کٹے مریدوں نے اسے پہلو کے بل کر دیا۔ عریسہ فراقی نے برتن، اس کے زخم کے عین نیچے رکھ دیا۔ بھل بھل نکلتا تازہ خون برتن میں جمع ہونے لگا۔ نیلا کمبل بھی خون میں تر نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ پورے کمرے میں خون کے چھینٹے تھے۔

زخمی ثریا نے اپنا زخمی پہلو دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ''بچاؤ بچاؤ'' کی کرب ناک فریاد بلند کی اور چھوٹے سفید دروازے کی طرف بڑھی۔

قدرت اللہ نے لپک کر اسے اس کے کھلے بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچ کر دوبارہ بستر پر پٹخ دیا۔ ''خبردار...... جان سے مار دوں گا۔'' اس نے ہیجانی لہجے میں دھمکی دی۔

مگر اس کی دھمکی بیکار رہی گئی۔ بستر پر گرتے گرتے ثریا دہشت اور تکلیف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ قدرت اللہ نے اسے دھیان سے دیکھا...... پھر صرف اتنا ترس کھایا کہ خون آلود برچھی کی مدد سے نیلے کمبل کا ایک حصہ ثریا کے بے ترتیب عریاں جسم پر ڈال دیا۔

چھیدی کا زخم نہایت کاری تھا۔ ایک نظر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ جان کنی کے عالم میں ہے۔ اس کی خرخراہٹ کمرے میں گونج رہی تھی۔ دو مریدوں نے اسے ابھی تک اپنے وزن کے نیچے دبا رکھا تھا۔ کم روشنی کی وجہ سے رستم کو اس کا چہرہ تو وضاحت سے نظر نہیں آیا مگر اس کے ڈھیلے پڑتے ہاتھ پاؤں سے اندازہ ہوا کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔

''چلو چھوڑ دو۔'' کچھ دیر بعد قدرت اللہ کی ماہرانہ رائے سنائی دی۔

ہٹے کٹے مرید چھیدی کے مُردہ جسم کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے اور اس کے جسم پر ایک خون آلود چادر ڈال دی۔ خون جمع کرنے والا برتن نہ صرف بھر چکا تھا بلکہ لبریز ہو گیا تھا۔ باقی خون فرش پر بکھرا ہوا تھا...... دو مرید نیم بے ہوش ثریا کو مقتل سے باہر لے گئے۔ ایک مرید نے

قدرت اللہ کے ساتھ مل کر لہو سے بھرا ہوا برتن اٹھا لیا اور کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔

کیمرہ حسرت ناک منظر پر تھوڑی دیر چلتا رہا پھر اچانک ٹی وی کی اسکرین تاریک ہو گئی۔ رستم اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش ہو رہی تھی۔ یہ اندوہناک فلم دیکھنے کے بعد رستم کے ذہن میں فوری طور پر دو سوال ابھرے تھے...... پہلا تو یہ کہ یہ فلم بنائی کس نے تھی؟ جن لوگوں نے یہ سنگین جرم کیا تھا ان سے تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ انہوں نے اپنے خلاف ایک ٹھوس ثبوت تیار کیا ہو گا...... پھر یہ کیا تھا؟ رستم کے ذہن میں کئی خیالات آئے۔ غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی تھی کہ کیمرے نے کہیں بھی اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی اور نہ ہی ہلا ہے۔ اسے غالباً کسی جگہ فکس کر دیا گیا تھا اور یہ کوئی پوشیدہ جگہ تھی۔

دوسرا سوال ذہن میں یہ ابھرتا تھا کہ ثریا نے اپنے اندر اتنی ہمت کیسے پیدا کر لی کہ اپنی ہی ایک عریاں فلم اسے دکھا دی۔ بے شک وہ فلم چلنے کے دوران میں موقع پر نہیں رہی تھی پھر بھی اسے معلوم تو تھا کہ فلم میں کیا ہے۔ اس سوال کا ایک ہی جواب ذہن میں آتا تھا۔ ثریا دکھ اور مظلومیت کی اس نہج پر پہنچی ہوئی تھی جہاں انسان اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ زندگی موت، صحت، بیماری، عزت، بے عزتی...... یہ سارے فرق اس کے لیے معمولی ہو جاتے ہیں۔

رستم نے اٹھ کر بغلی دروازے کو تھوڑا سا ہلایا۔ فوراً ہی آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ سامنے نوری کھڑی تھی۔ ثریا اس کے عقب میں تھی۔ اچانک بجلی چمکی، بادل بہت زور سے گرجے اور لائٹ چلی گئی۔ ثریا نے ایک قریبی دراز میں سے موم بتی نکالی اور اسے روشن کر دیا۔ اب وہ تینوں پہلے والے کمرے میں تھے۔ موم بتی کی روشنی میں ماحول پُراسرار لگ رہا تھا۔ شاید ایک طرح سے یہ ثریا کے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ نیم تاریکی میں بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ رستم کو بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یقیناً وہ خود بھی رستم کے سامنے نہیں آنا چاہ رہی تھی۔

رستم نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو کچھ دیکھا ہے یہ دل ہلا دینے والا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔'' وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر اس کے گندمی ہاتھوں پر گرے۔ نوری بھی یکسر خاموش تھی۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''فلم میں قدرت اللہ اور اس کی بیوی صاف پہچانے جا رہے ہیں۔ یہ ایک بے حد ٹھوس ثبوت ہے۔ اس بات پر حیران ہوں کہ یہ فلم بنائی کس نے ہے؟''

ثریا چند لمحے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مالک کے چھوٹے

بیٹے وقار عرف وکی نے۔ اس کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ یہاں کوٹھی میں یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے قتل سے تھوڑی دیر پہلے ہی یہ چھوٹا کیمرہ اس کمرے میں چھپا دیا تھا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ کسی کی سنتا نہیں۔ باپ سے بھی اس کا ان باتوں پر جھگڑا رہتا ہے۔ اس نے بس شرارت میں یہ فلم بنائی۔''

''یہ فلم تم تک کیسے پہنچی؟''

''بس جی! مجھے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ مالک کے چھوٹے بیٹے کے پاس قتل کی فلم ہے۔''

''بتاؤ گی نہیں کہ کیسے پتا چلا؟''

''یہ بات رہنے دیں جی۔'' وہ نیم تاریکی میں سے بولی۔

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اس فلم کے بعد کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا جی...... بس میرے گھر والے کی جان چلی گئی۔ میں بھی زخمی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر ہی ڈاکٹر بلا کر میرا علاج کراتے رہے۔ یہ دیکھیں یہاں ابھی تک اس برچھی کا پھٹ ہے۔'' اس نے ایک طرف سے اپنا کرتہ تھوڑا سا اٹھایا اور زخم کا گہرا نشان دکھایا۔

''تمہارے گھر والے کے بارے میں مالکوں نے دوسرے لوگوں کو کیا بتایا؟''

''انہوں نے کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دی جی۔ وہ کام کے لیے کویت جانے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے پاسپورٹ بھی بنوا رکھا تھا۔ مالکوں نے مشہور کر دیا کہ اسے کویت بھیج دیا گیا ہے۔ میرے گھر والے کا کوئی آگے پیچھے تو تھا نہیں۔ ایک بڈھا چاچا ہے، وہ بھی نابینا ہے۔ میں ہی میں تھی۔ مجھے مالکوں نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ میں کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے...... میرے پیٹ میں چھیدی کی نشانی تھی۔ وہ مجھے دھمکی دیتے تھے کہ اگر میں نے اس بارے میں اپنی زبان کھولی تو وہ میرے بچے کو اور مجھے مار دیں گے...... میری بڈھی ماں اور تیرہ چودہ سال کے بھرا کا بھی خون کر دیں گے۔ وہ بڑے زور والے تھے جی۔ وہ سب کچھ کرا سکتے تھے۔'' وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی۔

''تمہارے بچے کا کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

وہ بس روتی رہی۔ اس کی جگہ نوری نے جواب دیا۔ ''وہ بعد میں ضائع ہو گیا تھا۔''

''مالک کے بیمار بیٹے سہیل کا کیا بنا؟''

''میرے گھر والے کی جان لے کر بھی وہ بچ نہیں سکا۔ مر گیا وہ انگلینڈ جا کر۔''

''مالک اس کے علاج کے لیے ہی انگلینڈ گیا تھا؟''

ثریا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ساری فیملی کوئی چار مہینے پہلے یہاں سے گئی تھی۔ مالک کا پتر تو انگلینڈ میں ایک مہینے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اب باقی کے لوگ انگلینڈ میں ہی ہیں۔ مالک کا چھوٹا پتر وکی بھی وہیں ہے۔ سنا ہے کہ ان لوگوں نے اب واپس نہیں آنا ہے۔ انہوں نے یہ کوٹھی بیچنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ یہاں کا کاروبار بھی ختم کر رہے ہیں مگر...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' رستم نے پوچھا۔

''جس شخص نے اپنے ہتھ سے میرے گھر والے کی جان لی وہ تو یہیں ہے۔ وہ پیر نہیں شیطان ہے۔ دنیا کے لالچ نے اسے اندھا کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ پتا نہیں کیا کچھ کر چکا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ اس نے وڈے مالک تاج سے بھی لاکھوں روپے لیے ہیں۔ اسے پتا تھا کہ مالک کے پتر کی حالت بہت خراب ہے اور وہ دنیا جہان کا علاج کرا کرا کے عاجز آیا ہوا ہے۔ اس نے مالکن اور مالک کو اپنے کالے علم اور تعویذ گنڈوں کے چکر میں ڈال دیا اور ایسا ڈالا کہ وہ باقی سب کچھ بھول گئے۔ اس کو اپنے شیطانی عمل کے لیے تازہ خون کی ضرورت تھی۔ پہلے ایک دو بار اس نے جانوروں کے خون سے عمل کیے۔ جب کچھ فائدہ نہیں ہوا تو اس نے مالک اور مالکن کو اس خطرناک چکر میں ڈال دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ ان کے بیٹے کی جان بہت مشکل میں ہے۔ اس پر بہت بڑی اور ظالم بلاؤں کا اثر ہے۔ ان بلاؤں کو اس سے دور کرنے کے لیے بہت خاص عمل کی ضرورت پڑے گی لیکن اگر کسی طرح یہ عمل ہو گیا تو پھر بچہ بھی موت کے منہ سے واپس آ جائے گا۔ اور یہ عمل وہی تھا جی جو آپ نے ابھی فلم میں دیکھا ہے۔'' ثریا نے کراہتے ہوئے کہا۔

''مالکوں نے تم کو کیا بتایا تھا کہ تم...... میرا مطلب ہے کہ یہ فلم تمہارے سرونٹ کوارٹر میں تو نہیں بنی، کوٹھی کے بیڈ روم میں بنی ہے۔''

ثریا کا سر کچھ اور جھک گیا۔ نوری نے کہا۔ ''مالکوں نے کچھ نہیں کہا تھا جی۔ ثریا کے خاوند چھیدی سے پیر قدرت اللہ نے ہی گل بات کی تھی۔ ثریا کی طبیعت دو چار دن ذرا خراب رہی تھی۔ پیر قدرت اللہ نے ثریا کو ایک تعویذ پانی میں گھول کر پینے کے لیے دیا۔ اس نے چھیدی کو بتایا کہ لگتا ہے تمہارے بیوی ماں بننے والی ہے۔ پر ہونے والے بچے پر بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے تھوڑے سے عمل کی ضرورت ہے۔ اس عمل کے لیے تم میاں بیوی کو ایک رات اپنے کوارٹر میں گزارنے کے بجائے کوٹھی کے اندر سونا ہو گا۔ رات کے پچھلے پہر تم میاں بیوی تین کنوؤں کے پانی سے نہا کر خود کو پاک کرو گے اور سورج نکلنے تک ایک خاص

قسم کا جاپ کرو گے۔ اس نے چھیدی کو کنوؤں کا پانی بھی لا کر دیا تھا۔ یہ سارا ناٹک تھا جی۔ دراصل مالکوں سے قدرت اللہ کی بات ہو چکی تھی اور انہوں نے قدرت اللہ کے شیطانی عمل کے لیے ثریا کے بندے کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔'' نوری کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ رستم نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ ایک بار پھر اسے لگا کہ نوری کا چہرہ یا چہرے پر کوئی چیز اس کی جانی پہچانی ہے۔

ثریا کی آواز نے رستم کو چونکایا۔ ''میں نے آپ کو ملتان میں قدرت کے آستانے پر دیکھا تھا۔ وہاں آپ نے جو کچھ قدرت کے ساتھ کیا وہ تب تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگا تھا، پر جب میں نے خود اس شیطان کا اصلی روپ دیکھا اور اس کی درندگی دیکھی تو میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ انسان نہیں حیوان ہے...... شیطان ہے...... اس نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہوا ہے۔ اگر آپ کسی طرح اس کو مار سکیں تو یہ میرے جیسے اجڑے ہوئے لوگوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا...... بہت بڑا۔'' وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی۔

رستم خاموش رہا۔ وہ اس نہایت ڈرامائی صورتِ حال پر غور کر رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں تھا۔ ثریا کی آواز رستم کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''سنا ہے کہ وہ خبیث آج کل سیالکوٹ میں ہے۔ وہ دیہاتی علاقے کے دورے کر رہا ہے اور وہاں کے سیدھے سادے لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے میں لگا ہوا ہے......''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بے خیالی میں نوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے نوری کی آنکھیں دیکھیں...... اسے ایسا لگا جیسے یہ نوری کی نہیں نگینہ کی آنکھیں ہیں۔ وہی نگینہ جس کا پُر اسرار خیال اکثر و بیشتر رستم کی سوچ کو تہہ و بالا کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک معما تھی اور آج تک رستم کے لیے معما ہی رہی تھی۔ وہ ایک بھٹکا ہوا خیال تھی، کوئی ناقابلِ فہم وجود تھی...... یا صرف ایک وہم تھی...... رستم کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے چند خاص افراد کے سوا کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کا تذکرہ جگ ہنسائی کا سبب بن سکتا ہے۔ زندگی کے بہت سے ناقابلِ فہم سوالوں کی طرح اس نے اس سوال کو بھی لا ینحل ہی رہنے دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ اس سے پہلے اسے سفید فام گریس کی آنکھوں میں بھی نگینہ کی آنکھوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ گریس کے چہرے پر خانہ بدوش نگینہ کی آنکھیں ہیں۔ وہی نگینہ جس نے ہمیشہ رستم اور شانی کے ارد گرد رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

نوری کی آنکھوں میں دیکھ کر رستم کی رگوں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ

نوری سے کچھ پوچھے۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ پھر اس کے ذہن نے خود ہی اسے ٹوکا۔ یہ تم کس چکر میں پڑ رہے ہو؟ چہروں جیسے چہرے اور آنکھوں جیسی آنکھیں ہوتی ہیں۔ تم یہاں خواہ مخواہ نگینہ کو کیوں گھسیڑ رہے ہو؟

دفعتاً برآمدے کی طرف سے آہٹیں سنائی دیں۔ کوئی کھانسا اور پھر دیسی جوتی گھسیٹتا ہوا صحن کی طرف گیا۔ ثریا نے گھبرا کر کہا۔ ''بابا عبدالرحمٰن جاگ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ پیشاب کرنے باتھ روم میں گیا ہے۔ اب یہ کچھ دیر تک جاگتا رہے گا۔ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ اگر موقع ملا تو میں ایک بار پھر آپ سے ملوں گی۔ اگر نہ بھی مل سکی تو یہ ثبوت آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ مم...... مجھے آپ پر پورا یقین ہے...... آپ...... آپ اس شیطان پیر سے میرا اور میرے بے گناہ چھیدی کا بدلہ لے سکتے ہیں...... ضرور لے سکتے ہیں۔'' اس نے اَشک بار لہجے میں کہا اور ایک شاپر میں لپٹی ہوئی فلم رستم کو تھما دی۔

شاید وہ کچھ اور بھی کہتی مگر عبدالرحمٰن کے کھانسنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی اور لائٹ کسی بھی وقت واپس آسکتی تھی۔ رستم نے فلم لے لی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا...... واپس مڑا...... اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ ثریا سر جھکائے کھڑی تھی۔ رستم نے کہا۔ ''ثریا! میں وعدہ تو نہیں کر سکتا۔ پر میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تیرے گھر والے کا خون رائیگاں نہ جائے......''

وہ سسک پڑی۔ ''خدا حافظ۔'' رستم نے کہا اور احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ بارش کی رم جھم جاری تھی۔

رستم جس طرح خاموشی سے نکلا تھا اسی طرح خاموشی سے گھر واپس پہنچ گیا۔ ناصر اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ باقی سب سوئے پڑے تھے۔ رستم سیدھا ناصر کے بیڈ روم میں پہنچا کیونکہ اس کے اپنے بیڈ روم میں دس سالہ سرمد بھی اس کے ساتھ سو رہا تھا لہٰذا وہ اور ناصر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ رستم اور ناصر نے سگریٹ سلگائے۔ رستم نے آج کی اَبر آلود رات میں پیش آنے والا سارا واقعہ ناصر کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سب کچھ واقعی سنسنی خیز اور ڈرامائی تھا۔ رستم نے ناصر کو اس شرمناک فلم کے بارے میں بھی بتایا جو وہ کوٹھی نمبر 99 سے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ناصر نے فلم دیکھی تو نہیں مگر اس کی تفصیلات نے اس پر وہی اثر کیا جو رستم پر فلم کے دیکھنے سے ہوا تھا۔ ناصر کا لہو بھی کھولنے لگا۔ جب بھی وہ دونوں قدرت اللہ کے بارے میں بات کرتے تھے، ایک عجیب طرح کی بے چینی ان کے اندر پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک

اضطرابی کیفیت جو خون کو جلانے لگتی تھی۔ آخر وہ شخص لوگوں کو مسلسل دھوکا دینے میں کیوں کامیاب تھا؟ وہ اور اس کے اہم چیلے لوگوں کے سامنے بارہا ذلیل ہو چکے تھے۔ اور سب سے بڑی ذلت وہ تھی جب اجمل خان اور اس کے ساتھی فوٹو گرافر نے اپنی جان پر کھیل کر قدرت اللہ کی خارش زدہ بیویوں کی تصویریں اُتار لی تھیں...... بے شک اس واقعے کے بعد قدرت کی مقبولیت میں بہت کمی آئی تھی مگر وہ اب بھی مسلسل اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور سادہ لوح لوگوں کو ورغلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی بیماری کی طرح تھا جو جڑ سے ختم نہیں ہوتی تھی۔ دیکھا جائے تو اس میں سب سے زیادہ قصور لوگوں کی کم علمی اور جاہلیت کا ہی تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لیتے تھے اور اپنے دکھوں کا علاج قدرت جیسے شیطان عاملوں میں ڈھونڈتے تھے۔

رستم کی ہٹ لسٹ پر دو ہی بڑے نام تھے...... ریاض ہٹلر اور قدرت اللہ! ریاض ہٹلر تو موقع پر موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی نامعلوم مشن پر آزاد علاقے میں تھا...... رستم اور ناصر نے سوچا...... تو پھر کیوں نہ پہلے قدرت اللہ سے ہی دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ وہ بی بی کے دو بڑے دشمنوں میں سے ایک تھا اور اپنی بی بی کے دشمنوں کو ختم کیے بغیر تو رستم چین سے مر بھی نہیں سکتا تھا۔ رستم اور ناصر تا دیر جاگتے رہے اور اس موضوع پر فیصلہ کن گفتگو کرتے رہے۔

سویرے رستم کی ملاقات آپو زاہدہ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے رستم کے لیے ناشتا تیار کر کے پرانی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ دیسی گھی میں بنے ہوئے دو بھاری بھرکم پراٹھے تھے۔ انڈے کا آملیٹ تھا جس میں پیاز کتر کر ڈالا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دہی کی میٹھی لسی بھی تھی۔ بھائی اکرام اور بچے ناشتا کر چکے تھے۔ باقی لوگ ابھی سو رہے تھے۔ بہن اپنے لاڈلے اکلوتے بھائی کو اپنے سامنے ناشتا کرانے لگی۔ اس نے پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے رستم کے منہ میں رکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔ رستم نے بے ساختہ بڑی بہن کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بھی ایک لقمہ اپنی آپو زاہدہ کو دیا۔

ناشتے کے دوران میں دونوں خاموش ہی رہے۔ برتن سمیٹنے کے بعد آپو زاہدہ پھر رستم کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ اس میں ڈر، اندیشے، محبت بھی کچھ شامل تھا۔ انہوں نے عجیب انداز میں رستم کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ”رستم! وہاں تہہ خانے میں کون ہے؟“

”تت...... تہہ خانے میں؟ میں سمجھا نہیں؟“

”مجھ سے کیا کیا چھپائے گا رستم؟ مجھے پتا ہے کہ وہاں تُو نے کسی کو بند کر رکھا ہے۔

اجمل خان اس بندے کو کھانا دینے نیچے جاتا ہے۔ جاتا ہے یا نہیں؟“

رستم خاموش رہا۔ وہ اندر سے سٹپٹایا ہوا تھا۔ وہ آپو زاہدہ کو کیسے بتاتا کہ اس تہہ خانے میں ایک خطرناک ترین پولیس افسر کا بھتیجا بند ہے۔ وہ بھتیجا جس کی تلاش پورے پنجاب میں طوفانی انداز میں جاری ہے۔

رستم آپو زاہدہ کے سوال کا کوئی مناسب سا جواب ڈھونڈ رہا تھا جب آپو زاہدہ نے ایک بار پھر بے تاب ہو کر رستم کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ بے حد جذباتی لہجے میں انہوں نے کہا۔

”رستم...... میرا ابھرا...... اب واپس آ جا...... بڑی دیر ہو گئی ہے سوہنے...... اب آ جا۔“

”کک...... کہاں سے آ جاؤں آپو۔“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ حالانکہ آپو کا فقرہ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

آپو زاہدہ نے بھی سنی اَن سنی کی اور اسی لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”یہ دنیا تجھے مجھ سے چھین لے گی رستے! یہ بڑی ظالم دنیا ہے۔ دیکھ میرے سوہنے! میں تیرے سامنے اپنی جھولی پھیلاتی ہوں، اس جھولی میں مجھے میرا چھوٹا ویر ڈال دے۔ چھوڑ دے یہ سارے کم...... میں ایک بار تیرے سر پر سہرا سجا لوں۔ بس ایک بار تیری ووہٹی کا متھا چوم لوں پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی غم نہیں رہے گا۔“ وہ سسکیوں سے رونے لگیں۔ رستم انہیں کیسے بتاتا کہ وہ اس کی ووہٹی کے پاس ہی سے تو آئی ہیں۔

رستم کے سینے میں لہر سی اٹھی۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ اپنی بڑی بہن کو سب کچھ بتا دے۔ انہیں بتا دے کہ وہ دن رات جس چھوٹی چوہدرانی کے قصیدے پڑھتی رہتی ہیں، وہی اس کی ووہٹی ہے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک خوبصورت دلہن کے جتنے بھی سپنے دیکھے ہیں، وہ ان سب پر پوری اترتی ہے...... بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ جب وہ زرق برق کپڑے پہن کر چوڑیاں چھنکاتی ہوئی چار دیواری میں چلتی پھرتی ہے تو جیسے ہر طرف روشنی بکھیرتی چلی جاتی ہے۔

”کس خیال میں کھو گئے؟“ آپو نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”آپو! تمہیں چھوٹی چوہدرانی اچھی لگتی ہے؟“

آپو زاہدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”پپ...... پر تُو کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”اگر میں کہوں کہ...... میں چھوٹی چوہدرانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟“ وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

آپو زاہدہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہیں...... پھر بولیں۔ ”کیا

بات ہے...... چھوٹی چوہدرانی کے ساتھ...... کوئی معاملہ ہے تیرا؟“

”نہیں نہیں آپو...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یونہی پوچھ رہا ہوں۔“

آپو نے ایک گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔ ”میرے سوہنے! شادی بیاہ کے معاملے میں اپنے جیسے لوگوں کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے۔ وہ چوہدری لوگ ہیں۔ بڑا اُچا خاندان ہے۔ ہمارا ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔“

”نہیں آپو! میں تو ویسے ہی تجھ سے پوچھ رہا ہوں، وہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“

”تمہیں کئی بار بتایا تو ہے۔ بہت...... بہت چنگی ہے۔ بالکل نکی سی عمر میں اس کو چھوٹی چوہدرانی بنا دیا گیا ہے۔ اس پر بہت زیادہ ذمے داریاں ڈال دی گئی ہیں۔ اس وچاری کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ یہ اس کی فرمانبرداری ہے کہ اپنے بڑوں کا کہنا نہیں ٹال رہی اور وہ سب کچھ بڑی عقل مندی سے کر رہی ہے، جو وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ سوہنی بھی رج کے ہے۔ ہر کسی کا دل موہ لیتی ہے۔ میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے کہ اس کے لیے جو بھی ہو اچھا ہو۔“

”وہ تم سے کس طرح کی باتیں کیا کرتی تھی حویلی میں؟“ رستم نے پوچھا۔

”بڑی پیاری پیاری باتیں...... بڑی محبت والی۔ کہنے کو وہ چھوٹی چوہدرانی ہے پر اس کے اندر تو وہی الہڑ کڑی ہے ناں جو اپنی سکھیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنا چاہتی ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا، چھوٹی سی عمر میں وچاری کا ویاہ ہوا۔ بڑا سخت بندہ ملا اور تھوڑے ہی دنوں میں مر بھی گیا۔ اب اس کے دل میں تو وہی چاہیں ہیں ناں جو لڑکیوں کے دل میں ہوتی ہیں...... ایک دن پتا کیا ہوا۔ میں نے تیری ووہٹی کے جو گہنے بنا رکھے ہیں، وہ شانی نے دیکھ لیے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے یہ رستم کی ووہٹی کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے پیار سے گہنوں پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بعد میں مُنے نے مجھے بتایا کہ اس کی تائی یعنی شانی نے یہ سارے گہنے پہن کر دیکھے تھے......“

باتیں کرتے کرتے آپو زاہدہ نے ایک بار پھر چونک کر رستم کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ رستم کو کھوجنے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو آپو؟“

”مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”کیسی گڑبڑ؟“

”اچھا، مجھے یہ بتا جب تُو وڈے ڈیرے پر تھا، چوہدرانی شانی دو تین بندوں کو چھڑانے

کے لیے وہاں گئی تھی۔ گئی تھی ناں؟“

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”بس مجھے پتا ہے ناں۔ تُو بتا...... گئی تھی ناں؟“ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کریدنے والے انداز میں بولیں۔ ”ان بندوں کو تجھ سے چھڑوانے کے لیے شانی کو ہی کیوں بھیجا گیا تھا؟“

”تُو کیا کہنا چاہتی ہے آپو؟“

”مجھے سچ سچ بتا...... کہیں تیرا اور چوہدرانی شانی کا کوئی معاملہ تو نہیں ہے رستے...... پتا نہیں کیوں، مجھے شک ہو رہا ہے۔ جس طرح اب تُو شانی کے بارے میں کرید کرید کر باتیں پوچھ رہا ہے...... وہ بھی پوچھتی تھی تیرے بارے میں۔ نہیں رستے! دیکھ میں تیری ماں بجا بہن ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ کیا کوئی بات ہے...... تیرے اور چوہدرانی شانی کے درمیان؟“

رستم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ”نہیں آپو! کوئی بات نہیں۔ بس یہ ہے کہ میں اک بار بہت زخمی ہو کر چوہدرانی کی حویلی میں گھسا تھا۔ چھوٹی چوہدرانی اور اس کی جیٹھانی نے میری مرہم پٹی کی اور مجھے وہاں سے نکلنے میں مدد دی۔ مجھ پر چھوٹی چوہدرانی کا یہ بڑا احسان تھا۔ اس لیے جب وہ بندے چھڑانے کے لیے وڈے ڈیرے پر آئی تو میں انکار نہ کر سکا۔ ان دو بندوں کی وجہ سے وہ میری بڑی احسان مند ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کو پتا چلا کہ تم اور بھائی اکرام تھانے میں ہو اور تمہیں خطرہ ہے تو وہ تمہیں چھڑانے کے لیے پہنچ گئی۔“

”پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی رستے! چوہدرانی شانی کو کیسے پتا چلا کہ میں تمہاری بہن ہوں...... میں نے اس سے بھی کئی بار پوچھا ہے پر اس نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا۔“

”ان چوہدریوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں آپو...... ان کے اپنے مخبر ہوتے ہیں، جو دور دور کی خبریں لاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح چوہدرانی کو پتا چل گیا ہو۔ ویسے یہ بات خود ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ہے۔“

آپو زاہدہ نے رستم کے سر پر بڑے لاڈ سے ہاتھ پھیرا۔ ”رستے! ان چوہدریوں، جاگیرداروں کی دنیا اور ہے...... ہماری اور۔ نہ یہ ہمارے ساتھ خوش رہ سکتے ہیں نہ ہم ان کے ساتھ۔ اگر...... اگر تیرے دل میں چھوٹی چوہدرانی کے بارے میں کچھ ہے بھی...... تو میرے سوہنے! اسے دل سے نکال دے۔ تُو بس ایک بار ہاں کر دے۔ میں تیرے لیے اچھی سے

اچھی کُڑی ڈھونڈ لوں گی۔ اگر کوئی اور تیری نظر میں ہے تو مجھے بتا دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں...... میں اسے تیری دلہن بنا کے چھوڑوں گی۔" پھر وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئیں۔ رستم کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگیں۔ "جب تُو آخری بار مجھ سے گاؤں میں ملا تھا تو اس سے چند مہینے پہلے بھی تو گاؤں آیا تھا۔ اس وقت تُو بڑا خوش تھا۔ تُو نے مجھے بتایا تھا کہ ایک کُڑی تُو نے دیکھ لی ہے اور اسے بڑی جلدی اپنی ووہٹی بنا کر میرے پاس لائے گا۔ وہ لڑکی کون ہے؟"

"تھی وہ بھی ایک...... تیرے چھوٹے ویر کے کرتوت دیکھ کر اس نے نظر پھیر لی۔" رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

"تُو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ بہت سی باتیں چھپا رہا ہے۔" آپو زاہدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "دیکھ اگر تُو بتائے گا تو میں تیری مدد کر سکوں گی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے میرے سوہنے۔ دیکھ کر میں تیری بہن ہوں اور ماں کی جگہ بھی ہوں۔ کہیں تیرے دل میں...... کہیں...... میرا مطلب ہے، سچ مچ چھوٹی چوہدرانی؟"

رستم کے دل میں آئی کہ کہہ دے...... ہاں، چھوٹی چوہدرانی...... وہی ہے...... وہی ہے جو اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ جس کا عشق اس کے دل میں، خون میں اور روح کی گہرائیوں میں دور تک سرایت کر گیا ہے۔ ہاں، میری آپو! وہی ہے...... لیکن پھر اس کے ذہن میں وہ زہریلے الفاظ گونجنے لگے جو دل کو تیروں کی طرح چھلنی کرتے تھے...... "تم گھٹیا ہو اور گھٹیا ہی رہو گے...... تم گھٹیا ہی رہو گے۔"

اس نے اپنے لرزتے ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کر لیا اور آپو کی طرف سے رخ تھوڑا سا پھیر کر اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ "نہیں آپو! جو تم سوچ رہی ہو وہ نہیں ہے۔ چھوٹی چوہدرانی سے تو بس ایک احسان مندی کا رشتہ ہے۔"

آپو زاہدہ نے شہادت کی انگلی سے رستم کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور متلاشی نظروں سے رستم کی آنکھوں میں جھانکتی رہیں۔ آپو کی آنکھیں رستم کو بتا رہی تھیں کہ وہ شک میں پڑ چکی ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آپو کا شک آسانی سے دور نہیں ہوگا۔

وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر نہ بولنا ہی اچھا ہے۔ اس دوران میں دونوں بچے سرمد اور عاشی بھی آ گئے۔ عاشی اپنے ماموں کی کمر سے لپٹ کر لٹک گئی۔ سرمد نے آتے ساتھ ہی لیٹ کر سر ماموں کی گود میں گھسا دیا۔ آپو زاہدہ نے بیٹھے بیٹھے رستم کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کا سر بار بار چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔ "سوہنے! ہم سب نے

تجھے کھو کر پایا ہے۔ تجھے پتا نہیں جب تیرے بارے میں بری خبریں آتی تھیں تو ہمارے دلوں پر کیا گزرتی تھی۔ ہم مر مر کر جیتے رہے ہیں رستم۔ اب ہم تمہیں پھر سے گم نہیں ہونے دیں گے۔ بالکل نہیں ہونے دیں گے۔" آپو نے لمبے تڑنگے رستم کو یوں اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے وہ چھوٹا بچہ ہو اور وہ اسے اپنے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہوں۔ وہ جو کچھ اپنی محبت سے مجبور ہو کر کہہ رہی تھیں، رستم اس سے کوسوں دور تھا۔

رات کو رستم، ناصر اور اجمل میں ایک اہم ترین میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں رستم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو وہ دل خراش فلم بھی دکھائی جو قدرت اللہ کے خلاف ایک نہایت ٹھوس ثبوت کی حیثیت رکھتی تھی۔ فلم میں واقعی قدرت اللہ انسان سے زیادہ ایک حیوان نظر آیا تھا۔ جب وہ بغلی دروازے سے ہاتھوں میں برچھی نما آلہ لیے نمودار ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں جنون کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ چھیدی کے مرنے اور ثریا کے زخمی ہونے کے مناظر بھی دل دہلا دینے والے تھے۔

فلم دیکھنے کے بعد اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوئی۔ ناصر اور اجمل کے ذہن میں ایک اہم خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں ثریا اس سارے معاملے کو افشا نہ کر دے۔ اگر یہ بات دو چار افراد تک پہنچ جاتی کہ رستم اور اس کے ساتھی یہاں اس کوٹھی میں موجود ہیں تو پھر وہ بہت جلد پولیس کے گھیرے میں آ سکتے تھے۔

رستم نے کہا۔ "پتا نہیں کیوں، مجھے اس بارے میں کافی حد تک اطمینان ہے۔ میں نے اس بارے میں ثریا سے تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ اگر اس نے ایک مہینے تک کسی کو نہیں بتایا تو اب بھی نہیں بتائے گی۔"

اجمل نے کہا۔ "لیکن رستم صیب! یہ تو ہو سکتا ہے ناں کہ وہ دوسری ملازمہ نوری پیٹ کا ہلکا ہو۔"

"یہی بات تو اطمینان والی ہے۔" رستم بولا۔ "ثریا نے ابھی اپنی ساتھی کو بھی ہماری اصلیت نہیں بتائی ہے۔ اس نے اپنی ساتھی کے سامنے ایک بار بھی مجھے میرے نام سے نہیں پکارا ہے۔"

وہ رات گئے تک جاگتے رہے...... ان کی گفتگو کا موضوع قدرت اللہ کا قتل تھا۔ جب وہ رات تین بجے کے قریب سونے کے لیے اٹھے تو قدرت اللہ کو ٹھکانے لگانے کا سارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر رستم نے حاجی حیات کو بالکل بے خبر رکھا۔ قدرت اللہ کے بارے میں

معلومات حاصل کرنے کے لیے ناصر بڑی خاموشی کے ساتھ کوٹھی سے نکلا اور قریباً اٹھارہ گھنٹے بعد کوٹھی واپس پہنچا۔ اس نے اپنا کام بخوبی انجام دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ قدرت اللہ آج کل پسرور روڈ کے نزدیک ایک قصبے چھانگی وال میں موجود ہے۔ وہاں اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے چکر میں ڈالا ہوا ہے۔ وہاں کی نمبردار فیملی اس کی سپورٹ کر رہی ہے۔ بڑے نمبردار نے نہ صرف اسے رہنے کے لیے ایک شاندار گھر دیا ہوا ہے بلکہ اب اسے آستانے کے لیے دو ایکڑ مہنگی زمین بھی نذر کی ہے۔ علاقے میں دن بہ دن قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے پاؤں جمتے جا رہے ہیں۔ ناصر کی معلومات کے مطابق قدرت اللہ کا خصوصی چیلا شاہی بھی وہیں پر موجود تھا اور بڑی سرگرمی دکھا رہا تھا۔

شاہی کا نام آتے ہی اجمل خان بھڑک اٹھا۔ ”رستم صیب! امارا آپ سے ایک درخواست ہے اور ام کو پورا امید ہے کہ آپ یہ درخواست ضرور مانے گا۔ اگر شاہی وہاں موجود ہے تو اس کو مارنے کا پریضہ (فریضہ) آپ ام کو سونپے۔ اگر امارے ہوتے ہوئے وہ خبیث کسی اور کے ہاتھوں سے قتل ہوا تو ام اپنی قبر میں بھی چین سے نہیں رہ سکے گا۔“

رستم جانتا تھا، شاہی کے لیے اجمل کے دل میں بے حد نفرت ہے۔ درحقیقت یہ شاہی ہی تھا جس کی وجہ سے اجمل کی زندگی کا رخ تبدیل ہوا۔ وہ پولیس کی نوکری کرتے کرتے مجرم بن گیا۔ اس کا گھر بار چھوٹا، گاؤں چھوٹا، منگیتر کسی اور کی ہوئی اور وہ دربدر ہو گیا۔ شاہی کے بارے میں جو کچھ اجمل نے بتا رکھا تھا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اس بدبخت نے ایک دور دراز علاقے میں سادہ لوح لوگوں کو حیرت انگیز طور پر مطیع کر رکھا تھا۔ وہاں کی عورتیں چھاتی کے سرطان کے شدید خوف میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ لوگ اپنی صحت مند عورتوں کو جھاڑ پھونک کے لیے اس کے پاس بھیجتے تھے اور وہ شرمناک طور پر علاج کے بہانے ان کے جسم چھوتا تھا۔ اجمل نے اس کی سنگین بداخلاقی کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور وہ دربدر ہوا تھا۔

یہ خیالات چند سیکنڈ کے مختصر وقت میں رستم کے ذہن سے گزر گئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے اجمل! اگر حالات ٹھیک رہے تو شاہی تمہارا شکار ہے۔“

”اوہ... آپ کا بہت شکریہ۔“ اجمل کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے شاہی سچ مچ اس کے نشانے پر ہو اور وہ بس انگلی کو حرکت دے کر اس کی کھوپڑی اُڑا سکتا ہو۔

☆======☆======☆

بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل تو وزیری گاؤں والے واقعے کے بعد مشکوک ہو چکی تھی۔ موجودہ کارروائی میں اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کارروائی میں کار کے استعمال کا

منصوبہ تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ناصر اور اجمل رات گیارہ بجے کے بعد گئے اور ایک ٹیکسی کار چھین کر لے آئے۔ ٹیکسی کار کا نشئی ڈرائیور بھی کار کے اندر ہی مرغی کی طرح بندھا پڑا تھا۔ اجمل نے اس کے ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے تھے اور ایک کالی پٹی اس کی آنکھوں پر باندھ رکھی تھی۔ ناصر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ڈرائیور کا نام بھی اتفاقاً اجمل ہی تھا۔ اس کی جیبوں سے بھرے ہوئے سگریٹ نکلے تو اجمل نے کہا۔

”اوئے! تم نے تو امارا نام بدنام کر دیا...... چرس والا سگریٹ پیتا ہے۔“

ناصر نے لقمہ دیا۔ ”نسوار کھایا کرو...... بے شک کڑک مسالے والی کھا لیا کرو۔“

اجمل نے ناصر کو گھور کر دیکھا۔ ڈرائیور خاصا بزدل واقع ہوا تھا۔ مسلسل کانپ رہا تھا اور منت سماجت کر رہا تھا۔ ”میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جی۔“

اجمل نے کہا۔ ”تمہارا اپنا عمر بھی تیس سے زیادہ نہیں، تمہارا بچہ عمر رسیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ باقی تم گھبراؤ مت۔ ام تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ صبح ناشتے میں تم کو حلوہ پوری ملے گا۔ دوپہر کو دنبے کا نمکین گوشت ہو گا۔ رات تک تم پھر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاس پہنچ جائے گا...... اور تب تمہارا جیب بھی ایک دم گرم ہو گا۔ کیوں جی؟“ اجمل نے تائیدی نظروں سے ناصر کو دیکھا۔ ناصر نے بھی تائید کی۔

ڈرائیور کو کوٹھی کے ایک وسطی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ڈولا تسلی تشفی کے لیے ڈرائیور کے پاس ہی رہ گیا۔ یہ ساری کارروائی بڑی احتیاط سے کی گئی۔ رستم ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ آپو زاہدہ یا بھائی اکرام کو خبر ہو۔ اس صورت میں آپو زاہدہ نے ایک بار پھر اس کے سامنے اپنی نصیحتوں کی گٹھڑی کھول لینا تھی۔ وہ پہلے ہی پریشان تھیں، وہ انہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے روز وہ منہ اندھیرے ہی کوٹھی سے نکل کھڑے ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ان کو دو گاڑیوں میں سفر کرنا تھا۔ ناصر اور ڈولے کو ایک پرائیویٹ کار میں پسرور روڈ تک پہنچنا تھا۔ جبکہ رستم اور اجمل کو چھینی ہوئی ٹیکسی میں ان کے پیچھے پیچھے جانا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا۔ ناصر اور ڈولا کرائے کی ایک کار پر روانہ ہوئے جبکہ رستم اور اجمل ٹیکسی پر ان کے پیچھے ہو لیے۔ مرید کے قصبے کے پاس ان کی معمولی چیکنگ بھی ہوئی۔ رستم ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے کاغذات دکھائے۔ گاڑی میں موجود اسلحہ بڑے اچھے طریقے سے محفوظ کیا گیا تھا۔ انہیں جانے دیا گیا۔ وہاں تقریباً نصف درجن پولیس والے موجود تھے۔ کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جس شخص کو کلیئر کر کے جانے دے رہے

ہیں، وہ رستم سیال ہے۔ وہ رستم جسے ڈیڑھ دو برس پہلے پوٹھوہار کی گھاٹیوں میں ایک خوفناک مقابلے کے بعد مُردہ تصور کرلیا گیا تھا۔

رستم اور ناصر کے درمیان موبائل فون پر رابطہ قائم تھا تاہم وہ ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب نہیں کر رہے تھے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں پھر آگے پیچھے چلنے لگیں۔

اجمل نے کہا۔ ''رستم بھائی، آج کے اس دن کے بارے میں ام نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ یہ دن اماری آنکھوں کا سب سے خوبصورت سپنا تھا۔ امارا خواہش تھا کہ ام شاہی اور قدرت اللہ سے انتقام لینے جارہا ہو تو آپ امارے ساتھ موجود ہو۔ ام شانہ بہ شانہ ان لوگوں پر حملہ کرے اور انہیں پناپنار (فنانی النار) کردے۔''

''امید ہے، آج یہ خواہش پوری ہوگی۔'' رستم کی نگاہیں جی ٹی روڈ کی سیاہ چمکتی تارکول پر جمی ہوئی تھیں۔

''ام تو کہتا ہے رستم صیب...... قدرت اللہ کا جتنا چیلا بھی اس کے اردگرد موجود ہو، ان سب کو ٹپکا دیں۔ یہ سب لوگ برائی کے درخت کی شاخیں ہیں۔ ان کو جتنا زیادہ نقصان پہنچے گا اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

''خدا کرے وہاں صورت حال ہمارے حق میں رہے۔'' رستم نے کہا۔

''رستم بھائی! اگر اس کام میں اماری جان کا ضرورت ہے تو ام ایڈوانس میں اپنا جان آپ کے پاس جمع کرا دیتا ہے لیکن آج کا کام ایسا ہونا چاہیے کہ قدرت اللہ کا بیڑی بالکل غرق ہوجائے۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر چٹان کی سی سختی تھی۔ اجمل خان نے میکانکی انداز میں نسوار کی ڈبیا کھولی اور اس میں موجود ساری نسوار سمیٹ کر ہونٹ میں ڈالی مگر پھر وہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے تھوڑی سی خشک نسوار ہونٹ سے نکال کر دوبارہ ڈبیا میں رکھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ بہت بدشگونی ہے جی۔ ام ایک خطرناک کام کرنے جارہا ہے۔ تھوڑا سا نسوار تو ڈبیا میں رہنا چاہیے۔''

موبائل کے ذریعے وہ آپس میں گاہے بہ گاہے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ ناصر نے موبائل پر فوجی انداز میں اجمل خان سے پوچھا۔ ''جوان ریڈی؟''

''بالکل جوان ریڈی۔'' اجمل نے جواب دیا۔

''مورال اونچا؟''

''مورال اونچا...... بلکہ کچھ زیادہ ہی اونچا۔ ایک دم ہوا میں پرواز کرتا ہوا...... خو، ایف سولہ جہاز کی طرح۔'' اجمل نے جواب دیا۔

وہ پسرور روڈ سے ایک بغلی راستے پر ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا لیکن ابھی وہ اکٹھے ہونے کے مقام سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھے کہ کھیتوں کے ایک طویل سلسلے کے کنارے انہیں روک لیا گیا۔ روکنے والے قریباً نصف درجن دیہاتی تھے۔ ان میں سے دو ہٹے کٹے افراد آگے آئے۔ ایک بھاری آواز والے شخص نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

رستم نے اجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سواری کو چھوڑنے جا رہا ہوں، چھانگی وال تک۔'' رستم کا لہجہ ٹیکسی ڈرائیوروں والا ہی تھا۔

''ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ دو بندے پھٹل ہو گئے ہیں۔ ان کو پسرور ہسپتال میں پہنچانا ہے۔''

رستم اور اجمل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی ڈراما بھی ہوسکتا تھا۔ دوسرے وہ جس کام پر جارہے تھے، اس میں وقت کی بڑی اہمیت تھی۔

رستم نے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں جی۔ ان خان صیب کو بھی بہت ایمرجنسی ہے۔''

''کیا ایمرجنسی ہے۔ یہ چنگا بھلا تو بیٹھا ہے۔ ہماری ایمرجنسی زیادہ بڑی ہے۔ پنڈ میں اس وقت ایک ہی گاڑی تھی۔ وہ بھی خراب ہوگئی ہے۔ بندوں کو ہسپتال پہنچانا ضروری ہے۔''

اجمل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صیب! آپ کا بہت مہربانی۔ ام جلدی نہ پہنچا تو امارا بہت نقصان ہو جائے گا۔ آپ دو منٹ انتظار کرلیں۔ ابھی پیچھے سے کوئی اور گاڑی......''

''اوئے تُو ٹرٹر بند کر۔ نیچے اُتر گڈی سے۔'' ہٹے کٹے شخص نے بدتمیزی سے کہا۔ ''بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں ہے۔ اُدھر بندے زخمی پڑے ہیں اِدھر تم کو اپنے نقصان کی پڑی ہے...... چل نیچے اتر۔'' ہٹے کٹے شخص نے ایک ہاتھ کا مُکا بنایا اور دوسرے ہاتھ سے اجمل خان کی قمیص کندھے پر سے پکڑ لی۔

رستم نے اجمل خان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے دیکھا۔ یہ بڑا ظالم اور سنگین رنگ تھا۔ اجمل پر مُکا تاننے والے کو خبر نہیں تھی کہ وہ کس شخص کو اُکسا رہا ہے۔ اس کا میٹر گھوم جاتا تو وہ چند سیکنڈ میں پہلوان نما شخص کی آٹھ دس ہڈیاں توڑ سکتا تھا اور اس کے ساتھی افراد بھی

رستم اور اجمل کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بے چارے عام دیہاتی تھے۔ ہوائی فائرنگ سے ہی رفو چکر ہو سکتے تھے۔ مگر پھر اچانک رستم کی نگاہ سب سے پیچھے کھڑے ایک لڑکے پر پڑ گئی۔ اس دیہاتی لڑکے کی عمر سولہ سترہ سال رہی ہو گی۔ سادہ سے چہرے پر چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ایک آستین پر خون لگا ہوا تھا۔

اجمل خان بھڑک کر ٹیکسی کار سے باہر نکل آیا تھا۔ ان پانچ چھ افراد کو سخت مصیبت میں مبتلا کرنے سے پہلے اجمل کو رستم کے صرف ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ رستم نے یہ اشارہ نہیں دیا اور ہاتھ کی حرکت سے اجمل کو روک لیا۔

''کون بندے زخمی ہوئے ہیں؟'' اس نے ہٹے کٹے خرد ماغ شخص سے پوچھا۔

اس کے بجائے ایک دوسرے دیہاتی نے پیچھے کھڑے مصیبت زدہ لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بھائی اور باپ ہیں۔ اوپر درخت سے گر پڑے ہیں۔ ان کو ہسپتال نہ پہنچایا تو مر جائیں گے۔ تم ٹیکسی موڑو، دیر نہ کرو۔''

رستم نے ایک نظر سیدھی جاتی سڑک کی طرف دیکھا۔ یہ سڑک، چھانگی وال اُن کی منزل کی طرف جاتی تھی...... اور اس منزل تک وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ دوسرا راستہ جو بائیں طرف نکلتا تھا، کسی قریبی پنڈ کی طرف جاتا تھا اور وہاں دو بندے زخمی پڑے تھے۔ رستم اور اجمل جس راستے پر جانا چاہتے جا سکتے تھے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ انہیں روک سکے۔ مگر...... رستم کی نگاہ ایک بار پھر سب سے پیچھے کھڑے ہلکی نرم داڑھی والے نوعمر لڑکے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی بہت طاقتور تھی۔ رستم نے اجمل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین دیہاتیوں کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ ان میں نم آنکھوں والا لڑکا بھی شامل تھا۔ گاڑی دوسرے راستے پر موڑتے وقت رستم نے موبائل پر ناصر کو اطلاع دے دی کہ وہ جہاں ہیں، وہیں پر رُک جائیں۔ چائے شائے پئیں۔ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔

''بھائی خیریت تو ہے؟'' فون پر ناصر کی آواز ابھری۔

''ہاں خیریت ہے۔ راستے میں چند دوست مل گئے ہیں۔ ان کے دو بندے درخت سے گر کر زخمی ہو گئے ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ان کو ہسپتال پہنچانا ہے۔''

''لیکن اپنے کام میں دیر ہو جائے گی۔'' ناصر کی آواز میں اضطراب تھا۔

''دیر تو کسی اور وجہ سے بھی ہو سکتی تھی یار۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

''لیکن...... کوئی گڑ بڑ والا معاملہ تو نہیں ہے ناں؟''

''لگتا تو نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہاں پاس ہی دو چار دکانیں ہیں۔ ہم وہاں بیٹھتے ہیں لیکن آپ رابطہ رکھیں۔''

رستم نے اثبات میں جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

باقی دیہاتی ایک ٹانگے پر سوار ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ رستم اور اجمل کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہٹے کٹے شخص کا نام پیرو تھا۔ وہ بس ایویں سا بندہ تھا۔ گاؤں کے پٹواری کا ملازم تھا۔ رستم نے اس سے پوچھا کہ بندے زخمی کس طرح ہوئے ہیں۔

وہ بولا۔ ''درخت پر چڑھ کر کپڑا لگا رہے تھے۔''

رستم نے وضاحت چاہی تو پتا چلا کہ کپڑے سے پیرو کی مراد ''بینر'' ہے۔ یہ بینرز ایک جلوس کے لیے لگائے جا رہے تھے جو ساتھ والے گاؤں مدنی پور سے یہاں پہنچنے والا تھا۔

''جلوس کس لیے ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

پیرو بولا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے یار۔ تم فٹافٹ ٹیکسی چلاؤ تاکہ بندے ہسپتال پہنچ سکیں۔ بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔''

وہ تھوڑا آگے گئے تو رستم اور اجمل کو اپنے آپ ہی اس معاملے کی نوعیت کا پتا چلنے لگا۔ وہ گاؤں کی طرف جانے والے نیم پختہ راستے پر آ گئے تھے۔ یہاں جگہ جگہ کپڑے کے نئے اور پرانے بینرز لگے ہوئے تھے۔ ان بینرز پر اس طرح کے نعرے تھے۔ ''گاؤں کی بیٹی بر آمد کرو...... عزتوں کے لٹیروں کو پھانسی دو...... راجا نوازش مُردہ باد...... ایک کی بیٹی سب کی بیٹی۔'' اس طرح کے کئی اور نعرے اور فقرے دکھائی دے رہے تھے۔

ٹیکسی کار دھول اُڑاتی گاؤں میں داخل ہوئی۔ گاؤں سے باہر ہی چند درختوں تلے بہت سے افراد جمع تھے۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں سبھی شامل تھے۔ درمیان میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان چارپائیوں پر دو زخمی موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا، دوسرا جواں سال۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ بیٹا تو لوگوں کی کوششوں سے ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص ابھی تک بے ہوش تھا اور پھنسے پھنسے سانس لے رہا تھا۔ رستم اور اجمل کے پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ نزدیکی گاؤں سے ایک سمجھدار کمپاؤنڈر کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے آئے تھے۔ کمپاؤنڈر کے پاس ضروری دوائیں موجود تھیں...... وہ اس شخص کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کی بھی دو تین ہڈیاں ٹوٹی ہوئی

تھیں۔ رستم نے محسوس کیا کہ یہاں ڈاکٹر ناصر مدد کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً موبائل پر ناصر سے رابطہ کیا اور اسے مذکورہ گاؤں میں پہنچنے کی ہدایت کی۔

ناصر اور ڈولا زیادہ دور نہیں تھے۔ وہ صرف دس منٹ میں موقع پر پہنچ گئے۔ ناصر نے آتے ساتھ ہی سچویشن کو سمجھ کر اپنا کام سنبھال لیا۔ رستم نے دیکھا تھا کہ مشکل حالات میں ناصر کی صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ وہ بالکل ایک پیشہ ور ڈاکٹر نظر آنے لگتا تھا۔ ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر کے ساتھ مل کر ناصر نے پانچ دس منٹ میں ہی نہ صرف زخمی کی سانس بحال کر دی بلکہ اس کی گہری بے ہوشی کو بھی نیم بے ہوشی میں بدل دیا۔ اس دوران میں کمپاؤنڈر نے ناصر کی ہدایت کے مطابق مضروب کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی اور ٹخنے کو چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کی مدد سے اس طرح باندھ دیا کہ اسے آسانی سے گاڑی میں منتقل کیا جا سکے اور ہسپتال پہنچایا جا سکے۔ جب یہ لوگ شدید زخمی کو گاڑی میں منتقل کرنے کی تیاری کر رہے تھے تو دو تین افراد ایک ویگن لے کر پہنچ گئے۔ یہ ویگن اس جلوس سے علیحدہ ہو کر آئی تھی جو تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا تھا اس پر بھی ایک بینر لگا ہوا تھا۔ ''راجا کو گرفتار کرو۔''

دونوں زخمیوں کو فوری طور پر ویگن میں ڈال کر پسرور ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب رستم اور اجمل کو ہسپتال نہیں جانا پڑے گا۔

دیہاتی ان تینوں چاروں کے بہت شکر گزار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے خاص طور سے ناصر کو گھیر لیا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ایک شخص نزدیکی گھر سے چاٹی کی نمکین اور شکر والی لسی لے آیا۔ نمکین لسی میں تازہ مکھن تیرتا نظر آتا تھا۔ ناصر نے ایک ادھیڑ عمر دیہاتی سے پوچھا۔ ''چاچا! یہ لڑکی والا کیا معاملہ ہے؟''

ادھیڑ عمر والے نے حقے کا طویل کش لے کر رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''معاملہ کیا ہوتا ہے پتر! ہمارے ان دور دراز علاقوں میں زور آور لوگ جنگل کے شکاری جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو زیادہ کمزور اور بے چارا نظر آتا ہے، اس کو پکڑ لیتے ہیں اور سب کے سامنے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی لعنت یہ ہے کہ دیکھنے والے بھی چپ رہتے ہیں اور چیر پھاڑ دیکھ کر بھی منہ پرے کر لیتے ہیں۔ پر اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم منہ پرے نہیں کریں گے۔ ہم پنڈ کی دھی کو انصاف دلا کر رہیں گے۔ ہم پچھلے پورے ایک مہینے سے کوشش کر رہے ہیں اور اگر ہماری کڑی برآمد نہ ہوئی تو ہم دہائی دینے کے لیے لاہور تک جائیں گے۔''

''یہ کیا کس نے ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہاں کے زمیندار راجا نوازش نے۔''

لڑکی کون تھی؟''

''اس کے مزارعے فضلو کی دھی ہے۔ وہ راجا نوازش کے گھر میں آتی جاتی تھی۔ راجا اس کا رشتہ اپنے کسی جاننے والے کی طرف کرنا چاہتا تھا۔ ماں پیو نہیں چاہتے تھے اور نہ لڑکی خود چاہتی تھی۔ اس کا رشتہ اپنے چاچے کے پتر کی طرف ہو چکا تھا۔ بس راجا نوازش کی زبردستی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کو سولہ آنے یقین ہے کہ فضلو کی دھی شاہدہ کو راجا نوازش نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ اب بھی جانتا ہے کہ وہ کہاں اور کس کے پاس ہے۔''

''ہاں، وہ سب جانتا ہے۔'' ایک اور شخص نے کہا۔ ''یہ سب کیا دھرا اسی راجا نوازش کا ہے۔ اگر فضلو کی گھر والی اپنی دھی کے دکھ میں مری ہے تو اس کا قاتل بھی یہ کمینہ راجا ہی ہے۔''

وہی دکھ درد کی صدیوں پرانی کہانی...... وہی طاقتور اور کمزور کے درمیان چوہے بلی کا کھیل۔

ناصر نے پوچھا۔ ''وہ راجا نوازش اب کہاں ہے۔''

''پہلے تو وہ یہیں تھا۔ پر جب اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے تو خاموشی سے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ پہاڑی علاقے کی سیر کو نکل گیا ہے۔ اس کا پتر اور نوں بھی ساتھ ہیں۔ اس کے پتر راشد کو پھانسی کی سزا ہو چکی تھی۔ پر سزا سے صرف دو ہفتے پہلے اس کو معافی مل گئی اور وہ رہا ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ خبیث رب کا شکر کرتا اور اللہ توبہ کا رستہ پکڑتا، اس نے یہ چن چڑھا دیا۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے غریب فضلو کی دھی کو اغوا کرا دیا۔''

''تم لوگ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ لڑکی واقعی اغوا ہوئی ہے اور یہ کام راجا کا ہی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ کام راجا کے سوا کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا جی۔'' ایک جوشیلے جوان نے حلفیہ لہجے میں کہا۔ ''راجا نوازش دن رات فضلو اور اس کے گھر والوں کو دھمکاتا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہونے نہیں دے گا اور اگر ہو گئی تو وہ اپنے باپ کا نہیں۔''

ایک دوسرا دیہاتی بولا۔ ''اور جہاں تک دوسری بات ہے کہ کڑی واقعی اغوا ہوئی ہے یا نہیں تو اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جس رات یہ ظلم ہوا، پنڈ کے دو بندوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ وہ یہاں سے دو تین فرلانگ دور کھیتوں کو پانی لگا رہے تھے۔ آدھی رات سے ذرا پہلے ایک ٹویوٹا گڈی کچے راستے پر سے

گزری کھیتوں کے پاس سے موڑ کاٹتے ہوئے گڈی کا ایک طرف کا دروازہ ایک دم کھلا اور ایک کڑی شور مچاتی ہوئی گڈی سے باہر گری۔ وہ منہ بھار گری تھی اور صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے چھلانگ ماری ہے۔ گڈی بھی ایک دم رک گئی۔ گرنے کے بعد کڑی لنگڑاتی ہوئی بھاگی پر ابھی مشکل سے چار چھ قدم ہی بھاگی تھی کہ گڈی سے نکلنے والے دو تین ڈشکروں نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کھچا کر واپس گڈی میں لے گئے۔ گرنے سے اس وچاری کے دونوں ہاتھ سخت زخمی ہو گئے تھے۔"

"دیکھنے والوں نے کچھ نہیں کیا؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ دونوں بالکل نہتے تھے ڈاکٹر صیب..... اور گڈی والوں کے پاس اسلحہ تھا۔ انہوں نے دونوں دیکھنے والوں کو دھمکی دی کہ وہ ایک سیکنڈ میں بھون کر رکھ دیں گے۔"

"ان میں کوئی جانا پہچانا چہرہ نہیں تھا؟" رستم نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ بالکل باہر کے بندے لگتے تھے۔ دیکھنے والے بے چارے ہماری طرح چٹے ان پڑھ تھے۔ نہیں تو گڈی کا نمبر دیکھ لیتے۔"

ایک ادھیڑ عمر کے، عینک والے دیہاتی نے کہا۔ "ایسے لوگوں نے نمبر بھی تو جعلی لگائے ہوتے ہیں۔"

لوگوں میں زمیندار راجا کے بارے میں سخت غصہ پایا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ گاؤں کے برائے نام چوہدری سے زیادہ طاقتور اور اثر و رسوخ والا ہے۔ اس کے پتر شراب کی بھٹیاں بھی چلاتے تھے۔ شراب کے کاروبار میں ہی ایک دوسری پارٹی سے ان کا جھگڑا ہوا تھا اور کوئی چار سال پہلے راجے کے پتر کے ہاتھوں ایک بندہ قتل ہو گیا تھا۔ اس قتل میں اس کے پتر کو پھانسی کی سزا بھی ہوئی پر آخر میں وہ بچ گیا۔

ان دیہی علاقوں اور دور دراز بستیوں میں نہ جانے کتنے راجے اور کتنے مظلوم فضلو چھپے ہوئے تھے۔ رستم اور ناصر کس کس کے گریبان تک اپنا ہاتھ پہنچا سکتے تھے لیکن جو منظر نظر آ جائے اس کا دکھ تو ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ وہ اغوا ہونے والی لڑکی شاہدہ کا بدنصیب باپ فضلو تھا۔ اس کا گھر اُجڑ گیا تھا۔ لاڈلی بیٹی کو ظالم اچک کر لے گئے تھے اور بیوی کو موت نے چھین لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ اس نے لوگوں کو وہ چپل دکھائی جو اس کی بیٹی نے وقوعہ کے وقت پہن رکھی تھی اور جو اس کے پاؤں سے نکل گئی تھی۔ اس نے وہ دوپٹا دکھایا جو راستے میں گر گیا تھا۔ وہ دیوانوں کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ موقع پر موجود لوگ ایک بار پھر راجا کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔

اجمل سرگوشی میں بولا۔ "رستم بھائی! اس وقت تو ام سب ایک ارجنٹ کام پر ہیں لیکن امارا دل چاہتا ہے کہ یہ کام ختم ہو جائے تو آپ ام کو تھوڑا سا اجازت دے کہ ام پھر کسی دن اس گاؤں میں آئے اور یہاں کے راجے کا باجا بجائے۔ ام سچ کہتا ہے، ایسے لوگوں کو مارتے ہوئے اگر امارا جان چلا جائے تو ام کو موت کا ذرا غم نہیں۔"

"خیر، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" رستم نے کہا۔ "ابھی تو یہاں سے چلنا چاہیے۔ ہم اور لیٹ ہو گئے تو اصل کام دھرا رہ جائے گا۔"

"ہاں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلوس کے پہنچنے کی وجہ سے راستہ بلاک ہو جائے۔" ناصر نے کہا۔

اب یہاں ان کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ درخت سے گرنے والے دونوں زخمی ہسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ ناصر نے فضلو اور دیگر لوگوں سے اجازت طلب کی۔ دیہاتیوں نے ناصر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ایک سادہ لوح شخص ناصر کو مسلسل "ڈاکٹر جی" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وقتِ رخصت اس نے کچھ روپے ناصر کی جیب میں بطور فیس ڈالنے کی کوشش کی۔ ناصر نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ جس پہلوان نما شخص نے شروع میں بدتمیزی کی تھی، وہ بھی شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک بار پھر پسرور روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ اس مرتبہ رستم، ناصر، اجمل اور ڈولا چاروں ایک ہی گاڑی یعنی ٹیکسی کار میں تھے۔ دوسری کار عقب میں آ رہی تھی۔ اس مرتبہ اسٹیئرنگ وہیل اجمل کے ہاتھ میں تھا۔ ڈولا گم صم تھا۔ اس کے حساس کان جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اجمل نے کہا۔ "خیریت تو ہے ڈولے؟ تمہارے کانوں کا دوربین شاید کچھ سننے کی کوشش رہا ہے۔"

"یہ کانوں کی دوربین کیا ہوتی ہے؟" ناصر نے برا سا منہ بنایا۔

"دراصل ناصر بھائی! جب ام تمہاری شکل پر سوسوبل دیکھنا چاہتا ہے تو جان بوجھ کر اس طرح کا لفظ بولتا ہے۔ ورنہ یہ ام کو بھی پتا ہے کہ کانوں کو نظر نہیں آتا۔"

"مجھ کو تو لگتا ہے کہ تمہاری آنکھوں کو بھی نظر نہیں آتا..... وہ دیکھو سامنے کھڈا ہے۔" ناصر نے آخری الفاظ تقریباً چلا کر کہے۔

اجمل نے تیزی سے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور گاڑی کھڈے کے کنارے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اجمل مسکرایا۔ "ناصر بھائی! دراصل ام تمہارا ہاں ہاں تمہارا امتحان لے رہا تھا،

دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں کچھ نظر آتا ہے یا نہیں۔ دراصل تم نے جس طرح کی لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے چنا ہے، شک ہوتا ہے کہ تمہارا نظر......" اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ناصر نے کوئی مناسب جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اسے خاموش رہنا زیادہ مناسب لگا۔ وہ جس پچویشن میں جا رہے تھے، وہ خاصی سنگین تھی......اور ضرورت تھی کہ آنے والی گھڑیوں کے بارے میں ذرا سنجیدگی سے سوچا جائے۔

ڈولے کے کان مسلسل غیر مرئی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ بولا۔ "وہ لوگ ٹھیک کہہ رہے تھے جی......جلوس ادھر دائیں طرف ہے۔ وہ سامنے جو ذخیرے کے درخت نظر آ رہے ہیں ان کی دوسری طرف۔ کافی لوگ ہیں۔ وہ نعرے لگا رہے ہیں۔"

رستم اور ناصر وغیرہ نے گاڑی کی کھڑکیاں پوری کھول کر پوری کوشش کی مگر انہیں کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ ڈولا جو کہہ رہا ہے وہ درست ہے۔

"رفتار ذرا تیز رکھو۔" رستم نے ایک بار پھر اجمل خان سے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی پہلے ہی چالیس پچاس کی اسپیڈ پر بھاگ رہی تھی۔ اجمل نے ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اجمل نے پوچھا۔ "رستم بھائی! آپ نے بتایا نہیں کہ ہمارا بارہ بجے سے پہلے پہنچنا کیوں ضروری تھا؟"

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بے گناہ لوگ نہ مارے جائیں اور صرف قدرت اللہ اور اس کے قریبی چیلے ہی نشانہ بنیں تو پھر ہمارا بارہ بجے کے لگ بھگ چھانگی وال پہنچنا ضروری ہے۔ بارہ سے ڈیڑھ بجے کے درمیان منگل اور جمعرات کے روز ایک بیٹھک ہوتی ہے۔ جس میں صرف قدرت اللہ اور اس کے قریبی ساتھی بات چیت کرتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ بیٹھک شروع ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے۔" رستم نے اپنی خستہ حال گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ یہ گھڑی اس ڈرائیور ہی کی تھی جسے وہ کوٹھی میں پابند چھوڑ آئے تھے۔ رستم کے جسم پر لباس بھی ڈرائیور ہی کا تھا۔ تھوڑا تنگ تھا مگر گزارہ ہو رہا تھا۔ ناصر اور اجمل بھی عام لباس میں تھے۔ درحقیقت وہ عام عقیدت مندوں کے روپ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ ایک چھوٹے سے پنجرے میں کاک ٹیل طوطوں کا ایک جوڑا بھی اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ ایسے نر، مادہ پرندوں کو قدرت اللہ اپنے عملیات میں استعمال کرتا تھا۔

ان عام سے عقیدت مندوں کے پاس قدرت اللہ سے ملاقات کے لیے جو اصل سامان تھا وہ کافی خوفناک تھا۔ یہ ایک عدد اے کے 52 رائفل...... ایک ایل ایم جی...... دو کولٹ پسٹل اور چھ عدد دستی بم تھے۔ بم یو ایس اے میڈ تھے۔ ان کو "M67" کہا جاتا ہے۔ یہ بم ایک بوسیدہ سے تھیلے میں تھے۔ یہ سارا اسلحہ ٹیکسی کی پچھلی نشست کے اندر بڑی مہارت سے چھپایا گیا تھا۔ ایل ایم جی کے قریباً پانچ سو راؤنڈ بھی اس اسلحے میں شامل تھے۔

ٹیکسی کار اینٹوں کی سڑک پر ہچکولے کھاتی قریباً ساڑھے بارہ بجے چھانگی وال میں قدرت اللہ کے آستانے کے عین سامنے پہنچی۔ گرمی کے باوجود یہاں زائرین اور ضرورت مندوں کا ہجوم تھا۔ عارضی طور پر ایک سکول کی خالی عمارت کو قدرت اللہ کے آستانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ چھت پر بہت سے رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک طرف لنگر پک رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اسٹالوں پر قدرت اللہ کے چھاپے ہوئے کتابچے اور اس کی آواز کی کیسٹیں وغیرہ فروخت ہو رہی تھیں۔ یہاں رستم کو گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں، تانگے اور بیل گاڑیاں وغیرہ دکھائی دیں۔ یہ سب قدرت اللہ کے سادہ لوح عقیدت مندوں کی سواریاں تھیں۔

اجمل نے ٹیکسی کار کو چند گاڑیوں کے درمیان روک دیا۔ یہ جگہ قدرت اللہ کے اس عارضی آستانے کے صدر دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو ایک جھپٹ میں صدر دروازے تک پہنچ سکتے تھے۔ صدر دروازے پر مسلح محافظ موجود تھے اور وہ چیکنگ کے بعد ہی لوگوں کو اندر جانے دیتے تھے۔ ناصر نے بتایا تھا کہ اس چیکنگ کے بعد آگے ایک اور چیکنگ ہے۔ وہاں پر عورتوں اور مردوں کو علیحدہ علیحدہ بھی کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی تلاشی کے لیے وہاں مریدنیاں موجود تھیں اور عریسہ فراتی ان کی نگرانی کرتی تھی۔

ٹیکسی پارک کرنے کے بعد ان چاروں نے اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لے لیا تو وہ ایکشن کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈولا پچھلی سیٹ پر لیٹا تھا اور اس نے اپنا سر کسی بچے کی طرح ناصر کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ ناصر نے اس پر ایک چادر ڈال دی تھی۔

رستم نے ناصر اور اجمل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یاد دہانی کے لیے ہم ایک بار پھر اہم باتیں دہرا لیں۔ اجمل یہاں ٹیکسی میں رہے گا۔ میں اور ناصر اندر جائیں گے بالکل خالی ہاتھ جائیں گے۔ ڈولے کو چادر میں لپیٹ کر ناصر، بیمار بچے کی طرح اپنے کندھے سے لگائے رکھے گا۔ اندر پہنچ کر ہم تصدیق کریں گے کہ قدرت اللہ اور اس کے خاص چیلے بیٹھک کر رہے ہیں اور اگر کر رہے ہیں تو کس جگہ پر؟ اگر پوری تصدیق ہو گئی تو میں بیمار بچے کے

لیے شربت وغیرہ لینے کے بہانے باہر آ جاؤں گا...... اس دوران میں تم کیا کرو گے اجمل؟''
رستم نے اپنا بیان روک کر پوچھا۔

''ام سیٹ کے نیچے سے بندوق اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ نکال کر سیٹ کے اوپر رکھ دے گا اور اوپر چادر ڈال دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بعد ہم گاڑی کو بڑے دروازے سے سیدھا اندر گھسا لے جائیں گے اور ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جو بیٹھک سے قریب تر ہو۔ ہم صرف قدرت اللہ اور اس کے خاص چیلوں کو نشانہ بنائیں گے یا ان لوگوں کو جو ہم پر جوابی فائر کریں گے۔ کام مکمل ہونے کے بعد ہم اسی ٹیکسی کار پر واپس نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ٹیکسی استعمال کے قابل نہ ہوئی تو پھر دوسری کار کو استعمال کیا جائے گا۔ یہاں سے نکلتے وقت جو احتیاط کرنی ہے وہ ذہن میں ہے ناں؟'' رستم نے ناصر اور اجمل سے بیک وقت پوچھا۔

''بالکل جی۔'' اجمل نے جوش سے کہا۔ ''ام یہاں موجود ایسی گاڑیوں کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش کرے گا جو امارا پیچھا کر سکتی ہیں اور امارے خیال میں یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ ام دیکھ رہا ہے کہ یہاں ٹوٹل چار پانچ گاڑیاں ہی ایسا ہے جو امارے پیچھے آ سکتا ہے۔ ان گاڑیوں پر دو تین برسٹ چل گیا تو ان شاء اللہ یہ سب ٹھس ہو جائے گا۔''

ناصر نے کہا۔ ''اگر صورت حال دوسری ہوتی ہے... میرا مطلب ہے کہ ہم کچھ لیٹ ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ایکشن میں آتے آتے بیٹھک ختم ہو گئی کوئی اور صورت حال پیش آئی تو پھر؟''

''اگر کوئی ایسا معاملہ ہوا تو پھر ہم چاروں دوبارہ ٹیکسی میں آ جائیں گے اور نیا پروگرام بنائیں گے۔''

اجمل بولا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ اگر پیکنگ کے دوران میں پہرے داروں کو آپ پر شک ہو گیا تو آپ میرے موبائل پر مس کال دے گا۔ ایسے میں ام مزید انتظار نہیں کرے گا اور پائرنگ کرتا ہوا اندر آ جائے گا۔ مگر امارا اسلحہ تو ابھی سیٹ کے نیچے ہے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کے باہر نکلنے سے پہلے ام بندوق وغیرہ نکال لے؟''

''تمہیں بندوق وغیرہ نکالنے کا پورا وقت ملے گا۔'' رستم نے کہا۔ ''ہم یہاں سے نکلتے ہی آستانے میں نہیں چلے جائیں گے۔ دو چار منٹ اِدھر اُدھر گھومیں گے اور جائزہ لیں گے۔''

''بس یہ ٹھیک ہے جی۔'' اجمل نے جوش سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور

چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

رستم نے اپنے موبائل پر اجمل کا نمبر پہلے سے ہی ڈائل کر لیا۔ اب خطرے کی صورت میں صرف بٹن دبانے کی ضرورت تھی۔

رستم اور ناصر باہر نکل آئے۔ ڈولا چادر میں لپٹا ہوا ناصر کے کندھے سے لگا تھا۔ کاک ٹیل طوطوں والا چھوٹا سا پنجرہ رستم کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دونوں چار پانچ منٹ تک دائیں بائیں گھومتے رہے۔ کرائے کی کار بھی مناسب جگہ پر پارک ہو چکی تھی۔ کار کا ڈرائیور ذرا خاموش نظر آتا تھا۔ شاید اسے رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کی حرکات و سکنات پر تھوڑا بہت شک تھا۔ رستم نے احتیاطاً اس سے گاڑی کی چابی لے لی۔ آستانے کے دائیں طرف کچھ فاصلے پر زمین کے ایک وسیع رقبے پر تعمیر کا ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے تصدیق کی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت قدرت اللہ کا نیا آستانہ بنے گا۔ ناصر نے شکر کولا بیچنے والے ایک ریڑھی بان سے پوچھا۔ ''حضرت پیر صاحب آستانے میں ہی ہیں؟''

''آہو بھائی! اندر ہی ہیں۔'' ریڑھی بان نے جواب دیا۔ ''پر اب عام لوگوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ اب تین بجے کے بعد ملاقات دوبارہ شروع ہوگی لیکن رش بہت ہے۔ باری مشکل سے ہی آئے گی۔ جن لوگوں کو پتا ہوتا ہے وہ صبح سویرے ہی آ جاتے ہیں۔''

''اس وقت کیا کر رہے ہیں حضرت صاحب؟'' ناصر نے پوچھا اس کے ساتھ ہی ریڑھی والے کو دو گلاس شربت کا آرڈر بھی دے دیا۔

وہ بڑے سائز کے میلے کچیلے گلاسوں میں شربت انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک سے تو پتا نہیں، مگر آج منگل ہے۔ اس وقت بیٹھک ہوتی ہے۔ حضرت صاحب اور ان کے خاص مرید علیحدہ کمرے میں گل بات کرتے ہیں۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ہوا کیا ہے تمہارے بچے کو؟''

''چھپا کی نکلی ہوئی ہے۔ تیز بخار بھی ہے۔'' ناصر نے سیدھے سادے دیہاتی لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت مشکل ہے کہ آج حضرت صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جائے۔ اگر تم کہیں دور سے آئے ہو تو پھر تمہیں رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہوا تو میں تمہاری رہائش کا انتظام کر سکتا ہوں۔ زیادہ کرایہ نہیں ہوگا۔ صرف چار سو روپیہ رات کا۔ کھانے کا بندوبست بھی ہو جائے گا....'' ریڑھی بان اپنے فائدے کی باتیں کرنے لگا۔

پانچ چھ منٹ نکل گئے تو رستم اور ناصر آستانے کے صدر دروازے کی طرف روانہ

ہوئے۔ یہ درحقیقت ایک وسیع حویلی کا پھاٹک تھا۔ ان کی کارروائی کا مشکل مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ صدر دروازے پر محافظوں نے ان کے نام پوچھے اور آنے کی غرض دریافت کی۔ رستم اور ناصر نے اپنے فرضی نام بتائے۔ ان کے نام پتے ایک رجسٹر میں درج کر لیے گئے۔ اس کے بعد تلاشی ہوئی اور انہیں اندر روانہ کر دیا گیا۔ حویلی میں خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ سادہ لوح عقیدت مند مختلف جگہوں کو بوسے دے رہے تھے اور ماتھا ٹیک رہے تھے۔ عقیدت مندوں میں عورتیں زیادہ تھیں۔ اکثر کے ساتھ چھوٹی اور بڑی عمر کے بچے بھی تھے۔

رستم اور ناصر مستحکم قدموں سے چلتے ہوئے اگلی چیکنگ پر پہنچے۔ یہاں بہت اچھی طرح ان کی تلاشی لی گئی ......اور گتے کا بنا ہوا ایک ٹوکن تھما دیا گیا۔ ٹوکن پر نمبر لکھا تھا۔ رستم اور ناصر ایک چھوٹے سے دروازے سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھے تھے۔ حالانکہ جنریٹر کے ذریعے پنکھے چل رہے تھے، اس کے باوجود لوگ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ اسی طرح کا ایک اور ہال سامنے بھی نظر آ رہا تھا، یہاں صرف عورتیں تھیں۔ بچوں کے بولنے اور رونے چلانے کی آوازیں در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ رستم اور ناصر آخری کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رستم نے ساتھ بیٹھے ایک بیمار صورت شخص سے پوچھا۔ ''حضرت صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے دائیں طرف ایک بند دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور نحیف آواز میں بولا۔ ''وہاں بیٹھک ہو رہی ہے۔''

یہ سفید دروازہ اس ہال کمرے سے تھوڑا ہٹ کر دائیں جانب تھا۔ ایک تنومند گارڈ دروازے کے سامنے چوکس کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم لٹھ اور دوسرے میں تسبیح تھی۔ تاہم وہ کلین شیو تھا اور اس نے آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک چڑھا رکھی تھی۔

رستم اور ناصر نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صورتِ حال موافق تھی۔ رستم نے حدود اربعہ ذہن نشین [illegible] اس نے ٹوکن ناصر سے لے لیا۔ یہ باہر جانے کے لیے ضروری تھا۔ ابھی رستم اٹھنے اور واپس [illegible] کے پاس پہنچنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سفید دروازہ کھلا۔ دروازے پر موجود تنومند محافظ نے رکوع کے بل جھک کر تعظیم پیش کی۔ قدرت اللہ تیز قدموں سے باہر نکلا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا۔ وہ حسبِ معمول پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس کے پیچھے اس کے دو چیلے تھے۔ ان میں سے لمبے بالوں والے شاہی کو رستم نے صاف پہچانا۔ قدرت اللہ کو دیکھتے ہی اردگرد موجود بہت سے عقیدت مند اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ پیشانیوں تک لے جا کر سلام کیا۔ قدرت اللہ فون پر بات کرتا ہوا

اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے باقی چیلے کمرے کے اندر ہی موجود رہے۔

رستم اور ناصر دل مسوس کر رہ گئے۔ رستم نے سرگوشی کی۔ ''میرا خیال ہے کہ خبیث نکل گیا ہے۔ اب کمرے میں واپس نہیں آئے گا۔''

''جی ہاں۔ ہم دس پندرہ منٹ تک لیٹ ہو گئے ہیں۔'' ناصر نے جوابی سرگوشی کی۔

''پھر اب کیا کرنا ہے؟ باقی سارے شیطان تو کمرے میں ہیں۔''

''لیکن جب سرغنہ ابلیس ہی نہیں تو فائدہ؟'' ناصر نے کہا۔

''اچھا میں باہر جا کر اجمل کو صورتِ حال بتاتا ہوں۔ اس بات کی اُمید تو ہے کہ شاید وہ دوبارہ کمرے میں آئے...... کیونکہ بیٹھک ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ دوبارہ آتا ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہو گی۔ ایسے میں تم فوراً مجھے موبائل پر اطلاع دو گے۔''

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اندر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا قدرت اللہ بھی آج اسی طرح بچ جائے گا جس طرح چند دن پہلے ڈپٹی ریاض بچا ہے؟

پہلی چیکنگ کے مرحلے سے گزرنے کے بعد وہ صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے چند مردوزن کو بائیں طرف ایک راستے پر مڑتے دیکھا۔ ایک دو افراد کے ہاتھ میں اسے لوٹے بھی نظر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس طرف پیشاب اور طہارت وغیرہ کی جگہ ہے۔ رستم بھی صدر دروازے کی طرف جاتے جاتے اس راستے پر مڑ گیا۔ یہاں آگے جا کر ایک قطار میں بہت سے باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ اگلی قطار کے پیچھے دو قطاریں اور تھیں۔ وہ سب سے پچھلی قطار کے ایک خالی باتھ روم میں چلا گیا۔ یہ سب باتھ روم لو فلش تھے اور یہاں ہلکی سی بُو بھی تھی۔ ہر باتھ روم کی عقبی دیوار میں ہوا کی آمدورفت کے لیے ایک چوکور کھڑکی تھی جس میں جالی لگائی گئی تھی۔ رستم نے اس جالی میں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہاں حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اسے چھوٹے بڑے درخت دکھائی دیئے۔ یہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کوئی پہرے دار بھی دکھائی نہیں دیا۔ رستم کے اندر ترنگ سی پیدا ہوئی۔ اس نے جھک کر اپنی جوتی اتاری۔ جوتی کے موٹے تلوے میں ایک تیز دھار چاقو کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ چاقو کا پھل دو دھاری تھا اور ایک دھار کی طرف چھوٹے چھوٹے دندانے تھے۔

اگلے دو تین منٹ کے اندر رستم نے اس چاقو کی مدد سے کھڑکی کی بوسیدہ جالی پھاڑ دی

اور باتھ رومز کی عقبی جانب نکلنے کے لیے راستہ بنالیا۔ وہ تھوڑی دیر تک احتیاط سے ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا پھر بڑی مہارت سے اپنے جسم کو چوکور خلا میں سے گزار کر دوسری طرف لے گیا۔ قسمت نے یاوری کی، آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا ان گھنے درختوں میں آ گیا جو بیرونی دیوار کو اپنے عقب میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کھڑکی کی پھٹی ہوئی جالی کسی بھی وقت کسی کی نگاہ میں آ سکتی تھی۔ درختوں کے اندر ہی اندر چلتا ہوا وہ عمارت کے رہائشی حصے کی طرف آیا۔ وہ جانتا تھا کہ قدرت اللہ دوپہر کے کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اسی رہائشی حصے میں آیا ہو گا..... اچانک رستم کو ایک الگ تھلگ اور تنگ سا زینہ نظر آیا۔ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس زینے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ زینے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اوپر سے آنے والی ایک آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔

''کون ہے بھئی؟'' ایک شخص پکارا۔ رستم نے دیکھا یہ قدرت اللہ کا چیلا شاہی تھا۔ اس کے تیل میں چپڑے ہوئے بال اور سرمہ لگی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دم چوکنا سا ہو گیا تھا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ اگر اسے کسی طرح کا شک پڑ گیا تو وہ ایک دم چلانا شروع کر دے گا اور اردگرد موجود محافظ متوجہ ہو جائیں گے۔

رستم نے مسکین آواز میں کہا۔ ''چھوٹے حضرت صاحب! میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' یہ آٹھ دس الفاظ کہتے ہوئے رستم زینے طے کر کے شاہی کے بالکل قریب پہنچ گیا پھر اچانک ہی شاہی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ رستم نے وفعتاً جھپٹا مار کر شاہی کو جکڑ لیا۔ اس کا دایاں بازو شاہی کی گردن سے یوں لپٹا کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ رستم کے بائیں بازو نے شاہی کو کمر سے یوں جکڑا کہ اس کے دونوں بازو بھی اس شکنجے میں آ گئے۔ شاہی کے چربیلے جسم میں جنگلی بھینسے کی سی طاقت تھی۔ وہ جوان تھا، اس کے باوجود مرغن خوراکوں کی وجہ سے اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ اگلے پانچ چھ سیکنڈ میں اس نے اپنی گردن بازو کے خوفناک شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہ اپنی جان بچانے کا ایک فطری عمل تھا مگر..... وہ اپنے حصے کی تمام بھنی ہوئی مرغیاں اور مچھلیاں کھا چکا تھا۔ وہ تمام سادہ لوح عورتیں بھی اس کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھیں جن کی قسمت میں خراب ہونا لکھا تھا۔ آج اس حویلی کے ان نیم تاریک زینوں میں اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ اس کی موٹی گردن پر رستم کی گرفت نہایت مہلک اور ناقابلِ شکست تھی۔ وہ اصل میں اجمل خان کا شکار تھا لیکن زندگی موت کے کھیل میں کبھی شکار اور شکاری بدل بھی جاتے ہیں۔

وہ رستم کی گرفت میں پھڑکتا رہا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس نے قے کی، جو اس کے گلے تک آ کر پھر اس کے پیٹ میں واپس چلی گئی۔ اس کی مزاحمت کمزور ہوتی گئی اور ختم ہو گئی۔ رستم اس کے چربی دار جسم کو گھسیٹتا ہوا بالائی زینے تک لے آیا۔ شاہی کے سر پر لگے ہوئے سرسوں کے تیل اور گھٹیا عطر کی خوشبو رستم کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ بالائی زینے پر پہنچ کر رستم نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک خالی برآمدہ دکھائی دیا۔ زینوں کے بالکل پاس ایک کمرے کا ادھ کھلا دروازہ تھا۔ یہاں کاٹھ کباڑ نظر آیا۔ رستم شاہی کی لاش کو گھسیٹتا ہوا اس کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک پھٹا پرانا شامیانہ پڑا تھا۔ رستم نے شاہی کی تلاشی لی کہ شاید کوئی ہتھیار مل جائے مگر کوئی ہتھیار نہ مل سکا۔ رستم نے لاش کو شامیانے کے کپڑے کے نیچے کر دیا اور محتاط قدموں سے باہر نکل آیا۔ تیز دھار چاقو اس کی بغلی جیب میں تھا اور کسی بھی وقت اس کے ہاتھ میں آ سکتا تھا۔

یہ حویلی کی بالائی منزل تھی اور قدرے سنسان محسوس ہو رہی تھی۔ رستم ایک اندرونی راہداری میں چلا گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ ایک کھڑکی میں سے اس نے نیچے دیکھا۔ لنگر کھل گیا تھا۔ لنگر لینے والوں کی دو طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں یکایک قریب سے ابھرنے والی کچھ آوازوں نے رستم کو چونکایا۔ یہ آوازیں ایک اندرونی کمرے میں سے آ رہی تھیں۔ رستم نے چاقو ہاتھ میں لے لیا اور بند دروازے کی طرف بڑھا۔ اندازہ ہوا کہ دو عورتیں بول رہی ہیں۔ ایک جوان عورت بڑے تند لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ رستم نے ایک کھڑکی سے کان لگائے۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ ''میں نے کہا ہے ناں ماسی! میں نے نہیں نہانا... نہیں نہانا۔''

''اچھا...... چل خیر سر ہی دھو لے۔ دیکھ، بال کس طرح رسّے بن گئے ہیں۔''

''نہیں، بالکل ٹھیک ہیں۔'' روہانسی آواز میں کہا گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بڑی عمر کی عورت بولی۔ ''اچھا پھر کپڑے بدل لے۔ بالکل میلے ہو رہے ہیں۔ حضرت جی تیرے پاس آئیں گے تو انہیں بُو آئے گی۔''

''تو آنے ان کو بُو... میں تو کہتی ہوں، اس بُو سے... مر جائیں وہ۔''

عورت گھبرا کر بولی۔ ''ہائے میں مر گئی۔ کیسی باتیں کر رہی ہے تُو۔ خدا سے ڈر... اللہ والوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہیں کرتے۔ وبال... ہے۔ اور وہ تو تیرے سر کے سائیں بھی ہیں۔''

''کوئی نہیں میرے سر کا سائیں... کوئی نہیں۔'' لڑکی چلا کر بولی۔ ''میرے ساتھ جو

کچھ کیا گیا زبردستی کیا گیا۔ مجبور کر کے کیا گیا۔ میں کسی کو نہیں مانتی۔''

''تیرے نہ ماننے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ جو ہے وہ تو ہے ہی۔ اور یہی بات تو یہ ہے کہ تُو ناقدری کر رہی ہے۔ حضرت صاحب نے تجھے عزت دی ہے۔ پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔''

''اللہ کرے وہ تیری دھی کو بھی اسی طرح عزت دیں اور پھولوں کی طرح رکھیں۔ تُو چلی جا یہاں سے...... میں کہتی ہوں چلی جا۔'' لڑکی کرب ناک آواز میں بولی۔ اس نے شاید عورت کو دھکا دیا تھا۔ بہر حال عورت اندر ہی موجود تھی۔

رستم نے دروازے کے کی ہول میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اسے ایک لڑکی پہلو کی طرف سے دکھائی دی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر کہنیوں سے لے کر کلائیوں تک پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ پھر لڑکی کی تلخ آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ وہ بڑی عمر کی عورت سے کہہ رہی تھی۔ ''ایک مہینہ ہو گیا ہے، مجھے یہاں روتے کرلاتے ہوئے۔ کوئی میری فریاد نہیں سنتا اور تم کہتی ہو مجھے پھولوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ خدا کے لیے...... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے جانے دو میرے گھر والوں کے پاس۔''

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ لڑکی کہہ رہی تھی کہ وہ ایک مہینے سے یہاں بند ہے۔ اس کے دونوں بازو بھی زخمی تھے۔ وہاں گاؤں میں بھی لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ فضلو کی لڑکی کو اغوا ہوئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ اس نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی اور اس کے دونوں بازو بھی زخمی ہوئے تھے...... کہیں...... یہ وہی لڑکی شاہدہ تو نہیں تھی؟

لیکن پھر فوراً دوسرا خیال رستم کے ذہن میں آیا۔ شاہدہ والے معاملے میں تو راجا نوازش نامی زمیندار کا نام آ رہا تھا۔ پھر ایک دوسری بات بھی تھی۔ قدرت اللہ کے لیے عورتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک عرصے تک تین بیویوں کا بلا شرکت غیرے مالک رہا تھا۔ اب بھی اس کی سینکڑوں مریدنیوں میں سے کوئی بھی اس کے اشارے پر مسز حضرت صاحب بن سکتی تھی۔ اسے ایک مزارعے کی لڑکی کو زبردستی اپنے بیڈروم میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر رکوع کے انداز میں جھک کر کی ہول سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کی ہول کے سامنے تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں رستم نے لڑکی کو دیکھا اور اس کی صورت ذرا جانی پہچانی سی لگی۔ اسی دوران میں رستم کو اندازہ ہوا کہ بڑی عمر کی عورت کمرے سے باہر آ رہی ہے۔ اس کی فقط ٹانگیں ہی رستم کو دکھائی دے رہی تھیں۔

رستم جلدی سے ایک چوکور ستون کی اوٹ میں چلا گیا۔ چالیس پینتالیس سال کی فربہ اندام عورت کمرے سے نکلی اور راہداری میں گم ہو گئی۔ رستم نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے دروازے کو دو تین بار ہولے سے ہلایا، دروازہ کھلا تھا مگر رستم نے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ چند سیکنڈ بعد لڑکی نے دروازہ کھولا اور تعجب سے رستم کو دیکھا۔ ''کون ہو تم؟'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میں تمہاری مدد کے لیے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے گاؤں سے۔''

وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ ''م...... میں تمہیں نہیں جانتی۔''

''لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم راجا نوازش کو جانتی ہو ناں؟'' رستم نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

اندازہ ہوا کہ یہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ لڑکی کا خوف قدرے کم ہوا۔ ''کہاں ہے راجا نوازش؟'' وہ ہکلائی۔

''اس کو بھی تمہارے سامنے لے آؤں گا۔ فی الحال میں تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے آیا ہوں۔ میرے کچھ ساتھی بھی ہیں یہاں۔ تم چاچا فضلو کی بیٹی ہو ناں؟''

اس نے اپنا سر بے ساختہ اثبات میں ہلا دیا۔ یہ دوسرا تیر بھی عین نشانے پر پہنچا تھا۔ یہ فضلو ہی کی بیٹی تھی۔ رستم نے سوچا بھی نہ تھا کہ قدرت اللہ کے آستانے میں اس طرح اس لڑکی سے ملاقات ہو جائے گی۔ ''اندر آنے کا نہیں کہو گی؟'' رستم نے پوچھا۔

اس مرتبہ وہ جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے دونوں بازو پلاستر میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔ روشنی میں رستم نے ذرا غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ اس لڑکی کی شکل کافی حد تک قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف سے ملتی ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو ستر اسی فیصد مشابہت ضرور موجود تھی۔ صدف ملتان کے آستانے میں ہلاک ہو چکی تھی۔ رستم کو معلوم تھا کہ قدرت اللہ نے اس کا بہت سوگ منایا ہے۔

''تم صدف کی رشتے دار ہو؟'' رستم نے اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔

''شاید تم قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی کی بات کر رہے ہو؟''

رستم نے اقرار میں سر ہلایا۔

''نہیں، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔''

''مگر تمہاری شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک اس سے ملتا ہے۔''

"یہی تو میری بدقسمتی ہے۔" لڑکی کراہی۔ "اپنے اسی ناکردہ گناہ کی سزا میں، مَیں یہاں ہوں۔ قدرت اللہ کو اس کی مری ہوئی بیوی تو نہیں مل سکتی مگر میں کرماں ماری اس کے ہتھ آ گئی ہوں۔" وہ سسک پڑی۔

ایک دم بات رستم کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔ "راجا نوازش اس بہروپیے قدرت اللہ کا مرید ہے؟"

"ہاں۔ جب سے راجا کا بیٹا پھانسی سے چُھوٹا ہے، راجا، قدرت اللہ کے پاؤں میں بیٹھنے لگا ہے۔ قدرت اللہ کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرنا وہ اپنا دین ایمان سمجھتا ہے...... اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہی اس کُتے نے مجھے اس دوزخ میں ڈالا ہے۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ پہلے وہ اپنے کسی جاننے والے کے لیے میرا رشتہ مانگتا رہا پھر مجھے زبردستی یہاں لے آیا۔ اس کا جاننے والا یہی قدرت اللہ تھا۔" وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

رستم نے کہا۔ "دیکھو...... یہ سب باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ ابھی ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ میں تمہیں جیسے بتاتا ہوں تم نے ویسے ہی کرتے جانا ہے۔" رستم نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کرلیا اور اسے جلدی جلدی سمجھانے لگ گیا۔

اچانک لڑکی شاہدہ بری طرح بدک گئی۔ اس کے بدکنے کی وجہ قدموں کی وہ چاپ تھی جو راہداری سے سنائی دے رہی تھی۔

"قدرت اللہ آ رہا ہے۔" وہ ہکلائی۔

"گھبراؤ مت، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" رستم نے ایسے لہجے میں تسلی دی کہ ایک ہی لمحے میں شاہدہ کے خوف میں نمایاں کمی واقع ہوگئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ رستم بڑی تیزی سے ایک الماری کے پیچھے چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور قدرت اللہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنہری ڈبا تھا۔ اس نے شاہدہ کو سرتاپا دیکھا اور قدرے ناراضگی سے بولا۔ "تم نے آج بھی کپڑے نہیں بدلے۔"

"بس...... بس...... یونہی...... شام کو بدل لوں گی۔" لگتا تھا کہ وہ قدرت اللہ کی آسیبی شخصیت کے سامنے کافی مرعوب رہتی ہے۔

پہلے تو یوں لگا کہ قدرت اللہ کوئی سخت بات کہے گا مگر پھر وہ ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے سنہری ڈبا کھولا۔ اندر سفید موتیوں کا ہار تھا۔ قدرت اللہ بولا۔ "یہ کراچی کے ایک میمن صاحب تحفے کے طور پر لائے ہیں۔ بالکل اصلی موتی ہیں...... یمن والے۔ آج کل

ایسے موتی کہاں ملتے ہیں......"

وہ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ قدرت اللہ ہار اس کے گلے میں ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جو غیب دانی کے دعوے رکھتا تھا اور بڑی اعلیٰ قسم کی پیشین گوئیاں کرتا تھا، اس بات سے بےخبر تھا کہ اس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر اس کا خطرناک ترین دشمن موجود ہے۔ وہ دشمن جسے ڈیڑھ دو سال پہلے مُردہ سمجھ لیا گیا تھا، اب اجل بکف اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ جب وہ ہار پہنانے میں مصروف تھا، رستم الماری کی اوٹ سے نکلا۔ اس نے شکاری چیتے کی طرح چند قدم احتیاط سے اٹھائے پھر ایکا ایکی اس پر جھپٹ پڑا۔ رستم کی پکڑ میں آنے سے ایک سیکنڈ پہلے شاید قدرت اللہ کو خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا اور گھومنا چاہا تھا مگر تب تک رستم کے بازو کا شکنجہ اس کی گردن میں فٹ ہوگیا۔ قدرت اللہ نے دہشت کے عالم میں اپنے گلے سے گھٹی گھٹی آواز نکالی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ویسے اس نے رستم کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس جھلک کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں گہری حیرت چمکی تھی۔ غالباً اس کی نہایت تیز نظروں نے رستم کو پہچان لیا تھا۔ اس پہچان کے ساتھ ہی اس نے سوچا تھا کہ وڑے ڈیرے پر فنا ہو جانے والا شخص کس کلیئے کے تحت دوبارہ زندہ ہوا ہے اور اس کی گردن تک پہنچا ہے؟ رستم نے بڑی بےرحمی سے اس کا سر دو مرتبہ کمرے کی پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر کچھ زیادہ ہی شدید تھی۔ قدرت اللہ مُردہ چھپکلی کی طرح رستم کے بازوؤں میں جھول گیا۔ رستم نے اس عزت مآب کو کسی حقیر شے کی طرح شاہدہ کے قدموں میں لٹا دیا۔ شاہدہ کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا منہ اپنے دونوں زخمی ہاتھوں میں دبا رکھا تھا۔

رستم نے اس کا شانہ سہلا کر اسے تسلی دی۔ وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی اور اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

رستم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی اور اپنا موبائل فون نکال لیا۔ کام شروع ہو چکا تھا۔ اب وہ ہر خطرے سے بےنیاز تھا۔ اس نے پہلے ناصر کو فون کیا۔ ناصر ابھی تک اپنے بچے کے ساتھ انتظار گاہ میں ہی تھا۔ فون پر لوگوں کے بولنے اور بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے پوچھا۔ "چیلے بیٹھک میں ہی ہیں؟"

"ہاں جی، ابھی تک تو بیٹھک میں ہیں لیکن قدرت اللہ واپس نہیں آیا۔"

"وہ اب نہیں آئے گا...... تم چوکس ہو جاؤ...... ابھی تھوڑی دیر میں اجمل گاڑی لے کر اندر گھسنے والا ہے۔ عام لوگوں کو بھگا دو۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے لیکن بیٹھک والوں

میں سے کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اُڑا دو سب حرامیوں کو۔'' رستم کے لہجے میں درندگی تھی۔

''مگر قدرت اللہ اور شاہی۔''

''سمجھو وہ اب نہیں ہیں۔'' رستم نے اسی لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد رستم نے اجمل کو فون ملایا۔ وہ رستم کی ہدایت کے مطابق صدر دروازے سے باہر ٹیکسی کار میں ہی تھا۔ ''ہاں جوان ... ریڈی؟'' رستم نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''ایک سو دس پی صد ریڈی۔''

''اسلحہ سیٹ پر؟''

''جی ہاں اسلحہ سیٹ پر۔''

''ہینڈ گرینیڈ جیبوں میں؟''

''ہاں جی۔ واسکٹ کی جیبوں میں۔''

''ٹھیک ہے، گاڑی ڈرائیو کر کے سیدھی اندر گھسا دو۔ ناصر تمہیں بتائے گا کہ بیٹھک کہاں ہے۔ بیٹھک میں سے کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔''

''آپ پکر ہی نہ کریں جی۔ ایک دم صفایا ہو گا۔ چوہے کا بچہ بھی زندہ نہیں نکلے گا۔'' اجمل کی آواز سنسنی کے سبب کانپ رہی تھی۔ پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔ وہ رستم کو مخاطب کر کے بولا۔ ''لیکن آپ ام کو کہاں ملے گا۔''

''مجھ کو چھوڑو۔ میں اپنے حساب سے پہنچ جاؤں گا۔ تم بس کام کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' رستم کے لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا۔

''ٹھیک ہے رستم بھائی! اگر زندہ بچ گئے تو اس موقع کے حوالے سے ام آپ کو ایک بڑا اچھا شعر سنائے گا۔''

اجمل سے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد رستم شاہدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم ایک بڑی چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹ لو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں فائرنگ شروع ہو جائے گی اور ایک دو دھماکے ہوں گے۔ ڈرنا نہیں ... دھماکے ہونے کے فوراً بعد آس پاس کے لوگ نیچے بھاگیں گے۔ اس وقت ہم بھی یہاں سے نکلیں گے اور نیچے پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ ہم اس میں سوار ہوں گے اور نکل جائیں گے۔''

شاہدہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شاداب جسم اور جاذب نظر چہرے والی لڑکی تھی لیکن یہاں کی قید اور ستمگری نے اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی دونوں کلائیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور وہ اسی حالت میں قدرت اللہ کی محبت یعنی دست

درازی کا شکار تھی۔

اچانک رستم کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے فرش پر بے ہوش پڑے قدرت اللہ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب میں سے اسے مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ ایک بھرا ہوا نئی پسٹل تھا۔ رستم نے پسٹل اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ لڑکی نے چادر لے لی اور اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ وہ دونوں اب بالکل تیار تھے۔ قریباً ڈیڑھ دو منٹ سخت تناؤ میں گزرے۔ پھر نیچے کہیں سے شور سنائی دیا۔ ایک ساتھ بہت سے لوگوں کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ آستانے کے وسط میں کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پہلے فائر ہوئے۔ رستم نے پہچان لیا۔ یہ کولٹ پسٹل کے فائر تھے۔ کولٹ پسٹل یقیناً اجمل خان کے ہاتھ میں تھا اور اجمل کا نشانہ چوکتا نہیں تھا۔ وہ یقیناً مسلح پہرے داروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ آستانے کی بالائی منزل پر بھی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ رستم اور شاہدہ بھی بھاگنے کے لیے تیار ہو گئے۔

☆=======☆=======☆

جب رستم کا فون آیا تو اجمل کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔ وہ اسلحہ نکال کر سیٹ پر رکھ چکا تھا اور چھ میں سے تین دستی بم اس کی جیبوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ باقی تین بم گولیوں والے بیگ میں گولیوں کے ساتھ ہی موجود تھے۔ کینوس کا یہ بیگ اجمل کے گلے سے جھول رہا تھا۔ اجمل جانتا تھا کہ یہ "M67" بم ہیں۔ ان پر ایم 67 فریگ مینٹیشن لکھا ہوا تھا۔ عام دستی بموں کی طرح ان کی بیرونی سطح خانے دار اور غیر ہموار نہیں بلکہ ملائم تھی۔ کسی کمرے میں لڑھکانے یا دور تک پھینکنے کے لیے یہ بڑے کارگر تھے۔ رستم نے اسے بتایا تھا کہ یہ پانچ میٹر کے قطر میں بندے کی جان لے لیتے ہیں اور ان کے زخمی کرنے کی حد پندرہ میٹر قطر کا دائرہ ہے۔ اجمل کو یقین تھا کہ آج یہ بم مہلک ترین ثابت ہوں گے۔

اور پھر موبائل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف رستم بھائی تھے۔ ''ہاں جوان ریڈی؟'' رستم نے پوچھا۔

''ایک سو دس پی صد ریڈی جی۔''

''اسلحہ سیٹ پر؟''

''جی ہاں، اسلحہ سیٹ پر۔''

''ہینڈ گرینیڈ جیبوں میں؟''

''ہاں جی، واسکٹ کی جیبوں میں۔''

اس کے بعد رستم نے اجمل کو اٹیک کی ہدایت کی۔

اجمل کے سینے میں دھڑکن کا نقارہ بجنے لگا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے اس نے چند مرتبہ ایکسلریٹر دبایا۔ ٹیکسی کار کا رخ موڑ کر آستانے کے پھاٹک کی طرف کیا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے

ٹیکسی کو پھاٹک کی طرف روانہ کر دیا۔ طاقتور کولٹ پسٹل اجمل کے دائیں ہاتھ میں تھا اور یہ دایاں ہاتھ پسٹل سمیت اسٹیئرنگ پر تھا۔ گیٹ پر موجود محافظوں نے خوف کے عالم میں کار کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان میں سے ایک جو زیادہ پھرتیلا تھا۔ چلایا۔ ''اوئے۔''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اجمل کے کولٹ پسٹل کی گولی بالکل نشانے پر یعنی محافظ کے کھلے ہوئے منہ میں لگی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا۔ دوسرے محافظ نے اپنا دایاں ہاتھ رائفل کی طرف بڑھایا مگر اگلے ہی لمحے وہ بھی اپنی پیشانی پر سرخ بندیا لگوا کر گیٹ کے بیچوں بیچ گرا۔ کار اس کے جسم کو کچلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ دوسری چیکنگ تک پچیس تیس میٹر کا فاصلہ کار نے پلک جھپکتے میں طے کیا اور ٹوکن دینے والے دو افراد سے ٹکرائی۔ وہ چلاتے اور ہوا میں اچھلتے ہوئے نظر آئے۔ ٹیکسی کار نے دھماکے کے ساتھ ایک کشادہ دروازے کو توڑا۔ دروازہ چکنا چور ہوا اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسی کار کی ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ گئی۔

رستم کی ہدایت کے عین مطابق اجمل نے کار ایک سفید دروازے سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک سنہری رنگ کے بڑے فانوس کے نیچے روکی۔ ناصر اور ڈولا دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ اجمل نے اے کے 52 رائفل ناصر کی طرف اچھالی اور ایل ایم جی خود سنبھال لی۔

''وہ سامنے سفید دروازہ ہے۔'' ناصر نے پکار کر کہا۔

''سب اندر ہی ہیں؟''

''ہاں، ابھی اندر ہی ہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی رائفل سے تین سنگل شاٹ چلائے۔ ایک مسلح محافظ تڑپ کر گرا اور بھاگتے ہوئے زائرین کے قدموں تلے روندا گیا۔ اسی دوران میں اجمل نے بھی زائرین کو مزید خوف زدہ کرنے کے لیے ایک طویل برسٹ چلا دیا تھا اور پھر سفید دروازہ دھماکے سے کھلا۔ اطلاع کے مطابق اندر قدرت اللہ کے قریباً پندرہ عدد خصوصی چیلے موجود تھے۔ سب سے پہلے لمبے سیاہ بالوں والا ایک دراز قد چیلا نظر آیا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں اور چہرہ حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل بھاگتا، اجمل نے ایک چھوٹا برسٹ چلایا۔ چیلا چلا کر دائیں طرف گرا، ایک دو گولیاں پچھلے شخص کو بھی لگیں۔ دروازہ زوردار آواز سے بند کر دیا گیا۔

''ان حرامیوں میں سے کسی کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔'' ناصر پکار کر بولا۔

''نہیں نکلے گا۔'' اجمل نے بھی پکار کر جواب دیا اور سامنے زینوں سے اترتے ہوئے ایک گارڈ پر جوابی فائر کیا۔ گارڈ نے گردن میں گولی کھائی اور سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا سر کے

بل فرش پر گرا۔

ڈولا ایک بڑے ستون کی اوٹ میں تھا۔ وہ مار دھاڑ والا شخص نہیں تھا لیکن ایسے موقعوں پر اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا تھا۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کا رخ انتظار گاہ کی طرف کر کے ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ یہ جگہ عام لوگوں سے بالکل خالی ہو جائے۔ سفید دروازہ بند ہو گیا تھا اور بیٹھک میں مصروف چیلوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ اجمل نے دروازے پر چند فائر کیے پھر ٹیکسی کار کی اوٹ میں ہو کر دستی بم نکال لیا۔ دائیں ہاتھ میں دستی بم لے کر اس نے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے بم کی پن کھینچی اس کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے بڑی احتیاط سے بم کے سیفٹی لیور کو دبا رکھا تھا...... وہ جانتا تھا کہ اس لیور کو دبا کر رکھنا ہی بم پھینکنے والے کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ گھما کر بم سفید دروازے پر پھینکا۔ چند سیکنڈ بعد سماعت شکن دھماکا تھا۔ دھواں پھیلا اور دروازے کے پرخچے اُڑتے نظر آئے۔ اس دوران میں اجمل اور ناصر دو مزید بموں کی سیفٹی پنیں کھینچ چکے تھے۔ فوراً ہی یہ دونوں بم بھی کمرے کے اندر لڑھکا دیئے گئے۔ یہ مہلک ترین حملہ تھا۔ چیلوں سے بھرے ہوئے اس مختصر کمرے میں "M67" بموں کی مار نے تہلکہ مچا دیا۔ کربناک...... اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخیں ابھریں۔

''ایک اور پھینکو۔'' ناصر نے پکار کر اجمل سے کہا۔

اجمل نے ایک اور پھینکا۔ یوں لگا جیسے آستانے کا یہ حصہ منہدم ہو جائے گا۔ دو تین لہو لہان چیلے تباہ حال کمرے کے اندر سے نکل کر بھاگے۔ ناصر نے صاف دیکھا، ان میں سے ایک کا بازو کندھے سے غائب تھا۔ دوسرے کی شلوار بس چند چیتھڑوں کی شکل میں باقی رہ گئی تھی۔ اجمل اور ناصر نے بے دریغ فائرنگ کی اور ان کو بھی سفید دروازے کے عین سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

اسی دوران میں دائیں طرف زینوں سے فائرنگ ہوئی۔ دو گولیاں ناصر کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ ایک گولی اجمل کے سینے میں بائیں طرف لگی۔ وہ جھٹکے سے فرش پر گرا مگر ایل ایم جی بہ دستور اس کے ہاتھ میں رہی۔

''اجمل... اجمل۔'' ناصر اس کی طرف بڑھا۔

گولی اس کے سینے پر ذرا اوپر کندھے کی طرف لگی تھی۔ اس کی قمیص خون سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں بھی اس نے دو جوابی فائر کیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناصر کو یہ دیکھ کر قدرے تسلی ہوئی کہ گولی کا اینگل زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ اجمل نے بڑے دھیان

سے بیٹھک والے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں اب قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ دھوئیں کے پس منظر میں بس جسموں اور کپڑوں کے چیتھڑے دکھائی دیتے تھے۔

''امارا خیال ہے، اب نکلنا چاہیے۔'' وہ بولا۔

اجمل کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ناصر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اجمل اور ڈولا پھرتی سے پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی اور ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ کھلی ڈکی کی وجہ سے اسے ریورس کرنا مشکل تھا۔ ناصر نے اسے یوٹرن دیا اور برق رفتاری سے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں اجمل نے پچھلی نشست سے چند فائر بھی کیے۔ کار کم از کم دو لاشوں کو کچلتی ہوئی صدر دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ صدر دروازے سے باہر بھی قیامت برپا تھی۔ عورتیں اور بچے چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ یہاں ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ احتیاطاً انہوں نے پارکنگ میں کھڑی تین چار گاڑیوں پر چند فائر کیے اور کچھ ٹائروں کو ناکارہ بنا دیا۔

ناصر نے موبائل پر رستم سے رابطہ کیا۔ ''آپ کہاں ہیں رستم بھائی؟''

''میں پاس ہی ہوں...... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ تم نکل جاؤ...... میں بھی نکل رہا ہوں۔'' رستم کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ٹیکسی کار کچے راستے پر دو دو فٹ اچھلتی ہوئی پکی سڑک کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ جھٹکوں کے ساتھ اس کی ڈکی خود بخود ہی بند ہو گئی تھی۔ ونڈ اسکرین کے ٹکڑے جھڑ جھڑ کر گاڑی کے اندر گر رہے تھے۔ اجمل اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا پہلو خون آلود تھا۔

''اجمل، کیسے ہو؟'' ناصر نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''ام کو لگتا ہے کہ امارا آخری وقت آ گیا ہے۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ناصر سرتاپا کانپ گیا۔

''ہاں ناصر بھائی، امارے پردادا کو جنگ آزادی میں ٹھیک اسی جگہ گولی لگا تھا اور وہ ٹھیک چار سال بعد مر گیا تھا...... شوگر کی وجہ سے۔''

ناصر نے چونک کر اجمل کی طرف دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ اجمل سیریس نہیں تھا۔ اجمل نے اسی لہجے میں کراہتے ہوئے کہا۔ ''ام کو یقین ہے، ام بھی اب چار پانچ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ ام سوچتا ہے، امارے بعد امارے بچوں کا کیا ہو گا۔''

''جو بچے ابھی پیدا نہیں ہوئے ان کے لیے پریشان ہو رہے ہو؟'' ناصر نے تیزی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

''اوہو......ان کو پیدا کرنے کا پریشانی تو ہے ناں۔''

ناصر نے گاڑی چلاتے چلاتے مڑ کر اجمل کا زخم دیکھا۔ گولی نیچے سے اوپر کو گئی تھی اور کندھے میں کہیں اٹک گئی تھی۔ زخم تکلیف دہ ضرور تھا مگر خطرناک نہیں تھا۔ اپنی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لیے ہی اجمل اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔ ایک ہولناک ہنگامے کے بعد خود کو اعصابی طور پر پُرسکون کرنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ تھا۔

تب ناصر کی نگاہ ڈولے کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی جڑ سے غائب تھی۔ یہاں کوئی آوارہ گولی لگی تھی۔ ہاتھ خون آلود ہو رہا تھا۔ ڈولے نے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا تھا۔ ''زیادہ تکلیف تو نہیں؟'' ناصر نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ڈولے نے حوصلے سے کہا۔ گرم نال والا پستول اس کی گود میں رکھا تھا۔

ناصر کی نگاہ بار بار عقب نما آئینے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ یہ خدشہ ابھی موجود تھا کہ ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اس تعاقب سے نمٹنے کے لیے وہ پوری طرح تیار بھی تھے۔

گاڑی چھانگی وال سے پانچ چھ کلومیٹر آگے آگئی تو انہیں قدرے اطمینان ہو گیا۔ ناصر نے گاڑی ایک بغلی راستے پر موڑ دی۔ ڈولا کچھ خاموش سا ہو گیا تھا......خاموش اور مضطرب! پہلے تو ناصر نے سمجھا کہ شاید یہ زخم کی وجہ سے ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی غیر معمولی حسیات اسے کوئی وارننگ دے رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ڈولے؟ تم پریشان ہو؟'

''نن......نہیں۔'' اس نے رُکھی انداز میں کہا اور چاروں طرف دیکھنا جاری رکھا۔

''کوئی شک ہو رہا ہے تمہیں؟'' اجمل نے پوچھا۔

''ہاں...... لگتا ہے......لگتا ہے کہ......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور زیادہ مضطرب نظر آنے لگا۔

''کیوں الجھن میں ڈال رہے ہو؟'' ناصر نے ذرا تلخی سے کہا۔

''لگتا ہے کہ کوئی...... اور بھی ہمارے ساتھ......موجود ہے۔'' ڈولے نے عجیب لہجے میں کہا۔

''کہاں موجود ہے؟'' ناصر ششدر تھا۔

''یہاں......آ......آپ ذرا گاڑی روکیں۔''

ناصر نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں گاڑی ایک طرف کھیت کے کنارے روک دی۔ دور فاصلے پر دو تین کھیت مزدور اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ کسی ڈیزل انجن کی ''ٹھو ٹھو'' کے سوا چہار سُو خاموشی تھی۔ ڈولا جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ ہی اجمل اور ناصر بھی آ گئے۔ ڈولے کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی جیسے وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پا رہا ہو۔ وہ گاڑی کی ڈکی کی طرف بڑھا۔ لگتا تھا کہ ڈکی پوری طرح بند نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈولا ڈکی کی طرف ہاتھ بڑھاتا، وہ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ تڑ تڑ کی خوفناک آواز سے خودکار رائفل کا برسٹ چلا۔ ناصر نے ڈولے کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ ڈکی میں قدرت اللہ کا ایک جنونی مرید موجود تھا۔ وہ ایک دل ہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ باہر آیا۔ خوش قسمتی سے ایل ایم جی ابھی تک اجمل کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے جوابی فائر کیا۔ وہ ماہر ترین نشانہ باز تھا مگر جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور حواس باختہ کر دینے والا تھا کہ اجمل کا پہلا نشانہ خطا گیا۔ حملہ آور نے دوسرا برسٹ چلانے کے لیے خودکار رائفل سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ لبلبی دبا سکتا، ناصر کے کولٹ پسٹل کی گولی کام کر گئی۔ یہ گولی حملہ آور کے جبڑے میں لگی اور وہ اپنے پہلو پر گرا۔ اس کا چلایا ہوا برسٹ ہوا میں پرواز کر گیا۔ ناصر کی دوسری گولی دوبارہ اس کے چہرے پر لگی مگر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جنون کی کیفیت میں تھا۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ ناصر اور اجمل کی طرف بڑھا۔ ناصر نے پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کا رخ جنونی حملہ آور کی طرف تھا مگر ناصر نے تیسری گولی نہیں چلائی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور لمبے بالوں والے حملہ آور نے ناصر اور اجمل کی طرف بس پانچ چھ قدم ہی اٹھائے پھر تیورا کر پانی کے کھال کے پاس گر گیا۔

ناصر اور اجمل لپک کر ڈولے کی طرف گئے۔ اس کے چھوٹے سے سینے میں کم از کم تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اجمل خود بھی زخمی تھا مگر وہ اپنا زخم بھول گیا۔ اس نے تڑپ کر ڈولے کو کسی ننھے بچے کی طرح اپنی گود میں بھر لیا۔

''چھوٹو بھائی...... چھوٹو بھائی۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں ڈولے کو پکارا اور جھنجوڑا۔

ڈولے نے کھینچ کر سانس لیا اور دھندلائی ہوئی نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ اجمل نے پکار کر کہا۔

''ناصر بھائی۔ اس کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ یہ بچ جائے گا......ام کو یقین ہے، یہ بچ جائے گا۔''

ناصر کی آنکھوں میں مایوسی نظر آ رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ دیکھ چکا تھا کہ ڈولے کی زندگی بچنے کا چانس نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی وہ دونوں اسے کار تک لائے۔ اجمل کی گود میں ڈولے نے ہچکی لی اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں

''چھوٹو..... چھوٹو۔'' اجمل خان پکارتا رہا مگر ڈولا دیکھتے ہی دیکھتے جواب دینے کے مرحلے سے گزر گیا تھا..... ناصر نے نم آنکھوں کے ساتھ ڈولے کی پیشانی چومی اور اجمل نے اسے کسی بچے ہی کی طرح اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزدور ڈرے ڈرے انداز میں موقعہ واردات کی طرف آ رہے تھے..... جیسے وہ قریب آنا چاہ رہے ہوں اور ڈر بھی رہے ہوں۔ اجمل نے ایک شعلہ بار نظر مُردہ پڑے جنونی حملہ آور پر ڈالی۔ یہ حملہ آور انہی لوگوں میں سے تھا جو اس سے پہلے دو تین بار شانی بی بی پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ اجمل کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی گن کی باقی ساری گولیاں اس شخص کی لاش میں اتار دیتا مگر وقت بہت کم تھا۔ انہیں جلد از جلد یہاں سے آگے بڑھنا تھا۔ ناصر نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار کو آگے بڑھا دیا۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ موبائل کی بیل ہوئی۔ ناصر نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رستم تھا۔

''کہاں ہو ناصر؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کہاں ہیں؟'' ناصر نے جوابی سوال کیا۔

''میں نہر کے پل کے پاس پہنچ چکا ہوں۔''

''ہم بھی پل کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈھائی تین کلو میٹر دور ہوں گے۔''

''کیا بات ہے ناصر۔ تم پریشان لگ رہے ہو..... اجمل اور ڈولا تو خیریت سے ہیں؟''

ناصر چند سیکنڈ خاموش رہا۔ پھر وہ ہولے سے بولا۔ ''اجمل خیریت سے ہے۔''

''کیا مطلب؟ ڈولے کو کیا ہوا؟''

''اسے گولی لگ گئی ہے۔''

''وہ زخمی ہے؟''

''نہیں رستم بھائی..... وہ ختم ہو گیا ہے۔'' ناصر کی آواز بھرا گئی۔

دوسری طرف کئی لمحوں تک سناٹا رہا پھر رستم کی بوجھل آواز ابھری۔ ''کیسے ہوا یہ؟''

''میں ابھی آ کر آپ کو بتاتا ہوں..... ڈولا ہمارے ساتھ ہی آ رہا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

مختصر الوجود ڈولا اجمل کی گود میں یکسر ساکت پڑا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون اجمل کے کپڑوں اور گاڑی کی نشست کو سرخ کر چکا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی انگلی والا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا تھا۔ یہاں اس نے کس کر اپنا رومال باندھا ہوا تھا۔ مگر یہ زخم اب بالکل بے معنی ہو چکا تھا۔

اجمل خان نے آستین سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''ام کو تم پر پخر (فخر) ہے چھوٹو بھائی۔ تم نے دوستی کا حق ادا کیا۔ اپنا آپ ام پر قربان کیا۔'' اس نے ڈولے کو ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔

☆=======☆=======☆

ڈولے کی موت کی خبر رستم پر بجلی بن کر گری تھی۔ مگر وہ چاروں حالت جنگ میں تھے..... اور حالتِ جنگ میں اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا افسوس تادیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض دفعہ تو ایسے بھی ہوتا ہے کہ میدانِ کارزار میں اپنے ہی پیاروں کی لاشوں کو آڑ کے طور پر استعمال کر کے جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ جنگ اور محبت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں۔

رستم اس وقت کار میں تھا۔ وہ بے ہوش قدرت اللہ کو ایک بیڈ شیٹ میں لپیٹ کر اور اپنے کندھے پر لاد کر آستانے سے باہر لایا تھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی شاہدہ بھی اس کے ساتھ تھی..... ان کے کار تک پہنچتے پہنچتے آستانے کے اندر ناصر اور اجمل نے ہنگامہ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ وقتی بموں کے ہولناک دھماکے ہو رہے تھے۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور یہ صورتِ حال دیکھ کر ہلدی ہو چکا تھا۔ رستم کے ہاتھ میں ٹی ٹی پسٹل تھا اور چہرہ آتش فشاں ہو رہا تھا [illegible] بے چارے کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ رستم نے اسے چابی تھمائی تھی اور [illegible] معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا تھا..... اور اب وہ برق رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے چھوٹی نہر کا پل پار کر چکے تھے۔ رستم کے کہنے پر ہانپتے کانپتے ڈرائیور نے گاڑی چند گھنے درختوں کے درمیان روک دی۔ رستم پچھلی نشست پر تھا۔ عزت مآب قدرت اللہ اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیانی خلا میں آڑا ترچھا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے زخمی سر سے خون رِس رہا تھا۔ اس کی بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں بدل رہی تھی۔ وہ کسمسانا شروع ہو گیا تھا۔ رستم نے اس کی پتلون میں سے بیلٹ نکالی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ پھر ایک کپڑے سے اس کے ٹخنے بھی اچھی طرح جکڑ دیئے۔ اب وہ ایک بندھی ہوئی مرغی کی طرح اس کے پاؤں کے نیچے بے بس تھا۔

شاہدہ چادر میں لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو

رہا ہے۔ وہ قدرت اللہ جیسے جن کو ایک حقیر کیچوے کی شکل میں دیکھ رہی تھی اور یہ عبرتناک منظر تھا۔

وہ رستم سے مخاطب ہو کر منمنائی۔ "آپ نے یہ بہت خطرناک کام کیا ہے۔ قدرت اللہ کے پہرے دار اور چیلے بڑے دوراچھے ہیں۔ وہ اس کو چھڑانے پیچھے آئیں گے۔"

رستم نے اطمینان سے کہا۔ "جو اسے آستانے میں نہیں بچا سکے یہاں آ کر بھی نہیں بچا سکیں گے ... تم بے فکر رہو۔"

"یہ آوازیں کیسی ہیں؟" لڑکی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

آوازیں رستم کو بھی آ رہی تھیں۔ یہ دور افتادہ آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں۔

رستم نے ڈرائیور سے کہا۔ "تم چوکس ہو کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

ڈرائیور بے دام کا غلام نظر آ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غالباً اس کا گلا اتنا خشک تھا کہ وہ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جم کر رہ گیا تھا۔

رستم ٹی ٹی سمیت باہر نکلا۔ اس نے چند قدم آگے جا کر ذرا نشیب میں دیکھا۔ اسے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گرد اڑتی نظر آئی۔ یہ درجنوں گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں اور دیگر سواریاں تھیں۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگ تھے۔ ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں بینرز اور کتبے وغیرہ ہیں۔ یقیناً یہ وہی جلوس تھا جس کے بارے میں رستم، ناصر اور اجمل کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے قریبی گاؤں میں سن کر آئے تھے۔ رستم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہو گئی۔

اسی دوران میں رستم کو پل کی دوسری جانب ڈائیوو کی ٹیکسی کار نظر آ گئی۔ وہ دھول اڑاتی ہوئی تیزی سے نہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی ونڈ اسکرین ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کے بونٹ پر بڑے بڑے ڈینٹ تھے۔ رستم نے موبائل پر ناصر کو اپنی لوکیشن بتائی۔ تقریباً دو منٹ بعد ٹیکسی کار درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ گئی۔

ذولے کا مُردہ چہرہ دیکھنا رستم کے لیے بھی ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے ہنستا بولتا اس سے جدا ہوا تھا اور اب یکسر خاموش پڑا تھا۔ رستم نے محبت سے اس کے چھوٹے سے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے چادر سے ڈھک دیا۔ اجمل بھی لہولہان تھا مگر اس کا زخم دیکھتے ہی رستم پہچان گیا کہ اس کی حالت خطرناک نہیں۔

"قدرت اللہ کہاں ہے؟" اجمل نے آتشیں لہجے میں کہا۔

"میرے ساتھ ہے۔"

"مر گیا یا زندہ ہے؟"

"ابھی زندہ ہے۔"

"ام اس کو اپنے ہاتھ سے مارے گا رستم بھائی۔ آپ نے ام سے وعدہ کیا تھا۔" اجمل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وہ کار کی طرف بڑھے۔ قدرت اللہ دونوں سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور اس رال میں خون کی سرخی بھی شامل تھی۔

اجمل نے اپنی گن سے نیا میگزین اٹیچ کر لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے وہ کار کے اندر ہی قدرت اللہ کو بھون کر رکھ دے گا۔

رستم نے اجمل کی گن پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا بیرل نیچے جھکا دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں پتا ہے، شانی بی بی اس خبیث کے بارے میں کیا کہتی رہی ہیں؟" پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ "وہ کہتی تھیں کہ قدرت اللہ کا قتل کوئی کارنامہ نہیں۔ اگر قدرت اللہ کو مارنا ہی ہے تو ایسے طریقے سے مارنا ہو گا کہ اس کے ساتھ اس کی سوچ بھی مرے۔ وہ جاہلیت بھی مرے جس نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہوا ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں رستم بھائی؟" اجمل کراہ کر بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تقدیر نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ہم قدرت اللہ کے گندے خون سے ہاتھ رنگے بغیر بھی اسے اس کے انجام سے دوچار کر سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ وہی راستہ ہے جس کے بارے میں شانی بی بی بھی سوچا کرتی تھیں۔"

"آپ کا مطلب ہے، ام اس کو چھوڑ دیں گے۔"

"ہاں اجمل خان! لیکن مجھے یقین ہے، اس کا انجام اسے نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں رستم بھائی؟" اجمل کے چہرے پر انتہا درجے کی بے چینی تھی۔

رستم نے اگلی سیٹ پر سمٹی سمٹائی شاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟"

"کون ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"یہ فضلو کی بیٹی ہے جسے ایک مہینہ پہلے پاس کے گاؤں سے اٹھایا گیا تھا۔ اور تمہیں پتا

ہے یہ کہاں سے برآمد ہوئی ہے؟'' اجمل اور ناصر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگے۔ ''یہ اس قدرت اللہ کے بیڈ روم سے برآمد ہوئی ہے۔ اس حرامی نے اسے زبردستی اپنے گھر میں ڈالا ہوا تھا۔''

یہ انکشاف اجمل اور ناصر کے لیے سنسنی خیز تھا۔

رستم نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا چہرہ دھوپ میں دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب زہرناک کیفیت تھی۔ اس نے دور کیکر اور نیم کے خودرَو درختوں کے پاران لوگوں کی طرف دیکھا جو ایک مشتعل جلوس کی صورت میں پسرور روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ غالباً وہ اپنا شدید احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے روڈ کو بلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ رستم نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ قدرت اللہ کو ایک اچھے انجام سے دوچار کرنے کے لیے قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔''

اس نے اجمل اور ناصر کو ساری صورتِ حال بتائی۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کاریں بڑی تیزی سے آگے پیچھے جلوس کی طرف جا رہی تھیں۔

دور سے صورتِ حال واضح نظر نہیں آئی تھی۔ قریب پہنچ کر ان تینوں نے دیکھا تو انسانوں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا۔ یوں لگتا تھا کہ اردگرد کا پورا علاقہ اس احتجاجی جلوس میں اُمڈ آیا ہے۔ لوگ راجا نوازش اور انتظامیہ کے خلاف فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے راجا نوازش اور ایک بڑے سرکاری افسر کے پتلے اٹھا رکھے تھے اور انہیں بڑی سڑک پر نذرِ آتش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بوڑھے فضلو کی طرف سے اعلان تھا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اس کی بچی برآمد نہ ہوئی تو وہ اور اس کے بیٹے لاہور جا کر خود کو زندہ جلا لیں گے۔ رستم نے بڑے ڈرامائی انداز میں دونوں کاریں جلوس کے عین سامنے رکوائی تھیں۔ مشتعل لوگوں کا لہریں لیتا ہوا دریا گاڑیوں کے سامنے رک گیا۔ رستم، ناصر اور زخمی اجمل گاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ چند لمحے تک سنسنی خیز سکوت طاری رہا...... پھر کسی نے دھاڑ کر پوچھا۔ ''اوئے کون ہو تم؟''

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا، جلوس میں موجود کچھ افراد نے انہیں پہچان لیا۔ کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں پھر دو افراد ہجوم میں سے تیزی سے راستہ بناتے آگے بڑھ آئے۔ ان میں سے ایک وہی پٹواری کا ملازم پہلوان نما شخص تھا جس سے شروع میں ناصر اور اجمل کی تو تکرار ہوئی تھی۔ اس نے بڑے تعجب سے زخمی اجمل اور ٹوٹی پھوٹی ٹیکسی کار کو دیکھا۔

''یہ کیا ہوا بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت کچھ ہوا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''فضلو کی بیٹی برآمد ہو گئی ہے۔''

آخری الفاظ پہلوان نما شخص پیرد کے لیے بے حد تحیر خیز ثابت ہوئے۔ اس نے ہونقوں کی طرح رستم کا چہرہ دیکھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہے کُڑی؟''

''وہ سامنے گاڑی میں جو لڑکی بیٹھی ہے، شاہدہ ہی ہے۔'' رستم نے کہا۔

دونوں افراد کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی نگاہیں ٹیکسی کار میں موجود شاہدہ پر مرکوز ہو گئیں۔ رستم نے کہا۔ ''آپ دونوں یہیں ٹھہرو۔ میں لڑکی کو آپ کے پاس لاتا ہوں۔''

وہ گیا اور چادر میں لپٹی لپٹائی، لرزتی کانپتی شاہدہ کو لے کر جلوس کے سامنے آ گیا۔ جلوس کے سینکڑوں شرکاء میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل گئی کہ فضلو کی بیٹی برآمد ہو گئی ہے۔ وہ ابھی تک پردے میں تھی۔ فضلو اور اس کے چند قریبی رشتہ دار آگے آئے اور انہوں نے شاہدہ کو پہچان لیا۔ فضلو نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اردگرد موجود لوگوں کی آنکھیں بھی اَشک بار ہو گئیں۔ جلوس میں خوشی اور تحیر کی لہر دوڑ گئی۔

جلوس کے سرکردہ افراد آگے آ گئے۔ انہوں نے رستم اور ناصر وغیرہ سے تفصیل پوچھی۔ رستم نے کہا۔ ''یہ سب کچھ آسانی سے نہیں ہوا ہے بھائیو۔ میرے ایک دوست کی جان گئی ہے۔ اس کی لاش سامنے ٹیکسی میں پڑی ہے۔ یہ دوسرا دوست سخت زخمی حالت میں آپ کے سامنے کھڑا ہے۔''

''کہاں تھی ہماری دھی رانی؟'' ایک معزز بوڑھے نے شاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک ایسی جگہ پر تھی جس کے بارے میں آپ لوگوں کو ذرا مشکل سے یقین آئے گا۔ اس کو اغوا کرانے اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کا نام اگر آپ اس کی زبان سے ہی سنیں تو اچھا ہے۔''

راستے میں رستم شاہدہ کو زبان کھولنے کے لیے پوری طرح آمادہ کر چکا تھا۔

معزز افراد نے شاہدہ سے پوچھا کہ اس کو گاؤں سے لے جا کر اپنے پاس رکھنے والا شخص کون تھا۔ شاہدہ پہلے تو اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی...... پھر اس نے کربناک لہجے میں کہا۔ ''وہ پیر قدرت اللہ ہے۔ وہ بہروپیا ہے...... شیطان ہے وہ...... اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

معزز افراد جو شاہدہ کے اردگرد کھڑے تھے، سناٹے میں تھے۔ اس کا باپ فضلو بھی

سناٹے میں تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اُجڑی پجڑی بیٹی کو دوبارہ گلے سے لگایا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگی اور جیسے پھٹ پڑی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اوڑھنی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ اوڑھنی کے اندر سے ہی بولتی چلی گئی۔ اس نے سب کچھ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے گوش گزار کر دیا۔ اس کی آواز میں کرب تھا، ننگی سچائی تھی اور گہرے زخم تھے۔ اس کی گواہی کو جھٹلانا ممکن ہی نہیں تھا۔

سننے والوں کے تیور بدلتے چلے گئے۔ ان کے چہرے تمتمانے لگے۔ آنکھیں سرخ تر ہو گئیں۔ سب سے پہلے ایک جواں سال شخص ہی چلا کر بولا۔ ''ہم پہلے ہی کہتے تھے، آستانے کے اندر چکر چل رہے ہیں۔ یہ عامل ڈرامے باز ہے......''

ایک ساتھ بہت سے افراد بولنے لگے۔ ایک شخص چنگھاڑا۔ ''پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ میں تو کہتا ہوں ابھی اس حرامی کو پکڑ لو اور پھانسی دے دو۔''

ایک اونچے لمبے جٹ نے اپنا دیسی ساخت کا پستول ہوا میں لہرایا اور گرجا۔ ''موقع اچھا ہے۔ سب بھرا جمع ہیں۔ حملہ کر دو آستانے پر اور اینٹ سے اینٹ بجا دو۔''

''ہاں، حملہ کر دو۔'' دو تین آوازوں نے کہا۔

لوگوں کا غیض و غضب بڑھتا جا رہا تھا۔ ٹوٹی کلائیوں والی نوچی کھسوٹی ہوئی لڑکی ان کے سامنے بھی۔ اس سے بڑا ثبوت اور اس سے معتبر گواہی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ایک لیڈر ٹائپ شخص ایک ٹریکٹر کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے میگافون ہونٹوں سے لگایا اور پکار کر بولا......

''بھائیو! ہم نے بات کر لی ہے۔ یہ لڑکی فضلو کی بیٹی اور ہم سب کی بہن ہے......اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا مجرم پیر قدرت اللہ ہے......اس کا مجرم پیر قدرت اللہ ہے۔''

جلوس کے اشتعال میں اضافہ ہو گیا۔ لوگوں نے مختلف نعرے لگائے اور جلوس کے اگلے حصے میں ہلچل نظر آنے لگی۔ مقرر نے جوش سے اپنا مکا ہوا میں لہرایا اور بولا۔ ''میرے بھائیو! اس فراڈیے عامل کی بدمعاشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کوئی نہیں ملے گا۔ کیا ہم کو کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے؟''

''نہیں......نہیں۔'' اَن گنت آوازیں ابھریں۔ کچھ لوگوں نے ہوائی فائر کیے۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہجوم سرکش ہو رہا تھا۔

مقرر نے ایک بار پھر مکا ہوا میں لہرایا اور بولا۔ ''تو چلو پھر چھانگی دال کی طرف۔ اس شیطان عامل کو پکڑ لو اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالو۔''

''ہاں پکڑ لو......پکڑ لو۔'' اَن گنت مشتعل آوازیں ابھریں۔

ہجوم کے اندر سرکش سیلابی ریلے کی سی لہر پیدا ہوئی۔ رستم جست لگا کر ٹریکٹر کے اوپر چڑھا۔ اس نے مقرر کے قریب پہنچ کر مدھم آواز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ساتھی کی قربانی دے کر ہم نے آپ کا بہت سا کام کر دیا ہے۔ آستانے پر بہت کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی خبر ابھی تھوڑی دیر میں آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ باقی رہی قدرت اللہ کی بات......تو وہ حرامی اس وقت ہمارے ساتھ موجود ہے۔''

''کک......کیا کہہ رہے ہو؟'' مقرر کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''وہ دوسری کار کے اندر بندھا پڑا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کرنا ہے تو پولیس کے حوالے کر دیں۔ خود سزا دینی ہے تو بھی آپ کی مرضی۔''

اس صورتِ حال نے اردگرد موجود افراد کو چکرا کر رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر دیگر افراد میں پھیلنا شروع ہوئی۔ چند جوشیلے لوگ دوڑتے ہوئے کار کی طرف گئے جہاں قدرت اللہ دو نشستوں کے درمیانی خلا میں موجود تھا۔ رستم نے اس کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا تھا۔ لوگوں نے گاڑی کے عقبی دروازے کھولے اور چند ہی سیکنڈ میں قدرت اللہ کو پہچان لیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑا گیا اور جھٹکے سے کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔ اس کے جسم میں حرکت تھی۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا لیکن بندھا ہوا تھا۔ رستم کے ہاتھ میں اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ یہ چیز اس نے تقریر کرنے والے لیڈر نما شخص کو تھما دی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ہجوم کی اپنی ہی نفسیات ہوتی ہے۔ عام حالات میں لوگ جس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتے...... جب وہ ہجوم کی زد میں آتا ہے تو زیادہ بُرے سلوک کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اگر قدرت اللہ کے جرائم پر نظر ڈالی جاتی تو اس کے کھاتے میں شاہدہ کی بربادی سے بھی بڑے اور سنگین جرم موجود تھے۔ مگر آج یہی جرم اس کے یوم حساب کو کھینچ کر اس کے سر پر لے آیا تھا۔ رستم اور ناصر جانتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اور پھر اس لشکارے مارتی دوپہر میں، اس شعلہ بار سورج کے نیچے، اس گرد آلود میدان میں قدرت اللہ کے ساتھ وہی کچھ ہوا۔ اپنے گاؤں کی بیٹی کو تاراج کرنے کی پاداش میں لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ رستم اور ناصر نے دیکھا کہ وہ اسے مار رہے تھے۔ گھسیٹ رہے تھے، روند رہے تھے۔ لاٹھیاں، بھالے، کلہاڑیاں بہت کچھ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ہجوم کے تیور بتاتے تھے کہ لوگ اب اس شیطان عامل کی موت تک رکنے والے نہیں ہیں۔ رستم کی نگاہ ایک

نکلنے کے لیے اجمل خان پر پڑی۔ وہ قدرت اللہ کو انجام تک پہنچانے والے ہجوم کا حصہ تھا...... جلوس میں شریک سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو قدرت اللہ کی موت تو چاہتے تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس عمل میں شریک ہو سکتے۔ وہ بہ ظاہر غیر جانبدار ہو کر دور دور کھڑے تھے۔ معدودے چند بڑے بوڑھے ایسے ہوں گے جو اس عمل کو روکنا چاہتے تھے لیکن یہاں ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی کوئی پیش چل سکتی تھی۔

دفعتاً رستم اور ناصر کو اندازہ ہوا کہ قدرت اللہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ انہیں کوئی رسی جیسی شے خونخوار لوگوں کے پاؤں میں گھسٹتی نظر آئی...... لیکن یہ رسی نہیں تھی۔ یہ مقتول کی انتڑیاں تھیں۔ ''چلو ناصر چلیں۔'' رستم نے چٹان جیسے پتھریلے لہجے میں کہا۔

''ہاں، اب چلنا چاہیے۔''

ناصر گیا اور مشتعل لوگوں کے اندر سے اجمل خان کو گھسیٹ کر باہر لے آیا۔ اجمل کا جسم اپنے ہی زخم سے لہولہان تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی تکلیف بھول چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کا ایک ایسا نشہ تھا جو بڑی سے بڑی اذیت کو اپنے اندر غرق کر سکتا ہے۔

ناصر اسے سہارا دیتا ہوا کرائے کی گاڑی تک لے آیا۔ کار کے ڈرائیور کے لیے حالات اب برداشت سے باہر ہو چکے تھے۔ وہ کہیں رفو چکر ہو گیا تھا۔ رستم کی یہ احتیاط کام آ گئی کہ اس نے چابی ایک بار پھر اپنے پاس رکھی تھی۔ رستم ڈولے کی مختصر لاش کو ٹیکسی کار میں سے اٹھا لایا اور کار میں ڈال دیا۔ ان کے اردگرد شدید ترین افراتفری کا عالم تھا۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ وہاں سے نکل آئے۔

انہیں لاہور تک پہنچنے میں قریباً دو گھنٹے لگے۔ رستم نے انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی تھی۔ جی ٹی روڈ کے ایک ناکے پر انہیں روکا بھی گیا تھا مگر وہ رکے نہیں تھے۔ ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ رائفلوں کے منہ کھول سکتے تھے۔ بہرحال عام راہ گیروں سے پیسے بٹورنے میں مصروف پولیس اہلکاروں نے اس قسم کی مہم جوئی نہیں کی تھی۔ اجمل کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اسے ہسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ مگر وہ اسے ہسپتال نہیں لے جا سکتے تھے۔

ناصر نے راستے میں زخم کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''رستم بھائی! آپ سیدھے کوٹھی چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ گولی کندھے کے اوپر والے حصے سے زیادہ دور نہیں۔ میں اسے نکال لوں گا۔''

''دیکھ لو، خون کافی نکل چکا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''ضرورت پڑی تو خون کا انتظام بھی کر لیں گے۔ آپ کوٹھی چلیں۔'' ناصر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

رستم نے گاڑی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔ وہ عقب نما آئینے پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اگر اس کو تعاقب کا ہلکا سا شک بھی ہوتا تو وہ گاڑی کو کوٹھی کی طرف نہیں لے جا سکتا تھا۔

کوٹھی پر پہنچتے ہی ناصر، اجمل کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ اس نے خانساماں ظفر کو دواؤں اور دیگر چھوٹی موٹی اشیا کی ایک فہرست دی۔ خانساماں آدھ پون گھنٹے میں یہ اشیا لے آیا۔ ناصر اور رستم قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اپنے زخمی ساتھی کے ساتھ مصروف رہے۔ اس دوران میں ظفر نے مطلوبہ خون کی دو تھیلیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ ایک جاں گسل کوشش کے بعد ناصر، اجمل کے جسم میں پیوست گولی نکالنے میں کامیاب رہا۔ اجمل نے بھی کمال برداشت کا ثبوت دیا۔ خون نچڑنے کے سبب اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

ٹی وی پر چھانگی وال کے خوں ریز ہنگامے کی خبر چلنا شروع ہو گئی تھی۔ آستانے پر ہونے والی فائرنگ اور دھماکوں میں چوبیس افراد کی ہلاکت کی اطلاع تھی۔ دو افراد آستانے سے باہر ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں قدرت اللہ کا جنونی مرید اور قدرت اللہ خود شامل تھا۔ قدرت اللہ کی ناقابلِ شناخت لاش کی جھلک بھی نیوز چینل پر دکھائی جا رہی تھی۔ وہ مٹی اور خون میں لتھڑے ہوئے ایک چیتھڑے کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب کھڑے چند افراد کے صرف پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔

ڈولے کی لاش ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھ دی گئی تھی۔ رستم نے اس کے سرد رخساروں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اس کے گھر والوں کو اطلاع دینی ہوگی۔''

''لیکن کیسے؟ اس نے تو اس بارے میں زیادہ کچھ بتایا ہی نہیں۔ ماں باپ تو دونوں اب دنیا میں نہیں ہیں۔ شاید کوئی بھائی وغیرہ ہو۔ جہاں تک مجھے پتا ہے، یہ کوکی اور اس کے گھر والوں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ کوکی کی بڑی بہن اسے اچھی لگتی تھی اور اس کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو بی بی نے بھی بتائی تھی۔ درحقیقت چوہدری بشیر تک ڈولے کے پہنچنے کی وجہ بھی وہ لڑکی ہی تھی۔''

ناصر کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ ڈولے کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دل بھی کیا شے ہوتا ہے رستم بھائی۔ جان بوجھ کر اپنے لیے ایسے راستے چنتا ہے جن پر اسے نہیں چلنا چاہیے۔ اس دل کو پتا بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ ہونے والا کام کر رہا ہے، پھر بھی کرتا چلا جاتا ہے۔

ایسی امیدیں پالتا ہے جو زندگی کی آخری سانس تک بس امیدیں ہی رہتی ہیں۔''

ناصر نے جھک کر ڈولے کی سرد پیشانی چومی اور بولا۔ ''اس لڑکی کو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے ساتھ چپ چاپ پیار کرنے والا آج ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا ہے۔ اب وہ بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔''

رستم نے ڈولے کی جیبیں دیکھیں۔ ایک جیب میں بس ڈیڑھ دو سو روپے کی کرنسی تھی ..... فرضی شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ تھی جس پر پلاسٹک چڑھایا گیا تھا۔ ایک عام سا بال پوائنٹ اور گلا صاف کرنے والی دو گولیاں تھیں جن میں سے ایک گولی آدھی کھا کر آدھی دوبارہ ریپر میں لپیٹ دی گئی تھی۔

ایک معمولی شخص کی جیب سے برآمد ہونے والی یہ معمولی اشیا تھیں مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو یہ شخص معمولی نہیں تھا۔ اس کی سب سے اہم بڑائی تو یہی تھی کہ اس نے کسی سے خاموش محبت کی تھی اور اس محبت کو خاموشی کے سارے تقاضوں کے ساتھ نبھایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی معمولی نہیں تھا۔ اوپر والے نے اگر اس کی جسمانی ساخت میں اس سے کچھ چھینا تھا تو بدلے میں اسے بہت کچھ دیا بھی تھا۔ اس کی غیر معمولی حسیات نے ثابت کیا تھا کہ وہ معمولی نہیں ہے۔

ناصر نے کہا۔ ''رستم بھائی! اس کے گھر والوں کو تو بس شانی بی بی کے ذریعے ہی اطلاع پہنچ سکتی ہے۔ شانی کو ہی پتا ہوگا کہ کوکی اور راجو وغیرہ کہاں ہیں۔ کوکی اور راجو دوسروں کو بتا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو فون کر کے شانی تک یہ اطلاع پہنچا دو۔'' رستم نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''ان سے کیا کہا جائے؟''

''فون پر کسی بھی طرح کی تفصیل ٹھیک نہیں۔ بس یہ کہہ دو کہ ڈولا اب نہیں ہے اور اس کی میت ہمارے پاس کوٹھی میں ہے۔ مناسب تو یہی ہوگا کہ اس میت کو بڑی راز داری سے اس کے وارثوں تک پہنچا دیا جائے۔ اگر شانی نے بھی چہرہ دیکھنا ہوگا تو وہیں پر دیکھ لیں گی۔''

ٹی وی پر ایک بار پھر چھانگی وال کے واقعات کی خبر چل رہی تھی۔ اس سارے واقعے کو اغوا شدہ لڑکی شاہدہ کے ساتھ ہی منسوب کر دیا گیا تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''معتبر ذرائع کے مطابق پیر قدرت اللہ کی اندوہناک موت کا سبب مغویہ شاہدہ والا معاملہ ہی بنا ہے۔ شاہدہ کا انتقام لینے والوں نے نہ صرف چھانگی وال میں قدرت اللہ کے ٹھکانے کو تاراج کر دیا بلکہ

علاقے کی سب سے متنازعہ شخصیت قدرت اللہ کو بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بہرحال دیگر عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رنگ والی گاؤں کی بااثر شخصیت شانی بی بی اور قدرت اللہ کے درمیان بھی عرصے سے سنگین چپقلش چلی آ رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے شانی بی بی ہی کے ساتھی کچھ تصویریں منظرِ عام پر لائے تھے جن کی وجہ سے پیر قدرت اللہ کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ اس واقعے کے بعد رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی یعنی شانی بی بی پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے تھے۔ ابتدائی اطلاعات کے بعد اب آہستہ آہستہ تفصیلی خبریں آنا شروع ہوئی ہیں۔ ان خبروں کو دیکھا جائے تو پھر یہ پہلی تھیوری غلط محسوس ہونے لگتی ہے کہ یہ خوں ریز واقعہ صرف مغویہ لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس واقعے میں استعمال ہونے والی ایک ٹیکسی کار پر لاہور کا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ ایک نامعلوم شخص نے گوجرانوالہ کے تھانے میں اطلاع دی ہے کہ واردات میں استعمال ہونے والی دوسری کار اس کی ہے۔ یہ کار ایک شخص نے لاہور سے ڈرائیور سمیت کرائے پر حاصل کی تھی۔ وہ اس کار پر اپنے بیمار بچے کو پیر صاحب کے آستانے پر لے جانا چاہتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس شخص کے دو دیگر ساتھی بھی آستانے جا رہے ہیں۔ مگر وہ ایک دوسری ٹیکسی کار پر تھے......اس حوالے سے مزید تفصیلات آ رہی ہیں۔ امید ہے کہ یہ شخص اہم انکشاف کرے گا۔''

دفعتاً ناصر کو یاد آیا۔ وہ بولا۔ ''رستم بھائی! جب قدرت کو لوگ گاڑی میں سے نکال رہے تھے، آپ نے اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی شے ایک بندے کو دی تھی۔ وہ کیا تھا؟''

رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''قدرت اللہ کی درندگی کی وہ فلم جو تم نے دیکھی تھی۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' ناصر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

''چلو پھر فون کر لو۔'' رستم نے غمزدہ نظروں سے ڈولے کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ناصر فون کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

رستم وہاں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اس اندوہناک خبر پر شانی کا ردِعمل کیا ہوگا۔ شانی کو ڈولے سے بہت پیار تھا۔ وہ بھی انہیں بڑی محبت سے باجی جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور ان کے ایک اشارے پر خود کو بڑے سے بڑے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ کیا ڈولے کی موت کی خبر سن کر شانی یہاں آئیں گی؟ کیا اس گھر کی دہلیز پر دوبارہ ان کے قدم پڑیں گے؟ وہ سوچتا رہا اور ڈولے کی طرف دیکھتا رہا۔

☆=======☆=======☆

شانی رنگ والی کی حویلی میں تھی۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ آموں کے پیڑوں

پر آم پک چکے تھے۔ حویلی کے باغ میں لڑکیوں نے سن کے رسوں سے بڑے بڑے جھولے تیار کر لیے تھے۔ امرود، آڑو، جامن، رنگ والی کے باغوں سے بہت سے پھل تیار ہو کر حویلی میں آ رہے تھے۔ یہ گیت گانے اور تابڑ توڑ برستی بارشوں میں اودھم مچانے کے دن تھے مگر اصل موسم تو دل کا موسم ہوتا ہے۔ اور شانی کے دل میں ایک بے کنار خزاں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کوئی منظر کوئی آواز ... کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ خاص طور سے جب سے رستم کی بہن بہنوئی اور بچے خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے گئے تھے۔ شانی کو لگتا تھا کہ اپنے جیون ساتھی سے اس کا ہرناتا ٹوٹ چکا ہے۔ وہ حیران ہوئی تھی کہ رستم اتنا کٹھور کیسے ہو گیا۔ اس نے ایک نہایت غلط حرکت کی۔ خالو اعجاز کو تھپڑ مارا...... اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ اس نے اپنے منہ سے معذرت کا ایک لفظ تک ادا نہیں کیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ شانی کے سینے میں جیسے کوئی شے مرتی جا رہی تھی۔ سردار دراج اور اس کے ساتھ لاپتا ہو جانے والے تین مہتوں کا بھی ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ دراج کی بیوی ماکھو دونوں مظلوم لڑکیوں کے ساتھ ابھی تک حویلی میں ہی پناہ گزین تھی۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دل نہیں مانتا تھا کہ دراج اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہوا ہے۔

شانی حویلی کی وسیع نشست گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بادل گھر کر آئے ہوئے تھے مگر بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ مُنا باہر لان میں ملازمہ جمیلہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' شانی نے اپنی اوڑھنی درست کرتے ہوئے کہا۔

عارف کمبوہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی......

''شانی بہن! آپ نے ٹی وی دیکھا ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

عارف نے دائیں بائیں دیکھا اور پست لیکن جذباتی لہجے میں بولا۔ ''قدرت اللہ قتل ہو گیا۔''

شانی سکتے میں رہ گئی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا مگر جو کچھ عارف بتا رہا تھا وہ بڑا تفصیلی اور مدلل تھا۔ عارف کہہ رہا تھا۔ ''ابتدائی خبروں کے مطابق چھانگی وال کے آستانے میں کم از کم چوبیس بندے مارے گئے ہیں اور درجنوں زخمی ہوئے ہیں۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد قدرت کے خاص چیلوں کی ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہی بیٹھک میں موجود تھے۔ ان

میں قدرت کا سب سے قریبی چیلا شاہی بھی شامل ہے۔''

''قدرت کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس کے ساتھ جو ہوا ہے، وہ اسی کے لائق تھا۔ اسے کسی ایک شخص نے نہیں مارا، سینکڑوں لوگوں نے مارا۔ یہ علاقے کے لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس تھا جو ایک کنواری لڑکی کے اغوا کی وجہ سے نکالا گیا تھا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ لڑکی کے اغوا کا ذمے دار بھی قدرت اللہ ہے تو ان کا طیش اپنی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہ اس دھوکے باز عامل پر ٹوٹ پڑے۔ اسے کھیتوں میں گھسیٹتے رہے اور مار مار کر اس کی لاش کا بھی قیمہ کر ڈالا۔''

''اور اس کی بیویاں؟''

''ان کے بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں۔''

اس خوفناک واقعے کی تفصیل جاننے کے بعد شانی کی آنکھوں میں غم اور تاسف کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ان خاص لوگوں میں سے تھی جو اپنے بدترین دشمن کی تکلیف پر بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ عارف نے قدرت کی موت کا جو نقشہ کھینچا تھا اگر وہ درست تھا تو یہ شانی کے لیے دکھ کی بات تھی۔

عارف نے اٹھ کر نشست گاہ کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی بند کی اور شانی کے سامنے بیٹھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ابھی تک جو کچھ خبروں میں آیا ہے، اس سے شک ہو رہا ہے کہ اس ساری کارروائی میں اجمل خان، ناصر اور ہو سکتا ہے کہ رستم بھائی بھی شریک ہوں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس کارروائی میں استعمال ہونے والی دونوں گاڑیاں لاہور سے گئی تھیں۔ کرائے کی کار کے ڈرائیور نے پولیس کے رُوبرو جو بیان دیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کُل تین افراد تھے جو ایک بیمار بچے کو لے کر قدرت اللہ کے آستانے پر جا رہے تھے۔ اس نے ان لوگوں کے حلیے بھی بتائے ہیں۔ ایک حلیہ ناصر سے ملتا ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اس نے بتایا ہے کہ وہ پٹھان تھا اور پشتو کے لہجے میں اُردو بولتا تھا۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ قدرت اللہ کو عام لوگوں نے مارا ہے؟''

''مارا تو عام لوگوں نے ہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس انجام تک پہنچانے میں اجمل، ناصر اور شاید رستم بھائی نے بھی پورا کردار ادا کیا ہے۔''

اس کے بعد عارف شانی کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''ابھی مزید تفصیلات آ رہی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ لاہور سے آنے والے بندوں نے

مقامی لوگوں تک ایک وڈیو کیسٹ بھی پہنچائی ہے۔ اس کیسٹ میں بھی قدرت اللہ یا اس کے چیلوں کے خلاف کوئی خاص ثبوت موجود ہے۔"

شانی کا دماغ سنسنانے لگا۔ اسے رستم کی طرف سے اس قسم کے رویے کی توقع بھی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں کئی بار اس کے ذہن میں آچکا تھا کہ رستم اور اس کے دوست قدرت اللہ یا ڈپٹی ریاض پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔

عارف نے کہا۔ "شانی بہن! آپ سب کو اور خاص طور سے آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس واقعے کے بعد قدرت اللہ کے جنونی مرید کوئی کارروائی کر سکتے ہیں...... میں چاہتا ہوں کہ چوہدری اعجاز کے ساتھ بیٹھ کر ہم یہاں کی سکیورٹی کا مناسب انتظام کر لیں۔"

"زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔" شانی نے عجیب جذب کے عالم میں کہا۔

شانی نے اٹھ کر ٹی وی آن کیا۔ چند اشتہارات کے بعد خبریں آنے لگیں۔ پہلی خبر ہی چھانگی وال کے حوالے سے تھی۔ مرنے والوں کی تعداد ستائیس ہوگئی تھی۔ دیگر تفصیل کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ تین ملزمان کے ساتھ جو بیمار بچہ تھا، وہ بھی اس خونی واقعے میں جاں بحق ہوا۔ اس کی لاش جلوس کے کچھ شرکاء نے واردات میں استعمال ہونے والی ٹیکسی کے اندر دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ اور جسم لہولہان تھا۔ نیوز کاسٹر نے مزید بتایا کہ اس واردات میں قدرت اللہ کے دیرینہ دشمن اجمل خان کے ملوث ہونے کا شبہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے اور آئندہ ایک دو گھنٹوں میں اعلیٰ پولیس حکام کی طرف سے میڈیا کو بریفنگ دی جا رہی ہے۔

خبریں جاری تھیں کہ خالو اعجاز کے کمرے کے سامنے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتفاقاً خالو اعجاز حویلی میں موجود نہیں تھے۔ شانی اٹھ کر گئی اور اس نے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز نے اسے ہلا دیا۔ "ہیلو شانی بھابی! میں ڈاکٹر ناصر بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے نہایت گمبھیر آواز میں کہا گیا۔

شانی چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ ناصر سے بات کرے یا نہیں۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہیلو ناصر! کیا بات ہے؟"

"بھابی! ایک حادثہ ہوگیا ہے۔"

"کیا؟" شانی کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"ایک ساتھی ہم سے جدا ہوگیا ہے......" ناصر نے کہا۔ پھر ذرا رک کر بولا۔ "ڈولا اب ہم میں نہیں ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔" شانی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں مسل دیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک کچھ بھی نہ بول سکی۔ پھر اس نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا تھا ڈولے کو؟"

"گولی لگی ہے۔" ناصر نے مختصر جواب دیا۔

ایک دم شانی کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس کے ذہن نے کئی بکھری ہوئی کڑیاں ایک ساتھ جوڑ دیں...... ابھی عارف نے بتایا تھا کہ لاہور سے جو تین افراد قدرت کے ڈیرے تک پہنچے تھے، ان کے ساتھ ایک بیمار بچہ بھی تھا۔ پھر نیوز میں بتایا گیا کہ وہ بچہ بھی ہلاک ہونے والوں میں شامل تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے ایک گاڑی میں اس کا مُردہ جسم دیکھا تھا۔ کہیں وہ بچہ ڈولا ہی تو نہیں تھا؟

ڈولے کی موت کی اطلاع نے شانی کا دل غم سے بھر دیا۔ دوسری طرف ناصر کہہ رہا تھا۔ "بھابی! ڈولے کی میت اس وقت یہاں کوٹھی میں ہے۔ اس کے وارثوں کو بھی اطلاع دی ہے۔ اب آپ جیسے سمجھیں کر لیں۔"

"کتنے بجے یہ واقعہ ہوا ہے؟" شانی کا لہجہ اشک بار تھا۔

"قریباً چار گھنٹے تو ہو چکے ہیں۔ ہم نے میت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔"

"کیسے ہوا ہے یہ سب؟ کیا یہ وہی معاملہ ہے جس کی خبریں بھی آ رہی ہیں؟" شانی نے اشارے کنائے میں پوچھا۔

"اس بارے میں تو رستم بھائی ہی بتا سکتے ہیں۔ کیا آپ یہاں آئیں گی؟" ناصر نے پوچھا۔

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔" شانی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

عارف پُرتشویش نظروں سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی بری خبر ہے۔ شانی نے آنسوؤں کے درمیان اسے اس بری خبر سے آگاہ کیا۔ ڈولے کی موت نے عارف کو بھی افسردہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ "شانی بہن! باقی سب تو خیریت سے ہیں؟"

شانی نے کہا۔ "مجھے اجمل کے بارے میں شک پڑ رہا ہے۔ شاید وہ زخمی ہے یا پھر کہیں چلا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہی فون پر رابطہ کرتا تھا۔"

عارف نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "گویا یہ بات تو اب طے ہے کہ چھانگی وال گاؤں میں جو خونی کارروائی ہوئی ہے اس میں ناصر، اجمل اور رستم بھائی شامل ہیں۔"

شانی خاموشی سے آنسو پونچھتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈولے کی معصوم شکل گھومتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی کسی طرف سے "باجی جی" کہتا ہوا آئے گا اور اس کے

سامنے آن کھڑا ہوگا۔ اجمل کے حوالے سے بھی شانی کی تشویش گہری ہوتی جارہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خود لاہور چلی جائے۔ وہ اپنے ساتھ عارف کو بھی لے جاسکتی تھی۔ اس نے عارف سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی تائید کی اور کہا کہ انہیں لاہور میں جانا چاہیے۔ ڈولے کے اصل وارثوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کوکی، سنبل اور ان دونوں کے گھر والے ہی ڈولے کے وارث شمار ہو سکتے تھے۔ شانی کی معلومات کے مطابق کوکی اور راجو آج کل ایبٹ آباد میں گرمیاں گزار رہے تھے...... راجو ایک گڑیا سی بچی کا باپ بن چکا تھا۔ کوکی کے گھر والے بھی راجو کے ساتھ ایبٹ آباد میں ہی تھے۔ موجودہ حالات میں ڈولے کی میت کو ایبٹ آباد پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی کوکی اور اس کے گھر والے لاہور کی کوٹھی میں آسکتے تھے۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ ڈولے کو لاہور ہی میں سپرد خاک کردیا جائے...... شانی کا دل لاہور جانے کو بے قرار ہوگیا۔

جب شانی لاہور روانہ ہونے کے لیے ایک برقعے اور ایک پرانی پک اَپ کا انتظام کر چکی تھی، خالو اعجاز بھی حویلی پہنچ گئے۔ وہ اب تک کے سارے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ انہوں نے شانی کو علیحدہ کمرے میں لے جا کر کہا۔

''شانی! یہ سب رستم اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ چلو قدرت اللہ کی موت پر تو کسی کو اعتراض نہیں لیکن ان لوگوں نے درجنوں بے گناہ بھی مار دیئے ہیں۔ ستائیس اٹھائیس ہلاکتوں کا ذکر تو خبروں میں آرہا ہے، اصل تعداد زیادہ ہوگی۔''

''مگر خالو میں نے سنا ہے کہ صرف اس خاص کمرے میں ہلاکتیں ہوئی ہیں جہاں قدرت کے قریبی ساتھی بیٹھک کر رہے تھے۔''

''یہ غلط ہے۔ وہاں دستی بموں کے کئی دھماکے ہوئے ہیں اور ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے اس کارروائی کے ذریعے ہمیں بھی سخت خطرے میں ڈال دیا ہے...... قدرت اللہ کے حمایتی تو ہمیں اور رستم، اجمل وغیرہ کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ قدرت اللہ کی موت کی وجہ سے کئی جگہوں پر ہنگامے بھی شروع ہو گئے ہیں۔''

''خبروں میں تو صرف ملتان کے ایک علاقے میں ہنگامے کا ذکر کیا گیا ہے۔'' شانی نے کہا۔

اچانک خالو اعجاز کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے برقعے اور شولڈر بیگ پر پڑ گئی۔ ''یہ برقع یہاں رکھا ہے۔ کیا تم کہیں جارہی ہو؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

شانی نے کہا۔ ''خالو! شاید آپ کو پتا نہیں۔ ڈولے کو گولی لگ گئی ہے...... وہ بچ نہیں سکا۔''

''اوہ۔'' خالو اعجاز نے ہونٹ سکوڑے۔ ''مجھے بھی شک ہو رہا تھا کہ خبروں میں جس بیمار بچے کا ذکر ہو رہا ہے وہ کہیں ڈولا ہی نہ ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ ڈولے کو ادھر لاہور میں ہی دفن کیا جائے گا۔ میں...... اس کا منہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' شانی کا لہجہ اَشک بار تھا۔

خالو اعجاز نے آنکھیں پھاڑ کر شانی کو دیکھا پھر برہم لہجے میں بولے۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم رستم وغیرہ کے ٹھکانے پر جاؤ گی ڈولے کو دیکھنے؟'' شانی خاموش رہی۔ وہ مزید بلند آواز سے بولے۔ ''شانی! تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ ان حالات میں تو ہم حویلی کے اندر بھی خطرہ محسوس کر رہے ہیں اور تم باہر نکلنے کی بات کر رہی ہو۔ نہیں شانی بیٹی! میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ یہ تو سراسر مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ قدرت اللہ کے حمایتی بڑے طیش میں ہیں اور ہر جگہ پھنکارتے پھر رہے ہیں۔ اور پھر لاہور میں رستم اور ناصر وغیرہ کا ٹھکانا بھی کون سا محفوظ ہے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑی کارروائی کی ہے اور وہ کسی بھی وقت پولیس کی زد میں آسکتے ہیں۔

''اللہ نہ کرے ایسا ہو۔'' شانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ لاہور میں دبکنے کے بجائے اب کسی طرف نکل جائیں تو بہتر ہے۔''

اسی دوران میں شانی کے تایا معصوم بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی کہا۔ ''اعجاز! حویلی کا پہرا سخت کرادو۔ رنگ والی کی طرف آنے والے راستوں پر بھی دو تین ناکے لگوا دو۔ ہمیں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔'' پھر وہ شانی کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''دھی رانی! تم بھی بہت احتیاط کرو۔ احاطے کی طرف جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

شانی خاموش کھڑی رہی۔ خالو اعجاز نے معنی خیز نظروں سے شانی کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں...... ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا ناں؟''

شانی کا دل یہ پابندی قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ برقعے یا چادر کے پردے میں یہاں سے نکلے گی تو آسانی سے لاہور پہنچ جائے گی اور واپس بھی آجائے گی۔

تایا معصوم تو مردانے کی طرف چلے گئے، خالو اعجاز وہیں رہے۔ انہوں نے اگلے آٹھ دس منٹ تک شانی سے بحث کی اور اسے قائل کر کے چھوڑا کہ وہ لاہور نہیں جائے گی۔

ان کے جانے کے بعد شانی بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں اذیت

ناک خیالات ابھر رہے تھے۔ ڈولا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ ناصر نے اس سے فون پر بات کی تھی مگر اجمل خان اور رستم کے بارے میں شانی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ رستم کے رویے سے اسے لاکھ اختلاف سہی مگر اس وقت وہ خود کو رستم کے لیے دکھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ قدرت اللہ سے رستم اور اجمل وغیرہ کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اس دشمنی کی وجہ بھی وہ خود تھی اور اس کے حالات تھے۔ کیا رستم صرف اس کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہا تھا؟ اگر وہ رستم کے لیے واقعی اتنی اہمیت رکھتی تھی تو پھر رستم کا رویہ اس کے ساتھ اور اس کے بزرگوں کے ساتھ ایسا کیوں تھا؟ وہ اتنی سنگین غلطیاں کر چکا تھا اور ان غلطیوں پر ذرا سا بھی شرمندہ نہیں تھا......

وہ سوچتی رہی...... ڈولے کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہا اور اس کی آنکھیں آنسو گراتی رہیں۔ باہر کالے بادلوں میں سے بھی موٹے موٹے آنسو گرنے شروع ہو گئے تھے۔ رنگ والی کی کسی گلی سے ننگ دھڑنگ بچے شور مچاتے ہوئے گزر گئے۔

کالیاں اٹاں کالے روڑ
مینہ وسا دے زوروزور

اور پھر واقعی مینہ زور و زور برسنے لگا۔ ''ڈولے خدا حافظ!'' شانی نے دل ہی دل میں کہا اور چہرہ گھٹنوں پر جھکا کر سسک اٹھی۔

کچھ دیر تک دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد وہ اٹھی۔ وہ ناصر کو فون کر کے بتانا چاہتی تھی کہ وہ نہیں آسکے گی اور وہ لوگ ڈولے کی تدفین وہیں لاہور میں ہی کر دیں۔

وہ فون سیٹ کی طرف بڑھی۔ ریسیور اٹھایا تو وہ خاموش تھا۔ لائن پھر خراب تھی۔ وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ خالو اعجاز اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ ''کیا بات ہے شانی بیٹی؟''

''میں لاہور فون کر کے ناصر کو بتانا چاہتی تھی کہ میں نہیں آسکوں گی...... مگر فون پھر خراب پڑا ہے۔''

''لگتا ہے بارش کی وجہ سے لائن میں پھر گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' خالو اعجاز نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''پھر کیا کیا جائے؟ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''میں خادم حسین کو بلاتا ہوں۔ تم نے جو کہنا ہے اسے بتا دو۔ وہ جھنڈے شاہ جا کر لاہور فون کر دے گا۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانی نہیں جانتی تھی کہ بابا خادم حسین پہلے کی طرح اب بھی اس کا پیغام وہیں پہنچائے گا۔ وہ شانی سے ہمدردی رکھنے کے باوجود چوہدری اعجاز کے اشاروں پر چلتا تھا۔

شانی کی بات سننے کے بعد خادم حسین چوہدری اعجاز کے پاس ہی آیا اور اسے ساری بات بتائی۔ ''ٹھیک ہے۔'' چوہدری اعجاز نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم حویلی سے چلے جاؤ اور دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آنا۔ شانی بی بی سے یہی کہنا ہے کہ پیغام پہنچ گیا ہے۔''

''جو آپ کا حکم مالک۔'' خادم حسین نے کہا اور باہر چلا گیا۔

چوہدری اعجاز نے بے قراری سے کمرے کے اندر ہی دو تین چکر لگائے۔ وہ صداکار لڑکی نائیلہ اور اس کا شوہر اختر قصوری آج کل رنگ والی میں ہی موجود تھے اور چوہدری کے مہمانوں کی حیثیت سے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا بیمار بچہ اب کافی بہتر تھا اور وہ اسے چند دن کے لیے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر یہاں لائے ہوئے تھے۔ چوہدری اعجاز حویلی کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں یہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ آج پھر آوازوں کی ماہر نقالہ سے چوہدری کو تھوڑا سا کام لینا تھا۔

☆=======☆=======☆

رستم اور ناصر بے قراری کے ساتھ رنگ والی سے آنے والی کال کا انتظار کر رہے تھے۔ اجمل مسلسل نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ خانساماں ظفر احمد، ملازمہ حمیداں اور زری سوگواروں کی حیثیت سے ڈولے کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ناصر نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کال ناصر کو ہی ریسیو کرنا ہو گی۔

ناصر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شانی ہی تھی۔ ''ہیلو! میں شانی بول رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں بھابی! پھر آ رہی ہیں آپ؟''

''میں کیسے آسکتی ہوں۔ سارے علاقے میں قدرت اللہ کے بندے شکاری کتوں کی طرح پھر رہے ہوں گے۔ ہمیں تو حویلی کے اندر بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔'' شانی کی طرف سے قدرے سخت لہجے میں کہا گیا۔

ناصر کی امید...... مایوسی میں بدل گئی۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔''

"میری مرضی کو کون پوچھتا ہے۔" وہ بولی۔ "اور یہ بات بھی اب ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہاں چھانگی وال میں جو کچھ ہوا ہے اس میں کس کا ہاتھ ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ قدرت اللہ کے ساتھ درجنوں بے گناہ بھی مارے گئے ہیں۔ ان کا خون کس کی گردن پر ہے، ان کا کیا قصور تھا کہ ان کو بموں سے اُڑا دیا گیا......"

"بھابی! میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوا۔ چشم دید لوگوں کا تو یہی کہنا ہے کہ قدرت کے خاص چیلے ہی نشانہ بنے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی جگہ جمع تھے اور......"

"یہاں ہر ایک کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے۔" شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "آنکھوں میں مرچیں ڈالنا ہم لوگوں کا وتیرہ بن گیا ہے۔ بہرحال کام کرنے والے تو کام کر کے فارغ ہوئے ہیں، اب بھگتنا ہمیں پڑے گا۔"

شانی کے لب و لہجے نے ناصر کو سخت مایوس کیا مگر رستم کی خاطر اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "بھابی! اب آپ کیا کہتی ہیں؟ ڈولے کی تدفین وغیرہ......"

"جہاں جی چاہے تدفین کر دو۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اور جو ہیں وہ ان حالات میں یہاں پہنچ نہیں سکتے۔" شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ناصر نے چند سیکنڈ تک ریسیور کان سے لگائے رکھا اور پھر یونہی "خدا حافظ" کہہ کر ریسیور نیچے کریڈل پر رکھ دیا۔

رستم بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہیں جیسے ناصر کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ "ہاں، کیا کہتی ہیں شانی بی بی؟" اس نے پوچھا۔

"انہوں نے معذرت کی ہے۔ اس کا دل تو یہاں آنے کو زور مار رہا ہے مگر گھر والوں نے سختی سے منع کیا ہے۔ انہیں سکیورٹی کا خطرہ ہے۔ انہوں نے تدفین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ یہیں کہیں آس پاس ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

رستم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اسی دوران میں حاجی حیات 'ٹنٹڈ' شیشوں والی ایک پرائیویٹ کار میں کوٹھی پہنچ گئے۔ رستم فون پر انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر چکا تھا۔ انہیں کئی باتوں پر اختلاف تھا اور وہ ناراض بھی تھے لیکن اس موقع پر انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔ گاڑی میں ان کے ساتھ پہلوان اور جیرا بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کا معتمد ساتھی انسپکٹر حفیظ بھی تھا۔ ردکیٹ بستی میں سخت زخمی ہونے کے بعد اب وہ صحت یاب تھا۔

کوٹھی میں پہنچ کر صورت حال سے آگاہ ہوتے ہی پہلوان نے ایک قریبی قبرستان میں قبر کا انتظام کرا دیا۔ خانساماں ظفر احمد چوبرجی سے تدفین کا سامان لے آیا۔ ایک دو گھنٹے میں سارا کام کیا۔ کوٹھی کے اندر ہی حاجی حیات نے خود ڈولے کی نماز جنازہ پڑھائی۔ کوٹھی میں موجود افراد نے ہی نماز پڑھی۔ بارش کی رم جھم میں ڈولے کی میت کو گاڑی میں رکھ کر قبرستان پہنچایا گیا اور سپرد خاک کیا گیا۔ اجمل خان رسوم میں شریک نہیں ہو سکا۔

اگلے روز اجمل کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی۔ اس نے ڈولے کے بارے میں پوچھا۔ یہ جان کر اس کی آنکھوں میں دکھ امڈ آیا کہ ڈولے کے وارثوں میں سے کسی کو اطلاع نہیں دی جا سکی......اور اسے خاموشی سے قریبی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے۔

"کیا بات ہے۔ تم چپ ہو گئے ہو اجمل؟" ناصر نے پوچھا۔

"ڈولے کا جنازہ پڑھنے والے بس چھ سات لوگ ہی تھے؟" اجمل نے سوال کیا۔

"ہاں! مگر یہ دکھی کرنے والی بات نہیں ہے اجمل۔ جنازے کے بڑے یا چھوٹے ہونے سے مرنے والے کی حیثیت اور نیک نامی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سچ جھوٹ کی جنگ میں ایسے ایسے نامور اپنی جان دیتے ہیں جن کی لاشوں کو کندھا دینے والا کوئی نہیں ہوتا......مگر اس سے ان کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا۔"

"وہ چھوٹا تھا ناصر بھائی مگر اس کے اندر ایک بڑا اور بہت انوکھا بندہ چھپا ہوا تھا۔" اجمل نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

رستم بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔ وہ تینوں کچھ دیر تک صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ پھر خانساماں ظفر احمد نے آ کر رستم کو بتایا کہ آپو زاہدہ اسے یاد کر رہی ہیں۔

رستم آپو زاہدہ کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا مگر وہ تا دیر تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی اکرام چند روز پہلے اپنے بھائی کے پاس ساہیوال چلے گئے تھے۔ عاشی بھی ان کے ساتھ تھی۔ اب یہاں بس آپو زاہدہ اور چھوٹا سرمد ہی تھے۔ رستم کمرے میں پہنچا تو آپو زاہدہ اپنی اشک بار آنکھیں سرخ کیے بیٹھی تھیں۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے رستے؟ تم وہی کچھ کر رہے ہو جس سے میں ہر وقت ڈرتی ہوں اور تمہیں منع کرتی ہوں۔"

"آپو! یہ مجبوری تھی۔"

"یہ کیسی مجبوری تھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمہارے ہنستے کھیلتے ساتھی کی جان لے لی۔ دوسرا زخمی ہو کر بستر پر پڑا ہے۔"

رستم نے اپنی کلین شیو ٹھوڑی کو ہاتھ کی پشت سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپو! اگر کوئی جنگلی جانور ہمارے سامنے کمزور لوگوں پر حملے کر رہا ہو، انہیں چیر پھاڑ رہا ہو...... ہمارے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفل ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا خاموش کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا چاہیے؟“

”لیکن تم نے پوری دنیا کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہوا رستے۔ تم کب تک خود کو جنگلی جانوروں سے لڑاتے رہو گے...... خود بھی مرتے رہو گے اور ہمیں بھی مارتے رہو گے۔ ہم تمہیں جیتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں تیری خوشیاں دیکھنے کی حسرت ہے۔ کیا میں یہ حسرت لیے قبر میں چلی جاؤں گی؟“

وہ بولتی رہیں، رستم خاموشی سے سنتا رہا۔ جب ان کے دل کی بھڑاس کسی حد تک نکل گئی تو انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو دو بندے تُو نے کوٹھی میں بند کر رکھے ہیں، ان کو چھوڑتا کیوں نہیں؟ کیوں ان کے بچوں کی بددعائیں لے رہا ہے؟“

آپو زاہدہ کا اشارہ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے طفیل اور اس ٹیکسی ڈرائیور کی طرف تھا جسے دو دن پہلے اجمل خان ٹیکسی سمیت پکڑ کر لایا تھا۔

رستم نے کہا۔ ”آپو ان میں سے ایک کو تو ابھی تھوڑی دیر میں چھوڑ دوں گا۔ دوسرا ایسا ہے جس کو بند رکھنے سے بددعائیں نہیں ملیں گی، چھوڑ دینے سے ملیں گی۔“

”مجھے ہر وقت پولیس کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جس طرح کے کام تم لوگ کر رہے ہو، پولیس کسی بھی ٹائم یہاں آ سکتی ہے۔“

”بے فکر رہو آپو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، پولیس یہاں نہیں آئے گی۔“

آپو زاہدہ کھوئی کھوئی نظروں سے بڑے والہانہ انداز میں رستم کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولیں۔ ”رستے! اب میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔ میں نے تیری بڑی منت سماجت کر کے دیکھ لی ہے۔ اب میں تجھے بڑی بہن بن کے دکھاؤں گی۔ میں تیری ایک نہیں سنوں گی رستے۔ میں وہی کروں گی جو مجھے کرنا چاہیے۔“

”کیا کرو گی؟“ رستم اُداسی سے بولا۔

”مجھے اب تیری کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تیرے دل کے اندر ایک چور بکل مار کر بیٹھا ہوا ہے۔ جس دن یہ بکل اُتر گئی، تیرے چہرے پر سہرا بھی سج جائے گا۔“

”تُو کس کی بات کر رہی ہے آپو؟“ رستم بے زاری سے بولا۔

آپو زاہدہ نے رستم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور عجیب

لہجے میں بولیں۔ ”تُو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا غم دل سے لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔“

رستم نے آپو زاہدہ کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری بے زاری تھی۔ ”نہیں آپو! تُو کچھ نہیں جانتی...... کچھ نہیں۔“

وہ مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آپو نے رعب سے کہا۔ ”میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں رستے۔ تجھ سے کئی سال پہلے پیدا ہوئی تھی میں۔“

رستم سٹپٹایا ہوا تھا۔ ایک وقت تھا جب آپو زاہدہ کو شانی کے بارے میں بتانے کے لیے رستم کا دل مچل مچل جایا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دل سرشار ہو جاتا تھا کہ آپو اس کی دوہٹی کے بارے میں جان کر کتنا خوش ہوں گی لیکن اب سب کچھ برعکس ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آپو کی سوچ شانی تک کیسے جا پہنچی ہے؟

”کیا بات ہوئی رستم بھائی؟“ ناصر نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ آپو کو ہم تینوں کے حوالے سے پریشانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کمرے سے ٹیلی ویژن ہٹا دینا چاہیے۔ آپو کسی وقت دیکھنے بیٹھ جاتی ہیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“

”اور اس ٹیکسی ڈرائیور کا کیا کرنا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”رات کے وقت اُسے کہیں دور چھوڑ آتے ہیں۔“

رستم نے کچھ دیر سوچا پھر ایک الماری کی دراز میں سے کچھ نوٹ نکال کر ناصر کو تھما دیئے۔ ”یہ تیس ہزار روپے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ٹیکسی کا کچھ نہ کچھ نقصان پورا ہو جائے گا۔“

ناصر نے روپے جیب میں رکھ لیے اور ٹی وی کے تار اتار کر ٹی وی ٹرالی دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ رستم کا ذہن ملازمہ ثریا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ثریا کے شوہر چھیدی کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ٹی وی کے ذریعے ثریا بھی اس کے انجام سے باخبر ہو چکی ہو۔ رستم تصور کرنے لگا کہ اس خبر کو جاننے کے بعد ثریا کے احساسات کیا ہوں گے وہ ثریا سے ملنا بھی چاہتا تھا مگر ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ اسی دوران میں رستم کی نگاہ صوفے پر پڑی۔ وہاں تازہ اخبار پڑا تھا۔ ایک دو کالمی سرخی پر اس کی نگاہ جم گئی۔ یہ خبر چھانگی وال کے حوالے سے ہی تھی۔ خبر میں جہاں اس خونی واقعے کی کچھ دیگر تفصیلات بتائی گئی تھیں، وہاں اس ویڈیو فلم کا ذکر بھی تھا جو رستم موقع پر ایک شخص کے حوالے کر آیا تھا۔ نیوز رپورٹر نے لکھا تھا...... معتبر ذرائع کے مطابق ویڈیو فلم میں موجود مواد نے اعلیٰ حکام میں تہلکہ

مچا دیا ہے۔ فلم کی ریکارڈنگ کو بند کمرے میں دیکھا گیا ہے۔ فلم کے مناظر لرزہ خیز ہیں۔ ان مناظر میں قدرت اللہ کے عملیات دکھائے گئے ہیں۔ ماضی میں بھی لوگ قدرت کے خاص قسم کے عملیات کا ذکر کرتے رہے ہیں اور اس پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ قدرت اللہ کے عملیات اور جھاڑ پھونک کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ جانوروں کو ملاپ کے دوران میں ہلاک کرتا ہے اور ان کے خون سے جادو کرتا ہے یا جادو کا توڑ کرتا ہے۔ معتبر ذرائع کے مطابق مذکورہ فلم میں بھی اسی عمل کو فلمایا گیا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں جانوروں کے بجائے ایک انسانی جوڑے کو سفاکی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس فلم سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قدرت اللہ اور اس کے ساتھی گاہے بگاہے نہایت خفیہ طور پر اپنے جادو ٹونے کے لیے انسانی جانیں بھی لیتے رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ زر کثیر خرچ کرنے والے سائلوں کے لیے قدرت اللہ اور اس کے ساتھی یہ قبیح حرکت کرتے تھے......

خبر کے آخر میں لکھا گیا تھا......اس فلم کے بارے میں خبریں آنے کے بعد لوگوں کے غم و غصے میں اضافہ ہوا ہے۔ کئی اداروں اور تنظیموں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سادہ لوح لوگوں کے جان و مال سے کھیلنے والے ایسے بے رحم شعبدہ بازوں کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔ خاص طور سے قدرت اللہ کے بچے کھچے پیروکاروں کو پکڑا جائے اور انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ آخری سطروں میں قدرت اللہ کے عقیدت مند راجا نوازش کے گرفتار ہونے کی اطلاع بھی تھی۔ ساتھ ہی اس امر کا تذکرہ بھی تھا کہ راجا نوازش نے قدرت اللہ کی خوشنودی کے لیے جس غریب لڑکی کو اغوا کیا، اس کی شکل قدرت اللہ کی مرحومہ بیوی ڈاکٹر صدف سے ملتی جلتی ہے اور یہ اس نہایت سنگین معاملے کا ایک توجہ طلب پہلو ہے۔

رستم نے یہ تفصیلی خبر ناصر کو بھی دکھائی۔ یہ سب کچھ ان کی توقع اور خواہش کے عین مطابق تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اوپر والے نے ان کی مدد کی ہے۔ قدرت اللہ نہ صرف ہلاک ہوا تھا بلکہ ایسے طریقے سے ہلاک ہوا تھا کہ بے شمار سادہ لوح لوگوں کے دلوں میں موجود اس کا بت بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

ناصر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ڈولے کی قربانی اور اجمل کے زخموں سے بہنے والا خون رائیگاں نہیں گیا۔''

''شانی کیا کہتی تھیں؟'' رستم نے اچانک پوچھا۔

''شش......شانی بھابی؟'' ناصر ایک دم گڑبڑا گیا۔ ''انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میرا

مطلب ہے کوئی خاص ردِعمل نہیں تھا۔''

''میرے خیال میں تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا، وہ قدرت اللہ کے لیے اسی قسم کا انجام چاہتی تھیں......''

ناصر نے کچھ نہیں بتایا......اور وہ شانی کے تلخ ردِعمل کے بارے میں بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ مگر وہ جانتا تھا، رستم کی جہاندیدہ نظریں اسے ٹٹول رہی ہیں اور وہ اس کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''رستم بھائی! حاجی حیات صاحب نے کل یا آج آپ سے سردار دراج کے بارے میں کوئی بات کی ہے؟''

''نہیں۔'' رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کل شام سے ایک بات میرے ذہن میں چکرا رہی ہے۔ آپ پہلے ہی پریشان ہیں، میں آپ کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا مگر بات کہے بغیر چارہ بھی نہیں کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''چلو جہاں اتنی پریشانیاں ہیں، ایک پریشانی اور سہی۔'' رستم زخمی انداز میں مسکرایا۔

''سردار دراج کے بارے میں ہمیں پتا چلا تھا کہ اس کے تین ساتھیوں کو شانی بھابی اور چوہدری اعجاز اپنی ضمانت پر پولیس سے چھڑا کر رنگ والی لے گئے تھے مگر بعد میں سردار دراج وہاں آیا اور ان تینوں کو لے کر غائب ہو گیا۔ یہ بات ہمیں ہضم نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعی غلط بھی ہے۔''

''کوئی ثبوت ملا ہے تمہیں؟''

''بہت ٹھوس ثبوت جی۔'' ناصر نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ پھر رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''کل جب حاجی صاحب ڈولے کے جنازے میں شریک ہونے آئے تھے، ان کے موبائل پر ایک خاص کال آئی تھی۔ حاجی صاحب اس وقت باتھ روم میں وضو کر رہے تھے، میں اتفاقاً کمرے میں چلا گیا۔ حاجی صاحب کو آنے والی کال ان کے خاص مخبر امجد کی طرف سے تھی۔ حاجی صاحب پہلے تو تھوڑا ناراض ہوئے کہ اس نے بے وقت فون کیوں کیا ہے پھر انہوں نے مخبر امجد کی بات سنی اور دھیمے لہجے میں دو چار سوال بھی پوچھے۔ اس گفتگو سے پتا چلا کہ سردار دراج اور اس کے تینوں مہتم ساتھی پولیس کی تحویل میں ہیں۔ انہیں گوجرانوالہ کے انڈسٹریل ایریا کی ایک کوٹھی میں رکھا گیا ہے۔ ہم اس کو پرائیویٹ ٹارچر سیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کوٹھی شانی کے خالو اعجاز کے چھوٹے بھائی کی ہے۔ اور خالو اعجاز خود بھی اکثر وہاں پائے جاتے ہیں۔''

یہ انکشاف رستم کے لیے سنسنی خیز تھا۔ چوہدری اعجاز کا نام ایک بار پھر ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ ''یہ تو بہت اہم اطلاع ہے۔'' رستم پژمردہ لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں حاجی حیات صاحب نے یہ اطلاع جان بوجھ کر ہم سے چھپائی ہے اور وہ ہم سے چھپائے ہی رکھیں گے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم پہلے ہی خطرے پر خطرہ مول رہے ہیں اور ان کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔''

رستم کی پیشانی پر پسینے کی نمی چمک گئی۔ وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ سردار دراج اور اس کے ساتھی سخت مصیبت میں ہوں گے۔ ان پر ڈپٹی ریاض کے بھتیجے طفیل کے اغوا کا شبہ تھا۔ طفیل کے بارے میں دراج اور اس کے ساتھیوں کی زبانیں کھلوانے کے لیے پولیس ان پر سخت ترین تشدد کر سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ کسی عام شخص کی گمشدگی کا معاملہ نہیں ہے۔

رستم نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''سردار دراج کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے بھی بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بھائی کو بے رحمی سے مارا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ قاتلوں کا کھوج لگایا جاتا، پولیس اور گوراہی برادری نے پہلے دن سے مدعی پارٹی کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تھا۔''

''یہ سب کچھ ڈپٹی ریاض کے ایما پر ہو رہا ہے جی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ بادل کی طرح دراج کو بھی ختم نہ کر دیا جائے۔''

''پھر کیا ارادہ ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

ناصر نے سگریٹ کے چند طویل کش لے کر ٹکڑا پاؤں تلے مسلا اور بولا۔ ''ہم خاموش نہیں رہ سکتے رستم بھائی۔ دراج کو ایک ایسی کارروائی کی سزا مل رہی ہے جو اس نے کی ہی نہیں...... بلکہ ہم نے کی ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے...... ہم سردار اور اس کے ساتھیوں کو چھڑانے کی کوشش کریں؟''

''بالکل...... جس شخص نے نارپوریوں سے آپ کی جان بچائی تھی، اس کی جان بچانا ہمارا فرض ہے...... اور اگر آپ کسی وجہ سے خود جانا نہیں چاہتے تو مجھے اجازت دیں...... میں سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگاؤں گا۔'' ناصر کے لہجے میں جوش تھا اور نیلی آگ تھی۔

''کسی وجہ سے میرے نہ جانے کی بات تم کیوں کر رہے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میں چوہدری اعجاز کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ اگر آپ شانی بھابی کی وجہ سے

چوہدری اعجاز کا سامنا کرنا نہیں چاہتے تو یہ کام مجھے سونپ دیجیے رستم بھائی۔''

ناصر، رستم کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ وہ رستم کے ذہن کے دور دراز گوشوں میں موجود خیالات کو بھی بھانپ لیتا تھا۔

رستم نے سگریٹ سلگایا اور اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وہ بی بی کے مخالف رخ پر چلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسے سوچتا تھا تو اس کا دماغ سن ہونے لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ برسات کے حبس نے ماحول کو جکڑا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکیاں بند کر دیں اور ایئر کنڈیشنر چلا دیا لیکن حبس پھر بھی کم نہیں ہوا۔ دل میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ وہ شانی کا شوہر نہیں تھا، سچا عاشق تھا اور اس کا عشق ایسے درجے پر تھا جہاں مَن و تُو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ محبوب کی مرضی کے سوا کوئی مرضی ہوتی ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کسی عمل سے اپنے محبوب کو ناراض کیسے کر سکتا تھا، وہ تو اپنے پہلے عمل پر ہی حد درجہ پچھتا رہا تھا۔ اس نے بارہا سوچا تھا کہ کاش چوہدری اعجاز والا واقعہ نہ ہوا ہوتا۔

اب یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ وہ دراج اور اس کے ساتھیوں کو مصیبت سے نکالنے کے لیے کوئی کارروائی کرتا تو اس کا ٹکراؤ چوہدری اعجاز اور اس کے بھائی سے ہوتا اور چوہدری اعجاز شانی بی بی کے خالو تھے۔ وہ انہیں پورا اعتماد اور احترام دیتی تھیں۔ وہ بڑی دیر تک فیصلے کی صلیب پر لٹکتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی شانی بی بی کی منشا کے خلاف چلنا چاہتا ہے تو اس کے سارے بال و پَر جل جاتے ہیں۔ وہ کٹے ہوئے بالوں والے داستانی کردار سیمسن کی طرح اپنی ساری توانائیاں کھو بیٹھتا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ دو دلوں کے درمیان کیسا ناتا تھا......؟ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ناصر سے کہے تو وہ دیوانہ وار کارروائی کرے گا۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ گوجرانوالہ انڈسٹریل ایریا پہنچ جائے گا اور چوہدری اعجاز کو دن میں تارے دکھا دے گا لیکن وہاں جو کچھ بھی ہو گا، کیا وہ خود اس کی ذمے داری سے بچ سکے گا؟ چوہدری اعجاز اور رنگ والی کے دیگر چوہدری ناصر کو اس کا دستِ راست ہی سمجھیں گے۔ وہ شانی کو بتائیں گے کہ یہ سارا کچھ بھی رستم کے ایما پر ہوا ہے۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ اگر ایک طرف شانی تھی تو دوسری طرف مصیبت زدہ سردار دراج تھا۔ وہ سردار دراج کی مصیبت سے بھی نگاہ نہیں چرا سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اپنی ہی نگاہوں سے گر جاتا۔ وہ دیر تک پریشان رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے وہ سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے

کہ وہ کس جگہ اور کس حال میں ہیں۔ اس کے لیے وہ ناصر کو استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اجمل ویسے ہی زخمی تھا۔ رستم کے ذہن میں زوار کا خیال آیا۔ زوار اس کے ان دوستوں میں سے تھا جو اس کے لیے کسی بھی وقت کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ موبائل کے ذریعے زوار کے ایک دو پرانے نمبرز پر رابطے کی کوشش کرتا رہا مگر ناکامی ہوئی۔ پھر اس نے دیرینہ ملتانی دوست جہانگیر کا نمبر ٹرائی کیا۔ یہاں پہلی کوشش میں ہی اسے کامیاب ہوگئی۔ دوسری طرف سے جہانگیر کی گونج دار آواز آئی۔ ''کون ہے بھئی، کیا گل ہے؟''

انداز ہ ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھا کڑاہی گوشت یا اس قسم کی کوئی اور شے کھا رہا تھا۔ بے دریغ پیسہ خرچ کرنا اور زندگی کے ہر لمحے سے لطف حاصل کرنا جہانگیر کا وتیرہ تھا۔

رستم نے کہا۔ ''بڑی جلدی بھول گیا ہے جہانگیرے! تُو تو کہتا تھا، میں تیری آواز لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر جہانگیر کی چلائی ہوئی آواز آئی۔ ''اوئے رستم...... تم؟ کہیں میرے کان اندھے تو نہیں ہوگئے، میرا مطلب ہے بہرے تو نہیں ہوگئے؟ یار! تم نے تو اتنی لمبی جدائی ڈالی ہے کہ بس جیتے جی مار دیا ہے۔ کہاں تھے تم؟ اتنی دیر کہاں رہے...... ویری دشمنوں نے تو بڑی بری بری خبریں پھیلا رکھی تھیں...... تم نے فون کیوں نہیں کیا؟ نہ کوئی خط پتر، نہ کوئی پیغام؟'' اس نے ایک ہی سانس میں درجن بھر سوالات کر ڈالے۔

جہانگیر سے رستم کی آخری ملاقات ملتان میں ہی ہوئی تھی۔ قدرت کے ملتان والے آستانے پر تڑتھلی مچانے کے بعد رستم اور گوہرا نے چند روز جہانگیر کے پاس ہی گزارے تھے۔ یہاں جہانگیر نے رستم کو وہ 25 لاکھ روپے پیش کیے تھے جو ایک زمین کا قبضہ چھڑانے کے بدلے رستم کے حصے میں آئے تھے۔ اس 25 لاکھ میں سے کچھ رقم رستم نے اپنے اخراجات کے لیے رکھی تھی۔ باقی رقم میں سے کچھ رقم اس نے ڈھوک شاہاں کی اس مہربان لڑکی مہراں کو بھجوائی تھی جس نے رستم کی خاطر خود کو سراجے نام کے کریہہ صورت بندے کے سپرد کیا تھا۔ باقی رقم اس نے شانی بی بی ہسپتال کے لیے بھجوا دی تھی۔

آج ایک عرصے بعد رستم کے کانوں میں پھر اپنے اس بے تکلف دوست جہانگیر کی آواز پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جگر! ہم جیسے مفروروں کی زندگی تو کھلی جگہ پر رکھی ہوئی موم بتی کی طرح ہوتی ہے۔ قانون کی آندھی کسی بھی وقت اسے بجھا سکتی ہے پھر تم جدائیوں کے اتنے لمبے لمبے وقفے کیوں ڈال دیتے ہو؟''

''بس کچھ مجبوریاں تھیں...... تم بتاؤ تم نے میرے کام کیے تھے؟''

''جانِ جگر! یہ بھی کوئی پوچھنے والی گل ہے۔ میں نے پورا ایک ہفتہ لگا کر ڈھوک شاہاں کی اس لڑکی مہراں کو ڈھونڈا۔ اس کا نکھٹو شوہر سخت بیمار پڑا تھا۔ پورے گھر میں غریبی نچ رہی تھی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اتنی بڑی رقم پا کر ان لوگوں کو کتنی خوشی ہوئی۔ تیرے کہنے کے مطابق میں نے یہ سب کچھ تیرا نام لیے بغیر کیا تھا۔ شانی بی بی ہسپتال کو بھی رقم اسی طرح چھپ چھپاتے پہنچائی تھی۔''

''اچھا، یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ اب تُو کیا کر رہا ہے؟''

''بس مرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ پیسے خرچ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ پیسہ ایسی کمینی شے ہے کہ جب اسے کھلے دل سے خرچ کرنے کا ارادہ کر لو تو پھر خرچ ہی نہیں ہوتا۔ اب دیکھ...... ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مَیں نے اپنے تین یاروں کے ساتھ کوئی ساڑھے تین ہزار کا کھانا کھایا ہے۔ قریباً دس ہزار کی...... بلیک کی شراب پی ہے لیکن ہوٹل کا منیجر ایسا کھوتی دا پُتر ہے کہ مجھے پہچان گیا ہے۔ کہتا ہے کہ کھانے کا ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ اب ایسے سستے دور میں بندہ زہر کھا کر نہ مرے تو کیا کرے۔''

''میری ساری ہمدردیاں تیرے ساتھ ہیں۔'' رستم نے کہا۔ ''مگر اس وقت تجھے ایک بڑے خاص کام کے لیے فون کیا ہے۔''

''تیرا بتایا ہوا کوئی کام بھی میرے لیے عام نہیں ہوتا یار...... ہر کام کے لیے تیار ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ اس کام کے بعد تجھ سے ملاقات ہونی چاہیے۔''

''ملاقات بھی ہو جائے گی۔ پہلے کام سن لے۔'' رستم نے کہا۔ پھر وہ اسے بتانے میں مصروف ہو گیا کہ اسے گوجرانوالہ پہنچ کر کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

جہانگیر نے رستم کی توقع سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کیا۔ صرف بارہ گھنٹے بعد اس نے وہ تقریباً ساری معلومات رستم تک پہنچا دیں جو اسے درکار تھیں۔ اس نے رستم کے موبائل فون پر جو کچھ بتایا اس سے چوہدری اعجاز کے بھائی کی کوٹھی کا مکمل ایڈریس معلوم ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کوٹھی میں کتنے افراد موجود ہو سکتے ہیں۔ چوہدری اعجاز کے بھائی کا نام شاداب تھا۔ اسے شابی بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے انڈسٹریل ایریا میں چاول صاف کرنے والے دو تین شیلر لگا رکھے تھے۔ جہانگیر نے یہاں تک معلوم کر لیا تھا کہ چوہدری اعجاز ہر بدھ اور اتوار کو ورنگ والی سے سفر کر کے اپنے بھائی شاداب کے پاس آتا ہے اور تقریباً سارا دن وہیں گزارتا ہے۔ چاولوں کے کاروبار میں چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کی پارٹنرشپ بھی تھی۔

یہ ساری معلومات رستم کے لیے مفید تھیں۔اس نے جہانگیر کا شکریہ ادا کیا۔

وہ تڑپ کر بولا۔ ''نہیں نہیں......اس شکریے کے بجائے میرے سر پر اینٹ مار دو تو زیادہ اچھا ہے۔یاروں کے درمیان کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔اگر میرے لیے کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر مجھے ملاقات کا ٹائم دو۔ڈھیروں باتیں ہیں جو تمہارے ساتھ کرنی ہیں۔سمجھو کہ میری باتوں والی ٹینکی فل ہوئی پڑی ہے۔''

''باتیں تو میں نے بھی بہت سی کرنی ہیں مگر مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔یہ مہلت ہم دونوں کے لیے اچھی ہوگی۔''

جہانگیر کو بہ مشکل قائل کر کے رستم نے فون بند کر دیا۔اب اسے اس کوٹھی میں پہنچنے کی تیاری کرنا تھی جو چوہدری اعجاز کے بھائی کی ملکیت تھی......اور جہاں مصدقہ اطلاعات کے مطابق دراج اور اس کے ساتھی بند تھے۔جو کچھ رستم کے ذہن میں تھا، وہ بس اپنے تک ہی رکھنا چاہتا تھا۔ناصر اور اجمل کو بھی کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔کل اتوار کا دن تھا اور وہ کل ہی وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔اس کی خواہش تھی کہ جب وہ وہاں پہنچے تو چوہدری اعجاز بھی وہاں موجود ہو۔

اگلے روز دس بجے تک کا وقت اس نے بڑی مشکل سے کاٹا۔بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل کے لیے ایک نئی نمبر پلیٹ اور ہیلمٹ کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔حاجی حیات پہلے ہی اس بات سے ناراض تھا کہ رستم کوٹھی سے نکل کر کارروائیاں کر رہا تھا۔اب اسے پتا چلتا تو اس نے مزید ناراض ہونا تھا۔مگر لگتا تھا کہ رستم اب حاجی کی ہر طرح کی ناراضگی جھیلنے کو تیار ہو چکا ہے۔اجمل کی حالت بہتر تھی۔ناصر مسلسل اس کی تیمارداری اور علاج میں لگا ہوا تھا۔گاہے بہ گاہے زری بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔وہ بتدریج سلجھ رہی تھی۔حلیہ بھی بہتر ہو رہا تھا مگر اوٹ پٹانگ حرکتیں وہ اب بھی کرتی تھی۔اب بھی ایسا ہی ہوا۔اچانک گیراج کی طرف سے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گونج دار آواز آئی۔پھر موٹر سائیکل گری اور اس کی ریس بڑھتی چلی گئی۔گیراج کی طرف جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔رستم بھاگتا ہوا موقع پر پہنچا۔موٹر سائیکل گری ہوئی تھی اس کا پچھلا پہیہ اسپیڈ سے گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ موٹر سائیکل بھی گھوم رہی تھی۔خانساماں ظفر احمد موٹر سائیکل کو سنبھالنے کی کوشش میں موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ ہی چکریاں کھا رہا تھا۔پھر اس نے غلطی کی، موٹر سائیکل کو بند کیے بغیر اسے کھڑا کرنا چاہا۔تیزی سے گھومتے ہوئے پہیے نے پانچ ہارس پاور بی ایم ڈبلیو کو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی سی رفتار دے دی۔وہ تیزی سے آگے کو گئی اور ٹی وی لاؤنج کا بلوری دروازہ توڑتی ہوئی ایک صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

اسے بند کر کے بہ مشکل صوفے سے جدا کیا گیا۔اس تصادم کا سارا نقصان صوفے نے برداشت کیا تھا۔خانساماں ظفر نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔''یہ بی بی زری نے کیا ہے۔بڑی دیر سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی......''

''لیکن وہ گئی کہاں؟'' رستم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''زری......زری!'' ناصر نے اسے آوازیں دیں۔

زری کا جواب نہیں آیا......نہ ہی وہ کہیں دکھائی دی۔رستم، ناصر اور ظفر وغیرہ اسے ڈھونڈنے میں لگ گئے۔نیا ہیلمٹ جو رستم نے موٹر سائیکل کی سیٹ پر رکھا ہوا تھا، وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔رستم نے خانساماں ظفر سے پوچھا۔''ہیلمٹ کہاں ہے؟''

''وہ زری بی بی نے پہنا ہوا تھا جی......کہہ رہی تھی میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شانا باجی (شانی) کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔بس مذاق مذاق میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔''

''لیکن وہ گئی کہاں ہے؟'' ناصر نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

رستم بھی پریشان تھا۔وہ تقریباً ہر جگہ دیکھ چکے تھے۔وہ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف آئے۔دفعتاً رستم کی نگاہ باغیچے کے ایک اونچے درخت پر پڑی اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔وہ جامن کی ایک اونچی شاخ پر چڑھی بیٹھی تھی۔

رستم نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ناصر بھی سٹپٹا کر رہ گیا۔ہیلمٹ بہ دستور زری کے سر پر تھا اور وہ مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی۔

''چلو نیچے اترو۔'' ناصر نے تحکم سے کہا اور ساتھ ہی انگلی سے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

''میں نہیں اترتا۔تم ہم کو مارے گا۔''

''وہ تو ضرور ماروں گا۔اگر تم نیچے نہیں آؤ گی تو اوپر چڑھ کر ماروں گا۔''

''نہیں نہیں، مذاق کر رہا ہے۔چلو نیچے آ جاؤ، کچھ نہیں کہے گا۔'' رستم نے کہا۔

''وہ ایک دم چل پڑا۔مجھ کو پتا ہی نہیں چلا۔'' زری کا اشارہ موٹر سائیکل کی طرف تھا۔

ناصر بولا۔''تمہارے ہاتھ میں آنے والی ہر شے ایک دم چل پڑتی ہے اور تم کو پتا ہی نہیں چلتا۔کسی دن ایسے ہی پستول چلا کر شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جاؤ گی اور تمہیں پتا ہی نہیں چلے گا۔''

اس نے معصومیت سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔''مجھ سے غلطی ہوا۔میں معافی مانگتا ہوں۔''

''اب ایک اور غلطی......معافی مانگتا نہیں......معافی مانگتی ہوں۔بولو معافی مانگتی

ہوں۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں.... مانگتی ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''کیا مانگتی ہوں۔ پورا فقرہ بولو۔''

''میں معافا مانگتی ہوں۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''چلو جی۔ اب معافی کا معافا ہو گیا۔ تم نہیں سنور سکو گی۔'' ناصر نے مایوسی سے سر ہلایا۔''یہ ہمارا ہی 'غلطا' تھا کہ تمہیں ان برفوں سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔''

رستم نے کہہ سن کر زری کو بہ مشکل جامن کی کچی شاخوں سے نیچے اتارا۔ نیچے اُتر کر زری نے ہیلمٹ اُتارا اور ایک بار پھر بڑی معصومیت سے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔ اس کی یہ ادا اتنی معصومیت بھری ہوتی تھی کہ ناصر کا سارا غصہ کافور ہو جاتا تھا۔

وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا۔''دیکھو...... ہم نے تمہیں، اپنے کان خود ہی کھینچنے کی رعایت دی ہوئی ہے۔ یہ رعایت کسی بھی وقت واپس لی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں تمہارے کان اتنے لمبے نہیں رہیں گے جتنے اب ہیں۔''

پتا نہیں کہ ناصر کی بات زری کی سمجھ میں آئی یا نہیں مگر اس نے اثبات میں سر ضرور ہلایا۔ کمرے میں جا کر وہ رستم سے بولی۔''میں شانا باجی کے لیے بہت اداس...... وہ مجھ کو بہت اچھا لگتا۔ وہ واپس کیوں نہیں آتا؟ اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا......''

رستم نے لمبی سانس لی اور جواب دینے کی ذمے داری ناصر پر ڈال کر باہر آ گیا۔ گیراج میں جا کر رستم نے موٹر سائیکل کا معائنہ کیا۔ وہ کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہی تھی، بس چھوٹی موٹی خراشیں آئی تھیں۔

رستم دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ کوٹھی سے نکلا اور گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جی ٹی روڈ پر قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر نے اسے اس کی منزل تک پہنچا دیا۔ وہ انڈسٹریل ایریا میں داخل ہوا اور پھر اس شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جو ایک نسبتاً سنسان سڑک پر واقع تھی۔ کوٹھی کے عقب میں بسوں کی باڈیاں وغیرہ بنانے کی ایک بڑی فیکٹری تھی۔ دائیں طرف بھی ایک کارخانہ موجود تھا۔

گیٹ پر موجود گارڈز نے رستم سے آمد کی وجہ پوچھی۔ گارڈ سے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی رستم نے سرخ رنگ کی وہ نئی مگر کیچڑ آلود جیپ دیکھ لی جس پر چوہدری اعجاز عموماً سفر کرتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوٹھی میں موجود ہے۔

رستم نے گارڈ سے کہا۔''چوہدری اعجاز صاحب سے ملنے آیا ہوں۔''

''آپ نے ٹائم مقرر کیا ہوا ہے؟'' گارڈ نے ترشی سے پوچھا۔

''بس ان سے اتنا کہہ دو، وڈے ڈیرے والا آیا ہے۔ نام بتانے کی بھی ضرورت نہیں یا پھر فون پر بات کرا دو۔''

گارڈ نے دوسری تجویز پر عمل کیا۔ لکڑی کے کیبن میں انٹر کام موجود تھا۔ اس نے پہلے سرگوشیوں میں خود بات کی پھر ریسیور رستم کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری جانب چوہدری اعجاز ہی تھا۔''ہیلو!'' رستم نے کہا۔

''کون ہو تم؟'' دوسری طرف سے نہایت پریشان لہجے میں پوچھا گیا۔

''میرا خیال تھا کہ آپ وڈے ڈیرے کے اشارے سے پہچان لیں گے۔''

''اوہ!'' چوہدری نے متعجب انداز میں کہا۔ اس نے رستم کی آواز پہچان لی تھی۔ چند لمحے گمبھیر خاموشی رہی پھر چوہدری کی آواز ابھری۔''مجھے تمہارے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''میں حلفیہ کہتا ہوں۔ میرا کوئی ساتھی میرے ساتھ نہیں ہے، میں خود بھی خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے بندے میری تلاشی لے سکتے ہیں۔''

چوہدری خاموش رہا۔ وہ سخت ڈرا ہوا لگتا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... تم اکیلے اور خالی ہاتھ بھی کم خطرناک نہیں ہو۔ رستم نے کہا۔''میں قسمیں نہیں کھاتا، ہاں اپنی زبان کا پاس مجھے اپنی جان سے بھی عزیز رہتا ہے۔ اور میں اسی زبان سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں ہے۔ میں آپ سے بس چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد چلا جاؤں گا۔''

''لیکن ان باتوں کے لیے تم نے یہی جگہ کیوں چنی ہے؟'' چوہدری کے لہجے میں اب بھی شک بول رہا تھا اور اس شک کی وجہ بھی رستم جانتا تھا۔

''میں رنگ والی نہیں آ سکتا تھا...... نہ میرے بلاوے پر آپ لاہور پہنچ سکتے تھے، اس لیے مجھے یہی جگہ مناسب معلوم ہوئی لیکن اگر آپ کہیں اور بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔''

چوہدری اور رستم کے درمیان کچھ دیر سوال جواب ہوئے۔ پھر چوہدری اعجاز نے گارڈز کو انٹر کام پر ہدایات کیں کہ وہ رستم کو کوٹھی کے ساتھ ہی واقع مل کے آفس میں لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری نے گارڈز کو رستم کی تلاشی کی ہدایت بھی کی۔

گارڈز نے رستم کو کڑی نظروں سے گھورا اور جوتے اتروا کر مکمل تلاشی لی۔ اس کا ..

ہیلمٹ بھی اپنے پاس رکھ لیا گیا۔

مل کا دفتر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ بے حد سجا سجایا اور وسیع آفس تھا۔ امپورٹڈ فرنیچر، امپورٹڈ ڈیکوریشن۔ آفس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں تھوڑی سی گہما گہمی نظر آئی۔ چھٹی کے روز یہ گہما گہمی غیر متوقع تھی۔ رستم نے ایک فیشن ایبل نوجوان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی طلوعی تھی۔ گلے میں ہیرے کا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ وہسکی پی کر رات بھر کسی حسینہ کے پہلو میں موجود رہا ہوگا۔ اس کی شکل وشباہت نے ایک لمحے میں رستم کو سمجھا دیا کہ وہ چوہدری اعجاز کا چھوٹا بھائی شاداب عرف شابی ہے۔

چار عدد خوبرو لڑکیاں اور گنجے سروں والے دو منیجر نما افراد بھی آفس کے اس حصے میں موجود تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ آفس میں موجود چاروں لڑکیوں کے بال غیر معمولی طور پر لمبے اور سلکی تھے۔ وہ اپنے بالوں کو بڑے ناز سے گاہے بہ گاہے دائیں بائیں جھلاتی تھیں۔ ان میں سے دو تو خاصی خوبصورت تھیں۔

رستم صوفے پر بیٹھا رہا اور آفس کے دوسرے حصے میں ہونے والی نقل وحرکت کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں نخرے دکھا رہی تھیں اور گنجے سر والا درمیانی عمر کا شخص ایک جدید کیمرے سے ان کی تصویریں اتار رہا تھا۔ شاداب عرف شابی کی بھرائی ہوئی آواز رستم کے کانوں میں پہنچی۔ وہ ایک لڑکی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو مس شاہینہ! شیمپو کی فیلڈ میں بڑا سخت کمپی ٹیشن ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک سپر ماڈل اسکرین پر نظر آ رہی ہے۔ ہم کچھ نیا اور بہتر کر کے دکھائیں گے تو لوگ توجہ دیں گے ناں۔''

لڑکی جو پہلے ہی مختصر لباس میں تھی، اٹھلا کر بولی۔ ''تو پھر ہمارے سارے کپڑے ہی اتار لیجیے۔ ایک دم نیا ہو جائے گا۔''

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ شابی نے بڑی بے تکلفی سے ایک لڑکی کے بالوں کو اس کی پشت کی طرف سے اٹھا کر دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ سامنے کی طرف ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح کچھ اچھا لگ رہا ہے لیکن یہ مس شرماتی بہت ہے۔'' وہ واقعی شرما گئی۔

ایک دوسری لڑکی شوخی سے بولی۔ ''اس کی شرم دور کرنے کے لیے اس کے ساتھ ایک چکر کسی اچھے ریسٹورنٹ کا لگائیں اور رات کا کھانا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔''

لڑکیاں پھر کھلکھلا کر ہنسیں۔ شابی نے کمال بے تکلفی سے فقرہ کہنے والی لڑکی کی گال پر چٹکی لی اور بولا۔ ''تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم بولتی بہت ہو۔''

وہ رستم کی پرواہ کیے بغیر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اگر ان لڑکیوں کو اور ان کے ساتھیوں کو

رستم کی پہچان ہو جاتی تو وہ شاید ایک لمحہ بھی وہاں رکنا پسند نہ کرتے۔

رستم نے اندازہ لگایا کہ چوہدری اعجاز کا صنعت کار بھائی کاروبار میں کوئی نئی مہم جوئی کر رہا ہے۔ وہ غالباً کاسمیٹکس کی طرف آ رہا تھا اور شیمپو وغیرہ بنانا چاہ رہا تھا۔ دراز بالوں والی ماڈلز کا اجتماع بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ یعنی کاروبار کا کاروبار، تفریح کی تفریح! رستم جانتا تھا کہ رنگین مزاج صنعت کار اور کاروباری لوگ اس قسم کے راستے اپناتے رہتے ہیں۔ دونوں گنجے افراد اشتہاری کمپنی سے تعلق رکھتے تھے۔

اس دوران میں آفس کے دونوں حصوں کو ملانے والا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی چوہدری اعجاز اندر داخل ہو گیا۔ وہ بہت چوکس اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ وہ اکیلا اندر آیا تھا۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ اس کے اردگرد مسلح افراد موجود ہیں اور وہ یقیناً کمرے کے اندر کی صورت حال بھی دیکھ رہے ہیں۔ چوہدری اعجاز نے اندر آتے ہی ان دو گارڈز کو باہر بھیج دیا جو حساب کتاب کے فرشتوں کی طرح رستم کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

چوہدری اعجاز نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً کام کی بات پر آ جانا چاہیے...... سب سے پہلے تو میری یہ الجھن رفع کرو کہ تم نے اس ملاقات کے لیے یہ جگہ ہی کیوں چنی ہے؟'' چوہدری کے لہجے میں شک لہریں لے رہا تھا۔

رستم بولا۔ ''آپ کی طرح میں بھی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں سردار دراج کے موجود ہونے کا پتا ہے۔''

چوہدری کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''اب کیا چاہتے ہو تم؟''

''اپنے ساتھی کی رہائی لیکن آپ سے لڑ کر نہیں...... بات چیت کے ذریعے۔''

چوہدری نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ ''دیکھو رستم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ میں بس اپنی بھانجی کو...... جو مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر پیاری ہے...... غلط حالات سے بچانا چاہتا ہوں۔ اگر میں تم سے بیر کھانا چاہتا تو تم اور تمہارے ساتھی یوں آزادانہ نہ پھر رہے ہوتے۔ لاہور کی کوٹھی پر پولیس چڑھائی کر چکی ہوتی اور بہت خون خرابا ہو چکا تھا لیکن یہ سب کچھ میرے سینے میں دفن ہے اور دفن رہے گا۔''

''اگر آپ کی طرف سے برداشت دکھائی جا رہی ہے تو میں نے بھی کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھایا۔ مجھے کئی دن سے معلوم ہے کہ سردار دراج اور اس کے ساتھی یہاں موجود ہیں۔

مہتم ہر جگہ انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور بہت بپھرے ہوئے ہیں لیکن کوئی مہتم یہاں نہیں پہنچا اور نہ ہی پہنچے گا۔''

''اگر میں کہوں کہ سردار وراج یہاں نہیں ہے...... وہ پولیس کی تحویل میں ہے تو پھر؟''

''پھر ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی اور ہم دونوں کا، خاص طور سے آپ کا ٹائم ضائع ہو گا۔''

چوہدری اعجاز نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دو طویل کش لیے اور بولا۔

''تم اپنے دل کی بات بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟''

رستم کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اپنی شانی بی بی کا چہرہ آ گیا۔ ان کی اشک بار آنکھیں، ان کے خاموش لب...... رستم نے خود کو بہت گناہ گار محسوس کیا۔ اس کے سینے میں موجود فولادی دل...... فولادی نہ رہا۔ وہ جس نے جھکنا نہیں سیکھا تھا، جس کو پشیمان ہونا نہیں آتا تھا، جس نے اپنی ترنگ میں کبھی کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، ایک دم خود کو بدلا ہوا محسوس کرنے لگا۔

اس نے دل کی گہرائی سے کہا۔''چوہدری صاحب! غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی ہوئی۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔''

چوہدری اعجاز اپنی جگہ ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ کتنے ہی گمبھیر لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ آخر چوہدری کی بھاری آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔''اگر تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو میں بھی پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پچھلی باتوں کو بھولنا ہوگا۔'' چند لمحے توقف کر کے اس نے پوچھا۔''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''آپ شانی بی بی کے لیے عزت کی جگہ پر ہیں تو میرے لیے بھی ہیں۔ میں آپ سے سردار وراج کے بارے میں درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیں۔''

''یہ آسان کام نہیں ہے۔ وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سردار کے ساتھی حوالات توڑ کر بھاگے ہوئے ہیں۔''

''آپ چاہیں گے تو یہ سب کچھ ہو جائے گا۔'' رستم نے یقین سے کہا۔

چوہدری بغور رستم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے رستم! میں یہ کام کرا دیتا ہوں۔ تمہارے چھوٹے موٹے اور مسئلے ہیں وہ بھی حل ہو

جائیں گے...... لیکن اس کے بدلے؟''

''آپ بتائیں۔''

چوہدری کے چہرے پر پتھریلی سختی ابھر آئی۔ وہ کش لے کر بولا۔''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا ساتھ شانی کے لیے مصیبت اور دکھ کے سوا اور کچھ نہیں لائے گا۔ وہ اب خود بھی اس چیز کو سمجھ گئی ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑے دل کے مالک ہو اور مشکل فیصلے کر سکتے ہو...... میں چاہتا ہوں کہ تم شانی کی زندگی سے الگ ہو جاؤ۔''

رستم کے دل پر جیسے کسی نے بہت زوردار گھونسہ رسید کیا تھا۔ اسے اپنا آپ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولا۔''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا چوہدری صاحب کہ کچھ ہی دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ بس ایک دو ضروری کام ہیں...... وہ ہو جائیں تو یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ملک ہی چھوڑ جاؤں۔''

''نہیں رستم۔ میں ٹھوس حل چاہتا ہوں...... اور مجھے یقین ہے، اب شانی بھی یہی چاہتی ہے...... تمہیں شانی سے اپنا رشتہ ختم کرنا ہوگا...... اسے طلاق دینی ہوگی۔'' چوہدری کے آخری الفاظ رستم پر بجلی کی طرح گرے۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا بھسم ہو گیا ہے۔ کیا بی بی کے بغیر بھی کوئی زندگی ہو سکتی ہے؟ اس نے بے حد کرب اور تعجب سے سوچا۔ جواب نفی میں تھا...... یکسر نفی میں تھا......

''اسے طلاق دینی ہوگی۔'' چوہدری اعجاز کے الفاظ رستم کی سماعت میں گونج رہے تھے اور وہ سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔

چوہدری سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا پھر گہرا کش لے کر بولا۔''اگر تم راضی ہو تو میں ایک دو دن میں کاغذات تیار کروا سکتا ہوں۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب! ہم وقتی طور پر ایک دوسرے سے دور ہیں مگر...... ہمارے درمیان اتنی زیادہ دوری نہیں ہوئی کہ خدانخواستہ اس قسم کے فیصلے کی نوبت آ جائے...... آپ نے......''

''نہیں رستم! تم غلط سوچ رہے ہو۔'' چوہدری نے تیزی سے رستم کی بات کاٹی۔''میں نے تمہیں یہی کہا ہے کہ میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں مگر حالات بہت بدل چکے ہیں...... جو کام کچھ عرصے بعد خراب طریقے سے ہونا ہے، وہ ابھی اچھی طرح سے ہو جائے تو بہتر ہے۔''

''نہیں چوہدری صاحب! میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' رستم نے کراہ کر کہا۔ ''میں آپ سے یہ وعدہ تو کر سکتا ہوں کہ کبھی شانی کو اور آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا مگر...''

''تم اسے کس گناہ کی سزا دینا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ ساری زندگی تمہاری باندھی ہوئی بندش میں جکڑی رہے؟''

''نہیں چوہدری صاحب! یہ بندش زیادہ دیر نہیں رہے گی۔ مجھے پتا ہے کہ بہت جلد یہ بندش میرے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ جو خود بخود مر رہا ہے، آپ اس کا خون اپنے سر کیوں لینا چاہتے ہیں؟''

دفعتاً چوہدری اعجاز کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ چوہدری نے فون ریسیو کیا۔ چوہدری کے موبائل کا اسپیکر آن تھا یا شاید اس نے اب آن کیا تھا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز رستم کے کانوں میں پڑی اور رستم کا جسم سنسنا اٹھا۔ وہ اس کی شانی بی بی تھی۔ وہی کھنکتی ہوئی آواز، وہی جلترنگ بجاتا ہوا لہجہ۔ ''کیا بات ہے دھی رانی؟'' چوہدری نے پوچھا۔

''خالو جی! لاہور سے مہمان کس دن آ رہے ہیں؟''

''تمہیں بتایا تو تھا جمعے کو۔ سرفراز صاحب کے سیکرٹری شاید جمعرات کو ہی آ جائیں گے۔''

شانی کی آواز ابھری۔ ''خالو! جمعے کو ہی آپ کے زمیندار مہمانوں نے بھی آنا ہے.....تو پھر کیوں نہ ایک جلسے کا انتظام کر لیا جائے۔''

''تجویز تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن کیا اتنی جلدی بندوبست ہو جائے گا؟''

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''اب اتنا تجربہ تو ہو ہی چکا ہے۔''

دو تین منٹ تک خالو بھانجی میں بات ہوئی پھر چوہدری اعجاز نے ذرا گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شانی پتر! ایک خبر سناؤں تجھے؟''

''کیا بات ہے خالو جی؟'' وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''رستم سے ملاقات ہوئی ہے۔''

''کہاں؟''

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ کیا تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو؟'' دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر شانی کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''خالو جی! آپ نے جو بات بھی کرنی ہے خود کر لیں۔''

''مگر پتر.....''

''نہیں خالو..... مجھے اب ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔'' شانی نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

رستم اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس کی رگوں میں ایک سرد اندھیرا اُترتا جا رہا تھا۔ شانی کے الفاظ نہیں زہریلے نشتر تھے جو اس کی سماعت کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی لہولہان کر رہے تھے۔ کتنی رُکھائی، کتنی لاتعلقی تھی اس کے جملے میں..... ''خالو جی! آپ نے جو بات بھی کرنی ہے خود ہی کر لیں۔''

کیا یہ شانی بی بی تھیں؟ کیا یہ ان کے الفاظ تھے؟ جو اس کے سینے میں منہ چھپا کر ہولے سے کہا کرتی تھیں، اب ہمیں موت بھی جدا نہیں کر سکتی۔

خالو اعجاز نے بڑی نرمی سے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''رستم! زندگی کی کڑوی سچائیوں کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے اور سچ یہ ہے کہ تم اور شانی ایک راستے پر چل ہی نہیں سکتے تھے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ یہ معاملہ مزید خرابی اور جگ ہنسائی کی طرف نہ بڑھے تو ٹھنڈے دل کے ساتھ دو چار دن کے اندر کوئی فیصلہ کر لو۔ تم سمجھ دار ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہارا فیصلہ میری رائے سے الگ نہیں ہوگا۔''

رستم خاموش رہا۔ وہ جیسے قوتِ گویائی کھو چکا تھا۔

چوہدری اعجاز نے ایک بار پھر نرمی سے اس کا کندھا دبایا۔ ''رستم! میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ایک دو گھنٹے میں سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو رہا کرا لوں گا۔ یہ بات ذہن میں نہ رکھنا کہ وہ میرے پاس ہیں۔ وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ بہرحال، ایک ایسی تگڑی سفارش میرے پاس ہے کہ کام بن جائے گا..... بلکہ سمجھو بن گیا۔ اگر تم ابھی انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہو تو لے جا سکتے ہو، ورنہ وہ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں گے۔''

''نہیں۔ میں انہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم ادھر ہی بیٹھو۔ تھوڑی دیر آرام کرو۔ میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔''

رستم کا کلیجا کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں مسلسل شانی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ شانی کے الفاظ نہیں ہیں... نہ وہ شانی کی آواز تھی۔ وہ تو اس صداکارہ کی آواز تھی جو آج کل بڑی کامیابی سے شانی کی آواز اور لب و لہجے کی نقل کر رہی تھی۔ آواز اور انداز کی نقالی فنونِ لطیفہ کی ایک خوبصورت شاخ ہے مگر یہاں اس فن کو یوں استعمال

کیا جارہا تھا کہ دو زندگیاں بڑی تیزی سے بربادی کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھیں۔

قریباً ایک گھنٹے کے اندر ہی چوہدری اعجاز نے سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھیوں کو رستم کے حوالے کر دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان چاروں کی اس کوٹھی میں موجودگی مکمل طور پر راز رہے گی۔ رستم ان چاروں کو بھی یہ نہیں بتائے گا کہ وہ اصل میں کہاں اور کس کی حراست میں تھے۔ ان چاروں کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں اور چہروں پر تشدد کے نشانات بھی واضح دکھائی دیتے تھے۔

رستم نے اپنی موٹر سائیکل چوہدری اعجاز کی تحویل میں دے دی۔ چوہدری اعجاز نے پورا تعاون کرتے ہوئے رستم کو ایک سیکنڈ ہینڈ اسٹیشن وین فراہم کر دی۔ اس وین پر بھی نمبر پلیٹ موجود تھی۔ رستم نے اس نمبر پلیٹ کو موٹر سائیکل کی جعلی پلیٹ سے تبدیل کر کے گزارا کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد رستم، سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو لے کر انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی سے روانہ ہو رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے رستم نے موٹر سائیکل کی نشست کے نیچے چھپایا ہوا ماؤزر نکال کر وین میں رکھ لیا تھا۔

رستم وین کو ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی سے قریباً ایک کلومیٹر دور آ گیا تو سردار دراج نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''کیا کھیال ہے رستم! انکھیوں سے یہ پٹیاں ہٹا لیں؟''

''نہیں، ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو۔'' رستم نے کہا۔

وہ چوہدری کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا چاہتا تھا۔ چوہدری کے ساتھ جو باتیں طے ہوئی تھیں، ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ رستم اس کوٹھی سے نکلنے کے بعد دس کلو میٹر تک مہمتوں کی آنکھوں سے پٹیاں نہیں ہٹائے گا اور نہ ہی ہاتھ کھولے گا۔

رستم کے اندر کی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ سینے میں ایک جلتا ہوا صحرا اُتر گیا۔ مرنے اور مارنے کے لیے تو وہ پہلے ہی تیار تھا مگر اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔ آتی جاتی سانس ایک آری کی طرح اس کے سینے کو کاٹ رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نگاہ عقب نما آئینے پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ ایک بڑی سیاہ جیپ پیچھے آ رہی تھی۔ بغور دیکھنے سے رستم کو اندازہ ہوا کہ جیپ میں تین چار افراد موجود ہیں۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ مسلح ہیں۔ رستم کو یاد آیا کہ یہ جیپ اس نے کوٹھی کے سامنے سڑک پر دیکھی تھی۔ تو کیا کوٹھی میں سے ہی کوئی اس کے پیچھے لگ گیا تھا؟

اس نے اپنی رفتار کچھ دھیمی کی تو جیپ اور اسٹیشن وین کا فاصلہ کم ہو گیا۔ رستم نے جیپ کے اندر چوہدری اعجاز کے بھائی شاداب عرف شابی کو پہچان لیا۔ وہ بھنا کر رہ گیا۔ پیچھے آنے

والوں کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ یونہی نہیں آ رہے۔ وہ تعاقب کر رہے ہیں۔

رستم نے موبائل پر چوہدری اعجاز کا نمبر پریس کیا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ رستم کے اندر طیش کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سردار دراج کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ہٹا دی اور پشت پر سے اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ سردار دراج نے اپنے ساتھیوں کی بندشیں کھول دیں۔ رستم نے دوبارہ چوہدری کا نمبر ڈائل کیا۔ اس مرتبہ رابطہ ہو گیا۔ چوہدری کی قدرے گھبراہٹ آمیز ''ہیلو'' سنائی دی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے چوہدری؟ تمہارا بھائی پیچھے آ رہا ہے۔'' رستم پھنکارا۔

''وہ من مانی کر رہا ہے رستم۔ میں نے اسے بڑا سمجھایا ہے لیکن وہ نکل گیا ہے۔ بڑا بے وقوف ہے وہ...... تم نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''سنبھالو اسے...... نہیں تو مارا جائے گا۔'' رستم کے لہجے میں وحشت تھی۔

''سنبھالتا ہوں...... سنبھالتا ہوں۔ تم نے کچھ نہیں کہنا۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں، اس کے پیچھے آ رہا ہوں۔'' چوہدری کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔

''اسے میرے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''نہیں بتایا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں...... نہیں بتایا۔ اسی بات پر اس سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اسے کچھ نہیں کہنا۔'' چوہدری کے لہجے میں طیش، خوف، التجا سب کچھ شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

برق رفتار جیپ آندھی کی طرح اُڑتی ہوئی اسٹیشن وین کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اب اس میں شاداب اور اس کے مسلح گارڈز صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار رستم کو گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ پھر وہ اسٹیشن وین کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کرنے لگے...... کبھی دائیں سے کبھی بائیں سے۔ جب رستم نے راستہ نہیں دیا تو انہوں نے خطرناک انداز میں اسٹیشن وین کو ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔ رستم کے اندر سلگتی ہوئی آگ بھک سے بھڑک اٹھی۔ اس نے جیپ کو جوابی ٹکریں رسید کیں۔ دونوں گاڑیاں اب پہلو بہ پہلو بھاگ رہی تھیں۔ اسٹیشن وین کی ایک کھڑکی چکنا چور ہو گئی۔ مسلح گارڈز کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ شابی غلیظ گالیاں بک رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر رستم کو گاڑی روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

رستم کے موبائل پر ایک بار پھر چوہدری اعجاز نے رابطہ کیا۔ رستم دہاڑا۔ ''چوہدری! تمہارا بھائی باز نہیں آ رہا۔ اپنی مصیبت کو آواز دے رہا ہے۔ میرا راستہ روکے گا تو مار ڈالوں

گا۔“

”نہیں رستم! اسے کچھ پتا نہیں۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا۔ اسٹیشن وین کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ موبائل فون رستم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ طاقتور جیپ نے اسٹیشن وین کو اتنے زور سے سائیڈ ماری کہ رستم اس پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ وین پہلے اپنے دو پہیوں پر اٹھی پھر لہراتی ہوئی سڑک سے اُتری اور درختوں میں گھستی چلی گئی۔ جنتر کے بہت سے چھوٹے بڑے پودوں اور جھاڑیوں کو توڑنے کے بعد وہ ایک بڑے درخت سے ٹکرائی اور اُلٹ گئی۔ اس کے سارے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ ریڈی ایٹر پھٹ گیا اور بھاپ بڑے پریشر کے ساتھ اوپر کی طرف جانے لگی۔

”رستم! تم ٹھیک ہو؟“ سردار دراج کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ گاڑی سے باہر نکلو۔“

رستم نے دیکھا ایک مہتم کا سر بری طرح پھٹ گیا تھا۔ اس کے لہولہان چہرے میں سے اس کی ناک کا ٹوٹا ہوا بانسہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ رستم نے وین کے اندر سے نکلنے میں اس کی مدد کی۔ سردار دراج پہلے ہی نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں لیکن جو کچھ رستم کے اندر چل رہا تھا، وہ سردار دراج کی کیفیت سے بڑھ کر تھا۔ وہ ڈیش بورڈ میں سے اپنا بھرا ہوا ماؤزر نکال چکا تھا۔ جیپ دندناتی ہوئی درختوں میں گھسی تھی اور ان سے قریباً بیس میٹر کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ سب سے پہلے اس میں سے ایک قد آور کتا نکلا۔ رستم کی چلائی ہوئی سب سے پہلی گولی بھی کُتے کو ہی لگی۔ گولی اس کے کھلے ہوئے منہ میں گئی تھی اور مغز توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ رستم کے قہر کا دوسرا شکار وہ گارڈ بنا جو خونخوار کُتے کی زنجیر پکڑے جیپ میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ شاید اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ یوں آناً فاناً داعی اجل کو لبیک کہے گا۔ گولی اس کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہوئی۔ اگلے بیس پچیس سیکنڈ میں جو کچھ ہوا اس نے سردار دراج جیسے شخص کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ رستم جنونی کیفیت میں تھا اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ بڑی وحشت سے اس نے تین افراد کو جیپ کے اندر ہی چھلنی کر ڈالا۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ وہ اپنے ہتھیار استعمال کر سکتے۔ جیپ کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آئے۔ شابی، رستم پر صرف ایک گولی چلا سکا۔ وہ بھی خطا گئی۔ رستم کی چلائی ہوئی گولی نے اس کی کلائی میں سوراخ کر دیا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اپنی زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے دباتا ہوا جیپ کے کھلے دروازے سے باہر گرا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ شاید اس کے

سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا اور اتنی تیزی سے ہوگا۔

رستم اس کے سر پر کھڑا تھا۔ ماؤزر اس کے دونوں ہاتھوں میں اور انگلی لبلبی پر۔ آناً فاناً شابی کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔

”گگ...... گولی نہ چلانا۔“ وہ گھگیائی ہوئی آواز میں کراہا۔

”کیوں نہ چلاؤں؟“

”مم...... میں معافی مانگتا ہوں۔“ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا کچھ ہی دیر پہلے ماڈل گرلز کے درمیان سیل مرغ کی طرح اکڑ کر پھرنے والا جواں سال ہیرو، موت کو سامنے دیکھ کر ایک دم چوہا بن گیا تھا۔ مزاج کی ایسی تیز رفتار تبدیلیاں رستم پہلے بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔ اس کی یہ ”معافی“ رستم کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر مستحکم تھی۔ وہ اسے بھی شوٹ کر دینا چاہتا تھا مگر کوئی چیز آڑے آ رہی تھی۔ کوئی چہرہ...... جو رستم کے ماؤزر اور شابی کی کھوپڑی کے درمیان آ گیا تھا۔ رستم کی گرفت ماؤزر پر بے حد سخت رہی مگر وہ لبلبی نہیں دبا سکا۔ آخر کشمکش کے وہ چند جاں گسل لمحے گزر گئے۔ رستم نے فائر کیا۔ گولی شابی کے کان کو چھوتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلایا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کی ڈینم کی قیمتی پتلون گیلی ہو چکی ہو۔ رستم نے ماؤزر اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”جا......! کسی کے صدقے تجھے معاف کیا۔“

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اپنی بی بی کا چہرہ تھا۔

صرف پانچ منٹ بعد شابی کسی لاچار مرغی کی طرح بندھا ہوا درختوں میں پڑا تھا۔ اسے باندھنے کے لیے سردار دراج نے وہی رسیاں استعمال کی تھیں جن سے کچھ دیر پہلے وہ خود جکڑا ہوا تھا۔ شاداب عرف شابی کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تھا۔ اب وہ دو تین گھنٹے سے پہلے خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ اسی دوران میں شابی کی جیب سے نکلنے والے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رستم نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے چوہدری اعجاز کی سخت ہراساں آواز سنائی دی۔ ”شابی! کہاں ہو تم...... مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا۔ دیکھو، میری بات سنو۔ میں نے وہ چاروں بندے سوچ سمجھ کر چھوڑے ہیں۔ اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ تم اس معاملے سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم نہیں جانتے، وہ بہت خطرناک بندہ ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا سب کچھ......“ چوہدری اعجاز ایک ہی سانس میں اور ہذیانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گاڑی میں ہے۔ رستم نے موبائل آف کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ شابی کی لگژری جیپ پر سوار درختوں کے اس ویران جھنڈ سے نکل

رہے تھے۔ جھنڈ میں چار لاشیں تھیں۔ خونخوار کُتے کی لاش ان کے علاوہ تھی۔

مریدکے، کے بارونق قصبے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے شانی کی جیپ چھوڑ دی اور ایک ٹیکسی کار کے ذریعے لاہور پہنچ گئے۔ ٹیکسی کار کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چھوڑنے کے بعد وہ پیدل ہی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ گیراج میں حاجی حیات کی پرائیویٹ کار دیکھ کر رستم چونک گیا۔ حاجی حیات نے دو دن پہلے ہی رستم کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ اب کوٹھی سے باہر نہ نکلے اور چند دن سکون سے گزارے......

حاجی حیات سے رستم کی ملاقات کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ ان دونوں کی دوستی کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آج پہلی بار رستم کو حاجی حیات کے چہرے پر قدرے بیگانگی کے آثار نظر آئے۔

اس نے کہا۔ ''رستم! اب یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہو چکا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''اب کوئی اور جھوٹ نہ بولنا۔ تمہارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے تمہارے تازہ کارنامے کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی دو گھنٹے پہلے گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب جو چار بندے قتل ہوئے ہیں، ان کا خون تمہارے ہاتھوں پر ہے۔'' حاجی حیات کا لہجہ خشک اور طیش بھرا تھا۔

''یار! بغیر ثبوت کے تو بات نہ کرو۔''

''سب کچھ ثبوت کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' حاجی حیات اچانک بلند آواز سے بولا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تم زندہ ہو؟ اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو شبہ ہو چکا ہے کہ تم زندہ ہو اور پچھلے دنوں اوپر نیچے جو کارروائیاں ہوئی ہیں ان میں تمہارا ہاتھ ہے۔ یہ دیکھو......!'' حاجی حیات نے تازہ اخبار رستم کے سامنے پھینک دیا۔

رستم نے دو چھوٹی چھوٹی سرخیاں دیکھیں۔ لکھا تھا...... ''لالہ فرید کے ڈکیت گروپ کا اہم ترین رکن رستم سیال ابھی زندہ ہے؟''

دوسری سرخی تھی۔ ''کیا چھانگی والی کی خونی واردات میں بھی رستم شریک تھا؟''

نیچے ان سرخیوں کا متن تھا۔ رستم نے متن پڑھے بغیر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ حاجی حیات نے کہا۔ ''رستم! میں نے اپنی اور تمہاری دوستی میں ہر حد کو پھاندا ہے لیکن اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں اس سے آگے جانا چاہتا ہوں تو پھر مجھے اپنی وردی اتار کر پھینکنی ہو گی اور تمہاری طرح اشتہاری بننا ہو گا۔ اگر تم چاہتے ہو تو پھر میں یہ بھی کر گزرتا ہوں......''

رستم نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے دوست کا چہرہ تکتا رہا۔ حاجی حیات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بار بار سمجھایا مگر تم باز نہیں آئے اور حق بات تو یہ ہے کہ تم نے میری عزت کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ کسی بھی وقت میری پیٹی اُتر سکتی ہے اور میں تمہارے لیے بالکل بے کار ہو سکتا ہوں۔ یہ دیکھو......! ہیڈ کوارٹر سے کیا محبت نامہ آیا ہے میرے لیے۔''

حاجی حیات نے ایک دفتری لیٹر رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے لیٹر کی طرف دیکھے بغیر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اور میرے دوست یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔ تم ہر بات کو الٹ لیتے ہو۔ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہوا کا رخ دیکھو۔ میرے اور اپنے لیے مصیبتیں پیدا نہ کرو۔ چند مہینے خاموشی سے گزارلو پھر جو جی چاہے کرتے رہنا۔''

''میں نے ڈیڑھ سال سے زیادہ خاموشی سے گزارا ہے۔ اس سے کیا ہو گیا ہے؟ سب کچھ ایسا ہی ہے۔ میں اور خاموش رہوں گا تو اپنی نظروں میں آپ گر جاؤں گا...... اور اپنی نظروں سے گر کر زندہ رہنا مرنے سے بدتر ہے۔''

''تم اپنی ہٹ دھرمی اور جلد بازی سے بہت کچھ خراب کر رہے ہو رستم۔ تمہارا یہی رویہ رہا تو تمہارے اپنے بھی تم سے دور ہو جائیں گے۔ اب شانی کو ہی دیکھ لو...... وہ تم سے دن بہ دن بدظن ہو رہی ہے۔ چوہدری اعجاز کا رویہ وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ یہی معاملہ تایا معصوم کے ساتھ ہے۔ تمہاری جلد بازی کی وجہ سے ڈولے کی جان جا چکی ہے اور خان بے کار ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت جلد تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہونے والا۔''

''تم جو کچھ بھی کہو حاجی...... مگر میں اپنے دوستوں کی پکار سے اپنے کان بند نہیں کر سکتا۔ ان کے لہولہان چہرے دن رات میری آنکھوں میں گھومتے ہیں۔ ان کی آخری آوازیں، ان کی ہچکیاں میرا پیچھا کرتی ہیں۔ حاجی! میرے وہ یار مرتے مرتے اپنا سارا درد میرے حوالے کر گئے ہیں۔ یہ بہت بڑا بوجھ ہے...... بہت بڑا! میں اس بوجھ کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے معاف کر دو اور جس جس کا دل بھی میرے رویے کی وجہ سے دُکھا ہے، میں اس سے بھی معافی مانگتا ہوں۔''

''تم معافی مت مانگو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہاری منت کرتا ہوں کہ اپنے خیرخواہوں کا اتنا سخت امتحان مت لو۔ دیکھو، میری بات سنو۔ اگر لمبی چھلانگ لگانی

ہوتو پہلے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ ریاض ہٹلر سے ٹکر لینا بھی لمبی چھلانگ کی طرح ہی ہے۔ پہلے تیاری کرلو، کوئی پلاننگ بنالو۔"

رستم نے بے قراری سے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ "حاجی! یہاں آگ لگی ہوئی ہے اور جب آگ لگی ہوئی ہو تو اس کو بجھانے کے لیے بیٹھ کر پلاننگ نہیں کی جاتی...... جو فوری طور پر سمجھ میں آئے، کیا جاتا ہے۔"

"تو کیا آرہا ہے تمہاری سمجھ میں؟ یہی ناں کہ ڈپٹی ریاض کو ڈھونڈو اور جہاں وہ خبیث نظر آئے اس کے سامنے اپنے یاروں کے نام کی بھڑک مارو اور اسے گولیوں سے چھلنی کر دو یا پھر کسی کلہاڑی سے اس کے پندرہ بیس ٹوٹے کر دو......" رستم خاموش رہا۔ اس کا چہرہ پتھر تھا۔ حاجی حیات بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "پہلی بات تو یہ ہے رستم کہ ڈپٹی ریاض ایک بہت خرانٹ اور ہوشیار بندے کا نام ہے۔ وہ آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا کسی طرح...... تو پھر کیا ہوگا۔ جس جس کے ساتھ تمہارا تھوڑا بہت بھی تعلق واسطہ ہے، پولیس اس کو عبرت کا نشان بنا دے گی۔ وہ مر سکے گا نہ جی سکے گا۔ وہ روئے گا تمہاری جان کو۔"

"میرا کسی سے تعلق واسطہ نہیں ہے...... کسی سے نہیں ہے۔" دفعتاً رستم اتنی بلند آواز سے بولا کہ پوری کوٹھی جیسے گونج اٹھی۔ اس کا چہرہ اندرونی درد کی تصویر تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دہاڑا۔ "میں مر گیا ہوں سب کے لیے...... کوئی نہیں ہے میرا۔ نہ میں کسی کا ہوں۔ کوئی میری ہمدردی نہ کرے...... کوئی میری موت کا راستہ نہ روکے......" وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☆=======☆=======☆

شانی بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر تھا۔ زندگی اس کے لیے بے کار ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ آموں، جھولوں، پھولوں اور بارشوں کا موسم تھا مگر شانی کے سینے میں تو ایک بے کراں صحرا پھیلا ہوا تھا جہاں ہر وقت دم گھونٹ دینے والی آندھیاں چلتی تھیں۔ وہ کسی کی طوفانی محبت کے سامنے مجبور ہوئی تھی۔ کسی کے ناقابلِ مزاحمت عشق نے اسے ایک خطرناک راستہ چننے پر مجبور کیا تھا...... اور پھر روکیٹ کی اس پُر فضا بستی میں شانی نے رستم سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت شانی کا خیال تھا کہ وہ دونوں باقی دنیا سے کٹ کر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسائیں گے۔ کسی ایسی دور دراز جگہ پر جا رہیں گے جہاں کوئی انہیں جانتا نہ ہوگا۔ بس وہ ہوں گے اور ان کا لافانی پیار ہوگا۔ شانی جانتی تھی کہ رستم کے سینے میں ہمہ وقت ایک آتش بھڑکتی رہتی ہے۔ اس آتش کا تعلق اس قتلِ عام سے تھا جو ڈپٹی ریاض اور اس کے چند ساتھی افسروں نے

وڈے ڈیرے پر کیا تھا۔ انہوں نے اجرالی سرداروں سے ملی بھگت کی تھی اور ان بھوکے پیاسے لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جو ہتھیار پھینکنے کے لیے تیار تھے، بلکہ پھینک چکے تھے۔ شانی کو اس آتش سے خوف آتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ اُمید بھی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ رستم کے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کر دے گی...... یا اس کا رُخ کسی اچھی جانب موڑ دے گی۔ مگر حالات کے بہاؤ نے سارے ارادے غلط ثابت کر دیئے تھے۔ شانی ایک بار پھر اپنی جانی پہچانی دنیا میں آگئی تھی۔ یہاں اس کے اردگرد اس کے اونچے شملوں والے بزرگ تھے اور ان کے اصول تھے۔ دوسری طرف رستم بھی ایک تند بگولے کی طرح انتقام کے منطقی راستے پر چل پڑا تھا۔ کبھی کبھی شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نادیدہ ہاتھ ہیں جو اسے اور رستم کو ایک دوسرے سے دور کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اتنے میں شانی کی ہم راز سکینہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ اس نے حسبِ عادت شانی کے دونوں پہلوؤں کو اپنی انگلیوں سے گدگدایا۔ "کون یاد آرہا ہے میری رانی کو!" اس نے اپنے شوخ لہجے سے شانی کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی مگر جب اس نے دیکھا کہ شانی بہت سنجیدہ ہے تو وہ خود بھی سنجیدہ ہوگئی۔

شانی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "سکینہ! مجھے بتاؤ، میں کیا کروں۔ میرا دل روتا رہتا ہے۔ ڈولا مر گیا مگر میں اس کا منہ بھی نہ دیکھ سکی۔ مجھے لگتا ہے کہ اجمل بھی خیریت سے نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ہو چکا ہے۔"

"تُو اتنی زیادہ دکھی ہے تو پھر رستم کو فون کیوں نہیں کر لیتی۔ دو چار دفعہ کوشش کر، ہو سکتا ہے کہ بات ہو جائے۔"

"نہیں سکینہ! وہ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ شاید میری آواز سننا بھی نہیں چاہتے۔ اگر انہوں نے بات کرنی ہوتی تو اس وقت کرتے جب خالو اعجاز والا واقعہ ہوا تھا۔ معافی نہ مانگتے لیکن میری تسلی کے لیے ایک دو لفظ ہی بول دیتے ...... مگر لگتا ہے کہ وہ اپنے دل کو پتھر کر چکے ہیں۔"

"شانی! یہ خط...... ٹیلی فون، موبائل شوبائل مجھے تو چنگے ہی نہیں لگتے۔ بات تو وہی ہوتی ہے جو آمنے سامنے ہو۔ تُو ایک دفعہ کوشش کر کے رستم سے مل کیوں نہیں لیتی؟"

شانی نے مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں سکینہ! بات بہت بگڑ چکی ہے۔ آمنے سامنے سے اور بگڑ جائے گی۔"

اتنے میں شانی کی نگاہ سامنے رکھے اخبار پر پڑی۔ پچھلے صفحے کی ایک خبر پر اس کی نگاہ

جم گئی۔لکھا تھا۔''گوجرانوالہ میں چار مزید افراد قتل۔'' ذیلی سرخی تھی۔''کیا یہ واردات بھی انہی لوگوں نے کی جنہوں نے قدرت اللہ کو قتل کیا؟''

تفصیل میں اجمل کے ساتھ رستم کا نام بھی واضح طور پر لکھا گیا تھا۔اس شبے کا اظہار کیا گیا تھا کہ شاید اوپر تلے ہونے والی ان وارداتوں میں رستم سیال بہ نفسِ نفیس ملوث ہے۔ چھانگی وال کی خوں ریز واردات میں جو تین ملزم دیکھے گئے تھے ان میں سے ایک کے حلیے کو بیان کیا گیا تھا۔اس حلیے کو حوالہ بنا کر لکھا گیا تھا کہ رستم سیال زندہ ہے اور سرگرم ہے۔رستم کی ایک بہت پرانی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جس میں اس کی داڑھی نہیں تھی اور سر کے بال چھوٹے تھے۔اسے اس خبر میں دہشت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا تھا اور لکھا گیا تھا کہ اگر موجودہ وارداتوں میں بھی رستم شریک ہے تو پھر اس کے جرائم کی کتاب میں ایک اور خونی باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ چاروں مقتول موضع رنگ والی کے صنعت کار چوہدری شاداب کے گارڈز تھے۔

''یہ دیکھو شانی! یہ ایک اور تصویر ہے۔'' سکینہ نے اخبار پر ایک اور جگہ انگلی رکھی۔

یہ تازہ واردات کی تصویر تھی۔ایک الٹی ہوئی ویگن کے پاس چار میں سے دو افراد کی لاشیں گھاس پر پڑی نظر آ رہی تھیں۔قریب ہی ایک کتا بھی مرا پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی، بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور خالو اعجاز اندر داخل ہوئے۔سکینہ نے اٹھ کر ادب سے سلام کیا اور باہر چلی گئی۔خالو اعجاز صوفے پر بیٹھ گئے۔

یہ نے کہا۔''خالو! یہ خبر دیکھی ہے آپ نے؟'' اس نے اخبار خالو کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے خبر پر ایک سرسری نظر ڈالی اور گہری سانس لے کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ واردات بھی......'' شانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

چوہدری اعجاز نے ایک گہری سانس لی۔''مجھے کل ہی پتا چل گیا تھا شانی! میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب تم نے خود ہی دیکھ لیا ہے۔''

''کیا رستم بھی شامل تھا؟'' خالو اعجاز نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔شانی غمزدہ بیٹھی رہی۔پھر کراہتی ہوئی آواز میں بولی۔''رستم کیوں کر رہا ہے ایسا......اسے کیا ہو گیا ہے؟ ان بندوں کو کیوں مارا اس نے؟''

''بس چھوڑو ان باتوں کو شانی پُتر! جتنا تفصیل میں جائیں گے اتنا ہی دل دکھے گا۔ میرے خیال میں تو ان بندوں کا سب سے بڑا قصور یہی تھا کہ یہ ہمارے بندے تھے۔رستم نے انہیں دیکھا اور مار دیا۔اس کے سر پر خون سوار ہے۔''

''شاداب تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں، وہ بچ گیا ہے مگر زخمی ہوا ہے۔اس کی کلائی میں گولی لگی ہے۔شکر ہے کہ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔تمہارے لیے اس کا پیغام بھی ہے۔وہ تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہے۔ کہتا تھا کہ رستم کے سر پر خون سوار ہے۔وہ اپنے جنون میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔شانی اور تایا معصوم کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔''

شانی کے سینے میں ہونکتی ہوئی اداسی کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ابھی کچھ دیر پہلے سکینہ سے باتیں کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ خود کو اس بات کے لیے تیار کر سکتی ہے کہ ایک بار براہِ راست رستم سے رابطہ کرے... لیکن اب اس تازہ خبر کے بعد اسے اپنا وہ خیال عبث محسوس ہونے لگا۔حالات اتنی تیزی سے بگڑتے چلے جائیں گے، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

کہاں گیا وہ رستم جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی؟

کہاں گیا وہ رستم جو اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا؟

کیا اس کے عشق کی منزل بس جسم کا حصول تھا؟

نہیں......نہیں......ایسا نہیں ہو سکتا۔وہ تو ہمیشہ کہتا تھا، اصل عشق وہی ہوتا ہے جو جدائی سے کم ہوتا ہے نہ ملاپ سے دھندلا پڑتا ہے......نہیں......نہیں۔وہ اپنے اندر تڑپ کر رہ گئی۔

خالو اعجاز کی درد بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔وہ بولے۔''شانی پتر! مجھے یہ بات کہتے ہوئے دکھ محسوس ہو رہا ہے لیکن جو حقیقت ہے وہ دیوار پر لکھی نظر آ رہی ہے۔تم اور رستم کسی صورت ساتھ نہیں چل سکتے ہو۔مجھے تو کبھی کبھی ڈر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں وہ کاغذ کے اس ٹکڑے کا جسے وہ نکاح نامہ کہتا ہے، غلط استعمال نہ کرے۔میں تو کہتا ہوں، ہمیں اس کا سدِباب کر لینا چاہیے۔''

شانی نے چونک کر خالو کی طرف دیکھا۔سدِباب کا لفظ اس کے سر پر وزنی ہتھوڑے کی طرح لگا تھا۔سدِباب سے کیا مطلب تھا خالو اعجاز کا؟ کیا وہ طلاق کی بات کر رہے تھے؟ شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اسے لگا کوئی اس کے سینے میں سے اس کا دل کھینچ رہا ہے۔

''دیکھو شانی پُتر......'' خالو اعجاز نے اپنی بات جاری رکھنا چاہی۔

شانی نے تیزی سے نفی میں سر ہلا کر ان کی بات کاٹ دی۔''نہیں خالو......آپ ایسی بات نہ کریں۔پلیز! اس بارے میں خاموش رہیں...... پلیز!''

اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگی۔خالو اعجاز کچھ دیر تک اس کی طرف

دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری باتوں سے دکھ ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے غور کرو گی تو یہ باتیں تمہیں بری نہیں لگیں گی۔''

شانی سے رخصت ہونے کے بعد چوہدری اعجاز حویلی کے مہمان خانے میں آ گئے۔ صداکارہ نائلہ اور اس کا شوہر، چوہدری کے خاص مہمانوں کی حیثیت سے ابھی تک یہیں مقیم تھے۔ چوہدری نے میاں بیوی پر نوازشات کی بارش کر رکھی تھی۔ وجہ ظاہر تھی...... نائلہ کی کوشش سے چوہدری اعجاز اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رستم سے فون پر بات کرنے کے لیے کسی بھی وقت نائلہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کوشش کر کے فنکار جوڑے کو مستقل اپنا مہمان بنا رکھا تھا۔

اختر قصوری اور نائلہ سے چند رسمی باتیں کرنے اور ان کے بچے کا احوال پوچھنے کے بعد چوہدری اعجاز مہمان خانے کی چھت پر چلے گئے۔ انہوں نے موبائل پر اپنے چھوٹے بھائی شاداب سے رابطہ کیا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اب گھر میں تھا۔ چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''ہاں شابی! اب کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں بھائی جان۔'' شابی کی کمزور آواز ابھری۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''لیکن آپ نے مجھ سے یہ سب کچھ چھپایا کیوں؟''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میں اخباروں میں چھپنے والی خبر کی بات کر رہا ہوں۔ کہا جا رہا ہے کہ رستم سیال ابھی زندہ ہے اور کل ہم پر حملہ کرنے والا بھی رستم سیال ہی تھا۔''

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' چوہدری اعجاز چند سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''اور اسی لیے میں نے تمہیں کل بار بار اس کے پیچھے جانے سے منع کیا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تمہاری جلد بازی سے ہوا۔''

''اور بھائی جان! میں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ آپ مجھ سے حقیقت چھپاتے رہے اور اب بھی چھپا رہے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اگر رستم زندہ ہے تو پھر ہم بہت خطرناک کام کر رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ اور شانی ایک دوسرے کے حق میں ہیں۔ ہم شانی کو اس سے چھیننے کی کوشش کریں گے تو اسے بالکل آگ بگولا کر دیں گے۔ وہ بہت کچھ برباد کر دے گا۔'' شابی کی آواز میں لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''کیسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو شابی۔ ہم شانی کو اس سے چھیننے کی کوشش نہیں کر رہے، اپنے گھر کی بیٹی کو اس بدمعاش کے چنگل سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ہم یہ ضرور کریں گے اور تم دیکھنا چند دن تک شانی بھی اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ جائے گی۔ وہ خود اس سے چھٹکارا پانے کی بات کرے گی۔''

''لل...... لیکن کچھ بھی ہے بھائی جان! شانی بیوہ ہے۔ اس کے نام کے ساتھ رستم کے نام کا دھبا لگا ہوا ہے اور مجھے تو کبھی کبھی یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں وہ خفیہ طور پر شادی ہی نہ کر چکے ہوں۔ میں ایسی لڑکی کو بیوی کے طور پر کیسے قبول کروں گا؟''

''تم ایک عرصہ ملک سے باہر رہے ہو۔ تم نے شانی کو ٹھیک سے دیکھا اور جانا نہیں۔ وہ اتنی پیاری لڑکی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چوہدری بابر کو تو جانتے ہی ہو ناں تم؟ کیا کمی ہے اس میں؟ اونچا لمبا گبھرو جوان ہے۔ لمبی چوڑی جائیداد ہے۔ وہ شانی سے شادی کے لیے تڑپ رہا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہماری برادری میں درجنوں ایسے لڑکے ہوں گے جو شانی کو اپنانے کے لیے دل و جان سے تیار ہوں گے۔ باقی رہی رستم والی بات تو اب وہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں۔ اس کا دانہ پانی ختم ہے۔ جلد ہی وہ پولیس مقابلے میں پار ہو گا یا پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچ جائے گا۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' چوہدری نے تحکم سے کہا۔ ''تم کوئی کلرک پیشہ نہیں ہو...... زمیندار بچے ہو۔ ہمارے گھروں میں دو تین شادیاں تو عام بات ہے۔ بعد میں دل کیا تو تم بھی ایک دو اور کر لینا لیکن فی الحال اپنا ارادہ مضبوط رکھو۔ ہمیں اپنے خاندان کی عزت بچانی ہے۔ بھائی ارشاد کی بیٹی پر چادر ڈالنی ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے...... وہ الیکشن لڑے گی؟''

''ہم کوشش تو پوری کر رہے ہیں کیونکہ اگر وہ کھڑی ہو گئی تو لازی جیت بھی جائے گی۔''

''سنا ہے کہ اسے اس معاملے میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے مگر اس میں پریشانی کی بات نہیں۔ وہ الیکشن جیت کر انمول ہے تو الیکشن کے بغیر بھی انمول ہے۔'' چوہدری کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''اندازاً کتنی زمین ہو گی؟''

''جو شانی بیٹی کے نام انتقال ہو چکی ہے وہ تقریباً تین سو مربع ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے......''

فون لائن پر معنی خیز خاموشی طاری رہی۔ پھر چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''میں نے اسے تمہارے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا ہے۔ فکر مند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فون پر تمہاری خیر خیریت دریافت کرے۔ اچھے طریقے سے بات کرنا......اور یہ بوتل شوتل لگانا بھی کم کرو۔ ہر وقت آنکھیں لال کیے رہتے ہو۔''

''کل سے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔

''اور ان ماڈلنگ والی لڑکیوں کو بھی ان دنوں دائیں بائیں ہی رکھو۔ ہر وقت گھسے رہتے ہو ان کے اندر۔ تمہارے آلے دوالے کا ماحول خراب ہو رہا ہے اس سے۔''

''کوئی اور نصیحت؟''

''بس!''

''میں آپ کو نصیحت تو نہیں کر سکتا پر ایک گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ اس رستم والے ٹنٹے کو جلدی ختم کیوں نہیں کرا دیتے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کے ٹھکانے کا پتا ہے۔ آپ چاہیں تو ڈپٹی ریاض کے ذریعے اس ڈرامے کا ڈراپ سین بڑی جلدی ہو سکتا ہے۔''

''نہیں...... مجھے نہیں پتا لیکن اگر مجھے پتا بھی ہوتا تو میں اس معاملے میں نہ آتا...... سمجھنے کی کوشش کرو، جو کام خود بخود ہو رہا ہے ہمیں اس میں فریق بننے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شانی بیٹی کے دل میں ہمارے لیے ذرا سا بھی بال پیدا ہو۔ ہمیں اس معاملے میں اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنے چاہئیں۔''

''کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ آپ رستم سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔''

''خوف زدہ نہیں......محتاط ہوں۔ اسی لیے کل تمہیں بھی احتیاط کا مشورہ دیتا رہا۔''

دونوں بھائیوں کے درمیان اس معاملے میں کچھ دیر مزید بات ہوئی پھر چوہدری اعجاز نے شاداب کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا۔

☆=======☆=======☆

رستم اقبال ٹاؤن کی یہ کوٹھی چھوڑنے کا پختہ فیصلہ کر چکا تھا۔ حاجی حیات سے ہونے والی جھڑپ کے بعد اس کا دل ان در و دیوار سے بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ سوچنے کی بات تھی کہ وہ حاجی حیات کو کب تک آزمائش میں ڈالے رکھے گا۔ اگلے روز حاجی حیات کے جانے کے بعد اس نے جہانگیر کو پھر فون کیا۔ رستم کی آواز سن کر جہانگیر ایک دم کھل اٹھا۔ ''کیا حکم ہے میرے جگر؟'' وہ جوش سے بولا۔

''دو چار ہفتے کے لیے ایک ٹھکانا چاہیے، سر چھپانے کے لیے۔''

''ایک ٹھکانا؟ یار تُو بس ایک بار آنکھ سے اشارہ کر دے۔ آٹھ دس ٹھکانے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حاضر کر دیتا ہوں۔''

''نہیں، بس ایک ہی کافی ہے۔ لاہور کے کسی اچھے علاقے میں ہو جائے۔ زیادہ گنجان آبادی نہ ہو۔''

''گلبرگ میں ہو جائے؟ تین کینال کی کوٹھی ہے۔ پرانی بنی ہوئی مگر اندر سے زبردست ہے۔ ٹھیک ٹھاک باغ بھی ہے۔ اپنا ایک جاننے والا ہے۔ آج کل دبئی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اس سے چابی لے لیتے ہیں۔''

''بھروسے کا بندہ ہے؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے یار۔ ہم جیسوں کے لیے تو سب سے پہلا سوال ہی بھروسے کا ہوتا ہے۔''

''ایک بھروسے کے ڈاکٹر کا انتظام بھی کرنا ہوگا جو کوٹھی میں آ کر اجمل کا علاج کر سکے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہو رہی۔''

جہانگیر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''تُو پریشان نہ ہو۔ یہ بھی ہو جائے گا۔ سب سے بڑا روپیہ......اور روپیہ اپنے پاس بہت ہے۔ اپنا تو وڈا پرابلم ہی یہ ہے کہ زندگی کم اور روپیہ زیادہ۔ کسی ضرورت مند ڈاکٹر صاحب کی جیب میں جب ایک وزٹ کا بیس تیس ہزار روپڑا جائے گا تو وہ سر کے بل چل کر آئیں گے۔''

پانچ دس منٹ کی گفتگو میں سارے معاملات طے ہو گئے۔ جہانگیر نے رستم کو بتایا کہ کل رات نو بجے کے بعد کسی بھی وقت وہ اور اس کے ساتھی گلبرگ نمبر ایک کی کوٹھی میں شفٹ ہو سکیں گے۔

وہ ابر آلود رات تھی۔ ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے بوندا باندی بند ہو جاتی تھی۔ رستم کے دل کا موسم عجیب ہو رہا تھا۔ کوئی رہ رہ کر یاد آتا تھا اور دل سینے میں خون ہونے لگتا تھا۔ تو کیا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی؟ نہیں...... ایسا نہیں ہوگا......اس کے جانے سے پہلے وہ خود چلا جائے گا۔ شاید ایسی جگہ جہاں سے واپس آنا ہی ممکن نہیں ہوگا۔ جہاں سے کوئی واپس آتا ہی نہیں ہے۔

کمرے کی بند کھڑکی اور ہلکی بارش کے درمیان سے گزر کر اس کی نگاہیں احاطے میں اشوکا کے پودوں پر پڑیں۔ ان پودوں کے پیچھے وہ چار ساڑھے چار فٹ اونچی باؤنڈری وال تھی جو دو کوٹھیوں کی درمیانی حد مقرر کرتی تھی۔ اس باؤنڈری وال کو دیکھتے ہی ثریا کا خیال بھی

رستم کے ذہن میں آ گیا۔ پڑوس کی وہ ملازمہ لڑکی جس نے خود پر ہونے والے ستم کی رُوداد رستم تک پہنچائی تھی۔ اس رُوداد کے سبب ہی اتنی جلدی قدرت اللہ اور قدرت اللہ کے انجام کا ملاپ ہوا تھا۔ قدرت اللہ کے قتل کو بیس پچیس دن گزر چکے تھے مگر ابھی تک ثریا سے رستم کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا، پتا نہیں ثریا تک قدرت اللہ والی خوشخبری پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے بڑی ہمت کی تھی اور بڑے ڈرامائی انداز میں رستم تک اپنی بپتا پہنچائی تھی۔ اسے اپنی کوشش کا صلہ معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس لحاظ سے بھی قابلِ تعریف تھی کہ وہ رستم کے اعتماد پر پوری اُتری تھی۔ وہ اس اہم ترین راز سے آگاہ تھی کہ رستم اور اس کے ساتھی یہاں اس کوٹھی میں موجود ہیں۔ وہ بڑے ظرف سے اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی قریبی سہیلی کو بھی بے خبر رکھا تھا۔

رستم اور اس کے ساتھی کل یہاں سے جا رہے تھے۔ رستم کو مناسب محسوس ہوا کہ وہ یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار ثریا سے مل لے۔ تاریک رات میں تیز ہوا نے ایک بار پھر سائیں سائیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا کے ساتھ ہی بارش میں وقفہ آ گیا تھا...... یہ قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ رستم نے شال لی اور ناصر کو بتا کر کوٹھی سے نکل آیا۔ وہ پیدل ہی چلتا ہوا کوٹھی نمبر 99 کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ بارش اور تیز ہوا کے سبب علاقے کی لائٹ گئی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بھی بند تھیں۔ گہری تاریکی میں بلند قامت درختوں کے سائے مسلسل جھوم رہے تھے۔ اس سے پہلے جب وہ ثریا اور اس کی سہیلی نوری سے ملا تھا تو تب بھی ایسا ہی اَبر آلود موسم تھا۔

رستم نے گیٹ کی ایک درز سے اندر جھانکا۔ احاطے کا جھاڑ جھنکاڑ چغلی کھاتا تھا کہ کوٹھی کے مالک کئی ماہ سے یہاں مقیم نہیں ہیں۔ رستم نے اپنی نگاہ برآمدے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج بھی بابا عبدالرحمٰن اور اس کا حقہ برآمدے میں موجود ہیں یا نہیں۔ اس کی نگاہ برآمدے تک نہیں پہنچ سکی۔ بہرحال، رستم کو اُمید تھی کہ بابا عبدالرحمٰن آسانی سے نہیں جاگے گا اور کال بیل کی آواز پر ثریا یا نوری ہی باہر آئیں گی۔

اس نے کال بیل بجائی مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیل نہیں بج رہی۔ پھر اسے یاد آیا کہ بجلی تو گئی ہوئی ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے گیٹ پر دستک دی۔ قریباً ایک منٹ بعد قدموں کی چاپ اور کھانسی کی آواز سنائی دی۔ یہ جان کر رستم کو سخت مایوسی ہوئی کہ ثریا یا نوری کے بجائے بابا عبدالرحمٰن خود گیٹ کی طرف آ رہا ہے۔ چھوٹا دروازہ کھلا۔ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں پورٹ ایبل لائٹ تھی۔ وہ حویلیوں اور کوٹھیوں کی رکھوالی کرنے والا روایتی بوڑھا نظر آتا

تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ مجسم سوال تھا۔

"کیا بات ہے پُتر؟" اس نے قدرے بھرائی ہوئی پریشان آواز میں پوچھا۔

"میں ثریا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا پنڈ ہمارے پنڈ راس پور کے ساتھ ہی ہے۔"

بوڑھے عبدالرحمٰن نے رستم کو سر تا پا گھورا۔ پورٹ ایبل لائٹ اونچی کر کے درمیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بارش ایک دم پھر سے برسنے لگی تھی۔ بوڑھا اُلجھے ہوئے انداز میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بارش سے بچنے کے لیے اندر آ سکتا ہے۔ رستم شکریہ کہتا ہوا اندر چلا گیا اور احاطہ پار کر کے عبدالرحمٰن کے حقے اور چارپائی کے پاس ایک کرسی پر جا بیٹھا۔

عبدالرحمٰن نے رستم کا نام پوچھا...... ایک دو رسمی سوالات کیے پھر بولا۔ "لگتا ہے کہ تم ثریا اور چھیدی سے ملنے کافی دیر بعد آئے ہو؟"

"ہاں، یہ بات تو ہے جی۔ ثریا بہن نے کئی بار کہا تھا کہ لاہور آؤ تو ملنے ضرور آنا۔"

عبدالرحمٰن نے ٹھنڈی سانس لے کر بجھے ہوئے حقے کا کش لینے کی ناکام کوشش کی اور بولا۔ "ثریا تو فوت ہو گئی ہے پُتر۔"

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ "کب...... کیسے؟" وہ بے ساختہ کراہ اٹھا۔

"اسے گزرے تو چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔"

اس بار رستم بالکل چکرا کر رہ گیا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی دیوانے کو دیکھا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن ایک دم سنجیدہ اور رنجور بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں دکھ رینگ رہا تھا۔ "بابا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ مم...... میں...... میرا مطلب ہے......" وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

عبدالرحمٰن نے ایک مڑا تڑا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ لمبی کہانی ہے پتر! ابھی تک ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہاری سمجھ میں کیا آئے گی۔ بس جو اللہ کو منظور تھا وہ ہوا۔ ثریا کے خصم چھیدی کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ وہ کویت گیا تھا اور وہیں کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ثریا اس کوٹھی میں تھی۔ پتا نہیں کیسے اس کی وکھی (پہلو) میں ایک بڑا پھٹ (زخم) لگ گیا تھا۔ ٹھیک بات تو مالکوں کو ہی پتا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ وہ باورچی خانے میں ساگ کاٹنے والی درانتی پر گری تھی۔ آگے اللہ بہتر جانے...... اس وچاری کے پیٹ میں چھیدی کا بچہ بھی تھا۔ پتا نہیں کیوں مالک اسے ہسپتال لے کر نہیں گئے۔ انہوں نے دو چار روز کوٹھی میں ہی اس کا علاج شلاج کرایا...... پر وہ مر گئی۔"

"یہ...... یہ تم کب کی بات کر رہے ہو عبدالرحمٰن؟" رستم کا لہجہ لرزاں تھا۔

"میں نے بتایا ہے ناں کہ کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

رستم کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ تو چند دن پہلے وہ جس لڑکی سے ملا تھا وہ کون تھی؟ اچانک ہی اس کی نگاہوں میں ثریا اور اس کی سہیلی نوری کے چہرے گھومے۔ پھر اسے نوری کی آنکھیں یاد آئیں...... وہ آنکھیں...... ہاں وہ آنکھیں...... یہ وہ آنکھیں تھیں جو وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یہ نگینہ کی آنکھیں تھیں۔ یہ سب کیا تھا؟ کیا گورکھ دھندا تھا؟ وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا۔ بابا عبدالرحمٰن بھی حواس میں ہی نظر آتا تھا لیکن ابھی یہاں جو گفتگو ہوئی تھی وہ سمجھ سے بالاتر تھی۔

اس نے گھوم کر اس بند دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی جس میں سے گزر کر وہ ثریا اور نوری کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا اور جیسے گواہی دے رہا تھا کہ یہاں مدت سے کوئی نہیں رہتا۔

ایک دم رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ "اچھا بابا، میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ ایک دم اٹھ گئے ہو؟ میں تمہارے لیے چائے بنانے لگا تھا۔"

"نہیں، پھر کبھی سہی۔"

عبدالرحمٰن حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رستم رسمی کلمات ادا کر کے بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ یہ اجڑی پجڑی بے رنگ کوٹھی اسے پہلے سے زیادہ ویران محسوس ہوئی۔ دروازے کے قریب رک کر رستم نے بابا عبدالرحمٰن سے پوچھا۔ "ثریا کی کوئی سہیلی نوری بھی ہے؟"

"نوری!" اس نے تعجب سے کہا۔ "یہاں تو اس نام کی کوئی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈ میں ہو...... پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی۔" رستم نے گول مول جواب دیا اور عبدالرحمٰن کو حیران پریشان چھوڑ کر کوٹھی نمبر 99 سے باہر نکل آیا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ انہونا واقعہ ہوا تھا اور بقائمی ہوش و حواس ہوا تھا۔ وہ پہلے واقعات کو بھی ابھی پوری طرح بھول نہیں پایا تھا اور اس دفعہ تو سب کچھ زیادہ واضح اور تحیر خیز تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی رہائش گاہ کے قریب پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ ناصر ابھی

جاگ رہا ہوگا۔ وہ اس سے ثریا کے بارے میں اور اس سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں پوچھے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی روش پر قائم رہے گا۔ جس طرح اس نے پہلے ان واقعات کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا، اب بھی نہیں بتائے گا۔ پتا نہیں کیوں، یہ باتیں دوسروں سے کرتے ہوئے اسے بڑا عجیب لگتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دوسروں کو خواہ مخواہ شدید ترین الجھن میں مبتلا کر دے گا یا پھر وہ اس کی پریشان حالی پر ہنسنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ خیالوں اور واہموں کی دنیا میں رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف ٹھوس حقیقتوں کو ہی مانتا تھا لیکن جو کچھ گاہے بہ گاہے اس کے ساتھ ہوا تھا، اس سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

حسب توقع ناصر جاگ رہا تھا۔ اس نے ثریا کے بارے میں اس سے وہی سوال کیے جن کی اسے امید تھی۔ اس نے گول مول جواب دیئے اور سونے کے بہانے لیٹ گیا۔ دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جس رات ثریا اور نوری سے اس کی ملاقات ہوئی کہیں وہ نشے میں تو نہیں تھا...... پھر وہ اپنی خام خیالی پر خود ہی شپٹا گیا۔ مدت ہوئی اس نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور ویسے بھی ثریا سے اس کی ملاقات ایک نہیں دو بار ہوئی تھی۔ اور سب سے ٹھوس حقیقت...... وہ لرزہ خیز ویڈیو کیسٹ؟ وہ دیر تک عجیب و غریب خیالوں کے نرغے میں رہا پھر سو گیا......

اگلے روز رات کو رستم اور اس کے ساتھی بڑی خاموشی سے گلبرگ میں شفٹ ہو گئے۔ ان کو روانگی کے لیے تیار دیکھ کر خانساماں ظفر احمد دکھی ہو گیا تھا۔ اس نے حاجی حیات کو فون کرنے کی کوشش کی مگر رستم نے سختی کے ساتھ اسے روک دیا۔ جہانگیر نے ٹنڈڈ شیشوں والی ایک اسٹیشن ویگن بھیج دی تھی۔ زخمی اجمل کو اس میں احتیاط سے نیم دراز کر دیا گیا۔ سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھی پچھلی نشستوں پر چلے گئے۔ رستم نے آپوزاہدہ اور زری کو سرمد سمیت سب سے اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ ناصر اور رستم درمیانی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مرغی کی طرح بندھا ہوا طفیل دو نشستوں کے درمیان خلا میں ٹھونس دیا گیا۔ چند روز قید و بند کے بعد اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آنے لگے تھے اور اس کی ساری تن فن ختم ہو چکی تھی۔

گلبرگ کی کوٹھی واقعی بہت پرانی تھی مگر اندر سے اسے جدید انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ یہاں جہانگیر نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اجمل خان کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر آراستہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بیماری کے باوجود اجمل نے کسی نہ کسی طرح اپنی خوش دلی برقرار رکھی ہوئی تھی۔ اس نے جہانگیر کو اپنے دو خود ساختہ شعر سنائے۔ ان کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ "جس طرح گرمی کے سارے

دن گرم نہیں ہوتے اسی طرح پولیس کے سارے لوگ بھی برے نہیں۔ ان میں اکثریت اچھوں کی ہے۔ اس کا ایک ثبوت ایک سابقہ پولیس والا اس وہیل چیئر پر ہے۔" یہ رات دس بجے کا وقت تھا۔ درو دیوار میں کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

کھانے میں کیا ہے جہانگیر؟" رستم نے پوچھا۔

"تمہیں تو پتا ہی ہے، میں کھانے میں بس دو چیزوں کا خیال رکھتا ہوں۔ نمبر ایک، کھانا اچھا ہو اور نمبر دو...... بہت زیادہ ہو۔"

"پھر تو آپ اپنا ام خیال ہے۔" اجمل نے کراہ کر کہا۔

"لیکن آپ تو بیمار ہیں۔ کیا آپ کے لیے کوئی خاص چیز پکانی ہوگی؟"

"نہیں نہیں۔ کوئی احتیاط نہیں۔ جتنی بھی خاص خاص چیزیں ہیں، وہ سب ام کھائے گا۔"

"اور پھر رات بھر ہائے ہائے کرتا رہے گا۔" ناصر نے سنجیدگی سے کہا۔ "نہیں جہانگیر بھائی! اس کو جو بھی دینا ہے میرے مشورے سے دینا ہے۔"

"لگتا ہے، تم ام سے اگلے پچھلے بدلے چکانا چاہتا ہے۔ اللہ کسی کو بیمار نہ کرے اور اگر کرے تو پھر کسی دشمن ڈاکٹر کے ہتھے نہ چڑھائے۔ کل رات ام نے دو شعر بنائے ہیں اس بارے میں بھی۔

کبھی امارے کھانے پینے پر انگلی اٹھاتے ہیں
کبھی اماری دوسری عادتوں کو نشانہ بناتے ہیں
لوگ کہنے کو تو اماری بیمار پُرسی کرتے ہیں
لیکن اصل میں اپنے پرانے بدلے چکاتے ہیں

"دیکھو اجمل! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زخم گہرا ہے اور انفیکشن بھی ہے۔ تم اپنی تکلیف کو سنجیدگی سے لو۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ام آج ہی قبرستان کی طرف منہ کر کے لیٹ جاتا ہے اور کھانا پینا بند کر دیتا ہے۔ یار ناصر! تم کیسی باتیں کرتا ہے۔ اگر ام کو اس معمولی زخم کی وجہ سے ہی مرنا ہے تو ام یہ کام تمہاری مدد کے بغیر بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ ایک اور کتا (قطعہ) ہے۔

ام لالچی دکاندار سے پان کیوں لے
گندے نانبائی سے نان کیوں لے
ام جب مرنے میں خود کپیل (خود کفیل) ہے
تو ڈنگر ڈاکٹر کا احسان کیوں لے"

"تم زیادہ شوخے نہ بنو اجمل۔" رستم نے نرمی سے کہا۔ "ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے، تمہارا زخم معمولی نہیں ہے۔" اجمل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

رات کو اجمل کو بہت تیز بخار ہو گیا اور الٹی بھی ہوتی رہی۔ وہ ہلکی غنودگی کے عالم میں بولتا رہا۔ "جب وہ حرامی شاہی مر گیا تو پھر ام کو بھی مرنے کا کوئی غم نہیں . . . کوئی غم نہیں۔"

اگلے روز جہانگیر نے بھاگ دوڑ کر کے اچھے ڈاکٹر کا انتظام کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جہانگیر نے ڈاکٹر کو منہ مانگا معاوضہ دیا تھا اور اس ڈیل میں سب سے بڑی شرط راز داری ہی کی تھی۔ ایسے معاملوں میں رستم کو جہانگیر پر مکمل اعتماد تھا۔

ڈاکٹر نے تقریباً آدھ گھنٹے تک اجمل کا تفصیلی معائنہ کیا۔ آخر میں وہ کمرے سے باہر آ کر ناصر اور رستم سے بولا۔ "معاملہ آسان نہیں ہے۔ مریض کو ہسپتال کی شدید ضرورت تھی مگر اسے گھر میں رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے انفیکشن بڑھ گیا ہے۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ کسی طرح ان کو ہسپتال داخل کر دیا جائے۔ بایاں پھیپھڑا بھی متاثر ہو رہا ہے جس کی وجہ سے سانس میں دقت ہو رہی ہے۔"

جہانگیر نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ نے جو بھی کرنا ہے یہیں کریں۔ کوئی حل نکال لیں اس کا۔"

"لیکن کچھ ٹیسٹ وغیرہ صرف ہسپتال میں ہو سکتے ہیں۔"

"آپ ہسپتال کو اٹھا کر یہاں لے آئیں۔ ٹیسٹوں کی دو چار مشینیں ہی ہوں گی ناں۔ خرچے کی بالکل پروا نہ کریں۔" جہانگیر نے کہا۔

ڈاکٹر طارق جز بز نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا "اچھا.... ابھی میں نے کچھ دوائیں دی ہیں۔ ان کا اثر دیکھتے ہیں۔ اس دوران میں مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈتے ہیں۔"

سردار دراج کے دو زخمی ساتھیوں کی مرہم پٹی بھی ڈاکٹر سے کروائی گئی۔ دونوں زخمی مہتوں کے یہ گہرے زخم پولیس تشدد کا نتیجہ تھے۔ دو چار گہری چوٹیں سردار دراج کی پشت اور کندھوں پر بھی تھیں۔ ایک مہتم کی ناک کی ہڈی شاہی کے گارڈز کے ساتھ لڑائی میں ٹوٹی تھی۔

سردار دراج نے بلا جھجک رستم کو بتایا کہ پولیس اسے ساتھیوں کے سامنے ہی ننگا کر کے بے دریغ پیٹتی رہی ہے۔

وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "اپنی یہ بے بسی میں مرتے دم تک بھول نہیں سکتا۔ میں

بدلہ لوں گا... چاہے، مجھے اس کے لیے جندگی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔"

رستم نے پوچھا۔ "تم ان پولیس والوں کو پہچانتے ہو؟"

"ان کی شکلیں میرے دماک (دماغ) پر نقش ہوگئی ہیں۔ انہوں نے بہت برا سلوک کیا آپاں سے اور اس سے پہلے آپاں کی (ہماری) عورتوں سے بھی۔ ان میں سے ایک ڈپٹی ریاج کا حرامی یار ہے۔ وہ پلس میں تو نہیں پر پلس والوں کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کو تہور...... تہور کہتے ہیں۔ میں اس کو معاف کر دوں تو اپنے پیو کا تخم نہیں ہوں۔" دراج کے لہجے میں آگ کی پھنکار تھی۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر رستم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "رستم بھائی! مجھے یقین ہے کہ آپاں کو پکڑوانے میں حویلی والوں کا ہتھ ہے۔ حویلی والوں کی طرپھ تو آپاں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ وہ آپاں کے لیے عجت کی جگہ پر ہیں۔ پر ڈپٹی ریاج اور اس کے رشتے داروں سے ہتھ جوڑی جرور کریں گے ہم۔"

سردار کے انداز میں طیش تھا اور خودسری تھی۔ وہ بس رستم کو اطلاع دے رہا تھا، اس سے کسی رائے کا طلب گار نہیں تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس میں حویلی والوں کا ہاتھ ہے؟" رستم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"بس جی، آپاں کی جنگلی عقل تو یہی کہتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے آپاں کو چا پلائی گئی تھی۔ ضرور اس چا کے اندر کوئی نشے والی شے تھی۔ چا پینے کے بعد آپاں چاروں کو اپنی سدھ بدھ نہیں رہی۔ ہوش آئی تو آپاں ایک گڈی میں تھے اور ہتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ انکھیوں پر بھی پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ پھر آپاں کو اس کوٹھی میں لے جایا گیا اور رات دن مارا پیٹا گیا۔ اور آپ سچ پچھیں تو مار کٹ کی وہ تکلیف نہیں ہوئی جو بے عجتی کی ہوئی ہے۔ ہم گریبوں کے پاس آن عجت کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، اس بے عجتی کا بدلہ لوں گا یا اپنی جندگی ہار دوں گا۔"

سردار دراج واقعی کسی قدیم قبیلے کا جنگجو سردار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ خون کے دباؤ سے مزید سانولا ہوگیا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔

رات کو رستم کی ایک دلی تمنا پوری ہوگئی۔ جہانگیر کے چھوڑے ہوئے ایک ہرکارے نے اسے موبائل پر اطلاع دی کہ ڈپٹی ریاض بٹلر کا رابطہ نمبر معلوم ہوگیا ہے۔ یہ قبائلی علاقے میں کرم ایجنسی کی ایک لینڈ لائن تھی۔

نمبر معلوم ہوتے ہی رستم ڈپٹی ریاض سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ رات کے پُرتکلف کھانے میں سے بس چند لقمے لینے کے بعد رستم چھت پر چلا گیا اور اس نے موبائل فون کے ذریعے ڈپٹی ریاض سے رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ پانچویں چھٹی ٹرائی میں لائن مل گئی۔ ایک خاں صاحب پہلے پشتو میں بولے پھر انہوں نے اردو میں بات کی۔ رستم نے خان کو بتایا کہ وہ جناب ریاض صاحب سے بات کرنا چاہتا ہے۔

قریباً دو منٹ بعد وہ نہایت منحوس و کرخت آواز رستم کے کانوں سے ٹکرائی جو شاید اس کے لیے دنیا کی کریہہ ترین آواز تھی۔ یہ ریاض تھا۔ "ہیلو! کون ہے؟" وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

رستم نے گہری سانس لی۔ "اتنی جلدی بھول گئے ہو ڈپٹی ریاض! مجھے مرے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ریاض پھنکارا۔ "کیا بک بک ہے...... کون بول رہا ہے؟"

"فون بند نہ کرنا ڈپٹی ریاض۔ میری آواز پر تھوڑا سا غور کرلو۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے، تمہارے جیسے ظالموں کے حافظے اتنے کمزور نہیں ہوتے۔"

اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ طویل تھا۔ ریاض کی بھاری بھرکم آواز دوبارہ ابھری تو اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ اس کپکپاہٹ کے باوجود یہ آواز نہایت زہریلی اور کرخت تھی۔ "تو ہمارا شک درست تھا...... تم زندہ ہو۔"

"تم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن شاید میرے کچھ سانس باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سانسیں پوری ہونے سے پہلے تیرا میرا حساب بے باق ہو جائے۔"

"تیرا میرا کیا حساب ہے؟"

"تیرا میرا ہی تو حساب ہے۔ وڈے ڈیرے پر جو کچھ ہوا اسے میں بھول سکتا ہوں اور نہ تُو بھولا ہوگا۔"

"اچھا...... تو بدلہ لینا چاہتے ہو لالے اور حسنے گجراتی وغیرہ کا؟"

"لالے اور حسنے گجراتی کا اور خون کے اس ایک ایک قطرے کا جو تُو نے سرکاری ہتھیاروں سے وہاں گرایا...... ایک ایک فقرے کا!"

"میں سمجھا تھا گتے کہ تیری جان چھوٹ گئی ہے لیکن ابھی تیری قسمت میں اور تڑپنا پھڑکنا باقی ہے۔ چلو، ایسے ہی سہی۔"

"تو پھر مجھے تڑپانے پھڑکانے کے لیے سامنے آجا۔"

"سامنے تو تجھے آنا ہے۔" ریاض ہٹلر کے لہجے میں بلا کا زہر تھا۔

"تو پھر جگہ طے کر لے۔ میں آ جاتا ہوں، تُو بھی آ جا۔ جواں مردوں کی طرح فیصلہ کر لیتے ہیں۔ پر میں جانتا ہوں، تُو اپنے باپ کا تخم نہیں ہے۔ کوئی بدکار جنگلی جانور تیری پیدائش کی وجہ بنا ہے۔ تُو نہیں آئے گا اور نہ تجھے آنا ہے۔"

ریاض خاموش تھا۔ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگر کوئی اس سے ایسے لہجے میں بات کر سکتا ہے۔

رستم نے بات جاری رکھی۔ "ڈیڑھ دو سال پہلے تُو نے ٹیلی فون پر مجھے کچھ آوازیں سنا کر اپنے پاس بلایا تھا۔ آج میں بھی تجھے کچھ آوازیں سنانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تیرا دل بڑا خوش ہو گا۔ بس دس پندرہ منٹ انتظار کر۔" اس کے ساتھ ہی رستم نے فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے وہ چھت سے نیچے اترا۔ اس نے ناصر کو اپنے ساتھ لیا اور کوٹھی کے اس وسطی کمرے میں چلا گیا جہاں سب انسپکٹر طفیل کو بند رکھا گیا تھا۔ طفیل کھانا وغیرہ کھا کر لیٹا تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ رستم نے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی ناصر کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

اندر گھستے ہی ناصر نے کسی عقاب کی طرح طفیل کو چھاپ لیا۔ اسے اسپرنگ دار بستر سے اٹھا کر اوندھے منہ فرش پر پٹخا اور پھرتی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس دوران میں رستم پستول لیے اس کے سر پر کھڑا رہا تھا۔

طفیل خوف سے پیلا پڑ گیا اور منت سماجت کرنے لگا۔ "مجھے مت مارنا۔ میں تمہاری ہر بات مان رہا ہوں۔ تم جو پوچھتے ہو، میں بتا دیتا ہوں۔"

"آج تیری اسپیشل کلاس ہے۔ تجھ سے پوچھنا نہیں صرف مارنا ہے۔" ناصر زہریلے لہجے میں بولا۔

"نہیں، خدا کے لیے نہیں ... مم..... میرے سینے میں پہلے ہی درد ہے۔ مجھے کچھ ہو گیا تو ..."

"ہو گیا تو کیا ہو گا ..... زیادہ سے زیادہ تُو مر جائے گا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تیرے ہاتھوں بھی تو ایسے ہی لوگ مرتے رہے ہیں۔"

رستم کے اشارے پر ناصر نے قالین پر پڑے طفیل کی پسلیوں میں چند ٹھوکریں رسید کیں تو وہ بری طرح ڈکرانے لگا۔ رستم نے ایک بار پھر موبائل فون پر ڈپٹی ریاض سے رابطہ کیا۔ دوسری کوشش میں ریسیور پر ڈپٹی کی منحوس آواز ابھری۔ "کون؟"

"میرے خیال میں اب مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ابھی تھوڑی دیر

میں تُو جو آوازیں سنے گا اس کے بعد میری شناخت اور پکی ہو جائے گی۔"

"کیا بک رہا ہے حرامزادے؟" ڈپٹی ریاض، آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا ... اور مسلسل غلیظ گالیاں دینے لگا۔

رستم نے ناصر کو اشارہ کیا۔ اس نے نیچے لیٹے ہوئے طفیل کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ یہ بڑی کڑی سزا تھی۔ ناصر کے جسم کا وزن طفیل کی گردن پر آیا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس کا منہ کھل گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس کا رنگ نیلا ہو گیا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ رستم کے اشارے پر ناصر نے پاؤں کا دباؤ کم کیا تو طفیل نے زور سے سانس اندر کھینچی اور پھر چلانے لگا۔ وہ دو چار سانسیں لے چکا تو ناصر نے پاؤں کا دباؤ پھر بڑھا دیا اور اس کی آواز بند کر دی۔ بیس تیس سیکنڈ بعد اس نے پھر پاؤں کا وزن کم کیا تو طفیل کے گلے کا والیم کھل گیا۔ اس کی آواز ذبح ہوتے ہوئے جانور سے مشابہ تھی۔ "خدا کے لیے نہیں ..... خدا رسول کے لیے نہیں۔" وہ چلا رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" ڈپٹی ریاض فون پر دہاڑا۔

"تیرا بھتیجا طفیل۔ وہ مرنے والا ہے۔ ہم اس کی بہت مہمان نوازی کریں گے تو بھی یہ پانچ چھ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔"

لائن پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی ریاض ہٹلر کی گمبھیر آواز ابھری۔ "طفیل کو کچھ ہوا تو میں تیرے ....." اس سے آگے گالیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔

رستم نے ایک خوفناک سرد مہری کے ساتھ یہ گالیاں سنیں اور بولا۔ "میں نے کہا ہے ناں تُو انسان کا تخم ہی نہیں ہے۔ تجھ سے انسانوں کی طرح بات کرنا بے کار ہے۔ تیرے جیسے حرامی صرف ذلت کی زبان سمجھتے ہیں اور ذلت کی زبان یہ ہے کہ اپنے ..... مشکوک نسل والے بدکار بھتیجے کو بچانا چاہتا ہے تو چار پانچ دن کے اندر بچا لے۔ تیری آسانی کے لیے تجھے یہ بتا دیتا ہوں کہ میں لاہور میں ہوں ..... چل تھوڑی سی آسانی اور کر دیتا ہوں۔ نہر کی دوسری طرف اسٹیڈیم والی سائیڈ پر ہوں۔"

"لے ..... اب کھانے کے بعد تھوڑی سی سویٹ ڈش بھی کھا لے۔" ناصر نے طفیل کے کان میں سرگوشی کی ..... اور پلاس کے ساتھ طفیل کی گھنی مونچھوں کو ایک زوردار کھینچا مارا۔

وہ ایک بار پھر کنوئیں میں گر جانے والے بھینسے کی طرح ڈکرایا۔ اس کے ساتھ ہی رستم نے فون بند کر دیا۔

طفیل کی مونچھیں ایک جانب سے اکھڑ گئی تھیں، وہاں سے خون رسنے لگا۔ اس کا چہرہ پیلا

وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ایک ایسی نصیب سڑی عورت کی طرح گھگیانے لگا جسے اپنی عزت اور جان ایک ساتھ جاتی نظر آ رہی ہو۔ شاید ان لمحوں میں وہ اس گرد باد والی رات کو بھی کوس رہا تھا جب وہ ایک غیر ملکی خاتون کی حدت سے اپنا پہلو گرم کرنے کے لیے ایک مخصوص اڈے میں پہنچا تھا اور رستم کے شکنجے میں پھنسا تھا۔

کمرے میں ٹی وی بہ دستور آن تھا۔ فلم لگی ہوئی تھی۔ انڈین فلم کا گانا گونجنے لگا......

رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا...... جب نشہ چھائے گا تب مزہ آئے گا......! طفیل اچھی حالت میں ہوتا تو شاید اسے یہ گانا اچھا لگتا۔ یہ کمرہ کافی حد تک محفوظ تھا اور ویسے بھی کوٹھی کے بالکل اندرونی حصے میں تھا۔ رستم کو امید تھی کہ طفیل کے رونے چلانے کی آوازیں آپو زاہدہ اور سرمد کے کانوں تک نہیں پہنچی ہوں گی۔ آپو زاہدہ پہلے ہی بہت پریشان تھیں، وہ انہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

عین اس وقت کوٹھی کے ایک کمرے میں آپو زاہدہ بستر پر بڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ طفیل کی آواز تو ان تک نہیں پہنچی تھی لیکن ان کے اپنے اندر سے ابھرنے والی آوازیں انہیں ہلکان کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں کہہ رہی تھیں۔ ''زاہدہ! تیرا چھوٹا بھائی اندر ہی ندر ایک قاتل آگ میں سڑ رہا ہے۔ اس نے تجھ سے جس لڑکی کی بات کی تھی وہ کوئی اور نہیں رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ وہ شانی ہی ہے جس کے سپنے تیرے بدنصیب بھرا نے دیکھے ہیں اور جس کی چاہ کو دن رات اپنے دل میں پالا ہے۔ وہ چھوٹا تھا تب بھی ایسے کھلونوں کو دیکھ کر مچل اٹھتا تھا جن تک اس کی پہنچ نہیں ہوتی تھی۔ اب بھی وہ ایک ایسی شے کی خواہش کر بیٹھا ہے جو اس کی ہمت اور طاقت سے بہت اونچی ہے۔ وہ بہت اونچی پگڑیوں والے خاندان کی ایک بہت اونچی حویلی کی طرف دیکھ بیٹھا ہے۔''

آپو زاہدہ کو تسلی تھی تو صرف ایک بات کی اور وہ یہ کہ ان کا دل ایک بات کی گواہی دے رہا تھا۔ گواہی یہ تھی کہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی بھی اس کے چھوٹے ویر کو بہت چاہتی ہے... تو پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے دور تھے؟ یقیناً کچھ لوگوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ یہ غلط فہمیاں ہی تھیں جو رستم کو دن رات تڑپا رہی تھیں۔ انہوں نے رستم کی بے چین راتوں کے درد کو اتنی شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ اندر تک کانپ اٹھی تھیں۔ وہ دن رات تڑپ رہا تھا۔ کیا چھوٹی چوہدرانی بھی اس کے لیے ایسے ہی تڑپ رہی تھی؟ آپو زاہدہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس دن وہ اور اکرام رنگ والی سے اچانک لاہور

پہنچائے گئے تھے، رستم نے بند کمرے میں کتنی دیر تک اپنے دل کو لہو کیا تھا۔ ان دونوں کا رنگ والی سے آنا بھی کسی دل دکھانے والی غلط فہمی کا ہی نتیجہ تھا۔ آپو زاہدہ نے پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خاموشی سے رنگ والی پہنچے گی اور چھوٹی چوہدرانی سے ملے گی۔ وہ اس کو سب کچھ بتائے گی جو شاید رستم خود نہیں بتا سکتا۔ وہ اس کے سامنے اپنی جھولی پھیلا دے گی اور اتنے درد سے روئے گی کہ چھوٹی چوہدرانی کے پاس اقرار کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں رہے گا۔

آپو زاہدہ سب کچھ طے کر چکی تھیں۔ اگلے روز صبح سویرے ابھی رستم اور سرمد سو رہے تھے کہ آپو زاہدہ برقع اوڑھ کر رنگ والی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے سردار دراج کی بیوی کے بھائی کو جگایا اور اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ اپنے کسی ضروری کام سے جا رہی ہیں، شام تک واپس آ جائیں گی۔ بہت ہوا تو کل دوپہر تک لوٹ آئیں گی۔

انہوں نے کوٹھی کے باہر سے رکشہ لیا اور سیدھا بادامی باغ پہنچ گئیں۔ یہاں سے بس میں سوار ہو کر انہوں نے گوجرانوالہ کا رخ کیا...... گوجرانوالہ سے آگے ویگن اور پھر...... تانگے کا سفر تھا۔ ان تمام مرحلوں سے وہ قریباً پانچ گھنٹے میں فارغ ہوئیں اس وقت دوپہر کا سورج ذرا ڈھلنا شروع ہوا تھا جب وہ رنگ والی میں ایک کھٹارا تانگے پر سے اتریں۔ رنگ والی اپنی روایتی آب و تاب سے دمک رہا تھا۔ چوہدریوں کی بلند و بالا حویلی دور ہی سے نظر آ جاتی تھی۔ قریبی دیہات سے آنے والے اور بھی بہت سے ضرورت مند حویلی تک جانے والے راستے پر آ جا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو رنگ والی کی ہر دل عزیز چوہدرانی سے ملنے کے لیے کٹھن سفر کر کے یہاں پہنچتی تھیں۔ آپو زاہدہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ ان اونچی شان والے چوہدریوں اور زمینداروں کی نگری میں اس کا غریب دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر وہ چلی تو آئی تھی مگر اب ڈر بھی رہی تھی۔ وہ ٹوپی والے دیسی برقع میں لپٹی لپٹائی حویلی کے صدر دروازے تک پہنچی۔ پھر پہرے داروں کے سامنے سے گزر کر زنان خانے میں آئی اور اس قطار میں لگ گئی جہاں ضرورت مند کھڑے تھے۔ پتا چلا کہ تھوڑی دیر میں چھوٹی چوہدرانی آئے گی اور حسب معمول اپنے ہاتھ سے حاجت مندوں میں صدقہ خیرات تقسیم کرے گی۔ زاہدہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر چھوٹی چوہدرانی کو اپنی صورت دکھائے گی اور اس سے درخواست کرے گی کہ وہ اسے علیحدہ میں بات کرنے کا موقع دیں۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد اندر ایک برآمدے میں چھوٹی چوہدرانی کی مختصر جھلک دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی طویل قطار میں ہلچل محسوس ہونے لگی۔ چھوٹی چوہدرانی ملازم عورتوں کے

ساتھ اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئی تھی اور اب اسے قریباً ایک گھنٹہ یہیں پر رہنا تھا۔ زاہدہ نے دور ہی سے آنکھوں آنکھوں میں چھوٹی چوہدرانی کی بلائیں لیں۔ زرتار چادر میں لپٹی ہوئی وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دیتی تھی۔ اس کے اردگرد جیسے محبتوں سے بنا ہوا ایک نورانی ہالہ سا تھا۔ حویلی کی رنگ برنگ دوپٹوں والی نوکرانیاں اس کے آس پاس چہکتی پھرتی تھیں۔ کوئی اس کا دامن سنبھالتی تھی، کوئی ادب سے اس کے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔

اچانک زاہدہ چونک گئی۔ دو پہرے دار قطار کو گھورتے ہوئے زاہدہ کے قریب آ رہے تھے..... ''کہاں سے آئی ہو بی بی؟'' ایک پہرے دار نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ چکرا گئی۔ ''ن..... نور پور سے۔'' اس کے ذہن میں بس یہی نام آیا۔

''نور پور؟ یہ کہاں ہے؟'' دوسرے پہرے دار نے دریافت کیا۔

''گوجرانوالہ!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''اکیلی ہو؟'' پہرے دار نے پوچھا۔

زاہدہ نے گھبرا کر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پہرے دار کی آنکھوں میں شک نظر آیا۔ اس نے ایک ملازمہ صورت کو بلایا۔ ملازمہ عورت نے زاہدہ کا برقع اٹھا کر اس کی صورت وغیرہ دیکھنا چاہی۔ زاہدہ نے برقع کو دونوں ہاتھوں سے چہرے کے سامنے تھام لیا۔ پہرے داروں کو مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ زاہدہ کو ملائمت مگر پختہ ارادے کے ساتھ قطار سے نکال کر لے گئے۔ زاہدہ کو پاس ہی واقع ایک نیچی چھت والے کمرے میں لے جایا گیا۔ ملازمہ عورت نے زاہدہ کی جامہ تلاشی لینا چاہی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ برقع میں درحقیقت کون ہے۔ زنان خانے کی ملازمائیں بڑی اچھی طرح آپو زاہدہ کو پہچانتی تھیں۔ یہ ملازمہ بھی جانتی تھی۔ وہ آپو زاہدہ کو اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ فوری طور پر چوہدری اعجاز کو موقع پر بلایا گیا۔ چوہدری اعجاز نے بھی پہلی نظر میں زاہدہ کو پہچان لیا۔ چوہدری کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ غصے اور جھنجلاہٹ کے تاثرات بھی پھیلتے چلے گئے۔ انہوں نے دونوں پہرے داروں اور ملازمہ کو فوری طور پر رازداری کا پابند کر دیا اور زاہدہ کو بظاہر احترام کے ساتھ مردانے کے ایک کمرے میں لے گئے۔ بند کمرے میں چوہدری اعجاز نے زاہدہ کا برقع اتروا دیا۔ وہ باریک سے دوپٹے میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی۔ چوہدری نے سرخ آنکھوں سے اسے سرتاپا گھورا اور قہر سے بولا۔ ''تو خیر سے اپنے بھائی کی جاسوس بن کر آئی ہو یہاں؟''

''نہیں چوہدری صاحب! میں نے اللہ کو جان دینی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس

وچارے کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں یہاں ہوں..... مم..... میرا کوئی برا ارادہ نہیں تھا چوہدری جی!''

''اس سے برا ارادہ اور کیا ہوگا کہ تُو چھپ چھپا کر یہاں گھسی ہے اور چھوٹی چوہدرانی تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔ تجھے پتا ہے کہ اس طرح گھسنے والوں کو یہاں کیا سزا دی جاتی ہے؟''

آپو زاہدہ نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں نمانی تو بس چھوٹی چوہدرانی کو دیکھنے کے لیے آ گئی تھی..... میں نے تو.....''

''مجھے پتا ہے چھوٹی چوہدرانی سے ملنے کے لیے تم لوگوں کے دل کیسے تڑپ رہے ہیں۔'' چوہدری نے تیزی سے زاہدہ کی بات کاٹی۔ ''تم لوگ ہمیں برباد کر دو گے اور خود بھی ہو جاؤ گے۔''

''اللہ نہ کرے چوہدری جی!'' زاہدہ نے تڑپ کر کہا۔

چوہدری طیش میں بڑبڑاتا اور دروازے پر غصہ اُتارتا ہوا باہر نکل گیا۔ لگتا تھا کہ وہ زاہدہ کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا ہے کہ مبادا وہ غم و غصے میں کوئی بہت سخت بات کہہ دے۔ ابھی چوہدری کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ شانی کا ایک چچازاد بھائی طوفانی انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا۔ ملازم کے ہاتھ میں ایک دیوہیکل کتے کی زنجیر تھی۔ کتے کی خوفناک سرخ زبان اس کی ٹھوڑی پر لٹک رہی تھی۔ ایک تو کتے کی شکل ویسے ہی ڈراؤنی تھی، دوسرے اس کے تھوبڑے اور گردن پر زخموں کے بہت سے نشان بھی تھے۔ غالباً یہ ان کتوں میں سے تھا جو ریچھوں کے ساتھ لڑائی میں استعمال ہوتے تھے۔

نوجوان چوہدری افگن نے زاہدہ کو دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے ملازم کو دیکھ کر بولا۔

''یہی وہ عورت ہے؟''

''ہاں جی۔''

چوہدری نے زاہدہ کو چوٹی سے پکڑا اور بری طرح جھنجوڑ کر بولا۔ ''کون ہے تُو..... کیا ارادہ تھا؟''

''مم..... میں..... میں.....''

''کیا بکری کی طرح میں میں کر رہی ہے۔'' اس نے زاہدہ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ گھوڑے کے ایک دھاتی مجسمے سے ٹکراتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ ''چوری کے ارادے سے آئی تھی؟'' نوجوان چوہدری چنگھاڑا۔

اس سے پہلے کہ زاہدہ جواب میں کچھ کہتی، دیو ہیکل بلڈاگ نے زنجیر میں ذرا سی ڈھیل پا کر زاہدہ پر چڑھائی کی۔ اس کی آواز دل دہلا دینے والی تھی۔ زاہدہ کی قمیص کا پلو کُتے کے جبڑے میں آیا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں قمیص کو پہلو سے تار تار کر دیا۔ زاہدہ چلائی اور کُتے کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر اس کے جسم میں تو جنگلی شیر کی سی طاقت تھی۔ زاہدہ گر گئی۔ کتا اس کی گردن کی طرف آیا۔ زاہدہ نے اپنے ہاتھوں سے گردن کو ڈھانپا۔ کُتے کے بدبودار نکیلے دانت زاہدہ کے ہاتھوں کی پشت سے ٹکرائے اور کھال کو زخمی کر گئے۔ کُتے کے محافظ نے کُتے کو کھینچنے کی ادھوری کوشش کی...... زاہدہ کے چلانے، کُتے کے شور اور محافظ کے للکاروں سے چند سیکنڈ کے لیے جیسے قیامت برپا ہو گئی۔ اسی دوران میں چوہدری اعجاز تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ ''اوئے کیا کرتے ہو...... کیا کرتے ہو؟ پیچھے ہٹو......'' وہ گرجا۔

محافظ نے زور لگا کر کُتے کو زاہدہ سے دور کھینچ لیا۔ نوجوان چوہدری افگن بھی ٹھٹک کر چوہدری اعجاز کو دیکھنے لگا۔ چوہدری اعجاز نے افگن کو زاہدہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کہنا اسے...... جو کہنا تھا میں نے خود کہہ لیا ہے۔ تم نے پوچھ تو لینا تھا مجھ سے!''

''لیکن یہ ہے کون؟'' چوہدری افگن نرم پڑتے ہوئے بولا۔

''بس ہے کوئی...... تم باہر جاؤ۔''

نوجوان چوہدری، ملازم اور کُتے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ چوہدری اعجاز نے دروازہ بند کیا۔ کچھ دیر تک زاہدہ کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تُو رستم کی بہن ہے۔ ورنہ اس طرح یہاں گھسنے پر تیرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''مجھے معاف کر دیں۔ میں تو......''

''اب یہ میں میں چھوڑ۔ جس طرح آئی ہے، اسی طرح یہاں سے چلی جا۔ یہی ہمارے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔ رستم کو بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کر۔ جو کچھ ہوا وہ اسے بھول جائے اگر یہ معاملہ کنٹرول نہ ہوا تو بہت زیادہ خون خرابا ہو سکتا ہے۔''

''مگر میرا بھائی......''

''بس چپ۔ اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہنا۔'' چوہدری نے شہادت کی انگلی اٹھائی۔ ''رب کا شکر کر کہ میں یہاں تھا اور تُو بچ گئی ہے۔ بس اب نکل جا یہاں سے۔ میں تیرے لیے دوسری قمیص منگواتا ہوں۔ اسے پہن اور پھوٹ جا خموشی سے۔''

چوہدری نے نورے نامی ملازم کو آواز دی۔ نورا اندر داخل ہوا۔ اس مرتبہ دیو ہیکل کتا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ چوہدری نے زاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نورے سے کہا۔ ''بی بی کو

عزت کے ساتھ گاؤں سے باہر چھوڑ آنا۔'' عزت کا لفظ چوہدری نے بہت چبا کر کہا تھا۔ اپنا فقرہ مکمل کرتے کرتے چوہدری دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ پھر واپس آیا۔ اس نے جلتی نظروں سے زاہدہ کو دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔ ''دیکھ...... اپنی عقل کو ہتھ مار۔ پولیس رستم کے ساتھ ساتھ تجھے اور تیرے بندے کو بھی کھوجتی پھر رہی ہے۔ اگر تُو کہیں پولیس کے ہتھے چڑھ گئی تو قیامت تک نہیں چھوٹ سکے گی۔ چپ کر کے لاہور پہنچ جا اور کہیں چھپ چھپا کے بیٹھ۔''

چوہدری اعجاز کے الفاظ میں طیش ہلکورے لے رہا تھا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ زاہدہ کے لیے قمیص والی بات وہ بھول ہی گیا تھا۔ اس نے نورے کو اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی۔

نورے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''چلو بی بی!''

نورے کے تاثرات گواہ تھے کہ زاہدہ کے پاس باہر جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

زاہدہ نے چاروناچار برقع اوڑھا اور نورے کے ساتھ حویلی کے احاطے میں نکل آئی۔ اس کی پھٹی ہوئی قمیص کا ایک حصہ برقع کے نیچے سے نکل کر زمین پر گھسٹ رہا تھا اور وہ بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ احاطے میں موجود لوگ پُرتجسس اور مضحکہ اڑانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگے...... ان دیکھنے والوں میں دو آنکھیں حویلی کے سب سے پرانے ملازم بابا خادم حسین کی بھی تھیں۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔ اس نے رستم کی بڑی بہن کو چوہدری اعجاز کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔ خادم حسین کو سب کچھ معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زاہدہ پر کتا چڑھانے کا ڈراما بھی چوہدری نے خود ہی کیا تھا۔ اس نے پہلے افگن اور نورے کو کُتے کے ساتھ اندر بھیجا تھا پھر زاہدہ کا ہمدرد بن کر اندر چلا گیا تھا۔

زاہدہ جب حویلی میں تھی تو بابا خادم حسین اسے بیٹیوں کی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ بھی بابا کی بہت عزت کرتی تھی۔ خادم حسین حویلی کے ان دو چار افراد میں سے ایک تھا جو جانتے تھے کہ آپو زاہدہ اور اکرام دراصل رستم کے بہن اور بہنوئی ہیں۔ اب خادم حسین حویلی کی دوسری منزل پر کھڑا تھا۔ وہ چوہدری کی مکاری اور زاہدہ کی درگت دیکھ رہا تھا۔ ملازم نورے کے ساتھ حویلی سے باہر جاتی ہوئی زاہدہ بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر حویلی کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کے قدم غالباً رکنا چاہتے تھے مگر صورتِ حال کا جبر اُسے آگے کو دھکیل دیتا تھا۔ خادم حسین دیکھتا رہا۔ وہ اپنے پاؤں گھسیٹتی ہوئی رنگ والی کی بیرونی حدود تک پہنچ

گئی۔ نورا واپس آ گیا۔ وہ سُست انداز میں چلتی ہوئی تانگوں کے اڈے کی طرف جانے لگی۔

مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق یہاں زاہدہ کے ساتھ ایک اور زیادتی ہوئی۔ گاؤں کے آوارہ کتوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے لگ گئی۔ وہ خود کو کتوں سے بچاتی ہوئی کبھی کھیتوں میں گھسی، کبھی راستے پر آئی۔ وہ مسلسل شور مچا رہے تھے اور زاہدہ کے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک خدا ترس راہ گیر نے کتوں کو ڈرا دھمکا کر زاہدہ سے دور کیا۔ وہ تھک ہار کر ایک کنوئیں کے قریب بنی ہوئی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ بلندی سے خادم کو سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

خادم حسین کے اندر کئی ہفتوں سے جو جنگ جاری تھی، وہ آج زاہدہ کی حالتِ زار دیکھ کر اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ خادم حسین کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اب بھی چپ رہا تو اس کا کلیجا پھٹ جائے گا۔ اس نے چوہدری معصوم اور چوہدری اعجاز کی خاطر بہت برداشت کیا تھا مگر آج اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی محسنہ، اس کی مالکہ وڈی آپا اس کے سامنے کھڑی ہیں۔ ایک باوقار چوہدرانی کا مکمل روپ! وہ کہہ رہی ہیں...... خادم حسین! کیا آج بھی چپ رہو گے؟ کیا آج بھی اپنے بند ہونٹوں کا تالا نہیں کھولو گے؟

وہ بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیڑھیاں اترا، احاطے سے گزرا اور اس کنوئیں کی طرف چل دیا جہاں ایک نامراد بہن اپنے بھائی کے لیے کچھ کر گزرنے کی خواہش لیے ایک درخت تلے بیٹھی تھی۔

خادم حسین اس کے پاس پہنچا تو وہ اس کی صورت دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ وہاں اردگرد کوئی نہیں تھا۔ ایک سنسناتی دوپہر نے ہر طرف سکوت طاری کر رکھا تھا۔ وہ سسک اٹھی۔

''بابا! یہ دیکھو ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

''میں نے سب دیکھا ہے دھی رانی...... میں سب دیکھ رہا ہوں۔'' خادم حسین نے گلوگیر آواز میں کہا اور بے ساختہ زاہدہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ آخر وہ رستم کی بہن تھی۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''بابا! میرا بھائی رستم دکھی ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں...... وہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ شاید...... تمہیں تھوڑا بہت پتا ہی ہو۔ وہ اور چھوٹی چوہدرانی...... میرا مطلب ہے چھوٹی چوہدرانی اور وہ......'' زاہدہ ہکلا کر رہ گئی۔

بابا خادم حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے کچھ بتانے کی لوڑ نہیں بیٹی! میں اس بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں...... اور بہت کچھ ایسا بھی ہے جو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا... کوئی نہیں جانتا۔'' خادم کی آواز بھرا گئی۔

''بابا خادم حسین! اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ میں ایک بار...... صرف ایک بار چھوٹی چوہدرانی سے ملنا چاہتی ہوں۔ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے پتا ہے بیٹی! تُو نے اس سے کیا کہنا ہے۔ تُو ایسا کر .. تُو یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو اسی طرح واپس چلی جا...... بالکل بے فکر ہو کر بالکل سکون کے ساتھ۔ تیری جگہ اب میں شانی بی بی سے بات کروں گا۔ میں اسے بتاؤں گا سب کچھ...... میں اس کی آنکھیں کھولوں گا اور اسے یہ سب کچھ بھی بتاؤں گا جو ابھی تیرے ساتھ ہوا ہے۔ اب میں اور چپ نہیں رہوں گا، چاہے اس کے بدلے میری جان ہی چلی جائے۔'' خادم حسین کی بوڑھی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو گرنے لگے۔

ان گھنے درختوں تلے بابا خادم حسین اور زاہدہ کے درمیان بس آٹھ دس منٹ ہی بات ہوئی۔ یہ بڑی جذباتی گفتگو تھی۔ اس گفتگو میں خادم حسین نے زاہدہ کو بتا دیا کہ وہ ان ساری غلط فہمیوں سے باخبر ہے جو جان بوجھ کر رستم اور شانی بی بی کے درمیان پیدا کی جا رہی ہیں۔ وہ اب تک خاموش رہا ہے لیکن اب اس خاموشی کا ازالہ کرے گا۔ خادم حسین نے بڑی دانائی سے زاہدہ کو واپس لاہور جانے کے لیے نہ صرف آمادہ کر لیا بلکہ اس کے لیے تانگے کا انتظام بھی کر دیا۔

☆======☆======☆

زاہدہ کی واپسی کے قریباً دو گھنٹے بعد خادم حسین ایک بند کمرے میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سفیدی مائل داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ وہ عجیب انداز سے اپنی چھوٹی بی بی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بابا؟'' شانی نے پوچھا۔

''تُو کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے جب میں تجھے گود میں اٹھائے اس حویلی کے برانڈوں میں گھوما کرتا تھا۔''

''بابا! کیا آج کوئی خاص بات ہوئی ہے...... بہت دکھی نظر آ رہے ہو؟''

''ہاں شانی بی بی! آج بہت خاص بات ہوئی ہے۔ آج میں نے ایک بہن کو اپنے بھائی کے لیے اس طرح تڑپتے دیکھا ہے کہ میرا کلیجا پھٹ گیا ہے۔ آج میں نے بھی اپنے اندر کے ڈر اور مجبوری کو مار دیا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو بابا؟''

خادم حسین نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور دھیمی آواز سے بولا۔ ''میں یہ

کہنا چاہتا ہوں چھوٹی بی بی...... کہ آپ کے آلے دوالے سازش ہو رہی ہے۔ آپ سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ آپ کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔''

''کون کر رہا ہے ایسا؟''

''چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے بی بی...... لیکن کہہ وہی رہا ہوں جو حق ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے بعد زندہ بھی رہوں گا یا نہیں لیکن اب میں اور چپ نہیں رہ سکتا۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ بابا! تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' شانی نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کے خالو اعجاز کی بات کر رہا ہوں بی بی! وہ آپ سے...... اور چوہدری معصوم سے بھی بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ وہ...... دھوکا دے رہے ہیں۔''

اچانک ہی جیسے ایک بڑا شیشہ چھناکے سے شانی کے سر پر ٹوٹ گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بابا؟''

''سچ کڑوا ہے بی بی! لیکن یہی سچ ہے۔'' خادم حسین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میرے دل پر اس معاملے کا بڑا بوجھ ہے بی بی! کیونکہ میں خود بھی اس گناہ میں شریک رہا ہوں۔ پتا نہیں قیامت کے دن اپنی مالکن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''بابا! مجھے اس طرح بتاؤ کہ میں کچھ سمجھ سکوں۔'' شانی کراہی۔

خادم حسین نے گہری سانس لی۔ ''چھوٹی بی بی! چوہدری اعجاز آپ کو رستم سیال سے دور رکھنے کی ہر جائز و ناجائز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اب ہر حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ لاہور سے آپ کو جان بوجھ کر اچانک یہاں لایا گیا تھا۔ لاہور سے آنے کے بعد آپ رستم کے لیے جتنے پیغام میرے ذریعے پہنچاتی رہی ہیں، ان میں سے کوئی بھی رستم تک نہیں پہنچا۔ یہ پیغام پہنچائے بغیر ہی میں اپنا کالا منہ لے کر آپ کے پاس آتا رہا ہوں اور جھوٹ بکتا رہا ہوں۔''

شانی کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ خادم حسین بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ میں صرف آپ کا سامان واپس لانے کے لیے ہی لاہور گیا تھا اور مجھے بھیجنے والے چوہدری اعجاز تھے۔ اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ حویلی کا ٹیلی فون ہر وقت خراب کیوں رہتا ہے۔ یہ بھی آپ کو رستم سے دور رکھنے کے لیے ہے۔ جب چوہدری اعجاز کی مرضی ہوتی ہے، فون ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' شانی سناٹے کے عالم میں سن رہی تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔

خادم حسین نے اپنے صافے سے آنسو پونچھے اور بولا۔ ''رستم سے چوہدری اعجاز کا

رویہ بہت کرخت رہا ہے۔ ایک دو باتیں تو میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ شروع میں رستم برداشت کرتا رہا مگر پھر اس کے بس میں نہ رہا اور وزیری گاؤں میں تھپڑ والا واقعہ ہو گیا۔''

''مگر بابا! کچھ بھی ہے، اس واقعے کے بعد رستم کو معذرت تو کرنی چاہیے تھی یا کم از کم وہ......''

''آپ کو کچھ پتا نہیں چھوٹی بی بی...... یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' خادم حسین نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''آپ کو کچھ پتا نہیں۔ آپ سنیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔'' خادم کی آواز میں کرب تھا۔

''مجھے بتاؤ بابا! مم...... مجھے خود بھی لگ رہا ہے کہ میرے اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔''

خادم حسین نے ایک بار پھر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا پھر اپنی آواز کو مزید پست کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ سے غلط نہیں بولا کہ رستم کی دشمنی میں چوہدری اعجاز ہر حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ آپ کو ان میاں بیوی کا پتا ہے ناں جو مہمان خانے میں اعجاز صاحب کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ جانتی ہیں، وہ کون ہیں؟'' اس بار شانی نے نفی میں جواب دیا۔ خادم حسین بولا۔ ''آپ نے انہیں دیکھا ہوا ہے مگر آپ بھول گئی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ وزیری گاؤں میں چوہدری شہاب کے بیٹے کی شادی پر گئی تھیں۔ وہاں تھیٹر لگایا گیا تھا اور کچھ ایکٹر نقلیں اتار کر لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔''

''ہاں...... وہ ورائٹی شو تھا۔ لاہور سے اداکار آئے ہوئے تھے۔''

''یہ میاں بیوی ان ایکٹروں میں سے ہی ہیں۔ یہ آوازوں کی نقلیں اُتارنے میں ماہر ہیں۔ عورت کا نام نائلہ ہے۔ کچھ ہفتے پہلے اعجاز صاحب نے نائلہ کو آپ کی آواز کی کیسٹ دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ آپ کی آواز بنانے کی مشق کرے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اعجاز صاحب نے اس کام کے لیے نائلہ اور اس کے بندے کو بہت سا روپیہ بھی دیا ہے۔''

خادم حسین کی آواز لرز رہی تھی۔

شانی کی آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں۔ وہ غیر یقینی نظروں سے خادم حسین کو دیکھتی رہی۔ ''بابا! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''میں آپ کو سنی سنائی باتیں نہیں بتا رہا۔ وہی کچھ بتا رہا ہوں جو میں نے خود دیکھا اور سنا ہے۔ مجھے بہت اچھی طرح پتا ہے کہ وہ نائلہ نام کی عورت آپ کی جگہ رستم اور اس کے دوستوں سے بات کرتی رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ چوہدری اعجاز والے واقعے کے بعد بھی رستم نے معافی مانگنے کے لیے آپ کو فون کیا ہو۔ مگر اس کا جواب اسی عورت نے اس طرح دیا

ہو گا کہ رستم کو پھر بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی ہو گی۔ ایک مرتبہ میں اسے خود بھی فون کرتے سن چکا ہوں۔ وہ رستم کے کسی دوست سے بڑی بدتمیزی کے ساتھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز آپ سے اتنی ملتی تھی کہ آپ خود بھی سنتیں تو حیران رہ جاتیں۔ ایسے لگتا تھا کہ...... بس آپ ہی بول رہی ہیں۔"

شانی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ اس میں جیسے بولنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ خادم حسین بتا رہا تھا، وہ ناقابل یقین تھا مگر شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ایک دم شانی کی آنکھوں میں بہت سے آنسو جمع ہو گئے ...... تو کیا اسی لیے رستم ایک دم لاتعلق ہو گیا تھا...... اس قدر بے حس بن گیا تھا؟

خادم حسین نے صافے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "رستم کی بہن نے بتایا ہے کہ وہ بہت دکھی ہے، اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ وہ اپنے آپ سے بھی بالکل بے پرواہ ہو گیا ہے جیسے مرنے کے لیے موقع ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ یہ اوپر نیچے جو وارداتیں ہو رہی ہیں، ان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اگلے چند دن میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے خادم حسین سے پوچھا۔ "آپو زاہدہ آپ کو کہاں ملی تھیں؟"

خادم حسین کچھ بھی نہ چھپانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے شانی کو مختصراً الفاظ میں وہ سب کچھ بتا دیا جو تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے حویلی کے احاطے میں رستم کی بڑی بہن کے ساتھ ہوا تھا۔

شانی پوری جان سے تڑپ گئی۔ سارے حالات کی ایک دھندلی سی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی تھی۔ اس تصویر میں خالو اعجاز کا چہرہ یوں ابھر کر سامنے آیا تھا کہ شانی سکتہ زدہ رہ گئی تھی۔ خالو اعجاز کے حوالے سے کچھ معاملات اسے پہلے بھی الجھاتے رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ خالو اعجاز میں بڑی تیزی سے کچھ تبدیلیاں آئی ہیں...... مگر اب تو صورتِ حال کا ایک بالکل نیا رخ سامنے آ گیا تھا۔ اس کا دل سینے میں پھڑپھڑانے لگا۔ کسی کی جدائی اتنی شدت سے محسوس ہوئی کہ اس کے جسم کی کومل رگیں ٹوٹنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے پھر وہ راہداری کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں خالو اعجاز کے کمرے کے سامنے ٹیلی فون سیٹ پڑا رہتا تھا۔

ان دنوں لائن ٹھیک تھی۔ اتفاقاً خالو اعجاز بھی گھر میں نہیں تھے۔ شانی نے چڑھی

سانسوں اور کانپتی انگلیوں کے ساتھ لاہور میں رستم اور ناصر کی قیام گاہ کا نمبر ملانا شروع کیا۔

بہت دیر تک بیل ہوتی رہی...... پھر اسے خانساماں ظفر احمد کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"کون؟"

"رستم صاحب کہاں ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟" خانساماں ظفر، شانی کی آواز پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔

"میں...... ان کی عزیز ہوں۔ ان سے بات کرا دیں۔"

"لیکن رستم صاحب تو یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"کہاں؟"

"کچھ پتا نہیں ہے جی۔ کئی دن ہو گئے ہیں۔"

"اور ان کے دوست وغیرہ؟"

"وہ بھی سب چلے گئے ہیں بلکہ میں بھی تھوڑی دیر میں جا رہا ہوں۔ مگر...... آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟" آخر میں شاید ظفر کو احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ زیادہ بول رہا ہے۔

اسی دوران میں شانی کو خالو اعجاز کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ شانی نے فون بند کر دیا اور اپنے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ظفر احمد نے بتایا تھا کہ رستم اور اس کے ساتھی لاہور والی کوٹھی سے جا چکے ہیں۔ غالباً وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مگر وہاں سے کم از کم یہ تو پتا چل سکتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ شانی نے فیصلہ کیا کہ وہ لاہور جائے گی...... ابھی اور اسی وقت! وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆=======☆=======☆

ڈپٹی ریاض ہٹلر نے فون پر اپنے گمشدہ بھتیجے سب انسپکٹر طفیل کا رونا چلانا سنا تھا اور وہ آتش فشاں کی طرح کھول گیا تھا۔ یہ شک تو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ یہ کہیں رستم اور لالے کے کسی ساتھی کا کام نہ ہو مگر یہ بات اس کے گمان میں نہیں تھی کہ رستم، حیات ہے اور وہی طفیل کو اچک کر لے گیا ہے۔

کرم ایجنسی کے قبائلی علاقے میں اپنا کام جہاں کا تہاں چھوڑ کر وہ آندھی کی طرح لاہور پہنچ گیا۔ حالانکہ یہ اس کے لیے بڑا اہم ٹاسک تھا۔ ایس پی کی پوسٹ کے لیے ریاض کی ترقی وڈے ڈیرے والے واقعے کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ یہ قبائلی علاقے والا کیس اس ترقی کی رکاوٹ دور کر سکتا تھا یہ کام ادھورا چھوڑ کر اسے لاہور آنا پڑ گیا تھا۔ اب وہ ڈیفنس کی ایک

کوٹھی میں تھا۔ وسیع ڈرائنگ روم میں اپنے ہاتھ کمر پر باندھے وہ کسی زخمی درندے کی طرح چکرا رہا تھا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس بائیس سال ہو گی۔ وہ بے حد مختصر لباس میں تھی۔ دو بالشت کپڑا تھا جس نے اسے چھپانے کے بجائے مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ شکل سے ہی طوائف زادی دکھائی دیتی تھی۔ میڈم ڈی اپنے محسن ریاض ہٹلر کے پاس ایسے تحفے ارسال کرتی رہتی تھی۔ آج کل اس طرح کے دو تحفے اس کوٹھی کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پرات تھی اور نیم گرم پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا جگ تھا۔ وہ بڑی ادا سے ریاض ہٹلر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس کے بوٹ اتارے۔ بدبودار جرابیں اتاریں۔ اس کے پاؤں پرات میں رکھے اور انہیں ٹکور کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ڈپٹی ریاض سگریٹ پھونک رہا تھا اور لڑکی کے لمس بلکہ اس کی موجودگی سے بھی بے خبر نظر آتا تھا پھر جیسے اچانک اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ اس نے لڑکی کے پہلو پر ہلکی سی لات رسید کر کے اسے دور ہٹا دیا۔ نیم گرم پانی چھلک گیا اور نوخیز طوائف حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پھنکارا۔ ''چل دفع ہو جا یہاں سے۔''

وہ مشینی انداز میں اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''کہاں چل پڑی ہے چھمک چھلو! پوری بات تو سن۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''میں نے اوپر جانے کو نہیں کہا۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''اس کوٹھی سے چلی جا۔ تو بھی اور وہ دوسری ناچی بھی۔ اپنا سامان سمیٹ لو اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی شکلیں گم کرو۔''

''کک......کوئی غلطی ہوئی ہے......جی۔'' وہ زرد ہو کر ہکلائی۔

''نہیں ہوئی غلطی۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تمہاری کوئی نشانی نظر نہیں آنی چاہیے اوپر کی منزل پر۔ خوب اچھی طرح دیکھ لو۔ کوئی شے رہ گئی تو برا حشر کروں گا۔''

''ٹھ......ٹھیک......ہے......جی۔''

''میڈم کو فون کرو۔ اسے کہو، گاڑی دے کر کسی کو بھیجے جو تمہیں لے جائے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ واپس مڑی۔

''اور اپنی اس ماں کو بھی لے جا یہاں سے۔'' ڈپٹی نے طیش میں پرات کی طرف اشارہ کیا۔

نوخیز طوائف گھبرا کر آگے آئی۔ پرات اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

اس دوران میں کال بیل ہوئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر بعد اجرالی برادری کا

ایک سردار اندر داخل ہوا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ کانوں میں ہیرے کی بالیاں تھیں۔ وہ بڑا دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ ریاض اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''خیریت تو ہے مینڈے بھائی؟'' اس نے صوفہ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' ریاض پھنکارا۔ ''وہ کُتے کا بی رستم واقعی زندہ ہے۔ اس حرامی کا فون آیا۔ طفیل بھی اس کے پاس ہے۔ وہ اور اس کے یار تشدد کر رہے ہیں طفیل پر۔''

''یہ تو بڑی تڑتھلی مچانے والی خبر سنائی ہے تساں نے۔''

''تو مچ گئی ہے ناں تڑتھلی۔'' ڈپٹی سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''اس کنجر کے پتر نے طفیل کو جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا ہے کہ وہ وڈے ڈیرے پر مرنے والوں کا بدلہ لے گا۔''

''تو پھر آ جائے سامنے۔ بدلے تو اساں نے بھی بڑے لینے ہیں۔ اور سب سے بڑا بدلہ ہے وڈے ڈیرے کی لڑائی میں سردار غلام کبیر کی موت کا۔'' اجرالی سردار تہور خان پھنکارا۔

''صرف باتیں بنانے سے کام نہیں چلے گا تہور خان۔ میرے خون میں بھانبڑ مچا ہوا ہے۔ میں اس کی ماری ہوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا سوچو کہ اس کی ٹانگوں کے بیچ آگ لگ جائے اور یہ آگ لگی رہے......اس کی اگلی دو تین نسلوں تک۔''

''تو کیا ہے تمہارے دماغ میں؟''

''کچھ نہیں یار! کچھ نہیں۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''کیا سب کچھ سوچنے کو میرا دماغ ہی رہ گیا ہے۔ تم سب کے کھوپڑوں میں بھی تو کچھ نہ کچھ رکھا ہو گا۔''

اجرالی سردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔

ڈپٹی ریاض اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگا پھر جیسے اسے ایک دم خیال آیا۔ اس نے موبائل پر اپنی رہائش گاہ کا نمبر ملایا۔ وہاں اس کی بیوی، سالی اور پندرہ سالہ لڑکا رہتے تھے۔ رستم زندہ تھا اور اس موقع پر ڈپٹی کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بیوی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ ابھی دو ڈھائی گھنٹے میں ڈرائیور کو بھیجے گا، وہ اس کے ساتھ یہاں ڈیفنس میں چلی آئے۔ ڈپٹی ریاض کو امید تھی کہ تب تک دونوں طوائف زادیاں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔

ریاض نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ رنگ والی میں ڈپٹی ریاض کا ایک مخبر تھا۔ وہ وہاں موٹر مکینکی کرتا تھا۔ مخبر کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔ وہ بغیر تمہید کے بولا۔ ''سر

جی! نیاز بول رہا ہوں۔ لگتا ہے جی ستارے ہمارے حق میں ہیں۔ کل آپ نے فون کیا تھا، آج آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''کچھ کہے گا بھی یا مجرا سناتا رہے گا۔''

''سر جی! میری اطلاع کے مطابق رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کالے برقع میں حویلی سے نکلی ہے۔ اس کے ساتھ سکینہ نام کی ایک لڑکی بھی ہے۔ دونوں تانگے کے اڈے کی طرف جا رہی ہیں۔''

ریاض کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم نے بوتل تو نہیں لگائی؟ چھوٹی چوہدرانی تو اپنی ماں کی بغل میں گھس کر بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے پالتو کتوں کے بغیر کیسے نکل آئی حویلی سے؟ تجھے غلطی لگی ہوگی۔''

''نہیں سر! ایک دم کنفرم اطلاع ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

''تم کہاں ہو؟''

''میں موٹر سائیکل پر ہوں۔ ان دونوں سے میرا کافی فاصلہ ہے مگر وہ پوری طرح میری نظر میں ہیں۔''

''دیکھ اگر اس بار اطلاع غلط ہوئی ناں تو میں نے ''نیچے'' سے کاٹ ڈالنا ہے تجھ کو۔ بیوی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''نہیں سر! غلطی کا چانس نہیں ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ان کے پیچھے رہ۔ مجھے خبر دیتا جا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اگر برقع میں واقعی شانی ہے تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رخ لاہور کو ہو۔ اگر لاہور کو ہے تو پھر وہ حرامزادی اپنے منہ بولے خصم سے ملنے جا رہی ہوگی۔'' ریاض کے لہجے میں جوشیلی لرزش تھی۔

''او کے سر!''

''تیرے موبائل کی بیٹری وغیرہ سیٹ ہے ناں؟ ہمارا رابطہ ٹوٹنا نہیں چاہیے۔''

''مولا کریم نے چاہا تو نہیں ٹوٹے گا جی۔'' انفارمر نیاز کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ ابھری۔

ڈپٹی ریاض کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر موبائل پر گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں رابطہ قائم کیا۔ یہاں کا سب انسپکٹر تاج طارق، ڈپٹی کے معتمد ساتھیوں میں سے تھا۔ تاج طارق سے رابطہ ہوتے ہی ڈپٹی نے کہا۔ ''طارق! چھوٹی چوہدرانی چوری

چھپے حویلی سے نکلی ہے۔ اس کا کوئی بڑا خاص ارادہ ہے۔ تم سادہ کپڑوں میں پرائیویٹ کار پر نکلو اور فوراً رنگ والی کی طرف چل پڑو۔ نیاز سے رابطہ رکھو، وہ چوہدرانی کے پیچھے ہے۔ میں بھی لاہور سے نکل رہا ہوں۔ چھوٹی چوہدرانی کو کسی بھی صورت نظروں سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا ہے وہ کہاں جاتی ہے۔''

''وہ اکیلی ہے؟'' طارق نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، ایک لڑکی بھی ساتھ ہے۔ وہ اس وقت رنگ والی سے نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف جا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے پہنچنے تک وہ کسی بس وغیرہ پر چڑھ جائیں۔ نیاز الرٹ ہے۔ وہ تمہیں خبر دیتا رہے گا۔ تم بس فوراً نکلو۔ دو تین ہوشیار بندے بھی ساتھ لے لو لیکن کسی کو وردی میں نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ بے فکر رہیں جی۔''

ریاض نے رابطہ منقطع کیا اور ہولسٹر میں 38 بور کا سرکاری پسٹل لگاتا ہوا سردار تہور سے بولا۔ ''یہ سنہری موقع ہے۔ آج اس کتیا کو چھوڑوں گا نہیں۔ کسی صورت نہیں۔''

کچھ دیر بعد ریاض اپنی نیلی ڈاٹسن کار پر تیز رفتاری سے نکلا اور لاہور کے مضافات کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ گوجرانوالہ کی جانب تھا۔ اجرائی سردار تہور خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ راوی کا پل پار کر رہے تھے کہ انفارمر نیاز کی طرف سے کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''سر! دونوں حافظ آباد سے آنے والی ایک لاری میں بیٹھ گئی ہیں...... لاری گوجرانوالہ جا رہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، ہمارا یہ اندازہ درست ہے کہ وہ لاہور آ رہی ہیں؟''

''بالکل جی۔ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ آپ ابھی لاہور میں ہی ٹھہریں تو بہتر ہے۔ سب انسپکٹر تاج طارق صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان کی سفید گاڑی میرے آگے آگے جا رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان دونوں کو غائب نہیں ہونے دیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں لاہور سے باہر نکل کر جی ٹی روڈ پر ہی رکتا ہوں۔'' ڈپٹی ریاض نے کہا۔

ریاض کی بے چینی عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد شانی کا زرد چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ قدرت اللہ کی دردناک موت اور طفیل کے اغوا کے ساتھ ہی وہ ساری انڈر اسٹینڈنگ ختم ہو چکی تھی جو ریاض اور رنگ والی کے چوہدریوں کے درمیان حاجی حیات نے کروائی تھی۔ اب ریاض خود کو ہر طرح سے آزاد سمجھ رہا تھا۔ وہ سانپ تھا اور اس کی

ہتھیلیوں کے اندر بہت سا زہر جمع ہو چکا تھا۔ اب اسے کسی کو کاٹنا تھا اور بہت شدت سے کاٹنا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ریاض کو فون پر وہ اطلاع موصول ہو گئی جس کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر طارق نے اسے بتایا کہ برقع پوش شانی اور اس کی ساتھی لڑکی لاہور آنے والی بس پر سوار ہو چکی ہیں۔ یہ سلطان ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس تھی۔ طارق نے بس کا نمبر وغیرہ بھی ریاض کو نوٹ کرا دیا۔

اجرالی سردار نے کہا۔ ”ریاض بھائی! معاملہ صاف ہے۔ چھوٹی چوہدرانی اپنے یار سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔ اب ان دونوں کو بچنا نہیں چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دے دو اور نفری کو ریڈی کرا دو۔“

”نفری کو ریڈی ہی سمجھو۔ بس ایک کال کی ضرورت پڑے گی۔“ ریاض نے کہا۔

”بڑا پکا کام ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ حرامی اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے چار چھ ساتھی بھی ضرور ہوں گے۔“

”چار چھ ہوں یا چالیس پچاس...... اب ان میں سے کوئی بچے گا نہیں۔“ ریاض ہٹلر کے لہجے میں زہر کی سی کاٹ تھی۔

”رستم کو بھی پار کرنا ہے؟“ تہور خان نے پوچھا۔

”جی تو نہیں چاہتا اس کُتے کے تخم کو اتنی آسان موت دی جائے، پر مجبوری ہے۔ اس مرتبہ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔“

ریاض اور تہور خان نے قریباً ایک گھنٹہ مزید انتظار کی سُولی پر گزارا...... پھر شانی اور اس کی سہیلی کو لانے والی بس موقع پر پہنچ گئی۔ سب انسپکٹر طارق کی سفید کار اس کے تعاقب میں تھی۔ طارق نے بتایا کہ اس نے مخبر نیاز کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ اس نے موٹر سائیکل چھوڑ دی ہے۔

”اچھا کیا ہے۔“ ڈپٹی ریاض نے کہا۔ ”بس ہوشیاری سے پیچھا جاری رکھو...... میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

”ایک دو اہلکار موٹر سائیکل والے بھی ہو جائیں تو بہتر ہے۔“ طارق بولا۔

”بے فکر رہو۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ ایک گاڑی بھی اور آ رہی ہے۔“ ڈپٹی ریاض نے کہا پھر اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے وہسکی کا ادھا نکالا اور غٹا غٹ آدھی بوتل خالی کر گیا۔ سانپ کے پھن ہی کی طرح اس کی گردن اور جبڑوں سے نیچے کا گوشت پھولا ہوا تھا۔

گیڈ سے آلودہ آنکھوں میں قاتل سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

شانی اور سکینہ بادامی باغ کے اڈے پر بس سے اتریں اور ایک ٹیکسی والے سے کرایہ طے کر کے اقبال ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اگر رستم اور اجمل وغیرہ اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں نہیں تھے تو بھی وہاں سے ان کا پتا ٹھکانا تو معلوم ہو سکتا تھا۔

جوں جوں رستم سے شانی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی، وہ بہت خفا ہوگا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی تو اس کی ناراضگی برقرار نہیں رہ سکے گی۔ وہ اسے منا لے گی۔ اسے اپنی محبت کی بے پناہ طاقت پر بھروسہ تھا۔

اچانک وہ کچھ چونک گئی۔ اس کی نظر عقب نما آئینے پر پڑی تھی اور اسے پھر وہی سفید کار دکھائی دی تھی جسے وہ پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کار پر شانی کی نگاہ تب پڑی تھی جب وہ تانگے سے اُتر کر لاری پر سوار ہو رہی تھیں۔ دوسری بار شاید گوجرانوالہ کے پُر ہجوم بس اڈے پر شانی نے اس کار کو دیکھا تھا...... اور اب پھر......!

”کیا بات ہے شانی؟“ سکینہ نے شانی کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

”بس شک سا پڑ رہا ہے۔ لگتا ہے ایک کار ہمارے پیچھے ہے۔“ شانی نے بھی جوابی سرگوشی کی۔

”ہائے اللہ...... کیوں ڈرا رہی ہو۔“

”نہیں سکینہ! کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ سامنے شیشے میں دیکھو، تمہیں سفید کار نظر آئے گی۔“

سکینہ نے چادر کے گھونگھٹ میں سے قریباً ایک منٹ تک عقب نما آئینے کو گھورا پھر بولی۔ ”کار تو نظر آئی ہے مگر......“

”یہ بہت دیر سے پیچھے ہے۔“ شانی کی آواز میں لرزش تھی۔

”ہائے میں مرگئی۔ کہیں یہ...... میرا مطلب ہے کہیں یہ قدرت اللہ کے بندے تو نہیں؟“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ شانی نے کہا پھر ذرا توقف کے ساتھ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بھائی صاحب! اگلی سڑک سے دائیں طرف لے لینا۔ یہاں مارکیٹ کے پاس بس دو منٹ کے لیے رکنا ہے۔“

جواں سال ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی بغلی سڑک سے دائیں طرف موڑ دی۔ شانی بیک مرر میں دیکھتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ سفید گاڑی بھی اسی تنگ سڑک پر مڑ گئی تھی۔ اب شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ خوف کے پہلے حملے کے بعد شانی کے اندر کی دلیر لڑکی نے اسے حوصلہ دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مارکیٹ کے سامنے روک دی۔ یہ ایک درمیانے رقبے کی مارکیٹ تھی۔ شانی شاید پہلے بھی ایک دفعہ یہاں آئی تھی۔ سفید گاڑی ان سے کافی فاصلے پر ہی رک گئی تھی۔ اس میں دو سے زیادہ افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ایک موٹر سائیکل سوار ان کے بالکل پاس سے ہوتا ہوا اور انہیں گھورتا ہوا گزر گیا۔ ان دیکھے خطرے کا احساس شانی کے اندر شدید تر ہو گیا۔

''کیا بات ہے بی بی جی! آپ نے یہاں سے کچھ خریدنا ہے؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

ایک دم شانی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے سو سو کے تین نوٹ ڈرائیور کی طرف پھینکے، یہ طے شدہ کرائے سے پچاس روپے زیادہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی شانی، سکینہ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آئی۔ شانی جانتی تھی کہ مارکیٹ کے اندر سے گزر کر دوسری سڑک پر نکلا جا سکتا ہے۔ اب بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ دونوں تیزی کے ساتھ مارکیٹ کے اندر سے گزر کر دوسری سڑک پر پہنچ جاتیں اور فوراً کسی رکشہ ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل جاتیں یا پھر خود کو کسی دکان میں چھپا لیتیں۔

دونوں تیزی سے مارکیٹ کے اندر داخل ہوئیں۔ یہ شام آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ان دونوں نے تیزی سے مارکیٹ کے اندر ساٹھ ستر میٹر کا فاصلہ طے کیا اور دوسری طرف کی سڑک پر نکل آئیں۔ شانی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے جو کرخت صورت موٹر سائیکل سوار انہیں گھورتے ہوئے گزرا تھا، وہ موٹر سائیکل سمیت بالکل سامنے موجود تھا۔ شانی اور سکینہ کو دیکھتے ہی وہ چونکا اور موٹر سائیکل سے اُتر آیا۔ شانی اور سکینہ واپس مارکیٹ میں پلٹیں۔ ''ہائے اللہ شانی! وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔''

سکینہ کے فقرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک سے زیادہ ہیں۔ شانی نے سکینہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا اور اپنی رفتار کم نہیں کی۔ وہ راہ گیروں سے ٹکراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کئی لوگ مڑ مڑ کر حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''کون ہیں یہ؟'' سکینہ پھر ہانپتی ہوئی آواز میں کراہی۔

''کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قدرت اللہ کے بندے یا پھر...... پولیس والے۔'' شانی نے بھی ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے قریب دو ادھیڑ عمر کے افراد کھڑے تھے۔ کار کے دروازے کھلے تھے۔ شانی اور سکینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ کار کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔

''کیا بات ہے بی بی! بہت پریشان ہو؟'' ایک ادھیڑ عمر نے پوچھا۔

''کچھ غنڈے ہمارے پیچھے ہیں...... تنگ کر رہے ہیں۔'' شانی نے کہا۔

دونوں افراد نے دائیں بائیں دیکھا جیسے پیچھے آنے والوں کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ اسی دوران میں چند میٹر کے فاصلے پر دو دھماکے ہوئے۔ یہ ری پیٹر کے دو گونج دار فائر تھے۔ ایک شوکیس کا شیشہ چکنا چُور ہو گیا۔ ارد گرد موجود لوگوں کی توجہ چند سیکنڈ کے لیے ان فائرز کی طرف گئی۔ اسی دوران میں کار کے قریب موجود دونوں افراد نے شانی اور سکینہ کو گھسیٹ کر کار کے اندر کر لیا۔ اس کام میں دو دیگر افراد نے بھی ان کی مدد کی تھی۔ یہ کام اتنی سُرعت اور ٹائمنگ کے ساتھ ہوا کہ ارد گرد موجود افراد میں سے شاید ہی کسی کو پتا چلا ہو۔ یقینی بات تھی کہ کچھ فاصلے پر ری پیٹر کے دھماکا خیز فائر لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کیے گئے ہیں۔

شانی کو پچھلی سیٹ پر اور سکینہ کو اگلی سیٹ پر دو ہٹے کٹے افراد نے اس طرح دبوچ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکیں۔ گاڑی کے شیشے ''ٹنٹڈ'' تھے اور وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت میں آ گئی تھی۔ شانی نے خود کو دبوچنے والے شخص کے منہ پر کئی طمانچے رسید کیے۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں مگر پھر اس کی کلائیاں بڑی بے دردی سے دبوچ لی گئیں۔ شانی کو دبوچنے والے شخص نے شانی کو بے حرکت رکھنے کے لیے اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ وہ جیسے کسی وزنی پتھر کے نیچے پسنے لگی۔ اگلی سیٹ پر سکینہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دے...... حرامی چھوڑ دے۔''

پھر شاید سکینہ نے حملہ آور کا منہ نوچا تھا۔ وہ ڈکرایا۔ پھر دو دفعہ کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ حملہ آور نے سکینہ کے سر کو بڑی سفاکی سے پسٹل کے دستے سے نشانہ بنایا تھا۔ سکینہ کی آواز معدوم ہو گئی۔ گاڑی لہراتی ہوئی برق رفتاری کے ساتھ اُڑی چلی جا رہی تھی۔

یہ سفر بیس منٹ کا تھا۔ شانی اور سکینہ کو بالکل بے دست و پا کر کے اس بیس منٹ میں پہنچایا گیا تھا۔ سکینہ تو نیم بے ہوش تھی، شانی کے ہاتھ گاڑی کے اندر ہی اچھی طرح باندھ دیے گئے تھے۔ اس کے منہ پر ایک بڑی زبردست قسم کی ٹیپ چڑھائی گئی تھی۔ شانی کے برقع کا بالائی حصہ اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد اسے ایک بڑی چادر میں لپیٹا گیا اور ایک تنومند شخص نے اسے اپنے کندھے پر لاد کر ایک تہ خانے میں پہنچا دیا۔ اب

شانی کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے اور منہ سے ٹیپ بھی ہٹائی جا چکی تھی۔ وہ نیم بے ہوش سکینہ کی طرف لپکی۔ وہ ایک فوم میٹرس پر پڑی تھی اور کراہ رہی تھی۔ اس کی کنپٹی پر دو جگہ گومڑ بن گئے تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا...... تاہم اس کی حالت غیر تسلی بخش نہیں تھی۔ شانی نے دس پندرہ منٹ کوشش کی۔ وہ واش روم سے ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور سکینہ کے چہرے پر چھینٹے دیئے۔ آخر سکینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ خود کو اس چاروں طرف سے بند تہہ خانے میں پا کر اس کا رنگ پھر زرد ہونے لگا۔

''ہم کہاں ہیں شانی؟'' وہ سسکی۔

''ابھی مجھے خود ٹھیک سے پتا نہیں لیکن اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ قدرت اللہ کے لوگ نہیں ہیں۔ شاید......'' شانی کی آواز بھرا گئی اور اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کہیں یہ...... پولیس کے لوگ تو نہیں؟ مجھے ان کی شکلوں سے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا۔''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی......''

''وہ گولیاں کیسی چلی تھیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سارا ڈراما تھا۔ ہمیں بہت آہستہ بولنا چاہیے سکینہ! کیا پتا یہاں کوئی آواز پکڑنے والی شے چھپائی گئی ہو۔''

سکینہ کا رنگ زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بھی سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے کچھ ہو نہ جائے شانی! میرا دل ڈوب رہا ہے...... مم...... مجھے تو لگ رہا ہے ہمیں ڈپٹی ریاض نے پکڑوایا ہے۔''

سکینہ نے وہی بات کہی تھی جو خود شانی کے ذہن میں بھی اَن گنت اندیشوں کو جگا رہی تھی۔ بہرحال اس نے سکینہ کے خیال کی تصدیق کر کے اسے مزید خوف زدہ کرنا نہیں چاہا۔

شانی نے چاروں طرف دیکھا۔ اس مستطیل تہہ خانے میں صرف ایک میٹرس بچھا تھا۔ دو سنگل میٹرس ایک دیوار کے ساتھ کھڑے کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک الماری اور ایک اسٹیل کا پلنگ تھا۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ بالکل ساؤنڈ پروف ہے۔ ایک چھوٹا سا بغلی دروازہ اور بھی دکھائی دے رہا تھا، یہ کسی اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ شانی اور سکینہ کو اس زمین دوز قبر میں پھینک کر جانے والے اب ناپید ہو چکے تھے۔ اردگرد سے کوئی مدھم سی آواز بھی اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔

اچانک دروازہ خودکار طریقے سے سلائیڈ کر کے کھلا اور ڈپٹی ریاض طوفان کی طرح

اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی اجرائی سردار ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بڑی بڑی مونچھوں اور پتھریلے چہرے والا ایک ملازم صورت شخص تھا۔ ڈپٹی ریاض نے اندر آتے ہی ایک زناٹے کا تھپڑ شانی کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کو اپنے ہونٹوں پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔

''تیرا یار کہاں ہے؟'' ڈپٹی ریاض نے شانی کو بالوں سے جکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے۔

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ کراہی۔

''تجھے نہیں پتا تو پھر اپنے کس خصم کے پاس جا رہی تھی ٹیکسی پر چڑھ کر؟'' ریاض نے ایک اور بے رحم تھپڑ رسید کیا۔ شانی کی نگاہوں میں در و دیوار گھوم گئے۔

وہ چیل کی طرح سکینہ پر جھپٹا اور اسے بالوں سے جکڑ لیا۔ ''تو بتا حرامزادی! کہاں جا رہی تھیں تم دونوں......؟''

''بب...... بازار۔'' سکینہ نے ہکلا کر کہا۔

''بازار تو یہاں ایک ہی ہے تم جیسی آوارہ عورتوں کے لیے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں کو وہیں پہنچانا پڑے گا۔'' اس نے سکینہ کو وحشیانہ دھکا دیا۔ وہ پہلے دیوار سے ٹکرائی پھر پھسل کر فوم پر گر گئی۔ اس کے بال کھل گئے تھے۔

ریاض ہٹلر ملازم کو دیکھ کر پھنکارا۔ ''اتنی آسانی سے نہیں ماننا ہے انہوں نے...... دوسری طرف لاؤ اس حرامزادی کو۔'' ریاض کا اشارہ سکینہ کی طرف تھا۔ مونچھیل ملازم چیل کی طرح سکینہ پر جھپٹا۔ اجرائی سردار نے اس کی مدد کی۔ وہ دونوں پلک جھپکتے میں سکینہ کو بغلی دروازے سے گزار کر ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ شانی نے سکینہ کو بچانے کی کوشش کی مگر ریاض ہٹلر ایک سنگلاخ دیوار کی طرح اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس نے شانی کو تھپڑ مارے اور دیوار کے ساتھ لگا کر بے بس کر دیا۔

دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ دہرا تھا۔ ایک دروازہ پلائی ووڈ کا تھا اور دوسرا آہنی سلاخوں والا۔ پلائی ووڈ والا دروازہ کھلا رہنے دیا گیا اور آہنی سلاخوں والا دوسری طرف سے بند کر دیا گیا۔ اجرائی سردار، ریاض ہٹلر اور ملازم اب تینوں سکینہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے روتی چلاتی سکینہ کے کپڑے اتار کر اور پھاڑ کر اسے برہنہ کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ باندھ کر اسے چھت کے ایک آہنی ہک کے ساتھ رسے کی مدد سے لٹکا دیا۔ یہ منظر اتنا ہولناک تھا کہ شانی کو لگا، وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی۔ وہ آہنی سلاخوں والے دروازے کے ساتھ چمٹ گئی اور التجائیں کرنے لگی۔ ''مجھے جو کچھ پتا ہے

میں بتا دیتی ہوں۔ خدا کا واسطہ اس کو چھوڑ دو۔'' اس نے بار بار کہا مگر انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو آخری حد تک خوف زدہ کر دینا چاہتے ہیں تا کہ جب وہ اس کی فریاد پر کان دھر کر اسے بولنے کے لیے کہیں تو وہ فرفر بولتی جائے۔

''مارو حرامزادی کو۔'' ریاض ہٹلر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے گرجا۔

موچھیل ملازم ہیرے نے پانی کے ربر پائپ کا ایک تین فٹ لمبا ٹکڑا پکڑا۔ یہ کافی سخت ربر تھا۔ اس نے بے دردی سے سکینہ کے جسم پر ضربیں لگائیں۔ جہاں جہاں چوٹ لگی فوراً خونی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ سکینہ اذیت کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ کچھ یہی کیفیت شانی کی بھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سکینہ کی اذیت جسمانی اور شانی کی ذہنی تھی۔ وہ جو کسی غیر کو بھی کانٹا چبھنے کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی تھی، اس کے سامنے اس کی عزیز ترین سہیلی کو بدترین تکلیف سے گزارا جا رہا تھا۔

''بس کر دو...... خدا رسول کا واسطہ، بس کر دو۔'' شانی نے سلاخ دار دروازے کو بری طرح جھنجوڑا۔

ریاض ہٹلر نے بڑے تفاخر سے شانی کو دیکھا...... جیسے کہہ رہا ہو، بس میری رانی! اتنی سی برداشت۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے موچھیل ہیرے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا سفاک ہاتھ روک لیا۔ سکینہ نیم جان ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔

ڈپٹی ریاض نے سلاخ دار دروازے کے سامنے پہنچ کر پوچھا۔ ''ہاں، بتا کہاں ہے وہ تیرا منہ بولا خصم؟ اور یاد رکھ، جھوٹ بولا تو ابھی...... آج کی ڈیٹ میں ہی تیری سہیلی کی چمڑی پنڈے سے دکھری ہو جائے گی۔''

''مجھے بس اتنا پتا ہے رستم کے بارے میں کہ وہ...... اقبال ٹاؤن میں ہے۔''

''کون سا بلاک؟''

''شش شاید...... نرگس بلاک تھا......''

''شاید نہیں...... ٹھیک ٹھیک بتانا پڑے گا اور کوٹھی کا نمبر بھی۔''

شانی کا دل ہول رہا تھا مگر اسے کوٹھی کا نمبر بتانا پڑا۔

''فون نمبر بھی بتاؤ ان کا...... اور دیکھو، میں نے ابھی یہیں بیٹھے بیٹھے دس منٹ کے اندر ان ساری معلومات کی تصدیق کرنی ہے۔ تصدیق ہونے کے بعد ہی تیری اس موم بتی کو چھت سے اتاروں گا۔'' ریاض کا اشارہ سکینہ کی طرف تھا۔

شانی نے چاروناچار کوٹھی کا فون نمبر بھی بتایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سسکی۔ ''اتنا ظلم مت کرو ریاض! یہ مر جائے گی۔ اسے چھت سے اتار دو۔''

وہ ایک بدبودار ڈکار لیتے ہوئے مسکرایا۔ ''چل نکی چوہدرانی! تیری بات مان لیتے ہیں۔ چھت سے اتار دیتا ہوں مگر رسا تب ہی کھلے گا جب تیری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔'' اس نے موچھیل ہیرے کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازے کی سلاخ سے بندھے ہوئے رسے کو کھول کر تھوڑی سی ڈھیل دی۔ سکینہ نیچے کو آئی اور اس کے پاؤں کے دونوں پنجے فرش سے ٹک گئے۔ یوں اس کے کندھوں پر اس کے جسم کا جان لیوا دباؤ ختم ہو گیا۔ تاہم وہ اسی شرمناک حالت میں حسرت کی تصویر بنی کھڑی رہی۔

شانی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف زیادہ دیر دیکھ سکے۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں شانی کو موت کے سائے دکھائی دے رہے تھے۔ شانی نے اپنا رخ پھیر لیا اور ریاض سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دیکھو، مجھے جو کچھ پتا تھا...... میں نے پوری سچائی سے بتا دیا ہے۔ اب مجھے پتا نہیں کہ رستم اس کوٹھی میں ہے یا جا چکا ہے۔''

''تجھے سب پتا ہے مسماۃ شانی عرف نکی چوہدرانی! لیکن تُو بتائے گی آہستہ آہستہ رک رک کر۔ تیری زبان میں اٹک ہے۔ اس کو ساتھ ساتھ گریس دینی پڑے گی۔''

''نہیں ریاض! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

''نہیں نہیں...... تُو جھوٹ کیسے بولے گی۔ تُو تو دنیا کی سب سے سچی کھری عورت ہے۔ تُو نے ہمیشہ سچ بولا، اپنی اونچی پگڑی والے باپ سے سچ بولا...... اپنے لوگوں سے سچ بولا، پنچایت اور قانون سے سچ بولا...... اور یہ سارے سچ تُو نے کس کے لیے بولے۔ اس قاتل ڈکیت کے لیے جو اب تک تیرے علاوہ بھی نہ جانے کتنی زنانیوں کے ساتھ منہ کالا کر چکا ہے...... اور کر رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سو جان سے صدقے چلا جاؤں تیرے ان سارے سنہری سچوں پر۔''

''دیکھو میں غلط نہیں کہہ رہی......''

''نہیں نہیں...... غلط تو میں ہوں۔'' وہ جنونی انداز میں بولا۔ ''تُو غلط نہیں ہے۔ تُو سولہ آنے صحیح ہے اور اسی لیے اتنی خوش قسمت بھی ہے۔ ایک حرامی ڈکیت کی منہ بولی جورو ہے پھر بھی علاقے کے لوگ تجھ پر صدقے واری جاتے ہیں۔ الیکشن میں تیری صندوقڑی کو ووٹوں سے بھرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ نہیں نہیں...... تُو غلط کہاں ہے۔ غلط تو میں حرامزادہ ہوں۔ غلط تو میں...... ہوں۔'' اس نے بڑی روانی سے خود کو ایک غلیظ گالی دی...... اور شانی کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور میں بہت ساری غلطیاں کروں گا بھی...... اگر تُو نے اپنی زبان نہ کھولی۔''

سکینہ کو پانی وغیرہ پلایا گیا مگر اس کی رسی مزید ڈھیلی نہیں کی گئی۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ شانی کا دل چاہ رہا تھا کہ ریاض اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے مار دے یا خود مر جائے۔

چند منٹ بعد ریاض کے فون کی گھنٹی بجی۔ تہہ خانے میں آواز صاف نہیں تھی پھر بھی ریاض کسی نہ کسی طرح بات سننے میں کامیاب رہا۔

''کوئی ملازم شلازم بھی نہیں ہے؟'' دوسری طرف سے غالباً نفی میں جواب ملا۔ ریاض پھنکارا۔ ''آلے دوالے کے گھروں سے پوچھا تھا...... اچھا...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔''

اس نے آخری دو الفاظ تین چار دفعہ دہرائے اور سرخ چہرے کے ساتھ فون بند کر دیا...... اور شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہاں تیرا یار ہے اور نہ اس کے یار۔ وہ تیری ماں خالی پڑی ہوئی ہے اور گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ آس پاس والوں کو بھی کچھ پتا نہیں...... اب بتا میں غلط نہ ہو جاؤں تو کیا کروں؟ غلط تو ہونا ہی پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں درجنوں سانپ پھنکار رہے تھے۔ اجرالی سردار بھی شانی کی دگرگوں حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''چھڈ ریاض بھائی۔ اپنا کم شروع کر۔ یہ لاتوں کی بھوتیاں ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گی۔''

ریاض نے سفاکی سے مونچھیل ہیرے کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے نیم جان سکینہ کو پھر ہوا میں معلق کر دیا۔ سکینہ نحیف آواز میں چلائی اور بے چارگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے کمرے میں شانی کے پاس بھی آنکھیں بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

چند سیکنڈ بعد ایک بار پھر ربر پائپ سکینہ کے جسم پر برسنے لگا اور اس کے چلانے کی کربناک آوازیں شانی کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ کچھ دیر برداشت کرتی رہی پھر تڑپ کر بولی۔

''خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ جو ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ مار ڈالو مجھے...... مجھے مار ڈالو۔''

''اتنی بے صبری نہ بن میری چن مکھنی! تیرے سارے شوق بھی پورے کریں گے......'' ریاض ہٹلر نے زہرخند لہجے میں کہا۔

چند سیکنڈ بعد سکینہ کی آواز معدوم ہو گئی۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ شانی نے پوری جان سے تڑپ کر اس کے عرق آلود پیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں زیر و بم موجود تھا۔ وہ سانس لے رہی تھی، وہ چلائی۔ ''تمہیں تمہارے بچوں کا واسطہ ریاض...... اسے نیچے اتار دو، یہ مر جائے گی۔''

ریاض نے شانی کی دیگر فریادوں کی طرح یہ فریاد بھی نہیں سنی۔ تاہم سکینہ کی بے ہوشی دیکھ کر ہیرے کو رسا ڈھیلا کرنے کا اشارہ کر دیا۔ ہیرے نے سلاخ دار دروازے سے رسے کی گرہ کھولی۔ سکینہ نیچے آئی۔ پہلے اس کے پاؤں فرش سے لگے پھر وہ لیٹتی چلی گئی۔

ریاض کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ فون سنتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی باہر نکل گئے۔ تہہ خانے کو پھر باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ تہہ خانے کے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ اب کھلا تھا۔ شانی لپک کر سکینہ کے پاس پہنچ گئی۔ سب سے پہلے اس نے ایک چادر سکینہ کے جسم پر پھیلائی پھر اس کا منہ چومنے لگی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''سکینہ! میری بہن! آنکھیں کھول۔'' وہ بار بار پکارنے لگی۔

سکینہ کا رنگ غیر معمولی طور پر زرد تھا اور ہونٹ گہرے سانولے نظر آ رہے تھے۔ شانی کی سخت تگ و دو کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آئی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس بار سکینہ کی بے ہوشی گہری ہے اور اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ تہہ خانے کا دروازہ پیٹنے لگی۔ ''دروازہ کھولو...... یہ مر جائے گی...... دروازہ کھولو۔''

شانی کی پکار کا جواب دو تین منٹ بعد آیا۔ تنومند ہیرے نے دروازے کو سلائیڈ کیا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ ہیرے کے عقب میں ایک اور کرخت چہرہ شخص بھی موجود تھا۔

''کیا موت پڑ گئی ہے؟'' ہیرے نے بدتمیزی سے کہا۔

''اس کو دیکھو...... اس کی سانس ٹھیک نہیں آ رہی......'' شانی، سکینہ کی طرف اشارہ کر کے ہکلائی۔

ہیرا پستول بہ دست ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا شخص شانی کے ساتھ مل کر سکینہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ سکینہ یکسر ساکت تھی۔ اس کی سانس بھی بہت دھیمی پڑ گئی تھی۔ نو وارد شخص شاید میڈیکل کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے کونے میں جا کر ہیرے کے ساتھ تھوڑی سی کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے ہیرے نے شانی سے کہا۔ ''حوصلہ رکھ بی بی! ڈاکٹر لاتے ہیں اس کے لیے۔''

سکینہ کی حالت دیکھ کر شانی کے جسم میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اسٹیل کے ایک گلاس میں پانی لے کر سکینہ کو پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ شانی کا دل رونے لگا۔ یہ ایکا ایکی کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟ اس نے کہیں سنا تھا کہ شیش ناگ کی

دہشت سے اس کا شکار سکتے میں چلا جاتا ہے...... اور بلی کے خونخوار جبڑوں کے خوف سے چڑیا کا دل پھٹ جاتا ہے۔ تو کیا یہاں بھی چڑیا کا دل پھٹ گیا تھا؟

وہ سکینہ کو مسلسل جھنجوڑ رہی تھی اور اس سے آنکھیں کھولنے کی درخواست کر رہی تھی۔ اسی دوران میں موچھیل ہیرے اور اس کا ساتھی ایک گہرے سانولے رنگ والے ڈاکٹر نما شخص کو لے کر تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے شانی کو دوسرے کمرے میں بھجوا دیا اور میڈیکل باکس کھول کر سکینہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا...... یقیناً یہ ڈاکٹر ڈپٹی ریاض کا اپنا بندہ ہی تھا۔ اس نے سکینہ کی برہنگی اور اردگرد کی صورتِ حال کو بالکل حیرت کی نظر سے نہیں دیکھا۔

جوں جوں ڈاکٹر کا معائنہ طویل ہوتا گیا، شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ شانی اب کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ تہہ خانے کے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک بار شانی کو محسوس ہوا کہ ہیرا شاید فون پر ڈپٹی ریاض سے بات کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہیرے کے ساتھی کو دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے تہہ خانے سے باہر گیا اور قریباً دس منٹ بعد کچھ انجکشن وغیرہ لیے ہوئے واپس آیا۔ شانی نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ! کیا ہوا ہے سکینہ کو؟''

''ہمیں نہیں پتا۔ کیا پہلے بھی بیمار تھی؟'' خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

''نہیں کچھ نہیں تھا اسے۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے۔'' شانی چلائی۔

وہ شخص شانی کو راستے سے ہٹاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صرف پانچ منٹ بعد شانی کو سکینہ کی موت کی خبر مل گئی...... ہاں وہ مر گئی تھی۔ صرف پانچ چھ گھنٹے پہلے جو ہنستی کھیلتی، جیتی جاگتی سکینہ رنگ والی سے اس کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہوئی تھی، وہ اب نہیں رہی تھی۔ شانی نے اب کبھی اس کی آواز نہیں سننا تھی۔

یہ ایک قیامت تھی جو شانی پر ٹوٹی۔ اسے مارنے والے تو اپنا کام کر کے نکل گئے۔ شانی اس کی سرد لاش سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ شانی کو لگا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ زندہ تھی۔ وہ بری حالت میں تھی مگر وہ بول رہی تھی، دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی... شانی میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے کچھ ہو نہ جائے... اور کچھ ہو گیا تھا۔ اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔ وہ مر گئی تھی۔

''سکینہ! میری بہن!'' شانی نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکارا۔ اس نے سفید چادر میں لپٹی ہوئی سکینہ کو اپنے سینے سے لگایا اور روتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

سردار دراج کی حالت زخمی درندے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے جتنی زندگی بھی گزاری تھی، عزت اور وقار سے گزاری تھی۔ کسی پر ظلم کیا تھا نہ کسی کا ظلم برداشت کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہوا تھا، بے حد اذیت ناک تھا۔ سگے بھائی کے قتل کا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اوپر سے پولیس اور گوراہی چوہدریوں نے اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔ پچھلے ایک دو مہینے میں بے گناہ مہتموں کے ساتھ بدترین سلوک ہوا تھا۔ انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور ان کی عورتوں کو بے عزت کیا گیا تھا۔ دراج جانتا تھا کہ دو چار مہتم عورتیں ایسی بھی ہیں جو بدنامی کے ڈر سے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو چھپا بھی رہی ہیں۔ ایسی ہی دو لڑکیوں کو مزید تشدد سے بچانے کے لیے دراج نے اپنی بیوی ماکھو کے ساتھ رنگ والی بھیج دیا تھا۔ وہ اب شانی اور چوہدری معصوم کی پناہ میں تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو کھیا؟'' دراج کے ایک زخمی ساتھی نے اسے مخاطب کیا۔

''وہی جو تم بھی سوچ رہے ہو گے۔ کھد کو جلیل کھوار کرنے والے گوراہیوں کا پتا چل جائے تو ان کی چھاتی پر بیٹھ کر ان کے منہ پر پیشاب کریں۔''

''گوراہی چوہدریوں کے بارے میں تو پتا نہیں، پر ایک بندے کو ڈھونڈنے میں شاید میں تمہاری مدد کر سکوں کھیا جی۔''

''کیا مطبل؟''

دراج کے زخمی ساتھی نے اپنی پنڈلی کے زخموں پر سے مکھیاں اڑائیں اور بولا۔ ''میں نے ایک بار ڈپٹی ریاج کو لاہور کمپنی باغ کے پاس دیکھا تھا...... وہ گڈی میں تھا اور ایک کوٹھی کے اندر جا رہا تھا۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''میری پوری گل تو سنو کھیا جی! ان دنوں میں اپنے چھوٹے کاکے کا الاج گنگا رام ہسپتال میں کروانے آیا ہوا تھا۔ بس ایک دن پیدل جاتے ہوئے میری نجر اچانک ہی ڈپٹی ریاج پر پڑی تھی۔ وہ پلس کی گڈی نہیں تھی، نہ ہی ریاج پلس کے کپڑوں میں تھا۔ اس نے چوروں کی طرح اپنا منہ مفلر میں چھپایا ہوا تھا۔ میں بالکل پاس تھا اس لیے میں نے اسے پچھان لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک پڑا تھا کہ یہ ریاج کی کوٹھی ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی گل ہے۔''

''تیرا کیا کھیال ہے...... آپاں کو اسی کوٹھی میں ریاج مل سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ مل جائے۔ اگر نہ بھی ملے تو اس کا کوئی کھوج تو لگ سکتا ہے۔''

''تُو تو چٹا اَن پڑھ ہے۔ کوٹھی کا نمبر شمبر تو پڑھا نہیں ہوگا تُو نے؟''

''تم نمبر کی بات کرتے ہو کھیا جی۔۔۔۔۔ مجھے تو سڑک بھی یاد نہیں۔ پر تم جانتے ہو اپنا حاپھجا کا پھی تیج ہے۔ اگر تم مجھ کو لے جا کر گنگا رام کے پاس چڑیا گھر کے چھوٹے گیٹ کے سامنے کھڑا کر دو تو میں وہ سڑک ڈھونڈ لوں گا اور اس کوٹھی کو بھی۔۔۔۔۔''

اپنے ساتھی ساجے کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دراج نے اس کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ رستم اور ناصر باتیں کرتے ہوئے تیز قدموں سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ پاس سے ہو کر گزر گئے تو دراج نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو! آپاں کے کسی بھی ارادے کے بارے میں رستم اور ناصر کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟''

''بس جیادہ سوال نہ کر۔ کہہ دیا ہے ناں۔'' دراج کے لہجے میں ہلکا سا تحکم آ گیا۔

دراج جانتا تھا کہ بی بی سے دور ہو کر اور اپنے دوست حاجی حیات سے ناراض ہو کر رستم بہت زیادہ پریشان ہے۔ وہ اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا پھر جس طرح رستم نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر اسے اور اس کے تینوں ساتھیوں کو نامعلوم لوگوں کے چنگل سے نکالا تھا، وہ بات بھی کوئی بھولنے والی نہیں تھی۔ اب دراج کی خواہش تھی کہ اس کے کسی اچھے برے ارادے کا بوجھ رستم پر نہ پڑے۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا، اپنے بل بوتے پر کرنا چاہتا تھا۔

رستم اور ناصر کے جانے کے بعد سردار اور اس کے ساتھی پھر سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ جوں جوں بات آگے بڑھ رہی تھی، ان کے سانولے چہروں پر تمتماہٹ آتی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ پانیوں کے رتیلے کناروں میں سرکنڈوں اور داب کے اندر بسنے والے یہ قدیم جنگجو اپنی بے عزتی کو شاذ و نادر ہی برداشت کر پاتے تھے۔۔۔۔۔

☆========☆========☆

شانی اڑتالیس گھنٹے سے اس تہہ خانے میں سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ وہ کیا سوچ کر رنگ والی سے نکلی تھی اور کیا ہو گیا تھا۔ وہ اکیلی آنا چاہتی تھی لیکن سکینہ نے اسے اکیلے نہیں آنے دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے بہرصورت اکیلے رہ جانا ہے۔

وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر دل ہی دل میں پکاری۔ ''کہاں ہو رستم؟ میں تمہارے سینے پر سر رکھ کر اتنا رونا چاہتی ہوں کہ آنسوؤں کے ساتھ ہی میری جان بھی آنکھوں کے راستے نکل جائے۔'' لیکن رستم کہیں نہیں تھا۔ ان کے درمیان نامعلوم فاصلے حائل تھے۔ تیسرے دن

شانی نے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے چند لقمے لیے۔ وہ بھی جیسے اس کے حلق میں ہی اٹکے رہ گئے۔ سکینہ کی تجہیز و تکفین کیسے ہوئی تھی اور ہوئی بھی تھی یا نہیں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ لاوارث مقتولوں کی طرح اس کا مُردہ جسم بھی کہیں خاک میں ملا دیا گیا ہے یا کسی پختہ کمرے کا فرش اکھاڑ کر اس پر نئی ٹائلیں لگوا دی گئی ہیں۔

اور پھر وہ بری گھڑی بھی آن پہنچی جس کے اندیشے شانی کو دن رات شدید اضطراب میں رکھ رہے تھے۔ تہہ خانے کے دروازے نے سلائیڈ کیا اور ڈپٹی ریاض اندر آ گیا۔ وہ عجیب ہیئت کذائی میں تھا۔۔۔۔۔ اس کے بالوں پر تازہ تازہ مہندی لگی ہوئی تھی۔ جسم پر فقط ایک انڈر ویئر تھا۔ چمڑے کا ایک کالا ہولسٹر اس کے عریاں جسم سے بندھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں موبائل تھا۔ اندر آتے ہی اس نے عقابی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر شانی کو سرتاپا گھورا۔۔ جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں دیکھ لینا چاہتا ہو کہ اس کے پاس کوئی ایسی خطرناک شے تو نہیں جس سے وہ حملہ آور ہو سکتی ہو۔

مطمئن ہو کر وہ بڑے بے ہودہ طریقے سے پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مکمل لباس میں ہے یا ایک مختصر ترین انڈر ویئر میں۔ اپنے بالوں بھرے پیٹ کو کھجا کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہارا سوگ شوگ ختم ہو گیا ہوگا۔ کچھ کام کی بات کر لی جائے۔''

''بہتر ہے کہ مجھے بھی مار ہی ڈالو۔'' شانی سسکی۔

''میں اتنا بھی کھوتا نہیں ہوں نکی چوہدرانی۔۔۔۔۔! تُو نہ ہوگی تو تیرے عاشق یار سے کیسے ملاقات ہو سکے گی۔'' اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر گلا صاف کیا اور اجڈ پن سے تہہ خانے کی شفاف دیوار پر تھوکا۔ تھوڑی دیر تک شانی کو گھورنے کے بعد بولا۔ ''اس نے طفیل کو بند کر رکھا ہے۔ اسے بے دردی سے مارتا پیٹتا ہے۔ مجھے ٹیلی فون پر اس کی آوازیں سناتا ہے۔ مگر حرامزادہ اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتاتا۔۔۔۔۔ کب تک نہیں بتائے گا؟ بلکہ آج ہی بتائے گا۔ فون پر تیری دہائیاں سنے گا تو بتائے گا۔۔۔۔۔ یا پھر تیرے سامنے بے غیرتی کا ثبوت بن جائے گا۔''

اس نے فون آن کیا اور کال ملائی۔ کچھ دیر بعد تہہ خانے میں رستم کی بوجھل آواز گونجی۔

''ہیلو کیا بات ہے؟'' شانی کے جسم میں جیسے بجلی لپک گئی۔ ہاں، یہ رستم کی آواز ہی تھی۔

''میں نے تجھ سے کہا تھا ناں رستے! میں وہ عزت مآب کھوتا ہوں جس نے کبھی کسی کنجر کو اپنے اوپر سواری نہیں کرنے دی۔ تُو نے مجھے فون پر طفیل کی دہائی سنائی تھی، آج میں اس

کے بدلے تجھے تیری ایک پسندیدہ دہائی سناتا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ یہ تو ماں کی موم بتی ہے اور یہ میرے کمرے میں جل رہی ہے۔ عمر بائیس اور پچیس سال کے درمیان، قد تقریباً پانچ فٹ سات انچ، رنگ چوکھا گورا...... جسم رنگ رنگیلا، لک پتلا، فی الحال صرف سر اور پاؤں سے ننگی ہے...... گونگی بنی ہوئی ہے لیکن مار کٹائی کی زبان بڑی اچھی طرح سمجھ جائے گی اور ابھی تھوڑی دیر میں تم اسے فون پر فر فر بولتے سنو گے۔ نام ہے اس کا مسماۃ شانی!"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔" رستم کی آواز لرز اٹھی۔

ریاض نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر شانی کے بال مٹھی میں جکڑے اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا ماتھا ریاض کے گھٹنوں سے ٹکرا گیا۔ وہ بے ساختہ چلا اٹھی۔ ریاض فون میں پھنکارا۔ "اس موہنی سوہنی آواز کو تو تم لاکھوں میں پہچان سکتے ہو رستے! اب دیکھ لو، حساب برابر ہے۔ تم جتنی بار فون پر طفیل کی دہائی سنواؤ گے، میں اتنی ہی بار اس چن مکھنی کا نغمہ سنواؤں گا۔ اور یاد رکھو کہ یہ عورت ہے۔ اس کو ہلکی پھلکی موسیقی ہی نہیں بڑے سخت قسم کے پکے راگ گانے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر تُو ٹھیک کہہ رہا ہے تو میری بات کروا بی جی سے۔"

"ہائے اوئے میں صدقے جاواں اس عاشق معشوقی پر...... بی بی جی...... زور کس پر ہوا "جی" پر۔ تاریخ میں جتنے بھی بڑے بڑے بھوتنی دے عاشق ہیں، ان میں تیرا نام سب سے اُچی جگہ پر لکھا جانا چاہیے۔ باقی رہی بی بی جی صاحبہ سے بات کرنے کی بات تو میں نے کہا ہے ناں، اب تیرا میرا حساب برابر ہے۔ بی بی جی سے باتوں کا ٹھرک جھاڑنا ہے تو پہلے طفیل سے میری بات کرانی ہو گی۔"

رستم کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ریاض پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ رستم نے کبھی شانی کے سامنے بد زبانی نہیں کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ریاض کے موبائل کا مائیک آن ہے۔ جواب میں ریاض نے بھی اس فحش گالیاں دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شانی کو بے رحمی سے نوچا۔ شانی چلائی اور دو ہتڑ مار کر ریاض کا ہاتھ اپنے جسم سے دور کیا۔

ریاض درندگی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ "رستے! میں تجھے آخری وارننگ دیتا ہوں...... پیش ہو جا۔ ورنہ اس نکی چوہدرانی کو ایسی موت ماروں گا کہ لوگ مثال دیں گے۔

ہاں، سچ کہہ رہا ہوں۔ مائیں اپنی جوان کاکیوں کو سمجھائیں گی۔ نہ نہ، یار نہ پالنا ورنہ نکی چوہدرانی والا حشر ہو گا۔"

رستم ایک بار پھر قہر ناک انداز میں دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شاید لائن کٹ گئی تھی یا پھر رستم نے طیش کے عالم میں خود ہی فون بند کر دیا تھا۔

ریاض نے فون کے ذریعے ہی موچھیل ملازم ہیرے کو اندر بلایا۔ وہ سلائیڈنگ دروازے سے اندر آ گیا۔ ریاض نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا۔ اس گرانڈیل نے لپک کر شانی کو چڑیا کی طرح دبوچ لیا اور گھسیٹتا ہوا سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اب سکینہ کی جگہ سنبھالنے والی ہے۔ شاید چھت پر لگا ہوا آہنی کنڈا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر ابھی ہیرا دو چار قدم ہی چلا تھا کہ ریاض نے اسے روک دیا۔ "نہیں...... ادھر نہیں...... اُدھر!" اس نے آہنی بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

غالباً اسے سکینہ کی اچانک موت کا خیال آ گیا تھا اور ریاض شانی کے اچانک مرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگلے تین چار منٹ شانی کے لیے بہت اذیت ناک تھے۔ گرانڈیل ہیرے اور ریاض ہٹلر نے شانی کو آہنی بیڈ کے ساتھ باندھ دیا۔ اسے باندھنے کے لیے وہی منحوس رسا استعمال کیا گیا تھا جس نے ساتھ والے کمرے میں سکینہ کی جان لی تھی۔ اس عمل کے دوران میں شانی نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ اس کی انگلیوں کے متعدد نشان ہیرے اور ریاض ہٹلر کے چہرے پر موجود تھے۔ ہیرے کی قمیص بھی تار تار ہو گئی تھی۔ شانی کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

ریاض ہٹلر نے دوبارہ رستم سے رابطہ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں کال مل گئی۔ ریاض نے زہریلی ٹون میں کہا۔ "ہاں رستے! بات کرے گا اپنی بی...... بی...... جی سے۔"

رستم دہاڑا۔ "حرامزادے! اگر بی بی کو کچھ ہوا ناں تو میں تیرے پورے خاندان کو زندہ جلا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

"ہاں، یہ پرابلم تو ہے۔ اپنے خاندان کے بدلے، مجھے تیرے خاندان کو زندہ جلانا پڑے گا لیکن تُو تو دم کٹا کتا ہے۔ اس بی...... بی...... جی کے سوا تیرا آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ بس ایک بہن تھی جو تیری ماں کی کسی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور ایک اس کا حرامی خصم تھا۔ ان دونوں کو تُو نے پتا نہیں کس کھوڈ (سوراخ) میں چھپا رکھا ہے۔ اب میں مسکین کیا کروں گا۔ مجھے تو پھر سارے بدلے تیری اس چن مکھنی سے ہی لینے پڑیں گے۔ آخر میں کسی کو زندہ جلانے کے لیے بھی اسی پر گزارہ کرنا ہو گا۔"

اس کے ساتھ ہی ریاض نے تومند ملازم ہیرے کو اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے طمانچوں کا حساب برابر کرنے کے لیے پہلے ہی بے چین بیٹھا تھا۔ اس نے منحوس ربر پائپ کا تین فٹ لمبا ٹکڑا ہاتھ میں لیا اور شانی کے نازک تلوؤں اور جسم پر بے رحمی سے ضربیں لگائیں۔ شانی پہلے تو ہونٹ بھینچ کر برداشت کرتی رہی...... پھر وہ درد سے لاچار ہو کر کراہنے لگی۔ ریاض نے موبائل سیٹ شانی کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیا تھا۔ ایک بار شانی زور سے چلائی۔ ریاض کے ہونٹوں پر سفاکی کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

رستم چنگھاڑا تو اس کی آواز فرطِ کرب سے پھٹی ہوئی تھی۔ ''ریاض...... ریاض...... تُو جتنا ظلم کر رہا ہے اتنا سہہ نہیں سکے گا...... تُو نہیں سہہ سکے گا...... بس کر دے...... چھوڑ دے بی بی جی کو...... چھوڑ دے......''

''ٹھیک ہے...... چھوڑ دیتا ہوں۔ تُو ناصر اور اس پٹھان کے ساتھ پیش ہو جا......''

''میں ہو جاتا ہوں پیش...... تُو بی بی کو مارنا بند کر۔''

''چلو کر دیتا ہوں بند...... لیکن اس سے پہلے اپنی مزید تسلی کر لے۔ ہو سکتا ہے تیرے دماغ میں آئے کہ یہ ریکارڈنگ شیکارڈنگ ہے۔ لے تھوڑا سامنہ میٹھا کر لے اپنی رکھیل سے بات کر کے۔''

اس نے فون شانی کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ شانی بلاتمہید کراہ کر بولی۔ ''رستم! میں غلطی پر تھی...... مجھے معاف کر دیں...... ہمارے درمیان کسی نے غلط فہمیاں پیدا کیں...... رستم آپ سن رہے ہیں ناں...... پھر شاید میں کچھ کہہ نہ سکوں......''

''ششش...... شانی آپ کہاں ہیں...... آپ......''

''مجھے نہیں معلوم۔ آپ نے میری بات سن لی ہے ناں......'' شانی نے نفی میں جواب دیا۔

ریاض نے ایک دم موبائل فون پیچھے ہٹا لیا۔ مائیک پر انگوٹھا رکھ کر شانی سے مخاطب ہوا۔ ''اوئے سری دیوی! یہ کیا رام لیلا شروع کر دی ہے تُو نے۔ میں نے تجھے فون اس لیے تو نہیں دیا تھا۔''

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا اور رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں اب بتا...... کہاں اور کب گرفتاری دینی ہے؟''

''تُو کیا چاہتا ہے؟''

''میں تو چاہتا ہوں، جتنی جلدی سے جلدی تیرے درشن ہو جائیں اتنا ہی اچھا

ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں ساتھیوں سے مشورہ کر کے شام تک تمہیں بتاتا ہوں۔''

''مشورہ کرنا ہے یا کوئی چال سوچنی ہے؟ اگر کوئی چال سوچنی ہے تو پھر اس چن مکھنی پر ابھی فاتحہ پڑھ لے۔''

''دیکھ بی بی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے...... ورنہ وہ کچھ ہو جائے گا جو تیرے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔'' رستم کی آواز میں مہیب چٹانوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔

''چل، اپنے بلڈ پریشر کی دُم میں آگ نہ لگا۔ تیری بی...... بی...... جی کو چار پانچ گھنٹے تک کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے بعد کوئی ذمے داری نہیں ہے۔''

فون بند ہو گیا۔ ریاض نے فون کو گھور کر رستم کو ایک ننگی گالی دی اور اپنے انڈر ویئر میں بے پروائی سے ہاتھ ڈال کر اپنی پشت کو کھجاتا ہوا شانی کے قریب آن بیٹھا۔ ''دال میں کالا ہے لاڈو رانی! تیرا یار اوپر سے تپا ہوا ہے اور اندر سے بھی زوردار پٹاخے مار رہا ہے۔ اب اس حرامی نے کوئی نہ کوئی بڑا پنگا ضرور لینا ہے۔ میں ایک بار پھر تجھ سے کہتا ہوں، اس کا پتا ٹھکانا بتا دے اور مجھے پتا ہے کہ تُو جانتی ہے۔ دیکھ چن مکھنی! اس نے تو اب مرنا ہی مرنا ہے، پر ہو سکتا ہے کہ تیری جندڑی بچ جائے۔ تیرے پیٹ میں اس کا کوئی بچہ شچہ تو ہو گا ہی۔ اس کو پال پوس لینا۔ تیرا دل لگا رہے گا اور کیا پتا، کل کو وہ کوئی بڑا آدمی بن جائے اور اپنے ناجائز باپ کو جائز موت مارنے والوں سے بدلہ لے لے۔ کیا خیال ہے لاڈو رانی؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' شانی نے بیڈ سے بندھے بندھے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا، اس سے معافی کس بات کی مانگ رہی تھی۔ کیا اس کے ساتھ سونے میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟''

''میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر......'' شانی زور سے چلائی۔ ''اور تمہاری گندی زبان پر بھی۔''

ریاض کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ اس نے ہیرے کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہیرا پائپ کا ٹکڑا ایک کونے میں رکھ کر باہر چلا گیا۔

ریاض نے شانی کو سر سے پاؤں تک گھورا اور سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''میں کوئی درویش اللہ لوک نہیں ہوں۔ رج کے گندم کھاتا ہوں۔ میرے اندر کے جانور کو نہ جگا۔ میں بر

حد تک جا سکتا ہوں۔ ہر...... حد...... تک۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی بدبودار انگلیوں سے شانی کے ہونٹوں کو بری طرح مسلا۔ تمبا کو زدہ انگلیوں کی بُو اور ان کا کھردرا پن شانی کے رگ و پے میں اترتا چلا گیا۔

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر اپنے بالوں سے بھرے ہوئے بازوؤں کو کھجایا اور بولا۔ ''تیرے پاس سوچنے کے لیے پانچ گھنٹے ہیں۔ ان پانچ گھنٹوں میں اپنا اچھا برا دیکھ لے...... اور لمبے پینڈے (سفر) کے لیے اپنے انجن کا تیل پانی بھی چیک کر لے......'' وہ شانی کو سخت دھمکی آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کی زبان زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح تھی جو اپنے مخاطب کا سینہ چھلنی کر دیتے تھے۔

شانی سوچتی رہی، کیا اب وہ بھی اذیت کے دریا سے گزر کر سکینہ کے پاس پہنچنے والی ہے؟ کیا اب وہ کبھی رستم کی صورت نہیں دیکھ سکے گی؟ اس کی بانہوں میں چھپ کر رو نہیں سکے گی...... کیا اب اس کے ہونٹ کبھی مُنے کا ماتھا نہیں چومیں گے؟

وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ بیڈ سے بندھی ہوئی تھی۔ رسی کی بندشوں کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھے سن ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں ربر کے سخت پائپ نے اسے چوٹ لگائی تھی، وہاں آگ سی جل رہی تھی۔ وہ کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے کے بجائے مرنا بہتر سمجھتی تھی مگر فی الوقت تو زندگی کی طرح موت بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے نے سلائیڈ کیا اور دوبارہ ریاض کی مخمور شکل نظر آئی۔ وہ اب انڈرویئر کے بجائے مکمل لباس میں تھا۔ شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''وہ تیرا ہیجڑا یار اب فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ شاید پیچھا دکھا گیا ہے یا پھر کوئی چال شال سوچ رہا ہے۔ بہرحال ایک بات کلیئر ہے کہ میں نے تجھے جو پانچ گھنٹے دیئے تھے، ان میں سے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ چار گھنٹے یعنی 240 منٹ بعد تجھ پر بڑا سخت وقت آنے والا ہے۔''

شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ریاض! تم نے بہت کچھ کیا ہے میرے ساتھ اور میرے رشتے داروں کے ساتھ۔ جمشید قتل ہوا، تایا معصوم زخمی اور بیمار ہوئے، رستم کی ٹانگ گئی۔ اس کے علاوہ اور بھی پتا نہیں کیا کچھ لیکن میں سچ کہتی ہوں ریاض...... میں تمہیں اب بھی اپنا دشمن نہیں سمجھتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ میری قسمت میں تھا۔ میں اپنے مرے ماں باپ کی قسم کھاتی ہوں ریاض! میں اب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں

تو تمہاری بہتری کے لیے دعا مانگتی ہوں۔ میں اللہ سے التجا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے......''

''تالیاں...... تالیاں!'' ریاض نے تمسخر سے کہا۔ ''تمہاری اس اطلاع پر مجھے سر کے بل کھڑا ہو کر ناچنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہیں مبارک ہو۔ تمہاری التجا قبول ہوئی۔ مجھے سیدھا راستہ نظر آ گیا ہے۔ یہ راستہ چار گھنٹے بعد سیدھا اس تہہ خانے میں آئے گا...... پھر میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بھگوڑے یار کو ٹیلی فون پر تمہارے پکے راگ سنوا سکوں۔''

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''ریاض! میں نے اپنے مرے باپ کی قسم کھائی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نے کبھی تمہارے لیے بددعا نہیں کی، کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ یہ کہنے والی باتیں نہیں ہوتیں لیکن میں کہہ رہی ہوں۔ میں اوروں کی طرح تمہارے نام سے بھی صدقہ خیرات کرتی رہی ہوں۔ اپنے اندر یہ امید پالتی رہی ہوں کہ ایک دن تم وہ نہیں رہو گے جو اب ہو۔ تم اسے میرا دیوانہ پن کہہ سکتے ہو لیکن میں تمہارے لیے روتی رہی ہوں۔ اوپر والے سے تمہارا بھلا مانگتی رہی ہوں......''

''تالیاں...... ایک بار پھر تالیاں...... بھئی لوگ سچ کہتے ہیں، رنگ والی میں ایک جادوگرنی رہتی ہے جو اپنے چلتروں کے ساتھ چنگے بھلے لوگوں کی بیڑیوں میں وٹے ڈال دیتی ہے۔ وہ اس کے نام کی مالا جپنے لگتے ہیں۔ بالکل سچ کہتے ہیں لوگ...... لیکن ایک بات یاد رکھ! میں خود بھی الہ دین کا جن ہوں۔ تیری جیسی جادوگرنیوں کو اپنے مُوت کی دھار میں بہا دیتا ہوں، شوں کر کے......''

شانی نے بولنا چاہا مگر فرطِ رنج سے اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ ریاض نے بے رحمی سے اس کے لمبے ریشمی بالوں کو جھٹکا دیا اور پھنکارا۔ ''اپنی یہ ساری لولو پوپو باتیں اپنے پاس رکھ...... تیرے جیسی ففے کٹنیوں کے ایسے بڑے ناٹک دیکھے ہوئے ہیں ہم نے۔ یہ جو خلقِ خدا کی محبت چڑھی ہوئی ہے ناں تجھ پر، دو منٹ میں اتار کر ایک طرف رکھ دوں گا۔ اپنی چمڑی بچانے کے لیے کسی طوائف کی طرح الٹا سیدھا ناچتی نظر آئے گی...... حرامزادی...... آوارہ کتیا......'' اس نے شانی کے لیے فصیح و بلیغ گالیاں بکیں پھر ذرا دم لے کر بولا۔ ''یہ محبت نہیں لیڈری ہے۔ تیری اصل محبت، صرف اس حرامی ڈکیت کے پاس گھٹنے میں ہے۔... باقی سب گندی فلم، گندہ ڈراما! اگر نہیں تو پھر آج میرے یا ہیرے کے ساتھ بھی اس طرح سو کر دکھا جس طرح اس حرامی کے ساتھ سوتی ہے۔''

شانی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہچکیاں لینے لگی۔ جاتے جاتے ریاض نے بیڈ کو زور دار ٹھوکر لگائی اور بولا۔ ''کان کھول کر سن لے۔ اب تیرے پاس چار گھنٹے سے بھی کم ہیں......''

شانی آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ اس کی چوٹیں تکلیف دے رہی تھیں اور دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ریاض کے کمرے سے جانے کے بعد بھی دیر تک اس کی بُو کمرے میں چکراتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس کریہہ بُو سے اس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ شاید ہر زور آور اور جابر جسم کی بُو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کے جاگیردار شوہر فاخر کے جسم سے بھی تو ایسی ہی باس آیا کرتی تھی......اور یہ باس لاہور کی ایک کوٹھی میں قاسم برلاس کے جسم سے بھی آئی تھی......اور اس ریچھ کے جسم سے بھی جس نے گریس کے بچے پر حملہ کیا تھا......اور پھر چوہدری بشیر کے جسم سے بھی جب اس نے شانی کو ایک جعلی نکاح نامے کی آڑ میں روندنا چاہا تھا۔ ہاں...... یہ جانی پہچانی بُو تھی۔

شانی بندھی پڑی رہی اور اپنے دل کی دھڑکنیں گنتی رہی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ اسی عالم میں گزر گیا۔ اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ ایک بار پھر کوئی سلائیڈنگ دروازے سے باہر موجود ہے۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار آواز آئی جیسے دروازے سے کوئی وزنی شے ٹکرائی ہو۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی کئی افراد کے بلند آواز سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ دو تین افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے رنگ سانولے اور جسم توانا تھے۔ انہوں نے گھیردار شلواریں اور شلوکے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ سر ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے تاہم شانی دیکھتے ہی پہچان گئی۔ وہ مہتم تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دو کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبے چھرے تھے جو سرکنڈے وغیرہ کاٹنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار تھا اور ان میں سے ایک کے جسم پر بھی تازہ لہو کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ شانی سکتہ زدہ رہ گئی۔

اسی دوران میں شانی نے سردار دراج کو دیکھا۔ وہ لپکتا ہوا اندر آیا اور شانی کو بیڈ سے بندھا دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ کچھ دیر تک تو جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہوا۔ پھر وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''نکڑی! تم یہاں؟''

شانی خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں نکڑی ...... تم کو کچھ ہوا تو نہیں؟'' دراج تڑپ کر بولا پھر وہ اپنے بندوں سے مخاطب ہوا۔ ''کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کھولو ان کو۔'' وہ خود بھی شانی کی بندشیں کھولنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد شانی آزاد تھی۔ اس

کا لباس کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ دراج نے بستر کی چادر شانی کے سر پر ڈال دی۔

''میں اس کُتے ریاج کی ایک ایک بوٹی کر کے اپنے کتوں کو کھلاؤں گا۔ اس کے بچے بچے کو مار دوں گا۔'' دراج پھنکارا۔

کہیں باہر سے کسی عورت کے چلانے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا منہ بند کیا گیا ہے اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں دہائی دے رہی ہے پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد دو ہٹے کٹے مہتم ایک تیس بتیس سالہ عورت کو گھسیٹتے ہوئے اندر لائے۔ عورت ذرا فربہ اندام لیکن خوش شکل تھی۔ اس کا بالائی لباس تار تار ہو چکا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ''یہ اس کُتے ریاج کی جنانی (بیوی) ہے کھیاجی۔'' ایک مہتم نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس کی جنانی ہے تو تمہاری بھی ہے۔ لے جاؤ اس کو کسی کمرے میں۔'' دراج نے تخت پنجابی لہجے میں کہا۔ ڈھاٹے کے اندر سے دراج کی بس خونی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔

عورت چلائی۔ ''خدا کے لیے نہیں...... خدا کے لیے معاف کر دو...... ہمارا کوئی قصور نہیں۔''

''اوئے چل...... آپاں کسور بھی منوا لیتے ہیں تجھ سے۔'' ایک چھرا بردار مہتم وحشی انداز میں دھاڑا۔

پھر عالم جوش میں اس نے قدرے وزنی عورت کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اٹھا لیا۔ عورت نے ایک بار پھر گھگیاتے ہوئے فریاد کی۔ اس کی کرلاہٹ در و دیوار میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غالباً امکان یہی تھا کہ ریاض کوٹھی میں نہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں مہتم یہاں حملہ آور ہو گئے ہیں۔ ساؤنڈ پروف تہہ خانے کی وجہ سے شانی کو باہر کی آوازوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ تنومند شخص کے شکنجے میں جکڑی ہوئی لاچار عورت نے ایک بار پھر فریادی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ شانی کے اندر کی وہ عورت جاگ اٹھی جو ہر ظلم کے سامنے دیوار بن جانے کی خُو رکھتی تھی۔

وہ تڑپ کر تنومند افراد کے سامنے آگئی۔ ''اس کو کہاں لے جا رہے ہو...... اس کا کیا گناہ ہے؟''

دراج خونخوار لہجے میں بولا۔ ''نکڑی! تجھے کچھ کھبر نہیں۔ تُو اس معاملے میں نہ آ۔ اس ڈیٹی کے بڑے جلم سہے ہیں آپاں نے۔ اب حساب برابر کرنے کا وقت ہے۔ تُو پیچھے ہٹ جا نکڑی۔''

"ظلم ڈپٹی نے کیے ہوں گے۔ ...اس عورت کا کیا گناہ ہے؟"

"تو آپاں کی عورتوں کا کیا گناہ تھا؟ ان کے ساتھ ہر جلم کیا گیا۔ ہر جیادتی کی گئی۔ مار مار کر ہمارے جنوں (جوانوں) کی ہڈیاں کانی کر دی گئیں۔"

"دراج! میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔ تم اس کو چھوڑ دو۔ یہ عورت ہے۔"

"عورت سے ہونے والی جیادتی کا بدلہ عورت کو ہی دینا پڑے گا۔" فریاد کناں عورت کو گود میں بھرنے والا شخص پھنکارا۔

"میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔" شانی پختہ ارادے کے ساتھ بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عورت پر سے مشتعل مہتم کی گرفت ختم کرنا چاہی۔

مہتم نے سردار دراج کی طرف دیکھا۔ سردار دراج نے کارروائی جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ مہتم شانی کو دھکیلتا ہوا، عورت سمیت اس سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا جس کی دوسری جانب رنگ والی کی الھڑ مٹیار سکینہ کی جان گئی تھی۔ عورت کربناک انداز میں چلا رہی تھی۔ شانی تڑپ کر سلاخ دار دروازے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نہ صرف کھڑی ہوگئی بلکہ اس نے دروازے کو بند رکھنے کے لیے کنڈی بھی چڑھا دی۔

سردار دراج آتش فشاں تھا۔ وہ شانی کو کندھوں سے پکڑ کر پھنکارا۔ "نکڑی! تو پہلے اپنی حالت دیکھ پھر بات کر...... آپاں کی جنانیاں گاجر مولیاں نہیں ہیں۔ آپاں کی چھاتیوں میں آگ جل رہی ہے۔ اس آگ کو ٹھنڈا ہونے دے۔ پیچھے ہٹ جا۔"

"میں نہیں ہٹوں گی۔ مجھے ہٹانا ہے تو پھر مار دو مجھے۔" شانی نے آخری الفاظ اتنے زور سے کہے کہ وہ پورے بیس منٹ میں گونج اٹھے۔ وہ چٹان کی طرح دروازے کے سامنے موجود تھی۔

ہٹے کٹے شخص نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا پھر وہ کسی دوسرے کمرے میں جانے کے لیے تہہ خانے کے بیرونی دروازے کی طرف مڑا۔ عورت مسلسل اس کی آہنی گود میں تڑپ رہی تھی۔ اس کی مزاحمت کو بے اثر کرنے کے لیے ایک دوسرا مہتم مدد کر رہا تھا۔ شانی نے انہیں دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو ایک بار پھر رستے میں حائل ہوگئی۔ "میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے کہا اور عورت کو گرفت سے چھڑانے کے لیے دیوانہ وار کوشش کرنے لگی۔

اس کا آہنی عزم دیکھ کر دراج کا ہیجان جیسے ایک دم ماند پڑ گیا۔ وہ نسبتاً کم سخت لہجے میں بولا۔ "نکڑی! تو شاید اپنے ہوش میں نہیں۔ دشمن کی جنانی کے لیے اتنی جد (ضد)؟"

"یہ دشمن کی عورت نہیں ...... بس عورت ہے ...... مجھے تم پر شرم آ رہی ہے دراج! خدا کے

لیے ان کو روک دو۔" شانی کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

دراج نے چند سیکنڈ تک شانی کے چٹانی چہرے کو دیکھا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس حرام جادی کے ہتھ باندھو اور اسے بند کر دو اس تہہ کھانے میں۔" عورت مہتم کی جابر آغوش سے نکل آئی۔

اچانک کہیں اوپر سے پھر دھما چوکڑی کی آوازیں گونجیں۔ کوئی وزنی شے گری پھر دو تین افراد اندھا دھند بھاگے اور کسی عورت کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ یہ کوئی نوعمر لڑکی لگتی تھی یا شاید لڑکا تھا۔ اس ہنگامے نے سردار دراج سمیت سب کو چونکا دیا۔ وہ سب تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر کی طرف گئے۔ صرف ایک چھرا بردار مہتم ان کے پاس رہ گیا۔ خوش شکل عورت نے ایک دم شانی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنے لہجے میں دنیا جہاں کی التجا سمیٹ کر بولی۔ "میری چھوٹی بہن! تمہیں خدا رسول کا واسطہ، میرے بچے کو بچا لو۔ یہ اسے بھی مار دیں گے۔ خدا کے لیے......" وہ اچانک شانی کے پاؤں میں گر پڑی اور اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ "میں زندگی بھر تمہاری غلامی کروں گی، اسے بچا لو۔"

شانی دروازے کی طرف لپکی۔ فربہ اندام عورت بھی جسے ریاض کی بیوی کہا گیا تھا، دروازے کی طرف بڑھی۔ چھرا بردار مہتم نے فوراً اس کا راستہ روک لیا۔ "نہیں، تم باہر نہیں جاؤ گی۔" وہ گرجا۔

"تو پھر تم باہر جاؤ۔ میں اسے یہاں بند کرتی ہوں۔" شانی نے چلا کر کہا۔

مہتم نے ایک لحظے کے لیے سوچا پھر وہ تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ شانی نے سلائیڈنگ دروازہ بند کیا اور باہر سے مقفل کر کے چابی نکال لی۔ اس کے بعد وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھی۔ آوازیں بالائی منزل سے آ رہی تھیں۔ وہ بالائی منزل کی طرف بڑھی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق یہ رات کا وقت تھا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں گہرا سناٹا نظر آ رہا تھا۔ شانی بالائی منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سیڑھیوں پر موچھیل ہیرے کی لاش الٹی سیدھی پڑی تھی۔ اس کی شہ رگ بالکل قربانی کے بکرے والے انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ شانی اسے پھلانگتی ہوئی بالائی منزل پر پہنچی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جس آواز کو نسوانی سمجھ رہی تھی، وہ نسوانی نہیں تھی بلکہ وہ فربہ اندام عورت کے بچے کی آواز تھی اور غالباً وہ ریاض کا ہی بچہ تھا۔

یہاں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ بچے کی آواز بھی اب نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ خود کو چھڑا کر کسی طرف نکل گیا تھا یا کوٹھی میں ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ شانی چکراتی ہوئی کچن کے سامنے

سے گزری اور اسے ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ایک جواں سال لڑکی کچن کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے اردگرد تازہ دودھ بکھرا ہوا تھا اور سالن کا ایک پتیلا اوندھا پڑا تھا۔ لڑکی کی پیشانی اور گردن پر گولی کا نشان تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ لڑکی کی ایک ہی جھلک نے شانی کو بتا دیا کہ وہ فربہ اندام عورت کی چھوٹی بہن یا بہت قریبی عزیز ہے۔

دفعتاً لڑکے کی آہ و بکا پھر سنائی دینے لگی۔ شاید اسے پکڑ لیا گیا تھا۔ شانی حتیٰ الامکان تیزی سے آواز کی طرف لپکی۔ یہ ایک وسیع کوٹھی تھی۔ پڑوسی عمارتیں کچھ فاصلے پر دکھائی دیتی تھیں۔ جلد ہی شانی ایک بیضوی کمرے میں پہنچ گئی۔ یہاں سردار دراج کے دو ساتھیوں نے ایک لڑکے کو دبوچ رکھا تھا۔ لڑکے کی عمر چودہ پندرہ برس سے کم نہیں تھی۔ لڑکے کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی قمیص دھجیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

"کھون کے بدلے کھون۔" ایک مہتم گرجا۔ "اپنے بھائی بادل کے بدلے میں مار دو اس کتے کے پلے کو۔"

"ہاں مار دو۔" ایک اور شخص دہاڑا۔

پہلا شخص ایک فٹ لمبے چمک دار چھرے کے ساتھ لڑکے کی طرف بڑھا۔ شانی ایک بار پھر قاتل اور مقتول کے درمیان دیوار بن گئی۔ اس نے بے حد اضطراب کے ساتھ دہشت زدہ لڑکے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا..... جیسے مرغی چوزے کو پروں میں ڈھانپتی ہے...... اس کے ساتھ ساتھ وہ دراج کو آوازیں دینے لگی۔

لڑکا گر گیا۔ شانی اس کے اوپر گر گئی۔ مہتم لڑکے کو جو وحشیانہ ٹھوکریں رسید کر رہے تھے، وہ شانی کا جسم سہہ رہا تھا۔ وہ بدترین دشمن کا بیٹا تھا لیکن وہ شانی تھی۔ وہ ایک انوکھی عورت تھی، وہ ایک جدا روح تھی۔ تیز دھار چھرے کی ایک ضرب شانی کے کندھے پر لگی۔ ایک اور وار بچاتے ہوئے اس کی انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ اس دوران میں دراج بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے شانی کو خطرے میں دیکھا۔

"اوئے چھوڑ دو۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔" وہ چلایا۔

جیسے شکاری کتے مالک کے حکم پر شکار سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں، وہ تینوں افراد بھی ٹھٹک کر علیحدہ ہو گئے لیکن ان تینوں کے تیور اب بھی خطرناک تھے۔ جب تک وہ سردار دراج کے حکم پر بیضوی کمرے سے باہر نہیں گئے، شانی لڑکے سے علیحدہ نہیں ہوئی۔ لڑکا جس انداز میں غوں غاں کر رہا تھا، اس سے پتا چلا کہ وہ گونگا ہے...... وہ ڈپٹی ریاض کا بیٹا تھا۔ ڈپٹی ریاض کی زبان تلوار سے زیادہ تیز اور بچھو سے زیادہ زہریلی تھی۔ مگر ریاض کا بیٹا زبان ہی نہیں

رکھتا تھا۔

دراج بے بسی کے عالم میں شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھیں شاید سوچ رہی تھیں کہ کیا کوئی شانی جیسا سنکی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی اکثر باتیں سمجھ میں نہ آنے والی ہوتی تھیں۔

شانی کراہی۔ "بس کرو سردار دراج! جو ہو چکا وہی بہت زیادہ ہے۔ اب ان کی جان بخشی کرو اور اپنی جانوں پر بھی رحم کرو۔ اب نکلو یہاں سے۔"

سردار دراج الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "ان کو یہاں جندہ چھوڑ کر جائیں گے تو یہ ہمارے کھلاف ثبوت بنیں گے۔"

"ان کو مار بھی دو گے تو یہ سب کچھ چھپا نہیں رہ سکے گا۔"

سردار دراج آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ اس کا اصل شکار ڈپٹی ریاض اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب یہاں رکنا ازحد خطرناک ہے......

اسی دوران میں ایک مہتم بھاگتا ہوا اندر آیا۔ "پلس کی دو بڑی گڈیاں آئی ہیں۔ بڑے دروازے کے سامنے۔"

"کدھر ہیں؟" دراج کھڑکی کی طرف لپکا۔

اطلاع لانے والے مہتم اور دراج کے درمیان جو بات ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ یہ پولیس کسی اطلاع پر یہاں پہنچی تھی۔ یقیناً یہاں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ کچن میں پڑی لڑکی کو دو گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ شاید اڑوس پڑوس میں سے کسی نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ دراج نے اپنے ساتھیوں کو فوراً یہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔ انہوں نے فوراً ضروری ثبوت اٹھائے۔ صرف دو منٹ بعد ساتوں ڈھاٹا پوش مہتم، شانی سمیت کوٹھی کے عقبی دروازے پر تھے۔ اس چھوٹے سے دروازے سے باہر دو کاریں موجود تھیں۔ وہ آناً فاناً کاروں میں بیٹھے اور ایک تنگ سڑک سے ہو کر نکل گئے..... غیر متوقع طور پر کہیں ان کا راستہ نہیں روکا گیا۔

کوٹھی چھوڑنے سے پہلے شانی نے تہہ خانے کی چابی لرزتے کانپتے دہشت زدہ لڑکے کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ لڑکے کے ہاتھ میں چابی نہیں تھما رہی، اس کی ماں کا ہاتھ تھما رہی ہے......اور یہ احساس اس کے لیے بڑا ہی جاں افزا تھا۔

رات کی تیرگی میں دونوں کاریں آگے پیچھے لاہور کی سڑکوں پر اڑی چلی جا رہی تھیں۔ شانی دراج کے ساتھ کار کی پچھلی نشست پر موجود تھی۔ سردار دراج گم صم تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تو تھی کہ وہ بالکل اتفاقی طور پر شانی کو ایک خوفناک صورتِ حال سے نکالنے میں کامیاب

ہوا ہے مگر اس بات کا دکھ بھی تھا کہ وہ ڈپٹی ریاض کو انجام تک نہیں پہنچا سکا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں دراج؟" شانی نے پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو نکڑی؟"

"مجھے رستم کے پاس پہنچا دو۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"آپاں وہیں جا رہے ہیں؟"

"کتنی دیر کا رستہ ہے؟"

"دس بارہ منٹ لگیں گے۔ گلبرگ پہنچنا ہے۔"

شانی جلد از جلد رستم کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وقت کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے، وہ رستم کو سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ اپنے بارے میں، خالو اعجاز کے بارے میں اور ان حالات کے بارے میں جنہوں نے انہیں ایک دوسرے سے دور کیا۔ وہ رستم کے کشادہ سینے سے لگ کر دیر تک آنسو بہانا چاہتی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ آج فون پر رستم اور ریاض کے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ ریاض نے رستم کو تھوڑی سی مہلت دی تھی اور اس مہلت کے دوران میں رستم نے اپنے آپ کو ریاض کے حوالے کرنا تھا۔ شانی کو خوف تھا کہ کہیں ایک بار پھر وڈے ڈیرے والی کہانی نہ دہرا دی جائے۔ شانی کی خاطر رستم، ریاض کے سامنے پیش ہوا تھا اور ریاض نے اس پر سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔

"کیا تم میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں؟" شانی نے دراج سے پوچھا۔

"نہیں نکڑی۔ پر تُو پریشان کیوں ہوتی ہے، بس جرا سا رستہ رہ گیا ہے۔"

"اس سے کہو گاڑی ذرا تیز چلائے۔" شانی نے کہا۔

دراج کی ہدایت پر گاڑی چلانے والے نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ شانی زخمی تھی۔ کندھے سے تو باقاعدہ خون رِس رہا تھا مگر ان لمحوں میں شانی کو ان زخموں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اصل تکلیف تو سینے کے اندر تھی۔ دل کی گہرائی میں...... جہاں حالات کا مہیب ستم مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔

گاڑیاں تیز رفتاری سے گلبرگ کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئیں۔ پرانی تعمیر کی اس کوٹھی میں بس کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ باغیچہ، ڈرائیو وے، پورچ، سب تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"یہیں ہیں رستم؟" شانی نے بے چینی سے پوچھا۔

دراج نے اثبات میں جواب دیا۔ ملازم نے مین گیٹ فوراً بند کر دیا تھا۔ وہ سب گاڑیوں سے اترے۔ شانی کی نگاہ سب سے پہلے ناصر پر پڑی۔ وہ رہائشی حصے کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور قدرے حیرت سے گاڑیوں کو اور گاڑیوں سے اترنے والے مہتموں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار سمیت سارے مہتموں نے اب اپنے ڈھاٹے اتار دیئے تھے۔ ناصر کو دیکھ کر شانی کا دل بھر آیا۔ جیسے مدت سے بچھڑا ہوا کوئی ساتھی نظر آیا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکی۔ جب وہ پورچ میں پہنچی تو ناصر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ دو تین سیڑھیاں اُتر کر شانی کی طرف بڑھا۔ "بھابی! آپ یہاں؟" وہ بے حد حیرت سے بولا۔

"ناصر! رستم کہاں ہیں؟ شانی نے بلا تمہید کہا۔ اس کی بے تابی قابلِ دید تھی۔

"کیا ہوا بھابی! وہ یہیں ہیں...... آپ...... حوصلہ رکھیں۔"

"مجھے ان سے ملاؤ ناصر! جلدی کرو۔"

"اوہو، آپ تو زخمی لگ رہی ہیں۔ آپ اندر تو آئیں۔" ناصر نے اس کے کندھے سے اوپر چادر پر خون کا دھبا دیکھ کر کہا۔

وہ شانی کو لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ دراج اور اس کے ساتھیوں کو بھی سخت الجھن زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ لوگ رات کے اس پہر کہاں سے وارد ہوئے ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دراج کے مسلح ساتھیوں کو یہاں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

شانی نے اندر پہنچتے ہی ایک بار پھر رستم کے بارے میں پوچھا۔ ناصر نے کہا۔ "وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے نکلے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ پوری جان سے تڑپ گئی۔

"انہوں نے بتایا نہیں۔ میں بھی گیٹ کی آواز سن کر باہر آیا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سفید گاڑی بھی نہیں ہے۔ شاید اسی پر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے اجمل کو کسی دوا کی ضرورت پڑی ہو گی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" شانی نے سر تھام لیا۔ "ناصر تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ان کا موبائل نمبر ہے تو ملاؤ پلیز...... جلدی کرو۔"

ناصر نے پی ٹی سی ایل کی لائن سے رستم کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں جہانگیر سلیپنگ سوٹ پہنے برآمد ہوا۔ شانی نے خود کو اوڑھنی میں چھپا لیا تھا۔ درحقیقت وہ

جہانگیر کو پہچان ہی نہیں پائی تھی۔ جہانگیر نے ایک سوالیہ نظر شانی پر ڈالی پھر ناصر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یار! وہ بندہ کدھر ہے؟ کمرے کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''کون...... طفیل؟'' ناصر نے ٹھٹک کر پوچھا۔ جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کہیں وہ رستم بھائی کے ساتھ تو نہیں گیا؟'' ناصر کا لہجہ متفکر تھا۔

''یہ فون کس کو کر رہے ہو؟'' جہانگیر نے ناصر سے پوچھا۔

''رستم بھائی کو۔''

''اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ میں نے بھی دو تین بار ٹرائی کی ہے۔'' جہانگیر نے بتایا۔

شانی نے ناصر کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سسک کر بولی۔ ''ناصر! ہم نے دیر کی تو... پھر کبھی رستم کو دیکھ نہیں سکیں گے۔ مم...... مجھے ڈر ہے کہ وہ...... اپنی گرفتاری دینے....'' اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اب ناصر کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ ناصر، شانی اور جہانگیر دوڑتے ہوئے باہر آئے اور پورچ میں کھڑی ایک گاڑی کی طرف لپکے۔ جہانگیر ساتھ ساتھ موبائل پر رستم سے رابطے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ ناصر نے سنبھالی۔ رات کے سناٹے میں ہنڈا سوک کے پہیے چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔

''پہلے قریبی تھانے کی طرف چلو۔'' پچھلی نشست سے شانی نے کہا۔

ناصر نے ایک راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی کو گھمایا اور بڑی سڑک پر ڈال دیا۔ لاہور کی اس ٹھہری ہوئی خاموش رات میں ایک طوفان سر اٹھا رہا تھا۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ جہانگیر کا رابطہ رستم سے ہو گیا۔ ''ہیلو رستم! کہاں ہو تم؟'' جہانگیر نے بے حد بے قراری سے پوچھا۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' رستم کی گمبھیر آواز اسپیکر سے ابھری۔

''رستم یار! خدا کے لیے بتاؤ کہاں ہو؟ وہ حرامزدہ طفیل بھی کمرے میں نہیں ہے۔''

''وہ میرے ساتھ ہے۔''

''کہاں جا رہے ہو تم؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ ناصر کو لگا کہ کہیں رستم رابطہ منقطع نہ کر دے۔ اس نے موبائل سیٹ جہانگیر کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ''رستم بھائی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

چند سیکنڈ کی بوجھل خاموشی کے بعد رستم نے نہایت گمبھیر آواز میں کہا۔ ''ناصر! میں طفیل

کو اچھرہ کی طرف لے جا رہا ہوں۔ شمع چوک کے آس پاس میں اسے کہیں چھوڑ دوں گا۔''

''لیکن کیوں؟''

رستم کی بوجھل آواز ابھری۔ ''تمہیں معلوم نہیں ناصر! ایک بار پھر قسمت نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے...... ہم ایک بڑی مصیبت میں ہیں۔ شانی بی بی دوبارہ ڈپٹی ریاض کے قبضے میں چلی گئی ہیں۔ میں نے خود فون پر بات کی ہے ان سے۔ وہ بڑی مشکل میں ہیں ناصر۔'' رستم کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن رستم بھائی ابھی تھوڑی دیر......'' اس سے پہلے کہ ناصر کا فقرہ مکمل ہوتا اور وہ رستم تک یہ خوشخبری پہنچاتا کہ شانی یہاں موجود ہے، شانی نے ناصر کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ ناصر حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ شانی نے اشارے سے اسے سمجھایا کہ وہ ابھی رستم کو اس بارے میں نہ بتائے۔

رستم کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''ناصر! ریاض کے ساتھ کل سے فون پر میری بات ہو رہی ہے۔ وہ ہم تینوں کی گرفتاری کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بس اس حد تک مانا ہے کہ اگر ہم طفیل کو چھوڑ دیں تو وہ بی بی جی پر تشدد کا سلسلہ بند کر دے گا۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسے چھوڑ دیں۔ میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ہاتھ بھی باندھے ہوئے ہیں۔ شمع سینما کے قریب میں اسے چھوڑ کر واپس آؤں گا۔ وہاں سے یہ خود ہی ریاض کے پاس پہنچ جائے گا۔''

''کہیں آپ خود گرفتاری دینے کا ارادہ تو نہیں کر رہے؟''

''نہیں...... ابھی تو نہیں۔ میں واپس آتا ہوں تو اس بارے میں بات کرتے ہیں۔''

''لیکن رستم بھائی!'' ناصر نے الجھن سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مائیک پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی نے فون ناصر سے لیا اور کال منقطع کر دی۔

ناصر اور جہانگیر دونوں حیران تھے۔ یہ بات تو ان دونوں کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ شانی طفیل کی رہائی چاہ رہی ہے...... مگر کیوں؟

شانی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ نظر آ رہی تھیں۔

ناصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! ریاض کے بھتیجے کو ہمارے پاس رہنا چاہیے اس سے ہم بارگیننگ کر سکیں گے۔''

''اس سے کچھ نہیں ہوگا ناصر۔'' وہ کراہی۔ ''بس یہ ہوگا کہ بھڑکتی ہوئی آگ کچھ اور بھڑکے گی۔ کچھ اور لوگ قتل ہوں گے۔ کچھ اور سائیں بَین ڈالیں گی۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرو ناصر! کسی بھی طرح ٹھنڈا کرو..... ورنہ کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

ناصر اور جہانگیر اضطراب کے عالم میں شانی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ پوری طرح شانی سے متفق نہیں تھے مگر شانی کے چہرے پر ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ وہ اپنے لب نہیں کھول سکے۔ گاڑی واپس کوٹھی کی طرف پلٹ آئی۔ یہ سارا معاملہ ناصر اور جہانگیر کے لیے بے حد تجسس انگیز تھا۔ راستے میں ناصر نے شانی سے اس بارے میں پوچھا......

''بھابی! میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔ آپ تو رنگ والی میں تھیں۔ وہاں سخت پہرا ہے پھر آپ ڈپٹی ریاض تک کیسے پہنچ گئیں...... اور اس سے بھی زیادہ حیرانی یہ ہے کہ آپ اس بدبخت کی گرفت سے نکل بھی آئیں۔ سردار دراج والا معاملہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ پتا نہیں کب کوٹھی سے نکلا ہے...... اور اس کے یہ ہٹے کٹے مسلح ساتھی...... یہ کہاں سے آئے ہیں؟''

شانی نے سوالیہ نظروں سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ ناصر نے اس کا انداز بھانپ کر کہا...... ''جہانگیر بھائی سے کوئی پردہ نہیں۔ آپ ان کے سامنے بات کر سکتی ہیں۔''

شانی نے مختصر الفاظ میں ساری صورتِ حال ناصر کے سامنے بیان کر دی۔ اس کا سکینہ کے ساتھ رنگ والی کی حویلی سے نکلنا، لاہور پہنچنا...... یہاں مشکوک افراد کا ان کے پیچھے لگنا اور بالآخر شانی کا ڈپٹی ریاض کی تحویل میں چلے جانا..... اس نے سب کچھ ناصر کو بتا دیا۔ اگر کوئی بات چھپائی تو وہ سکینہ کی دردناک موت تھی۔ اس نے ناصر کو بتایا کہ لاہور میں صرف وہی ریاض کے ہتھے چڑھی، سکینہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

پتا نہیں کہ وہ یہ بات کیوں چھپا رہی تھی؟ بس اس کے اندر سے آواز سی آ رہی تھی کہ وہ یہ بات بتائے گی تو بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بھڑک سکیں گے۔ حالات اور بھی سنگین ہو جائیں گے۔

جہانگیر نے پوچھا۔ ''بھابی! سردار دراج ریاض کی کوٹھی تک کیسے پہنچ گیا؟ کیا اسے کوئی اطلاع ملی تھی؟''

''اس بارے میں تو وہی بہتر بتا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے مدد کی۔ وہ اور اس کے ساتھی بڑے وقت پر پہنچے...... لیکن...... وہاں بھی جو کچھ ہوا ہے، وہ شاید نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سردار اور اس کے ساتھی بہت بپھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں لوگوں کی جان لی

ہے۔ دو لاشیں تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جانی نقصان ہوا ہوگا۔ اللہ رحم کرے۔ آثار خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ریاض نے اب بہت بھڑکنا ہے۔''

وہ منزل پر پہنچ گئے۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا۔ پہرے دار نے انہیں پہچاننے کے بعد کوٹھی کے اندر جانے دیا۔ سردار دراج اور اس کے مسلح ساتھی برآمدے میں موجود تھے۔ ان کے ہتھیار ابھی تک ان کے پاس موجود تھے۔ گاڑی میں سے نکلنے سے پہلے ناصر نے شانی سے پوچھا۔

''رستم بھائی نے پوچھنا ہے کہ اگر آپ یہاں پہنچ چکی تھیں تو پھر ہم نے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کیوں نہیں۔ اس بارے میں رستم بھائی سے کیا کہنا ہے؟''

''پلیز! ابھی آپ دونوں نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ بس یہی کہنا ہے کہ جس وقت فون ہوا، تب تک میں نہیں پہنچی تھی۔ بعد میں موقع دیکھ کر ہم انہیں سچ بتا دیں گے۔ تم سمجھ ہی رہے ہو نا کہ ابھی یہ سچ انہیں بہت دکھ دے گا۔''

ناصر اور جہانگیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ناصر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اجمل کہاں ہے؟'' شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں۔'' ناصر نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

شانی، اجمل کو دیکھنے کے لیے فوراً کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ ناصر لمبے ڈگ بھرتا ہوا دراج کی طرف گیا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ناصر کے ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔ وہ ان سوالوں کے جواب دراج سے جاننا چاہ رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہوا ہے دراج؟ رات نو بجے تو تم اپنے کمرے میں آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ڈپٹی ریاض کے ٹھکانے کا تمہیں کیسے پتا چلا؟ اور کیسے پتا چلا کہ بھابی شانی وہاں ہیں؟ اور...... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ بھابی بتا رہی ہیں کہ وہاں لاشیں بھی پڑی ہیں۔''

دراج کی آنکھیں ابھی تک سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے سر پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ پھنکارا۔ ''اس حرامی ریاج کی قسمت چنگی ہے، وہ بچ گیا ہے۔ آپاں نے اس کو چھوڑنا نہیں تھا۔ اس کا سر کاٹنا تھا اور تھیلے میں ڈال کر لانا تھا یہاں۔'' دراج نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے کینوس کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے وحشی لہجے نے ناصر جیسے شخص کو بھی ہلا دیا۔

دراج نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپاں کو اس بات کا تو ڈھاڈا غم ہے کہ ریاج وقتی طور پر بچ گیا ہے، پر اس بات کی بہت جیادہ خوشی بھی ہے کہ اس نیلی چھتری والے نے مجھ جیسے ''نِچ نمانے'' سے ایک بہت چنگا کام کرا دیا ہے۔ اس حرام جادے ریاج نے اپنی تکڑی چوہدرانی کو وہاں کوٹھی میں بند کیا ہوا تھا۔ پلنگ چارپائی کے ساتھ رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ تم

خود دیکھ لو۔ اس کی مار سے نکڑی کا پنڈا نیلو نیل ہے۔ اس کی نیت نکڑی کی جان لینے کی تھی.....''

''یہ تو جو ہوا بہت اچھا ہوا ہے دراج! اوپر والے نے بھابی کے لیے اور ہم سب کے لیے تمہیں رحمت کا فرشتہ بنایا ہے مگر..... یہ بہت خطرے والا کام تھا۔ اس میں مشورہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید اگر مشورہ ہوتا تو ڈپٹی ریاض کا کام بھی تمام ہو جاتا۔''

دراج نے ناصر کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اس کے ایک ساتھی نے ریاض کے ٹھکانے کا سراغ دیا۔ کس طرح اس نے اپنے مسلح ساتھیوں کو گوجرانوالہ سے لاہور بلایا اور کس طرح ریاض کی کوٹھی پر ہلا بولا۔ سارا کام پروگرام کے عین مطابق ہوا مگر بدقسمتی سے ریاض اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ دراج نے ایک بار پھر چھاتی ٹھونک کر کہا۔ ''اگر وہ گھر میں ہوتا تو اس وقت اس تھیلے میں اس کا کٹا ہوا سر ہوتا۔''

ابھی ناصر اور دراج کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ بیرونی گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ ناصر نے کھڑکی میں سے دیکھا، مسلح چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ اندر آنے والا رستم ہی تھا۔ اس کی سفید گاڑی ڈرائیو وے پر آئی اور دھیرے دھیرے چلتی پورچ میں رک گئی۔ اندر سے رستم نکلا۔ اس کے لمبے بال منتشر تھے، چہرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی چال میں غیر محسوس سی لنگڑاہٹ اب بھی تھی تاہم کسی وقت بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ بڑے تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا زینے چڑھا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ناصر نے سوچا کہ کمرے میں جا کر اسے بھابی شانی والی خوشخبری سنائے مگر پھر اسے یہ زیادہ مناسب محسوس ہوا کہ شانی خود ہی رستم کے پاس پہنچے۔ یہ سرپرائز یقیناً رستم پر شادیٔ مرگ طاری کر سکتا تھا۔ ناصر فوراً شانی کے پاس پہنچا۔ وہ اجمل کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بیمار اجمل کے کندھے پر تھے۔ دونوں ڈولے کی موت کو یاد کر کے اشک بار ہو رہے تھے۔ ناصر نے ان کے قریب جا کر کہا۔ ''بھابی! رستم بھائی آ گئے ہیں۔''

شانی کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اضطراب، خوشی، خوف..... سب کچھ اس رنگ میں شامل تھا۔ ''میں ابھی آتی ہوں اجمل۔'' شانی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ناصر کے ساتھ چلتی ہوئی زینوں تک پہنچی۔ ناصر نے اسے اشارے سے بتایا کہ رستم کس کمرے میں ہے۔ شانی زینے چڑھ کر اوپر آ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری، تیسری دستک پر اندر سے رستم کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''آ جاؤ ناصر!''

شانی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا اور موبائل پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ یکایک اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی نگاہ شانی پر پڑی اور جیسے ساکت ہو کر رہ گئی۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ اس کی گود سے نکل کر گرا اور سگریٹ قالین پر بکھر گئے۔

''شانی..... آپ..... یہاں؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''ہاں رستم۔''

''مگر..... آپ..... تو.....'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''رستم! میں نکل آئی ہوں ریاض کے پاس سے۔'' شانی نے اشک بار لہجے میں کہا۔

''لیکن..... کب..... یہ کیسے ہوا..... میرا مطلب ہے آپ.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کی حیرت بھی تھی۔

شانی بے ساختہ رستم کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔ اس نے رستم کو اپنی بانہوں میں لیا اور سسکنے لگی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ رستم پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ رستم کا شانہ، شانی کے گرم آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

''رستم! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو دکھ دیا ہے۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔ آپ مجھے جو سزا دیں، مجھے منظور ہوگی۔'' وہ کہتی چلی گئی۔

رستم تحیر زدہ تھا۔ اس نے شانی کو ٹٹولا..... جیسے اس کے صحیح سالم ہونے کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ تب اس نے تسلی آمیز انداز میں اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''میرا دماغ پھٹ جائے گا شانی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے بتائیں کہ آپ یہاں کیسے پہنچیں؟''

''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔ پہلے آپ مجھے اس دکھ کے لیے معاف کریں جو میں نے آپ کو دیا۔'' وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے سسکی۔

''معافی تو مجھے بھی مانگنی تھی آپ سے لیکن آپ نے تو دو تین مہینے سے میری بات ہی نہیں سنی۔ میں دن رات آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر جب فون ہوا تو آپ نے بس دو لفظ بول کر بند کر دیا۔ ایسا کیوں کیا آپ نے شانی؟ کیوں اتنا انتظار کرایا؟ آپ کو پتا تھا کہ میرا ایک ایک پل کیسے گزر رہا ہوگا۔ آپ سب جانتی تھیں۔'' رستم کی آواز بوجھل ہو گئی۔

شانی کسی آکاش بیل کی طرح رستم سے چمٹی ہوئی تھی۔ شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس نے نم ہونٹوں سے رستم کا رخسار چوما۔ جواب میں رستم نے بھی اسے چوما۔ وہ دیر تک گلے

لگے رہے ان کے دل روتے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بند کمرے میں ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ وہ اس کے شانے سے لگی ہوئی تھی۔ وہی مضبوط شانہ جس کا لمس اسے ہر غم اور فکر سے آزاد کرتا تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ وہ کیسے اور کیونکر ڈپٹی ریاض کی مہلک ترین گرفت سے بچ کر یہاں پہنچ سکی ہے۔ اس نے اس کرشماتی واقعے کی پوری تفصیل رستم کو بتائی۔ رستم تحیر میں ڈوب کر سنتا رہا۔ ریاض کی ڈیفنس روڈ والی رہائش گاہ پر دراج اور اس کے ساتھیوں کی ڈرامائی کارروائی کا ذکر سنسنی خیز تھا۔ آخر میں شانی نے بتایا۔ ”ریاض کی قسمت اچھی ہے کہ وہ کچھ ہی دیر پہلے تیار ہو کر گھر سے جا چکا تھا...... ورنہ آج دراج اور اس کے ساتھیوں سے اس کا بچنا مشکل تھا۔ وہ سب ایک دم خونی ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چھرے اور پستول تھے۔ انہوں نے وہاں کئی لوگوں کو جان سے مار دیا ہے۔ ریاض کی بیوی اور بیٹا بھی مشکل سے جان بچا سکے ہیں۔“

”دراج اور اس کے ساتھیوں کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا؟“ رستم نے پوچھا۔

”نہیں، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔“

”آپ کو دراج ہی یہاں لایا ہے؟“

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔ ”ہم آپ کے آنے سے بس تھوڑی ہی دیر پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ بس دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہیں۔“

رستم نے جذباتی انداز میں شانی کے دونوں ہاتھ تھامے۔ ”مجھے اب تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ میں تو یہاں بیٹھا ریاض سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ اب کیا چاہتا ہے...... لیکن اب میں آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں، مجھے ناصر نے سب کچھ بتایا ہے۔ اس کا بھتیجا طفیل آپ کے پاس تھا۔ آپ شاید اسے کہیں چھوڑنے گئے تھے۔“

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں نے اپنی پیشانی کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو وہ دیکھ رہا ہے، وہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ پھر اچانک رستم کی نگاہ شانی کے کندھے پر پڑی۔ یہاں چادر پر خون کا دھبا تھا۔ ”اوہ...... آپ تو زخمی ہیں۔“ وہ تڑپ گیا۔

”نہیں، معمولی چوٹ ہے رستم۔“ شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے جذباتی لہجے میں بولی۔ ”اصل زخم تو دل میں ہیں۔“

وہ ایک بار پھر رستم کے شانے سے لگ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رستم کو سکینہ کی

اندوہناک موت کے بارے میں بتا دے۔ مگر ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رستم اور ریاض تو پہلے ہی دو آتش فشاں چوٹیوں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس آگ میں تیل کا یہ چھینٹا اور بھی مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کے لیے اپنے سینے سے ابھرنے والی سسکیوں کو سینے میں ہی دبا گئی۔

ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں، بہت سے سوال جواب تھے لیکن رستم پہلے دراج سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے شانی سے بس چند منٹ کی اجازت لی اور کمرے سے نکل گیا۔ شانی نے دیکھا، کھڑکیوں سے باہر رات کا قاتل اندھیرا سرسرا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں مہلک خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو طوفانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

☆=======☆=======☆

سکینہ مر چکی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے مری تھی لیکن شانی نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اپنے شریکِ حیات رستم کو بھی نہیں...... مگر اس خبر کو وہ رستم سے کب تک چھپا سکتی تھی؟ شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں رنگ والی میں حالات کیا ہیں۔ اسے رنگ والی سے آئے اب 72 گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اس کی اور سکینہ کی گمشدگی نے وہاں ہلچل مچا دی ہوگی۔ بہرحال، وہ اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ خبر عام ہوئی ہوگی یا نہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ بدنامی کے خوف سے حویلی میں اس خبر کو دبا لیا گیا ہو اور چپکے چپکے ان دونوں کی تلاش کی جا رہی ہو۔ اگر یہ تلاش چپکے چپکے نہ ہوتی اور خبر پھیل چکی ہوتی تو پھر پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں ناصر نے اس سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کیا ہوتا۔

اب وہ کیا کرے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حویلی میں بابا خادم حسین نے اسے جو کچھ بتایا تھا، اس کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اسے خالو اعجاز کا دوسرا چہرہ نظر آیا تھا اور یہ بے حد مختلف تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ خالو اعجاز وہ نہیں رہے جو کبھی تھے۔ ان کی نظریں اس کی بیش بہا جائیداد پر لگ گئی ہیں۔ وہ اس حوالے سے اپنے چھوٹے بھائی شاداب کو ایک مہرے کے طور پر آگے بڑھا رہے ہیں۔ شاداب کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان میں آیا تھا۔ اس نے انڈسٹری لگائی تھی...... رنگ والی میں آنا جانا شروع کیا تھا۔ تایا معصوم اور پھوپی آمنہ کے ساتھ اسے بہت لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ ان کے لیے اکثر قیمتی تحفے لاتا تھا۔ اب شانی کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ سارا کھیل کس لیے کھیلا جا رہا ہے۔

اور شانی دیکھ رہی تھی کہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے خواہش مندوں میں خالو اعجاز ہی پیش پیش نہیں...... خاندان کے باقی لوگ بھی اپنے اپنے انداز میں اس سے فائدے کی توقع لگائے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اسے زبردستی سیاست میں دھکیل رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی

اسے منظر سے ہٹانا چاہتے تھے۔ وہ تایا معصوم اور پھوپی آمنہ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی لیکن تایا معصوم اپنی بیماری کی وجہ سے اور پھوپی آمنہ عورت ہونے کے سبب شانی کے لیے مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔

پتا نہیں کیوں، شانی کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے۔ جائیداد، شہرت، رشتے داریاں...... اسے کچھ درکار نہیں تھا۔ وہ صرف دل کا سکون چاہتی تھی۔ وہ صرف اپنے شریکِ حیات کا ساتھ چاہتی تھی...... روکیٹ بستی جیسا ایک گل پوش گھر جہاں صرف رستم کی محبت ہو۔ اس گھر میں اگر اسے اپنے معصوم مُنے کا ساتھ بھی مل جاتا تو اس کی دنیا مکمل ہو جاتی لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب کچھ چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ وہ گردن تک اس دلدل میں دھنسی ہوئی تھی اور رستم اس سے زیادہ دھنسا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ رستم کے کہنے پر شانی نے اپنی قمیص کا ایک بازو اُتارا اور اپنے کندھے کے زخم پر رستم سے دوا لگوائی۔ رستم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے کندھے پر پٹی باندھی۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کا زخم بھی رستم سے چھپا نہیں رہ سکا۔ یہ ہاتھ شانی نے اب تک اوڑھنی کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ رستم نے انگلیوں کی بینڈیج بھی کی۔ اس نے شانی سے بار بار پوچھا کہ یہ زخم کیسے لگے۔ شانی نے بس گول مول جواب دیا۔ رستم کے لمس نے ایک جاں فزا ٹھنڈک شانی کے رگ و پے میں اتار دی۔

''دراج کیا کہتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہی جو آپ نے بتایا ہے۔ اس نے ریاض کی سالی کو مار دیا ہے۔ وہ اس کی بیوی اور بچے کو بھی مار دینا چاہتا تھا مگر آپ نے انہیں بچا لیا اور میرا خیال ہے......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''کیا کہنے لگے تھے آپ؟''

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''شاید آپ کو یہ زخم بھی ان دونوں کو بچاتے ہوئے ہی لگے ہیں۔''

شانی اعتراف کرنے والے انداز میں چپ رہی پھر بولی۔ ''کیا میں نے غلط کیا؟''

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن آپ جانتی ہیں کہ ریاض زہریلا سانپ ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ سانپ کے ساتھ اس کی مادہ اور سنپولیوں کو بھی مار دینا چاہیے۔'' رستم کے لہجے میں وہی دھاڑ پوشیدہ تھی جو شانی کو لرزا دیا کرتی تھی۔

''وہاں کتنے بندے مرے ہیں رستم؟''

''دو گارڈز...... ریاض کا ایک خاص ملازم ہیرا اور اس کی سالی۔''

شانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔''رستم! آپوزاہدہ کہاں ہیں؟''

''وہ موجود ہیں...... فجر کی اذان سے پہلے نہیں جاگیں گی۔''

''بھائی اکرام اور بچے؟''

''بھائی اکرام یہاں نہیں ہیں۔ عاشی بھی ان کے ساتھ ہے۔ ہاں، سرمد یہیں پر ہے۔''

شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔''رستم! آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں، ٹھیک ہیں۔ بس ہاتھ میں تھوڑی سی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ ایک دن ہاتھ پنکھے میں آ گیا تھا۔''

شانی سمجھ گئی کہ آپوزاہدہ نے رستم سے رنگ والی کا واقعہ چھپایا ہے۔ ہاتھ کی چوٹ یقیناً وہی تھی جو رنگ والی میں آئی تھی۔ خوں خوار کتے نے ان پر حملہ کیا تھا۔ وہ اس بارے میں رستم سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آپوزاہدہ سامنے ہوتیں تو وہ ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگتی...... وہ کچھ دیر تک اشک بار نظروں سے رستم کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔

''رستم! آپ مجھ سے بہت ناراض ہیں ناں؟''

''ناراضگی والا کام تو میں نے کیا تھا شانی۔ وزیری گاؤں میں چوہدری اعجاز صاحب کو تھپڑ مار دیا تھا۔ کچھ بھی تھا...... کچھ بھی تھا، وہ آپ کے بڑے تھے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ سے بہت شرمندہ ہوں بی بی۔ میں نے آپ سے اور چوہدری اعجاز سے معافی مانگنے کے لیے کئی بار رابطہ کرنا چاہا مگر نہ ہو سکا۔''

''رابطہ کیسے ہوتا، وہاں کوئی رابطہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔''

''کیا مطلب شانی؟''

''آپ کو کچھ معلوم نہیں رستم! وہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ خالو اعجاز...... بہت بدل گئے ہیں۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کریں۔ وہ حویلی کا فون اکثر خراب رکھتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وزیری گاؤں میں جو کچھ ہوا، اس میں آپ اکیلے قصوروار نہ تھے۔''

''میں بہت برداشت کرتا رہا شانی! مگر چوہدری صاحب اپنی زبان کو خنجر کی طرح استعمال کرتے رہے۔ شاید وہ چاہتے ہی یہ تھے کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے۔''

شانی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''رستم! وزیری گاؤں والے واقعے کے

بعد فون پر آپ نے مجھ سے کتنی بار بات کی تھی؟''

''ایک دو بار...... اس کے علاوہ ایک دو بار اجمل اور ناصر نے بھی کی ہوگی۔''

''لیکن رستم! اصل میں آپ سب سے میری بات ایک بار بھی نہیں ہوئی۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' رستم سوالیہ نظروں سے شانی کا غمزدہ چہرہ دیکھنے لگا۔

''وہاں ایک گہری چال چلی گئی ہے رستم! شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ جب بابا خادم حسین نے مجھے اس بارے میں بتایا تو میں خود بھی حیران رہ گئی تھی مگر پھر یقین کرنا پڑا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

شانی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔''وزیری گاؤں میں آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ایک ورائٹی شو ہو رہا تھا۔ وہاں اسٹیج کے اداکار آوازوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔''ان میں ایک لڑکی نائلہ بھی تھی۔ اس کو وہاں بہت داد ملی تھی۔ وہی لڑکی بعد میں خالو اعجاز کے ساتھ رنگ والی پہنچ گئی۔ آپ اور ناصر وغیرہ فون پر جو آواز سنتے رہے ہیں، وہ میری نہیں تھی...... وہ اسی نائلہ کی تھی۔ مجھے یہ سب خادم حسین نے بتایا ہے۔''

رستم ناقابلِ یقین نظروں سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ شانی نے اس بارے میں مکمل تفصیل رستم کو بتائی اور اس کی حیرانی اور کرب کو مزید گہرا کر دیا۔ ایک بار پھر وہی فقرہ رستم کے کانوں میں گونجنے لگا۔''رستم! تم گھٹیا ہو اور گھٹیا ہی رہو گے۔'' یہ الفاظ گزرے ہوئے دنوں میں لاتعداد بار اس کے سینے کو چھلنی کر چکے تھے۔ اس نے ہر بار بے حد تعجب سے سوچا تھا...... کیا بی بی اتنے سخت الفاظ اپنی زبان سے ادا کر سکتی ہیں؟ ہر بار جواب نفی میں آیا تھا اور ایک بے پناہ کرب اس کے رگ و پے میں پھیلا تھا اور آج بی بی اپنی زبان سے اسے بتا رہی تھیں کہ یہ ان کے الفاظ نہیں تھے۔ انہوں نے ادا نہیں کیے تھے۔ یہ ایک اداکارہ کے الفاظ تھے اور اس کے پیچھے چوہدری اعجاز کی ہدایت کاری تھی۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ رستم نے ایک بار پھر بے پناہ تحیر سے سوچا۔ یہ سب کچھ کسی فلم یا ڈرامے کی سچویشن جیسا تھا۔ بہرحال، اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں تھا کہ کچھ لوگ ہو بہو آوازوں کی نقل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ نہایت قریبی لوگوں کے لیے بھی اصل نقل میں فرق کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ رستم کے اندر میں ہلچل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر سینے میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ اس کا دل جیسے ایک بار پھر دھڑکنے لگا۔ اس کا دل...... جو صرف بی بی کا تھا۔ جس کی رگوں میں خون کی جگہ بی بی کا عشق حرکت کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بی بی کو ایکا ایکی اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے

بازوؤں نے جذب کے عالم میں بی بی کو اپنے ساتھ بھینچا...... وہ نم ناک لہجے میں منمنائی۔
''میں نے آپ کو کئی پیغام بھیجے لیکن اب پتا چلا ہے، کوئی بھی آپ کو نہ مل سکا...... میں نے آپ کو بہت انتظار کرایا۔ بڑا دکھ دیا۔''

''میں سب سمجھ گیا ہوں۔ آپ کچھ نہ کہیں۔''

وہ جذباتی کیفیت میں، بی بی کے اشکوں سے تر چہرے کو چومتا چلا گیا۔ بی بی نے اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ جیسے اپنے شریکِ حیات کے سینے میں سما کر ناپید ہو جانا چاہتی تھی۔ رات کے اس آخری پہر اس بند کمرے کی فضا میں یہ ملن بہت جذباتی اور رقت آمیز تھا۔

صبح سویرے شانی کی ملاقات اپنی نند آپو زاہدہ سے ہوئی۔ آپو زاہدہ کی آنکھوں میں پہلے تو تحیر کا سمندر ابھرا پھر انہوں نے شانی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور بے شمار بلائیں لیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر میں شانی کا استقبال کس طرح کریں۔ فرصت ملتے ہی آپو زاہدہ نے کہا۔ ''شانی! تمہیں پتا ہے نا، میں تمہارے لیے رنگ والی گئی تھی؟''

''ہاں۔ مجھے بابا خادم حسین نے سب بتایا ہے۔'' شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اور وہاں رنگ والی میں جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا، اس کے لیے معافی مانگنے کے لیے میرے پاس لفظ بھی نہیں ہیں۔''

''ان باتوں کو چھوڑو شانی! بس تم نے رستم کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

''نہیں، میں نے نہیں بتایا۔'' شانی نے آپو کا زخمی ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

آپو زاہدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک بار پھر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ ''شانی! وہ تم کو بہت چاہتا ہے۔ اتنا کہ شاید تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔ مجھے پتا ہے، وہ رات دن تمہارے لیے تڑپتا رہا ہے۔ وہ تمہارے بغیر مر جائے گا شانی۔ اس کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔''

''اچھا آپو۔'' وہ ناک میں گنگنائی۔

''مجھے پتا ہے کہ اس نے اونچی جگہ متھا لگایا ہے شانی۔ ہم غریبوں کا تم چوہدریوں سے کوئی جوڑ نہیں۔ پر اگر تم بھی اسے چاہتی ہو شانی تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے...... تم اس سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں اتنا خوش رکھے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی بدل جائے۔ وہ بڑے خطرے والے رستے پر چل رہا ہے۔ تم اسے واپس لا سکتی ہو۔ تم اسے جس طرح چاہو بدل سکتی ہو۔'' وہ بولتی چلی جا رہی تھیں۔

وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ وہ جس شادی کی بات کر رہی ہیں، وہ تو ڈیڑھ دو برس

پہلے ہو چکی ہے۔ شانی نے انہیں تسلی دی۔ ''آپو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ۔ بےفکر رہیں۔''

''نہیں شانی! وقت بہت تھوڑا ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے دشمنی کی آگ میں چھال مارنے سے روک لو۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ بس تم اسے روک سکتی ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ پولیس اسے ہر جگہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ اس کی بات تک نہیں سنیں گے۔ وہ کچھ دیر کے لیے کہیں رُوپوش ہو جائے۔ اگر اس نے کسی ڈپٹی شپٹی سے اپنا بدلہ لینا بھی ہے تو کچھ مہینوں کے لیے اس کام کو آگے ڈال دے۔ اگر نہیں ڈالے گا تو کچھ نہیں بچے گا۔''

شانی اور آپو زاہدہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ آپو جو کچھ کہہ رہی تھیں، وہ شانی کے دل کی آواز بھی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اگر رستم نے ریاض ہٹلر سے فوری بدلہ چکانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو نتائج خوفناک ہوں گے۔ وہ رستم کے ساتھ ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے سینے کا ایک بہت بڑا زخم رستم سے چھپا لیا تھا۔ سکینہ کے قتل کا غم کوئی معمولی زخم نہیں تھا۔

زاہدہ اور شانی میں ابھی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ زری بھاگتی ہوئی آئی اور عقب سے شانی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔ شانی نے رخ پھیر کر اس کا رخسار چوما۔

''تم کہاں چلا گیا تھا۔ میں تم کو ڈھونڈتا۔ تم مجھ کو بہت اچھا لگتا۔'' زری نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تم بھی بہت اچھی ہو زری۔'' شانی بولی۔

شانی کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر زری ایک دم پیچھے ہٹی۔ زری کے لپٹنے سے شانی کے کندھے کا زخم دکھ گیا تھا اور تھوڑا سا خون رس آیا تھا۔

زری ایک دم گھبرا گئی۔ ''اوہو...... مجھ کو پتا نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوا۔ میں معافی مانگتا۔'' اس نے حسبِ عادت دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔''

''میں بہت بے وقوف ہوں۔ مجھ سے کچھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ میں بہت تنگ کرتا۔''

''نہیں، تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہیں دل میں بٹھانے کو دل چاہتا ہے۔'' شانی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔ ''تم نہ جاتا تو شاید وہ بھی نہ جاتا...... وہ مر گیا...... وہ آپ کو بہت یاد کرتا۔'' زری ڈولے کا ذکر کر رہی تھی۔

ڈولے کے ذکر نے ان تینوں کو ایک دم اداس و غم زدہ کر دیا۔ شانی کو لگا جیسے ڈولا اب بھی ان کے اردگرد کہیں موجود ہے اور اچانک کہیں سے مسکراتا ہوا نمودار ہو جائے گا۔

اسی دوران میں ناصر بڑے تیز قدموں سے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اس کا رنگ فق تھا اور ہاتھوں میں اسٹیتھ اسکوپ نظر آ رہا تھا۔ آپو زاہدہ نے کہا۔ ''لگتا ہے اجمل کی طبیعت پھر خراب ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونا ہے۔''

شانی بھی مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناصر کے پیچھے وہ بھی کمرے میں پہنچ گئی۔ ہنستا مسکراتا اجمل دکھ اور تکلیف کے گھیرے میں تھا۔ اسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی اور سرخ و سپید رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ ناصر تیزی سے اس پر جھک گیا۔ پہلے اس نے اسٹیتھ اسکوپ سے چیک کیا پھر بی پی اپریٹس اس کے بازو سے منسلک کرنے لگا۔ اس کام میں شانی نے اس کی مدد کی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اجمل کا جسم آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر ایک بڑی سی پٹی بندھی تھی۔ اس پٹی کے ساتھ ایک نلکی بھی منسلک تھی جو جسم کے اندر سے پس کھینچ کر ایک بوتل میں ڈالتی تھی۔ اجمل کا بی پی چیک کرنے کے بعد ناصر نے اسے نس میں ایک انجکشن دیا۔ اس انجکشن کے بعد اس نے موبائل پر اجمل کے ڈاکٹر سرجن طارق سے تھوڑی سی بات چیت کی اور اسے ڈرپ لگا دی۔ انجکشن لگتے ہی اجمل کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی تھی۔ اس کی سانس میں روانی پیدا ہو گئی اور چہرے کی رنگت میں بھی قدرے تبدیلی آئی۔

اجمل نے شانی کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''دیکھا شانی بہن! آپ ام کو ایک دم چھوڑ کر چلا گیا تو کیا ہوا۔ چھوٹو بھائی (ڈولا) ختم ہو گیا اور ام بیمار ہو کر اس بستر پر پڑ گیا ہے۔ اب آپ کہیں نہیں جانا، بس امارے پاس رہو۔''

''میں تمہارے پاس ہی ہوں اجمل... میں یہیں ہوں۔'' شانی نے اس کے گرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آپ بے فکر رہو شانی بہن۔ ام اس چھوٹے سے زخم سے مرنے والا نہیں۔ ام ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔ پھر ام آپ کو افغانی پلاؤ کھلائے گا۔ اس میں دنبے کا گوشت ڈالے گا اور پلاؤ کے ساتھ سیخ کباب کے لیے تو ام خود بھی ترس گیا ہے۔ مطلب یہ کہ سلسلہ وہیں سے جوڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا اجمل۔''

''اور صرف افغانی پلاؤ کی بات ہی نہیں ہے، وہ سب کچھ ہوگا جو اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں ہوتا تھا۔ صبح کو بیڈمنٹن، دوپہر میں تیراکی اور شام کو کرکٹ۔ ام بال پھینکے گا اور ایک ہی بار میں درمیان والا وکٹ اُڑا دے گا۔''

ناصر نے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے بھابی کہ اجمل میں بیماری سے لڑنے کا زبردست حوصلہ ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہمت ہار گیا ہوتا۔''

''دراصل یہ سب تمہارا مہربانی ہے ناصر بھائی! خود تمہارا ڈاکٹری ام کو مارتا ہے لیکن تمہارا دشمنی ام کو مرنے نہیں دیتا۔ ام تم سے بہت بہت لڑنا چاہتا ہے اور لڑنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس موقع کے لیے بھی ام نے ایک کتا (قطعہ) کہا ہے..... ارشاد کیا ہے۔

اس سے امارا دشمنی ہے، اس سے امارا پیار ہے
ہر ایک بات پر لڑائی ہے، ہر ایک بات پر تکرار ہے
مرنے میں حرج تو نہیں ہے، مگر ام سوچتا ہے
اس سے پہلے ام مر گیا تو اس میں امارا ہار ہے''

ناصر اور شانی کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آ گئی۔ اجمل نے بھی ہنسنا چاہا مگر اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے اس کا چہرہ سیاہی مائل ہو گیا اور جسم اینٹھنے لگا۔ ناصر نے اس کے سینے پر مساج کیا اور تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ شانی نے اس کے منہ سے پانی کا گلاس لگایا۔ اجمل نے دو گھونٹ پانی پیا اور قدرے بہتر نظر آنے لگا۔ ناصر کوئی دوا لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف لپک گیا۔ شانی نے گلاس میز پر رکھا تو اس کے کنارے پر سرخ رنگ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ یہ خون کا رنگ تھا اور خون کی یہی آلائش اجمل کے ہونٹوں پر بھی موجود تھی۔ شانی نے رومال سے اجمل کے ہونٹ صاف کیے پھر اس کی نظر بچا کر گلاس کا کنارہ بھی اپنی اوڑھنی سے پونچھ دیا۔ اجمل نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''ام سے کیا چھپاتا ہے شانی بہن! ام نے سب دیکھ لیا ہے۔ دراصل آپ کو یہاں دیکھ کر امارا خون سیروں بڑھ گیا ہے۔ اس لیے تھوڑا سا خون باہر بھی آ گیا ہوگا۔ فکر کا بات نہیں ہے۔''

شانی نے کچھ دیر پہلے بھی ڈسٹ بن میں خون آلود روئی دیکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خون کے اخراج کا یہ سلسلہ پہلے سے جاری ہے اور یقیناً اجمل کو بھی اس کا علم تھا۔ شانی نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر آنسو پھر بھی آنکھوں میں امڈ آئے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

اجمل نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ دکھی کیوں ہوتا ہے شانی بہن۔ اول تو ام

مرے گا نہیں اور اگر ناصر کی مہربانیوں سے کوئی ایسا ویسا بات ہو بھی گیا تو ام اپنے دل پر کوئی بوجھ لے کر نہیں جائے گا۔ ام ایک دم ''سیٹس فائیڈ'' ہے۔ شاہی اور قدرت اللہ کی موت سے بڑا خوشی ام کو بھلا اور کیا ہوگا۔ خاص طور پر شاہی کو مار کر تو رستم بھائی نے امارے دل میں لڈوؤں کا پورا دکان پھوڑ دیا ہے۔ ہاں شانی بہن! شاہی مر گیا۔ قدرت اللہ بھی مر گیا۔ امارا مشن پورا ہو گیا۔ قدرت اللہ کو رستم بھائی نے مارنا تھا اور شاہی امارا شکار تھا۔ امارا کام رستم بھائی نے بہ قلم خود کیا اور ام نے رستم بھائی کا کام بہ قلم خود کیا۔ اسی کو محبت کہتے ہیں جی۔''

اجمل کی آواز کمزور تھی اور اسے بہت ہمت کر کے بولنا پڑ رہا تھا۔ شانی نے اسے خاموش رہنے کو کہا مگر وہ جذب کے عالم میں بولتا چلا گیا۔ ''ام نے رستم بھائی سے شاہی کے مرنے کا پورا تفصیل پوچھا ہے۔ آستانے کی سیڑھیوں کے اندر اس حرامی کا گردن رستم بھائی نے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا اور ایک بار جکڑنے کے بعد پھر چھوڑنے کا نام نہ لیا۔ وہ تین چار منٹ تک رستم بھائی کی گرپت میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ اس نے خون کا الٹی کیا، اس کا زبان باہر نکل آیا اور رستم بھائی کے بازو میں ہی اس کا جان خارج ہو گیا۔ اس نے بہت لوگوں کا زندگی خراب کیا تھا شانی بہن۔ اس کا موت ایسا ہی تڑپیلا ہونا چاہیے تھا۔''

تھوڑا سا مزید خون اجمل کے ہونٹوں پر نظر آیا۔ شانی نے اسے کپڑے سے پونچھ دیا۔ اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اجمل کی حالت اس کی توقع سے زیادہ خراب تھی۔ ناصر نے اسے بتایا تھا کہ گولی سینے میں لگ کر کندھے کی طرف گئی تھی مگر یہ زخم پھیپھڑے سے بہت نزدیک تھا۔

''کبھی کبھی ام کو خود پر بہت غصہ آتا ہے شانی بہن۔'' اجمل بولا۔ ''ام سوچتا ہے، کیا ام سچ مچ بستر پر ہی مر جائے گا۔ امارے لیے یہ بڑا ذلالت والا بات ہوگا۔ ام نے تو ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ اگر ام پوت ہوا تو امارا موت ایک دم تڑتھلی مچانے والا ہوگا۔ ام اپنے رستم بھائی کی حفاظت کے لیے لڑتا ہوا مرے گا۔ اپنی آخری گولی اور آخری سانس تک ام ہتھیار نہیں پھینکے گا لیکن اب۔۔۔'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''لیکن اب ام ذرا اور طریقے سے بھی سوچتا ہے شانی بہن! سب لوگ جنگ کے میدان کے اندر ہی تو نہیں مرتا ہے۔ بہت بڑا بڑا لوگ ایسا بھی گزرا ہے جنہوں نے لڑائی میں بہادری سے لڑتے ہوئے چوٹ کھایا۔۔۔۔۔ اور پھر اسی چوٹ کی وجہ سے کئی مہینے یا کئی سال بعد مرا۔ ان کا موت بھی تو بہادری کا موت ہی ہوتا ہے نا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو مگر ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو اجمل۔'' شانی نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ ''تمہاری ابھی بہت زندگی باقی ہے۔ ابھی تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ابھی رستم اور ناصر سے بات کرتی ہوں۔ ہم تمہارے علاج کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈتے ہیں۔''

ناصر دوائیں لے کر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس بھی تھا۔ وہ بڑی محبت اور توجہ سے اجمل کو دوا کھلانے میں مصروف ہو گیا۔

شام کا کھانا جلدی کھا لیا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی قریبی مسجد سے عشاء کی اذان ابھری۔ شانی نے آپو زاہدہ کو دیکھا، وہ اپنا چہرہ دوپٹے میں لپیٹے کوٹھی کی شمالی جانب جا رہی تھیں۔ شانی ان کے پیچھے چل دی۔ رہائشی حصے کے ساتھ منسلک ایک بڑا ہال نما کمرہ اور برآمدہ تھا۔ ایک طرح سے یہ رہائشی حصے کا ہی پورشن تھا۔ اس ہال کمرے کے دو دروازے کوٹھی کے اندر سے نکلتے تھے۔ ایک دروازہ باہر لان کی طرف تھا۔ یہ پورشن بھی باقی کوٹھی کی طرح قدیم طرز کا ہی تھا۔ اونچے محرابی دروازے تھے۔ تعمیر میں لکڑی کثرت سے استعمال کی گئی تھی۔ یہ نماز کی جگہ تھی۔ اسی دوران میں آپو زاہدہ نے بھی شانی کو دیکھ لیا۔

''نماز کے لیے کتنی پیاری جگہ بنائی ہے۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں۔۔۔۔۔ جہانگیر بتا رہا تھا کہ ہندوستان پاکستان بننے سے پہلے یہ کوٹھی یوپی کے کسی نواب صاحب کی تھی۔ نواب صاحب نماز روزے کے بڑے پابند تھے۔۔۔۔۔ وہ کئی سال پہیوں والی کرسی پر رہے مگر اسی حالت میں انہوں نے حج بھی کیا۔ بس جس کو اللہ توفیق دے۔''

آپو زاہدہ کے ساتھ شانی نے بھی مرمریں برآمدے میں نماز ادا کی۔ اس نے سکینہ کے لیے رو رو کر بخشش کی دعا کی اور اپنے حالات کے لیے بھی اللہ سے مدد مانگی۔

رات کو رستم اور شانی کے درمیان طویل بات چیت ہوئی۔ رستم کے ہاتھ شانی کے ہاتھوں میں تھے۔ اس کے سینے میں غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا مگر وہ خود کو حتی الامکان نارمل رکھے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کہہ دے گی رستم کو ماننا پڑے گا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ایک بہت بڑی بات کہے گی۔ یہ ایسی بات ہوگی جس کو ماننے کے لیے رستم کو برف اور آگ کے سات سمندروں پر سے گزرنا پڑے گا۔ اس بات کو مانتے مانتے وہ سینکڑوں بار جیے گا اور مرے گا۔

تو کیا وہ یہ بات کہہ دے۔۔۔۔۔ یہ حکم جاری کر دے۔ وہ جو ہر حکم پر سر اطاعت خم کرتا ہے، اسے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزار دے؟ وہ سوچ رہی تھی اور اپنے

اندر حوصلہ جمع کر رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں وہ مناسب ترین الفاظ جوڑ رہی تھی جو رستم کو کم تکلیف پہنچائیں۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی...... رستم! آپ ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں سے انتقام کا خیال دل سے نکال دیں۔ کم از کم وقتی طور پر نکال دیں۔ اس انتقام کو اپنی زندگی کے کسی اور حصے کے لیے چھوڑ دیں۔ چلیں آئیں، ہم...... موت اور بربادی کے اس گھیرے سے نکلنے کی ایک آخری کوشش کریں۔ اجمل خان کے ساتھ قبائلی علاقے کی کسی دور دراز بستی میں جا بسیں...... یا پھر کسی طرف سے پاکستان کی سرحد پار کر جائیں۔

گفتگو کے دوران میں اس نے کئی بار کوشش کی مگر یہ باتیں اس کی زبان پر نہیں آ سکیں۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اسے ڈر یہ تھا کہ اس کی بات مانتے مانتے رستم کا دل اس کے سینے کے اندر ہزار ہا ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ وہ ایک دوسرے سے عشق میں انسان کی اپنی کوئی مرضی و منشا رہتی ہی نہیں ہے۔ جب اپنی کوئی منشا ہی نہیں ہوتی تو پھر کوئی اختلافی بات کیسے کی جا سکتی ہے؟

بالآخر شانی نے گفتگو کا رخ اجمل کی طرف موڑ دیا۔ وہ بولی۔ "رستم! اجمل کی حالت نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ کیا ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟"

"جو زیادہ سے زیادہ کر سکتے ہیں، وہ تو ہو رہا ہے شانی۔ جہانگیر نے ایک بہت اچھے ڈاکٹر سرجن کا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ تقریباً ہر دوسرے روز اجمل کو دیکھنے آ رہا ہے۔"

"لیکن کیا وہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں...... یہ بہت خطرناک ہے۔ جہانگیر نے سارا پتا کرایا ہے۔ لاہور کے تقریباً سارے ہی بڑے ہسپتالوں اور پرائیویٹ کلینکوں پر پولیس کی گہری نظر ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ قدرت اللہ کے آستانے پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک حملہ آور شدید زخمی ہوا تھا۔ اب وہ اس زخمی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ آج صبح مجھے پتا چلا ہے کہ پولیس کے مخبروں نے قبرستانوں کے بھی بہت چکر لگائے ہیں۔ انہوں نے ڈولے کی قبر ڈھونڈ لی ہے۔ اس کی قبر کشائی کا پروگرام بن رہا ہے۔ وہ لوگ ڈولے کی قبر تک پہنچ گئے ہیں تو حاجی حیات کی کوٹھی تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شاید حاجی حیات ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہماری وجہ سے اس کی نوکری اور عزت بھی سخت خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

ڈولے کی قبر کشائی والی بات پر شانی سخت حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ دونوں کچھ دیر اس پر تبصرہ کرتے رہے پھر شانی نے پوچھا۔ "کیا حاجی صاحب کی کوٹھی سے ان کا کوئی کھوج مل سکتا ہے؟"

"کوٹھی کو تو اب تالا لگا ہوا ہے۔ ممکن ہے، حاجی نے وہاں سے ثبوت وغیرہ ختم کر دیئے ہوں...... پھر بھی خطرہ تو موجود ہے۔"

آخر میں شانی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اجمل خان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا؟"

"ابھی تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں کچھ تبدیلی آ جائے۔"

اگلے روز شانی نے ناصر کو بتایا۔ "ناصر! میں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا ہے۔"

"کیا؟"

"میں اب حویلی واپس نہیں جاؤں گی۔ میں اکتا گئی ہوں جھوٹ اور فریب کی اس زندگی سے...... مجھے وہاں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جائیداد، نہ شہرت، نہ سیاست...... میں نے اب جتنا بھی جینا ہے رستم کے ساتھ جیوں گی...... اور شاید...... مجھے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا بھابی! یہ آپ کی زندگی ہے۔ آپ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

"مجھے اگر رنگ والی سے کچھ چاہیے تو وہ مُنا ہے۔ اگر وہ کسی طرح یہاں آ سکے تو میرے لیے وہاں سب کچھ ختم ہے۔"

"جس قسم کے حالات جا رہے ہیں، ان میں فوری طور پر تو ممکن نہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ابھی آپ کا یہاں رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ درحقیقت ریاض کے ساتھ ہماری فیصلہ کن لڑائی چھڑ چکی ہے۔ وہ ہمیں معاف کر سکتا ہے، نہ ہم اسے کر سکتے ہیں۔ خاص طور سے دراج والے واقعے کے بعد تو اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں یہی تو چاہتی ہوں کہ وہ سب کچھ ٹل جائے جو ہونے والا ہے۔"

"اب یہ نہیں ہو سکے گا شانی بھابی! ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔"

"کیا رستم میری بات بھی نہیں مانیں گے؟"

ناصر ایک دم چونک کر شانی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ بالآخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر آپ کہیں تو شاید وہ مان جائیں لیکن میں آپ کو پورے یقین سے کہتا ہوں بھابی! ان کے سینے کا زخم ناسور بن جائے گا۔ وہ ان کو جینے نہیں دے گا۔ میں ان کے دل کی حالت بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ وڈے ڈیرے کے قتل عام کو بھول کر جئیں گے تو ہر گھڑی سولی پر لٹک کر گزاریں گے۔ یہ صورتِ حال آپ کو اور زیادہ

دیکھی کر دے گی۔"

"کیا نفرت، محبت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے ناصر؟"

"یہ نفرت نہیں ہے بھابی! یہ تو ایک قرض ہے جو ڈیرے کے مقتولوں نے جاتے جاتے ہمارے سروں پر رکھا ہے۔ اس قرض کو اتارے بغیر زندہ رہنا پڑا تو یہ ہمارے لیے موت سے بدتر ہوگا۔"

"زندگی کو موت سے بدتر نہ کہو ناصر! یہ ناشکری ہے۔ زندگی کیسی بھی ہو، زندگی ہی ہوتی ہے..... اور میں اس زندگی کے لیے ایک آخری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔"

"جو کچھ میری سمجھ میں آیا، میں نے بتا دیا ہے۔ اب آپ جو بھی مناسب سمجھیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے..... ڈپٹی ریاض کے گھیرے میں آنے سے پہلے پہلے ہم کسی طرح آزاد علاقے کی طرف نکل سکتے ہیں؟"

"حاجی حیات صاحب نے یہی بات رستم بھائی سے کہی تھی لیکن رستم بھائی بے حد طیش میں آ گئے تھے۔"

"حاجی حیات نے کیا کہا تھا۔"

"یہی کہ پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے لیکن وہ اب بھی کوشش کر کے ہمیں سرحدی علاقے میں پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں پہلوان اور جیرا بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"حاجی حیات سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"اگر آپ کہیں گی تو میں فون نمبر آپ کو دے دوں گا لیکن پہلے آپ اس بارے میں اچھی طرح سوچ لیں کہ رستم بھائی سے کس طرح بات کرنی ہے..... اور کرنی بھی ہے یا نہیں۔"

☆=======☆=======☆

ڈپٹی ریاض کی آنکھیں نشے کے سبب سوجی ہوئی تھیں۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔ وہ بس ایک مختصر نیکر میں تھا۔ بالوں بھرا جسم جنگلی ریچھ سے مشابہ تھا۔ اس کے سامنے اس کا زخمی بھتیجا طفیل تھا۔ وہ دونوں اس کوٹھی کے ایک کمرے میں موجود تھے جہاں دو دن پہلے نامعلوم افراد کی طرف سے ایک خوفناک حملہ ہوا تھا۔ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ریاض کی سالی اور تین کارندوں کو جان سے مار دیا گیا تھا۔ یہ معمولی واردات نہیں تھی۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا تھا۔ پورے علاقے کی پولیس حرکت میں آ گئی تھی اور قاتلوں

کو چپے چپے پر تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس سرتوڑ تلاش کے نتیجے میں کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی۔ ایک تھانے کے اہلکاروں نے اقبال ٹاؤن کے علاقے میں ایک پستہ شخص کی تازہ قبر کا سراغ لگایا تھا۔ اس بات کے خاصے شواہد تھے کہ یہ قبر رستم اور ناصر کے ساتھی کی ہے۔

جہاں تک کوٹھی پر حملہ آور ہونے والوں کا تعلق تھا ریاض کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ یہ رستم کے ساتھی ہیں۔ اس بات کے بھی کافی ثبوت موجود تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ ریاض نے سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور طفیل سے بولا "چل، تُو خود بات کر..... وہی مرغی کا بچہ اچھو لہوری ہے۔ اسے سمجھا دو ساری بات اس کی مادری زبان میں۔"

طفیل کراہتا ہوا اٹھا اور فون کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے فون اٹھایا اور ذرا رعب دار آواز میں بولا۔ "میں طفیل بول رہا ہوں۔"

"جی سر! میں آپ کا خادم اچھو۔ مجھے جناب عالی محترم ریاض صاحب نے ساری بات بتائی ہے۔ آپ حکم فرمائیں، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"دیکھو، میری بات دھیان سے سنو اچھو! یہ بات تو طے ہے کہ مجھے جس علاقے میں رکھا گیا، وہ گلبرگ کا تھا۔ گلبرگ نمبر ایک تھا یا دو..... اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو خاص بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ وہاں کہیں پاس ہی ایک جامع مسجد ہے۔ کوٹھی سے مسجد کا فاصلہ آدھ فرلانگ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اس مسجد میں مغرب اور عشاء کی اذان ایک لڑکا دیتا ہے۔ مشکل سے چودہ پندرہ سال کا ہوگا۔ تم تھوڑی سی کوشش کرو تو پتا چل سکتا ہے کہ یہ مسجد کون سی ہے۔ ایک بار مسجد کا پتا چل گیا تو پھر اس کوٹھی کا بھی پتا چل جائے گا جہاں وہ سارے حرامی اپنی ماں کی شادی پر ڈھولک بجانے کے لیے جمع ہیں۔"

"یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جی۔ میں ایک دو بھروسے کے بندے ساتھ لے لیتا ہوں اور ابھی چل پڑتا ہوں۔"

"ہمیں تمہارے چل پڑنے سے غرض نہیں ہے۔ رات دس بارہ بجے تک ہر صورت میں رپورٹ چاہیے..... اور یہی ڈپٹی صاحب کا بھی حکم ہے۔" طفیل گرجا۔

"آپ فکر ہی نہ کرو جی۔ میں بارہ بجے سے ڈھیر پہلے ہی آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا..... بلکہ اگر آپ کہیں تو اس کوٹھی کی ٹوہ شوہ بھی لگا میں؟"

ریاض مداخلت کرتے ہوئے پھنکارا۔ "کیا کہتا ہے یہ مرغی کا؟"

طفیل نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کہتا ہے کہ کوٹھی کی ٹوہ بھی لگاؤں؟"

ریاض نے بھڑک کر ریسیور طفیل کے ہاتھ سے لے لیا اور دہاڑا۔ "اوئے گندے

انڈے! تیری ماں کے ساتھ کچھ برا کیا تھا میں نے؟"

"جج جی ...... مم ... مم ... کوئی غلطی ہوئی جناب عالی!"

"جناب عالی کے بچے! تجھے کتنی بار کہا ہے کہ اپنا پیو خود نہ بنا کر۔ تجھے جتنا کہا ہے اتنا ہی کر۔ فالتو پنگا لیا نا تو تیری تشریف پر سے ساری چمڑی اتروا دوں گا۔ چل پھُٹ اب یہاں سے۔ بارہ بجے سے پہلے رپورٹ چاہیے اور بارہ بجے تک تُو نے ٹھرے کو ہاتھ بھی لگایا تو سمجھو آج میرے ہاتھوں گھنٹی بج گئی تیری۔"

ریاض کی آواز میں اتنا قہر تھا کہ مخبر اچھو لہوری ہکلا کر رہ گیا۔ ریاض نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور اچھو کا نمبر ری ڈائل کیا۔ "ہیلو۔" اچھو کی آواز آئی۔

ڈپٹی نرم لہجے میں بولا۔ "اور سن ...... اگر کام فٹ فاٹ ہو گیا نا تو پورا کریٹ وہسکی کا ملے گا اور یہ کریٹ میڈم ڈی کی سب سے چسکے دار ڈانسر اپنے سر پر اٹھا کر لائے گی تیرے مکان میں۔"

"ٹھٹھ ...... ٹھیک ہے جناب! ہم آپ کے خادم ...... آپ کے نوکروں کے نوکر۔ اوپر والے نے چاہا تو بارہ بجے سے پہلے پہلے ......"

ریاض نے فون بند کر دیا۔ اوپر کی منزل سے مدھم نسوانی آواز آئی۔ "ذرا سنیے۔" یہ ریاض کی بیوی تھی۔

ریاض نے برا سا منہ بنایا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اوپر کی منزل سے کوٹھی کی اطراف نظر آتی تھی۔ واردات کے بعد سے یہاں وردی والے اور سادہ لباس پولیس اہلکاروں کا کڑا پہرا تھا۔ ریاض کا چودہ پندرہ سالہ لڑکا ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر سو رہا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر نیل تھے۔ یہ نیل اس سنگین کھینچا تانی کا نتیجہ تھے جو اس لڑکے اور وراج کے نقاب پوش ساتھیوں کے درمیان ہوئی تھی۔

اس خیال سے کہ لڑکا جاگ جائے گا، ریاض اور اس کی بیوی فرزانہ ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ "ہاں، کیا اوازاری ہے تجھے۔" ریاض نے ٹانگیں کھجاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں ریاض! مرضی تو آپ نے اپنی ہی کرنی ہے لیکن ایک بات میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں ... " فرزانہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کی گردن پر بھی گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

ریاض پھنکارا۔ "مجھے پتا ہے تُو کیا کہنا چاہتی ہے۔ تُو کہنا چاہتی ہے دیکھیں جی! چھوٹی چوہدرانی جیسی تیسی بھی ہے، پر اس نے ہمارا بھلا کیا ہے۔ ہمارے بچے کی جان بچائی ہے۔ میری عزت کی رکھوالی بنی ہے ...... اس لیے میرے سرتاج ...... میں آپ پر صدقے واری، چھوٹی چوہدرانی کو اپنی بہن بنا لیں اور اس حرامی رستم کو بہنوئی تسلیم کر لیں۔ پھر ان دونوں کو اپنے خرچے پر ہنی مون کے لیے بھیج دیں نتھیا گلی میں ...... یہی کہنا چاہتی ہو نا؟"

"مم ...... میرا مطلب ہے کہ ......"

ریاض نے بڑے قہر سے اپنی بیوی کی چوٹی پکڑی اور دانت پیس کر بولا۔ "تم زنانیوں کی عقل یہاں ہوتی ہے اس گت میں ...... محکمہ ہی وکھرا ہے تم سب کا، محکمہ ہی وکھرا ہے۔" اس نے بیوی کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ وہ دہاڑا۔ "خبردار ...... ایک لفظ بھی نکالا زبان سے اس بارے میں تو ...... وہ بہت بڑی ففے کٹنی ہے۔ عاجزی مسکینی اس حرامزادی کے ہتھیار ہیں۔ اندر سے ایک نمبر کی کھوچل، بدمعاش عورت ہے۔ اپنی لولو پوپو باتوں سے تیری جیسیوں کو اُلو بناتی ہے اور اپنا مطلب نکالتی ہے ...... وہ دو چہروں والی ناگن ہے۔ اس ناگن کی زندہ کھال نہ اُتاروں گا تو مجھے اپنے پیو کا تخم کون کہے گا۔" ریاض کی آنکھوں میں نیلے شعلے رقصاں تھے۔

فرزانہ نے سسک کر کہا۔ "میں اس کی حمایت کہاں کر رہی ہوں۔ میں تو آپ کی خیر مانگ رہی ہوں۔ وہ رستم بالکل وحشی ہو رہا ہے۔ وہ بس آپ سے بدلہ لینا چاہ رہا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت خطرناک تھا۔ اب اپنی موت سامنے دیکھ کر اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔"

"چل پھر تُو ہی بتا میں کیا کروں ...... میری دلبر جانی! تُو جو کہے گی تیرا یہ نوکر خصم ویسا ہی کرے گا۔" ریاض کے لہجے سے زہر اُبلا پڑ رہا تھا۔

"مم ...... میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ ...... آپ اس کام میں سب سے آگے آگے نہ رہیں۔ یہ کوئی فرض واجب تو نہیں ہے کہ رستے کو آپ نے ہی مارنا ہے۔ اتنی پولیس پڑی ہے۔ اتنے افسر ہیں۔ دوسروں کو بھی تو اپنی نوکریاں حلال کرنے دیں۔"

"تیرے جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو ہیجڑا بناتی ہیں پھر ہیجڑے سے مُردہ بنا دیتی ہیں۔ یہ اپنا بھینس جیسا تھوبڑا لے کر دفع ہو جا یہاں سے۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جا۔" آخر میں ڈپٹی اتنے زور سے دہاڑا کہ دیواریں لرز گئیں۔ ڈپٹی کی بیوی فرزانہ تیزی سے دوسرے کمرے میں اوجھل ہو گئی۔

ڈپٹی ریاض سیڑھیوں کو اپنے پاؤں سے کوٹتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولی

ہوئی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک ملازم اس کے بھتیجے طفیل سے بات کر رہا ہے۔

''کیا کہتا ہے یہ؟'' ریاض نے پوچھا۔

''کہتا ہے کہ رنگ والی سے دو بندے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

''نام شام نہیں بتایا؟''

''نہیں جی۔ کہتے ہیں، بس یہ بتا دیں کہ رنگ والی حویلی سے آئے ہیں۔''

ڈپٹی ریاض نے انٹر کام پر بات کی۔ وہ چوہدری اعجاز کی آواز پہچان کر حیران رہ گیا۔ اس نے ملازم سے کہا۔ ''ان دونوں بندوں کے پاس اگر کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تو اسے اپنے پاس رکھ لو اور ان کی تلاشی لے کر اندر لے آؤ۔''

چند منٹ بعد چوہدری اعجاز اور اس کا چھوٹا بھائی شاداب عرف شابی ڈپٹی کے رُوبرو تھے۔ وہ دونوں رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح یہاں پہنچے تھے۔ گیٹ پر بھی انہوں نے اپنا نام وغیرہ نہیں بتایا تھا۔ شاداب کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں طفیل کی رہائی کے بارے میں جانتے تھے اس لیے طفیل کو دیکھ کر حیران نہیں ہوئے۔

''خیریت ہے چوہدری اعجاز! آج تم اپنی اچی پگڑی کے ساتھ اس کمین پولیس والے کی دہلیز کیسے پار کر آئے ہو؟''

''دیکھو ریاض! جو خود چل کر گھر آ جاتا ہے اس کے بارے میں اپنا دل صاف کر لیا جاتا ہے۔''

''میرا دل صاف ستھرا ہی رہتا ہے۔ تم اپنے دل میں جھاتی مار کر دیکھ لو۔''

''یہ میرا چھوٹا بھائی شاداب ہے۔ سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھی گوجرانوالہ میں اسی کی کوٹھی پر رکھے گئے تھے۔''

''اچھا اچھا...... پھر تو اس بندے کو خوش خلقی کے نمبر ملنے چاہئیں۔'' ریاض نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے شاداب کی طرف بڑھایا۔ اس سے حوصلہ پا کر چوہدری اعجاز نے بھی ڈپٹی سے مصافحہ کیا۔

ریاض بولا۔ ''پر چوہدری اعجاز...... اگر سوال ہی ٹھیک نہ کیا ہو تو پھر خوش خلقی وغیرہ بالکل بے کار ہوتی ہے۔ دراج اور اس کے چمچوں کو رستم تمہارے بھائی سے چھین کر لے گیا تھا۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''آپ جانتے ہی ہو ریاض۔ رستم کو روکنے کی کوشش میں شاداب کے چار بندوں کی جان گئی اور یہ خود بھی زخمی ہوا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھیک کام نہیں کرتا۔''

''لیکن کچھ شریف لوگ کہتے ہیں کہ سردار دراج کو چھوڑنے میں تمہاری اپنی مرضی بھی تھی۔ تم اپنی بھانجی شانی کے سامنے جھوٹا پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال چلو، ان باتوں کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں...... اب بتاؤ کیسے تشریف آوریاں ہوئی ہیں؟''

چوہدری نے سب سے پہلے تو ریاض کی سالی کی ناگہانی موت پر تعزیت کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ اصل قاتل جلد اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ریاض! وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے۔ کل کے دشمن آج کے دوست اور آج کے دوست کل کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ہمارے آپ کے درمیان بھی اختلاف وغیرہ رہے ہیں۔ اس اختلاف کی اصل وجہ یہی رستم تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کے لیے ہم نے اس بندے کو بہت برداشت کیا ہے لیکن اب سب کچھ برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ شانی بیٹی کی جمی جمائی زندگی کو خراب کرنے کے لیے رستم پھر یہاں آ دھمکا ہے۔ اس نے اوپر نیچے خطرناک کارروائیاں کی ہیں۔ آپ بھی جانتے ہو کہ درجنوں بندے مرے ہیں...... اب وہ ہمیں بھی لال آنکھیں دکھا رہا ہے۔''

''ہاں...... ہاں مجھے سب پتا ہے۔ وزیری گاؤں میں اس نے بڑی عزت افزائی کی تھی تمہاری...... سنا ہے چپیڑ شپیڑ مار دی تھی۔''

چوہدری اعجاز نے بلاتبصرہ بات جاری رکھی۔ ''اب میرا یہ بھائی اس خونی کے ہاتھوں بال بال بچا ہے۔ جو گولی اس کے بازو میں لگی ہے، سینے پر بھی لگ سکتی تھی۔ ہمارے چار بندے جان سے گئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی نقصان تو نہیں ہے۔''

''چوہدری! تم ذرا اپنی ہزار داستان کے صفحے چھیتی چھیتی پلٹ دو تو اچھا ہے۔ مجھے مین بات بتاؤ...... کیا کہنے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

چوہدری نے کھسیانے انداز میں گلا صاف کیا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ''ریاض پُتر! آج سے تم ہمیں دلی طور پر اپنے ساتھ ہی سمجھو۔ ہمیں رستم یا اس کے کسی ساتھی کے بارے میں کوئی بھی اطلاع ملی، میں ڈریکٹ تم کو خبر دوں گا۔ تم کو پتا ہی ہے، علاقے میں ہمارے اپنے مخبر بھی ہیں۔ ہمارے مخبر تمہارے مخبروں کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں جس طرح کے تعاون کی ضرورت ہو، ہم حاضر ہیں۔ پر اب اس بندے کو زیادہ دیر قانون کی پکڑ سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔''

''کس طرح کا تعاون کر سکتے ہو؟'' ریاض کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

''جس طرح کا بھی تم چاہو پُتر جی۔''

"تن من دھن، سب کچھ حاضر ہے ڈپٹی صاحب۔" شاداب نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"تن...... یہ تن اپنا حاضر ہے یا ان ماڈل کڑیوں کا جو تمہارے آلے دوالے رہتی ہیں؟" ریاض نے خشک انداز میں پوچھا۔

شاداب کے چہرے پر رنگ سا گزرا پھر وہ کھسیانے انداز میں ہنس دیا۔ "آپ تو خبروں کے بادشاہ ہیں جی۔ آپ سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔"

ریاض نے بے پروائی سے اپنی بالوں بھری رانوں پر ہاتھ پھیرا اور سگریٹ کا دھواں دونوں بھائیوں کی طرف چھوڑا۔ پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک لمبی ڈکار لی جس میں گوشت اور پیاز کی بُو تھی۔ اس کے بعد چوہدری اعجاز سے مخاطب ہوا۔ "اصل بات بتاؤ چوہدری...... اصل بات!"

چوہدری اعجاز کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ "میں سمجھا نہیں پُتر جی!"

"چھوٹی چوہدرانی کہاں ہے؟" ریاض نے اچانک سوال کیا۔

چوہدری اعجاز اور شاداب دونوں بدک گئے۔ "آپ کا مطلب ہے، شش شانی بٹی...... ؟ وہ تو حویلی میں ہے۔" چوہدری ہکلایا۔

"وہاں لسی رڑک کر مکھن نکال رہی ہو گی تم دونوں بھائیوں کے لیے...... اور ساتھ ساتھ گا رہی ہوگی...... خوشیاں دے نال، مینوں چڑھ گئے نیں حال...... کیوں، ایسا ہی ہے نا؟"

دونوں بھائی گنگ ہو گئے تھے۔ ریاض پھنکارا۔ "چوہدری! میں نے چھولے دے کر افسری نہیں لی ہے۔ تیرے جیسے چوہدریوں کے اندر سے ہو کر گزرا ہوں...... مجھے اصل بات بتا۔ مجھے پتا ہے کہ چھوٹی چوہدرانی اور اس کی لنگوٹن سہیلی حویلی میں نہیں ہیں۔ بتا...... کیا ہوا ہے ان کے ساتھ؟ وہ خود بھاگ گئی ہیں یا پھر وہ کنجر کا تخم رستما بھگا کر لے گیا ہے؟"

چوہدری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ شاداب بھی بنجر نظر آنے لگا۔

"یہ...... آپ...... کیا کہہ رہے ہو پُتر جی؟"

"کون پُتر؟ کس کا پُتر؟" تُو اپنی یہ ابا گیری اپنی بغل میں داب کے رکھ۔ میں راشی پولیس والا ہوں اور تُو حرام خور چوہدری ہے۔ بس یہ رشتہ کافی ہے ہم دونوں کے لیے...... چل، بول کدھر ہے وہ تیری لاٹری تین سو مربعوں والی...... اور ساتھ میں اس کی لنگوٹن سہیلی؟"

چوہدری گنگ تھا، شاداب کے ہونٹوں پر بھی مہر لگ گئی تھی۔ چوہدری کراہ کر بولا۔

"میں دراصل...... میں آپ کو اس بارے میں بتانا چاہ رہا تھا...... لیکن...... میرا مطلب ہے...... وہاں حویلی میں کچھ عجیب پوزیشن ہو گئی ہے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔"

"پریشانی تو ماں کے پیٹ میں شروع ہو جاتی ہے...... تُو میری بات کا جواب دے۔ نکی چوہدرانی شانی حویلی میں ہے کہ نہیں؟"

"نن...... نہیں ہے ریاض...... لیکن اگر اس بات کا پتا عام لوگوں کو لگ گیا تو بہت بدنامی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے، الیکشن بالکل پاس آ گئے ہیں۔ بہت ساری تیاریاں بھی ہو گئی ہیں۔ ایسے میں اگر...... آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

ریاض نے بے پروائی سے اپنی ننگی ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کا طویل کش لیا۔ "اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں چوہدری...... یا تو حویلی کے اندر سے کسی نے ان دونوں کڑیوں کو غائب کیا ہے یا پھر وہ اپنی مرضی سے اپنے یار کی طرف بھاگ گئی ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ بڑا تگڑا پولیس کیس ہے۔"

"لیکن ریاض پُتر...... میرا مطلب ہے ریاض باؤ! اس موقع پر ہم کسی صورت یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات باہر نکلے۔ چوہدری معصوم نے حویلی میں بھی یہی کہا ہے کہ شانی بٹی کچھ دنوں کے لیے لاہور گئی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ قریبی رشتے داروں کو بھی اصل بات کا پتا نہیں۔"

ریاض نے کہا۔ "چوہدری! ایسے راز بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے قیمت دینی پڑتی ہیں۔"

چوہدری اعجاز کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک آ گئی۔ "ریاض باؤ! میں نے تو شروع میں ہی کہا ہے، ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے حاضر ہیں۔"

"اگر وہ تیری بندے مار بھانجی فل فلیج بدنام ہو جائے اور الیکشن میں اپنا بچہ نہ تل سکے اور نہ تم لوگوں کا لچ تلا جائے تو کتنا نقصان ہو گا۔ کم از کم آٹھ دس کروڑ کو تو آگ لگ جائے گی نا...... بولو لگ جائے گی نا؟"

دونوں بھائیوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چوہدری اعجاز نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں جی ریاض باؤ...... بہت نقصان ہے۔"

"تو اس آٹھ دس کروڑ میں سے ساٹھ لاکھ کوئی بڑی رقم تو نہیں ہو گی؟"

"سس...... ساٹھ لاکھ؟" چوہدری کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"چل دو چار لاکھ کم کر لے...... مگر پچاس سے کم نہیں ہو گا۔ پچاس لاکھ میں تو آج کل

شہر میں مشکل سے فرنٹ کی ایک دکان آتی ہے اور پھر یہ صرف راز کو راز رکھنے کی قیمت نہیں ہے۔ اس رقم میں تمہارا دوسرا کام بھی تو ہو گا..... یعنی ایک خرید دو دوسرا مفت!''

''دوسرا کام؟'' چوہدری کی سوالیہ نظریں ریاض کے تمتماتے چہرے کی طرف اٹھیں۔

''اوئے! اس رستے کنجر سے بھی تو تمہارا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھڑانا ہے کہ نہیں؟''

چوہدری اعجاز نے سر ہلایا پھر مرے مرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ کافی بڑی رقم ہے۔''

''اوئے عقل کو ہتھ مار چوہدری ارستم سے تیرا پیچھا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے تیری بھانجی کو بھی برآمد کرنا اور یہ لوہے پر لکیر ہے کہ وہ بھوتنی وی ہوگی اس کے پاس ہی اور ان سارے کاموں کے لیے تجھ کو پچاس لاکھ زیادہ لگ رہا ہے؟ اگر زیادہ لگ رہا ہے تو پھر ٹھیک ہے..... سوچ لے..... میں بھی ذرا سوچ لیتا ہوں۔'' ریاض ایک دم جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

چوہدری نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں..... نہیں..... میرا مطلب ہے اتنی بڑی رقم..... اتنی جلدی..... دراصل..... وہ مگر..... آپ بیٹھو تو سہی۔''

ریاض اسے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔ ''دیکھ چوہدری! مجھ سے ہینگی پینگی نہ لگا۔ میں جانتا ہوں تُو کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ چل اگر زیادہ بات ہے تو آج کا دن لے لے۔ کل پہنچا دینا۔ کیش ہو تو اچھا ہے۔ چیک ہو تو کراس نہیں ہونا چاہیے۔ نام شام نہ لکھنا، میں خود بھر لوں گا۔''

''ایک منٹ..... ہم ذرا بات کر لیں۔'' چوہدری نے کہا اور کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ شاداب کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دونوں نے دو تین منٹ بات کی پھر واپس آ گئے۔

اس رشوت پیکیج کے سلسلے میں ریاض اور چوہدری کے درمیان چند منٹ مزید بات ہوئی۔ اعجاز اور شاداب کے چہروں سے ظاہر تھا کہ یہ رقم ان کی توقع سے کافی زیادہ ہے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح خود کو آمادہ کرنے میں کامیاب گئے تھے۔

سب کچھ طے ہو گیا۔ مختصر یہ کہ چوہدری اعجاز نے اگلی شام تک ریاض کو پچاس لاکھ پہنچانے تھے۔ کچھ دیر بعد دونوں بھائی لرزتے کانپتے رخصت ہو گئے تو ریاض نے ان پر غائبانہ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر میں بولا۔ ''حرامزادے..... سوکھی محبت کا چڑھاوا لے کر آئے تھے۔ پیدائشی کھوچل لوگ ہیں اور اس بڑے کمینے سے وہ چھوٹا کمینہ زیادہ کھوچل تھا۔ بہن خور گونگا بن کر بیٹھا ہوا تھا مگر اصل عقل اسی کی کام کر رہی تھی۔''

''لیکن یہ بڑا چوہدری بھی کچھ کم نہیں ہے چاچا جی۔ ڈھائی تین سال میں ہی حویلی کا کرتا

دھرتا بن بیٹھا ہے۔ چوہدری معصوم ایک کونے میں لگا ہوا ہے۔''

''اب یہ حرام خور اس سے بھی آگے کی سوچ رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے، چھوٹے بھائی کو نئی چوہدرانی کا خصم بنا دے۔ اس کے علاوہ اسے امید ہے کہ الیکشن کے بعد بھی دولت بارش کی طرح برسے گی اس کے گنجے کھوپڑے پر۔''

طفیل نے اپنے زخمی ہونٹوں سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن چچا! چوہدری اعجاز سے آپ کے وعدے کا کیا بنے گا؟''

''کیا مطلب؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے اس اخبار والے کو بتا دیا ہے سب کچھ۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم فون لگاؤ اس ٹھرکی ایڈیٹر کو۔''

طفیل نے ایک نمبر پریس کیا اور پھر ریسیور ریاض کی طرف بڑھا دیا۔ ''ہیلو! کون ہے؟'' ریاض نے کہا۔

دوسری طرف سے خوشامدی آواز ابھری۔ ''جی ڈپٹی صاحب! آپ کا خادم گلزار راہی عرض کر رہا ہوں۔ کوئی اور خبر ہے جناب؟''

''اوئے، خبروں کی بھوک تو تمہارے پیٹ میں ایسی وڑی ہوئی ہے کہ قیامت آنے کی اطلاع سے بھی کم نہیں ہو سکتی۔ اس وقت خبر دینی نہیں، واپس لینی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں ریاض صاحب؟''

''وہ جو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کی خبر ہے نا..... اس کو ابھی روکنا ہے۔''

''روکنا ہے؟'' گلزار راہی کے لہجے میں گہری مایوسی سرایت کر گئی۔

''اوئے، مرا کیوں جا رہا ہے گلزارے..... اس خبر کا جھنڈا تیرے ہی دفتر پر لگے گا۔ بس دو دن کے لیے چھری کے نیچے سانس لے۔ بلکہ بس پرسوں رات تک۔ پرسوں رات چھاپ دینا سب کچھ۔''

''لیکن.....''

''لیکن شیکن کچھ نہیں۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''بس کہہ دیا ہے نا۔ پرسوں رات تک دبا لے اپنی اس حاجت کو..... میرا ایک مسئلہ ہے۔''

''ٹھ..... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے کوئی اور بریک نہ کر دے۔''

''جب کسی کے پاس خبر ہی نہیں تو بریک اپنی ماں کا سر کرے گا۔ پتا نہیں کیسی باتیں کرتا

ہے تو۔''

''نہیں...... وہ تو...... میں نے بس...... پچ...... چلیں ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں، ویسے ہو جائے گا۔'' گلزار راہی ہکلایا۔

ریسیور کریڈل پر پہنچنے کے بعد ریاض کچھ دیر بڑبڑاتا رہا پھر اس نے مخبر اچھولہوری کی ماں بہن سے چند نازیبا رشتے جوڑنے کے بعد طفیل سے کہا کہ وہ لہوری کا نمبر لگائے......

دوسری تیسری کوشش میں طفیل نے اچھولہوری کا موبائل نمبر ملانے میں کامیابی حاصل کی۔

اچھولہوری سے رابطہ ہونے کے بعد ریاض نے اس پر دھاڑنا شروع کیا اور اس سے پوچھا کہ کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔ اچھولہوری نے بتایا کہ وہ اور اس کے تین ساتھی پوری تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ اب تک وہ علاقے کی چھوٹی بڑی تقریباً تیس مسجدیں دیکھ چکے ہیں۔ صرف ایک مسجد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا اذان دیتا تھا مگر وہ پچھلے دو مہینے سے اپنے آبائی علاقے ایبٹ آباد گیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مطلوبہ مسجد نہیں ہے۔ ریاض نے اچھولہوری کو کام کی رفتار بڑھانے کی ہدایت کی اور فون بند کر دیا۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں تین بڑے اہم کام ہوئے۔ سب سے پہلے تو دوسرے روز شام پانچ بجے تک رنگ والی کے چوہدریوں نے ریاض تک مطلوبہ رقم پہنچا دی۔ اس میں دو تین چیک بھی تھے۔

اگلے روز چیک کیش ہونے کے فوراً بعد ریاض نے ایڈیٹر گلزار راہی کو گرین سگنل دے دیا کہ وہ چھوٹی چوہدرانی کی خبر چھاپ سکتا ہے۔

اس رات تیسرا اہم ترین کام یہ ہوا کہ مخبر اچھولہوری گلبرگ کی مطلوبہ مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی فراہم کردہ اطلاعات بڑی ٹھوس تھیں۔ یہ اطلاعات طفیل کی ڈیمانڈ کے عین مطابق تھیں۔ مسجد میں مغرب اور عشاء کی اذان امام مسجد کا کم سن پوتا دیتا تھا۔ اس اطلاع کو سننے کے فوراً بعد ڈپٹی ریاض، طفیل اور تین سادہ پوش اہلکار پرائیویٹ گاڑی میں مطلوبہ علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سارے کام میں بے حد راز داری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ لہٰذا کسی فالتو آدمی کو ساتھ نہیں لیا گیا۔ جس گاڑی میں وہ لوگ روانہ ہوئے، اس کے شیشے کلرڈ تھے۔

سب سے پہلے ایک اندرونی سڑک پر واقع یہ مسجد لوکیٹ کی تھی۔ طفیل نے گاڑی مسجد کے سامنے رکوائی اور اس کا رخ شمال کی جانب رکھا۔ ''اب کیا کہتے ہو؟'' ریاض نے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اپنے شکار سے زیادہ دور نہیں۔'' طفیل کی آواز اندرونی جوش

سے لرز رہی تھی۔ ''یہ دیکھیے، دائیں طرف قطار میں دس بارہ کوٹھیاں ہیں۔ ان کے آگے ہی چوڑی گراؤنڈ ہے۔ پیچھے کی طرف مارکیٹ ہے اور کوئی رہائشی مکان نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارا کام اور آسان ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنے سیاہی مائل کپکپاتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''اس قطار کی پہلی تین چار کوٹھیاں تو ہم ویسے ہی چھوڑ سکتے ہیں کیونکہ اذان کی آواز مجھے کچھ فاصلے سے سنائی دیتی تھی۔ باقی کوٹھیوں کو ہم دیکھ لیتے ہیں۔''

''باقی کوٹھیوں میں سے کوئی خاص پہچان؟''

''ایک تو وہ کوٹھی دو منزلہ ہے۔ دوسرا...... میرے اندازے کے مطابق اس کا مین گیٹ لکڑی کا ہے۔''

''او کے!'' ریاض نے کہا اور ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے سڑک کا ایک چکر لگایا۔ سات آٹھ کوٹھیوں میں سے صرف دو کے مین گیٹ لکڑی کے تھے اور لکڑی کے گیٹس والی ان کوٹھیوں میں سے صرف ایک کوٹھی ڈبل اسٹوری تھی۔ وہ اپنی منزل سے قریب تر پہنچتے جا رہے تھے۔ پرانی تعمیر والی اس دو منزلہ کوٹھی کی زیادہ تر کھڑکیاں تاریک دکھائی دیتی تھیں۔

انہوں نے گاڑی اس کوٹھی کے سامنے تاریکی میں روک دی۔ ان کے دائیں جانب وہ وسیع گراؤنڈ تھا جس میں کہیں کہیں پتھر کی بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ گراؤنڈ میں کہیں کہیں بارش کا پانی کھڑا تھا اور وہ خالی پڑا تھا۔ اچانک دوسری منزل کی ایک بالکونی روشن ہوئی۔ ایک شخص تیزی سے چلتا ہوا بالکونی میں سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ اس دوسرے شخص کو دیکھتے ہی ڈپٹی ریاض کی دھڑکن نقارے کی طرح گونجنے لگی۔ اس کے لہو میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ فاصلہ کافی تھا پھر بھی وہ پہچان گیا۔ اسے نوے فیصد امید تھی کہ یہ دوسرا شخص رستم کا ساتھی ڈاکٹر ناصر ہے۔

اس نے وائرلیس سیٹ آن کیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس کا رابطہ ہیڈ کوارٹر میں ہو گیا۔ اس نے شاہ زمان نامی کسی ساتھی کو مخاطب کیا اور بلا تمہید کہا۔ ''مبارک ہو...... کوٹھی ٹریس ہو گئی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، فورس کے ساتھ مین مارکیٹ پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

رابطہ منقطع کرنے کے بعد ڈپٹی ریاض نے جلدی جلدی تین چار جگہ وائرلیس اور موبائل سے رابطہ کیا۔ اس نے ہر جگہ، چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کوٹھی ٹریس ہونے کی

اطلاع دی اور نفری طلب کی۔ کوٹھی کے مکین اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ کس طوفان میں گھرنے والے ہیں۔

☆=======☆=======☆

کوٹھی کے اندر رستم کے سامنے چائے کا کپ پڑا تھا اور وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ رنگ والی کی خبر شام کے اخبار میں ہی چھپ گئی تھی۔ سرخی تھی۔ ''انتخابی مہم موجود...... امیدوار غائب!'' ذیلی سرخیاں یوں تھیں۔ ''رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی رُوپوش یا اغوا؟ لواحقین صورتِ حال کو پوشیدہ رکھنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف۔''

خبر کے متن میں تفصیل درج تھی۔ اس واقعے کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا گیا تھا۔ شانی اور رستم کے تعلق کو بھی ایک بار پھر پورے زور و شور سے اچھالا گیا تھا۔ ان دونوں پر کئی گفتنی ناگفتنی الزام لگائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کی پرانی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ یہ اخبار ایک ملازم ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے لے کر آیا تھا۔ سب سے پہلے یہ رستم کے ہاتھ میں ہی آیا۔ اسے سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اسے اخبار چھپا لینا چاہیے۔ وہ شانی کو مزید دکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اخبار چھپا لیا لیکن اخبار چھپانے سے خبر تو نہیں چھپ جاتی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ناصر نے ایک نیوز چینل پر یہ خبر دیکھی اور اس بارے میں رستم کو بتایا۔ یہ بات اب طے تھی کہ رنگ والی میں شانی کی غیر موجودگی اب کہیں بھی راز نہیں رہے گی۔ اس خبر سے شانی کے ان ہزاروں خیر خواہوں اور مداحوں کو بھی شدید صدمہ پہنچنا تھا جو ہر جگہ اس کے حق میں نعرے لگاتے تھے اور اس کے گن گاتے پھر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی نگاہیں شانی کو عنقریب ایک بہت اونچے مقام پر دیکھ رہی تھیں۔

رنگ والی کی خبر میں ایک نئی اطلاع بھی تھی۔ شانی نے بتایا تھا کہ اس کی عزیز سہیلی سکینہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر اس خبر کے مطابق وہ بھی ابھی تک لاپتا تھی۔ وہ رنگ والی واپس نہیں پہنچی تھی۔ رستم سوچنے لگا کہ حالات کس طرح انسان کا ہانکا کرتے ہیں۔ وہ سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ پھر رستم سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سکینہ ختم ہو چکی ہو اور شانی نے یہ خبر اس لیے چھپا لی ہو۔ شانی کے عجیب و غریب مزاج کو سمجھنا رستم کے بس سے بھی باہر تھا۔ اکثر اس کی باتیں سمجھ سے بالاتر ہوتی تھیں۔ اب یہ بات کل شانی نے رستم کو خود ہی بتائی تھی کہ طفیل کو چھوڑے جانے سے پہلے وہ ریاض سے چھوٹ کر یہاں پہنچ چکی تھی مگر اس نے ناصر اور جہانگیر کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طفیل کی رہائی رک

جائے۔ یوں لگتا تھا کہ شانی برے سے برے اور اچھے سے اچھے شخص کے بارے میں ایک ہی مہربان طریقے سے سوچتی ہے۔

بستر پر جانے کے بجائے رستم چھت پر چلا گیا اور دیر تک بے چین پھرتا رہا۔ اجمل کی حالت بھی سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ آج پھر اسے تیز بخار تھا اور شدید درد کا سامنا بھی تھا۔ وہ تکلیف سے ہار ماننے والا شخص نہیں تھا لیکن مسلسل سختیاں پہاڑوں کو بھی مسمار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ آپو زاہدہ آج اجمل کی حالت دیکھ کر بہت آزردہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر رستم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان سارے چکروں کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں اجمل کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور وہاں اس کا علاج کراتے ہیں۔ اس کی سادہ دل بہن نہیں جانتی تھی کہ ان سب کو حالات نے کس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ ہسپتال تو رہے دور کی بات، اب تو قبروں میں بھی ان کا پیچھا کیا جا رہا تھا ...... یہ لڑائی اب اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والی تھی۔ اس لڑائی کا انجام جو بھی ہوتا مگر رستم کو ہر صورت ڈپٹی ریاض کا بوجھ دھرتی پر سے کم کرنا تھا۔ اگر وہ یہ بوجھ چھوڑ کر مر بھی جاتا تو چین نہ پا سکتا۔ اس کی روح روزِ محشر تک بھٹکتی رہتی۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ یہ ڈر بہت پہلے اس کے دل سے نکل چکا تھا لیکن وہ دو باتیں ضرور چاہتا تھا۔ ایک تو اس کے ساتھی اس آگ میں راکھ ہونے سے بچ جائیں۔ دوسرے مرنے سے پہلے وہ ریاض کو آخری سانس اور آخری ہچکی لیتے ہوئے دیکھ لے۔ بس ......اس کے سوا......اس کے سوا اسے کچھ درکار نہیں تھا۔

اچانک اس کی عقابی نگاہوں کو کچھ دکھائی دیا۔ ایک قریبی کوٹھی کی چھت پر دو متحرک سائے نمودار ہوئے اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ رستم ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ چھت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اسے نیچے سڑک پر دو گاڑیاں مشکوک انداز میں کھڑی دکھائی دیں۔ گاڑیوں کی لائٹس آف تھیں مگر وہ گاڑیاں خالی نہیں تھیں۔ ان کے اندر لوگ موجود تھے۔ یکایک رستم کی رگوں کی گردش تیز ہو گئی۔ ارد گرد کچھ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ موجود تھے۔

ایک سوال خوفناک چنگھاڑ کی طرح اس کے سینے میں ابھرا...... تو کیا کچھ لوگ ان کے بارے میں جان چکے تھے؟ پھر فوراً اس نے ایک اور بات محسوس کی۔ آس پاس کی دو تین کوٹھیاں خلافِ معمول تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ زینے پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ آپو زاہدہ نماز کے لیے مصلے پر تھیں۔ سرمد ان کے قریب قالین پر اوندھا لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ زری کچن میں آڑھی ترچھی روٹیاں پکا رہی تھی اور ان

کی شکلیں دیکھ دیکھ کر خود ہی مسکرا رہی تھی۔ ناصر، اجمل کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اجمل پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ رستم نے اشارے سے اسے باہر بلایا۔ ''خیریت ہے رستم بھائی؟''

''مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔ اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔ شاید کچھ بندے ہیں۔''

ناصر کی آنکھوں میں بھی گہری تشویش ابھر آئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کمر ٹٹول کر وہاں پستول کی موجودگی کا یقین کیا۔ رستم نے پوچھا۔ ''ٹیلی اسکوپ کہاں ہے؟''

''میں ابھی لایا۔'' ناصر بولا اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ٹیلی اسکوپ سمیت چھت کے ایک محفوظ حصے میں موجود تھے۔ یہ وہی ٹیلی اسکوپ تھی جو اجمل وغیرہ کے ٹو کے نواح میں استعمال کرتے رہے تھے۔ پہلے ناصر نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔''

رستم نے اس سے ٹیلی اسکوپ لے کر اپنی آنکھوں سے لگائی...... وہ ششدر رہ گیا۔ وہ چھت کے اس حصے سے جتنا کچھ بھی دیکھ سکتے تھے، وہ تہلکہ خیز تھا۔ قریبی چھتوں اور سڑک کے ساتھ ساتھ درختوں میں متحرک سائے موجود تھے۔ یقیناً یہ پولیس کے لوگ تھے۔ وہ گھیرے میں آ چکے تھے۔

''ناصر! سردار کو بلاؤ۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔

ناصر نیچے گیا اور چند سیکنڈ بعد سردار کو لے کر آ گیا۔ ''ہمیں گھیر لیا گیا ہے سردار! آس پاس کی چھتوں پر لوگ موجود ہیں۔ اپنے بندوں کو چوکس کر دو۔ دو چار کو چھت پر بھیجو۔ باقی کو نیچے لگا دو۔''

''پر...... یہ ہوا کیسے؟''

''ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ یہ نہ ہو، ہم پر ایک دم چڑھائی ہو جائے...... جلدی کرو۔''

سردار کے نتھنے پھول گئے۔ آنکھوں میں سرخی لپک آئی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد زینوں کی طرف سے شانی کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''رستم...... رستم!''

رستم اپنا ماؤزر قمیص کے نیچے چھپاتا ہوا زینوں پر پہنچا۔ شانی چند زینے نیچے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے رستم! آپ سب پریشان ہیں۔ کچھ گڑبڑ ہے؟''

'نہیں۔ بس شک سا ہے، ابھی پتا چل جائے گا۔ آپ لوگ اندر کے کمروں میں رہیں۔''

''کیا...... پولیس؟'' شانی نے رستم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

رستم کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ اسی دوران میں ناصر نے چھت پر سے رستم کو پکارا۔ رستم اوپر آیا۔ شانی تیزی سے نیچے چلی گئی۔

''رستم بھائی! یہ بڑا سخت گھیرا ہے۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے پوزیشنیں لی ہوئی ہیں۔ دیکھیں...... نیچے دو گاڑیاں اور آ گئی ہیں۔''

رستم نے دیکھا، دو مزید گاڑیاں گراسی میدان کے قریب آ کر رک گئی تھیں۔ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب پولیس والوں کی پوزیشن اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ انہیں اپنا آپ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔

پہلے سے موجود گاڑیوں میں سے دو سائے نکل کر نئی آنے والی گاڑیوں کی طرف لپکے بس ان کی ایک جھلک ہی نظر آئی۔ ناصر کی آنکھوں پر دوربین تھی اس لیے وہ بہتر طور پر دیکھ سکا۔ ان میں سے ڈپٹی کے سانولے سلونے بھتیجے طفیل کو اس نے صاف پہچان لیا۔

رستم نے پوچھا۔ ''وہ حرامی ریاض تو دکھائی نہیں دیا؟''

''نہیں بھائی! ابھی نہیں...... مگر بھتیجے صاحب نظر آئے ہیں۔''

''کون؟ طفیل؟''

''جی ہاں۔'' ناصر نے طویل سانس لی۔ ''اور مجھے لگتا ہے کہ پولیس اسی کی مدد سے یہاں تک پہنچ سکی ہے۔ شاید اس بدبخت نے اپنے حافظے کے زور پر یہاں تک کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

اچانک یکے بعد دیگرے اردگرد کی چھتوں پر قریباً نصف درجن سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان ساری لائٹس کی روشنی اس پرانی طرز کی دو منزلہ کوٹھی پر ہی پڑ رہی تھی۔ خاص طور سے کوٹھی کی ایک سائیڈ اور سامنے والا حصہ روشنی میں نہا گئے تھے۔ رستم اور ناصر تاریک گوشوں میں چلے گئے۔

طاقتور میگا فون پر ایک کریہہ آواز ابھری۔ اس آواز کو رستم اور ناصر ہزار ہا آوازوں میں پہچان سکتے تھے۔ یہ اس فرعون صفت شخص کی آواز تھی جس نے عیاری اور سفاکی میں نام پیدا کیا تھا...... اور جو اپنے اردگرد موجود انسانوں کو حقیر کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا اور یہی وہ شخص تھا جس نے پوٹھوہار کی گھاٹیوں میں بھی بے رحم خوں ریزی کی تاریخ رقم

کی تھی۔ یہ ڈپٹی ریاض کی آواز تھی۔ وہ ہولناک فقرہ جوایسے موقعوں پر اکثر کہا جاتا ہے، ڈپٹی ریاض کی آواز نے اس فقرے کو مزید قہرناک بنا دیا تھا۔ ''رستم! تم اور تمہارے ساتھی پوری طرح گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ...... ورنہ مارے جاؤ گے۔''

یہ اعلان قریباً 300 فٹ کی دوری سے دو مرتبہ دہرایا گیا۔ اس دوران میں پولیس کی موبائل گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھتوں پر لگی ہوئی نیلی ریوالونگ لائٹس بھی اپنی چمک دکھاتی رہیں۔ یوں لگتا تھا کہ بڑی خاموشی کے ساتھ اردگرد کی کوٹھیوں میں اور مارکیٹ کی چھتوں پر پوزیشن لینے کے بعد اب اردگرد کے علاقے کو بھی گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔ بہت سے گھروں کے مکینوں کو تو غالباً گھروں کے اندر ہی محفوظ کمروں میں پہنچا دیا گیا تھا، تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے گھر چھوڑ کر ٹولیوں کی شکل میں پیچھے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ رستم اور ناصر نگاہِ تصور سے دیکھ سکتے تھے کہ درجنوں طاقتور رائفلوں کا رخ اس کوٹھی کی جانب ہے۔

سردار دراج اپنے ساتھیوں کو مختلف پوزیشنوں پر لگانے کے بعد ہانپا ہوا رستم کے پاس پہنچا۔ ''رستم! آپاں نے بندوں کو بالکل ٹھکانے پر بٹھا دیا ہے۔ دو جنے (بندے) اوپر پانی والی بڑی ٹینکی کے اندر ہیں۔ ان کو تو بنا بنایا مورچا مل گیا ہے۔ ایک جنے کو وہ سامنے کھبے کنارے پر لگا دیا ہے۔ اس کے پاس رپی پیٹر ہے۔ دوسرا یہ تھم (ستون) کے پیچھے کھڑا ہے۔ باقی نیچے ہیں۔ نیلی چھتری والے نے چاہا تو ان میں سے ایک بندہ بھی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں۔ آکھری گولی اور آکھری ساہ تک لڑ کر دکھائے گا۔''

''ٹھیک ہے دراج! تم بھی نیچے ہی رہو۔ کلاشنکوف کا کتنا خرچہ پانی ہے تمہارے پاس؟''

''تین چار سو گولیاں تو جرور ہوں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اپنے بندوں سے بھی کہہ دو کہ فائرنگ کی نوبت آئی تو بچت کے ساتھ گولی چلانی ہے۔ جن کے پاس آٹومیٹک ہیں، وہ اپنی رائفلوں کو سنگل پر سیٹ کر لیں...... برسٹ خاص ضرورت کے وقت ہی چلایا جائے۔''

''تم ایک دم بے فکر رہو رستم! آپاں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی یہ باتیں بول دی ہیں۔''

اتنے میں جہانگیر سیڑھیوں کی طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور

آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ نیند اور نشے کی ملی جلی سرخی تھی۔ وہ آج جلدی سو گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ غالباً وہ اس صورتِ حال سے ابھی ابھی باخبر ہوا تھا۔

''رستم! یہ کیا ہو گیا ہے یار..... اس کی تو بالکل امید نہیں تھی۔'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

''بس دیکھ لو...... جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔''

''یار! کہیں اس ڈاکٹر طارق نے تو.....''

''نہیں نہیں۔'' ناصر نے یقین سے سر ہلایا۔ ''یہ دوسرا چکر ہے۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے؟'' جہانگیر نے کہا پھر چند سیکنڈ بعد پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''کہیں وہ حرامی طفیل تو جج منٹ نہیں کر گیا؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' رستم بولا۔

یہی وقت تھا جب پولیس کی طرف سے دوسرا اعلان کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی سماعت کو چکنا چُور کرنے والی زہریلی آواز ڈپٹی ریاض ہنٹر کی ہی تھی۔ ''اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔ تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تم لوگ خود کو ہمارے حوالے کر دیتے ہو تو تمہارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اس بات کی گارنٹی ہم پریس والوں کی موجودگی میں دے رہے ہیں۔ میں اپنا اعلان پھر دہرا رہا ہوں۔''

اس کے بعد ریاض نے غالباً لکھا ہوا اعلان ایک بار پھر دہرایا۔ اسی دوران میں درجنوں پولیس اہلکار اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتے ہوئے کچھ مزید قریب آ گئے تھے۔ انہوں نے گاڑیوں کے عقب میں اور گراسی میدان کے تناور درختوں کے پیچھے پوزیشنیں لے لی تھیں۔ تارکول کی سڑک پران کے بوٹوں کی گونج سناٹے میں بار بار ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

رستم نے جہانگیر سے کہا۔ ''جہانگیر! تم اپنی گن لے لو اور عورتوں کے پاس چلے جاؤ۔ ان کی حفاظت اور حوصلہ تسلی تمہاری ذمے داری ہے۔''

''یار، ہو سکتا ہے ابھی پیچھے مارکیٹ کی طرف گھیرا زیادہ سخت نہ ہوا ہو۔ کیوں نہ فائرنگ کرتے ہوئے نکلنے کی کوشش کریں۔''

رستم اور ناصر نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جہانگیر! تم نے پیچھے دیکھا نہیں۔ وہاں چھتوں پر اس سے زیادہ نفری ہے۔'' رستم نے کہا۔

میگا فون پر ایک بار پھر اعلان گونجا۔ ڈپٹی ریاض نے کہا۔ ''رستم سیال، اجمل خان،

دراج مہتم اور ناصر...... ہم تمہیں دس منٹ کی مہلت دے رہے ہیں۔ ہتھیار ڈال کر اور دونوں ہاتھ اٹھا کر، ایک ایک کر کے اوپر والی گیلری میں آ جاؤ۔ تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی... میں پھر کہتا ہوں تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی۔ اگر تم باہر نہیں آتے ہو تو ٹھیک دس منٹ بعد ہم فائر کھول دیں گے۔"

اگلے دس منٹ میں رستم اور اس کے ساتھیوں نے خود کو ذہنی طور پر آنے والے حالات کے لیے تیار کر لیا۔ دوسری طرف پولیس فورس نے بھی مورچا بندی کر لی۔ ٹھیک دس منٹ بعد بغیر کسی مزید وارننگ کے فائرنگ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے خودکار رائفل سے ایک طویل برسٹ چلا جس نے بالکونی کے پیچھے ساری کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور کر دیئے۔ پھر اوپر تلے کئی چھوٹے برسٹ چلے اور سناٹا تڑتڑ کی لرزہ خیز آوازوں سے تھرا اٹھا۔ رستم کے ساتھیوں نے بھی اس حملے کا بھرپور جواب دیا اور ہر طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے لپکتے نظر آئے۔

یہ فائرنگ قریباً تین منٹ تک جاری رہی۔ پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ یقیناً پولیس فورس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر لڑائی کا سامان موجود ہے اور لڑنے والے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

قریباً تین چار منٹ تک جاری رہنے والی اس فائرنگ میں دراج کا ایک ساتھی زخمی ہوا۔ اس کے گھٹنے میں گولی لگی۔ اس کے علاوہ کوئی اور نقصان نہیں پہنچا۔ رستم اور اس کے ساتھیوں کی فائرنگ سے بھی یقیناً کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا ہوگا۔ بہرحال، تین سرچ لائٹس کا تاریک ہونا تو ثابت تھا۔

فائرنگ کے وقفے کے دوران میں مسلح پولیس اہلکار تیزی سے اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتے نظر آئے۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور اکثر نے حفاظتی جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ وہ اسپیشل فورس کے لوگ تھے۔ رستم جانتا تھا کہ یہ لوگ عمارتوں کے اندر گھسنے اور کمانڈو ایکشن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کا گھیرا اتنا مکمل تھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

زینوں پر ایک بار پھر شانی کی آواز سنائی دی۔ رستم ایک چوڑے ستون کی اوٹ سے نکلا اور تیزی سے زینوں میں داخل ہو گیا۔ زینوں پر گولیوں کے بہت سے خول بکھرے تھے اور ہر طرف بارود کی بو پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔

شانی نے کراہ کر کہا۔ "رستم! آخر وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ دائیں طرف سے اور پیچھے سے وہ بالکل پاس آ گئے ہیں۔"

"شانی! آپ نے تو دوسروں کو حوصلہ دینا ہے۔ آپ خود پریشان ہوں گی تو پھر کیا بنے

گا۔ باقی آپ ان کے قریب آنے سے پریشان نہ ہوں۔ ہم ان کے لیے حلوہ نہیں ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی کہ وہ اس کوٹھی کے قریب پھٹک بھی نہیں سکیں گے۔ ابھی تو ہم نے انہیں کچھ دکھایا ہی نہیں ہے۔"

"مگر اس کا اینڈ کیا ہوگا رستم؟ ہم کب تک انہیں روک سکیں گے؟"

"جب تک دم ہے۔" رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

نیچے کمرے سے اجمل کے بری طرح کھانسنے کی آواز آنے لگی۔ بارود کی بو اور دھواں اس پر اثر کرنے لگا تھا۔ سرمد کے رونے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً اس صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اچانک ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ پہل پولیس کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کوٹھی کے اندر سے بھی جواب دیا جانے لگا۔ کوٹھی کے شیشے چکنا چور ہونے لگے۔ لکڑی کے پرخچے اُڑنے لگے۔ پورچ میں کھڑی کسی گاڑی کے دو ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے...... سردار دراج کا ایک ساتھی گردن میں گولی کھا کر زینوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اس کے دو ساتھی اسے گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئے۔ شانی اور رستم زینوں میں ہی کھڑے تھے۔ وہ نیچے بیٹھ گئے اور دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ شانی کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت رستم کے بازو پر قائم تھی۔ بارود کی بُو بڑھتی جا رہی تھی۔ اجمل کی کھانسی، بارود کی بُو اور دھماکوں کی آواز...... سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔

فائرنگ کا یہ دوسرا دورانیہ کم و بیش پانچ منٹ کا تھا۔ دوطرفہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ کوٹھی کی اکثر لائٹس بھی چکنا چور ہو گئی تھیں۔ بس دو چار کمرے ہی روشن نظر آ رہے تھے۔ اجمل کی کھانسی اب ذرا رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔ شاید اس کی سانس اٹک رہی تھی۔ رستم اور شانی تیزی سے زینے اترتے ہوئے اجمل کی طرف بڑھے۔ زینوں کے نچلے سرے پر جہانگیر موجود تھا۔ اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔ یہ گولی اس کے بائیں بازو کو چھیدتی ہوئی گزری تھی۔ خون بہہ رہا تھا تاہم جہانگیر کا مورال بلند تھا۔ رستم نے دیکھا کہ وہ خود ہی اپنے بازو پر پٹی باندھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈرائنگ روم میں آپو زاہدہ، سرمد کو اپنے بازوؤں میں چھپائے ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی بیشتر کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے تھے۔ رستم اور شانی اجمل کے کمرے میں پہنچے۔ ناصر نے اسے آکسیجن لگا دی تھی۔ اجمل کا چہرہ ہوا کی کمی کے سبب نیلگوں ہو رہا تھا۔ اگر کچھ دیر بعد پولیس فورس کی طرف سے یہاں ٹیئر گیس پھینکی جاتی یا اس قسم کا کوئی اور حربہ استعمال ہوتا تو اجمل کی سانسوں کا بحال رہنا

مشکل تھا۔اسی اثنا میں پھر میگا فون پر ہتھیار پھینک کر باہر آنے کی ترغیب دی جانے لگی۔اس مرتبہ آواز ڈپٹی ریاض کی نہیں تھی۔ یہ مجسٹریٹ تھا۔شانی نے رستم کا بازو تھاما اور اجمل کے کمرے سے باہر لے آئی۔ ”رستم! کہیں یہاں پھر وڈے ڈیرے والی کہانی نہ دہرائی جائے۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں شانی؟“

”میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی...... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میں جو کہوں گی آپ مان لیں گے اور اگر میری رائے غلط ہوئی تو میں ذمے دار ٹھہروں گی۔ میں تو...... میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ خود دیکھیں اور فیصلہ کریں۔“

”آپ کا مطلب ہے گرفتاری؟“

”نہیں رستم! میری کوئی رائے نہیں۔ بس آپ، ناصر اور سردار خود سوچیں۔“

رستم نے کہا۔”ضروری نہیں کہ ہم گرفتاری دیں اور وہ ہمیں گرفتار ہی کریں...... وڈے ڈیرے پر ہتھیار پھینکنے والوں کو بھی چھلنی کر دیا گیا تھا۔“

”مگر یہاں حالات وہ نہیں رستم! وہ تو ویرانہ تھا۔ یہاں پولیس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن میں ایک بار پھر کہوں گی، آخری فیصلہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے کرنا ہے۔“ شانی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

جہانگیر کے بازو سے خون کا اخراج بہت تیز تھا۔ وہ ابھی تک پٹی باندھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔شانی اس کی مدد کرنے کے لیے اس کی طرف لپک گئی۔

رستم کو اکیلا دیکھ کر دراج تیزی سے اس کے پاس آیا۔ اس کا سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں شعلے رقصاں تھا۔”رستم! نکڑی کیا کہہ رہی تھی؟“

”کچھ نہیں۔“

”رستم! وہ نکڑی ہے، چھوٹی ہے۔ اس کی چھاتی میں بڑا نرم دل ہے۔ پر جو بات آپاں مرد سمجھ رہے ہیں، وہ نکڑی نہیں سمجھ سکتی۔ آپاں اس وقت بغیر کسی شرط کے باہر نکلیں گے تو وہ آپاں کو بھون ڈالیں گے۔ کسی جنانی، بچے کا لحاظ بھی نہیں کریں گے۔ اگر آپاں نے گرفتاری دینی بھی ہے تو ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔“

ناصر بھی اجمل کو آکسیجن لگا کر وہاں پہنچ گیا۔ محاصرے کی صورتِ حال نے اسے بھی ایک دم افسردہ کر دیا تھا۔ اس نے بھی دراج کی بات کی تائید کی۔ وہ بولا۔”اگر ہم اگلے دس بارہ گھنٹے بھی پولیس کو روک لیں تو پھر پچویشن بدل جائے گی۔ ذمے دار لوگ یہاں پہنچیں گے

اور تب گرفتاری دینے یا نہ دینے کی بات بھی کی جا سکے گی۔“

ایک بار پھر دونوں طرف سے اکا دکا فائر ہونے لگے۔ رات کی تیرگی میں گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں اور فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ دراج نے جن دو رائفل برداروں کو اوپر پانی کی ٹنکی میں چھپایا تھا، وہ بڑی موثر فائرنگ کر رہے تھے۔ان کی فائرنگ کے سبب پولیس بے حد محتاط رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

رستم اور ناصر ایک بار پھر چھت پر آ گئے۔ ناصر دبے لہجے میں بولا۔”رستم بھائی! شاید دراج ٹھیک ہی کہتا ہے۔شانی بھابی کے سینے میں بہت ہی مہربان اور نرم دل ہے۔ کئی دفعہ وہ اپنی رَو میں انوکھا فیصلہ کر جاتی ہیں۔اب اس دن والی بات ہی لیں۔ وہ یہاں پہنچ چکی تھیں مگر انہوں نے یہ بات ہمیں آپ کو بتانے سے روک دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ طفیل ہماری گرفت میں رہے۔اپنے طور پر تو انہوں نے طفیل کی بھلائی کی...... لیکن اب یہی طفیل ہمارے لیے مصیبت بن کر آ گیا ہے۔“

رستم نے اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ طفیل کی رہائی کا دکھ تو اسے بھی تھا مگر اپنی بی بی کے کسی فیصلے پر وہ مخالفانہ انداز میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسنیپر کی ایک گولی ان سے چار پانچ فٹ کی دوری سے سنسناتی ہوئی گزری اور گیلری کی چھت سے لگے قیمتی فانوس کا ایک حصہ کرچیوں میں بدل گیا۔ فائرنگ میں ایک بار پھر شدت آتی جا رہی تھی۔ گاہے بگاہے رستم اور ناصر بھی اس فائرنگ میں حصہ لینے لگے۔ ناصر کے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی جبکہ رستم کے پاس سائیلنسر لگا ہوا ماؤزر تھا۔

کچھ دیر بعد جہانگیر بھی ان کے پاس آن بیٹھا۔اس کے بازو کی بینڈیج ہو چکی تھی...... اپنے درد سے دھیان ہٹانے کے لیے اس نے تین چار پیگ وسکی کے چڑھا لیے تھے۔ اب وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

”میرا دل کہتا ہے رستم...... یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہے۔“ جہانگیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

”یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ رستم نے پوچھا۔

”بس ایک پرانی بات یاد آ رہی ہے۔ یہ کوٹھی میرے دوست ملک تنویر کی ہے...... تمہیں بتایا ہے نا، وہ آج کل دبئی میں ہے۔تنویر سے پہلے اس کوٹھی کا مالک فلم ساز، ہدایت کار سرتاج مبارک تھا۔سرتاج آج کل تو بیماری اور بڑھاپے کے گھیرے میں ہے مگر اٹھارہ بیس سال پہلے اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔سرتاج کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ہر فلم میں ایک نئی

اداکارہ ضرور لیتا تھا۔ اس دور کی زیادہ تر ہیروئنیں سرتاج کی ہی بنائی ہوئی تھیں۔ مگر یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ وہ ہر نئی ہیروئن سے قیمت ضرور وصول کرتا تھا۔ فلم کی کاغذی کارروائیوں کے دوران میں ہی وہ ہیروئن سرتاج کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی تھی۔''

''ہاں، یہ بات تو تم نے پہلے بھی بتائی تھی۔'' رستم نے کہا۔

''لیکن ایک بات شاید نہیں بتائی ہوگی۔ یہ بات کسی وجہ سے اخباروں میں بھی نہیں آ سکی تھی۔ ہاں، خاص خاص لوگوں کو پتا ہے۔ مجھے تنویر نے ہی بتایا تھا کہ ایک بار سرتاج ایک نئی لڑکی کو اس کوٹھی میں ہیروئن بنا رہا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کے بھائی اسحاق بٹ اور شوکت بٹ وغیرہ کئی درجن مسلح ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچ گئے تھے۔ سرتاج مبارک اپنی ہیروئن کا اسکرین ٹیسٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ لڑکی اور سرتاج کے کپڑے بھی ایک کمرے میں پڑے رہ گئے تھے۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ کسی اندرونی راستے سے فرار ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہاں کوئی ایسا راستہ موجود ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''دو سال پہلے میں یہاں تنویر کے ساتھ دس پندرہ دن رہا تھا۔ یہاں دو تین تہہ خانے بھی ہیں۔ ہم کافی ویران تہہ خانوں میں گھومتے رہے تھے۔ اس وقت تو کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ ایک پرانے ملازم نے بھی یہی کہا تھا کہ یہاں کوئی چور راستہ نہیں ہے مگر...... میرا مطلب ہے اگر وہ نئی ہیروئن والا واقعہ صحیح ہے تو پھر سرتاج اور وہ ہیروئن کسی نہ کسی طرح تو بھاگے ہوں گے نا...... اور مجھے یقین ہے کہ وہ واقعہ ہے بالکل صحیح۔''

ناصر بے زاری سے بولا۔ ''جہانگیر! اگر کوٹھی کے نئے مالک کو تین چار سال یہاں رہنے کے بعد بھی کسی ایسے راستے کا پتا نہیں چل سکا تو ہمیں کیسے چل جائے گا؟ کئی دفعہ ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی حقیقت نہیں ہوتی۔''

''نہیں ناصر! میرے ذہن میں ایک اور بات ہے۔ مجھے شک سا ہو رہا ہے۔''

''کیسا شک؟''

''نہیں، پہلے مجھے تصدیق کرنے دو پھر بتاؤں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

اس دوران میں کوٹھی ایک دم تاریکی میں ڈوب گئی۔ لائٹس کے ساتھ ساتھ پنکھے اور ایئر کنڈیشنز بھی بند ہو گئے۔ غالباً باہر سے کوٹھی کی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔

''یہ خطرناک ہے۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ چارج کریں۔''

وہ سب اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف لپک گئے۔ بہرحال، رستم وغیرہ کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ تاریکی کی آڑ میں کوئی زوردار ہلا بولا جائے گا۔ اکا دکا فائر دونوں طرف سے

ہوتے رہے۔ کبھی کبھی برسٹ بھی چلتا رہا۔ ہاں، یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ پولیس اپنا گھیرا سخت تر کرتی جا رہی ہے۔ وہ ایک ایک چپے پر موجود تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی کے فرار کے لیے ایک انچ جگہ بھی خالی نہ چھوڑی جائے۔

محاصرے کی طویل رات گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہو گیا۔ دن جو تازگی اور امنگ ترنگ کی علامت ہوتا ہے لیکن یہ دن بارود کی بو، خون کے چھینٹے اور موت کے سائے لے کر آیا تھا۔ دور دور تک پولیس اور انتظامیہ کی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھی کی طرف آنے والے راستوں کو خاردار باڑیں لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اردگرد کے مکانات میں کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔

کوٹھی کی حالت بھی ابتر تھی۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں، گولیوں کے خول اور لکڑی کے پرخچے بکھرے ہوئے تھے۔ گردن میں گولی لگنے والا مہتم علی الصباح دم توڑ گیا تھا۔ جہانگیر کے علاوہ دو اور مہتم بھی زخمی ہوئے تھے۔ کوٹھی کی برقی رو منقطع کر دی گئی تھی اور دونوں فون بھی کاٹ دیئے گئے تھے۔ لہٰذا باہر کی کوئی خبر ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ٹی وی پر بھی کچھ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

دوپہر سے ذرا قبل رستم کے موبائل فون پر باہر سے رابطہ کیا گیا۔ یہ رابطہ انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کیا۔ اس نے بالکل یک طرفہ بات کی۔ اس نے رستم سے کہا کہ وہ اور اس کے ساتھی مکمل طور پر پولیس کے گھیرے میں ہیں۔ اگر وہ مزاحمت جاری رکھیں گے تو فوری موت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ بہتر ہے کہ وہ اپنے ساتھ موجود عورتوں اور بچوں پر رحم کریں اور خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔

رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ایسا ہی قانونی سلوک ہمارے ساتھ وڈے ڈیرے پر ہو چکا ہے۔ ہم ہتھیار پھینکنے سے لڑتے ہوئے مر جانا بہتر سمجھتے ہیں۔''

''تمہارے بہت سے ساتھیوں کی رائے یہ نہیں ہوگی۔ وہ زندہ رہنا چاہتے ہوں گے۔ تم اپنے ساتھ انہیں بھی لے ڈوبو گے۔''

''ہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے تمہاری دی ہوئی زندگی سے موت پیاری نہ ہو۔''

رستم نے فون بند کر دیا۔ ایک دو منٹ کے وقفے سے پھر بیل ہونے لگی۔ اس مرتبہ ناصر نے کال ریسیو کی۔ وہی عہدے دار پھر لائن پر تھا۔ اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''دیکھو، فون بند نہ کرنا۔ ہم تمہیں درمیانی راستے کی طرف لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ تمہیں

مارنا اتنا مشکل نہیں۔"

"کوئی نئی بات ہے تو بتاؤ۔ ہم یہ سب کچھ پہلے بھی سن چکے ہیں۔" ناصر نے رکھائی سے کہا۔

"جناب سرفراز قزلباش صاحب تم سے خود بات کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ راستے میں ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک پہنچ جائیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے، ان کو پہنچنے دو۔"

"فون بند نہ کرنا۔ تم اتنی دیر رنگ والی کے چوہدری معصوم صاحب سے بات کرو۔ وہ یہاں موجود ہیں۔

رستم کے اشارے پر ناصر نے فون بند کر دیا۔

رستم، ناصر اور جہانگیر اس صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ کوٹھی کا محاصرہ کرنے والوں کو یقین تھا کہ شانی اندر موجود ہے۔ وہ شانی کی جان بچانا چاہتے تھے ورنہ اس پوری عمارت کو تہس نہس کرنے میں بھی انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

ان سب نے کل دوپہر سے کھانا کھایا ہوا تھا۔ اب چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ شانی اور زاہدہ نے کھانا تیار کیا۔ دراج اور اس کے ساتھیوں کو ان کی پوزیشنوں پر کھانا پہنچایا گیا۔ باقی افراد نے بھی اس ترتیب کے ساتھ کھانا کھایا کہ کوئی اہم پوزیشن تادیر خالی نہ رہے۔

زری ایک دم مغموم نظر آنے لگی تھی۔ وہ ہر پل ناصر کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش کی وجہ سے اسے کئی بار ناصر سے ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑی۔ آخری ڈانٹ کے بعد وہ باقاعدہ رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

جہانگیر نے اسے پچکارا تو وہ اور زور سے رونے لگی۔ "میں بہت بُرا۔ میں کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ مجھ کو اپنا گھر بہت یاد آتا۔ میں واپس جانا چاہتا...... چچا کے پاس جانا چاہتا۔"

ناصر جل کر بولا۔ "ہاں بھئی لے جاؤ اسے۔ نیچے سے رکشہ پکڑو اور اسے بس اڈے پر پہنچا دو۔ وہاں سے یہ مانسہرہ والی بس پکڑ لے گی۔"

وہ اور زور سے رونے لگی۔ "تم کیا سمجھتا۔ میں جا نہیں سکتا۔ تم کو چھوڑ نہیں سکتا ہوں؟"

وہ ایک دم اٹھی اور واپس مڑی۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے جھکنا تھا مگر وہ سیدھی چلی گئی۔ سامنے گراسی میدان کی طرف سے دو فائر ہوئے۔ کھڑکی کا بچا کھچا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ زری پٹ سے اوندھے منہ گری۔ ناصر رائفل پھینک کر چلاتا ہوا اس کی طرف

لپکا۔ "زری...... زری!" اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے چمٹا لیا۔ وہ بھی اس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بال بال بچی تھی۔ ناصر نے کئی بار اس کی پیشانی چومی، اسے گود میں اٹھایا اور زینے طے کر کے نیچے لے گیا۔ وہ دونوں آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر سب جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر دو پل بھی رہ نہیں سکتے۔

دونوں طرف سے اکا دکا فائر ہوتے رہے۔ پانچ دس منٹ بعد رستم کے موبائل پر باہر سے دوبارہ رابطہ کیا گیا۔ اس مرتبہ فون پر اہم سیاسی رہنما سرفراز قزلباش تھے۔ سرفراز قزلباش اور رستم کے درمیان جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

سرفراز قزلباش نے کہا۔ "رستم! بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔ تم لوگوں کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"یہ بات ہم پہلے بھی ایک سو ایک دفعہ سن چکے ہیں۔ کیا آپ یہی کہنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟"

"دیکھو، میں تمہیں ایک آفر دیتا ہوں۔ تم اندر موجود عورتوں اور بچے کو باہر بھیج دو۔ اس کے بدلے ہم تمہیں سوچ بچار کے لیے چھ گھنٹے کی مہلت دیتے ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے کچھ لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے لیے دوائیں وغیرہ بھی میں بھجوا دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ......"

"آپ کی اس پیشکش کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اندر موجود عورتوں اور بچے کو یہاں زبردستی نہیں روکا گیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ آخری دم تک ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو انہیں باہر نہیں بھیج سکتے۔"

"تو پھر...... شانی بی بی کو بھیج دو۔" سرفراز قزلباش نے اصل بات کہی۔

"وہ بھی کسی صورت آنا نہیں چاہتیں۔"

"کیا تم ان سے میری بات کرا سکتے ہو؟"

"وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔"

"اپنے گھر والوں سے بھی نہیں۔"

"نہیں!"

"تم چاہتے کیا ہو رستم؟"

"جو ہم چاہتے ہیں، وہ آپ کر نہیں سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ پولیس کا گھیرا ختم کرا دیں اور اس حرامی ریاض ہٹلر کے گلے میں پٹا ڈال کر اسے یہاں سے واپس لے جائیں۔"

"رستم! یہ سراسر تباہی کا راستہ ہے۔ تمہیں شاید اپنی جان کی پرواہ نہ ہو لیکن تمہیں ان لوگوں کی پرواہ کرنی چاہیے جن کی جانیں بچ سکتی ہیں..... جنہیں انصاف مل سکتا ہے۔ کیا تم پھر وڈے ڈیرے والی کہانی دہرانا چاہتے ہو؟"

"جب تک بے انصافی رہے گی۔ وڈا ڈیرا رہے گا اور وڈے ڈیرے کی کہانیاں بھی رہیں گی۔"

رستم اور سرفراز قزلباش کے درمیان آٹھ دس منٹ بات ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں سرفراز قزلباش نے یہ بھی کہا کہ وہ اندر آ کر بات کرنا چاہتے ہیں لیکن رستم اور ناصر جانتے تھے کہ وہ اس تجویز میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اندر آنے کا رسک کوئی معمولی رسک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پیچھے ریاض کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔

سرفراز قزلباش کے واپس جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ کوٹھی پر تین طرف سے فائر کھولا گیا۔ یہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ کچن کی طرف جانے والی گیس لائن کو بھی نقصان پہنچا اور کچن میں دھماکے سے آگ بھڑک اٹھی۔ کچھ دیر کے لیے کوٹھی میں افراتفری نظر آئی۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پولیس کمانڈوز ساتھ والی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے وہاں محفوظ جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اس ملحقہ چھت پر رسائی حاصل ہونے کے بعد پولیس کی فائرنگ سے براہ راست اندرونی کمرے متاثر ہونے لگے۔ دراج کے تین ساتھی کچن کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ آٹھ ایم ایم کی گولی اس کا سینہ پھاڑ کر نکل گئی تھی۔

رستم خطرے کو بالائے طاق رکھ کر دوڑتا ہوا پانی والی ٹنکی تک پہنچ گیا اور ان دو مہتموں کے ساتھ شریک ہو گیا جو کل سے بھوکے پیاسے مزاحمت کر رہے تھے۔ رستم کے آنے سے ان دو افراد کو نہ صرف زبردست سہارا ملا بلکہ کھانے پینے کی اشیا بھی دستیاب ہوئیں۔ اس ٹنکی پر سے ہونے والی لگاتار اور مؤثر فائرنگ نے پولیس اہلکاروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ورنہ کچھ دیر کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ساتھ والی چھت پر آنے کے بعد پولیس کوٹھی کے اندر بھی پہنچ جائے گی۔

دراج کے ساتھیوں نے جہانگیر کے ساتھ مل کر بڑی دلیری سے کچن کی آگ پر قابو پایا... گیس کا کاک بند کرنے کی کوشش میں جو مہتم ہلاک ہوا تھا، اس کی لاش اندرونی کمرے میں دوسری لاش کے پاس پہنچا دی گئی۔ یہ زوردار فائرنگ تقریباً آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔

یوں لگتا تھا کہ یہ بے رحم فائرنگ ریاض کے طیش کا نتیجہ ہے اور یہ طیش بات چیت کی ناکامی سے پیدا ہوا ہے۔

اس فائرنگ کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک خاموشی رہی۔ ایسے لگتا تھا کہ محاصرہ کرنے والے حکمت عملی طے کر رہے ہیں۔ تھکے ہوئے پولیس اہلکاروں کی جگہ تازہ دم سپاہیوں کی آمد بھی ہو رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتے ہی ایک بار پھر فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں اکا دکا فائر ہوتے رہے۔ پھر بتدریج دونوں طرف سے فائرنگ میں شدت آ گئی۔ کوٹھی گہری تاریکی اور حبس کے گھیرے میں تھی۔ چاروں طرف سنسناتے شعلے رقص کر رہے تھے۔ اجمل اپنے بستر پر تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر درد نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ رستم اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ رائفل رستم کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ وہ نیم دراز اجمل کو اپنے ہاتھ سے گندم کا دلیہ کھلا رہا تھا۔ چند چمچ لینے کے بعد اجمل نے بے ذائقہ دلیے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ رستم نے تھوڑے سے اصرار کے بعد پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ اجمل نے کہا۔ "رستم بھائی! کاش اس وقت ام بھی آپ کے ساتھ لڑائی میں شریک ہو سکتا۔ ام کو بستر پر مرنا بالکل پسند نہیں۔"

"اور مجھے تمہارا کہیں بھی مرنا پسند نہیں۔ تم زندہ رہو گے اجمل! ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔"

"آپ ام کو جینے کا دعا نہ دے۔ اگر یہ دعا دیتا ہے تو پھر ساتھ میں آپ اپنا زندگی بھی مانگے۔ آپ امارے دل کی بات پوچھتا ہے رستم بھائی تو آپ امارا ہیرو ہے۔ ام نے آپ کو دیکھ کر جینا سیکھا۔ آپ کو دیکھ کر امارے دل میں یہ امید پیدا ہوا کہ ام اپنے سب سے بڑے دشمن سے بدلہ لے سکتا ہے...... اور یہ امید پورا ہوا۔ شاہی اور قدرت اللہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ام خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور یہ سب کچھ آپ کی مدد سے ہوا ہے۔ اس لیے ام کہتا ہے کہ آپ امارا ہیرو ہے۔"

"اور تم کیا ہو؟ کریکٹر ایکٹر!"

"ہاں جی...... ام کو کریکٹر ایکٹر ہی سمجھو اور آپ کو پتا ہو گا پلم (فلم) کے اینڈ میں اکثر کریکٹر ایکٹر مر جاتا ہے جبکہ ہیرو زندہ رہتا ہے۔"

"لیکن کبھی کبھی الٹ بھی تو ہوتا ہے۔" رستم نے کہا۔ اجمل کراہ کر رہ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی قوت برداشت اور خوش دلی بیماری کے ریلے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

چند گھنٹے کے وقفے کے بعد رات بارہ بجے ایک بار پھر تیز فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ آنسو گیس بھی استعمال کی گئی۔ مگر تیز ہوا اور ناموافق رخ کی وجہ سے یہ گیس زیادہ مؤثر

ثابت نہیں ہوئی۔ رستم، ناصر اور وراج چھت پر موجود تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے گیلے کپڑوں میں لپیٹ لیے اور زور دار مزاحمت جاری رکھی۔ ساتھ والی چھت پر پولیس والوں نے اپنی پوزیشنیں مضبوط کر لی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔
اس جانب سے وہ اتنے نزدیک تھے کہ ان کی پکارتی ہوئی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔
ان میں ریاض کے بھتیجے طفیل کی آواز پہچانی جاتی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے چلا کر اپنے رائفل مینوں کو مختلف ہدایات دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے میگا فون پر خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیں۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ طیش کے سبب اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہا ہے۔ رستم وغیرہ کی اطلاعات کے مطابق وہ آج کل بدعنوانی کی وجہ سے معطل تھا...... اب پتا نہیں کہ وہ کس حیثیت سے اس اِن کاؤنٹر میں حصہ لے رہا تھا۔

رات آخری پہر رستم اور اس کے ساتھیوں کو ایک شدید نقصان پہنچا۔ پولیس کے کمانڈوز نے طاقتور گن سے پانی کی ٹنکی پر کئی طویل برسٹ چلائے۔ اس اندھا دھند فائرنگ سے ٹنکی کی ایک دیوار مسمار ہو گئی اور اندر بیٹھے دونوں مہتم بھی ہلاک ہو گئے۔ یہ مورچا اب تک رستم اور اس کے ساتھیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد خطرہ پیدا ہوا کہ رستم اور اس کے ساتھیوں کو چھت خالی کر کے نیچے جانا پڑے گا مگر پھر رستم اور ناصر نے فوراً چھت کی برساتی میں ایک اور مضبوط پوزیشن بنا لی اور مزاحمت جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

دن کا اجالا پھیلتے ہی فائرنگ رک گئی۔ رستم اور اس کے ساتھی ایک اور رات پولیس کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ اجالا ہونے کے بعد نقصانات کا جائزہ لیا گیا۔
کوٹھی کی حالت خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ دو تین جگہ سے پانی لیک کرنے لگا تھا۔ کچن مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا اور گیس بند تھی۔ مرنے والے دونوں مہتموں کی لاشیں اوپر مسمار شدہ ٹنکی میں ہی پڑی تھیں۔ انہیں وہاں سے نکالنا فی الحال ممکن نہیں تھا۔
رستم اور ناصر کوٹھی کے مختلف حصوں کا جائزہ لیتے ہوئے بالائی منزل کے ایک نیم تاریک کمرے میں پہنچے تو ششدر رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک دیوار کے ساتھ اجمل خان کی لاش پڑی تھی ...... وہ مر چکا تھا۔ اس کے سینے پر دو جگہ خون کا پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ فرش پر تھا اور اس نے بڑے آرام وہ انداز میں دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔
''اجمل ...اجمل!'' رستم نے بے ساختہ اسے پکارا اور نیچے بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر

ناصر کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد سردار وداج اور جہانگیر بھی وہاں پہنچ گئے۔
وہ سب حیرت زدہ تھے۔ اجمل خان کے پاس ہی ٹیلی اسکوپ والی دور مار رائفل (اسنیپر) پڑی تھی۔ اردگرد کم و بیش پچاس خول بکھرے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شب کی تاریکی میں کئی گھنٹے یہاں رہا ہے اور فائر کرتا رہا ہے۔
''خان تو بستر سے ہل نہیں سکتا تھا...... یہ کیسے پہنچ گیا یہاں؟'' جہانگیر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''نہ صرف پہنچا ہے بلکہ دو تین گھنٹے گولیاں بھی چلائی ہیں۔'' ناصر کا لہجہ اشک بار تھا۔
موقع کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اجمل خان نے گزر جانے والی رات کو بڑے اہتمام کے ساتھ گزارا ہے اور شاید انجوائے کیا ہے۔ اس کے قریب درد روکنے والی گولیوں کی ایک شیشی خالی پڑی تھی۔ ناصر کے اندازے کے مطابق اس میں سات آٹھ گولیاں موجود تھیں۔ اجمل نے یہ ساری گولیاں ایک ساتھ کھا کر اپنے شدید درد پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے الماری میں سے اسنیپر اور اس کے راؤنڈ لائے تھے۔ قریبی کمرے کے ریفریجریٹر سے اس نے سیخ کبابوں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ لی تھی۔ اس کو اوون میں گرم کیا تھا...... اور اس کمرے میں پہنچ گیا تھا...... پلیٹ اب بھی موقع پر ہی موجود تھی، اس میں ایک دو کباب بچے تھے۔ قریب ہی نسوار کی خالی ڈبیا بھی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کوک کی ایک لیٹر بوتل تھی۔ یہ بھی تین چوتھائی خالی تھی۔ اجمل نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے اسے سخت پرہیز بتایا گیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دو تین گھنٹوں کو اس نے مکمل طور پر اپنی مرضی سے گزارا تھا۔ وہ اپنے اردگرد یہ ساری چیزیں سجا کر بڑے اطمینان سے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور اسنیپر استعمال کرتا رہا تھا۔ خون آلود گن اب بھی کسی محبوب شے کی طرح اس کی گود میں موجود تھی......

رستم نے اجمل کے خون آلود جسم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ ''کہتا تھا کہ میں بستر پر مرنا نہیں چاہتا...... اور مجھے پتا تھا، یہ ہٹ کا بڑا پکا ہے۔''
رستم، اجمل کی لاش کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر نیچے لایا اور اسی بستر پر لٹا دیا جہاں کل شام اس سے آخری باتیں کی تھیں۔ اجمل کا چہرہ بیماری زدہ ضرور تھا مگر اس پر گہرا اطمینان تھا۔
''میرا بھائی!'' شانی نے چلا کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔
زاہدہ اور زری بھی رونے لگیں۔ رستم اپنے خون آلود ہاتھ سے اجمل کے سر کے ریشمی

بالوں کو سہلاتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سختی تھی۔

دوپہر کے وقت باہر سے ایک بار پھر موبائل پر رابطہ کیا گیا۔ یہ کال رستم کے موبائل پر آئی تھی۔ دوسری طرف انتظامیہ کا ایک اہم عہدے دار تھا۔ اس نے وہی باتیں دہرائیں جو اس سے پہلے بھی کی جا چکی تھیں بلکہ اب ان باتوں کا لب و لہجہ زیادہ سخت تھا...... رستم سے کہا گیا کہ اس کے پاس ہتھیار پھینکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں...... اور اب اس کام کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں رہا۔ وہ اور اس کے ساتھی جلد از جلد فیصلہ کر لیں۔

رستم نے کہا۔ ''ہم اپنے ان ساتھیوں کی لاشیں اٹھانا چاہتے ہیں جن کو اوپر ٹنکی میں گولیاں لگی ہیں۔''

''جب تم اپنی طرف سے کوئی نرمی نہیں دکھا رہے تو ہم سے یہ امید کیوں رکھتے ہو؟'' عہدے دار نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''کیا نرمی چاہتے ہو؟''

''چھوٹی چوہدرانی کے لواحقین پرسوں رات سے یہاں موجود ہیں۔ چوہدرانی کے تایا اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... تم ہمیں لاشیں اٹھانے دو۔ میں بات کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد طے ہو گیا۔ دراج اور اس کے تین ساتھی جہانگیر کے ساتھ اوپر چھت پر گئے اور مسمار شدہ ٹنکی میں سے دونوں ہمتوں کی لاشیں نکال لائے۔

کچھ دیر بعد رستم کے موبائل پر دوبارہ کال آئی۔ اس مرتبہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ شانی کے تایا معصوم تھے۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ اور ہراس تھا۔ وہ بولے۔ ''رستم! تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟ تم اسے باہر کیوں نہیں آنے دیتے؟''

''وہ خود باہر آنا نہیں چاہتیں اور اس کی وجہ آپ خود اس سے پوچھیں۔ بلکہ بہتر ہے کہ چوہدری اعجاز سے پوچھیں۔ یہ بندہ آستین کا سانپ ہے۔ یہ آپ سمیت سب کو دھوکا دے رہا ہے۔''

''میں تم سے کسی طرح کی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ تم بس ایک بار میری بات شانی بیٹی سے کرا دو۔''

شانی پاس ہی تھی۔ رستم نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا اور اشارے سے کہا کہ وہ تایا سے کچھ بولے۔ ''ہیلو تایا جی!'' شانی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''شانی! تم کیسی ہو؟ تت...... تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے بہ مشکل کہا۔

''رستم کہتا ہے کہ تم باہر آنا نہیں چاہتیں۔ مجھے پتا ہے، وہ جھوٹ بک رہا ہے۔ وہ کیوں کر رہا ہے ایسا...... کیوں کر رہا ہے؟'' شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ بول نہیں پا رہی۔ ''شانی! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ میری بات کا جواب دو نا۔''

شانی پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے۔ تایا معصوم نے اسے بار بار بولنے کے لیے کہا لیکن وہ خاموش رہی۔ آخر میں اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ''خدا حافظ تایا جی'' کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔ ٹنکی والی پوزیشن ختم ہونے کے بعد محاصرہ کرنے والوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اب عقب سے بھی قریب آ گئے تھے۔ بہرحال وہ اب بھی کوٹھی کی حدود میں داخل ہونے سے احتیاط برت رہے تھے۔ رستم کے خیال میں اس احتیاط کی ایک وجہ ان کا یہ اندیشہ تھا کہ رستم اور اس کے ساتھیوں کے پاس مہلک "M67" دستی بم موجود ہیں اور ان کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا۔ قدرت اللہ کے ڈیرے پر تباہی مچانے والے "M67" ہینڈ گرینیڈز میں سے چار اب بھی کوٹھی میں موجود تھے۔

جہانگیر کافی دیر سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم اسے دیکھنے کے لیے نیچے گیا تو شانی سے ملاقات ہو گئی۔ شانی نے اسے چھوٹا سا ٹی وی سیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ ایک الماری سے ملا ہے۔ بیٹری سیلز سے بھی چلتا ہے۔'' شانی نے ٹی وی سیٹ آن کر کے دکھایا۔

وہ پچھلے 36 گھنٹے سے باہر کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ ناصر نے ٹی وی سے کیبل وائر منسلک کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک نیوز چینل دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ چینل پر اس طویل پولیس مقابلے کی خبر وقفے وقفے سے چل رہی تھی۔ چینل کے مقامی رپورٹر نے علاقے کے کچھ مکینوں کے مختصر تاثرات نشر کیے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ دو راتوں سے چین سے سو نہیں سکے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سرچ لائٹس کی چکراتی ہوئی روشنیاں اور آنسو گیس کی شیلنگ سب کچھ ان کا جینا دوبھر کر رہا ہے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ اس آپریشن کو جلد از جلد مکمل کیا جائے۔

اردگرد کی کوٹھیوں سے جو لوگ نقل مکانی کر کے گئے تھے، وہ بھی جلد از جلد اپنے گھروں میں واپس آنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گنتی کے چند قانون شکن افراد کی وجہ سے علاقے کے مکینوں کو مشکلات کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ان تاثرات کے بعد انتظامیہ کے ایک عہدے دار نے مختصر انٹرویو دیا۔ اس نے کہا کہ ایس آئی طفیل کی صورت میں ایک قیمتی جانی نقصان ہوا ہے۔ عہدے دار نے رپورٹر کے سوال

ہوشی کے عالم میں ہذیان بول رہا تھا۔ ''ماموں ... مجھے بازار لے کر جاؤ ... مجھے کپڑے لے کر دو۔ شب برأت آنے والی ہے۔ پٹاخے چل رہے ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

سرمد کی حالت دیکھ دیکھ کر زاہدہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ رستم کو دیکھ کر سسک پڑیں۔ ''تمہیں اسی دن سے ڈراتی تھی رستم..... دیکھ لیا نا اپنے کاموں کا نتیجہ!''

رستم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر آپو زاہدہ کو اپنے ساتھ لگایا۔ ''میں آپ سب کو کچھ نہیں ہونے دوں گا آپو...... جو مصیبت آنی ہے مجھ پر آئے گی۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''اگر تجھ کو کچھ ہوگا تو بھی ہم کو ہی ہوگا۔'' وہ رونے لگیں۔

اچانک دراج دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی کلاشنکوف بالکل تیار حالت میں اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''رستم! پلس والے آگے آ رہے ہیں۔ ان کی تین گڈیاں بڑے درواجے کے بالکل سامنے پہنچ گئی ہیں۔ وہ پیچھے سے بھی حرکت کر رہے ہیں۔ میرا کھیال ہے کہ وہ کچھ کرنے والے ہیں۔''

رستم، ناصر اور جہانگیر وغیرہ دراج کے پیچھے چلتے ہوئے چھت کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میگا فون پر ریاض ہٹلر کی چرچری آواز گونجنے لگی۔ ''رستم سیال...... اجمل خان اور دراج مہتم! ہم تمہیں صرف پندرہ منٹ کی مہلت اور دے رہے ہیں۔ اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔ پندرہ منٹ پورے ہونے کے فوراً بعد ہم کارروائی شروع کر دیں گے۔ میں یہ اعلان ایک بار پھر دہراتا ہوں۔''

ریاض نے پاٹ دار آواز میں اپنا بیان دہرایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ طوفان سے پہلے کی سی خاموشی تھی۔ رستم نے چھت پر سے دیکھا۔ دور تک پولیس کی گاڑیاں اور ان کی نیلی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ موت کے سائے چاروں طرف سے طویل ہو رہے تھے اور ان کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔

برساتی کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر رستم نے اپنی سیون ایم ایم رائفل کے میگزین بھرنے شروع کیے۔ شانی اس کے قریب ہی بیٹھی تھی لیکن اس نے اس کام میں رستم کی مدد نہیں کی...... اس نے گولیوں کو ہاتھ لگایا اور نہ کسی میگزین کو۔ وہ بس چپ چاپ کسی طرح گہری سوچ میں کھوئی رہی۔ دونوں خاموش تھے لیکن شاید دونوں باتیں کر رہے تھے۔ یہ دل کی زبان تھی اور دل ہی سمجھتا تھا۔

رستم کہہ رہا تھا۔ ''شانی! آپ اپنا ارادہ بدل نہیں سکتیں؟ آپ کا معاملہ ہم سب سے

کے جواب میں بتایا کہ طفیل آن ڈیوٹی نہیں تھا اور رضا کارانہ طور پر اس کارروائی میں حصہ لے رہا تھا۔

طفیل کی موت کی خبر کو رستم اور ناصر وغیرہ نے خوشگوار حیرت کے ساتھ سنا۔ اگر یہ پورٹ ایبل ٹی وی آن نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس اہم خبر سے بھی بے خبر ہی رہتے۔

رپورٹر نے پوچھا۔ ''جناب! کیا یہ بات درست ہے کہ طفیل صاحب کی موت ٹارگٹ کلنگ ہے۔ جیسا کہ کچھ دیر پہلے ان کے ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ طفیل صاحب کارروائی کے دوران میں بہ آواز بلند ہدایات جاری کر رہے تھے۔ دو تین بار ان کی آواز پر فائر آیا اور وہ بال بال بچے۔ ان کے ساتھی نے انہیں تنبیہہ بھی کی تھی کہ وہ اونچی آواز میں نہ بولیں۔''

عہدے دار نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات سنی جا رہی ہے مگر ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایس آئی طفیل کو اتفاقیہ گولی لگی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نشانہ بنایا گیا ہو۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ملزمان میں اجمل خان ایک بہترین نشانہ باز ہے۔ اس قسم کے پروفیشنل نشانے باز گہری تاریکی میں بھی آواز کی نشاندہی پر شوٹ کر سکتے ہیں۔''

رپورٹر نے کہا۔ ''اس شبے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ایس آئی طفیل پر ہونے والے فائر اسٹیپر گن کے تھے اور حوالدار اجمل خان کو پولیس میں اسٹیپر گن کا ماسٹر سمجھا جاتا تھا۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟''

عہدے دار نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔

اشتہار چلنے شروع ہو گئے تھے۔ ٹی وی کی بیٹری بچانے کے لیے ناصر نے ٹی وی آف کر دیا۔ رستم، جہانگیر اور ناصر تینوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ناصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ نشانے باز نے کل رات جان دینے سے پہلے ایک اور بہترین نشانہ لگایا ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہے۔'' رستم نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

اجمل کی موت ایک بار پھر انہیں بڑی شدت سے محسوس ہوئی اور وہ تینوں سوگوار ہو گئے۔

شام کا کھانا انہوں نے باری باری کھایا۔ کچھ پوزیشنیں ایسی تھیں جنہیں وہ چند سیکنڈ کے لیے بھی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پانی، بجلی، گیس سب کچھ منقطع تھا۔ مسلسل تناؤ اور خوف کے سبب چھوٹے سرمد کو تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے

مختلف ہے۔ آپ کو باہر ایک محفوظ زندگی ملے گی۔"

شانی نے کہا۔ "رستم! ہم اکٹھے زندہ نہیں رہ سکے لیکن اکٹھے مر تو سکتے ہیں۔ آپ کی بانہوں میں موت آئی تو بڑی آسان ہوگی۔"

"لیکن آپ کے مرنے سے میرا کوئی بھلا تو نہیں ہو جائے گا۔ ہاں، آپ کے بچ جانے سے بہت سوں کا بھلا ہوگا۔ آپ بے شمار لوگوں کے لیے امید کی روشنی ہیں۔ ان کے لیے نئی زندگی کا پیغام ہیں۔"

"میں نہیں ہوں گی تو کوئی اور آ جائے گا۔ کوئی بھی...... رات، سویرے کے بغیر تو نہیں ہوتی۔"

"آ..... آپ نے کچھ کہا؟" رستم نے میگزین لوڈ کرتے کرتے چونک کر پوچھا۔

"نہیں تو۔" وہ بولی۔

"کیا آپ...... کچھ کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"نہیں...... کیا آپ چاہ رہے ہیں؟"

رستم نے گہری سانس لی اور اوپر دیکھا۔ دور تاریک آسمان پر تارے جیسے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر چھت کے فرش کو گھورتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شانی! آپ باہر چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مصمم ارادے سے بولی۔ "نہیں...... رستم! بہت دور رہ لیا...... اب نہیں۔"

"بہت...... محبت...... کرتی ہیں؟" وہ عجیب انداز سے بولا۔

"آپ...... جتنی نہیں۔" اس نے کہا اور آنسو چھپانے کے لیے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

پندرہ منٹ کب پورے ہوئے، پتا بھی نہیں چلا۔ محاصرہ کرنے والوں نے دو منٹ مزید انتظار کیا۔ پھر ایک دم کئی سرچ لائٹس روشن ہوئیں اور اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔ حملہ کرنے والوں کی پوزیشنیں اب بہت بہتر تھیں۔ اس بہتری کا نتیجہ یہ نکلا کہ فائرنگ کے پہلے ہی منٹ میں ایک نڈر مہتمم سینے پر ایل ایم جی کا برسٹ کھا کر رستم اور ناصر کے درمیان ڈھیر ہوگیا۔ دراج کے ہاتھ پر بھی ایک کارتوس کے وزنی چھرے لگے اور وہ اپنی کلاشنکوف کو اچھے طریقے سے استعمال کرنے کے قابل نہ رہا۔ دراج کا زخمی ہونا ایک اور بڑا نقصان تھا۔ اس نے چھت کی پوری ایک سائیڈ کو سنبھال رکھا تھا۔

اسی دوران میں ناصر چلایا۔ "وہ آنسو گیس پھینک رہے ہیں۔"

ابھی ناصر کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ گیس کے چار پانچ شیل چھت اور سائیڈ کی راہداری میں گرے۔ اس وقت ہوا نہیں تھی۔ گیس تیزی سے کوٹھی کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر داخل ہونے لگی۔ کسی اندرونی کمرے سے زاہدہ اور زری کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ فائرنگ سے کچن کے قریب ایک بار پھر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ کٹھن لمحے تھے۔

جہانگیر ایک بار پھر غائب تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں چلا جاتا تھا۔ رستم نے بری طرح کھانستے ہوئے اس کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ اچانک اس کی نگاہ جہانگیر پر پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ گیلے کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ جھک کر چلتا ہوا رستم کے پاس آن بیٹھا۔ رستم نے محسوس کیا کہ اس کے کپڑے گندے ہیں اور ان میں سے بُو اٹھ رہی ہے۔

وہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولا۔ "یار! قسمت نے زور مارا ہے۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" پھر اس نے ناصر سے کہا۔ "جم کر گولی چلاؤ یار!...... ہم دو منٹ میں آ رہے ہیں۔"

اس نے رستم کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا زینے اترنے لگا۔ وہ نچلی منزل پر پہنچے اور تہہ خانوں میں چلے گئے۔ یہاں سیلن اور گھٹن تھی۔

"کیا کوئی سرنگ شرنگ ہے؟" رستم نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! ایک بہت پرانا سیوریج پائپ ہے۔ شاید انگریزوں کے زمانے سے بند پڑا ہے۔ یہ پائپ آگے جا کر ایک انڈر گراؤنڈ نالے سے مل جاتا ہے۔ نالہ بھی لگتا ہے، سالوں سے خشک پڑا ہوا ہے۔ میں دو دن سے اس کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔"

جہانگیر نے ٹارچ رستم کو پکڑائی اور ایک جگہ سے سیوریج کا ایک بڑا سا زنگ آلود ڈھکن اٹھایا۔ وہی بُو اٹھی جو مدتوں سے بند کنوؤں اور سرنگوں وغیرہ سے برآمد ہوتی ہے۔ جہانگیر بلا تامل اندر اُتر گیا اور ٹارچ کی روشنی دور تک پھینکی۔

"اس کا دوسرا سرا بھی دیکھا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"دیکھ لیا ہے جن پیارے! ایک دم سیف ہے۔ کوئی دو فرلانگ دور جا کر نکلے گا اور اگر

اس سے آگے جانا چاہیں تو بھی جا سکتے ہیں......لیکن باہر نکلنے کی گارنٹی بس دو فرلانگ تک کی ہے۔''

رستم نے خود بھی چار فٹ قطر کے قدیم پائپ میں اُتر کر تسلی کی......انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے حکمتِ عملی طے کر لی۔ باہر سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ۔گیس کی اذیت ناک بُو اب ہر جگہ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ رستم اور جہانگیر ٹارچ کی روشنی میں دوڑتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچے۔ انہوں نے عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور بچے کھچے ساتھیوں کو ان کی پوزیشنوں پر جا کر صورتِ حال بتا دی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر وہ اس نئی موومنٹ کے لیے تیار تھے۔''لاشوں کا کیا ہو گا؟'' ناصر نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''وہی جو لڑائی میں ہوتا ہے......سپردِ خدا!'' رستم نے کہا۔

رستم اور ناصر آخر وقت تک چھت پر سے فائرنگ کرتے رہے۔ دو مہتم فرسٹ فلور سے گولی چلاتے رہے۔ جہانگیر باقی افراد کو لے کر تہ خانے میں پہنچ گیا۔ پھر رستم کی ہدایت پر دونوں مہتموں نے بھی پوزیشنیں چھوڑ دیں۔ آخر میں رستم اور ناصر بھی چھوٹے چھوٹے برسٹ چلاتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر چلے گئے۔ یہاں رستم نے ایک الماری سے کینوس کا ایک تھیلا نکال کر کندھے پر ڈال لیا۔

یہی وقت تھا جب پولیس سامنے سے چارج کر کے کوٹھی کے اندر گھس آئی۔ اس کے فوراً بعد ساتھ والی چھت سے بھی اسپیشل فورس کے لوگ کوٹھی کی بالائی بالکونیوں میں کود گئے۔ ان کی تقدیر ایک بار پھر پلٹا کھاتی محسوس ہوئی۔ جب رستم اور ناصر فائرنگ کرتے ہوئے تہ خانے تک پہنچے، پوری کوٹھی میں پولیس دندنا رہی تھی۔ پولیس میں سے بیشتر نے گیس ماسک اور بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے للکارے در و دیوار میں گونجنے لگے۔

''مارو۔ ۔پکڑو جانے نہ پائیں۔''

رستم نے تہ خانے کے آہنی دروازے کو اندر سے لاک کر دیا پھر وہ زینے پھلانگتا ہوا اس پرانے مین ہول تک پہنچ گیا جس میں اس کے ساتھی ایک ایک کر کے اُتر رہے تھے۔ اسی دوران میں پولیس تہ خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ اہلکاروں کی دھاڑتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آہنی دروازے پر کسی وزنی شے سے ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر ایل ایم جی کے دو طویل برسٹ چلے۔ آہنی دروازے کا لاک ٹکڑے ہو گیا۔ جس وقت رستم ہول کے اندر داخل ہوا، آہنی دروازہ کھلا۔ پولیس کمانڈوز جھپٹے اور خودکار رائفلوں کے پُر شور

برسٹ تہ خانے میں قیامت برپا کرنے لگے۔

رستم چلایا۔''ناصر، جہانگیر! تم لوگ نکل جاؤ۔ میں ان کو روکتا ہوں۔''

''نہیں بھائی......میں بھی یہاں ہوں۔'' ناصر نے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔'' رستم دہاڑا۔

دراج، رستم کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔''تم بھی جاؤ دراج!'' رستم نے اسے پیچھے دھکیلا۔

دراج نے رستم کے دھکے کی پرواہ کیے بغیر کلاشنکوف سے فائرنگ جاری رکھی۔

''دراج! جاؤ تم! یہاں بس ایک بندے کی ضرورت ہے...... جاؤ۔''

دراج نے جیسے رستم کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ کی پرواہ کیے بغیر مسلسل زینوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اس کی سرخ آنکھوں سے بھی لہو ٹپک رہا ہے۔ اچانک ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے کھوپڑی کا ایک طرف کا حصہ اُڑا کر رکھ دیا۔ دراج پیچھے کی طرف گرا۔ اس کی جیون ساتھی اس کی کلاشنکوف اس کے خون آلود ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ یکسر ساکت ہو گیا...... دو گولیاں جیسے رستم کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ رستم نے دو جوابی فائر کیے۔

فائرنگ کی آواز سے کان پڑی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ رستم اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر دہاڑا۔''ناصر! میں تم سے کہتا ہوں کہ ان کو لے جاؤ یہاں سے......ورنہ...... تم بھی بے موت مرو گے...... لے جاؤ ان کو۔'' اس کی آواز پرانے سیوریج پائپ میں دور تک گونجی۔

ناصر تذبذب میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے باقی ساتھی تھے۔ ان لمحوں میں اس کا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ رستم پھر دہاڑا۔''دفع ہو جاؤ ...... دفع ہو جاؤ۔'' اس نے سخت ہیجانی انداز میں ناصر کے قدموں میں برسٹ چلایا۔ ناصر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ رستم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، ناصر کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ آپو زاہدہ کے رونے اور پکارنے کی آواز دور تک رستم کے کانوں میں آتی رہی۔

رستم نے قریباً تین منٹ تک جم کر فائرنگ کی ...... پھر اس کی سیون ایم ایم خالی ہو گئی......دشمنوں کا دشمن اور دوستوں کا دوست دراج، اس کے پہلو میں ساکت پڑا تھا۔ رستم نے اس کی کلاشنکوف اٹھا لی۔ اس نے کلاشنکوف سے سنگل شاٹ چلائے اور چار پانچ منٹ مزید گزار دیئے۔ تہ خانے میں موجود مقابل اہلکار قریب آتے جا رہے تھے۔ رستم کلاشنکوف

کی آخری تین چار گولیاں بچا کر دس پندرہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب اس کے پاس آخری ہتھیار رہ گیا تھا۔ کینوس کا وہ چھوٹا تھیلا جو اس نے اپنے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔ اس میں چار عدد M67 ہینڈ گرینیڈ موجود تھے۔ یہاں پائپ میں ایک بڑا خم موجود تھا۔ وہ اس خم کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا۔ بیگ کی زپ کھولی اور ہینڈ گرینیڈ نکال لیا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید دستی بموں کے دھماکے، پولیس والوں کو وقتی طور پر خوف زدہ کر دیں اور وہ اندر گھسنے میں جلدی نہ کریں۔

اس نے پہلے بم کی پن کھینچی۔ پن کھینچنے کے فوراً بعد اس نے سیفٹی لیور کو انگوٹھے سے دبا لیا اور پھر بازو گھما کر اس مہلک لوہے کو مین ہول کے رخ پر پھینک دیا۔ چمک کے ساتھ لرزہ خیز دھماکا ہوا۔ مختصر خلا میں گرد و غبار اور دھواں پھیلا۔ چند سیکنڈ کے لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ پھر رستم نے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کہ مین ہول نظر نہیں آ رہا۔ دھماکے سے بہت سا ملبہ گرا تھا اور اس نے سیوریج پائپ کا راستہ تقریباً بند کر دیا تھا۔ یہ نتیجہ خلافِ توقع لیکن حسبِ ضرورت تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن موت کے قدم رک گئے تھے۔

رستم واپس مڑا۔ تاریکی میں اس کا پاؤں کسی زندہ شے سے ٹکرایا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ شانی واپس نہیں گئی تھی۔ وہ یہیں موجود تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی رہی تھی۔

''شانی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

''وہی جو آپ کو دیکھنا چاہیے۔'' وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

''دراج ختم ہو گیا؟'' اس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' رستم بے حد بوجھل آواز میں بولا پھر اس نے شانی کا ہاتھ تھاما اور تاریکی میں بھاگتا چلا گیا۔۔۔۔

ان کا بھاگنا عجیب انداز کا تھا۔ وہ بالکل جھکے ہوئے تھے۔ ان کے سر بار بار پائپ کی اندرونی سطح سے ٹکرا رہے تھے۔ پائپ میں اینٹوں کے ٹکڑے تھے، خشک ٹہنیاں تھیں، ٹوٹے ہوئے جالے تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔ رستم کو اپنی ایک ٹانگ میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا مگر وہ شانی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا چلا گیا۔

قریباً تین منٹ بعد وہ گرتے پڑتے ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہ بھی ایک انڈر

گراؤنڈ نالہ ہی تھا۔ پتا نہیں کتنی مدت سے خشک پڑا تھا۔ بارش اور سیوریج کے پانی کی نکاسی کے ایسے نالے عام طور پر بڑی سڑکوں کی دونوں جانب بنائے جاتے ہیں اور انہیں اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ نالہ خشک تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر سڑک متروک ہو چکی ہے۔۔۔۔

رستم نے ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھینکی۔ زمین کی گواہی بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھی دائیں جانب سے نکلے تھے۔ وہ بھی دائیں طرف مڑ گیا۔ اس نالے کی چھت اونچی تھی۔ اب انہیں زیادہ جھکنا نہیں پڑ رہا تھا۔ ٹارچ بہترین راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ حتیٰ الامکان تیزی سے بھاگتے چلے گئے۔

ایک جگہ شانی گر گئی۔ تکلیف کے سبب وہ کراہی۔ رستم نے اسے اٹھایا اور بے ساختہ اس کا سر چوما۔ ''بس تھوڑی دور اور۔'' وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔

کچھ آگے جا کر اس نے ناصر اور جہانگیر کو آوازیں دیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اندر موجود ہوں اور جواب دیں لیکن جواب نہیں آیا۔ سوڈیڑھ سو قدم مزید آگے جانے کے بعد رستم کو ایک جگہ چھت میں تکون سا خلا نظر آیا۔ اس نے ٹارچ فوراً بجھا دی۔

یہ سیمنٹ اور بجری کی ایک بہت پرانی سل تھی جسے شاید تھوڑی ہی دیر پہلے اس کی جگہ سے ہلایا گیا تھا۔ رستم چند لمحے سن گن لیتا رہا پھر اس نے تکونے خلا کے کناروں کو تھاما اور بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھایا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دم بدبو کے چنگل سے نکل کر خوشبو کے گھیرے میں آ گیا ہے۔ اس کے اردگرد بہت سے چھوٹے بڑے درخت اور پودے تھے۔ یہ ایک نرسری تھی۔ رستم نے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کسی متنفس کی موجودگی محسوس نہیں ہوئی۔

''ہمیں باہر نکلنا ہے شانی۔'' اس نے کہا اور نیچے بیٹھ گیا۔ شانی کھڑی تھی رستم نے اسے گھٹنوں کے قریب سے اٹھایا اور تکونے خلا تک پہنچا دیا۔ وہ تھوڑی سی کوشش سے باہر نکل گئی۔ رستم نے کینوس کا تھیلا، ٹارچ اور کلاشنکوف اسے تھمائی اور خود بھی نکل آیا۔

''یہاں کوئی ہے۔'' شانی کی ہانپی ہوئی پُراندیش آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔

رستم نے شانی کی نظر کا تعاقب کیا۔ تاریکی میں چند فٹ کے فاصلے پر نباتاتی کھاد کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس ڈھیر کے ساتھ ہی ایک غیر متحرک جسم موجود تھا۔ رستم نے ٹارچ جلائے بغیر دیکھا۔ زمین پر اوندھا پڑا یہ شخص درمیانی عمر کا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کی کنپٹی سے خون رِس رہا ہے۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''کیا ہوا اسے؟'' شانی نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ناصر وغیرہ نے اسے بے ہوش کر کے پھینکا ہے۔ شاید یہ نرسری کا رکھوالا ہے۔"

رستم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن دیکھی۔ دھڑکن سست تھی مگر موجود تھی۔ "یہ زندہ ہے نا؟" شانی نے پوچھا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔" شانی نے پُر درد لہجے میں کہا۔

"نہیں کافی صحت مند ہے۔" رستم نے مختصر جواب دیا اور گہری نظروں سے اردگرد دیکھا۔ اس امر کا امکان موجود تھا کہ اس کا کوئی ساتھی بھی یہاں موجود ہو۔ تاہم ایسی کوئی شہادت دکھائی نہیں دی۔ رستم نے چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ چند میٹر آگے کچی زمین پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشان موجود تھے۔ شاید یہ سوزوکی لوڈر وغیرہ تھی۔ رستم کی چھٹی حس نے کہا کہ ناصر، جہانگیر اور دیگر ساتھی اس گاڑی کے ذریعے نکل گئے ہیں۔

"وہ دیکھیں رستم!" شانی نے انگلی سے دائیں جانب اشارہ کیا۔

کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر پولیس موبائلز کی نیلی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ دو روشنیاں تھیں مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ روشنیوں کا رخ مخالف سمت میں تھا اور یہ دو روشنیاں ہی نہیں تھیں جو یہاں موجود تھیں..... قریباً ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بہت سی نیلی روشنیاں جھلک دکھا رہی تھیں۔ پولیس موبائلز کے دور افتادہ سائرن بھی سنائی دیتے تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ اسی کوٹھی کے اردگرد تھا جہاں سے وہ جان بچا کر نکلے تھے۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" شانی منمنائی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" رستم نے کہا اور شانی کے ساتھ نرسری کے کنارے کی طرف بڑھا۔ کینوس کا تھیلا اس کے کندھے پر تھا اور کلاشنکوف ہاتھ میں۔ دوسرے ہاتھ میں وہ چیز تھی جو اسے بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے سکتی تھی۔ یہ شانی کا ہاتھ تھا۔

نرسری کے کنارے پر ایک چھوٹا سا نیم پختہ کمرہ بنا ہوا تھا۔ کمرہ خالی نظر آتا تھا۔ کمرے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا زرد بلب روشن تھا اور اپنے اردگرد کی گہری تاریکی کو بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ رستم نے شانی کو وہیں درختوں کی تاریکی میں چھوڑا اور خود احتیاط سے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں پھینکا۔ یہاں نرسری کا سامان موجود تھا۔ کھاد کے پیکٹ، کیڑے مار دواؤں کی بوتلیں، خالی گملے اور بیلچے وغیرہ۔ اکلوتی چارپائی خالی تھی۔ سرہانے کی طرف ٹرانزسٹر ریڈیو بج رہا تھا۔ کسی پرانی پاکستانی فلم کا

نغمہ تھا۔

آپ ہی اپنے تڑپنے کا مزہ لیتے ہیں
ہنس کے ہر غم کو وہ سینے سے لگا لیتے ہیں
غم سے ڈرتے ہوئے دیکھا نہیں دیوانوں کو
یاد کرتا ہے زمانہ انہی انسانوں کو

یہ موسیقی بکھیرتا ریڈیو یقیناً اسی شخص کا تھا جو کھاد کے ڈھیر کے پاس چوٹ کھائے پڑا تھا۔ اس کمرے میں رستم کو جس شے کی تلاش تھی وہ اسے مل گئی۔ یہ ایک بڑی چادر تھی۔ رستم نے یہ چادر بکل کی صورت میں اپنے گرد لپیٹ لی۔ کینوس کا بیگ، کلاشنکوف، ٹارچ سب کچھ بکل کے اندر چھپ گیا۔ یہ بکل واقعی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ رستم نے چارپائی کی چادر بھی کھینچ لی۔ باہر آ کر یہ چادر اس نے شانی کو اوڑھا دی۔ رستم کی طرح شانی کے سارے کپڑے بھی سیوریج کے گرد و غبار اور نمی سے برباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہلکی بُو بھی اٹھ رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب رستم کو ایک بار پھر اپنی ٹانگ کی تکلیف کا احساس ہوا۔ شانی کی نگاہ بچا کر اس نے اپنی شلوار کا پائنچا اٹھایا اور پنڈلی دیکھی۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ پنڈلی کے پچھلے حصے پر گہرا زخم تھا۔ زخم سے بہنے والا خون جوتی میں چپچپا رہا تھا۔ رستم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ زخم کب لگا ہے پھر اچانک اسے اس دھماکے کا خیال آیا جو کچھ دیر پہلے اس کے پھینکے ہوئے ہینڈ گرینیڈ سے ہوا تھا۔ پتھر اور لوہے کے بہت سے پرخچے اڑے تھے۔ شاید انہی میں سے کوئی پرخچا اس کی پنڈلی کو گھائل کر گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" شانی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کوئی پتھر لگا ہے شاید۔" رستم نے کہا اور شلوار برابر کر دی۔

دونوں نرسری کے گنجان سبزے سے باہر نکل آئے۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلے تھے کہ انہیں پھر واپس درختوں میں آنا پڑا۔ ایک پولیس کار برق رفتاری سے ان کے پاس سے گزر گئی۔

"ہم کہاں جائیں گے رستم؟" شانی نے دل گیر لہجے میں کہا۔

"آپ آئیں..... کوئی سواری ڈھونڈتے ہیں۔" رستم نے شانی کا ہاتھ تھاما۔

سامنے تارکول کی سنسان سڑک تھی۔ دونوں طرف کوٹھیاں تھیں۔ ہر کوٹھی میں بس ایک دو لائٹس ہی روشن تھیں۔ کبھی کبھی رکھوالی کے کسی کتے کی آواز سناٹے کا سینہ چیر دیتی تھی۔ رستم

کی لنگراہٹ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹی سڑک کو طے کر کے وہ ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر آ گئے۔ دور مغربی افق پر بجھا بجھا سا چاند اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ ہوا مدھم لیکن خوش گوار تھی۔ یہ رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ ان کے عقب میں قریباً ڈھائی تین فرلانگ کی دوری پر پولیس کاروں کے سائرن سنائی دیتے تھے اور کبھی کبھی کوئی پٹاخہ (فائر) بھی چل جاتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کوٹھی کے اردگرد ہو رہا تھا جہاں سے وہ نکلے تھے۔ وہ کچھ دور چلے تھے کہ ایک مہران ٹیکسی کار نظر آئی۔ وہ مخالف سمت جا رہی تھی۔ رستم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ دونوں ٹیکسی میں جا بیٹھے۔ رستم آگے اور شانی پیچھے بیٹھی۔ ''کہاں جانا ہے؟'' جواں سال ڈرائیور نے رستم کو سرتاپا گھورتے ہوئے کہا۔

''گلبرگ مین مارکیٹ!'' رستم نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ تین چار منٹ چلنے کے بعد جونہی وہ ایک چھوٹے چوراہے سے آگے بڑھے رستم کو زبردست پولیس ناکا دکھائی دیا۔ یہاں کوئی ایک درجن اہلکار موجود تھے۔ ایک پولیس موبائل بھی نظر آ رہی تھی...... رستم کا ذہن فوری طور پر کام کر گیا۔ ناکے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ٹیکسی ایک بغلی سڑک پر مڑوا دی۔

رستم کی اس حرکت سے ڈرائیور کے شبہات مزید گہرے ہو گئے ہوں گے مگر وہ خاموش ہی رہا۔ مین مارکیٹ پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے ٹیکسی ایک تاریک سڑک پر روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر رستم کو بھی باہر بلا لیا۔ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یار! اگر آپ کسی چکر میں ہو تو ادھر ہی اُتر جاؤ۔ ورنہ خود بھی پھنسو گے اور مجھے بھی پھنساؤ گے۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے پوچھا۔

''آگے موڑ کے پاس ہی پھر پولیس ناکا ہے۔ یہاں سے گلی میں ہو کر پیدل نکل جاؤ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ ... لیکن اب تم نے گاڑی روک ہی دی ہے تو ٹھیک ہے۔'' رستم نے ڈرائیور کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ وہ تیزی سے گاڑی چلا کر نکل گیا۔ اب ایک بار پھر وہ سنسان سڑک پر تھے۔ دونوں طرف کوٹھیاں تھیں اور بغلی سڑکیں نکلتی تھیں۔

''کہیں یہ ڈرائیور کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔'' شانی نے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔ ...اور نہیں بھی۔'' رستم نے جواب دیا اور شانی کا نرم ہاتھ تھام کر ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ان کا رخ مین مارکیٹ کی طرف نہیں تھا۔ اردگرد کوئی رکشہ ٹیکسی دکھائی نہیں دے رہی تھے۔ یہ سواریاں مین مارکیٹ کی طرف سے ہی مل سکتی تھیں مگر ادھر جانا

خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سامنے ایک کوٹھی کے کارنر پر نیلی وردیوں والے دو تین سکیورٹی گارڈز کھڑے تھے۔ ''کون ہو بھئی؟'' ایک موچھیل گارڈ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''رانا صاحب کے گھر جانا ہے۔ کوٹھی نمبر سی 28۔'' رستم نے اگلے بلاک کا ایڈریس بتایا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' گارڈ نے رستم کا ابتر حلیہ دیکھ کر سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس کی نگاہیں بار بار رستم کی پھولی ہوئی چادر کی طرف اٹھ رہی تھیں جس کے نیچے سردار دراج کی کلاشنکوف موجود تھی۔

گارڈ کا رویہ دیکھ کر شانی کو لاہور ہی کی وہ دل خراش رات یاد آ گئی جب وہ اسی طرح سڑکوں پر بھٹک رہی تھی اور ایک گارڈ جیرے نے سکندر اور کامی نام کے لڑکوں کے ساتھ مل کر اس کو سخت ہراساں کیا تھا۔ آج شاید گارڈ جیرا ایک اور روپ میں اس کے سامنے تھا لیکن آج وہ اکیلی نہیں تھی۔ آج اس کے ساتھ رستم تھا۔ اس گارڈ جیسے چار چھ اور بھی ہوتے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ دیگر گارڈ بھی تفصیل حال جاننے کے لیے قریب آ گئے۔ شانی دعا کرنے لگی کہ وہ اپنی کسی حرکت سے رستم کو مشتعل نہ کر دیں۔

اچانک سامنے سے آنے والی ایک کار کے پہیے زور سے چرچرائے اور وہ چند میٹر آگے جا کر رک گئی۔ ''کیا یہ کوئی نئی مصیبت ہے؟'' شانی نے لرز کر سوچا۔ سفید ٹویوٹا کار ریورس ہوئی اور رستم کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے جو فرد نکلا، اسے دیکھ کر شانی ششدر رہ گئی۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ راجو تھا۔ کوکی کا شوہر اور تاؤ حشام کا بیٹا! وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ رستم سے زیادہ وہ شانی کو جانتا تھا لیکن شانی چونکہ نقاب میں تھی اس لیے اس کی نگاہ رستم پر ہی پڑی تھی۔ رستم نے بھی راجو کو پہچان لیا تھا۔ راجو بانہیں کھول کر رستم سے بغل گیر ہو گیا۔ سکیورٹی گارڈ معذرت کے انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔

''آپ...... یہاں...... میں حیران رہ گیا ہوں۔'' راجو بولا پھر اس کی سوالیہ نگاہ شانی کی طرف اٹھی۔ ''یہ کون ہیں؟''

''تمہارے خیال میں کون ہو سکتی ہیں؟'' رستم نے کہا۔

راجو نے آنکھیں سکوڑ کر غور سے شانی کو دیکھا پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ تیزی سے شانی کے قریب آیا۔ ''شانی باجی...... آپ؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔ اس نے بے ساختہ اپنا سر شانی کے کندھے سے لگا دیا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں راجو کے ساتھ اس کی سفید کار میں تھے اور کار تیزی سے نہر کی

طرف جا رہی تھی۔ راجو سمجھ گیا تھا کہ شانی اور رستم فی الوقت شدید مشکل میں ہیں۔ اس نے رستم کی خون آلود پنڈلی دیکھ لی تھی اور اس کی چادر کے نیچے کلاشنکوف کی موجودگی بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے شانی اور رستم سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے...... اس نے اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول رکھی۔ وہ زیادہ اچھی ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا مگر سڑکیں خالی تھیں اس لیے کوئی دشواری نہیں تھی۔ پانچ چھ منٹ میں راجو کی گاڑی ایک نئی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔

''کوکی کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ بھی یہیں ہے باجی۔ دراصل چھوٹی ندا کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، میں میڈیکل سٹور سے اس کی دوا لینے نکلا تھا۔ قدرت کو منظور تھا کہ آپ سے ملاقات ہو۔'' ندا، راجو کی بچی کا نام تھا۔

کسی اندرونی کمرے سے بچی کے رونے کی باریک آواز بلند ہو رہی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا اور راجو، شانی اور رستم کو لے کر اندر آ گیا۔ اندر پہنچ کر شانی نے اپنا نقاب ہٹا دیا۔ اس نے روشنی میں دیکھا کہ رستم کی طرح اس کا اپنا حلیہ بھی ابتر ہو رہا ہے۔

راجو لرزتی آواز میں پکارا۔ ''دیکھو کوکی...... کون آیا ہے۔''

اندر سے کوکی برآمد ہوئی۔ اس کی گود میں روتی بسورتی بچی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھلی کھلی آنکھوں سے شانی کو دیکھتی رہی پھر اسے پہچان کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے بچی کو ایک طرف لٹایا اور شانی آپا پکارتی ہوئی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

شانی کے زخمی کندھے سے شدید ٹیس اٹھی لیکن اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ پھر بھی شانی کی زخمی انگلیوں پر اس کی نظر پڑ گئی۔ ''شانی آپا! آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟ آپ کے کپڑوں کو کیا ہوا؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوالات پوچھ ڈالے۔

''خیریت نہیں ہے کوکی۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اندرونی کمرے میں آ گئے۔

راجو نے کہا۔ ''آپ کسی بڑی مشکل میں ہیں شانی باجی۔''

شانی نے رستم کی طرف دیکھا۔ رستم بولا۔ ''شاید تم لوگ ٹی وی وغیرہ نہیں دیکھتے۔''

''ٹی وی تو ہے لیکن دو تین دن سے ندا کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ہم دونوں کو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ کہیں... پولیس کے ساتھ تو......'' راجو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گلبرگ کے علاقے میں دو دن سے ٹاکرا ہو رہا تھا۔

دونوں طرف سے کافی نقصان ہوا ہے۔''

راجو نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... کل ہم ندا کے ساتھ ہسپتال میں تھے۔ وہاں ایک بندہ گلبرگ میں پولیس مقابلے کی بات تو کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کسی انسپکٹر طفیل کو گولی لگی ہے۔''

''انسپکٹر نہیں، سب انسپکٹر تھا۔ ڈپٹی ریاض کا رشتے دار ہے۔'' رستم نے تصحیح کی۔ ''وہ ہمارے ساتھ لڑنے والوں میں شامل تھا۔''

''آپ کے ساتھی ناصر اور اجمل خان وغیرہ کہاں ہیں؟'' راجو نے پوچھا۔

''ناصر بھی ہماری طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہے مگر اجمل کو گولی لگ گئی ہے۔'' رستم نے بے حد بوجھل لہجے میں کہا۔

''اور وہ مہتم سردار دراج؟''

''وہ بھی نہیں بچ سکا۔'' رستم کی آواز مزید بوجھل ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔ راجو اور کوکی کے چہروں پر گہرا دکھ نظر آیا۔

راجو بولا۔ ''میں ابھی آپ کے لیے کمرہ ٹھیک کرواتا ہوں۔ یہاں آپ بالکل محفوظ رہیں گے۔ کسی طرح کا کوئی ڈر فکر نہیں ہے۔''

''نہیں راجو! ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے...... ہم تمہارے لیے مصیبت نہیں بننا چاہتے۔'' رستم نے جواب دیا۔

کوکی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ شانی آپا ہمارے لیے سگی بہنوں کی طرح ہیں۔ انہوں نے جو کچھ ہم دونوں کے لیے کیا ہے، ہم مرتے دم تک نہیں بھول سکتے۔ ان کے لیے ہماری جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں۔''

اسی دوران میں کوکی کی بڑی بہن سنبل بھی اندر آ گئی۔ وہ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں بھاری نظر آ رہی تھیں۔ یہی وہ لڑکی تھی جس سے کوتاہ قد ڈولے نے خاموش محبت کی تھی۔ جس کی تمنا چپکے چپکے اپنے دل میں پالی تھی اور پھر اس تمنا سمیت منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ شانی کو پہچان کر سنبل بھی حیران ہوئی۔ پھر وہ لپک کر شانی کے گلے لگ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی نہا کر اپنے کپڑے بدل چکی تھی۔ سنبل کے کپڑے اسے تقریباً پورے آئے تھے۔ وہ اجمل خان اور دراج کی موت پر سوگوار بیٹھی تھی۔ کوکی اور سنبل اسے دلاسہ دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ خود بھی اشک گرا رہی تھی۔

''کوکی! یہ گھر کس کا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہمارا ہے آپا...... ہم نے چھ مہینے پہلے خرید لیا تھا۔ اس کا بچا کھچا کام ہو رہا تھا۔ ہم صرف بیس پچیس دن پہلے ہی گاؤں سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ ابھی تو سامان بھی پوری طرح سیٹ نہیں کیا ہے۔''

''تاؤ (حشام) کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ دو تین مہینے پہلے ہی یہاں آ گئے تھے۔ لاہور میں ان کے تین چار کیسوں کی تاریخیں چلتی ہیں نا۔''

''وہ ٹھیک ہیں؟'' شانی نے دریافت کیا۔

کوکی نے اثبات میں جواب دیا۔ ''وہ بھی ہماری طرح آپ کے لیے بہت پریشان رہے ہیں۔ دو دن پہلے کورٹ کے احاطے سے ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اخبار میں آپ کے لاپتا ہونے کی خبر چھپی ہے۔ وہ اس خبر کو جھوٹا بتا رہے تھے لیکن اب یہ سب کچھ سچ نکلا ہے۔ آپ رنگ والی کے بجائے یہاں لاہور میں ہیں۔''

شانی نے کوکی اور سنبل کو مختصر الفاظ میں اپنے حالات کے بارے میں بتایا۔ تاہم سکینہ کی موت کی خبر وہ ان دونوں سے بھی چھپا گئی۔

شانی کے حالات نے کوکی اور سنبل کو مزید غم زدہ کیا۔ پھر گفتگو کا رخ ڈولے کی ناگہانی موت کی طرف مڑ گیا۔ وہ تینوں اس کی موت پر سوگوار ہو گئیں۔ سنبل نے روتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت اچھا تھا۔ بڑا سادہ دل...... بڑا ہمدرد۔ کوکی اور راجو کو ملانے میں آپ کی طرح اس نے بھی بہت کوشش کی۔ کوکی کی خراب حالت دیکھ کر وہ راجو کو ڈھونڈنے نکل گیا اور کئی موقعوں پر اپنی جان تک خطرے میں ڈالی۔''

''میں اس کی کوششوں کی گواہ ہوں۔'' شانی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں پتا ہے، وہ یہ سب کس کے لیے کرتا تھا؟''

سنبل کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ دو موٹے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسلے...... وہ بولی۔ ''پتا ہے بھی اور نہیں بھی...... وہ مجھ سے بہت لگاؤ رکھتا تھا۔ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کہتا تھا۔''

''لیکن کوئی بات ایسی بھی ہوگی جو اس نے نہیں کہی ہوگی۔''

سنبل نے ایک آہ کھینچ کر دوبارہ گردن جھکا لی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی کہتا تھا، میں آپ کو ایک بات بتاؤں گا...... میں نے کبھی اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مجھے لگا، وہ کچھ کہنے کے لیے میرے پاس آیا ہے۔ اس نے ڈھیروں

باتیں کیں مگر وہ ادھر اُدھر کی باتیں ہی کرتا رہا۔ کوئی خاص بات اس کی زبان پر کبھی نہیں آئی۔''

''تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گیا ہوگا سنبل؟''

''سیانے کہتے ہیں نا آپا...... جس گاؤں جانا نہ ہو، اس کی راہ پوچھنے سے فائدہ!''

وہ تینوں خاموش ہو گئیں۔ اپنی اپنی جگہ سوچتی رہیں۔ ڈولے کے بارے میں...... اس کے مقدر کے بارے میں۔ آخر سنبل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے آپا؟ قدرت کچھ لوگوں سے ایسا مذاق کیوں کرتی ہے؟ انہیں پورا دل اور پوری سوچ دیتی ہے مگر جسم...... پورا نہیں دیتی۔''

''قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے اور ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔ وہ تینوں قالین پر بیٹھی تھیں۔ شانی اور سنبل نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سنبل نے اپنا ماتھا اپنے گھٹنوں پر ٹیک کر چہرہ چھپایا اور اچانک سسکیوں سے رونے لگی۔ پھر اس کی سسکیاں بلند ہوتی گئیں اور ہچکیوں میں بدل گئیں۔ وہ موسلا دھار روئی اور کئی منٹ تک روتی رہی...... شانی نے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تاکہ وہ اپنے دل کا بوجھ اچھے طریقے سے ہلکا کر لے۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔

اسی دوران میں راجو اور رستم نے ٹی وی کا تار وغیرہ لگا کر اسے آن کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد خبریں نشر ہوئیں تو ان میں گلبرگ کی خبر بھی موجود تھی۔ زیادہ تفصیل نہیں تھی، بس اتنا بتایا گیا کہ گھیرے میں آئے ہوئے مزید تین ڈاکو ہلاک ہو گئے ہیں۔ پولیس عمارت کے اندر پہنچ گئی ہے اور مزید ملزموں کی تلاش جاری ہے۔ تہہ خانے میں ہونے والے ایک زوردار دھماکے کا ذکر بھی خبر میں موجود تھا۔ اسے ڈائنامیٹ کا دھماکہ کہا جا رہا تھا۔ اصل میں یہ وہی "M67" دستی بم تھا جو رستم نے پرانے سیوریج پائپ کے اندر پھینکا تھا...... اور جس کی وجہ سے اسے اور شانی کو بھاگنے کا موقع ملا تھا۔

اب رات کے قریباً تین بج چکے تھے۔ کبھی کبھی کسی دور افتادہ سڑک سے گزرنے والی پولیس موبائل کا سائرن بھی سنائی دے جاتا تھا۔ راجو نے رستم کو اپنے ساتھ لیا اور دوسری منزل کے کمرے میں چلا گیا جبکہ شانی اور سنبل نیچے کوکی کے بیڈروم میں رہیں۔ راجو سمیت یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شانی اور رستم شادی شدہ ہیں، ورنہ شاید ان کے لیے ایک ہی کمرے کا انتظام کیا جاتا۔

کوکی نے کہا۔ ''آپا! آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔''

شانی خاموش رہی۔ وہ لیٹ گئی مگر اس کی آنکھوں میں انگارے اترے ہوئے تھے۔

گزر جانے والا ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ ابھی اجمل خان کی موت کا صدمہ ہی کم نہیں ہوا تھا کہ سردار دراج بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اسے بڑے پیار سے نکڑی کہنے والا اور اپنے گز بھر چوڑے سینے سے اس کے سامنے محفوظ دیوار کھڑی کرنے والا دراج اب کبھی نہ اٹھنے کے لیے گر چکا تھا۔ پھر اسے اپنے دیگر ساتھیوں کا خیال آیا۔ ڈاکٹر ناصر، زری، جہانگیر، دراج کا برادرِ نسبتی اور باقی تین چار مہتم نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھے؟ نیوز میں ان کے پکڑے جانے کی کوئی اطلاع تو نہیں تھی مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کی گرفتاری کو چھپایا گیا ہو۔ رستم کا خیال تھا کہ وہ نرسری میں سے لوڈر لے کر نکل گئے ہیں۔ شانی سوچنے لگی کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ پھر اس کا دھیان رستم کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رستم کی ٹانگ زخمی ہے اور یہ وہی ٹانگ تھی جو ایک بار اس کے جسم سے جدا بھی ہو چکی تھی۔ اس ٹانگ میں دوسری ٹانگ جیسی طاقت نہیں تھی۔ کم از کم ابھی تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کے زخمی ہو جانے سے رستم کو مزید مشکل پیش آرہی تھی۔

وہ رات بھر سو نہیں سکی...... بس دو تین بار اونگھ سی آئی۔ آنکھوں سے آنسو رستے رہے۔

کوکی اپنی روتی بسورتی بچی کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور بچی کے ساتھ ساتھ کچھ دیر کے لیے خود بھی سو گئی۔ رات بھر قریبی سڑکوں پر پولیس موبائلز کے سائرن گونجتے رہے۔

علی الصباح شانی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ رستم کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لیے وہ برآمدے کی کھڑکیوں کے سامنے سے گزر رہی تھی جب اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی نگاہ کوٹھی کے عقبی لان میں پڑی۔ صبح کے جھٹپٹے میں اسے تاؤ حشام نظر آیا۔ وہ بڑی محویت سے ایک کیاری پر جھکا ہوا تھا اور کچھ کر رہا تھا۔ شانی نے دھیان سے دیکھا اور اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ یہ ایک ویسا ہی منظر تھا جو وہ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ نار پور میں دیکھ چکی تھی۔ دس پندرہ فٹ مربع کی کیاری میں کوئی زندہ شے رینگ رہی تھی۔ یقیناً یہ ایک کوبرا سانپ تھا۔ تاؤ حشام پلاسٹک کے ایک لوٹے کے ذریعے کیاری میں کچھ انڈیل رہا تھا۔ یقیناً یہ پانی نہیں تھا۔ یہ خون تھا۔ تاؤ حشام اس کیاری کی ''آبیاری'' خون سے کر رہا تھا۔ کیاری کے چھوٹے چھوٹے پودوں کو دیکھ کر شانی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی خونی پودا تھا جس کا حصول بہت سے لوگوں کے لیے زندگی موت کا سوال بنا ہوا تھا۔ اسی پودے کی نحوست کے سبب رستم اور ناصر کے ٹو کے قریب پاک چین سرحد تک پہنچے تھے اور پورے ایک برس تک شدید ترین مشکلات کا شکار رہے تھے۔ مہر جی کی موت کے بعد اس پودے کی کاشت کچھ لوگوں کے لیے سربستہ راز بن گئی تھی اور وہ اس راز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں

تھے۔

شانی کو اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کوکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو آپا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تاؤ حشام کب سے اس چکر میں ہیں؟''

''پچھلے دو ڈھائی مہینے سے...... بلکہ گاؤں میں بھی یہی چکر ان پر سوار رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ پودا پروان چڑھانے میں کامیاب ہو گئے تو بڑا پیسہ کما سکتے ہیں۔ ایک سنیاسی کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لگایا ہوا ہے۔ دن رات لگے رہتے ہیں؟''

''کچھ کامیابی ہوئی ہے؟''

''تاؤ تو کہتے ہیں کہ ہوئی ہے مگر راجو نہیں مانتا۔ راجو کہتا ہے کہ اس پودے کے پتوں کی شکل بالکل ویسی نہیں جیسی سپ گندل کی ہوتی ہے۔ تاؤ نہیں مانتے۔ تاؤ نے تو ایک ہفتہ پہلے کچھ پتے توڑے بھی ہیں اور ان کی دوا بھی بنائی ہے۔''

''دوا بنائی ہے...... کس لیے؟''

''بیچنے کے لیے۔ بلکہ یہاں کاروں میں بیٹھ کر دو چار گاہک آئے بھی ہیں۔ ایک تو کل بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کا کوئی رشتے دار ہے۔''

شانی نے اس کا حلیہ پوچھا لیکن کچھ سمجھ نہ سکی۔ کوکی بولی۔ ''تاؤ جی کو پیسے کی کچھ کمی تو نہیں ہے۔ بس یہ شوق ہے ان کا۔ انہیں کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ چپکے چپکے لگے رہتے ہیں۔ یہ تو آپ صبح سویرے اٹھ گئیں اس لیے آپ نے کیاری دیکھ لی، ورنہ انہوں نے کیاری کی چھوٹی چار دیواری کا دروازہ بند کیا ہوتا ہے۔''

کیاری میں پھنکارتا ہوا سانپ خوفناک لگ رہا تھا۔ تاؤ حشام نے ایک چھوٹے سے مُردہ چوہے کو دُم کی طرف سے پکڑ کر سانپ کے سامنے کیا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس پر جھپٹ پڑا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید شانی اس معاملے میں دلچسپی محسوس کرتی مگر اب تو وہ ایک تند آندھی کے دوش پر تھی۔ اس کے اور رستم کے پیچھے موت کے ہرکارے تھے اور وہ ان سے بھاگ رہے تھے۔ اس شہر میں شاید کوئی جگہ بھی ان کے لیے محفوظ نہیں تھی۔

شانی، تاؤ حشام کو اس کے حال پر چھوڑ کر بالائی منزل کی طرف بڑھی اور اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں رستم ٹھہرا ہوا تھا۔

رستم بھی یقیناً سو نہیں سکا تھا۔ اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ اس کی حالت سی

گھائل جانور کی سی تھی جو اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہو اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی تھے...... یقیناً اس کی پنڈلی کا زخم پریشان کر رہا تھا۔

تنہائی ملتے ہی رستم نے کہا۔ ''شانی! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں؟ میں اکیلا ہوتا تو میرے بچ نکلنے کے مواقع زیادہ ہوتے اور میں ڈپٹی ریاض کی گردن تک بھی جلد پہنچ جاتا۔''

''اکیلے اکیلے بہت بھاگ کر دیکھ لیا رستم! اب مجھ سے اور اکیلے نہیں رہا جاتا۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، ہم دونوں کے ساتھ ہوگا۔''

''لیکن...... لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی زندگی...... بہت قیمتی ہے۔''

''یہ قیمتی ہے یا سستی...... مگر یہ آپ ہی کی ہے۔'' شانی نے عجیب جذباتی انداز میں کہا اور رستم کا بازو تھام کر اس کے چوڑے شانے سے لگ گئی۔

رستم کی کلاشنکوف رائفل اس کے دوسرے شانے سے جھول رہی تھی اور ہینڈ گرینیڈ والا بیگ سامنے تپائی پر دھرا تھا۔ اردگرد کی فضا میں نادیدہ خطرات کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

راجو کھنکارتا ہوا داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گرم چائے کے دو کپ تھے۔ شانی نے اسے دیکھا...... یہ راجو اس اجڈ لڑکے سے کتنا مختلف نظر آتا تھا جس نے کبھی میانہ گاؤں میں جوان نوکرانیوں کے درمیان راجا اندر کے سے شب و روز گزارے تھے اور یہیں پر بس نہیں، اس نے اپنی نوعمری کی پرواہ کیے بغیر شانی کو بھی جبر کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ آج شاید راجو ان واقعات کے بارے میں سوچ کر ہی ندامت کے پسینے میں ڈوب جاتا ہوگا۔

شانی نے چائے نہیں پی۔ رستم نے بھی دو گھونٹ لے کر ایک طرف رکھ دی۔ اسی اثنا میں ایک دیہاتی ملازم تازہ اخبار لے آیا۔ شانی اور رستم نے اخبار دیکھا۔ گلبرگ کے پولیس مقابلے کی خبر نمایاں جگہ پر موجود تھی۔

بتایا گیا تھا کہ پورے شہر کی پولیس ہائی الرٹ ہے اور مفرور ملزموں کو ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ خبر میں کوٹھی کے نیچے پرانی سیوریج لائن کا ذکر بھی موجود تھا اور بتایا گیا تھا کہ ملزمان کس ڈرامائی انداز میں فرار ہوئے۔ خبر میں اجمل خان، دراج اور چار مہتموں کو خطرناک ڈاکو قرار دیا گیا تھا اجمل اور دراج کی لاشوں کی تصویروں نے ان کی موت کا غم پھر شدت سے ابھار دیا۔

میڈیا کے لوگ اس نرسری تک بھی جا پہنچے تھے جہاں نرسری کا رکھوالا بے ہوش ملا تھا اور

اس کا لوڈر غائب پایا گیا تھا۔ آخر میں ایک اعلیٰ پولیس افسر نے عوام الناس کو یقین دلایا تھا کہ خطرناک مجرم رستم اور اس کے ساتھی اگلے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر زندہ یا مردہ گرفتار ہو جائیں گے۔ پولیس افسر کا دعویٰ تھا کہ مفرور ڈاکوؤں کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے...... اور ڈراپ سین دنوں کی نہیں گھنٹوں کی بات ہے۔

رستم اور راجو اخبار دیکھ رہے تھے جب یکایک کوٹھی کے عین سامنے دو گاڑیاں تیز رفتاری سے آ کر رک گئیں۔ اگلی گاڑی اسٹیشن وین تھی۔ پچھلی ایک بند جیپ تھی۔ گاڑیوں کا انداز دیکھتے ہی راجو چونک گیا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''یہ کون ہیں؟'' رستم نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''ٹھہرو، میں خود دیکھتا ہوں۔'' رستم نے کہا اور کلاشنکوف کو چادر کے نیچے چھپاتا ہوا زینوں کی طرف بڑھا۔ شانی سائے کی طرح اس کے پیچھے تھی۔ ''رستم! دھیان سے۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوکیدار نے گیٹ بند رکھا ہوا تھا اور اسٹیشن وین والے سے شناخت مانگ رہا تھا۔ دفعتاً وین کا پچھلا دروازہ کھلا اور اس میں سے چوہدری اعجاز برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ وہ چھوٹے دروازے کو دھکا دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ عقبی جیپ سے اس کے کارندے بھی باہر نکل آئے تھے...... شانی، خالو اعجاز کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس کے اندر سے اس کے اندر سے ایک سوال دردناک پکار بن کر ابھرا۔ ''تو کیا وہ بری گھڑی آ گئی ہے؟''

☆=======☆=======☆

خالو اعجاز نے گرج کر کہا۔ ''چوہدری حشام! کہاں ہو؟''

چوہدری حشام شاید کسی اندرونی کمرے میں تھا۔ رستم اور شانی نے کامن روم میں سے دیکھا، گیٹ پر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ چوہدری اعجاز کے قریباً سبھی کارندے گاڑیوں میں سے نکل آئے تھے۔

''رستم! کیا انہیں پتا چل گیا ہے کہ ہم یہاں ہیں؟'' شانی نے ڈری ہوئی سرگوشی کی۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' رستم نے جواب دیا۔ اس کی تیز نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

شانی نے دیکھا، خالو اعجاز کے کارندے بڑی افراتفری کے عالم میں بڑے گیٹ سے

اندر داخل ہونے لگے۔ ایک تنومند کارندے نے کسی بے ہوش یا نیم بے ہوش شخص کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ اس کارندے کے پیچھے دو افراد نے کسی لڑکی کو اٹھایا ہوا تھا۔ لڑکی بھی بے حس و حرکت تھی۔ اس کا ایک مرمریں بازو کٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔

"جلد کرو... اندر لے چلو۔" خالو اعجاز نے چلاتے ہوئے کہا۔ خالو اعجاز کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

اسی اثنا میں اندرونی حصے سے تاؤ حشام تیز قدموں سے نمودار ہوا۔ صورت حال دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

تاؤ حشام کو دیکھ کر چوہدری اعجاز دہاڑا۔ "یہ دیکھ حشام! کیا حشر ہوا ہے ان کا۔ یہ سب تیرا کیا دھرا ہے...... تیرا کیا دھرا ہے۔"

تاؤ حشام نے آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھا جو ایک گرانڈیل کارندے کی گود میں تھا۔ اس وقت شانی کی نگاہ نے بھی اس بے ہوش شخص کو پہچان لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ یہ خالو اعجاز کا چھوٹا بھائی شاداب تھا۔ خالو اعجاز اکثر شانی کے سامنے شاداب کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے تھے۔ آج یہ شاداب، بے ہوشی کی حالت میں...... ایک نیم عریاں، بے ہوش لڑکی کے ساتھ اس کوٹھی میں موجود تھا۔ جوڑے کی حالت مخدوش نظر آتی تھی۔

وہ سب افراتفری کے عالم میں بے ہوش جوڑے سمیت ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ تاؤ حشام نا قابل فہم بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا۔ شانی کو کم از کم یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ رستم کے تنے ہوئے اعصاب بھی قدرے ڈھیلے نظر آنے لگے۔ بہر حال، کلاشنکوف پر اس کی گرفت اب بھی موجود تھی۔

"یہ کیا چکر ہے رستم؟" شانی نے رستم کے بازو سے لگے لگے سرگوشی کی۔

"لگتا ہے کوئی نشہ وغیرہ کھا لیا ہے انہوں نے۔"

اچانک شانی کا دھیان سپ گندل کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ اسی خطرناک پودے کا شاخسانہ تو نہیں؟ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے وہ اسی چار دیواری میں سپ گندل کی منحوس جھلک دیکھ چکی تھی۔ ڈرائنگ روم کی دیوار گیر کھڑکی کا پردہ برابر نہیں تھا۔ اندر ہونے والی بھاگ دوڑ شانی اور رستم کو دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بلند آہنگ میں بولے جانے والے فقرے بھی ان کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ خالو اعجاز بار بار تاؤ حشام پر برس رہا تھا۔ "تم ذمے دار ہو۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے۔ یہ تو بچہ تھا...... تم تو سمجھدار تھے۔ تمہیں لالچ نے اندھا کیا ہے۔"

"میں نے اسے زہر تو نہیں دے دیا...... اور نہ میں چل کر اس کے پاس گیا تھا۔" تاؤ

حشام جوابی طور پر دہاڑا۔

"جو چیز جان لے لے وہ زہر ہی ہوتی ہے اور اسے دیکھو... یہ مر رہا ہے۔ اگر کر سکتے ہو تو اس کا کچھ کرو۔ یہ مر گیا تو میں تمہیں... میں تمہیں پھانسی کے تختے پر پہنچا دوں گا۔"

تاؤ حشام کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں جیسے کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چمچ کے ذریعے کوئی سیاہی مائل لعاب دار دوا شاداب کے منہ میں انڈیلنے کی کوشش کی۔ یہ دوا غالباً اس کی باچھوں سے بہہ گئی۔

ڈرائنگ روم میں جو گفتگو ہو رہی تھی، اس سے پتا چلا کہ طبیعت خراب ہونے کے بعد شاداب نے بڑے بھائی اعجاز سے کہا کہ وہ اسے چوہدری حشام کے پاس لے جائے۔ وہ لوگ اسے گاڑی میں ڈال کر لاہور روانہ ہوئے۔ ساتھ میں شاداب کی ساتھی لڑکی بھی تھی۔ راستے میں دونوں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔

شانی نے دیکھا کہ شاداب کے جسم پر صرف بنیان اور ٹراؤزر تھا۔ لڑکی نیم عریاں تھی اور اس کے مرمریں بدن پر کھرونچوں اور خراشوں کے واضح نشان تھے۔ رخساروں پر بھی نیل دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے لمبے ریشمی بال ڈرائنگ روم کے صوفے پر کسی سیاہ چادر کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی بے ہوشی بھی گہری دکھائی دیتی تھی۔ یہ وہی شیمپو کے اشتہار میں کام کرنے والی لڑکی تھی۔

شانی کے کانوں میں وہ بات گونجنے لگی جو تھوڑی دیر پہلے اسے کوکی نے بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ تاؤ نے سپ گندل سے کشید کی جانے والی دوا تیار کر لی ہے۔ بلکہ وہ اسے خاص خاص لوگوں کو استعمال بھی کرا رہا ہے۔ کوکی نے بتایا تھا کہ تاؤ حشام کے پاس آنے جانے والوں میں شانی کا ایک رشتے دار بھی شامل ہے۔

تو وہ رشتے دار یہی شاداب عرف شابی تھا۔ اب ساری بات شانی کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ اندر ڈرائنگ روم میں صورت حال تہلکہ خیز تھی۔ یوں لگتا تھا کہ شاداب نے آخری سانس لینے شروع کر دیئے ہیں۔ خالو اعجاز فرط غم سے چلا رہا تھا۔ وہ کبھی نیم مردہ شاداب کو جھنجوڑتا، کبھی اپنا سر پیٹنے لگتا تھا۔ پھر اس نے تاؤ حشام کو دو ہتڑ مار کر شاداب سے دور ہٹا دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔ "اسے ہسپتال لے چلو۔ اس حرامی سے کچھ نہیں ہو گا۔ یہ مار ڈالے گا اسے۔"

خالو اعجاز کے کارندے چیلوں کی طرح جھپٹے۔ انہوں نے تنومند شاداب کو اٹھانے اور کمرے سے باہر لے جانے کی کوشش کی مگر لگتا تھا کہ اب بھاگ دوڑ کا وقت گزر گیا ہے۔

شاداب کے ہاتھ پاؤں مُردہ شاخوں کی طرح جھول رہے تھے۔ اس کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے آگ کی طرح دہک رہا تھا، اب ٹھنڈا اور بے رنگ دکھائی دینے لگا تھا۔ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچ کر شاداب کا جسم ایک بار پھر ایک صوفے پر رکھ دیا گیا۔ خالو اعجاز کی روتی کرلاتی آواز فضا کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ ''ماردیا...... میرے بھرا کو جان سے مار دیا۔ اس ظالم نے مجھ سے میرا بھرا چھین لیا۔ میں لٹ گیا ...... میں برباد ہو گیا۔ او شاداب! آنکھیں کھول۔ اوئے، دیکھ میری طرف ...... اوئے، مجھ سے بات کر۔''

خالو اعجاز اپنے چہیتے بھائی کے مُردہ جسم سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مارنے لگا۔

اندر شاید لڑکی بھی مشکل میں تھی۔ اس کا خوبرو چہرہ اندرونی حدت سے سرخ تھا اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ دو افراد نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک زنانہ لباس بے ہوش لڑکی کے جسم پر گھسیٹا اور اسے اسٹیشن وین میں ڈال کر لے گئے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ اسے ہسپتال یا پرائیویٹ کلینک میں لے کر گئے ہوں گے۔

شاداب کی لاش کو ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ ڈرائنگ روم میں کہرام مچ گیا۔ سب سے زیادہ بلند اور کرب ناک آواز چوہدری اعجاز کی تھی۔ وہ لاڈلے بھائی کی لاش پر عورتوں کے انداز میں بَین کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس پر غشی طاری ہوئی۔ ہوش میں آتے ہی وہ ایک بار پھر نوحہ کناں ہو گیا۔ تاؤ حشام دائیں بائیں ہو گیا تھا، تاہم راجو اور کوکی ڈرائنگ روم میں نظر آ رہے تھے۔ اس ناگہانی موت پر ان کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

شانی اور رستم کامن روم کے عقبی دروازے سے نکلے اور بڑی احتیاط سے زینے چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے تک وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خالو اعجاز اور اس کے بھائی سے ملاقات ہو گی اور اس طرح ہو گی۔

اوپر پہنچ کر رستم نے کہا۔ ''شانی! لگتا ہے یہ سب اسی منحوس بوٹی سپ گندل کی کارستانی ہے۔ شاید بڑے چوہدری مہر کی طرح تاؤ حشام کے پاس بھی سپ گندل موجود ہے۔''

''موجود نہیں ہے رستم! تاؤ اسے یہاں پچھواڑے میں اگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے کوکب نے بتایا ہے سب کچھ اور مجھے لگتا ہے کہ یہاں تاؤ حشام نے جو کچھ اگایا ہے، وہ صحیح سپ گندل بھی نہیں ہے۔ اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔ میں نے خود اس کے پتے دیکھے ہیں۔ اب یہ تاؤ کی جلد بازی ہی ہے کہ وہ ان پتوں سے دوا بنا رہا تھا بلکہ اس نے اس کا استعمال بھی شروع کرا دیا۔''

نیچے کی منزل پر افراتفری بدستور موجود تھی۔ گاہے بگاہے خالو اعجاز کی روتی بلکتی آواز

بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر یہ آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔ کچھ دیر بعد کوکی اشک بار آنکھوں کے ساتھ اوپر آئی۔ اس نے رستم اور شانی کو نیچے کی صورتِ حال بتائی اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی کہ چوہدری اعجاز کو ہسپتال لے جایا گیا ہے۔

''کیا ہوا انہیں؟'' شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

''کھڑے کھڑے گر گئے ہیں۔ دائیں ٹانگ اور بازو بالکل حرکت نہیں کر رہے۔ اللہ خیر کرے، لگتا ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''تمہارا مطلب ہے...... فالج!''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' کوکی نے کہا۔

خالو اعجاز ایک نہایت برے روپ میں سامنے آئے تھے۔ کچھ عرصے سے ان کا کردار حد درجہ سازشی رہا تھا اور اب اس کے ٹھوس ثبوت بھی مل چکے تھے۔ شانی کے دل میں ان کے لیے عزت تو نہیں رہی تھی مگر ان کے لیے نفرت وہ اب بھی اپنے دل میں نہیں ابھار سکی تھی۔ شاید نفرت کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے گرم آنسو امڈ پڑے۔ اس کے دل سے آواز نکلی...... یا اللہ رحم کر! خطا کاروں کی خطائیں معاف فرما۔ تُو معاف فرمانے والا ہے...... میں اپنے لیے اور خالو اعجاز کے لیے تجھ سے معافی مانگتی ہوں۔''

کچھ دیر آنسو بہانے اور منہ دھونے کے بعد وہ باہر نکلی تو رستم فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے فون بند کیا اور شانی سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''شانی! معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

''کیوں ...... کیا ہوا؟''

''شاید کچھ دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے۔ شاداب کے جو ساتھی بے ہوش لڑکی کو لے کر ہسپتال گئے تھے، انہوں نے وہاں بتا دیا ہے کہ شاداب اور اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے شاداب کے مرنے کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ پولیس پارٹی کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچ جائے گی۔''

آپ کو یہ سب کس نے بتایا ہے؟''

''راجو نے...... وہ ہسپتال کی ایمرجنسی سے فون کر رہا تھا۔''

صرف دس پندرہ منٹ بعد ہی رستم اور شانی اس کوٹھی سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ کوکی، رستم کے لیے تاؤ حشام کا ایک جوڑا لے آئی تھی۔ یہ بوسکی کی لمبی قمیص اور سفید تہہ بند پر مشتمل

تھا۔ ساتھ میں سفید پگڑی بھی تھی۔ یہ لباس رستم کو نہ صرف پورا آ گیا بلکہ اس کے جسم پر سجا بھی..... شانی کے لیے سنبل نے اپنا ایک زرق برق جوڑا دے دیا۔ غالباً یہ کام دار جوڑا اس نے کوکی کی شادی پر پہنا ہوگا۔ ایک اٹیچی کیس میں رستم نے کلاشنکوف، اس کے راؤنڈ اور بقایا دو دستی بم رکھ لیے۔

کوکی ان دونوں کو روکنا چاہتی تھی مگر رستم اور شانی جانتے تھے کہ اب یہاں رکنا شدید خطرے کو دعوت دیتا ہے۔ پولیس کسی بھی وقت اس کوٹھی میں دندنا سکتی تھی۔ وقتِ رخصت کوکی شانی سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''اتنی چھوٹی ملاقات۔ ابھی تو ہم نے آپ کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

راجو کا ایک ملازم موٹر رکشا لے آیا تھا۔ رستم اور شانی رکشا پر بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ اب صبح کے نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام تھا۔ سکولوں، دفتروں اور کارخانوں میں جانے والے لوگ ایک تیز رو سیلاب کی طرح لاہور کی سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ وہ اپنی اپنی سمت میں بہہ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے خبر، اپنی ہی دُھن میں مگن......اور ان کے درمیان رستم اور شانی تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی چل رہے تھے.....لیکن وہ دوسروں کی طرح نہیں تھے۔ ان کا راستہ مختلف تھا۔ ان کی منزل جدا تھی۔ ان کے سینوں میں آگ تھی اور ان کے پیچھے موت تھی۔ بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم ان کو اندر سے مسمار کر رہا تھا اور آنے والی گھڑیوں کی خوفناک سنگینی ان کی دھڑکنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہاں، وہ دوسروں کے ساتھ چل رہے تھے لیکن دوسروں کی طرح نہیں تھے۔

رستم کے بازو سے لگے لگے شانی نے ایک لمحے کے لیے.....صرف ایک لمحے کے لیے سوچا..... کتنا اچھا ہوتا، آج وہ دونوں بھی گھر سے ناشتا کرنے کے بعد اپنے اپنے کام پر جانے کے لیے نکلے ہوتے..... یا پھر راوی کے کنارے، گلشن اقبال کے سرسبز میدانوں میں یا شالامار باغ کی پُرسکون چھاؤں میں کوئی خوشگوار مصروفیت ان کی منتظر ہوتی۔

یہ لاہور کی بھری پُری سڑکوں پر افراتفری کی گھڑیاں تھیں اور یہ افراتفری شانی اور رستم کے لیے مفید تھی۔ اس وقت انہیں کہیں کوئی خاص ناکا بھی نظر نہیں آیا۔ صرف جین مندر اور داتا دربار کے پاس چند پولیس والوں پر نگاہ پڑی۔ جلد ہی وہ راوی کے پل پر پہنچ گئے اور رکشا چھوڑ دیا۔ یہاں بیرونی شہروں کو جانے والی بسیں ایک دومنٹ کا سٹاپ کرتی تھیں۔ رستم اور شانی بھی فوراً میانوالی جانے والی ایک بس پر سوار ہو گئے۔ وہ دونوں دیکھنے میں نو بیاہتا جوڑا ہی لگتے تھے۔ شانی کا چہرہ چمکیلے کناروں والی شال کے گھونگھٹ میں چھپا تھا۔ رستم بھاری بھر

کم پگڑی اور لٹھے کے کھڑکھڑاتے تہ بند کے ساتھ دیہاتی پنجاب کا گبھرو جوان دکھائی دیتا تھا۔ اٹیچی کیس بھی شوخ رنگ کا تھا اور نو بیاہتا جوڑے کے کردار میں رنگ بھرتا تھا۔ یہ بات صرف شانی جانتی تھی کہ اس وقت رستم کی ٹانگ میں شدید تکلیف ہے۔ یہ رستم کی برداشت تھی کہ یہ تکلیف اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی اور نہ اس کی چال سے!

رستم اور شانی کو پچھلی نشستوں پر جگہ ملی۔ یہ بس ایکسپریس نہیں تھی، تاہم یہ زیادہ اسٹاپ بھی نہیں کر رہی تھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔ رستم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پگڑی کا چوڑا پلو منہ کے آگے کر لیا۔ انداز وہی تھا جو لوکل بسوں کے مسافر گرد و غبار سے بچنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ رستم کی بغلی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا اور یہ مسلسل شانی کی پشت سے چھو رہا تھا۔ اس چبھن میں اطمینان اور تحفظ کا بے پناہ احساس بھی تھا۔

''ہم کہاں جائیں گے رستم؟'' شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے سرگوشی کی۔

''ذہن میں کوئی خاص جگہ تو نہیں ہے۔ فی الوقت لاہور سے جتنی دور چلے جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''آپ کی ٹانگ میں زیادہ درد تو نہیں؟''

''آپ نے یاد کرایا ہے تو یاد آیا ہے..... میں بالکل بھولا ہوا تھا۔'' رستم نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں جانتی ہوں، آپ چھپا رہے ہیں۔'' شانی نے کہا اور شال کے اندر سے ہی اپنا ہاتھ رستم کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ وہ شال کے اندر سے ہی ہولے ہولے اس کے گھٹنے کو دبانے لگی۔

''شانی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' رستم نے اس کا ہاتھ روکنا چاہا۔

شانی نہیں رکی۔ ان لمحوں میں اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ رستم کا سارا درد اپنی پلکوں سے چن کر اپنے جسم میں اتار لے۔ اس سے لپٹ جائے اور اس کا ہر دکھ ہر آنسو اپنے اندر جذب کر لے۔

خوف، امید اور بے یقینی کے جھونکوں کے درمیان ان کا سفر جاری رہا۔ ایک موقع پر دو پولیس والے بس میں سوار ہو گئے۔ تاہم ان کی حیثیت صرف مسافروں کی تھی۔ جب تک وہ سرگودھا کے قریب بس سے اُتر نہیں گئے، شانی اور رستم تناؤ کی کیفیت میں رہے۔

بس میں ایک دو اخبار بھی چکرا رہے تھے۔ رستم نے ایک قریبی مسافر سے اخبار لیا اور اس پر بہ ظاہر سرسری نظر ڈالی۔ یہ دوپہر کا اخبار تھا۔ اس میں بھی گلبرگ کے پولیس مقابلے کی

خبر موجود تھی۔ رستم اور اجمل خان کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر شانی کو ایک طرح کے عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ پولیس کی طرف سے ایک بار پھر زور دے کر کہا گیا تھا کہ مفرور ملزم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ ایک امید افزا بات یہ تھی کہ شانی اور رستم کے علیحدہ سے فرار ہونے کا ذکر خبر میں موجود نہیں تھا۔

شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے ناصر، زری اور جہانگیر کی بہت فکر ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟''

''ہوسکتا ہے، وہ ہم سے اچھی پوزیشن میں ہوں۔''

''ہم سے بری پوزیشن میں بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''کہیں ٹھکانے پر پہنچ جائیں، پھر ان سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

میانوالی کے وسیع و عریض بس اڈے سے وہ ایک دوسری بس میں سوار ہوئے اور قریباً دو گھنٹے کے پُراندیش سفر کے بعد عیسیٰ خیل پہنچ گئے۔ بھوک، پیاس سے ان کا برا حال تھا لیکن یہ تقاضے اندیشوں کے شور میں دبے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے چاروں طرف موت کے سائے رینگ رہے ہیں۔ عیسیٰ خیل کے بس اڈے پر چند پولیس اہلکاروں کی کڑی نظروں سے بچتے ہوئے وہ ایک لوکل ٹیکسی میں بیٹھے۔ عیسیٰ خیل کا یہ الگ تھلگ قصبہ رستم کو عارضی قیام کے لیے مناسب محسوس ہو رہا تھا۔ رستم نے شانی کو بتایا کہ اندر کے بازار میں ایک ٹھکانا اس کا دیکھا بھالا ہے۔ وہ ایک دو دن کے لیے وہاں رہ سکتے ہیں۔ یہ ''سلطان رضا ہوٹل'' تھا۔ رستم نے ٹیکسی سیدھی سلطان رضا ہوٹل کے سامنے رکوائی اور شانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اس تین منزلہ ہوٹل کے کمرے صاف ستھرے تھے اور ماحول بھی بہتر لگتا تھا۔

ہوٹل کا موٹا سا سُست الوجود منیجر رستم کو جانتا تھا مگر رستم کی حیثیت سے نہیں۔ اس نے رستم کو چوہدری جلال کہہ کر مخاطب کیا اور اس سے زمینوں کے بھاؤ اور دس مرلہ کوٹھیوں پر آنے والی لاگت وغیرہ پوچھی۔ جلد ہی رستم اور شانی دوسری منزل کے ایک آرام دہ کمرے میں تھے۔ اجمل خان اور دراج کی موت کا دکھ تو ایک لمحے کے لیے بھی شانی سے جدا نہیں ہوا تھا، تاہم ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس دکھ کو آنکھوں کی راہ ملی اور شانی نے بستر کی چادر میں چہرہ چھپا کر دیر تک آنسو بہائے۔ یہاں تک کہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا اور وہ آئندہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پر رستم موجود تھا اور وہ بھی شاید اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کلاشنکوف اٹیچی کیس میں سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس کے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔

شانی بستر پر کھسک کر تھوڑا سا آگے گئی اور نیم دراز رستم کے بازو سے لگ گئی۔ اس کے مضبوط سینے پر سر رکھ کر شانی کو لگا کہ مرنا بہت آسان ہے۔ مرنے کا خوف تو ہر ذی روح میں موجود ہوتا ہے۔ شانی میں بھی موجود تھا مگر جب سے وہ رستم کے قریب تھی، اسے موت کے معنی بدلے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

رستم نے بڑی نرمی سے اپنی انگلیاں شانی کے سر کے ریشمی بالوں میں داخل کر دیں۔

شانی نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''رستم! یقین نہیں آ رہا کہ پچھلے دو دن میں ہم نے اتنی موتیں دیکھی ہیں...... اور آخر میں شاداب کی موت اور خالو اعجاز پر فالج کا حملہ......''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شاداب جس طرح کی زندگی گزار رہا تھا، وہ عام طور سے اسی طرح کے انجام پر ختم ہوتی ہے۔ اپنی کوٹھی پر اس نے عیاشی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہاں اس نے ماڈل لڑکیاں جمع کی ہوئی تھیں۔ ان سے کسی شیمپو کے لیے اشتہاری فلم وغیرہ بنوا رہا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سب عیش کرنے کا ڈھکوسلا تھا۔ یہ لڑکی جو اس کے ساتھ ہی بے ہوش ہو کر لاہور پہنچی ہے، یہ ان ماڈل لڑکیوں میں شامل تھی۔ یہ بہت شرما رہی تھی۔ باقی لڑکیاں شاداب کو مشورہ دے رہی تھیں کہ وہ اس کی شرم اُتارنے کے لیے اسے کہیں گھمانے پھرانے کے لیے لے جائے۔ گھمانے پھرانے کا اینڈ یہ ہوا ہے، جو آج صبح ہم نے دیکھا ہے......''

شانی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے رستم...... اس لڑکی اور شاداب کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں سپ گندل کا بھی دخل ہے۔ شاداب کا چہرہ اور لڑکی کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ نارپور کی حویلی میں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہوا ہے۔ مہر جی اور اکبرا کے چہرے آج تک میری نظروں میں گھومتے ہیں۔ یہ سپ گندل انسان کو حیوان بناتی ہے اور صورتوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے......''

شانی کی آنکھوں میں وہ بیتا ہوا منظر گھوم گیا جب نارپور کی حویلی میں مہر کا ملازم خاص اکبرا سپ گندل کے نشے میں چُور شانی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ قیامت کے لمحے مر کر بھی شانی کے حافظے پر نقش رہنا تھے۔

''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' شانی نے کہا۔ ''شاداب نے تو سپ گندل استعمال کی ہوگی...... مگر اس لڑکی نے کیوں کی؟''

''ہوسکتا ہے، شاداب نے اسے زبردستی کرا دی ہو۔ ایسے لوگ ہر حد تک چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، لڑکی کے چہرے اور جسم پر نیل تھے۔ اسے بری طرح نوچا

کھسوٹا گیا تھا۔ اس پر سختی کی گئی تھی۔"

شانی کی نگاہوں میں بے ہوش لڑکی کا سراپا گھوم گیا اور وہ کانپ گئی۔ واقعی اس کا جسم انسانیت سوز سلوک کا گواہ تھا۔ وہ بڑی کراہت سے سوچنے لگی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مرد اور عورت کا انتہائی خوبصورت اور دل نواز تعلق ایسا رخ کیوں اختیار کرتا ہے؟ وہ رخ جس میں خوشی کے بجائے تکلیف، محبت کے بجائے نفرت اور بالآخر سرشاری کے بجائے ندامت ہوتی ہے...... اسے چوہدری فاخر یاد آیا۔ قاسم برلاس یاد آیا اور چوہدری بشیر یاد آیا۔ وہ بے ساختہ رستم کے بازو سے کچھ اور بھی چمٹ گئی۔ وہ بھی مرد تھے اور رستم بھی ایک مرد تھا...... مگر کتنا فرق تھا رستم میں اور ان میں! وہی فرق جو خوشبو اور بدبو میں ہوتا ہے، جو زہر اور امرت میں ہوتا ہے۔

اس نے رستم کے سینے سے سر لگائے لگائے اپنی آنکھیں بند کیں اور عجیب لہجے میں بولی۔ "رستم! زندگی پر سے میرا ایمان اٹھ چکا تھا۔ مجھے ہر مرد کے چہرے میں فاخر کا چہرہ نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسانے والا، جانور کی طرح عورت پر جھپٹنے والا...... اسے روندنے والا اور اپنے گندے بوجھ سے اس کا دم روکنے والا...... میں مرد کے سائے سے نفرت کرنے لگی تھی۔ مگر پھر مجھے آپ ملے...... مجھے پتا چلا کہ تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ ایسے مہربان ہاتھ بھی ہوتے ہیں جو جسم کو چھو لیں تو مُردہ تن زندہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی پیار بھری نظریں بھی ہوتی ہیں جن کو محسوس کر کے، اپنے عورت ہونے پر فخر ہونے لگتا ہے۔ آپ میرے مسیحا ہیں رستم! مجھے اعتراف کرنے دیں کہ آپ نے مجھے پھر سے جینا سکھایا ہے۔"

"اور آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے، اس کا آپ کو پتا نہیں۔"

"مجھے سب پتا ہے رستم! پلیز، آج آپ صرف میری بات سنیں۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے اسی دل گداز لہجے میں بولی۔ "آج آپ وعدہ کریں کہ اب کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوں گے۔ ایک گھڑی کے لیے نہیں، ایک پل کے لیے نہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں...... پلیز رستم...... وعدہ کریں۔"

وہ رستم سے پیوست ہو گئی۔ اس کا رخسار رستم کے سینے میں دھنس رہا تھا۔

نیچے کسی سڑک سے کوئی ایمبولینس یا پولیس موبائل سائرن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ رستم نے شانی کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "تو آپ بھی مجھ سے ایک وعدہ کریں۔"

"بولیں۔"

"آپ نے خود کہا تھا کہ زندگی کیسی بھی ہو، زندگی ہوتی ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ اگر آپ کو زندہ رہنے کا موقع ملا تو آپ زندگی کو ٹھکرائیں گی نہیں۔"

"یہ وعدہ تو آپ کو بھی کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی وعدہ کرتا ہوں لیکن شرط تو یہی ہے نا کہ...... اگر زندہ رہنے کا موقع ملا تو...... اور یہ شرط بہت کڑی ہے میرے لیے۔"

رستم کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ وہ بہت دیر تک ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر کوئی جواب موصول نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ خود بھی جہانگیر سے رابطے کی بہت کوشش کرتا رہا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شانی جانتی تھی، وہ ناصر اور جہانگیر کے لیے بہت پریشان ہے اور اس سے بھی زیادہ آپو زاہدہ کے لیے۔ کیونکہ وہ ایک عورت تھی اور اس کے ساتھ ایک کم عمر بچہ تھا۔

ویٹر سے کہہ کر رستم نے نیچے بازار سے مرہم پٹی کا سامان منگوایا۔ رستم کے بہت منع کرنے کے باوجود شانی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹانگ کی بینڈ ایج کی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی اپنی زخمی انگلیاں بھی تکلیف سے اینٹھتی رہیں مگر اس تکلیف میں ایسی لذت تھی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سارا جسم ایسی ہی تکلیف سے بھر جائے۔ وہ رستم کے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے اپنی جان سے چلی جائے۔ مرہم پٹی کے بعد اس نے رستم کا سوجا ہوا پاؤں اپنی گود میں رکھا اور اسے ہولے ہولے دبانے لگی۔ اس کی نرم گداز ہتھیلیاں جیسے رستم کے تلوے کو چوم رہی تھیں۔ رستم نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "پلیز رستم! مجھے نہ روکیں۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ رستم کے ہونٹ سل گئے۔ رات تیسرے پہر رستم تو سو گیا لیکن شانی جاگتی رہی۔ ایک پہرے دار کی طرح وہ رستم کے اردگرد موجود رہی۔ پھر اس نے مصلیٰ بچھایا اور خدا کے حضور سربسجود ہو گئی۔ وہ ان پیاروں کے لیے دعا مانگتی رہی جو پچھلے چند دنوں میں ان سے جدا ہو گئے تھے۔ ڈولا، اجمل، دراج...... سب کے نام اس کی زبان پر آئے اور دعا بن گئے۔ پھر وہ ان ساتھیوں کے لیے خیر مانگنے لگی جو زندہ تھے مگر ان دونوں ہی کی طرح موت کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور تو اور شانی کی اس نیم شب کی دعا میں خالو اعجاز بھی شامل ہو گیا۔ خالو اعجاز نے جو کچھ کیا تھا، وہ ایک زہریلے تیر کی طرح شانی کے سینے میں پیوست تھا۔ مگر وہ تو تیر مارنے والے کا بھی برا نہیں چاہ سکتی تھی۔ یہ اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔

☆=======☆=======☆

اگلے روز انہوں نے کمرے میں ہی ناشتا تھا۔ شانی کی خواہش تھی کہ وہ اور رستم شدید ضرورت کے وقت ہی کمرے سے باہر نکلیں۔ دوپہر کا کھانا بھی کمرے میں ہی کھایا گیا۔
دوپہر کے وقت رستم نے ویٹر سے اخبار منگوایا۔ یہ لاہور ایڈیشن نہیں تھا اور اس میں رستم اور شانی کی دلچسپی کی کوئی خبر موجود تھی۔ بس، اندر کے صفحوں میں ایک چھوٹی سی اطلاع موجود تھی۔ ''زہریلی طاقت بخش دوا کھانے سے نوجوان صنعت کار ہلاک۔ اس کی ساتھی ہسپتال میں داخل۔''

اس اطلاع سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاداب کی ساتھی ماڈل گرل بچ گئی ہے۔ خبر میں سپ گندل کے حوالے سے کسی قسم کی تفصیل موجود نہیں تھی۔

شانی اور رستم کی اگلی شب بھی شدید غم اور کرب کے عالم میں گزری۔ رستم کی ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ گھٹنے سے نیچے پوری ٹانگ میں ورم آ گیا تھا۔ شانی مسلسل رستم کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ تیسرے روز صبح نو بجے کے لگ بھگ انہیں پہلی اچھی خبر ملی۔

رستم کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بری طرح چونک گیا۔ یہ ناصر کی آواز تھی۔ ''ہیلو ناصر! کہاں ہو تم؟'' رستم ٹانگ کی پرواہ کیے بغیر بستر سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ کہاں ہیں بھائی؟''

''میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم اپنا بتاؤ۔ آپو زاہدہ اور زری کہاں ہیں؟''

''وہ سب خیریت سے ہیں۔'' ناصر کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم لوگ لاہور میں ہو؟''

''نہیں بھائی! لاہور سے بہت دور ہیں۔ آپ سمجھیں کہ رحمت کے دو فرشتے ہمیں مل گئے ہیں۔ یہ ہمیں لاہور سے اٹھا کر کرم ایجنسی کے آزاد علاقے میں لے آئے ہیں...... افغان

بارڈر کے بالکل پاس! لگتا ہے کہ اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

''سو فیصد بھائی! میں فون پر آپ کو اس جگہ کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ بس آپ سمجھیں کہ وہاں سے افغان بارڈر صاف نظر آتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ ہم بارڈر پار کر سکتے ہیں۔'' رستم نے اس حوالے سے ناصر کو تھوڑا سا مزید کریدا تو ناصر نے خرلاچی کے نواح میں کسی خشک نالے اور تین پہاڑیوں کا ذکر کیا۔ ان دونوں کی گفتگو سے شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اور ناصر پہلے بھی اس سرحدی علاقے میں جا چکے ہیں۔

''اب تم کس جگہ سے بات کر رہے ہو؟''

''میں اٹھارہ بیس میل پیچھے پارہ چنار کے قصبے میں آیا ہوا ہوں۔ صرف آپ کو فون کرنے کے لیے...... پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے رابطہ ہوا ہے۔''

''تم نے بتایا نہیں۔ تمہیں یہاں لانے والے لوگ کون ہیں؟''

''فون پر ان کے بارے میں بتانا بھی مناسب نہیں۔''

''کوئی اشارہ دو۔''

ناصر چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''بھائی! ان رحمت کے فرشتوں کو بھیجنے والا وہی ہے جس سے اقبال ٹاؤن میں آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔ آپ کا دل دکھا تھا اور اس کا بھی۔ شاید آپ نے دل ہی دل میں اسے بے وفا بھی جانا ہو۔ اس کی دوستی پر شک بھی کیا ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟''

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اپنے روٹھے یار حاجی حیات کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما۔ دل میں ایک لہر سی اٹھی۔ کل رات ہی وہ حاجی کو یاد کرتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا، کیا وہ اپنا راستہ ہمیشہ کے لیے جدا کر چکا ہے؟ کیا ان مشکل ترین گھڑیوں میں بھی وہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھے گا؟ آج اس کا جواب مل گیا تھا اور اتنے اچھے طریقے سے ملا تھا کہ رستم خوشگوار حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ یہ بہت اہم اور بے حد تسلی بخش خبر تھی۔ اس کے ساتھی بخیریت تھے۔ رستم نے یکا یک خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے یقین تھا کہ ناصر نے خیریت کی جو اطلاع دی ہے، وہ بالکل درست ہے۔

''آپ چپ کیوں ہو گئے؟'' فون پر ناصر کی آواز ابھری۔

''یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں آپ کو فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ قدرت کو ہماری سلامتی منظور

تھی۔ ہم لاہور سے نکلنے کے بعد سوزوکی لوڈر پر گوجرانوالہ کی طرف جا رہے تھے کہ فون پر ان لوگوں سے رابطہ کیا۔ اس کے بعد سب کچھ ان لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی جان پر کھیل کر انہوں نے ہمیں یہاں پہنچایا ہے۔ کوہاٹ روڈ پر ایک ناکے پر گولی بھی چلی جس میں ہمارا ایک مددگار زخمی ہوا۔ آپ ملیں گے تو تفصیل بتاؤں گا۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"ہمارے مددگار آپ سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو بھی حفاظت سے یہاں پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟"

رستم کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری۔ "جب تم فون پر اپنے ٹھکانے کا نہیں بتا سکتے تو میں کیسے بتاؤں؟"

"آپ بھی کوئی اشارہ دے دیں۔"

"میرے سارے اشارے تو اسی بندے کی طرف جاتے ہیں جس سے میں نے حساب کتاب کرنا ہے۔" رستم کا مطلب ڈپٹی ریاض سے تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب وحشت تھی۔

دوسری طرف ناصر خاموش ہو گیا۔ وہ رستم کے دل کا بھیدی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ رستم کسی صورت حاجی حیات اور اس کے ساتھیوں کو اپنا ٹھکانا نہیں بتائے گا۔ حاجی حیات سے رابطہ ہو جاتا تو پھر وہی قضیہ چھڑ جاتا تھا۔ حاجی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ رستم وقتی طور پر رُوپوش ہو جائے۔ ڈپٹی سے بدلے کا خیال دل سے نکال دے اور یہ رستم کو کسی طور قبول نہیں تھا۔

ریسیور سے ناصر کی بوجھل آواز ابھری۔ "آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں بھائی۔ آپ نے کہا تھا، یہ مشترکہ لڑائی ہے۔ آپ اکیلے نہیں لڑیں گے۔"

"لڑائی تو ایک ہی ہے یار...... سمجھو کہ مورچے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ تم پر میرے ساتھیوں، میری بہن اور بھانجے کی ذمے داری ہے۔ تم اپنے مورچے پر ڈٹے رہو۔ میں بھی اگر سرخرو ہو گیا تو تم لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

ناصر خاموش تھا۔ شاید اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے مختصر الفاظ میں رستم کو بتایا کہ آپو زاہدہ اور چھوٹا سرمد ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان دونوں کو پہلوان نے گوجر خان کے قریب بھائی اکرام کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ بھائی اکرام اور پہلوان کے درمیان رابطہ تھا اور بھائی اکرام پہلے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ خبر رستم کے لیے اطمینان بخش تھی۔ کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر رستم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"اب تمہارے مددگار کہاں ہیں؟"

"آس پاس ہی ہیں۔" ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ان میں سے ایک واپس چلا گیا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ رنگ والی میں اس کا ایک قریبی ساتھی موجود ہے اور حویلی میں آتا جاتا ہے۔ وہ کوشش کرے تو مُنے کو بھی حویلی سے نکال کر یہاں لایا جا سکتا ہے۔" مُنے کی بات کرتے کرتے ناصر کو جیسے ایک دم شانی کا خیال آیا۔ وہ بولا۔ "بھابی کہاں ہیں؟"

"وہ میرے ساتھ ہی ہیں۔ سو فیصد خیریت سے ہیں۔"

"بات کر سکتا ہوں؟"

رستم نے فون شانی کی طرف بڑھایا۔ شانی نے "ہیلو" ہی کہا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک ہوئی۔ رستم نے فون شانی سے واپس لے لیا اور بولا۔ "اچھا برادر! کوئی آیا ہے۔ موقع ملا تو دوبارہ بات کریں گے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

"کون؟" رستم نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"میں جی، ویٹر گلزار!" مدھم آواز ابھری۔

رستم نے چند لمحے سوچا پھر پہلو ٹٹول کر پسٹل کی موجودگی کا یقین کیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ویٹر گلزار بتیسی نکالے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور سانولا سا شخص تھا۔ ویٹر گلزار بولا۔ "یہ ڈسپنسر ماجد ہے جی۔ میرا پرانا دوست ہے۔ سامنے بازار میں اس کی ڈسپنسری ہے۔ آپ کو چوٹ شوٹ لگی ہے نا۔ میں نے کہا شاید آپ کو ضرورت ہو۔"

رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ "اگر ضرورت ہوتی تو میں خود کہہ دیتا۔"

"م...... معافی چاہتا ہوں جی...... لیکن مجھے آپ کی فکر تھی۔"

رستم کو لگا شاید اس نے اضافی ٹپ کے لالچ میں ایسا کیا ہے۔ عموماً ہوشیار ویٹر اس طرح کے کام کرتے رہتے ہیں۔ ڈسپنسر کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں مرہم پٹی کا مکمل سامان موجود تھا۔ اب چونکہ وہ آ ہی گیا تھا، رستم نے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔ عین ممکن تھا کہ ڈسپنسر بہتر طور پر اس کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر سکتا۔ ڈسپنسر مقامی طرز کے لباس میں تھا۔ شانی ساتھ والے کمرے میں تھی۔ مگر رستم جانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن رہی ہے۔

رستم نے ڈسپنسر کو اپنی متاثرہ پنڈلی دکھائی۔ "یہاں کیا ہوا ہے جناب؟" اس نے رستم کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بس چوٹ لگ گئی ہے۔ تم زیادہ سوال جواب نہ کرو۔ پٹی کھول کر زخم دیکھو اور کچھ کر

سکتے ہو تو کرو۔''

ڈسپنسر رستم کی پٹی کھولنے میں مصروف ہوگیا۔ یکایک رستم اس کے متعلق شک میں مبتلا ہوگیا۔ یوں لگا کہ ڈسپنسر ہونے کے باوجود اسے پٹی کھولنی نہیں آتی۔ وہ پٹی کو ساتھ ساتھ رول کرنے کے بجائے بکھیرتا جا رہا تھا۔ رستم نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ یکایک اسے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ اسے ڈسپنسر کا ایک پہلو کافی بھاری محسوس ہوا۔ شاید کرتے کے نیچے شلوکے میں کوئی ہتھیار تھا۔

رستم کے چونکنے کو غالباً ڈسپنسر نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''پٹی بالکل چڑی (چپکی) ہوئی ہے۔ میں گرم پانی لے کر آتا ہوں جناب۔''

وہ تیزی سے واپس مڑا لیکن وہ رستم سے زیادہ تیزی نہیں دکھا سکتا تھا۔ رستم کے دل نے گواہی دی کہ یہ ڈسپنسر نہیں، سادہ کپڑوں میں پولیس والا ہے اور اگر ایک سیکنڈ کی تاخیر ہوئی تو وہ کمرے سے باہر ہوگا۔ رستم نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ اس شخص کا ہاتھ برق رفتاری سے اپنے پہلو کی طرف بڑھا۔ شاید وہ شلوکے میں اپنا آتشیں ہتھیار نکالنا چاہتا تھا۔ اب شبے کی گنجائش مطلق نہیں تھی۔ رستم نے بڑی بے رحمی سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ دھم کی زوردار آواز کے ساتھ وہ لڑکھڑا گیا اور گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی رستم کی ٹانگ کی طوفانی ضرب ویٹر گلزار کے سینے پر لگی۔ وہ اچھل کر باتھ روم کے دروازے سے لگا اور دروازہ کھولتا ہوا اندر جا گرا۔ اس موقع پر شانی نے بھی کردار ادا کیا وہ تیزی سے سامنے آئی اور اس نے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ مبینہ ڈسپنسر کو رستم کی دوسری ضرب اپنی گردن پر سہنی پڑی۔ یہ بھاری پسٹل کی ضرب تھی۔ یہ ضرب اس شخص کے لیے کافی ثابت ہوئی اور وہ پٹ سے اوندھے منہ قالین پر گر کر ساکت ہوگیا۔ رستم نے اس کے شلوکے سے ریوالور کھینچ لیا۔

اندر ویٹر دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ''بچاؤ بچاؤ!'' اس نے دو بار زور سے کہا۔ مگر اس کی آواز باتھ روم کے مختصر خلا میں ہی گونج کر رہ گئی۔ ''اس کا دھیان رکھیں شانی۔'' رستم نے بے سدھ ڈسپنسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور باتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔ بدحواس ویٹر دروازہ کھلتے ہی باہر کو بھاگا۔ وہ دس گنا تیزی بھی دکھاتا تو شاید رستم سے نہ بچ سکتا۔ رستم نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ ڈکراتا ہوا دوبارہ باتھ روم میں گر گیا۔ اس کا سر اڑیسہ کے بالکل قریب تھا۔ رستم نے سائیلنسر لگے پسٹل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ ''آواز نکالی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔'' وہ ہیجانی انداز میں اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگا۔ اس کا منہ بھاڑ کی

طرح کھل گیا تھا۔ طوطے جیسی ناک زرد تھی جیسے اس پر رنگ کر دیا گیا ہو۔ رستم نے اس کے سینے پر پاؤں رکھا تو وہ چکنے فرش پر تھوڑا سا اوپر کو کھسک گیا اور اس کا سر باقاعدہ اڑیسہ (پاٹ) کے اندر چلا گیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ ''خدا کا واسطہ! مجھے گولی نہ مارنا، میرا کوئی قصور نہیں۔''

''تو پھر میرا قصور ہے۔ یہ تیرا باپ، پولیس والا تیرے ساتھ کیوں آیا ہے؟''

''نہیں، یہ تو ڈسپنسر ہے.....''

ابھی فقرہ ویٹر کے منہ میں ہی تھا کہ رستم نے بے دریغ اس کے منہ پر پسٹل کی ضرب لگائی۔ اس کا دانت ٹوٹنے کی آواز آئی۔ منہ پھٹ گیا اور خون ''پاٹ'' میں بہہ نکلا۔

''پلیز رستم!'' شانی کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ رستم کے عقب میں تھی۔ شانی کی نگاہ کو باتھ روم کے خون آلود منظر سے بچانے کے لیے رستم نے باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ ویٹر اب باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کا سر بہ دستور پاٹ کے اندر تھا۔

رستم نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھنکارا۔ ''دیکھ...... مجھے ایک ایک لفظ سچ بتا دے ورنہ ابھی تیرا مغز اس پاٹ میں بہتا ہوا نظر آئے گا۔''

ویٹر خرانٹ اور سخت جان تھا مگر رستم کے لب و لہجے نے اسے چند سیکنڈ میں توڑ دیا، وہ گھگھیایا۔ ''مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ کو بال بچے کا واسطہ!''

''یہ پولیس والا ہے نا؟'' رستم نے پوچھا۔ ویٹر نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اور کتنے بندے ہیں اس کے ساتھ؟''

''اکیلا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں اور کوئی نہیں۔''

رستم نے ایک اور بے رحم ٹھوکر اس کے منہ پر ماری اور پاؤں عین اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''اس پیو کو کیوں لایا ہے یہاں؟''

جواب میں ویٹر نے ہکلاتے گھگھیاتے اور خون تھوکتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اخبار میں رستم کی پرانی تصویر دیکھ کر اور رستم کے زخم کے بارے میں جان کر اسے کچھ شک ہوا تھا۔ اسے لگا کہ شاید یہ چوہدری جلال ہی وہ نامی گرامی ڈکیت ہے جسے پنجاب پولیس ہر طرف ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا مشہور و معروف بندہ اس چھوٹے سے شہر کے اس چھوٹے سے ہوٹل کے اس کمرے میں ہو اور وہ خود اسے سروس مہیا کر رہا ہو۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کا یہ تذبذب رستم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ ویٹر گلزار نے تھانے میں اطلاع دینے یا منیجر کو بتانے کے بجائے اپنے طور پر اپنا

شک رفع کرنا چاہا۔ وہ اپنے اس دوست اے ایس آئی کو سب کچھ بتا کر یہاں لے آیا تا کہ وہ رستم سے مل کر کوئی رائے قائم کر سکے۔

ویٹر گلزار کی بات سے رستم کو یقین ہو گیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ مگر اب اس ہوٹل سے جلد از جلد نکلنا رستم اور شانی کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ رستم نے گلزار کو گریبان سے کھینچ کر پاٹ میں سے نکالا اور فلش کر کے اس کا خون اندر سے صاف کر دیا۔

''تم نے چوں چراں بھی کی نا تو آج شام تک تمہاری نماز جنازہ ادا ہو جائے گی۔'' رستم نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور باتھ روم کے ایک کونے میں سٹ کر بیٹھ گیا۔ رستم نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شانی سے کہا۔ ''ایک کام کریں۔ اٹیچی میں نائیلون کی رسی پڑی ہے، وہ مجھے دیں۔''

شانی تیزی سے اٹیچی کی طرف بڑھ گئی۔ رستم کا ارادہ تھا کہ گلزار کی مشکیں کس کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر باتھ روم میں بند کر دے...... مگر جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ رستم بھی چکرا گیا۔ غالباً ویٹر گلزار کا حد سے بڑھا ہوا خوف ہی اس بکے لیے مہلک ثابت ہوا۔ رستم کی توجہ دو سیکنڈ کے لیے شانی کے ہاتھ میں پکڑی رسی پر مبذول ہوئی۔ گلزار کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح باتھ روم سے برآمد ہوا اور کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

کچھ کہنے یا کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ سائیلنسر لگا پسٹل رستم کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ٹرائیگر دبایا۔ گولی گلزار کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی اور کھوپڑی میں گھس گئی۔ وہ پہلے دروازے سے ٹکرایا پھر پہلو کے بل قالین پر گرا۔ اس کا سر بے ہوش پڑے اے ایس آئی کے پاؤں میں آیا تھا۔ شانی کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور اس نے ایک ہاتھ سے اپنا منہ مضبوطی سے دبا لیا تھا۔ گلزار کی گردن سے ابلتے خون نے چند سیکنڈ میں قالین کو داغ دار کر دیا......

''یہ کیا ہوا رستم؟'' شانی ہکلائی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ یہ دستک اَن گنت اندیشوں کو ابھار گئی۔ سائیلنسر لگے پسٹل کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ باہر سنی جا سکتی۔ عین ممکن تھا کہ گلزار کے دروازے سے ٹکرانے کی آواز نے کسی کو متوجہ کیا ہو یا پھر یہ گلزار اور اے ایس آئی کا کوئی ہم راز ساتھی ہی ہو۔ رستم نے گلزار کا بے جان جسم گھسیٹ کر دروازے کے سامنے سے ہٹایا۔ شانی کو ساتھ والے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور کلاشنکوف بیڈ کے نیچے سے نکال کر بیڈ پر رکھ دی اور اوپر چادر ڈال دی۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔

''کون؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں جی؟'' باہر سے ایک شائستہ آواز آئی۔

رستم نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ سامنے ایک دبلا پتلا لڑکا کھڑا تھا۔ عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہو گی۔ ''ایکسکیوز می بھائی جان! کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ ابھی بہت شور ہوا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''کین آئی ہیلپ یو پلیز!'' لڑکے نے بڑے بااخلاق انداز میں پوچھا۔

''نہیں، شکریہ...... میں ٹھیک ہوں۔'' رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا اور لڑکے کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

اس زندگی سے بھرپور ہنستے مسکراتے لڑکے کو کیا معلوم تھا کہ وہ کتنے مہیب خطرے کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا ہلکا سا شک اور اس کی تھوڑی سی دلیری اسے بے وقت موت کے جبڑوں میں پہنچا سکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس لڑکے کو دیکھ کر رستم کو اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ کبھی وہ بھی تو اسی طرح زندگی اور خوشی سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔ اس کی باتوں سے شہد ٹپکتا تھا اور اس کی آنکھوں سے توانا روشنی پھوٹتی تھی۔ وہ بھی اسی طرح ہر وقت کسی کا دکھ بانٹنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ مگر پھر وقت نے اس سے اس کا سارا اخلاق، ساری مسکراہٹ اور ساری خوشی چھین لی تھی۔ اس کے بدلے، اس کے ہاتھ میں لہو ٹپکاتا ہوا خنجر تھمایا تھا اور اس کے پاؤں سے بگولے باندھ دیئے تھے۔

اگلے پانچ منٹ کے اندر اندر رستم اور شانی اس کمرے کو چھوڑنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ رستم نے کلاشنکوف ایک بار پھر اٹیچی کیس میں رکھ دی تھی۔ بے ہوش اے ایس آئی اور مردہ ہیڈ ویٹر کی لاش باتھ روم میں پہنچا دی گئی تھی۔ ہیڈ ویٹر گلزار کی موت کا شانی کے ساتھ ساتھ رستم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ مگر جو کچھ ہوا، اس میں زیادہ دخل گلزار کی غلطی کا تھا اور یہ اس کی پہلی غلطی نہیں تھی۔ پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ رستم کو شناخت کرنے کے لیے فقط ایک ڈھیلے ڈھالے اے ایس آئی کو لے کر اس کمرے میں گھس آیا تھا۔

رستم اور شانی نیچے لابی میں پہنچے۔ ریسپشن پر موجود شخص رستم کے ہاتھ میں اٹیچی کیس دیکھ کر چونکا۔ ''آپ جا رہے ہیں چوہدری صاحب؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''نہیں...... ابھی کسی کام سے نکلے ہیں۔ شام تک آ جائیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی رستم نے چند بڑے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ رکھ لو۔ رسید واپسی پر لے لوں گا۔''

''او کے جناب!'' اسسٹنٹ منیجر مطمئن ہو گیا۔ رستم اور شانی دروازے کی طرف بڑھے تو وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''کمرے کی صفائی کروا دوں جی؟''

''نہیں، ضرورت نہیں۔'' رستم نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ بلڈنگ کی سائیڈ پر آئے۔ یہاں پارکنگ موجود تھی۔ ایک قطار میں دس بارہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اب دن کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ ستمبر کی شروعات تھی۔ فضا میں گہرا حبس موجود تھا۔ رستم نے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ایک اچھی حالت کی سیاہ مرسیڈیز گاڑی میں اسے ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ شکل وصورت سے ڈرائیور لگتا تھا۔ گاڑی پر لاہور کا نمبر تھا۔ رستم آگے بڑھا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اٹیچی کیس پچھلی نشست پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اگلا دروازہ کھول کر وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نما شخص حیران نظروں سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں شانی بھی پچھلے دروازے سے گاڑی میں چلی آئی۔ رستم نے گول چہرے والے جواں سال ڈرائیور نما شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھ! میری قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ہے لیکن اس پستول سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر نقصان پہنچے گا تو تب...... جب تُو میری بات نہیں مانے گا۔''

جواں سال شخص کا چہرہ ایک دم ہلدی ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولنے اور باہر نکلنے کے لیے اضطراری حرکت کی مگر رستم نے اتنی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑا کہ وہ پتھر ہو کر رہ گیا۔ رستم پھر پھنکارا۔ ''دیکھ! میں ابھی پانچ منٹ پہلے اوپر کمرے میں ایک بندہ قتل کر چکا ہوں...... اب تجھے مارنا بھی میرے لیے مشکل نہیں۔ جان بچانی ہے تو گاڑی اسٹارٹ کر اور پارکنگ سے نکل۔'' رستم کے لب ولہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس شخص کا ہاتھ فوراً گاڑی کے اگنیشن کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بولا۔ ''میں غریب بندہ ہوں۔ مجھ پر رحم کرو جی۔''

''تم خود پر رحم کرو گے تو رحم ہی ہو گا۔ بس چپ چاپ چلتے جاؤ۔''

اس نے لرزتے کانپتے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور سڑک پر آ گیا۔ رستم نے دیکھا، وہی لڑکا جو تھوڑی دیر پہلے کمرے کے دروازے پر ملا تھا اب ہوٹل کے گیٹ پر کھڑا جوس والے سے انار کا جوس پی رہا تھا۔ اس کا اپنا رنگ بھی قندھاری انار سے ملتا جلتا ہی تھا...... زندگی اور رعنائی سے بھرپور! اس نے خوش دلی سے رستم کو سلام کیا۔ رستم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔ رستم کو یوں لگا جیسے یہ خوش باش نوجوان کسی اور دنیا کا باسی ہے اور وہ کسی اور دنیا کا رہنے والا ہے...... یا پھر...... کسی اور

دنیا کی طرف جا رہا ہے۔

ڈرائیور پھر ہکلایا۔ ''سر جی! مجھ کو چھوڑ دیں جی۔ یہ گڈی جہاں جی کرے لے جائیں۔ میں بالکل شور نہیں ڈالوں گا۔''

شانی عقب میں تھی، ڈرائیور کی آواز اور اس کے ڈیل ڈول نے اسے چونکا دیا۔ اسے ایک بھولا بسرا چہرہ یاد آ گیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' شانی نے پوچھا۔

نوجوان ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا اور شانی کے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ اس نیم احمق سے کافی عرصہ پہلے مل چکی تھی۔ جب وہ لاہور میں قاسم برلاس اور قاسم جیسے دوسرے شکاریوں سے جان بچاتی پھر رہی تھی تو رکشا ڈرائیور زکریا کے گھر میں پناہ گزین ہوئی تھی۔ اس چند روزہ قیام میں اس کا واسطہ لفافہ میکر جنتے اور اس کے اول جلول بیٹے گلابے سے پڑا تھا۔ یہ گلابا ہی تھا۔ گلابے نے بھی شانی کو دیکھ لیا تھا اور اب اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا...... پھر اس کے حماقت مآب چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی۔ ''تت، تم!'' وہ ہکلایا۔

''سامنے دیکھو...... اُلو کے پٹھے۔'' رستم دہاڑا۔

گلابے نے سامنے دیکھ کر تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور پرانے ماڈل کی یہ مرسیڈیز ایک نئی نکور ہنڈا کار کا بوسہ لیتے لیتے رہ گئی۔

''تم ان کو جانتے ہو؟'' رستم نے گلابے سے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... جی ہاں۔''

''جانتے ہو یا نہیں؟'' رستم نے پھنکار کر پوچھا۔

گلابے کی آواز جیسے اس کے گلے میں ہی پھنس گئی تھی۔ اس کے بھدے ہونٹ ہل رہے تھے مگر وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''ہاں رستم! میں نے آپ سے ایک مرتبہ لاہور کے رکشا ڈرائیور زکریا کا ذکر کیا تھا نا...... یہ اسی کا بیٹا ہے گلابا۔ میں کچھ دن ان لوگوں کے ہاں رہی تھی۔''

''سلاماں لیکم جی...... سلاماں لیکم۔'' گلابے نے پیچھے مڑ کر شانی کی طرف دیکھا اور اپنا کانپتا ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

''اوئے آگے دیکھ باندر کے پُتر!'' رستم نے اس دفعہ باقاعدہ گلابے کی گردن پر جھانپڑ مارا۔

گلابے نے ایک بار پھر تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھتے چڑھتے بچی۔ نوجوان گلابے کی پیشانی پر پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ آنکھوں سے نیچے پہنچتے

پہنچتے اس پسینے میں سرے کی کچھ کالک بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر گھگیایا۔ ''میں نے آپ کو پہچان لیا ہے شہناز بی بی۔ اب تو یہ گھر کی بات ہی نکل آئی ہے۔ آپ جانتی ہیں، میں بالکل بڑا (برا) بندہ نہیں ہوں۔ آپ مجھ کو معافی دے دیں جی۔ مجھ کو جانے دیں۔ یہ گڈی جہاں مرضی لے جائیں۔''

شانی کے ذہن میں وہ سارے منظر گھوم گئے جن کا تعلق رکشا ڈرائیور زکریا کے گھر سے تھا۔ گلابے کی ماں جنتے لفافے بناتی تھی اور اپنے ساتھ شانی کو بھی اس کام پر لگاتی تھی۔ شانی کے حوالے سے جنتے کا رویہ ''مالِ مفت، دلِ بے رحم'' والا تھا۔ وہ شانی کو اپنے اوٹ پٹانگ بیٹے یعنی گلابے کی بیوی بنانے کی اسکیمیں سوچنے لگی تھی اور بیٹا یعنی گلابا بھی کون سا کم تھا۔ وہ اپنی عقل سمجھ کے مطابق شانی کو پھانسنے کی کوششیں کرتا تھا۔ گرم جلیبیوں اور پستے بادام کا لالچ دے کر اسے اوپر چوبارے میں بلاتا تھا...... آج برسوں بعد سرِراہ پھر گلابے سے ملاقات ہوئی تھی۔ زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے ایسے ہی شناسا لوگ ملتے اور اوجھل ہوتے رہتے ہیں۔

گاڑی شہر سے باہر نکل آئی تھی اور اب بنوں کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھی۔ شانی نے کہا۔ ''گلابے! تم تو ریڑھی لگاتے تھے نا...... ڈرائیوری کیسے شروع کر دی؟''

''بس جی...... گاجر، سیب کا مربہ بیچتے بیچتے ایک محلے دار کی بیٹی سے میرا ویاہ ہوگیا۔ میرا سسر ایک سیٹھ کی ڈرائیوری کرتا ہے، اس نے مجھے بھی ڈرائیوری دلا دی۔''

''یہ تو لاہور کا نمبر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میڑا مالک لکری...... (لکڑی) کا کام کرتا ہے۔ ہم ٹل سے لکری لینے گئے ہوئے تھے۔ بنوں کے رستے سے واپس آئے ہیں۔ صبح چار بجے یہاں پہنچے ہیں۔ میرا مالک تھک گیا تھا۔ اس کے گردے میں پیڑ بھی ہے۔ وہ سونے کے لیے ہوٹل میں چلا گیا ہے۔ کہتا تھا سات آٹھ گھنٹے آرام کے بعد پھر آگے چلیں۔'' اس نے ایک لحہ توقف کیا، تب ایک بار پھر فریادی لہجے میں بولا۔ ''مجھے جانے دیں جی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں......''

''اوئے حرامی! آگے دھیان رکھ۔'' رستم نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ اس مرتبہ بھی گاڑی لہرا کر رہ گئی۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' شانی نے پوچھا۔

''تین جی۔'' اس نے یوں کہا جیسے جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے شانی کے دل میں رحم کا جذبہ ابھارنے کے لیے ایک آدھ بچہ زیادہ بتایا ہو۔

شانی کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ کسی بھی وقت کسی حادثے

کا سبب بن سکتا تھا۔ اس سے جتنی جلدی جان چھڑالی جاتی اتنا ہی اچھا تھا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ گلابے کی بدحواسی کی وجہ سے کہیں اس کے ساتھ بھی ویٹر گلزار جیسا واقعہ پیش نہ آ جائے۔

شانی نے گلابے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، تمہارے مالک کو گاڑی غائب ہونے کا پتا کب تک چلے گا؟''

گلابے نے پہلے ہونقوں کی طرح شانی کا منہ دیکھا پھر بولا۔ ''میرے خیال میں شام چھ بجے تک تو ان کو سونا ہی سونا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کمرے سے باہر آئیں گے۔''

''اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو کیا کرو گے؟'' شانی نے اچانک پوچھا۔

گلابے کا چہرہ تھوڑا سا گلابی ہوا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ ''آپ کو اور آپ کے میاں کو بے شمار دعائیں دوں گا جی۔'' پھر اس نے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

''دعاؤں کے علاوہ اور کیا کرو گے؟'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

''جیسا آپ کہیں گے، بالکل ویسا ہی کروں گا۔ اگر ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہوں تو جو کالے چور کی سزا، وہ میری۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا جیسے اپنی ہی قسم کھا رہا ہو۔

''اگر ہم کہیں کہ ایک دن کے لیے کہیں غائب ہو جاؤ تو......؟'' رستم نے استفسار کیا۔

''آپ کہیں تو ایک ہفتے کے لیے غیب ہو جاتا ہوں جی۔'' وہ رستم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ وہ رستم سے سخت خوف زدہ نظر آتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ گلابا اندر سے کتنا کمزور اور ڈرپوک ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ واقعی غائب ہو جائے گا۔ شانی نے رستم کو اشارہ کیا۔ رستم نے گاڑی سڑک سے اتروا کر درختوں کے درمیان رکوا دی۔ یہ کافی محفوظ جگہ تھی۔ سڑک پر بھی ٹریفک خاصا کم تھا۔ شانی اور رستم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ گلابے کو گاڑی میں ہی رہنے دیا گیا۔ تاہم رستم نے احتیاطاً گاڑی کی چابی اگنیشن میں سے نکال لی تھی۔ ''کیا کرنا ہے شانی؟'' رستم نے باہر نکل کر پوچھا۔

''میرے خیال میں تو اسے چھوڑ بھی دیں تو یہ ایک دو دن کے لیے کہیں غائب ہو جائے گا...... یہ اندر سے بہت ڈرا ہوا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے ہوٹل میں ایک بندے کا خون کیا ہے۔''

''لیکن ہمیں یہ رسک لینا نہیں چاہیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اسے بے ہوش کر کے کہیں پھینک دیا جائے۔''

''آپ کا مطلب ہے چوٹ وغیرہ لگا کر؟'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی جلدی سے بولی۔ ''نہیں رستم! یہ بڑا سادہ دل ہے اور اندر سے بہت کمزور بھی۔ ہمیں اسے یہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔''

''اگر کہیں بھوکا پیاسا پڑا رہا تو..... یا کسی اور مصیبت کا شکار ہو گیا؟''

''اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا شانی۔ ویسے بھی یہ تھوڑی سی سختی اس کے لیے اچھی ہو گی۔ مالکوں کو گاڑی چھینے جانے کا یقین آئے گا۔''

شانی کو قائل کرنے کے بعد رستم اور شانی دوبارہ گاڑی میں آئے۔ گلابے کے چہرے پر مسلسل ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جب رستم نے نائیلون کی رسی نکالنے کے لیے اٹیچی کیس کھولا اور اس میں گلابے کو سیاہ رنگ کی خوفناک کلاشنکوف نظر آئی تو اس کی باقاعدہ گھگی بندھ گئی...... اس نے شانی کو فریادی نظروں سے دیکھا۔ شانی نے آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ رستم نے صرف تین چار منٹ میں گلابے کی مشکیں کس دیں۔ جب اس نے گلابے کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے لیے اسے منہ کھولنے کو کہا تو اس نے اتنا زیادہ منہ کھولا کہ اس کا تالو اندر تک نظر آنے لگا۔ رستم نے کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ایک اور رومال نما کپڑا باندھ دیا۔ گلابا ہر حکم پر بلا چوں وچرا عمل کر رہا تھا۔ رستم نے اسے ساتھ والی نشست پر منتقل کیا اور خود گاڑی ڈرائیو کر کے درختوں کے اندر ہی اندر کافی آگے لے گیا۔ یہاں ایک جوہڑ کے کنارے خود رَو سرکنڈوں کے درمیان اسے ایک جگہ مناسب نظر آئی۔ اس نے گلابے کو اٹھا کر وہاں ڈال دیا۔ امید نہیں تھی کہ یہاں کوئی جلد ہی گلابے تک پہنچ سکے گا۔ گلابا اس صورتِ حال پر مطمئن نظر آتا تھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں رستم اور شانی کو اپنے بھرپور تعاون اور دوستی کا یقین بھی دلا رہا تھا..... گلابے کے لیے شانی کی ہمدردی دیکھتے ہوئے رستم نے کچھ نوٹ گلابے کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

شانی نے گلابے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور رستم کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی...... رستم نے دوبارہ سڑک پر جانے کے بجائے درختوں کے اندر ہی اندر کچے پکے راستے پر سفر کرنا مناسب سمجھا۔ شدید ترین حبس اور گرمی کے بعد شمال کی طرف سے اچانک بادل گھر آئے تھے۔ یہ بڑے سیاہ بادل تھے۔ ان کے اندر بجلی کی تڑپتی لکیریں تھیں اور وہ جوق در جوق شمالی افق پر امڈتے چلے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن میں رات کا سماں ہو گیا۔ اردگرد کے درخت، کھیت اور نشیب و فراز سب تاریکی میں ڈوبتے محسوس ہوئے۔ پہلے کچھ دیر ہوا چلی پھر تیز بارش ہونے لگی۔ رستم اور شانی نے گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے اور وِنڈ

اسکرین پر وائپر حرکت کرنے لگے۔

زندگی میں واقعات ایسے ہی اچانک اور بے ترتیبی سے رُونما ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہیں ایک اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان گلابا مل گیا تھا اور اب حبس اور گرمی کے بے کنار صحرا میں تابڑ توڑ بارش سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ ایک نیم پختہ راستے پر جارہے تھے۔ ان کے اردگرد ویرانہ تھا۔ بس کہیں کہیں گنے یا چارے کا کوئی کھیت دکھائی دے جاتا تھا۔ وہ کہاں جارہے تھے، انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ کیوں جارہے تھے، یہ بھی پتا نہیں تھا۔ رستم کے ذہن میں بس یہ موہوم سا خیال تھا کہ وہ شانی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔

''ہمیں کہاں جانا ہے؟'' شانی نے رستم کے کندھے سے لگے لگے پوچھا۔

''یہاں سے شاید دس پندرہ میل دور لکی نام کا قصبہ ہے۔ وہاں میرا ایک پرانا واقف کار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی حویلی میں دو چار دن کے لیے ٹھکانا مل جائے.....''

''دو چار دن بعد کیا کریں گے؟'' شانی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''دو چار دن میں سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' رستم نے بھی کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

گاڑی میں کافی فیول موجود تھا۔ وہ چلتے رہے۔ بارش کی بوچھاڑوں کے درمیان، جھومتے درختوں کے درمیان اور فراٹے بھرتی ہوا کے درمیان! بس کہیں کہیں انہیں کوئی بیل گاڑی نظر آجاتی تھی..... یا ٹریکٹر جس پر موجود افراد نے اپنے اوپر پولی تھین کی شیٹ وغیرہ تان رکھی ہوتی تھی۔ اس طوفانی بارش میں کہیں کسی پولیس ناکے یا نگرانی وغیرہ کا امکان نہیں تھا۔

دس بارہ میل چلنے کے بعد رستم کو محسوس ہوا کہ یہ کچا پکا راستہ پختہ سڑک تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ الجھن محسوس کرنے لگا۔ ''رستم! کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟'' شانی نے اس کے کندھے سے لگے لگے پوچھا۔

''شاید.....'' وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''بارش تو تیز ہوتی جارہی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... شاید ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا بھی ہو جائے۔'' رستم نے کہا۔

شانی کا سر رستم کے کندھے پر تھا۔ اس کی چمکیلی شال کا نقرئی کنارہ رستم کے گھٹنے پر پھیلا ہوا تھا۔ شانی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''رستم! کتنا اچھا ہو اگر ہم واقعی راستہ بھول

جائیں۔ کہیں بہت دور جانکلیں   کسی انجانی جگہ! جہاں سے آگے کوئی راستہ نکلتا ہی نہ ہو۔ جہاں ہمیشہ ایسی ہی بارش ہوتی رہتی ہو، ایسے ہی دن میں اندھیرا چھایا رہتا ہو۔"

"آپ بولتی ہیں تو لگتا ہے شاعری کر رہی ہیں۔" رستم بھی گمشدہ آواز میں بولا۔

ان کے سامنے بجلی زور سے چمکی اور کڑاکے کے ساتھ جیسے شیشم اور گوندی کے درختوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ شانی کچھ اور بھی رستم کے بازو سے پیوست ہوگئی۔ رستم نے ایک ہاتھ کو اسٹیئرنگ سے ہٹا کر شانی کے کندھے پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ گاڑی پانی کی چادر میں آگے بڑھتی رہی۔ وہ اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے کہ ان کے آنے کے بعد سلطان رضا ہوٹل میں کیا حالات ہوئے ہوں گے اور سرکنڈوں میں پڑا گلا با کس حال میں ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں شام نے بادلوں کے ساتھ مل کر تاریکی کو گہرا کرنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ اچانک رستم اور شانی کو رکنا پڑا۔ نیم پختہ راستہ ایک نشیبی جگہ سے ہو کر گزرتا تھا اور یہاں بارش کے تیز رفتار پانی نے ندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رستم نے گاڑی عین اس پانی کے کنارے روک دی۔ اس میں سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رستم جانتا تھا کہ بعض اوقات وزنی بسیں اور ٹریکٹر ٹرالیاں بھی ایسے ریلوں میں بہہ جاتی ہیں۔ یہ تو پھر ایک کار تھی جس میں فقط دو افراد سوار تھے۔

کچھ دیر تک پانی کا جائزہ لینے کے بعد رستم نے کہا۔ "ہمیں پانی کے اُترنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"اور پانی تب تک نہیں اُترے گا جب تک بارش نہ رکے۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد بھی ایک دو گھنٹے تک پانی چڑھا رہے۔" انہوں نے گاڑی موڑی اور آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ یہاں کیچڑ بہت زیادہ تھی۔ گاڑی بار بار لہرا رہی تھی۔ رستم کو محسوس ہوا کہ راستے کے بغیر زیادہ آگے تک جانا ممکن نہیں۔ لمبے سرکنڈوں اور خودرو درختوں کے درمیان ایک جگہ وہ رک گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ مزید سفر کے حوالے سے بہتر وقت کا انتظار کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔

رستم نے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مرسیڈیز کے کشادہ ڈی بورڈ میں کچھ میٹھے اور نمکین بسکٹس کے علاوہ چکن پیٹیز بھی موجود تھے۔ عقبی نشست کے پیچھے بورڈ پر ایک فلاسک بھی رکھا تھا۔ شانی نے دیکھا، اس میں دودھ پتی نما چائے اب بھی گرم ہے۔ انہوں نے چائے کے ساتھ کچھ بسکٹس لیے اور بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد قدرے ہلکی تو ہو جاتی تھی مگر

رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ آبی گزرگاہ میں بہتے پانی کا شور انہیں کافی فاصلے سے بھی سنائی دیتا تھا۔

رستم نے کہا۔ "شانی! آپ پچھلی سیٹ پر چلی جائیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" شانی سیٹ کو اسٹریچ کر کے وہیں نیم دراز ہوگئی۔

رستم نے بھی کچھ دیر بعد سیٹ اسٹریچ کر لی۔ شانی نے محبت سے معمور لہجے میں پوچھا۔

"ٹانگ کا درد اب ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ درد والی گولیوں سے کچھ فرق پڑا ہے۔"

شانی نے رستم کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیا اور عجیب جذب کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

ہاتھ کے راستے محبت کی نہایت توانا اور دل گداز لہریں رستم کے جسم میں سرایت کرنے لگیں۔ رستم نے نیم دراز حالت میں ہی آگے کو کھسک کر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے سینے میں گم سی ہوگئی۔ رستم نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے اور باہر بارش کی بوچھاڑیں گاڑی سے ٹکراتی رہیں۔ رستم نے بڑی نرمی سے شانی کے نم رخساروں اور ہونٹوں کو چوما۔ اسے لگا کہ مہیب طوفانوں میں گھرے ہوئے اس قاتل سمندر میں یہ گاڑی ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور یہاں زندگی اپنی حدتوں کے ساتھ موجود ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو اس زندگی کو چھوا جا سکتا ہے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت پڑے رہے اور باہر بادوباراں کی رات گرجتی رہی، آگے کو کھسکتی رہی۔ ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ وہ دونوں خاموش تھے مگر ان کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ رستم کی نگاہیں اپنی بی بی کے حسین سراپا پر تھیں۔ وہ دلہن جیسے زرق برق لباس میں تھیں اور دلہن ہی نظر آتی تھی۔ رستم نے دل ہی دل میں کہا۔ "شانی! کیا اب ہمیں کبھی نہیں ملنا...... اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے، ہمیشہ کے لیے......"

"آپ نے کچھ کہا؟" شانی نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں تو۔" رستم نے جواب دیا۔

شانی نے پھر رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ رستم کے اندر اپنی بی بی کے لیے مہیب خلا موجود تھا...... اور یہ صرف جذباتی خلا ہی نہیں تھا، جسمانی خلا بھی تھا۔ اس کو اپنے اندر کا یہ احساس کبھی بھی برا نہیں لگا تھا کہ وہ بی بی کو تمام تر روحانی اور جسمانی شدتوں کے ساتھ چاہتا ہے۔ وہ بہت فخر سے اعتراف کرتا تھا کہ وہ جس طرح بی بی کی روح سے عشق کرتا ہے، اسی طرح بی بی

کے جسم سے بھی کرتا ہے۔ بی بی کے رخسار، ان کے ہونٹ، ان کی گردن جس پر کسی شیشے کا گمان ہوتا تھا...... اور ان کا خوشبو دار سانس اور ان کے تراشے ہوئے بدن کی نرمی اور حدت...... وہ ان سب کا دیوانہ تھا۔ ہاں، یہ بات تھی کہ ان ساری قربتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے اندر اپنی بی بی کی چاہت کا الاؤ دھیما نہیں پڑتا تھا...... اور شاید یہی بات تھی کہ اس کے اندر اپنی بے پایاں خواہشوں کے حوالے سے کوئی ندامت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ہاں، یہ وہی عشق تھا جس کے بارے میں اماں سیانی نے کہا تھا، یہ ملاپ سے کم ہوتا ہے نہ جدائی سے...... اور یہ بھی کہ اگر ہیر رانجھا مل بھی جاتے تو وہ زندگی کی آخری سانسوں تک ہیر رانجھا ہی رہتے۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' شانی نے غنودہ آواز میں کہا۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

''کیا یہ بارش ہمیشہ اسی طرح نہیں رہ سکتی؟''

''ہمیشہ کا تو پتا نہیں...... مگر اب تو ہو رہی ہے۔''

''آپ اسے روک لیں۔'' شانی نے رستم کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

رستم اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ یکا یک ایک نامانوس آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ ماحول کے سحر سے نکل آئے اور ایک دم اٹھ بیٹھے۔ رستم نے فوراً اپنے لوڈڈ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دور کچھ فاصلے پر درختوں کے اندر انجن کا شور سنائی دے رہا تھا...... درختوں سے اور بارش کی بوچھاڑوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی بھی انہیں دکھائی دی۔

''یہ کیا ہے رستم؟'' شانی نے دہل کر پوچھا۔

''لگتا ہے کہ پولیس کی گاڑی ہے۔ بلکہ شاید دو ہیں۔ ایک پولیس کی ہے، ایک پرائیویٹ جیپ ہے۔''

''کیا انہیں ہمارے بارے میں پتا چل گیا ہے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روٹین کا گشت ہو۔''

چار پانچ منٹ تک رستم اور شانی نے بڑی بے چینی سے انتظار کیا کہ یہ دونوں گاڑیاں آگے نکل جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ غالباً وہاں درختوں کے درمیان کوئی ٹین کا شیڈ وغیرہ تھا جس پر رستم اور شانی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ دونوں گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ اب ان کی ہیڈ لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ بس اندرونی بتیاں جل رہی تھیں۔ بارش اب پہلے سے ہلکی ہو گئی تھی۔ گاڑیوں میں موجود افراد میں سے کوئی بلند آواز سے بولتا تھا تو اس کی مدھم لہریں

رستم اور شانی کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پولیس والے یہاں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں...... اور یہ بے حد خطرناک تھا۔

رستم قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اب زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے تھے مگر انجن اسٹارٹ کرنے سے پولیس والے ہوشیار ہو سکتے تھے۔ گاڑی کو چھوڑ کر جانا بھی سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ ایک بات رستم کے ذہن میں آ رہی تھی۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک ڈھلوان ہی شروع ہوتی تھی۔ گاڑی اس ڈھلوان پر پہنچ جاتی تو سوڈیڑھ سو گز تک انجن کے بغیر ہی چلتی چلی جاتی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' شانی نے سرگوشی کی۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ آپ گاڑی میں ہی رہیں، میں باہر نکل کر گاڑی کو دھکا لگاتا ہوں۔ ہم اس سامنے والی ڈھلوان تک پہنچ گئے تو کافی آگے نکل جائیں گے۔''

''مگر آپ اکیلے کیسے کریں گے۔ آپ کی ٹانگ......؟''

''آپ بے فکر رہیں...... ہو جائے گا۔''

رستم نے گاڑی کو نیوٹرل کر دیا اور ہینڈ بریک ہٹا دیا۔ اس کے بعد وہ بڑی احتیاط سے باہر نکل آیا۔ گرجتے برستے موسم نے اس کا استقبال کیا۔ پانی کی تیز بوچھاڑوں نے اسے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ اس نے گاڑی کو دھکا لگانا شروع کیا۔ ٹانگ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں مگر وہ لگا رہا۔ آٹھ دس میٹر آگے جانے کے بعد گاڑی رک گئی۔ اس کا ایک پہیہ شاید کسی چھوٹے سے گڑھے میں تھا۔ رستم نے پورا زور لگایا مگر کیچڑ کے سبب اس کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اچانک یہ مشکل آسان ہو گئی۔ رستم نے چونک کر دیکھا۔ شانی بھی اس کوشش میں شریک ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر تھی اور اپنی طرف سے گاڑی کو دھکیل رہی تھی۔ گاڑی حرکت کرتی ہوئی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں اسے دھکیلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ رستم نے اس کا ہینڈ بریک کھینچا۔ دونوں گاڑی کے اندر بیٹھے، دروازے بند کیے اور ہینڈ بریک ہٹا دیا۔ گاڑی پہلے سست روی سے رینگی پھر اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ڈھلوان پر آگے بڑھتی رہی تھی۔ کہیں کہیں رستم کو بریک استعمال کرنا پڑا۔ تابڑ توڑ برستی بارش میں وہ بڑی خاموشی کے ساتھ قریباً ڈیڑھ سو میٹر دور چلے آئے۔ بجلی کی چمک گاہے بہ گاہے قرب و جوار کو روشن کر دیتی تھی۔ آگے بڑھنا دشوار تھا مگر کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کر سکتے تھے۔

شانی سرتاپا بھیگ گئی تھی۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے اور گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ زرق برق لباس بھی شرابور تھا۔ ''آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی؟''

"آپ کو نہیں لگ رہی تو مجھے بھی نہیں لگ رہی۔"

وہ ڈرائیو کرنے لگا۔ شانی نے ایک بار پھر بڑی اداسی سے اپنا سر رستم کے کندھے سے لگا دیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں رستم کہ گلابے کو ڈھونڈ لیا گیا ہو اور اردگرد کی پولیس الرٹ ہو گئی ہو۔"

"گلابا نہ بھی ڈھونڈا گیا ہو مگر سلطان رضا ہوٹل والا معاملہ تو کھل چکا ہوگا۔ بے ہوش اے ایس آئی ہوش میں آ گیا ہوگا اور اس نے بتا دیا ہوگا کہ اس کمرے میں کون کون ٹھہرا تھا۔ ہمارے چلے جانے کے بعد پولیس کو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہوٹل میں ہم ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"پتا نہیں کیوں رستم...... میرا دل کہتا ہے کہ ہمارے اردگرد ہمیں تلاش کرنے والے موجود ہیں۔ وہ کسی بھی وقت......" وہ کہتے کہتے رک گئی، اس کا گلا رندھ گیا۔

"میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" وہ عجیب لہجے میں بولا۔

"آپ اور میں دو نہیں ہیں اور آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اب ایک پل کے لیے بھی مجھے خود سے جدا نہیں کریں گے۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

وہ جیسے تیسے چلتے رہے۔ راستہ سخت ناہموار اور دلدلی تھا لیکن وہ اب پختہ راستے پر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ایک دو جگہ گاڑی پھنس بھی گئی، تاہم وہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا رخ بنوں کے پہاڑی علاقے کی طرف تھا......

بارش کی طوفانی کیفیت اب ختم ہو چکی تھی مگر وہ رکی نہیں تھی۔ کبھی رم جھم اور کبھی سرلائے کی شکل میں آسمان مسلسل پانی گرا رہا تھا۔ ایک مقام کے سوا انہیں اپنے اردگرد کہیں آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ ایک جگہ ایک بیلے کے اندر ان کی گاڑی پنکچر بھی ہوئی اور انہیں ٹائر بدلنا پڑا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے جب اچانک ان کی گاڑی کو شدید جھٹکا لگا اور وہ خطرناک زاویے سے بائیں طرف جھک گئی۔ اس کا اگلا پہیہ بری طرح نرم زمین میں دھنس گیا تھا۔ رستم نے پہیہ نکالنے کے لیے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا تو یکا یک انجن جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا۔ رستم نے کئی بار سیلف مارا...... مگر بوڑھی مرسیڈیز ہمت ہار چکی تھی۔ رستم نے باہر نکل کر بونٹ اٹھایا اور انجن میں تاک جھانک کی۔ کچھ دیر بعد وہ بونٹ بند کر کے گاڑی میں آن بیٹھا۔

"لمبی خرابی لگتی ہے۔ شاید ٹائمنگ بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" شانی گھبرا کر بولی۔

"گاڑی چھوڑنا پڑے گی۔"

انہوں نے سامان سمیٹا، اٹیچی کیس اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آئے۔ دھیمی بارش جاری تھی۔ کبھی کبھی بجلی کی روشن لکیریں سیاہ آسمان کو اتھل پتھل کر دیتی تھیں۔ وہ پیدل چلنے لگے۔ ایک مومی شاپر میں لپٹا ہوا پسٹل رستم کی جیب میں تھا...... اور خطرے کے وقت فوراً اس کے ہاتھ میں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں چاروں طرف خودرَو جھاڑیاں تھیں اور ویرانی تھی۔ ایسے علاقوں میں گیدڑ، سؤر اور جنگلی بلے وغیرہ موجود ہوتے ہیں مگر موسلا دھار بارش نے شاید انہیں بھی پناہ گاہوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا...... کچھ آگے جا کر گھنے درختوں کے درمیان شانی کو ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت نظر آئی۔ "یہ کیا ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"شاید مسجد!" رستم نے جواب دیا۔

وہ مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ لگتا تھا کہ یہ عرصے سے خالی پڑی ہے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ چھوٹا سا محراب اور منبر...... برآمدہ بھی مختصر تھا۔ کمرے کے اندر گرد و غبار سے اٹی ہوئی فقط ایک شکستہ چٹائی پڑی تھی۔ رستم نے اٹیچی سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں دیکھا۔ طاقوں کے اندر دیے تھے جو نہ جانے کب سے بجھے ہوئے تھے۔ کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔ برآمدے میں کسی دور دراز کے دیس سے آنے والے پرندے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ برآمدے کے پاس ہی شانی اور رستم کو ایک تنگ دہانے کا کنواں نظر آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی خشک پڑا ہے۔ بارش کی رفتار پھر بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دم گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ جیسے صبح صادق نمودار ہوتے ہوتے واپس لوٹ گئی ہو۔ انہوں نے کچھ دیر یہاں رکنا مناسب سمجھا۔ رستم نے اپنی پنڈلی کی گیلی پٹی اتار پھینکی۔ اٹیچی میں صاف پٹی اور روئی موجود تھی۔ پہلے اس نے شانی کی انگلیوں کی بینڈیج کی۔ پھر شانی نے رستم کی پنڈلی پر پٹی باندھی۔ پیدل چلنے کے سبب زخم سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ اس چھوٹی سی مسجد کی ویرانی دیکھ کر شانی کے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہ چار دیواری مدت سے کسی انسان کی راہ تک رہی ہو۔ یہاں تو شاید کسی تہوار پر بھی کوئی دیا نہیں جلاتا تھا۔

شانی نے اپنی اوڑھنی سے مسجد کی اکلوتی صف کو صاف کیا۔ چھت سے لٹکے ہوئے جالے اس نے اپنے ہاتھ سے اتارے۔ برآمدے کے پاس ہی ایک پختہ گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ شانی نے یہاں سے وضو کیا اور فجر کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ رستم اپنا سائیلنسر لگا پسٹل گود میں رکھے بیٹھا رہا۔ اس نے احتیاطاً چار دیواری کے دروازے کو اندر

سے کنڈی چڑھادی تھی۔

پھر نہ جانے رستم کے دل میں کیا آئی کہ اس نے بھی وضو کیا اور ایک گوشے میں نماز ادا کرنے لگا۔ اس کے چاروں طرف مہیب اندیشوں کی چاپ تھی۔ اس نے کہیں سنا تھا کہ ہر نماز کو آخری نماز سمجھ کر ادا کرنا چاہیے۔ نماز پڑھتے ہوئے اس کی عجیب کیفیت ہوگئی۔

گاڑی سے نکلتے ہوئے شانی نے بسکٹس اور پیٹیز وغیرہ اٹیچی میں رکھ لیے تھے...... دودھ پتی والا فلاسک بھی ایک موٹے شاپر میں لپیٹ کر اٹیچی میں سنبھال لیا تھا۔ رستم نے سلام پھیرا تو شانی نے کہا۔ ”کچھ کھالیں۔“

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ آپ کھالیں۔“

رستم کے ”نہ نہ“ کہتے بھی شانی نے ہلکا پھلکا ناشتہ سجا دیا۔ اٹیچی کیس کو اس نے میز کے طور پر استعمال کیا تھا۔ رستم نے چند بسکٹ لیے اور چائے پی۔ شانی نے بھی چائے کا آدھا کپ لیا۔ یہ فلاسک کا ڈھکن ہی تھا جسے وہ کپ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اچانک شانی نے رستم کو چونکتے دیکھا۔ شانی نے غور کیا اور اسے بھی مدھم انسانی آواز سنائی دی یا شاید یہ ایک سے زیادہ آوازیں تھیں۔ یہ آوازیں خودرو جھاڑیوں کے پار سے آرہی تھیں...... قریباً ڈیڑھ دو سو قدم کے فاصلے سے! شاید ہوا کا رخ ان کی سمت نہ ہوتا تو یہ آوازیں ان کے کانوں تک نہ پہنچ پاتیں۔

”کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ رستم نے کہا۔

”ہو سکتا ہے، آس پاس کے دیہاتی ہوں۔“

آپ یہیں رکیں، میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔“ رستم نے کہا۔

”نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ شانی نے رستم کا بازو تھام لیا۔

رستم اور شانی مسجد کے شکستہ دروازے سے نکل کر جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ پسٹل رستم کے کُرتے کے نیچے تھا لیکن ایک لمحے میں اس کے ہاتھ میں آسکتا تھا۔ رستم کے سفید تہہ بند کا نچلا کنارہ بارش میں چلنے سے کیچڑ آلود ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بارش کی بوچھاڑوں میں آگے بڑھتے قریباً دو سو قدم دور آگئے۔ اس سے آگے نشیبی جگہ تھی۔ شانی کا خیال تھا کہ شاید مقامی خانہ بدوشوں سے ان کی ملاقات ہونے والی ہے یا پھر چرواہوں کا کوئی ڈیرا ہوگا۔ مگر جو کچھ انہوں نے نشیب میں دیکھا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ صبح کے ملگجے اجالے میں انہیں ایک لینڈ کروزر جیپ نظر آئی۔ وہ گھنے درختوں تلے کھڑی تھی۔ جیپ سے باہر دو افراد موجود تھے اور بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ذرا غور کرنے پر شانی اور رستم کو اندازہ ہوا کہ دونوں

افراد کے ہاتھوں میں شراب کی چھوٹی بوتلیں ہیں۔

ایک شخص کو پہچان کر شانی کا لہو سنسنا اٹھا۔ اگر اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ ڈپٹی ریاض کا دوست، اجرالی سردار تہور خان تھا۔ یہ نہایت گرانڈیل شخص تھا۔ ریاض کی ڈیفنس والی کوٹھی میں، بے گناہ سکینہ کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اُتارنے والوں میں یہ شخص بھی شامل تھا۔ شانی کے دل میں آئی کہ وہ رستم کو چلا چلا کر بتائے کہ یہ شخص بھی سکینہ کے قاتلوں میں شامل ہے لیکن وہ کیسے بتا سکتی تھی؟ اس نے تو رستم کو ابھی تک سکینہ کی موت کے بارے میں بھی نہیں بتایا تھا۔ شانی نے رستم کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ یہ رستم کا وہی روپ تھا جو دیکھنے والے کو لرزہ براندام کر دیتا تھا۔ ایک بے کراں وحشت تھی جو تابڑ توڑ بارش ہی کی طرح رستم کے چہرے پر برس رہی تھی۔

اسی دوران میں گاڑی کے اندر سے ایک باوردی پولیس والا نکلا اور اس نے مسکراتے ہوئے تہور خان کو ایک اور چھوٹی بوتل تھما دی۔ ”یہ کون لوگ ہیں رستم؟“ شانی نے پوچھا۔

”یہ اجرالی سردار ہیں اور ان کے ساتھ دو پولیس والے بھی ہیں۔“ رستم کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آرہی تھی۔

”آپ ان کو جانتے ہیں؟“

”میں ان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ان کی صورتیں رات دن میری نظروں میں گھومتی ہیں۔ یہ پانچ بندے ہیں اور پانچوں ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے وڈے ڈیرے پر قتلِ عام کیا۔“ رستم کے سانسوں کی لَے تیز ہوتی جا رہی تھی اور آنکھوں میں نیلگوں شعلے رقصاں ہو گئے تھے۔ شانی اندر تک لرز گئی۔ اس کی چھٹی حس نے بارود اور خون کی بُو سونگھی اور اس کے کانوں نے چلاتی ہوئی دردناک آوازیں سنیں۔

”یہ...... لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ ہکلائی۔

”وہی جو انہیں کرنا چاہیے۔ یہ کُتے کے تخم اپنی موت کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“ رستم نے پھنکارا پھر اس نے شانی سے کہا۔ ”میں ایک منٹ میں آیا۔“ اس سے پہلے کہ شانی اسے روک سکتی یا کچھ بھی کہتی وہ مسجد کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ شانی کا دل رونے لگا۔ اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی کاش! رستم کے آنے سے پہلے یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا...... رستم جس طرح بگولے کی طرح گیا تھا، اسی طرح واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ کلاشنکوف شانی نے دور ہی سے دیکھ لی۔ اپنا پسٹل وہ غالباً اٹیچی میں ہی

رکھا آیا تھا۔ ''آپ...... کیا کرنے لگے ہیں رستم؟''

''آپ دیکھتی جائیں...... اور اگر...... نہیں دیکھ سکتیں تو...... اپنا رخ دوسری طرف کر لیں۔'' رستم کے لہجے میں وحشت اور درندگی کی بلند و بالا لہریں تھیں۔ وہ سرتاپا موت نظر آرہا تھا۔ شانی کو یوں لگا جیسے کوئی کمزور دل شخص اس کی صورت دیکھ کر ہی جان ہار سکتا ہے۔ شانی نے رستم کے اس مہلک ترین روپ کے بارے میں کئی بار دوسروں سے سنا تھا لیکن آج وہ خود دیکھ رہی تھی اور سکتے کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

شانی کو وہیں گھنی جھاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر وہ تیزی سے لینڈ کروزر جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ کسی شکاری جانور کی سی ہوشیاری سے ڈھلوان پر اُترتا جا رہا تھا۔ شانی کو محسوس ہوا کہ اس کا شدت سے دھڑکتا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ بعد شانی نے پہلے فائر سنے، یہ چھوٹے چھوٹے دو برسٹ تھے۔ پھر رستم کی للکار شانی کے کانوں تک پہنچی۔ یہ آواز بجلی کی کڑک سے کم لرزہ خیز نہیں تھی۔ شانی نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں۔ لینڈ کروزر کے ایک سائیڈ کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ ایک پولیس والے کی لاش جیپ کے پائیدان پر پڑی تھی، ایک شاید اندر موجود تھا اور وہ بھی بالکل بے حرکت تھا۔ باقی تینوں افراد نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے تھے اور جیپ سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رستم کی مہلک کلاشنکوف کا رخ ان کے سینوں کی طرف تھا۔ یہ تینوں دبنگ اجرالی سردار تھے لیکن ان لمحوں میں قطعی بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً انہیں اپنے ہتھیاروں تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''اپنی قمیصیں اتارو۔'' رستم دھاڑا۔

انہوں نے پس و پیش کیا۔ رستم نے ایک اور برسٹ ان کے قدموں میں چلایا۔ ان تینوں نے اپنی قمیصیں اتار دیں۔ ان میں سے ایک نے قمیص کے نیچے ہولسٹر لگا رکھا تھا۔ دوسرے نے چمڑے کی پیٹی میں شاید خنجر اڑسا ہوا تھا۔ رستم بھی یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ دونوں ہتھیار بھی اجرالی سرداروں کے جسم سے علیحدہ کروا دیئے۔

دونوں پولیس والوں کی طرح یہ اجرالی سردار بھی وڈے ڈیرے پر ہونے والی خون ریزی کے ماسٹر مائنڈز تھے۔ انہوں نے ریاض ہٹلر سے مل بھگت کی تھی اور چند پہاڑوں پر ملکیت کی خاطر عام معافی کے پروگرام کو سبوتاژ کیا تھا۔ ڈیرے کے مکینوں کو جان سے مروا دیا تھا۔ آج یہ ماسٹر مائنڈز سردار غلام کبیر ہی کی طرح رستم کے نشانے پر تھے۔ انہوں نے جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا تھا اور سرتاپا سکتہ زدہ نظر آرہے تھے۔ رستم نے ان تینوں کو ایک

گرے ہوئے درخت کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ وہ بلاچون و چرا عمل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شاید کچھ بول بھی رہا تھا۔ غالباً وہ رستم کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ نیچے گرائے تو رستم گرجا۔ ''ہاتھ اوپر...... ہاتھ اوپر!''

اس نے لرز کر دوبارہ ہاتھ اوپر کر دیئے۔ اس کی چربی دار توند اس کے باقی جسم ہی کی طرح تھل تھل کر رہی تھی۔ اس کی دہشت سے پھٹی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''رستم! مینڈا قصور نئیں...... مجھ کو ان لوگوں نے جبر دستی اپنے ساتھ رکھا۔ میں قسم کھاتا ہوں......''

''بکواس بند کرو۔'' رستم دھاڑا۔ ''مجھ سے تم لوگوں کا کچھ چھپا ہوا نہیں۔''

اسی دوران میں ہٹا کٹا تہور خان بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ کافی فاصلے سے بھی اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد دکھائی دے رہا تھا۔ رستم نے اس کی ٹانگوں کے قریب زمین پر ایک سنگل فائر کیا اور اس کو پھر سے اٹھنے اور ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا...... پہلے فریاد کناں شخص نے موت کو بالکل سامنے دیکھ کر رستم کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے اور دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی۔ یہی شخص کچھ دیر پہلے گہرے نشے میں نظر آرہا تھا۔ اب اس کا نشہ یوں ہرن ہوا تھا کہ وہ ایک دم شیر سے گیدڑ دکھائی دینے لگا تھا۔ رستم پھر دھاڑا۔ ''بند کرو یہ بکواس اور میں نے کہا ہے ہاتھ اوپر رکھو اور تمہیں پتا ہے، ہاتھ اوپر اٹھانے کا کیا مطلب ہوتا ہے...... پتا ہے تمہیں؟'' رستم کے لہجے میں وحشت اور دیوانگی تھی۔ اس شخص نے ہاتھ اٹھانے کے بعد کچھ کہا جو شانی کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ رستم چلایا۔ ''حرامزادو...... ہاتھ اٹھانے کا مطلب ہوتا ہے...... ہم نے مقابلہ ختم کیا، ہم نے ہار مانی۔ ہم نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا۔ ایسے لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے یا گولیوں سے چھلنی کیا جاتا ہے؟ بولو، کیا کیا جاتا ہے ان کے ساتھ؟...... بولو...... بولو......'' رستم کی آواز دور تک گونجی۔

جواب ندارد تھا، بس تین کانپتے ہوئے جسم تھے اور چھ اجل دیدہ آنکھیں تھیں۔ پھر رستم نے برسٹ چلایا۔ تینوں نیم برہنہ افراد گولیاں کھا کر اوندھے سیدھے گرے۔ شانی نے آنکھیں بند کر لیں...... دوسرا برسٹ چند سیکنڈ بعد چلا...... اور پھر تیسرا!

شانی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ پھر وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پتا نہیں کیوں؟

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ بارش مدھم تھی۔ اجالا پھیلا ہوا تھا۔ شانی کو تینوں

لاشیں صاف نظر آئیں۔ خون میں ڈوبی ہوئی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی۔ ان میں سے ایک شخص نے مُردہ حالت میں بھی اپنے ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ جیسے اسے آخر وقت تک امید رہی ہو کہ اگر وہ ہاتھ کھڑے رکھے گا تو شاید بچ جائے۔ درست کہا جاتا ہے، بے انصافی سے انتقام جنم لیتا ہے اور ظلم سے سفاکی پروان چڑھتی ہے۔

رستم کو شانی نے جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے زمین سے وہ خنجر اٹھا لیا جو ایک مقتول سردار کے جسم سے جدا ہوا تھا، تب وہ جیپ کی طرف بڑھا۔ وہ غالباً اس کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔

رستم نشیب میں تھا۔ شانی بلندی پر تھی۔ اچانک اس کی نگاہ درختوں کے درمیان ایک متحرک جسم پر پڑی...... بلکہ یہ دو جسم تھے۔ وہ رستم سے قریباً سو میٹر دور تھے اور تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ''رستم...... رستم!'' شانی چلائی۔ آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔

''کیا بات ہے شانی؟'' رستم نے نشیب سے آواز دی۔

''کوئی آ رہا ہے، آپ کی طرف...... آپ کے سامنے سے!'' شانی کی آواز میں خوف کی لہریں تھیں۔

رستم نے اپنے سامنے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد اسے بھی خطرے کا احساس ہوگیا۔ وہ تیزی سے جیپ کی آڑ میں ہوگیا اور کلاشنکوف درختوں کی طرف سیدھی کر لی۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد دونوں افراد موقعہ واردات کے قریب پہنچ گئے۔ تاہم وہ سامنے نہیں آئے۔ انہوں نے خود کو درختوں کی اوٹ میں چھپائے رکھا۔ شاید انہوں نے لینڈ کروزر جیپ کے چکنا چور شیشے دیکھ لیے تھے اور ہوسکتا ہے کہ لاشوں پر بھی ان کی نگاہ پڑ گئی ہو۔

''رستم! انہوں نے خود کو درختوں کے پیچھے چھپا لیا ہے...... یہ دو ہیں۔''

''اسلحہ ہے؟''

''ہاں جی! ایک کے پاس رائفل ہے شاید۔''

رستم نے کلاشنکوف سے سنگل شاٹس چلائے...... دوسری طرف سے بھی فائر ہوا۔ رستم کو ان کی پوزیشن کا اندازہ ہوگیا۔ اگلے تین چار منٹ میں دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ رستم کلاشنکوف استعمال کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے خودکار رائفل اور پسٹل کا فائر آ رہا تھا۔ رستم کی ہدایت پر شانی نے خود کو ایک تناور درخت کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اچانک شانی نے دیکھا کہ رستم کے حریفوں میں سے ایک گر گیا ہے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔

شانی نے بلند آواز میں رستم کو اطلاع دی۔ ''ایک گر گیا ہے، دوسرے نے اس کی رائفل اٹھائی ہے۔''

رائفل سے چند سنگل شاٹ چلائے گئے۔ پھر اندازہ ہوا کہ رائفل خالی ہوگئی ہے۔ پسٹل شاید پہلے ہی خالی ہوگیا تھا۔

رستم درختوں کی آڑ لیتا ہوا کچھ آگے چلا گیا۔ دوسرا بندہ بھاگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شانی اس بارے میں رستم سے کچھ کہتی...... یا خاموش رہنے کا فیصلہ کرتی، رستم کو اس کے بھاگنے کا علم ہوگیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا...... چند سیکنڈ بعد شانی نے رستم کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ پسپا ہونے والے کو رکنے کا کہہ رہا تھا۔

پسپا ہونے والا کھلی جگہ پر تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر رکا نہیں تو کلاشنکوف بھون ڈالے گی۔ وہ رک گیا۔ کچھ دیر بعد شانی نے ان دونوں کو آگے پیچھے جیپ کی طرف آتے دیکھا...... وہ قریب آئے تو شانی دنگ رہ گئی...... یہ ڈپٹی ریاض تھا۔ شانی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی......

ڈپٹی ریاض ہمیشہ کی طرح عام کپڑوں میں تھا۔ اس نے سیاہ پتلون کے اوپر ٹریک سوٹ جیسی نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز تھے۔ ایک ٹیلی اسکوپ اس کے گلے سے جھول رہی تھی اور واکی ٹاکی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح دہکا ہوا ہے اور رستم پر جھپٹ پڑنے کے لیے بس ایک چھوٹے سے موقع کا منتظر ہے۔ اپنے تین ساتھیوں کی خونچکاں لاشوں کے قریب پہنچ کر ریاض کا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آنے لگا...... ہاں...... یہ ڈپٹی ریاض ہٹلر ہی تھا۔ وہ بدترین شخص جو رستم کو درکار تھا۔

رستم نے شانی کو بار بار آواز دی۔ مجبوراً شانی کو نیچے اُترنا پڑا۔ وہ کیچڑ آلود زمین پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی رستم اور ریاض کے پاس پہنچ گئی۔ ریاض کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے قہر سے بار بار زمین پر تھوک رہا تھا۔ اس کے اردگرد چھ لاشیں تھیں اور ان لاشوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یہ چھ لاشیں ان سرکردہ افراد کی تھیں جنہوں نے وڈے ڈیرے کے خونی آپریشن کو فائنل شکل دی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک دو اور بھی ہوں مگر اپنی کسی نیکی کے سبب وہ فی الوقت یہاں موجود نہیں تھے۔

رستم پھنکارا۔ ''دیکھ لے ریاضے! میں نے کہا تھا نا، تجھے ایک دن لالے اور اس کے ساتھیوں کے خون کا حساب دینا پڑے گا...... اور تُو اپنے آلے دوالے کی دیواریں جتنی مرضی اُچی کر لے، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا۔''

ریاض نے ایک بار پھر تھوکا اور بولا۔ ''رستے! اسلحے کے زور پر بڑھکیں مارنا بہت آسان

ہوتا ہے۔اس ماں (کلاشنکوف) کو نیچے رکھ کے دیکھ۔“

شانی نے دیکھا کہ یہ فقرہ ادا کرنے سے پہلے ریاض کی نگاہ رستم کی زخمی ٹانگ پر گئی تھی۔ بھاگ دوڑ کے سبب ٹانگ لہولہان ہو گئی اور رستم کے لیے اس پر وزن ڈالنا مشکل ہو رہا تھا۔شانی نے کراہتے ہوئے کہا۔”نہیں رستم! اس کی باتوں میں نہ آنا......آپ زخمی ہیں۔“

مگر شانی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی رستم کلاشنکوف کیچڑ میں پھینک چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمن کو بھنبھوڑنا چاہتا ہے اور چیر پھاڑ دینے کی خواہش رکھتا ہے۔

شانی کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسے لگا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ اس نے ایک کیکر کے تنے کا سہارا لیا...... وہ آمنے سامنے تھے۔ دو بدترین دشمن...... ایک مدت سے وہ ایک خوفناک جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر کبھی اس طرح ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے۔ فقط ایک دفعہ پوٹھوہار کے ٹیلوں میں وہ چند سیکنڈ کے لیے ایک دوسرے کے رُوبرو ہوئے تھے۔ رستم نے ریاض کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے نشیب میں گرا دیا تھا اور پولیس والوں کے نرغے سے بچ کر نکل گیا تھا۔ آج اس برستی بارش میں، گرجتے بادلوں کے نیچے......ان سنسان درختوں کے اندر...... وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ تماشائی نگاہ شانی کی تھی۔ یوں لگتا تھا، اس پورے علاقے میں دور دور تک ان تینوں کے سوا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں۔

جیپ کے قریب ایک رائفل پڑی تھی۔ اس کی سنگین اُتر کر دور جا گری تھی۔ ریاض نے لپک کر یہ سنگین اٹھالی۔ رستم نے جواب میں وہ خنجر قمیص کے نیچے سے نکال لیا جو کچھ دیر پہلے اس نے اجرالی سردار سے رکھوایا تھا۔ اپنے تہہ بند کو اس نے گھٹنوں سے اوپر تک اڑس کر مضبوط گرہ لے لی۔

ریاض جیسے طیش سے دیوانہ ہو کر رستم پر جھپٹا۔ اس کی چنگھاڑ دل ہلا دینے والی تھی۔ اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے رستم نے بائیں طرف ہٹنا چاہا مگر بائیں طرف ہٹنے کے لیے دائیں ٹانگ پر وزن ڈالنا ضروری تھا اور دائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رستم پوری طرح ریاض کے وار سے بچ نہیں سکا۔ سنگین اس کا دایاں بازو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ شانی بے ساختہ چلا اٹھی۔ پہلے وار کی کامیابی سے ریاض کا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا وار رستم کی گردن پر کیا جو اس کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ رستم پیچھے ہٹتے ہٹتے درخت کے گرے ہوئے تنے سے ٹکرایا اور پشت کے بل گر گیا۔ ریاض پھر ایک خوفناک چنگھاڑ کے

ساتھ رستم پر حملہ آور ہوا اور اس کے اوپر آیا۔ شانی نے رستم کی کراہ سنی۔ شاید سنگین نے دوبارہ اس کے جسم کو زخمی کیا تھا۔

یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا...... یہ بڑا ہی خوفناک احساس تھا۔ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا...... جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ دو افراد جن کے ہاتھوں میں تیز دھار آلے تھے، پوری وحشت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کسی بھی وقت ان میں سے کسی کا پیٹ چاک ہو سکتا تھا یا گردن اُدھڑ سکتی تھی...... یا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ کیچڑ میں لتھڑ گئے اور ناقابلِ شناخت ہو گئے۔ شانی نے دیکھا، ریاض ابھی تک رستم کے اوپر تھا اور بڑی بے رحمی سے اس کی زخمی ٹانگ پر جوگرز بوٹ کی ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ شانی کے دل سے جیسے لہو رسنے لگا۔ یکایک شانی نے ریاض کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ اس کا کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ شانی کے دل میں سے دعا نکلی کہ یہ ریاض کا اپنا خون ہی ہوگا۔ پانی کیچڑ اور گھاس میں گرنے کے بعد ریاض نے دیوانہ وار دائیں بائیں ہاتھ چلائے۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ سنگین اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ رستم کھڑا ہو گیا۔ یہ گھائل ریاض پر وار کرنے کا بہترین موقع تھا مگر حیران کن طور پر رستم نے اسے وقت دیا۔ یہاں تک کہ خوفناک رنگیلی سنگین دوبارہ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ رستم نے ہاتھ کے اشارے سے ریاض کو پھر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ریاض اپنی ڈکشن کی بدترین گالیاں بکتا ہوا رستم پر جھپٹا۔ اس بار رستم پوری طرح تیار تھا۔ اس نے نہ صرف وار بچایا بلکہ ریاض کی گردن پر ہاتھ چلایا۔ گردن کے عقب سے موٹی چربی کٹ کر لٹک گئی اور ریاض ڈکراتا ہوا لینڈ کروزر کی سائیڈ سے ٹکرایا۔ رستم نے اس کی پشت پر وار کیا۔ خنجر کئی انچ تک ریاض کے چربی اور گوشت میں دھنس گیا۔ رستم نے خنجر کو کھینچنے کی کوشش کی تو دونوں ایک بار پھر پانی اور کیچڑ میں گرے۔ ریاض کا سر درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا۔ سنگین پھر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ سنگین پر جھپٹا۔ شانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ رستم نے پھر اسے سنگین تک پہنچنے کا موقع دیا۔ رستم کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ کیا وہ ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا؟ وہ کیوں ریاض جیسے موذی کو بار بار موقع دے رہا تھا؟ وہ اپنی شدید زخمی ٹانگ کے سبب کسی بھی وقت ریاض سے زیر ہو سکتا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں بارش کی بوچھاڑ کے درمیان رستم اور ریاض میں سخت خونی جدوجہد ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے۔ رستم کی دو تین خوفناک ٹکروں نے ریاض کے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس خونی لڑائی کے دوران میں رستم نے کم از کم ایک مرتبہ مزید ریاض کو گری ہوئی سنگین اٹھانے کا موقع دیا۔

ریاض اتنا ہانپ چکا تھا کہ اس کی نہایت زہریلی اور قہرناک زبان اب اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بس زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس کا سارا جسم لہولہو تھا۔ پھر اچانک شانی نے دیکھا کہ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھا ہے۔ وہ جو آج تک سب کو بھگاتا ہی رہا تھا، اب خود بھاگ رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ رستم نے جیپ کے پاس گری ہوئی رائفل اٹھائی اور ریاض کے پیچھے لپکا۔

شانی بھی ان کے پیچھے لپکی۔ رستم نے بھاگتے بھاگتے ایک دو فائر کیے لیکن گنجان جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے ریاض کو نشانہ بنانا آسان نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان...... بہ مشکل پچاس ساٹھ قدم کا فاصلہ تھا۔ رستم کسی بھی وقت ریاض کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ ریاض بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رستم نہیں موت ہے جو اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ اپنے گھائل جسم کے ساتھ بار بار پھسل رہا تھا اور اٹھ رہا تھا۔ ”تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔“ رستم اس کے قریب پہنچتے ہوئے وحشی آواز میں دہاڑا۔

ریاض نے بھاگتے بھاگتے اچانک رخ بدلا اور شکستہ مسجد میں گھس کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ رستم بگولے کی طرح اس کے پیچھے گیا۔ رستم کی طوفانی ٹکر سے دروازے کی کنڈی ٹوٹ گئی اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ ”رستم نہیں...... نہیں۔“ شانی نے پھر پکار بلند کی۔

رستم کے پانچ چھ سیکنڈ بعد شانی بھی مسجد میں داخل ہو گئی۔ اس نے لرزہ خیز منظر دیکھا۔ رستم رائفل کے وزنی کندے سے ریاض کو بے رحمی سے مار رہا تھا۔ ریاض کے اگلے دانت ٹوٹ گئے تھے، ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ایک آنکھ کی پلک چر کر نیچے لٹک رہی تھی اور ایک کلائی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی مزاحمت یکسر دم توڑ چکی تھی۔ رائفل کی ضربیں کھا کھا کر وہ مسجد کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور گر رہا تھا۔

”نہیں رستم!“ شانی کربناک آواز میں چلائی۔ ”یہ مسجد ہے۔“

رستم تو جیسے کچھ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ شانی کے روکتے روکتے اس نے ریاض کو اندرونی فرش پر گرایا اور اس کی لہولہان گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ پاؤں کے دباؤ سے بے ساختہ ریاض کا منہ کھل گیا۔ رستم نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ یہ آخری لمحے تھے۔ وہ وحشت ناک آواز میں دہاڑا۔ اس نے بس دو الفاظ ہی کہے۔ ”ریاض..... ریاض!“ شانی اپنی پوری ہمت سے اسے روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس نے سیون ایم ایم رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک بار دو بار ...لیکن یہاں ایک انہونی ہوئی۔ گولی نہیں چلی رائفل خالی ہو چکی تھی۔

نیم جان ریاض کی آنکھیں موت کی وحشت سے یوں پھیلی ہوئی تھیں جیسے ابھی حلقوں سے باہر نکل آئیں گی۔ رستم نے رائفل پھینکی اور چنگھاڑتا ہوا اس اٹیچی کیس کی طرف بڑھا جو کونے میں رکھا تھا۔ شانی سمجھ گئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ پسٹل نکالنے لگا تھا۔ شانی اس سے لپٹ گئی...... ”نہیں رستم ....ایسا نہ کرو۔“

رستم نے پسٹل نکال لیا۔ شانی پوری جان سے رستم کے ہاتھ سے لپٹ گئی۔ اس نے پسٹل کا رخ فرش کی طرف موڑ دیا..... ”نہیں رستم!“ وہ بار بار یہی کہتی جا رہی تھی۔ ریاض سکتہ زدہ پڑا تھا۔

رستم کو فرطِ غضب نے دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ اسے کون روک رہا ہے..... کیوں روک رہا ہے؟ ان لمحوں میں بس اس کی ایک ہی خواہش تھی، وہ ریاض کو ٹھنڈا کر دے..... اس نے ریاض کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ شانی اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ ریاض نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی اور اپنے کٹے پھٹے جسم کو سمیٹ کر صحن کی طرف بڑھا۔ رستم نے آخری زور لگایا مگر شانی پسٹل کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی گئی۔

ریاض لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے سے نکلا اور... گھنے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا......

رستم کو جیسے اچانک جھٹکا لگا۔ اس نے چونک کر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی شدید ہیجانی کیفیت ذرا ماند پڑی۔ اس کے بے حد تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ تاہم اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہیں سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ اس نے گھنے درختوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ کچھ ہی لمحے بعد اس نے پسٹل پر سے اپنی آہنی گرفت ختم کر دی اور شانی سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا... جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وہ کتنی ہی دیر دیوار سے ٹیک لگائے ایسے ہی بیٹھا رہا۔ اس کی ٹھوڑی سے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون ٹپکتا رہا۔ کھینچا تانی میں شانی کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کی کہنیوں اور گھٹنوں سے کھال چھل گئی تھی۔ زخمی انگلیوں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم اٹھا۔ اسے ایک دم نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑکی کی پختہ چوکھٹ پر مارنا شروع کر دیا۔ اس کا چہرہ فرطِ کرب سے بگڑا ہوا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس

نے ہاتھ کو لہولہان کر لیا۔

"رستم! کیا کر رہے ہو؟" شانی چلائی اور تڑپ کر رستم کا ہاتھ تھام لیا۔

کھال چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ اس نے زخمی ہاتھ کو چوما، سینے سے لگایا اور رونے لگی۔

وہ عجیب آواز میں بولا۔ "میں نے آپ کو گھسیٹا، آپ کو زخمی کیا۔ مجھے بہت زیادہ سزا ملنی چاہیے۔۔۔ بہت زیادہ ملنی چاہیے۔"

اس کی آنکھیں جو ہمیشہ خشک رہتی تھیں، آج نم ہو گئیں۔ ان میں سے آنسو گرے اور اس کی نرم داڑھی میں جذب ہو گئے۔ شانی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے کیچڑ آلود سینے کو چومنے لگی۔ اس کی لہولہو گردن کو چومنے لگی۔ "نہیں رستم! آپ نے کچھ نہیں کیا ہے۔ جو کچھ کیا ہے میں نے کیا ہے اور۔۔۔۔۔ اور میں نے بھی اس لیے کیا ہے کہ۔۔۔۔۔ یہ مسجد ہے۔۔۔۔۔ خدا کا گھر ہے۔۔۔۔ اس نے یہاں پناہ لی تھی۔ اس نے پناہ لی تھی یہاں۔۔۔۔۔"

دونوں خاموش رہے۔ ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ دونوں کے جسم خونچکاں تھے۔۔۔۔ اور رستم کے زخمی جسم سے تو لہو باقاعدہ ٹپک رہا تھا۔ باہر بارش کے ساتھ ہوا بھی شامل ہو گئی تھی اور پانی کی بوچھاڑیاں اس شکستہ ویران مسجد کی دیواروں سے ٹکراتی محسوس ہوتی تھیں۔

ایک بہت بڑا طوفان آ کر گزرا تھا۔۔۔۔۔ اور اس طرح گزرا تھا کہ ابھی تک رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ بالکل آخری لمحوں میں ریاض اس سے بچ کر نکل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ اس جگہ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ اگر وہ مزید زندہ رہنا چاہتے تھے تو انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اور یہ بات شانی بھی جانتی تھی مگر دوسری طرف وہ رستم کی دگرگوں حالت بھی دیکھ رہی تھی۔ سب سے بری حالت اس کی ٹانگ کی تھی یوں لگتا تھا کہ ٹانگ کی کھال مختلف جگہوں سے چر گئی ہے اور لہو اگل رہی ہے۔

اس شکستہ بے آباد مسجد کو چھوڑتے ہوئے شانی جذباتی ہو گئی۔ اس نے محراب و منبر کو دیکھا۔ محراب کے ساتھ والی دیوار پر الوداعی انداز میں ہاتھ پھیرا اور دل ہی دل میں بولی۔۔۔۔۔

اے خانۂ خدا! ہمیں معاف کرنا۔ ہم تیری ویرانی کو رونق تو نہ دے سکے، الٹا تیرے در و بام کی بے حرمتی کی تیرے تقدس کو پامال کیا۔ ہم تیرے گناہ گار ہیں۔۔۔۔۔ اور اتنے کم نصیب ہیں کہ خواہش کے باوجود کچھ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتے۔۔۔۔ لیکن ہم دعا کرتے ہیں کہ کسی روز

تجھے آباد کرنے والے آئیں، تیرے طاقوں میں مدت سے بجھے ہوئے دیے روشن ہوں۔ تیری سنسان دیواروں میں اذان کی آواز گونجے۔ وہ دیوار کو ہاتھ سے چھوتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆=======☆=======☆

سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر گاہے بہ گاہے شانی کے سینے سے اٹھتی تھی اور پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ رستم کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ رستم وہی لینڈ کروزر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا جس کے شیشے کلاشنکوف کی مار سے چکنا چور تھے اور جس میں مرنے والوں کا خون لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ وہ وحشی بارش میں موقعہ واردات سے قریباً بارہ کلو میٹر آگے آ چکے تھے۔ اب ان کے اردگرد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ رستم کے اندازے کے مطابق ان کا رخ مغرب میں بنوں کے پہاڑوں کی طرف تھا۔ ریاض کا طاقتور واکی ٹاکی عین اس جگہ سے ملا تھا جہاں ریاض اور رستم میں کئی منٹ تک دوبدو لڑائی ہوئی تھی۔ اس واکی ٹاکی کے ملنے سے رستم اور شانی کو اتنی تسلی ضرور تھی کہ زخمی ریاض فوری طور پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ نہیں کر سکے گا۔ اس کے باوجود وہ تادیر اس جیپ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک کچے راستے پر رستم نے جیپ روک دی۔ اس نے ڈیش بورڈ میں اور نشستوں کے نیچے کوئی کام کی چیز تلاش کرنا چاہی مگر شراب کی چھوٹی بوتلوں، فحش تصویروں والے تاش کے پتوں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اپنے اٹیچی کیس کے ساتھ وہ دونوں جیپ سے نکل آئے۔ مسجد سے نکلنے کے بعد سے رستم یکسر خاموش تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی گویائی ہی سلب ہو گئی ہے۔ اس کے سپاٹ چہرے سے شانی کے لیے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شانی کو سب سے زیادہ تشویش اس کی ٹانگ کی طرف سے تھی۔ جیپ سے نکل کر وہ بیس تیس قدم جیپ کے رخ پر ہی چلتے گئے۔ اٹیچی کیس رستم نے ہی تھام رکھا تھا مگر اس کا وزن سہارنے میں شانی اس کی مدد کر رہی تھی۔

"رہنے دیں شانی!" رستم نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

شانی نے اٹیچی کے ہینڈل پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ لنگڑاتے ہوئے بیس تیس قدم چلنے کے بعد رستم رک گیا۔ وہ دائیں طرف مڑا۔ یہاں گھاس کی ایک طویل پٹی راستے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہ اس پر آ گیا۔ شانی اور وہ دونوں اس گھاس پر چلنے لگے مگر اب رستم واپس آ رہا تھا۔

"میں سمجھی نہیں رستم؟"

"وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے شانی۔" رستم نے بہ دستور ویران لہجے میں کہا۔

اس کی بات شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ کچی زمین پر اپنے پاؤں کے نشان بنا کر رستم نے تعاقب کرنے والوں کو الجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ یہاں جھاڑیاں گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ راستہ مسدود ہو جائے گا۔ یہ بالکل غیر آباد علاقہ تھا۔ بس کہیں کہیں کسی گائے بھینس کا گوبر یا بکریوں کی مینگنیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ شانی کو رستم کی قوت برداشت کا علم تھا۔ پھر بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ اس سے چلنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی مگر اس علاقے میں معالج تو درکنار کوئی انسان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رستم کے جسم اور خاص طور سے ٹانگ کی حالت دیکھ دیکھ کر شانی کا دل رو رہا تھا۔

"تھوڑی دیر رک جائیں رستم؟" شانی نے التجائی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں شانی! یہ خطرناک ہوگا۔" رستم نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن آپ کی ٹانگ......"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

وہ جیسا ٹھیک تھا شانی کو اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا تہہ بند گھٹنوں تک کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ کرتہ سامنے سے پھٹ چکا تھا اور بالائی جسم پر کئی جگہ سنگین کے گہرے کٹ تھے...... خاص طور سے بائیں پہلو پر تو گہرا زخم آیا تھا اور یہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا۔ خون جو رستم کا تھا...... جس کا ایک ایک قطرہ شانی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔

"آپ کے پہلو کا زخم کھلتا جا رہا ہے۔ پلیز! آپ کہیں بیٹھ جائیں۔" شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔

"شانی آپ سمجھنے کی کوشش کریں ...... ہمیں زیادہ سے زیادہ دور جانا ہے۔"

رستم نے اسی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے قریباً ایک کلومیٹر سفر مزید طے کیا۔ پھر رستم کی حالت دیکھنا شانی کے بس میں نہیں رہا۔ وہ خود کو نڈھال ظاہر کرتی ہوئی ایک جگہ بیٹھ گئی۔ رستم کو بھی بیٹھنا پڑا۔ شانی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ رستم کے خون اگلتے جسم کو دیکھ سکے۔ بارش اب ہلکی پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی تاہم بادل بہ دستور موجود تھے۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خون کے اخراج کے سبب رستم کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ وہ حتیٰ الامکان اپنی حالت کو شانی سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک جگہ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ انہیں کہیں قریب سے ٹخ ٹخ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص کسی بیل، گھوڑے وغیرہ کو ہانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رستم نے

کُرتے کے نیچے سے پسٹل نکال لیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ دونوں جھاڑیوں میں رک کر انتظار کرنے لگے۔

"بیل گاڑی لگتی ہے۔" شانی نے سرگوشی کی۔ رستم نے سر اثبات میں ہلایا۔

یہ ایک بیل گاڑی ہی تھی۔ اس میں دو توانا بیل بندھے ہوئے تھے اور وہ گاڑی کو تیزی سے کھینچتے چلے جا رہے تھے۔ "گاڈی" درمیانی عمر کا سرخ و سپید توانا شخص تھا۔ اس نے غالباً بارش سے لطف اندوز ہونے کے لیے بالائی لباس اتار رکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی تھی۔ وہ کچھ گنگنا رہا تھا اور آم چوس رہا تھا۔

رستم نے پسٹل کُرتے کے نیچے چھپایا اور گاڈی کے سامنے آ گیا۔ گاڈی (گاڑی بان) لہولہان رستم کو دیکھ کر ٹھٹکا اور اس نے جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ بیل گاڑی رک گئی۔ صحت مند گاڈی جست لگا کر نیچے اُترا اور رستم کی طرف بڑھا۔ "او جواناں! کیا ہوا تم کو؟ یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟"

رستم نے کہا۔ "ہم میاں بیوی آ رہے تھے۔ رستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور گاڑی میں ڈال لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے۔"

گاڈی نے رستم کو سرتاپا دیکھا اور اس کے زخم زخم جسم کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھوں میں ہمدردی کی جوت جاگی۔ "اوئے تیرا تو برا حال ہے برادر تیری گھر والی بھی ساتھ ہے؟"

اس دوران میں شانی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلی اور رستم کے پاس آ گئی۔ "او ہو...... تیری تو گھر والی بھی کافی بھٹکل ہے۔" گاڈی نے تاسف سے کہا۔

پھر اس خیال سے کہ وہ ایک جوان عورت کے سامنے نیم عریاں ہے، اس نے جلدی سے اپنی بھیگی ہوئی قمیص پہن لی۔ اس کی توانا گردن میں چاندی کا بھاری تعویذ اچھا لگ رہا تھا۔

شانی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "بھائی! میرے شوہر کی ٹانگ بہت زخمی ہے۔ کیا تم ہمیں اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھا سکو گے؟"

"یہ کوئی کہنے والی بات ہے میری بہن۔" گاڈی نے صدق دل سے کہا اور رستم کے ہاتھ سے کیچڑ آلود اٹیچی کیس لے کر بیل گاڑی پر رکھ لیا۔ پھر اس نے رستم کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے مضبوط کندھے کا سہارا دیا اور بیل گاڑی پر سوار کر دیا۔ شانی بھی رستم کے ساتھ ہی ایک بوری پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس جگہ پر ہوا ہے برادر؟" گاڈی نے پوچھا۔

رستم نے اسے مختصراً بتایا کہ وہ کیسے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھے اور کیسے نکلے۔

''تمہارے سوٹ کیس میں کوئی بہت قیمتی شے تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے گڈ (بیل گاڑی) کے نیچے چھپا دیتا ہوں۔''

''نہیں بھائی! بس عام استعمال کا سامان ہے۔'' شانی بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''یہ ہم کس جگہ پر ہیں بھائی؟''

''ہم عیسیٰ خیل اور بنوں شہر کے درمیان میں ہیں۔ یہاں بہت کم آبادی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا گراں نور خیل یہاں سے ڈیڑھ میل آگے ہے۔ میرا نام غلام محمد ہے۔'' گاڈی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں پشتو لہجے کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔

گاڈی غلام محمد نے مڑ کر ایک بار پھر رستم کی حالتِ زار دیکھی اور پریشان ہو کر بولا۔

''براور! تمہیں تو فوری طور پر علاج کی ضرورت ہے۔ تمہارے بہت سا خون نکل گیا ہے۔ گراں پہنچ کر میں تمہارے لیے کوئی انتظام کرتا ہوں۔ اگر نہ ہوا تو پھر ہم تمہیں بنوں کے ہسپتال میں لے جائیں گے۔ تم ایک دم بے فکر رہو۔''

اس نے بیل گاڑی کو تیز ہانکنا شروع کر دیا۔ ہچکولوں سے رستم کو تکلیف ہو رہی تھی اور یہ تکلیف رستم کے چہرے سے عیاں تھی۔ تاہم شانی جانتی تھی کہ پیدل چلنا اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ اپنے گراں کے نزدیک پہنچ کر غلام محمد نے اپنی بھیگی ہوئی چادر نچوڑ کر رستم کو دے دی تاکہ وہ اپنے خون آلود لباس کو چھپا سکے۔ رستم نے اس چادر سے احتیاط کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھانپ لیا۔ پگڑی جو اس کے گلے میں پڑی تھی، اس نے دوبارہ اپنے سر پر باندھ لی۔ شانی نے بھی اپنے کیچڑ آلود لباس کو اپنی اوڑھنی میں اچھی طرح چھپا لیا۔

''لگتا ہے تم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے؟'' غلام محمد نے شانی کے زرق برق لباس سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ نور محمد افسردہ لہجے میں بولا۔ ''پھر تو گہنے وغیرہ بھی گئے ہوں گے؟''

''نہیں، کچھ زیادہ نہیں تھے۔ باقی گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

اب آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے ایک دو راہگیر ملے جنہوں نے مقامی لہجے میں غلام محمد سے سلام دعا کی۔ ایک شخص نے غلام محمد کے ساتھ موجود مہمانوں کے بارے میں بھی پوچھا۔ غلام محمد نے گول مول جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

یہ درختوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی نیم پہاڑی بستی تھی۔ سرسبز درختوں میں چھپے ہوئے نیچی چھتوں والے مکانات تھے۔ بارش رکنے کے بعد شلوار قمیصوں میں ملبوس بہت سے بچے گلیوں میں نکل آئے تھے اور غلیلوں سے چڑیوں کا شکار کر رہے تھے۔ غلام محمد ان دونوں کو سیدھا اپنے گھر میں لے گیا۔ اس گھر میں وہ فقط اپنی جواں سال بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو تین کمروں والا یہ گھر صاف ستھرا تھا۔ ماں کی طرح بچوں کے چہرے بھی روشن تھے۔ بڑا بچہ پانچ چھ سال کا اور چھوٹا ڈھائی تین سال کا تھا۔ غلام محمد کی تھوڑی سی زمین تھی جہاں وہ کاشت کاری کرتا تھا۔ غلام محمد کی بیوی شانی سے باتیں کرنے لگی اور رستم، غلام محمد کے ساتھ بیٹھک نما کمرے میں چلا گیا۔

غلام محمد کی بیوی آسیہ بنوں شہر سے آگے میرم شاہ کی رہنے والی تھی اور پشتو کے علاوہ پشتو لہجے میں اردو بولتی تھی۔ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''چھوٹی بہن! تمہارا شوہر تو بہت زخمی ہے۔ اس کو دیکھ کر امارا دل کانپ گیا۔ کیا تم پولیس میں پرچہ کرائے گا؟''

''ہم غریبوں کی کون سنتا ہے بہن۔ خوامخواہ کی مصیبت ہی گلے پڑے گی۔ شکر ہے جان بچ گئی۔''

شانی نے غلام محمد کی بیوی کو بتایا کہ وہ خوشاب سے داؤد خیل جا رہی تھی، اپنی شادی شدہ بہن سے ملنے کے لیے...... رستے میں یہ واقعہ پیش آ گیا۔

اتنے میں بیٹھک سے غلام محمد نے آواز دے کر شانی کو بلایا۔ شانی بیٹھک میں پہنچی۔ رستم کا پھٹا ہوا کیچڑ آلود لباس اب غلام محمد کے لباس سے تبدیل ہو چکا تھا۔ تاہم اس لباس پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ پہلو کے گھاؤ پر غلام محمد نے پٹی بھی باندھی تھی مگر یہ پٹی بھی سرخ ہو گئی تھی۔ رستم نیم دراز تھا۔ اس نے اپنی شدید زخمی ٹانگ سامنے لکڑی کی تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

شانی لرز گئی۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ڈیڑھ سال پہلے رستم کی ٹانگ کٹی تھی۔ غلام محمد نے کہا۔ ''ٹانگ کی حالت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بہن! میں ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں۔''

''ڈاکٹر کہاں سے آئے گا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''میری بہن کا بیٹا پکا ڈاکٹر ہے۔ بنوں ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ آج کل یہاں نور خیل آیا ہوا ہے، میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔''

شانی نے تذبذب میں رستم کی طرف دیکھا۔ رستم نے رضامندی کے انداز میں آنکھیں

بند کرلیں۔اس کا چہرہ زرد تھا اور لگتا تھا کہ تکلیف حد سے بڑھی ہوئی ہے۔

غلام محمد چھتری پکڑ کر باہر جانے لگا تو رستم نے آواز دے کر اسے روک لیا۔وہ سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔رستم نے کہا۔''غلام محمد! میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں کسی کو ہمارے بارے میں اور...... ہماری حالت کے بارے میں پتا نہ چلے......''

''تم ایک دم بے فکر ہو براور! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ان چوروں، ڈکیتوں کی سی آئی ڈی بڑی تیز ہوتی ہے اور یہ ڈاکٹر صیب ہے نا، یہ اپنا بچہ ہے۔اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں۔جیسا کہیں گے ویسا کرے گا۔''

رستم کو تسلی دے کر غلام محمد تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔شانی ہمت کر کے رستم کے زخموں کو دیکھنے لگی۔غلام محمد نے ایک دو جگہ عارضی پٹی بھی باندھی تھی مگر خون پھر بھی رس رہا تھا۔پہلو کے علاوہ کلائی کا ایک گھاؤ بھی بڑا گہرا تھا۔ہڈی تک نظر آرہی تھی۔شانی کا دل رو رہا تھا۔وہ اپنی چوٹیں بھول گئی تھی۔رستم اور شانی کے داغ دار کپڑوں کو بدلنے کے لیے غلام محمد کی بیوی ایک مردانہ اور ایک زنانہ جوڑا لے آئی۔زنانہ جوڑا شانی کے جسم پر ٹھیک آیا مگر مردانہ جوڑے میں رستم کا بس گزارہ ہی ہو سکا۔یہ شلوار قمیص تھی۔یہ گہرے رنگ کی تھی۔اس پر بھی خون کے ایک دو دھبے نمودار ہوئے مگر یہ زیادہ نمایاں نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اٹھائیس تیس سال کا ایک خوش رُو شخص اندر آگیا۔اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔سلام دعا کے بعد اس نے رستم کا معائنہ کیا۔ٹانگ کی حالت دیکھ کر اس کے کلین شیو چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

''ٹانگ کا زخم تھوڑا پرانا لگ رہا ہے......اور لگتا ہے خاصا سیپٹک ہو گیا ہے۔''اس نے کہا۔

''ہاں جی! چار پانچ دن پہلے موٹر سائیکل سے گر گئے تھے۔''شانی نے مختصر وضاحت کی۔

مقامی ڈاکٹر دھیان سے زخم دیکھتا رہا۔ٹانگ کی مجموعی حالت دیکھ کر اسے الجھن ہو رہی تھی ..... وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔''پہلے بھی اس ٹانگ کا کافی بڑا آپریشن ہو چکا ہے۔''

''ہاں جی! یہ کافی پرانی بات ہے۔ان کی ٹانگ کٹ گئی تھی......بس کے حادثے میں۔''

ڈاکٹر نے اس حوالے سے ایک دو سوال پوچھے۔شانی نے مناسب جواب دیے تاہم ڈاکٹر کے چہرے پر الجھن برقرار رہی۔وہ غلام محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔''ماموں! میں مرہم پٹی تو کر دیتا ہوں۔ایک دو زخموں کو ٹانکے لگنے ہیں، وہ بھی لگا دیتا ہوں مگر ٹانگ کی طرف سے

مجھے تسلی نہیں ہے ..... اللہ کرے، ایک آدھ دن میں بہتر ہو جائے ورنہ ان کو ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

غلام محمد نے شانی کی طرف دیکھا۔شانی بولی۔''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! اگر ان کی حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو میں ان کو واپس خوشاب لے جاؤں گی۔وہاں میرے ایک دو رشتے دار ہیں......''

ڈاکٹر کا نام بایزید خان تھا۔وہ سرجری کورس بھی کر رہا تھا۔اس کے میڈیکل باکس میں طبی امداد کا کافی سامان موجود تھا۔سب سے پہلے تو اس نے رستم کا شدید درد اور بخار کم کرنے کے لیے اسے دو انجکشن دیے۔پھر اس کے زخموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس نے دلجمعی سے کام کیا اور مرہم پٹی مکمل کر لی۔شانی نے اپنی زخمی انگلیاں اوڑھنی میں چھپائے رکھی تھیں۔چونکہ انگلیوں کا زخم بھی تھوڑا پرانا تھا، اس لیے وہ اسے ڈاکٹر کے سامنے لانا نہیں چاہتی تھی۔ڈاکٹر بایزید خان نے جاتے جاتے غلام محمد سے مخاطب ہو کر کہا۔''ماموں! ان کو بستر پر آرام کی ضرورت ہے۔یہ اپنی ٹانگ کو جتنا کم سے کم ہلائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

دن ڈھلتے ہی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔یہ سلسلہ چراغ جلنے تک چلتا رہا۔اس چھوٹی سی بستی میں بجلی نہیں تھی۔شام ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کھانا وغیرہ کھا لیا گیا اور بستی پر غنودگی چھانے لگی۔شانی اور رستم کے لیے بیٹھک نما کمرے میں ہی سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔لالٹین کی روشنی میں وہ دونوں جاگتے رہے۔باہر تواتر سے بارش کا پانی کچے پکے مکانوں پر گرتا رہا اور گاہے بگاہے بجلی چمکتی رہی۔

رستم اور شانی کی چارپائیاں ساتھ ساتھ تھیں۔رستم کمر تک چادر اوڑھے چت لیٹا تھا...... بالکل خاموش...... اور ساکت! شانی نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔اس نے ہاتھ کو تھاما اور اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ہاتھ کتنی دیر رستم کے ہونٹوں پر رکھا رہا پھر رستم کی کھوئی کھوئی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔''شانی! میں بہت شرمندہ ہوں ... مجھے معاف کر دیں۔''

''کس بات کی معافی رستم!''

''میں اپنے ہوش میں نہیں تھا۔مجھے اس وقت اس کُتے (ریاض) کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔میں نے آپ کو گھسیٹا...... آپ کو زخمی کیا۔آپ سے کھینچا تانی کی۔مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دوں۔''

''آپ نے کچھ نہیں کیا لیکن اب آپ ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے پہلے زخم کم ہیں جو اور زخم لگانے کا سوچ رہے ہیں۔ آپ کو...... آپ کو کیا پتا، آپ کے جسم سے نکلنے والا خون کا ایک ایک قطرہ میری جان کو نچوڑ رہا ہے۔''

اس نے بڑے جذباتی انداز میں رستم کا زخمی ہاتھ چوما اور چومتی چلی گئی۔ وہ بڑی نرمی اور آہستگی سے اس کے بستر میں چلی آئی۔ اس کے سینے، گردن اور رخساروں کو شانی نے کئی بار بوسہ دیا پھر نرم ریشم کی طرح اس سے لپٹ کر اشک بہانے لگی۔

رستم نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شانی! بس ایک بار...... اپنی زبان سے کہہ دیں...... آپ نے مجھے معاف کیا۔ میری سختی کے لیے مجھے معاف کیا...... ایک بار کہہ دیں۔''

اس کا یہ جذباتی پن شانی کو ششدر کر دیا کرتا تھا۔ وہ آج بھی ششدر ہو گئی۔ معافی تو شانی کو مانگنی چاہیے تھی۔ رستم کی زندگی کا اولین مقصد شانی کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ ریاض، بدترین مات کھانے کے باوجود رستم سے بچ کر نکل گیا...... اور وہ اس بہت بڑی بات کو یکسر بھول کر شانی کی چند خراشوں کے لیے اس سے معافی تلافی کر رہا تھا۔

شانی کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے میں سمیٹ لے۔ اس کی ساری ذہنی اور جسمانی تکلیفوں سمیت اسے ہر بلا سے بچا کر کہیں دور نکل جائے...... دنیا کے کسی انجانے گوشے میں! کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے ایک بھرپور کوشش کی جا سکتی ہے؟ وہ رستم کے شانے سے لگے لگے اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''آپ جو چاہتے تھے...... وہ ہو گیا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو گیا ہے کہ ڈیرے پر ظلم کرنے والے اصل لوگ مارے گئے ہیں۔ ریاض بھی بری طرح زخمی ہوا ہے اور آپ کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے کے بعد جان بچا کر بھاگا ہے...... کیا یہ سب کافی نہیں ہے؟'' اس نے آخری سوال بہت ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

رستم کافی دیر خاموش رہا پھر اس نے عجیب دل فگار لہجے میں کہا۔ ''شانی! کاش میرے بس میں ہوتا۔ میں ان لوگوں کو بار بار زندہ کر کے مار سکتا ہے...... آپ میری بات چھوڑیں...... آپ بتائیں کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''رستم! کیا ہم...... ڈپٹی ریاض کو معاف نہیں کر سکتے؟''

''شانی! آپ...... آپ......'' وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ زخمی آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ کتنی ہی دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ نیم تاریکی میں بارش کی صدا گونجتی رہی یا ان کے دھڑکتے دلوں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ آخر شانی نے ایک بار پھر اسے اپنے نرم بازوؤں میں سمیٹا اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''رستم! زندگی میں بس ایک بار آپ سے کچھ مانگنا

چاہتی ہوں، اس کے بعد کبھی نہیں...... کچھ نہیں...... ''

رستم کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں اور عجیب لہجے میں کہا۔ ''آپ کچھ نہ مانگیں شانی...... آپ...... بس حکم دیں۔''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''حکم نہیں رستم! ایک التجا...... شاید پہلی اور آخری۔''

''آپ کہیں بی بی!''

شانی نے رستم کو کچھ اور بھی اپنی بانہوں میں سمویا اور بولی۔ ''رستم! آئیں...... اپنی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کریں...... سب کچھ بھول کر، سب کچھ معاف کر کے...... یہاں سے کہیں نکل جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں دشمنی اور بدلے کی یہ آگ نہ پہنچ سکے۔ جہاں بس میں اور آپ ہوں...... کوئی نہ ہو...... کوئی بھی نہیں۔''

شانی کی بانہوں میں رستم ساکت تھا۔ بالکل بے جان...... بے روح...... شانی کو لگا، دھڑکن کے سوا اس کے جسم میں زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں۔ خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ شانی کے کان رستم کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔ آخر یہ آواز ابھری اور شانی کی منتظر سماعت سے ٹکرائی۔ یہ عجیب آواز تھی، یہ عجیب لہجہ تھا۔ رستم نے کہا۔ ''شانی! یہ کیسے ہو سکتا ہے...... آپ کچھ کہیں اور میں ماننے سے انکار کر دوں...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں......''

رستم کی آنکھ سے ٹپکنے والا ایک گرم آنسو شانی کی پیشانی پر گرا اور اس کے رخسار کی طرف بہہ گیا۔

''شکریہ رستم...... شکریہ!'' شانی نے کہا اور اس کے گرد اپنی نرم بانہوں کا حصار مضبوط کر دیا۔ وہ کیا تھا۔ ایک سرکش ہوا تھا...... ایک بے اماں موج تھا۔ پنجاب پولیس کی ہتھکڑیوں میں استعمال ہونے والا بے شمار لوہا اسے زنجیر کرنے میں ناکام رہا تھا...... لیکن ان لمحوں میں وہ کسی ناتواں جسم کی طرح شانی کی بانہوں میں تھا۔ اس نے جیسے خود کو شانی کی بانہوں میں گرا دیا تھا۔ اس کی مرضی کے سپرد کر دیا تھا۔

وہ وارفتگی سے گویا ہوئی۔ ''رستم! آپ کی ٹانگ ذرا بہتر ہو جائے تو ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ ہم پارہ چنار اور خرلاچی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ بس ایک دن کا سفر ہے۔ یہ ایک دن کا سفر کچھ بھی نہیں۔ ہم یہ طے کر لیں گے۔ وہاں خرلاچی کے قریب وہ سب موجود ہیں۔ ناصر، جہانگیر، زری...... اور پہلوان...... وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جتنا انتظار کر سکے، ضرور کریں گے۔'' اس نے چند لمحے توقف

کیا اور رستم کو گفتگو میں شامل کرنے کے لیے بولی۔ ''افغان بارڈر خرلاچی سے کتنی دور ہے رستم؟''

''بس ایک دو میل۔'' رستم نے جواب دیا۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے اور ہم بارڈر پار نہ بھی کریں تو بھی وہ ایسا علاقہ ہے جہاں بڑی آسانی سے کچھ عرصے کے لیے چھپا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے شانی...... جیسا آپ کہیں۔''

''آپ کی...... اپنی رائے کیا ہے؟ کیا ہمیں پارہ چنار اور خرلاچی کی طرف جانا چاہیے؟''

''ہم...... کسی بھی طرف جا سکتے ہیں لیکن......''

''لیکن کیا رستم؟''

وہ زخمی آواز میں بولا۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے شانی...... کسی صورت نہیں...... ڈپٹی ریاض بے حد عیار بندہ ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر ہم نکلے تو کس طرف جائیں گے۔''

''زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنی بھرپور کوشش کریں گے رستم! کیا پتا...... کیا پتا......'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ چند لمحے بعد وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''رستم! میرے ابا جی اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر درگزر کرنے والا اور معاف کرنے والا خدا کو بہت پسند ہے۔ کیا پتا رستم! ہماری یہ چھوٹی سی نیکی ہی ہمارے کسی کام آ جائے اور ہم مصیبتوں کے اس گھیرے سے نکل جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے نا رستم؟''

''آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا شانی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

شانی نے اس کا زخمی رخسار چوما۔ ''تو پھر آنکھیں بند کر کے سو جائیں...... کل جب صبح ہوگی تو ہم ایک نئے انداز سے سوچیں گے۔''

''آپ بھی سو جائیں۔''

''نہیں، میں جاگوں گی۔'' شانی بولی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لَو مزید مدھم کر دی اور رستم کے لمبے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلانے لگی۔ کمرے سے باہر رات کسی ناگن کی طرح آگے کو سرک رہی تھی۔ اس کی پھنکار میں اَن گنت اندیشے سرسرا رہے تھے۔

صبح نکھری ہوئی تھی مگر شانی کی آنکھوں میں یہ ''نکھار'' رستم کی تکلیف کے سبب دھندلایا

ہوا تھا۔ رات آخری پہر رستم کی ٹانگ کی تکلیف مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ حتیٰ الامکاں ضبط کر رہا تھا مگر گاہے بہ گاہے کراہنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ صبح سویرے ہی غلام محمد اپنے ڈاکٹر بھانجے کو بلانے چلا گیا۔ ڈاکٹر بایزید خان نے آ کر رستم کی ٹانگ کی پٹی کھولی...... شانی نے دیکھا کہ رستم کی پوری پنڈلی میں تریڑیں سی نمودار ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ گوشت مُردہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کانپ گئی۔ ٹانگ کی یہ کیفیت اس حصے تک تھی جو ڈیڑھ دو سال پہلے رستم کے جسم سے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔

تو کیا...... رستم کی ٹانگ کا یہ حصہ دوبارہ اس کے جسم سے جدا ہو رہا ہے؟ یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح شانی کے دل میں پیوست ہو گیا۔

تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر بایزید خان نے مایوسی سے سر ہلایا اور شانی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ شانی باہر آئی تو بایزید خان نے کہا۔ ''آپ کے شوہر کی حالت ٹھیک نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جائیں۔''

''لل...... لیکن۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

''دیکھیں، آپ اس معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ڈاکٹر بایزید خان نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ٹانگ کا زہر جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اگر یہ واقعی پھیل گیا تو...... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جان بھی جا سکتی ہے۔''

شانی کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہاں کوئی پرائیویٹ ہسپتال نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے۔''

''آپ ہسپتال سے اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں؟'' ڈاکٹر نے شانی کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی بات ہے تو بتائیں۔ ہمیں دھوکے میں نہ رکھیں۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر! بس ان لوگوں سے ڈر آ رہا ہے جنہوں نے ہمیں پکڑا تھا۔''

اس جواب سے ڈاکٹر بایزید خان پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ رستم کی ٹانگ کے حوالے سے بھی اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آ رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''آپ کے شوہر کی زخمی ٹانگ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ ٹانگ مکمل طور پر اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ جسم کے ایسے حصے دوبارہ جوڑے نہیں جا سکتے۔ اگر یہ جڑ بھی جائیں تو زندہ نہیں رہتے۔ مگر یہ جڑا ہوا ہے۔ کیا یہ ٹانگ بالکل علیحدہ ہو گئی تھی؟''

''نہیں جی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ کچھ رگیں جڑی رہ گئی تھیں۔''

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ویسے، یہ آپریشن ہوا کہاں تھا؟'' ڈاکٹر بایزید خان نے تفتیشی

انداز میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی، غلام محمد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا اور آنکھوں میں تشویش دکھائی دیتی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور شانی کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو بی بی؟''

''میں نے آپ کو بتایا تھا۔''

''تم نے غلط بتایا تھا۔ تم وہ نہیں ہو۔ پولیس اردگرد کی بستیوں میں تم دونوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ وہ جو کچھ بتا رہے ہیں، وہ بہت حیران کرنے والا ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ ان کے میزبان پر بہت کچھ ظاہر ہو چکا ہے۔ اب کچھ چھپانا بے سود تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ''میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہوں گی۔ جو کچھ مجھ پر اور میرے ساتھی پر بیتی ہے، سب کچھ آپ کو بتا دیتی ہوں۔ اس کے بعد آپ جو فیصلہ بھی کریں، مجھے قبول ہے۔ ہمیں چھوڑ دیں، مار دیں...... یا پولیس کے حوالے کر دیں۔ جو آپ کا جی چاہے۔''

''تم کیا بتانا چاہتی ہو؟'' غلام محمد نے پوچھا۔

''سب کچھ...... اگر کہتے ہیں تو بالکل شروع سے بتا دیتی ہوں۔''

''ہوسکتا ہے کہ جو کچھ تم بتاؤ، مجھے اس سے زیادہ پتا ہو۔'' غلام محمد نے عجیب آہنگ میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''رستم سیال کا نام ہمارے لیے نیا نہیں ہے اور خاص طور سے میرے لیے اور رستم کے ساتھ ساتھ میں تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم شانی بی بی ہو نا...... رنگ والی کی چوہدرانی؟'' غلام محمد نے لرزتے لہجے میں کہا۔ شانی حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ غلام محمد کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ''ہاں شانی بی بی! یہاں بہت سے لوگ تمہارے اور رستم کے بارے میں جانتے ہیں۔ سچ پوچھو تو لالا فرید، رستم سیال اور حسنے گجراتی نے ہم لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی ہوئی ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے سیکسر میں اجرالی سرداروں کے ہاتھ توڑے اور ہم جیسے بے سہارا لوگوں کو ان کی زوردستیوں سے بچایا...... لالے فرید کے ننھیالی ہمارے علاقے کے تھے۔ وہ اکثر یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے...... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن مجھ جیسے نمانے، ناچیز کے گھر میں لالے کا ساتھی رستم سیال آئے گا۔ میں بڑا چھوٹا بندہ ہوں۔ اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر بھی جو کچھ مجھ سے اور میرے گھرانے سے ہوسکا، میں تم لوگوں کے لیے ضرور کروں گا۔''

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں بی بی! میں نے اس سے پہلے کبھی رستم سیال کو یا آپ کو نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی سے ملا ہوں۔ بس ایک دو دفعہ لالے فرید کو دور سے دیکھا تھا...... صرف ایک دو دفعہ لیکن ہمارے گراں کے بہت سے لوگ آپ کو نہ جانتے ہوئے بھی جانتے ہیں۔ آپ ہمارے اپنے ہیں۔'' غلام محمد کا گلا رندھ گیا۔

''مگر ہم آپ پر بوجھ بننا نہیں چاہتے۔ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ بس ان کی ٹانگ......''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بی بی۔ آپ کوئی بوجھ دل پر نہ رکھیں۔ ہم تو وہ لوگ ہیں بی بی جو کسی کو بھی پناہ دے دیں پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔ آپ تو رستم سیال اور شانی بی بی ہو۔''

ڈاکٹر بایزید خان خاموش کھڑا تھا۔ ابھی تک اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا تھا۔ غلام محمد نے شانی کو تو رستم کے پاس بھیجا اور خود بایزید کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم ٹرنکولائزر کے زیر اثر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کی ہلکی کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کی پنڈلی کا رنگ اور جلد کی کیفیت دیکھ کر شانی کا دل خون ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پنڈلی تادیر اس کے جسم کا حصہ نہیں رہ سکتی۔

پندرہ بیس منٹ بعد غلام محمد نے شانی کو پھر پہلے والے کمرے میں بلایا۔ ڈاکٹر بایزید خان جا چکا تھا۔ غلام محمد نے افسردہ لہجے میں شانی کو بتایا کہ رستم کی ٹانگ کے بارے میں بایزید کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ٹانگ کے ٹھیک ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ رستم کے جسم کے ساتھ رہی تو اس کی زندگی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔

شانی کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ڈاکٹر بایزید خان جو کہہ رہا ہے وہ درست ہے لیکن اس بات کو قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا...... اگلے ایک گھنٹے کے اندر شانی کے دل و دماغ میں ایک جاں گسل کشمکش جاری رہی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا اور اکیلے کرنا تھا...... وہ ایک طوفان کی زد میں تھی۔ غلام محمد نے شانی کو بتا دیا تھا کہ اگر ٹانگ کو علیحدہ کرنا ہوا تو ہسپتال کی ضرورت پڑے گی۔ تاہم وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ بایزید خان یہیں پر یہ کام کرنے کو تیار ہو جائے۔

سہ پہر تک رستم کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بولا۔ ''شانی! یہ ٹانگ میری جان لے لے گی۔ اس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کو کاٹ کر پھینک دیں۔''

شانی نے اس کے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی آپ کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔ ہم جو فیصلہ کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے اور آپ کا مشورہ لیں گے۔“

”میرا کوئی مشورہ نہیں ہے شانی۔ میں نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے...... سب کچھ آپ پر۔“ وہ جیسے کہیں بہت دور سے بول رہا تھا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر بایزید خان آ گیا۔ وہ بڑی تکلیف دہ شام تھی۔ یہ نامہرباں شام...... جیسے شانی کو روندتی اور کچلتی ہوئی گزر گئی۔ اسے ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر بایزید خان بالکل تیار نہیں تھا لیکن وہ ماموں کے اصرار کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ ناکافی سامان اور غیر موزوں ماحول کے باوجود اس نے تین لالٹینوں کی روشنی میں ایک گھنٹے کا آپریشن کیا اور رستم کی نیم مُردہ ٹانگ اس کے جسم سے علیحدہ کر دی۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ رستم کے جسم کا وہ حصہ جو کچھ عرصہ پہلے ایک غیر فطری عمل کے تحت اس کے جسم سے جوڑا گیا تھا پھر علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ شاید کبھی اس کے جسم کا حصہ بنا ہی نہیں تھا۔ وہ بس ایک ”تجربہ“ تھا...... جو کچھ دیر چلنے کے بعد ناکام ہو گیا تھا یا پھر ایک حیران کن پودے کی طلسم کاری تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنا اثر کھو بیٹھی تھی......

☆=======☆=======☆

اگلے 72 گھنٹے میں شانی نے مہمان نوازی اور بے لوث قربانی کی ایسی مثال دیکھی جسے آخری سانس تک بھلانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ غلام محمد شاید ان فرشتوں میں سے تھا جو اب بھی کہیں کہیں اس زمین پر بسیرا رکھتے ہیں۔ شانی اور رستم کو پناہ دے کر وہ اپنے چھوٹے سے بنتے کھیلتے گھرانے کے لیے ایک شدید ترین خطرہ مول لے رہا تھا مگر اسے پرواہ نہیں تھی۔ شانی کی ہر بات کے جواب میں وہ بڑی خوش دلی سے پوٹھوہاری کا ایک شعر بولتا تھا جس کا مطلب تھا...... بندہ پانی میں غوطہ لگا کر سوکھا رہ سکتا ہے مگر اس مصیبت سے نہیں بچ سکتا جو اس کے مقدر میں ہو اور نہ اس راحت سے محروم رہ سکتا ہے جو اس کے نصیب میں ہو۔ وہ لالے فرید کا پرستار تھا اور اس حوالے سے رستم کا بھی۔ اس کا رویہ دیکھ کر شانی کو ڈھوک شاہاں کی وہ ایثار پیشہ لڑکی مہراں یاد آ گئی جس کے بارے میں رستم نے اسے بتایا تھا۔ مہراں نے رستم کو ایک مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لیے اپنا کومل جسم ایک نہایت مکروہ اور کرخت شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ غلام محمد کا ایثار بھی مہراں سے کم نہیں تھا...... اپنی حاملہ بیوی اور دو پھول جیسے بچوں کی زندگی کی پرواہ کیے بغیر تن من دھن سے شانی اور رستم کا سہارا بنا ہوا تھا۔ شانی نے

سوچا...... جب تک ظلم رہے گا، تب تک ظلم سے ٹکرانے والے اور لہولہو ہونے والے بھی رہیں گے اور جب تک لہولہو ہونے والے رہیں گے، گمنام بستیوں میں ان کا سہارا بننے والے مہراں...... اجمل خان اور غلام محمد بھی رہیں گے

حیرت انگیز طور پر رستم کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ خون کی کمی کے سبب اس کا رنگ گہرا زرد تھا۔ بخار اور شدید درد میں افاقہ تھا۔ آج وہ لاٹھی کے سہارے دو چار قدم چلا بھی تھا۔ ڈاکٹر بایزید خان روزانہ آ کر رستم کے زخموں کی بینڈیج کر رہا تھا۔ خاص طور سے اس کی ٹانگ کی۔ تاہم شانی صاف محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر بایزید خان اس ساری صورتِ حال سے خوش نہیں ہے۔ وہ شانی اور رستم سے بس بہت ضروری بات ہی کرتا تھا۔ شانی دل سے سمجھتی تھی کہ بایزید خان کا رویہ بے جا نہیں ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی سوچتا۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ جلد از جلد رستم کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ مگر غلام محمد جو اطلاعات پہنچا رہا تھا۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ تلاش کرنے والے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک یہی غنیمت تھا کہ وہ نور خیل نامی اس چھوٹی سی الگ تھلگ بستی میں نہیں پہنچے تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شانی پچھلے دو دن میں گاہے بہ گاہے رستم کے موبائل فون پر بھی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کے دل میں یہ موہوم آس موجود تھی کہ شاید کسی طرح ناصر اور جہانگیر وغیرہ سے رابطہ ہو سکے لیکن یہاں سگنلز ہی نہیں مل رہے تھے۔

تیسرے روز رات کو شانی اور غلام محمد میں دیر تک بحث ہوئی۔ آخر شانی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”بھائی! اگر آپ ہمارے جانے کا انتظام نہیں کریں گے تو ہم از خود نکل جائیں گے۔ اگر پیدل چلنا پڑا تو پیدل چل پڑیں گے...... اور ایسا کرنے سے جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہو گا، اس کے ذمے دار آپ لوگ ہوں گے۔“

شانی کے فیصلہ کن رویے نے غلام محمد کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی سے تا دیر مشورہ کیا۔ بیوی، غلام محمد کی چچا زاد تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح کھلے دل اور حیران کن اخلاق کی مالک تھی۔ شانی نے دیکھا تھا، ہر معاملے میں میاں بیوی کی رائے ایک ہوتی ہے۔ یہ بڑا پیارا سا گھرانہ تھا...... ایک ایسا ہی گھرانہ جو کہیں شانی کے ذہن میں بھی بسا ہوا تھا مگر اب شانی کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔ گھر والی سے مشورہ کرنے کے بعد غلام محمد نے شانی کو بتایا کہ وہ آٹھ دس گھنٹے میں ان کے جانے کا انتظام کر دے گا۔

رات کو لالٹین کی روشنی میں شانی اور رستم کے درمیان پھر مکالمہ ہوا۔ رستم نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔ ”شانی! اب تو میں اور بھی بے کار ہو گیا ہوں۔ ہمیں حقیقت کو مان لینا

چاہیے۔ یہ لوگ ہمیں پارہ چنار کی طرف نکلنے نہیں دیں گے۔ آپ کے پاس اب بھی موقع ہے، آپ......"

شانی نے رستم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کر دیں۔"

رستم چپ ہو گیا۔ گردن ایک بار پھر جھک گئی۔ شانی نے کہا۔ "آپ اندھیرا دیکھ رہے ہیں مگر مجھے امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں۔ آپ نے خود بتایا ہے کہ خرلاچی گاؤں تک تقریباً ایک دن کا سفر ہے۔ ہم لوکل بس پر یہ سفر کر سکتے ہیں۔"

"لیکن سڑک تک کیسے پہنچیں گے؟" رستم نے پوچھا۔

"اس کا انتظام غلام محمد کر رہا ہے۔ وہ گندم اور تمباکو وغیرہ لے کر ایک قریبی قصبے کی طرف جاتا ہے۔ وہ ہمیں اپنی بیل گاڑی میں چھپا کر لے جائے گا۔"

رستم کسی دل سوز سوچ میں گم رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ "شانی! کہیں آپ کے ذہن میں یہ خیال تو نہیں کہ آپ نے...... آپ نے بالکل آخری لمحوں میں ریاض کی جان بچا لی ہے۔ اس کے بدلے میں وہ بھی ہم سے کسی طرح کی رعایت کرے گا۔"

"رستم! ہم نے جو کچھ کیا کسی بدلے کے لیے نہیں کیا۔ ہم نے اپنا کام کیا۔ اس نے کیا کرنا ہے یہ سوچنا اس کا کام ہے۔"

"شانی! اگر آپ کے ذہن کے کسی دور دراز کونے میں بھی یہ بات موجود ہے تو اسے نکال دیں۔ ریاض کو میں اس کی پیدا کرنے والی ماں سے بھی بڑھ کر جانتا ہوں۔ وہ بد ذات...... کتے کی اس دُم جیسا ہے جو سو سال حقے کی نلی میں رہ کر بھی ٹیڑھی رہتی ہے۔"

"میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی رستم۔ ہمیں تو بس اپنے بارے میں سوچنا ہے، یہاں سے نکلنے کے بارے میں۔"

رات دو بجے کے لگ بھگ غلام محمد کہیں سے ایک پرانی بیساکھی لے آیا۔ یہ لاٹھی کی نسبت بہت بہتر تھی...... اور یہ رستم کے لیے نئی شے نہیں تھی۔ روکیٹ بستی میں وہ کئی ماہ اس کے سہارے چلتا رہا تھا...... اور وہ دن اس کی زندگی کے سہانے دنوں میں سے تھے۔ وہ مر کر بھی انہیں نہیں بھول سکتا تھا۔ غلام محمد نے ایک بڑی سی خستہ حال چادر کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس میں ایک پیوند لگا ہوا تھا۔ اٹیچی کیس میں سے کلاشنکوف گولیاں اور دستی بم نکال کر ایک بستر میں گول گول لپیٹ دیئے گئے۔ اس بستر کو سوت کی رسی سے باندھ دیا گیا۔ شانی نے رستم کے لمبے بال سمیٹ کر اور پن کر کے ایک کام دار ٹوپی میں چھپا دیئے۔ غلام محمد کی بیوی آسیہ نے

دیسی گھی کے پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے...... راستے میں ناشتہ کرنے کے لیے ایک بڑے رومال میں لپیٹ دیئے۔ رات آخری پہر تین بجے کے لگ بھگ رستم اور شانی جانے کے لیے تیار تھے۔ ڈاکٹر بایزید خان موقع پر موجود تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا...... وہ جیسے جلد از جلد رستم اور شانی کو اس گھر سے باہر دیکھنا چاہتا تھا۔

وقتِ رخصت شانی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا، وہ ہم بھول نہیں سکتے، اس موقع پر شکریے کے سارے لفظ چھوٹے محسوس ہو رہے ہیں۔"

بایزید کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اس نے ذرا سا مسکرانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ شانی دل کی گہرائی سے بولی۔ "میں جانتی ہوں ڈاکٹر! آپ پریشان ہیں۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ ہم نے جلد یا بہ دیر پکڑے جانا ہے۔ میں آپ کے اندیشے کو غلط نہیں کہہ سکتی مگر ایک بات کا آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ ہم پکڑے گئے اور بدترین تکلیف سے بھی گزرے تو آپ کا اور آپ کے ماموں کا نام ہماری زبانوں پر نہیں آئے گا...... مرتے دم تک بھی نہیں۔"

اس بار بایزید خان نے صرف شکریہ کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ مزاجاً ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند شخص لگتا تھا۔

گھر کے کشادہ صحن میں گندم کی چھوٹی بوریوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں بڑی سمجھ داری سے رستم کے لیے اور شانی کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ بستر بند کو غلام محمد نے اپنے پاس رکھنا تھا۔ رستم کو بیل گاڑی پر چڑھنے میں تھوڑی سی دشواری ہوئی۔ جب رستم اور شانی اوپر پہنچ گئے تو غلام محمد نے تمباکو کے چند گٹھے اور تین چار گندم کی بوریاں مزید رکھ کر ان دونوں کو بالکل چھپا دیا۔

بیل گاڑی کا سفر طویل اور بے حد تناؤ والا تھا۔ اندیشوں کے دیو...... ان کے اردگرد چنگھاڑ رہے تھے۔ باہر سے آنے والی ہر آواز پر انہیں کسی پولیس اہلکار یا اجرالی ہرکارے کا شبہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی شانی کے ذہن میں ڈاکٹر بایزید خان کے حوالے سے بھی ہلکا سا شک گزرتا تھا کہ کہیں وہ کسی طرح کی مخبری نہ کر دے مگر اس نسبت سے آخر تک خیریت ہی گزری۔ صبح تین بجے کے چلے ہوئے وہ دوپہر کو منزل تک پہنچے۔ غلام محمد نے ان کو باہر نکالا۔ یہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی ایک جگہ تھی۔ سامنے بلند اور خشک پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ "وہ سامنے سڑک ہے برادر! ٹل جانے والی بس یہاں سے مل جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پارہ چنار کی بس ہی مل جائے۔"

"اب آپ جائیں۔" شانی نے آنکھوں میں اشک لے کر کہا۔

"نہیں نہیں، جب تک آپ سوار نہ ہوں گے، میں یہیں رہوں گا۔"

رستم یکسر خاموش تھا۔ اپنی جسمانی تکلیف اور ذہنی رنج والم سے لڑتا ہوا...... اس نے جیسے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شانی کے بہاؤ کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ریاض سے ہونے والے خونی ٹکراؤ کے بعد سے اس پر عجیب بے حسی طاری تھی۔

اپنے محسن غلام محمد سے رخصت ہونے کے بعد شانی اور رستم پروگرام کے مطابق علیحدہ علیحدہ پختہ سڑک کی طرف بڑھے۔ میلی کچیلی چادر میں لپٹا ہوا اور بیساکھی کے سہارے...... بہ مشکل چلتا ہوا رستم ایک قابلِ رحم شخص لگ رہا تھا۔ گول بستر اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ شانی اس سے کافی پیچھے تھی۔ دونوں سڑک کے کنارے ایک سنگِ میل پر پہنچے۔ یہاں دیسی برقعے میں لپٹی ہوئی دو عورتیں اور تین خان صاحبان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو تین بچے بھی تھے۔ شانی اور رستم ایک دوجے سے دور اور لاتعلق کھڑے رہے۔ شانی نے اپنا جسم اور چہرہ مکمل طور پر مقامی طرز کی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس عمر کی عورت ہے۔

بس نے تھوڑا سا انتظار تو کرایا لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ سیدھی پارہ چنار جانے والی بس تھی۔ رستم کے سوار ہونے کے بعد شانی بھی سوار ہوگئی۔ وہ دونوں بس کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بیٹھے۔ رستم بستر بھی بس کے اندر لے جانے میں کامیاب رہا۔ شانی اگلے حصے میں تھی اور گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے جیسے بہت دور تھا۔ کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا...... غمزدہ و رنجور! جسمانی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

☆=======☆=======☆

ٹل میں بس صرف آدھ گھنٹہ رکی اور پارہ چنار کی طرف روانہ ہوگئی۔ خشک پہاڑوں اور مفلس کھیتوں کے درمیان یہ ایک طویل تھکا دینے والا سفر تھا۔ شانی اور رستم کے لیے یہ اعصابی طور پر بھی تھکا دینے والا تھا۔ راستے میں انہیں کئی جگہ لیویز کے ناکے نظر آئے۔ ایک دو جگہ رکی ہوئی بس کے اندر لیویز کے اہلکاروں نے تاکا جھانکی بھی کی۔ شانی کے دل کی دھڑکنوں میں ہر آن اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں شانی کو اپنے اردگرد پشتو کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہر شخص کے کندھے پر رائفل نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکوں کے کندھوں پر بھی ہلکی پھلکی رائفلیں موجود تھیں۔

یہاں پاکستانی اور افغانی دونوں طرح کی کرنسی نظر آرہی تھی۔ جب شام کی سیاہی پھیل چکی تو شانی کو دور شمال مغربی افق پر ایک پہاڑی سلسلے کی بالائی لکیر نظر آئی۔ شانی نے اپنے قریب بیٹھی برقع پوش عورت سے پوچھا۔ "وہ سامنے والے پہاڑ پارہ چنار کے ہیں؟"

"نہیں بہن! وہ افغانستان کا پہاڑ ہے۔"

"اور پارہ چنار؟"

"ام کو ٹھیک سے پتا نہیں۔ پارہ چنار بائیں طرف ہے۔ ام بس آدھ گھنٹے کے اندر پہنچ جائے گا۔"

شانی کو اپنی رگوں میں خون کی گردش بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالآخر وہ منزل کے قرب وجوار میں تھے۔ اسے افق پر وہ پہاڑ دکھائی دے رہے تھے جن کے پار انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا موقع۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوچا۔ "کیا وہ وہاں تک پہنچ پائیں گے؟ کیا آنے والا ایک ڈیڑھ گھنٹا بخیریت گزر جائے گا؟" اس کا دل گواہی دینے لگا کہ ایسا ہوگا۔ قدرت انہیں نئی سرزمین پر نئی زندگی شروع کرنے کا ایک موقع دے گی۔ مگر اس کی چھٹی حس دوسرے انداز کی پکار بلند کرنے لگی...... جب وہ بس سے اتریں گے، انہیں چپے چپے پر نگراں آنکھیں نظر آئیں گی۔ وہ اس ماحول میں بالکل اجنبی اور جدا دکھائی دیں گے۔ خاص طور سے رستم...... وہ فوراً نگاہوں میں آجائے گا۔

وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی اور بس پاک افغان سرحد کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک چیک پوسٹ پر انہیں روکا گیا۔ یہاں سڑک پر باقاعدہ پھاٹک سا بنایا گیا تھا۔ حسبِ سابق شلوار قمیص والے دو رائفل بردار اہلکاروں نے بس میں نگاہ دوڑائی۔ وہ نیچے اترنے لگے مگر ایک اہلکار مڑا۔ اس کی نگاہ پچھلی نشستوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رستم بھی انہی نشستوں پر موجود تھا۔ شانی کا دل اچھل کر گلے میں آگیا۔ اہلکار پچھلی نشستوں کے پاس گئے...... اور رستم کے سامنے رک گئے۔ پہلے انہوں نے پشتو میں کچھ پوچھا پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولے۔ "ہاں بھئی! کہاں سے آیا ہے؟"

"بنوں سے۔" رستم کا چہرہ پتھر کی طرح بے تاثر تھا۔

"کہاں جارہا ہے؟"

"پارہ چنار...... حاجی اکرم علی کے پاس۔"

اہلکاروں نے دو تین مزید سوال پوچھے۔ وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ پچھلے اہلکار نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے کھولو۔"

رستم چند سیکنڈ ساکت رہا۔ شانی جانتی تھی۔ یہ موت سے پہلے کا سکوت ہے...... یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ رستم ایک گہری سانس لے کر نیچے جھکا۔ اس نے بستر کھولا۔ شانی کی دھڑکنیں اس کی پسلیاں توڑنے لگیں۔ بستر کے اندر کلاشنکوف ایک بیڈشیٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ رستم نے بیڈشیٹ کے اندر سے ہی فائر کیا۔ دھماکے سے گولی اہلکار کے سینے میں گھسی اور وہ پشت کے بل ایک طرف کی نشستوں پر گرا۔ پوری بس میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ دیوانہ وار چلائے اور نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے اہلکار نے رائفل سیدھی کرنا چاہی۔ کلاشنکوف سے دو مزید فائر ہوئے اور یہ اہلکار بھی زخمی ہو کر گر گیا۔ رستم بس کے عقبی دروازے کے بالکل پاس تھا۔ اسے بیساکھی سنبھالنے اور بس سے نکلنے میں پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں تھی اور کینوس کا تھیلا اس کے کندھے پر تھا۔

رستم کے ساتھ ہی شانی بھی اگلے دروازے سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ ارد گرد موجود خضدار، لیویز اہلکار یا دیگر لوگ۔ کچھ سمجھتے یا کرتے، رستم قریب کھڑے ایک سوزوکی لوڈر میں داخل ہو گیا اور کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن سے لگا دی۔ نوجوان ڈرائیور کی آنکھیں دہشت سے کھلی رہ گئیں۔ یہ سواریاں ڈھونے والا لوڈر تھا اور اس کے پچھلے حصے میں نشستیں تھیں۔ جونہی شانی ایک نشست پر بیٹھی، رستم ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔

''تمہاری بھی جان جائے گی۔ جان بچانی ہے تو گاڑی بھگا دو۔''

معلوم نہیں کہ قبائلی ڈرائیور رستم کا فقرہ سمجھا یا نہیں مگر اس کا مفہوم ضرور سمجھ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ دو مسلح اہلکار لوڈر کی طرف جھپٹے، انہوں نے فائر کیے۔ ایک گولی شانی کو چھو کر گزری اور سائیڈ ونڈو کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ رستم نے اہلکاروں کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں اور انہیں زمین بوس کر دیا۔

''تیز چلو۔'' وہ لرزہ خیز آواز میں دھاڑا۔

ہیبت زدہ ڈرائیور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ ''بائیں موڑو۔'' رستم نے کلاشنکوف کی نال اس کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک سے اُتاری اور پہاڑیوں کے درمیان کچے راستے پر ڈال دی۔ شانی نے کانپ کر دیکھا۔ رستم کی ٹوٹی ٹانگ کی پٹی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پہلو کے زخم کا منہ بھی شاید کھل گیا تھا۔ ہلکی پھلکی گاڑی زوردار ہچکولے کھا رہی تھی اور شانی کا سر بار بار چھت کے پائپوں سے ٹکرا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اسے چند تیز رفتار ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''رستم! وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ ویسے بھی راستہ پُر پیچ ہونے کی وجہ سے عقب میں آنے والے فائر نہیں کر سکتے تھے۔ سوزوکی لوڈر اچھلتی کودتی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ رستم نے کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن میں گھسیڑ رکھی تھی۔ غالباً اسے یہ ڈر بھی تھا کہ ڈرائیور کہیں گھبرا کر چھلانگ ہی نہ لگا دے۔ ''شانی! آپ سیٹ پر لیٹ جائیں۔'' رستم نے کہا۔ شانی نے ہدایت پر عمل کیا۔ ''تیز چلو خان!'' رستم گاہے بگاہے ڈرائیور پر گرج رہا تھا۔

''اور تیز چلے گا تو گاڑی الٹے گا۔'' ڈرائیور نے کراہتے ہوئے کہا۔

''الٹ کر کسی دریا میں نہیں گر جائے گا۔'' رستم نے اس کے سر پر کلاشنکوف کا بیرل رسید کیا۔ وہ تقریباً دو میل تک اسی طرح چلتے رہے۔ وہ اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ قرب و جوار بالکل تاریک تھے۔ گاہے بگاہے عقب میں آنے والی گاڑیوں کی روشنیاں چمک جاتی تھیں پھر چند فائر سنائی دیئے۔ یہ دھماکا خیز فائر ہیوی رپیٹر کے تھے۔ راستہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ لوڈر کو شدید جھٹکا لگا اور وہ زوردار آواز سے بائیں طرف جھک گیا۔ نیچے سے کسی نکیلے پتھر نے اس کا انجر پنجر پھاڑ دیا تھا۔ ''اوہ خدایا!'' ڈرائیور نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''شانی! آپ اُتر آئیں۔'' رستم پکارا۔

شانی اُتر آئی۔ رستم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ واپس بھاگ جائے۔ رستم نے جیسے ہی یہ بات کہی، ڈرائیور نے ڈھلوان پر دوڑ لگا دی۔ رستم اور شانی آگے بڑھنے لگے۔ تاروں کی روشنی ان کی مدد کر رہی تھی۔ ''شاید وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' شانی نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

رستم نے مڑ کر دیکھا۔ اسے بھی نشیب میں ٹارچوں کی روشنیاں چمکتی نظر آئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں نے بھی گاڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ رستم نے ایک جگہ رک کر کینوس کے بیگ سے نیا میگزین نکالا۔ اسے کلاشنکوف سے اٹیچ کیا اور چھوٹے چھوٹے تین برسٹ چلائے۔ کلاشنکوف کی دہلا دینے والی آواز سناٹے میں دور تک گونجی اور کئی سیکنڈ تک پہاڑیوں میں اس کی بازگشت سنائی دی۔ روشنیاں پہلے اوجھل ہو گئیں پھر بکھری بکھری دکھائی دیں۔ پیش قدمی کرنے والوں کے قدم رک گئے تھے۔

رستم اور شانی پھر اوپر چڑھنے لگے۔ بیساکھی کے ساتھ رستم کو خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ شانی گاہے بگاہے اسے سہارا دیتی تھی۔

''رستم! ہم کہاں تک جائیں گے۔'' وہ دل فگار آواز میں بولی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ...... جیسا کہیں گی میں ویسا کروں گا۔'' وہ درد سے کراہا۔

وہ اب تک اسی کیفیت میں تھا جس میں، ریاض سے ٹکراؤ کے بعد مبتلا ہوا تھا۔ اس نے جیسے

اپنا سر تسلیم خم کرلیا تھا اور سب کچھ ..... سب کچھ شانی کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

"یہ کون سے پہاڑ ہیں رستم؟" شانی نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ناصر نے انہی تین پہاڑوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کے پار افغان سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ خرلاچی کا گاؤں ہماری دائیں طرف ہے۔"

"ناصر اور جہانگیر کہاں ہوں گے؟"

"اگر ہم اس پہاڑ کو ذرا بائیں طرف سے پار کرلیں تو ہم اس گاؤں کی طرف اتریں گے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"کیا ہم ان تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے رستم؟" شانی نے عجیب حسرت آمیز آہنگ میں کہا۔

"اس موقع پر کیا کہا جا سکتا ہے شانی؟"

ایک بار پھر عقب سے فائرنگ ہوئی۔ یہ تین چار رائفلیں تھیں جو ایک ساتھ چلائی گئی تھیں۔ رستم اور شانی ڈھلوان کے ساتھ لگ گئے۔ فائرنگ کے انداز سے ظاہر ہوا کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ پیچھے آنے والوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ رستم اور شانی کا رخ کس طرف ہے۔

"شاید یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی فائر کریں اور انہیں ہمارے رخ کا ٹھیک سے پتا چلے۔" شانی نے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور شانی کے ساتھ اوپر چڑھنا جاری رکھا۔

ایک موڑ مڑتے ہی وہ عقب کے نشیب میں دور تک دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ یہ نظارہ ہرگز خوش کن نہیں تھا۔ نشیب میں چمکتی روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی لوگ ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ پھیل کر بڑھ رہے تھے۔ کسی وقت ان کی دور افتادہ آوازیں ہوا پر تیر کر ان تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان آوازوں میں طیش تھا اور آگ کی لپک تھی۔

یہ تکلیف دہ سفر جاری رہا۔ پیچھے آنے والے ایک بار پھر قریب آتے جا رہے تھے۔ شانی نے کہا۔ "رستم! مجھے لگتا ہے، ہم چوٹی پر پہنچنے والے ہیں۔" رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بولی۔ "اس چوٹی پر پہنچ کر شاید ہم وہ گاؤں دیکھ سکیں جہاں ناصر، جہانگیر اور دوسرے ساتھی ہیں۔"

"شاید!" رستم نے مختصر جواب دیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ گاؤں سے سرحد زیادہ دور نہیں ہے... کیا پتا ہم سرحد پار کر ہی جائیں۔" شانی نے امید ظاہر کی۔

"اصل مسئلہ تو گاؤں تک پہنچنے کا ہے۔" رستم نے کہا۔

اچانک رستم کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا کئی میٹر نیچے چلا گیا۔ "رستم...... رستم!" شانی چلائی اور رستم کی طرف بڑھی۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ کلاشنکوف ابھی تک اس کے گلے میں تھی، تاہم کینوس کا تھیلا کندھے سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ بیساکھی بھی دور تک پھسل گئی تھی۔ شانی نے پہلے بیساکھی پکڑی پھر رستم کی طرف لپکی۔ اس کا دل دہل گیا۔ رستم کے کئی زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ ٹانگ سے لپٹی ہوئی پٹی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید پہلو کے کچھ ٹانکے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گرنے سے کلاشنکوف کا میگزین علیحدہ ہو گیا اور کچھ گولیاں بکھر گئیں۔

"رستم...... رستم!" شانی نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹا اور اٹھنے میں مدد دی۔ وہ اٹھ تو بیٹھا...... مگر اس کی حالت ابتر تھی۔ ٹانگ کے زخم سے باقاعدہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ شانی نے اضطرابی حالت میں ٹارچ جلانا چاہی مگر رستم نے اسے روک دیا۔ یہی وقت تھا جب پھر فائرنگ بھی ہونے لگی۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونجے اور گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزرنے لگیں۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کوئی گولی کینوس بیگ میں ہی نہ جا لگے...... "شانی! ہمیں کسی آڑ میں ہونا ہوگا۔" رستم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

وہ انتہائی برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھا اور شانی کے سہارے سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر انہیں دو پتھروں کے درمیان ایک خلا سا نظر آیا۔ رستم اور شانی کسی نہ کسی طرح اس خلا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ پہاڑوں میں ایسی پناہ گاہیں عام ہوتی ہیں۔ اس کھوہ کے اندر ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ پتھر کی دیواریں اور لکڑی کے وزنی تختوں کی چھت۔ ماضی میں شاید یہاں کوئی چیک پوسٹ بنائی گئی تھی مگر اب یہ خالی پڑی تھی۔ ایک طرف کی دیوار بھی گری ہوئی تھی۔ سنگلاخ چھت کی کسی اندرونی آب جو کا پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ رستم اور شانی اندر چلے گئے۔ ایک چوبی کھڑکی میں سے جنوب کے نشیب کو دور تک دیکھا جا سکتا تھا یہاں تک کہ پارہ چنار کی دور افتادہ روشنیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

تعاقب کرنے والے قریب آتے جا رہے تھے۔ شانی اور رستم کے کانوں تک ان کی طیش بھری آوازیں پہنچنے لگیں۔ اس موقع پر رستم نے پھر کلاشنکوف سے چند فائر کیے۔ اس وارننگ دیتی ہوئی فائرنگ سے قریب آنے والوں کے قدم رک گئے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ پتا بھی چل گیا کہ رستم اور شانی کہاں ہیں۔

یہ نازک ترین صورتِ حال تھی۔ شانی روئی اور پٹیوں کی مدد سے رستم کی ٹانگ سے بہتا

خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا فائر کر رہا تھا۔

''رستم! خون نہیں رک رہا۔'' شانی کراہی۔

''آپ چھوڑ دیں۔ خود ہی رک جائے گا۔'' وہ نحیف آواز میں بولا۔

''رستم! کیا ہم...... خود کو ان کے حوالے کر دیں؟''

''میں نے کہا ہے نا...... میں وہی کروں گا...... جو آپ کہیں گی۔''

کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولی۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ شاید اسی جگہ ہمیں......'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

رستم نے چھ سات گولیوں کا ایک برسٹ چلایا۔ کسی کے چلانے اور نشیب میں لڑھکنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ جواب میں چیک پوسٹ کی پتھریلی دیوار پر تابڑ توڑ گولیاں برسائی گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔

یہ خطرناک لمحے تھے۔ پیچھے آنے والے جوش میں آ کر چیک پوسٹ پر چارج کر سکتے تھے۔ اس موقع پر رستم نے ایک دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ کر اسے پوری طاقت سے ڈھلوان پر پھینک دیا...... روشنی کے ساتھ ساتھ ساعت شکن دھماکا ہوا اور جیسے چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔

رستم اور شانی کو اندازہ ہوا کہ گھیرا ڈالنے والے ہراساں ہو کر تھوڑے فاصلے پر چلے گئے ہیں۔ کلاشنکوف کے ساتھ ساتھ دستی بموں کی موجودگی یقیناً انہیں بہت محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''آپ کے پاس کتنی گولیاں ہیں رستم؟''

''ہم صبح تک انہیں روک سکتے ہیں۔''

''اس کے بعد؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شانی۔''

شانی چند لمحے چپ رہی پھر اس نے فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر رستم کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ''رستم! لگتا ہے ہم نہیں بچ سکیں گے۔''

''شاید...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ کچھ فاصلے پر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شانی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور اسے اپنا دل بالکل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ نیچے ڈھلوان سے کافی آگے تاریک نشیب میں بہت سی مزید روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ روشنیاں ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''یہ کیا ہے رستم؟''

''شاید گاڑیاں ہیں۔ مگر اتنی دور سے بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔''

''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''بس ہم دو کے لیے اتنے زیادہ لوگ؟''

''یہ ڈرے ہوئے لوگوں کی نشانی ہوتی ہے شانی۔''

نشیب میں رینگنے والی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر ان میں پولیس کاروں کی ریوالونگ بلیو لائٹس بھی دکھائی دینے لگیں۔ رستم اور شانی کے ارد گرد فائرنگ رک گئی تھی۔ شاید فائرنگ کرنے والے کمک اور اعلیٰ افسران کی ہدایات کا انتظار کر رہے تھے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ گاہے بہ گاہے ہلکی فائرنگ کے سوا کوئی کارروائی نہیں ہوئی تاہم یہ بات تھی کہ مسلح افراد نے انہیں مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا۔ خون کے مسلسل اخراج سے رستم کے لب و لہجے میں غیر معمولی نقاہت اُتر آئی تھی۔ شانی جانتی تھی کہ وہ نیم جان ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ شانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کے بازو کے ساتھ لگ کر اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر کھڑکی میں سے جھانکا اور کراہی۔ ''رستم! وہ قریب آتے جا رہے ہیں...... وہ کافی زیادہ ہیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں شانی! ہم آخری دم تک لڑیں گے۔''

اچانک میگا فون پر ایک گرج دار آواز ابھری۔ یہ لیویز کے کسی پڑھے لکھے افسر کی آواز تھی۔ اس نے رستم کا نام لے کر اسے ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ رستم نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اب یہ بات بالکل صاف ہو چکی تھی کہ رستم اور شانی کو شناخت کیا جا چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میگا فون پر ایک اور آواز ابھری اور یہ وہی منحوس آواز تھی جسے وہ پہلے بھی بہت مرتبہ سن چکے تھے۔ یہ آواز پہچاننے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ ریاض کی آواز تھی۔ وہ قہرناک انداز میں گرجا۔ ''رستے! ذلیل موت مرنے سے بہتر ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ یہ تیرے لیے آخری موقع ہے۔ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آ......''

شانی اور رستم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ریاض ان کی توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ حالات کا اندازہ لگا کر پہلے سے اس علاقے میں موجود تھا یا پھر کسی برق رفتار سواری پر آیا تھا۔

اگلے پانچ منٹ میں ریاض نے میگا فون پر دو تین مرتبہ رستم اور شانی کو مخاطب کیا۔ وہ اپنی ڈکشنری کے بدترین الفاظ بول رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے زہریلے تیروں کی طرح تھے جو سینے

سے آر پار ہو جاتے تھے۔

رستم نے کلاشنکوف سے دو تین طویل برسٹ چلائے...... قریب آنے والے مسلح افراد پھر فاصلے پر جاتے محسوس ہوئے۔ یہ مزاحمت انہیں سمجھا رہی تھی کہ رستم سیال، محصور ہونے کے باوجود تر نوالہ نہیں ہے۔ وہ آسانی سے جان نہیں ہارے گا۔

ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ مگر شانی جانتی تھی کہ اس خاموش تاریکی میں موت کے بیسیوں ہرکارے موجود ہیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر رستم کے شانے سے لگا دیا۔ رستم نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ چاند کی مدھم روشنی اب کھوہ کے اندر پہنچنے لگی تھی۔ سامنے کھوہ کی چھت سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والا پانی ایک ملائم سیاہ پتھر پر گر رہا تھا۔ یہ قطرہ دو چار دن سے نہیں گر رہا تھا، نہ ہی دو چار سالوں سے...... یہ شاید دو چار صدیوں سے گر رہا تھا یا پھر اَن گنت زمانوں سے۔ نیچے سیاہ پتھر میں ایک سوراخ نمودار ہو گیا تھا۔ رستم نے کھوئے کھوئے نحیف لہجے میں کہا۔ ''شانی! آپ دیکھ رہی ہیں...... پتھر پر پانی بھی مسلسل گرتا رہے تو آر پار ہو جاتا ہے...... لیکن...... کچھ لوگ سنگلاخ پتھروں سے بڑھ کر سخت ہوتے ہیں۔ ان پر اَن گنت زمانوں کی محبت اور مہربانی بھی کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ یہ شخص جو ابھی اسپیکر پر اپنے منہ سے شعلے نکال رہا تھا، یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ رستم کا اشارہ ریاض کی طرف ہے۔ رستم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''شانی! آپ کے سینے میں بڑا نرم اور محبت کرنے والا دل ہے۔ آپ ہر چیز میں اچھائی تلاش کرتی ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں سے آپ جیسے لوگ بھی اچھائی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ مجھے پتا ہے شانی! آپ ہر ہر موڑ پر ریاض پر احسان کرتی رہی ہیں۔ آپ نے اس کی فطرت کو بدلنے کی اپنی طرف سے ہر کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے شانی! آپ نے ریاض کو بدلنے کی اچھی نیت کے ساتھ مجھ سے بھی بہت کچھ چھپایا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''وہی جو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔'' اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''جب میں ریاض کے بھتیجے طفیل کو چھوڑنے کے لیے گیا تھا...... اسے چھوڑنے سے پہلے ہی آپ ناصر اور جہانگیر کے پاس واپس آ چکی تھیں۔ مگر آپ نے مجھ سے یہ خبر چھپالی۔ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ طفیل قید رہے اور ریاض کے اندر جلتا ہوا بھانبڑ اور اونچا ہو جائے۔''

شانی چپ رہی، وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

رستم نے اپنے شدید زخمی پہلو کو دباتے ہوئے کہا۔ ''اور شانی! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ

آپ کی قریبی سہیلی سکینہ مر چکی ہے۔ اسے تکلیف دے کر مارنے والا یہی ریاض حرامی تھا۔ آپ نے یہ بات بھی مجھ سے چھپائی۔ صرف اس لیے کہ شاید اس طرح ریاض کے دل میں کسی طرح کی کوئی نرمی پیدا ہو جائے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں رستم!'' شانی گردن جھکائے جھکائے سکی۔

''اور مجھے یہ بھی پتا ہے شانی کہ آپ نے ڈیفنس میں ریاض کی بیوی اور بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ آپ نے شدید خطرہ مول لیا اور زخمی بھی ہوئیں...... آپ کی انگلیوں سے ابھی تک خون رستا ہے...... آپ نے ہر موڑ پر ریاض کو دعائیں دی ہیں شانی! اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید وہ بدل جائے...... مجھ سے وہ، جیپ والا واقعہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے......''

شانی اَشک بار سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ حرامزادہ آپ کو گوجرانوالہ سے وڈے ڈیرے کی طرف لا رہا تھا اور تایا معصوم بھی ساتھ تھے۔ اس نے جیپ میں آپ کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے، سب کے سامنے......''

شانی چپ رہی...... رستم کی معلومات پر اسے حیرانی ہو رہی تھی۔ اس نے نہ جانے کون کون سی باتیں پیٹ میں ڈال رکھی تھیں۔ اس کی بے پناہ برداشت کا شانی کو اعتراف تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''شانی! یہ دو چار واقعے نہیں، درجنوں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے بہت سے موقعوں پر ریاض سے مہربانی اور درگزر کا سلوک کیا...... لیکن میں نے کہا ہے نا، کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے تکبر کا علاج مہربانی اور محبت سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کی بیماری کی ایک ہی دوا ہوتی ہے۔ اینٹ کے بدلے میں ان کے کھوپڑے پر پتھر مار کر ان کا بھیجا نکال دیا جائے۔''

''مگر رستم...... پتھر مارنے سے بھی تو سارے مسئلے حل نہیں ہوتے......''

''مجھے معاف کرنا شانی! میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ جس طرح پتھر مارنے سے سارے مسئلے حل نہیں ہوتے، اسی طرح محبت اور مہربانی سے بھی ہر مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ہاں شانی...... میں سوچتا ہوں...... دنیا میں اربوں کھربوں روپے کا اسلحہ کیوں بنایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ دماغوں والے لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بندے کی خصلت میں اچھائی کم اور برائی زیادہ ہے...... اور یہ برائی صرف اسلحے کے زور پر ہی کنٹرول میں رہتی ہے۔''

شانی نے چونک کر رستم کا زخم زخم چہرہ دیکھا۔ رستم خود کو اَن پڑھ اور گنوار کہتا تھا۔ مگر اکثر وہ اپنی ترنگ میں ایسی بات کہہ جاتا تھا جو کسی فلسفی کے قول سے کم نہیں ہوتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں رستم!'' شانی بھی کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''مگر داناؤں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ شہر طاقت سے فتح ہو سکتے ہیں لیکن دلوں کو صرف محبت سے جیتا جا سکتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے رستم...... کہ دلوں کو جیتنے کے لیے بہت سا وقت چاہیے ہوتا ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے اور بہت ساری برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور شاید وہ بھی ہمارے پاس نہیں تھی...... کم از کم میرے پاس تو نہیں تھی۔''

''اگر آپ کے پاس برداشت نہیں تو پھر کس کے پاس ہوگی؟'' رستم نے عجیب آہنگ میں کہا۔

اچانک ایک برسٹ چلا۔ پتھریلی دیوار لرز اٹھی اور پتھر کی بہت سی کرچیاں ان کے اردگرد بکھر گئیں۔ رستم نے بھی جوابی طور پر دو سنگل شاٹ چلائے۔ چونکہ وہ بلندی پر تھا اس لیے اس کی فائرنگ خطرناک ثابت ہوئی تھی۔

موبائل فون اب تک رستم کی جیب میں تھا۔ شانی نے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ مُردہ ہو چکا تھا اور اگر اس کی بیٹری موجود بھی ہوتی تو یہاں سگنلز کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سوچنے لگی، ان کے ساتھی ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اور نہ ہی سرحد زیادہ دور ہے۔ مگر یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی اب شاید صدیوں پر محیط تھا...... ایک بار پھر اس کا دھیان ڈپٹی ریاض کی طرف چلا گیا۔ رستم کے الفاظ شانی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا...... اثر کر ہی نہیں سکتا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''کیا واقعی کچھ لوگ بدترین مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔'' رستم کی یہ بات حقیقت تھی کہ شانی نے ہر ہر موڑ پر ریاض کی بے پناہ نفرتوں کا جواب بے پناہ برداشت اور صلح جوئی سے دینے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل میں یہ امید پالی تھی کہ شاید یہ شخص بھی اتنا برا نہ رہے، جتنا ہے...... بلکہ شانی کے دل کے کسی گوشے میں اب سے چند گھنٹے پہلے تک بھی یہ آس موجود تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا کھوہ سے فقط چالیس پچاس میٹر کی دوری پر ہوا تھا۔ ''اوہ خدایا! مجھے لگتا ہے یہ بارودی سرنگ ہے۔'' رستم نے کہا۔

''مگر بارودی سرنگ کہاں سے آئی؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ کسی نے یہاں پہلے سے دبا رکھی ہو۔'' رستم کراہتے ہوئے بولا۔

سرنگ پھٹنے کے کچھ ہی دیر بعد مسلح افراد کا وہ گھیرا پھیلتا ہوا محسوس ہوا جو بہ تدریج تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ آوازیں جو پہلے قریب سے آ رہی تھیں، اب فاصلے پر چلی گئی ہیں۔ اس واقعے کو کیا کہا جا سکتا تھا؟ شاید قدرت کی طرف سے ان کو تھوڑی سی مزید مہلت دی گئی تھی...... لیکن کب تک...... آخر کب تک؟ شانی نے بے حد دکھ سے سوچا۔

''رستم! اس کھوہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں؟ ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔''

شانی اور رستم میں اس موضوع پر چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ بڑی خاموشی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پوسٹ چھوڑنے سے پہلے رستم نے چند آخری فائر کیے اور شانی کے ساتھ کھوہ میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے چلنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہر تیس چالیس قدم پر شانی اسے کہتی۔ ''رک جائیں۔ ذرا سانس لیں۔'' وہ کسی معمول کی طرح رک جاتا اور شانی کے سہارے بیٹھ جاتا۔ ان کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ شاید یہ کھوہ انہیں کسی طرف سے راستہ دے دے۔ مگر یہ آس تا دیر قائم نہیں رہی۔ قریباً نصف فرلانگ چلنے کے بعد کھوہ بند ہو گئی۔ کھوہ کے آخری سرے پر بھی ایک ویسی ہی شکستہ پوسٹ موجود تھی جیسی وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ دیواروں سے جالے لگے ہوئے تھے۔ دو چار چمگادڑوں کی موجودگی بھی ثابت ہوئی۔ خبر نہیں، یہ کیسی جگہیں تھیں اور کن لوگوں نے کس مقصد کے لیے استعمال کی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی ایک دیوار پر پڑی تو یہاں روغن سے چند نعرے لکھے نظر آئے۔ یہ روسی فوجیوں کے خلاف تھے۔

رستم کے سارے ہی زخموں کے منہ جیسے کھل گئے تھے۔ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے ایک بار پھر اپنی چادر پھاڑی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں؟'' وہ کمزور آواز میں کراہا۔

''آپ کی ٹانگ پر اور پٹی باندھ دوں۔''

''یہ بھی دو منٹ میں بھیگ جائے گی۔'' رستم نے اسے روک دیا۔ اس کی آواز اٹک رہی تھی۔

''رستم! میں آپ کی ٹانگ کا کیا کروں؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ کا سارا خون اس زخم کے رستے نکل جائے گا۔'' وہ دلدوز آواز میں بولی۔

''اس خون نے اب ویسے بھی تو نکل ہی جانا ہے شانی۔''

''ایسا مت کہیں آپ۔'' اس نے رستم کا خون چکاں شانہ چوما۔

''حقیقت کو مان لینا چاہیے شانی!'' اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا غنودگی بھرا ذہن، بند آنکھوں کے ساتھ ایک تصوراتی منظر دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے یہاں سے کچھ فاصلے پر ان پہاڑوں کے پار ایک گھر میں ناصر، جہانگیر، زری، نذیر اور پہلوان موجود ہیں۔ وہ رستم اور شانی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان راہ دیکھنے والوں میں اس کا مُنا بھی شامل ہے۔ پہلوان اسے رنگ والی سے یہاں لے آیا ہے۔ وہ اپنی توتلی زبان میں پہلوان سے پوچھ رہا ہے۔ ”انکل! میلی تاتی جلدی آ جائیں گی؟“

شانی نے تصور ہی تصور میں اس کا ماتھا چوما اور دل ہی دل میں بولی۔ ”موت اور زندگی کے درمیان ہوں میرے مُنے۔ کچھ کہہ نہیں سکتی...... نہ آ سکی تو معاف کر دینا۔“

رستم کے پاس اب آخری دستی بم تھا۔ یہ شاید اس نے کسی خاص وقت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ گولیوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ چوبیس گولیوں والا الگ لوڈڈ میگزین تھا۔ اس کے علاوہ دس پندرہ گولیاں تھیلے میں تھیں۔ رستم ان کو بڑی کفایت سے استعمال کر رہا تھا۔ پسٹل میں بھی صرف دو یا تین گولیاں باقی تھیں۔ جس جگہ رستم بیٹھا تھا، وہاں کافی خون جمع ہو گیا تھا۔ یہ رستم ہی کا خون تھا اور اس کے جسم کے مختلف زخموں سے نکلا تھا۔

اچانک شانی نے دیکھا کہ رستم اپنی کلاشنکوف کو زور زور سے جھٹکے دے رہا ہے۔ پھر اس نے کلاشنکوف کے بیرل کو دو تین بار زمین پر مارا۔ ”کیا ہوا رستم؟“

”یہ کام نہیں کر رہی...... لگتا ہے...... یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔“ وہ بڑے کرب سے بولا۔

اس نے بیرل کا رخ چھت کی طرف کر کے تین چار بار ٹرائیگر دبایا مگر ٹرائیگر بلٹ کو ہیمر کرنے کے بجائے آزادانہ حرکت کر رہا تھا۔ رستم نے میگزین ہٹا کر، دو تین بار دوبارہ اٹیچ کیا۔ مختلف کل پرزوں کو حرکت دی مگر کلاشنکوف خاموش ہو چکی تھی۔ جب رستم کھوہ کی طرف آتے ہوئے بلندی سے لڑھکا تھا تو کلاشنکوف بری طرح پتھروں سے ٹکرائی تھی۔ شاید اسی وقت اس میں نقص پیدا ہوا تھا جو اب نمایاں ہو کر ظاہر ہو گیا تھا۔

رستم کے لیے یہ ایک اور شدید دھچکا تھا۔ وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ وہ گولیاں جو اب تک وہ بچا بچا کر رکھ رہا تھا، ایک دم بے کار ہو گئی تھیں۔ ان کی حقیقت کھوہ کے کنکروں سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ رستم کچھ دیر مزید کلاشنکوف سے الجھتا رہا پھر اس نے عجیب بے پروائی سے اسے ایک طرف رکھ دیا...... اور اب اس کے پاس پسٹل تھا جس میں فقط تین گولیاں تھیں اور ایک دستی بم تھا...... اور یہ بم بھی ایسا ہتھیار نہیں تھا جو موت کے بڑھتے ہوئے ہرکاروں کو تا دیر

ان سے دور رکھ سکتا...... اور موت کے ہرکارے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن موجود تھے یہاں سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر دہانے سے آگے پہاڑیوں میں، جھاڑیوں میں اور پتھروں کے پیچھے...... ہر جگہ وہ تاریکی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ ان کی سرچ لائٹس، جاسوس کتے اور آتشیں ہتھیار اس کی جگہ کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھے۔ ڈپٹی ریاض شاید ایک بار پھر میگا فون پر کچھ بول رہا تھا۔ اس کی بہت مدھم آواز دہانے تک تو یقیناً پہنچ رہی تھی مگر رستم اور شانی کی اس نئی پناہ گاہ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کی اناؤنسمنٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ رستم اور شانی کو ابھی تک دہانے والی پناہ گاہ میں ہی سمجھ رہا ہے۔

خون کی کمی کے سبب رستم کا گلا خشک ہونے لگا۔ اسے پانی کی شدید طلب تھی مگر پانی یہاں نہیں تھا۔ شانی بھی شدید پیاس محسوس کر رہی تھی تاہم رستم کی تکلیفوں نے اور حالات کی سنگینی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ ایک بند کھوہ کی شکستہ پناہ گاہ میں تھے اور اپنی طرف رینگتی ہوئی موت کی پرچھائیاں دیکھ رہے تھے۔

”رستم! مجھ سے بہت ناراض ہیں نا آپ؟“ وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ ریاض آپ سے بچ کر نکل گیا۔“

”بے شک، یہ خواہش پوری نہیں ہوئی مگر یہ اطمینان تو ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ آخر وقت تک میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں رہے گا۔“

”ہاتھ میں ہاتھ ہی نہیں رہے گا۔ اگر مرنا پڑا تو جان بھی جان کے ساتھ جائے گی۔“

”ہم ہار گئے ہیں نا شانی؟“

”نہیں رستم! ہماری ہار ہزار جیتوں پر بھاری ہے۔ ہم لڑنے والوں کے خلاف آخری وقت تک لڑے ہیں اور ہمیں یہ فخر ہے کہ ہم نے اپنے بدترین دشمن کو بھی زیر کرنے کے بعد معاف کیا ہے۔ ریاض بچ گیا رستم! مگر ہم نے اپنے ظرف سے اسے ایسے زخم لگائے ہیں جن کی جلن اسے زندگی بھر...... بے قرار رکھے گی۔“

وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے سے لگے خاموش بیٹھے رہے۔ بھنبھناہٹ جیسی ان آوازوں کو سنتے رہے جو ہوا کی لہروں پر تیر کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں میں بلا کی وحشت اور غضب ناکی تھی۔

شانی نے رستم کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل پر اپنا زخمی ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ”رستم! وہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ ان کے ہاتھ آنے کے بجائے مرنا آسان لگ رہا ہے۔“

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں شانی! آپ اس بات کو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ابھی پستول میں تین گولیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک گولی میری مشکل آسان کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے شانی! آپ کے ہاتھ کی چلی ہوئی گولی مجھے کوئی تکلیف نہیں دے گی۔ بس آپ میرا سر اپنی گود میں رکھ لیں...... پستول کی نال کو یہاں رکھیں۔ میرے کان سے ذرا اوپر اور گھوڑا دبا دیں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے شانی! مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں حرام موت مرنے سے بھی بچ جاؤں گا۔'' وہ بولنے کے ساتھ ساتھ کراہ رہا تھا۔

''میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔''

''تو کیا آپ مجھے اذیت سے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں...... وہ مجھے یہاں...... زندہ پکڑنا چاہیں گے...... اور اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو کچھ کریں گے، وہ آپ کے تصور میں نہیں آ سکتا۔''

''لیکن...... لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے رستم۔ ابھی زندگی کا امکان باقی ہے۔ ابھی ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''اب یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہے شانی! جو کچھ ہونے والا ہے، وہ آپ بھی دیکھ رہی ہیں۔''

''آپ ہی تو کہتے تھے، موت سے پہلے مرنا گناہ ہے۔'' وہ سسکی۔

''تو پھر وعدہ کریں شانی! جب وقت آ جائے گا اور آپ دیکھ لیں گی کہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیں گی۔''

''جو وقت ہم دیکھنا نہیں چاہتے، اس کے بارے میں کیوں سوچیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔'' وہ اپنا رخسار رستم کے شانے سے رگڑتے ہوئے بولی۔

وہ کہہ رہی تھی لیکن ان دونوں کے ذہن جیسے بہ تدریج موت کو قبول کرتے جا رہے تھے..... اور ایک دوسرے کی قربت انہیں مرنے کا حوصلہ بخش رہی تھی۔ موت جواب اٹل تھی، جس سے مفر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رستم کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کی زخمی پیشانی پر اپنے ہونٹوں کو مستقل ٹھہرا دیا۔

اچانک ایک لرزہ خیز آواز نے انہیں سرتاپا دہلا دیا۔ شانی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ڈپٹی ریاض کی قہرناک آواز اتنی جلدی سنے گی اور اتنی قریب سے۔ یہ آواز بہ مشکل بیس پچیس فٹ کے فاصلے سے ابھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی

نہایت تیز روشنی نے ان کی آنکھیں چندھیا دیں۔ یہ دراصل سرچ فوکس لائٹ تھی۔ یہ اپنے دائرے میں آنے والی ہر شے کو روشن تر کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ پتھروں کی طرح ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ڈپٹی ریاض کے پیچھے دو اور سائے بھی تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد تھا۔ یہ دونوں افراد بھی مسلح تھے۔ ڈپٹی ریاض کے اپنے ہاتھ میں جدید خودکار رائفل تھی۔ ڈپٹی کی آنکھیں آتش فشاں کے دو دہانوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ عہدِ قدیم کے کسی منگول حملہ آور کی طرح غیر متوقع طور پر اچانک یلغار کر کے ان کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دفعتاً اس سنگلاخ زمین سے اُگ آیا ہے۔

رستم کا ہاتھ پستول کی طرف بڑھا۔ ڈپٹی ریاض گرجا۔ ''خبردار...... ہاتھ پیچھے رکھ۔''

رستم رک گیا۔

ریاض کا قبائلی ساتھی جو درمیانے قد کا تھا، آگے بڑھا اور اس نے پستول کو رستم کے قریب سے اٹھا لیا۔ کلاشنکوف پہلے ہی دور پڑی تھی۔ ریاض دانت نکوس کر پھنکارا۔ ''لگتا ہے، تیری یہ ماں خالی ہو چکی ہے۔ اسی لیے دور پڑی ہے۔'' اس نے قبائلی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہزارہ خان اٹھا لے اس کلاشنکوفڑی کو بھی۔'' ہزارہ خان نے حکم کی تعمیل کی۔ دستی بم والا تھیلا رستم کے عقب میں تھا مگر اس پر بھی ریاض کی عقابی نظر پڑ گئی۔ ''اس تھیلے کو بھی اٹھا لو جس میں یہ اپنی بہن کا جہیز ڈال کر پھر رہا ہے۔''

قبائلی ہزارہ خان بندوق تان کر آگے بڑھا۔ رستم مزاحمت کے قابل نہیں تھا۔ وہ دیکھتا رہا اور ہزارہ خان کینوس کا تھیلا بھی اٹھا کر لے گیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھ میں بھی سرچ فوکس لائٹ تھی۔ اس کی روشنی ریاض پر پڑی۔ شانی نے دیکھا کہ ریاض کے ورم زدہ چہرے پر پٹیاں تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر سفید پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خونخوار لہجے میں دہاڑا۔ ''کھڑے ہو جاؤ دونوں بہن بھائی۔''

دونوں بیٹھے رہے۔ ڈپٹی نے دونوں کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور شانی کی پسلیوں میں رائفل کی نال گھسیڑتے ہوئے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ شانی لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی لیکن رستم میں اتنی سکت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ اس کی سانس رک رہی تھی... اور آنکھیں جیسے خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ ریاض کے اشارے پر قبائلی ہزارہ خان نے آگے بڑھ کر رستم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ نیم جان رستم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکا۔ ہزارہ خان نے رستم کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ رستم کا زیریں لباس خون سے نچڑا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ والا خون آلود پائنچا حسرت آمیز انداز میں جھول رہا تھا۔ بیساکھی پاس ہی

پڑی تھی مگر ہزارہ خان نے رستم کو بیساکھی دینے کی زحمت نہیں کی۔ ریاض کے حکم پر اس نے بیساکھی کو دیوار سے ٹکرا کر توڑا اور دور پھینک دیا۔

ٹارچوں کی روشنی میں شانی سر جھکائے کھڑی تھی۔ رستم بھی کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور بولنے کی ذمے داری شانی پر ڈال دی ہے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''شانی! یہی شخص تھا نا، چار دن پہلے جس کی موت کا راستہ آپ نے روکا تھا لیکن کچھ بھی ہے...... میرا عشق، میرا ایمان ہے اور میرے عشق میں اختلاف اور انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جو آپ کا رستہ...... وہی میرا رستہ ہے...... جو آپ کی چاہ وہی میری۔''
شانی نے درد بھری نظروں سے رستم کو دیکھا۔

ریاض سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا دیکھ رہی ہے بی بی جان! تیرے اس منہ بولے خصم میں اب کوئی تڑ شڑ نہیں رہی ہے۔ اس کے سامنے تیرے ٹوٹے بھی کر دوں تو یہ اب سلطان راہی نہیں بن سکتا۔ روپے میں بارہ آنے مُردار ہو چکا ہے یہ حرامزادہ۔''

اور ریاض شاید غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رستم نیم جان تھا۔ سخت سے سخت انسان کی برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے اور رستم پر یہ حد آ چکی تھی۔

ریاض نے اے کے 56 رائفل سیدھی کی۔ ''دل تو نہیں چاہتا چن مکھنی...... کہ تم دونوں کو اتنی آسان موت دوں...... پر میں ایک غریب مسکین پلسیا ہوں۔ تم دونوں حرامزادوں کے کلّے بڑے پکے ہیں۔ کیا پتا کل کلاں پھر چھوٹ جاؤ اور میرے سینے پر چڑھ کر دھمالیں ڈالنے لگو۔ اس لیے تم دونوں کی عاشقی معشوقی کا دی اینڈ اسی جگہ کر دینا بہتر ہے۔'' پھر وہ ہزارہ خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیوں بھئی ہزارہ خان! کر دوں نا دی اینڈ...... بجا دوں نا قومی ترانہ؟''

''بالکل ریاض صیب! اب دیر کس بات کی ہے۔ مارو فائر اور لمبا کر دو کنجری کو اور اس کے کنجر یار کو اور بہتر ہے کہ ان کے پیٹ میں گولیاں مارو، دس پندرہ منٹ تڑپ پھڑک تو دکھائیں گے۔''

ریاض پھنکارا۔ ''کیا خیال ہے ہیر سیال! پہلے اپنے ڈھڈ میں تُو گولی کھائے گی یا تیرا یہ بہن خور یار؟''

''ریاض! تُو نے جو بھی کرنا ہے جلدی کر دے۔'' شانی سسکی۔ ''اور اچھا ہے کہ پہلے مجھے مار دے۔''

''ہائے اوئے مُخبتاں...... قربان جانواں اس بھونڈی عاشقی کے۔'' ریاض نے زہر

اگلا اور رائفل کی گولی اس طرح چلائی کہ رستم اور شانی کے درمیان سے گزر کر دیوار میں لگی۔

وہ دونوں محفوظ ساکت کھڑے رہے۔ ریاض ایک دم طیش سے بے قابو ہو کر رستم پر پل پڑا۔ وہ رائفل کے کندے سے رستم کو اندھا دھند مارنے لگا۔ نیم جان رستم نے مزاحمت کی مگر یہ مزاحمت چڑھے ہوئے دریا میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ وہ مزید زخمی ہو کر گر گیا۔ شانی تڑپ کر رستم اور ریاض کے درمیان آ گئی۔ ریاض شانی کو دھکیلتا ہوا ایک بار پھر دور جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم آتش فشاں ہو گیا تھا۔ وہ خوفناک آہنگ میں گرجا۔ ''کھڑے ہو جاؤ...... کھڑے ہو جاؤ دونوں۔'' شانی کھڑی ہو گئی مگر رستم دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔

وہ وہیں خاک و خون میں لتھڑا پڑا رہا۔ اسے زمین بوس دیکھ کر شانی بھی بیٹھ گئی۔ اس نے رستم کو بانہوں میں بھر لیا۔

ریاض چنگھاڑا۔ ''حرامزادی! کیا سمجھتی تھی تُو؟ میں تیری نیک پروینی اور تیری میٹھی چھری سے حلال ہو جاؤں گا؟ تُو فٹے کتنی ماں کی فٹے کتنی دھی ہے۔ تیری عاجزی مسکینی، تیری لولو پوپو باتیں، یہ سب کچھ گندا ناٹک ہے۔ تیری جیسی گندی نالی کی کیڑیاں اونچی کرسیوں پر چڑھنے کے لیے ایسے ہی مومن مولویانیاں بنتی ہیں۔ یہ کوئی نئی سائنس ایجاد نہیں کی تُو نے، یہ بڑا ٹوٹا ٹوٹکا ہے اور...... اور میں نے کہا تھا نا، میں تجھ جیسی پکی جادوگرنیوں کو اپنے پیشاب کی دھار میں بہا دیتا ہوں۔ کہا تھا نا میں نے؟''

شانی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے اے کے 56 رائفل کی نال شانی کی طرف سیدھی کی اور چنگھاڑا۔ ''مرنے سے پہلے اپنی زبان سے اقرار کر کہ تُو فٹے کتنی ہے...... بہروپن ہے۔ تیری نظر ایم این اے کی کرسی پر اور اس سے بھی آگے تھی۔ تُو اس ڈاکو کے ساتھ بغیر نکاح کے سوتی تھی۔ تیرے پیٹ میں اس کے گناہ کی نشانی ہے۔ اقرار کر اپنے منہ سے...... نہیں تو تجھے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا۔ اگر نہ لٹکاؤں تو اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔ اقرار کر......''

شانی بس سسکتی رہی۔ ریاض جیسے دیوانگی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ ہذیانی تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس نے جیبیں ٹٹول کر ایک فل اسکیپ سادہ کاغذ نکالا۔ یہ کاغذ اس نے شانی کی طرف پھینکا اور فاؤنٹین پین شانی کے منہ پر دے مارا۔ ''پکڑ یہ پین...... پکڑ!'' وہ گرجا۔

شانی نے پین بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ''لکھ اس کاغذ پر جو باتیں میں نے تجھ سے کہی ہیں۔ لکھ...... نہیں تو تیرے اس یار کو نیچے سے کاٹ دوں گا اور تجھے اوپر سے برابر کر دوں گا۔''

لکھ حرامزادی! تاکہ سندر ہے تیرے اوپر۔"

شانی سسکی۔"میں نہیں لکھ سکتی۔"

"کیوں؟"

شانی نے اَشک بار آنکھیں اٹھا کر ریاض کو دیکھا اور بولی۔"میری انگلیاں زخمی ہیں۔"

ریاض کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ یقیناً اسے یاد آیا ہوگا کہ یہ انگلیاں کیسے زخمی ہوئی تھیں اور یہ بھی یاد آیا ہوگا کہ کیوں ہوئی تھیں۔ مگر وہ غیظ و غضب کا چڑھا ہوا دریا تھا۔ چھوٹی موٹی رکاوٹیں اس کا رستہ کہاں روک سکتی تھیں۔ وہ اسی آتش فشاں لہجے میں بولا۔"کسی کُتے کے بچے کا کوئی احسان نہیں ہے مجھ پر۔ سن رہی ہے تُو، کوئی احسان نہیں ہے۔ میں نے اتار پھینکے ہیں بہتَ سے احسان۔ وہاں تیری رنگ والی حویلی میں تیرا وہ ٹھرکی بڈھا معصوم علی زندہ ہے اور تیری وہ بدکار پھوپھی بھی اپنے حصے کی دودھ جلیبیاں کھا رہی ہے۔ میں نے تیرا کافی سارا احسان برابر کر دیا ہے۔ صرف ایک جنازہ نکالا ہے۔ دو جنازے تجھے معاف کیے ہیں۔ چل لکھ۔ چل لکھ...... نہیں تو پہلی گولی تیرے اس ہاتھ پر ہی ماروں گا۔"

شانی نے کوشش کی مگر انگلیوں سے خون رسنے لگا۔"مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔" وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر بولی۔

اس نے شانی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور للکارا۔"اچھا، اپنے منہ سے بول...... بول جو میں نے کہا تھا۔ بول تُو ٹھگنی ہے، بہروپن ہے۔ جادو ٹونے کرتی ہے۔ بول میں کہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں ہذیان تھا۔

رستم کے جسم میں جنبش جاگی مگر وہ گوشت پوست کا انسان تھا۔ ناتوانی کی حد سے گزر چکا تھا۔ اب وہ دل و جان سے چاہتا بھی تو قابلِ ذکر مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔

ریاض کے بے پناہ جبر سے مجبور ہو کر شانی ریاض کے پیچھے پیچھے بولنے لگی۔

بول۔"میں ٹھگنی ہوں۔"

"میں ٹھگنی ہوں۔"

"بول میں بہروپن ہوں۔"

"میں بہروپن ہوں۔"

"میں نے سب کو دھوکا دیا۔"

"ہاں، میں نے سب کو دھوکا دیا۔"

"میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔"

"ہاں، میں نے دیا۔"

"پورا فقرہ بول حرامزادی! میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔"

"میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔"

"میری نظر ایم این اے کی کرسی پر تھی۔"

"میری نظر کرسی پر تھی۔"

"میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں۔"

"میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں...... ہاں، میں معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب معاف کر دیں۔ میں نے جن کو دھوکا دیا اور جن کو دھوکے دینے کے ارادے رکھتی تھی۔ میں نے جن کو لوٹا اور جن کو لوٹنے کے ارادے رکھتی تھی۔ مجھے سب معاف کر دیں اور ریاض! تم بھی معاف کر دو۔" وہ روتی گئی اور بولتی چلی گئی۔"میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگتی ہوں اور تم سے بھی۔ بس، اب اتنا احسان مجھ پر کرو۔" اس کا سر جھک گیا۔ بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھوں میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا جو اس نے بند کر دیا۔

ریاض کی آنکھیں بدستور شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے رائفل شانی اور رستم کی طرف سیدھی کی۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور انگلی ٹرائیگر پر رکھ دی۔ اس کی انگلی کی ایک حرکت رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی اور وسطی پنجاب کے ڈکیت رستم سیال کو عدم آباد روانہ کر سکتی تھی۔ انگلی ٹرائیگر پر تھی اور ٹرائیگر منتظر تھا اور ٹرائیگر سے آگے رائفل کا بیرل تھا...... اور بیرل سے آگے دو لٹے پٹے جسم تھے...... اور انگلی ٹرائیگر پر حرکت نہیں کر رہی تھی۔ انگلی کیوں حرکت نہیں کر رہی تھی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ صدیوں کی بساط پر فیصلے کا لمحہ تھا...... اور روزِ اَزل سے ایسے حیران کن لمحے آتے ہی رہتے ہیں۔ جب وقت کے طوفانوں میں ظلم اور برداشت ٹکراتے ہیں۔ جفا اور وفا میں رَن پڑتا ہے، خنجر اور گردن کا تصادم ٹھہرتا ہے تو پھر ایسی ساعتیں آتی ہیں۔ ان ساعتوں میں کچھ ہو جاتا ہے۔ شیشے کی ضرب سے پتھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھول کی پتیوں سے ہیروں کے جگر کٹ جاتے ہیں اور نازک گردنیں، خنجروں کو کند کر دیتی ہیں...... ہاں، ایسا ہوتا ہے اور پتھروں کو اور ہیروں کے جگر کو اور تیز دھار خنجروں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ یہ انقلاب آفریں تبدیلی کب آ گئی۔ ریاض جیسے پھنکارتے، شعلے برساتے انسان بھی کبھی کبھی ایسی تبدیلیوں کی زد میں آتے ہیں۔ ان کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کے اندر کب تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ ان کے اندر کے لات منات کب ٹوٹنا شروع ہوئے اور

ان کے سینے کے نیلے شعلوں کو کب پیہم برسنے والی بارشوں نے دھواں کر دیا۔

بے شک یہ حیران کن لمحے تھے۔ ریاض کی اے کے 56 رائفل تنی ہوئی تھی۔ چہرہ انگارہ تھا اور سانس چڑھی ہوئی تھی مگر رائفل خاموش تھی۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں ریاض کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں دکھائی دیں۔ وہ کھڑا کھڑا جیسے پتھر ہو چکا تھا۔ وہ لمحے تھے یا صدیاں تھیں لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بالآخر گزر گیا۔ ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ ریاض نے گولیاں چلائیں۔ اس نے کل چار فائر کیے۔ یہ چاروں فائر رستم اور شانی کے سروں کے کافی اوپر سے گزرے اور سنگلاخ دیوار پر لگے۔ ہر طرف پتھریلی کرچیاں بکھر گئیں۔

قبائلی ہزارہ خان حیرت سے گنگ تھا اور ریاض کا چہرہ تک رہا تھا۔ ریاض نے رائفل گھما کر دیوار پر دے ماری۔ وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری۔ ریاض، شانی پر جھپٹا...... دیوانگی کے عالم میں اسے کئی دو ہتھڑ رسید کیے اور دہاڑا۔ ''تُو کس مٹی کی بنی ہوئی ہے...... تُو کیا ہے...... تُو کیا ہے؟''

پھر وہ بے دم سا ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر کہنیاں رکھیں اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ کیا کرے۔

اچانک اس کا واکی ٹاکی جاگا۔ کافی دیر بپ ہوتی رہی۔ آخر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو...... ہیلو ریاض صیب...... ہیلو! خو آپ کہاں پر ہے؟''

ریاض نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد بوجھل آواز میں بولا۔ ''میں یہاں آگے آیا ہوا ہوں...... اوور!''

''ابھی اندر سے تین چار گولیاں چلنے کا مدھم آواز آیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ اوور!''

''ہاں خیریت ہے۔ یہاں اندھیرے میں کچھ شک ہوا تھا۔ اس لیے گولیاں چلائیں...... اوور!''

''مفرور کا پتا چلا؟ اوور!''

''نہیں، ابھی نہیں۔ اوور اینڈ آل!'' ریاض نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔

شانی کو لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیا واقعی ہو رہا تھا یا وہ مر چکی تھی؟ اسے اپنے اردگرد کی ہر شے چکراتی دکھائی دی۔ اسے اب بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونا ہے۔

ریاض نے عالمِ وحشت میں اپنی رائفل دور پھینک دی تھی۔ یہ پوسٹ کے پیچھے ایک

تاریک گوشے میں جا گری تھی۔ دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل اسے اٹھانے کے لیے بڑھا۔ شانی کی چھٹی حس نے پکار کر کسی انجانے خطرے کی اطلاع دی۔ اچانک سماعت شکن دھماکا ہوا اور اس نے دراز قد شخص کو اڑ کر دور گرتے دیکھا۔ یہ خیال شانی کے ذہن میں برق کی طرح کوندا کہ یہ زمین میں چھپی کسی مائن کا دھماکا ہے مگر شاید یہ ایک مائن نہیں تھی۔ اکٹھی کئی مائنز کا بلاسٹ تھا۔ رستم اور خود شانی بھی ہوا میں اچھل کر گرے۔ اس کے ساتھ ہی شانی کو احساس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کسی نہایت وزنی شے کے نیچے دب گئے ہیں۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ پوسٹ کی چھت بھی دھماکے سے گر گئی ہے اور اس کا ایک کندھا کسی وزنی شے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے شعلے بھڑکتے دکھائی دیے۔ ''رستم...... رستم!'' وہ چلائی مگر جہاں رستم گرا تھا، وہاں اب ملبے کا ایک بڑا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس ڈھیر پر ایک زخمی چمگادڑ پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہر طرف دھول اور دھواں تھا۔ دونوں ٹارچوں کی روشنی بھی اس دھوئیں میں کہیں چھپ گئی تھی۔ اب صرف آگ کی روشنی تھی اور آگ چاروں طرف سے بڑھ رہی تھی۔ شانی کو ریاض اور ہزارہ خان بھی کہیں دکھائی نہیں دیے۔ چند ساعتوں بعد شانی کو لگا کہ اردگرد کا ٹمپریچر ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے پاؤں وزنی شے کے نیچے سے کھینچنا چاہے مگر یکسر ناکام رہی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ۔'' وہ اضطراری کیفیت کے تحت چلائی۔

اس کے نتھنوں میں بارود کی مہلک بُو تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کے بال جھلس رہے ہیں۔ تو کیا یہ آخری لمحے تھے؟ اس کی قسمت میں آگ میں جل کر مرنا تھا؟ رستم کہاں تھا؟ رستم کہاں تھا؟ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ ڈپٹی ریاض پر پڑی۔ وہ قریباً تیس فٹ کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس آگ کو دیکھ رہا تھا جو شانی کو نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

ریاض کا چہرہ یکسر سپاٹ تھا۔ یقیناً وہ بھی جان چکا تھا کہ شانی کے پاؤں آزاد نہیں ہیں۔ آگ کی لپٹوں اور دھوئیں سے شانی کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی اوڑھنی جلنا شروع ہو گئی۔ اس نے آخری بار پاؤں آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا...... اس نے ڈپٹی ریاض کو دیکھا۔ وہ جو دہشت، بربریت اور درندگی کی علامت تھا۔ جو صرف زندہ درگور کرنا اور مارنا جانتا تھا...... ہاں، وہی ریاض شانی کی طرف لپک رہا تھا اسے آگ کی لپٹوں سے نکالنے کے لیے۔ اس کی آنکھوں میں ان لمحوں میں، انسانی ہمدردی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یہ ناقابلِ یقین نظارہ تھا۔ شانی نے اسے دوڑتے اور آگ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ شانی کے پاس آیا۔ اسے ملبے کے بوجھ کے نیچے سے نکالنے کی کوشش

کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کے بال بھی جھلسنے لگے۔ اس کے چہرے کے گرد لپٹی ہوئی سفید پٹی نے آگ پکڑ لی۔

''الو کی پٹھی! خود بھی زور لگا۔'' وہ شانی کو کھینچتے ہوئے دہاڑا۔

شانی نے اپنی سی کوشش کی مگر دونوں پاؤں مفلوج ہو چکے تھے۔

ریاض نے ملبے کو، آگ کو اور اس ساری صورتِ حال کو کئی گندی گالیاں دیں اور ایک جلتی ہوئی شہتیر کو شانی کے پاؤں پر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے اپنے ہاتھ جل گئے۔ باہر سے ہزارہ خان چلایا۔ ''چھوڑ دو ریاض صیب! دوسرا چھت بھی گرنے والا ہے...... باہر آ جاؤ۔''

ریاض نے کوئی جواب نہیں دیا اور شانی کو کھینچنے کی کوشش کرتا رہا۔

''چھوڑ دو۔'' شانی کراہی۔ ''تم خود کو بچاؤ۔''

''بکواس بند کرو۔'' ریاض نے کہا اور پورا زور لگا کر شانی کو کھینچا۔ وہ تھوڑا سا کھسکی مگر مکمل طور پر باہر نہ آ سکی۔ ریاض کے کپڑوں نے پہلو کی طرف سے آگ پکڑ لی۔ شانی کے اپنے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ اسے لگا، وہ انگاروں سے لپٹی ہے۔

''ریاض صیب! کیا ہو گیا تم کو...... چھوڑ دو اس خبیث کو۔'' ہزارہ خان پھر چلایا۔

اسی دوران میں شانی کے پاؤں ایک جھٹکے سے آزاد ہو گئے۔ جھٹکے سے ریاض بھی گرا...... اس کے ہاتھ میں ایک چٹائی آ گئی۔ یہ چٹائی اس نے شانی کے گرد لپیٹی، اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور دوڑتا ہوا آگ کے گھیرے سے باہر آ گرا۔ ہزارہ خان نے جلدی سے ایک بھاری کپڑا ریاض کے جسم پر ڈال کر اس کی آگ بجھائی۔ وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے۔

''رستم...... رستم! کہاں ہو تم؟'' شانی دھوئیں کے اندر سے ملبے کے ڈھیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سلگتے ہوئے ملبے کو ننگے ہاتھوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ ریاض نے اسے کھینچ کر ملبے سے دور کیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ بالائی چھت بھی دھماکے سے ملبے کے ڈھیر پر گر گئی اور یہی نہیں ہوا، کھوہ کی چھت کا بے شمار ملبہ بھی ساتھ ہی گرا۔ ہزاروں ٹن پتھروں نے ارد گرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔

''رستم...... رستم!'' شانی دیوانہ وار چلاتی چلی گئی...... پکارتی چلی گئی۔

ریاض نے اسے بانہوں میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے آگ اور قاتل دھوئیں میں کودنے سے بہ مشکل روکے ہوئے تھا۔ ہزارہ خان دیکھ رہا تھا اور حیرت سے گنگ تھا۔ واکی ٹاکی پر مسلسل سگنل

موصول ہو رہے تھے۔ ریاض نے کال ریسیو نہیں کی۔ تپش اور دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔

''ہزارہ خان! اسے یہاں سے نکالنا ہے۔'' ریاض نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا جو اس کے بازوؤں میں تھی۔

''ام سمجھا نہیں ریاض صیب!''

''میں نے فارسی نہیں بولی۔ اسے پہاڑ سے پار کرنا ہے۔ تم آگے چلو...... تمہیں راستے کا پتا ہے۔'' وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے۔ سب سے برا حال شانی کا تھا۔ وہ بہت کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے اس کی سانس بالکل گم ہو جاتی تھی۔ وہ اب جو کچھ بھی بول رہی تھی، وہ اس کے گلے کے اندر ہی گونج رہا تھا۔

ہزارہ خان نے ٹارچ اٹھائی اور گہرے دھوئیں میں راستہ بناتا ہوا چل دیا۔ ریاض نے شانی کو بانہوں میں لے رکھا تھا اور اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔ شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ وہ رستم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس گہرے سیاہ دھوئیں میں، بے گور و کفن، اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے چاہا، وہ بھی اسی سیاہ دھوئیں میں ختم ہو جائے مگر ریاض کی بانہیں اس کے نیم جان جسم کو کھینچتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ کھوہ کے اندر سے پھوٹنے والے ایک نہایت تنگ راستے سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے بہ مشکل ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ شانی نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، اس راستے کے اوپر شاید کھلا آسمان تھا...... مگر دھواں یہاں بھی بھرا ہوا تھا۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ بھی مر رہی ہے۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ اس کی سانس اس کے سینے سے بچھڑ رہی تھی۔ وہ گر گئی۔ اسے لگا کہ ہزارہ خان اسے کندھے پر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ نہ جانے کب تک اس تاریکی میں رہی۔ اس تاریکی میں گاہے بہ گاہے کچھ دور افتادہ آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ کچھ لمس، کچھ بالکل تاریک مناظر...... جیسے یہ سب کچھ کسی اور دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس بے ہوشی کے عالم میں اسے احساس ہوا کہ وہ رستم کے ساتھ ہے۔ ایک نہایت چمکیلی شام میں۔ روکیٹ بستی کا خوب صورت گھر ہے اور ٹیلے ہیں۔ وہ رستم کا مضبوط ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے...... ہنستی جا رہی ہے، بولتی جا رہی ہے۔

لیکن پھر یہ سب کچھ ایک اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی گہرے، بہت گہرے کنوئیں میں اترتی جا رہی ہے...... رستم اس کے ساتھ نہیں۔ وہ یکسر تنہا ہے۔

نہ جانے بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے یہ دورانیے کب تک آتے جاتے رہے پھر شانی کو

محسوس ہوا کہ رات کا وقت ہے اور وہ کسی گاڑی میں ہچکولے کھا رہی ہے......اس کے اردگرد کچھ لوگ موجود تھے۔ اسے ناصر کی آواز سنائی دی۔ پھر جہانگیر کی...... پھر کوئی پشتو میں زور سے بولا۔

شانی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کے گرد چھائی ہوئی تاریکی کا پردہ رفتہ رفتہ چاک ہونے لگا۔ وہ کسی جیپ نما گاڑی میں تھی۔ گاڑی کے اندر ہلکی روشنی تھی۔ اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر بہت سی کریم لگی ہوئی تھی۔ اسے سامنے ہی ایک برقع پوش عورت نظر آئی......رستم کہاں ہے؟ یہ سوال دہکتے ہوئے تیر کی طرح اس کے سینے میں اُتر گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلائی۔ ''رستم......رستم!''

کسی نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ یہ ناصر تھا...... ہاں، یہ ناصر تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑی پگڑی نظر آ رہی تھی۔ ''رستم کہاں ہے ناصر؟'' شانی نے اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

ناصر نے نرمی سے کہا۔ ''آپ لیٹ جائیں بھابی! آپ زخمی ہیں۔''

''مجھے رستم کے بارے میں بتاؤ۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ وہ زندہ ہیں نا؟''

''ہاں، وہ زندہ ہیں......آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔'' ناصر نے عجیب لہجے میں کہا۔

''دیکھو ناصر! مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟''

اچانک شانی کے نتھنوں میں اسپرٹ کی بُو گھسی۔ اسے بازو پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر آہ و بکا کرتی رہی۔ ''دیکھو ناصر...... دیکھو جہانگیر...... ان کو مُردہ نہ سمجھنا۔ وہ زندہ ہیں۔ ان کو ڈھونڈو۔ وہ ملبے کے نیچے ہیں......وہ مل جائیں گے......'' وہ بولتی رہی اور ایک بار پھر بہ تدریج تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک گھر میں تھی۔ یہ نیچی چھت والا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ شانی نے پہچان لیا، یہ زری تھی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ گاڑی میں اس نے جس برقع پوش کو دیکھا تھا وہ زری ہی تھی۔ شانی کو ہوش میں آتے دیکھ کر زری تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ ہی ناصر کو آوازیں دینے لگی۔ ناصر بھاگا ہوا اندر آیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا لیکن اب سر پر پگڑی نہیں تھی۔

شانی پر ایک بار پھر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور مسلسل رستم کے بارے میں سوال کرنے لگی۔ ناصر نے زری کو باہر بھیجا اور شانی کو بڑی محبت سے بستر پر لٹا دیا۔

''بھابی! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا لیکن آپ کو حوصلے اور ہمت سے سننا ہوگا۔''

''میں سنوں گی۔ تم بتاؤ۔'' وہ کراہی۔

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''رستم بھائی لاپتا ہیں لیکن ہم ان کی طرف سے ابھی مایوس نہیں ہیں۔ وہاں کھوہ میں بہت سا ملبہ گرا ہے۔ پہاڑی کا ایک حصہ ڈھے گیا ہے۔ بہت سے پاکستانی اور افغانی لوگ تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔''

''لیکن ...... ہمیں کیسے پتا چلے گا......وہ کیسے ہیں؟''

''آپ بے فکر رہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے۔ پہلوان اور نذیر خان کے رابطے سرحد کی دونوں طرف ہیں۔''

ناصر کافی دیر تک شانی کو سمجھانے اور سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ وہ چیک پوسٹیں دراصل ان لشکریوں کے ٹھکانے تھے جو کچھ عرصہ پہلے روسی فوجوں سے لڑتے رہے۔ اس علاقے میں اکثر جگہوں پر اب بھی بارودی سرنگیں موجود ہیں۔ یہ ایک ساتھ پھٹ جانے والی چار پانچ سرنگیں ہی تھیں جنھوں نے اتنا بڑا دھماکا کیا۔

شانی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کون لایا تم لوگوں کے پاس؟''

''ہم بارڈر کے پاس بورکی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کل رات آخری پہر ایک قبائلی ہمارے پاس آیا۔ اس نے اپنا نام ہزارہ خان بتایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اور اس کے دو ساتھی پچھلے کئی گھنٹے سے ہمیں اردگرد کی بستیوں اور ڈیروں پر تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے اور ہمارے میزبان کو ساتھ لیا اور گاؤں سے باہر ایک درے میں لے آیا۔ وہاں آپ ایک چٹائی پر بے ہوش پڑی تھیں۔ آپ کو اپنے ساتھ لانے والا ڈپٹی ریاض تھا۔ ڈپٹی ریاض کا بایاں پہلو بری طرح جلا ہوا تھا۔ چھاتی کی طرف سے کھال اُتر گئی تھی اور چربی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا۔''

''اس نے کچھ کہا؟''

''ہاں۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑے طیش میں تھا۔ پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا...... جلن کی وجہ سے بھی اس کا برا حال تھا۔ پھر وہ ہزارہ خان کے ساتھ واپس چلا گیا۔''

''اس نے کچھ کہا ناصر! مجھے بتاؤ...... اس کے لفظوں میں بتاؤ'' شانی نے اصرار کیا۔

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر کہنے لگا۔ ''اس نے آپ کو...... گالی دی اور بولا، اس کو بتا دینا کہ ڈپٹی ریاض نے کبھی کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھا۔ میں نے اس کی اور اس کے خصم کی جان بخشی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا خصم سرنگ میں سے نکل نہیں سکا۔ اگر وہ ملا تو اسے بھی پارسل کر دوں گا تم حرامیوں کے پاس۔''

''جب وہ یہ کہہ رہا تھا ناصر......اس کے چہرے پر کیا تھا؟''

ناصر پُر سوچ انداز میں سامنے دیوار کو تکتا رہا۔ آخر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

''بھابی! کبھی آپ نے کسی پتھر کو روتے دیکھا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب ریاض یہ باتیں کر رہا تھا... میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھے اپنی نظر پر یقین نہیں آیا۔ مجھے... بالکل یہی لگا جیسے کوئی پتھر رو رہا ہے...... ریاض اور آنسو...... سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے نا؟''

شانی کی آنکھوں میں بھی تازہ آنسو اُمڈ آئے۔ ''اس نے کچھ اور کہا؟''

''نہیں بھابی...... بس جاتے جاتے اس نے کوئی شے پتھر پر مار کر توڑ دی۔ وہ پرزے پرزے ہوگئی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس کی کیسٹ بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں۔ ہزارہ خان کے ساتھ واپس بارڈر کی طرف چلا گیا۔''

شانی نے گھٹنوں میں منہ چھپایا اور سسکتی رہی۔ اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ناصر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔''

''کیا؟'' وہ گھٹنوں میں سر دیئے دیئے بولی۔

''آنکھیں کھول کر دیکھ لیں۔''

شانی نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے دروازے میں مُنا کھڑا تھا۔ اس نے زری کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اس کے عقب میں پہلوان تھا۔ ''منے!'' شانی نے پکارا۔ وہ جیسے صدیوں کا بچھڑا ہوا تھا۔ بھاگ کر آیا اور شانی سے لپٹ گیا۔

☆========☆========☆

اگلا ایک مہینہ انتہائی کرب، اضطراب اور انتظار کا مہینہ تھا۔ شانی کے کان ہر لحظہ کسی اچھی خبر پر لگے ہوئے تھے... اور وہ اچھی خبر کہیں نہیں تھی۔ یہاں وہ پہلوان کے ایک قبائلی دوست تبریز علی خان کے آبائی ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان یہ ایک الگ تھلگ بستی تھی۔ بہ مشکل پندرہ بیس گھر اور یہ سب لوگ آپس میں رشتے دار تھے۔ نزدیکی شہر خوست تھا اور وہ جنوب مشرق میں قریباً چالیس... کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

تبریز خان اپنی تین اونٹنیوں پر عمارتی لکڑی خرلاچی منڈی میں لے کر جاتا تھا۔ وہ ہر پانچویں چھٹے روز پاکستانی علاقے سے ہو کر آتا تھا اور ناصر، جہانگیر وغیرہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا تھا۔ سرنگ جس جگہ سے بیٹھی تھی، وہاں پہاڑی میں کئی دراڑیں نمودار ہو گئی تھیں۔

وہاں سے ملبہ ہٹانا اور کسی کو تلاش کرنا خاصا دشوار گزار کام تھا۔ اس کے علاوہ مزید بارودی سرنگوں کا اندیشہ بھی موجود تھا۔ سترہویں اٹھارہویں دن تبریز خان کی زبانی، شانی تک ایک اچھی خبر پہنچی تھی..... اور وہ یہ کہ پورے اٹھارہ روز بعد ملبے کے نیچے سے ایک شخص زندہ نکلا تھا۔ یہ وہی دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل تھا جو رستم کے ساتھ ہی ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو شدید زخمی تھے۔ زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے پھر بھی وہ اپنی سانس کی ڈور کسی نہ کسی طرح بحال رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ عمارت کے ملبے کے نیچے بن جانے والے ایک خلا میں موجود رہا تھا۔ اس خبر کے بعد شانی اور اس کے ساتھیوں کی امید بندھی۔ وہ رستم کے بارے میں پھر سے تھوڑے پُر امید ہو گئے۔

اب اس واقعے کو بھی نو دس دن گزر چکے تھے۔ آس امید کے چراغوں کی لو پھر مدھم پڑنے لگی۔ شانی کے لیے دنیا اندھیر تھی...... اور تو اور وہ مُنے کی طرف سے بھی بالکل بے پرواہ ہو چکی تھی۔ مُنے کی دیکھ بھال زری ہی کر رہی تھی۔ شانی زیادہ تر گھر کی چھت پر جا کر چارپائی پر لیٹی رہتی۔ وہ جنوب کے ان پہاڑوں کی طرف دیکھتی رہتی جن کے پار اس کا جیون ساتھی رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہتا، اس کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی۔

وہ جیسے ہوا کے ہاتھ پیغام بھیجتا تھا۔ میری شریکِ حیات اور میرے دوستو! میرا انتظار کرنا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ میری واپسی کے امکان اپنے دل میں زندہ رکھنا اور امکان تو بہت سے ہیں...... ممکن ہے کہ میں ملبے کے نیچے زندہ موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے گرفتار کرلیا گیا ہو اور کسی نامعلوم جگہ پر رکھا گیا ہو اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں کھوہ سے نکلنے میں کامیاب رہا ہوں۔ کسی جگہ رکا، کسی جگہ چھپا اچھے وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔

ہوا پیغام دیتی رہی اور وقت گزرتا رہا...... وہ آس سب کے دلوں میں زندہ رہی جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی اور سب سے زیادہ شانی کے دل میں اس آس کا بسیرا تھا۔ اسے شب و روز کی ہر ہر ساعت میں کسی کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔

ایک دن زری نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے عقب سے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔ ''دیکھو! تم نے اپنا کیا حالت بنا لیا۔ تم کو دیکھ کر میرا دل روتا...... تم ایسا مت کرو۔''

وہ بولی۔ ''زری! کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔ زندگی نہ موت۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کر دیا کرو۔''

''دیکھو! ناصر ہر وقت مجھ کو تنگ کرتا۔ اگر تم بھی کرتا تو پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔''

اس نے پرانی دھمکی دی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ شانی نے تڑپ کر دیکھا۔ ناصر اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی خبر ہے لیکن یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی شاید۔

شانی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ پتھر کی طرح ساکت۔ ''کک...... کیا ہوا...... ناصر؟'' وہ ہکلائی۔

ناصر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ڈپٹی ریاض مرگیا بھابی۔''

''کیا...... کیسے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''ہاں بھابی! یہ کنفرم اطلاع ہے۔ پہلوان اخبار بھی ساتھ لایا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ ہسپتال میں تھا۔ اس کا ایک تہائی جسم جل چکا تھا۔ خاص طور سے سینہ۔ پچھلے دس بارہ روز سے اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ پرسوں جمعے کی دوپہر کو اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اسے لاہور سے اسلام آباد لایا جارہا تھا مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔''

آج کل شانی کی آنکھوں کو آنسوؤں کی قلت تھی۔ مگر اس دلدوز خبر نے اس کی آنکھوں کے سوتے پھر کھول دیئے۔ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کی نگاہوں میں وہ آخری مناظر گھومنے لگے جب ریاض...... ریاض نہیں رہا تھا۔ چند انقلابی لمحوں نے اس کی اندرونی اچھائی کو اس کی ساری ظاہری باطنی برائیوں پر غالب کردیا تھا۔ وہ جان کی پرواہ کیے بغیر نہایت دلیری سے آگ میں جھپٹا تھا اور شانی کو باہر نکالنے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔

شانی کا دل چاہا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے دانشور اس کے سامنے ہوں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے رُوبرو کھڑی ہوجائے۔ وہ ان سے کہے...... ابھی انسان سے مایوس ہونے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی برے سے برے انسان کے اندر بھی اچھائی موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اچھائی تہہ در تہہ غلافوں اور خولوں میں چھپی ہوئی ہو لیکن وہ موجود ہے۔ اسے تدبیر، برداشت اور پیہم محبت کے زور سے نکالا جاسکتا ہے...... اور جب وہ نکل آئے گی اور ہمیں اسے نکالنے کا ڈھنگ آجائے گا تو پھر دیکھنا...... اس دنیا کا چہرہ اور ہوجائے گا۔

☆=======☆=======☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے...... شانی کی آنکھیں کھلے کواڑوں اور سنسان راستوں پر لگی رہیں لیکن جس کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا...... وہ نہیں آیا۔ وہ شاید کہیں تھا ہی نہیں۔ مگر وہ اس آس کا کیا کرتی جو ہر روز اس کے اندر مر مر کر جاگتی تھی۔ یہ آس کہتی تھی، وہ تیرے بغیر کیسے جاسکتا ہے۔ وہ کہیں موجود ہوگا، زندہ ہوگا، تیرے عشق نے اسے زندہ رکھا ہوگا۔

یہ آسیں ایسی ہی دیوانی ہوتی ہیں۔ یہ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتیں۔ فنا کے گھاٹ اُتر کر پھر زندہ ہوجاتی ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی سہارے!

کہتے ہیں جو مرجاتے ہیں ان کے لیے چین آجاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ آخری سانس تک تڑپاتے رہتے ہیں...... اور شانی تڑپ رہی تھی۔

سورج ڈوبتا رہا اور ابھرتا رہا۔ ہوائیں اپنا لَمس بدلتی رہیں۔ دھوپ اپنے زاویے تبدیل کرتی رہی۔ شامیں، صبحیں...... اور دوپہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہیں...... اسی طرح پورے سات ماہ گزر گئے۔ شانی کے پاس رستم تو نہیں آیا لیکن اس کی آخری نشانی آگئی۔ یہ ایک ہمکتا، مسکراتا بچہ تھا۔ ایک چھوٹا رستم۔ وہ اپنی ماں کے بالوں میں اپنی ننھی انگلیاں پھنساتا اور اسے کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا...... جیسے اس کا دھیان اس کے بے پناہ دکھ سے ہٹانا چاہتا ہو اور وہ چند لمحوں کے لیے کامیاب بھی ہوجاتا تھا...... مگر صرف چند لمحوں کے لیے!

ناصر اور جہانگیر مستقل طور پر اس بور کی نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ انہوں نے یہاں خود کو فرضی ناموں عباس خان اور عبدالعزیز کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ عبدالعزیز یعنی جہانگیر کے پاس کافی کرنسی موجود تھی۔ روسی جنگ کے بعد افغانستان میں پاکستانی کرنسی کا ریٹ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس روپے سے جہانگیر اور ناصر نے ایک باغ اور دو کھیت خرید لیے۔ کھیت تو انہوں نے ٹھیکے پر دے دیئے مگر باغ کی نگہداشت اپنے ذمے رکھی۔ وہ سب اپنے اپنے ماضی کو تقریباً فراموش کرچکے تھے۔ شانی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد اس کے پیچھے کیا ہوا ہے اور اب وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کو بھی ان پہاڑوں تک محدود کرلیا تھا اور اسی میں عافیت تھی۔

باغ خریدنے کے دو تین مہینے بعد شانی کے بے حد اصرار پر ناصر اور زری نے شادی کرلی۔ یہ شادی رستم کی آخری خواہش کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ شانی اور جہانگیر نے گھر کا ایک حصہ ناصر اور زری کے لیے مخصوص کرنا چاہا مگر انہوں نے ہر صورت اکٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ ناصر کو شانی کی ذہنی کیفیت کا پتا تھا۔ وہ شانی کو ہر دم مصروف اور رونق میں رکھنا چاہتا تھا...... لیکن جب دل میں رونق نہ ہو تو باہر کی گہما گہمیاں یکسر بے اثر رہتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد علاقے کے حالات اچھے نہیں تھے۔ شانی مُنے کو باہر بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گھر ہی میں اس کی تعلیم شروع کردی تھی۔ مُنے کے ساتھ زری بھی اکثر اس کے پاس پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ چند ماہ کا بچہ ان کے آس پاس کھیلتا رہتا تھا۔ شانی نے اس کا نام راسب رکھا تھا...... راسب کا مطلب تھا باتحمل، بُردبار!

زندگی کے شب و روز اسی عجیب دھوپ چھاؤں میں گزرتے چلے جا رہے تھے۔ کسی اداس شام میں جب وہ تنہا ہوتی، سنسان گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی...... اسے لگتا وہ کچھ دیر پہلے یہاں تھا۔ کسی کونے کھدرے سے اسے اور اپنے بچے کو دیکھتا ہوا گزر گیا ہے۔ وہ گلی میں نکل کر دور تک دیکھتی لیکن کوئی نہ ہوتا۔ وہ پلٹ آتی۔ پھر ویرانی میں سے ایک بھولی بسری آواز ابھرتی اور اس کے کانوں میں گونجنے لگتی...... میریاں گلاں یاد کریں گی، رو رو کے فریاد کریں گی، فیر میں تینوں یاد آواں گا۔

......اور پھر پورے تین سال گزر گئے۔ گہرے زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ رونے دھونے اور تلاش کرنے والوں کو یقین ہونے لگا کہ رستم اب نہیں ملے گا...... زندگی رواں رہی۔ اب ہوائیں اسی طرح چلتی تھیں۔ موسم اسی طرح بدلتے تھے، کھیتوں میں مزدور کام کرتے تھے...... چشموں سے پانی نکلتا تھا، باغوں میں پھول کھلتے تھے، چاندنی چٹکتی تھی اور اَبر آلود راتوں میں آسمان سے برف کے گالے گرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ آسمان سے جنگی طیارے چنگھاڑتے ہوئے گزر جاتے، افق پر دھوئیں کے مرغولے دکھائی دیتے...... اور کبھی کبھی رات بھر دور کے پہاڑوں میں فائرنگ کی آوازیں آتی رہتیں...... ہاں، سب کچھ ویسا ہی تھا...... لیکن شانی کے لیے سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ اس کا کوئی زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر گھاؤ خونچکاں تھا۔ زمانہ بھول سکتا ہے اور بھول کر زندہ رہ سکتا ہے...... مگر خوشبو اپنے پھول سے بچھڑ کر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ چاندنی کا وجود چاند سے اور ندی کا وجود پانی سے مشروط ہے۔

سرما کی ایک زرد دوپہر میں شانی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ باغ کے کنارے کھڑی تھی۔ اسے دور پہاڑیوں پر ہجوم نظر آیا۔ "یہ کیا ہے جہانگیر؟" اس نے پوچھا۔

"شاید جنگی سردار کسی نئی لڑائی کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارنے کے سوا ان کا کام ہی کیا ہے۔"

اسی دوران میں ناصر آ گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ لڑائی کی نہیں، صلح کی منصوبہ بندی ہے۔ دو جنگی گروپ ایک دوسرے کے قیدی رہا کر رہے ہیں۔ ہماری بستی کے کئی لوگ بھی واپس آ رہے ہیں۔"

ناصر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد بستی کے چوراہے میں دیگیں کھڑکھڑاتی جانے لگیں پھر شانی نے بستی کے رہا ہونے والے چند نوجوانوں کو بستی میں آتے دیکھا۔ اسے ایسے منظر بڑے اچھے لگتے تھے۔ جب کوئی بچھڑا ہوا ملتا تھا۔ جب باہیں ایک دوسرے کو لپٹاتی

تھیں۔ جب رخسار چومے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکتے تھے۔

اور وہ باغ کے کنارے کھڑی چپ چاپ دیکھتی رہی۔ بوڑھی مائیں، جوان بہنیں اور شرماتی لجاتی بیویاں اپنے بچھڑے ہوؤں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ڈالی جا رہی تھی۔ ہار پہنائے جا رہے تھے، نفیریاں بج رہی تھیں۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہو گیا، جیسے سب ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں۔

شانی پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی قینچی تھی۔ وہ انگوروں کی بیل سے سرخی مائل انگوروں کے گچھے بڑے سلیقے سے علیحدہ کر رہی تھی اور ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کام میں مُنا بھی اس کی مدد کرنے لگتا تھا۔ چھوٹا راسب ایک چٹائی نما کپڑے پر سو رہا تھا۔ اچانک شانی کو لگا، اس کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ ایک نادیدہ لہر اس کے جسم سے ٹکرائی، اس نے آنکھیں سکوڑیں۔ اس کی سانس جیسے سینے میں رک گئی۔ دل کی دھڑکن تھم گئی اور کائنات کی گردش بھی۔ وہ دیکھتی چلی گئی۔ وہ وہم تھا یا حقیقت؟ نہیں وہم اتنا ٹھوس اور واضح تو نہیں ہوتا...... وہ اب پختہ عمر کا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر لمبے جھاڑ جھنکار بال تھے۔ اس کے نقوش پر ماہ و سال کی دبیز گرد تھی۔ مگر اس کی آنکھیں...... اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اسی پہلے دن کی طرح جب وہ اسی طرح اجڑا اجڑا، لٹا لٹایا چودھری فاخر کی حویلی میں نظر آیا تھا۔ ان کئی برسوں میں ان آنکھوں میں ذرا سی تبدیلی بھی تو نہیں آئی تھی۔

شانی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو کر جائے گی لیکن پھر اس نے سوچا، اگر اسے گرنا ہی ہے تو وہ اپنے محبوب کی باہوں میں گرے، یا پھر اس کے پاؤں میں...... "رستم!" وہ عجیب آواز میں سسکی...... وہ بھاگی، اس کے بازو پھیلے، اس کی اوڑھنی ہوا میں لہرائی۔ اس کا سینہ پُرنور محبت کی "تجلی" سے تھرایا...... اور وہ لپٹ گئی۔ اپنے شوہر سے، اپنے محبوب سے۔

☆=======☆=======☆

اور یہ رات تھی۔ سرما کی رات...... جب گھروں سے باہر سردی دندناتی ہے اور گھروں کے اندر آتش دان دہکتے ہیں۔ وہ سب بھی ایک انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ رستم، ناصر، جہانگیر، شانی اور زری...... رستم کی لکڑی اور پلاسٹک کی ٹانگ اس کے جسم کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چھاتی اور گردن پر بھی جلنے کے پرانے نشان موجود تھے۔ مُنا اس کی گود میں سر رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ رستم کا آنا ایک ایسے سپنے جیسا تھا جس پر یقین کرتے بنتی تھی نہ جس کو جھٹلاتے۔ وہ اپنی طویل رُوداد ختم کر چکا تھا۔ وہ سب کچھ بتا چکا تھا...... سب کچھ۔ وہ

اس قاتل رات میں کیسے رینگتا ہوا گرم ملبے کے ڈھیر سے نکلا، کیسے ایک دراڑ میں سے رینگ کر کھلی فضا میں پہنچا اور پھر کیسے وہ کئی دن تک ایک یوسف زئی بیوہ عورت کے گھر میں چھپا رہا...... وہ بتا چکا تھا کہ کس طرح اس نے بعد کے کئی ماہ تک شانی اور ساتھیوں کی تلاش چپکے چپکے جاری رکھی اور پھر کس طرح وہ خوست کے ایک وزیرستانی راہ زن کو قتل کرنے کے بعد ایک جنگی گروپ کا حصہ بن گیا۔ دریائے کرم کے ساتھ کوہ سفید کی ویران گھاٹیوں میں ایک ''وارلارڈ'' کے ساتھ اپنی آوارہ گردی کے بارے میں بھی رستم نے سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کیسے وہ مخالف گروپ کے ہاتھوں قید ہو کر پورا ایک سال قید میں پڑا رہا ہے۔ قید کے دوران میں ہی اسے اپنے ایک ساتھی سے معلوم ہو گیا تھا کہ دو پاکستانی اپنی دو عورتوں کے ساتھ اس ''بورکی'' نامی بستی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پاکستانی تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی جانتا ہے۔ یہ اشارے رستم کے لیے کافی ثابت ہوئے تھے۔

رستم کی رُوداد ختم ہوئی تو شانی، ناصر اور جہانگیر نے خود پر بیتنے والے حالات سے آگاہ کیا۔

اور پھر ڈپٹی ریاض کا ذکر چھڑ گیا...... وہ جو سب سے برا تھا...... اور جو سب سے بازی لے گیا۔ وہ بدلا تو ایسے بدلا کہ دیکھنے والوں کی انگلیاں دانتوں میں دبی رہ گئیں۔ اس نے ایک ہی کایا پلٹ شب میں اپنی سفاکی اور بے حسی کی سارے داغ اپنے خون سے دھو دیئے۔

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

وہ جاتے جاتے ان سب کو تنگ نظروں کی آنکھیں کھول گیا جو انسان کو صرف اچھے یا صرف برے روپ میں دیکھتے ہیں...... اور جس کو برے روپ میں دیکھتے ہیں اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔

فضا جب زیادہ گمبھیر ہونے لگی تو رستم نے مُنّے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سب کے لیے ایک تحفہ بھی لایا ہوں اپنے ساتھ!''

''کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''میرا ایک ساتھی جو میرے ساتھ ہی رہا ہوا ہے۔ پتا ہے وہ کون ہے؟''

''کون؟'' شانی اور زری نے ایک ساتھ پوچھا۔

''اجمل خان!''

''اجمل؟ کس اجمل کی بات کر رہے ہیں؟'' ناصر نے کہا۔ وہ سب حیرت سے رستم کو

دیکھنے لگے۔

''اجمل خان جو شاید ایک نئے روپ میں ہمارے پاس آ گیا ہے۔ یہ قندھار کا رہنے والا ہے۔ اس کا قد اجمل سے تھوڑا چھوٹا ہے لیکن اجمل ہی کی طرح ہنس مکھ اور دل والا ہے۔ اس کا پورا نام اجمل خان اچکزئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گا۔ اس کے سامنے تم مجھے جلال کے نام سے پکارو گے۔ اسے یہی نام معلوم ہے۔''

ابھی اجمل خان اچکزئی کی بات ہو ہی رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہو گئی۔ ناصر اٹھا اور پھر تھوڑی دیر بعد اجمل خان ان کے درمیان تھا۔ اس کے کندھے پر وزنی رائفل اور گولیوں والی دو بیلٹس تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب میں گھل مل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد یوں لگنے لگا کہ وہ سب اسے عرصے سے جانتے ہیں۔ اس کے چہرے اور گردن پر زخموں کے نشان اس کی جنگجو طبع کے غماز تھے۔ وہ رستم کو بے تکلفی سے جلال اور جلالم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شانی کو بھی بڑے خلوص سے بہن جی کہنے لگا۔ گرم قہوے کی بڑی سی چسکی لیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''بھائیو! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوا۔ آپ کو بھی ہوا ہوگا۔ ام چاہتا ہے، یہ خوشی برقرار رہے۔ اس لیے اپنے بارے میں ام آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔''

''آپ کہیں جی۔'' ناصر نے کہا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''برادر! ام دل کا برا نہیں۔ پر ام کو غصہ بہت زیادہ آتا ہے اور جب آتا ہے، ام بہت سخت دل ہو جاتا ہے۔ ایک دم پتھر کے ماپق (مافق)۔ مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ اپنی اس خامی پر ام خود بھی بہت شرمندہ ہے۔''

رستم نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ایک محبت بھری نظر اپنے سوتے ہوئے دو ڈھائی سالہ بچے پر ڈالی پھر کن انکھیوں سے شانی کو دیکھا۔ شانی کا آدھا چہرہ اوڑھنی کے پیچھے تھا اور باقی آدھے پر انگیٹھی کی روشنی رنگ بکھیر رہی تھی۔ وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''اجمل! تمہاری اس سخت دلی کا علاج ہمارے پاس...... ایک دیوی ہے...... جس کا جادو سخت لوہے کو موم کر دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟...... کون سا دیوی؟''

''دیوی...... یعنی دیوی!''

''ام اب بھی نہیں سمجھا جلالم؟''

''تم دیویوں کے بارے میں نہیں جانتے؟'' اجمل خان نے معصوم انداز میں نفی میں جواب دیا۔ رستم نے لمڑکی سے باہر دور کوہ سفید کی تاریک چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجمل خان! دیویاں وہ نرم و نازک عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے سینے میں بے حد مضبوط دل

رکھتی ہیں۔ ان کے حوصلے پہاڑوں سے اونچے ہیں۔ یہ بڑی نرمی اور محبت سے آہستہ آہستہ منہ زور پانیوں کے راستے بدل دیتی ہیں......اور پانیوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ ہاں اجمل خان! یہ دیویاں کہانیوں کو نیا رنگ دے دیتی ہیں......تاریخ کا چہرہ بدل دیتی ہیں۔"

"جلالم! تمہارا یہ باتیں بالکل اماری سمجھ میں نہیں آرہا۔" اجمل خان نے سر کھجایا۔

رستم گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے پنجاب کے ایک بڑے سخت پولیس افسر ریاض ہٹلر کا نام سنا ہے نا؟"

"بالکل......جب ام راولپنڈی میں تھا، ام نے سنا تھا لیکن آپ اس کو کیوں یاد کر رہا ہے؟"

"اس پولیس افسر کو بھی ایک دیوی کے جادو نے لوہے سے موم کر دیا تھا......سوچو اجمل خان! اگر ایسا شخص موم ہو سکتا ہے تو تم تو کوئی چیز نہیں ہو......" رستم کا لہجہ جذباتی تھا اور تحسین آمیز بھی۔

"آپ کا بات اب بھی اماری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید ام نے زیادہ نسوار کھا لیا ہے۔"

ناصر اور جہانگیر خاموشی سے سن رہے تھے......اور سمجھ بھی رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہانگیر، ناصر اور زری سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اجمل خان اچکزئی بھی اٹھ گیا......وہ اپنے جیل کے ساتھی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"جلالم! ام جانتا ہے، تم بڑے لمبے عرصے بعد اپنے بچے اور اپنی بیوی صاحبہ سے ملا ہے۔ رات بہت ہو گیا ہے۔ ام زیادہ دیر تمہارے اور بیوی صاحبہ کے درمیان روڑا بننا نہیں چاہتا۔"

ناصر، زری اور جہانگیر بھی چلے گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اپنی دیوی کو دیکھتا رہا۔ انگیٹھی میں آگ سلگ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر برفیلی چوٹیوں اور تاریک نشیب و فراز پر سرد ہواؤں کے قافلے اُتر رہے تھے......یہ شروعات تھی ایک نئی کہانی کی......!

☆=======ختم شد=======☆

عین۔ شین۔ قاف

محمد فیاض ماہی

- عشق و محبت کے اس سوداگر کی کہانی۔ جس نے عشق نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی...... مگر اس کی ضد اور انا عشق کے پہلے حرف "عین" کی اسیر بن گئی۔
- شرابی اور آوارہ مزاج احمد سبحانی جب عاشق بنا تو "عین" نے اس کو روح کی گہرائی تڑپا دینے والا تاوان دینے پر مجبور کر دیا۔ شیطان ملعون کے کاری وار "عین" کی سرخروئی کی راہ میں دیوار تھے۔
- اس عاشق کا قصہ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کا عشق "شین" سے شک نہیں بلکہ "شین" سے شہادت پر مبنی ہے۔ وہ خاندان سے بغاوت کر کے شہر محمد ﷺ کا مسافر بنا تو طوفان نے اس کا راستہ روک لیا۔ کیا اس نے عشق کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگا کر عشق کا دوسرا حرف "شین" سرخرو کر دیا؟
- سادات گھرانے کی وکالت عشق کے خلاف دلیل بن گئی جبکہ مدعیہ ایک طوائف تھی۔ گندگی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی طوائف نے "قاف" کو اپنا پیرہن بنا لیا۔
- وہ عشق کے قاف کی ایسی اسیر بنی کہ دنیاوی عذابوں نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی۔ اُس نے "قاف" کو کس طرح خراج پیش کیا؟
- محبت و عقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ عشق کی رعنائیوں سے لبریز سطریں عبادت گزار فقرے بہترین اسلوب عشق الٰہی اور محبوبِ الٰہی کے عشق میں جانوں کے نذرانے تحفتاً پیش کرنے والوں کی کہانی۔
- عین۔ شین۔ قاف کی سچی اور سُچی تشریح سہ حرفی "عشق" کی حشر سامانیاں۔
- عشق حقیقی پر اب تک لکھی جانے والی کتب کو فراموش کرا دینے والی شاندار تحریر۔

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور ☏ 7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور